عظیم مسلمان شخصیات

رفیقان محمد ﷺ، صاحبانِ باصفا،
امت کے محسنین، مسلم تہذیب کے پاسبان،
ریگ زاروں کے امین، ادوارِ زرّین،
وسط ایشیا کے جواہر، ہند کے حکمران

کلیم چغتائی

ٹائم مینجمنٹ کلب

عظیم مسلمان شخصیات

کلیم چغتائی

ٹائم مینجمنٹ کلب
Opposite Zainab Market, 268/2, R.A. Lines,
Abdullah Haroon Road, Saddar Karachi-75530.
Contact 0092 323 298 7638, Email: tmcbooks@gmail.com

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں
غیر قانونی طور پر چھپوانا اور فروخت کرنا ہر لحاظ سے جرم ہے

"عظیم مسلمان شخصیات"
کے سلسلے کے تحت آٹھ کتابیں (ایک جلد میں)
رفیقان محمد ﷺ، صاحبانِ باصفا، امت کے محسنین، مسلم تہذیب کے پاسبان،
ریگ زاروں کے امین، ادوارِ زرّیں، وسط ایشیا کے جواہر، ہند کے حکمران

مولف:
کلیم چغتائی

سیریز ایڈیٹر و مہتمم اشاعت:
عبدالسلام سلامی

صفحہ سازی: ندیم احمد سولنگی
سرورق: فضل الرحمٰن

پہلی اشاعت: ۲۰۱۰ء
دوسری اشاعت: ۲۰۱۴ء

ISBN: 978-969-9019-16-6

Distributors
IPS Books
Institute of Policy Studies
1, Street 8, F-6/3, Islambad, Pakistan
Tel: +92 51 84 38 39 1-3, Fax: +92 51 84 38 39 0
Web: www.ips.org.pk, Email: ips@ips.net.pk

ناشر: ٹائم مینجمنٹ کلب
پوسٹ بکس نمبر 12356، کراچی۔75500

Marfat.com

فہرست

عرضِ ناشر ۷
تعارف و تشکر ۸

رفیقانِ محمد ﷺ ۱۱
حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ۱۷
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۲۲
حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ۲۹
حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ۳۶
حضرت امِ ایمن رضی اللہ عنہا ۳۸
حضرت امِ عمارہ رضی اللہ عنہا ۴۰
حضرت ابو ذر غِفاری رضی اللہ عنہ ۴۳
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ۴۸
حضرت بلال رضی اللہ عنہ ۵۳
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ۵۷
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ۶۲
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۶۶
حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ۷۱
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ۷۹

امت کے محسنین ۸۷
حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ۹۳
حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۹۸
حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۳
حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۸
حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۴
حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۹
حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۳
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۰
حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۴
حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۹
حضرت امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ ۱۴۶
حضرت امام مسلم بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۲
حضرت امام ابو عیسٰی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۷
حضرت امام ابو عبدالرحمٰن نسائی رحمۃ اللہ علیہ ۱۶۳
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۱۶۸
امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۴
ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۲
شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۹

Marfat.com

صاحبانِ باصفا ۱۹۵

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۱
حضرت جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۵
سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ۲۱۲
سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ۲۱۹
حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ ۲۲۶
حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ۲۳۲
حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ۲۳۸
مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ ۲۴۵
حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۱
حضرت شرف الدین احمد بن یحیٰ مَنیری رحمۃ اللہ علیہ ۲۵۹
حضرت نصیرالدین محمود چراغِ دہلی رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۵
حضرت مخدُوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ ۲۷۱
مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ ۲۷۷
مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۳
مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ۲۸۹

مسلم تہذیب کے پاسبان ۲۹۹

ولید بن عبدالملک ۳۰۵
ہشام بن عبدالملک ۳۱۱
ابو جعفر منصور ۳۱۹
محمد بن عبداللہ المہدی ۳۲۳
ہارون الرشید ۳۳۱
مامون الرشید ۳۳۷
معتصم باللہ ۳۴۵
مہتدی باللہ ۳۵۱
ابو العبّاس معتضد باللہ ۳۵۷
مستنصر باللہ ۳۶۲
مدرسہ مستنصریہ ۳۶۶
متوکل علی اللہ ۳۶۸
بغداد ۳۷۶

ریگ زاروں کے امین ۳۸۱

طارق بن زیاد ۳۸۷
عبدالرحمٰن الداخل ۳۹۱
ہشام اوّل ۳۹۶
عبدالرحمٰن الاوسط ۴۰۱
احمد بن طولون ۴۰۷
عبدالرحمٰن الناصر ۴۱۳
المعزلدین اللہ ۴۱۹
العزیز باللہ ۴۲۴
محمد بن ابی عامر ۴۳۰
عبدالمومن ۴۳۵
یعقوب المنصور باللہ" ۴۴۱
ابو یوسف یعقوب ۴۴۸
علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون ۴۵۴
اسکیا محمدؒ ۴۶۰
منصور ذہبی ۴۶۴
اندلس کی عظمتِ رفتہ ۴۶۹

Marfat.com

ادوارِ زرّیں ۴۸۳
عضد الدولہ ۴۸۹
عماد الدین زنگی ۴۹۳
نور الدین زنگی ۴۹۹
صلاح الدین ایوبی ۵۰۷
ملک الظاہر بیبرس ۵۱۴
عثمان خان ۵۲۲
اُور خان ۵۲۸
مُراد اوّل ۵۳۴
مراد دوم ۵۴۰
سلطان محمد فاتح ۵۴۷
سلیم اوّل ۵۵۴
سلیمان اوّل ۵۶۰
عباس اوّل ۵۶۵
مراد چہارم ۵۶۹

وسط ایشیا کے جواہر ۵۷۷
نظام الملک طوسی ۵۸۳
طغرل بیگ محمد ۵۹۱
اَلپ ارسلان ۵۹۷
ملک شاہ سلجوقی ۶۰۴
سنجر سلجوقی ۶۰۹
رشید الدّین ۶۱۷
شاہ رُخ ۶۲۴
علی شیر نوائی ۶۳۰
الغ بیگ ۶۳۷
حسین بایقرا ۶۴۱

ہند کے حکمراں ۶۴۹
محمد بن قاسم ۶۵۵
محمود غزنوی ۶۶۲
مسعود غزنوی ۶۷۲
ابراہیم غزنوی ۶۷۷
شہاب الدین غوری ۶۸۴
قطب الدین ایبک ۶۹۲
ناصر الدین قباچہ ۶۹۸
شمس الدین التتمش ۷۰۳
ناصر الدین محمود ۷۱۰
غیاث الدین بلبن ۷۱۶
جلال الدین خَلجی ۷۲۴
علاؤالدین خلجی ۷۳۲
غیاث الدّین تغلق ۷۴۱
محمد بن تغلق ۷۴۵
فیروز شاہ تغلق ۷۵۳
زین العابدین ۷۵۹
بہلول لودھی ۷۶۶
محمود شاہ بیگڑہ ۷۷۲
محمود گاواں ۷۷۸
سکندر لودھی ۷۸۴
ظہیر الدین بابر ۷۹۰
شیر شاہ سوری ۸۰۰
اسلام شاہ سوری ۸۰۸
ٹیپو سلطان ۸۱۳

Marfat.com

کلیم چغتائی

تعلیمی لیاقت: ایم۔ اے صحافت (۱۹۸۶ء، جامعہ کراچی)، بی۔ ایس۔ سی (آنرز)، ایم۔ ایس۔ سی بایوکیمسٹری (۱۹۷۶ء، جامعہ کراچی)۔

تصانیف وتراجم: "عظیم مسلمان شخصیات" کے سلسلے کے تحت آٹھ کتابیں ٭ رفیقانِ محمد ﷺ ٭ امت کے محسنین ٭ صاحبانِ باصفا ٭ مسلم تہذیب کے پاسبان ٭ ریگزروں کے امین ٭ ادوارِ زریں ٭ وسط ایشیا کے جواہر ٭ ہند کے حکمران۔ "اسلامی طرزِ فکر" (تالیف وترجمہ، جلد دوم وسوم)، بچوں کے لیے بیس کتابیں، بچوں کے رسائل، ماہنامہ "تعلیم و تربیت"، "آنکھ مچولی"، "پھول"، "پیغام ڈائجسٹ" اور "ساتھی" میں متعدد کہانیاں۔ پی آئی اے کے سفری رسالے "ہمسفر" میں سیاحت کے موضوع پر کئی مضامین۔ معروف اخبارات و جرائد میں ادب، تاریخ سائنس، سیاحت اور عمومی موضوعات پر درجنوں مضامین۔

پیشہ ورانہ خدمات:
- ٭ ریسرچ آفیسر، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سہ ماہی تحقیقی جرائد، "ہمدرد اسلامیکس" اور "ہسٹاریکس"، یکم جنوری ۲۰۰۶ء تاحال)
- ٭ سینئر ایڈیٹر/اعزازی سینئر ایڈیٹر ماہنامہ "سم سم" کراچی (جنوری ۲۰۰۴ء تاحال)۔
- ٭ مشیر اعزازی، سہ ماہی مزاح پلس، کراچی
- ٭ مدیر اعلیٰ، ماہنامہ "خوشیاں" (مئی ۲۰۰۴ء تا نومبر ۲۰۰۵ء)۔
- ٭ ایڈیٹر، بین الاقوامی ماہنامہ "رابطہ" (جنوری ۲۰۰۱ء تا اپریل ۲۰۰۲ء قبل ازیں دسمبر ۱۹۸۵ء سے دسمبر ۲۰۰۰ء تک اسی رسالے میں اسسٹنٹ ایڈیٹر، سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر)۔
- ٭ سب ایڈیٹر، روزنامہ "جسارت" کراچی (نومبر ۱۹۸۰ء تا جنوری ۱۹۸۶ء)۔
- ٭ ایسوسی ایٹ ایڈیٹر، ہفت روزہ "وقت" کراچی (نومبر ۱۹۷۹ء تا مئی ۱۹۸۰ء)۔
- ٭ بانی مدیر، ماہنامہ "ساتھی" کراچی (اگست ۱۹۷۷ء)۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کی دعوۃ اکادمی کے تحت ینگ رائٹرز کیمپ میں متعدد بار بطور "ریسورس پرسن" یا مرتی شرکت۔

پندرہ سے زیادہ کتابوں کی ادارت اور اشاعت کا اہتمام۔

شعبہ "بچوں کا ادب" دعوۃ اکادمی کے تحت اسکول کے بچوں کے لیے ۱۲ یونٹوں پر مشتمل خط و کتابت کورس کی تشکیل۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام: پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "اسلامک سائیکلوپیڈیا" کے اسکرپٹ کی تالیف (دو سال)
ریڈیو پاکستان کے مختلف پروگراموں میں شرکت۔

پیشہ ورانہ اعزاز: یونیسیف نے ۱۹۹۹ء میں شائع ہونے والی کہانی "بے خبر لوگ" کو سال کی "بہترین کہانی" قرار دیا۔

ای میل: kckcpk@yahoo.com
kckcpk@gmail.com

موبائل (پاکستان): 0300-2814899

Marfat.com

عرضِ ناشر

مشاہدے میں آیا ہے کہ اردو اخبارات اور رسائل میں مختلف موضوعات پر بعض نہایت مفید اور معلوماتی تحریریں شائع ہوتی ہیں، لیکن چونکہ اخبار یا رسالے کی زندگی ایک دن یا ایک ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے اگلے دن یا چند ماہ بعد بعض انتہائی قابلِ قدر تحریریں ردّی بن کر ضائع ہو جاتی ہیں۔

ماہنامہ "رابطہ" بلا شبہ اردو کا ایک ایسا معیاری اور رجحان ساز جریدہ رہا ہے جس کا مقابلہ کسی بھی بین الاقوامی جریدے سے کیا جا سکتا ہے۔ "رابطہ" کے مضامین کے کئی مفید سلسلے اپنی نوعیت کے اعتبار سے مستقل اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ مضامین کے تین سلسلوں "سرمایہ کاری"، "زندگی کے راستے" اور "دین کا راستہ" کا انتخاب دو ناشرین کتابی صورت میں شائع کر چکے ہیں جبکہ "رابطہ" کے اشاعتی ادارے او میگ انٹرپرائز نے "مضامینِ صحت" اور "عظیم مسلمان شخصیات" کے عنوان سے "رابطہ" کے چند مطبوعہ مضامین پر مشتمل کتابیں شائع کیں۔

ٹائم مینجمنٹ کلب نے ۲۰۰۷ء میں، "صحت" کے عنوان کے تحت "رابطہ" کے مطبوعہ مضامین کو تین کتابوں کے ایک سلسلے "مضامینِ صحت" کے تحت شائع کیا۔ "رابطہ" کا ایک اور مفید سلسلۂ مضامین "تاریخ سے ایک ورق" تھا جس میں صحابہ کرامؓ، بزرگانِ دینؒ اور علمائے عظامؒ کے علاوہ کامیاب اور عظیم مسلمان حکمرانوں، جرنیلوں اور فاتحین کا تذکرہ شائع کیا جاتا تھا۔ یہ تمام مضامین کلیم چغتائی صاحب نے نہایت شوق اور محنت سے تحریر کیے۔ ٹائم مینجمنٹ کلب نے ان ہی مضامین کو از سرِ نو کتابی صورت میں مرتب کیا ہے اور "عظیم مسلمان شخصیات" کے عنوان کے تحت یہ مضامین ۸ کتابوں کے سلسلے (سیریز) کی صورت میں شائع کیے گئے۔ ان کتابوں کو قارئین کے حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ ان آٹھ کتب کی قیمت کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس خیال سے اب ان کتب کو ایک ہی جلد میں شائع کیا جا رہا ہے کہ قارئین کو اب یہ آٹھ کتابیں اور بھی کم قیمت پر دستیاب ہو سکیں گی۔

آٹھ کتابوں کے اس تازہ سلسلے کے لیے نہ صرف مضامین کو از سرِ نو مرتب کیا گیا، بلکہ چند کتب کے لیے نئے مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پوری کوشش کی گئی ہے کہ سابقہ مطبوعہ مضامین میں جو چند اغلاط تھیں، انھیں درست کیا جائے۔ تاریخ کے متعلقہ شعبے کی ممتاز شخصیات نے مسودوں پر نظرِ ثانی کی ہے اور اپنا تبصرہ قلم بند کیا ہے جس سے ان کتابوں کی قدر افزائی ہوئی ہے۔

جیسا کہ ان کتابوں کے مولف نے 'عرضِ مولف' میں نشان دہی کی ہے، "یہ مسلمانوں کی تاریخ کی کتب نہیں ہیں اس لیے ان میں مختلف ادوار کا تسلسل نہیں ملے گا، نہ ہی ان کتب کو تاریخ کی کتب کے معیار پر جانچنا چاہیے۔ یہ در اصل مختلف قابلِ تحسین مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے... جو... یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب کوئی اچھا حکمران مملکت میں انصاف کی عمل داری قائم کر دیتا ہے اور اپنے اچھے اقدامات کی بدولت مملکت کو فلاحی ریاست میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس کے ان اقدامات کے اثرات کتنی صدیوں تک برقرار رہتے ہیں۔"

ان کتابوں کی تیاری میں خاصا وقت بھی صرف ہوا ہے اور محنت و وسائل بھی، لیکن خوشی اور اطمینان یہ ہے کہ اردو کے ایک ممتاز و موٴقر رسالے میں شائع شدہ مفید مضامین کی کتابی صورت میں اشاعت سے مضامین کے اس قابلِ قدر سلسلے کو دیرپا اور مستقل حیثیت حاصل ہو گئی ہے جو قارئین کے لیے تا دیر مفید و موٴثر ثابت ہو گی۔

ٹائم مینجمنٹ کلب، ماہنامہ "رابطہ" کے ناشر جناب عیاض غزنوی اور ان کی علم دوستی کا ممنون ہے کہ انھوں نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ، "رابطہ" کے مطبوعہ مضامین کو، قبل ازیں "مضامینِ صحت" اور اب "عظیم مسلمان شخصیات" کے سلسلے کے تحت شائع کرنے کی غیر مشروط اجازت دی۔ ان تمام اہلِ علم کا بھی شکریہ جنھوں نے ان کتابوں کے مسودات پر نظرِ ثانی کے لیے وقت نکالا اور گراں قدر تبصرے تحریر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام صاحبانِ علم کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہماری اس کاوش کو قبولیت عطا کرے۔

ان کتب کی تیاری میں ہر ممکن احتیاط برتنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن انسانی کوشش میں غلطیوں کا احتمال ہمیشہ رہتا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اگر کوئی سہو ان کی نظر میں آئے تو اس کی نشاندہی ضرور فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اسے درست کیا جا سکے۔ کتابوں کے اس سلسلے کے بارے میں آپ کی آرا اور تبصرے ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہوں گے۔

اشرف النسا بشیر جمعہ

Marfat.com

تعارف و تشکر

میں اپنے رب کا انتہائی شکر گزار ہوں، جس نے مجھے عظیم مسلمان شخصیات پر مضامین تحریر کرنے کی توفیق و صلاحیت بخشی اور ان مضامین کی اشاعت کے اسباب و وسائل عطا فرمائے۔

یہ مضامین ابتدا میں کراچی سے شائع ہونے والے بین الاقوامی ماہنامہ "رابطہ" میں شائع ہوئے۔ ان میں سے چند مضامین پر مشتمل ایک کتاب "عظیم مسلمان شخصیات" کے عنوان سے 1992ء میں ماہنامہ "رابطہ" کی انتظامیہ نے شائع کی۔ پھر ان تمام مضامین کو زمانی اور موضوعاتی لحاظ سے ترتیب دے کر آٹھ کتب کی صورت میں "ٹائم مینجمنٹ کلب" نے 2010ء میں شائع کیا۔ اب یہی ادارہ ان آٹھ کتب کو بڑے سائز کے صفحات پر ایک ہی جلد میں یکجا کر کے شائع کر رہا ہے۔ مجھے ربِ کریم سے امید ہے کہ اس طرح ان آٹھ کتب کو محفوظ رکھنے میں سہولت حاصل ہوگی، نیز ایک ہی جلد میں دستیابی کے باعث، کم قیمت پر ان کا حصول، قارئین کے لیے ممکن ہوگا۔

اس اشاعتِ ثانی سے قبل پروف کی رہی سہی اغلاط کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ غلطی کا امکان پھر بھی رہتا ہے لیکن اللہ عزوجل سے امید اور دعا ہے کہ اشاعتِ ثانی، صحت اور متن کے حوالے سے بہتر ہوگی۔ حوالے کی ان کتب کی فہرست ہر کتاب کے آخر میں درج کر دی گئی ہے جن سے اس کتاب میں شامل مضامین کی تیاری کے لیے مدد لی گئی۔

'عظیم مسلمان شخصیات' کے سلسلے کی ان آٹھ کتب میں سے پہلی تین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین" تبع تابعین" اور صوفیاء کرام" کے حالاتِ زندگی اور خدمات کا احاطہ کرتی ہیں۔ بقیہ پانچ کتب مختلف ادوار کے مسلمان حکمرانوں کے احوال اور کارناموں کا تعارف کرواتی ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ یہ تاریخ کی کتب نہیں ہیں۔ اس لیے ان میں ادوار کا تسلسل موجود نہیں ہے۔ پہلی تین کتب ان پاکیزہ نفوس کی بلند سیرتوں کے تذکروں پر مشتمل ہیں جو دینِ اسلام کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ بقیہ پانچ کتب مختلف قابلِ تحسین مسلمان حکمرانوں کے حالاتِ زندگی، اوصاف اور کارناموں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کتب کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں میں کس قدر صاحبِ ایمان، روشن سیرتوں کی مالک اور لائقِ صد تکریم شخصیات موجود تھیں اور کتنے باکردار، دین دار، خدا ترس، انصاف پسند، علم دوست، اچھے منتظم اور دلیر حکمران، جہاں بانی کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ جب بھی قدرت نے زمامِ حکومت ایسے نیک بندوں کے ہاتھوں میں دی تو انسانیت کو سکون اور فلاح میسّر آئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اللہ سے ڈرنے والے اور اچھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک، نیک حکمران کسی قوم کو ملے، وہ قوم فلاح و ترقی کی منزلیں سر کرتی چلی گئی اور جب بھی زمامِ کار، اللہ سے غافل، بدکردار اور غیر منصف مزاج حکمرانوں کے ہاتھوں میں آئی، ان کی قوم پر زوال کسی سیلاب کی مانند آیا۔ آج بھی اللہ کے حضور حاضری کا خوف رکھنے والے انصاف پسند حکمرانوں کی بدولت، انسانیت سکھ کا سانس لے سکتی ہے۔

عظیم مسلمان شخصیات کے یہ تذکرے امتِ مسلمہ کو بیداری اور عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔

عظیم مسلمان شخصیات کے سلسلے کی ان آٹھ کتب کو منظرِ عام پر لانے میں، میرے کئی کرم فرماؤں نے تعاون فرمایا۔ میں ان سب کا نہایت ممنون ہوں اور ان کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔

اپنے چند محسنوں کو میں، بطورِ خاص تشکر و سپاس اور دعاؤں کا نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے، میں بین الاقوامی ماہنامہ 'رابطہ' کے بانی و مدیرِ اعلیٰ، محترم محمد عیاض غزنوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ان کی ذاتی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں مجھے 'رابطہ' میں عظیم مسلمان شخصیات پر مضامین تحریر کرنے کا موقع ملا۔

ان مضامین کی تیاری میں ایک اور شخصیت میرے لیے شجرِ سایہ دار ثابت ہوئی۔ یہ تھے محترم ثروت صولت صاحب۔ آپ نے تاریخ کے موضوع پر بڑا کام کیا۔ ان کا خاص موضوع "ترکی" تھا۔ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ "ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ" کے عنوان سے ایک نہایت معلوماتی کتاب مرتب کی جو پانچ جلدوں میں ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتب تحریر کیں۔ محترم ثروت صولت صاحب نے میری بڑی رہنمائی کی۔ انہوں

Marfat.com

نے مجھے اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کی کھلی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ عظیم سے نوازے اور اپنی بے شمار رحمتیں عطا فرمائے۔

ان مضامین کی تیاری کے لیے میں نے مختلف کتب خانوں سے مدد حاصل کی۔ ان میں کراچی میں محترم خالد اسحٰق مرحوم کی بہت وسیع ذاتی لائبریری، مجلس علمی لائبریری، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی عمدہ لائبریری اور بہادر یار جنگ اکیڈمی کی لائبریری خصوصاً قابلِ ذکر ہیں جہاں بے حد قیمتی اور معلومات افزا کتب مجھے میسّر آئیں۔ میں جہاں ان کتب کے مصنفین اور مؤلفین کا شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہوں، جن سے میں نے استفادہ کیا، وہیں مذکورہ کتب خانوں کے منتظمین کا بھی بے حد ممنون ہوں اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجر و رحمت کی دعا کرتا ہوں۔

ان کتب کے پیش لفظ میرے واجب الاحترام اساتذہ اور صاحبِ علم شخصیات نے تحریر فرمائے۔ ان میں محترم ڈاکٹر انیس احمد صاحب، محترم ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی صاحب، محترم ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب، محترم ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ، محترم ڈاکٹر صفدر محمود صاحب، محترم اطہر ہاشمی صاحب، محترم ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب اور محترم ڈاکٹر انصار زاہد خان صاحب شامل ہیں۔ میں ان تمام لائقِ تکریم شخصیات کا نہایت ممنون اور ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔

ان مضامین کی تیاری کے دوران اپنے انتہائی قابلِ احترام اور مخلص رفیقِ کار، محترم سید محمد یعقوب صاحب (ایڈیٹر، ماہنامہ 'رابطہ') کی مکمل اخلاقی حمایت اور رہنمائی مجھے حاصل رہی۔ میں ان کے لیے بھی دعا گو ہوں۔

میں اپنے عزیز و محبی برادر محترم اور "رابطہ" میں میرے مشفق ساتھی، جناب عبدالسلام سلامی صاحب کا خاص طور پر ممنون اور ان کے لیے بہت دعا گو ہوں۔ انہوں نے از حد محنتِ شاقہ کے بعد ان سوا سو سے زائد مضامین کو یکجا کیا، انہیں موضوعات اور ادوار کے اعتبار سے ترتیب دیا۔ ان کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، اور کتابی صورت میں طباعت و اشاعت کے متعدد جاں گسل مراحل، پوری خندہ پیشانی سے طے کیے۔ یہ ان ہی کی محنت ہے کہ یہ مضامین کتابی صورت میں قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچ رہے ہیں۔

میں اپنے نہایت محترم اور محبت پاش برادر، تعمیرِ انسانیت کی گہری تڑپ رکھنے والے انتہائی نفیس انسان اور شفقت آگیں شخصیت کے مالک اور متعدد بیش قیمت کتب کے مصنف، محترم بشیر جمعہ صاحب کا بھی انتہائی شکر گزار اور ان کے لیے بہت دعا گو ہوں، جن کی ذاتی دلچسپی، بھرپور معاونت اور مکمل سرپرستی کے نتیجے میں یہ مضامین، کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔

آخر میں عرض کروں گا کہ ان کتب میں اگر کوئی خوبی ہے تو میرے رب کے کرم کی بدولت ہے اور جتنی خامیاں ہیں وہ میری لغزشوں کی عکاس ہیں۔ وَاللہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

رفیقانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بلند مرتبت ہستیاں رض جنہیں

رحمتِ دوعالم ﷺ کی رفاقت نصیب ہوئی

Marfat.com

انتساب

اپنے نہایت محترم والد مرحوم
محمود بیگ چغتائی

اور

بے حد عزیز والدہ مرحومہ
رحیم النساء کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

حیات طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعجاز تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ آپ کے تئیس سالہ تربیتی نظام اور دعوتی شخصیت سے جو بھی مَس کر گیا وہ مسِ خاک کندن بن کر نکلا۔ یہاں کے علم و تقویٰ کے فیضِ عام سے جس نے جتنا پیا وہ اتنا ہی سیراب ہوا اور ایسے کتنے خوش نصیب قیامت تک کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کے طفیل "نجوم" کی مانند قرار پائے۔ جس طرح رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں، لق ودق صحراؤں میں سفر کرنے والوں کے لیے ستارے راستے کے چراغ بنتے اور رہنمائی فراہم کرتے تھے، ایسے ہی اس انسانِ کامل اور پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے دبستان سے جو نکلا وہ انسانیت کی قیادت اور اپنے طرزِ عمل اور رویے کے سبب دوسروں کے لیے سنت کی ایک جیتی جاگتی مثال بن گیا۔

ایک مسلمان بلکہ ایک بااخلاق انسان کے لیے بھی ہدایت و رہنمائی کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں۔ یا تو وہ اپنے نفس، اپنی عقل، اپنے تجربے، اندرونی قلبی کیفیات اور اپنی محدود فکر کو اپنا رہنما بنائے اور فلسفہ، تجربی علوم، نفسی کیفیات و تجربات کی روشنی میں زندگی گزارے اور چونکہ یہ سب ذرائع علم اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود محدود ہیں اس لیے تمام زندگی محدودیت کا شکار رہے۔ یا پھر دوسرا راستہ وہ ہے جو خالق کائنات و انسانیت نے اپنی مخلوق کی ضروریات از مقصدِ تخلیق کے پیش نظر اپنی رحمت و محبت اور ربوبیت کی بنا پر مختلف ادوار میں انسانوں کو بامقصد، کامیاب اور پرامن زندگی گزارنے کے لیے اپنے منتخب کردہ انبیاؑ و رسلؑ کے ذریعہ دکھایا اور اس راستہ کو دکھانے کے ساتھ ساتھ اس کی عملی شکل بھی فراہم کر دی تاکہ کوئی انسان یہ نہ کہہ سکے کہ جو اصولِ حیات اور نظامِ زندگی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی خصوصی محبت و رحمت کی بنا پر انسانوں کے لیے بھیجا ہے وہ نظری تو ہے لیکن اس پر عمل کیسے کریں اور کون کرے؟ کیا یہ صرف چند مخصوص روحوں کے لیے قابلِ عمل ہے جو دنیا کو چھوڑ کر صرف رب سے لو لگانے کے دعوے کے ساتھ گوشہ نشین ہو کر عرفانِ نفس حاصل کر لیں یا یہ "کافۃ للناس" تمام انسانیت کے لیے ہے، اور اسی بنا پر اس کے لانے والے اور عملی طور پر تمام انسانوں کے لیے نمونہ اور مثال پیش کرنے والے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمۃ للعالمین" قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال محض اہل ایمان کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے ایک مثالی اخلاقی طرزِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن کریم کی عالم گیریت اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہونے کا تقاضا تھا کہ چلتا پھرتا قرآن بھی عالمگیر نمونہ ہو اور قیامت تک کے لیے اس کی مسکراہٹ ہو یا صبر و استقامت، اس کی گھریلو زندگی ہو یا بین الاقوامی معاہدے اور عقود، میدانِ جنگ میں ہمت و شجاعت کے ساتھ عاجزی و انکسار ہو یا مسجد میں معاشی، سیاسی، فقہی معاملات میں فیصلے، اس کی ہر ادا اور ہر عمل، قرآن کی تفسیر ہونے کے سبب قیامت تک انسانیت کے لیے ایک قابلِ عمل مثال بن جائے۔

خاتم النبیین ﷺ کی اس کاملیت اور جامعیت کا عکس آپ کے رفقا بشمول رفقائے حیات میں نظر آتا ہے۔ وہ امت کی مائیں سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ عائشہؓ ہوں یا مفسر قرآن عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو ایوب انصاریؓ ہوں یا سلمان فارسیؓ، بلالؓ اور ابو ہریرہؓ ہوں یا سعد بن ابی وقاصؓ اور ابو ذر غفاریؓ، سیرت پاک کے چلتے پھرتے نمونے اور امت مسلمہ کے لیے محرک کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔

یوں تو سیرت پاکؐ اور اصحابؓ اور صحابیاتؓ پر مفصل تحقیقی تصانیف کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن دلکش انداز میں، تاریخی مصادر پر مبنی مختصر احوال تحریر کرنا بظاہر آسان ہونے کے باوجود ایک مشکل کام ہے۔ مختصر مضامین کا یہ مجموعہ، رفیقانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جسے کلیم چغتائی صاحب نے تحریر کیا ہے اس لحاظ سے ایک انفرادیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس گرانقدر تحریری سرمائے کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ مضامین پڑھنے کے بعد دل میں یہ خواہش لازماً ہوئی کہ ان مضامین کا انگریزی زبان میں ایسے ہی دلچسپ انداز اور سلیس زبان میں ترجمہ لازماً آنا چاہیے تاکہ وہ نسل جسے "جدیدیت" اور نام نہاد "روشن خیالی" کے نام پر اسلامی تعلیمات، قرآن و سنت اور امت کے اصل رہنماؤں کی حیات سے دُور کیا جا رہا ہے وہ اپنی روایات کے آئینے میں سچائی کی تصویر دیکھ سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد
وائس چانسلر، رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد پاکستان

Marfat.com

عرضِ مؤلف

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے: بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ (صحابہ کرامؓ) ہیں۔ (بخاری، ترمذی)

میں اپنے رب کریم کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے رحمتِ دوعالم ﷺ کے عظیم صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم میں سے چند جلیل القدر ہستیوں کی سیرت ہائے پاک تحریر کرنے کی سعادت بخشی۔ ان بلند مرتبہ ہستیوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا، جنہیں رب کائنات کے محبوب ترین بندے ﷺ کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان عظیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہادی برحق ﷺ کے ایک ایک فعل اور ہدایت کو پوری طرح سمجھا اور نبی رحمت ﷺ کی سیرتِ پاک اور ہدایات کو مکمل دیانت داری اور تفصیل کے ساتھ بعد میں آنے والوں تک پہنچایا۔ رب العالمین ان برگزیدہ شخصیات پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں بھی اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل فرمائے۔

واضح رہے کہ بلند مرتبہ صحابہ کرامؓ وصحابیات کی تعداد اتنی ہے کہ ان کے تذکرے ایک مختصر کتاب میں یکجا نہیں کیے جاسکتے، چنانچہ اس کتاب میں صرف چھ صحابیاتؓ اور آٹھ صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ سیرتوں کا احوال پیش کیا جاسکا ہے۔ ان میں وہ تین عظیم المرتبت صحابیاتؓ شامل ہیں جو رحمت العالمین ﷺ کو بے حد محبوب تھیں، یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو مختلف مزاج عطا فرمائے ہیں۔ اسی طرح ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین میں بھی مختلف صلاحیتوں اور مزاج کی حامل شخصیات ملتی ہیں۔ ان میں حضرت ابوذر غفاریؓ جیسا زاہد اور درویش صفت انسان بھی ہے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف جیسا صاحبِ ثروت اور صاحبِ دل صحابی بھی موجود ہے اور حضرت عائشہؓ جیسی ذہین اور فقیہ ام المومنین بھی ہیں۔

مزاجوں اور صلاحیتوں کے اختلاف سے قطع نظر، یہ بات ہمیں تمام صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم میں مشترک نظر آتی ہے کہ وہ سب نبی کریم ﷺ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور آپ ﷺ کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی یاد رکھ کر خود بھی اسے اپنے معمولات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ دین اسلام کو نہ صرف اپنی ذات پر نافذ فرماتے تھے بلکہ اپنے اہل خانہ اور دیگر مسلمانوں، حتیٰ کہ اپنے وقت کے حکمرانوں کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔ وہ حق بات کہنے میں نہ تو کوئی خوف یا جھجک محسوس کرتے تھے، نہ کسی مصلحت کا شکار ہوتے تھے۔

باری تعالیٰ ان رفیع الشان ہستیوںؓ کو اجرِ عظیم اور بے شمار رحمتیں عطا فرمائے اور ہمیں بھی ان کی مانند، دین اسلام میں پورے کا پورا داخل ہو جانے کی توفیق بخشے۔

میں واجب الاحترام استاد، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر محترم پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد صاحب کا از حد ممنون اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمایا اور اس کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مونس و غمخوار جنہیں اللہ تعالیٰ کا سلام موصول ہوا

قافلہ شام جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

یہ ایک تجارتی قافلہ تھا۔ بہت سے اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا۔ کئی افراد سامان کی نگہبانی اور انتظامات میں مصروف تھے۔ یہ سب مال ایک خاتون کا تھا۔ وہ نہایت دولت مند تھیں۔ ان کی مالی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب شہر کے لوگوں کا قافلہ تجارت کے لیے روانہ ہوتا تھا صرف ان خاتون کا سامان قبیلے کے بقیہ افراد کے سامان کے برابر ہوتا تھا۔ یہ خاتون دولت مند تو تھیں ہی، لیکن اس سے اہم بات یہ تھی کہ وہ بہت اچھی عادات اور بہترین اخلاق کی مالک تھیں۔ بہت سمجھدار اور ہمت والی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہانت کے ساتھ اچھی شکل و صورت بھی عطا فرمائی تھی۔

خاتون کو ان کی پاکیزہ طبیعت کی وجہ سے لوگ طاہرہ کہتے تھے۔ طاہرہ کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ ان کا تجارتی سامان ایک طرف شام بھیجا جاتا تھا تو دوسری طرف یمن کے شہروں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ طاہرہ نے اپنے اس پھیلے ہوئے کاروبار کو چلانے کے لیے بہت سے ملازم رکھے ہوئے تھے لیکن وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھیں جو بہت دیانت دار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی انتظامی صلاحیتوں کا بھی مالک ہو۔

کچھ عرصے سے طاہرہ ایک دیانت دار اور سچے نوجوان کے چرچے سن رہی تھیں۔ ہر فرد اس نوجوان کی تعریف کرتا تھا۔ لوگ اسے "امین" یعنی امانت دار اور "صادق" یعنی سچا کہتے تھے۔ لوگ بتاتے تھے کہ یہ نوجوان اپنے چچا کے ساتھ کئی بار تجارتی سفر پر جاچکا ہے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نوجوان کے لیے تجارت کوئی نئی بات نہ تھی۔

طاہرہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا مالِ تجارت اس نوجوان کو دے کر شام بھیجیں گی۔ انہوں نے نوجوان کو پیغام بھجوایا کہ اگر آپ میرا تجارتی سامان لے کر شام جائیں تو میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں آپ کو دگنا معاوضہ دوں گی۔

نوجوان نے پیشکش قبول کرلی اور اب وہی نوجوان، خاتون کا تجارتی قافلہ لے کر شام جارہا تھا۔ طاہرہ نے اپنے خاص غلام میسرہ کو بھی قافلے کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ انہوں نے میسرہ کو تاکید کی تھی کہ قافلے کے نوجوان قائد کا خاص خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

کچھ عرصے بعد طاہرہ کا مالِ تجارت لے جانے والا قافلہ شام سے واپس لوٹ آیا۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا تھا۔ تمام مال دگنے منافع پر فروخت ہوگیا تھا۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ قافلے کے ساتھ جانے والا ہر شخص قافلے کے نوجوان سردار کے اخلاق اور اعلیٰ انتظام کی تعریف کررہا تھا۔ طاہرہ کا خاص غلام میسرہ تو اس نوجوان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے تھکتا نہ تھا۔

طاہرہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ انہوں نے تجارتی قافلہ لے جانے والے نوجوان کو طے شدہ رقم سے بڑھ کر معاوضہ دیا۔ یہی نہیں، انہوں نے نوجوان کی خوبیوں کے اعتراف کے طور پر چند تحفے بھی اسے پیش کیے۔

طاہرہ دو مرتبہ بیوہ ہوچکی تھیں۔ پہلے شوہر کے انتقال کے بعد دوسری شادی ہوئی۔ دوسرے شوہر بھی وفات پاگئے تو شہر کے کئی معزز سرداروں نے طاہرہ کو شادی کے پیغامات بھیجے لیکن طاہرہ نے انکار کردیا تھا۔ اب ان کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ محسوس کررہی تھیں کہ وہ اس نوجوان کے بہترین اخلاق سے بہت متاثر ہوگئی ہیں جسے انہوں نے اپنا سامانِ تجارت دے کر شام بھیجا تھا۔ نوجوان کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ طاہرہ عمر میں اس سے بڑی تھیں، لیکن انہوں نے غور

Marfat.com

و فکر کر کے اس نوجوان کو شادی کا پیغام بھیج دیا۔
نوجوان کو پیغام ملا تو اس نے اپنے چچا سے مشورہ طلب کیا۔ نوجوان کے والد کا تو بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ چچا ہی اس کے سرپرست تھے۔ چچا نے اس رشتے کی تائید کی تو نوجوان نے پیغام قبول کر لیا۔ بات طے ہو گئی، طاہرہ نے نکاح کی تاریخ مقرر کی اور پیغام دیا کہ حسب دستور اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آ جائیے۔
مقررہ تاریخ کو نوجوان اپنے بزرگوں کے ساتھ طاہرہ کے گھر آیا۔ نوجوان کے چچا نے نکاح پڑھایا۔ اب طاہرہ اس با اخلاق، دیانت دار، صادق اور امین نوجوان کی بیوی تھیں۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ چند برس بعد اللہ تعالیٰ اس صادق و امین نوجوان کو دنیا کے آخری نبی کا عظیم الشان مرتبہ عطا فرمائے گا۔
یہ تھیں طاہرہ، جنہیں ہم سب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام سے جانتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ، تمام مسلمانوں کی ماں، جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ درجۂ بلند عطا فرمایا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی زوجۂ محترمہ تھیں۔
حضرت خدیجہؓ وہ عظیم اور خوش نصیب خاتون ہیں جو نبی آخر الزماں محمد ﷺ کی نبوت پر سب سے پہلے ایمان لائیں۔ آپؓ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو سلام کہلوایا۔ آپ ہی کے بارے میں رسول اقدس ﷺ نے فرمایا "ساری دنیا کی عورتوں میں (اپنے زمانے میں) مریم (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ) افضل تھیں اور اسی طرح خدیجہؓ افضل ہیں۔"
حضرت خدیجہؓ، مکہ مکرمہ کے ایک تاجر خُوَیلد بن اسد کی صاحب زادی ہیں۔ ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ ہے۔ حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں نبی کریمؐ کے خاندان سے جاملتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی۔ ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام ہند تھا، دوسرے کا حارث۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ کی شادی عتیق بن عابد مخزومی سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام بھی ہند رکھا گیا۔ اسی وجہ سے حضرت خدیجہؓ ام ہند بھی کہلاتی تھیں۔ عتیق کے وفات پا جانے کے بعد حضرت خدیجہؓ نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔
رسول اقدس ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے بے حد محبت تھی۔ وہ حضور ﷺ سے نکاح کے بعد پچیس برس تک زندہ رہیں۔ ان کی زندگی میں رسول کریم ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ان کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم میں سے ایک صاحب زادے ابراہیم کو چھوڑ کر صرف حضرت خدیجہؓ سے اولاد عطا فرمائی۔ چار بیٹیاں، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ۔ ایک بیٹے حضرت قاسمؓ پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔ ابن سعد نے مزید دو بیٹوں طیب اور (عبد اللہ) طاہر کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک صاحب زادے حضرت ابراہیم، حضرت ماریہؓ کے بطن سے ہوئے۔
رسول کریم ﷺ سے نکاح کے بعد حضرت خدیجہؓ نے اپنا تمام کاروبار آنحضرت ﷺ کے حوالے کر دیا۔ جب رسول اللہؐ کی عمر ۳۵ برس ہوئی تو آپ تنہائی پسند ہو گئے۔ مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک غار واقع تھا جسے حرا کہتے تھے۔ آپ ﷺ وہاں چلے جاتے اور کئی دن تک وہیں قیام فرماتے۔ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کو کئی دن کے لیے کھانے پینے کا سامان تیار کر کے دے دیتیں۔ آپ ﷺ یہ سامان لے کر غارِ حرا میں چلے جاتے اور وہاں غور و فکر کرتے۔ جب یہ سامان ختم ہو جاتا تو پھر گھر تشریف لے آتے اور مزید سامان لے کر غارِ حرا چلے جاتے۔
ایک دن رسول کریم ﷺ بہت پریشانی کے عالم میں گھر تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے آتے ہی حضرت خدیجہؓ سے فرمایا، مجھے کمبلوں سے ڈھانپو، مجھے کمبلوں سے ڈھانپو۔ حضرت خدیجہؓ نے ایسا ہی کیا۔ جب کچھ دیر بعد آنحضرت ﷺ کو ذرا سکون ہوا تو آپ ﷺ نے غارِ حرا میں اپنے ساتھ کچھ دیر قبل پیش آنے والا واقعہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا کہ میں غارِ حرا میں تھا کہ ایک فرشتہ آیا اس نے مجھ سے کہا، اقراء (پڑھ)۔ میں نے جواب دیا۔ مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ اس پر اس نے مجھے پکڑ کر زور سے بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا، پڑھ۔ میں نے وہی جواب دیا، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا، پڑھ۔ میں نے پھر وہی جواب دیا تو اس نے تیسری مرتبہ اس زور سے بھینچا کہ میں تھک کر چُور ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا، پڑھ۔ اس پر میں نے کہا، کیا پڑھوں؟ اس نے کہا:

Marfat.com

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۗ

(پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا۔ پڑھو کہ تمہارا رب نہایت بزرگ کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اسی نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ جانتا نہ تھا)۔

جب تکمیل ہو گئی تو وہ فرشتہ چلا گیا اور یہ عبارت میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔

یہ واقعہ حضرت عائشہؓ نے خود حضور ﷺ سے سن کر بیان فرمایا جسے بخاری، مسلم اور دیگر محدثین نے مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یہ واقعہ سنانے کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا، مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ یہ ایک نہایت غیر معمولی صورت حال تھی، لیکن اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے بے حد یقین، حکمت اور محبت سے آپ ﷺ کی دل جوئی فرمائی۔ آپؓ گزشتہ پندرہ برسوں سے حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ بیوی کی نگاہ سے شوہر کی سیرت اور عادات چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے جن الفاظ میں اپنے شوہر کو تسلی دی وہ حضور ﷺ کے کردار کی عظمت، آپ ﷺ کے اخلاق کی بلندی اور آپ ﷺ کی خوبیوں کا اعتراف صاف ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

"آپ خوش ہو جائیے، اللہ کی قسم، آپ کو اللہ کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں، نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں اور مصیبت میں دوسروں کے مددگار ہیں۔"

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

"میرے ایک چچا زاد بھائی وَرَقہ بن نوفَل ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتے ہیں۔ کل صبح ہم ان کے پاس جائیں گے۔ آپ ان سے اپنا قصہ بیان کیجیے گا۔ وہ بتا سکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔"

ایک روایت کے مطابق اگلی صبح خود حضرت خدیجہؓ آنحضرت ﷺ کو لے کر وَرَقہ بن نوفَل کے پاس گئیں۔ دوسری روایت کے مطابق اگلی صبح حضرت ابو بکرؓ آپ ﷺ کے گھر تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے ان کو یہ واقعہ سنایا اور حضور ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ وَرَقہ بن نوفَل کے پاس بھیجا۔

وَرَقہ بن نوفَل عیسائی عالم تھے۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے اور ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انہوں نے جب حضور ﷺ سے غار میں فرشتے کی آمد اور آیات کی تعلیم کا واقعہ سنا تو فوراً کہہ اٹھے:

"یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ طرف سے نازل ہوا تھا۔"

البلاذری کی روایت کے مطابق وَرَقہ نے یہ بھی کہا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی نبی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب کہ قوم آپ کو ستائے گی اور آپ کو اپنے شہر سے نکال دے گی۔"

رسول اللہ ﷺ نے سوال کیا، کیا سچ مچ میری قوم مجھے اپنے شہر سے نکال دے گی؟ اس پر وَرَقہ بن نوفَل نے کہا: "بخدا، آج تک جو بھی اس دعوت کو لے کر آیا ہے، اس کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے (بخاری)۔ اگر میں اس وقت زندہ رہا تو میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"

وَرَقہ اس کے بعد زیادہ عرصہ نہ جی سکے اور جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

وَرَقہ نے اپنی گفتگو میں لفظ "ناموس" استعمال کیا تھا۔ یونانی زبان میں "توریت" کو "نوموس" کہتے ہیں۔ وَرَقہ کو سُریانی زبان آتی تھی اور انہوں نے سریانی سے عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ محمدؐ پر جو پیغام نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب "توریت" سے مشابہ ہے۔

رسول کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہونے کے بعد تین سال تک کوئی اور وحی نازل نہیں ہوئی۔ لیکن اس دوران آنحضرتؐ نے اپنے بہت قریبی احباب کو رازداری کے ساتھ اسلام کی دعوت پہنچائی۔ آپؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے کی سعادت آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کو حاصل ہوئی۔ مردوں میں حضرت ابو بکرؓ، بچوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہؓ نے سب سے پہلے

Marfat.com

اسلام قبول کیا۔

البلاذری کی روایت کے مطابق پہلی وحی کے موقع پر حضرت جبرئیلؑ نے حضور اکرم ﷺ کو طہارت حاصل کرنے کا طریقہ، وضو کا طریقہ بھی بتایا اور پھر امام بن کر نماز پڑھائی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کی امامت میں نماز ادا کی۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی نبوت کے ابتدائی زمانے میں گو کہ کھلے عام تبلیغ شروع نہیں فرمائی تھی لیکن آپ ﷺ اپنی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نماز ادا کرنے لگے تھے۔ ابن الاثیر کے مطابق چاشت کی نماز آپ ﷺ حرم میں ادا فرماتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں جائز تھی۔ سیرت کی کتب میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ دونوں کعبہ کے سامنے نماز پڑھا کرتے تھے اور لوگ انہیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ اس وقت تک قرآن پاک کی وہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں جن میں بت پرستی کو برا قرار دیا گیا تھا، اس لیے مکہ والوں میں حضور ﷺ سے دشمنی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں نبی کریم ﷺ شہر سے باہر جا کر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز ادا فرمانے لگے۔ حضرت خدیجہؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر حضرت علیؓ بھی آنحضرت ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کا پیچھا کرتے ہوئے گھاٹی تک پہنچ جاتے تھے اور وہ بھی اس نماز میں شامل ہو جاتے تھے۔

کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتے داروں کو اللہ سے ڈرائیں، یعنی ان تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ بازار سے اشیا خرید کر لائیں، پھر اپنی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ ان اشیا سے ضیافت کا اہتمام کریں۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا کہ خاندان کے تمام گھروں میں جائیں اور انہیں دعوت دیں کہ فلاں دن اور فلاں وقت کھانے کے لیے میرے گھر آئیں۔ مقررہ دن بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے لوگ کھانے پر آئے۔ آنحضرت ﷺ نے سب کو اسلام کی دعوت دی لیکن ابولہب نے بدزبانی کی اور محفل درہم برہم ہو گئی۔ صرف حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کا اعلان فرمایا۔

اس کے بعد کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کا ساتھ دینے والوں کی مخالفت شروع کر دی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مخالفت میں شدت آتی گئی۔ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ کو طرح طرح کی تکالیف دی جانے لگیں۔

آنحضرت ﷺ کو دکھ پہنچانے والوں میں آپ ﷺ کے اپنے چچا ابولہب اور ابوجہل پیش پیش تھے۔ ابولہب حضور ﷺ کے مکان کے دروازے پر اور راستے میں گندگی اور غلاظت پھینک دیتا۔ وہ ہر اس جگہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے چلا آتا جہاں آپ ﷺ تبلیغ فرمارہے ہوتے اور شور مچا کر اور حضورؐ کے خلاف باتیں کر کے لوگوں کو آپ ﷺ کی باتیں سننے سے روک دیتا۔ کبھی نماز کی حالت میں اونٹ کی اوجھڑی رسول اقدس ﷺ کی پشت مبارک پر رکھ دی جاتی تو کبھی آپ ﷺ کی گردن میں چادر ڈال کر اسے شدت سے بل دیے جاتے۔ کفار مکہ کے اکسانے پر لڑکے آنحضرت ﷺ کا پیچھا کرتے اور آپ ﷺ پر پتھر برساتے۔

فطری بات ہے کہ کفار مکہ کی جانب سے ان ایذا رسانیوں پر رسول کریم ﷺ کو دکھ ہوتا لیکن ایسے ہر موقع پر حضرت خدیجہؓ اپنے رفیقِ حیات، نبی برحق ﷺ کی ڈھارس بندھاتیں۔ آپ ﷺ کو تسلی دیتیں۔ خود نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

"میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھ کو ناگوار محسوس ہوتی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اقدس ﷺ پر منصبِ نبوت کی بھاری ذمے داری کو آسان بنانے میں حضرت خدیجہؓ نے بہت اہم کردار ادا فرمایا۔

جب کفار مکہ تمام تر مظالم کے باوجود مسلمانوں کو اسلام ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکے اور اسلام کی دعوت کو پھیلنے سے نہ روک سکے تو انہوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ نبی کریم ﷺ کے خاندان بنی ہاشم کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک قرارداد لکھی گئی کہ آئندہ سے کوئی فرد بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے کسی فرد سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ نہ ان سے شادی بیاہ کا تعلق قائم کرے گا، نہ کوئی تجارتی لین دین کرے گا حتیٰ کہ ان سے بات چیت بھی نہ کرے گا۔ یہ قرارداد لکھ کر خانۂ کعبہ میں لٹکا دی گئی۔

اس مقاطعہ کے نتیجے میں نبی کریم ﷺ اپنے خاندان کے ساتھ ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ

Marfat.com

حضرت خدیجہؓ اس موقع پر اپنے خاندان میں واپس چلی جائیں گی لیکن انہوں نے تنگی اور سختی میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور مسلمانوں سے دوری اختیار نہ کی۔

یہ مقاطعہ ایک دو دن نہیں، تین سال تک برقرار رہا۔ یہ بڑا مشکل دور تھا۔ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر صحابہ کرامؓ نے سوکھے اور بدمزہ چمڑے تک تناول فرمائے۔ کئی کئی دن کا فاقہ رہتا۔ کفارِ مکہ گھاٹی کو جانے والے راستوں کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور باہر سے کوئی شے گھاٹی کے اندر پہنچنے نہ دیتے تھے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے حکیم بن حزام کھانے پینے کی تھوڑی سی اشیاء چپکے سے بھیج دیتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ یہ اشیاء گھاٹی میں قید لوگوں کے درمیان تقسیم فرما دیتی تھیں۔

تین سال بعد مکہ مکرمہ کے کچھ نیک دل افراد نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس سنگ دلانہ معاہدے کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ ان افراد نے خانۂ کعبہ میں کھڑے ہو کر مقاطعہ کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ابو جہل نے مخالفت کی لیکن کئی قبیلوں کے افراد نے مقاطعہ کے خلاف رائے دی۔ جب مقاطعہ کی قرارداد کو دیکھا گیا تو سب حیران رہ گئے کہ اللہ کے حکم سے اس قرارداد کے الفاظ کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ صرف اللہ کا نام باقی تھا۔

مقاطعہ دس نبوی میں ختم تو ہو گیا لیکن تین سال تک فاقہ کشی کی صعوبت برداشت کرتے کرتے حضرت خدیجہؓ بہت کمزور ہو گئی تھیں، کچھ ہی عرصے بعد آپؓ بیمار پڑ گئیں اور اسی علالت میں اپنے رب سے جا ملیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا رسول اللہ ﷺ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ آپؐ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ اسی زمانے میں حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا۔ اسی لیے حضور ﷺ سنہ ۱۰ نبوی کو "عام الحزن" یعنی "غم کا سال" کہا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی انہیں ہمیشہ یاد فرماتے تھے۔ بہت مدت تک آپ ﷺ کا یہ طریقہ رہا کہ اس وقت تک گھر سے نہیں نکلتے تھے جب تک حضرت خدیجہؓ کی خوب تعریف نہ کر لیتے۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ بکری ذبح فرماتے تو اس کا گوشت حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھی بھجواتے۔

ایک بار رسول کریم ﷺ نے فرمایا، خدیجہؓ سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائیں۔ انہوں نے ایسے وقت میری مدد کی جب کسی کے مال کا سہارا میرے پاس نہ تھا اور اللہ نے مجھے ساری اولاد خدیجہؓ سے عطا فرمائی۔

حضرت خدیجہؓ کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک بار حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: خدیجہؓ برتن میں کھانے یا پینے کی کوئی شے لا رہی ہیں جب وہ جائیں تو آپ ان کو اللہ کا اور میرا اسلام پہنچا دیں (بخاری)۔ بخاری ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری سنائی کہ ان کو جنت میں موتیوں کا محل عطا کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ حضرت خدیجہؓ پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے جو اللہ کے محبوب ترین بندے کی مونس و غم خوار رہیں۔ اللہ نے اپنے حبیب محمد ﷺ پر نبوت کی جو گراں بار ذمہ داری عائد فرمائی، اسے ادا کروانے میں حضرت خدیجہؓ کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

***

Marfat.com

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

آپؓ کی ذاتِ اقدس میں مسلم خواتین کے لیے بہترین نمونہ موجود ہے

رات ڈھلنے کو تھی!

سیاہ چادر میں جڑے ہوئے موتیوں کی مانند ان گنت ستاروں نے آسمان کے وسیع و عریض صحرا میں اجالا کر رکھا تھا۔ ان ننھے ٹمٹماتے دیوں کی روشنی میں ایک قافلہ اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ صحرا کے چوڑے سینے پر اونٹوں کی قطار مخصوص ترتیب سے حرکت میں تھی۔

اچانک قافلے کی رفتار مدھم پڑ گئی اور آہستہ آہستہ تمام اونٹ ٹھہر گئے۔ صحرا کی خاموشی میں قافلے کے شرکا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شاید لوگ ایک دوسرے سے اچانک رُک جانے کا سبب پوچھ رہے تھے۔

معلوم ہوا کہ اُمّ المومنینؓ کا ہار کھو گیا ہے۔

قافلے نے پڑاؤ ڈال دیا اور ہار کی تلاش شروع ہو گئی۔ نیم تاریک صحرا کی وسعتوں میں ہار کی تلاش خاصا دشوار کام تھا۔ تھوڑی دیر میں مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ قافلے کے شرکا میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ ”نمازِ فجر کا وقت قریب ہے، یہاں صحرا میں وضو کے لیے پانی کہاں سے میسر آئے گا؟“

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

صبح صادق کے اجالے میں صحرا کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، کسی بھی لمحے آفتاب کا دمکتا چہرہ افق پر نمودار ہونے والا تھا۔ قافلے کے شرکا پریشان تھے۔ نماز فجر کیسے ادا ہو گی؟

مالکِ کائنات کی نگاہ سے قافلے کے لوگوں کا اضطراب پوشیدہ نہ تھا۔ یہ کوئی معمولی قافلہ نہ تھا، اس میں اللہ کے نبی آخر الزماں محمد ﷺ بھی سفر فرما رہے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ اللہ اپنے مخلص بندوں کو آزمائش کی اس گھڑی سے نکال لے۔ بارگاہ ایزدی سے جبرئیل امینؑ کو حکم ہوا اور اللہ کے رسولؐ پر وحی نازل ہونے لگی۔

”اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو، بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے“ (النساء ۴۳)۔

چند لمحوں بعد قافلے کے شرکا مسرت اور استعجاب کے عالم میں تیمم کر کے نماز فجر ادا کر رہے تھے۔

ہر زبان پر یہی چرچا تھا۔ ام المومنینؓ کا ہار کھونا کس قدر مبارک ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو مشقت سے بچانے کے لیے تیمم کی عظیم رعایت عطا فرما دی۔ اب کوئی بھی مسلمان پانی نہ ملنے کی صورت میں پاک مٹی سے تیمم کر کے طہارت حاصل کر سکے گا۔

نمازِ فجر کے بعد قافلے نے کوچ کیا۔ جب ام المومنینؓ کا اونٹ اٹھا تو اس کے نیچے سے گمشدہ ہار مل گیا۔

یہ ہار ام المومنینؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تھا۔ اللہ کے حبیب محمد ﷺ کی پیاری زوجۂ محترمہ، جن کی ذات میں امتِ مسلمہ کی خواتین کے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو کئی اعتبار سے فضیلت عطا کی ہے۔ رب العزت آپؓ پر اپنی لاکھوں رحمتیں نازل فرمائیں۔

آپؓ کا نام عائشہ اور لقب صدیقہ ہے۔ آپؓ کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے کوئی کنیت بھی نہ تھی لیکن ایک بار آپؓ نے رسول اقدس صلی

Marfat.com

اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ دیگر خواتین نے تو اپنے بچوں کے نام پر اپنی کنیت رکھ لی ہے میں اپنی کنیت کس کے نام پر رکھوں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "تم اپنے بھانجے عبداللہؓ کے نام پر اپنی کنیت رکھ لو" عبداللہؓ حضرت عائشہؓ کی ہمشیرہ حضرت اسماءؓ کے صاحبزادے تھے، انہیں حضرت عائشہؓ نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، چنانچہ آپؓ کی کنیت اُمّ عبداللہ قرار پائی۔

آپؓ سرکار رسالت مآب ﷺ کے حبیب اور دمساز، خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی ہیں، والدۂ محترمہ کا نام ام رومانؓ تھا۔ رسول پاک ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت پر والد کی طرف سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپؓ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ آپؓ کے والد ماجد کو تو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے، چنانچہ شمع اسلام نے دنیا میں آپؓ کی آمد سے پہلے ہی آپؓ کے گھر کو منور کیا ہوا تھا۔ امام بخاریؒ نے آپؓ کی حدیث درج کی ہے کہ "میں نے جب سے اپنے والدین کو پہچانا ان کو مسلمان پایا۔"

آپؓ کو بچپن میں کھیل کود سے بڑی دلچسپی تھی، آپؓ کو دو کھیل پسند تھے، گڑیاں کھیلنا اور جھولا جھولنا۔ آپؓ کی چند سہیلیاں بھی آپؓ کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ بعض اوقات ایسے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آتے، حضرت عائشہؓ انہیں دیکھ کر شرم سے اپنی گڑیاں چھپا لیتیں اور آپؓ کی سہیلیاں بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپ جاتیں۔ رسول ﷺ اقدس ایسے موقعوں پر آپؓ کی کمسنی کا خیال کرتے ہوئے آپؓ کی سہیلیوں کو تلاش کرتے اور انہیں بلا کر حضرت عائشہؓ کے ساتھ کھیلنے کے لیے کہتے۔ یہ حضرت عائشہؓ کی شادی سے پہلے کی بات ہے۔

ہجرت سے تین سال قبل آنحضرت ﷺ کی رفیق و غم خوار زوجہ حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی زوجیت میں آئیں۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح بے حد سادگی سے ہوا۔

بیشتر روایات یہی ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہجرت سے تین سال قبل، شوال کے مہینے (مئی ۶۲۰ء) میں ہوا تھا اور آپؓ کی رخصتی ہجرت کے پہلے سال شوال ہی کے مہینے میں ہوئی۔ آپؓ نکاح کے بعد تین سال تک میکے میں رہیں جن میں سے دو برس تین ماہ مکہ مکرمہ میں اور تقریباً آٹھ ماہ مدینہ منورہ میں گزرے، اس دوران حضرت سودہؓ حضور ﷺ کی زوجیت میں آچکی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ روزانہ صبح یا شام کے وقت حضرت ابو بکرؓ کے گھر تشریف لاتے تھے۔ ایک دن خلافِ معمول آپ ﷺ دوپہر کے وقت تشریف لے آئے، آپ ﷺ نے چادر سے اپنے چہرۂ مبارک کو لپیٹا ہوا تھا۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ گھر میں موجود تھے اور آپؓ کی دونوں صاحبزادیاں حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ آپؓ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضور ﷺ نے بلند آواز سے کہا، "ابو بکرؓ، ذرا لوگوں کو ہٹا دیجیے، میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا، "یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔" آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: 'ہجرت کا حکم مل گیا ہے'۔ آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو بشارت دی کہ اس مبارک سفر میں وہ بھی ساتھ ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ دونوں نے مل کر سامانِ سفر درست کیا اور نبی کریم ﷺ اپنے محبوب رفیق حضرت صدیق اکبرؓ کو لے کر روانہ ہو گئے۔

مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصے بعد حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت ابو رافعؓ کو مکہ معظمہ بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کے اہل خانہ کو لے آئیں۔ حضرت ابو بکرؓ کی ہدایت پر ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ اپنی والدہ محترمہ اور دونوں بہنوں حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو لے کر مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ جس اونٹ پر سوار تھیں وہ راستے میں بھاگ نکلا، آپؓ کی والدہ بے قرار ہو گئیں، بہت دور جا کر اونٹ کو روکا گیا۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجدِ نبویؐ اور اس کے آس پاس کے مکانات بنوا رہے تھے۔

حضرت عائشہؓ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بنو حارث بن خزرج کے محلے میں پہنچیں اور سات آٹھ ماہ تک اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ رہیں۔ اس دوران آپؓ علیل ہو گئیں، جب آپ بیماری سے شفایاب ہوئیں تو آپؓ کے والد محترم حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ اب آپؓ عائشہ کو گھر بلوا لیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، میرے پاس مہر ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے، حضرت ابو بکرؓ نے گزارش کی، آپؓ میری دولت قبول فرمائیں۔ حضور ﷺ نے یہ بات قبول فرمائی اور حضرت عائشہؓ کے گھر مہر کی رقم بھجوا دی۔

حضرت عائشہؓ کا نکاح جس سادگی سے ہوا تھا، آپؓ کی رخصتی بھی

Marfat.com

اسی سادگی سے ہوئی۔ جب انصار کی خواتین، حضرت عائشہؓ کو لینے کے لیے آپؓ کے گھر پہنچیں تو والدہ نے آواز دی، وہ آئیں تو منہ دھلوا کر بال سنوارے اور اس کمرے میں لے گئیں جہاں انصار کی خواتین موجود تھیں۔ خواتین نے حضرت عائشہؓ کا سنگھار کیا، تھوڑی دیر میں رسول اقدس ﷺ بھی تشریف لے آئے۔ یوں نہایت سادہ طریقے پر حضرت عائشہؓ رخصت ہو کر سرورِ کونین ﷺ کے گھر پہنچ گئیں۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح کے ذریعے عرب میں دورِ جاہلیت کی بہت سی رسوم کا خاتمہ ہو گیا۔ مثلاً منہ بولے بھائی کی لڑکی سے نکاح کے بارے میں غلط فہمی دور ہو گئی (واضح رہے کہ حضرت ابو بکرؓ حضورؐ کے منہ بولے بھائی تھے)۔ اہل عرب شوال کے مہینے میں شادی کو منحوس سمجھتے تھے، کیونکہ کبھی شوال کے مہینے میں یہاں طاعون پھیل گیا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح شوال میں ہوا اور رخصتی بھی شوال میں ہوئی۔ ایک اور رسم رائج تھی کہ دلہن کے آگے آگ جلائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ شوہر، دلہن سے پہلی ملاقات محمل میں کرتا تھا۔ امام بخاریؒ کے مطابق ان تمام رسوم کا خاتمہ اسی مبارک تقریب میں ہوا۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ رخصت ہو کر جس گھر میں آئیں اس کی شان یہ تھی کہ مسجد نبویؐ کے چاروں طرف بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے حجروں میں سے ایک حجرہ تھا۔ یہ حجرہ مسجد کی مشرقی سمت میں واقع تھا، اس کا ایک دروازہ مسجد کے اندر مغرب کی جانب کھلتا تھا۔ آنحضرت ﷺ اسی دروازے سے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ یہ حجرہ چھ سات ہاتھ سے زیادہ بڑا نہ تھا، دیواریں مٹی کی تھیں، کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں کی مدد سے چھت تعمیر کی گئی تھی، جس پر کمبل پڑا رہتا تھا۔

ایک چارپائی، ایک تپائی، ایک بستر، ایک تکیہ جس میں چھال بھری ہوئی تھی، آٹا اور کھجور کے رکھنے کے دو مٹکے، پانی کا ایک برتن اور پانی پینے کا ایک پیالہ، یہی مختصر سا سامان تھا۔

خیبر فتح ہونے کے بعد حضور ﷺ نے تمام ازواجِ مطہراتؓ کے سالانہ وظائف مقرر کر دیے تھے، عہد صدیقیؓ میں بھی خیبر کی پیداوار سے غلہ ملتا رہا، حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام امہات المومنینؓ کے لیے سالانہ وظائف از سر نو مقرر کیے۔ لیکن عام مسلمانوں کی خوشحالی کے باوجود حضرت عائشہؓ کے جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کوئی مال و متاع اپنے پاس نہ چھوڑتی تھیں اور سب کا سب محتاجوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ رسول مقبول ﷺ کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ آٹا پیستی تھیں، گوندھ کر روٹی پکاتی تھیں، آپ ﷺ کا بستر خود بچھاتی تھیں۔ آپ ﷺ کے لیے وضو کا پانی لا کر رکھتی تھیں۔ آپ ﷺ قربانی کے جو اونٹ بھیجتے تھے ان کے لیے قلادہ خود بنتی تھیں، رسول اقدس ﷺ کے بالوں میں اپنے ہاتھ سے کنگھا کرتی تھیں، آپ ﷺ کے عطر لگاتی تھیں، حضورؐ کے کپڑے خود دھوتی تھیں۔ جب آپ ﷺ رات کو آرام فرماتے تو مسواک اور پانی سرہانے رکھ دیتی تھیں، مسواک کو صاف رکھنے کی غرض سے اکثر دھویا کرتی تھیں۔

آپؓ عبادات کے معاملے میں ہمیشہ حضور ﷺ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتی تھیں، حضور ﷺ رات میں بیدار ہو جاتے اور تہجد کی نماز ادا فرماتے، آخری پہر میں آپ ﷺ حضرت عائشہ کو بھی بیدار فرما دیتے، وہ اٹھ کر حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا کرتیں، نبی کریم ﷺ طویل سورتیں تلاوت فرماتے۔ آخر میں وتر ادا فرماتے۔ پھر سپیدۂ سحر نمودار ہوتا تو فجر کی سنتیں پڑھ کر لیٹ جاتے اور حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتے۔ پھر نمازِ فجر کے لیے باہر نکل جاتے۔ آپؓ اکثر حضور ﷺ کے ساتھ روزے رکھتیں، رمضان المبارک میں اپنے حجرے میں اعتکاف کرتی تھیں۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ جب گھر میں ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کو تعلیم دے رہے ہوتے تو آپؓ کان لگا کر حکمت کی باتیں سنا کرتیں۔ اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو اسے بعد میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لیتیں۔ آپؓ آنحضرت ﷺ سے کوئی بات سنتی تھیں تو جب تک اسے سمجھ نہ لیتی تھیں کسی اور سے بیان نہ کرتی تھیں۔ آپ ﷺ نے خواتین کی درخواست پر ہفتہ میں ایک دن مقرر فرما دیا تھا۔ اس دن خواتین آ کر آپ ﷺ سے مسائل پوچھا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ آپؓ سے بے حد محبت فرمایا کرتے تھے۔ آپؓ کی کم سنی اور اس عمر کے ذوق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، حضور ﷺ آپؓ سے ہلکی پھلکی اور پُر مزاح گفتگو بھی فرمایا کرتے تھے اور آپؓ کو دل بہلانے کے مواقع بھی فراہم کیا کرتے تھے۔

ایک بار حضرت عائشہؓ ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھیں، آپ ﷺ نے تمام صحابہ کرامؓ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور

Marfat.com

حضرت عائشہؓ سے فرمایا، آؤ دیکھیں کون آگے نکل جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اس وقت دُبلی پتلی تھیں، دوڑ میں رسول پاک ﷺ سے آگے نکل گئیں۔ کئی سال بعد پھر ایسا ہی موقع آیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب میرا بدن بھاری ہو گیا تھا، دوڑ میں حضور ﷺ آگے نکل گئے، آپؐ نے فرمایا، عائشہؓ، یہ اس دن کا جواب ہے۔ (ابو داؤد)۔

اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نوجوان بیوی کے جذبات اور خوشیوں کا خیال رکھنے کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے طرزِ عمل میں کیسا مثالی نمونہ موجود ہے، لیکن یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ سے بے تکلفانہ گفتگو فرما رہے ہوتے اور اچانک اذان کی آواز آتی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس موقع پر آپ ﷺ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ایسا محسوس ہوتا جیسے آپ ﷺ ہم کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ جہاں اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیت فرماتے تھے، وہیں آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی تربیت کا بھی خاص اہتمام فرمایا۔ آپ ﷺ جہاں مناسب سمجھتے نصیحت فرماتے اور جہاں ضرورت محسوس کرتے ٹوک دیتے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے آٹا پیسا اور اس کی ٹکیاں پکائیں۔ حضور ﷺ تشریف لائے تو نماز ادا کرنے لگے، آپ ﷺ کے انتظار میں حضرت عائشہؓ کی آنکھ لگ گئی، اس دوران پڑوس کی ایک بکری گھر میں چلی آئی اور ٹکیاں کھا گئی، حضرت عائشہؓ بیدار ہوئیں تو بکری کو مارنے کے لیے دوڑیں۔ رسول پاک ﷺ نے آپؓ کو روک دیا اور فرمایا: عائشہ، ہمسائے کو تکلیف نہ دو۔

حضرت عائشہؓ جب حضور ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو آپ ﷺ کی پہلی زوجہ محترمہ (حضرت خدیجہ) سے چار بیٹیوں میں سے تین کی شادی ہو چکی تھی یعنی حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ۔ ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ اس موقع پر حضرت عائشہؓ نے خاص طور پر سامان درست کیا، مکان لیپا، بستر لگایا، اپنے ہاتھ سے کھجور کی چھال دُھن کر تکیے بنائے، چھوہارے اور منقے دعوت میں پیش کیے، لکڑی کی الگنی بنائی تاکہ اس پر پانی کی مشک اور کپڑے لٹکائے جا سکیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "فاطمہؓ کے بیاہ سے اچھا بیاہ میں نے نہیں دیکھا۔"

صفر ۱۱ھ میں آنحضرتؐ علیل ہو گئے، آپ ﷺ حضرت میمونہؓ کے گھر جا کر رہے پھر ایک ایک دن تمام ازواجِ مطہراتؓ کے پاس قیام فرمایا۔ آپ ﷺ ہر روز استفسار فرماتے کہ کل میں کہاں رہوں گا، ازواجِ مطہراتؓ نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے ہاں منتقل ہو گئے۔ آپ ﷺ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ۱۳ دن بیمار رہے اور ان ۱۳ دنوں میں سے آٹھ دن آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے پاس قیام فرمایا۔ کچھ عجب نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس خواہش کا مقصد یہی ہو کہ حضرت عائشہؓ جیسی قوتِ حافظہ اور مثالی فہم و دانش رکھنے والی خاتون کے ذریعے، آپ ﷺ کی زندگی کے آخری لمحات تک کے واقعات اور آپ ﷺ کے ارشادات، امتِ مسلمہ تک پہنچ سکیں۔

جب حضور ﷺ کی علالت بہت شدید ہو گئی تو آپ ﷺ بہت بے چین تھے۔ حضرت عائشہؓ آخر وقت تک دعائیں پڑھ پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی رہیں۔ حضرت عائشہؓ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آخر دم تک آنحضرت ﷺ کا سر مبارک آپؓ کے زانو پر رہا اور آپؓ ہی کے حجرے میں رسول اقدس ﷺ سپردِ خاک کیے گئے۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عائشہؓ نے عہدِ صدیقیؓ اور عہدِ فاروقیؓ کو بھی دیکھا اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ بھی۔ حضرت امیر معاویہؓ کے خلیفہ بننے کے اٹھارہ برس تک آپؓ حیات رہیں۔ رمضان المبارک ۵۸ھ میں آپؓ علیل ہو گئیں، صحابہ کرامؓ عیادت کے لیے آتے تو آپؓ کی تعریفیں کرتے، آپؓ جواب میں فرماتیں، "اے کاش میں پتھر ہوتی، میں کسی جنگل کی جڑی بوٹی ہوتی۔"

رمضان المبارک کی ۱۷ تاریخ تھی (۱۳ جون ۶۷۸ء)، رات نمازِ وتر کے بعد آپؓ دنیا کی زندگی کو الوداع کہہ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ آپؓ کی وصیت کے مطابق آپؓ کو رات ہی میں جنت البقیع کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں اتنے لوگ تھے کہ رات کے وقت پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ صحابیِ رسول، حضرت ابو ہریرہؓ ان دنوں مدینہ منورہ کے قائم مقام حاکم تھے، انہوں نے آپؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی، آپؓ کے بھتیجوں اور بھانجوں قاسم بن محمدؒ، عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؒ، عبداللہ بن عتیقؒ، عروہ بن زبیرؒ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے مل کر قبر میں اتارا۔

آپؓ نے اپنے ترکہ میں ایک جنگل اور چند دیگر اشیا چھوڑیں۔ جنگل آپؓ کی ہمشیرہ اسماءؓ کے حصہ میں آیا، حضرت معاویہؓ نے یہ جنگل تبرک کے طور پر ایک لاکھ درہم میں خریدا۔ حضرت اسماءؓ نے یہ

Marfat.com

تمام رقم عزیزوں میں تقسیم کر دی۔

حضرت عائشہؓ کی ذاتِ اقدس میں امتِ مسلمہ کی خواتین کے لیے بہترین نمونہ موجود ہے۔ آپؓ کو متعدد فضیلتیں حاصل ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپؓ کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر وحی نازل فرمائی۔ بعض اوقات آپؓ کے کسی واقعہ کے نتیجے میں اہم دینی اصول مرتب کیے گئے۔

شعبان ۵ھ میں غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر منافقین نے حضرت عائشہؓ پر (معاذاللہ) تہمت تراشی کی، اس کا مقصد پوری اسلامی تحریک کو زبردست زک پہنچانا تھا، یہ بے حد کڑی آزمائش تھی، کئی دن تک مدینہ کی صورتِ حال کشیدہ رہی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرما کر حضرت عائشہؓ کی پاک دامنی کی خود گواہی دی۔ اسی موقع پر بہت سے دیگر احکام نازل ہوئے جن کا مقصد معاشرے سے بے حیائی کو دور کرنا اور انسان کے فطری تقاضوں کی تکمیل میں آسانیاں پیدا کرنا تھا۔

قدیم زمانے میں طلاق کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ شوہر طلاق دیتا اور پھر کچھ عرصے بعد رجوع کر لیتا۔ ایک عورت اس طرح کی شکایت لے کر حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، آپؓ نے حضور ﷺ کی عدالت میں یہ معاملہ پیش کیا، اس پر سورہ بقرہ کی ۲۹ویں آیت نازل ہوئی جس میں مرد کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ بیوی کو صرف ۲ طلاقیں دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہے اس کے بعد اسے چاہیے کہ یا تو بیوی کو اچھی طرح رکھے یا خوبی کے ساتھ رخصت کر دے۔

آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو بہت محبوب رکھا کرتے تھے، ایک بار ایک سفر میں حضرت عائشہؓ کا اونٹ بدک کر بھاگنے لگا، حضور ﷺ بے قرار ہو گئے۔ ایک بار حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا، "آپ دنیا میں سب سے زیادہ کسے محبوب رکھتے ہیں؟" فرمایا "عائشہؓ کو۔" عرض کیا "مردوں کی نسبت سوال ہے۔" فرمایا، "عائشہؓ کے باپؓ کو۔" (صحیح بخاری)۔ حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ کے اس غیر معمولی انس کو دیکھتے ہوئے حضرت عمرؓ آپؓ کا زیادہ خیال رکھا کرتے تھے۔ ایک بار عراق کی فتوحات میں موتیوں کی ایک ڈبیا آئی، موتیوں کی تقسیم دشوار تھی، حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ سے کہا کہ آپؓ لوگ اجازت دیں تو میں یہ موتی ام المومنین حضرت عائشہؓ کو بھیج دوں، وہ آنحضور ﷺ کو زیادہ محبوب تھیں۔ سب نے خوشی سے اجازت دے دی۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے متعلق خود رسول ﷺ اللہ کی زبانِ مبارک نے ارشاد فرمایا، "عائشہؓ کو عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو تمام کھانوں پر۔" (صحیح بخاری)۔ (ثرید ایک کھانا ہے، جو گوشت اور روٹی کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے)۔ آپؓ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بشارت دی کہ وہ حضرت عائشہؓ کو اپنی زوجیت میں لیں، صحیح بخاری کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر کوئی چیز آپ ﷺ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا، یہ کیا ہے۔ جواب ملا، یہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ آپ ﷺ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہؓ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو اللہ نے یہ شرف بھی عطا فرمایا کہ آپؓ کے سوا اور کسی کے بستر پر حضور ﷺ پر وحی نازل نہیں ہوئی۔ جب سورۂ بقرہ اور سورۃ النساء نازل ہوئیں تو حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے پاس موجود تھیں۔ آپؓ کو یہ فخر بھی حاصل ہوا کہ حضرت جبرئیلؑ نے آپؓ کو سلام کہا اور حضرت عائشہؓ نے حضرت جبرئیلؑ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ افضلیت بھی عطا ہوئی کہ آپؓ تمام امہات المومنین میں واحد کنواری خاتون ہیں جنھیں نبی اکرم ﷺ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا۔

آپؓ بہت سنجیدہ، فیاض، قانع، عبادت گزار اور رحم دل تھیں، اپنی ذات پر آپؓ بہت کم خرچ کرتی تھیں، پہننے کے لیے صرف ایک جوڑا پاس رکھتی تھیں، کبھی کبھی زعفران میں رنگ کر کپڑے زیبِ تن فرما لیا کرتی تھیں، سرخ کرتا اور سیاہ رنگ کی اوڑھنی بھی استعمال کرتی تھیں۔ کبھی کبھی زیور پہنا کرتی تھیں، کبھی کبھی یمن کا بنا ہوا ہار گلے کی زینت بنتا تھا۔

آپؓ نے بہت سے بچوں کو گود لے کر پرورش کی، کئی یتیم بچوں کا خرچ برداشت کیا۔ ایک انصاری لڑکی کی پرورش کی اور بیاہ کیا۔ حضرت اسماءؓ (ہمشیرہ) کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو تو آپؓ نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی آپؓ سے بہت محبت کرتے تھے۔ حضرت محمد بن ابی بکرؓ کی صاحبزادیوں کو لے کر آپؓ نے پالا اور پھر ان کی شادیاں کیں۔

ایک بار حضرت معاویہؓ نے ایک لاکھ درہم بھیجے، آپؓ نے شام ہوتے ہوتے ساری رقم محتاجوں میں بانٹ دی۔ اس دن آپؓ کا روزہ تھا۔

Marfat.com

ایک بار حضرت ابن زبیرؓ نے ایک لاکھ کی رقم بھیجی۔ ایک طبق میں رقم رکھ دی اور بانٹنا شروع کر دی حتیٰ کہ طبق خالی ہو گیا، اس دن بھی آپؓ روزے سے تھیں۔ ایک اور مرتبہ، آپؓ کا روزہ تھا، دروازے پر کسی سائلہ نے صدا دی، گھر میں صرف ایک روٹی تھی وہی دے دی۔ خادمہ نے عرض کیا، شام کو افطار کس سے کیجیے گا؟ شام ہوئی تو کسی نے بکری کا سالن بھیجا۔ خادمہ سے فرمایا: دیکھو اللہ نے تمہاری روٹی سے بہتر چیز بھیج دی۔

آپؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ ہے۔ علمی حیثیت سے حضرت عائشہؓ کا مقام انتہائی بلند ہے۔ ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے، ہم (صحابہ کرامؓ) کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی جس کو ہم نے حضرت عائشہؓ سے نہ پوچھا ہو، اور ان سے اس کے متعلق کچھ معلومات نہ ملی ہوں۔ عطا بن رباحؒ مشہور تابعی ہیں۔ مستدرک میں آپؒ کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ فقیہہ اور سب سے زیادہ صاحبِ علم تھیں۔ امام زہریؒ کا کہنا ہے کہ حضرت عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں، بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ صحابیِ رسول حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کے صاحبزادے ابو سلمہؒ تابعی ہیں۔ فرماتے ہیں، "میں نے رسول اللہ کی سنتوں کا جاننے والا، آیتوں کی شانِ نزول اور فرائض کے مسئلے کا واقف کار حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہ دیکھا۔"

حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک غلام ابو یونس سے قرآن پاک کی کتابت کروائی تھی۔ آپؓ ہر مسئلے کے جواب کے لیے پہلے قرآنِ پاک سے رجوع فرماتی تھیں۔ آپؓ نے حضور ﷺ سے جو احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔ ان میں سے ۲۸۶ احادیث ایسی ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں شامل ہیں۔ ۵۴ ایسی احادیث ہیں جو صرف صحیح بخاری میں ہیں اور ۵۸ ایسی ہیں جنہیں صرف صحیح مسلم میں شامل کیا گیا ہے، بقیہ ۱۷۴۲ احادیث دونوں کتب میں مشترک ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے جو ۲۲۱۰ روایات فرمائیں ان کی ترتیب و تدوین کا کام ہجرت کے سو سال بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور میں کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب خلیفہ بنے تو مدینہ منورہ میں ابو بکر بن عمر بن حزم الانصاریؒ، قاضی (جج) کے منصب پر فائز تھے۔ حضرت ابو بکر بن عمرؒ کو علم کے اس درجے پر پہنچانے میں ان کی خالہ عمرہ بنت عبد الرحمٰن کا بڑا کردار تھا، جو حضرت عائشہؓ کی شاگرد تھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حضرت ابو بکر بن عمرؒ کو ہدایت کی کہ وہ اپنی خالہ عمرہؒ کے ذریعے حضرت عائشہؓ کی تمام روایتیں تحریری صورت میں خلیفہ کے پاس ارسال کر دیں۔

حضرت عائشہؓ نہ صرف حدیث روایت کرتی تھیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح بھی فرماتی تھیں، آپؓ کا شمار فقہا میں ہوتا ہے، اکثر لوگ آپؓ سے مسئلے پوچھنے یا فتویٰ حاصل کرنے لیے آیا کرتے تھے۔ آپؓ کو اگر کسی ذریعے سے حدیث ملتی تھی تو اس کے بارے میں سخت چھان بین کرنے کے بعد ہی اسے روایت کرتی تھیں۔ اگر کوئی فرد ایسے مسئلے پر سوال کرتا جس کے بارے میں کسی اور سے حدیث روایت ہوئی ہو تو آپؓ اس فرد کو متعلقہ راوی کے پاس بھیج دیتی تھیں، مثلاً کسی نے موزوں پر مسح کا مسئلہ دریافت کیا، آپؓ نے فرمایا: "حضرت علیؓ کے پاس جاؤ، وہ سفر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔"

آپؓ نے بہت سے مسائل کی تصحیح فرمائی، مثلاً ایک صحابیؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے چار عمرے کیے جن میں سے ایک رجب میں ادا کیا۔ حضرت عائشہؓ نے سنا تو ان صحابیؓ کے لیے دعائے رحمت کر کے فرمایا "رجب میں حضورؐ نے کوئی عمرہ ادا نہیں فرمایا۔" آپؓ نے فجر کی نماز میں صرف دو رکعت فرض رکھنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ فجر کی رکعتوں میں طویل قرأت کی جاتی ہے۔ اسی طرح آپؓ نے وضاحت کی کہ حضورؐ نفل نمازیں بیٹھ کر اس وقت پڑھنے لگے تھے جب آپؐ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

دور اور نزدیک سے لوگ علم حاصل کرنے آپؓ کے پاس آتے۔ آپؓ حجرے میں اوٹ میں بیٹھ جاتیں اور لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے، سوالات کرتے، آپؓ جوابات مرحمت فرماتیں۔ کبھی کوئی سلسلہ بحث چھڑ جاتا، کبھی خود مسئلہ بیان فرماتیں۔ آپؓ اپنے شاگردوں کی زبان، طرزِ ادائیگی اور تلفظ کی کڑی نگرانی کرتی تھیں۔ حج کے موقع پر جہاں آپؓ کا خیمہ نصب ہوتا، لوگ آکر آپؓ سے مسائل پوچھتے۔ اگر کوئی سوال پوچھتے ہوئے شرم محسوس کرتا تو اس کو حوصلہ دلاتیں اور کہتیں کہ میں تمہاری ماں ہوں۔

حضرت عائشہؓ کے خاص شاگردوں میں آپؓ کے بھانجے عروہ بن زبیرؓ قابل ذکر ہیں۔ مشہور تابعی امام زہریؒ حضرت عروہؓ کے شاگرد ہیں۔ ان کے علاوہ قاسم بن محمدؒ (بھتیجے) بڑے ہو کر مدینہ کے فقیہ کہلائے۔ مسروق کوفیؒ کی پرورش حضرت عائشہؓ نے فرمائی۔ آپؒ فقہائے

Marfat.com

عراق میں شمار ہوتے ہیں۔ خواتین میں اسعد بن زرارہؓ کی پوتی عمرہ بنت عبدالرحمٰنؒ نمایاں ہیں، امام بخاریؒ کے مطابق لوگ اپنے مراسلے، خطوط اور تحائف انہی کے ذریعے حضرت عائشہؓ تک پہنچاتے تھے۔ آپؓ کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔

حضرت عائشہؓ کے دبستان سے نہ صرف لوگوں کو تعلیم دی جاتی تھی بلکہ یہ وہ تربیت گاہ تھی جہاں انسانوں کے اخلاق بھی سنوارے جاتے تھے۔ آپؓ کی حیثیت ایک مشفق مربی کی تھی، جو تعلیم دینے میں تو نرم خوئی اور شفقت سے کام لیتا ہے لیکن اس تعلیم پر عمل نہ ہونے کی صورت میں سخت گیری سے گریز نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں بچے پیدا ہوتے تو آپؓ کی خدمت میں لائے جاتے۔ ایک بار ایک نوزائیدہ بچہ آپؓ کے پاس لایا گیا، اس کے سر کے نیچے لوہے کا استرا نظر آیا۔ دریافت کیا "یہ کیا ہے؟" لوگوں نے بتایا، "اس کی وجہ سے بھوت بھاگ جاتے ہیں۔" آپؓ نے استرا اٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا: حضور ﷺ نے شگون سے منع فرمایا ہے۔ ایک بار ایک شخص نے آ کر کہا، "بعض لوگ ایک رات میں قرآن شریف دو دو بار ختم کر ڈالتے ہیں۔" آپؓ نے ارشاد فرمایا، "ان کا پڑھنا اور نہ پڑھنا دونوں برابر ہیں، آنحضرتؐ تمام رات نماز میں کھڑے رہتے تھے لیکن بقرہ، آل عمران اور نساء سے آگے نہ بڑھتے تھے، جب کسی بشارت کی آیت پر پہنچتے تو اللہ سے دعا مانگتے اور جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے جس میں عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے تو پناہ مانگتے۔"

جاہلیت کے دور میں عرب کا کیا حال تھا، اس عہد کی رسوم کیا تھیں اور قبائل کا شجرۂ نسب کیا تھا، ان تمام امور میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا علم بہت وسیع تھا۔ حضرت عائشہؓ ان ہی کی صاحبزادی تھیں۔ آپؓ نے بھی والد گرامیؓ کے اس علم سے بھرپور استفادہ فرمایا۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں، "میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ کسی کو عرب کی تاریخ کا ماہر نہ پایا۔" حضرت عائشہؓ کی بے مثال قوتِ حافظہ کا کمال تھا کہ عرب کی رسوم جاہلیت، اس دور کے معاشرتی حالات، شادی کے طریقے، طلاق کی صورتیں، پھر اسلام آنے کے بعد کے حالات تاریخی ترتیب سے حضرت عائشہؓ کے ذریعے دیگر انسانوں تک پہنچے اور تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہو گئے۔

حضرت عائشہؓ نہایت فصیح اللسان تھیں اور آپؓ کا اندازِ گفتگو بہترین، شیریں اور متاثر کن تھا۔ آپؓ کے شاگرد حضرت موسیٰ بن طلحہؓ کا کہنا ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ فصیح اللسان نہیں دیکھا۔ آپؓ کو اللہ نے تقریر و خطابت کی بہت عمدہ صلاحیت بھی بخشی تھی۔ آپؓ کی آواز بلند تھی اور سننے والے اس آواز کے جلال سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا شعری ذوق بھی اعلیٰ تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ صحابیٔ رسول ﷺ تھے۔ آپؓ بہت اچھے شاعر تھے اکثر آپؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اشعار سناتے۔ حضرت عائشہؓ کو بہت سے اشعار یاد تھے اور وہ موقع محل کی مناسبت سے شعر پڑھنے میں مہارت رکھتی تھیں۔ آپؓ کو طب کا بھی علم تھا۔ جب مختلف علاقوں سے اطبا آ کر مدینہ منورہ میں ٹھہرتے تو وہ جن بیماریوں کے علاج بتاتے انہیں حضرت عائشہؓ یاد کر لیتیں۔

حضرت عائشہؓ نے رسول کریم ﷺ کی زوجۂ محترمہ کی حیثیت سے تقریباً نو برس آپ ﷺ کی رفاقت میں بسر کیے۔ یہ وہ عہد زریں ہے جس میں حضرت عائشہؓ نے اللہ کے حبیب ﷺ سے علم و عرفان کی ایک دنیا حاصل کی اور یہ تائید ایزدی ہی تھی کہ نبی کریم ﷺ کے معمولات، اخلاق، عادات اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں آپ ﷺ کی تعلیمات، امتِ مسلمہ تک حضرت عائشہؓ کی ذاتِ گرامی کے ذریعے پہنچیں۔ اللہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بے پناہ فہم و فراست اور بے مثال قوتِ حافظہ بخشی تھی، چنانچہ آپؓ کی ذاتِ اقدس بہت سی قیمتی معلومات اور احکام کو عوام الناس تک پہنچانے کا باعث بنی۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جہاں دیگر وجوہ کی بنا پر مختلف سن و سال اور مختلف صلاحیتیں رکھنے والی خواتین سے عقد فرمایا وہیں، حضرت عائشہؓ کو ان کی غیر معمولی ذکاوت اور مثالی حافظے کی بنا پر اپنی زوجیت میں لینے کا شرف عطا فرمایا۔ ایک شخص کی نجی زندگی سے اگر کوئی پوری طرح واقف ہو سکتا ہے، تو وہ اس کی بیوی ہو سکتی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی رفاقت میں آپ ﷺ کے ایک ایک عمل کو دیکھا، اسے سمجھا، یاد رکھا اور دوسروں تک پہنچایا۔ فی الواقع رب العالمین نے حضرت عائشہؓ کی صورت میں امت مسلمہ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے جن کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ امتِ مسلمہ پر آشکار ہوا اور زندگی کے ہر شعبے میں امتِ مسلمہ کے لیے واضح طرزِ عمل اور ہدایت میسر آ گئی۔

•••

Marfat.com

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا

جگر گوشۂ رسولؐ سیدۃ النساء اہل الجنۃ جو تسلیم و رضا کا کامل نمونہ ہیں

وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے!

ان کا تعلق قبیلہ بنو سلیم سے تھا۔ اس وقت وہ سرکار رسالت مآب ﷺ کی پاکیزہ مجلس میں حاضر تھے اور اسلام لانے کی خواہش ظاہر کر رہے تھے۔ رُوئے زمین پر ایک اور مسلمان کا اضافہ ہو رہا تھا۔

"نبی کریم ﷺ نے بنو سلیم کے ضعیف شخص کو کلمہ پڑھوایا، دین اسلام کے ضروری احکام اور مسائل کی تعلیم دی پھر ان سے پوچھا: کیا آپ کے پاس کچھ مال بھی ہے؟"

جواب ملا۔ "اے اللہ کے رسول ﷺ، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، بنو سلیم کے تین ہزار افراد میں، سب سے غریب اور محتاج میں ہی ہوں۔"

"رحمتِ دو عالم ﷺ کی نگاہیں اپنے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی طرف اٹھ گئیں، آپ ﷺ نے فرمایا: آپ میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا؟"

قبیلہ خزرج کے سردار اٹھے اور عرض کرنے لگے، "میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں پیش کرتا ہوں۔"

"یہ حضرت سعد بن عبادہؓ تھے، سید البشر ﷺ کے لبوں کو جنبش ہوئی: آپ میں سے کون ہے جو ان کا سر ڈھانک دے؟"

ایک صحابیؓ اٹھے اور انہوں نے اپنا عمامہ اتار کر اسلام قبول کرنے والے ضعیف اعرابی کے سر پر رکھ دیا۔ یہ حضرت علیؓ تھے۔

"پھر آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا، کون ہے جو ان کی خوراک کا بندوبست کرے؟"

حضرت سلمان فارسیؓ نے ان صاحب کو ساتھ لیا اور مختلف گھروں پر دستک دی لیکن ہر صحابیؓ کے گھر سے معذرت کی گئی کہ کھانے کا کوئی انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا اور مسلمانوں کی مالی حالت مستحکم نہ تھی۔

پھر حضرت سلمان فارسیؓ ایک دروازے کی طرف بڑھے، دستک دی اور پورا حال کہہ سنایا۔

مکان کے اندر سے آواز آئی "اے سلمانؓ اللہ کی قسم آج گھر میں سب کو تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گی۔ جایئے یہ میری چادر شمعون کے پاس لے جایئے اور اس سے کہیے کہ اس چادر کے عوض کچھ جنس دے دے۔"

حضرت سلمان فارسیؓ چادر لے کر، نو مسلم اعرابی کے ساتھ شمعون کے پاس پہنچے اور اسے تمام روداد سنائی کہ یہ چادر کس نے بھیجی ہے اور کیا پیغام دیا ہے۔ شمعون ایک یہودی تھا۔ حضرت سلمانؓ نے بات ختم کی تو شمعون پر سکتہ طاری تھا۔ وہ شدید حیرت زدہ تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا نیا مذہب ہے جس کے ماننے والے خود بھوکے رہ کر مساکین کا پیٹ بھرتے ہیں۔ اس کے دل میں توحید کی شمع روشن ہو چکی تھی، وہ پکار اٹھا: "اے سلمانؓ، خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے۔ تم گواہ ہو کہ میں ایمان لایا۔"

پھر انہوں نے کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کے سپرد کیا اور چادر بھی واپس کر دی۔ حضرت سلمانؓ غلہ اور چادر لے کر اسی دروازے پر پہنچے جہاں سے چادر وصول کی تھی۔ دونوں چیزیں گھر میں بھجوائیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر میں موجود خاتون نے اناج پیس کر روٹیاں تیار کر دیں۔ حضرت سلمانؓ کہتے ہیں۔ "اس میں سے کچھ بچوں کے لیے رکھ لیجیے۔" جواب ملتا ہے، "جو چیز میں راہِ خدا میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے جائز نہیں۔"

یہ خاتون تھیں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بنتِ محمد ﷺ جن کے عظیم ایثار نے نہ صرف ایک نو مسلم اعرابی کو فاقہ کشی سے بچالیا بلکہ ایک غیر مسلم کو اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا کر دی۔ آپؓ جگر

Marfat.com

گوشۂ رسول ﷺ ہیں، امتِ مسلمہ کی خواتین کے لیے تسلیم و رضا کا نمونہ ہیں اور دنیا اور جنت کی خواتین کی سردار ہیں۔

آپؓ وہ خوش قسمت خاتون ہیں جن کو اللہ کے حبیب نبی کریم ﷺ سب سے بڑھ کر محبوب رکھا کرتے تھے اور آپؓ کی ذاتِ اقدس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؓ ہی کے ذریعے سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی نسل کو آگے بڑھایا۔ سیدہ فاطمہؓ عظمت و رفعت کی ان بلندیوں پر فائز ہیں جو اللہ اپنے بے حد پیارے بندوں کو عطا کرتا ہے۔ آپؓ کے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر آپؓ کو مختلف القاب دیے گئے ہیں جن میں چند یہ ہیں: زہراء (تازہ پھول کی طرح پاکیزہ)، بتول (اللہ کی سچی اور بے لوث بندی)، سیدۃ النساء اہل الجنۃ (جنت کی عورتوں کی سردار)، بضعۃ الرسول ﷺ (جگر گوشۂ رسول ﷺ)۔

سرور عالم ﷺ کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی پیدائش اس زمانے میں عمل میں آئی جب قریش خانۂ کعبہ کی دیواروں کو ڈھا کر از سرِ نو تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ یہ آنحضرت ﷺ کو نبوت عطا کیے جانے سے پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت رسول ﷺ پاک کی عمر ۳۵ برس تھی۔ سیدہ فاطمہؓ اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہیں۔

سیدۃ النساء اہل الجنۃ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو یہ مقام بلند حاصل ہے کہ آپؓ کو دو جہانوں کے سردار حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شفقتِ پدری میسر آئی اور نبی کریمؐ کی مونس و غمخوار حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی مامتا بھری آغوش نصیب ہوئی۔ ان دو عظیم ترین ہستیوں کے ہاتھوں پلنے والی حضرت بتولؓ کو تعلیم و تربیت کی معراج حاصل ہوئی جو پہلے ہی خوبیوں کا مرقع اور حیا، متانت اور پاکیزگی کا پیکر تھیں۔ سیرت کی قدیم کتب میں حضرت فاطمہؓ کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں ان سے سیدۃ النساء کے بچپن کی ایک پاکیزہ اور نفیس تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

بچے بالعموم شریر اور کھیل کود کے شیدائی ہوتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ بچپن ہی سے بے حد متین، سنجیدہ اور سادگی پسند تھیں۔ انہیں کھیلوں سے دلچسپی نہ تھی، نہ ہی بہت اعلیٰ قسم کے کپڑے اور زیورات استعمال کرنے کا شوق تھا۔ ایک بار آپؓ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ کے کسی عزیز کی شادی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر اپنی تمام بچیوں کے لیے اچھے کپڑے اور زیور بنوائے لیکن حضرت فاطمہؓ نے یہ کپڑے اور زیورات استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور سادہ لباس زیب تن کر کے تقریب میں شرکت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے بے نیازی کا وصف سیدۃ النساءؓ کی فطرت کا جزو تھا اور اس کا اظہار بچپن ہی سے ہونے لگا تھا۔

ننھی فاطمہؓ اپنے والد گرامی آنحضرت ﷺ اور والدۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ آپؓ اپنے والد محترم ﷺ کے افعال، عادات، گفتگو اور اطوار کو غور سے دیکھتی تھیں اور خود بھی وہی انداز اپنانے کی کوشش کرتی تھیں۔ آپؓ شکل و صورت میں بھی نبی کریم ﷺ سے بہت مشابہ تھیں اور آپؓ کا انداز نشست و برخاست بھی آنحضرت ﷺ سے ملتا جلتا تھا۔ جب بھی رسولِ اقدس ﷺ باہر سے گھر میں تشریف لاتے تو آپ ﷺ بلند آواز میں السلام علیکم کہتے، پھر چند لحات کے توقف کے بعد گھر میں داخل ہو جاتے۔ نبی کریمؐ کی چہیتی ننھی فاطمہؓ اپنے پیارے والد ﷺ کی آواز سن کر دوڑی آتیں اور آنحضرتؐ کی انگلی اپنے ننھے ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں ساتھ لاتیں۔ نبی کریم ﷺ کو اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت تھی۔ آپ ﷺ ایسے موقعوں پر اکثر اپنی بیٹی کو گود میں لے لیتے اور آپ ﷺ کی جبیں پر بوسہ دیتے۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو اللہ نے بے پناہ ذہانت اور مثالی حافظہ عطا کیا تھا۔ آپؓ اپنے والد گرامیؐ اور والدۂ محترمہؓ سے اکثر دین کے بارے میں سوالات کرتیں، ایک بار آپؓ نے اپنی والدہ سے پوچھا، "اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں اور دنیا اور ہر شے کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ہمیں نظر بھی آسکتا ہے؟" حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جواب دیا، "بیٹی! اگر ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کریں، اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز رہیں، کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لائیں تو قیامت کے دن ہم ضرور اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ اس دن نیکی اور بدی کا حساب بھی ہو گا۔"

اس سوال و جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ بچپن ہی میں کس قدر ذہانت سے بھرپور سوالات فرمایا کرتی تھیں اور آپؓ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؓ کتنے پیارے انداز میں ان سوالوں کے جواب دیا کرتی تھیں کہ بچی مطمئن بھی ہو جائے اور اس کی تربیت بھی ہوتی رہے۔ رسول اللہ ﷺ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تو حضرت فاطمہؓ، سرورِ دو عالم ﷺ کی زبان سے ادا ہونے والے رشد و ہدایت کے موتی ایک ایک کر کے محفوظ کر لیا کرتیں۔ آپ ﷺ اپنی بیٹی کو

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے بندوں سے محبت کا درس دیا کرتے۔ جب حضور اقدس ﷺ گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو حضرت خدیجہؓ ننھی فاطمہؓ سے دریافت فرماتیں کہ آج اپنے ابا جان ﷺ سے کون کون سی باتیں سیکھی ہیں۔ ننھی بتولؓ کا حافظہ بہت اچھا تھا، وہ فوراً تمام باتیں دہرا دیتیں۔

اعلانِ نبوت کے چوتھے برس کے آغاز پر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپؐ اللہ کے احکام اب کھلے عام سنایئے۔ آپ ﷺ نے کھلے عام دعوتِ اسلام کا آغاز کر دیا۔ اس وقت سے آپ ﷺ کے لیے آزمائشوں کا در کھل گیا۔

ایک بار رحمتِ دو عالم ﷺ کعبۃ اللہ کے نزدیک نماز ادا فرمارہے تھے۔ قریب ہی قریش کے کفار کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ ابو جہل نے کہا، ”کاش اس وقت کوئی شخص فلاں قبیلے میں جاتا، وہاں اونٹ ذبح ہوا ہے، اس کی اوجھڑی اٹھالاتا اور یہ شخص (محمد) جب سجدہ میں جاتا تو اس کی پیٹھ پر رکھ دیتا۔“

عقبہ بن ابی معیط نے کہا، ”یہ کام میں کروں گا۔“ وہ دوڑا ہوا گیا اور اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لایا، پھر اس نے یہ اوجھڑی ایسے وقت رسول ﷺ پاک کی پشت مبارک پر رکھ دی جب آپ ﷺ سجدہ فرما رہے تھے۔ اونٹ کی اوجھڑی بہت وزنی ہوتی ہے۔ اس سے آنحضرت ﷺ کو شدید تکلیف پہنچی۔ اس منظر کو دیکھ کر کفار بڑے خوش ہوئے اور قہقہے لگانے لگے، ان کا حال یہ تھا کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپؓ جلدی سے حضور اقدس ﷺ کے گھر پہنچے اور واقعہ عرض کیا۔ ان لمحات میں یہ سیدہ فاطمہؓ تھیں جو بے قرار ہو کر دوڑی آئیں، انہوں نے اپنے پیارے باپؐ کی پشت سے اونٹ کی اوجھڑی ہٹائی اور ہنسنے والے کفار سے فرمایا، ”احکم الحاکمین تمہیں ان شرارتوں کی سزا دے گا۔“

اعلانِ نبوت کے بعد ۱۳ ویں برس ذی الحجہ کے مہینے میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ کچھ عرصے بعد آپ ﷺ بھی حضرت ابو بکرؓ کی رفاقت میں ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ نے جب مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر شروع کروائی تو آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو حکم دیا کہ وہ مکہ معظمہ جا کر آپ ﷺ کے اہل و عیال کو مدینہ منورہ لے آئیں۔ حضرت زیدؓ مکہ مکرمہ پہنچے اور اُمّ المومنین حضرت سودہؓ، حضورؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ، اپنی زوجہ محترمہ حضرت ام ایمن اور صاحبزادے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مدینہ منورہ لے آئے۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا اور نبی کریم ﷺ اپنے جاں نثار صحابہؓ کے ہمراہ اسلامی تحریک کی قیادت فرمارہے تھے۔ دین اسلام کی کرنیں بڑی تیزی سے پھیل رہی تھیں۔ انہی دنوں رسول اکرم ﷺ کی چہیتی بیٹی سیدہ فاطمہؓ کے لیے نکاح کے کئی پیغام آئے لیکن حضور ﷺ نے سکوت فرمایا۔ بعض روایتوں کے مطابق آپ ﷺ کو حکمِ الٰہی کا انتظار تھا۔ پھر صحابہ کرامؓ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ آپؓ سیدہ فاطمہؓ کے لیے پیام بھیجیں۔ انہوں نے کچھ تامل کے بعد حضور ﷺ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست قبول فرما لی۔ آپ ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ آپ ﷺ جب بھی کسی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہتے تو ان کے پاس تشریف لے جاتے اور بلند آواز میں فرماتے، ”فلاں شخص نے تمہارے لیے نکاح کا پیغام دیا ہے۔“ اگر اس کے جواب میں آپؐ کی صاحبزادی سکوت اختیار کرتیں تو حضور ﷺ سمجھ جاتے کہ بچی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے لیے پیغام بھیجا تو رسول کریم ﷺ نے اپنی پیاری صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ سیدہ بتولؓ کی خاموشی ہی ان کی رضامندی کا اظہار تھی۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت انس بن مالکؓ کو حکم دیا کہ وہ صحابہ کرامؓ کو مسجد نبویؐ میں بلا لائیں۔ جب بہت سے اصحاب رسولؐ مسجد نبویؐ میں جمع ہو گئے تو حضورؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ”مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ بنت محمدؐ کا نکاح علیؓ ابن ابی طالب سے کر دوں۔ میں آپ کے سامنے اس حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔“ پھر آپؐ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ خطبہ کے بعد آپؐ حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ کے روئے مبارک پر مسکراہٹ تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے دریافت فرمایا، ”میں نے چار سو مثقال چاندی کے مہر پر فاطمہؓ کو تیرے نکاح میں دیا، کیا تجھے منظور ہے؟“ (بعض روایتوں میں مہر کی رقم پانچ سو درہم اور بعض میں ۴۸۰ درہم بیان کی گئی ہے) حضرت علیؓ نے جواب دیا، ”بسر و چشم۔“

Marfat.com

اللہ کے رسول ﷺ نے اس مبارک موقع پر دعا فرمائی۔ صحابہ کرامؓ نے بھی دعا مانگی اور حاضرین میں شہد کا شربت اور کھجوریں تقسیم کی گئیں۔

نکاح کی یہ تقریب اور سیدہ فاطمہؓ کی رخصتی کب ہوئی، اس بارے میں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مبارک تقریب غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے پہلے یعنی رمضان ۲ھ اور شوال ۳ھ کے درمیان منعقد ہوئی۔ رخصتی کے بارے میں بعض مورخین کہتے ہیں کہ نکاح کے ایک ماہ بعد رخصتی ہوئی اور بعض کا کہنا ہے کہ نکاح کے ساڑھے سات مہینے یا ساڑھے نو ماہ بعد رخصتی عمل میں آئی۔

رخصتی کے دوسرے دن حضور ﷺ نے خواہش ظاہر کی کہ ولیمہ بھی کیا جائے۔ حضرت سعدؓ نے ایک بھیڑ کا تحفہ پیش کیا۔ دیگر صحابہ کرامؓ نے بھی مدد کی۔ دعوت ولیمہ میں کھجور، پنیر، جو کی روٹی اور گوشت پیش کیا گیا۔ حضرت اسماءؓ نے اس ولیمے کو اس زمانے کا بہترین ولیمہ قرار دیا ہے۔

دونوں جہانوں کے سردار ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی کو جو جہیز دیا اس کی تفصیل مختلف روایتوں میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ایک بستر مصری کپڑے کا، ایک نقشین تخت، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، ایک مشکیزہ، مٹی کے دو برتن، ایک چکی، ایک پیالہ، دو چادریں، ایک جائے نماز۔

جب سیدہ بتولؓ رخصت ہو کر حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئیں تو حضورؐ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے آنے کی اطلاع دی پھر اندر داخل ہوئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا اور اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال دیے، پھر آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے حضرت علیؓ کے سینے اور بازوؤں پر پانی چھڑکا اس کے بعد آپ ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ کو بلایا اور ان پر بھی پانی چھڑک کر فرمایا: "فاطمہؓ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان میں بہترین شخص سے کی ہے۔" پھر آپ ﷺ نے زوجین کے لیے دعا فرمائی اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت فاطمہؓ رخصت ہو کر جس مکان میں گئی تھیں وہ حضرت علیؓ نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ یہ مکان مسجد نبوی ﷺ سے فاصلے پر تھا۔ حضور ﷺ کو وہاں آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: "مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کے لیے آنا پڑتا ہے، میں چاہتا ہوں تمہیں اپنے قریب بلالوں۔"

حضرت حارثہ بن نعمانؓ ایک دولت مند صحابیؓ تھے۔ وہ اپنے کئی مکانات آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر چکے تھے، جنہیں حضور ﷺ نے ہجرت کر کے آنے والے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر دیا تھا۔ حضرت حارثہؓ کو جب علم ہوا کہ رسولِ پاک ﷺ اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کو اپنے قریب بلانا چاہتے ہیں تو وہ دوڑے ہوئے حضور ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا، "میں نے سنا ہے کہ آپؐ سیدہ فاطمہؓ کو کسی قریبی مکان میں لانا چاہتے ہیں۔ میں آپ ﷺ کے مکان سے متصل ایک مکان خالی کر دیتا ہوں۔ آپؐ حضرت فاطمہؓ کو اس میں بلا لیجیے۔" حضور ﷺ نے حضرت حارثہؓ کی تعریف کی اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ رسول اللہؐ کی رہائش گاہ سے متصل مکان میں منتقل ہو گئے۔

۳ھ میں اللہ تعالیٰ نے اس مبارک جوڑے کو ایک فرزند سے نوازا۔ آنحضرت ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ بہت مسرور ہوئے، آکر نومولود کے کان میں اذان دی، اپنا لعابِ دہن چٹایا، پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا، دو مینڈھے ذبح کیے اور نومولود کے سر کے بال اتروا کر ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ فرمائی۔ حضور ﷺ نے بچے کا نام "حسن" رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ ۴ھ میں رب العالمین نے سیدہ فاطمہؓ کو دوسرا بیٹا عطا فرمایا حضور ﷺ تشریف لائے۔ بچے کے کانوں میں اذان دی پھر آپ ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ کو بچے کا عقیقہ کرنے اور بچے کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کرنے کی ہدایت کی۔ اس بچے کا نام حضور ﷺ اقدس نے "حسین" رکھا۔

سرورِ عالم ﷺ اپنے ان دونوں نواسوں سے حد درجہ محبت فرماتے تھے۔ حضرت حسنؓ کو تقریباً آٹھ سال اور حضرت حسینؓ کو تقریباً سات سال آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے اور آپ ﷺ سے تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کی دیگر اولادوں میں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ شامل ہیں۔ سیرت نگاروں نے آپؓ کے ایک صاحب زادے حضرت محسنؓ کا بھی ذکر کیا ہے جو کمسنی میں فوت ہو گئے تھے۔

حضرت فاطمہؓ کی ذات امتِ مسلمہ کی خواتین کے لیے ایک روشن مثال اور کامل نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپؓ نے اپنا گھر بار بھی سنبھالا، شوہر اور بچوں کی پوری خدمت کی، عبادت کا پورا پورا اہتمام فرمایا اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپؓ غزوات میں شریک ہوتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور

Marfat.com

مجاہدین اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ حضرت حسنؓ کی ولادت ہوئی تو کچھ دنوں بعد اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ حضرت فاطمہؓ کا حال یہ تھا کہ شیر خوار بچے کو آغوش میں لیے میدانِ اُحد میں دوڑی آئی تھیں۔ غزوۂ اُحد میں رسولِ پاک ﷺ زخمی ہوگئے تو ان کے چہرۂ مبارک کا زخم سیدہ فاطمہؓ ہی نے دھویا اور مرہم پٹی کی تھی۔ غزوۂ خندق کے موقع پر حضور ﷺ کئی دن سے خندق کی کھدائی میں مصروف تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے روٹی پکائی اور حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: آج تین دن بعد یہ لقمہ مجھے ملا ہے۔

سیدہ فاطمہؓ بے حد کریم النفس اور رحم دل تھیں۔ آپؓ کی ذات، ایثار و قربانی کا دوسرا نام تھی۔ ایک بار حضرت علیؓ نے ساری رات ایک باغ کو سینچا۔ اُجرت میں آپؓ کو تھوڑے سے جَو حاصل ہوئے۔ آپؓ جَو لے کر گھر آئے۔ حضرت فاطمہؓ نے ایک حصہ لے کر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ ابھی کھانا تیار ہوا تھا کہ کسی مسکین نے دستک دی اور سوال کیا۔ سیدہؓ نے سارا کھانا دے دیا۔ پھر بچے ہوئے اناج کا ایک حصہ لے کر پیسا اور کھانا پکایا، ابھی یہ کھانا تیار ہوا ہی تھا کہ ایک یتیم نے دروازے پر آکر ہاتھ پھیلا دیا۔ سیدہؓ نے یہ سارا کھانا اس کے حوالے کر دیا۔ پھر آپؓ نے جتنا بھی اناج بچا تھا اسے پیس کر کھانا پکایا لیکن اسے کھانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک مشرک نے آکر کھانا مانگا۔ آپؓ نے سارا کھانا اسے دے دیا۔ آپؓ اور آپؓ کے اہلِ خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اس گھرانے کے پاکیزہ نفوس کے بارے میں سورۃ الدھر کی یہ آیت نازل ہوئی، (ترجمہ):

"اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

سیدۃ النساء اہل الجنۃ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے جو پہلے یہودی تھے پھر اللہ کی ہدایت سے مسلمان ہو کر اصحابِ رسولؐ میں شامل ہوگئے۔ اس پر ان کے رشتے دار ان سے ناراض ہوگئے۔ ان کا کاروبار تباہ ہوگیا اور وہ مفلسی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اسی عالم میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے رشتے داروں میں سے کوئی نہ آیا۔ ایسے موقع پر یہ حضرت فاطمہؓ تھیں جو فوراً پہنچیں اور آپؓ نے میت کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔

ایک بار آپؓ چکی پیس رہی تھیں کہ پڑوس سے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آپؓ فوراً پڑوس میں پہنچیں۔ معلوم ہوا کہ ایک خاتون دردِ زہ میں مبتلا ہیں اور ان کی جان خطرے میں ہے۔ آپؓ نے گھر والوں کو تسلی دی اور ایک کنیز کے ساتھ مل کر ان خاتون کی اتنی اچھی طرح دیکھ بھال کی کہ بچہ صحیح سلامت پیدا ہوگیا اور زچہ بھی بالکل ٹھیک رہیں۔

سنہ ۱۰ھ میں حضور ﷺ نے حجۃ الوداع فرمایا۔ اس مبارک سفر میں سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھیں۔ ۱۱ھ میں جدائی کی گھڑیاں آن پہنچیں۔ آنحضرت ﷺ شدید علیل ہوگئے۔ آخری ایام میں آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہاں مقیم تھے۔ آپ ﷺ کی تیمارداری کے لیے حضرت فاطمہؓ آئیں تو حضور ﷺ نے بڑی محبت و شفقت سے پاس بٹھایا پھر ان کے کان میں آہستگی سے کوئی بات کہی جسے سُن کر سیدہؓ رو پڑیں۔ پھر حضور ﷺ نے کوئی بات ان کے کان میں فرمائی جسے سُن کر سیدہؓ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا، "اے فاطمہؓ، تمہارے ابا جانؐ نے تم سے کیا کہا؟" سیدہؓ نے فرمایا "جو بات حضورؐ نے چھپا کر کہی ہے میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔"

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ سے اس واقعہ کی تفصیل دوبارہ دریافت فرمائی تو سیدہ فاطمہؓ نے بتایا۔ "پہلی بار حضور ﷺ نے مجھ سے کہا کہ حضرت جبرئیلؑ سال میں میرے ساتھ ہمیشہ ایک بار قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے، اس سال خلافِ معمول دو بار دور کیا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ سن کر میں رونے لگی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھے ملو گی اور تم جنت کی خواتین کی سردار ہوگی۔ اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔"

نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو سیدہؓ پر گویا رنج والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سیرت نگاروں کے مطابق اس کے بعد کسی نے حضرت فاطمہؓ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپؓ ہر وقت رنجیدہ اور ملول رہنے لگیں۔ وہ سخت نحیف اور کمزور ہوگئیں، جب ضعف اور نقاہت بہت بڑھ گئی تو آپؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس کو بلوا کر ان سے فرمایا، "میرا جنازہ لے جاتے وقت اور تدفین کے وقت پردے کا خاص خیال رکھا جائے۔" حضرت اسماءؓ نے کہا کہ میں نے حبش میں دیکھا ہے کہ جنازے پر درخت کی شاخیں باندھ کر ان پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔" پھر انہوں نے کھجور کی چند شاخیں منگوائیں انہیں جوڑا اور ان پر کپڑا ڈال کر دکھایا۔ حضرت فاطمہؓ نے اس طریقے کو پسند فرمایا۔

رمضان المبارک ۱۱ھ میں رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت

Marfat.com

سیدہ فاطمہؓ سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ (اس تاریخ پر مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ مختلف مؤرخین کے مطابق حضرت فاطمہؓ نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے دو ماہ، چار ماہ، چھ ماہ، آٹھ ماہ، یا اٹھارہ ماہ بعد وفات پائی، لیکن زیادہ مؤرخین کا اتفاق چھ ماہ کی روایت اور ۳ رمضان المبارک ۱۱ھ کی تاریخ پر ہے)۔

حضرت فاطمہؓ کے وصال کی خبر پھیلی تو لوگ مبہوت رہ گئے۔ حضرت علیؓ سخت رنجیدہ تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابو بکرؓ نے اور دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

سیدہ فاطمہؓ جہاں ایک سعادت مند اور نیک بیٹی تھیں وہاں بہت خدمت گزار اور صابر الفطرت بیوی بھی تھیں۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کا ہمیشہ احترام فرمایا، ان کی اطاعت کی اور خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہ گھرانہ زوجین کے پاکیزہ، خلوص آگیں اور محبت آمیز تعلقات کی سچی تصویر تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ اور سیدہ بتولؓ کے درمیان کاموں کی تقسیم فرما دی تھی۔ گھر کے اندر جتنے کام تھے، مثلاً چکی پیسنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ وہ سب حضرت فاطمہؓ کے سپرد تھے۔ باہر کے کام مثلاً بازار سے سودا لانا، اونٹ کو پانی پلانا، پانی بھر کر لانا وغیرہ یہ سب حضرت علیؓ کے ذمہ تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ بے حد محنتی تھیں۔ آپؓ طبیعت ناساز ہونے کے باوجود بھی گھر کے تمام کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں۔ ایک بار سیدہؓ کو بخار آگیا۔ رات بھر آپؓ شدید بے چین رہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی رات بھر جاگتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر آنکھ لگ گئی۔ فجر کی اذان سن کر بیدار ہوا تو دیکھا فاطمہؓ وضو کر رہی ہیں۔ میں نے مسجد جا کر نماز ادا کی واپس آیا تو دیکھا کہ فاطمہؓ معمول کے مطابق چکی پیس رہی ہیں۔ میں نے کہا، "فاطمہؓ تمہیں اپنے حال پر رحم نہیں آتا؟ رات بھر تمہیں بخار رہا۔ صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا، اب چکی پیس رہی ہو۔ اللہ نہ کرے زیادہ بیمار ہو جاؤ۔"

حضرت فاطمہؓ کا جواب تھا: "میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو کچھ پروا نہیں۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی اللہ کی اطاعت کے لیے اور چکی پیسی آپؓ کی اطاعت اور بچوں کی خدمت کے لیے۔"

حضرت فاطمۃ الزہراؓ گھر کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لیے اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتی تھیں۔ حال یہ تھا کہ آپؓ چکی پیستی تھیں یا کوئی اور کام کر رہی ہوتی تھیں اور آپؓ کی زبان پر قرآن کی آیات جاری ہوتی تھیں۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں فاطمہؓ کو دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کرتی جاتی تھیں۔ آپؓ بہت عبادت گزار تھیں لیکن حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ عبادت کی کثرت کی وجہ سے آپؓ گھر کے کاموں میں فرق نہ آنے دیتی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ کا مکان متصل ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے آیات قرآنی اور دیگر نصیحتیں سننے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جب بھی حضور ﷺ آخرت کا ذکر فرماتے حضرت فاطمہؓ شدتِ احساس سے رو پڑتیں، عبادت کے وقت بھی آپؓ کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، آنکھیں اشک بار ہو جاتیں اور اکثر مصلیٰ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔

جب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا اور مجاہدین کو فتوحات حاصل ہونے لگیں تو مدینہ منورہ میں مال غنیمت آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضور ﷺ اللہ کی ہدایت کے مطابق مالِ غنیمت کا صرف پانچواں حصہ اپنے پاس رکھ کر بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیتے، پھر اپنا حصہ بھی راہِ خدا میں دے دیتے۔ آپ ﷺ نے اپنا حصہ اپنی ازواج مطہراتؓ اور اپنی لاڈلی بیٹی سیدہ فاطمہؓ تک کو دینا گوارا نہ فرمایا۔ ایک بار حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ "چکی پیستے پیستے تمہارے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں اور چولہا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ آج حضور ﷺ کے پاس مالِ غنیمت میں بہت سی کنیزیں آئی ہیں، جاؤ اپنے ابا جانؐ سے ایک کنیز مانگ لاؤ۔"

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن شرم کی وجہ سے کوئی بات عرض نہ کر سکیں اور واپس آ گئیں۔ دوسرے دن آپؓ حضرت علیؓ کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچیں اور اپنی تکالیف بیان کر کے ایک کنیز کی درخواست کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "میں تمہیں کوئی کنیز خدمت کے لیے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحاب صفہ کے لیے انتظامات کرنے ہیں۔ میں ان لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر فاقہ کیا ہے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ رات میں آنحضرت ﷺ سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: "تم جس چیز کی خواہش مند تھیں، اس سے بہتر ایک چیز

Marfat.com

میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار الحمد للہ، اور دس بار اللہ اکبر پڑھا کرو اور سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے لونڈی اور غلام سے بہتر ہو گا۔"

حضرت فاطمہؓ نہ صرف اپنے شوہر اور بچوں کی بلکہ عزیزوں، رشتہ داروں اپنے جاننے والوں اور اہلِ محلہ کی خدمت کے لیے بھی تیار رہتی تھیں۔

حضرت فاطمہؓ کی خوشدامن حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کا کہنا ہے کہ "میری جس قدر خدمت فاطمہؓ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی خدمت کی ہو۔"

حضرت سیدہ فاطمہؓ ہر معاملے میں حضور ﷺ کی ہدایت کو پیشِ نظر رکھتی تھیں اور آپ ﷺ کے اشارہ ابرو کو خوب سمجھتی تھیں۔ ایک بار حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو باہر سے کچھ رقم بھیجی۔ اس زمانے میں حضور ﷺ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپ ﷺ واپس آئے تو حضرت فاطمہؓ نے اس خوشی میں ایک نقشین پردہ خرید کر دروازے پر لٹکا دیا اور چاندی کے دو کنگن بنوا کر ہاتھوں میں پہن لیے۔ حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے خلافِ معمول گھر میں قدم نہ رکھا اور واپس چلے گئے۔ حضرت فاطمہؓ اس پر بہت رنجیدہ ہوئیں اور رو پڑیں۔ آپؓ نے حضور ﷺ کی بے رُخی پر غور کیا تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ میں نے دروازے پر نقشین پردہ لگا دیا ہے اور ہاتھوں میں کنگن پہن لیے ہیں۔ شاید اس وجہ سے حضور ﷺ ناراض ہو گئے ہیں۔ آپؓ نے پردہ اتار دیا اور کنگن ہاتھوں سے نکال دیے پھر یہ دونوں چیزیں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ہاتھوں حضور ﷺ کی خدمت میں بھجوا دیں۔

بچے پہنچے تو آنحضرت ﷺ بڑے خوش ہوئے۔ آپ ﷺ نے بیٹی فاطمہؓ کے لیے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: یہ میرے اہلِ بیت ہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف (زرق برق آرائش) سے آلودہ ہوں۔ (سنن ابو داؤد، سنن نسائی)۔

آنحضرت ﷺ کو حضرت فاطمہؓ سے بے حد محبت تھی۔ جب کبھی آپ ﷺ سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ سے ملنے کے لیے جاتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے سیدہ فاطمہؓ سے آکر ملتے۔ حضور ﷺ تقریباً ہر روز حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے، ان کی کوئی مشکل ہوتی تو اسے حل کرنے کی کوشش فرماتے۔ آپ ﷺ کے گھر میں کوئی چیز پکتی تو آپ ﷺ اس میں سے ایک حصہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں ضرور بھجوا دیتے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے: فاطمہؓ میرے جسم کا ایک حصہ ہے، جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھ کو اذیت دی (صحیح بخاری)۔ ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: فاطمہؓ اہلِ جنت کی خواتین کی سردار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہؓ کے بچوں حسنؓ اور حسینؓ کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ حسن اور حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔

حضرت اسامہؓ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے کسی ضرورت سے رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر دستک دی، آپ ﷺ کسی چیز کو چادر میں لپیٹے ہوئے باہر تشریف لائے میں جب اپنی ضرورت بیان کر چکا تو میں نے دریافت کیا۔

"یہ آپ کیا لپیٹے ہوئے ہیں؟"

آپؐ نے چادر ہٹائی تو اس میں حسنؓ اور حسینؓ برآمد ہوئے جو آپ ﷺ کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں میرے بیٹے، میری بیٹی کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان دونوں سے اور ہر شخص سے جو ان سے محبت رکھتا ہے، محبت فرما۔ (جامع ترمذی)۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے اٹھائیس یا انتیس برس کی عمر پائی، چنانچہ آپؓ کو زیادہ احادیث روایت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آپؓ سے اٹھارہ یا انیس احادیث مروی ہیں۔ امام دار قطنیؒ نے حضرت فاطمہؓ سے روایت کردہ احادیث پر مشتمل ایک کتاب تیار فرمائی تھی جس کا نام مُسند فاطمہؓ رکھا تھا۔ حضرت سیدہ بتولؓ علم حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ آپؓ شعر بھی کہتی تھیں۔ آپؓ کی بعض نصیحتوں کا بعد میں فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا

حضرت صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی، جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'ذات النطاقین' کا لقب عطا فرمایا

وہ روزانہ کئی میل پیدل چلتی تھیں!

ان کا گھر قبا میں تھا۔ یہ بستی مدینہ منورہ کے قریب واقع ہے۔ وہ کچھ ہی عرصے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئی تھیں۔ انہیں اور ان کے شوہر کو ایک نخلستان میں کچھ زمین دے دی گئی۔ وہ لوگ اس زمین پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ زمین قبا سے تین فرسخ (۹ میل) دور تھی۔

وہ خاتون روزانہ قبا سے تین فرسخ دور اپنی زمین تک پیدل جاتیں۔ وہاں کھجور کی گٹھلیاں جمع کرتیں۔ ان گٹھلیوں کا گٹھا بنا کر سر پر رکھتیں اور پیدل واپس اپنے گھر آجاتیں۔ وہ ان گٹھلیوں کو کوٹ کر اونٹ کو کھلاتیں۔

یہ خاتون روزانہ اتنا فاصلہ پیدل طے کرنے کے علاوہ گھر کے سارے کام بھی خود کرتی تھیں۔ وہ گھوڑے کے لیے گھاس لاتیں۔ گھوڑے کو کھلاتیں۔ پانی بھرتی تھیں۔ پانی کا ڈول یا مشک پھٹ جاتی تو اسے سیتی تھیں۔ اتنی محنت کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ تنگ دست تھے۔ ان کے پاس مال و دولت نہیں تھی۔ خاتون کے شوہر کے پاس صرف ایک گھوڑا اور ایک اونٹ تھا۔

شروع میں یہ خاتون آمدنی کم ہونے کی وجہ سے ہر چیز ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں۔ ان کی اس عادت کا علم رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو انہوں نے فرمایا:

"ناپ تول کر مت خرچ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی ناپ تول کر روزی دے گا۔"

خاتون نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا تو کھلے دل سے خرچ کرنے لگیں۔ اللہ کا کرم ہوا اور اس کے بعد ان خاتون کے شوہر کی آمدنی بڑھنے لگی۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کے گھر کی تنگی جاتی رہی۔

دولت مند ہو جانے کے باوجود خاتون پہلے کی طرح سادہ زندگی گزارتی رہیں۔ دوسروں کے لیے وہ فیاضی سے خرچ کرتیں لیکن خود سادہ غذا کھاتیں۔ موٹے اور کم قیمت کپڑے پہنتیں۔

یہ خاتون تھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے محبوب ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحب زادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا۔

صحابیات میں حضرت اسماءؓ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپؓ کے شوہر حضرت زبیر بن العوامؓ مشہور صحابیؓ ہیں۔ وہ ان دس صحابہ کرامؓ میں شامل ہیں جن کو اللہ کے رسولؐ نے جنت کی خوش خبری سنادی تھی۔ ان دس صحابہؓ کو "عشرۂ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔ حضرت اسماءؓ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ بھی صحابی تھے۔ حضرت اسماءؓ کی چھوٹی بہن حضرت عائشہؓ ام المومنین ہیں۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ ہجرت نبوی سے ستائیس سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں۔ ایمان لانے والوں میں ان کا نمبر اٹھارہواں ہے۔ اس زمانے میں مسلمان چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھلے عام دعوتِ اسلام دینا شروع کی تو مخالفتوں کا طوفان آگیا۔ حضرت اسماءؓ بتاتی ہیں کہ ایک بار خانہ کعبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکین نے حملہ کر دیا۔ کسی نے آکر ہمیں خبر کی۔ میرے والد (حضرت ابو بکرؓ) فوراً خانۂ کعبہ کی طرف دوڑے۔ وہاں انہوں نے کفار کو روکنے کی کوشش کی۔ کفار نے ان کو اتنا مارا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔ وہ اتنے زخمی تھے کہ ہم ان کے سر کو ہاتھ لگاتے تھے تو ان کے بال جھڑ جاتے تھے۔

تیرہ برس تک مکہ مکرمہ میں دعوت دین دینے کے بعد

Marfat.com

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ہوا۔ حضور ﷺ نے بہت راز داری کے ساتھ ہجرت کی تیاری فرمائی اور اس مبارک سفر کے لیے حضرت ابو بکرؓ کو منتخب فرمایا۔ ہجرت کی رات حضور ﷺ کے گھر کے باہر مشرکین کا پہرہ تھا لیکن اللہ نے ان لوگوں پر غفلت طاری کر دی اور حضور ﷺ اپنے گھر سے نکل کر حضرت ابو بکرؓ کے گھر تشریف لے آئے۔ حضرت ابو بکرؓ آپ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسماءؓ نے سفر کا سامان تیار کر رکھا تھا۔ حضورؐ تشریف لے آئے تو حضرت اسماءؓ نے کھانے کے تھیلے اور پانی کے مشکیزے کو باندھنا چاہا لیکن فوری طور پر کوئی رسی نہ ملی۔ اس زمانے میں عورتیں اپنے لباس کے اوپر کوئی رومال یا کپڑا کمر کے گرد باندھ لیتی تھیں۔ حضرت اسماءؓ کے پاس بھی ایسا ہی کمر بند تھا۔ انہوں نے کمر بند کے دو ٹکڑے کیے اور ان کی مدد سے کھانے کے تھیلے اور مشکیزے کو باندھ دیا۔ اس قسم کا کمر بند "نطاق" کہلاتا تھا۔ حضورؐ نے اس موقع پر حضرت اسماءؓ کو "ذات النطاقین" کا لقب عطا فرمایا یعنی دو کمر بند والی۔

حضور ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے ہجرت کرنے کے کچھ دنوں بعد حضرت اسماءؓ اپنی سوتیلی والدہ حضرت ام رومانؓ، بہن حضرت عائشہؓ اور بھائی حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئیں۔ حضرت اسماءؓ کے شوہر حضرت زبیرؓ بھی کچھ عرصے بعد اپنی والدہ حضرت صفیہؓ (حضورؐ کی پھوپھی) کو لے کر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماءؓ کو ایک بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام انہوں نے عبداللہ رکھا۔

حضرت اسماءؓ کی والدہ کا نام قتیلہ تھا۔ وہ مسلمان نہ ہوئی تھیں۔ ہجرت کے بعد ایک بار قتیلہ مدینہ منورہ آئیں اور انہوں نے حضرت اسماءؓ سے کچھ رقم مانگی۔ حضرت اسماءؓ ان کی مدد کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر وہ حضور ﷺ کے پاس گئیں اور ان کو ساری بات بتا کر پوچھا کہ میں کیا کروں۔ حضور ﷺ نے ان کو اپنی والدہ کی مدد کرنے کی اجازت دے دی اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ صلہ رحمی (عزیزوں، رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک) سے نہیں روکتا۔"

حضرت اسماءؓ بہت سخی تھیں۔ ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی ماں سے بڑھ کر فیاض کسی کو نہیں دیکھا۔ جب حضرت عائشہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت اسماءؓ کو ترکہ میں جائیداد ملی۔ حضرت اسماءؓ نے اسے ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا اور اپنے دو رشتہ داروں قاسم بن محمد اور ابن ابی عتیق کو یہ رقم دے دی کیونکہ وہ ضرورت مند تھے۔

حضرت اسماءؓ بہت بہادر تھیں۔ وہ اپنے شوہر حضرت زبیرؓ اور بیٹے عبداللہؓ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

حضرت اسماءؓ علم والی بھی تھیں۔ آپؓ نے حضور ﷺ سے چھپن احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت اسماءؓ نے اپنی اولاد کی بہت اچھی طرح تربیت کی۔ ان کو ہمیشہ سچ بولنا سکھایا اور بہادری سے لڑنے کی تعلیم دی۔ جب مسلمانوں کے نظام حکومت میں خرابی آئی اور ایک حکمران کے بعد اسی کے بیٹے کو حکمران بنایا جانے لگا تو حضور ﷺ کے نواسے حضرت امام حسینؓ نے اس طریقے کے خلاف جہاد کیا۔ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے قائم کیے ہوئے خلافت کے نظام کو بدلنے سے بہت خرابیاں پیدا ہوں گی۔ حضرت اسماءؓ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی حضرت امام حسینؓ کی طرح جہاد کیا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں اپنا مرکز قائم کیا اور عراق اور حجاز کے لوگوں نے انہیں خلیفہ مان لیا۔ وہ چھ سال تک مخالفین سے لڑتے رہے۔

جب عبدالملک بن مروان حکمران بنے تو انہوں نے ایک سالار حجاج بن یوسف کو حضرت زبیرؓ کی خلافت ختم کرنے کی ذمے داری سونپی۔ چھ ماہ تک مکہ مکرمہ میں اناج پہنچنے نہ دیا گیا۔ آخر حضرت عبداللہؓ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

حضرت اسماءؓ نے اس موقع پر بہت صبر و ہمت کا ثبوت دیا۔ بیٹے کی شہادت کے کچھ عرصے بعد آپؓ بھی وفات پا گئیں۔ آپؓ نے سو برس کی عمر پائی۔ اللہ تعالیٰ آپؓ سے راضی ہو۔ آمین۔

***

Marfat.com

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا

سرورِ کونین ﷺ نے انہیں اپنی دوسری ماں اور اپنے گھر کی آخری نشانی قرار دیا

یہ کوئی معمولی محفل نہ تھی!

یہاں دونوں جہانوں کے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے صحابہ کرامؓ تھے جو بہت ادب سے بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک ایک بوڑھی خاتون اس محفل میں تشریف لے آئیں۔ ان کی رنگت گہری سانولی تھی۔ وہ ایک سادہ سی خاتون تھیں۔

سرور الانبیاؐ ان خاتون کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ ﷺ نے 'میری ماں! میری ماں' کہتے ہوئے ان خاتون کا ادب سے استقبال کیا۔ نہایت عزت اور احترام سے اپنی چادر ان خاتون کے لیے بچھائی اور فرمایا: "یہ میری والدہ آمنہ کے بعد میری دوسری امی ہیں اور میرے گھر کی آخری نشانی ہیں۔"

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن خاتون کے لیے خود اٹھ کر ادب سے اپنی چادر بچھائی تھی وہ تھیں حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا۔ آپؓ وہ عظیم خاتون ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے رسول کریم ﷺ کے بچپن میں ان کی دیکھ بھال کی سعادت عطا فرمائی۔ حضرت ام ایمنؓ رسول پاک ﷺ کے پسندیدہ صحابی حضرت زید بن حارثہؓ کی زوجہ محترمہ اور حضور ﷺ کے محبوب حضرت اسامہ بن زیدؓ کی والدہ ہیں۔

حضرت ام ایمنؓ کا اصل نام برکہ بنت ثعلبہ ہے۔ آپؓ کو ام ایمن اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپؓ کے ایک صاحب زادے کا نام 'ایمن' ہے۔ ام ایمن کا مطلب ہے 'ایمن کی ماں۔' حضرت ام ایمنؓ کا تعلق حبش سے تھا۔ وہ حضور ﷺ کے والد محترم کی کنیز تھیں۔ حضورؐ کے والد کے انتقال کے بعد وہ آنحضرتؐ کی والدہ محترمہ کی خدمت کرنے لگیں۔ جب آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے ام ایمن کو اپنے چھ سالہ پوتے محمد ﷺ کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے مقرر کر دیا۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ام ایمنؓ کو آزاد کر دیا تھا۔

حضرت ام ایمنؓ ان افراد میں سے ہیں جو اسلام کے ابتدائی دنوں میں ایمان لائے۔ آپؓ کی شادی حضرت عبید سے ہوئی۔ ان سے آپؓ کے بیٹے ایمن پیدا ہوئے۔ حضرت عبید بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ بیٹے کی پیدائش کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت ام ایمنؓ بیٹے ایمن کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں تشریف لائیں۔ حضور ﷺ نے ان کو تسلی دی اور ایک دن صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا:

"جو کوئی جنت کی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو وہ ام ایمنؓ سے نکاح کرے۔" یہ سن کر حضرت زید بن حارثہؓ نے حضرت ام ایمنؓ سے نکاح کر لیا۔ ان سے حضرت اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔ آنحضرت ﷺ حضرت زیدؓ کی طرح حضرت اسامہؓ کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرح اسامہؓ سے پیار کرتے تھے۔ حسنؓ اور اسامہؓ کو ایک ساتھ گود میں بٹھا لیتے اور فرماتے: "اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو بھی ان سے محبت فرما۔"

جب رسول ﷺ اللہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ نے حضرت ام ایمنؓ کے شوہر حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت رافعؓ کو حکم دیا کہ وہ مکہ جا کر حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ، ام المومنین حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، ام ایمنؓ اور ان کے بیٹے اسامہؓ کو مدینہ لے آئیں۔ حضرت زیدؓ پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ آ چکے تھے۔ حضورؐ نے حضرت زیدؓ اور حضرت رافعؓ کو ایک ایک

Marfat.com

اونٹ اور پانچ پانچ سو درہم بھی عطا فرمائے۔

حضرت ام ایمنؓ نے غزوۂ احد، غزوۂ حنین اور غزوۂ خیبر میں شرکت فرمائی۔ غزوۂ احد میں وہ حضرت ام سلیمؓ، ام عمارہؓ اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ مل کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ ان کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور مجاہدین کے گر جانے والے تیر اٹھا کر دیتی تھیں۔

غزوۂ احد میں ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک مشرک شخص حبان دشمنوں کی جانب سے لڑ رہا تھا۔ اس نے مردوں پر حملہ کرنے کی بجائے حضرت ام ایمنؓ کا نشانہ لگا کر تیر چلا دیا۔ تیر لگنے سے حضرت ام ایمنؓ زمین پر گر گئیں تو وہ مشرک شرمندہ تک نہ ہوا بلکہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔ حضرت ام ایمنؓ کے اس طرح تیر لگنے سے گر جانے کے باعث حضور ﷺ کو بہت تکلیف پہنچی۔ آپ ﷺ نے ایک تیر اٹھایا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو دیتے ہوئے فرمایا: "حبان کو ماریں۔"

حضرت سعدؓ نے وہ تیر اپنی کمان میں رکھ کر حبان کا نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ تیر حبان کی گردن کے قریب سینے میں لگا۔ وہ الٹ کر زمین پر گرا۔ نبی کریمؐ نے حبان کو یوں بدحواسی کے عالم میں گرتے دیکھا تو آپ ﷺ کے چہرے پر تبسم آگیا اور آپ ﷺ ہنس پڑے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "سعدؓ نے ام ایمنؓ کا بدلہ لے لیا۔ اللہ سعدؓ کی ہر دعا کو قبول فرمائے۔"

غزوۂ حنین میں آٹھ صحابہ کرامؓ ایسے تھے کہ جو شروع سے آخر تک حضور ﷺ کے ساتھ میدان جنگ میں جمے رہے۔ ان آٹھ صحابہؓ میں سے حضرت ایمنؓ نے شہادت پائی جو حضرت ام ایمنؓ کے بیٹے تھے۔

حضرت ام ایمنؓ ان بیس صحابیات میں شامل تھیں جو حضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئی تھیں۔ خیبر فتح ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے اس غزوہ میں شریک ہونے والی ہر صحابیہ کو ایک چٹائی، ایک یمنی چادر اور دو درہم عنایت فرمائے۔ حضرت ام ایمنؓ نے بھی یہ اشیاء وصول کیں۔

جنگ موتہ میں حضرت ام ایمنؓ کے شوہر حضرت زیدؓ بن حارثہ نے شہادت حاصل کی۔ ۱۱ ہجری میں حضور ﷺ نے جنگ موتہ کا بدلہ لینے کے لیے ایک لشکر روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں کئی بزرگ صحابہ کرامؓ شامل تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت ام ایمنؓ کے بیٹے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اس لشکر کا سالار مقرر فرمایا۔ ابھی یہ لشکر مدینہ سے کچھ فاصلے پر پہنچا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ لشکر کو واپس بلا لیا گیا۔ حضور ﷺ کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بنے، انہوں نے اسی لشکر کو روانہ کیا اور حضرت اسامہؓ ہی کو لشکر کا سالار مقرر کیا۔

نبی کریم ﷺ حضرت ام ایمنؓ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا حال پوچھنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور آپ کی ضرورتوں کو پورا فرماتے تھے۔ رحمتِ دوعالم ﷺ حضرت ام ایمنؓ سے کبھی کبھی ہلکا پھلکا مذاق بھی فرما لیتے تھے۔ ایک بار حضرت ام ایمنؓ حضور ﷺ کے پاس تشریف لائیں اور ان سے سواری کے لیے اونٹ کا سوال کیا۔ حضور ﷺ نے مذاق سے فرمایا: "میں آپ کو اونٹ کا بچہ دوں گا۔" حضرت ام ایمنؓ نے فرمایا: "وہ میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا نہ وہ مجھے چاہیے۔" حضورؐ نے دوبارہ فرمایا: "میں آپ کو اونٹ کا بچہ ہی دوں گا۔" پھر آپؐ نے ایک جوان اور تندرست اونٹ منگوایا اور حضرت ام ایمنؓ سے فرمایا: "ہر اونٹ، اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے۔"

رسول اقدس ﷺ کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی حضرت ام ایمنؓ کے گھر جا کر ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت ام ایمنؓ نے ایک بار رسول اللہؐ کے لیے آٹے کو چھان کر نرم چپاتیاں تیار کر دیں۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: "امی، یہ کیا ہے؟" حضرت ام ایمنؓ نے فرمایا: "یہ ہمارے علاقے کا کھانا ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے اس لیے آپ کے لیے تیار کیا ہے" حضور ﷺ نے فرمایا: "اس چپاتی کو دوبارہ باریک کر کے آٹے میں گوندھ لیں۔" حضور ﷺ موٹے آٹے کی روٹی پسند فرماتے تھے۔

اللہ نے حضرت ام ایمنؓ کو بہت لمبی عمر عطا فرمائی۔ آپؓ کا انتقال حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپؓ سے راضی ہو جن کو اللہ کے حبیب ﷺ اپنی ماں کہہ کر یاد فرماتے تھے۔

***

Marfat.com

حضرت ام عمّارہ رضی اللہ عنہا

جانباز و جری صحابیہؓ، جنھوں نے چار غزوات میں عملی حصہ لیا

کپڑے بہت قیمتی تھے!

ان میں دوپٹے تھے۔ جن پر عمدہ کام کیا گیا تھا۔ خوب صورت چادریں تھیں۔ ایک چادر تو بہت ہی حسین تھی۔

یہ تمام سامان اسلامی مملکت کے دارالخلافے میں مالِ غنیمت کے طور پر پہنچایا گیا تھا۔ یعنی یہ سامان کسی جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہونے پر ملا تھا اور اسے اس جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں نے خود نہیں رکھ لیا تھا بلکہ دیانت داری سے دارالخلافہ بھیج دیا تھا تاکہ اسلامی حکومت شریعت کے مطابق اس سامان کو تقسیم کر دے۔

اس وقت یہ قیمتی کپڑے اسلامی مملکت کے سربراہ کے سامنے پھیلے ہوئے تھے اور ایک خوش نما اور دلکش چادر ان سب میں نمایاں تھی۔

سربراہِ مملکت کے قریب کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے مشورہ دیا:

"امیر المومنین یہ چادر آپ اپنے بیٹے عبداللہ کی بیوی صفیہ بنت ابی عبید کو دے دیں۔"

سربراہِ مملکت کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا: "میں یہ چادر ان خاتون کو دوں گا جو میری بہو صفیہ بنت ابی عبید سے زیادہ اس کی حق دار ہیں۔ یعنی ام عمارہ، نسیبہ بنت کعبؓ۔ کیونکہ میں نے غزوۂ احد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: "میں نے جنگ میں جب بھی اپنے دائیں بائیں دیکھا نسیبہ بنت کعبؓ کو میرا دفاع کرتے ہوئے پایا۔ وہ میری جان بچانے کے لیے لڑ رہی تھیں۔"

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہ چادر ام عمارہ نسیبہ بنت کعبؓ کو بھجوا دی۔

حضرت نسیبہ بنت کعبؓ وہ عظیم صحابیہ ہیں جو اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسلمان ہوئیں۔ اس وقت اسلام کا نام لینا مصیبتوں کو دعوت دینے کے برابر تھا اور کفار مسلمانوں کو سخت تکلیفیں دے رہے تھے۔

حضرت نسیبہؓ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ رحمتِ دو عالمؐ نے حضرت نسیبہؓ کے لیے دعا فرمائی کہ اے اللہ ان کو جنت میں میرا رفیق بنا دے۔

حضرت نسیبہؓ کا تعلق مدینہ منورہ کے قبیلے بنو نجار سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کی پردادی کا تعلق بھی قبیلہ بنو نجار سے تھا۔ حضور ﷺ اس قبیلے کو عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا:

"اگر میں انصار کے کسی گھرانے میں شامل ہوتا تو بنو نجار میں شامل ہوتا۔" (صحیح مسلم)۔

حضرت ام عمارہؓ کو اسلام قبول کرنے کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب مکہ مکرمہ میں کفار کے مظالم حد سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان کی سختیوں اور مخالفت کی وجہ سے مسلمان بہت تکلیف میں تھے۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ منورہ سے چھ افراد حج کے لیے آئے تو منیٰ کے قریب عقبہ کے مقام پر ان کی ملاقات نبی کریم ﷺ سے ہوئی۔ ان چھ افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ یعنی عقبہ کے مقام پر کیا جانے والا پہلا عہد۔ ان چھ افراد نے واپس مدینہ منورہ جا کر اسلام کی تبلیغ کی۔ ذی الحجہ ۱۳ھ میں تہتر (۷۳) افراد مدینہ منورہ سے آکر حضور اکرم ﷺ سے ملے۔ ان میں صرف دو خواتین تھیں جن میں سے ایک حضرت ام عمارہؓ تھیں۔

یہ ملاقات بہت احتیاط سے اور کفار کی نگاہوں سے چھپ کر کی گئی۔ حضرت کعبؓ بن مالک نے اس رات کا حال کچھ یوں بیان فرمایا ہے:

"ہم لوگ ایک تہائی رات تک سوئے رہے۔ پھر ہم اٹھے اور عقبہ میں اس مقام کی طرف چل پڑے جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ ہم تہتر افراد تھے۔ ان میں سے صرف دو خواتین تھیں۔ ایک

Marfat.com

ام عمارہؓ (نسیبہ بنت کعب) اور دوسری اسماء بن عمروؓ۔"

جب ہم مقررہ جگہ پر پہنچے تو کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ کے ساتھ تشریف لے آئے۔ حضرت عباسؓ نے ایک تقریر فرمائی۔ پھر حضور ﷺ نے قرآن پاک کی تلاوت فرمائی۔ اسلام کی دعوت دی۔ پھر فرمایا: "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم لوگ میری اس طرح حفاظت کرو گے جس طرح تم اپنی عورتوں کے محافظ ہو۔" اس کے بعد حضور ﷺ نے ان تمام افراد سے بیعت لی۔ سب نے عہد کیا کہ حضور ﷺ یثرب (مدینہ منورہ) تشریف لائیں گے تو ہم اپنی جان، مال اور اولاد کے ساتھ آپ ﷺ کی حمایت اور مدد کریں گے۔

تمام مرد حضور ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کر چکے تو حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہ دو خواتین بھی بیعت میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ آپؐ ان سے بھی بیعت لے لیں۔ سرور دوجہاں ﷺ نے فرمایا: میں ان سے بھی ان شرائط پر بیعت لے چکا ہوں جن پر میں نے تم سے بیعت لی ہے۔ ہاں میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔

حضرت ام عمارہؓ بہت بہادر خاتون تھیں۔ آپؓ نے کئی غزوات میں حصہ لیا۔ 'غزوہ' اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی ہو۔ اس کی جمع غزوات ہے۔ غزوۂ احد میں حضرت ام عمارہؓ نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اس جنگ میں چند مسلمانوں کی غلطی سے فائدہ اٹھا کر کفار نے مسلمانوں پر زبردست حملہ کر دیا تھا۔ حضرت ام عمارہؓ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے قریب ہی تھیں۔ آپ پیاسے مجاہدین کو پانی پلا رہی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی تھیں۔ کوئی تیر تلوار یا نیزہ گر جاتا تو اٹھا کر مجاہدین کو تھما دیتی تھیں۔

حضرت ام عمارہؓ نے اپنی بھانجی حضرت ام سعد بنت سعد کو خود اس جنگ کا حال اس طرح سنایا:

"جب مسلمان (کفار کے حملے کی وجہ سے) پیچھے ہٹے تو میں رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھ گئی۔ میں اپنی تلوار سے ہر اس شخص پر حملہ کرتی جو رسول اللہ ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑھتا۔ کبھی اپنی کمان سے تیر چلاتی۔ یہاں تک کہ میں زخمی ہو گئی۔" حضرت ام سعدؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنی خالہ کے کندھے پر زخم کا گہرا نشان دیکھا۔ حضرت ام عمارہؓ نے بتایا کہ یہ زخم ایک کافر ابن قمیئہ نے لگایا۔ وہ ہر ایک سے کہتا تھا مجھے بتاؤ محمد کہاں ہیں۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر اور دیگر صحابہؓ نے حضور ﷺ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس وقت ابن قمیئہ نے مجھ پر وار کیا۔ میں نے بھی اس پر کئی وار کیے۔ مگر اس نے دو دو زرہیں پہن رکھی تھیں۔

حضرت ام عمارہؓ نے ایک اور مقام پر اس جنگ کا حال اس طرح بیان فرمایا:

"میں نے دیکھا رسول ﷺ اللہ کے گرد دس بارہ افراد رہ گئے تھے۔ میں، میرے شوہر اور بیٹے حضور ﷺ پر ہونے والوں حملوں کو روک رہے تھے۔ حضور ﷺ نے مجھے بغیر ڈھال کے دیکھا تو ایک اور صحابیؓ سے فرمایا: "تم اپنی ڈھال اسے دے دو جو ابھی جنگ کا ارادہ رکھتی ہے۔" میں نے وہ ڈھال لے لی۔ ایک کافر گھڑ سوار نے بڑھ کر مجھ پر تلوار سے وار کیا۔ میں نے ڈھال آگے کر دی۔ پھر میں نے اس کے گھوڑے کے ٹخنے کے قریب چوٹ لگائی۔ وہ اپنی پیٹھ کے بل گرا۔ یہ دیکھ کر رسول ﷺ اللہ نے میرے بیٹے کو آواز دی کہ اپنی ماں کو دیکھو۔ وہ فوراً آیا۔ ہم دونوں ماں بیٹے نے مل کر اس گھڑ سوار کافر کو ہلاک کر دیا۔"

اسی جنگ میں حضرت ام عمارہؓ کے ایک صاحب زادے عبداللہ کا بازو زخمی ہو گیا۔ حضرت ام عمارہؓ نے پہلے سے تیار پٹیاں زخم پر باندھ دیں۔ پھر انہوں نے بیٹے سے کہا: "اٹھو میرے بیٹے، جنگ میں شریک ہو کر مشرکین پر وار کرو۔" نبی کریم ﷺ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "اے ام عمارہؓ تم جیسی ہمت اور طاقت کون رکھتا ہے؟"

حضرت ام عمارہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو کس مشرک نے زخمی کیا تھا۔ میں نے بڑھ کر اس کی پنڈلی پر زور سے وار کیا وہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر اس مشرک کا خاتمہ کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اے نسیبہؓ، تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔"

حضرت ام عمارہؓ نے غزوۂ احد میں بارہ کفار کو زخمی کیا اور خود انہیں اس جنگ میں تیرہ زخم آئے۔ کندھے کے زخم کا علاج سال بھر جاری رہا۔ اس کے بعد ایک اور جنگ غزوۂ حمرا الاسد کا موقع آگیا۔ حضرت ام عمارہؓ اس جنگ میں شرکت کے لیے نکل آئیں لیکن کندھے کے زخم سے خون بہنے لگا اور آپؓ بے ہوش ہو گئیں۔ اس لیے میدانِ جنگ تک نہ پہنچ سکیں۔

حضرت ام عمارہؓ نے غزوۂ خندق میں بھی شرکت فرمائی۔ آپؓ

Marfat.com

اس جنگ میں دشمنوں پر کڑی نظر رکھتی تھیں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کا سامان پہنچانے کا انتظام کرتی تھیں۔ حضرت ام عمارہؓ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی موجود تھیں۔ جب حضور ﷺ نے ایک درخت کے نیچے تمام صحابہؓ سے بیعت لی جو "بیعت رضوان" کہلاتی ہے تو ان صحابہ میں حضرت عمارہؓ بھی شامل تھیں۔ حضرت ام عمارہؓ غزوۂ حنین اور غزوۂ خیبر میں بھی شریک ہوئیں۔ آپ نے دشمنوں کی سازشوں پر نگاہ رکھی۔ مجاہدین کو کھانے پینے کی اشیا فراہم کیں اور زخمیوں کو طبی امداد دی۔ حضرت ام عمارہؓ نے فتح مکہ کا یادگار دن بھی دیکھا۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں ایک شخص نے نبی ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ اس کا نام مسیلمہ تھا۔ اس کو مسیلمہ کذاب کہا جانے لگا یعنی مسیلمہ جھوٹا۔ اس نے ایک بڑی فوج بھی تیار کرلی۔ اس کو سمجھانے اور دین کی دعوت دینے کے لیے جن صحابی کا انتخاب کیا گیا وہ تھے حضرت ام عمارہؓ کے صاحب زادے حضرت حبیب بن زیدؓ۔ وہ مسیلمہ کے پاس گئے۔ اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس ظالم نے حضرت حبیبؓ پر تلوار سے وار کرنے شروع کردیے اور ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے انہیں شہید کردیا۔

حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مسیلمہ کذاب اور اس کی فوج سے لڑنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ اس لشکر کے سربراہ حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ حضرت ام عمارہؓ بھی اپنے دوسرے بیٹے حضرت عبداللہ بن زیدؓ کے ساتھ اس لشکر میں شامل تھیں۔

یمامہ کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی۔ مسیلمہ کی فوج نے سخت مقابلہ کیا لیکن آخر وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے مسیلمہ کے ایک باغ میں داخل ہوگئی۔ یہ باغ قلعے کی طرح تھا۔ مسیلمہ کے لوگوں نے قلعے کا دروازہ بند کرلیا لیکن ایک صحابی نے دیوار پھاند کر قلعے کا دروازہ کھول دیا اور مسلمانوں کی فوج اندر داخل ہوگئی۔ حضرت ام عمارہؓ فرماتی ہیں: "میرا ارادہ تھا کہ مسیلمہ کو قتل کروں گی۔ میں قلعے کے اندر چلی گئی۔ اچانک مسیلمہ کے ایک حمایتی نے مجھ پر وار کیا جس سے میرا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ میں پھر بھی آگے بڑھتی گئی۔ جب میں مسیلمہ کے پاس پہنچی تو میرا بیٹا خون لگی ہوئی تلوار مسیلمہ کے کپڑوں سے صاف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا اس کو تم نے قتل کیا ہے؟ بیٹے نے کہا، ہاں۔ یہ سنتے ہی میں نے شکر کا سجدہ ادا کیا۔" دیگر روایات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت وحشیؓ نے مسیلمہ پر اپنا خاص نیزہ پھینکا تھا اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے تلوار سے وار کیا تھا۔

اس جنگ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے بڑی توجہ سے حضرت ام عمارہؓ کا علاج کروایا۔ ان کے زخم تو اچھے ہوگئے لیکن ایک ہاتھ کلائی کے پاس سے کٹ چکا تھا۔

حضرت ام عمارہؓ نے ۱۳ھ / ۶۳۴ء میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ اس بہادر صحابیہؓ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

•••

Marfat.com

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ

صدق وصفا، سادگی کا پیکر جن کی علم کی پیاس شدید تھی

جُندب نے چھوٹی سی سیاہ مشک پانی سے بھر کر پشت پر رکھ لی، زنبیل میں کچھ پھل ڈالے اور بھائی کو الوداع کہا۔ وہ تن تنہا، حجاز کے صحراؤں میں سفر کر کے مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔

سفر تمام ہوا۔ منزل سامنے تھی، لیکن جُندب یہاں بالکل اجنبی تھے، کوئی جان پہچان والا ہوتا تو اس کے گھر قیام کرتے، لیکن یہاں کس سے بات کرتے۔ چنانچہ حرم پاک ہی میں ایک جانب پڑ رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ یہاں جس مقصد کے تحت آئے تھے وہ مقصد کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے آنے والا جو مسافر ان سے ملا تھا اس نے بتایا تو تھا کہ قبیلہ قریش کے ممتاز خاندان کا ایک شخص یہاں موجود ہے، جو کہتا ہے کہ اللہ نے اپنا کلام اس پر نازل فرمایا ہے۔ جُندب اپنے ساتھ جو پھل لائے تھے، وہ ختم ہو چکے تھے اور زم زم کے پانی پر گزارہ ہو رہا تھا۔

ایک رات حرم پاک میں ایک جانب لیٹے ہوئے تھے اور دو عورتیں "یا اساف"، "یا نائلہ" کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اساف اور نائلہ کے متعلق مشہور تھا کہ یمن کے رہنے والے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہوئے اور حرم پاک میں بدکاری کے مرتکب ہوئے جس کے نتیجے میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور دونوں پتھر کے ہو گئے۔ عربوں نے غضب یہ کیا کہ ان پتھر کے بتوں کی پوجا شروع کر دی اور انہیں کعبہ اور چاہِ زم زم پر نصب کر دیا گیا۔

عورتیں اساف اور نائلہ سے دعائیں مانگ رہی تھیں اور جُندب لیٹے سن رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے طنز سے کہا: "ایک کا دوسرے سے نکاح کر دو۔"

عورتیں یہ آواز سن کر چونک گئیں۔ اساف اور نائلہ کے متعلق ایسی بات؟ دن کا وقت ہوتا تو کسی کو مدد کے لیے پکارتیں، لیکن اس وقت کس کو بلاتیں۔ بڑبڑاتی ہوئی جلدی سے حرم پاک سے نکل گئیں۔ سامنے ایک پہاڑی تھی، اس پر چڑھنے لگیں، سامنے سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق ابو بکرؓ کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا ہوا؟" عورتوں نے کہا: "کیا بتائیں، صابی کعبہ میں پڑا ہوا ہے"۔ دریافت کیا: "وہ کیا کہتا ہے؟" جواب ملا، "بس! بری بات بک رہا ہے"۔ رسول کریم ﷺ حرم پاک آئے۔ نوجوان جُندب سے ملے، لیکن اس موضوع پر تفصیلی بات نہیں کی۔ حضرت ابو بکرؓ نوجوان کو اپنے گھر لے گئے۔ طائف کی کشمشیں پیش کیں۔ صبح ہوئی تو جُندب حرم پاک آ گئے۔ رات ہوئی تو حضرت علیؓ تشریف لائے۔ آپؓ اس نوجوان کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ رہا نہ گیا پوچھ بیٹھے، "آپ یہاں کس ضرورت کے تحت آئے ہیں؟"

جُندب کہنے لگے، "میں نے سنا تھا کہ مکہ میں ایک شخص ہے، جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں"۔ حضرت علیؓ نے خوش ہو کر فرمایا:

"یہ بالکل سچ ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں، صبح آپ میرے ساتھ چلیں، راستے میں اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا جس میں خطرہ محسوس ہو تو میں بہانے سے رک جاؤں گا، پھر میں جدھر جاؤں، چلے آئیے گا۔"

صبح ہوئی تو، حضرت علیؓ، نوجوان کو رسولِ کریم ﷺ کے پاس لے گئے۔ آپ ﷺ نے نوجوان کے سامنے کلام پاک کی تلاوت فرمائی، ادھر تلاوت ختم ہوئی ادھر نوجوان جندب نے کلمہ شہادت پڑھ لیا اور رُوئے زمین پر پانچویں مسلمان کا اضافہ ہو گیا۔

یہ نوجوان تھے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ جو تقویٰ اور پرہیز گاری کی روشن علامت ہیں۔ آپؓ کا تعلق قبیلہ غفار سے ہے، اس نسبت سے غفاری کہلاتے ہیں۔ جُندب آپؓ کا نام اور ابو ذر کنیت ہے۔ قبیلہ غفار اس راستے پر آباد تھا جس کے ذریعہ تجارتی قافلے مکہ مکرمہ

Marfat.com

سے پہاڑی درّوں اور ریگستانوں سے ہوتے ہوئے شام و فلسطین کی سمت جایا کرتے تھے۔ قبیلۂ غفار تجارتی قافلے لُوٹنے کے لیے مشہور تھا۔ ابتدا میں جُندب نے بھی قافلوں کی لوٹ مار میں حصہ لیا، لیکن آپؓ کی فطرتِ سلیم نے اس کام کو پسند نہ کیا، نہ ہی آپؓ بتوں کے آگے سر جھکانے اور ان سے مرادیں مانگنے پر مطمئن ہوئے۔ آپؓ کا دل کہتا تھا کہ اس بیکراں کائنات، اس روشن اور گرم سورج، ان چمکیلے ستاروں، ان تپتے صحراؤں اور ان بلند و بالا پہاڑوں کا کوئی ایک خالق ہے۔

اسی اثنا میں آپؓ کو خبر ملی کہ مکہ مکرمہ میں کوئی صاحب ایسے ہیں جو خود کو اللہ کا نبی کہتے ہیں۔ آپؓ نے پہلے اپنے بھائی انیس کو معلومات حاصل کرنے کے لیے مکہ روانہ کیا۔ ادھر انیس روانہ ہوئے ادھر ابو ذرؓ انتظار کی گھڑیاں گننے لگے۔ بعد میں آپؓ اس وقت کی کیفیت بتاتے ہیں کہ ''انیس نے بہت دیر لگائی تھی۔''

انیس واپس آئے تو انہوں نے بتایا، ''مکہ مکرمہ میں جو صاحب خود کو اللہ کا نبی کہتے ہیں وہ اچھی عادتوں کی تعلیم دیتے ہیں، لوگ انہیں شاعر اور کاہن کہتے ہیں، لیکن میں نے شعر کے وزن پر اس شخص کے کلام کو خوب پرکھا۔ شعر تو وہ یقیناً نہیں ہیں، رہا کاہن تو میں سینکڑوں کاہنوں سے ملا ہوں۔ اس شخص کے کلام کو کاہنوں کی گفتگو سے کوئی واسطہ نہیں۔'' حضرت ابو ذرؓ، بھائی کی زبانی یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور خود مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کر لیا۔

نوجوان حضرت ابو ذر غفاریؓ ایمان لا چکے تو حضرت ابو بکرؓ کی رہائش گاہ پر ہی رہنے لگے۔ ایک دن حرم پاک میں آئے تو ایک عورت ''یا اساف، یا نائلہ'' کہہ کر پکار رہی تھی۔ آپؓ نے جھلا کر پھر کہہ دیا، ''ایک کا دوسرے سے نکاح کر دو۔'' وہ عورت شور مچانے لگی۔ فوراً بہت سے لوگ آ گئے۔ اور آپؓ کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ بنی بکر قبیلے والوں نے آ کر آپؓ کو چھڑایا۔

رسول اقدس ﷺ نے حضرت ابو ذرؓ سے فرمایا، ''میں کھجوروں والی سرزمین کی طرف متوجہ کیا گیا ہوں۔ میں اسے مدینہ کے سوا کسی شہر کو خیال نہیں کرتا تو کیا تم اپنی قوم کو میری جانب سے تبلیغ کر سکتے ہو؟ ممکن ہے اللہ انہیں تم سے نفع پہنچائے اور تمہیں اجر دے۔''

حضرت ابو ذرؓ کہہ اٹھے! ''جب تک میں مسجدِ حرام میں بلند آواز سے اپنے اسلام لانے کا اعلان نہ کر دوں میں نہیں جا سکتا۔'' ایمان کی کیا قوت ہے جو ایک نوجوان کو تن تنہا، ہزاروں افراد کے سامنے سینہ سپر

کر دیتی ہے، فوراً حرم پاک گئے اور بلند آواز میں کلمۂ شہادت پڑھ دیا۔

قریش بھلا اس بات کو کب گوارا کر سکتے تھے کہ حرم پاک میں ''نئے'' دین کی بات کی جائے۔ فوراً بہت سے لوگ آپؓ پر پل پڑے۔ لاتوں، گھونسوں، لکڑیوں سے مارنا پیٹنا شروع کر دیا، اس وقت آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ وہاں سے گزرے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن انہوں نے مداخلت کی اور قریش والوں سے کہا، ''ارے کیا کرتے ہو، یہ قبیلۂ غفار کا آدمی ہے، جدھر سے تمہارے تجارتی قافلے گزرتے ہیں۔ تمہاری تجارت بند ہو کر رہ جائے گی۔''

تجارت بند ہونے کے خوف سے لوگ رک گئے۔ دوسرے دن حضرت ابو ذرؓ پھر حرم پاک پہنچے اور کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کر دیا، ایک بار پھر آپؓ کو اللہ کے واحد معبود ہونے کی شہادت دینے کی پاداش میں زدوکوب کیا جانے لگا۔ حضرت عباسؓ پھر تشریف لائے اور بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے قریش کو ڈانٹا کہ ''کیا تمہارا ارادہ ہے کہ قریش کے قافلے لوٹ لیے جائیں؟''

حضرت ابو ذرؓ حرم پاک میں اپنے مسلمان ہو جانے کا بے باکانہ اظہار کر چکے تو آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر پہنچے۔ بھائی انیس سے ملے، انہیں اپنے مسلمان ہو جانے کی خبر دی۔ بھائی آپؓ کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بھی ایمان لے آئے، آپؓ کی والدہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

اب حضرت ابو ذرؓ نے اپنے قبیلے والوں کی طرف توجہ کی، قبیلے والے جمع تھے۔ سردار خفاف بن ایماؑ کے پاس جا کر بیٹھے اور کہنے لگے، ''مکہ میں ایک نبی کا ظہور ہوا ہے وہ اس صاف آسمان، وسیع زمین اور چمکدار ستاروں کے خالق کی طرف دعوت دیتا ہے۔''

شور مچ گیا، ''ابو ذرؓ گمراہ ہو گیا، ابو ذرؓ گمراہ ہو گیا۔'' سردار نے کہا، ''ٹھہرو! ذرا اسے بات تو پوری کرنے دو۔''

حضرت ابو ذرؓ نے بڑے موثر انداز میں اپنی بات بیان کی، فرمایا: ''ایک دن میں نہم کے بت کے پاس آیا۔ بڑے انکسار کے ساتھ اس پر دودھ کی نذر چڑھائی، واپس ہونے لگا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک کتا دودھ پی رہا ہے اور معبود خاموش کھڑا ہے، وہ اُسے مقدس دودھ سے نہ ہٹا سکا۔ پھر کتے نے نہ صرف معبود کی نذر ہڑپ کر لی بلکہ پاؤں اٹھا کر اس پر پیشاب بھی کر دیا۔ یہ ہے نہم کی طاقت، قوت، عزت، جلال

Marfat.com

اور اس کی سلطنت۔"

یہ بات سن کر سب نے گردنیں جھکا لیں۔ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حضرت ابو ذرؓ کی تبلیغ سے، سردار خفاف مسلمان ہو گئے، کئی اور افراد نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا اور جو باقی بچے انہوں نے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ یہاں آئیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔

حضرت ابو ذرؓ تبلیغِ دین میں مصروف رہے، ادھر رسول کریمؐ کو ہجرت اور پھر جنگ کا حکم ملا۔ غزوۂ بدر و اُحد کے معرکے در پیش آئے۔ حتیٰ کہ غزوۂ خندق بھی ہوا جس میں اللہ کی قدرت سے کفار کو سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

اب قبیلۂ غفار کے بقیہ لوگوں نے بھی ایمان لانے کی خواہش ظاہر کی۔ پڑوس کے قبیلے، اسلم والے بھی تیار ہو گئے۔

سنہ ۵ ہجری کے ابتدائی مہینوں میں حضرت ابو ذرؓ مدینہ تشریف لائے، آنحضرت ﷺ سے ملے۔ آپؐ نے دعا فرمائی، "اللہ، غفار کی مغفرت کرے اور اسلم کو سلامت رکھے۔"

غزوۂ خندق کے بعد حضرت ابو ذرؓ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت ابو ذرؓ علم حاصل کرنے کے بڑے شائق تھے۔ آپؓ خود فرماتے ہیں، "میں، حضور ﷺ سے پوچھا کرتا تھا اور پوچھنے میں شدید تھا۔" ایک بار فرمایا، "حضور ﷺ نے ہمیں اس وقت چھوڑا جب فضا میں اڑنے والے پرندوں کے متعلق بھی ہمیں کچھ نہ کچھ علم مل گیا۔" ایک اور بار آپؓ نے بتایا "میں ہر چیز کے بارے میں حضورؐ سے سوال کرتا تھا، حتیٰ کہ کنکری کے متعلق بھی پوچھا۔"

حضرت عمرؓ، آپؓ کو علم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے برابر سمجھتے تھے۔ آپؓ کی بیان کردہ احادیث کی تعداد ۲۸۱ ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آپؓ کے علم سے استفادہ کیا ہے۔

آپؓ نے جو کچھ علم حاصل کیا، اس کی چلتی پھرتی تفسیر تھے۔

رسول کریم ﷺ سے آپؓ کو بے پناہ عقیدت تھی اور آنحضرت ﷺ بھی آپؓ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ جب رسول کریم ﷺ اپنے وصال سے قبل سخت بیمار ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابو ذرؓ کو بلوایا۔ حضرت ابو ذرؓ جھکے تو حضور ﷺ نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سینۂ مبارک سے چمٹا لیا۔

رسول کریم ﷺ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ جب بھی آپ ﷺ کا ذکر فرماتے تو حبیبی، خلیلی (میرے محبوب، میرے دوست) کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ جس بات کی حضور ﷺ نے تعلیم دی، مرتے دم تک اس پر عمل پیرا رہے۔

ایک بار حضرت ابو ذرؓ نے تنگ دستی سے پریشان ہو کر حضور ﷺ سے خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی صوبے کا عامل (گورنر) بنا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "ابو ذرؓ، میں تمہیں کمزور پاتا ہوں، میں تمہارے لیے اسی بات کو پسند کرتا ہوں جو مجھے اپنے لیے پسند ہے۔ تم ہرگز دو آدمیوں کے امیر نہ بننا۔"

آپؐ کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد حضرت ابو ذرؓ نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔

ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے آپؓ سے فرمایا، "کیا تم ایسی بات پر بیعت کرو گے جس کے بعد تمہارے لیے صرف جنت ہو۔" کہنے لگے، "جی ہاں" اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "تم کسی شخص سے کچھ نہیں مانگو گے۔" حضرت ابو ذرؓ نے کہا، "بہت بہتر" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "حتیٰ کہ وہ کوڑا بھی نہیں جو تمہارے گھوڑے سے گر پڑے، بلکہ تم اترو اور خود اٹھاؤ۔" اس کے بعد آپؓ کا حال یہ تھا کہ آپؓ نے کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا۔

ایک بار حضرت ابو ذرؓ نے حضرت بلالؓ کے لیے سخت الفاظ استعمال کر دیے۔ حضرت بلالؓ نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ آنحضرتؐ نے حضرت ابو ذرؓ کو بلوایا اور پوچھا کہ "کیا تم نے ایسا کہا ہے؟" آپؓ نے اقرار کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: "تم میں ابھی تک جاہلیت موجود ہے۔" حضرت ابو ذرؓ نے بے ساختہ پوچھا: "کیا اس وقت بھی؟ اتنی بڑی عمر میں؟" جواب ملا، "ہاں۔" پھر آپ ﷺ نے نہایت نرمی سے سمجھایا، "ابو ذرؓ! غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے ان لوگوں کو تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ انہیں وہی کھانے کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، وہی کپڑے پہناؤ جنہیں تم پہنتے ہو۔" (صحیح بخاری)۔ اس کے بعد حضرت ابو ذرؓ کی کیفیت یہ تھی کہ گھر سے نکلتے ہیں تو غلام ساتھ ہے، جو لباس اپنے بدن پر ہے وہی غلام کے بدن پر ہے۔

سنہ ۹ھ / ۶۳۰ء میں سلطنتِ روم نے ملکِ شام میں بہت بڑی فوج جمع کر دی تھی۔ یہ بڑا فیصلہ کن لمحہ تھا۔ حضور ﷺ نے اعلانِ جہاد کر دیا تھا، سخت گرمی کا موسم، کھجور کی فصلیں پک کر تیار تھیں۔ روم جیسی بڑی طاقت سے ٹکر لینے کا معاملہ تھا، سچے اور مخلص مسلمان

Marfat.com

تو جہاد میں حصہ لینے کے لیے بے تاب تھے لیکن منافق طرح طرح کے عذر کر کے رخصت طلب کر رہے تھے۔ بالآخر مسلمانوں کا لشکر غزوۂ تبوک میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہوا۔ ابو ذرؓ کا اونٹ ذرا سست رفتار تھا، وہ لشکر سے پیچھے رہ گیا۔ شور مچ گیا، "ابو ذرؓ رہ گئے، ابو ذرؓ رہ گئے"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، "تو اللہ اسے خود تم لوگوں سے ملا دے گا"۔

ادھر حضرت ابو ذرؓ نے بڑی کوشش کی کہ اونٹ تیز چلے، لیکن لشکرِ اسلام کو پکڑ نہ سکے۔ بیتاب ہو کر اونٹ سے اُتر پڑے، کچھ سامان جو اٹھا سکے اٹھایا اور دوڑنا شروع کر دیا۔

قافلے والوں نے دور سے دیکھا کوئی شخص دوڑتا چلا آرہا ہے۔ ہر طرف صدائیں لگنے لگیں۔ "کوئی آرہا ہے، کوئی آرہا ہے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "ابو ذر ہی ہو، ابو ذر ہی ہو۔"

تھوڑی دیر بعد قافلے میں شور مچ رہا تھا۔ "ابو ذر ہی ہیں۔"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ ابو ذرؓ پر رحمت فرمائے، وہ تنہا چلے گا، تنہا مرے گا اور تنہا ہی روزِ قیامت اٹھایا جائے گا۔"

حضرت عثمانؓ کے عہد میں پے در پے فتوحات ہوئیں، لوگ آرام و آسائش کی طرف مائل ہوئے، لیکن حضرت ابو ذرؓ بدستور سادہ زندگی بسر کرتے رہے اور عیش و آرام کے اسباب پر تنقید کرتے رہے۔ یہ تنقید اس قدر بڑھی کہ حضرت عثمانؓ نے آپؓ کو مدینہ بلا کر فرمایا کہ آپ میرے پاس رہیے، لیکن آپؓ مدینہ کے قریب ایک گاؤں، "ربذہ" جا کر رہنے لگے۔

ایک دن حضرت ابو ہریرہؓ جو ان دنوں بحرین کے عامل تھے، آئے تو محبت سے حضرت ابو ذرؓ کے گلے لگ گئے، لیکن آپؓ انہیں دھکے دے کر چھڑانے لگے۔ پھر ابو ذرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا، "آپ کسی صوبہ کے عامل مقرر ہوئے؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے اقرار کیا۔ پوچھا "کوئی مکان بنوایا؟ کوئی زمین حاصل کی؟ اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ کے مالک ہوئے؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: "نہیں۔" خوش ہو کر گلے لگالیا، فرمایا: "ہاں؟ تم میرے بھائی ہو۔"

حق گوئی حضرت ابو ذرؓ کا شعار تھی۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا، "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابو ذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں" (ترمذی) اور حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا، "اگر ابو ذر کی رگِ گلو پر تلوار رکھ دی جائے اور کسی سچی بات کی تبلیغ اس سے رہ گئی ہو، تب بھی وہ اسے نافذ کر کے رہے گا۔"

نبی کریم ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا تھا، "ابو ذر تنہا چلتا ہے، تنہا مرے گا اور تنہا ہی روزِ قیامت اٹھایا جائے گا۔"

اللہ کے رسول ﷺ کی اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ ۳۲ھ / ۶۵۳ء میں حج کا زمانہ تھا۔ گاؤں "ربذہ" میں جہاں حضرت ابو ذرؓ اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے، اوّل تو آبادی تھی ہی بہت تھوڑی، پھر سب لوگ حج کے لیے چلے گئے۔ حضرت ابو ذرؓ شدید بیمار ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے۔ اہلیہ سخت پریشان تھیں۔ حضرت ابو ذرؓ نے اطمینان سے کہا، "حضور ﷺ نے مجھ سمیت کچھ افراد سے فرمایا تھا، "تم میں سے ایک صحرا میں مرے گا، اور اس کی موت کے وقت وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچ جائے گی۔" ان افراد میں سے میرے سوا، سب کے سب آبادی میں انتقال کر چکے ہیں۔ تم جا کر دیکھو کوئی آتا ہو گا۔" اہلیہ نے پریشان ہو کر کہا، اب تو حجاج جا چکے ہیں۔" آپؓ نے اصرار کیا۔ "نہیں تم جا کر دیکھو تو سہی۔" اب حال یہ تھا کہ اہلیہ محترمہ دوڑ دوڑ کر ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتی تھیں پھر بھاگتی ہوئی شوہر کے پاس عیادت کے لیے آتی تھیں، حتیٰ کہ دور سے کچھ سوار آتے دکھائی دیے۔

سوار قریب پہنچے تو حضرت ابو ذرؓ کی اہلیہ نے ان سے کہا، "ایک مسلمان مر رہا ہے اس کے دفن کا سامان کرو۔" کسی نے پوچھا، "وہ کون ہے؟" آپ نے بتایا، "ابو ذر، صحابیِ رسولؐ۔" شور مچ گیا۔ لوگ اونٹوں سے کود پڑے اور حضرت ابو ذرؓ کے خیمے کی طرف دوڑے۔

حضرت ابو ذرؓ نے آوازیں سنیں تو بیٹی سے کہا، "گھر میں مہمان آرہے ہیں ایک بکری ذبح کر لو اور آگ پر چڑھا دو، جب میری تدفین ہو جائے تو ان سے کہنا کہ ابو ذرؓ نے آپ لوگوں کو اللہ کی قسم دی ہے جب تک کھانا نہ کھالیں سواریوں پر سوار نہ ہوں۔"

مسلمانوں کی جماعت خیمے میں پہنچی تو فرمایا، "اے کاش میرے پاس اتنے کپڑے ہوتے کہ میں اس سے اپنا کفن بنالیتا۔ میری وصیت یہ ہے کہ مجھے جو بھی کفن دے وہ حکومت کا اہلکار نہ ہو۔"

یہ حضرت ابو ذرؓ کے تقویٰ کی بلندی ہے۔ آپؓ چونکہ سادہ زندگی گزارنے کے قائل تھے اور آپؓ کا خیال یہ تھا کہ حکومت کا اہلکار بن جانے کے بعد آدمی سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے اور وہ عیش و آرام کی زندگی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اس لیے آپؓ نے یہ قید لگادی کہ آپؓ

Marfat.com

کو جو بھی کفن دے وہ سرکاری اہلکار نہ ہو۔

اتفاق یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اس جماعت میں جو آپؓ تک پہنچی تھی، جتنے بھی افراد تھے وہ سب کسی نہ کسی سرکاری عہدے پر فائز تھے، صرف ایک انصاری نوجوان ایسا تھا جو سرکاری اہلکار نہ تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود چادریں پیش کر دیں۔ ذوالحجہ کی آٹھ تاریخ تھی، ہجرت کے ۳۲ویں سال/ ۱۰ جولائی ۶۵۳ء کو صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اسی دوران حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اونٹ پر وہاں سے گزرے، آپؓ کوفہ سے عمرہ کا احرام باندھے آ رہے تھے۔ لوگوں نے روک کر کہا، "ابوذرؓ صحابیٔ رسولؐ کی تدفین میں مدد کیجیے، یہ سننا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے چیخ ماری اور کہنے لگے، "حضور ﷺ نے سچ فرمایا تھا۔ ابوذرؓ تنہا چلتا ہے، تنہا مرے گا اور تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔"

اس طرح قادرِ مطلق نے اس صحرا میں اپنے پیارے بندے کی تدفین میں حصہ لینے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت بھیجی۔ نماز جنازہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پڑھائی اور تقویٰ کے اس پیکر کو اسی صحرا میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

رسول ﷺ اللہ کے خادمِ خاص، علمِ فقہ کے امام

برکتوں اور سعادتوں سے بھرپور رمضان کا مبارک مہینہ رخصت ہونے کو تھا۔

آخری عشرے کی ایک رات بیت چکی تھی۔ تاریکی سمٹتی جا رہی تھی اور صبح کا اجالا شہر کے گلی کوچوں، بازاروں اور در و بام کو منور کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک بزرگ اپنے مکان کی چھت پر تشریف فرما تھے اور ملاقات کے لیے آئے ہوئے ایک صاحب سے کہہ رہے تھے، "اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا ہے!"

"وہ کیا ہے؟" ان صاحب نے پوچھا۔

بزرگ نے جواب دیا، "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس میں شعاع نہیں ہوتی، چنانچہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

یہ بزرگ تھے، رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جنہیں طویل عرصے تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کا شرف حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شب قدر کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے اور رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ لوگو! تم پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا، وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا اور اس شب کی خیر و برکت سے وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے اس عظیم رات کو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ لوگ نہایت خوش نصیب ہیں جو اس رات کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا نام عبداللہ، کنیت ابو عبدالرحمٰن، والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبدؓ ہے۔ اس لیے آپؓ ابن ام عبد کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

عرب کا دستور تھا کہ لڑکوں کو روزانہ بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بھی لڑکپن میں یہی ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک دن آپؓ عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرا رہے تھے کہ سرور کائنات ﷺ اپنے رفیق حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ادھر سے گزرے۔ حضرت ابو بکرؓ نے دریافت کیا، "صاحب زادے! تمہارے پاس کچھ دودھ ہے تو ہماری پیاس بجھاؤ۔" نوجوان عبداللہؓ نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا، "میں آپ کو دودھ نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ دوسرے کی امانت ہے۔" یہ اس معاشرے میں بسنے والے نوجوان کا جواب تھا، جس میں چاروں طرف گمراہی کے اندھیرے پھیلے ہوئے تھے، لیکن زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے نے اس نوجوان کو وہ پاکیزہ نفس عطا کر دیا تھا جو اسے برائی اور بھلائی میں تمیز کرنا سکھاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے نوجوان کا جواب سن کر دریافت فرمایا، "اچھا! کیا تمہارے پاس کوئی بن بیاہی بکری بھی ہے۔" جواب ملا۔ "ہاں" اور نوجوان عبداللہؓ نے ایسی ایک بکری پیش کر دی۔ حضور ﷺ نے اس بکری کے تھن پر ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی۔ کائنات کے خالق سے اس کے محبوب ترین بندے نے دعا کی تھی۔ تائید ایزدی سے بکری کے تھن دودھ سے لبریز ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اسے دوہا تو اس قدر دودھ نکلا کہ تینوں افراد نے سیر ہو کر پیا۔ رسول کریم ﷺ نے بکری کے تھن کو حکم دیا۔ "خشک ہو جا" تھن اپنی اصلی حالت پر واپس آ گئے۔

یہ معجزہ دیکھ کر نوجوان عبداللہؓ حیرت زدہ رہ گئے۔ رسول اقدس ﷺ کی مسحور کن شخصیت نے انہیں اسیر کر لیا۔ عرض کیا،

Marfat.com

"مجھے موثر کلام کی تعلیم دیجیے۔" حضورؐ نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا "تم تعلیم یافتہ بچے ہو۔" یہی وہ مبارک دن تھا جب رسولِ عربی ﷺ نے نوجوان عبداللہ کو اپنے شاگردوں کی صف میں شامل فرمایا اور اپنے خادم خاص کا مرتبہ دیا۔ خود اس پاکیزہ صفت نوجوان کی تربیت کی، ستر سورتوں کی خود تعلیم دی۔ جس نے اللہ کے حبیب ﷺ سے علم کی دولت پائی ہو اس کا کیا پوچھنا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جو علم و فضل کے اعتبار سے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔

جب اس بیس سالہ نوجوان کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری ہوا تو اسلام کو بحیثیتِ دین قبول کرنے والوں کی تعداد رُوئے زمین پر بہت تھوڑی تھی اور دنیا اس بات سے بے خبر تھی کہ صرف چند برس بعد یہ نیا دین کتنی بڑی قوت بن جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بجا طور پر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انہیں اسلام لانے والے چھٹے فرد کا اعزاز نصیب ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف یہی اعزاز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیے سرمایۂ افتخار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اور بھی کئی امتیازات سے نوازا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وہ خوش نصیب ہیں جنہیں رسول پاک ﷺ کے تکیے، جنگ کا سامان اور جوتوں کی نگرانی کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضور ﷺ کے لیے مسواک کا اہتمام کرنا بھی آپؓ ہی کے فرائض میں داخل تھا۔ سواری کے موقع پر کجاوہ کستے اور عصا لے کر حضور ﷺ کے آگے آگے چلتے۔ آپؓ اور آپ کی والدۂ محترمہ ام عبدؓ کو حضور ﷺ کا اس قدر قرب حاصل تھا کہ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ یمن سے مدینہ آئے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضور ﷺ کے پاس بار بار جاتے دیکھا تو ایک عرصے تک وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضور ﷺ کے خاندان کا ہی ایک فرد سمجھتے رہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ خود فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ کو ان موقعوں پر بھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت تھی جب دیگر صحابہ کرامؓ کو روک دیا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ میں علم دین حاصل کرنے کی تڑپ تھی۔ دن رات حضورؐ کی خدمت میں حاضری دیتے اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے علم و معرفت کے موتی سمیٹ لیتے۔

علم دین کے حصول کی تڑپ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی فہم و فراست کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام پاک کی تفسیر بیان کرنے میں آپؓ کا بہت بلند مقام ہے۔ آپؓ کی بیان کردہ تفاسیر مختلف کتابوں میں شامل ہیں۔ انہیں اگر جمع کیا جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

احادیث کی مستند کتب میں آپؓ سے ۸۴۸ احادیث روایت کی گئی ہیں۔ آپؓ کا شمار ان بلند پایہ صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جو فقہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ فقہ حنفی کی تمام تر بنیاد آپؓ ہی کے فتاویٰ پر رکھی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ ان چار صحابہ کرامؓ میں شامل ہیں جن کے متعلق رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم چار آدمیوں سے حاصل کرو۔ حضور ﷺ نے سب سے پہلے ابنِ اُمِّ عبدؓ (عبداللہ بن مسعودؓ) کا نام لیا۔ دیگر صحابہ کرامؓ میں حضرت سالمؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت اُبی بن کعبؓ شامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ خود فرماتے ہیں کہ "قرآن پاک میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں، میں نہ جانتا ہوں کہ کب، کہاں اور کس سلسلے میں نازل ہوئی۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور میں، دیر تک نبی کریم ﷺ کے ایک کام کے سلسلے میں بات چیت کرتے رہے۔ فارغ ہو کر نکلے تو حضور ﷺ میرے اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان چل رہے تھے۔ جب ہم مسجد کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ حضور ﷺ کھڑے ہو گئے اور کان لگا کر سننے لگے۔ میں نے عرض کیا، "اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ رُک گئے؟" آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس آدمی نے قرأت کے بعد رکوع کیا، سجدے کیے اور دعا میں مشغول ہو گیا۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا، "تم مانگو! اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائیں گے"۔ یہ بات آپ ﷺ نے دوبارہ فرمائی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا، "جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ قرآن کریم کو اسی طرح پڑھے جس طرح کہ نازل ہوا ہے تو وہ ابنِ اُمِّ عبد (عبداللہؓ بن مسعود) کی طرح قرآن پڑھے۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "اس طرح میں نے اور حضرت ابو بکرؓ نے سمجھ لیا کہ یہ شخص حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔" جب صبح ہوئی تو میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس پہنچا تاکہ انہیں حضور ﷺ کی جانب سے دی گئی بشارت سے آگاہ کروں، لیکن عبداللہؓ

Marfat.com

بن مسعود نے مجھے بتایا کہ ابو بکرؓ پہلے ہی یہ خوشخبری ان تک پہنچا چکے ہیں اور ابو بکرؓ نے جب آکر عبد اللہؓ بن مسعود کو مبارکباد دی تو یہ بھی پوچھا کہ، "آپ نے کیا دعا مانگی؟"

جواب ملا، "میں نے دعا مانگی، "اے اللہ! مجھے ایسا ایمان عطا فرما جس کو کبھی جنبش نہ ہو، ایسی نعمت دے جو کبھی ختم نہ ہو اور جنت میں حضور اکرم ﷺ کی رفاقت عطا فرما۔"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو تلاوتِ کلام پاک کا بہت شوق تھا۔ تنہائی میں اکثر قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ آپؓ فرماتے ہیں۔ ایک بار حضور ﷺ نے فرمایا، "مجھے سورۃ النساء پڑھ کر سناؤ۔" میں نے عرض کی، "یارسول ﷺ اللہ! قرآن تو آپؐ پر نازل ہوا ہے اور آپؐ کو میں سناؤں؟" ارشاد ہوا، "کیوں نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ کوئی قرآن پڑھے اور میں سنوں۔" میں نے حکم کی تعمیل کی جب اس آیت پر پہنچا، (ترجمہ) "بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان پر گواہ بنائیں گے۔" (النساء، ۴۱) تو میں نے دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ طویل عرصے تک حضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ آپ ﷺ سے دین کا بیش بہا علم حاصل کیا۔ ۸۴۸ احادیث روایت بھی کیں، لیکن حدیث بیان کرتے ہوئے آپؓ حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب کبھی "قال رسول اللہ ﷺ" فرماتے، کانپ اٹھتے۔ حضرت ابو عمر شیبانیؒ فرماتے ہیں: "ایک بار حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان فرمائی تو آپؓ کا بدن تھر تھرا اُٹھا" کہنے لگے "حضور ﷺ نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب یا اس کے مشابہ۔"

حدیث بیان کرتے ہوئے نہایت سنجیدہ ہو جاتے تھے اور ادب و احترام کے ساتھ حدیث بیان فرماتے تھے۔ آپؓ نے حضور ﷺ کی رفاقت میں جو طویل عرصہ گزارا اس دوران آپؓ نے جس توجہ اور محبت کے ساتھ حضور ﷺ کی عادات و اخلاق کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار ایک طویل حدیث بیان کی جس میں قیامت، جنت اور مسلمانوں اور اللہ تعالیٰ کے سوال و جواب کا ذکر تھا۔ حدیث ختم کرکے آپؓ مسکرا دیے، پھر فرمایا، "آپ لوگ پوچھتے نہیں کہ میں کیوں مسکرا رہا ہوں؟" لوگوں نے پوچھا، "آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟" فرمایا، "اس لیے کہ حدیث بیان کرکے حضور ﷺ بھی مسکرائے تھے!" حضرت حذیفہؓ سے پوچھا گیا کہ ایسا کون شخص ہے جو عادات اور طریقوں کے لحاظ سے حضور ﷺ کے قریب تر ہو؟ جواب ملا، "سب سے زیادہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، آنحضرت ﷺ کی ہدایت، حسنِ اخلاق اور طور طریقوں کے پابند تھے۔"

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا فقہ میں بہت بلند مقام ہے اور فقہ حنفی کی عمارت آپؓ ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ / ۶۴۱ء میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو قاضی اور افسر بیت المال مقرر کرکے کوفہ بھیجا اور ساتھ ہی خط تحریر کیا، "میں نے ابن اُم عبد (عبد اللہ بن مسعودؓ) کو خود سے جدا کرکے ایثار کا مظاہرہ کیا ہے۔"

مسلمانوں کو تعلیم دینے اور کوفہ کے گورنر کی وزارت کے فرائض بھی آپؓ کے سپرد تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے کوفہ پہنچ کر ایک حلقۂ درس قائم کیا۔ لوگ آتے اور مختلف دینی مسائل دریافت کرتے۔ یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا حتیٰ کہ پورا خطۂ عراق فقہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا پیروکار ہو گیا۔ آپؓ کی یہ درس گاہ کوئی معمولی درسگاہ نہ تھی۔ یہاں بڑے بڑے علما اور ائمہ تیار ہوئے۔ آپؓ کے شاگردوں میں سے علقمہؒ اور اسودؒ نے فقہ میں کمال حاصل کیا۔ ان کے بعد حضرت ابراہیم نخعیؒ کوفہ کی فقہ کے حوالے سے مشہور ہوئے، یہاں تک کہ فقیہ عراق کہلائے جانے لگے۔ ان کے پاس حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ کا بڑا ذخیرہ تھا، جو انہیں حفظ بھی تھا۔ یہ ذخیرہ ان سے حضرت حمادؒ تک منتقل ہوا اور حضرت حمادؒ سے علم کا یہ بیش قیمت خزانہ حضرت امام ابو حنیفہؒ تک پہنچا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنی فہم و فراست اور قوتِ اجتہاد سے اس فقہ کو اس قدر وسعت دی کہ آج مسلمانوں کی اکثریت اس فقہ پر کاربند ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے دیگر شاگردوں میں مسروقؒ، عبیدہؒ، حارثؒ، قاضی شریحؒ اور ابو وائلؒ نے بہت نام پایا۔ حضرت علقمہؒ تو آپؓ کے طور طریقوں کے اس قدر پابند تھے کہ لوگوں کا کہنا تھا کہ جس نے علقمہؒ کو دیکھ لیا اس نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو دیکھ لیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی تقریر مختصر، جامع اور بے حد موثر ہوتی تھی۔ اس کی اثر آفرینی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ لوگ آپؓ کے مکان سے نکلنے کے منتظر رہتے تھے تاکہ آپؓ آئیں تو آپؓ سے علم حاصل کیا جائے۔ تقریر میں عموماً توحید، نماز باجماعت اور خوفِ خدا کی

Marfat.com

تلقین فرماتے۔ تقریر کے دوران واقعات اور تمثیلات کا حوالہ بھی دیتے۔ لوگوں کے شوق کے باوجود آپؓ زیادہ وعظ و نصیحت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فقہ کے ایک اہم رکن "قیاس" کو بھی تقویت دی اور ایسے کئی قواعد مقرر کر دیے جو آج علم اصولِ فقہ کی بنیاد ہیں۔

حضرت عمرؓ جب بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھتے تو چہرہ ہشاش بشاش ہو جاتا۔ فرماتے، "ایک ظرف ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے"۔ ایک بار حضرت علیؓ سے کوفے کے چند افراد نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تقویٰ، حُسنِ خلق اور علم کی تعریف کی۔ حضرت علیؓ نے پوچھا، "کیا آپ یہ باتیں سچے دل سے کہہ رہے ہیں؟" جواب ملا، "جی ہاں۔" حضرت علیؓ نے فرمایا، "آپ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جو کچھ تعریف کی ہے میں ان کو اس سے بھی بہتر خیال کرتا ہوں۔"

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ میں سے چھ اصحاب مجتہد سمجھے جاتے تھے۔ وہ فقہ کے مسائل میں بحث و مذاکرہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت علیؓ، اُبی ابن کعبؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ایک ساتھ اور حضرت عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک ساتھ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مسائل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

آپؓ نے جہاں علم کے شعبے میں اپنی فراست کا لوہا منوایا، وہیں جنگ و جدل کے میدان میں بھی جرأت و بہادری کی ناقابلِ فراموش مثالیں قائم کیں۔ آپؓ کے ایمان کی قوت اور بے خوفی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب صرف چند صحابۂ کرامؓ ایمان لائے تھے اور حضورِ اقدس ﷺ کے سوا کسی کو بلند آواز میں کلام پاک پڑھتے نہیں سنا گیا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فوراً آگے بڑھے اور قریش کو قرآن پاک سنانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ آپؓ کے ساتھیوں نے منع کیا کہ آپ کا خود کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ یہ کام تو ایسے شخص کو کرنا چاہیے جس کا خاندان بڑا ہو تاکہ مشرکین سے اس کی حفاظت کر سکے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا جواب تھا، "مجھے چھوڑ دیجیے، اللہ میرا حافظ ہے۔"

دوسرے دن جب مشرکین، خانۂ کعبہ میں جمع ہوئے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وہاں پہنچے اور آپؓ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بلند آواز میں قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔ پہلے پہل تو لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ آپؓ کیا پڑھ رہے ہیں۔ وہ تعجب کے ساتھ سننے لگے پھر ایک طرف سے کسی نے کہا، "ارے محمدؐ پر جو کتاب اتری ہے وہی پڑھ رہے ہیں۔" یہ آواز آنی تھی کہ کفار بپھر گئے۔ چاروں طرف سے لوگ آپؓ پر ٹوٹ پڑے۔ آپؓ کو اس قدر مارا پیٹا گیا کہ چہرے پر ورم آگیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ واپس لوٹے تو آپؓ کے ساتھیوں نے کہا "دیکھا، اسی لیے ہم تمہیں جانے نہ دیتے تھے۔" حضرت عبداللہؓ نے کمالِ بے خوفی سے کہا، "اللہ کی قسم! اللہ کے دشمن آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے۔ اگر آپ چاہیں تو میں کل پھر اسی طرح ان کے مجمع میں جا کر انہیں قرآن پاک سناؤں۔" صحابہ کرامؓ نے کہا، "بس جانے بھی دو، اتنا ہی کافی ہے، وہ جس چیز کا سننا پسند نہ کرتے تھے اس کو تم نے بلند آواز سے ان کے کانوں تک پہنچا دیا۔"

آپؓ تمام اہم جنگوں میں شریک رہے۔ بدر کا معرکہ ہو یا اُحد کا میدان، غزوۂ خندق ہو یا حدیبیہ کا مرحلہ، غزوۂ خیبر یا فتح مکہ تمام مواقع پر حضور ﷺ کے شانہ بہ شانہ دادِ شجاعت دی۔ مکہ سے واپسی پر غزوۂ حنین پیش آیا۔ حضرت عبداللہؓ خود فرماتے ہیں کہ مشرکین نے اس طرح حملہ کیا کہ مسلمان منتشر ہو گئے۔ دس ہزار سے میں سے صرف ۸۰ اصحاب، رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم لوگ تقریباً ۸۰ قدم تک پسپا ہوئے، لیکن پھر ہم نے قدم جما لیے۔ حضور ﷺ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتے، لیکن وہ پیچھے ہٹتا۔ اس حالت میں ایک بار آپ ﷺ ذرا جھکے تو میں نے پکار کر کہا "آپ ﷺ سربلند رہیں اللہ نے آپؐ کو رفعت بخشی ہے۔" رسول اللہؐ نے مجھے حکم دیا، "مجھے ایک مٹھی خاک اٹھا کر دو۔" میں نے خاک اٹھا کر دی۔ آپ ﷺ نے وہ خاک دشمنوں کی طرف پھینک دی۔ پھر فرمایا، "مہاجرین و انصار کہاں ہیں؟" میں نے اشارے سے بتایا تو حکم ہوا، "انہیں آواز دے کر بلاؤ۔" میں نے چیخ کر مہاجرین و انصار کو بلایا تو یکایک سب پلٹ پڑے اور مشرکین پر ٹوٹ پڑے۔ ذرا دیر میں پانسہ پلٹ گیا اور مشرکین کو بھاگتے ہی بنی۔

غزوۂ تبوک کے زمانے میں مسلمانوں کا لشکر راستے میں ایک جگہ ٹھہر گیا۔ حضور ﷺ کے لیے مسواک کا اہتمام کرنا بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ذمے تھا، چنانچہ وہ مسواک کاٹنے کے لیے پیلو کے درخت پر چڑھ گئے۔ آپؓ کی ٹانگیں نہایت دبلی پتلی تھیں۔ لوگوں نے دیکھا تو

Marfat.com

ہنس پڑے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیوں ہنس رہے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہؓ کی پتلی ٹانگیں دیکھ کر ہنسی آگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، "یہ ٹانگیں جو تمہیں اس وقت انتہائی کمزور اور ہلکی دکھائی دے رہی ہیں قیامت کے روز میزان میں احد کے پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہوں گی۔"

کوفے میں آپؓ بحیثیت قاضی اور افسر بیت المال دس سال تک مقیم رہے۔ اس دوران گورنر تبدیل ہوئے، لیکن آپؓ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔ کوفے کی وسعت اور موصول ہونے والے محصولات کی کثرت کے اعتبار سے یہاں کا بیت المال بہت اہمیت کا حامل تھا۔ یہ فوجی مرکز تھا۔ ہزاروں سپاہیوں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ لاکھوں کے وظائف جاری ہوتے تھے۔ خراسان، ترکستان اور آرمینیا پر فوج کشی کے مصارف ادا کیے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نہایت محنت اور توجہ کے ساتھ اس گراں بار ذمے داری کو نبھایا۔

ایک بار کوفہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو نماز کے لیے پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انتظار نہیں کیا اور نماز پڑھا دی۔ ولید ناراض ہوئے اور انہوں نے پیغام بھجوایا، "آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کیا یہ امیر المومنین کا حکم ہے یا آپؓ کی اپنی ایجاد ہے؟" جواب ملا، "نہ تو امیر المومنین کا حکم ہے، نہ اپنی ایجاد، البتہ اللہ کو یہ ناپسند ہے کہ آپ اپنے مشاغل میں مصروف رہیں اور لوگ نماز کے لیے آپ کے منتظر رہیں۔"

حضرت تمیم بن حرامؒ فرماتے ہیں، "مجھے اکثر اصحابِ رسولؐ کی ہم نشینی کا فخر حاصل ہے۔ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ کسی کو دنیا سے بے خبر اور آخرت کا طالب نہیں دیکھا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نہایت سادہ مزاج تھے۔ بالعموم سفید رنگ کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ ایک انگلی میں لوہے کی انگوٹھی پہنتے تھے جو غالباً مہر لگانے کے کام آتی تھی۔ خضاب نہ لگاتے تھے اور عطر کا متواتر استعمال کرتے تھے۔

آپؓ نہایت رحم دل واقع ہوئے تھے، لیکن جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام پر عمل کرنے کا معاملہ درپیش ہوتا، وہاں کسی رعایت سے کام نہ لیتے۔ ایک بار عدالت میں کسی شخص نے اپنے بھتیجے کو شراب نوشی کے الزام میں پیش کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تحقیقات کروائی تو الزام درست ثابت ہوا، آپؓ نے مجرم کو سزا دینے کا حکم دیا۔ جب کوڑے پڑنے لگے تو وہی شخص جو اپنے بھتیجے کو عدالت میں پکڑ لایا تھا، اب آپؓ کی منت سماجت کرنے لگا کہ اسے چھوڑ دیجیے۔ اس سے اپنے بھتیجے کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس بات پر ناراض ہو کر فرمایا، "تم بے حد ظالم چچا ہو، پہلے اسے حدِ شرعی کا مستحق ثابت کروایا اور اب چھوڑ دینے کی سفارش کر رہے ہو، یہ ممکن نہیں۔"

سنہ ۳۲ھ میں آپؓ کی عمر ۶۰ سال سے زائد ہو چکی تھی۔ ایک شخص آپؓ کے پاس آیا کہنے لگا، اللہ مجھے آپ کی آخری زیارت سے محروم نہ رکھے میں نے کل رات خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ ایک بلند منبر پر تشریف فرما ہیں اور آپ ان کے سامنے حاضر ہیں۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں "ابنِ مسعود میرے بعد تمہیں بہت تکلیفیں پہنچائی گئی ہیں، آؤ میرے پاس چلے آؤ۔"

حضرت عبداللہؓ نے دریافت کیا، "اللہ کی قسم تم نے یہ خواب دیکھا ہے؟" کہنے لگا، "جی ہاں۔" فرمایا، "تم میرے جنازے میں شریک ہو کر ہی مدینہ سے کہیں جاؤ گے۔"

چند دنوں بعد آپؓ علیل ہو گئے اور یہی علالت آپؓ کے سفر آخرت کا پیغام لے کر آئی۔ حضرت عثمانؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں صحابی رسولؐ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے پہلو میں آپؓ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

•••

Marfat.com

حضرت بلال رضی اللہ عنہ

آپؓ کو اسلام کا پہلا موذن ہونے کا شرف حاصل ہے

صبح صادق کے دھندلکے میں، روشن اور گرم دوپہر میں، گھماگھمی سے بھرپور سہ پہر میں، سرمئی شام میں اور پھر رات کی تاریکی میں، روزانہ، دنیا کے گوشے گوشے میں ایک آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ آواز، ۱۴ صدیوں سے اسی تسلسل کے ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ ہر دور میں اس آواز نے یکساں کلمات ادا کیے ہیں۔ ان کلمات میں ذرہ برابر بھی تو تغیر نہیں آیا!

یہ کلمات اس دین کے ماننے والوں کا سرمایہ افتخار ہیں، جسے لے کر ایک نبی امی ﷺ، فاران کی سرزمین پر اترا۔ ان کلمات میں جادو ہے، جو دلوں کو اسیر کرلیتا ہے، ان کلمات میں وہ رعب و جلال ہے جو بڑے بڑے جابروں کا پتاپانی کر دیتا ہے۔

اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے

رُوئے زمین پر سب سے پہلے ان کلمات کو بلند کرنے کی سعادت جس شخص کے حصے میں آئی، وہ نہ تو بے حد دولت مند تھا، نہ ہی بہت بااثر اور نہ اس کے حسن و جمال نے لوگوں کو متوجہ کیا تھا بلکہ وہ ایک حبشی النسل غلام تھا۔ جس کی رنگت سیاہ تھی، آنکھیں سرخ اور ہونٹ موٹے تھے، لیکن اس کا دل نہایت حسین تھا۔

حسین دل والے یہ غلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے عزت و شرف کی بلندیوں پر فائز کیا، حضرت بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ آپؓ کو نہ صرف دنیا کا پہلا موذن ہونے کا اعزاز حاصل ہے، بلکہ آپؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص بھی تھے۔ آپؓ کی خوش نصیبی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے آپؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"بلالؓ کس قدر اچھا آدمی ہے، وہ تمام موذنوں کا سردار ہے۔"

حضرت بلالؓ کے والد رباح اور والدہ حمامہ قبیلہ بنو جمح کے غلام تھے۔ یہ سرزمین عرب کا وہ تاریک دور تھا جب انسان اخلاقی پستیوں کی گہرائیوں میں جاگرا تھا اور اس پر گمراہی مسلط تھی۔ اس دور میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ غلاموں کا تھا، جسے بنیادی انسانی حقوق ملنا تو دُور کی بات، چین سے جینے کا حق بھی حاصل نہ تھا۔

رب کائنات نے جب اپنے پسندیدہ بندے ﷺ کو نور نبوت سے آراستہ کیا تو حضرت بلالؓ کی عمر تقریباً ۲۸ سال تھی۔ آپؓ اپنے آقا امیہ بن خلف کی بکریاں، چرانے کے لیے پہاڑوں میں لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپؓ کا گزر غارِ حرا کی طرف ہوا جہاں رسول کریم ﷺ اپنے عزیز ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک حبشی نوجوان کو بکریاں لے جاتے دیکھا تو اسے بلایا اور فرمایا، "میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری اسلام کے متعلق کیا رائے ہے؟"

حضرت بلالؓ رسول اقدس ﷺ کی پُر شکوہ شخصیت سے حد درجہ متاثر ہوچکے تھے، پھر حضور ﷺ کا دل نشیں انداز گفتگو! بلالؓ کے منہ سے نکلا "میں آپؐ کے دین کو اچھا پاتا ہوں۔"

حضرت بلالؓ واپس لوٹ گئے، لیکن دل حضور ﷺ کی طرف لگا رہا۔ دوسرے روز پھر بکریاں لے کر وہیں پہنچ گئے۔ نبی کریمؐ کی سادہ اور پُراثر باتیں سنیں تو دل بے قرار ہوگیا، جو سچائی آپؓ کے قلب میں قدرت نے پہلے ہی ودیعت کر دی تھی وہ دین اسلام کی صورت میں آپؓ کے سامنے آگئی تھی۔ آپؓ نے اسلام کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ آپؓ ان پہلے سات خوش نصیب افراد میں سے ہیں جن کے لیے اسلام نے اپنے دروازے کھول دیے۔

یہ اسلام کا دورِ اوّلین تھا۔ حضور اکرم ﷺ، اللہ کے حکم سے فی الحال تبلیغ دین، راز داری کے ساتھ فرمارہے تھے، لیکن اسلام کا جو

Marfat.com

منفرد اور پاکیزہ رنگ ہے، وہ زیادہ عرصے تک کفار مکہ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہوں نے جلد ہی چوکنا ہو کر دیکھنا شروع کیا کہ ان کے بعض ساتھیوں میں، خواتین میں، غلاموں میں ایک تبدیلی سی آگئی ہے۔

اُمیہ بن خلف کو بھی بہت جلد خبر مل گئی کہ اس کا غلام بلال بن رباحؓ، محمد ﷺ کے ساتھیوں میں شامل ہوگیا ہے۔ غلام اور اس کی یہ مجال کہ آقا کے دین سے رُوگردانی کرے۔ امیہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے بلالؓ کو طلب کیا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیے۔ اب اذیتوں اور تکالیف کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

مکہ مکرمہ کے علاقے حرّہ کی زمین اپنی گرمی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ دھوپ میں تانبے کی طرح گرم ہو جاتی ہے۔ اُمیہ نے حضرت بلالؓ کو حرّہ کی اسی زمین پر لٹا دیا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا، لیکن حضرت بلالؓ کی زبان سے "اَحد اَحد" کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ اُمیہ نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں بنا تو اس نے مردہ جانور کی کھال لی اور حضرت بلالؓ کو اس میں لپیٹ کر سی دیا اور پھر تپتی دھوپ میں ڈال دیا۔ گرمی کی شدت سے کھال سوکھ گئی اور اس نے حضرت بلالؓ کے جسم کو جکڑ لیا، لیکن آپؓ بدستور خدائے واحد کا کلمہ بلند کرتے رہے۔ آپؓ کو دہکتے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ امیہ کہتا، "بلالؓ اب بھی محمد کے خدا سے باز آجا" لیکن جواب وہی تھا، "اَحد۔۔۔اَحد۔"

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں، "میں نے حضرت بلالؓ کو اس حالت میں دیکھا کہ اُمیہ نے ان کو ایسی تپتی ہوئی زمین پر لٹا رکھا تھا کہ جس پر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ گل جاتا، لیکن حضرت بلالؓ اس حالت میں بھی اللہ کے سوا دوسرے کسی معبود کا انکار کرتے تھے۔"

اُمیہ کے طیش کا عالم دیدنی تھا، اس نے حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی باندھ دی اور مکہ کے شریر لڑکوں کے حوالے کر دیا۔ لڑکے آپؓ کو مکہ کی گھاٹیوں میں گھسیٹتے پھرتے، پھر جلتی ریت پر لا کر اوندھے منہ ڈال دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ اسلام کے اس سچے عاشقؓ کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو شدید زخمی نہ ہو چکا ہو۔

تشدد کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ حضرت ابوبکرؓ قبیلہ بنو جمح کے محلے میں ہی رہائش پذیر تھے۔ وہ آتے جاتے حضرت بلالؓ پر ظلم ہوتا دیکھتے۔ ایک دن ان سے رہا نہ گیا۔ وہ امیہ کے پاس گئے اور اس سے کہا "امیہ! اس بے گناہ اور بے کس غلام پر اتنا ظلم تو نہ کرو، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کرتا ہے۔ اگر تم اس پر احسان کرو تو یہ احسان آخرت کے دن تمہارے کام آئے گا۔" اُمیہ نے حقارت سے کہا، "میں تمہارے خیالی یومِ آخرت کا قائل نہیں۔ میرے جو جی میں آیا کروں گا۔" حضرت ابوبکرؓ تحمل کے ساتھ اسے سمجھاتے رہے کہ "دیکھو تم طاقتور ہو، اس مجبور غلام پر ظلم و ستم کرنا تمہارے شایانِ شان نہیں، اس طرح عربوں کی قومی روایات کو بٹّا نہ لگاؤ۔" اُمیہ نے کہا، "اگر تم اس غلام کے اتنے ہی ہمدرد ہو تو اسے خرید کیوں نہیں لیتے؟"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "بولو کیا لوگے؟"

اُمیہ بولا "تم اپنا غلام فسطاس رومی مجھے دے دو اور اسے لے جاؤ۔"

فسطاس بڑے کام کا غلام تھا اور اُمیہ کا خیال تھا کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت بلالؓ جیسے کمزور غلام کے بدلے اتنا صحت مند اور کارآمد غلام دینے پر رضامند نہیں ہوں گے، لیکن حضرت ابوبکرؓ فوراً بولے، "مجھے منظور ہے۔" اُمیہ حیران رہ گیا، تاہم اس نے ایک شرط اور لگادی۔ بولا: "فسطاس کے ساتھ چالیس اوقیہ چاندی بھی لوں گا۔" (ایک اوقیہ = ڈھائی تولے) حضرت ابوبکرؓ اس پر بھی راضی ہوگئے۔ جب وہ حضرت بلالؓ کو لے کر چلنے لگے تو اُمیہ ہنس کر کہنے لگا، "ابوقحافہ! تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس غلام کو درہم کے چھٹے حصے کے عوض بھی نہ خریدتا۔" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "اُمیہ تم اس غلام کی قدر و قیمت سے واقف نہیں، مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کی قیمت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔" یہ کہا اور حضرت بلالؓ کو آزاد کر دیا۔

رسول پاک ﷺ کو خبر ملی تو آپ ﷺ نے نہایت مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا، "مجھے بھی اس میں شریک کرلو" حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی، "یارسول اللہ ﷺ! میں اللہ کی راہ میں بلال کو آزاد کر چکا ہوں۔"

اب حضرت بلالؓ آزاد تھے۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت رسول اقدس ﷺ کی خدمت میں گزارتے۔ آپ ﷺ سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے، حکمت و دانائی کی باتیں سیکھتے اور دین اسلام کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتے۔

ہجرت کا حکم ہوا تو بلالؓ بھی مکہ سے مدینہ پہنچے۔ رسول کریم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کا بھائی چارہ کروادیا تھا۔ حضرت بلالؓ

Marfat.com

کو حضرت ابو رویحہؓ کا بھائی بنایا گیا۔ حضرت بلالؓ کو حضرت ابو رویحہؓ سے اس قدر محبت ہوگئی کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں حضرت بلالؓ جہاد پر جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا، "بلالؓ! آپ کا وظیفہ کون وصول کرے گا؟" جواب ملا، "ابو رویحہ! کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہم میں جو برادرانہ تعلق قائم کر دیا ہے وہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔"

مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈال دی گئی تو ایک سال بعد یہ سوال اٹھا کہ نماز باجماعت کے لیے لوگوں کو کس طرح اکٹھا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا، ہر نماز کے وقت ایک پرچم بلند کر دیا جائے۔ کچھ نے کہا ناقوس بجایا جائے۔ کچھ لوگ کہنے لگے، آگ روشن کی جائے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ نماز کے لیے آجائیں۔ کچھ کا مشورہ یہ تھا کہ ایک شخص جا کر لوگوں کے گھروں پر اطلاع دے آیا کرے۔ رسول کریم ﷺ نے ان طریقوں کو پسند نہیں فرمایا۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے، مجھے خواب میں ایک شخص نے اذان کے کلمات سکھائے ہیں۔ انہوں نے وہ کلمات دہرائے۔ حضورؐ نے وحی الٰہی کے مطابق ان کلمات کو پسند فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی اپنا خواب بیان کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تم اذان دو۔ آپ ﷺ نے انہیں اذان کے کلمات سکھائے اور ہدایت کی کہ دونوں کانوں میں انگلیاں دے کر اذان دو تاکہ تمہاری آواز بلند ہو اور دور تک پہنچے۔ مدینہ کی فضاؤں میں نغمۂ توحید گونج اٹھا اور حضرت بلالؓ کو اسلام کے پہلے مؤذن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت بلالؓ کی آواز میں وہ لحن تھا کہ جو آپؓ کی اذان سنتا، مسحور ہو کر رہ جاتا۔ جب نمازی آجاتے تو آپؓ حضور ﷺ کے دروازے پر جا کر نہایت ادب سے کہتے "اے اللہ کے رسول ﷺ! نماز تیار ہے۔"

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو اس کے ایک سرے پر ایک چبوترہ بنا کر اس پر چھت ڈال دی گئی۔ اس چبوترے پر نبی کریم ﷺ کے وہ صحابۂ کرامؓ رہنے لگے جو تمام وقت رسول پاک ﷺ کی خدمت میں رہنا چاہتے تھے اور علم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان اصحاب کو "اصحابِ صُفّہ" کہا جانے لگا، (عربی میں چبوترے کو 'صُفّہ' کہتے ہیں)۔ حضرت بلالؓ بھی ان ہی اصحابِ صفہ میں سے تھے۔

حضرت بلالؓ تمام مشہور غزوات میں شریک تھے۔ غزوۂ بدر میں آپ نے امیہ بن خلف کو ہلاک کیا جو اسلام کا بہت بڑا دشمن تھا۔ حضرت بلالؓ فتح مکہ میں بھی آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھے۔ حضور ﷺ خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دینے کا حکم فرمایا۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ نے خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ سے درخواست کی کہ میں راہِ خدا میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔

حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو حضرت بلالؓ نے جہاد کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمرؓ نے بھی روکا، لیکن آپؓ کے اصرار پر اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت بلالؓ شام کی جنگوں میں شرکت کے لیے روانہ ہوگئے، بیت المقدس کی فتح میں شریک تھے۔ ۱۶ھ/۶۳۷ء میں جب حضرت عمرؓ شام گئے تو جابیہ میں حضرت بلالؓ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا "اے ہمارے سردار بلالؓ، اسلام کے قبلۂ اول پر توحید کا پرچم لہرایا ہے۔ اس باعظمت موقع پر آپؓ اذان دیں تو ہم آپؓ کے شکر گزار ہوں گے۔"

حضرت بلالؓ نے اذان دی، برسوں بعد وہی آواز بلند ہوئی جو مدینے کے گلی کوچوں میں سنائی دیتی تھی تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا بھی یہی حال تھا۔

حضرت بلالؓ نے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ انہیں اور حضرت ابو رویحہؓ کو شام میں مستقل رہائش کی اجازت دے دی جائے۔ اس موقع پر وہ حضرت ابو رویحہؓ کو نہ بھولے تھے، جنہیں ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کا بھائی بنا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ درخواست قبول کر لی۔

ایک دن حضرت بلالؓ نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں، "بلال! یہ خشک زندگی کب تک؟ کیا تمہارے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ہماری زیارت کرو۔" یہ خواب دیکھنا تھا کہ حضرت بلالؓ تڑپ اٹھے، فوراً مدینہ روانہ ہوگئے۔ روضۂ رسول ﷺ پر پہنچے تو آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ رسول پاک ﷺ کے نواسوں، حسنؓ اور حسینؓ کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ دونوں نے اذان کی

Marfat.com

فرمائش کی۔ آپؓ یہ فرمائش ٹال نہ سکے۔ مسجد نبوی سے جب روح پرور اذانِ بلالی بلند ہوئی تو عورتیں تک بے قرار ہو کر گھروں سے نکل آئیں۔

کچھ عرصے بعد حضرت بلالؓ اپنے پیارے نبی ﷺ کے شہر سے رخصت ہوئے اور واپس شام چلے گئے۔ ۲۰ھ / ۶۴۱ء میں آپؓ نے اپنا سفرِ حیات مکمل کر لیا۔ آپؓ کو دمشق میں باب الصغیر کے قریب دفن کیا گیا۔ آپؓ کی وفات کی خبر حضرت عمرؓ تک پہنچی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ بار بار کہتے تھے کہ "آہ ہمارا سردار بلال بھی ہمیں داغِ جدائی دے گیا۔"

حضرت بلالؓ کو صحیح معنوں میں حضور اقدس ﷺ کے معتمد (سیکریٹری) کا درجہ حاصل تھا۔ سفر ہو یا قیام، دکھ سکھ، امن، جنگ غرض ہر حالت میں آپؓ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے۔ رسول کریم ﷺ بھی آپؓ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ آپؓ، حضور ﷺ کے گھر کے کاموں سے لے کر امورِ مملکت تک کو سنبھالتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر کا سودا سلف لے آتے، قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کے انتظامات کرتے۔ حضور ﷺ کے مہمانوں کے آرام کا خیال رکھتے۔ رسول پاک ﷺ کو نمازوں کے اوقات اور جماعت کی تیاری کی اطلاع کرتے تھے۔

حضور ﷺ کے وضو کے پانی کا انتظام بھی حضرت بلالؓ ہی کے سپرد تھا۔ ایک بار آپؓ حضور ﷺ کے لیے وضو کا پانی لائے۔ حضور ﷺ کے وضو کر لینے کے بعد بچے ہوئے پانی سے حضرت بلالؓ نے وضو کر لیا۔

میدان میں نماز ہوتی تو حضور ﷺ کے آگے "سُترہ" کے طور پر نیزہ رکھنے کا فریضہ بھی حضرت بلالؓ انجام دیتے تھے۔ "سُترہ" کا مطلب یہ ہے کہ نماز باجماعت کے دوران امام کے آگے کوئی لکڑی یا نیزہ گاڑ دیا جاتا ہے، جس کے بعد دیگر افراد کو اگر جماعت کے سامنے سے گزرنا پڑے تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ خاص خاص مواقع پر حضرت بلالؓ ہی نیزہ لے کر حضور ﷺ کے آگے آگے چلا کرتے تھے۔

آپؓ، حضور ﷺ کے خزانچی بھی تھے۔ آپؓ کے پاس ہر وقت رقم موجود رہتی تھی اور آپؓ حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق مختلف لوگوں کو رقم ادا کیا کرتے تھے۔ آپؓ، حضور ﷺ کے حکم سے مختلف اعلانات بھی کیا کرتے تھے۔ غزوۂ حمراً الاسد اور غزوۂ بنو قریظہ کے موقعوں پر آپؓ ہی نے حضور ﷺ کی ہدایت پر مسلم مجاہدین کو حضور ﷺ کے اس حکم سے آگاہ کیا تھا کہ وہ آخری وقت تک لڑیں۔

غزوات کے بعد حضور ﷺ کے کہنے پر حضرت بلالؓ ہی مالِ غنیمت تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپؓ پہلے منادی کرتے تو لوگ اپنا اپنا مال پہنچا دیتے۔ حضور ﷺ اس مال غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کروانے کے بعد چار حصے مجاہدین میں تقسیم کروا دیتے۔ ایک حصّہ حکومت کے خزانے میں جمع کر دیا جاتا۔

ایک بار نمازِ عید ختم ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کے سہارے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، پھر آپؐ عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں نصیحتیں کیں۔ جب آپ ﷺ نے عورتوں کو صدقے کا حکم دیا تو یہ حضرت بلالؓ ہی تھے جنہوں نے چادر پھیلا دی اور عورتیں اپنے گلے اور کان سے زیور اُتار اُتار کر چادر میں ڈالنے لگیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ ۸ ذی الحجہ ۱۰ھ / ۲۹ مارچ ۶۳۰ء کو منیٰ کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت بلالؓ، آپ ﷺ پر کپڑے سے سایہ کیے ہوئے تھے، جب مدینے کو واپسی ہوئی تو حضور ﷺ کی اونٹنی کی مہار حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں تھی۔

یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صدق دل سے لایا گیا ایمان ہی تھا جو آلام و مصائب اور اذیتوں کے سمندر سے نکلا تو اس کی آب و تاب پہلے سے سوا تھی، اور ایسے ہی ایمان کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کرنے والے بندے کا درجہ اللہ رب العزت کے نزدیک بے حد بلند ہے۔

•••

Marfat.com

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

عظیم مسلمان جرنیل جن کے ہاتھوں ایران کی فتح عمل میں آئی

وہ نوجوان بہت پریشان تھا!

پریشانی کوئی معمولی نہ تھی۔ نوجوان کی ماں اس سے ناراض ہو گئی تھیں، انہوں نے کھانا پینا، بات چیت سب بند کر دی تھی، ماں کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان نے ایک نیا مذہب، اسلام قبول کر لیا تھا۔

تین دن ہونے کو آئے تھے اور ماں نے نہ کوئی چیز کھائی تھی، نہ پانی پیا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بیٹا جب تک اسلام ترک نہ کرے گا، میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، نہ اس سے بات کروں گی۔

نوجوان کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ ماں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں۔ ماں ہے ہی ایسی پیاری ہستی! اپنی اولاد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی! نوجوان کو اس بات کا دکھ تھا کہ ماں اس کی بات سمجھ نہیں رہی ہیں، لیکن وہ اسلام کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسلام کیا تھا، ایک نشہ تھا جو اس کی رگ و پے میں سما گیا تھا!

آخر نوجوان اپنی ماں کے پاس گیا اور کہنے لگا، "ماں! آپ مجھے بے حد عزیز ہیں لیکن آپ کے قالب میں خواہ ہزار جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے ہر جان نکل جائے تب بھی میں اسلام نہیں چھوڑوں گا۔"

بیٹے کے منہ سے یہ بات سن کر ماں حیران رہ گئیں، لیکن جب بیٹے نے اسلام کی باتیں دلنشیں انداز میں بیان کرنی شروع کیں تو ماں کا دل پگھل گیا، دینِ اسلام کی کشش انہیں بھی کھینچ لے گئی اور وہ بھی دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئیں۔

اسلام کے عشق سے سرشار یہ نوجوان تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قابلِ رشک دس صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنھیں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کی خوش خبری سنا دی تھی۔ ان صحابہ کرامؓ کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔

آپؓ کا نام سعد اور کنیت ابو اسحاق ہے جو آپؓ کے بڑے صاحب زادے اسحاق کے نام پر رکھی گئی ہے۔ آپؓ کو سعد بن ابی وقاصؓ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپؓ کے والد محترم مالک بن وہیب کی کنیت ابو وقاص ہے۔ آپؓ کا تعلق قبیلہ بنو زہرہ سے ہے اور آپؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ بھی قبیلہ بنو زہرہ سے تھیں اور حضرت سعدؓ کے والد ابو وقاص کی چچا زاد بہن تھیں۔ اس لحاظ سے ابو وقاص رشتہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہوتے تھے اور حضرت سعدؓ ماموں زاد بھائی۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر سرفراز کیا تو حضرت سعدؓ اپنی عمر عزیز کی سترہ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ رسولِ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حضرت سعدؓ کی اچھی دوستی تھی۔ حضرت سعدؓ نے جب نئے مذہب اسلام کا ذکر سنا تو اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ دل نے حق کی پکار پر لبیک کہا اور آپؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آپؓ کا شمار اسلام قبول کرنے والے پہلے سات خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے۔

نبوت کے ابتدائی دور میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام ظاہر نہ کرنے کا حکم تھا تو حضرت سعدؓ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی قریبی پہاڑیوں یا سنسان گھاٹیوں میں نکل جاتے اور وہاں چھپ کر نماز ادا کرتے۔ ایک دن چند مشرکین اس طرف آ نکلے۔ انہوں نے جو ایک نامانوس طریقۂ عبادت کو دیکھا تو لگے چھیڑ چھاڑ کرنے۔ حضرت سعدؓ نوجوان تھے۔ خون جوش میں آ گیا۔ قریب ہی اونٹ کی ہڈی پڑی ہوئی تھی آپؓ نے وہ اٹھالی اور ایک مشرک پر حملہ کر دیا۔ ہڈی کی ضرب سے مشرک کا سر پھٹ گیا اور اور خون بہنے لگا۔ حضرت سعدؓ وہ پہلے مسلمان ہیں جن کے ہاتھ سے اسلام کی حمایت میں کسی کا خون بہا۔

Marfat.com

حضرت سعدؓ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ اور ان کے اہلِ خاندان کو کفار نے تین سال تک، شعب ابی طالب کی گھاٹی میں محصور کر دیا تو حضرت سعدؓ بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ یہ تین سال بڑے کٹھن تھے۔ کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے پیے گزر جاتے تھے۔ حضرت سعدؓ خود فرماتے ہیں کہ شعب ابی طالب میں ایک دفعہ رات کو مجھے سوکھے چمڑے کا ایک ٹکڑا مل گیا، اسے میں نے پانی سے دھویا، آگ پر بھونا، کوٹ کر پانی میں گھولا اور ستو کی طرح پی لیا۔

ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت سعدؓ بھی اپنے بھائی عمیرؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے جس کا نام ان دنوں یثرب تھا۔ یثرب میں آپؓ اپنے بڑے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کے مکان میں ٹھہر گئے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

مدینہ طیبہ میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو چاروں طرف سے خطرات منڈلاتے رہتے تھے۔ حضور ﷺ ان خطرات کے پیشِ نظر مسلح دستے، دشمن کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔ ان مہمات کو سَرِیَہ کہتے ہیں۔ ایک سَرِیَہ میں، جس کی قیادت حضرت عبیدہ بن حارثؓ کر رہے تھے، قریش کے ایک قافلے سے مڈبھیڑ ہوئی۔ باقاعدہ لڑائی تو نہ ہوئی البتہ مخالف سمت سے کسی نے نعرہ مارا تو حضرت سعدؓ نے قریش کی سمت ایک تیر چلا ہی دیا۔ آپؓ خود فرماتے ہیں کہ "میں پہلا عرب ہوں جس نے اللہ کی راہ میں تیر چلایا۔"

رمضان ۲ھ / مارچ ۶۲۴ء میں غزوۂ بدر کا معرکہ ہوا۔ اس معرکے میں حصہ لینے والے ۳۱۳ جانبازوں میں حضرت سعدؓ بھی شامل تھے۔ لڑائی شروع ہوئی۔ حضرت سعدؓ انتہائی جوانمردی سے تلوار چلاتے ہوئے کفار کے ایک سردار سعید بن العاص تک جا پہنچے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپؓ نے سعید بن العاص کی مشہور تلوار "ذوالکتیفہ" پر قبضہ کر لیا۔ جنگ ختم ہوئی تو آپؓ یہ تلوار لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تلوار جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دو"۔ حضور ﷺ نے یہ حکم اس لیے دیا کہ اس وقت تک مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ غزوۂ بدر میں حضرت سعدؓ کے چھوٹے بھائی عمیرؓ شہید ہو گئے تھے۔ حضرت سعدؓ کو ان سے بچھڑنے کا صدمہ تو تھا ہی پھر سعید بن العاص کی تلوار نہ ملنے کا بھی افسوس ہو رہا تھا، لیکن آپؓ نے سعید کی تلوار فوراً رکھ دی۔ کچھ ہی دیر بعد سورۂ انفال نازل ہوئی جس میں مالِ غنیمت کے بارے میں احکام تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ کو بلایا اور فرمایا، "جاؤ اپنی تلوار لے لو۔"

صرف ایک سال بعد یعنی ۳ھ میں، اپنے زخم چاٹتے ہوئے قریش پھر مقابلے پر نکلے۔ میدانِ اُحد میں اسلام اور کفر کے لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی غلطی سے پانسہ پلٹ گیا اور اسلامی فوج منتشر ہونے لگی۔ اس نازک موقع پر یہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے جو چند دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ حضور ﷺ کی حفاظت کے لیے ڈٹ گئے۔ آپؓ نہایت جرأت کے ساتھ تیر برسائے جا رہے تھے۔ آپؓ کے عزم و استقلال اور شجاعت کو دیکھ کر سرورِ کائنات ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا "اے سعدؓ تیر چلا، میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔" کیا مرتبہ ہے اس شخص کا جس کے لیے دونوں جہانوں کے سردار ﷺ کہیں کہ "میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں!" حضرت علیؓ فرماتے ہیں، "میں نے سعدؓ کے سوا کسی اور کے حق میں ایسے الفاظ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نہیں سنے۔"

چاروں طرف سے کفار یورش کر رہے تھے، حضرت سعدؓ تیر چلا رہے تھے، رسول مقبول ﷺ نے تیر اٹھا کر فرش پر ڈال دیے اور ایک ایک تیر اٹھا کر حضرت سعدؓ کو دینے لگے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے "اے سعدؓ تیر چلا، میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔" ایک تیر ایسا تھا جس میں اَنی (نوک) نہیں تھی حضرت سعدؓ نے عرض کی۔ "اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو خالی ہے"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اسے بھی چلاؤ۔"

اسی معرکہ اُحد کا ذکر ہے، ایک مشرک مسلمانوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہا تھا، حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ کو حکم دیا کہ اس پر حملہ کرو۔ ترکش میں کوئی تیر نہیں بچا تھا، حضرت سعدؓ نے بغیر پھل کا تیر اٹھایا اور اس مہارت سے اس مشرک کی پیشانی پر مارا کہ وہ بدحواس ہو کر پیچھے گر پڑا۔ حضور ﷺ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔

بدر و اُحد کے بعد غزوۂ خندق کا مرحلہ آیا۔ یہاں بھی حضرت سعدؓ نے اپنی جانبازی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس غزوہ کا ایک واقعہ حضرت سعدؓ خود بیان فرماتے ہیں کہ "ایک کافر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خندق عبور کر گیا۔ اس نے زرہ پہن رکھی تھی اور سر پر خود تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جب وہ میرے تیر کی زد میں

Marfat.com

آگیا تو میں نے ایک تیر نکال کر کمان سے جوڑا، وہ یہ دیکھ کر ٹھہر گیا۔ وہ اپنی ڈھال کو ناک کے کبھی اُوپر کبھی نیچے کرتا رہا۔ جیسے ہی اس نے یہ حرکت بند کی میں نے کمان پر چڑھا ہوا تیر تاک کر اس کی آنکھ پر مارا۔ وہ گھوڑے سے گر کر تڑپنے لگا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ بے ساختہ مسکرا دیے۔"

احزاب، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف، تبوک، تمام غزوات میں حضرت سعدؓ حضور اکرم ﷺ کے شانہ بہ شانہ لڑے۔ ۱۰ھ میں رسول پاک ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو حضرت سعدؓ ہمراہ تھے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت سعدؓ شدید بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ عیادت کے لیے تشریف لائے تو حضرت سعدؓ نے عرض کی، اے اللہ کے رسولؐ! میرا، ایک بیٹی کے سوا کوئی وارث نہیں، مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کردوں، جواب ملا "نہیں۔" عرض کی، نصف ہی سہی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "نہیں۔" عرض کی، تو ایک تہائی مال صدقہ کرنے کی اجازت دے دیجیے۔" آپ ﷺ نے فرمایا، "ایک تہائی بھی بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑو گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہوں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ تم جو کچھ بھی اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے صرف کرو گے، اس کا اجر ملے گا یہاں تک کہ اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ ڈالتے ہو اس کا بھی ثواب پاؤ گے۔"

حضرت سعدؓ نے نہایت افسردہ ہو کر کہا، "اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے مکہ مکرمہ کی خاک نصیب ہو گی، حالاں کہ اس سرزمین کو راہِ حق میں ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکا ہوں۔" آنحضرتؐ نے انہیں دلاسا دیا اور اپنا دستِ مبارک حضرت سعدؓ کے چہرے، پیشانی سے لے کر شکم تک پھیر کر فرمایا، "اے اللہ! سعدؓ کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل فرما دے۔" پھر آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کو مزید تسلی دیتے ہوئے پیش گوئی فرمائی، "سعدؓ! تم اس وقت تک نہیں مرو گے، جب تک تم سے ایک قوم کو نقصان اور ایک کو فائدہ نہ پہنچ جائے"۔

رسول ﷺ کی دعا قبول ہوئی۔ حضرت سعدؓ صحت یاب ہونے لگے اور ٹھیک ہو کر مدینہ منورہ واپس چلے گئے۔ آپؓ کہتے تھے، "حضور ﷺ کے دستِ مبارک کی ٹھنڈک میں ہمیشہ اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔" بعد میں حضور ﷺ کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی اور حضرت سعدؓ کی قیادت میں لشکر اسلام نے پے در پے فتوحات حاصل کیں۔

ربیع الاول ۱۱ھ / جون ۶۳۲ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو واپس بلا لیا۔ رسول پاک ﷺ کے یارِ غار حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ بنے۔ حضرت سعدؓ نے فوراً حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت سعدؓ کو ہوازن کے علاقے کا افسر مقرر کیا۔ ۱۳ھ میں حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ پر بارِ خلافت ڈالا گیا۔

حضرت عمرؓ کے دور سے پہلے ہی مجوسی ایرانیوں سے مسلمانوں کی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا اور اب مجوسیوں پر کاری ضرب لگانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک بڑی فوج تشکیل دی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس فوج نے قادسیہ کے مقام پر وہ تاریخی جنگ لڑی جسے "جنگِ قادسیہ" کہا جاتا ہے اور جس میں کامیابی کے نتیجے میں پورا عراقِ عرب مفتوح ہوا اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتحِ ایران کہلائے جانے لگے۔ قادسیہ کا میدانِ جنگ موجودہ عراق کے شہر کوفہ سے تقریباً پینتالیس (۴۵) میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

جنگ قادسیہ میں حضرت سعدؓ ایک شدید مرض کی وجہ سے خود تو شریک نہ ہو سکے، البتہ آپؓ میدان جنگ کے قریب ہی ایک عمارت کی بالائی منزل سے سارا منظر دیکھتے رہے اور پرچوں پر ہدایات لکھ لکھ کر اپنے نائب حضرت خالد بن عرفطہؓ کے لیے پھینکتے رہے۔

ربِ ذوالجلال نے اپنے دین کو غالب فرمایا اور دو لاکھ مجوسی ایرانیوں کے مقابلے میں تیس ہزار مسلمانوں کو فتح مبین سے سرفراز کیا۔ قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل تک ایرانیوں کا تعاقب کیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی بے مثل شجاعت سے راستے میں آباد سردار اس قدر مرعوب ہو چکے تھے کہ انہوں نے خود ہی صلح کر لی اور مسلمانوں کی آسانی کے لیے جگہ جگہ پل تیار کر دیے۔

حضرت سعدؓ نے بابل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اپنے ایک افسر زہرہ کی قیادت میں فوج آگے روانہ کر دی جس نے ایک تاریخی مقام کوثیٰ پر قبضہ کر لیا۔ حضرت ابراہیمؑ کوثیٰ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ظالم بادشاہ نمرود کے حکم پر حضرت ابراہیمؑ کو اسی مقام پر آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اب حضرت سعدؓ کوثیٰ سے آگے بڑھے، بہرسیر پہنچے، یہ مدائن کی

Marfat.com

سات بستیوں میں سے ایک تھا۔ عرب اس کو بَہرَسِیر کہتے تھے۔ یہاں کسریٰ کا شکاری شیر رہتا تھا۔ حضرت سعدؓ کا لشکر جوں ہی اس شہر میں پہنچا، شیر مقابلے کے لیے چھوڑا گیا۔ شیر نے جست لگائی، حضرت سعدؓ کے بھتیجے ہاشم نے جو، ہراول دستے کے افسر تھے، اس صفائی سے تلوار ماری کہ شیر فضا میں ہی کٹ کر ڈھیر ہو گیا۔ حضرت سعدؓ اس بات سے اس قدر خوش ہوئے کہ آپؓ نے بے اختیار اپنے بھتیجے کی پیشانی چوم لی۔ بہرسیر کے دو ماہ محاصرے کے بعد ایرانی فوج خود باہر نکلی، لیکن مسلمانوں کے آگے ٹھہر نہ سکی اور شکست سے دوچار ہوئی۔

اب بہرسیر اور دارالسلطنت مدائن کے درمیان صرف دریائے دجلہ حائل تھا۔ ایرانیوں نے دجلہ پر بنے تمام پل توڑ دیے تھے تاکہ مسلمانوں کا لشکر دریا عبور نہ کر سکے۔ بارش کے باعث دریا میں طغیانی آئی ہوتی تھی اور ایرانی یہ سوچنے میں یقیناً حق بجانب تھے کہ مسلمان دریا کو کسی طرح عبور نہ کر سکیں گے، لیکن اس کائنات کے خالق پر سچا یقین اور توکل رکھنے والے صحابیِ رسولؐ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے لشکر کو للکارا اور اللہ کا نام لے کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ امیر لشکر کا پانی میں اترنا تھا کہ سارا لشکر دریا کی شوریدہ سر موجوں سے لڑتا ہوا پانی میں اتر پڑا۔ ایرانیوں نے جب یہ دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ "دیواں آمدند" (دیو آگئے، دیو آگئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مدائن فتح ہو گیا۔

حضرت سعدؓ جب شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا تھا، ایرانی بھاگ چکے تھے۔ اس عالم میں حضرت سعدؓ کی پاکیزہ نفسی کا حال یہ ہے کہ تکبر کا کوئی کلمہ زبان سے نکالنے کی بجائے زبان پر قرآن پاک کی آیات جاری ہو جاتی ہیں۔ ترجمہ:

> "کتنی قومیں کس قدر باغ، چشمے، کھیتیاں اور طرح طرح کی نعمتیں، عمدہ محلات چھوڑ کر چل بسیں، جن میں خوش باش زندگی بسر کرتی تھیں اور ہم نے ان چیزوں کا مالک دوسری قوموں کو بنا دیا۔" (الدخان: ۲۵تا۲۸)۔

مدائن پر قبضہ کے بعد کسریٰ کے ایوان میں منبر نصب کیا گیا۔ اذانِ حق بلند ہوئی، توحید کا دلکش نغمہ گونجا اور یہاں پہلی بار جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔ مدائن فتح ہوا تو پورے عراقِ عرب پر مسلمانوں کی حکومت ہو گئی۔ اب دارالخلافہ سے حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ آگے بڑھنے کی بجائے ریاستی نظم و نسق سنبھالنے پر توجہ دی جائے۔

حضرت سعدؓ نے امورِ مملکت کو نہایت عمدگی سے چلایا۔ پورے عراقِ عرب کی مردم شماری اور زمین کی پیمائش کروائی۔ مفتوحہ علاقوں کو ملک کے اصلی باشندوں کے ہاتھ ہی میں رہنے دیا۔ لگان اور جزیہ کے اصول بنائے۔ مدائن میں ایک جامع مسجد تعمیر کروائی۔

مدائن کی مرطوب آب و ہوا، عرب کے گرم علاقے کے مسلمانوں کو راس نہ آئی، تو حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت سعدؓ نے ۱۷ھ/۶۳۸ء میں نیا شہر کوفہ آباد کیا۔ کوفہ میں چالیس ہزار افراد کے لیے مکانات بنائے گئے جو ابتدا میں نرسلوں کے تھے، لیکن ایک بار ان میں آگ لگ گئی تو حضرت عمرؓ کی اجازت سے اینٹ اور گارے کے مکانات تعمیر کیے گئے۔ اس شہر میں ہر قبیلے کی ایک آبادی تھی، ہر آبادی میں ایک مسجد تھی۔ حضرت سعدؓ نے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کروائی جس میں چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ آپؓ نے شہر میں چھوٹی چھوٹی نہریں کھدوائیں، پل، مسافر خانے بنوائے، ذاتی سرمائے سے کئی مدارس قائم کیے۔ آپؓ نے اپنی توجہ اور محنت سے کوفہ کو اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی بنا دیا۔

۲۱ھ/۶۴۲ء میں حضرت سعدؓ کے خلاف کچھ شورشیں ہونے لگیں تو حضرت عمرؓ نے آپؓ کو واپس مدینہ منورہ بلا لیا۔ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا گیا۔ وفات سے قبل حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے جن چھ اکابر صحابہ کرامؓ کے نام تجویز کیے ان میں ایک حضرت سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر کہا کہ "اگر سعدؓ خلافت کے لیے منتخب ہو جائیں تو وہ اس کے اہل ہیں اور اگر وہ منتخب نہ ہوں تو جو خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے مدد لے۔"

حضرت عثمانؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی حضرت سعدؓ کو دوبارہ کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ تین سال بعد بیت المال کے مہتمم حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے حضرت سعدؓ کا کوئی اختلاف ہوا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت سعدؓ کو سبکدوش کر دیا۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ مدینہ منورہ سے دس میل دور عقیق کے مقام پر رہنے لگے۔ بقیہ تمام عمر آپؓ نے اختلافات اور تنازعات سے دور رہ کر گزاری۔ ایک بار آپؓ کو خلیفہ بننے کی ترغیب دی گئی تو سخت ناراض ہوئے فرمایا، "میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ پرہیزگار، بے غرض اور گمنام بندے کو محبوب رکھتا ہے۔"

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی پاکیزہ سیرت و کردار تاریخ اسلام کا

Marfat.com

ایک روشن باب ہے۔ آپؓ دین کا گہرا فہم رکھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آپؓ کو علم کی دولت وافر مقدار میں نصیب ہوئی۔ آپؓ کا شمار حضرت ابو بکرؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ جیسے جلیل القدر فقیہ صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی ۲۱۵ احادیث روایت کی ہیں، جن میں سے پندرہ متفق علیہ ہیں، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ "جب سعد بن ابی وقاصؓ حضور ﷺ سے کوئی حدیث روایت کریں تو پھر اس کے متعلق کسی دوسرے سے مت پوچھو۔"

آپؓ کی زندگی آپؓ کے قلب پاکیزہ کا عکس تھی۔ نہایت کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ رات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کے یہ صحابیؓ اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے ہو جاتے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خشیت الٰہی سے جسم لرزنے لگتا اور چہرے کی رنگت تبدیل ہو جاتی۔ رات کے آخری حصے میں آپؓ اپنے رب کو یاد کر کے اس قدر روتے کہ ڈاڑھی اور جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

آخری عمر میں بے حد ضعیف ہو گئے تھے۔ ۵۵ھ / ۶۷۵ء میں آپؓ نے اپنے خالق کے بلاوے پر لبیک کہا۔ میت مدینہ لائی گئی۔ مدینہ کے گورنر مروان نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسلام کے اس عظیم جرنیل کو جنت البقیع میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

آپؓ نے اللہ کی راہ میں تین بار ہجرت فرمائی

چاروں طرف سناٹے کا راج تھا!

تاریکی نے ہر طرف ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ لوگ اپنی اپنی خواب گاہوں میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ شہر کی گلیاں سنسان تھیں اور ان سنسان اور تاریک گلیوں میں دو انسانی سائے حرکت کر رہے تھے۔ دونوں سائے دراز قد تھے۔ ایک ان میں چھریرے بدن کا معلوم ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرا قدرے جسیم تھا۔

کچھ دور جانے پر ایک مکان سے روشنی پھوٹتی دکھائی دی۔ دونوں سائے روشنی کی سمت چل دیے۔ روشنی جوں جوں واضح ہوتی گئی، فضا میں ایک طرح کا شور بڑھتا گیا، جسے ان سایوں نے بھی محسوس کیا۔ شور ایسا تھا جیسے کچھ لوگ ہڑبونگ مچا رہے ہوں۔ کچھ ایسا شور، جیسے عیش و طرب کی محفلوں سے اٹھتا ہے۔

ایک سائے نے دوسرے سے پوچھا،

"تمہیں معلوم ہے یہ کس کا مکان ہے؟"

جواب ملا، "نہیں!"

پہلے سائے نے بتایا، "یہ ربیعہ بن امیہ بن خلف کا مکان ہے اس وقت یہ لوگ مست ہیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

دوسرے سائے نے کہا۔ "ہم بہت غیر مناسب جگہ چلے آئے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "لَا تَجَسَّسُوْا" لوگوں کے عیوب تلاش نہ کرو۔"

یہ سن کر پہلے سائے نے خاموشی اختیار کرلی، پھر دونوں سائے مڑے اور جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے گئے۔

تاریک راتوں میں گلی گلی گھوم کر لوگوں کا حال معلوم کرنے والے یہ سائے تھے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ اور صحابیٔ رسولؐ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے راتوں کو گشت پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کیا تھا، اور یہ حضرت عبدالرحمٰن ہی تھے جنہوں نے اس وقت کی وسیع و عریض اسلامی مملکت کے حکمراں حضرت عمرؓ کو قرآن پاک کی آیت سنا کر روک دیا تھا۔

آپؓ کا نام عبدالرحمٰن اور کنیت ابو محمد ہے، والد کا نام عوف اور والدہ کا نام شفا تھا۔ ایمان لانے سے قبل آپؓ کا نام عبد عمرو تھا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو خود رسول اقدس ﷺ نے آپؓ کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ آپؓ نے اس عالم رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں تو مکہ مکرمہ میں واقعۂ فیل رونما ہوئے، دس سال بیت چکے تھے اور ابرہہ کے ہاتھیوں کی ابابیلوں کے ہاتھوں تباہی کی داستان لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھی۔

آفتابِ رسالتؐ طلوع ہوا تو اس کی روشنی حضرت عبدالرحمٰنؓ کے دل میں بھی گھر کر گئی۔ رسول پاک ﷺ کے رفیق محترم حضرت ابو بکر صدیقؓ نے توحید کی دعوت دی تو آپؓ نے اس پر فوراً لبیک کہا۔ ایمان لانے والوں میں آپؓ تیرھویں خوش نصیب ہیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت زیادہ نہیں بڑھی تھی اور آپ ﷺ حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ کے مکان میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔

مکہ کے کفار اور قریش کی نگاہوں سے نیا دین (اسلام) چھپا نہ رہ سکا۔ جلد ہی ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو گیا اور کمزور ستائے جانے لگے تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کر جانے کی ہدایت کی۔ حضرت عبدالرحمٰن ان صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنہوں نے حبشہ کے لیے دوبار ہجرت کی۔ بالآخر آپؓ دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

مدینہ منورہ میں انصار نے مہاجرین کو بے حد عزت و احترام سے

Marfat.com

اپنے ہاں جگہ دی۔ حضور اکرم ﷺ نے سعد بن الربیع انصاریؓ سے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا بھائی چارہ کروادیا۔ حضرت سعدؓ نے اس موقع پر ایثار و قربانی کی جو مثال قائم کی اس کی آب و تاب سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی اسی طرح باقی ہے۔ حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا، "میں اپنا نصف مال آپ کو دیتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ انہیں دیکھ لیں۔ آپ کو جو پسند آجائے مجھے اس کا نام بتائیں۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ عدت گزر جانے کے بعد آپؓ اس سے نکاح کر لیجیے گا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جواب دیا۔ "اللہ آپؓ کے مال اور اہل و عیال میں برکت عطا فرمائے۔ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے۔"

لوگوں نے انہیں بنی قینقاع کے بازار میں پہنچا دیا۔ آپؓ نے تھوڑے سے مال سے تجارت شروع کر دی۔ واپس آئے تو کچھ گھی اور پنیر بطور نفع ساتھ تھا۔ اس کے بعد تو چند برسوں میں حال یہ تھا کہ آپؓ کا کاروبار دور دور تک پھیل چکا تھا۔ کچھ تو والد کی تربیت کا اثر تھا کہ آپؓ کاروباری رموز سے واقف تھے لیکن دراصل یہ اللہ کا آپؓ پر خاص کرم تھا کہ آپؓ جس کاروبار میں ہاتھ ڈالتے وہ پھلنے پھولنے لگتا۔ خود آپؓ کا کہنا ہے کہ "میں پتھر بھی اٹھاتا ہوں تو اس کے نیچے سے سونا نکل آتا ہے۔" آپؓ کا مال سینکڑوں اونٹوں پر لد کر باہر جاتا تھا اور اسی طرح واپس آتا تھا۔ ایک بار آپؓ کا قافلہ مدینے لوٹا تو اس میں سات اونٹوں پر صرف گیہوں، آٹا یا دیگر اشیائے خورونوش لدی ہوئی تھیں۔ بعد میں آپؓ نے زراعت بھی شروع کر دی تھی۔ حضور ﷺ نے خیبر میں وسیع جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ جرف کے مقام پر آپؓ کی مملوکہ اراضی میں بیس اونٹ آب پاشی کا کام کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؓ نے اپنے وارثوں کے لیے بہت بڑی دولت چھوڑی۔ آپ کی چار بیواؤں نے جائیداد کے صرف آٹھویں حصے سے اسی اسی ہزار دینار پائے۔ سونے کی اینٹیں اتنی بڑی تھیں کہ کلہاڑی سے کاٹ کر تقسیم کی گئیں۔

لیکن اتنی بڑی دولت کے مالک ہونے کی وجہ سے کیا آپؓ میں تکبر آگیا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ آپؓ تو اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؓ نے نصف مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دیگر دو مواقع پر اللہ کی راہ میں چالیس ہزار دینار دیے۔ ایک بار جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ دیے۔ ایک بار ایک زمین چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کی اور یہ ساری رقم اللہ کی راہ میں دے دی۔ ایک دن میں تیس تیس غلام آزاد کر دیتے تھے۔ انتقال کے وقت پچاس ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے اللہ کی راہ میں وقف کیے۔ جن صحابۂ کرامؓ نے غزوۂ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی اور اس وقت تک حیات تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے چار سو دینار کی وصیت کی۔ اس وقت ایسے ایک سو صحابہ کرامؓ حیات تھے، یہ رقم ان تمام میں تقسیم کی گئی۔ ان میں خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے۔ امہات المومنینؓ کے لیے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔

اللہ کی راہ میں اس قدر مال و دولت نثار کرنے والا صحابیٔ رسول ﷺ پھر بھی فکر مند رہتا تھا کہ اس سے کہیں آخرت میں اس کے مال کے بارے میں باز پرس نہ کر لی جائے۔ یہی فکر انہیں ایک بار امّ المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس لے گئی۔ آپؓ نے حضرت ام سلمہؓ سے عرض کی، "مجھے خوف ہے کہ مال کی کثرت مجھے ہلاک کر دے گی۔"

ام المومنینؓ نے جواب دیا، "راہِ خدا میں صَرف کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میرے اصحابؓ میں سے بعض ایسے ہیں کہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد انہیں میرا دیدار نصیب ہو گا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ کو اللہ نے اس قدر دولت دی کہ آپؓ چاہتے تو عالیشان محل کھڑا کر لیتے اور دنیا بھر کی آسائشیں اپنی جھولی میں ڈال لیتے، لیکن آپؓ کے تقویٰ کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ ایک بار روزہ رکھا، شام کے وقت کھانا سامنے آیا تو آپؓ رو پڑے اور فرمایا، "مصعب بن عمیرؓ مجھ سے بہتر تھے۔ وہ شہید ہوئے تو ان کے کفن میں صرف ایک چادر تھی جس سے سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں چھپاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ شہید ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے۔ اب دنیا ہمارے لیے کشادہ ہو گئی ہے اور ہمیں اس قدر دنیاوی نعمتیں دے دی گئی ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ شاید ہماری نیکیوں کا صلہ دنیا میں ہی مل گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس قدر روئے کہ کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ (صحیح بخاری)۔

آپؓ کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یعنی ان دس صحابہ کرامؓ میں جنہیں رسول پاک ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور شجاعت و دلیری کے جوہر

Marfat.com

دکھائے۔ غزوۂ احد میں بدن پر ۲۱ زخم لگے، یہ تمام زخم بدن کے سامنے حصے پر تھے۔ پشت پر کوئی زخم نہ تھا۔ اسی غزوہ میں پاؤں میں اتنا کاری زخم لگا کہ صحت یاب ہونے کے بعد بھی ہمیشہ پاؤں پر زور دے کر چلتے تھے۔

شعبان ٦ھ/٦٢٧ء میں حضور ﷺ نے دومۃ الجندل کے قریب آباد قبیلہ کلب کو اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا۔ یہ قبیلہ خاصا طاقت ور تھا اور اگر یہ اسلام لے آتا تو مسلمانوں کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوتی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ ایسے شخص کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھیجا جائے جو بات موثر اور دلکش انداز میں پہنچا سکے، اور اگر لڑائی کی ضرورت پیش آجائے تو اس کی بھی اہلیت رکھتا ہو۔ آپ ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن کو بلوایا۔ اپنے دستِ مبارک سے سیاہ عمامہ باندھا۔ چار انگشت شملہ پشت کی جانب چھوڑتے ہوئے فرمایا، "عبدالرحمٰن اسی طرح عمامہ باندھا کرو کیوں کہ یہ عمدہ اور پسندیدہ طریقہ ہے۔"

پھر آپ ﷺ نے سات سو مجاہدین ساتھ کیے اور ہاتھ میں علم دے کر فرمایا، "بسم اللہ! اللہ کی راہ میں روانہ ہو جاؤ۔ جو لوگ اللہ کی نافرمانی اور گناہ میں مبتلا ہیں ان سے جا کر جہاد کرو۔ کسی کو دھوکا نہ دینا، فریب نہ کرنا، بچوں کو نہ مارنا۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ دومۃ الجندل پہنچے۔ اسلام کی دعوت اس قدر عمدگی سے دی کہ قبیلہ کلب کے سردار اصبغ بن عمرو جو عیسائی تھے، اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں سمیت حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حضرت رافع بن کیثؓ کے ہاتھ ایک خط میں حضور ﷺ کو اس خوشخبری سے آگاہ کیا۔ حضور ﷺ نے جواباً پیغام بھجوایا کہ تم قبیلے کے سردار اصبغ کی بیٹی سے شادی کر لو۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ایسا ہی کیا۔ اسی خاتون سے حضرت ابو سلمہ بن حضرت عبدالرحمٰنؓ پیدا ہوئے، جو مشہور راویِ حدیث ہیں۔ سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ نے اصبغ کی بیٹی سے شادی کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ اس طرح قبیلہ بنو کلب سے مسلمانوں کے تعلقات استوار ہوں گے۔ اس سے پہلے قریش اور بنو کلب میں شادی بیاہ کے تعلقات نہ تھے۔

غزوۂ احد میں لڑائی زوروں پر تھی۔ حضرت حارث بن صمہ انصاریؓ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، "تم نے عبدالرحمٰن کو دیکھا ہے؟" انہوں نے عرض کی، "وہ پہاڑی کی طرف کفار کے نرغے میں تھے، میں نے ادھر جانا چاہا لیکن آپ پر نظر پڑ گئی اس لیے میں ادھر آگیا۔" رحمتِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "عبدالرحمٰن کو فرشتے بچا رہے ہیں۔" حضرت حارثؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ کے پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے سات کافروں کی لاشیں پڑی ہیں۔ حضرت حارثؓ نے پوچھا، "ان سب کو آپ نے قتل کیا ہے؟" جواب ملا، "دو کو تو میں نے قتل کیا ہے باقی مشرکین کو قتل کرنے والے مجھے نظر نہیں آئے۔" یہ سننا تھا کہ حضرت حارثؓ پکار اٹھے، "رسول اللہ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔"

رسول پاک ﷺ کے بعد خلافت کا مسئلہ اٹھا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے بھی اس مسئلے کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپؓ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے تیسرے فرد تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں آپؓ کو ہر قسم کے مشوروں میں شریک رکھا۔

حضرت عمرؓ پر خلافت کی ذمے داری ڈالی گئی تو انہوں نے امورِ مملکت کو چلانے کے لیے وسیع انتظامات کیے، مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے مستقل مجلس شوریٰ قائم کی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی اس مجلس کے رکن بنائے گئے۔ آپؓ کی رائے بہت سے مواقع پر حتمی تسلیم کی گئی۔ مثلاً جب عراق پر فوج کشی کے لیے مسلمانوں کی فوج بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو سوال اٹھا کہ اس فوج کا سپہ سالار کسے بنایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ وہ خود فوج کی قیادت کریں لیکن یہ حضرت عبدالرحمٰنؓ تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ کو روکا اور متبادل کے طور پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ یہ تجویز مان لی گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں مسلمانوں نے مشہور جنگِ قادسیہ میں فتح حاصل کی۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فقہ پر جتنا کام ہوا اس میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کی آرا بھی شامل تھیں۔ آپؓ ان جلیل القدر اور صاحبِ علم صحابۂ کرامؓ میں سے ہیں جو رسول پاک ﷺ کے زمانے میں فتویٰ دیتے تھے، اکثر صحابۂ کرامؓ اور تابعین نے آپؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان راویوں میں حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں۔ کئی اہم مواقع پر آپؓ نے خلفائے راشدینؓ کو اپنے علم سے فائدہ پہنچایا۔ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں حضور کریم ﷺ کی وراثت کا مسئلہ پیدا ہوا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اس حدیث کی تصدیق کی کہ حضور ﷺ کے ترکہ میں وراثت نہیں ہے۔

Marfat.com

سنہ ۱۸ھ / ۶۳۹ء میں شام میں طاعون پھیل گیا۔ حضرت عمرؓ دورہ کرتے ہوئے "سرغ" کے مقام پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ وہاں سے جانا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ کو اختلاف تھا۔ حضرت عباسؓ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آئے، وہ بعض ضرورتوں سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فرمایا، "اس مسئلے کے متعلق مجھے علم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب تم اس (طاعون) کو کسی زمین میں سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب تم کسی علاقے میں ہو اور وہاں وبا پھوٹ پڑے تو اس سے بھاگ کر نہ جاؤ۔" یہ حدیث پاک سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، "اللہ کا شکر ہے، پلٹ چلو۔"

خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار عشا کی نماز کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے عرض کی "مجھے بلوا لیا ہوتا، خود کیوں تکلیف کی؟" جواب ملا، "مجھے اطلاع ملی ہے کہ مدینے کے باہر ایک قافلہ اترا ہے۔ قافلے والے تھک کر سو گئے ہیں، میرے ساتھ چلو۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ فوراً تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ انہیں لے کر مدینہ کے باہر تشریف لے گئے۔ اور نماز ادا کرنا شروع کر دی اس طرح قافلے کی حفاظت بھی کرتے رہے۔ اور نماز کا ثواب بھی سمیٹ لیا۔

معرکۂ نہاوند میں مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانے پر مال غنیمت ملا۔ مالِ غنیمت کی سینکڑوں گٹھڑیاں مدینہ منورہ لائی گئیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں مسجد نبویؐ میں رکھنے کا حکم دیا اور چند صحابہ کرامؓ کو نگرانی کے لیے مامور کر دیا۔ ان صحابہ کرامؓ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی شامل تھے۔

۲۶ ذوالحجہ ۲۳ھ / ۴ نومبر ۶۴۴ء کو حضرت عمرؓ نماز فجر کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے، اسی وقت ایک پارسی غلام ابو لؤلؤ نے آپؓ پر حملہ کر دیا۔ آپؓ شدید زخمی ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن میمونؓ فرماتے ہیں کہ زخمی ہوتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا ہاتھ پکڑا اور امامت کے لیے انہیں کھڑا کر دیا، جو لوگ قریب تھے انہیں تو علم تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جو لوگ دور تھے وہ حضرت عمرؓ کی آواز نہ آنے پر چلا رہے تھے "سبحان اللہ، سبحان اللہ۔"

حضرت عمرؓ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان سے اصرار کیا گیا کہ وہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، "عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ میں سے جس کی حمایت کثرت آرا سے ہو، اسے خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ ان سب سے آخر وقت تک خوش رہے تھے۔" حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ "عبدالرحمٰن نہایت صائب الرائے، ہوش مند اور سلیم الطبع ہیں۔ ان کی رائے کو غور سے سننا اور اگر انتخاب میں اختلاف پیدا ہو جائے تو جس کی طرف عبدالرحمٰنؓ ہوں اس کا ساتھ دینا۔"

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں آپؓ امورِ مملکت سے دور رہے، ۳۲ھ / ۶۵۲ء میں آپؓ اپنے رب سے جا ملے۔ اس وقت آپؓ کی عمر ۷۲ سال تھی، بعض مؤرخین نے آپؓ کی عمر ۷۵ سال بتائی ہے۔ حضرت علیؓ نے جنازے پر کھڑے ہو کر کہا، "عبدالرحمٰنؓ جاؤ، تم نے اچھا زمانہ پایا اور فتنوں سے بچ کر چل دیے۔"

رسول کریم ﷺ مختلف مواقع پر آپؓ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار حضور کریم ﷺ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، تو حضرت عبدالرحمٰنؓ ساتھ تھے۔

مسند احمد اور ترمذی میں خود حضرت عبدالرحمٰنؓ سے روایت ہے کہ "اصحابؓ میں سے چار پانچ افراد حضور ﷺ سے جدا نہ ہوتے تھے، تاکہ آپ ﷺ کو کسی بھی وقت کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے پورا کر سکیں۔ ایک دن میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اپنے مکان سے نکلے، میں پیچھے پیچھے چلا۔ آپ ﷺ بلندی پر واقع ایک باغ میں داخل ہو گئے، وہاں آپ ﷺ نے سجدہ کیا۔ سجدہ اتنا طویل تھا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں رو پڑا۔ آپ ﷺ نے سجدے سے سر اٹھا کر پوچھا، "عبدالرحمٰنؓ! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے اپنے رونے کی وجہ بتائی، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "جبریلؑ نے مجھ سے کہا کہ کیا میں آپؐ کو یہ بشارت نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو آپؐ پر درود بھیجے گا میں اس پر درود بھیجوں گا اور جو آپؐ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلام بھیجوں گا"۔ یعنی حضور اقدس ﷺ اس پیغام کے جواب میں سجدۂ شکر بجا لا رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ رحمۃ للعالمین ﷺ پر لاکھوں درود اور لاکھوں سلام نازل فرمائے، جن کے تربیت کردہ صحابہ کرامؓ کی ستاروں کی مانند روشن سیرتیں گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کو راستہ دکھا رہی ہیں۔

***

Marfat.com

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

علم کا وہ ظرف جس کے بغیر حدیث کا ذکر نامکمل ہے

بازار میں بڑی رونق تھی۔

دکانوں پر گاہکوں کی ریل پیل تھی۔ دکاندار گاہکوں کو مال کی خصوصیات سے آگاہ کرنے اور انہیں مال خریدنے پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے جن کا رنگ گندمی تھا، شانے کشادہ اور دانت آبدار تھے۔ انہوں نے سادہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

بزرگ، بازار میں خرید و فروخت کے ارادے سے نہیں آئے تھے، وہ بازار میں پہنچ کر ٹھہر گئے اور زور سے پکارے، "تم لوگوں کو کس چیز نے مجبور کر رکھا؟"

لوگ بزرگ کی جانب متوجہ ہوگئے اور پوچھنے لگے، "کس چیز سے؟"

بزرگ کے لبوں کو جنبش ہوئی، کہنے لگے "وہاں رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اور تم لوگ یہاں بیٹھے ہو؟"

"کہاں؟" لوگوں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"مسجد میں!" بزرگ کا جواب تھا۔

یہ سننا تھا کہ بازار دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہوگیا، لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی طرف دوڑے کہ رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اس سے محروم نہ رہ جائیں، لیکن — یہ کیا؟ مسجد میں نہ کوئی تقسیم کرنے والا نظر آیا، نہ وصول کرنے والوں کی بھیڑ دکھائی دی، وہاں تو بس چند افراد نماز پڑھ رہے تھے، کچھ لوگ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے اور چند افراد حلال و حرام کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔

مسجد میں کچھ نہ پا کر، تمام لوگ، کچھ حیران، کچھ ناخوش، واپس بازار چلے آئے، بزرگ سے شکایت کی کہ مسجد میں تو کچھ نہیں ہے، آپ نے تو کہا تھا کہ میراث رسول ﷺ تقسیم ہو رہی ہے، وہاں تو بس کچھ لوگ نماز ادا کر رہے ہیں۔ کچھ کلام پاک کی تلاوت کر رہے ہیں اور بعض افراد حلال و حرام پر گفتگو کر رہے ہیں۔

بزرگ نے جواب دیا، "تم لوگوں پر افسوس ہے۔ یہی تو تمہارے نبی ﷺ کی میراث ہے!"

یہ بزرگ تھے، عظیم المرتبت صحابی رسولؐ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علم حدیث میں جن کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آپؓ تمام صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑے حافظِ حدیث ہیں۔ آپؓ نہ صرف خود علم حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے، بلکہ آپؓ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دوسرے بھی علم دین حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو علم کی دولت کے ساتھ ساتھ حکمت کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ حکمت سے اپنی بات کہنے کا آپؓ کو جو سلیقہ تھا اس کا اظہار اس مضمون کی ابتدا میں بیان کیے گئے واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا تعلق قبیلہ دوس سے ہے جو یمن میں آباد تھا۔ اسلام لانے سے قبل آپؓ کا نام عبد شمس تھا، لیکن لوگ آپؓ کو ابوہریرہ کہتے تھے۔ یہ نام یوں پڑا کہ کم عمری میں آپؓ نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ رات کو ایک درخت میں جگہ بنا کر اسے سلا دیتے۔ صبح کو جب بکریاں چرانے کے لیے جاتے تو بلی ساتھ ہو لیتی۔ دن بھر بکریاں چرانے کے علاوہ، کمسن عبد شمس، بلی کے ساتھ کھیلا کرتے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انہیں ابوہریرۃ کہنا شروع کر دیا، کیونکہ عربی زبان میں بلی کے لیے "ہِرّہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور بلی کے بچے کو "ہریرہ" کہتے ہیں۔

عبد شمس ابھی چھوٹے ہی تھے کہ آپؓ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ مالی حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ شروع سے ہی فقر و فاقے کی زندگی گزاری۔ ذرا بڑے ہوئے تو ایک عورت برہ بنت غزوان کے پاس روٹی

Marfat.com

کپڑے پر ملازم ہو گئے۔ کام یہ تھا کہ جب مالکہ سواری پر ہو تو یہ ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے سواری کو لے چلیں۔ اتفاق دیکھیے کہ بعد میں یہی خاتون آپؓ کے نکاح میں آ گئیں۔

قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے والے ایک اور صاحب طفیل بن عمرو مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں جانے سے پہلے ہی لوگوں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص نیا دین پیش کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں بڑا سحر ہے۔ وہ ایک کلام پیش کرتا ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ طفیل مکہ مکرمہ پہنچے تو تجسس ہوا کہ آخر سنیں تو سہی نیا دین ہے کیسا؟ اور وہ کلام کیسا ہے جسے اللہ کا کلام کہا جا رہا ہے۔ انہوں نے کلام پاک کی آیات سنیں تو سحر زدہ ہو کر رہ گئے اور ایمان لے آئے۔ واپس قبیلے میں پہنچے تو وہاں اسلام کی دعوت کو عام کرنے میں مصروف ہو گئے حضرت طفیل بن عمروؓ کی کوششوں سے ہی قبیلہ دوس میں اسلام پھیلا۔

سنہ ۷ھ/۶۲۸ء میں غزوۂ خیبر ہوا۔ اسی زمانے میں حضرت طفیلؓ یمن کے ۸۰ افراد کے ہمراہ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ حضور ﷺ خیبر میں تھے، اس لیے یہ قافلہ خیبر جا پہنچا۔ حضرت ابوہریرہؓ ساتھ تھے۔ اس وقت آپؓ کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ دورانِ سفر آپؓ کا ایک غلام کہیں بچھڑ گیا۔ خیبر پہنچ کر حضرت ابوہریرہؓ اسلام لے آئے، اسی وقت بچھڑا ہوا غلام دکھائی دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، "ابو ہریرہؓ تمہارا غلام آ گیا"۔ اسلام کی مسرت سے سرشار ابوہریرہؓ کا جواب تھا، "اب وہ اللہ کی راہ میں آزاد ہے"۔

حضرت ابو ہریرہؓ اسلام لے آئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے آپؓ کے خاندانی نام عبد شمس کو بدل کر آپؓ کا نام عمیر رکھ دیا، لیکن آپؓ ابوہریرہؓ ہی کے نام سے پکارے جاتے رہے اور آج بھی اسی کنیت سے مشہور ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دَر کے ہو رہے، آپؓ کے دل میں علم دین حاصل کرنے کی جو خواہش تھی وہ بڑھ کر حرص کی صورت اختیار کر چکی تھی، چنانچہ مسجد نبویؐ کے ایک گوشے میں رہائش اختیار کر لی، جہاں چند اور صحابہؓ بھی رہ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگیوں کا مرکز و محور اللہ کے دین کے علم کا حصول تھا، ان کے لیے مسجد میں ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جس پر چھت ڈال دی گئی تھی۔ چونکہ عربی زبان میں چبوترے کے لیے "صُفّہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے اس چبوترے پر رہنے والے اصحابؓ کو "اصحابِ صُفّہ" کہا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ خود تو ایمان کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کر چکے تھے، اب آپؓ کی خواہش تھی کہ والدہ محترمہ بھی اسلام کی نعمت سے فیضیاب ہوں۔ آپؓ مختلف مواقع پر والدہ کو اسلام لانے کی دعوت دیتے رہے، لیکن والدہ کی جانب سے انکار ہوتا رہا۔ ایک دن آپؓ نے والدہ کو پھر دعوت اسلام دی، والدہ نے رسول پاک ﷺ کے لیے کچھ ایسے کلمات ادا کیے جن کو سن کر حضرت ابو ہریرہؓ کو شدید رنج پہنچا، آنکھوں سے آنسو نکل آئے، روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ سے واقعہ بیان کیا اور حضور ﷺ سے درخواست کی کہ والدہ کے لیے دعا فرمائیں تا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی --- کائنات کے خالق سے اس کے محبوب ترین بندےؐ نے دعا کی تھی، کیوں نہ قبول ہوتی۔ حضرت ابوہریرہؓ واپس گھر پہنچے تو والدہ محترمہ غسل کر کے تیار ہو رہی تھیں، بیٹا گھر میں داخل ہوا تو والدہ کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ پھر روتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے، رسول پاک ﷺ کو والدہ کے اسلام لے آنے کی اطلاع دی اور درخواست کی کہ آپ ﷺ دعا فرمائیں، اللہ میری اور میری ماں کی محبت تمام مسلمانوں کے دل میں ڈال دے۔

اللہ کی راہ کا یہ دیوانہؓ، جو بے حد تنگ دستی سے گزر بسر کر رہا ہے، رسول اللہ ﷺ سے دعاؤں کی درخواست کرتا ہے تو دنیاوی مال و دولت کی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی محبت کی دولت پانے کی درخواست کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ "اس کے بعد کوئی ایسا مسلمان نہ تھا جس نے مجھے دیکھا ہو، اور مجھ سے محبت نہ کی ہو۔"

رسولِ پاک ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کو اصحابِ صُفّہ کے منتظم کی حیثیت دے رکھی تھی۔ جب بھی آنحضرت ﷺ، کھانے یا کسی دوسرے کام کے سلسلے میں اصحابِ صفہ کو جمع کرنے کا ارادہ فرماتے تو حضرت ابو ہریرہؓ سے کہتے کہ اصحابِ صفہ کو بلا لائیں۔ حضور ﷺ اصحابِ صُفّہ کے ساتھ بے حد شفقت سے پیش آتے تھے۔ جب بھی آپ ﷺ کے پاس صدقے کی کوئی چیز آتی آپ ﷺ اسے تمام کی تمام اہل صفہ کو بھجوا دیتے اور جب تحفے کے طور پر کوئی شے

Marfat.com

آتی تو خود بھی لیتے اور اصحابِ صفہ کو بھی عنایت فرماتے۔

رسول پاک ﷺ کا وصال ہوا، اور حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفہ بنے۔ مختلف صحابہ کرامؓ پر امورِ مملکت کے سلسلے میں مختلف ذمہ داریاں ڈالی گئیں، لیکن ابو ہریرہؓ ان امور سے لاتعلق ہو کر رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو عام کرنے میں مصروف رہے۔

حضرت عمرؓ نے مسندِ خلافت سنبھالی تو آپؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر مقرر کر دیا۔ ایک مدت کے بعد وہاں سے لوٹے تو کچھ رقم ان کے پاس تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، "یہ رقم کہاں سے آئی؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے مناسب جواب دیا۔ تحقیق پر آپؓ کی بات درست نکلی۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ بحرین کا گورنر بنانا چاہا تو آپؓ نے انکار کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بھی آپؓ نے سیاسی امور میں مداخلت نہ کی۔ آپؓ نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ گمنامی کے گوشے میں گزارا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں مدینے کے گورنر مروان کے قائم مقام رہے۔

سنہ ۵۷ھ / ۶۷۷ء میں بیمار پڑے۔ لوگ عیادت کے لیے آئے تو دیکھا کہ آپؓ رو رہے ہیں۔ لوگوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا، "میں اس دنیا کی دلفریبیوں پر نہیں روتا، بلکہ سفر کی طوالت اور زادِ راہ کی قلت پر آنسو بہاتا ہوں۔ اس وقت میں دوزخ اور جنت کے نشیب و فراز کے درمیان ہوں، معلوم نہیں ان میں سے کس راستے پر جانا ہو گا۔"

ساری زندگی دین کی خدمت کرنے والے صحابیؓ رسول کے خوفِ خدا کا یہ عالم ہے کہ وہ آخرت کے خیال سے لرزاں ہے کہ نہ جانے دوزخ یا جنت میں سے کون سی جگہ مقدر بنتی ہے۔

آپؓ کو حضور ﷺ سے اتنی محبت تھی کہ انتقال سے قبل وصیت کی، "مجھے، رسول اللہ ﷺ کی طرح، عمامہ اور قمیص پہنانا۔ میری قبر پر عرب کے دستور کے مطابق خیمہ نہ نصب کرنا، جنازے کے پیچھے آگ لے کر نہ چلنا۔ جنازہ لے جانے میں جلدی کرنا۔ اگر میں صالح ہوں گا تو جلد اپنے رب سے ملوں گا اور اگر بدقسمت ہوں گا تو ایک بوجھ تمہاری گردن سے دور ہو گا۔"

یہ وصیت کرنے کے بعد آپؓ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرامؓ، آپؓ کی نماز جنازہ اور تدفین میں شریک تھے۔ حضرت عثمانؓ کے صاحب زادوں نے کندھا دے کر جنت البقیع (مدینہ منورہ) پہنچایا اور آپؓ کو اس مبارک سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپؓ نے ۷۸ سال کی عمر پائی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بغیر حدیث کا ذکر نامکمل ہے۔ آپؓ وہ خوش قسمت صحابیؓ ہیں جن کے بارے میں خود رسول اقدس ﷺ نے فرمایا، "ابو ہریرہ علم کا ظرف ہیں۔" (صحیح بخاری)۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ میں علم کے حصول کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ خواہش سے بڑھ کر حرص کا روپ دھار چکی تھی۔ عام طور پر لوگ حضور ﷺ سے زیادہ سوالات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے، لیکن حضرت ابو ہریرہؓ پوچھنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے تھے۔ ایک بار آپؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا، "قیامت کے دن کون خوش قسمت آپ ﷺ کی شفاعت کا زیادہ مستحق ہو گا؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "حدیث کے بارے میں تمہاری حرص دیکھتے ہوئے، میرا پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے اور کوئی نہ کرے گا"۔ (مسند احمد بن حنبل)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے صاحب زادے اور مشہور صحابی رسولؐ ہیں، آپؓ فرماتے ہیں، "ابو ہریرہؓ ہم سب سے زیادہ حدیث جانتے تھے" اور امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہؓ اپنے ہم عصر حفاظ میں سب سے بڑے حافظ تھے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کی بیان کردہ روایات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ ان میں سے ۳۲۵ احادیث متفق علیہ ہیں، حالاں کہ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بہت طویل عرصہ نہیں گزارا۔ اس کی وجہ آپؓ خود بیان کرتے ہیں، آپؓ نے فرمایا، "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابو ہریرہ حدیثوں کو بیان کرتا ہے، حالانکہ مہاجرین اور انصار ان حدیثوں کو نہیں بیان کرتے، لیکن اعتراض کرنے والے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہمارے مہاجر بھائی اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں، انصار اپنی زراعت کی دیکھ بھال کرتے ہیں، میں سارا وقت حضور ﷺ کی خدمت میں گزارتا تھا، جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہ رہتے تھے، میں ان اوقات میں بھی موجود رہتا تھا، دوسرے یہ کہ جن باتوں کو وہ بھلا دیتے تھے میں ان کو یاد رکھتا تھا۔"

حضرت ابو ہریرہؓ متعدد غزوات میں شریک ہوئے، لیکن غزوات میں مسلمانوں کی فتح کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا، آپؓ اس سے

Marfat.com

لاتعلق رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار رسول کریم ﷺ نے پوچھ لیا کہ "ابو ہریرہ تم اس مالِ غنیمت کا سوال کیوں نہیں کرتے جس کا تمہارے دوسرے ساتھی سوال کرتے ہیں؟" علم دین کے شیدائی نے عرض کی "میری درخواست تو یہ ہے کہ آپ مجھے وہ علم سکھائیں جو اللہ نے آپ ﷺ کو سکھایا ہے" یہ سن کر رسول ﷺ پاک نے فرمایا "چادر پھیلاؤ۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی چادر پھیلا دی۔ پھر حضور ﷺ احادیث بیان فرمانے لگے۔ جب آپ ﷺ نے اپنی بات ختم کی تو فرمایا، "اس چادر کو سمیٹ کر اپنے جسم سے لگالو۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے ایسا ہی کیا۔ آپؓ فرماتے ہیں "اس کے بعد میرے حافظے کا یہ حال تھا کہ جو کچھ حضور ﷺ ارشاد فرماتے اس کا ایک حرف بھی نہیں بھولتا۔"

ایک بار مدینے کے گورنر مروان نے آپؓ کا امتحان لیا۔ انہوں نے اپنے کاتب کو تخت کے نیچے بٹھادیا اور آپؓ سے احادیث پوچھنا شروع کیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ احادیث بیان فرماتے جاتے تھے اور تخت کے نیچے چھپا ہوا کاتب لکھتا جاتا تھا۔ ایک سال بعد مروان نے پھر اسی طرح سے ابو ہریرہؓ کو بلوایا اور کاتب کو تخت کے نیچے بٹھا دیا۔ احادیث پوچھنا شروع کیں، حضرت ابو ہریرہؓ نے وہی احادیث بیان کر دیں حتیٰ کہ ان کی ترتیب میں کوئی فرق نہ آیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے علم سے بڑے بڑے صحابہ کرامؓ نے استفادہ کیا ہے۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ شامل ہیں۔ آپؓ کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہے جن میں متعدد تابعین شامل ہیں۔ آپؓ کا شمار مدینے کے فقہا کرام میں ہوتا ہے۔ رسول پاک ﷺ کے بعد مدینہ منورہ میں جس جماعت کو فتویٰ دینے کی ذمے داری سونپی گئی اس کے ایک رکن آپؓ بھی تھے۔ عربی آپؓ کی مادری زبان تھی، تاہم آپؓ فارسی زبان بھی جانتے تھے۔ دیگر مذاہب پر بھی آپؓ کی نظر تھی اور توریت کے مسائل سے خاصی واقفیت تھی۔

آپؓ کو عبادت سے خصوصی لگاؤ تھا۔ آپؓ کا خاندان تین افراد پر مشتمل تھا۔ آپؓ، آپ کی اہلیہ اور خادم۔ آپؓ کا معمول تھا کہ رات کو جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے اور اپنی اہلیہ اور خادم کو بھی عبادت کے لیے جگادیا کرتے تھے۔

ہر ماہ کے شروع میں تین روزے رکھا کرتے تھے۔ آپؓ فرماتے تھے کہ "ایسا میں اس لیے کرتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے تو کم از کم وہ ماہ تو روزوں کے ثواب میں لکھا جائے"۔

ذکر اللہ کا بطور خاص اہتمام کرتے تھے۔ آپؓ کے پاس ایک تھیلی میں کنکریاں اور گٹھلیاں بھری رہتی تھیں ان پر تسبیحات پڑھا کرتے تھے۔

ایک بار حضرت شفیا اصبحیؒ مدینہ منورہ آئے۔ آپؒ نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور بزرگ احادیث بیان فرما رہے ہیں۔ آپؒ نے پوچھا، "یہ کون ہیں؟" لوگوں نے بتایا، "یہ حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔" آپؒ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ جب لوگ حدیثیں سن کر رخصت ہوگئے تو حضرت اصبحیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا، "کوئی ایسی حدیث سنایئے جسے آپؓ نے حضور ﷺ سے خود سنا ہو، سمجھا ہو اور جانا ہو۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا، "ایسی ہی حدیث بیان کروں گا"۔ یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہوش میں آئے تو فرمایا، "میں آپ سے ایسی حدیث بیان کروں گا جو حضور ﷺ نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی، اس وقت میرے اور آپ ﷺ کے سوا کوئی تیسرا شخص نہ تھا۔" یہ کہا اور پھر چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد ہوش میں آئے تو فرمایا، "آپؒ سے ایسی حدیث بیان کروں گا جو حضور ﷺ نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور میرے اور آپ ﷺ کے سوا یہاں کوئی نہ تھا۔" یہ کہا اور چیخ مار کر تیسری بار بے ہوش ہوگئے۔

حضرت اصبحیؒ نے آپؓ کو تھام لیا، دیر تک تھامے رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو ہوش آیا تو فرمایا، "رسول ﷺ اللہ نے فرمایا تھا، قیامت کے دن سب سے پہلے تین آدمی طلب کیے جائیں گے، ایک عالم قرآن پاک، راہ خدا میں شہید ہونے والا اور دولت مند۔ اللہ تعالیٰ عالم دین سے پوچھیں گے، "کیا میں نے تجھ کو قرآن کی تعلیم نہیں دی؟" وہ کہے گا "ہاں میرے خدا۔" اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے، "تو نے اس پر کیا عمل کیا؟" وہ جواب دے گا، "رات دن اس کی تلاوت کرتا تھا"۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، "تو جھوٹا ہے، تو اس لیے تلاوت کرتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کا خطاب دیں، چنانچہ خطاب دیا جاچکا۔" پھر دولت مند سے سوال کیا جائے گا، "کیا میں نے تجھ کو مال و دولت نہیں دیا کہ تو بے نیاز ہوگیا؟" وہ کہے گا، "ہاں میرے خدا۔" اللہ تعالیٰ پوچھیں گے، "تو نے

Marfat.com

اس دولت کا کیا کیا؟" وہ کہے گا، "میں صلہ رحمی کرتا تھا، صدقہ دیتا تھا۔" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے "جھوٹ بولتا ہے، تیرا مقصد تو یہ تھا کہ تو فیاض اور سخی کہلائے۔ سو لوگوں نے کہہ دیا۔" پھر وہ شخص پیش ہوگا جسے اپنی جان راہِ خدا میں دینے کا دعویٰ تھا، اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے، "تو کیوں مار ڈالا گیا؟" وہ کہے گا، "اے اللہ آپ نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا، میں آپ کی راہ میں لڑا اور مارا گیا۔" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، "تو جھوٹ کہتا ہے، تو چاہتا تھا کہ تو دنیا میں جری اور بہادر کہلائے تو یہ کہا جا چکا۔"

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا، یہ حدیث بیان فرما کر رسول اللہ ﷺ نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا، "ابو ہریرہؓ، سب سے پہلے انہی تینوں پر جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔"

اس حدیثِ رسول ﷺ کو بیان کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ کا تین مرتبہ بے ہوش ہو جانا، آپؓ کے خوفِ خدا کی بے پناہ شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپؓ اس حقیقت سے بخوبی باخبر تھے کہ انسان اگر ساری عمر نیک اعمال کرتا رہے، لیکن اس کی نیت درست نہ ہو تو اس کے سارے اعمال اکارت جاتے ہیں۔

***

Marfat.com

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ

جلیل القدر صحابی رسول، جنہیں رحمت دو عالم ﷺ کی میزبانی کی سعادت حاصل ہوئی

دروازے پر دستک ہوئی!

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ صاحب خانہ باہر آئے اور ایک بزرگ کو دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی اور عقیدت کے ساتھ بزرگ کو خوش آمدید کہا اور مکان کے اندر چلنے کی درخواست کی۔ بزرگ سیکڑوں میل کا سفر کر کے ابھی ابھی یہاں پہنچے تھے۔ ان کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی۔ طویل سفر کی تکان اور عمر کا تقاضا یہی تھا کہ بزرگ کچھ دیر آرام فرماتے، غسل کر کے تازہ دم ہو جاتے اور کھانا تناول فرماتے، لیکن بزرگ کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فی الحال ٹھہرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور انہیں کوئی ضروری کام درپیش ہے۔ بزرگ نے اس مکان میں ٹھہرنے کی بجائے شہر کے حاکم کے مکان کا پتا دریافت کیا۔ صاحب خانہ نے بزرگ کو پتے سے آگاہ کر دیا۔

بزرگ بتائے ہوئے پتے پر پہنچے۔ حاکم کو اطلاع ہوئی تو وہ بے تابانہ باہر نکل آئے اور بزرگ کا بڑی محبت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اپنی رہائش گاہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ لیکن بزرگ نے حاکم شہر سے فرمایا: ”میں تم سے ایک خاص حدیث رسول ﷺ سننے کے لیے آیا ہوں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ دنیا بھر میں اس حدیث کا جاننے والا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے یہ حدیث اس وقت فرمائی تھی جب تمہارے سوا ان کی خدمت میں کوئی نہ تھا۔“

حاکم شہر نے حدیث کی نوعیت معلوم کی اور تصدیق کی کہ انہوں نے سرور کائنات ﷺ سے یہ حدیث سنی تھی، اس کے بعد انہوں نے حدیث کے الفاظ بزرگ کے سامنے دہرائے۔

حدیث سن لینے کے بعد بزرگ نے حاکم شہر سے اجازت چاہی، سیکڑوں میل کے سفر کی تکان ان کا راستہ نہ روک سکی، نہ انہوں نے کچھ دیر آرام فرمایا، نہ غسل کیا، نہ کھانا کھایا، بلکہ حدیث سنتے ہی حاکم شہر سے الوداعی مصافحہ کر کے اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور سیکڑوں میل دور اپنے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔

حدیثِ رسول ﷺ کی سماعت کی خاطر سیکڑوں میل کا سفر کرنے والے یہ بزرگ تھے، عظیم المرتبت صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ جنہیں ربِ کریم نے اپنے محبوب پیغمبر، رحمۃ للعالمین ﷺ کی طویل عرصے تک میزبانی کا شرف عطا فرمایا۔ آپؓ کو حدیثِ رسولؐ جاننے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ آپؓ نے صرف ایک حدیث کی تصدیق کی خاطر مدینہ منورہ سے مصر تک کا طویل سفر طے کیا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع تیز رفتار نہ تھے اور راستے بھی ہموار نہ تھے، پھر آپؓ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن آپؓ کو علم تھا کہ مصر کے حاکم حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ ہی اس خاص حدیث کے سامع ہیں اور ان کی روایت کردہ احادیث مستند سمجھی جاتی ہیں اس لیے آپؓ نے یہ حدیث سننے کی خاطر سیکڑوں میل کا سفر طے کیا۔ پھر آپؓ کے اخلاصِ نیت کا یہ عالم ہے کہ جب آپؓ نے اپنے سفر کا مقصد حاصل کر لیا یعنی حدیث سن لی تو مزید کچھ دیر ٹھہرنا گوارا نہ کیا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو صرف میزبانِ رسول ﷺ ہونے ہی کی فضیلت حاصل نہیں بلکہ آپؓ کو دیگر کئی فضیلتیں بھی حاصل ہیں۔ آپؓ انصارِ مدینہ میں ایمان لانے والے اولین صحابہؓ میں سے ہیں۔ آپ بیعتِ عقبہؑ کبیرہ اور بیعتِ رضوان میں شریک تھے۔ آپؓ کو تمام غزوات اور متعدد جنگوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور قسطنطنیہ کے معرکے کے دوران، یعنی حالتِ جہاد میں آپؓ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

آپؓ کا نام خالد بن زید ہے لیکن آپؓ اپنی کنیت ابو ایوب کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ آپؓ کے ایک صاحبزادے کا نام ایوب تھا، چنانچہ ان

Marfat.com

کی نسبت سے آپؓ ابو ایوب کہلائے۔ یہ کنیت اتنی معروف ہوئی کہ لوگ آپؓ کا اصل نام بھول گئے اور لوگوں کی بڑی تعداد کو آپؓ کے اصل نام کا علم ہی نہ ہو سکا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ، رسولِ اقدس ﷺ اور دیگر مسلمانوں کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت سے ۳۰ سال قبل مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں یہ شہر یثرب کے نام سے مشہور تھا۔ آپؓ کی والدہ محترمہ کا نام ہند بنت سعد تھا۔ آپؓ کا تعلق مدینہ منورہ کے مشہور قبیلے خزرج کے خاندانِ نجار سے تھا۔ اس قبیلے کو ایک فضیلت یہ حاصل تھی کہ یہ قبیلہ حضور ﷺ اکرم کے ننھیال کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ حضور ﷺ اکرم کی پردادی، حضرت سلمٰی (حضور ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ) اسی خاندان، بنو نجار سے تھیں۔ صحیح بخاری میں ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: انصار کے گھرانوں میں سب سے بہتر گھرانے بنو نجار کے ہیں۔ صحیح مسلم کے مطابق رسول ﷺ پاک نے فرمایا: اگر میں انصار کے کسی گھرانے میں شامل ہوتا تو بنو نجار میں شامل ہوتا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا تعلق ایک متمول اور خوشحال گھرانے سے تھا۔ آپؓ بنو نجار کے رئیس تھے۔ انصار کا عام پیشہ زراعت تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی کھجوروں کے ایک باغ کے مالک تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ہجرت سے قبل آپؓ نے پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ غالباً زراعت کے ساتھ ساتھ آپؓ نے پارچہ بافی کو بھی اپنا رکھا تھا۔

یثرب (مدینہ منورہ) میں دو بڑے قبائل اوس اور خزرج آباد تھے۔ ان قبائل میں دینِ حق، اسلام کی دعوت سب سے پہلے ایک تعلیم یافتہ شخص سوید الکامل کے ذریعے پہنچی، لیکن انہیں اسلام کی تعلیمات کو پھیلانے کا زیادہ موقع نہ ملا اور وہ اوس اور خزرج کی باہمی لڑائی میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کے بعد ایک اور فرد ایاس بن معاذ ایمان لائے لیکن ان کا انتقال بھی ہجرت نبویؐ سے قبل ہو گیا۔ نبوت کے دسویں سال، حج کا زمانہ آیا تو آنحضرت ﷺ عازمین حج سے ملاقاتیں کرتے ہوئے، انہیں اسلام کی انقلابی دعوت پہنچاتے ہوئے منیٰ میں ایسے خیموں کے پاس پہنچے جہاں یثرب سے آئے ہوئے عازمین حج ٹھہرے ہوئے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی دلنشیں گفتگو اور دعوتِ اسلام کے پُراثر انداز سے متاثر ہو کر چھ افراد نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا، ان تمام افراد کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ یہ افراد لوٹ کر مدینہ منورہ گئے تو اسلام کی دعوت پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال حج کے زمانے میں یثرب سے ۱۲ مسلمان مکہ مکرمہ آئے۔ انہوں نے رات کے وقت منیٰ (عقبیٰ کی گھاٹی میں وہ مقام جہاں اب ایک مسجد ہے) میں حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت عقبیٰ اولیٰ کہلاتی ہے۔ ان افراد کی درخوست پر حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو معلم بنا کر ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ نے یثرب پہنچتے ہی اسلام کی تعلیم دینے کا آغاز کر دیا۔ آپؓ کی کوششوں سے حضرت اسعد بن زرارہؓ، قبیلہ اوس کے سربراہ حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت اسید بن حضیرؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

چند ماہ بعد حج کا زمانہ آ گیا۔ ۱۲ نبوی میں یثرب سے ۵۰۰ افراد کا ایک کارواں حج کے لیے روانہ ہوا۔ اس کارواں میں ایسے ۷۳ مرد اور ۲ خواتین بھی شامل تھیں جنہیں ایمان لانے کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ تنازعہ پیدا ہو جانے کے خدشے کے پیش نظر ان ۷۵ افراد کا ایک الگ قافلۂ حج نہیں تشکیل دیا گیا تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی اس مبارک قافلے کے ہم سفر تھے۔ مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد رسول اقدس ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ ۷۵ نفوس رات کی تاریکی میں عقبہ کی گھاٹی میں ایک درخت کے نیچے جمع ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان سے بیعت لی کہ وہ اپنی جانوں اور اہل و عیال کی مانند، حضور ﷺ کی حفاظت کریں گے اور دین کو پھیلانے میں آپ ﷺ کی پوری مدد کریں گے۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ یا بیعت عقبہ کبیرہ کہا گیا ہے۔

اس بیعت کو تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت حال یہ تھا کہ کفار، مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، بہت کم لوگوں میں یہ جرأت تھی کہ دینِ حق کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کا اعلان کریں لیکن اس کرۂ ارض پر یہ ۷۵ افراد تھے جو ایمان کی لذت سے آشنا تھے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر بڑے بڑے خطرے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار تھے۔ راہِ حق کے ان دیوانوں میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ سب سے آگے تھے۔ مشہور

Marfat.com

سیرت نگار ابن ہشام نے بیعت عقبہ ثانیہ کرنے والوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا نام سب سے پہلے درج کیا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ حج سے واپس لوٹے تو ایک انوکھی کیفیت سے سرشار تھے۔ آپؓ کو دنیا کے سب سے بڑے انسانؐ، ہادیِ برحق ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ آپؓ یثرب پہنچتے ہی اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ آپؓ کی تبلیغ سے آپ کی اہلیہ محترمہ امّ ایوب انصاریہؓ بھی ایمان لے آئیں۔ اب یثرب کے مسلمانوں کو اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا انتظار تھا۔ انہیں علم ہوچکا تھا کہ آنحضرت ﷺ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح ہجرت فرماکر یثرب کو عزت بخشنے والے ہیں۔

اب حال یہ تھا کہ یثرب کے قبیلوں اوس اور خزرج کے مسلمان، روزانہ چلچلاتی دھوپ میں یثرب سے چار میل دور حرہ کے علاقے تک جاتے تھے۔ ٹیلوں پر چڑھ کر آنحضرت ﷺ کی راہ دیکھتے تھے اور دوپہر تک انتظار کرکے ناکام لوٹ آتے تھے۔ نبیٔ برحق ﷺ کا بے تابی سے انتظار کرنے والے ان شیدائیوں میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے۔

آخر وہ مبارک دن آگیا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳ نبویؐ (ایک روایت کے مطابق ۸ ربیع الاول ۱۳ نبویؐ) کو آنحضرت ﷺ اپنے رفیق و ہمدم حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ قبا پہنچ گئے جو یثرب سے تین میل دور واقع ایک بستی ہے۔ آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع اوس و خزرج کے مسلمانوں کو مل چکی تھی۔ وہ ہتھیار سجاکر آپؐ کے استقبال کے لیے آئے۔ قبا میں آنحضرت ﷺ نے ۱۴ دن قیام کیا۔ اس دوران آپ ﷺ کے حکم سے یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی۔

اب سرورِ کونین ﷺ کی سواری یثرب کی جانب روانہ ہوئی۔ یثرب والوں کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ وہاں جشن کا سماں تھا۔ ہر گھر سجا ہوا تھا۔ راستے کے دونوں جانب ہتھیار بند افراد کھڑے تھے۔ ان کی تلواروں کی چمک چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ حضورِ اقدس ﷺ کی سواری کے دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، مسلمانوں کے دستے چل رہے تھے۔ یثرب کے حبشی ایک جانب اپنے فوجی کرتب دکھا رہے تھے۔ بچے خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔ خواتین اپنے گھروں کی چھتوں پر اوٹ لیے کھڑی تھیں۔ راستے میں متعدد قبائل کے سرکردہ افراد سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ادب سے درخواست کرتے کہ حضور اکرم ﷺ ہمارا گھر حاضر ہے، ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ ہر قبیلے کی دعوت پر اس کے لیے دعائے خیر فرماتے اور کہتے جاتے: اس (اونٹنی) کو چھوڑ دو، یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہے۔ آپ ﷺ نے اونٹنی کی مہار چھوڑ دی تھی، اونٹنی اپنی مرضی سے چل رہی تھی اور سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ دیکھیں وہ کون خوش نصیب ہے جسے دونوں جہاں کے سردار ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

سرکارِ دوعالم ﷺ کی اونٹنی جب بنو نجار کے محلے میں پہنچی تو اس جگہ جا کر بیٹھ گئی جہاں آج کل مسجد نبویؐ کا بڑا دروازہ ہے۔ آنحضرت ﷺ اونٹنی سے نہ اترے۔ اونٹنی کھڑی ہوگئی اور تھوڑی دور چل کر واپس اسی جگہ آکر بیٹھ گئی جہاں تھوڑی دیر قبل بیٹھی تھی۔ اب کی بار اونٹنی نے وہ مخصوص آواز نکالی جسے اونٹ بیٹھنے کے وقت نکالتے ہیں۔ اس جگہ کے قریب حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا گھر واقع تھا۔ وہ بے اختیار مسرت کے عالم میں دوڑے۔ اس دوران بنو نجار کے دیگر افراد بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہر ایک کی تمنا تھی کہ سرکار دوجہاں ﷺ کی میزبانی کا شرف اسے حاصل ہو۔ رحمت دوعالم ﷺ نے کسی کی حوصلہ شکنی نہ کی اور فرمایا کہ قرعہ ڈال لو۔ قرعہ ڈالا گیا تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہی کا نام نکلا۔

یہی واقعہ بعض دیگر روایات میں قدرے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے رسالت مآب ﷺ کو اپنے دومنزلہ مکان کی بالائی منزل پیش کی لیکن آپ ﷺ نے ملنے کے لیے آنے والوں کی سہولت کے خیال سے نچلی منزل پسند فرمائی۔ کچھ عرصے بعد حضرت ابوایوب انصاریؓ کی درخواست پر حضور ﷺ اوپری منزل میں منتقل ہوگئے۔ اس مکان میں رسولِ اقدس ﷺ نے تقریباً چھ ماہ قیام کیا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے اسی مکان میں یہود کے ایک بڑے عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اسلام قبول کیا۔

رسول مقبول ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں فروکش ہونے کے چند دن بعد ایک مسجد بنانے کا فیصلہ فرمایا۔ یثرب کا نام رسول اللہ ﷺ نے طیبہ اور طابہ رکھ دیا تھا اور یہ مدینۃ النبیؐ بھی کہلانے لگا تھا۔ یہ مدینے کی پہلی مسجد تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت

Marfat.com

ابو ایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے اس قطعہ زمین کو منتخب فرمایا جہاں آپ ﷺ کی اونٹنی آکر بیٹھی تھی۔ یہاں کچھ قبریں اور کھجور کے درخت تھے۔ یہ زمین دو یتیم بچوں سہلؓ اور سہیلؓ کی ملکیت تھی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ زمین بلا قیمت لینا گوارا نہ فرمایا اور لوگوں کے مشورے سے اس کی قیمت دس مثقال (پونے چار تولے) سونا مقرر فرمائی۔ ایک روایت کے مطابق یہ رقم حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ادا فرمائی۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ رقم حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ادا کی اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت اسعد بن زرارہؓ نے ایک باغ دونوں بچوں کو دے دیا تھا۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اس میں آپؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجرے بن گئے تو حضور ﷺ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر سے، مسجد نبویؐ سے متصل حجرے میں منتقل ہوگئے۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کے منافقوں نے مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ مدینے کے یہود بھی اس قسم کی منفی سرگرمیوں میں ملوث ہوگئے تھے چنانچہ رسول اقدس ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت فرمائی کہ وہ رات کو ہتھیار باندھ کر سویا کریں۔ ایک رات حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی باری تھی۔ آپؓ نے رات بھر جاگ کر پہرہ دیا۔ دونوں جہان کے سردار ﷺ نے آپؓ کے حق میں دعا فرمائی: "اے ابو ایوبؓ، اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے کہ تم نے اس کے نبیؐ کی حفاظت کی۔" کیا مرتبہ ہوگا اس صحابیؓ کا جسے اللہ کے حبیب ﷺ کے تحفظ کے لیے پہرہ دینے کی سعادت حاصل ہوئی اور رحمت عالم ﷺ نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بقیہ تمام عمر مصیبتوں اور تکالیف سے محفوظ رہے حتیٰ کہ آپؓ کی رحلت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی قبر کی حفاظت غیر مسلموں کے ہاتھوں کروائی، بالآخر مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا جہاں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر واقع ہے۔

ہجرت کے پانچ ماہ بعد آنحضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آنے والوں اور مدینہ منورہ میں ان مہاجرین کی میزبانی کرنے والے انصار کے درمیان مواخات (بھائی چارہ) کروا دی۔ اس بھائی چارہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک جانب تو مہاجرین اس نئے معاشرے سے مانوس ہو جائیں، اس میں اچھی طرح جذب ہو سکیں اور اپنے گھر چھوڑنے کے باعث فطری طور پر جو غم ہوتا ہے وہ بھی دور ہو سکے۔ دوسری جانب مہاجرین جو دنیا کے سب سے بڑے معلم ﷺ سے تربیت پا چکے تھے وہ اپنے نو مسلم بھائیوں کی تربیت کر سکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھائی چارہ کرواتے ہوئے دونوں بھائیوں کے مزاج اور رجحان کا خاص خیال رکھا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا بھائی چارہ مشہور صحابی رسول حضرت مصعب بن عمیرؓ سے کروایا گیا۔ دونوں بھائیوں کے حالات میں کئی باتیں مماثل تھیں۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ متمول اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انصاریوں میں بہت ابتدا میں ایمان لائے۔ ایمان لانے کے بعد آپؓ نے اسلام کی تعلیم دینے کا آغاز کر دیا اور اللہ کی راہ میں قربانی دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہے۔ دوسری جانب حضرت مصعب بن عمیرؓ کا تعلق بھی بہت دولت مند گھرانے سے تھا۔ انہوں نے بڑے عیش و آرام میں پرورش پائی تھی۔ آپؓ مہاجرین میں ابتدائی دور میں ایمان لانے والوں میں سے تھے، اور آپؓ کو بھی حضورؐ اقدس نے معلم بنا کر مدینہ منورہ بھیجا تھا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ہر غزوہ میں شریک ہوئے اور رسول پاک ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپؓ نے ایک کے سوا ہر جنگ میں شرکت کی۔ ہجرت کے کچھ ہی عرصے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا۔ یہ عجیب موقع تھا کہ اس پوری دنیا میں صرف ۳۱۳ نفوس کلمہ حق پڑھتے ہوئے اسلام کا پرچم تھام کر کفر کی طاقت سے ٹکرانے چلے تھے۔ کسے خبر تھی کہ صرف چند برسوں میں یہ دین حق پورے عالم عرب پر رحمت فگن ہو جائے گا اور اس کے بعد دنیا کا بہت بڑا حصہ اس کی برکتوں سے مستفید ہو رہا ہوگا۔

بدر کے نازک موقع پر یہ ۳۱۳ صحابہ کرامؓ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں کا مرتبہ بہت بلند رکھا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بدری صحابیوںؓ کو ہمیشہ دوسروں پر فوقیت دی۔ مجلس میں بیٹھنے کی جگہ نہ ہوتی تو دیگر اصحابؓ کو اٹھنے کا حکم دیا اور بدری صحابہؓ کو بیٹھنے کی جگہ دلوائی۔ بعد ازاں، خلفائے راشدینؓ نے بھی بدری صحابہؓ کو ہر موقع پر اہمیت دی۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی ان خوش نصیب صحابہ کرامؓ میں شامل ہیں جنہیں غزوۂ بدر میں شرکت کی فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معرکۂ بدر میں اپنے دین کے مٹھی بھر علم برداروں کو کفار کی بڑی

Marfat.com

جمعیت پر غالب فرمایا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس غزوہ میں ایک شخص مطلب بن حطیب کو جنگی قیدی بنایا۔ مطلب کے پاس فدیہ دینے کے لیے کچھ نہ تھا اس لیے بعد میں اسے فدیہ لیے بغیر ہی رہا کر دیا گیا۔

بدر کے بعد حضرت ابو ایوب انصاریؓ غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق) میں شریک ہوئے۔ پھر ذی قعدہ ۶ ھ میں سرورِ عالم ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اندیشہ تھا کہ قریش مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اور یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عثمان غنیؓ کو سفیر بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا اور خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ سے باہر ٹھہر گئے۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کو واپس جانے نہ دیا۔ مسلمانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم عثمانؓ کا بدلے لیے بغیر نہیں جائیں گے۔ پھر آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہو گئے اور آپ ﷺ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے تمام ۱۴۰۰ اصحابؓ سے بیعت لی کہ جب تک ہماری جان میں جان ہے، کفار سے لڑیں گے۔ بیعت کرنے والوں میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ کو صحابہ کرامؓ کی بیعت کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کا تذکرہ قرآن کریم میں فرمایا اور اس بیعت میں حصہ لینے والوں کے لیے "اصحاب الشجرہ" کے الفاظ استعمال فرمائے۔

سنہ ۶ ھ کے آخر یا سنہ ۷ھ کے شروع میں خیبر کی مشہور جنگ پیش آئی۔ خیبر، عرب میں یہود کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ مدینہ منورہ سے ۳۰۰ میل دور ہے۔ غزوۂ احزاب میں ہزیمت اٹھانے کے بعد یہود نے جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کو ان تیاریوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اعلان کروا دیا کہ یہود سے جنگ کی جائے گی اور ہمارے ساتھ وہ لوگ آئیں جو جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۶۰۰ جانثارانِ رسولؐ تیار ہو گئے۔ ان میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے۔ مسلمانوں کی یہ مختصر سی فوج خیبر پہنچی۔ یہود قلعہ بند ہو گئے اور اندر سے تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی لیکن صرف ایک ماہ میں مسلمانوں نے خیبر کے سارے قلعے فتح کر لیے۔ ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا، پھر غزوۂ حنین ہوا۔ ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ ان تمام معرکوں میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ پیش پیش تھے۔ آپؓ نے ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں بھی شرکت فرمائی۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا۔ مصر فتح کرنے کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ نے ایک لشکر شمالی افریقہ روانہ کیا جو برقہ کے علاقوں کو فتح کر کے لوٹا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس لشکر میں بھی شامل تھے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ آپؓ نے تقریباً اسی برس کی عمر میں بھی جنگوں میں حصہ لیا۔ آپؓ نے جہاد کی غرض سے تین براعظموں، ایشیا، افریقہ اور یورپ کا سفر کیا۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی پہلی فوج جو بحری جہاد کرے گی اس پر جنت واجب ہو گئی۔ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا، میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر قسطنطنیہ پر جہاد کرے گا اس کے لیے مغفرت ہے (البدایہ والنہایہ)۔ ان ارشاداتِ رسولؐ کے باعث مسلمان، رومیوں کے خلاف جہاد کے بے چینی سے منتظر تھے۔ آخر یہ موقع حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت معاویہؓ کے دور میں مسلمانوں کو مل گیا۔ مسلمان پہلی بار قسطنطنیہ کب پہنچے، اس بارے میں مؤرخین کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ سنہ ۴۴ھ / ۶۶۴ء میں پہنچ چکے تھے۔ ایک روایت ہے کہ یہ معرکہ ۴۸ھ یا ۴۹ھ میں ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق ۵۱ھ میں مسلمان قسطنطنیہ کی فصیلوں کے سامنے نمودار ہوئے۔ بہر حال، یہ جنگ سات سال تک جاری رہی۔ اس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ بھی شریک تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس فوجی دستے میں شامل تھے جس کے سربراہ حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولیدؓ تھے۔

رومیوں نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر محصور ہو جانا مناسب سمجھا اور اپنے شہر کی مضبوط فصیل کی آڑ لے کر مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ اسی دوران حضرت ابو ایوب انصاریؓ علیل ہو گئے۔ آپؓ کی علالت بے حد شدت اختیار کر گئی۔ امیر لشکر آپؓ کی عیادت کے لیے آئے تو آپؓ نے ان سے کہا "میں جب انتقال کر جاؤں تو تم میری میت دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک لے جا سکو، لے جا کر دفن کرنا۔"

اسی مرض میں آپؓ نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا۔ آپؓ کا سنہ وفات ۴۹ھ، ۵۰ھ یا ۵۲ھ لکھا گیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ

Marfat.com

جنگ قسطنطنیہ سات برس تک جاری رہی تھی۔ مؤرخین کی اکثریت ۵۲ھ / ۶۷۲ء کو ترجیح دیتی ہے۔

مسلمانوں نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے جسدِ مبارک کو اٹھایا اور رات کے وقت لے جاکر قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے سپرد خاک کر دیا۔ صبح ہوئی تو قیصر روم نے مسلمانوں سے دریافت کروایا کہ رات آپ لوگ مصروف نظر آرہے تھے معاملہ کیا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ ہمارے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابیؓ کا انتقال ہوگیا تھا۔ ہم ان کی تدفین میں مشغول تھے۔ قیصر نے پیغام بھجوایا کہ جب تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے تو ہم اس قبر کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ مسلمانوں کی طرف سے قیصر کو سخت انتباہ کیا گیا کہ اگر تم نے اس قبر کی بے حرمتی کی کوشش کی تو پورے عالم اسلام میں کسی گرجا میں ناقوس نہ بج سکے گا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ ختم کر دیا۔ حالات ایسے نہ تھے کہ محاصرہ جاری رکھا جاتا۔ قیصر روم نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا بلکہ ایک روایت کے مطابق تو خود قیصر نے آپؓ کی قبر پر گنبد تعمیر کروایا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر کے آثار سیکڑوں برس بعد محو ہوگئے۔ پھر جب ۸۵۷ھ / ۱۴۵۳ء میں ساتویں عثمانی فرمانروا محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے اس پر پہلی بار علم اسلام لہرایا تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر بھی دریافت کرلی گئی۔ مسلمانوں کو یہ تو علم تھا کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ قسطنطنیہ کی فصیل تلے دفن ہیں لیکن آپؓ کی قبر کہاں ہے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد محمد فاتح نے آپؓ کی قبر کی تلاش شروع کروادی۔ محمد فاتح نے اپنے شیخ الاسلام شیخ شمس الدینؒ سے بھی مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی دیر مراقبہ کیا اور پھر ایک جگہ کی نشاندہی کی۔ اس جگہ کو کھودا گیا تو سنگ مرمر کا ایک کتبہ برآمد ہوا جس پر عبرانی زبان میں عبارت تحریر تھی۔ عبرانی سے واقف افراد کو بلایا گیا تو تصدیق ہوگئی کہ یہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر کا کتبہ ہے۔ یہی کتبہ آج بھی آپؓ کی قبر کے باہر دیوار میں نصب ہے۔

محمد فاتح نے آپؓ کی قبر پر ایک شاندار گنبد تعمیر کروایا۔ اس کے قریب جامع مسجد تعمیر کروائی جو جامع ابو ایوبؓ کہلاتی ہے۔

مسجد کی تعمیر کے بعد محمد فاتح نے اس مسجد میں جاکر نماز ادا کی اور نماز کے بعد شیخ الاسلام نے ان کی کمر میں تلوار باندھی۔ اس کے بعد یہ دستور ہوگیا کہ جو بھی نیا عثمانی فرمانروا بنتا تھا، وہ سب سے پہلے جامع ابو ایوبؓ آتا تھا اور اس وقت کے شیخ الاسلام نئے فرمانروا کی کمر سے، پہلے عثمانی حکمراں عثمان خان کی تلوار باندھتے تھے۔ اس کے بعد دعا کی جاتی تھی۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کی عمارت بڑی عالی شان ہے۔ اس کی اطراف دلکش جالی لگی ہوئی ہے۔ پوری عمارت منقش ہے۔ چاروں جانب کتبے آویزاں ہیں۔ مزار کے قریب ایک قبرستان ہے جو گورستانِ ابو ایوب انصاریؓ کے نام سے معروف ہے۔ قریب ہی جامع ابو ایوبؓ ہے، اس کے ایک کمرے میں سبز چادر میں لپٹا ہوا علَم رکھا گیا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اسی علَم کو لڑائیوں میں اٹھا کر چلتے تھے۔ عثمانی سلاطین کے زمانے میں مزار سے ملحق دینی تعلیم کا ایک مدرسہ بھی تھا۔ یہ مدرسہ اب بند ہو چکا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مکان مدینہ منورہ میں آج بھی موجود ہے۔ وہاں ایک کنواں بھی "بئر ابو ایوب" کے نام سے تھا لیکن اب اس کنویں کے آثار نہیں ملتے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا شمار ان رفیع الدرجات اصحابِؓ رسولؐ میں ہوتا ہے جنہوں نے حضورِ اقدس ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں پورا قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ آپؓ بہت بلند پایہ عالم تھے۔ بڑے بڑے بزرگ صحابہ کرامؓ علمی مسائل میں آپؓ کی بصیرت اور علم سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات اختلافی مسائل کی صورت میں آپؓ سے رجوع کیا جاتا تھا اور آپؓ اپنی علمی استعداد، ذکاوت اور تدبر سے کام لیتے ہوئے ان مسائل کو حل فرمادیتے تھے۔ آپؓ سے جن صحابہؓ کرام نے استفادہ کیا ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت زید بن خالد جہنیؓ، حضرت عبداللہ بن یزید خطمیؓ، حضرت مقدام بن معد یکربؓ اور حضرت جابر بن سمرۃؓ شامل ہیں۔ آپؓ سے علمی فیض پانے والے تابعین میں حضرت عروہ بن زبیرؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سالم بن عبداللہؒ، حضرت عطا بن یسارؒ، حضرت عطا بن یزید لیثیؒ، حضرت ابو سلمہؒ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ جیسے اکابرین شامل ہیں۔

ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت مسور بن مخرمہؓ میں اس بارے میں اختلاف پیدا ہوا کہ کوئی شخص احرام کی حالت میں

Marfat.com

غسلِ جنابت (ناپاکی دور کرنے کے لیے غسل) کرتے ہوئے اپنے سر کو ہاتھ سے دھو سکتا ہے یا نہیں۔ دونوں صحابہ کرامؓ نے حضرت عبداللہ بن حسینؓ کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی خدمت میں بھیجا۔ جب حضرت عبداللہؓ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر پہنچے تو اتفاق سے وہ غسل فرما رہے تھے۔ حضرت عبداللہؓ کی آمد کا مقصد انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے چادر کی اوٹ سے اپنا سر باہر نکالا اور اس پر اپنا ہاتھ پھیرا، پھر ایک شخص سے کہا کہ پانی ڈالو۔ اس نے پانی ڈالا تو آپؓ نے ہاتھوں سے سر کو حرکت دی اور ہاتھوں کو سر پر آگے سے پیچھے لے گئے اور واپس لائے۔ پھر فرمایا: "میں نے رسول ﷺ اللہ کو اس طرح غسل فرماتے دیکھا ہے۔"

آپؓ کو احادیثِ رسولؐ کی اشاعت اور انہیں زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانے کا خیال رہتا تھا۔ قسطنطنیہ کے محاذ پر جب آپؓ بسترِ مرگ پر تھے، اس وقت بھی آپؓ نے دو احادیث رسول ﷺ بیان فرمائیں جو اس سے قبل بیشتر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے علم میں نہ تھیں۔ آپؓ کی رحلت کے بعد عام اعلان کے ذریعے ان احادیث کو تمام لوگوں تک پہنچایا گیا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو حدیثیں جاننے کا جس قدر شوق تھا اس کا اندازہ اس مضمون کے آغاز میں بیان کیے گئے واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

آپؓ سے ایک سو پچاس احادیث روایت کی گئی ہیں۔ آپؓ سے حدیث روایت کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت زید بن خالد جہنیؓ، حضرت عبداللہ بن یزید خطمیؓ، حضرت جابر بن سمرہؓ، حضرت ابو حر صر انصاریؓ، حضرت مقدامؓ بن عمرو بن معدیکرب جیسے عظیم صحابہ کرامؓ شامل ہیں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو رسول اقدس حضرت محمد ﷺ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ آپؓ نے مدینہ منورہ میں پانچ یا چھ ماہ تک حضور ﷺ اکرم کی جس طرح میزبانی کی وہ آپؓ کے حبِّ رسول ﷺ کی آئینہ دار ہے۔ رسولؐ پاک جن دنوں آپؓ کے مہمان تھے تو آپؓ، حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا پیش کیا کرتے تھے۔ دیگر اصحابؓ بھی آپ ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتے تھے۔ جو کھانا بچ جاتا تھا، حضور اکرم ﷺ اسے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے پاس بھجوا دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی آنحضرت ﷺ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپؓ سب سے پہلے یہ دیکھا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانا کس طرف سے کھایا ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح ہو جاتا تھا کہ کھانے پر حضور ﷺ کی انگلیوں کے نشان موجود ہوتے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ انہی نشانات پر اپنی انگلیاں رکھ کر کھانے کا آغاز کرتے تھے۔

ایک دن حضور ﷺ کے پاس سے کھانا واپس آیا تو ایک کھانا ایسا تھا جسے حضورؐ نے چھوا تک نہ تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بے تاب ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ آپ ﷺ نے یہ کھانا تناول نہ فرمایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں، اس میں لہسن ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے دریافت کیا، کیا لہسن حرام ہے؟ رسول اقدس ﷺ نے فرمایا نہیں، بلکہ اس کی بو کے سبب میں اسے کھانا پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا، تو پھر جس چیز کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا، میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں (صحیح مسلم)۔

مسجدِ نبویؐ سے متصل حجرے میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی سرورِ عالم ﷺ کبھی کبھی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو شرفِ میزبانی عطا فرماتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی میزبانی کی فضیلت اور آپؓ کے بلند درجہ کی وجہ سے دیگر صحابہ کرامؓ آپؓ کا بہت احترام کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے دور میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بصرہ کے حاکم تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ ان سے ملنے کے لیے بصرہ تشریف لے گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ان کی آمد سے اتنی خوشی ہوئی کہ انہوں نے بصرہ میں اپنا مکان، تمام سازو سامان سمیت حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی خدمت میں پیش کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح آپ نے رحمتِ دوجہاں ﷺ کی میزبانی کے لیے اپنا گھر خالی کر دیا تھا اسی طرح میری خوشی یہ ہے کہ میں آپ کی میزبانی کے لیے اپنا گھر خالی کر دوں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ حق بات کہنے میں کسی رعایت سے کام نہ لیتے تھے اور اس سلسلے میں بڑے سے بڑے اور بااثر سے بااثر فرد کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دن مصر کے والی (گورنر) حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ نماز مغرب کی امامت کے لیے دیر سے تشریف لائے۔ حضرت عقبہؓ خود بھی بڑے بزرگ صحابی تھے، لیکن حضرت ابو ایوبؓ نے فوراً انہیں تنبیہ کی کہ عقبہؓ یہ کیسی نماز ہے؟ حضرت عقبہؓ نے

Marfat.com

معذرت کی کہ ایک کام کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ حضرت ابو ایوبؓ نے فرمایا: "یہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ مت بھولیے، کہ آپ صحابیؓ رسولؐ ہیں۔ آپ کا عمل لوگوں کے لیے حجت بن سکتا ہے، رسول ﷺ اللہ نے مغرب کی نماز جلد ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اگر آپ صحابیؓ رسولؐ ہوتے ہوئے نماز میں تاخیر کریں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ رسول ﷺ اللہ بھی اسی وقت نماز ادا کرتے ہوں گے۔"

حضرت ابو ایوب انصاریؓ بہت نرم دل اور فیاض تھے۔ آپؓ کے ایک غلام افلح تھے۔ ایک بار آپؓ نے افلح کو مکاتب بنا کر آزاد کرنا چاہا۔ (مکاتب سے مراد یہ ہے کہ غلام اپنے آقا کو کچھ دے کر آزادی حاصل کرے) تاہم کسی وجہ سے آپؓ نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ لیکن افلح، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے حسنِ اخلاق کے اس قدر گرویدہ تھے کہ انہوں نے آپؓ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ چند روز بعد حضرت ابو ایوبؓ نے افلح کو غیر مشروط طور پر آزاد کر دیا۔

غزوۂ روم میں بہت سے رومی باشندوں کو جنگی قیدی بنا لیا گیا تھا۔ واپسی کے سفر میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ایک قیدی عورت کو بری طرح روتے دیکھا۔ آپؓ نے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا بچہ اس سے الگ کر کے کسی اور جگہ رکھا گیا ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس بچے کو لے آئے اور ماں کے حوالے کر دیا۔ قیدیوں کے نگراں نے مسلمانوں کے سالار سے شکایت کی۔ سالار نے حضرت ابو ایوبؓ سے وجہ دریافت کی تو آپؓ نے فرمایا، رسول اکرم ﷺ نے اس طریقے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابو ایوبؓ نے دو شادیاں فرمائیں۔ آپؓ کی ایک اہلیہ کا نام اُمّ حسنؓ تھا۔ ان سے ایک صاحب زادے عبدالرحمان ہوئے، جن کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا۔ دوسری اہلیہ اُمّ ایوبؓ انصاریہ تھیں۔ وہ مشہور صحابیہؓ ہیں اور ان سے کئی احادیث روایت کی گئی ہیں۔ مدینہ منورہ میں رسول اقدس ﷺ کی میزبانی کا شرف ان ہی کو حاصل ہوا۔ آپؓ سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے تین بیٹے ایوب، خالد، محمد اور ایک بیٹی عمرہ ہوئیں۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ آج بھی دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو بہت شہرت حاصل کی۔ ایک مشہور بزرگ حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ کی اولاد، افغانستان کے علاقے ہرات اور دوسرے علاقوں میں آج بھی آباد ہے۔

•••

Marfat.com

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

انہوں نے زندگی محض ایک مسافر کی طرح بسر کی

مکان کی میں تعمیراتی کام کے لیے مزدور آچکے تھے، لیکن بوذخشاں کچھ پریشان تھے۔

وہ اصفہان کے پرانے شہر کے نواحی قصبہ جیؔ کے بڑے جاگیر دار تھے اور انہیں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے روزانہ جانا پڑتا تھا۔ اگر وہ روزانہ کی طرح جاگیر پر چلے جاتے تو مکان میں تعمیراتی کام کی نگرانی کون کرتا۔ آخر بہت کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے بیٹے مابہ کو بلایا۔ مابہ آئے تو بوذخشاں نے کہا، "بیٹے آج میں یہاں گھر میں مصروف ہوں لہٰذا تم جاگیر کی طرف چلے جاؤ، وہاں دیکھ بھال کرنا لیکن دیکھو وہاں زیادہ دیر نہ لگانا ورنہ مجھے پریشانی ہوگی۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ تم مجھے جاگیر سے بھی زیادہ عزیز ہو۔"

مابہ نے کہا "بہت اچھا۔" اور وہ جاگیر کی سمت روانہ ہو گئے۔ دن ڈھلا، سورج کا چہرہ زرد ہوا، سائے دراز ہونے لگے اور بالآخر سورج اپنا سرخ چہرہ لیے مغرب میں روپوش ہو گیا، لیکن مابہ جاگیر سے نہیں لوٹے۔ بوذخشاں سخت پریشان تھے، مابہ کہاں گئے؟ انہوں نے اپنے عزیز بیٹے کو تلاش کرنے کے لیے مختلف سمتوں میں آدمی روانہ کر دیے، لیکن تمام ہی افراد مابہ کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

بوذخشاں بیٹے کی گمشدگی کے صدمے سے نڈھال تھے، ان کے ہاں آتش کدے میں بیٹے کی روشن کی ہوئی آگ بدستور روشن تھی۔ بوذخشاں مذہب کے اعتبار سے مجوسی تھے۔ یعنی آگ کی پرستش کرنے والے۔ مجوسیوں میں یہ عقیدہ ہے کہ اگر ان کے ہاں روشن کی جانے والی آگ بجھ جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کا خدا ان سے ناراض ہو گیا ہے۔ آتش کدے میں آگ بھی روشن تھی۔ مابہ تو اس آتش کدے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مدرسے سے آکر فوراً آتش کدے کی نگرانی میں لگ جاتے تھے۔ وہ اسے اس طرح روشن رکھتے تھے کہ آگ ایک لمحہ کے لیے بھی بجھنے نہ پاتی تھی۔ مقدس آگ کی اس قدر دیکھ بھال کرنے والے مابہ سے خدا کیسے ناراض ہو سکتا ہے، آخر وہ کہاں گئے؟

رات بھیگنے لگی لیکن مابہ کا کوئی پتا نہ چلا، اور پتا چلتا بھی کیسے؟ مابہ تو ایک کلیسا میں بیٹھے مسیحی پادریوں سے ان کے دین کی باتیں سن رہے تھے اور انہیں عبادت کرتے دیکھ رہے تھے۔ اہل کلیسا تو مجوسیوں کے دشمن سمجھے جاتے تھے اس لیے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مابہ کسی کلیسا میں بیٹھے ہوں گے۔

خاصی رات گزر گئی تو مابہ گھر لوٹے، دل گرفتہ باپ نے بیٹے کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ جب جذبات کا طوفان تھما تو بوذخشاں نے گلوگیر لہجے میں مابہ سے پوچھا، "بیٹے تم کہاں تھے؟" مابہ نے جھجکتے ہوئے اصل بات بتا دی کہ میں تو جاگیر پر جانے کے لیے نکلا تھا، راستہ میں کلیسا میں کچھ لوگوں کو عبادت کرتے دیکھا۔ ان کی عبادت مجھے بہت اچھی لگی اس لیے میں وہیں رک گیا۔ میں نے کلیسا والوں سے ان کے دین کی بہت سی باتیں سنیں۔ ان کے مذہب کے ماننے والے شام میں ہیں۔ میں اس مذہب کے بارے میں اور جاننا چاہتا ہوں۔" مابہ کی زبان سے یہ سننا تھا کہ بوذخشاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور سخت لہجے میں بولے۔ "بیٹے، اس مذہب میں قطعاً کوئی بھلائی نہیں ہے۔ تمہارا اپنا اور باپ دادا کا مذہب اس مذہب سے کہیں بہتر ہے۔" لیکن مابہ اب مجوسیت سے بیزار ہو چکے تھے۔ ان کے دل میں تلاشِ حق کا جذبہ موجزن تھا۔ آگ کی پوجا کرنا انہیں بے معنی دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس ذات کی تلاش میں تھے جس نے اس کائنات کو، زمین آسمان، چاند اور ستاروں کو تخلیق کیا ہے، جس کے حکم پر دن اور رات باری باری آتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور موسم بدلتے ہیں۔

Marfat.com

ماہہ کو نصرانیت (عیسائیت) میں حق کی خوشبو محسوس ہوئی تھی وہ کہہ اٹھے، "نہیں خدا کی قسم وہ مذہب ہمارے مذہب سے یقیناً بہتر ہے۔" بوذخشاں یہ سن کر سخت ناراض ہوئے۔ اگرچہ انہیں اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی لیکن اپنا پیارا بیٹا دشمنوں کے دین کو پسند کرنے لگے، یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ انہوں نے سوچا، ابھی جوان خون ہے، جذباتی ہو گیا ہے سختی سے سمجھا دوں گا تو سمجھ جائے گا۔ انہوں نے ماہہ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور انہیں گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں انہیں خوراک وغیرہ فراہم کر دی جاتی۔ گھر کے دیگر افراد ماہہ کے ساتھ یہ سخت سلوک ہوتے دیکھتے لیکن بوذخشاں کے خوف سے کچھ نہ کہتے۔ ماہہ قید میں تھے لیکن ان کے دل میں ایک دُھن سمائی ہوئی تھی۔ اس کائنات کے مالک کو پہچاننے کی دُھن۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح ایک شخص کے ذریعہ کلیسا والوں کو کہلا بھیجا کہ جب شام سے کوئی قافلہ آئے تو مجھے اطلاع دینا۔ کچھ دنوں بعد ایک قافلہ شام سے آکر قصبے میں ٹھہرا، ماہہ کو اطلاع دی گئی انہوں نے اہلِ کلیسا کو پیغام بھجوایا کہ جب قافلہ شام واپس جانے لگے تو مجھے خبر دینا۔ قافلہ چند روز ٹھہر کر واپس جانے لگا تو ماہہ کو اطلاع دی گئی۔ ماہہ نے کسی طرح اپنے پیر بیڑیوں سے آزاد کیے، اپنے گھر پر الوداعی نظر ڈالی اور چھپتے چھپاتے، قافلے والوں سے جا ملے، اب ان کی منزل شام تھی۔

کئی دن کے سفر کے بعد قافلہ شام پہنچا، وہاں پہنچ کر ماہہ نے کلیسا کے بڑے پادری (اُسقُف) سے ملاقات کی اور ان کے پاس رہ کر کلیسا کی خدمت کرنے اور علم حاصل کرنے کی گزارش کی۔ اُسقُف نے گزارش قبول کرلی۔ ماہہ اُسقُف کے ساتھ رہنے لگے کچھ عرصے بعد اسقف کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ایک اور صاحب اُسقُف بنائے گئے۔ لیکن کچھ مدت بعد ان کا بھی آخری وقت آن پہنچا۔ ماہہ نے پریشان ہو کر پوچھا، "اب میں کس کے پاس جاؤں۔" اسقف نے کہا کہ "بیٹا دین کی سچی تعلیم پر تو اب شاید کوئی بھی کاربند نہیں رہا تم مَوصِل جاؤ ایک بزرگ ہیں ان سے ملو اور میرا سلام کہو۔"

مَوصِل عراق کا دروازہ ہے۔ یہ شہر الجزیرہ اور عراق سے ملا ہوا ہے اس لیے اس کا نام موصل (ملاپ کا مقام) پڑ گیا۔ ماہہ موصل پہنچ کر بتائے ہوئے پتے پر بزرگ سے ملے۔ وہ بھی اچھے انسان تھے لیکن ماہہ کے وہاں پہنچنے کے کچھ عرصے بعد یہ بزرگ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے انتقال سے قبل ماہہ نے ان سے درخواست کی کہ ایسے شخص کا پتا بتاتے جائیں جو دین پر صحیح طرح عمل پیرا ہو۔ بزرگ نے انہیں نصیبین جانے کا مشورہ دیا۔ نَصِیبین، الجزیرہ کے شہروں میں سے ایک شہر ہے جو موصل سے شام جانے والے قافلوں کے راستے میں آتا ہے۔ اس شہر اور موصل کے درمیان چھ دن کی مسافت تھی۔ ماہہ نصیبین پہنچ کر بزرگ سے ملے اور ان کے پاس ٹھہر گئے، لیکن حق تعالیٰ کی ذات انہیں آزما رہی تھی کہ یہ شخص تلاشِ حق میں کتنا سچا ہے۔ نصیبین والے بزرگ بھی جلد انتقال کر گئے انہوں نے وفات پانے سے قبل ماہہ کو روم کے شہر عَمُّوریہ جانے کا مشورہ دیا جہاں ایک بزرگ رہتے تھے۔ عَمُّوریہ، موجودہ ترکی کے شہر استنبول کے قریب واقع تھا۔

ماہہ عموریہ پہنچے، بزرگ سے ملاقات ہوئی، انہی کے پاس رہنے لگے۔ کاروبار بھی شروع کر دیا۔ جلد ہی ماہہ خوشحال ہو گئے ان کے پاس بھیڑ بکریاں بھی خاصی ہو گئیں، لیکن اب ان بزرگ کا بھی آخری وقت آن پہنچا۔ ماہہ پریشان تھے کہ اب ان کی رہنمائی کون کرے گا۔ بزرگ نے ان سے کہا۔ "اب میرے خیال میں ہمارے عقیدے (توحید) کو ماننے والا ایک فرد بھی رُوئے زمین پر زندہ نہیں ہے البتہ ایک پیغمبرؐ کے ظہور کا وقت آ گیا ہے۔ وہ پیغمبرؐ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوگا۔ انؐ کا ظہور سرزمین عرب سے ہوگا۔ پھر وہؐ ایسے مقام کی طرف ہجرت کریں گے جو دو حرّوں (سیاہ سنگلاخ میدانوں) کے درمیان واقع ہے۔ وہاں کھجور کے درخت ہیں۔ ان پیغمبرؐ کی یہ نشانی ہوگی کہ وہؐ ہدیہ قبول کریں گے لیکن صدقہ قبول نہیں کریں گے اور انؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوتؐ ہوگی۔"

بزرگ کی وفات کے بعد ماہہ کچھ دن عموریہ میں ٹھہرے رہے۔ آخر قبیلہ کلب کے کچھ تاجر وہاں سے گزرے۔ ماہہ نے ان تاجروں کی منت سماجت کی کہ آپ میری بھیڑ بکریاں لے لیں اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ملک عرب لے چلیں، تاجر مان گئے۔ سودا طے ہو گیا۔ ماہہ کی بھیڑ بکریاں تاجروں نے لے لیں اور انہیں اپنا شریک سفر کر لیا۔

قافلہ وادی القریٰ پہنچا تو تاجروں کی نیت بدل گئی انہوں نے سوچا اس شخص کی بھیڑ بکریاں تو ہم اپنے قبضے میں کر ہی چکے ہیں، اس کے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں جو اس کی خبر گیری کرے کیوں نہ اسے بیچ کر کچھ پیسے کھرے کر لیے جائیں۔ انہوں نے ماہہ کو غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا اور خوش و خرم اپنی راہ لی۔

وادی القریٰ، مدینہ منورہ سے شام جانے والے راستے پر آباد،

Marfat.com

ایک بستی تھی۔ اونٹ پر اس بستی سے مدینہ منورہ پہنچنے میں چھ دن لگتے تھے۔ مابہ کا شوق انہیں وادی القریٰ تک تو لے ہی آیا تھا، اب قدرت نے انہیں اس سرزمین تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا جہاں آفتابِ حق کی کرنیں جلوہ گر ہونے والی تھیں، لیکن ابھی مابہ کو مزید امتحانوں سے گزرنا تھا۔ مابہ وادی القریٰ میں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن ان کے آقا کا چچازاد بھائی عثمان بن اشہل القرظی وہاں آنکلا۔ اس نے مابہ کو محنت سے کام کرتے دیکھا تو انہیں پسند کر لیا۔ اس نے بھاؤ تاؤ کیا اور مابہ کو خرید کر یثرب (مدینہ منورہ) لے آیا۔ عثمان بن اشہل کا تعلق یہودیوں کے قبیلے بنی قریظہ سے تھا۔ اس کا نخلستان قبا کی بستی کے قریب واقع تھا، بستی قبا، یثرب سے دو تین میل کے فاصلے پر تھی۔ قبا دراصل ایک کنویں کا نام تھا۔ یہاں بنو عمرو بن عوف کے مکانات تھے۔

مابہ اب عثمان بن اشہل کے نخلستان میں کام کرنے لگے۔ ایک دن مابہ کھجور کے ایک پیڑ پر چڑھے کام میں مصروف تھے کہ ان کے آقا کا ایک چچازاد بھائی تیز تیز قدم بڑھاتا آیا اور آتے ہی بنی قیلہ (انصار) کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمام انصار ایک شخص کے پاس جمع ہو رہے ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص اللہ کا نبی ہے۔

مابہ نے یہ بات سنی تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔ بدن کانپنے لگا انہیں خدشہ ہوا کہ وہ کھجور کے پیڑ پر سے گر نہ پڑیں۔ وہ جلدی سے درخت سے اتر آئے اور آقا کے چچازاد بھائی سے پوچھنے لگے، "آپ ابھی کیا کہہ رہے تھے؟" ان کے آقا کو یہ بے تکلفی ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے مابہ کے منہ پر زور سے طمانچہ مار کر کہا، "تمہیں ان باتوں سے کیا غرض؟ جاؤ اپنا کام کرو۔"

مابہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن بے چینی کے ساتھ رات کا انتظار کرنے لگے۔ رات ہوئی تو کھجوریں لے کر قبا کی طرف چل دیے۔ ان کا رخ اس مکان کی طرف تھا جہاں مکہ سے آئے ہوئے لوگ مقیم تھے۔ وہاں پہنچ کر مابہ نے دیکھا کہ ایک بے حد روشن چہرے والا حسین شخص بیٹھا ہے اور اس کے اطراف جو لوگ ہیں وہ اس پر گویا نثار ہو رہے ہیں۔ یہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تھے جو اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مابہ نے کھجوریں پیش کیں اور بولے "مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نیک آدمی ہیں۔ یہ صدقہ ہے۔ اسے کھا لیجیے۔" نبی کریم ﷺ نے کھجوریں اپنے ساتھیوں کو دے دیں لیکن خود ان میں سے نہ کھایا۔ مابہ نے دل میں کہا، ایک نشانی تو مل گئی، پھر وہ واپس چلے آئے۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ سے آئے ہوئے لوگ یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ مابہ نے پھر کھجوریں جمع کیں اور مدینہ پہنچ گئے وہاں وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں پہنچے اور یہ کہہ کر کھجوریں پیش کیں کہ یہ آپ حضرات کے لیے تحفہ ہے۔ اس بار نبی کریم ﷺ نے خود بھی کھجوریں کھائیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی کھلائیں۔ مابہ نے دل میں کہا، "دو نشانیاں تو پوری ہو گئیں۔" اب مابہ کو مہر نبوتؐ دیکھنے کی جستجو تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک انصاریؓ کا انتقال ہو گیا ان کی تدفین بقیع الفرقد میں ہوئی۔ جنازے سے فارغ ہو کر رسول اقدس ﷺ قبرستان بقیع میں تشریف فرما تھے۔ مابہ حاضر ہوئے، انہوں نے سلام کیا اور نبی رحمت ﷺ کے ارد گرد گھوم پھر کر مہر نبوتؐ دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ آپ ﷺ کے جسم پر دو موٹی چادریں تھیں۔ مابہ کے انداز سے آپ ﷺ سمجھ گئے اور اپنی پشتِ مبارک سے چادر ایک طرف کو ہٹا دی۔ مابہ کے سامنے مہر نبوتؐ تھی۔ کبوتر کے انڈے کی مانند، پشت پر دونوں شانوں کے درمیان۔ تلاشِ حق کا پُر صعوبت سفر ختم ہو گیا تھا اور مابہ نے منزل پالی تھی۔ مابہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ مہر نبوتؐ کو جھک کر عقیدت کے ساتھ چومنے لگے۔ آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ آخر اللہ کے نبی ﷺ نے انہیں متوجہ کیا اور سامنے آنے کے لیے کہا، مابہ نے حق کی تلاش کے لیے مشقتوں اور تکالیف سے پُر اپنی پوری داستان کہہ سنائی، حضور پاک ﷺ سے کلمہ طیبہ سیکھ کر پڑھا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ رسول اقدس ﷺ نے آپؓ کا نام سلمان رکھا۔

یہ حضرت سلمانؓ ہیں جو فارس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے سلمان فارسیؓ کہلاتے ہیں۔ ایک موقع پر آپؓ کو حضور ﷺ نے "الخیر" کا لقب بھی عطا فرمایا، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ میں آپؓ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ حاکم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "سبقت لے جانے والے چار افراد ہیں۔ میں خود عربوں میں سبقت لے جانے والا ہوں، سلمانؓ فارس کے لوگوں میں سبقت لے جانے والے ہیں، بلالؓ حبش کے سابق ہیں اور صہیبؓ روم کے سابق ہیں۔" دیگر کئی احادیث میں آپؓ کی اس فضیلت کا تذکرہ ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور پاک ﷺ نے فرمایا، "سلمانؓ واقعی علم سے بھرپور ہیں۔" حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، "ہر نبی کے سات نجیب اور رفقا ہوئے ہیں جبکہ مجھے ۱۴ نجبا (رفقا) عطا کیے گئے ہیں۔" حضرت علیؓ نے ۱۴ نجبا کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں حضرت

Marfat.com

سلمان فارسیؓ کا نام بھی شامل ہے۔ ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار آدمیوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور مجھے یہ بھی بتایا ہے وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ ان چار افراد میں حضرت سلمانؓ بھی شامل ہیں۔ ایک اور موقع پر رسول اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جنت تین آدمیوں علیؓ، عمارؓ، اور سلمانؓ کی مشتاق ہے۔(ترمذی)۔

حضور ﷺ حضرت سلمان فارسیؓ کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور بعض اوقات ان سے تنہائی میں طویل گفتگو فرمایا کرتے تھے، یہی حضرت سلمان فارسیؓ ہیں جنہیں حضور ﷺ نے بطور خاص اہل بیت میں شامل فرمایا۔ آپؓ رسول ﷺ کے خاص صحابہؓ کی اس جماعت میں بھی شامل تھے جو اصحابِ صفہ کہلاتی ہے۔ آپؓ کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا کہ وہ علم کا ایسا سمندر تھے جس کا جتنا پانی نکال لیا جائے وہ خشک نہیں ہوتا۔

حضرت سلمان فارسیؓ نے رسالت مآب ﷺ کا زمانہ دیکھا، پھر عہد صدیق اکبرؓ میں وہ عراق و شام کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی انہوں نے متعدد محاذوں پر داد شجاعت دی، حضرت عمرؓ نے انہیں مدائن کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد آپؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا دور بھی دیکھا اور اس زمانے میں بھی متعدد مہمات میں شرکت فرمائی۔ حضرت عثمانؓ ہی کے دورِ خلافت میں آپؓ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت سلمانؓ جس وقت ایمان لائے، آپؓ عثمان بن اشہل القرظی کے غلام تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ آپؓ اپنے آقا سے مکاتبت کرلیں۔ غلام کی جانب سے آقا کو کچھ دے کر یا کسی شرط پر آزاد ہونے کا معاہدہ کرنا مکاتبت کہلاتا ہے۔ حضرت سلمانؓ نے اپنے آقا سے بات کی تو اس نے کہا غفیر کے مقام پر کھجور کے تین سو درخت لگاؤ، انہیں پانی دو اور انہیں تیار کردو اس کے ساتھ چالیس اوقیہ چاندی لاؤ تو تمہیں آزاد کرسکتا ہوں۔" ایک اوقیہ ڈھائی تولے کا ہوتا ہے یعنی عثمان بن اشہل نے سو تولے چاندی طلب کی تھی جو تقریباً پندرہ تولے سونے کے برابر ہوتی ہے۔

آزادی کی یہ شرائط بہت سخت تھیں۔ حضرت سلمانؓ اکیلے کہاں سے تین سو پودے لگاتے، انہیں سینچتے پھر انہیں تیار ہونے میں سات آٹھ سال لگتے۔ اس کے علاوہ چالیس اوقیہ چاندی کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ لیکن حضرت سلمانؓ اب دین اسلام کے نام لیواؤں میں شامل ہوچکے تھے جس کے ماننے والوں کو ان کے رسول ﷺ نے آپس میں اس درجہ محبت سے رہنے کی تعلیم دی ہے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اپنے بھائی سلمانؓ کی مدد کرو۔ نبی کریم ﷺ کے حکم کی دیر تھی، کوئی صحابیؓ کھجور کے تیس پودے لیے چلے آئے، کوئی بیس، کوئی پندرہ حتیٰ کہ حضرت سلمانؓ کے پاس کھجور کے تین سو پودے جمع ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ نے گڑھے کھودنے کا حکم دیا۔ حضرت سلمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ گڑھے کھودنے میں مصروف ہوگئے۔ گڑھے تیار ہوگئے تو حضور ﷺ کو آگاہ کیا گیا۔ آپ ﷺ تشریف لائے۔ حضرت سلمانؓ اور دیگر اصحابؓ رسولؐ ایک ایک پودا اٹھا کر حضور ﷺ کے پاس لاتے اور آپؐ اپنے مبارک ہاتھوں سے اس پودے کو گڑھے میں لگادیتے۔ اس طرح سارے پودے حضور ﷺ نے لگادیے۔ مسند احمد کے مطابق حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں سلمانؓ کی جان ہے، ان پودوں میں سے ایک بھی پودا نہیں مرا۔" عام طور پر کھجور کا پودا سات آٹھ سال بعد پھل دیتا ہے لیکن ان پودوں کو اللہ کے حبیب ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے لگایا تھا۔ اسی سال یہ پودے بڑے ہوگئے اور پھل بھی دینے لگے۔

اب چالیس اوقیہ چاندی کی ادائیگی کا مسئلہ تھا۔ اسی دوران ایک غزوہ میں حضور ﷺ کے پاس مرغی کے انڈے کے برابر سونا آیا۔ حضور ﷺ نے حضرت سلمانؓ کو بلا کر یہ سونا دیا اور فرمایا تم اس سے رقم ادا کردو۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ سونے کی اس ڈلی سے پورے چالیس اوقیہ چاندی کی قیمت ادا ہوگئی۔ اب حضرت سلمانؓ آزاد تھے۔

مدینہ منورہ آتے ہی رسول اللہ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کروادیا تھا۔ حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوالدرداء انصاریؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا گیا، اللہ کے پیارے نبی ﷺ کا قائم کیا ہوا یہ رشتہ حضرت سلمانؓ کو عمر بھر عزیز رہا اور آپؓ نے اس رشتے کے تقاضے نبھانے کی ہمیشہ کوشش کی۔

ہجرت کے پانچویں سال بدر اور احد کے شکست خوردہ قریش بڑی تیاریوں کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے، دس ہزار کا لشکر تھا جبکہ مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس موقع پر حضرت سلمانؓ نے ایک اہم اور مفید مشورہ پیش کیا کہ مدینہ منورہ کے

Marfat.com

اطراف خندق کھود لی جائے۔ انہوں نے کہا کہ "حضور ﷺ، جب ہم فارس میں محاصرے کی حالت میں ہوتے تھے تو خندق کھود لیا کرتے تھے۔" مدینہ منورہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ اگر شمال کی طرف سے حفاظت کا انتظام ہو جاتا تو دوسری اطراف سے دشمن کے اچانک حملے کا خدشہ نہ رہتا، چنانچہ خندق کھودنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

حضور ﷺ نے خندق کھودنے کے لیے انصار و مہاجرین کو دس دس کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت سلمانؓ کے ساتھ عجیب معاملہ تھا۔ آپؓ مہاجر بھی تھے کیونکہ آپؓ نے دین کی خاطر اپنا گھر بار اور وطن چھوڑا تھا، پھر آپؓ انصار میں سے بھی تھے، کیونکہ آپؓ حضور ﷺ کی آمد سے قبل ہی سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؓ کی دلآویز شخصیت کے، کیا انصار اور کیا مہاجرین سب ہی مداح تھے۔ چنانچہ جب خندق کھودنے کا کام شروع ہوا تو انصار کہنے لگے کہ حضرت سلمانؓ ہمارے ساتھ ہوں اور مہاجرین نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت سلمانؓ ہمارے ساتھ کام کریں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے انہوں نے یہ دلچسپ بحث سنی تو فرمایا، "سلمانؓ تو ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔" حضرت سلمانؓ کے لیے یہ یقیناً بہت عظیم سعادت تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں اپنے اہل بیت میں شامل فرما لیا تھا۔

حضرت سلمانؓ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام مہمات میں شریک ہوئے۔ صلح حدیبیہ سے قبل بیعت الرضوان میں بھی آپؓ شامل تھے۔ غزوۂ خیبر میں بھی آپؓ نے حصہ لیا۔ پھر حضور ﷺ وادی القریٰ پہنچے۔ یہودیوں نے معمولی مقابلہ کیا پھر ہتھیار ڈال دیے۔ اللہ کی شان دیکھیے، یہی وادی القریٰ تھی جہاں حضرت سلمانؓ نے پہلی دفعہ غلام کی حیثیت سے قدم رکھا تھا آج وہ ایک فاتح قوم کے فرد کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔

سنہ ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔ پھر غزوۂ حنین ہوا۔ اس کے بعد طائف کا محاصرہ ہوا۔ یہاں بنو ثقیف نے زبردست قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ اس قلعہ کو توڑنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس موقع پر حضرت سلمانؓ نے ایک اور طریقۂ جنگ سے اپنے احباب کو متعارف کروایا۔ یہ منجنیق کا استعمال تھا، کہتے ہیں کہ منجنیق فینیقیوں نے ایجاد کی۔ ان سے یونانیوں کو اور پھر یونانیوں سے اہل فارس کو یہ فن منتقل ہوا۔ حضرت سلمانؓ نے خود اپنے ہاتھ سے منجنیق تیار کی اور چلائی۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت سلمانؓ مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اور اہل بیتؓ کی خدمت میں مصروف رہے۔ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے میں عراق و شام کی فتوحات کا آغاز ہوا۔ حضرت سلمانؓ کا خیال تھا کہ وہ عراق میں جا کر آباد ہو جائیں تاکہ وہ ان علاقوں میں نو مسلموں کی تربیت کر سکیں، حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ بنے تو حضرت سلمانؓ عراق میں آباد ہو گئے اور آپؓ کے دینی بھائی حضرت ابو الدرداءؓ نے سکونت کے لیے شام کو پسند کیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دمشق کا قاضی مقرر کر دیا۔

اس زمانے میں عراق کا بیشتر حصہ فارس کے شہنشاہ کسریٰ کے ماتحت تھا۔ حضرت سلمانؓ نے عراق کی جنگوں میں شرکت کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ خود فارس کے تھے۔ ان علاقوں سے واقفیت رکھتے تھے اور فارسی زبان بول سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ کو ان جنگوں میں داعی اور رائد مقرر کیا۔ داعی کے فرائض یہ تھے کہ وہ حملے سے قبل کفار کو اسلام کی دعوت دے اور تین معروف شرائط پیش کرے یعنی اسلام قبول کر لو یا جزیہ ادا کر دو اور اپنے مذہب پر قائم رہو یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ "رائد" کا عہدہ فوج کے افراد کو خوراک اور جانوروں کو چارہ کی فراہمی کے منتظم اعلیٰ کا عہدہ تھا۔ "رائد" بالعموم ہراول دستے کا سردار بھی ہوتا تھا۔ ان عہدوں کے لیے حضرت سلمانؓ کا انتخاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپؓ قرآن و سنت کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اچھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور علاقے سے خوب واقف تھے۔

عراق کی مہمات میں غالباً جنگ بویب، وہ پہلا معرکہ ہے جس میں حضرت سلمانؓ شریک ہوئے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فوج کے سالار حضرت مثنیٰؓ تھے۔ حضرت سلمانؓ رائد تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو اللہ نے فتح سے نوازا۔ ۱۴ھ / ۶۳۵ء میں جنگ قادسیہ ہوئی جس میں تیس ہزار مسلمانوں کے مقابلے پر ایک لاکھ بیس ہزار کفار تھے۔ اس جنگ میں بھی حضرت سلمانؓ داعی اور رائد تھے۔ ۱۶ھ / ۶۳۷ء میں بہر شیر اور مدائن فتح ہوئے جو دریائے دجلہ پر ایک پل کے ذریعے باہم ملے ہوئے تھے۔ جب بہر شیر پر مسلمانوں نے قبضہ کیا تو دشمن فوج نے اس پل کو توڑ دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے دریا عبور کرنے کے لیے کشتیاں تلاش کروائیں لیکن کشتیاں نہ مل سکیں۔ اسی اثنا میں دجلہ میں شدید طغیانی آ گئی۔ حضرت سعدؓ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں کے

Marfat.com

گھوڑے دریا میں داخل ہو گئے ہیں اور انہوں نے دریا عبور کر لیا ہے۔

حضرت سعدؓ نے گھوڑوں کی مدد سے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ امام طبری کے مطابق گرمی کا شدید موسم تھا دریا میں طغیانی موجیں اٹھ رہی تھیں لیکن امیر لشکر کے حکم پر مسلمانوں کی پوری فوج دریا میں اتر گئی۔ یہی وہ تاریخی جنگ ہے جس کا علامہ اقبالؒ نے اپنے مشہور شعر

دشت تو دشت ہے، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

میں ذکر کیا ہے۔ دریا عبور کرتے ہوئے حضرت سلمانؓ، حضرت سعدؓ کے ساتھ تھے۔ اہل فارس نے جب مسلمانوں کو اس طرح دریا سے نکلتے دیکھا تو وہ "دیواں آمدند، دیواں آمدند" (دیو آ گئے، دیو آ گئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت سلمانؓ نے فتوحاتِ ایران کے سلسلے میں کئی لشکروں کی قیادت کی۔ آپؓ کو تیس ہزار مسلمانوں کی قیادت کا بھی موقع ملا۔

سنہ ۱۷ھ / ۶۳۸ء تک عراق کا صوبائی صدر مقام مدائن رہا، پھر حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ مدائن کی آب و ہوا عرب سے گئے ہوئے مسلمان سپاہیوں کی صحت کے لیے موافق نہیں ہے، انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو نئے صدر مقام کے لیے جگہ پسند کرنے کی غرض سے بھیج دیں۔ ایسا مقام منتخب کیا جائے جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو، جانوروں کے لیے چارہ آسانی سے مل جائے، وہ مقام ایسی جگہ ہو جہاں میرے اور اس مقام کے درمیان کوئی دریا یا پل حائل نہ ہو۔ حضرت سعدؓ نے دونوں صحابہ کرامؓ کو حضرت عمرؓ کی ہدایات سے آگاہ کیا۔ دونوں اصحابِ رسولؐ الگ الگ روانہ ہوئے، اتفاق دیکھیے کہ دونوں مخالف سمتوں سے آکر ایک ہی جگہ رکے۔ دونوں نے ایک ہی مقام کو پسند کیا تھا۔ اسی مقام پر کوفہ آباد کیا گیا۔

حضرت عمرؓ، حضرت سلمان فارسیؓ کے تقویٰ اور انتظامی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ انہوں نے اصرار کر کے حضرت سلمانؓ کو مدائن کا والی (گورنر) بنا دیا۔ حضرت سلمانؓ نے چند سال یہ ذمے داری ادا کی لیکن اس پورے عرصے میں بھی آپؓ اسی سادگی سے زندگی بسر کرتے رہے جو اس سے پہلے آپؓ کا شعار تھی، جو تنخواہ ملتی اللہ کی راہ میں دے دیتے اور خود اپنے ہاتھ سے کھجور کی چٹائیاں بن کر فروخت کرتے۔ جو رقم حاصل ہوتی اس سے اپنی اور اہل و عیال کی گزر بسر ہوتی۔ حضرت عمرؓ کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ حضرت سلمانؓ فرماتے تھے، اگر امیر المومنینؓ مجھے نہ روکتے تو میں گورنری کے باوجود یہ کام کرتا رہتا۔ حضرت سلمانؓ مدائن کی گورنری کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت بھی فرماتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان سے مسائل پوچھنے کے لیے آتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانے میں حضرت سلمانؓ نے شادی کی ضرورت محسوس کی۔ آپؓ کی شادی ایک خاتون بقیرہؓ سے ہوئی۔ شادی کی تقریب بے حد سادگی سے منعقد ہوئی، اللہ نے آپؓ کو تین بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔

آپؓ اپنی زندگی کے آخری ایام تک مصروف جہاد رہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مہم بلنجر کی طرف روانہ کی گئی، آپؓ نے اس میں بھی شرکت فرمائی۔ بلنجر بحیرۂ خزر (کیسپئن) کے ساحل پر واقع مشہور شہر تھا جو حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہو چکا تھا لیکن عہد عثمانیؓ میں وہاں بغاوت ہوئی تو اس کی سرکوبی کے لیے مہم بھیجی گئی۔

سنہ ۳۶ھ / ۶۵۶ء میں حضرت سلمانؓ بیمار پڑ گئے۔ آپ مدائن میں ایک مکان کی بالائی منزل پر صاحبِ فراش تھے۔ آپؓ اس وقت بھی اپنے محبوب رسول ﷺ کو بار بار یاد کرتے تھے۔ آپؓ نے ساری زندگی حضور ﷺ کے ارشادات پر عمل پیرا رہنے کی کوشش کی اور اس وقت بھی آپؓ اس بات پر پریشانی کا بار بار اظہار فرماتے تھے کہ ہمارے حبیب ﷺ نے ہم سے جدا ہوتے ہوئے یہ وعدہ لیا تھا کہ مومن کا زادِ راہ اتنا ہونا چاہیے جتنا ایک سوار مسافر کا ہوتا ہے۔ یہی کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عیادت کے لیے آئے تو انہوں نے حضرت سلمانؓ کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن حضرت سلمانؓ نے فرمایا، "میں موت کے خوف سے نہیں روتا بلکہ بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک کا دنیاوی سازو سامان، مسافر کے توشے جتنا ہونا چاہیے جبکہ میرے ارد گرد یہ کالے ناگ پڑے ہوئے ہیں۔ حضرت سلمانؓ جس سامان کو کالے ناگ قرار دے رہے تھے وہ محض مٹی کا ایک لوٹا، کپڑے دھونے کا لگن اور ایسی ہی چند معمولی چیزیں تھیں۔

مرض بڑھ گیا تو اہلیہ سے کہا "وہ چیز لے آؤ جو تمہیں حفاظت سے رکھنے کو دی تھی۔" اہلیہ مشک والی ایک سربمہر تھیلی لے آئیں۔ آپؓ نے

Marfat.com

پیالے میں پانی منگوایا۔ مشک کو پانی میں اپنے ہاتھ سے ملایا۔ پھر اردگرد چھڑکنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد فرمایا، "تم لوگ چلے جاؤ اور انتظار کرو۔"

اہلیہ حضرت بقیرہؓ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئیں تو دیکھتی ہیں کہ ان کے رفیق زندگی حضرت سلمانؓ اپنے خالق سے جا ملے ہیں۔ آپؓ کو مدائن میں طاق کسریٰ کے شمال مغرب میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ علاقہ آپؓ کی نسبت سے "سلمان پاک" کہلاتا ہے۔ کربلائے معلی سے گزرنے والا ہر زائر یہاں حاضری دیتا ہے۔ آپؓ کا مزار پرانی وضع کا تھا۔ عثمانی سلطان مراد رابع نے اسے جدید انداز میں تعمیر کروایا۔ آپؓ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے تاہم امام ذہبیؒ کی روایت ہی مستند سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلمانؓ نے ۶۷ یا ۷۷ سال کی عمر پائی۔

سعودی عرب میں مدینہ منورہ کے قریب سلع پہاڑ پر مسجد سلمانؓ اب بھی حضرت سلمانؓ کی یاد دلاتی ہے۔ یہ مسجد اس مقام پر تعمیر کی گئی ہے جہاں غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت سلمانؓ کا خیمہ نصب تھا۔ حضرت سلمانؓ کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے کھجور کے ۳۰۰ پودے لگائے تھے وہ باغ عالیہ (بالائی مدینہ) میں غفیر کے مقام پر موجود ہیں۔ یہ باغِ سلمانؓ کہلاتا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کو اللہ نے بے پناہ علم و حکمت کی دولت سے نوازا تھا۔ آپؓ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے لیکن آپؓ پر اللہ کا خوف اس قدر طاری تھا کہ احتیاط کی وجہ سے بہت کم احادیث بیان فرماتے تھے۔ آپؓ سے روایت کردہ ۶۴ احادیث، کتب میں محفوظ ہیں، آپؓ سے حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو سعید الخدریؓ، حضرت ابو الطفیلؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے احادیث روایت کی ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو فقہی مسائل بتانے اور فتوے دینے کی ذمے داری دی گئی تھی۔ حضرت سلمانؓ بھی اس جماعت میں شامل تھے۔

آپؓ متعدد آریائی اور سامی زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ فارسی تو آپؓ کی مادری زبان تھی۔ عرب میں آئے تو عربی زبان اہل زبان کی طرح بولنے لگے۔ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ آپؓ سے عربی زبان بولنے میں کبھی لحن یا قواعد کی غلطی نہیں ہوئی، خیال ہے کہ آپؓ عبرانی زبان بھی جانتے تھے کیونکہ تورات کی تعلیمات عبرانی زبان میں تھیں اور آپؓ تورات کی تعلیمات سے باخبر تھے۔ آپؓ متعدد فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ آپؓ کی ذاتی کوششوں سے کئی صنعتوں کو رواج ملا۔ ان میں گیسو تراشی، دباغت (چمڑا رنگنا)، کاشت کاری اور منجنیق سازی شامل ہیں۔ بوریاں بننے، ٹوکریاں بنانے اور چٹائیاں بننے کا کام انصار سے سیکھا تھا۔

آپؓ نے اپنی عمر کا خاصا حصہ راہبوں کے درمیان گزارا، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد آپؓ نے رہبانیت یعنی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر عبادت کرنے سے گریز کیا۔ آپؓ اپنے اصحابؓ اور دیگر لوگوں سے مل کر رہے اور تمام ذمے داریاں ادا کیں۔ محنت مزدوری بھی کی اور ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ اللہ کی یاد سے اپنے قلب کو معمور کیے رکھا۔ آپؓ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فرائض اور واجبات کو پورے خشوع و خضوع سے ادا کرنا چاہیے اور جس قدر نوافل آسانی سے ادا ہو سکتے ہوں ادا کرنے چاہئیں۔

طارق بن شہابؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے حضرت سلمانؓ کے ساتھ گزاری، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپؓ نوافل کیسے پڑھتے ہیں۔ حضرت سلمانؓ رات کے آخری حصے میں کھڑے ہوئے اور نوافل ادا کرنے لگے۔ آپؓ کے متعلق میرا گمان یہ تھا کہ آپؓ بہت زیادہ عبادت کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا، میں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ حضرت سلمانؓ سے کر دیا۔ انہوں نے فرمایا، "اپنی پانچ فرض نمازوں کا اچھی طرح خیال رکھا کرو۔ انہیں پورے آداب سے ادا کرو کیونکہ وہ چھوٹی چھوٹی خطاؤں کا کفارہ ہیں بشرطیکہ تم سے بڑے بڑے گناہ سرزد نہ ہوں۔"

مسند احمدؒ میں ابو عثمان النہدیؒ فرماتے ہیں "ایک روز میں حضرت سلمانؓ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ حضرت سلمانؓ اچانک اس درخت کی ٹہنی پکڑ کر اسے ہلانے لگے، ایسا کرنے سے درخت کے بہت سے پتے جھڑ گئے، پھر آپؓ نے مجھ سے پوچھا۔ "اے ابو عثمانؒ تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے عرض کی، "آپ ہی بتا دیجیے۔" حضرت سلمانؓ نے فرمایا، "میں بھی ایک دفعہ حضور کریم ﷺ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے درخت کی ٹہنی پکڑ کر زور سے ہلائی تو درخت کے بہت سے پتے جھڑ گئے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا، "اے سلمانؓ پوچھتے کیوں نہیں، میں نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے عرض کی۔ "آپ ہی بتا دیجیے۔" حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا، "جب کوئی مسلمان اچھی طرح وضو کرتا ہے اور پانچوں نمازیں خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح یہ پتے جھڑ گئے ہیں۔"

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

اسد الغابہ: علامہ ابو الحسن علی الجزری ابن اثیر / مولانا محمد عبد الشکور فاروقی
اسوۂ صحابہؓ
اصحابؓ رسولؐ
الزہراؓ: عمر ابو النصر / شیخ محمد احمد پانی پتی
تاریخ طبری: علامہ ابن جریر طبری / حکیم احمد عثمانی
تیس پروانے شمع رسالتؐ کے: طالب الہاشمی
جامع ترمذی شریف
حضرت ابوایوبؓ انصاری: طالب ہاشمی
حضرت ابوذر غفاریؓ: مولانا سید مناظر احسن گیلانی
حضرت ابوذر غفاریؓ: عبد الحمید جودہ السحار
حضرت ابوہریرہؓ
حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ
خیر البشرؐ کے چالیس جانثار: مولانا طالب الہاشمی
دائرۂ معارف اسلامیہ۔
رحمتِ دارینؐ کے سو شیدائی: مولانا طالب الہاشمی
سیارہ ڈائجسٹ رسولؐ نمبر
سیر الصحابہ (مہاجرین): مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی
سیر الصحابہؓ (جلد دوم): مولانا شاہ معین الدین ندوی
سیرت الرسولؐ: محمد حسین ہیکل / محمد وارث کاملی
سیرت الصحابیاتؓ: مولانا عبد السلام ندوی / مولانا سعید احمد انصاری
سیرت النبیؐ: علامہ شبلی نعمانی
سیرت بلالؓ: ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی
سیرت سلمانؓ: علامہ فضل احمد عارف
سیرت عائشہؓ: علامہ سید سلیمان ندوی
سیرت فاطمۃ الزہراؓ: طالب ہاشمی
سیر انصار: سعید انصاری
صحابیاتؓ: نیاز فتحپوری
صحیح بخاری
صحیح مسلم
طبقات ابنِ سعد: محمد بن سعد / مولانا راغب رحمانی
طبقات ابنِ سعد حصہ چہارم: محمد بن سعد / علامہ عبد اللہ ابن العمادی
عشرہ مبشرہؓ
غلامانِ اسلام: مولانا سعید احمد
فاطمہؓ بنتِ محمدؐ: عمر ابو النصر / رئیس احمد جعفری
مدارج النبوۃ: شیخ عبد الحق محدث دہلوی
نقوش سیرت نمبر: جلد ۸،۷،۵۔

...

Marfat.com

امت کے محسنینؒ

امتِ مسلمہ کو راہِ ہدایت دکھانے والے

ائمہ اور اہل علم

Marfat.com

انتساب

اپنی عزیز رفیقِ زندگی

نزہت کلیم

کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

"اُمت کے محسنین" اسلامی تاریخ کے حوالے سے ایک ایسی کوشش ہے جس میں اسلام کے عظیم اسکالرز کے بارے میں ہی نہیں لکھا گیا بلکہ اس دور کے پورے معاشرے کو زندہ کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے جہاد کے میدانوں میں ہی کارنامے انجام نہیں دیے بلکہ علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی حوالوں سے بھی ایسے کارنامے پیش کیے ہیں جن پر تاریخ کو بجا طور پر فخر ہے۔ ذہانت، دانشوری اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی حیرت انگیز مثالیں قائم کی ہیں۔ ہم برملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان بزرگانِ دین نے اسلام کا پرچم بلند کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے وہ سرمایہ چھوڑا ہے جو اسلامی تحریکوں اور مسلسل جدوجہد کا سبب ہیں۔ کلیم چغتائی اسلامی اصولوں، تاریخ اور اسلامی معاشرے کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان واقعات اور حوالوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے جو وقت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے نئی نسل کو نہایت واضح اور دلچسپ انداز میں بتایا ہے کہ دین کا سچا جذبہ رکھنے والے ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ انھوں نے جو راستہ اختیار کیا اور جو مثالیں قائم کیں وہ آج بھی چراغِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلیم چغتائی نے اسلامی تاریخ کے اوراق سامنے رکھ کر اس دور کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔ انھوں نے امت کے محسنین اسکالرز کی تعلیم و تربیت، جدوجہد، جفاکشی، جذبے اور اسلام کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کے روشن پہلوؤں سے ملت میں ایک روح بنی رُوح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمان علما، فقہا اور فلاسفروں کے جو کارنامے پیش کیے ہیں وہ پوری قوم کے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان میں انقلابی روح ہے۔ یہ حیرت انگیز واقعات ہم میں جذبے اور ولولے کی تحریک پیدا کرتے ہیں، ہمیں بتاتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں بے شمار سنہری باب ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے وہ قیمتی اثاثہ چھوڑا ہے جو ہمیں سچا جذبہ رکھنے والا انقلابی انسان بنا سکتا ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ سے سبق نہیں لیتیں وہ باقی بھی نہیں رہتیں۔

کلیم چغتائی کے یہاں علم کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یقین کی دولت بھی ہے۔ وہ اپنی بات کو انتہائی موثر انداز میں کہنے کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔ وہ خود عالم ہیں۔ ان کے الفاظ میں ولولہ، امنگ اور اُمید کے ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ بھی ہے۔ وہ مسلسل جدوجہد اور سچائی کے ہنر سے واقف ہیں۔ علمی، ادبی گہرائی میں وہ دور تک چلے جاتے ہیں۔ ان کی باتوں کا فلسفیانہ رنگ ذہنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یقین کی فضا قائم ہوتی ہے۔ ان کے ہاں فلسفیانہ پہلو ہونے کے باوجود دلچسپی کا عنصر نمایاں ہے۔ قریب قریب ہر اسکالر کا ذکر انھوں نے کسی نہ کسی دلچسپ واقعے یا قصے سے کیا ہے۔ یہ واقعات اتنے اثر انگیز ہیں کہ پڑھنے والا چونک بھی جاتا ہے اور خوشی کے ساتھ فخر بھی محسوس کرتا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ جدوجہد کی جائے تو آج بھی وہ دور آسکتا ہے۔ علم و ادب کی حکمرانی ممکن ہے۔ ذہنوں اور جذبوں میں یقین کی دولت پیدا کر دینا بڑا کام ہے۔ یہ واقعات اسکالرز کی زندگی کا حصہ تو ہیں ہی، ان کی تاریخی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ ان سے ملت مسلمہ کے بھرپور افادے کی صورت اور اس کے لیے سازگار ماحول کی نشاندہی کلیم چغتائی کی فنکاری سے عبارت ہے۔

کلیم چغتائی ایک ایسے عالم ہیں جو ملت مسلمہ کو بیدار کرنے اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تاریخی حوالے اور دوسرے ماخذ نہایت مستند ہیں۔ ان کا جذبہ بے حد تعمیری ہے۔ انھوں نے فروعی باتوں پر اتنی توجہ نہیں دی، وہ مثبت پہلو تلاش کرنے میں ماہر ہیں۔ اسلامی اصولوں اور معاشرے کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے فلسفے اور اس کی عملی صورت کو عام کیا جائے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہماری بنیاد قرآن اور احادیث پر ہے، اسے ہمیں اپنی زندگی کا حاصل بنا لینا چاہیے۔ مضبوط بنیاد ہی ہماری فلاح کا راستہ ہے۔

کلیم چغتائی قوم کے مزاج اور جذبات سے بخوبی واقف ہیں۔ انھیں اسلامی تحریکوں سے خاصی واقفیت ہے اس لیے ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بھی الگ ہے۔ کلیم چغتائی کے بیان میں سادگی ہے، ان کے ہاں لفّاظی قطعی نہیں، کام کے لفظوں میں کام کی بات کرتے ہیں۔ ہر واقعہ مستند ہے اور ایک والہانہ جذبے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں اثر انگیزی بھی زیادہ ہے۔ یہ تاریخی کہانیاں صرف کہانیاں نہیں ہیں، مستند حوالوں کی روشنی میں ایک تحریک بھی ہیں۔ کلیم چغتائی نے نئی نسل کو جو تحفہ پیش کیا ہے وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

پی۔ایچ۔ڈی، جامعہ سندھ، ماہر تعلیم، نقاد و ادیب

Marfat.com

عرضِ مؤلف

اللہ تبارک و تعالیٰ نے کرۂ ارض پر انسانوں کی رہنمائی کے لیے مختلف ادوار میں اپنے انبیاء کرامؑ بھیجے۔ تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات ایک جیسی تھیں۔ ان سب نے ایک ہی دین، دینِ اسلام کی دعوت دی اور اللہ واحد کی بندگی کی طرف بلایا۔ انبیاء کرام کی آمد کا سلسلہ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد موقوف ہو گیا۔ نبی رحمت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل فرمائی اور آپ ﷺ پر اتارے گئے اپنے کلام پاک کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔

محسن اعظم ﷺ نے اللہ کی کتاب کی تعلیم اپنے صحابہ کرامؓ کو دی اور اپنی روشن سیرت کے ذریعہ سے اس کتاب کی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش فرمادیا۔ نبی کریم ﷺ سے تربیت پانے والے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین نے آپ ﷺ سے جو کچھ سیکھا، اسے کامل امانت داری اور صحت کے ساتھ بعد میں آنے والوں تک پہنچادیا۔ ان تمام تعلیمات کو پوری اسناد اور حوالوں کے ساتھ محفوظ رکھنے کی شدید ضرورت تھی۔ اس اہم ضرورت کو کئی ایسی عظیم شخصیات نے پورا کیا جنھیں آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرامؓ کو دیکھنے اور ان کے بے پایاں علم سے خوشہ چینی کا شرف حاصل ہوا۔ زیرِ نظر کتاب میں انہی عظیم شخصیات کی سیرتوں اور قابلِ قدر علمی خدمات کا تعارف کروانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں فقہ اسلامی کے چار مشہور ائمۂ کرام، رفیع الشان محدثین اور مجتہدین شامل ہیں۔

یہ ان بلند پایہ شخصیات کا تذکرہ ہے جنھوں نے اللہ تبارک تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ کے فرامین اور تعلیمات کے بارے میں نہایت جانفشانی سے تحقیق کی۔ انہوں نے بہت تگ ودو کے بعد انتہائی مستند روایات کو حاصل کیا، پھر ان کو ترتیب دے کر ضخیم کتب کی شکل میں پیش کر دیا۔ ان میں وہ جنید فقہاء کرام بھی شامل ہیں جنھوں نے ربِ کریم کی کتابِ ہدایت اور اللہ کے محبوب رسول ﷺ کی سنتوں اور تعلیمات کو سمجھا اور ان کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے تفصیلی ضابطے مرتب کیے۔

واضح رہے کہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے اس میں آپ مختلف ادوار کا تسلسل نہیں پائیں گے لیکن اس کتاب میں ان لائق صد تحسین اور قابلِ احترام شخصیات میں سے چند کی درخشاں سیرتوں اور عظیم خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تعلیمات کو تفصیلی اور مربوط انداز میں محفوظ فرمادیا۔ ان بلند مرتبہ شخصیات نے سختیاں جھیلیں، مظالم برداشت کیے، مصائب سے گزرے لیکن کامل خلوص اور پامردی کے ساتھ اپنی جد وجہد جاری رکھی۔

یہ حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ ان عظیم شخصیات کی ہمیشہ احسان مند رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتوں کی بارش فرمائے۔

میں اپنے بہت مہربان اور محبت پاش استاد، علم آفرین شخصیت، نقاد و ادیب اور ماہر تعلیم، محترم ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی صاحب کا انتہائی ممنون اور ان کے لیے دعا گو ہوں، جنھوں نے اپنی شدید علالت اور گوناگوں ذاتی مسائل کی پروا کیے بغیر، اس کتاب کا مسودہ پوری توجہ اور احتیاط سے ملاحظہ فرمایا اور اس پر اپنا محبت آگیں پیش لفظ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

عظیم علمی شخصیت، جن کے مختصر دورِ حکومت کا ہر لمحہ روشن ہے

اس عورت کی پانچ بیٹیاں تھیں۔
کفالت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سخت پریشان تھی کہ روزمرہ کے اخراجات کس طرح پورے کرے، بالآخر اس نے سربراہِ مملکت کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

طویل سفر طے کر کے وہ سربراہ مملکت کے شہر پہنچی، سربراہِ مملکت کا مکان تلاش کیا۔ اسے توقع تھی کہ بہت عالیشان محل ہو گا جہاں دروازے پر دربان مقرر ہوں گے، لیکن اس کی توقع کے برعکس اس معمولی سے مکان پر کوئی دربان نہیں تھا، وہ بلا کھٹکے اندر چلی گئی۔ سربراہِ مملکت کی اہلیہ سے ملی۔ یہاں بھی اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مکان میں نوکروں کی فوج ظفر موج کہیں نظر نہ آتی تھی۔ سربراہ کی اہلیہ خود ہی بیٹھی روئی ٹھیک کر رہی تھیں۔ گھر کا سازو سامان بے حد معمولی تھا۔ اس عورت کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا 'اس ویران گھر سے اپنا گھر آباد کرنے آئی تھی؟'

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور باہر سے ایک شخص اندر آگیا۔ اس نے گھر کے کنویں میں سے پانی کے ڈول نکال کر ایک طرف پڑی مٹی پر ڈالنے شروع کر دیے۔ وہ عورت تو ایک طرف ہو گئی، لیکن سربراہِ مملکت کی اہلیہ وہیں بیٹھی روئی ٹھیک کرتی رہیں۔ اس عورت نے کہا "اس مٹی بنانے والے مزدور سے پردہ تو کر لو، یہ تمہاری طرف ہی گھور رہا ہے!"

سربراہِ مملکت کی اہلیہ نے بتایا، "یہ میرے شوہر اور امیر المومنین ہیں۔"

یہ اس مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ تھا جو بلادِ روم سے دیوارِ چین تک اور اندلس کے آخری گوشوں سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔

امیر المومنین کام سے فارغ ہوئے، نماز ادا کی پھر اہلیہ سے پوچھا: "یہ عورت کون ہے؟" جواب ملا، عراق سے آئی ہے۔ عورت کہنے لگی،

"میری پانچ بے کس و بے سہارا لڑکیاں ہیں، میں آپ سے حُسنِ شفقت کی تلاش میں آئی ہوں۔"

عورت کا یہ کہنا تھا کہ امیر المومنین "بے کس و بے سہارا" کے الفاظ دہرا کر رونے لگے۔ پھر کاغذ قلم لیا اور عراق کے والی (گورنر) کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ عورت سے کہا، "بڑی لڑکی کا نام بتاؤ، اس نے نام بتایا۔ امیر المومنین نے بڑی لڑکی کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے کہا "الحمد للہ"۔ پھر دوسری، تیسری اور چوتھی لڑکی کا نام دریافت کرتے گئے اور وظیفہ مقرر کرتے گئے۔ عورت ہر وظیفے پر الحمد للہ کہتی جاتی، چوتھے وظیفے پر خوش ہو کر اس نے امیر المومنین کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔ امیر المومنین نے ہاتھ روک لیا اور فرمایا: "جب تک تم حمد کے مستحق یعنی اللہ کا شکریہ ادا کرتی رہی تھیں، ہم وظیفہ لگاتے رہے، لیکن اب تم نے ہمارا شکریہ ادا کیا تو اس کے بعد کا وظیفہ نفسانیت پر مبنی ہو گا، چنانچہ ان چاروں لڑکیوں سے کہنا کہ اپنے وظیفوں میں سے پانچویں لڑکی کو بھی دے دیا کریں۔"

عورت تحریر لے کر خوش خوش عراق جا پہنچی۔ گورنر کو خط پیش کیا تو خط پڑھتے ہی گورنر رونے لگا، اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ عورت تعجب سے گورنر کو دیکھتی تھی کہ اس خط میں کون سی ایسی بات ہے کہ جس کو پڑھ کر گورنر پر رقت طاری ہو گئی ہے۔ گورنر نے روتے ہوئے کہا، "اللہ صاحب خط پر رحم فرمائے۔" عورت نے بے اختیار پوچھا، "کیا ان کا انتقال ہو گیا؟" گورنر نے کہا "ہاں!" عورت یہ سن کر روتے ہوئے واپس جانے لگی تو گورنر نے اسے روک لیا۔ کہنے لگا،

"ٹھہرو! فکر نہ کرو میں کسی بھی معاملے میں ان کی تحریر کو رد نہیں کر سکتا" اور چاروں لڑکیوں کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

عراق کے گورنر نے جس شخصیت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چار لڑکیوں کا وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ تھے اموی دور کے خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جن کا دورِ خلافت اس قدر تابناک اور روشن ہے کہ لوگ

Marfat.com

آپؒ کو پانچویں خلیفہ راشد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپؒ کا دورِ خلافت گرچہ بہت مختصر تھا، تاہم اس نے حضرت عمرؓ بن خطاب کے دور کی یاد تازہ کر دی، چنانچہ آپؒ کو عمر ثانیؒ بھی کہا جاتا ہے۔

آپؒ کا نام عمر اور کنیت ابو حفص ہے۔ آپؒ کی والدہ محترمہ اُمّ عاصم خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن خطاب کی پوتی ہیں۔ آپؒ نے ہجرت کے اکسٹھویں سال مدینہ منورہ میں آنکھ کھولی۔ یہ بنوامیہ کی خلافت کا دور تھا۔ اسلامی مملکت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ افریقہ اور مغرب کے تمام شہر، سندھ، کابل اور فرغانہ، روم، قسطنطنیہ، قبرص اس مملکت میں شامل تھے، گویا اندلس کے آخری گوشوں سے سندھ تک اور بلادِ روم سے چین کی دیواروں تک اسلامی مملکت کا سکہ رواں تھا۔

آپؒ کے والد محترم عبدالعزیز بن مروان اس زمانے میں مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے اہلیہ سے کہا کہ عمر کو لے کر مصر چلی آؤ۔ مشہور صحابی عبداللہ بن عمرؓ جو آپؒ کی والدہ امّ عاصم کے چچا تھے، کہنے لگے کہ اس بچے کو ہمارے ہاں چھوڑ دو، کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہم سے مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اکیلی مصر چلی گئیں۔ شوہر نے پوچھا، "عمر کہاں ہے؟" انہوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ہے۔ عبدالعزیز بہت خوش ہوئے۔ اس طرح مدینہ منورہ میں اس بچے کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا جسے بڑے ہو کر مملکتِ اسلامیہ کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ بلند پایہ محدث حضرت صالح بن کیسانؒ کو ان کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے اتالیق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بعد میں انہوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے حضرت صالحؒ ہی کو زحمت دی۔

آپؒ نے بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا۔ عربی زبان اور شعر گوئی کی تعلیم حاصل کی۔ علم حدیث مختلف شیوخ سے سیکھا، تاہم زیادہ تر حضرت عبیداللہ بن عتبہؒ سے استفادہ کیا۔ بڑے اور اہم محدثین نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے علم و فضل کو سراہا۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ، "وہ بڑے امام، بڑے فقیہ، بڑے مجتہد، حدیث کے بڑے ماہر اور معتبر حافظ تھے۔" مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں: "ہم لوگ انہیں تعلیم دینے گئے تھے لیکن کچھ دنوں بعد ہم خود ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔"

آپؒ کے والد کے انتقال کے بعد آپؒ کے چچا عبدالملک بن مروان نے اپنی لڑکی فاطمہ سے آپؒ کی شادی کر دی۔ ۶۸ھ / ۶۸۷ء میں ولید بن عبدالملک خلیفہ بنے تو انہوں نے ربیع الاول ۸۷ھ / مئی ۶۹۰ء میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

ایک بار خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ سفر پر نکلے۔ آپؒ نے اپنا سامان اور خیمہ پہلے سے نہیں بھجوایا تھا۔ منزل پر پہنچے تو ہر شخص اپنے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کہیں نظر نہ آئے۔ خلیفہ نے تلاش کروایا تو ایک درخت کے نیچے اس حال میں ملے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ خلیفہ نے بلوا کر دریافت کیا کہ "رونے کی کیا بات ہے؟" جواب ملا، "رونے کا سبب یہ ہے کہ مجھے قیامت کا دن یاد آگیا، دیکھیے میں نے گھر سے کوئی چیز پہلے سے نہ بھیجی تھی، منزل پر پہنچ کر مجھے کچھ نہ ملا، اسی طرح یوم قیامت کے لیے جس نے جو چیز بھیج دی ہو گی اس روز اسے وہی ملے گی۔"

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے آپؒ کے دل میں ابتدا ہی سے خشیتِ الٰہی کا مادّہ رکھ دیا تھا۔ شاید آپؒ کے اسی تقویٰ سے متاثر ہو کر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے آپؒ کو اپنا جانشین نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک ۹۹ھ / ۷۱۷ء میں بیمار پڑے۔ انہوں نے وصیت کی کہ میرے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بخدا اب میں ایسی نامزدگی کروں گا جس میں شیطان کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد ان کی وصیت پر بنوامیہ کے تمام لوگوں سے بیعت لی گئی، پھر وصیت کا اعلان کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو خلیفہ بنائے جانے پر کچھ لوگ جزبز تو ہوئے، لیکن کچھ کر نہ سکے۔ ادھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا حال یہ تھا کہ آپؒ بارِ خلافت کے احساسِ ذمہ داری سے نڈھال تھے۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی تجہیز و تکفین اور خلافت کے ابتدائی مرحلے مکمل کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے گھر لوٹے تو تھوڑی دیر آرام کرنا چاہا۔ اسی وقت آپؒ کے صاحبزادے عبدالملک نے آ کر پوچھا، "آپؒ ان اموال کی واپسی سے پہلے سونا چاہتے ہیں جن پر خلفائے بنوامیہ نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔" آپؒ نے کہا "میں رات کا جاگا ہوا ہوں، نمازِ ظہر کے بعد یہ کام کر لوں گا۔" صاحبزادے نے کہا، "ظہر کے وقت تک آپ کی زندگی کا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے؟" حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر اس فقرے کا اس قدر اثر ہوا کہ صاحبزادے کو پاس بلا کر گلے سے لگا لیا، پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا: "اللہ کا شکر ہے اس نے مجھ کو ایسی اولاد دی ہے جو مجھ کو دین کے کاموں میں مدد دیتی ہے۔" اسی

Marfat.com

وقت منادی کروادی کہ لوگ اپنے مال و جائیداد کے بارے میں اپنی شکایتیں پیش کر دیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ اسے زبردستی ہتھیالیا گیا ہے۔

یہ کام بڑا خطرناک اور نازک تھا۔ خود آپؒ کے پاس بڑی موروثی جاگیر تھی۔ بعض افراد نے آکر آپؒ سے کہا کہ اگر آپؒ نے اپنی جاگیر واپس کر دی تو اولاد کی کفالت کیسے کریں گے؟ آپؒ نے فرمایا، "ان کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" اس کے بعد آپؒ نے تمام اہلِ خاندان کو بلوایا اور ان سے کہا "بنی مروان! میرا خیال ہے امت کا نصف یا دو تہائی مال تمہارے قبضہ میں ہے۔"

تمام اہلِ خاندان نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی بات کو بھانپ کر کہا، "خدا کی قسم جب تک ہمارے سر تن سے جدا نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہ جائیدادیں واپس نہیں ہو سکتیں۔ خدا کی قسم نہ تو ہم اپنے آباؤاجداد کو کافر بنا سکتے ہیں نہ اپنی اولادوں کو مفلس بنائیں گے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نہایت سختی کے ساتھ فرمایا، "خدا کی قسم اگر اس حق میں تم میری مدد نہ کرو گے تو میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑوں گا۔"

اس کے بعد آپؒ نے تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور اعلان کیا کہ اموی خلفا نے جس مال، جاگیر یا جائیداد پر ناجائز قبضہ جمالیا ہے، وہ ان کے حقداروں کو واپس کی جا رہی ہیں۔ اس اعلان کے بعد جاگیروں کی دستاویزات منگوائیں۔ آپؒ کے ایک ماتحت ان دستاویزات کو نکال کر پڑھتے جاتے تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے تھے۔ صبح سے لے کر نمازِ ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپؒ نے اپنی اور اہلِ خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی اور اس میں کسی کے ساتھ کسی قسم کی رعایت سے کام نہ لیا، نہ آپؒ کو دوستیاں متاثر کر سکیں، نہ قرابت داریوں نے مرعوب کیا۔

دستور تھا کہ خلیفہ کے انتقال کے بعد اس کے استعمال شدہ ملبوسات اور عطر اس کے اہل و عیال کا حق سمجھے جاتے تھے اور غیر استعمال شدہ اشیا آنے والے خلیفہ کے حوالے کر دی جاتی تھیں۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہوا تو ان کے اہل و عیال رات بھر تیل اور خوشبو ایک شیشی سے دوسری میں انڈیلتے رہے اور جو ملبوسات استعمال نہ ہوئے تھے انہیں پہن پہن کر استعمال شدہ بناتے رہے۔ صبح ہوئی تو تمام چیزیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے حاضر کر دیں اور کہنے لگے، "یہ چیزیں آپؒ کی ہیں اور یہ ہماری ہیں۔" آپؒ نے پوچھا: "یہ" اور "وہ" کا کیا مطلب ہے؟" اس کی وضاحت کی گئی تو دو ٹوک لہجے میں فرمایا، "یہ ساری چیزیں نہ میری ہیں، نہ سلیمان کی، نہ تمہاری" خادم سے کہا، "سب چیزیں بیت المال میں پہنچادو۔"

خلیفہ بننے سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نفاست پسندی کا حال یہ تھا کہ نہایت بیش قیمت لباس زیب تن کرتے تھے اور تھوڑی دیر میں اسے اُتار کر دوسرا قیمتی لباس پہن لیتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ خوش لباس اور جامہ زیب شخص مانے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عیش و عشرت کے دلدادہ اس شخص پر جب بارِ خلافت ڈالا تو فلکِ نیلگوں پر طلوع ہونے والے سورج نے، رات کی تاریکی میں چمکنے والے چاند ستاروں نے اور ڈالی ڈالی کھلنے والے خوش رنگ پھولوں نے دیکھا کہ اس شخص کی زندگی میں کتنا بڑا تغیر آ گیا ہے۔

عمر ثانیؒ نے خلیفہ بنتے ہی گھر کا ایک ایک نگینہ بیت المال میں داخل کروادیا، خاندان کے تمام وظائف بند کر دیے، شاہی سواری پیش کی گئی تو فرمایا، "میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔" اپنی تمام سواریوں کو فروخت کر کے رقم بیت المال میں داخل کروادی۔ خلفا کے ساتھ نقیبوں اور علمبرداروں کے چلنے کا سلسلہ بند کروادیا۔

غصب شدہ اموال اور جاگیریں ان کے اصل مالکان کو واپس دلوانا آپؒ کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ آپؒ کے اس جرأت مندانہ فیصلے کے اثرات مختلف ہوئے۔ خارجیوں نے جو ہمیشہ خلفا کے خلاف بغاوت کرتے رہتے تھے کہہ دیا کہ اب اس شخص سے جنگ ہمارے لیے مناسب نہیں، لیکن بنوامیہ کے لوگ سخت ناراض ہوئے انہوں نے آپؒ کے فیصلے کو بدلوانے کی بڑی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ صورتحال دیکھ کر بنوامیہ کے امرأ اور وزرا سخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ دیکھو شاہی سواری ٹھکرادی، زینت و آرائش کی اشیا ٹھکرادیں، اب صرف کنیزیں رہ گئی ہیں، وہی پیش کر کے دیکھو، شاید بات بن جائے۔ چنانچہ ایک سے ایک خوبصورت کنیز آپؒ کی خدمت میں پیش کی گئی۔

در حقیقت یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ آپؒ نے ذاتی عیش و آرام کو تو خیرباد کہہ ہی دیا تھا۔ سارے خاندان بنوامیہ کے قبضہ میں موجود غصب شدہ جاگیریں واپس کرواکے سب کی مخالفت مول لی تھی اور اب آپؒ کو خوبرو کنیزیں پیش کر کے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی، لیکن قدرت یہ چاہتی تھی کہ اس مردِ صالح کے ذریعے اس قوم کو راہِ راست

Marfat.com

دکھائے جو دنیا کے عیش و آرام اور اس کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر اپنی منزل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ آپؒ نے ہر کنیز سے اس کے مالک کا نام پتا پوچھا اور اسے اس کے مالک کے پاس بھجوا دیا۔

جب اہلِ خاندان نے دیکھا کہ آپؒ کسی طور اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہیں، تو انہوں نے آپؒ کی پھوپھی کو آپؒ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے آ کر کہا، ''تمہارے رشتہ داروں کو شکایت ہے کہ تم نے ان کی روٹی چھین لی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔''

حکمرانی کے خواہش مند شخص کو اقتدار کی کرسی مل جاتی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی کرسی بچانے کی فکر ہوتی ہے، اس غرض سے وہ اپنی رعایا کے بااثر حلقوں کو مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا ہے، چاہے اس کے لیے اسے ان بااثر حلقوں کو کچھ بے جا مراعات دینی پڑیں، لیکن درویش صفت خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ان باتوں سے بے نیاز تھے۔ آپؒ نے پھوپھی کی بات سن کر کوئی جواب دینے کی بجائے ایک اشرفی، ایک گوشت کا ٹکڑا اور انگیٹھی منگوائی، اشرفی کو آپؒ نے انگیٹھی میں ڈال دیا، جب وہ خوب سرخ ہو گئی تو اسے آپؒ نے اٹھا کر گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا جس سے وہ بھن گیا۔ اب آپؒ نے اپنی پھوپھی سے فرمایا ''پھوپھی! آپ اپنے بھتیجے کے لیے اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتیں؟''

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دورِ خلافت صرف دو سال اور پانچ مہینے کی قلیل مدت پر محیط ہے، لیکن اس مختصر مدت میں آپؒ نے حکمت اور جرأت سے بھرپور جو فیصلے کیے، ان کی بدولت پوری مملکت کی کایا پلٹ گئی۔ آپؒ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ بن خطاب سے بہت متاثر تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد آپؒ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کے پوتے حضرت سالمؒ کو خط لکھا کہ، ''میں چاہتا ہوں، اگر اللہ مجھے اس کی استطاعت دے تو میں رعایا کے معاملات میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی روش اختیار کروں۔ اس لیے آپ میرے پاس ان کی وہ تمام تحریریں اور فیصلے بھیج دیجیے جو انہوں نے مسلمانوں اور ذمیوں کے بارے میں کیے ہیں، اللہ کو منظور ہوا تو میں ان کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔''

آپؒ نے اپنے مختصر سے دورِ خلافت میں رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے۔ آپؒ کے خلیفہ بننے سے پہلے نومسلموں سے بھی جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا، آپؒ نے نومسلمانوں سے جزیہ وصول کیے جانے کی ممانعت کر دی۔ اس پر صرف مصر ہی میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی اور وہاں کے حاکم نے آپؒ سے شکایت کی کہ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے مجھے قرض لے کر مسلمانوں کے وظیفے ادا کرنے پڑ رہے ہیں۔ آپؒ نے جواب میں لکھا، ''جزیہ بہرحال ختم کر دو، حضور ﷺ ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل بنا کر نہیں۔''

آپؒ نے بیت المال کی حفاظت کا نہایت سخت انتظام کیا۔ دفتری اخراجات میں تخفیف کر دی۔ مدینۂ منورہ کے والی (گورنر) ابوبکر بن حزمؒ نے خلیفہ سلیمان کے زمانے میں کاغذ، قلم، دوات اور روشنی کے مصارف میں اضافے کی درخواست کی تھی۔ دفتری کارروائی سے پہلے ہی خلیفہ سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں اس درخواست کے جواب میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے لکھا ''قلم باریک کر لو اور سطریں قریب قریب لکھا کرو، ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لیا کرو، میں مسلمانوں کے خزانے سے کوئی ایسی رقم صَرف نہیں کروانا چاہتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔''

ملک میں جتنے معذور و مجبور تھے ان کی فہرست تیار کروا کے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ شیر خوار بچوں کے وظیفے مقرر کیے۔ اگرچہ آپؒ نے نومسلموں پر جزیہ معاف کر دیا تھا جس سے آمدنی گھٹ گئی تھی پھر بھی سرکاری خزانے سے حاجتمندوں کے وظائف مقرر کیے، لیکن ناجائز آمدنیوں کی روک تھام، ظلم کے سدباب اور مال کی دیانت دارانہ تقسیم کے نتیجے میں صرف ایک سال بعد یہ نوبت آ گئی تھی کہ لوگ صدقہ لے کر آتے تھے اور صدقہ لینے والے نہ ملتے تھے۔ بیت المال کی آمدنی کم ہونے کی بجائے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

آپؒ نے ذمیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ ذمی ان غیر مسلم افراد کو کہتے ہیں جو اسلامی مملکت میں رہتے ہیں، اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرتے ہیں اور حکومت ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ آپؒ نے ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر قرار دی۔

تمام حکام کے نام آپؒ نے فرمان جاری کیا کہ ''نماز کے وقت ہر کام اور کاروبار چھوڑ دیا کرو۔ جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے وہ دوسرے فرائض کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہو گا۔''

آپؒ نے جگہ جگہ سرائیں بنوائیں۔ ان میں مسافروں کی ایک دن اور بیمار مسافروں کی دو دن میزبانی کا حکم دیا۔ شراب کی دکانوں کو بند کروا دیا اور حکم دیا کہ کوئی ذمی، مسلمانوں کے شہروں میں شراب نہ لانے پائے۔ اعلان کر دیا گیا کہ ''جو شخص کھلے عام شراب پیتا پایا گیا

Marfat.com

اسے سخت سزا دی جائے گی اور جو چھپ کر پیے گا اس کو اللہ عذاب دینے والا ہے۔"

آپؒ نے اپنے دور میں علم کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ آپؒ نے حکام کو ہدایت کی کہ مساجد میں علم کو عام کیا جائے۔ جو علماء کرام علم کی تدریس و اشاعت میں مشغول تھے، انہیں فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا۔ ان کے لیے بیت المال سے بھاری وظیفے مقرر کر دیے۔ مختلف ملکوں میں دین کا علم پھیلانے کے لیے علماء بھیجے۔ اسلامی مملکت کے زیر نگیں آنے والے تمام علاقوں میں واعظ اور مفتی مقرر کیے۔

آپؒ کا سب سے بڑا تعلیمی کارنامہ احادیثِ نبویؐ کی حفاظت اور اشاعت ہے۔ آپؒ نے جب یہ دیکھا کہ حدیثوں کے حافظ دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں، تو آپؒ نے مدینہ کے والی قاضی ابو بکر بن حزامؒ کو ہدایت کی کہ احادیثِ نبویؐ کو تلاش کرو اور تحقیق سے ان کے مستند ہونے کے بارے میں اطمینان کر کے انہیں لکھ لو۔ احتیاط رہے کہ صرف مستند احادیث قبول کی جائیں۔ اسی قسم کا حکم نامہ تمام صوبوں کے گورنروں کے نام بھیجا، نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح احادیث کا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدا ترسی، بلند پایہ سیرت اور دیانت دارانہ حُسنِ انتظام کا یہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ پورے معاشرے پر اسلام کا رنگ غالب آ گیا۔ پانچویں خلیفۂ راشد نے اسلام کے پیغام کو دنیا میں عام کرنے کی جانب بھی بھرپور توجہ دی کہ دراصل امتِ مسلمہ کا اصل کام یہی ہے۔ آپؒ نے فوجی افسروں کو ہدایت کر دی کہ رومیوں کی کسی جماعت سے اس وقت تک جنگ نہ کریں جب تک اسے اسلام کی دعوت نہ دے لیں۔ والی خراسان جراح بن عبداللہ حکمیؒ کی تبلیغ سے ان کے ہاتھ پر چار ہزار ذمی مسلمان ہو گئے اور اس طرح والی مغرب اسمٰعیل بن عبداللہؒ کی تبلیغ سے سارے شمالی افریقہ میں اسلام پھیل گیا۔

آپؒ نے سندھ کے حکمرانوں اور زمینداروں کو اسلام کی دعوت دی۔ اکثر نے اسلام قبول کر لیا، ان کی جائیدادیں اور زمینیں ان ہی کے قبضہ میں رہنے دی گئیں۔ راجہ داہر کا لڑکا جے سنگھ بھی انہی میں تھا۔ آپؒ کے اخلاق سے متاثر ہو کر بعض ملکوں نے وفد بھیج کر اپنے ہاں اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے علماء بھیجنے کی درخواست کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی شخصیت میں ہمیں ایک بے حد متقی، پرہیز گار، دانا اور کمال کا منتظم نظر آتا ہے، جس کے پورے جسم پر خشیتِ الٰہی غالب ہے اور جس کا دل فکرِ آخرت سے ہر لمحہ معمور ہے۔ آپؒ کا ایک ایک عمل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس آپ پر ہر لمحہ طاری تھا۔

روزانہ نماز عشا کے بعد تنہائی میں بیٹھ جاتے اور رو رو کر دعائیں کیا کرتے۔ جب لوگ اس بارے میں کچھ کہتے تو فرماتے "تم لوگ رونے پر مجھے ملامت نہ کیا کرو، اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلے عمرؒ پکڑا جائے گا۔"

بیت المال کی جانب فقرا اور مساکین کے لیے جو مہمان خانہ تھا، اس کے باورچی خانے سے اپنے لیے پانی تک گرم نہ کرواتے تھے۔ ایک بار آپؒ کی لاعلمی میں خادم ایک ماہ تک اسی باورچی خانے سے پانی گرم کرتا رہا۔ آپؒ کے علم میں یہ بات آئی تو جتنی لکڑی خرچ ہوئی تھی اتنی ہی لکڑی خرید کر باورچی خانے میں رکھوا دی۔

ایک بار بیت المال سے بہت سے سیب آئے۔ آپؒ انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کا چھوٹا بچہ ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ آپؒ نے اس کے منہ سے سیب چھین لیا، بچہ سیب چھن جانے پر روتا ہوا اماں کے پاس چلا گیا۔ ماں نے بازار سے سیب منگوا کر دے دیا۔ آپؒ گھر آئے تو سیب کی خوشبو آئی، پوچھا، "سرکاری سیب یہاں تو نہیں آیا؟" اہلیہ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ آپؒ نے فرمایا: "خدا کی قسم! میں نے اس کے منہ سے سیب نہیں چھینا تھا، بلکہ اپنے دل سے چھینا تھا، لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ مسلمانوں کے حصے کے سیب کے بدلے خود کو اللہ کے حضور برباد کر لوں۔"

رجب ۱۰۱ھ / جنوری ۷۲۰ء میں بیمار پڑے۔ اس سلسلے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ آپؒ کی علالت طبعی تھی۔ دوسری یہ کہ بنو امیہ نے آپؒ کے ایک خادم کو ایک ہزار اشرفیاں دے کر آپؒ کو زہر دلوا دیا تھا۔ آپؒ کو علالت کے دوران ہی اس کا علم ہو گیا تھا، لیکن آپ نے غلام سے کوئی انتقام نہ لیا، بلکہ اشرفیاں اس سے لے کر بیت المال میں داخل کروا دیں اور غلام کو آزاد کر دیا۔

طبیعت بہت خراب ہو گئی تو آپؒ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ یزید بن عبدالملک کے نام وصیت لکھوائی، جس میں انہیں تقویٰ کی تلقین کی۔ ۲۵ رجب ۱۰۱ھ / ۱۰ فروری ۷۲۰ء کو آپؒ نے اپنا سفر حیات مکمل کر لیا۔ اس وقت آپؒ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ آپؒ کو حلب کے قریب دیر سمعان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

دانا و بے باک فقیہِ اعظم، احادیثِ نبویؐ کی حفاظت و اشاعت ان کا کارنامہ ہے

وہ ایک موچی تھا!

دن بھر جوتے مرمت کرتا اور شام ہوتی تو بازار کا رخ کرتا، مزدوری کی رقم سے گوشت اور شراب خرید لیتا اور گھر لوٹ آتا، رات گئے اس کے دوست احباب جمع ہو جاتے۔ موچی خود ہی سیخ پر کباب لگانے کا فریضہ بھی سنبھال لیتا، محفل ناؤنوش گرم ہو جاتی، جام گردش میں آ جاتا، خوب غل غپاڑہ مچتا، موچی ترنگ میں آکر ایک شعر گاتا جس کا مفہوم یہ تھا:

"لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا، اور کیسے بڑے شخص کو کھو دیا جو لڑائی کے دن کام آتا، اور سرحدوں کی نگہبانی کرتا۔"

موچی کے پڑوس میں ایک بہت بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ صرف علم ہی کے نہیں عمل کے بھی شہسوار تھے، نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ دن ان کا درس و تدریس میں اور رات ذکر اللہ میں گزرتی تھی۔ پڑوس میں روزانہ رات کو ہنگامہ رہتا اور رنگین مزاج موچی اور اس کے دوستوں کے شور شرابے کے باعث بزرگ کی عبادت میں خلل پڑتا، لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے کبھی اپنے پڑوسی سے کچھ نہ کہا۔

ایک رات شہر کا کوتوال ادھر آنکلا۔ اس نے جو ہنگامہ ہوتے دیکھا تو موچی کو پکڑ کر لے گیا اور جیل میں ڈال دیا۔ صبح ہوئی تو بزرگ نے اپنے دوستوں سے دریافت کیا کہ رات ہمارے پڑوس میں سکون تھا، ہمسائے کی آواز نہیں آئی۔ لوگوں نے بتایا کہ اسے کوتوال صاحب پکڑ کر لے گئے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو خوشی کا اظہار کرتا کہ چلو اچھا ہوا جان چھوٹی۔ کئی دنوں سے رات کی نیند حرام کر رکھی تھی، اب جیل کی ہوا کھائے گا تو درست ہو جائے گا، لیکن بزرگ نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے سواری طلب کی اور والی (گورنر) کے پاس تشریف لے گئے۔ والی کو لوگوں نے بزرگ کی آمد کی اطلاع دی تو وہ تعظیم کے لیے اٹھا اور کہنے لگا "آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھے بلا بھیجتے۔" بزرگ نے فرمایا، "ہمارے محلے میں ایک موچی رہتا ہے کوتوال نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا ہو جائے"۔ والی نے اسی وقت حکم دیا اور موچی کو رہا کر دیا گیا۔

بزرگ واپس جانے لگے تو موچی بھی ساتھ ہو لیا۔ بزرگ نے اس سے اس کے پسندیدہ شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیوں، ہم نے تم کو ضائع نہیں کیا؟" موچی بولا۔ "نہیں، آپ نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا۔"

اس رات بزرگ کے پڑوس میں شراب و کباب کی محفل نہیں جمی، وجہ یہ نہیں تھی کہ کوتوال موچی کو دوبارہ پکڑ کر لے گیا تھا یا کوتوال نے موچی کو دھمکیاں دی تھیں، بلکہ وجہ یہ تھی کہ موچی نے عیش پرستی سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے دل پر اپنے بزرگ پڑوسی، امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حسنِ سلوک کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ اس کی کایا پلٹ گئی تھی، وہ امام صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے فقہ میں اتنی مہارت حاصل کی کہ "فقیہ" کے لقب سے سرفراز ہوا۔

یہ امام ابو حنیفہؒ تھے، جن کا امتِ مسلمہ پر عظیم احسان ہے، جن کے بیان کردہ مسائل بارہ سو برس سے تمام اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی عظیم اکثریت فقہی مسائل کے حل کے لیے آپؒ کی جانب رجوع کرتی ہے۔ آپؒ تابعی ہیں اور فقہ حنفی کے بانی ہیں۔

آپؒ کا نام نعمان اور والد کا نام ثابت تھا۔ کنیت نام سے زیادہ مشہور ہے، یعنی ابو حنیفہ لیکن یہ حقیقی کنیت نہیں ہے۔ آپؒ کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہیں تھا۔ کنیت وصفی معنوں کے اعتبار سے ہے۔ قرآن پاک

Marfat.com

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "حنیف" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی "یکسو" ایسا شخص جو ہر طرف سے کٹ کر ایک خدا کا ہو رہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی حیاتِ مبارکہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپؒ کی ذات نہ صرف علم کا ایک وسیع و عریض سمندر تھی بلکہ آپؒ عمل کی بلندیوں پر بھی فائز تھے۔ آپؒ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اس ایک ذات کے ہو رہے تھے، جس کے قبضے میں دونوں جہانوں کے خزانے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی لالچ، کوئی ڈر اور کوئی دباؤ آپؒ کو حق بات کہنے سے باز نہ رکھ سکا۔

امام ابو حنیفہؒ ۸۰ھ/۶۹۹ء میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اپنے والد کی طرح تجارت کی طرف مائل ہوئے، وہ کوفہ میں ایک قسم کا ریشمی کپڑا "خز" بناتے اور اس کی تجارت کرتے تھے۔ جامع مسجد کے پاس ان کی دکان اور کارخانہ تھا۔ جن دنوں آپؒ کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ تھی، ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک دن بازار جارہے تھے، کوفے کے مشہور امام، امام شعبیؒ کے مکان کے سامنے سے گزرے۔ امام شعبیؒ نے انھیں دیکھا تو سمجھے کوئی نوجوان طالب علم ہے۔ پاس بلالیا، پوچھا "کہاں جارہے ہو؟" انہوں نے کسی سوداگر کا نام بتایا کہ اس کے پاس جارہا ہوں۔ امام شعبیؒ نے دریافت کیا۔ "تم پڑھتے کس سے ہو؟" جواب ملا۔ "کسی سے نہیں"۔ امام شعبیؒ نے کہا "تم میں مجھ کو قابلیت کے جوہر نظر آتے ہیں، تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔"

امام حمادؒ کوفہ کے مشہور امام تھے۔ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے نہایت قریبی صحابی حضرت انسؓ سے حدیث سنی تھی، ابو حنیفہؒ، امام حمادؒ کے درس میں شریک ہوگئے۔ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے، کیونکہ نئے طالب علموں کے لیے یہی طریقہ تھا لیکن چند ہی دنوں بعد امام حمادؒ نے حکم دیا کہ ابو حنیفہؒ سب سے آگے بیٹھا کریں، کیونکہ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ پورے حلقے میں کوئی بھی شاگرد ذہانت اور حافظے میں ابو حنیفہؒ کی برابری نہیں کر سکتا۔

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں، "دو سال تک امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتا رہا، پھر خیال آیا کہ خود بھی درس کا سلسلہ شروع کروں مگر استاد کا ادب مانع آتا تھا، انہی دنوں امام حمادؒ کے ایک رشتے دار بصرہ میں انتقال کر گئے، امام صاحبؒ کو جانا پڑا وہ مجھے اپنا قائم مقام بنا گئے۔ اب اگلے چند دنوں میں کئی ایسے مسئلے میرے سامنے آئے جن کے بارے میں استاد سے میں نے کوئی روایت نہ سنی تھی۔ میں نے ان مسائل کے جوابات اپنے اجتہاد سے دیے اور احتیاطاً ایک یادداشت لکھتا گیا۔ دو ماہ کے بعد امام حمادؒ واپس آئے تو میں نے یادداشت پیش کی۔ ساٹھ مسئلے تھے۔ استاد نے ان کے جوابات میں بیس غلطیاں نکالیں اور کہا کہ باقی جوابات درست ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب تک امام حمادؒ زندہ ہیں ان کی شاگردی نہ چھوڑوں گا۔" امام حمادؒ کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اگرچہ دیگر کئی اساتذہ اور علما سے علم حاصل کیا لیکن وہ امام حمادؒ کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ اب حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ کوفہ میں شاید ہی کوئی ایسا محدث ہو جس کی امام صاحبؒ نے شاگردی نہ اختیار کی ہو۔ آپؒ کے اساتذہ میں امام شعبیؒ، ابو اسحٰق شعبیؒ، حضرت سماکؒ اور حضرت قتادہؒ شامل ہیں۔ اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ وہاں مکہ مکرمہ میں حضرت عطا بن ابی رباحؒ کا حلقۂ درس قائم تھا، اس میں شریک ہوگئے۔ آپؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے غلام حضرت عکرمہؒ، شام کے امام المذہب مکحول شامیؒ اور امام اوزاعیؒ سے مکہ میں علم حاصل کیا اور حدیث کی سند لی۔ آپؒ کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار بیان کی گئی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی شہرت کا اب یہ حال تھا کہ حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ کرتے تو شور مچ جاتا کہ فقیہ عراق عرب جارہے ہیں۔

ایک دفعہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اتنا ہجوم تھا کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ آپؒ نے کہا "کاش ہمارے میزبان سے کوئی کہتا کہ اس ہجوم کا انتظام کرے۔" ابو عاصم نبیل نے کہا "میں جاتا ہوں لیکن چند مسئلے دریافت کرنے رہ گئے ہیں۔" امام صاحبؒ نے مسئلے توجہ سے سنے، اس میں میزبان کا خیال جاتا رہا، ابو عاصم سے فارغ ہوئے تو دیگر طالب علموں نے مسائل پوچھنے شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد پھر خیال آیا تو دریافت کیا "کسی شخص نے میزبان کے پاس جانے کے لیے کہا تھا۔" ابو عاصم کہنے لگے "جی ہاں میں نے عرض کیا تھا۔" آپؒ نے پوچھا "پھر تم گئے نہیں؟" ابو عاصم شوخی سے کہنے لگے "میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ابھی جاتا ہوں، جب فرصت ہوگی تب جاؤں گا۔" امام صاحبؒ نے ابو عاصم کی بات پر فوراً گرفت کی اور فرمایا۔ "عام بول چال میں ان احتمالات کا موقع نہیں، ان لفظوں کے معنی وہی لیے جائیں گے جو عوام کی غرض ہوتی ہے۔"

امام صاحبؒ میانہ قد، خوش رُو اور موزوں اندام تھے۔ گفتگو بلند اور صاف آواز میں کرتے تھے۔ مزاج میں تکلف تھا۔ اچھا لباس پہنتے

Marfat.com

تھے۔ وظیفہ لینے کے مخالف تھے اسی لیے آپؒ کو حق گوئی میں کبھی باک نہ ہوا۔

خلیفہ منصور اور ان کی بیوی حرہ میں کچھ ناچاقی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتے۔ منصور نے کہا، کسی کو منصف قرار دے لو، خاتون نے امام ابو حنیفہؒ کا نام لیا۔ خلیفہ نے اسی وقت بلوالیا۔ خاتون پردے کے پیچھے موجود تھیں۔ منصور نے امام صاحبؒ سے پوچھا "شریعت کی رُو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟" امام صاحبؒ نے کہا۔ "چار" منصور نے کہا "سنتی ہو؟" پردے کے پیچھے سے آواز آئی "ہاں سنا"۔ امام صاحبؒ نے منصور سے کہا "مگر یہ اجازت اس شخص کے لیے خاص ہے جو عدل پر قادر ہو، ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں ہے۔" منصور چپ ہو گئے۔

امام صاحبؒ گھر آ گئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم لے کر حاضر ہوا کہنے لگا۔ "خاتون نے نذر بھیجی ہے اور کہا کہ آپ کی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے اور آپ کی حق گوئی کی نہایت شکر گزار ہے"۔ امام صاحبؒ نے رقم واپس کر دی اور کہا "جا کر خاتون سے کہنا، میں نے جو کچھ کہا، وہ کسی غرض سے نہیں کہا، یہ تو میرا فرض تھا۔"

لاکھوں کی تجارت کرتے تھے، اکثر شہروں میں آپؒ کے نمائندے مقرر تھے۔ ایک بار حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس کپڑے کے تھان بھیجے، ساتھ ہی پیغام دیا کہ فلاں فلاں تھان میں خرابی ہے خریدار کو بتا دینا۔ حفص کو یاد نہ رہا اور خریدار کو بتائے بغیر ہی تھان فروخت کر دیے۔ امام صاحبؒ کو معلوم ہوا تو نہایت رنج ہوا، آپؒ نے تمام تھانوں کی قیمت، تیس ہزار درہم خیرات کر دی، آپؒ نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس رقم میں سے ایک درہم بھی اپنے پاس رکھیں۔

ایک بار کسی بیمار کی عیادت کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شخص ملا اس نے چاہا کہ کترا کر نکل جائے۔ اسے امام صاحبؒ نے بلا لیا اور پوچھا کہ راستہ کاٹ کر کیوں نکل رہے تھے۔ اس نے کہا "امام صاحبؒ میں آپ کا دس ہزار درہم کا مقروض ہوں اسی شرم سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔" امام صاحبؒ اس شخص کی غیرت پر حیران ہوئے، فرمایا "جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔"

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں، "امام ابو حنیفہؒ لوگوں کو پچاس پچاس اشرفیاں یا اس سے بھی زائد رقم دے دیتے، لیکن جب کبھی کوئی شخص لوگوں کے سامنے شکریہ ادا کرتا تو آپؒ کو اس سے تکلیف ہوتی، فرماتے:

"میاں! اللہ نے یہ روزی تم تک پہنچائی ہے، میں تو صرف خزانچی ہوں، جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں رکھ دیتا ہوں۔"

ایک بار کسی حاجی نے آپؒ کی خدمت میں جوتوں کے ایک ہزار جوڑے تحفہ کے طور پر پیش کیے۔ ایک دو دن کے بعد آپؒ اپنے بیٹے کے لیے بازار میں جوتا خریدتے دکھائی دیے۔ آپؒ کے شاگرد حضرت یوسف بن خالدؒ نے دریافت کیا کہ ابھی تو آپؒ کے پاس ہزار جوڑے جوتے آئے تھے۔ آپؒ نے فرمایا "میرا قاعدہ یہی ہے کہ تحائف اپنے شاگردوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔"

موصول ہونے والے تحائف تو آپؒ دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور خود آپؒ کا حال یہ تھا کہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ تحفے دیا کرتے تھے۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ میرے پاس امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے تحفوں کی اس قدر بھرمار ہوئی کہ میں گھبرا اُٹھا۔ ایک شخص نے امام ابو حنیفہؒ کو تین درہم کی چیز تحفے کے طور پر پیش کی آپؒ نے اس کو پچاس درہم مالیت کا خز (ریشمی کپڑا جس میں اون شامل ہوتا ہے) کا ٹکڑا جوابی تحفہ کے طور پر بھیجا۔

آپؒ اپنے طلبہ کے لیے جمعہ کے روز طرح طرح کے کھانے پکواتے لیکن کھانے میں خود شریک نہ ہوتے، پوچھنے پر فرماتے "اس طرح تم لوگوں کی بے تکلفی جاتی رہے گی۔" اس سے امام صاحبؒ کے حلم اور حکمت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ جانتے تھے کہ نوجوانوں کو کسی بزرگ کی موجودگی میں سنجیدہ ہو کر بیٹھنا پڑے گا اور وہ آپس میں ہنسی مذاق نہ کر سکیں گے۔

کوفہ کے والی ابن ہبیرہ نے جب امام صاحبؒ کو میر مفتی بنانا چاہا تو آپؒ نے انکار کر دیا۔ اس پر اس نے امام صاحبؒ کو دُرّے لگوائے، جس کا امام صاحبؒ کی والدہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں، "مجھے اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا، البتہ یہ رنج تھا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہنچا۔"

امام صاحبؒ کی دیانت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس زمانے میں گورنر کی طرف سے آپؒ کے فتوی دینے پر پابندی تھی، ایک دن گھر میں بیٹھے تھے کہ آپؒ کی لڑکی نے آ کر مسئلہ پوچھا "میرا روزہ ہے، دانتوں سے خون بہہ نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اتر گیا، روزہ ہے یا جاتا رہا"۔ امام صاحبؒ چاہتے تو جواب دے سکتے تھے،

Marfat.com

گھر کے اندر خلیفہ کے کارندے تو جانچ پڑتال کے لیے نہیں آتے تھے، لیکن آپؒ نے کہا" جانِ پدر! اپنے بھائی حمادؒ سے پوچھ، مجھے فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہے۔" مؤرّخ ابن خلکان کہتے ہیں کہ چند روز بعد والی کو بعض فقہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ اس نے امام ابو حنیفہؒ سے رجوع کیا۔ اس طرح امام صاحبؒ کو پھر فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی۔

خلیفہ منصور نے ایک بار امام صاحبؒ کے پاس کچھ رقم بھیجی۔ آپؒ نے لینے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا، "لے کر خیرات ہی کر دیجیے" آپؒ نے پوچھا"کیا ان لوگوں کے پاس حلال بھی کچھ ہے؟ کیا ان کے پاس حلال بھی کچھ ہے؟"۔

کوفہ میں امام صاحبؒ کا ایک قسم کے کپڑے "خز" کا بڑا کارخانہ تھا۔ شہر میں ایک بڑی دکان بھی تھی۔ آپؒ کے صاحب زادے اور شاگرد دکان پر کام کرتے تھے۔ آپؒ نے دکان پر مختلف قسم کے کپڑوں کی قیمتیں متعین کر دی تھیں۔ ایک دن امام صاحبؒ دکان پر موجود نہ تھے۔ ایک شاگرد نے کسی گاہک کو مقررہ دام سے زیادہ قیمت میں کپڑا دے دیا۔ امام صاحبؒ نے بعد میں حسابات کی جانچ پڑتال کی تو اس بات کا علم ہوا کہ شاگرد نے کپڑے کے زیادہ دام وصول کر لیے ہیں۔ آپؒ نے اپنے طالب علم کو برہمی سے دیکھا اور فرمایا، "تم لوگوں کو دھوکا دیتے ہو؟" خریدار مدینہ منورہ کا باشندہ تھا۔ آپؒ مدینہ تشریف لے گئے اور اس معاملے کی تلافی کی۔

امام ابو حنیفہؒ کی ذہانت، حاضر جوابی اور معاملہ فہمی مشہور ہے۔ کوفہ کے گورنر ابن ہبیرہ نے ایک بار امام صاحبؒ سے اپنے پاس آنے کی درخواست کی۔ آپؒ پہنچے، دیکھا کہ ایک نگینہ اس کے سامنے پڑا ہے اور وہ کچھ سوچ رہا ہے، آپؒ نے دریافت کیا کہ کس سوچ میں گم ہو؟ کہنے لگا، "یہ نگینہ مجھے پسند آ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے استعمال کروں لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس پر دوسرے آدمی کا نام کھدا ہوا ہے۔" امام صاحبؒ نے نگینہ لے کر دیکھا تو اس پر نقش تھا "عطا بن عبد اللہ"۔

امام صاحبؒ نے سامنے بیٹھے ایک شخص کو نگینہ دیا اور اسے ہدایت کی کہ اس نگینہ پر کھدے ہوئے الفاظ "عطا بن عبد اللہ" میں صرف اتنی تبدیلی کروا دو کہ "بن" کو "من" کر دو اور "عبد اللہ" کی "ب" کے نقطہ کو مٹا کر "عبد" کے اندر نون کا نقطہ لگوا دو۔ وہ شخص گیا اور تھوڑی دیر میں نگینہ لے کر لوٹ آیا۔ آپؒ نے نگینہ ابن ہبیرہ کے حوالے کیا اور فرمایا، "اب آپ اسے پہن سکتے ہیں۔"

ابن ہبیرہ نے تعجب سے پوچھا، کیا ہوا؟ امام صاحبؒ نے کہا "اب پڑھیے" ابن ہبیرہ نے پڑھا تو نگینہ پر کھدے الفاظ میں معمولی سی تبدیلی کے بعد اب جو الفاظ پڑھے جا رہے تھے وہ تھے، "عطا من عند اللہ" یعنی اللہ کی طرف سے دی ہوئی چیز ہے۔ امام صاحبؒ کی ذہانت پر ابن ہبیرہ اچھل پڑا، فوراً سنار کے پاس نگینہ بھیجا گیا کہ انگوٹھی میں جڑ کر واپس کرے۔

قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں، "ایک بار میں خلیفہ کی ڈیوڑھی میں تھا، سامنے سے ایک آدمی گزرا، لوگ آپس میں کہنے لگے، یہ بڑا حساب دان ہے، مجھے ایک حسابی مسئلے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں اس شخص کے پاس پہنچا اور مسئلہ پیش کیا۔ اس نے ایک طریقہ بتایا لیکن اس طریقے سے مسئلہ حل کرنے پر جواب درست نہیں آیا، تب اس شخص نے کہا، اب بس ایک طریقہ رہ گیا ہے جو مجھے امام ابو حنیفہؒ نے بتایا تھا، قاضی ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ "اس طریقے سے مسئلہ حل کیا تو بالکل صحیح جواب آ گیا۔"

ایک بار ایک شخص امام صاحبؒ کے پاس آیا، اس نے کہا "میں نے اپنی رقم ایک جگہ احتیاط سے رکھ دی تھی اب یاد نہیں آتا کہ کہاں رکھی ہے مجھے رقم کی سخت ضرورت ہے۔ کوئی تدبیر بتایئے۔" امام صاحبؒ نے کہا۔ "بھائی، یہ کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے، مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟" وہ شخص منت سماجت کرنے لگا۔ آپؒ نے فرمایا، "جاؤ آج ساری رات نماز پڑھو۔"

وہ شخص گیا اس نے جا کر نماز شروع کی، تھوڑی ہی دیر میں اسے یاد آ گیا کہ رقم فلاں جگہ رکھی تھی۔ دوڑا ہوا امام صاحبؒ کے پاس آیا کہنے لگا "آپؒ کی تدبیر درست ثابت ہوئی۔" امام صاحبؒ نے فرمایا، "ہاں! شیطان کب گوارا کرتا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو، اس نے جلد یاد دلا دیا، تاہم مناسب یہ تھا کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے رات بھر نماز پڑھتے۔"

امام صاحب کی تصنیف کردہ کتب میں فقہ اکبر، العالم والمتعلّم اور مسند شامل ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدوّن کیے، ان کی تعداد بارہ لاکھ ۹۰ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ امام صاحبؒ نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا تھا وہ بہت وسیع اور دشوار تھا۔ انہوں نے اتنے مشکل کام کو تن تنہا انجام دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے شاگردوں میں سے

Marfat.com

چالیس ماہر افراد کا انتخاب کیا، ان کی ایک مجلس بنائی۔ ان میں امام زفرؒ بھی شامل تھے۔ اس طرح فقہ کے اعلیٰ درجے کے ایک ادارے کی بنیاد پڑی۔ اس ادارے نے امام ابو حنیفہؒ کی سربراہی میں تیس برس تک کام کیا۔ امام ابو حنیفہؒ کی زندگی ہی میں اس مجلس کے فتاویٰ تیار ہو کر، ملک بھر میں پھیلنے لگے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اپنا اصولِ تحقیق کچھ یوں بیان کیا ہے، "میں کتاب اللہ سے اخذ کرتا ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ مجھے وہاں نہیں ملتا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ سے لیتا ہوں اور جب وہاں بھی نہ ملے تو صحابہ کرامؓ میں سے کسی کا قول مان لیتا ہوں اور جب معاملہ ابراہیم شعبیؒ، ابن سیرینؒ اور عطا پر آجائے تو یہ لوگ مجتہد تھے، اس وقت میں بھی انہی لوگوں کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔" (تہذیب التہذیب)۔

امام ابو حنیفہؒ دینی مسائل میں غور و فکر کے بعد اپنے شاگردوں سے بحث کرتے تھے اور پھر حاصلِ بحث کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ آپؒ کی اولاد میں سے آپؒ کے بیٹے حمادؒ اور پوتے اسماعیلؒ نے فقہ اسلامی میں بڑا نام پیدا کیا۔ آپؒ کے اہم شاگردوں میں حضرت داؤد الطائیؒ، امام ابو یوسفؒ، اسد بن عمروؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جیسے جلیل القدر بزرگ شامل ہیں۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں امام ابو حنیفہؒ کے فتاویٰ کو پورے ملک میں قانون کا درجہ حاصل تھا۔ آپؒ کے شاگردوں کی تعداد ۷۳۰ اور ایک دوسری روایت کے مطابق ۸۸۰ ہے۔

امامؒ ابو یوسفؒ کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کوئی ہنر سیکھے لیکن امام ابو یوسفؒ، امام ابو حنیفہؒ سے علم حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ایک دن حضرت ابو حنیفہؒ کے درس میں شریک تھے کہ والد آئے اور امام ابو یوسفؒ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ گھر آکر سمجھایا "بیٹا، ابو حنیفہؒ کو رزق کی طرف سے اطمینان ہے تم ان کی برابری کیوں کرتے ہو؟" امام ابو حنیفہؒ نے دو چار دن بعد پوچھا، "یعقوب (امام یوسفؒ) اب نہیں آتے؟" لوگوں نے بتایا کہ ان کے والد نے منع کر دیا ہے۔ امام صاحبؒ چپکے سے امام ابو یوسف کے پاس پہنچے، سو درہم کی تھیلی ان کے حوالے کی اور کہہ گئے کہ جب یہ رقم خرچ ہو جائے تو مجھ سے اور لے لینا، اسی طرح ان کی مدد کرتے رہے، یہاں تک امام ابو یوسفؒ فقہ کے عالم بن گئے۔

جب ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء میں بغداد میں سلطنتِ عباسیہ قائم ہوئی تو خلیفہ منصور نے بغداد کو دارالخلافہ بنایا۔ ۱۴۶ھ / ۷۶۳ء میں آپؒ کو خلیفہ نے بلایا اور قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ آپؒ نے انکار کر دیا اور فرمایا "مجھ میں اس کی قابلیت نہیں ہے۔" منصور نے کہا، "آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" آپؒ نے جواب دیا، "اگر میں جھوٹا ہوں تو آپ ایک جھوٹے کو قاضی مقرر نہیں کر سکتے"۔ خلیفہ لاجواب ہو گئے۔ پھر آپؒ نے انہیں سمجھایا کہ میں عربی النسل نہیں ہوں، اس لیے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار گزرے گی۔ لیکن منصور نے قسم کھا کر کہا کہ آپ کو عہدہ قبول کرنا ہوگا۔ آپؒ نے بھی قسم کھا کر کہا کہ ہرگز قبول نہ کروں گا۔ خلیفہ نے آپ کو قید کر دینے کا حکم دے دیا۔

قید کے دوران میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ امام محمدؒ نے جیل ہی میں آپؒ سے تعلیم پائی۔ بالآخر لوگوں کے بے حد زور دینے پر محض خلیفہ کی قسم پوری کرنے کے لیے آپؒ نے فرمایا کہ دجلہ کے پار ایک چھوٹی سی آبادی "رصافہ" کے قاضی کا عہدہ قبول کر لیتا ہوں۔ خلیفہ اس پر راضی ہو گئے۔

رصافہ میں آپؒ نے پانچ دن گزارے، پھر آپؒ بیمار پڑ گئے اور چھ دن تک بیمار رہے اور اسی بیماری کے عالم میں اپنے رب سے جا ملے۔ ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں علم کا یہ چمکتا ہوا آفتاب غروب ہو گیا۔

امام صاحبؒ کی وفات کی خبر کیا پھیلی کہ سارا بغداد امڈ آیا۔ پہلی بار پچاس ہزار افراد نے آپؒ کی نماز جنازہ ادا کی، پھر مزید پانچ مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ یہاں تک کہ عصر کے قریب تدفین ہوئی۔ مؤرخ خطیب کے مطابق، وفات کے بیس دن بعد تک بھی لوگ آ آکر نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ آپؒ کو آپؒ کی وصیت کے مطابق خیزراں کے مقبرے کے مشرق میں دفن کیا گیا۔ جس محلّے میں آپؒ کا مقبرہ واقع ہے وہ اب بھی امام اعظم کے نام سے اعظمیہ کہلاتا ہے۔

•••

Marfat.com

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

اپنے استاد سے 'علم کا محافظ' کا خطاب پانے والے عظیم محدث

عید کا دن تھا۔

ہر طرف چہل پہل تھی، لوگ عمدہ لباس پہنے، عید کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنے گھروں کی طرف رواں تھے تاکہ گھر والوں کو عید کی مبارک باد دے سکیں۔ لیکن ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس کے قدم اپنے گھر کی بجائے کسی اور سمت میں اٹھ رہے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ نوجوان اپنے گھر والوں سے خفا تھا یا اسے کسی دوست یا رشتے دار سے ملنا تھا یا وہ کسی تفریح میں حصہ لینے جا رہا تھا بلکہ وہ نوجوان ایک بہت بڑے عالم کے مکان پر جا کر رُک گیا۔

نوجوان نے دروازے پر دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ بہت بڑے عالم نے نوجوان سے پوچھا۔

"تم عید کی نماز پڑھ کر گھر نہیں گئے؟"

"نہیں!"

"کچھ کھالو!"

"جی نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"حدیث بیان فرمایئے!"

بزرگ نے اس نوجوان کو کتاب لانے کا حکم دیا۔ نوجوان کتاب نکال کر لایا۔ بزرگ نے چالیس حدیثیں بیان کیں، نوجوان نے کہا: "اور ارشاد فرمایئے!"

"یہی کافی ہیں"۔ بزرگ نے فرمایا، "اگر تم نے یہ حدیثیں یاد کرلیں تو تمہارا شمار حفاظ میں ہو گا۔"

"میں نے یاد کرلیں!!" نوجوان نے انکشاف کیا۔

بزرگ نے نوجوان کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور فرمایا: "بیان کرو۔"

نوجوان نے وہ تمام چالیس حدیثیں لفظ بہ لفظ بیان کر دیں جو ابھی چند لمحوں قبل، بزرگ نے اس کے سامنے بیان کی تھیں۔

بزرگ کے لبوں کو جنبش ہوئی، انہوں نے فرمایا: "جاؤ! تم علم حدیث کے زبردست فقیہ ہو۔"

یہ نوجوان تھے مالک بن انسؒ جو آگے چل کر امام مالکؒ کہلائے اور بزرگ تھے امام ابن شہاب الزہریؒ، جن سے علم کے حصول کے لیے مالکؒ نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ نماز عید کے بعد گھر چلے جائیں۔ خود امام مالکؒ کے کہنے کے مطابق: "میں نے سوچا کہ آج ایسا دن ہے کہ امام ابن شہاب فارغ ہوں گے اس لیے ان کے پاس چلا گیا۔"

علم دین حاصل کرنے کے لیے یہ شوق، جستجو، تڑپ اور لگن تھی جس نے امام مالکؒ کو مسلمانوں کے فقہ کے چار بڑے اماموں میں سے ایک کے بلند مرتبہ پر فائز کیا۔ آپؒ کی پوری زندگی ایک روشن مینار کی مانند ہے، جس سے آنے والی نسلیں نور کی کرنیں لے کر اپنی سیرتوں کو منور کر سکتی ہیں۔

آپ کا نام مالک، کنیت ابو عبداللہ اور لقب "امام دار الہجرۃ" یعنی مدینے کا امام ہے۔ آپ ۹۳ھ / ۷۱۱ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بنوامیہ کی حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ولید بن عبدالملک حکمران تھے اور اسلامی حکومت مشرق میں ترکستان (چین) کابل، سندھ اور مغرب میں افریقہ اور اسپین تک پھیل چکی تھی۔ اسلامی حکومت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ مملکتِ اسلامی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

امام مالکؒ نے ایسے گھر میں آنکھیں کھولیں جو علم حدیث کی روشنی سے منور تھا۔ آپؒ کے دادا حضرت مالک بن ابی عامرؒ بڑے تابعی اور علما میں سے تھے۔ والد انس بن مالکؒ محدث تھے، بھائی پہلے ہی علم حدیث

Marfat.com

میں مشغول تھے۔

ننھے مالک بن انسؒ کو بچپن میں پرندے پالنے میں بہت دلچسپی تھی۔ آپؒ کی والدہ محترمہ عالیہ بنت شریک نے اپنے لختِ جگر کو دینی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ آپؒ نے پہلے ایک مکتب میں حضرت علقمہ بن ابی علقمہؒ سے عربی، نحو اور عروض کی تعلیم حاصل کی اور قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد تجوید میں مہارت حاصل کی۔ اس زمانے میں مسجد نبوی کو درسگاہوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

آپؒ نے فنِ قرأت میں اہل مدینہ کے امام حضرت نافع بن نعیمؒ سے قرأت سیکھی۔ پھر اس کمسن لڑکے کے دل میں علم حدیث سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، گھر والوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، والدہ محترمہ معصوم بچے کی زبان سے یہ سن کر خوشی سے جھوم اُٹھیں، فوراً عمدہ لباس پہنایا، سر پر عمامہ باندھا اور کہا: "جاؤ اور ابھی سیکھو!"

والدہ کے شوق دلانے پر مستقبل کا یہ فقیہ، مسجد نبویؐ میں حضرت ربیعۃ الرائےؒ کی درس گاہ کا طالب علم بن گیا۔

اس نو وارد طالبِ علم کا حال یہ تھا کہ جو پڑھتا تھا اسے یاد کر لیتا تھا۔ روزانہ، سبق پڑھنے اور لکھنے کے بعد یہ لڑکا دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کی بجائے، درختوں کے سائے میں جا بیٹھتا۔ ایک دن بہن نے دیکھ لیا، والد سے جاکر کہا کہ مالکؒ درختوں کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ والد نے فرمایا "بیٹی وہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث یاد کرتے ہیں۔"

حضرت ربیعۃ الرائےؒ کے ساتھ ساتھ مالکؒ دیگر اساتذہ سے بھی علم حاصل کر رہے تھے۔ امام مالکؒ خود کہتے ہیں، میرے والد نے ایک دفعہ مجھ سے اور میرے بھائی نضر سے ایک مسئلہ پوچھا، میرے بھائی نے صحیح جواب دیا، میں نے غلطی کی، والد نے کہا "علم حاصل کرنے میں تم ہجوم کی وجہ سے پیچھے رہ گئے" (یعنی بیک وقت کئی اساتذہ سے علم حاصل کر رہے ہو)۔ مجھے غصہ آگیا، پھر میں حضرت ابن ہرمزؒ کے پاس جاکر سات سال تک علم حاصل کرتا رہا اور ان کے علاوہ دوسرے علماء کرام سے نہ ملا۔ شروع میں یہ حال تھا کہ مالکؒ کو لوگ "نضر کے بھائی" کے نام سے پہچانتے تھے بعد میں یہ نوبت آئی کہ نضر کا ذکر مالکؒ کے بھائی کے نام سے کیا جانے لگا۔

علم حدیث کے شیدائی، مالکؒ نے اب حضرت نافع بن عمر کی مجلس کا رخ کیا لیکن حضرت ابن ہرمزؒ سے حصولِ علم ترک نہ کیا۔ امام مالکؒ خود فرماتے ہیں، "میں حضرت نافعؒ کے پاس دوپہر کے وقت آتا تھا، سخت دھوپ سے کسی درخت کے نیچے پناہ نہیں ملتی تھی، میں ان کے نکلنے کا انتظار کرتا۔ وہ آتے اور مجلس میں داخل ہونے تک میں ان سے مسائل پوچھتا۔" امام صاحبؒ نے حضرت نافعؒ سے بارہ سال تک علم حاصل کیا۔ واضح رہے کہ حضرت نافعؒ کا مکان مدینہ منورہ سے باہر بقیع میں واقع تھا۔

ایک دن حضرت امام ابن شہاب الزہریؒ سے ملاقات ہوئی۔ امام مالکؒ کے استاد حضرت ربیعۃ الرائےؒ بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابن شہاب الزہریؒ نے چالیس سے زائد احادیث بیان کیں۔ امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ دوسرے دن ہم امام الزہریؒ کے پاس گئے انہوں نے فرمایا:

"کتاب میں دیکھو تاکہ میں حدیثیں بیان کروں، کل میں نے جو کچھ بیان کیا تھا، کیا تم نے دیکھ لیا؟"

حضرت ربیعۃؒ نے کہا، "یہاں ایک شخص موجود ہے جو تمام احادیث آپ کو سنا دے گا جو آپ نے کل بیان کی تھیں"۔ امام زہریؒ نے پوچھا، وہ کون ہے؟ "حضرت ربیعۃ نے بتایا ابن ابی عامرؒ۔" (امام مالکؒ)۔

امام الزہریؒ نے فرمایا، "سناؤ" میں نے انہیں چالیس احادیث سنا دیں۔ امام الزہریؒ نے تعجب سے کہا "میں سمجھتا تھا کہ یہ احادیث میرے سوا کسی دوسرے کو یاد نہیں ہیں"۔ اس کے بعد امام مالکؒ، ابن شہاب الزہریؒ سے بھی علم حاصل کرنے لگے۔ امام الزہریؒ نے اپنے ہونہار شاگرد کا نام "علم کا محافظ" رکھ دیا تھا۔

سال ہا سال تک اپنے سینے کو علم دین سے منور کرنے کے بعد اب وہ وقت آگیا تھا کہ امام مالکؒ خود مسجد نبویؐ میں مسندِ درس پر فائز ہوں اور مسائل کے سلسلے میں فتوے دیں، لیکن امام مالکؒ نے خود آگے بڑھ کر یہ بارِ گراں نہیں اٹھایا، آپ فرماتے ہیں، "میں خود نہیں بیٹھا یہاں تک کہ اہل علم میں سے ستر علماء کرام نے شہادت دی کہ میں اس منصب کا اہل ہوں۔"

اللہ کے حبیب ﷺ کی مسجد میں امام مالکؒ نے پچاس سال سے زائد عرصے تک درس دیا۔ درس کی مجلس نہایت پروقار ہوتی تھی، آپؒ کے شاگرد کہتے ہیں، "امام صاحبؒ ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا ہم ہی میں سے ہیں۔ کھل کر باتیں کرتے تھے لیکن جب درس دینے بیٹھتے تو ان کے کلام سے ہم پر ہیبت طاری ہو جاتی گویا وہ ہمیں پہچانتے ہی

Marfat.com

نہیں، نہ ہم انہیں جانتے ہیں۔"

مجلس کے وسط میں شہ نشین تھی جس پر امام صاحبؒ صرف اس وقت تشریف رکھتے جب حدیث کا املا کروانا ہوتا، مجلس میں شرکت کرنے والوں کے لیے جگہ جگہ پنکھے رکھے ہوتے تھے۔ حدیث کا درس ہوتا تو عود اور لوبان جلایا جاتا۔ صفائی اور نفاست کا یہ حال تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا۔

امام مالکؒ فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنا جواب "ماشاءاللہ لاقوۃ الّا باللہ" سے شروع کرتے اور اکثر اپنے فتوے کے آخر میں کہتے "یہ صرف ہمارا خیال ہے، ہمیں اس پر پکا یقین نہیں ہے۔"

خلوصِ نیت کا یہ عالم تھا کہ ان مسائل پر فتویٰ نہیں دیتے تھے جو قاضیوں (ججوں) کا حق تھے۔ فتویٰ دینے میں بہت غور سے کام لیتے تھے اور خود آپؒ کا کہنا ہے کہ اکثر مجھے ایسے مسائل پیش آجاتے ہیں کہ میں ایک سال کی راتیں ان پر سوچنے میں گزار دیتا ہوں۔"

جن مسائل یا احادیث کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہ ہوتے ان پر کوئی فتویٰ نہ دیتے۔ ایک بار ایک شخص چھ ماہ کا طویل سفر کر کے ایک مغربی ملک سے آپؒ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اس نے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ آپؒ نے سادگی سے فرمایا، "میں نہیں جانتا"۔ وہ شخص حیران رہ گیا کہنے لگا، "حضرت میں اتنا طویل سفر کر کے صرف اس مسئلے کا جواب لینے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں، جواب لیے بغیر لوٹ کر جاؤں گا تو میرے وطن کے لوگ کیا کہیں گے۔" امام صاحبؒ نے فرمایا "جا کر کہہ دینا مالکؒ نے کہا ہے، میں اس مسئلے کا جواب نہیں جانتا۔"

فتویٰ دینے میں عمر بھر اس قدر احتیاط سے کام لینے کے باوجود خوفِ خدا سے معمور اس عظیم بزرگ کا حال تھا کہ جب بیمار پڑے اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ایک شاگرد نے رونے کا سبب دریافت کیا، اس پر جواب ملا، "میں نہ روؤں تو کون روئے؟ اے کاش مجھے میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلے ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔" یہی الفاظ ادا کرتے ہوئے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

امام مالکؒ نے گو کہ کثیر تعداد میں احادیث بیان فرمائی ہیں، لیکن آپؒ نے حدیثوں کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہر سنی ہوئی روایت کو بے تحقیق بیان کر دینا عقل مندی نہیں۔ آپؒ نے اپنی مشہور کتاب "موطا" میں ابتدا میں دس ہزار احادیث میں سے چار ہزار حدیثیں منتخب کر کے شامل فرمائی تھیں۔ آپؒ کی وفات تک نظر ثانی کے نتیجے میں اس کتاب میں ایک ہزار سے کچھ زائد احادیث رہ گئیں۔

موطا کی تالیف امام مالکؒ نے عباسی خلیفہ منصور (۱۳۶ھ / ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء) کے دور میں شروع کی اور منصور کے آخری زمانۂ خلافت تک وہ مسوّدہ مکمل کر چکے تھے۔ اس زمانے میں ضرورت محسوس کی جاری تھی کہ خلیفۃ المسلمین ایک ایسی جامع کتاب مقرر کریں جس کے مطابق سارے مقدمات کا فیصلہ ہو، چنانچہ امام مالکؒ نے موطا لکھی۔ اس کتاب میں احادیثِ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال شامل ہیں۔

امام صاحبؒ حدیث کے ساتھ ساتھ "درایت" یعنی حدیث کے راویوں کی صحت کو پرکھنے کے امام بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔ وہ فقہائے مدینہ میں پہلے فرد ہیں جنھوں نے غیر ثقہ راویوں اور ثقہ راویوں کو الگ الگ کیا۔

امام مالکؒ اور ان کے دور کے دیگر جید علمائے کرام کی سیرتوں کا مطالعہ کریں تو ایک بات خاص طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے گو فقہ کے مختلف مسالک پیش کیے، کئی امور میں ایک دوسرے سے سخت اختلاف کیا لیکن کبھی ایک دوسرے کے بارے میں تعصب کو ذرہ برابر دل میں جگہ نہ دی۔

حضرت لیث بن سعدؒ فرماتے ہیں، میں امام مالکؒ سے مدینہ منورہ میں ملا، دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے ہیں، سبب دریافت کیا تو جواب ملا، "ابو حنیفہؒ کے ساتھ پسینہ آگیا وہ تو بڑے فقیہ ہیں۔"

حضرت لیثؒ کہتے ہیں، پھر میں امام ابو حنیفہؒ سے ملا، ان سے پوچھا، "آپ کو امام مالکؒ کی کیا بات پسند آئی؟" جواب ملا، "صحیح جواب، اس قدر جلد دینے والا میں نے اور کوئی نہیں دیکھا اور نہ اس قدر پرکھنے والا پایا۔"

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کو دیکھا گیا کہ عشا کی نماز کے بعد مسجد نبویؐ میں علمی گفتگو شروع ہوئی تو فجر کی نماز تک جاری رہی، جب کسی مسئلہ میں ایک امام دوسرے کے قول پر مطمئن ہو جاتا تھا تو بلا تامل اس کو اختیار کر لیتا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں، "امام مالکؒ اہل علم کے

Marfat.com

سرداروں میں سے ایک ہیں، وہ حدیث اور فقہ میں امام ہیں، کوئی ان کا مثل نہیں۔"

ہارون الرشید نے چاہا کہ امام مالکؒ کی موطا، خانہ کعبہ میں آویزاں کردی جائے لیکن خود امام مالکؒ نے فرمایا، "ایسا نہ کرو، صحابہ کرامؓ خود جزوی باتوں میں مختلف ہیں اور وہ کئی ملکوں میں پھیل چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نیک راہ پر ہے۔"

امام صاحبؒ نے اپنی چھیاسی سال کی عمر میں ولید بن عبدالملک سے ہارون الرشید تک، بنو امیہ اور بنو عباس کے متعدد حکمرانوں کو دیکھا۔ آپؒ ان سے ملتے بھی رہے، بعض اوقات ان کے تحفے بھی آپؒ نے قبول فرمائے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس مرد جری نے کبھی کسی حکمران کے سامنے حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ کسی حکمران کی خوشامد نہ کی اور کسی حکمران سے بے جا رعایتیں حاصل نہ کیں۔

آپؒ سے ایک شاگرد نے کہا "لوگ کہتے ہیں آپ امراء سے ملتے ہیں"۔ فرمایا "یہ تو میرے لیے لازم ہے اس لیے کہ میں انہیں بہت سی نامناسب باتوں سے منع کرتا ہوں۔" ایک اور موقع پر کسی نے خلفاء کے دربار میں جانے پر اعتراض کیا تو جواب دیا "اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے؟"

خلیفہ منصور کے دربار کا قاعدہ تھا کہ جو دربار میں داخل ہوتا، خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، لیکن امام مالکؒ نے کبھی ایسا نہ کیا، آپؒ کی نگاہوں میں اتنا رعب تھا کہ لوگ نظریں نہ ملا پاتے تھے، حکام پر بھی ان کی زبردست ہیبت طاری رہتی تھی۔

خلیفہ مہدی نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ امام صاحبؒ سے موطا سنیں۔ موسیٰ اور ہارون نے امام صاحبؒ کو بلوایا۔ امام صاحبؒ نے بے نیازی سے کہا "علم بیش قیمت چیز ہے، اس کے پاس شائقین خود آتے ہیں۔"

ہارون الرشید ۱۷۰ھ/۷۸۶ء میں خلیفہ بنے۔ چار سال بعد اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر حج کے ارادے سے آئے۔ آپؒ سے ملے تو موطا سننے کی خواہش ظاہر کی۔ آپؒ نے فرمایا "کل کا دن اس کے لیے ہے۔" ہارون اگلے دن انتظار کرتے رہے مگر آپؒ نہیں گئے۔ ہارون نے شکایت کی، امام صاحبؒ نے فرمایا، "علم کے پاس لوگ آتے ہیں، علم لوگوں کے پاس نہیں جاتا۔"

آخر ہارون خود اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر امام صاحبؒ کی مجلس میں حاضر ہوئے، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا۔ ہارون نے کہا "اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔" امام صاحبؒ نے فرمایا، "ایک شخص کے فائدہ کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جاسکتا۔"

پھر ہارون مسند پر بیٹھ گئے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا "تواضع پسندیدہ ہے۔" ہارون مسند سے اتر آئے۔ پھر امام صاحبؒ کے شاگرد نے قرأت کی، بعد میں امام صاحبؒ نے خلیفہ ہارون کی توجہ مدینہ کے فقراء کی جانب دلائی، ہارون نے ان فقراء کی دل کھول کر مدد کی۔

امام صاحبؒ سب سے زیادہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ خلفاء اور حکام کے نزدیک جو لوگ رہتے ہیں وہ ان کی جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ آپؒ ایسے شخص سے سخت ناراض ہوتے تھے جو بادشاہوں کے منہ پر ان کی تعریف کرتا ہو۔ ایک بار ایک حاکم امام صاحبؒ کے پاس موجود تھے حاضرین میں سے کسی نے حاکم کی تعریف شروع کردی۔ امام صاحبؒ برہم ہوگئے فرمایا، "احتیاط کرو، ایسا نہ ہو کہ تعریف کرنے والوں کے دھوکے میں آجاؤ۔"

امام صاحبؒ نے ایک روایات کے مطابق ۷۵ اور ایک روایت کے مطابق ۹۴ جلیل القدر اساتذۂ کرام سے علم حاصل کیا لیکن حصولِ علم کے سلسلے میں امام صاحبؒ نے بڑے نکتے کی بات ارشاد فرمائی کہ "اس کے لیے صرف زہد و تقویٰ اور سادگی ہی نہیں، علم و فہم اور پختگی بھی درکار ہے۔"

امام صاحبؒ نہایت نفاست پسند تھے۔ ہمیشہ بیش قیمت لباس آپؒ کے بدن پر رہتا تھا، قیمتی کپڑے عدن سے منگوایا کرتے تھے، بہت اچھی خوشبو استعمال کرتے تھے۔ جس گلی سے نکل جاتے، دیر تک خوشبو پھیلی رہتی۔ کھانے کا ذوق بھی بے حد عمدہ تھا، آپؒ فرماتے تھے "میں کسی آدمی کے لیے پسند نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نعمتیں دی ہوں اور پھر ان کے آثار اس پر ظاہر نہ ہوں۔"

ان سطور سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام مالکؒ عمر بھر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے رہے۔ آپؒ نے علم دین کے حصول کے لیے بے شمار سختیاں بھی جھیلی ہیں اور آپؒ پر وہ دور بھی آیا ہے جب آپؒ کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ آپؒ کی بچی بھوک سے بے تاب ہو کر رویا کرتی تھی اور یہ خوددار شخص اپنی خادمہ سے کہتا تھا کہ چکی چلائے تاکہ پڑوسی بچی کے رونے کی آواز نہ سن سکیں۔ امام صاحبؒ تنگ دستی سے دوچار رہے لیکن آپؒ نے علم کا حصول ترک نہ

Marfat.com

گیا اور اس غرض سے اپنے گھر کی چھت کی لکڑیاں تک بیچ دیں۔ امام مالک خود فرماتے ہیں:

"اس علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک علم حاصل کرنے والا فقر میں مبتلا نہ ہو اور اس پر بھی وہ بہرحال علم حاصل کرنے کو ترجیح دے۔"

امام مالکؒ کی حق گوئی، فراخدلی اور عفو و در گزر کے واقعات تاریخ اسلام میں درخشاں ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ جب آپؒ نے جبراً دلوائی گئی طلاق کے خلاف فتویٰ دیا تو خلیفہ منصور کے چچا زاد بھائی جعفر نے جو مدینہ کے حاکم تھے، آپؒ سے کہا کہ ایسا فتویٰ نہ دیں کیونکہ لوگ اس فتوے کی روشنی میں منصور کی بیعت کو "جبری" قرار دے رہے ہیں۔ یعنی امام صاحبؒ کے فتوے سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے کہ جبر کے ذریعہ کروایا گیا ہر کام ناجائز ہے اور منصور نے جبر کے ذریعہ بیعت لی ہے، چنانچہ یہ بیعت ناجائز ہے تاہم امام مالکؒ جبری طلاق کے خلاف فتویٰ دیتے رہے۔

جعفر نے امام صاحبؒ کو ستر کوڑے لگوائے، آپؒ کی پیٹھ خون سے بھر گئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اتر گئے، پھر جعفر نے آپؒ کو اونٹ پر بٹھایا اور شہر میں گھمایا۔ آپؒ بازاروں اور گلیوں سے گزر رہے تھے اور بلند آواز سے فرما رہے تھے۔ "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالکؒ بن انس ہوں، فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری طلاق درست نہیں۔"

امام مالکؒ نے ۱۱۷ھ / ۷۳۵ء میں درس و تدریس کی مسند سنبھالی تھی۔ ربیع الاول ۱۷۹ھ / ۷۹۵ء میں آپؒ کا انتقال ہوا، اس طرح ۶۲ سال تک ایک امت کو علم و حکمت کے خزانوں سے مالا مال کرنے کے بعد مدینہ کا امام مدینے کی خاک میں جا بسا۔ وفات کے وقت آپؒ کی عمر چھیاسی سال تھی۔ آپؒ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

***

Marfat.com

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

دانشمند اور بے باک فقیہ جنہوں نے فقہ کی تدوین میں اہم کردار ادا فرمایا

وہ کسی بات پر سخت متفکر تھے!

ان کا قد چھوٹا اور جسم ناتواں تھا لیکن ان کے چہرے سے بے پناہ علمی فضیلت جھلکتی تھی۔ وہ مملکت کے محکمۂ انصاف کے سربراہ تھے۔

کسی نے ان سے پوچھا: "آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

جواب ملا: "میں اس بات پر سخت اذیت اور رنج محسوس کرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کیا جواب دوں گا۔"

پھر انہوں نے اس بات کی وضاحت فرمائی: "ایک بار بوڑھے کسان نے خلیفۂ وقت کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے لیکن خلیفہ نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اتفاق سے اس روز خلیفہ خود عدالت میں موجود تھے۔ میں نے خلیفہ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے قبضے میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ ہی باغ میں اس کا حق ہے۔ میں نے مدعی سے پوچھا، تمہارے پاس تمہارے دعوے کے حق میں کوئی دلیل ہے؟ بوڑھے نے کہا، اگر میری بات پر یقین نہیں تو خلیفہ سے قسم لی جائے۔ میں نے خلیفہ سے کہا آپ قسم کھائیں کہ یہ باغ آپ کی ملکیت ہے۔ خلیفہ نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد نے مجھے عطا کیا تھا۔ بوڑھا یہ سن کر غصے میں یہ بڑبڑاتا ہوا کمرہ عدالت سے نکل گیا کہ جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے، اسی طرح سے اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی ہے۔"

لوگوں نے کہا: "اس میں آپ متفکر کیوں ہیں۔ آپ یہی تو کر سکتے تھے کہ آپ نے اتنی بڑی مملکت کے سربراہ کو ایک معمولی کسان کے دعوے پر قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔"

محکمۂ انصاف کے سربراہ یہ سن کر گویا ہوئے: "آپ لوگ سمجھ نہ سکے کہ میں کس خیال سے پریشان ہوں۔ مجھے تکلیف اس بات پر ہے کہ میں خلیفۂ وقت سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے اور وہاں کھڑے ہو جائیے جہاں مدعی بوڑھا کسان کھڑا ہے۔ یا پھر اجازت دیجیے کہ اس کسان کے لیے بھی کرسی لائی جائے۔"

یہ تھے فقہ کے عظیم المرتبت امام حضرت امام ابو یوسفؒ جنہوں نے محکمۂ انصاف کے سربراہ (قاضی القضاۃ) کی حیثیت سے خلیفہ ہارون الرشید کے خلاف مقدمے کی سماعت کی اور اس سماعت کے دوران اپنی ایک فروگزاشت پر وہ عمر بھر پشیمان رہے۔ امام ابو یوسفؒ محض قاضی نہیں تھے، بلکہ آپؒ کا اصل کارنامہ فقۂ اسلامی کی تدوین ہے۔

آپؒ کا نام یعقوب اور کنیت ابو یوسف ہے۔ آپؒ کے والد کا نام ابراہیم ہے۔ اس بات پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ آپؒ کا تعلق مدینہ کے انصاری خاندان سے ہے۔ آپؒ کے پردادا حضرت سعد بن حبتہ صحابی تھے اور غزوۂ خندق اور دیگر غزوات میں شریک رہے تھے۔ پھر وہ کوفہ چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ امام ابو یوسفؒ کی پیدائش کوفہ ہی میں ہوئی۔ آپؒ کے سالِ ولادت میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ ۹۳ھ / ۱۲-۷۱۱ء ہے جبکہ اکثر کے نزدیک یہ ۱۱۳ھ / ۷۳۱ء ہے۔ تاہم درست سالِ ولادت غالباً ۹۳ھ ہی ہے۔

امام ابو یوسفؒ کو کم عمری ہی سے علم کے حصول سے گہری دلچسپی تھی لیکن آپؒ کے مالی حالات اچھے نہ تھے، اس وجہ سے آپؒ کے والدِ محترم کی یہ خواہش تھی کہ ان کا بیٹا معاش کی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ مگر امام ابو یوسفؒ کے دل میں حصولِ علم کی جو خواہش تھی وہ دب نہ سکی۔ آپؒ والد صاحب سے چوری چھپے علما کی مجالس میں شریک

Marfat.com

ہونے لگے۔

امام ابویوسفؒ سب سے پہلے، قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کی مجالس درس میں شریک ہوئے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ بہت بڑے عالم تھے۔ اموی اور عباسی حکومتوں میں قاضی رہ چکے تھے۔ حضرت علیؓ اور قاضی شریحؒ کے طرزِ انصاف سے واقفیت رکھتے تھے۔ امام ابویوسفؒ تقریباً نو برس تک قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کے پاس حاضر ہوتے رہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰؒ بہت پائے کے عالم تھے لیکن جب کبھی کوئی مشکل فقہی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپؒ سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلے کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی کیا رائے ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی بڑا اشتیاق تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے درس سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ آخر ایک دن امام ابویوسفؒ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس میں جا پہنچے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے، امام ابویوسفؒ کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ اسی بنا پر ان کے والدِ محترم انہیں باربار مجبور کرتے رہتے تھے کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جس سے گھر کے اخراجات پورے ہونے میں مدد مل سکے، لیکن امام ابویوسفؒ کے دل میں علم کے حصول کا سودا سمایا ہوا تھا۔ ایک دن امام ابویوسفؒ کے والد آئے اور امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس سے انہیں زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ گھر لے جا کر انہیں سمجھایا کہ بیٹا امام ابوحنیفہؒ کے پاس خدا کے فضل سے سب کچھ موجود ہے۔ تم ان کی برابری نہیں کرسکتے۔ تم معاش کی طرف توجہ دو۔

والد صاحب کے کہنے پر امام ابویوسفؒ نے دل پر پتھر رکھ کر، امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس میں حاضر ہونا ترک کردیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے چند دن بعد پوچھا: "یعقوب اب نہیں آتے؟" ان کے دیگر تلامذہ نے اصل وجہ بتائی۔ امام ابویوسفؒ کو علم ہوا تو وہ اپنے استاد محترم امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام ابوحنیفہؒ نے مجلس درس کے اختتام پر امام ابویوسفؒ کو الگ لے جا کر چپکے سے انہیں ایک تھیلی تھمادی اور فرمایا کہ اس سے اپنے اخراجات پورے کرو اور جب ختم ہوجائیں تو اور لے لینا۔ امام ابویوسفؒ نے گھر جا کر تھیلی کھولی تو اس میں سو درہم تھے۔ اس کے بعد امام ابویوسفؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے درس میں باقاعدگی سے شرکت شروع کردی اور امام صاحبؒ کی حیات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

امام ابویوسفؒ کی چونکہ کم عمری میں شادی ہوچکی تھی اور وہ صاحب اولاد بھی ہوگئے تھے، اس لحاظ سے بھی ان کے والد محترم شدت سے مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ یعقوب (امام ابویوسفؒ) کو روزی کمانے پر توجہ دینی چاہیے لیکن امام ابویوسفؒ علم فقہ اور علم حدیث حاصل کرنے میں مگن رہتے تھے۔ ایک ہی دن میں کئی کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ آپؒ کے والد آپؒ کو امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس سے، ہاتھ پکڑ کر اٹھالے جاتے تھے لیکن آپؒ پھر وہیں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک دن آپؒ کے والد بہت برہمی کے عالم میں، امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے بیٹے (امام ابویوسفؒ) کو بہت برا بھلا کہا اور مجلس میں تشریف فرما تمام لوگوں سے کہا: "میرا لڑکا باربار میری حکم عدولی کرتا ہے اور آپ لوگ اس معاملے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔"

امام ابوحنیفہؒ نے دریافت کیا: "آپ کیا چاہتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "یہ بازار جاکر کچھ کمائیں اور اہل وعیال کی پرورش میں میرا ہاتھ بٹائیں۔" امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: "ان شاءاللہ اس کار خیر میں ہم ان کی مدد کریں گے۔" لیکن امام ابویوسفؒ کے والد نے اس بات کو پسند نہ کیا۔ آخر امام ابوحنیفہؒ نے ذرا سختی سے فرمایا: "اگر آپ ان کو علم کے حصول سے روکنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی قطعاً مدد نہیں کی جاسکتی، ہاں کفالت کے سلسلے میں ہم ان کی مدد کے لیے تیار ہیں۔"

امام ابویوسفؒ کو امام ابوحنیفہؒ سے بے حد محبت تھی اور امام ابوحنیفہؒ بھی آپ کو بے انتہا محبوب رکھتے تھے۔ امام ابویوسفؒ کو امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس اس قدر عزیز تھی کہ آپ نے سوائے علالت کے دنوں کے، کبھی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ تک کے دن اس مجلس درس میں غیر حاضر رہنا پسند نہ فرمایا۔ آپؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے کتنے برس تک تعلیم حاصل کی، اس بارے میں مؤرخین کے مابین اختلاف ہے، تاہم یہ مدت کم سے کم ۹ برس ہے اور امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ وہ روزانہ فجر کی نماز امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے۔

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں "مجھے دنیا میں کوئی مجلس درس، امام ابوحنیفہؒ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کی مجلس درس سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ تو میں نے امام ابوحنیفہؒ جیسا بہترین فقیہ دیکھا اور نہ ابن ابی لیلیٰؒ جیسا قاضی۔"

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام ابویوسفؒ نے محض امام ابوحنیفہ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ سے علم کے حصول پر قناعت کرلی تھی۔ آپؒ کا

Marfat.com

شوق اور ذوق بہت بلند تھا۔ آپؒ نے سو سے زائد بڑے علماء کرام اور فقہاء کرام سے علم حاصل کیا۔ ان میں ثابت ابو حمزہ الشمالیؒ، حصین بن عمرو بن میمونؒ، حنظلہ بن ابی سفیانؒ، سفیان بن عیینہؒ، عبید اللہ بن عمرؒ، امام مالک بن انسؒ، مسعر بن کدامؒ اور دیگر کئی جلیل القدر بزرگ شامل ہیں۔

جن دنوں امام ابو یوسفؒ امام ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس میں شامل تھے، اس زمانے میں محمد بن اسحاقؒ کوفہ تشریف لائے۔ وہ سِیَر و مغازی کے امام تھے۔ سِیَر سے مراد سیرت اور مغازی کا لفظ جنگوں کے احوال اور غازیوں کے اوصاف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے محمد بن اسحاقؒ سے ان کی کتاب، کتاب المغازی سنی۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی کو باقاعدہ مدوّن فرمایا اور امام ابو یوسفؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے فقہ حنفی کو زیادہ عملی شکل دی اور بہت سے پیچیدہ مسائل کو اپنے [illegible] ذریعے حل فرمایا۔ امام ابو حنیفہؒ نے جس عظیم فقہی مکتب کی بنا [illegible] تھی، امام ابو یوسفؒ اس مکتب کے ایک اہم ستون تھے۔

امام ابو یوسفؒ قرآن کریم کے حافظ تھے، بلکہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے خاص تلامذہ کے اجلاس میں شرکت کی پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ امیدوار کو حافظِ قرآن ہونا چاہیے۔ اس اجلاس میں فقہا کرام فقہی مسائل پر بحث و مباحثہ میں شریک ہوتے تھے اور سب کی متفقہ آراء سے کسی فقہی مسئلے اور اس کے حل کو حتمی شکل دی جاتی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس غیر معمولی اجلاس میں شرکت کے لیے حافظِ قرآن کی شرط اسی لیے عائد کی تھی کہ وہ فقہی مسائل کے حل کے لیے سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا پسند فرماتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ نہ صرف قرآن پاک کے حافظ تھے بلکہ قرآن کریم کے معانی اور مفاہیم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپؒ نے جہاں کہیں کسی فقہی مسئلے پر بحث فرمائی ہے وہاں قرآن کریم کی آیات کو بطور حوالہ پیش کر کے ان سے استنباط فرمایا ہے اور اپنے عہد کے عملی مسائل کو قرآن پاک میں دیے گئے اشاروں کی مدد سے حل کیا ہے۔

امام صاحبؒ حدیث کا بھی وسیع علم رکھتے تھے۔ آپؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی مجلس درس میں فقہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کی خدمت میں بھی باقاعدگی سے حاضری دی جہاں صرف حدیث کا املا اور [illegible] کرائی جاتی تھی۔ بعض روایات کے مطابق جب آپؒ امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں پہلی بار تشریف لے گئے تو آپؒ کا شمار حفاظِ حدیث میں ہوتا تھا۔ امام ابو یوسفؒ کا حافظہ بے حد غیر معمولی تھا۔ آپؒ ایک نشست میں پچاس ساٹھ احادیث ان کی اسناد کے ساتھ حفظ فرما لیتے تھے۔

ایک بار خلیفہ ہارون الرشید سے بعض افراد نے شکایت کی کہ وہ امام ابو یوسفؒ کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہارون الرشید نے کہا:

"ایسا میں اس لیے کرتا ہوں کہ کوئی ایسا بابِ علم نہیں جس میں، میں نے امام ابو یوسفؒ کو کامل و یکتا نہ پایا ہو۔ وہ ہمارے ساتھ حدیث کے حلقوں میں جاتے تھے۔ ہم لکھ لیتے تھے اور وہ نہیں لکھتے تھے۔ پھر ہم مجلس سے اٹھتے تو لوگ انہیں گھیر لیتے اور اپنے لکھے ہوئے کی تصدیق ان کے حافظے سے کرتے تھے اور فقہ میں انہیں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے پاس بڑے بڑے فقہا آتے تھے، ان سے سوال کرتے تھے۔ امام صاحبؒ کے پاس کوئی کتاب، کوئی تحریر نہ ہوتی تھی، وہ بیٹھے [illegible] بیٹھے چلے جاتے تھے۔ لاؤ اگر امام ابو یوسفؒ سا کوئی آدمی [illegible]"

امام ذہبیؒ نے امام ابو یوسفؒ کو حفاظِ حدیث کے اس گروہ میں شامل کیا جس میں حضرت امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، عبد اللہ بن مبارکؒ، یحییٰ بن معینؒ اور سفیان بن عیینہؒ شامل ہیں۔

امام ابو یوسفؒ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کا چشمۂ فیض آپؒ کی کتابوں اور آپؒ کے سیکڑوں تلامذہ کے ذریعے جاری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد تقریباً سولہ برس تک، یعنی ۱۶۶ھ/۷۸۲ء تک امام یوسفؒ نے تلامذہ کو فیض یاب کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۶۶ھ میں آپؒ کو قاضی (جسٹس) کے منصب پر مامور کر دیا گیا۔ تقریباً سترہ برس تک آپؒ محکمۂ انصاف کی نازک ذمہ داریوں سے متعلق رہے۔ اس دوران آپؒ بہت معروف رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود رات میں درس کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔

اپنے وصال سے چند لمحے پیشتر بھی آپؒ علمی مسائل سے غافل نہ تھے۔ آپؒ کے خاص شاگرد قاضی ابراہیم بن الجراحؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ جب شدید بیمار ہو گئے تو میں ان کی عیادت کے لیے گیا۔ وہ غشی کے عالم میں تھے۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے مجھ سے ایک

Marfat.com

فقہی سوال فرمایا۔ میں نے جواب دیا۔ انہوں نے اسے غلط قرار دیا۔ میں نے دوسرا جواب دیا۔ انہوں نے اسے بھی غلط قرار دیا اور پھر مسئلے کی وضاحت فرمائی۔ میں ان کے پاس سے اٹھ کر واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا کہ رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ امام ابویوسفؒ رحلت فرما چکے ہیں۔

امام ابویوسفؒ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ آپؒ کے شاگردوں میں فقہ کے مشہور امام حضرت احمد بن حنبلؒ بھی شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ میں نے تین الماریوں کے برابر کتابوں کا علم امام ابویوسفؒ سے حاصل کیا ہے۔ امام ابویوسفؒ کے دیگر تلامذہ میں اسد بن فراتؒ، امام مالکؒ کے شاگرد اسماعیل بن حمادؒ، جعفر بن یحییٰ برمکی (ہارون الرشید کے وزیر)، علی بن المدینیؒ، فضیل بن عیاضؒ اور فقہ حنفی کے مشہور امام حضرت امام محمد بن حسن شیبانی شامل ہیں۔ آپؒ کے تلامذہ کا تعلق خراسان، بلخ، مرو، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ، مغربِ اقصیٰ غرض ایک وسیع علاقے سے ہے۔

امام ابویوسفؒ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے تو آپؒ کی ملاقات امام مالکؒ بن انس سے بھی ہوئی تھی۔ امام مالکؒ سے ان کا چند فروعی امور پر فقہی اختلاف ہوا تھا۔ لیکن جب امام مالکؒ نے دلائل دیے تو امام ابویوسفؒ نے اپنی رائے تبدیل کر کے امام مالکؒ کی رائے کو اختیار کر لیا تھا۔

امام ابویوسفؒ اساتذہ اور عالموں کا بہت احترام فرماتے تھے۔ آپؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا ذکر ہمیشہ بہت ادب اور توقیر کے ساتھ فرمایا۔ آپؒ فرماتے تھے کہ میں نے جب بھی کوئی فرض یا نفل نماز ادا کی ہے تو امام ابوحنیفہؒ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کے لیے دعا ضرور کی ہے۔

امام ابویوسفؒ ایک بار حج کے لیے گئے تو مشہور سیرت نگار واقدیؒ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ آپؒ انہیں اپنے ساتھ بغداد لے آئے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر یحییٰ برمکی نے پوچھا: "امام صاحبؒ مکہ مکرمہ سے آپ کیا تحفہ لائے ہیں؟" امام صاحبؒ نے فرمایا: "میں آپ کو ایسا تحفہ دوں گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا ہوگا۔" پھر انہوں نے واقدیؒ کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: "میں واقدیؒ کو بطور تحفہ لایا ہوں۔" پھر انہوں نے واقدیؒ کی بہت مالی امداد کروائی۔ واقدیؒ کے مالی حالات ان دنوں اچھے نہ تھے۔

خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں انتظامی اور عدالتی امور الگ الگ نہیں تھے۔ ریاست کا سربراہ یا والی ہی عدالتی ذمہ داریاں بھی ادا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب اسلامی مملکت وسیع ہو گئی تو آپؓ نے دونوں شعبوں کو الگ الگ کر دیا۔ لیکن دونوں شعبوں کے ذمہ داروں کا تقرر خلیفۃ المسلمین کیا کرتے تھے۔ بنوامیہ کا دور آیا تو عدلیہ کے ذمہ داروں کے تقرر اور معزولی کے اختیارات صوبوں کے والیوں کو دے دیے گئے چنانچہ جو قاضی مقرر کیے جانے لگے وہ بہت اہل نہ تھے، دوسرے یہ کہ ان کے فرائض میں سرکاری انتظامیہ کی مداخلت بڑھنے لگی، یہی وجہ ہے کہ جو متقی اور صالح قسم کے علما کرام تھے، وہ انصاف سے متعلق سرکاری ذمہ داریاں قبول کرنے سے گریز کرنے لگے۔ البتہ اضطراری کیفیت میں انہوں نے یہ عہدے قبول فرمائے۔ امام ابویوسفؒ نے البتہ یہ سوچ کر خود بھی قضا کا منصب قبول فرمایا اور امام محمدؒ کو بھی آمادہ کیا کہ وہ اس ذریعے سے اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس ضمن میں ان کے پیش نظر اپنے استاد مکرم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ فرمان رہا ہو کہ "میرے دو اصحاب یعنی امام زفرؒ اور امام ابویوسفؒ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ قاضیوں اور مفتیوں کو تیار کریں۔"

امام ابویوسفؒ نے تین عباسی خلفا کے دور میں قاضی کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ مہدی نے انہیں بغداد کے مشرقی حصے کا قاضی مقرر کیا تھا۔ خلیفہ ہادی کے عہد میں انہیں پورے بغداد کا قاضی بنا دیا گیا اور ہارون الرشید کے دور میں انہیں قاضی القضاۃ مقرر کر دیا گیا۔ یعنی وہ پوری مملکت کے وزیر عدل و قانون تھے۔ مشرق سے مغرب تک تمام اسلامی ریاستوں میں ان کے حکم کے بغیر قاضی (جج) کے منصب پر کسی کا تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قاضی القضاۃ کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید تک، امام ابویوسفؒ کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی آمد پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ امام ابویوسفؒ نے بطور قاضی ہمیشہ انصاف کا پرچم سربلند رکھا اور اس سلسلے میں خلیفہ، وزرا یا حکومت کے بااثر افراد کا بھی لحاظ نہ کیا۔

خلیفہ ہادی کے زمانے میں امام صاحبؒ کے روبرو ایک مقدمہ پیش کیا گیا جس کے مطابق ایک باغ کی ملکیت کے مسئلے پر خلیفہ ہادی اور ایک عام شخص کے درمیان تنازعہ تھا۔ شہادتوں کے مطابق باغ خلیفہ ہادی کا ہی تھا۔ لیکن امام صاحب نے اس معاملے کی خفیہ طور پر تحقیقات

Marfat.com

کروائی جس سے معلوم ہوا کہ باغ اس عام آدمی کا ہے۔ امام صاحبؒ نے مقدمے کی ساعت ملتوی کر دی۔ خلیفہ ہادی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ 'مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟' امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مدعا علیہ کی طرف سے مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف بھی لیا جائے۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا آپ ایسا کروانا درست سمجھتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کی تو یہی رائے ہے۔ یہ سن کر خلیفہ نے کہا: "اچھا تو باغ مدعا علیہ کے حوالے کر دیجیے۔"

اسی نوعیت کا ایک فیصلہ امام صاحبؒ نے خلیفہ ہارون الرشید اور ایک عراقی بوڑھے کے مقدمے میں سنایا تھا جس کا تذکرہ اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ ایک بار وزیر علی بن عیسیٰ نے کسی معاملے میں شہادت دی تو امام صاحبؒ نے یہ شہادت رد کر دی۔ وزیر صاحب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ ہارون نے امام صاحبؒ سے دریافت کیا، امام صاحبؒ نے فرمایا "میں نے شہادت اس لیے رد کر دی کہ میں نے اپنے کانوں سے انہیں یہ کہتے سنا ہے کہ میں تو خلیفہ کا غلام ہوں۔ جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں۔" بعض روایتوں کے مطابق امام صاحبؒ نے فرمایا کہ "یہ جماعت سے نماز نہیں ادا کرتے" اس لیے شہادت رد کر دی۔

امام ابو یوسفؒ نے اپنی عمر کا ابتدائی بڑا حصہ تنگی ترشی میں گزارا لیکن آپؒ ہمیشہ اپنے رب کے شکر گزار رہے۔ بعد میں جب آپؒ قاضی القضاۃ ہو گئے تو آپؒ کے حالات تبدیل ہو گئے۔ دولت کی فراوانی ہو گئی لیکن آپ کا طرزِ بود و باش سادہ ہی رہا۔ آپ نے اپنے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے رکھے۔ کسی دربان کو روک ٹوک کے لیے نہ بٹھایا۔ آخری عمر میں آپؒ فرماتے تھے: "کاش میں فقر کی حالت ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا اور یہ عہدۂ قضا قبول نہ کرتا۔"

امام صاحبؒ بہت فیاض اور کریم النفس انسان تھے۔ اس دنیا سے رخصت ہونے سے قبل انہوں نے وصیت کی کہ ان کے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ اور بغداد کے مستحقین میں تقسیم کر دیے جائیں۔

ایک بار ایک شخص امام صاحبؒ کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے کسی کو آپ کی طرف سے خط لکھ کر اتنی رقم حاصل کر لی ہے اور وہ مجھ سے رقم طلب کر رہا ہے۔ اس سے مجھے نجات دلائیے۔ امام صاحبؒ نے اس شخص کو قید کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تک رقم واپس نہ کرو گے رہائی نہیں ہو گی۔ اس نے دہائی دی کہ ایک بار میں نے آپ کے استاد حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے ایک فرضی خط لکھ کر کسی سے رقم حاصل کر لی تھی اور جب میں نے امام ابو حنیفہؒ کو اس بات کی اطلاع دی تو انہوں نے وہ رقم میری طرف سے ادا کر دی تھی۔ آپ بھی ان کے شاگرد ہیں، آپ سے بھی مجھے یہی امید تھی۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: "میں امام ابو حنیفہؒ نہیں ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ لوگ ان کے علم اور رتبہ کی وجہ سے ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے نام پر رقم دے دیتے تھے، جبکہ میں حکومت کا ایک ذمہ دار افسر ہوں۔ اس بات کا امکان ہے کہ تم میرے نام پر کسی سے رقم طلب کرو اور وہ میرے خوف سے تمہیں رقم ادا کر دے۔" امام صاحبؒ نے اس شخص کو ایک دن قید رکھا پھر اگلے دن اسے بلوا کر فرمایا: "جس سے تم نے رقم لی تھی اسے میں نے واپس کر دی ہے۔ اب تم جاؤ اور اب اگر وہ شخص تمہیں رقم اپنی خوشی سے بھی دینے کی کوشش کرے تو ہر گز نہ لینا اور آئندہ اس طرح کبھی نہ کرنا۔"

امام ابو یوسفؒ کی سب سے بڑی خدمت فقہ کے حوالے سے ہے۔ آپؒ پہلے فرد ہیں جنہوں نے علم اصولِ فقہ کے فن کو باقاعدہ مدوّن فرمایا۔ امام شافعیؒ نے بھی اصول فقہ کی تدوین فرمائی تھی اور انہوں نے اس کام کو زیادہ تفصیل سے انجام دیا لیکن اس کام کا آغاز امام ابو یوسفؒ فرما چکے تھے۔ فقہ حنفی کی ہر کتاب میں امام ابو یوسفؒ کے اقوال اور آرا موجود ہیں۔

امام یوسفؒ کو فقہ کے شعبے "فرائض" یعنی وراثت کی تقسیم کے مسائل پر مکمل عبور حاصل تھا۔ آپؒ تاریخ، سیرت، ادب، نحو اور ایام عرب سے بھی واقف تھے۔

امام ابو یوسفؒ نے بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپؒ کی ایک کتاب امالی امام ابو یوسفؒ تین سو جلدوں پر مشتمل تھی۔ ایک اور امالی ۳۶ حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک اور کتاب کتاب الجوامع کے چالیس حصے تھے۔ اس میں علما کرام کے فقہی اختلافات کا مفصل تذکرہ تھا۔ ایک اور کتاب اختلاف (علما) الامصار کے نام سے لکھی۔ ایک کتاب "کتاب الرد علی مالک بن انس" کے عنوان سے تصنیف فرمائی۔ ان کی اہم کتاب اصول فقہ پر تھی۔ افسوس کہ یہ تمام کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ امام صاحبؒ کی جو کتابیں اس وقت موجود ہیں، وہ یہ ہیں:

Marfat.com

کتاب الآثار: اس کتاب میں آپؒ نے وہ تمام احادیث جمع فرمادی ہیں جو حنفی مسلک کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب کو "مسند ابی یوسف" بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زیادہ احادیث ہیں۔

اختلاف ابی حنیفہؒ وابن ابی لیلیؒ: اس کتاب میں امام ابو یوسفؒ نے امام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابن ابی لیلیؒ کے فقہی اختلافات کو یکجا کر دیا۔ اس کتاب میں امام ابو یوسفؒ نے کئی جگہ امام ابو حنیفہؒ کی اور متعدد مقامات پر دونوں ائمہ کی رائے سے اختلاف فرمایا ہے۔

الرد علی سیر الاوزاعیؒ: امام ابو یوسفؒ نے یہ کتاب امام اوزاعیؒ کے ان دلائل کی تردید میں لکھی ہے جو انہوں نے یہ کہتے ہوئے دیے تھے کہ اہل عراق سیر و مغازی سے واقفیت نہیں رکھتے۔

کتاب الخراج: یہ کتاب امام ابو یوسفؒ کی سب سے اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب مالیاتِ عامہ اور اسلامی مالیات کے تمام شعبوں سے بحث کرتی ہے جسے امام صاحبؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھا۔ امام صاحبؒ کے کئی معاصر علما کرام اور آپؒ کے بعد کئی علما نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان میں سے کوئی کتاب اس پائے کی نہیں جیسی امام ابو یوسفؒ نے تصنیف فرمائی ہے۔ اس کتاب میں آپؒ نے قرآنی آیات، احادیث، اقوالِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور اقوالِ تابعینؒ درج کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مجتہدانہ رائے کا بھی اظہار فرمایا ہے اور تاریخی مباحث پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے یہ کتاب خلیفہ ہارون الرشید کے کہنے پر لکھی تھی، لیکن آپؒ نے اس کتاب میں خلیفہ کو نہایت بے باکی سے نصیحتیں کی ہیں اور بڑی جرأت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا انتقال ۵ ربیع الاول ۱۸۲ھ / ۲۶ اپریل ۷۹۸ء کو ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے لیے مخصوص قبرستان میں ان کی تدفین کروائی۔ انتقال سے قبل امام ابو یوسفؒ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے تیرے بندوں کے درمیان کسی فیصلے میں تکبر سے کام نہیں لیا اور نہ خلافِ واقعہ فیصلہ کیا۔ ہمیشہ کوشش کی کہ جو فیصلہ ہو، وہ تیری کتاب اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔ جب کسی مسئلے میں مشکل پیش آئی تو میں امام ابو حنیفہؒ کو واسطہ بناتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابو حنیفہؒ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور جان بوجھ کر حق کے دائرے سے کبھی باہر نہ جاتے تھے۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور میں نے کبھی ایک درہم بھی جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا۔"

***

Marfat.com

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ

تقویٰ کی بلندیوں پر فائز عظیم محدث، فقیہ، مفسّر اور صوفیا کے امام

قافلہ روانہ ہونے والا تھا۔

اونٹوں پر سامان باندھا جا چکا تھا اور قافلے کے تمام شرکا روانگی کے لیے تیار تھے۔ اچانک ایک خوش رو نوجوان، امیر قافلہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: "آپ مجھے سفر میں ساتھ لے چلیں، میں معاوضے کے طور پر راستے بھر آپ کی خدمت کروں گا۔"

امیر قافلہ نے نوجوان کا جائزہ لیا۔ انہیں غالباً سفر کے دوران کسی خادم کی ضرورت بھی تھی۔ انہوں نے نوجوان کو ساتھ لے جانے پر رضامندی ظاہر کردی۔ قافلہ روانہ ہوگیا۔

راستے میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ امیر قافلہ نے نوجوان کو بلایا اور کہا: "کھانے کا وقت ہے، تم قافلے کے شرکا کے لیے روٹیاں پکاؤ۔"

نوجوان روٹیاں پکانے کے انتظامات کرنے لگا۔ پھر اس نے روٹیاں پکائیں۔ روٹیاں دستر خوان پر لائی گئیں تو امیر قافلہ سمیت بہت سے لوگوں کے چہروں پر ناراضگی کے آثار نمودار ہوگئے۔ روٹیاں اچھی نہیں پکی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ نوجوان اس کام میں مشّاق نہیں رکھتا تھا۔ امیر قافلہ کو اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے نوجوان کو بلا کر زدوکوب کیا۔ نوجوان یہ سزا خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔

قافلہ پھر روانہ ہوگیا۔

کئی دن کے سفر کے بعد قافلہ مکہ مکرمہ پہنچا۔ قافلہ ابھی شہر میں جا کر رکا ہی تھا کہ لوگ جمع ہونے لگے۔ قافلے والوں کو تعجب ہوا کہ لوگ کس لیے جمع ہو رہے ہیں۔ امیر قافلہ کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لوگ اسی خدمت گار نوجوان کے پاس جمع ہو رہے تھے جسے انہوں نے روٹیاں اچھی طرح نہ پکانے پر مارا پیٹا تھا۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا:

"یہ نوجوان کون ہے؟"

"انہیں آپ نہیں جانتے؟" آنے والے لوگوں میں سے ایک نے حیرت سے پوچھا، "یہ سفیان ثوریؒ ہیں، کوفہ کے مشہور محدث اور بہت بڑے عالم۔"

امیر قافلہ انگشت بدنداں تھے۔ حصول علم کے لیے اس تنگ دست نوجوان نے یہ تک گوارا کرلیا کہ قافلے والوں کی ادنیٰ خدمات انجام دے اور قافلے والوں کے مطمئن نہ ہونے کی صورت میں ان کی سزا بھی برداشت کرلے۔

یہ تھے حضرت سفیان ثوریؒ، دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم، محدث، فقیہ اور صوفیا کے امام جو بے پناہ علم کے ساتھ انتہائی درویشانہ طبیعت کے حامل نہایت باعمل انسان تھے۔ آپؒ کے تقویٰ کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود آپؒ فرماتے ہیں:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث مجھ تک پہنچی، اس پر میں نے عمل کیا ہے۔"

آپؒ کا نام سفیان اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ آپؒ کے والد کا نام سعید بن مسروقؒ ہے۔ آپؒ کے نام کے ساتھ "ثوری" کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ آپؒ کے آباؤ اجداد میں ایک بزرگ ثور بن مناةؒ تھے، ان ہی کی نسبت سے آپؒ سفیان ثوریؒ کہلاتے ہیں۔

آپؒ کا تعلق ایک علمی خانوادے سے ہے۔ آپؒ کے والد محترم، سعید بن مسروقؒ مشہور تابعین میں سے تھے اور بہت بڑے عالم تھے۔ خصوصاً حدیثِ نبویؐ کی روایت کے سلسلے میں ان کی شہرت تھی۔ حدیث کی چھ مستند ترین کتابوں، یعنی بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت سعید بن مسروقؒ کی روایات شامل ہیں۔ حضرت سعید بن مسروقؒ کا شمار کوفہ کے جید فضلاً میں ہوتا تھا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کی والدہ ماجدہ بھی بہت پاکیزہ صفت، نیک سیرت اور عالم و دانا خاتون تھیں۔ علامہ ابن جوزیؒ نے انہیں عابدہ اور

Marfat.com

زاہدہ خاتون کہا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کے بھائی بھی محدث تھے۔ آپؒ کے ایک بھائی حضرت عمر بن سعیدؒ سے امام مسلمؒ نے روایت کی جبکہ دوسرے بھائی حضرت مبارک بن سعیدؒ سے ائمہ ترمذیؒ، ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے روایت کی ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے سالِ ولادت میں اختلاف ہے۔ کچھ مؤرخین کے نزدیک آپؒ ۹۵ھ / ۷۱۳ء میں کوفہ میں پیدا ہوئے جبکہ بعض مؤرخین نے اسے ۹۶ھ یا ۹۷ھ / ۷۱۵ء یا ۷۱۴ء بتایا ہے۔ زیادہ حوالے ۹۷ھ / ۱۶-۷۱۵ء کے حق میں ہیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے حدیث کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم حضرت سعید بن مسروقؒ سے حاصل کی۔ آپؒ کے معاشی حالات اچھے نہ تھے، لیکن آپؒ کے والدین نہایت باہمت اور غیرت مند تھے۔ انہوں نے اپنے پیارے بیٹے کو اعلیٰ دینی تعلیم دلوانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپؒ کی والدہ محترمہ نے آپؒ سے فرمایا: ''اے میرے بچے، تم علم کے حصول میں مصروف رہو، میں چرخہ کات کر تمہارے اخراجات پورے کروں گی۔''

آپ کی والدۂ محترمہ نے آپؒ کو یہ نصیحت بھی کی کہ اس علم کو آپؒ کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کا باعث ہونا چاہیے۔ آپ کی والدہؒ نے ایک بار آپ سے فرمایا:

''بیٹے جب تم دس حرف لکھ چکو تو دیکھو کہ تمہاری چال ڈھال میں بہتری اور علم و وقار میں اضافہ ہوا یا نہیں۔ اگر اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تو سمجھ لو کہ علم نے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔''

حضرت سفیان ثوریؒ نے کوفہ کے تمام مشہور علما، محدثین اور فقہا سے علم حاصل کیا۔ کوفہ میں جو تابعین سب سے زیادہ ممتاز تھے ان میں امام ابو محمد سلیمان بن مہران الاعمشؒ اور ابو اسحاق سبیعیؒ سب سے نمایاں تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے ان دونوں جید علما سے بھرپور استفادہ کیا۔

یہ وہ دور تھا کہ ابھی تمام احادیث نبویؐ کو یکجا کر کے تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا اور حدیث کا علم تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے سینوں میں محفوظ تھا، چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ کو علم حدیث کے حصول کے لیے سیکڑوں میل کا سفر کرنا پڑا۔ کوفہ کے شیوخ سے احادیث حاصل کر لینے کے بعد وہ خراسان، بصرہ، بغداد، واسط، بیت المقدس، عسقلان، مکہ مکرمہ اور حجاز کے متعدد مقامات پر تشریف لے گئے۔ کثرت سے سفر کرنے کی وجہ سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہو گئی۔ آپ سفر کے اخراجات پورے نہ کر سکتے تھے، اس کا حل آپؒ نے یہ نکالا تھا کہ آپ قافلے والوں سے کہتے، ''آپ مجھے ساتھ لے چلیں، میں راستے بھر آپ کی خدمت کروں گا۔'' اس ضمن میں ایک واقعہ اس مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک بار آپؒ یمن تشریف لے گئے۔ راستے میں قافلے کا کچھ سامان چوری ہو گیا۔ چند لوگوں نے آپؒ پر شبہ ظاہر کیا۔ آپؒ کو امیر قافلہ کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے پوچھا: ''یہ سامان آپؒ نے چرایا ہے؟''

آپؒ نے فرمایا: ''میں نے یہ سامان نہیں چرایا۔''

انہوں نے آپؒ کا نام پوچھا۔ آپؒ نے فرمایا: ''سفیان ثوریؒ'' امیر قافلہ حیران رہ گئے اور تعجب سے پوچھنے لگے: ''کیا واقعی آپؒ ہی سفیان ثوریؒ ہیں؟''

یعنی آپؒ کے نام سے اکثر لوگ واقف تھے کہ سفیان ثوریؒ علم کے حصول کی خاطر کثرت سے سفر کرتے ہیں لیکن بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ ان کے ساتھ سفر کرنے والے نوجوان ہی سفیان ثوریؒ ہیں۔ پھر امیر قافلہ نے آپ سے معذرت کی اور آپ کے ساتھ عزت کا سلوک کیا۔

غیر معمولی علم اور بے پناہ فراست کی بنا پر حضرت سفیان ثوریؒ کو کم عمری ہی میں درس و افتا کی مسند نصیب ہوئی۔ آپؒ ابھی نوجوان تھے کہ لوگ آپؒ سے مختلف مسائل میں فتویٰ حاصل کرنے لگے تھے۔ آپ کے درس کی پہلی محفل بخارا میں منعقد ہوئی۔ اس وقت آپؒ کی عمر ۱۸ برس تھی۔

علم کا کوئی سا شعبہ ہو، اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے حافظہ اور اپنے علم پر اعتماد ضروری ہے اور حدیث نبویؐ کی روایت کے سلسلے میں تو ان خصوصیات کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے کیونکہ احادیث نبویؐ کی روایت نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ رب کریم و جلیل نے انہیں غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ آپؒ کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ آپؒ جس روایت کے بارے میں جو بات فرماتے، اسے پورے وثوق کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا شمار امام اعمشؒ کے لائق اور ذہین تلامذہ میں ہوتا تھا۔ آپؒ نے امام اعمشؒ سے جو احادیث روایت کی تھیں وہ آپؒ

Marfat.com

کو حرف بحرف یاد تھیں۔ مشہور محدث زائدہؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ امام اعمشؒ کے درس میں احادیث لکھ کر واپس آتے تھے تو ان احادیث کو حضرت سفیان ثوریؒ کے ملاحظے کے لیے پیش کر دیتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ ان احادیث کا مطالعہ فرما کر نشاندہی فرماتے کہ فلاں فلاں روایتیں تو امام اعمشؒ کی بیان کردہ نہیں ہیں۔ ہم کہتے کہ ہم ابھی امام اعمشؒ سے یہ روایتیں سن کر آرہے ہیں۔ حضرت سفیانؒ فرماتے کہ آپ لوگ امام اعمشؒ سے تصدیق کریں۔ ہم لوگ امام اعمشؒ کو یہ بات بتاتے تو وہ غور کر کے فرماتے: "سفیانؒ نے سچ کہا ہے۔" یعنی یہ وہ روایتیں نہیں تھیں جو امام اعمشؒ نے اپنے شیوخ سے براہ راست سنی تھیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوش سنبھالا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب احادیثِ نبویؐ کے منتشر ذخیرے کو یکجا کیا جا رہا تھا۔ بعد کے دور میں جب لاکھوں احادیث تحقیق کے بعد جمع کر دی گئی تھیں تو محدثین کے لیے انہیں یاد رکھنا قدرے آسان ہو گیا تھا۔ لیکن تبع تابعینؒ کے عہد میں احادیث نبویؐ کی تدوین کی ابتدا ہوئی تھی۔ حضرت سفیان ثوریؒ کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ اس دور میں بھی آپؒ کو تیس ہزار احادیث یاد تھیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ بلند پایہ محدث ہونے کے علاوہ قرآنِ کریم کے حافظ تھے۔ آپؒ قرآنِ کریم کی قرأت کے ماہر تھے اور آپؒ کو ساتوں قرأتوں پر عبور حاصل تھا۔ قرآن حکیم کی تفسیر میں بھی آپؒ کمال رکھتے تھے اور قرآن و حدیث پر مجتہدانہ نظر کے حامل تھے۔ آپؒ نے قرآنِ کریم کی تفسیر بھی تحریر فرمائی۔ آپؒ اعلیٰ درجہ کے فقیہ بھی تھے اور ایک مستقل فقہی مسلک کے بانی تھے۔ آپؒ کے فقہی مسلک کے پیروکار باقی نہ رہے، اور یہ مسلک ختم ہو گیا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کو فقہاکرام اور علمائے محترم میں یہ اعلیٰ مقام یوں ہی نہیں مل گیا۔ آپؒ فرماتے ہیں: "میں نے تیس برسوں تک راتیں جاگ کر علم حاصل کرنے کی کوشش کی۔"

حضرت سفیان ثوریؒ کے علم سے اتنے زیادہ افراد نے استفادہ کیا ہے کہ ان کی تعداد بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "ان سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔"

تمام مشہور تبع تابعینؒ کو آپ کے شاگرد ہونے یا آپ کے بے پناہ علم سے فائدہ اٹھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں حضرت امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جیسے جید فقہا اور محدثین شامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: "میں نے ۱۱۰۰ شیوخ سے حدیثیں لکھیں اور ان میں سب سے افضل حضرت سفیان ثوریؒ کو پایا۔" آپؒ یہ بھی فرماتے ہیں: "رُوئے زمین پر سفیانؒ سے بڑے کسی عالم کو میں نہیں جانتا۔"

حضرت سفیان ثوریؒ نے بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپؒ کے علمی اور تحقیقی کام کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے شاگردوں، عبداللہ بن عبداللہؒ اور یزید بن ولیدؒ کا بیان ہے:

"جب ہم نے آپؒ کی کتابوں کو اکٹھا کیا تو وہ نو صندوقوں میں سمائیں اور ان میں سے ہر صندوق ہمارے سینے کے قریب قریب بلند تھا۔"

افسوس کہ آپؒ کی تصنیف کردہ اتنی بہت سی کتب میں سے صرف چند کتب باقی ہیں۔ ان کتب کے محفوظ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ حکمرانوں کی نظر میں معتوب تھے اور حکمرانوں کے خوف سے کوئی فرد کھلم کھلا آپؒ کی حمایت نہ کرتا تھا۔ غالباً اسی ڈر سے آپؒ کی کتابوں کو منظر عام پر لانے اور بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کی موثر کوشش بھی نہ کی گئی۔ دوسری روایتوں کے مطابق حضرت سفیان ثوریؒ جب بستر مرگ پر تھے تو انہوں نے خود اپنے ایک رفیق کو ہدایت کی کہ وہ ان تمام کتابوں کو نذر آتش کر دیں۔

آپؒ کی جو کتابیں بعد کے ادوار تک پہنچیں، ان کے نام یہ ہیں:

● الجامع الکبیر فی الفقہ ● الجامع الصغیر ● کتاب الفرائض ● قرآن پاک کی تفسیر۔

اس تفسیر کا ایک حصہ (مخطوطہ) کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نہایت متقی اور زاہد مرتاض (پرہیز گار اور نہایت عبادت گزار) بزرگ تھے۔ آپؒ نے دنیا کو ایک مسافر کی طرح بسر کیا اور دنیاوی چیزوں کی کبھی خواہش نہ کی۔ دنیا سے آپؒ کے تعلق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے فرمان کے مطابق: "میں نے اپنی عمر بھر ایک درہم بھی مکان بنانے پر صرف نہیں کیا۔" خراسان میں آپؒ کو اپنے چچا کی کچھ جائیداد ملی تھی۔ اس کی مدد سے آپؒ اپنے محدود اخراجات پورے کر لیا کرتے تھے۔ نہایت سادہ لباس زیب تن کیا کرتے تھے اور آپؒ کے استعمال کی تمام اشیا بے حد کم قیمت ہوتی تھیں۔ آپؒ کی خوراک بھی بہت معمولی سی ہوتی تھی۔

Marfat.com

آپؒ مزاجاً نہایت متواضع اور خاکسارانہ طبیعت کے مالک تھے۔ کسی محفل میں تشریف رکھتے تو خود کو نمایاں کرنے اور صدرِ محفل بننے کی کبھی کوشش نہ فرماتے بلکہ دیوار کے ایک کنارے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے تھے۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے، ”میں چاہتا ہوں کہ میں ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہ ہو۔“

حضرت سفیان ثوریؒ بے نیاز طبیعت کے مالک تھے۔ نہ کبھی کسی سے کوئی شے مانگتے تھے، نہ کسی سے تحفہ قبول کرتے تھے۔ حکمرانوں سے تو آپؒ ہمیشہ دور رہتے تھے اور ان کے بھیجے ہوئے تحائف لوٹا دیا کرتے تھے۔ آپؒ انہیں قبول نہ فرماتے تھے۔ آپؒ کے بھائی مبارکؒ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت سفیانؒ کے ایک دوست تھے جن کے یہاں آپؒ اکثر تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دن ان کا بیٹا درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی لے کر حضرت سفیانؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ آپؒ کے مزاج سے واقف نہ تھا۔ اس نے پہلے پوچھا:

”آپؒ کو میرے والد کی جانب سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟“

حضرت سفیانؒ نے فرمایا: ”نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر رحم فرمائے وہ تو بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔“

نوجوان نے کہا: ”یہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے پاس دولت کن ذرائع سے آتی ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ جو رقم میں لے کر آیا ہوں، آپ اسے قبول کر لیں اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کریں۔“

حضرت سفیانؒ نے تھیلی اس کے ہاتھ سے لے لی اور جب وہ اجازت لے کر باہر چلا گیا تو آپؒ نے مجھے (یعنی بھائی مبارک) کو بلایا اور فرمایا: ”یہ رقم اسے واپس کر دو۔“

میں اس نوجوان سے ملا اور رقم واپس کر دی۔ نوجوان واپس آیا اور اصرار کرنے لگا کہ یہ رقم قبول کر لیں۔ حضرت سفیانؒ نے فرمایا: ”میں نے رقم ہاتھ میں تو لے لی تھی، اب تم اس کو واپس لے جاؤ۔“

اس نوجوان نے پوچھا: ”کوئی ناراضگی تو نہیں ہے۔“ آپؒ نے فرمایا: ”نہیں۔“ وہ نوجوان بار بار اصرار کرتا رہا کہ آپؒ رقم قبول کر لیں لیکن آپؒ رضامند نہ ہوئے حتیٰ کہ وہ نوجوان مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ بعد میں تنہائی میں، میں نے (یعنی بھائی مبارکؒ نے) عرض کیا: ”بھائی، آپ کا تو دل بالکل پتھر ہو گیا ہے۔ آپ ہم پر تو رحم کرتے، آپ کو اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں پر بھی رحم نہیں آیا۔“ اسی طرح میں نے ان سے بہت سی باتیں کہیں۔ جب میں سب کچھ کہہ چکا تو آپؒ نے فرمایا:

”مبارک! تم تو رقمیں وصول کر کے مزے سے کھاؤ پیو اور اس کے بارے میں مجھ سے باز پرس ہو، ایسا قطعی نہیں ہو سکتا۔“

حضرت سفیان ثوریؒ جس طرح تحفہ قبول کرنے سے گریز فرماتے تھے، اسی طرح قرض لینے سے بھی سختی کے ساتھ پرہیز کرتے تھے۔ حضرت سفیانؒ نہایت رقیق القلب انسان تھے اور آخرت کے خوف سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ آپؒ خود فرماتے ہیں: ”میں رات میں سوتا ہوں اور اچانک کوئی آواز آجاتی ہے تو یہ سوچ کر چونک پڑتا ہوں کہ ہم پر عذاب نہ آگیا ہو۔“ ایک بار قرأت کرتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے (ترجمہ) ”جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ دن بڑا سخت ہوگا۔“ تو چیختے ہوئے شدید دھوپ میں باہر نکل آئے۔ ایک بار آپؒ نے عشا کی نماز ادا کر کے اپنے ایک شاگرد یوسف سے کوئی برتن مانگا۔ شاگرد نے برتن لا کر پیش کیا، آپؒ نے برتن اپنے دائیں ہاتھ میں لیا اور اس حالت میں پوری رات گزار دی۔ فجر کا وقت ہوا تو آپؒ کے شاگرد نے آکر آپؒ کو متوجہ کیا۔ آپؒ نے فرمایا: ”تم نے جب برتن دیا تو میں آخرت کے متعلق غور کر رہا تھا۔“ اسی حالت میں وقت گزرنے کا آپؒ کو علم تک نہ ہوا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں: ”ان سے زیادہ رقیق القلب شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ رات کے پہلے حصے میں سو جاتے تھے۔ پھر اچانک گھبرا کر ”دوزخ، دوزخ“ کہتے ہوئے اٹھ جاتے پھر وضو فرماتے اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔“

حضرت سفیان ثوریؒ حکمرانوں سے دور رہنا پسند فرماتے تھے اور حاکموں کی جانب سے کسی عہدے کو قبول نہ فرماتے تھے۔ آپؒ نے پہلے عباسی خلیفہ سفاح اور اس کے بعد منصور اور مہدی کا زمانہ دیکھا۔ منصور اور مہدی سے آپ کی جب بھی ملاقات ہوئی، آپؒ نے انہیں سخت لہجے میں نصیحتیں کیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، آپؒ کے مزاج کا حصہ تھا۔ آپؒ کو کوفہ کے قاضی کا عہدہ بھی پیش کیا گیا لیکن آپؒ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ آپؒ نہ صرف خود امرا اور حکام سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی حکمرانوں سے دور رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ آپؒ نے ایک بار اپنے شاگرد کو خط لکھا جس میں بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا: ”میرے بھائی، امرا سے میل جول نہ رکھنا، تم سے کہا جائے گا کہ لوگوں کی سفارش کرو۔“

حج بیت اللہ کے موقع پر آپؒ کی ملاقات عباسی خلیفہ منصور سے

Marfat.com

ہوئی۔ آپؒ منصور کے روبرو فرش پر بیٹھ گئے اور آپؒ نے قرآن کریم کی آیت تلاوت فرمائی (ترجمہ): اسی خاک سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور پھر اسی سے دوبارہ تمہیں اٹھائیں گے۔" (سورۂ طٰہٰ: ۵۵)

یہ آیت سن کر منصور کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس کے بعد حضرت سفیان ثوریؒ نے خلیفہ کو نصیحتیں شروع کر دیں۔ آپؒ کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ منصور کے وزیر نے خیال کیا کہ اب منصور ان کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔

منصور کے بعد بارِ خلافت مہدی پر ڈالا گیا۔ حضرت سفیان ثوریؒ ان پر بھی بلا رورعایت تنقید کرتے رہے۔ ایک بار آپؒ مہدی کے پاس تشریف لے گئے۔ مہدی نے آپؒ کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا، پھر کہنے لگے: آپؒ ہم سے دور دور رہتے ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم آپ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے؟"

حضرت ثوریؒ نے نہایت دلیری اور بے نیازی سے فرمایا: "ہاں اگر آپ میرے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں تو آپ کے اوپر ایک عادل اور مالک موجود ہے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر کے رہے گا۔"

مہدی کے ایک وزیر اس وقت موجود تھے، انہیں حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ طرز تخاطب ناگوار گزرا، انہوں نے سخت اعتراض کیا، لیکن مہدی نے وزیر کو ڈانٹا اور حکم دیا کہ امام صاحب کو کوفہ کا قاضی (جج) مقرر کیا جائے اور اس سلسلے میں ابھی خط تحریر کر دیا جائے۔ حضرت سفیان ثوریؒ اپنے قاضی بنائے جانے کا حکم نامہ لے کر باہر نکلے اور آپؒ نے اس حکم نامے کو دریائے دجلہ کی موجوں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد آپؒ روپوش ہو گئے۔ مہدی کے حکم پر آپؒ کو تلاش کرنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی لیکن کوئی آپؒ کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کے بعد کے ایام آپؒ کے لیے سخت گزرے۔ حکمران آپؒ کے مخالف ہو گئے اور آپؒ کو ان سے دُور رہنے کے لیے بصرہ جانا پڑا۔ بصرہ میں بڑے بڑے فقہا نے آپؒ سے حدیث کا درس لیا۔

بعض بہی خواہوں کے اصرار پر آپؒ نے حکمرانوں سے بات کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ آپؒ بغداد جانے کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ علیل ہو گئے۔ یہی علالت آپؒ کے لیے پیغامِ اجل لے آئی۔ جس رات آپؒ نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، اس رات آپؒ نے نماز کے لیے کئی بار وضو فرمایا۔ آپؒ کے رفیق ابن مہدی آپؒ کے قریب موجود تھے۔ جب صبح ہونے لگی تو فرمایا: "ابن مہدیؒ میرا چہرہ زمین پر رکھ دیجیے۔" ابن مہدی گھبرا کر دیگر احباب کو اطلاع دینے گئے۔ ذرا دیر میں کئی علما کرام اور شیوخ جمع ہو گئے۔

اس موقع پر حضرت سفیان ثوریؒ نے ہدایت کی کہ عبدالرحمٰن بن عبدالملک میری نماز جنازہ پڑھائیں۔ پھر آپؒ نے اپنے رفیق ابو سلمہؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "کیا تم کو امید ہے کہ مجھ جیسے آدمی کی مغفرت ہو جائے گی۔"

ابو سلمہؒ نے فرمایا: "اس میں کیا تعجب ہے۔" اس کے بعد حضرت سفیان ثوریؒ نے دنیا سے کنارہ فرمایا۔ آپ نے شعبان ۱۶۱ھ / مئی ۷۷۸ء میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ بہت سے جغرافیہ دانوں نے بصرہ میں آپؒ کی قبر کا ذکر کیا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کی شادی کوفہ میں ہوئی تھی۔ آپؒ کی اہلیہ کا نام اُمِ حسان تھا۔ آپؒ کی ایک شادی بصرہ میں اُمِ ابی حذیفہ سے ہوئی۔ آپؒ کے ایک صاحب زادے تھے جن کا انتقال آپؒ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

حضرت سفیان ثوریؒ کے تبحر علم، ان کے ایمانِ خالص، ان کی بے ریا اور درویشانہ زندگی اور زاہدانہ طبیعت کی بنا پر صوفیا کرام انہیں اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور انہیں مشائخ کبار میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے تذکرۃ الاولیا میں ایک طویل مقالہ خاص طور پر حضرت سفیان ثوریؒ کے بارے میں تحریر کیا ہے جس میں آپؒ نے حضرت سفیان ثوریؒ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے ہیں۔

•••

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ

دلوں پر حکمرانی کرنے والے عظیم محدث جن کا انتقال حالتِ جہاد میں ہوا

بادشاہ وقت اپنے محل میں نہایت شان و شوکت سے براجمان تھا، اچانک ایک شور اٹھا، بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا،

"یہ کیسا شور ہے؟"

کچھ خدام شور کی حقیقت جاننے کے لیے لپکے۔ محل کے باہر لوگ ایک ہی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ ہجوم بڑھتا جارہا تھا، ہر شخص ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں تھا، زبردست دھکم پیل ہو رہی تھی، بہت سے لوگوں کی جوتیاں تک ٹوٹ گئی تھیں، لیکن ہجوم کے جوش و خروش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

بادشاہ ابھی تک حیران بیٹھا تھا۔

اس نے اپنے جن ملازمین کو شور کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، وہ ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ بادشاہ کے اطراف جو چند افراد رہ گئے تھے، ایک ایک کرکے وہ بھی چلے گئے اور بہت بڑی سلطنت کا بادشاہ اس وقت اتنے بڑے محل میں یکہ و تنہا رہ گیا تھا۔

بادشاہ کے محل میں ایک کنیز کھڑی لوگوں کو دوڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سادگی سے پوچھا، "یہ بھگدڑ کیسی ہے؟ لوگ کہاں جارہے ہیں؟" کسی نے اسے بتایا، "خراسان کے بہت بڑے عالم حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تشریف لائے ہیں، لوگ ان کے دیدار کے لیے، دوڑے جارہے ہیں۔"

کنیز بے اختیار کہہ اٹھی اور اس کا یہ بے ساختہ جملہ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا: "اصل بادشاہت تو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی ہے نہ کہ ہارون الرشید کی، کہ محافظوں اور اہل کاروں کے بغیر لوگ بادشاہ کے لیے جمع ہی نہیں ہوتے۔"

کنیز نے بالکل سچ کہا تھا۔

ہارون الرشید کی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ ایک بار انھوں نے ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر نہایت اطمینان سے کہا تھا، "جہاں تیرا جی چاہے جا کر برس جا، تیرا اخراج بہر صورت میرے پاس آئے گا۔"

ہارون الرشید، کی سلطنت ہند اور تاتار سے بحر اوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اندلس کے سوا کُل اسلامی دنیا، ہارون کی تابع فرمان تھی اور یورپ کے پاس صرف روم اور یونان کی حکومتیں تھیں اور یہ دونوں حکومتیں بھی سلطنتِ عباسیہ کی باج گزار تھیں۔ سلطنت عباسیہ میں موجودہ سرزمین حجاز، شام، اردن، یمن، مصر، ایران، افغانستان، ترکی، روسی ترکستان آرمینیا، سندھ اور افریقہ کا بڑا حصہ شامل تھا۔

اتنی بڑی سلطنت کے باوجود لوگوں کے دلوں پر حکمرانی حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تھی۔

دلوں کا یہ بادشاہ، مملکت کے بادشاہ یعنی ہارون الرشید سے ملنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا! ہارون الرشید نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو کئی بار ملاقات کی دعوت دی لیکن وہ گریز کرتے رہے۔ ابراہیم موصلیؒ جن کا تعلق دربار شاہی سے تھا، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کا کہنا تھا، "ہارون الرشید نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے ملنے کی خواہش متعدد بار ظاہر کی لیکن میں ٹال دیتا تھا، میں جانتا تھا کہ ابن مبارکؒ کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہوگی تو وہ ہارون کو سختی سے روکیں گے بلکہ تنبیہ کریں گے اور یہ بات ہارون کی ناگواری کا سبب بنے گی اور پھر نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جنھوں نے اپنے بے پناہ علم اور بلندیِ کردار کی بدولت ایک جہاں کو منور کیا، ایک نہایت دیندار اور متقی باپ کے بیٹے تھے۔ آپؒ کے والد، مبارک ایک غلام تھے۔ ایک دن ان کے آقا نے حکم دیا کہ باغ سے میٹھا انار توڑ لاؤ۔ مبارک گئے اور ایک انار توڑ کر لے آئے۔ آقا نے انار چھیل کر چکھا تو کھٹا نکلا۔ آقا نے

Marfat.com

کہا میٹھا انار لے آؤ۔ مبارک دوبارہ گئے اور ایک انار توڑ لائے۔ آقا نے اس انار کو چکھا تو یہ بھی کھٹا نکلا۔ آقا نے ناراض ہو کر پوچھا، "تمہیں کھٹے اور میٹھے انار کی تمیز نہیں؟"

مبارک نے سنجیدگی سے جواب دیا، "آپ نے مجھے انار توڑنے کی اجازت دی ہے کھانے کی تو نہیں۔"

آقا اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔ آقا کی ایک لڑکی تھی جس کے لیے بہت سے اچھے اچھے پیام آ رہے تھے، آقا نے ایک دن مبارک کو بلایا اور ان سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ مبارک نے کہا: "عہد جاہلیت میں لوگ خاندانی حسب نسب اور عزت و شہرت کو تلاش کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کو مال کی جستجو رہتی تھی اور عیسائی حُسن و جمال کو ترجیح دیتے تھے لیکن امتِ محمدیہؐ کے نزدیک معیار، دین و تقویٰ ہے، اب آپ جس کو چاہیں ترجیح دیں۔"

آقا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا، بعد میں اس نے اپنی بیوی سے کہا، "میری لڑکی کے لیے مبارک سے زیادہ موزوں شوہر اور کوئی نہیں مل سکتا۔"

بیوی یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ایک غلام سے شادی؟ اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ لڑکی کے لیے اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہ ہو۔ اس نے اس رشتے کی مخالفت کی لیکن آقا فیصلہ کر چکا تھا۔

مبارک کی شادی اپنے آقا کی بیٹی سے ہو گئی۔ اسی لڑکی سے ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ پیدا ہوئے۔ آپؒ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے اور اصلی وطن مرو ہے۔ اس نسبت سے آپ مروزی کہلاتے ہیں۔

مرو میں ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حضرت ابن مبارکؒ نے شام و حجاز، یمن و مصر، کوفہ اور بصرہ کے مختلف شہروں اور قصبوں کا سفر کیا اور بڑے بڑے اہلِ علم، شیوخ اور علما سے فیض حاصل کیا۔

حضرت امام احمدؒ کہتے ہیں، "طلبِ علم کے لیے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے زیادہ سفر کرنے والا ان کے زمانے میں کوئی نہ تھا۔" یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اب سے ساڑھے بارہ سو سال قبل ذرائع آمد و رفت نہایت محدود تھے اور سفر کرنا موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت مشکل تھا۔

ان کے ممتاز اساتذہ میں امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ اور امام اوزاعیؒ جیسے جید علما کرام اور فقہا شامل ہیں۔

حدیث کا ذکر چھڑ جاتا تو ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ ایک دن نمازِ عشا کے بعد علی بن حسنؒ کے ساتھ کسی حدیث کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ ساری رات مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی اور انھیں احساس تک نہ ہو سکا۔ علمِ حدیث میں آپؒ کا مرتبہ امام حدیث کا ہے۔ آپؒ کی بیان کردہ روایات کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے۔

محدثین کو کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے پاس چلے آتے۔ حضرت فضالہؒ کہتے ہیں، جب کبھی محدثین میں کسی روایت پر اختلاف ہوتا تو وہ کہتے "اچھا اس اختلاف کو "طبیبِ حدیث" کے پاس لے چلو۔ "طبیبِ حدیث" سے ان کی مراد حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تھے۔

خلافتِ راشدہ تک حدیث کی روایت پر کچھ حدود و قیود عائد تھیں۔ خصوصاً حضرت عمرؓ کا رویہ اس معاملے میں نہایت سخت تھا، لیکن بنو امیہ کے زمانے میں ضعیف روایات بھی بیان کی جانے لگیں۔ اس پر ائمۂ حدیث نے بعض اصول مرتب کیے جن کی مدد سے حدیث کو پرکھا جا سکے۔

جو شخص اس زمانے میں "قال النبیؐ" کے الفاظ زبان سے نکالتا، اس کی روایت کی صحت ہی نہیں، اس شخص کے ذاتی حالات کے بارے میں تفتیش شروع کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس کے ضبطِ احتیاط، قوتِ حافظہ اور اخلاقی حالت کے بارے میں اطمینان نہ ہو جاتا، ائمۂ حدیث اس کی روایت قبول نہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے بھی اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ ابن عساکرؒ کہتے ہیں، ہارون الرشید کے پاس ایک مُلحِد لایا گیا۔ ہارون الرشید نے اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ مُلحِد بولا کہ آپ ان ایک ہزار احادیث کا کیا کریں گے جو میں نے تیار کر کے ملک بھر میں پھیلا دی ہیں حالانکہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ ہارون الرشید نے اطمینان سے کہا، "اے دشمنِ خدا! تو کس خیال میں ہے، ابو اسحاق فزاریؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جیسے نقاد یہاں موجود ہیں، وہ ایک ایک حرف نکال کر باہر پھینک دیں گے۔" اس کے بعد ملحد کو سزائے موت دے دی گئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی ذات قرآن پاک کی آیت (ترجمہ) "اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" کا مکمل نمونہ

Marfat.com

تھی۔ آپؒ کے استاد حضرت سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں: "میں نے صحابہؓ کرامؓ کے حالات پر غور کیا تو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو سوائے اس کے اور کسی بات میں صحابہ کرامؓ سے کم تر نہ پایا کہ انہیں نبی کریم ﷺ کی صحبت میسر نہ تھی۔"

ایک بار حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے شام میں کسی شخص سے قلم مستعار لیا۔ مرو پہنچ کر یاد آیا کہ وہ اس شخص کا قلم واپس کرنا بھول گئے ہیں، واپس شام گئے اور قلم لوٹا کر آئے۔ واضح رہے کہ مرو، شام سے سینکڑوں میل دور ہے اور اس زمانے میں صرف گھوڑوں اونٹوں اور خچروں پر سفر ہوتا تھا۔

حضرت عبداللہؒ بن مبارک کبھی مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے، فرماتے تھے مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے، اللہ اس کا حساب نہیں لیتا۔ سال کے بیشتر حصے میں روزہ رکھتے تھے۔ سخاوت کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ درہم سالانہ، صرف فقراء پر خرچ کرتے تھے۔

خراسان سے تجارت کا سامان حجاز لاکر فروخت کیا کرتے تھے، ایک بار آپؒ کے شاگرد حضرت فضیل بن عیاضؒ نے ان سے کہا، "آپؒ ہم لوگوں کو تو زہد و قناعت اور دنیا سے بے رغبتی کی تربیت دیتے ہیں اور خود قیمتی سامان کی تجارت کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

آپؒ نے جواب دیا، "فضیلؒ! یہ تجارت اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے اپنی ذات کو مصائب سے، اپنی عزت کو ذلت سے بچاسکوں اور اللہ کی اطاعت میں اس سے مدد لوں اور اللہ نے جو مالی حقوق میرے ذمے کیے ہیں، ان کو بخوبی ادا کروں۔"

کسی نے شکایت کی کہ آپ اپنے شہر میں مال اتنی فراوانی سے خرچ نہیں کرتے جس فراوانی سے باہر بھیجتے ہیں، جواب میں فرمایا،

"میں ان لوگوں پر مال خرچ کرتا ہوں، جن کے علم و فضل اور صداقت و دیانت سے بخوبی واقف ہوں، وہ علم دین کی طلب و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں مگر ان کی ذاتی ضرورتیں بھی ہیں۔ اگر یہ لوگ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہوجائے گا اور اگر ہم ان کی مدد کرتے ہیں تو ان کے ذریعے علم کی اشاعت ہوتی رہے گی اور منصب نبوت کے اختتام کے بعد علم دین کی اشاعت سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔"

ایک شخص سات سو درہم کا مقروض تھا، کچھ لوگوں نے درخواست کی کہ اس کا قرض ادا کردیں۔ آپؒ نے اپنے ماتحت اہل کار کو لکھا کہ حامل رقعہ کو سات ہزار درہم ادا کردیے جائیں۔ یہ تحریر لے کر وہ شخص حضرت عبداللہؒ کے اہل کار کے پاس پہنچا۔ اس نے تحریر پڑھ کر پوچھا، "تمہیں کتنی رقم چاہیے؟" اس نے بتایا کہ میں سات سو درہم کا مقروض ہوں اور اسی کے لیے لوگوں نے سفارش کی تھی۔ اہل کار نے حضرت ابن مبارکؒ سے استفسار کیا۔ آپ نے جواب میں لکھا، "تمہیں جس وقت میرا خط ملے اسی وقت تم اس شخص کو ۱۴ ہزار درہم دے دو۔" اہل کار نے ازراہِ ہمدردی لکھا کہ اس طرح تو جلد ہی سرمایہ ختم ہوجائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے سخت لہجہ میں لکھا: "اگر تم میرے ماتحت ہو تو میں جو حکم دیتا ہوں اس پر عمل کرو اور اگر تم مجھے اپنا مامور و محکوم سمجھتے ہو تو پھر تم آکر میری جگہ بیٹھو اس کے بعد جو تم حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا۔ میرے سامنے مادّی دولت و ثروت سے زیادہ قیمتی سرمایہ آخرت کا ثواب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو اچانک اور غیر متوقع طور پر خوش کردے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔"

آپؒ شام کے شہر طرطوس جایا کرتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا۔ وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے تھے۔ اس سرائے میں ایک نوجوان بھی رہا کرتا تھا۔ جب تک آپؒ سرائے میں قیام کرتے وہ نوجوان آپؒ سے حدیثیں سنتا۔ ایک بار سرائے پہنچے تو نوجوان کو نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دس ہزار کے قرض کے سلسلے میں قید ہے۔ آپؒ نے قرض خواہ کو بلایا، رقم ادا کردی اور وعدہ لے لیا کہ کسی سے تذکرہ نہ کرے گا۔ اسی رات آپؒ رقہ سے روانہ ہوگئے۔

نوجوان رہا ہوکر سرائے میں پہنچا، اسے آپؒ کی آمد کی اطلاع ملی، اسے ملاقات نہ ہونے کا اتنا رنج ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی سمت روانہ ہوگیا۔ خاصی دور جاکر حضرتؒ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حال دریافت کیا۔ نوجوان نے بتایا کہ میں قید تھا، کوئی اللہ کا بندہ آکر سرائے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے قرض ادا کرکے مجھے رہائی دلوائی۔ آپؒ نے فرمایا، "اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس مصیبت سے تمہیں نجات مل گئی"۔ محمد بن عیسیٰؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی وفات کے بعد قرض خواہ نے اس واقعہ کو لوگوں سے بیان کیا۔

تقریباً ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ سفرِ حج پر معمول تھا کہ سفر سے پہلے تمام رفقائے سفر سے کہتے کہ اپنی اپنی رقم میرے حوالے کردیں، جب وہ لوگ رقم حوالے کردیتے تو ہر ایک کی رقم الگ الگ تھیلی میں ہر

Marfat.com

ایک کے نام کے ساتھ مُہر بند کرتے اور صندوق میں رکھ دیتے۔ سفر کے دوران خود خرچ کرتے، اچھا کھانا کھلاتے، جب فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ پہنچتے تو ہم سفروں سے کہتے کہ اہل و عیال کے لیے جو خریدنا ہو خرید لیں۔ اس سارے سامان کی قیمت خود ادا کرتے، جب واپس پہنچتے تو سب کی دعوت کرتے اور ہر ایک کو اس کی تھیلی لوٹا دیتے۔ یہ آپؒ کا زندگی بھر کا معمول رہا۔

مرو میں آپؒ کا اچھا خاصا کشادہ مکان تھا لیکن اسے چھوڑ کر کوفہ چلے آئے اور نہایت تنگ و تاریک مکان میں ٹھہر گئے۔ لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا، "جس بات کو تم پسند کرتے ہو یعنی عقیدت مندوں کا ہجوم، وہ مجھے ناپسند ہے اور یہاں تم گمنامی کی زندگی کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ مجھے پسند ہے۔"

ایک بار کسی سبیل پر پانی پینے گئے، وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا، اچانک ایسا دھکا لگا کہ دُور جا پڑے، اٹھ کر اپنے ساتھی سے فرمایا، "زندگی اسی طرح گزارنی چاہیے کہ نہ ہم کو لوگ پہچانیں، نہ ہماری توقیر کریں۔"

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی، قرآن پاک کی آیت، "اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" کا نمونہ تھی۔ آپؒ زندگی کے ہر گوشے میں اسلام پر عمل پیرا تھے۔ آپؒ نے سال کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ تجارت اور درس و تدریس، جہاد اور سفرِ حج۔

اس زمانے میں رومیوں اور مسلمانوں میں بڑی کشاکش تھی، کبھی رومی، اسلامی سرحدوں پر حملہ کرتے تو کبھی مسلمان پیش قدمی کرتے۔ ایک بار لشکرِ اسلام رومیوں کے خلاف صف آرا تھا، رومی فوج سے ایک سپاہی نکلا، اس نے لڑنے کی دعوت دی، سلیمانؒ مروزی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی جانب سے بھی ایک سپاہی نکلا، اس نے پہلے ہی وار میں رومی فوج کے سپاہی کا کام تمام کر دیا۔ پھر دشمن کے کئی سپاہی یکے بعد دیگرے آئے اور ان سب کا یہی حشر ہوا۔ لوگوں نے یہ بہادری دیکھ کر، اس مسلمان مجاہد کو گھیر لیا۔ اس کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی تو دیکھا، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ہیں۔

ایک بار ایک مجوسی سے برسرِپیکار تھے، مجوسی کی عبادت کا وقت آگیا تو اس نے مہلت مانگی۔ جب وہ سورج کے سامنے سجدہ کرنے لگا تو آپؒ نے ارادہ کیا کہ اس کا کام تمام کر دیں لیکن فوراً ہی قرآن پاک کی آیت یاد آگئی (ترجمہ) "عہد کی پابندی کرو، عہد کی باز پرس ہوگی۔" فوراً رک گئے۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد مجوسی کو واقعہ کا علم ہوا تو وہ مسلمان ہو گیا۔

آپؒ نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ امام ذہبیؒ نے ان کی صرف ایک کتاب، "کتاب الذہب" کا ذکر کیا ہے لیکن ابنِ ندیم کے مطابق آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں کتاب السنن، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب البر والصلۃ شامل ہیں۔

عظیم بزرگ نے داعیٔ اجل کو لبیک ایسے عالم میں کہا، جب وہ شام کے علاقہ میں جہاد کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۱ھ / ۷۹۷ء کی بات ہے۔ دورانِ سفر طبیعت خراب ہو گئی، صحرائے شام کے شہر ہیت میں ٹھہرے، ستو پینے کی خواہش ظاہر کی، ایک شخص نے ستو پیش کیا لیکن یہ شخص ہارون الرشید کا درباری تھا، اس لیے ستو پینے سے انکار کر دیا۔ وفات سے کچھ دیر قبل آواز گلے میں پھنس گئی، انہیں خدشہ ہوا کہ زبان سے کلمۂ شہادت نہ نکل پائے گا۔ انہوں نے اپنے شاگرد حسن بن ربیعؒ سے کہا، "دیکھو جب میری زبان سے کلمۂ شہادت نکلے تو تم اتنی بلند آواز سے دہرانا کہ میں سن لوں، جب تم ایسا کرو گے تو یہ کلمہ خود بخود میری زبان پر جاری ہو جائے گا" اسی حالت میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

•••

Marfat.com

حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ

فقہ حنفی کے امام، جنہوں نے فقہی احکام کی تدوین میں اہم کردار انجام دیا

"میں آپ کے شاگردوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں!"

بزرگ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک نہایت وجیہ و شکیل لڑکا ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ لڑکے کے بال گھنے تھے، صحت اچھی تھی، اور متناسب جسم پر عمدہ لباس تھا۔

بزرگ کو یاد آیا، یہی لڑکا چند روز قبل ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔ اور اب یہ ان سے علم سیکھنے کا خواہش مند تھا۔

بزرگ، فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی مستحکم رائے یہ تھی کہ قرآن کریم میں غور و فکر کیے بغیر فقہ کو سمجھا نہیں جا سکتا، چنانچہ وہ اپنے تمام شاگردوں سے پہلا مطالبہ یہی کرتے تھے کہ پہلے قرآن کریم حفظ کر لیں۔

اس خوش لباس، خوبصورت لڑکے سے بھی بزرگ نے یہی کہا: "آپ پہلے قرآن کریم حفظ کر لیں اور اس پر اچھی طرح نظر ڈال لیں، پھر میرے پاس آیئے گا۔"

لڑکا سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد یہی لڑکا اپنے والد کے ساتھ، بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "میں نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہے اور اس پر اچھی طرح نظر ڈال لی ہے۔"

پھر اس لڑکے نے بزرگ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، بزرگ نے پوچھا: "یہ مسئلہ آپ کسی سے سُن کر دریافت کر رہے ہیں یا آپ کے ذہن میں آیا ہے؟"

"یہ مسئلہ خود میرے ذہن میں آیا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

آپ تو بڑے لوگوں جیسے سوال کرتے ہیں۔ آپ میرے حلقۂ درس میں آتے رہا کریں۔"

یوں وہ چودہ سالہ لڑکا فقہ کے امام اعظم، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گیا۔

اُس لڑکے کو دنیا، فقۂ حنفی کے عالی مرتبت امام محمدؒ بن الحسن کے نام سے جانتی ہے۔ امام محمدؒ، جن کی پوری زندگی فقہ و حدیث کی تدوین و ترویج میں گزری اور جن کی ذات ایک نہایت باعمل، متقی اور راست گو انسان کی ذات تھی۔ فقہی احکام کی جزئیات کو مدوّن کرنے میں امام محمدؒ کا بڑا کردار ہے اور آپؒ کے تلامذہ اور بعد کے دیگر ائمہ نے اس سلسلے میں آپؒ ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے۔

فقۂ حنفی کو فروغ تو امام ابو یوسفؒ کی وجہ سے ہوا لیکن فقۂ حنفی کی حقیقی بنیاد امام محمدؒ کی تصانیف پر ہے۔ امام محمدؒ قانون بین الممالک کے بانیٔ اوّل سمجھے جاتے ہیں چنانچہ پیرس اور روم کے قانون دانوں نے ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء میں امام محمدؒ کی ۱۲۰۰ ویں برسی بڑے اہتمام سے منائی۔

آپؒ کا نام محمدؒ اور کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ آپؒ کے والد کا نام حسن بن فرقد ہے۔ آپؒ کے نام کے ساتھ "شیبانی" اس لیے شامل کیا جاتا ہے کہ آپؒ کے والد محترم بنو شیبان کے غلام تھے۔ آپؒ کے والد، حسن، کا تعلق شام میں دمشق کے ایک گاؤں "حرستا" سے تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جناب حسن، فلسطین میں رملہ کے رہنے والے تھے، جبکہ بعض مؤرخین کی رائے میں جناب حسن، جزیرہ کے باشندے تھے۔ پھر وہ فوج سے متعلق ہونے کی بنا پر شام چلے گئے۔ تاہم غالباً یہی بات درست ہے کہ جناب حسن، حرستا سے عراق آ گئے تھے اور یہاں کے قصبے واسط میں آباد ہو گئے تھے۔ امام محمدؒ اسی قصبے میں ۱۳۲ھ / ۴۹-۷۵۰ء میں پیدا ہوئے۔

امام محمدؒ کی عمر ابھی چند برس تھی کہ ان کے والد اپنی عسکری ملازمت کے سلسلے میں عراق کے شہر "کوفہ" منتقل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ

Marfat.com

تھا کہ کوفہ علم و دانش اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ امام محمدؒ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اسی علمی مرکز سے ہوا۔ سب سے پہلے آپؒ نے قرآن کریم مکمل کیا پھر اس کا بڑا حصہ حفظ کر لیا۔ اس کے بعد آپؒ نے عربی زبان، ادب، لغت اور ریاضی کا علم حاصل کیا اور ان تمام مضامین میں کمال حاصل کیا۔

امام صاحبؒ کی عمر صرف ۱۴ برس تھی، جب آپؒ کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں پہلی بار شریک ہوئے۔ ان واقعات کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ جب تک امام ابو حنیفہؒ بقید حیات رہے، امام محمدؒ نے کسی دوسرے فقیہ کی شاگردی اختیار نہیں فرمائی۔

امام محمدؒ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ سے چار سال تک حصولِ علم کا موقع ملا۔ ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں امام ابو حنیفہؒ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد امام محمدؒ نے امام ابو یوسفؒ سے حصولِ علم کا فیصلہ کیا۔ امام ابو یوسفؒ کا شمار امام ابو حنیفہؒ کے لائق ترین شاگردوں میں ہوتا تھا اور امام ابو حنیفہؒ اُن ہی کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔

امام محمدؒ نے فقہی علوم کی تکمیل امام ابو یوسفؒ سے کی لیکن اس دوران وہ حدیث کے دیگر اماموں کی مجالسِ درس میں بھی شریک ہونے لگے۔ ان کا معمول بن گیا کہ صبح سویرے وہ حدیث کی مجالسِ درس میں شرکت کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جب حدیث کا درس لے کر امام ابو یوسفؒ کی مجلسِ فقہ میں پہنچتے تھے تو امام ابو یوسفؒ اس وقت تک بہت سے مسائل کی تشریح فرما چکے ہوتے تھے لیکن امام محمدؒ سے امام ابو یوسفؒ کو اس قدر محبت تھی اور وہ ان کے علم اور صلاحیتوں کے اتنے زیادہ قدردان تھے کہ درس میں ان کی تاخیر سے آمد کے بعد وہ ان تمام مسائل کو دہراتے جو ان کے آنے سے پہلے بیان ہو چکے ہوتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ سے یہ تعلق امام محمدؒ نے ہمیشہ قائم رکھا اور آخری چند برسوں کے سوا امام ابو یوسفؒ سے بہت کم جدا ہوئے۔

امام ابو محمدؒ کوفہ میں امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور دیگر کئی محترم اساتذہ سے قرآن کریم، فقہ اور حدیث کا علم حاصل کر چکے تھے، لیکن آپ کو کسی ایسے جلیل القدر استاد کی بھی تلاش تھی جو حدیث کے فن میں کامل ہو، چنانچہ امام محمدؒ نے مدینہ منورہ جا کر امام مالکؒ سے استفادہ کرنے کی ٹھانی۔ وہ سیکڑوں میل کا سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تین سال تک ان کے ساتھ رہ کر احادیث کی سماعت کی۔ آپؒ نے مدینہ منورہ کے دیگر علما کرام اور ائمہؒ حدیث سے بھی تحصیل علم کی۔

"سیر و مغازی" بھی حدیث کا ایک شعبہ ہے۔ "سِیَر" "سیرت" کی جمع ہے اور "مغازی" "مغزیٰ" کی۔ "مغزیٰ" سے مراد ہے کافروں سے لڑائیاں، خصوصاً وہ لڑائیاں جن میں آنحضرت ﷺ نے بھی شرکت فرمائی ہو۔ اور علم "مغازی" سے مراد غازیوں کے اوصاف کا علم ہے۔ امام محمدؒ نے سیر و مغازی کا علم محمد بن عمر الواقدیؒ سے حاصل کیا جو اس زمانے میں اس فن کے ماہر تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ واقدیؒ امام محمدؒ کے شاگردوں میں سے تھے، لیکن امام محمدؒ نے سیکھنے کے معاملے میں اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کیا اور کوئی عار محسوس نہ کی کہ وہ اپنے شاگرد سے کسی خاص شعبہ کا علم حاصل کر رہے ہیں۔

امام محمدؒ نے عربی زبان و ادب اور لغت و نحو کا علم اس فن کے ماہر، امام کسائیؒ سے حاصل کیا۔ اس فن سے امام محمدؒ کو اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ درس کی مسند سنبھالنے کے بعد بھی لغت اور نحو کے ائمہ سے زبان کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔

امام محمدؒ نے بڑے بڑے نامور فقہائے کرام سے استفادہ کیا۔ آپؒ حصولِ علم کی خاطر، کوفہ، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، بصرہ، واسط، خراسان اور یمامہ جا کر مختلف اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؒ کے اساتذہ کی تعداد تقریباً ستر بیان کی گئی ہے۔ ان اساتذہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، مسعر بن کدامؒ، امام زفرؒ، سفیان بن عیینہؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جیسے رفیع الشان فقہا شامل ہیں۔

آپؒ کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں امام بخاریؒ کے شیخ، ابو حفص الکبیر البخاریؒ، امام شافعیؒ، ابو سلیمانؒ، موسیٰ بن سلیمان الجوزجانی، ابو عبیدؒ، قاسم بن سلام ہرویؒ، اسد بن فراتؒ، شعیب بن سلیمان الکیسانیؒ اور محمد بن عمر الواقدیؒ جیسے پائے کے علما اور فقہا شامل ہیں۔

امام محمدؒ نے نہایت کم مدت میں اس قدر وسیع علم حاصل کر لیا اور اپنی ذہانت اور حافظے کا لوہا منوا لیا کہ آپؒ کو صرف بیس برس کی عمر میں مسندِ درس پر فائز کر دیا گیا۔

امام محمدؒ کے درس دینے کا طریقہ یہ تھا کہ آپؒ کتاب سے قرأت خود کرتے تھے، پھر کسی مسئلے کو لے کر اس کی تشریح فرماتے۔ امامؒ

Marfat.com

شافعیؒ کے مطابق امام محمدؒ جب کسی مسئلے پر تقریر کرتے تھے تو کلام میں ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا تھا۔ امام محمدؒ کی تقریر غیر ضروری الفاظ سے پاک ہوتی تھی۔

امام محمدؒ کے زمانے میں امام مالکؒ کی روایات کو تمام فقہائے کرام کی روایات میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ تمام لوگ طویل فاصلے طے کر کے امام مالکؒ کی خدمت میں مدینہ منورہ نہیں جاسکتے تھے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے امام مالکؒ کی روایتوں کے درس کے لیے ایک خاص دن مقرر کر دیا تھا۔ اس مقررہ دن اتنی بڑی تعداد میں لوگ درس سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے کہ جگہ کم پڑ جاتی تھی۔

امام محمدؒ اپنے روز شب کا بڑا حصہ درس و تدریس ہی میں صرف فرماتے تھے۔ دن میں وہ درسِ عام دیتے لیکن رات کے وقت بھی درس دیا کرتے تھے۔ یہ درس ان طلبہ کے لیے ہوتا تھا جو دُور دراز کے مقامات سے بڑی لگن کے ساتھ، آپؒ سے علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے امام شافعیؒ، ابو عبیدؒ اور اسد بن فراتؒ کے لیے رات میں خاص طور پر وقت نکالا اور انہیں تعلیم دی۔

اسد بن فراتؒ، قیروان (شمالی افریقہ) سے آپؒ کی خدمت میں پہنچے، چند دن تک آپؒ کے درس میں شرکت کے بعد انہوں نے امام صاحب سے عرض کی کہ میں ایک مسافر ہوں، دن میں آپؒ کے درس میں اتنے افراد شریک ہوتے ہیں کہ میں آپؒ سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: "آپ دن میں تو عام افراد کے ساتھ درس میں شریک ہو جایا کیجیے اور رات میں میرے پاس آجایا کیجیے۔"

اسد بن فراتؒ رات میں بھی امام صاحبؒ کے پاس جانے لگے۔ امام صاحبؒ ایک پیالہ پانی اپنے پاس رکھ لیتے اور درس شروع کر دیتے۔ جب رات زیادہ گزر جاتی تو اسد بن فراتؒ نیند محسوس کرنے لگتے۔ جب بھی اسد بن فراتؒ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں، امام صاحب ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دے کر بیدار فرما دیتے۔ بڑے عرصہ تک یہی معمول رہا۔ اسد بن فراتؒ، امام محمدؒ کے وہ نامور شاگرد ہیں جنہوں نے بعد میں صقلیہ (سسلی) فتح کیا اور افریقہ میں امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کو عام کر دیا حتیٰ کہ افریقہ کے باشندوں کی اکثریت حنفی فقہ کی پیروکار ہوگئی۔

امام محمدؒ کے قابلِ فخر اور لائقِ احترام تلامذہ میں امام شافعیؒ جیسا بڑا نام بھی شامل ہے۔ امام شافعیؒ، آپؒ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ آپؒ کی علمیت اور تفقّہ کی امام شافعیؒ نے بڑی تعریف فرمائی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "میں نے امام محمدؒ کی کتابوں پر ستر دینار صَرف کیے۔ غور و فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا اور ہر مسئلے کے ساتھ (اسی موضوع کی) کوئی حدیث بھی درج کر دی۔"

امام محمدؒ، امام شافعیؒ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ ایک بار امام شافعیؒ نے آپؒ کی کتابیں عاریۃً مانگیں۔ آپؒ نے اپنی تمام کتابیں انہیں بطور ہدیہ عنایت کر دیں۔ امام شافعیؒ جب بھی تشریف لاتے، امام محمدؒ اپنے ضروری سے ضروری کام کو بھی چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باعث امام شافعیؒ فرماتے تھے: "علم اور دنیاوی اسباب کے سلسلے میں مجھ پر امام محمدؒ کا جتنا احسان ہے، اتنا کسی دوسرے کا نہیں ہے۔"

امام محمدؒ کے وسیع علم سے خواتین بھی استفادہ کرتی تھیں۔ ان کے لیے بھی آپؒ نے رات کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔

امام محمدؒ نہایت بردبار اور متحمل مزاج تھے۔ آپ سے چاہے جتنا پیچیدہ مسئلہ دریافت کر لیا جاتا، یا کسی مسئلے پر کتنی ہی بحث کر لی جاتی، آپؒ متانت اور ملائمت سے جواب دیتے رہتے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جس سے بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، لیکن امام محمد بن حسنؒ پر یہ کیفیت کبھی طاری نہ ہوئی۔ امام محمدؒ نے فقہ اور حدیث پر نہایت گراں قدر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ تبع تابعین میں تصنیف و تالیف کا سب سے زیادہ کام امام محمدؒ ہی نے انجام دیا۔ ان کے ہم عصروں میں کسی نے اتنی کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف نہیں کی ہیں۔ امام محمدؒ کی یہ تصانیف اس لحاظ سے بے حد اہمیت کی حامل ہیں کہ ان ہی کی بنیاد پر چاروں فقہی مسلکوں یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کی مزید تدوین ہوئی اور انہیں ترقی دی گئی۔

امام محمدؒ کی تصانیف کی تعداد کتنی ہے، اس بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ نے ۹۹۹ کتب تصنیف فرمائیں، لیکن یہ روایت درست محسوس نہیں ہوتی۔ مؤرخین نے توجیہ یہ پیش کی ہے کہ امام صاحبؒ ایک ہزار کتابیں تصنیف فرمانا چاہتے تھے لیکن اتنی کتب لکھنے کا انہیں موقع نہ مل سکا۔ بیشتر مؤرخین نے امام محمدؒ کی کتب کی جو تفصیل لکھی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتب کی تعداد ۲۳ ہے۔ امام محمدؒ کی کتب کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

Marfat.com

المبسوط: امام محمدؒ کی یہ کتاب "الاصل" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فقہ میں امام صاحبؒ کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ پوری کتاب چھ جلدوں میں ہے اور ہر جلد ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں امام صاحبؒ نے ۱۰ ہزار سے زیادہ فقہی مسائل پر بحث فرمائی ہے۔ یہ دس ہزار مسائل وہ ہیں جن کے بارے میں امام صاحبؒ نے فتوے دیے۔ اگر انہوں نے کہیں امام ابو یوسفؒ سے اختلاف فرمایا ہے، تو اس کا بھی ذکر کر دیا ہے اور جس مسئلے پر ان دونوں جلیل القدر فقہاکرام کے درمیان اختلاف نہیں ہے، اسے متفق علیہ مسئلے کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

علامہ سرخسیؒ کے مطابق امام ابو یوسفؒ نے اپنے اساتذہ ابن ابی لیلیٰؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے مابین اختلافی مسائل کو اپنی تصنیف میں جمع کیا۔ امام محمدؒ نے یہ مسائل امام ابو یوسفؒ سے اخذ کیے اور ان میں دیگر اساتذہ سے سنے گئے مسائل کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح "المبسوط" دراصل امام ابو یوسفؒ کی تصنیف ہے جس کے مؤلف امام محمدؒ ہیں۔ امام محمدؒ نے مسائل بیان کرتے ہوئے ان احادیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے جن کی صحت مسلم ہے۔ اگر ان آثار و احادیث کو الگ کر لیا جائے تو ایک مختصر مجموعۂ حدیث تیار ہو سکتا ہے۔ امام محمدؒ سے "المبسوط" کے متعدد نسخے روایت کیے گئے ہیں لیکن سب سے بہتر نسخہ ابو سلیمان جوزجانیؒ کا سمجھا جاتا ہے جو فقہ میں امام محمدؒ کے شاگرد ہیں۔ المبسوط کے قلمی نسخے استنبول اور مصر کے کتب خانوں میں آج بھی موجود ہیں۔

الجامع الصغیر: یہ کتاب ان مسائل پر مشتمل ہے جنہیں امام محمدؒ نے امام ابو یوسفؒ سے روایت کیا۔ جب امام محمدؒ "المبسوط" کی تصنیف سے فارغ ہو گئے تو امام ابو یوسفؒ نے ان سے فرمایا کہ وہ ایک کتاب لکھیں جن میں ان روایتوں کو یکجا کر دیں جو انہوں (امام ابو یوسفؒ) نے امام محمدؒ کو امام ابو حنیفہؒ کے واسطے سے سنائی ہیں۔ چنانچہ امام محمدؒ نے ان روایات کو یکجا کر کے کتابی صورت میں امام ابو یوسفؒ کے سامنے پیش کر دیا۔ امام ابو یوسفؒ نے کتاب کا مطالعہ فرمایا اور رائے دی کہ میری روایات کو بہت عمدہ طریقے سے محفوظ رکھا گیا ہے صرف تین مسئلوں میں غلطی کی ہے۔ امام محمدؒ نے جب یہ بات سنی تو اعتماد سے فرمایا: "میں نے غلطی نہیں کی بلکہ وہ (امام ابو یوسفؒ) خود ہی روایت بھول گئے ہیں۔"

یہ کتاب امام ابو یوسفؒ کو اس قدر عزیز تھی کہ وہ سفر میں بھی اسے اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اس کتاب کی تیس سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں۔

الجامع الکبیر: اس کتاب کو امام محمدؒ نے "جامع صغیر" کے بعد تصنیف فرمایا۔ آپؒ نے اس کتاب میں امام ابو یوسفؒ سے اخذ کردہ مسائل کے علاوہ، وہ مسائل بھی درج فرمائے ہیں جو دیگر فقہاکرام سے آپ نے حاصل کیے۔ اس ضخیم کتاب میں ابو حنیفہؒ کے اقوال کے ساتھ امام زفرؒ کے اقوال بھی شامل ہیں۔ ہر مسئلے کے ساتھ اس کی دلیل بھی لکھی ہے۔ امام صاحبؒ نے "الجامع الکبیر" ایک بار تصنیف کرنے کے کچھ عرصے بعد اس پر نظر ثانی بھی فرمائی اور مزید ابواب اور مسائل کا اضافہ کر دیا۔ اس کتاب کی شرحیں بڑے بڑے فقہاکرام نے لکھیں۔ ان شرحوں میں سے ۴۲ کا ذکر کتب میں کیا گیا ہے۔

"الجامع الکبیر" اتنی اہم کتاب ہے کہ بعد کے دور میں حنفی مسلک کے فقہاکرام نے اصولِ فقہ کے مسائل اسی کتاب کی بنیاد پر مرتب کیے۔ یہ کتاب فقہی مباحث کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کی درستگی اور عربیت کے اعتبار سے بھی لاجواب ہے۔ عربی ادب و لغت کے امام اخفشؒ، ابو علی فارسیؒ، علامہ شریف النقیبؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ "الجامع الکبیر" کے متعدد قلمی نسخے استنبول کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

زیادات: امام محمدؒ نے "زیادات" اور "زیادة الزیادات" کے نام سے دو کتب تصنیف فرمائیں۔ جن مسائل کا تذکرہ "الجامع الکبیر" میں درج ہونے سے رہ گیا تھا، امام صاحب نے انہیں ان دو کتب میں شامل کر دیا ہے۔ ان کتب سے بھی امام محمدؒ کی وسعتِ نظر کا پتا چلتا ہے۔ ان کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے قلمی نسخے بھی استنبول کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

السیر الصغیر: فقہ پر امام صاحبؒ کی یہ کتاب بھی بڑی قدروقیمت کی حامل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے سِیَر و مغازی (یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سیرتوں اور جنگوں کے احوال) کے ضمن میں اپنے شاگردوں کو املا کروایا تھا۔ اسے ان کے کئی شاگردوں نے کتابی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔ امام محمدؒ بھی ان ہی شاگردوں میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں احکام جہاد کی تشریح کی گئی ہے۔

السیر الکبیر: امام اوزاعیؒ نے کتاب "السیر الصغیر" پر تنقید فرمائی تھی، اس پر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے جواب میں کتب تصنیف

Marfat.com

فرمائیں۔ امام ابو یوسفؒ کی کتاب "الرد علی سیر الاوزاعی" کے نام سے منظر عام پر آئی اور امام محمدؒ کی کتاب کا عنوان "السیر الکبیر" رکھا گیا۔ گو کہ یہ کتاب آپؒ نے امام اوزاعی کی تنقید کے جواب میں لکھی لیکن اس طرح یہ کتاب سیر و مغازی کے متعلق بیش قدر معلومات کا ذخیرہ بن گئی۔ اس میں آپؒ نے جہاد و قتال، صلح و جنگ کے طریقے، معاہدات، فدیہ، غلامی وغیرہ کے مسائل سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کو یہ کتاب بہت پسند تھی۔ انہوں نے اپنے دونوں صاحب زادوں امین اور مامون کو یہ کتاب پڑھوائی تھی۔ اس کتاب کے بھی کئی قلمی نسخے، استنبول کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

امام محمدؒ نے حدیث کے موضوع پر بھی متعدد کتب مرتب فرمائیں، ان کتب کا مختصر تعارف پیش ہے۔

موطا امام مالکؒ: دوسری صدی ہجری میں مرتب ہونے والے احادیث کے مجموعوں میں موطا امام مالکؒ سب سے زیادہ مکمل اور اہم ہے۔ دنیا بھر سے علم کے جویا، حدیث سننے کے لیے امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے حدیث کی سماعت کر کے لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح موطا امام مالکؒ کے کئی نسخے تیار ہو گئے۔ امام محمدؒ نے بھی موطا امام مالکؒ کی سماعت کر کے یہ کتاب مرتب فرمائی۔

موطا امام محمدؒ: امام محمدؒ نے اس کتاب میں احادیث بیان کرنے کے بعد یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ فقہاء عراق کا مسلک ان میں سے کس کس کے مطابق ہے اور اگر کوئی اختلاف کرتا ہے، تو اس اختلاف کی بنیاد کن احادیث پر ہے۔ موطا امام محمدؒ کی یہ وہ خصوصیت ہے جو اسے دیگر موطات پر فوقیت دیتی ہے۔ امام صاحبؒ نے اپنی موطا میں پہلے باب کی سرخی درج کی ہے پھر اس کے ذیل میں امام مالکؒ سے روایت لکھ دی ہے۔

موطا امام محمدؒ میں جتنی روایات درج کی گئی ہیں وہ بالعموم قوی سند کی حامل ہیں۔ چند روایتیں ضعیف ضرور ہیں لیکن متعدد طریقوں سے روایت کی گئی ہیں اس لیے محدثین کے نزدیک یہ روایتیں ضعیف شمار نہیں کی جاتیں۔

کتاب الآثار: امام محمدؒ نے احادیث کی اس کتاب میں صحابہؓ کرامؓ اور تابعینؒ کی روایات شامل فرمائی ہیں۔ فقہ کے ابواب پر مشتمل حدیثوں کے اس مجموعے کو امام ابو حنیفہؒ کے کئی شاگردوں نے روایت کیا ہے لیکن سب سے مقبول نسخہ امام محمدؒ کا روایت کردہ ہے۔ اس کتاب میں وہ تمام عدالتی فیصلے اور فتوے جمع کیے گئے ہیں جن کی بنیاد کتاب و سنت کے قطعی احکام پر ہے۔

کتاب الحج: فن حدیث پر امام محمدؒ نے اس کتاب میں امام مالکؒ اور بعض دیگر فقہائے مدینہ کی آراء سے اختلاف کیا ہے اور ان کے مدلل جوابات دیے ہیں۔

امام محمدؒ کی ایک کتاب "رقیات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں وہ مسائل یکجا کر دیے گئے ہیں جو انہوں نے رقہ میں اس زمانے میں مرتب کیے تھے جب وہ وہاں قاضی کے منصب پر فائز تھے۔ امام صاحبؒ کی ایک کتاب "کیسانیات" کہلاتی ہے۔ اس کے راوی شعیب بن سلیمان الکیسائیؒ ہیں، اسی لیے ان کے نام پر کتاب کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ ایک اور کتاب "جرجانیات" ہے۔ امام صاحبؒ کے ایک شاگرد علی بن صالح الجرجانیؒ ہیں، ان ہی کے نام پر کتاب کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ امام صاحبؒ کی ایک اور کتاب "ہارونیات" ہے اور ایک کتاب، "کتاب النوادر" ہے۔ آپؒ کی ایک کتاب، "کتاب الکسب" ہے جسے آپؒ مکمل نہ کر سکے۔

امام محمدؒ نے ان کے علاوہ بھی کئی کتب تصنیف فرمائیں۔

امام محمدؒ کے استاد امام ابو یوسفؒ تین خلفا کے دور میں قاضی کے منصب پر فائز رہے۔ مہدی کے دور میں وہ بغداد کے مشرقی حصے کے قاضی تھے۔ ہادی کے عہد میں انہیں پورے بغداد کا قاضی مقرر کر دیا گیا اور خلیفہ ہارون الرشید نے انہیں پوری مملکت کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ ان کے حکم کے بغیر کسی بھی جگہ قاضی (جج) کا تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا تھا: میرے دو اصحاب یعنی امام زفرؒ اور امام ابو یوسفؒ قاضیوں اور مفتیوں کو تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ سے جب مشورہ کیا گیا کہ رقہ میں کسے قاضی مقرر کیا جائے، تو غالباً انہوں نے اپنے استاد محترم کی اسی بات کو پیش نظر رکھا ہو گا۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: "میرے علم کے مطابق اس عہدے کے لیے مناسب ترین فرد صرف ایک ہے اور وہ محمد بن الحسنؒ ہیں جو ان دنوں کوفہ میں قیام پذیر ہیں۔"

خلیفہ ہارون الرشید کے حکم پر امام محمدؒ کو کوفہ سے بغداد بلوایا گیا۔ امام محمدؒ تشریف لائے اور انہوں نے ابو یوسفؒ سے دریافت فرمایا: "مجھے کس لیے یاد کیا گیا ہے؟" امام ابو یوسفؒ نے وجہ بتائی۔ امام محمدؒ نے

Marfat.com

فرمایا: "مجھے اس کی آرزو نہیں ہے۔" امام ابو یوسفؒ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے آپؒ کو کب بلوایا ہے، آپ تو سرکاری طور پر بلوائے گئے ہیں۔ پھر وہ امام محمدؒ کو لے کر یحییٰ بن خالد برمکی کے پاس پہنچے، جہاں امام محمدؒ کو رقہ میں قاضی بنائے جانے کا تقرر نامہ دیا گیا۔

امام محمدؒ نے قاضی بننے کے بعد نہایت جرأت مندانہ انداز میں فیصلے کرنے شروع کر دیے۔ کچھ ہی عرصے بعد ایک شخص کا مقدمہ خلیفہ ہارون الرشید کے روبرو پیش ہوا۔ ہارون الرشید اس شخص کو امان دے چکے تھے لیکن اب وہ بعض وجوہ کی بنا پر چاہتے تھے کہ اس شخص کو سزا دی جائے۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے قاضیوں سے رائے لینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تمام قاضی بلوائے گئے۔ امام محمدؒ بھی تشریف لے گئے۔ ہارون الرشید نے پہلے امام محمدؒ سے دریافت کیا۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ جو امان دی جا چکی ہے، وہ صحیح ہے اور اب سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔ امام محمدؒ کے اس دوٹوک اظہار رائے سے حکام بالا ناخوش ہوئے اور انہیں عہدۂ قضا سے ہٹا دیا گیا۔ انہیں فتوے دینے سے بھی روک دیا گیا۔ غالباً اسی فیصلے کی پاداش میں امام صاحبؒ کو قید بھی کاٹنی پڑی۔

کچھ عرصے بعد ہارون الرشید کی والدہ، اُم جعفر نے ایک وقف قائم کیا۔ انہوں نے امام محمدؒ سے رائے طلب کی۔ امام صاحبؒ نے بتایا کہ خلیفہ کے حکم کی رُو سے اب وہ فتویٰ نہیں دے سکتے۔ اُم جعفر نے خلیفہ ہارون الرشید کو سمجھایا، جس پر آپؒ کو فتویٰ دینے اور مسائل بیان کرنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن آپؒ کو ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا، تاہم کچھ عرصے بعد ہارون الرشید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے امام محمدؒ کو بلایا اور پوری مملکت کا قاضی (قاضی القضاۃ) مقرر کر دیا۔

امام محمدؒ کے قاضی القضاۃ بننے کے کچھ ہی دنوں بعد ہارون الرشید رے کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں وہ امام محمدؒ اور نحو و لغت کے امام کسائیؒ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ رے کے مقام پر امام محمدؒ اس دار فانی کو الوداع کہہ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء کی بات ہے۔ آپؒ نے ۵۸ برس کی عمر پائی۔ امام کسائی بھی، امام محمدؒ کی وفات کے دن یا دو دن ہی بعد انتقال کر گئے۔ ہارون الرشید، ایک ہی موقع پر ان دو بے حد عزیز اور عالی مرتبت، ہستیوں کے بچھڑ جانے پر شدید غم زدہ تھے۔ اور بار بار افسوس کے ساتھ کہتے تھے: "فقہ اور نحو دونوں کو میں نے رے میں دفن کر دیا۔"

رے کے مشہور قلعے جبل طبرک میں امام محمدؒ کو سپرد خاک کیا گیا۔

امام محمدؒ نہایت کریم النفس، فیاض، متحمل مزاج اور بااخلاق تھے۔ آپؒ کو علم کی دولت سے عشق تھا اور اس دولت کے حصول اور دوسروں کو یہ دولت دلوانے کی خاطر، آپؒ نے مادّی دولت کے ہاتھ سے جانے کی کبھی پروانہ کی۔ آپؒ کے والدِ محترم کا جب انتقال ہوا تو امام محمدؒ کو وراثت میں ۳۰ ہزار درہم ملے۔ امام صاحبؒ نے یہ تمام رقم علم کی دولت کے حصول پر صَرف کر دی۔ آپؒ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے والد سے تیس ہزار درہم وراثت میں ملے۔ پندرہ ہزار درہم میں نے فقہ و حدیث کے حصول پر خرچ کیے اور پندرہ ہزار درہم شعر و ادب، لغت اور نحو کا علم حاصل کرنے پر صَرف کر دیے۔

امام محمدؒ اپنے تلامذہ کی ضروریات کا خیال رکھا کرتے تھے اور اکثر ان کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؒ یہ خیال رکھتے تھے کہ یہ مدد نہایت خاموشی اور رازداری سے کی جائے چنانچہ جس کی مدد کرتے تھے اس کے ساتھیوں کو اس کا علم نہ ہو پاتا تھا۔

امام محمدؒ جب تصنیف و تالیف اور مطالعے میں مصروف ہو جاتے تو وہ باتوں میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر انہیں کچھ کہنا بھی ہوتا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے اپنی ضرورت کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے تاکید کر رکھی تھی کہ میرے مطالعے کے وقت مجھ سے دنیاوی ضرورت کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو ضرورت ہو میرے وکیل (منتظم) سے بیان کر دی جائے۔

امام محمدؒ بہت قوی حافظہ کے مالک تھے۔ آپؒ نے بہت مختصر مدت میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ آپؒ امام ابو یوسفؒ کی مجلس درس میں صبح سویرے پہنچ جاتے تھے لیکن بعض دیگر تلامذہ ان سے بھی پہلے پہنچ چکے ہوتے تھے۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ امام محمدؒ مجلس درس میں پہنچتے تو امام ابو یوسفؒ درس شروع کر چکے ہوتے۔ ان کی آمد پر امام ابو یوسفؒ درس کے اس حصے کو دہرا دیتے جو وہ امام محمدؒ کی آمد سے قبل دے چکے ہوتے تھے۔

ایک بار امام محمدؒ کی آمد پر امام ابو یوسفؒ نے کسی ایسے مسئلے کے بارے میں ان سے سوال کیا جو ان کے آنے سے پہلے پڑھایا جا چکا تھا۔ امام محمدؒ نے جواب دیا۔ امام ابو یوسفؒ نے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مسئلہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ہے۔ امام محمدؒ نے اصرار کیا کہ مسئلہ اسی طرح سے ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ کچھ دیر بحث کے بعد متعلقہ کتب

Marfat.com

منگوائی گئیں اور دیکھا گیا تو مسئلہ اس طرح تھا جیسا کہ امام محمدؒ نے فرمایا تھا۔ یہ دیکھ کر امام ابویوسفؒ نے فرمایا: "حافظہ اس کو کہتے ہیں۔"

حدیث کے ایک عالم عیسیٰ بن ابانؒ کو غلط فہمی تھی کہ امام محمدؒ حدیث کے مخالف ہیں۔ امام محمدؒ سے ملاقات ہوئی اور انہیں اس الزام کا علم ہوا تو افسوس ظاہر کیا کہ بغیر تحقیق کے ایسا الزام عائد نہ کرنا چاہیے تھا۔ امام محمدؒ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد عیسیٰ تھے۔ کہتے تھے: "ایک پردہ حائل تھا جو اٹھ گیا۔" امام ابو حفصؒ فرماتے ہیں: "امام محمدؒ کو اگر کوئی دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ صرف علم کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت صالح، خلیق، مہذب اور عمدہ روش کے مالک تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی، ہر شخص سے محبت ان کا شیوہ تھا۔"

ایک عالم علی بن معبدؒ فرماتے ہیں: "ایک بار میں رقہ گیا۔ وہاں امام محمدؒ قاضی تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا لیکن دروازے پر دربان نے روک دیا۔ پھر میں ان کے پاس نہ گیا۔ ایک دن سر راہ امام محمدؒ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور شکوہ کیا کہ آپ رقہ آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ میں نے وجہ بتائی۔ امام صاحبؒ کو بہت افسوس ہوا۔ پھر دریافت کیا، کس حاجب (دربان) نے روکا تھا؟ میں نے اس خیال سے کہ حاجب کو سزا ملے گی، نشاندہی نہیں کی۔ پھر امام صاحبؒ نے تمام حاجبوں کو بلا کر ہدایت کی کہ کسی کو نہ روکا جائے۔"

امام محمدؒ عام لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتے تھے اور ان کے مسائل کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ ایک بار آپؒ رنگریزوں کے محلے میں تشریف لے گئے اور ان سے مل کر ان کے مسائل پوچھتے رہے۔ ایسا کرنا اس لحاظ سے بھی آپؒ کے لیے ضروری تھا کہ آپؒ مختلف پیشوں اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے معاملات اور مسائل سے باخبر رہیں تاکہ کسی معاملے میں فتویٰ دیتے ہوئے بہتر سے بہتر رائے دے سکیں۔

امام محمدؒ نہایت متقی، عبادت گزار اور راست باز انسان تھے۔ رات کا وقت آپؒ نے تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک حصہ درس و تدریس کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے حصے میں آرام فرماتے اور تیسرا حصہ عبادات کے لیے وقف تھا۔ آپؒ نمازیں بے حد خشوع و خضوع کے ساتھ ادا فرماتے۔ امام شافعیؒ کے مطابق میں نے محمد بن حسنؒ جیسا زاہد اور پرہیز گار انسان نہیں دیکھا۔ امام شافعیؒ ہی کا کہنا ہے کہ میں نے امام محمدؒ جیسا حلیم الطبع آدمی نہیں دیکھا۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف باتیں سنتے اور برداشت کر لیتے تھے۔

امام محمدؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی خاطر گزرا۔ آپؒ نے اپنے علم سے بے شمار افراد کو فیض یاب فرمایا۔ امتِ مسلمہ پر آپؒ کا بڑا احسان ہے لیکن اس سب کے باوجود آپؒ اپنی وفات سے کچھ دیر قبل خوفِ خدا سے لرزاں و ترساں تھے۔ آپؒ پر رقت طاری تھی اور اس عالم میں آپؒ فرما رہے تھے: "جس وقت میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑا کر دیا جاؤں گا اور مجھ سے پوچھا جائے گا کہ "رے" کے مقام تک تجھے کون سی چیز لے کر آئی ہے۔ رضائے الٰہی کی تلاش یا جہاد فی سبیل اللہ؟ تو میں کیا جواب دوں گا؟"

***

Marfat.com

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

اصولِ فقہ کے بانی اور علمِ فراست کے ماہر اہم محدّث

سینکڑوں برس پرانی بات ہے۔

ایک نوجوان یمن سے "علم فراست" کی تکمیل کر کے اپنے وطن واپس آرہا تھا۔ اس زمانے میں آج کی طرح نہ تو تیز رفتار ٹرینیں تھیں، نہ ہوا سے باتیں کرتے ہوائی جہاز۔ زیادہ تر سفر بار برداری کے جانوروں کے ذریعے طے ہوتا تھا۔ نوجوان ابھی اپنی منزل سے دور تھا کہ رات نے ڈیرے ڈال دیے۔ نوجوان نے سوچا، 'جس مقام پر ہوں رات یہیں بسر کی جائے۔' یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ایک مکان کے سامنے ایک شخص ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ اس شخص کی پیشانی ابھری ہوئی تھی اور آنکھیں نیلی، نوجوان نے اپنے علم فراست سے کام لیتے ہوئے اس شخص کے بارے میں غور کیا۔ نوجوان کا وجدان کہتا تھا کہ یہ شخص اچھا نہیں ہے، بہر حال نوجوان نے اس شخص سے رات بھر قیام کی بات کی اور وہ شخص راضی ہو گیا۔

میزبان بہت خوش اخلاق ثابت ہوا۔ اس نے نوجوان کو رات بسر کرنے کے لیے کمرہ دیا، اچھا بستر مہیا کیا، پر تکلف کھانا کھلایا۔ گھوڑے کے لیے گھاس کا انتظام کیا، نوجوان شش و پنج میں تھا۔ اس نے سوچا، یا تو علم فراست ہی غلط ہے یا پھر یہ شخص جلد ہی کوئی حرکت کرے گا۔

صبح ہوئی، نوجوان نے اٹھ کر تیاری کی، رختِ سفر باندھا، میزبان سے ملاقات کی اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "آپ مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو محمد بن ادریس کا مکان دریافت کر لیجیے، میرے ہاں قیام فرمایئے گا۔"

ابھری پیشانی اور نیلی آنکھوں والے میزبان نے پوچھا: "یہ تو بتایئے کہ آپ کی کوئی امانت میرے پاس تھی یا آپ نے میرے اوپر کبھی احسان کیا تھا؟"

نوجوان نے کہا، "نہیں!"

اس پر میزبان نے سوال کیا، "میں نے آپ کا اتنا خیال رکھا، اتنا آرام پہنچایا، اس کا معاوضہ کہاں ہے؟"

مہمان نوجوان نے معاوضہ دریافت کیا۔ "خوش اخلاق" میزبان نے ہر چیز کا معاوضہ بتادیا۔ نوجوان نے تمام رقم ادا کر دی اور پوچھا، "اور کچھ؟"

اس شخص نے کہا: "اب صرف مکان کا کرایہ باقی ہے۔"

نوجوان نے شب بسری کا کرایہ بھی ادا کیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا، اب وہ مطمئن تھا کہ فراست کا علم واقعی علم ہے!

یہ نوجوان تھے حضرت محمد بن ادریس "جو امام شافعیؒ" کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کو علم فراست ہی نہیں بلکہ فنِ لغت، فنِ تاریخ، علم الانساب، فنِ نحو، عروض، تیر اندازی اور حکمت میں بھی کمال حاصل تھا، لیکن آپؒ کی اصل وجہ مقبولیت علم فقہ میں آپؒ کا بے حد بلند مقام ہے۔

آپؒ کا نام محمد، کنیت ابو عبداللہ اور لقب "ناصر الحدیث" ہے۔ آپؒ کو آپؒ کے جدِ اعلیٰ حضرت شافعؓ کی نسبت سے 'شافعی' کہا جاتا ہے، جو صحابی تھے۔ ساتویں پشت پر آپؒ کا سلسلۂ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپؒ کی والدہ محترمہ بنت عبیداللہ یمن کے ممتاز قبیلے "ازد" سے تعلق رکھتی ہیں۔

امتِ مسلمہ کے اس محسن کی پیدائش بیت المقدس سے دو منزل کے فاصلے پر واقع غزہ میں رجب ۱۵۰ھ / اگست ۷۶۷ء میں ہوئی (یہ عجب اتفاق ہے کہ اسی سال امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ہوا)۔ مدتِ رضاعت کے دو سال بعد والدہ آپؒ کو یمن کے نواح میں آباد اپنے قبیلے "ازد" لے گئیں۔ ماموں کے پاس آٹھ سال گزارے۔ قدرت نے آپؒ کو ذہانت، فہم و فراست اور حافظہ کی غیر معمولی

Marfat.com

صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا۔ صرف سات برس کی عمر میں آپؒ قرآن پاک حفظ کر چکے تھے، دس سال کے ہوئے تو موطا امام مالکؒ آپؒ کو یاد ہو چکی تھی۔ آپؒ بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی زندگی بڑی تنگی ترشی سے گزری، لیکن علم حاصل کرنے کی جستجو کبھی ماند نہ پڑی۔

بیٹے کی غیر معمولی ذہانت کو دیکھتے ہوئے والدہ نے انہیں چچا کے پاس مکہ مکرمہ بھیج دیا تاکہ علم الانساب حاصل کریں۔ اس زمانے میں نسب دانی باقاعدہ ایک علم کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا سیکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ محمد بن ادریسؒ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ ایک ماہر انساب کے پاس گئے اس نے مشورہ دیا کہ کوئی ذریعۂ معاش پیدا کرو پھر علم سیکھنا۔ اس وقت آپؒ دس سال کے تھے، خالقِ حقیقی نے بچے کو مسلمانوں کا امام بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ کے حصولِ علم کے شوق کا یہ عالم تھا کہ کسی عالم سے کوئی حدیث یا مسئلہ سنتے، اسے سنتے ہی یاد کر لیا کرتے اور ہڈیوں پر لکھ لیا کرتے۔ امام شافعیؒ خود فرماتے ہیں، ”میں اتنا غریب تھا کہ کاغذ تک خریدنے پر قادر نہ تھا اس لیے ہڈیوں پر لکھا کرتا اور ان ہڈیوں کو مٹکے میں احتیاط سے محفوظ کر لیتا۔“

آپؒ کے چچا کی مالی حالت کمزور تھی اس لیے آپؒ کے شوق کو دیکھنے کے باوجود وہ آپؒ کی مدد سے قاصر تھے۔ آپؒ نے عرب قبائل میں خاصا عرصہ گزارا اس لیے آپؒ کو عربی زبان میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ اصمعی جیسے عربی ادب کے ماہر آپؒ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

ایک دن آپؒ کو علم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں حضرت مسلم بن خالد زنجیؒ فقہ و حدیث کے امام اور مفتی ہیں۔ آپؒ ان کے پاس پہنچ گئے۔ مفتی مسلم بن خالدؒ اس نوعمر لڑکے کی ذہانت، ذکاوت اور حافظہ سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیا۔ تین سال تک فقہ و حدیث کی تعلیم دی۔ مفتی صاحب کی مجلس میں اکثر امام مالکؒ کا تذکرہ رہتا تھا جو مدینہ منورہ میں درس دیا کرتے تھے، چنانچہ مفتی مسلم بن خالدؒ کے نوجوان شاگرد نے امام مالکؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مفتی صاحب نے امام مالکؒ کے نام ایک خط لکھ کر حوالے کیا۔

مفتی مسلم بن خالدؒ نے امام مالکؒ کو مخاطب کر کے لکھا تھا ”میں جس نوجوان کو آپؒ کی خدمتِ اقدس میں بھیج رہا ہوں وہ آپ کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کا واقعی مستحق ہے، اس میں غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔“

امام مالکؒ کے نام خط تو مل گیا، لیکن اب سفر کے اخراجات کس طرح پورے ہوں۔ نہ تو محمد بن ادریسؒ (امام شافعیؒ) کے پاس اتنی رقم تھی نہ آپؒ کے چچا کے پاس اتنا سرمایہ تھا، لیکن علم حاصل کرنے کا شوق آپؒ کو کشاں کشاں حضرت مصعب بن الزبیرؒ کے پاس لے گیا۔ عرضِ مدعا کی تو حضرت مصعبؒ نے کسی سے سفارش کر کے سو دینار دلوا دیے۔ رقم ملتے ہی آپؒ نے سفر کے انتظامات کیے اور مدینہ منورہ جا پہنچے۔

مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ کے مکان پر پہنچ کر دستک دی۔ خادمہ آئی، نام پوچھ کر گئی، پھر امام مالکؒ تشریف لائے۔ آپؒ نے مفتی مسلم بن خالدؒ کا خط پیش کیا۔ امام مالکؒ نے خط پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا، فرمایا: ”سبحان اللہ، کیا رسول اللہ ﷺ کا علم اب اس قابل رہ گیا ہے کہ وہ سفارشوں سے حاصل کیا جائے۔“

امام مالکؒ کی برہمی دیکھ کر محمد بن ادریسؒ (امام شافعی) آگے بڑھے اور کہنے لگے، ”میں عبد المطلب کے خاندان کا فرد ہوں“، پھر اپنا حال اور قصہ بیان کیا۔

امام مالکؒ بے پناہ فراست کے مالک تھے، انہوں نے اس نوجوان کی طرف کچھ دیر دیکھا پھر فرمایا، ”نام کیا ہے؟“

جواب ملا ”محمد بن ادریس!“

امام مالکؒ نے فرمایا، ”محمد! اللہ سے ڈرو، گناہوں سے بچو، بے شک تمہاری شان بہت بلند ہو گی۔“ پھر فرمایا، ”کل آنا اور اپنے ساتھ ایک شخص لیتے آنا جو تمہارے لیے قرأت کرے“۔

امام شافعیؒ خود بیان کرتے ہیں، دوسرے دن میں امام مالکؒ کے پاس پہنچا۔ کتاب (موطا) میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے خود ہی قرأت شروع کر دی۔ امامؒ کی ہیبت سے مرعوب ہو کر جب ارادہ کرتا کہ اب قرأت روک دوں تو امام مالکؒ پسندیدگی سے فرماتے، ”صاحب زادے! اور ـــ اور!“

محمد بن ادریسؒ (امام شافعیؒ) تین سال تک امام مالکؒ سے علم حاصل کرتے رہے۔ دیگر ۸۱ شیوخ سے بھی سند حاصل کی، پھر آپؒ مکہ مکرمہ واپس چلے آئے۔ اس کے بعد یمن میں قیام فرمایا، اس دوران میں آپؒ نے قبیلہ ہذیل میں تیر اندازی، فنِ لغت، فنِ تاریخ، علم الانساب، فنِ نحو، عروض اور علمِ فراست میں کمال پیدا کیا۔ آپؒ بہترین طبیب بھی تھے، جالینوس، ارسطو، بقراط اور دیگر حکمائے روم و یونان کی کتب پر

Marfat.com

آپؒ کی گہری نظر تھی۔ آپؒ کی غیر معمولی فراست کا ایک واقعہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آپؒ کے استاد امام حمیدیؒ فرماتے ہیں، "ایک بار میں اور امام شافعیؒ مکہ سے باہر چلے، راستے میں ایک شخص ملا۔ میں نے امام شافعیؒ سے پوچھا: "فراست سے کام لے کر بتایئے کہ اس شخص کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

امام شافعیؒ نے فرمایا: "یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے۔"
اس شخص سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: "میں پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا، آج کل درزی ہوں۔"

آپؒ کو تیر اندازی میں کمال حاصل تھا۔ خود فرماتے ہیں: "مجھے دو چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ایک تیر اندازی، دوسرے علم، تیر اندازی میں تو واقعی میں نے کمال حاصل کر لیا۔ باقی رہا علم...." اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ حاضرین میں سے بعض نے کہا "خدا کی قسم، آپؒ کا علم تیر اندازی کے فن سے بھی زیادہ کامل ہے۔"

آپؒ باکمال افراد کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ ایک شخص تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ جیب سے تین دینار نکال کر دیے اور افسوس ظاہر کیا کہ مزید رقم نہیں ہے اگر میرے پاس اور دینار ہوتے تو وہ بھی دے دیتا۔

امام مالکؒ کے انتقال کے بعد آپؒ نے تحصیل علم کے لیے متعدد سفر کیے۔ بغداد جا کر حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ سے تین سال تک علم حاصل کیا۔ امام محمدؒ سے حصولِ علم کے بعد امام شافعیؒ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے آئے اور درس و افتا کا سلسلہ شروع کیا۔ نو سال تک آپؒ حرم پاک میں درس دیتے رہے۔ اسی زمانے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ملاقات ہوئی۔ اسی دوران آپؒ نے اجتہاد، استنباط اور فقہ کے اصول تیار کیے جو فی الواقع آپؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ امام شافعیؒ نے فقہی اجتہاد اور حدیث دونوں کو اختیار فرمایا۔ انہوں نے نہ صرف پہلے سے موجود فقہی سرمائے کو ذہن نشین کیا بلکہ اپنی کتاب "الرسالہ" میں فقہ کے اصول اور فقہی استدلال کے طریقے بیان کیے۔ انہیں اصولِ فقہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں یمن کے گورنر مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے۔ قریش کے سرداروں نے ان سے سفارش کی کہ امام شافعیؒ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، ان سے سرکاری خدمت لی جانی چاہیے۔ گورنر نے آپؒ کو نجران کا عامل بنا دیا۔ جس شخص نے اللہ کی کتابِ مقدس اور اس کے رسول پاک ﷺ کی تعلیمات کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اس پر بھلا رشوت یا خوشامد اثر انداز ہو سکتی تھی؟ آپؒ مقدمات کے فیصلے نہایت عدل و انصاف کے ساتھ فرماتے رہے۔ آپؒ نے پنچایت کے طور پر سات قابل اعتماد افراد کی ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ معمولی جھگڑوں کا تصفیہ کمیٹی ہی میں ہو جاتا۔

بہت سے مفاد پرستوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انہوں نے امام شافعیؒ کے خلاف خلیفہ ہارون الرشید کے کان بھرے کہ امام شافعیؒ سادات میں سے ہیں اور شاید خلیفہ کے خلاف تحریک چلانے والے ہیں۔ ہارون نے امام صاحبؒ کو فی الفور بغداد بھیجنے کا حکم صادر کر دیا۔

جب امام صاحبؒ کو ہارون الرشید کے دربار میں پیش کیا گیا تو چمڑے کے فرش پر بٹھا دیا گیا اور آپؒ کو شہید کر دینے کے لیے تلوار لائی گئی۔ اس وقت اس مردِ جری نے ایسی پُر درد تقریر کی کہ ہارون الرشید کانپ اٹھے۔ انہوں نے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ سے پوچھا، "کیا ان کے خلاف شکایت درست ہے؟" امام محمدؒ نے فرمایا، "ان کے بارے میں جو شکایت کی گئی ہے وہ ان کی شان سے بعید ہے، علم میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

ہارون نے امام شافعیؒ کے قتل کا حکم منسوخ کر کے آپؒ کو نظر بند کر دیا۔ چند دنوں بعد کسی نے امام شافعیؒ کے ایک علمی مباحثے کی تفصیل ہارون کے سامنے بیان کی۔ ہارون الرشید لیٹے ہوئے تھے۔ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "ذرا پھر سے سناؤ۔" سنانے والے نے علمی مباحثے کی تفصیل دہرائی۔ ہارون الرشید نے فوراً امام شافعیؒ کی رہائی کے احکامات جاری کر دیے۔

ایک بار ہارون الرشید نے امام صاحبؒ کو بلوایا اور کہنے لگے کہ آج جب میرے دربار میں سب لوگ جمع ہوں تو آپؒ درس دیں۔ آپؒ نے نہایت موثر درس دیا۔ ہارون کا حال یہ تھا کہ بھرے دربار میں چیخ چیخ کر رونے لگے۔ جب ذرا سنبھلے تو آپؒ کی خدمت میں پچاس ہزار درہم پیش کیے۔ آپؒ نے اسی وقت چالیس ہزار درہم نادار علما، یتیموں، بیواؤں اور مساکین میں تقسیم کر دیے۔ کتنی ہی بار لوگوں نے آپؒ کی خدمت میں رقوم پیش کیں، لیکن آپؒ نے ہمیشہ ان رقوم کا بڑا حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر بار غریبوں میں رقم بانٹنے کے بعد آپؒ اللہ سے دعا فرماتے، "الٰہی! مجھے حرصِ دنیا سے ہمیشہ محفوظ رکھنا۔"

ایک بار عید کے دن گھر میں کھانے پینے کا مناسب سامان نہ تھا۔

Marfat.com

اہلیہ نے آپؒ سے کہا، "آپؒ اپنی قوم کے ساتھ تو بڑی صلہ رحمی کرتے رہتے ہیں، آج عید ہے، گھر میں سامان نہیں۔ کسی سے قرض ہی منگوا لیں۔" آپؒ نے ایک شخص سے ستر دینار قرض منگوائے، راستے میں مساکین نے گھیر لیا۔ پچاس دینار ان میں بانٹ دیے، بیس دینار لے کر گھر پہنچے۔ ابھی اہلیہ کو رقم دینے نہ پائے تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ آپؒ باہر تشریف لے گئے۔ ایک شخص منتظر تھا۔ اس نے رو رو کر اپنا حال سنایا اور مدد مانگی۔ امام صاحبؒ نے بچے ہوئے بیس دینار اس کے سامنے رکھ دیے کہ جس قدر چاہے اٹھا لے۔ اس نے تمام دینار اٹھا لیے اور بولا، "مجھے تو ابھی اور ضرورت ہے۔" آپؒ گھر پہنچے۔ اہلیہ کو قصہ سنایا۔ اہلیہ نے ناراضگی سے کہا، "آپؒ یہی کرتے رہتے ہیں۔" امام صاحبؒ خاموشی کے ساتھ سو گئے۔

صبح ہوئی تو خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی کا قاصد آیا اور بلا لے گیا۔ جعفر نے آپؒ کو بے حد تعظیم سے بٹھایا اور کہنے لگے، "آج رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا ہے، وہ واقعہ آپؒ ہی سنا دیجیے۔"

امام صاحبؒ نے واقعہ سنا دیا، جعفر نے بہت اصرار کر کے ایک ہزار دینار آپ کو پیش کیے۔

امام شافعیؒ رات کا ایک تہائی حصہ نوافل، ذکرِ الٰہی اور توبہ استغفار میں صَرف کرتے تھے۔ قرأت اس قدر پُر اثر تھی کہ جب آپؒ قرأت فرماتے تو سننے والے رو پڑتے۔

رات کی تاریکی میں چراغ بجھا کر غور و فکر کیا کرتے۔ آپؒ کا خیال تھا کہ چراغ کی روشنی میں خیالات یکسو نہیں رہتے۔ تصنیف و تالیف کا زیادہ تر کام مسجد میں کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر دوسروں کی کتابوں سے بھی مدد لیتے اور ان کے مواد کو پرکھتے۔

امام شافعیؒ نے مختصر مدت اور خصوصاً آخر عمر میں کثرت سے لکھا اور املا بھی کروایا۔ حافظ ابنِ حجر کے مطابق امام صاحبؒ نے مصر میں چار سال قیام کیا اور اس دوران ڈیڑھ ہزار اوراق (تین ہزار صفحات) املا کروائے۔ امام صاحبؒ اپنی کتابوں پر نظر ثانی بھی کرتے تھے۔ بعد کے دور میں آپؒ نے اپنی کئی کتب پر نظر ثانی کر کے ان میں ترامیم اور اضافے کیے۔

امام بیہقیؒ کے مطابق امام شافعیؒ کی تصانیف میں تین خوبیاں ہیں، حُسنِ ترتیب، مسائل کی تشریح میں دلائل، ایجاز اور اختصار۔

آپؒ اپنے شاگردوں کو املا بھی کرواتے رہتے تھے۔ اس طرح کئی کتب تیار ہو گئیں جنھیں آپؒ کی ایک کتاب "کتاب الام" میں شامل کر دیا گیا۔ یہ کتاب چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اس کی سات جلدیں ہیں اور اسے قاہرہ سے ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں شائع کیا گیا۔ آپؒ کی ایک اور کتاب "الرسالہ" بہت مشہور ہے۔ اس میں اصولِ فقہ بیان کیے گئے ہیں۔ امام شافعیؒ کی تصانیف کی تعداد ایک سو تیرہ ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور اشعار میں ہمیشہ اچھائی کا پیغام دیتے تھے۔

امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ (وفات: ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء) سے بہت متاثر تھے، ان کی کتابیں امام شافعیؒ نے اپنے لیے نقل کی تھیں۔ اس موقع پر امام شافعیؒ نے اپنے لیے فقہ کے شعبہ کا انتخاب کیا۔ وہ ۱۸۸ھ / ۸۰۴ء میں حران اور شام ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ بیت اللہ میں درس دینا شروع کیا۔ ۱۹۵ھ / ۸۱۱ء میں وہ بغداد چلے آئے۔ یہاں حلقۂ درس قائم کیا۔

امام صاحبؒ نے اہلِ حدیث اور اہل الرائے (یعنی اہلِ فقہ) کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ان میں ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ آپؒ کے شاگردوں میں المزنی (وفات: ۲۶۴ھ)، البویطیؒ (وفات: ۲۳۱ھ)، امام احمد بن حنبلؒ (وفات: ۲۴۱ھ) اور کئی دیگر نامور فقہا بھی شامل ہیں۔

۱۹۸ھ / ۸۱۳ء میں امام صاحبؒ مصر تشریف لے گئے۔ فسطاط میں ۳۰ رجب ۲۰۴ھ / ۲۰ جنوری ۸۲۰ء کو عصر کے وقت آپؒ کی طبیعت بگڑ گئی۔ عشا کی نماز ادا کی اور گڑگڑا کر دعا مانگی۔ دعا سے فارغ ہو کر لیٹے ہی تھے کہ اللہ نے اپنے پیارے بندے کو اپنے پاس بلا لیا۔

آپؒ کو قاہرہ کے باہر قرافۃ الصغریٰ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آپؒ کا مزار آج بھی قائم ہے۔ بعد میں آپ کے مزار کے مقابل، صلاح الدین ایوبی نے بہت بڑا مدرسہ تعمیر کروایا۔

***

Marfat.com

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

مُسند احمد کے موئلف، جنہوں نے عزیمت کی راہ اختیار فرمائی

روٹی پکانے کے لیے خمیر کی ضرورت تھی۔

صالح کے گھر سے خمیر لے لیا گیا اور روٹی پک کر سامنے آئی تو صالح کے والد محترم نے پوچھا، "یہ روٹی کیسی ہے؟"

بتایا گیا کہ خمیر صالح کے گھر سے آیا ہے۔ اس پر صالح کے والد نے فرمایا:

"اس نے تو ایک سال تک قاضی کے منصب کو اختیار کیا ہے، اب اس کی روٹی ہمارے حلق سے نہ اتر سکے گی۔" پوچھا گیا: "اب ان روٹیوں کا کیا کریں!"

فرمایا، "جب کوئی سائل آئے اور سوال کرے تو تفصیل سے روٹیوں کے بارے میں اسے بتا دینا کہ خمیر صالح کے گھر کا ہے، آٹا احمد کے گھر کا ہے اور احمد نے ان روٹیوں کو کھانے سے انکار کر دیا ہے اگر وہ ان روٹیوں کو لینا پسند کرے تو بہتر ہے، اسے دے دینا۔"

چالیس روز تک دروازے پر کوئی سائل نہ آیا، روٹیاں خراب ہو گئیں حتیٰ کہ ان روٹیوں کو دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا۔

یہ، فقہ اور حدیث کے بہت بڑے عالم، حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ جنہوں نے اپنے بیٹے کے گھر کے خمیر سے تیار شدہ روٹی تک کھانا گوارا نہ کیا، حالانکہ آپؒ کے صاحب زادے صالح، نہایت، متقی شخص تھے، لیکن چونکہ اصفہان میں ایک سال تک قاضی رہے تھے اور امام صاحبؒ کے نزدیک اس وقت کی اسلامی حکومت اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے رہی تھی اس لیے امام صاحبؒ سرکاری عہدوں پر فائز افراد سے کچھ لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی پیشِ نظر تھا کہ فیصلہ کرتے ہوئے قاضی سے غلطی بھی ہو سکتی ہے، غالباً اسی وجہ سے امام صاحبؒ اس قدر احتیاط کیا کرتے تھے اور ایسا زہد و تقویٰ رکھنے والوں کے نام زندۂ جاوید ہو جایا کرتے ہیں۔

آپ کا نام احمد بن محمد بن حنبلؒ اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ آپ عربی النسل ہیں اور آپؒ کا تعلق قبیلہ شیبان سے ہے جو قبیلہ قریش کی شاخ ہے۔ ربیع الاول ۱۶۴ھ / نومبر ۷۸۰ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ربیع الثانی ۱۶۴ھ / دسمبر ۷۸۰ء میں آپؒ کے والد مرو سے بغداد منتقل ہوئے اور اس کے چند ماہ بعد آپ کی پیدائش عمل میں آئی۔ آپ کی والدہ محترمہ صفیہ بنت عبدالملک مرو سے بغداد آئی تھیں۔ ابھی آپؒ صرف تین سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ آپؒ کے والد سرخس کے سالار تھے۔ والد کے انتقال کے بعد آپؒ کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری والدہ محترمہ پر آپڑی۔

اس دور میں بغداد علم کا مرکز تھا۔ آپؒ خود فرماتے ہیں، "میں بچہ ہی تھا کہ حفظِ قرآن سے فارغ ہو گیا۔ ۱۴ سال کی عمر کو پہنچا تو تحریر و کتابت کی مشق و تحصیل میں منہمک ہو گیا۔"

آپؒ کا دورِ طالبِ علمی بڑی تنگ دستی میں گزرا، حال یہ تھا کہ سوتے وقت سر کے نیچے تکیے کی جگہ اینٹ رکھ لیا کرتے تھے۔ جب آپؒ نے ۱۷۹ھ / ۷۹۵ء میں اپنی عمر کے ۱۶ ویں سال میں قدم رکھا تو، علم حدیث کی تحصیل کا آغاز کیا۔ آپؒ فرماتے ہیں، "حدیث کا پہلا سبق میں نے امام ابو یوسفؒ سے حاصل کیا۔"

امام ابو یوسفؒ سے تین سال تک فقہ اور حدیث کا علم حاصل کرتے رہے، اس دوران امام محمدؒ سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد چار سال تک بغداد میں امام ہیثم بن بشیر بن ابو حازمؒ سے علم حاصل کرتے رہے۔ آپؒ نے حصولِ علم کے لیے طویل طویل سفر کیے۔ راستے میں زادِ راہ ختم ہو گیا تو محنت مزدوری کی۔ آپ یمن اور شام گئے۔

۱۸۶ھ میں بصرہ اور ۱۸۷ھ میں حجاز تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت امام شافعیؒ سے ملاقات ہوئی۔ دوسری بار بغداد میں ملے اور

Marfat.com

امام شافعیؒ سے علم حاصل کیا۔ پھر امام شافعیؒ جب تک بغداد میں رہے، آپؒ ان سے جُدا نہ ہوئے۔ امام شافعیؒ کو بھی آپؒ سے بہت محبت تھی اور وہ آپؒ کے تقویٰ کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے تحصیل حدیث کے لیے جو سفر کیے، ان کے نتیجے میں آپؒ کو لاکھوں احادیث حفظ ہو گئیں۔ آپؒ کے اساتذہ کی تعداد سو سے زائد ہے۔

چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو آپؒ نے بغداد کی جامع مسجد میں باقاعدہ حلقۂ درس قائم کیا۔ آپؒ کی مجلسِ درس عام طور پر نماز عصر کے بعد منعقد ہوتی تھی۔ نہایت باوقار مجلس ہوتی تھی۔ آپؒ کے درس میں سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار تک ہوتی تھی جن میں پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے۔ آپؒ کے شاگردوں میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، حافظ ابوزرعہؒ جیسے عظیم المرتبت محدثین شامل ہیں۔

امام صاحبؒ کا عظیم علمی کارنامہ مسند احمدؒ کی تالیف ہے، جو تیس ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ آپؒ نے دیگر کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں، "امام احمدؒ آٹھ علوم میں بے نظیر عالم فاضل سمجھے جاتے تھے، ان میں قرآن پاک، حدیث، فقہ، لغت شامل ہیں"۔ آپؒ کے بیان کردہ فقہی مسائل پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد عمل پیرا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید ان شدت پسند علما کے خلاف تھے، جو معتزلہ کہلاتے ہیں، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید عقلاً معلوم ہو سکتی ہے اس لیے وحی کے بغیر ہی اہل حکمت و عقل، توحید پر ایمان لا سکتے ہیں۔ ہارون کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مامون رجب ۱۹۸ھ / فروری ۸۱۴ء میں مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ مامون معتزلہ سے متاثر تھے، چنانچہ معتزلہ ان پر چھا گئے۔ انہوں نے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ یہاں سے امام صاحبؒ کے دورِ ابتلا کا آغاز ہوتا ہے جو کم و بیش ۱۴ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔

امام صاحبؒ نے محسوس کیا کہ کتاب و سنت کے خلاف غلط عقیدے کو عام کیا جا رہا ہے، اگر مسلمانوں کو درست عقائد کی تعلیم نہ دی گئی تو امتِ مسلمہ کے بڑے حصے کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اس طرح صحیح کو غلط سے الگ کر کے پیش نہ کرنے کی ذمہ داری علما پر عائد ہو گی۔ خلقِ قرآن کا مسئلہ اٹھانے والوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کریم اللہ کی دیگر مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، جبکہ امام صاحبؒ نے واضح کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اس کی ایک صفت ہے۔ چنانچہ آپؒ خلقِ قرآن کے غلط عقیدے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؒ کی یہ جسارت اس وقت کے حکمرانوں اور ان کے گرد جمع مصاحبین کو سخت ناگوار گزری، اس لیے آپؒ پر مصائب و مظالم کا دروازہ کھل گیا۔

مامون الرشید اپنی زندگی کے آخری ایام میں رومیوں کے خلاف لڑنے کے لیے بغداد سے روانہ ہوئے تو انہوں نے بغداد کے گورنر اسحٰق بن ابراہیم کو پیغام بھجوایا کہ تمام لوگوں کو "خلقِ قرآن" کے مسئلے کی دعوت دی جائے۔ گورنر نے تمام علما، ائمہ حدیث کو جمع کیا اور انہیں خلقِ قرآن کے مسئلے پر قائل کرنے کی کوشش کی لیکن سب نے اس عقیدے پر لبیک کہنے سے انکار کر دیا۔

مامون کو خبر ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ امام احمدؒ اور امام محمد بن نوحؒ کو بیڑیاں پہنا کر عدالت میں حاضر کیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ راستہ میں امام محمد بن نوحؒ "عانہ" کے مقام پر رب سے جا ملے۔ امام احمدؒ نے ان کی نمازِ جنازہ ادا کی اور سفر جاری رکھا۔ آپؒ راستے میں دعا فرما رہے تھے کہ "اے اللہ میری، مامون سے ملاقات نہ ہو۔" چنانچہ ابھی آپؒ کا سفر جاری تھا کہ طرطوس کے مقام پر لوگ چیختے چلاتے آپؒ کے پاس آئے کہ مامون فوت ہو گئے ہیں۔

مامون کا انتقال رجب ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد ابواسحٰق، محمد بن ہارون المعتصم تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ابن ابی داؤد کو منصبِ قضا سونپ دیا، جو امام صاحبؒ کے بدترین مخالفین میں سے ایک تھا۔ اس کے حکم سے امام صاحبؒ کو واپس بغداد لے جا کر قید کر دیا گیا اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ جیل ہی میں آپؒ نے مجلس درس قائم کی۔ پاؤں میں بیڑیوں کے باوجود نماز کی امامت فرماتے تھے۔

چند دنوں بعد بغداد کا گورنر اسحٰق بن ابراہیم جیل میں امام صاحبؒ کے پاس پہنچا اور آپؒ سے دوستانہ انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ باتوں باتوں میں اس نے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا اور کہنے لگا، "کس قدر اچھا ہو کہ آپ امیر المومنین معتصم باللہ کی مخالفت ترک کر دیں۔"

امام صاحبؒ نے انکار کر دیا۔ اس پر اسحٰق نے پینترا بدل کر دھمکی دی کہ آپؒ کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس پر بھی امام صاحب مرعوب نہ ہوئے تو اسحٰق نے جھلا کر حکم دیا کہ امام صاحبؒ کو مزید بوجھل بیڑیاں پہنا دی جائیں۔ اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو حکم دیا

Marfat.com

کہ جیل سے نکل کے پیدل چلیں۔

امام صاحبؒ نے چلنے کی پوری کوشش کی لیکن ظالموں نے بیڑیاں اس قدر وزنی ڈال دی تھیں کہ پاؤں اٹھانا ممکن نہ تھا۔ پاؤں اٹھاتے تو سخت تکلیف ہوتی۔ مجبور ہو کر آپؒ نے پاجامے سے ازار بند نکالا اور اسے پاؤں اور بیڑیوں کے درمیان رکھا تاکہ چلا جاسکے اور پاجامہ بلا ازار بند لپیٹ لیا، لیکن اس طرح بھی چلنا ممکن نہیں تھا، جب اسحاق بن ابراہیم کو یقین ہو گیا کہ امام صاحبؒ چل نہیں سکتے تو انہیں ایک سواری پر اسی حالت میں بٹھادیا گیا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں وزنی بیڑیاں، کسی انسان کے سہارے کے بغیر اس حالت میں سواری پر بیٹھنا بھی مشکل تھا، قریب تھا کہ گر پڑیں، لیکن اللہ نے اپنے بندے کی حفاظت کی۔ نصف شب کے قریب آپؒ کو ایک شخص ابو اسحاق کے گھر لے جا کر ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

صبح امام صاحبؒ کو خلیفہ معتصم کی عدالت میں پابجولاں پیش کیا گیا، وہاں امام صاحبؒ کا بدترین مخالف ابن ابی داؤد اور اس کے دیگر ساتھی بھی موجود تھے۔ امام صاحبؒ کو خوف زدہ کرنے کے لیے تلواریں میانوں سے باہر چمک رہی تھیں، نیزے سجے ہوئے تھے اور لاٹھیاں موجود تھیں۔ آپؒ نے طاقت کے اس مظاہرے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ابن ابی داؤد اور دیگر مصاحبوں نے خلیفہ کو بھڑکایا کہ یہ شخص ہم کو کافر بنا رہا ہے اور علما سے کہا کہ خلق قرآن کے مسئلے پر مناظرہ کریں۔

مجلس مناظرہ کے لیے ملک کے کونے کونے سے علما بلائے گئے۔ مناظرہ تین دن تک جاری رہا۔ امام صاحبؒ نے نہایت موثر دلائل دے کر مخالفین کی زبان بند کر دی اور ان کے پاس اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا۔ خلیفہ اس صورتحال سے بڑے پریشان ہوئے۔ ایک دن انہوں نے امام صاحبؒ سے کہا، "اے احمدؒ! آپ کے مسئلے نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے، مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ اگر مجھ سے پہلے حکمران نے آپؒ کو گرفتار نہ کیا ہوتا تو میں کبھی اس قسم کی جرأت نہ کرتا، میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ کا مسئلہ کسی طور حل ہو جاتا ہے تو میں کبھی کسی کو اس قسم کے مسائل کی وجہ سے گرفتار نہیں کروں گا۔"

مناظرے کے تیسرے دن خلیفہ کو اس کے مصاحبین نے پٹی پڑھائی، جس پر خلیفہ نے کہا، "اے احمد! مجھے خبر ملی ہے کہ آپ منصب جلیلہ کے خواہش مند ہیں، اگر آپ میری بات مان جائیں تو نہ صرف آپ کا شاہانہ استقبال ہو گا، بلکہ سرکاری ملازمین بھی آپ کے دائیں بائیں ہوں گے، آپ کو اچھے منصب پر فائز کیا جائے گا۔ آپ کی عظمتِ شان کے قصائد کہے جائیں گے اور آپ کی تشہیر کے لیے سرکاری ذرائع اختیار کیے جائیں گے۔"

امام صاحبؒ نے جواب میں فرمایا، "اے امیر المومنین! ہمارے سامنے قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ صحیح احادیث کا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر آپ اپنا موقف ان کی روشنی میں واضح کر دیں تو مجھے آپ کا موقف اختیار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو گی۔"

اس واضح اعلان پر امام صاحبؒ کے مخالفین آگ بگولہ ہو گئے، یکے بعد دیگرے سب نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ امام صاحبؒ ان کے اعتراضات کے جوابات دیتے رہے جب مخالفین دلائل دینے سے عاجز آ گئے تو ابن ابی داؤد نے دھمکی دی کہ امیر المومنین نے آج قسم کھا کر کہا ہے کہ آپ کو شدید اذیتیں دی جائیں اور کوڑے برسائے جائیں۔

امام صاحبؒ نے کہا کہ اس سے پہلے مجھے کھلی مجلس میں اپنا موقف بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ میدانِ مناظرہ میں لائے گئے۔ یہاں بھی امام صاحبؒ نے اپنے دلائل سے سب کو مبہوت کر دیا۔ اس صورتِ حال سے امام صاحبؒ کے مخالفین سخت ناخوش ہوئے۔ ابن ابی داؤد، برغوث، شعیب اور بشیر مریسی، خلیفہ کو برابر اکساتے رہے۔ حتیٰ کہ خلیفہ نے حکم دیا کہ آپؒ کی قمیض اتار کر پشت پر کوڑے برسائے جائیں۔ جب آپؒ کو کوڑے مارنے کی تیاری شروع ہوئی تو آپؒ نے نہایت جرأت کے ساتھ خلیفہ سے کہا "یاد رکھیے! جس طرح آج میں آپ کی عدالت میں کھڑا ہوں اسی طرح ایک دن آپ کو بھی اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اے امیر المومنین اللہ کے جلال سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔"

خلیفہ معتصم پر ان کلمات کو سن کر سکتہ طاری ہو گیا۔ ابن ابی داؤد نے فوراً کہا، "امیر المومنین آپ ایک کافر اور گمراہ انسان کی باتوں سے متاثر ہو رہے ہیں؟" امام صاحبؒ نے کہا، "امیر المومنین! آپ میرے قتل کے معاملے میں اللہ سے ڈریں۔ قیامت کے روز کیا جواب دیں گے؟"

ابھی آپؒ کا یہ جملہ مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ ہر طرف سے شور مچ گیا، "یہ کافر ہے، یہ کافر ہے۔"

Marfat.com

خلیفہ نے حکم دیا کہ امام صاحبؒ کو ٹکٹکی پر باندھ دیا جائے۔

آپ کو ٹکٹکی پر باندھ دیا گیا، ٹکٹکی کی دونوں جانب لگی لکڑیوں کو پکڑنے کا حکم دیا گیا اور جلّادنے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ کائنات تھرا گئی۔ ایک عظیم انسان پر کلمۂ حق بلند کرنے کی پاداش میں اذیتوں کے پہاڑ توڑے جارہے تھے۔ خلیفہ بار بار کوڑوں کا معائنہ کرتے اور انہیں تبدیل کرنے اور زیادہ سخت کوڑے لگانے کا حکم دیتے۔ باری باری ایک جلاد زور سے کوڑے مارتا اور پیچھے ہٹ جاتا، لیکن خلیفہ کی تسلی نہ ہوتی اور وہ جلادوں کو ڈانٹتے ہوئے کہتے، "تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پورے زور سے کوڑے کیوں نہیں مار رہا ہے؟"

ایک جلاد نے بعد میں بتایا، "میں نے امام احمدؒ کی پیٹھ پر اتنے کوڑے برسائے کہ اگر کسی ہاتھی کو اتنے کوڑے لگ جائیں تو وہ بھی اپنے ہوش و حواس قائم نہ رکھ سکے۔"

ایک قیدی ابوالہیثم جو امام صاحبؒ کو کوڑے لگنے کا منظر دیکھ رہا تھا، کہتا ہے، "میں نے کبھی اتنی قوت سے کسی کو کوڑے برستے نہیں دیکھے۔ جب امام صاحبؒ کو کوڑے سے زخم لگتا تو جلاد ایک آلے سے زخم کی گہرائی ناپتے کہ کہیں اندر سوراخ تو نہیں، ایک بار کوڑا ان کے کان پر لگا جس سے کان پھٹ گیا۔

کوڑے برس رہے تھے اور اللہ کے اس اولوالعزم اور صابر بندے کی زبان پر قرآن کی یہ آیت جاری تھی، ترجمہ: "ہم پر وہی مصیبت آسکتی ہے جو اللہ نے پہلے ہی لکھ دی ہے۔"

اتنے کوڑے برسائے گئے کہ امام صاحبؒ بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آئے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا، حتیٰ کہ پھر بے ہوش ہوگئے۔ خاصی دیر بعد ہوش آیا تو خلیفہ نے کہا، "اب بھی وقت ہے میری بات تسلیم کرلو۔" امام صاحبؒ نے انکار کر دیا تو تیسری بار کوڑے لگائے گئے۔ یہاں تک کہ امام صاحبؒ پھر بے ہوش ہوگئے۔ اس پر خلیفہ کچھ خوفزدہ ہوگئے۔ انہوں نے کوڑوں کا سلسلہ بند کروایا اور ابن ابی داؤد کے اصرار کے باوجود امام صاحبؒ کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

آپ کو بغداد کے گورنر کی خاص سواری پر گھر بھیج دیا گیا۔ سواری پر نہایت تکلیف کے عالم میں تھے۔ سواری سے اتارنے والوں کا بیان ہے کہ جب ہمارا ہاتھ امام صاحبؒ کے جسم کے اس حصہ کو لگتا جہاں کوڑے برستے رہے تھے تو وہ سخت تکلیف محسوس کرتے، بالآخر وہ ہمارا سہارا لے کر اترے، مگر چونکہ شدید زخمی تھی اس لیے منہ کے بل لیٹ گئے۔ علاج کا سلسلہ شروع ہوا، جسم کا جو حصہ کوڑوں کی ضربات سے بے حس ہو چکا تھا اسے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ بالآخر زخم مندمل ہوئے البتہ ہاتھ اور دونوں انگوٹھے کام نہیں کر رہے تھے۔

ربیع الاول ۲۲۰ھ / مارچ ۸۳۵ء میں واثق باللہ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ نہایت پُرعزم ہیں، انہیں زدو کوب کرنا یا ایذائیں دینا مناسب نہیں، البتہ انہوں نے اپنے غم و غصے کو فرو کرنے کے لیے حکم دیا کہ امام صاحبؒ کے پیروکاروں پر ظلم توڑے جائیں، چنانچہ محدثین، فقہا، معلمین، حتیٰ کہ موذنوں تک کو پکڑ کر ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ اکثر لوگ روپوش ہوگئے۔ بہت سے قید کر لیے گئے۔ امام صاحبؒ کو ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ نماز کے لیے بھی نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ واثق کی وفات یعنی ۲۳۲ھ تک آپ کا یہ دورِ ابتلا جاری رہا۔

ذی الحجہ ۲۳۲ھ / جولائی ۸۴۸ء میں متوکل خلیفہ بنے۔ وہ عقائد کے اعتبار سے مامون، معتصم اور واثق سے مختلف تھے اور قرآن پاک کو مخلوق تسلیم کرنے والوں کو شدید لعن طعن کرتے تھے۔ ان کے دور میں صورتِ حال بدل گئی، لیکن یہ امام صاحبؒ کے لیے آزمائشوں کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

آپؒ کے قدموں میں مال و دولت ڈھیر کیا جانے لگا۔ اعلیٰ عہدوں کی پیش کشیں ہونے لگیں۔ رہائش کے لیے آرام دہ اور خوشنما محل پیش کیے جانے لگے، لیکن مردِ درویش صفت نے اس سامانِ تعیش کی جانب ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔

امام صاحبؒ کے صاحب زادے عبداللہ بیان کرتے ہیں، "متوکل نے والد محترم کو پیغام بھیجا کہ میں آپ کے دیدار کا متمنی ہوں اور آپ کی دعاؤں کا تبرک چاہتا ہوں آپ قدم رنجہ فرمائیں، چنانچہ ہم وہاں پہنچے۔ خلیفہ نے ہماری رہائش کے لیے ایک بہترین محل کا انتخاب کیا۔ امام صاحبؒ محل میں داخل ہوئے تو متوکل نے اپنی والدہ سے کہا، "امام صاحبؒ کے محل میں داخل ہوتے ہی محل بقعہ نور بن گیا۔"

کہاں تو کئی سال تک یہ عالم تھا کہ امام احمدؒ بن حنبل پر کوڑے برس رہے تھے، انہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی تھیں اور ان پر مظالم ڈھائے جارہے تھے اور کہاں اب یہ دور ہے کہ خلیفہ بہت سامال و دولت لیے مؤدب کھڑے ہیں کہ حضرت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہو۔ پھر چشم فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ عزیمت کا پیکر وہ شخص جس

Marfat.com

نے برہنہ پشت پر کوڑوں کی مار نہایت صبر و استقامت کے ساتھ جھیل لی تھی، خلیفہ کے ہاتھوں میں فاخرانہ لباس اور مال و زر دیکھ کر رو پڑتا ہے اور کہتا ہے، "ساٹھ سال تک تو میں اس ابتلا سے محفوظ رہا اب عمر کے آخری حصہ میں اس فتنہ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔"

بعد میں متوکل نے آپؒ کی خدمت میں بہت ساماں و دولت بھیجا پہلے تو آپؒ نے انکار کیا، لیکن لوگوں کے اصرار پر لے کر تمام کا تمام مستحق افراد میں تقسیم کر دیا۔ اب حال یہ تھا کہ خلیفہ متوکل آپؒ کے مشورے کے بغیر نہ کسی کو معزول کرتے تھے نہ کسی کو کوئی منصب سونپتے تھے۔ بقیہ زندگی بھر شاید ہی کوئی ایسا دن ہو گا جس دن خلیفہ نے کسی اہم مسئلے پر مشورے کے لیے امام صاحبؒ کو پیغام نہ بھیجا ہو۔ یہاں تک کہ ان کے عہد میں عباسی خلافت دراصل محدثین حنابلہ کی حکومت کہلاتی تھی۔

امام صاحبؒ کے لیے یہ دور بڑی آزمائشوں کا دور تھا جب لوگ آپؒ کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے تھے اور آپؒ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ ایسے عالم میں آپؒ فرماتے ہیں، "اگر مجھے راستہ ملے تو میں کہیں کسی نامعلوم مقام کی طرف بھاگ جاؤں یہاں تک کہ میرے ذکر کا سلسلہ ہی بند ہو جائے۔ جی چاہتا ہے کہ مکہ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں چھپ رہوں یہاں تک کہ کوئی مجھے یاد نہ کرے۔ میں شہرت کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہوں۔"

امام احمدؒ نے جس فقہ یعنی فقہ حنبلی کی بنیاد ڈالی وہ آج مسلمانوں کے چار اہم فقہی مسالک میں سے ایک ہے۔ فقہ حنبلی میں زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کی رائے کو دی گئی ہے۔ امامؒ صاحب صحابہ کرامؓ کی پیروی میں بہت سخت تھے۔

آپؒ کے حکیمانہ فیصلوں اور آرا کو بعد میں آپ کے شاگرد ابو بکر المروزیؒ کے ایک شاگرد ابو بکر الخلال محدثؒ نے کتاب الجامع کی شکل میں مرتب کر دیا۔

امام صاحبؒ نے اپنے اصول و عقائد سے متعلق دو بنیادی رسالے تصنیف کیے۔ ان میں سے ایک رسالہ، رسالہ الرد علی الجہمیہ والزنادقہ میں آپؒ نے ایک فرقہ کے پیروکار جہم بن صفوان کے عقائد کی وضاحت اور تردید کی۔ یہ عقائد پورے خراسان میں پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے رسالے "کتاب السنۃ" میں آپؒ نے بعض دینی مسائل پر نظر ڈالی ہے اور اسلام کے تمام بڑے بڑے اصولوں کے مطابق اپنا موقف صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپؒ نے ایک "کتاب الصلوٰۃ" تحریر کی جس میں، نماز جماعت اور صحت کے ساتھ ادا کرنے کی ضرورت تحریر کی گئی ہے۔ "مسند من مسائل احمد بن حنبلؒ" امام صاحبؒ کے سیاسی اور مذہبی خیالات کے مطالعہ کے لیے اہم ہے۔ آپؒ کی ایک تصنیف "کتاب الورع" بھی ہے جس میں ایسے مسائل کے بارے میں آپؒ کی آراء درج ہیں جن میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

فقہائے حنابلہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر دور میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا تاکہ فقہی مسائل کی ترتیب و تدوین کا عمل جامد ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قرآن و حدیث کی روشنی میں فقہی مسائل ترتیب دیے جاتے رہیں۔

علم حدیث کے دائرے میں امام صاحبؒ مستقل مجتہد کہے جاسکتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، "امام احمد بن حنبلؒ کو اپنے شیوخ سے احادیث و اخبار کا جو انبار ملا تھا اس میں سے آپؒ نے اپنا مسلک خود قائم کیا۔"

۷۷ سال کی عمر میں بیمار پڑ گئے۔ نو دن تک بیمار رہے۔ عیادت کرنے والوں کے ہجوم کا یہ حال تھا کہ بازار میں خرید و فروخت دشوار ہو گئی۔ ربیع الاول کے مبارک مہینے ہی میں آپؒ کی پیدائش ہوئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ / ۳۱ جولائی ۸۵۵ء کو آپؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپؒ کو بغداد کے مقابر الشہداء میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں لاکھوں سوگواروں نے شرکت کی۔

•••

Marfat.com

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

انتہائی غیر معمولی حافظے کے مالک، انہوں نے زندگی علمِ حدیث کے لیے وقف کردی

درسِ حدیث کا آغاز ہو چکا تھا۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ وقفے وقفے سے بلند ہونے والی شیخ الحدیث کی پُر وقار آواز اس خاموشی کو توڑ دیتی اور کاغذات پر جھکے طالب علموں کے قلم تیزی سے چلنے لگتے۔ وہ شیخ الحدیث کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو قرطاس کے سینے پر محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ ان طالب علموں میں ایک دبلا پتلا طالب علم ایسا بھی تھا جس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ بڑے غور سے شیخ الحدیث کا درس سن رہا تھا، لیکن دیگر طلبہ کی طرح احادیث لکھنے کا اہتمام نہیں کر رہا تھا۔ درس ختم ہوا تو تمام طلبہ شیخ الحدیث کو سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر درس شروع ہوا۔ شیخ الحدیث نے احادیث بیان کرنا شروع کیں۔ آج بھی تمام طلبہ اس کوشش میں تھے کہ احادیث کا ایک ایک لفظ پوری صحت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لے آئیں، لیکن وہی طالب علم قلم و قرطاس سے بے نیاز بیٹھا، توجہ سے درس سن رہا تھا۔ آج بھی درس اسی طرح مکمل ہوا اور طلبہ رخصت ہو گئے۔

پندرہ دن گزر گئے۔ ان پندرہ دنوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ وہ طالب علم اپنے ساتھ قلم اور کاغذ لایا ہو یا اس نے کسی ساتھی سے قلم یا کاغذ کی فرمائش کی ہو۔ اس کے ساتھیوں کو بڑا تعجب تھا کہ یہ نوجوان یہاں کس لیے آتا ہے۔ انہوں نے اس نوجوان کو روک کر اس پر تنقید شروع کر دی کہ آپ یہاں آکر حدیثیں نہیں لکھتے، آپ کی تو اتنے دنوں کی محنت ضائع ہو گئی۔

جب تنقید کا سلسلہ دراز ہو گیا تو نوجوان طالب علم کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا، "اچھا آپ وہ تمام احادیث لے آئیں۔" تمام طالب علم اپنے اپنے مجموعے لے آئے۔ اس وقت تک شیخ الحدیث کئی ہزار احادیث قلم بند کروا چکے تھے۔ نوجوان طالب علم نے حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں اور تمام کی تمام احادیث اسی ترتیب سے بیان کر دیں جس ترتیب سے گزشتہ پندرہ دنوں میں شیخ الحدیث نے بیان کی تھیں۔

انتہائی غیر معمولی حافظہ کا مظاہرہ کرنے والے یہی نوجوان آگے چل کر امام بخاریؒ کے نام سے مشہور ہوئے، جنہیں صحیح احادیث کا سب سے مستند مجموعہ "صحیح بخاری" مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ علمائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک کے بعد رُوئے زمین پر صحیح بخاری ہی سب سے صحیح کتاب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ صحیح بخاریؒ کی صورت میں بالکل صحیح اور مستند احادیث کو الگ الگ ابواب کے ذیل میں مرتب کر کے، امام بخاریؒ نے امتِ مسلمہ پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ آپؒ نے اس کے علاوہ بھی بیس سے زائد کتب تحریر فرمائی ہیں لیکن تنہا یہی ایک کارنامہ آپؒ کو بے پناہ فضیلت، قدر و منزلت اور اہمیت بخشنے کے لیے کافی ہے۔

آپؒ کا نام محمدؒ اور والد کا نام اسماعیل ہے، آپؒ کے پردادا مغیرہ بن بَردِزبہ، بخارا کے حاکم یمان الجعفی کے ہاتھ پر ایمان لائے تھے۔ چنانچہ اس نسبت سے آپؒ کا خاندان الجعفی کہلانے لگا۔ بخارا میں پیدائش کی وجہ سے آپؒ بخاری مشہور ہیں۔ آپؒ کو امام المحدثین اور امیر المومنین فی الحدیث جیسے معزز القاب سے بھی نوازا گیا ہے۔

حدیث کے یہ بلند مرتبت امام، ۱۴ شوال ۱۹۴ھ / ۲۱ جولائی ۸۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد گرامی اسماعیل بن ابراہیمؒ بڑے ثقہ اور ذی علم محدث تھے۔ انہیں امام مالکؒ کے علم سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے حماد بن زیدؒ، امام مالکؒ اور ابو معاویہؒ سے احادیث روایت کی تھیں اور خراسان کے نامور محدث اور عالم حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی علمی مجالس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ علم کے گہر ہائے آبدار کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ،

Marfat.com

حضرت اسماعیل بن ابراہیمؒ میدانِ عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی زندگی ایک سچے اور پکے مسلمان کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ ان کی نیک نفسی اور تقویٰ کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے ایک محدث احمد بن حفصؒ بیان فرماتے ہیں، "اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے حضرت اسماعیلؒ بن ابراہیم نے فرمایا، "میں ترکہ میں مال کی بہت بڑی مقدار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ الحمدللہ کہ اس میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں۔"

حضرت اسماعیل بن ابراہیمؒ اس شان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن اس وقت آپؒ کے صاحب زادے محمدؒ بہت چھوٹے تھے، جن کی تربیت اور پرورش کی تمام ذمہ داری آپؒ کی والدہ محترمہ پر آپڑی تھی۔ وہی محمدؒ جنہیں بڑے ہو کر اپنے پیارے والد محترم کا نام روشن کرنا تھا، ایک امت کو اپنے بے پناہ علم سے بہرہ ور کرنا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کا وہ عظیم مجموعہ مرتب کرنا تھا جو آج بھی صحیح بخاری کے نام سے گھر گھر موجود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قادرِ مطلق نے ننھے محمد کی والدہ محترمہ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی، یہ ذمہ داری ایک بڑی آزمائش کی صورت میں بدل گئی جب ننھے محمد کی آنکھوں میں کوئی خرابی ہوگئی۔ طبیبوں نے علاج کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے اور محمد اس حسین دنیا کو دیکھنے سے محروم ہوگئے۔ ننھے محمد کی والدہ ماجدہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پھول سا بچہ اب اپنی ماں کو دیکھ نہ سکتا تھا، صرف ماں کی شفقت بھری آغوش کو محسوس کرسکتا تھا۔ محمد کی والدہ دل شکستہ ضرور تھیں، لیکن اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہرگز نہیں تھیں۔ وہ اپنے نابینا بچے کو دیکھتیں تو بے اختیار اپنے پروردگار کو پکار اٹھتیں جو ہر شے پر قادر ہے۔ اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز ہو جاتیں اور اپنے معصوم بچے کی بینائی کی بحالی کے لیے رو رو کر دعائیں مانگتیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بہت مہربان و رحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں کی پکار ہمیشہ سنتا ہے۔ کائنات کے خالق نے کمسن محمد کو ان کی بصارت لوٹانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ایک رات، محمد کی والدہ محترمہ نے خواب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے مخاطب ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "تمہارے رونے اور دعا کرنے سے اللہ نے تمہارے بیٹے کی آنکھیں درست کردی ہیں۔"

آنے والی صبح اپنے ساتھ خوشیاں لے کر آئی۔ ننھے محمد نے بیدار ہو کر آنکھیں کھولیں تو دنیا اپنے تمام تر حسن و جمال کے ساتھ ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ اب ہر شے کو دیکھ سکتے تھے۔ شفیق و محترم ماں اور مسرور و شادماں بہن اور بھائی کا دیدار کرسکتے تھے۔ والدہ محترمہ اللہ کی اس عنایت پر، رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ بچے کی بصارت بحال ہونے کے بعد انہوں نے اسے حصول علم کے لیے بخارا کے نامور محدثین اور علمائے کرام کے پاس بھیج دیا۔

محمد اس کمسنی ہی میں بلا کے ذہین تھے اور آپ کی یادداشت غضب کی تھی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بخارا کے بلند پایہ محدثین محمد بن سلام بیکندیؒ، محمد بن یوسف بیکندیؒ، ابراہیم بن الاشعثؒ، عبداللہ بن محمد مسندیؒ سے حاصل کی۔ صرف ایک سال کے عرصے میں آپ احادیث کا بڑا حصہ ان کی اسناد کے ساتھ حفظ کرچکے تھے لیکن حدیثیں جاننے کی پیاس تھی کہ بڑھتی جاتی تھی اور آپ درسِ حدیث کی مجالس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ اسی دوران میں ایک واقعہ پیش آیا۔

ایک دن آپ اپنے استاد محترم علامہ داخلیؒ کے حلقۂ درس میں شریک تھے۔ علامہ داخلی نے ایک حدیث بیان فرمائی۔ اچانک ننھے محمد نے کھڑے ہو کر ادب سے عرض کیا کہ "حدیث کی سند اس طرح نہیں ہے جس طرح آپ نے بیان فرمائی ہے۔" گیارہ سال کے بچے سے یہ بات سن کر علامہ داخلیؒ حیران رہ گئے۔ انہوں نے اصل کتاب نکال کر دیکھی تو ننھے محمد کی بات کو درست پایا۔ علامہ داخلیؒ اس بچے کی غیر معمولی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور کتاب میں خود اس بچے کے قلم سے تصحیح کروائی۔

محمد بن اسماعیلؒ سولہ برس کے ہوئے تو آپؒ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور حضرت وکیع بن الجراحؒ کی تمام کتابوں کو حفظ کرچکے تھے۔ اس وقت آپؒ کو ستر ہزار احادیث یاد تھیں اور آپ یہ بھی فوراً بتاسکتے تھے کہ یہ ستر ہزار احادیث کن صحابیؓ یا تابعیؒ سے روایت کی گئی ہیں اور روایت کرنے والے کی جائے سکونت، جائے وفات اور دیگر حالات کیا ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسندِ خلافت پر مامون الرشید فائز تھے۔ اسلامی مملکت وسیع ہو رہی تھی۔ نئے علاقے فتح ہو رہے تھے اور محدثین کرام دور دور کے علاقوں میں پھیل چکے تھے تاکہ نئے مسلمان ہونے والے افراد کو علم سکھاسکیں۔ محمد بن اسماعیلؒ بخارا کے اہلِ علم اور اساتذۂ کرام سے حصولِ علم کرچکے تھے۔ اب انہوں نے دوسرے علاقوں میں جاکر علم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ حدیث یا اس کی اعلیٰ سند

Marfat.com

کو حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے اسے محدثین کی اصطلاح میں "رحلت" کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے اس طرح کے سفر بہت کیے ہیں۔

آپؒ کی زندگی کا پہلا سفر، سفر حج تھا جو آپؒ نے والدہ محترمہ اور بھائی کے ساتھ ۲۱۰ھ / ۸۲۶ء میں کیا۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد آپؒ نے مزید تحصیلِ علم کی خاطر مکہ مکرمہ میں ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا۔ آپؒ کی والدہ اور بھائی واپس بخارا چلے گئے۔

اس زمانے میں امام ابوالولید احمد بن الازرقیؒ، اسماعیل بن سالمؒ، ابوبکر عبدالستار بن زبیرؒ، علامہ حمیدیؒ مکہ مکرمہ کے نامور علمائے کرام میں شمار ہوتے تھے۔ محمد بن اسماعیلؒ نے ان کے علم سے خوشہ چینی کی اور ۲۱۲ھ / ۸۲۷ء میں مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے، جہاں عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسیؒ، ابراہیم بن المنذرؒ، مطرف بن عبداللہ ابو ثابتؒ، محمد بن عبیداللہؒ اور ابراہیم بن حمزہؒ جیسے بلند مرتبت محدثین درس دے رہے تھے۔ محمد بن اسماعیلؒ نے ان تمام محدثین کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے عطا کیے ہوئے علم کے موتی اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔

اپنی عمر کے اٹھارویں برس میں آپؒ نے "قضایا الصحابہؓ والتابعین" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ آپؒ کی سب سے پہلی تالیف تھی۔ اسی سال آپؒ نے "التاریخ الکبیر" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی۔ اس کتاب کا مسودہ آپؒ نے رسول پاک ﷺ کے روضۂ مبارک اور منبر کے درمیان بیٹھ کر لکھا۔

تاریخ الکبیر میں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ میں سے حدیث کے چالیس ہزار راویوں کے اسمائے گرامی، حروف تہجی کے اعتبار سے درج کیے گئے ہیں۔ اگر کہیں ایک ہی نام کے چند حضرات کا ذکر اکٹھے آیا ہے تو ان کے والد کے ناموں میں حروف تہجی کی ترتیب قائم فرمادی گئی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ "تاریخ الکبیر میں کوئی ایسا نام نہیں جس کے متعلق مجھے کوئی واقعہ یاد نہ ہو لیکن طوالت کے خوف سے یہ واقعات میں نے درج نہیں کیے کہ یہ کتاب نہیں رہے گی بلکہ کتب خانہ بن جائے گی۔"

مدینہ منورہ سے آپؒ بصرہ تشریف لے گئے۔ اس وقت تک آپؒ کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور آپؒ کے غیر معمولی حافظہ کا بڑا چرچا تھا۔ آپؒ کے بصرہ پہنچتے ہی لوگ جوق در جوق آپؒ سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ اس وقت بصرہ میں بڑے بڑے محدثین اور علما کرام موجود تھے جن میں ابوالولید الطیالسیؒ، صفوان بن عیسیٰؒ، ابوعاصم النبیلؒ، محمد بن عرعرہؒ، سلیمان بن حربؒ اور دیگر علما شامل تھے۔ بصرہ کے شیوخ نے بخارا کے نوجوان عالم محمد بن اسماعیلؒ کی آمد پر ایک علمی مجلس کا اہتمام کیا۔ اس مجلس میں آپؒ نے احادیث بیان کیں۔

بصرہ سے آپؒ کا علمی سفر آپؒ کو، کوفہ اور بغداد لے گیا۔ بغداد اس دور میں خلافتِ عباسیہ کا دارالحکومت تھا اور وہاں علوم و فنون کو زبردست ترقی دی گئی تھی۔ کوفہ میں عمر بن حفصؒ، سعید بن حفصؒ، اسماعیل بن ابانؒ، خالد بن مخلدؒ اور دیگر علما کرام سے استفادہ کیا۔ تحصیل علم کا شوق اب آپؒ کو کشاں کشاں بغداد لے آیا جہاں فقہ کے مشہور امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ، شریح بن نعمانؒ، محمد بن عیسیٰ الباغؒ اور محمد بن سائقؒ درس دینے میں مصروف تھے۔ بغداد سے آپؒ نے شام کی راہ لی اور وہاں حیوۃ بن شریحؒ، حکم بن نافعؒ، آدم بن ابی ایاسؒ، ابو نصر اسحاق بن ابراہیمؒ اور یوسف فریابیؒ سے احادیث کا درس لیا۔ اس کے بعد مصر میں یحییٰ بن عبداللہؒ، احمد بن شعیبؒ، احمد بن صالحؒ، سعید بن ابی مریمؒ اور سعید بن کثیرؒ سے علم حاصل کیا۔ غرض یہ کہ حدیث سننے کے لیے آپؒ نے کل عالم اسلام کا سینکڑوں میل طویل سفر کیا۔ اس مبارک سفر کے نتیجے میں سولہ سال کا ایک نوجوان، حدیث کے ایک رفیع الشان اور عظیم المرتبت امام کی حیثیت سے ابھرا، جنھیں دنیا امام بخاریؒ کے نام سے جانتی ہے۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں "میں نے استفادۂ حدیث کے لیے مصر و شام کا دو دو دفعہ سفر کیا۔ چار دفعہ بصرہ اور چھ بار حجاز گیا اور شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کے ساتھ کتنی مرتبہ کوفہ اور بغداد میں گیا۔" بغداد میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ آپؒ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور جب بھی امام بخاریؒ بغداد جا کر وہاں سے لوٹنے کا ارادہ کرتے، امام احمد بن حنبلؒ کی خواہش ہوتی کہ امام بخاریؒ وہاں سے واپس نہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے امام صاحبؒ کو انتہائی حیرت انگیز اور فقید المثال حافظہ سے نوازا تھا۔ آپؒ کو تین لاکھ احادیث یاد تھیں۔ مختلف محدثین اور علما کرام نے آپؒ کے حافظہ کا بار بار امتحان لیا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امام صاحبؒ نے ایک حدیث کا مضمون دوسری حدیث سے ملا دیا ہو، کسی راوی یا حوالے میں کوئی غلطی کی ہو، حتیٰ کہ انھیں جس ترتیب سے احادیث سنانے کو کہا جاتا تھا، وہ اسی ترتیب سے سنا سکتے تھے۔ امام صاحبؒ

Marfat.com

کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار اسّی کے قریب ہے۔ ایک بار بلخ تشریف لے گئے۔ وہاں لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے شیوخ (اساتذہ) کی ایک ایک روایت بیان فرمائیں، آپؒ نے ایک ہزار شیوخ سے ایک ہزار احادیث اسی وقت بیان کر دیں۔ امام صاحبؒ جب بغداد تشریف لے گئے تو اہلِ بغداد نے ان کا امتحان لینا چاہا۔ انہوں نے دس محدثین کو منتخب کیا اور ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی۔ اس مجلس میں امام صاحبؒ کو مدعو کیا گیا۔ باری باری ہر محدث نے دس دس حدیثیں سنائیں لیکن جان بوجھ کر ہر حدیث کی سند اور متن میں کچھ تبدیلی کر دی اور اس طرح سو احادیث آپؒ کے سامنے بیان کی گئیں۔ ہر حدیث کے جواب میں امام صاحبؒ یہی کہتے رہے کہ مجھے معلوم نہیں۔

جب تمام احادیث بیان ہو چکیں تو امام صاحبؒ نے کہنا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے محدث کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "آپ نے سب سے پہلے یہ حدیث بیان کی جو یوں تھی۔" پھر آپؒ نے کہا، "آپ نے حدیث کے بیان میں یہ غلطی کی اور سند میں یہ بات درست نہ تھی۔ اصل حدیث یہ ہے۔" اس طرح آپؒ نے ترتیب وار سو کی سو احادیث بیان فرمادیں۔ پہلے آپؒ محدث کی بیان کردہ حدیث اور اس کی سند بیان کرتے۔ اس کے بعد درست متن اور سند کے ساتھ وہی حدیث بیان کر دیتے۔ آپؒ نے ہر محدث کی بیان کردہ احادیث کو صرف ایک بار سنا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ امام صاحب کے حافظہ میں نقش ہو گئی ہوں۔

ایک بار سمرقند میں چار سو محدثین جمع ہوئے۔ انہوں نے امام صاحبؒ کا ایک ہفتہ تک امتحان لیا۔ کئی احادیث کی اسناد بدل بدل کر آپؒ کے سامنے بیان کیں لیکن امام صاحبؒ نے ہر حدیث صحیح متن اور درست سند کے ساتھ بیان کر دی اور کسی مرحلے، پر آپؒ مغالطہ کا شکار نہ ہوئے۔

امام صاحبؒ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ قضایا الصحابہؓ و التابعین اور تاریخ الکبیر کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، الادب المفرد، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر بہت اچھی کتاب ہے۔ دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں: التفسیر الکبیر، التاریخ الاوسط، الجامع الکبیر، اسامی الصحابہؓ، کتاب المبسوط، الجامع الصغیر فی الحدیث الوالدین، کتاب الکنی، الرقاق، التاریخ الصغیر، المسند الکبیر، کتاب الوحدان، کتاب الاشربہ، خلق افعال العباد، کتاب الفوائد، کتاب الہبات، جزالقرأت خلف الامام، رفع الیدین اور کتاب الضعفاالصغیر۔

ان تمام کتابوں کے ساتھ ساتھ امام صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جامع صحیح بخاری کی تالیف ہے۔ آپؒ نے مسلسل سولہ سال تک نہایت محنت سے احادیث تلاش کیں۔ ان کی اسناد اور متن کی باریک بینی کے ساتھ جانچ پڑتال کی اور چھ لاکھ احادیث میں سے خوب چھان پھٹک کر سات ہزار دو سو پچھتر احادیث منتخب کی ہیں۔

حدیثیں لکھ کر محفوظ کرنے کا سلسلہ تو آنحضرت ﷺ کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا البتہ باقاعدہ تالیفِ حدیث کا اہتمام نہ تھا۔ ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلیفہ بننے پر احادیث کی تدوین کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کا آغاز ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد بڑے بڑے جلیل القدر محدثین بھی اس مبارک فریضہ کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ ان میں حضرت ابن جریجؒ، امام مالکؒ، محمد بن اسحاقؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ جیسے عظیم محدثین اور فقہا شامل تھے۔

تیسری صدی کے اوائل میں احادیث کو صحابہ کرامؓ کی ترتیب کے اعتبار سے جمع کیا گیا۔ اس طرز کے مجموعے کو "مسند" کہتے ہیں۔ اس دور میں امام احمد بن حنبلؒ، حافظ حسن بن احمدؒ، عبید اللہ بن موسیٰؒ، یعقوب بن شیبہؒ جیسے پائے کے فقہا اور محدثین سامنے آتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی جمع کردہ احادیث بھی بعد میں مرتب کی گئیں۔

تیسری صدی ہجری ہی میں تدوینِ حدیث کا کام بہت اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا اور صحیح احادیث کو یکجا کرنے میں اس دور کے محدثین نے بڑا کام کیا۔ محدثین کے اس کارواں کے قائد امام بخاریؒ تھے۔ امام بخاریؒ نے جب احادیث کا مطالعہ کیا تو آپؒ نے محسوس کیا کہ احادیث کے مجموعوں میں بہت سی ضعیف روایات بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اسی دوران آپؒ کے محترم استاد حضرت شیخ الحدیث اسحاق بن راہویہؒ نے خواہش ظاہر کی کہ کیا ہی اچھا ہو آپؒ ایسی کتاب مرتب کریں جس میں رسول پاک ﷺ کی صرف صحیح احادیث ہوں۔ یہ بات امام بخاریؒ کے دل میں بیٹھ گئی۔ پھر آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ آپؒ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ آپؒ کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کی مدد سے آپؒ، حضور ﷺ پر سے مکھیوں کو ہٹا رہے ہیں۔ امام صاحبؒ نے علمائے کرام سے اس خواب کی تعبیر معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ آپ رسول پاک ﷺ سے منسوب جھوٹی احادیث کو صحیح احادیث سے الگ کر دیں گے۔ اس خواب نے امام صاحبؒ کے دل میں بھڑکنے والی آتش شوق کو

Marfat.com

اور تیز کر دیا اور آپؒ تن من دھن سے احادیث نبویؐ کی تدوین و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

امام صاحبؒ سفر میں رہے یا قیام کی حالت میں، آپؒ جامع صحیح کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہے۔ آپ ﷺ نے ہر باب کے تحت احادیث کا اندراج ایک بار تو حرم پاک میں انجام دیا اور دوسری مرتبہ مسجد نبویؐ میں منبر و محراب کے درمیان۔ سولہ سال کی مسلسل ریاضت اور محنت کے بعد امام صاحبؒ نے بالآخر بالکل صحیح اور مستند احادیث کا مجموعہ ترتیب دے لیا۔ اس مجموعے میں سات ہزار دو سو پچھتر احادیث ہیں جنہیں، امام صاحبؒ نے چھ لاکھ احادیث میں سے منتخب کر کے لکھا ہے۔ ہر حدیث کو اپنی کتاب میں درج کرنے سے قبل آپؒ نے اس کے متن، راویوں اور حوالوں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی لیکن ان ۷۲۷۵ احادیث میں سے ہر ایک کو اپنی کتاب میں شامل کرنے سے قبل آپؒ نے ہر بار غسل فرمایا، دو رکعت نفل نماز ادا کی پھر اس حدیث کی صحت کے بارے میں استخارہ کیا اور جب اللہ کی طرف سے ان کے دل کو اطمینان بخش دیا گیا، تب انہوں نے اس حدیث کو اپنی کتاب میں درج فرمادیا۔ جب امام صاحبؒ نے اپنی جامع صحیح، امام احمد بن حنبلؒ، علی بن مدینیؒ اور یحییٰ بن معینؒ جیسے مشہور شیوخ کے سامنے پیش کی تو سب نے اس کی بہت تعریف کی اور اس کتاب کی صحت کی گواہی دی۔ اس کتاب کو ۹۰ ہزار افراد نے امام بخاریؒ سے براہ راست پڑھا ہے۔ صحیح بخاری محض احادیث کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کو فقہی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں کئی حکیمانہ باتیں شامل ہیں۔ امام نوویؒ کے بقول، امام بخاریؒ کا مقصد احادیث سے مسائل کا استنباط (نتیجہ نکالنا) ہے، یہی وجہ ہے کہ امام صاحبؒ نے ایک ہی متن کی حدیث کو کئی بابوں میں درج کیا ہے تاکہ ایک ہی حدیث سے نکلنے والے کئی مطالب اور مسائل کی نشاندہی کی جاسکے۔

صحیح بخاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی ہجری سے آج پندرہویں صدی ہجری تک صحیح بخاری پر علماکرام کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کی شرحیں لکھی گئیں ہیں، اس کے مشکل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں اور اس کے رجال پر تحقیق کی گئی ہے۔

امام بخاریؒ کے والد محترم اسماعیل بن ابراہیمؒ کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا تھا۔ انہوں نے ورثے میں اپنے بیٹے کے لیے کثیر رقم اور دیگر اشیا چھوڑی تھیں۔ امام صاحب نے مضاربت (یعنی نفع میں شریک بنا کر کسی کو تجارت کے لیے مال دینا) کو ترجیح دی۔ اس طرح آپؒ کو درس و تدریس کے لیے وقت مل گیا۔

آپؒ کی طبیعت میں تقویٰ، زہد، انکسار، سخاوت اور رحم دلی جیسے اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ایک بار آپؒ کے ایک شاگرد ابو حفصؒ نے آپؒ کی خدمت میں کچھ مال بھیجا۔ شام کے وقت چند تاجر آگئے اور انہوں نے کچھ رقم دے کر یہ مال خریدنا چاہا، امام صاحب نے فرمایا کہ میں صبح کے وقت بات کروں گا۔ دوسرے دن کچھ اور تاجر آگئے اور انہوں نے پہلے تاجروں کی پیشکش سے دگنی رقم دے کر مال خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ امام صاحبؒ چاہتے تو اس پیشکش سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ایسا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، کیونکہ پہلے تاجروں سے امام صاحبؒ نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن امام صاحبؒ کے تقویٰ کی بلندی ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے فرمایا، ”میں پہلے تاجروں کے ہاتھ مال فروخت کرنے کی نیت کر چکا ہوں اور میں اپنی نیت توڑنا پسند نہیں کرتا۔“

آپؒ اپنی ذات کی حد تک بے حد سادگی پسند تھے، معمولی غذا اور سادہ لباس پسند فرماتے تھے مضاربت کی جو بھی آمدنی وصول ہوتی اسے محدثین، علم دین کے طلبہ، فقرا اور مساکین پر صرف کرتے۔ ایک بار ایک مضارب (شریکِ تجارت) نے آپؒ سے پچیس ہزار درہم کی رقم لی اور واپس نہ کی۔ جب زیادہ عرصہ گزر گیا تو وہ خود پریشان ہو کر ایک مقام آمل پہنچ گیا۔ امام صاحبؒ کے شاگردوں نے بتایا کہ وہ شخص آمل میں ہے اس سے رقم لے لیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، ”قرض دار کو پریشانی میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔“ قرض دار وہاں سے بھاگ کر خوارزم چلا گیا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ خوارزم کے والی (گورنر) کو ایک خط لکھ دیں، حکومت خود اس شخص سے رقم نکلوا لے گی۔ امام صاحبؒ نے انکار کر دیا۔ آخر آپؒ کے شاگردوں نے آپؒ کے علم میں لائے بغیر ایک خط آمل کے والی، ابی مسلم کاشانی کو لکھ دیا کہ اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے۔ امام صاحبؒ کو خبر ملی تو آپؒ بہت رنجیدہ ہوئے، فرمایا، ”تم مجھ سے زیادہ میرے خیر خواہ نہ بنو۔“ اسی وقت خوارزم میں موجود اپنے کسی شاگرد کو خط لکھا کہ ”میرے قرض دار سے کوئی باز پرس نہ کی جائے۔“ وہ شخص خوارزم سے مرو چلا گیا۔ وہاں بھی کچھ تاجروں کو اطلاع مل گئی کہ یہ شخص امام صاحبؒ کی رقم لے کر واپس نہیں کر رہا

Marfat.com

ہے۔ حکومت نے بھی کچھ سختی کی۔ امام صاحبؒ نے اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا۔ آخر انہوں نے یہ کہہ کر اس معاملے کو ختم کر دیا کہ یہ شخص دس درہم ماہانہ ادا کر دیا کرے۔

امام صاحبؒ بہت منکسر المزاج تھے۔ محمد بن حاتم وراقؒ، آپؒ کے ایک خاص شاگرد تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار امام صاحبؒ بخارا کے قریب سرائے بنوا رہے تھے اور خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر مزدوروں کو دے رہے تھے۔ وراقؒ کہتے ہیں کہ ایک بار سفر میں، میں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ رات کو پندرہ بیس بار اٹھے، خود چراغ روشن کیا۔ کچھ احادیث پر نشانات لگائے اور پھر لیٹ گئے۔ میں نے درخواست کی کہ آپؒ مجھے حکم دے دیا کریں۔ میں اٹھ کر چراغ روشن کر دیا کروں گا لیکن امام صاحبؒ نے فرمایا "تم جوان ہو اور گہری نیند سوتے ہو، میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

امام صاحبؒ کی زندگی ایک سچے مسلمان کی تصویر تھی۔ آپؒ اپنے رب سے تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے ہر دم کوشاں رہتے تھے۔ آپؒ بہت زیادہ نوافل پڑھنے والے، راتوں کو اپنے آقا کے حضور کھڑے رہنے والے اور قرآن کریم کی بہت زیادہ تلاوت کرنے والے تھے۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو نہایت خشوع و خضوع سے تلاوت فرماتے۔ ایک دن نماز ظہر ادا کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ "میری قمیص میں کچھ ہے تو نہیں؟" ساتھیوں نے قمیص اٹھا کر دیکھی تو ایک بھڑ برآمد ہوئی۔ اس بھڑ نے آپ کے بدن پر جگہ جگہ ڈنک مارا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ نماز توڑ دیتے۔ آپ نے فرمایا، "میں ایک ایسی سورۃ پڑھ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا پہلے اسے ختم کرلوں۔"

آپؒ نہایت خلیق، بردبار اور درگزر کرنے والے تھے۔ برائی کا بدلہ ہمیشہ نیکی سے دیا کرتے تھے۔ کسی شخص کی اصلاح کرنا ہوتی تو سرعام کبھی ملامت نہ کرتے۔ ایک بار مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی سے تنکا الگ کر کے مسجد میں ڈال دیا۔ امام صاحبؒ نے وہ تنکا چپکے سے اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لیا اور بعد میں اسے مسجد سے باہر پھینک دیا۔

امام صاحبؒ انسانی مساوات کے قائل تھے۔ اسلام کی تعلیم یہی ہے۔ جب آپؒ نے بخارا میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا تو بخارا کے گورنر نے امام صاحبؒ کو پیغام بھجوایا کہ امام صاحبؒ میرے گھر آ کر میرے بیٹے کو پڑھا دیا کریں۔ امام صاحبؒ نے جواب دیا کہ جس شخص کو پڑھنے کی ضرورت ہو اسے میرے درس میں آنا چاہیے۔ گورنر نے کہا کہ میرا لڑکا درس میں ضرور آئے گا لیکن وہ عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں پڑھے گا، آپ اسے الگ بیٹھ کر پڑھائیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا "میں کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سننے سے نہیں روک سکتا۔"

امام صاحبؒ نے اپنے استاد امام وکیعؒ کے مقولے پر عمل فرمایا کہ "آدمی اس وقت تک محدث نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بڑوں، ہم عصروں اور چھوٹوں سے استفادہ نہ کرے۔" چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنے ہم عصروں اور شاگردوں سے بھی روایت کی ہے۔

امام صاحبؒ سے براہ راست نوّے ہزار افراد نے جامع صحیح بخاری کو سنا۔ آپؒ کی مجلسِ درس کبھی مسجد میں اور کبھی آپؒ کی رہائش گاہ پر ہوتی تھی۔ آپؒ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور ان میں کئی نامور محدثین شامل ہیں۔ حدیث کی چھ صحیح کتابیں "صحاح ستّہ" کہلاتی ہیں۔ ان میں سے تین کتابوں کے مرتبین یعنی امام مسلم بن حجاجؒ، امام ابو عبدالرحمٰن نسائیؒ، اور امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ کو آپؒ کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

امام صاحبؒ جہاں ایک بلند پایہ محدث و فقیہ تھے وہیں ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ آپؒ کے کلام میں عارفانہ رنگ جھلکتا ہے۔ امام صاحبؒ کو تیر اندازی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپؒ کبھی کبھی تیر اندازی کے لیے احباب کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ایک بار اسی طرح دوستوں کے ساتھ نکلے۔ تیر اندازی کی مشق ہونے لگی۔ امام صاحبؒ کا ایک تیر اتفاق سے ایک نہر پر بنے ہوئے پل پر جا لگا اور اس سے پل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ امام صاحبؒ نے پل کے مالک حمید بن الاخضر کو پیغام بھجوایا کہ "میرے تیر سے آپ کے پل کو نقصان پہنچا ہے۔ آپ اس کا ہرجانہ لے لیں۔" حمید بن الاخضر نے جواب میں کہلوایا کہ "امام صاحبؒ کو میرا سلام کہیں اور انہیں بتائیں کہ میرا کل مال اور ساری دولت آپؒ پر قربان ہے۔" امام صاحبؒ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں آپؒ نے سو درہم مستحقین میں تقسیم فرمائے۔

امام بخاریؒ کے زمانے میں بصرہ، بغداد، نیشاپور، سمرقند اور بخارا علوم اسلامیہ کے مراکز تھے۔ آپؒ ان شہروں میں بار بار گئے، ہر بار آپؒ کے عقیدت مند آپؒ کا والہانہ خیر مقدم کرتے تھے۔ آپؒ حلقۂ درس قائم کرتے اور احادیث املا کرواتے۔ ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء میں آپؒ

Marfat.com

بخارا سے سمرقند روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک بستی خرتنگ میں قیام کیا جہاں آپؒ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ اس دوران سمرقند والوں کو آپؒ کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ انہوں نے آپؒ کو ساتھ لے جانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔ امام صاحبؒ نے جانے کی تیاری کی۔ عمامہ باندھا، موزے پہنے، سواری طلب کی لیکن سواری کی طرف چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ فرمایا "ضعف بڑھتا جارہا ہے، مجھے چھوڑ دو" آپؒ لیٹ گئے۔ آپؒ کی زبانِ مبارک پر اللہ کی حمد وثنا، اور دعائیں جاری ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد آپؒ سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ یہ یکم شوال/یکم ستمبر کی رات تھی۔ یعنی اگلے روز عید الفطر تھی جو خوشیوں بھرا دن ہوتا ہے لیکن آپؒ کے جسدِ خاکی کے اطراف چہرے سوگوار تھے، آنکھیں اشکبار تھیں۔ عید کے دن نمازِ ظہر کے بعد آپؒ کو خرتنگ ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپؒ نے تقریباً ۶۲ سال کی عمر پائی۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ "دفن کیے جانے کے بعد امام بخاریؒ کی قبر سے بہت اچھی خوشبو پھوٹی، جس سے فضا مہک اٹھی۔ لوگ دور دور سے اس مٹی کو حاصل کرنے کے لیے آنے لگے حتیٰ کہ مٹی کی حفاظت کے لیے قبر کے گرد احاطہ بنادیا گیا۔"

***

Marfat.com

حضرت امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ

حدیث نبویؐ کی چھ مستند ترین کتب میں سے ایک "سنن ابی داؤد" کے مؤلف

دروازے پر دستک ہوئی۔

خادم نے جاکر دروازہ کھولا۔ دروازے پر، شہر کے حاکم کھڑے تھے۔ اس وقت آفتاب دن بھر کا سفر مکمل کرکے افق کے پار روپوش ہوچکا تھا اور رات سیاہ آنچل پھیلائے زمین پر اتر آئی تھی۔ مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد لوگ کچھ دیر پہلے گھروں کو واپس لوٹے تھے۔

حاکم نے صاحب خانہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

خادم اندر چلا گیا، اس نے صاحب خانہ سے عرض کی: "حاکم شہر تشریف لائے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔"

"انہیں اندر لے آئیں۔" صاحب خانہ نے کہا۔

حاکم شہر اندر آئے اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔

صاحب خانہ نے جو ایک پُرسکون اور متین چہرے والے بزرگ تھے، نرمی سے پوچھا: "کہیے، کون سی ضرورت، اس وقت، امیر شہر کو یہاں لے آئی ہے؟"

"مجھے آپ سے تین درخواستیں کرنی ہیں۔" حاکم شہر کہہ رہے تھے۔

"ایک تو یہ کہ آپ بصرہ منتقل ہو جائیں اور وہاں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف ملکوں سے آنے والے طلبہ آپ سے استفادہ کرسکیں۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ آپ میرے لڑکوں کو کتاب السنن کی تعلیم دیجیے، اور تیسری یہ ہے کہ آپ میرے صاحب زادوں کو الگ سے تعلیم دیجیے کیوں کہ امرا اور سلاطین کے بچے، عوام کے بچوں کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔"

حاکم شہر نے اپنی بات مکمل کی تو بزرگ گویا ہوئے: "آپ کی پہلی دو درخواستیں تو مناسب ہیں لیکن تیسری بات مناسب نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہوسکتا کیوں کہ علم کے معاملے میں عام آدمی کی اولاد اور امرا اور سلاطین کی اولاد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ان میں امتیاز نہیں برتا جاسکتا۔"

حاکم شہر نے یہ واضح اور دوٹوک جواب سنا تو خاموشی سے واپس چلے گئے۔

بہت جلد، بزرگ بصرہ منتقل ہوگئے جہاں دور دور سے آنے والے طلبہ آپ سے اکتسابِ فیض کرنے لگے۔ آپ کے تلامذہ میں حاکم شہر کے صاحب زادے بھی شامل تھے۔ ان کے لیے الگ سے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ وہ عام لوگوں کے بچوں کے ساتھ درس میں شریک ہوتے تھے۔

یہ بزرگ تھے جلیل القدر محدث اور بلند پایہ فقیہ حضرت امام ابوداؤدؒ جنہوں نے شہر بغداد کے حاکم ابواحمد موفق کی یہ خواہش پوری کرنے سے انکار فرمادیا تھا کہ وہ ان کے صاحب زادوں کو خاص طور پر الگ تعلیم دینے کا اہتمام فرمائیں۔ امام ابوداؤد کی تالیف کردہ احادیثِ نبویؐ کی کتاب، سنن ابی داؤدؒ حدیث کی چھ مستند کتابوں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤدؒ، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ) میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کی تدوین، امام ابوداؤدؒ کا بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ اور امتِ مسلمہ پر عظیم احسان ہے۔

آپؒ کا نام سلیمان بن اشعث ہے، لیکن آپؒ اپنی کنیت ابوداؤد سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپؒ قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۰۲ھ / ۸۱۷ء میں سجستان میں پیدا ہوئے۔ "سجستان" دراصل خراسان کے علاقے سیستان کا عربی تلفظ ہے۔ بعض مؤرخین نے سجستان یا سجستانہ کو بصرہ کا ایک نواحی گاؤں قرار دیا ہے، لیکن بیشتر مؤرخین کا اتفاق اس پر ہے کہ امام ابوداؤدؒ بصرہ میں جاکر آباد ضرور ہوگئے تھے، لیکن بصرہ کے قریبی گاؤں سجستان میں آپؒ کی پیدائش نہیں ہوئی بلکہ آپؒ کی جائے

Marfat.com

پیدائش وہ سجستان ہے جو سندھ اور ہرات کے درمیان، قندھار کے قریب واقع ہے۔ سجستان سے نسبت رکھنے کی وجہ سے آپؒ کے نام کے ساتھ "سجستانی" یا "سجزی" بھی لگادیا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد امام ابوداؤدؒ کی توجہ علمِ حدیث پر مرکوز ہوگئی۔ اس زمانے میں احادیثِ نبویؐ کی سماعت اور روایت پر خصوصی توجہ دی جارہی تھی، تاکہ آنحضرت رسولِ اقدس ﷺ کے تمام کے تمام ارشاداتِ گرامی کو مکمل صحت کے ساتھ محفوظ کیا جاسکے۔ زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں سرورِ دوعالم ﷺ کی ہدایات مرتب شکل میں لوگوں تک پہنچ سکیں اور ان ہدایات میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔

امام ابوداؤدؒ نے احادیثِ نبویؐ کے حصول کے لیے دور دور تک سفر فرمائے۔ آپؒ کو جہاں کہیں مشائخ حدیث کے بارے میں علم ہوا، آپؒ تکالیف جھیل کر اس مقام پر پہنچے اور ان مشائخ سے احادیث کی سماعت کی۔ اس زمانے میں ذرائع آمدورفت محدود تھے اور سفر کرنا بے حد دشوار تھا، لیکن امام صاحبؒ نے بصرہ، بغداد، حجاز، مصر، شام، جزیرہ، نیشاپور، مرو، اصفہان اور بہت سے دیگر علاقوں تک سفر کیے۔

امام ابوداؤدؒ نے علمِ حدیث میں کمال حاصل کرنے کے لیے جتنی محنت فرمائی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے اساتذۂ کرام کی تعداد ۳۰۰ کے قریب ہے۔ ان اساتذۂ کرام میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور ابو ثورؒ جیسے بلند مرتبت فقہا اور حضرت ابوبکر بن ابی شیبہؒ، ہشام بن عبدالمالک طیالسیؒ، یحییٰ بن معینؒ اور عثمان بن ابی شیبہؒ جیسے جید محدثین شامل ہیں۔ آپؒ کے دیگر محترم اساتذہ میں حیوۃ بن شریحؒ، خلف بن ہشام بغدادیؒ، سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقیؒ، عبداللہ بن رجا بصریؒ، ربیع بن نافع حلبیؒ، قتیبہ بن سعیدؒ اور بہت سے جید فقہا کرام اور نامور محدثین و علما کرام شامل ہیں۔

امام ابوداؤدؒ کے تلامذہ میں بھی بڑے بڑے محدثین اور علما کرام شامل ہیں۔ صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ مستند ترین کُتب کے دو مؤلفین امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ نے بھی آپؒ سے فیض حاصل کیا ہے۔ امام ابوداؤدؒ کے شاگردوں میں آپؒ کے صاحب زادے ابوبکر بن ابی داؤدؒ بھی شامل ہیں۔ سنن روایات کرنے والے تلامذہ میں ابوعمرو احمد بن علی بن حسن بصریؒ، ابو علی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤیؒ، ابو سعید احمدؒ وغیرہ، دیگر کتب روایت کرنے والوں میں ابو عبداللہ محمد بن احمدؒ (کتاب الرد علیٰ اہل القدر کے راوی)، ابو بکر احمد بن سلیمانؒ (کتاب الناسخ والمنسوخ کے راوی)، اسماعیل بن محمد صفارؒ (مسند مالک کے راوی) شامل ہیں۔ آپؒ کے تلامذہ میں چار زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ ایک تو خود آپؒ کے صاحب زادے حضرت ابوبکرؒ ہیں۔ دیگر تین تلامذہ یہ ہیں: ابو علی لؤلؤیؒ، ابن داسہؒ اور ابن اعرابیؒ۔

امام ابوداؤدؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت ہی اچھے حافظے، ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بین نظر اور بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کو صحیح، قوی، ضعیف، مشہور، منکر، حسن، موضوع، ہر طرح کی روایات کو پرکھنے میں کمال حاصل تھا۔ آپؒ جس دور میں علمی اور تحقیقی کام فرما رہے تھے، اس دور میں احادیثِ نبویؐ کی لاکھوں روایات کی چھان بین کا کام جاری تھا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ ہر راوی کی نہ صرف بیان کردہ روایات کی مکمل تحقیق کی جاتی تھی بلکہ راوی کی سیرت و کردار، اس کے ذرائع آمدنی اور مصروفیات وغیرہ کے بارے میں بھی پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد روایت کو درست مانا جاتا تھا۔ امام ابوداؤدؒ نے یہ کٹھن کام نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے انجام دیا۔

امام ابوداؤدؒ کی قدر و منزلت اور آپؒ کی مثالی صلاحیتوں کا دیگر بڑے محدثین بھی اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت احمد بن محمد بن یاسین ہرویؒ کے مطابق: "امام ابو داؤدؒ ان محدثین میں سے ہیں جو حدیثِ نبویؐ کے علم، علل و اسناد کے حافظ اور حدیثِ نبویؐ کے شہ سواروں میں سے ہیں۔" حضرت ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ "حضرت ابوداؤدؒ کو احادیث پر اسی طرح دسترس حاصل ہوگئی تھی جس طرح حضرت داؤدؑ کو لوہے پر دسترس حاصل تھی۔"

امام ابوداؤدؒ کی شہرت گو کہ محدث ہونے کی وجہ سے ہے، لیکن آپؒ فقہ اور اجتہاد میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے۔ بعض علماکرام کے مطابق صحاح ستہ کے مؤلفین میں اجتہاد اور فقہ کے لحاظ سے امام بخاریؒ کے بعد امام ابوداؤدؒ کا درجہ سب سے بلند ہے۔ فقہ سے امام ابوداؤدؒ کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ آپؒ نے احادیثِ نبویؐ کا جو مجموعہ مرتب فرمایا اس میں صرف احکام سے متعلق احادیث درج فرمائیں۔

امام ابوداؤدؒ نہایت جلیل القدر محدث، عالم، فقیہ، مفسر اور متعدد علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار تھے۔ آپؒ بہت سادہ مزاج تھے۔ شریعت کے احکام اور سنتِ نبویؐ کی سختی سے پابندی فرماتے تھے، اور خلافِ شریعت کام ہوتے

Marfat.com

دیکھ کر آپؒ کو بڑی تکلیف پہنچتی تھی۔

امام ابو داؤدؒ کے مزاج کی سادگی اور تقویٰ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے کُرتے کی ایک آستین تنگ تھی اور ایک کشادہ تھی۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپؒ نے فرمایا "ایک آستین اس لیے کشادہ ہے کہ اس میں، میں اپنی کتاب کے کچھ اجزا رکھ لوں اور دوسری کو کشادہ کرنا میرے نزدیک اسراف بے جا ہے، اس لیے اس کو تنگ ہی رکھا ہے۔"

ائمہ کرام کا کہنا ہے کہ امام ابو داؤدؒ اپنی عادات اور سیرت کے اعتبار سے اپنے استاد مکرم حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے ملتے جلتے تھے۔

آپؒ کے علم سے فیض یاب ہونے اور آپؒ کی خدمت میں رہ کر اپنی سیرت و کردار کو سنوارنے کے خواہش مندوں کا ہجوم آپؒ کی اقامت گاہ پر رہتا تھا۔ ان میں عام افراد کے علاوہ بڑے بڑے محدثین، فقہا اور علما کرام شامل تھے۔

امام ابو داؤدؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ شہرت "سنن ابی داؤد" کو حاصل ہوئی۔ اس عظیم کتاب کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا۔ آپؒ کی دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب الرد علی اھل القدر: اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں مسئلہ جبر و قدر پر اظہار خیال کیا گیا ہو گا۔ امام صاحبؒ کے شاگرد ابو عبد اللہ بصریؒ اس کتاب کے راوی ہیں۔

۲۔ کتاب الناسخ والمنسوخ: اس کتاب کا نام اس بات کا غماز ہے کہ اس میں ناسخ اور منسوخ آیات پر بحث ہو گی۔ امامؒ صاحب کے شاگرد ابو بکر احمد نجادؒ اس کے راوی ہیں۔

۳۔ کتاب المسائل: اس کتاب میں امام ابو داؤدؒ نے وہ تمام سوالات اور ان کے جوابات درج فرمائے ہیں جو آپؒ نے اپنے استاد حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے کیے تھے۔

۴۔ مُسنَدِ مالکؒ: حضرت ابو داؤدؒ نے یہ کتاب غالباً طرسوس میں اپنے ۲۰ سالہ قیام کے دوران تحریر فرمائی۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امام مالکؒ کی مسانید پر مشتمل ہو گی۔

۵۔ کتاب المراسیل: یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ قیاس ہے کہ ۵۶ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں، مرسل روایتوں کا بیان اور ان پر بحث ہو گی۔

۶۔ کتاب المصابیح اور کتاب المصاحف: ان کتابوں کے بارے میں مؤرخین کے مابین اختلاف ہے۔ ملا چلپی کے مطابق یہ کتب امام صاحبؒ کے صاحب زادے حضرت ابو بکر کی تصانیف ہیں، لیکن ابن ندیم کا کہنا ہے کہ یہ امام ابو داؤد ہی نے تصنیف فرمائی ہیں۔

۷۔ کتاب البعث والنشور: خیال ہے کہ اس کتاب میں موت کے بعد حاصل ہونے والی آخرت کی زندگی پر بحث کی گئی تھی۔

۸۔ کتاب التفسیر: یہ کتاب امام ابو داؤدؒ نے امام ابو جعفر طبریؒ کی مشہور تفسیر کے زمانے میں لکھی تھی۔

۹۔ کتاب نظم القرآن

۱۰۔ کتاب فضائل القرآن

۱۱۔ کتاب شریعۃ التفسیر

۱۲۔ کتاب شریعۃ المقاری۔

ان تمام کتابوں میں سے صرف سنن ابو داؤد دستیاب ہے۔ بقیہ کتابیں غالباً طبع نہیں ہو سکیں یا نایاب ہیں۔ البتہ مؤرخین نے ان کے تذکرے کیے ہیں۔

امام ابو داؤدؒ کا سب سے بڑا کارنامہ سنن ابی داؤد کی تدوین ہے۔ اس کتاب کو امام صاحبؒ نے بے پناہ محنت، دیدہ ریزی اور بھرپور تحقیق کے بعد مرتب فرمایا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ امام صاحبؒ نے پہلے پانچ لاکھ احادیث جمع فرمائیں پھر ان میں سے ایک ایک حدیث کے بارے میں تحقیق کر کے ۴۸۰۰ احادیث کا انتخاب فرمایا۔

سنن ابی داؤدؒ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف احکام اور مسائل سے متعلق روایات پر مشتمل ہے۔ امام ابو داؤد سے قبل احادیث کی جو کتابیں مرتب کی گئی تھیں وہ "جامع" یا "مسند" کہلاتی تھیں۔ ان میں سنن، احکام، تفسیر، اخبار، قصص، آداب، ہر قسم کی روایتیں شامل تھیں۔ لیکن سب سے پہلے امام ابو داؤد نے صرف احکام پر مشتمل احادیث کو مرتب فرمایا۔ آپؒ خود فرماتے ہیں کہ "میں نے سنن میں صرف احکام سے متعلق روایات جمع کی ہیں۔ زہد اور فضائل اعمال کی احادیث اس میں نہیں ہیں۔"

سنن ابی داؤد، فقہ اور احکام کے استنباط کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب ہے۔ امام صاحبؒ نے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں مختلف اسناد اور مختلف احادیث کے متن کو جمع کر دیتے ہیں اور ہر حدیث کے الفاظ کو الگ الگ بیان فرماتے ہیں۔ امام صاحبؒ

Marfat.com

نے حتی الامکان تکرار سے گریز کیا ہے۔ ایک ہی مضمون کی احادیث صرف اس وقت شامل کی ہیں، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔ آپؒ نے طویل حدیثوں کو مختصر کر کے بھی شامل کیا ہے۔

امام صاحبؒ نے ۱۸۷۱ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں موضوعات کی جامعیت کا خیال رکھنے کے ساتھ حُسنِ ترتیب کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

امام صاحبؒ نے راویوں کے ناموں، کنیتوں اور القابات کے بارے میں پیدا ہونے والے ابہام کی تفصیل اور وضاحت بھی درج فرمائی ہے۔ راویوں کی ثقاہت (قابل اعتبار ہونے) کی نشاندہی کی ہے اور روایات کے حسن وقبح اور صحت کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ امام ابوداؤدؒ ایک کامل مجتہد اور فقیہ بھی تھے، انہوں نے احادیث کو مختلف ابواب کے تحت اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ محض باب کے عنوان سے احکام اور احادیث کا منشا معلوم ہو جاتا ہے۔ امام ابوداؤدؒ کی منتخب کردہ روایات، علماکرام اور فقہا کے باہمی اختلافات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے عراق، مصر، بلادِ مغرب اور دیگر بہت سے علاقوں میں سنن ابی داؤد کو بے حد مقبولیت حاصل رہی۔

امام صاحبؒ نے سنن ابی داؤدؒ کا بیشتر حصہ بغداد میں مرتب فرمایا۔ یہ عظیم کتاب ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء سے پہلے مکمل ہو چکی تھی، کیونکہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا انتقال ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء میں ہوا تھا، اور جب امامؒ ابوداؤد نے اپنی سنن کی تالیف مکمل کر لی تو انہوں نے یہ کتاب اپنے استادِ مکرم حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں ملاحظہ کے لیے پیش کی تھی۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کتاب کو بہت پسند فرمایا تھا۔ امام ابوداؤدؒ کی منتخب کردہ روایات کے مستند ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے استادِ محترم حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بھی آپؒ کے حوالے سے ایک حدیث روایت فرمائی ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے سنن ابی داؤدؒ کو مرتب کرتے ہوئے جس غیر معمولی احتیاط سے کام لیا، اس کی تفصیل امام صاحبؒ کے اس رسالے میں ملتی ہے جو آپؒ نے سنن کے متعلق اہل مکہ کے دریافت کرنے پر تحریر فرمایا تھا۔ "رسالہ مکیہ" کے نام سے مشہور اس رسالے میں آپؒ فرماتے ہیں: "آپ لوگوں نے مجھ سے کتاب السنن کی احادیث کے متعلق پوچھا کہ آیا یہ میرے علم کے مطابق صحیح ترین حدیثیں ہیں؟ سو، یہ تمام ایسی ہیں۔ البتہ وہ حدیث جو دو صحیح طریقوں سے روایت کی گئی ہو اور ان میں سے ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہو (یعنی اس کی سند بہتر ہو اور واسطے کم ہوں) اور دوسری کا راوی حفظ میں بڑھا ہوا ہو، تو ایسی صورت میں، میں کبھی پہلے طریقے کو لکھ دیتا ہوں، حالانکہ میرے خیال میں مجھے ایسی دس احادیث بھی اپنی کتاب میں معلوم نہیں ہوتیں۔ میں نے جب کسی باب میں کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دوہرایا ہے تو اس وجہ سے کہ اس میں کوئی بات زائد تھی۔

بعض اوقات میں نے ایک طویل حدیث کو مختصر کر کے ذکر کیا ہے، کیوں کہ پورا نقل کرنے کی صورت میں پڑھنے والوں کو فقہ کا مسئلہ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ رہیں مرسل احادیث، تو جب تک کوئی مسند روایت، مرسل روایت کے خلاف موجود نہ ہو اور مسند روایت نہ پائی جائے تو ایسی صورت میں مرسل روایت کو بھی مانا جائے گا۔ لیکن وہ قوت میں متصل روایت کے برابر نہیں ہے۔ ("مرسل" اس حدیث کو کہتے ہیں جسے کوئی محدّث، مسلسل اسناد کے ساتھ تابعی تک لے جائیں اور پھر وہ تابعیؒ کسی صحابیِ رسولؐ کا نام لیے بغیر اس کو آنحضرت ﷺ سے روایت فرمائیں۔ اور "مسند" اس حدیث کو کہا جاتا ہے، جو ثقہ راویوں کے ایسے سلسلے کے ذریعے آنحضرت ﷺ سے روایات کی گئی ہو، جو درمیان میں کہیں پر ٹوٹا نہ ہو)۔

یہ ایسی کتاب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو سنت بھی ٹھیک اسناد کے ساتھ آپ کو ملے گی، وہ اس میں موجود ہو گی۔ امام ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مسائل کی بنا ان ہی احادیث پر ہے۔ تاہم، مجھے یہ بات پسند ہے کہ اس کتاب کے ساتھ صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فتاویٰ کو بھی قلم بند کر لیا جائے، نیز کوئی ایسی کتاب بھی نقل کر لی جائے جیسی کہ امام سفیان ثوریؒ کی جامع ہے۔"

امام ابوداؤدؒ نے فرمایا: "سنن میں ۴۸۰۰ احادیث شامل ہیں جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں۔ میں نے اپنے علم اور یقین کے مطابق صحیح بلکہ اصح روایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے، جو سند کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ درجے کی ہیں۔"

امام ابوداؤدؒ پہلے ایسے محدث ہیں جنہوں نے اپنی احادیث کے ساتھ مفصل حواشی تحریر فرمائے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں: "میں نے اپنی کتاب میں ان احادیث کی وضاحت کر دی ہے جو ضعیف ہیں اور جن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، وہ اچھی (صالح) ہیں۔" امام ابوداؤد کے مفصل حواشی کے باعث آپؒ کے شاگرد امام ترمذیؒ کے لیے ان احادیث پر فرداً فرداً زیادہ منظم طریقے سے جائزے و تبصرے کا راستہ

Marfat.com

کھل گیا۔

امام ابوداؤدؒ کی سنن ابی داؤد، اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں نہیں۔ سنن ابی داؤد کے بارے میں نامور محدثین اور مؤرخین نے تحسین آمیز کلمات ادا کیے ہیں۔ مشہور عالم و فلسفی حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ”علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔“

علامہ احمد بن محمد الخطابیؒ نے اپنی مشہور کتاب معالم السّنن (شرح سنن ابی داؤد) میں لکھا ہے: ”سنن ابی داؤد ایک عمدہ کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔“ حافظ ابن جوزیؒ جیسے محتاط اور سخت تنقید کرنے والے فقیہ تک نے لکھا ہے: ”وہ کبار محدثین اور علما میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان جیسی کتاب السّنن کسی اور نے پہلے نہیں لکھی ہے۔“

امام ابوداؤدؒ نے اپنی کتاب سنن ابی داؤد کے بارے میں فرمایا: ”میرے اس منتخب مجموعۂ احادیث میں چار حدیثیں ایسی ہیں جو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں:

۱۔ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

۲۔ کسی شخص کے اچھے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے۔

۳۔ کوئی شخص اس وقت تک مکمل طور پر مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۴۔ حلال اور حرام دونوں ظاہر ہیں اور ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں۔ پس جو فرد ان مشتبہ چیزوں سے بچتا رہے، اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا۔

علامہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ امام ابوداؤد کے قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”مردِ عاقل کے لیے یہ چار احادیث استاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ عبادات کی درستی کے لیے پہلی حدیث، عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث، ہمسایوں، عزیز و اقارب اور دیگر افراد سے معاملات اچھے رکھنے کے لیے تیسری حدیث اور شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے چوتھی حدیث ہے۔“

امام صاحبؒ سے سنن ابی داؤد کو روایت کرنے والے تلامذہ کی تعداد سات ہے لیکن آپؒ کے چار شاگردوں کے روایت کردہ نسخے زیادہ معتبر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ شاگرد مشہور حُفّاظِ حدیث میں شمار ہوتے ہیں:

۱۔ نسخۂ لُولُوی: یہ نسخہ ابو علی محمد بن احمد عمر و لُولُوی (وفات: ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) سے روایت کردہ ہے۔ انہوں نے امام ابوداؤد سے یہ نسخہ ۲۷۵ھ/۸۸۸ء میں سماعت کیا تھا۔ امام صاحبؒ نے آخری بار اپنی کتاب کا املا اسی سال کروایا تھا۔ اسی برس امام صاحبؒ رحلت فرما گئے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ آخری اور سب سے معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر اور بلادِ مشرق میں یہی نسخہ رائج ہے۔

۲۔ نسخۂ ابن داسہؒ: امام حافظ ابو بکر محمد بن بکر بن محمد بن عبدالرزاق بن داسہؒ (وفات: ۳۴۵ھ/ ۹۵۶ء) سے روایت کردہ ہے۔ نسخۂ لُولُوی اور اس نسخے میں چند احادیث کی تقدیم و تاخیر کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ نسخہ بلادِ مغرب میں مشہور ہے۔

۳۔ نسخۂ رملی: امام حافظ ابو عیسیٰ اسحٰق بن موسیٰ بن سعید الرملیؒ (وفات: ۳۱۷ھ/۹۲۹ء) نے روایت کیا۔ یہ نسخہ ابن داسہؒ سے ملتا جلتا ہے۔

۴۔ نسخۂ ابن الاعرابی: حافظ ابو سعید احمد بن محمد بن زیادؒ (وفات: ۳۴۰ھ/۹۵۱ء) نے روایت کیا۔ یہ نسخہ دیگر نسخوں سے خاصا مختلف ہے۔

سنن ابی داؤدؒ کی شرحیں ہر زمانے کے نامور علمائے کرام اور محدثین عظام نے لکھیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

معالم السّنن: مشہور محدث امام خطابیؒ (وفات: ۳۵۸ھ/۹۶۹ء) نے لکھی۔ آپؒ کا پورا نام ابو سلیمان حمد بن محمد خطابیؒ ہے۔ آپؒ اپنے زمانے کے بڑے فاضل ادیب، مؤرخ اور شاعر بھی تھے۔ فقہ اور حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ یہ کتاب حلب (شام) سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

شرح قطب الدین: قطب الدین ابو بکر یمنیؒ (وفات: ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء) نے چار ضخیم جلدوں میں یہ شرح لکھی۔ تاہم، یہ شرح اب نایاب ہے۔

تلخیص منذری: ابو محمد ذکی الدین معریؒ (وفات: ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) نے سنن ابی داؤد کو اختصار کے ساتھ مرتب کیا۔ آپؒ فقہ، قرأت اور حدیث پر عبور رکھتے تھے۔

Marfat.com

شرح نووی: مشہور محدث ابو زکریا محی الدین نوویؒ (وفات:۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء) کی تصنیف کردہ یہ شرح مکمل نہ ہو سکی۔ امام نوویؒ حدیث وفقہ کے جیّد اساتذہ میں شامل ہیں۔

تہذیب سنن ابی داؤد: علامہ شمس الدین محمد بن ابو بکر جوزیؒ (وفات: ۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء) کی یہ شرح نہایت بلند پایہ کتاب ہے۔

شرح عراقی: ابو زرعہ ولی الدین احمد عراقیؒ (وفات: ۸۲۶ھ / ۱۴۲۳ء) کی یہ شرح اگر مکمل ہو جاتی تو تقریباً ۴۰ جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ یہ ابتدا سے سجدہ سہو تک سات جلدوں میں ہے اور ایک دوسری جلد میں صیام اور جہاد کا بیان ہے۔

شرح سیوطیؒ: مشہور مفسر اور محدث علامہ جلال الدین سیوطیؒ (وفات: ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) نے بھی "مرقاۃ الصعود الیٰ سنن ابی داؤد" کے نام سے شرح لکھی۔

الہدیٰ المحمود الترجمہ سنن ابی داؤد: مشہور مترجم حدیث اور محدث مولانا وحید الزماںؒ (وفات: ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) نے دو ضخیم جلدوں میں شرح لکھی۔

بذل المجہود فی حل ابی داؤد: مشہور محدّث مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے پانچ جلدوں میں یہ شرح تصنیف فرمائی۔

ان کے علاوہ کئی شرحیں لکھی گئیں جن میں حافظ علاؤ الدین مغلطائیؒ، شیخ سراج الدین عمرؒ، ابو العباس احمدؒ (رسلان رملی) علامہ بدرالدین عینیؒ، علامہ ابو الحسن سندیؒ، مولانا شمس الحقؒ، شیخ فخر الحسن گنگوہیؒ اور دیگر علما کرام کی شرحیں شامل ہیں۔

امام ابو داؤدؒ کی اولاد کے بارے میں مورخین نے تفصیل نہیں دی ہے۔ کتب میں آپؒ کے صرف ایک صاحب زادے ابو بکر عبد اللہؒ کا تذکرہ ملتا ہے، جو آپؒ کے شاگردوں میں شامل ہیں اور خود بھی نامور محدّث تھے۔

امام ابو داؤدؒ نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک علمی اور تحقیقی خدمات انجام دیں۔ ۱۶ شوال ۲۷۵ھ / ۲۱ فروری ۸۸۹ء کو جمعہ کے دن آپؒ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ آپؒ نے ۷۳ برس کی عمر پائی۔ آپؒ کی نماز جنازہ عباسؒ بن عبد الواحد الہاشمی نے پڑھائی اور آپؒ کو بصرہ میں حضرت امام سفیان ثوریؒ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت امام مسلم بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ

'صحیح بخاری' کے بعد ان کی کتاب 'صحیح مسلم' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے

وہ مطالعہ میں مصروف تھے۔

ان کے اطراف بہت سی کتابیں، قلمی نسخے اور کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کتابوں، قلمی نسخوں، مسودوں اور یادداشتوں کے مطالعے میں منہمک تھے۔ وہ کبھی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگتے، کبھی کاغذات اٹھا کر ان پر لکھی گئی یادداشتوں کا مطالعہ شروع کر دیتے۔

وہ ایک وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ سرخ و سفید رنگت پر ان کی سفید ڈاڑھی نہایت بھلی محسوس ہوتی تھی۔ سر پر عمامہ تھا جس کا شملہ ان کے شانوں کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ گو کہ اس وقت وہ تشریف فرما تھے، لیکن اس حالت میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصے نکلتے ہوئے قد کے مالک ہیں۔

بزرگ کی نشست کے قریب ہی ایک ٹوکرا رکھا ہوا تھا جس میں کھجوریں تھیں۔ بزرگ، مطالعہ کے دوران اس ٹوکرے میں سے ایک ایک کھجور نکال کر نوش فرما رہے تھے، لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کھجوریں نوش کرنے کا یہ عمل وہ ارادی طور پر انجام نہیں دے رہے، یوں لگتا تھا کہ وہ خود اس بات سے بے خبر ہیں کہ مطالعہ کے دوران وہ گاہے گاہے، کھجوریں بھی نوش فرما رہے ہیں۔

بزرگ کو دراصل ایک حدیث کی تلاش تھی جو ان کے حافظہ سے محو ہو گئی تھی۔ ان کے تلامذہ نے اس حدیث کے بارے میں ان سے سوال کیا تھا۔ کئی گھنٹوں کی تحقیق کے بعد بالآخر بزرگ، مطلوبہ حدیث تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن اب وہ شدید تھکن اور اضمحلال محسوس کر رہے تھے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔

طبیعت کی یہ خرابی معمولی نہ تھی۔ بزرگ صاحب فراش ہو گئے۔ علاج معالجہ کی کوشش کی گئی لیکن دونوں جہانوں کے مالک نے بزرگ کو اپنے حضور طلب فرمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بزرگ، ہزاروں سوگواروں کو گریہ کناں چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ اطبا کی رائے میں، بزرگ کا انتقال غیر معمولی مقدار میں کھجوریں نوش کر لینے کے باعث ہوا۔ بزرگ مطالعہ میں اس قدر منہمک تھے کہ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ وہ بڑی تعداد میں کھجوریں نوش فرما چکے ہیں۔

یہ بزرگ تھے، عظیم محدث، امام مسلم بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے احادیث نبویؐ کی اہم کتاب "صحیح مسلم" نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب فرمائی۔ امتِ مسلمہ پر آپؒ کا بڑا احسان ہے۔

آپؒ کا نام مسلم، کنیت ابو الحسین اور لقب عسکر الدین ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام حجاج بن مسلم تھا۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنو قشیر سے ہے۔ یہ عرب کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ آپ کی ولادت خراسان کے معروف شہر نیشاپور میں ہوئی۔ آپؒ کے سالِ ولادت میں اختلاف ہے۔ مورخین نے ۲۰۲ھ، ۲۰۳ھ، ۲۰۴ھ اور ۲۰۶ھ (۸۱۷ء، ۸۱۸ء، ۸۱۹ء اور ۸۲۱ء) درج کیا ہے تاہم اکثر علما اور مورخین کی تحقیق کے مطابق ۲۰۶ھ / ۸۲۱ء درست ہے۔

امام مسلمؒ نے ابتدائی تعلیم والدین کی نگرانی میں حاصل کی۔ والدین نے آپؒ کی اتنی اچھی تربیت کی کہ تمام عمر آپؒ نے برے کاموں کو کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ آپؒ نے تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی بسر کی اور آپؒ کی زبان سے کسی کے لیے کبھی برے کلمات ادا نہ ہوئے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام مسلمؒ کو غیر معمولی ذہانت، سوجھ بوجھ اور عمدہ حافظہ عطا فرمایا تھا، جس کے باعث آپؒ نے کم عمری ہی میں مروّجہ علوم و فنون کی تربیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد آپؒ نے ۱۸ برس کی عمر میں علم حدیثِ نبویؐ کی تحصیل کا آغاز کیا۔

Marfat.com

اس زمانے میں علم حدیث حاصل کرنے کی جانب بہت زیادہ توجہ دی جا رہی تھی۔ نیشاپور کو علمی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے باعث نمایاں حیثیت حاصل تھی اور اس دور میں بغداد کے بعد نیشاپور ہی کا نام لیا جاتا تھا۔ نیشاپور میں حدیث کے دو بڑے ائمہ حضرت محمد بن یحییٰ ذہلی نیشاپوریؒ اور حضرت یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوریؒ موجود تھے۔ ان کے تلامذہ میں امام بخاریؒ جیسے عظیم محدث بھی شامل تھے۔ خراسان میں حضرت اسحٰق بن راہویہؒ بھی علم کو عام فرما رہے تھے۔ امام مسلمؒ نے علم حدیث کے حصول کی خاطر طویل سفر کیے۔ اس دور میں، جبکہ ذرائع آمد و رفت محدود تھے، اور سفر دشوار گزار، امام مسلمؒ رے، عراق، حجاز، یمن اور شام تشریف لے گئے اور آپؒ نے وہاں محدثین کرام کو تلاش کر کے ان سے علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔

امام مسلمؒ نے رے میں محمدؒ بن مہران حمالؒ اور ابو غسانؒ، عراق میں امام احمد بن حنبلؒ اور ابو عبداللہ بن مسلمہؒ، حجاز میں سعید بن منصورؒ اور ابو مصعبؒ، مصر میں عمرو بن اسودؒ اور حرملہ بن یحییٰؒ (امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد) سے احادیث کا علم حاصل فرمایا۔ بغداد کا سفر متعدد بار کیا۔ وہاں یحییٰ بن صاعدؒ اور محمد بن مخلدؒ سے استفادہ فرمایا۔ احمد بن سلمہؒ کے ساتھ آپؒ بصرہ اور بلخ بھی تشریف لے گئے۔ آپ کے دیگر اساتذہ میں اسماعیل بن ابی اویسؒ، عون بن سلامؒ، داؤدؒ بن عمرو الضبیؒ، شیبان بن فروخ اور امام بخاریؒ شامل ہیں۔

امام مسلمؒ کے تبحرِ علم سے استفادہ کرنے والے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں حدیث نبویؐ کی چھ مستند ترین کتابوں (صحاح ستہ) میں سے ایک کے مرتب، امام ترمذیؒ بھی شامل ہیں۔ آپؒ کے دیگر تلامذہ میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ابو الفضل احمد بن سلمہؒ، ابراہیم بن ابی طالبؒ، ابو عمرو خنافؒ، حسین بن محمد قبانیؒ، حافظ صالح بن محمدؒ، ابن خزیمہؒ، ابن صاعدؒ، ابو محمد بن ابی رازیؒ، ابراہیم بن محمد بن سفیانؒ، ابو عوانہؒ اور ابو حامد اعمشیؒ۔

امام مسلمؒ کی علمی برتری اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف ان کے ہم عصر ائمہ کرام نے کیا ہے۔ اسحاق بن راہویہؒ جیسے عظیم محدث نے امام مسلمؒ کے بارے میں نہایت تعجب سے فرمایا تھا: "اللہ جانے یہ شخص کس پائے کا ہوگا۔" حضرت اسحاق بن منصورؒ کی مجلس درس میں ایک بار امام مسلمؒ بھی موجود تھے۔ حضرت اسحاقؒ احادیث نبویؐ لکھوا رہے تھے اور امام مسلمؒ ان احادیث میں سے انتخاب فرما رہے تھے۔ مجلس میں موجود ایک اور بزرگ ابو عمروؒ فرماتے ہیں کہ اچانک حضرت اسحاق بن منصور نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور امام مسلمؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اللہ تبارک و تعالیٰ جب تک آپ کو مسلمانوں کے درمیان رکھے گا، ان شاءاللہ ہم خیر سے محروم نہ ہوں گے۔"

امام مسلمؒ کے ایک اور استاد، حضرت محمد بن عبدالوہابؒ نے فرمایا: "مسلم علم کا خزانہ ہیں، میں نے ان میں خیر کے سوا کچھ نہیں پایا۔" حضرت ابو بکر جارودیؒ فرماتے ہیں: "مسلم علم کے محافظ تھے۔" مسلمہ بن قاسمؒ کے الفاظ ہیں: "وہ جلیل القدر امام تھے۔" اس زمانے کے مشہور علما کرام ابو زرعہؒ اور ابو حاتمؒ، امام مسلمؒ کو اپنے زمانے کے تمام علما پر ترجیح دیتے تھے۔

امام مسلمؒ کے اساتذہ بھی ان کی علمی برتری، اعلیٰ صلاحیتوں اور بے پناہ قوتِ حافظہ کے معترف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہم عصر، ائمہ حدیث نے بھی آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں ابو حاتم رازیؒ، موسیٰ بن ہارونؒ، احمد بن سلمہؒ، امام ترمذیؒ، یحییٰ بن صاعدؒ اور ابو عوانہؒ شامل ہیں۔ احمد بن سلمہؒ تو آپ کے اس قدر گرویدہ تھے کہ وہ احادیث کے مجموعے "صحیح مسلم" کی تیاری کے عمل میں پندرہ برس تک آپ کے ساتھ رہے اور جہاں جہاں امام صاحبؒ تشریف لے گئے، احمد بن سلمہؒ بھی ان کے ساتھ تھے۔

امام مسلمؒ نہایت مخلص، راست گو، حق پسند اور بے باک فقیہ تھے۔ احادیثِ نبویؐ کی روایات کے انتخاب میں انہوں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ وہ ہمیشہ حق بات کہنا پسند فرماتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ امام مسلمؒ، نیشاپور کے قابل استاد امام ذہلیؒ کی مجلس درس میں شریک ہوا کرتے تھے اور آپ کے علم سے استفادہ فرماتے تھے۔ کچھ عرصے بعد امام بخاری بھی نیشاپور تشریف لائے، امام مسلمؒ، امام بخاریؒ کے حلقۂ درس میں بھی شریک ہونے لگے۔ امام ذہلیؒ کا امام بخاریؒ سے ایک مسئلے پر علمی نوعیت کا شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا لیکن امام مسلمؒ اس مسئلے میں امام بخاریؒ کے حامی تھے۔ ایک دن امام ذہلیؒ نے اپنی مجلس درس میں اعلان کر دیا کہ مذکورہ مسئلے پر جو فرد ان کی رائے سے متفق نہیں ہے، وہ ان کی مجلس میں نہ آئے۔ یہ سننا تھا کہ امام مسلمؒ مجلس سے اٹھے اور گھر چلے آئے۔ آپ نے امام ذہلیؒ سے جو کچھ علمی استفادہ فرمایا تھا، وہ ہزاروں کاغذات پر موجود تھا۔ آپ نے یہ تمام کاغذات جمع کیے

Marfat.com

اور اونٹوں پر لدوا کر امام ذہلیؒ کی خدمت میں بھجوا دیے۔

اس واقعے سے جہاں امام مسلمؒ کی حق گوئی اور بے باکی کا اظہار ہوتا ہے، وہیں آپؒ کی دیانت اور خودداری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ امام مسلمؒ کی راست گوئی اور بے باکی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جن امام بخاریؒ کی حمایت میں آپؒ نے اپنے استادِ مکرم امام ذہلیؒ کی ناراضگی مول لی، ان ہی امام بخاریؒ سے کسی علمی مسئلے پر اختلاف کیا تو پوری قوت کے ساتھ کیا۔

آپؒ کسی معاملے میں اپنی تحقیق کے مطابق کوئی رائے اختیار فرما لیتے تھے تو بڑے سے بڑے عالم کے سامنے اس رائے کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہ فرماتے تھے، چنانچہ امام بخاریؒ سے بھی آپؒ نے بعض علمی نوعیت کے اختلافات کا اظہار بلا رُو رعایت فرمایا، حالانکہ آپؒ امام بخاری کے اس درجہ معتقد تھے کہ امام بخاریؒ کی مجلس درس میں ان کے تبحرِ علم سے متاثر ہو کر ایک بار امام مسلمؒ نے فرمایا: "اے علم حدیث کے امیر المومنین، مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے قدم چوم لوں۔"

امام مسلمؒ نہایت متقی، دیانت دار اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپؒ کا اخلاق بے حد بلند تھا۔ کبھی کسی نے بھی آپؒ کی زبان سے کسی کے لیے برے کلمات نہیں سنے۔ آپؒ نے کبھی کسی سے درشت کلامی نہ کی۔ اپنی پوری زندگی کبھی کسی کا برا نہ چاہا، حتیٰ کہ کسی کی غیبت تک نہ کی، نہ کسی کو اپنے ہاتھوں سے ضرب پہنچائی۔

امام مسلمؒ گو کہ اپنے روز و شب کا بیشتر حصہ مطالعے اور تصنیف و تالیف میں بسر کرتے تھے لیکن آپؒ معاش کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ آپؒ کپڑوں کی تجارت فرماتے تھے۔

امام مسلمؒ نے 20 سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت اور عالمگیر مقبولیت آپؒ کے مرتب کردہ مجموعہ احادیثِ نبویؐ "صحیح مسلم" کو حاصل ہوئی۔ احادیثِ نبویؐ کی جو چھ کتابیں درست ترین تسلیم کی جاتی ہیں، انہیں "صحاح ستہ" کہتے ہیں۔ پہلے درجہ پر حضرت امام بخاریؒ کی کتاب "صحیح بخاری" ہے۔ "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" دونوں کا جب ایک جگہ ذکر آ جائے تو انہیں "صحیحین" کہا جاتا ہے۔

محدثین کی اصطلاح میں احادیث نبویؐ کے اس مجموعے کو "صحیح" کہا جاتا ہے جس میں بیان کردہ تمام احادیث کے راویوں کا سلسلہ آخر تک متصل ہو۔ یہ تمام راوی عادل ہوں۔ اس مجموعے میں کوئی عیب یا کمزوری نہ ہو۔

بعض علمائے کرام اور مورخین نے "صحیح مسلم" کا اصل نام "الجامع الصحیح" بیان کیا ہے۔ "جامع" حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں تفسیر سے متعلق احادیث بھی شامل ہوں۔ اس پر دیگر اہل علم نے توجہ دلائی ہے کہ "صحیح مسلم" میں تفسیری احادیث کم ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امام مسلمؒ نے تفسیر سے متعلق اکثر روایات کو کتاب کے مختلف حصوں میں بیان فرمایا ہے، اس لیے کتاب التفسیر میں انہیں دوبارہ درج نہیں فرمایا۔

امام مسلمؒ کی کتاب "صحیح مسلم" اسناد اور حُسنِ ترتیب دونوں لحاظ سے بہت اعلیٰ حیثیت کی حامل ہے، اگرچہ امام بخاریؒ کی کتاب "صحیح بخاری" سند کے اعتبار سے سب سے بہتر قرار دی گئی ہے، تاہم چونکہ امام بخاریؒ نے فقہی احکام کو پیش نظر رکھتے ہوئے احادیث کو ترتیب دیا ہے، اس لیے انہوں نے ایک ہی حدیث کو متعدد طریقوں سے مختلف ابواب میں درج فرمایا ہے۔ اس کے برخلاف امام مسلمؒ نے ہر حدیث کو ایک خاص باب میں درج فرمایا ہے، اس بنا پر "صحیح مسلم" سے استفادہ کرنا سہل ہے۔ بہرحال یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جس وقت احادیثِ نبویؐ کی ترتیب کا کام شروع فرمایا تھا، اس وقت ان کے سامنے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے ایک ایک کے بارے میں تحقیق کر کے ۷۲۷۵ احادیث منتخب فرمائیں اور صحیح احادیث کو محفوظ کر دیا، جبکہ امام مسلمؒ کے سامنے امام بخاریؒ کا کام موجود تھا، اس طرح ان کے لیے آسانی پیدا ہوئی کہ وہ احادیثِ نبویؐ کے مجموعے کو خامیوں سے بچانے اور اس کی ترتیب میں مزید خوبیاں پیدا کرنے کا اہتمام کر سکیں۔

امام مسلمؒ نے پندرہ برس تک شدید محنت اور عرق ریزی کے نتیجے میں رمضان ۲۵۷ھ / جولائی ۸۷۱ء میں "صحیح مسلم" کی ترتیب کا کام مکمل کیا۔ اس غرض سے آپؒ نے تین لاکھ احادیث کے بارے میں تحقیق فرمائی اور احادیث کے حصول کے لیے دور دور کے شہروں میں تشریف لے گئے۔ تین لاکھ احادیث کا مجموعہ ترتیب دے چکے تو آپؒ اسے اس وقت کے جید امام اور محدث حافظ ابوزرعہؒ کی خدمت میں لے گئے۔ حافظ ابوزرعہؒ نے ان تمام احادیث کو ملاحظہ فرمایا اور جن جن روایات کی صحت پر انہوں نے اعتراض فرمایا، امام مسلمؒ نے بلا تامل، ان

Marfat.com

روایات کو اپنے مجموعے سے الگ کر دیا۔

امام مسلمؒ کی یہ کتاب "صحیح مسلم" تقریباً بارہ ہزار احادیث پر مشتمل ہے، تاہم اس میں تقریباً آٹھ ہزار احادیث مکرر بیان کی گئی ہیں چنانچہ چار ہزار احادیث غیر مکرر ہیں۔

امام مسلمؒ نے "صحیح مسلم" کی تیاری میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے خود براہِ راست شیوخ سے احادیث سماعت فرمائی تھیں۔ آپؒ خود فرماتے تھے: "میں نے اپنے کانوں سے سنی ہوئی تین لاکھ احادیث میں سے یہ مجموعہ منتخب کیا ہے۔" پھر آپؒ نے یہ اہتمام بھی فرمایا کہ صرف ان احادیث کو مجموعے میں شامل فرمایا جن کی صحت پر شیوخِ وقت متفق تھے۔ آپؒ خود فرماتے ہیں: "میں نے ہر اس حدیث کو صحیح مسلم میں درج نہیں کیا، جو میرے نزدیک صحیح تھی، بلکہ صرف ان احادیث کا انتخاب کیا جن کی صحت پر شیوخِ وقت کا اتفاق ہے۔" واضح رہے کہ "شیوخِ وقت" سے مراد اس وقت کے مشہور شیوخ کرام ہیں چنانچہ علامہ بلقینیؒ کے مطابق امام مسلمؒ نے جن شیوخِ وقت کے متفق ہونے کا ذکر فرمایا ہے، ان میں امام احمد بن حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، عثمان بن ابی شیبہؒ اور سعید بن منصور خراسانیؒ شامل ہیں۔

صحیح مسلم مرتب کرتے ہوئے امام مسلمؒ نے چند باتوں کا خاص خیال رکھا ہے:

۱۔ انہوں نے صرف ثقہ اور قابل اعتماد راویوں کی بیان کردہ روایات ہی منتخب کی ہیں۔

۲۔ امام صاحبؒ نے احادیث کی سند درج کرتے ہوئے راویوں کے نام و لقب کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ایک ہی نام کے دو افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ امام صاحبؒ ایسے تمام مقامات پر راوی کے نام کے ساتھ اس کے والد کا نام بھی تحریر کر دیتے ہیں تاکہ کوئی اشتباہ پیدا نہ ہو۔

۳۔ امام صاحب نے روایات کے انتخاب میں "حدثنا" اور "اخبرنا" کے فرق تک کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں "حدثنا" کا لفظ ان احادیث کے شروع میں استعمال کیا جاتا ہے جنہیں اساتذہ نے درس میں خود پڑھا اور اس سلسلے میں ضروری گفتگو فرمائی۔ "اخبرنا" کا لفظ ان احادیث کے شروع میں آتا ہے جنہیں شاگرد نے پڑھا اور استاد نے ان پر گفتگو فرمائی۔ یہ بہت ہی باریک سا فرق ہے اور بظاہر اس سے حدیث کی حیثیت یا اس کے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور امام بخاریؒ، امام زہریؒ اور امام یحییٰ بن سعیدؒ کے نزدیک "اخبرنا" کے بجائے "حدثنا" اور "حدثنا" کی بجائے "اخبرنا" کہہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن امام مسلمؒ اس بات سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر شاگرد نے حدیث کو استاد سے سنا ہے تو وہ "حدثنا" ہی کہہ سکتا ہے "اخبرنا" نہیں۔ امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ اور امام نسائیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

۴۔ اگر دو راویوں کے الفاظ میں اختلاف پایا جائے لیکن حدیث کا مفہوم ایک ہی ہو تو امام مسلمؒ نے دونوں راویوں کے الفاظ کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی روایت میں الفاظ کے اختلاف سے مفہوم تبدیل ہو گیا ہے تو اس کو بھی واضح فرمایا ہے۔

۵۔ امام مسلمؒ نے احادیثِ نبویؐ کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ایک موضوع پر احادیث ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

۶۔ امام مسلمؒ نے احادیث نبویؐ کو صحابہؓ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال کے ساتھ یکجا نہیں فرمایا ہے۔ آپؒ کا کہنا تھا کہ اس طرح بعد کے زمانے کے پڑھنے والوں کو احادیث اور اقوالِ صحابہؓ کو الگ الگ کرنے میں دشواری محسوس نہیں ہوگی۔

امام مسلمؒ نے "صحیح مسلم" کی ابتدا میں ایک بہت اہم اور قابل قدر مقدمہ بھی شامل فرمایا۔ اس مقدمے میں آپؒ نے ان شرائط سے بحث فرمائی جن کا پورا کیا جانا، کسی حدیثِ نبویؐ کو مستند قرار دینے کے لیے ضروری ہے۔ اس مقدمے سے احادیث کو پرکھنے کے اہم اصولوں کا علم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام مسلمؒ نے جس زمانے میں یہ مقدمہ تصنیف فرمایا، اس دور میں کتنی بڑی تعداد میں موضوع (گھڑی ہوئی) احادیث لوگوں میں پھیلا دی گئی تھیں۔ ان حالات میں احادیث کے راویوں پر جرح کرنے اور احادیث کی سند اور متن کو پرکھنے کے اصولوں کا مرتب کیا جانا نہایت ضروری تھا۔

صحیح مسلم کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں، بلکہ بعض علما کرام نے تو "مقدمہ صحیح مسلم" کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔ صحیح مسلم کی شرحوں میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ المنهاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج: یہ شرح امام محی الدین نوویؒ نے تصنیف فرمائی ہے۔ اس کی ابتدا میں ایک اہم مقدمہ بھی ہے۔ یہ بے حد مفید اور کارآمد شرح ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے لوگوں کی پست ہمتی کا خیال نہ ہوتا تو میں یہ شرح سو جلدوں میں لکھتا۔

Marfat.com

۲۔ مختصر شرح نووی: شمس الدین محمد بن یوسف القونویؒ نے لکھی۔

۳۔ اکمال المعلم فی شرح مسلم: یہ شرح جید امام قاضی عیاض مالکیؒ نے لکھی اور امام نوویؒ کی شرح کا یہی ماخذ ہے۔

۴۔ المعلم فوائد کتاب مسلم: ابو عبداللہ محمد بن علی المازنی نے تصنیف کی۔

۵۔ المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم: یہ ابوالعباس احمد بن عمرو القرطبیؒ کی شرح ہے۔ آپؒ نے صحیح مسلم کی تلخیص اور ابواب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

۶۔ الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج: علامہ سیوطیؒ کی نہایت اعلیٰ شرح ہے۔ اس شرح کا اختصار "وشی الدیباج" کے عنوان سے مرتب کیا گیا۔

۷۔ فتح الملہم: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تالیف ہے۔ ابتدا میں ایک مفید مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔

بعض علما کرام نے صحیح مسلم کی "مستخرجات" بھی مرتب کیں۔ حدیث کی اصطلاح میں "مستخرج" حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی کتاب کی احادیث کو دیگر سندوں کے ساتھ اس کے مؤلف کی شرائط پر جمع کیا جائے۔ چنانچہ، حافظ ابو بکر محمد بن محمد نیشاپوری الاسفرائنی نے "المسند الصحیح علی مسلم" کے عنوان سے "مستخرج" تالیف فرمائی۔ ان کے علاوہ بھی کئی ائمہ کرام نے صحیح مسلم کی تخریج میں کتابیں مرتب کی ہیں۔

صحیح مسلم کا خلاصہ کر کے اس کی مختصرات بھی شائع کی گئی ہیں اور بعض علما کرام نے ان کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔ مثلاً ابو لفضل محمد بن عبداللہ المرسیؒ نے "مختصر صحیح مسلم" تصنیف کی۔

صحیح مسلم کے اسماء الرجال پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ابو بکر احمد بن علی الاصفہانیؒ کی تالیف نے شہرت پائی۔

امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کے علاوہ جو کتابیں تصنیف فرمائیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ المسند الکبیر علی الرجال	۱۲۔ کتاب مشائخ ثوریؒ
۲۔ کتاب الجامع علی الابواب	۱۳۔ کتاب مشائخ شعبہؒ
۳۔ کتاب التمییز	۱۴۔ کتاب من لیس لہ الاراوواحد
۴۔ کتاب العلل	۱۵۔ کتاب المخضرمین
۵۔ کتاب الوحدان	۱۶۔ کتاب اولاد الصحابہؓ
۶۔ کتاب الافراد	۱۷۔ کتاب اوہام المحدثین
۷۔ کتاب الاقران	۱۸۔ کتاب الطبقات
۸۔ کتاب سوالات احمد بن حنبل	۱۹۔ کتاب الاسماء والکنیٰ
۹۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب	۲۰۔ کتاب افراد الشامیین
۱۰۔ کتاب الانتفاع باہب السباع	۲۱۔ کتاب رواۃ الاعتبار
۱۱۔ کتاب مشائخ مالکؒ	۲۲۔ مسند الصحابہؓ

امام مسلمؒ کی یہ تمام کتابیں پوری تحقیق اور ان کی شب و روز کی محنت کا حاصل ہیں۔ آپؒ خود فرماتے ہیں: "میں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ شامل کیا ہے، وہ کسی دلیل اور حجت کے بغیر شامل نہیں کیا اور جو کچھ ترک کیا ہے اسے کسی دلیل اور حجت کے بغیر ترک نہیں کیا۔"

امام مسلمؒ نے تقریباً ۵۵ برس کی عمر میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔ آپؒ کا انتقال جس سبب سے ہوا، وہ مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے اور جو علم حدیث سے آپؒ کے غیر معمولی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

آپؒ کا انتقال ۲۴ رجب ۲۶۱ھ / ۴ مئی ۸۷۵ء کو ہوا۔ آپ کو نیشاپور کے مضافات میں نصر آباد کے مقام پر سپرد خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

حضرت امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

حدیث، تفسیر اور فقہ میں درجۂ کمال کے حامل امام بخاریؒ کے لائق شاگرد

وہ اتفاقاً قافل گئے تھے!

قافلہ، سرزمین حجاز کی سمت سفر کرتے ہوئے راستے میں ایک جگہ رکا تھا۔ قافلے کے تمام شرکا ستانے کے خاطر، اپنے اپنے اونٹوں سے اتر کر اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ انہی شرکا میں ایک جواں سال طالب علم بھی تھے جو تیزی سے ایک جانب جا رہے تھے۔

طالب علم کی یہ بے تابی بلاوجہ نہ تھی۔ دورانِ سفر طالب علم کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس سفر میں، ان کی ملاقات اپنے شیخ سے ہو جائے گی۔ یہ محض اتفاق تھا، لیکن طالب علم اس سنہری موقع کو گنوانا نہ چاہتے تھے۔ انہیں شیخ کی جانب سے کچھ احادیث پہنچی تھیں۔ طالب علم کی خواہش تھی کہ وہ اب شیخ کے روبرو ان ہی احادیث کی سماعت کر لیں تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

طالب علم نے شیخ کے پاس پہنچ کر ادب سے سلام کیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ شیخ نے فرمایا: "وہ تمام احادیث جو آپ نے لکھ رکھی ہیں، یہاں لے آئیں۔ میں قرأت کرتا ہوں، آپ لکھی ہوئی احادیث سے موازنہ کرتے جائیں، جہاں کہیں کوئی فرق پائیں، اپنا مسوّدہ درست کر لیں۔"

طالب علم، خوش خوش اپنے اونٹ تک پہنچے اور اس پر بندھا ہوا سامان کھول کر اپنے علمی کاغذات نکال لیے لیکن یہ دیکھ کر طالب علم کو شدید پریشانی ہوئی کہ جن کاغذات پر انہوں نے شیخ کی ارسال کردہ احادیث لکھ رکھی تھیں، وہ سامان میں نہ تھے۔ غالباً انہیں وہ کہیں اور رکھ آئے تھے۔ سامان میں چند سادہ کاغذات البتہ موجود تھے۔ طالب علم نے پریشانی کے عالم میں وہی سادہ کاغذات اٹھا لیے اور شیخ کی خدمت میں واپس چلے آئے۔

شیخ نے دیکھا کہ طالب علم ہاتھ میں چند کاغذات اٹھائے چلے آ رہے ہیں، انہوں نے طالب علم کے آتے ہی فوراً احادیث کی قرأت شروع کر دی۔ طالب علم انہماک سے سنتے رہے۔ اچانک شیخ کی نظر، طالب علم کے ہاتھوں میں موجود کاغذات پر پڑی جو بالکل سادہ تھے۔ شیخ نے برہم ہو کر پوچھا:

"آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟"

طالب علم کو احساس ہو گیا کہ شیخ کو ان کے ہاتھ میں موجود کاغذات کے کورے ہونے کا علم ہو گیا ہے تاہم طالب علم نے نہایت ادب سے عرض کیا:

"آپ نے جن احادیث کی قرأت فرمائی، وہ میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آپ اگر حکم فرمائیں تو میں انہیں لفظ بہ لفظ دہرا سکتا ہوں۔"

شیخ کو طالب علم کی بات کا یقین نہ آیا۔ انہوں نے امتحان لینے کی غرض سے طالب علم سے کہا کہ وہ ان تمام احادیث کو دہرائیں جن کی قرأت شیخ نے ابھی طالب علم کے سامنے کی تھی۔

طالب علم نے وہ تمام احادیث حرف بحرف بیان کر دیں، جو شیخ کی جانب سے طالب علم تک پہنچی تھیں۔

شیخ کو اب بھی یقین نہ آیا۔ انہیں گمان تھا کہ طالب علم نے ان کے پاس آنے سے قبل ان احادیث کو حفظ کر لیا تھا۔ طالب علم نے عرض کیا: "اگر آپ کو شبہ ہے تو دوسری احادیث سنا کر امتحان لے لیجیے۔" شیخ نے چالیس احادیث سنائیں۔ طالب علم نے صرف ایک بار ان احادیث کو شیخ کی زبان سے سنا اور اسی وقت چالیس کی چالیس احادیث لفظ بہ لفظ اسی ترتیب سے سنا دیں، جس ترتیب سے شیخ نے ان کی قرأت کی تھی۔

انتہائی غیر معمولی حافظے کے مالک یہ طالب علم تھے حضرت ابو عیسیٰ محمد بن ترمذیؒ جنہیں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ

Marfat.com

درست ترین مجموعوں (صحاح ستہ) میں سے ایک مجموعے "جامع ترمذی" مرتب کرنے کا شرف حاصل ہے۔

آپؒ کا نام محمدؒ اور کنیت ابو عیسیٰ ہے۔ آپؒ کے والد کا نام بھی عیسیٰ ہے۔ آپؒ قبیلہ بنو سلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپؒ کے نام کے ساتھ "ترمذی" اس لیے لگایا جاتا ہے کہ آپؒ کی پیدائش شہر 'ترمذ' میں ہوئی۔ گو کہ آپؒ نے روایات میں اکثر اپنا ذکر اپنی کنیت "ابو عیسیٰ" سے کیا ہے اور "قال ابو عیسیٰ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں لیکن آپؒ اپنی جائے پیدائش "ترمذ" کے حوالے سے ہی مشہور ہیں۔ ترمذ ایک قدیم شہر ہے۔ بلخ سے اس کا فاصلہ تقریباً اٹھارہ میل ہے۔ اس شہر کے نام کا تلفظ "تَرمِذ"، "تِرمِذ" اور "تُرمُذ" تینوں طرح کیا جاتا ہے، لیکن معروف تلفظ "ترمِذ" ہی ہے۔ اس شہر میں بڑے بڑے علما کرام اور محدثین کرام پیدا ہوئے، اس لیے اسے مدینۃ الرجال بھی کہا جانے لگا تھا۔

ترمذ کے حوالے سے دو اور شخصیات تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور چونکہ ان کے نام کے ساتھ بھی "ترمذی" بولا اور لکھا جاتا ہے اس لیے انہیں بھی امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ سمجھ لیا جاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان دو شخصیات کا تعارف بھی کروا دیا جائے۔ ان میں پہلی شخصیت ابوالحسن احمد ترمذیؒ کی ہے (وفات: ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء)۔ یہ امام احمد بن حنبلؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور پائے کے محدث تھے۔ دوسری شخصیت ابو عبداللہ محمد بن علی حسین ترمذیؒ کی ہے جو حکیم ترمذی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بھی محدث، فقیہ اور صوفی تھے۔ ان کی تقریباً تیس تصنیفات مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں، تاہم علما کرام نے بعض معاملوں میں آپ سے شدید اختلاف کیا ہے۔

امام ترمذیؒ ۲۰۹ھ / ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا۔ جب حدیث کو بہت فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ حضرت امام بخاریؒ کی ان تھک محنت اور شب و روز کی ریاضت کے نتیجے میں خراسان اور ماوراء النہر (دریائے جیحوں اور سیحوں کا درمیانی علاقہ) علم حدیث کے بہت بڑے مراکز کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ حضرت امام بخاریؒ (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ / ۸۰۹ء تا ۸۷۰ء) اس زمانے میں حیات تھے اور علم حدیث کو عام کرنے میں مصروف تھے۔ امام ترمذیؒ نے ہوش سنبھالا تو اپنے اطراف، علم و معرفت کے دریا بہتے ہوئے پائے۔ آپؒ نے علم و معرفت کے ان خزانوں سے بھرپور استفادہ فرمایا۔ آپؒ نے علم کے حصول کی خاطر، خراسان، عراق اور حجاز کے متعدد شہروں کا سفر فرمایا۔ آپؒ کا شوقِ علم آپؒ کو نہایت لائق و فاضل اساتذۂ کرام تک لے گیا۔ قدرت نے آپؒ پر خاص کرم فرمایا، چنانچہ آپؒ کو حضرت قتیبہ بن سعدؒ، حضرت مصعبؒ، حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن ہرویؒ، حضرت اسماعیل بن موسیٰ اسدیؒ، حضرت سوید بن نصرؒ، حضرت ابوالحسن علی بن حجر بن ایاسؒ، حضرت ابوالسریٰ ہنادؒ، حضرت ابو کریب محمد بن العلاءؒ، حضرت ابو بکر محمد بن بشارؒ، حضرت ابو محمد عبداللہ بن الرحمٰن تمیمیؒ، حضرت ابو بکر محمد بن عبدالملکؒ، حضرت مسلم بن الحجاجؒ، حضرت امام ابو داؤد اور حضرت امام بخاریؒ جیسے جید محدثین، فقہا کرام اور علم دین کے نیرہائے تاباں کی ضو سے اپنے قلب و جگر منور کرنے کا موقع ملا۔ آپؒ کے بعض اساتذہ کا مختصر احوال پیش جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ آپؒ کے اساتذہ میں کیسی کیسی بلند پایہ اور برگزیدہ شخصیات شامل تھیں۔

۱۔ **ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس سعدی مروزیؒ:** بڑے جید عالم اور بزرگ حافظ الحدیث تھے۔ قرآن پاک میں بھی بڑا درک رکھتے تھے۔ شعر و ادب کا بھی شوق تھا۔ ۲۴۴ھ / ۸۵۸ء میں وفات پائی۔

۲۔ **ابو السریٰ ہناد بن سری تمیمیؒ:** کوفہ کے بہت بلند مرتبہ شیخ تھے۔ ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزری۔ بڑے لائق محدث تھے۔ ۲۴۳ھ / ۸۵۷ء میں وفات پائی۔

۳۔ **ابو کریب محمد بن العلاءؒ:** انہوں نے کوفہ میں تین لاکھ احادیث کو عام فرمایا۔ ۲۴۸ھ / ۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔

۴۔ **ابوبکر محمد بن بشار بن عثمانؒ:** بصرہ کے بہت عظیم حافظ حدیث تھے۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ تک ان سے احادیث کی سماعت کرتے تھے۔

۵۔ **ابو محمدؒ عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی دارمی:** سمرقند کے عالی مرتبت عالم اور احادیث کے حافظ تھے۔ فقہ و تفسیر پر بھی عبور رکھتے تھے اور اس کے ساتھ عبادات اور زاہدانہ زندگی میں بھی درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام ابو داؤد نے بھی آپؒ سے استفادہ فرمایا ہے۔ ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء میں وفات پائی۔

۶۔ **ابو رجا قتیبہ بن سعد بلخیؒ:** خراسان کے مانے ہوئے محدث تھے۔ ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔

Marfat.com

۷۔ابو مصعب احمد بن ابی بکر زھری: حضرت امام مالکؒ کے شاگرد تھے۔ مدینہ منورہ کے مشہور محدثین اور فقہا میں سے ایک تھے۔

۸۔حضرت ابو اسحٰق ابراهیم بن عبدالرحمٰن هروی: ہرات کے ممتاز حفاظ میں شامل تھے۔

۹۔ابوجعفر عبداللہ بن معاویہ: بصرہ کے محدث تھے۔ حضرت ابوداؤدؒ اور حضرت ابن ماجہؒ کے بھی شیخ تھے۔ ۲۴۳ھ/۸۵۷ء میں وفات ہوئی۔

۱۰۔حضرت امام ابوداؤدؒ: احادیث کی چھ درست ترین کتابوں میں سے ایک کے مرتب، آپؒ کی کتاب سنن ابی داؤدؒ علما کرام اور فقہا کے باہمی اختلافات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ آپؒ کا انتقال ۲۷۵ھ / ۸۸۹ء میں ہوا۔

۱۱۔حضرت امام مسلمؒ: احادیث کی دو درست ترین کتابوں میں سے ایک کے مرتب، آپؒ نے تین لاکھ احادیث نبویؐ کے بارے میں ۱۵برس تک تحقیق کر کے چار ہزار صحیح احادیث پر مشتمل مجموعہ ترتیب دیا۔ آپؒ نے اس کے علاوہ ۲۰ سے زائد کتب تصنیف فرمائیں۔ آپؒ کا انتقال ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء میں ہوا۔

۱۲۔حضرت امام بخاریؒ: عظیم محدث، احادیث کی درست ترین کتاب کے مؤلف، آپ کو تین لاکھ احادیث ازبر تھیں۔

حضرت امام بخاریؒ تو امام ترمذیؒ سے اس درجہ متاثر تھے کہ آپؒ امام ترمذیؒ سے فرمایا کرتے تھے: "آپ نے مجھ سے اس قدر استفادہ نہیں کیا جتنا استفادہ میں نے آپؒ سے کیا ہے۔" امام ترمذیؒ کے درجہ علم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود امام بخاریؒ نے دو احادیثِ نبویؐ امام ترمذیؒ سے روایت کی ہیں۔ حضرت امام ترمذیؒ کے اساتذۂ کرام میں جہاں اتنے بلند مرتبت اور عظیم محدثین، فقہائے ذی وقار اور علمائے محترم شامل تھے، وہیں آپؒ کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: احمد بن عبداللہ المروزیؒ، ہیثم بن کلیب الشامیؒ، محمد بن احمد بن محبوبؒ، احمد بن یوسفؒ، اسعد بن حمدویہؒ، داؤد بن نصرؒ، ابوذر محمد بن ابراہیمؒ، محمد بن سفیانؒ۔

امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی سے قبل حدیثِ نبویؐ کی کئی کتابیں مرتب کی جا چکی تھیں۔ ان میں سے مشہور کتب کے نام یہ ہیں: موطا امام مالکؒ، مسند عبداللہ بن زبیرؓ، سنن سعید بن منصورؒ، مسند احمدؒ، مسند دارمیؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ، سنن ابن ماجہؒ، سنن ابی داؤدؒ۔

امام ترمذی نے ان کتابوں کی موجودگی میں ایسا منفرد اسلوب اختیار فرمایا اور اپنی کتاب "جامع ترمذی" کو اس طور مرتب فرمایا کہ یہ کتاب "حدیثِ نبویؐ" کے دیگر مجموعوں سے ممتاز ہو گئی بلکہ افادیت کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہو گئی۔ اگرچہ جامع ترمذی کا درجہ صحاح ستہ میں صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے بعد رکھا گیا ہے، لیکن اس میں جو خصوصیات ہیں، وہ اسے صحاح ستہ کی دیگر تمام کتب میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔

احادیث کی جس کتاب میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کیے جائیں اسے "جامع" کہا جاتا ہے۔ وہ آٹھ قسم کے مضامین یہ ہیں:

۱۔سیَر ۲۔آداب ۳۔تفسیر ۴۔عقائد ۵۔فتن ۶۔احکام ۷۔اشراط ۸۔مناقب۔

چونکہ ترمذی شریف میں ان آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل احادیث یکجا کر دی گئی ہیں، اس لیے اسے "جامع" کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ترمذی شریفؒ میں چونکہ امام ترمذیؒ نے احادیث کو ترتیب دیتے ہوئے فقہی احکام کا بھی خیال رکھا ہے، اس لیے اسے "سنن" بھی کہتے ہیں۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: "میں جب احادیثِ صحیحہ کے مجموعے کی تالیف سے فارغ ہوا تو میں نے اسے پہلے حجاز کے علما کی خدمت میں پیش کیا، انہوں نے اسے بہت پسند فرمایا۔ پھر میں نے اسے علما عراق کے روبرو پیش کیا تو انہوں نے بھی توصیف فرمائی، اس کے بعد میں نے یہ کتاب علمائے خراسان کے سامنے پیش کی، تو انہوں نے بھی اس کتاب کی تعریف فرمائی۔ جب تمام علما کرام اس پر متفق ہو گئے تب میں نے اسے عام لوگوں کے سامنے پیش کیا۔"

جامع ترمذی میں احادیث کی تعداد گو کہ صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے مقابلے میں کم، یعنی ۳,۹۵۶ ہے، لیکن جامع ترمذی میں احادیث کی تکرار بھی کم ہے۔ امام ترمذیؒ نے احادیث کے اس مجموعے کو اس طور ترتیب دیا ہے کہ عام افراد بھی اس سے بآسانی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جامع ترمذی کی وہ خصوصیات جو اسے احادیث کے دیگر مجموعوں سے ممتاز کرتی ہیں، یہ ہیں:

۱۔اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہر روایت کسی نہ کسی امام، محدث یا فقیہ کے نزدیک، صحیح، خامیوں سے پاک اور قابلِ عمل ہے۔ (صرف دو احادیث اس قاعدے

Marfat.com

سے مستثنیٰ ہیں)۔

۲۔ جامع ترمذی میں روایات کی تکرار بہت کم ہے۔ دوسری جانب ایک مسئلے کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مثلاً امام صاحبؒ نے ایک روایت درج فرمانے کے بعد یہ بھی تحریر فرمادیا ہے کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث روایت کی گئی ہے۔ اس روایت کے متن میں جو کمی یا زیادتی ہوئی ہے، اس کی بھی وضاحت فرمادیتے ہیں۔ ایک حدیث اگر کئی صحابہؓ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے روایت کی گئی ہو، تو جن صحابی محترم سے اس حدیث کی روایت مشہور ہو، ان کا ذکر فرمایا ہے اور باقی کے صرف ناموں کا ذکر فرمادیا ہے۔

۳۔ امام صاحبؒ جو روایت بیان فرماتے ہیں، اس کے بارے میں مخصوص اصطلاح استعمال فرما کر یہ ظاہر فرمادیتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے یہ روایت کس درجے پر فائز ہے۔ مثلاً یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مرسل ہے یا منقطع ہے۔ "صحیح" کی اصلاح ان احادیث کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کی اسناد کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ان کے راوی عادل ہوں، ان میں کوئی کمزوری نہ ہو اور ان کی یہ روایات بیشتر محدثین کی روایات کے خلاف نہ ہوں۔ "حسن" سے مراد وہ احادیث ہیں جن کے راوی صدقِ امانت کے اعتبار سے مشہور ہوں۔ (البتہ "صحیح" احادیث کے راوی اپنے تقویٰ اور حافظے کے لحاظ سے "حسن" کے راویوں سے بہتر سمجھے جاتے ہیں)۔

۴۔ امام ترمذیؒ نے یہ اہتمام بھی فرمایا ہے کہ فقہی نوعیت کی احادیث میں آپؒ اپنی رائے بھی ظاہر فرمادیتے ہیں۔ مثلاً اس حدیث سے فلاں امامؒ نے استدلال کیا ہے، اس میں یہ اختلاف ہے یا استدلال درست نہیں ہے۔ اس طرح ائمہؒ کرامؒ کے مابین جو فقہی اختلافات ہیں، ان کو سمجھنے میں اور فقہ سے استفادہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۵۔ امام صاحبؒ نے راویوں کے ناموں، کنیتوں اور القاب کی تفصیل بھی بیان فرمادی ہے۔ اگر ایک وصف کے ساتھ دو راوی مشہور ہوں تو امام صاحبؒ ان دونوں کا مکمل نام اور ان کا مرتبہ بیان فرمادیتے ہیں۔

۶۔ بعض اوقات کسی حدیث میں کوئی مشکل لفظ آجائے تو امام ترمذیؒ اس کا مفہوم آسان لفظوں میں درج فرمادیتے ہیں۔

۷۔ اگر کسی حدیث کا کوئی حصہ کسی خاص باب سے متعلق ہو تو امام صاحبؒ، حدیث کے صرف اتنے ہی حصے کا ذکر فرماتے ہیں۔ اسی طرح اگر حدیث طویل ہے تو بعض مقامات پر آپؒ نے حدیث کو مختصر اُدرج فرما کر، وضاحت کردی ہے کہ یہ حدیث طویل ہے۔

امام صاحبؒ نے جامع ترمذی میں بعض خاص اصطلاحات بھی استعمال فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر آپؒ نے جہاں یہ فرمایا ہے: "فلاں ذاھب الحدیث" تو اس کا مطلب یہ ہے: اس شخص کو حدیث یاد نہیں رہتی۔ "شیخ لیس بذاک": یعنی اس کی روایت نامقبول ہے۔ "ہذا حدیث جید۔" یعنی وہ حدیث جو "حسن" کے درجہ سے ترقی کرلے مگر صحیح تک نہ پہنچ سکے۔

امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب جامع ترمذی میں احادیثِ احکام میں سے صرف ان احادیث کو منتخب فرمایا جن پر فقہا کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف آپؒ نے اسے صرف احکام کے لیے مخصوص نہیں کر دیا، بلکہ امام بخاریؒ کی طرح تمام ابواب کی احادیث شامل فرما کر کتاب کو جامع بنادیا ہے۔ علما کرام کا کہنا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں علم حدیث کے مختلف فنون کو یکجا کر دیا ہے اور اس کام میں انہیں امتیاز حاصل ہے۔

امام ترمذیؒ کی کتاب جامع میں ایک ایسی حدیث نبویؐ بھی شامل ہے جس میں آپؒ اور آنحضرتؐ کے درمیان صرف تین واسطے پائے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک، جامع ترمذی میں صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ اور سنن ابو داؤدؒ کی بعض اچھی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔ جامع ترمذی میں دو باب خاص طور پر بڑے وسیع اور مفصل ہیں یعنی مناقب اور تفسیر القرآن۔ یہ دونوں باب بقیہ تین سنن یعنی سنن ابو داؤدؒ، سنن نسائیؒ اور سنن ابن ماجہؒ میں موجود نہیں ہیں۔

جامع ترمذی کی متعدد شرحیں بھی لکھی گئی ہیں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابو بکر محمد عبداللہ الاشبیلیؒ نے "عارضۃ الاحوذی" کے عنوان سے تصنیف کی۔ آپ ابن العربیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپؒ کا انتقال ۵۴۶ھ / ۱۱۵۱ء میں ہوا۔

۲۔ حافظ ابوالفتح محمد بن شافعیؒ (وفات: ۷۳۴ھ / ۳۴-۱۳۳۳ء) نے "النفح الشذی" کے نام سے نہایت ضخیم شرح لکھی ہے جو دس جلدوں میں سمائی ہے، حافظ صاحبؒ اسے مکمل نہ کر سکے۔ ان کی

Marfat.com

وفات کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیمؒ نے اسے مکمل کیا۔

۳۔ سراج الدین عمر بن رسلانؒ (وفات:۸۰۵ھ / ۳-۱۴۰۲ء) نے بھی "العرف الشذی" کے عنوان سے شرح لکھی، جو مکمل نہ ہو سکی۔

۴۔ "شرح الزوائد علی الصحیحین وابی داؤد" کے عنوان سے سراج الدین عمر بن علی (وفات: ۸۰۴ھ / ۲-۱۴۰۱ء) نے تصنیف کی۔

۵۔ "القوت المقتدی": یہ شرح حافظ جلال الدین سیوطیؒ (وفات: ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) نے لکھی۔

۶۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (وفات: ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء) نے "اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب" کے عنوان سے شرح لکھی۔

۷۔ مولانا شمس الحسن عظیم آبادیؒ نے "ہدایۃ اللوذعی بنکات ترمذی" کے نام سے شرح لکھی۔

۸۔ "العرف الشذی" کے عنوان سے مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے افادات شائع ہوئے۔

۹۔ "الکوکب الدری" کے عنوان سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے افادات ہیں۔

جامع ترمذیؒ کے کئی مختصرات بھی شائع ہوئے، مثلاً نجم الدین محمد بن عقیل الیاسی (وفات:۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء)، نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی (وفات:۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء) کے مرتب کردہ مختصرات۔ جامع ترمذیؒ پر بہت سے حواشی بھی تحریر کیے گئے۔

امام ترمذیؒ کی ایک اور کتاب اپنی افادیت کے لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب "شمائل ترمذی" ہے۔ رسول اقدس ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پہلو، کل امتِ مسلمہ کے لیے نہایت روشن اور فروزاں نمونہ اور ہر مسلمان کے لیے واجبِ تقلید ہے۔ امام ترمذیؒ سے قبل رسول اکرم ﷺ کے اعلیٰ ترین اخلاق، پاکیزہ اعمال، نفیس عادات اور شائستہ اطوار کی تفصیل مختلف احادیث کی کتب میں بیان تو کی گئی تھیں لیکن یہ تمام تفصیلات کسی ایک کتاب میں ایک جگہ نہ تھیں۔

امام ترمذیؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے سرکارِ دوعالم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے متعلق ان بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا، جن کا جاننا پاکیزہ صفت اور سچا، پکا مسلمان بننے کی غرض سے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ رحمت للعالمین ﷺ کے حلیۂ مبارک، لباسِ مبارک، سامان، عادات وخصائل، رفتارو گفتار، نشست وبرخاست، اخلاق اور معمولات کے بارے میں جتنی بھی مستند احادیث، امام ترمذیؒ تک پہنچیں، آپؒ نے انہیں "شمائل ترمذی" کے نام سے ایک کتاب میں یکجا کر دیا۔ یہ مختصر لیکن جامع کتاب رسولِ رحمت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپ ﷺ کے اخلاقِ مطہرہ کا آئینہ ہے۔

"شمائل ترمذی" کے بعد اسی نوعیت کی اور کتابیں بھی مرتب ہوئیں مثلاً ابو العباس جعفر بن محمد المستغفریؒ (وفات:۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء) کی "شمائل النبی ﷺ" اور ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاریؒ (وفات:۵۵۲ھ / ۱۱۵۸ء) کی "شمائل بالنور الساطع الکامل"، تاہم امام ترمذیؒ کی کتاب شمائل ترمذی کو اولیت ہی نہیں سب سے زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

"جامع ترمذی" کی طرح "شمائل ترمذی" کی بھی کئی شرحیں اور حواشی لکھے گئے۔ شرح وحواشی لکھنے والوں میں حافظ جلال الدین سیوطیؒ، ملا علی قاریؒ شامل ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے شاگرد مولانا نور الحقؒ، مولانا زکریاؒ اور ابو الضیا نور الدینؒ نے شرحیں لکھیں۔

امام ترمذیؒ نے ایک کتاب، "کتاب علل" کے نام سے تصنیف کی۔ یہ کتاب کسی روایت کی صحت اور اس کی خامیوں کو جانچنے کے موضوع کے بارے میں رہنمائی کرتی ہے۔ حدیث کی روایت کو پرکھنے کے لیے اصول وقواعد موجود ہیں اور یہ ایک مستقل فن ہے، لیکن بعض روایات میں ایسی مخفی خامیاں ہوتی ہیں جن کا علم اصولوں اور قواعد کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ کوئی روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل درست ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی مخفی عِلّت ہوتی ہے۔ اس علت کو پانے کے لیے علم حدیث پر گہری نظر ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کے عیوب کو تلاش کرنے کے لیے علم علل حدیث موجود ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس علم کے بارے میں مختصر لیکن مفید کتاب تصنیف کی ہے۔ بعض مورخین کے مطابق امام ترمذیؒ نے "کتاب علل" کے عنوان سے دو کتابیں تحریر فرمائیں ایک "کتاب علل الصغیر" کہلاتی ہے، جبکہ دوسری کتاب کا نام "علل الکبیر" ہے۔

امام صاحبؒ نے دیگر کتابیں بھی تصنیف کیں لیکن خیال ہے کہ یہ کتابیں اب نایاب ہیں:

Marfat.com

۱۔ کتاب التاریخ ۲۔ کتاب الزہد ۳۔ کتاب الاسماء والکنیٰ
۴۔ کتاب التفسیر (اس کتاب کا ذکر حافظ ابن کثیرؒ نے کیا ہے)۔

امام ترمذیؒ نہایت متقی اور خدا ترس بزرگ تھے۔ آپ رب کریم کے حضور عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تو آپؒ پر رقت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے اشک بہنے لگتے اور آپؒ عاجزی و خاکساری کی تصویر نظر آتے۔ عبادت کرتے ہوئے آپؒ اتنا زیادہ رویا کرتے تھے کہ شدتِ گریہ کے باعث آخری عمر میں آپؒ کی بینائی جاتی رہی تھی۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ امام ترمذیؒ مسلک کے اعتبار شافعی یا حنفی تھے۔ درحقیقت امام ترمذیؒ کسی ایک مسلک کے قائل نہ تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں غیر معمولی اور مجتہدانہ بصیرت سے نوازا تھا، چنانچہ انہوں نے ہر مسئلے کو فقیہانہ نقطۂ نظر سے، اپنے بے پناہ علم و فراست کی روشنی میں پرکھا اور کبھی فقہ شافعی کی تائید کی تو کسی جگہ اس سے اختلاف بھی کیا۔ اسی طرح بعض مقامات پر آپؒ نے کسی ایک مسلک سے اتفاق کیا ہے تو کسی اور جگہ اس مسلک کے خلاف رائے دی ہے۔ امام ترمذیؒ نہایت حق گو انسان تھے۔ آپؒ نے بعض مقامات پر اپنے اساتذۂ کرام سے بھی علمی نوعیت کا اختلاف کیا ہے۔

امام ترمذیؒ نے ۱۳رجب ۲۷۹ھ / ۱۹اکتوبر ۸۹۲ء کو اس دنیا کو خیر باد کہا۔ بعض مؤرخین کے مطابق آپؒ کا سنہ وفات ۲۷۵ھ / ۸۹-۸۸۸ء ہے، آپؒ کا انتقال ایک قصبے بوغ میں ہوا جو ترمذ سے تقریباً ۱۸ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

اسی قصبے میں آپؒ کو سپرد خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

حضرت امام ابو عبد الرحمٰن نسائی رحمۃ اللہ علیہ

فنِ قرأت، تفسیر قرآن حکیم کے ماہر اور فقیہ جنہیں 'حافظ الحدیث' کا خطاب دیا گیا

درس حدیث شروع ہو چکا تھا۔

استادِ مکرم درس دے رہے تھے اور تمام تلامذہ توجہ کے ساتھ درس کے ایک ایک جملے کو بغور سنتے اور لکھتے جاتے تھے۔ اچانک استاد کی نگاہ ایک شاگرد پر پڑی جس کے بدن پر طویل جبہ تھا اور سر پر بڑی سی ٹوپی۔ وہ اس طرح بیٹھا ہوا تھا، کہ اس کو شناخت کرنا ممکن نہ تھا۔ استادِ مکرم کو شبہ ہوا کہ یہ شخص حاکم وقت کا جاسوس ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس شخص کو درس میں آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوسرے دن درس کا آغاز ہوا۔ حاکم وقت کا جاسوس درس میں موجود نہ تھا۔ لیکن وہ تو موجود تھا! ایک دروازے کی آڑ لیے وہ بیٹھا تھا، لیکن کیا واقعی وہ حاکم وقت کا جاسوس تھا؟ اگر وہ جاسوس تھا تو پھر اسے اتنی توجہ سے درس سننے اور اسے تحریر کی صورت میں محفوظ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو یوں بھی دروازے کی آڑ میں چھپ کر بیٹھا تھا۔

اس واقعے کے خاصے عرصے بعد شہر کے ایک بڑے محدّث، فقیہ اور عالم دین نے چند احادیث روایت کیں، لیکن انہوں نے عام محدّثین کی طرح "حدثنا واخبرنا" (یعنی ہمیں حدیث پہنچی اور ہمیں خبر دی گئی) کہہ کر روایت کا آغاز نہیں کیا بلکہ "قرأ علیہ وانا اسمع" (ان کے سامنے پڑھا جارہا تھا اور میں سن رہا تھا) کے الفاظ استعمال کیے۔

انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ درس کے وقت استاد مکرم کے روبرو نہ تھے بلکہ دروازے کی آڑ لیے بیٹھے تھے اور ان کے ساتھی تلامذہ، استاد کی آواز سن کر جو کچھ دہراتے جاتے تھے، وہ اسے سن کر لکھتے جاتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں دروازے کی آڑ لے کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استاد مکرم حارث بن مسکینؒ اپنے اس شاگرد سے کسی بات پر خفا تھے، لیکن استاد کے درس کی دولت سے محروم ہونا، ہونہار شاگرد کو کسی قیمت پر گوارا نہ تھا، چنانچہ وہ پہلے تو طویل جبہ اور بڑی سی ٹوپی زیب تن کر کے درس میں پہنچا تاکہ استاد اسے پہچان نہ سکیں، لیکن جب استاد نے اسے حکمراں کا جاسوس سمجھ کر درس میں آنے سے روک دیا تو وہ دروازے کی آڑ میں چھپ کر درس میں شریک ہونے لگا۔ اس طالب علم نے درس سے پورا پورا استفادہ کیا۔ پھر طویل عرصے کے بعد اس طالب علم کو ایک بڑے محدث، فقیہ اور عالمِ دین کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ اس وقت انہوں نے چند ایسی احادیث روایت کیں جو استاد حارث بن مسکینؒ کے درس میں، دروازے کی آڑ لے کر سنی تھیں۔ تقویٰ اور دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ دیگر احادیث کی طرح وہ "حدثنا واخبرنا" سے روایت کا آغاز کرنے کے بجائے "قرأ علیہ وانا اسمع" (ان کے سامنے پڑھا جارہا تھا، اور میں سن رہا تھا) کے الفاظ استعمال کرتے، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

یہ محدّث، عالم دین، فقیہ بزرگ تھے، امام ابو عبد الرحمٰن نسائیؒ جو احادیث نبویؐ کے چھ درست ترین مجموعوں (صحاح ستہ) میں سے ایک "سنن نسائی" کے مؤلف ہیں۔ "سنن نسائی" کی تالیف آپؒ کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔

امام نسائیؒ کا نام احمد اور کنیت ابو عبد الرحمٰن ہے۔ آپؒ کے والد کا نام شعیب بن علی ہے۔ بعض مؤرخین نے علی بن شعیب لکھا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ امام نسائیؒ "حافظ الحدیث" کے لقب سے مشہور ہیں۔ امام صاحب کو "نسائی" ان کے شہر کی نسبت سے کہا جاتا ہے۔ وہ خراسان کے شہر "نساء" میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ شہر مرو اور نیشاپور کے قریب واقع تھا اور علم و فن کا بڑا مرکز تھا۔ "نساء" سے نسبت ظاہر کی جاتی ہے تو "نسائی" اور "نسوی" دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ امام نسائیؒ

Marfat.com

نے اگرچہ بعد میں مصر کو اپنا مرکز بنالیا تاہم شہر نساء کو ان کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ اسی نسبت سے مشہور ہیں۔

امام نسائیؒ کی پیدائش ۲۱۵ھ / ۸۳۰ء میں عمل میں آئی۔ اگرچہ بعض مؤرخین نے آپ کا سالِ پیدائش ۲۱۴ھ یا ۲۲۵ھ بھی درج کیا ہے لیکن بیشتر مؤرخین نے ۲۱۵ھ پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔ خود امام نسائیؒ نے بھی اپنا خیال ۲۱۵ھ کے حق میں ظاہر کیا ہے۔ یہ مامون الرشید کا زمانۂ خلافت تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں ۱۲ عباسی خلفا کا دورِ حکومت دیکھا۔ آپ کا انتقال ۱۸ ویں عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے دور میں ہوا۔

امام نسائیؒ نے ابتدائی تعلیم خراسان میں حاصل کی۔ پندرہ برس تو وہ "نساء" ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء میں نیشاپور روانہ ہوئے، جہاں آپؒ نے اسحاق بن ابراہیمؒ، حسین بن منصورؒ اور محمد بن رافعؒ جیسے بڑے علاکرام سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد آپؒ بغداد تشریف لے گئے جہاں اس وقت کے مشہور امام الحدیث قتیبہ بن سعیدؒ سے اکتسابِ علم کیا۔ آپ امام قتیبہؒ کی خدمت میں ایک برس دو ماہ تک موجود رہے۔ اس کے بعد امام نسائیؒ نے اپنی تشنگی علم کو بجھانے کی خاطر عراق، شام، مصر، الجزائر اور دیگر ملکوں کا سفر کیا اور جید علاکرام، فقہاعظام اور بلند پایہ محدثین سے علم کی بیش بہا متاع حاصل کی۔ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت محدود تھے اور راستے دشوار گزار، لیکن آپ کے سمندِ شوق کو راہ کی دشواریاں کبھی نہ روک سکیں۔

امام نسائیؒ کے اساتذۂ کرام میں آسمانِ علم کے بڑے بڑے درخشاں ستارے شامل ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: امام بخاریؒ، امام ابوداؤدؒ، امام احمدؒ، اسحاق بن راہویہؒ، اسحاق بن حبیب الشہیدؒ، سلیمان بن اشعثؒ، اسحاق بن شاہینؒ، حارث بن مسکینؒ۔ قرأت کا علم امام نسائیؒ نے احمد بن نصر نیشاپوریؒ اور ابوشعیب سوسیؒ سے حاصل کیا۔

آپ کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے۔ ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں: ابوالقاسم طبرانیؒ، حافظ ابوعوانہؒ، امام ابوجعفر طحاویؒ، امام ابوبشر الدولابیؒ، امام ابوجعفر عقیلیؒ، امام ابراہیم بن محمد بن صالحؒ، ابوعلی حسین بن محمد نیشاپوریؒ، حمزہ بن محمد الکنانیؒ، ابوبکر الحداد الفقیہؒ، ابوبکر احمد بن اسحاق السنیؒ اور خود امام نسائیؒ کے صاحب زادے عبدالکریم نسائیؒ۔

ان تلامذہ سے اکثر کو فنِ حدیث میں امامت کا مرتبہ حاصل ہوا۔ ابوبکر الحداد الفقیہؒ نے امام نسائیؒ کے علاوہ کسی اور سے حدیث روایت نہیں کی۔ ابوبکر احمد بن اسحاق السنیؒ نے تو امام نسائیؒ سے اتنا زیادہ استفادہ کیا ہے کہ وہ "صاحب النّسائی" کہلانے لگے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام نسائیؒ کو غیر معمولی قوتِ حافظہ عطا فرمائی تھی۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالمِ دین، فقیہ اور مؤرخ علامہ شمس الدین محمد بن عثمان الذہبیؒ نے امام نسائیؒ کے حافظے کی بے حد تعریف کی ہے، بلکہ ان کے خیال میں امام نسائیؒ، حافظے کے اعتبار سے امام مسلمؒ سے بھی بڑھ کر تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی امام نسائیؒ کی اعلیٰ یادداشت کو سراہا ہے۔ تاریخ مصر کے مصنف ابن یونسؒ نے امام نسائیؒ کو ثقہ و ثبت، معتبر اور حافظ قرار دیا ہے۔ امام دار قطنیؒ نے امام نسائیؒ کے بارے میں فرمایا ہے: "امام نسائی اپنے دور میں تمام علمائے حدیث سے فائق و برتر تھے اور ان کی کتاب "صحیح" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے" (تاریخ ابن کثیرؒ)۔ اسی طرح ایک اور جگہ، امام دار قطنیؒ اور حاکم نے متفقہ طور پر فرمایا: "امام نسائیؒ اپنے دور میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ، صحیح و سقیم روایات کے سب سے زیادہ ماہر اور رجال کے سب سے بڑے واقف کار تھے۔"

امام نسائیؒ کا اصل میدان علم حدیث ہے لیکن وہ دیگر علوم و فنون میں بھی کمال رکھتے تھے۔ قرأت کے فن پر انہیں عبور حاصل تھا۔ قرآن پاک کی تفسیر پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ فقہی احکام سے پوری طرح واقف تھے۔ ابنِ یونس اور دیگر علمانے تو انہیں فقیہ کے ساتھ مجتہد بھی قرار دیا ہے۔

امام نسائیؒ کو ان کی جلالتِ علم اور فقہ واجتہاد میں غیر معمولی مہارت کے پیشِ نظر شام کے شہر، حمص کا قاضی (جج) اور والی (گورنر) بھی بنایا گیا۔ وہ ان عہدوں پر کچھ عرصے فائز رہے۔

امام نسائیؒ کا علمی مرتبہ اتنا زیادہ بلند ہے لیکن، آپؒ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اگر کبھی آپؒ نے محسوس فرمایا کہ کسی لفظ کے اصل معانی کی تہ تک پہنچنے میں آپؒ کو دشواری ہو رہی ہے تو آپؒ نے سادگی کے ساتھ اس بات کا اعتراف فرمالیا اور کہا: "میں اس بات کو حسبِ منشا نہیں سمجھ سکا۔" یہ بات آپ کے فطری انکسار کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک ماہر اور بلند مرتبت محدّث میں جو اوصاف و خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ تمام، امام نسائیؒ کی ذات گرامی میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ حفظ، ثقاہت، عدالت، ضبط، صدق، امانت جیسی خوبیوں کے پیکر تھے۔ فن

Marfat.com

جرح وتعدیل (احادیث اور روایوں کو پرکھنے کا فن) کے ماہر تھے۔ صحیح، غلط، قوی، ضعیف روایات کو پہچان سکتے تھے۔

امام نسائیؒ راویوں کے انتخاب کے سلسلے میں حد درجہ احتیاط سے کام لینے کے عادی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مستند راویوں کی روایات منتخب فرمائیں اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی طرح صحیح سند کے ساتھ احادیث درج کی ہیں۔ خود امام نسائیؒ فرماتے ہیں: "میری کتاب 'السنن' تمام تر صحیح احادیث پر مشتمل ہے۔" امام صاحبؒ نے احادیثِ نبویؐ کے دو مجموعے مرتب فرمائے۔ پہلے آپؒ نے ایک مفصل مجموعہ ترتیب دیا جسے "السنن الکبریٰ" کہتے ہیں۔ جب آپ یہ کتاب مکمل کر چکے تو رملہ (فلسطین کا ایک شہر) کے امیر نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپؒ کی اس کتاب میں تمام صحیح روایات شامل ہیں؟ اس پر امام نسائیؒ نے جواب دیا کہ اس میں صحیح اور حسن دونوں قسمیں موجود ہیں۔ (صحیح سے مراد وہ احادیث نبویؐ ہیں، جن کی اسناد متصل ہوں اور ان کے راوی عادل ہوں، ان میں کوئی کمزوری نہ ہو اور یہ روایات بیشتر محدثین کی روایات کے خلاف نہ ہوں۔ "حسن" کی اصطلاح ان احادیث کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کے راوی صدق وامانت میں مشہور ہوں، ان پر روایتِ حدیث میں کذب کا الزام تک نہ لگا ہو، لیکن صحیح حدیث کے راویوں کو ان کے تقویٰ، استحکام اور حافظے کے باعث جو درجہ حاصل ہے، "حسن" احادیث کے راوی اس درجہ کو نہ پہنچتے ہوں)۔

جب امیر رملہ کو یہ علم ہوا کہ امام صاحبؒ نے اپنی "سنن" میں "صحیح" اور "حسن" دونوں طرح کی احادیث کو یکجا فرمایا ہے تو انہوں نے گزارش کی کہ امام صاحبؒ ایک ایسا مجموعۂ احادیث مرتب فرمائیں جس میں صرف وہ احادیث شامل ہوں جو صحت کے اعلیٰ درجے کو پہنچتی ہیں۔ اس پر امام صاحبؒ نے بڑی عرق ریزی، محنت اور توجہ سے، احادیثِ نبوی کا ایک اور مجموعہ ترتیب دیا، جس میں آپؒ نے صرف صحیح احادیث شامل فرمائیں۔

اس مجموعۂ احادیث کو "سنن الصغریٰ" کہا جاتا ہے اور یہی مجموعہ "سنن نسائیؒ" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ اس مجموعے میں ۵,۷۶۱ احادیث شامل کی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام نسائیؒ روایات کے انتخاب میں کس درجہ محتاط تھے۔ اگرچہ صحیح اور حسن اور دونوں طرح کی روایات قابلِ اعتماد ہیں اور ان کے راویوں پر بھروسا کیا جاسکتا ہے، لیکن صحیح احادیث کے راویوں کو افضلیت حاصل ہے۔

امام نسائیؒ کی احتیاط کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے راویوں کا انتخاب کرنے سے قبل اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ بھی فرمایا۔ آپؒ فرماتے ہیں: "جب میں نے سنن کی جمع وتالیف کا ارادہ کیا تو میں نے بعض ایسے راویوں کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ کیا جن کے بارے میں مجھے تھوڑا تردّد تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں ان لوگوں سے روایت نہ کروں، چنانچہ میں نے اعلیٰ سندوں کی احادیث کا ذکر کیا ہے۔"

سنن صغریٰ کو "مجتبیٰ" بھی کہا جاتا ہے، یعنی "منتخب۔" سنن نسائیؒ کا نام سنن ابوداؤدؒ اور جامع ترمذیؒ کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ یہ احادیث کے ان چھ درست ترین مجموعوں میں شامل ہیں جنھیں "صحاح ستہ" کہا جاتا ہے۔

امام نسائیؒ نے اپنی کتاب سنن نسائیؒ (صغریٰ یا مجتبیٰ) میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی جمع کر دی ہیں، یہاں تک کہ آپؒ نے رکوع وسجود میں پڑھی جانے والی دعائیں اور دیگر دعائیں بھی یکجا کر دی ہیں۔ امام صاحبؒ نے اپنی کتاب میں ہر نئے عنوان کو "کتاب" سے موسوم کیا ہے۔ اور پھر ہر کتاب کے تحت ابواب قائم کیے ہیں۔ مثلاً کتاب الطہارت کے تحت ۲۰۴ ابواب ہیں۔ کتاب مناسک الحج میں ۲۳۱ اور کتاب الزینت میں ۱۲۲۔ سنن نسائی میں کل ۵۱ کتابیں (مباحث) ہیں۔

سنن نسائیؒ کے قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے مطابق سنن نسائیؒ سے محدثین اور فقہا نے ہر زمانے میں استفادہ کیا ہے اور اہلِ علم نے احادیث کی شرح، رجال کی تحقیق وتفتیش اور عام فقہی مسائل اخذ کرنے کے لیے اس سے مدد لی ہے۔

امام نسائیؒ نے اپنی سنن میں ابواب کی جو ترتیب رکھی ہے وہ دیگر کتبِ احادیث کے مقابلے میں زیادہ موزوں محسوس ہوتی ہے اور دینی موضوعات کے اعتبار سے مناسب ہے۔ امام نسائیؒ نے اپنی کتاب میں بعض ایسے ابواب کا اضافہ کیا ہے جو دیگر کتب احادیث میں نہیں ملتے، مثلاً کتاب الخیل، کتاب الاحباس، کتاب عشرۃ النسا اور کتاب الزینہ وغیرہ۔

امام بخاریؒ کی طرح امام نسائیؒ نے بھی متعدد مسائل کو ثابت کرنے کے لیے ایک ہی حدیث کا ذکر کئی ابواب میں فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت

Marfat.com

اسامہ بن عمرؓ کی ایک روایت کو امام نسائیؒ نے کتاب الطہارت میں بھی بیان فرمایا ہے اور کتاب الزکوۃ میں بھی، ایک حدیث جتنے طریقوں اور اسناد سے روایت کی گئی ہے، امام نسائیؒ نے ان سب کا ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ امام مسلمؒ کا طریقہ ہے۔ لیکن امام نسائیؒ نے ایک اور اہم کام انجام دیا ہے کہ جہاں کہیں انہوں نے کسی حدیث کے طریقوں اور الفاظ کے مابین اختلافات اور اسناد کا ذکر فرمایا ہے، وہیں انہوں نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ کون کون سی اسناد صحت کے اعتبار سے برتر ہیں۔ اکثر آپؒ نے ایک حدیث کی مختلف روایات کا باہمی موازنہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کون سا طریقہ درست ہے۔ اگر تمام اسناد صحیح ہیں تو آپ یہ بتاتے ہیں کہ ان تمام اسناد میں سے زیادہ صحیح اور قابل ترجیح کون سی سند ہے۔

بعض اوقات راوی ایک حدیث کے متن کو دوسری حدیث کے متن سے ملا دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں امام نسائیؒ نے اس بات کی وضاحت فرما دی ہے۔ اگر کسی حدیث میں راوی کا نام درست بیان نہیں کیا گیا ہو تو امام صاحبؒ اس کی بھی اصلاح کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی روایت میں قوی اور ضعیف دونوں طرح کے راوی ہوں تو اس کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں۔ امام نسائیؒ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اہل روایت کا مکمل تعارف کروا دیتے ہیں۔ مثلاً بعض روایتوں میں راوی کے اصل نام کی بجائے صرف کنیت کا ذکر ہوتا ہے۔ امام صاحبؒ نے اہتمام کیا ہے کہ راوی کا اصل نام بتا دیا جائے۔ بعض مقامات پر امام صاحب نے راوی کے والد کے نام کا بھی بطور خاص ذکر کیا کیونکہ یہ راوی اپنے والد کے نام کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ کسی جگہ آپؒ نے راوی کے اس وصف کا ذکر بھی فرمایا ہے جس کی بنا پر انہیں شہرت حاصل ہے۔ اگر روایت کرنے والا کسی راوی کا ذکر نہ کر پائے تو امام صاحبؒ اس کی وضاحت فرما دیتے ہیں۔ اس طرح اگر کسی روایت میں راوی سے کچھ کمی بیشی ہو جائے تو امام صاحبؒ اس کی نشاندہی کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے ایک اور بات کا خیال رکھا ہے کہ اگر کسی حدیث کے متن میں آپ نے کسی لفظ کو مشکل محسوس کیا ہے تو آپ نے الگ سے اس لفظ کے معنی بھی درج فرما دیے ہیں۔

سنن نسائی میں تین طرح کی احادیث شامل کی گئی ہیں:

۱۔ وہ احادیث جو "صحیحین" یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں۔

۲۔ وہ احادیث جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی شرائط کے مطابق ہیں۔

۳۔ وہ احادیث جنہیں امام نسائیؒ نے خود منتخب فرمایا اور اگر ان کی سند میں کوئی کمی ہے تو اسے بھی بیان کر دیا ہے۔

سنن نسائیؒ کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایک مشہور شرح "الامعان فی شرح سنن نسائی لابی عبدالرحمٰن" کے نام سے ہے۔ یہ شرح علامہ ابوالحسن بن عبداللہ الانصاریؒ (وفات: ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء) کی تالیف ہے۔ دوسری شرح ابن الملقنؒ (وفات: ۸۰۴ھ / ۱۴۰۱ء) نے "زوائد نسائی" کے نام سے لکھی ہے۔ تیسری شرح حافظ جلال الدین سیوطیؒ) وفات: ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) نے تصنیف فرمائی۔ "تعلیقات سندی" کے نام سے علامہ محمد بن عبدالہادی سندی (وفات: ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء) نے دیگر کتب صحاح کی طرح امام نسائیؒ کی سنن کا حاشیہ بھی لکھا ہے۔ ایک حاشیہ علامہ ابویحیٰی محمد شاہجہاں پوری کا ہے۔

امام نسائیؒ نے کئی دیگر کتابیں تصنیف فرمائیں جو یہ ہیں:

۱۔ **خصائص سیدنا علی ؓ:** یہ رسالہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہے۔ اس میں احادیثِ نبویؐ کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے محاسن اور دیگر اہل بیت کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ **فضائلِ صحابہ ؓ:** امام نسائیؒ نے خصائص سیدنا علیؓ کی تالیف کے بعد دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و مناقب پر بھی ایک کتاب لکھی جس کا تذکرہ علامہ ابن سبکیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور علامہ ذہبیؒ نے کیا ہے، تاہم یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

۳۔ **مسند علی ؓ و مسند مالکؒ:** یہ دونوں کتابیں حضرت علیؓ اور امام مالکؒ کے مسانید پر مشتمل تھیں لیکن اب نایاب ہیں۔

۴۔ **کتاب الضعفاء والمتروکین:** یہ فن رجال کی کتب ہے۔ اس کتاب میں ضعیف اور متروک راویوں کا حروف تہجی کی ترتیب سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ دیگر کتب یہ ہیں:

۵۔ کتاب الجمعہ	۶۔ کتاب التمیز
۷۔ کتاب المدلسین	۸۔ کتاب الاخوہ
۹۔ مسند منصور بن رازان	۱۰۔ مشیختہ النسائی

Marfat.com

۱۱۔ اسماالرواۃ ۱۲۔ مناسک حج
۱۳۔ کتاب الجرح والتعدیل

امام نسائیؒ کا طرزِ زندگی نہایت پاکیزہ تھا۔ آپ بے حد باعمل اور پابندِ شریعت انسان تھے۔ آپ کے سینے میں خشیت الٰہی سے لبریز دل دھڑکتا تھا۔ نہ صرف فرض عبادات کی ہر وقت ادائیگی کا خاص خیال رکھتے تھے، بلکہ نفل عبادت کا بھی غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے۔ رات کا بڑا حصہ خالق کائنات کے حضور عبادات اور ذکر و دعا میں گزرتا تھا۔ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور اگلے دن افطار فرمایا کرتے تھے۔ (یہ دراصل حضرت داؤد علیہ سلام کی سنت ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ روزہ داؤد کا ہے)۔

امام نسائیؒ حج بھی اکثر کیا کرتے تھے۔ آپؒ نے جہاد میں بھی حصہ لیا۔ آپؒ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن آپؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ میدان جنگ میں امیر مصر سے دور دور رہے تاکہ حکمرانوں سے آپؒ کو کوئی فائدہ نہ پہنچ جائے۔ آپؒ نہایت بہادر اور شجاع تھے اور جہاد میں آپ نے بے مثال شجاعت اور جانبازی کا مظاہرہ کیا۔ جہاد کے دنوں میں بھی آپؒ کی عبادات کی کثرت کا وہی عالم تھا جو عام دنوں میں ہوتا تھا۔ آپؒ دن بھر جہاد میں حصہ لیتے اور رات کا بڑا حصہ عبادات میں مصروف رہتے۔ آپؒ کی طبیعت میں فیاضی کا وصف بھی نمایاں تھا۔ آپؒ مسلمان قیدیوں کو فدیہ دے کر رہائی دلوایا کرتے تھے۔

امام نسائیؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مردانہ وجاہت سے نوازا تھا۔ رنگت سرخ وسفید تھی۔ آپؒ کا چہرہ اتنا پرنور تھا کہ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں آپؒ کی شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا۔ آپ ضعیف العمر ہو گئے تب بھی آپ کی وجاہت اور حسن میں زیادہ فرق نہ آیا۔ امام نسائیؒ عمدہ لباس استعمال کرنے کے عادی تھے۔ خوراک بھی اچھی استعمال کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پر عمل پیرا تھے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو مال و دولت سے نوازیں تو اس کے فضل واحسان کا اثر اس کے جسم پر ظاہر ہونا چاہیے۔

امام نسائیؒ کی اولاد کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی، البتہ آپؒ کے ایک صاحب زادے عبدالکریم نسائیؒ نمایاں ہیں جو آپ کے تلامذہ میں شامل تھے۔

امام نسائیؒ نے ابتدا میں حصول علم کے لیے عالم اسلام کے بڑے حصے کا دورہ فرمایا اور کئی ملکوں میں اہل علم سے استفادہ کیا۔ بالآخر آپؒ نے مصر میں سکونت اختیار کرلی۔ طویل عرصے تک مصر میں قیام فرمانے کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر آپؒ نے ذی قعدہ ۳۰۲ھ / جون ۹۱۵ء میں دمشق جانے کا فیصلہ کیا۔ دمشق پہنچنے پر آپؒ نے دیکھا کہ عوام کی اکثریت بعض صحابہ کرامؓ کے مناقب کے بارے میں انتہاپسندانہ طرز عمل اختیار کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ امام صاحب نے عوام کی اصلاح کی غرض سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل ومناقب پر ایک کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کے عام ہونے پر لوگوں نے آپؒ سے بعض سوالات کیے جن کے جوابات لوگوں کی پسند یا مزاج کے مطابق نہ تھے چنانچہ لوگ آپؒ سے سخت ناراض ہوگئے اور اسی عالم میں آپؒ کو بری طرح زدوکوب کیا گیا، جس کے نتیجے میں آپؒ کے جسم کے نازک مقامات پر چوٹیں آئیں۔ امام صاحبؒ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے مکہ مکرمہ لے جایا جائے۔ انہیں مکہ مکرمہ لے جایا گیا، جہاں صفر ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء میں یہ عظیم اور جلیل القدر امام الحدیث اور جید فقیہ رحلت فرما گئے۔ انہیں صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سپرد خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

پانچویں صدی ہجری کے عظیم مجدد جنہوں نے امتِ کو اصلاح و ترقی کی راہ دکھائی

قافلہ آہستہ خرامی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں تھا۔

قدیم فارس کے شہر جرجان سے طوس جانے والا یہ قافلہ اس وقت ایک ویران مقام سے گزر رہا تھا۔ دور دور تک آبادی دکھائی نہ دیتی تھی، فضا پر سکوت طاری تھا صرف اونٹوں کے چلنے اور ان کی گردنوں میں بجنے والی گھنٹیوں کی آوازیں اس سکوت کو ایک تسلسل کے ساتھ توڑ رہی تھیں۔

اچانک قافلے میں ہلچل مچ گئی۔ سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں کسی خطرے کی نقیب تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے قافلے کو چاروں طرف سے گھڑ سواروں نے گھیر لیا۔ قافلے والے دم بخود رہ گئے۔ کسی کو مہلت نہ ملی کہ حملہ آوروں سے بچ کر بھاگ سکے۔

گھڑ سواروں نے قافلے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا تمام سامان اور دیگر قیمتی اشیا ایک طرف ڈھیر کر دیں۔ حکم کی تعمیل کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ ذرا سی دیر میں قافلے کے شرکا اپنے کل مال و متاع سے محروم ہو چکے تھے۔ ڈاکو اطمینان سے لوٹا ہوا سامان باندھنے میں مصروف تھے۔

قافلے کے مسافروں میں ایک نوجوان بھی شامل تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا شدید اضطراب کے عالم میں تھا۔ بے چینی کے آثار اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف ہویدا تھے۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچ گیا۔ سردار نے سوالیہ نظروں سے نوجوان کو دیکھا۔

"میں نے علم حاصل کرنے کی غرض سے طوس سے جرجان تک سفر کیا تھا۔" نوجوان نے کہنا شروع کیا، "وہاں میں نے جو کچھ حاصل کیا اسے میں نے کاغذات پر لکھ لیا تھا۔ آپ کے آدمیوں نے دوسرا سامان تو چھینا ہی ہے، وہ کاغذات بھی مجھ سے چھین لیے ہیں۔ میں صرف وہ کاغذات واپس مانگ رہا ہوں، کیونکہ میں نے اسی علم کو حاصل کرنے کے لیے سفر کیا تھا۔"

"ہاہاہا..." سردار بڑے زور سے ہنسا۔ "بھئی، میں نے تو سنا تھا کہ علم وہ شے ہے جسے کوئی نہیں چرا سکتا۔ تم نے جرجان جا کر کیا سیکھا، جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ چند کاغذات تمہارے پاس نہیں تو علم تمہارے پاس نہیں۔" یہ کہہ کر سردار نے اپنے کسی آدمی کو حکم دیا کہ نوجوان کے کاغذات واپس کر دیے جائیں۔ ڈاکوؤں کے سردار کی اس بات کا نوجوان کے دل پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ اس نے کاغذات پر موجود تمام علمی مباحث کو بہت تھوڑے عرصے میں ذہن نشین کر لیا۔

اب نوجوان کو ان کاغذات کی حاجت نہ تھی۔ علم اس کے سینے میں محفوظ ہو چکا تھا۔

یہ نوجوان تھے، پانچویں صدی ہجری کے عظیم مجدد حضرت امام غزالیؒ۔ آپؒ نے اپنے زبردست علمی کام کے ذریعے امتِ مسلمہ کو اصلاح و ترقی کی راہ دکھائی۔ آپؒ کے بارے میں یہ کہنا درست ہو گا کہ آپؒ کی شخصیت کمالات کا مجموعہ تھی۔ آپؒ نے برسوں سے چھائے ہوئے جمود کو توڑ کر مسلمانوں کو عمل کی ترغیب دلائی اور معاشرے میں رواج پانے والے غلط چلن کی اصلاح کر کے عوام الناس کو سیدھے راستے پر گامزن کر دیا۔

آپؒ کا نام محمد، کنیت ابو حامد اور لقب حجت الاسلام ہے۔ آپ کے والد کا نام بھی محمد ہے۔ امام غزالیؒ خراسان کے ضلع طوس کے ایک شہر طاہران میں ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد سوت کاتنے کا کام کرتے تھے۔ عربی زبان میں "غزل" کے معنی "کاتنے" کے ہیں۔ اسی مناسبت سے آپ کا خاندان غزالی کہلاتا ہے۔ عربی ترکیب کے اعتبار سے 'غزالی' کے 'ز' پر تشدید ہے یعنی "غزّالی"، لیکن عام طور پر غزالی کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

امام صاحبؒ کے والد درویش صفت اور صوفی مزاج انسان تھے۔ اپنے ہاتھ کی محنت سے کمائی پر گزر اوقات کرتے تھے۔ صوفیا کی محفلوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا اور فقہا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ گاہے گاہے وعظ کی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ جب فقہا کی محفلوں میں شریک ہوتے اور ان کی بصیرت افروز باتیں سنتے تو اللہ کے حضور دست بدعا ہو جاتے کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو اعلیٰ درجے کا فقیہ ہو اور جب کبھی وہ وعظ کی کسی محفل میں تشریف لے جاتے اور واعظ کی دلنشین تقریر سنتے تو آپ کی زبان پر دعا جاری ہو جاتی کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا عنایت فرما جو بہت پائے کا واعظ ہو۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ اس نے دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ آپ کے ایک صاحب زادے امام غزالیؒ بہت بڑے فقیہ اور دوسرے صاحب زادے احمد غزالی بہت بڑے واعظ بنے لیکن آپ کی یہ خواہش آپ کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ امام غزالیؒ صرف پندرہ برس کے تھے کہ آپ والد کے سائے سے محروم ہو گئے۔ انتقال سے قبل آپؒ کے والد صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا اور اپنے ایک دوست سے کہا کہ میرا تو آخری وقت آ پہنچا ہے، میری خواہش ہے کہ یہ دونوں لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ میں انہیں تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔

دوست نے دونوں بھائیوں کی سرپرستی قبول کر لی اور دونوں کو تعلیم دلوانا شروع کر دی لیکن وہ ان دونوں بھائیوں کے تعلیم کے اخراجات پورے نہ کر سکے۔ مجبور ہو کر انہوں نے دونوں برادران کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مدرسے میں داخل ہو جائیں۔ اس زمانے میں گھروں یا مساجد میں درسگاہیں قائم تھیں۔ ان درسگاہوں کے مصارف اہل دل مخیر حضرات برداشت کیا کرتے تھے۔ امام غزالیؒ نے حضرت احمد بن محمدؒ رازکانی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد امام صاحب جرجان چلے گئے جہاں آپ نے امام ابو نصر اسمٰعیلؒ سے درس لیا۔ (جرجان آج کل استرداد کہلاتا ہے)۔

امام ابو نصر اسمٰعیلؒ سے تحصیلِ علم کے بعد امام غزالیؒ واپس طوس چلے آئے۔

اس زمانے میں اگرچہ ہر شہر علم و فن کا گہوارہ تھا، لیکن دو شہروں کو بے حد شہرت حاصل تھی۔ یہ تھے نیشاپور اور بغداد۔ اس دور میں دو بزرگوں کے علم و بصیرت کی سارے زمانے میں دھوم مچی ہوئی تھی یعنی امام الحرمینؒ اور علامہ ابو اسحٰق شیرازیؒ۔ یہ دونوں بزرگ انہی دو شہروں میں درس دیتے تھے۔ نیشاپور، طوس سے قریب تھا چنانچہ امام غزالیؒ نے نیشاپور جا کر علم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

امام غزالیؒ، امام الحرمینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؒ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ امام الحرمینؒ کے شاگردوں کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ امام غزالیؒ نے اپنی بے پناہ فراست، حافظہ اور علم سے گہری دلچسپی کی بدولت بہت جلد ان چار سو شاگردوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ چنانچہ امام الحرمینؒ نے خوش ہو کر فرمایا: "غزالیؒ دریائے ذخار ہیں۔"

اس زمانے میں طریقہ کار یہ تھا کہ جب استاد درس دے کر فارغ ہو جاتے تھے تو ان کے شاگردوں میں جو سب سے زیادہ قابل ہوتا تھا، وہ اسی درس کو دہراتا تھا تاکہ تمام شاگردوں کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے، جو شاگرد یہ خدمت انجام دیتا تھا اسے "معید" کہتے تھے۔ امام غزالیؒ کو بھی یہ اعلیٰ منصب حاصل ہوا۔ جب تک امام الحرمینؒ بقید حیات رہے، امام غزالیؒ سے جدا نہ ہوئے۔ ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء میں امام الحرمینؒ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔

اس زمانے میں مملکتِ اسلامیہ پر عباسی خلافت کی حکمرانی تھی تاہم، خلیفہ کی تائید سے عملی انتظام سلجوقیوں کے ہاتھ میں تھا اور سلجوقیوں نے اسلامی مملکت کو استحکام بخشنے اور اسے سنوارنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک طوسی کا سارے عالم میں شہرہ تھا۔ امام غزالیؒ جب نیشاپور میں نظام الملک کے دربار میں پہنچے تو آپؒ کو بڑی عزت دی گئی۔

۴۸۴ھ / ۱۰۹۱ء تک امام صاحبؒ نظام الملک کے دربار میں متعین علما کی جماعت میں شامل رہے۔ ان کے علم کی وسعت اور گہرائی کے پیش نظر انہیں ۴۸۴ھ میں بغداد کی عظیم جامعہ نظامیہ (نظامیہ یونیورسٹی) کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت آپؒ کی عمر صرف ۳۴ سال تھی۔ جمادی الاول ۴۸۴ھ میں امام صاحبؒ بغداد پہنچے اور جامعہ نظامیہ میں اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں، آپ کے علم اور تفقہ کی دور دور تک شہرت تھی۔ اب آپؒ کو اس قدر بلند مقام حاصل تھا کہ مملکت کے اہم کام آپ کے مشوروں کے بغیر انجام نہ دیے جاسکتے تھے۔ آپ فقہ پر درس دیا کرتے تھے، اس دوران آپؒ نے علم فقہ پر چند کتابیں بھی لکھیں۔

سنہ ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء میں عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا انتقال ہوا۔

Marfat.com

ان کے بعد بارِ خلافت مستظہر باللہ پر ڈالا گیا۔ مستظہر علم پرور خلیفہ تھے اور امام صاحبؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ امام صاحبؒ کا درس بڑی شان کا ہوا کرتا تھا۔ آپؒ کے درس میں تین سو مدرسین، سو امرا اور رؤسا شریک ہوتے تھے۔ امام صاحبؒ وعظ بھی فرماتے تھے۔ ان وعظوں کو شیخ صاعد بن الفارسؒ ضبطِ تحریر میں لاتے جاتے تھے، اس طرح ایک سو اتراسی وعظ تحریر کی صورت میں لے آئے گئے۔ انہیں دو ضخیم جلدوں کی شکل میں مدوّن کیا گیا۔ امام صاحبؒ نے ان جلدوں پر خود نظرثانی فرمائی اور یہ کتابیں "مجالسِ غزالیہ" کے نام سے مشہور ہوئیں۔

سنہ ۴۸۳ھ / ۱۰۹۰ء سے امام صاحبؒ نے اپنے زمانے کے مختلف علوم خصوصاً فلسفے کا عمیق مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ آپؒ کو مختلف عقائد کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا اور تحقیق و جستجو آپ کے مزاج میں شامل تھی، اسی دوران آپؒ پر بغداد کی جامعہ نظامیہ کی بھاری ذمے داری بھی آ پڑی تھی۔ آپ بے حد مصروف رہتے تھے لیکن آپؒ نے کسی نہ کسی طرح وقت نکالا اور تمام علوم کا تحقیقی مطالعہ کر ڈالا۔ اس مطالعے کے نتیجے میں آپ پر جو انقلابی کیفیت طاری ہوئی اس نے آپؒ کو اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کرنے پر آمادہ کیا۔

امام صاحبؒ نے گہرے غور و فکر کے نتیجے میں یہ بات اخذ کی کہ اصل حقائق تک چونکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جا سکتا ہے اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس دارِ فانی سے بے رغبتی پیدا کی جائے، چنانچہ آپؒ نے فیصلہ کیا کہ آپؒ کو بغداد سے نکل جانا چاہیے۔ لیکن خود آپؒ کے الفاظ میں، "میں بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا لیکن چھ ماہ کشمکش میں گزر گئے۔"

امام صاحبؒ نے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو یہ خبر اہل بغداد پر بجلی بن کر گری کہ ان کے محبوب امام غزالیؒ بغداد چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپؒ کی ذات علوم کے دلدادہ اور علم کے پیاسوں کے لیے ایک سرچشمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپؒ کے پاس لوگوں کی بھیڑ لگ گئی جو بڑی عاجزی سے آپؒ سے درخواست کر رہے تھے کہ آپؒ بغداد چھوڑنے کا ارادہ ترک فرما دیں۔

امام صاحبؒ نے بغداد چھوڑنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ آپؒ کے پاس جو کچھ مال و دولت تھا اس میں صرف ضرورت کی اشیا پاس رکھ کر آپؒ نے سب کا سب ضرورت مندوں میں بانٹ دیا اور ذوقعدہ ۴۸۸ھ / نومبر ۱۰۹۵ء میں شہر بغداد کو الوداع کہہ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ آپؒ کی حیاتِ مبارکہ کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ بغداد سے امام صاحبؒ پہلے شام تشریف لے گئے۔ دمشق کی جامع مسجد اموی میں سکونت اختیار کی۔ آپؒ کا حال یہ تھا کہ روزانہ جامع اموی کے غربی مینار پر چڑھ کر دروازہ بند فرما لیتے اور ذکرِ الٰہی اور مراقبہ شروع کر دیتے۔ دو برس تک آپؒ نے دمشق میں قیام فرمایا اور اس دوران ریاضت اور مجاہدے کے ساتھ ساتھ علمی مصروفیات بھی جاری رکھیں۔ جامع اموی کو گویا دمشق کی یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی، اس کے غربی حصہ میں امام صاحبؒ درس دیا کرتے تھے۔

دمشق سے امام صاحبؒ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں بھی یہی معمول رہا کہ صخرا کے حجرے میں داخل ہو کر مجاہدہ شروع کر دیتے۔ بیت المقدس سے مقام خلیل گئے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے۔ پھر حج بیت اللہ کی نیت سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ مکہ مکرمہ میں ایک مدت تک آپؒ نے قیام فرمایا۔ یہاں سے مصر اور اسکندریہ کا قصد کیا۔ اسکندریہ میں عرصے تک مقیم رہے۔ ابن خلکان کے مطابق امام صاحبؒ یوسف بن تاشفین سے ملنے کے لیے مراکش جانا چاہتے تھے کہ یوسف کا انتقال ہو گیا چنانچہ آپؒ نے مراکش جانے کا ارادہ ترک فرما دیا۔ ابن الاثیر کے مطابق امام صاحبؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'احیاءعلوم الدین' اسی سفر میں تصنیف فرمائی اور دمشق میں ہزاروں طالبانِ علم نے خود امام صاحبؒ سے اس کتاب کا درس لیا۔ اسی سفر میں آپؒ نے علم العقائد پر رسالہ "قواعد العقائد" بیت المقدس والوں کی فرمائش پر تحریر فرمایا۔ ممکن تھا کہ امام صاحبؒ بقیہ زندگی اسی طرح گوشہ نشینی کے عالم میں بسر کر دیتے لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے عظیم کام لینا تھا۔ آپؒ فرماتے ہیں: "میں نے محسوس کیا کہ عام لوگوں کے عقائد متاثر ہو چکے ہیں اور میں ان شبہات کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں... یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ یہی کام کرنا چاہیے، یہی وقت کا فریضہ ہے۔ دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت کب جائز ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے ٹھیک ایسے ہی لمحات میں جب امام صاحبؒ گوشہ نشینی ترک کر کے، مفاسد اور برائیوں کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، حکمرانِ وقت کے دل میں بات ڈال دی کہ امام صاحبؒ کو نیشاپور کی جامعہ نظامیہ میں آنے کی دعوت دی جائے۔

Marfat.com

اس زمانے میں سنجر سلجوقی حکمراں تھے۔ ان کے لائق وزیر فخر الملک نے خود حاضر ہو کر امام صاحبؒ سے درخواست کی کہ وہ یونانی فلاسفہ کی یلغار کا مقابلہ کرنے اور عام مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کرنے کی غرض سے نیشاپور تشریف لے آئیں۔

امام صاحبؒ نے اپنے احباب سے مشورہ کیا۔ سب نے آپؒ کو گوشہ نشینی ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ بہت سے بزرگوں نے اس فیصلے کے حق میں خواب دیکھے۔ ذی قعدہ ۴۸۸ھ کو امام صاحبؒ بغداد سے روانہ ہوئے تھے اور پورے گیارہ سال بعد ذی قعدہ ۴۹۹ھ / جولائی ۱۱۰۶ء میں امام صاحبؒ پھر باقاعدہ طور پر درس و تدریس اور اصلاح و تبلیغ کے میدان میں اتر آئے۔ آپؒ نے حاکم وقت کی درخواست پر نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں مسندِ تدریس سنبھال لی۔

امام صاحبؒ نے اس کے بعد جو انقلابی کام انجام دیا، اس کی بنا پر آپؒ کو مجدّدین میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب الحاد اور باطنیت کے طوفان نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یونانی فلاسفہ نے تشکیک کے بیج بو دیے تھے۔ اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔ مذہبی مناظروں کا چلن تھا۔ باطنی ایک فرقہ تھا جس نے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔

اس عالم میں امام غزالیؒ اُٹھے اور انہوں نے اپنی پُر جلال تقریروں اور کاٹ دار تحریروں سے الحاد و فلسفہ کے تار و پود بکھیر ڈالے اور فلسفہ و مناظرہ کی ذہنی عیاشی سے لطف اندوز ہونے والوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا۔ ان کی انقلابی تحریروں نے مسلمانوں میں نئی روح پھونک دی۔ ان تحریروں کے اثرات یورپ تک پھیل گئے۔

اب تک فلسفہ ٔ الحاد اور باطنیت کے خلاف جتنا کام ہوا تھا اس کی حیثیت صرف مدافعت کی سی تھی۔ امام غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے یونانی فلسفے کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کر کے اس کا بھرپور انداز میں جواب دیا اور یونانی فلسفے کی حقیقت کھول کر بیان کر دی۔ امام صاحبؒ نے پہلے "مقاصد الفلاسفہ" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی جس میں آپؒ نے یونانی فلسفے کے نظریات اور مباحث کو پوری غیر جانبداری سے پیش کر دیا۔ یہ کتاب آسان زبان میں سلجھے ہوئے طریقے پر لکھی گئی۔ اس کتاب سے واضح ہو گیا کہ امام صاحبؒ کو فلسفہ پر کامل عبور حاصل ہے۔ اس کے بعد امام صاحبؒ نے اپنی زبردست کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس میں انہوں نے یونانی فلسفے کے نظریات اور مباحث پر اسلامی نقطہ ٔ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں اور اس کے استدلال کے ضعف کو پوری طرح واضح کر دیا۔ "مقاصد الفلاسفہ" کا نسخہ اسپین کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ یہ ترجمہ فرانس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ "تہافت الفلاسفہ" کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے اس کتاب نے فلسفے کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا۔

امام صاحبؒ کا دوسرا اہم کارنامہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا اسلامی نقطہ ٔ نظر سے جائزہ اور اس کی اصلاح کی کوشش تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیاءعلوم الدین" تصنیف فرمائی۔ آپؒ نے معاشرے میں پھیلے ہوئے اخلاقی امراض کا جائزہ لے کر ان کا علاج تجویز کیا۔ مناظرہ میں جو خامیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان کی اصلاح کی۔ بعض الفاظ کا غلط استعمال ہونے لگا تھا، اس جانب توجہ دلائی۔ آپؒ کی یہ کتاب اصلاح و تجدید کی بہت عظیم کوشش ہے۔ آپؒ نے دین کے فہم اور اجتہاد کی روح کو تازہ کیا۔

"احیاءعلوم الدین" سے پہلے فلسفے کی کئی کتب لکھی گئی تھیں لیکن ان کا پیرایۂ اظہار مشکل تھا اور ان میں مذہبی رنگ نہ تھا چنانچہ عام لوگوں کو ان کتابوں سے دلچسپی نہ تھی۔ امام صاحبؒ نے "احیاءعلوم الدین" میں فلسفہ اور مذہب دونوں کو آسان زبان میں سمو دیا۔ اس کتاب کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھنے سے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ لوگ اس کتاب کو سینے سے لگائے رہتے تھے۔ ضخامت کی وجہ سے علما نے اس کے کئی خلاصے لکھے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ کوئی خشک بے مزہ علمی بحث ہے بلکہ قاری کہانی کے انداز میں اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔

امام صاحبؒ نے اس کتاب میں عقائد کی اصلاح کی ہے اور نظام تعلیم کی بھی۔ پہلے عقلی اور صنعتی علوم مذہبی درس میں شامل نہ تھے۔ امام صاحبؒ نے اس نظام کی اصلاح کی اور نظامیہ یونیورسٹی میں علوم عقلیہ کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ امام صاحبؒ نے عام لوگوں کی خرابی کا ذمہ دار علمائے کرام کو ٹھہرایا۔ آپؒ نے احیاءعلوم کا خلاصہ فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا۔ اس کا نام کیمیائے سعادت رکھا گیا۔ دونوں کتب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ احیاءعلوم الدین دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ عبادات کے ظاہری پہلو اور مذہبی رسوم سے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں زندگی کے باطنی پہلو، قلب اور اس کے اعمال سے بحث کی گئی ہے۔ ہر

Marfat.com

حصہ دو ربعوں پر مشتمل ہے اور ہر ربع میں دس کتب ہیں۔

محرم ۵۰۰ھ / ستمبر ۱۱۰۶ء میں سلجوقی وزیر فخر الملک کو باطنیوں نے شہید کر دیا۔ اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام غزالیؒ نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ سے علیٰحدہ ہو گئے اور اپنے شہر طوس میں آباد ہو گئے۔ یہاں آپؒ نے اپنی رہائش گاہ کے قریب ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔

۵۰۰ھ میں حکمرانِ وقت محمد بن ملک شاہ سلجوقی نے نظام الملک طوسی کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ احمد نے امام صاحبؒ سے بغداد آنے کی درخواست کی۔ احمد نے خراسان کے والی صدر الدین کو بھی خط لکھا کہ امام صاحبؒ کو جامعہ نظامیہ بغداد میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے راضی کریں۔ امام صاحبؒ کے نام خط میں احمد نے لکھا کہ بغداد اسلام کا مرکز ہے۔ آپؒ کی قیام گاہ یہاں ہونی چاہیے تاکہ دنیا کے تمام حصوں کے لوگ آسانی سے آپؒ تک پہنچ کر اکتسابِ علم کر سکیں۔ اس خط پر خلیفہ کے دربار کے تمام اراکین نے دستخط کیے۔ امام صاحبؒ نے ان خطوط کے جواب میں ایک طویل خط میں بغداد آنے سے معذرت فرمائی۔

امام صاحبؒ نے اپنے اساتذہ سے درس حاصل کرنے کے دوران یوں تو لاکھوں احادیثِ نبویؐ سنی تھیں لیکن باقاعدہ طور پر حدیث کی جانب توجہ نہیں فرمائی تھی۔ چنانچہ امام صاحبؒ نے مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسنؒ کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا اور اس کی سند حاصل کی۔

امام صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ریاضت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ / ۱۸ دسمبر ۱۱۱۱ء کو آپؒ نے اسی شہر طاہران میں انتقال فرمایا جہاں آپؒ کی پیدائش عمل میں آئی تھی۔ آپؒ کے بھائی احمد غزالیؒ فرماتے ہیں، "پیر کا دن تھا، صبح کے وقت امام صاحبؒ بستر سے اٹھے، وضو کر کے نماز ادا فرمائی، پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر فرمایا: "آقا کا حکم سر آنکھوں پر۔" یہ کہہ کر ہاتھ پھیلا دیے۔ لوگوں نے دیکھا تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔" امام صاحبؒ کو طاہران میں ہی سپردِ خاک کیا گیا۔ آپؒ نے اپنے پس ماندگان میں چند لڑکیاں چھوڑیں۔

امام صاحبؒ نے درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا گراں بہا کام انجام دیا۔ آپؒ کی کتب اور رسائل کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ان میں سے بعض کئی جلدوں میں ہیں۔ آپؒ نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، ان میں فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، کلام، تصوف و اخلاق شامل ہیں۔

تصوف و اخلاق کے موضوع پر آپؒ کی کتاب "احیاءعلوم الدین" کے علاوہ مشکوٰۃ الانوار، فی لطائف الاخبار، فلسفہ میں مقاصد الفلاسفہ، کلام میں تہافت الفلاسفہ، فقہ میں وسیط، بسیط، مجموعہ فتاویٰ، اصول فقہ میں تحصین الماخذ، شفاءالعلیل، منطق میں معیار العلم اور میزان العمل مشہور ہیں۔ فقہ پر آپؒ کی کتاب بسیط کی تقریباً ستر شرحیں لکھی گئی ہیں۔ امام صاحبؒ نے ایک کتاب توریت اور انجیل میں تحریف کے ثبوت میں لکھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپؒ توریت اور انجیل کا علم بھی رکھتے تھے۔

امام صاحبؒ کے شاگرد بے شمار ہیں۔ خود امام صاحبؒ نے ایک خط میں ان کی تعداد ایک ہزار بتائی۔

امام صاحبؒ نے باقاعدہ شاعری تو نہیں کی لیکن آپؒ اعلیٰ شعری ذوق رکھتے تھے اور آپؒ نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ عمر خیام امام صاحبؒ کے ہم عصر تھے۔ آپؒ نے جو فارسی شاعری کی ہے، اس میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپؒ کی کتاب "احیاءعلوم الدین" بھی فارسی شاعری پر اثر انداز ہوئی ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد فارسی شاعری میں تصوف کے مضامین شامل کیے گئے۔

امام غزالیؒ نے حق بات کہتے ہوئے کبھی جھجک یا خوف محسوس نہ کیا۔ آپؒ نے حاکم وقت محمد بن ملک شاہ سلجوقی کو ایک رسالہ "نصیحت الملوک" کے نام سے لکھ کر بھیجا۔ محمد بن ملک شاہ کی زبان فارسی تھی اس لیے یہ رسالہ فارسی میں تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے حکومت کی خرابیوں سے حاکم وقت کو آگاہ کیا اور انہیں مفید مشورے دیے۔ اس زمانے میں مملکت کا نظم و نسق عموماً وزراء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا اس لیے امام صاحبؒ نے سلاطین سے زیادہ ان کے وزراء پر توجہ دی، انہیں تفصیلی خطوط لکھے اور اصلاح کی طرف مائل کیا۔

سنہ ۵۰۱ھ / ۱۱۰۷ء میں اندلس (اسپین) سے ایک صاحب، امام صاحبؒ کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے آئے۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا۔ انہوں نے امام صاحبؒ سے علوم حاصل کر کے ان میں کمال پیدا کیا پھر انہوں نے امام صاحبؒ کے سامنے ارادہ ظاہر کیا کہ اندلس میں نئی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے۔ امام صاحبؒ نے پہلے تو ان سے سوالات کر کے اس بات کا اچھی طرح

Marfat.com

اطمینان کیا کہ یہ مہم فی الواقع قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں اور انقلاب لانے کے بعد نئی حکومت کو مستحکم اور منظم بھی رکھا جاسکے گا یا نہیں۔
جب امام صاحبؒ کو اطمینان ہو گیا تو آپؒ نے اجازت دے دی۔ محمد بن عبداللہ تومرت اندلس گئے اور انہوں نے وہاں جا کر نئی حکومت قائم کی۔ وہ خود حکمراں نہیں بنے بلکہ انہوں نے عبدالمومن کو سربراہ بنایا۔ یہ موحدین کی حکومت کہلاتی ہے، جو تقریباً دو سو برس تک قائم رہی اور اس نے عظیم کارنامے انجام دیے۔
امام غزالیؒ نے تقریباً پچپن برس کی عمر پائی۔ اس مختصر سے عرصے میں آپؒ نے اصلاح و تجدید کے عظیم کارنامے انجام دیے۔ اسی عرصے میں گیارہ برس کی شہر نوردی اور گوشہ نشینی کا عرصہ بھی شامل ہے۔ بیس برس کی عمر میں آپؒ نے تصنیف و تالیف کا آغاز فرمایا۔ آپؒ کی زندگی فی الواقع ایک مجاہدِ اسلام کی مثالی زندگی ہے۔ کسی زمانے میں آپؒ کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی۔ دور دور سے مسائل آتے تھے اور آپ ان پر فتوے تحریر فرماتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ لکھنے کے لیے وقت نکالنا اور اپنے اہلِ خانہ کو وقت دینا بے انتہا مشکل کام تھا لیکن امام صاحبؒ نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔

***

Marfat.com

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

عظیم مفسّر، حدیث وفقہ کے امام، مجدّد، مصلح، مجاہد اور نابغۂ روزگار شخصیت

"وہ بچہ آتا ہی ہوگا!"

درزی نے حلب کے بڑے عالم سے ادب کے ساتھ کہا، "اس کے مکتب کا راستہ یہی ہے، آپ تشریف رکھیے۔"

حلب کے یہ بڑے عالم دمشق تشریف لائے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک بچے کی شہرت سنی تھی، انہوں نے دمشق کے بازار میں ایک درزی سے اس بارے میں دریافت فرمایا اور اب وہ بچے کے اس راہ سے گزرنے کا انتظار فرما رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے نظر آئے۔

"دیکھیے، وہ بچہ..." درزی نے اشارہ کیا "وہ جس کے ہاتھ میں بڑی سی تختی ہے۔"

حلب کے شیخ نے اس بچے کو آواز دی۔ وہ اپنی تختی اور کتابیں لیے چلا آیا، شیخ نے بچے کے ہاتھ سے تختی لے لی اور اس پر گیارہ احادیث لکھوادیں، پھر فرمایا "بیٹے ان کو پڑھ لو۔"

بچے نے تختی پر نظریں جمادیں اور احادیث کو غور سے پڑھنے لگا۔ جب وہ تمام احادیث پڑھ چکا تو شیخ نے تختی اس کے ہاتھ سے لے لی اور فرمایا: "اب ان احادیث کو سناؤ..." بچے نے وہ تمام کی تمام احادیث اسی ترتیب سے سنادیں جس ترتیب سے وہ تختی پر لکھی گئی تھیں۔ شیخ نے فرمایا۔ "اچھا! اب انہیں پونچھ ڈالو..." پھر چند اسناد تحریر کردیں۔ بچے نے ان اسناد کو غور سے پڑھا، پھر تختی واپس کرکے تمام اسناد زبانی سنادیں۔

حلب کے شیخ اس بچے کے غیر معمولی حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے فرمایا "اگر یہ بچہ جیتا رہا تو ان شاء اللہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

حلب کے شیخ کا کہنا درست تھا۔ غیر معمولی یادداشت اور علم کا بے پناہ شوق رکھنے والا یہ بچہ چند برسوں بعد، تفسیر، حدیث اور فقہ کا بہت بڑا امام بنا۔ یہ امام ابنِ تیمیہؒ تھے جن کی ذاتِ گرامی میں ایک عالم، مجتہد، مجاہد اور مصلح کی تمام صفات یکجا ہوگئی تھیں۔ آپؒ نے اپنے وسیع علم، بے پناہ ذہانت، بے مثال حافظے، بے بہا بصیرت اور شاندار انتظامی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو خدمات انجام دیں ان پر ہمیں بجا طور پر فخر ہونا چاہیے۔

آپؒ کا نام احمد، لقب تقی الدین اور کنیت ابو العباس ہے، لیکن دنیا آپ کو امام ابنِ تیمیہؒ کے نام سے جانتی ہے۔ دراصل "خاندان ابنِ تیمیہ" سے تعلق رکھنے والا ہر فرد "ابنِ تیمیہ" کہلاتا تھا، لیکن "ابنِ تیمیہ" کے نام سے شہرت صرف احمد تقی الدین امام ابنِ تیمیہؒ نے پائی۔

لفظ "تیمیہ" کے سلسلہ میں متعدد روایات مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ امام ابنِ تیمیہؒ کے جد امجد محمد بن الخضر ایک سفر کے دوران یمن کی بستی "تیما" سے گزرے۔ وہاں انہیں ایک معصوم بچی نظر آئی۔ جب وہ واپس گھر پہنچے تو انہیں اپنی بچی کی ولادت کی اطلاع دی گئی۔ بچی کو دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ اس بچی اور تیما میں نظر آنے والی بچی کی صورتوں میں بڑی مماثلت ہے، چنانچہ ان کے منہ سے اچانک "تیمیہ" کا لفظ نکلا یعنی "تیما والی لڑکی"۔ اس کے بعد خاندان کا ہر فرد "ابنِ تیمیہ" کہلانے لگا۔ مشہور مؤرخ ابنِ خلکان نے اس روایت پر اعتراض کیا ہے کہ اگر "تیمیہ" کی نسبت تیما کی جانب ہے تو یہ لفظ "تیماویہ" ہونا چاہیے تھا۔ ایک اور روایت ہے کہ امام ابنِ تیمیہؒ کے جد امجد محمد بن الخضر کی والدہ یا دوسرے قول کے مطابق دادی کا نام تیمیہ تھا جو بہت ہی قابل، عالم اور فاضل تھیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ کی پیدائش ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ / ۲۱ جنوری ۱۲۶۳ء کو مشہور شہر حران میں عمل میں آئی۔ یہ شہر دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ اس علاقے کو

Marfat.com

قدیم عرب مؤرخین "الجزیرہ" کہتے تھے، قدیم عربی کتب میں اسے دیار بکر اور دیار ربیعہ بھی کہا گیا ہے۔ آج کل یہ شہر ترکی اور شام کی سرحد کے قریب ترکی کی حدود میں واقع ہے۔

امام صاحبؒ کا خاندان علمی لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ آپؒ کے دادا ابو البرکات مجد الدین ابنِ تیمیہ بہت جید عالم اور فقیہ تھے۔ آپؒ کے والد شہاب الدین عبد الحلیم ابنِ تیمیہؒ، بلند پایہ عالم، محدث، فقیہ اور مفتی تھے۔ وہ جامع حران کے خطیب اور مدرسہ نوریہ کے مدرس تھے۔ امام صاحبؒ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت عبدالرحمٰنؒ بھی بڑی پرہیزگار، بلند حوصلہ اور متحمل مزاج خاتون تھیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں، وہ دور مسلمانوں کے لیے ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ منگول حکمران ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کو صرف پانچ برس گزرے تھے اور عالم اسلام کا بڑا حصہ منگولوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ تھا۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے اپنی عمر کے ابتدائی سات برس حران میں بسر کیے۔ آپؒ کی تعلیم کا آغاز حران ہی میں ہو چکا تھا۔ جب آپؒ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے دمشق پہنچے تو وہاں آپؒ کو بڑے بڑے علماکرام کے وسیع علم سے استفادہ کرنے کا موقع میسر آیا۔ آپؒ نے کم عمری ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اس کے بعد تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرف توجہ فرمائی۔

خاندان ابنِ تیمیہ جب منگولوں کے حملے سے بچنے کی خاطر اپنا علمی سرمایہ لے کر دمشق منتقل ہوا تو وہاں پہنچتے ہی اس علمی گھرانے کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ امام ابنِ تیمیہؒ کے والد محترم شہاب الدینؒ عبد الحلیم ابنِ تیمیہ سے جامع اموی اور دارالحدیث سکریہ میں درس دینے کی درخواست کی گئی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے دارالحدیث سکریہ کے علاوہ دمشق میں قائم مدرسہ (حنبلیہ مدرسہ ابنِ عمر) میں بھی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے جن اساتذہ سے حدیث کی سماعت کی ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ جناب یوسف کوکن عمری نے ان میں سے ۴۴ کے نام اور حالاتِ زندگی درج کیے ہیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے حدیث کی مشہور ترین کتب، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند احمد، مسند ابی داؤد، مسند نسائی اور مسند ابن ماجہ کئی اساتذہ سے کئی بار پڑھا۔ انہیں علم حدیث پر اتنی دسترس حاصل ہو گئی کہ یہاں تک کہا جانے لگا کہ جس حدیث کا علم امام ابنِ تیمیہؒ کو نہیں، اس حدیث کے حدیثِ نبویؐ ہونے میں شک ہے۔

امام صاحبؒ نے فقہ اور اصولِ فقہ کی کتب اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ تفسیر کلام پاک سے خاص دلچسپی تھی۔ آپؒ خود فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آیت کو سمجھنے کے لیے میں نے سو تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے صرف قرآن و حدیث اور فقہ ہی نہیں بلکہ دیگر تمام رائج علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ لغت اور نحو پر گہری توجہ فرمائی، نحو کے مانے ہوئے استاد سیبویہ کی کتاب، "الکتاب" کو نہایت غور سے پڑھا۔ یہ کتاب عربی قواعد اور نحو میں مستند تصور کیا جاتی تھی، لیکن امام ابنِ تیمیہؒ نے اس کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی فرمائی۔ آپؒ نے عربی زبان و ادب کی تاریخ کا عمیق مطالعہ فرمایا۔

اسلامی حکومتوں کی تاریخ پر آپؒ کی گہری نظر تھی۔ آپؒ کو قدیم و جدید عربی شعرا کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ امام صاحبؒ نے حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، فلسفہ، علم کلام، منطق، معانی و بیان کا علم بھی حاصل کیا اور خوشنویسی (کتابت) میں بھی مہارت حاصل فرمائی۔ وہ جس عالم کی شہرت سنتے تھے، ان کے پاس جاتے اور ان کے علم سے استفادہ کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان کے استاد کس مسلک یا مکتب یا فقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپؒ کے اساتذہ میں امام نوویؒ، ابن دقیقؒ، جمال الدین یوسف، کمال الدینؒ ابو المعالی اور کئی ممتاز علما کرام شامل ہیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ کی عمر جب ۱۹ برس کی ہوئی تو انہیں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی۔ ۳۰ ذی الحجہ ۶۸۲ھ / ۱۹ مارچ ۱۲۸۴ء کو امام صاحبؒ کو اپنے والدِ محترم سے جدائی کا غم سہنا پڑا۔ ان کے والد دمشق کے دارالحدیث سکریہ میں مدرس تھے، ان کی وفات کے بعد یہ مسند خالی ہوئی۔ حکومت نے اس عہدے پر امام ابنِ تیمیہ کا تقرر کر دیا۔ اس وقت آپؒ کی عمر تقریباً ۲۲ برس تھی۔ ۲ محرم ۶۸۳ھ / ۲۱ مارچ ۱۲۸۴ء کو امام صاحبؒ نے دارالحدیث سکریہ میں پہلی بار درس دیا۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ دارالحدیث میں کسی مدرس کے پہلے درس میں وقت کے ممتاز علما، بڑے بڑے امرا اور بعض اوقات خود خلیفۃ المسلمین بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ گویا نئے مدرس کا آزمائشی درس اور ایک کڑا امتحان تھا۔

امام صاحبؒ نے درس کا آغاز کیا اور صرف "بسم اللہ الرحمن

Marfat.com

الرحیم" کی شرح بیان کرنی شروع کی۔ الفاظ و معانی کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نئے نئے نکات ابھر کر سامنے آ رہے تھے اور حاضرین کے سامنے گویا ایک نئی دنیا جلوہ گر تھی۔ امام صاحب کے اس درس کو تمام علمائے کرام اور دیگر حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ ایک بڑے عالم شیخ تاج الدین فزاریؒ نے تو اس پورے درس کو حرف بہ حرف تحریر کر لیا اور اس قلمی نسخے کو دارالحدیث سکریہ کے کتب خانے میں رکھوا دیا۔

اگلے ماہ یعنی صفر کی دس تاریخ کو امام صاحبؒ نے جامع اموی دمشق میں تفسیر کلام پاک بیان فرمائی اور یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہو گیا۔ امام صاحبؒ اس مسجد میں کئی برس تک ہر جمعہ کو درس دیتے رہے۔ دارالحدیث سکریہ میں امام صاحبؒ کا درس تقریباً ۱۶ برس، یعنی ۶۹۹ھ / ۱۳۰۰ء تک جاری رہا۔ شعبان ۶۹۵ھ / جون ۱۲۹۶ء میں امام صاحبؒ کو دمشق کے دارالحدیث حنبلیہ (مدرسہ ابن عمر) میں شیخ الحدیث مقرر کر دیا گیا۔

امام ابنِ تیمیہؒ کے علم کی وسعت کا اندازہ لگانا محال تھا۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور اپنے علم پر انہیں کامل دسترس اور عبور حاصل تھا۔ ان کے ایسے رفقا بھی جو عمر میں ان سے بڑے تھے اور اپنے شعبہ میں ماہر سمجھے جاتے تھے، کہا کرتے تھے کہ امام ابنِ تیمیہؒ کو ہر فن میں مہارت حاصل ہے اور جب کسی ایک فن میں امام صاحبؒ کی مہارت کا مشاہدہ کر لیا جائے تو خیال آتا ہے کہ امام صاحبؒ شاید صرف اسی ایک فن کے ماہر ہوں گے، لیکن دیگر فنون میں بھی انہیں اتنی ہی مہارت حاصل تھی۔ مصر کے نامور محدث علامہ تقی الدینؒ ابن دقیق نے امام ابنِ تیمیہؒ سے ملاقات کے بعد فرمایا: "مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمام علوم اس شخص کی آنکھوں کے سامنے ہیں، جسے چاہتا ہے، لے لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔" امام ابنِ تیمیہؒ کی علمی قابلیت اور فہم و فراست کا ان کے مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ کو عام طور پر شاعری نہیں کرتے تھے لیکن فن شعر گوئی میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک شخص نے تقدیر کے مسئلے پر اپنا سوال آٹھ اشعار کی صورت میں ارسال کیا۔ آپؒ نے قلم اٹھا کر اس کا جواب لکھنا شروع کر دیا، حاضرین کا خیال تھا کہ امام صاحبؒ نثر میں اس مسئلے کا تفصیلی جواب تحریر فرما رہے ہیں، لیکن جب امام صاحبؒ نے جواب مکمل کیا تو حاضرین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ امام صاحبؒ نے مسئلے کا جواب ۱۸۴ اشعار کی صورت میں تحریر فرما دیا تھا اور ان اشعار کا قافیہ اور ردیف وہی تھے جو سوال کرنے والے کے اشعار میں استعمال ہوئے تھے۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے پانچ سو سے زائد کتب تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے ۱۵۹ کتب آج بھی دستیاب ہیں، بقیہ کتب کے صرف نام، تاریخ نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ تمام کتب کسی ایک موضوع پر نہیں ہیں۔ امام صاحبؒ کو متعدد علوم اور موضوعات پر عبور حاصل تھا، چنانچہ انہوں نے تفسیر کلام پاک، علم حدیث، فقہ، علم کلام، اخلاق و تصوف، فلسفہ و منطق اور دیگر مختلف معاملات پر بیسیوں کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا یوسف کوکن عمری کے مطابق امام صاحبؒ کی چند کتابیں ابھی تک قلمی صورت میں محفوظ ہیں، ان میں ۵۰۸ صفحات کا ایک قلمی نسخہ "مناظرات ابنِ تیمیہ مع المصریین والشامیین" کے نام سے ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

امام صاحبؒ نے تصنیف کا یہ عظیم کام وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق سر انجام دیا۔ بہت سی کتب لوگوں کے سوالات، اعتراضات یا استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ امام صاحبؒ نے آخری عمر میں قرآن کریم کی مشکل آیتوں کی جو تفسیر لکھی تھی وہ ۱۴ جلدوں میں رکھی گئی تھی۔ ابن بطوطہ کے مطابق اس تفسیر کی چالیس جلدیں تھیں۔ یہ مکمل تفسیر آج کل دستیاب نہیں ہے، البتہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں کی تفاسیر شائع ہو چکی ہیں۔ آپؒ نے اصولِ تفسیر پر پہلا مستقل رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔ آپؒ کی تصنیفات میں سے تفسیری حصوں کو الگ کر کے بھی شائع کیا جا چکا ہے۔

آپؒ کے فتاویٰ پر مبنی ایک کتاب "فتاویٰ ابنِ تیمیہ" کے نام سے پانچ جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ آپؒ نے ۳۹۰ صفحات کی ایک اور کتاب 'الطلاق' کے بعد طلاق یافتہ عورت سے دوبارہ شادی کرنے کے لیے حلالہ کے مسئلے پر تحریر فرمائی۔ حضور اکرم ﷺ کی اہانت کے مسئلے پر چھ سو صفحات کی ایک کتاب تصنیف فرمائی، یہ کتاب بھی مصر سے شائع ہوئی ہے۔ امام صاحبؒ کی بعض کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے اپنے زمانے میں رائج فلسفہ، منطق اور علم کلام پر تفصیلی تنقید کی۔ یونانی فلسفے کے نقائص بیان کیے اور اسلامی فلسفے کی برتری کو ثابت کر دکھایا، تاہم ان کی تنقید نہایت متوازن تھی۔ انہوں نے علوم ریاضی اور طبیعیات میں یونانیوں کی خدمات کو سراہا، لیکن الٰہ

Marfat.com

تعالیٰ کی معرفت کے سلسلے میں یونانی فلاسفہ کی تہی دامنی کا واضح الفاظ میں ذکر کیا۔ امام صاحبؒ نے مسیحیوں کی طرف سے اپنے دین کو برحق ثابت کرنے اور اسلام کے بارے میں غلط تصورات پھیلانے کی کوششوں کا بھی پُرزور انداز میں جواب دیا اور اس سلسلے میں مسیحیوں کی ایک کتاب کے جواب میں چار جلدوں پر مشتمل ایک کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" بھی لکھی۔

امام ابنِ تیمیہؒ کے شاگردوں میں بڑے اعلیٰ پائے کے علما کرام شامل ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں حافظ ابن قیمؒ ہیں جو حدیث، فقہ، اصول فقہ، عربیت اور علمِ کلام میں ماہر تھے۔ انہوں نے بہت سی کتب تصنیف فرمائیں۔ ان کتب میں "زادالمعاد" کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ امام ابنِ تیمیہؒ کے دیگر تلامذہ میں ابنِ کثیرؒ ہیں جن کی تفسیر ابن کثیرؒ اور تاریخ کی ۱۴ جلدوں پر مشتمل کتاب "البدایہ و النہایہ" بہت مشہور ہیں۔ امام صاحبؒ کے شاگرد ابن عبد الہادیؒ نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔

امام ابنِ تیمیہؒ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ فن رجال کے امام اور مورخ، حافظ ذہبی کے مطابق، میں نے ان سے زیادہ "متون" نہیں دیکھا، حدیث کا ذخیرہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے اور زبان کی نوک پر تھا۔ "متون" کا مطلب ہے: "حدیث کے الفاظ اور اصلی عبارت کا یاد رکھنے والا اور ان کا بروقت صحیح حوالہ دینے والا۔" جس زمانے میں امام صاحبؒ کو قید کر دیا گیا تھا تو اس وقت انہیں زیادہ کتابیں میسر نہ تھیں، لیکن اس حالت میں بھی امام صاحبؒ نے کئی کتب تحریر فرمائیں اور ان میں مستند کتابوں کے طویل اقتباسات محض اپنے حافظے کی مدد سے نقل کر دیے۔

ایک بار یہودیوں نے ایک قدیم کاغذ پیش کیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں پر جزیہ معاف کر دیا تھا۔ اس کاغذ پر حضرت علیؓ، حضرت سعد بن معاذؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے دستخط تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس کاغذ کو درست تسلیم کر لیا، لیکن امام ابنِ تیمیہؒ نے اس کاغذ کو پڑھ کر اسے ناقابلِ تسلیم اور جھوٹ قرار دیا۔ انہوں نے اس کاغذ کے جعلی ہونے کی دس وجوہ بیان کر دیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ اس کاغذ پر حضرت سعد بن معاذؓ کے دستخط ہیں، جبکہ حضرت سعد بن معاذؓ غزوۂ خیبر سے پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس کاغذ کی رُو سے یہودیوں پر جزیہ معاف کر دیا گیا تھا، جبکہ جزیہ کا حکم غزوۂ خیبر کے بھی تین سال بعد غزوۂ تبوک کے سال نازل ہوا تھا۔

امام صاحبؒ نے بڑی تعداد میں لوگوں کو برے کاموں سے روکا اور ان کی اصلاح فرمائی۔ آپؒ کی کوششوں اور تبلیغ سے بہت سے یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں دمشق کے تورات کے بڑے عالم قاضی عبدالسید بن اسحٰق شامل تھے۔ وہ اپنے تمام اہل و عیال سمیت مسلمان ہوئے۔ ان کا اسلامی نام بہاالدین رکھا گیا۔ شام کے حاکم نے اس خوشی میں بڑی دعوت کی۔ بہاالدینؒ اس کے بعد پندرہ سال تک اسلام کی تبلیغ کی خدمات انجام دیتے رہے۔

امام صاحبؒ گو کہ سرکاری عہدوں سے ہمیشہ بے نیاز رہے، لیکن عدل و انصاف کے نفاذ اور نیکی کو رائج کرنے کے سلسلہ میں آپؒ نے حکمرانوں کو مفید مشورے ہمیشہ دیے۔ آپؒ ہی کے اشارے پر امیر شمس الدین افرم کو طرابلس کا حاکم بنایا گیا تھا۔ آپؒ چاہتے تھے کہ لوگ اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کی بنا پر اونچے عہدے حاصل کریں۔ آپؒ نے اس ضمن میں ملک ناصر کو توجہ دلائی، ملک ناصر نے ایک حکم لکھ کر دمشق بھیجا کہ صرف قابلیت اور اہلیت کی بنا پر عہدے دیے جائیں۔ آپؒ نے یہ حکم نامہ بھی لکھوایا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے ورثا خود انتقام نہ لیں بلکہ عدالت سے رجوع کریں۔

امام ابنِ تیمیہؒ کا ایک بڑا کارنامہ غیر شرعی رسوم و رواج اور غلط عقائد کے خلاف جہاد ہے۔ آپؒ نے نہ صرف درس و تدریس اور تبلیغ کے ذریعے ان ناپسندیدہ رسوم اور عقائد کی اصلاح کی بلکہ ان رسوم و رواج کے خلاف عملی قدم بھی اٹھایا۔ دمشق کے نواح میں نہر قلوط کے کنارے ایک چٹان تھی۔ توہم پرست افراد اس چٹان سے عقیدت رکھتے تھے اور وہاں جا کر منتیں مانتے تھے، امام ابنِ تیمیہؒ رجب ۷۰۴ھ / فروری ۱۳۰۵ء میں مزدوروں اور سنگ تراشوں کو لے کر خود چٹان تک گئے اور اس چٹان کو کٹوا دیا۔

اس زمانے میں لوگ قبروں پر بھی جا کر طرح طرح کی رسومات ادا کرنے لگے تھے، رجب اور شعبان میں ایسی نمازیں پڑھی جانے لگی تھیں جن کی شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ملتی تھی۔ مسجدوں کے اطراف بازار لگتے، جشن کا سماں ہوتا، امام صاحبؒ نے ان تمام باتوں کے خلاف سخت مہم چلائی۔ دمشق کے حکمراں سے کہہ کر ۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء میں ان رسوم کو بند کروا دیا تاہم امام صاحبؒ کو جب مصر بلایا گیا تو

Marfat.com

٧٠٦ھ میں یہ رسوم پھر سے جاری ہو گئیں۔

امام صاحبؒ نے تصوف کی بھی اصلاح کی۔ عام طور پر تصور کیا جانے لگا تھا کہ صاف ستھرے نہ رہنے، کھانا پینا چھوڑ دینے، ترکِ دنیا کرنے اور عبادات کی پابندی نہ کرنے کا نام تصوف ہے۔ ایسے بہت سے افراد تھے جو ظاہری اعتبار سے درویش لگتے تھے، لیکن عبادات سے غافل تھے، غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ امام صاحبؒ نے ایسے کئی افراد کو سمجھا کر ان سے توبہ کروائی۔ اسی دور میں ایک فرقہ "رفاعیہ" کے نام سے موجود تھا۔ اس کے پیشرو شیخ احمد صالحؒ تھے جو بہت متقی بزرگ تھے، لیکن ان کے پیروکاروں میں سب لوگ اچھے نہ تھے۔ یہ لوگ سیاہ لباس پہنتے تھے، ہاتھوں اور گلوں میں زنجیریں ڈالے رکھتے تھے۔ نماز روزہ کے پابند نہ تھے، لیکن کرامات دکھانے میں شہرت رکھتے تھے۔

امام صاحبؒ نے تقاریر اور تحریروں کے ذریعہ رفاعیہ کے بزرگ شیخ احمدؒ کی بلند شخصیت اور ان کی اچھی تعلیمات کو کھول کر بیان کرنا شروع کر دیا اور بہت سے رفاعیوں سے توبہ کروائی، لیکن بعض رفاعیوں نے امام صاحبؒ کے خلاف مہم شروع کر دی۔ شکایت شام کے حکمران (نائب الشام) امیر افرم تک پہنچی۔ امام صاحبؒ اور رفاعیوں کو بلایا گیا۔ امیر افرم کے سامنے بڑی دیر تک امام صاحبؒ اور رفاعیوں میں مناظرہ ہوا۔ رفاعیوں نے دعویٰ کیا کہ ہم بھڑکتی آگ میں کود سکتے ہیں، ہمیں کچھ نہ ہو گا۔ امام صاحبؒ نے کہا کہ آگ میں کودنے سے قبل ان لوگوں کو گرم پانی سے اچھی طرح غسل دیا جائے اور ان کے جسم کو سرکہ اور گھاس سے اچھی طرح مانجھا جائے۔ اس پر ایک رفاعی صوفی نے بے ساختہ کہا: "ہمارے یہ کرتب تاتاریوں کے پاس چلتے ہیں، شریعت کے مقابلے میں نہیں چلتے۔" اس پر ان لوگوں کا پول کھل گیا۔

امام صاحبؒ نے بڑی بحث کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ رفاعی غلط راہ پر ہیں۔ انہوں نے رفاعیوں سے توبہ کروائی اور ان سے کتاب و سنت کی پیروی کرنے کا وعدہ لیا۔ ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ جو کوئی غلط عقائد اور رسوم کو اختیار کرے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امیر افرم نے اس اعلان کی تائید کی۔

امام صاحبؒ نے ان مفسدوں کے خلاف بھی مسلح جہاد کیا جو مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے، ان میں باطنی اور نصیری قبائل شامل تھے۔ امام صاحبؒ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے برائیوں کے خلاف زبانی نہیں بلکہ عملی جہاد کیا۔ ایک زمانے میں شام میں شراب فروخت ہونے لگی تھی۔ حکومت بدلنے کے باوجود یہ کاروبار پہلے کی طرح جاری تھا۔ امام صاحبؒ خود اٹھے اور اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر شہر کا دورہ کیا، جہاں شراب کی دکان نظر آئی وہاں شراب کا ذخیرہ تباہ کر دیا۔

ہلاکو خان کے پڑپوتے قازان خان نے ٦٩٥ھ/١٢٩٦ء میں تاتاری مملکت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت وہ مسلمان ہو چکا تھا اور اس نے اپنا نام محمود رکھ لیا تھا، اس کے ساتھ بہت سے تاتاری بھی مسلمان ہو گئے تھے، لیکن قازان خان اور نو مسلم تاتاریوں کی درست تربیت نہ ہو پائی تھی (قازان خان کو غازان خان بھی لکھا گیا ہے)۔ قازان نے ٦٩٩ھ میں مصر میں مسلمانوں کی غیر مستحکم حکومت کو دیکھتے ہوئے شام اور مصر پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں شام پر سیف الدین قپچاق کی حکومت تھی جو معروف فرمانروا ملک ناصر کے نائب تھے۔

ملک ناصر نے قازان خان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی فوجی تیاری کی اور لشکر لے کر دمشق پہنچ گئے۔ دمشق کے باہر ٢٧ ربیع الاول ٦٩٩ھ/٢٢ دسمبر ١٢٩٩ء کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، لیکن ملک ناصر کی فوج کی تمام تر بہادری کے باوجود اسے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ملک ناصر کی فوج پسپا ہو کر مصر چلی گئی۔ دمشق میں افرا تفری پھیل گئی، منگول حملہ آوروں کی دہشت طاری تھی، مزید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ بہت سے قیدی، قید خانہ توڑ کر باہر نکل آئے اور انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی، گویا نفسا نفسی کا عالم تھا۔

ان حالات میں یہ امام ابنِ تیمیہؒ تھے جو درس و تدریس کا عمل موثر کر کے اٹھے اور انہوں نے شہر میں امن و امان قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ آپؒ نے علماکرام کو جمع کیا اور انہیں دعوت دی کہ چل کر قازان خان سے بات چیت کی جائے چنانچہ ٣ ربیع الثانی ٦٩٩ھ/٢٨ دسمبر ١٢٩٩ء کو امام صاحبؒ دیگر علماکرام کے ساتھ جا کر دمشق اور حمص کے درمیان ایک مقام پر قازان سے ملے۔

اس ملاقات میں امام صاحبؒ نے نہایت جرأت اور بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھلے کھلے الفاظ میں قازان خان کو غیرت دلائی۔ آپؒ نے فرمایا "تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو، لیکن تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا حالانکہ تمہارے باپ اور دادا نے غیر مسلم ہونے کے باوجود جو کچھ عہد کیا اسے پورا کیا اور تم نے جو کچھ عہد کیا

Marfat.com

اسے توڑ دیا۔"

امام صاحبؒ کے ساتھ جو علما تشریف لے گئے تھے ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کا خیال تھا کہ اب امام صاحبؒ سمیت ہم میں سے کسی کی جان سلامت نہیں رہے گی، لیکن قازان خان نے نہایت تعجب کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے ایسا نڈر شخص آج تک نہیں دیکھا۔ قازان نے امام صاحبؒ اور ان کے ساتھ آئے ہوئے علماکرام کے ساتھ بڑی عزت کا سلوک کیا۔ امام صاحبؒ کی سفارش پر قازان نے بہت سے مسلمان جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد کھانا پیش کیا گیا۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے اس موقع پر بھی بے حد دلیری کا ثبوت دیا اور یہ کہتے ہوئے کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ: "یہ کھانا لوٹ مار کے ذریعے غریب مسلمانوں کی بھیڑ بکریوں کے گوشت سے تیار کیا گیا ہے اور ان لوگوں کے درختوں کے ایندھن سے پکایا گیا ہے جو ظلم کر کے کاٹے گئے ہیں۔"

قازان، امام صاحبؒ سے بہت متاثر ہوا اور ان سے دعا کی درخواست کی، آپؒ نے دعا فرمائی: "اے اللہ! اگر اس جنگ سے قازان کا مقصد تیرے کلمے کی بلندی اور تیری راہ میں جہاد ہے تو اس کی مدد فرما اور اگر حرص و ہوس ہے تو اسے اس کا بدلہ عطا فرما۔" قازان اس دعا پر آمین کہتا جاتا تھا، امام صاحبؒ کے ساتھ گئے ہوئے علماکرام نے بعد میں بتایا کہ اس موقع پر ہمارا خیال تھا کہ قازان شدید ناراض ہو کر امام صاحبؒ کو تہ تیغ کرنے کا حکم دے گا، لیکن قازان نے نہ صرف امام صاحبؒ کو عزت کے ساتھ رخصت کیا بلکہ دمشق کے لیے امن کا پروانہ بھی دے دیا۔ ۸ ربیع الآخر ۶۹۹ھ کو منگولوں کے نمائندوں کے دمشق میں داخل ہونے کے اگلے دن یہ پروانۂ امن جامع مسجد میں پڑھ کر سنایا گیا۔

دمشق میں تو امن قائم ہو گیا لیکن دمشق کے اطراف حملہ آور فوج نے لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ شہر پر تو تاتاریوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن قلعہ پر وہ قبضہ نہ کر سکے۔ ابنِ کثیرؒ کے مطابق امام ابنِ تیمیہؒ نے قلعہ کے حاکم کو خفیہ پیغام ارسال کیا تھا کہ قلعہ کسی حالت میں تاتاریوں کے حوالے نہ کرنا۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۶۹۹ھ / ۱۱ فروری ۱۳۰۰ء کو قازان عراق چلا گیا۔ اس نے اپنے نائب بولائی کو امیر بنا دیا تھا اور ساٹھ ہزار سپاہی چھوڑ دیے تھے۔ تاتاریوں کی لوٹ مار بند کروانے کے لیے امام صاحبؒ نے بولائی سے ملاقات کی، اسے سمجھایا اور بہت سے مسلم اور غیر مسلم قیدیوں کو رہا کروالیا۔ ۳ رجب کو اطلاع ملی کہ مصر کی فوج دمشق کی طرف بڑھ رہی ہے، یہ سن کر تاتاری فوج دمشق روانہ ہو گئی۔ یہ بڑا پُرخطر اور کشیدگی سے بھرپور زمانہ تھا۔ شہر میں لوگ رات رات بھر جاگتے تھے اور گھروں کی حفاظت کرتے تھے۔ امام صاحبؒ کا حال یہ تھا کہ رات بھر فصیلِ شہر کے اطراف گشت کرتے رہتے تھے اور لوگوں کو جہاد سے متعلق آیات سنا کر صبر کی تلقین کرتے تھے۔

امام صاحبؒ نے باطنی فرقے کے ان پہاڑی باشندوں کے خلاف بھی اپنے رضاکاروں اور سرکاری افواج کی مدد سے کارروائی کروائی جنہوں نے حملہ آور تاتاریوں کا ساتھ دیا تھا۔

صفر ۷۰۰ھ / اکتوبر ۱۳۰۰ء میں شام پر تاتاریوں کے حملے کی خبر پھر گرم ہوئی جس سے بے چینی پھیل گئی۔ امام صاحبؒ نے فوراً جامع مسجد میں جہاد پر، پُرجوش تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا اور لوگوں کو غیرت دلائی۔ ادھر مصر سے ملک ناصر کی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی جس سے لوگوں کو اطمینان ہوا، لیکن ملک ناصر نے کچھ دنوں بعد لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ امام صاحبؒ پہلے تو شام کے حاکم (نائب) سے ملے جو دمشق سے باہر اپنی فوج کے ساتھ موجود تھے۔ انہیں تسلی دے کر وہ مصر پہنچے اور ملک ناصر کو شرم دلائی کہ اگر شام تمہاری قلمرو کا حصہ نہ بھی ہو تا تب بھی تم پر لازم تھا کہ شام کی حفاظت کرتے۔ امام صاحبؒ نے ملک ناصر کو جہاد پر ابھارا، آخر ملک ناصر تیار ہو گئے اور مصری فوج دمشق کی سمت روانہ ہو گئی۔ امام صاحبؒ بھی دمشق لوٹ آئے اور مصری فوج کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ تاتاری فوج مصری فوج کی پیش قدمی کو دیکھ کر واپس چلی گئی۔

رجب ۷۰۲ھ / فروری ۱۳۰۳ء میں تاتاریوں کی یلغار کا پھر چرچا ہوا۔ اس موقع پر یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ تاتاری بھی مسلمان ہیں، ان سے جنگ کیوں کی جائے۔ امام صاحبؒ نے فتویٰ دیا کہ اگرچہ تاتاری مسلمان ہیں، لیکن انہوں نے خلافت کے خلاف بغاوت کی ہے، دوسرے مسلمانوں پر گناہوں اور مظالم کا الزام لگایا ہے اور خود اس سے زیادہ بری حرکات میں ملوث ہیں، اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔

مصری لشکر دمشق آپہنچا۔ اسی دوران میں رمضان المبارک کا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ ۲ رمضان المبارک کو مساجد میں اعلان ہوا کہ

Marfat.com

مصری اور شامی فوج اور تاتاریوں کا مقابلہ ہے، لوگ فتح کی دعا کریں۔ شقحب کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ امام صاحبؒ نے فتویٰ دیا کہ مجاہدین کو روزہ کھول لینا چاہیے، تاکہ لڑنے کی طاقت پیدا ہو۔ انہوں نے اس سلسلے میں حدیثِ نبویؐ بھی بیان فرمائی۔ جنگ ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے تاتاریوں کو شکست سے ہمکنار کیا۔ قازان اس جنگ میں شریک نہ تھا۔ اسے شکست کا سخت صدمہ ہوا اور اگلے سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس جنگ کے بعد امام صاحبؒ کی عزت اور قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو گیا، لیکن آپؒ تمام سیاسی عہدوں سے الگ رہے اور حسبِ سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

اس جنگ میں امام صاحبؒ نے زبردست شجاعت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے شہادت کی جگہ دکھاؤ۔ امیر نے ایسی جگہ لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں تاتاریوں کے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ امام صاحبؒ نے کچھ دیر دعا کی پھر تلوار سنبھال کر دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے۔

امام ابنِ تیمیہؒ کو اپنی حق گوئی کی وجہ سے طرح طرح کی تکالیف اور مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، ان کے بعض فقہی نظریات اور فتاویٰ بھی شدید اختلاف کا باعث بنے۔ ان میں ایک مسئلہ صفاتِ الٰہی سے متعلق تھا۔ اس زمانے میں علمِ کلام اور منطق کا بڑا زور تھا اور علما نے مختلف بحثوں میں الجھ کر نئے نئے عقائد تخلیق کر لیے تھے۔ امام صاحبؒ کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی اور فعلی تمام صفات پر ایمان لانا فرض ہے اور ان کے معانی میں حذف اور اضافے کی اجازت نہیں ہے۔ علما نے حکمرانوں کو بھڑکا کر امام صاحبؒ کو قید کروا دیا۔ قید میں بھی آپؒ کے عقیدت مند آپؒ سے علم حاصل کرنے کے لیے آتے رہے۔ آپؒ کو دو سال بعد رہائی ملی لیکن کچھ ہی عرصے بعد آپؒ کو پھر پابندِ زنداں کر دیا گیا۔ زنداں میں بھی درس کا سلسلہ جاری رہا۔ شوال ۷۰۸ھ میں حکومت تبدیل ہو گئی تو آپؒ کو اعزاز کے ساتھ رہا کیا گیا۔ جن علما نے آپؒ کے خلاف مہم چلائی تھی، ان سب نے آپؒ سے معافی مانگی۔ آپؒ نے سب کو معاف کر دیا۔

امام صاحبؒ حلالہ کی رسم کے سخت خلاف تھے، یعنی کوئی شخص اگر بیوی کو طلاق دیدے اور پھر اس سے دوبارہ شادی کرنا چاہے تو اس کے لیے شریعت میں حکم ہے کہ اس طلاق یافتہ عورت کی کسی اور مرد سے شادی ہو، پھر دونوں ساتھ رہیں اور ازدواجی تعلق قائم کریں، پھر وہ مرد اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے طلاق دے دے تو اس طلاق یافتہ عورت کا پہلے مرد سے نکاح جائز ہے۔ امام صاحبؒ نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی مرد کسی مطلقہ عورت کو اس کے سابق شوہر پر حلال کرنے کی نیت سے شادی کرے اور ایک دن بعد اسے طلاق دے دے تو وہ زانی ہے اور اسے زنا کی سزا ملنی چاہیے۔

حلف بالطلاق، البتہ ایسا مسئلہ ہے جس پر امام صاحبؒ کے فتوے سے دیگر علما نے اختلاف کیا ہے، یعنی اگر کوئی شخص کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے اور کہے کہ اگر یہ قسم پوری نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق۔ امام صاحبؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابنِ قیم کا خیال تھا کہ قسم پوری نہ ہونے پر صرف قسم ٹوٹنے کا کفارہ دینا ہو گا اور طلاق نہ ہو گی۔ انہوں نے اس نظریہ کے حق میں دو ہزار صفحات پر مشتمل مختلف رسائل بھی لکھے۔ بہر حال یہ ان کا نقطۂ نظر تھا، لیکن اس پر دیگر علما سخت ناراض ہو گئے اور ان کی مخالفت کی وجہ سے رجب ۷۲۰ھ / اگست ۱۳۲۰ء میں امام صاحبؒ کو دمشق کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ پانچ ماہ ۱۸ دن بعد آپ کو رہائی ملی، لیکن مخالفین کی وجہ سے آپؒ کو پھر دمشق کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ آپ قید میں بھی تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے اور درس دیتے رہے۔

آپؒ نے محض زیارتِ قبور کے لیے سفر کرنے سے منع فرمایا۔ دیگر کئی علما نے آپؒ کی تائید کی، لیکن بہت سے علما آپ سے ناراض ہو گئے۔ آپؒ سے لکھنے پڑھنے کی سہولتیں واپس لے لی گئیں۔ آپؒ شدید افسردہ ہوئے اور آپؒ نے کوئلے سے قید خانے کی دیوار پر لکھا: ”کوئی حقیقی سزا ہے تو یہی ہے۔“ اس پابندی کے بعد آپ تقریباً چار ماہ بقید حیات رہے۔ ذی قعدہ ۷۲۸ھ / ستمبر ۱۳۲۸ء کی ابتدائی تاریخوں میں علیل ہو گئے۔ دو سال تین ماہ اور چند دن کی اس قید میں آپؒ نے اسّی بار قرآن کریم ختم کیا۔ ۲۸ ذی قعدہ ۷۲۸ھ / ۳ نومبر ۱۳۲۸ء کی شب آپؒ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

اگلے دن صبح سویرے مسجد کے میناروں سے اعلان کیا گیا تو سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ امام صاحبؒ نے اہلِ دمشق کو تاتاریوں سے نجات دلائی تھی۔ لوگ ان کے احسان مند تھے۔ لاکھوں افراد جمع ہو گئے۔ پہلے قلعے کے باہر نمازِ جنازہ ادا کی گئی پھر جنازہ جامع اموی لے جایا گیا۔ نمازِ ظہر کے بعد پھر نمازِ جنازہ ہوئی۔ پھر شہر سے باہر تیسری بار نمازِ جنازہ ہوئی۔ آپؒ کو مقابر صوفیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ قبرستان

Marfat.com

اب باقی نہیں ہے اور یہاں عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں البتہ امام صاحبؒ کی قبر موجود ہے۔ آپؒ کی غائبانہ نمازِ جنازہ دیگر کئی ملکوں میں بھی ادا کی گئی۔ آپؒ کے وصال کی اطلاع چین پہنچی تو وہاں بھی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔

امام ابنِ تیمیہؒ نہایت با عمل انسان تھے۔ اپنے رب کی محبت اور اس کا خوف ان کی ذات کا لازمی جزو تھا۔ وہ اپنے علم پر کبھی نازاں یا مغرور نہ ہوئے۔ کسی بھی دینی مسئلے، قرآنی آیت یا عملی معاملے کو سمجھنے کے لیے وہ جہاں کتابوں کو کھنگال ڈالتے، علما سے بحث و مباحثے کرتے تھے، وہیں وہ اپنے معبود سے دعا کرنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ وہ اکثر عاجزی سے اپنے رب کے حضور التجا کرتے تھے: "اے ابراہیمؑ کو علم عطا کرنے والے، مجھے اس کی سمجھ عطا فرما۔"

آپؒ خود فرماتے ہیں کہ "کسی وقت کسی مسئلے میں مجھے مشکل پیش آتی ہے تو میں استغفار کرنا شروع کر دیتا ہوں، یہاں تک کہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔" امام صاحبؒ نے اپنی تمام زندگی لوگوں کے درمیان رہ کر گزاری۔ وہ ترکِ دنیا کے خلاف تھے۔ زندگی کی گہما گہمی ان کے اوراد و وظائف کو متاثر نہ کرتی تھی، خود امام صاحبؒ نے اس بات کا ذکر فرمایا ہے۔

امام ابنِ تیمیہؒ عبادات کو پورے خشوع و خضوع اور انہماک سے ادا کرتے تھے۔ رات کے وقت طویل قیام کرتے، نوافل ادا کرتے، قرآن پاک کی تلاوت فرماتے، اس میں غور و فکر کرتے۔ جب وہ نماز کا آغاز کرتے تو اپنے پروردگار کے خوف سے ان کے شانے اور دیگر اعضاء لرزنے لگتے۔ نمازِ فجر کے بعد، امام صاحبؒ کا معمول تھا کہ اپنی جگہ خاصی دیر بیٹھے رہتے تھے۔

امام صاحبؒ کا دل، ہوس و لالچ اور دنیاوی آسائشوں کی محبت سے پاک تھا۔ انہوں نے زندگی بھر کوئی عہدہ لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ جب انہیں دینے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے معذرت کر لی۔ وہ سادہ زندگی بسر فرماتے تھے، تاہم لباس اور رہن سہن میں خیال رکھتے تھے کہ وہ نہ تو بہت عالی شان ہو نہ بہت گھٹیا یا پھٹا پرانا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں نگاہ اس لباس کی طرف اٹھتی ہے۔ پہلی صورت میں لوگ صاحبِ لباس سے رشک یا حسد کرنے لگتے ہیں، دوسری صورت میں یا تو اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں یا اسے کوئی پہنچا ہوا فقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ بات نہیں تھی کہ امام صاحبؒ بہت نادار تھے اور آپؒ کو گزراوقات کے لیے رقم میسر نہ تھی، آپؒ دراصل بہت کھلے دل کے مالک تھے۔ ان کے پاس قیمتی گھوڑے، جانور، املاک، زر و جواہر وغیرہ آتے، وہ ان میں سے کوئی شے اپنے پاس نہ رکھتے، تمام اشیا ضرورت مندوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ اگر ان کے پاس اتفاق سے دینے کے لیے کچھ نہ ہوتا اور ایسے وقت کوئی حاجت مند آ کر سوال کر بیٹھتا تو آپؒ اپنا کوئی کپڑا ہی اٹھا کر اسے دے دیتے تھے۔

امام صاحبؒ بے حد عالی ظرف انسان تھے۔ انہوں نے اپنے شدید ترین مخالفوں اور ایذا رسانی میں آگے آگے رہنے والوں، حتیٰ کہ ان کے قتل کے فتوے دینے والوں کے لیے بھی ہمیشہ دعائے خیر فرمائی اور جب کبھی ان مخالفین سے بدلہ لینے کا موقع آیا تو آپؒ نے فراخدلی سے انہیں معاف فرما دیا۔ ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں جب انہیں قید سے رہائی ملی تو حکمراں ملک ناصر نے امام صاحبؒ سے ان قاضیوں کے قتل کا فتویٰ لینا چاہا جنہوں نے ملک ناصر کی مخالفت کی تھی اور امام صاحبؒ کے قتل کے فتوے دیے تھے۔ امام صاحبؒ نے ان قاضیوں کی تعریف و تحسین کی اور حکمراں کو ان کے قتل کا ارادہ بدلنے پر آمادہ کر لیا۔ آپؒ نے اپنی عمر کے آخری چند لمحات میں خاص طور پر یہ بات بیان فرمائی کہ میں نے ان تمام افراد کو معاف کر دیا ہے، جنہوں نے زندگی میں کبھی بھی مجھے تکلیف پہنچائی۔

امام صاحبؒ اتنے تبحرِ علم اور اتنے بڑے مرتبہ کے حامل ہونے کے باوجود بے حد منکسر المزاج تھے، کوئی ان کی تعریف کرتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتے: "میں تو امتِ مسلمہ کا ایک عام آدمی ہوں۔" امام صاحبؒ اپنے معمولات میں کتاب و سنت کی پوری پوری پابندی فرماتے تھے۔ آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی سے تو آپؒ کو حد درجہ محبت تھی۔ آپؒ کے ایک ہم عصر حافظ سراج الدینؒ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا ادب اور احترام کرنے والا اور آپ ﷺ کا اتباع کرنے والا ابنِ تیمیہؒ سے بڑھ کر کوئی نہ دیکھا۔

***

Marfat.com

ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ

فن قرأت پر حاوی، فقہ و حدیث میں کامل، تاریخ، نحو اور شعر کی ماہر عظیم شخصیت

وہ بے اولاد تھے!

ان کی شادی کو چالیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن وہ اولاد کی نعمت سے ابھی تک محروم تھے۔

اس وقت وہ حج بیت اللہ کی غرض سے سرزمین حجاز میں موجود تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ عزوجل کے گھر پر نگاہ پڑی تو ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے خانہ کعبہ کا طواف بڑی دل سوزی سے کیا۔ پھر وہ چاہِ زم زم پر گئے۔ آب زم زم پینے کے بعد انہوں نے ہاتھ اٹھا لیے۔ ان کی دیرینہ دلی تمنا لفظوں کی صورت میں ڈھل کر لبوں تک آ گئی۔ انہوں نے تڑپ کر دعا کی:

"اے میرے رب، مجھے نیک و صالح اولاد عطا فرمایئے۔" حج بیت اللہ کے تمام مناسک سے فارغ ہو کر وہ اپنے ملک واپس پہنچ گئے۔ انہیں، نہیں معلوم تھا کہ کائنات کے رب نے ان کے دل سے نکلی دعا کو شرفِ قبولیت بخش دیا ہے۔

چند ماہ بعد رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہو گیا۔ برکتوں اور سعادتوں سے معمور اسی ماہِ مبارک کی ۲۵ ویں تاریخ کو دمشق کے ایک محلے میں ایک بچے نے جنم لیا۔ یہ بچہ اسی غم زدہ شخص کی دعاؤں کا جواب تھا، جو اپنی شادی کے بعد ۴۰ برس سے اولاد کی نعمت کا منتظر تھا۔ اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ محمد کے گھر جنم لینے والا یہ بچہ کتنا بڑا عالم، قاری، فقیہ اور محدث بنے گا۔

آج دنیا اس بچے کو ابن الجزریؒ کے نام سے جانتی ہے۔ ابن الجزریؒ جو فنِ قرأت کے جید امام، فقہ اور حدیث کے عالم اور حافظ تھے۔ آپؒ کے علم و فضل سے ایک خلقت نے فیض حاصل کیا اور آپؒ کی تصانیف نے علم کا اجالا دور دور تک پھیلا دیا۔

آپؒ کا نام محمد، کنیت ابو الخیر اور لقب شمس الدین ہے لیکن آپؒ اپنی عرفیت ابن الجزریؒ سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپؒ کے والد، دادا اور پردادا کا نام بھی محمد تھا۔ آپؒ کو یہ عرفیت جزیرہ ابن عمر سے نسبت رکھنے کے باعث ملی۔ (جزیرہ ابن عمر موصل کے شمال میں جبل جودی کے قریب ایک علاقہ تھا۔ جبل جودی پر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی آ کر ٹھہری تھی)۔

ابن الجزریؒ ۲۵ رمضان المبارک ۷۵۱ھ / ۲۶ نومبر ۱۳۵۰ء کو دمشق میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ آپؒ نے کم عمری ہی میں قرآن کریم حفظ کرنا شروع کر دیا تھا اور صرف ۱۲ برس کی عمر میں آپؒ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آپؒ ہر سال تراویح کی نماز میں قرآن پاک سنایا کرتے تھے۔ ابن الجزریؒ نے فقہ شافعیہ کی پانچ مشہور کتابوں میں سے فقیہ ابو اسحٰق ابراہیم الشیرازیؒ (وفات: ۴۷۶ھ / ۱۰۸۳ء) کی کتاب "التنبیہ" کو بھی حفظ کیا۔

ابن الجزریؒ قرآن پاک کی مختلف قرأتوں کے ماہر تھے۔ آپؒ نے پہلے ۷۶۸ھ / ۱۳۶۷ء میں قرآن پاک کی سات مشہور قرأتوں کا علم حاصل کیا۔ اس غرض سے آپؒ نے علامہ ابو عمر عثمان الدانیؒ کی مشہور کتاب التیسیر اور ابو محمد قاسم الشاطبی (وفات: ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء) کی، حرز الامانی ووجہ التہانی (شاطبیہ کے نام سے مشہور ہے) شیخ تقی الدین عبدالرحمٰن البغدادی سے پڑھیں۔ ساتوں قرأتوں کی مشق احمد بن الحسین الکفری (وفات: ۷۷۴ھ / ۱۳۷۲ء) کی مدد سے کی۔ شیخ القراء محمد بن احمد اللبان (وفات: ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء) سے کتب کا علم بھی حاصل کیا اور قرأت بھی سیکھی۔ اس کے بعد ابن الجزریؒ، قرآن پاک کی ۱۴ قرأتوں کی طرف مائل ہوئے اور آپؒ نے شیخ عبدالوہاب بن یوسفؒ اور شیخ احمد بن رجب البغدادیؒ کی مدد سے الگ الگ ۱۴ قرأتوں کی مشق کی اور اسناد حاصل کیں۔

Marfat.com

یہ وہ زمانہ تھا جب دمشق علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن ابن الجزریؒ حصول علم کے شوق میں دیگر مقامات تک بھی جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ چنانچہ ۷۶۸ھ/۱۳۶۶ء میں آپؒ اپنے وطن سے روانہ ہوئے، پہلے فریضۂ حج بیت اللہ ادا کیا، اس کے بعد قاہرہ، اسکندریہ، بعلبک اور دیگر شہروں میں نامور اساتذہ کی شاگردی اختیار کی۔

ابن الجزریؒ نے فقہ کا علم جمال الدین عبدالرحیم الاسنویؒ (وفات: ۷۷۲ھ/ ۱۳۷۰ء)، عمر بن رسلانؒ (وفات: ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء) اور ابوالبقا عبدالوہابؒ (وفات: ۷۷۱ھ/ ۱۳۶۹ء) جیسے قابل فقہا کرام سے حاصل کیا۔ اصول فقہ اور معانی و بیان کی تعلیم علامہ عبدالرحمٰن بن سعد الدینؒ (وفات: ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء) اور دیگر اہل علم سے پائی۔ حدیث کا درس لینے کے لیے ابن الجزریؒ نے شیخ ابوالثنا محمد بن خلیفہؒ (وفات: ۷۶۷ھ/ ۱۳۶۵ء)، بہاالدین عبداللہؒ (وفات: ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۲ء)، شہاب الدین احمد الحنبلی (وفات: ۷۷۷ھ/ ۱۳۷۵ء)، شمس الدین محمد ابن المحب المقدسی (وفات: ۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء) اور ابن کثیر الدمشقیؒ جیسے نامور حافظِ حدیث کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

اس کے علاوہ ابن الجزریؒ نے فخر الدین النجاریؒ (وفات: ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء)، حافظ شرف الدین عبدالمومن الدمیاطی (وفات: ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۵ء) اور شیخ شہاب الدین احمد الابرقوہی (وفات: ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱ء) کے نامور تلامذہ سے بھی احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت کی۔ حافظ الحدیث عمر بن الحسن المراغیؒ (وفات: ۷۷۸ھ/ ۱۳۷۶ء) سے سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی کی سماعت کی اور شیخ صلاح الدین الحنبلیؒ (وفات: ۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء) سے طبرانی کی المعجم الکبیر اور مسند احمد پڑھیں۔

ابن الجزریؒ کو فن قرأت قرآن حکیم سے خاص دلچسپی تھی۔ آپؒ نے اس فن میں کمال بھی حاصل کیا تھا۔ آپؒ کے بعض اساتذہ نے آپؒ کو مشورہ دیا کہ علم قرأت بہت محنت چاہتا ہے، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد کم ہے، آپؒ کو دیگر علوم سے لگاؤ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ابن الجزریؒ نے احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ فرمائی اور باقاعدہ اسناد کے ساتھ ایک لاکھ احادیث یاد کر لیں۔

ابن الجزریؒ اب متعدد علوم کی تکمیل فرما چکے تھے۔ اور آپؒ کی غیر معمولی ذہانت، حافظے اور علم سے گہری دلچسپی سے آپؒ کے اساتذہ بہت متاثر تھے۔ اب آپؒ کے اساتذہ نے آپؒ کو درس و تدریس افتا اور تحدیث (حدیث روایت کرنا) کی اجازت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۲ء میں حضرت عمادالدین ابن کثیرؒ نے ۷۷۸ھ/ ۱۳۷۶ء میں ضیاالدین القریؒ نے اور ۷۸۵ھ/ ۱۳۸۳ء میں شیخ الاسلام البلقینیؒ نے ابن الجزریؒ کو درس دینے اور فتویٰ جاری کرنے کی اجازت عنایت فرمائی۔

ابن الجزریؒ نے چند برس تک دمشق کی جامع بنی امیہ میں قرأت کی تعلیم دی۔ اس غرض سے وہ قبۂ نسرین کے نیچے اپنی نشست رکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپؒ کو دارالعلوم عادلیہ کا شیخ القرأ مقرر کر دیا گیا۔ پھر آپؒ نے دارالحدیث اشرفیہ میں شیخ القرأ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آپؒ اپنے شیخ ابن السلاؒ کی وفات کے بعد، تربتہ ام الصالح کے شیخ القرأ بنا دیے گئے، یہاں آپؒ نے دارالقرآن کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرزمین مصر پر ملک الظاہر سیف الدین برقوق نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ برقوق ایک دین دار، نیک دل، بہادر، اولو العزم، اور علم دوست حکمراں تھے۔ انہوں نے ۷۸۴ھ کے اواخر ۱۳۸۳ء کے اوائل میں مصر کا اقتدار سنبھالا تھا۔ انہوں نے ابن الجزریؒ کو جامع توتہ کا خطیب مقرر کر دیا۔ ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء میں آپؒ کو بیت المقدس کی الجامعہ الصلاحیہ میں امورِ تعلیم کا ناظم مقرر کیا گیا۔ ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء میں ایک اور اہم ذمے داری آپؒ کی منتظر تھی۔ امیر شام التنمش نے آپؒ کو شام کا قاضی (جج) مقرر کر دیا تاہم یہ ذمہ داری ابن الجزریؒ کے لیے بڑی کٹھن ثابت ہوئی۔ اوقاف کے حسابات تسلی بخش نہ ہونے کے باعث امیر شام آپؒ سے ناخوش ہو گئے۔ آپؒ پر سختیاں کی گئیں اور آپؒ کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

ان حالات سے ابن الجزریؒ کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ عثمانی سلطنت کے حکمراں بایزید اوّل کے پاس ان کے دارالحکومت بُرسہ (بروصہ) چلے گئے۔ بایزید جو یلدرم (بجلی) کے لقب سے مشہور تھے، ایک بہادر اور علم پرور حکمراں تھے۔ انہوں نے ابن الجزریؒ کی بہت عزت افزائی کی۔ تعظیم و احترام سے اپنے ہی پاس ٹھہرایا اور جب تک وہ حکمراں رہے، انہوں نے ابن الجزریؒ کو بُرسہ سے کہیں جانے نہ دیا۔

بُرسہ میں ابن الجزریؒ نے درسِ حدیث اور درسِ قرأت کا

Marfat.com

سلسلہ شروع کر دیا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے آپؒ کے علم سے استفادہ کیا۔ خود عثمانی سلطان بایزید یلدرم نے آپؒ سے دس قراٰتوں کی تکمیل کی۔ لیکن اس کے بعد بد قسمتی سے امیر تیمور اور بایزید اوّل کے مابین جنگ چھڑ گئی۔

بایزید اوّل، بلقان کے محاذ پر مسیحیوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے، لیکن اپنے حلیفوں کے ترغیب دلانے پر انہوں نے اناطولیہ (موجود ایشیائی ترکی) پر چڑھائی کر دی اور امیر تیمور کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جواب میں امیر تیمور نے سخت کارروائی کی۔ آخر ۱۹ ذی الحج ۸۰۴ھ / ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء کو انقرہ کے مضافات میں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں بایزید کی فوجوں نے شکست کھائی۔ بایزید گرفتار ہو گئے۔ امیر تیمور نے ان کے ساتھ بہت احترام کا سلوک کیا لیکن بایزید قید کی حالت میں ۱۴ شعبان ۸۰۵ھ / ۹ مارچ ۱۴۰۳ء کو انتقال کر گئے۔ کچھ مورخین کے مطابق بایزید نے خودکشی کی تھی۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ بایزید جیسے بہادر سالار کو اپنی شکست کا غیر معمولی صدمہ پہنچا تھا۔

امیر تیمور نے جب عثمانی سلطنت کے دارالحکومت بُرسہ پر قبضہ کر لیا تو برسہ کی بعض علمی شخصیات نے برسہ سے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان میں ابن الجزریؒ بھی شامل تھے۔ لیکن آپؒ کو حراست میں لے کر امیر تیمور کے پاس پہنچا دیا گیا۔ امیر تیمور، علما اور فقرا کی بہت عزت کرتے تھے۔ ابن الجزریؒ کے بے پناہ علم سے واقف ہوئے تو انہوں نے ابن الجزریؒ کو اپنی محافل اور اجلاسوں میں شریک کرنا شروع کر دیا۔ پھر جب امیر تیمور واپس ماوراء النہر آئے تو ابن الجزریؒ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

امیر تیمور ابن الجزریؒ سے اس درجہ متاثر تھے کہ جب وہ سمرقند پہنچے تو انہوں نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں، مملکت کے سرکردہ امرا، علما، فقرا، شریک ہوئے۔ تیموری دعوتوں میں صفیں ہمیشہ حلقے کی شکل میں بنائی جاتی تھیں۔ علما اور فضلا کو دائیں جانب اور امرا کو بائیں جانب بٹھایا جاتا تھا۔ اس دعوت میں مشہور عالم، فلسفی، فقیہ اور ماہر لسانیات سید شریف جرجانیؒ بھی مدعو تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ۵۰ سے زائد کتابیں تصنیف کی تھیں جو فقہ، علم بلاغت، منطق، صرف و نحو سے متعلق تھیں۔ امیر تیمور نے سید شریف جرجانیؒ کو ابن الجزریؒ کے پیچھے جگہ دی۔ مسلمانوں میں سے کسی نے امیر تیمور سے دریافت کیا کہ آپؒ نے سید شریف جرجانیؒ کو ابن الجزریؒ کے عقب میں جگہ دی، حالانکہ سید شریف جرجانیؒ تو محفل میں سب سے آگے جگہ پانے کے حق دار ہیں۔ امیر تیمور نے بلاتاخیر جواب دیا:

"میں بھلا ایسے شخص کو آگے جگہ کیوں نہ دوں جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عالم ہو اور جب اسے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی اشکال درپیش ہو، تو وہ اس کو حل کر لیتا ہو۔"

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امیر تیمور، ابن الجزریؒ کی کس قدر توقیر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر تیمور نے اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک ابن الجزریؒ کو خود سے جدا نہیں ہونے دیا۔ امیر تیمور کی ہدایت پر ابن الجزریؒ ماوراء النہر کے علاقے کش اور پھر سمرقند میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۸۰۷ھ / ۱۴۰۴ء میں امیر تیمور کا انتقال ہو گیا جس کے بعد ابن الجزریؒ خراسان چلے گئے۔

خراسان سے ابن الجزریؒ ہرات، یزد اور اصفہان ہوتے ہوئے رمضان المبارک ۸۰۸ھ / فروری ۱۴۰۶ء میں شیراز پہنچے۔ شیراز میں وہ کچھ عرصہ درس دیتے رہے، پھر شیراز کے حاکم پیر محمد نے ابن الجزریؒ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کر دیا۔ ابن الجزریؒ یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن حاکم کے بے حد مجبور کرنے پر آپؒ نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور طویل عرصے تک یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ شیراز میں بھی آپؒ نے قراءت کی تعلیم اور حدیث کی ایک درس گاہ قائم کی جہاں سات یا دس قراٰتوں کی تکمیل کے بعد طلبہ کو اسناد جاری کی جاتی تھیں۔ شیراز کے باشندوں کو آپؒ کی ذات سے بہت فیض حاصل ہوا۔ آپؒ کے ذریعے اس علاقے میں علم قراءت اور حدیث کو بہت فروغ ملا۔

اشاعتِ علم کا یہ سلسلہ ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر حاکم شیراز آپؒ سے ناراض ہو گئے اور ابن الجزریؒ سے ان کے تعلقات کی نوعیت میں پہلی جیسی گرم جوشی نہ رہی۔ ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء میں ابن الجزریؒ نے حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اور بصرہ کے راستے سرزمین حجاز روانہ ہو گئے۔ راستے میں آپؒ کے قافلے کو رہزنوں نے لوٹ لیا۔ آپؒ کے پاس مال و متاع نام کی کوئی شے نہ بچی۔

ان حالات میں آپؒ اس سال فریضۂ حج بیت اللہ بھی ادا نہ

Marfat.com

کر سکے۔ آپؒ نے مدینہ کے قریب قدیم بندر گاہ ینبع میں قیام فرمایا۔ ربیع الاول ۸۲۳ھ / مارچ ۱۴۲۰ء میں آپؒ مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں آپ نے درسِ حدیث دیا اس کے بعد آپؒ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ آپؒ نے اسی سال حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ پھر آپؒ اپنی دو ازواج کے ساتھ بلادِ عجم کی سیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔ دمشق سے ہوتے ہوئے آپؒ قاہرہ پہنچے۔ یہاں اس زمانے میں سلطان الاشرف، حاکم تھے۔ انہوں نے ابن الجزریؒ کے ساتھ بہت عزت اور احترام کا سلوک کیا۔ قاہرہ میں آپؒ تقریباً دو ہفتے رہے۔

ابن الجزریؒ کی قاہرہ آمد کی خبر پھیلتے ہی قاری حضرات آپؒ کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور زبردست ہجوم ہو گیا۔ ہر فرد اس بات کا خواہاں تھا کہ آپؒ سے علمِ قرأت سیکھ لے۔ قاریوں کا اتنا ازدحام تھا کہ آپؒ ہر ایک کے لیے فرداً فرداً قرأت نہیں فرما سکتے تھے چنانچہ آپؒ مجمع کے سامنے ایک آیتِ قرآنی کی قرأت فرماتے اور پھر تمام قاری حضرات مل کر اس کو دہراتے تھے۔ قاہرہ میں ابن الجزریؒ نے درسِ حدیث بھی دیا۔ آپؒ نے مسند احمدؒ، اور مسند شافعیؒ کی تعلیم دی۔

قاہرہ سے ابن الجزریؒ یمن کے راستے ایک بار پھر فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہو گئے۔ یمن میں آپؒ کی کتاب "الحصن الحصین" کا بہت بڑا شہرہ تھا۔ اور اہلیانِ یمن اس کتاب کا حوالہ دینا پسند کرتے تھے۔ جب آپؒ یمن پہنچے تو آپؒ کے مداحوں اور عقیدت مندوں نے بڑی تعداد میں آپؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ آپؒ کی کتاب "الحصن الحصین" کی سماعت جن لوگوں نے اس سے قبل آپؒ سے کی تھی، ان میں سے بہت سے اب انتقال کر چکے تھے۔ اب ان افراد کے بیٹوں اور پوتوں وغیرہ نے آپؒ سے اس کتاب کی سماعت کی۔

ابن الجزریؒ نے کچھ دنوں مکہ مکرمہ سے عدن کو جانے والی شاہراہ پر واقع شہر زبید کی مسجد الاشاعرہ میں حدیث کا درس دیا اور زبید کے علما کرام نے آپؒ سے حدیث کی اجازت لی۔ یمن کے حاکم ملک المنصور بھی علم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ بھی آپؒ کے پاس حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپؒ کو صحیح مسلم سنائی اور آپؒ سے حدیث کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے آپؒ کو متعدد تحائف پیش کیے اور مکہ مکرمہ تک سفر کا اعلیٰ انتظام کیا۔

ابن الجزریؒ ربیع الاول ۸۲۸ھ / جنوری ۱۴۲۵ء میں مکہ مکرمہ پہنچے جہاں مسجد الحرام میں آپؒ نے مسند احمدؒ کا درس دیا۔

اپنی عمر کے آخری ایام آپؒ نے شیراز ہی میں گزارے جہاں محلہ استکافیین میں آپؒ کی قیام گاہ تھی۔

ابن الجزریؒ دو واسطوں سے امام شاطبیؒ کے شاگرد تھے۔ امام شاطبیؒ (وفات: ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء) اندلس کے صوبہ بلنسیہ کے شہر، شاطبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؒ ان تمام علوم کے ماہر تھے جن کا تعلق قرآن مجید کی قرأت اور تفسیر سے ہے۔

ابن الجزریؒ حدیث کے علم میں بھی کامل تھے۔ آپؒ کو ایک لاکھ احادیث اسناد کے ساتھ حفظ تھیں۔ محدث طاؤسی لکھتے ہیں: "وہ اعلیٰ روایت، حفظِ احادیث، جرح وتعدیل، قدیم اور بعد کے راویوں کی معرفت میں یکتا تھے۔ وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند دارمی، مسند امام شافعی اور موطا امام مالک سے روایت کرتے تھے۔"

ابن الجزریؒ فنِ قرأت اور حدیث کے علاوہ دیگر کئی علوم مثلاً تاریخ، طبقات، رجال، نحو اور اصولِ فقہ میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ابن الجزریؒ کو شعر و سخن سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے قرآن پاک کی قرأت سے متعلق فنِ تجوید (یعنی حروف کو ان کے مخارج سے صحیح طور پر ادا کر کے پڑھنا یا حروف کا درست تلفظ کرنا) کے اصول اور قواعد کو اشعار کی صورت میں مرتب فرمایا۔ آپؒ نے مختلف قرأتوں کے اختلاف کو بھی اشعار میں نظم کیا تاکہ یاد کرنے میں آسانی ہو۔ آپؒ نے صرف ۱۸ برس کی عمر میں علامہ شاطبیؒ کے انداز میں ایک نظم لکھی، جو دس قرأتوں کے موضوع پر تھی۔ اس نظم کا نام الہدایہ فی تتمہ العشرہ رکھا۔ اس نظم کا وزن اور قافیہ وہی ہے جو علامہ شاطبی کی مشہور نظم شاطبیہ میں استعمال ہوا ہے۔ شاطبیہ کا قافیہ حرف لام ہے۔ مورخین کے مطابق شاطبیؒ کے انداز میں لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔

ابن الجزریؒ نے مقدمہ۔ الجزریہؒ کے نام سے بھی نظم لکھی۔ طیبۃ النشر میں سات اور دس قرأتوں کے اختلافات کو ایک ہزار اشعار کی صورت میں نظم کیا۔ اصولِ حدیث پر بھی ایک نظم لکھی۔ ان کے علاوہ آپؒ نے عشقِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں بھی متعدد اشعار کہے۔ ایک بار آپؒ نے اپنے تلامذہ کو شمائل ترمذی کی تکمیل کروائی تو فی البدیہہ دو اشعار کہے۔ ابن الجزریؒ زبان و ادب میں بھی کمال رکھتے تھے۔ نہایت فصیح زبان بولتے اور لکھتے تھے۔

ابن الجزریؒ خوبصورت چہرے اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ آپؒ کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ ۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء میں جب آپؒ

Marfat.com

قاہرہ پہنچے تو اس وقت آپؒ کی عمر تقریباً ۷۳ برس تھی۔ اس وقت گو کہ آپؒ کی سماعت میں قدرے فرق آ گیا تھا، لیکن بصارت اس عمر میں بھی بالکل ٹھیک تھی۔ آپؒ اس وقت بھی اسی طرح باریک خط میں لکھا کرتے تھے جس طرح اپنی جوانی کے زمانے میں لکھتے تھے۔

ابن الجزریؒ نے درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود تصنیف کے لیے وقت نکالا اور ۳۵ سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان کتابوں میں سے چند کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کتاب النشر فی قرأت العشر: قرأت کے دس مختلف انداز پر یہ نہایت مشہور کتاب ہے اور فن قرأت پر جو کتابیں سرفہرست سمجھی جاتی ہیں، ان میں اس کتاب کا شمار ہوتا ہے۔ ابن الجزریؒ نے یہ کتاب صرف نو ماہ کے مختصر عرصے میں تصنیف فرمائی۔ پہلی بار یہ کتاب دمشق سے ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ مراد آباد سے قاری عبداللہ نے توضیح النشر کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ بھی شائع کیا۔

۲۔ تحبیر التیسیر القرأت: علامہ عثمان بن سعید دانیؒ نے قرآن کریم کی سات قرأتوں پر ایک کتاب التیسیر کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔ یہ کتاب سبع قرأت پر سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مقبول کتاب ہے۔ علامہ دانیؒ کا تعلق قرطبہ سے تھا۔ وہ فقہ مالکیہ کے ماہر اور فن قرأت کے امام تھے۔ انہوں نے ۲۰ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ۱۸ فن قرأت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سے التیسیر نے شہرت حاصل کی۔ ابن الجزریؒ نے اس کتاب پر تبصرہ لکھا اور اس میں مزید تین قرأتوں کے بیان کا اضافہ کر کے اس کتاب کا نام تحبیر التیسیر رکھ دیا۔

۳۔ طیبہ النشر فی قرأت العشر: یہ قرآن کریم کی قرأت کے دس طریقوں پر ایک ہزار اشعار کی ایک نظم ہے۔ اس نظم کو ابن الجزریؒ نے شعبان ۷۹۹ھ / مئی ۱۳۹۷ء میں مکمل کیا۔ یہ کتاب قاہرہ سے پہلی بار ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء اور پھر ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو میں ترجمہ قاری عبداللہ نے کیا جو مراد آباد سے شائع ہوا۔

۴۔ الدرۃ المضیتہ فی قرأت الائمہ الثلاثہ المرضیتہ: یہ طویل بحر میں ۲۴۱ اشعار پر مشتمل ایک نظم ہے جسے آپؒ نے ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں مکمل فرمایا۔ یہ دراصل علامہ شاطبیؒ کی مشہور کتاب شاطبیہ کی منظوم تکمیل ہے، جو قرأتوں کے دس مختلف انداز کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب قاہرہ سے ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ ھدایہ (یا، غایہ) المھرہ فی زیادۃ العشرۃ: بارہ انداز کی قرأتوں کے موضوع پر یہ ایک اور نظم ہے۔

۶۔ منجد المقربین ومرشد الطالبین: اس کتاب میں ابن الجزریؒ نے حافظ ابو شامہ کی کتاب "المرشد الوجیز فی علوم القرآن العزیز" کا جواب دیا ہے اور اس کی تردید کی ہے۔ آپؒ نے اس کتاب میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ دس قرأتوں کا سلسلہ متواتر قائم ہے اور اس کے راوی ہر زمانے میں کثرت سے موجود رہے ہیں۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔

۷۔ المقدمہ الجزریہؒ: فن تجوید پر ایک منظوم رسالہ ہے جو ۱۱۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ مصر اور تبریز سے شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ التمھید فی علم التجوید: تلاوت کلام پاک پر یہ رسالہ ابن الجزریؒ نے ۷۶۹ھ / ۱۳۶۷ء میں مکمل فرمایا۔

۹۔ کفایہ الالمعی فی آیۃ یا ارض ابلعی: قرآن کریم کی سورۃ ہودؑ کی آیت نمبر ۴۶، "یا ارض ابلعی" کی تفسیر اور اس کی وجوہ اعجاز کے بارے میں ایک کتاب ہے۔

۱۰۔ مختصر طبقات القرأ المسمیٰ بغایۃ النھایہ: ابن الجزریؒ نے ایک ہی موضوع پر جو کتابیں تالیف کیں، ان میں یہ مختصر تر ہے۔

۱۱۔ مقدمہ علم الحدیث: اصطلاحات حدیث پر ایک کتاب ہے۔

۱۲۔ الھدایہ الی معالم الروایہ: یہ تلاوت کلام پاک پر ۲۷۰ اشعار کی ایک نظم ہے۔

۱۳۔ عقد اللہ لی فی الاحادیث المسلسلۃ العوالی: اس کتاب کو ابن الجزریؒ نے شیراز میں ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء میں مکمل فرمایا۔

۱۴۔ اصول القرأت: قرأت کے اصولوں پر مختصر رسالہ ہے۔

۱۵۔ اعانتہ المھرہ فی زیادۃ العشرۃ: یہ دس قرأتوں کے بعض کی قرأتوں کے بیان میں ایک کتاب ہے۔

۱۶۔ الغاز: فن قرأت کے اختلافات کو منظوم چیستاں میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۷۔ الغریب: یہ کتاب النشر کی تلخیص ہے۔

Marfat.com

۱۸۔ شرح طیبہ النشر: آپؒ کی کتاب طیبہ النشر کی شرح اور مختصر حواشی پر مشتمل کتاب ہے۔

۱۹۔ العقد الثمین: آپؒ کی کتاب الغاز کی غیر منظوم شرح ہے۔

۲۰۔ القرأت الشاذة: یہ شاطبیہ کے انداز میں قرأتوں کے موضوع پر ایک منظوم رسالہ ہے۔ غالباً یہ وہی کتاب ہے جس میں قرآن کریم کی قرأت کے ۴۰ مشکل مسائل پر بحر طویل میں ایک نظم کہی گئی ہے۔

۲۱۔ المولد الکبیر: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اطہرؐ پر ایک رسالہ ہے۔

۲۲۔ الاجلال والتعظیم فی مقام ابراهیم ﷺ: اس کتاب میں آپؒ نے مقام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے فضائل درج فرمائے ہیں۔

۲۳۔ التوضیح فی شرح المصابیح: ابن الجزریؒ نے مشہور محدث حسینؒ بن مسعود الفرا البغوی (وفات: ۵۱۰ھ یا ۵۱۶/۱۱۱۶ یا ۱۱۲۲ء) کی کتاب مصابیح السنہ کی شرح "التوضیح فی شرح المصابیح" کے عنوان سے لکھی۔ یہ کتاب ابن الجزریؒ نے نویں صدی ہجری کے اوائل میں اس وقت تصنیف فرمائی جب امیر تیمور آپؒ کو اپنے ساتھ ماوراءالنہر لے گئے تھے۔ یہ شرح تین جلدوں میں ہے۔

حسین البغوی ہرات کے قریب ایک گاؤں بغ یا بغیشور سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شافعی فقہ کے بڑے عالم، محدث اور مفسر قرآن پاک تھے۔ اپنی کتاب "مصابیح السنہ" میں انہوں نے موضوعات کے اعتبار سے احادیث نبویؐ جمع فرمائی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں کوئی منکر (یعنی رد کی ہوئی) یا موضوع (یعنی گھڑی ہوئی) حدیث شامل نہیں ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہے اور بعد میں اس کا ترجمہ "مشکوۃ المصابیح" کے نام سے کیا گیا ہے۔

۲۴۔ الاربعین: اس کتاب میں ۴۰ نہایت صحیح اور مختصر احادیث کو یکجا کیا گیا ہے۔

۲۵۔ الحصن الحصین: دعاؤں میں پڑھنے کے لیے احادیث کا مجموعہ ہے۔ عبدالعلیم نوال نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو کراچی سے شائع ہوا۔

۲۶۔ ذات الشفا فی سیرت النبی ﷺ والخلفاء: یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت پر ایک طویل نظم ہے جس میں عثمانی حکمران بایزید یلدرم کے عہد حکومت اور ترکوں کی طرف سے قسطنطنیہ کے محاصرے تک کی تاریخ اسلام بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب ابن الجزریؒ نے شیراز کے حاکم پیر محمد کی خواہش پر لکھی اور اسے آپؒ نے ذی الحج ۷۹۸ھ / ستمبر ۱۳۹۶ء میں مکمل فرمایا۔

۲۷۔ الزهر الفائح: نیکی اور پاک بازی کی تلقین کرنے والی ایک کتاب ہے۔

۲۸۔ الاصابہ فی لوازم الکتابہ: خطاطی پر ایک مختصر رسالہ۔

۲۹۔ هیئت پر بحر رجز میں اشعار۔

ابن الجزریؒ عبادات کا غیر معمولی اہتمام کرتے تھے۔ آپؒ نے اپنے روز وشب کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصے میں آپؒ قرأت اور حدیث کی تدریس میں مشغول رہتے، دوسرا حصہ تصنیف وتالیف کے لیے وقف تھا اور تیسرے حصے میں آپؒ عبادت فرماتے تھے۔ تمام عمر آپؒ کا یہی معمول رہا۔ آپؒ ہر ماہ پانچ روزے رکھتے تھے۔ سفر کی حالت میں بھی آپؒ نے شب بیداری اور نماز تہجد کی ادائیگی ترک نہ فرمائی۔

ابن الجزریؒ نہایت خلیق ملنسار، نرم خو اور شیریں کلام تھے۔ آپؒ کے مزاج میں انکسار اور فروتنی تھی۔ آپؒ جس سے ملتے اس سے بہت اخلاق اور حسن سلوک سے پیش آتے۔ آپؒ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے صاحب حیثیت تھے۔ اہل علم اور ضرورت مندوں کے ساتھ ہمیشہ فیاضی کا سلوک فرماتے تھے۔ خصوصاً اہل حجاز کے ساتھ احسان کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ابن الجزریؒ کے پانچ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ سب سے بڑے صاحب زادے ابوالفتح محمد، ان سے چھوٹے ابوبکر محمد الجزری اور ان کے بعد ابوالخیر محمد الجزری تھے۔ یہ تینوں بڑے جید محدث، قاری اور فقیہ تھے۔ دیگر دو صاحب زادے، ابوالبقاء اسماعیل اور ابوالفضل بھی قاری اور محدث تھے۔ صاحبزادیوں کے نام فاطمہ، عائشہ اور سلمیٰ تھے۔ آپؒ نے اپنی صاحبزادیوں کو بھی حدیث اور قرأت کی اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ یہ تمام صاحبزادیاں فن تجوید کی ماہر، بہترین قاری اور احادیث کی حافظ تھیں۔

ابن الجزریؒ نے علم دوست تیموری حکمران شاہ رخ کے دور حکومت میں ۵ ربیع الاول ۸۳۳ھ / ۲ دسمبر ۱۴۲۹ء کو شیراز میں اپنی

Marfat.com

قیام گاہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپؒ کی وفات کی اندوہ ناک خبر پھیلتے ہی ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہزاروں گریہ کناں عقیدت مندوں نے آپؒ کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ آپ کے ایک شاگرد فرماتے ہیں کہ جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو اتنا ہجوم تھا کہ علمائے کرام، حکومت کے اعلیٰ افسران، امرا، عام افراد سب ہی جنازے کو کندھا دینے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح جنازے کو کم از کم چھونے ہی میں کامیاب ہو جائے۔

اپنے وقت کے عظیم فقیہ، محدث اور علم قرأت کے ماہر ابن الجزریؒ نے تقریباً ۸۲ برس کی عمر پائی۔ آپؒ کو شیراز میں آپؒ کے مدرسے دارالقرآن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

اصلاحِ امت کی بھرپور اور ہمہ گیر تحریک کے عظیم قائد، مجتہد اور عالمِ دین

باغ بہت خوبصورت تھا!

سرسبز و شاداب درختوں کی شاخیں، ٹھنڈی ہوا میں جھومتی تھیں۔ مختلف پودوں پر خوش رنگ پھول اپنی بہار دکھاتے تھے۔ فضا پرندوں کی سُریلی چہکار سے وقتاً فوقتاً گونج اٹھتی۔

چند نوجوان باغ میں سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نوجوانی کا زمانہ شوخی اور جولانی سے بھرپور ہوتا ہے، تاہم یہ نوجوان اپنے انداز و اطوار سے بہت سلجھے ہوئے، مہذب اور نیک نفس نظر آتے تھے۔ وہ باغ کے قدرتی حسن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ان نوجوانوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ باغ سے باہر نکل آئے اور ایک طرف کو چل دیے۔ آگے جا کر ان سب کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

نوجوان نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو اس کی ملاقات اپنے والدِ محترم سے ہوئی۔ نوجوان نے ادب سے سلام کیا۔ والدِ محترم نے سلام کا جواب دینے کے بعد دریافت فرمایا:

"کہاں گئے تھے؟"

نوجوان نے بتایا کہ وہ چند دوستوں کے ساتھ باغ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ والدِ محترم نے اچانک ایک سوال کر دیا۔

"کیا تم نے وہاں کوئی ایسی چیز حاصل کی جو بطور یادگار باقی رہے؟"

نوجوان، والدِ محترم کا سوال سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ اپنے والد کی ہر بات پر پوری توجہ دینے کی کوشش کرتا تھا، اس نے والد کی نصیحت کو بھی گرہ میں باندھ لیا اور ہر کام کو انجام دیتے ہوئے انہماک کا مظاہرہ کیا کہ گویا وہ اس سے ایسی نصیحت یا درس حاصل کرنا چاہتا ہو جو اس کی زندگی پر مثبت اثرات ڈال کر اسے یادگار بنا دے۔

اس نوجوان نے علم حاصل کرنے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی اور بہت جلد بہت بڑے عالم بن کر ابھرے۔

یہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ جنہوں نے اپنی پوری زندگی نہ صرف علم حاصل کرنے میں صَرف کر دی بلکہ مسلمانوں کو صدیوں کے جمود سے نجات دلائی، معاشرے میں پھیلی ہوئی بے شمار برائیوں کا خاتمہ فرمایا، امتِ مسلمہ کو گروہ بندیوں سے چھٹکارا دلا کر متفق اور متحد کرنے کی موثر کوششیں فرمائیں اور ایک ایسی کامیاب تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا جو بعد میں دعوتِ دین اور اصلاح معاشرہ کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں کے لیے بنیاد اور قوت ثابت ہوئی۔ شاہ ولی اللہ، امتِ مسلمہ کے عظیم محسن ہیں۔

شاہ ولی اللہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ / ۱۰ فروری ۱۷۰۳ء کو (بھارت کے) ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں 'پھلت' میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ محترم شاہ عبد الرحیم بھی ایک بڑے عالم اور پاک باطن بزرگ تھے اور انہیں صوفیا میں بڑا مقام حاصل ہے۔ شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ نسب اپنے والد محترم کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ کاظمؒ سے جاملتا ہے۔

شاہ عبد الرحیم نے دینی علوم کی تعلیم کے لیے دہلی میں ایک درس گاہ "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے قائم کی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ولی اللہ ابو الفیاض قطب الدین احمد رکھا۔ شاہ عبد الرحیم نے یہ نام بلند مرتبہ بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی نسبت سے رکھا تھا، لیکن بعد میں ولی اللہ ہی مشہور ہو گیا۔

شاہ ولی اللہؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ محترم ہی سے حاصل کی۔ پانچ سال کی عمر میں آپ کو مدرسہ رحیمیہ میں داخل کروا دیا گیا۔ آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد عربی اور فارسی

Marfat.com

کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ آپ نے کم عمری ہی میں بہت وسیع مطالعہ کر لیا۔ ۱۴ برس کی عمر میں آپ کی شادی کر دی گئی۔ شاہ ولی اللہ نے اس دوران قرآن پاک میں غور و تدبر کی تعلیم بھی حاصل کی اور اپنے والد محترم سے بیعت کے ساتھ ساتھ تصوف کے تمام تقاضوں اور مراحل سے آگہی حاصل کی۔ تقریباً ۱۷ برس کی عمر کو پہنچنے تک شاہ ولی اللہ نے اس زمانے میں رائج علوم عربیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، ادب، کلام، معانی، منطق، فلسفہ، تصوف، طب اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپ نے ان علوم کی باقاعدہ سند اور تدریس کی اجازت حاصل کی۔

شاہ ولی اللہ کی عمر ۱۷ برس تھی، اس وقت آپ کے والدِ محترم رحلت فرما گئے۔ والد کی رحلت کے تقریباً ۱۲ برس تک، شاہ ولی اللہ دہلی میں درس دیتے رہے۔ ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء میں آپ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ کے بعد آپ نے ۱۴ ماہ تک حرمین شریف میں قیام فرمایا۔ اس دوران آپ نے حرمین کے بلند مرتبت اساتذہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابی ماجہ، مسند احمد، مسند دارمی، شیخ ابو طاہر مدنی سے پڑھیں، موطا امام محمدؒ، کتاب الآثار کی تعلیم شیخ تاج الدین، مفتی مکہ مکرمہ سے حاصل کی۔ موطا امام مالکؒ تین بار شیخ ابو طاہرؒ، شیخ تاج الدین اور شیخ وفد اللہ سے پڑھی۔ شاہ ولی اللہ نے شیخ عبداللہ بن سالم البصری سے حدیث کی سند کی اجازت حاصل کی۔

شاہ ولی اللہ رجب ۱۱۴۵ھ / دسمبر ۱۷۳۲ء میں واپس دہلی پہنچے۔ آپ نے اپنے والد محترم شاہ عبدالرحیم کی درس گاہ "مدرسہ رحیمیہ" میں تدریس شروع کر دی۔ اس درس گاہ میں دیگر کئی قابل اساتذہ بھی درس دینے لگے۔ بہت جلد شاگردوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ درس گاہ چھوٹی محسوس ہونے لگی تو سربراہِ مملکت، محمد شاہ نے دہلی ہی میں ایک وسیع اور شاندار حویلی شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ شاہ صاحب نے درس گاہ اس حویلی میں منتقل کر دی۔

شاہ ولی اللہ کی پیدائش جس زمانے میں ہوئی، وہ مغلیہ سلطنت کے آخری طاقت ور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا آخر دور تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد، مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ ملک میں خانہ جنگی اور بدامنی شروع ہو گئی۔ حکمران محمد شاہ کے زمانے میں مہاراشٹر کے مرہٹوں نے بغاوت کی اور پانچ سال میں وسط ہند کے بڑے علاقے پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

اُدھر شمال سے ایرانی حکمران نادر شاہ نے تباہ کن حملہ کیا۔ دہلی میں قتل عام ہوا اور بڑی بربادی پھیلی۔ نادر شاہ مغلوں کا خزانہ اور قیمتی اشیا لوٹ کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ملک میں بغاوتیں ہونے لگیں اور چند سال میں دکن، سندھ، بنگال اور اودھ میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پھر کشمیر بھی دہلی کے بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

مسلمان نہ صرف سیاسی لحاظ سے کمزور ہو گئے تھے بلکہ وہ اخلاقی اعتبار سے بھی زوال کی طرف جا رہے تھے۔ دولت سے محبت، آرام طلبی، عیش و عشرت، خود غرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی بہت سی خرابیاں ان میں پیدا ہو گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل پر اختلافات پیدا ہونا عام تھا۔ لوگ مختلف بنیادوں پر گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ علما اور صوفیا کا حال بھی مختلف نہ تھا، وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے حرمین شریفین سے واپسی پر، امتِ مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنے اور اصلاح کے عظیم اور کٹھن کام کا آغاز فرمایا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے مختلف علمی اور فقہی طبقوں کے درمیان مفاہمت اور قربت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم اور ان کے پیروکار عوام کے درمیان اختلافات بہت کم ہو گئے۔ اعتدال کی روش اختیار کی جانے لگی، تعصبات دور ہونے لگے اور ایسے امور کی طرف توجہ دی جانے لگی جن پر سب متفق تھے۔

شاہ ولی اللہ نے معاشرے میں بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کا عظیم اور کٹھن کارنامہ نہایت منظم اور موثر انداز سے انجام دیا۔ آپ نے ایک جانب تو پوری تاریخ اسلام کا تنقیدی جائزہ لیا اور بے حد باریک بینی سے یہ واضح کیا کہ اسلام قبول کرنے والی مختلف اقوام نے اپنے دینی عقائد میں کون کون سی غیر اسلامی باتیں شامل کر لیں اور ان کے اعمال، اخلاق، تہذیب، تمدن اور سیاست میں کس طرح نامناسب اور گمراہ کن تبدیلیاں آ گئیں۔ پھر شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی پستی، بدحالی، زوال اور گمراہی کے دو بنیادی اسباب بیان فرمائے۔ ایک، اقتدار کا خلافت سے بادشاہت کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانا۔ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں مسلمانوں میں پھیلی ہوئی خرابیوں کی تفصیل بیان فرمائی اور ان کی وجوہ سے آگاہ فرمایا۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے زوال کے صرف اسباب ہی بیان

Marfat.com

نہیں کیے بلکہ ان کو دور کرنے کے طریقے بھی سمجھائے۔ آپ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے اور ایک دوسرے کے فقہی مسلک کی عزت کرنے کی تعلیم دی۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں کو اجتہاد اور تحقیق پر راغب فرمایا اور اجتہاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط بھی بیان فرمائیں۔ اجتہاد سے مراد قرآن اور حدیث کی روشنی میں اسلام کی روح اور شریعت کے منشا کے مطابق مسائل کا حل دریافت کرنا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے امتِ مسلمہ کو صدیوں سے بھولا ہوا یہ سبق یاد دلایا کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو زندگی کے ہر شعبے پر پوری طرح نافذ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسلام کے پورے کے پورے اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کر دیا۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی نظریاتی تربیت کے لیے درس و تدریس، وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کی جو عظیم خدمات انجام دیں، ان ہی کی بنا پر مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی اور اس کے بعد جتنی بھی اسلامی تحریکیں چلائی گئیں، جن میں تحریکِ پاکستان بھی شامل ہے، ان سب کی بنیاد شاہ ولی اللہ کی جدوجہد اور انتھک محنت سے پُر نظریاتی تحریک ہے۔

شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاح کے لیے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ اس زمانے میں ہندوؤں کے اثرات کی وجہ سے بیوہ کی شادی کو برا سمجھا جانے لگا تھا۔ شاہ صاحب نے اس رسم کی مخالفت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی خوشی اور غم کے مواقع پر فضول رسموں سے روکا۔ شاہ صاحب نے تصوف کی بھی اصلاح فرمائی۔

شاہ ولی اللہ کا ایک اہم کام قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اور لوگ قرآن پاک کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے۔ شاہ صاحب کے ترجمے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ قرآن کریم کو سمجھنے کے قابل ہوگئے۔

شاہ ولی اللہ نے تعلیمی نصاب کے پرانے نظام میں اصلاح و ترمیم کی اور اسے الجھنوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے امیروں اور غریبوں کے درمیان پائی جانے والی طبقاتی کشمکش کو دور کرنے کے لیے قرآن و سنت سے اقتصادی اور معاشی نظریے پیش کیے۔

شاہ ولی اللہ نے سیاسی پہلو کو بھی بڑی اہمیت دی۔ آپ نے حکمرانوں، عہدے داروں اور سپاہ کے حالات کا مکمل جائزہ لیا۔ درست حکمرانی کے اصول بیان فرمائے، اسلامی نظام حکومت کی تشریح کی اور حاکم اور رعایا کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے طریقوں کی تعلیم دی۔ شاہ صاحب نے بادشاہِ وقت، امرا اور دیگر عہدیداروں سے رابطے قائم کیے اور انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

شاہ ولی اللہ کے دور میں مہاراشٹر کے مرہٹوں نے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۷۳۷ء میں وہ مہاراشٹر سے دہلی تک کے علاقے پر قابض ہوگئے تھے۔ مغل بادشاہ محمد شاہ اور اس کے جانشین، احمد شاہ سلطنت کے زوال کو روکنے میں ناکام ہوگئے۔ مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک عہدیدار شہاب الدین نے احمد شاہ کو معزول کر کے اس کے جانشین عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا اور اس کے لڑکے شاہ عالم ثانی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر شاہ عالم فرار ہو کر الہ آباد چلے گئے اور انگریزوں کی پناہ حاصل کر لی جو بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد الہ آباد تک آ گئے تھے۔

اِدھر شرقی سمت سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے، اُدھر افغانستان میں احمد شاہ ابدالی نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور اب وہ برصغیر پر حملے کر رہے تھے۔ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان انہوں نے برصغیر پر ۹ حملے کیے۔ تیسری طرف مرہٹوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر انہیں مرہٹوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے اور مسلمانوں کو مرہٹوں سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ روہیلہ سردار نجیب الدولہ اور چند دوسرے امرا بھی اس کارروائی میں شریک ہوگئے۔

احمد شاہ ابدالی، شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ایک بار پھر برصغیر آئے۔ دہلی کے قریب پانی پت کے مشہور میدانِ جنگ میں، مسلمانوں اور مرہٹوں کے درمیان، ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو زبردست جنگ ہوئی جو پانی پت کی تیسری جنگ کہلاتی ہے۔ مرہٹہ فوج کی تعداد ۳ لاکھ تھی اور مقابلے پر مسلمانوں کی فوج میں صرف ۹۰ ہزار سپاہی تھے لیکن اللہ نے مسلمانوں کو فتح سے نوازا۔ ۲ لاکھ مرہٹے جنگ میں مارے گئے۔ احمد شاہ ابدالی کی اس بھرپور جنگی کارروائی کے نتیجے میں مرہٹوں کی سیاسی اور فوجی طاقت بہت کمزور ہوگئی اور انہیں سنبھلنے میں بہت وقت لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد دہلی

Marfat.com

میں اپنی حکومت قائم نہیں کی اور اقتدار مغلوں کے سپرد کر کے واپس چلے گئے جس کے نتیجے میں مملکت پھر سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی۔

شاہ ولی اللہ کی ایک شادی، آپ کے ماموں شاہ عبید اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی اور دوسری شادی مولوی سید حامد سونی پتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دوسری اہلیہ سے چار صاحب زادے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں: شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ۔ یہ چاروں صاحبزادے علوم دینیہ کے ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ ۶۰ برس تک دینی علوم اور حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ شاہ رفیع الدین نے پہلی بار اردو زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کی اردو میں تفسیر لکھی جو آج بھی پڑھی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے چوتھے صاحبزادے شاہ عبدالغنی کے بیٹے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا تاریخ میں بڑا مقام ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور انہوں نے سید احمد کے ساتھ مل کر تحریکِ مجاہدین چلائی اور معرکۂ بالاکوٹ میں شہادت کا مرتبہ پایا۔ سید احمد شہید، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریکِ دعوت و اصلاح کس قدر موثر اور ہمہ گیر تحریک تھی جس کے اثرات سیکڑوں برس بعد تک بھی قائم رہے۔

شاہ ولی اللہ نے قرآن کریم، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، سیرت سمیت تقریباً ہر موضوع پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ شاہ صاحب کو عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان دونوں زبانوں میں شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ فارسی میں اشعار کہتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی چند مشہور تصانیف کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ **تفسیر فتح الرحمٰن بترجمة القرآن:** یہ قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک تفصیلی مقدمہ ہے جس میں ترجمے کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن پاک کے اردو تراجم کے لیے شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بنیاد بنا۔

۲۔ **الفوز الکبیر فی اصول التفسیر:** تفسیر کے اصولوں پر کتاب

۳۔ **تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیا و المرسلین:** قرآن مجید میں انبیا کرامؑ کے حالات و واقعات پر منفرد تبصرہ ہے۔

۴۔ **حجة اللہ البالغہ:** فقہ، اسرارِ شریعت اور تصوف کے علاوہ احادیث کے ایک اہم ذخیرے کی علمی اور عقلی تشریح ہے۔

۵۔ **ازالة الخفاعن خلافة الخلفا:** خلافتِ راشدہ کے حق میں تفصیلی کتاب ہے۔

۶۔ **فیوض الحرمین:** قیام حجاز کے دوران، مشاہدات اور علم الکلام و تصوف کے مباحث پر مشتمل ہے۔

۷۔ **الخیر الکثیر:** فلسفہ، طبیعیات اور تصوف کے مباحث بیان کیے گئے ہیں۔

۸۔ **اطیب النغم فی مدح سید العرب و العجم:** شاہ صاحب کے نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے۔

۹۔ **التفہیمات الالٰھیہ:** شاہ ولی اللہ کی قلبی کیفیات اور وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔

شاہ صاحب کے مکاتیب کی تعداد بھی خاصی ہے اور آپ کی بعض تصانیف اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا ذکر تو ملتا ہے لیکن اصل مخطوطات نہیں مل سکے۔

شاہ ولی اللہ نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اصلاح میں بسر فرمایا۔ ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ / ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء کو ظہر کے وقت علم و دانش کا یہ چمکتا دمکتا سورج غروب ہو گیا اور ایک عالم کو سوگوار کر گیا۔ آپؒ کو دہلی میں اپنے والد محترم کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔

•••

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آثار امام شافعیؒ: ڈاکٹر محمد ابوزہرہ
آثار امام محمدؒ: علامہ زاہد الکوثری / رئیس احمد جعفری
آثار امام محمدؒ و امام ابویوسفؒ: محمد ابوزہرہ / رئیس احمد جعفری
اسلام کے درخشندہ ستارے: نصیر الدین حیدر
الغزالی: شبلی نعمانی
امام ابنِ تیمیہؒ: محمد یوسف کوکن عمری
امام ابنِ ماجہؒ اور علم حدیث: مولانا محمد عبد الرشید نعمانی
امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ناقدین: حبیب الرحمن خان شیروانی
امام ابوحنیفہؒ: محمد ابوزہرہ / رئیس احمد جعفری
امام ابویوسفؒ: رئیس احمد جعفری
امام ابوداؤدؒ اور ان کی سنن
امام احمد بن حنبلؒ: ڈاکٹر محمد ابوزہرہ
امام احمد بن حنبلؒ کا دورِ ابتلاء: ڈاکٹر محمد نعش مصری
امام اعظم اور علم الحدیث: مولانا محمد علی کاندھلوی
امام اعظمؒ: علامہ شبلی نعمانی
امام مالکؒ: ڈاکٹر ابوزہرہ
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام:
ائمہ اربعہ: سید رئیس احمد جعفری
برِ عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ: اشتیاق حسین قریشی
بستان المحدثینؒ: شاہ عبد العزیز محدث دہلوی / مولانا عبد السمیع
تاریخ ادبیات ایران: ڈاکٹر رضازادہ شفق / سید مبارز الدین رفعت
تاریخ اسلام: اکبر شاہ نجیب آبادی
تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی
تاریخ دعوت و عزیمت: مولانا ابوالحسن علی ندوی
تاریخ ملت (حصہ پنجم): مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی۔
تبع تابعین: حافظ مجیب اللہ ندوی
تبع تابعین (جلد دوم): ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی
تجدید و احیائے دین: ابوالاعلیٰ مودودی
تذکرہ المحدثین: مولانا غلام رسول سعید
تذکرہ المحدثین: ضیاء الدین اصلاحی
تذکرہ ائمہ اربعہ: اسلام الحق اسعدی مظاہری
تذکرۃ الاولیا: خواجہ فرید الدین عطارؒ
ترکان عثمان: ڈاکٹر محمد صابر
جامع ترمذی
جغرافیہ خلافت مشرقی: محمد عنایت اللہ / جی لی اسٹرینج
حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ / علامہ ابو محمد عبد الحق
حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی: علامہ سیّد مناظر احسن گیلانی
حکمائے اسلام: عبد السلام ندوی
حیات حضرت امام ابوحنیفہؒ: محمد ابوزہرہ / پروفیسر غلام احمد حریری
حیات مالکؒ: علامہ سیّد سلیمان ندویؒ
خصوصی مقالہ: مولوی ضیاالدین اصلاحی، ماہنامہ معارف اکتوبر، نومبر ۱۹۰۹ء
خصوصی مقالہ "ابن الجزریؒ": مولانا محمد عبد الحلیم چشتی، ماہنامہ معارف نومبر، دسمبر ۱۹۵۷ء
دائرۂ معارف اسلامیہ
درس ترمذی: مولانا محمد تقی عثمانی
سرگزشت غزالی: مولانا محمد حنیف ندوی
سطعات: شاہ ولی اللہ / مولانا محمد متین ہاشمی
سنن نسائیؒ: امام عبد الرحمٰن نسائیؒ / مولانا فضل احمد
سنن ابی داؤدؒ: امام ابوداؤدؒ / مولانا سبحان محمود
سیرت الائمہ: مولانا عبد المجید سوہدروی
سیرت البخاری: محمد عبد السلام مبارکپوری
سیرت امام شافعیؒ: حضرت مولانا میاں خالد صاحب انصاری بھوپالی
سیرت عمر بن عبد العزیزؒ: ابو محمد عبد اللہ بن عبد الحکم
سیرۃ النعمان: شبلی نعمانی
شخصیات: سید ابوالاعلیٰ مودودی

Marfat.com

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
صحاح ستہ اور ان کے مؤلفین: الاستاذ محمد عبدہ، الفلاح الفیروز پوری
صحیح مسلم: ناشر: قرآن محل
صحیح مسلم: شرح: علامہ نوویؒ
صحیح مسلم: ترجمہ: علامہ وحید الزماں
صحیح بخاری، ترجمہ: مولانا محمد عادل خان نقش بندی
طبقات ابنِ سعد: محمد بن سعد
علم حدیث اور چند اہم محدثین: سالم قدوائی
عمر بن عبد العزیزؒ: عبد السلام ندوی
غزالی نامہ: جلال ہمائی / رئیس احمد جعفری
فضل الباری شرح صحیح البخاری: مولانا قاضی عبد الرحیم
فلسفیان اسلام: ڈاکٹر غلام جیلانی برق
فیض المنعم: مولانا سعید احمد
کشف المحجوب: سید علی ہجویریؒ
ماہنامہ معارف: اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۴۵ء، مئی ۱۹۶۲ء
ماہنامہ معارف، جنوری، فروری ۶۱ء
مباحث کتاب الایمان: عبد الحمید سواتی
محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
مسلمانوں کے سیاسی افکار: پروفیسر رشید احمد
ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
موسوعہ فقہ سفیان الثوریؒ: الدکتور محمد رواس قلعہ جی
میراث ایران: سید عابد علی عابد / پروفیسر اے جے آربری
ہارون الرشید: عبد الجبار جومرد / رئیس احمد جعفری

Marfat.com

صاحبانِ باصفا

راہِ ہدایت کو روشن کرنے والے

صوفیا اور مصلحینِ گرامی

Marfat.com

انتساب

اپنے محسن اور نہایت محترم و بے حد مشفق استاد
علم کے بحرِ بیکراں اور صاحبِ طرز ادیب و شاعر
پروفیسر ابوالخیر کشفی مرحوم
کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

کلیم چغتائی ہمارے اُن لکھنے والوں میں ہیں جو ہمیشہ بہتر سے بہتر کی جستجو میں رہتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دین و دنیا کی اچھی باتیں ان کے قاری تک پہنچ جائیں۔ انھوں نے علم نافع کی ترسیل میں بڑی محنت کی ہے اور اُن کی یہ کوشش اُن تمام حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جو پاکستانی قوم کو صراطِ مستقیم پر گامزن دیکھنے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میری رائے میں کلیم چغتائی صاحب جیسے لوگ نہایت قابل قدر اور پوری قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ بڑی سنجیدگی اور خاموشی سے نوجوان ذہنوں کی تشکیل میں مثبت کردار انجام دے رہے ہیں۔

اُن کی تازہ ترین تالیف "صاحبانِ باصفا" جو راہِ ہدایت اُجاگر کرنے والے صوفیا اور مصلحین گرامی کے احوال و آثار پر مشتمل ہے، بڑی قابلِ قدر اور قابل تحسین تالیف ہے۔ صوفیائے کرام اور مصلحین کے بارے میں بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں اور لوگ اُن سے حسب دل خواہ استفادہ کرتے ہیں لیکن ایک ایسی چھوٹی کتاب، جو پوری تحقیق اور ذمہ داری کے ساتھ مرتب کی گئی ہو، دل کش انداز کی حامل ہو اور ہر سطح کے پڑھنے والوں کے لیے مفید ہو، کم نظر آتی ہے۔ چغتائی صاحب نے "صاحبانِ باصفا" مرتب کر کے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے جن بزرگانِ کرام کے بارے میں لکھا ہے، پوری تحقیق سے لکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اُن کے دینی اور علمی کارناموں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ ہر شخص انھیں سمجھ سکے، اُن کی اہمیت محسوس کر سکے اور اُن سے فائدہ اُٹھا سکے۔ یہ کام وہی بزرگ انجام دے سکتے ہیں جو دلِ دردمند اور علم وافر کے حامل ہوں۔ اصلاح کا کام بڑا مشکل ہے۔ بالخصوص ذہنوں کی اصلاح اور قلوب کی اصلاح اُن بزرگوں کا کام ہے جو لوثِ دنیا سے پاک ہوں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو اپنے پاکیزہ خیالات اور زہد و تقویٰ کے توسط سے لوگوں تک پہنچادیں۔

ہمارے یہاں بزرگوں اور اُن کے کارناموں کی تعداد اور اہمیت ہر اعتبار سے بہت زیادہ ہے اور یہ سلسلہ تیرہ سو برس کے عرصے پر محیط ہے۔ کلیم چغتائی صاحب نے مختلف ادوار اور دنیائے اسلام کے مختلف ممالک کے پندرہ اہل اللہ کا انتخاب کیا ہے۔ یہ کام بڑا مشکل تھا۔ انتخاب کا مسئلہ ویسے بھی مشکل ہوتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس انتخاب میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مولانا رومؒ اور بعض دوسرے بزرگوں کے نام شامل ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ چغتائی صاحب نے اس انتخاب میں مولانا انور شاہ کشمیری کا نام نامی اور اسم گرامی بھی شامل کیا ہے، جن کے علم و دانش، زہد و تقویٰ اور علمی تبحّر کی سارے برصغیر میں دھوم تھی۔ مولانا کا حافظہ غضب کا تھا اور علوم پر انھیں جو محرمانہ دسترس حاصل تھی وہ اپنی جگہ بے مثال تھی۔ نیک نفس اور پاکیزہ بزرگ تھے۔ دنیاوی منصبوں سے منہ موڑ کر مختلف مدارس میں علوم کی تعلیم و تدریس میں ساری عمر گزار دی۔ قناعت پسند تھے، دنیاوی نعمتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے آج کے نوجوان کو یہ اندازہ نہیں کہ مولانا انور کشمیری کس پائے کے بزرگ تھے، کتنے بڑے عالم تھے اور کیسے نفیس انسان تھے۔ چغتائی صاحب نے مولانا کا احوال بڑی محنت اور محبت سے قلم بند کیا ہے اور نئی نسل کو اُن کی علمی کارناموں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہت بڑی خدمت ہے۔

چغتائی صاحب کا طرزِ بیان اور اسلوب بڑا رواں دواں اور دلچسپ ہے۔ انھوں نے "صاحبانِ باصفا" میں شامل تمام بزرگوں کے حالات اور کارنامے بڑے دلچسپ انداز سے قلم بند کیے ہیں۔ اُن حالات میں جو طرزِ تحریر اختیار کیا گیا ہے وہ عام فہم، سادہ لیکن ادبی انداز کا حامل اور دل میں گھر کرنے والا ہے۔ چغتائی صاحب کا طرزِ تحریر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان کا ہر قاری اُن کی تحریر میں ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ عام طور پر احوال و آثار پر مشتمل کتابوں میں اتنا رواں دواں اور سبک انداز نہیں ملتا۔ چغتائی صاحب نے بزرگوں کی حیات اور کارناموں کو بڑے ڈرامائی انداز سے پیش کیا ہے۔ قاری اس کتاب کے مطالعے میں بار بار چونکتا ہے، شخصیت کی تہیں کھلتی ہوئی محسوس کرتا ہے، ذہن میں روشنی پھیلتی ہے۔ مطالعہ سے ایک روحانی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ چغتائی صاحب نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور یہ قارئین کے ہر حلقے میں مقبول ہو گی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

نگرانِ اعلیٰ ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی

سابق صدر، شعبہ اردو، جامعہ کراچی

Marfat.com

عرضِ مؤلف

"صاحبانِ باصفا" آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔
انسان سے شیطان کی دشمنی ازلی ہے۔ ہر دور میں ابلیسِ لعین اپنے شاگردوں کے ساتھ مل کر انسان کو راہِ راست سے بھٹکانے کی کوشش کرتا آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مختلف ادوار میں اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا۔ نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، آپ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے بعد انسانوں کی اصلاح کا فریضہ بزرگانِ دینؒ اور صوفیاء کرامؒ نے سنبھال لیا۔ بگڑے ہوئے معاشروں میں اللہ کے ان نیک بندوں نے منارۂ نور بن کر لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔ ان بزرگوں کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔
اللہ تبارک تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ اس نے مجھے ان صاحبانِ باصفا کی حیات ہائے مبارکہ اور عظیم دینی خدمات پر کچھ لکھنے کی سعادت بخشی۔ ان بزرگوں کی سیرتوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ حوصلہ ملتا ہے کہ انسان اگر چاہے تو اپنے رب کا قرب حاصل کر سکتا ہے اور اپنی پاکیزہ سیرت کے باعث بندگانِ خدا کی اصلاح کا سبب بن سکتا ہے۔ آج کے حبس زدہ اور شر آلود معاشرے میں ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے جو لوگوں کو بداعمالیوں کے خطرناک نتائج سے خبردار کریں اور انہیں اپنے رب سے ڈرنے اور اس کے حضور پیش ہونے کا احساس دلائیں۔
میں نے ان مضامین میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ صوفیاء کرامؒ کس قدر باعمل انسان تھے۔ عام طور پر کرامتوں کے پیمانے سے صوفیاء کرامؒ کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ میں نے مطالعہ کے دوران یہ محسوس کیا کہ تمام اکابر صوفیاء کرامؒ، کرامتوں کے اظہار کو پسند نہ فرماتے تھے۔ اس کے برعکس وہ دینی فرائض کی ادائیگی کو اوّلیت دیتے تھے اور دل کی پاکیزگی پر زور دیتے تھے۔
ان واجب الاحترام بزرگوں نے نامساعد حالات میں انتھک محنت کی اور دین سے مسلمانوں کا رشتہ کمزور نہ پڑنے دیا۔ انہوں نے منظم طریقے سے تحریک چلائی۔ اپنے ہزاروں ارادت مندوں کی بہترین تربیت کی اور پھر ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو اصلاحِ نفس کی جانب مائل کیا۔ ان بزرگوں کی تبلیغی اور اصلاحی تحریکوں کے اثرات بہت دُور تک پہنچے اور تادیر قائم رہے۔ اگرچہ صوفیاء کرامؒ نے خود کو دنیاوی سہولتوں، مال و دولت اور حکمرانوں سے دُور رکھا لیکن متعدد عظیم المرتبت صوفیاءؒ کی تعلیمات حکمرانوں پر بالواسطہ اثر انداز ہوئیں۔ صوفیاء کرامؒ کے بارے میں یہ بہت بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کیا اور اپنے تلامذہ، ارادت مندوں اور عام مسلمانوں کو بھی دنیا کی لذتوں سے دُور رہنے کی تلقین کی۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں ترکِ دنیا کے تصور نے تقریباً عقیدے کی صورت اختیار کر لی۔ سچے اور پکے مسلمان بننے کے لیے دنیا سے منہ موڑ کر گوشہ نشینی کو لازمی سمجھا جانے لگا، حالانکہ بلند مرتبہ صوفیاء کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ یہ صاحبانِ باصفا عمدہ لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، ازدواجی زندگی کے تقاضے بھی پورے کرتے تھے اور جہادِ فی سبیل اللہ بھی فرماتے تھے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ صوفیاء کرامؒ فرض نماز تو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام بہت سختی سے کرتے تھے لیکن نفل عبادات کے لیے تنہائی پسند فرماتے تھے۔
اللہ تبارک و تعالیٰ ان عظیم ہستیوں پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں ان کی پاکیزہ سیرتوں سے درسِ عمل لینے کی توفیق بخشے۔
میں، انتہائی شفیق و مکرم استاد، صوفیاء کرامؒ سے گہری عقیدت اور نسبت رکھنے والے، صاحبِ علم و فہم و ذکا، نقاد، ادیب و شاعر، محترم ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا نہایت شکر گزار اور ان کے لیے بے حد دعا گو ہوں کہ انہوں نے اپنی علالت اور ضعیفی کے باوجود اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ فرمایا، فرد گزاشتوں کی نشاندہی اور مناسب اصلاح فرمائی اور اس کتاب کا بہت خوبصورت پیش لفظ کمال محبت سے تحریر فرمایا جو میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

بلند مرتبت مفسر، محدث، فقیہ، ماہر لسانیات، عالم با عمل اور تصوّف کے امام

بزرگ مسجد سے برآمد ہوئے تھے۔

ان کی شخصیت انتہائی پُرکشش تھی۔ چہرے کے دلکش نقش پہلی ہی نظر میں متاثر کرتے تھے۔ ان کی ذات وجاہت اور وقار کا حسین امتزاج تھی۔ وہ مسجد سے نکلنے والے بہت سے افراد میں سب سے ممتاز نظر آتے تھے۔

بزرگ کی سواری کا جانور واپس جا چکا تھا، اس لیے ایک صاحب نے اپنا جانور پیش کیا اور ادب اور حفاظت کے خیال سے جانور کی لگام تھام لی۔

بزرگ روانہ ہوئے تو ان کے بہت سے عقیدت مند ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بہت سے بااثر لوگ جب کہیں جاتے ہیں تو ان کے حامیوں اور تعریف کرنے والوں کی بھیڑ ساتھ ہو لیتی ہے اور وہ اپنے ان حامیوں کی بڑی تعداد دیکھ کر نازاں ہوتے ہیں، کبر و غرور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن بزرگ نے اپنے عقیدت مندوں کے اس اندازِ تحسین کو پسند نہ کیا اور فرمایا:

"مسلمان اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا کہ وہ بالکل تہی دامن ہے۔ ان لوگوں کے جوتوں کی چاپ ضعیف انسان کے دل کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔"

یہ بزرگ تھے مشہور فقیہ و مفسر اور تصوف کے امام، حضرت حسن بصریؒ جن کی ذات علم و عمل کے ایک ایسے درخشاں مینار کی طرح ہے جو تقریباً چودہ صدیوں سے امت مسلمہ کو نیکی اور فلاح کا راستہ دکھا رہا ہے۔ صوفیائے کرام کے اس عظیم سردار کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں تو تصوف سے متعلق پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیاں آپ سے آپ رفع ہو جاتی ہیں۔ تصوف کو اس کے صحیح رنگ میں اپنانے کے لیے حضرت حسن بصریؒ کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

آپؒ کا نام حسن اور کنیت ابو سعید ہے۔ بعض مورخین نے آپ کی کنیت ابو علی اور ابو محمد بھی بیان کی ہے۔ بصرہ میں طویل عرصے تک قیام کے باعث بصری کہلاتے ہیں۔ آپؒ کے والد کا نام یسار البصری ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کی پیدائش کے بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ آپؒ ۲۱ھ / ۶۴۲ء میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، دوسری روایت کی رو سے آپؒ کا سنہ پیدائش تو وہی ہے جو پہلی روایت میں بیان کیا گیا البتہ جائے پیدائش بصرہ بیان کی گئی ہے۔ آپؒ کے والدین غلام تھے، اس بارے میں بھی روایات کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک روایت یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے عراق کا شہر میسان فتح کیا تو بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا، ان قیدیوں میں آپ کے والد یسار بھی تھے، جن کا اصلی نام پیروز تھا، انہیں مدینہ منورہ لایا گیا جہاں صحابی رسول اللہ ﷺ حضرت انس بن مالکؓ کی پھوپھی حضرت ربیع بنت نضرؓ نے یسار کو خرید کر آزاد کر دیا۔ دوسری روایت میں صرف اس قدر اختلاف کیا گیا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کے والد، حضرت زید بن ثابتؓ کے غلام تھے اور ان کی والدہ محترمہ خیرہ، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی آزاد کردہ کنیز تھیں۔ حضرت یسار نے خیرہ سے شادی کر لی تھی۔ مورخین نے آخری روایت کو زیادہ مستند مانا ہے۔ حضرت خیرہ مختلف کاموں میں مصروف رہتی تھیں، حسن بصریؒ ابھی شیر خوار تھے، ماں کو قریب نہ پا کر رونے لگتے تھے، ایسے وقت میں حضرت ام سلمہؓ انہیں گود میں لے لیا کرتی تھیں اور انہیں بہلانے کے لیے دودھ منہ میں دے دیتی تھیں۔

حضرت حسن بصریؒ اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کی پیدائش ایسے وقت میں ہوئی جب عظیم المرتبت صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد بقید حیات تھی۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا آخری زمانہ تھا، آپؒ کی پیدائش خلافت عمرؓ کے اختتام سے دو سال قبل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، حضرت حسن بصریؒ کو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی شفقت بھری آغوش میسر آئی تھی۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا اور بڑی نعمت

Marfat.com

تھی، اس سے بڑھ کر حضرت حسن بصریؒ کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ آپؒ کو اپنے بچپن میں نبی کریم ﷺ کی دیگر ازواج مطہراتؓ کے گھروں میں آنے جانے کا بھی بارہا موقع ملا۔ آپؒ خود فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت تک، جب کہ میری عمر چودہ سال تھی، میں امہات المومنینؓ کے گھروں میں آتا جاتا رہتا تھا۔ پھر یہ کہ آپؒ کو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے ملنے، ان کی مجالس میں اٹھنے بیٹھنے، ان کے علم سے استفادہ کرنے اور ان کی پاکیزہ سیرتوں سے معرفت کی روشنی کے حصول کا بھی موقع ملا۔

علامہ ابن کثیر کے مطابق آپؒ کی والدہ آپؒ کو صحابہ کرامؓ کے پاس بھیجا کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ آپؒ کو دیکھ کر دعا فرماتے، "اے اللہ! اسے اپنے دین کی سمجھ عطا فرما اور اسے لوگوں کا محبوب بنا دے۔" اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی یہ دعا قبول فرمائی۔ حضرت حسن بصریؒ کی خوش نصیبی تھی کہ آخری دو خلفائے راشدینؓ کے دور میں اسلامی قوانین اور اسلام کے نفاذ سے متعلق جو اہم فیصلے اور مباحث ہوئے وہ بھی آپؒ کے علم میں آئے۔

حضرت حسن بصریؒ کو علم سے والہانہ لگاؤ تھا، جب ان کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو انہوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قرآن کریم میں غور و فکر بھی کرنے لگے، آپؒ کو کتاب اللہ کی مختلف آیات کا مفہوم سمجھنے اور ان میں چھپے ہوئے مطالب اور معانی کے موتیوں کو حاصل کرنے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ حضرت ابو بکر الہذلیؒ کے مطابق حضرت حسن بصریؒ جب تک ایک سورت کی تفسیر سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے اور جن حالات میں وہ سورت نازل ہوئی تھی ان کے بارے میں جان نہ لیتے تھے، اس وقت تک دوسری سورۃ پر غور کرنا شروع نہ کرتے تھے۔ قرآن حکیم کو سمجھنے کی اس جستجو کے نتیجے میں حضرت حسن بصریؒ کا شمار قرآن کریم کے بڑے علما میں ہونے لگا اور وہ قرآن کی تفسیر کا درس دینے لگے۔

کتاب اللہ میں غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت حسن بصریؒ نے حدیث رسول پاکؐ کا علم بھی حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یہ آپؒ کی خوش قسمتی تھی کہ آپؒ کو جید صحابہ کرامؓ سے استفادہ کے مواقع میسر تھے چنانچہ آپؒ نے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت جابر بن معاویہؓ، حضرت معقل بن یسارؓ، حضرت ابی بکرہؓ، حضرت عمران بن حصینؓ اور حضرت جندب بجلیؓ جیسے عظیم اصحابؓ سے براہ راست احادیث رسول کریمؐ سنیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی تربیت معلم اخلاق رسول اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی اور ان اصحابؓ نے، قرآن کریم کی عملی تفسیر، رسول پاک ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ ﷺ کے انداز نشست و برخاست، آپؐ کی عادات و اخلاق کو خود دیکھ کر اسی کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔

حضرت حسن بصریؒ نے خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت ابن کعبؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ثوبانؓ، حضرت عثمان بن ابی العاصؓ اور حضرت معقل بن سنانؓ سے بالواسطہ طور پر استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ اس وقت تابعین کی بڑی تعداد موجود تھی، حضرت حسن بصریؒ کو ان کے علم سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی میسر آیا۔

حضرت حسن بصریؒ کی شخصیت اس قدر پرکشش اور آپ کا انداز تعلیم اتنا دلنشیں تھا کہ لوگ جوق در جوق آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپؒ سے قرآن و حدیث کا درس حاصل کیا کرتے تھے۔ آپؒ جس شہر میں جاتے تھے وہاں تشنگانِ علم آپ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ ان میں اس وقت کے نامور علما کرام مثلاً مجاہدؒ، عطا ابن رباحؒ اور طاؤسؒ بھی شامل تھے۔ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں ان علما کرام کا کہنا تھا: "ہم نے ان جیسا اور کوئی نہ دیکھا۔"

حضرت حسن بصریؒ نے قرآن و حدیث کا وسیع علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی پر بھی عبور حاصل کیا۔ ۳۷ھ کے بعد وہ بصرہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے فقہ میں نام پیدا کیا اور بصرہ کے مفتی اعظم کا درجہ پایا۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ حلال و حرام کے امور کے سب سے بڑے عالم تھے۔ حضرت ربیع بن انسؒ کا کہنا ہے کہ میں دس برس تک حضرت حسن بصریؒ کے پاس آتا جاتا رہا اور ہر بار ان سے نئے نئے مسائل کا علم حاصل کرتا تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ اس قدر بلند مرتبہ پانے کے باوجود حضرت حسن بصریؒ جب بھی کسی مسئلے میں دشواری محسوس کیا کرتے تو اس سلسلے میں دیگر بزرگوں سے پوچھ لیا کرتے اور اس میں کبھی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ مثلاً آپؒ نے حضرت سعید بن مسیبؒ سے تحریری طور پر مسائل دریافت فرمائے۔

حضرت حسن بصریؒ کو اللہ نے دین کا غیر معمولی فہم فرمایا تھا، آپؒ قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد بھی کرتے تھے، یعنی اگر کسی ایسے مسئلے کے بارے میں

Marfat.com

فتوٰی دینے کی ضرورت پیش آتی جس کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح احکامات موجود نہ ہوں تو آپ دین اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی بنیاد پر اپنی رائے دیتے تھے۔ اس دور کے علماکرام آپ کی اس مجتہدانہ صلاحیت کے معترف تھے۔ حضرت ابو قتادہؒ کہتے تھے کہ خدا کی قسم میں نے حضرت حسن بصریؒ کی رائے سے زیادہ کسی اور کی رائے کو حضرت عمر بن خطابؓ کی رائے سے مشابہ نہیں دیکھا۔ حضرت انس بن مالکؓ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا، آپؓ نے فرمایا "حسنؒ سے پوچھا کرو۔" لوگوں نے کہا ہم آپ سے پوچھتے ہیں۔ فرمایا "ہم نے بھی حدیثیں سنیں اور حسنؒ نے بھی، ہم بھول گئے اور انہیں یاد رہیں۔"

حضرت حسن بصریؒ کی شخصیت کا ایک اور پہلو زبان و ادب کے حوالے سے ہے۔ آپ عربی ادب کے بہت بڑے ماہر تھے اور آپ کی فصاحت اور بلاغت مسلم تھی۔ آپ کے جو ارشادات محفوظ کر لیے گئے ہیں انہیں ابتدائی عربی نثر کے بہترین نمونوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ وہ مضمون کو اس انداز میں بیان کرتے تھے کہ جملوں میں جان پڑ جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انشا اور ادب کے ماہرین جاحظ اور المبرد نے حضرت حسن بصریؒ کے اقوال کو اسلوب کے مثالی نمونوں کے طور پر نقل کیا ہے۔ ان کے بعض اقوال لغت کی اہم کتابوں میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربی کے واعظانہ ادب کی شاید ہی کوئی ایسی تصنیف ہوگی جس میں حضرت حسن بصریؒ کے اقوال شامل نہ کیے گئے ہوں۔

حضرت حسن بصریؒ علمی مجلسوں میں بیٹھنا بہت پسند کرتے تھے۔ آپ کے پاس اکثر اہل علم حضرات جمع رہتے تھے اور مختلف امور پر علمی گفتگو جاری رہتی تھی۔ یہ گفتگو بعض اوقات اتنی طویل ہو جاتی کہ آپ اور دیگر علماکرام کو کھانے تک کا خیال نہ رہتا۔ ایک بار چند علما حضرات آپ سے ملنے کے لیے آئے اور دینی گفتگو کرنے لگے۔ باتوں میں اتنی دیر ہوگئی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت نکل گیا۔ آخر حسن بصریؒ کے صاحبزادے نے ادب سے کہا "آپ حضرات نے والد محترم پر خاصا بار ڈال دیا، اب انہیں آرام کر لینے دیں۔" حضرت حسن بصریؒ نے فوراً بیٹے کو تنبیہ فرمائی۔ "ان لوگوں کو دیکھنے سے زیادہ میرے لیے میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور کوئی نہیں۔ جب دو مسلمان آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو اللہ کا ذکر اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں اور حدیث بیان کرتے ہیں۔"

حضرت حسن بصریؒ حق بات کہنے سے کبھی نہ ہچکچاتے تھے۔ آپؒ نے اس معاملے میں بااثر حکمرانوں کی بھی پروانہ کی اور جب کبھی ضرورت محسوس کی، حکمرانوں کی غلطی پر انہیں ٹوک دیا۔ ذاتی طور پر آپ سرکاری عہدوں، حکومت کے عطا کردہ انعامات اور مراعات سے خود ہی دور دور رہے۔ ایک بار غیر کاشت شدہ اراضی مفت تقسیم کی جا رہی تھی لیکن آپؒ نے اسے قبول کرنا پسند نہ فرمایا۔ انہوں نے حکمرانوں کو نصیحت کرنے کے لیے ان کے نام طویل خطوط بھی لکھے۔ ان میں سے ایک خط عبدالملک بن مروان کے نام لکھا گیا، جس میں اخوت انسانی اور بنی نوع انسان سے گہری ہمدردی پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خط حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام تحریر کیا تھا جس میں انہیں نصیحتیں کی تھیں۔ یہ دونوں خطوط رسالوں کی شکل میں طبع کیے گئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں لیکن یہ تصانیف زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ آپ نے قرآن پاک کی ایک تفسیر، حدیث اور فقہ پر بعض کتابیں لکھی تھیں۔ حضرت حسن بصریؒ کی تعلیمات اب عربی تاریخ، سیرت، اخلاقیات، تصوف اور ادب کی کتب میں بکھری ہوئی ہیں۔ شائقین علم نے حضرت حسن بصریؒ سے کثیر تعداد میں استفادہ کیا۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں سے چند کے نام یہ ہیں: حضرت حمید الطویلؒ، حضرت یزید بن ابی مریمؒ، حضرت ایوبؒ، حضرت قتادہؒ، حضرت بکر بن عبداللہ مزنیؒ، حضرت جریر بن ابی حازمؒ، حضرت ابو الاشہبؒ، حضرت ربیع بن صبیحؒ، حضرت عطاء بن سائبؒ، حضرت یونس بن عبیدؒ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عطاءؒ، حضرت طاؤسؒ۔

حضرت حسن بصریؒ دین اسلام کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ دین کے کسی ایک حصہ پر عمل کر کے مطمئن ہو جانے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے دینی علوم پر دسترس حاصل کی اور اس پر پوری طرح عمل بھی کیا۔ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ جیسا اہم فریضہ بھی انجام دیا۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ نے کئی مہمات میں جہاد کیا اور کابل، زابلستان اور مشرقی ایران کی جنگوں میں شریک ہوئے۔

حضرت حسن بصریؒ اپنے تمام اعمال اور افعال میں رسول کریم ﷺ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آپؒ کو اصحاب رسولؐ سے مشابہ قرار دیتے تھے۔ امام شعبیؒ سے ان کے صاحبزادے نے ایک بار پوچھا، "ابا جان، میں دیکھتا ہوں کہ آپ جتنا ادب اور جیسا برتاؤ حسن بصریؒ سے کرتے ہیں ویسا کسی اور سے نہیں کرتے۔" امام شعبیؒ نے جواب دیا، "بیٹا، میں نے رسول اللہ ﷺ کے ستر صحابہ کرامؓ

Marfat.com

کو دیکھا ہے اور حضرت حسنؒ سے زیادہ کسی کو ان سے مشابہ نہیں پایا۔"

حضرت حسن بصریؒ حد درجہ عبادت گزار، خدا ترس اور باعمل عالم دین تھے۔ ابو بکر ہذلیؒ کہتے ہیں کہ وہ دوسروں کو ایسا کوئی کام کرنے کی ہدایت نہ کرتے تھے جو وہ خود نہ کرتے ہوں اور کسی ایسے کام سے منع نہ فرماتے تھے جو وہ خود کرتے ہوں۔ آپؒ فرماتے تھے، "فقیہ وہ ہوتا ہے جو زاہد و متقی ہو، اپنے سے کم رتبہ والے کا مذاق نہ اڑاتا ہو اور اللہ نے اسے جو علم عطا کیا ہے اس سے دنیا کے فائدے حاصل نہ کرتا ہو۔"

حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک زہد کا مطلب یہ نہیں کہ محض زبانی دعوے کر لیے جائیں اور ظاہری وضع قطع درویشوں کی سی بنا لی جائے، آپؒ کے نزدیک اصل چیز اخلاص سے کیا گیا عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ لوگوں کو متنبہ کرتے رہتے تھے کہ ہمارے حلقے میں بہت سے لوگ بیٹھتے ہیں لیکن ان کی غرض دنیا سے ہوتی ہے۔ ایک بار آپؒ کے سامنے ان لوگوں کا تذکرہ کیا گیا جو درویشوں کی طرح گلیم پوشی (کمبل اوڑھے رکھنا) کی عادت اپنائے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا، "یہ لوگ دل کی گہرائیوں میں غرور کے بت چھپائے ہوئے ہیں اور ظاہری لباس سے تواضع اور فروتنی (عاجزی اور مسکینی) ظاہر کرتے ہیں۔ بخدا یہ اپنی گلیم پوشی میں بیش قیمت ردا پوشوں (قیمتی چادر اوڑھنے والوں) سے زیادہ مغرور ہیں۔" حضرت حسن بصریؒ اسی نظریہ پر عمل کرتے تھے اور اسی لیے آپ ہمیشہ سادہ اور درویشانہ لباس زیب تن نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی عمدہ اور قیمتی لباس بھی پہن لیا کرتے تھے۔

ایک بار آپؒ نے اچھی قسم کا یمنی جبہ اور چادر اوڑھ لی۔ گھر سے باہر نکلے تو ایک صاحب نے تعجب کا اظہار کیا۔ آپؒ نے جواب دیا، "تمہیں علم نہیں کہ دوزخ میں جانے والوں کا ایک بڑا حصہ گلیم پوشوں (کمبل اوڑھنے والوں یعنی ظاہری طور پر درویش بن جانے والوں) میں سے ہوگا۔" آپ کا یہ انداز فکر آپ کے اخلاص اور عمل پسندی کا ثبوت ہے۔ آپؒ کا ایمان تھا کہ انسان اپنے لباس اور طرز بود و باش سے چاہے کتنا ہی عبادت گزار اور متقی نظر آئے، اگر اس کے دل میں خلوص نہیں ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر عمل نہیں کرتا تو اس کی یہ ظاہری وضع قطع اسے اللہ کے غضب سے محفوظ نہ رکھ سکے گی اور اسے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مشہور مقامات کے عمدہ کپڑے سلوا کر وقتاً فوقتاً زیب تن کرتے رہتے تھے۔ ہمیشہ پورے لباس یعنی جبہ، چادر اور عمامہ کا اہتمام کرتے تھے۔ عمامہ پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ جواہرات اور موتیوں کی تجارت کر کے روزی کماتے تھے، لیکن آپ کا دل مال جمع کرنے کی حرص سے پاک تھا حتیٰ کہ آپ نے اپنی بیٹی کی شادی ایک ایسے شخص سے کرنے سے انکار کر دیا جو بے حد دولت مند تھا اور محض اپنی دولت کی وجہ سے مشہور تھا۔

حضرت حسن بصریؒ اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے، آپ کی حرکات و سکنات اور تمام اعمال سے یہ کیفیت عیاں رہتی تھی۔ آپ جب بھی قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو کوئی آیات پڑھ کر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ لوگوں نے آپ کو ہمیشہ آخرت کی فکر کرتے دیکھا۔ اسی لیے آپ بے کار، فضول اور بے مقصد گفتگو کبھی نہ فرماتے تھے اور بہت زیادہ ہنسی مذاق سے دور رہتے تھے۔ فرماتے تھے، "مومن کی ہنسی قلب کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔"

آپؒ اکثر دعا فرماتے رہتے تھے: "اے اللہ شرک، غرور، نفاق، ریا، فریب، شہرت طلب کرنے اور اپنے دین میں شک و شبہ سے ہمارے دلوں کو محفوظ رکھنا۔" آپؒ گفتگو کی کسی محفل کے اختتام پر بھی یہی دعا فرماتے تھے۔ آپؒ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر کسی انسان کے سامنے اس کی تعریف کر دی جائے تو اس کا نفس مغرور ہو جاتا ہے اور اس کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی لیے جب بھی کوئی فرد آپ کی تعریف کرتا تھا تو آپؒ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے تھے، البتہ لوگ آپؒ کے لیے دعا کرتے تو آپؒ اس سے خوش ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ اپنی نفل عبادات کے معاملے میں کوشش کرتے تھے کہ دوسروں کو ان کا علم نہ ہونے پائے۔ یہ بالکل صحیح اسلامی روش ہے اور دین اسلام کی تعلیم یہی ہے۔ مشہور عرب مصنف ابن ابی الدنیا کے مطابق حضرت حسن بصریؒ نے بیس سال تک اس طرح عبادت کی کہ پڑوسیوں تک کو اس کا علم نہ ہو سکا۔

عالم اسلام کے اس عظیم بزرگ کا انتقال رجب ۱۱۰ھ/اکتوبر ۷۲۸ء میں جمعہ کی شب بصرہ میں ہوا۔ نماز جمعہ کے بعد آپؒ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ہزاروں غمزدہ نفوس کی موجودگی میں آپؒ کو بصرہ ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

•••

Marfat.com

حضرت جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

بُلند پایہ فقیہ، محدّث، مفسّر اور صوفیا کے امام

شہر بغداد کے گلی کوچوں میں ایک ہی تذکرہ تھا:

”مسجد شونیزیہ چلو! مسجد شونیزیہ چلو!“

یہ جمعہ کا دن تھا۔ بغداد کے تمام شہری نہا دھو کر اور صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے ایک ہی سمت رواں تھے، مسجد شونیزیہ کی طرف، جہاں ان کے محبوب امامؒ وعظ فرمانے والے تھے۔

مسجد شونیزیہ میں نمازیوں کی بڑی تعداد وعظ شروع ہونے کی منتظر تھی۔ ان کی بے چین نگاہیں بار بار منبر کی جانب اٹھ جاتی تھیں، جہاں امام الائمہ ”تشریف لانے والے تھے۔ آخر انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔ امام صاحبؒ تشریف لے آئے تھے۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ فضا میں صرف امام صاحبؒ کی آواز گونج رہی تھی، جو نہایت فصیح و بلیغ انداز میں توحید کے موضوع پر اظہار خیال فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر کیا تھی گویا لفظوں کے موتی ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ تقریر کے اچھوتے انداز، دلیل کی قوت اور دلکش طرز ادا نے حاضرین کو مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔ آپؒ شرک سے بچنے کی تلقین فرما رہے تھے اور توحید کے تقاضے اجاگر کر رہے تھے۔ بات آپؒ کے دل سے نکل رہی تھی اور سامنے بیٹھے ہر فرد کے دل کو موم بنا رہی تھی۔ آپؒ کی تقریر ختم ہوئی تو مجمع کو احساس تک نہ ہوا۔ تقریر کا تاثر ایسا شدید تھا کہ چند لمحوں کے لیے تمام افراد اپنی جگہ دم بخود بیٹھے رہے۔

اس موقع پر پچھلی صفوں سے ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اگلی صفوں میں بیٹھے لوگ مڑ کر دیکھنے لگے کہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے۔ نوجوان ایک درخواست کر رہا تھا، ”حضرت اس حدیث کا مفہوم سمجھاتے جائیں: مومن کی فراست (ایمانی) سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔“

حضرتؒ نے اپنا سر جھکا لیا، چند لمحوں کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر فرمایا، ”اے نوجوان! تو اس حدیث کا مفہوم مجھ سے جاننا چاہتا ہے، تو ادھر آ اور مسلمان ہو جا، کیونکہ تیرے اسلام لانے کا وقت آ گیا ہے۔“

تمام لوگ تعجب کے ساتھ اس نوجوان کو دیکھنے لگے جو مسجد میں موجود تھا، اس کا لباس بھی مسلمانوں کا سا تھا اور حضرتؒ اس سے کہہ رہے تھے کہ آگے آ اور مسلمان ہو جا! پھر لوگوں نے حیرانی سے اس نوجوان کو دیکھا کہ وہ آگے بڑھا اور اس نے حضرتؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ مسجد نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی۔ پھر اس نو مسلم نوجوان نے بتایا، ”میں عیسائی تھا، جب میں نے سنا کہ مسلمانوں کے روحانی پیشوا وعظ کے لیے پہلی بار مسجد میں آ رہے ہیں تو میں مسلمانوں کا سا لباس پہن کر آ گیا۔ میری نیت یہ تھی کہ میں حضرتؒ کا امتحان لینے کے لیے ان سے ایک حدیث کا مفہوم دریافت کروں گا اگر انہوں نے میری نیت جان لی تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔“

مسلمانوں کے یہ امام جن کے ہاتھ پر عیسائی نوجوان کو مسجد شونیزیہ میں اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت جنید بغدادیؒ تھے، جنہیں اللہ نے قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر متعدد اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ تصوف کی بلندیوں سے نوازا تھا۔ آپؒ نہایت باعمل اور سچے مسلمان ہیں اور آپؒ کو صوفیا کرام میں بے حد اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے۔ آپؒ کو یہ اعزاز بھی نصیب ہوا ہے کہ آپ کے وعظ اور نصیحت سے متاثر ہو کر کئی ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے آباؤ اجداد کا تعلق شہر بغداد سے نہیں ہے۔ آپؒ کے اجداد ایران کے مشہور شہر نہاوند میں آباد تھے۔ صوبہ جبال کا یہ شہر ہمدان سے چالیس میل جنوب میں واقع ہے۔ ۱۵۰ھ میں دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے شہر بغداد تعمیر کروایا اور اس شہر کو دار الخلافہ مقرر کیا۔ شہر کی شہرت سن کر دور دور سے لوگ آ کر

Marfat.com

یہاں آباد ہونے لگے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے والد محمد قواریری بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے جو اپنے خاندان سمیت بغداد چلے آئے اور یہاں رہائش اختیار کرلی۔

آپؒ کے والد محمد کو قواریری اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کا پیشہ شیشہ فروشی تھا۔ اسی وجہ سے حضرت جنید بغدادیؒ کو زجاج گر بھی کہا جاتا تھا یعنی آئینہ ساز، لیکن جوان ہونے پر آپؒ نے چونکہ خام ریشم کی فروخت کا پیشہ اپنایا اس لیے لوگ آپ کو ”خزاز“ کہہ کر بھی پکارنے لگے یعنی خام ریشم کا سوداگر۔ بغداد میں پیدا ہونے یہیں علم حاصل کرنے اور اسی شہر میں رہ کر ایک دنیا کو اس علم کی روشنی سے مستفید کرنے کی وجہ سے آپؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ تیسری صدی ہجری کا آغاز تھا جب محمد قواریری کے ہاں ایک بچے کی پیدائش عمل میں آئی۔ محمد قواریری نے بچے کی والدہ اور ماموں کے مشورے سے بچے کا نام اس کے دادا کے نام پر جنیدؒ رکھا۔ جنید کے معنی ہیں ”چھوٹا سا لشکر“ اور پھر گزرتے وقت نے دیکھا کہ قدرت نے اس نیک و سعید بچے کی ذات میں کس قدر خوبیاں یکجا کردی ہیں۔

حضرت جنیدؒ اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھے کہ ان کو بے حد عمدہ تعلیمی ماحول میسر آیا تھا۔ بغداد تو یوں بھی علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا، پھر آپؒ کے والد بے حد دیندار انسان تھے۔ والدہ ماجدہ نہایت متقی اور پرہیز گار خاتون تھیں۔ ان کے بھائی یعنی حضرت جنیدؒ کے ماموں حضرت سری سقطیؒ ایک بڑے عالم، مفسر، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ چنانچہ آپؒ نے جوں ہی ہوش سنبھالا، آپ کے کانوں میں تلاوت قرآن پاک کی آواز پہنچی، حدیث کی سماعت کا موقع ملا اور ہر جانب علم کا چرچا دیکھا۔ بچپن ہی سے ماموں کے زیر تربیت رہے۔ کم عمری ہی میں آپؒ کے والد کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد حضرت سری سقطیؒ پیارے بھانجے کو اپنے گھر لے آئے اور نہایت توجہ اور محبت سے پرورش کی۔

حضرت سری سقطیؒ مسالے کا کاروبار کرتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام سقطی، مشہور ہوگیا تھا، یعنی وہ شخص جو مسالا فروخت کرتا ہو۔ آپؒ کو بڑے جلیل القدر ائمہ سے تحصیل علم کا شرف حاصل ہے۔ آپؒ نے حضرت ابن عباسؓ، شیخ یزید بن ہارونؒ اور امام سفیان بن عیینہؒ جیسے عظیم محدثین سے حدیثیں سماعت کی تھیں۔ آپؒ کی زندگی ایک سچے اور پکے مسلمان کی زندگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپؒ نے جنگوں میں بھی حصہ لیا، کاروبار بھی کیا، خدمتِ خلق بھی کی اور امت مسلمہ کو اپنے علم کے وسیع دریا سے سیراب بھی کیا۔

حضرت سری سقطیؒ تصوف کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔ آپؒ کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک کسی کو قرآن و سنت اور فقہ و شریعت پر عبور حاصل نہ ہو جائے، اسے تصوف اور طریقت کے راستے پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ نے حضرت جنیدؒ کو سب سے پہلے قرآن کریم سے متعارف کروایا اور انہیں قرآن مجید حفظ کروایا۔

حضرت جنیدؒ سات برس کے تھے تو آپؒ کے ماموں حضرت سری سقطیؒ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس مبارک سفر پر انہوں نے اپنے پیارے بھانجے کو بھی ساتھ لے لیا۔ ایک مقام پر حضرت سری سقطیؒ اور دیگر بہت سے مشائخ کے درمیان ایک علمی بحث چھڑ گئی۔ موضوع تھا ”شکر“ بحث طویل ہوگئی لیکن ”شکر“ کی کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ حضرت سری سقطیؒ کی نگاہ اپنے کمسن بھانجے جنیدؒ پر پڑی، تو ان سے پوچھ لیا، ”بیٹے تم بتاؤ شکر الٰہی کیا ہوتا ہے؟“

اس قدر کم عمر بچے سے اس سوال کے جواب کی کسی کو توقع نہ تھی۔ لیکن تمام علماکرام نے حیرت اور خوشی کے ساتھ ننھے جنیدؒ کا جواب سنا جو کہہ رہے تھے: ”شکر، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے ذریعے انسان اس کی نافرمانی نہ کرے بلکہ اپنی تمام تر توانائیوں کو اسی کی اطاعت میں صرف کردیا جائے۔“

تمام مشائخ نے اس جواب پر خوش ہو کر کہا آپ نے بہت خوب تعریف بیان فرمائی ہے۔

حضرت جنیدؒ کی فراست اور حکمت کا اندازہ آپ کے ماموں اور دیگر اساتذہ کو بہت شروع ہی میں ہوگیا تھا۔ ایک دن آپؒ حضرت سری سقطیؒ کی خدمت میں موجود تھے۔ اطراف میں اور کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت سریؒ نے لوگوں سے پوچھا، ”کون سی ایسی چیز ہے جو آنکھوں سے نیند اڑا دے؟“ مختلف جواب آئے۔ کسی نے کہا ”بھوکا رہنے سے نیند اڑ جاتی ہے۔“ کوئی بولا، ”پانی کم پیا جائے تو نیند نہیں آتی۔“ حضرت جنیدؒ کی باری آئی تو آپؒ نے عرض کی ”دلوں کا اس بات کو جان لینا کہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کے بارے میں پوری طرح خبر ہے کہ اس نے کیا کچھ کمایا ہے۔“ حضرت سریؒ نے یہ جواب سنا تو خوش ہو کر فرمایا، ”پیارے بیٹے تم نے خوب جواب دیا۔“ اس دن کے بعد حضرت سریؒ جب بھی کہیں تشریف رکھتے تھے، اپنے لائق بھانجے حضرت جنیدؒ

Marfat.com

کو اپنے قریب جگہ دیتے تھے۔

خیال ہے کہ حضرت جنیدؒ جب نو برس کی عمر کو پہنچے تو وہ تجوید اور ترتیل کے ساتھ قرآن پاک حفظ کر چکے تھے۔ اس کے بعد آپؒ نے اپنے ماموں حضرت سری سقطیؒ سے حدیث کی سماعت کی اور دیگر علوم حاصل کیے۔ حضرت حسن بن عرفہؒ سے کتابتِ حدیث کی تعلیم پندرہ سال کی عمر تک پائی۔ سولہ سے بیس سال کی عمر تک آپؒ نے اپنی تمام توجہ فقہ جیسے مشکل علم پر مرکوز کیے رکھی۔ آپ نے حضرت ابو ثورؒ اور حضرت ابو عبیدؒ سے فقہ کے پیچیدہ مسائل سیکھے اور اس عمیق علم پر اس قدر دسترس حاصل کی کہ صرف بیس سال کی عمر میں آپؒ کو مفتی اور فقیہ کا رتبہ مل گیا اور لوگ آپؒ سے فتووں کے سلسلہ میں رابطہ قائم کرنے لگے۔

اب آپؒ نے تصوف کی طرف توجہ فرمائی اور حضرت سری سقطیؒ، حضرت حارث محاسبیؒ، حضرت ابو جعفر الکبیرؒ، حضرت الکلانسیؒ اور حضرت القنطریؒ سے تصوف کے اسرار و موز سیکھے۔ ان اساتذۂ کرام سے آپ نے علم میں انہماک، عمل کی اہمیت، زُہد، مشاہدہ، توجہ الی اللہ، فقر، تواضع، سادگی، کم گوئی اور کسبِ حلال کا درس لیا۔ ان دنوں بغداد سفر و سیاحت، تجارت اور صاحبانِ علم کا بڑا علمی مرکز تھا، چنانچہ حضرت جنیدؒ کو بغداد میں رہتے ہوئے ہی دور دور سے آنے والے علما کرام اور دیگر ممتاز شخصیات سے ملاقات کا موقع مل جاتا تھا۔

اس علمی انہماک اور عمیق مطالعہ کے نتیجے میں آپؒ نے وہ مقام بلند پایا جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ لیکن آپؒ کی شہرت محض آپ کے علم کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ آپؒ کی پوری زندگی ایسے کامل مسلمان کی زندگی کا مثالی نمونہ تھی جو اپنے رب کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل پیرا ہو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی اپنے پروردگار کی مرضی اور منشا کو نظر انداز نہیں کرتا۔ آپؒ کی شہرت کا حال یہ تھا کہ دور دور سے علما کرام مسائل لکھ کر آپ کو بھجواتے تھے۔ آپ ان کا جواب تحریری طور پر ان علما کرام کو بھجوا دیتے تھے۔ مثلاً نیشاپور سے حضرت ابو بکر کسائیؒ، اصفہان سے حضرت علی بن سہیلؒ مسائل بھیجا کرتے تھے۔ شام سے کچھ مشائخ نے چند دینی امور کے سلسلے میں کچھ باتیں دریافت کی تھیں اور آپؒ نے ان کے جواب میں ایک رسالہ تحریر کر کے بھیج دیا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسف بن الحسین رازیؒ، حضرت یحییٰ بن معاذؒ، حضرت عمرو بن مکیؒ کو آپؒ نے جو خطوط تحریر فرمائے تھے ان میں سے بعض خطوط قاہرہ میں محفوظ ہیں۔

تاج العارفین حضرت جنید بغدادیؒ کے سینے میں اللہ کا کلام محفوظ تھا۔ آپؒ کو قرآن کریم کی تمام آیات پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ آپؒ جو آیت بیان فرمانا چاہتے فوراً ذہن میں آجاتی۔ مسائل کی تشریح، تقریر کے دوران استدلال یا دیگر علمی بحثوں میں آپؒ کی یہ مہارت بہت مددگار ثابت ہوئی۔ قرآن کو سمجھنے میں بھی آپؒ کا جواب نہ تھا۔

ایک بار آپؒ اپنے ماموں حضرت سریؒ کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ ایک شخص بے ہوش پڑا ہے۔ دریافت کرنے پر آپؒ کو بتایا گیا کہ یہ شخص قرآن پاک کی ایک آیت سن کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ آپؒ نے مشورہ دیا کہ وہی آیت اسے دوبارہ سنوائی جائے، چنانچہ وہی آیت دوبارہ پڑھی گئی تو وہ شخص ہوش میں آگیا۔ حضرت سریؒ نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ آپؒ نے فرمایا:

"میں نے یہ بات قرآن پاک سے سیکھی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی چھین لینے کا باعث بنی تھی، وہی قمیض آپ کی بینائی واپس لانے کا سبب بنی۔"

ایک بار ایک خاتون آئیں اور کہنے لگیں میرا بیٹا کھو گیا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیں۔ آپؒ نے انہیں صبر کی تلقین کی۔ آخر وہ کہنے لگیں۔ "مجھ میں اب صبر کی تاب نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔" خاتون کی حالت بہت خراب تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا "آپ گھر جائیں، ان شاء اللہ آپ کا بیٹا گھر پہنچ چکا ہو گا۔" وہ خاتون جلدی سے گھر پہنچیں تو دیکھا کہ بیٹا واقعی گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ دوڑی دوڑی واپس حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں آئیں تاکہ شکریہ ادا کریں۔ لوگوں نے آپؒ سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ خاتون کا بیٹا گھر پہنچ گیا ہو گا؟" آپؒ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، "کون ہے جو بے قرار کی دعا کو قبول کرتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے، اور اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔" (پارہ ۲۰، آیت ۶۲)۔

علم دین کو دور دور تک پھیلانے، فقہی مسائل کو عام فہم بنا کر پیش کرنے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور غلط فہمیوں کی اصلاح کرنے میں امام الائمہ حضرت جنیدؒ کا بہت اعلیٰ مقام ہے۔ آپؒ کا زمانہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدوین اور انہیں جمع کرنے کا زمانہ تھا۔ آپؒ نے بھی احادیث کی سماعت کی اور حدیثیں کتابت فرمائیں۔

Marfat.com

آپؒ نے احادیث روایت بھی کی ہیں۔

حضرت جنیدؒ نے متعدد کتب تحریر فرمائیں، افسوس کہ ان میں سے بہت سی کتابیں اب موجود نہیں ہیں۔ قرآن پاک کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے بارے میں تفسیری نوعیت کی ایک کتاب "امثال القرآن" کے نام سے تحریر فرمائی۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) نے آپ کی کتاب "تصحیح الارادہ" کا حوالہ دیا ہے، اس کتاب کا بھی کوئی نسخہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ دعاؤں اور مناجاتوں کے بارے میں آپؒ نے ایک کتاب "کتاب المناجات" کے عنوان سے لکھی، یہ بھی ناپید ہے۔ آپؒ کی دیگر کتب میں "شرح شطحیات ابی یزید بسطامیؒ" "منتخب الاسرار فی صفات الصدیقین والابرار"، "العمدہ" "دوا الارواح" شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں آپؒ نے اپنے استاد حضرت حارث محاسبیؒ کے افکار کو اپنی زبان میں نقل فرمایا ہے۔

آپؒ کی ایک کتاب "قصیدۃ فی التصوّف" کا قلمی نسخہ برلن (جرمنی) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ آپؒ نے متعدد رسالے بھی تحریر فرمائے جن میں "رسالہ فی تکذیب الرویت"، "رسالہ دوا التصریط"، "رسالہ فی مسائل الشامیین" شامل ہیں۔ "کتاب الفنا"، "کتاب المیثاق" "کتاب الالوہیت" "کتاب فی الفرق بین الاخلاص والصدق"، "کتاب آداب"، "المفتقر الی اللہ"، "باب آخر فی التوحید"، "مسائل ستہ"، "آخر مسئلہ فی التوحید"، آپؒ کی دیگر تصانیف ہیں۔

آپؒ نہایت اعلیٰ شعری ذوق رکھتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے، گو کہ ان کی تعداد کم ہے۔ محفل میں تشریف فرما ہوتے تو موقع و محل کے اعتبار سے موزوں اشعار پڑھتے تھے۔ آپؒ کے ایک شعر کا مفہوم ہے: " اے میرے محبوب اللہ، میں آپ کو یاد کرتا ہوں، اور آپ کو کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں بھولا، مجھے ذکر میں سب سے آسان ذکر اپنی زبان سے ذکر الٰہی کرنا لگتا ہے۔"

آپؒ کا مکان طالبانِ علم کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں علمی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ فقہی مسائل کا چرچا رہتا، علمی مباحثے برپا ہوتے۔ اسپین، ترکستان، ایران اور مغربی ممالک سے فریضۂ حج کی ادائیگی کو جانے والے یہاں سے گزرتے ہوئے آپؒ سے ملنے کے لیے ضرور آتے۔

آپؒ اپنے شاگردوں کو درس کی صورت میں تعلیم دیتے تھے اور آپؒ کے شاگرد آپ کی باتوں کو سن کر لکھتے جاتے تھے۔ آپؒ کی گفتگو کا انداز نہایت موثر اور عام فہم تھا۔ درس کے بعد شاگردوں کے سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے۔ آپؒ موضوع سے ہٹ کر کبھی بات نہیں کرتے تھے اور جو بات بھی کرتے، دلیل اور منطق کی بنیاد پر بے حد سلجھے ہوئے انداز سے کرتے تھے۔

حضرت جنید بغدادیؒ اپنے تلامذہ میں سب سے زیادہ توجہ ابو محمد احمد ابن الحسن الجریریؒ کو دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے انہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اس معاملے میں آپؒ نے اپنے اکلوتے صاحبزادے حضرت قاسمؒ کو کبھی فوقیت نہیں دی، حالانکہ وہ بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپؒ کے دیگر شاگردوں میں ابو بکر ابن مجید دالشبلیؒ، ابو مغیث الحسینؒ، ابن منصور الحلاجؒ، حضرت ابو الحسین ثوریؒ، حضرت ابنِ عطا آدمی حضرت جعفر خلویؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت حاتم اصمؒ، حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ، حضرت احمد بن الجا الحواریؒ جیسے علما کرام شامل ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی زندگی رضائے الٰہی کے طلب گار ایک سچے اور مخلص مسلمان کی مکمل تصویر تھی۔ آپؒ کسبِ حلال پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ آپ اپنے اخراجاتِ زندگی پورے کرنے کے لیے ریشمی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اس تجارت سے جو نفع ہوتا اسے اپنے اہل خانہ اور اپنے ضرورت مند شاگردوں پر صرف کرتے اور جو کچھ بچ جاتا اسے اللہ کی راہ میں دے دیتے۔ آپؒ نے جہاد میں بھی حصہ لیا اور رومیوں کے خلاف کئی جنگوں میں شرکت کی۔

آپؒ اپنے تمام جاننے والوں اور عوام الناس کے مسائل اور تکالیف دور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ یوں تو آپؒ کی زبان پر ہمیشہ ذکرِ الٰہی جاری رہتا تھا، لیکن جب بھی آپؒ سے ملنے کے لیے کوئی آتا تو ذکر روک کر اس کی بات سنتے، اس کی ضرورت پوری کرتے اور پھر ذکر کرنے لگتے۔ آپؒ نہایت سادہ زندگی بسر کرنا پسند فرماتے تھے۔ گھر میں مٹی کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ آپؒ محنت و مشقت سے بھرپور زندگی بسر کرتے تھے۔

آپؒ نماز باجماعت پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے، حال یہ تھا کہ بیس سال تک آپ سے نماز باجماعت کی تکبیر اولیٰ نہ چھوٹی۔ روزانہ نوافل کا اہتمام فرماتے تھے۔ اکثر نفلی روزے رکھتے تھے۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ فرماتے ہیں، "حضرت جنید بغدادیؒ کسی بیماری یا مصیبت میں مبتلا ہوتے تو زیادہ نفل نمازیں ادا فرماتے۔" حضرت خواجہ

Marfat.com

نظام الدین اولیا کا کہنا ہے کہ "حضرت جنیدؒ نماز میں اس قدر قیام فرماتے تھے کہ آپؒ کے پیروں پر ورم آ کر ان سے خون جاری ہو جاتا تھا۔" حضرت جنیدؒ نے متعدد حج بھی فرمائے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں، "حضرت جنیدؒ نے خود کو عبادت گزاری کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی برکت سے اللہ نے ان پر علوم کے بہت سے دروازے کھول دیے۔"

آپؒ نماز کی سختی سے پابندی فرماتے تھے۔ ایک بار آپؒ کو آشوبِ چشم کی شکایت ہوگئی۔ ایک مجوسی (آتش پرست) طبیب نے مشورہ دیا کہ آپ آنکھوں کو پانی لگنے سے بچائیں۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا، "وضو کرنے کی وجہ سے ایسی احتیاط ممکن نہیں ہے۔" طبیب نے کہا کہ اگر آپ آنکھوں کی صحت چاہتے ہیں تو یہ احتیاط کرنی ہوگی۔ آپؒ نے طبیب کے مشورے پر توجہ نہ دی۔ معمول کے مطابق وضو کیا اور نماز ادا فرمائی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو سب لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کہ آپؒ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ دوسرے دن وہی طبیب آیا تو وہ بھی آپؒ کی صحت مند آنکھیں دیکھ کر تعجب کرنے لگا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا؟ حضرت جنیدؒ نے سادگی سے فرمایا، "میں نے تو اپنی آنکھوں کے مقابلے میں آنکھوں کی ٹھنڈک، نماز کو عزیز تر سمجھ کر وضو کر لیا تھا، شافیِ مطلق نے اپنا کرم فرمایا۔" یہ سننا تھا کہ طبیب کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہو گیا، وہ کہہ رہا تھا "یہاں انسان کا کیا کام، یہ تو خالق و مالک کا علاج ہے۔"

ذکرِ الٰہی کا بہت اہتمام فرماتے تھے، آپ کا کہنا تھا، "اللہ کی ذات سے غافل ہونا میرے نزدیک دوزخ میں جانے سے سخت تر ہے۔" آپؒ کو تلاوتِ قرآنِ پاک کرنا بہت پسند تھا۔ رات کے وقت اگر کوئی آپؒ کے کمرے سے کان لگا کر سنتا تو اسے آپؒ کی دلنشین آواز میں قرآن پاک کی تلاوت سنائی دیتی۔ آپؒ تلاوت کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی آیات پر غور و تدبر بھی کرتے جاتے۔

اپنے وسیع علم پر حضرت جنیدؒ نے کبھی فخر کا اظہار نہیں فرمایا۔ ایک بار کسی نے آپؒ کے سامنے قرآن پاک کی آیت پڑھی جس کا ترجمہ ہے، "اے ایمان والو، تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جن پر تم خود عمل نہیں کرتے" (سورہ الصف، آیت ۴)۔ اس آیت کا سننا تھا کہ آپؒ پر رقت طاری ہو گئی۔ آپؒ بہت انکسار سے اللہ کے حضور التجا کرنے لگے، "اے پروردگار، آپ جانتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا وہ محض آپ کی رضا کی خاطر اور آپ ہی کی توفیق سے کیا ہے اور جو کچھ نیک عمل ہو سکتے ہیں، وہ بھی بس آپ کی رضا کے لیے اور آپ کی توفیق ہی سے انجام دے سکتے ہیں۔"

آپؒ اپنے عہد کے دیگر بزرگانِ دین، مشائخ اور علما کرام کا بے حد احترام کرتے تھے، ان کی خدمت کرتے تھے اور ان سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ بغداد، شام، بصرہ، نیشاپور اور دیگر تمام مقامات کے مشائخ آپ کے احباب میں شامل تھے۔ یہ بزرگانِ دین جب آپؒ سے ملنے کے لیے آتے تو آپؒ ان کی خوب خاطر تواضع کرتے، جواب میں یہ بزرگ بھی حضرت جنیدؒ کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے۔ حضرت جنیدؒ ہر ایک کی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ کوئی بیمار ہو جاتا تھا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ ایک بار آپؒ کے شاگرد حضرت نوریؒ علیل ہوئے تو آپؒ ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت جریریؒ آپؒ کے شاگرد تھے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار سفرِ حج سے لوٹا تو گھر جانے سے پہلے استاد محترم جناب حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں چلا گیا تاکہ انہیں مجھ سے ملنے میں زحمت نہ ہو۔ دوسرے دن نماز فجر پڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ دیکھتا ہوں، حضرت جنیدؒ پیچھے کھڑے انتظار فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا، "میں تو آپؒ کی خدمت میں حاضر اسی لیے ہوا تھا کہ آپؒ کو تکلیف نہ ہو۔" فرمایا، "وہ آپ کی مہربانی تھی اور یہ آپ کا حق ہے۔"

آپؒ بے حد شفیق، حلیم اور کریم النفس بزرگ تھے، لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے اور خاموشی سے ان کی اصلاح کر دیتے تھے۔ ابن ساباط کا واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے۔ یہ واقعہ چونکہ تاریخی کتب اور عام جرائد میں بہت تفصیل سے شائع ہو چکا ہے اس لیے یہاں اسے اختصار سے بیان کیا جا رہا ہے:

ابن ساباط ایک ڈاکو تھا۔ ایک بار وہ گرفتار ہوا تو سزا کے طور پر اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا گیا اور کئی سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ رہا ہو کر آیا تو اس نے پہلی ہی رات ایک گھر میں نقب لگائی۔ یہ حضرت جنیدؒ کا گھر تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ کپڑوں کے تھان پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے ان کپڑوں کی گٹھڑی بنانے کی کوشش شروع کر دی، لیکن ایک ہاتھ کٹا ہوا ہونے کی وجہ سے اسے مشکل پیش آ رہی تھی۔ اتنے میں حضرت جنیدؒ اس کمرے میں تشریف لے آئے جہاں ابن ساباط گٹھڑی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے ابن ساباط نے خیال کیا کہ یہ بھی کوئی ایسا شخص ہے جو اس مکان سے کچھ لینے کے لیے آ گیا ہے۔ اس نے حضرت جنیدؒ کو حکم دیا کہ کپڑوں کی دو

Marfat.com

گٹھڑیاں بنائیں ایک چھوٹی ایک بڑی۔ پھر ابن ساباط نے چھوٹی گٹھڑی خود اٹھالی اور بڑی گٹھڑی حضرت جنیدؒ کو دے کر انھیں حکم دیا کہ وہ اسے لے کر چلیں۔ راستے بھر ابن ساباط حضرت جنیدؒ کو برا بھلا کہتا رہا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ابن ساباط نے چھوٹی گٹھڑی انہیں بطور انعام دینا چاہی، تو آپؒ نے متانت اور نرمی سے کہا، "یہ تکلیف نہ کرو، وہ میرا ہی مکان ہے جہاں سے تم نے یہ کپڑے اٹھائے تھے۔ آئندہ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتادینا"۔ یہ کہا اور ابن باساط کو حیران چھوڑ کر چلے آئے۔

دوسرے دن ابن ساباط آپؒ کی مسجد کے سامنے سے گزرا تو حضرت جنیدؒ کی آواز کان میں پڑی، آپؒ لوگوں کو توبہ کی تلقین فرمارہے تھے۔ قدرت نے ابن ساباط کے دل کی حالت بدل دی، وہ اسی وقت حضرت جنیدؒ کے پاس پہنچے، توبہ کی اور پھر اپنے عہد کے بڑے بزرگ کہلائے۔

تاج العارفین حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک بڑا کارنامہ تصوف کی اصلاح ہے۔ آپؒ نے تصوف کے سلسلے میں پھیلی ہوئی مختلف غلط فہمیوں اور خامیوں کی اصلاح فرمائی۔ آپؒ تصوف کی راہ اختیار کرنے سے قبل قرآن وحدیث اور فقہ پر عبور حاصل کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ آپؒ کا کہنا ہے "میں نے فقہ کی تعلیم حضرت ابو عبیدؒ اور حضرت ابو ثورؒ جیسے اساتذۂ حدیث کے مسلک کے مطابق حاصل کی، بعد میں، میں نے حضرت حارث المحاسبیؒ اور حضرت سری بن مغلس جیسے صوفیا کی صحبت اختیار کی۔ یہی چیز میری کامیابی کا راز بنی، اس لیے کہ ہمارا علم ہمیشہ قرآن وحدیث کے ضابطے کے اندر رہنا چاہیے۔ جس شخص نے قرآن حفظ نہیں کیا اور نہ حدیث باقاعدہ طور پر پڑھی ہے اور تصوف کا رخ کرنے سے پہلے فقہ کا علم بھی حاصل نہیں کیا، وہ ایک ایسا شخص ہے جسے رہنمائی کرنے کا حق نہیں ہے۔"

آپؒ نے تصوف میں خرابیوں کے خلاف منظم اور بھرپور جہاد کیا اور کتاب وسنت کی پابندی پر زیادہ سے زیادہ زور دیا۔ آپؒ نیت کی پختگی کی ہمیشہ تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپؒ کا فرمان ہے، "جو شخص اپنے اوپر نیک نیتی کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ اس پر توفیق کے دروازے کھول دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اپنے اوپر بدنیتی کا دروازہ کھولتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس پر ستر دروازے رسوائی کے کھول دیتا ہے۔"

آپؒ نے رہبانیت یعنی دنیا کو چھوڑ کر گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ آپ فرماتے تھے، "مجھے بیوی کی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی کہ کھانا کھانے کی۔" ایک بار ایک شخص نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا سارا مال واسباب اللہ کی راہ میں دے دینا چاہتا ہے اور ان کے پاس فقیر بن کر بیٹھنے کا آرزومند ہے۔ آپؒ نے اسے مشورہ دیا کہ "تم اپنا سارا مال خرچ نہ کردو، اپنے گزارے کے لیے کچھ رکھ لو، اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی راہ میں صرف کردو، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تمہارا نفس تم سے مطالبہ نہ کرنے لگ جائے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ اس لحاظ سے تصوف اور طریقت (باطنی علم) کے بانی تصور کیے جاتے ہیں کہ انہوں نے تصوف اور طریقت کے قوانین وضع فرمائے اور اسے منظم اور مربوط شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے تصوف کی ایک اصطلاحی زبان کی بنا رکھی۔ آپؒ کا مرتبہ، صوفیا کرام میں بہت بلند ہے۔ آپؒ کو "تاج العارفین" یعنی "اہل عرفان کے تاج"، "سید الطائفہ" یعنی طبقۂ صوفیا کے سردار، "امام الائمہ" یعنی اماموں کے امام، جیسے خطاب ملے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) نے اپنی کتابوں میں ان کو طاؤس العلما (علما کے طاؤس) اور "طاؤس العباد" (عابدوں کے مور) جیسے القاب سے یاد فرمایا ہے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ آپؒ کی ذات سے بہت زیادہ کرامات منقول نہیں ہیں اور آپؒ خود اپنے مریدوں سے فرماتے تھے: "تو استقامت کا طلبگار بن، اور کرامت کا طالب نہ بن، کیونکہ بے شک اللہ تعالیٰ تجھ سے استقامت کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے "پس تو استقامت اختیار کر جس طرح تجھے حکم دیا گیا ہے، جبکہ نفس امارہ تجھ سے کرامت کا مطالبہ کرتا ہے۔"

آپؒ فرماتے تھے، "تم اگر کسی شخص کو ہوا میں چوکڑی مارے بیٹھا دیکھو تو بھی اس کی طرف توجہ نہ دو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ وہ شخص کتاب وسنت کا پابند ہے یا نہیں۔"

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ کرامات کی کثرت عظمت کی علامت نہیں ہوتی۔ آپؒ فرماتے ہیں، "حضرت جنیدؒ ولایت میں اس قدر بلند مرتبے پر ہیں کہ "سید الطائفہ" کہلاتے ہیں اس کے باوجود آپؒ سے دس کرامتیں بھی منقول نہیں۔ کرامات ظاہرہ سے زیادہ بڑی کرامت درحقیقت استقامت ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں یہ نعمت نصیب ہو۔"

حضرت جنیدؒ تمام عمر نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے مومنانہ فریضے کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ اللہ کے دین کی نعمت سے

Marfat.com

ہر غیر مسلم کو سرفراز کرنے کے لیے وہ ہمیشہ بے چین رہتے تھے۔ آپؒ خود فرماتے ہیں، "ایک بار میں نے ایک یہودی کو دیکھا جو نہایت خوبصورت تھا۔ میں نے دعا کی، پروردگار جس طرح تو نے اسے دنیا میں خوبصورت بنایا ہے، اسی طرح اس کی عاقبت بھی سنور جائے۔" تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "مجھے کلمۂ شہادت کی تلقین فرمایئے۔" میں نے اسے کلمہ پڑھایا، وہ مسلمان ہو گیا اور پھر اسے اسلام سے ایسا عشق ہوا کہ وہ ولی اللہ بن گیا۔"

سید الطائفہ حضرت جنیدؒ کی ذات گرامی طویل عرصے تک ایک خلقت کے لیے علم کا سرچشمہ بنی رہی۔ ۹۰ یا ۹۱ برس کی عمر میں آپؒ علیل ہو گئے۔ اس حال میں بھی آپؒ نے اپنے محبوب رب کی خدمت میں حاضری سے محروم ہونا گوارا نہ کیا۔ نمازیں پڑھتے اور سجدے کرتے تھے۔ منہ پر ورم آ گیا تھا۔ لیکن تکیہ پر سجدہ کرتے ہوئے نمازیں ادا کرتے رہتے تھے۔ کسی نے کہا کہ ایسی حالت میں آپ نماز ترک نہیں کر سکتے؟" آپ نے فرمایا کہ "اسی نماز کے ذریعے تو میں اللہ تک پہنچا ہوں، اس کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" آپؒ کی زبان مبارک پر قرآن کریم کی آیات جاری تھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے آپؒ نے پورا قرآن مجید ختم کر لیا۔ پھر ابتدا سے تلاوت شروع کر دی۔ جب آپؒ سورہ بقرہ کی سترویں آیت پر پہنچے تو اللہ نے اپنے محبوب بندے کو اپنے پاس بلا لیا۔

خیال ہے کہ آپؒ کا انتقال شوال ۲۹۷ھ یا ۲۹۸ھ (جون ۹۱۰ء یا ۹۱۱ء) میں ہوا۔ آپؒ کی وصیت کے مطابق آپؒ کے شاگرد، حضرت ابو محمد جریریؒ نے آپؒ کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔ آپؒ کے صاحبزادے حضرت قاسمؒ نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اس کے بعد آپؒ کو شونیزیہ کے قبرستان میں مغربی جانب، آپؒ کے ماموں اور قابل احترام استاد حضرت سری سقطیؒ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

***

Marfat.com

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ نے برِ صغیر میں اسلام کا نور پھیلانے کی عظیم خدمت انجام دی

رات کا وقت تھا۔

ہر سُو تیرگی کا راج تھا البتہ اندھیرے کی دبیز چادر کو چیرتی ہوئی اِکا دُکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔

خراسان جانے والے راستے پر وہ ایک خانقاہ تھی جس کے نچلے کمرے میں ایک مسافر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس مسافر نے موٹے اور کھردرے ٹاٹ کی ایک گدڑی پہن رکھی تھی۔ اس کا کُل سامان ایک عصا اور کُوزے پر مشتمل تھا۔

خانقاہ کے اوپری حصے میں چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس حصے سے تازہ اور اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ یقیناً وہ لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نچلے کمرے میں ٹھہرے ہوئے مسافر کو ان لوگوں نے محض ایک سوکھی روٹی دے دی تھی۔ وہ لوگ اس مسافر کے بارے میں طنزیہ گفتگو بھی کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ "یہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

اوپری حصے میں بیٹھے ہوئے لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے خربوزے کاٹ کر کھانے شروع کر دیے۔ اس وقت بھی انہوں نے یہ پسند نہ کیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عطا کردہ اس نعمت میں اس مسافر کو بھی شریک کر لیں، انہوں نے مزید ستم یہ کیا کہ خربوزے کے چھلکے اس مسافر پر پھینکنے شروع کر دیے۔

مسافر نے اس "مہمان نوازی" کا ہرگز برا نہ مانا۔ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کرتا جاتا تھا اور اس توہین و بدسلوکی کو برداشت کرتا جاتا تھا۔

اس مسافر نے بعد میں ایک عظیم کتاب تصنیف کی جس میں اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد لکھا: "اس طعن و ملامت کا بوجھ اٹھانے کی وجہ سے میری ایک مشکل حل ہو گئی جس کے لیے میں مجاہدے کر رہا تھا اور سفر کی مشقت اٹھا رہا تھا۔"

یہ مسافر تھے عظمت و معرفت کے آسمان کے ماہِ درخشاں حضرت سید علی ہجویریؒ جنہیں دنیا "داتا گنج بخش" کے نام سے جانتی ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی روشنی پھیلانے اور گمراہ مسلمانوں کو راہِ راست دکھانے کی عظیم خدمت انجام دی۔ آپؒ علوم دین و فقہ کے ماہر اور سچے، پکے اور باعمل انسان تھے۔ آپؒ نے پوری زندگی شریعت کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزاری اور یہ واضح کر دکھایا کہ جو شے ضروری ہے وہ محض پھٹے پرانے کپڑے پہن لینا اور درویشوں کی سی وضع قطع بنا لینا نہیں ہے بلکہ دل میں اپنے خالق و مالک کی یاد بسی ہونی چاہیے اور انسان کے تمام اعمال اس مالک اور اس کے بھیجے ہوئے پیارے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہونے چاہئیں۔

آپؒ کا نام علی اور کنیت ابوالحسن ہے لیکن آپ "داتا گنج بخش" کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپؒ کے والد کا نام عثمان ہے، چنانچہ آپؒ نے خود اپنا تعارف اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" میں اس طرح کروایا ہے: "قال، علی بن عثمان علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کے دادا کا نام بھی علی ہی تھا۔ آپؒ نے خود کو غزنی، جلاب اور ہجویر سے منسوب کیا ہے۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں وضاحت کی ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ دراصل غزنیں، (غزنی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ جلاب اور ہجویر اس شہر کے محلوں میں سے دو محلے ہیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں۔ آپؒ کی والدہ محترمہ کی قبر غزنیں میں ہے۔ آپؒ کی پیدائش ہجویر میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے تاہم بیشتر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ آپؒ

Marfat.com

کی پیدائش ۴۰۰ھ / ۱۰-۱۰۰۹ء میں ہوئی۔ آپؒ کا قیام ہجویر اور جلاّب دونوں میں رہا۔ آپؒ کے والد جلاّب میں رہا کرتے تھے۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت زیدؒ کے واسطے سے سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا کر مل جاتا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ کی پیدائش جس زمانے میں ہوئی، سلطنتِ غزنی پر محمود غزنوی حکمران تھے اور یہ سلطنتِ غزنی کے عروج کا زمانہ تھا۔ حضرت علی ہجویریؒ ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور آپؒ کا خاندان صوفیا کا خاندان تھا، چنانچہ آپؒ کے ماموں کا لقب "تاج الاولیا" تھا۔ آپؒ کے ماموں کی عزت و شہرت کا اندازہ یوں لگائیں کہ جس محلے میں آپؒ کے ماموں کی تدفین ہوئی وہ بھی "تاج الاولیا" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ حضرت علی ہجویریؒ کے والدین کی تدفین بھی اسی قبرستان میں ہوئی جہاں آپؒ کے ماموں کو سپردِ خاک کیا گیا تھا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ کے عہد میں تدریسی نظام اس طور کا تھا کہ علم حاصل کرنے کے خواہش مند مختلف اہلِ علم ہستیوں کے پاس حاضر ہوتے اور ان سے فیض پاتے۔ حضرت علی ہجویریؒ نے بھی حصولِ علم کے لیے فرداً فرداً مختلف ذی علم شخصیات کی خدمت میں حاضری دی، دُور دُور کے سفر کیے اور اس راہ کی صعوبتوں کی کوئی پروانہ کی۔ اس غرض سے آپؒ نے شام و عراق، ماوراًالنہر، آذر بائیجان، بسطام، خراسان، کش، کمند، نیشاپور، سرخس، طوس، غزنیں (غزنی)، ہندوستان، رملہ، بخارا، ترکستان اور دیگر متعدد مقامات تک کا سفر کیا اور ہزاروں علماکرام کے علم سے خوشہ چینی کی۔

آپؒ نے اپنے بہت سے بزرگ اساتذہ کا تذکرہ فرمایا ہے اور عزت کے ساتھ ان کے نام لیتے ہوئے ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ آپؒ نے اس طویل سفر میں بڑی تعداد میں علماکرام سے علم حاصل کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود آپ کے کہنے کے مطابق آپؒ خراسان میں ۳۰۰ مشائخ سے ملے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے جن بلند پایہ شیوخ اور عظیم المرتبت محدثین و فقہا سے کسبِ علم کیا، آپؒ نے ان میں سے کئی کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک شیخ ابوالعباس شقانی (الاشقانی) ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ ان کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "اپنے طریق میں شیخ و امام یگانہ، ابوالعباس الاشقانی، فنونِ علم اصول و فروغ میں امام تھے۔ مجھے ان سے بہت اُنس تھا اور انہیں مجھ سے شفقتِ صادق۔ وہ بعض علوم میں میرے استاد تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا آپؒ کی مانند کوئی نہیں دیکھا، نہ آپؒ سے بڑھ کر شریعت کی تعظیم کرنے والا کوئی دیکھا۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے حضرت ابوالعباسؒ الاشقانی کا تذکرہ اپنی کتاب میں پانچ جگہ فرمایا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ کے ایک اور استاد محترم شیخ ابو جعفر محمد المصباح الصیدلانی تھے جن کا تعلق بغداد سے تھا۔ وہ صوفیا کے سرداروں میں سے تھے اور تحقیق میں ان کی زبان بہت عمدہ تھی۔ حضرت علی ہجویریؒ کے ایک استاد شیخ ابوالقاسم علی گرگانیؒ تھے۔ حضرت علی ہجویریؒ نے بعض مشکل مسائل کے حل کے لیے شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے مدد حاصل فرمائی۔ آپؒ اپنے استاد کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ اپنے وقت میں بے مثال تھے۔ وقت کے تمام طالبانِ حق کا آپؒ پر اعتماد تھا۔ علوم و فنون کے ماہر تھے۔ آپؒ کا ہر مرید زیورِ علم سے آراستہ تھا۔ مجھ سے بہت احترام سے پیش آتے تھے اور بہت توجہ سے میری بات سنتے تھے حالاں کہ میں آپؒ کے مقابلے میں نوعمر بچہ تھا۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیریؒ سے بھی فیض حاصل کیا۔ آپؒ کئی رسالوں اور تفسیر لطائف الاشارات کے مصنف تھے۔ حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ: "شیخ ابوالقاسم قشیریؒ اپنے زمانے کے نادر الوجود اور بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ ہر فن میں آپؒ کی تصانیف محققانہ اور عمدہ تھیں۔ آپؒ بے کار صحبتوں اور لغو باتوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔"

حضرت علی ہجویریؒ کے ایک استاد مکرم، ابو عبداللہ محمد بن علیؒ تھے جو داستانی بسطامیؒ کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ: "آپؒ تمام علوم کے عالم تھے۔ بہت نیک خلق تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات لطیف ہیں۔ میں نے ان کی کتاب "معانی انفاس" کے چند حصے ان سے سماعت کیے۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے اپنے ایک استاد محترم ابو سعید فضل اللہ محمد مہینیؒ کے بارے میں لکھا: "آپؒ طریقت کے جمال اور وقت کے صاحبِ دبدبہ بادشاہ تھے۔ ایک زمانہ آپؒ کا گرویدہ تھا۔ ابتدائی تعلیم آپؒ نے سرخس میں حاصل کی۔"

تصوف میں حضرت علی ہجویریؒ نے شیخ ابوالفضلؒ محمد بن الحسن الختلی کو اپنا مرشد قرار دیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ: "شیخ ابوالفضلؒ علم

Marfat.com

تفسیر اور علم حدیث کے بڑے اونچے پائے کے عالم تھے۔ وہ تصوف میں مذہبِ جنید" (حضرت جنید" بغدادی) کے پیرو تھے۔" حضرت علی ہجویریؒ کے مطابق شیخ الختلیؒ نے ساٹھ برس تک گمنامی کی زندگی بسر کی۔ وہ فرماتے تھے: "دنیا صرف ایک دن ہے اور ہم اس دن کا روزہ رکھے ہوئے ہیں۔" یعنی اس دنیا سے کوئی حصہ نہیں لیتے اور اس کے جال میں نہیں پھنستے کیوں کہ اس کی آفت ہم اچھی طرح دیکھ چکے ہیں اور اس کے پردوں سے واقف ہیں، اس لیے ہم اس سے دور ہٹ گئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل ختلیؒ کا وطن دریائے جیحوں کا بالائی علاقہ ختلان تھا لیکن آپؒ جبل لکام کے گاؤں بیت الجن میں جا کر رہنے لگے تھے جو اس کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔

حضرت علی ہجویریؒ نے جن دس معاصر صوفیا کرام کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے چھ سے براہِ راست استفادہ کیا۔ ان میں شیخ ابو احمد المظفر بن احمد بن حمدانؒ بھی ہیں۔ شیخ خواجہ احمد حمادی سرخسیؒ بھی، شیخ ابو عبداللہ محمد بن علیم حکیم ترمذیؒ بھی ہیں جن سے حضرت علی ہجویریؒ کو بے حد عقیدت تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ آپؒ نے کئی صوفیا کرام کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے چند کے نام اور ان کے بارے میں حضرت علی ہجویریؒ کے تاثرات قوسین میں دیے جاتے ہیں: شیخ محمد ذکی بن العلاؒ (زمانے کے سردار اور محبت کا شعلہ)، شیخ القاسم سوسیؒ (پیر مجاہد)، شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہؒ (توحید میں روشن بیاں)، شیخ ابو اسحاق بن شہریارؒ (صاحب دبدبہ)، شیخ ابو عبداللہ جنیدیؒ (بڑے احترام والے)، شیخ ابو طاہر مکشوفؒ (جلیل القدر بزرگ)، خواجہ ابو جعفر محمد بن علی الجوینیؒ (محقق بزرگ)۔

حضرت علی ہجویریؒ لاہور کب تشریف لائے، اس سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں۔ اس ضمن میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید حضرت میر حسن علا سجزیؒ نے آپؒ کے ملفوظات (ارشادات) پر مبنی کتاب "فوائد الفواد" میں یہ روایت نقل کی ہے:

"کچھ بات مزارِ لاہور کے متعلق چلی۔ آپؒ نے (حضرت نظام الدین اولیاؒ نے) فرمایا: "وہاں بہت سے بزرگ مدفون ہیں۔ پھر آپؒ نے پوچھا۔ تم نے لاہور دیکھا ہے؟ بندے نے جواب دیا، جی، میں نے دیکھا ہے اور بعض بزرگوں کی زیارت بھی کی ہے، جیسے شیخ حسین زنجانیؒ اور دیگر اولیا۔ آپؒ نے فرمایا: "شیخ حسین زنجانیؒ اور حضرت علی ہجویریؒ دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے۔ ان کے پیر نے حضرت علی ہجویریؒ سے فرمایا: تم لاہور جا کر رہو۔ جب حضرت علی ہجویریؒ اس حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو اگلی صبح شیخ حسین زنجانیؒ انتقال کر گئے"۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ اپنے شیخ طریقت حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن ختلیؒ کے پاس دمشق کے نواح میں ایک بستی بیت الجن میں موجود تھے۔ حضرت محمد بن الحسنؒ کا وقت آخر آیا تو حضرت علی ہجویریؒ ان کے قریب تھے۔ انتقال سے قبل شیخ ختلیؒ نے آپؒ کو لاہور جانے کی ہدایت کی۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ سلطان مسعود غزنوی کی فوجوں کے ساتھ لاہور آئے۔ دوسری روایت کے مطابق آپؒ صرف دو بزرگوں، شیخ احمد حمادی سرخسیؒ اور حضرت ابوسعید ہجویریؒ کے ساتھ لاہور تشریف لائے۔ حضرت ابوسعید ہجویریؒ کے سوالات کے جواب میں آپؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "کشف المحجوب" تصنیف فرمائی۔

بعض دیگر محققین نے ان روایات کی صحت کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اول تو حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں اپنے کسی ایسے پیر بھائی کا ذکر نہیں فرمایا جن کا اسم گرامی شیخ حسین زنجانیؒ ہو۔ دوسرے یہ روایات بھی ہیں کہ شیخ حسین زنجانیؒ کی تاریخ وفات ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء یا ۶۰۴ھ/ ۱۲۰۷-۸ء تھی اور اس وقت تک حضرت علی ہجویریؒ وفات پا چکے تھے۔ بعض اشارے ایسے ملتے ہیں کہ آپ کم از کم ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸-۴۹ء یا اس کے قریب کے زمانے میں لاہور میں موجود تھے۔ مثلاً آپؒ نے شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کو مرحوم لکھا ہے۔ شیخ ابوسعیدؒ کی وفات شعبان ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء میں ہوئی تھی اور کشف المحجوب حضرت علی ہجویریؒ نے لاہور میں تصنیف فرمائی۔ پھر ہمیں کشف المحجوب ہی سے یہ علم ہوتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کے شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلیؒ کی رحلت بیت الجن (دمشق کے قریبی گاؤں) میں ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷-۶۸ء میں ہوئی۔

اس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ اپنے شیخ کی وفات سے بہت پہلے لاہور آ چکے تھے۔ سلطان مسعود کی فوجوں نے پانچویں صدی ہجری کی تیسری دہائی کے آخر میں ملتان، ہانسی، لاہور وغیرہ پر حملے کیے اور اسی زمانے میں لاہور پر مسعود غزنوی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے کہ آپؒ ان ہی فوجوں کے ساتھ لاہور آئے ہوں۔

Marfat.com

حضرت علی ہجویریؒ کو داتا گنج بخش کا خطاب کیسے ملا؟ اس سلسلے میں ایک روایت یہ ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء میں آپؒ کے مزار پر آئے اور وظیفہ مکمل کیا تو واپس ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اس کے بعد لوگ حضرت علی ہجویریؒ کو "گنج بخش" کہنے لگے اور عقیدت مندوں نے اس میں لفظ داتا کا اضافہ کر دیا، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لوگ حضرت علی ہجویریؒ کو ان کی زندگی میں ہی "گنج بخش" کہا کرتے تھے کیوں کہ آپؒ بہت سخی اور فیاض تھے۔ اس کی شہادت خود آپؒ کی تصنیف "کشف الاسرار" سے ملتی ہے جس میں آپؒ نے فرمایا: "اے علی، خلقت تجھے "گنج بخش" کہتی ہے حالاں کہ تیرے پاس ایک حبہ بھی نہیں، اس بات کو اپنے دل میں جگہ مت دے کیوں کہ یہ پندار و غرور کی بات ہے۔ گنج بخش اور رنج بخش ذاتِ حق ہی ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؒ اپنے لیے اس لقب کو پسند نہ فرماتے تھے اور آپؒ کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ آپؒ خود کو خبردار کرتے تھے کہ لوگوں کے کہنے سے خود کو گنج بخش نہ سمجھنے لگنا اور نہ اس پر غرور کرنا کیوں کہ دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کی ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ شریعت و فقہ کا بڑا علم رکھتے تھے۔ آپؒ نے صوفیا کرام کو فقہ کی تعلیم بھی دی ہے۔ فقہ میں آپؒ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی پیروی فرماتے تھے۔ ملحدوں اور دیگر بے دین فرقوں کے خلاف آپؒ نے لسانی جہاد فرمایا ہے۔ آپؒ کو خلیفۂ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو تو آپؒ طریقت کا امام مانتے ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ نے بعض اوقات کسی مسئلے پر مناظرہ بھی فرمایا ہے۔ جب آپؒ نے لاہور میں سکونت فرمائی تو یہاں علم کی ترویج اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا۔ آپؒ کی کوششوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام قبول کرنے لگے اور عام مسلمانوں کے طرزِ حیات اور معمولات میں اسلامی رنگ جھلکنے لگا۔ لوگ دین کی طرف مائل ہونے لگے۔ آپؒ دین کی تبلیغ کے سلسلے میں سفر بھی فرمایا کرتے تھے چنانچہ آپؒ نے برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ فرمائی۔ آپؒ نے "کشف المحجوب" میں ایک جگہ فرمایا کہ:

"مجھے یہ دقت پیش آ رہی ہے کہ میری کتابیں غزنی میں ہیں اور میں ہندوستان کے ایک گاؤں بھنور میں ہوں جو ملتان کے گرد و نواح میں واقع ہے۔"

ایک بار غزنی میں ایک عالم نے لباس میں پیوند لگانے کو بدعت قرار دیا۔ حضرت علی ہجویریؒ نے فرمایا: "ریشم اور زری کے کپڑے جو بادشاہوں سے تم عاجزی سے درخواست کر کے مانگ لاتے ہو انہیں تو جائز سمجھتے ہو اور حلال ذرائع سے حاصل کیے ہوئے لباس کو پہننا بدعت قرار دیتے ہو۔"

حضرت علی ہجویریؒ جب لاہور تشریف لائے تو آپ کی دل نشین تلقین سے متاثر ہو کر پنجاب کے نائب حاکم رائے راجو بھی مسلمان ہو گئے، ان کا نام شیخ ہندی رکھا گیا۔ رائے راجو بڑی بااثر شخصیت کے مالک تھے۔ والیِ کابل و غزنوی سلطان مودود غزنوی کی طرف سے پنجاب کے نائب حاکم تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علی ہجویریؒ نے لاہور میں ایک مسجد بھی قائم کی تھی۔ یہ مسجد اس جگہ کے قریب واقع تھی جہاں آپؒ مدفون ہیں۔

حضرت علی ہجویریؒ نہایت باعمل مسلمان تھے۔ آپؒ دل کی پاکیزگی اور باطنی صفائی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ظاہری وضع قطع درویشوں کی سی بنا لینا اور اعمال کا شریعت کے مطابق نہ ہونا، آپؒ کو ناپسند تھا۔ شریعت کی پابندی کے سلسلے میں آپؒ کی احتیاط اور کوشش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؒ نے علمِ دین کے حصول اور تبلیغ کے سلسلے میں چالیس برس سفر فرمایا لیکن اس پورے سفر کے دوران آپؒ نے نمازیں ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں۔ جمعہ کی نماز کے لیے آپؒ ہمیشہ کسی قصبے میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نماز کی باجماعت ادائیگی کو کتنی اہمیت دیا کرتے تھے اور اسلام نے مل کر رہنے اور ایک نظم و ضبط کے تحت عبادت کرنے اور دیگر معمولات انجام دینے کی جو تاکید کی ہے اس کا آپؒ کو کتنا گہرا فہم تھا۔

حضرت علی ہجویریؒ کے نزدیک لفظ "صوفی" "صفا" سے نکلا ہے۔ "صفا" کی اصل یہ ہے کہ دل غیر اللہ اور دنیا کی یاد سے خالی ہو جائے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے جڑ جائے۔ یعنی اخلاص اور سچی محبت

Marfat.com

کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بندگی کی راہ اختیار کی جائے۔ آپؒ فرماتے ہیں: "طالب کو تمام احوال میں شرع اور علم کا پیرو ہونا چاہیے کیوں کہ سلطانِ علم سلطانِ حال پر غالب اور اس سے افضل ہے۔" آپؒ کا قول ہے: "جب دین، جو اصل ہے، مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس کی شاخ ہے، کس طرح مفید ہو سکتا ہے؟"

اس کے ساتھ ساتھ آپؒ سادگی اور قناعت کو بھی پسند فرماتے تھے۔ آپؒ حصولِ علم کے لیے سفر پیدل فرماتے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ: "مجھے اپنی سیاحتوں میں سب سے زیادہ اذیت اور رنج اس بات سے ہوتا ہے کہ خادم (خانقاہ سے) مجھے کبھی کسی زمیندار کے گھر لے جاتے تھے اور کبھی کسی اور کے پاس ٹھہرا دیتے تھے۔"

آپ نے سفر کے دوران اکثر سادہ اور معمولی لباس ہی زیب تن فرمایا لیکن آپ نے اچھا لباس بھی پہنا ہے۔ جب آپؒ عراق میں مقیم تھے تو بہت خوشحال تھے اور ضرورت مندوں کی ہر طرح مدد کرتے تھے حتیٰ کہ آپؒ خود قرض دار ہو گئے تھے۔

نکاح کے بارے میں حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں: "جو شخص مخلوق میں رہنا چاہے، اس کے لیے نکاح کرنا شرط ہے۔ اور اگر بغیر نکاح کے اس کے گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے نکاح فرض ہے، لیکن جو شخص مخلوق سے الگ تھلگ رہتا ہو اس کے لیے مجرد رہنا اچھا ہے تاکہ اس کی وجہ سے کوئی نیک بخت پریشان نہ ہو۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے شادی کی یا نہیں؟ اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے آپؒ نے شادی نہیں فرمائی، دوسرے یہ کہ آپؒ نے دوبار شادی فرمائی لیکن دونوں بار آپؒ کی شادی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ پہلی روایت کے حق میں آپؒ کی وہ تحریر پیش کی جاتی ہے جس میں آپؒ نے شادی نہ کرنے اور مجرد رہنے کے خطرات کو واضح فرمایا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں: "اللہ تبارک وتعالیٰ عزوجل نے گیارہ برس تک شادی کی آفت سے بچایا لیکن اس فتنے میں مبتلا ہونا مقدر میں لکھا تھا۔ میں ایک پری صفت کو دیکھے بغیر اس کی صفات سن کر دل وجان سے اس کا گرویدہ ہو گیا اور ایک سال تک اس میں مستغرق رہا۔ قریب یہ کہ میرا دین تباہ و برباد ہو جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کمال لطف و مہربانی سے میرے دل پر عصمت و پاکیزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے اس آفت سے نجات بخشی۔"

آپؒ کی شادی اگر ہوئی تو کوئی اولاد تھی یا نہیں، اس بارے میں بھی تاریخ نے سکوت اختیار کیا ہوا ہے۔ آپؒ اپنی کنیت ابو الحسن لکھتے ضرور تھے لیکن اس کی شہادت نہیں ملتی کہ حسن نام کے آپؒ کے کوئی صاحب زادے تھے۔ بہر حال مسلمانوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اولاد کے بغیر بھی کنیت اختیار کر لی گئی ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں لیکن ان کی صرف ایک کتاب "کشف المحجوب" دستیاب ہے۔ دیگر کم از کم آٹھ کتابوں کا ذکر مؤرخین نے کیا ہے۔ ان کی تفصیل دی جاتی ہے:

۱۔ **دیوانِ شعر:** حضرت علی ہجویریؒ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ آپؒ نے متعدد اچھے عربی اشعار کا اپنی کتاب کشف المحجوب میں حوالہ دیا ہے۔ آپؒ نے "دیوانِ شعر" کے عنوان سے اپنا دیوان مرتب کیا، لیکن ایک بدنیت شخص نے یہ دیوان آپؒ سے عاریتہً مانگا اور پھر اسے اپنی ذات سے منسوب کر ڈالا۔ اس کا تذکرہ آپؒ یوں فرماتے ہیں: "کسی نے مجھ سے میرے اشعار کا دیوان دیکھنے کے لیے مانگا اور پھر واپس نہ کیا۔ اسے اپنے نام سے پیش کر دیا۔ چونکہ دیوان کا یہی ایک نسخہ تھا جو وہ لے گیا، اس لیے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس نے میری محنت کو برباد کر دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے۔"

۲۔ **منہاج الدین:** حضرت علی ہجویریؒ نے یہ کتاب تصوف کے متعلق تصنیف فرمائی جس میں آپؒ نے اصحابِؓ صفہ کے مناقب تفصیل سے درج فرمائے۔ لیکن اس کتاب کے ساتھ بھی وہی صورت ہوئی کہ ایک شخص نے یہ کتاب آپؒ سے مانگی اور اس پر سے آپؒ کا نام مٹا کر اسے اپنے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

۳۔ **کتاب فنا و بقا:** حضرت علی ہجویریؒ نے یہ کتاب فقر کے موضوع پر تصنیف فرمائی۔

۴۔ **اسرار الخرق و المؤنات:** یہ کتاب درویشانہ لباس کے بارے میں لکھی گئی۔

۵۔ **الرعایۃ بحقوق (لحقوق) اللہ تعالیٰ:** اس کتاب میں حضرت علی ہجویریؒ نے توحید کے دلائل کو یکجا کر دیا۔

۶۔ **کتاب البیان لاھل العیان:** ۷۔ **نحو القلوب یا**

Marfat.com

بحرالقلوب: ان دونوں کتابوں میں جمع و تفریق کے مسائل بیان کیے گئے۔

۸۔ کتاب الایمان: اس کتاب میں آپؒ نے ایمان کے مباحث درج فرمائے۔

حضرت علی ہجویریؒ کی شاہکار کتاب "کشف المحجوب" ہے۔ یہ فارسی زبان میں علم تصوف کی پہلی کتاب ہے اور اس علم کی بنیادی کتب میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب گزشتہ کئی صدیوں سے معرفت اور دانائی کے موتی بکھیر رہی ہے اور تشنگانِ راہِ حق کی پیاس بجھا رہی ہے۔ سید حضرت علی ہجویریؒ یہ کتاب نے فارسی زبان میں تصنیف کی، بعد ازاں اس کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق اس وقت قلمی نسخوں میں قدیم ترین نسخہ ساتویں صدی ہجری کا ہے جو محمد شفیع لاہوری کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہے۔

انگلستان میں پروفیسر نکلسن نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے مخطوطوں کی مدد سے ۱۹۱۱ء میں کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ کیا۔ روس میں پروفیسر ژوکوفسکی نے، وی آنا، تاشقند اور لینن گراڈ کے چند قدیم مخطوطوں کی مدد سے ایک نسخہ شائع کیا جو ۱۹۲۶ء میں لینن گراڈ میں طبع ہوا۔ ڈاکٹر محمد باقر کا دعویٰ ہے کہ مولوی محمد شفیع لاہوری کے کتب خانے میں جس قلمی نسخے کو ساتویں ہجری کا بتایا گیا ہے وہ دراصل گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ سمرقند سے بھی "کشفال المحجوب" کا ایک نسخہ شائع ہوا جسے ملا سید عبدالمجید مفتی نے شوال ۱۳۳۰ھ / اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا۔

کشف المحجوب وہ کتاب ہے جس کی عظمت کا اعتراف صوفیائے عظام نے ہر دور میں کیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں:

"جس شخص کا کوئی مرشد نہ ہو، اسے "کشف المحجوب" کے مطالعے سے مل جائے گا۔" مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے الفاظ میں:

"کشف المحجوب اس فن کی مشہور اور معتبر کتاب ہے۔"

حضرت علی ہجویریؒ نے اس کتاب کا نام "کشف المحجوب" کیوں رکھا؟ اس بارے میں آپؒ خود فرماتے ہیں: "میں نے اس کتاب کا نام کشف المحجوب اس وجہ سے رکھا ہے کہ کتاب کا نام اس کے مضامین پر دلالت کرے اور اصحابِ علم کتاب کا نام سن کر یہ سمجھ لیں کہ یہ کتاب کس فن سے متعلق ہے، نیز چوں کہ یہ کتاب اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے کا بیان اور بشریت کے حجاب دور کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے، اس لیے "کشف المحجوب" سے بہتر اس کے لیے کوئی نام نہیں ہو سکتا تھا۔"

بعض روایات کے مطابق کشف المحجوب کا مکمل نام "کشف المحجوب لارباب القلوب" ہے۔ یہ کتاب حضرت علی ہجویریؒ نے اپنے رفیق محترم ابوسعید ہجویریؒ کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائی۔ کتاب کی حیثیت محض مجموعہ حکایات و روایات کی نہیں بلکہ یہ ایک مستند محققانہ تصنیف ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ نے اس کتاب میں قرآن کریم کی ۲۳۴ آیات کریمہ، ۱۳۴ احادیث نبویؐ، مشائخ کے ۳۰۰ اقوال اور عربی اشعار درج کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز تمہید سے ہوتا ہے۔ پھر پہلے باب میں علم کی اہمیت، فضائل اور اقسام کا احوال ہے۔ دوسرے باب میں فقر و مسکنت کے فضائل اور تیسرے باب میں تصوف کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ بعد کے ابواب میں خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اہل بیتؓ، اہل اللہؒ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، متاخرین، صوفیائے متاخرین اور پھر معاصر صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ ۱۵ویں باب سے ۲۵ویں باب تک "کشف حجابات" کے عنوان سے معرفتِ الٰہی، توحید، ایمان، ارکان اسلام، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، فلسفۂ ازدواج، مسئلہ سماع پر بڑی عالمانہ لیکن بہت دل نشین اور سلیس انداز میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اولیاءاللہؒ کے واقعات اور ان کے اقوال کو بھی بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ سماع کے قائل تھے لیکن آپؒ کے نزدیک سماع کی بہترین صورت سماعِ آیاتِ قرآنی ہے۔ آپؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب کے آخری باب "آداب السماع" میں سماع کے لیے مندرجہ ذیل سخت شرائط عائد کی ہیں:

۱۔ خواہ مخواہ ارادہ کر کے سماع نہ سنے۔ طبیعت کو جب از خود رغبت ہو تو اس وقت سنے۔ ۲۔ بہت کثرت سے سماع نہ سنے کہ طبیعت اس کی عادی ہو جائے۔ بلکہ کبھی کبھی سنے تاکہ ہیبتِ سماع دل پر قائم رہے۔ ۳۔ محفل سماع میں ایک مرشد یا پیر طریقت موجود رہے۔ ۴۔ محفل میں عوام شریک نہ ہوں۔ ۵۔ سماع پیش کرنے والا پاک باز ہو، فاسق نہ ہو۔ ۶۔ قلب مکروہاتِ دنیاوی سے خالی ہو۔ ۷۔ طبیعت لہو ولعب کی طرف آمادہ نہ ہو۔ ۸۔ کسی قسم کا تکلف نہ کیا جائے۔

حضرت علی ہجویریؒ سماع کو کیا حیثیت دیتے تھے یہ بات ان کے

Marfat.com

اپنے بیان کردہ ایک واقعہ سے واضح ہوتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

"ایک زمانے میں، میں مرو میں تھا۔ ایک دن وہاں کے مشہور ترین امام اہل حدیث نے مجھ سے کہا کہ میں نے سماع کے جواز پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے کہا، یہ تو بڑا غضب ہوا کہ حضرت امام نے ایک ایسی لہو کو حلال کر دیا جو ہر فسق کی جڑ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم سماع کو حلال نہیں سمجھتے تو خود کیوں سنتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ اس کا حکم مختلف حالات پر منحصر ہے۔ اگر سماع سے دل میں تاثر حلال پیدا ہوتا ہو تو سماع حلال ہے۔ اگر حرام پیدا ہوتا ہو، تو حرام ہے، اگر مباح پیدا ہو تو مباح ہے۔ ایسی شے جس کی ظاہر پر حکم فسق کا ہو اور جس کا باطن مختلف احوال کا تابع ہو، کوئی ایک قطعی حکم لگا دینا محال ہے۔"

حضرت علی ہجویریؒ کی تاریخ وفات کا معاملہ بھی الجھا ہوا ہے۔ بیشتر مؤرخین نے آپؒ کا سنہ وفات ۴۶۵ھ / ۷۳-۱۰۷۲ء درج کیا ہے، لیکن خود حضرت علی ہجویریؒ نے بہت سے ایسے ہم عصر اولیا اور بزرگوں کا تذکرہ اپنی کتاب کشف المحجوب میں کیا ہے، جن کے بارے میں یہ بات متفقہ ہے کہ وہ ۴۶۵ھ کے بعد بھی بقید حیات تھے مثلاً حضرت ابو القاسم قشیریؒ (وفات: ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء حضرت ابو الحسین سالبہؒ (وفات:۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء) حضرت ابو علی فارمدیؒ (وفات: ۴۷۷ھ/۱۰۸۴ء) خواجہ عبداللہ انصاریؒ (وفات ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء)

حضرت علیؒ ہجویری کے مزار پر البتہ آپؒ کا سنہ وفات ۴۶۵ھ درج ہے اور مندرجہ بالا شواہد کے پیش نظر یہ سنہ وفات محل نظر ہے۔

حضرت علی ہجویریؒ کا مقبرہ ایک روایت کے مطابق سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی کے پوتے (مسعود غزنوی کے بیٹے) سلطان ابراہیم غزنوی نے تعمیر کروایا۔ ان کے دو بیٹے سیف الدولہ محمود اور علاؤالدولہ مسعود ۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء تک لاہور میں صوبہ دار رہے تھے۔ حضرت علی ہجویریؒ کا مزار لاہور شہر میں بھاٹی دروازے کے باہر واقع ہے۔ بعد ازاں آپؒ کی خانقاہ اور مسجد کی تعمیر و مرمت کا کام ہوتا رہا۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ/۱۵۵۵ء تا ۱۶۰۵ء) نے خانقاہ کا فرش اور ڈیوڑھی تعمیر کروائی۔ احاطۂ مزار کے اندر حضرت علی ہجویریؒ کے کئی مریدوں کی قبریں بھی موجود ہیں۔

***

Marfat.com

سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ کی اصلاحی تحریک نے لاکھوں افراد کو خیر و فلاح کی راہ دکھائی

دن بھر کا تھکا ہارا سورج مغرب میں رُوپوش ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

پرندے اپنے آشیانوں کی سمت پرواز کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا قافلہ حِلّہ کے قصبے میں آکر رُکا۔ شاید قافلے کو اس قصبے میں رات بھر ٹھہرنا تھا۔ قصبے کا ایک شخص قافلے کے قریب سے گزرا تو قافلے میں شامل ایک بزرگ نے اسے بلایا۔ گندمی رنگ، سرمگیں آنکھوں اور کشادہ سینے والے نورانی صورت بزرگ نے اس سے پوچھا: "اس قصبے میں سب سے زیادہ نادار اور محتاج کون ہے؟"

"اس قصبے میں؟" وہ شخص سوچ میں پڑ گیا۔ "ہاں ایک بوڑھا ہے جو اپنی بوڑھی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا ہے، اس کی کٹیا کا پتا میں آپ کو بتاتا ہوں۔" پھر اس نے کٹیا کا پتا بتایا۔

بزرگ کے اشارے پر قافلہ حرکت میں آگیا اور بوڑھے کی کٹیا تک پہنچ گیا۔ کٹیا بہت بوسیدہ تھی۔ اس کی دیواریں گر چکی تھیں اور ان کی جگہ پھٹے پرانے کمبل لٹک رہے تھے۔ آپؒ نے بوڑھے کو بلایا اور اس کے مکان میں ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔

بوڑھا حیرت زدہ رہ گیا۔ قصبے کے خوبصورت اور سجے سجائے مکانات چھوڑ کر یہ بزرگ اس بدنما کٹیا میں کیوں قیام فرمانا چاہتے ہیں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، بہرحال بوڑھے نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بزرگ اور ان کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہا۔

بزرگ کو بوڑھے کی کٹیا میں بیٹھے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ کٹیا کے باہر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سب لوگ بزرگ کی آمد کی خبر سن کر یہاں جمع ہو گئے تھے، ہر ایک بزرگ کا دیدار کرنے کے لیے بے چین تھا۔ بزرگ نے سب کو شرفِ باریابی بخشا۔ جو بھی آتا اپنے ساتھ لائے ہوئے مویشی، سونا، چاندی، غلہ اور دیگر تحائف پیش کرتا۔ بزرگ یہ تمام تحائف اپنے بوڑھے میزبان کے حوالے کرتے جاتے۔ یہ سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔

دوسرے دن بزرگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کی منزل حجازِ مقدس تھی، جہاں انہیں فریضۂ حج کی ادائیگی کرنا تھی۔ بوڑھا اب حِلّہ کا سب سے نادار اور محتاج شخص نہیں رہا تھا، بلکہ اس کا شمار قصبے کے متمول ترین افراد میں ہونے لگا تھا۔ اس کی زبوں حالی اور عُسرت کے دن گزر چکے تھے۔ اور آرام و آسائش سے بھرپور لحات اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

حِلّہ کے مفلوک الحال بوڑھے کو تنگی و ترشی کی زندگی سے نجات دلانے والے یہ بزرگ تھے حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو غوث الاعظمؒ اور تاج العارفینؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپؒ امتِ مسلمہ کے عظیم مصلح اور محسن ہیں۔ آپؒ ہی کی مساعی جمیلہ اور زبردست جدوجہد کے نتیجے میں گمراہی کے اندھیرے چھٹ گئے اور ایک انبوہِ کثیر نے فلاح کا راستہ پایا۔ مسلمانوں کو عقائد کی خرابیوں اور بدعملی سے نجات دلانے اور دین کو سربلند کرنے کے لیے آپؒ نے جو کردار ادا کیا وہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

آپؒ کا نام عبدالقادر اور لقب محی الدین ہے۔ آپؒ کی پیدائش گیلان کی ایک بستی نیف میں عمل میں آئی۔ گیلان کا علاقہ موجودہ شمالی ایران میں بحیرۂ خزر (بحیرۂ کیسپیئن) کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ گیلان کا تلفظ اہل عرب نے جیلان کیا ہے۔ اسی نسبت سے آپؒ جیلانی مشہور ہوئے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس دور میں اس دنیا میں قدم رکھا، جب یورپ کی عیسائی حکومتیں مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے

Marfat.com

کے در پے تھیں اور صلیبی جنگوں کے لیے پر تول رہی تھیں۔ خود مسلمانوں کی طاقت منقسم ہو رہی تھی، ان کے عقائد کو کمزور کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ دین میں نئی باتوں کو رواج دینے کا چلن عام تھا۔ سیاسی اور فکری اعتبار سے مسلمان ضعف کا شکار ہو گئے تھے اور بے یقینی اور بد عملی نے انہیں اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

مشیتِ ایزدی یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور انہیں فکری اور عملی اعتبار سے ایک بار پھر بلندیوں پر فائز کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی شخصیت نمودار ہو۔ قدرت نے تاج العارفین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی صورت میں امتِ مسلمہ کو ایک عظیم مصلح عطا فرمایا۔ آپؒ کی آمد کی خبر حضرت جنید بغدادیؒ نے بہت پہلے دے دی تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا دور آپؒ سے دو سو برس پہلے کا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے غیب سے اشارہ ہوا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے آخر میں ایک عظیم بزرگ تشریف لائیں گے۔ ان کا نام عبدالقادرؒ ہوگا، جیلان میں ان کی ولادت ہوگی۔" دیگر کئی بزرگوں نے بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی آمد کی پیش گوئی کی۔

امتِ مسلمہ کو شیخ الاسلام حضرت عبدالقادر جیلانیؒ جیسا جلیل القدر بزرگ عطا کرنے کی غرض سے قدرت نے دو سعید روحوں کا ملاپ کروایا۔ یعنی اس دور کے عظیم صوفی اور ولی حضرت سید عبداللہ صومعیؒ کی پاکباز صاحبزادی حضرت امّ الخیر فاطمہؒ کو ایک بڑے عابد و زاہد نوجوان حضرت سید ابو صالح موسیٰؒ کی زوجیت نصیب ہوئی، جس کے نتیجے میں باری تعالیٰ نے انہیں یکم رمضان ۴۷۰ھ / مارچ ۱۰۷۸ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ حضرت ابو صالح موسیٰؒ اور حضرت ام الخیر فاطمہؒ نے اپنے جگر گوشے کا نام عبدالقادر رکھا، کنیت ابو محمد قرار پائی۔

عبدالقادرؒ کی زندگی کی اٹھان ہی کچھ اور طرح کی تھی۔ دوسرے بچے کھیلتے کودتے شور مچاتے لیکن آپؒ کو کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ آپؒ کبھی کوئی کم عقلی کی بات فرماتے تھے۔ دوسرے بچوں کے برعکس آپؒ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے۔

آپؒ کم سن ہی تھے کہ والد گرامی سید ابو صالح کا انتقال ہو گیا۔ آپؒ کے نانا حضرت سید عبداللہ صومعیؒ نے آپؒ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ آپؒ پانچ برس کے ہوئے تو والدہ ماجدہ نے جیلان کے مدرسہ میں داخل کروا دیا۔ ابھی آپؒ مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے کہ آپؒ کے نانا کا سایہ بھی آپؒ کے سر سے اٹھ گیا۔ اب آپؒ اور آپؒ کے ایک چھوٹے بھائی کی پرورش اور تربیت کی تمام تر ذمہ داری والدہ محترمہ حضرت امّ الخیر فاطمہؒ پر آپڑی۔ انہوں نے یہ فریضہ بڑی محنت سے ادا فرمایا۔

عبدالقادرؒ اٹھارہ برس کے ہوئے تو آپؒ نے اپنی والدہ محترمہ سے علم کے حصول کے لیے بغداد جانے کی اجازت مانگی۔ والدہ تو دل سے چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا علم کی رفعتیں پائے، لیکن بغداد، جیلان سے چار سو میل دور تھا اور آج سے تقریباً نو سو برس قبل ذرائع آمد و رفت نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ یہ سفر کسی مشکل کے بغیر چند گھنٹوں میں طے کیا جا سکے۔ اس سفر میں صحراؤں اور بیابانوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا، جہاں ڈاکوؤں کے ٹولے قافلوں کی تاک میں رہتے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت ام الخیر فاطمہؒ نے اپنے پیارے بیٹے کو پُرنم آنکھوں کے ساتھ اجازت دے دی کہ وہ بغداد جا سکتے ہیں۔ والدِ مرحوم کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں اسّی دینار موجود تھے۔ حضرت ام الخیر فاطمہؒ نے چالیس دینار حضرت عبدالقادرؒ کے چھوٹے بھائی کے لیے رکھ چھوڑے اور چالیس دینار حضرت عبدالقادرؒ کی گدڑی میں بغل کے نیچے سی دیے۔ جب عبدالقادرؒ سفر پر روانہ ہونے لگے تو والدہ نے نصیحت کی:

"ہمیشہ سچ بولنا اور جھوٹ کے نزدیک بھی نہ پھٹکنا۔"

والدہ کی اس نصیحت کو عبدالقادرؒ نے دل میں بٹھا لیا اور حضرت ام الخیر فاطمہؒ کی یہی نصیحت ڈاکوؤں کے ایک پورے گروہ کو راہِ راست پر لانے کا سبب بن گئی۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے اس لیے ہم اسے اختصار سے بیان کریں گے۔ عبدالقادرؒ جس قافلے کے ساتھ بغداد روانہ ہوئے وہ ہمدان کے مشہور شہر تک تو خیریت سے پہنچ گیا لیکن اس سے آگے ترنک کے سنسان پہاڑی علاقے میں ساٹھ ڈاکو اس قافلے کے منتظر تھے۔

ڈاکوؤں نے قافلے کا سارا مال و اسباب لوٹ کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ عبدالقادر کو لڑکا سمجھ کر کسی نے ان پر خاص توجہ نہ دی۔ یوں ہی ایک ڈاکو نے آپؒ سے پوچھ لیا: "لڑکے تمہارے پاس بھی کچھ ہے؟" آپؒ نے اطمینان سے کہا "ہاں چالیس دینار ہیں۔" ڈاکو نے اس بات کو مذاق سمجھا اور آگے چلا گیا۔ پھر دوسرے ڈاکو نے بھی یہی سوال کیا تو اسے بھی پہلے جیسا جواب ملا۔ اس بات کی خبر ڈاکوؤں کے سردار احمد بدوی کو ملی۔ اس نے عبدالقادر کی تلاشی لی تو واقعی بغل کے نیچے گدڑی میں سلے ہوئے چالیس دینار نکل آئے۔ سردار نے پوچھا کہ تم نے دینار چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کی اور سچ سچ کیوں بتا دیا؟ آپؒ کا جواب تھا: "میری والدہ محترمہ نے گھر سے روانہ ہوتے وقت مجھے نصیحت کی تھی کہ

Marfat.com

ہمیشہ سچ بولنا۔"

احمد بدوی نے یہ جواب سنا تو اس کا دل لرز گیا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، وہ روتے ہوئے بولا: "لڑکے، تم نے اپنی ماں سے کیے ہوئے عہد کا اتنا پاس رکھا اور میں اتنے برس سے اپنے خالق سے کیا ہوا عہد توڑ رہا ہوں۔" پھر احمد بدوی نے تمام برے کاموں سے توبہ کر لی۔ اس کی پیروی میں پورے گروہ کے ڈاکوؤں نے بھی برے کاموں سے بچنے کا عہد کر لیا۔ روایت ہے کہ یہ تمام ڈاکو اس توبہ کے بعد بہت نیک اور دین دار زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔ "یہ پہلی توبہ تھی جو گمراہ لوگوں نے میرے ہاتھوں پر کی۔"

۴۸۸ھ / ۱۰۹۵ء میں قافلہ بغداد پہنچ گیا۔ بغداد اس زمانے میں عالم اسلام کا مرکز تھا۔ علمی اور فنی اعتبار سے اس شہر کا درجہ بہت بلند تھا اور غیر اسلامی دنیا میں بھی اسے بہت عزت اور توقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بغداد پہنچ کر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے چند ہی دنوں بعد جامعہ نظامیہ میں داخلہ لے لیا، یہ اعلیٰ پائے کا مدرسہ تھا۔ آپؒ نے اس دور کے متعدد علما کرام سے علم حاصل کیا۔ آپؒ نے قرآن پاک حفظ کیا۔ قرأت سیکھی، تفسیر قرآن، حدیث، فقہ، لغت، شریعت، طریقت اور علم و ادب کی تعلیم جید اساتذہ سے حاصل کی۔ ان اساتذہ میں ابو الوفا علی بن عقیل البغدادیؒ بھی ہیں جنہوں نے آپؒ کو فقہ کی تعلیم دی۔ قاضی ابو سعید المخرّمیؒ بھی جو فقہ اور اصولِ فقہ میں آپؒ کے شیخ طریقت بھی تھے، پھر علم حدیث میں ابو محمد جعفر السراجؒ، ابو بکر احمد بن المظفرؒ، ابو غالب محمد بن الحسن الباقلانیؒ اور دیگر اساتذہ نے آپؒ کو تعلیم دی۔ نحو، لغت اور ادب کے امام ابو زکریا یحییٰ بن علی بن الخطیب التبریزیؒ (جامعہ نظامیہ میں شعبۂ ادب اور کتب خانے کے نگراں) سے حضرت عبدالقادرؒ نے عربی زبان اور ادب کی تعلیم حاصل کی جس کے نتیجے میں آپؒ کو عربی زبان پر بڑی قدرت حاصل ہو گئی اور آپؒ کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ خطابت کا جوہر پیدا ہو گیا۔ علم طریقت کی تعلیم آپؒ نے شیخ حماد بن مسلم الدبّاسؒ سے حاصل کی۔

آٹھ سال تک علم کے دریاؤں سے سیراب ہونے کے بعد آپؒ نے تزکیۂ نفس کی غرض سے عبادت و ریاضت کی طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت آپؒ کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ اس عمر میں امنگیں جوان ہوتی ہیں اور انسان دلفریب باتوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے لیکن عبدالقادر جیلانیؒ کا قلب علم کی روشنی سے منور تھا، اس میں اپنے خالق کی محبت جاگزیں ہو چکی تھی۔ آپؒ مجاہدے اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپؒ کا مقصد دنیا کو ترک کر کے راہبانہ زندگی بسر کرنے کا ہرگز نہ تھا بلکہ آپ معرفت نفس اور معرفتِ الٰہی چاہتے تھے۔ ۴۹۶ھ سے ۵۲۱ھ کا دور آپؒ نے ریاضت اور عبادت میں گزارا۔

آپؒ خود فرماتے ہیں کہ اس دوران میں شیاطین نے کئی طرح سے بہکانے کی کوشش کی لیکن اللہ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا۔ ایک بار میں صحرا میں تھا۔ دیکھا کہ ایک عظیم روشنی نمودار ہوئی جس میں سے ایک صورت جھلکنے لگی۔ اس صورت نے مجھ سے کہا: "اے عبدالقادر، میں تیرا رب ہوں، میں نے تیرے لیے تمام حرام چیزیں حلال کر دی ہیں۔" میں نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھ کر اسے دھتکار دیا تو وہ روشنی فوراً تاریکی سے بدل گئی اور صورت دھواں بن گئی۔ اس دھوئیں سے آواز آئی "اے عبدالقادرؒ، اللہ نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے میرے مکر سے بچا لیا۔" میں نے فوراً کہا "بے شک یہ میرے مولا کا کرم ہے۔" یعنی شیطان یہ چاہتا تھا کہ آپؒ اپنے علم اور تفقہ کے گھمنڈ میں مبتلا ہو جائیں لیکن ربِ ذوالجلال کے کرم سے اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔

آپؒ نے پچیس سال ریاضت اور مجاہدے میں بسر کیے، پھر آپؒ حضرت قاضی ابو سعید مبارک المخرمیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ۱۶ شوال ۵۲۱ھ / اکتوبر ۱۱۲۷ء کو آپؒ کو دن میں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی جو فرما رہے تھے، اے عبدالقادرؒ تم لوگوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وعظ و نصیحت کیوں نہیں کرتے؟

یہ خواب دیکھنا تھا کہ آپؒ تڑپ اٹھے۔ بیدار ہو کر ظہر کی نماز ادا کی اور وعظ کے لیے بیٹھ گئے۔ آپؒ کی تقریر تھی کہ بہتا ہوا دریا تھا۔ آپؒ کی زبانِ مبارک سے نکلتے ہوئے الفاظ تھے کہ موتی، جو ایک لڑی میں پرو دیے گئے تھے، ہر گہر آبدار! لوگ آپؒ کی فصاحت اور بلاغت سے بے حد متاثر ہوئے۔ آپؒ نے ایک طرف تو باطل کی قوت پر اپنے خطبات کے ذریعے کاری ضرب لگائی دوسری طرف اپنے درس، فتووں اور تبلیغی نظام کی مدد سے مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے اور اپنے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے پر آمادہ کرنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

ابتداء میں آپؒ نے اپنے شیخ ابو سعید مخرمیؒ کے مدرسے میں درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت جلد آپؒ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ پھر تو

Marfat.com

آپؒ کے درس کے وقت نہ صرف مدرسہ بھر جاتا بلکہ لوگ اطراف کی سڑکوں پر بھی بیٹھ جاتے۔ مدرسے کی عمارت کو ناکافی دیکھ کر ۵۲۸ھ میں قرب وجوار کے مکانات کو بھی مدرسے میں شامل کر دیا گیا۔ اس غرض سے مخیر حضرات نے مالی امداد دی اور جو مال سے مدد نہ کر سکتا تھا اس نے مدرسے کے تعمیراتی کام میں رضاکارانہ حصہ لیا۔ مدرسے کی عمارت توسیع کے بعد بھی حاضرین کے لیے تنگ محسوس ہوئی تو شیخ کی مجلس وعظ شہر سے باہر عید گاہ بغداد کے کھلے احاطے میں منعقد کی جانے لگی۔ آپؒ کے ارشادات سننے کے لیے ہزاروں افراد دور دور سے آتے تھے۔ بہت سے لوگ گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور ان سواروں کی صفیں مجلس کے ارد گرد فصیل کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ حاضرین کی تعداد ستر ہزار اور اس سے بھی زائد ہو جاتی تھی۔

آپؒ کے درس کو سیکڑوں افراد لکھتے بھی جاتے تھے۔ ایک وقت میں چار سو دواتیں شمار کی گئی تھیں۔ آپؒ ہفتے میں تین دن وعظ فرماتے تھے۔ ان وعظوں کا سلسلہ پورے چالیس برس، یعنی ۵۲۱ھ سے ۵۶۱ھ (۱۱۲۷ سے ۱۱۶۶ء) تک، یعنی آپؒ کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے تک جاری رہا۔ وعظ میں بڑے بڑے علما کرام بھی شریک ہوتے۔ بہت سے غیر مسلم افراد نے بھی ان وعظوں میں شرکت کی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی پُر اثر تقریر سے ان کے دل موم ہو جاتے اور ان کی زبانوں پر کلمۂ شہادت جاری ہو جاتا۔ ہر مجلس کے بعد اسلام قبول کرنے والوں اور گناہوں سے توبہ کرنے والوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ خود شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں: "میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد عیسائی اور یہودی مسلمان ہو چکے ہیں اور ایک لاکھ سے زائد بدکار اور فاسق وفاجر لوگ توبہ کر چکے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے مدرسے میں تیرہ علوم وفنون کی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان میں تفسیر، حدیث، فقہ حنبلی، فقہ مع اختلاف المذاہب، اصولِ فقہ اور نحو کے مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نمازِ ظہر کے بعد قرآن مجید کی تجوید اور قرأت کا درس دیا جاتا تھا اور صبح وشام تفسیر وحدیث اور دیگر علوم پڑھنے والے طلبہ آتے تھے۔ مدرسے میں آپؒ کے چند صاحبزادے بھی تعلیم دیتے تھے۔ آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے صاحبزادوں نے اس مدرسے کو قائم رکھا۔

آپؒ کے تلامذہ میں شیخ ابو محمد عبداللہ بن ابو الحسن الجبائیؒ، ابو سعید السمعانیؒ، شیخ عمر بن مسعود البزازیؒ، شیخ عبدالمنعم بن علی الحرانیؒ اور دیگر بہت سے علما کرام شامل ہیں۔ آپؒ کے صاحبزادوں، پوتوں اور نواسوں نے بھی آپؒ کے علم بیکراں سے استفادہ کیا۔ مدرسے میں ایک وقت میں ۶۰۰ طلبہ زیر تعلیم تھے جن میں ہرات، حجاز، یمن، شام اور مصر کے طلبہ بھی تھے۔

آپؒ کے مدرسے میں فتویٰ نویسی کا مستقل شعبہ قائم تھا۔ محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس شعبے کے بھی نگراں تھے۔ دور دور سے استفتا (مسائل) موصول ہوتے اور آپؒ ان پر فتوے جاری کر دیتے تھے۔ آپؒ کے علم کی وسعت اور ذہنی چابکدستی کا یہ عالم تھا کہ مسئلہ پڑھتے ہی فتویٰ تحریر فرما دیتے تھے۔ کوئی بھی استفتا آپؒ کے پاس رات بھر بھی نہیں رہا۔ ایک بار آپؒ کے پاس ایک مسئلہ آیا جو عراق کے بہت سے علما کے سامنے پیش ہوا تھا لیکن شافی جواب نہ مل سکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص نے غصے میں قسم کھا لی کہ اگر وہ کوئی ایسی عبادت نہ کر سکا جو اس وقت رُوئے زمین پر کوئی نہ کر رہا ہو تو اس کی بیوی کو تین طلاق ہوں۔ غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ شخص پریشان تھا۔ تاج العارفین حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپؒ نے فوراً فرمایا: "یہ شخص مکہ مکرمہ چلا جائے، مطاف اس کے لیے خالی کروایا جائے اور وہ تنہا طواف کرے۔" یہ فتویٰ ملتے ہی وہ شخص مکہ مکرمہ روانہ ہو گیا۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے درس وموعظت کو محض بغداد میں اپنے مدرسے تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ ایک باقاعدہ وسیع تبلیغی نظام قائم کیا۔ آپؒ کے شاگرد، مرید، خلفا اور خدام چاروں طرف دنیا بھر میں پھیل گئے اور انہوں نے اپنی تبلیغ سے ہزاروں افراد کو نیکی کا راستہ دکھایا۔ آپؒ اپنے خلفا اور شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ آپؒ کی کوششوں سے کئی شہروں میں مستقل تبلیغی مدارس قائم ہو گئے۔ ۵۴۱ھ میں آپؒ کے تبلیغی مدارس موصل، حلب، دمشق، تبریز، ہمدان، طوس، بسطام، کوفہ اور الطیف میں کام کر رہے تھے۔

شیخ جب بھی کسی مرید یا خادم کو دعوتِ دین کی ذمے داری سونپ کر کسی خاص علاقے کی طرف روانہ کرتے تو آپؒ اسے ہدایات فرماتے: "حکام اور امرا کی ملازمت نہ کرنا، کسی امیر سے وظیفہ قبول نہ کرنا، ہر کام میں اللہ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا، کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا دامن مضبوطی سے پکڑنا، سادہ زندگی کو شعار بنانا، غرور وتکبر کے نزدیک نہ پھٹکنا، تبلیغ حق کی راہ میں کسی مصیبت یا رکاوٹ سے

Marfat.com

دل برداشتہ نہ ہونا، غیر مسلموں سے رواداری کا برتاؤ کرنا، دنیاوی عزت اور نمود و نمائش سے پرہیز کرنا۔"

آپؒ نے جن لوگوں کو خلافت کی سند دی یا داعیِ حق بنایا وہ نہ صرف اعلیٰ درجے کے خطیب تھے بلکہ اپنے اعمال کے لحاظ سے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی ہدایات پر سختی سے عمل کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ بالعموم پیدل سفر کرتے تھے اور کوچہ کوچہ اسلام کی دعوت عام کرتے جاتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ بے حد قدروقیمت کا حامل ہے۔ آپؒ نے شریعت، طریقت، تصوف اور دیگر موضوعات پر کئی کتابیں تحریر فرمائی ہیں، ان میں "غنیۃ الطالبین" مشہور ہے، کیونکہ اس کا تعلق مسلمانوں کی روز مرہ زندگی کے مسائل سے ہے۔ دراصل اس کتاب کا نام "الغنیۃ لطالبی طریق الحق" ہے، کیونکہ شیخؒ نے اس کتاب کا یہی نام رکھا تھا۔ اس کتاب میں شریعتِ اسلامی کے ارکان کی تفصیل اور فقہی مسائل، انفرادی اور مجلسی زندگی کے آداب، نیکی کا حکم دینے کی شرائط اور دیگر بہت سے مفید مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کا عربی سے اردو اور فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

'فتوح الغیب' علم تصوف کے موضوع پر آپؒ کے ۷۸ مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کا بھی فارسی اور اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ 'بشائر الخیرات' میں حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کے لیے متعدد عبارات مرتب کی گئی ہیں۔ آپؒ کی دیگر تصنیفات اور تالیفات میں الفتح الربانی، الفیوضات الربانیہ فی الاوراد القادریہ، تحفۃ المتقین و سبیل العارفین، حزب الرجاوالانتہا، الرسالۃ الغوثیہ، یواقیت الحکم، معراج لطیف المعانی وغیرہ شامل ہیں۔ آپؒ نے ۱۴ قصائد تحریر فرمائے، ایک مناجات ہے جو چہل کاف کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مفتی طرابلس (شام) کے کتب خانے میں قرآن مجید کی ایک عمدہ تفسیر کا قلمی نسخہ موجود ہے اور یہ تفسیر بھی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تحریر کردہ ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ درس و موعظت اور دین کی سربلندی اور مسلمانوں کو گمراہی سے بچا کر ان کا اصل فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یاد دلانے کی جدوجہد میں اپنی عمر کے آخری لمحات تک مصروف رہے۔ ۵۶۱ھ میں جب آپؒ کی عمر ۹۰ سال سے زائد ہو چکی تھی، آپؒ صاحبِ فراش ہو گئے۔ علالت طویل ہو گئی اور ربیع الثانی کے شروع میں اس نے شدت اختیار کر لی۔ وصال سے کچھ دیر قبل آپؒ نے اپنے صاحبزادے شیخ عبدالوہابؒ کی خواہش پر انہیں کئی نصیحتیں کیں پھر غسل فرمایا۔ نماز عشا ادا کی۔ دیر تک سجدہ ریز رہے اور پوری امتِ مسلمہ کے لیے دعائیں مانگتے رہے: "اے اللہ محمد ﷺ کی امت کو بخش دے۔ اے اللہ محمد ﷺ کی امت پر رحم فرما۔" پھر اپنے بستر پر لیٹ گئے، چند کلمات ارشاد فرما کر آپؒ کی زبان مبارک سے نکلا "اللہ، اللہ، اللہ" پھر آپؒ کی آواز پست ہو گئی اور آپؒ ۱۰ ربیع الآخر ۵۶۱ھ / ۱۳ فروری ۱۱۶۶ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

آپؒ کے وصال کی خبر پھیلی تو لوگ روتے ہوئے بیتابی کے ساتھ آپؒ کی قیام گاہ کی طرف دوڑے۔ ہر آنکھ پُرنم تھی اور ہر فرد گریہ کناں تھا۔ جنازے اور تدفین میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ آپؒ کو بغداد میں سپرد خاک کیا گیا۔ بعد ازاں ۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء میں عثمانی فرمانروا سلیمان اول نے آپؒ کے مزار پر خوبصورت گنبد تعمیر کروایا۔ آپؒ کے مرقد کی زیارت کرنے کے لیے مسلمان آج بھی جاتے ہیں۔

پیرِ طریقت حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی نہایت دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔ آپؒ کی زندگی کا ہر گوشہ اور ہر لمحہ اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آپؒ کے بلند اوصاف اور اعلیٰ اخلاق کا ہر کوئی گرویدہ تھا۔ آپؒ نے اپنے حسنِ سلوک اور شفقت آمیز رویے کی بدولت ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔

حضرت شیخ حرّادہؒ فرماتے ہیں: "میں نے اپنی زندگی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑھ کر کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب، محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔" شیخ سعدیؒ آپؒ کے عجز و انکسار کے بارے میں گلستان میں لکھتے ہیں: "شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو لوگوں نے دیکھا کہ حرم کعبہ میں کنکریوں پر سر رکھے ہوئے تھے اور کہتے جاتے تھے "اے خداوند کریم مجھے بخش دے اور اگر میں سزا کا مستحق ہوں تو روزِ محشر مجھے اندھا اٹھانا تاکہ میں نیکیوں کے آگے شرمسار نہ ہوں۔"

آپؒ حد درجہ منکسر المزاج تھے۔ کوئی بچہ بھی مخاطب ہوتا تو، توجہ سے اس کی بات سنتے، خود بازار جا کر سودا خرید لاتے، اگر آپؒ کی اہلیہ علیل ہوتیں تو خود آٹا پیستے، گوندھتے، روٹی پکاتے اور بچوں کو کھلاتے۔ پانی کا گھڑا کندھے پر رکھ کر اکثر کنوئیں سے پانی بھر لاتے۔ سفر میں خود کھانا پکاتے اور ساتھیوں کو اس میں شریک کرتے۔ ایک بار گلی

Marfat.com

میں بچے کھیل رہے تھے، آپؒ کا اس گلی سے گزر ہوا تو ایک بچے نے آپؒ کو روک کر مٹھائی کی فرمائش کی، آپؒ فوراً بازار گئے اور مٹھائی لا کر بچوں میں تقسیم کر دی۔

بلاضرورت گفتگو آپؒ کو پسند نہ تھی۔ احکام خداوندی کی خلاف ورزی پر آپؒ فوراً ٹوک دیا کرتے تھے۔ اپنی ذات کے لیے کبھی ناراض نہ ہوتے تھے۔ گھر پر سائل آتے تو کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے۔ کئی ضرورت مند راستے میں روک لیتے، آپؒ ان کی مدد فرماتے۔ آپؒ کا حکم تھا کہ رات کو وسیع دستر خوان بچھایا جائے۔ آپؒ خود بھی مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ عقیدت مند اور شاگرد تحائف پیش کرتے تو فوراً مساکین میں بانٹ دیتے۔ آپؒ خود فرماتے تھے: "غریبوں کو کھانا کھلا کر مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگر دنیا میرے ہاتھ میں ہوتی تو سب کی سب بھوکوں کو کھانا کھلانے پر صرف کر دیتا۔"

آپؒ مریضوں کی عیادت ضرور فرماتے تھے۔ روزانہ ملنے والوں میں کوئی شخص کسی دن نہ آتا تو بے چین ہو جاتے اور اس کی خیریت دریافت فرماتے۔ اگر وہ بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے تھے۔ آپؒ کو دوسروں کے عیوب بیان کرنا پسند نہ تھا، فرماتے تھے "اگر برائی کا بدلہ برائی سے دیا جائے تو یہ دنیا خونخوار درندوں کا گھر بن جائے۔"

شیخؒ کا لباس بہت قیمتی ہوتا تھا لیکن آپؒ کوئی لباس ایک دن سے زیادہ استعمال نہیں فرماتے تھے اور اپنا لباس مساکین اور ناداروں کو دے دیا کرتے تھے۔ ایک بار آپؒ نے اپنے ایک مرید شیخ علی ابن نصرہ المنتہی کے مرید شیخ علی ابن ادریس یعقوبیؒ کو اپنی قمیض پہنا دی اور فرمایا: "علی تم نے تندرستی کی قمیض پہن لی۔" علیؒ فرماتے ہیں کہ اس قمیض کو پہن کر میں پھر کبھی بیمار نہ ہوا۔

آپؒ کو خوشبو بہت پسند تھی۔ محتاجوں اور غربا کے لیے آپؒ کے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ ان کے لیے آپؒ کا دستر خوان بہت وسیع تھا لیکن آپؒ کی اپنی خوراک بہت سادہ تھی۔ مرغن غذا اور گوشت وغیرہ عام طور پر نہیں کھاتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی عمدہ اور پُر تکلف کھانا بھی قبول فرما لیتے تھے۔

آپؒ اکثر روزے سے رہا کرتے تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ رات کے ابتدائی حصے میں کچھ دیر کے لیے آرام کرتے پھر بیدار ہو کر عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔

تاج العارفین حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے جس قدر کرامات منسوب ہیں غالباً اور کسی ولی سے نہیں ہیں۔ رب کائنات نے آپؒ کو غیر معمولی طاقت عطا فرمائی تھی۔ ایک بار ایک شخص اصفہان سے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میری بیوی کو اکثر مرگی کے دورے پڑتے ہیں، علاج کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔ آپؒ نے فرمایا، تمہاری بیوی کو مرگی نہیں ہے بلکہ سر اندیپ کا ایک شریر جن تمہاری بیوی کو ستاتا ہے۔ تم گھر جاؤ اور جب تمہاری بیوی کو دورہ پڑے تو تم اس کے کان میں کہہ دینا "عبدالقادرؒ جو بغداد میں رہتے ہیں تم سے کہتے ہیں کہ پھر نہ آنا ورنہ مارے جاؤ گے۔" اس شخص نے گھر جا کر ایسا ہی کیا۔ دس سال بعد وہ شخص پھر حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ شیخؒ کے کہنے پر عمل کرنے کے بعد بیوی کو کبھی دورہ نہیں پڑا۔

خلیفہ المستنجد باللہ کا ایک رشتہ دار استقا کے مرض (ایک مرض جس میں پیاس بہت لگتی ہے) میں مبتلا ہو گیا۔ علاج کیا گیا مگر شفا نہ ہوئی۔ بالآخر اسے آپؒ کے پاس لایا گیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی اور پیٹ پھولا ہوا تھا۔ آپؒ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا، اللہ کے کرم سے وہ فوراً شفایاب ہو گیا۔

ایک دن شیخ ابو حفص عمر بن صالح حدادیؒ اپنی اونٹنی لے کر آپؒ کے پاس آئے اور کہنے لگے "میرا حج پر جانے کا ارادہ ہے لیکن میری اونٹنی بہت کمزور ہے۔ میرے پاس کوئی اور سواری نہیں ہے۔" آپؒ نے یہ سن کر اپنا ہاتھ اونٹنی کی پیشانی پر رکھا اور اپنے پیر سے اسے ٹھوکر لگائی۔ شیخ ابو حفصؒ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے وہ اونٹنی صبا رفتار ہو گئی۔

آپؒ کے ایک رفیق شیخ علی ابن نصر الہیتیؒ علیل تھے اور شیخ ابوالمظفر اسمٰعیلؒ کے باغ میں مقیم تھے۔ آپؒ ان کی عیادت کے لیے باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں کھجور کے دو خشک درخت تھے جن پر چار سال سے پھل نہیں آ رہا تھا۔ آپؒ نے ایک درخت کے نیچے وضو کیا اور دوسرے کے نیچے نماز ادا فرمائی۔ جلد ہی دونوں درخت ہرے بھرے ہو گئے اور پھل دینے لگے۔

ایک بار آپؒ وعظ فرما رہے تھے۔ لوگوں میں سے بعض آپؒ کے کلام کی طرف متوجہ نہ تھے، آپؒ نے فرمایا "تم میرے کلام پر دھیان نہیں دے رہے ہو، اگر اللہ چاہے تو میری تقریر سننے کے لیے سبز پرندوں کو بھیج دے۔" یہ کہنا تھا کہ سبز پرندوں کے غول نمودار ہوئے اور مجلس میں آ کر بیٹھ گئے۔

Marfat.com

آپؒ کے ایک شاگرد مظفر حرمیؒ فرماتے ہیں: "ایک رات میں مدرسے میں سو گیا تاکہ صبح سویرے مجلس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے قریب بیٹھ سکوں۔ گرمی کی وجہ سے میں چھت پر چلا گیا، وہیں آپؒ کا کمرہ بھی تھا۔ جب میں لیٹ گیا تو کھجور کھانے کی خواہش نے دل میں جنم لیا۔ اسی وقت حضرتؒ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی اور میرا نام لے کر فرمایا: "لو بھئی یہ کھجوریں کھالو، اب تو تمہاری خواہش پوری ہو گئی۔"

آپؒ کی کرامات بے شمار ہیں لیکن آپؒ کی سب سے بڑی کرامت، احیائے دین، یعنی دین کو زندہ کرنا ہے۔ اسی لیے آپؒ کو محی الدین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ کسی بھی جگہ ہوتے، احیائے دین کی بات فرماتے تھے۔ آپؒ کو بخوبی احساس تھا کہ مسلمان صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور دنیا اور آخرت میں ان کے سرخرو ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے اور انہیں اس کام کے لیے تیار کیا جائے جس کے لیے انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ یعنی نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا۔ حضرت علامہ ابوالحسن علی ندوی کے مطابق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اللہ نے جو دردمندی اور سوزِ دل عطا فرمایا تھا اس کا اندازہ ان کے خطبات اور مواعظ سے لگایا جا سکتا ہے جن میں وہ نہایت آسان، دلنشین اور موثر انداز سے لوگوں کو عمل کی ترغیب دیتے ہیں اور فلاح کی جانب بلاتے ہیں۔ ایک بار آپؒ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ کے دین کی دیواریں گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے۔ اے باشندگانِ زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کر دیں، یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی۔ سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیے۔"

آپؒ کے تبلیغی نظام کا تذکرہ ہم پچھلی سطور میں کر چکے ہیں۔ آپؒ دین کے معاملے میں بہت سخت تھے، فرماتے تھے: "لوگوں کے دلوں پر میل جم گیا ہے۔ جب تک اسے زور سے رگڑا نہیں جائے گا، دور نہ ہو گا۔" ایک بار آپؒ نے فرمایا: "میرا وعظ کے منبر پر بیٹھنا تمہارے قلوب کی اصلاح و تطہیر کے لیے ہے نہ کہ الفاظ کے الٹ پھیر اور تقریر کی خوش نمائی کے لیے۔"

آپؒ کسی کو غلط کام کرتے دیکھتے تو برملا ٹوک دیتے۔ حکمرانوں کے معاملے میں بھی آپؒ بالکل رعایت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار خلیفہ نے ایک ایسے شخص کو بغداد کا قاضی بنا دیا جس کے ظلم کی وجہ سے لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے۔ آپؒ کو علم ہوا تو آپؒ نے خلیفہ سے کہا: "تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو ظالم ہے۔ تم اپنے خالق کو کیا جواب دو گے؟" یہ سن کر خلیفہ اس قدر روئے کہ داڑھی تر ہو گئی۔ انہوں نے اسی وقت قاضی کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ خلیفہ کے نام خطوط میں سخت باتیں لکھا کرتے تھے۔ خلیفہ آپؒ کا ہر خط پڑھ کر کہتے "بے شک شیخ سچ فرماتے ہیں۔ انہوں نے مجھے سیدھی راہ دکھائی۔"

آپؒ نے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے غلط عقائد کی اصلاح فرمائی۔ تصوف کو عام آدمی کے لیے عام فہم بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے خطبات بالکل سلیس ہیں اور ان کا انداز سیدھا سادہ ہے۔ آپؒ نے صوفیوں کی اصطلاحات استعمال کرنے سے بھی گریز کیا ہے اور تصوف سے وابستگی کے دروازے عام آدمی کے لیے کھول دیے ہیں۔ آپؒ نے چالیس برس تک لوگوں میں رہ کر وعظ و تدریس کا کام کیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ تصوف کا مقام لوگوں میں رہ کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کہ تارک الدنیا ہو کر۔

آپؒ کے بعد بھی آپؒ کے خلفا نے دعوت الی اللہ اور تجدید و احیائے دین کا سلسلہ جاری رکھا جو یمن، جاوا، سماٹرا اور ہندوستان میں لاکھوں افراد کے قبولِ اسلام کا باعث بنا۔ آپؒ کے خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے تصوف کو بدعتوں سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاالدین زکریا ملتانیؒ ہیں۔ آپؒ کی بدولت ہندوستان میں ایک خلقت کو اللہ نے ہدایت سے نوازا۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں اسلام کے جو نہایت بلند مرتبت مصلحین ابھرے ان میں ایک امام غزالیؒ اور دوسرے عبدالقادر جیلانیؒ ہیں۔ شیخ عبدالقادرؒ جیلانی نے مسلمانوں کو ذہنی، سیاسی و فکری ضعف اور اضمحلال نیز بے یقینی اور بدعملی کے مرض سے نجات دلائی۔ امتِ مسلمہ کا سر اس احسان کے بار سے ہمیشہ جھکا رہے گا۔

***

Marfat.com

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ کی انتھک جدوجہد سے بتوں کی سرزمین اسلام کا گہوارہ بن گئی

وہ ایک پریشان حال کسان تھا...!

اس کا چہرہ غم سے عبارت تھا۔ وہ ایک بزرگ کی خدمت میں ادب کے ساتھ بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا: "حضرت! دہلی کے سرکاری اہلکاروں نے میرے کھیت ضبط کر لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک حکمرانِ وقت اجازت نہ دیں گے، تمہارے کھیت واپس نہیں کیے جائیں۔ میں پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں آپ سے گزارش ہے کہ میری سفارش فرمائیں۔"

بزرگ کے نورانی چہرے پر شفقت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے دلگیر کسان کو تسلی دی اور فرمایا، "اطمینان رکھو! تمہارے اس کام کے لیے میں خود تمہارے ساتھ دہلی چلوں گا۔"

بزرگ، کسان کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔ بزرگ کی دہلی آمد کی خبر چھپی نہ رہ سکی۔ آپ کے خلفا مرید اور دیگر عام افراد آپ سے فیض اور برکت حاصل کرنے کے لیے آنے لگے۔ حکمرانِ وقت کو بھی اطلاع ملی تو وہ حاضر ہو گئے۔

بزرگ نے کسان کی شکایت بیان کی اور اس کی سفارش فرمائی۔ حاکم وقت نے عرض کی، "اس کام کے لیے آپ نے ناحق زحمت فرمائی۔ اگر آپ اپنے کسی خادم کے ذریعے کہلا بھیجتے تو بھی فوراً تعمیل کرتا۔"

بزرگ نے فرمایا، "مظلوموں کی امداد بھی عبادت میں داخل ہے اس لیے میں خود ہی اس کام کو انجام دینے کے لیے چلا آیا..."

یہ بزرگ تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے ایک معمولی کسان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ازالے کے لیے اجمیر سے دہلی تک کا سفر فرمایا اور حکمرانِ وقت شمس الدین التمش سے اس کسان کی سفارش فرمائی۔

آپؒ امتِ مسلمہ کے محسن ہیں۔ آپؒ کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں برصغیر پاک وہند میں دینِ حق کا اجالا پھیلا اور جس سرزمین پر لوگ بتوں کو پوج رہے تھے، طبقات میں تقسیم تھے اور جاہلانہ رسوم کا شکار تھے، وہاں خدائے واحد کی پرستش ہونے لگی اور اس خطے کو اسلام کی عظیم نعمت میسر آگئی۔

آپؒ کا نام معین الدین اور آپ کے والد محترم کا نام سید غیاث الدین حسن ہے۔ آپؒ کی سوانح رقم کرنے والوں نے آپؒ کا پورا نام حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتیؒ لکھا ہے۔ اجمیر میں ایک طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے آخر میں لفظ "اجمیری" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ آپؒ کو سجزی اس لیے لکھا جاتا ہے کہ آپؒ کی پیدائش ایران کے علاقے سجستان (جو، اب سیستان کہلاتا ہے) کے شہر سجز میں ہوئی۔ بعض مؤرخین کا اصرار ہے کہ یہ لفظ "سنجری" ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے اشعار میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کو "پیر سنجر" کہہ کر مخاطب کیا ہے لیکن بیشتر مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ لفظ سجزی (س ج، ز، ی) ہے۔ عرب جغرافیہ نویس سیستان یا سجستان کو سجز بھی کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اسی علاقے کو خراسان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ آج کل اس کا اکثر حصہ ایران میں ہے اور باقی افغانستان میں۔ اس علاقے کا پایۂ تخت "زرنج" تھا جس کے کھنڈر اب بھی زاہدان کے قریب پائے جاتے ہیں۔

خواجہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ چشتی اس لیے لگایا جاتا ہے کہ آپؒ چشتیہ سلسلے سے منسلک ہیں۔ "چشت" خراسان کے مشہور شہر کا نام ہے۔ وہاں کچھ بزرگوں نے اصلاح و تربیت کا مرکز قائم کیا اور یہ نظام اس شہر کی مناسبت سے "چشتیہ" کہلانے لگا۔ سب سے پہلے جن بزرگ کے نام سے چشتی کا لفظ استعمال کیا گیا وہ حضرت ابو اسحاق شامی تھے جن

Marfat.com

انتقال ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں ہوا۔ وہ اپنے وطن شام سے چل کر بغداد آئے اور حضرت خواجہ ممشاد دینوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ ممشاد دینوریؒ نے خواجہ ابو اسحاقؒ کو تبلیغ دین کے لیے چشت روانہ فرمایا، جہاں جا کر انہوں نے چشتیہ سلسلے کی داغ بیل ڈالی۔ خواجہ معین الدینؒ کا تعلق ساتویں درجے میں جا کر خواجہ ابو اسحاق چشتیؒ سے مل جاتا ہے۔ صوفیائے کرام کا جو سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان پہنچا وہ یہی چشتیہ سلسلہ تھا جسے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ چونکہ غریبوں اور ناداروں کی امداد دل کھول کر فرماتے تھے، اس لیے آپ کو لوگ "خواجہ غریب نواز" کہنے لگے۔

خواجہ صاحبؒ کے سنہ پیدائش کے سلسلے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بیشتر تذکروں میں ان کا سنہ پیدائش ۵۳۵ھ درج کیا گیا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق خواجہ صاحبؒ ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء یا اس کے قریب پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلجوقی حکومت عدم استحکام کا شکار تھی اور گمراہ کن عقائد رکھنے والے زور پکڑ چکے تھے۔ باطنی فرقے سے تعلق رکھنے والوں نے تباہی پھیلا رکھی تھی۔ ان حالات کے باعث خواجہ صاحبؒ کے والد محترم سجز سے خراسان چلے آئے۔ خواجہ صاحبؒ کا بچپن یہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم آپ نے یہیں حاصل کی۔ ۵۴۴ھ میں آپؒ کو مدرسہ نیشاپور میں داخل کروایا گیا۔ یہ اس زمانے میں بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے بعد سب سے بڑا مدرسہ تھا۔

خواجہ صاحبؒ کی عمر پندرہ برس ہوئی تو آپؒ کو والدِ گرامی سے جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ والد کے ترکہ سے آپؒ کو ایک باغ اور ایک پن چکی حاصل ہوئی۔ کچھ عرصے بعد آپؒ کی والدہ محترمہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اب آپؒ کا بیشتر وقت اپنے باغ کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ لیکن قدرت آپ سے محض ایک باغ کو سنوارنے کا نہیں بلکہ اک جہاں کو سنوارنے کا عظیم کام لینا چاہتی تھی۔

ایک دن خواجہ صاحبؒ کے دل کی دنیا بدل گئی۔ وہ باغ جس پر ان کی گزر اوقات تھی، ایک بے حقیقت شے محسوس ہونے لگا اور یہ دنیا جو ان کے لیے پُر کشش اور دلفریب تھی، ایک کمتر اور حقیر چیز لگنے لگی۔ آپؒ نے اپنے قلب کو انوارِ الٰہی سے روشن کرنے کی غرض سے سفر کا ارادہ کر لیا۔ اپنا باغ، پن چکی، مال اسباب فروخت کر ڈالا، جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے فقط زادِ راہ لے لیا اور بقیہ رقم درویشوں اور مساکین میں تقسیم کر ڈالی۔ آپؒ کی منزل سمر قند تھی۔

سمر قند میں خواجہ صاحبؒ نے ایک مدت تک قیام فرمایا، اس عرصے میں آپؒ نے کلام پاک حفظ کیا اور تفسیر حدیث اور فقہ میں مہارت حاصل کی۔ آپؒ حصول علم کے لیے بخارا میں مقیم رہے۔ سمر قند میں آپؒ نے مولانا شرف الدینؒ اور بخارا میں شیخ حسام الدینؒ جیسے عظیم علمائے کرام سے تعلیم حاصل کی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد آپؒ نے باطنی علوم کی طرف توجہ فرمائی اور عراق کی سمت چل پڑے۔

عراق جاتے ہوئے خواجہ صاحبؒ جب خراسان سے گزرے تو نیشاپور کے قریب قصبہ ہرون میں ایک بزرگ حضرت عثمان ہرونیؒ کا بہت چرچا تھا۔ خواجہ صاحبؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ ایک پاکیزہ مجلس تھی جہاں معرفتِ نفس اور معرفتِ الٰہی کی گفتگو رہتی تھی۔

خواجہ صاحبؒ کا دل اس مجلس میں ایسا لگا کہ یہاں آپؒ نے طویل عرصہ گزار دیا۔ پھر آپؒ نے چاہا کہ حضرت عثمان ہرونیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیں۔ آپؒ نے اپنی اس خواہش کا اظہار حضرت عثمان ہرونیؒ کے روبرو کیا، لیکن شیخ نے آپؒ کی لیاقت اور صلاحیتوں سے واقف ہونے کے باوجود آپؒ کو فوراً حلقۂ ارادت میں لینے میں توقف فرمایا اور طویل ریاضت اور سخت مجاہدے کے بعد ہی آپؒ کو بیعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اخبار الاخیار، مونس الارواح اور سفینۃ الاولیا کے مطابق خواجہ صاحب بیس سال تک اپنے شیخ کے ساتھ رہے۔ ان میں سے دس برس شیخ کے ساتھ سفر میں گزرے۔ آپ اپنے شیخ کا حد درجہ ادب فرماتے تھے حتیٰ کہ سفر میں آپؒ اپنے شیخ کو سامانِ سفر اٹھانے نہ دیتے تھے بلکہ سامان خود اپنے سر پر رکھ کر ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ آپؒ نے اپنے شیخ کے ساتھ حج بھی فرمایا۔

اس کے بعد خواجہ صاحبؒ ایک عرصے تک سفر میں رہے، بہت سے اولیاء اللہ اور صوفیا کرام سے ملاقاتیں رہیں اور افکار کا تبادلہ ہوا۔ آپؒ موصل کے قریب سنجار (سنجان) کے قصبے میں حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ سے ملے۔ تقریباً ڈھائی ماہ ان کی صحبت میں گزارا۔ پھر آپؒ قصبہ جیل آئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس زمانے میں یہیں تھے۔ یہ قصبہ کوہ جودی کی وادی میں واقع ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی۔ خواجہ صاحبؒ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ان کے حجرے میں ستاون دن رہے اور آپ کے وسیع علم سے استفادہ کیا۔ یہاں سے خواجہ صاحبؒ بغداد تشریف لائے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے شیخ اور سہروردیہ سلسلہ کے بانی شیخ ضیاالدین

Marfat.com

ابوالنجیب سہروردیؒ سے ملے۔ سیر العارفین میں لکھا ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے خلیفہ شیخ حسام الدین چشتیؒ کے مطابق شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بغداد سے خواجہ صاحبؒ ہمدان آئے۔ یہاں سے تبریز گئے۔ وہاں شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے ملے۔ یہاں سے آپ اصفہان آئے۔ شیخ محمود اصفہانیؒ کی خدمت میں رہے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ وہیں تھے، وہ خواجہ صاحبؒ سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنی دوتائی (جسے اوڑھا کرتے تھے) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو عطا فرمائی۔ حضرت قطب الدین اپنے شیخ کے ساتھ رہے اور بعد ازاں بر صغیر میں وہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جانشین ہوئے۔

خواجہ صاحبؒ علم و معرفت کی کرنیں بکھیرتے اصفہان سے خرقان گئے۔ دو سال تک یہاں مقیم رہے اور لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ پھر استر آباد (ایران کا سرحدی شہر) چلے گئے۔ یہاں سے ہرات اور پھر سبزوار آئے۔ سبزوار میں ان دنوں ایک بے حد دولت مند شخص رہتا تھا جس کا نام یادگار محمد تھا۔ یہ شخص گمراہ کن عقائد رکھتا تھا۔ اس نے شہر کے نزدیک ایک شاندار باغ بنا رکھا تھا۔ خواجہ صاحبؒ اسی باغ میں جا کر ٹھہر گئے۔ نماز ادا کی اور تلاوت میں معروف ہوگئے۔ اسی دوران یادگار کا دل چاہا کہ اپنے باغ میں چل کر تفریح کرے۔ اس کے خدمت گار پہلے ہی پہنچ کر اپنے مالک کے لیے انتظامات اور جھاڑ پونچھ میں لگ گئے۔ خواجہ صاحبؒ کے ساتھ جو درویش تھے انہوں نے خواجہ صاحبؒ کو مشورہ دیا کہ یہاں سے چل کر کہیں اور قیام کیا جائے، لیکن خواجہ صاحبؒ اسی جگہ بیٹھے رہے۔

یادگار کی سواری آئی، وہ باغ میں پہنچا تو درویشوں کو بیٹھا دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ اسی وقت خواجہ صاحبؒ نے اپنی جلالی نظریں یادگار پر ڈالیں۔ نظریں ملنا تھا کہ یادگار کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا، چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ بے حال ہو کر گر پڑا۔ یادگار کے جتنے ملازم تھے ان سب پر دہشت چھاگئی تھی۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنے ساتھی درویش سے کہا کہ اس شخص کے منہ پر حوض سے پانی چھڑکیے۔ درویش نے ایسا ہی کیا۔ یادگار ہوش میں آگیا۔ آپؒ نے پوچھا "تم نے توبہ کی؟" اس نے کہا "میں نے توبہ کی۔" آپؒ نے دریافت فرمایا۔ "تم نے برا عقیدہ چھوڑ دیا؟" اس نے کہا "خدا کی قسم چھوڑ دیا۔" یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہوگیا دوبارہ ہوش میں آیا تو اس نے خواجہ صاحبؒ کے حکم پر وضو کرکے شکرانے کی نماز ادا کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نے اپنا سارا مال، اسباب آپؒ کی خدمت میں پیش کردیا۔ لیکن خواجہ صاحبؒ نے کہا "تم نے جس جس فرد سے کوئی شے ظلم کے ذریعے حاصل کی ہے اسے اس کو واپس لوٹا دو۔" یادگار نے ایسا ہی کیا، اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کردیا۔

خواجہ صاحبؒ سبزوار سے حصار شاداں آئے۔ آپ کے مرید، یادگار ساتھ تھے، ان کو آپ نے حصار شاداں میں مقرر کردیا۔ یادگار یہیں رہے اور اسی شہر میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا مزار اسی شہر میں ہے، یہ شہر بلخ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے اب بلخ کا رخ کیا۔ یہاں سے آپ لاہور تشریف لائے۔ آپؒ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر تشریف لے گئے۔ پھر خواجہ صاحبؒ ملتان چلے گئے۔ یہاں آپؒ نے پانچ سال قیام فرمایا اور ہندوستان کی زبان سیکھی۔ خواجہ صاحبؒ کے اس طرز عمل میں اسلامی تحریک چلانے والوں کے لیے بڑا سبق پنہاں ہے۔ آپؒ بخوبی جانتے تھے کہ کسی بھی زبان کو اجنبی یا غیروں کی زبان سمجھ کر نہ سیکھنا یا تعصبات کے حصار میں مقید رہنا، بے حد نامناسب بات ہے۔ آپؒ درسِ حق کا جو پیغام بر صغیر کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے اس کے لیے یہاں کی زبان سیکھنا آپؒ کے لیے بہت ضروری تھا۔

ملتان سے آپؒ دہلی آئے۔ آپؒ چاہتے تو دہلی میں قیام فرماسکتے تھے یا لاہور کو اپنا مستقر بناسکتے تھے کیونکہ آپؒ کو یہاں زیادہ سہولتیں مل سکتی تھیں۔ آپؒ کی سیاسی اور اخلاقی مدد کرنے والے لوگ بھی موجود تھے لیکن خواجہ صاحبؒ کی معاملہ فہم اور دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس وقت جس شہر کو دعوتِ دین کا مرکز بنانے کی ضرورت تھی وہ اجمیر تھا۔ اس زمانے میں اجمیر کو دہلی سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی یہاں ہندوؤں کے مشہور اور طاقتور راجا پرتھوی راج کی حکومت تھی۔

اگرچہ پہلی صدی ہجری سے ہی بر صغیر میں اسلام کے وفود آنے شروع ہوگئے تھے اور ۹۳ھ میں عظیم سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ سے ملتان تک کے علاقے میں اسلامی پرچم لہرا دیا تھا۔ اور پھر پانچویں صدی ہجری میں محمود غزنوی نے بر صغیر کے بڑے حصے کو تسخیر کرڈالا تھا لیکن اس کے بعد ایک تعطل سا چھا گیا تھا۔ قرامطہ (ایک گمراہ کن عقیدہ رکھنے والے لوگ) ابھر آئے تھے۔ سندھ سے ساحل عرب تک

Marfat.com

ان کی حکومت قائم ہوگئی تھی، لاہور غزنویوں کے قبضے میں تھا۔ برصغیر مختلف طاقتوں کے درمیان بٹا ہوا تھا اور کئی ہندو راجا اپنی اپنی ریاستوں میں حکمرانی کر رہے تھے۔

ان حالات میں اجمیر کو اپنی تحریک کا مرکز بنانا خواجہ صاحبؒ کا نہ صرف یہ کہ دانشمندانہ فیصلہ تھا بلکہ آپ کی غیر معمولی جرأت اور حوصلے کا مظہر تھا۔ یہ ایسا مقام تھا جہاں رہ کر پورے برصغیر کے ساتھ رابطہ قائم رکھا جاسکتا تھا، لیکن یہاں مسلمانوں کی مخالفت عروج پر تھی۔ اس کے باوجود خواجہ صاحبؒ نے مسلمانوں کی کشتی کو مخالفتوں کے طوفان کے بیچ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ آپؒ جانتے تھے کہ اس خطے میں بسنے والوں کو اسلام کے نورِ ہدایت کی ضرورت ہے۔

اجمیر میں خواجہ صاحب کی آمد پرتھوی راج (رائے پتھورا) کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ آپؒ کے رعب و جلال سے خوفزدہ ہو کر آپؒ کو تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس نے آپؒ کے رفقا کو تکالیف پہنچانا شروع کر دیں۔ ادھر خواجہ صاحبؒ کی پُرکشش شخصیت، آپؒ کا دلکش اندازِ گفتگو اور آپؒ کی دل نشیں تعلیمات کی بدولت لوگ دور دور سے آپؒ کے پاس کھنچے چلے آرہے تھے اور آپؒ کی تلقین سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر رہے تھے۔ آپؒ نے برصغیر میں اپنی تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی۔ دہلی میں آپؒ نے اپنے مرید حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو مقرر فرمایا تھا۔

پرتھوی راج، خواجہ صاحبؒ کی تحریک سے سخت پریشان تھا۔ اس نے خواجہ صاحبؒ کے مریدوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحبؒ کے اثرات کو زائل کرنے کی غرض سے اس نے ہندو جوگیوں کو بلوالیا، لیکن ان جوگیوں کے جادو اور منتر بے کار ثابت ہوئے۔ ان میں ایک جوگی جے پال نے خواجہ صاحبؒ کو مغلوب کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحبؒ کو اس کے برے اثرات سے محفوظ رکھا۔ جے پال اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کے دل میں ایمان کی شمع لَو دینے لگی۔ اس نے آپؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ خواجہ صاحبؒ نے اس کے ساتھ بڑا شفقت آمیز سلوک فرمایا۔ اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا اور خلافت بھی بخشی۔

انہی دنوں پرتھوی راج نے خواجہ صاحبؒ کے ایک مرید کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ خواجہ صاحبؒ نے مناسب الفاظ میں اپنے مرید کی سفارش کی تو پرتھوی راج نے ان کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کیے اور دھمکی دی کہ وہ آپؒ کو اجمیر سے نکلوا دے گا۔ اس پر آپؒ نے فرمایا: "ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کو دے دیا۔" آپ کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ ۵۸۸ھ میں شہاب الدین غوری نے ترائن کے مقام پر، پرتھوی راج کی فوج پر پھر حملہ کیا، ۵۸۷ھ میں اسی مقام پر لڑی جانے والی جنگ میں مسلمان کامیابی حاصل نہ کر سکے تھے، لیکن اس بار صورتحال مختلف تھی۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ پرتھوی راج گرفتار ہوا اور مارا گیا۔

شہاب الدین غوری نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستان کی فرمانروائی بخشی اور خود غزنی چلے گئے۔ قطب الدین ایبک نے میر سید حسین خنگ سوار کو اجمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اب خواجہ صاحبؒ کی اسلامی تحریک کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ خود میر سید حسینؒ، خواجہ صاحبؒ کے مرید تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحبؒ طویل عرصے تک اجمیر ہی میں مقیم رہے۔ شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد گو کہ اجمیر کی سیاسی اہمیت کم ہوگئی تھی لیکن آپؒ نے اجمیر ہی میں قیام کرنا مناسب سمجھا۔ دہلی میں شمس الدین التمش کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ التمش، خواجہ صاحبؒ اور ان کے مرید شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔

خواجہ معین الدینؒ چشتی کا وصال ۶ رجب ۶۳۲ھ / ۲۷ مارچ ۱۲۳۵ء کو اجمیر ہی میں ہوا۔ بعض مؤرخین کے مطابق آپؒ کا سنہ وصال ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء ہے۔ آپؒ نے ۹۷ برس کی عمر پائی۔ آپؒ کو اسی حجرے میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں آپؒ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ اس وقت کوئی پختہ قبر تیار نہ کی گئی۔ آپؒ کے وصال کے تقریباً دو سو برس بعد یعنی ۱۴۶۴ء میں مالوہ کے حکمراں سلطان محمود خلجی نے آپؒ کا پختہ مزار تعمیر کروایا اور ایک مسجد بھی تعمیر کروائی جو "صندل خانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۵۷۰ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے یہاں شاندار مسجد بنوائی۔ آپؒ کی درگاہ میں سب سے خوبصورت اضافہ شاہ جہاں نے کیا۔ انہوں نے یہاں سنگِ مرمر کی دلکش جامع مسجد بنوائی۔ یہ مسجد ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں دو لاکھ چالیس ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر ہوئی تھی۔ ایک بلند دروازے کا اضافہ کیا۔ روضۂ مبارک کا حسین گنبد بھی شاہ جہاں ہی نے تعمیر کروایا۔

شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آرا بیگم کو بھی خواجہ صاحبؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ درگاہ کا دالان بھی انہوں نے ہی ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں

Marfat.com

بنوایا تھا۔ انہوں نے خواجگان چشتی پر ایک کتاب "مونس الارواح" کے نام سے تحریر کی تھی۔ خواجہ صاحبؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے آج بھی دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ہر سال یہاں خواجہ صاحبؒ کا عرس ہوتا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے آپؒ کی درگاہ کو ایک دیگ دی تھی۔ یہ دیگ آگرہ میں تیار ہوئی اور پھر اجمیر لے جائی گئی تھی۔ مشہور ہے کہ اس میں اسی من چاول پک سکتے ہیں۔ اب یہ "چھوٹی دیگ" کے نام سے معروف ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے دو شادیاں فرمائیں۔ ایک شادی اجمیر کے حاکم سید وجیہ الدین مشہدی کی صاحبزادی عصمت اللہ بی بی سے ہوئی ان سے خواجہ ضیاالدین ابو سعید پیدا ہوئے۔ دوسری شادی ایک خاتون امت اللہ سے ہوئی جو پہلے ہندو تھیں اور آپ سے شادی سے قبل مسلمان ہو گئی تھیں۔ ان سے خواجہ فخر الدین، خواجہ حسام الدین اور بی حافظہ جمال پیدا ہوئیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات اسلام کی تعلیمات کی عملی تفسیر ہے۔ آپؒ بنیادی فرائض نماز، روزہ اور حج کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ فرماتے تھے، نماز رکن دین ہے اور رکن ستون کے مترادف ہے۔ اگر ستون قائم رہے گا تو گھر کھڑا رہے گا اور جب ستون ہی گر جائے گا تو گھر گر پڑے گا۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا کہ جب کوئی نماز پڑھے تو اس طرح پڑھے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

خواجہ صاحبؒ نے اپنی تعلیمات میں شریعت کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے فرمان کے مطابق اہل تصوف کے لیے ہر قسم کے اخلاق و محاسن کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ مومن سے کوئی کام خلافِ شریعت سرزد نہ ہو۔

خواجہ صاحبؒ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ آپؒ کے فقر و غنا کا عالم یہ تھا کہ پانچ مثقال سے زیادہ کی روٹی افطار میں میسر نہ آتی تھی۔ آپؒ نے متعدد حج بھی فرمائے۔ برصغیر میں عظیم فکری انقلاب برپا کرنے والے ملک المشائخ حضرت معین الدین چشتیؒ کے لباس کا یہ حال تھا کہ ایک سادہ سی دوتہی (ایک قسم کا موٹا کپڑا) میں ملبوس رہتے تھے۔ رہائش کے لیے آپ نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کو کافی سمجھا تھا۔

خواجہ صاحبؒ کو رسولِ اقدس ﷺ سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ وہ جب حدیث نبویؐ بیان فرماتے تھے تو ان کا انداز بہت والہانہ ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رسول پاک ﷺ کی حدیث بیان کرتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ایک بار فرمایا "افسوس ہے اس شخص پر جو قیامت کے دن حضور ﷺ سے شرمندہ ہو گا، اس کی جگہ کہاں ہو گی جو آپ ﷺ سے شرمندہ ہو گا، وہ کہاں جائے گا۔" یہ کہہ کر بے اختیار رو پڑے۔

خواجہ صاحبؒ نہایت رحم دل اور فیاض تھے۔ آپؒ نے اپنی ذات کی خاطر کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ ایک بار ایک شخص آپؒ کو ہلاک کرنے کے ارادے سے آیا۔ آپؒ اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے اور محبت سے پاس بٹھا کر فرمایا "تم جس ارادے سے آئے ہو اسے پورا کرو۔" وہ شخص یہ سنتے ہی لرز اٹھا، آپؒ کے سامنے جھک گیا اور کہنے لگا، "میں لالچ میں آ گیا تھا، مجھے معاف کر دیجیے" پھر اس نے ایک چھری نکالی اور آپؒ کے سامنے ڈال دی اور کہنے لگا، "مجھے آپؒ کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، اب آپؒ اس چھری سے مجھے ہلاک کر دیجیے۔" آپؒ نے شفقت سے فرمایا، "ہم درویشوں کا یہ شیوہ ہے کہ ہمارے ساتھ اگر کوئی برائی بھی کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ نیکی سے پیش آتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس شخص کے لیے دعا کی۔ اس شخص نے اسی وقت اپنے گناہوں سے توبہ کی اور آپؒ کی خدمت میں رہنے لگا۔

خواجہ صاحبؒ کے مطبخ میں روزانہ بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا اور حاجت مند افراد یہاں کھانا کھایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحبؒ پڑوسیوں کا بھی خیال رکھتے تھے، کسی کا انتقال ہو جاتا تو جنازے کے ساتھ تشریف لے جاتے، تدفین کے بعد اور لوگ واپس آ جاتے لیکن آپؒ کچھ دیر وہیں قبر کے پاس بیٹھے رہتے اور مرنے والے کے لیے دعائیں کرتے۔

خواجہ صاحبؒ کسبِ حلال اور محنت سے اپنی روزی حاصل کرنے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ آپؒ نے اپنے خلفا اور مریدوں کی تربیت اسی طور پر کی تھی، چنانچہ آپ کے خلیفہ شیخ حمید الدین ناگوریؒ، ایک قطعہ اراضی پر کاشت کر کے روزی کماتے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا امتِ مسلمہ پر یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے برصغیر آ کر کفر و ظلمت کے اندھیاروں میں اسلام کی شمع روشن فرمائی۔ آپؒ نے تبلیغ اسلام کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ اپنے تربیت کردہ خلفا کو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں تبلیغ کی ذمے داری سونپی۔ "خزینۃ الاصفیا" کے مطابق آپؒ کے خلفا کی تعداد ۲۱ ہے جس میں شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ جیسے جلیل القدر صوفیا بھی شامل ہیں۔ سیر الاقطاب کے مطابق آپؒ کے خلفاء کی

Marfat.com

تعداد ۱۳ ہے۔ ان میں آپؒ کی چہیتی بیٹی حافظہ جمال بھی شامل ہیں۔
خواجہ صاحبؒ نے صرف مردوں ہی میں نہیں بلکہ خواتین میں بھی تبلیغ اسلام کے لیے منصوبہ بندی فرمائی، اس غرض سے آپؒ نے اپنی بیٹی حافظہ جمال کی تربیت کی۔ آپؒ قرآن پاک کی حافظہ تھیں۔ آپؒ کا مزار خواجہ صاحبؒ کے مزار کی بائیں جانب، جنوبی دیوار کے قریب ہے۔
خواجہ صاحبؒ نے تعلیم و تدریس کے لیے اجمیر میں مدرسہ بھی قائم فرمایا تھا۔

خواجہ صاحبؒ جہاں کئی علوم کے ماہر تھے وہاں بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ آپ کے اشعار کی تعداد سات ہزار سے آٹھ ہزار تک ہے۔ فارسی شعراء کے مشہور تذکرے "آتش کدہ" میں آپؒ کی دو رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ آپؒ کی تعلیمات "دلیل العارفین" اور "انیس الارواح" کے نام سے کتب میں محفوظ ہیں۔

***

Marfat.com

حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

جنوبی ایشیا میں دعوت واصلاح اور تبلیغ دین کی منظم تحریک کے بانی

خادم مؤدب ہو کر کھڑا ہوا تھا!

سامنے تشریف فرما بزرگ اس سے کہہ رہے تھے: "جایئے' جس صندوقچے میں پانچ ہزار سرخ دینار رکھے ہوئے ہیں' وہ صندوقچہ لے آیئے۔"

خادم نے ادب سے سر جھکایا اور صندوقچہ لینے چلا گیا۔ اس نے مقررہ مقام پر صندوقچہ تلاش کیا، صندوقچہ وہاں نہیں تھا۔ پھر اس نے دیگر سامان ہٹا کر دیکھا، مختلف مقامات پر ڈھونڈا لیکن صندوقچہ نہیں ملا۔

خادم سخت پریشان ہوا، کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ غفلت سے کام لیتا ہے۔

وہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطلاع دی: "حضرت! صندوقچہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا۔"

"الحمدللہ!" بزرگ کے لبوں سے یہ کلمات ادا ہوئے۔

کچھ دیر بعد وہی خادم پھر حاضر ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ اس نے بزرگ کو اطلاع دی: "حضرت، صندوقچہ مل گیا ہے۔" اس نے صندوقچہ آپؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"الحمدللہ" بزرگ نے وہی کلمات پھر دہرائے۔

اطراف میں کئی اصحاب اور تلامذہ موجود تھے انہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ بزرگ نے پانچ ہزار دینار سے بھرا صندوقچہ کھو جانے پر بھی "الحمدللہ" کے کلمات ادا فرمائے اور پھر اسی صندوقچے کے مل جانے کی اطلاع پر بھی "الحمدللہ" ہی فرمایا۔ کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپؒ کے اس عمل میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔

"فقیروں کے لیے دنیا کا عدم اور وجود برابر ہے۔" بزرگ کہہ رہے تھے: "انہیں نہ کسی چیز کے آنے پر خوشی ہوتی ہے اور نہ اس کے جانے کا غم ہوتا ہے۔" (مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ولی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں)۔

یہ کہہ کر بزرگ نے صندوقچہ کھلوایا اور اس میں موجود تمام پانچ ہزار دینار، محتاجوں اور مساکین میں تقسیم کروا دیے۔

یہ بزرگ تھے صوفیا کے مشہور سلسلے سہروردیہ کے عظیم المرتبت پیشوا، حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ، جنہوں نے اپنی عمر عزیز اسلام کی دعوت عام کرنے اور امت کی اصلاح وتربیت کی تحریک منظم کرنے اور اسے کرۂ ارض کے وسیع حصے میں پھیلانے میں صرف کر دی۔ آپؒ امت مسلمہ کے محسن ہیں، آپؒ کے لیے جتنی بھی دعائے خیر کی جائے، کم ہے۔

آپؒ کا نام زکریا بہاءالدین اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپؒ ملتان کے نواحی علاقے کوٹ کروڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۶ھ / ۳ جون ۱۱۷۱ء کو طلوع سحر کے وقت عمل میں آئی۔ یہ جمعہ کی شب تھی۔ گویا کئی اعتبار سے یہ ایک مبارک ساعت تھی۔

حضرت بہاءالدین زکریاؒ کے والد محترم مولانا وجیہ الدین محمد غوث اور والدہ محترمہ فاطمہ بنت مولانا حسام الدین ترمذی ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ آپؒ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔

حضرت بہاءالدینؒ کی تعلیم کا آغاز کم سنی میں ہو گیا۔ ان کے والد محترم نے حصول علم کے لیے انہیں مولانا نصیر الدینؒ کے پاس بھیج دیا۔ صرف سات برس کی عمر میں حضرت بہاءالدینؒ نے قرآن کریم حفظ کر لیا۔ آپؒ کو قرآن پاک کی ساتوں قراتوں پر بھی عبور حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد آپؒ کو درسی کتب کی تعلیم دی جانے لگی۔

۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء میں حضرت بہاءالدینؒ کے والد مولانا وجیہ

Marfat.com

الدین محمد غوثؒ انتقال فرما گئے۔ اس وقت حضرت بہاؤالدینؒ کی عمر بمشکل بارہ یا تیرہ برس تھی۔ آپؒ نے اپنے چچا شیخ احمد غوث سے درخواست کی کہ مجھے علم حاصل کرنا ہے۔ شیخ احمد غوث یہ بات سن کر بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے وقت کے بڑے علما سے حضرت بہاؤالدینؒ کو تربیت دلوانے کا اہتمام کیا۔ اس کے بعد آپؒ ملتان تشریف لے گئے اور وہاں کے علماکرام سے تحصیل علم کی۔ ملتان میں آپؒ کے اساتذۂ کرام میں مولانا عبدالرشید کرمانیؒ بھی شامل تھے۔

ملتان کے بعد حضرت بہاؤالدینؒ نے خراسان کا رخ کیا، جو اس زمانے میں بڑی شہرت کا حامل تھا۔ خراسان میں آپؒ نے سات برس تک علماکرام سے علم حاصل فرمایا۔ اس کے بعد آپؒ بخارا چلے گئے اور آٹھ سال تک یہاں رہ کر مختلف علوم کی تکمیل کرتے رہے۔ آپؒ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؒ ایک ایک کر کے مختلف عالموں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرتے رہے اس طرح آپؒ نے ۴۴ اساتذۂ کرام سے علم سے حاصل فرمایا۔

علم کے حصول کی اس جدوجہد کے دوران آپؒ کے ذاتی کتب خانے میں دو ہزار سے زائد قیمتی کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ خیال رہے کہ یہ چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) کی بات ہے، جب طباعت کی سہولتیں موجود نہ تھیں۔ اس لحاظ سے یہ بہت بڑا ذخیرۂ کتب تھا۔

خراسان اور بخارا کی تمام درس گاہوں سے حصول علم کے بعد آپؒ نے تزکیۂ نفس کے لیے مجاہدہ اور ریاضت کا آغاز کر دیا۔ آپؒ کے کردار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ اپنی اس ریاضت کی کیفیات کسی سے بیان نہ فرماتے تھے۔ آپؒ کا ارشاد تھا کہ ریاضت کی کیفیات ظاہر کر دینے سے غرور کا اظہار ہوتا ہے۔ آپؒ نے ریاضت اور مجاہدے کا یہ سلسلہ بیس برس تک جاری رکھا، اس کے بعد آپؒ حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہو گئے۔

حج کے فریضے سے سبکدوش ہونے کے بعد آپؒ مدینہ منورہ تشریف لائے اور مولانا کمال الدین محمد یمنیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ مولانا کمال الدین محمدؒ اپنے وقت کے عظیم محدث تھے۔ انہوں نے ۵۳ برس تک حرم نبویؐ میں خدمات انجام دیں۔ حضرت بہاؤالدینؒ نے مولانا کمال الدین محمدؒ سے پانچ سال تک حدیثِ نبویؐ کا درس لیا۔ جب آپؒ نے حدیث کے علوم کی تکمیل کر لی تو مولانا کمال الدین محمدؒ نے آپؒ کو سند عطا کی۔ اس کے بعد آپؒ بیت المقدس روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد آپؒ بغداد تشریف لے گئے۔

بغداد میں صوفیوں کے مشہور سلسلے سہروردیہ کے بہت بڑے پیشوا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ حضرت بہاؤالدینؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے اپنی بصیرت اور نگاہِ جوہر شناس سے اس بیش قیمت ہیرے کو پہچان لیا اور اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔

حضرت بہاؤالدینؒ، شیخ شہابؒ الدین کی خدمت میں ستر روز رہے، اس کے بعد شیخ نے آپؒ کو ملتان جانے اور وہاں رہ کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ ۶۱۵ھ / ۱۲۱۸ء میں آپ ملتان پہنچے۔

اب حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی منظم اصلاحی تحریک کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جس کی بدولت سندھ، ملتان اور بلوچستان کے علاقوں میں ہزاروں افراد، دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور لاکھوں نے آپؒ کی تعلیمات اور تبلیغی مساعی سے متاثر ہو کر بُرے کاموں سے توبہ کر لی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس خطۂ ارض میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد مسلمان ہو گئی، جس کو چند صدیوں کے بعد پاکستان کے نام سے رُوئے زمین پر ابھرنا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کے قیام کی بنیادیں رکھنے والوں میں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے ملحدوں کے خلاف جہاد، اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں لانے کی غرض سے ایک جامع منصوبہ تیار فرمایا۔

آپؒ نے اپنی خانقاہ تیار کروائی اور اس کے ساتھ ایک درس گاہ قائم کی۔ یہ محض درس گاہ نہ تھی بلکہ بہت اعلیٰ تربیت گاہ بھی تھی۔ اس کے دو شعبے تھے۔ ایک شعبے میں علماکرام تیار ہوتے تھے اور دوسرا شعبہ مبلغین کی تیاری کے لیے وقف تھا۔

آپؒ نے مختلف مضامین کی تعلیم و تربیت کے لیے لائق اور فاضل علماکرام کو دُور دُور سے بلا کر ان کا تقرر فرمایا اور ان کے لیے بہت اچھے مشاہرے اور ان کی رہائش وغیرہ کے انتظامات کیے۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی اس عظیم جامعہ میں جب علما اپنے مضامین کی تکمیل کر لیتے تھے تو آپ کے پاس حاضر ہوتے۔ آپؒ ہر ایک سے تنہائی میں پوچھتے کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں تبلیغ کے لیے تیار ہیں۔ اکثر علماکرام تیار ہو جاتے۔ جو فرد جس علاقے میں جانے کی خواہش ظاہر کرتا، اس

Marfat.com

کے لیے اس علاقے کی زبان وثقافت کی تعلیم کا بندوبست کر دیا جاتا۔ اس غرض سے اسے دو برس دیے جاتے۔ دو برس کے بعد حضرت بہاالدینؒ اس فرد کو طلب کرتے جسے تبلیغ کے لیے بھیجنا مقصود ہوتا۔ اس مبلغ کے معلّم (استادِ محترم) کو پانچ ہزار اشرفیاں مرحمت فرماتے اور ہدایت دیتے کہ جس علاقے میں مبلغ کو بھیجا جا رہا ہے، وہاں کی مناسبت سے سامانِ تجارت خرید کر ایک کشتی میں رکھ دیا جائے۔

پھر مبلغ کو چند ہدایات دیتے:

۱۔ سامان کم منافع پر فروخت کرنا۔

۲۔ لین دین میں اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھنا۔

۳۔ ناقص اشیا فروخت نہ کرنا۔

۴۔ خریداروں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔

۵۔ جب تک لوگوں کا اعتماد حاصل نہ ہو، ان کے سامنے اسلام پیش نہ کرنا۔

اس کے بعد آپ مبلغ کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتے۔ یہ ایک منظم تحریک تھی۔ تاجروں کے روپ میں علما کرام روانہ ہوتے رہے۔ چین، فلپائن، جاوا، سماٹرا اور دیگر علاقوں میں پہنچ کر وہ اپنی دکانیں قائم کرتے، تجارتی اشیا مقامی تاجروں یا عام افراد کو فراہم کرتے اور ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ بھی کرتے جاتے۔ یہ علما کرام اپنے اچھے اخلاق، دیانت، صفائی ستھرائی اور حُسنِ سلوک کی بدولت ہر ایک کو گرویدہ بنالیتے۔ ان کی دلنشیں باتیں سن کر لوگ اسلام کی رفعت اور حقانیت کے قائل ہو جاتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ آج مشرقِ بعید کے بے شمار جزائر میں جو کروڑوں مسلمان بستے ہیں وہ ان ہی علما کرام کی محنتوں کا ثمرہ ہیں جنھوں نے ساتویں صدی ہجری میں، تاجروں کے روپ میں یہاں آکر اسلام کی اشاعت کی تھی۔

حضرت بہاالدینؒ نے اصلاح وتربیت اور تبلیغ کا دوسرا نظام برصغیر کے اندر قائم فرمایا۔ آپؒ نے مختلف دینی علوم کے ماہر مبلغین کی جماعتیں تیار کر کے برصغیر کے مختلف علاقوں میں روانہ کرنا شروع کر دیں۔ آپؒ کے تربیت کردہ افراد کشمیر سے راس کماری اور گوادر سے بنگال تک پھیل گئے۔

حضرت بہاالدینؒ جو تبلیغی جماعتیں روانہ فرماتے تھے وہ کسی پر بوجھ نہیں بنتی تھیں۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ تبلیغی جماعت کسی مقام پر پڑاؤ ڈالنے کے بعد مقامی باشندوں سے فی سبیل اللہ کھانا طلب کرنے لگے یا راہ خدا میں عطیات کا مطالبہ کر بیٹھے، بلکہ حضرت بہاالدینؒ ان تبلیغی جماعتوں کو روانہ فرماتے ہوئے، ہزاروں اشرفیوں کی مالیت کا سامانِ تجارت خرید کر ان کے ساتھ کرتے تھے۔ جہاں بھی یہ جماعتیں پڑاؤ ڈالتیں، وہاں گویا میلے کا سماں ہوتا تھا۔ جابجا دکانیں کھل جاتیں۔ ان پر اشیائے خورونوش اور دیگر سامان فروخت ہونے لگتا۔ مقامی لوگ ملتان اور دیگر علاقوں کی بنی ہوئی اشیا دیکھنے اور خریدنے کے اشتیاق میں اُمڈ آتے۔ ان کی دلچسپی کے لیے محافظ دستے جنگی مظاہرے کرتے اور اس طرح نوجوانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کرتے۔ زور آزمائی، شہ سواری، نیزہ بازی، شمشیرزنی کے کمالات دکھائے جاتے۔ اس تمام تفریح کے ساتھ ساتھ مقررہ اوقات میں قرآن وحدیث کے درس بھی ہوتے جن میں ہزاروں افراد شرکت کرتے۔

آپؒ کی اس منظم اصلاحی تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کے اثرات دور دور تک پھیل گئے۔ برصغیر پاک وہند میں عموماً اور ملتان، سندھ اور بلوچستان کے علاقوں میں خصوصاً دینی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ دینی تعلیم عام ہوئی اور معاشرے میں نیکی، راست بازی اور دیانت کا چلن ہوا۔ آپؒ کی تحریک کے آغاز سے قبل معاشرے میں طرح طرح کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ آپؒ نے برائیوں کے انسداد کے لیے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں خداخوفی کا جذبہ پیدا فرمایا۔ آپؒ جب بھی کسی فرد سے بیعت لیتے تھے تو پہلے اس سے دریافت فرماتے کہ تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ پھر اسے حلال روزی کمانے کی تلقین کرتے اور فرماتے کہ تم دیانت سے کام لوگے تو تمہاری کمائی میں برکت ہوگی۔

آپؒ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کا الگ الگ اہتمام فرماتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپؒ کی تحریک کتنی سائنٹیفک اور جدید خطوط پر استوار تھی اور آپؒ فرد کی نفسیات اور ضروریات کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ آپؒ کے کسی مرید کا تحریر کردہ ایک قلمی رسالہ دستیاب ہوا ہے جس میں، حجام، ترکھان، دھوبی، جولاہے اور دکانداروں کے بارے میں ہدایات کی گئی ہیں۔ اس رسالے میں حجامت کے اوزاروں کا ذکر ہے پھر چند دعائیں درج ہیں اور حجام کو ترغیب دی گئی ہے کہ حجامت کے دوران وہ اِدھر اُدھر کی لایعنی یا بے ہودہ باتیں کرنے کی بجائے دعائیں پڑھے۔ استرا اٹھاتے وقت، قینچی چلاتے ہوئے یا دیگر امور انجام دیتے ہوئے اسے ان دعاؤں

Marfat.com

کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح دھوبی کی اصلاح وتربیت کے لیے اہم باتیں لکھی گئی ہیں مثلاً یہ کہ اگر تم جان بوجھ کر کپڑا پھاڑو گے یا بے پروائی سے کام لو گے تو تمھارے رب کو اس کی خبر ہے۔ اس کی سزا تمھیں آخرت میں ملے گی۔ دھوبی کے لیے بھی کپڑے اٹھانے، دھونے، سکھانے، لپیٹنے وغیرہ کی دعائیں درج کی گئی ہیں۔

حضرت بہاؤالدینؒ نے خواتین کی تربیت کا بھی اہتمام فرمایا۔ آپؒ کی تحریک کے اثرات کا اندازہ یوں لگائیں کہ آپؒ کی خادمائیں چکی پیسنے بیٹھتیں تو آپس میں دوسری عورتوں کی غیبت کرنے یا فضول باتیں کرنے کی بجائے قرآن پاک پڑھتی جاتیں۔ آپؒ کی تحریک کے نتیجے میں تجارت اور لین دین میں بے ایمانی کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں سے متاثر ہو کر دیگر مذاہب کے تجارت پیشہ افراد نے بھی دھوکا دہی اور خیانت ترک کر دی۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے فلاحِ عامہ کے بھی بہت سے اہم کام سرانجام دیے۔ آپؒ نے جنگلات کو آباد کروایا، کنویں کھدوائے، نہریں تعمیر کروائیں اور زراعت پر توجہ دی۔ آپؒ کا اسبابِ تجارت، سکھر، بھکر، ٹھٹھہ، منصورہ اور وہاں سے عراق، عرب اور مصر تک جاتا تھا۔ خشکی کے راستے، کابل، ایران، دہلی اور لاہور سے تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ آپؒ اپنی اراضی کی پیداوار، خام اجناس اور مصنوعات اپنے معتمد خدام کے ذریعے دور دراز کے ملکوں کو بھجواتے تھے۔ مبلغین کی طرح ان خدام کو بھی ہدایت تھی کہ مال پر کم نفع لیا جائے اور دیانت داری کے ساتھ معاملات کیے جائیں۔ کوٹ کروڑ میں آپؒ کی ذاتی جائیداد سے بھی بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ تحصیل لودھراں میں بھی اراضی پر اچھی کھیتی باڑی ہوتی تھی۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے ۹۴ برس کی عمر پائی۔ آپؒ کی صحت آخر وقت تک اچھی رہی۔ آپؒ ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرنے پر زور دیتے تھے۔ اور اس عمر میں بھی بالائی منزل سے اتر کر جماعت سے نماز ادا فرماتے تھے۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ روزانہ فجر، اشراق اور چاشت کی نمازیں ادا کرنے کے بعد دیوان خانے میں اپنی مسند پر تشریف لے جاتے۔ علما و مشائخ حاضر ہونے لگتے۔ ملازمین، تجارت، زراعت اور مطبخ کے حسابات اور معاملات پیش کرتے۔ آپؒ اپنے ماتحتوں کے ذریعے ان کی جانچ پڑتال کرواتے۔ ہدایات جاری کرتے۔ اس دوران محتاج اور مساکین حاضر ہوتے۔ انھیں نوازنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ دوپہر کو کھانا تناول فرماتے۔ جب آپؒ روزے رکھتے تو کئی کئی دن تک رکھتے تھے۔

گھریلو امور دوپہر کے وقت پیش کیے جاتے۔ تھوڑی دیر قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز مسجد میں جماعت سے ادا فرماتے پھر اپنے حجرے میں تشریف لے جاتے جہاں ذکر میں مصروف ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد مجلس کا انعقاد ہوتا جس میں تبلیغی جماعتوں کے وفود سے ملاقاتیں ہوتیں۔ ان کی کارکردگی پیش کی جاتی۔

عصر کی نماز مسجد میں ادا فرماتے پھر قرآن وحدیث کا درس دیتے جس میں ہزاروں افراد شریک ہوتے۔ وہ چبوترہ جہاں آپؒ بیٹھ کر درس دیتے تھے، اب تک آپؒ کے روضۂ مبارک کے مشرق میں موجود ہے۔ غروب آفتاب سے قبل مضافات کی سیر کے لیے نکل جاتے۔ کبھی یہ سواری پر ہوتی، کبھی پاپیادہ۔ آپؒ کے خدام اور تلامذہ ساتھ ہوتے۔ مغرب کی نماز واپس آکر مسجد میں جماعت سے ادا کرتے۔ پھر تخلیے میں چلے جاتے۔ ذکر اذکار کرتے رہتے۔ عشا کی نماز مسجد میں ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک عبادت فرماتے۔ پھر کھانا تناول فرما کر کچھ دیر آرام فرماتے، رات میں تہجد ادا فرماتے پھر فجر کی نماز تک تلاوت کلام پاک کرتے رہتے۔

آپؒ کا مطبخ بہت وسیع تھا۔ اس میں طرح طرح کے کھانے پکتے تھے۔ آپؒ کے دسترخوان پر روزانہ اہلِ علم، مریدوں اور فقرا کی بڑی تعداد موجود ہوتی تھی۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے اپنی طویل عمر میں کئی حکمرانوں کے ادوار دیکھے۔ ان میں شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، آرام شاہ، شمس الدین التتمش، ناصر الدین قباچہ، رکن الدین، رضیہ سلطانہ، معزالدین، بہرام شاہ، ملک اعزالدین، علاؤالدین مسعود اور ناصر الدین محمود شامل ہیں۔ حکمرانوں سے آپ کے تعلقات اچھے رہے، اکثر حکمران آپؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپؒ نے سیاسی امور میں بھی دلچسپی لی اور جہاں ضروری سمجھا، مداخلت فرمائی۔ شمس الدین التتمش نے تو آپؒ کو مملکت کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا، جس کا تعلق قاضیوں کے تقرر اور شریعت کے نفاذ سے تھا۔ یہ منصب خاصے عرصے تک آپؒ کے خاندان میں رہا۔

اعز الدین بلبن، التتمش کے ایک امیر تھے۔ انہوں نے ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء میں منگولوں کو ملتان پر حملے کی ترغیب دی۔ منگولوں

Marfat.com

نے حملہ کیا۔ عین ممکن تھا کہ حملہ آور شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار شروع کر دیتے کہ حضرت بہاالدینؒ ایک لاکھ درہم لے کر پہنچے اور انہوں نے یہ رقم منگولوں کو دے کر واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس واقعے کے بعد التتمش نے اعزالدین کو معزول کر کے شیر خان کو اُچ اور ملتان کا حاکم مقرر کر دیا۔

التتمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کو بھی حضرت بہاالدینؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک بار جب وہ ایک بغاوت کو کچلنے کی غرض سے پنجاب آئیں تو ملتان پہنچ کر انہوں نے حضرت بہاالدینؒ کی خدمت میں حاضری دی اور آپؒ کے لنگر خانے کے لیے ایک گاؤں وقف کیا۔ ناصر الدین محمود جب ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء میں حکمران بنے تو انہوں نے غیاث الدین بلبن کو وزیر اعظم بنایا۔ ناصر الدین محمود ۶۴۹ھ / ۱۲۵۱ء میں ملتان آئے اور حضرت بہاالدینؒ کی خدمت میں حاضری دی۔

حضرت بہاالدینؒ کی عظمت سے سندھ، ملتان اور اُچ کے حکمران ناصر الدین قباچہ بھی بہت متاثر تھے تاہم وہ آپؒ کی مقبولیت سے خائف بھی رہتے تھے۔ حضرت بہاالدینؒ لوگوں کی درخواست پر ناصر الدین قباچہ کے نام سفارشی خط لکھ دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے قباچہ کی گزارش پر قحط کے زمانے میں گندم فراہم کر کے ان کی مدد بھی فرمائی تھی۔ تاہم، قباچہ اور دہلی کے حکمران شمس الدین التتمش میں چپقلش رہتی تھی۔ قباچہ خود مختار رہنے کے خواہش مند تھے جبکہ التتمش برصغیر پاک و ہند کی متحدہ اور مضبوط حکومت چاہتے تھے۔ اس معاملے میں حضرت بہاالدینؒ، التتمش کے ہمنوا تھے۔ اس کے علاوہ ان کی رائے میں قباچہ کے زیر اقتدار کچھ شکایات بھی موصول ہو رہی تھیں۔ چنانچہ آپؒ نے اس علاقے کے تمام حالات لکھ کر التتمش کو روانہ کر دیے۔ ملتان کے حاکم شرف الدین اصفہانی کو بھی کچھ شکایتیں تھیں۔ انہوں نے بھی جائزہ تحریر کر کے التتمش کو بھیج دیا۔ اتفاق سے دونوں خطوط راستے میں پکڑے گئے۔

قباچہ کو ان خطوط کے بارے میں علم ہوا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ دونوں علما کو بلوایا گیا۔ دونوں ایک ہی وقت پہنچے۔ قباچہ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور اپنے دائیں اور بائیں جگہ پیش کی۔ پھر قاضی شرف الدین کا خط انہیں دکھایا۔ قاضی اسے دیکھ کر چپ رہے۔ قباچہ نے ان کا سر قلم کروا دیا۔ پھر قباچہ نے حضرت بہاالدینؒ کا خط ان کے حوالے کیا تو آپؒ نے نہایت جرأت اور بے خوفی سے فرمایا: "ہاں یہ میرا خط ہے، میں نے صحیح لکھا ہے۔ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

قباچہ یہ سن کر شرمندہ ہو گئے۔ انہوں نے آپؒ کو عزت سے رخصت کیا۔

حضرت بہاالدین زکریا ملتانیؒ دیگر علما کرام اور صوفیا عظام کی بہت توقیر فرماتے تھے۔ ان میں صوفیا کے دیگر سلسلوں مثلاً چشتیہ کے کئی بزرگ شامل تھے۔ چشتیہ سلسلے کے مشہور عالم بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان تشریف لائے تو آپؒ نے ان کو بہت احترام سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ آپؒ کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے تو حضرت بہاالدینؒ کو بہت محبت تھی۔ ان دونوں میں مراسلت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دونوں عظیم بزرگوں نے ایک ساتھ متعدد سفر کیے۔ بابا فریدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاالدینؒ نے بڑی سیاحت فرمائی تھی۔ میں نے ۱۳۸۰ مشائخ کی زیارت کی لیکن حضرت بہاالدینؒ نے مجھ سے بھی زیادہ مشائخ کی زیارت فرمائی۔

حضرت بہاالدین زکریاؒ کے مریدوں میں سے حضرت لال شہباز قلندرؒ نے بڑی شہرت حاصل فرمائی۔ آپؒ کا اصل وطن تبریز کے قریب ایک گاؤں مرند ہے لیکن بعد میں آپؒ سندھ کے مقام سیوستان (سہون) آکر آباد ہو گئے۔ حضرت بہاالدینؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت لال شہباز قلندرؒ اور حضرت سید جلال بخاریؒ یہ چاروں بزرگ اکثر مل کر مختلف مقامات کے دورے فرماتے تھے۔ موسم گرما میں وہ کشمیر اور بلخ و بخارا کا رخ کرتے تھے۔ ساون بھادوں میں سہون، ملیر اور دیبل میں تبلیغ فرماتے تھے۔ موسم سرما میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا میدانی علاقہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا۔ یہ چاروں بزرگ "چار یار" بھی کہلاتے ہیں۔

حضرت بہاالدین زکریاؒ کا ایک بار سماع سننا گو کہ ثابت ہے لیکن آپؒ کو سماع سے رغبت نہ تھی، نہ ہی آپؒ نے اس کو رواج دیا۔ آپؒ شریعت کی پابندی کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔

حضرت بہاالدینؒ نے ایک کتاب "اوراد" کے نام سے فارسی زبان میں تحریر فرمائی جو صدیوں تک پڑھی جاتی رہی۔ آپؒ کے ایک مرید مولانا علی بن احمد غوریؒ نے اس کتاب کی شرح "کنز العباد" کے نام سے عربی زبان میں مرتب کی۔ یہ اوراد و وظائف کی کتاب نہیں بلکہ صوفیانہ رنگ میں لکھی گئی ایک فقہی تصنیف ہے جس میں نماز، روزہ،

Marfat.com

طہارت، توبہ، اخلاق وغیرہ کے مسائل درج ہیں۔ آپؒ نے ایک رسالہ "شروط اربعین" کے نام سے تحریر فرمایا جس میں اعتکاف کے آداب و شرائط بتائی گئی ہیں۔ آپؒ کو اپنی تبلیغی اور اسلامی سرگرمیوں کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا وقت کم ملا، پھر یہ کہ اس زمانے میں تبلیغ اور تربیت کا انداز ہی یہ تھا کہ درس اور وعظ نصیحت کا زیادہ اہتمام کیا جائے تاہم آپؒ نے اپنے مریدوں کو جو خطوط تحریر فرمائے وہ بھی مستقل تصانیف کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت بہاالدین زکریاؒ اپنی عمر کے آخری ایام میں تمام وقت اپنے حجرے میں معتکف رہنے لگے تھے۔ صرف نمازِ باجماعت کے لیے حجرے سے نکل کر مسجد تشریف لاتے تھے۔ ۷ صفر ۶۶۱ھ / ۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء کو معرفت اور طریقت کا یہ خورشیدِ درخشاں تقریباً نصف صدی تک ضیا پاشی کے بعد اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔ آپؒ کے وصال کی خبر پھیلتے ہی لاکھوں سوگواران روتے ہوئے آپؒ کی خانقاہ کی طرف دوڑے آئے۔ آپؒ کے صاحبزادے صدرالدین محمدؒ نے نمازِ جنازہ کی امامت فرمائی جس کے بعد آپؒ کو خانقاہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آج بھی ملتان میں آپؒ کا مزار موجود ہے جہاں عقیدت مند آکر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ (آپؒ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، یہ تاریخ کی مختلف کتابوں میں ۶۵۶ھ، ۶۶۱ھ اور ۶۶۶ھ درج کیا گیا ہے)۔

حضرت بہاالدینؒ نے دو شادیاں فرمائیں۔ پہلی بیوی رشیدہ بانو سے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تولد ہوئیں۔ دوسری بیوی شہر بانو سے تین صاحبزادے اور دو صاحب زادیاں پیدا ہوئیں۔ آپؒ کے بڑے صاحب زادے شیخ صدرالدین عارفؒ نے تصوف میں بڑا نام پیدا کیا اور آپؒ کے بعد آپؒ کی خانقاہ کا جملہ انتظام انہوں نے ہی سنبھالا۔

حضرت بہاالدین زکریاؒ کی اصلاحی تحریک بڑی ہمہ گیر تحریک تھی۔ آپؒ اور آپؒ کے خلفا کی اَن تھک جدوجہد کی بدولت سندھ و ہند کے کئی علاقے اسلام کی برکتوں اور سعادتوں سے مہک اٹھے۔ آپؒ کے خلیفہ امیر حسینی نے ہرات میں اور عراقی نے مصر و شام میں دینِ اسلام کی تبلیغ کی۔ آپؒ اپنے مریدوں میں شیخ حسن افغان کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ دیگر خلفا میں مخدوم سید جلال سرخ بخاریؒ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے دادا محترم)، حضرت موسیٰ نوابؒ، شیخ جمال اچویؒ، حضرت لال شہباز قلندرؒ اور بہت سے عظیم بزرگ شامل ہیں۔ آپؒ کے خلفا اور اولاد میں سے بہت سوں نے سندھ، پنجاب، کشمیر، بنگال اور دیگر علاقوں میں سکونت اختیار کی اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

***

Marfat.com

حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی تبلیغ سے ہزاروں افراد اسلام کی نعمت سے آشنا ہوئے

انہیں چند بے حد پیچیدہ علمی مسائل کا سامنا تھا۔

ان کا شمار دہلی کے ممتاز ترین علماکرام میں ہوتا تھا۔ بہت سے دقیق اور الجھے ہوئے مسائل ان کی نظر سے گزرے تھے، لیکن اس بار جو مسائل درپیش تھے، وہ اس قدر مشکل تھے کہ باوجود کوشش کے، وہ ان مسائل کو حل نہیں کر پا رہے تھے۔ تھک ہار کر انہوں نے دہلی کے دیگر علماکرام سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کئی علما کے پاس گئے اور انہیں ان علمی مسائل سے آگاہ کیا۔ تمام اہل علم حضرات نے اپنی سی کوشش کر دیکھی، لیکن مسائل جوں کے توں تھے۔ آخر انہوں نے سوچا کہ بخارا جا کر وہاں کے نامور عالموں سے مدد حاصل کی جائے۔ انہوں نے سفر کی تیاری کی۔ بہت سی اہم کتابیں جانوروں پر لدوائیں اور بخارا کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

دہلی سے سفر کرتا ہوا ان کا قافلہ مغربی پنجاب میں داخل ہوا جب وہ دریائے ستلج کے کنارے پہنچے تو انہیں ان کے ایک ساتھی نے بتایا کہ یہاں اجودھن کے قصبے میں ایک بہت بڑے بزرگ قیام پذیر ہیں۔ ان کے علم کی بڑی شہرت ہے۔ کیوں نہ آپ اپنے علمی مسائل ان بزرگ کی خدمت میں پیش کریں اور دیکھیں کہ وہ ان کا کیا جواب دیتے ہیں۔

دہلی کے ممتاز عالم نے سوچا، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اجودھن میں ٹھہر گئے اور اپنی بہت سی کتابیں لے کر ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کا ذکر ان کے دوست نے کیا تھا۔

بزرگؒ ایک سادہ سی چادر اوڑھے، کمبل پر تشریف فرما تھے۔ ان کا چہرہ ایک پاکیزہ صفت اور مہربان انسان کا چہرہ تھا۔ دہلی سے آنے والے عالم نے سلام کیا پھر اپنے علمی مسائل بزرگؒ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ بزرگؒ نے پہلا مسئلہ پڑھا، اس کے بعد اس پر علمی بحث کا آغاز کر دیا۔ آپؒ مختلف کتابوں اور قدیم فقہا اور علما کے حوالے دیتے جاتے تھے اور مسئلہ سلجھتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں مسئلہ اس طرح حل ہو گیا جیسے یہ کوئی مشکل کام ہی نہ تھا۔ بزرگؒ نے اسی طرح باقی تمام علمی مسائل کو بھی حل کر دیا۔

دہلی کے ممتاز عالم نے دل میں سوچا کہ معمولی سی چادر اوڑھنے والے ان سادہ مزاج بزرگؒ کے سینے میں علم کے کتنے دریا رواں ہیں۔ انہوں نے بخارا جانے کا ارادہ ترک کر دیا، ان کا گوہر مراد یہیں ہاتھ آگیا تھا۔ انہوں نے اب زندگی بھر یہیں ٹھہر کر بزرگؒ کی خدمت کرنے اور ان کے علم سے فیض یاب ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ عظیم بزرگ تھے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ جو بابا فریدؒ کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی دعوت، تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کے نتیجے میں وسیع علاقے میں اسلام کا اجالا پھیلا اور ہزاروں افراد کو راہِ ہدایت میسر آگئی۔ اور دہلی کے ممتاز عالم تھے، حضرت بدر الدین اسحاقؒ جو اپنی بقیہ عمر حضرت فرید الدینؒ کی خدمت میں ان کے معاونِ خاص بن کر رہے۔ بابا فریدؒ نے اپنی ایک صاحبزادی کی شادی حضرت بدرالدین اسحاقؒ سے کر دی تھی۔

آپؒ کا نام مسعود اور لقب فرید الدین ہے۔ تاہم آپؒ گنج شکر کے خطاب سے زیادہ معروف ہیں۔ گنج شکر کا خطاب آپؒ کو کیسے ملا؟؟ اس سلسلے میں تاریخ کی کتابوں میں کئی واقعات بیان کیے گئے ہیں، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مطابق ان میں سے کسی کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ آپؒ نسلاً فاروقی ہیں۔ آپؒ کا نسب بیس واسطوں کے بعد دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ سے مل جاتا ہے۔ آپؒ کے آباؤ اجداد اس علاقے میں آباد ہو گئے تھے، جہاں ان دنوں افغانستان واقع ہے۔ آپؒ کے خاندان میں کابل کے بادشاہ فرخ شاہ عادل بھی شامل تھے۔

Marfat.com

-- چنگیز خان نے کابل اور دیگر علاقوں پر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کیا تو مسلمانوں کی بڑی تعداد نے برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا۔ ان میں حضرت فرید الدینؒ کے دادا، قاضی شعیب بھی شامل تھے۔ وہ اپنے تین بیٹوں کے ساتھ پہلے لاہور آئے جہاں سے وہ ضلع ملتان کے ایک شہر کھوتوال چلے گئے۔ اس قصبے کا نام "کھوتی وال" بھی لکھا گیا ہے۔ آج کل اسے "کوٹھی والی" کہتے ہیں۔ کھوتی وال میں قاضی شعیب کو قاضی (جج) مقرر کر دیا گیا۔ قاضی شعیب کے ایک بیٹے شیخ جمال الدین سلیمان تھے۔ ان کی شادی ملا وجیہ الدین کی بیٹی مرسم خاتون سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ جمال الدین کو تین بیٹوں سے نوازا۔ محمود، مسعود اور متوکل۔ محمود کو اعزالدین کا لقب ملا۔ متوکل، نجیب الدین کہلائے اور مسعود کو فرید الدین کا لقب دیا گیا۔ یہی فرید الدین بڑے ہو کر بہت بڑے عالم اور عظیم صوفی بنے، گنج شکر کہلائے، جنہوں نے مغربی پنجاب کے بڑے حصے میں اسلام کا نور عام کرنے کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔ آپؒ کا سنہ پیدائش ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء ہے۔ تاہم دائرۂ معارف اسلامیہ میں بحث کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ آپؒ کا سنہ پیدائش ۵۷۵ھ / ۱۱۷۹ء ہے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کمسن تھے کہ ان کے والد محترم شیخ جمال الدین کا انتقال ہو گیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد بچوں کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری مرسم خاتون پر آ پڑی۔ وہؒ بہت عبادت گزار، نیک سیرت اور صالح خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ شیخ فریدؒ کو ابتدائی تعلیم کھوتی وال میں خود اپنی نگرانی میں دلوائی، اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملتان بھیج دیا۔

ملتان، ان دنوں بلند پایہ علاکرام کا مرکز تھا اور یہاں تعلیمی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ شیخ فریدؒ ملتان پہنچ کر سرائے حلوائی کے قریب ایک مسجد میں ٹھہر گئے۔ یہاں مولانا منہاج الدین ترمذیؒ درس دیا کرتے تھے۔ شیخ فریدؒ بھی مولانا منہاج الدین ترمذیؒ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ آپؒ نے مولانا منہاج الدین ترمذیؒ کی نگرانی میں قرآن پاک حفظ کیا اور فقہ کی کتاب "نافع" کا درس لیا۔ اسی مسجد میں ایک دن "نافع" کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مسجد میں تشریف لائے۔ انہوں نے نماز ادا کی پھر ایک نوجوان کو انہماک سے کتاب پڑھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا، "کون سی کتاب ہے؟"

نوجوان فرید الدینؒ نے ادب سے جواب دیا "نافع۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا "تمہیں نافع سے نفع ہو گا۔" فرید الدینؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت فرید الدینؒ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ سیر الاولیا کے مطابق فرید الدینؒ نے حضرت بختیار کاکیؒ کے ہاتھ پر بیعت اس وقت کی جب وہ ملتان سے دہلی گئے۔

فرید الدینؒ چاہتے تھے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ساتھ دہلی جائیں اور ان کے علم سے استفادہ کریں۔ آپؒ کچھ دور تک اپنے شیخ کے ساتھ گئے بھی، لیکن شیخؒ نے خود ہی نوجوان فرید الدینؒ کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ پہلے تم علوم ظاہری (مروجہ علوم) کی تکمیل کرو پھر میرے پاس چلے آنا۔

مرشد کی ہدایت پر فرید الدینؒ حصولِ علم کے لیے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پہلے آپؒ قندھار گئے جہاں آپؒ نے پانچ برس قیام کے دوران مختلف علما سے علم حاصل کیا۔ آپؒ سیستان بھی گئے۔ خود حضرت فرید الدینؒ کے کہنے کے مطابق انہوں نے غزنی، بغداد، بخارا، سیوستان اور بدخشاں جا کر بھی علم حاصل کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ "بغداد میں شیخ شہاب الدینؒ سہروردی (وفات: ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے علم سے کئی دن تک استفادہ کیا۔" حضرت فریدؒ کا کہنا ہے کہ جب میں بغداد میں تھا تو اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ اہل اللہ اور صوفیا سے ملاقات کرنے کا موقع مل جائے۔ ہر کسی سے اس بارے میں پوچھتا تھا اور تلاش کرتا رہتا تھا۔ آپؒ نے حضرت سعد الدین حمویؒ، حضرت اوحد الدین کرمانیؒ، حضرت فرید الدین عطار نیشاپوریؒ، حضرت سیف الدین باخرزیؒ اور دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔

طویل عرصے تک ملک ملک کی سیر اور ریاضت کے بعد حضرت فریدؒ دہلی پہنچ گئے۔ اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنے لائق شاگرد کے لیے غزنی دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب کی۔ حضرت فریدؒ، شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے تصوف کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ انہی دنوں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دہلی تشریف لائے۔ آپؒ، فرید الدینؒ کی لگن اور تڑپ سے متاثر ہوئے اور فرمایا "بابا بختیارؒ، فریدؒ ایسی شمع ہے جو درویشوں کے سلسلے کو روشن کر دے گی۔"

کچھ عرصے بعد ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء میں حضرت قطب الدین بختیار

Marfat.com

کاکیؒ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت فرید الدینؒ کو اطلاع ملی تو وہ دہلی پہنچے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ وصیت کر گئے تھے کہ میرے وفات پانے کے بعد میرا خرقہ (گدڑی، پیوند لگا ہوا لباس) اور دیگر اشیا فرید الدین مسعودؒ کو دی جائیں، وہی میرے خلیفہ ہوں گے۔ حضرت فرید الدینؒ دہلی آئے تو حضرت حمید الدین ناگوریؒ نے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی امانتیں حضرت فرید الدینؒ کے حوالے کر دیں۔

شیخ کا خرقہ پہن کر حضرت فرید الدینؒ دہلی میں مسند پر بیٹھے۔ آپؒ کے علم سے استفادہ کرنے والوں کا ہجوم رہنے لگا۔ انہی دنوں برِصغیر کے حکمراں شمس الدین التتمش کا انتقال ہوا تھا اور دہلی کے سیاسی حالات اچھے نہ تھے۔ چنانچہ حضرت فریدؒ دہلی سے ہانسی چلے گئے۔ ہانسی میں بھی آپؒ کے عقیدت مند آپؒ سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ ہانسی سے آپؒ نے اپنے شہر کھوتی وال جانے کا فیصلہ کیا۔ کھوتی وال سے آپؒ لاہور گئے اور حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کے مزار کے قریب ایک ٹیلے پر کچھ عرصے قیام فرمایا۔ پھر آپؒ نے ۶۴۲ھ / ۱۲۴۸ء میں اپنی رہائش کے لیے اجودھن کے مقام کو پسند فرمایا۔ یہ وہی مقام ہے جو اب "پاک پٹن" یا "پاک پتن" کہلاتا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر کو حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے بڑی عقیدت تھی اور ان کی ہدایت پر اجودھن کا نام "پاک پٹن" رکھ دیا گیا۔ "پٹن" سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، آبادی، بستی۔ "پاک پتن"، اب پاکستان کے ضلع ساہیوال کا مشہور شہر ہے۔

اجودھن کا علاقہ اس زمانے میں تقریباً غیر آباد تھا اور بڑے رقبے پر جنگلات پھیلے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں حضرت فرید الدینؒ کو ایک بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ آپؒ نے اپنے بھائی نجیب الدین متوکل کو کھوتوال بھیجا کہ والدہ محترمہ کو وہاں سے لے کر اجودھن چلے آئیں۔ نجیب الدین کھوتوال گئے، لیکن واپسی کے سفر میں والدہ آپؒ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔

اجودھن میں حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے باقاعدہ درس گاہ قائم کر دی۔ اس درس گاہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ آپؒ کے علم سے فیض اٹھانے اور آپؒ سے تربیت حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ یہ محض درس گاہ نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کی اصلاح اور اخلاقی تربیت کا ادارہ بھی تھا اور اسلام کے آفاقی پیغام کو غیر مسلموں تک پہنچانے اور انہیں اسلام کی نعمت سے روشناس کروانے کی ایک عظیم تحریک بھی تھی۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی قیادت میں یہ تحریک بہت تیزی سے پھیلی اور اس نے مغربی پنجاب کے بہت بڑے حصہ کو متاثر کیا۔ اس تحریک کی بدولت ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا، ہزاروں افراد کے کردار و اخلاق سنوارے گئے اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے تربیت یافتہ علماکرام اور صوفیا کی بڑی جماعت تیار ہو گئی۔

یہ درس گاہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی وفات تک، یعنی تقریباً چوبیس برس تک کام کرتی رہی۔ آپؒ کے وصال کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ پر اس تحریک کی ذمے داری آپڑی، اس طرح تحریک کا مرکز دہلی منتقل ہو گیا۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا سب سے بڑا کارنامہ اسلام کی اشاعت ہے جس کے نتیجے میں مغربی پنجاب کے بہت سے غیر مسلم قبائل اور خاندانوں نے اسلام کی نعمت پائی۔ ان علاقوں میں بسنے والے قبائل، راجپوت، سیال، وٹو، کھوکھر، مرہنگوالیان، بھلیان، جکروالیان، بکان، سیان وغیرہ حضرت فریدؒ ہی کی کوششوں سے مسلمان ہوئے۔ ضلع ملتان کے گزیٹیر کے مطابق راجپوتوں کا مشہور قبیلہ "سیال"، ملتان، منٹگمری (ساہیوال) اور جھنگ میں کثرت سے آباد ہے۔ یہ قبیلہ حضرت فریدؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ منٹگمری (ساہیوال) کے گزیٹیر میں بتایا گیا ہے کہ دریائے ستلج کے دونوں بازوؤں پر ساٹھ میل دور تک اور گوگیرہ کے علاقے میں "وٹو" قبیلہ آباد تھا، اسے بھی حضرت فریدؒ نے مسلمان کیا۔ اسی گزیٹیر میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ منٹگمری کے ضلع میں ہندو اچھوتوں کی تعداد ۴۶ ہزار سے زیادہ تھی۔ چھوت چھات کی پابندی کی وجہ سے ان پر روزگار کے دروازے بند تھے۔ جب حضرت فریدؒ کی کوششوں سے یہ ہندو اچھوت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو ان پر روزگار کے دروازے بھی کھل گئے اور انہوں نے کپڑا بننے، کھانا پکانے، پانی بھرنے، رنگ کرنے جیسے مختلف شعبوں کو اختیار کر لیا۔ اس طرح اسلام ان کی آخرت ہی نہیں دنیا بھی سنوارنے کا باعث بنا اور انہیں عزت نصیب ہوئی۔

اجودھن کو گو کہ ابراہیم غزنوی نے ۴۷۲ھ / ۱۰۷۹ء میں فتح کیا تھا، لیکن پھر بھی یہاں ہندو بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ ہندوؤں کا مشہور راج جوگی سمبوناتھ بھی یہیں رہتا تھا۔ حضرت فریدؒ کی تلقین سے متاثر ہو کر وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ ساندل بار کے متعدد جاٹ قبائل

Marfat.com

اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نے حضرت فریدؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ تبلیغ و اصلاح کی تحریک کو منظم کرنا ہے۔ آپؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی آپؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا چاہتا، اسے آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑتی۔ یہ گویا ایک طرح کا حلف نامہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے تھے:

"جب بھی کوئی شخص حضرت فریدؒ کی خدمت میں ارادت کی نیت لے کر آتا تو آپؒ اسے ہدایت کرتے: پہلے ایک بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھو۔ پھر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع تلاوت فرماتے، اس کے بعد دیگر چند آیات تلاوت کرتے۔ اس کے بعد مرید سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ، پاؤں اور آنکھوں کی حفاظت کرے گا اور شریعت کے راستے پر قائم رہے گا۔" (سیر الاولیا)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والے کو فوراً یہ احساس ہو جاتا تھا کہ اسے شریعت کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے۔ اس طرح ابتدا ہی سے عمل کی ترغیب ملتی تھی اور گناہوں سے بچنے کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

حضرت فرید الدینؒ اپنے شاگردوں کو خود بھی تعلیم دیتے تھے اور ان کے تیار کردہ صوفیا بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ جب حضرت فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؒ نے حضرت نظام الدینؒ سے فرمایا، "آپؒ کو کچھ کتابیں مجھ سے پڑھنی ہوں گی۔" چنانچہ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی مشہور کتاب "عوارف المعارف" پڑھائی شروع کی اور اس کے چھ باب خود پڑھائے۔ علم اصول حدیث پر ابو شکور سالمی کی کتاب تمہید المہتدی بھی خود ہی پڑھائی۔ قرآن کریم کے چھ پاروں کا تجوید کے ساتھ درس دیا۔

حضرت فریدؒ نے تمہید المہتدی پڑھانے کے بعد حضرت نظام الدینؒ کو درس کی سند بھی جاری کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت فریدؒ اپنے شاگردوں کو اسناد بھی جاری کرتے ہوں گے۔ اس سند میں تصدیق کی گئی تھی کہ "علم اصولِ حدیث پر سب سے عمدہ کتاب تمہید المہتدی ہے۔ حضرت فرید الدینؒ کے شاگرد حضرت نظام الدینؒ نے یہ کتاب ان سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ وہ صاحبِ استعداد، شائستہ اور مہذب ہیں۔ میں انہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ وہ یہ کتاب طالب علموں کو پڑھائیں بشرطیکہ پڑھانے میں غلطی سے بچیں اور لکھنے اور بات کرنے میں ان سے بھول چوک نہ ہو۔"

حضرت فریدؒ کا درس دینے کا انداز اتنا دلکش اور پُر اثر تھا کہ حضرت نظام الدینؒ ہمیشہ فرماتے تھے کہ اس درس کی لذت ہمیشہ یاد آتی ہے۔

حضرت فرید الدینؒ شریعت کے علم میں کمال حاصل کرنے پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ جب تک شرعی علوم میں دسترس نہ ہوگی، اللہ کی محبت، معرفت اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی۔ آپؒ نے ایک محفل میں فرمایا، "اگر لوگوں پر علم کی اہمیت کا راز افشا ہو جائے تو وہ سارے کام چھوڑ کر علم کی تحصیل میں مصروف ہو جائیں۔ علم ایسا بادل ہے جس سے صرف رحمت برستی ہے۔" اسی محفل میں آپؒ نے ایسے علما کرام پر تنقید کی جنہوں نے علم کو تجارت بنا رکھا ہے۔ اس کے بعد آپؒ یہ سوچ کر آبدیدہ ہوگئے کہ قیامت کے روز ایسے علما کرام کو عذاب دیا جائے گا۔

حضرت فرید الدینؒ کی مسلسل محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپؒ نے قابل صوفیا کرام کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔ آپؒ نے اپنے کئی خلفا کو تبلیغ دین کی ذمے داری دے کر برصغیر کے مختلف گوشوں میں بھیجا۔ آپؒ کے نامور خلفا میں حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ جمال الدین ہانسویؒ، مخدوم علاالدین صابرؒ شامل ہیں۔ آپؒ نے حضرت امام الحق سیالکوٹیؒ کو خلیفہ بنا کر سیالکوٹ روانہ کیا۔ شیخ منتخب الدینؒ کو دکن بھیجا۔ شیخ زین الدین دمشقیؒ، شیخ علی شکر ریزؒ، شیخ محمد سراجؒ، شیخ عارف سیوستانیؒ اور مولانا داؤد پالیؒ بھی آپؒ کے خلفا میں شامل ہیں۔ شیخ نظام الدینؒ سے نظامیہ، شیخ علاء الدین صابرؒ سے صابریہ اور شیخ جمال الدینؒ سے جمالیہ سلسلہ کا اجرا ہوا۔ کچھ عرصے بعد جمالیہ سلسلہ، نظامیہ میں مدغم ہوگیا۔ حضرت فرید الدینؒ شیخ جمال الدینؒ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

حضرت فرید الدینؒ اپنے مریدوں کی اخلاقی تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپؒ خود بھی نماز ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس کی سختی سے تاکید فرماتے تھے۔ آپؒ کا حکم تھا کہ اگر کسی جگہ صرف دو افراد موجود ہوں اور نماز کا وقت ہو جائے تو انہیں بھی باجماعت نماز ادا کرنی چاہیے۔ آپؒ کا یہ حکم حضور ﷺ کے ارشادِ گرامی کے عین مطابق تھا۔ آپؒ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دینی اور دنیاوی نعمت پیدا کی ہے وہ نماز ہے۔ آپؒ خود بھی نفلی روزے رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی نفلی روزے رکھنے کی تاکید فرماتے

Marfat.com

تھے۔ آپؒ نے کئی حج بھی کیے۔ آپؒ اپنے شاگردوں کو قرآن پاک حفظ کرنے کی بھی خاص ہدایت فرماتے تھے۔ آپؒ کو خود بھی تلاوتِ کلامِ پاک بہت پسند تھی۔ آپؒ حافظ قرآن تو تھے ہی، آپؒ کی تجوید یعنی حروف کی ان کے بالکل درست تلفظ کے ساتھ ادائیگی بھی بہت اچھی تھی۔ آپؒ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہر فرد سے اس کی صلاحیت، سمجھ اور ذہنی سطح کے مطابق گفتگو فرماتے تھے۔

حضرت فرید الدینؒ اپنے مریدوں ہی نہیں، خلفا تک کو غلطی پر ٹوک دیتے تھے۔ آپؒ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ سرکاری عہدیداروں، امرا اور دولت مند لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھیں اور ان سے کسی قسم کی مراعات حاصل نہ کریں۔ آپؒ کے ایک خلیفہ نے دہلی میں خانقاہ بنوائی اور ایک سرکاری عہدیدار سے بعض سہولتیں حاصل کرلیں۔ کچھ عرصے بعد وہ عہدیدار کسی الزام میں گرفتار ہوگیا۔ خلیفہ نے حضرت فریدؒ کو خط لکھا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے جواب میں لکھا "جو کوئی اپنی روش پر چلے گا، وہ ضرور ہمیشہ بے چین رہے گا۔ آپؒ نے اپنے پیروں کی روش کے خلاف خانقاہ کیوں بنوائی؟ اور اس میں کیوں بیٹھے؟ حضرت خواجہ قطب الدینؒ اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کی روش اور عادت یہ تو نہیں رہی کہ اپنے لیے خانقاہ بنا کر دکانداری کریں!" (سیر العارفین)۔

حکام سے دور رہنے کے باوجود بہت سے سرکاری عہدیدار اور خود سربراہِ مملکت، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے معتقد تھے۔ شمس الدین التتمش کے بیٹے ناصر الدین محمود ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء تا ۶۶۴ھ /۱۲۶۶ء بھی آپؒ سے عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار وہ اپنے لشکر کے ساتھ اُچ اور ملتان جارہے تھے۔ راستے میں اجودھن میں ٹھہر کر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لشکر کے ہر سپاہی کی خواہش تھی کہ اسے حضرت فرید الدینؒ کو ایک نظر دیکھنے کا موقع مل جائے۔ ناصر الدین محمود آپؒ سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے وزیر الغ خان کو بڑی رقم اور چار دیہات کا ملکیت نامہ دے کر حضرت فریدؒ کی خدمت میں بھیجا۔ الغ خان بعد میں برصغیر کے حکمراں بنے اور غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت فریدؒ نے رقم اور چار دیہات کا ملکیت نامہ شکریہ کے ساتھ واپس کردیا اور فرمایا: "یہ انہیں دے دیجیے جنہیں ان کی ضرورت ہے۔"

جب بلبن حکمراں بنے تو انہوں نے بھی حضرت فریدؒ کے پاس بہت بڑی رقم بھجوائی۔ آپؒ نے لینے سے انکار کردیا، لیکن بلبن کی جانب سے بار بار اصرار ہوا تو آپؒ نے رقم لے لی، مگر فوراً ہی حکم دیا کہ اس رقم کو محتاجوں اور نادار افراد میں تقسیم کردیا جائے۔ آپؒ کے معتمد اور خصوصی معاون مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ساری رقم مساکین اور محتاجوں میں تقسیم کردی۔ حضرت فریدؒ فرماتے تھے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دیا جائے اسراف نہیں ہے اور جو کچھ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ حکومت کے اہلکاروں اور عہدیداروں سے زیادہ میل جول تو نہ رکھتے تھے لیکن جہاں ضرورت پڑتی وہ سرکاری عہدیداروں سے رابطہ قائم کرتے تھے، کسی غلطی پر انہیں ٹوکتے تھے، کسی بات کی طرف توجہ دلاتے تھے، کسی کے جائز کام کے سلسلے میں سفارش کردیتے تھے۔ سفارش کے ضمن میں بھی آپؒ نہایت احتیاط فرماتے۔ ایک بار کسی نے آپ سے درخواست کی کہ برصغیر کے حکمران غیاث الدین بلبن سے ایک معاملے میں سفارش کردیں۔ آپؒ نے بلبن کو یہ خط تحریر فرمایا:

> "میں اس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر آپ اس کو کچھ دے دیں گے تو حقیقی طور پر عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا اور آپ مشکور ہوں گے اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا اور آپ معذور ہوں گے۔"

اس خط کی خوبی یہ ہے کہ حضرت فریدؒ نے برصغیر پاک و ہند کے حکمراں بلبن کو بھی یہ احساس دلادیا کہ تمام تر اختیارات، اتنی بڑی مملکت اور بے پناہ وسائل کے باوجود، اگر وہ کسی کو کچھ دیں گے تو دراصل یہ عمل اللہ تعالیٰ کی رضا اور مہربانی سے ہوگا۔

ایک بار اجودھن کے ایک سرکاری اہلکار، اجودھن کے حاکم کی شکایت لے کر باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حاکم مجھ پر ظلم کرتا ہے۔ باباصاحبؒ نے حاکم کو پیغام بھیجا کہ فریدؒ پر احسان کرو اور اہلکار کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔۔۔ لیکن حاکم کی عداوت میں اور اضافہ ہوگیا۔ اہلکار پھر شکایت لے کر آئے۔ حضرت فریدؒ نے فرمایا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تمہاری سفارش کی اور حاکم نے نہ سنی اسی طرح تم سے بھی کسی نے کسی مظلوم کی سفارش کی ہوگی اور تم نے اس پر دھیان

Marfat.com

نہ دیا ہو گا۔ یہ سن کر وہ اہلکار بہت شرمندہ ہوئے، توبہ کی اور وعدہ کیا کہ اب کسی مظلوم پر ظلم نہیں کریں گے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے حاکم کے رویے میں بہت تبدیلی محسوس کی۔ انہوں نے اس اہلکار کو انعامات بھی دیے۔ اب وہ بہت مہربان ہو چکے تھے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے علم اور روحانی مرتبے کی شہرت ان کی زندگی ہی میں برصغیر پاک و ہند سے باہر دور دراز کے ملکوں میں پھیل چکی تھی۔ مراکش کے مشہور عالم سیاح ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں دو جگہ حضرت بابا فریدؒ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں اپنے ایک سفر میں اسکندریہ (مصر) کے ایک شیخ برہان الدین الاعرج سے حضرت فرید الدینؒ کا نام سنا پھر جب ابن بطوطہ ۷۳۴ھ/۱۳۳۳ء میں سفر کرتے ہوئے برصغیر پہنچے تو انہوں نے اجودھن (پاک پٹن) جا کر حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کی اور حضرت فریدؒ کے پوتے شیخ علاؤالدین سے ملاقات کی۔ حضرت فریدؒ کی عظیم شخصیت کے اثرات اتنے گہرے اور دیرپا تھے کہ اس وقت کے برصغیر پاک و ہند کے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء تا ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) شیخ علاؤالدینؒ کے مرید تھے اور حضرت فریدؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے اکثر آیا کرتے تھے۔ حضرت فریدؒ کو اسی حجرے میں سپرد خاک کیا گیا تھا جہاں ان کا وصال ہوا تھا۔ بعد میں برصغیر کے حکمراں محمد تغلق (۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء تا ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے آپؒ کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کروا دیا تھا۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا زیادہ وقت تبلیغ اسلام اور اپنے مریدوں کی تربیت میں صرف ہوا۔ چنانچہ آپؒ تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؒ نے وقت اور حالات کی ضرورت کے تحت ذاتی طور پر درس و تدریس کے ذریعہ علما کرام اور صوفیا کی جماعتیں تیار کرنے کو زیادہ اہم جانا ہو۔ آپؒ نے اپنے مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ارشادات کو مرتب کیا تھا اور خود آپؒ کے ارشادات و ملفوظات (اقوال، نصیحت، وعظ وغیرہ) آپؒ کے خلفا نے کتابی صورت میں یکجا کیے۔ ان میں سے ایک کتاب "راحت القلوب" ہے جسے آپؒ کے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے مرتب کیا ہے۔ دوسری کتاب، "اسرار الاولیا" ہے جسے حضرت بدرالدین اسحاقؒ نے ترتیب دیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے بے پناہ علم، تجربے اور آپؒ کے صافی دل کی آئینہ دار ہیں۔ ان کتابوں میں جگہ جگہ مشہور کتب کے حوالے ملتے ہیں۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا ادبی ذوق بہت عمدہ تھا۔ آپؒ فارسی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ عربی ادب سے بھی آپؒ کو دلچسپی تھی۔ ایک بار آپؒ کے سامنے ایک شخص نے عربی کے دو اشعار پڑھے اور یہ کہہ کر معذرت کی کہ اس نظم کے باقی اشعار مجھے یاد نہیں ہیں۔ آپؒ نے باقی اشعار سنا دیے۔ آپؒ کبھی کبھی ہندی زبان میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تبلیغ دین کے لیے آپؒ مخاطب کے مزاج اور پسند کے مطابق اس کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی تعلیمات میں دینی فرائض پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور یہی اسلام کی روح کے مطابق بھی ہے۔ آپؒ نماز کی سختی سے تاکید کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ شریعت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے پانچ درہم زکوٰۃ نکالی جائے۔ طریقت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے پانچ درہم اپنے لیے رکھے جائیں اور ایک سو پچانوے درہم اللہ کی راہ میں دے دیے جائیں اور حقیقت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ دو سو درہم میں سے ایک حبہ بھی اپنے لیے نہ رکھا جائے۔ آپؒ نے ایک بار فرمایا: "جب آدمی تین باتوں کو چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے تین باتیں اٹھالیتا ہے۔ جو زکوٰۃ نہیں دیتا، اللہ اس کے مال سے برکت اٹھالیتا ہے۔ جو شخص قربانی نہیں دیتا اللہ اس سے عافیت چھین لیتا ہے، جو نماز نہیں پڑھتا، اللہ مرنے کے وقت اس کے ایمان کو اس سے جدا کر دیتا ہے۔" (راحت القلوب)۔ آپؒ نے درویشوں کے متعلق فرمایا کہ جو درویش اس دنیائے فانی کی عزت و جاہ کا طلب گار اور اہلِ دنیا کے لطف و کرم کا خواہش مند ہے وہ درویش نہیں ہے بلکہ درویشوں کو بدنام کرنے والا اور طریقت کا مرتد ہے۔

عام طور پر بزرگوں کے مرتبے کا تعین ان کی کرامتوں کی تعداد اور نوعیت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے۔ خود حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا: "کرامت کا اظہار کرنا پست حوصلے والوں کا کام ہے۔ مشائخ نے اس کے اظہار کو پسند نہیں کیا ہے، کیونکہ اس سے نفس میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔" (راحت القلوب)۔ ایک موقع پر آپؒ نے فرمایا: "میں نے چار چیزوں کے متعلق سات سو بزرگوں سے سوال کیا، سب نے ایک ہی متفقہ جواب دیا، ا۔ لوگوں میں سب سے عقل مند وہ ہے جس نے دنیا کو ترک کیا، ۲۔ سب سے بزرگ وہ ہے جو کسی شے سے نہ

Marfat.com

بدلا، ۳۔ سب سے غنی وہ ہے جو قناعت کرتا ہے، ۴۔ سب سے محتاج وہ ہے جس نے قناعت کو ترک کر دیا۔"

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کو سرورِ دوعالم حضرت محمد ﷺ سے بہت محبت اور عقیدت تھی۔ جب بھی حضور ﷺ کا ذکر ہوتا، آپؒ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایک بار حضور ﷺ کے وصال کا ذکر خود فرمایا اور اتنے روئے کہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔ ہوش آیا تو فرمایا: "جس ﷺ کے واسطے تمام عالم پیدا کیا گیا جب اسی ﷺ کو اس عالم سے اٹھا لیا گیا تو دوسرے ناچیز بندوں کی کیا حیثیت ہے کہ زندگی کی خواہش کریں۔ ہم خود کو جانے والوں میں شمار کریں۔ غفلت کا پردہ زمین سے اٹھادیں اور زادِ راہ کی فکر میں لگے رہیں۔"

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بہت منکسر المزاج اور شفیق تھے۔ آپؒ کی خدمت میں لوگ تحائف لے کر آتے تھے، انواع و اقسام کے کھانے پیش کرتے تھے، آپؒ ان سے کبھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔ تمام اشیا ضرورت مندوں اور مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ آپؒ کا دروازہ ناداروں اور بے کسوں کے لیے نصف شب تک کھلا رہتا تھا۔ آپؒ بچوں سے بہت محبت فرماتے تھے۔ آپؒ کی خدمت میں لوگ جو مٹھائی پیش کرتے وہ اجودھن کے بچوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ایک بار چند افراد آئے۔ آپؒ کے گھر میں جوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ حضرت فریدؒ نے خود جوار پیسا اور روٹیاں پکا کر مہمانوں کو پیش کر دیں۔

آپؒ اصلاحِ معاشرہ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ کوئی سرکاری عہدیدار کسی کے ساتھ زیادتی کرتا تو اسے ظلم سے باز آجانے کی تلقین فرماتے۔ کسی بے قصور کو سزا دی جارہی ہوتی تو اسے اس مشکل سے نجات دلاتے، گناہوں میں مبتلا لوگوں کو اپنی دلنشیں گفتگو کے ذریعے نیکی کا راستہ دکھاتے۔ کسی شخص اور اس کی بیوی میں تنازعہ یا جدائی ہوجاتی تو کوشش کر کے دونوں کے درمیان صلح صفائی کروادیتے۔ لوگ آپؒ سے بیماروں کے لیے بھی خصوصی دعائیں کرواتے تھے۔ آپؒ بہت ملنسار تھے اور ہر آنے والے سے اس طرح محبت سے ملتے تھے جیسے اسے بہت عرصے سے جانتے ہوں۔

حضرت فریدؒ کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ آپؒ کی سادگی، زندگی کے تمام لمحات پر محیط تھی۔ آپؒ کے خصوصی معاون حضرت بدرالدین اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بابا فریدؒ کی برسوں خدمت کی اور میں نے ہمیشہ ان کے ظاہر و باطن کو یکساں پایا۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ ان کا طرزِ عمل، رویہ اور عادات، تنہائی میں کچھ اور ہوں اور عام افراد کے سامنے کچھ اور۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی ایک شادی ایک بیوہ خاتون سے ہوئی تھی اور ایک شادی ایک روایت کے مطابق غیاث الدین بلبن کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ بلبن نے بابا صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ حضرت فرید الدینؒ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ صاحب زادے اور تین صاحبزادیاں عطا کی تھیں۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے جن بزرگانِ دین سے علم حاصل کیا، ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بغداد کے مشہور عالم حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے تو آپؒ کو اتنی عقیدت تھی کہ آپؒ نے اپنے ایک لڑکے کا نام شہاب الدین رکھا۔ آپؒ اپنے ہم عصر صوفیا کرام سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ ملتان کے عظیم صوفی بزرگ حضرت بہاالدین زکریاؒ، آپؒ کے تقریباً ہم عمر تھے۔ دونوں بزرگوں کے مابین خط و کتابت رہتی تھی۔ حضرت فریدؒ، حضرت بہاالدین زکریاؒ کو "شیخ الاسلام" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

۵ محرم ۶۷۰ھ / ۱۳ اگست ۱۲۷۱ء کی شب حضرت بابا فریدؒ نے نمازِ عشا جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد آپؒ پر غشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو پہلا سوال یہی کیا کہ کیا میں نے عشا کی نماز ادا کر لی ہے۔ آپؒ کے بستر کے گرد لوگوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! آپ نماز عشا ادا کر چکے ہیں، لیکن آپؒ کی تسلی نہ ہوئی، دوبارہ نماز ادا کی، پھر اپنے خصوصی معاون مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو ہدایت کی کہ جو خرقہ مجھے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملا تھا اسے بدایوں کے نظام الدینؒ کو پہنچا دینا۔ گویا آپؒ نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ پھر آپؒ نے وضو کے لیے پانی منگوایا، دو رکعت نماز ادا کی، پھر سجدے میں گر گئے اور اسی حالت میں آپؒ کا وصال ہوگیا۔ وصال کے وقت آپؒ کی زبان پر "یاحیُّ یاقیُّوم" کے الفاظ جاری تھے۔

•••

Marfat.com

مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ

جیّد عالم، صوفی اور شاعر جن کی مثنوی نے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا

وہ جمعہ کا دن تھا۔

قونیہ کی ایک وسیع مسجد میں جہاں تک دیکھو، انسانی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ منبر پر ایک دراز قامت بزرگ تشریف فرما تھے۔ ان کا چہرہ معرفتِ الٰہی کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ ایک قاری ان کے قریب موجود تھے جو قرآن پاک کی آیات تلاوت کرتے تھے اور پھر بزرگ ان آیات کی تفسیر بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ حاضرین محویت کے عالم میں اس تفسیر کو سن رہے تھے۔ اچانک بزرگ کے بیان کا تسلسل ایک صاحب کے کھڑے ہو جانے کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ حاضرین کی توجہ ان صاحب کی طرف مبذول ہو گئی جو کہہ رہے تھے کہ مولانا، آپ پہلے سے مقررہ آیتوں کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں۔

بزرگ نے اعتراض سنا اور بڑی متانت سے فرمایا: "آپ کوئی سورۃ پڑھیں، میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔" ان صاحب نے سورۃ الضحیٰ کی تلاوت کی۔ بزرگؒ نے "والضحیٰ" کے "و" کی شرح بیان فرمانی شروع کی۔ الفاظ و معانی کا ایک دریا تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، تشریح و مطالب کی ایک دنیا تھی جو حاضرین کے سامنے پیش کی جا رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر گئے، حاضرین پر جیسے کسی نے سحر کر دیا تھا، ایک وجد کی کیفیت طاری تھی، نماز کا وقت ہوا تو بزرگ نے اپنی بات وہیں پر روک دی۔ اعتراض کرنے والے صاحب سخت شرمندہ تھے۔ انہیں شاید بزرگ کی وسعتِ علمی کا اندازہ نہیں تھا۔ ہر زبان پر مولانا کی علمیت اور قوتِ بیان کا چرچا تھا۔

اس واقعے کے بعد بزرگ نے اس طرح کبھی وعظ نہ کیا اور فرمایا: "جس قدر میری شہرت بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر میں بلا میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں۔"

یہ بزرگ تھے، عالمِ اسلام کے عظیم مفکر، متبحر عالمِ دین، صاحبِ کشف و علم، صوفی شاعر، مولانا جلال الدین رومیؒ، جن کا عارفانہ کلام گزشتہ سات صدیوں سے امتِ مسلمہ کی اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ آپؒ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپ اصلاح و تبلیغ کے فرض سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ آپ کی بدولت اٹھارہ ہزار غیر مسلموں کو اسلام کی نعمت نصیب ہوئی۔

آپؒ کا نام محمد، لقب جلال الدین اور عرفیت مولانا رومیؒ ہے۔ آپؒ کے اسلاف بلخ کے رہنے والے تھے جو آج کل افغانستان کا حصہ ہے۔ مولانا رومیؒ ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ / ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے دادا حسین بن احمد خطیبیؒ بڑے صاحبِ علم اور فاضل شخص تھے۔ آپؒ کے والد مولانا بہاالدینؒ بھی بہت بڑے عالم تھے اور سلطان العلما کہلاتے تھے۔

مولانا رومیؒ جس زمانے میں اس دنیا میں تشریف لائے، یہ وہ دور تھا جب اسلام شمالی افریقہ تک پھیل چکا تھا اور یورپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ برِ صغیر (پاک و ہند) میں شہاب الدین غوری کی اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اسلام کے ثقافتی اثرات دنیا کے بڑے حصے میں پھیل چکے تھے لیکن اسلام دشمنوں نے مسلمانوں کو عقائد اور علم کلام کی بحثوں میں الجھا رکھا تھا۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ کوئی مردِ مومن اٹھے جو دلوں کو ایمان باللہ کے نور سے بھر دے۔

یہی وہ دور ہے جب مغرب کی طرف سے صلیبی فوجیں یلغار کر رہی تھیں اور مشرق کی طرف سے تاتاری سیلاب امڈ رہا تھا، لیکن امتِ مسلمہ پر یہ اللہ کا خاص کرم تھا کہ اس نے مسلمانوں کو مولانا جلال الدین رومیؒ جیسی صاحبِ کشف و علم ہستی عطا کی جنہوں نے اصلاح و تربیت کا کٹھن کام اس خوبی سے انجام دیا کہ اللہ کے فضل و کرم سے اسی صدی کے آخری حصے میں اسلام کے دشمن، اسلام کے نام لیوا بن گئے۔

Marfat.com

تاتاری حکمران برکہ خاں نے اسلام قبول کر لیا اور ان ہی مغلوں نے اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دیں، جو کبھی اسلام کو (نعوذ باللہ) صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے تھے۔

مولانا رومیؒ کے والد محترم مولانا بہاالدین محمدؒ، امام غزالیؒ سے بہت متاثر تھے۔ امام غزالیؒ کا انتقال مولانا بہاالدین محمدؒ کی پیدائش سے چند سال قبل ہو چکا تھا، لیکن امام صاحب نے فلسفے کے نظام پر بے خوفی کے ساتھ جو عالمانہ تنقید کی تھی، اس کے اثرات ابھی تک بڑے نمایاں تھے۔ چنانچہ مولانا رومیؒ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گھرانے میں امام غزالیؒ کی تعلیمات کا چرچا تھا۔ یوں بھی یہ ایک علم پرور گھرانا تھا، جس پر صوفیانہ رنگ غالب تھا۔ چنانچہ ایسے ماحول میں مولانا رومیؒ کی فطری صلاحیتوں کو بھرپور جِلا ملی اور ان کی پاکیزہ سیرت کے گوہر اور زیادہ نکھر گئے۔

یہ وہ عہد تھا جب بچوں کو قرآن کریم اور حدیث کا مطالعہ کروایا جاتا تھا، پھر فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ حساب، منطق، طبیعیات، مابعد الطبیعیات، سیاسیات اور فلسفۂ اخلاق کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا بہاالدینؒ کو اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال تھا۔ اسی غرض سے انہوں نے اپنے ایک معتمد اور چہیتے مرید سید برہان الدینؒ محقق ترمذی کو اپنے بیٹے کا اتالیق مقرر فرمایا۔ سید برہان الدینؒ بڑے بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ آپؒ نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے لائق شاگرد کو پانچ برس تک تعلیم دی۔ اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مولانا بہاالدین کو ۶۱۰ھ میں بلخ کی سکونت ترک کرنی پڑی۔ اس کی وجہ مختلف مؤرخین نے مختلف بیان کی ہے، لیکن اصل وجہ غالباً یہی ہے کہ آپؒ کو اس علاقے پر منگولوں کے حملے کا اندیشہ تھا اور آپؒ نے اس علاقے کے حکمران محمد شاہ خوارزم کو خبردار بھی کر دیا تھا۔

مولانا بہاالدینؒ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بلخ سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں جس شہر سے گزرتے، آپؒ کا پرجوش خیر مقدم ہوتا۔ آپؒ نیشاپور پہنچے جہاں مشہور بزرگ شاعر خواجہ فرید الدینؒ عطار سے آپؒ کی ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحبؒ نے ننھے جلال الدین (رومیؒ) کو دیکھا تو آپؒ کے والد مولانا بہاالدینؒ سے کہا، ”اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا۔“ یہ کہہ کر آپؒ نے اپنی کتاب ”اسرار نامہ“ ننھے رومیؒ کو مرحمت فرمائی۔ مولانا رومیؒ نے اس کتاب کو آخر دم تک عزیز رکھا۔

نیشاپور سے مولانا کے والد اپنے اہل خانہ کو لے کر بغداد پہنچے۔ بغداد میں روم کے سلجوقی حکمراں علاؤالدین کیقباد کے کچھ سفارت کار بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ مولانا بہاالدینؒ سے مل کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے واپس جا کر علاؤالدین کیقباد سے انؒ کا ذکر کیا۔ مولانا بہاالدینؒ بغداد سے مکہ مکرمہ پہنچے، حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس مبارک فریضے کی ادائیگی میں ننھے رومیؒ ان کے ساتھ تھے۔ مکہ مکرمہ سے یہ خاندان دمشق اور پھر زنجان چلا گیا۔ زنجان میں فخر الدین بہرام شاہ حکمران تھا جو بڑا علم دوست تھا۔

زنجان سے مولانا بہاالدینؒ نے ملاطیہ کا رخ کیا۔ آپؒ کے ہمسفروں نے آذربائیجان میں قیام کرنا چاہا مگر آپؒ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا۔ والیٔ آذربائیجان کی ملکہ، عصمت خاتون خود آپؒ کو روکنے کے لیے پہنچیں، ان کے بے حد اصرار پر مولانا بہاالدینؒ نے خواہش ظاہر کی کہ قصبہ آقشہر میں آپؒ کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کر دیا جائے، چنانچہ فوری طور پر ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا۔ مولانا بہاالدینؒ نے اس مدرسے میں چار سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ آذربائیجان کے والی تلک فخر الدین اور ملکہ عصمت خاتون کے انتقال کے بعد سلطانُ العلما مولانا بہاالدینؒ لارندہ چلے آئے۔ یہاں بھی ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا اور مولانا بہاالدینؒ نے سات برس تک یہاں تعلیم دی۔

سمرقند کے ایک معزز بزرگ خواجہ شرف الدین سمرقندیؒ بھی لارندہ آ گئے تھے۔ مولانا بہاالدینؒ کی خواہش پر خواجہ شرف الدین کی بیٹی گوہر خاتون کی شادی، مولانا جلال الدین رومیؒ سے کر دی گئی۔ اس وقت مولاناؒ کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال تھی۔ ۶۲۳ھ میں مولاناؒ کے پہلے فرزند رشید سلطان پیدا ہوئے، مولانا کے دوسرے بیٹے علاؤالدین بھی لارندہ ہی میں پیدا ہوئے۔

روم کے حکمراں علاؤالدین کیقباد کے دور میں تاتاریوں کا فتنہ نمودار ہو چکا تھا اور چنگیز خان نے بلخ، بخارا، سمرقند، نیشاپور، ہرات اور مرو میں تباہی مچادی تھی۔ چنانچہ تمام متاثرہ علاقوں سے لوگ پناہ لینے کے لیے قونیہ کا رُخ کر رہے تھے۔ یہ شہر موجودہ ترکی کے شمالی حصے میں واقع ہے۔ علاؤالدین کیقباد علم پرور حکمراں تھے۔ انہوں نے قونیہ آنے والی علمی شخصیات کو بہت عزت دی اور مولانا بہاالدینؒ کو بھی قونیہ آنے کی دعوت دی۔ مولانا بہاالدینؒ نے دعوت قبول کر لی اور لارندہ سے قونیہ منتقل ہو گئے۔ اس وقت مولانا رومیؒ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ علاؤالدین کیقباد نے مولانا بہاالدینؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

Marfat.com

قونیہ میں قیام کے دو سال بعد مولانا رومیؒ کو ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ۶۲۸ھ میں مولانا کے والد سلطان العلما مولانا بہاؤالدینؒ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد تمام اکابر کی نگاہ مولانا رومیؒ پر پڑی اور اتفاق رائے سے مولانا رومیؒ کو اپنے والد کا جانشین چن لیا گیا۔ ان دنوں مولانا رومی کے اتالیق، سید برہان الدین محقق ترمذی اپنے وطن ترمذ میں تھے۔ انہیں اپنے مرشد مولانا بہاؤالدینؒ کے انتقال کی اطلاع ملی تو وہ اشکبار آنکھوں کے ساتھ قونیہ پہنچے۔ پیارے شاگرد جلال الدین رومیؒ کو گلے لگا لیا۔ یہ جان کر انہیں بہت مسرت ہوئی کہ ان کے ہونہار شاگرد نے تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: "اب علم باطنی رہ گیا ہے، اس کی تعلیم تمہیں دیتا ہوں۔"

مولانا رومیؒ اپنے تبحر علم کے باوجود اب بھی علم کے حصول کے متلاشی تھے۔ علم کی پیاس ہنوز باقی تھی۔ اپنی تشنگی دور کرنے کی غرض سے انہوں نے ۶۳۰ھ میں شام کا رخ کیا۔ اس زمانے میں دمشق بہت بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ مولاناؒ پہلے حلب پہنچے۔ یہاں صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے کئی مدرسے قائم کیے تھے۔ مولانا نے مدرسہ حلاویہ میں مولانا کمال الدین ابن عدیمؒ سے تحصیل علم کی۔ دیگر کئی مدارس سے بھی استفادہ کیا۔ پھر حلب سے آپؒ دمشق پہنچے۔ یہاں بڑے بڑے علمائے کرام درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مولانا رومیؒ دمشق سے بہت متاثر ہوئے۔ آپؒ نے بعد میں اپنے بیٹے کو بھی حصولِ علم کی خاطر دمشق بھیجا۔

دمشق میں آپؒ کا قیام چار برس رہا، جہاں مدرسہ مقدسیہ میں آپؒ نے اپنی تشنہ کامی علم کا سامان کیا۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ، شیخ سعد الدین حمویؒ، شیخ عثمان مرویؒ، شیخ اوحدالدین کرمانیؒ اور شیخ صدرالدین قونویؒ، جیسے صاحبانِ علم کے ساتھ آپؒ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ۶۳۵ھ میں آپؒ دمشق سے واپس قونیہ چلے آئے۔ علاؤالدین کیقباد کے اتالیق امیر بدرالدین گہر تاش نے یہاں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا تھا۔ آپؒ واپس آکر اسی مدرسہ میں قیام پذیر ہوئے حالانکہ آپؒ کو عظیم الشان محلات کی پیشکش کی گئی تھی۔

قونیہ میں آپؒ نے درس و تدریس کی ذمے داری سنبھال لی۔ مولانا کے اکثر ساتھی بھی قونیہ آ گئے، اس طرح قونیہ علماکرام کا بڑا مرکز بن گیا۔ مولانا رومیؒ کے مدرسے میں چار سو سے زائد طلبہ تھے۔ مولاناؒ اپنے مدرسے کے علاوہ دیگر تین مدارس میں بھی درس دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں آپؒ نے فتویٰ نویسی کا بھی باقاعدہ آغاز کیا۔

قونیہ میں مولانا رومیؒ کے درس و مواعظ کا یہ سلسلہ ۶۴۲ھ تک باقاعدگی سے جاری رہا۔ پھر ایک ایسی شخصیت مولاناؒ کی زندگی میں داخل ہوئی جس نے مولاناؒ کے خیالات و افکار پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ اس شخصیت کے روحانی تاثر نے مولاناؒ کے دل کی کیفیت یکسر بدل کر رکھ دی۔ یہ شخصیت ایک بہت بڑے بزرگ اور صوفی حضرت شمس تبریزؒ کی تھی۔ حضرت شمس تبریزؒ سے مولانا رومؒ کی ملاقات کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت شمس تبریزؒ کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کو سن کر مولانا رومیؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور آپؒ حضرت شمس تبریزؒ کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد کیفیت یہ تھی کہ مولانا رومیؒ اور حضرت شمس تبریزؒ گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھے رہتے تھے اور معرفتِ الٰہی اور تصوف کی گفتگو جاری رہتی تھی۔

۶۴۵ھ میں حضرت شمس تبریزؒ لاپتا ہو گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ انہیں شہید کر دیا گیا، لیکن درست روایت غالباً یہی ہے کہ حضرت شمس تبریزؒ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گئے۔ آپؒ کی جدائی سے مولانا رومیؒ کو بہت قلق ہوا، پھر آپؒ نے ۶۴۷ھ میں شیخ صلاح الدین زرکوبؒ کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا۔ مولاناؒ ہی کی خواہش پر ان کے بیٹے سلطان ولد کی شادی، شیخ صلاح الدینؒ زرکوب کی صاحبزادی فاطمہ خاتون سے کر دی گئی۔ یکم محرم ۶۵۷ھ کو صلاح الدینؒ زرکوب رحلت فرما گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا رومیؒ نے حسام الدینؒ چلپی کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔

۶۷۲ھ میں مولانا رومیؒ علیل ہو گئے۔ اطبا نے علاج کی بڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مولانا رومیؒ نے بیماری کے عالم میں مولانا حسام الدین چلپیؒ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اپنے مریدوں کو نصیحتیں کیں کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں۔ ۶ جمادی الآخر ۶۷۲ھ/۱۳ دسمبر ۱۲۷۳ء کو غروبِ آفتاب کے وقت عالمِ اسلام کے اس نیر تاباں نے دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ رات میں آپؒ کی تجہیز و تدفین ہوئی۔ مولانا امتیاز الدینؒ نے غسل دیا۔ صبح کو جنازہ کے لیے لے جایا گیا تو زبردست ازدحام تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلم بھی آہ و زاری کرتے ساتھ چل رہے تھے۔

آپؒ کی وصیت کے مطابق شیخ صدرالدینؒ کو نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے

Marfat.com

کہا گیا، لیکن وہ آپؒ کی جدائی کے صدمے سے نڈھال تھے۔ آخر قاضی سراج الدینؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مولانا رومیؒ کو ان کے والد محترم مولانا بہاؤالدینؒ کے مقبرے کے اندر ہی دفن کیا گیا۔ قونیہ (ترکی) میں آج بھی مولانا رومیؒ کا مزار موجود ہے جہاں ہزاروں عقیدت مند آکر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ مزار سے متصل عمارتوں میں کئی عجائب گھر اور ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ایک عجائب گھر میں مولانا کی ذاتی استعمال کی اشیاء رکھی گئی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کو بہت سے لوگ ان کی مثنوی کے حوالے سے ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا رومیؒ کی شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے۔ آپؒ ایک متبحر عالم دین، مفتی اور واعظ ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کے بھی ماہر تھے۔ آپؒ نے سیکڑوں برس قبل کہہ دیا تھا کہ تمام اجرام فلکی کشش رکھتے ہیں اور زمین اس کائنات میں معلق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر لوہے پر چاروں طرف سے مقناطیس کی کشش اثر کر رہی ہو تو لوہا معلق ہو جائے گا۔ آپؒ نے تجاذبِ ذرات پر بھی لکھا۔ آج یہ بات سب جانتے ہیں کہ ہمارے جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔ پرانے خلیات ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات لے لیتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ پورے جسم کے خلیات نئے ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا یہی نظریہ آج سے سیکڑوں برس قبل مولانا رومیؒ نے بیان فرما دیا تھا۔

مولانا رومیؒ کی شخصیت ایک باعمل انسان کی شخصیت تھی۔ آپ کے انداز و اطوار، نشست و برخاست، لباس، طعام، معمولات، عبادات غرض ہر فعل سے یہ صاف ظاہر تھا کہ آپؒ حد درجہ متقی اور شریعت کے پابند انسان تھے۔ نماز کا وقت ہوتا تو آپؒ قبلہ کی طرف اپنا رُخ کر لیتے، آپؒ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو جاتا۔ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو خشوع و خضوع کی کیفیت آپ کے پورے سراپا پر طاری ہو جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات میں نماز (تہجد) کے لیے کھڑے ہوئے تو دو رکعتوں میں صبح ہو گئی۔ ایک بار سردیوں کے موسم میں نماز ادا کر رہے تھے، قرآن پاک کی آیات تلاوت کرتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سجدہ میں تشریف لے گئے تو اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے ڈاڑھی تر ہو گئی اور یہ آنسو جم کر برف کی شکل اختیار کر گئے۔ فریدون بن احمدؒ سپہ سالار آپؒ کے شاگرد تھے۔ چالیس سال تک آپؒ کی خدمت میں موجود رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا کو کبھی شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، نیند کا غلبہ ہو جاتا تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ اکثر روزے رکھتے تھے۔

آپؒ کو مال و دولت سے بالکل دلچسپی نہ تھی لیکن عقیدت مند آکر جو کچھ پیش کرتے تھے اسے لوگوں کا دل رکھنے کے لیے قبول فرما لیتے تھے۔ پھر یہ سب مال و دولت اور اشیا اپنے خلیفہ شیخ صلاح الدین یا حسام الدین چلپیؒ کے پاس بھجوا دیتے تھے، جہاں سے یہ سامان آپؒ کے مریدوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ طبیعت میں جود و سخا اور فیاضی کا رنگ غالب تھا، جب کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو آزردہ ہو جاتے اور ان کی مدد فرماتے۔ مولانا رومیؒ ضرورت مندوں اور مستحقین کی مدد کے لیے امرا اور حاکموں کو سفارشی خطوط بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ دن میں اس نوعیت کے کئی خطوط لکھے جاتے تھے۔

آپؒ بہت رحم دل اور درگزر کرنے والے تھے۔ ایک بار ایک شخص آیا، آپ نماز میں مشغول تھے۔ وہ آپؒ کا غالیچہ اٹھا کر لے گیا اور بازار میں جا کر فروخت کرنے لگا۔ آپؒ کے ایک ساتھی خواجہ فخر الدین نے اس شخص کو پکڑ لیا اور مولانا کے پاس لے آئے۔ مولاناؒ نے خواجہ صاحب سے فرمایا: "اس شخص نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے، اس سے یہ غالیچہ خرید لیا جائے۔"

مولانا رومیؒ کی ذات، قناعت پسند اور بے نیازی کی روشن تصویر ہے۔ آپؒ اپنے مریدوں سے کبھی کچھ طلب نہ فرماتے تھے۔ آپؒ کو یہ بات بڑی ناپسند تھی کہ کوئی شخص محض صدقات اور ہدیوں پر گزر بسر کرے۔ آپؒ اپنے مریدوں کو ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ صدقات پر گزر نہ کریں۔ ایک بار فرمایا: "اولیاﷲ نے سوال کو ذلتِ نفس کے لیے جائز رکھا تھا، میں نے اس در کو بند کر دیا ہے تاکہ میرے مرید اپنی محنت سے کمائیں یا تجارت میں مصروف ہوں۔"

آپؒ نہایت حلیم طبیعت کے مالک تھے، کسی کو تکلیف دینا پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک بار غسل کے لیے حمام تشریف لے گئے لیکن فوراً باہر نکل آئے، لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ حمام کے منتظم نے میری خاطر، ایک شخص کو حمام سے ہٹا دیا، مجھے یہ بات اچھی نہ لگی تو میں باہر نکل آیا۔ ایک بار راستے سے گزر رہے تھے، دو افراد سرِ راہ لڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا، "تو مجھے ایک کہے تو ہزار سنے گا۔" آپؒ آگے بڑھے اور فرمایا "جو کچھ کہنا ہو مجھے کہو، ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔" دونوں افراد یہ سن کر بڑے شرمندہ ہوئے اور انہوں نے آپس میں صلح کر لی۔

Marfat.com

اپنے علم کی بے پناہ وسعت کے باوجود، مولانا رومیؒ اپنے اساتذہ کا بے حد احترام فرماتے تھے اور ان کے سامنے اپنے علم کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایک بار شیخ صدر الدین قونویؒ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ شیخ نے بڑی محبت سے بٹھایا۔ آپؒ ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ حاضرین میں سے ایک درویش نے مولانا رومیؒ سے پوچھا، "فقر کسے کہتے ہیں؟" مولاناؒ نے سکوت اختیار فرمایا۔ درویش نے اپنا سوال دہرایا۔ لیکن مولاناؒ خاموش رہے۔ تیسری بار پوچھے جانے پر بھی آپؒ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب مولاناؒ اٹھ کر چلے گئے تو شیخ صدر الدین قونویؒ نے اس درویش سے کہا، "اس سوال کا یہ کیا موقع تھا۔ چپ رہنے سے مولاناؒ کا مقصد یہ تھا کہ فقیر جب اللہ کو پہچان لیتا ہے تو اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔" یعنی مولاناؒ اپنے عمل کے ذریعے درویش کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ شیخ نے جو بات فرمائی ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اصل بات غالباً یہ تھی کہ مولانا رومیؒ شیخ کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کی موجودگی میں کبھی نماز کی امامت نہیں فرماتے تھے۔

مولانا رومیؒ نے اپنی تمام تر عملی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، امتِ مسلمہ کے اصل فریضے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) کو بھی پوری طرح انجام دیا۔ آپؒ کے دور میں مملکتِ روم کی حکمرانی یکے بعد دیگرے تین اشخاص، علاؤالدین کیقباد، غیاث الدین کیخسرو، اور رُکن الدین قلیج ارسلان کے پاس آئی۔ آپؒ نے ان تمام حکمرانوں کو وقتاً فوقتاً نصیحتیں فرمائیں اور جہاں کہیں ضروری سمجھا ان کے غلط طرزِ عمل پر انہیں تنبیہ بھی کی۔ آپؒ حکمرانوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہ فرماتے تھے، ایک امیر نے معذرت کی کہ میں ذرا مصروف رہتا ہوں اور آپؒ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو پاتا ہوں۔ فرمایا، معذرت کی ضرورت نہیں، میں آپ کے آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں۔ رُکن الدین قلیج ارسلان کے زمانے میں معین الدین پروانہ حاجب (وزیرِ اعظم) تھے۔ وہ مولاناؒ کے بہت عقیدت مند تھے اور اکثر آکر آپؒ سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔

مولانا رومیؒ نے دیوان کے علاوہ "فیہ مافیہ" کے عنوان سے اپنے اقوال کی کتاب بھی مرتب فرمائی لیکن ان کا زندۂ جاوید کارنامہ اس مثنوی کی تخلیق ہے جس نے پورے عالمِ اسلام میں اصلاحِ نفس، خود احتسابی اور اسلام کے صحیح فہم کی روح کو بیدار کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولاناؒ کو بذاتِ خود شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی، انہوں نے شاعری سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ لوگ چونکہ شعر کے پیرائے میں بات سننا پسند کرتے ہیں اس لیے میں نے یہ ذریعۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب تک حضرت شمس تبریزؒ آپؒ کی زندگی میں داخل نہ ہوئے تھے، آپؒ نے اشعار نہیں کہے، ۳۷ برس کی عمر میں آپؒ نے شعر کہنا شروع کیے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب آپؒ کی حضرت شمس تبریزؒ سے ملاقات ہوئی تھی۔ ۶۴۳ھ سے ۶۵۹ھ تک آپؒ نے غزلیں کہیں۔

مولانا رومیؒ کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ آپؒ نے شعر کو حُسن و عشق کے روایتی ماحول سے نکال کر معرفت و اصلاح کی راہ دکھائی۔ آپؒ نے اس عرصے میں ڈھائی ہزار غزلیں کہیں اور پچاس ہزار اشعار پر مشتمل آپؒ کا دیوان مرتب ہوا۔ مولاناؒ کے قلم کی خوبی یہ ہے کہ وہ قصیدہ گوئی سے پاک ہے۔ مولاناؒ نے ۱۶۰۰ کے قریب رباعیات بھی کہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تخلص کا اہتمام بھی نہ کیا بلکہ کئی جگہ اپنے محبوب و مرشد حضرت شمس تبریزؒ کا نام استعمال کیا ہے۔ آپؒ کی زندگی کے آخری بارہ سال مثنوی کی تخلیق میں بسر ہوئے۔ مثنوی کی تخلیق میں آپؒ کے ہمدم و ہمراز مولانا حسام الدین چلپیؒ کا بڑا کردار ہے۔ انہی کی ترغیب و اعانت سے مولانا رومیؒ نے اس مثنوی کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

مثنوی کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک دن مولانا حسام الدین چلپیؒ، مولانا رومی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے، سنائی اور عطار کی مثنویوں جیسی کوئی چیز تخلیق فرمائیں۔ مولاناؒ نے فرمایا، میرا بھی یہی خیال تھا اور اپنے عمامے سے ایک کاغذ نکال کر دکھایا جس پر اٹھارہ اشعار درج تھے۔ یہی اٹھارہ اشعار آپؒ کی مثنوی کا آغاز بنے، اس کے بعد صورت یہ تھی کہ مولانا رومیؒ اور مولانا چلپیؒ رات رات بھر بیٹھ کر کام کرتے۔ مولانا رومیؒ اشعار کہتے جاتے اور مولانا چلپیؒ انہیں لکھتے جاتے اور ساتھ ساتھ اپنی مترنم آواز میں انہیں گنگناتے بھی جاتے۔ اس طرح بارہ برس کی مدت میں مولانا رومیؒ نے پچیس ہزار سات سو اشعار قلمبند کروائے۔ یہ مثنوی معنوی کہلاتی ہے اور چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ مولانا رومیؒ نے اس مثنوی کو اپنے خلیفہ مولانا حسام الدین کی نسبت سے "حسامی نامہ" قرار دیا ہے۔

Marfat.com

مثنوی معنوی نے عالم اسلام کے افکار اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایران میں چار کتب بے حد مقبول ہوئیں یعنی شاہ نامہ، گلستان، دیوانِ حافظ اور مثنوی۔ ان چاروں کتب میں سب سے زیادہ مقبولیت مثنوی مولانا رومی کو حاصل ہوئی۔ مثنوی سے قبل اخلاقیات اور تصوف کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں ان میں مختلف عنوانات کے تحت حکایات درج کی جاتی تھیں یا علمی انداز میں مسائل بیان ہوتے تھے۔ شاعری کے میدان میں ایسے موضوعات رائج تھے جن کا اصلاح و تربیت سے تعلق نہ تھا۔ یہ مولانا رومیؒ کا کمال ہے کہ انہوں نے قصہ گوئی اور حکایت نویسی کے انداز میں ہر قسم کے موضوع پر بڑی دانائی کی باتیں رقم کر دیں، جنھیں پڑھ کر ایک خلقت کو علمی اور فکری رہنمائی میسر آئی۔ مولانا رومیؒ نے ایسی حکایتیں بیان فرمائی ہیں جن کا نتیجہ اچھوتا اور متاثر کن ہے۔

مثنوی نہ صرف تصوف اور طریقت کی کتاب ہے بلکہ اس میں عقائد کی بھی اصلاح کی گئی ہے اور علم کلام کے حوالے سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی مکمل طور پر بیخ کنی کر دی گئی ہے۔ مولانا رومیؒ نے جب ساتویں صدی ہجری میں درس و تدریس کا فریضہ سنبھالا، اس وقت پورے عالم اسلام میں ظاہر پرستی اور عقلیت پسندی کا دور دورہ تھا۔ کسی شے کا وجود اس وقت تک تسلیم نہ کیا جاتا تھا جب تک اسے عقلی دلائل سے ثابت نہ کر دیا جاتا، مولاناؒ نے اپنی مثنوی کے ذریعے علم کلام کو غلط راہ اختیار کرنے سے روک دیا اور عقلیت پرستی کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔

آپؒ نے ثابت کیا کہ انسان کو حواسِ باطنی بھی نصیب ہیں۔ معرفتِ نفس کے لیے تزکیۂ نفس بہت ضروری ہے۔ دل کی تختی جس قدر صاف ستھری ہوگی، ایمان اسی قدر روشن اور اجاگر ہوگا۔ مولاناؒ عمل، جدوجہد اور اجتماعی زندگی کے شدت سے حامی ہیں۔ آپؒ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کو اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ، جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) کی تاکید کیوں کی گئی۔ آپؒ نے ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت، ملائکہ، روح، آخرت، جبر و قدر اور توکل پر بھی بڑے دلنشیں پیرائے میں بحث کی ہے۔

مثنوی مولاناؒ روم کا شمار، ادبِ اسلامی کی ان کتب میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے بہت طویل عرصے تک عالم اسلام پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ گزشتہ سات صدیوں سے مثنوی مولاناؒ روم اس دنیا کے طول و عرض میں اصلاح و ارشاد کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ مثنوی نے شاعری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ یہ مثنوی ہی ہے جس نے بیسویں صدی میں چھانے والے مادیت کے غلبے کا مقابلہ کیا اور یورپ کے فلسفے اور سائنس کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک کو رفع کر ڈالا۔ برصغیر پاک و ہند کے اہلِ علم حضرات کی بڑی تعداد اس مثنوی سے براہِ راست متاثر ہوئی ہے۔ خود بیسویں صدی کے عظیم مفکر حکیم الامت علامہ اقبالؒ مولانا رومیؒ کے بہت زیادہ معترف ہیں اور بار بار انہوں نے مولانا رومی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور انہیں ”پیر رومیؒ“ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

مثنوی مولانائے روم کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں کمال الدین حسین خوارزمی کی شرح فارسی میں، اور اسماعیل بن احمد کی شرح ترکی میں بہت مشہور ہیں۔ اردو میں مولانا نذیر احمد نے مفتاح العلوم کے نام سے مثنوی مولانائے روم کی شرح تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق اردو میں مرتب شدہ، مولانا اشرف علی تھانوی کی شرح نثر میں اور سیماب اکبر آبادی کی منظوم شرح بہت مشہور ہیں۔ آج مثنوی مولانا روم، یورپ اور امریکا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی، مقبول ترین کتابوں میں شامل ہے۔

•••

Marfat.com

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ چشتیہ کی اصلاحی تحریک کو برصغیر میں منظم کرنے والے صوفیا کے تاجدار

رات کی تاریکی دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔

صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ شہر میں بسنے والے ابھی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ شہر کے پُر رونق بازاروں میں سناٹا تھا اور سڑکیں ویران تھیں۔ درخت بھی یوں سر جھکائے کھڑے تھے، گویا انہیں بھی نیند آگئی ہو۔ ایسے میں شہر کی ایک دو منزلہ عمارت کی کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس عمارت کے رہنے والے سحر خیزی کے عادی ہیں۔

عمارت کے اندر ایک صاحب، خوان میں کھانے پینے کی مختلف اشیا رکھ رہے تھے۔ خوان سجانے کے بعد انہوں نے اسے اٹھالیا۔ ان کا رخ اب زینے کی جانب تھا۔ وہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے عمارت کی سب سے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔

بالائی منزل کے ایک کمرے کے دروازے پر انہوں نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ خوان لے کر اندر داخل ہوگئے۔ دروازہ ایک بزرگ نے کھولا تھا۔ ان بزرگ کا چہرہ بڑا پرکشش لیکن نہایت بارعب تھا۔ ان کی خوابیدہ سی آنکھوں سے محبت و شفقت جھلکتی تھی۔ اندر آنے والے صاحب نے خوان بزرگ کے سامنے رکھ دیا اور خود ایک جانب مؤدب ہو کر کھڑے ہوگئے۔

کچھ دیر گزر گئی۔ بزرگ نے ابھی تک خوان میں سے ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔ آنے والے صاحب نے عرض کی، ”سحری کا وقت نکلا جارہا ہے، آپ کچھ تو نوش فرمائیں۔“

بزرگ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں فرمایا، ”کتنے ہی نادار اور بیکس افراد فاقے سے ہوں گے انہوں نے اسی عالم میں رات گزاری ہوگی، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے اتر سکتا ہے۔“

بزرگ نے ان صاحب کے اصرار کے باوجود خوان سے ایک لقمہ تک نہ لیا اور سحری کے بغیر ہی روزہ رکھ لیا۔

یہ بزرگ تھے صوفیا کے عظیم تاجدار حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے اَن تھک محنت کے ذریعے، برصغیر میں چشتیہ سلسلہ کی اصلاحی تحریک کو بے حد منظم اور مستحکم کر دیا اور ہزاروں انسانوں کو نیکی اور نجات کا راستہ دکھایا۔ آپؒ نے دلوں میں شریعت پر عمل کا جو بیج بویا وہ اتنا بار آور ثابت ہوا کہ اس کے ثمرات پورے برصغیر پاک وہند میں پھیل گئے۔

آپؒ کا نام سید محمد اور والد کا نام احمد بن علی ہے۔ آپؒ کو کئی القاب دیے گئے جن میں محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، سلطان الاولیا اور نظام الدین اولیا شامل ہیں۔ آخر الذکر لقب کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی چنانچہ آپؒ آج بھی ”نظام الدینؒ اولیا“ کے لقب سے معروف ہیں۔

آپؒ ۲۷ر صفر المظفر ۶۳۶ھ / ۱۵ اکتوبر ۱۲۳۸ء کو مشہور شہر بدایوں میں پیدا ہوئے، یہ شہر اس زمانے میں بداؤں کہلاتا تھا اور اسے دہلی کے سرحدی شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور میں بدایوں بہت پُر رونق اور آباد شہر تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب، منگولوں کی یلغار کی وجہ سے بخارا سے یہاں آگئے تھے۔

حضرت نظام الدینؒ پانچ برس کی عمر کو پہنچے تو آپؒ کے والدِ محترم رحلت فرماگئے۔ آپؒ کی اور آپؒ کی ہمشیرہ کی پرورش اور تربیت کی گراں بار ذمہ داری آپؒ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا پر آپڑی۔ بی بی زلیخا نہایت متقی، پرہیز گار اور باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کی پرورش کے لیے دن رات محنت کی اور انہیں اخلاق و آداب کے زیور سے آراستہ کیا۔ جب آپؒ پڑھنے کے قابل ہوئے تو والدہ صاحبہ نے آپ کو مولانا علاؤالدین اصولی کے پاس پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ مولانا

Marfat.com

علاءالدین" اصولی سے آپؒ نے تفسیر، فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔

جب آپؒ یہ تعلیم حاصل کر چکے تو مولانا علاءالدینؒ نے انہیں ہدایت کی کہ اب دستارِ فضیلت باندھو۔ یہ گویا ایک قسم کی سند تھی۔ اب حضرت نظام الدینؒ نے لغت کا علم حاصل کرنا شروع کیا۔

جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عمر ۱۶ برس کی ہوئی تو آپؒ، والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بدایوں سے دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی آ کر بھی آپؒ نے حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپؒ معاشی مشکلات سے دوچار رہے، فقر و فاقہ کی سختیاں بھی سہنی پڑیں، ذاتی مکان نہ ہونے کی وجہ سے بار بار سکونت تبدیل کرنی پڑی لیکن آپؒ علم کے موتی چننے میں مصروف رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت تھی اور ان کے قابل وزیر غیاث الدین بلبن عملاً حکمرانی کر رہے تھے۔ دہلی اس دور میں بڑے لائق اور جید علماکرام اور اساتذہ کا مرکز تھا۔ ان علماکرام میں سب سے نمایاں نام مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ، مولانا شمس الدین خوارزمیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ آپؒ نے اپنی ذہانت، حافظے، محنت اور علم سے لگاؤ کی بدولت بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ مولانا شمس الدین خوارزمیؒ نے بھی آپؒ کی ذات میں چھپے ہوئے جواہر کو محسوس کر لیا اور آپؒ کو اپنے خاص تلامذہ میں شامل کر لیا۔

کچھ ہی عرصے میں آپؒ کے علمی تبحر، زورِ بیاں، طاقتِ گفتار اور استدلال میں مہارت کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ آپؒ جس بھی علمی بحث و مباحثے میں شرکت فرماتے وہاں آپؒ کے دلائل کے آگے بند باندھنے کی کسی میں جرأت نہ ہوتی اور آپؒ کے پیش کردہ حقائق سے اختلافات کوئی کم ہی کر پاتا تھا۔ آپؒ کی اس غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے لوگ آپ کو "مولانا نظام الدینؒ محفل شکن" کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔

دہلی ہی میں آپؒ کی والدہ محترمہ سفرِ آخرت پر روانہ ہوئیں۔ اب حضرت نظام الدین اولیاؒ، عظیم صوفی بزرگ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے بھائی شیخ نجیب الدینؒ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ شیخ نجیبؒ کی زبانی حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے تذکرے سن کر، آپؒ کے دل میں، حضرت فریدؒ سے ملنے کا اشتیاق شدت اختیار کر گیا۔ آخر ایک دن آپؒ سفر کی تیاری کر کے اجودھن (موجودہ پاک پتن) پہنچ گئے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے آنے والے نوجوان کو عزت سے بٹھایا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عمر بیس برس تھی۔ اسی قیام میں حضرت نظام الدینؒ نے بابا فریدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپؒ نے اپنے مرشد سے دریافت کیا کہ اب میں تعلیم کا سلسلہ روک کر عبادات، اذکار اور نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ بابا فریدؒ نے فرمایا، "میں کسی کو تعلیم سے الگ نہیں کرواتا، درویش کو علم بھی چاہیے۔" پھر حضرت فرید الدینؒ نے فرمایا، "نظام، تم کو کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی ہوں گی۔" لہٰذا حضرت فریدؒ نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی تصوف پر مشہور کتاب "عوارف المعارف"، پڑھانی شروع کی۔ اس کتاب کے چھ باب حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حضرت بابا فریدؒ ہی سے پڑھے۔ بابا فریدؒ نے انہیں تمہید ابو شکور سالمی بھی پڑھائی اس کے علاوہ قرآن پاک کے چھ پاروں کی تجوید کے ساتھ تعلیم دی۔

ایک دن حضرت بابا فریدؒ نے آپ کو نماز جمعہ کے بعد طلب فرمایا، خلافت (نیابت) عطا کی۔ قرآن کریم حفظ کرنے کی ہدایت فرمائی اور دہلی جانے کا حکم دیا۔ پھر نصیحت فرمائی، "دہلی جانا تو مجاہدے میں مشغول رہنا بیکار نہ رہنا۔" بابا فریدؒ نے خلافت نامہ دیتے ہوئے کہا کہ "تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سائے میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ اب اپنے شیخ کے حکم کے مطابق دہلی واپس آ گئے۔ آپؒ کے علم کی دھوم تو پہلے ہی سے تھی، اب حضرت بابا فریدؒ کی تعلیم نے آپ کی شخصیت کو اور بھی زیادہ آبدار بنا دیا تھا۔ آپؒ کو بڑی سے بڑی عدالت میں منصف (جج) کا عہدہ یا شیخ الاسلام کا منصب مل سکتا تھا لیکن آپؒ نے دہلی آ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تقریباً آٹھ برس کے عرصے میں آپؒ نے اجودھن جا کر شیخ فریدؒ کی خدمت میں تین بار حاضری دی۔ اس عرصے میں آپؒ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ آخری بار شیخ فریدؒ کے انتقال سے تین یا چار ماہ قبل جانا ہوا۔ حضرت فریدؒ نے آپ کو پھر دہلی بھیج دیا جہاں کچھ عرصے بعد آپؒ کو اپنے شیخ کے وصال کی اندوہناک اطلاع ملی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی کہ بابا فریدؒ نے آپؒ کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے اپنی نشانیاں آپؒ کے سپرد کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ پر اب ایک بھاری ذمہ داری آپڑی

Marfat.com

تھی۔ چشتیہ سلسلے کی وہ تحریک جس کا بیج برصغیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بویا تھا اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اسے منظم کیا تھا، اب اسی تحریک کو پھیلانے اور مستحکم بنانے کا فریضہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ یہ محرم ۶۷۰ھ / اگست ۱۲۷۱ء کی بات ہے، اس زمانے میں برصغیر پر غیاث الدین بلبن کی حکومت تھی۔

آپؒ فرماتے ہیں کہ شروع شروع میں دہلی میں دل نہیں لگتا تھا، چنانچہ میں غیاث پور چلا گیا تھا (غیاث پور دہلی سے متصل ایک بستی تھی)۔ اب تک کئی بار سکونت تبدیل کر چکے تھے آخر آپؒ کے ایک مرید نے ایک سہ منزلہ عمارت آپ کے لیے تعمیر کروادی۔ یہی عمارت ہندوستان بھر کے لوگوں کے لیے رشد و ہدایت کا مرکز بنی۔

کچھ عرصے بعد لوگ دینی مسائل معلوم کرنے اور دین کا علم سیکھنے کے لیے آپؒ کے پاس اسی عمارت میں آنے لگے۔ ہر آنے والا آپؒ کے لیے بیش قیمت تحائف لے کر آتا۔ آپؒ ان تحائف میں سے ایک ذرہ بھی اپنے پاس نہ رکھتے بلکہ سب کا سب توشہ خانے میں رکھوادیتے۔ آپؒ کی کوشش ہوتی کہ جو کچھ تحائف آئے ہیں وہ اسی دن مستحقین اور مساکین میں تقسیم ہو جائیں۔ اس غرض سے آپؒ ہر تھوڑی دیر بعد اپنے کسی ماتحت کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیتے کہ جو کچھ جمع ہوا ہے اسے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی یہ خانقاہ، برصغیر میں ایک بڑے فلاحی ادارے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

آپؒ کے معمولاتِ زندگی میں ایک انتہائی سادہ مزاج درویش کی شان جھلکتی ہے۔ آپؒ ممنوع دنوں کو چھوڑ کر ہمیشہ روزے سے رہتے تھے۔ آپؒ کی سحری بہت معمولی اور تھوڑی خوراک پر مشتمل ہوتی۔ فجر کی نماز کے بعد لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہر فرد اپنی ضرورت یا مسئلہ لے کر حاضر ہوتا۔ ساتھ ساتھ علمی گفتگو بھی جاری رہتی۔

نمازِ ظہر کے بعد علمی مجلس پھر آراستہ ہوتی۔ اب کی بار اس میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اور باقاعدہ کسی موضوع پر درس دیتے اور علمی نکات کو گہرائی کے ساتھ بیان فرماتے۔ علامہ زمخشریؒ کی تفسیر کلام پاک اور دیگر کتب کا درس ہوتا۔ عصر کی نماز کے بعد اوپر اپنی قیام گاہ میں تشریف لے جاتے۔ نمازِ مغرب سے ذرا دیر قبل پھر نیچے تشریف لے آتے۔ اس وقت بھی علمی گفتگو جاری رہتی۔ تمام حاضرین کو پھل، خشک میوے اور مشروبات پیش کیے جاتے۔ افطار اور نماز مغرب کے بعد واپس بالائی منزل پر تشریف لے جاتے۔ آپؒ کے تلامذہ اور دیگر افراد کو بھی اوپر بلایا جاتا، وہیں کھانا حاضر کر دیا جاتا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ خود تو برائے نام کھاتے لیکن دیگر حضرات کو اصرار کر کے پیش کرتے۔

نمازِ عشا کی ادائیگی کے لیے آپؒ نیچے تشریف لاتے۔ نماز کے بعد واپس بالائی منزل پر اپنے کمرے میں تشریف لے جاتے تھے۔ اس موقع پر آپؒ کے قریبی اعزہ مثلاً ہمشیرہ صاحبہ کے پوتے آپؒ کے پاس چلے جاتے۔ آپؒ کے محبوب شاگرد حضرت امیر خسرو کو بھی اس موقع پر آپ کے پاس آنے کی اجازت تھی۔ آپؒ سے کچھ دیر گفتگو کے بعد تمام لوگ رخصت ہو جاتے۔ آپؒ کے وضو کے لیے پانی رکھ دیا جاتا، پھر آپؒ عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کو علم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ آپؒ تصوف کے لیے علم کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ آپؒ کی علمی جستجو کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے ۴۳ برس کی عمر میں یعنی ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء میں حضرت بابا فریدؒ کے وصال کے دس برس بعد، حدیث کا درس لیا۔ آپ کو علم حدیث کی تعلیم اس وقت کے مشہور محدث مولانا کمال الدین زاہد محمد بن احمد ماریکلیؒ نے دی۔ مولانا کمال الدینؒ حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کے مؤلف امام حسن بن محمد صغانیؒ کے شاگرد تھے۔

"مشارق الانوار" میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ۲ ہزار ۲ سو ۴۶ احادیث جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب برصغیر میں بہت مقبول ہوئی۔ مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی اور عالمِ اسلام کے ممتاز علما کرام نے اس کی ڈھائی ہزار سے زائد شرحیں اور حواشی تحریر فرمائے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے "مشارق الانوار" کو حفظ فرمالیا تھا۔ آپؒ نے جب مولانا کمال الدینؒ سے حدیث کی تعلیم مکمل کرلی تو آپؒ کو سند دی گئی۔ آپؒ کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سند پر آپؒ کے لیے "شیخ الامام العالم" کے القاب درج ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ کا ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ آپؒ کو صرف و نحو پر بھی عبور تھا۔ حضرت امیر خسرو جو فارسی کے بہت بڑے شاعر ہیں، ابتدا میں آپؒ سے اپنے اشعار پر اصلاح لیا کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے مریدوں کو بھی حصولِ علم کی بڑی تاکید فرماتے تھے اور علوم کی تکمیل نہ کرنے والوں کو "خلافت" عطا

Marfat.com

کرنے سے گریز کرتے تھے۔ لکھنوتی (بنگال) سے ایک نوجوان مولانا سراج الدینؒ آپؒ کی خدمت میں آکر رہا کرتے تھے۔ عرصہ دراز تک یہی ہوتا رہا کہ سال کے اختتام پر وہ والدہ محترمہ سے ملنے کے لیے لکھنوتی چلے جاتے اور چند دن بعد پھر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ جب حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے مریدوں کو خلافت دینے کا فیصلہ فرمانے لگے تو مولانا سراج الدینؒ کا نام بھی تجویز ہوا۔ اس پر آپؒ نے فرمایا، "اس کام میں پہلا درجہ علم کا ہے۔" یہ سن کر مولانا فخر الدینؒ رازی نے مولانا سراج الدین کی تدریس کی ذمہ داری قبول کرلی۔ مولانا فخر الدینؒ کی محنت اور مولانا سراج الدینؒ کی لگن کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد مولانا سراج الدینؒ ایک جید عالم کے طور پر ابھرے جس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے انہیں خلافت عطا فرمائی اور "آئینۂ ہند" کا خطاب دیا۔ مولانا سراج الدینؒ "اخی سراج" کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے بنگال کی سرزمین پر چشتیہ تحریک کو منظم فرمایا، اور اصلاح و تربیت کا نظام قائم کیا اور ایک کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں، "پیر ایسا ہونا چاہیے جو احکام شریعت، طریقت، اور حقیقت کا علم رکھتا ہو، اگر ایسا ہوگا تو وہ خود ہی کسی غیر شرعی بات کے لیے نہیں کہے گا۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ کو فروغِ علم سے اس قدر دلچسپی تھی کہ آپ کی ہدایت پر ہر ماہ تین ہزار طالب علموں کو وظائف (اسکالرشپ) ملا کرتے تھے۔ آپؒ اپنے شاگردوں کو قرآن کریم حفظ کرنے کی ہدایت بھی فرماتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ، تدریس کے ساتھ اپنے مریدوں کی تربیت بھی فرماتے رہتے تھے۔ ان کے معمولات کے بارے میں وقتاً فوقتاً دریافت کرتے رہتے تھے۔ ایک بار آپؒ نے امیر حسن سجزی سے پوچھا، "آپ باقاعدگی سے نماز باجماعت ادا کر رہے ہیں؟" امیر حسنؒ نے جواب دیا، "میرے گھر کے نزدیک ایک مسجد ہے تو، لیکن ہم جس جگہ رہتے ہیں اگر ہم وہاں سے اٹھ کر چلے جائیں تو کوئی ایسا فرد موجود نہیں ہوتا جو ہمارے کاغذات اور کتابوں کا دھیان رکھے اس لیے گھر پر ہی نماز باجماعت ادا کرلیتے ہیں۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے یہ سنا تو فرمایا، "نماز باجماعت ہی ادا ہونی چاہیے لیکن افضل جماعت وہ ہے جو مسجد میں ادا کی جائے۔" ایک اور موقع پر آپؒ نے فرمایا کہ ایک جگہ نماز ادا کرنے والے چاہے صرف دو ہوں، تب بھی انہیں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنی چاہیے۔ آپؒ اپنے مریدوں سے یہ بھی پوچھتے رہتے تھے کہ کس قسم کے افراد کے درمیان ان کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے تصوف کے بارے میں پھیلے ہوئے نظریات کی اصلاح بھی فرمائی اور وقتاً فوقتاً تنبیہ کے ذریعے درست اور اسلامی نقطۂ نظر اپنے شاگردوں پر واضح کیا۔ آپؒ اپنے مریدوں کو خلافت عطا کرتے ہوئے تلقین فرماتے تھے:

"تارک الدنیا ہو جاؤ، دنیا اور اہل دنیا کی طرف میلان نہ رکھو۔ گاؤں جاگیر قبول نہ کرو اور بادشاہوں سے صلہ نہ لو۔" آپؒ نے "تارک دنیا" کے بارے میں وضاحت یوں فرمائی: "ترکِ دنیا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خود کو برہنہ کر دے مثلاً لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے، کھانے کھائے، جو کچھ میسر آئے اسے استعمال کرے لیکن اسے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو اور اپنے دل کو کسی دنیاوی شے میں الجھا نہ لے۔"

آپؒ کے ایک شاگرد مولانا نصیر الدین محمودؒ نے جو بعد میں آپؒ کے جانشین ہوئے، آپؒ سے دریافت کیا کہ "میں اودھ میں رہتا ہوں وہاں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے اپنی مشغولیت میں خلل پڑتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں کسی صحرا یا کسی پہاڑ پر چلا جاؤں اور وہاں عبادت کروں۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا، "تم کو اللہ کی مخلوق کے درمیان ہی رہنا ہوگا، انسانوں کی بے مروتی اور بے رخی کو برداشت کرنا ہوگا اور اس کا بدلہ سخاوت اور ایثار سے دینا ہوگا۔"

آپؒ نے کرامت کے اظہار کے سختی سے ممانعت فرمائی۔ آپؒ کے بعض تلامذہ نے کرامت کے اظہار کی خواہش ظاہر کی تو آپؒ نے انہیں روک دیا۔ آپؒ نے ایک موقع پر فرمایا: "اللہ نے اپنے اولیاؒ پر کرامت کا چھپانا اسی طرح فرض کیا ہے جس طرح اپنے انبیا کرامؑ پر معجزے کا ظاہر کرنا فرض کیا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی کرامت کا اظہار کرتا ہے تو وہ ایک فرض کو ترک کرتا ہے۔ ایسا کرکے اس نے کون سا اچھا کام کیا؟"

حضرت نظام الدین اولیاؒ خود بھی اس بات کا بے حد اہتمام کرتے تھے کہ آپؒ کے تمام افعال نہ صرف شریعت کے احکام کے مطابق انجام پائیں بلکہ آپؒ کی زندگی رسول اقدس ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے

Marfat.com

مطابق بسر ہو۔ آپؒ نہ صرف فرائض بلکہ سنتوں، نوافل اور مستحبات کی ادائیگی کا بھی خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ آپؒ کا ارشاد ہے: "رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور اتباع پر مضبوطی اور ثابت قدمی دکھانی چاہیے اور کوئی مستحب فوت نہ ہونے پائے۔" آپؒ نماز ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ آپؒ کا یہ معمول زندگی بھر رہا، حتیٰ کہ جب آپؒ کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی، تب بھی آپؒ جماعت سے نماز ادا کرنے کے لیے بالائی منزل سے اتر کر نیچے تشریف لاتے تھے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی اصلاحی تحریک بڑی ثمر بار ثابت ہوئی۔ اس کے اثرات ہر شعبۂ زندگی تک پہنچے۔ مشہور مؤرخ مولانا ضیاالدین برنی، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ فیروز شاہی میں" حضرت نظام الدین اولیاؒ کی اصلاحی تحریک کے ثمرات کا جائزہ بڑے خوب صورت اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مولانا ضیاالدین برنی لکھتے ہیں کہ "علاالدین خلجی کے زمانے میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وجہ سے ہزاروں گناہ گاروں نے توبہ کی اور وہ نماز کے پابند ہوگئے۔ آپؒ نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا۔ آپؒ کے زیادہ تر مرید چاشت اور اشراق کی نمازیں بھی ادا کرنے لگے تھے۔ نیک دل افراد نے دہلی شہر سے غیاث پور تک جگہ جگہ چبوترے بنوا دیے تھے، ان پر سائبان ڈال دیے گئے تھے، چٹائیاں بچھوا دی گئی تھی۔ یہاں پانی سے بھرے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیے گئے تھے۔ قریب ہی کنویں کھدوائے گئے تھے۔ ہر سائبان میں خادم مقرر تھے تاکہ شہر سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ تک جانے اور وہاں سے آنے والے افراد کو وضو کرنے اور نماز ادا کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔"

"ہر سائبان میں نفل نمازیں ادا کرنے والوں کا ہجوم رہنے لگا تھا۔ شہر میں لوگ نمازوں، دعاؤں اور اذکار کے بارے میں آپس میں بات چیت کرتے تھے۔ آبادی کی اکثریت میں قرآن حفظ کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پرانے مریدوں کے ذمہ نئے مریدوں کی تربیت کا کام تھا۔ حکمران علاالدین خلجی کے محل میں بہت سے افسران اور ملازم، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔ شہر کا کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں ہر ماہ یا بیس دن بعد دینی اجتماع نہ ہوتا ہو۔ طالب علموں میں تصوف اور دینی کتب کے مطالعہ کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور دینی کتب کی نقول تیار کرنے اور ان کی فروخت میں اضافہ ہو گیا تھا۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی اصلاحی تحریک، اشاعتِ اسلام کی تحریک بھی ثابت ہوئی۔ اجودھن میں آپؒ نے ہندو جوگیوں سے سوال و جواب کی نشستیں رکھیں۔ دہلی اور غیاث پور میں بھی ہر مذہب کے لوگوں میں تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری فرمایا۔ جب آپؒ نے حضرت بابا فریدؒ کے جانشین کی حیثیت سے ذمے داری سنبھالی تو اس وقت برصغیر پر غیاث الدین بلبن کی حکومت تھی۔ بلبن کے زمانے میں دہلی کے نواحی علاقے میوات پر غیر مسلم رہزنوں کا قبضہ تھا اور انہوں نے اطراف کے علاقوں میں آئے دن لوٹ مار کر کے ان علاقوں کے شہریوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، میوات کا علاقہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرکز غیاث پور سے جنوب میں واقع ہے۔ مؤرخین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بڑی تعداد میں میواتی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی کوششوں سے مسلمان ہوئے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مطابق شیخ نظام الدین اولیاؒ کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ہندو اسلام کے گرویدہ ہوگئے۔ بعض اپنے رشتے داروں کے ڈر سے اپنے اسلام قبول کرنے کو چھپاتے تھے لیکن دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہونے والوں میں ایک ہندو شخص "کنو" بھی تھا۔ "کنو" مسلمان ہونے کے بعد خان جہان تلنگانی کے نام سے فیروز شاہ تغلق کے وزیر اعظم بنے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی تحریک بڑی ہمہ گیر تحریک تھی۔ آپؒ نے غیاث پور میں مسندِ ارشاد پر پچاس برس کا طویل عرصہ گزارا۔ اس عرصے میں نہ صرف ملک بھر سے آنے والے لاکھوں افراد کی عملی، اخلاقی اور روحانی تربیت فرمائی بلکہ اپنے خلفا کو تعلیم و تربیت کے بعد برصغیر کے مختلف حصوں میں روانہ کیا۔ تاریخ مشائخ چشت کے مطابق "آپؒ نے بڑے بڑے شہروں میں ایسے سات سو خلفا (نائبین) روانہ کیے تھے کہ ان میں سے ہر شخص کے سینے سے گویا عرفان کا آفتاب طلوع ہوتا تھا۔" آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے کئی خلفا نے خود مختلف علاقوں میں جا کر دینی خدمات انجام دیں اور چشتیہ تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان میں اخی سراجؒ نے بنگال، بہار اور آسام کے علاقوں میں چشتیہ سلسلے کی دینی تحریک کو مستحکم کیا۔ دکن میں پہنچنے والے ایک بڑے چشتی بزرگ حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ تھے۔ بعد ازاں حضرت سید

Marfat.com

محمد گیسو درازؒ نے دکن پہنچ کر گلبرگہ میں چشتیہ سلسلے کی عظیم الشان خانقاہ قائم فرمائی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے خلفا شیخ سید حسنؒ، شیخ حسام الدین ملتانیؒ اور شاہ بارک اللہؒ کو گجرات میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ آپؒ نے شیخ وجیہ الدین یوسفؒ کو چندیری، شیخ کمالؒ کو مالوہ اور مولانا مغیث الدینؒ کو اجین بھیجا تھا۔ حضرت نظام الدینؒ نے اپنا جانشین حضرت نصیر الدینؒ کو مقرر فرمایا تھا جو " چراغِ دہلی " کے لقب سے معروف ہوئے۔ انہوں نے دہلی، اودھ، پنجاب اور گجرات میں اصلاح و تربیت کا نظام منظم رکھا۔ خواجہ حسن نظامی کے مطابق چین میں بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک خلیفہ تھے۔ ان کا نام خواجہ سالار حسنین تھا۔ انہوں نے چین میں سلسلہ نظامیہ قائم کر کے اسلام کی تبلیغ کی۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنی پوری زندگی حکمرانوں سے الگ تھلگ رہے۔ آپؒ اپنی زندگی میں صرف ایک بار ایک مناظرے کے لیے حکمران کے ایوان میں تشریف لے گئے ورنہ آپؒ نے حکمرانوں سے کبھی تعلق نہ رکھا، نہ ان سے کوئی مراعات قبول فرمائیں۔ آپؒ نے اپنے قیامِ دہلی و غیاث پور میں پانچ سربراہانِ مملکت کا زمانہ دیکھا لیکن کوئی حکمران آپؒ کو اپنے پاس آنے پر آمادہ نہ کر سکا۔

آپؒ کے اس طرزِ عمل سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آپؒ حکمرانوں سے لاتعلق رہے۔ آپؒ کی شخصیت اور آپؒ کی تحریک، حکمرانوں اور ان کے نظامِ حکومت پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہوئی۔ آپؒ نے نیک نفس حکمرانوں کے لیے ہمیشہ اچھے کلمات ارشاد فرمائے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ شمس الدین التتمش کا ذکر آپؒ نے کئی بار عزت احترام اور محبت سے فرمایا بلکہ التتمش کے بعض اقوال اور افعال کو بطور نصیحت اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کیا۔ آپؒ نے التتمش کے صاحبزادے اور جانشین ناصر الدین محمود نیز غیاث الدین بلبن کے نام کے ساتھ بھی ہمیشہ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ استعمال کیے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے خلفا کو تو حکمرانوں سے ملنے، ان کی ملازمت کرنے اور ان سے تحائف وصول کرنے سے منع فرماتے تھے لیکن آپؒ کے عام مریدوں کے لیے ایسی کوئی پابندی نہ تھی۔ آپؒ کے محبوب مرید امیر خسرو، حکمرانوں کے بہت قریب تھے، ماہانہ تنخواہ پاتے تھے، حکمرانوں کے ساتھ دوروں پر جاتے تھے لیکن آپؒ نے انہیں کبھی ایسا کرنے سے منع نہ فرمایا بلکہ ہمیشہ اپنے سے قریب رکھا اور ان پر خصوصی توجہ فرمائی۔ اس کے برخلاف اپنے بعض مریدوں کو آپؒ نے خود حکمرانوں سے دور رکھا۔ بلبن کے بعد جلال الدین خلجی اور پھر علاؤالدین خلجی حکمراں بنے۔ یہ دونوں، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے معتقد تھے۔ علاؤالدین خلجی کے دونوں بیٹے خضر خان اور شادی خان، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔

علاؤالدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ اور پھر چار سال بعد خسرو خان بر سر اقتدار آئے۔ اس کے چار ماہ بعد ملتان اور دیپال پور کے صوبے دار غازی ملک نے خسرو خان کو ہٹا کر اقتدار حاصل کر لیا۔ وہ غیاث الدین تغلق کہلائے۔ لوگوں نے غیاث الدین تغلق کو حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ سماع کے قائل ہیں۔ غیاث الدین تغلق نے سماع پر پابندی لگوادی۔ اس پر مناظرے کا اہتمام کیا گیا۔

آپؒ اپنی زندگی میں پہلی بار سرکاری ایوان میں تشریف لائے۔ ایک جانب متعدد علما کرام تھے، دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاؒ تن تنہا جواب دے رہے تھے۔ مناظرہ صبح چاشت کے وقت سے شروع ہو کر عصر کے وقت تک جاری رہا۔ آخر شیخ بہاالدین زکریا ملتانیؒ کے نواسے مولانا علم الدینؒ نے جو ایک جید عالم تھے اور غیاث الدین تغلق ان کے معتقد تھے، سماع کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد غیاث الدین تغلق نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کو سماع سے دلچسپی تھی لیکن سماع کے بارے میں آپؒ کی عائد کردہ شرائط بہت سخت تھیں اور ان شرائط کو پورا کیے بغیر آپؒ سماع میں شرکت نہ فرماتے تھے۔ آج کل ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ آپؒ نے فرمایا، "مباح (جائز) سماع کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں: سنانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پوری عمر کا آدمی ہو، کم سن نہ ہو، خاتون نہ ہو، سننے والے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ وہ سن رہا ہو وہ حق سے خالی نہ ہو، جو کچھ پڑھا جارہا ہو وہ بے حیائی اور فحش مذاق کا کلام نہ ہو۔ سماع میں مزامیر یعنی باجے، جیسے چنگ و رباب استعمال نہ کیے جائیں۔"

آپؒ، مزامیر یعنی موسیقی کے آلات کے استعمال سے سختی سے منع فرماتے تھے۔ جب بھی آپؒ کو اطلاع ملتی کہ کسی جگہ سماع میں آلاتِ موسیقی استعمال کیے گئے ہیں تو آپؒ سخت ناراض ہوتے تھے۔

Marfat.com

ایک بار آپؒ کو بتایا گیا کہ چند درویشوں نے ایسی مجلسِ سماع میں شرکت کی اور رقص کیا جس میں چنگ و رباب اور آلاتِ موسیقی استعمال کیے گئے تھے۔ آپؒ نے فرمایا: "اچھا نہیں کیا، جو بات شریعت کے خلاف ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔" اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ جب یہ درویش محفل سے باہر آئے اور ان سے لوگوں نے کہا کہ آپ نے ایسی محفل میں شرکت کیوں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم سماع میں ایسے کھو گئے تھے کہ ہمیں پتا نہ چلا کہ اس سماع میں آلاتِ موسیقی استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا: "یہ جواب بھی کچھ نہیں، یہ بات ہر گناہ کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ جب عارفانہ نوعیت کے اشعار سنتے تو آپؒ آبدیدہ ہو جاتے لیکن پاس بیٹھے لوگوں کو علم نہ ہو پاتا۔ آپؒ کے نائب آپؒ کو رومال پکڑاتے جاتے اور وہ آپؒ کے آنسوؤں سے تر ہوتے جاتے تب لوگوں کو آپؒ کی کیفیت کا علم ہوتا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ بہت محبت کرنے والے، خلیق اور ملنسار تھے۔ بردباری اور درگزر کرنے کی صفت آپؒ کی طبیعت کا جوہر تھی۔ ایک شخص آپؒ کو برا بھلا کہتا تھا اور تکلیف پہنچانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آپؒ نے اس کے لیے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور دعا کی، "اے اللہ اس شخص نے جو کچھ کیا ہو، برا سوچا ہو، میں نے اسے معاف کر دیا، تو میری وجہ سے اسے سزا نہ دینا۔"

ایک بار آپؒ کی مجلسِ ارشاد میں بعض افراد جگہ نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ آپؒ نے سائے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا، "بھائی ذرا مل کر بیٹھو تاکہ ان بھائیوں کے لیے بھی جگہ ہو جائے۔ دھوپ میں یہ بیٹھے ہیں اور جلا میں جا رہا ہوں۔" ایک بار غیاث پور میں آگ لگ گئی اور بہت سے مکانات جل گئے۔ آپؒ مکانات کو جلتا دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور آپؒ نے اس حادثے کا گہرا اثر لیا۔ آگ بجھی تو آپؒ نے ہر متاثرہ گھرانے کو کھانا اور رقوم بھجوائیں۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ بچوں سے بھی بہت محبت فرماتے تھے۔ اپنے بھانجے کے کمسن صاحبزادے خواجہ رفیع الدین ہارون سے خصوصی انس تھا۔ کبھی اگر کھانے کے وقت پر رفیع الدین کو پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو آپؒ ان کا انتظار کر لیتے۔ رفیع الدین کو تیر اندازی، پیراکی، اور کشتی لڑنے کا بڑا شوق تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ رفیع الدین کے ساتھ ان کی دلچسپی کے امور پر گفتگو فرماتے تھے اور انہی فنون کی باریکیوں اور اہم نکتوں کے بارے میں انہیں تعلیم دیتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے شادی نہیں کی۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے بچوں اور پوتوں ہی کو اپنے بچے سمجھتے تھے۔

آپؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان میں دو ایسی شخصیات بھی شامل ہیں جنہوں نے دینی تعلیم کے علاوہ مروجہ دیگر علوم میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں ایک شخصیت مولانا ضیاالدین برنی کی ہے جنہوں نے برصغیر کی ایک بہترین تاریخ مرتب کی، یہ "تاریخ فیروز شاہی" کہلاتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے تلامذہ میں ایک اور اہم شخصیت حضرت امیر خسرو کی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ امیر خسرو کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ امیر خسرو کو میری قبر کے برابر دفن کیا جائے، (تاہم امیر خسرو کو حضرت نظام الدینؒ کی قبر کے پائنتی دفن کیا گیا)۔ امیر خسرو نہایت باصلاحیت اور باکمال انسان تھے۔ وہ فارسی کے صفِ اول کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر میں تقریباً ایک سو کتابیں تصنیف کیں۔ انہیں فارسی کے علاوہ عربی، ترکی، سنسکرت، اور ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ انہوں نے معرکہ آرا مثنویاں لکھنے کے علاوہ اپنے دور کے تاریخی واقعات بھی نظم کیے۔ گو کہ امیر خسرو کا دور آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو برس قبل کا دور ہے لیکن آپ کی شاعری کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کی بنیاد اسی دور میں اور آپ ہی کے ہاتھوں پڑی۔ آپ نے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ کی آمیزش کی اور زبان کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ امیر خسرو اپنے شیخ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنی تمام تر عمر حصولِ علم، درس و تدریس اور اصلاح و تبلیغ میں بسر کی اور کتابوں کی تصنیف و تالیف کی طرف توجہ فرمانے کی بجائے انسان تصنیف کیے۔ آپ کے بعض تلامذہ نے آپؒ کے ارشادات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا اہتمام کیا۔ ان میں اہم ترین کتاب "فوائد الفواد" ہے جسے امیر حسن سجزیؒ نے مرتب کیا۔ امیر حسن سجزیؒ کا یہ معمول تھا کہ وہ آپؒ کے پاس جب بھی حاضر ہوتے، آپؒ کے ارشادات سن کر لکھتے جاتے۔ اگر کوئی بات لکھنے سے رہ جاتی تو جگہ چھوڑ دیتے۔ بعد میں یہ ارشادات نظام الدینؒ کو پیش کر دیتے۔ آپؒ نے اس طریقے کو پسند فرمایا اور بعض تحریروں کی اصلاح بھی کی۔ "فوائد الفواد کے بارے میں امیر خسرو کہتے تھے کہ کاش امیر

Marfat.com

حسن سجزیؒ میری ساری کتابیں لے لیں اور یہ ایک کتاب میرے نام کر دیں۔"

امیر خسرو نے بھی "افضل الفوائد" کے نام سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اقوال پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کے بعض حصے جب امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دکھائے تو انہوں نے فرمایا، "خوب لکھا ہے اور نام بھی اچھا رکھا ہے۔" پھر آپؒ نے مسودے کو اپنے ہاتھ سے متعدد مقامات پر درست کیا اور موقع پر موجود لوگوں سے فرمایا: "خسرو کے لیے یہ بات واقعی قابلِ فخر ہے کہ انہوں نے اتنی باتیں یاد رکھی ہیں اور لکھی ہیں حالانکہ وہ ہر وقت خیالات کے سمندر میں غرق رہتے ہیں۔" امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ارشادات پر مشتمل "راحت المحبین" کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی۔ حضرت نظام الدینؒ کے ایک اور مرید خواجہ سید محمد مبارک امیر خورد نے بھی آپؒ کے حالات کو کتابی صورت میں جمع کیا اور اس کتاب کا نام "سیر اولیا" رکھا۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عمر جب اسی برس سے متجاوز ہوئی تو آپؒ علیل رہنے لگے۔ علالت کے دوران آپؒ نے اپنے کئی تلامذہ کو خلافت عطا فرمائی، وفات سے کچھ روز پہلے آپؒ اپنے رب کی یاد میں زیادہ دیر بے خود رہنے لگے۔ آپؒ نے اپنے گھر کی تمام اشیا نادار اور مستحق افراد میں تقسیم کروا دیں۔ آپؒ کے ایک مرید کے ذریعے بعض لوگوں نے دریافت کیا کہ آپؒ کی وفات کے بعد آپؒ کو لوگ اپنی بنوائی ہوئی عمارت میں سپردِ خاک کرنے کے خواہش مند ہیں، آپؒ کسی ایک کو اس بات کی اجازت دے دیں۔ یہ سن کر حضرتؒ نے فرمایا، "میں کسی عمارت میں دفن ہونا نہیں چاہتا، مجھے جنگل میں سپردِ خاک کیا جائے۔"

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ/ ۳ اپریل ۱۳۲۵ء کا سورج طلوع ہوا تو ایک جہان کو اپنی کرنوں سے منور کرنے والے اس آفتاب نے اس جہاں کو خیر باد کہا۔ آپؒ کی نماز جنازہ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے پڑھائی۔ آپؒ کو آپؒ کی وصیت کے مطابق کھلے میدان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ بعد میں برصغیر کے حکمران محمد تغلق نے آپ کی قبر پر گنبد تعمیر کروا دیا۔

•••

Marfat.com

حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ

آپؒ نے تبلیغِ اسلام اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے عظیم خدمات انجام دیں

دربار سجا ہوا تھا۔

یہ برصغیر وہند کے فرمانروا کا دربار تھا۔ سربراہِ مملکت اپنی خصوصی مسند پر تشریف فرما تھے۔ اطراف میں مختلف محکموں سے تعلق رکھنے والے عہدیداروں اور امرا نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال رکھی تھیں۔

اچانک ایک خادم نے ایک بڑے بزرگ کی آمد کی اطلاع دی۔ بزرگ کا نام سنتے ہی امرا چونک گئے۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بزرگ کو ان کی خانقاہ کے لیے جو جاگیر دی گئی تھی، اب وہ غالباً اس میں اضافہ چاہتے ہیں۔

سربراہِ مملکت نے یہ سن کر جوش کے ساتھ کہا: "اگر وہ پورا صوبہ مانگیں گے تو بھی میں ان کی خدمت کروں گا، انہیں عزت کے ساتھ یہاں لایا جائے۔"

بزرگ دربار میں تشریف لائے۔ حکمراں سمیت تمام حاضرین نے مؤدب ہو کر ان کا استقبال کیا۔ بزرگ نے فرمایا: "میں ایک عرض لے کر آیا ہوں، اگر قبول فرمانے کا وعدہ کریں تو عرض کروں۔"

سربراہِ مملکت نے بے تابی سے کہا: "آپ فرمایئے، میں حضور کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

بزرگ نے اپنی آستین سے ایک سند نکالی اور سلطانِ وقت کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے گویا ہوئے: "اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے، اسے واپس لے لیجیے یہ میرے کام کی نہیں۔"

فرمانروائے مملکت نے حیرانی کے ساتھ سند کو کھول کر پڑھا۔ یہ اسی جاگیر کی سند تھی جو کچھ عرصہ قبل بزرگ کی خانقاہ کے اخراجات کے لیے انہیں ان کی خواہش کے خلاف دی گئی تھی۔

دربار میں موجود ہر ایک فرد، دم بخود تھا۔

سربراہ مملکت نے سکوت کو توڑتے ہوئے نہایت ادب سے گزارش کی: "آپ اپنے اخراجات کے لیے ہماری جانب سے کچھ رقم قبول فرمائیں۔"

یہ کہہ کر سلطانِ وقت نے اشارہ کیا۔ فوراً ایک بڑی رقم پیش کر دی گئی۔ سلطان نے بہت اصرار کے ساتھ یہ رقم بزرگ کو پیش کی۔ بزرگ رقم قبول کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن سلطان کا اصرار بڑھتا گیا۔ بالآخر بزرگ نے رقم قبول کر لی اور رخصت کی اجازت چاہی۔ سلطان اور دیگر امرا کے بار بار روکنے کے باوجود آپؒ دربار سے نکل آئے۔

دربار سے باہر آتے ہی آپؒ نے ہاتھ میں تھامی ہوئی تمام رقم محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے۔

یہ عظیم بزرگ تھے حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ، جنہوں نے برصغیر کے حکمران سلطان محمد شاہ تغلق کی جانب سے دی گئی جاگیر، فیروز شاہ تغلق کو واپس فرما دی تھی اور پھر سلطان کی جانب سے پیش کی گئی رقم کا ایک پیسہ تک اپنے پاس رکھنا گوارا نہ فرمایا تھا۔ حضرت شرف الدین منیریؒ برصغیر کے صوفیا کرام میں بہت محترم نام ہے۔ بھارت کے صوبہ بہار میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آپؒ کی خدمات سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

آپؒ کا نام شرف الدین احمدؒ اور آپؒ کے والد کا نام یحییٰ ہے۔ آپ عام طور پر شرف الدین احمد بن یحییٰ المنیریؒ یا مختصراً یحییٰ منیریؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپؒ شوال ۶۶۱ھ / اگست ۱۲۶۳ء میں اور دوسری روایت کے مطابق ۲۶ شعبان ۶۶۱ھ / ۵ جولائی ۱۲۶۳ء کو قصبہ "مَنیر" میں پیدا ہوئے۔ مَنیر بھارت کے شہر بہار سے ساٹھ میل دور ایک قصبہ ہے۔ اسی قصبے کی نسبت سے آپ "مَنیری" کہلائے۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالمطلب بن ہاشم

Marfat.com

سے جا کر ملتا ہے۔ والدہ محترمہ کا نسب نامہ ۱۴ویں پشت میں حضرت امام جعفر صادقؒ سے جا کر مل جاتا ہے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل فرمائی۔ اس دور میں مصادر، مفتاح اللغات اور اس نوعیت کی دیگر کتب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آپؒ نے مفتاح اللغات کو حفظ کر لیا تھا۔ آپؒ کی عمر سات آٹھ برس کے لگ بھگ ہوئی تو مولانا شرفؒ الدین ابو توامہؒ، منیر کے علاقے سے گزرتے ہوئے یہاں ٹھہرے۔ وہ اپنے شہر سنار گاؤں (بنگال) جا رہے تھے۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو انہوں نے ننھے شرف الدین احمدؒ کو اپنے ساتھ لے لیا اور سنار گاؤں لے گئے۔

حضرت شرف الدین احمدؒ، ۲۲ برس سے زیادہ مدت تک حضرت شرف الدین ابو توامہؒ کے ساتھ سنار گاؤں میں رہے۔ آپؒ نے حضرت ابو توامہؒ سے علم تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ آپؒ نے علم ریاضی، منطق اور فلسفہ کا علم بھی حاصل کیا اور علم تصوف کی کتب بھی زیر مطالعہ رہیں۔

جن دنوں آپؒ حضرت ابو توامہؒ سے تعلیم حاصل فرما رہے تھے، ان ہی دنوں، آپؒ کو حضرت ابو توامہؒ نے اپنی صاحب زادی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک فرما دیا۔ حضرت شرف الدین منیریؒ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تین اولادیں عطا فرمائیں۔ ان میں سے صرف ایک صاحب زادے شاہ ذکی الدینؒ طویل عرصے تک بقید حیات رہے۔

حصولِ علم سے حضرت شرف الدین منیریؒ کے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۲۳ برس کی اس مدت میں جس میں آپؒ اپنے گھر سے دور سنار گاؤں میں حضرت ابو توامہؒ کے پاس زیر تعلیم رہے، آپؒ نے اپنے گھر سے آنے والے ہر خط کو جوں کا توں بند حالت میں رکھ دیا اور اسے کھولا تک نہیں، جب آپؒ نے تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا، تب آپؒ نے گھر سے آئے ہوئے تمام خطوط کو کھولا۔ ان میں سے ایک خط میں آپؒ کے والدِ گرامی کے انتقال کی اطلاع دی گئی تھی۔

یہ المناک اطلاع پڑھتے ہی آپؒ کو شدید ملال ہوا۔ اسی وقت اپنے آبائی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر اہل خانہ سے ملے۔ چند دن گزرے تو آپؒ نے دہلی روانگی کا ارادہ فرمایا جو ان دنوں بزرگانِ دین کا بڑا مرکز تھا۔ آپؒ چاہتے تھے کہ ۲۳ برسوں میں آپؒ نے جو کچھ علم حاصل فرمایا ہے، اس میں مزید اضافہ ہو اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صحبت میں رہ کر آپؒ معرفتِ الٰہی کی نئی منزلیں طے کریں اور اپنے قلب کو رب العالمین کے ذکر سے ہمیشہ معمور کیے رکھیں۔ چنانچہ آپؒ دہلی تشریف لے گئے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے دہلی پہنچ کر متعدد بزرگانِ دین اور صوفیا سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، پھر آپ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بعض علمی مسائل پر آپؒ سے گفتگو فرمائی اور ان مسائل پر آپؒ کی پُر مغز اور عالمانہ گفتگو سن کر بہت متاثر ہوئے، پانوں کی ایک طشتری آپؒ کی علمی جلالت کے اعتراف کے طور پر پیش کی۔ اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے آپؒ سے فرمایا: "برادر شرف الدینؒ آپ کی ارادت اور تعلیم ہمارے بھائی شیخ نجیب الدین فردوسیؒ سے متعلق ہے۔ آپؒ ان کے پاس چلے جایئے۔ آپ کو اپنا حصہ ان کی توجہ اور نگرانی سے ملے گا۔"

حضرت شیخ نجیب الدین فردوسیؒ، شیخ رکن الدین فردوسیؒ کے مرید تھے۔ آپؒ پانی پت میں مقیم تھے۔ حضرت شرف الدین منیریؒ پانی پت تشریف لے گئے اور حضرت شیخ نجیب الدین فردوسیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ نے بہت محبت اور شفقت کے ساتھ آپؒ کا خیر مقدم فرمایا۔ چند نصیحتیں اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرما کر عطا کیں، اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرمایا اور آپؒ کو رخصت ہونے کا حکم دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ راستے میں کوئی خبر ملے تو واپس نہ آنا۔

حضرت شرف الدین منیریؒ، اپنے شیخ سے رخصت لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں شیخ کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی لیکن چونکہ شیخ کا حکم تھا، اس لیے واپس نہ گئے، تاہم دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ جب بہیا (ضلع آرہ) کے جنگل میں پہنچے تو آپؒ عبادتِ الٰہی کی غرض سے وہیں ٹھہر گئے۔ کئی برس تک بہیا اور راج گیر (ضلع پٹنہ) کے جنگلوں میں مقیم رہے، اس کے بعد آپؒ شہر بہار تشریف لے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے آنے کی خبر بہار اور قریب وجوار کے شہروں اور دیہات میں پھیل گئی اور دور دور سے لوگ علم کے حصول اور مشورے اور دعائیں لینے کی غرض سے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے اب بہار شریف اور گرد و نواح

Marfat.com

کے علاقے میں اسلام کی تبلیغ کا جامع نظام مرتب فرمایا۔ آپؒ نے تعلیم حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا اور خواہش مندوں سے بیعت لینے کا بھی آغاز کر دیا۔ آپؒ جس فرد میں طلبِ علم اور شوقِ اصلاح پاتے، اسے اپنے مریدوں میں شامل فرماتے، اس کی تربیت اور اصلاح فرماتے اور تبلیغ دین کی ہدایات دے کر کسی خاص علاقے میں بھیج دیتے۔ آپؒ نے بہار اور اطراف کے علاقوں میں تبلیغ دین کے سلسلے میں بے حد اہم خدمات انجام دی ہیں۔ آپؒ کے دست مبارک پر بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ تبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً ۶۰ برس تک جاری رہا اور آپؒ کے وصال کے بعد آپؒ کے شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔

حضرت شرف الدین منیریؒ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ جو مرید آپؒ کی مجالس تعلیم میں شریک نہ ہوسکتے تھے، انہیں آپ خطوط کے ذریعے تعلیم دیا کرتے تھے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ کے تلامذہ اور مریدوں کی تعداد یوں تو بہت زیادہ ہے لیکن مولانا امام مظفر بلخیؒ، مولانا نصیر الدین جونپوریؒ اور حسین نوشہ توحیدؒ، بہار کے نامور محدثین اور فضلاء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان بزرگوں نے بدعتوں کی روک تھام اور کتاب و سنت کی تبلیغ کے لیے عمر بھر خدمات انجام دیں۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے جب بہار آکر سکونت اختیار فرمائی تو آپؒ کے ایک مرید نظام الدین مولیؒ نے ایک چھوٹا سا مکان بنوادیا۔ آپؒ اس میں رہنے لگے۔ برصغیر کے حکمراں سلطان محمد تغلق کو آپؒ کے علمی مرتبے اور خدا ترسی کا علم ہوا تو انہوں نے بہار کے حکمران کے نام حکم جاری کیا کہ حضرت شرف الدین منیریؒ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کروادی جائے اور اس خانقاہ کے اخراجات کے لیے راج گیر کا پرگنہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں، تو زبردستی انہیں دیا جائے۔

حاکم بہار نے خانقاہ تعمیر کروائی اور راج گیر کا پرگنہ بھی مخصوص کردیا۔ حضرت شرف الدین منیریؒ نے سخت احتجاج کیا اور اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا لیکن حاکم کے پُرزور اصرار اور زبردستی کرنے پر آپؒ مجبوراً دل کی ناراضامندی کے ساتھ، اس خانقاہ میں تشریف لے آئے، لیکن آپؒ حکمرانوں سے کوئی شے لینے پر دل سے آمادہ نہ تھے، چنانچہ سلطان محمد تغلق کے انتقال کے بعد آپؒ نے فیروز شاہ تغلق کے حکمراں بنتے ہی، راج گیر کی جاگیر انہیں واپس کردی۔ اس واقعے کا ذکر اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ، حکمرانوں کو بھی نہایت دل سوزی کے ساتھ نصیحتیں فرمایا کرتے تھے، اگر کسی پر کوئی ظلم ہوتا تو اس کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے حکام کو خطوط لکھا کرتے تھے۔

ایک بار سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ایک صاحب خواجہ عابد ظفر آبادی نے آپؒ سے فریاد کی کہ ان کا مال برباد کر دیا گیا ہے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو ایک مکتوب ارسال فرمایا۔ اس مکتوب میں آپؒ نے نہایت سادہ، دل نشین اور موثر پیرائے میں سلطان کو ان کا فرض یاد دلایا۔ آپؒ نے اپنی بات کا آغاز رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واقعہ سے کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ کسی کو نصیحت کرتے ہوئے اور اس کی کسی خامی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کیسا پُر حکمت انداز اختیار فرماتے تھے۔

اس واقعہ میں آپؒ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک نصرانی (عیسائی) تک کی فریاد پر اس کا وہ مال ابو جہل سے واپس دلوادیا، جسے ابو جہل نے زبردستی حاصل کر لیا تھا۔ اس غرض سے سرورِ دوعالم ﷺ تپتی دھوپ اور شدید گرمی میں چل کر ابو جہل کے پاس تشریف لے گئے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ کا یہ مکتوب سلاست، حکمت اور دلسوزی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسی طرح آپؒ نے ایک خط سلطان محمد تغلق کے داماد، داؤد ملک کے نام ارسال فرمایا۔ آپؒ نے جن دیگر امراً کی تعلیم و تربیت فرمائی، ان کے نام ہیں: قاضی صدر الدین، ملک مفرح، ملک معزز الدین، شمس الملک، شمس الدین وغیرہ۔ امراً میں، جنہوں نے حضرت شرف الدینؒ منیری سے، سب سے زیادہ استفادہ فرمایا، وہ چوسہ کے حاکم قاضی شمس الدین ہیں۔ حضرت شرف الدین منیریؒ کے بہت سے خطوط قاضی شمس الدین کے نام ملتے ہیں۔

حضرت شرف الدین منیریؒ فرماتے تھے کہ حکمراں کا کام یہ ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلوائے، اجڑے دلوں کو آباد کرے اور حاجت مندوں کی حاجات پوری کرے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ سے اس وقت کے حکمراں ہی کو نہیں، بعد کے حکمرانوں کو بھی گہری عقیدت رہی۔ مثال کے طور پر، برصغیر کے حکمراں سکندر لودھی، حضرت شرف الدین منیریؒ کے مزار

Marfat.com

پر فاتحہ خوانی کی غرض سے شوال ۹۰۱ھ / جون ۱۴۹۶ء میں بہار آئے۔ بعد میں ظہیر الدین بابر بھی آپؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے۔ حضرت شرف الدین منیریؒ کی علمی شان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ کے وصال کے سیکڑوں برس بعد تک بھی آپؒ کی کتابیں شوق سے پڑھی جارہی ہیں۔ مغل حکمران اورنگ زیب عالمگیرؒ جن چند کتابوں کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے، ان میں حضرت شرف الدین منیریؒ کے مکتوبات پر مشتمل کتاب بھی شامل تھی۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ علم حدیث پر تو آپؒ کو دسترس حاصل تھی۔ آپؒ کی تحریریں ادبی اعتبار سے بھی بے حد بلند پایہ ہیں۔ آپؒ کے مکاتیب، آپؒ کی ادب نوازی کے عمدہ نمونے ہیں۔ آپؒ نہ صرف خوبصورت نثر لکھتے تھے بلکہ نظم میں بھی کمال رکھتے تھے۔ نثر میں بھی آپؒ برجستہ اشعار درج فرمایا کرتے تھے اور آپس کی گفتگو میں بھی فی البدیہہ اشعار پڑھ دیا کرتے تھے۔ آپؒ کو شاعری پر عبور حاصل تھا۔ آپؒ عربی، فارسی اور بنگالی، تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپؒ کے خاندان کے لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت شرف الدین منیریؒ نے ۱۷۰۰ کتب تصنیف فرمائیں، تاہم ان میں سے صرف ۲۷ کے بارے میں علم ہوسکا ہے۔ ان کتب کو ہم مکتوبات، ملفوظات اور تصانیف کے زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ملفوظات سے مراد وہ کتب ہیں جن میں آپؒ کی جانب سے اپنے مریدوں کو دی گئی تعلیمات اور نصائح کو یکجا کردیا گیا ہو۔ آپؒ کی کتب کے نام یہ ہیں:

مکتوبات: ۱۔ مکتوبات صدی۔ ۲۔ مکتوبات دو صدی۔ ۳۔ مکتوبات بست وہشت۔

ملفوظات: ۱۔ معدن المعانی۔ ۲۔ گنج المعانی۔ ۳۔ راحت القلوب۔ ۴۔ خوانِ پُر نعمت۔ ۵۔ کنز المعانی۔ ۶۔ مغز المعانی۔ ۷۔ گنج لایخفی۔ ۸۔ مونس المریدین۔ ۹۔ تحفۂ غیبی۔ ۱۰۔ ملفوظ الصغر۔ ۱۱۔ برات المحققین۔

تصانیف: ۱۔ فوائد رکنی۔ ۲۔ شرح و آداب۔ ۳۔ عقائد اشرفی۔ ۴۔ ارشاد السالکین۔ ۵۔ ارشاد الطالبین۔ ۶۔ اجوبہ۔ ۷۔ اوراد خورد۔ ۸۔ اوراد اوسط۔ ۹۔ فوائد المریدین۔ ۱۰۔ اجوبہ زاہدیہ۔ ۱۱۔ رسالہ اشارات۔ ۱۲۔ رسالہ مکیہ۔ ۱۳۔ اوراد کلاں۔

ان میں سے بعض کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔

آپؒ کے ملفوظات اور ارشادات بعض دیگر کتابوں میں بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً لطائف المعانی، فتوح الاوراد اور رسالہ در طلب طالبین۔

مکتوبات صدی: یہ مکتوبات حضرت شرف الدین منیریؒ نے چوسہ کے حاکم قاضی شمس الدین کے نام تحریر فرمائے۔ قاضی شمس الدین اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے باعث حضرت شرف الدین منیریؒ کی خدمت میں باربار حاضر نہ ہوسکتے تھے، اس لیے، حضرت شرف الدین منیریؒ، قاضی شمس الدین کی تعلیم مکاتیب کے ذریعہ فرماتے تھے۔ حضرت شرف الدین منیریؒ قاضی شمس الدین کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور انہیں کبھی فرزند اور کبھی برادر لکھا کرتے تھے۔ آپؒ نے اپنے وصال کے وقت فرمایا: "قاضی شمس الدین میرے فرزند ہیں، ان ہی کی وجہ سے مجھے کہنا اور لکھنا پڑا۔" مکتوبات صدی میں تصوف کے اہم مسائل پر تحقیقی بحث ہے۔

مکتوبات دوصدی: یہ کتاب ۱۵۱ مکتوبات پر مشتمل ہے۔

مکتوبات سہ صدی: اس کتاب میں ۳۰۰ مکتوبات ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری میں حضرت شرف الدین منیریؒ کے مکاتیب کا ایک اور مجموعہ بھی موجود ہے۔

مکتوبات بست وہشت: یہ مکتوبات مولانا امام مظفر بلخیؒ کے نام ہیں۔ حضرت شرف الدین منیریؒ نے مولانا مظفر کو ۲۰۰ سے زائد خطوط لکھے تھے لیکن مولانا مظفرؒ نے انہیں عام نہ فرمایا۔ مولاناؒ کی وفات کے بعد ۲۸ خطوط مل گئے۔ جنہیں کتابی شکل میں شائع کردیا گیا۔

حضرت شرف الدین منیریؒ کے مکتوبات آپؒ کے مرید ہی نہیں آپؒ کے ہم عصر بزرگان دین اور بڑے بڑے صوفیا کرام بھی بہت توجہ سے پڑھتے تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سید جلال الدین بخاریؒ کے بڑے معتقد تھے۔ ایک بار فیروز شاہ تغلق نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو اجازت نہ ملی اور بتایا گیا کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کو حضرت شرف الدین منیریؒ کے مکتوبات موصول ہوئے ہیں اور وہ ان کا مطالعہ فرمارہے ہیں۔

معدن المعانی: اس کتاب میں حضرت شرف الدین منیریؒ کے وہ ملفوظات ہیں جو آپؒ نے ۷۴۹ھ تا ۷۵۱ھ / ۱۳۴۸ء تا ۱۳۵۰ء ارشاد فرمائے۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں صرف تصوف پر

Marfat.com

بحث نہیں، بلکہ مذہب، حدیث، علم کلام پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شرف الدین منیریؒ کی مجالس میں تصوف کے ساتھ حدیث، علم کلام، دینی امور، امر و نہی، اوصاف حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تصوف اس دور میں مذہب سے الگ کوئی شاخ نہ تھی، بلکہ یہ مذہب ہی کا ایک حصہ تھا۔

خوانِ پُرنعمت: اس کتاب کو 'معدن المعانی' ہی کی تیسری جلد سمجھنا چاہیے۔ کتاب میں تصوف کے جزوی نکات کے ساتھ ساتھ فقہی اور شرعی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔

مخ المعانی: یہ کتاب شیخ شہاب الدین عمادؒ نے مرتب کی۔ اس میں، مختلف دینی مسائل کا ذکر ہے مثلاً تلاوتِ کلام پاک، دعائیں، کھانے کے آداب، نماز تراویح، تزکیہ نفس وغیرہ۔

راحت القلوب: اس کتاب میں رضائے حق، تعظیم تلاوتِ کلام پاک، نماز جمعہ کی فضیلت جیسے مختلف مسائل کے علاوہ کلام پاک کی بعض آیات کی تفسیر بھی شامل کی گئی ہے۔

فوائد رکنی: اس مختصر رسالے میں حضرت شرف الدین منیریؒ نے اپنے ایک مرید رکن الدین کو حج کے لیے جاتے ہوئے سفر میں مطالعہ کرنے کی ہدایات دی ہیں۔

ارشاد الطالبین: اس کتاب میں حضرت شرف الدین منیریؒ نے اپنے مریدوں کو مختلف ہدایات دی ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کتاب کا نام "برہان العارفین" لکھا گیا ہے۔

ارشاد السالکین: یہ توحید کے موضوع پر مختصر رسالہ ہے۔

رسالہ مکیہ و ذکرِ فردوسیہ: اس رسالے میں اذکار کی اقسام اور طریقے بتائے گئے ہیں۔

شرح آداب المریدین: حضرت شیخ ضیاالدین ابو النجیب سہروردیؒ کی مشہور عربی تصنیف کی شرح ہے۔

فوائد المریدین: اس رسالے میں نماز باجماعت کی برکت، جنت، دوزخ، ایمان، حقوق الوالدین، حقوق العباد کے بارے میں آپؒ کی ہدایات شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؒ اپنے مریدوں کی کس قدر توجہ سے اخلاقی تربیت فرماتے تھے اور اسلام کے ہر گوشے کے بارے میں انہیں تعلیم دیا کرتے تھے۔

اجوبہ: یہ سوالات کا مجموعہ ہے۔ آپؒ کے مرید آپؒ سے مختلف سوالات کیا کرتے تھے۔ اس کتاب میں تصوف کے بہت سے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے ایک جانب تو باطن کی پاکیزگی پر بے حد زور دیا ہے اور قلبِ خالص اور نیتِ صادق اپنانے کی تاکید فرمائی ہے، دوسری جانب آپؒ نے مسلمانوں کو ظاہری اعتبار سے بھی پاک صاف رہنے کی ہدایت کی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تصوف کے بعض پیروکار میلا لباس زیب تن کرنے اور برے حالوں میں رہنے کو جو افضلیت دیتے ہیں، وہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حضرت شرف الدینؒ فرماتے ہیں: "سالک کا جسم، لباس اور لقمہ طاہر اور حلال ہو، تاکہ اس کا دل بھی اوصافِ ذمیمہ سے پاک ہو"۔ ایک اور جگہ آپؒ نے سالک کی طہارت کو تفصیل سے یوں بیان فرمایا:

۱۔ طہارتِ جسم، یعنی بدن اور لباس کا پاک ہونا۔

۲۔ طہارتِ حواس، یعنی زبان سے جھوٹ بات نہ نکلے، نظر نامحرموں پر نہ پڑے، کان میں ایسی آواز نہ آئے جسے سننا منع ہے۔

۳۔ طہارتِ دماغ، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کا تخیل نہ ہو۔

۴۔ طہارتِ دل یعنی دل مذموم خیالات، ریا، بخل، حسد و رشک وغیرہ سے پاک ہو۔

آپؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سالک، اخلاقِ حمیدہ میں نبی کریم ﷺ کا پیرو ہو، بدخو نہ ہو، تازہ رو اور کم سخن ہو، سلام میں سبقت کرتا ہو، سخی ہو، غیبت، جھوٹ، فحش کلمات زبان پر نہ لاتا ہو۔ آپؒ نے تصوف میں دو چیزیں لازمی قرار دیں: ایک "علم" دوسری "شریعت کا اتباع"۔ آپؒ نے فرمایا کہ علم کے بغیر اس راہ میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ اسی طرح شریعت کے بغیر اس راہ میں آنا جہالت اور ہلاکت ہے۔

آپؒ نے وضاحت فرمائی کہ شریعت، توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اور امر و نواہی کا نام ہے اور امر و نواہی کی تحقیق اور ان کی روشنی میں ضمیر کی صفائی، اخلاق کی تطہیر اور نفس کے تزکیہ کو طریقت کہتے ہیں۔

حضرت شرف الدین منیریؒ خود بھی نہایت باعمل انسان تھے۔ آپؒ ہمیشہ اس بات کی سخت تاکید فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں رسول کریم ﷺ کی سنت کے مطابق چلنا چاہیے۔ وہ خود بھی احادیث پر پورے اہتمام کے ساتھ عمل پیرا رہتے تھے۔ آپؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے عمر بھر تربوز نہ چکھا کیونکہ آپؒ یہ تحقیق نہ فرما سکے تھے کہ

Marfat.com

رسول کریم ﷺ نے تربوز نوش فرمایا تھا یا نہیں اور اگر نوش فرمایا تھا تو کس طرح؟ حضرت شرف الدین منیریؒ عبادات کا خصوصی اہتمام کرتے تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے خوف سے آپؒ اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ آپؒ کرامات کو ہمیشہ پوشیدہ رکھنے پر زور دیا کرتے تھے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ حکمرانوں اور امراء سے تعلقات کے باوجود بے حد سادہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ آپؒ کی خوراک خشک روٹی، خشک چاول یا خشک کھچڑی پر مشتمل تھی۔ لباس بھی سادہ تھا۔ تہ بند، مرزئی، کرتہ اور چادر استعمال فرماتے۔ سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے۔ لوگوں کی خدمت کو ہمیشہ اولیت دیتے اور ہر ایک کی دلجوئی فرماتے، کسی کو بے عزت نہ کرتے اور لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپؒ فرماتے تھے: "مسلمانوں کا کام انجام دینا اور ان کے کام میں لگے رہنا، بڑی دولت ہے۔ یہ کام انبیا علیہم السلام کا ہے۔" ایک اور جگہ فرمایا: "اس تاریک دنیا میں قلم، زبان، مال اور جاہ سے جہاں تک ممکن ہو، محتاجوں کو راحت پہنچاؤ۔"

حضرت شرف الدین منیریؒ لوگوں کا یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ اگر آپؒ نے نفل روزہ رکھا ہوتا اور کوئی بہت عقیدت اور اصرار سے اپنے ہاں کھانے پر مدعو کرتا تو اس کی دل شکنی نہ فرماتے اور روزہ افطار کر لیتے۔ فرماتے: "نفل روزے کی تو قضا ہے لیکن دل شکنی کی قضا نہیں ہے۔" کوئی اگر تیز لہجے میں گفتگو کرتا تو نرمی اور شفقت سے جواب دیتے۔ ایک صاحب جب آپؒ کی مجلس میں پہلی بار شامل ہوئے تو مختلف مسائل پر انہوں نے بہت تلخ اور تند انداز سے گفتگو کی۔ حضرت شرف الدین منیریؒ نے ان کی ہر بات کا جواب ٹھنڈے دل سے دیا۔ وہ صاحب حضرت شرف الدین منیریؒ سے اتنے متاثر ہوئے کہ زندگی بھر ان کے خدمت گار بنے رہے۔

حضرت شرف الدین منیریؒ سماع کو جائز قرار دیتے تھے لیکن آپؒ نے سماع کے جائز ہونے کے لیے اس کے ساتھ نہایت سخت شرائط عائد کی ہیں۔ آپؒ نے اپنی کتب میں سماع پر بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر سماع سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے تو یہ حلال ہے اور اگر دل فسق وفجور کی طرف مائل ہوتا ہے، تو یہ حرام ہے۔ آپؒ نے سماع کے لیے حسب ذیل شرائط عائد فرمائیں:

۱۔ جس جگہ مجلس سماع منعقد ہو، وہ مشائخ کی جگہ ہو، پاکیزہ، کشادہ اور روشن ہو۔
۲۔ جو افراد مجلس سماع میں شریک ہوں، وہ درویش یا درویش کے دوست ہوں، اہل تمیز اور عبادات میں مشقت کرنے والے ہوں۔
۳۔ سماع کے وقت دل تمام غیر متعلق باتوں سے خالی ہو۔
۴۔ مجلس سماع کے شرکا دوزانو بیٹھیں۔
۵۔ سر کو آگے جھکائے رکھیں۔
۶۔ دائیں بائیں نہ دیکھیں۔
۷۔ ہاتھ اور سر کو جنبش نہ دیں۔
۸۔ پیاس محسوس ہو تو پانی نہ پئیں۔
۹۔ آپس میں گفتگو نہ کریں۔
۱۰۔ قوال کی خوش گوئی کی داد نہ دیں۔
۱۱۔ اشعار کو بہتر طریقے سے پڑھنے کی فرمائش نہ کریں۔
۱۲۔ دل کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف مائل رکھیں۔

حضرت شرف الدین منیریؒ نے شوال ۷۸۲ھ / جنوری ۱۳۸۱ء میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ ۶ شوال ۷۸۲ھ / ۳ جنوری ۱۳۸۱ء کو نمازِ فجر کے بعد سے آپؒ نے اس سفر کی تیاری کا آغاز کر دیا تھا۔ مریدوں کو پاس بلاتے تھے، کسی کو نصیحت فرماتے اور کسی کو وصیت۔ بار بار کلام پاک کی آیات اور کلمۂ مبارک آپؒ کی زبان پر جاری ہو جاتا۔ نماز مغرب ادا کی۔ اس کے بعد صرف کلمۂ طیبہ پڑھتے رہے اور دعائیں فرماتے رہے۔ امتِ مسلمہ کے لیے دعا فرما رہے تھے کہ "لا الہ الا اللہ" کہتے ہوئے، وصال ہو گیا۔ آپؒ کی نمازِ جنازہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے پڑھائی۔ آپؒ کو بہار شہر میں سپرد خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

حضرت نصیر الدین محمود چراغِ دہلی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کی کوششوں سے اسلام کی روشنی برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچی

دوپہر کا وقت تھا!

کمرے میں بزرگ کے سوا کوئی نہ تھا۔ بزرگ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں تھوڑی دیر قبل تشریف لائے تھے اور اس وقت وظائف میں مصروف تھے۔ اچانک ایک شخص کمرے کے اندر داخل ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چھری نکالی اور بزرگ پر چھری سے وار کرنے شروع کر دیے۔ بزرگ نے کوئی مزاحمت نہ کی اور بدستور وظائف پڑھتے رہے۔ اس شخص نے چھری سے مزید وار کیے۔ کمرے کے باہر لوگوں کو خبر ہی نہ تھی کہ اندر کیا قیامت بیت رہی ہے۔ لیکن چند لمحوں بعد کمرے کی نالی سے خون کی لکیر بہتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور وہ پریشانی کے عالم میں دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں پہنچ کر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بزرگ پر چھری سے وار کر رہا ہے۔ بزرگ کے جسم پر جابجا زخم ہیں جن سے خون بہہ رہا ہے لیکن بزرگ بدستور ذکر اور وظائف میں مشغول ہیں۔

لوگوں نے لپک کر حملہ آور کو پکڑ لیا۔ ہر شخص غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ ہر فرد کہہ رہا تھا کہ اس حملہ آور کو سخت سزا دی جائے لیکن بزرگ نے اشارے سے سب کو روک دیا۔ پھر بزرگ نے تمام افراد سے وعدہ لیا کہ وہ حملہ آور کو کچھ نہیں کہیں گے۔ تمام افراد نے نہ چاہتے ہوئے بھی وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد بزرگ نے حملہ آور شخص کو کچھ رقم دی اور اسے شفقت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

یہ بزرگ تھے چشتیہ سلسلے کے قابلِ احترام امام حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ جن کی زندگی تسلیم و رضا کا بہترین نمونہ ہے اور جنہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کی بدولت برصغیر و پاک ہند کے گوشے گوشے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی پہنچائی۔

آپؒ کا نام محمود اور والد کا نام یحییٰ ہے۔ آپؒ کے دادا عبداللطیف یزدی، خراسان سے لاہور تشریف لائے تھے۔ اسی شہر میں یحییٰ یعنی حضرت نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کے والد کی پیدائش عمل میں آئی۔ یحییٰ بعد میں اودھ منتقل ہو گئے۔ حضرت نصیر الدین محمودؒ اودھ ہی میں پیدا ہوئے، چنانچہ آپؒ کے نام کے ساتھ اس نسبت سے "اودھی" بھی لکھا جاتا ہے اور دادا کے نام کی مناسبت سے "یزدی" بھی لکھتے ہیں۔ "نصیر الدین" اور "چراغ دہلی" آپ کو دیے جانے والے القاب ہیں۔

چراغ دہلی کا لقب آپؒ کو اس طرح ملا کہ حضرت سید جلال الدین بخاریؒ، المعروف بہ مخدوم جہانیاں گشتؒ جب مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں کے امام شیخ عبداللہ یافعیؒ سے خاصے عرصے تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایک دن شیخ عبداللہ یافعیؒ نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے فرمایا کہ اگرچہ شہر دہلی سے بڑے بڑے مشائخ اُٹھ چکے ہیں لیکن ان کی برکت کا اثر شیخ نصیر الدین محمود میں باقی ہے، وہ چراغ دہلی ہیں۔ جب مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے یہ سنا تو حضرت نصیر الدین محمودؒ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ جب وہ مکہ مکرمہ سے واپس برصغیر آئے تو دہلی پہنچ کر حضرت نصیر الدین محمودؒ سے ملے اور شیخ عبداللہ یافعیؒ کی بات دہرائی۔ اس دن سے حضرت نصیر الدین محمودؒ کا لقب "چراغ دہلی" مشہور ہو گیا۔

آپؒ کے والد پشمینے (اونی کپڑے) یا روئی کی تجارت کرتے تھے۔ آپؒ کی عمر نو برس کی ہوئی تو آپؒ کو اپنے والد محترم سے جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ شوہر کے انتقال کے بعد آپؒ کی والدہ محترمہ نے آپؒ کی تربیت کی اور آپؒ کو اچھی دینی تعلیم دلوائی۔ ابتدائی تعلیم آپؒ نے اپنے وقت کے مشہور عالم دین مولانا عبدالکریم شیروانیؒ سے حاصل کی اور ان سے فقہ کی معروف کتابوں ہدایہ اور اصول البزدوی کا درس لیا۔

Marfat.com

ابھی اصول البزدوی کی تعلیم جاری تھی کہ مولانا عبدالکریم شیروائیؒ انتقال فرماگئے۔ اس کے بعد آپؒ نے باقی کتابیں مولانا افتخار الدین گیلانیؒ سے پڑھیں۔ بعض مورخین کے مطابق کتاب بزدوی کی تعلیم آپؒ نے قاضی محی الدین کاشانیؒ سے حاصل کی۔ آپؒ بچپن ہی سے بے حد نیک طبیعت کے مالک تھے اور نماز باجماعت کسی حال میں ترک نہ کرتے تھے۔

جب آپؒ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو آپؒ نے اپنے نفس کے محاسبے، مجاہدے، سخت ریاضت اور عبادت کی غرض سے جنگلوں کا رخ فرمایا۔ آپؒ اس سفر میں اکیلے نہیں تھے، بلکہ آپؒ نے اپنے ایک یا دو ساتھیوں کو ساتھ لے لیا تھا تاکہ نماز باجماعت نہ چھوٹنے پائے۔ آپؒ نے آٹھ برس ریاضت فرمائی۔ اس دوران آپؒ روزے رکھتے رہے۔

تینتالیس برس کی عمر میں آپؒ دہلی تشریف لے آئے اور کیلوکھری (دہلی کا نواحی علاقہ) میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔

حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ اپنی والدہ سے ملنے کے لیے اودھ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد آپؒ چند ماہ اودھ میں ٹھہرے۔ بعد میں آپ اپنی بہن سے ملاقات کے لیے کبھی کبھی اودھ جایا کرتے تھے۔

دہلی میں شیخ نصیر الدین محمودؒ کی رہائش ایک اور مشہور بزرگ شیخ برہان الدین غریبؒ کی قیام گاہ میں تھی۔ شیخ برہان الدین غریبؒ بھی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ، ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔

حضرت نصیر الدین محمودؒ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی بہت محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ مرشد کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرکز درس و تدریس میں حضرت خواجہ بہاالدین زکریا ملتانیؒ کے ایک مرید آکر ٹھہرے۔ رات کے وقت ان کے کپڑے کھو گئے، وہ ان کی تلاش میں ادھر ادھر لوگوں سے بلند آواز میں پوچھتے پھرے، اس سے شور ہونے لگا۔ حضرت نصیر الدین محمودؒ نے دیکھا کہ کوئی صاحب رات کے وقت بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں اور ان کے شور سے مرشد کی عبادت میں خلل پڑ سکتا ہے تو وہ فوراً اٹھے اور جاکر شور کی وجہ دریافت کی۔ وجہ معلوم ہونے پر آپؒ نے فوراً اپنے کپڑے لاکر ان صاحب کو دے دیے۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے علم میں آیا۔ انہوں نے اپنے پیارے مرید حضرت نصیر الدین محمودؒ کو طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو ان پر بہت شفقت فرمائی۔ اپنا لباس انہیں عنایت فرمایا اور ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

جب شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ، اپنی والدہ محترمہ کے پاس اودھ جایا کرتے تھے تو وہاں بھی شہر کی رونقیں تھیں، شور و شغب رہتا تھا، چنانچہ آپؒ کو عبادتِ الٰہی کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ میسر نہیں آرہی تھی۔ آپؒ نے حضرت امیر خسرو کے ذریعے اپنے مرشد سے درخواست کی کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے کسی جنگل بیابان میں عبادت کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ارشاد فرمایا "شیخ نصیرؒ سے کہہ دو کہ تمہیں خلقت میں رہنا اور لوگوں کے جور و ظلم کی مصیبتوں کو جھیلنا ہوگا، اس قربانی کا بدلہ تم کو ملے گا۔"

جب شیخ نصیر الدین محمودؒ نے مرشد کا یہ حکم سنا تو پھر عمر بھر اس پر عمل پیرا رہے۔ کبھی لوگوں سے الگ نہ ہوئے، انہی کے درمیان رہے، حالانکہ آپ کو بہت سی مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن آپؒ کی زبان پر شکایت کا ایک حرف نہ آیا۔ مضمون کے آغاز میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، اسے بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

جب حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عمر اسی برس کے قریب ہوئی تو آپؒ علیل رہنے لگے۔ اس وقت آپؒ نے اپنے خاص خلفا (نائبین) کو بلایا۔ مولانا برہان الدین غریبؒ کو اپنی خاص دستار (پگڑی) شال، لباس اور مصلیٰ عطا کیا اور حکم دیا کہ آپ دکن تشریف لے جائیں اور وہاں بندگانِ خدا کو نیکی اور فلاح کی راہ دکھائیں۔ اسی طرح کی بعض اشیا شیخ یعقوب پٹنیؒ کو دے کر گجرات جانے کی ہدایت کی۔ مولانا شمس الدین یحییٰؒ کو بھی اپنی ایک دستار اور پیراہن بخشا۔ کئی دیگر خلفا کو اپنی مختلف اشیا دے دیں، حتیٰ کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس کوئی شے باقی نہ بچی۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ بھی اس موقع پر اپنے مرشد کی خدمت میں موجود تھے، لیکن حضرت نظام الدین اولیاؒ نے انہیں کچھ بھی نہ دیا، نہ ہی انہیں کسی قسم کی ہدایت فرمائی۔ اس موقع پر جتنے بھی بزرگانِ دین اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلفا حاضر تھے، حیرت زدہ رہ گئے کہ شیخ نصیر الدین محمودؒ سے آخر کیا خطا سرزد ہوگئی ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے انہیں اپنی کوئی چیز عنایت نہ فرمائی، لیکن کسی کو اس بارے میں سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

Marfat.com

چند روز بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو بلوایا۔ وہ حاضر ہوئے تو آپؒ نے انہیں ایک خرقہ (لباس) ایک مصلیٰ، ایک تسبیح اور لکڑی کا ایک پیالہ عطا کیا۔ یہ تمام اشیا حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دراصل بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے اس وقت ملی تھیں جب بابا فریدؒ نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ اب انہی اشیا کو حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے خصوصی نائب، حضرت نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلی کے حوالے فرما رہے تھے، یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ آپؒ نے اپنے سیکڑوں مریدوں میں سے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو اپنا جانشین منتخب فرمایا ہے۔ اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنے پیارے مرید حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو ایک بار پھر نصیحت کی کہ وہ لوگوں کی جانب سے ملنے والی تکالیف اور اس راہ کی صعوبتوں کو صبر و تحمل سے برداشت کریں۔

۱۸ ربیع الاخر ۷۲۵ھ / ۳ اپریل ۱۳۲۵ء کو حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ آپؒ کی رحلت کے بعد آپ کی قیام گاہ آپؒ کی بہن کی اولاد کو ترکہ میں دے دی گئی۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ اب چشتیہ سلسلے کے سربراہ تھے۔ آپؒ نے دہلی سے چھ کوس جنوب میں اپنی رہائش کے لیے ایک جگہ کا انتخاب فرمایا۔ اب چشتیہ سلسلے کی تمام تدریسی اور تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز آپؒ کی قیام گاہ تھی۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے دین کی دعوت عام کرنے، لوگوں کو شریعت کی تعلیم دینے اور اصول دین سکھانے کے اس کام کو مزید وسعت دی جس کا اہتمام ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ مختلف علاقوں میں اپنے نائبین کی ذمہ داریاں مقرر کرتے تھے اور انہیں ہدایت فرماتے تھے کہ وہ ان علاقوں میں جاکر عام افراد کو دین کی باتیں سکھائیں اور غیر شرعی اعمال سے منع کریں۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ نے تدریس و تبلیغ کے اس نظام کو مزید منظم کر دیا۔ انہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو دکن جاکر دعوتِ دین پھیلانے کی ہدایت فرمائی۔ آپؒ کی وفات کے بعد حضرت بندہ نوازؒ گیسو درازؒ دکن تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اصلاح و تربیت کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اسی طرح حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے شیخ سراج الدینؒ کو گجرات روانہ کیا جہاں وہ طویل عرصے تک لوگوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کے لیے تبلیغ فرماتے رہے۔ اپنی عمر کے آخری برسوں میں شیخ سراج الدین دہلیؒ واپس آگئے تھے، لیکن ان کے نائبین نے گجرات میں وعظ و نصیحت کا کام جاری رکھا۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے شیخ احمد تھانیسریؒ اور مولانا خواجگیؒ کو کالپی بھیجا تھا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ شرعی اور فقہی مسائل میں غور و فکر کرنا اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا، بہت پسند فرماتے تھے۔ آپؒ شریعت پر پوری طرح کاربند رہتے تھے اور اپنے ماتحتوں اور عام افراد کو ہمیشہ شرعی احکام کی پوری طرح پابندی کی تلقین فرماتے تھے۔ آپؒ کے علمی مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں تغلق خاندان کے تیسرے فرمانروا فیروز شاہ تغلق کے دور ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ / ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء میں جن تین علما کرام نے اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے بے پناہ شہرت حاصل کی وہ تینوں حضرت چراغ دہلیؒ کے خصوصی خلفا (نائب) تھے۔ یہ تین علما کرام تھے، حضرت مولانا احمد تھانیسریؒ، مولانا خواجگیؒ اور قاضی عبد المقتدر دہلویؒ۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے قاضی عبد المقتدرؒ کے بارے میں اخبار الاخیار میں لکھا ہے: ”وہ ہمیشہ درس دینے اور اشاعتِ علم میں مصروف رہتے تھے اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ اور ان کے اکثر خلفا کا یہی طریقہ تھا۔ شیخ کے پاس جو مرید آتے وہ انہیں علم حاصل کرنے میں مشغول رہنے اور شریعت کی حفاظت کرنے کی تلقین فرماتے۔“

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے شاگردوں میں مولانا عبد المقتدر دہلویؒ اور مولانا خواجگیؒ سے قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ نے علم حاصل کیا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ بہت بڑے عالم تھے، مغلیہ عہد سے پہلے جس عالم نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ ہی تھے۔ انہیں ملک العلما کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کا تعلق جونپور سے تھا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ایک اور نائب حضرت سید محمد بن جعفر المکی والحسینیؒ تھے۔ وہ بھی بڑے ولی تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ بحر المعانی، رسالہ پنج نکات، بحر الانساب کے مصنف تھے۔ انہوں نے محمد تغلق سے بہلول لودھی تک کا عہد حکومت دیکھا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب حضرت نظام الدین اولیاؒ

Marfat.com

کے جانشین کی حیثیت سے چشتیہ سلسلے کی قیادت سنبھالی تو ابتدائی برسوں میں آپؒ کو بہت تکلیف اور تنگی ترشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا پڑی۔ آپؒ نے ایک بار انہی ایام کا ذکر کرتے ہوئے بتایا، "میں نے مسلسل دو دن روزہ رکھا۔ کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ آخر میرا ایک واقف میرے لیے دو روٹیاں اور ترکاری لے کر آیا، لیکن مجھے مشقت اور اسی بات میں خوشی محسوس ہوتی تھی کہ میرے ساتھ دنیاوی سازوسامان نہ ہو۔" یعنی آپؒ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ دنیا میں مال و اسباب جمع کرنا درست نہیں۔ دنیا کو محض ایک مسافر کی طرح بسر کرنا چاہیے، جس طرح ایک مسافر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے تو اپنی منزل پر پہنچنا ہے اس لیے وہ زیادہ سامان اکٹھا نہیں کرتا اور صرف زادراہ پاس رکھتا ہے۔ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔

کچھ عرصے بعد وہ دور بھی آیا کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے پاس مال و دولت کی کمی نہ رہی لیکن آپؒ اپنے پاس تحائف کی صورت میں آنے والی تمام اشیا اور رقوم، یا تو محتاجوں اور مساکین میں تقسیم کروادیا کرتے یا آنے والے عقیدت مندوں اور مہمانوں کی خاطر مدارات پر صَرف کر دیتے۔ آپؒ کے دستر خوان پر، پُر تکلف کھانے پیش کیے جاتے، آپؒ خود تو روزہ رکھتے لیکن اپنے مریدوں، شاگردوں، عقیدت مندوں اور مہمانوں کو اصرار کر کے کھانا کھلاتے۔ آپؒ افطار فرماتے تو تھوڑا سا کھانا چکھ لیتے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے پاس نہ صرف برصغیر پاک وہند کے مختلف شہروں اور دیہات سے بلکہ دیگر ملکوں سے بھی لوگ آیا کرتے تھے اور آپؒ سے دینی تربیت حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ آپؒ ان تمام لوگوں کی اصلاح و تربیت فرماتے تھے۔ آپؒ اپنی مجلس درس و تدریس میں زیادہ تر قرآن پاک کی آیات اور احادیث رسولِ اقدس ﷺ بیان فرماتے اور ان کی تشریح و تفسیر فرماتے۔ آپؒ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے اسے کیا جائے اور جس کام سے منع کیا ہے اس سے دور رہا جائے۔ آپؒ نماز باجماعت کی خود بھی سختی سے پابندی فرماتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی کڑی تاکید کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو آپؒ کی ہدایت تھی کہ اگر کوئی ایسا شخص ان کے درمیان آکر بیٹھے جو نماز نہ ادا کرتا ہو تو اس کی تعظیم نہ کی جائے تاکہ اسے اپنے بے نمازی ہونے کا احساس ہو۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ بہت پاکیزہ صفت اور نفاست پسند تھے۔ حضرت سید محمد گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ حضرت چراغ دہلیؒ جس جگہ تشریف فرما ہوتے وہ نہایت پاک و صاف اور روشن ہوتی تھی، وہاں ایک تنکا تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ آپؒ کے لباس سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ کل پہنا تھا یا آج پہنا ہے۔ آپؒ کے دائیں بائیں پھولوں کا انبار لگا ہوتا تھا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ عمر بھر سرکاری عہدوں سے بے نیاز رہے اور آپؒ نے حکومت کے اہلکاروں سے کسی قسم کی مراعات کبھی طلب نہیں فرمائیں لیکن حکومت کے بہت سے عہدیدار آپؒ کے عقیدت مند تھے۔ تغلق خاندان کے دوسرے فرمانروا محمد تغلق، جو اس زمانے میں برصغیر پر حکمراں تھے، علما اور صوفیا سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کے بارے میں بعض مؤرخین نے لکھا ہے لیکن غالباً اس سلسلے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ محمد تغلق اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اور جب ۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء میں محمد تغلق ٹھٹھہ کی مہم پر گئے تو وہ حضرت چراغ دہلیؒ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس مہم کے دوران محمد تغلق کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ملک میں شورشیں ہونے لگیں۔ اس موقع پر یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہی تھے جن کی کوششوں سے فیروز شاہ تغلق جیسے عادل، رحم دل، نرم خو اور منتظم برصغیر پاک وہند کے فرماں روا بنے اور انہوں نے چالیس برس تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔

تاریخ فیروز شاہی کے مطابق حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے، فیروز شاہ تغلق کے حکمراں بننے سے قبل ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ رعایا کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آئیں گے۔ اس پر فیروز شاہ تغلق نے جوابی پیغام میں وعدہ کیا تھا کہ وہ رعایا کے ساتھ حلم اور بردباری سے پیش آئیں گے اور ان پر انصاف اور محبت سے حکومت کریں گے۔

فیروز شاہ تغلق کے وزیر خان جہاں، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مرید تھے۔ یہ ابتدا میں ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور محمد تغلق کی حکومت میں وزارت کا عہدہ حاصل کیا۔ انہوں نے بہت جلد اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور فیروز شاہ تغلق کے دور میں بھی وہ بہت اہم وزیر رہے۔ جب خان جہاں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان

Marfat.com

سے پوچھا کہ میں کس طرح عبادت اور ریاضت کروں۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا، "تم وزیر ہو، تمہاری عبادت یہی ہے کہ حاجت مندوں کی حاجات پوری کرنے کی انتہائی کوشش کرو۔" خان جہاں نے ان سے پوچھا کہ میں کن اوراد اور وظائف کا اہتمام کروں؟ اس پر حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ اگر تم ہمیشہ باوضو رہو تو تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ آپؒ کی اس نصیحت کے بعد خان جہاں ہمیشہ باوضو رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ وہ ہر دم اپنی رعایا کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے اقدامات میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کسی پر ذرا سا بھی ظلم ہوتا اور اس کا علم خان جہاں کو ہو جاتا تو وہ فوراً اس ظلم کی تلافی کرواتے اور ظلم کرنے والے کو سزا دلواتے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی خدمت میں دیگر کئی سرکاری عہدے دار آپؒ سے دینی تعلیم کے حصول کے لیے آیا کرتے تھے۔ آپؒ کے پاس علم دین حاصل کرنے، مسائل معلوم کرنے اور آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے آنے والوں میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ آپؒ کو آرام کے لیے بھی وقت نہ ملتا تھا۔ آپؒ نے خود ایک دن مولانا حمید شاعرؒ سے فرمایا "اب مجھ کو تنہائی میں عبادت کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ اگر تھک کر لیٹ جاتا ہوں تو لوگ آکر جگا دیتے ہیں کہ فلاں صاحب آئے ہیں۔"

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے لاکھوں انسانوں کو بے پناہ عقیدت تھی اور اس کا اظہار شب و روز ہوتا تھا، لیکن آپؒ نے خود کو حاصل ہونے والے اس بلند مقام پر کبھی فخر یا تکبر نہیں فرمایا بلکہ آپؒ اکثر انکسار سے فرماتے تھے کہ میں کس لائق ہوں کہ شیخ بنوں۔ آپؒ کے انکسار اور احتیاط کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے:

جب حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ فیروز شاہ تغلق کے حکمراں بننے کے بعد ان کے ساتھ ٹھٹھہ سے واپس دہلی آرہے تھے تو آپؒ نے ایک اور صوفی بزرگ حضرت قطب الدین منورؒ سے ملاقات کے لیے ہانسی جانے کا ارادہ فرمایا۔ حضرت قطب الدین منورؒ بھی حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی طرح حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ تھے۔ جب حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہانسی پہنچے اور حضرت قطب الدین منورؒ سے ملے تو نماز کے وقت حضرت قطب الدین منورؒ نے حضرت چراغ دہلیؒ سے امامت کی درخواست کی۔ حالانکہ اس وقت حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہی چشتیہ سلسلے کے سربراہ تھے لیکن آپؒ نے حضرت قطب الدین منورؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "اگرچہ مرشد نے ہم دونوں بھائیوں کو ایک ہی دن خلافت عطا فرمائی تھی، لیکن آپ کو صبح کے وقت خلافت ملی اور مجھے ظہر کی نماز کے وقت، اس لیے امامت آپ کا حق ہے۔"

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے تصوف کو غیر شرعی امور سے پاک رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ اس سلسلے میں آپؒ نے سماع کے دوران کیے جانے والے غلط افعال کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ آپؒ نے سماع کے ساتھ باجے استعمال کرنے سے ہمیشہ منع فرمایا۔ ایک بار ایک محفل میں سماع کے ساتھ باجا بجایا جانے لگا۔ آپؒ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؒ کے ساتھیوں نے آپؒ سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ آپؒ نے فرمایا "یہ خلافِ سنت ہے۔" اس پر ساتھیوں نے کہا کہ کیا آپ سماع سے انکار کر رہے ہیں، تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا "یہ تو کوئی دلیل نہیں، قرآن کریم اور حدیث نبویؐ سے دلیل لاؤ۔" ایک اور محفل میں کسی نے آپؒ سے آلاتِ موسیقی دف، رباب اور رقص کے متعلق دریافت کیا آپؒ نے فرمایا، "مزامیر (آلاتِ موسیقی) جائز نہیں ہیں۔ اول تو سماع ہی میں علما کا اختلاف ہے، اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ اس کو جائز کہا گیا ہے لیکن مزامیر تو متفقہ طور پر جائز نہیں ہیں۔" تاہم اگر سماع درست شرائط کے ساتھ ہوتا تھا تو آپؒ اس میں شریک ہوتے تھے اور معرفتِ الٰہی لیے ہوئے اشعار پر داد دیتے تھے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ارشادات کو بعد میں آپؒ کے شاگردوں نے کتابی شکل میں محفوظ کیا۔ ان میں دو مجموعے مشہور ہیں۔ ایک مجموعہ "خیر المجالس" کہلاتا ہے جسے آپؒ کے ایک مرید حمید شاعرؒ نے مرتب کیا تھا۔ دوسرا مجموعہ "مفتاح العاشقین" کے نام سے مرتب کیا گیا۔ اس کے مرتب محب اللہؒ ہیں۔ "خیر المجالس" میں حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات وارشادات کے علاوہ آپؒ کی سوانح حیات بھی شامل ہے۔

جیسا کہ مضمون کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ پر ایک بار قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ آپؒ کے جسم پر گیارہ زخم آئے لیکن اللہ کے کرم سے آپؒ کی جان بچ گئی اور اس واقعے کے بعد آپؒ تین برس تک بقید حیات رہے۔ رمضان ۷۵۷ھ / ستمبر ۱۳۵۶ء میں آپؒ علیل ہوئے اور مختصر علالت کے بعد ۱۸ رمضان المبارک

Marfat.com

۷۵۷ھ / ۱۴ ستمبر ۱۳۵۶ء کو آپؒ نے رحلت فرمائی۔ آپؒ کو آپ کی قیام گاہ ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ جگہ دہلی سے ۶ کوس کے فاصلے پر ہے۔ بعد میں حاکم وقت فیروز شاہ تغلق نے آپؒ کا مقبرہ تعمیر کروادیا۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے شادی نہیں فرمائی تھی۔

حضرت نصیر الدین چراغِ دہلیؒ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ فرمایا حالانکہ آپؒ کے خلفا میں بڑے بڑے اہلِ علم صوفیا کرام موجود تھے۔ ایک دن آپؒ کے خادمِ خصوصی شیخ زین الدینؒ نے عرض کیا کہ آپ اپنے خلفا میں سے کسی ایک کو اپنا جانشین مقرر فرمادیں۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ جن صوفیا کرام کو تم چشتیہ سلسلے کی قیادت کا اہل سمجھتے ہو ان کے نام لکھ کر لاؤ۔ مولانا زین الدینؒ نے تین فہرستیں تیار کیں۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے ان فہرستوں کے مطالعے کے بعد فرمایا "ان لوگوں سے کہہ دو کہ اپنے ہی ایمان کی فکر کریں دوسروں کا بوجھ سر پر لینے سے کیا حاصل۔"

حضرت چراغِ دہلیؒ کا خیال تھا کہ اس وقت کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو پورے برصغیر پاک وہند میں چشتیہ سلسلے کی قیادت سنبھال سکتی، چنانچہ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ جو تبرکات (خرقہ، تسبیح، لکڑی کا پیالہ، کھڑاویں وغیرہ) انہیں ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ملے تھے، وہ ان کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ ہی دفن کردیے جائیں۔ اس طرح حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے انتقال کے بعد چشتیہ تحریک کی مرکزیت ختم ہوگئی تاہم آپؒ کے پیشرو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور خود آپؒ نے جس اصلاحی تحریک کو پروان چڑھایا تھا وہ مختلف صورتوں میں پورے برصغیر پاک وہند میں پھیلتی چلی گئی اور آپؒ کے خلفا نے لوگوں کی تعلیم و تربیت کے جو مراکز برصغیر کے طول و عرض میں قائم کیے تھے وہ اپنا کام خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

•••

Marfat.com

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ

عظیم المرتبت بزرگ جنہوں نے عوام کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی بھی اصلاح فرمائی

وہ ایک محرر تھا!

اس کے بیٹے کو وزیر اعظم کے کہنے پر قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ لڑکے کا قصور نہ تھا، لیکن وزیر اعظم کا حکم تھا، اس لیے سرکاری اہلکاروں نے لڑکے کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

محرر بہت پریشان تھا۔ اس نے پہلے تو حکام کی منت سماجت کی پھر وہ ایک بہت بڑے بزرگ کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔ اس نے سنا تھا کہ بزرگ کا سب ادب کرتے ہیں۔ اسے امید تھی کہ وزیر اعظم، بزرگ کی بات نہیں ٹالیں گے۔

بزرگ نے محرر کی فریاد سنی۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ محرر کے بیٹے کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ وہ اٹھے اور وزیر اعظم کے پاس خود تشریف لے گئے۔ وزیر اعظم کو بزرگ کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ وزیر اعظم، بزرگ کے مخالف تھے۔ انہوں نے اندر ہی سے کہلوا دیا کہ میں نہ تو بزرگ سے ملوں گا نہ ان کی سفارش مانوں گا۔

بزرگ واپس آ گئے لیکن پھر وزیر اعظم کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے دوبارہ اندر سے وہی بات کہلوا دی کہ وہ بزرگ سے ملنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بزرگ واپس تشریف لے آئے لیکن پھر وزیر اعظم کے پاس تشریف لے گئے۔ ایسا ۱۹ مرتبہ ہوا۔

انیسویں مرتبہ وزیر اعظم نے اندر سے یہ پیغام بھجوایا کہ اے سید کیا آپ میں غیرت نہیں کہ میں نے اتنی بار جواب دیا ہے اور آپ پھر چلے آتے ہیں۔

بزرگ نے جواب بھجوایا: "عزیزم، میں تو جتنی مرتبہ آتا ہوں، اس کا اجر و ثواب مجھے مل جاتا ہے لیکن ایک مظلوم کا مقصد پورا نہیں ہوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ایک مظلوم کو آپ کی قید سے رہائی دلواؤں تاکہ اس کا اجر و ثواب آپ کو بھی مل سکے۔"

یہ پُراثر پیغام جب وزیر اعظم تک پہنچا تو اسے سن کر ان کے دل کی دنیا بدل گئی۔ انھیں اچانک احساس ہوا کہ وہ کتنی سنگین غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے ایک بے گناہ کو قید میں ڈال دیا، پھر اتنے بڑے بزرگ سفارش کے لیے خود تشریف لائے تو ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور بزرگ کا ظرف دیکھیے کہ انکار کے باوجود ۱۹ بار آنے کی زحمت فرمائی ہے۔

وہ دوڑ کر باہر آئے اور بزرگ سے نہایت عاجزی کے ساتھ معذرت طلب کرنے لگے۔

بزرگ نے اپنی شفقت کا اظہار فرمایا۔ چند نصیحتیں فرمائیں۔ وزیر اعظم نے محرر کے بیٹے کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اب وزیر اعظم کے دل کی دنیا میں انقلاب آ چکا تھا۔ وہ بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، اب بزرگ کا اشارۂ ابرو، ان کے لیے گویا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

یہ بزرگ تھے سہروردیہ سلسلے کے نہایت جلیل القدر شیخ، حضرت سید جلال الدین بخاریؒ جو مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے لقب سے مشہور ہیں اور جنہوں نے اپنے مخالف وزیر اعظم، خان جہاں کو اپنے بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی بدولت اپنا گرویدہ بنا لیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ، تعلیم و تدریس اور اصلاح و تربیت کے سلسلے میں آپؒ کی عظیم خدمات ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کو راہِ راست پر لانے، انھیں عدل و احسان کے اوصاف سے مزین کرنے اور مملکت میں سیاسی استحکام پیدا کرنے میں آپؒ کا کردار نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ سہولت کی خاطر آئندہ سطور میں آپؒ کا ذکر حضرت مخدومؒ کے مختصر نام سے کیا جائے گا۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے دادا کا نام بھی سید جلال الدین بخاریؒ تھا لیکن انھیں سید جلال الدین سرخ بخاریؒ یا صرف حضرت جلال سرخ

Marfat.com

کہا جاتا ہے۔ حضرت جلال سرخؒ بخارا سے برصغیر میں تشریف لائے تھے۔ یہاں انھوں نے مشہورِ زمانہ صوفی بزرگ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ملتان میں وہ تیس برس تک مقیم رہے۔ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء) میں انتقال فرماگئے تو حضرت جلال الدین سرخؒ نے بہاولپور سے ۳۸ میل دور واقع ایک شہر اُچ میں سکونت اختیار کرلی۔ اس شہر کا نام اوچ اور اوچھ بھی لکھا گیا ہے۔

حضرت جلال سرخؒ نے اُچ میں رہ کر بھی تبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا۔ آپؒ کی کوششوں کے نتیجے میں کئی غیر مسلم قوموں نے اسلام قبول کرلیا، ان میں علاقے کا ایک راجا بھی شامل تھا۔ مشہور شہر جھنگ سیالاں کی بنیاد بھی حضرت جلال سرخؒ نے ڈالی تھی۔ حضرت جلال سرخؒ کا انتقال ۱۹ جمادی الاول ۶۹۰ھ / ۲۰ مئی ۱۲۹۱ء کو ہوا۔ آپ کے تین صاحب زادے ہیں۔ سید بہاؤالدین، سید محمد غوث اور سید احمد کبیر۔ یہی سید احمد کبیر، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے والد محترم ہیں۔

حضرت مخدومؒ ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ / ۸ فروری ۱۳۰۸ء کو اُچ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والدین اور خاندان کے بزرگوں نے آپؒ کی بہت اچھی طرح تربیت فرمائی۔ آپؒ نے ابتدائی تعلیم اُچ ہی میں حاصل کی۔ آپؒ کے اوّلین اساتذہ میں آپؒ کے چچا سید محمد بخاریؒ، شیخ جمال محدث خنداں روؒ اور اُچ کے قاضی، شیخ بہاؤالدینؒ شامل ہیں۔ شیخ جمال خنداں روؒ نہایت جید عالم تھے۔ ان سے حضرت مخدومؒ نے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاضی بہاؤالدینؒ سے فقہ کی کتب ہدایہ اور بزدوی کا درس لیا۔

قاضی بہاؤالدین کے انتقال کے بعد حضرت مخدومؒ ملتان پہنچے جہاں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے پوتے شیخ رکن الدینؒ اپنے بے پناہ علم سے لوگوں کو فیضیاب فرمارہے تھے۔ شیخ رکن الدینؒ نے حضرت مخدومؒ کا بہت شفقت سے خیر مقدم کیا۔ ان کے طعام و قیام کا انتظام فرمایا اور دو بڑے علماکرام شیخ موسیٰؒ اور مولانا مجد الدینؒ کو حضرت مخدومؒ کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کردیا۔ ان علماکرام سے حضرت مخدومؒ نے کئی کتابوں کا درس لیا۔ تعلیم کی تکمیل پر شیخ رکن الدینؒ نے اپنی کشتی کے ذریعے حضرت مخدومؒ کو اُچ بھیج دیا۔

اب آپؒ کے علم کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ آپؒ کو تغلق خاندان کے دوسرے فرمانروا محمد تغلق ۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ / ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء نے شیخ الاسلام مقرر کردیا اور چالیس خانقاہوں کی نگرانی بھی آپؒ کے سپرد کردی۔

شیخ الاسلام کا منصب بہت اہم منصب تھا۔ امورِ مذہبی کی حفاظت اور شرعی احکام کے نفاذ کی ذمے داری قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام کے سپرد ہوتی تھی۔ اس محکمے کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ شیخ الاسلام تمام فقرا اور درویشوں کو حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے وظائف کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ محمد تغلق کے عہد میں شیخ الاسلام کی تنخواہ ساٹھ ہزار تنکے سالانہ تھی۔

حضرت مخدومؒ نے بطور شیخ الاسلام زیادہ عرصہ ذمہ داریاں انجام نہیں دیں اور آپؒ اس عہدے سے جلد ہی مستعفی ہوکر سرزمین حجاز روانہ ہوگئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت مخدومؒ نے شیخ مکہ حضرت عبداللہ یافعی سہروردیؒ اور مدینہ منورہ میں شیخ مدینہ حضرت عبداللہ مطہری سہروردیؒ سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ آپؒ نے یہاں کئی ایسی کتابوں کو دوبارہ پڑھا جن کا مطالعہ برصغیر پاک وہند میں فرماچکے تھے۔

مدینہ کے شیخ حضرت عبداللہ مطہریؒ آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ مطہریؒ، حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے علم، لیاقت اور اہلیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایک بار حضرت مخدومؒ سے مسجد نبوی میں نماز کی امامت بھی کروائی۔

مکہ مکرمہ میں حضرت مخدومؒ نے سات برس گزارے۔ اس دوران آپؒ قرآن کریم کی کتابت کرکے اپنی معاشی ضروریات پوری کرتے رہے، لیکن کتابت کے ذریعہ ملنے والی رقم قلیل تھی چنانچہ تنگدستی کے ساتھ بسر ہوتی رہی، لیکن آپؒ تحصیل علم سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ مدینہ منورہ میں آپؒ نے دو برس گزارے۔ پھر آپؒ یمن وعدن تشریف لے گئے۔ آپ کو دمشق اور لبنان جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ آپؒ مدائن بھی گئے اور عراق کے ایک قصبے 'شوکارہ' جاکر آپؒ نے حضرت شرف الدین محمود تستریؒ سے عوارف المعارف کی تعلیم حاصل فرمائی اور سند سے سرفراز ہوئے۔

آپؒ سفر و سیاحت کی غرض سے بصرہ، کوفہ، شیراز، تبریز، خراسان، بلخ، نیشاپور، سمرقند، گازرون، (شیراز سے ۸۸ میل جنوب مغرب میں اہم شہر تھا) لہسہ (غالباً احسا ہے اور یہ بحرین کا دارالحکومت تھا) بحرین، قطیف، غزنی بھی تشریف لے گئے۔ برصغیر میں قیام کے دوران آپؒ نے ملتان، دہلی، بھکر، الور، روہڑی، لاڑہ اور ٹھٹھہ کے سفر کیے۔

Marfat.com

حکمرانوں کے بارے میں حضرت مخدومؒ کا طرزِ عمل حکمت اور رواداری کا حامل رہا۔ آپؒ نے ایک بار فرمایا: "مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور خراسان کے مشائخ نے مجھے وصیت کی ہے کہ حکمرانوں کا مخلص اور خیر خواہ رہنا چاہیے۔" ایک اور موقع پر آپؒ نے فرمایا: "بادشاہ کے لیے بددعا نہ کرنی چاہیے بلکہ اصلاح کی دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ تو امام اور امت کو اور حاکم اور محکوم کو صالح اور درست بنادے۔"

دوسری جانب آپؒ حکام کو توجہ دلاتے رہتے تھے کہ انھیں اپنے فرائض پوری دیانت داری سے بجالانے چاہئیں، رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے، ناداروں، مساکین اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا نہیں کریں گے تو انھیں قیامت کے دن اس سلسلے میں جواب دینا ہوگا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے اہم سیاسی امور میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس کی تفصیلات تاریخ کی کتب کے مطالعے سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جب فیروز شاہ تغلق ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء میں برسراقتدار آئے تو انہیں مختلف شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان شورشوں کو رفع کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ۷۶۲ھ/۱۳۶۰ء میں انہیں بنگال کی مہم پر جانا پڑا۔ ادھر سندھ میں سمہ خاندان برسراقتدار آچکا تھا۔ اس خاندان کا پہلا سردار انر تھا اور اس کے بیٹے کا نام صدرالدین تھا تاہم وہ بانہبینہ کے نام سے مشہور تھے۔ بانہبینہ کے چچا کا نام علاءالدین تھا لیکن وہ جام جونا کے نام سے معروف تھے۔ چچا بھتیجے نے منگولوں سے رابطہ قائم کرلیا اور فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے لیے مسائل کھڑے کردیے۔

ملتان کے حاکم عین الملک نے اس سیاسی بدامنی کی اطلاع مرکز کو دے دی، لیکن فیروز شاہ بنگال میں مصروف تھے۔ ملتان کے حاکم عین الملک کے انتقال کے بعد ٹھٹھہ کے حکمرانوں جام جونا اور بانہبینہ کو مکمل طور پر آزادی مل گئی۔ یہ صورت حال فیروز شاہ کے لیے تشویشناک تھی۔ انہوں نے فوراً فوجی تیاری کی اور اجودھن (پاک پتن) اور بھکر ہوتے ہوئے سیوستان (سیہون) پہنچے اور وہاں سے پانچ ہزار کشتیوں کا بیڑہ بنا کر ٹھٹھہ پہنچ گئے۔ جنگ ہوئی لیکن فیروز شاہ کو ہزیمت اٹھانی پڑی، تاہم انہوں نے اگلے سال، بھرپور تیاری سے ٹھٹھہ کا رخ کیا۔ اس بار فیروز شاہ کو بالادستی حاصل ہوگئی۔ انہوں نے چار ہزار شورش پسندوں کو قیدی بنالیا۔

اس صورتحال کی وجہ سے جام جونا اور بانہبینہ سخت متفکر ہوگئے۔ انہیں ایک صورت یہ نظر آئی کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے سفارش کی درخواست کریں، چنانچہ وہ حضرت مخدومؒ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان سے التجا کرنے لگے کہ وہ فیروز شاہ تغلق سے معافی دلوادیں۔ حضرت مخدومؒ نے انہیں اطمینان دلایا کہ صلح ہوجائے گی اور یہی ہوا۔ حضرت مخدومؒ کی ہدایت پر جام جونا اور بانہبینہ نے فیروز شاہ کے سامنے حاضر ہوکر اپنی غلطی تسلیم کرلی اور آئندہ کے لیے اطاعت کی یقین دہانی کروائی اور حضرت مخدومؒ ہی کی سفارش پر فیروز شاہ نے ان دونوں حکمرانوں کو معاف کردیا، حالانکہ وہ ان سے سخت ناراض تھے۔ فیروز شاہ نے ٹھٹھہ کی حکومت جام جونا کے بیٹے جام تماچی کے حوالے کردی اور دونوں حکمرانوں یعنی جام جونا اور بانہبینہ کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔

تقریباً دس برس بعد یعنی ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں جام تماچی نے بھی مرکزی حکومت سے سرکشی کا رویہ اپنا لیا۔ اس پر فیروز شاہ نے جام جونا کو ٹھٹھہ روانہ کیا تاکہ وہ جام تماچی کو سمجھائیں۔ اس بار بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو زحمت دی گئی۔ اتفاق سے وہ ان دنوں دہلی میں موجود تھے۔ وہ بھی جام جونا کے ساتھ ٹھٹھہ تشریف لے گئے اور کسی تنازعے کے بغیر جام تماچی کو دہلی لے آئے۔ جام جونا کو ٹھٹھہ کا حاکم بنادیا گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مخدومؒ کتنی زبردست سیاسی بصیرت کے حامل تھے اور سیاسی لحاظ سے آپؒ کا اثر ورسوخ کتنا موثر تھا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ عام افراد کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کو بھی اکثر نصیحتیں کیا کرتے تھے اور ان کی غلطیوں پر انہیں ٹوکتے رہتے تھے۔ آپؒ کی اصلاحی کوششوں کی وجہ سے فیروز شاہ کو راہِ راست پر چلنے اور درست فیصلے کرنے میں بڑی مدد ملی۔ آپؒ ہر دوسرے یا تیسرے برس دہلی تشریف لے جاتے تھے۔ دہلی میں آپؒ جو درس دیا کرتے تھے اس میں اعلیٰ حکام بھی شریک ہوتے تھے۔ دہلی میں آپؒ کے قیام کے دوران امرا، افسران، وزرا، شہزادے وغیرہ آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپؒ سے دین و حکمت کی باتیں سیکھتے تھے۔ وزیراعظم خان جہاں، آپؒ کے حضور اکثر حاضر ہوتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے انہیں حکم دے رکھا تھا کہ وہ حضرت مخدومؒ کے احکام کی فوراً تعمیل کیا کریں۔ حضرت مخدومؒ، خان جہاں کو بھی اکثر

Marfat.com

نصیحتیں کیا کرتے تھے اور انہیں شریعت کے مطابق عدل کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔

فیروز شاہ تغلق آپؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ آپؒ کے پاس اکثر حاضر ہوا کرتے تھے اور آپؒ سے رشد و ہدایت کی باتیں سنا کرتے تھے۔

ایک بار حضرت مخدومؒ نے ایک حدیث بیان فرمائی۔ فیروز شاہ تغلق کو یہ حدیث اتنی پسند آئی کہ انہوں نے حضرت مخدومؒ سے گزارش کی کہ وہ اس حدیث کو ترجمے کے ساتھ تحریر کر کے عطا فرمائیں۔ حضرت مخدومؒ جب دہلی سے اچ چلے گئے تب بھی ان کا فیروز شاہ تغلق سے رابطہ رہتا تھا اور وہ مختلف ہدایات ان کے نام بھیجتے رہتے تھے۔

یہ حضرت مخدوم جہانیاں گشتؒ ہی کا فیض تھا کہ فیروز شاہ نے بہت سے غیر ضروری محصولات (ٹیکس) منسوخ کر دیے جن میں منڈی پر محصول، پھولوں کی فروخت پر محصول، رنگ بنانے، رسیاں بنانے، تیل نکالنے، پان، مچھلیاں بیچنے، صابن بنانے، اینٹیں اور مٹی کے برتن بنانے پر محصولات شامل تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا علم ایک وسیع سمندر تھا جس سے ایک دنیا فیض حاصل کرتی تھی۔ آپؒ قرآن کریم کا گہرا فہم رکھتے تھے۔ قرآن کریم کو ساتوں قرأتوں کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ قرأت کا علم آپؒ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سیکھا تھا۔ آپؒ حدیث اور فقہ کے بڑے عالم تھے اور صرف و نحو اور زبان و بیان کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپؒ کی مجالس میں حدیث کا باقاعدہ درس ہوتا تھا اور اس میں صرف و نحو کے مطابق حدیث کی شرح بیان کی جاتی تھی۔

آپؒ کو فقہ میں مجتہد کا درجہ حاصل ہے۔ چاروں مشہور فقہی مسالک پر آپؒ کو عبور حاصل تھا۔ درس کے دوران کوئی فقہی مسئلہ سامنے آتا تو آپؒ چاروں مسالک کا نقطۂ نظر بیان فرماتے۔

حضرت مخدومؒ کو عربی اور فارسی کے ان گنت اشعار یاد تھے۔ آپؒ عربی اور فارسی زبانوں میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؒ ہندی، ملتانی (پنجابی) اور سندھی زبانیں بھی بولتے تھے اور ان زبانوں میں تبلیغ فرماتے تھے۔ آپؒ کے دور یعنی ۱۴ویں صدی عیسوی میں پیش آنے والے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان اس وقت اپنے ارتقا کے ابتدائی مرحلے سے کس طرح گزر رہی تھی۔ مثال کے طور پر دہلی کے سفر کے دوران آپؒ ایک بار تھک کر ایک درخت کے نیچے آرام کے لیے لیٹ گئے۔ درخت پر چڑیاں زور زور سے چہچہانے لگیں تو آپؒ کی نیند میں خلل پڑا۔ آپؒ نے ناراض ہو کر فرمایا "مویاں نیند کرنے دو"۔ اسی طرح ایک بار فیروز شاہ تغلق کے بارے میں فرمایا "کا کافیروز چنگا ہے۔"

حضرت مخدومؒ شریعت کا وسیع علم رکھنے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے امور کے بارے میں گہرا علم رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر آپؒ کے ملفوظات کے مجموعے سراج الہدایہ میں ضرورت کی بہت سی اشیا کے فوائد بیان کیے گئے ہیں جن میں چاول، گندم، کھجور، انگور، امرود، تربوز، انار، اسپغول، کشمش، ہلیلہ، پیاز، گوشت، انڈا، سرکہ اور دودھ وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت مخدومؒ کا کتب خانہ بہت عمدہ تھا۔ آپؒ طلبہ کو کتابیں خود فراہم کرتے تھے۔ آپؒ اچھی اور نادر کتابوں کی تلاش میں رہتے اور ان کی نقول حاصل کر لیتے تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ عمل کے بغیر علم کو بالکل ناکارہ قرار دیتے تھے۔ آپؒ زندگی کے ہر لمحے کو شریعت کے مطابق گزارنا پسند فرماتے تھے اور اسی بات کی دوسروں کو تاکید فرماتے تھے۔ آپؒ کو رسول اقدس ﷺ سے بے حد عقیدت تھی اور نبی کریم ﷺ کے تمام معمولات، عادات و اخلاق کا اتباع کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ بچوں کو ہمیشہ وہ دعائیں دیتے جو آنحضرت ﷺ نے بچوں کو دی ہیں۔ سنت کی پیروی کے خیال سے جنگل سے لکڑیاں خود چُن کر لایا کرتے تھے۔ عاجزی اور انکسار آپؒ کی طبیعت کا حصہ تھا۔ گھر میں داخل ہوتے تو بلند آواز سے سلام کرتے۔

آپؒ نماز باجماعت کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی نماز جماعت سے ادا کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ آپؒ کو ۳۶ بار حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

حضرت مخدومؒ نے تصوف کی اصلاح بھی فرمائی اور اس بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور غیر ضروری پابندیوں کا تدارک فرمایا۔ آپؒ نے فرمایا، "انبیا کا علم اولیا کرامؒ کو اس وقت تک نہیں پہنچا جب تک کہ انہیں فقہ اور اصول فقہ اور علم کلام کا علم نہ ہو۔" آپؒ فرماتے تھے، "طریقت شریعت سے نکالی گئی ہے جیسے کسی چیز کا مغز اور خلاصہ نکالا جائے۔ شریعت توحید و معاملات کا بیان ہے۔ طریقت، اوصاف باطن یعنی صفائی، ضمیر، تہذیب و اخلاق کے ساتھ اعمال کو آراستہ کرنا ہے۔"

Marfat.com

آپؒ نے سماع کے بارے میں بھی محتاط طرزِ عمل اختیار فرمایا اور سخت شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی۔ ایک بار چند حضرات حاضر ہوئے۔ کچھ اشعار پڑھے۔ جب انہوں نے اس کے ساتھ تالیاں بجانی چاہیں تو آپؒ نے منع فرمایا اور کہا "چاروں فقہی مذاہب میں منع ہے۔" اسی طرح آپؒ نے آلاتِ موسیقی کے استعمال کی اجازت بھی نہیں دی۔ ایک بار ایک موقع پر لوگوں نے آپؒ کے ہاتھ چومنے چاہے، آپؒ نے لوگوں کو روک دیا۔

آپؒ فرماتے تھے، "جو شخص گفتار، کردار اور رفتار میں سنت نبویؐ کا اتباع نہیں کرے، وہ ولی نہیں ہے۔" آپؒ عبادات کی نمود و نمائش سے بھی منع فرماتے تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اصلاحی تحریک کے نتیجے میں خصوصاً پنجاب، سندھ اور گجرات میں اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی اور ان علاقوں میں غیر مسلموں نے بہت بڑی تعداد میں آپؒ یا آپؒ کے نائبین کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے حضرت مخدومؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، بہاولپور کے سرکاری گزیٹیئر میں ان کی تفصیل شامل ہے۔ ان قبیلوں کی تعداد آٹھ ہے۔ ان میں کھرل راجپوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل تھا۔ نون قبیلے کے لوگ بھی حضرت مخدومؒ کی کوششوں سے مسلمان ہوئے۔ کھرل راجپوتوں کا اولین راجا کرن، ہستناپور کا راجا تھا۔ اس کے جانشین بھوپا نے اُچ میں رہائش اختیار کی اور بھوپا اور اُس کے بیٹے کھرل نے حضرت مخدومؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

حضرت مخدومؒ جب بھی کسی کو مسلمان کرتے، اس کی پوری طرح تربیت فرماتے تھے تاکہ وہ تمام ضروری دینی احکام اچھی طرح سمجھ لے۔ پھر وہی فرد جا کر اپنے قبیلے یا برادری کے بہت سے افراد کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کا سبب بن جاتا تھا۔ آپؒ سے متاثر ہو کر اسلام لانے والوں میں ہندوؤں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہردوار (یوپی) کے قریب قصبہ جوالاپور ہے۔ وہاں راجپوتوں کا ایک قدیم خاندان آباد ہے۔ اس خاندان کا لقب راؤ ہے۔ اس خاندان کے ایک بڑے بزرگ راؤ محمد صدیق کے مطابق راجپوتوں کا یہ خاندان حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق جیسلمیر کے قدیم باشندے راجپوت تھے۔ اس خاندان کے ایک شخص رائے تلسی داس نے حضرت مخدومؒ کی کوششوں سے اسلام قبول کیا۔ تقسیم برصغیر کے بعد اس نومسلم کا خاندان بکھر گیا اور اب اس کے افراد چیچاوطنی اور نور پور (ضلع فیصل آباد) میں مقیم ہیں۔

حضرت مخدومؒ نے نہ صرف اپنی تبلیغ کے ذریعے ہزاروں افراد کو اسلام کی نعمت سے آشنا فرمایا بلکہ وہ اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی حکومت کو وجود میں لانے کا باعث بھی بنے۔ گجرات میں سہارن اور سادھو کے نام سے دو بھائی حکمراں تھے۔ یہ تھانیسر کے رہنے والے تھے اور ذات کے نانک تھے۔ فیروز شاہ تغلق ان دونوں کی خدمات سے خوش ہوئے۔ بعد ازاں یہ دونوں مسلمان ہوئے اور حضرت مخدومؒ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ سلطان نے سہارن کو وجیہ الملک کا خطاب دیا۔ یہ خاندان گجرات میں تقریباً دو سو برس تک حکومت کرتا رہا۔ بعد میں حضرت مخدومؒ کے خاندان کے بہت سے بزرگ گجرات میں آ کر آباد ہو گئے اور ان کی وجہ سے گجرات میں دینی امور کی تبلیغ بہت اچھے انداز میں ہوتی رہی۔

ریاست مانگرول (کاٹھیاواڑ) کا قیام بھی حضرت مخدومؒ کی ذات بابرکات کا نتیجہ تھا۔ آپؒ کے ایک مرید سکندر بن مسعود تھے جنہیں طویل عرصے تک تربیت دینے کے بعد تبلیغ کے لیے آپؒ نے مانگرول روانہ کیا۔ سکندر بن مسعود اور ان کی اولاد نے بڑے عرصے تک اس علاقے میں تبلیغ و اصلاح کی خدمات انجام دیں۔ بالآخر ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء میں فیروز شاہ تغلق نے ملک عزالدین کی قیادت میں ایک فوج مانگرول بھیجی جہاں راجا کنور پال حکمراں تھا۔ اس فوج میں سکندر بن مسعود اور ان کے بہت سے مرید بھی شامل تھے۔ جنگ میں راجا مارا گیا۔ اس فتح کی یادگار میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ پھر اس علاقے پر سکندر بن مسعود کے خاندان کو حکمرانی نصیب ہوئی۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ دیگر صوفیائے کرام سے بھی اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ملفوظات کے سات مجموعے مرتب کیے گئے جنہوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ملفوظات کے لفظی معنی "مقالات" یا "تقاریر" کے ہیں۔ صوفیا کرام کے نظام تربیت میں ملفوظات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ شیخ جب بھی کسی موضوع پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو بعض ذہین اور صاحب علم مرید آپؒ کی باتوں کو لکھتے جاتے ہیں۔ بعد میں یہ تحریر شیخ کو

Marfat.com

دکھائی جاتی ہے اور وہ چاہیں تو اس میں ترمیم و اضافہ کر دیتے ہیں اور اس طرح تحریر کو شیخ کی سند حاصل ہو جاتی ہے۔

آپؒ کے ملفوظات کی تفصیل یہ ہے:

خلاصته الالفاظ جامع العلوم: اس مجموعے نے "جامع العلوم" کے نام سے شہرت پائی اور اس کا اردو ترجمہ الدر المنظوم کے نام سے ہوا ہے۔ اس مجموعہ کو ابو عبد اللہ علاؤ الدین نے مرتب کیا۔ اس میں تصوف کے حقائق، شرعی، فقہی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

سراج الهدایه: حضرت مخدومؒ کی اس کتاب میں فیروز شاہ کی ٹھٹھہ کی مہم کے حوالے ملتے ہیں اور فیروز شاہ، خان اعظم، ظفر خاں اور دیگر اہم شخصیات کے بارے میں قیمتی معلومات ملتی ہیں۔

مقرر نامه: یہ کتاب حضرت مخدومؒ کے ان مکاتیب اور ہدایات پر مبنی ہے جو انہوں نے تاج الدین بن معین سیاہ پوش کے بعض استفسارات کے جواب میں تحریر فرمائیں۔

خزانهٔ جلالی: یہ مجموعہ بہت مشہور ہے۔ اسے حضرت مخدومؒ کے مرید احمد المدعو بہا بن حسن نے مرتب کیا۔

جواهر جلالی: حضرت مخدومؒ کے مرید حضرت فضل اللہ بن ضیا العباسی نے اس مجموعے کو ٧٨١ھ / ١٣٧٩ء میں مرتب کیا۔

مظهر جلالی: یہ بھی آپؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔

مناقب مخدوم جهانیاں: اس مجموعہ کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ دراصل دو کتابوں، وظائف شاہی اور حضرت مخدومؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔

ترجمه فارسی، رساله مکیه: حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے شیخ قطب الدین دمشقیؒ کے مرتب کردہ رسالہ مکیہ شریف کا فارسی میں ترجمہ بھی فرمایا۔ یہ رسالہ حضرت قطب الدینؒ نے دمشق میں مرتب کیا۔ مکہ کے شیخ عبد اللہ یافعیؒ اس رسالے کا باقاعدہ درس دیتے تھے۔

حضرت مخدومؒ نے ایک اور کتاب "اربعین صوفیا" کے نام سے مرتب فرمائی تھی۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ٧٨٥ھ / ١٣٨٤ء میں عین عید الاضحی کے دن اس دنیا کو خیر باد کہا۔ ١٠ ذی الحجہ ٧٨٥ھ / ٣ فروری ١٣٨٤ء کو اُچ میں نماز عید ادا کرنے کے بعد آپؒ کی طبیعت خراب ہو گئی، اسی دن جب آفتاب اپنا دن بھر کا سفر تمام کر کے غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا، علم و معرفت کا یہ نیر تاباں، افق کے پار جا چھپا لیکن ایک جہاں میں اپنی روشنی سے اُجالا کر گیا۔ آپؒ کو اُچ ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ

صوفی شاعر اور مصنف جن کی تصانیف معرفت اور علم و دانش کا خزانہ ہیں

محل تیار ہو چکا تھا!

یہ سلطنت کے فرماں روا کا عالی شان محل تھا۔ بلند در و دیوار دریچے اور کھڑکیاں، دیواروں پر نفیس نقاشی اور سنگ تراشی کا عمدہ کام تھا، عمارت بے حد حسین ہونے کے ساتھ نہایت پُر شکوہ بھی تھی۔

اس پُر مسرت موقع پر کئی شعراء کرام نے قصائد پیش کیے۔ سب نے سلطانِ معظم کی تعریفوں کے پُل باندھنے کی کوشش کی۔ اب ایک ایسے بزرگ شاعر کے قصیدے کا انتظار تھا جو سلطان کو بہت محبوب تھے۔ لوگ منتظر تھے کہ اس قصیدے میں کیا مضمون باندھا جاتا ہے۔

بزرگ شاعر دربار میں تشریف لائے اور انہوں نے سلطان کے روبرو قصیدہ پیش کیا، لیکن یہ قصیدہ تو نہ تھا۔ یہ تو سلطان کو کھلی کھلی نصیحت تھی۔ اس قصیدے میں سلطان کو مخاطب کر کے جو کچھ کہا گیا تھا، اس کا مفہوم یہ تھا:

"میں چاہتا ہوں کہ اس کی شاعرانہ تعریف کروں لیکن عقل کے نزدیک ایسی تعریف کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اصلی ستائش یہ ہے کہ اپنی فیاضی اور سخاوت سے عدل اور جود و سخا کی یادگار زمانے کے صفحہ پر تحریر کر دیں۔"

پھر بزرگ نے اپنے اشعار میں سلطان کو یوں احساس دلایا: "اب ظاہری عمارت بنانا چھوڑ دیں کیوں کہ روحانی عمارت بنانے والوں کے نزدیک یہ عیب اور شرم کی بات ہے۔ در و دیوار پر نقش و نگار بنانا بچوں کا کام ہے۔ عقل مندوں کو بچوں کا کام ہرگز زیب نہیں دیتا۔"

یہ بزرگ شاعر تھے مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ جنہوں نے سلطنت وسط ایشیا کے فرماں روا حسین بایقرا کے بنوائے ہوئے عظیم الشان محل کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرنے کی بجائے دو ٹوک انداز میں نصیحت کرنے کو ترجیح دی۔ عبدالرحمٰن جامیؒ فارسی ادبیات کی تاریخ میں بہت بڑا نام ہے۔ آپؒ کی شاعری نے نہ صرف فارسی ادبیات بلکہ ترکی اور برصغیر کی ادبیات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ مولانا جامیؒ نہایت باکمال اور کئی علوم کے ماہر تھے۔ آپؒ کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ آج بھی معرفت اور عقل و دانش کی روشنی بکھیر رہا ہے۔

آپؒ کا نام عبدالرحمٰن اور لقب نورالدین ہے۔ جامی آپؒ کا تخلص ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپؒ کا اصل نام عماد الدین ہے۔ آپؒ ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ / ۷ نومبر ۱۴۱۴ء کو خراسان کے ایک گاؤں خرجرد، میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد کا نام نظام الدین احمد ہے۔ آپؒ کے والد محترم اور آباؤاجداد اصفہان کے نواح میں واقع ایک محلے "دشت" میں سکونت پزیر تھے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ "دشتی" کہلاتے تھے۔ بعد میں آپؒ کے والد محترم خراسان کے شہر "جام" میں آکر آباد ہوگئے۔

جام کو کسی زمانے میں "زام" کہا جاتا تھا اور یہ قوہستان خراسان کے پہاڑی خطے کا ایک شہر تھا۔ قوہستان خراسان چاروں طرف سے وسطی سطح مرتفع ایران کے وسیع صحرا سے گھرا ہوا ہے۔ جام کے نواح میں ایک گاؤں "خرجرد" واقع ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامیؒ کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی۔ آپؒ کے والدین اور دیگر بزرگوں نے چونکہ شہر جام، میں سکونت اختیار کی تھی، اس لیے آپؒ نے اپنا تخلص "جامی" پسند فرمایا ہے۔

آپؒ کا تعلق ایک علم دوست گھرانے سے تھا۔ آپؒ کے والد نظام الدین احمدؒ اور دادا محترم شمس الدینؒ دونوں کا شمار جید علماء کرام میں ہوتا تھا۔ شہر جام میں فتویٰ دینے اور عدالتی فیصلے کرنے کے مناصب ان ہی کے سپرد تھے۔ مولانا عبدالرحمن جامیؒ کا سلسلۂ نسب والد اور والدہ دونوں جانب سے فقہ کے مشہور امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ (حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد) سے ملتا ہے۔

Marfat.com

عبدالرحمن جامیؒ کمسن تھے کہ ان کے والد انہیں ہرات لے گئے جہاں ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ والد صاحب نے بچے کو پہلے قرآن کریم حفظ کروایا۔ اس کے بعد عربی کی صرف و نحو کی خود تعلیم دی۔ پھر مدرسہ نظامیہ ہرات میں داخل کروا دیا۔ یہاں مولانا جامیؒ کو مولانا جنید اصولیؒ جیسے بلند پایہ عالم اور عربی کے ماہر استاد میسر آئے جن سے انہوں نے علم معانی و بیان کی تعلیم حاصل کی۔

اس زمانے میں سمرقند علم و ادب کا بڑا مرکز تھا چنانچہ مولانا جامیؒ سمرقند تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے خواجہ علی سمرقندیؒ، مولانا شہاب الدین محمدؒ اور قاضی رومؒ سے مختلف علوم کی تکمیل کی۔ قاضی رومؒ علم ہیئت کے ماہر تھے۔ وہ مولانا جامی کی ذہانت، حافظہ اور دیگر صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ کئی علمی نکات پر نوجوان شاگرد جامیؒ نے اپنے استاد قاضی رومؒ سے اختلاف کی جرأت کی اور بحث و مباحثے کے بعد قاضی رومؒ کو اپنے لکھے پر نظر ثانی کر کے اس میں ترمیم کرنی پڑی۔ مولانا جامیؒ نے مولانا علی خوشجیؒ سے بھی علم حاصل کیا جو فن ہیئت کے ماہر اور مشہور مصنف تھے۔

علوم اسلامی اور تاریخ و ادبیات کی اعلیٰ تعلیم میں کمال حاصل کرنے کے بعد مولانا جامیؒ نے تصوف اور معرفت پر اپنی توجہ مرکوز فرمائی۔ تصوف کا چرچا آپؒ کے خاندان میں پہلے سے تھا۔ خود مولانا جامیؒ کو بچپن ہی سے کئی بڑے صوفیا کرام کی خدمت میں حاضری دینے اور ان کی عارفانہ گفتگو سننے کا شرف حاصل ہوتا رہا تھا۔ علوم دین اور تاریخ و ادب کی تکمیل کے بعد آپؒ نے خواجہ سعد الدین کاشغریؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی جو سلسلۂ نقشبندیہ کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ ان کے وفات پاجانے کے بعد مولانا جامیؒ ہی کو مرشد کا مقام نصیب ہوا۔

مولانا جامیؒ جب پیدا ہوئے تو وسطی ایشیا پر امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ کی حکمرانی تھی۔ ۸۵۰ھ / ۱۴۴۷ء میں شاہ رخ کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے الغ بیگ حکمران بنے لیکن ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء میں ان کے قتل کے بعد ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء تک تین حکمران تبدیل ہوئے۔ ابو سعید مرزا ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء تا ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ء حکومت کرتے رہے۔ ان کے بعد تیموری سلطنت محدود ہوگئی اور اس میں بھی تین حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ہرات اور خراسان میں حسین بایقرا نے ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ء میں حکومت قائم کی۔

اس تمام عرصے میں مولانا جامیؒ علمی سرگرمیوں، اوراد تصوف اور سیرت و شخصیت کی تعمیر میں مصروف رہے۔ حسین بایقرا کے دور حکومت سے ان کے تصنیفی اور تالیفی کام میں تیزی آگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود حسین بایقرا بہت ذی علم اور علوم و فنون کی سرپرستی کرنے والے حکمران تھے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حسین بایقرا کے ندیم خاص علی شیر نوائی نے اہل علم کو یکجا کرنے اور انہیں سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں بے حد نمایاں اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔ علی شیر نوائی خود بھی بہت اچھے عالم اور ترکی اور فارسی زبانوں کے شاعر و ادیب تھے۔

علی شیر نوائی مولانا جامیؒ کے بڑے معتقد تھے۔ علی شیر نوائی نے اپنی کتاب "مجالس النفائس" کے شروع میں مولانا جامیؒ کا مختصر تذکرہ کرنے کے علاوہ ایک پوری کتاب "خمسۃ المتحیرین" کے نام سے مولانا جامیؒ کی تعریف میں تصنیف کی۔ اس کتاب میں، جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے، علی شیر نوائی نے مولانا جامیؒ کی ولادت، ان کا حسب و نسب، علی شیر نوائی سے ان کی واقفیت، دوستی، باہمی خط و کتابت کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب میں ان کتب کا بھی ذکر ہے جو علی شیر نوائی نے مولانا جامیؒ کے مشورے پر پڑھیں اور ان کتابوں کا بھی تذکرہ ہے جو مولانا جامیؒ نے علی شیر نوائی کی تجویز اور ترغیب دلانے پر تصنیف کیں۔

سلطان حسین بایقرا بھی مولانا جامیؒ کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "مجالس عشاق" میں ۷۶ مقالے شامل کیے ہیں۔ ہر مقالہ کسی نہ کسی ولی اللہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ آخری مقالہ مولانا جامیؒ کی شخصیت پر تحریر کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں ایران کے مغربی اور جنوبی حصوں پر قرہ قویونلو اور آق قویونلو نامی ترکمان خاندانوں کی حکومت تھی۔ مولانا جامیؒ کی شہرت نہ صرف ایران کے ان حصوں میں تھی بلکہ عراق، شام، حجاز اور دور و نزدیک کے تمام علاقوں میں آپؒ کے زبردست علم اور بے پناہ صلاحیتوں اور معرفت نفس کی بڑی دھوم تھی۔ اناطولیہ (ترکی) کے عثمانی سلاطین تو آپؒ سے بہت متاثر تھے۔ سلطان محمد فاتح (۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ / ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) اور ان کے صاحب زادے بایزید دوم (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ / ۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) مولانا جامیؒ کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی یہ خواہش رہی کہ مولانا جامیؒ عثمانی سلطنت چلے آئیں۔

مولانا جامیؒ کو رب جلیل و کریم نے بڑی عزت دی۔ آپؒ کو

Marfat.com

بڑے بڑے حکمرانوں نے بیش قیمت تحائف پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنے پاس آکر قیام کرنے کی دعوت دی لیکن آپؒ نے کبھی کسی کی جھوٹی تعریف سے اپنی زبان اور اپنے قلم کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ آپؒ کے ایک شعر کا مفہوم ہے: ''میں وہ شخص نہیں ہوں کہ میری زبان بےہودہ باتوں سے آلودہ ہو اور دنیاداروں کی ہجو اور مدح میں خامہ فرسائی کروں۔''

ایک اور جگہ آپؒ نے چند اشعار میں اپنے پاکیزہ خیالات کو جن الفاظ میں پیش کیا، ان کا مفہوم ہے: ''دانتوں سے دیوار میں سوراخ کرنا، ناخن سے پتھریلی چٹانیں کاٹنا، آتش دان میں الٹا کرکے ڈال دیا جانا، آنکھوں سے چنگاریاں اٹھانا، سر پر سو اونٹوں کا بوجھ رکھ لینا، مشرق سے مغرب تک دوڑنا، یہ سب جامیؒ کے لیے بہت آسان ہے، بہ نسبت کم ظرفوں کے احسان کا بوجھ اٹھانے سے۔''

ایک بار سلطان یعقوب تبریزی نے آپؒ کو خط اور تحائف ارسال کیے۔ آپؒ نے جواب میں انھیں عدل وانصاف کرنے کی تاکید فرمائی۔

مولانا جامیؒ کے مزاج میں درویشی، بے نیازی اور استغنا نمایاں تھا۔ آپؒ کا قیام ہرات میں مرزا خیابان کی خانقاہ میں تھا۔ آپؒ کی مجلس گویا مشرقی مہمان نوازی کا مثالی نمونہ تھی۔ آپؒ کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور آپؒ کی بلند مرتبہ علمی گفتگو سننے اور آپؒ کے عارفانہ کلمات سے استفادہ کرنے کے لیے علماکرام، صوفیا اور عام افراد آپؒ کی خدمت میں دور دور سے حاضر ہوتے تھے۔ مولانا جامیؒ نے اپنے مرشد خواجہ سعدالدین کاشغریؒ کی پوتی اور خواجہ کلاں کی صاحب زادی سے شادی کی تھی۔ آپؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چار بیٹے عنایت فرمائے لیکن ان میں سے تین بیٹے شیر خوارگی میں ہی وفات پاگئے۔ پہلا بچہ تو صرف ایک دن زندہ رہا۔ دوسرے بچے صفی الدین نے چند ماہ کی عمر پائی اور چوتھے بچے کا انتقال پیدائش کے چالیس دن بعد ہوگیا۔ صرف تیسرا بچہ یوسف ضیاالدین زندہ رہا تاہم عالمِ جوانی میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

مولانا جامیؒ نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی فرمائی۔ ان میں نعت، مثنوی، غزل، قصیدہ، رباعی شامل ہیں لیکن مولانا جامیؒ کا اصل میدان نعت گوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؒ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی اور گہری عقیدت تھی۔ مولانا جامیؒ کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلا کی روانی ہے اور بات کو گھما پھرا کر اور پیچیدہ بنا کر کہنے سے گریز کیا گیا ہے۔

مولانا جامیؒ، نظم اور نثر دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ آپؒ کی تصنیفات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض مؤرخین نے یہ تعداد ۹۹ لکھی ہے بعض کے خیال میں یہ ۵۰ اور کچھ کی رائے میں ۵۴ ہے تاہم بیشتر مؤرخین کا کہنا ہے کہ آپؒ کی تصانیف کی تعداد ۴۴ ہے۔ ان ۴۴ کتب کے نام اور تفصیلات بھی تاریخی کتب میں درج کردی گئی ہیں اور ان کا محض سرسری جائزہ ہی حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی ہے کہ مولانا نظم ونثر کی کتنی بہت سی اصناف پر مکمل عبور رکھتے تھے اور آپؒ کو کتنے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔

مولانا جامیؒ کی زیادہ تر تصنیفات اگرچہ نثر میں ہیں لیکن آپؒ کی اصل شہرت آپؒ کی شعری تخلیقات کی وجہ سے ہوئی۔ آپؒ کی شعری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول، آپؒ کی مثنویاں ہیں جو مجموعی طور پر ''ہفت اورنگ'' کے عنوان سے موسوم ہیں۔ آپؒ نے تین دیوان بھی تخلیق فرمائے جن کے نام ہیں: فاتحۃ الشباب، واسطۃ العقد اور خاتمۃ الحیاۃ۔ اول الذکر میں آپؒ کی جوانی کے دور کا کلام یکجا کردیا گیا ہے۔ اسے آپؒ نے ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء میں مرتب فرمایا۔ مولانا نے دوسرا دیوان ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء میں مرتب فرمایا اور یہ آپؒ کی عمر کے درمیانی حصے کا کلام ہے۔ تیسرے دیوان میں آپؒ کی زندگی کے بقیہ دنوں میں کہی گئی منظومات جمع کردی گئی ہیں۔ ہر دیوان میں قصائد، غزلیں، قطعات اور رباعیات موجود ہیں اور انھیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

ان دواوین کے علاوہ آپؒ کی بقیہ ۴۱ تصانیف کا مختصر تذکرہ حسبِ ذیل ہے۔ پہلے آپؒ کی سات مثنویوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ سلسلۃ الذہب: یہ مثنوی مولانا جامیؒ نے سلطان حسین بایقرا کے نام معنون کی اور اسے آپؒ نے سلطان کی تخت نشینی ۸۷۳ھ / ۱۴۶۸ء اور اپنے سفر حجاز ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء کے درمیانی عرصے میں تخلیق فرمایا۔ اس مثنوی میں فلسفیانہ، اخلاقی اور دینی مسائل بیان کیے گئے ہیں اور ہر موضوع پر دلچسپ حکایات بھی شامل کردی گئی ہیں۔ اس طرح اخلاقی اور فلسفیانہ سوالات کی تشریح کا ایک مجموعہ میسر آجاتا ہے۔ مولانا نے اس مثنوی میں اسلامی عقائد، قرآن کی بعض آیات کی تفسیر اور تصوف کے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔

۲۔ سلامان والسبال: اس مثنوی کو مولانا جامیؒ نے یعقوب بن

Marfat.com

اوزون حسن کے نام معنون فرمایا، جو شمالی ایران اور اناطولیہ میں (۸۸۳ھ تا۸۹۶ھ / ۱۴۷۸ء تا ۱۴۹۰ء) حکمران تھے۔ یہ تمثیلی پیرائے میں ایک خیالی قصہ ہے۔

۳۔ تحفتہ الاحرار: یہ فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ایک نصیحت آموز مثنوی ہے اور اسے آپؒ نے نقشبندیہ سلسلے کے بانی حضرت بہاؤالدینؒ اور اس سلسلے کے بزرگ ناصر الدین عبید اللہؒ (خواجہ احرارؒ) کی شان میں تصنیف فرمایا۔

۴۔ سجتہ الابرار: یہ مثنوی تحفتہ الاحرار سے مشابہ لیکن صوفیانہ رجحانات کی حامل ہے۔ اسے مولانا نے ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء میں سلطان حسین بایقرا کے نام معنون فرمایا۔

۵۔ یوسف وزلیخا: یہ مولانا کی سب سے مشہور مثنوی ہے۔ اسے آپؒ نے ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء میں تصنیف فرمایا۔ اس مثنوی میں آپؒ نے حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات زندگی کو متصوفانہ انداز میں نظم فرمایا ہے۔ اس مثنوی کے تراجم انگریزی، جرمن اور دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ مثنوی چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا نے یہ مثنوی بھی سلطان حسین بایقرا کے نام معنون کی۔

۶۔ لیلیٰ ومجنوں: ۳۷۶۰ اشعار پر مشتمل اس مثنوی کے بھی جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ یہ مثنوی مولانا جامیؒ نے ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں تصنیف کی۔

۷۔ خردنامہ سکندری: یہ ایک ناصحانہ مثنوی ہے جس میں سکندر اور بعض فلسفیوں کے درمیان چند فلسفیانہ اور اخلاقی مسائل پر بحث ومباحثہ کا بیان ہے۔ مولانا جامیؒ نے یہ مثنوی ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ء میں تصنیف فرمائی اور سلطان حسین بایقرا کے نام معنون کی۔

۸۔ معمائے کبیر: مولانا جامیؒ کو معمہ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ آپؒ نے اپنے اشعار میں مختلف معمے پنہاں کر دیے ہیں۔ معموں ہی پر مزید تین کتابیں اور ہیں۔

۹۔ رسالۂ معمائے متوسط

۱۰۔ رسالۂ معمائے صغیر

۱۱۔ رسالۂ اصغر درمعما

۱۲۔ رسالۂ عروض: یہ علم عروض یعنی شاعری کے قواعد سے متعلق ایک کتاب ہے۔

۱۳۔ رسالۂ درقافیہ: فن قافیہ پر یہ کتاب مولانا جامیؒ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں تصنیف فرمائی۔

۱۴۔ رسالۂ موسیقی: مولانا جامیؒ کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی اور اپنی عمر کے ابتدائی برسوں میں آپ نے موسیقی کا علم حاصل کیا تھا۔

۱۵۔ انشائے جامی: مولانا جامیؒ نے اکثر سلاطین یا فضلا کو جو خطوط لکھے تھے، انھیں اس کتاب میں یکجا کیا گیا ہے۔

۱۶۔ مناقب مولوی وخواجہ انصاری

۱۷۔ نثر اللآلی

۱۸۔ سخنان خواجہ پارسا

۱۹۔ رسالہ طریق صوفیاں

۲۰۔ فتوح الحرمین: اس کتاب میں مولانا نے اپنے سفر حج کی روداد منظوم شکل میں بیان فرمائی اور حج کے فضائل سے متعلق روایتوں کو نظم کر دیا ہے۔

۲۱۔ رسالہ لوائح: صوفیانہ خیالات کو رباعیوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

۲۲۔ شرح رباعیات: مولانا نے اس کتاب میں خود اپنی ہی بعض رباعیوں کی شرح بیان فرمائی ہے۔

۲۳۔ شرح بیتے چند از مثنوی مولوی: مولانا رومؒ کی مثنوی کے پہلے دو اشعار کی شرح نظم اور نثر دونوں میں بیان کی گئی ہے۔

۲۴۔ شرح بیت امیر خسرو

۲۵۔ رسالہ تہلیلیہ: اس کتاب میں مولانا نے کلمۂ طیبہ کے معنی بیان فرمائے ہیں۔

۲۶۔ رسالہ طریق توجہ

۲۷۔ رسالہ وجودیہ

۲۸۔ شرح قصیدہ تائیہ فارضیہ: اس کتاب میں مولانا نے مصر کے شاعر ابن فارض کے قصیدہ تائیہ کی شرح لکھی ہے اور ہر شعر کا مفہوم ایک ایک رباعی میں بھی بیان فرمایا ہے۔

۲۹۔ شرح قصیدہ میمیہ خمریہ (لوامع): ابن فارض کے قصیدہ خمریہ کی شرح ہے۔

۳۰۔ اشعۃ اللمعات: حضرت بہاؤالدین نقشبندیؒ کے مرید اور داماد شیخ فخر الدین عراقی (وفات: ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء) نے علامہ ابن

Marfat.com

عربیؒ کی کتاب فصوص الحکم سے چند مضامین منتخب کر کے "لمعات" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ مولانا جامیؒ نے اسی رسالے کی شرح علی شیر نوائی کی فرمائش پر "اشعۃ اللمعات" کے نام سے لکھی۔

۳۱۔ **نقد النصوص:** علامہ ابن عربیؒ نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" سے انتخاب کر کے ایک رسالہ "نقش النصوص" ترتیب دیا تھا۔ مولانا جامیؒ نے ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں اس رسالے کی شرح 'نقد النصوص' کے نام سے لکھی۔

۳۲۔ **شواهد النبوة:** امام مستغفری کی کتاب "دلائل النبوۃ" اور اس نوعیت کی دیگر کتابوں کا نچوڑ اس کتاب میں قلم بند کر دیا گیا ہے۔

۳۳۔ **مناسك الحج:** جب مولانا جامیؒ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو آپؒ نے بغداد میں قیام کے دوران حج کے ارکان اور مناسک پر یہ کتاب لکھی۔ مناسک حج کے سلسلے میں فقہ کے چار مشہور اماموں کے مابین جو اختلافات پائے جاتے ہیں، مولانا نے انھیں بھی بیان فرمایا ہے۔

۳۴۔ **رسالہ صرف:** عربی صرف و نحو کے اصول نثر و نظم میں بیان کیے گئے ہیں۔

۳۵۔ **شرح مأته عامل**

۳۶۔ **الفوائد الضيائيه فی شرح كافيه:** علامہ ابنِ حاجب (وفات: ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) نے علم نحو پر ایک کتاب "کافیہ" کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔ مولانا جامیؒ نے اس کتاب کی شرح عربی زبان میں لکھی۔ یہ کتاب مولانا کے زبردست علم و فضل اور ان کی بے پناہ قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۳۷۔ **بہارستان (روضة الاخيار):** جس زمانے میں مولانا جامیؒ اپنے صاحب زادے یوسف ضیاالدین کو علامہ سعدی شیرازیؒ کی گلستان پڑھا رہے تھے تو آپؒ نے ارادہ فرمایا کہ خود بھی اسی طرز کی ایک کتاب لکھیں، چنانچہ "روضہ" یعنی "باغ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جسے "بہارستان" بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے اور ساتویں (آخری) باب میں سیرتؐ پر مواد بھی ملتا ہے۔ کتاب کا مقصد تفریح کے ساتھ نصیحت فراہم کرنا ہے۔ بہارستان آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کا نام "روضہ" رکھا گیا ہے۔ کتاب ملی جلی نظم و نثر میں ہے تاہم نظم کا حصہ زیادہ ہے۔

۳۸۔ **تفسیر فاتحه الكتاب:** سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔

۳۹۔ **ترجمه اربعين حديث**

۴۰۔ **شرح حديث حضرت ابوذر غفاریؓ**

۴۱۔ **نفحات الانس:** مولانا جامیؒ نے اپنی اس عظیم کتاب میں اپنے زمانے تک کے بزرگانِ دین اور صوفیا و مشائخ کے حالات اور کلمات تحریر فرمائے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے یہ کتاب میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھی، اس کی تکمیل میں تین برس (۸۸۱ھ تا ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۶ء تا ۱۴۷۸ء) لگے۔ اس کتاب کا ماخذ شیخ عبدالرحمٰن بن محمد حسن نیشاپوری (وفات: ۴۱۲ھ/ ۱۰۲۱ء) کی کتاب "طبقات الصوفیا" ہے۔ اس کتاب میں صرف ۱۰۰ صوفیا کرام کا تذکرہ تھا اور صرف تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک کے صوفیا کرام کے حالات درج تھے۔ مزید یہ مشکل تھی کہ اس کتاب میں کئی تحریفات ہو چکی تھیں، پھر اس کا ترجمہ ہراتی زبان یا ہروی فارسی میں موجود تھا جو خراسان کے لوگوں کے لیے قابل فہم نہ تھا۔

مولانا جامیؒ نے اپنی کتاب "نفحات الانس" میں ۶۱۶ صوفیا کرام کے حالات شامل فرمائے ہیں جن میں ۵۸۲ عارف حضرات ہیں اور ۳۴ خواتین ہیں۔ مولانا جامیؒ نے صوفیا کرام کا یہ احوال نہایت احتیاط سے تحقیق کر کے قلم بند فرمایا ہے۔ مولانا نے صوفیا کرام کے حالات زمانی ترتیب کے مطابق بیان کیے ہیں اور نفحات الانس کا ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس مقدمے میں صوفیا کے عقائد، عمل اور تاریخ سے متعلق مختلف امور سے بحث کی گئی ہے۔ مولانا جامیؒ کے ایک شاگرد مولانا عبدالغفور لاریؒ (وفات: ۹۱۲ھ/ ۱۵۰۶ء) نے نفحات الانس کا ایک اضافہ تصنیف کیا جس میں دیگر صوفیا کرام کے ساتھ خود مولانا جامیؒ کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

"نفحات الانس" کے تراجم انگریزی اردو اور دیگر کئی زبانوں میں ہوئے ہیں اور اس پر فارسی میں مقالے لکھے گئے ہیں۔ خود میر علی شیر نوائی نے اس کتاب کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا۔ "نفحات الانس" تصوف کی نہایت اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔

مولانا جامیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طول طویل بیان سے اجتناب کرتے ہیں اور اپنی بات کو واضح کرنے یا حوالہ دینے کی غرض سے عربی آیات، احادیث، عبارتیں، اقوال اور اشعار بھی درج کرتے

Marfat.com

ہیں۔ مولانا نے صوفیا کرام کا احوال لکھنے سے قبل تصوف اور اس کی حقیقت کے بارے میں بڑی عالمانہ اور محققانہ بحث فرمائی ہے۔

مولانا جامیؒ بہت لطیف ذوق کے مالک تھے۔ بعض اوقات آپؒ کی باتوں میں بذلہ سنجی کی جھلک نمودار ہو جاتی تھی۔ ایک بار آپؒ ایک صاحب کی عیادت کے لیے گئے۔ ان صاحب نے تصوف کے حقائق اور اسرار پر اظہار خیال شروع کر دیا، جس میں انھوں نے بعض غلطیاں بھی کیں۔ آپؒ خاموشی سے سنتے رہے۔ بعد میں ان صاحب نے دوسرے لوگوں سے کہا کہ آج مولانا جامیؒ میرے پاس تشریف لائے تھے۔ میں نے تصوف کے وہ باریک نکات بیان کیے کہ انھوں نے کان پکڑ لیے۔ مولانا جامیؒ تک جب یہ بات پہنچی تو مولانا نے کہا: "واقعی ان کی باتیں ایسی تھیں جن کو سن کر کان پکڑنے ہی چاہیے تھے۔" ایک بار ایک شاعر نے اپنی غزل سنائی اور خواہش ظاہر کی اسے شہر کے دروازے پر لٹکا دیا جائے تاکہ شہر بھر کے لوگ اسے پڑھیں۔ مولانا نے برجستہ فرمایا: "یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ تمہاری غزل ہے۔ بہتر ہوگا تمہیں بھی اس غزل کے ساتھ لٹکا دیا جائے!"

جب مولانا سفر حج کے سلسلے میں بغداد پہنچے تو آپؒ کے ایک مرید جمال عراقی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپؒ کا استقبال کرنے کے لیے آئے۔ جمال عراقی اور ان کے ساتھیوں نے اونٹ کی کھال کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جمال عراقی کی نظر جوں ہی مولانا جامیؒ پر پڑی تو انھوں نے عقیدت سے کہا: "جَمالِ الٰہی دیدم" (میں نے خدا کا جمال دیکھا) مولانا نے فوراً فرمایا: "جِمالِ الٰہی دیدم" (میں نے خدا کے اونٹ دیکھے!، عربی میں اونٹ کو جمل کہتے ہیں، جس کی جمع جمال ہے)۔

مولانا جامیؒ نے ۱۶ ربیع الاول ۸۷۷ھ / ۲۱ اگست ۱۴۷۲ء میں حج بیت اللہ کی غرض سے سفر فرمایا۔ اس سفر کے دوران آپؒ نے بہت بلند پایہ نعتیں اور منقبتیں کہیں جو آج بھی نہایت عقیدت سے پڑھی جاتی ہیں اور برصغیر میں معروف ہیں۔ مولانا جامیؒ نے اس سفر کے دوران بغداد، نجف، کربلا میں بھی قیام فرمایا۔ واپسی میں آپؒ شام کے راستے تبریز تشریف لے گئے۔ عثمانی سلطان محمد فاتح، مصر کے سلطان ملک اشرف اور ترکی کے حکمرانوں نے انھیں متعدد تحائف پیش کیے لیکن مولانا جامیؒ ان تحائف سے بے نیاز رہے۔

جب مولانا ہرات سے نیشاپور، سبزوار، بسطام، دامغان اور قزوین ہوتے ہوئے ہمدان پہنچے تو وہاں کے بادشاہ مرزا منوچہر نے آپؒ کا شاندار خیر مقدم کیا اور اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا۔ جب آپؒ رخصت ہونے لگے تو اپنی فوج کی حفاظت میں آپؒ کو بغداد کی سرحد تک پہنچایا۔

مولانا جامیؒ ۱۸ شعبان ۸۷۸ھ / ۸ جنوری ۱۴۷۴ء کو ہرات واپس پہنچے۔ زندگی کے بقیہ بیس برس آپؒ نے مطالعہ، شعر و شاعری، تصنیف و تالیف اور روحانی مجاہدوں میں بسر فرمائے۔ ۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء میں ۱۳ محرم کو مولانا علیل ہو گئے۔ علاج کے باوجود آپؒ کی طبیعت سنبھل نہ پائی۔ ۱۸ محرم ۸۹۸ھ / ۹ نومبر ۱۴۹۲ء کو جس وقت جمعہ کی اذان ہو رہی تھی، آپؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپؒ کی وفات کی خبر آناً فاناً دور دور تک پھیل گئی اور کہرام مچ گیا۔ سلطان حسین بایقرا، علی شیر نوائی اور دیگر امرا آپؒ کے جنازے کو کاندھا دے کر قبر تک لے گئے۔ آپؒ کو مزارِ خیابان میں اپنے مرشد خواجہ سعد الدین کاشغریؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپؒ کا مقبرہ آج بھی موجود ہے۔

•••

Marfat.com

مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

پچاس سے زیادہ علوم کی ماہر، ایک غیر معمولی، ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت

مسئلہ بہت پیچیدہ تھا!

مسئلے کا تعلق ریاضی سے تھا۔ اسے حل کرنے کی کوشش کرنے والی بھی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ ان کا شمار برصغیر کے مانے ہوئے ریاضی دانوں میں ہوتا تھا، وہ ایک بڑی جامعہ (یونیورسٹی) کے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) بھی تھے۔

بڑی کوشش کے باوجود ریاضی کا مسئلہ لاینحل ہی رہا۔ شیخ الجامعہ نے ارادہ کیا کہ وہ جرمنی جا کر اس مسئلے کا حل وہاں کے ماہرین کی مدد سے تلاش کریں گے۔ شیخ الجامعہ ابھی اسی سوچ میں تھے کہ شعبۂ دینیات کے ناظم تشریف لے آئے۔ انہیں شیخ الجامعہ کو درپیش الجھن کا علم ہوا تو بریلی جا کر ایک بزرگ سے ملنے کا مشورہ پیش کیا۔ شیخ الجامعہ کو یہ مشورہ قابل عمل محسوس نہ ہوا لیکن ناظم شعبۂ دینیات کے زور دینے پر ان کے ساتھ بریلی چلے گئے۔

بریلی میں شیخ الجامعہ کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ دبلے پتلے بدن کے مالک بزرگ نے عمامہ اور انگرکھا زیب تن کر رکھا تھا۔ شیخ الجامعہ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور ریاضی کا پیچیدہ مسئلہ بزرگ کے سامنے رکھ دیا۔

بزرگ نے ریاضی کے مسئلے پر نظر ڈالی اور شیخ الجامعہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بزرگ نے ریاضی کا وہ الجھا ہوا مسئلہ فوری طور پر حل فرمادیا، جس کو حل کرنے کی کوشش شیخ الجامعہ کئی دنوں سے کر رہے تھے۔

اس کے بعد تو ریاضی ہی کے مسائل پر گفتگو شروع ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بزرگ نے اپنی ایک کتاب منگوائی اور شیخ الجامعہ کو دکھائی۔ یہ کتاب ریاضی اور جیومیٹری کے بارے میں تھی۔ شیخ الجامعہ اس کتاب کو دیکھ کر مزید حیرت زدہ رہ گئے۔

گفتگو جاری رہی اور بزرگ کے ارشادات گویا شیخ الجامعہ کے دل کو تسخیر کرتے چلے گئے۔ جب شیخ الجامعہ واپس اپنے شہر پہنچے تو ان کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ نمازوں کے پابند ہو چکے تھے اور چند دنوں میں ان کا چہرہ سنتِ نبویؐ سے مزین ہو چکا تھا۔

یہ بزرگ تھے مولانا احمد رضا خان بریلویؒ جنہیں بجا طور پر علوم و فنون کا خزینہ کہا جانا چاہیے۔ آپؒ ہی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاالدین احمد کو درپیش، ریاضی کا پیچیدہ مسئلہ چند ثانیوں میں حل کر کے دکھا دیا اور آپؒ ہی کے ارشادات کی بدولت ڈاکٹر ضیاالدین کو ایک باعمل مسلمان بن جانے کی سعادت میسر آگئی۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو آج ان کی عقیدت سے لبریز نعتوں کی وجہ سے شہرت حاصل ہے لیکن بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ مولانا احمدؒ رضا بریلوی انتہائی غیر معمولی، ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔

آپؒ کی زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ آپؒ نے ایک طرف پچاس سے زائد علوم پر سیکڑوں کتابیں تصنیف فرمائیں، دوسری طرف اپنی تقاریر، وعظ و تلقین، تعلیم اور تربیت سے ہزاروں افراد کو نیکی کی راہ دکھائی اور اپنے خلفا کے ذریعے برصغیر کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؒ نے دینی اور سیاسی تحریکوں میں بروقت رہنمائی فرمائی اور کلمۂ حق بلند کیا، مزید یہ کہ آپ نے غیر اسلامی امور اور رسموں کے خلاف بھی جہاد فرمایا۔ گویا آپ نے تن تنہا وہ کارنامے انجام دیے جن کے لیے ایک بڑے تحقیقی ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ (۱۴ جون ۱۸۵۶ء) کو یوپی کے شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد ۱۷۳۹ء

Marfat.com

میں افغانستان سے آئے۔ آپؒ کے جد امجد محمد سعید خان قندھار میں سلطنت مغلیہ کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ وہ لاہور سے دہلی منتقل ہوئے۔ ان کے بیٹے سعادت یار خان بھی وزیر رہے۔ سعادت یار خان کے تین بیٹوں میں اعظم خان بھی حکومت کے عہدوں پر فائز رہے، پھر انہوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی۔ اعظم خان کے صاحب زادے حافظ محمد کاظم خان تھے جو بدایوں کے حاکم تھے۔ کاظم خان کے بیٹے رضاؒ علی خان اپنے وقت کے زبردست عالم اور روہیل کھنڈ کے بزرگ فاضل تھے۔ ان کے زمانے میں اس خاندان میں فقر و درویشی کا رنگ غالب آیا۔ رضا علی خان کو اللہ نے نقی علی خان کی صورت میں اولاد عطا فرمائی۔ مولانا نقیؒ علی خان بہت بڑے عالم تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیاں اور تین بیٹے عطا فرمائے۔ ان تین بیٹوں میں سے ایک، مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی ہیں جن کی بے پناہ علمی اور دینی خدمات دلوں میں اجالا کر رہی ہیں۔ آپؒ کی پاکیزہ شخصیت، اعلیٰ سیرت اور ارفع کردار کے باعث تاریخ کے اوراق روشن ہیں۔

مولانا احمدؒ رضا بریلوی کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی غیر معمولی ذہن، مثالی قوتِ فہم، حیرت انگیز سوجھ بوجھ اور فقید المثال حافظہ عطا فرمایا تھا۔ آپؒ نے بہت کم عمر میں قرآن پاک ختم فرمایا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپؒ کے والد محترم مولانا نقی علی خان نے آپؒ کو مولانا مرزا غلام قادر بیگ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے آپؒ کو صَرف و نحو اور زبانِ عربی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد آپؒ نے اپنے والد محترم مولانا نقیؒ علی خان سے ۲۱ علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

علم قرآن، علم حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، جدل، تفسیر، عقائد، کلام، نحو، صَرف، معانی، بیان، منطق، بدیع، مناظرہ، فلسفہ، تکسیر، ہیئت، حساب، ہندسہ۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے دیگر ۱۰ علوم دوسرے اساتذۂ کرام سے حاصل فرمائے ان کے نام یہ ہیں:

قرأت، تجوید، تصوف، سلوک، اخلاق، اسمأ الرجال، سِیَر، تاریخ، لغت، ادب۔

ان کے علاوہ مزید ۲۴ علوم میں بھی آپؒ کو مہارت حاصل تھی، جن میں جبر و مقابلہ، حساب، زیجات، مثلث کروی، مثلث مسطح، ہیئت جدیدہ، علم الفرائض، عروض و قوافی، فن تاریخ، خطاطی اور دیگر کئی علوم شامل ہیں۔ اس طرح ان تمام علوم کی تعداد ۵۵ کے قریب ہے۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؒ کی ذات علوم کا خزینہ تھی۔ آپؒ کو ایک مجسم انسائیکلوپیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے بہت کم عمر میں قرآن، حدیث اور فقہ کے اہم دینی علوم پر دسترس حاصل فرمالی۔ آپؒ کی غیر معمولی استعداد، ذہانت، حافظہ اور علم کو دیکھتے ہوئے آپؒ کے والد محترم نے آپؒ کو فتویٰ دینے کی اجازت عطا فرمائی چنانچہ آپؒ نے ۱۳ برس کی عمر میں پہلا فتویٰ تحریر فرمایا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آپؒ کی وفات تک یعنی ۵۰ برس سے زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ آپؒ کے پاس ایشیا، افریقہ، امریکا غرض یہ کہ دور دور سے مسائل اور سوالات آتے تھے۔ ایک ایک وقت میں پانچ سو سوالات جمع ہو جاتے تھے۔ آپؒ ہر سوال کا تسلی بخش فتویٰ لکھ دیا کرتے تھے یا لکھوا دیا کرتے تھے۔ آپ کو بیک وقت عربی، فارسی، اردو اور ہندی پر دسترس حاصل تھی۔ انگریزی میں آنے والے سوالات کے جوابات انگریزی میں ترجمہ کروا کے بھیجے جاتے۔ آپؒ کے ان فتاویٰ کو بعد میں کتابی شکل میں مرتب کیا گیا۔ فتاویٰ رضویہ کے نام سے یہ کتابیں ۱۲ جلدوں میں ہیں اور ہر جلد ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے حج بیت اللہ کی سعادت پہلی بار ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں حاصل فرمائی۔ اس وقت آپؒ کی عمر ۲۲ برس تھی۔ سرزمین حجاز کے علما آپؒ کے علم کی گہرائی سے بہت متاثر ہوئے۔ اس موقع پر آپؒ نے کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے حج بیت اللہ کی غرض سے دوسرا سفر ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں فرمایا۔ اس بار آپؒ نے مدینہ منورہ میں ۳۱ دن قیام فرمایا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں مارہرہ تشریف لے گئے اور آپؒ نے حضرت سید شاہ آل رسول احمدی کے حلقۂ ارادت میں شمولیت اختیار فرمائی۔ آپؒ کو خلافت اور سند حدیث عطا ہوئی۔ مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے ۱۳ سلاسلِ طریقت میں اجازت اور خلافت حاصل فرمائی۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو ان کے مداحوں نے کئی القاب دیے جن میں اعلیٰ حضرت، محدث بریلی اور فاضل بریلوی شامل ہیں۔ ان میں اعلیٰ حضرت، کا لقب بہت زیادہ مقبول و معروف ہوا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو متعدد علوم پر کامل عبور حاصل تھا۔ آپؒ قرآن پاک کا نہایت گہرا فہم رکھتے تھے۔ آپؒ نے ''کنزالایمان''

Marfat.com

کے عنوان سے قرآن پاک کا ترجمہ فرمایا۔ اس ترجمے کی شرح مولانا نعیم الدین نے لکھی۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ترجمۂ قرآن نہایت سلیس ہے اور کمال احتیاط سے کیا گیا ہے۔ آپؒ نے قرآن پاک کے موضوع پر عربی، فارسی اور اردو میں دیگر کئی کتابیں تحریر فرمائیں۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی علم الحدیث میں بھی مہارت رکھتے تھے، آپؒ کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ ایک ایک راویِ حدیث کے حالات آپ کو ازبر تھے۔ فقۂ حنفی سے متعلق تمام حدیثیں آپؒ کے پیش نظر رہتی تھیں۔ آپؒ اعلیٰ درجہ کے فقیہ بھی تھے۔ آپؒ نے کئی امور میں اپنے علم، اپنی بصیرت اور اللہ کی توفیق سے اجتہاد بھی فرمایا، مثلاً تیمم کے ذیل میں آپ نے ۳۱۱ امور بیان فرمائے ان میں سے ۱۰۷ وہ ہیں جنہیں اعلیٰ حضرت نے اپنے اجتہاد سے بیان فرمایا۔

صوفیا کرام میں بھی اعلیٰ حضرت کا مقام بہت بلند ہے۔ آپؒ ایک عظیم مفکر، محقق اور دانشور تھے۔ مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو علم ریاضی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اسی طرح علم ہندسہ اور لوگارتھم سے بھی گہری واقفیت تھی۔ ریاضی یا الجبرا کا کیسا ہی مشکل سوال ہو، آپ اسے حل فرما دیتے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو علم ہیئت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپؒ نے مولانا عبدالعلی سے اس سلسلے میں علم حاصل کیا۔ آپ کو علم نجوم سے بھی واقفیت تھی لیکن آپ اللہ کی قدرت اور قوت کے قائل تھے اور ستاروں کی چال کو اہمیت نہ دیتے تھے۔ یہ بات آپ کے ایمان خالص کی دلیل ہے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو علم حجریات (پیٹرولوجی) پر بھی دسترس حاصل تھی۔ آپؒ نے مسئلہ تیمم بیان کرتے ہوئے کئی ضمنی رسائل تحریر کیے جن میں اس علم کے حوالے سے قابلِ قدر معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ حجریات وہ علم ہے جس میں پتھروں کی تاریخ، بناوٹ اور ان کی ساخت کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی کو علم کیمیا اور فلکیات سے بھی لگاؤ تھا۔ لاہور کے ایک پروفیسر مولوی حاکم علی کو مولاناؒ سے بہت عقیدت تھی۔ مولاناؒ انہیں "مجاہد اکبر" کہتے تھے۔ مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کے شاگرد مفتی تقدس علی خان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں دیکھا ہے کہ جب بھی مولوی حاکم علی، بریلی شریف تشریف لاتے تھے تو مولوی صاحب اور اعلیٰ حضرتؒ مختلف سائنسی آلات کو کنوئیں میں معلق کر کے حرکتِ زمین کے بارے میں تجربات کیا کرتے تھے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ آپؒ اکثر فوری طور پر کسی معاملے سے متعلق تاریخی مادہ ارشاد فرما دیتے اور کبھی آپ کا بتایا ہوا تاریخی مادہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی اعلیٰ پائے کے شاعر اور انشا پرداز بھی تھے۔ آپؒ نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شاعری فرمائی۔ آپؒ نے ہمیشہ حمد، نعت، منقبت، مناجات اور سلام پر توجہ دی اور عشقِ رسالتؐ میں ڈوبے ہوئے اشعار کہے جو آج بھی ہر فرد کی زبان پر ہیں۔ آپؒ نے واضح فرمایا کہ نعت گوئی ایک مشکل صنف ہے اور حمد لکھنا آسان ہے، کیونکہ نعت لکھنے میں بہت احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کی شاعری بے حد معیاری ہے۔ اس میں شاعری کے فنی لوازم کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے اور جا بجا شعری محاسن نظر آتے ہیں۔ آپؒ نے غزل، مثنوی، رباعی اور دیگر اصناف میں شاعری فرمائی ہے۔ مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے کئی نظمیں ہندی کی آمیزش سے بھی کہیں۔ آپؒ کی ایک نعت تو عربی، فارسی، اردو اور ہندی، چاروں زبانوں کی آمیزش کا ایک حسین شاہکار ہے۔

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِی نَظَرٍ مِثْلِ تو نشد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

آپؒ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جو سلام پیش فرمایا وہ تو آج بھی گلی گلی میں اور چپے چپے پر پڑھا جاتا ہے۔

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نہایت ماہر خطیب اور مقرر بھی تھے۔ اکثر آپؒ چار اور چھ گھنٹے تک مسلسل خطاب فرماتے۔ سال میں تین تقریریں بہت اہم ہوتی تھیں۔ پہلی تقریر مدرسہ اہل سنت والجماعت محلہ بہاولپور کے فارغ التحصیل طلبہ کے سالانہ جلسہ دستار بندی کے موقع پر ہوتی تھی۔ دوسری تقریر ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر ہوتی۔ یہ تقریب بعد نماز عشا مولانا حسن رضا خان کے مکان پر منعقد ہوتی۔ تیسری تقریر ۱۸ ذی الحجہ کو سید شاہ آل رسول مارہرویؒ کے عرس کے موقع پر ہوتی۔ اعلیٰ حضرت کا اندازِ بیاں اتنا شیریں اور لطیف ہوتا کہ سامعین

Marfat.com

اس میں گم ہو کر رہ جاتے۔ آپؒ کی تقریر طویل ہوتی لیکن سامعین کو وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا۔ آپؒ کی تقریر خیالات کے ربط، الفاظ کے عمدہ انتخاب، لہجے کی نرمی اور اظہار کی روانی کی آئینہ دار ہوتی۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کو عربی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ آپؒ نے کم عمری ہی میں عربی میں کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں۔ آپؒ کی عربی کی تصانیف اور حواشی ۲۰۰ سے زیادہ ہیں۔ آپؒ کے فتووں کی کتاب "فتاویٰ رضویہ" میں سیکڑوں فتوے عربی زبان میں ہیں۔ آپؒ عربی ادب اور شاعری پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپؒ کے پاس اشعار سے متعلق بھی علمی اور فقہی سوالات آتے تھے، چنانچہ آپؒ نے متعدد عربی قصائد اور اشعار کی اصلاح فرمائی۔ علمائے عرب نے بھی آپؒ کی عربی دانی کی تعریف کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا احمد رضا خان بریلوی کو بے مثال قوتِ حافظہ عطا فرمائی تھی۔ یہ صلاحیت آپؒ کو بچپن سے ملی تھی۔ اساتذہ جو کچھ پڑھاتے آپؒ کو یاد ہو جاتا۔ آپؒ کا حال یہ تھا کہ کوئی بھی مسئلہ پیش کیا جاتا، آپؒ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مختلف کتابوں کے نام اور صفحات بتا دیتے کہ فلاں کتاب کے فلاں باب میں یہ مسئلہ اس طرح درج ہے۔ دارالافتامیں آپؒ کو ایک ہی وقت میں سیکڑوں مسائل موصول ہوتے۔ آپؒ بیک وقت چار فتاویٰ املا کرواتے۔ کاتب لکھتے جاتے، سب کے مضامین، دلائل اور حوالے الگ لیکن کسی کا تسلسل نہ ٹوٹتا۔ اگر کوئی بلند آواز میں قرآن پاک پڑھ رہا ہوتا اور اعراب کی غلطی کرتا تو چاہے کتنے ہی مصروف ہوتے، آپؒ اسے فوراً ٹوک دیتے اور اصلاح فرماتے ہوئے واضح کر دیتے کہ کس پارے کے کس رکوع کی کون سی آیت کے کس لفظ میں اعراب کی غلطی کر گئے ہو۔

مولاناؒ کی قوتِ مطالعہ بہت تیز تھی۔ بعض کتابیں صرف ایک شب میں پڑھ کر واپس کر دیتے اور وہ کتاب آپؒ کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی۔

مولاناؒ نے بچپن میں قرآن پاک حفظ نہیں کیا تھا، لیکن جب ایک بار کسی نے آپؒ کو حافظ لکھ دیا تو آپؒ کو اس بات کا اتنا احساس ہوا کہ آپؒ نے مختصر عرصے میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا۔

اعلیٰ حضرتؒ کو خطاطی پر بھی عبور حاصل تھا۔ آپؒ کو خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ شکستہ تمام میں مہارت حاصل تھی۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے تحصیلِ علم کے بعد ابتدا میں تدریس کی طرف توجہ دی۔ آپؒ کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ دور دور سے طلبہ آپؒ سے فیض یاب ہونے کے لیے آتے۔ آپؒ ایک ماہر تعلیم تھے۔ آپؒ کو ندوۃ العلما کی مجلسِ نصاب کا رکن بنایا گیا۔ بعد میں آپؒ چند وجوہ کی بنا پر اس مجلس سے الگ ہو گئے۔ آپؒ دارالعلوم منظر اسلام کے بانی تھے۔ آپؒ نے اپنے تلامذہ کا حساب کبھی نہیں رکھا۔ آپؒ کے تلامذہ میں مولانا نواب سلطان احمد خان، مولوی سید امیر احمد، مولوی حسن رضا خان، مولوی حاجی سید نور احمد چاٹگامی، مولوی سید شاہ غلام محمد، مولانا سید شاہ احمد اشرف اور دیگر بہت سے ممتاز علما شامل ہیں۔ ان سب علما کا تعلق برصغیر کے مختلف حصوں سے ہے لہٰذا آپؒ کی دینی تحریک کے اثرات برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پہنچے۔ آپؒ کے بہت سے خلفا اور تلامذہ کا تعلق سرزمین حجاز سے بھی تھا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کی تصنیف کردہ کتابوں، کتابچوں اور رسالوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ ان میں سے ۵۴۸ کتابوں کی باقاعدہ فہرست جاری کی جا چکی ہے۔ بہت سی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔ جن کتابوں کی فہرست منظر عام پر آ چکی ہے ان کی تفصیل یہ ہے: تفسیر کے موضوع پر ۱۱، حدیث و اصولِ حدیث کے موضوع پر ۵۳، عقائد و کلام ۵۴، فقہ، اصولِ فقہ، لغت فقہ، اور تجوید ۲۱۴، تنقیدات ۴۰، تصوف، اذکار، اخلاق ۱۹، تاریخ، سیر، مناقب فضائل ۵۵، ادب، نحو، لغت، عروض ۱۳، جفر و تکسیر ۱۱، جبر و مقابلہ ۴، مثلث، لوگارتھم ۸، توقیت، نجوم، حساب ۲۲، ہیئت، ہندسہ، ریاضی ۳۱، منطق و فلسفہ ۶۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے قرآن پاک کا عمدہ ترجمہ "کنزالایمان" کے نام سے پیش کیا۔ بیضاوی، معالم، درِ منثور اور تفسیر خازن پر عربی میں حواشی تحریر فرمائے۔ آپؒ نے حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں کی شرح بھی لکھیں اور ان کتابوں کی معروف شرحوں، عمدۃ القاری، ارشاد الباری اور فتح الباری پر حواشی تحریر فرمائے۔ اعلیٰ حضرتؒ کے فتاویٰ کو 'فتاویٰ رضویہ' کے نام سے ۱۲ جلدوں میں یکجا کیا گیا۔ ہر جلد بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی عالم باعمل تھے۔ آپؒ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ آپؒ نے زندگی بھر پانچوں وقت کی فرض نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں۔ آخر عمر میں جب بہت کمزور ہو گئے تھے تو آپؒ کو کرسی پر بٹھا کر مسجد لایا جاتا تھا اور آپؒ جماعت میں شریک

Marfat.com

ہو جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ آپؒ کو کوئی لے جانے والا نہ ملا تو آپؒ کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچ گئے، پھر لوگوں نے آپؒ کو کرسی پر بٹھا کر مسجد پہنچادیا۔ آپؒ روزوں کا بھی بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ آخر عمر میں اطباء نے آپؒ کو مشورہ دیا کہ آپؒ روزے نہ رکھیں لیکن آپؒ نے فرمایا کہ بریلی میں گرمی کی وجہ سے میں روزے نہیں رکھ سکتا لیکن بھوالی جو پہاڑی مقام ہے، وہ ٹھنڈا ہے، وہاں روزے رکھ سکتا ہوں، چنانچہ آپؒ نے بھوالی جا کر روزے رکھے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے دوسروں کو بھی ہمیشہ شریعت پر چلنے کی تاکید کی اور خلافِ شریعت کاموں پر ہمیشہ گرفت کی۔ آپؒ لکھتے ہیں: "یقیناً شریعت ہی اصل کار ہے، شریعت ہی معیار ہے۔ شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو ایک ایک سانس، ایک ایک پل، مرتے دم تک ہے۔"

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے غیر ضروری اور خلافِ شریعت رسوم کے خلاف رسائل تحریر فرمائے جن میں ان کاموں سے سختی سے منع فرمایا۔ مثلاً تصویر کا مسئلہ، غمی کے موقع پر کھانے وغیرہ کے اہتمام کے حوالے سے ورثا پر بوجھ ڈالنا، قبروں پر عورتوں کی حاضری، سجدۂ تعظیمی کی حرمت، آپؒ نے ان تمام کاموں سے منع فرمایا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی کا دور مذہبی اور سیاسی تحریکوں کے حوالے سے بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ آپؒ کی ولادت سے قبل تحریک بالاکوٹ چلائی گئی۔ ولادت کے ایک برس بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی۔ پھر تحریکِ اتحاد عالم اسلامی، تحریک دیوبند، تحریک علی گڑھ، تحریک ندوۃ العلما اور تحریک احمدیت چلی۔ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ پھر تحریک ریشمی رومال، تحریک ترک موالات چلیں۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی نے ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت کی اور کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو بعض کڑی شرائط سے پابند کر دیا۔ پھر آپؒ نے ۱۸۸۵ء میں، جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جس نے اہم خدمات انجام دیں۔ اعلیٰ حضرت نے سیاسی حالات کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور آپؒ نے رسائل اور فتاویٰ میں کھل کر آپؒ نے خیالات کا اظہار کیا۔ آپؒ نے انگریزی نواز علما کے خلاف قلم اٹھایا اور انگریز حکومت کے خلاف تحریر اور تقریر کے ذریعے جہاد کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ۱۸۹۷ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس پٹنہ کے اجلاس میں دو قومی نظریہ کے حق میں اظہارِ خیال فرمایا، آپؒ نے اس سلسلے میں تحریری دستاویز ۱۹۲۰ء میں پیش کی۔ آپؒ کی قائم کردہ جماعت رضائے مصطفیٰ نے ۷۰ سوالات ترکِ موالات کے حامی علما کی خدمت میں پیش کیے۔ اعلیٰ حضرتؒ کے خلفا سید سلیمان اشرف اور مولانا نعیم الدین نے مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے ملاقاتیں کیں۔ بعد میں علما اہلِ سنت نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی کے دور میں احمدی جماعت بھی وجود میں آئی۔ اس جماعت کے سربراہ نے نعوذ باللہ، نبوت کا دعویٰ کیا۔ اعلیٰ حضرت نے فوراً متعدد فتوے جاری کر کے اس فتنے کو مسترد فرمایا اور پانچ کتابیں تحریر فرمائیں جن میں ختم نبوت کے مخالفین کے افکار و خیالات کی پُرزور اور مدلل تردید کی گئی۔

مولاناؒ بچپن ہی سے بے حد سنجیدہ مزاج تھے۔ جھوٹ، غلط بیانی، بے ہودہ مذاق، وقت ضائع کرنے اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز فرماتے تھے۔ نہایت سادگی سے رہتے۔ چلتے وقت قدموں کی آواز تک نہ آتی۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی دبلے پتلے بدن کے مالک تھے۔ عمامہ اور انگرکھا پہنتے تھے۔ آپؒ کی غذا معمولی اور مختصر ہوتی تھی۔ آپؒ کبھی غیر ضروری گفتگو نہ فرماتے، کبھی بلند آواز سے قہقہہ نہ لگاتے، ہر فرد سے اخلاق سے پیش آتے۔ بازار میں دکاندار آپؒ کو مفت سودا دینے کی کوشش کرتے لیکن آپؒ ہمیشہ بازار کے بھاؤ کے مطابق سامان کی قیمت ادا فرماتے۔ ہر فرد کی عزت فرماتے، مسکینوں کو خاص طور پر عزت دیتے۔ سوال کرنے والے کو تسلی کے ساتھ جواب دیتے اور اس وقت تک سمجھاتے جب تک وہ مطمئن نہ ہو جاتا۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی بے حد فیاض تھے۔ اپنی ضرورت کی اشیا حاجت مندوں کو دے دیا کرتے تھے۔ حتی الامکان کسی سائل کا سوال رد نہ فرماتے۔

مولانا احمدؒ رضا خان بریلوی اپنے والدین کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ اپنے والد محترم کے انتقال کے بعد اپنی جائیداد کے خود مالک تھے لیکن والدہ محترمہ کی اجازت کے بغیر ایک پیسہ تک نہ لیتے۔ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ دیگر علما کرام کا حد درجہ ادب فرماتے تھے۔ آل رسولؐ کا بھی بہت زیادہ احترام فرماتے تھے۔

Marfat.com

مولانا احمد رضا خان بریلوی کی شادی ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں ارشاد بیگم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو دو صاحب زادے اور پانچ صاحبزادیاں عطا فرمائیں۔ آپؒ کے دونوں صاحب زادوں، علامہ محمد حامد رضا خان اور محمد مصطفیٰ رضا خان نے مفتی کی سند پائی اور دینی و سیاسی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی آخری عمر میں بہت ضعیف ہو گئے۔ جسمانی کمزوری، مسلسل مصروفیت، تصنیف و تالیف، فتاویٰ نویسی، تقاریر، مباحثوں، تبلیغ اور دیگر کاموں کے باعث آپؒ کی صحت خراب ہو گئی۔ ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ (۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء) جمعہ کے دن آپؒ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپؒ کو بریلی کے محلہ سوداگراں میں سپرد خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

غیر معمولی حافظہ کے مالک بزرگ جنہوں نے برائیوں کے خلاف جہاد فرمایا

بزرگ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔

طویل علالت نے انہیں کمزور کر دیا تھا لیکن ان کے کھلتے ہوئے سفید چہرے اور کشادہ پیشانی سے علم و عرفان کی کرنیں گویا پھوٹی پڑتی تھیں۔

انہیں اطلاع دی گئی کہ قاری صاحب ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بزرگ نے قاری صاحب کو بلوانے کی ہدایت کی۔

قاری صاحب نے حاضر ہو کر سلام کیا، عیادت کی، اس کے بعد گویا ہوئے: ''حضرت! میں آپؒ کو زحمت دینے آیا ہوں۔ مجھے ابوالحسن کذّاب کے بارے میں تفصیلات درکار ہیں۔''

بزرگ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں قاری صاحب کے چہرے پر جماتے ہوئے ادب اور تاریخ کی آٹھ دس کتابوں کے نام بتا دیے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کتابوں کے کن حصوں میں مطلوبہ مواد مل جائے گا۔

قاری صاحب نے کہا: ''حضرت، مجھے اس شخص کی صرف صفتِ کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا۔''

بزرگ کے لبوں کو جنبش ہوئی: ''مولوی صاحب، آپ نے بھی کمال کیا۔ عنوانات ہمیشہ کمالات پر قائم کیے جاتے ہیں، صفت کذب کون سی تعریفی صفت ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کر کے لکھتے۔''

تاہم، بزرگ نے مختلف کتب میں چند مقامات کی نشاندہی فرمائی۔

قاری صاحب بولے: ''حضرت، آپ ہی اس شخص کی دروغ گوئی سے متعلق دو چار واقعات بیان فرما دیجیے۔ آپ کے حوالے سے کتاب میں شامل کر لوں گا۔''

بزرگ شفقت سے مسکرائے۔ اس کے بعد آپؒ نے ابوالحسن کذاب کے سنہ ولادت سمیت اس کے تمام حالات زندگی سال بہ سال بیان کرنا شروع کر دیے۔ آپؒ اس طرح تفصیل بیان فرما رہے تھے گویا ابھی کچھ دیر قبل ابوالحسن کذاب کے حالات کا مطالعہ فرمایا ہو۔

قاری صاحب نے حیرت کے عالم میں پوچھا: ''حضرت، کیا آپ نے حال ہی میں ابوالحسن کذاب سے متعلق کوئی کتاب پڑھی ہے۔''

بزرگ نے سادگی سے جواب دیا: '' نہیں تو! کوئی چالیس برس قبل، میں مصر گیا تھا۔ وہاں خدیو مصر کے کتب خانے میں اتفاقاً ابوالحسن کذاب پر کتاب نظر سے گزری تھی۔ آپ نے سوال فرمایا تو وہی تفصیل یاد آ گئی۔''

انتہائی غیر معمولی حافظہ کے مالک یہ بزرگ تھے مشہور عالم دین مولانا انور شاہ کشمیریؒ جنہوں نے قاری محمد طیب کے ایک سوال پر چالیس برس قبل پڑھی ہوئی کتاب کی تفصیلات بیان فرما دیں۔ آپؒ کی پوری عمر تحصیلِ علم اور درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ آپؒ نے ہزاروں طلبہ کو اپنے وسیع علم سے مستفید کیا، آپؒ کے تلامذہ میں بڑے بڑے علماکرام شامل ہیں۔

حضرت انور شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب امام ابو حنیفہؒ سے جاملتا ہے۔ ان کے آباؤاجداد سوا دو سو برس قبل بغداد سے برصغیر آ گئے تھے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام رہا پھر یہ خاندان ملتان منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ کے بزرگوں نے کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انور شاہ صاحبؒ کے والد مولانا معظم شاہؒ نے ضلع بارہ مولا کی تحصیل ہندواڑہ کے ایک گاؤں ورنو میں مکان بنا لیا تھا۔ کپواڑہ سے ایک دریا ورنو کی پہاڑیوں سے گزرتا ہے، اسی دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی 'دوودوان' کے نام سے ہے جہاں انور شاہؒ صاحب ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ / ۲۸ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ وادیِ لولاب کہلاتا ہے۔

Marfat.com

انور شاہ صاحبؒ کی عمر ساڑھے چار برس کی ہوئی تو آپؒ نے اپنے والد محترم معظم شاہ صاحبؒ سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ ڈھائی سال میں کلام پاک ہی نہیں بلکہ فارسی کی کئی کتب بھی ختم کر لیں۔ والد صاحب نے آپؒ کو گلستان، بوستان، جامی، نظامی، خسرو دہلوی اور جلال الدین درانی کی کئی کتب پڑھائیں۔ اس طرح آپؒ کو فارسی زبان پر اچھی دسترس حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد آپؒ نے مولانا غلام محمدؒ سے عربی پڑھنی شروع کر دی۔ دو سال آپؒ مولانا غلام محمدؒ سے صرف و نحو، فقہ اور اصول فقہ پڑھتے رہے۔

اس زمانے میں ہزارہ علم کا مرکز تھا اور اس کی شہرت تھی، انور شاہ صاحبؒ نے ارادہ کیا کہ مزید اعلیٰ تعلیم ہزارہ جا کر حاصل کی جائے۔ آپؒ اپنے والدین سے اجازت لے کر اپنی عمر کے ۱۳ ویں سال میں ہزارہ چلے گئے۔ ہزارہ میں آپؒ نے تین سال تک فلسفہ، ہیئت اور منطق کا گہرا مطالعہ کیا اور وہاں کے علما سے فیض حاصل کیا۔

ہزارہ میں تحصیل علم کے بعد بھی آپؒ تشنگی محسوس کرتے تھے۔ اس زمانے میں آپؒ نے دیوبند کا ذکر سنا۔ وہاں کے علمی ماحول اور اساتذہ کی شہرت سن کر آپؒ ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ / ۹۰-۱۸۸۹ء میں دیوبند تشریف لے گئے۔ دیوبند پہنچ کر آپؒ نے وہاں مسجد قاضی میں قیام کیا۔ مسجد کے متولی قاضی احمد حسن صاحب نے دریافت کیا: "آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں۔"

انور شاہ صاحبؒ نے بتایا: "مولانا محمود حسنؒ سے علم حاصل کرنے کے لیے کشمیر سے آیا ہوں۔"

قاضی احمد حسن صاحب نے شاہ صاحبؒ کو کھانا کھلایا اور اسی وقت مولانا محمود حسنؒ کے پاس لے گئے۔

دیوبند کے مدرسے میں اس وقت تک نہ تو مطبخ کا انتظام تھا، نہ ہی زیادہ طلبہ کی رہائش کا بندوبست، چنانچہ آپ مولانا مشیت اللہ کے ساتھ رہے۔ پھر آپؒ پٹھانپورہ کی جامع مسجد کے ایک حجرے میں منتقل ہوگئے۔ جہاں آپؒ نے خاصے عرصے تک امامت کی، مسجد کی دیگر خدمات انجام دیں اور حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا۔

انور شاہ صاحبؒ نے ۱۲-۱۳۱۱ھ / ۹۴-۱۸۹۳ء میں صحیح بخاری، جامع ترمذی، جلالین شریف، ہدایہ جلد اول، قاضی مبارک، ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء میں ابوداؤد، مسلم، بیضاوی، تصریح، شرح چغمنی، صدرا، موطا امام مالکؒ، موطا امام محمدؒ، سنن نسائیؒ، سنن ابن ماجہؒ، شمس بازغہ" اور طب میں نفیس پڑھی۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپؒ نے اس مختصر مدت میں علم حدیث کے کتنے بڑے ذخیرے سے استفادہ فرمایا۔

آپؒ نے جن بلند پایہ اساتذۂ کرام سے فیض حاصل کیا ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا اسحاق امرتسریؒ اور مولانا غلام رسولؒ جیسے جید علماکرام شامل ہیں۔ آپؒ نے مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ کے شاگرد مولانا عبدالجمیل افغانیؒ سے علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔

دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد انور شاہ صاحبؒ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے علم حدیث کے علاوہ باطنی فیض بھی پایا۔

انور شاہ صاحبؒ اپنے رفیق مولانا مشیت اللہ کے پاس بجنور میں مقیم تھے کہ مولوی امین الدین دہلوی صاحب بجنور تشریف لائے۔ وہ دہلی میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے انور شاہ صاحبؒ سے بہت اصرار کیا کہ وہ دہلی چل کر یہ مدرسہ قائم فرمائیں اور اس مدرسے کی صدر مدرسی بھی قبول فرمائیں۔ انور شاہ صاحبؒ نے یہ خیال کر کے کہ مولوی امین الدین صاحب کی دل شکنی نہ ہو، یہ دعوت قبول کر لی۔

دہلی پہنچ کر ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں چاندنی چوک کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ کی داغ بیل ڈالی۔ یہ مدرسہ بے سروسامانی کے عالم میں چند طلبہ کے ساتھ شروع کیا گیا تھا لیکن شاہ صاحبؒ نے مختصر عرصے میں اس مدرسہ کو اتنی ترقی دی کہ یہ ہندوستان کے بڑے بڑے مدارس کی ہمسری کرنے لگا۔

ربیع الاول ۱۳۱۹ھ / جون ۱۹۰۱ء تک شاہ صاحبؒ نے مدرسہ امینیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیے پھر آپؒ کو اپنی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر ملی تو آپ کشمیر تشریف لے گئے۔ کشمیر میں پھیلی ہوئی جہالت، بدعتوں کے چلن اور دین سے بے پروائی کے باعث آپؒ کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ آپؒ نے بارہ مولا کے رئیس خواجہ عبدالصمد ککرو کے اصرار پر مدرسہ فیض عام قائم کیا اور تین سال تک اس مدرسے کے انتظامات اور تدریس سے منسلک رہے۔

انور شاہ صاحبؒ کے دل میں حرمین شریفین کی زیارت کی آرزو مچل رہی تھی۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں آپؒ نے حج بیت اللہ کے ارادے

Marfat.com

سے سرزمین حجاز کا سفر فرمایا۔ حج کے فریضے سے سبکدوش ہونے کے بعد آپؒ نے طرابلس، بصرہ شام اور مصر کا سفر بھی کیا اور وہاں کے بڑے علماکرام سے ملاقاتیں کیں۔ شیخ حسین طرابلسیؒ آپؒ کے علم سے بہت متاثر ہوئے۔ سفر سے واپسی پر آپؒ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء تک مدرسہ فیض عام سے وابستہ رہے۔ پھر آپؒ دیوبند تشریف لے گئے۔

دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے لائق شاگرد انور شاہؒ کو حکم دیا کہ آپؒ یہیں قیام فرمائیں اور طلبہ کو اپنے علم سے فیض پہنچائیں۔ آپؒ دیوبند ہی میں ٹھہر گئے اور صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کا درس دینے لگے۔

اسی دور میں دیوبند کے علما کو یہ اندیشہ ہوا کہ مولانا انور شاہؒ دیوبند سے بھی چلے جائیں گے چنانچہ آپؒ کے رفقا نے اب یہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ آپؒ شادی فرمالیں۔

اس وقت تک شاہ صاحب اپنی علمی مصروفیات کی وجہ سے خود ہی ازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہے تھے۔ آخر گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک معزز گھرانے میں آپؒ کا رشتہ طے ہوگیا۔ آپؒ کے خسر چونکہ ۱۸۵۷ء میں بھوپال میں جاکر آباد ہوگئے تھے، اس لیے بارات بھوپال گئی۔ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں آپؒ کا نکاح میمونہ خاتون سے ہوگیا۔ اس وقت آپؒ کی عمر ۳۴ برس تھی۔

یہ زمانہ برصغیر اور عالم اسلام میں نت نئی سیاسی تبدیلیوں کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں ترکی کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ طرابلس پر اٹلی نے قبضہ کرلیا تھا اور بغاوت کی وجہ سے ترکی، بلقان کی ریاستوں سے دستبردار ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں جنگِ عظیم اوّل چھڑ گئی۔ ان حالات میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے فیصلہ کیا کہ برصغیر سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ایک تحریک چلانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دیگر مسلم ملکوں پر انگریزوں کے تسلط سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔

مولانا محمود حسنؒ نے تحریک کا آغاز کردیا۔ شوال ۱۳۳۳ء / اگست ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسنؒ حج کے ارادے سے دیوبند سے روانہ ہوگئے۔ آپؒ نے دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے لیے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو منتخب فرمایا۔ شاہ صاحبؒ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ آپؒ نے تدریس کے انداز میں انقلابی تبدیلیاں فرمائیں۔

۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم میں اصلاحات کے نام سے ایک تحریک دارالعلوم کے انتظامات کے خلاف شروع ہوگئی۔ طلبہ نے یہ تحریک دارالعلوم کے نظام، طعام کے بندوبست، کتب خانے، دارالطلبہ (ہاسٹل) وغیرہ کے انتظامات کو درست کروانے کے لیے چلائی تھی۔ شاہ صاحبؒ سمیت بعض اساتذہ نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ ارباب اختیار نے مداخلت کی۔ دارالعلوم میں پولیس متعین کردی گئی۔ حکام نے شاہ صاحبؒ سے استعفیٰ طلب کرلیا۔ شاہ صاحب کے ساتھ مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا محمد ادریس نے بھی اپنا اپنا احتجاجی استعفیٰ پیش کردیا۔ یہ استعفیٰ رجب ۱۳۴۷ھ / دسمبر ۱۹۲۸ء میں دیے گئے۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ کے استعفیٰ پر علامہ اقبالؒ نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا: "میں شاہ صاحبؒ کے استعفیٰ سے بہت خوش ہوا ہوں۔ دارالعلوم کو صدر مدرس اور مل جائیں گے لیکن اسلام کے لیے اب جو کام میں شاہ صاحبؒ سے لینا چاہتا ہوں، وہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔"

دارالعلوم دیوبند سے علیٰحدگی کے بعد متعدد بڑی درسگاہوں نے انور شاہ صاحبؒ کو اپنے یہاں آنے اور تدریس کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی جن میں ڈھاکا یونیورسٹی، ندوۃ العلما اور لکھنؤ یونیورسٹی شامل ہیں، لیکن مولانا انور شاہؒ نے ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کی درس گاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درسِ حدیث کی دعوت قبول فرمائی۔ شاہ صاحبؒ کے ساتھ دیگر کئی علما بھی ڈابھیل چلے گئے۔ ان میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سراج احمد رشیدی، مولانا سید محمد ادریس اور مولانا یحییٰ شامل تھے، ۲۷۵ طلبہ بھی ہمرکاب تھے۔

ڈابھیل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے صرف ایک ماہ گزرا تھا کہ مولانا انور شاہؒ صاحب علیل ہوگئے۔ آپؒ کو بواسیر خونی کا مرض تھا، جو ڈابھیل کی آب وہوا میں عود کر آیا، بہرحال آپؒ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران لاہور، امرتسر، بجنور اور دیوبند کے سفر بھی جاری رہے۔

۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں آپؒ کو ایک مشہور مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں بہاولپور جانا پڑا۔ مقدمہ کی نوعیت کچھ یوں تھی کہ بہاولپور میں ایک شخص عبدالرزاق، قادیانی عقائد اختیار کرکے مرتد ہوگیا۔ اس

Marfat.com

کی منکوحہ غلام عائشہ نے بالغ ہونے کے بعد عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ اس کا نکاح فسخ کیا جائے۔ مقدمے میں بڑے بڑے علماکرام نے دلائل پیش کیے۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ کو بھی مقدمے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ آپؒ ان دنوں بہت علیل تھے، لیکن علالت کے باوجود آپؒ نے مقدمہ کی اہمیت کے پیش نظر، یہ دعوت قبول فرمالی۔

مولانا انور شاہؒ ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۵۱ھ / ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور پہنچے۔ عدالت میں آپ کا بیان ۲۸ ربیع الآخر ۱۳۵۱ھ / ۳۱ اگست ۱۹۳۲ء کو شروع ہوا۔ آپؒ نے بیماری اور کمزوری کے باوجود پانچ دن تک روزانہ پانچ پانچ گھنٹے تک عدالت میں شرکت فرمائی۔ آپؒ کا ۱۴۱ صفحات کا بیان ۱۷۸ صفحات پر مشتمل علما کے بیان کا حصہ ہے۔ مقدمہ کی سماعت طویل عرصے تک جاری رہی اور اس کا فیصلہ ۳ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ / ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو مدعیہ کے حق میں ہوا۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ بہاولپور سے واپسی پر مزید علیل ہو گئے۔ اس دوران آپؒ کے والد اور برادران نے اصرار کیا کہ وہ کشمیر تشریف لے آئیں۔ آپؒ نے کشمیر جانے کا ارادہ فرمالیا۔ آپؒ کو علم تھا کہ کشمیر میں قادیانیت کا فتنہ عروج پر ہے، چنانچہ آپؒ نے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوتؐ پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ آپؒ کا ارادہ تھا کہ اسے خود طبع کروا کے تقسیم کروائیں گے لیکن پیام اجل آپہنچا۔ ۴ صفر ۱۳۵۲ھ / ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو علم وعرفان کا یہ چمکتا آفتاب دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آپؒ کی رحلت کی خبر تمام علمی حلقوں کے لیے بہت بڑا تازیانہ تھی۔ محدث مولانا میاں اصغر حسینؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، دیوبند ہی میں عید گاہ کی جنوبی جانب ایک باغ میں آپؒ کی تدفین عمل میں آئی۔ یہ جگہ شاہ صاحبؒ کو پسند تھی اور آپؒ نے یہیں دفن ہونے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی۔ شاہ صاحبؒ کی بیوہ نے اپنا ایک طلائی زیور فروخت کر کے اسی دن زمین کا یہ ٹکڑا خرید لیا جس روز شاہ صاحبؒ کی وفات ہوئی۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جلسہ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا: "شاہ صاحبؒ کی وفات سے طلبہ ہی نہیں بلکہ پڑھانے والے بھی یتیم ہو گئے ہیں۔"

لاہور کے ایک جلسے میں علامہ اقبالؒ نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "اسلام کی آخری پانچ سو سالہ تاریخ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میں نے جدید فقہ کی تدوین کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ اس موضوع پر ان سے گفتگو بھی رہی۔ جس طرز پر فقہ کی تدوین میرے پیش نظر تھی، اس کے لیے ان سے مناسب شخصیت عالم اسلام میں کوئی نہ تھی۔ دیوبند سے ان کی علیٰحدگی کے بعد میں نے ان کے سامنے لاہور میں قیام کی تجویز رکھی تھی جسے انہوں نے قبول بھی فرمالیا تھا لیکن اہل گجرات کے اصرار پر آپؒ ڈابھیل تشریف لے گئے اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت کی تکمیل بدقسمتی سے نہ ہو سکی۔"

مولانا انور شاہؒ کے لواحقین میں ایک بیوہ، تین لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں۔ صاحب زادوں کے نام وزیر شاہ، اکبر شاہ، انظر شاہ اور صاحب زادیوں کے نام عابدہ خاتون اور راشدہ خاتون ہیں۔ مولانا انظر شاہ صاحب دیوبند کے دارالعلوم جدید میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ نہایت منکسر المزاج، نرم خُو اور سادگی پسند انسان تھے۔ صاف اور اُجلے کپڑے زیب تن فرماتے۔ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سبزی ترکاری پسند تھی، تاہم پرندوں کے گوشت اور پھلوں کے رس سے بھی رغبت تھی۔ مئو کے خربوزے آپؒ کو پسند تھے۔ کبھی کبھار فرماتے: "مجھے کچھ نہیں چاہیے، صرف دو پیالیاں کشمیری چائے کی، دو بسکٹ، ایک تلوار اور ایک گھوڑا۔"

لوگ آپؒ کے ساتھ عقیدت سے پیش آتے تو آپؒ منع فرما دیتے۔ کچھ لوگ آپؒ کے پاؤں چھونے کی کوشش کرتے تو آپؒ نرمی سے روک دیتے۔ آپؒ خود فرماتے ہیں کہ "لوگوں کے درمیان میں کوشش کرتا تھا کہ لوگ مجھے محض ایک عام طالب علم سمجھیں۔"

اگر کوئی فرد آپؒ کو ہدیہ پیش کرتا تو پوچھ لیتے کہ آپؒ کی آمدنی کیا ہے؟ اگر تحفہ دینے والے کی آمدنی، شاہ صاحبؒ کی آمدنی سے بھی کم ہوتی تو شائستگی کے ساتھ تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔

آپؒ طبیعت میں انکسار کے ساتھ خودداری کی دولت سے بھی مالامال تھے اور صاحب حیثیت لوگوں سے مرعوب ہرگز نہیں ہوتے تھے۔ جب آپؒ نظام حیدرآباد دکن کی خواہش پر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو اخبار "مہاجر" کے ایڈیٹر نے شاہ صاحبؒ اور نظام کی ملاقات کی خبر کی سرخی ان الفاظ میں تیار کی: "بارگاہِ خسروی میں علامہ کشمیر کی باریابی۔"

شاہ صاحبؒ کو اس خبر کی اطلاع ہو گئی۔ آپؒ نے برہمی کے ساتھ فرمایا: "میں ہر چند کہ ایک مردِ بے مایہ ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی

نہیں کہ یہ عنوان گوارا کرلوں۔ کیسی بارگاہِ خسروی اور کیسی باریابی؟ صاف لکھیے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات۔"

جب مجلس علمی ڈابھیل میں آپؒ کی کتابوں کی طباعت ہونے لگی تو کتب پر آپؒ کے نام کے ساتھ تعظیمی القاب درج کیے جانے لگے۔ آپؒ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا اور ہدایت کی کہ صرف "محمد انور شاہ الکشمیری" لکھیے یا زیادہ سے زیادہ "الاستاد محمد انور شاہ الکشمیری" لکھیے۔

مولانا انور شاہؒ نے اپنی ضروریاتِ زندگی کو محدود کر رکھا تھا۔ آپؒ دارالعلوم دیوبند سے شروع میں تو کوئی مشاہرہ نہیں لیتے تھے، بعد میں قلیل رقم لینی شروع کر دی تھی۔ دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد مختلف یونیورسٹیوں نے آپؒ کو معقول مشاہرے کی پیش کش کی لیکن آپؒ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بہت کم مشاہرے پر خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ ایک بار آپؒ رنگون والوں کے اصرار پر رنگون گئے۔ پندرہ دن تک وہاں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے لیے رقوم کا عطیہ وصول کر کے واپس تشریف لائے۔ آپؒ نے ان پندرہ دنوں کا مشاہرہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "میں اس زمانے میں رخصت پر رہا، اس لیے مشاہرہ نہیں لے سکتا۔"

مولانا انور شاہؒ کو قدرت نے غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ ان کے حیرت انگیز حافظے کے سلسلے میں ایک واقعہ اس مضمون کے آغاز میں بیان کیا جا چکا ہے۔ آپؒ اکثر فرماتے: "میں کسی کتاب کا سرسری مطالعہ کرتا ہوں تو وہ پندرہ برس تک میرے حافظے میں محفوظ رہتی ہے۔" صحاحِ ستہ یعنی حدیث کی چھ مشہور کتب "صحیح بخاریؒ"، "صحیح مسلمؒ"، "جامع ترمذیؒ"، "سنن ابوداؤدؒ"، "سنن نسائیؒ" اور "سنن ابن ماجہ" آپؒ کو ازبر تھیں۔ امام بخاریؒ نے ایک حدیث کے جتنے حصوں کو مختلف طریقے سے بیان فرمایا ہے وہ سب آپؒ کو یاد تھے۔ اس کے علاوہ فقہ کے اماموں کی بیان کردہ تمام جزئیات بھی آپؒ کے حافظے میں محفوظ تھیں۔

آپؒ کو تاریخ سے بھی گہری واقفیت تھی، اور اسماء الرجال، مصنفین کے تذکرے اور ان کی شروح آپؒ کو یاد تھیں۔ کئی مواقع پر آپؒ نے وضاحت فرمائی کہ فلاں کتاب میں عبارت غلط چھپ گئی ہے اور فلاں ایڈیشن میں عبارت درست ہے۔ مولانا یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں کہ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں کتاب "فتح القدیر" کا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں بخاری شریف کا درس دیتے ہوئے مولانا انور شاہؒ نے فرمایا: "۲۶ سال پہلے فتح القدیر کا مطالعہ کیا تھا۔ پھر ضرورت پیش نہ آئی، جو کچھ بیان کروں گا، فرق کم پاؤ گے۔"

مولانا انور شاہ صاحبؒ کے مطالعے کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ایک بار فرمایا: "میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں فتح الباری (شرح بخاری) کی تیرہ جلدیں، بیس روز میں مکمل پڑھ ڈالی تھیں۔"

ایک بار فرمایا: "میں بعض اوقات طویل اور ضخیم کتب کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن کوئی علمی نکتہ میرے ہاتھ نہیں آتا۔ اگر مطالعے کے دوران ایک آدھ بات میرے ہاتھ لگ جاتی ہے تو مجھے اپنی طویل محنت پر افسوس نہیں ہوتا۔"

مولانا انور شاہؒ کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع تھا۔ آپؒ نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تحصیل بھی فرمائی تھی۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپؒ نے دہلی میں حکیم واصل خان سے فنِ طب کی تعلیم حاصل کی۔ آپؒ کو طب سے اتنی اچھی واقفیت تھی کہ طب کے موضوع پر کئی کتب اپنے برادرِ نسبتی، حکیم سید محفوظ علی، مولانا صدیق نجیب آبادی اور مولانا ادریس سکھروڈی کو پڑھائیں۔

مولانا انور شاہؒ نے جدید سائنسی علوم، طبیعیات، ریاضی، ہندسہ، قیافہ، الٰہیات، سلوک و تصوف، علم مناظرے کا علم بھی حاصل کیا۔ نحو کی اہم کتاب "سیبویہ" کے بارے میں بتایا کہ میں نے اس کتاب کا کئی بار مطالعہ کیا ہے اور اس کی بعض نادر شرحیں بھی نظر سے گزری ہیں۔

فلسفے میں آپؒ نے ابو سینا کی شفا، نجات، تعلیقات، اشارات کا مطالعہ کیا۔ مولانا انور شاہؒ جدید سائنس کی ان کتب کا بہت شوق سے مطالعہ فرماتے تھے جو انگریزی اور فرانسیسی سے عربی میں منتقل ہو رہی تھیں۔ آپؒ اپنے شاگردوں کو بھی یہ کتب پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ آپؒ نے اپنے شاگردوں کو انگریزی پڑھنے کے لیے بھی بار بار توجہ دلائی اور انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔

مولانا انور شاہؒ کو اردو کی اہمیت کا بھی بہت احساس تھا۔ ایک شاگرد نے عربی زبان میں مقالہ لکھ کر پیش کیا تو آپؒ نے یہ کہہ کر واپس فرما دیا: "مولوی صاحب، اگر ہندوستان میں خدمت کرنا ہے تو اردو میں

Marfat.com

لکھیے اردو میں پڑھیے۔"[1]

مولانا انور شاہؒ نے درسِ حدیث کے طریقے میں انقلابی تبدیلیاں فرمائیں۔ آپؒ نے حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے دیگر متعدد مضامین کو شامل کیا۔ جن میں صرف و نحو، فقہ، اصولِ فقہ، معانی و بلاغت، اسرار و حکم، سلوک و تصوف، فلسفہ و منطق، سائنس اور عصری علوم، رجال کی بحثیں، مصنفین اور مؤلفین کی سوانح وغیرہ شامل تھیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور قاری محمد طیب صاحبان کے مطابق مولانا انور شاہؒ کا درسِ حدیث صرف حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ ضمناً یہ ہر علم و فن کی بحث ہوتی تھی۔ شاہ صاحبؒ کا درس اردو میں ہوتا تھا تاہم آپؒ کی زبان پر عربی اور فارسی کا اثر گہرا تھا۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، مفتی محمد حسن صاحب امر تسریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، قاری محمد طیبؒ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، مفتی محمد شفیعؒ، سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا یوسف بنوریؒ اور خواجہ حسن نظامیؒ جیسے بڑے اور قابلِ قدر علماکرام شامل ہیں۔

مولانا انور شاہؒ کا بیشتر وقت تحصیل علم اور تعلیم و تربیت میں گزرا، پھر بھی آپؒ نے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالا۔ آپؒ کی ۲۵ مطبوعہ تصانیف کا پتا چلا ہے جن میں ۱۹ کو آپؒ نے خود مرتب کیا اور چھ کو آپؒ کے شاگردوں نے ترتیب دیا ہے۔

۱۔ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین: یہ کتاب عربی میں ہے، ۱۳۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مسئلہ تکفیر پر محققانہ تصنیف ہے۔

۲۔ النور الفائض علی نظم الفرائض: علم میراث پر فارسی میں ۹۲ اشعار پر مشتمل رسالہ ہے۔

۳۔ ازالۃ الدین فی الذب عن قرۃ العینین: ۱۹۶ صفحات پر مشتمل فارسی زبان کی یہ کتاب شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین کی حمایت میں ہے۔

۴۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح: فتنۂ قادیانیت کی تردید میں مختصر رسالہ ہے۔

۵۔ انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد: سنن ابی داؤد کے درس کے املا پر مشتمل ہے۔ ۶۱۶ اور ۵۷۶ صفحات پر مبنی دو جلدوں میں ہے۔

۶۔ العرف الشذی علی جامع الترمذی: امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کی شرح ہے۔ شاہ صاحبؒ کی ان درسی تقاریر کو آپؒ کے شاگرد مولوی چراغ محمد نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۷۔ الاتحاف لمذہب الاحناف: ۲۶۸ صفحات کی اس کتاب میں مولانا انور شاہؒ نے حنفیہ کی طرف سے مخالفین کے اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں۔

۸۔ انوار الباری (شرح اردو صحیح البخاری): مولانا سید احمد رضا بجنوری نے درس بخاری کے نام سے عربی زبان میں موجود شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔

۹۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین: رفع الیدین کے مسئلے پر یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔

۱۰۔ تحیتہ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: ۱۴۹ صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں ۲۲۱ حواشی بھی شامل ہیں۔

۱۱۔ خاتم النبیین: ۹۳ صفحات کے اس رسالے میں شاہ صاحبؒ نے عقیدۂ قادیانیت کی تردید کی ہے۔

۱۲۔ خلاصہ تقاریر حضرت العلامہ الکشمیری: اس کتاب میں مولانا انور شاہؒ کی وہ تقاریر بھی شامل ہیں جو آپ نے سری نگر میں فرمائیں۔

۱۳۔ خاتمہ الخطاب: امام کے پیچھے نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے پر فارسی کتابچہ ہے۔

۱۴۔ دعوت حفظ ایمان: اردو میں دو حصوں میں مشتمل کتاب ہے۔

۱۵۔ سہم الغیب فی کبد اہل الریب: مختصر اردو رسالہ ہے۔

۱۶۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم: چار سو اشعار کے اس رسالے میں علم کلام کی بحث ہے۔

۱۷۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: ۳۴۰ صفحات پر مشتمل عربی زبان کی اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کو ثابت کیا ہے۔

۱۸۔ فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب: اس کتاب میں بھی امام

Marfat.com

کے پیچھے نماز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کے مسئلے پر بحث ہے۔

۱۹۔ **فیض الباری:** یہ شاہ صاحبؒ کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو آپ نے درس صحیح بخاری کے دوران کیں۔ ان تقاریر کو مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے کئی سال کی محنت کے بعد عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے جو ۴۱۲، ۴۹۵، ۴۷۸ اور ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔

۲۰۔ **کشف الستر عن صلوۃ الوتر:** مسئلہ وتر پر ۹۸ صفحات کا عربی میں رسالہ ہے۔

۲۱۔ **مرقاۃ الطارم لحدوث العالم:** عربی میں مختصر رسالہ ہے۔

۲۲۔ **مشکلات القرآن:** یہ کتاب آپؒ کی وفات کے بعد ترتیب دی گئی۔ اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں ۴۸ سورتوں سے ماخوذ ۱۹۰ قرآنی آیات پر نہایت علمی انداز سے بحث کی گئی ہے۔ آپ کے شاگرد مولانا یوسف بنوریؒ نے اس کتاب کا طویل مقدمہ تحریر کیا ہے۔

۲۳۔ **معارف السنن:** مولانا انور شاہؒ کے ارشادات کی مدد سے مولانا یوسف بنوریؒ نے یہ کتاب مرتب فرمائی۔

۲۴۔ **آثار السنن:** حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان احادیث کو خاص ترتیب سے جمع کیا جن سے حنفی فقہ کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا انور شاہؒ نے اس کتاب پر حواشی لکھے جن میں سیکڑوں کتابوں کے حوالے ہیں۔

مولانا انور شاہؒ کو شعر و سخن کا نفیس ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ہزاروں اشعار یاد تھے۔ خود بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ آپ کے اشعار کی تعداد پندرہ ہزار سے زائد ہے۔ یہ اشعار زیادہ تر عربی یا فارسی میں ہیں۔ چند اشعار اردو میں بھی ہیں۔ آپؒ کے کلام میں سلاست پائی جاتی ہے۔ آپؒ نے نعت، قصیدہ، نظم، مرثیہ اور قطعہ گوئی میں طبع آزمائی فرمائی۔ جب درس دیتے تو ایک لفظ کو واضح کرنے کے لیے کئی کئی شعر سنا دیتے۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک استاد مولانا اعزاز علی نے ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں ایک ادبی انجمن "نادیۃ الادب" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کا اجلاس ہر جمعرات کو عشا کے بعد منعقد ہوتا۔ انور شاہ صاحبؒ اس اجلاس کی صدارت فرماتے۔ اجلاس میں اپنی غزلیں پیش کرتے۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ اپنے شعر ترنم سے ارشاد فرماتے تھے۔

مولانا انور شاہؒ نے بدعتوں اور غیر ضروری رسوم و رواج کے خلاف موثر جہاد کیا۔ آپؒ نے خواتین کو میراث سے محروم کرنے کے تصور کی اصلاح بھی کی۔ آپؒ نے فرمایا "ہماری بدقسمتی کی داستان بہت طویل ہے۔ ہم نے خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی شادیوں کو اپنے لیے پھانسی کا پھندا بنا رکھا ہے۔ اسراف و فضول خرچی کی انتہا ہے۔ برادری میں ناک کٹنے کے اندیشے سے سودی قرضے لے کر تباہی و بربادی کو دعوت دی جاتی ہے۔" آپؒ نے اس بات کی بھی ممانعت کی کہ میت کی تجہیز و تکفین سے پہلے گھر والوں کو برادری کی دعوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مولانا انور شاہؒ کا ایک بڑا کارنامہ سود کے خلاف تحریک چلانا ہے۔ آپ نے جمعیت العلما کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے کارکنوں کے ذریعہ گاؤں گاؤں جا کر مسلمانوں کو سودی کاروبار کے ناجائز اور نقصان دہ ہونے سے آگاہ کریں۔ دوسری جانب انہوں نے سود کے متبادل کے طور پر تجویز دی کہ بیت المال قائم کر کے مسلمانوں کو بلا سود قرضے دیے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز پر سب سے پہلے دیوبند میں عمل ہوا۔ ایک کمرے میں بیت المال کا دفتر قائم کیا گیا۔ اس دفتر نے ترقی کی اور دس سال بعد اس نے ایک وسیع اور خوبصورت عمارت کا روپ دھار لیا۔ دس سال میں ڈیڑھ کروڑ روپے کی مالیت کے قرضے دیے گئے، جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں مختلف مقامات پر سو عدد مسلم فنڈ قائم کیے گئے۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ نے عملی سیاست میں تو حصہ نہ لیا لیکن سیاسی صورت حال پر آپ کی گہری نظر رہی۔ جمعیت العلما ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں آپؒ نے ہمیشہ شرکت کی۔ ۱۹۲۷ء میں پشاور میں جمعیت العلما کے سالانہ اجلاس کی صدارت میں آپ نے برطانوی حکمرانوں کے خلاف سخت جملے استعمال کیے۔ آپؒ نے فرمایا:

"آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔"

مولانا انور شاہؒ انگریزوں کی حکومت کو اسلامی تہذیب کے لیے شدید خطرہ سمجھتے تھے۔ آپؒ فرماتے تھے: "ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیا پر بھی ٹیکس

Marfat.com

عائد کر دیا ہے۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد کر رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے۔"

مولانا انور شاہؒ نے اوقافِ مسلمین کے تحفظ پر بھی توجہ مبذول کروائی۔ اس زمانے میں سیکڑوں خانقاہیں اور مقبرے ایسے افراد کے قبضے میں تھے جنہیں علمِ دین سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان اوقاف کے متولیوں کا تقرر ہر سال کیا جائے۔ ان کے حسابات رکھے جائیں اور اوقاف کو نجی استعمال میں لانے سے روکا جائے۔ جمعیت العلما نے ۱۹۴۷ء کے بعد ان امور پر توجہ دی۔

مولانا انور شاہؒ کی پوری زندگی علمی اور عملی جہاد سے عبارت ہے۔

آپؒ نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ درس و تدریس جیسا عظیم کا انجام دیتے ہوئے گزارا۔ آپؒ عبادات کے معاملے میں بہت اہتمام فرماتے تھے اور تہجد اور اوّابین کا بھی خصوصی خیال رکھتے تھے، لیکن آپؒ کے خوفِ خدا کا یہ حال تھا کہ آپؒ کی زندگی کی آخری شب مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ آپؒ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک رسالے خاتم النبیین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "مولوی صاحب میرے پاس کوئی توشۂ آخرت نہیں، میں دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ شاید یہ تالیف میرے لیے ذریعۂ نجات بن جائے۔"

***

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آبِ کوثر: شیخ محمد اکرام
احوال و تعلیمات شیخ ابوالحسن ہجویریؒ: ڈاکٹر محمد باقر
اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی
اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیا کرام کا کام: ڈاکٹر مولوی عبدالحق
اعلیٰ حضرت کی سیاسی بصیرت: سید نور محمد قادری
افکار رضا جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء ممبئی
اکابر علماء دیوبند: حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری
امام احمد رضا اور ان کی خصوصیات: خواجہ ابرار حسین فاروقی
امام احمد رضا اور علم جحریات: ڈاکٹر عبداللہ قادری
امام احمد رضا کی اردو اور فارسی شاعری: ڈاکٹر حامد علی خاں
امام احمد رضا کی دینی و سیاسی بصیرت: علامہ سید الزماں حمدوی
امام احمد رضا کی عربی شاعری: ڈاکٹر حامد علی خاں
امام احمد رضا ایک شخصیتی جائزہ: ڈاکٹر مختار الدین آرزو
امام احمد رضا، امام شعر و سخن: مولانا دارث جمال بستوی
امام احمد رضا، ایشیا کا عظیم محقق: مولانا عبدالکریم نعیمی
امام احمد رضا، علوم و فنون کا ہمالہ: مقبول جہانگیر
امیر خسرو: ڈاکٹر وحید مرزا
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔
انوار اصفیائ: شعبہ تصنیف و تالیف، شیخ غلام علی اینڈ سنز
انوار اولیا: سید رئیس احمد جعفری
انوار صوفیا: شیخ عبدالحق محدث دہلوی
انوار الصفا: محمد خصلت حسین صابری
اولیائے لاہور: محمد لطیف ملک
اولیائے ملتان: سید محمد اولاد علی گیلانی
بابر نامہ: ظہیر الدین بابر
برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علما کا کردار: ایچ بی خان
بزم صوفیا: سید صباح الدین عبدالرحمٰن
تاریخ اولیائے ایران، در عہدِ مغولان: محمد داؤد رہبر / ای۔ جی۔ براؤن
بیس بڑے مسلمان: عبدالرشید ارشد
پروفیسر حاکم علی کی امام احمد رضا سے عقیدت: پروفیسر محمد صدیق از معارف رضا
پنجاب کے صوفی دانشور: قاضی جاوید
تابعین: معین الدین احمد ندوی
تاریخ ابن کثیر: علامہ حافظ ابوالفدا عمادالدین ابن کثیر / حافظ سید عبدالرشید ندوی
تاریخ ادبیات ایران: ڈاکٹر رضازادہ شفق / سید مبارز الدین رفعت
تاریخ دعوت و عزیمت: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ
فوائد الفواد: ضیاالدین برنی / ڈاکٹر سید معین الحق
تاریخ فیروز شاہی: امیر حسن سجزی / پروفیسر محمد سرور
تاریخ فیروز شاہی: شمس سراج عفیف
تاریخ مشائخ چشت: خلیق احمد نظامی
تاریخ تصوف: پروفیسر حبیب اللہ غضنفر
تذکرہ حضرت بہاالدین زکریا ملتانیؒ: نور احمد خان فریدی
تذکرہ سیدنا غوث اعظمؒ: طالب ہاشمی
تذکرہ علماہند: محمد ایوب قادری
تذکرۃ الکرام: مولانا سید شاہ محمد کبیر ابوالعلاء دانا پوری
تصوف اسلام: عبدالماجد
جغرافیہ خلافتِ مشرقی: محمد جمیل الرحمٰن / جی لی اسٹرینج
جمعیت العلماہند (اول، دوم) پروین روزینہ
جنید بغداد: ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر، ترجمہ: محمد کاظم

Marfat.com

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ: محمد ایوب قادری
حیات جامیؒ: مولانا محمد اسلم جیراجپوری
خصوصی مقالہ ماہنامہ معارف دسمبر ۵۹ء: مولانا سید عبدالرؤف اورنگ آبادی
دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
دس ولی: بشیر احمد سعدی
زبدۃ الآثار: ملا نور الدین ابی الحسن / شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: خلیق احمد نظامی
سوانح مولانا روم: شبلی نعمانی / سید عابد علی عابد
سیارہ ڈائجسٹ، اولیا کرام نمبر
سیر العارفین: حامد بن فضل اللہ جمالی / ترجمہ: محمد ایوب قادری
سیرت انور شاہ کشمیریؒ: عبدالصمد صارم
سیرت جنیدؒ: علامہ فضل احمد عارف
شاہ جیلان: قاضی عبدالنبی کوکب
شرح لوائح جامیؒ: سید عبدالرشید فاضل
شیخ عبدالقادرؒ جیلانی: غلام حیدر سہیل
صاحب المثنوی: قاضی تلمذ حسین
طبقات ابن سعد: محمد ابن سعد / مولانا راغب رحمانی
طبقات الاولیا: علامہ عبدالوہاب الشعرانی / سید عبدالغنی وارثی
عاشق مصطفیٰ امام رضا: مدثر سرور چاند
عہد غزنوی کی علمی سرگرمیاں (مقالہ): ثروت صولت
فقہائے ہند: محمد اسحاق بھٹی
قلائد الجواہر: محمد یحییٰ الطادفی / مولانا زبیر افضل عثمانی
کشف المحجوب: حضرت سید علی ہجویریؒ / میاں طفیل محمد
مآثر لاہور: سید ہاشمی فرید آبادی
مجالس صوفیہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن
مجلہ فکر و نظر، جنوری۔مارچ ۹۱ھ: ادارۂ تحقیقات اسلامی
مرآۃ الاسرار: شیخ عبدالرحمٰن انیس
مفتاح العلوم: مولانا جلال الدین رومی / مولانا نذیر احمد
مقالہ جات از انوار رضا: شرکت حنفیہ لمیٹڈ لاہور
مکتوبات دو صدی: حضرت شرف الدین منیریؒ
ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
منتخب التواریخ: ملا عبدالقادر ملوک بدایونی
مولانا انور شاہ کشمیریؒ: ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ
مولانا رومیؒ، حیات و افکار: ڈاکٹر افضل اقبال / بشیر محمود اختر
نقش دوام: انظر شاہ مسعودی
ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن
یادِ رفتگاں: علامہ سید سلیمان ندوی

•••

Marfat.com

مسلم تہذیب کے پاسبان

اسلامی تہذیب و تمدن کے سرپرست
اموی اور عباسی حکمراں

Marfat.com

انتساب

عظیم مدبر، مصلح، بے شمار انسانوں کے محسن
اور نابغۂ روزگار شخصیت
شہید حکیم محمد سعید کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

افراد واقوام کے حوالے سے تاریخ کا معاملہ مختلف رہا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک تاریخ محض مردہ ماضی ہے، جبکہ بعض کے نزدیک تاریخ ایک چیلنج ہے، جو حال سے نبرد آزما ہونے کا شعور اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں معاونت فراہم کرتی ہے۔ بعض لوگوں اور اقوام کے لیے ماضی فخر و اطمینان کا باعث ہوتا ہے اور وہ اپنے ماضی سے قوت اور توانائی حاصل کرتے ہیں جبکہ دوسروں کے لیے ماضی محض گزرا ہوا بھیانک خواب ہوتا ہے، جسے دہرانے کا انہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔
تاریخ میں مسلمانوں نے جس ذوق و انہماک کا مظاہرہ کیا اس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ قرآن میں امم سابقہ کے قصے اور ایام گزشتہ کے واقعات بیان کیے گئے تھے۔ گو کہ یہ عبرت کے لیے تھا لیکن اس سے مسلمانوں میں تاریخ سے شغف پیدا ہوا۔ بعد ازاں حدیث کی حفاظت اور تدوین کے ساتھ سیرت و مغازی کے تحفظ کے اہتمام نے تاریخ سے مسلمانوں کی وابستگی کو مستحکم کر دیا، ورنہ مسلمانوں سے قبل دیگر تمام تہذیبوں میں "علم التاریخ" کے نام پر جو کچھ ملتا تھا اس کی حیثیت اساطیر سے زیادہ نہیں تھی۔

معاملہ یونان و ایران کا ہو یا روم و عرب کا، عموماً ایک جیسی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ان اقوام کے قدیم سے قدیم دستیاب تاریخی سرمائے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ تاریخ کے نام پر ان اقوام کے یہاں قصص و اساطیر کا جو سرمایہ ہے اس میں تاریخی حقائق کم سے کم اور داستان سازی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔
مسلمانوں نے جب تاریخ نویسی کا آغاز کیا تو اس کا رشتہ قرآن سے جڑا ہوا تھا۔ قرآنِ کریم میں قصص کی متعدد آیات ہیں جن میں اقوام سابقہ اور ان کی طرف بھیجے گئے پیغمبروں کے واقعات کہیں مفصلاً اور کہیں اجمالاً بیان کیے گئے ہیں۔ پھر ایسے تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق اہلِ عرب کے ماضیِ قریب یا حال سے تھا، مثلاً سورۂ فیل میں اصحابِ فیل کا واقعہ یا سورۂ قریش میں قریش کی سماجی برتری اور معاشی تفوق کا تذکرہ، سورۂ انفال میں جنگِ بدر کا تذکرہ۔ قرآن کے علاوہ مسلمانوں کے لیے جو چیز اہم ترین تھی وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوہ تھا، رسول اللہ ﷺ کے اقوال و احادیث جمع کرنے کا کام تاریخ نویسی میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ آغاز سیرت نگاری سے ہوا۔ سیرت النبیؐ سے ہی 'علم المغازی' نے استحکام حاصل کیا جو دراصل فتوحات کی تاریخ تھی۔ اگلے ادوار میں سیرتِ صحابہ و تابعین کے حوالے سے "طبقات" کی کتب منظرِ عام پر آئیں۔ مزید آگے مسلمانوں نے علم تاریخ نویسی میں یہاں تک ترقی کی کہ عالمی تاریخ اور خلفاً و سلاطین سے وزرا، فقہا، امرا، قرا، حفّاظِ حدیث، مورّخین، نحویوں، ادبا، شعرا، قضاۃ یہاں تک کہ اسخیا و بخلا تک کی تاریخ مرتب کی گئی۔
عہدِ اموی میں باقاعدہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں کم و بیش ایسے پینتیس افراد موجود تھے جنھوں نے اسلامی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا، اس دور میں لکھی جانے والی تاریخی تصانیف حدیث کی طرز پر مع سند لکھی گئیں جس کی وجہ سے "تاریخ" کو استناد و اعتبار نصیب ہوا۔

تاریخ اور حدیث کے راستے تیسری صدی ہجری میں جدا ہوئے اور تاریخ نے ایک جداگانہ مستقل فن کی شکل اختیار کر لی جس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔
علامہ ابنِ خلدون (۷۳۲ھ / ۱۳۳۲ء تا ۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء) کے فلسفۂ تاریخ نے مسلمانوں کے علم التاریخ کو ایک نئی زندگی اور جہت عطا کی۔
کلیم چغتائی صاحب کی زیرِ نظر کتاب "مسلم تہذیب کے پاسبان" دراصل ان اموی امرا اور عباسی خلفا کا تذکرہ ہے جنھوں نے تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ کتاب اموی یا عباسی ادوار کی تاریخ نہیں ہے لیکن ہم اسے چند قابلِ ذکر اموی اور عباسی خلفا کا تذکرہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اس تذکرہ کو مرتب کرنے میں انھوں نے اہم تاریخی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ کلیم چغتائی صاحب نے اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کا اظہار کم کیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ نہایت سلیقے سے تاریخ کی چند اہم شخصیات کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی جائے، مسلمانوں کا یہ وہ ماضی ہے جس سے آج بھی قوت و توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔
کلیم چغتائی صاحب کئی برس تک ماہنامہ "رابطہ" سے وابستہ رہے جہاں وہ تاریخ کی مسلم شخصیات پر پابندی سے لکھا کرتے تھے۔ یہ مضامین بھی 'رابطہ' کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب انھیں کتابی شکل میں یکجا کر کے تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یک گونہ سہولت فراہم کر دی گئی ہے۔ اُمید ہے قارئین کے حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہو گی۔

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

چیئرپرسن، شعبۂ تاریخ اسلامی، جامعہ کراچی

Marfat.com

عرضِ مؤلف

جب اللہ تبارک و تعالیٰ کے لطف و کرم سے اس جہاں میں آفتابِ رسالت ﷺ طلوع ہوا تو اس وقت دنیا کا بڑا حصہ تہذیب و تمدن سے نا آشنا ایک ایسے وحشی معاشرے کی تصویر پیش کر رہا تھا جہاں انسانیت سسکیاں لے رہی تھی۔ روم اور فارس گو کہ تمدنی لحاظ سے نمایاں تھے لیکن وہاں بھی اشرافیہ اور مذہب کے خود ساختہ قائدین کا گٹھ جوڑ تھا اور عام انسان ان کے مظالم کے بوجھ تلے کچلے جا رہے تھے۔ سرزمین عرب بھی طرح طرح کی اخلاقی برائیوں سے پامال ہو رہی تھی۔ شراب نوشی، بدکاری، قمار بازی، سود خوری اور غلاموں کا کاروبار عروج پر تھا۔

ان بدترین حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر کرم فرمایا اور انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ انسان کو اپنا نبی (ﷺ) بنا کر بھیجا جس نے اللہ کی آیات پڑھ کر انسانوں کو سنائیں، انہیں پاک کیا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دی۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اللہ کے حبیب ﷺ نے ایک یکسر بگڑے ہوئے معاشرے کے غیر مہذب اور تمدن سے بے بہرہ افراد کی تربیت اس طور کی اور دینِ اسلام کے اصول اس خوبی سے نافذ فرما دیے کہ محض تین عشروں میں وہی اجڈ اور غیر متمدن افراد تعلیم اور تہذیب کی معراج کو پہنچے۔ انہوں نے دنیا کے بڑے حصے کو فتح کر کے وہاں اسلام کے قائم کیے ہوئے اصولوں کو نافذ کر دیا۔ انصاف کی حکمرانی قائم کر دی۔ علم و حکمت اور صنعتی ترقی کو عام کر دیا اور اپنے زیرِ نگیں علاقوں کو خوشحالی اور آسودگی کی تصویر بنا دیا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مثالی اور درست اسلامی نظام تو بس خلافتِ راشدہ کے زمانے میں رائج رہا۔ پھر جوں ہی خلافت کی جگہ ملوکیت کے موروثی نظام نے لی، اسلامی نظام کی ساری برکتیں اچانک ختم ہو گئیں۔ حکمران رنگ رلیاں منانے لگے۔ محلاتی سازشوں کے تانے بانے بنے جانے لگے۔ عام لوگوں کو انصاف ملنا بند ہو گیا اور رعایا کو ہر قسم کی سہولتوں سے محروم کر دیا گیا۔ اسلامی ریاست، سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے پسماندہ ہو گئی اور معاشرے میں بدی کا چلن فوراً عام ہو گیا۔

لیکن۔۔۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قائم کردہ اسلامی نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط اور گہری ہیں کہ خلافت کی جگہ عملاً بادشاہت رائج ہو جانے کے باوجود علمی اور فلاحی اعتبار سے مسلمانوں نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اموی حکمرانوں کے تقریباً سو برس اور پھر عباسی حکمرانوں کے تقریباً پانچ سو برس گواہ ہیں کہ ان کے بیشتر حکمران بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انہوں نے مملکتِ اسلامی کو وسعت دی۔ تحقیق کی بھرپور سرپرستی کی اور عام انسانوں کو انصاف، علاج معالجہ اور ضروریاتِ زندگی وافر مقدار میں فراہم کیں۔ تابعینؒ، تبع تابعینؒ، محدثینؒ اور فقہاء کرامؒ نے انہی ادوار میں زبردست علمی خدمات انجام دیں۔ درست اور مستند احادیث کے مجموعے ترتیب دیے اور فقہی احکام کو باقاعدہ مرتب کیا۔

اموی اور عباسی حکمرانوں کی بشری کمزوریوں سے قطع نظر، مسلم تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے اور اس کو تحفظ دینے کے لیے ان حکمرانوں کی خدمات بڑی درخشندہ ہیں۔ مثال کے طور پر اموی حکمران ولید بن عبد الملک کا دور تعمیرات کے حوالے سے یادگار ہے۔ انہوں نے دمشق میں "جامع اموی" کے نام سے جو شاندار مسجد تعمیر کروائی تھی، قرونِ وسطیٰ کے مسلمان، یہاں تک کہ امام شافعیؒ بھی اسے دنیا کے عجائبات میں شمار کرتے تھے۔ ہارون الرشید نے "بیت الحکمت" کے نام سے جو علمی و تحقیقی ادارہ قائم کیا تھا، اس نے ہارون الرشید اور ان کے بعد ان کے صاحب زادے مامون الرشید کے دور میں جو شاندار علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں، ان کی تفصیل حیران کر دیتی ہے۔

میں بے حد لائقِ احترام استاد، منفرد طرز کی ادیبہ، مہربان شخصیت اور علمِ تاریخ کی پروفیسر ڈاکٹر محترمہ نگار سجاد ظہیر صاحبہ کا از حد شکر گزار اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ پڑھنے کے لیے وقت نکالا اور اس پر علمی اور تحقیقی نوعیت کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

ولید بن عبدالملک

بنی امیہ کے پانچویں خلیفہ، مملکتِ اسلامیہ کی توسیع ان کا اہم کارنامہ ہے

اسے مدد کی ضرورت تھی!

اس کا تعلق قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔ اسے کسی قسم کی مدد درکار تھی چنانچہ وہ مدد لینے کے لیے اٹھا اور ایک جانب چل دیا۔ اسے اطمینان تھا کہ مدد تو بہرحال اسے مل ہی جائے گی۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ پہنچ کر رک گیا۔ یہ مملکت کے فرمانروا کی رہائش گاہ تھی۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اسے مملکت کے سربراہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے اپنی ضرورت بیان کی۔

سربراہِ مملکت نے مدد مانگنے والے سے دریافت کیا: "کیا آپ اس مدد کے مستحق ہیں؟"

"میں کیسے مستحق نہ ہوتا، جبکہ میں آپ کا رشتہ دار ہوں۔" مدد کے خواہش مند شخص نے فوراً کہا۔

"کیا آپ کو قرآن حکیم پڑھنا آتا ہے؟" سربراہِ مملکت نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں۔" جواب ملا۔

"ہمارے پاس آیئے۔" سربراہِ مملکت نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا۔

مدد مانگنے والا شخص، خوش خوش، سربراہِ مملکت کے قریب پہنچ گیا۔ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ مملکت کے فرمانروا اس کی درخواست تو کبھی مسترد کر ہی نہیں سکتے۔

لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ قریب پہنچنے پر سربراہِ مملکت نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا عمامہ اتار لیا۔ پھر انہوں نے ایک چھڑی اٹھائی اور اب مدد کا خواہش مند شخص سربراہِ مملکت کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔

چند چھڑیاں رسید کرنے کے بعد سربراہِ مملکت نے ایک اور شخص کو بلایا اور حکم دیا کہ قرآن حکیم سے بے بہرہ اس شخص کو لے جایئے اور اپنے ساتھ اس وقت تک رکھیے جب تک کہ یہ شخص قرآن حکیم پڑھنا نہ سیکھ لے۔

قرآن کریم سے بے حد محبت کرنے والے یہ حکمران تھے اموی دور کے پانچوں فرمانروا خلیفہ ولید بن عبدالملک جن کا دور، مملکتِ اسلامیہ کی توسیع کے حوالے سے یادگار ہے۔

ولید چوتھے اموی خلیفہ، عبدالملک بن مروان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ ولادہ بنت عباس کا تعلق قبیلہ عبس سے تھا۔ ولید ۵۰ھ / ۶۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ عبدالملک نے اپنے بیٹے کی پرورش بڑے اہتمام سے کی اور ان کو تعلیم دینے کے لیے لائق اساتذہ اور علما مقرر کیے۔

ولید بن عبدالملک اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کے والد عبدالملک بن مروان نے اپنے ۲۱ سالہ دور میں تمام مخالفتوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور جب ولید ۸۶ھ / ۷۰۵ء میں اپنے والد عبدالملک کی وفات کے بعد مملکت کے فرمانروا بنے تو انہیں پورے اطمینان کے ساتھ مملکتِ اسلامیہ کو وسعت دینے کا موقع ملا۔ ولید کی دوسری خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں پانچ ایسے قابل اور اولوالعزم سپہ سالار میسر آگئے تھے جو لشکر لے کر مختلف سمتوں میں بڑھتے چلے گئے اور اسلامی مملکت کی حدود ایک جانب چین سے جا ملیں، دوسری طرف شمالی بھارت کو چھونے لگیں اور تیسری جانب اندلس کو مملکت کا حصہ بناتے ہوئے فرانس تک جا پہنچیں۔ یہ پانچ عظیم سپہ سالار تھے، قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبدالملک۔

ولید نے جب زمام حکومت سنبھالی تو فارس (ایران) کی جانب مملکتِ اسلامیہ کی حدود دریائے جیحوں تک تھیں۔ ۸۶ھ / ۷۰۵ء میں قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں اگرچہ

Marfat.com

ترکستان کے ایک حصے پر مسلمانوں کی حکمرانی تسلیم کی جاچکی تھی لیکن یہاں کے چھوٹے حکمران وقتاً فوقتاً سرکشی اختیار کرتے رہتے تھے۔ سمرقند اور بخارا اور نواحی علاقوں کے حکمرانوں کا طرزِ عمل بھی ان دنوں معاندانہ تھا، چنانچہ قتیبہ بن مسلم کو ان حکمرانوں کی سرکوبی کی ہدایت کی گئی۔

قتیبہ بن مسلم نے فوجی تیاریوں کا حکم دیا اور دریائے جیحوں پار کرکے آگے بڑھے۔ صغانیان کے حکمراں نے اطاعت قبول کرلی، اس کی دیکھا دیکھی شومان اور کفیان کے حاکم بھی مطیع ہوگئے۔ بادغیس کے حکمراں نیزک نے بھی مسلمانوں سے صلح کرلی۔ ۸۷ھ/۷۰۶ء میں قتیبہ نے بخارا کے شہر بیکند پر فوج کشی کی۔ شہر والے قلعہ بند ہوگئے لیکن پھر انہوں نے بھی صلح کرلی۔ قتیبہ نے یہاں ایک مسلمان حاکم مقرر کردیا، تاہم جب اس مسلمان حاکم کو شہر والوں نے بغاوت کرکے قتل کردیا تو قتیبہ نے پھر کارروائی کی اور شہر پر قبضہ کرکے سرکشوں کو سزائے موت دے دی۔

سنہ ۸۸ھ/۷۰۷ء میں قتیبہ نے نومجکث فتح کیا۔ اسی اثنا میں خاقانِ چین کے بھتیجے نے ترک اور فرغانیوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ اس سال قتیبہ نے بخارا پر چڑھائی کی۔ بلاذری کے مطابق شہر کے حاکم نے صلح کرلی لیکن ابن اثیر کہتے ہیں کہ قتیبہ مقابلے میں کامیابی نہ حاصل کرسکے اور ۹۰ھ میں انہوں نے دوبارہ حملہ کرکے بخارا کو فتح کرلیا۔

ادھر بادغیس کے حاکم نیزک کی نیت تبدیل ہوئی۔ اسے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے آس پاس کے حکمرانوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے طخارستان سے مسلمان حاکم کو نکال دیا۔ قتیبہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو طخارستان بھیجا۔ خود وہ طالقان کی طرف بڑھے۔ اس کے حاکم نے اطاعت کرلی۔

سنہ ۹۱ھ/۷۱۰ء میں قتیبہ نے فاریاب کو تسخیر کیا۔ پھر جوزجان فتح ہوا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن کے ساتھ مل کر نیزک کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو ایک دشوار گزار گھاٹی میں جاچھپا تھا لیکن مسلمان وہاں بھی جاپہنچے۔ نیزک یہاں سے بھاگ کر کرز کی گھاٹی میں چھپ گیا۔ قتیبہ نے اس گھاٹی کا دوماہ تک محاصرہ کیے رکھا۔ بالآخر نیزک کو سزائے موت دی گئی۔

سنہ ۹۳ھ/۷۱۲ء میں ترکستان کے خوارزم شاہ نے قتیبہ کی اطاعت قبول کی، لیکن خوارزم شاہ کو خود ان کی رعایا نے قتل کردیا۔ اس کے بعد قتیبہ نے سمرقند پر فوج کشی کی۔ شہر کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ پھر سمرقند والوں کی مدد کے لیے اطراف سے فوجیں آگئیں۔ قتیبہ نے ان فوجوں کو شکست دی اور شہر کا محاصرہ سخت کردیا، پھر پتھر برسا کر شہر کی فصیل توڑ دی۔ شہر والوں نے جم کر مقابلہ کیا لیکن آخر کار صلح پر مجبور ہوگئے اور کئی شرائط پر صلح ہوگئی۔

مسلمانوں نے شہر میں مسجد تعمیر کی، نماز ادا کی گئی۔ قتیبہ نے اعلان کروایا کہ مسلمان صلح کے معاہدے میں طے شدہ رقم کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ سمرقند میں بت پرست رہتے تھے جو سغد کہلاتے تھے۔ بہت سے سغد مسلمان ہوگئے۔

قتیبہ نے اس کے بعد شاش اور فرغانہ فتح کیے اور چین کے سرحدی مقام استیجاب تک پہنچ گئے۔ ایک لشکر روانہ کیا جو کاشغر فتح کرتا ہوا چین کے اندر تک چلا گیا۔ چین کے بادشاہ نے اہلِ سمرقند کا ساتھ دیا تھا اس لیے اس کے خلاف کارروائی ضروری تھی۔ خاقانِ چین نے پہلے تو سخت رویہ اختیار کیا لیکن پھر جزیہ دے کر اطاعت کا اقرار کرلیا۔

ولید بن عبدالملک ہی کے دور میں مسلمان پہلی بار سندھ کی سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ گویا اس خطے میں جہاں پاکستان واقع ہے، اسلامی حکومت ولید ہی کے عہد میں قائم ہوئی۔ سندھ پر باقاعدہ فوج کشی اس سے قبل نہیں کی گئی تھی' البتہ اِکا دُکا فتوحات ہوتی رہی تھیں۔ اس فوج کشی کا محرک سندھ کے راجا داہر کی جانب سے کچھ عرب تاجروں کے جہاز لوٹنے اور مسلمان خواتین کو قید کرنے کا واقعہ بنا۔

ابتدائی چند فوجی مہمات کی ناکامی کے بعد ۹۲ھ/۷۱۱ء میں نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم کو چھ ہزار سپاہی دے کر سندھ بھیجا گیا جو مکران ہوتے ہوئے خشکی کے راستے سندھ پہنچے۔ پہلے انہوں نے قنزپور (اب پنجگور) فتح کیا پھر ارمابیل (ارمن بیلہ) کو تسخیر کرلیا۔ ارمن بیلہ کے بعد انہوں نے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد ساحلی شہر دیبل کو فتح کیا۔ دیبل سے محمد بن قاسم نیرون (حیدرآباد) پہنچے۔ یہاں کے راجا نے صلح کرلی۔ اس سے آگے دریائے سندھ کی شاخ تک کا علاقہ آسانی سے فتح ہوگیا۔ دریا پار کرنے کے بعد محمد بن قاسم سیوستان (سیہون) پہنچ گئے اور محاصرہ اور سنگ باری کرکے اسے بھی فتح کرلیا۔ اس کے بعد وہ سیسم گئے اور اسے بھی تسخیر کرلیا۔ پھر مرکز سے حکم ملنے

Marfat.com

پر وہ واپس نیرون گئے اور راجا داہر سے لڑکر اسے شکست دی۔ پھر انہوں نے راوڑ (بدین کے قریب ایک قدیم شہر)، بغرور (موجودہ بھکر) اور برہمن آباد کے علاقے فتح کیے۔ اس کے بعد اروڑ (روہڑی کے قریب ایک قدیم شہر)، قلعہ بابیہ، سکہ اور اسکلندہ، اسلامی مملکت میں شامل ہوئے۔ یہاں سے محمد بن قاسم دریائے چناب عبور کر کے ملتان کی سمت بڑھے۔ سخت جنگ کے بعد ملتان بھی فتح ہو گیا۔

محمد بن قاسم قنوج پر حملہ کرنے والے تھے کہ شوال ۹۵ھ / جون ۷۱۴ء میں عراق کے حاکم حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا اور آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی ۹۶ھ / فروری ۷۱۵ء میں ولید بن عبد الملک بھی انتقال کر گئے۔ اس دوران محمد بن قاسم سلیمان اور کیرج کے علاقے فتح کر چکے تھے لیکن ولید کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبد الملک کے دور میں محمد بن قاسم کو واپس عراق بلا لیا گیا۔

محمد بن قاسم نے اپنے ساڑھے تین سالہ دور حکومت میں سندھ کے وسیع و عریض علاقے کا بہت اچھا انتظام کیا۔ سندھ سے مراد اس دور میں مکران سے گجرات تک اور مالوہ سے ملتان تک کا علاقہ تھا۔ محمد بن قاسم نے مالیات کی تحصیل کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا۔ کسانوں کو سہولتیں دیں۔ انصاف کے حصول کے لیے تمام شہروں میں قاضی مقرر کیے گئے۔ ہر علاقے میں مساجد تعمیر ہوئیں جو اشاعتِ علوم کے مراکز بن گئیں۔ منصورہ، ملتان اور دیگر شہروں میں بھی مدارس قائم ہوئے۔

ادھر یورپ میں، اندلس کی مملکت میں جہاں صدیوں سے گاتھ خاندان حکمراں تھا، تہذیبی انحطاط عروج پر تھا۔ ایک یونانی سردار کاؤنٹ جولین نے جو گاتھ خاندان سے ناراض تھا، مسلمانوں کو اندلس پر حملے کی دعوت دی۔ اندلس کا ایک سرا شمالی افریقہ سے بہت قریب واقع ہے۔ شمالی افریقہ میں موسیٰ بن نصیر حاکم تھے۔

کاؤنٹ جولین کی دعوت ملنے پر موسیٰ بن نصیر نے ولید بن عبد الملک کو خط لکھ کر ان سے اندلس پر حملے کی اجازت مانگی۔ ولید نے اجازت دینے میں تامل کیا اور جواب میں لکھا کہ کسی تجربے کے بغیر فوج کو سمندر کے خطرات میں الجھانا درست نہیں ہے۔ پہلے وہاں کے حالات معلوم کریں۔ اس کے جواب میں موسیٰ نے اطلاع دی کہ یہ سمندر نہیں بلکہ معمولی آبنائے ہے اور دوسرے کنارے کی چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ اس پر ولید نے حملے کی اجازت دے دی۔

موسیٰ نے ۹۱ھ / ۷۱۰ء میں پہلے اپنے ایک غلام طریف بن مالک کو مختصر سی فوجی جمعیت دے کر اندلس بھیجا تاکہ صورتحال کا اندازہ لگایا جاسکے۔ طریف نے بعض ساحلی شہروں پر کامیاب حملے کیے اور لوٹ آئے۔ اس کے بعد موسیٰ نے اپنے غلام طارق بن زیاد کو ۹۲ھ / ۷۱۱ء میں سات ہزار سپاہی دے کر اندلس روانہ کر دیا۔ ۵ رجب ۹۲ھ / ۲۸ اپریل ۷۱۱ء کو طارق اندلس کے ساحل پر اترے اور ایک پہاڑ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ پہاڑ جبل الطارق یعنی "طارق کا پہاڑ" کہلایا۔

اندلس کا بادشاہ راڈرک (لزریق) ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج لے کر آگیا۔ طارق نے موسیٰ سے کمک مانگی۔ انہوں نے پانچ ہزار سپاہی مزید بھیج دیے۔ وادی لکہ یا وادی بکہ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، زبردست جنگ ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی۔ اس کے بعد طارق نے شذونہ، حصن المدور، قرمونہ اور استجہ کو فتح کیا۔ پھر قرطبہ کی مہم پر ولید نے ایک تجربہ کار غلام مغیث رومی کو فوج دے کر بھیجا۔ مغیث نے قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔

ایک فوج تدمیر بھیجی گئی جس نے تدمیر کو فتح کیا۔ دارالحکومت طلیطلہ پر طارق نے خود حملہ کیا، یہ شہر کسی خونریزی کے بغیر فتح ہو گیا۔ موسیٰ بن نصیر نے قرمونہ، اشبیلیہ اور بطلیوس کو تسخیر کیا۔ طلیطلہ سے سرقوسہ تک کا علاقہ زیر نگیں آگیا۔ اس کے بعد مسلمان فوج شمالی اندلس میں پھیل گئی اور ساحلی شہر برشلونہ (بارسلونا) کو فتح کرتی ہوئی فرانس کی سرحد دریائے رڈونہ تک جا پہنچی۔ مسلمانوں نے اربونا، اوینون اور حصن لودون فتح کیے۔

اندلس کی فتوحات سے مسلمانوں کو بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس میں سونے، چاندی اور جواہرات کے علاوہ بہت سے نوادر بھی شامل تھے۔

اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے اندلس کے شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ احترام کا سلوک کیا۔ اندلس میں گاتھ خاندان کے آخری حکمراں وٹیزا کے بیٹوں نے طارق سے درخواست کی کہ مختلف صوبوں میں ان سے جو جاگیریں چھین لی گئی ہیں وہ انہیں واپس کر دی جائیں۔ موسیٰ نے ان کو ولید بن عبد الملک کے پاس بھیج دیا۔ ولید نے بھی ان کے ساتھ عزت کا سلوک کیا اور ان کی جاگیریں بحال کر دیں۔

ولید بن عبد الملک کے دور حکومت میں جنگ کا تیسرا محاذ ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) تھا۔ ایشیائے کوچک پر قیصر روم حکمران تھا۔ ولید کے والد عبد الملک کے عہد میں قیصر نے مسلمانوں کے سرحدی علاقے

Marfat.com

مصیصہ پر حملہ کیا تھا اور عبد الملک کو مصالحت کرنی پڑی تھی۔ ولید حکمراں بنے تو انہوں نے اپنے بھائی مسلمہ بن عبد الملک اور بیٹے عباس کو مصیصہ کی حفاظت کی ذمے داری سونپ دی۔

مسلمہ نے ۸۷ھ/۷۰۶ء میں مصیصہ کے علاقے میں کئی قلعے فتح کیے۔ اگلے سال رومیوں سے طوانہ کے قریب مقابلہ ہوا، جس میں رومیوں نے بالآخر شکست کھائی۔ ۸۹ھ/۷۰۸ء میں مسلمہ نے حصن عموریہ اور آذر بائیجان کے بعض شہر فتح کر لیے۔ ۹۳ھ اور ۹۴ھ/۷۱۲ء اور ۷۱۳ء میں عباس نے طرسوس اور انطاکیہ تسخیر کر لیے۔ ولید کے عہد میں بحیرۂ روم کے جزائر میورقہ اور منورقہ بھی فتح ہوئے، جو شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے زیر نگیں علاقوں کے دفاع کے نقطۂ نظر سے بہت اہم تھے۔

ولید بن عبد الملک کے زمانے میں مسلمانوں کے فوجی نظام کو بہت وسعت دی گئی اور اسے جدید خطوط پر منظم کیا گیا۔ یہ فوج اتنے اچھے انداز سے تیار ہوئی کہ بیک وقت کئی کئی محاذوں پر بر سر پیکار تھی۔ اسلامی فوجیں ایک طرف سندھ میں، دوسری طرف وسط ایشیا اور تیسری جانب یورپ میں پیش قدمی کر رہی تھیں اور تمام محاذوں پر فتح ان کے قدم چوم رہی تھی۔

بحری جہاز سازی کے کارخانوں کا قیام گو کہ ولید کے دور سے پہلے ہی عمل میں آچکا تھا لیکن ولید نے ان میں بہت اضافہ کیا۔ صرف موسیٰ بن نصیر نے تیونس میں جو کارخانہ قائم کیا تھا اس میں ان کے دور میں ایک سو جہاز تیار کیے گئے تھے۔

ولید بن عبد الملک کا دور، شاندار تعمیرات کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے عہد میں، مسجد نبویؐ کی عمارت میں نمایاں توسیع کی گئی۔ ۸۸ھ/۷۰۷ء میں ولید بن عبد الملک نے مدینے کے حاکم کو ہدایت بھیجی کہ مسجد نبویؐ کی قدیم عمارت کو شہید کر کے اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کروائی جائے۔ مسجد سے متصل مکانات اور امہات المومنینؓ کے حجروں کا رقبہ بھی مسجد میں شامل کر لیا جائے۔ اس زمانے میں مدینہ کے حاکم مشہور خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ تھے۔ انہوں نے ہدایت ملتے ہی، مسجد نبویؐ کے آس پاس کے مکانات میں بسنے والوں سے بات چیت کی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں توسیع ہونی تھی، لوگوں نے خوشی خوشی اپنے مکانات حاضر کر دیے۔ انہیں ان مکانات کا معقول معاوضہ دیا گیا۔

ولید بن عبد الملک نے بھاری رقوم مدینہ منورہ بھجوانا شروع کر دیں۔ شام اور مصر سے اعلیٰ درجے کے ۸۰ ماہر معمار بلوائے گئے۔ اسی اثنا میں روم کے بادشاہ قیصر کو اطلاع ملی کہ مسلمان اپنے نبی ﷺ کی مسجد از سر نو تعمیر کروانا چاہتے ہیں تو انہوں نے ایک لاکھ مثقال سونا اور چالیس اونٹوں پر لدا ہوا منبت کاری کا سامان (پچی کاری کے لیے رنگا رنگ پتھر) بھیجا۔ اس کے علاوہ ایک سو رومی کاریگر بھی روانہ کیے۔ ان میں سے دس کاریگر ایسے تھے جن کی اجرت ایک لاکھ اسی ہزار دینار ادا کی گئی۔ جب تعمیر کا سامان پہنچ گیا تو مسجد نبویؐ کی قدیم عمارت کو شہید کرنے کے کام کا آغاز کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے مدینہ منورہ کے علما کرام کو بلوایا۔ ان میں قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ، سالم بن عبد اللہؒ، ابو بکر بن عبد الرحمٰنؒ، عبید اللہؒ، خارجہ بن زیدؒ، عبد اللہ بن عمرؒ شامل تھے۔ ان علما کرام کی موجودگی میں مسجد نبویؐ کی پرانی عمارت کو شہید کیا گیا، پھر انہی علما کرام سے نئی عمارت کی بنیاد رکھوائی گئی جس کے بعد نئی عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خود تعمیر کے تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ ادھر ولید بن عبد الملک دارالحکومت دمشق سے رقوم ارسال کرتے جاتے تھے اور مسلسل ہدایات بھیجتے رہتے تھے کہ مسجد نبویؐ کی تعمیر نو میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کاریگروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں اجرت کے علاوہ انعام بھی دیتے تھے۔ مسجد کی تعمیر نو پر بھاری رقم خرچ ہوئی۔ صرف قبلہ رُخ دیوار کی تعمیر اور اس پر طلائی کام کے سلسلے میں ۴۵ ہزار اشرفیوں کا خرچ آیا۔

مسجد نبویؐ کی نئی عمارت پتھروں کی مدد سے تعمیر کی گئی تھی۔ تمام در و دیوار اور چھت پر طلائی کام اور اعلیٰ درجے کی منبت کاری کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مسجد میں ایک فوارہ بھی تعمیر کیا گیا۔ مسجد کی تعمیر نو، تین سال میں مکمل ہوئی۔ ۹۱ھ/۷۱۰ء میں مسجد نبویؐ کی تعمیر نو مکمل ہونے پر ولید بن عبد الملک خود مدینہ منورہ پہنچے۔ انہیں مسجد نبویؐ کی نئی عمارت بہت پسند آئی۔ اس مبارک تعمیر کی تکمیل پر انہوں نے اہل مدینہ کے مابین نقد رقوم اور عمدہ قسم کے ظروف تقسیم کیے۔

ولید بن عبد الملک کے عہد کی ایک اور اہم تعمیر دمشق کی جامع مسجد ہے جسے جامع اموی بھی کہا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان اس مسجد کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے بھی

Marfat.com

اس مسجد کو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا ہے۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے۔ ولید نے یہ مسجد بہت اہتمام سے تعمیر کروائی۔ اس پر بے دریغ رقم صَرف کی۔ مؤرخین کے مطابق مسجد کی تعمیر پر ۵۶ لاکھ اشرفیاں خرچ کی گئیں۔ ہند (برصغیر پاک وہند) فارس، روم اور دیگر ملکوں سے تعمیراتی سامان منگوایا گیا۔ صرف جزیرہ قبرص سے اٹھارہ جہازوں پر سونا اور چاندی لایا گیا۔ قیصر روم نے منبت کاری کے لیے علیحدہ سامان ارسال کیا۔ دو سو کاریگر بھی بھیجے۔

جامع مسجد دمشق بہت وسیع تھی۔ اس میں بیک وقت بیس ہزار افراد نماز ادا کر سکتے تھے۔ پوری عمارت سنگِ مرمر کی مدد سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں مختلف رنگوں کے پتھر بھی استعمال کیے گئے تھے۔ مسجد کا فرش چاندی کا تھا۔ در و دیوار پر سونے اور لاجورد کا کام تھا۔ محرابوں میں بیش قیمت جواہرات جڑے تھے۔ چھت پر بھی دلفریب نقوش تھے۔ چھت پر سیسے کی چادر چڑھائی گئی تھی۔ چھت میں چھ سو قندیلیں نصب کی گئیں جو سونے کی زنجیروں سے آویزاں تھیں۔ ان قندیلوں میں مشک جلایا جاتا تھا۔ محراب میں ایک ایسا قیمتی موتی جڑا گیا تھا جس کی روشنی چراغ کی مانند تھی۔ مسجد کی تعمیر میں بارہ ہزار کاریگروں نے حصہ لیا اور اس کی تعمیر میں آٹھ یا نو برس کا عرصہ لگا۔

ولید بن عبدالملک کو اس مسجد کی تعمیر سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ اکثر مسجد میں آکر بیٹھے رہتے تھے اور تعمیر کے کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ مسجد کی پیشانی پر لاجورد کی تین تختیاں لگائی گئیں جن پر سونے کے حروف سے قرآنی آیات درج کی گئیں تھیں۔ مسجد کی اوپری دیواروں پر مملکتِ اسلامیہ کے مشہور شہروں کے نقشے بنے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کی تصویر محراب کے رُوبرُو تھی۔ مسجد کے دو مینار پہلے سے بنے ہوئے تھے۔ انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ شمال کی جانب ایک مینار ولید کے دور میں تعمیر ہوا۔

ولید بن عبدالملک نے مکہ مکرمہ اور بیت المقدس میں بھی قدیم مساجد کی عمارتوں میں توسیع کروائی اور نئی مساجد تعمیر کروائیں۔ اسی زمانے میں مصر کے حاکم ابن شریک نے جامع مسجد تعمیر کروائی۔ ولید بن عبدالملک نے روضۂ رسول ﷺ کے چاروں اطراف دوہری دیواریں بھی بنوائی تھیں۔

ولید کے دور میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ دمشق کے مشرق میں تقریباً ساٹھ میل دور ایک عمارت، قصر جبل سیس کے نام سے تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کی دیواریں ۶۷ گز طویل تھیں۔ طبریہ کے شمال مغرب میں ایک اور قصر تعمیر ہوا۔ بلقان کے صحرا میں قصر طوبیٰ کے نام سے ایک عمارت تعمیر کروائی گئی۔ ولید نے ایک ایوانِ عام اور حمام کی عمارت بھی بنوائی جو آج کل شرق اردن میں قُصیر عَمْرہ کے نام سے مشہور ہے۔ حمام کا ایک حصہ گرمابہ کہلاتا تھا جس کے فرش کے نیچے آتش دان تھے۔ گرمابہ کی چھت گنبد نما تھی۔ گنبد کو اندر سے آسمان کی شکل دی گئی تھی، جس میں مشہور ستاروں کی منڈلیاں دُبِ اکبر، دُبِ اصغر وغیرہ نظر آتی تھیں۔ منیا میں جھیل طبریہ کے کنارے بھی ایک محل بنوایا گیا تھا۔ یہ قصر باہر سے قلعے کی مانند نظر آتا تھا۔

ولید بن عبدالملک کا دور، مملکت کی توسیع واستحکام کے ساتھ ساتھ امن وامان اور خوشحالی کا دور بھی ہے۔ ان کے عہد میں عوامی بھلائی کے اتنے زیادہ کام انجام دیے گئے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے اس وقت تک کسی حکمراں نے فلاحِ عامہ کی اتنی خدمات انجام نہ دی تھیں۔

ولید نے حکمراں بننے کے دو برس بعد ۸۸ھ / ۷۰۷ء میں پوری مملکت میں سڑکوں کی تعمیر ومرمت کروائی۔ ان پر پیمائش کے لیے پتھر (سنگِ میل) نصب کیے گئے جن کی مدد سے مسافت کا تعین کیا جا سکتا تھا اور قافلوں کے بھٹکنے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے تمام راستوں پر کنوئیں بنوائے، نہریں جاری کروائیں۔ مسافروں کو قیام کی سہولت دینے کے لیے جگہ جگہ مسافر خانے تعمیر کروائے۔

ولید بن عبدالملک سے قبل باقاعدہ شفاخانوں کا قیام عمل میں نہ آیا تھا۔ ولید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے پوری مملکت میں پہلی بار شفاخانوں کا ایک نظام قائم کیا۔ انہوں نے جذامیوں (کوڑھیوں) کو الگ رکھنے کے لیے بھی شفاخانے قائم کیے اور ان کے وظیفے مقرر کردیے۔ ولید کا ایک اور قابلِ تحسین اقدام یہ ہے کہ انہوں نے پوری مملکت میں معذور اور اپاہج افراد کے لیے وظیفے مقرر کردیے۔ معذروں کے کام انجام دینے کے لیے خادم مہیا کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مملکت بھر میں بھیک مانگنے پر پابندی عائد کردی۔ انہوں نے یتیموں کی کفالت اور تعلیم وتربیت کے انتظامات بھی کیے۔

ولید بن عبدالملک نے عوام کو ارزاں نرخوں پر اشیائے صَرف کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا۔ وہ خود بازاروں کے اچانک دورے کرتے تھے اور اشیا کے دام معلوم کرتے تھے۔ اگر کوئی شے مہنگے داموں فروخت

Marfat.com

ہو رہی ہوتی تو گراں فروش کے خلاف کارروائی کرتے تھے۔

ولید اپنی ذاتی زندگی میں مذہب کے بہت پابند تھے۔ وہ ہر تین دن یا سات دن میں قرآن حفظ کرنے پر عطیہ دیا کرتے تھے۔ منگل اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ رمضان المبارک میں روزہ داروں کے لیے کھانے کا اہتمام کرتے تھے۔

ولید ایک مشفق حکمراں تھے۔ لوگوں سے محبت کرتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک بیدار مغز انسان تھے اور فیصلوں کے نفاذ میں سخت گیری سے کام لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نرمی سے کوئی فائدہ اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ولید بن عبدالملک کا انتقال ۵ جمادی الثانی ۹۶ھ/۱۵ فروری ۷۱۵ء کو شام میں دمشق کے نزدیک ایک گاؤں دیر مران میں ہوا۔ ان کی عمر ۴۶ برس تھی۔ انہوں نے نو سال آٹھ ماہ تک خلافت کے فرائض انجام دیے۔

ولید بن عبدالملک کے دور کی سب سے نمایاں خصوصیت مملکتِ اسلامیہ کی بے پناہ توسیع ہے، لیکن یہ صرف فتوحات نہیں تھیں۔ انہیں ہم ملک گیری کے خواہش مند کسی حکمراں کی اندھا دھند کارروائیاں قرار نہیں دے سکتے بلکہ ولید نے جو علاقے فتح کیے ان علاقوں کو نہ صرف سماجی اور اقتصادی لحاظ سے بہتری بخشی بلکہ علمی اعتبار سے بھی انہیں اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔

•••

Marfat.com

ہشام بن عبد الملک

اولوالعزم اموی خلیفہ جن کا دور مملکت کی توسیع و استحکام کے حوالے سے یادگار ہے

جمعہ کا دن تھا!

اجلے کپڑے زیب تن کیے نمازی جوق در جوق مسجد کا رخ کر رہے تھے۔ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کا وقت آ گیا تھا۔ خطبہ دیا گیا، پھر اقامت کہی گئی۔ نمازی صف بستہ ہو گئے اور ہزاروں انسانوں نے اپنی جبینیں اس ذاتِ اقدس کے حضور جھکا دیں جس کی حکمرانی کُل کائنات پر محیط ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھ گئے۔ ہزاروں افراد اپنی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے ربِ کائنات کی بارگاہ میں درخواست گزار تھے۔

دعا کے بعد نمازی رخصت ہونے لگے۔ امیر المومنین کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ انہوں نے جہاں تک دکھائی دیتا تھا نظریں دوڑائیں، لیکن مطلوبہ فرد کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

گھر واپس پہنچ کر انہوں نے مطلوبہ فرد کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ مطلوبہ فرد ایک نوجوان تھا جو شرمندگی کے عالم میں آکر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ نے نمازِ جمعہ ادا کی؟" امیر المومنین نے سنجیدہ اور محکم لہجے میں دریافت کیا۔

"میری سواری ناکارہ ہو گئی تھی اس لیے میں حاضر نہ ہو سکا۔"

آنے والے نوجوان نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

"خوب! نماز کی ادائیگی کے لیے سواری کا ہونا ضروری ہے؟ کیا آپ پیدل نہیں آ سکتے تھے؟ نماز ترک کرنے کی پاداش میں آپ کے لیے سواری کا استعمال ایک سال کے لیے ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔"

نوجوان دم بخود کھڑا رہ گیا لیکن امیر المومنین اپنا فیصلہ سنا چکے تھے۔ امیر المومنین جو محض امیر المومنین ہی نہیں اس کے والدِ محترم بھی تھے۔ انہوں نے والد ہونے کے ناتے اس سے کسی قسم کی رعایت برتنا پسند نہ فرمایا تھا۔

یہ تھے بنی امیہ کے نویں خلیفہ ہشام بن عبد الملک جن کا شمار بنی امیہ کے بہترین خلفا میں ہوتا ہے۔ ہشام بن عبد الملک کا دورِ حکومت فتوحات کی کثرت اور مملکتِ اسلامیہ کی توسیع کے اعتبار سے یادگار ہے۔ ان کے تدبر، حسنِ انتظام اور درست و بروقت فیصلوں کے نتیجے میں اسلامی مملکت بلادِ شام سے برصغیر (پاک و ہند)، ایشیائے کوچک، اندلس، فرانس، سودان (موجودہ سینیگال اور مالی) اور صقلیہ (سسلی) تک وسیع ہو گئی۔ اتنی وسیع سلطنت کے مکمل اختیارات خلیفۃ المسلمین ہشام بن عبد الملک کے پاس تھے۔

ہشام ۷۲ھ / ۶۹۱ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام عائشہ بنت ہشام تھا۔ ہشام کا نام ان کے نانا کے نام پر رکھا گیا تھا۔

آٹھویں اموی خلیفہ یزید بن عبد الملک کے انتقال کے بعد ہشام نے رمضان المبارک ۱۰۵ھ / فروری ۷۲۴ء میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

ہشام بن عبد الملک نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد عراق کے والی (گورنر) کو تبدیل کر دیا۔ عراق کا صوبہ بے حد اہم تھا اور یہاں کا والی سب سے اہم اور گورنر جنرل تصور کیا جاتا تھا۔ تمام مشرقی علاقے اسی کے تحت ہوتے تھے اور ان علاقوں کے حکام بھی وہی مقرر کرتا تھا۔ ان علاقوں میں موجودہ ایران، افغانستان، ترکستان اور سندھ شامل تھے۔ ہشام نے جب اقتدار سنبھالا تو عمر بن ہبیرہ عراق کے والی تھے۔ ہشام نے ان کی جگہ خالد بن عبد اللہ القسری کو مقرر کر دیا۔ خالد القسری بڑے قابل، منتظم اور مدبر انسان تھے۔ وہ پندرہ برس تک عراق کے والی رہے۔ اس دوران انہوں نے عراق کو زرعی اور اقتصادی اعتبار سے نمایاں ترقی دی۔

Marfat.com

اسی زمانے میں خراسان، ترکستان، آرمینیا، آذربائیجان میں شدید بغاوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ خراسان کے والی مسلم بن سعید غیر مسلم ترکوں کی ایک شاخ 'خزر' سے برسرپیکار تھے۔ غیر مسلم ترکوں کے فرمانروا خاقان کے ساتھ سمرقند، بخارا اور سغد کے محاذوں پر کئی جنگیں ہوئیں۔ مسلمانوں کا بھی خاصا نقصان ہوا لیکن بالآخر کامیابی مسلمانوں ہی کو حاصل ہوئی۔ ۱۱۱ھ/۷۲۹ء سے ۱۱۶ھ/۷۳۴ء تک خراسان کی ولایت جنید بن عبدالرحمٰن کے پاس رہی۔ ان کے بعد عاصم بن عبداللہ والی بنائے گئے اور ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں نصر بن سیار جیسے جری، اولوالعزم اور منتظم امیر کا تقرر ہوا۔

نصر بن سیار نے حکمت اور تدبر سے کام لیا اور نرم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغاوتوں پر قابو پالیا۔ نومسلموں کے ساتھ سختی ختم کردی گئی اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہوا۔ اسی دوران نصر بن سیار نے ماوراَالنہر (دریائے جیحوں اور سیحوں کا درمیانی علاقہ) پر کئی سمتوں سے حملے کیے۔ ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں چاچ پر حملہ کیا، تاہم بعض شرائط پر صلح قبول کرلی۔ چاچ کے بعد وہ فرغانہ کی طرف بڑھے لیکن چند لڑائیوں کے بعد فرغانہ کے حاکم نے صلح کا ہاتھ بڑھادیا۔

ترک خزر اب بہت عاجز آچکے تھے۔ ان کے رہنما خاقان اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ وہ امن و سکون چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے چند گزارشات پیش کیں اور صلح کا پیغام دیا۔ نصر بن سیار نے اسے منظور کرلیا۔ اس طرح خراسان و ترکستان کے علاقوں میں امن قائم ہوگیا۔

ہشام کے عہد میں دوسرا محاذِ جنگ آرمینیا اور آذربائیجان کا علاقہ تھا جہاں آٹھ برس تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں مسلسل لڑائیوں کا آغاز ۱۱۱ھ/۷۲۹ء سے ہوا۔ خزر نے کئی حملے کیے جنہیں پسپا کردیا گیا۔ ۱۱۳ھ/۷۳۱ء میں ہشام نے یہاں اپنے بھائی مسلمہ کا تقرر کیا، انہوں نے خزر کے سارے علاقے میں فوج کشی کی اور کوہستان بلنجر کے پار کا علاقہ فتح ہوگیا۔ ہشام نے ۱۱۴ھ/۷۳۲ء میں اپنے چچازاد بھائی، مروان بن محمد کو ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی دے کر آرمینیا بھیجا۔ مروان بن محمد نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور داغستان سے گزرتے ہوئے خزر کے دارالحکومت بلنجر تک پہنچ گئے۔

مروان کے حملوں کی وجہ سے مملکتِ خزر کا دارالحکومت کئی سو میل شمال میں دریائے والگا کے کنارے آتل کے مقام پر منتقل کردیا گیا۔ ۱۲۱ھ/۷۳۹ء میں مروان نے بحیرۂ خزر کے ساحلی علاقے میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مطیع کرلیا جو ارغستان سے طبرستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مروان کی دلیرانہ کارروائیوں کی بدولت مسلمان فوج کاکیشیا سے آگے دریائے والگا کے دہانے تک جا پہنچی، تاہم کاکیشیا کے شمال میں کوئی پائیدار کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

ادھر ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) کے محاذ پر لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ یہاں بھی کئی اہم فتوحات حاصل ہوئیں۔ ۱۰۵ھ/۷۲۳ء میں مروان نے قونیہ اور کمخ تسخیر کیے۔ ۱۰۸ھ/۷۲۶ء میں مسلمہ بن عبدالملک نے قیساریہ کو فتح کیا۔ ۱۰۹ھ/۷۲۷ء میں معاویہ بن ہشام نے قلعہ طیبہ، ۱۱۰ھ/۷۲۸ء میں صملہ اور ۱۱۲ھ/۷۳۰ء میں خرشنہ کو فتح کیا۔ ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں مسلمہ نے مطمورہ پر قبضہ کرلیا۔

ہشام بن عبدالملک کے دور میں سندھ میں بھی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس زمانے میں سندھ کا صوبہ بہت وسیع تھا اور اس میں ملتان کے شمال مشرق سے جنوب میں کاٹھیاواڑ اور گجرات تک کے علاقے شامل تھے۔ ہشام نے ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں یہاں جنید بن عبدالرحمٰن کو امیر مقرر کیا۔ جنید بہت قابل اور اچھے منتظم تھے۔ انہوں نے کشمیر تک تقریباً وہ تمام علاقے فتح کرلیے جو اب پاکستان کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بھارت کے علاقے مارواڑ، اجین، کیرج، گجرات اور بھڑوچ تک کے علاقے کو فتح کرلیا۔ یہ ضرور ہے کہ بعد کے مسلمان امراَ ان فتوحات کو قائم نہ رکھ سکے۔

جنید نے سندھ کی امارت سنبھال کر دریائے سندھ کے کنارے پیش قدمی شروع کی۔ یہ راجا داہر کے لڑکے جے سنگھ کا علاقہ تھا (جے سنگھ کو جے سیہ بھی لکھا گیا ہے)۔ جے سنگھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا لیکن ہشام کے عہد میں جنید سے بدگمان ہو کر مرتد ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جے سنگھ اپنا بحری بیڑا لے کر مقابلے پر آگیا۔ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر مقابلہ ہوا جس میں جے سنگھ مارا گیا۔

کیرج (کھڑا) کا علاقہ محمد بن قاسمؒ کے دور میں فتح ہوچکا تھا لیکن اب یہ لوگ سرکشی اختیار کرچکے تھے۔ جنید نے کیرج کی فصیل کو قلعہ شکن آلات سے منہدم کروادیا اور کیرج پر قبضہ کرلیا۔ یہ علاقہ گجرات میں احمد آباد اور پنچ محل کے درمیان ضلع کا صدر مقام تھا۔ کیرج

Marfat.com

میں انتظامات درست کرنے کے بعد جنید نے گجرات، سوراشٹر، مدھیہ پردیش اور راجپوتانہ کے مختلف مقامات پر فوجی مہمات بھیجیں۔ یہ علاقے محمد بن قاسم کے دور میں فتح ہو چکے تھے لیکن اب انہوں نے بغاوت کی راہ اپنالی تھی۔

جنید نے کیرج کو اپنا مرکز بنایا تھا، یہ مقام گجرات، سوراشٹر، راجپوتانہ اور مدھیہ پردیش کے وسط میں ہے چنانچہ بہت موزوں ثابت ہوا۔ مہمات کامیاب رہیں۔ جنید نے گجرات، سوراشٹر اور راجپوتانہ کے مقامات مرید (مارواڑ)، مندل (مانڈل، ویراگام) اور بروص (بھڑوچ) میں حکام کا تقرر کیا۔ ایک مہم اجین روانہ کی۔ ایک فوج مالیہ (مالوہ) بھیجی۔ خود جنید نے بیلمان (بھیلمان) اور جزر (گوجر یا گجرات) کو فتح کیا۔

جنید نے سرزمین ہند کے ایک علاقے ارضِ چین کو بھی فتح کیا۔ خیال ہے کہ یہ علاقہ گجرات سے آگے مشرق میں کوکن کی طرف سے چین جاتے ہوئے راستے میں واقع تھا۔ یہ علاقہ چین کی ایک باج گزار ریاست تھا۔ یہاں ترک تاجروں کی آمدورفت رہتی تھی اور چینی باشندے بھی کثرت سے آباد تھے۔ جنید نے یہاں کے راجا کو اسلام کی دعوت دی تھی لیکن اس نے جنگ شروع کر دی تھی۔

جنید بن عبدالرحمٰن نے سندھ اور اطراف کے علاقوں میں ۱۰۶ھ تا ۱۱۱ھ / ۷۲۴ء تا ۷۲۹ء فرائض انجام دیے۔ یہ بڑا اچھا دور تھا، ہر طرف امن وامان ہو گیا تھا اور رعایا بہت خوشحال ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ جنید نے لاکھوں درہم مرکزی بیت المال کو روانہ کیے اور جب انہوں نے سندھ کو چھوڑا تو ان کے بیت المال میں ایک کروڑ اسی لاکھ ططری درہم موجود تھے۔ ایک ططری درہم خالص چاندی کے ڈیڑھ درہم کے برابر ہوتا تھا۔ ہندوستان کے راجا بھی مسلمانوں سے خوش تھے۔

جنید کے بعد تمیم بن زید قینی سندھ میں امیر بنائے گئے لیکن وہ صورتحال کو پوری طرح سنبھال نہ سکے۔ ان کے انتقال کے بعد حکم بن عوانہ الکلبی کو بھیجا گیا۔ حکم نے آکر امن وامان قائم کیا۔ حکم سندھ کی مہمات کے دوران محمد بن قاسمؒ سے تربیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ بڑے تجربہ کار، لائق اور بہادر سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی اور سیاسی امور کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ حکم بن عوانہ ۱۱۲ھ سے ۱۲۴ھ / ۷۳۰ء تا ۷۴۲ء تقریباً بارہ برس سندھ کے امیر رہے۔ اس دوران انہوں نے بہت سی فتوحات کیں۔ انتظامات درست کیے۔ عمدہ اصلاحات کیں اور دو نئے شہر محفوظہ اور منصورہ بسائے۔

حکم سے قبل تمیم بن زید کے دور میں بغاوتوں کی وجہ سے بعض مفتوحہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے اور بغاوتوں نے سر ابھار لیا تھا، چنانچہ حکم نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہند کی سرحد کے قریب ایک خلیج کی جنوبی سمت ایک نیا شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اس خلیج کو مؤرخ بلاذری نے "بحیرہ" کا نام دیا ہے۔ حکم نے اس شہر کا نام "المحفوظہ" رکھا۔ ان کے پیشِ نظر فوجی اور دفاعی اہمیت کا شہر بسانا تھا تاکہ مسلمان یہاں محفوظ رہ سکیں اور کسی شورش کی صورت میں اسے مرکز بنا کر دیگر علاقوں میں کارروائی کی جا سکے۔

حکم بن عوانہ کو خوش قسمتی سے محمد بن قاسمؒ کے فرزند عمرو بن محمد کی رفاقت میسر آگئی تھی جو بڑے دلیر اور جنگ آزما سالار تھے۔ محفوظہ کو مرکز بنا کر حکم نے عمرو بن محمد کی قیادت میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متعدد فوجی مہمات روانہ کیں۔ جب عمرو فتح و ظفر کے پھریرے لہراتے واپس آئے تو حکم نے انہیں حکم دیا کہ اب وہ بحیرہ (خلیج) کی شمالی سمت ایک اور شہر آباد کریں۔ جب یہ شہر تعمیر ہو گیا تو حکم نے مسلمانوں کی حالیہ فتوحات کے پیشِ نظر نئے شہر کا نام منصورہ (فتح مند) رکھا۔

حکم نے اس شہر کو بہت ترقی دی اور بعد کے ادوار میں یہی شہر سندھ کا دارالحکومت بنا رہا۔ اس عظیم تاریخی شہر کے کھنڈرات آج بھی سندھ کے ضلع سانگھڑ میں شہر سنجھورہ سے تقریباً سات میل جنوب میں اور شہداد پور سے تقریباً سات میل مشرق میں واقع ہیں۔ یہ شہر ایک قدیم شہر برہمن آباد سے دو فرسخ (چھ میل) کے فاصلے پر آباد کیا گیا۔ اس زمانے میں دریائے مہران (سندھ) کا پانی برہمن آباد کے قریب دریائے جلوالی کی گزرگاہ سے بہتا تھا۔ دریائے جلوالی برہمن آباد کے نزدیک مشرق کی طرف سے بہتا تھا۔ جس جگہ منصورہ آباد کیا گیا وہاں ببول کے گھنے جنگلات تھے، جنہیں کاٹ کر شہر بسایا گیا۔ حاصل ہونے والی لکڑی اینٹیں پکانے کے لیے استعمال کی گئی۔ منصورہ شہر پکی اینٹوں سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کا ثبوت شہر کے کھنڈرات ہیں۔

منصورہ کی آبادکاری کا عرصہ ۱۱۵-۱۱۶ھ / ۷۳۳-۷۳۴ء کے آس پاس متعین کیا گیا ہے۔ برطانوی عجائب گھر (برٹش میوزیم) میں تانبے کا ایک سکہ محفوظ ہے جو ۱۱۶ھ / ۷۳۴ء میں منصورہ میں ڈھالا گیا تھا۔

Marfat.com

منصورہ چونکہ برہمن آباد کے قریب بسایا گیا تھا اس لیے بعض مؤرخین نے اسے نیا برہمن آباد بھی کہا، لیکن تیسری صدی ہجری کے آخر میں دریائے جلوالی کی گزرگاہ خشک ہو گئی اور مہران نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا چنانچہ منصورہ ایک زرخیز علاقہ بن گیا اور پرانا برہمن آباد ویران ہو گیا۔ دریائے جلوالی کی گزرگاہ کے آثار شہر جھول، ضلع سانگھڑ سے دو میل مغرب میں نظر آتے ہیں۔

پرانے برہمن آباد کے ویران ہو جانے کے بعد منصورہ ہی برہمن آباد کہلانے لگا۔ اگرچہ سرکاری کاغذات میں اس کا نام منصورہ ہی تھا اور عباسی دور میں بھی جو والی (گورنر) متعین ہوئے وہ منصورہ ہی میں متعین ہوئے، تاہم ایک طویل عرصے تک شاداب اور آباد رہنے کے بعد یہ شہر اجڑ گیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں اس شہر کی دارالحکومت کی حیثیت ختم ہو گئی اور حکام کے یہاں سے چلے جانے سے اس کی اہمیت متاثر ہوئی۔ دوسرے یہ کہ دریائے مہران (سندھ) نے اپنا راستہ بدل لیا جس کی وجہ سے منصورہ سے متصل مشرقی نالہ خشک ہو گیا۔ زلزلے سے تباہی کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال منصورہ پانچ سو برسوں تک ایک بڑے اور خوشحال شہر کے طور پر قائم رہا اور اس شہر نے سندھ میں علمی، تہذیبی، تمدنی، تعمیراتی اور زراعتی و تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ اس شہر کے مدارس سے فارغ ہونے والے علما نے دیبل، سیہون، بکھر، ملتان اور دیگر متعدد شہروں کو علمی مراکز بنا دیا۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد کی فوجی مہمات میں سب سے اہم مہم فرانس پر فوج کشی ہے۔ اندلس تو ولید بن عبدالملک ہی کے زمانے میں (۸۶ھ تا ۹۶ھ / ۷۰۸ء تا ۷۱۵ء) فتح ہو چکا تھا اور اس کے بعد مسلمان جبل البرانس کو پار کر کے سرزمین فرانس میں اربونہ اور حصن لودون تک پہنچ گئے تھے لیکن اس کے بعد مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں امیر سمح نے جنوبی فرانس کے علاقے نربونہ (ناربن) کو مطیع کیا۔

امیر سمح کی شہادت کے بعد خلیفہ ہشام کے عہد میں امیر عنبسہ بن سحیم، اندلس کے والی بنائے گئے۔ انہوں نے ۱۰۷ھ / ۷۲۵ء میں جبل البرانس کو عبور کر کے قرقشونہ اور سپٹی مینیا کو فتح کر لیا۔ اب عنبسہ اندرونِ فرانس کی سمت بڑھے اور دریائے رودنہ (رون) کی وادی کے پورے علاقے کو تسخیر کرتے ہوئے لیانس، برگنڈی اور اوٹن کو فتح کر لیا۔ اس سے آگے دیہاتیوں کے ایک جتھے سے جھڑپ میں امیر عنبسہ زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔

سنہ ۱۱۳ھ / ۷۳۱ء میں امیر عبدالرحمٰن غافقی کو اندلس کا والی مقرر کیا گیا۔ بعض روایات کے مطابق ان کا تقرر ۱۱۳ھ / ۷۳۰ء کے آغاز میں ہو گیا تھا۔ وہ تابعین میں سے تھے اور بہت اولوالعزم اور جری رہنما تھے۔ انہوں نے اندلس میں تمام انتظامی خرابیوں کو دور کر دیا۔ اس کے بعد وہ فوجی مہمات کی طرف متوجہ ہوئے۔

اسلامی فوجیں جبل البرانس کو سر کر کے فرانس کے میدانی علاقے میں داخل ہوئیں۔ فرانس کی ایک ریاست ایکوائینیا کے ڈیوک سے پہاڑ کے دامن میں مقابلہ ہوا جس میں ڈیوک کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن غافقی دریائے گاران کی سرسبز وادی سے گزرتے ہوئے بوردو کی بندرگاہ پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے دریائے ڈاردون پہ لڑائی کے بعد پواتیے (پوئٹرز) پر اسلامی پرچم لہرایا۔

مسلمانوں کی ان پے در پے فتوحات سے مسیحی اضطراب میں تھے۔ ڈیوک آف ایکوائینیا نے دہائی دے کر اپنے حلیفوں ہی نہیں اپنے حریف چارلس مارٹل کو بھی پکارا۔ چارلس مارٹل جرمنی کے شاہی دیوان کے ناظم تھے۔ انہیں بھی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی یہ مسلسل پیش قدمی خود ان کی حکومت کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اور غفلت برتی گئی تو مسلمان سارے یورپ پر قابض ہو جائیں گے۔ چنانچہ چارلس مارٹل نے بھی اپنے تمام امرا کو آواز دی اور ان کی پکار پر جرمنی، فرانس اور پرتگال کے امرا فوجیں لے کر آ گئے۔

اس وقت تک مسلمانوں کی فوجیں فرانس کے مقام طلوشہ (ٹورس) کے قریب پہنچ چکی تھیں، جو پیرس سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ طلوشہ اور پواتیے (ٹورس اور پوئٹرز) کے درمیان ایک میدان میں فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ رمضان ۱۱۴ھ / اکتوبر ۷۳۲ء کا مہینہ تھا۔ مسیحی فوج طاقت میں مسلمانوں کی فوج سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود چارلس مارٹل نے ایک ہفتے تک مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کی۔ آخر امیر عبدالرحمٰن غافقی نے خود ہی پہل کر دی۔ صبح سے شام تک خونریز لڑائی ہوئی۔ دوسرے دن سہ پہر تک شدید جنگ ہوئی۔ اس کے بعد ڈیوک آف ایکوائینیا نے ایک تازہ دم فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ مسلمان اس شدید حملے کی تاب نہ لا سکے۔ امیر عبدالرحمٰن

Marfat.com

دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور بے حد زخمی ہو کر مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

رات میں مسلمان فوجی افسران نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ سپہ سالار کی شہادت کے بعد نئے انتظامات کیے بغیر لڑائی جاری رکھنا بہتر نہ ہوگا کیونکہ امیر عبدالرحمٰن اندلس کے والی بھی تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج رات کی تاریکی میں خاموشی سے پسپا ہو کر سپٹی مینیا تک آگئی۔ چارلس پر مسلمانوں کا اتنا خوف طاری تھا کہ اس نے مسلمانوں کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ کی۔ اس جنگ کو مسلمان "بلاط الشہدا" یعنی "شہیدوں کی اونچی سڑک" کہتے ہیں کیونکہ اس جنگ میں بڑے بڑے نامور مسلمان شہید ہوئے۔ اگر مسلمان اس جنگ میں کامیاب ہو جاتے تو شاید پورے مغربی یورپ کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

ہشام بن عبدالملک کو مسلمانوں کی پسپائی کی اطلاع ملی تو انہوں نے عبدالملک بن خطن کو اندلس کا والی بنا کر بھیجا۔ انہوں نے شمالی اندلس کی بغاوتوں پر قابو پانے کے بعد فرانس کے شہر اوگنون کو فتح کیا۔ پھر ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں عقبہ کو اندلس کا والی بنایا گیا۔ انہوں نے اندلس کو بڑی ترقی دی۔ انہوں نے اپنے پانچ سالہ دور میں فرانس پر متعدد حملے کیے۔ سینگوڈوک سے لے کر دریائے سون تک چھوٹی چھوٹی حفاظتی چھاؤنیاں تعمیر کروائیں، جنہیں "رباط" کہتے ہیں۔ ناربون میں بہت بڑا قلعہ تعمیر کروایا۔ مشرق میں پیدمونت فتح ہو چکا تھا۔ مسلمان اب ڈفنی میں داخل ہوئے حتیٰ کہ برگنڈی جا پہنچے، یہاں تک کہ اسلامی فوجیں فرانس کے دارالحکومت کے قریب پہنچ گئیں۔

چارلس نے اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ہر طرف سے حملہ کر دیا اور اوگنون چھین لیا، پھر ناربون کا محاصرہ کیا اور شکست کھائی تاہم خود مسلمان امرا کی باہمی چپقلش کی وجہ سے مسلمان زیادہ پیش قدمی نہ کر سکے۔ البتہ عقبہ کے دور میں سرحدی صوبے کے دارالحکومت بلبلونہ، اس سے ملحق صوبہ البہ اور اندلس کے شمال مغربی صوبہ جلیقیہ کو زیر نگیں کیا گیا۔

افریقہ کے والی امیر عبیداللہ بن حجاب (۱۱۶ھ تا ۱۲۳ھ/۷۳۴ء تا ۷۴۱ء) نے اندلس کے علاوہ ماتحت علاقوں میں نئے انتظامات کیے۔ ان انتظامات کے نتیجے میں ہشام بن عبدالملک کی حکومت کو مزید وسعت حاصل ہوئی۔ مراکش کے شہر طنجہ میں عمر بن عبیداللہ المرادی کو مقرر کیا گیا۔ حبیب بن ابی عبیدہ الفہری کو مغرب کی مہم سپرد کی گئی۔ اسلامی لشکر، مراکش کے جنوب میں صحرائے اعظم کو پار کر کے اس علاقے میں داخل ہو گیا جو آج کل سینیگال اور مالی کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ اس زمانے میں سودان کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں سیاہ فام باشندے آباد تھے چنانچہ عرب اس علاقے کو "سودان" یعنی "کالے رنگ کے لوگوں کی سرزمین" کہتے تھے۔ مسلمانوں نے سودان میں بہت سا سونا اور مال غنیمت حاصل کیا۔ مراکش کے انتہائی جنوبی حصے سوس اقصیٰ کو بھی اسلامی مملکت کا حصہ بنایا گیا اور یہاں کے بہت سے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔

امیر عبیداللہ ابن حجاب نے جہاز سازی کے نئے کارخانے بھی قائم کیے اور بحری بیڑے کو ترقی دی۔ ۱۲۲ھ/۷۴۰ء میں انہوں نے حبیب بن ابی عبیدہ کو صقلیہ (سسلی) کی مہم پر روانہ کیا۔ اسلامی فوج کا بحری بیڑا صقلیہ کے دارالحکومت سرقوسہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ حبیب کے صاحب زادے عبدالرحمٰن نے رومیوں کو شکست دے کر سرقوسہ کا محاصرہ کر لیا اور اہل شہر نے اطاعت پر آمادگی ظاہر کر دی۔

اسی دوران شمالی افریقہ میں بربروں نے بغاوت کر دی اور طنجہ پر حملہ کر دیا۔ اسلامی فوج کا بیشتر حصہ صقلیہ میں مصروف تھا چنانچہ باغیوں کو کامیابی ہوئی۔ خلیفہ ہشام کو اطلاع ملی تو انہوں نے ابن حجاب کی جگہ کلثوم بن عیاض کو افریقہ کا والی مقرر کیا اور تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوجی کمک بھیجی۔ کلثوم نے ۱۲۳ھ/۷۴۰ء میں بقدورہ کے مقام پر باغیوں سے مقابلہ کیا لیکن اسلامی لشکر کو شکست ہوئی۔ کلثوم اور کئی نامور رہنما جاں بحق ہوئے۔ ہشام بن عبدالملک نے شدید برہم ہو کر حنظلہ بن صفوان کلبی کو افریقہ کا والی بنا کر بھیجا۔

حنظلہ صفر ۱۲۴ھ/دسمبر ۷۴۱ء میں افریقیہ پہنچے۔ (افریقیہ دراصل بربرستان کے مشرقی حصے کا عربی نام ہے۔ بعد میں اس نام کا اطلاق پورے براعظم افریقہ پر ہونے لگا۔ افریقیہ کی حدود مشرق میں برقہ اور مغرب میں طنجہ تک تھیں۔ اس کا دارالحکومت قیروان تھا۔ بعد کے مؤرخین افریقیہ سے مراد صرف تونس [تیونس] قیروان کا علاقہ لینے لگے)۔ حنظلہ نے مزید حملے کر کے القرن کے مقام پر باغیوں کو شکست فاش دی۔ جنگ میں دو لاکھ بربری کام آئے۔ اس کے بعد شمالی افریقہ میں بغاوتوں کا زور ٹوٹ گیا۔ ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں حنظلہ، حکومت عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری کے سپرد کر کے دارالحکومت واپس چلے گئے۔

Marfat.com

ان بغاوتوں کا اثر اندلس پر بھی پڑا اور وہاں بھی متعدد بغاوتیں ہوئیں۔ آخر ہشام نے ابو الخطا کو اندلس کا والی بنا کر بھیجا، تاہم شورشیں جاری رہیں۔ بالآخر ہشام کے پوتے عبدالرحمٰن الداخل نے ۱۳۸ھ/۷۵۵ء میں اندلس میں بنی امیہ کی حکومت قائم کر لی جو ۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء تک قائم رہی۔

ہشام کا عہد انتظامی لحاظ سے بے حد مستحکم تھا۔ دفاتر اور دواوین کی ترتیب کے لحاظ سے ان کا عہد تمام خلفا میں ممتاز تھا۔

ہر صوبے کا اپنا بیت المال تھا جس میں تمام آمدنی جمع ہوتی تھی۔ صوبائی حکومت کے اخراجات کی رقم منہا کر کے باقی رقم مرکزی بیت المال کو بھیج دی جاتی تھی۔ صوبائی بیت المال کے افسر کو صاحب الخراج کہتے تھے۔ اس کا تقرر یا تنزل براہِ راست خلیفہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ قاضیوں کا تقرر صوبوں کے والی کرتے تھے۔ ہشام نے اپنے دور میں مردم شماری بھی کروائی تھی۔

ہشام کے عہد میں فوجی انتظامات بھی بہت اچھے تھے۔ بصرہ، کوفہ، واسط، قیروان کے علاوہ تمام سرحدی علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں۔ شام اور روم کی سرحدوں پر فوج مستقلاً موجود رہتی تھی۔ روم کی سرحد پر کئی قلعے بنوائے جن میں حصن قطرغاش، حصن بورہ اور حصن بونا قابلِ ذکر ہیں۔ فوج کا سب سے چھوٹا افسر امیر العشرہ یا عارف کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت دس سپاہی ہوتے تھے۔ اس سے اوپر نائب کا عہدہ تھا۔ اس کے تحت دس عارف اور سو سپاہی ہوتے تھے۔ دس نائبوں پر ایک "قائد" متعین ہوتا تھا اور قائد سے اوپر امیر کا عہدہ تھا جس کے تحت دس ہزار سپاہی ہوتے تھے۔ امیر سے اوپر سپہ سالار کا عہدہ تھا۔ ہشام کے عہد میں شمالی افریقہ میں جہاز سازی کے نئے کارخانے قائم کیے گئے تھے۔ ہشام کو گھوڑوں کی پرورش سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کے اپنے پاس چار ہزار منتخب گھوڑے موجود تھے۔

ہشام ایک علم دوست حکمراں تھے۔ انہوں نے امام زہریؒ (۵۰ھ تا ۱۲۴ھ/ ۶۷۰ء تا ۷۴۲ء) سے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجموعہ مرتب کروایا تھا۔ امام زہریؒ نے مدینہ منورہ کے ایک ایک گھر میں جا کر خواتین اور مردوں سے احادیثِ نبویؐ حاصل کی تھیں۔ ہشام نے ایرانیوں کے بہت سے علوم و فنون، ان کے فرمانرواؤں کے حالات اور سیاسی واقعات پر مشتمل فارسی زبان کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ بھی کروایا تھا۔ یہ کتاب باتصویر تھی۔ ہشام، امام زہریؒ اور ابوزنادؒ جیسے نامور محدثین کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ امام زہریؒ کئی کتب کے مصنف تھے۔ ان کے فتوے تین جلدوں میں مرتب کیے گئے تھے۔ ہشام کی حکومت سے ابرش الکلبی اور ان کے لائق شاگرد عبدالحمید بن یحییٰ وابستہ تھے۔ عبدالحمید بن یحییٰ عربوں میں وہ پہلے شخص خیال کیے جاتے ہیں جو فنِ انشا، یعنی دستاویز نویسی کے فن میں شہرۂ آفاق ہوئے۔

ہشام کا دور تابعین کا دور تھا۔ ان کے دورِ حکومت میں بعض نامور تابعین نے انتقال کیا۔ ان میں حضرت حسن بصریؒ (۲۰ھ تا ۱۱۰ھ/ ۶۴۱ء تا ۷۲۸ء) تصوف کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ حضرت قتادہؒ (۶۱ھ تا ۱۱۷ھ/ ۶۸۰ء تا ۷۳۵ء) تھے جو تفسیر و حدیث کے علاوہ لغت، ایام عرب اور انساب کے ماہر تھے۔ حضرت مکحولؒ تھے جن کا انتقال ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں ہوا۔ وہ فقہ کی اولین کتابوں کے مصنف تھے۔ اسی طرح حضرت یزیدؒ بن حبیب (۵۳ھ تا ۱۱۸ھ/ ۶۷۳ء تا ۷۳۶ء) تھے جو مصر کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ وہ شرعی علوم کے علاوہ تاریخ مصر کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی قرأت کی بنیاد جن سات قاریوں پر ہے ان میں سے دو کا انتقال ہشام کے دور میں ہوا۔ یہ حضرات مکہ مکرمہ کے ابوسعید عبداللہ (وفات: ۱۲۰ھ/۷۳۸ء) اور دمشق کے ابو عمران عبداللہ (وفات: ۱۱۸ھ/۷۳۶ء) تھے۔ اس دور میں ہمامؒ بن منبہ (۴۰ھ تا ۱۳۱ھ/ ۶۶۰ء تا ۷۴۸ء) تھے جنہوں نے صحیفہ ہمام کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ وہب بن منبہ (وفات: ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) نے یمن کے سلاطینِ حمیر کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔

ہشام ہی کے عہد میں سندھ میں تصنیف و تالیف اور تحقیق کا کام بھی شروع ہوا۔ جب منصورہ آباد کیا گیا اور مسلمانوں کی حکومت یہاں مستحکم ہو گئی تو مقامی زبان سندھی جاننے کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ سندھی کو عربی رسم الخط میں لکھا گیا اور سندھ میں جتنی بولیاں اور زبانیں رائج تھیں ان میں عربی آمیز سندھی کو منصورہ میں معیاری زبان قرار دیا گیا۔ مقامی لغات کے علاوہ مقامی طب کی کتب کا مطالعہ بھی کیا گیا۔

علم نجوم کی کتب کے سنسکرت سے عربی میں تراجم کا سلسلہ تو منصورہ کی تعمیر سے قبل سے شروع ہو گیا تھا۔ ۱۱۷ھ/۷۳۵ء میں قبیلے بنو فزارہ کے عالم ابراہیم بن حبیب الفزاری نے منصورہ میں مقامی اور

Marfat.com

بھیلمان (بیلمان) کے عالموں کی وساطت سے برہم گپتا کی کتاب "کرن کھنڈر کھادیک" کا عربی میں ترجمہ "الارکند" کے نام سے کیا۔ اس کے بعد اسی مصنف کی دوسری کتاب "برہم سدھانت" کا ترجمہ "سند ھند" کے نام سے کیا گیا۔ منصورہ میں تراجم کا یہ سلسلہ بغداد کی تعمیر سے تقریباً تیس سال قبل اور مامون الرشید کے بیت الحکمت کے قیام سے تقریباً اسّی سال قبل شروع ہو چکا تھا۔ بغداد میں سنسکرت کی کتب کے مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں منصورہ ہی سے رجوع کیا جاتا تھا۔

ہشام نے زمینوں کی آبادکاری پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے دور میں سندھ میں منصورہ، محفوظہ، وسط ایشیا میں بلخ اور شام میں رصافہ کے شہر اور دیگر کئی شہر آباد کیے گئے۔ منصورہ اپنی تعمیراتی ترقی اور عمدہ سہولتوں کے لحاظ سے بے حد ممتاز تھا، چنانچہ اس کے وسیع اور شاندار کھنڈر اس کی عظمتِ رفتہ کی کہانی تقریباً تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی سنا رہے ہیں۔ اس کی مضبوط فصیل، اس میں پانی کی نکاسی کی پکی نالیوں، جامع مسجد کی وسیع بنیادوں، شاہی مینار، وسط شہر کی عمارتوں کی غیر معمولی بنیادوں اور کشادہ شاہراہوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ مختلف اطراف سے تجارتی شاہراہیں اسی شہر پر آکر ختم ہوتی تھیں۔ یہاں آب پاشی کا ایک ترقی یافتہ نظام بھی موجود تھا۔

بلخ بہت قدیم اور مشہور شہر ہے۔ اس کے آثار افغانستان میں مزار شریف کے قریب آج بھی موجود ہیں۔ اس شاندار شہر کو ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں خراسان کے والی اسد بن عبداللہ نے تعمیر کروایا تھا اور اپنی فوجوں اور صوبائی حکومت کے دفاتر کو مرو سے بلخ منتقل کر دیا تھا۔ اس شہر کی تعمیر کی ذمہ داری انہوں نے برامکہ کے سپرد کی تھی جو بعد میں عباسی دور میں بڑے ممتاز رہے۔

"رصافہ" شام کا ایک صحرائی شہر تھا جو دریائے فرات سے جنوب میں چار فرسخ (بارہ میل) کے فاصلے واقع تھا۔ اسے "رصافہ الشام" یا "رصافہ ہشام" کہا جاتا تھا۔ مؤرخین کے مطابق ہشام نے شام میں کئی شہر تعمیر کروائے تھے جن میں سے بعض حال کی کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ تدمر کے مغرب میں قصر الحیر کے دو عظیم الشان محل ہشام ہی نے تعمیر کروائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قصر الحیر الشرقی ہی دراصل رصافہ ہشام ہے۔ قصر الحیر الغربی میں کھدائی کے دوران آرائش وزیبائش کے نمونوں میں ہشام کی تصویر بھی برآمد ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ قصر الملح، خربۃ المفجر اور قصر الطوبیٰ ان ہی کی یادگاریں ہیں۔ ماضی قریب میں شرقِ اردن میں جتنی عمارتیں اور کھنڈر کھدائی کے بعد برآمد ہوئے ہیں ان کے کتبات یا نقش و نگار کی علامات سے پتا چلتا ہے کہ ان کا تعلق ہشام کی ذات یا ان کے عہدِ حکومت سے ہے۔

قصر الحیر الغربی، ہشام نے ۱۰۹ھ/۷۲۷ء کے قریب تعمیر کیا۔ اس کے لیے انہوں نے تدمر سے چالیس میل مغرب میں ایک ٹیلے کو منتخب کیا۔ قصر الحیر الغربی کی کھدائی سے پتا چلا ہے کہ اس میں گچ کے عمدہ نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ دروازے بہت بڑے تھے۔ دریچوں کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔ اسی قصر کی تعمیر سے مسلمانوں کی تعمیرات میں فصیل کے تاب دان (روشن دان) بنانے کی روایت پڑی۔ دو سال بعد ہشام نے قصر الحیر الشرقی کے نام سے ایک اور محل تعمیر کروایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شہر بھی بسایا۔ محل کی فصیل پتھر کی تھی جس میں بارہ گول برج تھے۔ ان کی بلندی کم از کم ۱۴ میٹر تھی۔ محل کی ایک دیوار کی لمبائی ۷۱ میٹر تھی۔

اریحا سے چار میل شمال میں خربۃ المفجر کے مقام پر ہشام کا ایک اور محل کھدائی کے نتیجے میں برآمد ہوا ہے۔ اس محل میں اتنی خوبصورت پچی کاری ہے کہ فلسطین میں کسی اور عمارت میں ایسی دریافت نہیں ہوئی۔ زینے عمدہ اور فراخ تھے۔ ہندسی اشکال سے مزین چوکے (ٹائلز)، دریچوں کی جھلملیاں ملی ہیں اور یکساں رنگ کے مکعبی پتھروں کو جوڑ کر شاندار محرابی بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔

خربۃ المنیۃ ایک اور عمارت تھی۔ وہاں کھدائی سے کئی ایوان اور صحن برآمد ہوئے ہیں جن کے فرشوں پر پچی کاری کا کام ہے اور ان پر جالی دار نقش و نگار اور آرائشی نمونے بنے ہوئے ہیں۔ پچی کاری (موزیک) کا یہ کام "فسیفسا" کہلاتا تھا۔ ان تمام آثارِ قدیمہ کے نمونے دمشق اور بیت المقدس کے عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

ہشام کے عہد میں ریشمی کپڑوں نیز ململ، قلمکار اور تن زیب کی صنعت کو بھی ترقی دی گئی۔ اس زمانے میں والیٔ عراق خالد القسری نے سکہ سازی کی صنعت کو نہایت منظم و مستحکم کر دیا۔ ان کے بعد یوسف بن عمر، والی بنے۔ انہوں نے بھی سکہ سازی کا عمدہ انتظام کیا۔ واسط اور دمشق میں ٹکسالیں تھیں۔ سکوں پر کسی خلیفہ کا نام نہیں ہوتا تھا صرف تاریخ اجرا تحریر ہوتی تھی۔

ہشام عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ فرائض کی پابندی کرتے تھے اور اپنی اولاد سے بھی فرائض کی پابندی کرواتے

Marfat.com

تھے۔ ان کے دور میں اسلام کی دعوت وسیع بنیادوں پر پھیلائی گئی خصوصاً وسط ایشیا، برصغیر (پاک و ہند) میں لوگوں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ ہشام دین میں بدعتوں کے سخت خلاف تھے۔

ہشام اپنی حکومت کے آمدنی کے ذرائع کے معاملے میں بھی بہت احتیاط کرتے تھے اور حلال و حرام کا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک کسی جگہ سے آنے والے محصول کے بارے میں چالیس افراد شہادت نہ دے دیں کہ یہ آمدنی جائز ہے، اس وقت تک اسے بیت المال میں داخل نہ کیا جائے۔ ہشام بن عبد الملک کفایت شعار بھی تھے اور اتنی بڑی مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود ان کے پاس ذاتی استعمال کے ملبوسات بہت کم تھے۔ وہ ایک ہی لباس طویل عرصے تک استعمال کرتے تھے۔

ہشام بن عبد الملک بے حد باصلاحیت اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں تدبر، معاملہ فہمی، بیدار مغزی، اولوالعزمی، حوصلہ مندی کے ساتھ ساتھ خوش انتظامی، کفایت شعاری اور نرم مزاجی کے اوصاف پائے جاتے تھے۔ اتنی وسیع مملکت کا انتظام انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا اور بے شمار جنگوں اور بغاوتوں کے باوجود اسلامی ریاست کی سالمیت اور مرکزیت پر آنچ نہ آنے دی۔ انہوں نے مشرق میں غیر مسلم ترکوں (خزر) اور تاتاریوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ مغرب میں بربروں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی اور مملکت کو بے پناہ وسعت دی۔

ہشام کا انتقال ۶ ربیع الثانی ۱۲۵ھ / ۶ فروری ۷۴۳ء کو خناق کے مرض کے باعث ہوا۔ انہیں رصافہ ہشام میں سپرد خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

ابو جعفر منصور

مسلمانوں کے ایک عہدِ درخشاں کے بانی، بنو عباس کے دوسرے خلیفہ

مدینہ کی عدالت تھی!

محمد بن عمران طلحی جج کی مسند پر تشریف فرما تھے۔ مقدمات کی کارروائی جاری تھی۔ گواہیاں پیش ہو رہی تھیں۔ جرح کا سلسلہ چل رہا تھا اس اثنا میں چند اونٹ والے عدالت میں داخل ہوئے، ان کا آپس میں یا اپنے ہم پیشہ افراد کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ وہ خلیفۂ وقت کے خلاف ایک دعویٰ لے کر آئے تھے۔

جج صاحب نے دعویٰ سنا پھر اپنے پیش کار نمیر مدنی کو حکم دیا کہ وہ مدعا علیہ یعنی امیر المومنین کے نام عدالت میں طلبی کا پروانہ (سمن) جاری کر دیں تا کہ مدعا علیہ کو صفائی کا موقع دیا جائے اور اس کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

پیش کار عجب شش و پنج میں پڑ گئے۔ امیر المومنین کے نام پروانہ جاری کرتے ہیں تو خدشہ ہے کہیں امیر المومنین ناراض نہ ہو جائیں، پروانہ جاری کرنے سے انکار کرتے ہیں تو جج صاحب کے خفا ہونے کا اندیشہ ہے۔ نمیر مدنی نے کچھ جھجکتے ہوئے معذرت کی لیکن جج صاحب نے پھر حکم دیا کہ امیر المومنین کے نام پروانہ جاری کر دیا جائے، چنانچہ پروانہ تیار ہو گیا۔ اس پر عدالت کی مہر ثبت کر دی گئی اور پیش کار پروانہ لے کر خلیفۂ وقت کے پاس پہنچ گئے۔ نمیر مدنی کہتے ہیں کہ خلیفہ نے اپنے دربار میں مجھ سے پروانہ لے کر پڑھا تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ "کوئی میرے ساتھ نہ آئے۔ مجھے عدالت میں طلب کیا گیا ہے۔"

خلیفۃ المسلمین مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے۔ اونٹ والے مدعیان بھی موجود تھے۔ حالت یہ تھی کہ نہ تو جج اور نہ کمرۂ عدالت میں موجود کوئی بھی شخص، امیر المومنین کی تعظیم کے لیے اٹھا۔ اس وقت وہ مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں جج کے روبرو پیش ہوئے تھے۔ کاشغر سے بحرِ ظلمات تک پھیلی ہوئی عظیم مملکتِ اسلامیہ کا حکمران اس عدالت کے کٹہرے میں یکہ و تنہا کھڑا تھا، اس کے پاس خدام کی بھیڑ نہ تھی۔

مقدمہ پیش ہوا۔ ثبوت مانگے گئے۔ جج نے گواہیاں سنیں۔ سوال و جواب ہوئے اور بالآخر جج نے فیصلہ دے دیا۔

فیصلہ امیر المومنین کے خلاف ہوا تھا۔

یہ اسلام کا اعجاز ہے جس نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرایا ہے۔ عزت والا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ امیر المومنین نے فیصلہ سنا تو انہوں نے جج سے کہا، "اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ مذہبی احکام اور حقوق کی پوری تعمیل کرتے ہیں، اس سلسلے میں آپ کو دس ہزار اشرفیاں بطور انعام پیش کرتا ہوں۔"

یہ خلیفہ تھے ابو جعفر منصور۔ بنو عباس کے دوسرے خلیفہ جنہوں نے بائیس سال سے زیادہ عرصے تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کی اور اپنی حکمت و تدبر سے کام لیتے ہوئے بہت سے کارنامے انجام دیے۔ عباسی دور حکومت جو تقریباً پانچ سو سال کے عرصے پر محیط ہے، اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن، شاندار اور ارتقائی عہد ہے۔ اس پورے دور میں محض اندرونی طور پر ہی دور رس تبدیلیاں نہیں آئیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کے اثرات نہایت ہمہ گیر اور وسعت پذیر تھے۔ اسلامی حکومت کے ان اثرات کو ہمہ گیری اور وسعت عطا کرنے میں خلیفہ ابو جعفر منصور کا بڑا ہاتھ ہے۔

ابو جعفر منصور کا پورا نام ابو جعفر عبداللہ بن محمد ہے۔ منصور ان کا لقب ہے۔ ۹۵ھ / ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ سلامہ نہایت متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں، والد امام محمد بن علیؒ تابعی تھے۔ منصور نے ابو العباس عبداللہ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۶ھ / جون ۷۵۴ء میں

Marfat.com

خلافت کی ذمہ داری سنبھالی، اس وقت ان کی عمر ۴۱ سال تھی۔ اس سے قبل وہ آرمینیا، آذربائیجان اور عراق کے والی رہ چکے تھے۔

تمام مورخین ابو جعفر منصور کے کمالات کے معترف ہیں۔ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ منصور، ہیبت و شجاعت، اصابت رائے، اور سطوت کے لحاظ سے بنو عباس کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ مسعودی کے مطابق، منصور خوبیِ تدبیر اور حسنِ سیاست کی معراج پر پہنچے ہوئے تھے۔ ابن طقطقی کا خیال ہے کہ منصور، عقل و دانش، علم، حسنِ تدبیر اور وقار و تمکنت کے لحاظ سے دنیا کے عظیم حکمرانوں میں سے تھے۔

منصور کو علم سے بڑی دلچسپی تھی وہ خود بھی فقہ کے عالم تھے اور فصاحت و بلاغت اور شاعری سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ابن خلکان کے مطابق انہوں نے علم کے حصول کے لیے طویل سفر کیے، جہاں کسی محدث کے بارے میں سنتے ان کے پاس پہنچ جاتے اور علم حدیث حاصل کرتے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ منصور نے اپنے والد اور عطا ابن یسارؒ سے حدیث روایت کی۔ منصور زبردست خطیب بھی تھے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں، "منصور نے میرے ساتھ اوّلین دور کے علما اور بزرگوں کے بارے میں گفتگو شروع کی تو میں نے انہیں سب سے زیادہ علم والا پایا، فقہ اور دیگر علوم پر بات چھڑی تو وہ تمام مسائل کے بڑے عالم ثابت ہوئے، انہیں تمام روایتیں یاد تھیں۔" منصور نے اپنے بیٹے مہدی کو امام مالکؒ کے پاس مدینے بھیجا، مہدی نے امامؒ صاحب سے موطا پڑھی۔

منصور کے عہد سے پہلے رواج یہ تھا کہ علما کرام اپنی یادداشت کی مدد سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ خلیفہ منصور کے دور میں علم کو کتب کی صورت میں محفوظ کرنے کا باقاعدہ آغاز ہوا اور حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین اور ترتیب کا کام منظم انداز میں شروع کروایا گیا۔

ابن جریجؒ مکہ میں تھے۔ مدینہ میں امام اوزاعیؒ تعلیم دے رہے تھے، بصرہ میں ابن ابی عروبہؒ اور حماد بن سلمہؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا اور کوفہ میں سفیان ثوریؒ علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ ۱۴۳ھ / ۷۶۰ء میں ان تمام علما کرام اور فقہا نے حدیث و فقہ اور تفسیر کو مرتب اور مدوّن کرنا شروع کر دیا۔ ابن اسحٰقؒ نے مغازی (جنگوں کے حالات اور غازیوں کے اوصاف) اور امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اور قیاس پر کتابیں تالیف کیں۔ کچھ عرصے بعد لیثؒ پھر ابن مبارکؒ، امام ابو یوسفؒ اور ابن وہبؒ نے اپنی تصنیفات پیش کیں۔ اس کے علاوہ ادب، تاریخ، لغت اور سیرت پر کئی کتابیں لکھی گئیں، اس طرح پوری اسلامی مملکت علم و ادب کا گہوارہ بن گئی۔ منصور نے سریانی اور دیگر زبانوں میں دستیاب کتب کے پہلی بار عربی ترجمے بھی کروائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قیصر روم سے بھی کہا کہ اہم علمی کتب کے عربی ترجمے کروا کے بھیجیں۔ قیصر نے کئی کتب کے ترجمے بھجوائے، اس طرح علم کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ منصور کے دور میں علم طب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ طبی کتب کے ترجمے ہوئے، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔

ایک بار کسی نے منصور سے پوچھا "آپؒ کی کوئی تمنا ہے؟" جواب ملا، "میری آرزو یہ ہے کہ ایک چبوترہ ہو اور اصحابِ حدیث میرے چاروں طرف موجود ہوں، جن سے میں احادیث نبویؐ سنتا رہوں اور اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔"

منصور کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ دن بھر امورِ مملکت انجام دیتے تھے، نمازِ عصر کے بعد کا وقت اہلِ خانہ کے ساتھ گزارتے تھے۔ رات میں پہلے سے طے شدہ ملاقاتیں ہوتیں۔ عشا کے بعد مختلف مقامات سے آئے ہوئے خطوط کا مطالعہ کرتے۔ کچھ دیر آرام کے بعد رات کے آخری پہر تہجد کے لیے کھڑے ہو جاتے اور نمازِ فجر تک اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے، نمازِ فجر کی خود امامت کرتے اور دن چڑھنے پر دربار میں آکر سرکاری کاموں میں منہمک ہو جاتے۔

منصور مملکت کے انتظامات کو خدا خوفی کے بھرپور جذبے کے ساتھ چلانے کے خواہشمند تھے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے، "میں چاہتا ہوں چار نہایت دیانت دار اور پاکباز آدمی میرے پاس ہوں۔" ایک بار لوگوں نے پوچھا، "وہ چار آدمی کون ہیں؟" جواب ملا، "وہ جن کے بغیر کسی مملکت کا انتظام درست نہیں چل سکتا۔ ان کی مثال تخت کے چار پایوں کی سی ہے۔ جب تک وہ چاروں پائے عمدہ، مضبوط اور سیدھے نہ ہوں، تخت مضبوط نہیں رہ سکتا۔ ایک تو ایسا قاضی ہے جس پر اللہ کی راہ میں کسی لعنت ملامت کا اثر نہ ہو سکے۔ دوسرے کوتوال جو قوی کے مقابلے میں ضعیف کے حق میں انصاف کر سکے۔ تیسرے وہ افسر ہے جو پوری مال گزاری وصول کرے لیکن رعایا پر ظلم نہ کرے اور چوتھے۔" یہ کہہ کر خلیفۂ وقت نے اپنا انگوٹھا تین مرتبہ دانتوں سے دبایا اور ہر مرتبہ ان کے منہ سے "اف" کی آواز نکلی۔ لوگوں نے پوچھا، "چوتھا شخص کون ہے؟" جواب ملا، "وہ افسر ڈاک جو، ان تمام

Marfat.com

افسران کی سچی خبریں نہایت دیانتداری سے مجھے لکھتا رہے۔" منصور کے عہد میں ڈاک کے افسروں کی ذمے داری تھی کہ وہ اشیا کے نرخوں کی نگرانی کرتے رہیں کہ کہیں حکومت کے مقرر کردہ نرخوں سے زیادہ قیمت پر اشیا فروخت نہ ہو رہی ہوں۔

منصور کو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا بڑا احساس تھا۔ ایک بار وہ عرصے تک منظر عام پر نہیں آئے تو عوام میں چرچا ہونے لگا کہ امیر المؤمنین بیمار پڑ گئے ہیں۔ ایک صاحب منصور کے پاس جا پہنچے اور ان سے عوام میں پھیلی ہوئی اس خبر کا تذکرہ کیا۔ منصور تھوڑی دیر سر نیچا کیے سوچتے رہے پھر بولے "عوام کو اب ہماری کیا ضرورت رہی؟ ہم نے ان کے جھگڑوں کے تصفیے کے لیے منصف مقرر کر دیے۔ ان کے راستوں کو محفوظ کر دیا، وہ دن رات بلا خوف و خطر سفر کر سکتے ہیں۔ اور ہم نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر دیا ہے۔ اب عوام کو ہماری کیا ضرورت ہے۔"

چند روز بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ سواری کا انتظام کیا جائے۔ پھر وہ سواری پر برآمد ہوئے اور عوام نے خلیفہ کو دیکھ لیا۔

منصور ذاتی طور پر سادگی پسند تھے۔ ایک بار ان کی خادمہ نے انہیں پیوند لگا ہوا کرتہ پہنے دیکھ لیا اور بولی "خلیفہ اور پیوند لگا ہوا کرتہ؟" منصور نے جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی کوئی شخص اس حالت میں عزت و شرف حاصل کر لیتا ہے جب کہ اس کی چادر پرانی ہوتی ہے اور اس کی قمیص میں پیوند لگا ہوتا ہے، پھر بولے، "اے خادمہ، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔"

مسعودی کہتے ہیں کہ منصور کو جس معاملے میں نفع کی توقع ہوتی تھی اس میں بے دریغ رقم صرف کر دیتے تھے اور جہاں رقم ضائع ہونے کا امکان ہوتا وہاں تھوڑا سا پیسہ بھی صرف نہ کرتے۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ مال بیکار ضائع نہ کیا جائے، اپنے لڑکے مہدی کو حکم دیا تھا کہ خزانے کو کفایت شعاری سے خرچ کیا جائے۔ بعض افسران نے شاعروں کو بڑے بڑے انعامات دیے، منصور کو اطلاع ملی تو انہوں نے افسران کو سختی سے متنبہ کیا اور شاعروں کو کچھ انعام دے کر باقی رقم واپس لے لی۔ ایک بار وہ اپنی رہائش گاہ کے دروازے سے داخل ہوئے تو دیکھا تین قندیلیں روشن ہیں، فوراً سوال کیا، "کیا ایک قندیل کافی نہ تھی؟"

حضر موت کے والی (گورنر) اکثر شکار کے لیے جایا کرتے تھے۔ منصور کو اطلاع ملی تو سختی سے باز پرس کی "آپ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا تھا نہ کہ جانوروں کو تکلیف دینے کے لیے" اور والی کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا۔

اصمعی کہتے ہیں کہ خلیفہ منصور نے ایک بار ایک شخص کو سزا دینے کے لیے بلایا۔ اس شخص نے کہا "امیر المؤمنین بدلہ لینا عدل و انصاف ہے اور معاف کر دینا اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔" یہ سن کر منصور نے اسے معاف کر دیا۔

عباسی خاندان کے اس دوسرے خلیفہ کے عہد حکومت میں لوگوں کو عام آزادی تھی کہ اگر کسی شخص کو کسی اہل کار یا افسر سے تکلیف پہنچے تو وہ کسی روک ٹوک کے بغیر خلیفہ تک پہنچ کر شکایت کر سکتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے ایک افسر کی شکایت کی کہ اس نے اس کی جائیداد کا کچھ حصہ اپنی جائیداد میں شامل کر لیا ہے۔ خلیفہ نے فوراً اس افسر کو لکھا کہ اگر تم عدل کرو گے تو سلامتی ہمیشہ تمہارا ساتھ دے گی۔

سوار بن عبداللہ بصرہ کے جج تھے۔ انہیں ایک دن منصور نے پیغام بھیجا کہ زمین کے بارے میں گھوڑے ہانکنے والے اور تاجر کا جو مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے اس میں آپ گھوڑے ہانکنے والے کے حق میں فیصلہ دے دیں۔ وہاں سے جواب آیا کہ شہادتوں سے ثابت ہے کہ زمین تاجر کی ہے، میں شہادتوں اور ثبوت کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔ منصور نے پھر پیغام بھجوایا کہ گھوڑے ہانکنے والے کے حق میں فیصلہ دے دیں، لیکن سوار بن عبداللہ نے جواب بھجوایا کہ خدا کی قسم میں یہ فیصلہ نہیں دے سکتا۔ منصور نے یہ جواب سنا تو کہا "بخدا میں نے رُوئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا ہے۔" سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ بھی منصور نے قائم کیا۔ اس عہدے پر قاضی ابن ابی لیلیٰ مقرر ہوئے جو تیس سال تک یہ ذمے داری نبھاتے رہے۔

خلیفہ منصور کے عہد میں مختلف بغاوتوں کو فرو کیا گیا، اس کے علاوہ سندھ کے مختلف حصوں میں فوجیں روانہ کی گئیں۔ طبرستان اور دیلمہ میں بھی مہمات بھیجیں اور وہاں عرب والی مقرر کیے گئے۔

۱۳۲ھ میں قیصر روم نے ملطیہ پر چڑھائی کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ ملطیہ اسلامی اور رومی سرحد کا اہم مورچہ تھا۔ خلیفہ منصور نے انطاکیہ کے گورنر عباس بن محمد کو مقابلے پر بھیجا جنہوں نے رومیوں کو مار بھگایا۔ ۱۳۶ھ میں عباس نے ملطیہ کو دوبارہ تعمیر اور آباد کیا۔ ۱۴۰ھ میں منصور

Marfat.com

نے ملطیہ میں قلعہ تعمیر کروایا۔ ۱۵۵ھ / ۷۷۲ء تک قیصر روم سے کشمکش جاری رہی بالآخر قیصر روم نے منصور سے مصالحت کی درخواست کی اور ہر سال ایک بڑی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ منصور نے سرحدی دفاع پر خصوصی توجہ دی۔ سرحدی قلعے تعمیر کروائے۔ انہوں نے دو شہروں ملطیہ اور المسیہ کو از سر نو تعمیر کروایا۔

منصور ذی الحجہ کے مہینے میں پیدا ہوئے، ذی الحجہ میں خلافت کی مسند پر بیٹھے اور ذی الحجہ ہی میں انہوں نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ آخری عمر میں وہ علیل رہنے لگے تھے۔ ان کو معدے میں خرابی کی شکایت تھی۔ طبیبوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ علاج تو ممکن ہے لیکن جو دوائیں استعمال ہوں گی وہ بذات خود گرم ہوتی ہیں۔ ان کا فوری اثر تو ہو گا لیکن بعد میں نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ اسی زمانے میں ہندوستان سے ایک طبیب آئے، انہوں نے کئی سفوف اور جوارش تیار کیں۔ منصور نے انہیں استعمال کیا تو کھانا ہضم ہونے لگا تاہم دیگر معالجوں کا کہنا تھا کہ ان دواؤں سے خلیفہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ذی الحجہ ۱۵۸ھ / اکتوبر ۷۷۵ء میں منصور احرام باندھ کر حج کے ارادے سے نکلے لیکن راستے ہی میں ان کی حیات کے دن پورے ہو گئے۔ مکہ مکرمہ سے چند میل پہلے بطن کے مقام پر ۷ ذی الحجہ / ۸ اکتوبر کو ان کا انتقال ہو گیا، انہیں باب معلیٰ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

منصور کی ذات میں ایک خدا ترس اور صالح سوچ رکھنے والا حکمران نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے جو طویل وصیت نامہ لکھا ہے اس میں انہیں امورِ مملکت کے بارے میں بہت سی نصیحتیں کی ہیں، اس وصیت کے ایک حصے میں انہوں نے لکھا:

"بیٹا! محمدؐ کی امت کی حفاظت کرنا، اس کے بدلے اللہ تمہارے کاموں کی حفاظت کرے گا۔ حرام خونریزی سے بچنا کہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے، حلال کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ اس میں تمہارے لیے آخرت میں بھی ثواب ہے اور دنیا میں بھی بھلائی ہے، اعتدال سے نہ بڑھنا کہ اس میں ہلاکت ہے۔"

منصور کا ایک ایسا کارنامہ بھی ہے جو صدیوں تک مسلمانوں کی عظمت، جاہ و جلال اور ان کی پاکیزہ ثقافت کی علامت بنا رہا۔ اس کی تفصیل اس کتاب (مسلم تہذیب کے پاسبان) کے آخری مضمون میں دی گئی ہے۔

•••

Marfat.com

محمد بن عبداللہ المہدی

نرم خُو، انصاف پسند، انسان دوست، جری اور اولوالعزم حکمران

وہ نماز ادا کر کے فارغ ہوئے تھے!

ان کا خوبصورت چہرہ ملاحت اور صباحت کا حسین امتزاج تھا۔ بال گھنگریالے تھے، عام حالات میں ان کے چہرے سے بشاشت عیاں رہتی تھی لیکن اس وقت ان کا چہرہ فکر و پریشانی کی عکاسی کر رہا تھا۔

"موسیٰ کو لایا جائے۔" انہوں نے اپنی شیریں اور مترنم آواز میں حکم دیا۔ ان کے ماتحت سمجھ گئے کہ وہ کس موسیٰ کی بات کر رہے ہیں۔ موسیٰ بن جعفر کو پیش کر دیا گیا جنہیں بغاوت کے الزام میں قید کر دیا گیا تھا۔

موسیٰ کو طلب کرنے والی شخصیت نے کہا:

"موسیٰ! میں نے نماز میں ایک آیت کی تلاوت کی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ "اگر تم کو حکمرانی ملے تو کچھ عجب نہیں کہ تم دنیا میں فساد پھیلاؤ اور باہمی رشتوں کو توڑ دو۔" اس آیت کو پڑھ کر مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ قطع رحمی کی ہے کیونکہ تم میرے رشتے دار ہو۔ اگر تم وعدہ کرو کہ بغاوت نہ کرو گے تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔"

موسیٰ نے وعدہ کر لیا اور انہیں رہا کر دیا گیا۔

قرآن کریم کی آیت پڑھ کر اپنے فیصلے کو تبدیل کرنے والے یہ تھے تیسرے عباسی خلیفہ محمد بن عبداللہ جو عام طور پر مہدی کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ مہدی ایک دین دار، نرم مزاج، انسان دوست اور اچھے منتظم حکمران تھے۔ ان کا تقریباً دس سالہ دورِ خلافت، عباسی عہد کا روشن اور مستحکم باب ہے۔

مہدی کے والد ابو جعفر منصور نامور عباسی خلیفہ تھے۔ مہدی کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔ آئندہ سطور میں ان کا ذکر "مہدی" ہی نام سے کیا جائے گا۔

مہدی کی پیدائش ۱۲۶ھ / ۷۴۴ء میں ایذج کے قصبے میں ہوئی۔ یہ قصبہ ایران کے جنوب مغربی علاقے لرستان کا حصہ تھا اور اب کھنڈر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ بعد میں یہ شہر "مالِ امیر" کہلانے لگا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مہدی کے والد ابو جعفر منصور نے عہد بنی امیہ کے آخری دس برسوں میں خلیفہ کی جانب سے ایذج کے علاقے میں حکومت کی تھی۔ یہیں ان کے بیٹے مہدی پیدا ہوئے اور یہاں عباسیوں کی کچھ املاک وغیرہ موجود تھیں، چنانچہ ایذج کو "مالِ امیر" یعنی "امیر کا مال" کہا جانے لگا۔ مہدی کی والدہ کا نام ام موسیٰ بنت منصور تھا اور وہ ایذج کے ایک بڑے خاندان حمیر سے تعلق رکھتی تھیں۔

ابو جعفر منصور نے اپنے بیٹے مہدی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ نامور علمائے کرام سے تعلیم دلوائی۔ مہدی نے حدیث کی سماعت اپنے والد اور حضرت مبارک بن فضالہؒ سے کی۔ ابو جعفر منصور خود ایک اچھے عالم تھے اور حضرت مبارک بن فضالہؒ بھی بڑے لائق محدث تھے۔ اس کے بعد ابو جعفر منصور نے مہدی کو حضرت امام مالکؒ جیسے عظیم المرتبت فقیہ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجا، جہاں سے انہوں نے سندِ حدیث حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر منصور نے رے اور طبرستان کی حکومت مہدی کے حوالے کر دی اور خالد بن برمک کو بطور اتالیق ان کے ساتھ کر دیا۔

منصور نے ابتدا ہی سے اس بات کا خیال رکھا کہ علمی تربیت کے ساتھ ساتھ مہدی کی عسکری تربیت بھی ہو، چنانچہ مہدی جب صرف پندرہ برس کے تھے تو منصور نے انہیں ایک فوجی مہم کا سربراہ بنا کر خراسان بھیج دیا تھا۔ ۱۴۱ھ / ۷۵۸ء میں خراسان کے علاقے میں ایک حاکم عبدالجبار بن عبدالرحمٰن نے بغاوت کر دی تھی۔ منصور نے عبدالجبار کو مرو کی بغاوت کے خاتمے کی ذمے داری سونپی تھی لیکن

Marfat.com

عبدالجبار خود بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ اس پر منصور نے مہدی کو تیس ہزار سپاہیوں کا لشکر دے کر روانہ کر دیا۔ یہ لشکر رے میں آکر ٹھہرا۔ ادھر مرو کے شہریوں نے مہدی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور عبدالجبار کو گرفتار کر لیا۔ مہدی نے اپنے سالار خازم بن خزیمہ کو مزید آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ خازم نے کئی شہر اور قلعے فتح کیے۔

مہدی تین سال تک ان علاقوں میں مصروف رہے اور انہوں نے ان علاقوں کا انتظام بہتر بنایا۔ پھر وہ واپس بغداد آئے جہاں ان کی شادی ان کے چچا کی صاحب زادی ریطہ بنت ابوالعباس سے ہوگئی۔ مہدی اس کے بعد واپس رے چلے گئے جہاں انہوں نے رے کو بہت ترقی دی۔ وہ رے میں سات برس رہے۔ یہیں ان کی دوسری اہلیہ خیزراں کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ یہی دو لڑکے موسیٰ اور ہارون بعد میں ہادی اور ہارون الرشید کے نام سے خلیفہ بنے۔

۱۵۰ھ /۷۶۷ء کے آخر میں مہدی کے بھائی جعفر اکبر کا انتقال ہوگیا، جس کے بعد انہیں خراسان سے بغداد آنے کا حکم ملا۔ مہدی پورے خاندان کے ساتھ رے سے بغداد پہنچے جہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ منصور نے ان کے لیے رصافہ کے علاقے میں بہت خوبصورت قصر تعمیر کروایا۔ مہدی نے یہاں ایک نیا اور شاندار شہر آباد کر دیا۔ انہوں نے یہاں رہائش اختیار کرنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

۱۵۳ھ /۷۷۰ء میں منصور نے مہدی کو امیر الحج مقرر کیا۔

ذی الحجہ ۱۵۸ھ /اکتوبر ۷۷۵ء میں منصور حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے مہدی کو بلا کر انہیں بہت سی نصیحتیں کیں۔ پھر وہ سفر حج پر روانہ ہوگئے لیکن دراصل یہ ان کا سفر آخرت تھا۔ راستے میں وہ بیمار ہوئے اور ۷ ذی الحجہ ۱۵۸ھ /۱۸ اکتوبر ۷۷۵ء کو بطن کے مقام پر ان کا انتقال ہوگیا۔ منصور نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے مہدی کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۵۸ھ /۲۳ اکتوبر ۷۷۵ء کو مہدی نے بغداد کے علاقے کرخ کے قصر خلد میں نئے خلیفہ کی حیثیت سے مملکت کی عنان سنبھال لی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ سال تھی۔

مہدی نے اپنے والد سے بالکل مختلف طبیعت پائی تھی۔ ان کے والد منصور کفایت پسند تھے اور خزانے کو بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنے کے عادی تھے۔ ساتھ ہی وہ سخت مزاج بھی تھے لیکن مہدی بہت نرم مزاج تھے اور مال و دولت خرچ کرنے، عطیے اور انعامات دینے اور مستحقین کی امداد کرنے کے معاملات میں ان کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔

اپنی نرم مزاجی اور مدبرانہ سوچ کے زیر اثر مہدی نے خلیفہ بنتے ہی بیشتر سیاسی قیدیوں کو فوراً آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔ ان قیدیوں میں ایسے افراد کی اکثریت تھی جو بنی امیہ سے کسی طرح کا تعلق رکھنے یا ان کی حمایت کرنے کے الزام میں قید کر دیے گئے تھے۔ مہدی نے رہائی پانے والے تمام افراد کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی علاقے میں جا کر آباد ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے ایسے تمام افراد کی ضبط شدہ جائیدادیں بھی واپس کر دیں۔

منصور اپنے بائیس سالہ عہد خلافت میں مملکت کو تمام بڑی مخالفتوں اور شورشوں سے چھٹکارا دلا چکے تھے چنانچہ مہدی کو یکسوئی کے ساتھ ترقیاتی سرگرمیوں اور تعمیری اصلاحات پر توجہ دینے کا موقع مل گیا۔ تاہم ان کے دور میں اتنی زیادہ فوجی مہمات بھی روانہ کی گئیں کہ بنی امیہ کے بعد ان کی مثال نہیں ملتی۔ ترقیاتی سرگرمیوں کا ذکر کرنے سے قبل ان عسکری مہموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مہدی کو سب سے پہلے ۱۶۰ھ /۷۷۶ء میں خراسان میں یوسف بن ابراہیم کی جانب سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ مہدی نے یزید بن مزید شیبانی کو اس بغاوت کے خاتمے کے لیے مامور کیا۔ بغاوت کچل دی گئی۔ باغیوں کو سزائے موت دی گئی۔ اسی زمانے میں خراسان ہی میں ایک شخص حکم بن عطا عرف مقنع نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ بہت سے لوگ بہکاوے میں آکر اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس نے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ مہدی نے کئی افراد کو اس شخص کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ آخر ۱۶۳ھ /۷۷۹ء میں معاذ بن مسلم اور سعید حرشی نے سخت کارروائی کر کے اس فتنے کا قلع قمع کیا۔ ہزاروں افراد نے توبہ کی البتہ تقریباً دو ہزار افراد مقنع کے ساتھ محصور ہوگئے۔ مقنع نے خواتین کو زہر دے دیا اور باقی افراد کے ساتھ آگ میں کود کر خودکشی کر لی۔

۱۶۲ھ /۷۷۸ء میں ایک شخص عبدالسلام بن ہاشم یشکری نے جزیرہ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ جزیرہ سے مراد دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے کا شمالی حصہ ہے۔ یہ بغاوت اتنی بڑھی کہ اس کو کچلنے کے لیے کئی مہمات بھیجی گئیں اور کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ آخر شعیب نامی سالار نے بڑی مشکلوں سے اس پر قابو پایا۔

مہدی نے اپنے عہد حکومت میں ایک نہایت دانشمندانہ قدم

Marfat.com

اٹھایا جس سے ان کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے ۱۶۴ھ / ۷۸۰ء میں اپنے ماتحت تمام باج گزار حکمرانوں اور پڑوسی ممالک کے فرماں رواؤں کے پاس سفیر روانہ کیے اور حالات و تعلقات کی مناسبت سے ان کے ساتھ اطاعت، امن یا دوستی کے معاہدے کیے۔ اس طرح وہ تمام حکمراں جو پہلے ہی مطیع تھے ان کے بغاوت پر آمادہ ہونے کا خطرہ جاتا رہا اور سرحدوں کے قریب واقع ممالک کے سربراہوں سے امن اور دوستی کے معاہدے ہو جانے سے بیرونی حملوں کے خدشات ٹل گئے۔ اس ضمن میں کابل، طبرستان، صغد، طخارستان، بامیان، فرغانہ، اشروسنہ، سجستان، تبت، سندھ اور چین کے حکمرانوں نیز ہندوستان کے بعض راجاؤں کے ساتھ معاہدے کیے گئے۔

مہدی کے زمانے میں سندھ کے علاقے میں بھی فوج کشی کی گئی۔ ۱۵۹ھ / ۷۷۵ء میں مہدی نے عبدالمالک بن شہاب کو ایک بحری مہم پر سندھ کی جانب بھیجا۔ انہوں نے باربد کے ساحل پر اتر کر شہر کا محاصرہ کیا اور شہریوں کی مزاحمت کے باوجود باربد کو فتح کر لیا۔ بدقسمتی سے اسی زمانے میں ایک وبائی بیماری پھیل گئی۔ مسلمانوں کا لشکر واپس کشتیوں کے ذریعہ روانہ ہوا۔ بحیرۂ احمر میں طوفان کی وجہ سے بہت سی کشتیاں ٹوٹ گئیں۔

مہدی کے دور میں بازنطینی (رومی) سلطنت سے بھی متعدد جنگیں لڑی گئیں۔ اپنے دس سالہ عہد میں مہدی نے تقریباً ہر سال موسم گرما میں رومی سلطنت پر فوج کشی کی۔ مہدی نے تخت نشین ہونے کے بعد اگلے ہی برس، ۱۵۹ھ / ۷۷۶ء میں اپنے چچا عباس بن محمد کو فوج کا سالار مقرر کر کے سلطنتِ روم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے اس مہم کو اس قدر اہمیت دی کہ خود بغداد سے نکل کر اس فوج کو رخصت کیا۔ عباس بن محمد نے رومیوں کے شہر ادھرہ کو فتح کیا۔ ۱۶۱ھ / ۷۷۷ء میں ثمامہ بن ولید نے مسلمانوں کی فوج کی قیادت کی۔ دوسری جانب سے رومیوں کا سردار میخائل اسی ہزار سپاہی لے کر آیا اور مرعش پر حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ میخائل جیجان کی طرف چلا گیا۔

مہدی کو اس ہزیمت کی خبر ملی تو انہوں نے دوسرا لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ ۱۶۲ھ / ۷۷۸ء میں رومیوں نے اسلامی مملکت کی سرحد پر واقع شہر حدث پر حملہ کر دیا اور اس کی فصیل منہدم کر دی۔ مہدی نے حسن بن قحطبہ کو ایک بڑی فوج دے کر روانہ کیا۔ انہوں نے رومیوں کے علاقے میں کارروائی کی اور واپس آ گئے۔ اسی سال یزید بن اسید سلمی نے قالیقلا کے نواح میں تین قلعے فتح کیے۔

سنہ ۱۶۳ھ / ۷۷۹ء میں مہدی نے خود رومیوں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے خراسان اور دیگر علاقوں سے فوج کے تازہ دم دستے طلب کیے۔ بغداد میں اپنے بیٹے ہادی کو قائم مقام مقرر کیا اور خود فوج لے کر روانہ ہوئے۔ انہوں نے موصل اور جزیرہ کا راستہ اختیار کیا۔ فرات پار کر کے حلب پہنچے۔ یہاں انہوں نے اپنے بیٹے ہارون کو فوج کی قیادت سپرد کی اور رومی سلطنت کی سمت بڑھنے کی ہدایت کی۔ خود جیجان تک ان کے ساتھ آئے۔ ہارون نے قلعہ سالو کا محاصرہ کر لیا جو چالیس دن تک جاری رہا۔ آخر یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ ہارون چند دیگر قلعے فتح کر کے واپس آئے اور مہدی کے ساتھ بیت المقدس کے راستے بغداد پہنچ گئے۔ مہدی نے اب ہارون کو مملکت کے پورے غربی حصے یعنی شمالی افریقہ، مصر، شام، آرمینیا اور آذربائیجان کا والی بنا دیا۔

مہدی نے ۱۶۵ھ / ۷۸۲ء میں ہارون (بیٹے) کو ایک بار پھر فوج کا امیر بنا کر رومی سلطنت کی سمت بھیجا۔ ایک لاکھ سپاہی ان کے ساتھ تھے۔ ہارون قسطنطنیہ تک بڑھتے چلے گئے اور آبنائے باسفورس میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں قسطنطنیہ پر ملکہ آئرین حکمراں تھی۔ اس نے تین سال کے لیے صلح کرنے اور ستر ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ صلح نامے میں یہ شرط بھی شامل کی گئی کہ مسلمانوں کا لشکر واپسی میں جن جن راستوں سے گزرے گا وہاں رومی، بازار لگائیں گے اور مسلمانوں کو سفر کے لیے درست راستہ اختیار کرنے میں مدد بھی دیں گے۔

محرم ۱۶۶ھ / اگست ۷۸۲ء میں ہارون ظفر مند ہو کر بغداد لوٹے۔ رجب ۱۶۶ھ / فروری ۷۸۳ء میں مہدی نے اعلان کر دیا کہ ان کے پہلے بیٹے ہادی کے بعد دوسرے ولی عہد ہارون ہوں گے۔ "الرشید" کا لقب ہارون کو اسی موقع پر دیا گیا۔ رمضان المبارک ۱۶۸ھ / مارچ۔ اپریل ۷۸۵ء میں رومیوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ توڑ ڈالا چنانچہ محاذ آرائی کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اس جنگ کا سلسلہ مہدی کی وفات تک جاری رہا اور اس وقت تک کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔

جرجان (بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع علاقہ) میں ۱۶۶ھ / ۷۸۲ء میں زبردست بغاوت پھوٹ پڑی اور اس نے طبرستان (موجودہ ایرانی علاقہ ماژندران) کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مہدی

Marfat.com

نے اس بغاوت سے نمٹنے کے لیے ایک بڑا لشکر تشکیل دیا اور یزید بن مزید کو لشکر کا سالار، اور ہادی (موسیٰ) کو امیر بنایا کیونکہ مشرقی علاقے کے والی وہی تھے۔ ۱۶۷ھ / ۷۸۳ء کے اوائل میں لشکر روانہ ہوا۔ طبرستان اور جرجان کے علاقے پہاڑی ہیں، یہاں زبردست معرکے ہوئے جو سال بھر تک جاری رہے۔

اسی زمانے میں مہدی نے محسوس کیا کہ ان کے بڑے بیٹے ہادی کے مقابلے میں ان کے چھوٹے بیٹے ہارون الرشید زیادہ قابل اور باصلاحیت ہیں چنانچہ انہوں نے ہارون کو ہادی کی بجائے اپنا ولی عہد نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں مہدی نے ہادی سے گفتگو کے لیے خود جرجان جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر میں ہارون ان کے ساتھ تھے۔ محرم ۱۶۹ھ / جولائی ۷۸۵ء میں مہدی سفر پر روانہ ہوئے۔ وہ نہروان کے قریب ایک مقام ماسبذان پہنچے۔ نہروان کا شہر بغداد سے نکلنے کے بعد شاہراہ خراسان پر پہلے پڑاؤ کی حیثیت رکھتا تھا۔

مہدی نے ماسبذان میں ٹھہر کر آرام کرنے کا حکم دیا۔ قافلے نے پڑاؤ ڈال دیا۔ ابھی خاصا سفر باقی تھا لیکن اگلے ہی دن یعنی ۲۲ محرم ۱۶۹ھ / ۴ اگست ۷۸۵ء کو مہدی اپنا سفر حیات تمام کر چکے تھے۔

مہدی کی موت کیسے واقع ہوئی؟ اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ مہدی شکار کے لیے نکلے۔ ایک ہرن کا نشانہ لیا۔ ہرن زخمی ہو کر تڑپتا ہوا ایک مکان کے دروازے میں گھس گیا۔ گھوڑا بھی دوڑتا ہوا اس مکان کے دروازے میں جا گھسا۔ دروازہ چھوٹا تھا اس لیے مہدی کو شدید چوٹ آئی۔ ان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اسی وقت ان کی روح پرواز کر گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مہدی کے ساتھ جو کنیزیں سفر کر رہی تھیں ان میں سے ایک نے دوسری کو زہر بھرا کھانا بھیجا جسے لاعلمی میں مہدی نے کھا لیا۔ اس طرح ان کی موت واقع ہو گئی۔ ایک اور روایت کے مطابق مہدی نے ایک زہر بھرا امرود کھا لیا تھا۔ اکثر مورخین نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

ہارون الرشید نے اپنے والد مہدی کو ماسبذان کے ایک علاقے الرذ میں سپرد خاک کروا دیا۔

مہدی ایک وسیع مملکت پر حکمراں تھے۔ اس مملکت کی حدود کاشغر سے سوسِ اقصیٰ تک تھیں۔ اس میں جو علاقے شامل تھے ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جزیرۃ العرب: اس میں حجاز (موجودہ سعودی عرب)، یمن، عمان وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

۲۔ عراق: اس صوبے میں کوفہ، بصرہ، واسط، مدائن، حلوان اور سامرا جیسے مشہور شہر شامل تھے۔

۳۔ جزیرہ: یہ دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ تھا۔ اس میں دیار ربیعہ، دیار مضر اور دیار بکر کے علاقے تھے۔

۴۔ شام: اس حصے میں قنسرین، حمص، دمشق، اردن و فلسطین کے علاقے شامل تھے۔

۵۔ مصر: یہ صوبہ جفار، ریف، اسکندریہ، فسطاط، صعید کے علاقوں پر مشتمل تھا۔

۶۔ مغرب: اس صوبے میں برقہ، افریقیہ (تیونس)، سجلماسہ، فاس، سوس اقصیٰ اور اندلس کے علاقے آتے تھے۔

۷۔ ماوراالنھر: یہ دریائے جیحوں کے مشرق میں واقع تھا اور اس میں فرغانہ، اشروسنہ، صغد کے علاقے شامل تھے۔

۸۔ خراسان: اس صوبے میں بلخ، غزنی، کابل، بست، سجستان، ہرات، جوزجان، نیشاپور وغیرہ کے علاقے شامل تھے۔

۹۔ دیلم: اس صوبے میں قومس، جرجان، طبرستان، خزر وغیرہ کے علاقے آتے تھے۔

۱۰۔ رحاب: اران، آرمینیا اور آذربائیجان کے علاقوں پر مشتمل تھا۔

۱۱۔ جبال: رے، ہمدان اور اصفہان کے مشہور شہر شامل تھے۔

۱۲۔ خوزستان: سوس، تستر، اہواز، رام ہرمز کے علاقوں پر مشتمل تھا۔

۱۳۔ فارس: شیراز، سابور، اصطخر، اردشیر کے علاقے شامل تھے۔

۱۴۔ کرمان: بردسیر، سیرجان، جیرفت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۵۔ سندھ: مکران، طوران، منصورہ، دیبل کے علاقے شامل تھے۔

ان پندرہ صوبوں میں سے چھ میں عربی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

مہدی ایک علم دوست حکمراں تھے اور عالموں کی بے حد قدر کرتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت علما کے درمیان گزرتا تھا۔ انہوں نے اپنے استاد، مبارک بن فضالہؒ اور اپنے والد ابو جعفر منصور سے احادیث کی روایت کی۔ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔

مہدی نے مشہور محدث اور فقیہ حضرت سفیان ثوریؒ کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی۔ سفیان ثوریؒ حکمرانوں سے ملنے جلنے سے گریز کرتے تھے۔ مہدی نے انہیں کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا لیکن

Marfat.com

حضرت سفیان ثوریؒ نے مہدی کے پاس سے واپس آکر تقرر نامہ ضائع کر دیا اور خود کہیں روپوش ہو گئے۔ وہ منصبِ قضا قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح مشہورِ عالم قاضی شریکؒ کو بھی مہدی نے بلایا اور ان سے کہا کہ آپ یا تو عہدۂ قضا (قاضی کا منصب) قبول کیجیے یا میری اولاد کی تربیت فرمایئے یا میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جایئے۔ قاضی شریکؒ نے آخری صورت منظور کر لی۔ تاہم بعض مؤرخین کے مطابق مہدی نے قاضی شریکؒ کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا تھا۔

مہدی کے دورِ حکومت میں بہت سی جلیل القدر علمی ہستیاں موجود تھیں۔ یہ تابعین کا زمانہ تھا۔ ان میں امام مالک بن انسؒ جیسے عظیم فقیہ بھی تھے جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "الموطا" کی تالیف مہدی کے والد منصور کی خواہش پر شروع کی اور مہدی کے زمانے میں یہ کتابی شکل میں سامنے آ چکی تھی۔ امام مالکؒ کے بے شمار تلامذہ تھے جن میں بڑے بڑے فقہا شامل تھے۔ مثلاً مدینہ منورہ میں عبدالعزیز بن ابی حازمؒ (وفات: ۱۸۵ھ/ ۸۰۱ء)، محمد بن ابراہیم بن دینارؒ (وفات: ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء)، معن بن عیسیٰؒ (وفات: ۱۹۸ھ/ ۸۱۳ء)، مصر میں عبدالرحمن بن القاسمؒ (وفات: ۱۹۱ھ/ ۷-۸۰۶ء)، شمالی افریقہ میں علی بن زیادؒ (وفات: ۱۸۳ھ/ ۷۹۹ء) وغیرہ۔ امام مالکؒ نے ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء میں انتقال فرمایا۔

مہدی کے زمانے میں بلند مرتبہ فقیہ، امام ابو یوسفؒ (وفات: ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء) اور امام محمدؒ (وفات: ۱۸۹ھ/ ۸۰۵ء) بھی موجود تھے۔

مہدی دینی عقائد کے معاملے میں بہت سخت تھے اور عقائد سے روگردانی کو معاف نہیں کرتے تھے۔ ان کے دور میں بعض الحاد پرستوں نے نئے عقائد کو رواج دینے کی کوشش کی۔ مہدی نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ ان عقائد کے رد میں کتابیں لکھوائیں۔ علمِ کلام کے فتنے نے بھی اسی دور میں سر اٹھایا۔ مہدی نے ملحدوں کو تلاش کروا کے انہیں موت کی سزائیں دیں اور ان کی کتابوں کو ضائع کروا دیا۔ مہدی کے حکم پر بعض ادبی کتب بھی لکھی گئیں مثلاً مفضل بن محمد ضبّی نے مہدی کی ہدایت پر امثال و ایامِ عرب پر ایک کتاب لکھی۔

مفضل بن محمد ضبّی ماہر لسانیات تھے۔ وہ مہدی کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے مہدی کے لیے پرانے عربی قصائد پر مشتمل ایک کتاب المفضلیات بھی لکھی تھی۔ یہ عربی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون کو تعلیم دینے کی ذمہ داری بھی مفضل ضبّی کے سپرد کی تھی۔

مہدی کے وزیر ابو عبداللہ معاویہ بن یسار نے اصولِ خراج پر ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کے علاوہ ابو جعفر منصور کے زمانے میں جو احادیثِ نبویؐ جمع کی گئی تھیں مہدی نے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ منصور کے زمانے میں جو محکمہ تراجم قائم ہوا تھا مہدی نے اسے مزید ترقی دی۔ مدارس اور مساجد کے انتظامات کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا گیا۔

مہدی کے زمانے میں خطِ کوفی کی جدید شکل نے رواج پایا اور اسے ترقی دی گئی۔ منصور اور مہدی کے دور میں اسحٰق بن حماد نے خط کوفی کو زیادہ عملی، مفید، مقبول اور سہل بنانے کے لیے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ مثلاً مساجد اور عمارتوں کی پیشانیوں کے لیے خطِ طومار، دفتری دستاویزات کے لیے خطِ سجلات (پیچیدہ خط تاکہ اس میں تصرف نہ کیا جا سکے) اور فرامین اور احکام کے لیے خطِ عہدہ ایجاد کیا گیا۔

جدید خطِ کوفی کو خلیل بن احمد عروضی سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا انتقال بصرہ میں ۱۷۰ھ اور ۱۷۵ھ/ ۷۸۶ء اور ۷۹۱ء کے درمیان ہوا۔ وہ ایک پرہیز گار شخص تھے۔ نحو اور لغت کے ماہر تھے۔ ان کے شاگردوں میں سیبویہ اور اصمعی جیسے قابل اساتذہ شامل ہیں۔ انہیں فنِ عروض (اشعار کے اوزان، بحر اور قافیہ وغیرہ کا علم) کا موجد کہا جاتا ہے۔ فارسی، ترکی اور اردو کی شاعری میں ان کے قائم کردہ اصولوں پر آج بھی عمل کیا جاتا ہے۔

مہدی نے امورِ مملکت کے انتظام کی بڑی اصلاح کی اور متعدد نئے شعبے قائم کر کے مملکت کو انتظامی لحاظ سے بہت بہتر بنا دیا۔ گزشتہ دور میں کئی شعبوں کا کام ایک ہی محکمے کے تحت ہو رہا تھا۔ مہدی نے ہر کام کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے اس کا الگ نگران مقرر کیا۔ ایک شعبہ آمدنی اور خرچ کی جانچ پڑتال کے لیے قائم کیا۔ اس کا نام "دیوان الازمہ" رکھا۔ نئے شعبہ جات میں دیوان رسائل اور دیوانِ زندیقہ بھی شامل تھے۔ "دیوانِ رسائل" کے تحت مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمن اور دیگر شہروں سے رسل و رسائل (ڈاک) کا سلسلہ پہلی بار شروع ہوا۔ "دیوانِ زندیقہ" کے ذمے زندیقی (ملحدانہ) عقائد کا خاتمہ کرنا تھا۔ مہدی ہی کے دور میں محکمہ پیمائش و بندوبست قائم ہوا۔ اس محکمے کے تحت پوری مملکت کی زرعی زمین کی پیمائش کروائی گئی۔

Marfat.com

مہدی نے پولیس کو بھی بے حد منظم کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک گشتی عدالت بھی قائم کی تھی جس کا کام یہ تھا کہ وہ منڈیوں اور بازاروں کے دورے کرتی تھی۔ اچانک معائنے کرتی تھی۔ اوزان اور پیمانوں کی جانچ پڑتال کرتی تھی کہ کہیں مقررہ معیار سے کم درجے کے اوزان اور پیمانے تو استعمال نہیں ہو رہے۔ اس کے علاوہ ناقص غلہ یا دیگر اشیا کی فروخت کی روک تھام بھی اسی عدالت کے ذمے تھی۔

مہدی نے پہلی بار خاص طور پر کاشتکاروں کے مقدمات کی سماعت کے لیے عدالتیں قائم کیں۔ وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے ہر قسم کے قیدیوں کے لیے بھی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کا انتظام کیا۔ انہوں نے جذامیوں (کوڑھیوں)، نابینا اور معذور افراد کے وظائف بھی مقرر کیے۔

مہدی کا دور داخلی استحکام اور امن کا دور تھا، چنانچہ مؤرخین کے مطابق ان کے دور میں ایسی صنعتی ترقی ہوئی کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوئی تھی۔ مہدی کے والد منصور نے بغداد شہر کی آبادکاری کا منصوبہ بہت عمدگی سے ترتیب دیا تھا۔ مہدی کے دور میں بغداد ایک بہت بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز تھا۔ یہاں کی خاص صنعت رنگین ریشمی کپڑے تھے۔ ان کپڑوں میں عتابی نام کا کپڑا مشہور تھا جو نہایت مضبوط ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں پردے، نقاب، عماموں کے لیے ریشمی کپڑا، رومال اور نرسلوں کے بورے بھی تیار ہوتے تھے۔

مہدی نہایت انصاف پسند حکمران تھے۔ عوام اپنی شکایات براہِ راست ان تک پہنچا سکتے تھے۔ جسے کوئی شکایت ہوتی وہ اسے تحریر کر کے مہدی کی رہائش گاہ پر مامور فرد تک پہنچا دیتا۔ ان شکایتی خطوط کو جوں کا توں مہدی تک پہنچا دیا جاتا تھا، ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاتی تھی۔ مہدی خود مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ عدالت میں علما اور فقہا کو بھی اپنے ساتھ بٹھاتے تا کہ فیصلہ کرنے میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ مہدی انصاف سے کسی کو بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار انہیں خود ملزم بن کر عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا اور فیصلہ ان کے خلاف ہوا تھا۔

مہدی کے زمانے میں بغداد کے علاوہ مرو، سمرقند، کوفہ، اہواز، اصفہان، دمشق، حلب اور صنعا میں دارالضرب (ٹکسال) قائم تھیں۔ مہدی کے دور کے سکوں پر محمد رسول اللہ نقش ہوتا تھا۔ ان کے زمانے میں دینار کے علاوہ آدھا دینار، تہائی دینار اور چوتھائی دینار بھی ڈھالے جاتے تھے۔ عید اور خوشی کی تقریبات کے موقع پر مختلف وزن اور حجم کے بڑے دینار ڈھالے جاتے تھے جو "دینار الصلہ" کہلاتے تھے۔ یہ دینار تحفے کے طور پر دیے جاتے تھے۔

مہدی دینی رجحانات کے حامل تھے۔ نماز باجماعت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ نماز کی امامت خود کرتے تھے۔ مہدی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ ﷺ کا ذکر آنے پر مہدی بہت مؤدب ہو جاتے۔ ایک بار ایک حدیثِ نبویؐ مہدی کے سامنے بیان کی گئی تو مہدی نے جھک کر اسے تعظیم دی اور پھر کہا کہ حدیثِ نبویؐ کی تعمیل کرنا ہم پر لازم ہے۔ مہدی جب خطبہ کا آغاز کرتے تو رسول کریم ﷺ پر درود بھیجتے۔

جب بھی کوئی پریشانی ہوتی، مہدی رب العالمین کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگتے۔ ایک بار سخت آندھی آئی۔ مہدی کے ایک کارکن حسن الوصیف کہتے ہیں کہ میں امیر المومنین کی تلاش میں نکلا۔ دیکھا کہ وہ اپنی پیشانی زمین پر ٹیکے نہایت عاجزی سے دعا کر رہے ہیں کہ: "اے اللہ! امتِ محمدیؐ کی حفاظت فرما، اے اللہ! ہمارے دشمنوں کو ہماری تباہی پر ہنسنے کا موقع نہ دے۔"

مہدی بہت منکسر المزاج تھے۔ اتنی بڑی مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود وہ جب عام لوگوں کے درمیان ہوتے تو اپنے لیے کوئی امتیازی جگہ کا اہتمام نہ کرتے۔ بعض حکمرانوں نے مسجد میں سربراہِ مملکت کے لیے بڑے منبر رکھوا دیے تھے اور نماز ادا کرنے کے لیے مقصورہ یعنی خیمہ نما حجرہ تعمیر کروالیا تھا۔ مہدی نے تمام منبروں کی اونچائی مسجد نبویؐ کے منبر کے برابر کروائی اور مقصورہ ختم کروادیا۔

مہدی نے حرمین شریفین کے لیے بڑی خدمات انجام دیں۔ ۱۶۰ھ/۷۷۷ء میں جب وہ حج بیت اللہ کے لیے گئے تو خانہ کعبہ کی عمارت میں توسیع کروائی۔ عمارت کی چاروں جانب رواق (کمرے) تعمیر کروائے۔ ان میں سنگِ رخام کے ستون لگوائے، ساگوان کی چھت ڈلوائی۔ خانہ کعبہ کے پرانے غلاف اتروا کر اس کی دیواروں پر مشک وغیرہ ملوایا اور قیمتی کپڑوں کے تین غلاف زیبِ کعبہ کیے گئے۔

مہدی نے مسجد نبویؐ کی عمارت میں بھی توسیع کروائی اور اس کی آرائش کے لیے اقدامات کیے۔ عمارت کا جو رخ شام کی جانب تھا اس سمت میں سو ہاتھ کی توسیع کی گئی۔ سنگِ رخام کے دس نئے ستون لگوائے اور پوری عمارت کو نقش و نگار سے مزین کروایا۔

Marfat.com

مہدی نے مکہ مکرمہ جانے والی سڑکیں درست کروائیں۔ نئی کشادہ سڑکیں تعمیر کروائیں۔ راستے میں سنگِ میل لگوائے۔ جگہ جگہ سرائیں بنوائیں۔ ہر منزل پر کنویں کھدوائے۔ قافلوں کے ساتھ چلنے والے جانوروں کے لیے حوض بنوائے اور حکم دیا کہ یہ حوض کبھی خشک نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے عازمینِ حج کے لیے ٹھنڈے پانی کے انتظامات کروائے۔

مہدی نے اس سفرِ حج میں دل کھول کر دولت خرچ کی۔ انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں تین کروڑ درہم تقسیم کیے اور لاکھوں درہم مالیت کا کپڑا بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کیا۔ مہدی نے مدینہ منورہ سے پانچ سو نوجوانوں کو فوج میں شامل کیا۔

مہدی نے تقریباً ۱۶۱ھ / ۷۷۸ء میں بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کو جزوی طور پر دوبارہ تعمیر کروایا۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس زمانے میں اس عمارت میں ایک وسطی دالان تھا۔ دالانوں کی سات قطاریں بائیں طرف تھیں جن میں سے ہر ایک کا عرض ۶ میٹر (تقریباً اکیس فٹ) تھا۔ ان سب پر کوہانی انداز کی چھتیں تھیں۔ مرکزی دالان کے آخری سرے پر بڑا چوبی گنبد تھا۔ شمالی ضلعے میں بڑا وسطی دروازہ تھا۔ دائیں بائیں سات سات چھوٹے دروازے تھے۔ مشرقی حصے میں چھ غیر مزین دروازے تھے۔

اندلس کے اموی حکمران عبدالرحمٰن اول نے قرطبہ میں ۱۷۰ھ / ۸۷-۷۸۶ء میں جو جامع مسجد تعمیر کروائی تھی اس کا طرزِ تعمیر مسجد اقصیٰ سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔

مہدی نے بغداد کے قریب دریائے دجلہ کی مشرقی جانب ایک شہر بسایا تھا جس کا نام ان کے نام پر "مدینۃ المہدی" رکھا گیا تھا۔ باب خراسان سے کشتیوں کے ایک بڑے پل کی جانب راستہ جاتا تھا۔ لوگ اس پل کے ذریعے دریائے دجلہ عبور کر کے مشرقی بغداد میں داخل ہوتے تھے جو مدینۃ المہدی کہلاتا تھا۔ مہدی نے یہاں شاندار قصر بنوایا اور ایک بہت عمدہ جامع مسجد تعمیر کروائی۔

مدینۃ المہدی تین حصوں میں منقسم تھا۔ پل کے سرے کے قریب کا حصہ "رُصافہ" کہلاتا تھا۔ دوسرا حصہ "شماسیہ" تھا جو رصافہ کے شمال میں واقع تھا۔ تیسرا حصہ مُخرّم، رصافہ کے جنوب میں واقع تھا۔ ان تینوں محلوں کے گرد نصف دائرے کی شکل کی فصیل تھی۔ مہدی نے اس شہر میں فوجی چھاؤنی قائم کی تھی۔ انہوں نے اس علاقے میں آباد ہونے والوں کی پوری حوصلہ افزائی کی۔ بہت کم مدت میں یہ بستی بے حد آباد اور بارونق شہر کی صورت اختیار کر گئی۔ یہاں بازار قائم ہو گئے، باغات لگا دیے گئے اور تفریح گاہیں بنا دی گئیں۔

مہدی جس زمانے میں خراسان میں تھے تو انہوں نے شہر "رے" کو بہت ترقی دی۔ انہوں نے شہر کے بڑے حصے کو از سرِ نو تعمیر کروایا۔ یہاں بہت اچھی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ یہ شہر اس قدر خوبصورت تھا کہ ابن حوقل نے اس شہر کو دیکھ کر کہا کہ مشرق میں بغداد کے بعد رے سے زیادہ خوبصورت شہر کوئی نہیں ہے۔

مہدی نے اس شہر کی فصیل بنوائی اور ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء میں یہاں بہت شاندار جامع مسجد تعمیر کروائی۔ غالباً یہ وہی مسجد ہے جس کی بنیادوں کے آثار حالیہ زمانے میں بوسٹن میوزیم کی تحقیقاتی جماعت نے دریافت کیے ہیں۔ مہدی کے عہد میں رے شہر میں مساجد اور میناروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض مؤرخین نے ان کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے جو ظاہر ہے مبالغہ آمیز ہے۔

رے شہر کا سرکاری نام مہدی کے نام محمد کی مناسبت سے "محمدیہ" رکھ دیا گیا تھا۔ شہر کے پانچ دروازے تھے۔ باب باطاق، باب بلیسان، باب کوہک، باب ہشام اور باب سین۔ شہر کے بازار ان دروازوں کے قریب یا ان سے باہر واقع تھے۔ سب سے زیادہ بارونق بازار ساربانان الروزہ کی بستیوں میں تھے۔ شہر میں دو دریاؤں، سور قنا اور جیلانی کے ذریعے پانی پہنچتا تھا۔ شہر کی اہم عمارتوں میں دارالکتب (کتب خانہ) اور دارالبطیخ (پھلوں کا بازار) شامل تھے۔

شہر کا مرکزی حصہ مدینہ کہلاتا تھا، جس کے گرد ایک خندق تھی۔ اس کے باہر کے حصے کو "محمدیہ" کہتے تھے۔ باہر کی آبادی پہاڑی پر واقع تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ تھا جسے الزبیدیہ یا الزبندی کہتے تھے۔ مہدی کی رہائش اسی قلعے میں تھی، ان کے بیٹے ہارون الرشید کی پیدائش اسی قلعے میں عمل میں آئی۔ نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں یہ شاندار شہر ویران ہونے لگا اور ایران کے موجودہ دارالحکومت تہران نے اس کی جگہ لے لی۔

قزوین کا شہر تہران سے ایک سو میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ اس شہر کے دو حصے تھے۔ ایک مدینہ موسیٰ اور دوسرا مدینہ مبارک کہلاتا تھا۔ مدینہ موسیٰ کو مہدی کے زمانے میں ان کے بیٹے موسیٰ (ہادی) نے تعمیر کروایا تھا۔

Marfat.com

مہدی نے ایک سرحدی شہر الحدث بھی از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ یہ شہر چھ سو سال سے زائد عرصے سے غیر آباد ہے اور اس کی صحیح جائے وقوع متعین نہیں کی جاسکی ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ یہ شہر دریائے آق صو کے کنارے لنکلی کے قریب واقع تھا۔ اسے رومیوں نے تباہ کر دیا تھا جس کے بعد مہدی نے اسے ۱۶۲ھ/۷۷۹ء میں دوبارہ تعمیر کروایا۔ ان ہی کے نام پر اس شہر کا نام مہدیہ رکھا گیا۔ یہ شہر جنگی اہمیت کا حامل تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ حلب سے البستان (ایشیائے کوچک) جانے والی ایک فوجی شاہراہ پر اثر انداز ہوا جاسکتا تھا۔

مہدی کے دورِ خلافت میں ان کے بیٹے ہارون الرشید نے مَلَطیہ کے علاقے میں واقع ایک شہر حصن منصور کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ اس شہر میں آب پاشی کا اچھا نظام تھا۔ مہدی نے ایشیائے کوچک اور شام کی سرحد پر واقع تجارتی شہر طرسوس کی فصیلوں کو بھی نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس شہر کے مشہور دروازے باب الجہاد سے ہر سال فوجی مہمات عیسائیوں سے لڑنے کے لیے روانہ کی جاتی تھیں۔

مہدی نے اہواز کے جنوب میں واقع دریائے دجیل کی کھاڑی کے سرے پر بھی ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا جسے "حصن مہدی" کہا جاتا تھا۔ سمنان کا قلعہ ۱۶۳ھ/۷۸۰ء میں تعمیر کیا گیا۔ ایران میں مسلمانوں کی حکومت کی پہلی دو صدیوں میں جو مساجد تعمیر ہوئیں ان میں صرف دامغان کا تاری خانہ ابھی تک باقی ہے۔ ۱۶۰ھ/۷۷۶ء میں تعمیر ہونے والی یہ عمارت آج بھی مسلمانوں کی شاندار ترین عمارتوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کا ایک حصہ منہدم ہو چکا ہے لیکن اس سیدھی سادی عمارت سے بڑی شان و شوکت جھلکتی ہے۔ مغربی ماہرین نے اس عمارت کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "یہ تقویٰ اور ذوق و شوق کا ایک نیا اظہار ہے جسے ایک قوی اور خدا پرست ذہن نے تخلیق کیا ہے۔"

•••

Marfat.com

ہارون الرشید

ان کا ۲۳ سالہ عہدِ خلافت اسلامی تاریخ کا روشن اور فروزاں باب ہے

یہ ایک سرد رات تھی۔

پہاڑی کے دامن میں آباد شہر "رے" کی گلیاں تاریک اور سنسان تھیں۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا کے جھونکے، درختوں کے پتوں کو بے کل کیے دیتے تھے۔ شہر کے باشندے گرم بستروں میں سہانی نیند سو رہے تھے لیکن پہاڑی کی چوٹی پر بنے قلعہ نما محل، "زبیدی" میں بڑی رونق تھی جہاں ایک کمرے میں ایک خاتون اپنے بچے کو ممتا بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھوں والے گورے چٹے اور صحت مند بچے نے کچھ ہی دیر قبل اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔ یہ خیزراں کا دوسرا بچہ تھا، خیزراں، جو خلیفہ وقت ابو جعفر منصور کے صاحب زادے محمد بن منصور (مہدی) کی رفیقۂ حیات تھیں۔

محمد بن منصور نے اپنے بچے کا نام ہارون رکھا۔

ہارون اپنی زندگی کے دوسرے سال میں داخل ہوئے تو بھائیوں اور اپنے ہم عمر دیگر بچوں کے ساتھ "زبیدی" کے باغات میں کھیلنے کودنے لگے۔ انہیں فصیل پر جا کر شہر کا نظارہ کرنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاید ان کی آنکھوں کو وہ سرسبز شاداب کھیت بھا گئے تھے جو میدانوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

تین سال کا عرصہ یوں ہی بیت گیا۔

اچانک ہارون کے والد کو بغداد سے ان کے پدر محترم خلیفہ ابو جعفر منصور کی جانب سے حکم ملا کہ وہ اہلِ خانہ سمیت بغداد چلے آئیں۔ محمد بن منصور نے اہلِ خاندان کو تیاری کا حکم دیا، رختِ سفر باندھا اور ایک فوجی لشکر کی حفاظت میں یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ ننھے ہارون بھی اس قافلے کے ایک مسافر تھے، جن کی معصوم نگاہوں نے اب تک "رے" اور اس کے مضافات سے آگے کچھ نہ دیکھا تھا۔

یہ سفر بڑا ہی تھکا دینے والا اور پُر صعوبت تھا۔ راستے میں کئی بڑے پہاڑ آتے تھے۔ ۱۵۱ھ کے ماہ شوال / اکتوبر ۷۶۸ء میں یہ قافلہ بابِ خراسان کو پار کر کے بغداد کی حدود میں داخل ہوا اور قافلے کے شرکا بغداد کے نواح میں واقع بستی "رصافہ" میں جا ٹھہرے۔

سفر کی تکان دور کرنے کے بعد محمد بن منصور اپنے والد ابو جعفر منصور کی خدمت میں اپنے تینوں بچوں سمیت حاضر ہوئے۔ دادا نے تینوں پوتوں، موسیٰ، علی اور ہارون کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور انہیں بوسہ دیا۔ ان تینوں میں انہیں ہارون کی خوبصورتی نے بہت متاثر کیا اور پھر اس ننھے پوتے کی آنکھوں کی چمک! انہوں نے ہارون کو پھر سے گود میں بٹھا لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمد بن منصور سے کہا، "میرا یہ بیٹا ان شاء اللہ سیرت صالحہ کا مالک اور صاحب اقتدار و اختیار بنے گا۔" محمد بن منصور نے پوچھا، "کیا آپ نے اس کی کسی ادا سے اندازہ کیا ہے؟" منصور نے جواب دیا، "میں ابھی سے اس طرح کے آثار دیکھ رہا ہوں۔" اپنے باپ اور دادا کی گفتگو سے بے نیاز، ہارون بڑے مزے سے دادا کی گود میں بیٹھے دادا کو تکے جا رہے تھے۔

ابو جعفر منصور نے دعا کے انداز میں اپنی جس خواہش کا اظہار کیا تھا وہ پوری ہوئی۔ تقریباً تیئس برس بعد ہارون مسندِ خلافت پر متمکن ہو چکے تھے۔ انہوں نے تیس سال سے زائد مدت تک یہ گراں بار ذمہ داری انجام دی اور اپنی اچھی سیرت اور حسنِ انتظام کے ذریعہ مملکت اسلامیہ کو ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ علمی، سیاسی، معاشی، تمدنی غرض ہر لحاظ سے اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے اس عہد کو بعض مؤرخین نے "عہدِ عروس" قرار دیا ہے۔

ہارون ذرا بڑے ہوئے تو ان کے والد نے ان کے لیے قابل اور لائق اساتذہ کا انتظام کر دیا۔ ان اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں اہم اور ممتاز نام علی بن حمزہ کسائی کا ہے۔ کسائی بڑے زاہد، متقی، نیکوکار

Marfat.com

بزرگ تھے۔ قرآن پاک کی سات طرح سے قرأت کے ماہر تھے۔ لغت، ادب، نحو میں وہ اہل کوفہ کے امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ ایک اور استاد مفضل بن محمد تھے جن کا شمار روایات اور ادب کے شیوخ میں ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ ہارون نے دیگر کئی اساتذہ سے بھی اکتسابِ علم کیا۔

محمد بن منصور کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ہارون، جسمانی اعتبار سے بھی مضبوط اور توانا ہو، چنانچہ ماہر اساتذہ نے ہارون کو بچپن ہی سے گھڑ سواری اور تیر اندازی کی تعلیم دی۔ نیزے کی انی سے کام لینا اور تلوار چلانا سکھایا۔ ان تمام فنون کی تعلیم ہارون نے فوجی افسران سے حاصل کی۔ بچپن سے ان پُر مشقت کھیلوں میں حصہ لینے کے نتیجے میں ہارون ایک خوش قامت، تندرست اور توانا جوان بن کر ابھرے۔ دس سال کی عمر میں ان کی مہارت کا عالم یہ تھا کہ منہ زور گھوڑے کو آسانی سے قابو کر لیا کرتے تھے۔

ذی الحجہ ۱۵۸ھ / اکتوبر ۷۷۵ء میں خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور کا انتقال ہو گیا۔ ہارون، جن کی عمر اس وقت دس برس تھی، اپنے دادا کی وفات پر سب سے زیادہ روئے، کیونکہ دادا انہی سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ منصور کے بعد ہارون کے والد محمد بن منصور خلیفہ بنے جن کو مہدی کا لقب دیا گیا۔ خلیفہ بننے کے بعد مہدی نے جب فریضۂ حج ادا کیا تو ہارون بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ہارون کا پہلا حج تھا۔ اس سفر میں ہارون کی تربیت اور رہنمائی کے لیے خلیفہ مہدی نے ایک قابل شخص ابان بن صدقہ کو مقرر کیا تھا۔ ابان بن صدقہ نے ہارون کو حج کے مناسک کی تعلیم دی اور جہاں وہ گئے وہاں کی تاریخ سے انہیں باخبر کیا۔ ۱۴ سال کی عمر میں ہارون نے اس مبارک سفر سے بہت کچھ حاصل کیا۔

سولہ سال کی عمر میں ہارون کو پہلی بار ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کا موقع ملا اور وہ بھی اس شان سے کہ رومیوں کے خلاف ہونے والی اس جنگ میں اسلامی فوج کی قیادت اُن ہی کو کرنی تھی۔ اس جنگ میں ہارون کی مدد کے لیے بڑے منجھے ہوئے ماہرین جنگ موجود تھے۔ ہارون فوج لے کر روانہ ہوئے اور حدودِ روم میں ایک بڑے قلعہ سمالو کا محاصرہ کر لیا۔ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ محاصرہ ۳۸ دن تک جاری رہا۔ قلعہ والوں نے بھوک پیاس سے تنگ آکر ہتھیار ڈال دیے۔ ہارون جزیہ اور مالِ غنیمت لے کر فاتحانہ شان سے لوٹ آئے۔

کچھ عرصے بعد ہارون کے والد نے فیصلہ کیا کہ ہارون کی شادی ان کی چچازاد بہن زبیدہ سے کر دی جائے۔ زبیدہ کا اصل نام امۃ العزیز تھا۔ ان کے والد کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب امۃ العزیز صرف تین سال کی تھیں۔ اس کے بعد دادا منصور نے اس بچی کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ یہ بچی نہایت خوبصورت نازک اندام، دراز قد اور گھنے بالوں والی تھی۔ دادا اسے پیار سے زبیدہ کہنے لگے "زبد" عربی زبان میں مکھن کو کہتے ہیں۔ امۃ العزیز کی جسمانی نزاکت اور رنگ و روپ کی وجہ سے ان کا نام زبیدہ پڑ گیا۔

زبیدہ بہت اچھی خاتون تھیں، انہوں نے قرآن پاک پڑھا اور اس کا بڑا حصہ حفظ کر لیا تھا۔ ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سیرت و تاریخ پر ان کی وسیع نظر تھی۔ وہ نماز اور روزے کی پابند تھیں، اللہ سے ڈرنے والی اور نیکی کی طرف مائل تھیں۔ جس وقت بغداد میں ہارون کی شادی کے انتظامات ہو رہے تھے اور شہر میں جشن کا ساماں تھا، اسی وقت ایک فوجی سردار عبد الکبیر بن عبد الحمید نے روم کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ ان کے ساتھ صرف تین ہزار سوار تھے۔ رومیوں نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس پسپائی کی خبر سن کر خلیفہ مہدی نے حکم دیا کہ رومیوں سے زبردست جنگ کی تیاری کی جائے۔ چنانچہ ایک لاکھ سپاہیوں کا لشکر ترتیب دیا گیا۔ ہر دستے کا اپنا مخصوص شناختی پرچم تھا۔ لشکر کا سالار ایک نہایت اہل اور قابل ترین ماہر جنگ یزید بن مزید شیبانی کو بنایا اور ہارون کو لشکر کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا گیا۔

ہارون کے لیے یہ ایک کڑی آزمائش تھی اور ان کی نوبیاہتا بیوی زبیدہ کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت، لیکن وہ جہاد کی اہمیت کو سمجھتی تھیں۔ انہوں نے پُر نم آنکھوں کے ساتھ اپنے شوہر کو الوداع کہا۔ جمادی الآخر ۱۶۵ھ / جنوری ۷۸۲ء میں ہارون لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ روم کی سرحد پر پہنچے۔ کئی علاقے فتح کیے۔ اب وہ قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانے میں روم پر ملکہ آئرین (ایرینی) حکمراں تھی جو نو عمر وارث تخت شہزادہ قسطنطین سادس کی ماں تھی۔ ملکہ آئرین نے مسلم فوج کی زبردست طاقت دیکھی تو صلح کی بات چیت شروع کر دی اور ہر سال جزیہ دینے کی پیشکش کی۔ ہارون نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ مالِ غنیمت اور جزیہ کی رقم کے ساتھ محرم ۱۶۶ھ / اگست ۷۸۲ء میں وہ فتح کے پھریرے لہراتے بغداد لوٹے تو ان کا والہانہ خیر مقدم کیا گیا۔ فضا تکبیر کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ لوگ فاتح لشکر پر پھول برسا رہے تھے۔ ہارون کی والدہ خیزراں قصرِ خلافت کی کھڑکی سے عوام کا جوش و خروش دیکھ رہی تھیں اور ہارون کی شریکِ زندگی زبیدہ ایک

Marfat.com

کمرے میں بیٹھی آنے والے لمحات کے تصور میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ان کا محبوب شوہر آٹھ ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے کے لیے آ گیا تھا۔

خلیفہ مہدی اپنے ایک بیٹے موسیٰ کو ولی عہد نامزد کر چکے تھے، رجب ۱۶۶ھ / فروری ۷۸۳ء میں انہوں نے ہارون کو ولی عہد ثانی نامزد کر دیا۔ اس موقع پر انہوں نے ہارون کو رشید کا لقب دیا۔ قبل ازیں ۱۶۵ھ / ۷۸۱ء میں مہدی انہیں مشرقی علاقے کا گورنر مقرر کر چکے تھے۔ مہدی ۱۶۹ھ / ۷۸۵ء تک خلیفہ رہے پھر ان کے بیٹے موسیٰ نے زمام اقتدار سنبھالی۔ موسیٰ کا لقب ہادی تھا۔ وہ صرف ایک سال تین ماہ خلیفہ رہے اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ / ۱۴ ستمبر ۷۸۶ء کی وہ رات اس اعتبار سے نہایت منفرد ہے کہ اس رات ایک خلیفہ یعنی ہادی کا انتقال ہوا۔ اسی رات دوسرے خلیفہ یعنی ہارون نے امورِ مملکت سنبھال لیے اور یہی وہ رات ہے جب ایک تیسرے خلیفہ یعنی مامون الرشید کی پیدائش عمل میں آئی۔ مامون کا نام عبداللہ تھا، ان کی والدہ ایک کنیز تھیں جنہیں ہارون نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔

بارِ خلافت سنبھالنے کے بعد ہارون بغداد پہنچے، جہاں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا۔ نماز کا وقت آیا تو ہارون نے جامع مسجد میں نماز کی امامت کی۔ شوال ۱۷۰ھ / اپریل ۷۸۷ء میں زبیدہ بھی ایک لڑکے کی ماں بن گئیں جس کا نام محمد رکھا گیا۔ یہی محمد بعد میں امین کے نام سے خلیفہ بنے۔ ہارون نے اپنی خلافت کے پہلے ہی برس حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ حج سے واپس ہوئے تو انہوں نے امورِ مملکت کی طرف باقاعدہ توجہ دی اور پوری مملکت کا جائزہ لے کر مکہ، مدینہ، طائف، کوفہ، خراسان، آرمینیا، جزیرہ اور شمالی افریقہ کے انتظامی عہدوں پر دوررس تبدیلیاں کیں۔ بغداد کی تعمیر دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، ہارون نے اسے اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ اس زمانے میں بغداد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن شہر سمجھا جاتا تھا۔

ہارون نے بحر ابیض متوسط (اب بحیرۂ روم) کے ساحل پر شہر طرطوس کو آباد کیا۔ روم کی سرحد پر کئی شہر اور قلعے تعمیر ہوئے۔ بہت سے پل تعمیر کروائے گئے۔ نہریں بنوائی گئیں۔ ان تمام اصلاحات کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا۔ موسم گرما کے دوران بغداد میں شدید گرمی پڑتی تھی، چنانچہ ہارون الرشید نے موسم گرما کا صدر مقام مدینۃ التجار کے نام سے بنوایا لیکن یہ بغداد سے دور تھا چنانچہ رقہ کے مقابل اپنے والد کے بنوائے ہوئے شہر رافقہ پر توجہ دی۔ وہاں ایک بڑا قصر تعمیر کروایا جس کا نام قصر السلام رکھا گیا۔ ہارون کے ایما پر یہاں دیگر صاحب ثروت لوگوں نے بھی عالیشان مکانات تعمیر کیے۔ گھڑ دوڑ اور چوگان (پولو) کے لیے میدان، شکار گاہیں، کشتیوں کے لیے لنگر گاہیں اور تفریح گاہیں تعمیر کی گئیں۔

ہارون الرشید نے وزارت کو دو قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ۔ تفویض کا وزیر تمام امور میں خلیفہ کا مددگار ہوتا تھا اور انتظامی معاملات اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ تنفیذ کا وزیر احکامات پر عمل درآمد کروانے کا ذمے دار تھا۔ کئی محکمے قائم کیے گئے تھے ان میں ایک اہم شعبہ "دیوانِ زمام" کے نام سے مشہور تھا جو آج کل کے لحاظ سے آڈیٹر جنرل کی طرح کا شعبہ تھا۔ جملہ سرکاری محکموں کے حسابات کی جانچ پڑتال یہیں ہوتی تھی۔ سیاسی خطوط کی تیاری اسی شعبے کا کام تھا، اس طرح کے خطوط پر مہر خلافت بھی یہیں لگتی تھی۔

دیوانِ خراج کا کام خراج اور جزیے کے حسابات مرتب کرنا تھا۔ دیگر شعبوں میں دیوانِ طرز (خلعتوں اور ملبوسات کا حساب) دیوانِ جند (فوج کے حسابات کی تنظیم)، دیوانِ برید (ڈاک سے متعلق خدمات)، دیوانِ مظالم (قاضیوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے)، دیوانِ شرطہ (پولیس کے معاملات)، دیوان الاکرہ (زراعت سے متعلق) شامل ہیں۔ ایک الگ محکمہ غیر مسلموں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے بنایا گیا تھا۔ محکمہ احتساب بھی تھا جس کا افسر اعلیٰ محتسب کہلاتا تھا۔ ہر شہر میں یہ محکمہ قائم تھا۔ اس کا کام بازاروں کی صورتِ حال پر نظر رکھنا، وہاں ہر قسم کی بدعنوانیوں کا سدباب کرنا اور راستوں کے انتظامات درست رکھنا تھا۔ محکمہ قضا کے تحت خلیفہ نے ہر شہر میں ایسے قاضی کا تقرر کیا تھا جو وہاں کی آبادی کی اکثریت کے فقہی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر کسی اور فقہی مسلک سے متعلق مقدمہ آ جاتا تو متعلقہ فقہ سے وابستہ قاضی کے پاس بھیج دیا جاتا۔ ہارون رشید نے قاضیوں کے سربراہ کے طور پر ایک نیا عہدہ "قاضی القضاۃ" قائم کیا تھا جو آج کل کے چیف جسٹس کے عہدے کے مساوی تھا۔ سب سے پہلے اس عہدے پر حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ کا تقرر ہوا۔ انہیں پوری مملکت میں قاضیوں کے تقرر کا اختیار تھا اس محکمے کی نگرانی ان کے سپرد تھی۔ خلیفہ کے خاص معاملات پر فتویٰ بھی وہی دیا کرتے تھے۔ مجالس علما میں شریک ہوتے تھے اور سفر پر خلیفہ کے ساتھ جاتے تھے۔ ۱۸۲ھ تک وہ اپنے فرائض

Marfat.com

خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

ہر شہر کا قاضی مقدمات کے فیصلے ہی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اوقاف کا نگران بھی تھا اور نابالغوں اور یتیموں کے ولی مقرر کرتا تھا۔ قاضیوں کو بہت معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ہارون اپنی رعایا کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے کئی طرح کی مجالس کا اہتمام کرتے تھے۔ مجالس کے آداب مقرر تھے۔ ان میں لغو، لایعنی باتوں، غیر شائستہ گفتگو اور طنز و مزاح کی کوئی گنجائش نہ تھی، البتہ بزم بے تکلف میں ہر شخص کو بات کرنے اور ظریفانہ گفتگو کی اجازت حاصل تھی۔ ہارون کا عہد خلافت خوشحالی اور فراخی کا عہد زریں تھا۔ ان کے دور میں خراج کی آمدنی سب سے اہم تھی۔ ذمیوں (غیر مسلموں) پر جزیہ (ٹیکس) فی کس ۱۴ تا ۱۸ درہم سالانہ تھا۔ تاہم ذمیوں میں معذور افراد، بچوں اور عورتوں پر جزیہ معاف تھا۔ زکوٰۃ، عشر سے بھی خطیر رقم حاصل ہوتی تھی۔ زراعت کو بھرپور انداز میں ترقی دی گئی تھی۔ محاصل سے چار کروڑ بیس لاکھ دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

لوہا، تانبا اور سیسہ بڑی مقدار میں خراسان میں پایا جاتا تھا، چنانچہ یہاں کے باشندے برتن، سازو سامان، آلات اور اسلحہ بنانے میں ماہر تھے۔ شام اور بصرہ کی طرح فارس کے باشندے بھی شیشہ سازی کی صنعت میں کمال رکھتے تھے۔ مینا کاری کا کام خوب کرتے تھے۔ انہیں سونے کے زیورات پر نقاشی اور جواہرات سے مرصع کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ زیورات میں خوبصورت تصویریں بھی بناتے تھے۔ سونے کی کانیں نفقور میں تھیں۔ چاندی طبرستان اور خزف میں، سنگ مرمر، تبریز میں، نمک اور گندھک شمالی فارس میں پایا جاتا تھا۔ کاغذ سازی کا فن بھی چین اور مصر سے آنے والوں کی بدولت یہاں پہنچ چکا تھا۔ کپڑوں پر طلائی بیل بوٹے بنانے کا فن فارس سے آیا تھا۔ پن چکیوں کا استعمال عام تھا۔ گھڑی بھی ایجاد ہو چکی تھی۔ مصر میں تجارتی اور جنگی جہاز اور کشتیاں بنانے کی صنعت عروج پر تھی۔ طب کے شعبے میں زبردست ترقی ہوئی تھی۔ خراسان اور آرمینیا والوں کو پردے اور فرش سازی میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ شام میں اعلیٰ قسم کا ریشم تیار ہوتا تھا۔ کوفہ میں باریک اون بنتا تھا جس کا نام ہی کوفیہ پڑ گیا تھا۔ موصل میں ریشم کا باریک کپڑا بنتا تھا جس کو موسلین کہتے تھے۔ اس عہد میں دباغت اور چرم سازی کی صنعت عروج پر تھی۔ گھوڑوں کی زینیں، جوتے اور دیگر اشیا بنتی تھیں۔ ہارون الرشید کی حکومت اور پڑوس کی مشرقی حکومتوں مثلاً چین، ہند، ترکستان اور روم وغیرہ کے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ شام فلسطین اور مصر کے تجارتی تعلقات بحری راستے سے، جنوبی یورپ سے قائم تھے۔ راستے محفوظ ہونے اور سہولتیں میسر آنے کی وجہ سے تجارت کو زبردست ترقی حاصل ہوئی۔ اس ترقی میں ڈاک کے محکمے نے بھی قابل ذکر کردار ادا کیا۔ ہارون کے دور میں محکمۂ ڈاک کو بہت ترقی دی گئی۔

ہارون الرشید کا دور اس لحاظ سے دیگر ادوار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں بے پناہ علمی اور تحقیقی کام ہوا۔ ہارون نے "بیت الحکمت" کے نام سے بغداد کے قصر خلافت میں تالیف اور ترجمہ کا بے مثال ادارہ قائم کیا۔ اچھی تنخواہوں پر علما اور مترجمین مقرر کیے۔ اس ادارے میں یونانی، فارسی اور دیگر متعدد زبانوں کی اہم اور بیش قیمت کتابوں کے عربی تراجم ہوئے۔ توریت اور انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ اسی عہد میں ہوا۔ ہارون کے دور میں طب، فلکیات، فلسفہ، حکمت، ادب اور افسانے کی کتب کو عربی زبان کے قالب میں ڈھالا گیا۔ ہارون الرشید ہی کے دور میں امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد بن حسنؒ نے فقہ پر بڑا کام کیا۔ تصوف کے موضوع پر کئی کتب تصنیف کی گئیں، احادیث کو جمع کر کے مرتب کرنے کا کام شروع ہوا۔ اس طرح علم حدیث وجود میں آیا۔ علم تاریخ پر کام شروع ہوا۔ فلسفہ، حکمت، حساب، ہندسہ، طب اور نجوم کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ہارون الرشید کو جب بھی کسی عالم کے بارے میں علم ہوتا تھا وہ کوشش کرتے تھے کہ انہیں بغداد بلایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے دور دور سے علما کو دعوت دی اور انہیں بغداد میں قیام کی سہولتیں مہیا کیں۔ ہارون کے دور میں جن مشاہیر نے وفات پائی، ان میں امام مالکؒ، امام لیث بن سعدؒ، امام ابویوسفؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، عبداللہ بن ادریس کوفیؒ، قاسم بن معنؒ، مسلم بن خالدؒ، اسد کوفیؒ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امام مالک کے شاگرد صعصعہ بن سلامؒ نے بھی اسی دور میں انتقال فرمایا۔

ہارون کا ایک بڑا کارنامہ امام ابویوسفؒ سے "کتاب الخراج" لکھوانا ہے۔ ہارون الرشید نے خلیفہ بننے کے بعد محسوس کیا کہ محصولات کی وصولیابی میں بے قاعدگیوں کو روکنے کی ضرورت ہے، چنانچہ انہوں نے امام ابویوسفؒ سے خراج کا قانون مرتب کروایا جو آج بھی "کتاب الخراج" کے نام سے موجود ہے۔ یہ کتاب خراج، صدقات، جزیہ وغیرہ سے متعلق قوانین کے بارے میں ہے لیکن اس میں حکومت اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت، ذمی اور مسلمان رعایا کے حقوق اور

Marfat.com

فرائض، حکومت کے عہدے داروں کے اختیارات اور فرائض اور اسلامی اصولِ حکمرانی کے متعلق بہت سی مفید ہدایات ہیں۔ ہارون نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ خراج کی تحصیل میں سختی کو کم کر دیا۔ ان کی اصلاحات کی بدولت، خاص طور پر کاشتکاروں کو کام کرنے کی آزادی میسر آئی اور مملکت میں زراعت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

ہارون الرشید کا عہدِ زریں فتوحات کے لحاظ سے بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ان کی حکومت مغرب میں اقصیٰ سے سرزمینِ سندھ تک، مشرق میں ارغِ چین تک، شمال میں آرمینیا اور جنوب میں سواحلِ یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے روم پر پانچ حملے کیے۔ اپنے والد کے عہدِ خلافت میں وہ روم پر دوبار حملے کر چکے تھے۔ پھر مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے روم پر تین بار فوج کشی کی، ۱۸۱ھ /۷۹۷ء میں انہوں نے صفصاف کا قلعہ فتح کیا۔ اسی سال ان کے ایک سالار عبدالملک بن صالح ایشیائے کوچک میں انقرہ تک بڑھتے چلے گئے اور مطمورہ کو فتح کر لیا۔ ۱۸۷ھ /۸۰۳ء میں قاسم بن رشید نے قرہ اور عباس جعفر نے حصن سنان کا محاصرہ کیا۔ دونوں شہروں کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ذنبیہ تک مسلمانوں کی حکومت کے باعث خشکی کے راستے شام پر رومیوں کا حملہ ممکن نہ تھا چنانچہ وہ بحیرۂ روم کے راستے شام کے ساحل پر حملہ کرتے تھے۔ ہارون نے ان حملوں کو روکنے کے لیے شام کے ساحل پر کئی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے بنوائے۔ شام اور مصر کے ساحلوں پر جنگی بیڑے تیار رکھے جاتے تھے، کشتیاں، جہاز اور جنگی سامان تیار کرنے کے کارخانے بھی تھے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ روم پر حکمراں، ملکہ آئرین، ہارون الرشید کو خراج دیا کرتی تھی۔ ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء میں ملکہ کے خلاف فوج کے سپہ سالار نقفور کی قیادت میں بغاوت ہوئی۔ نقفور بادشاہ بن بیٹھا تو اس نے ہارون رشید کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ پچھلا جتنا خراج ادا کیا گیا تھا وہ بھی واپس مانگا۔ ہارون الرشید کو یہ پیغام ملا تو شدید برہم ہوئے۔ اب اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عہد کر کے پھر جانے والوں کو طاقت کے زور سے مزہ چکھایا جائے۔ انہوں نے جنگ کی تیاریوں کا حکم دے دیا۔ تیاریاں جاری تھیں کہ خبر ملی کہ رومی فوج سرحد پار کر کے اسلامی حدود میں آگئی ہے اور مسلمانوں پر حملے کر رہی ہے۔ ہارون الرشید نے فوری طور پر ایک لاکھ تیس ہزار کی فوج اکٹھی کر کے پیش قدمی شروع کر دی۔ مسلمان لشکر رومی فوج کو دھکیلتے ہوئے روم کی سرحد کے اندر بڑھتا چلا گیا۔ ہر قلعہ فتح کیا اور اپنے دستوں کو مختلف سمتوں میں روانہ کیا گیا، جنہوں نے زبردست فتوحات حاصل کیں۔ پے در پے یلغار سے گھبرا کر نقفور نے امان طلب کی اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔

ہارون رقہ لوٹ گئے ابھی رقہ پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ اطلاع ملی، نقفور نے مسلمانوں کی آبادیوں پر پھر حملے کروادیے ہیں۔ یہ شدید سردی کا موسم تھا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ نقفور کا خیال تھا کہ اتنے خراب موسم میں مسلمان لوٹنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ ہارون الرشید نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوج کو واپس روم کی سمت بڑھنے کا حکم دے دیا۔ نقفور کی فوج سے خونریز جنگ ہوئی۔ آخر نقفور مجبور ہو گیا اور اس نے مملکتِ روم کے ایک ایک باشندے کا جزیہ ادا کر دیا اور تاوان کے طور پر تین لاکھ دینار ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

مسلسل جنگوں میں مصروف رہنے اور خراب موسم میں دشوار گزار سفر کرنے کی بدولت ہارون کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ جمادی الآخر ۱۹۳ھ / مارچ ۸۰۹ء میں انہوں نے ایک مہم میں خراسان کا سفر کیا۔ جرجان پہنچے تو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ارادہ کیا کہ بغداد لوٹ آئیں لیکن واپسی میں طوس پہنچ کر علالت نے شدت اختیار کر لی اور اسی شہر میں یہ عظیم شخصیت اپنی حیاتِ مستعار کے آخری لمحات گزار کر ۳ جمادی الآخر ۱۹۳ھ / ۲۴ مارچ ۸۰۹ء کو آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ انہیں طوس ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ہارون کی شخصیت علم و دانش، تقویٰ، خدا ترسی، حکمت و تدبر، خطابت، حبِ رسولؐ اور حمیتِ اسلامی جیسے اوصاف کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انہوں نے نہ صرف مملکتِ اسلامیہ میں علم کو بھرپور انداز میں فروغ دیا، بلکہ اس علم سے خود بھی بے اندازہ استفادہ کیا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے علم حاصل کیا۔ وہ جب کبھی کسی واعظ یا متقی بزرگ کی تعریف سنتے تو خود ان کے پاس جاتے اور ان سے نصیحتیں سنتے۔

وہ بھیس بدل کر بغداد کی مساجد میں نامور اساتذہ کے حلقہ ہائے درس میں ایک عام طالب علم کی طرح شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے لغت، حدیث اور نحو کے مانے ہوئے اساتذہ بھی دارالحکومت میں جمع کر لیے تھے۔ وہ انہیں اپنی مجلس میں بلا کر ان میں علمی اور فنی مذاکرے کرواتے تھے۔ ان اساتذہ میں کسائیؒ، مبارک بن فضالہؒ، ابو معاویہؒ، امام

Marfat.com

ابو یوسفؒ اور اصمعیؒ جیسے لوگ شامل تھے۔ ہارون کہا کرتے تھے، "ایک فرماں روا کے لیے اس سے بڑھ کر بُری بات کوئی نہیں کہ وہ عالم نہ ہو۔"

ہارون نے طلبِ علم کے لیے سفر کیے۔ امام مالکؒ سے 'موطا' سننے کے لیے وہ مدینہ منورہ گئے۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی، وہ اپنے خطبے میں قرآن پاک کی آیات اور احادیثِ نبویؐ ان کی اسناد کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وعظ و نصیحت سن کر ہارون بے اختیار رونے لگتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں بے حد عقیدت تھی۔ جب کبھی آپؐ کا نام لیا جاتا بے اختیار کہہ اٹھتے، "صلی اللہ علیٰ سیدی رسول اللہؐ۔"

ایک بار ایک محدث ابو معاویہ نے ہارون کے سامنے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "میری آرزو ہے، اللہ کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں۔" یہ حدیث سن کر روتے روتے ہارون کی ہچکی بندھ گئی۔ اپنے عہدِ خلافت میں ہارون الرشید نے نو حج کیے۔ ایک سال حج اور دوسرے سال جہاد کیا کرتے تھے۔ سو علما اور فقہا کو بھی اپنے ساتھ سفرِ حج پر اپنے خرچ پر لے جاتے تھے۔ جس سال حج نہ کرتے اس سال تین سو افراد کو حج پر روانہ کرتے تھے۔ آخری حج کے لیے ہارون نے رقہ سے مدینہ تک پیدل سفر کیا۔ اس سفر میں ان کی اہلیہ زبیدہ بھی ساتھ تھیں۔ اسی حج کے موقع پر زبیدہ نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک ایک نہر کھدوائی جس پر خطیر رقم صرف ہوئی۔ یہ نہر آج بھی نہرِ زبیدہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہارون نے اپنے معاملات انجام دینے کے لیے ہفتے کی ہر رات ایک مختلف کام کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ان میں وزرا، کاتبوں، سپہ سالاران، علما و فقہا، قاریوں اور عابدوں کے لیے راتیں مخصوص تھیں۔ ایک رات وہ بالکل تنہا گزارتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ یہ رات وہ عبادت میں صَرف کرتے ہوں گے۔ ہارون روزانہ فرض نمازوں کے علاوہ نفل بھی ادا کیا کرتے تھے اور اپنی ذاتی رقم سے صدقہ بھی دیا کرتے تھے۔ ہارون کو اپنی رعایا کی بڑی فکر رہتی تھی۔ رعایا کے حالات و مسائل سے باخبر رہنے کے لیے انہوں نے پوری مملکت میں ڈاک کا بہت اچھا انتظام قائم کیا تھا۔ خلیفہ کے نمائندے انہیں ہر علاقے کے عوام کی مشکلات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ہارون خود بھی راتوں کو بھیس بدل کر مختلف علاقوں کے دورے کرتے تھے تاکہ عوام کے مسائل جان سکیں۔ اس کے بعد وہ مستحق افراد کے وظیفے خاموشی کے ساتھ جاری کروا دیتے۔

پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ہارون کو بچپن ہی سے مختلف فنونِ حرب اور جفاکشی والے کھیلوں کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کا یہ وصف خلیفہ بننے کے بعد ماند نہیں پڑا بلکہ انہوں نے اسے اور جلا دی، وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بہترین نیزے بازی کر سکتے تھے۔ لکڑی کی میخیں زمین میں گاڑ کر تیز رفتار گھوڑا بھگاتے گزرتے اور تلوار سے میخ کے دو ٹکڑے کر دیتے۔ تیر اندازی اور شمشیر زنی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ تیر اندازی میں مہارت کا اندازہ یوں لگائیں کہ کبوتر کے پاؤں میں سنہرا دھاگا باندھ دیا جاتا پھر تیر اندازی ہوتی۔ دھاگا تیر سے کٹ جاتا لیکن کبوتر کو کسی طرح کا زخم نہ پہنچتا۔ گھوڑوں کی پرورش اور بار آوری کے لیے بڑی بڑی چراگاہیں اور وسیع میدان مخصوص کیے گئے تھے۔ کرخ، رصافہ اور رقہ میں گھڑ دوڑ کے خصوصی میدان موجود تھے۔

ہارون لباس اور طعام کے معاملے میں بے حد خوش ذوق تھے۔ تاہم وہ روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ کی طرح قیمتی جواہرات سے مزین تاج نہیں پہنتے تھے بلکہ قمیص، سیاہ جبہ اور عمامہ استعمال کرتے تھے۔

ہارون الرشید کے دورِ حکومت کا ذکر خاندانِ برامکہ کے بغیر ادھورا ہے۔ برامکہ کا خاندان بلخ میں آباد تھا۔ یہ ایک مجوسی گھرانہ تھا۔ اس خاندان کے جدِ اعلیٰ برمک کے بیٹے خالد نے اموی عہد کے آخری ایام میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ خالد بہت قابل منتظم تھے۔ ابو جعفر منصور خلیفہ بنے تو انہوں نے خالد کو طبرستان، رے، کا حاکم بنا دیا۔ منصور کے صاحب زادے محمد بن منصور (مہدی) "رے" میں مقیم تھے۔ خالد اور ان کے صاحب زادے یحییٰ کے روابط مہدی اور ان کے گھرانے سے بہت پختہ ہو گئے۔ یحییٰ کے بیٹے فضل اور جعفر کمسنی میں ہارون کے ساتھ کھیلتے رہے۔ پھر ہارون خلیفہ بنے تو انہوں نے یحییٰ، فضل اور جعفر کو اپنی حکومت میں نمایاں مقام دیا۔ یحییٰ اور ان کے دونوں صاحب زادے نہایت بیدار مغز اور ذہین تھے اور انہوں نے مملکت کا انتظام چلانے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔

ہارون الرشید کا ۲۳ سالہ دورِ خلافت، اسلامی تاریخ کا ایک ایسا روشن اور فروزاں باب ہے جس کی خیرہ کن چمک دمک اور آب و تاب صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح باقی ہے۔ اسلامی حکومت کو استحکام بخشنے اور مملکتِ اسلامیہ کو خوشحالی اور مسرت و شادمانی کا مرقع بنانے کے لیے ہارون الرشید نے جس خدا خوفی اور احساسِ ذمہ داری سے کام کیا، اس کا اعتراف اسی عہد کے معروف زاہد بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مجھے ہارون کی موت سے زیادہ صدمہ کسی امر کا نہیں ہوا۔ مجھے یہ گوارا تھا کہ اللہ میری عمر کا حصہ ہارون کی عمر میں زیادہ کر دیتا۔"

Marfat.com

مامون الرشید

ان کا بیس سالہ عہدِ حکومت علمی ترقی کا تابناک دور ہے

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

کمرے میں ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دو بستر پاس پاس بچھے ہوئے تھے۔ ایک بستر پر ایک بزرگ اور دوسرے پر ایک نسبتاً جوان شخص محو خواب تھے۔ اچانک بزرگ کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہیں بڑی شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن انہیں پانی نظر نہ آیا۔

"خیر تو ہے۔۔۔؟"

یہ بزرگ کے برابر سوئے ہوئے نوجوان شخص کی آواز تھی جو آہٹ سن کر بیدار ہو گیا تھا۔

"مجھے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔" بزرگ نے بتایا۔

نوجوان بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا، اس کے سرخی مائل سفید رنگ پر ڈاڑھی خوب سج رہی تھی، چہرے پر ایک تل بھی تھا، وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا اور صراحی لے کر چلا آیا۔ اس نے پانی نکال کر بزرگ کو ادب کے ساتھ پیش کیا۔ بزرگ نے پانی پینے کے بعد فرمایا۔۔۔ "کسی خادم سے کہہ دیا ہوتا۔"

نوجوان نے نرمی اور شائستگی سے کہا، "آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے "سید القوم خادمھم" (قوم کا سردار، قوم کا خادم ہوتا ہے)۔

یہ بزرگ تھے، حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام ترمذیؒ کے استاد یحییٰ بن اکثمؒ اور رات کے وقت ان کی خدمت بجا لانے والے یہ نوجوان تھے، مامون الرشید جن کی حکومت عرب سے ترکستان تک پھیلی ہوئی تھی، اور اندلس (اسپین) کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی خطہ ان کی قلمرو سے باہر نہ تھا۔ مامون الرشید کی وسیع مملکت میں موجودہ عرب، شام، مصر، عراق، ایران، سندھ، ترکی، افغانستان اور ترکستان شامل تھے۔ مامون کا بیس سالہ دور حکومت علمی ترقی کے اعتبار سے عباسی عہد کا سب سے تابناک دور ہے۔ ان کی کوششوں سے، مسلمان جدید علوم کے میدان میں ترقی کی منزلیں سر کرتے چلے گئے۔

دولتِ عباسیہ کے پانچویں خلیفہ ہارون الرشید کے فرزند مامون الرشید کا اصل نام عبداللہ ہے۔ مامون ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ/۱۴ستمبر ۷۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام مراجل تھا۔ وہ ہرات کے شہر بادغیس کی ایک کنیز تھیں۔ خراسان کے گورنر علی بن عیسیٰ نے ان کو ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مامون کو ماں کی آغوش صرف چند دن میسر آئی، ان کی والدہ کا انتقال، مامون کی ولادت کے دو چار دن بعد ہی ہو گیا تھا۔

مامون الرشید کی پیدائش ایک ایسی تاریخی رات عمل میں آئی جب عباسی خاندان کے چوتھے خلیفہ ہادی کا انتقال ہوا اور پانچویں خلیفہ ہارون الرشید نے زمام کار سنبھالی، اور ساتویں خلیفہ یعنی مامون پیدا ہوئے۔

ہارون الرشید کی ایک بیوی زبیدہ تھیں، ان کے بطن سے ایک لڑکا، مامون کی پیدائش کے تقریباً سات ماہ بعد پیدا ہوا، جس کا نام محمد رکھا گیا۔ یہی محمد، امین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ہارون نے مامون اور امین کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دی۔ دونوں تقریباً پانچ برس کے ہوئے تو ان کے لیے اساتذہ مقرر کیے گئے۔ دونوں بچے بہت ذہین تھے۔ ان کی تدریس کے لیے جن علما اور قابل اساتذہ کو زحمت دی گئی ان میں قرآن پاک کے عالم یزیدیؒ اور صرف و نحو کے ماہر کسائیؒ شامل تھے۔ کسائیؒ خود بتاتے ہیں کہ ایک بار میں ہارون الرشید کے پاس گیا، انہوں نے مجھ سے پوچھا، "اے علی! کیا تم محمد (امین) اور عبداللہ (مامون) سے ملنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا، "بالکل، مجھے تو ان کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔"

Marfat.com

یہ سن کر ہارون نے دونوں بیٹوں کو بلایا۔ وہ آہستگی اور وقار سے نگاہیں نیچی کیے ہوئے آئے۔ دونوں نے ادب سے سلام کیا۔ ہارون نے انہیں اپنے دائیں اور بائیں بٹھالیا اور مجھ سے کہا کہ قرآن پاک اور دیگر علوم میں ان دونوں کا امتحان لیجیے۔ میں نے مختلف سوالات کیے، دونوں نے میرے سوالوں کے جواب اتنی جلدی اور تہذیب سے دیے کہ میں عش عش کر اٹھا۔ میں نے دونوں کی خوب تعریف کی، خلیفہ نے دونوں کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا، پھر رخصت کر دیا۔

یزیدیؒ کے ذمہ مامون کی تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت بھی تھی۔ وہ گویا مامون کے اتالیق تھے، مامون کی عادات اور انداز نشست و برخاست کی نگرانی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جہاں مناسب سمجھتے تھے، سختی بھی کرتے تھے اور کوئی انہیں اس وجہ سے روک نہیں سکتا تھا کہ ان کا شاگرد سربراہِ مملکت کا بیٹا ہے۔ ایک دن یزیدیؒ تدریس کے لیے آئے، مامون کو کسی وجہ سے باہر آنے میں قدرے تاخیر ہوگئی۔ اس دوران میں خدام نے مامون کی کسی عادت کی شکایت کی۔ مامون باہر آئے تو ان کے اتالیق نے چھ سات بید مارے۔ مامون رونے لگے۔ اسی وقت وزیر مملکت جعفر برمکی آگئے اور مامون سے کوئی بات کرنے لگے۔ جب جعفر چلے گئے تو یزیدیؒ نے مامون سے پوچھا، "کیا تم نے جعفر سے میری شکایت کی؟" مامون نے ادب سے کہا، "استغفر اللہ، کیا میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے مجھے جو سزا دی ہے اس سے مجھے کس قدر فائدہ پہنچے گا۔" یزیدیؒ نے مامون اور امین کو تقریر اور برجستہ ادائیگی کا فن بھی سکھایا۔ ایک دن مامون نے جمعہ کا خطبہ پڑھا، یہ خطبہ اتنا پُر اثر تھا کہ سننے والوں کے دل لرز گئے اور بہت سے افراد رونے لگے۔

مامون نے قرآن پاک حفظ کیا، علم حدیث میں حضرت ہشیمؒ، عباد بن العوامؒ، یوسف بن عطیہؒ، ابو معاویہ النصرؒ، اسمٰعیل بن علیہؒ، اور حجاج الاعورؒ سے سند حاصل کی۔ اس زمانے میں حدیث کے فن میں یکتا، حضرت امام مالکؒ موجود تھے۔ ہارون الرشید نے ان سے درخواست کی کہ وہ مامون اور امین کو حدیث کی تعلیم دیں۔ امام مالکؒ نے بے نیازی سے فرمایا، "علم کے پاس لوگ آتے ہیں، علم لوگوں کے پاس نہیں جاتا"۔ ہارون الرشید نے یہ بات سنی تو مامون اور امین کو امام مالکؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ ہارون خود بھی اکثر امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے ان کی حدیث کی مشہور کتاب موطا پڑھا کرتے تھے اور مامون اور امین بھی ان کے ہمراہ امام مالکؒ کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

مامون نے فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ جب ہارون الرشید کوفہ گئے تو انہوں نے وہاں موجود حدیث کے تمام عالموں (محدثین) کو مدعو کیا۔ دو محدثین حضرت عبداللہ بن ادریسؒ اور حضرت عیسیٰ بن یونسؒ حکمران کے دربار میں نہیں آئے۔ ہارون الرشید نے مامون اور امین کو حکم دیا کہ وہ خود ان اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مامون اور امین حضرت عبداللہ بن ادریسؒ کے پاس پہنچے۔ حضرت عبداللہؒ نے سو احادیث بیان فرمائیں۔ مامون غور سے سنتے رہے اور جب احادیث مکمل ہوئیں تو مامون نے وہ تمام احادیث اسی وقت زبانی سنا دیں۔ حضرت عبداللہؒ، مامون کے اس زبردست حافظے سے بہت متاثر ہوئے۔

مامون نے اپنے دور کے تمام علوم میں دسترس حاصل کی تھی لیکن فقہ، تاریخ، ادب اور ایام عرب (اسلام سے قبل عرب کے حالات) کے تو وہ ماہر تھے۔ شاعری، انساب، فلسفہ، ریاضی میں بھی ان کا مطالعہ گہرا تھا۔ انہوں نے ابونواس، ابوالعتاہیہ اور اصمعی جیسے بلند پایہ شعرا اور سیبویہ اور فرا جیسے نحو (گرامر) کے ماہرین سے استفادہ کیا تھا۔ مامون کو طب سے بھی لگاؤ تھا اور انہوں نے طب کا علم حاصل کیا تھا۔

ہارون الرشید کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے چار بہت ممتاز تھے۔ مامون، امین، موتمن اور معتصم۔ ان چاروں میں مامون، درا امین اپنی لیاقت، ذہانت اور فراست کی وجہ سے فائق تھے لیکن ہارون الرشید کے تمام بیٹوں میں علم، عقل اور حسن سیرت کے اعتبار سے مامون ہی برتر تھے۔

ہارون الرشید نے ایک حکم نامے کی رو سے اپنے بعد امین اور ان کے بعد مامون کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مملکت کو امین اور مامون کے درمیان تقسیم بھی کر دیا تھا، اس تقسیم کے مطابق مامون کو مملکت کے نصف مشرقی حصہ کا عملاً خود مختار حکمران بنایا گیا تھا۔ اس حصے میں موجودہ ایران، افغانستان، سندھ اور ترکستان کے علاقے شامل تھے۔ امین کو موجودہ عراق، عرب، مصر اور شام کے علاقے دیے گئے تھے۔ ایک بیٹے معتصم کو ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ایشیائی ترکی کے سرحدی علاقے ملنے تھے۔ اس طرح ہارون کے بعد خلیفہ گو کہ امین کو بنایا جاتا لیکن عملاً خود مختاری امین اور مامون کو مملکت کے الگ الگ حصوں پر حاصل رہتی۔

۳ جمادی الثانی ۱۹۳ھ / ۲۴ مارچ ۸۰۹ء کو ہارون الرشید کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد امین نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، لیکن امین نے ایسے اقدامات کیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے بعد مامون کی بجائے

Marfat.com

اپنے بیٹے کو خلیفہ نامزد کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خطبہ سے مامون کا نام نکال کر اپنے بیٹے کا نام شامل کر دیا اور مامون کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائیوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ لڑائی تقریباً پانچ سال تک چلتی رہی، بالآخر امین کو گرفتار کرنے کے خواہش مند کچھ افراد نے ۲۴ اور ۲۵ محرم ۱۹۸ھ کی درمیانی شب امین کو قتل کر دیا۔ امین کے قتل کا مامون کو بے حد افسوس ہوا۔ بہر حال ۲۶ محرم ۱۹۸ھ / ۲۶ ستمبر ۸۱۳ء کو مامون نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ مامون کا دورِ خلافت بیس سال چھ ماہ رہا۔ اس دور کو عباسی خلافت کا دور زرّیں کہا جاتا ہے، کیونکہ علمی ترقی، استحکام حکومت اور خوشحالی کے اعتبار سے عباسیوں کے ۵۰۸ سالہ دور میں مامون ہی کا عہد اس قدر شاندار تھا۔

مامون الرشید کا دور علمی ترقی کے اعتبار سے بڑا درخشاں ہے۔ علمی پیش رفت کی ابتدا تو مامون الرشید کے والد ہارون الرشید کے دور ہی سے ہو چکی تھی جب ہارون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ یہاں اچھی کتابوں کے تراجم ہوتے تھے اور علمی تحقیق ہوتی تھی، مامون نے خلیفہ بننے کے بعد بیت الحکمت کو اس قدر وسعت دے دی کہ یہ ادارہ ایک عظیم یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا۔ مامون نے اس وقت کے نامور اور مایۂ ناز علما، مفکرین، محققین، مترجمین اور کتابوں کو اس ادارے میں یکجا کر دیا تھا۔ وہ ہر اچھی تصنیف یا ترجمے پر دل کھول کر انعام دیا کرتے تھے بلکہ جن کتابوں کے ترجمے وہ خود کرواتے تھے ان کے بدلے، مترجم کو تول کر سونا یا چاندی دیا کرتے تھے۔

مامون کی اس علم دوستی اور دریا دلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور دور سے اہلِ علم سمٹ کر بغداد میں جمع ہو گئے اور ہر موضوع پر بہت اعلیٰ پائے کا علمی اور تحقیقی کام ہونے لگا۔ مامون کے ایما پر مختلف زبانوں کی قیمتی کتب دور دور سے تلاش کر کے بیت الحکمت میں جمع کی جانے لگیں اور ان کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا آغاز ہو گیا۔ مامون کے علمی ذوق کو دیکھتے ہوئے دیگر امرا اور افسران میں بھی علم سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور انہوں نے بھی اپنے ذاتی کتب خانے قائم کر لیے۔ بیت الحکمت میں عربی، فارسی، یونانی، سریانی (شامی)، قبطی (مصری)، ہندی اور سنسکرت کی کتابوں کا عظیم خزانہ اکٹھا ہو گیا تھا۔

ان کتابوں کی تلاش میں جو دقت پیش آئی اس کا درست اندازہ تلاش کرنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔ مشہور مترجم حنین بن اسحٰق نے ایک رسالے میں ان دشواریوں کا ذکر کیا ہے، انہوں نے بتایا کہ ایک کتاب کی تلاش میں وہ فلسطین، مصر، شام اور جزیرہ (صحرائے شام اور ترکی کا درمیانی علاقہ) میں گھومتے پھرے لیکن صرف نصف کتاب دمشق میں مل سکی۔

مامون نے اسلام کی آمد سے قبل عرب کی تصانیف کا بڑا سرمایہ بھی بیت الحکمت میں اکٹھا کر دیا تھا۔ اس دور کے اشعار، خطوط، دستاویزات، معاہدے بڑی کوششوں سے حاصل کیے گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبد المطلب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رقعہ بھی تھا جو کپڑے پر لکھا ہوا تھا۔ اس طرح بیت الحکمت ایک عظیم کتب خانہ ہی نہ تھا بلکہ ایک عجائب گھر کی صورت بھی اختیار کر گیا تھا۔

حنین بن اسحٰق ۱۹۴ھ / ۸۰۹-۱۰ء میں پیدا ہوئے اور دسویں عباسی خلیفہ متوکل باللہ کے دور میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے حکیم جالینوس کی ایک سو اکیس کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے۔ مامون الرشید نے حنین کو دارالترجمہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ بقراط کی دس کتابوں کو عربی میں منتقل کیا گیا، ان میں سے سات کتابوں کے ترجمے حنین نے کیے۔ علم ہیئت کی مشہور کتاب "المجسطی" کا ترجمہ مامون نے حنین بن اسحٰق سے کروایا تھا۔ مترجمین کو عام طور پر دس ہزار درہم ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔

یعقوب بن اسحٰق کندی کے نام سے کون واقف نہیں؟ وہ بہت بڑے فلسفی، طب، حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ، نجوم کے ماہر اور بہت اچھے مترجم تھے۔ منطق میں ان کی کتابیں مسلم درس گاہوں کے نصاب میں چھٹی صدی ہجری تک رائج رہیں۔ انہوں نے دو سو بیاسی کتابیں تصنیف کیں۔ مامون نے ارسطو کی کتابوں کے ترجمے یعقوب کندی ہی سے کروائے تھے۔

علم جبر و مقابلہ پر ایک معرکہ آراء کتاب مامون کی فرمائش پر مشہور سائنس داں محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے لکھی۔ یہ تصنیف آج بھی موجود ہے۔ الخوارزمی نے مامون کے دور میں بے حد قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ستاروں کے علم پر مشتمل فہرست مرتب کی جو "زیچ" کہلاتی ہے۔ یہ زیچ نہایت قابلِ اعتماد تھی۔

مامون کے دور میں تین بھائیوں نے بھی سائنس پر بہت کام کیا۔ ان بھائیوں کے نام محمد، حسن اور احمد ہیں، یہ بنو موسیٰ کہلاتے تھے۔ ان

Marfat.com

کے والد موسیٰ بن شاکر علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کے تین بچے محمد، حسن اور احمد کم سن تھے۔ مامون نے انہیں اسحٰق بن ابراہیم کی زیر نگرانی دے دیا اور بیت الحکمت میں ان کی تربیت ہوئی۔ یہ تینوں بھائی حد درجہ ذہین تھے۔ انہوں نے ریاضی کی تمام شاخوں ہندسہ، علم الحیل والحرکات یعنی میکانیات موسیقی اور ہیئت میں نام پیدا کیا۔ ابن خلکان کے مطابق میکانیات کا علم مسلمانوں میں سب سے پہلے انہی بھائیوں کی وجہ آیا۔ انہوں نے بہت سے مسائل ایجاد کیے اور کتب تصنیف کیں۔ مامون رشید کو ان تینوں بھائیوں سے بہت محبت تھی، حتیٰ کہ وہ جب ایشیائے کوچک کے محاذ پر جہاد میں مصروف تھے تو وہاں سے بھی ان تینوں بھائیوں کی خبر گیری کے لیے ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔

مامون نے انہی تینوں بھائیوں کو حکم دیا تھا کہ علم ہیئت کے ماہرین کی مدد سے کسی ہموار اور وسیع صحرا میں تجربات کے ذریعے کرۂ ارض کے محیط کی پیمائش کریں۔ چنانچہ سنجار کے وسیع صحرا میں سائنسی آلات کی مدد سے تجربات کیے گئے اور یہ معلوم کیا گیا کہ زمین کا محیط چوبیس ہزار میل ہے۔

مامون وہ پہلے مسلمان فرمانروا ہیں جنہوں نے اجرام فلکی کے مشاہدے کے لیے رصد گاہ (آبزرویٹری) قائم کروائی۔ یہ عظیم رصد گاہ ۲۱۴ھ میں بغداد کے قریب شماسیہ کے مقام پر قائم کی گئی۔ یحییٰ بن منصور کو رصد گاہ کا مہتمم بنایا گیا۔ ایک رصد گاہ دمشق کے پہاڑ قاسیون پر بھی قائم کی گئی۔ مامون ہی کے عہد میں ایک سائنس داں ابو الحسن نے دور بین ایجاد کی۔ غرض یہ کہ مامون کے عہد میں حساب، جیومیٹری، فلسفہ، فلکیات، موسمیات، میکانیات اور طب پر بہت زیادہ کام ہوا۔ مامون کے حکم پر ابن خلف مروزی نے سائنسی آلات تیار کیے جن میں اسطرلاب (ستاروں کی بلندی، مقام اور رفتار بتانے والا آلہ) بھی شامل تھا۔

مامون نے خوزستان کے شہر جندیشاپور کے مدرسۂ طب کی بھی بھرپور سرپرستی کی۔ یہ شہر طبِ یونانی کا گہوارہ تھا اور یہاں بڑے بڑے فاضل اطبا موجود تھے۔ مامون کے کہنے پر انہوں نے طب پر بہت کام کیا۔

مامون نے ادب و صرف و نحو کو پروان چڑھانے پر بھی توجہ دی۔ انہوں نے مشہور شاعر اور ماہر لسانیات اصمعی کو بصرہ سے بغداد بلانا چاہا لیکن انہوں نے اپنی ضعیف العمری کا عذر پیش کیا تو مامون نے حکم دیا کہ نحو اور ادب کے مشکل مسائل اصمعی کے پاس بصرہ بھیجے جائیں۔ مامون نے علم نحو کے عالم فرانحوی سے کہا کہ وہ نحو (گرامر) کی ایک جامع کتاب تصنیف کریں جو عربی قواعد کے تمام اصولوں کا احاطہ کرے اور اس میں تمام محاورے بھی شامل ہوں۔ اس غرض سے مامون کی سرکاری رہائش گاہ میں ایک کمرہ مخصوص کیا گیا۔ کئی کاتب اور نقل نویس مقرر کیے گئے۔ فرا رات دن اس کمرے میں مصروف رہتے تھے، صرف نماز کے وقت ایک شخص اطلاع دیتا تھا "وقت ہوا۔" دو برس کی محنت و مشقت کے بعد نحو کی ایک عظیم کتاب تیار ہوئی جس کا نام "کتاب الحدود" رکھا گیا۔ مامون کی ہدایات پر اس کی کئی نقلیں تیار کر کے تمام کتب خانوں کو روانہ کی گئیں۔

مامون کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کو نئی زندگی دی۔ مامون سے قبل فارسی زبان میں جو شاعری ہوتی تھی، اس کے مجموعے، جنگوں میں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے اور اب فارسی شاعری رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جارہی تھی۔ مامون کے ایما پر جدید فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ عباس مروزی جو جدید فارسی شاعری کے بانی ہیں، مامون کے دور میں ابھرے۔ مامون کی کوششوں سے فارسی میں عربی کے ہزاروں الفاظ شامل ہوئے۔ مامون نے فارسی اور پہلوی زبانوں سے ترجمہ کے لیے سہل بن ہارون کو مقرر کیا تھا۔ وہ مجوسیوں کے علوم و فنون کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ عربی کے بڑے انشا پرداز بھی تھے۔ انہوں نے "کلیلہ و دمنہ" کی طرز پر ایک کتاب "ثعلہ و عفرا" لکھی تھی۔ صفِ اوّل کے شعرا ابو تمام اور ابو العتاہیہ، مامون ہی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

مامون کے دور میں فنِ خطاطی نے بھی ترقی کی۔ مامون سے قبل خطاطی کا رواج تھا لیکن خطاطی کے اصول و قواعد مامون ہی کے عہد میں مدوّن ہوئے۔ مامون کے وزیر اعظم نے بھی ایک خط ایجاد کیا جو "قلم الریاسی" کے نام سے مشہور ہے۔

مامون الرشید نے فلسفہ پر ارسطو کی متعدد تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کروانے کا اہتمام کیا۔ اس غرض سے انہوں نے قیصر روم کو لکھا کہ ارسطو کی تصانیف فراہم کریں، قیصر نے ارسطو کی کتابیں روانہ کر دیں۔

مامون کے اس علمی ذوق کے پیش نظر مختلف حکمران انہیں کتابوں اور صاحبانِ علم کی صورت میں تحائف بھیجا کرتے تھے۔ ہندوستان کے ایک راجا نے اپنے مشہور حکیم دوبان کو مامون کے پاس

Marfat.com

بھیجا۔ مامون کی اس علمی سرپرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ پوری مملکت میں ایک علمی ماحول پیدا ہو گیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ جب علامہ نضر بن شمیل بصرہ سے مامون کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوئے تو انہیں تین ہزار افراد نے رخصت کیا۔ ان میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو حدیث، نحو، لغت یا عروض کے فن میں ماہر نہ ہو۔ امام بخاریؒ اسی زمانے میں موجود تھے۔ خود براہ راست ان سے ان کی کتاب جامع صحیح بخاری پڑھنے والوں کی تعداد نوّے ہزار سے کم نہ تھی۔

مشہور فقہا کرام امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، حضرت سفیان بن عیینہؒ، امام واقدیؒ، سیرت نگار ابن ہشامؒ، مشہور سوانح نگار ابن سعدؒ، مامون ہی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مامون الرشید، حضرت یحییٰ بن اکثمؒ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت یحییٰ، امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کے استاد تھے۔ مامون نے قاضی (جج) کے مناصب حضرت یحییٰ اور حضرت احمد بن ابی داؤد کے سپرد کیے تھے۔

علم سے مامون کی دلچسپی کا حال یہ تھا کہ جنگوں میں انہیں مال غنیمت ملتا تھا تو حاصل ہونے والی کتابیں اہتمام کے ساتھ بغداد کے بیت الحکمت بھیج دی جاتی تھیں۔ ابن ندیم کہتے ہیں کہ مامون الرشید نے جب قیصر روم کو ایک معرکے میں شکست دی تو دونوں حکمرانوں کے درمیان ایک طویل خط و کتابت ہوئی تھی۔ اس خط و کتابت کے نتیجے میں جو صلح ہوئی، اس کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ قیصر مسلمانوں کو اپنی مملکت میں پائی جانے والی تمام کتب کے ترجمے کی اجازت دے گا اور یہ ترجمہ وہ لوگ کریں گے جنہیں مامون بھیجیں گے۔ یہ اسلامی تاریخ کی ایک تابندہ مثال ہے کہ ایک فاتح نے فتح کی قیمت کے طور پر علم طلب کیا ہو۔

مامون الرشید ادب، فلسفہ اور سائنس کے ماہرین کے ساتھ ہر منگل کو اجلاس منعقد کرتے تھے۔ اس میں اہم علمی مسائل پر مباحثے ہوتے تھے۔ مامون کو ریاضی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا حال یہ تھا کہ ان کے لباس کی آستینوں پر اقلیدس کی بنائی ہوئی ایک شکل پر مشتمل طغرہ بنا ہوتا تھا، اسی لیے اس شکل کو "شکل مامونی" کہتے ہیں۔ یہ شکل مامون کو بہت پسند تھی۔

مامون نے علمی مناظروں کا بھی اہتمام کیا۔ ان میں مذہبی اور فلسفیانہ نوعیت کے مناظرے بھی تھے۔ وہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتے تھے کہ اسلام دلیل اور نصیحت کے ذریعے نہیں پھیلا ہے۔ ان مناظروں کے چند اصول و قواعد تھے جن کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اصول یہ تھے: مناظر غصہ میں نہ آئے، تعجب نہ کرے، شور نہ کرے، اپنے مقابل کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے اور جب وہ بات کر رہا ہو تو تلاشِ حق اور سیدھی راہ کے حصول کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو۔

ان فلسفیانہ بحثوں کا ایک نقصان بھی ہوا کہ یہ بحثیں بہت شدت اختیار کر گئیں اور "خلق قرآن" کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فلسفے کے مطالعے کی وجہ سے مامون اس عقیدے کے قائل ہو گئے تھے کہ قرآن کریم مخلوق ہے۔ انہوں نے علمائے کرام کو مجبور کیا کہ وہ اس نظریے کو تسلیم کریں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس نظریے سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجے میں ان پر سختیاں کی گئیں۔ یہ مسئلہ مامون کے بعد آنے والے خلفا کے زمانے میں اور زیادہ شدت سے ابھر کر آیا۔

مامون الرشید، فقہ، حدیث، ادب، ایام العرب، شاعری، انساب، فلسفہ، ریاضی غرض ہر مروّجہ علم میں ماہر تھے۔

ایک بار مامون کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ محدث ہے اور اس کی عمر اسی فن میں گزر گئی ہے۔ مامون نے اس سے ایک مسئلے کے بارے میں حدیث بیان کرنے کے لیے کہا، وہ خاموش رہا۔ مامون نے خود بیسیوں احادیث بیان کر دیں اور ان کے حوالے بھی بتائے۔ پھر ایک اور مسئلے کی بابت پوچھا۔ وہ شخص پھر بھی خاموش رہا۔ مامون نے اس شخص کو نصیحت کی اور کچھ رقم دلوا کر رخصت کر دیا۔

ایک بار حدیث، فقہ، نحو اور شعر کے استاد، نضر بن شمیل مامون کے پاس آئے۔ مامون نے ان سے ایک حدیث بیان کی جس میں وہ ایک لفظ کو زبر کے ساتھ پڑھ گئے۔ نضر نے اسی حدیث کو خود بیان کیا اور اس میں وہی لفظ زیر کے ساتھ ادا کیا۔ مامون سنبھل کر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے، کیا یہ لفظ زبر کے ساتھ غلط ہے۔ نضر نے کہا، جی ہاں، اور ایک شعر بطور سند پیش کیا۔ مامون نے سر جھکا لیا۔ پھر مختلف مضامین کے اشعار سنے اور رخصت ہوتے ہوئے نضر کو ایک خط دیا جس میں خزانہ کے حکام کو نضر کو رقم دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔

مامون ادب، لسانیات اور شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی فہم و فراست کا عالم یہ تھا کہ ایک موقع پر عمارہ بن عقیل نے ان کے پاس آ کر سو اشعار پر مشتمل پوری نظم سنائی۔ ہر شعر کا پہلا مصرعہ سن کر مامون کہہ دیتے تھے کہ اس کا قافیہ یہ ہے۔ عمارہ سخت حیران ہو کر کہنے لگے، بخدا

Marfat.com

میں نے یہ نظم آپ سے پہلے کسی کو نہیں سنائی۔ مامون کو قدیم شعرائے عرب کے علاوہ اس دور کے شعرا کے سیکڑوں اشعار یاد تھے اور وہ ان اشعار کو برمحل طریقے پر ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مامون بے حد سادہ مزاج، انکسار پسند، صاحب دل، فیاض اور وسیع الظرف حکمران تھے۔ ایک دن مامون نے اپنے خادم کو کسی کام کے لیے آواز دی، کوئی نہ آیا۔ دوبارہ آواز دی تو ایک خادم آیا اور آتے ہی بڑبڑانے لگا، "کیا خادم کھاتے پیتے نہیں، جب ذرا کسی کام کے لیے باہر جاؤ، آپ بلانے لگتے ہیں۔" مامون نے سر جھکا لیا۔ اس وقت ایک صاحب عبداللہ بن طاہر بھی موجود تھے، انہوں نے دل میں سوچا کہ مامون اپنے خادم کو اس بدتمیزی کی سزا ضرور دیں گے مگر مامون نے عبداللہ سے کہا "نیک مزاجی میں یہ بڑی مشکل ہے کہ نوکر اور خادم بدخو ہو جاتے ہیں لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کو نیک خو بنانے کے لیے میں بدمزاج ہو جاؤں۔"

مامون کا عفو و درگزر انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنی ذات کے لیے انتقام لینا پسند نہ کرتے تھے اور دیگر کوتاہیوں پر بھی صَرفِ نظر کر جاتے تھے۔ ان کے دور میں ایک مشہور شاعر دعبل تھے لیکن وہ کسی وجہ سے مامون کے مخالف ہو گئے تھے۔ دعبل نے مامون کے خلاف کئی اشعار کہے۔ مامون نے دعبل کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہ کی بلکہ دعبل نے مامون کی ہجو میں جو اشعار کہے تھے ان کے ادبی پہلو اور زبان کی شائستگی کی تعریف کی۔ مامون کو دعبل کے یہ اشعار بھی یاد تھے۔

ایک بار ایک شخص سے جو کئی بار نافرمانی کر چکا تھا مامون نے کہا، "تم جس قدر گناہ کرتے جاؤ گے، میں بخشتا جاؤں گا۔ یہاں تک کہ عفو تم کو تھکا کر درست کر دے گا۔"

مامون کی اس نرم دلی اور عفو پسندی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ امورِ مملکت چلانے کے معاملے میں کمزور تھے، مامون کا انتظام بے حد عمدہ اور مستحکم تھا۔ وہ ایک بیدار مغز حکمراں تھے۔ ان کے اہلکار پوری مملکت میں پھیلے ہوئے تھے جو تمام واقعات اور حالات سے ان کو باخبر رکھتے تھے۔ وہ جہاں کوئی خرابی محسوس کرتے تھے فوراً کارروائی کرتے تھے، ہر شعبے کے الگ الگ خفیہ نویس اور وقائع نگار مقرر تھے۔ ایک بار کسی شخص نے درخواست پیش کی کہ مجھے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے۔ مامون نے اس سے پوچھا، تمہارے کتنے بچے ہیں۔ اس شخص نے بچوں کی تعداد اصل تعداد سے بڑھا کر بیان کی۔ اس شخص کو وظیفہ نہیں دیا گیا، کیونکہ مامون کو اپنے ذرائع سے علم ہو چکا تھا کہ اس شخص نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس شخص نے دوبارہ درخواست دی جس میں بچوں کی درست تعداد لکھی، اب کی بار اسے وظیفہ دے دیا گیا۔

مامون اپنے ماتحتوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کو سخت ہدایات جاری کرتے رہتے تھے، مثلاً ایک افسر بن الفضل طوسی کو لکھا، "تمہارا درشت خو ہونا تو میں نے گوارا کیا لیکن رعایا پر ظلم تو برداشت نہیں کر سکتا"۔ ایک اور شخص ہشام کو انتباہ کیا، "جب تک ایک شخص بھی میرے دروازے پر تمہاری شکایت لے کر آئے گا، تمہاری مجھ تک رسائی نہ ہو گی۔"

نظام انصاف بہت عمدہ تھا۔ پوری مملکت میں قاضی موجود تھے، ہر اتوار کو صبح سے ظہر تک مامون خود بھی اپنی عدالت میں بیٹھتے تھے۔ اس عدالت میں کوئی بھی فرد آ کر شکایت کر سکتا تھا۔ انصاف سے کوئی بھی فرد بالاتر نہ تھا حتیٰ کہ خود مامون بھی عام آدمیوں کی طرح عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ ایک بار مامون پر کسی شخص نے کچھ رقم کا دعویٰ کر دیا، مامون کو عدالت میں طلب کیا گیا، مامون عدالت میں حاضر ہوئے، ان کے خادموں نے ان کے لیے کچھ اہتمام کرنا چاہا۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) نے حکم دیا کہ یہاں مدعی اور مدعا علیہ برابر ہیں، کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ مامون، قاضی القضاۃ کے اس جرأت مندانہ اقدام پر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قاضی القضاۃ کی تنخواہ میں اضافے کا حکم دیا۔

خلیفہ کے بعد، سب سے بڑا عہدہ وزیراعظم کا تھا۔ ان کے علاوہ کاتب کا عہدہ وزیر کے برابر تھا۔ اس عہدے پر بہت پڑھے لکھے اور سمجھدار شخص کو رکھا جاتا تھا۔ وہ تمام احکام، معاہدے وغیرہ اپنی خاص عبارت میں لکھ کر دستخط کرتا اور سرخ روشنائی سے مہر لگاتا تھا، قاضی کے ذمہ مقدمات کے فیصلوں کے علاوہ یتیموں، بیواؤں کی جائیداد کے انتظامات اور مستحقین کی امداد وغیرہ بھی تھی۔ محتسب کا کام یہ تھا کہ عام جگہوں پر کوئی کام خلافِ شریعت نہ ہو رہا ہو۔

مامون نے ملکی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ تجارت آزادی سے کی جا سکتی تھی۔ نئے شہر آباد ہو رہے تھے۔ مامون پوری مملکت کا دورہ کرتے تھے اور انتظامات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ معذوروں، یتیموں اور محتاجوں کے وظیفے مقرر تھے۔ حکام کو ہدایت تھی کہ ان کے علاقے میں اگر کوئی فاقے سے ہو یا تنگدست ہو تو

Marfat.com

اسے کوئی روزگار دلوائیں یا وظیفہ مقرر کریں۔
غیر مسلموں سے جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ فی کس ۴۸ درہم سالانہ تھا۔ مامون کے عہد میں غیر مسلموں کے ساتھ بڑی رواداری برتی جاتی تھی، چنانچہ انہیں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی آزادی حاصل تھی۔

مامون کی شادی ان کے وزیر حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام خدیجہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ سخی بھی تھیں۔ انہوں نے بغداد میں کئی شفاخانے اور خواتین کے لیے مدرسے بنوائے۔

مامون نے اپنی اولاد کی تربیت پر بھی توجہ دی تھی۔ ان کے دو بیٹے فرّا نحوی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک بار فرّا کسی کام سے اٹھے۔ دونوں بچے استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے دوڑے۔ دونوں میں تکرار ہونے لگی کہ یہ سعادت کون حاصل کرے گا، آخر دونوں نے ایک ایک جوتی سیدھی کی۔ مامون کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرّا سے کہا، اگر آپ ان بچوں کو اس کام سے روکتے تو مجھے افسوس ہوتا، پھر دونوں بچوں اور فرّا نحوی کو دس دس ہزار درہم دیے۔

مامون نے اپنے دورِ حکومت میں اظہارِ رائے کی آزادی کو بڑی اہمیت دی۔ ان کی حکومت نے ایک اعتبار سے پارلیمانی طرز اختیار کر لیا تھا۔ مملکت میں آباد تمام قوموں کے نمائندوں کی ایک کونسل بنائی گئی تھی۔ اس کونسل کے اجلاس ہوتے تھے اور نمائندوں کو اپنا موقف آزادی سے بیان کرنے کا حق حاصل تھا۔

ایک بار ایک شخص مامون کے پاس آیا اور پوچھنے لگا، "آپ نے خلافت زبردستی حاصل کی ہے یا تمام مسلمانوں نے اتفاقِ رائے سے آپ کو منتخب کیا ہے۔" مامون نے کہا "نہ زبردستی حاصل کی ہے نہ اتفاقِ رائے سے۔ بات یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جو حکمران تھے، انہوں نے مجھے خلیفہ بنانے کے لیے عام بیعت لی اور حکومت کے ارکان نے اس پر دستخط کیے۔ حکمران کے انتقال کے بعد میں نے سوچا کہ ایسی شخصیت کو اقتدار سنبھالنا چاہیے جس پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو، لیکن ایسا شخص نہ مل سکا، ادھر ملک کے انتظام کے لیے ضرورت تھی ورنہ بدنظمی پھیل جاتی، مجبوراً میں نے انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور منتظر بیٹھا ہوں کہ دنیا کے سارے مسلمان اتفاقِ رائے سے کسی ایک شخص کو منتخب کر لیں تو میں حکومت اسے دے دوں۔"

مامون الرشید نے اپنے دورِ حکومت میں ملکی استحکام پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جہاد کی جانب بھی توجہ دی۔ انہوں نے کابل پر فوج کشی کی۔ کابل کے حکمران نے اسلام قبول کر کے اطاعت کا اعلان کیا۔ اس علاقے میں متعدد مساجد تعمیر ہوئیں۔ ترکستان کے علاقے اشروسنہ کا حاکم کاؤس مسلمان ہو گیا۔ مامون کے وزیر نے کشمیر اور تبت کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ تبت دراصل کشمیر میں لیہہ اور لداخ کا علاقہ تھا جو تبت خُرد کہلاتا تھا۔ تبت خُرد کے رئیسوں میں سے بھی ایک نے اسلام قبول کیا۔

مامون کے دور میں یورپ میں بھی فتوحات ہوئیں۔ عباسی خلافت کی باج گزار حکومت اغالبہ کے فوجی افسر ابو حفص اندلسی نے جزیرہ اقریطش (کریٹ) کو فتح کیا۔ یہ جزیرہ بحیرۂ روم میں واقع ہے۔ مامون ہی کے عہد کی ایک یادگار فتح صقلیہ (سسلی) کی فتح ہے۔ اس سلسلے میں جو اسلامی فوج صقلیہ پر حملہ آور ہوئی تھی اس کے سپہ سالار حضرت امام مالکؒ کے شاگرد اور مشہور محدث اسد بن فرات تھے۔

ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) پر ہونے والی فوج کشی کی قیادت مامون نے خود کی۔ اس زمانے میں یہاں رومیوں کی حکومت تھی اور یہ سارا علاقہ رومی سلطنت میں شامل تھا۔ جمادی الاول ۲۱۵ھ میں مامون کو اطلاع ملی کہ ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے میں رومی فوج مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ مظلوم مسلمانوں میں سے ایک عورت نے "ہائے محمد" کہہ کر آواز دی۔ یہ بات مامون تک پہنچی۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی تیاریاں کیں اور رومیوں پر چڑھائی کر دی۔ جب اسلامی فوج رومی سلطنت کی سرحد پر پہنچی تو قیصر روم کے ایلچی صلح کا پرچم تھامے مامون کے پاس آ پہنچے، انہوں نے مندرجہ ذیل پیشکش کی:

۱۔ دارالخلافہ سے یہاں تک پہنچنے میں آپ کے جو اخراجات ہوئے ہیں وہ ہم پورے کریں گے۔
۲۔ ہمارے ملک میں جتنے بھی مسلمان قیدی ہیں انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیں گے۔
۳۔ اسلامی مملکت کے شہروں کو رومیوں کے حملوں میں جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ہم کریں گے۔

آپ سے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے دارالخلافے واپس چلے جائیں۔

یہ پیشکش خاصی پُرکشش تھی۔ مامون، ایلچیوں کا پیغام سن کر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر انہوں نے جا کر دو رکعت نماز ادا کی، دعا کرنے کے

Marfat.com

بعد قیصر روم کے قاصدوں کو بلوایا اور کہا: "پہلی شرط کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ تم اپنا تحفہ اپنے پاس رکھو، دوسری پیشکش بھی بے سود ہے، کیونکہ جو مسلمان دین کی خاطر لڑنے گئے وہ اگر قید میں ہیں تو قید ان کے لیے باعثِ فخر ہے اور اگر وہ دنیا کی خاطر گئے ہیں تو وہ قید ہی کے مستحق ہیں۔ تیسری پیشکش بھی مجھے منظور نہیں ہے کیونکہ قید ہوتے وقت جس مسلمان عورت نے "ہائے محمد" کہہ کر پکارا ہو گا، میں اس کی دردناک آواز کو روم کے بڑے سے بڑے قلعے کے بدلے بھی فروخت نہیں کر سکتا۔"

جنگ شروع ہو گئی، مسلمانوں نے کئی قلعے فتح کر لیے، ان میں طرسوس اور مصیصہ شامل تھے۔ مامون دمشق واپس آئے لیکن ۲۱۶ھ میں سرحد سے اطلاع آئی کہ قیصر روم کے حکم پر طرسوس اور مصیصہ کے سرحدی علاقوں میں رومی فوج نے سیکڑوں مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ مامون نے یہ اطلاع ملنے پر فوجی تیاریوں کا حکم دیا او راسلامی لشکر رومی سلطنت کی سرحد پر جا پہنچا۔ مامون خود اس لشکر کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کے بھائی معتصم نے تیس بڑے قلعے فتح کیے۔ مامون کے بیٹے عباس نے بھی کئی قلعوں کو تسخیر کیا۔ ان پے درپے حملوں سے گھبرا کر ۲۱۷ھ / ۸۳۲ء میں قیصر روم نے صلح پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس نے صلح کا جو پیغام دیا اس میں سفارتی آداب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور تکبر کا اظہار کیا گیا تھا۔

مامون نے اس پیغام کے بعد جہاد کا عام حکم جاری کر دیا اور فوج کو رومی سلطنت کی سمت پیش قدمی کی ہدایت دے دی۔ اس زمانے میں رومیوں کا سب سے مشہور قلعہ لوکوہ تھا۔ مامون کی زیر قیادت فوج نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن جب کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو مامون نے حکم دیا کہ قلعے کے مقابل کچھ فاصلے پر دو نئے قلعے تیار کیے جائیں۔ قیصر روم بذات خود قلعہ تک فوج لے کر آیا لیکن ڈر کر واپس چلا گیا۔ مامون کے دو سپہ سالار جبلہ اور ابو اسحٰق نے قلعہ لوکوہ پر حملہ کر دیا۔ لوکوہ والوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء میں مامون نے رومی سرحد کے قریب طورنہ کے مقام پر ایک شہر بسانے کا حکم دیا۔

مامون کا ارادہ غالباً یہ تھا کہ وہ رومی سلطنت کے اہم ترین شہر قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوں لیکن اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔ ایک دن وہ اپنے بھائی معتصم کے ساتھ نہر بذندوں پر گئے۔ یہ مقام موجودہ ترکی میں طرسوس کے قریب ہے اور کلک بو غازی کہلاتا ہے۔ طرسوس، ایشیائے کوچک اور شام کی سرحد پر واقع ایک شہر ہے۔ مامون نے نہر کا پانی پیا جو بہت سرد تھا، وہاں سے واپسی پر بدن میں حرارت محسوس ہوئی اور بخار چڑھ آیا۔ قیام گاہ پہنچے تو علالت شدید ہو گئی اور یہی علالت ان کے لیے سفر آخرت کا پیغام ثابت ہوئی۔ جمادی الثانی اور ایک اور روایت کے مطابق رجب ۲۱۸ھ / جولائی ۸۳۳ء میں مامون نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی عمر تقریباً ۴۸ برس تھی۔ انہوں نے بیس سال چھ ماہ حکومت کی۔

مامون جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو انہوں نے اپنے بھائی ابو اسحٰق معتصم کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عباس کو خلافت کے لیے منتخب نہ کیا حالانکہ وہ بھی بہت اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

مامون الرشید نے اس جہاں سے رخصت ہونے سے قبل اپنے اہل خاندان علما اور امرا کو یکجا کیا اور جو کلمات ادا کیے اس سے ان کی خدا ترسی اور خشیتِ الٰہی کے احساس کا پتا چلتا ہے۔ ان کے آخری خطاب کے چند جملے یہ ہیں:

"مجھ کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے اور امید اور خوف دونوں مجھ پر حاوی ہو رہے ہیں، لیکن جب میں اللہ کے عفو کا خیال کرتا ہوں تو امید کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے... تعریف کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے، دیکھو میں کس قدر بلندی پر فائز تھا لیکن اللہ کے حکم کے آگے کچھ زور نہ چل سکا، بلکہ حکومت نے میری آئندہ زندگی اور بھی پُر خطر کر دی۔" پھر انہوں نے اپنے بھائی معتصم کو جنہیں بارِ خلافت اٹھانا تھا، مخاطب کر کے کہا، "اے ابو اسحٰق، میرے حال سے عبرت حاصل کرو، اللہ نے خلافت کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے، تم کو ایسے شخص کی طرح رہنا چاہیے جو اللہ کی طرف سے احتساب سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔ رعایا کی بھلائی کو ہر وقت ترجیح دینا، جو زور آور ہے وہ کمزور کو ستانے نہ پائے، ضعیفوں سے محبت کے ساتھ پیش آنا...۔"

اس کے بعد مامون نے قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کیں اور پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔ ہوش آیا تو آسمان کی طرف دیکھا اور ان کی زبان سے نکلا، "اے وہ، جس کی سلطنت کبھی نہ زائل ہو گی اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر یہ عظیم فرمانروا ابدی نیند سو گیا۔

مامون الرشید کو طرسوس میں دفن کیا گیا۔

Marfat.com

معتصم باللہ

آٹھویں عباسی خلیفہ جن کے دور میں سلطنت روم کا اہم شہر عموریہ فتح کیا گیا

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی!

سخت سردی کا موسم تھا۔ بارش کی وجہ سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، لیکن بارش اور سردی کی پروا کیے بغیر کچھ لوگ گھوڑے دوڑائے چلے جا رہے تھے۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور آن بان سے صاف ظاہر تھا کہ کسی بڑے آدمی کی سواری گزر رہی ہے۔ گھوڑوں پر لدے سامان سے لگتا تھا کہ یہ افراد شکار کھیلنے کے لیے جا رہے ہیں۔

راستے میں ایک نالہ نظر آیا۔ اس نالے کے قریب ایک بوڑھا پریشان کھڑا تھا۔ اس کے پاس ایک خچر تھا جس پر بہت سی لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ شاید وہ نالہ پار کرنا چاہتا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے خچر کو نالے میں اتار دیا اور نالہ پار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن خچر بوجھ سمیت نالے میں گر پڑا۔ بوڑھے نے پورا زور لگا لیا لیکن خچر کو اٹھا نہ سکا۔ خچر پر بوجھ بہت زیادہ تھا۔

دوڑتے ہوئے گھوڑے رک گئے۔ ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار شخص نے انہیں رکنے کا حکم دیا تھا۔ اس شخص کی رنگت سرخی مائل سفید تھی اور اس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بوڑھے کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ کچھ لوگ نالے میں اتر پڑے، انہوں نے زور لگا کر بوڑھے اور خچر کو اٹھانا چاہا لیکن اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ دیکھ کر خوبصورت گھوڑے پر سوار شخص خود نیچے اتر آیا اور نالے میں اتر گیا۔ سب لوگوں نے مل کر کوشش کی تو بوڑھے کو اٹھا لیا۔ اس طرح لکڑیوں سے لدے خچر کو بھی نالے سے باہر نکال لیا گیا۔ بوڑھا اور خچر نالے سے باہر آ گئے تو اس شخص نے بوڑھے کو تسلی دی پھر سب لوگ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

نالے میں اتر کر بوڑھے لکڑہارے کی مدد کرنے والے یہ تھے آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم باللہ، جن کا دورِ حکومت استحکام اور خوشحالی کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ آپ کے عہد حکومت میں رومی سلطنت کا اہم شہر عموریہ فتح کیا گیا۔

معتصم باللہ پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے صاحب زادے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۰ھ /۷۹۶ء میں سلطنت روم کی سرحد سے قریب ایک مقام "زِبطرہ" میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا نام ماردہ تھا۔ ہارون الرشید کو معتصم باللہ سے بہت محبت تھی۔

معتصم باللہ کو بچپن ہی سے جنگی فنون سے دلچسپی تھی۔ وہ جسمانی اعتبار سے بہت طاقتور تھے۔ دلیری اور جانبازی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ ہارون الرشید نے ایک قابل شخص کو معتصم کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا تھا۔ معتصم نے حصولِ علم کے لیے تو غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن وہ بہت ذہین تھے اور ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔

اپنے بھائی مامون الرشید کے دور حکومت میں معتصم باللہ شام اور مصر کے حاکم رہے۔ اس طرح ان کی انتظامی صلاحیتوں کو جِلا ملی۔

ساتویں عباسی خلیفہ مامون الرشید بیس برس خلافت کے فرائض انجام دینے کے بعد رجب ۲۱۸ھ میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے اپنے بیٹے عباس کی بجائے اپنے بھائی معتصم باللہ کو خلیفہ بنانے کی ہدایت کی تھی، چنانچہ رجب ۲۱۸ھ / اگست ۸۳۳ء میں معتصم باللہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

معتصم کو خلیفہ بنتے ہی اطلاع ملی کہ خراسان کے پہاڑی علاقے

Marfat.com

میں ڈاکوؤں نے شرانگیزی شروع کر دی ہے۔ یہ لوگ سرخ لباس پہنتے تھے اس لیے اہل عرب انہیں "محمرہ" کہتے تھے۔ معتصم نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کچھ افراد کو بھیجا لیکن ناکامی ہوئی تاہم جب سخت کارروائی کی گئی تو علاقے میں امن وامان ہو گیا۔

معتصم کو ایک اور سیاسی تحریک کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ تحریک ایک شخص بابک خرمی نے ۲۰۱ھ / ۸۱۶ء میں شروع کی تھی۔ اس کا مرکز ایران میں گیلان اور آذر بائیجان کے دشوار گزار کوہستان میں تھا۔ مامون الرشید کو بھی اس تحریک کی وجہ سے خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مامون نے معتصم کو وصیت کی تھی کہ خرمیوں سے غفلت نہ برتنا، ان کا فتنہ بہت خطرناک ہے۔

معتصم نے ایک ماہر ترک سالار حیدر بن کاؤس (جو "افشین" کے نام سے مشہور تھے) کو خرمی تحریک کے استیصال کے لیے روانہ کیا۔ افشین نے پوری تیاری کے ساتھ کوچ کیا۔ وہ برزند پہنچے۔ علاقے میں رسد کا انتظام کیا۔ نئی چوکیاں قائم کیں۔ ڈاک کا انتظام درست کیا۔ افشین اور بابک میں معرکہ آرائی کا سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ درمیان میں برفباری کی وجہ سے جنگ رک گئی۔ موسم درست ہونے کے بعد افشین نے پیش قدمی کی۔ مختلف سمتوں میں فوج پھیلا دی۔ یدالروز میں فوجیں متعین کر کے رمضان ۲۲۳ھ / اگست ۸۳۷ء میں بابک کے مستقل مرکز بذ کی طرف بڑھے۔ بابک اس طویل جنگ سے پریشان ہو چکا تھا، اس نے بات چیت کی خواہش ظاہر کی لیکن بات چیت موثر ثابت نہ ہوئی۔ اس اثنا میں معتصم نے جعفر خیاط کی قیادت میں ایک بڑا لشکر بطور کمک روانہ کیا۔ شدید لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کی فوج بذ میں داخل ہو گئی۔ بابک فرار ہو گیا اور آرمینیا میں جا چھپا، لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ کامیابی دو سال کی جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی۔ بابک کی گرفتاری اہم واقعہ تھا۔ اس کی دھوم پوری دنیائے اسلام میں مچ گئی۔ بابک کو دارالحکومت سامرہ لایا گیا جہاں صفر ۲۲۴ھ / جنوری ۸۳۸ء میں اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بابک خرمی کا خاتمہ معتصم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اگر اس فتنے کو ختم نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کو شدید نقصان ہوتا۔ بابک نے دو لاکھ سے زائد افراد کو قتل کیا تھا اور ہزاروں افراد کو قید کر رکھا تھا۔

معتصم کا دور حکومت عموریہ کی جنگ کی وجہ سے بڑا یادگار ہے۔ عموریہ دراصل ایک بہت مضبوط قلعہ تھا جو رومیوں کی سلطنت میں شامل تھا۔ سریانی زبان میں یہ اموریَن کہلاتا تھا۔ یہ قلعہ عظیم بوزنطی (رومی) فوجی سڑک پر واقع تھا جو قسطنطنیہ (استنبول) سے 'کیلیے کیا' کو جاتی ہے۔

جس زمانے میں معتصم باللہ کی فوج، بابک خرمی کے خلاف کارروائی میں مصروف تھی، اس دوران بابک خرمی نے روم کے شہنشاہ تھیوفیبلوس (توفیل) بن میخائل کو ترغیب دی کہ معتصم نے تو اپنی تمام فوج حتیٰ کہ درزی اور باورچی تک کو میرے مقابلے کے لیے بھیج دیا ہے آپ یوں کریں کہ مسلمانوں کے دارالحکومت پر حملہ کر دیں کیونکہ اس وقت دارالحکومت خالی ہے اور اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ توفیل کو یہ بات پسند آئی۔ اس نے ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ مملکتِ اسلامیہ پر چڑھائی کر دی۔ بالائی دجلہ کے علاقے "زِبطرہ" میں رومی فوج نے تباہی مچادی۔ مسلمان مردوں کو قتل کر ڈالا، بچوں اور خواتین کو گرفتار کیا گیا۔ مطلیہ کے علاقے میں قلعوں کو تباہ کر دیا اور بعض مسلمانوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر کر ان کی ناک کان کاٹ ڈالے۔ گرفتار ہونے والوں میں سے ایک خاتون نے چیخ کر معتصم کو مدد کے لیے پکارا۔

اس حملے کی خبر لانے والوں نے اس خاتون کی پکار بھی معتصم تک پہنچائی۔ معتصم اس وقت اپنے امرا کے ساتھ اجلاس میں مصروف تھے۔ جونہی انہوں نے رومیوں کے مظالم کی تفصیل سنی اور یہ سنا کہ ایک مظلوم خاتون نے ان کی غیرت کو للکارا ہے تو وہ اسی وقت "لبیک لبیک" (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں) کہتے ہوئے اپنی نشست سے اتر آئے۔ فوراً جنگی تیاریوں کا حکم دیا اور اپنا مخصوص گھوڑا سواری کے لیے طلب کر لیا۔ ہر طرف جنگ کے نقارے بجنے لگے اور تھوڑی دیر بعد فوج کوچ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس موقع پر علم نجوم کے ماہرین نے معتصم کو مشورہ دیا کہ ستاروں کے مطابق یہ وقت جنگ کے لیے مناسب نہیں ہے لیکن معتصم نے ان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

معتصم نے بغداد کے قاضی عبدالرحمن بن اسحاق، شعبہ بن سہل اور دیگر ۳۲۸ امرائے مملکت کو طلب کیا اور ان کے سامنے وصیت کی: "میری جائیداد کا ایک تہائی میری اولاد کو، ایک تہائی میرے خدام کو دیا جائے اور ایک تہائی حصہ راہِ خدا میں صرف کیا جائے۔" جمادی الاول ۲۲۳ھ / اپریل ۸۳۸ء میں فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ فوج نے دجلہ کی مغربی سمت پڑاؤ ڈالا۔ معتصم نے اپنے افسروں عجیف، عمرو وغیرہ کو زِبطرہ کے مظلوم مسلمانوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلانے کے

Marfat.com

لیے بھیجا۔ رومی فوج اس وقت تک لوٹ مار کر کے واپس جا چکی تھی۔ مسلمان فوج کے آجانے سے مسلمانوں میں خوف و ہراس دور ہوا اور جو لوگ زبطرہ چھوڑ کر چلے گئے تھے، وہ واپس زبطرہ آکر آباد ہو گئے۔ اس دوران معتصم کی فوج بابک خرمی کے مقابلے میں فتح حاصل کر چکی تھی۔ معتصم کو اپنی اس فوج کی واپسی کا انتظار تھا۔ یہ فوج بھی واپس لوٹ آئی۔

معتصم نے امراء سے پوچھا کہ "رومیوں کے نزدیک ان کا کون سا شہر سب سے زیادہ اہمیت کا مالک ہے؟" امراء نے بتایا "عموریہ"۔ معتصم نے فوراً لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ اس مہم کے لیے غیر معمولی تیاری کی گئی کیونکہ مقابلہ دنیا کی ایک بہت بڑی فوجی طاقت سے تھا۔ اسلحہ، جانور، خیمے، چرمی حوض، آتش گیر مادے اور دیگر فوجی ساز و سامان اتنی کثرت سے جمع کیا گیا کہ اس سے قبل کسی مہم میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔

آرمینیا کے قریب فریقین کا سامنا ہوا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ابتدا میں تو مسلمان فوج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا اور اس کے پیدل سپاہیوں کی بڑی تعداد شہید ہو گئی لیکن پھر مسلم سپاہ نے سنبھل کر حملے شروع کر دیے۔ ایسی افراتفری مچی کہ رومی سپاہی بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب لڑائی کا زور تھما تو، توفیل نے دیکھا کہ اس کے "وفادار" ساتھی فرار ہو چکے ہیں۔ وہ سخت برہم ہوا۔ اس نے اپنے افسران کو سخت سزائیں دیں، پھر حکم دیا کہ انگورہ (انقرہ) کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ توفیل کے آدمیوں نے اطلاع دی کہ اسلامی فوج کے حملے کے خوف سے انگورہ کے شہری شہر چھوڑ بھاگے ہیں۔ اس پر توفیل نے فیصلہ کیا کہ اہم شہر عموریہ کی حفاظت کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

معتصم کے جاسوسوں نے توفیل کے اس فیصلے کی اطلاع معتصم تک پہنچا دی۔ معتصم فوج لے کر عموریہ جا پہنچے۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا جو کئی روز تک جاری رہا۔ اس جنگ میں ہزاروں رومی سپاہی مارے گئے اور ہزاروں زخمی ہو گئے۔

عموریہ کے محافظ نے معتصم سے رحم کی درخواست کی۔ معتصم نے اسے امان دے دی۔ اسی وقت مسلمان فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ اس طرح ۵۵ روز کے محاصرے کے بعد شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ معتصم نے فوجیوں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کسی قسم کی لوٹ مار نہ ہو، نہ ہی شہریوں کو پریشان کیا جائے۔ مسلمانوں کو اتنا زیادہ مال غنیمت حاصل ہوا کہ پانچ دن تک نیلام ہوتا رہا۔ جب معتصم عموریہ کی مہم سے ظفریاب ہو کر لوٹے تو مشہور شاعر ابو تمام نے ایک قصیدہ لکھا جس میں کہا گیا کہ تقدیر کے فیصلے ستارے نہیں کرتے۔

عموریہ کی فتح نہایت اہم واقعہ تھا۔ اس سے پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ اس فتح کے بعد معتصم نے قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کے پیش نظر رسول اقدس ﷺ کی یہ حدیث رہی ہو گی کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہو گا اسے اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے (صحیح بخاری)۔

معتصم قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے لیکن انہیں دارالحکومت سے ملنے والی ایک اہم خبر کی وجہ سے حملے کا ارادہ ترک کر کے واپس جانا پڑا۔ مامون الرشید کے بیٹے عباس (معتصم کے بھتیجے) کو بعض افراد نے بہکا دیا کہ مامون الرشید کے بعد خلافت تو دراصل آپ کا حق تھا، یہ معتصم صاحب کیسے خلیفہ بن گئے۔ آپ بغاوت کر دیں۔ اس طرح ایک سازش کا تانا بانا بُنا گیا۔

معتصم کو یہ خبریں ملیں تو وہ فوراً دارالحکومت واپس آ گئے۔ عباس کو گرفتار کر کے ان کا مال و اسباب ضبط کر کے فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ عباس کچھ عرصے بعد قید میں انتقال کر گئے۔

معتصم نے فوج کو بہت ترقی دی۔ ان کی فوج میں ایک لاکھ سوار اور ایک لاکھ پیدل سپاہی ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق معتصم کی فوج اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی فوج تھی۔ معتصم کی قیادت میں اس فوج نے طبرستان، سیستان، آذربائیجان، فرغانہ، روم، ماوراء النہر اور کابل وغیرہ میں نمایاں فتوحات حاصل کیں۔

معتصم کو ترک فوجیوں سے بہت لگاؤ تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی والدہ ترک تھیں، دوسرے یہ کہ معتصم خود جنگجویانہ اوصاف کے مالک تھے اور دلیری و جانبازی کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فوج میں ترک جوانوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کر لیا۔ ان کے لیے خاص قسم کی خوبصورت وردیاں تیار کروائیں۔ ترک جوانوں کو انہوں نے سمرقند، فرغانہ اور اشروسنہ وغیرہ سے بلوایا۔ ترکوں کی اس فوج کا نام "فرغانہ" رکھا۔ دوسری طرف عرب سپاہیوں کی فوج تیار کی گئی۔ اس کا نام "مغاربہ" رکھا۔

ترک سپاہیوں کو یکجا کر کے مضبوط فوج تشکیل دینے سے فوائد تو بہت ہوئے لیکن بعد میں یہی فوج، خلافتِ عباسیہ کے لیے غیر مفید ثابت ہوئی کیونکہ جب حکومت میں عدم استحکام آگیا تو یہی ترک اس پر

Marfat.com

غالب آ گئے اور خلفا کا وقار جاتا رہا۔ معتصم کو اپنے دورِ حکومت کے آخری حصے میں اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنے ایک معتمد سے اس بات کا اعتراف بھی کیا۔

انہی ترک فوجیوں کی وجہ سے معتصم کو اپنا دارالخلافہ بغداد سے منتقل کرنا پڑا اور دارالخلافہ کے لیے ایک نیا شہر "سامرا" بسانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بغداد کے شہریوں کو ترک فوجیوں کی سخت مزاجی، درشت رویے اور زیادتیوں پر شدید اعتراض تھا۔

سامرا کی تعمیر معتصم کا ایک اہم اقدام تھا۔ آج تو سامرا دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے، تکریت اور بغداد کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن تقریباً گیارہ سو برس قبل سامرا ایک نہایت پُر رونق شہر تھا۔ سامرا، ۲۲۱ھ سے ۲۷۹ھ / ۸۳۶ء سے ۸۹۲ء تک دارالخلافہ رہا۔ اس دوران سات عباسی خلفا نے حکومت کی۔ اس کے بعد دارالخلافہ پھر بغداد منتقل کر دیا گیا تھا۔ آج دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سامرا کے کھنڈرات وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سامرا دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر سات فرسخ (۲۱ میل) دور تک چلا گیا تھا۔

بغداد سے ۷۵ میل شمال میں تعمیر ہونے والے اس شہر کے نام کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ بعض مؤرخین کے خیال میں یہ "سام راہ" تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ "سائی امراء" یا "سامرا" یعنی "خراج ادا کرنے کی جگہ" تھا۔ معتصم باللہ نے جب اس شہر کو دارالخلافہ بنایا تو اس کا نام "سُرَّ مَنْ رائی" (یعنی جس نے اسے دیکھا، وہ خوش ہوا) کر دیا۔ معتصم نے جو سکے تیار کروائے ان پر یہی نام درج تھا۔

سامرا کی سب سے خوبصورت عمارت "قصر سامرا" تھی۔ اس محل کی بنیاد ۲۲۱ھ / ۸۳۶ء میں رکھی گئی۔ یہ محل اس سطح مرتفع کے کنارے تعمیر کیا گیا جو دریائے دجلہ کے نشیبی علاقے سے ۱۷ میٹر بلند تھی۔ اس نشیبی علاقے میں ۱۲۷ مربع میٹر کا ایک طاس تھا جس سے ساٹھ میٹر چوڑا زینہ باب العامہ کی طرف بڑھتا تھا۔ باب العامہ تقریباً بارہ میٹر بلند تین محرابوں پر مشتمل تھا۔ اس قصر کے کھنڈرات میں سب سے بہتر حالت میں یہی حصہ رہ گیا ہے۔ باقی مقامات پر صرف ایک یا دو میٹر بلند دیواریں رہ گئی ہیں۔

باب العامہ کے عقب میں چھ ایوان اور پھر ایک مربع صحن تھا۔ شمال میں خلیفہ کے کمرے اور جنوب میں حریم واقع تھا۔ آگے جا کر تخت گاہ تھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھی۔ اس سے آگے ایک سو اسی میٹر چوڑا اور تین سو پچاس میٹر طویل سطح میدان تھا۔ مزید آگے چوگان بازی کا میدان تھا۔

محل میں لکڑی کا سارا کام ساگوان کی مدد سے کیا گیا تھا جس پر بہت نفیس نقش و نگار کندہ کیے گئے تھے۔ کمروں میں مرمر کی سلیں لگائی گئی تھیں۔

دارالخلافہ بننے سے قبل سامرا میں آٹھ مسیحی خانقاہیں موجود تھیں۔ معتصم نے شہر میں متعدد جدید عمارتیں تعمیر کروائیں جن میں ایک قصر کا نام "الجوش" تھا۔ معتصم نے شہر میں ایک بڑی جامع مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد کا مینارہ اتنا بلند تھا کہ چاروں طرف سے ایک فرسخ (تین میل) کے فاصلے سے دکھائی دیتا تھا۔ خلیفہ کی خواہش تھی کہ اذان کی آواز پورے شہر میں سنائی دے اسی لیے اس مینار کو بلند رکھا گیا تھا۔ مینار کی بلندی ۱۷۰ ذراع (۱۷۰ گز) تھی۔ غالباً یہی وہ مینار ہے جو موجودہ سامرا سے نصف میل شمال میں واقع ہے اور "مینار ملویہ" کہلاتا ہے۔ اس کے گرد باہر کی طرف چکر دار زینہ ہے۔

سامرا میں تعمیرات کے لیے مملکت کے ہر حصے سے ماہر کاریگر اکٹھے کیے گئے تھے۔ ساگوان کی لکڑی بڑی مقدار میں لائی گئی۔ بصرہ سے کھجور کی لکڑی، انطاکیہ (شام) اور لاذقیہ (ایشیائے کوچک) سے سنگِ مرمر منگوایا گیا۔

معتصم نے دارالخلافہ سامرا کے مقابل، دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سیر و تفریح کے لیے ایک بہت خوبصورت باغ تیار کروایا تھا۔ اس باغ کو دارالخلافہ سے کشتیوں کے پل کے ذریعے منسلک کر دیا گیا تھا۔ بصرہ سے کھجور کے درخت، خراسان اور شام کے دور دراز مقامات سے نایاب پودے لا کر اس باغ میں لگائے گئے تھے۔ اس دور میں سامرا ایک کامیاب تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یہاں اعلیٰ قسم کے برتن تیار ہوتے تھے۔ سامرا سے ملنے والے ظروف تین قسم کے ہیں۔ سفید مٹی کے جن پر خطاطی نما نیلے رنگ کے نقش و نگار ہیں، دوسرے مٹی کے برتن جنہیں مختلف رنگوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ غالباً ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی کے چینی سنگی ظروف سے متاثر ہو کر بنائے گئے تھے۔ تیسرے مجلا کے نام سے مشہور ظروف ہیں جن میں مختلف دھاتوں کے رنگ جھلکتے ہیں۔ ان ظروف کی تجارت عالم اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری تھی چنانچہ ان ظروف کے بہت سے ٹکڑے خلافتِ قرطبہ کے دارالامارات، مدینۃ الزہرا سے برآمد

Marfat.com

ہوئے ہیں۔

سامرا میں کپڑے پر کشیدہ کاری، سوزن کاری، کپڑے میں عبارت بُن دینے کا فن بھی عروج پر تھا۔ اس قسم کی اشیا بھی سامرا کے آثارِ قدیمہ سے ملی ہیں۔ اس عہد میں کپڑے کی صنعت عروج پر تھی۔ چھاپ والا ریشمی کپڑا اور خز (مضبوط پشم اور اون کو ملا کر بنایا گیا کپڑا) تیار ہوتا تھا جو بہت مقبول تھا۔ زیور، چمڑا، خوشبودار تیل، عطر، صابن اور شیشے کی صنعت نے بغداد میں بڑی ترقی کی تھی۔

معتصم کا دور حکومت زرعی ترقی کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہیں زراعت کو فروغ دینے، بنجر اراضی کو قابلِ کاشت بنانے اور ویرانوں کو آباد کرنے سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کا کہنا تھا: "زمین کی آبادی میں بہت سے فوائد ہیں، اس سے مخلوق کی زندگی قائم ہے، خراج بڑھتا ہے، ملک کی دولت وثروت میں اضافہ ہوتا ہے، مویشیوں کے لیے چارہ مہیا ہوتا ہے، اشیا کے نرخ کم ہو جاتے ہیں اور لوگوں کے معاش میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔"

معتصم کے دور میں بغداد، مرو، سمرقند، کوفہ، اہواز، اصفہان، دمشق، حلب اور صنعا میں ٹکسالیں قائم تھیں جہاں دینار، نصف دینار، تہائی دینار کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔

معتصم کے عہد حکومت میں بھی نہایت لائق اور قابل شخصیات موجود تھیں جنہوں نے بیش قدر علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں امام احمد بن حنبلؒ تھے جو دس لاکھ احادیث کے حافظ تھے اور جن کی مرتب کردہ احادیث کی کتاب "مسند احمد" عالم گیر شہرت کی حامل ہے۔ آپؒ بہت بڑے فقیہ بھی تھے۔ چار مشہور فقہی مسالک میں سے ایک یعنی حنبلی مسلک، آپ ہی کی ذات سے منسوب ہے۔ آپؒ نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اسی دور میں حدیثوں کی سب سے صحیح کتاب "صحیح بخاری" کے مرتّب امام بخاریؒ بھی موجود تھے۔ معتصم کے انتقال (۲۲۷ھ / ۸۴۲ء) کے وقت امام بخاریؒ کی عمر تقریباً ۳۴ برس تھی۔

حدیثوں کے ایک اور امام، امام مسلمؒ کی عمر اس وقت تقریباً ۲۱ برس تھی۔ ایک اور فقیہ محمد بن ابراہیمؒ تھے جو ابن عوام کے نام سے زیادہ معروف تھے۔ اس زمانے میں سحنونؒ کا بہت چرچا تھا۔ سحنونؒ کا تعلق افریقیہ (تیونس) سے تھا۔ وہ ۱۶۰ھ / ۷۷۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں وفات پائی، یعنی وہ معتصم کے پورے دورِ حکومت میں موجود رہے اور انہوں نے معتصم کے انتقال کے بعد مزید تقریباً تیرہ برس کی زندگی پائی۔ آپؒ نے فقہ مالکی کی کتاب 'مدونہ' مرتب فرمائی جس میں ۳۶ ہزار مسائل شامل ہیں۔

اسی دور میں تاریخ اور سیرت نگاری کا کام بھی ہوا۔ مؤرخ علی بن محمد مدائنی (۱۳۵ھ تا ۲۲۵ھ / ۷۵۲ء تا ۸۴۰ء) نے اپنی عمر کا آخری حصہ بغداد میں گزارا۔ اس دور میں ایک اہم سیرت نگار محمد ابن سعد تھے جو ۱۶۸ھ / ۷۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء میں یعنی معتصم کی وفات کے دو برس بعد انتقال کیا۔ آپ نے تابعین اور نامور علما اور فقہا کے حالات زندگی پر ایک عمدہ کتاب مرتب کی جو "طبقات ابن سعد" کہلاتی ہے۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے۔

امام احمدؒ کے ساتھیوں میں علی بن سعد بن شدادؒ بھی تھے۔ آپؒ فقیہ اور محدث تھے۔ ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء میں وفات پائی۔ احمد بن حفصؒ فقہ اور حدیث میں امام محمدؒ کے شاگرد ہیں۔ اس کے علاوہ شداد بن حکیم بلخیؒ امام زفرؒ کے اصحاب میں سے تھے۔ فقیہ اور محدث تھے۔ آپؒ کا انتقال ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء میں ہوا۔ حدیث اور فقہ کے ایک اور عالم حضرت عیسیٰ بن ابانؒ تھے جنہوں نے ۲۲۱ھ میں وفات پائی۔ ایک اور بڑے محدث اور فقیہ نعیم بن حمادؒ تھے۔ آپؒ کا انتقال ۲۲۹ھ / ۸۴۳ء میں ہوا۔ امام ابو یوسفؒ کے ایک شاگرد فرخ تھے۔ امام محمدؒ کے اصحاب میں اسماعیل بن ابی سعید الجرجانیؒ (وفات ۲۳۰ھ) اور نصر بن زیاد نیشاپوری بھی تھے۔

شعر و ادب کے میدان میں نامور ادیب، اور انشاپرداز جاحظ کا تذکرہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ ۱۵۱ھ / ۷۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء میں انتقال فرمایا۔ سادہ طرزِ تحریر، پاکیزہ ظرافت، خیالات کی گہرائی اور شاعرانہ نغمگی آپ کی نثر نگاری کی خوبیاں ہیں۔ جاحظ کے سرپرست معتصم کے وزیر ابن عبدالملک بن زیات تھے۔ ان کی کتاب، کتاب الحیوان بڑے عرصے تک ان چار کتب میں شمار کی گئی جن پر عربی ادب کا دارومدار ہے۔

ابو تمام (۱۸۰ھ تا ۲۲۸ھ / ۷۹۶ء تا ۸۴۲ء) بہت اچھے شاعر تھے۔ انہیں معتصم کے دربار میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ابو تمام کا عربی ادب کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ انہوں نے عرب شعرا کے کلام کے متعدد مجموعے مرتب کیے۔ ان میں سے ایک مجموعہ "حماسہ" کو آج تک عربی شاعری کا مستند مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ معتصم باللہ کے وزراء بھی نہایت قابل اور دانا تھے تاہم ان کے پہلے وزیر فضل بن مروان کے

Marfat.com

بارے میں مورخین کی آرا اچھی نہیں ہیں۔ معتصم نے شکایات موصول ہونے پر ان کی جگہ احمد بن عمار کو وزیر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد معتصم نے اپنے ایک اور قابل ساتھی محمد بن عبدالملک الزیات کو وزیر بنادیا۔ محمد بن عبدالملک کے دادا زیتون کی تجارت کرتے تھے اس لیے وہ الزیات کہلانے لگے۔ محمد بن عبدالملک شعر و ادب، تاریخ، قوانین اور دیگر علوم کے ماہر تھے۔ نہایت فہیم اور ذہین شخص تھے۔ وہ بڑے ادیب، فاضل اور صرف و نحو کے اچھے عالم اور نہایت اعلیٰ شاعر بھی تھے۔

اس دور میں احمد بن ابی داؤد کو پوری مملکت کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بڑے عالم تھے۔ نامور ادیب اور انشا پرداز جاحظ کی سرپرستی انہوں نے ہی کی۔ ان کے عقائد سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی علمی حیثیت کا سب اعتراف کرتے ہیں۔

معتصم کے دورِ حکومت کا ایک منفی پہلو فقہ کے عظیم المرتبت امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ سخت سلوک ہے۔ مامون الرشید کے دور میں قرآن کریم کو مخلوق قرار دینے کے عقیدے پر جس تنازعے کا آغاز ہوا تھا وہ معتصم کے دور میں بھی جاری رہا۔ معتصم باللہ کے دور میں امام احمد بن حنبلؒ کو سخت اذیتیں دی گئیں۔ معتصم کے پورے عہد میں امام صاحبؒ گوشہ نشین رہے۔ معتصم نے اپنے افسران کو ہدایت کی کہ امام صاحبؒ پر سختی نہ کی جائے لیکن جو امرا امام صاحبؒ کے مخالف تھے ان کے کہنے پر امام صاحبؒ کو ایذائیں دی گئیں۔

معتصم بہت قوی ہیکل تھے اور غیر معمولی قوت کے مالک تھے۔ بہت وزنی سامان اٹھا کر چل سکتے تھے۔ جنگوں میں انہوں نے بے مثال تہور اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ معتصم کی معلومات وسیع تھیں۔ انہیں شاعری سے شغف تھا اور وہ خود شعر کہا کرتے تھے۔

حکومت پُرشکوہ انداز میں کرنے سے معتصم کو بہت دلچسپی تھی اور وہ اس ضمن میں تمام سرکاری آداب کو پیش نظر رکھتے تھے لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ بہت سادگی پسند تھے۔

معتصم بہت فیاض بھی تھے۔ قاضی ابن ابی داؤد کہتے ہیں کہ معتصم باللہ نے صرف میرے ذریعے ایک کروڑ درہم نیک کاموں میں خرچ کیے۔

محرم ۲۲۷ھ / اکتوبر ۸۴۱ء میں معتصم کی طبیعت خراب ہوگئی۔ افاقہ ہوا لیکن پھر طبیعت بگڑ گئی اور ۲۰ ربیع الاول ۲۲۷ھ / ۷ جنوری ۸۴۲ء کو معتصم انتقال کر گئے۔ انہیں سامرا میں سپرد خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

مہتدی باللہ

ان کے اصلاحی اقدامات نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور کی یاد تازہ کر دی

افطار کا وقت قریب تھا!

دو افراد بیٹھے اذان کے منتظر تھے۔ چند لمحوں بعد اذانِ مغرب کی صدا بلند ہوئی۔ دونوں افراد نے اپنے مہربان و رحیم رب کریم و عظیم کے پاک اور بابرکت نام سے روزہ افطار کیا۔ اس کے بعد یہ دونوں حضرات نمازِ مغرب ادا کرنے کے لیے مسجد کی سمت روانہ ہو گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد یہ دونوں افراد پھر اسی جگہ یکجا ہوئے۔ ذرا سی دیر میں کچھ اشیائے خورونوش لا کر رکھ دی گئیں۔

ان دونوں افراد میں ایک صاحب خانہ تھے، وہ گندمی رنگت اور دبلے پتلے جسم کے مالک تھے۔ ان کی پیشانی کشادہ اور ڈاڑھی نہایت خوبصورت تھی۔ انہوں نے دوسرے صاحب کو کھانے کی دعوت دی۔ دوسرے صاحب نے کھانے پر نظر ڈالی۔ بید کی ایک چھوٹی سی ٹوکری میں دو روٹیاں تھیں، ایک برتن میں تھوڑا سا نمک تھا، دوسرے برتن میں سرکہ اور تیسرے برتن میں زیتون کا تیل تھا۔ ان صاحب نے دل میں سوچا یہ محض افطاری ہے اصل کھانا بعد میں آئے گا اور چند لقمے لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔

گندمی رنگت اور خوبصورت ڈاڑھی والے صاحب نے مہمان سے دریافت کیا:

"کیا آپ کا آج روزہ نہ تھا؟"

"جی ہاں، تھا۔" جواب ملا۔

"تو کیا کل روزہ رکھنے کا ارادہ نہیں ہے؟" سوال ہوا۔

"رمضان المبارک کا مہینہ ہے، روزہ کیوں نہ رکھوں گا۔" مہمان نے حیران ہو کر جواب دیا۔

"تو پھر جو کھانا سامنے ہے، اسی کو تناول فرمایئے اور یہ امید نہ رکھیے کہ مزید کھانا آئے گا، کیونکہ اس کے سوا میرے لیے اور کوئی کھانا نہیں ہے۔" صاحب خانہ نے سکون اور متانت سے کہا۔

مہمان کے چہرے پر تعجب کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے حیرانی سے کہا: "آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر طرح کی نعمتیں عطا کی ہیں پھر بھی آپ کے کھانے میں ان چند چیزوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

حسین ڈاڑھی والے صاحبِ خانہ نے مہمان کی بات سکون سے سنی اور گویا ہوئے: "آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ درست ہے لیکن میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اُسوہ پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سیرت کو اپنانے کے خواہش مند یہ درویش صفت انسان تھے ۱۴ویں عباسی خلیفہ مہتدی باللہ جن کی حکومت ہزاروں مربع میل کے وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مہتدی باللہ نے انتہائی نامساعد حالات میں خلافتِ اسلامیہ کی ذمہ داری سنبھالی۔ انہیں ایک سال سے بھی کم عرصہ، حکومت کا موقع ملا لیکن اس مختصر مدت میں انہوں نے نہ صرف اپنے اعلیٰ کردار کی نہایت تابناک مثال قائم کی بلکہ اپنے دلیرانہ، تدبر آمیز اور مبنی بر حکمت اقدامات کے ذریعے ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کا باب کھول دیا۔ یہ ضرور ہے کہ انہیں، اپنی اس عظیم جدوجہد کو جاری رکھنے کا موقع نہ مل سکا لیکن وہ آنے والوں کے لیے ایک تاباں و فروزاں نظیر چھوڑ گئے۔

مہتدی باللہ کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن واثق ہے۔ مہتدی باللہ ان کا لقب ہے، جو انہوں نے خلیفہ بننے کے بعد اختیار کیا۔ وہ ۲۱۰ھ / ۸۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہ مامون الرشید کا زمانۂ خلافت تھا جو عباسی دور کا عہدِ زریں تھا، اس ماحول میں مہتدی نے اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے علم وہنر کے موتی چنے۔

Marfat.com

آگے بڑھنے سے قبل بہتر یہ ہوگا کہ ان حالات کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے جن کے نتیجے میں مہتدی کو بارِ خلافت اٹھانا پڑا اور یہ کہ ایک مضبوط اور مستحکم عباسی حکومت کس طرح کمزور اور ناپائیدار ہو کر رہ گئی۔

دسویں عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ کا دور بھی خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زریں سمجھا جاتا تھا۔ ۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ / ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء تک کے اس دور میں متعدد فتوحات ہوئیں اور مملکت میں استحکام آیا۔ معاشی اعتبار سے بہت ترقی ہوئی اور علمی لحاظ سے قابلِ قدر خدمات انجام دی گئیں، لیکن آخر میں متوکل علی اللہ کے خلاف منصوبے بننے لگے، ترک امرا کا اثر و نفوذ بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کا عالم گیر تصور دلوں سے محو ہو گیا اور عصبیت، نسل پرستی اور لسانی برتری نے اس کی جگہ لے لی۔ بالآخر شوال ۲۴۷ھ / دسمبر ۸۶۱ء میں متوکل کو قتل کر دیا گیا۔

متوکل کا قتل عباسی خلافت کے دورِ زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ ان کے بعد مملکت میں سیاسی ابتری پھیل گئی۔ متوکل کے فوراً بعد منتصر باللہ تخت نشین ہوئے، لیکن انہیں عملاً بہت کم اختیارات حاصل تھے اور امرا، وزرا اور فوجی جرنیل اپنی من مانی کرتے رہتے تھے۔ متوکل نے اپنی زندگی میں ہی مملکت کو اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا تھا لیکن منتصر باللہ کے خلیفہ بننے کے بعد ان کے دیگر دو بھائیوں معتز اور مؤید کو مجبور کیا گیا کہ وہ کسی بھی قسم کی حکومت کے دعوے سے دستبردار ہو جائیں۔

منتصر، ربیع الثانی ۲۴۸ھ / جون ۸۶۲ء میں صرف چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گئے۔

منتصر کے انتقال کے بعد امرا اور فوجی سالاروں نے منتصر کے عم زاد بھائی احمد کو ۲۴۸ھ / ۸۶۲ء میں مسندِ خلافت پر بٹھا دیا اور انہیں مستعین باللہ کا لقب دے دیا۔ ان کی تخت نشینی سے سیاسی بے چینی پیدا ہوئی اور جو لوگ منتصر کے سگے بھائی معتز کے حامی تھے انہوں نے احتجاجی مہم کا آغاز کر دیا جس کے باعث خاصی خونریزی بھی ہوئی۔ معتز اور ان کے بھائی مؤید کو قید کر دیا گیا، لیکن ۲۵۱ھ / ۸۶۵ء میں معتز کے حامیوں نے انہیں قید سے چھڑا لیا اور ایک بار پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر مستعین معزول کر دیے گئے اور شوال ۲۵۱ھ / اکتوبر ۸۶۵ء میں انہیں ابدی نیند سلا دیا گیا۔

مستعین کے بعد محرم ۲۵۲ھ / جنوری ۸۶۶ء میں متوکل علی اللہ کے بیٹے معتز باللہ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ ان کا تقریباً تین سالہ دور بھی پُرآشوب اور ہنگامہ خیز تھا۔ ترک سالاروں سے ان کی مستقلاً چپقلش رہی۔ ملکی خزانہ خالی ہو چکا تھا اور خلیفہ کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ فوجیوں کی تنخواہیں دی جا سکیں، اس کے نتیجے میں فوج میں بے چینی پھیل گئی۔ آخر رجب ۲۵۵ھ / جولائی ۸۶۹ء میں معتز باللہ نے خود خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور مستعفی ہو گئے۔

معتز باللہ نے اجلاسِ عام طلب کیا جس میں انہوں نے تقریر کی اور بتایا کہ وہ اب امورِ سلطنت انجام دینے سے عاجز ہو چکے ہیں اور انہوں نے اب خود ایسے شخص کا انتخاب کر لیا ہے جو مملکت کو بہتر انداز سے چلا سکے گا۔ انہوں نے اس بات پر لوگوں کو گواہ بھی بنایا۔ پھر انہوں نے انکشاف کیا کہ انہوں نے خلافت کے لیے ابو عبداللہ محمد بن واثق باللہ کا نام تجویز کیا ہے پھر انہوں نے سب سے پہلے خود اپنا ہاتھ بڑھا کر محمد بن واثق باللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کے بعد امرا اور اجلاس میں موجود دیگر افراد نے بیعت کی۔ محمد بن واثق باللہ نے مہتدی باللہ کا لقب اختیار کیا۔

مہتدی باللہ کے خلیفہ بنتے ہی چند روز بعد بغداد میں ایک زبردست شورش برپا ہوئی۔ نائب السلطنت سلیمان بن عبداللہ سے عوام نے مطالبہ کیا کہ معتز کے بھائی احمد بن متوکل کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن یہ سارا کچھ اس لیے ہوا کہ لوگوں کو مہتدی باللہ کی خلافت کی خبر نہ تھی۔ جیسے ہی اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ مہتدی باللہ مملکت کے ۱۴ویں عباسی خلیفہ بنا دیے گئے ہیں تو عوام نے اس خبر کا خوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ مہتدی باللہ کو خلیفہ بننے کے بعد اگرچہ بعض امرا اور فوجی افسران کی جانب سے مخالفتوں کا سامنا تھا لیکن انہوں نے مستقل مزاجی، تدبر اور حکمت سے صورتحال پر قابو پانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

مہتدی باللہ کو شدت سے احساس تھا کہ مملکت میں معاشرتی بگاڑ پوری طرح سرایت کر چکا ہے۔ لوگ اخلاقی اعتبار سے روز بہ روز انحطاط کی طرف مائل ہیں۔ ناانصافی کا چلن عام ہے، غیر مناسب عادات پروان چڑھ رہی ہیں، لایعنی رسوم و رواج کو اپنا لیا گیا ہے اور لوگ بحیثیتِ مجموعی تن آسانی کا شکار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مہتدی باللہ نے برائیوں اور خرابیوں کی بیخ کنی کے لیے سخت اقدامات کا فیصلہ کیا۔

Marfat.com

مہتدی باللہ نے اصلاح کا آغاز خود اپنے محلوں سے کیا۔ محلوں میں دولت و عشرت کے جو سامان تھے انہوں نے ان کا خاتمہ کرنا شروع کر دیا۔ سونے اور چاندی کے برتن بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہے تھے، انہیں واپس لے لیا۔ انہیں بھٹی میں پگھلا دیا گیا اور اس سونے اور چاندی کے سکے ڈھلوا دیے گئے۔ ماضی میں بعض حکمراں اور امرا تفریحِ طبع کے لیے مینڈھے اور مرغے لڑوایا کرتے تھے اور اس غرض سے اعلیٰ نسل کے مینڈھوں اور مرغوں کی پرورش کی جاتی تھی۔ مہتدی نے ان تمام مینڈھوں اور مرغوں کو ذبح کروا دیا۔ اسی طرح تفریح کی غرض سے درندے اور کتے بھی پالے جاتے تھے۔ مہتدی نے انہیں بھی ہلاک کروا دیا۔ پُر تکلف فرش اور قالین وغیرہ ہٹوا دیے۔

ماضی میں خلیفہ کے دستر خوان پر قسم قسم کے کھانے حاضر کیے جاتے تھے جن پر روزانہ ہزاروں درہم خرچ ہوتے تھے۔ مہتدی نے حکم دیا کہ دستر خوان پر روزانہ سو درہم سے زائد خرچ نہ کیا جائے۔ مہتدی یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ملتِ اسلامیہ کے زوال کا بڑا سبب اس کا غیر ضروری اور غیر شرعی مشغلوں میں پڑ جانا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ رقص و سرود اور گانا بجانا ممنوع قرار دے دیا جائے اور غیر ضروری قسم کے کھیل بھی بند کر دیے جائیں۔ وہ اپنے اہلِ خانہ اور عزیزوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی روش پر چلنے دیں۔

مہتدی باللہ نے رعایا کو عدل و انصاف فراہم کرنے کی بھی بھرپور اور موثر کوشش کی۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی انہوں نے مملکت میں اعلان کروا دیا کہ اگر کسی نے ظلم کے ذریعے کسی کا مال حاصل کر لیا ہے تو وہ اس کے حق دار کو واپس کر دے ورنہ قانون اور عدالت کے ذریعے اسے واپس دلوایا جائے گا۔ مہتدی باللہ نے تمام صوبوں اور شہروں میں حکام کے نام فرمان ارسال کیا کہ کوئی فرد کسی پر ظلم نہ کرنے پائے اور ہر افسر عدل و انصاف سے کام لے۔ مملکت میں نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔ یہ وہی عظیم فریضہ ہے جو رب العالمین نے امتِ مسلمہ کے سپرد کیا ہے۔

مہتدی باللہ نے مملکت کو برائیوں سے پاک کرنے اور عوام کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے خفیہ اہلکار بھی مقرر کیے جو انہیں تمام حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ مہتدی خود بھی پورے ملک کے معاملات سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے عوام کو انصاف فراہم کرنے کی غرض سے ایک خاص عمارت بنوائی تھی جس کا نام "قبۃ المظالم" رکھا گیا تھا۔ مہتدی اس عمارت میں روزانہ اجلاس کرتے تھے اور عوام کو یہ آزادی حاصل تھی کہ اگر وہ عدالت کے ذریعے انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں یا انہیں عدالت کے کسی فیصلے سے اتفاق نہیں ہے تو وہ خلیفۃ المسلمین کی اس عدالت میں دعویٰ دائر کر سکتے ہیں۔ مہتدی خود ایسے تمام مقدمات کا جائزہ لے کر ضروری احکام صادر کرتے تھے یا حتمی فیصلہ سناتے تھے۔

مہتدی باللہ اس عدالت میں امیر غریب یا عام آدمی اور حکومت کے اعلیٰ افسر کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار کسی شخص نے خود مہتدی کے لڑکے کے خلاف دعویٰ کیا۔ مہتدی نے اپنے لڑکے کو فوراً عدالت میں طلب کر لیا اور اسے مدعی کے پہلو میں کھڑا کر کے اس مقدمے کی سماعت کی۔ مملکت کے سربراہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے مدعا علیہ یعنی خلیفہ کے بیٹے کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ جب جرح ہوئی تو مہتدی کے بیٹے نے اپنی زیادتی کا اقرار کر لیا۔ مہتدی نے اسی وقت مدعی کو اس کا حق دلوایا۔

مہتدی باللہ کا یہ انصاف دیکھ کر ایک شخص عبداللہ بن ابراہیم نے مہتدی کی شان میں چند اشعار کہے جن کا ترجمہ یہ ہے: "تم لوگوں نے اسے اپنا حاکم بنایا تو اس نے ایسا صحیح فیصلہ دیا جو چمکتے ہوئے چاند کی طرح بہت ہی واضح ہے۔ وہ اپنے فیصلے میں کسی قسم کی رشوت قبول نہیں کرتا ہے اور ہونے والے نقصان کی پروا نہیں کرتا ہے۔"

مہتدی نے اپنے لیے یہ تعریفی اشعار سنے تو کہا:

"اے عبداللہ، تمہاری اس خوش گمانی کا اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں صلہ عطا فرمائے لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری اس ستائش سے میں ذرّہ برابر بھی کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہوا ہوں، میں تو قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کیے بغیر مسندِ خلافت پر کبھی نہیں بیٹھتا: (ترجمہ) ہم روزِ قیامت انصاف کا ترازو لگائیں گے جس سے کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں ہوگا اگرچہ کسی کا کوئی عمل ایک ذرّہ برابر وزن کا ہوا اور درست حساب کے لیے ہم ہی کافی ہیں۔ (سورۂ انبیا)"۔

یہ کہہ کر رونے لگے اور ان کی یہ بات سن کر تمام حاضرین مجلس بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

مہتدی نے مملکت میں حکام کو ظلم و زیادتی سے باز رکھنے کی خاطر

Marfat.com

سخت اقدامات کیے۔ بہت سے امرا اور حاکموں کو سزائیں دیں۔ وہ بہت سے دفاتر کی نگرانی اور جانچ خود کرتے تھے۔ ہفتے میں دو دن اتوار اور جمعرات دفاتر کے حساب کتاب اور جانچ پڑتال کے لیے مخصوص تھے۔ مہتدی کاتبوں کو سامنے بٹھا کر اندراجات کی جانچ کرواتے تھے۔

مہتدی باللہ نہایت دین دار، متقی اور پابندِ شرع انسان تھے۔ ان کی ذاتی زندگی حد درجہ سادگی کا نمونہ تھی۔ وہ ہر نماز باجماعت جامع مسجد میں باقاعدگی سے ادا کرتے تھے بلکہ خود ہی نماز کی امامت بھی کرتے تھے۔ مسجد میں خطبہ بھی دیا کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد سے اپنی عمر کے آخری دن تک روزے رکھتے رہے۔ ان کی سادہ زندگی کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے جسے مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ مؤرخ خطیب کا بیان ہے کہ مہتدی اگلے تمام خلفا کے مقابلے میں بہت بہتر تھے اور سخاوت، پرہیز گاری، عبادت گزاری اور خلوت نشینی میں ان سب سے زیادہ تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے دستر خوان کا یومیہ خرچ ہزاروں درہم سے گھٹا کر صرف سو درہم یومیہ کر دیا تھا، لیکن ان سو درہموں میں سے بھی بہت کم رقم خلیفہ کی ذات پر خرچ ہوتی تھی کیونکہ مہتدی ہر دن روزہ رکھتے تھے۔

لباس کے معاملے میں مہتدی بہت سادگی پسند تھے۔ وہ ایک ہی لباس طویل عرصے تک استعمال کرتے تھے۔ عبادت کے اوقات میں صوف کا جبہ، چادر اور کلاہ زیب تن کر لیتے تھے۔ رات کا بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔

مہتدی باللہ علم دوست حکمراں تھے اور علما کرام کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے جس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کیا تھا اس کے لیے علما کرام کی رہنمائی ضروری تھی۔ مہتدی نے اس غرض سے بلند مرتبہ علما کرام کو اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ ان کے ساتھ نشستیں رکھیں۔ فقہا کرام کے مرتبہ میں اضافہ کیا اور علما و فقہا کو مختلف مراعات فراہم کیں۔

مہتدی بزرگانِ دین کے نصائح کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے مواعظ کو دہراتے تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کا ایک دل افروز خطبہ محمد بن علی ربعی سے سن کر تحریر کر لیا تھا۔ مہتدی ان مواعظ سے اتنا زیادہ اثر لیتے تھے کہ مورخین کے مطابق وہ حضرت علیؓ کا مذکورہ خطبہ روزانہ رات کو تنہائی میں پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

مہتدی نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ جب ان پر بارِ خلافت ڈالا گیا تو انہوں نے امرا کے سامنے تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ میں تو صرف پیٹ بھرنے کے لیے روزی چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا، البتہ میرے چند بھائی ہیں جو محتاج ہیں ان کی ضرورت پوری کرنے کی فکر کرتا ہوں۔

احادیثِ نبویؐ کی سب سے صحیح کتاب صحیح بخاری کے مرتب امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ مہتدی کے دور میں موجود تھے اور مہتدی ہی کے عہد میں (شوال ۲۵۶ھ / اگست ۸۷۰ء) میں امام بخاریؒ کا انتقال ہوا۔

مہتدی کے عہد میں ایک اور ذی علم شخصیت امام ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمیؒ کی تھی۔ انہوں نے احادیثِ نبویؐ کی تلاش میں عراق، شام، مصر اور دیگر ممالک کے سفر کیے۔ انہیں سمرقند میں قاضی کے عہدے کی پیشکش کی گئی تھی۔ انہوں نے یہ عہدہ قبول تو کر لیا لیکن ایک ہی فیصلہ دینے کے بعد اس عہدے پر قائم رہنے سے معذرت کر لی۔ امام دارمیؒ نے تفسیر قرآن بھی لکھی اور احادیثِ نبویؐ کا مجموعہ مسند دارمیؒ مرتب فرمایا۔ امام دارمی کا انتقال ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء میں ہوا۔

احادیثِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر پانچ درست ترین کتابوں صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابی ماجہ کے مرتبین بھی مہتدی کے عہد میں موجود تھے۔ امام مسلمؒ نے ۲۰۶ھ تا ۲۶۱ھ / ۸۲۱ء تا ۸۷۵ء، امام ترمذیؒ نے ۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ / ۸۲۴ء تا ۸۹۳ء، امام ابو داؤدؒ نے ۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ / ۸۱۷ء تا ۸۸۸ء، امام ابنِ ماجہؒ نے ۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ / ۸۲۴ء تا ۸۸۶ء اور امام نسائیؒ نے ۲۲۱ھ تا ۳۰۳ھ / ۸۳۶ء تا ۹۱۵ء اپنی زندگی میں نہایت گراں قدر خدمات انجام دیں۔

اپنے زمانے کے سب سے بڑے مؤرخ علامہ ابنِ جریر طبری (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ / ۸۳۹ء تا ۹۲۳ء) بھی مہتدی کے دور میں علمی خدمات انجام دے رہے تھے۔

مشہور سائنس داں اور فلسفی یعقوب الکندی (وفات: ۲۶۰ھ / ۸۷۴ء) کوفہ میں موجود تھے۔ انہوں نے مامون الرشید اور معتصم باللہ کے زمانے سے اپنی عمر کے آخری ایام تک فلسفہ، نجوم، ہیئت، مناظرہ، حساب، ہندسہ، طب، طبیعیات، موسیقی اور دیگر علوم پر متعدد کتب تصنیف کیں۔

مہتدی نے سلیمان بن وہب کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ سلیمان اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو برس ہا برس سے کتابت کے فن میں

Marfat.com

ممتاز تھا۔ سلیمان کے والد وہب بن سعید، جعفر برمکی اور بعد میں الفضل بن سہل کے پاس ملازمت کر چکے تھے۔ بعد میں انہیں فارس اور کرمان کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے بیٹے سلیمان ۱۴ برس کے تھے جب انہیں خلیفہ مامون الرشید نے اپنا کاتب مقرر کیا۔ مہتدی باللہ نے ان کی زبردست انشاپردازی، ادب شناسی اور علم و فضل میں امتیاز کے پیش نظر انہیں اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔

مہتدی نے معاشرے کی حالت بہتر بنانے کی غرض سے اپنی جدوجہد کا آغاز بہت پُرعزم انداز میں کیا، لیکن باغی عناصر کی جانب سے انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مملکت کے اہم عہدوں اور فوج کے اعلیٰ منصب پر مہتدی کے مخالفین موجود تھے جو ہر حال میں اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے تھے۔

شوال ۲۵۵ھ / دسمبر ۸۶۹ء میں مہتدی کو ایک فتنے کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شخص علی محمد بن عبدالرحیم نے بصرہ میں نمودار ہو کر بہت سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو صرف ایک مرتبہ پڑھ کر یاد کر چکا ہے۔ اس نے لوگوں کے دلوں کا حال جاننے کا دعویٰ بھی کیا اور یہ انکشاف بھی کیا کہ اسے غیب سے احکامات ملتے ہیں۔ وہ "صاحب الزنج" کے نام سے مشہور تھا یعنی "زنگیوں کا صاحب۔"

اس زمانے میں لاکھوں حبشی، غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ "صاحب الزنج" نے اعلان کر دیا کہ جو غلام اپنے آقا کو چھوڑ کر اس کے پاس چلا آئے گا وہ آزاد ہے۔ اس طرح ہزاروں افراد اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس نے عباسی حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا۔ خصوصاً بحرین، بصرہ، اُبلّہ اور کربلا میں اس بغاوت کا زور بہت زیادہ تھا اور بصرہ پر تو ان کا قبضہ ہی ہوگیا تھا۔ باغیوں نے نہ صرف حکومت کے خلاف سرکشی اختیار کرلی بلکہ عام شہریوں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بڑی تعداد میں شہری ان کے مظالم کا نشانہ بنے۔ مہتدی نے "صاحب الزنج" اور اس کے ماننے والوں کی سرکوبی کے لیے متعدد فوجیں روانہ کیں لیکن یہ فوجیں بغاوت کو کچلنے میں ناکام رہیں۔ "صاحب الزنج" نے اب بصرہ کا رخ کیا وہاں تباہی مچائی، اس کے بعد اُبلّہ شہر کو آگ لگادی، پھر اہواز کو لوٹ لیا۔ یہ سلسلۂ غارت گری تقریباً پندرہ برس تک جاری رہا اور مہتدی اپنی زندگی میں "صاحب الزنج" کی شورشوں کو پوری طرح فرو نہ کر سکے۔ البتہ بعد میں معتمد علی اللہ کے دور میں "صاحب الزنج" کو قتل کیا گیا۔

مہتدی کو ایک ترک سردار موسیٰ بن بغا کی جانب سے بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ موسیٰ محرم ۲۵۶ھ / دسمبر ۸۶۹ء میں اپنی فوج کے ساتھ رے سے سامرا پہنچے۔ مہتدی رعایا کے مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ باغی فوجی مہتدی کو وہاں سے لے گئے لیکن موسیٰ نے اس فعل پر معذرت کی اور بیعت کرلی۔ تاہم موسیٰ ایک امیر صالح بن وصیف کے خلاف تھے اور ان کی معزولی چاہتے تھے اور اسی معاملے پر بدگمان ہو کر وہ مہتدی کی خلافت کے خاتمے کے درپے ہوگئے۔

مہتدی کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا، خوشبو لگائی اور تلوار لے کر نکلے، گویا موت سے بے نیاز ہو کر چلے۔ انہوں نے ترک امرا کے اجلاس میں جرأت مندانہ تقریر کی:

"میں موت کے لیے تیار ہو کر آیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں تلوار ہے اور جب تک اس کے قبضے پر میرا ہاتھ ہے اس وقت تک میں لڑتا رہوں گا۔ اور یاد رکھیے اگر میرا ایک بال بھی گرا تو اس کے بدلے میں آپ کا پورا گروہ برباد کر دیا جائے گا۔ کیا آپ کو ذرا سی بھی شرم نہیں آتی کہ آپ خلیفۃ المسلمین کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں اور کیا آپ تمام لوگوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو آپ کی زندگی چاہتے ہیں اور نیک سیرتوں کے مالک ہیں اور وہ بھی جو آپ کے سامنے کھلے عام مے نوشی کرتے ہیں اور آپ ان پر اعتراض نہیں کرسکتے اور وہ کمزوروں سے ان کا مال چھین کر قبضہ جمالیتے ہیں۔

"آپ کا اگر یہ خیال ہے کہ آپ کی ذات سے مجھے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے تو مجھے بتایئے کہ آپ سے مجھے کیا ملا۔ آپ کو علم ہوگا کہ آپ لوگ مجھ سے میرے بھائیوں اور میری اولاد سے زیادہ دولت مند ہیں۔ اگر آپ کو اس کا ثبوت چاہیے تو جایئے آپ کے سامنے میرا گھر موجود ہے، جایئے اسے اور میرے بھائیوں اور میرے رشتے داروں کے گھروں کو دیکھیے۔ کیا آپ ان میں ٹھاٹھ باٹ اور شان و شوکت والا کوئی سامان پاتے ہیں؟"

اس تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہتدی کس درجہ درویش صفت اور بے باک حکمراں تھے۔ ان کی تقریر سن کر باغی افسران وقتی طور پر مطمئن ہوگئے لیکن درپردہ ان کے خلاف منصوبہ سازی کرتے رہے۔

Marfat.com

رجب ۲۵۶ھ / جون ۸۷۰ء میں موسیٰ بن بغا اور ان کے ساتھیوں نے مہتدی کے خلاف بڑی فوجی بغاوت کی۔ وہ بڑا لشکر لے کر آئے۔ مہتدی کی وفادار فوجوں نے مقابلے کی جان توڑ کوشش کی، اس مقابلے میں ہزاروں جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ بالآخر باغی مہتدی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس عظیم، فقیر منش، دین دار اور بہادر حکمراں کو شہید کر دیا۔

مہتدی نے صرف ۴۶ برس کی عمر پائی۔ انہیں محض ساڑھے گیارہ ماہ تک خلافت کا موقع ملا۔ اگر وہ مزید کچھ عرصے تک حکمران رہتے تو شاید صورتِ حال بالکل مختلف ہو جاتی۔ وہ امتِ مسلمہ کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بن کر دکھانا چاہتے تھے اور ان ہی کی مانند انہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے کٹھن کام کا آغاز بڑے دلیرانہ انداز میں کیا تھا، لیکن ان کے لیے پیامِ اجل آ چکا تھا۔ انہیں اپنے عظیم منصوبے کی تکمیل کی مہلت تو نہ ملی لیکن انہوں نے بے خوفی اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرتبۂ شہادت حاصل کر لیا۔

مہتدی کی شہادت کے بعد لوگوں کو ان کا ایک صندوقچہ ملا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ اس صندوقچے میں ضرور قیمتی لعل و جواہر یا زیورات ہوں گے لیکن جب صندوقچہ کھولا گیا تو اس کو دیکھنے والے دنگ رہ گئے اس لیے کہ صندوقچے میں بیش قیمت لعل و جواہر کی بجائے محض صوف کا ایک جبہ اور ایک معمولی سی بنڈی رکھی ہوئی تھی۔ مہتدی کے خادم سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ مہتدی باللہ رات گئے اس جبے اور بنڈی کو پہن لیتے تھے اور صبح تک اپنے ربِ کریم و جلیل کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

•••

Marfat.com

ابو العبّاس معتضد باللہ

ایک دُور اندیش، زیرک اور جری حکمران جن کا دورِ خلافت تابناک ہے

وہ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔

وہ دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک صاحب گندمی رنگت' دبلے بدن اور درمیانی قد کے حامل تھے۔ انہوں نے دوسرے صاحب کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ دوسرے صاحب کی عمر ساٹھ سال اور پہلے صاحب کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔

چلتے چلتے اچانک' گندمی رنگت اور دبلے بدن والے صاحب نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسرے صاحب حیران ہو کر کھڑے رہ گئے' ان کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"ڈریے نہیں۔!" پہلے صاحب نے تسلی دی! "باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ کے اوپر تھا' اس لیے میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اسے ادب کے خلاف سمجھتا ہوں کہ کسی ذی علم شخصیت کے ہاتھ کے اوپر میرا ہاتھ آئے۔"

اہل علم کی اتنی توقیر اور ان کا اس قدر احترام کرنے والے یہ صاحب تھے ۱۶ویں عباسی خلیفہ معتضد باللہ' جنہوں نے مشہور ریاضی داں' فلسفی اور طبیب' ثابت بن قُرّۃ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اس بنا پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا کہ ان کا ہاتھ ثابت بن قُرۃ جیسی علمی شخصیت کے ہاتھ کے اوپر تھا۔

معتضد باللہ کا تقریباً آٹھ سالہ دورِ خلافت کئی اعتبار سے روشن اور تابناک ادوار میں شمار کیا جاتا ہے۔

دسویں عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ / ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) کے بعد خلافتِ عباسیہ میں وہ استحکام نہ رہا جس کا مظاہرہ وہ اب تک کرتی آئی تھی۔ ترک امرا کا اقتدار بڑھ گیا تھا' حکمرانوں کا تقرر اور معزولی زیادہ تر ان امرا ہی کی مرضی سے ہوتی تھی۔ متوکل کے بعد صرف آٹھ برس کے مختصر عرصے میں چار خلفا تخت نشین ہوئے۔ چنانچہ کئی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جو گو کہ عباسی خلیفہ کو تسلیم کرتی تھیں' ان کی مساجد میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا' لیکن عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ ان خود مختار علاقوں میں عباسی خلیفہ کے احکام نہیں چلتے تھے۔ معتضد باللہ کے عہد تک جو خود مختار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں' ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ **دولتِ صفاری**: یہ حکومت یعقوب بن لیث صفار نے ۲۵۳ھ / ۸۷۶ء میں قائم کی تھی اور پورا جنوبی ایران' ان کے قبضے میں تھا۔

۲۔ **دولتِ علویہ**: ایران کے شمالی علاقے ماژندران کو اس دور میں طبرستان کہتے تھے، اسی طبرستان میں حسن زید علوی نے ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء میں یہ حکومت قائم کی تھی۔

۳۔ **دولتِ طولونیہ**: احمد بن طولون نے یہ حکومت ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء مصر اور شام میں قائم کی تھی۔

۴۔ **دولتِ سامانیہ**۔ یہ حکومت ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء میں نصر بن احمد اسد نے ماوراءالنہر، موجودہ افغانستان اور خراسان میں قائم کی تھی۔

معتضد باللہ نے جب بارِ خلافت سنبھالا تو ان کے سامنے سیاسی بدامنی اور عدم استحکام کے حوالے سے لاتعداد مسائل تھے لیکن معتضد باللہ نے نہایت حکمت' تدبر' جرأت اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مختلف خود مختار حکومتوں کو مطیع کیا اور ان کی سرکشی کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ ان کے دور میں مصر و شام کی طولونی حکومت نے عباسی خلافت کی اطاعت تسلیم کر لی اور معتضد باللہ کے جانشین مکتفی کے عہد میں تو مصر و شام براہ راست عباسی خلافت میں شامل کر دیے گئے۔ معتضد باللہ نے عرب، عراق، مغربی عراق اور آرمینیا میں پھر سے

Marfat.com

امن وامان بھی قائم کر دیا۔

پندرھویں عباسی خلیفہ معتمد علی اللہ اپنے بھتیجے ابوالعباس احمد بن ابو احمد موفق (معتضد باللہ) کو خلیفہ نامزد کر گئے تھے۔ معتمد علی اللہ کے انتقال کے بعد ربیع الاول ۲۷۹ھ / جون ۸۹۲ء میں معتضد باللہ نے مملکت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۳۷ برس تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ معتمد علی اللہ کے دور میں معتضد باللہ کے والد الموفق ہی عملاً حکمران تھے اور آخری دو برسوں میں تو معتضد باللہ ہی امورِ مملکت انجام دے رہے تھے۔

معتضد باللہ نے سب سے پہلے باغی اور سرکش امراً کا زور توڑنے کے لیے کارروائی کا آغاز کیا۔ انہوں نے رافع بن ہرثمہ کی جگہ عمرو بن لیث صفاری کو خراسان کا حاکم بنا دیا۔ رافع نے مزاحمت کی اور طبرستان کے حاکم محمد بن زید علوی کو ساتھ ملا کر خراسان واپس پہنچنا چاہا لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ بعد میں وہ خوارزم فرار ہو گئے جہاں انہیں قتل کر دیا گیا۔

موصل اور جزیرہ کے علاقے میں خارجیوں نے شورش بپا کر رکھی تھی۔ ان کی قیادت ہارون خارجی کے پاس تھی۔ معتضد باللہ نے خارجیوں کی بغاوت کا خاتمہ کیا اور موصل کے حاکم کو تبدیل کر دیا۔ لیکن خود خارجیوں میں باہمی چپقلش شروع ہو گئی۔ ایک خارجی محمد بن عبادہ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ وہ موصل کے غلے کا عشر اور زکوٰۃ وصول کرنے لگا۔ اس نوعیت کے واقعات معتضد باللہ کے لیے موجبِ تشویش تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ موصل میں ان کے مقرر کردہ حکام خارجیوں کی بیخ کنی میں کامیاب نہیں ہو پا رہے، چنانچہ ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں خود معتضد باللہ خارجیوں کو سبق سکھانے کے لیے فوج لے کر نکلے۔ جب وہ موصل پہنچے تو ان کی ہیبت اور دبدبے کے باعث خارجیوں نے اطاعت قبول کرنے ہی میں عافیت جانی، انہوں نے اطاعت کا یقین دلاتے ہوئے ضمانت کے طور پر کچھ افراد کو یرغمال کے طور پر پیش کیا۔ ایک سال بعد پھر خارجیوں نے عہد شکنی کی اور موصل میں سرکشی شروع کر دی، معتضد باللہ ایک بار پھر فوج لے کر پہنچے۔ انہوں نے عام سپاہیوں کی طرح جنگ میں بڑی بے خوفی سے حصہ لیا اور خارجیوں کو عبرت ناک شکست دی۔

اس کے بعد معتضد باللہ نے حمدان بن حمدون تغلبی اور اسحٰق بن ایوب کی بغاوت کا خاتمہ کیا، لیکن شورشیں جاری رہیں۔ بالآخر ہارون خارجی کو خاصی تگ و دو کے بعد گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی، اس کے بعد موصل میں امن وامان قائم ہو گیا۔

معتضد کے عہد میں سامانیوں سے بھی جنگ ہوئی۔ عمرو بن لیث صفاری، جنہوں نے خراسان کے باغی حاکم رافع بن ہرثمہ کو قتل کیا تھا، ماوراءالنہر کی حکومت چاہتے تھے جہاں اسمٰعیل سامانی حکمران تھے۔ عمرو اور اسمٰعیل کی فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں عمرو کو شکست ہوئی۔ معتضد نے عمرو کو قید کر کے اسمٰعیل کو ان کے مقبوضہ علاقوں کا حاکم بنا دیا۔ معتضد نے مصر کے طولونی خاندان سے بھی راہ و رسم بڑھائی۔ طولونی حکومت اس سے قبل بڑی حد تک خود مختار ہو چکی تھی لیکن معتضد نے طولونی حکمران خمارویہ سے ذاتی تعلقات استوار کر لیے اور ان کی صاحب زادی کو اپنے عقد میں لے آئے۔

معتضد کے عہد میں بیرونی محاذوں پر جنگیں کم ہوئیں تاہم ۲۸۵ھ / ۸۹۸ء میں رومیوں سے بحری جنگ ہوئی۔ رومیوں کے ۳۰ جہاز جلا دیے گئے۔ ۲۸۷ھ / ۹۰۰ء میں رومیوں نے طرطوس پر چڑھائی کر دی۔ ۲۸۸ھ / ۹۰۱ء میں کئی رومی قلعے فتح ہو گئے لیکن اس کے جواب میں رومیوں نے پندرہ ہزار مسلمانوں کو قیدی بنا لیا۔

معتضد کے پیشرو خلیفہ معتمد علی اللہ کے زمانے میں ایک نئے فرقے، قرامطہ نے سر اٹھایا۔ قرمط نام کے ایک شخص نے بصرہ کے نواح میں ۲۷۸ھ / ۸۹۱ء میں اس فرقے کی بنیاد رکھی تھی، یہ فرقہ پچاس سال سے زیادہ عرصے تک فتنہ انگیزیاں کرتا رہا۔ جنوبی عراق اور شام میں اس فرقے کے لوگوں نے زیادہ لوٹ مار کی اور لوگوں پر ظلم ڈھائے۔ قرمط نے ایک آسمانی کتاب کا دعویٰ بھی کیا اور بھولے بھالے دیہاتیوں کو ورغلا کر اپنے خود ساختہ مذہبی قوانین کی پابندی کرنے پر آمادہ کیا۔ معتضد کے دور میں قرامطہ کے خلاف موثر کارروائی نہ ہو سکی۔ قرمط عراق چھوڑ کر شام چلا گیا اور مشہور یہ کر دیا گیا کہ وہ اپنی کرامت کی وجہ سے غائب ہو گیا ہے، تاہم تحریک اندر ہی اندر پھیلتی رہی۔ بحرین میں ایک قرمطی یحییٰ بن مہدی نے خود کو مہدیِ موعود قرار دیا۔ جب قرامطہ نے بصرہ پر حملہ کیا تو معتضد نے بصرہ کی فصیل تعمیر کروائی اور بحری راستے سے امدادی فوج بھی بھیجی لیکن قرامطہ نے بصرہ اور ہجر میں بڑی تباہی پھیلائی۔ پھر انہوں نے کوفہ کے نواح میں شورش شروع کر دی۔ معتضد نے یہ صورت دیکھی تو یکے بعد دیگرے فوجیں بھیجنا شروع کر دیں۔ ہزاروں قرمطی مارے گئے لیکن قرامطہ کی طاقت کو

Marfat.com

پوری طرح کچلا نہ جاسکا۔ ان کے ایک رہنما ذکرویہ نے شام کی سرحد تک کئی بستیاں اجاڑ ڈالیں اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز میں جاری رہا۔

معتضد باللہ کے بعض فیصلوں کو تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان فیصلوں کے باعث معاشرے کو بگاڑ سے بچانے میں بہت مدد ملی۔ ان کی اصلاحات میں ایک اہم اصلاح وراثت کے قانون میں ترمیم ہے۔ معتضد وراثت کے سلسلے میں حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہما کے مسلک پر عمل پیرا تھے جس کی رو سے میراث میں "ذوی الارحام" کا کوئی حصہ نہیں ہے اور "ذوی الفروض" اور "عصبات" کے موجود نہ ہونے کی صورت میں میراث بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔

"ذوی الارحام" سے مراد وہ رشتے دار ہیں جن کے حصے قرآن و حدیث میں متعین نہیں ہیں، مثلاً میت کی بیٹیوں کی اولاد، بہنوں کی اولاد اور اس کے ماموں، خالائیں اور پھپھیاں۔

"ذوی الفروض" کا مطلب ہے، وہ افراد جن کا حصہ قرآن و سنت کی رُو سے مقرر ہے۔ یعنی شرعی ورثا، ان میں باپ، دادا، اخیافی بھائی، خاوند، بیوی، بیٹی، پوتی، بہن، پھپھی، خالہ، ماں اور نانی شامل ہیں۔

"عصبات" سے مراد میت کے وہ خاص رشتے دار ہیں جو "ذوی الفروض" یعنی شرعی ورثا سے بچا ہوا مال لے سکتے ہیں یا جب شرعی ورثا موجود نہ ہوں تو عصبات کو ساری میراث ملتی ہے۔ ان میں بیٹا، باپ، چچا وغیرہ شامل ہیں۔

اس مسلک پر عمل کرنے کی صورت میں "ذوی الارحام" یعنی میت کے دیگر قرابت دار ترکے سے بالکل محروم رہ جاتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک "عصبات" کے بعد "ذوی الارحام" وارث ہیں۔ معتضد نے حکم دیا کہ قانونِ وراثت کو تبدیل کیا جائے اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق "عصبات" کے بعد "ذوی الارحام" کو میراث سونپ دی جایا کرے۔ اس حکم کے نافذ ہونے کے بعد بیت المال میں میراث کی وصولی کا محکمہ ختم کر دیا گیا۔

معتضد باللہ نے ستارہ شناسوں، منجموں اور قصہ خوانوں کو عام راستوں پر بیٹھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ یہ ان کا ایک اور اہم فیصلہ تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خود معتضد کو علم ہیئت سے گہری دلچسپی تھی لیکن وہ اسے ایک علمی سرگرمی کے طور پر جاری رکھے ہوئے تھے جبکہ نام نہاد نجومیوں نے عوام کو ستاروں کی چال اور زائچہ نویسی میں الجھا کر گمراہ کیا ہوا تھا۔ اسی طرح قصہ خواں سرِعام بیٹھ کر لوگوں کو بے سروپا اوہام و خرافات سے لبریز قصوں میں مشغول رکھتے تھے۔ ایک اور رسم یہ تھی کہ مجوسیوں کے زیرِ اثر نوروز کے دن مسلمان بھی آگ جلاتے تھے اور پھر آگ پر پانی چھڑکتے تھے۔ معتضد نے اس رسم کو بھی سختی سے بند کروادیا۔

معتضد باللہ کا دورِ حکومت علمی ترقی کے اعتبار سے بھی ممتاز ہے۔ انہوں نے اپنا دارالخلافہ، سامرا سے دوبارہ بغداد منتقل کر دیا تھا۔ بغداد یوں بھی اہلِ علم و فن کی آماجگاہ تھا، دارالخلافہ بننے کے بعد یہاں پرانی رونقیں عود کر آئیں۔ معتضد نے بغداد میں ایک بہت عمدہ دارالعلوم قائم کیا۔ یہ دارالعلوم بے حد اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا جس میں طلبہ کی رہائش کا بھی عمدہ انتظام تھا۔ یہاں نہ صرف دینی تعلیم کا بہت اچھا بندوبست تھا بلکہ دیگر علمی شعبوں ادب اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر فن کے لیے الگ عمارت تھی اور ہر عمارت میں دارالاقامہ (ہاسٹل) بھی تھا۔ ہر شعبے میں ماہر اساتذۂ فن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور مختلف علوم میں تحقیق (ریسرچ) کے مواقع بھی میسر تھے۔

معتضد باللہ نے جب بغداد میں شماسیہ کا محل بنوانے کا ارادہ کیا تو اس محل کے لیے انہوں نے غیر معمولی طور پر وسیع اراضی کا انتخاب کیا۔ جب ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ میں یہاں خصوصی عمارتیں تعمیر کروانا چاہتا ہوں جن میں مختلف صنعتوں اور علوم کے ماہرین رہیں گے۔ ان کی کفالت شاندار طریقے سے اسی ادارے سے کی جائے گی تاکہ جو فرد جس علم و فن کی تعلیم حاصل کرنا چاہے وہ اسی فن کے ماہرین سے استفادہ کر سکے۔ معتضد کے عہد میں بغداد کے علاوہ دیگر کئی شہروں میں بھی علمی سرگرمیاں جاری ہو گئی تھیں۔

معتضد کے دور کے فقہا میں محمد بن مسلمہ بلخی نمایاں ہیں۔ ان کا انتقال ۲۷۸ھ/ ۸۹۱ء میں ہوا۔ امام محمدؒ کے اصحاب میں سے ایک، سلیمان بن شعیبؒ بھی اسی زمانے میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ احمد بن ابی عمران شیخ الطحاویؒ، فقیہ اور محدث تھے۔ ۲۸۰ھ/ ۸۹۳ء میں وفات پائی۔ بغداد کے قاضی القضاۃ اور فقیہ عبدالحمید بن عبدالعزیزؒ اس دور کے علما کرام میں ممتاز ہیں۔ ان کا انتقال ۲۹۰ھ/ ۹۰۳ء میں ہوا۔

معتضد ہی کے عہد میں ایک عرب جغرافیہ داں ابن الفقیہ نے

Marfat.com

بڑی شہرت پائی۔ وہ نہ صرف جغرافیہ داں تھے بلکہ وہ اور ان کے والد دونوں اعلیٰ پائے کے محدث بھی تھے۔ ابن الفقیہ کا پورا نام ابو بکر احمد بن محمد اسحاق الہمدانی تھا۔ انہوں نے ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں ایک کتاب "کتاب البلدان" کے نام سے لکھی۔ ابن الفقیہ نے اپنے زمانے کے بہترین شاعروں پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔

اسی زمانے میں ایک شہرۂ آفاق ماہر نباتات ابو حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری بھی تھے۔ ان کا انتقال ۲۸۲ھ/۸۹۵ء میں ہوا۔ وہ نہ صرف ماہر نباتات تھے بلکہ فقہ، نحو، لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی اور تاریخ میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے بیس سے زائد کتابیں لکھیں جن میں ۱۳ جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن کریم بھی شامل تھی۔

اسی دور میں علوم فلسفہ، منطق اور موسیقی کے ماہر احمد بن الطیب سرخسی تھے، جو ایک عرصے تک معتضد کے قریبی رفقا میں شامل رہے۔ علم ہندسہ، ہیئت اور حرکات نجوم کے ماہر فضل بن حاتم بھی اسی زمانے میں موجود تھے۔ انہوں نے معتضد باللہ کے لیے کتاب "احداث الجو" لکھی تھی۔

معتضد کے عہد کے علما ہی نہیں بلکہ دیگر شعبوں کے اہلکار تک علمی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ معتضد کے داروغۂ اصطبل یعقوب بن اخی حزام نے فن بیطاری (مویشیوں کے علاج) پر ایک کتاب "الفروسیہ دستیاب الخیل" لکھی جو اس موضوع پر اہم کتاب ہے۔

معتضد کے عہد کے ایک بڑے ماہر ریاضی، طبیب اور فلسفی ثابت بن قُرۃ تھے۔ خلیفہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی علمی استعداد کے معترف تھے۔ ثابت قُرۃ نے بغداد میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یونانی علما کی تصانیف کے تراجم اور شرحیں لکھنے میں صَرف کیا۔ انہوں نے کتاب فی علم الموسیقی کے علاوہ موسیقی کے علم پر دیگر چار کتب بھی تصنیف کیں۔ انہوں نے ریاضی کی کتابیں بھی تالیف کیں اور طبابت کا شغل بھی جاری رکھا۔ ثابت بن قرۃ کا انتقال ۲۶ صفر ۲۸۸ھ/۱۶ فروری ۹۰۱ء کو ہوا۔

معتضد خود بھی ذی علم انسان تھے۔ انہیں علم ہیئت سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے دور میں اسحٰق بن حنین ایک بڑے طبیب اور فلسفی تھے۔ وہ حنین بن اسحٰق کے صاحب زادے تھے۔ حنین بن اسحٰق بھی بڑے مایۂ ناز طبیب، محقق، مترجم اور مصنف تھے، انہیں مامون الرشید نے اپنے دیوان الترجمہ کا رئیس مقرر کیا تھا۔ اسحٰق بن حنین نے یونانی زبان میں لکھی گئی ریاضی اور فلسفے کی متعدد کتب، کو نہایت خوبی کے ساتھ عربی میں منتقل کیا۔ انہوں نے بعض طبّی تصانیف بھی چھوڑیں۔ معتضد، اسحٰق بن حنین کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہوں نے اسحٰق بن حنین اور دیگر ماہرین کی مدد سے تقویم کی اصلاح کروائی۔ ابو ریحان البیرونی کہتے ہیں کہ معتضد کے عہد میں بڑی تحقیق اور دشواری سے "تقویم" کی اصلاح کی گئی اور نئی تقویم تیار کی گئی جو "تقویم معتضدی" کے نام سے مشہور ہے۔ "تقویم" سے مراد وہ کتاب ہے جس میں سال بھر کی تاریخیں، ستاروں کے مقامات اور گرہن وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔

معتضد اچھا ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ علامہ سیوطی نے ان کے اشعار نقل کیے ہیں۔ معتضد اپنے دور کے ایک بڑے ادیب ابن ابی الدنیا (وفات: ۲۸۱ھ/۸۹۴ء) سے علم و ادب کی تعلیم لیا کرتے تھے۔

معتضد باللہ بہت اچھے منتظم تھے۔ وہ ایک بیدار مغز اور چوکس حکمراں تھے۔ تمام سرکاری دفاتر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان سے پہلے کے ادوار میں مالیات کا شعبہ قدرے کمزور ہو گیا تھا۔ معتضد کے بروقت اقدامات اور سخت فیصلوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ قومی خزانہ مستحکم ہو گیا، تمام مصارف کے بعد بھی سرکاری خزانے میں بڑی رقم بچ جایا کرتی تھی۔

معتضد فضول خرچ نہ تھے لیکن ہر معاملے میں جُزرسی سے بھی کام نہ لیتے تھے۔ جہاں خرچ کرنا ضروری ہوتا وہاں دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ جب معتضد کا انتقال ہوا تو بعض روایات کے مطابق خزانے میں ۹۰ کروڑ اشرفیاں موجود تھیں۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ معتضد نے اپنے دورِ حکومت میں کوئی نیا محصول (ٹیکس) نہیں لگایا بلکہ بعض پرانے محصولات میں کمی کر دی۔ اس طرح رعایا کو آسانی میسر آئی اور روزمرہ استعمال کی اشیا کی قیمتیں کم ہو گئیں۔ تاریخ الوزرا کے مطابق معتضد نے حالانکہ رعایا سے نرمی کا سلوک کیا لیکن ان کے دور میں عراق سے اتنا زیادہ خراج وصول ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور کو چھوڑ کر کسی زمانے میں اتنا زیادہ خراج وصول نہ ہوا تھا۔

معتضد نے مملکت کو زرعی لحاظ سے بھی ترقی دی۔ دجلہ کی ایک نہر دجیل کا دہانہ مدتوں سے بند تھا جس کے نتیجے میں اطراف کی وسیع اراضی پانی نہ ملنے سے بنجر ہو چکی تھی۔ معتضد نے اس نہر کو درست

Marfat.com

کروادیا جس کے باعث بڑا علاقہ سیراب اور شاداب ہو گیا۔ معتضد نے اپنی مملکت میں تجارت کے نظام کو بھی بہتر بنایا۔ تاجروں کو رعایتیں دیں۔ تاجروں کے قافلوں کی حفاظت کا اعلیٰ انتظام کیا۔ محکمۂ ڈاک کی کارکردگی بھی اس عہد میں بہت اچھی ہو گئی تھی۔

معتضد نے نظام انصاف کو بھی بہتر بنایا اور جرائم کی حوصلہ شکنی کے لیے سخت قوانین نافذ کیے۔ عدالتی کارروائی سے خود خلیفہ بھی بالاتر نہ تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی معاملے میں ایک شخص پر دعویٰ کیا لیکن خلیفہ کے پیش کردہ گواہ عدالت کو مطمئن نہ کر سکے۔ اس لیے خلیفہ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔

معتضد نہایت دلیر انسان تھے۔ ان کے ایک خادم جعیف السمرقندی بتاتے ہیں: ایک بار میں خلیفہ معتضد کے ساتھ سفر میں تھا۔ اچانک ہمارا سامنا ایک شیر سے ہو گیا۔ خلیفہ نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان کے گھوڑے کو پکڑے رکھوں اور خود گھوڑے سے اتر گئے۔ گھوڑے سے اترتے ہی انہوں نے نیام سے تلوار نکال لی اور شیر کی طرف آہستگی سے بڑھنے لگے۔ شیر نے اچانک جست لگائی اور خلیفہ پر حملہ کر دیا لیکن خلیفہ نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار کا وار کیا اور شیر کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا، پھر انہوں نے شیر کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سر پر تلوار ماری جس سے شیر تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ خلیفہ نے شیر کی پیٹھ کے بالوں سے اپنی تلوار صاف کی اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ جعیف کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد وہ خلیفہ کی بقیہ زندگی ہمیشہ ان کے ساتھ رہے لیکن خلیفہ نے اپنی بہادری کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔

معتضد باللہ ہی کے زمانے میں ایک اچھے بیمارستان (اسپتال) کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ بیمارستان دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر المخرّم کے علاقے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس بیمارستان کے قیام میں معتضد کے خادم المعتضدی نے اہم خدمات انجام دیں۔ معتضد نے مشہورِ زمانہ طبیب، کیمیادان اور فلسفی ابو بکر محمد بن زکریا الرازی کو اس بیمارستان کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ رازی کو بجا طور پر سب سے بڑا مسلمان طبیب قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مختلف امراض پر کتابیں اور رسائل تصنیف کیے ان میں چیچک اور خسرہ پر ان کا رسالہ "الجدری والحصبہ" تو بہت زیادہ مشہور ہے۔ انہوں نے طب پر دستور العمل کی کئی کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی دیگر کتابوں میں "طب المنصوری، طب الملوکی" شامل ہیں۔ عربی زبان میں سب سے بڑا طبی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) بھی رازی کی تالیف ہے جسے انہوں نے پندرہ برسوں میں مکمل کیا۔

معتضد کے عہد کے دیگر ممتاز اطبا میں حکیم سنان بن ثابت کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ معتضد نے انہیں اپنی حکومت میں طبیبِ خاص کا درجہ دیا تھا۔ وہ "رئیس الاطبا" کہلاتے تھے۔ حکیم سنان نے بعد میں دیگر خلفا کی ماتحتی میں بھی کام کیا۔ الحکم کے عہد میں حکیم سنان کے مشورے پر ایک عظیم الشان شفاخانہ ۳۰۶ھ / ۹۱۸ء میں باب الشام میں قائم کیا گیا اور اس کا نام "بیمارستان المعتضد" رکھا گیا۔

معتضد باللہ کا دور حکومت تعمیرات کے لحاظ سے بھی یادگار ہے۔ جب وہ بغداد منتقل ہو گئے تو انہوں نے ایک محل "قصر حسنی" میں رہائش اختیار کی۔ ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں معتضد نے اس محل کو نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس کے میدانوں کو وسیع کروایا، اس میں نئی عمارتوں کا اضافہ کروایا۔ انہوں نے اس میں گھڑ دوڑ کا ایک میدان بھی بنوایا۔ معتضد نے اس پورے علاقے کے گرد ایک خصوصی دیوار بھی تعمیر کروائی، انہوں نے اس علاقے کو دارالخلافہ کا مرکز قرار دیا تھا۔

معتضد نے قصر حسنی کے قریب ہی دریائے دجلہ کے کنارے "قصر التاج" کی تعمیر کا بھی آغاز کروایا۔ عمارت ابھی نامکمل تھی کہ معتضد کو عمارت کے معائنے کے دوران احساس ہوا کہ اس مقام پر فضا دھوئیں سے آلودہ رہتی ہے۔ یہ بات ان کے ذوقِ لطیف کے اعتبار سے موزوں نہ تھی، چنانچہ انہوں نے شمال مشرق کی سمت دو میل کے فاصلے پر ایک اور محل کی تعمیر شروع کروادی۔ اس طرح ایک شاندار عمارت "قصر الثریا" کے نام سے تعمیر ہو گئی۔ قصر حسنی اور قصر الثریا کو زمین دوز راستے کے ذریعے آپس میں ملایا گیا تھا۔ معتضد کے حکم پر قصر الثریا کے ارد گرد باغات لگائے گئے اور نہر موسیٰ سے وہاں پانی پہنچایا گیا۔ قصر الثریا ۴۶۹ھ / ۱۰۷۷ء تک اچھی حالت میں رہا پھر یہ پُرشکوہ عمارت سیلاب میں بہہ گئی۔ قصر التاج کی تکمیل معتضد کے جانشین مکتفی نے کروائی۔ معتضد نے جامع منصور کی توسیع پر بھی ہزاروں دینار صرف کر دیے۔ انہوں نے مسجد میں ۷ دروازوں کا اضافہ کر دیا۔

ربیع الاول ۲۸۹ھ / فروری ۹۰۲ء میں معتضد بیمار ہو گئے۔ یہی علالت ان کے لیے پروانۂ اجل لے کر آئی۔ ۲۱ ربیع الثانی ۲۸۹ھ / اپریل ۹۰۲ء کو یہ دور اندیش، زیرک، دانا و جری حکمران سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

Marfat.com

مستنصر باللہ

ان کا ۱۷ سالہ عہد، خلافتِ عباسیہ کے آخری دور کا عہدِ زریں ہے

اس سبزہ زار کو دیکھنے سے نگاہوں میں طراوت پیدا ہوتی تھی۔
صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس خوبصورت سبزہ زار کی حالت درست رکھنے اور اسے بنانے سنوارنے پر غیر معمولی توجہ صَرف کی جاتی ہے۔ اس وقت بھی سبزہ زار کے پودے ہلکی ہلکی ہوا میں جھوم رہے تھے اور ان پر کھلے ہوئے خوش رنگ پھول مسکرا رہے تھے۔ اچانک ایک جانب سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کی پُر تمکنت شخصیت پہلی ہی نظر میں متاثر کرتی تھی۔ وہ آہستہ روی کے ساتھ اس گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں ایک برج تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر وہ شخص برج میں داخل ہو گیا اور اوپر پہنچ کر اطمینان سے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھنے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی، وہاں ایک دریچہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔
دریچے کی دوسری جانب ایک وسیع و عریض مدرسہ تھا۔ یہ مدرسہ کیا تھا پوری جامعہ (یونیورسٹی) تھی۔ اس مدرسہ کی عمارت بے حد خوبصورت تھی اور شہر کی کوئی عمارت خوبصورتی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ حسین محرابوں سے مزین اس عمارت میں ہمہ وقت علم کا چرچا رہتا تھا۔

وہ شخص دریچے کی دوسری جانب جاری سرگرمیوں کا نہایت خاموشی کے ساتھ جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں طلبہ گروہ در گروہ علمی مباحث میں مشغول تھے۔ اساتذہ درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ کسی قسم کی ہڑبونگ، افراتفری اور بدنظمی دکھائی نہ دیتی تھی اور ہر کام انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ انجام دیا جا رہا تھا۔ وہ شخص کچھ دیر مدرسہ کے علمی ماحول کا جائزہ لیتا رہا، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور برج سے اتر کر باہر چلا گیا۔

یہ تھے ۳۶ ویں عباسی خلیفہ مستنصر باللہ جن کا ۱۷ سالہ عہد، خلافتِ عباسیہ کے آخری دور کا زریں حصہ ہے۔ ان کے قائم کردہ عظیم مدرسہ مستنصریہ نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور یہ قابلِ فخر علمی ادارہ تقریباً چار صدیوں تک علم کی ضوفشانی میں مصروف رہا۔ اس مدرسے کو قائم کرنے اور اسے معیار کی بلندیوں تک پہنچانے میں مستنصر باللہ کا کردار تاریخ کے صفحات میں روشن مینار کی طرح اجالا کر رہا ہے۔ مستنصر باللہ کو اس مدرسے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب انہوں نے اس مدرسے کا معائنہ نہ کیا ہو۔
مستنصر باللہ کا اصل نام ابو جعفر منصور ہے۔ ان کے والد کا نام ابو نصر محمد بن ناصر اور لقب ظاہر بامر اللہ ہے۔ ظاہر بامر اللہ بہت نیک دل، خدا ترس اور عادل خلیفہ تھے۔ انہوں نے مختصر عرصے میں مملکت عباسیہ کو ایک فلاحی ریاست بنا دیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے کی یاد تازہ کر دی، لیکن اجل نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی، وہ صرف نو ماہ تک خلافت کی گراں بار ذمہ داریاں انجام دے سکے۔
والد کے انتقال کے بعد خلافت کی ذمے داری ابو جعفر منصور پر آپڑی، انہوں نے ۱۴ رجب ۶۲۳ھ / ۱۱ جولائی ۱۲۶۲ء کو زمام کار اپنے ہاتھ میں لی۔ خلیفہ بنتے ہی انہوں نے عام اعلان کروا دیا کہ ملک میں انصاف کا بول بالا ہوگا۔ جس کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو وہ عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔ ہر مظلوم کو ظلم سے نجات دلائی جائے گی اور ہر مستحق کو اس کا حق دیا جائے گا۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جائے گی۔
مستنصر نے جو کہا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے تقریباً سترہ برس پر محیط دورِ حکومت میں عباسی حکومت کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا، اس کی عظمتِ گم گشتہ بحال ہوئی، دنیا نے مسلمانوں کی اس طاقت کو ایک بار

Marfat.com

پھر محسوس کیا جس نے بظاہر ناقابلِ تسخیر، ایوانوں کو درہم برہم کر ڈالا تھا اور عالیشان اور مضبوط محلوں میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔

مناسب ہوگا کہ یہاں خلافتِ عباسیہ کے پورے دورِ حکومت کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے۔ عباسی خلافت کا شمار دنیا کی طویل ترین اور بے حد مضبوط حکومتوں میں ہوتا ہے۔ اس کے پانچ سو آٹھ سالہ دور کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور، دورِ عروج کہلاتا ہے جو ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ۲۴۷ھ / ۸۶۱ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس عہد کا آغاز ابوالعباس سفاح سے ہوا اور دسویں عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ پر اس کا اختتام ہوا۔ اس دور میں مسلمانوں نے شاندار ترقی کی اور اسلامی حکومت کے پرچم اقصیٰ سے سرزمین سندھ تک اور چین سے سواحلِ یمن تک لہرانے لگے۔

سنہ ۲۴۷ھ / ۸۶۱ء سے عباسی عہد کے دوسرے حصے کا آغاز ہوا جو ۴۸ سال جاری رہا۔ اس دور میں متعدد نیم خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں جن میں جنوبی ایران کے صفاری، مازندران (شمالی ایران) کی دولتِ علویہ، مصر کی دولتِ طولونیہ، شام کے آلِ حمدان، ترکوں کی دولتِ اخشیدیہ جیسی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ ایران ہی کی دولتِ سامانیہ، ایران و عراق کی بنی بویہ اور مصر کی دولتِ فاطمیہ جیسی بڑی حکومتیں شامل تھیں، لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام حکومتیں عباسی خلیفہ کی سیادت کو تسلیم کرتی تھیں اور عباسی خلیفہ کا خطبہ ان تمام ریاستوں میں پڑھا جاتا تھا۔

۲۹۷ھ / ۹۰۹ء میں مصر پر فاطمیوں کا تسلط قائم ہوگیا اور ۳۳۴ھ / ۹۴۶ء میں بنی بویہ نے ایران پر قبضہ کرلیا۔ یہ عباسی خلافت کے دور کا تیسرا حصہ تھا۔ اس دور میں عباسی خلفا کی قیادت تسلیم تو کی گئی لیکن اس کی حیثیت رسمی تھی۔ اس دور میں سامانیوں، بنی بویہ، سلجوقیوں اور فاطمیوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء میں عباسیوں کی خود مختاری کے دوسرے دور کا آغاز ہوا جب ۳۱ویں عباسی خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء میں انتظامِ حکومت سنبھالا اور عباسی حکومت سلجوقیوں کے دائرۂ اثر سے آزاد ہوئی۔ اس کے بعد گو کہ خوارزم کی حکومت مصر و شام کی زنگی اور ایوبی حکومت اور ہرات کی غوری حکومت نے نمایاں مقام حاصل کیا، لیکن عباسیوں نے بھی پھر سے سنبھالا لے لیا۔

یہی عباسیوں کے دورِ حکومت کا آخری حصہ ہے جو ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی تک کے عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ آخری دور کے عباسی خلفا کی تعداد سات ہے۔ ان میں بڑے لائق اور اہل خلیفہ گزرے۔ آخری دور کے عباسی خلفا میں سب سے اچھا دور مستنصر باللہ کا ہے جن کے عہدِ حکومت کا زیرِ نظر مضمون میں جائزہ لیا جارہا ہے۔

مستنصر باللہ صفر ۵۸۸ھ / فروری ۱۱۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے بہت اچھی عادات و اطوار کے مالک تھے۔ نیکیوں کو اپنانے اور برائیوں سے اجتناب کرنے کی ان کی فطرت اور ذہانت کی وجہ سے ان کے دادا ناصر الدین ان کو بہت پسند کرتے تھے اور انہیں "قاضی" کہہ کر بلاتے تھے۔

رجب ۶۲۳ھ / جولائی ۱۲۲۶ء میں اپنے والد ظاہر بامر اللہ کی جگہ خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد مستنصر باللہ کے سامنے ایک بڑا چیلنج تھا کہ تاتاریوں کا سیلِ بلا، سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، نیشاپور سمیت وسط ایشیا اور ایران کے بہت سے شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اب عراق کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

تاتاریوں کے طوفانی حملوں کی خبریں مستنصر کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، انہوں نے اسی وقت سے تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ ان کے حکم پر ایک بہت طاقتور فوج تشکیل دی گئی۔ اس میں ایک لاکھ تو صرف سوار تھے۔ پیدل سپاہی ان کے علاوہ تھے۔ علامہ سیوطی کے مطابق "مستنصر باللہ نے تاتاریوں کے مقابلے کے لیے اتنی بڑی فوج تیار کی تھی کہ ان کے پیش رووں میں سے کسی کے پاس اتنی بڑی فوج نہ تھی۔" اتنی مضبوط فوج تیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت، لڑنے کی اہلیت اور دفاع کی صلاحیت کی دور دور تک دھاک بیٹھ گئی اور تاتاری جو لوٹ مار کرتے ہوئے عراق کی سرحد کے قریب پہنچ چکے تھے، عراق میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرسکے۔

سیوطی کی ایک اور روایت کے مطابق تاتاریوں نے عباسیوں کے علاقے پر حملہ کیا تھا اور مستنصر باللہ کی فوج نے اسے شکست دی تھی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء میں چنگیز خان کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں نے تاتاری مہم کو جاری رکھا اور جب ۶۳۵ھ / ۳۸-۱۲۳۷ء میں تاتاریوں نے عباسی مملکت پر حملہ کیا تو خلیفہ مستنصر باللہ کی فوج نے

Marfat.com

تاتاریوں کو ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ البتہ بعض دیگر موٴرخین کے بیانات اس روایت سے متصادم ہیں۔ بہر حال یہ بات متفقہ ہے کہ مستنصر باللہ فوجی حکمت عملی اور جنگی فنون کے ماہر تھے، ان میں قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ شجاعت اور بے خوفی جیسے اوصاف کے مالک تھے۔ ان کی حکومت ایک مستحکم حکومت تھی اور خراسان، آذر بائیجان، موصل، شام وغیرہ کے حکمران بھی مستنصر باللہ کے مطیع تھے اور ان کا ادب کرتے تھے۔ مستنصر باللہ کا خطبہ اندلس میں بھی پڑھا جاتا تھا۔ وہ برصغیر کے قابل حکمران شمس الدین التتمش کے ہم عصر تھے۔

یاقوت کہتے ہیں کہ مستنصر باللہ کے قائم کردہ شاندار مدرسے، مستنصریہ سے تھوڑے فاصلے پر مسجد مستنصریہ تھی۔ اس مسجد کے ایک مینار پر خلیفہ مستنصر باللہ کا نام کندہ کیا گیا تھا۔ یاقوت نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مسجد تین صدیوں قبل عباسی خلیفہ المکتفی نے تعمیر کروائی تھی۔ مستنصر باللہ نے اس مسجد کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ مستنصر نے اس مسجد میں منبر کی دائیں جانب چار بڑے چبوترے تعمیر کروائے تھے جن تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ اس قسم کا چبوترہ "دکہ" کہلاتا تھا۔ اس پر چڑھ کر موذن اذان دیا کرتے تھے اور طلبہ نماز جمعہ کے بعد ان چبوتروں پر بیٹھ کر علمی مباحثے کرتے تھے۔ اس مسجد کے آثار آج بھی سوق الغازی (دھاگوں کا بازار) میں باقی ہیں۔ مسجد کے آثار میں اس کا سنہ تعمیر ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء لکھا ہوا پایا گیا ہے۔

مستنصر باللہ کے عہد میں دمشق کے حکمران ملک اشرف نے ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء میں دمشق میں مدرسہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء میں مدرسے کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس مدرسے کو دارالحدیث اشرفیہ کہا جاتا تھا۔ اس میں خاص طور پر احادیث کا درس دیا جاتا تھا۔

مستنصر باللہ نے اپنے ۱۷ سالہ عہد میں متعدد مساجد، عمارتیں، پل، سرائیں اور مسافر خانے بنوائے۔ ان میں سرائے حربی، سرائے نہر سابس، سرائے خزینی شامل ہیں۔ ۴۸۸ھ/ ۱۰۹۵ء میں عباسی خلیفہ المستظہر نے بغداد کے اہم محلے "حریم" کے گرد دیوار تعمیر کروائی تھی جس کا مقصد آبادی کو سیلاب سے بچانا تھا۔ ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء کے سیلاب میں دیوار ٹوٹ گئی اور بہت سے محلے تباہ ہو گئے۔ سیلاب کے گزرنے پر دیوار کی مرمت کر کے ساری دیوار کے گرد پشتہ تعمیر کر دیا گیا۔ مستنصر کے دور میں اس دیوار کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ اس دیوار نے مشرقی بغداد کی حدود متعین کر دیں جو عثمانی دور کے آخر تک قائم رہیں۔

عراق کا مشہور دریا دجلہ مختلف زمانوں میں اپنی گزرگاہ تبدیل کرتا رہا ہے۔ آج کل بھی یہ دریا عباسی عہد کے مقابلے میں پانچ سے بارہ میل مغرب میں ہٹ کر بہہ رہا ہے۔ دریا کے اپنی گزرگاہ بدل لینے سے بہت سی زمینیں خشک سالی کا شکار ہو جاتی تھیں۔ نہر دجیل، دریائے دجلہ کی ایک ندی تھی جو بہت سی شاخیں بناتی ہوئی آگے جا کر دجلہ ہی میں گر جاتی تھی۔ دجیل کے علاقے میں بہت سے شہر تھے، ان میں سب سے بڑا حربا تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جو بعد میں سوادالعراق کہلانے لگا۔ یہاں سوتی کپڑے کی صنعت نے بہت ترقی کی تھی اور دیگر ملکوں میں اس کپڑے کی بڑی مانگ تھی۔ یہاں مٹی کے نفیس برتن بنانے کی صنعت بھی عروج پر تھی۔

مستنصر کے عہد میں دریائے دجلہ نے جو حربا سے ذرا اوپر کی سمت بہتا تھا، اپنا راستہ بدل لیا تو خلیفہ نے آب رسانی کے دیگر ذرائع مہیا کرنے کا آغاز کر دیا اور متعدد نہریں تعمیر کروائیں۔ موجودہ 'نہر دجیل' ان کے منصوبے کا حصہ ہے۔ حربا کے شمال میں نہر مستنصر تعمیر کی گئی۔ نہر دجیل پر حربا کا بڑا پل تعمیر کیا گیا تھا۔ سنگی اینٹوں سے مضبوط طریقے پر بنائے گئے اس پل کی چار عظیم محرابیں تھیں، جن کی لمبائی ایک سو اسی فٹ اور چوڑائی چالیس فٹ تھی۔ دونوں پہلوؤں میں تین سو فٹ طویل ایک کتبہ لگایا گیا تھا۔ اس کتبے سے معلوم ہوا کہ یہ پل ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس پل کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ شہر کے کھنڈرات میں ایک بزرگ حضرت سعدؓ کے مقبرے کے گنبد بھی نمایاں ہیں۔ مستنصر نے ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ء میں مکہ مکرمہ میں ایک شاندار شفاخانہ بھی بنوایا تھا۔

مستنصر باللہ نے اپنی قلمرو میں چاندی کے سکے رائج کروائے تھے۔ یہ سکے ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں جاری کیے گئے۔ خزانہ کے وزیر نے اراکین حکومت اور تاجروں کا اجلاس طلب کیا اور خلیفہ کے فیصلے سے انہیں آگاہ کیا کہ یہ فیصلہ تجارت میں سود کی ممکنہ شکلوں کو ختم کرنے کا بھی باعث ہوگا۔ چاندی کے دس سکوں کو ایک اشرفی کے برابر قرار دیا گیا۔ مستنصر کے دور میں عدالتی نظام کی بھی اصلاح کی گئی۔

موٴرخ ابن طقطقی کے مطابق مستنصر بڑے بہادر، فیاض اور کریم النفس تھے۔ ان کی سخاوت کی بڑی شہرت تھی۔ وہ لوگوں کی فلاح و بہبود پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے اور کہتے تھے۔ "میری نظر میں سونا

Marfat.com

اور مٹی برابر ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، (ترجمہ) "تم نیکی کو اس وقت تک حاصل نہ کر سکو گے جب تک تم وہ چیزیں (راہ خدا میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم محبوب رکھتے ہو۔" (آل عمران۔ ۹۲) اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میں اپنے کیے کے ثواب سے محروم نہ رہ جاؤں۔"

مستنصر کے دور میں علمی خدمات انجام دینے والے مشہور علما میں حافظ عزالدین علی ابن اثیر، ابن العربی، یاقوت حموی، ابوالعباس عونی اور متعدد دیگر مشاہیر شامل ہیں۔ حافظ عزالدین علی ابن اثیر (۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء تا ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی ایک سوانح "اسد الغابہ" کے نام سے مرتب کی۔ اس کتاب میں ساڑھے سات ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی یکجا کیے گئے ہیں اور صحابہ کرامؓ کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ابن اثیر ایک اہم کتاب "تاریخ الکامل" کے بھی مصنف ہیں جس میں آغازِ اسلام سے ۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے "تاریخ اتابکہ موصل" کے نام سے زنگی خاندان کی سب سے مستند اور مفصل تاریخ بھی لکھی۔

ابن العربی کا پورا نام ابو بکر محی الدین محمد ابن علی ہے۔ وہ رمضان ۵۶۰ھ / جولائی ۱۱۶۵ء میں اندلس کے جنوب مشرقی شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے متعدد شہروں میں جا کر علم حاصل کیا۔ بعد میں وہ بغداد بھی آئے اور آخر انہوں نے دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی جہاں ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ڈھائی سو کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے زیادہ تر تصوف پر لکھا ہے، تاہم انہوں نے تفسیر، حدیث، سیرت النبیؐ، ادب، ہیئت وغیرہ پر بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

یاقوت حموی (۵۷۵ھ تا ۶۲۶ھ / ۱۱۷۹ء تا ۱۲۲۹ء) اپنے دور کے سب سے بڑے جغرافیہ داں اور سیاح تھے۔ جغرافیہ کے موضوع پر انہوں نے ایک لاجواب کتاب "معجم البلدان" مرتب کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے سیکڑوں ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کے حالات پر مشتمل ایک کتاب "معجم الادبا" کے نام سے لکھی۔

مستنصر باللہ کا زمانہ عباسی حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ اس وقت بغداد گو کہ پہلے کے مقابلے میں سمٹ چکا تھا لیکن پھر بھی وہ دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہاں کئی شفاخانے تھے جن میں سوق مارستان کا شفاخانہ قابل ذکر ہے۔ یہاں طبیبوں کی تعداد ۵۲ تھی۔ شہر میں دو ہزار عالی شان حمام تھے۔ مدرسوں کی تعداد تیس تھی۔ شہر کے مشرقی حصے میں شاندار محل، پُرکشش باغات اور پُررونق بازار تھے۔ مغربی حصے میں شہر کے ہر محلے کی اپنی فصیل تھی۔ بغداد کے ہر محلے میں ایک مہمان خانہ تعمیر کیا گیا تھا تاکہ رمضان المبارک میں غریبوں کو کھانا کھلایا جا سکے۔

عظیم خلیفہ مستنصر باللہ نے ۱۰ جمادی الثانی ۶۴۰ھ / ۵ دسمبر ۱۲۴۲ء کو اپنا سفر حیات تمام کیا۔

Marfat.com

مدرسہ مستنصریہ

مستنصر باللہ کا اہم کارنامہ

مستنصر باللہ کا ایک بڑا کارنامہ، مدرسہ مستنصریہ کا قیام ہے۔ یہ اس قدر اچھا تعلیمی ادارہ تھا کہ بعض مورخین کے مطابق یہ مدرسہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس وقت کے بہترین تعلیمی ادارے، مدرسہ نظامیہ سے بھی آگے نکل گیا۔ مستنصر باللہ کے حکم پر بغداد میں، مدرسہ مستنصریہ کی تعمیر ۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء میں شروع ہوئی اور مدرسے کی خوبصورت اور وسیع عمارت ۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء میں مکمل ہوگئی۔ اس عمارت کی تعمیر پر ستر ہزار مثقال سے زیادہ لاگت آئی تھی۔ عمارت دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع تھی، اس کا ایک حصہ تو دریائے دجلہ کے اندر تک چلا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس عظیم الشان مدرسے کی عمارت کے آثار بغداد میں آج بھی موجود ہیں۔ مدرسہ مستنصریہ اس لحاظ سے دیگر مدارس سے مختلف تھا کہ اس میں چاروں فقہی مسالک یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے مطابق الگ الگ تعلیم دی جاتی تھی۔ دیگر مدارس میں صرف ۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء میں قائم ہونے والا 'البشیریہ' ایسا مدرسہ تھا جہاں چاروں فقہی مسالک کے مطابق تدریس کا انتظام تھا۔ بقیہ مدارس چاروں مذاہب فقہ میں سے کسی ایک کے ساتھ منسلک تھے۔

۶۳۱ھ / ۱۲۳۳ء میں اس شاندار مدرسے، المستنصریہ کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی جس میں نامور علماکرام اور فضلانے شرکت کی۔ اس مدرسہ میں چار بڑے شعبے قائم کیے گئے جن کے نام حدیث، نحو، طب اور فرائض ہیں۔ چاروں شعبوں کے سربراہ الگ الگ تھے جنہیں بالترتیب شیخ الحدیث، شیخ النحو، شیخ الطب اور شیخ الفرائض کہا جاتا تھا۔ ان کے تحت بہت سے مدرسین تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اساتذہ کو بھاری تنخواہیں ملتی تھیں۔ مستنصر باللہ کی خواہش تھی کہ اس مدرسے میں اپنے وقت کے جید ترین علماکرام درس دیا کریں۔ چنانچہ انہوں نے مملکت اسلامیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مختلف بڑے علماکرام سے گزارش کی کہ وہ بغداد آکر مدرسہ مستنصریہ میں تعلیم دیں۔ کئی علماکرام نے ان کی درخواست قبول کرلی۔ ان میں فقہ، اصول حکمت و کلام کے ماہر رشید الدین فرغانی بھی تھے۔ وہ پہلے سنجار کے مدرسے سے وابستہ تھے، لیکن مستنصر کی درخواست پر بغداد چلے آئے تھے۔ انہیں فقہ کا مدرّسِ اعظم مقرر کیا گیا۔

مدرسہ مستنصریہ اقامتی نوعیت کا مدرسہ تھا، یعنی یہاں طلبا کی رہائش کے انتظامات بھی کیے گئے تھے۔ طلبا کو بہترین سہولتیں دی گئی تھیں۔ رہائش، تعلیم، خوراک، علاج کی تمام سہولتیں بلامعاوضہ فراہم کی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں دولت مند یا نادار میں کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا تھا، سب کو یکساں سہولتیں ملتی تھیں۔ ہر طالب علم کو پلنگ، بستر، خوراک، چراغ، تیل، کتابیں، کاغذ، لکھنے کا سامان مفت ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک طلائی دینار ماہانہ دیا جاتا تھا۔ طلبا کو مٹھائیاں اور میوے بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ غسل کے لیے بہترین حمام موجود تھے۔ ایک اعلیٰ قسم کا شفاخانہ بھی مدرسے سے منسلک تھا۔ ایک مورخ، نابہر نے ۱۷۵۰ء میں بغداد کا دورہ کیا اور بتایا کہ مستنصریہ کا باورچی خانہ اس وقت بالکل سلامت تھا اور وہاں مستنصر کا نام اور مدرسہ کی تاریخ تعمیر درج تھی۔

مدرسہ مستنصریہ میں تعلیم کا نصاب مکمل کرکے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کو اسناد دی جاتی تھیں، ہر مرحلے کی سند الگ تھی۔ دینیات، منطق اور فلسفے کے علوم کے ماہرین جو سند پاتے تھے اسے "سندِ فاضل" کہا جاتا تھا۔ جو لوگ دینی علوم میں مہارت کا ثبوت دیتے تھے اور ان کی قابلیت حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی انہیں "سند

Marfat.com

عالم" کا مستحق ٹھہرایا جاتا تھا۔ ایسے علما کرام جنہیں مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہو جاتا تھا اور علوم میں ان کی مہارت مستند تسلیم کی جاتی تھی وہ "سندِ قابل" کے حقدار قرار پاتے تھے۔

اپنی شان و شوکت، آرائش، تکلفات اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے مستنصریہ اسلامی دنیا کے تمام مدارس کے مقابلے میں سبقت لے گیا تھا۔ مدرسے کے دروازے پر ایک دیوان تھا جس میں نہایت خوبصورت اور قیمتی گھڑی رکھی گئی تھی۔ اس گھڑی کے بارہ دروازے تھے۔ جب گھنٹہ پورا ہوتا تو تانبے کی موگری گھنٹی پر پڑتی اور ایک دروازہ کھل جاتا تھا۔ جب تمام بارہ دروازے کھل جاتے تو ان سے بارہ سوار نکل کر گھڑی کی پیشانی پر چکر لگاتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کے مطابق مستنصر باللہ نے بغداد میں اپنے مدرسے کے لیے عجیب گھڑی تیار کروائی تھی۔ اس گھڑی میں لاجورد کا ایک حلقہ آسمان کی شکل کا بنایا گیا تھا اور اس میں ایک آفتاب مسلسل حرکت کرتا رہتا تھا۔

مدرسے کے مصارف بے تحاشا تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے مستنصر باللہ نے سیکڑوں دیہات کی آمدنی وقف کر دی تھی۔ ان دیہات کی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال طلائی تھی۔

مدرسہ مستنصریہ کا کتب خانہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس کتب خانے میں ہزاروں نادر اور قیمتی کتابیں جمع کر دی گئی تھیں۔ جب مدرسہ قائم کیا گیا تو مستنصر باللہ نے اپنے خاص ذخیرۂ کتب سے اہم نوعیت کی کتابیں، ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لدوا کر مستنصریہ بھجوائیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستنصر اعلیٰ علمی ذوق کے مالک تھے اور ان کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔

مستنصریہ کے کتب خانہ میں جو نادر اور نایاب کتابیں رکھی گئی تھیں ان میں "کتاب الباسہ" بھی تھی یعنی آئین منگول کا نسخہ۔ اس میں چنگیز خان کے وہ احکام تھے جو اس نے اپنی رعایا کے لیے جاری کیے تھے۔ کتب خانہ میں مطالعہ کرنے والوں کے بیٹھنے کا بہت اچھا انتظام تھا۔ روشنی کا بندوبست عمدہ تھا۔ قلم دوات اور کاغذات موجود رہتے تھے۔ پینے کا ٹھنڈا پانی دستیاب رہتا تھا۔ کتابوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ کسی کو بھی اپنی پسند کی کتاب حاصل کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔

کتب خانے کے مہتمم کی ذمہ داری بھی اپنے وقت کے ممتاز علما کو دی جاتی تھی۔ پہلے مہتمم، الشمسی بن علی تھے۔ بعد میں ممتاز مؤرخ ابن الساعی (م ۶۷۴ھ) اور مشہور محدث، مؤرخ اور فلسفی ابن الفوطی (م ۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء) اس کتب خانے کے مہتمم مقرر کیے گئے۔ ابن الفوطی بڑے قابل محدث اور مؤرخ تھے۔ انہوں نے ۸۳ کتب لکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب تو پچاس جلدوں میں تھی۔

عباسیوں کے آخری عہد میں صرف بغداد میں ۲۷ کتب خانے تھے جن میں کتابوں کی تعداد چار کروڑ سے کم نہ تھی۔ ان کتب خانوں میں مستنصریہ سب سے نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ مستنصریہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اسے عباسیوں نے خود قائم کیا، جبکہ مدرسہ نظامیہ کو ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک طوسی نے قائم کیا تھا۔

مدرسہ مستنصریہ، سترھویں صدی عیسوی تک کام کرتا رہا۔

•••

Marfat.com

متوکل علی اللہ

دسویں عباسی خلیفہ جن کا دورِ حکومت عباسی عہد کا عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے

متوکل علی اللہ کا دور، یوں تو بہت سی خوبیوں کی بنا پر ممتاز ہے

لیکن ان کا ایک بڑا کارنامہ کتاب و سنت کے خلاف عقائد کی روک تھام ہے۔ ان عقائد کی وجہ سے بڑے بڑے نامور علما کرام کو تکالیف سہنی پڑیں اور وہ علم دین کی اشاعت نہ کرسکے۔ متوکل نے خلق قرآن کی بحث کا خاتمہ کر دیا اور علما کرام کو مساجد میں درس دینے کی آزادی دے دی۔ ان کے اس اہم فیصلے کو مؤرخین نے احیائے سنت کا نام دیا ہے۔

متوکل علی اللہ کا پورا نام ابوالفضل جعفر بن محمد ہے۔ وہ شوال ۲۰۶ھ / ۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد معتصم باللہ ہیں جو خود بھی اپنے دور میں عباسی خلیفہ تھے۔ والدہ کا نام شجاع تھا۔ متوکل علی اللہ اپنے بھائی واثق باللہ کی وفات کے بعد ۲۴ ذی الحجہ ۲۳۲ھ / ۱۲ اگست ۸۴۷ء کو خلیفہ بنائے گئے۔

متوکل کے دور میں رومیوں سے متعدد جنگیں ہوئیں اور صقلیہ (سسلی) میں بھی فتوحات ہوئیں۔ سندھ کا علاقہ بھی زیر نگیں آیا۔ اس کے علاوہ متوکل کو بعض بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً آذربائیجان کے حکمران محمد بن بعیث نے ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء میں بغاوت کی۔ متوکل نے انہیں گرفتار کروایا پھر انہیں رہا کیا تو وہ دوبارہ باغی ہو گئے۔ آخر ابن بعیث کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

بالائی دجلہ کے علاقے (میدان عراق) کے جنوب میں اور ایشیائے کوچک کے مشرق میں آرمینیا کا وسیع علاقہ واقع تھا۔ ۲۴ھ / ۶۴۰ء میں پہلی بار اس علاقے پر مسلمانوں نے مکمل اقتدار قائم کیا تھا۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عہد خلافت تھا۔ اس کے بعد کشمکش کا سلسلہ جاری رہا۔ ۳۳ھ / ۶۵۳ء میں رومی بادشاہ نے آرمینیا کے پورے ملک اور گرجستان (جارجیا) پر قبضہ کر لیا۔ تاہم اس علاقے میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش عرصے تک جاری

Marfat.com

رہی۔ آرمینیا میں مسلمانوں کی حکومت کے خلاف سب سے بڑی اور سب سے زیادہ خطرناک بغاوت متوکل کے عہد میں ۲۳۷ھ / ۸۵۱ء میں ہوئی۔ متوکل نے اپنے بہترین آزمودہ کار سپہ سالار بغاالکبیر کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔

بغاالکبیر نے ۲۳۷ھ۔۲۳۸ھ / ۵۲-۸۵۱ء میں متعدد شدید لڑائیوں کے بعد تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا اور سرکردہ امرا کو قید کر دیا۔ تاہم بعد میں متوکل کو جب رومیوں سے لڑنے کے لیے فوجوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے قیدی سرداروں کو ۲۴۷ھ / ۲-۸۶۱ء میں رہا کر دیا اور بجراتی خاندان کے اشوط کو آرمینیا کا بڑا امیر بنا دیا جنہوں نے اس علاقے کا اچھا انتظام کیا۔ وہ متوکل کو سالانہ خراج باقاعدگی سے ادا کیا کرتے تھے۔

سنہ ۲۳۷ھ / ۸۵۱ء میں ایک شخص صالح بن نصر نے سجستان پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں یعقوب بن لیث انصار کو یہاں حکمراں مان لیا گیا۔ یعقوب نے یہاں مستقل حکومت قائم کر لی جو دولت صفاریہ کہلاتی ہے۔

رومیوں نے ۲۳۸ھ / ۸۵۲ء میں دمیاط کی سمت سے مصر پر تین سو جنگی جہازوں کی مدد سے حملہ کر دیا۔ دمیاط پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا تاہم شہریوں نے اس کے بعد مزاحمت کی اور رومیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد متوکل نے دمیاط میں قلعے تعمیر کروائے اور حفاظت کا معقول انتظام کیا۔

سنہ ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء میں روم پر ملکہ تدورہ حکمراں تھی۔ اس کے قبضے میں بارہ ہزار مسلمان قید تھے۔ ان میں سے کئی کو قتل کر دیا گیا۔ متوکل نے فدیہ دے کر ۷۸۵ مردوں اور ۱۲۵ خواتین کو رہائی دلوائی۔ سو سے زائد ذمی عیسائیوں کو بھی متوکل نے قید سے نجات دلوائی۔

مصر اور حبشہ کے درمیان ایک قوم "بجاۃ" آباد تھی۔ ان کے علاقے میں چاندی، سونے اور جواہرات کی کانیں کثرت سے تھیں۔ مسلمانوں اور ان میں عرصے سے معاہدہ تھا کہ مسلمان ان کے علاقوں پر حملہ نہ کریں گے اور بجاۃ سالانہ چار سو مثقال سونا مصر کو دیا کریں گے۔ بجاۃ ایک طویل مدت تک معاہدے کے پابند رہے لیکن متوکل کے زمانے میں انہوں نے عہد توڑ دیا بلکہ سونے کی کانوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ متوکل نے اس صورت حال پر بڑی برہمی کا اظہار کیا اور فوج کشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ امرا نے راستے کی صعوبتوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ بجاۃ سخت وحشی ہیں۔ لیکن متوکل نے محمد بن عبداللہ کو جو "قمی" کے لقب سے معروف تھے بیس ہزار سپاہیوں اور ضروری رسد کے ساتھ خشکی کے راستے بھیج دیا۔

قمی لشکر لے کر پہنچے۔ بجاۃ میدان میں آئے۔ قمی کو اندازہ ہو گیا کہ بجاۃ کے اونٹ گھنٹی کی آواز سے بھڑک جاتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے گھوڑوں کے گلوں میں گھنٹیاں بندھوا دیں۔ اس طرح ہزاروں گھنٹیوں کی آوازیں سن کر بجاۃ کے اونٹ بدک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخر کار بجاۃ کو شکست ہوئی اور انہوں نے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اطاعت اختیار کی اور گزشتہ چار سال کا واجب الادا خراج بھی ادا کیا۔ متوکل نے فراخ دلی سے انہیں معاف کر دیا۔

متوکل کے زمانے میں صقلیہ میں بھی فتوحات ہوئیں۔ گو کہ صقلیہ کے بعض علاقے پہلے ہی مسلمانوں کے پاس تھے اور بلرام ان کا مرکز تھا۔ ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء میں رغوس کے باشندوں نے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

رجب ۲۳۶ھ / جنوری ۸۵۱ء میں صقلیہ کے مسلمان حاکم محمد بن عبداللہ بن اغلب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد صقلیہ کے مسلمانوں نے عباس بن فضل بن یعقوب کو اپنا امیر بنایا۔ عباس نے اپنے چچا رباح کو قلعہ ابی ثور کی طرف بھیجا اور خود قصریانہ کی طرف بڑھے۔ انہوں نے فوجی کارروائی کی۔ ۲۳۸ھ / ۸۵۲ء میں وہ پھر فوج لے کر روانہ ہوئے اور قصریانہ، قطانہ، سرقوسہ پر حملے کیے۔

صقلیہ کا دارالحکومت سرقوسہ تھا۔ مسلمانوں کے حملے کے بعد رومیوں نے قصریانہ کو دارالحکومت بنایا تھا۔ عباس نے قصریانہ کو فتح کرنے کے لیے بحری بیڑا بھیجا جس نے چالیس جہازوں پر مشتمل رومیوں کے بحری بیڑے سے مقابلہ کیا اور ان کے دس جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کئی معرکے ہوئے آخر شوال ۲۴۴ھ / جنوری ۸۵۹ء میں قصریانہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ عباس نے قصریانہ میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اور جمعہ کا خطبہ پڑھا۔ اس فتح کے بعد رومیوں نے تین سو جہازوں کی مدد سے حملہ کیا لیکن عباس نے اسے بھی شکست دی۔ اس کے بعد بھی رومیوں نے کئی بار حملے کرنے کی کوشش کی لیکن عباس نے سب کو ناکام بنا دیا اور رومیوں کے بڑے بڑے لشکروں کو بے جگری سے شکست دی۔ جمادی الثانی ۲۴۷ھ / اگست ۸۶۱ء میں عباس علالت کے باعث انتقال کر گئے۔

دیگر مقامات پر بھی رومیوں سے معرکے ہوئے۔

Marfat.com

۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء میں متوکل نے بغا کبیر کو سرحد پر مامور کیا۔ انہوں نے صملہ فتح کر لیا۔ لیکن رومیوں نے سمیساط پر حملہ کر کے سیکڑوں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ادھر مجاہد کبیر فضل بن قاران نے بحری حملہ کر کے انطاکیہ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اس طرح دیکھیں تو فتوحات کے اعتبار سے متوکل کا دور بڑا کامیاب ہے۔

متوکل ہی کے عہد میں سرزمین سندھ پر بھی مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوئی۔ متوکل نے عمر بن عبدالعزیز ہباری کو سندھ کی حکومت کی سند بھیج دی تھی۔

متوکل کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے دریائے نیل کے دہانوں پر رشید، دِمیاط اور تینس (تیونس) میں بہت مضبوط بحری مراکز قائم کیے اور جو مراکز قائم تھے انہیں مزید مستحکم بنا دیا تاکہ ان علاقوں کا بوزنطی (رومی) حملوں سے دفاع کیا جا سکے۔ متوکل نے ان علاقوں میں ایسی احاطہ بند لشکر گاہیں بنوا دیں جیسی شام میں تھیں۔ رشید، دریائے نیل کی شاخ رشید کے مغربی ساحل پر اس کے دہانے سے دس میل اوپر واقع مصر کا قصبہ ہے۔ متوکل کے عہد سے قبل بحری جہاز فوہ تک آتے تھے لیکن اس علاقے میں بہت زیادہ گاد جمع ہو جانے کی وجہ سے رشید کو وہ اہمیت حاصل ہو گئی جو فوہ کو حاصل تھی۔

دِمیاط، مصر زیریں کا شہر ہے جو دریائے نیل کی مشرقی شاخ پر اس کے دہانے کے قریب واقع ہے۔ فتح اسلام سے قبل یہ ایک اہم شہر تھا۔ مسلمانوں کے قبضے کے بعد اس شہر پر بار بار بحری حملے ہوئے۔ پہلے بوزنطیوں کی طرف سے پھر صلیبیوں کی طرف سے۔ ذوالحجہ ۲۳۸ھ/ جون ۸۵۳ء میں ایک حملے کے بعد متوکل نے بحیرۂ روم کے ساحل کی مورچہ بندی کے لیے ایک منصوبے کے مطابق دمیاط کے مقام پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔

تینس موجودہ تونس یا تیونس کا قدیم نام ہے بلکہ یہ شہر موجودہ تیونس شہر کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ شہر جھیل تونس یا بحیرہ (البحیرہ) کے کنارے تھا۔ اس زمانے میں اس جھیل میں جہاز رانی ہو سکتی تھی۔

متوکل کے عہد سے پہلے عباسی خلفا نے مصر میں اسلحہ خانے قائم کیے تھے۔ ان میں ایک قلزم میں اور ایک اسکندریہ میں تھا۔ قلزم کی جگہ بعد میں سویز نے لے لی۔ یہ کارخانہ بہت اہم تھا۔ اسلحہ بنانے کا نہایت ترقی یافتہ کارخانہ نیل کے کنارے فسطاط کے قریب قائم کیا گیا تھا۔ فسطاط اب قاہرہ کہلاتا ہے۔ پہلے پہل یہ اسلحہ خانہ جزیرہ روضہ میں بنایا گیا تھا۔ یہ جزیرہ بڑے جزیروں کے سلسلے میں سے ایک جزیرہ ہے جو دریائے نیل کی دو شاخوں دِمیاط اور رشید میں منقسم ہونے سے پہلے اس کے طاس میں واقع ہے۔ بوزنطیوں سے بحری جنگوں کے دوران، متوکل نے ۲۳۸ھ/ ۸۵۳ء میں جزیرہ روضہ کے اسلحہ خانے کو دوبارہ منظم کیا۔ یہ اتنا مشہور ہوا کہ اس زمانے میں جزیرہ روضہ کو "جزیرہ الصناعہ" یعنی صنعت و حرفت کا جزیرہ کہا جانے لگا۔

متوکل علی اللہ ایک بہت وسیع مملکت کے حکمراں تھے۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ نئے خلیفہ کی نامزدگی اختلافات کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مملکت کو اپنے تین بیٹوں کے مابین اپنی زندگی ہی میں تقسیم کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں محمد، طلحہ اور ابراہیم کو بالترتیب منتصر باللہ، معتز باللہ اور مؤید باللہ کے القاب دیے۔ مملکت کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی:

منتصر باللہ کو افریقہ، مصر، شام، عراق، مغرب، قنسرین، دیار ربیعہ، دیار مضر، موصل، عانہ، خابور، کوروجلہ، حرمین، یمن، حضر موت، سندھ، مکران، قندابیل کے علاقے دیے گئے۔

معتز کے حصے میں خراسان، طبرستان، رے، آرمینیا، آذربائیجان اور فارس کے علاقے آئے۔ مؤید کو حمص، دمشق، اردن، فلسطین اور شام کے علاقے دیے گئے۔

ان تینوں کو ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت کا اختیار نہ تھا۔ تاہم متوکل کی جانشینی میں پہلا نام منتصر کا تھا۔ بعد میں متوکل کے خیالات میں تبدیلی آئی اور وہ معتز کو اپنا پہلا جانشین مقرر کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ منتصر اسی وجہ سے متوکل کے خلاف ہو گئے تھے۔ متوکل کے بعض مخالفین نے اس اختلاف کو مزید ہوا دی اور ایک سازش کے تحت ۴ شوال ۲۴۷ھ/ ۱۱ دسمبر ۸۶۱ء کو متوکل کو قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے ۱۳ برس اور چار ماہ حکومت کی۔

متوکل علی اللہ کا عہد حکومت نہایت اعلیٰ پائے کی علمی شخصیات کی موجودگی اور ان کے بے حد قابل قدر علمی کارناموں کی بدولت ممتاز ہے۔ ان میں فقہ کے جلیل القدر امام حضرت احمد بن حنبلؒ ہیں جن کے مسلک کے پیروکار بڑی تعداد میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کو مخلوق قرار دینے کا تنازعہ مامون الرشید کے دور میں شروع ہوا تھا اور معتصم کے دور میں بھی جاری رہا تھا۔ اس دوران امام احمد بن حنبلؒ پر سختیوں کے پہاڑ توڑے گئے اور آپؒ کو شدید اذیت پہنچائی گئی۔ لیکن

Marfat.com

جب متوکل خلیفہ بنے تو انہوں نے کتاب وسنت کے خلاف تمام عقائد کو منسوخ قرار دے دیا اور خلق قرآن پر بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد امام احمدؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ بحال فرما دیا۔

سنہ ۲۳۷ھ / ۸۵۲ء میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) احمد بن ابی داؤد کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ ان کے عقائد اہل سنت سے متصادم تھے۔ بعض روایات کے مطابق امام احمدؒ نے احمد بن ابی داؤد کی جگہ یحییٰ بن اکثم کے تقرر کی سفارش کی تھی۔ ۲۳۷ھ / ۸۵۲ء ہی میں امام صاحبؒ کو خلیفہ متوکل علی اللہ نے سامرا آنے کی دعوت دی۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ متوکل امام صاحبؒ سے اپنے صاحبزادے معتز کو حدیث کی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ یہ خیال بھی ہے کہ خلیفہ سنت کی بحالی کے سلسلے میں امام صاحبؒ کے تعاون اور رہنمائی کے خواہش مند تھے۔ امام صاحبؒ سامرا تشریف لے گئے جہاں آپؒ کو بہت عزت و تکریم کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا۔ آپؒ کی خدمت میں بیش قیمت تحائف پیش کیے گئے تاہم امام صاحبؒ نے خواہش ظاہر کی کہ آپؒ کو آپؒ کی عمر اور صحت کے پیش نظر کوئی خاص ذمے داری نہ دی جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ امام صاحبؒ کا انتقال متوکل ہی کے عہد میں ربیع الاول ۲۴۱ھ / جولائی ۸۵۵ء میں ہوا۔

امام احمدؒ نے ایک بہت اہم مجموعۂ احادیث مرتب فرمایا جو "مسند احمد" کہلاتا ہے۔ آپؒ نے حدیث و فقہ پر بہت عظیم کام کیا ہے اور متعدد کتب تحریر فرمائی ہیں۔ آپؒ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد آپؒ کے بعد علم و دین کی ترویج و تحقیق میں مصروف رہی۔

متوکل ہی کے دور میں حدیث کی سب سے صحیح کتاب "صحیح بخاری" کے مرتب امام بخاریؒ بھی موجود تھے۔ ان کا انتقال ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء میں یعنی متوکل کی وفات کے تقریباً ۹ برس بعد ہوا۔ امام صاحبؒ نے صحیح بخاری کے علاوہ تقریباً پچیس دیگر کتب بھی تحریر فرمائیں۔ حدیث کی دوسری صحیح کتاب "صحیح مسلم" کے مولف امام مسلمؒ بھی اسی دور میں احادیث کی اشاعت فرما رہے تھے۔ ان کا انتقال ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء میں یعنی متوکل کے انتقال کے تقریباً ۱۴ برس بعد ہوا۔

متوکل کے عہد کی ایک اہم شخصیت فتح بن خاقان کی ہے۔ وہ وسطی ایشیا کی ترک فوج کے سالار تھے۔ متوکل کے ہم عصر تھے۔ متوکل نے خلیفہ بننے کے بعد انہیں مختلف ذمہ داریاں دیں۔ وہ مصر کے حاکم اور دمشق میں نائب بھی رہے۔ وہ خود اچھے مصنف اور شاعر تھے اور علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً اخلاق الملوک، السید و الجوارح، الروضہ و الظہر وغیرہ۔ یہ کتابیں اب ناپید ہیں۔ سامرا میں ان کا بہت اچھا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں فلسفہ پر بہت سی کتابیں تھیں۔ فتح بن خاقان کو بھی ۴ شوال ۲۴۷ھ / ۱۱ دسمبر ۸۶۱ء کو خلیفہ متوکل کے ساتھ ہی قتل کیا گیا۔ انہوں نے خلیفہ کو قاتلانہ حملے سے بچانے کے لیے سخت مدافعت کی تھی۔

متوکل کے دور میں ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق الکندی کا نام بھی بڑا نمایاں ہے۔ انہوں نے مامون اور معتصم کے دور میں فلسفہ یونان سے متعلق کتب کے تراجم کیے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور معتصم کے ایک بیٹے کے اتالیق کی خدمات انجام دیں۔ وہ معتزلہ عقائد کے پیرو تھے۔ چنانچہ متوکل کے عہد میں ان کا کتب خانہ کچھ عرصے کے لیے ضبط کر لیا گیا۔ وہ طبیعیات، کیمیا اور طب کے ماہر تھے۔ انہوں نے تقریباً پونے دو سو کتابیں اور رسائل تصنیف کیے۔

متوکل کے عہد کی ایک بڑی علمی شخصیت ابن السکیت کی ہے۔ وہ علم قرآن، عربی لغت و شعر پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ متوکل نے اپنے دو بیٹوں المعز اور المؤید کی تعلیم و تربیت ابن السکیت کے سپرد کر دی تھی۔ "اصلاح المنطق" اور "کتاب الالفاظ" ان کی دو اہم تصانیف ہیں۔ انہوں نے عرب شعرا کے تقریباً تیس دیوان مع حواشی مرتب کیے۔ عربی لغات مرتب کرنے والے اپنی کتابوں میں ابن السکیت کا حوالہ بار بار دیتے ہیں۔

متوکل علی اللہ کے زمانے میں دیگر علوم کو بھی ترقی دی گئی۔ ان کے عہد میں ایک رصد گاہ قائم تھی جو موسیٰ بن شاکر کے لڑکوں نے بنائی تھی۔ متوکل کے زمانے میں النظیری اور محمد بن عیسیٰ ابو عبداللہ نے اس رصد گاہ کو بے حد ترقی دی۔ انہوں نے علم ہیئت کے مسائل پر گراں قدر تحقیق کی اور سورج اور دیگر ستاروں کی گردش کے بارے میں نہایت مفید اور حیرت انگیز معلومات فراہم کیں۔ ان دونوں ماہرین نے اس دوربین کو بھی مزید بہتر بنایا جسے ابوالحسن نے تیار کیا تھا۔ اسی دور کے ایک ممتاز ہیئت داں ابو العباس احمد الفرغانی تھے۔ انہوں نے ایک بہت عمدہ کتاب "المدخل الیٰ ہیئۃ الافلاک" تصنیف کی تھی۔

طب کے شعبے پر بھی متوکل نے توجہ دی اور ایک بے حد مشہور اور قابل طبیب ابو زید حنین بن اسحاق العبادی کو اپنے یہاں ملازمت دی۔ حنین بن اسحاق ایک مسیحی عرب تھے۔ وہ نہ صرف طبیب تھے بلکہ

Marfat.com

سریانی اور عربی زبانوں میں متعدد یونانی کتابوں کے مترجم بھی تھے اور ایک فلسفی کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی شہرت ہے۔ مامون الرشید نے انہیں بیت الحکمت کے دارالترجمہ کا رئیس مقرر کیا تھا جہاں انہوں نے متعدد کتابوں کے تراجم کیے اور تراجم کی جانچ اور نگرانی کے فرائض انجام دیے۔ حنین ۱۹۴ھ / ۸۰۹-۱۰ء میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۲۶۰ھ / ۸۷۳ء میں وفات پائی۔ وہ فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے طب پر کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں مشہور کتاب المسائل فی الطب للمتعلمین اور طبیعیات اور ہیئت کے موضوعات پر کئی کتابیں شامل ہیں۔

حنین نے امراضِ چشم اور ان کے علاج پر متعدد کتابیں لکھیں، دانتوں، معدے اور نبض سے متعلق تصانیف بھی ملتی ہیں۔ تراجم میں ویسقوریدوس کی مخزن الادویہ بہت مشہور ہے۔ جالینوس کی شاید ہی کوئی ایسی تصنیف ہو جس کی انہوں نے اصلاح یا ترجمہ نہ کیا ہو۔ بطلیموس کی ایک کتاب اثرات النجوم پر ہے، اس کا بھی ترجمہ کیا۔ متوکل نے حنین کی بہت قدر کی۔ تین بڑی عمارتیں ان کے لیے خالی کر دیں۔ سرکاری کتب خانہ بھی ان ہی عمارتوں میں منتقل کر دیا تھا۔ ایک اور مشہور طبیب علی بن سہل ابان الطبری متوکل کے دور میں مسیحیت ترک کر کے مسلمان ہوئے۔ انہوں نے ایک کتاب "فردوس الحکمت" لکھی۔ وہ خاصے عرصے تک خلیفہ کے معالج رہے۔

متوکل کے دور میں علامہ بلاذری بھی موجود تھے۔ احمد بن یحیٰی بن جابر بلاذری بہت بڑے مورخ، ماہر انساب اور جغرافیہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ متوکل کے رفقا میں سے تھے۔ علامہ بلاذری نے یوں تو بہت سی کتابیں تصنیف کیں لیکن ان کی دو کتابوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ ان میں ایک "فتوح البلدان" ہے یعنی مسلم فتوحات کی تاریخ۔ علامہ نے یہ کتاب متوکل کے عہد میں تصنیف کی۔ اس کتاب کا آغاز غزوات نبویؐ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد شام، الجزیرہ، آرمینیا، مصر اور المغرب کی فتوحات کا تذکرہ ہے اور آخر میں عراق و ایران پر تسلط کی تفصیل ہے۔ علامہ بلاذری نے اس کتاب میں ثقافتی اور معاشرتی حالات کے متعلق اہم اشارے کیے ہیں۔

علامہ بلاذری کی دوسری اہم کتاب "انساب الاشراف" بہت ضخیم کتاب ہے۔ کتاب کا آغاز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اعزہ کے حالاتِ زندگی سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر اس میں دیگر متعدد قبائل کا ذکر ہے۔ یہ کتاب نہایت بیش قیمت تاریخی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ خیال ہے کہ علامہ بلاذری کا انتقال ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں ہوا۔

متوکل ہی کے عہد میں مشہور زمانہ کتاب "طبقات ابنِ سعد" کے مولف ابو عبداللہ بن محمد سعد بھی موجود تھے۔ وہ ابنِ سعد کے نام سے معروف ہیں۔ انہوں نے کئی جلدوں پر مشتمل کتاب "الطبقات الکبریٰ" لکھی جو "طبقات ابنِ سعد" کے نام سے مشہور ہے۔ ابن سعد ۱۶۸ھ / ۸۵-۷۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۳۰ھ / ۸۴۵ء میں بغداد میں فوت ہوئے۔ طبقات ابن سعد میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور اپنے زمانے تک کے تابعینؒ کے حالات تحریر کیے ہیں۔

اسی زمانے میں ابن خرّدازبہ نے ۲۳۲ھ / ۸۴۶ء میں اہم کتاب "کتاب المسالک و الممالک" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب سے مشہور جغرافیہ داں ابن الفقیہ ابن حوقل اور المقدسی نے اپنی تصانیف میں بڑی مدد لی ہے۔ حیاتیات کے ضمن میں ابو عثمان عمرو نے متوکل کے عہد میں ایک نہایت ضخیم اور اہم کتاب "کتاب الحیوان" تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے جانوروں کی کشمکش حیات پر بحث کی ہے۔ انہوں نے متعدد دیگر کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ابو عثمان نے جانوروں کے فضلے کو خشک کر کے امونیا بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

متوکل نے مامون الرشید کے عہد میں قائم ہونے والے عظیم کتب خانے کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام کیا۔ ان کے وزیر فتح بن خاقان نے بھی ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ بغداد اور سامرا میں دیگر علما اور امرا کے کتب خانے بھی موجود تھے۔ اسحاق الموصلی کا کتب خانہ بغداد کے عظیم ترین کتب خانوں میں ایک تھا۔

اسحاق الموصلی بھی متوکل کے عہد میں تھے۔ ان کا پورا نام ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم ہے، انہوں نے ایک فقیہ، ماہر صرف و نحو، شاعر و مصنف کے طور پر بڑا نام پیدا کیا۔ وہ ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قرآن کریم الکسائی اور الفرا سے پڑھا۔ حدیث کی تعلیم ابنِ بشیر سے حاصل کی اور خالص ادب کی تعلیم الاصمعی اور ابو عبیدہ المثنیٰ سے حاصل کی۔ لیکن انہوں نے موسیقی کا وسیع علم بھی حاصل کیا اور اسی حیثیت سے وہ بے حد مشہور ہوئے۔ عباسی خلفا ان کے بے حد مداح تھے۔ مامون الرشید نے ایک بار کہا کہ اگر اسحاق ایک مغنی کی حیثیت

Marfat.com

سے اتنے مشہور نہ ہوتے تو میں انہیں قاضی کا عہدہ دے دیتا۔

اسحاق الموصلی کو بڑے بڑے علما اور ادبا کی صف میں بیٹھنے اور فقہا کے لیے مخصوص لباس پہننے کی اجازت حاصل تھی۔ انہوں نے علم موسیقی پر بہت کام کیا اور اس کے ضابطے مقرر کیے۔ انہوں نے تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کیں۔ جب ۲۳۵ھ / ۸۵۰ء میں اسحاق الموصلی کا انتقال ہوا تو متوکل پکار اٹھے: "اسحاق کی موت نے میری سلطنت کو بڑی زینت اور افتخار سے محروم کر دیا۔" اسحاق الموصلی کی سوانح ان کے صاحبزادے حماد نے لکھی جو خود بھی ایک نامور محدث اور مصنف تھے۔ اسحاق الموصلی کے متعدد تلامذہ نے اپنے اپنے شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔

متوکل نہایت علم دوست حکمران تھے اور علما کرام کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ جب ان پر بارِ خلافت ڈالا گیا تو انہوں نے ۲۳۴ھ / ۸۴۸ء میں تمام محدثین کو دارالخلافہ سامرا میں مدعو کیا۔ ان سے احادیث بیان کرنے کی درخواست کی اور انہیں گراں قدر تحائف پیش کیے۔ متوکل نے علامہ ابو بکر بن ابی شیبہ کو جامع رصافہ (بغداد کے قریب دریائے دجلہ کی مشرقی جانب شہر رصافہ کی مسجد) میں اور ان کے بھائی علامہ عثمان کو بغداد کی جامع منصور میں درسِ حدیث دینے کے لیے مقرر کیا۔ ایک ایک درس میں تیس تیس ہزار افراد شریک ہوتے تھے۔

متوکل امام شافعیؒ کے بڑے معتقد تھے اور کہا کرتے تھے کہ اے کاش امام شافعیؒ اس زمانے میں ہوتے تو میں ان سے ملتا اور ان سے علم حاصل کرتا۔ وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے شافعی مسلک اختیار کیا۔ متوکل نے چند احادیثِ نبویؐ کی روایت بھی کی ہے۔

متوکل اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ملک میں خلافِ شرع و سنت عقائد کا پرچار نہ ہو چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے جو مصر کے ایک بڑے صوفی بزرگ تھے، جب بعض صوفیانہ نظریات کی تبلیغ کی اور امام مالکؒ کے تلامذہ نے ان نظریات کی مخالفت کی تو متوکل نے اس بات کی تحقیق کروائی۔ حضرت ذوالنونؒ کو دارالخلافہ بلوایا اور ان سے "معرفت" اور "عرفان" کے بارے میں سوالات کیے۔ وہ ان کے جوابات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ بعد میں جب کبھی علما اور صوفیا کا ذکر آتا تھا تو متوکل کہہ اٹھتے تھے کہ حضرت ذوالنونؒ کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ حضرت ذوالنونؒ ایک صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ طب اور کیمیا کا علم بھی رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۲۴۶ھ / ۸۶۱ء میں، مصر میں ہوا۔ متوکل نے امام مالکؒ کے شاگرد حارث بن مسکینؒ کو مصر میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کیا تھا۔

متوکل علی اللہ نے دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع شہر سامرا کو بے حد ترقی دی۔ بغداد سے تقریباً ساٹھ میل شمال میں واقع یہ شہر متوکل کے والد معتصم باللہ نے بسایا تھا اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ متوکل کے عہد میں یہ شہر اپنے اوجِ کمال کو پہنچا لیکن متوکل کے دور کے خاتمے کے ساتھ ہی اس شہر کو بھی زوال آ گیا۔ گو کہ ۲۷۶ھ / ۸۸۹ء تک، یعنی متوکل کے انتقال کے ۲۸ برس بعد تک بھی عباسی خلفا سامرا میں مقیم رہے، تاہم ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں دارالحکومت سامرا سے واپس بغداد منتقل کر دیا گیا۔

سامرا دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سامرا کے مقابل بہت سے قلعے بنے ہوئے تھے جنہیں نہر اسحاقی، اصل آبادی سے الگ کرتی تھی، یہ نہر دجلہ کے متوازی بہتی تھی۔ سامرا کا اصل شہر دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر سات فرسخ (۲۱ میل) دور تک چلا گیا تھا۔ معتصم باللہ نے اس شہر کو بے حد خوبصورت بنا دیا تھا اور یہ بغداد کی ہمسری کرنے لگا تھا۔

معتصم کے بعد ان کے بیٹے واثق باللہ خلیفہ بنے۔ انہوں نے دجلہ کے کنارے ایک قصر بنوایا جس کا نام الہارونی رکھا۔ واثق کے بعد متوکل خلیفہ بنائے گئے۔ وہ پہلے تو الہارونی میں مقیم رہے لیکن پھر ۲۴۵ھ / ۸۵۹ء میں انہوں نے کرخ سے تین فرسخ (۹ میل) شمال میں ایک نیا قصر بنوایا اور نئی شاہراہ شارع الاعظم کو اس محل تک توسیع دے دی گئی۔ متوکل نے ۲۴ دیگر قصر تعمیر کروائے یا ان کی توسیع کروائی۔ ان میں بلکوارہ، العروس، المختار اور الوحید بہت مشہور تھے۔

متوکل کا ارادہ تھا کہ وہ شمال کی جانب کرخ فیروز اور "دور" کے عین وسط میں ایک نیا شہر تعمیر کروائیں۔ انہوں نے کرخ سے ۹ میل شمال میں جو قصر بنوایا تھا اس کے نواح میں ایک بستی آباد ہو گئی تھی، متوکل اسی علاقے کو شہر کے طور پر ترقی دینا چاہتے تھے۔ اس شہر کا نام متوکل کے نام پر "جعفریہ" رکھا گیا۔ بعض مؤرخین اسے متوکلیہ بھی لکھتے ہیں۔ متوکل نے اس نئے شہر کی عالی شان عمارتوں کے لیے دیگر ممالک سے ساز و سامان منگوایا تھا۔ تاہم متوکل کے انتقال کے بعد المنتصر خلیفہ بنے انہوں نے جعفریہ کی بجائے سامرا کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا دیا۔

Marfat.com

آج سامرا دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے، تکریت اور بغداد کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور گیارہ سو برس قبل تعمیر ہونے والی اس کی شاندار اور پُر وقار عمارتیں کھنڈر بن چکی ہیں۔ بد قسمتی سے گزشتہ سیکڑوں برس کے دوران ان کھنڈروں سے عمارتوں کے لیے پتھر حاصل کیے جاتے رہے۔ اس طرح یہ اور زیادہ ویران ہو گئے۔ سامرا کے آثار قدیمہ کی کھدائی سے اس شہر کی عمدہ اور عالی شان عمارتوں کے طرز تعمیر اور تزئین کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

سامرا کے جو کھنڈرات ابھی تک سلامت ہیں ان میں قدیم شہر کی جنوبی سمت دریائے دجلہ کے کنارے وہ عظیم الشان مسجد بھی شامل ہے جسے متوکل نے تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد کے نزدیک شمال کی سمت خلیفہ کے پُر شکوہ قصر بلکوارہ کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے مقابل دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک مضبوط قلعے قصر العاشق کے آثار ہیں۔ اس قلعے سے نصف میل جنوب میں ایک مقبرہ ہے جو قبہ السلیکیہ کہلاتا ہے۔ خلیفہ کے قدیم شہر کے کھنڈروں کے قریب ایک جدید سامرا کے آثار ہیں جس میں سنہری گنبد بھی موجود ہے۔ اس گنبد کی چوٹی سے صحرا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

سامرا کے محلات اور عمارتوں کے آرائشی نقش و نگار میں ایک ہی قسم کی فنکاری نمایاں ہے۔ دیواروں کے ساتھ تین فٹ کی بلندی تک تمام کمروں کے اندر چاروں طرف نہایت خوبصورت پٹیاں نصب ہیں۔ ان سے اوپر مزین طاقچے ہیں۔ دروازوں کی چوکھٹیں اور موکھے سب مزین ہیں۔ سامرا میں یونانی، شامی، قبطی، ایرانی اور ہندی طرز تعمیر کی ملی جلی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ان سب کے امتزاج سے وہاں ایک نئے طرز تعمیر نے جنم لیا ہے۔

متوکل علی اللہ کے والد معتصم باللہ نے سامرا میں جو جامع مسجد تعمیر کروائی تھی، متوکل نے اسی مسجد کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ یہ کام ۲۳۴ھ / ۹-۸۴۸ء میں شروع ہوا اور رمضان المبارک ۲۳۷ھ / فروری۔ مارچ ۸۵۲ء میں مکمل ہو گیا۔ اس سے قبل اتنی بڑی کوئی مسجد تعمیر نہ ہوئی تھی۔ اس کی بیرونی دیواروں کے اندر پکی اینٹوں کی ایک عظیم مستطیل عمارت تھی جس کا رقبہ اڑتیس ہزار مربع میٹر (۲۴۰ میٹر x ۱۵۶ میٹر) تھا۔ اب اس مسجد کی صرف بیرونی دیواریں سلامت رہ گئی ہیں جن کی موٹائی ۶۵ء۲ میٹر ہے۔ ان کے استحکام کے لیے نیم کروی برج بنائے گئے تھے جن کا قطر اوسطاً ۶۰ء۳ میٹر ہے۔ مستطیل کے گوشوں پر چار برج ہیں اور مشرق و مغرب کی طرف بارہ بارہ اور شمال و جنوب کی جانب آٹھ آٹھ برج درمیان میں ہیں۔ برجوں کی کل تعداد ۴۴ ہے۔ مستطیل شکل کے ۱۶ دروازے تھے جن کی لمبائی میں شہتیر رکھے تھے۔

برج بالکل سادہ ہیں لیکن ان کے بیچ میں احاطے کی دیوار ایک آرائشی پٹی سے مزین ہے جس پر مربع دندانہ دار کناروں کے بنے ہوئے چھ طاق نما ہیں۔ سادگی کے باوجود عمارت بہت پُر عظمت محسوس ہوتی ہے۔ جنوبی دیوار میں مسقف (چھت دار) حصے کے پچیس دالانوں کے سرے پر بیس دریچے بنائے گئے ہیں۔ کل ۲۸ دریچے تھے۔ اصل مسجد کے اردگرد مشرق، شمال اور مغرب کی طرف ایک بیرونی (اضافی) احاطہ تھا۔ اس طرح جو عظیم تر احاطہ بنتا تھا اس کی پیمائش ۳۷۶x ۴۴۴ میٹر تھی۔

مسجد کے اندر ایک بڑا ایوان (حرم) تھا جس کے وسط میں پچیس در تھے۔ یہ تمام در تیس فٹ سے زائد بلند تھے اور سنگ مرمر کے ستونوں کے سہارے قائم تھے۔ تین اور چھوٹے ایسے ایوان دوسری جانب تھے۔ حجرۂ محراب منقش قیمتی چوب کاری سے ڈھکا ہوا تھا۔

باہر کی طرف مسجد کی شمالی دیوار سے سوا ستائیس میٹر کے فاصلے پر ایک مشہور مینار تھا۔ یہ مینار ملویہ کہلاتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک سو مربع فٹ پر تھی۔ اس کے گرد چکر دار زینہ ہے۔ یہ مینار ۱۷۰ فٹ بلند تھا۔

چند برس بعد ۲۴۶ھ / ۶۱-۸۶۰ء میں متوکل نے سامرا کے شمال میں ابو دلف کے مقام پر ایک اور عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ اس کی اندرونی پیمائش شمالاً جنوباً ۲۱ میٹر اور شرقاً غرباً ۱۳۵ میٹر تھی۔ ۶۰ء۱ میٹر دبیز بیرونی دیواریں تعمیر کی گئی تھیں۔ مسجد کے مسقف حصے کو سترہ دالانوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور اس میں پانچ پانچ محرابوں کی سولہ قطاریں تھیں۔ شمال کے طرف مسجد سے کچھ فاصلے پر مینار ملویہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ بھی ہے۔

متوکل کا دور اقتصادی لحاظ سے بہت بہتر تھا۔ گو کہ ان کے زمانے میں کئی قدرتی آفات بھی آئیں لیکن متوکل کے اچھے انتظامات کے باعث رعایا خوشحال تھی۔ مؤرخین نے اس عہد کو عباسی حکومت کا عہد زریں قرار دیا ہے۔ متوکل نے رشوت ستانی کی مکمل روک تھام کر دی تھی۔ ان کے زمانے میں راستے محفوظ اور پُرامن تھے اور آزادانہ تجارت ہوتی تھی۔ متوکل کے عدل و انصاف کی بھی بڑی شہرت تھی۔

Marfat.com

مشہور مؤرخ سعودی کے مطابق "عدل و انصاف کے لحاظ سے بھی متوکل کا زمانہ ممتاز شمار کیا جاتا ہے۔"

متوکل غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے تھے تاہم مسیحی افراد کی بار بار کی شرارتوں اور رومیوں کے ساتھ سازشوں کے باعث متوکل نے مسیحیوں پر پابندی لگادی تھی کہ وہ گلوبند باندھا کریں تاکہ آسانی سے شناخت کر لیے جائیں۔

متوکل طبعاً نرم خو، متحمل مزاج، فیاض اور خوش دل واقع ہوئے تھے۔ ان سے قبل کے خلفا نے سخت گیری کا طرز عمل اختیار کر رکھا تھا لیکن متوکل کہتے تھے:

"اگلے خلفا رعایا پر اس لیے سختیاں کرتے تھے کہ وہ سختی کے خوف سے ان کے مطیع رہیں اور میں نرمی کرتا ہوں تاکہ وہ مجھ سے محبت کریں، میرے پاس آئیں اور میری اطاعت کریں۔"

•••

Marfat.com

بغداد

اسلامی تاریخ کا یہ افسانوی شہر پانچ صدیوں تک مسلم دنیا کا دارالخلافہ رہا

وہ ایک جھوٹی سی بستی تھی۔!

یہ بستی خراسان کی سڑک پر، دریا کے کنارے ایک ایسے زرخیز میدان میں واقع تھی جہاں مختلف راستے آکر ملتے تھے۔ یہ راستے آئے دن سفر کرنے والے ان قافلوں سے خوب واقف تھے جو اصفہان، خراسان اور نہ جانے کہاں کہاں سے سامان لے کر آتے تھے۔ ہر مہینے یہاں میلے لگتے اور جشن کا سماں ہوتا۔

بستی ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں نہائی ہوئی تھی، اچانک ایک جانب سے ایک شاندار قافلہ آکر رکا۔ قافلے میں مضبوط جسم والے گھوڑے تھے جن پر چاق وچوبند محافظ سوار تھے۔ قافلے کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بڑے فرماں روا کی آمد ہے۔ جلد ہی اس مقام پر خیموں کی طنابیں تن گئیں۔ گھوڑوں کو کھول کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور کھانا پکانے کے لیے الاؤ روشن ہو گئے۔ قافلے کے شرکا نے نماز عصر ادا کی۔ تھوڑی دیر میں تھکا ہارا سورج دور افق کے پار جا چھپا اور چار سو تاریکی نے ڈیرے ڈال دیے۔ فضا میں لطیف سی خنکی رچ بس گئی۔ خیموں سے بلند ہونے والا، گفتگو کا ہلکا ہلکا سا شور رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا اور تھکے ہارے قافلے والے میٹھی نیند سو گئے۔

رات رخصت ہوتے ہوئے اپنے ساتھ تاریکی کو سمیٹ لے گئی اور دن اپنی آغوش میں اجالا لے کر اس بستی میں بھی آپہنچا، قافلے والے بیدار ہو گئے۔ خیموں میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ قافلے کا سردار ہلکے رخساروں والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "یہاں مجھے اس قدر سہانی نیند آئی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، یہ جگہ مجھے بے حد پسند آئی ہے۔ یہاں نہروں کا جال ہے جو زراعت کے لیے مفید ہے، یہی دفاع کا کام بھی دے سکتی ہیں۔ اس کے پہلو میں دریائے دجلہ رواں ہے، یہاں سے چین تک ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ ہمیں ہر قسم کا سامان بحری راستے سے موصول ہو سکتا ہے، دریائے فرات بھی قریب ہی واقع ہے۔ اس کے ذریعے شام، مصر، رقہ، شمالی افریقہ اور ارد گرد کے علاقوں سے ہر قسم کی پیداوار ہمیں موصول ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسی علاقے کو اپنا دارالخلافہ بنانا چاہیے۔"

وہاں جتنے لوگ موجود تھے انہوں نے ان باتوں کی تائید کی۔ وہ باتیں، جو ان کے خلیفہ ابو جعفر منصور نے کہی تھیں۔

کچھ عرصے بعد اس بستی کے بطن سے ایک نیا شہر جنم لے رہا تھا۔ ہزاروں مزدور اور کاریگر اس شہر کی صورت گری میں مصروف تھے جو تقریباً آٹھ سال بعد اپنی مکمل صورت میں ابھر کر سامنے آگیا اور پھر صدیوں تک عالم اسلام کا ثقافتی مرکز بنا رہا۔

یہ شہر ــــ عظیم شہر بغداد ہے، جس کی تعمیر کا سہرا دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے سر ہے۔ یہی شہر جس کی بنیاد دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) میں رکھی گئی تھی، ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں خلافتِ عباسیہ کے اختتام تک دارالخلافہ بنا رہا۔

بغداد وہ شہر ہے جہاں سے خاندانِ عباسیہ نے پانچ صدیوں تک دنیا کے بیشتر حصے پر حکمرانی کی۔ بغداد کے خلفائے بنو عباس کی تعداد ۳۳ ہے، جن میں ابو جعفر منصور، ہارون الرشید، مامون الرشید، واثق، متوکل، معتصم، معتضد، مکتفی اور دیگر خلفا شامل ہیں۔ بغداد کے خلفائے بنو عباس کا دور ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء تک رہا۔

بغداد کا نقشہ ۱۴۱ھ / ۷۵۸ء میں تیار ہو چکا تھا، لیکن اس کی تعمیر یکم جمادی الاول ۱۴۵ھ / ۲۸ جولائی ۷۶۲ء کو شروع ہوئی۔ فن تعمیر کے چار ماہرین نے شہر کا منصوبہ تیار کیا۔ منصور نے شہر کی تعمیر کے لیے

Marfat.com

ایک لاکھ مزدور اور کاریگر اکٹھے کیے۔ پہلے پورے علاقے پر شہر کا نقشہ بنوایا۔ پھر اس پر روئی کے بنولوں سے لکیریں ڈلوائیں پھر ان بنولوں پر تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی اور منصور نے بلندی سے معائنہ کیا کہ شہر تعمیر کے بعد کیسا نظر آئے گا۔ جب وہ مطمئن ہوگئے تو تعمیر شروع ہوئی۔ نہر کرخایہ سے ایک چھوٹی نہر نکالی گئی تاکہ تعمیر کے کاموں اور پینے کے لیے پانی میسر آسکے۔ ۱۴۹ھ/۷۶۶ء تک بغداد کی تعمیر مکمل ہوچکی تھی۔

منصور نے اس شہر کا نام "مدینۃ السلام" (سلامتی کا شہر) رکھا۔ یہ نام قرآن پاک سے اخذ کیا گیا تھا کیوں کہ جنت کے لیے قرآن مجید کی سورۃ الانعام میں یہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ "مدینۃ السلام" کا سرکاری نام، تمام دستاویزات، سکوں اور باٹوں پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بغدان، مدینہ ابی جعفر، مدینہ المنصور، مدینہ الخلفا اور الزورا جیسے نام بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ البتہ بغداد نہایت قدیم نام ہے، جو آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں ایک باغ تھا جہاں پر نوشیروان عادل بے کسوں اور مجبوروں کی داد رسی کیا کرتا تھا۔ اسی لیے اس مقام کا نام "باغ داد" پڑ گیا جو عوام کی زبان پر چڑھ کر "بغداد" بن گیا۔

خلیفہ منصور کا یہ شہر دائرے کی شکل میں نہایت عمدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ اس شہر کا مرکز اپنے ہر حصے سے یکساں فاصلے پر تھا۔ شہر کے چار دروازے تھے اور ان سے شاہراہیں اسلامی دنیا کی چاروں سمتوں کو جاتی تھیں۔ ان دروازوں کے نام باب الخراسان، باب الکوفہ، باب البصرہ اور باب الشام تھے۔

ہر دو دروازوں کے درمیان اٹھائیس بڑے بڑے برج تھے، البتہ باب الکوفہ اور باب البصرہ کے درمیان ان کی تعداد ۲۹ تھی۔ ہر دروازے پر ایک گنبد تھا جہاں سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔ اصل فصیل کے بعد تقریباً ۱۷۰ میٹر چوڑا میدان تھا جس میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک سادہ سی دیوار آتی تھی جس کے اندر قصر خلافت، مسجد جامع المنصور اور سرکاری دفاتر واقع تھے۔ شہر کو دو سڑکوں کے ذریعے چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، یہ سڑکیں بیرونی دروازوں سے آتی تھیں اور شہر کے وسط میں ایک دوسرے کو قطع کرتی تھیں۔ شہر کے وسط میں خلیفہ کی سرکاری رہائش گاہ "قصر الذہب" کی عمارت تھی۔ اس کی تعمیر میں سنگِ مرمر استعمال ہوا تھا اور اس کے دروازے کو طلائی کام سے مزین کیا گیا تھا۔ یہ محل تقریباً نصف صدی تک خلیفہ کی سرکاری رہائش گاہ کا کام دیتا رہا۔

قصر الذہب کے اوپر ایک سبز گنبد تعمیر کیا گیا تھا جو تقریباً ۴۸ میٹر بلند تھا۔ اس کی چوٹی پر ایک شہسوار کا مجسمہ نصب تھا جو بغداد کے ہر حصے سے نظر آتا تھا۔

محل کے قریب ہی جامع مسجد تعمیر کی گئی تھی جسے "جامع المنصور" کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد صدیوں تک مسلمانوں کی عظمت کی علامت بنی رہی۔ اس مسجد میں ایک مینار تھا جو ۳۰۳ھ میں جل گیا، لیکن دوبارہ تعمیر کر دیا گیا۔ عباسیوں کے عہدِ خلافت میں یہی مسجد بغداد کی جامع مسجد رہی۔

منصور نے بغداد کا نقشہ بنواتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ بڑی فصیل سے اندرونی دیوار تک چاروں شاہراہوں کے کنارے بلند محرابوں والے کمرے بنائے جائیں جن میں دکانیں قائم کی جائیں۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ دیوار کے باہر چاروں حصوں میں منڈیوں کے لیے کافی زمین چھوڑ دی جائے تاکہ ہر حصے میں ایک بڑی منڈی قائم ہوسکے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

سنہ ۱۵۷ھ میں دفاعی نقطۂ نظر سے منڈیاں شہر سے باہر نہر صراۃ اور نہر عیسیٰ کے درمیان کرخ کے مقام پر منتقل کر دی گئیں۔ ہر پیشے سے متعلق الگ منڈی تھی۔ مثلاً پھلوں کی منڈی، کپڑے کی منڈی، غلے کی منڈی، بازار صرافہ، کتب کا بازار، بھیڑ بکریوں کی منڈی۔ شہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں خراسان، مرو، بلخ، بخارا اور خوارزم سے سوداگر آنے لگے۔ ان کی منڈیاں محلہ حربیہ میں تھیں۔ شہر کی آبادی بھی کرخ منتقل کر دی گئی۔ کہتے ہیں کہ آبادی کی منتقلی کی ایک وجہ شہر میں دھوئیں کی کثرت تھی۔

منصور کے زمانے سے منڈیوں کی نگرانی کے لیے محتسب مقرر کیا جاتا تھا جو دھوکے بازی، فریب کی روک تھام کرتا تھا اور ناپ تول کے باٹوں کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ یہی محتسب حماموں کے انتظام کی نگرانی بھی کرتا تھا اور مسجدوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد تھی۔ اس کے علاوہ تخریبی کارروائیوں کا انسداد بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔

ہر منڈی اور صنعت کا ایک نگراں ہوتا تھا جسے حکومت مقرر کرتی تھی۔ بغداد سے سوتی اور ریشمی کپڑا بن کر باہر جاتا تھا، رومال، عمامے، تراشیدہ بلور، روغنی برتن، مختلف قسم کے تیل، عرق، معجون

Marfat.com

بھی بر آمد ہوتے تھے۔ بغداد میں قمیصیں اور تولیے بھی تیار ہوتے تھے، جن کی بڑی شہرت تھی۔ بغداد کی خاص صنعت یہاں کا رنگین ریشمی کپڑا تھی۔ یہ کپڑا بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دہاں پردے، نقاب، عماموں کے لیے ریشم کا کپڑا، ہر قسم کے رومال اور نرسلوں کے بوریے بھی تیار ہوتے تھے۔ باب الطاق میں بہت عمدہ تلواریں تیار ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بغداد اپنی چرمی مصنوعات اور کاغذ سازی کے لیے بھی معروف تھا۔ بغداد کے تجارتی قافلے ہندوستان، ملایا، چین، فرانس اور شمال مغربی افریقہ کے دور دراز علاقوں تک جاتے تھے، بینکاری کے نظام کی ترقی بھی بغداد کی تجارت اور صنعت وحرفت کو فروغ دینے کا باعث بنی۔

بغداد آبادی کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی شہر تھا۔ یہاں مساجد اور حماموں کے جو تخمینے بیان کیے گئے ہیں وہ مبالغہ آمیز ہیں اور ان کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی ہے۔ تاہم ۳۸۳ھ میں حماموں کا شمار کیا گیا تو ڈیڑھ ہزار نکلے۔

دریائے دجلہ پر متعدد پُل تھے۔ اس کے باوجود مشرقی اور مغربی دونوں سمتوں میں آمدورفت کے لیے تین ہزار کشتیاں چلتی تھیں۔ منصور نے ۱۵۷ھ / ۷۷۴ء میں باب الخراسان کے مقابل ایک محل دریائے دجلہ کے کنارے تعمیر کیا جس میں وسیع باغات تھے۔ اس کا نام منصور نے "الخلد" رکھا۔ یہ جگہ مچھروں سے پاک تھی اور تازہ ہوا کے لیے مشہور تھی۔ پھر منصور نے دریائے دجلہ کی مشرقی جانب اپنے بیٹے مہدی کے لیے ایک فوجی چھاؤنی قائم کی جس کا نام بعد میں "رصافہ" ہو گیا، کیونکہ ہارون الرشید نے بعد میں یہاں اس نام سے ایک محل بنوایا تھا۔

منصور نے بغداد کی تعمیر پر کتنی رقم خرچ کی، اس بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ تاہم اس سرکاری بیان کی رُو سے جو دفاترِ خلافت کی قدیم دستاویزوں پر مشتمل ہے، منصور نے اس قدیم شہر کی تعمیر پر چالیس لاکھ آٹھ سو تراسی درہم صَرف کیے۔

خلیفہ ابو جعفر منصور نے جس بغداد کی بنیاد ڈالی تھی وہ عمارتوں کی کثرت، تجارتی سرگرمیوں اور آبادی کے لحاظ سے بڑھتا ہی چلا گیا۔ مشرقی بغداد میں تو لوگ دور دور سے سمٹ آئے۔ بعد کے ادوار میں عباسی خلفا نے بغداد کو مزید ترقی دی۔ الامین نے قصر الذہب کو درست کروا کے اس کے چاروں طرف احاطہ بنوایا اور مکانات کی قطار کا اضافہ کر دیا۔ ملکہ زبیدہ نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک مسجد بنوائی جس کا نام ملکہ کے نام پر رکھا گیا۔ المامون نے ۲۰۴ھ میں مرو سے بغداد پہنچ کر اپنے قصر کو وسیع کیا۔ اس میں گھڑ دوڑ کا ایک میدان اور ایک چڑیا گھر بنوایا۔ المقتدر (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) نے کئی نئی عمارتوں کا اضافہ کیا۔ ایک دار الشجرۃ بنوایا جس میں بڑے حوض کے اندر چاندی کا درخت تھا، جس کی اٹھارہ ٹہنیاں تھیں۔ ان پر طلائی اور نقرئی چڑیاں بیٹھی تھیں جو سیٹیاں بجاتی تھیں۔ دونوں طرف شہسواروں کے پندرہ مجسمے ایک ہی سمت میں حرکت کرتے تھے گویا ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں۔ چڑیا گھر میں ہر قسم کے جانور تھے۔ ایک شیر گھر تھا جس میں سو شیر تھے۔ ایک قصر الفردوس تھا جس میں قابلِ دید اسلحہ تھا۔ اس زمانے میں بغداد اپنے عروج پر تھا۔ المقتدر کے عہد میں اس شہر کا رقبہ تقریباً ۴۵ مربع کلو میٹر تھا۔

تیسری اور چوتھی ہجری (نویں اور دسویں عیسوی) میں شفا خانوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ شفاخانوں میں "البیمارستان السیدہ" (۳۰۶ھ)، البیمارستان المقتدری (۳۰۶ھ) اور البیمارستان العضدی (۳۷۲ھ) بہت مشہور تھے۔ طبیبوں کی نگرانی ہوتی تھی۔ المقتدر کے زمانے میں تو حکم دیا گیا تھا کہ طبیبوں کا امتحان لیا جائے اور امتحان میں کامیاب ہونے والے ہی کو طبابت کا اجازت نامہ دیا جائے، چنانچہ تقریباً ۸۶۰ طبیبوں کو اجازت نامے دیے گئے۔ ایک سیاح بن یامین نے ۵۶۷ھ میں بغداد کی سیر کی اور عضدی اسپتال کی بڑی تعریف کی، جس میں ساٹھ طبیب تھے اور دماغی مریضوں کی صحت گاہ تھی۔ ایسا پہلا اسپتال جس میں بستر ہوں، خلیفہ ہارون الرشید نے قائم کیا جس کا نام "مستشفیٰ" تھا۔ ابو بکر رازی آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے درمیان بغداد کے سب سے بڑے اسپتال کے بانی تھے۔ انہوں نے شفاخانے کے لیے مناسب مقام اس طرح تلاش کیا کہ شہر کے مختلف مقامات پر گوشت کے پارچے لٹکائے جس جگہ گوشت سب سے کم سڑا وہیں اسپتال بنوایا۔

بغداد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علم و فن کا گہوارہ تھا اور مسلم ثقافت کا عظیم مرکز تھا۔ یہ حنفی اور حنبلی فقہ کا گھر تھا۔ یہاں ایک بے مثال علمی ادارہ "بیت الحکمت" قائم ہوا جس میں بڑے بڑے عالموں اور سائنس دانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور یہاں اہم کتب کے ترجمے کیے گئے۔ بیت الحکمت میں عربی، فارسی، یونانی، سریانی، قبطی

Marfat.com

اور ہندی کتب کا بڑا خزانہ جمع کر دیا گیا تھا۔ یہاں علوم طبعی سے متعلق تجربات بھی کیے جاتے تھے۔

بیت الحکمت کے باہر بھی کتب کے تراجم ہوتے تھے۔ شہر میں کتابوں کی دکانیں بہت بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ شاعروں، مورخوں اور عالموں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ عباسی عہد ہی میں عام کتب خانے اور دار المطالعے قائم کیے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ابو النصر سابور بن اردشیر کا دارالعلم تھا۔ جب مدرسوں کا دور شروع ہوا تو "النظامیہ" اور "المستنصریہ" جیسی پائے کی جامعات قائم ہوئیں جن کے اثرات تمام تعلیمی اداروں کے طریقۂ تعلیم اور نظام تعلیم پر پڑے۔ ہارون الرشید کے عہد میں صرف بغداد ہی میں ۱۴ جامعات تھیں۔ یہاں بڑے بڑے ہال تعمیر کیے گئے تھے جن میں علمی مذاکرے (سیمینار) ہوتے تھے۔ پانچ پانچ سو اونٹوں پر لدی کتابیں ہندوستان، یونان اور اطالیہ سے آتی تھیں، جن پر محققین دن رات کام کرتے تھے۔ مترجمین میں سے ہر ایک کو پانچ سو دینار تنخواہ ملتی تھی جو ۶۰ ہزار روپے کے برابر ہے۔ کتاب کا ترجمہ مکمل ہونے پر خلیفہ المامون ہر کتاب کے وزن کے برابر سونا انعام دیا کرتے تھے۔ بغداد میں علم حدیث کے درس کے لیے سات سو دارالعلوم اور دسویں صدی عیسوی میں ہزاروں مدرسے اور سینکڑوں اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں تھیں۔

بغداد میں مدرسہ ابو حنیفہ ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء میں قائم ہوا جو آج تک "کلیہ الشریعہ" (یعنی شریعت کالج) کے نام سے موجود ہے۔ المستنصر نے "المستنصریہ" قائم کیا جو سترہویں عیسوی تک کام کرتا رہا۔ یہ مدارس چاروں مذاہب فقہ میں سے کسی ایک سے منسلک تھے۔ البتہ "المستنصریہ" اور "البشیریہ" میں چاروں مذاہب کی فقہ پڑھائی جاتی تھی۔ یتیموں کا ایک مکتب بھی تھا جو نظام الملک کے فرزند شمس الملک نے قائم کیا تھا۔

النظامیہ یونیورسٹی، نظام الملک طوسی نے ۵۹-۴۵۷ھ/ ۶۷-۱۰۶۵ء میں قائم کی تھی۔ دنیا بھر سے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اکثر کو رہائش، کھانا اور کتب فراہم کی جاتی تھیں۔ یہاں فلسفہ، آرٹس، سائنس اور دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ عظیم درسگاہ ۲۰۰ سال تک قائم رہی۔ اس میں ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس کے نگراں علامہ ابوزکریا تبریزی تھے۔

یہ بغداد ہی ہے جس کی سرزمین نے کتنے ہی ایسے گہر ہائے آبدار کو جنم دیا جن کی چمک سے اسلامی تاریخ روشن ہے، ان میں فقہ کے جید امام حضرت ابو حنیفہؒ بھی ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کی پر شکوہ شخصیت بھی ہے۔ امام موسیٰ کاظمؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت معروف کرخیؒ اسی بغداد میں منوں مٹی تلے سو رہے ہیں۔ یہی بغداد ہے جہاں امام غزالیؒ نے نظامیہ یونیورسٹی کے پرنسپل کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ یہ گراں بار ذمہ داری امام طبریؒ، ابن الخطیبؒ، تبریزیؒ اور ابوالحسن فصیحیؒ کے بھی سپرد رہی۔

بغداد وہ شہر مردم خیز ہے جہاں علم و آگہی کے مایۂ ناز ادارے بیت الحکمت میں ریاضی اور ہیئت کے امام موسیٰ الخوارزمی نے تعلیم حاصل کی۔ مشہور عالم دین فلسفی اور سائنس دان یعقوب الکندی گو بصرہ میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی ساری عمر بغداد میں گزری۔ پچاس زبانوں کے ماہر ابو النصر فارابی نے بغداد ہی میں چالیس سال تک کام کیا اور اعلیٰ تعلیم یہیں حاصل کی۔ عظیم سیاح، جغرافیہ داں، مورخ اور طبیعیات کے عالم ابو الحسن علی ابن حسین المسعودی بھی بغداد میں پیدا ہوئے۔ ریاضی، طبیعیات اور نوریات کے ماہر ابن الہیثم نے بھی بصرہ اور بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ علوم فقہ، حدیث اور ادب کے عالم و فاضل الماوردی نے بھی علم کے موتی اسی بغداد میں چنے۔ فلکیات، ریاضی، نوریات، جغرافیہ، طب اور فلسفہ کے ماہر نصیر الدین طوسی کی ایک عمر بغداد میں گزری۔ چیچک اور خسرہ کے امراض پر پہلی بار کام ابوبکر رازی نے بغداد ہی میں کیا۔

بغداد واقعی ایک افسانوی شہر تھا۔

•••

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو: ڈاکٹر مصطفی سباعی / معروف شاہ شیرازی
اسلامی کتب خانے: الحاج محمد زبیر
البدایہ والنہایہ: علامہ ابنِ کثیرؒ
المامون: علامہ شبلی نعمانی
الہارون: عمر ابو النصر
اندلس کا تاریخی جغرافیہ: محمد عنایت اللہ / جی لی اسٹرینج
اے شارٹ، ہسٹری آف سیراسنس: امیر علی سید
بغداد ڈیورنگ دی اباسائڈ کیلیفیٹ: جی لی اسٹرینج
تاریخ ابنِ خلدون: عبد الرحمن ابن خلدون
تاریخ اسلام: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
تاریخ اسلام: رئیس احمد جعفری
تاریخ اسلام: ڈاکٹر حمید الدین
تاریخ اسلام: شاہ معین الدین ندوی
تاریخ الامت: مولانا محمد اسلم جیراج پوری
تاریخ الخلفا: علامہ جلال الدین سیوطی / اقبال الدین احمد
تاریخ تمدنِ اسلام: مولوی محمد حلیم انصاری / جرجی زیدان
تاریخ طبری: علامہ ابن جریر طبری
تاریخ ملت: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
تہذیب و تمدن اسلامی: رشید اختر ندوی
جغرافیہ خلافت مشرقی: محمد جمیل الرحمن / جی لی اسٹرینج
حکمائے اسلام: مولانا عبد السلام ندوی
خلافت امویہ اور ہندوستان: مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
خلافتِ بنوامیہ: علامہ ابن الاثیر الجزری / سید ہاشم ندوی
خلافت بنوعباس: ظفر عمر زبیری / عطیہ عمر زبیری
خلافت عباسیہ اور ہندوستان: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری
دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
طب العرب: حکیم سید علی احمد نیر واسطی
غیر مطبوعہ مقالہ: ثروت صولت
قدیم اسلامی مدارس: منور جہاں رشید
مروج الذہب: ابو الحسن علی مسعودی / مولوی سید محمد ابراہیم
مسلمان حکمراں: رشید اختر ندوی
مقالاتِ شبلی: شبلی نعمانی
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
ہارون الرشید: عبد الجبار الجومرد / رئیس احمد جعفری

Marfat.com

ریگ زاروں کے امین

اندلس اور افریقہ کی
قابل فخر شخصیات

Marfat.com

انتساب

ایک عظیم انسان، صاحب کردار
باکمال صحافی، صاحب طرز ادیب و شاعر
اپنی ذات میں انجمن
اور میرے محسن
محترم امداد نظامی (مرحوم)
کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

ہر قوم اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ تاریخ میں اچھے برے واقعات، اچھے برے لوگ سبھی کچھ ہوتا ہے اور مؤرخ کا کام سب کچھ بلا کم و کاست بیان کر دینا ہوتا ہے۔ مگر انسانی ذہن غیر جانبدار ہوتا نہیں ہے چنانچہ ہر مؤرخ تاریخ کو اپنے انداز سے بیان کرتا ہے۔ تاریخ نویسی سے بڑھ کر ایک اور کام ہوتا ہے اور وہ زیادہ مشکل ہے۔ وہ ہے تاریخ کو مسخ کیے بغیر اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرنا کہ ہر خاص و عام اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ تاریخ ہر ملک کے نصاب کا حصہ ہوتی ہے۔ طالب علم اسے مجبوراً پڑھتا ہے تاکہ امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ امتحان ختم اور تاریخ کی کتابیں بند۔ لیکن دلچسپ انداز میں لکھی گئی تاریخ کو صرف طالب علم ہی نہیں ہر فرد شوق سے پڑھتا ہے۔ تاریخ کو دلچسپ انداز میں لکھنا ایک فن ہے اور کلیم چغتائی کو یہ فن خوب آتا ہے اور اسے انہوں نے کامل مہارت سے برتا ہے۔

آج کا انسان بلاوجہ بہت مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے خود کو لاحاصل بکھیڑوں میں الجھا لیا ہے۔ اب اسے کوئی سنجیدہ تحریر پڑھوانے کے لیے اسی طرح مجبور کرنا پڑتا ہے جیسے بچوں سے کوئی کام کروانے کے لیے انہیں بہلایا پھسلایا جاتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی تحریر کا ابتدائیہ قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو جائے تو وہ خود بخود آگے پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس تکنیک کو کلیم چغتائی نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ وہ تاریخی موضوعات یا شخصیات پر لکھتے ہوئے روایتی انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ کسی چونکا دینے والے فقرے سے آغاز کرتے ہیں، مثلاً 'وہ ایک کمرے میں چھپا ہوا تھا۔' (العزیز باللہ) خلیفہ کی ذاتی رہائش گاہ کے لیے اشیائے خورونوش کی ضرورت تھی۔' (عبدالرحمٰن الناصر) اس طرح کے چونکا دینے والے جملے قاری کا تجسس بیدار کر دیتے ہیں۔

فی زمانہ بے عیب اردو لکھنا بجائے خود ایک کمال بن چکا ہے۔ اچھے اچھے نثر نگاروں بلکہ پروفیسروں تک کو ہم نے زبان کا غلط استعمال کرتے دیکھا اور پڑھا ہے، لیکن کتاب کی اس خوبی نے بھی مجھے بہت متاثر کیا ہے کہ اس میں درست زبان لکھی گئی ہے۔ پاکستان کی نئی نسل کے لیے عظیم مسلمان شخصیات کے بارے میں لکھا جانا اور بار بار لکھا جانا کئی حوالوں سے بہت ضروری ہے، بالخصوص اس لیے بھی کہ پاکستان میں وفاقی وزیر تعلیم کے منصب پر ایسے "لائق" افراد تعینات کیے جا چکے ہیں جو علی الاعلان کہتے تھے کہ ہماری تاریخ تو اشوک کے دور سے شروع ہوتی ہے۔

ریگزاروں کا پہلا امین طارق بن زیاد ہے۔ ہمارے نوجوانوں میں سے کتنوں کو معلوم ہو گا کہ اندلس یا اسپین کیسے فتح ہوا، کس نے کس طرح فتح کیا اور اس پر حملہ کیوں کیا گیا۔

طارق بن زیاد اور اندلس کی فتح کے ذکر کے علاوہ اس باب میں ایک اور اہم اور توجہ طلب بات ہے اور وہ ہے "بربریت"۔ یہ لفظ ظلم، زیادتی، درندگی اور وحشت کے معانی میں ہماری زبان میں بری طرح رائج ہو گیا ہے۔ "باربیرین ازم" مغرب کا تحفہ ہے جسے ہم نے سوچے سمجھے بغیر خوشی خوشی قبول کر لیا۔ کلیم چغتائی نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے کہ بربر قبائل عرصہ دراز سے شمالی افریقہ کے علاقے بربر میں آباد تھے۔ اندلس پر حملے کے لیے جو لشکر تیار کیا گیا، وہ سات ہزار بربر مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ ان بربروں نے عیسائی حکمراں راڈرک کی ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج کو شکستِ فاش دی۔ شکست خوردہ یورپی اقوام نے اپنی ذلت کو چھپانے کے لیے بربر اور بربریت کو ایک گالی بنا دیا۔ ہم بھی اس لفظ کو برے معنوں میں استعمال کر کے اپنے اسلاف اور اپنے ہیروز کو بلا تکلف برا بھلا کہتے ہیں۔

تاریخ کا طالب علم تو میں بھی رہا ہوں لیکن اس کتاب "ریگزاروں کے امین" کے کئی ابواب میرے لیے بھی معلومات افزاء ہیں، خاص طور پر فاطمی خلافت کے حوالے سے۔ خلافتِ فاطمیہ بھی مسلمانوں کی تاریخ کا اہم جزو ہے۔ ایک وقت میں خلافتِ اسلامیہ کے دو مراکز کیوں اور کیسے؟ یہ موضوع زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ اس حوالے سے دوسرے مؤرخین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مسلکی اختلاف نمایاں رہا ہے لیکن کلیم چغتائی کی تحریر اس عیب سے پاک ہے۔

مشہور مؤرخ ابن خلدون بذاتِ خود تاریخ کا اہم موضوع ہیں جن پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کلیم چغتائی نے بھی اس اہم موضوع کو خوب نبھایا ہے۔ اس کے علاوہ دولتِ موحدین پر توجہ دینا کلیم چغتائی ہی کی تجسس پسند طبیعت کا کام ہے۔

کلیم چغتائی کی یہ کاوش اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اپنی تاریخ اور تہذیبی جغرافیہ سے نابلد نئی نسل کو بہت سے تاریخ ساز واقعات کا علم ہی نہیں ہے۔ اس میں ایسے نوجوان بھی پائے جاتے ہیں جنہیں یہ تک معلوم نہیں کہ بنگلہ دیش بھی کبھی پاکستان کا حصہ تھا یا یہ کہ برعظیم پاک و ہند پر مسلمانوں نے سیکڑوں برس حکومت کی۔ وہ اکثر حیران ہو کر پوچھ بیٹھتے ہیں کہ اچھا کبھی اسپین پر بھی مسلمانوں کی حکومت تھی؟

اطہر ہاشمی

چیف ایڈیٹر، روزنامہ جسارت کراچی

Marfat.com

عرضِ مؤلف

امتِ مسلمہ آج ایک بہت بڑی قوت ہوتے ہوئے بھی غیر موثر ہے۔ وہ غیر مسلموں کی طاقت اور علمی ترقی سے مرعوب ہے۔ اس کے خاکستر میں چنگاریاں ضرور ہیں لیکن اپنے رب سے کمزور تعلق، حُبِ دنیا، گروہی عصبیت، بے عملی، بزدلی اور ایسی ہی بعض کمزوریوں نے اسے اسلام دشمنوں کے لیے بڑی حد تک بے ضرر بنا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان نہ صرف یہ کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر ریاستوں کا انتظام ایسے حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے جو دشمنانِ اسلام کے مفادات کے بلاواسطہ یا بالواسطہ، طوعاً و کرہاً نگراں ہیں۔

لیکن۔۔۔ یہی امتِ مسلمہ جب دینِ اسلام پر عمل پیرا تھی اور اسے خدا ترس، لائق، پُراعتماد، ذہین اور اچھے منتظم حکمراں میسر تھے تو اسے دنیا کے بڑے حصے پر اقتدار حاصل تھا اور یہ اقتدار سیکڑوں برس تک قائم و دائم رہا۔

سرزمین اندلس ہی کو لیجیے، جہاں مسلمانوں نے سات سو اسی (۷۸۰) برس حکومت کی۔ اس طویل عرصے میں اسلامی تہذیب و تمدن نے اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اندلس میں مسلمانوں کو محکوم ہوئے پانچ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے باوجود وہاں پر مسلمانوں کے اثرات آج بھی موجود ہیں اور غیر مسلموں کا صدیوں تک تسلّط ان اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔

اندلس میں مسلمانوں نے قرطبہ اور اشبیلیہ میں جو جامعات (یونیورسٹیاں) قائم کیں، ان کا معیارِ تعلیم اتنا بلند تھا کہ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ سے طالب علم آتے تھے۔

اندلسی مسلمانوں نے زراعت کے فن میں اتنی زبردست ترقی کی تھی کہ ایک فرانسیسی مؤرخ کے مطابق اندلس میں مسلمانوں نے علم زراعت کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔

عبدالرحمٰن اوّل کے دور میں اندلس میں آب پاشی کے لیے جو آلات استعمال ہوتے تھے، اس قسم کے آلات یورپ میں سیکڑوں برس بعد استعمال کیے گئے۔

اندلس کی تعمیرات میں مسجد قرطبہ آج بھی مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی تابندہ علامت ہے۔

اسی طرح سرزمینِ مصر پر علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے بڑے سرپرست احمد بن طولون تھے۔ اسی سرزمین پر العزیز باللہ کا نام بھی ابھرتا ہے جنھوں نے جامعۃ الازہر قائم کی جو آج بھی ایک مستند اور ذی وقار درس گاہ ہے۔ پھر دولتِ موحدین اور بنی مرین کے لائق حکمرانوں، عبدالمومن، یعقوب المنصور اور ابو یوسف یعقوب کے علمی کارنامے منظرِ عام پر آتے ہیں اور اسکیا محمد جیسے قابلِ فخر حکمران سولہویں صدی عیسوی میں نمودار ہوتے ہیں جنھوں نے افریقہ کو علم کی روشنی سے منور کر دیا۔

"ریگزاروں کے امین" کے عنوان سے یہ کتاب سرزمینِ اندلس کے چند قابلِ تحسین مسلمان حکمرانوں کی درخشاں خدمات کا احوال پیش کرتی ہے۔ مصر اور افریقہ کے چند دیگر سربراہانِ مملکت کا تذکرہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ سرزمینِ اندلس پر حکومت کرنے والے پانچ اموی حکمرانوں کے حالات و خدمات اس کتاب میں شامل ہیں۔ دو سو چوراسی (۲۸۴) برس تک قائم رہنے والی دولتِ امویہ کے صرف پانچ حکمرانوں کا تذکرہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اموی سلطنت میں ان کے علاوہ اچھے حکمران نہیں گزرے۔ دراصل اس کتاب میں پانچ اموی حکمرانوں، نیز مصر اور افریقہ کے چند سربراہان کا تذکرہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ اچھا حکمران اپنی مملکت کے لیے کتنے زیادہ ثمرات حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے اور اس کا دورِ اقتدار کتنی بڑی تعداد میں انسانوں کو آسودگی اور خوشحالی فراہم کرتا ہے۔ یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے کہ اچھے حکمران کے فلاحی اقدامات کے اثرات کئی صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔

میں اپنے نہایت عزیز، محبی اور محترم استاد، نفیس اور محبت آگیں شخصیت، صاحبِ طرز ادیب اور کہنہ مشق صحافی، محترم سید اطہر ہاشمی صاحب کا بے حد ممنون ہوں اور ان کے لیے دعا گو کہ انھوں نے اس کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمایا اور اس کا پیش لفظ محبت کے ساتھ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

طارق بن زیاد

اندلس کے تاریک افق پر نمودار ہونے والا صبح کا ستارہ

جب کبھی اندھیری سیاہ رات چھا جاتی ہے، تو تمام رونقیں منہ موڑ کر کہیں چل دیتی ہیں۔ بھرے پُرے شہروں پر قبرستان کا گمان ہونے لگتا ہے۔ سُوئے منزل رواں دواں قافلے ٹھہر کر صبح کے انتظار میں ذرا دَم لیتے ہیں اور سحر کی پہلی علامت کے طور پر جب صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے تو اندھیارے چھٹنے لگتے ہیں، تاریکی سمٹنے کو ہوتی ہے، رونقیں لوٹ آتی ہیں اور ہر طرف سحر کا اُجلا اُجلا رنگ بکھر جاتا ہے۔

طارق بھی تو صبح کا ستارہ ہی تھا۔ طارق کہتے ہی صبح کے ستارے کو ہیں۔ امتِ مسلمہ کا یہ عظیم جرنیل جسے خالقِ کائنات نے "اندلس کا فاتح" ہونے کا اعزاز عطا کیا، ایک ستارۂ صبح کی مانند، اندلس کے تاریک افق پر نمودار ہوا اور اپنے ساتھ ایسی سحر لایا، جس کی روشنی نے یورپ کے بیشتر حصے کو صدیوں تک کے لیے منوّر کر دیا۔

اس انوکھی سحر کو تصور کی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ہمیں تقریباً تیرہ سو برس پیچھے جانا ہوگا، جب اندلس اپنی سرسبزی اور شادابی کے اعتبار سے یورپ کا ممتاز ترین ملک تھا۔ یہ جنوب مغربی یورپ کے آخری سرے کا وہی جزیرہ نما علاقہ ہے جہاں آج کل اسپین اور پرتگال کے نام سے دو ملک قائم ہیں۔ دورِ حاضر کے محققین کا کہنا ہے کہ ۴۱۱ء سے ۴۲۹ء کے دوران اندلس پر ایک جرمن قوم 'واندالسیہ' یا 'واندال' قابض رہی تھی، اسی قوم کے نام پر اس جزیرہ نما کا جنوبی حصہ 'واندلسیہ' کہلاتا تھا۔ جب عربوں نے یہاں قدم جمائے تو وہ 'واندلسیہ' کو عربی تلفظ کے مطابق اندلس کہنے لگے، پھر پورے علاقے کا نام یہی پڑ گیا۔

اندلس کی سرزمین بہت زرخیز تھی۔ یہاں کی آب و ہوا یورپ بھر میں سب سے اچھی تھی۔ معدنیاتی اعتبار سے بھی یہ خطۂ زمین بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی تین سمتوں میں تین سمندر تھے۔ مشرق میں بحیرۂ روم، مغرب میں بحرِ اوقیانوس، جنوب میں آبنائے جبرالٹر (جسے عرب، بحرِ زقاق کہتے ہیں) یہی آبنائے اس مقام پر یورپ اور افریقہ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتی ہے۔

سرزمین اندلس، قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے بے حد تنزل اور گراوٹ کا شکار تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل تک یہاں گاتھ خاندان کی حکومت تھی۔ گاتھ خاندان کے آخری فرمانروا وٹیزا کو معزول کر کے جو بوڑھا اور تجربہ کار فوجی برسرِاقتدار آیا، اس کا نام راڈرک تھا، جسے عرب، رزریق یا لذریق کہتے ہیں۔

گاتھ خاندان کے دستور کے مطابق اندلس کے امرا اور جاگیرداروں کے بچے شاہی محل میں پرورش پاتے تھے تاکہ وہ شاہی آداب سیکھ لیں۔ دراصل یہ امرا اور جاگیرداروں کو بغاوت سے باز رکھنے کا اچھا طریقہ تھا۔ انہی امرا میں سے ایک یونانی سردار کاؤنٹ جولین کی بیٹی فلورنڈا بھی شاہی محل میں تربیت پا رہی تھی۔ کاؤنٹ جولین، گاتھ خاندان کے آخری فرمانروا کا داماد تھا۔ فلورنڈا بے حد حسین تھی اور اس کا یہی حسن و جمال اندلس کے فرمانروا راڈرک کو دیوانہ کر گیا۔ فلورنڈا بے بس تھی، وہ اپنے گوہرِ عصمت کو راڈرک کے ہاتھوں داغدار ہونے سے نہ بچا سکی۔

فلورنڈا غم و غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے والد کاؤنٹ جولین کو راڈرک کی زیادتی سے کسی نہ کسی طرح آگاہ کر دیا۔

کاؤنٹ جولین کو جب یہ خبر ملی تو وہ سکتے میں رہ گیا، تاہم اس نے خود پر قابو پا لیا اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے، راڈرک کی حکومت

Marfat.com

کا تختہ الٹنے کا عزم کر لیا۔

کاؤنٹ جولین سبطہ کا حکمراں تھا اور افریقہ میں واحد عیسائی حکمراں تھا۔ قلعہ سبطہ شمالی افریقہ کے ساحل پر تھا، تاہم کاؤنٹ، اندلس کی حکومت کے ماتحت تھا۔ کاؤنٹ، راڈرک کے دربار میں پہنچا، جہاں اس نے راڈرک کو بے حد پریشان لہجے میں بتایا کہ فلورنڈا کی ماں سخت بیمار ہے اور وہ آخری لمحات میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہے۔ راڈرک نے فلورنڈا کو لے جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا "میں نے سنا ہے افریقہ کے باز بہت اچھے ہوتے ہیں، چند باز مجھے بھیج دینا۔"

کاؤنٹ جولین نے کہا "اگر میں زندہ رہا تو ایسے باز بھیجوں گا، جن کو آپ نے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔"

کاؤنٹ جولین، راڈرک کے دربار سے ان بازوں کی تلاش میں نکلا، جنہیں اندلس کی سرزمین کو تسخیر کرنا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب افریقہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ شمالی افریقہ میں موسیٰ بن نصیرؒ گورنر تھے۔ شمالی افریقہ میں اسلامی حکومت مستحکم ہو جانے کے بعد موسیٰ بن نصیرؒ کی نظریں یورپ کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یورپ میں بھی اسلام کی روشنی پھیلائی جائے۔

یورپ میں داخل ہونے کا قریب ترین راستہ اندلس کا تھا۔ اندلس اور شمالی افریقہ کے درمیان صرف دس میل لمبی ایک آبنائے تھی۔ موسیٰ بن نصیرؒ ابھی ان امکانات پر غور کر ہی رہے تھے کہ جیسے قدرت نے یورپ کے در، اسلام کے لیے کھول دینے کی واضح سبیل پیدا کر دی۔ کاؤنٹ جولین، موسیٰ بن نصیرؒ کے ماتحت، طنجہ کے حکمراں طارق بن زیاد کے پاس پہنچا اور انہیں اندلس پر حملے کی دعوت دی۔ انہوں نے کاؤنٹ کو موسیٰ بن نصیرؒ کے پاس بھیج دیا۔ کاؤنٹ نے موسیٰ بن نصیرؒ سے مل کر دعوت دہرائی اور ہر ممکن حمایت کا وعدہ کیا۔

موسیٰ بن نصیرؒ نے خلیفہ ولید بن عبدالملکؒ کو پیغام بھیج کر اندلس پر حملے کی اجازت طلب کی۔ خلیفہ کا جواب آیا کہ مسلمانوں کو سمندر کے خطرات میں پھنسانا مناسب نہیں ہے۔ پہلے وہاں کے حالات معلوم کیے جائیں۔ موسیٰؒ نے جواب بھجوایا کہ راہ میں سمندر نہیں بلکہ ایک چھوٹی آبنائے حائل ہے اور دوسرے کنارے کی چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ اس پر خلیفہ نے اجازت دے دی۔ موسیٰؒ ایک تجربہ کار جرنیل تھے، انہوں نے پہلے کاؤنٹ کو آزمانے کی خاطر انہیں ہدایت کی کہ وہ خود ایک مختصر سا لشکر لے کر اندلس میں کسی مقام پر حملہ کرے۔ جولین نے مختصر لشکر، اندلس کے ساحلی شہر جزیرۂ خضراء بھیجا، جہاں معمولی چھیڑ چھاڑ کر کے لشکر واپس آ گیا۔

موسیٰؒ نے اب اپنے غلام طریف بن مالک کو ۹۱ھ / ۷۱۰ء میں پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ اندلس بھیجا۔ طریف نے آبنائے پار کی اور چند شہروں پر کامیاب حملے کرنے کے بعد لوٹ آئے۔

ان آزمائشی حملوں کے بعد اب وقت آ گیا تھا کہ اسلامی لشکر اندلس پر باقاعدہ فوج کشی کرے۔ اس لشکر کی قیادت کے لیے موسیٰ بن نصیرؒ کی نگاہِ انتخاب طارق بن زیادؒ پر پڑی۔

طارق بن زیادؒ بن عبداللہ طنجہ کے حکمراں تھے۔ نہایت متقی، فرض شناس اور بلند ہمت۔ مؤرخین نے طارق کے بارے میں مختلف باتیں کہی ہیں۔ الادریسی کے نزدیک طارق بربر تھے۔ بربر قبائل عرصۂ دراز سے شمالی افریقہ کے علاقے بربر میں آباد تھے۔ ابن خلدون نے طارق کو لیثی خاندان سے بتایا ہے۔ بعض مؤرخین کے نزدیک طارق ایرانی الاصل اور ہمدان کے باشندے تھے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ وہ موسیٰ بن نصیرؒ کے آزاد کردہ غلام اور نائب تھے اور موسیٰؒ جیسے ماہر فن حرب کی زیر نگرانی طارق کی تربیت ہوئی۔ طارق جنگی منصوبہ بندی کے بڑے ماہر تھے اور خود کو غیر معمولی طور پر ذہین، دور بین اور مستعد ثابت کر چکے تھے۔

طارق کو اندلس پر حملے کے لیے فوج کا سپہ سالار چن لیا گیا۔ یہ فوج سات ہزار بربری مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ۹۲ھ میں رجب کی پانچویں تاریخ (۲۸ اپریل ۷۱۱ء) تھی، جب اسلامی لشکر اندلس کے ساحل پر اتر گیا۔ طارق نے ایک پہاڑ کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ پہاڑ "جبل الطارق" کہلایا۔ آج یہی نام بگڑ کر جبرالٹر کہلاتا ہے۔ طارق نے پڑاؤ ڈالنے کے بعد ایک انوکھا کام کیا۔ انہوں نے ان جہازوں کو آگ لگوا دی، جن کے ذریعے اسلامی فوج اندلس کے ساحل پر اتری تھی، گویا اب واپسی کی راہ مسدود تھی، اسلامی لشکر کو آگے ہی بڑھنا تھا۔

اندلس کے گاتھ خاندان کا ایک جاگیر دار تھیوڈومیر (عربی تلفظ، تدمیر) اس وقت اس علاقے میں موجود تھا۔ اس نے جو اجنبی فوج دیکھی تو اپنے حامیوں کے ساتھ اس سے الجھ پڑا، لیکن شکست کھائی۔ تھیوڈومیر نے گھبرا کر اندلس کے فرمانروا راڈرک کو پیغام دیا "ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ ان کا وطن معلوم ہے، نہ

Marfat.com

اصلیت ہے یہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں!"

راڈرک کو خبر ملی تو اس نے ایک لاکھ سپاہی جمع کیے اور اجنبی لشکر کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ طارق کو اطلاع مل گئی تھی کہ راڈرک ایک لاکھ سپاہی لے کر آرہا ہے۔ انہوں نے موسیٰ بن نصیرؒ سے مزید کمک طلب کی۔ موسیٰؒ نے پانچ ہزار سپاہی اور بھیج دیے۔

طارق کی جنگی حکمتِ عملی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ انہوں نے ایسی جگہ منتخب کی جو فوجی لحاظ سے اسلامی لشکر کے لیے محفوظ تھی۔ اس کے قریب پانی اور رسد کی سہولتیں تھیں۔ یہ جگہ وادی رباط کے کنارے تھی جس کا دوسرا نام وادی الکبیر تھا۔ اسلامی لشکر کے عقب میں جھیل لاجندا تھی جسے وہ البحیرہ کہنے لگے تھے۔

راڈرک شاہی آن بان کے ساتھ لاؤ لشکر لیے مقابلے پر آپہنچا۔ تاحد نگاہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانوں کا سمندر تھا۔ راڈرک خود ایک تجربہ کار فوجی جرنیل تھا۔ فوج کے آگے آگے سجے بنے تخت پر سوار تھا اور اس کے سر پر خوبصورت چھتری سایہ کیے ہوئے تھی۔ اگرچہ اندلس میں تین سال سے قحط پڑا ہوا تھا، لیکن راڈرک کی فوج کے پاس رسد کی کمی نہ تھی۔

طارقؒ سمجھ چکے تھے کہ یہ وہ وقت ہے جب اسلامی فوج کا حوصلہ بلند کرنے اور اس کا ولولہ تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بارہ ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں ایک لاکھ سپاہی۔ گویا ایک اور دس کی نسبت تھی۔ امیر لشکر طارق بن زیادؒ نے اپنے مجاہدین کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے نہایت جوشیلی تقریر کی جو تاریخ کے صفحات میں ثبت ہوگئی۔ طارق کے الفاظ تھے:

"خبردار! ذلت پر راضی نہ ہونا۔ خود کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔ اللہ نے مشقت اور جفاکشی کے ذریعے تمہارے لیے دنیا میں جو عزت وشرف اور آخرت میں شہادت کا جو ثواب مقرر کردیا ہے اس کی طرف بڑھو۔ اللہ کی پناہ اور حمایت کے باوجود اگر تم ذلت پر راضی ہوگئے تو بڑے گھاٹے میں رہوگے۔ دوسرے مسلمان، تم کو برے الفاظ سے یاد کریں گے۔ جیسے ہی میں حملہ کروں تم بھی حملہ آور ہو جاؤ۔"

رمضان المبارک الوداع ہونے کو تھا۔ ۲۷ رمضان ۹۲ھ / ۱۸ جولائی ۷۱۱ء کی تاریخی صبح تھی، جب دونوں حریف میدانِ جنگ میں صف آرا ہوئے۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ دنیاوی آسائشوں سے بے پروا اور جنت کی نعمتوں کے طلب گار، اللہ کی رضا کے دیوانے، دشمن پر بے خوف وخطر ٹوٹ پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہر طرف خون ہی خون، لاشیں ہی لاشیں، کراہتے، زخمی، آہ وبکا کا طوفان، آسمان کے وسیع صحرا میں سفر کرتے ہوئے سورج نے یہ منظر دیکھا اور دور افق کے پار جا چھپا۔

کفر واسلام کی یہ جنگ آٹھ روز جاری رہی۔ طارق اپنے رب کے آگے گڑگڑاتے تھے، دعائیں کرتے تھے اور اپنی فوج کو جوش دلاتے تھے۔ بالآخر امیر لشکر نے فیصلہ کن وار کرنے کا ارادہ کیا۔ طارق بن زیادؒ خود اپنا گھوڑا بڑھا کر دشمن کی فوج کے قلب میں گھس گئے۔ سر سے کفن باندھے ہوئے مسلمان مجاہدین ان کے پیچھے تھے۔ وہ برق کی مانند راڈرک کی فوج پر گرے اور راڈرک کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔

راڈرک نے جو یہ رنگ دیکھا تو اسے فرار ہوتے ہی بنی۔ اس سے پہلے کہ طارق، راڈرک تک پہنچتے وہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر فرار ہو چکا تھا، لیکن موت راڈرک کا تعاقب کر رہی تھی۔ گمنامی کی موت۔

مسلمانوں نے راڈرک کا پیچھا کیا۔ کچھ دور جاکر دریائے رباط کے کنارے راڈرک کا سفید گھوڑا جس پر یاقوت وزبرجد (ایک قسم کا زمرد) سے مرصع ساز کسا ہوا تھا، دلدل میں پھنسا ملا۔ وہیں راڈرک کے پاؤں کا موزہ ملا، جس میں یاقوت وموتی ٹکے ہوئے تھے۔ ایک زرتار حلہ (جبہ) بھی ملا جو بیش قیمت جواہرات سے مزین تھا۔

دریائے رباط کی دلدل اندلس کے اس فرمانروا کو نگل چکی تھی جسے ایک لاکھ سپاہیوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔

راڈرک کا فرار ہونا تھا کہ میدان صاف ہوگیا، رہی سہی عیسائی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس جنگ میں تین ہزار مسلمان سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ بے شمار عیسائی سپاہی تہ تیغ کر دیے گئے، ان کی بے گور وکفن لاشوں سے میدان پٹا پڑا تھا۔ ان میں امرا، متوسط حال اور غلاموں کی لاشیں تھیں، جنہیں ان کی انگلیوں میں پڑی سونے، چاندی اور تانبے کی انگوٹھیوں کی مدد سے پہچانا جاسکتا تھا۔ یہ اندلس میں مسلمانوں کی کامیابیوں کا شاندار آغاز تھا، سحر طلوع ہو چکی تھی اور اس کا اُجالا چارسُو پھیل رہا تھا۔

دریائے رباط کے کنارے ہونے والی یہ جنگ اس اعتبار سے نہایت فیصلہ کن تھی کہ ہسپانوی فوج پھر کہیں بھی متحد ہو کر اسلامی لشکر کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکی۔

Marfat.com

طارق بن زیادؒ نے اب اندلس کے جنوب مغربی علاقے کا رخ کیا اور صوبہ قادس کے مشہور شہر شذونہ کو فتح کر لیا، پھر حصن المدور پر قبضہ کیا جو قرطبہ کے مغرب میں ہے۔ اس کے بعد اسلامی لشکر اشبیلیہ سے ۲۵ میل مشرق میں شہر قرمونہ جا پہنچا۔ پھر طارق نے استجہ کا محاصرہ کر لیا۔ سخت مقابلہ کے بعد استجہ فتح ہو گیا۔ طارق نے شہر میں میٹھے پانی کی ایک نہر کھدوائی اور اسے چار میل دور واقع دریا سے منسلک کروا دیا۔ یہ نہر ''عین الطارق'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

استجہ کی فتح کے بعد اندلس کے عوام پہاڑی علاقوں میں چلے گئے اور امراء نے طلیطلہ میں پناہ لی۔ اسی اثنا میں طارق کے حکم سے مغیث بن وائل کی قیادت میں سات سو سواروں نے قرطبہ کے اہم شہر کو فتح کیا۔ طارق اب اریولہ کی طرف بڑھے۔ تھیوڈومیر نے جو اریولہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا، ایک نرالی ترکیب سوچی۔ اس نے خواتین کو فوجی لباس پہنا کر فصیل پر کھڑا کر دیا اور صلح کی پیشکش کی۔ مسلمانوں نے آسان شرائط پر صلح کر لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تھیوڈومیر نے کیا چال چلی تھی۔ بہر حال یہ پورا علاقہ آگے چل کر تھیوڈومیر کے نام پر ''تدمیر'' کہلایا۔ پھر طارق نے مالقہ، البیرہ، ریہ اور پھر شمالی اسپین میں استرقہ اور صوبہ جلیقیہ کو فتح کر لیا۔ اگرچہ طارق کے طلیطلہ پہنچنے سے پہلے ہی اندلس کے امراء طلیطلہ خالی کر کے دوسرے علاقوں میں جا چکے تھے اور اپنا قیمتی مال و دولت سمیٹ کر ساتھ لے گئے تھے، تاہم پھر بھی یہاں دولت کا انبار ملا۔ ایک کلیسا سے ۲۴ زرنگار تاج ملے، قسم قسم کے نقرئی اور طلائی ظروف ہاتھ آئے۔

مسلمانوں کی پیش قدمی کو موثر بنانے کے لیے طے یہ ہوا کہ مشرقی سمت سے طارق آگے بڑھیں اور مغرب کی طرف سے موسیٰ بن نصیر اپنی فوج لے کر چلیں۔ ۹۴ھ/۷۱۳ء میں موسیٰؒ اور طارق کی ملاقات طلیطلہ میں ہوئی۔ دونوں قائدین نے مفتوحہ علاقوں کی انتظامی صورت حال کا جائزہ لیا، داخلی حکمتِ عملی کا خاکہ تیار کیا اور مزید پیش قدمی کی منصوبہ بندی کی۔ مزید مہمات پر روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی فوج کو جو احکام جاری کیے وہ عسکری لٹریچر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس منصوبے کے مطابق دونوں سپہ سالاروں نے نئی مہمات کا آغاز کیا اور شمال مشرقی اندلس کے علاوہ جنوبی فرانس پر پیش قدمی کر کے تین اہم شہروں اربونہ، لودون اور اوینون پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے اندلس کے شمال مغربی حصوں پر فوج کشی کی اور سرسطہ کی طرف بڑھے۔

یہ سلسلہ جاری تھا اور اندلس تقریباً تمام کا تمام فتح ہو چکا تھا کہ خلیفہ ولیدؒ بن عبدالملک کی طرف سے پیغام آیا کہ دونوں رہنما جلد از جلد دارالخلافہ دمشق پہنچ جائیں۔ چنانچہ ۹۵ھ/۷۱۳ء میں موسیٰؒ اور طارق واپس دمشق چلے گئے، لیکن طارق نے اندلس کو فتح کر کے اسلام کی جو شمع روشن کر دی تھی وہ تاریک یورپ میں صدیوں تک روشنیاں بکھیرتی رہی۔

•••

Marfat.com

عبدالرحمٰن الداخل

اندلس کے پہلے اموی حکمراں جنہیں مسجد قرطبہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا

ان دونوں بچوں کی عمریں دس بارہ سال کے لگ بھگ ہوں گی۔

وہ دونوں اس عالیشان قصر کے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے جو دمشق کے علاقے قنسرین میں واقع تھا۔ اسی وقت کوئی شخص گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ قصر کے دروازے پر پہنچ کر اس شخص نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ گھوڑا رک گیا۔ اس شخص نے قریب کھڑے خادم سے پوچھا "یہ کس کے بچے ہیں؟"

"معاویہ بن ہشام کے۔" جواب ملا۔

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، "یہ معاویہ مرحوم کے بچے ہیں؟" اس کی زبان سے نکلا۔ "انہیں گود میں اٹھا کر میرے قریب لاؤ۔"

خادم نے حکم کی تعمیل کی۔ دونوں بچے خوبصورت تھے۔ لیکن ایک تو بہت ہی پیارا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھونگھریالے سنہری بال، صاف رنگت اور چہرے پر کھیلتا بھولپن۔

اس شخص نے بچے کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھالیا۔ اسی وقت اس شخص کے بھائی، خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک، قصر کے دروازے پر نمودار ہوگئے۔ گھوڑے پر سوار شخص نے اپنے بھائی سے کہا "میں اس بچے کی پیشانی پر اس کے حکمراں بننے کی نشانیاں دیکھ رہا ہوں۔"

خلیفہ ہشام کے بھائی، مسلمہ بن عبدالملک کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صرف پندرہ سال بعد وہی بچہ سرزمین اندلس کا فرمانروا بن چکا تھا۔

یہ بچہ اندلس میں اموی سلطنت کا بانی عبدالرحمٰن بن معاویہ تھا جسے دنیا آج بھی عبدالرحمٰن الداخل کے نام سے جانتی ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے ۳۳ سالہ عہد حکومت میں اندلس کو ایسی آب و تاب اور رعنائی بخشی کہ آنے والے ادوار یورپ اور افریقہ کے سنگم پر واقع اس سرزمین کی دلکشی اور چمک دمک میں اضافے کی نوید لے کر آئے۔

یہ وہی عبدالرحمٰن الداخل ہیں جنہیں عظیم مسجدِ قرطبہ تعمیر کروانے کا شرف حاصل ہے۔ وہی مسجدِ قرطبہ جسے دیکھ کر، شاعر مشرق علامہ اقبال نے ایک لاجواب نظم کہی۔

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود!
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

عبدالرحمٰن ۱۱۳ھ / ۷۳۱ء میں دمشق کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ کی کنیت ابو المطرف اور لقب "الداخل" ہے۔ یہ لقب آپ کو اس وقت ملا جب آپ نے سرزمین اندلس میں داخل ہو کر اموی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ عبدالرحمٰن ابھی صرف پانچ سال کے تھے کہ والد محترم، معاویہ بن ہشام کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا ہشام بن عبدالملک ان دنوں خلیفۂ وقت تھے۔ عبدالرحمٰن کی ذہانت اور غیر معمولی صلاحیتوں نے شروع ہی سے انہیں اوروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔ انہوں نے کم عمری ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دور دور جا کر عالموں اور بزرگوں سے علم سیکھا۔ حکومت کے سرکردہ افراد کے درمیان رہ کر ملکی سیاست کی باریکیوں کو سمجھا اور کھلے میدانوں میں جا کر فنونِ حرب کی تربیت حاصل کی۔ نوجوانی ہی میں آپ اعلیٰ پائے کے شہسوار اور شمشیر زن تھے۔

جب ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں بنو امیہ کا دور ختم ہوا اور عباسی خاندان برسر اقتدار آیا تو عبدالرحمٰن نے دمشق سے کہیں اور چلے جانا بہتر سمجھا۔ وہ فلسطین چلے گئے۔ وہاں سے اپنے آزاد کردہ غلام بدر کے ساتھ مصر پہنچے اور پھر افریقہ کا رخ کیا۔ افریقہ کے حکمراں نے ان کی آمد کو پسند نہ

Marfat.com

کیا تو وہاں سے بھی کوچ کیا لیکن قدرت شاید انہیں اچھی طرح آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی۔ عبدالرحمٰن کو کہیں پناہ نہ ملی۔ اس طرح انہوں نے پورا شمالی افریقہ طے کر ڈالا۔

عبدالرحمٰن کو اس طرح صحرا نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے ایک دو نہیں پانچ سال بیت گئے، بالآخر سیتا کے نواح میں بسنے والے بربر قبیلے نفرہ نے عبدالرحمٰن کی میزبانی قبول کر لی۔ جب قبیلے والوں کو علم ہوا کہ عبدالرحمٰن کی والدہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں تو اجنبیت کے پردے اٹھ گئے۔

اب عبدالرحمٰن نے اپنے وفادار غلام بدر کو ہسپانیہ روانہ کیا کہ وہاں جا کر سرکردہ رہنماؤں سے ملیں اور انہیں بتائیں کہ بنو امیہ کے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے پوتے عبدالرحمٰن بن معاویہ افریقہ آ بسے ہیں۔ بدر اندلس پہنچے اور وہاں کے چیدہ چیدہ رہنماؤں سے ملاقات کی اور انہیں عبدالرحمٰن کی حمایت پر آمادہ کیا۔ ادھر عبدالرحمٰن اپنے غلام کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک روز وہ ساحل سمندر پر عصر کی نماز ادا کر کے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ دور سمندر میں ایک جہاز چلا آتا ہے۔ یہ جہاز رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا گیا اور جب وہ ساحل سمندر سے کچھ دور رہ گیا تو اس میں سے ایک شخص نے چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا ساحل پر آ پہنچا۔ یہ بدر تھے جو اپنے مالک کو خوشخبری سنانے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے آتے ہی عبدالرحمٰن کو مبارک باد دی کہ اندلس کے رہنما آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہیں اور ہم آپ کو لے جانے کے لیے یہ جہاز لائے ہیں۔

عبدالرحمٰن اندلس روانہ ہو گئے۔ یکم ربیع الاول ۱۳۸ھ / ۱۴ اگست ۷۵۵ء کو ان کا جہاز اندلس کی بندرگاہ المنکب پر لنگر انداز ہوا۔ اندلس کی عنان اقتدار سنبھالنے سے پہلے عبدالرحمٰن کو کچھ معرکے سر کرنے پڑے۔ مختلف رکاوٹیں حائل ہوئیں لیکن بالآخر دس ذی الحجہ ۱۳۸ھ / ۱۵ مئی ۷۵۶ء کو عبدالرحمٰن قرطبہ پر اپنا پرچم لہرا چکے تھے۔

یہاں سے اندلس میں بنو امیہ کے اقتدار کا دور شروع ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس پر ۳۳ سال چار مہینے حکومت کی اور اس عرصے میں اندلس کو جو استحکام بخشا اس کے نتیجے میں بنو امیہ اندلس پر پونے تین سو سال تک حکومت کرتے رہے اور اس کے بعد بھی سینکڑوں سال تک اندلس پر اسلام کا پرچم لہراتا رہا۔

یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا، جب اہل مغرب رہنمائی کے لیے اندلس کی طرف دیکھا کرتے تھے جو علوم و فنون کا عظیم مرکز تھا۔ اندلس کے دامن میں ایسے بے شمار اہل علم کے نام محفوظ ہیں جو اپنے علم و فن میں یکتا تھے اور جن کے ناموں سے دنیا آج بھی اچھی طرح واقف ہے۔

عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد ملک کو انتظامی اعتبار سے چھ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں طلیطلہ، مریدہ، سرقسطہ، بلنسیہ، غرناطہ اور مرقسیہ شامل ہیں۔ ہر صوبے میں قاضی مقرر کیا گیا۔

ملک کو دفاعی اعتبار سے مستحکم بنانے کے لیے عبدالرحمٰن نے فوج کی تنظیم پر خصوصی توجہ دی۔ اور بالآخر ان کی فوج میں صرف سواروں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ انہوں نے بحری بیڑے کو بھی مضبوط بنایا۔ ۱۵۵ھ / ۷۷۲ء میں عبدالرحمٰن نے قرطبہ کی فصیل تعمیر کروائی۔ قرطبہ میں قصر شاہی پہلے سے قائم تھا۔ قدیم زمانے میں گاتھ قوم سے تعلق رکھنے والے بادشاہ قرطبہ آتے تھے تو یہیں قیام کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے اس قصر کو از سر نو تعمیر کروایا۔

۱۶۲ھ / ۷۷۹ء میں فرانس کے بادشاہ شارلیمن نے اندلس پر چڑھائی کر دی۔ اس غرض سے شارلیمن نے فرانس میں پروپیگنڈہ کروایا کہ یہ عیسائیت اور اسلام کی جنگ ہے۔ اس طرح اس نے بڑی فوج اکٹھی کر لی اور اندلس کے شہر سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ سرقسطہ کے عوام نے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ اسی دوران خود فرانس میں شورشیں ہونے لگیں تو شارلیمن کو واپس جانا پڑا۔ واپسی پر جب اس کی فوج جبل البرانس کے تنگ دروں سے گزرنے لگی تو وہاں کے عیسائی باشندوں نے جو بشکنش (باسک) کہلاتے تھے، اس کی فوج پر حملہ بول دیا۔

عبدالرحمٰن الداخل سرقسطہ پہنچے تو شارلیمن محاصرہ ختم کر کے واپس جا چکا تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس کا پیچھا کیا اور فرانس پر حملہ کر کے جنوبی علاقے کے تمام قلعے تباہ کر دیے۔ بعد میں شارلیمن نے صلح کی درخواست کی، جسے قبول کر لیا گیا۔

شمالی اندلس میں سرحدی پہاڑی کے آس پاس آباد عیسائیوں نے عبدالرحمٰن کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ ۱۶۴ھ / ۷۸۱ء میں عبدالرحمٰن شمالی اندلس کے صوبے لوگرونو کے مشہور شہر قاہرہ پہنچے۔ اسے فتح کیا۔ پھر نبلونہ پر حملہ کیا اس کے بعد بشکنش کی حدود میں داخل ہوئے اور ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر وہاں کے حکمران کاؤنٹ آف سرڈین نے

Marfat.com

جزیہ دینا قبول کرلیا۔

عبدالرحمٰن الداخل اپنی رعایا سے بہت اچھا سلوک کرنے کے قائل تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کو علم حاصل کرنے کی یکساں سہولتیں میسر تھیں۔ ان کے حُسنِ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کرلیا۔ عبدالرحمٰن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ عرب اور بربر قبائل میں خوشگوار تعلقات قائم کروادیے۔ اس طرح ملک میں امن وامان ہوگیا۔

عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں اقامتِ نماز کا خصوصی اہتمام کیا۔ چنانچہ ان کے دور میں صرف قرطبہ میں مساجد کی تعداد ۴۹۰ تھی جو بعد کے ادوار میں بڑھ کر ۸۳۷ تک جا پہنچی۔ ہر مسجد سے مدرسہ منسلک تھا۔ مسافروں کے لیے سرائے تھی۔ مسجد سے ملحق دیوان تھا۔ جہاں سرکاری افسران آکر امورِ مملکت پر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔

قرطبہ کی عظیم جامع مسجد کی تعمیر عبدالرحمٰن الداخل کے نمایاں کارناموں میں سے ایک ہے۔ قدیم زمانے میں جب ہسپانیہ میں بت پرستوں کی حکمرانی تھی تو ان کا ایک بڑا بت خانہ قرطبہ میں واقع تھا۔ جب ہسپانیہ میں عیسائی مذہب پھیلا تو عیسائیوں نے اس بت خانے کو گرا کر اس کی جگہ ایک بڑا کلیسا قائم کرلیا۔ جب طارق بن زیاد کی قیادت میں مسلمانوں نے اندلس فتح کرلیا تو جس طرح دمشق پر قبضے کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم پر حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہاں جاکر گرجا کو مسلمانوں اور عیسائیوں میں مساوی تقسیم کردیا تھا، اس کلیسا کو بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مساوی تقسیم کردیا گیا۔ اس طرح ۹۸ھ میں قرطبہ کو دارالحکومت بنایا گیا تو قدرتی طور پر شہری آبادی میں اضافہ ہوگیا اور مسجد قرطبہ بڑی تعداد میں آنے والے نمازیوں کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی۔ مسجد میں وسعت پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی گئیں لیکن نمازیوں کو مسجد کی بالائی منزلوں تک پہنچنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

جب عبدالرحمٰن الداخل امیر اندلس بنے۔ انہوں نے مسجد کو وسیع کرنے کے لیے عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں کو بلایا اور انہیں پیشکش کی کہ وہ مسجد کے ساتھ واقع کلیسائی زمین، حکومت کو فروخت کردیں۔ کچھ بحث کے بعد عیسائی رہنما اس شرط پر راضی ہوگئے کہ اندلس میں دیگر جتنے کلیسا مسمار کردیے گئے تھے انہیں از سر نو تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ عبدالرحمٰن نے یہ شرط منظور کرلی اور عیسائیوں کو زمین کی قیمت کے طور پر ایک لاکھ دینار بھی ادا کیے۔

دمشق کے ایک بڑے ماہر تعمیرات نے مسجد کا نقشہ تیار کیا۔ عبدالرحمٰن خود بھی فن تعمیر سے واقف تھے۔ میریا کا لیکٹ "تاریخ اسپین" میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن اپنے ساتھ مشرق سے علم معماری اور عالی شان تعمیرات کا ذوق لائے تھے۔ وہ نہ صرف نقشہ جات بنانے سے واقف تھے بلکہ عمدہ معمار بھی تھے۔ انہوں نے مسجد کی تعمیر کے لیے پہاڑوں کو کٹوا کر نہر تعمیر کروائی۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ عام مزدوروں کے ساتھ پتھر ڈھوتے تھے۔ انہوں نے مسجد کے پرانے میناروں کو گرا کر ۱۰۸ فٹ بلند ایک نیا مینار بھی تعمیر کروایا۔ علامہ اقبالؒ نے مسجد قرطبہ کے اس مینار کو جلوہ گہ جبرئیلؑ کہا ہے۔

تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند، جلوہ گہِ جبرئیل

اس قدیم عبادت گاہ کا شمالی اور مغربی حصہ اب تک محفوظ ہے۔ ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں اندلس پر عیسائی قابض ہوگئے، جس کے بعد اس مسجد کو کلیسا بنادیا گیا لیکن اس میں کئی تبدیلیوں کے باوجود اس کی وضع قطع اب بھی بالکل مسجد کی سی ہے۔ حکام نے اس کے ایک حصے کو اب سیاحوں کے لیے کھول دیا ہے اور آنے والے مسلمان سیاح، یہاں دو رکعت نماز نفل ادا کرسکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یہاں نماز پڑھی اور اس مسجد پر بہت پُراثر نظم کہی۔ مسجد مستطیل کی شکل کی ہے جس کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ اس مسجد کو ایک منفرد انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے کے اوپر بنی ہوئی دہری محرابوں سے تعمیر کا طریقہ کسی اور مسجد میں نہیں ملتا۔

اس مسجد کی تعمیر پر عبدالرحمٰن الداخل نے صرف دو سال کے عرصے میں ۸۰ ہزار دینار صرف کیے۔ مسجد کے گرد مدرسے، سرائیں اور اسپتال کا خاکہ بھی تیار کیا گیا۔ دو سال بعد مسجد اس قدر تعمیر ہوگئی کہ اس میں نماز ادا کی جاسکے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے نماز جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی، اور جب ۲۵ ربیع الآخر ۱۷۲ھ/۲ اکتوبر ۷۸۸ء کو عبدالرحمٰن الداخل نے اپنا سفر حیات مکمل کیا تو اسی مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور قرطبہ کے قصر میں سپرد خاک کردیا گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل نے قرطبہ کے قریب ایک شاندار باغ بھی

Marfat.com

لگوایا۔ اس کا نام انہوں نے "رصافہ" رکھا۔ دمشق میں عبدالرحمٰن کے دادا ہشام بن عبدالملک نے جو باغ لگوایا تھا اس کا نام بھی رصافہ تھا۔ رصافہ میں عبدالرحمٰن نے دور دور سے نایاب قسم کے پودے منگوا کر لگوائے۔ انہوں نے یہاں ایک خوبصورت قصر بھی تعمیر کروایا۔ عبدالرحمٰن کی ایک بہن ام الاصبغ دمشق سے اپنے بھائی کو میوے اور پودے وغیرہ بھیجا کرتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے نہایت خوش ذائقہ انار بھیجے۔ عبدالرحمٰن نے یہ انار اپنے احباب میں تقسیم کیے۔ ایک حصہ سفر بن زید الکلامی کو دیا گیا۔ سفر بن زید اس خاندان انصار سے تھے جو رسول اللہ ﷺ کا علم بردار رہا تھا۔ ان دنوں وہ ریہ کے گاؤں میں تھے، انار لے کر وہ گھر آئے اور اس کے بیج اپنے باغ میں بو دیے ان بیجوں کی کونپلیں پھوٹیں، ان کونپلوں نے آہستہ آہستہ درخت کا روپ دھارا اور پھر ان پر پھل بھی آ گیا۔

سفر بن زید انار لے کر امیر عبدالرحمٰن کے پاس پہنچے عبدالرحمٰن یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ اتنا خوش ذائقہ انار اندلس کی سرزمین میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اس انار کے بیج رصافہ کے باغ میں بوئے جائیں، پھر ایک وقت ایسا آیا کہ گھر گھر اس انار کے درخت نظر آنے لگے۔ چونکہ اس انار کا درخت اندلس میں پہلی بار سفر بن زید نے لگایا تھا اس لیے یہ انار "رمان سفری" کے نام سے مشہور ہو گیا (عربی میں انار کو رُمان کہتے ہیں)۔ اس باغ میں کھجور کا ایک درخت بھی لگایا گیا تھا جس پر بعد میں عبدالرحمٰن نے ایک نظم بھی لکھی کہ اس درخت کی مانند وہ دیارِ غیر میں خود کو کس طرح تنہا محسوس کرتا ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے ہی، اندلس کی سرزمین میں پہلی بار کھجور کا درخت لگایا۔

ایک فرانسیسی مؤرخ کا کہنا ہے کہ عربوں نے علم زراعت کو انتہائے کمال تک ترقی دی۔ انہوں نے اسپین میں آبپاشی اور آب رسانی کے جو آلات استعمال کیے، اسی قسم کے آلات سیکڑوں سال بعد یورپ میں استعمال کیے گئے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے ملک بھر میں سڑکیں بنوائیں۔ ڈاک کا اعلیٰ انتظام کیا، محکمہ پولیس قائم کیا، جنوبی شہر المریہ میں سامان حرب تیار کرنے اور جہاز بنانے کے کارخانے قائم کروائے، انہوں نے دار الحکومت میں ایک ٹکسال بھی تعمیر کروائی۔

عبدالرحمٰن الداخل اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے، اس غرض سے وہ ملک بھر کے دورے کرتے تھے اور راتوں کو بھیس بدل کر گشت کرتے۔ عام لوگوں کی شکایات سننے کے لیے خود بھی دربار میں بیٹھتے۔ مزاج کے بہت نرم دل، حلیم اور بردبار تھے۔ لوگ راہ چلتے ان کا ہاتھ تھام کر اپنا مسئلہ بیان کر دیتے تھے۔ امیر اندلس نے اپنے صاحب زادوں کو بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں کا اچانک معائنہ کرتے رہا کریں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کہیں کسی کو کوئی شکایت تو نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن الداخل کی خصوصی توجہ کی بدولت چند سال میں قرطبہ کا حسن نکھر آیا۔ خوب صورت تعمیرات اور سرسبز و شاداب باغات کی بہتات تھی۔ خصوصاً دارالعلوم کی عمارتیں بہت نفیس اور کشادہ تھیں، امیر اندلس خود بھی علم کے جویا تھے اور علم کی سرپرستی پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اندلس میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ قرطبہ ایک بہت بڑا علمی مرکز بن گیا۔ دور دور سے اہلِ علم اور ماہرین فن یہاں اکٹھے ہو گئے۔ علم کو فروغ دینے کے نتیجے میں اندلس میں خواندگی کا تناسب تقریباً صد فیصد ہو گیا۔ یہاں کے تعلیمی اداروں کے بلند معیار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرطبہ اور اشبیلیہ کی یونیورسٹیوں میں حصولِ علم کے لیے یورپ سے طالب علم آیا کرتے تھے۔

عبدالرحمٰن الداخل کے دربار میں علما کرام اور اہلِ علم و دانش کا اجتماع رہتا تھا۔ لوگوں کا علمی ذوق اس قدر بلند تھا کہ وہ نظموں میں یا فصیح و بلیغ مراسلوں میں عبدالرحمٰن الداخل کو مخاطب کرتے اور عبدالرحمٰن اسی طرح علمی اور ادبی زبان میں انہیں جواب دیتے۔ ایسی بعض نظمیں اور مکالمے مؤرخین کے پاس محفوظ ہیں۔ امیر اندلس عبدالرحمٰن نے علم کو فروغ دینے کے لیے دنیا کے ہر حصے سے علما اور دانشوروں کو بلوایا۔ علمی تحقیقات کے لیے مجالس مقرر کیں۔ عوام میں علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے مناظروں اور مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا اور اچھی نظموں اور مناظروں کی کامیابی پر انعامات دیے جاتے۔ عبدالرحمٰن خود بھی علمی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔

اس زمانے میں شیخ غازی بن قیس قرطبہ میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ پھر وہ مشرقی ممالک میں گئے۔ امام مالکؒ سے موطا سنی، نافع بن ابو نعیمؒ سے قرأت قرآن سیکھی، امام اوزاعیؒ اور ابنِ جریجؒ سے علم حاصل کیا اور یوں علم کے خزانے لے کر واپس قرطبہ آئے اور اس طرح ان کے ہاتھوں موطا شریف پہلی بار اندلس پہنچی۔ عبدالرحمٰن ان

Marfat.com

کا بہت احترام کرتے تھے، انہیں قاضی کا عہدہ بھی پیش کیا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔

اسی دور میں موسیٰ ہواریؒ ایک بہت بڑے عالم تھے وہ مواور میں قیام پذیر تھے۔ جب کبھی قرطبہ آتے تو یہاں کے علمائے کرام عیسیٰ بن دینارؒ اور سعید بن حسانؒ ان کے احترام میں فتویٰ خود نہیں دیتے بلکہ ان سے دلواتے۔ عبدالرحمٰن الداخل بھی ابو موسیٰ ہواریؒ کی بہت عزت کرتے تھے۔

اندلس پر مسلمان سینکڑوں سال تک حکمراں رہے۔ یہ دور بڑا تابناک، درخشاں اور یادگار ہے۔ اس دور کا جب بھی ذکر چھڑے گا، عبدالرحمٰن الداخل کا نام ضرور لیا جائے گا، جنہوں نے اپنے حسن سیرت، تدبر اور خوش انتظامی کی بدولت اندلس کے گوشے گوشے کو علم و آگہی کی خوشبو سے مہکا دیا۔

اس خوشبو سے تاریخ کے اوراق آج بھی معطر ہیں۔

***

Marfat.com

ہشام اوّل

فیاض، متقی، صاحب علم، اور اعلیٰ درجے کے منتظم، اندلس کے دوسرے فرمانروا

پُل بن کر تیار ہو چکا تھا۔

یہ عظیم الشان پل بلاشبہ عجائبات میں سے تھا۔ بڑی بڑی سنگی محرابیں، شاندار ستون اور خوبصورت برجیاں۔ اس کی تعمیر پر خطیر رقم صرف ہوئی تھی۔ خود حکمران وقت نے اس پل کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس پل سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ خود روزانہ اس کی تعمیر کا جائزہ لیتے تھے اور اپنی نگرانی میں مزدوروں کو اجرت کی ادائیگی کرواتے تھے۔ پل تیار ہو چکا تھا، لیکن ابھی آمدورفت کے لیے نہیں کھولا گیا تھا۔ ایک دن حکمران وقت اپنے کچھ افسران کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ لوگوں کی اس پل کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ایک ماتحت نے عرض کی، "بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پل آپ نے اس لیے تعمیر کروایا ہے کہ شکار کی غرض سے آنے جانے میں آپ کو دقت نہ ہو۔"

حاکم وقت کے سرخ وسفید چہرے پر تفکر کے آثار نمودار ہوگئے۔ پھر انہوں نے کہا، "اب میں اس پُل سے کبھی نہ گزروں گا۔"

حکمران اپنے عہد کے سچے تھے۔ انہوں نے اس عظیم الشان پل پر کبھی قدم نہ رکھا۔

یہ حکمران تھے اندلس کے دوسرے اموی فرمانروا ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل جنہیں تاریخ ہشام اول کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آپ کا آٹھ سالہ دور حکومت، اندلس کی تاریخ کا ایک دمکتا باب ہے۔ مؤرخین نے ہشام اول کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سیرت و کردار میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مشابہ تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے طرزِ حکومت اور ہشام اول کے اندازِ حکمرانی میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہشام اول نے نہ صرف اندلس میں بنوامیہ کی حکومت کو وسعت اور استحکام بخشا بلکہ اپنے شاندار انتظام کے ذریعے اندلس کو خوشحالی اور مسرتوں کی آماجگاہ بنادیا۔

ہشام کی کنیت ابوالولید ہے۔ آپ شوال ۱۳۹ھ / ۷۵۶ء میں، یعنی اپنے والد عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس میں داخل ہونے کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام حلل تھا جو ابتدا میں ایک کنیز تھیں۔ انہیں عبدالرحمٰن سے قبل اندلس کے والی یوسف الفہری نے عبدالرحمٰن الداخل کی خدمت میں پیش کیا تھا اور عبدالرحمٰن الداخل نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے تمام بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ انہوں نے اپنے دو بیٹوں ہشام اور سلیمان کو حکم دیا تھا کہ دارالقضا میں جا کر کام سیکھا کریں۔ اس کے علاوہ جب مجلس امرا کا انعقاد ہوتا تھا تو عبدالرحمٰن الداخل کے تمام بیٹے اجلاس میں موجود رہتے تھے۔

عبدالرحمٰن الداخل کے تمام بیٹوں میں ہشام سب سے لائق تھے۔ وہ حصول علم کے بے حد شوقین تھے اور علما اور مشائخ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ان کے والد عبدالرحمٰن الداخل اکثر ہشام کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے، وہ کہتے تھے "ہشام جب کسی محفل میں آجاتے ہیں تو اپنے علم وادب، تاریخ کے مطالعے اور جنگوں کے تذکروں سے پوری محفل کو بھر دیتے ہیں۔" ہشام کا شعری ذوق بھی اعلیٰ تھا۔

ہشام کی متاثر کن شخصیت ان کے اعلیٰ اوصاف اور بہترین انتظامی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے عبدالرحمٰن الداخل نے انہیں صوبہ مریدہ کا والی (گورنر) مقرر کر دیا تھا۔ جب ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء میں عبدالرحمٰن الداخل کا انتقال ہوا تو ہشام مریدہ ہی میں تھے۔ انہیں ان کے والد کی وصیت کے مطابق اندلس کا امیر (حکمران) تسلیم کر لیا گیا۔

Marfat.com

حکمران بننے کے بعد ہشام کو مختلف شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شورشوں کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے فرو کرنے کے بعد ہشام فرانس کی جانب متوجہ ہوئے۔ سرحد کے عیسائی قبائل مسلمانوں کے علاقوں میں آکر اکثر چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں کو لوٹ لیا کرتے اور املاک کو آگ لگا دیا کرتے تھے۔ ہشام نے انہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ۱۷۵ھ / ۷۹۱ء میں اپنے سالار ابو عثمان کی سرکردگی میں ایک فوج اندلس کے شمال میں البہ کی سمت بھیجی۔ اس فوج نے البہ اور نواحی قلعے فتح کر لیے۔ اسی سال ہشام نے یوسف بن نحبہ کو سالار بنا کر جلیقیہ پر چڑھائی کرنے کے لیے بھیجا۔ جلیقیہ کو غیاسیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ اندلس کے بالکل شمال مغربی گوشے کا ایک بڑا صوبہ ہے۔ اس زمانے میں یہاں ایک عیسائی شخص برمیوڈر بادشاہ تھا، جسے برمند کبیر بھی لکھا گیا ہے۔ اس نے اسلامی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اطاعت اختیار کر لی۔ البہ پر دوسرا حملہ ۱۷۶ھ / ۷۹۲ء میں کیا گیا۔ عبدالملک بن عبدالواحد کی قیادت میں یہ مہم بھی کامیاب رہی۔ مسلمان قلاع تک پہنچ گئے۔

سنہ ۱۷۷ھ / ۷۹۳ء میں ہشام نے عبدالملک ہی کی قیادت میں ایک فوج جرندہ بھیجی جو اندلس کے بالکل شمال مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ یہاں عیسائی حکمران تھے۔ اسلامی لشکر نے پے در پے حملے کر کے جرندہ کی فصیل اور برجوں کو مسمار کر دیا۔ عیسائی بھاگ کر فرانس کے شہر اربونہ چلے گئے تو اسلامی فوج وہاں بھی پہنچ گئی اور اربونہ بھی اسلامی مملکت کا حصہ بن گیا۔ کثیر تعداد میں عیسائی گرفتار ہوئے۔ عبدالملک نے جنگی قیدیوں سے کہا کہ آپ کی رہائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ آپ شہر اربونہ کی فصیل گرائیں اور اس کے پتھر قرطبہ پہنچائیں۔ اربونہ اور قرطبہ کے درمیان کئی سو میل کا فاصلہ ہے لیکن قیدیوں نے رہائی کی خاطر یہ مشقت برداشت کر لی۔ ان پتھروں کو قرطبہ پہنچایا گیا۔ اور وہاں باب الجنان کے قریب ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ باب الجنان (باغوں والا دروازہ) قرطبہ کے قدیم شاہی محل کا ایک دروازہ تھا۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے اپنی کتاب تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ اربونہ کی فصیل کے پتھروں سے قرطبہ کی جامع مسجد کی مشرقی دیوار کا ایک حصہ تعمیر کیا گیا۔

سنہ ۱۷۸ھ / ۷۹۴ء میں ہشام نے عبدالکریم کو لشکر دے کر جنوبی فرانس کی طرف بھیجا۔ دوسرا لشکر ان کے بھائی عبدالملک کی سرکردگی میں جلیقیہ بھیجا گیا۔ عبدالکریم نے جنوبی فرانس کے کئی علاقے فتح کئے اور ڈیوک آف ٹولوس کو بھی شکست دی۔

اگلے سال یعنی ۱۷۹ھ / ۷۹۵ء میں ہشام نے پھر دو لشکر تیار کیے، ایک کو مشرقی اندلس کی سرحد کے پار بھیجا، یہ لشکر کامیابیاں حاصل کر کے لوٹا۔ دوسرا لشکر عبدالملک کی قیادت میں جلیقیہ بھیجا گیا کیونکہ یہاں عیسائی سرکشی دکھا رہے تھے۔ جلیقیہ کے حکمران الفانسو نے مقابلے کی بڑی تیاریاں کیں اور اطراف کی ریاستوں سے بھی مدد حاصل کی، لیکن عبدالملک کا سامنا کرتے ہی الفانسو اس قدر ہیبت زدہ ہو گیا کہ مڑ کر فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ عیسائی فوج بھی اس کے ساتھ بھاگ نکلی۔ مسلمانوں کی اس کامیابی کے بعد الفانسو کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے علاقوں پر فوج کشی کرے۔

ہشام، انتہائی فیاض اور صاحب جود وسخا حکمران تھے۔ وہ سرد راتوں کو اپنی رہائش گاہ سے نکل جایا کرتے اور مساکین اور غریبوں کی خاموشی سے مدد کر آتے تھے۔ بیماروں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ان کی عیادت کے لیے جاتے تھے۔ ہشام کے پہلو میں درد مند دل تھا۔ وہ بارش اور برف باری کی پروا کیے بغیر یتیموں اور نادار لوگوں کے گھر چلے جاتے تھے اور ان کی حاجات پوری کرتے تھے۔ مؤرخ العذاری کے مطابق ہشام نے بیت المال سے غریبوں اور محتاجوں کے ماہانہ وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے، جو ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنی خودداری کی وجہ سے دستِ سوال دراز نہ کرتے تھے۔ ایسے لوگ جب فجر یا عشا کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد آتے تو خود ہشام یا ان کے ماتحت نہایت خاموشی کے ساتھ ان لوگوں کے پاس رقوم کی تھیلیاں رکھ جاتے تھے۔

خدا ترسی، فیاضی، انصاف پسندی، انسان دوستی اور حق گوئی جیسے اعلیٰ اوصاف بچپن ہی سے ہشام کی فطرت کا حصہ تھے۔ جس زمانے میں وہ اندلس کے حکمران نہیں بنے تھے، ایک شخص الہراری ان کے پاس آیا اور اس نے کسی کا نام لے کر بتایا کہ اس شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی زمین فروخت کی جا رہی ہے۔ زمین بہت نرم، زرخیز اور شاداب ہے اور اس سے بڑی مقدار میں غلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ شخص ہشام سے کہنے لگا کہ میں چاہتا ہوں آپ اس زمین کو خرید لیں۔ ہشام نے کہا "مجھے تو وہ چیز حاصل کرنی ہے کہ اس کے حاصل ہوتے ہوئے اس زمین کی کوئی حقیقت نہ رہے گی اور اگر وہ چیز

Marfat.com

حاصل نہ کر سکا تو یہ زمین بھی میرے کام نہ آسکے گی۔ مجھے تو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں کسی آدمی کے ساتھ احسان کر کے اسے اپنا بنالوں، بجائے اس کے کہ زمین کا مالک بنوں۔"

الہراری نے کہا، "اگر ایسا ہے تو آپ مجھ ہی کو اپنا کیوں نہ بنالیں، میں سب سے بڑھ کر احسان مند ثابت ہوں گا۔" ہشام نے حکم دیا کہ زمین خرید کر الہراری کو دے دی جائے۔ اس موقع پر ایک اور شخص نے کہا کہ مال سے آرزوؤں کی تکمیل میں بہت مدد ملتی ہے۔ ہشام نے یہ سن کر سر جھکالیا، پھر یوں گویا ہوئے:

"کرم کی حقیقت خرچ کرنا ہے، نہ کہ جمع کرنا۔ تم مجھ سے وہ نہ چاہو جس کی میرا اخلاق مجھے اجازت نہیں دیتا۔ زمین کتنی ہی اچھی ہو مجھے اس سے کیا سروکار، میرا کام تو یہ ہے کہ شریف لوگوں کو نعمتیں دے کر اپنا بنالوں۔"

حکمراں بننے سے پہلے ہی کا ذکر ہے، ہشام کے والد عبدالرحمٰن الداخل کا دور حکومت تھا۔ ایک دن ہشام دریا کے کنارے بیٹھے تھے۔ جیان سے ایک شخص ان کے پاس چلا آیا، کہنے لگا، میری قوم میں سے ایک شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا، جس کا قصاص پوری برادری کو دینا پڑ رہا ہے۔ میرے گھرانے کے افراد پر سختی کی گئی ہے۔ ہشام نے اس شخص کو ایک زیور دے دیا اور کہا اس کو فروخت کر دینا، قیمت تین ہزار دینار ملے گی، اس سے قصاص ادا کر دینا، وہ شخص کہنے لگا: میں آپ کے پاس رقم لینے نہیں آیا ہوں بلکہ ظلم کی شکایت کرنے آیا ہوں۔

ہشام اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے، والد کے پاس گئے، سلام کیا اور کھڑے رہے، انہوں نے بیٹھنے کے لیے کہا لیکن ہشام نے کہا میں کس طرح بیٹھ سکتا ہوں جب کہ میرا قلب مطمئن نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن نے تفصیل دریافت کی، ہشام نے واقعہ بیان کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے فوراً بیت المال کے افسر کو حکم دیا کہ شکایت گزار شخص کی جانب سے قصاص بیت المال سے ادا کر دیا جائے اور جیان کے عامل کو خط لکھ دیا کہ آئندہ اس شخص یا اس گھرانے پر زیادتی نہ کی جائے۔ باہر آکر ہشام نے اس شخص کو یہ باتیں بتائیں۔ اس نے زیور واپس کرنا چاہا لیکن ہشام نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔

ہشام غریبوں اور مسکینوں کے لیے جتنے رحم دل اور کریم النفس تھے، ظالموں اور بدکردار لوگوں کے لیے اتنے ہی سخت گیر تھے۔ ان کی نرم دلی سے کوئی فرد ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ان کا انتظام بہت عمدہ تھا، انہوں نے انصاف کو سربلندی عطا کی۔ ہشام کے دور میں عدالتوں کا نظام اس قدر اچھا تھا اور مظلوموں کی دادرسی اتنی جلد اور تسلی بخش طور پر کی جاتی تھی کہ ہشام کو لوگ عام طور پر "العادل" کہنے لگے تھے۔ عدالتوں میں فیصلے مالکی فقہ کے مطابق ہوتے تھے۔ عدالتوں کی نگرانی کے لیے ہشام نے خصوصی اہلکار اور محتسب مقرر کر رکھے تھے۔ اس منصب پر صرف اہل علم حضرات کو مامور کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ اچانک عدالتوں کا معائنہ کرتے تھے جہاں محسوس کرتے کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، فوراً مداخلت کرتے تھے۔ ہشام کے قابل اعتماد افسران ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے جو انہیں مقامی حکام کی کارکردگی اور عوام کو ملنے والی سہولتوں سے باخبر رکھتے تھے۔ اسی طرح اسپتالوں، تعلیمی اداروں، سڑکوں و سرکاری عمارتوں، غرض ہر شعبے کے نگران اور محتسب الگ الگ تھے، جو بے قاعدگیوں پر فوراً گرفت کرتے تھے۔

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب پر معاوہ بن صالح فائز رہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ہشام نے مصعب بن عمران کو یہ منصب قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ ہشام نے عدالتوں کے کام میں کبھی مداخلت نہ کی۔ ایک بار ایک شخص شکایت لے ہشام کے پاس آیا کہ قاضی مصعب بن عمران نے اسے اس کے مکان سے بے دخل کر دیا ہے۔ ہشام نے کہا، "اگر قاضی صاحب اس جگہ کے بارے میں جہاں میں بیٹھا ہوں، یہی فیصلہ دیتے تو میں ابھی اسے چھوڑ دیتا۔" انصاف سے کوئی شخص بالاتر نہ تھا، حتیٰ کہ ہشام کے بیٹے عبید الملک کو بھی، جو فوج کے سپہ سالار رہے تھے، ایک بار کسی غلطی کی پاداش میں قید کی سزا کاٹنی پڑی۔

ایک بار ہشام کسی سرکاری ضرورت کے تحت ایک محلے میں ایک مکان خریدنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنے ماتحتوں کو بھیجا اور تاکید کی کہ مالک مکان کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ مکان خریدنے والا کون ہے۔ جب مالک مکان سے بات کی گئی تو اس نے مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ ہشام چاہتے تو سرکاری دباؤ ڈال کر اس سے مکان حاصل کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس مکان کو خریدنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

ہشام خود بھی بہت اچھے عالم تھے اور علما کی عزت کرتے تھے۔ فقہ مالکی کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ اعلیٰ ادبی اور شعری ذوق کے مالک تھے۔ انہوں نے جہاد میں اپنی معروفیت کے باوجود تعلیم

Marfat.com

کو عام کرنے پر بھرپور توجہ دی۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مدارس میں عربی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندلس کے عیسائیوں نے بھی عربی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ بہت جلد ان کی بڑی تعداد قرآن کریم بھی پڑھنے لگی اور متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔ اس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو اجنبیت اور دوری تھی، وہ ختم ہوگئی۔

ہشام کے ابتدائی دور حکومت میں اندلس کے معروف علما اور فقہا فرعون بن عباس، عیسیٰ بن دینار اور سعید بن ابی ہند حج بیت اللہ کی ادائیگی کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں وہ امام مالکؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور بہت متاثر ہوئے۔ واپس آکر انہوں نے فقہ مالکی کے نظریات کی تبلیغ کی۔ اندلس کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ابوعبداللہ زید نے بھی مالکی فقہ کو پسند کیا۔ ہشام نے بھی اس فقہ کا مطالعہ کر کے اسے قبول کیا اور حکم دیا کہ ہر سال حکومت کی جانب سے ان لوگوں کے تمام اخراجات برداشت کیے جائیں جو امام مالکؒ کی خدمت میں فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جائیں، چنانچہ بڑی تعداد میں لوگوں نے امام مالکؒ کے پاس جا کر علم حاصل کیا۔ ہشام نے ملک میں دینی اور فقہی علوم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے فقہ مالکی کے بیس ہزار سے زیادہ علماکرام پورے اندلس میں پھیلا دیے تھے۔ اندلس میں مالکی فقہ کے سب سے بڑے عالم بربر قبیلے کے یحییٰ تھے۔

ہشام اوّل نے اپنے دور حکومت میں تعمیرات پر بھی توجہ دی۔ ان کے والد محترم عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی وفات سے دو سال قبل یعنی ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں مشہورِ عالم جامع مسجد قرطبہ کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔ ہشام اوّل نے اس مسجد کو تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے عام مزدوروں کے ساتھ مل کر مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ مسجد کی تعمیر میں کل نو برس کا عرصہ صرف ہوا۔ بعد میں دیگر اموی حکمرانوں نے مسجد میں اضافے کیے اور اسے وسعت دی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اس مسجد پر اسی ہزار دینار خرچ کیے تھے۔ ہشام اول نے مسجد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار صرف کیے۔ اربونہ کی فتح سے جتنا مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اس کا خمس (پانچواں حصہ) ۴۵ ہزار دینار بنتا تھا، ہشام نے یہ تمام رقم مسجد قرطبہ کی تعمیر پر خرچ کر دی۔

وادی الکبیر، قرطبہ کا مشہور دریا ہے، اسے نہر قرطبہ، نہر اعظم یا نہر اشبیلیہ بھی کہتے ہیں۔ اس پر ایک پل عربوں کی فتوحات سے دو سو برس قبل موجود تھا، لیکن یہ پل بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اموی خلیفہ دمشق سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں اندلس کے والی السمح بن مالک الخولانی (۱۰۰ھ تا ۱۰۲ھ / ۷۱۸ء تا ۷۲۰ء) نے اس جگہ نیا پل بنوا دیا تھا۔ ہشام نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے اس پل کو از سر نو تعمیر کروایا۔ دریائے وادی الکبیر جب اشبیلیہ کے سامنے سے گزرتا ہے، تو اس کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے، جبکہ قرطبہ سے گزرتے ہوئے اس کی چوڑائی کم ہو جاتی ہے۔ یہاں دریا کے بہنے کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں پل تعمیر کرنا قدرے آسان تھا۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں بتایا گیا ہے، یہ پل اندلس کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ۱۸ محرابیں تھیں (اب ۱۶ محرابیں باقی ہیں)۔ ہر محراب پچاس ہاتھ چوڑی ہے اور محرابوں کے بیچ میں جو پیل پائے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی چوڑائی بھی اتنی ہی ہے۔ پل کی چوڑائی ۲۰ ہاتھ اور دریا سے اس کی بلندی ساٹھ ہاتھ ہے۔ یہ پل آج بھی سلامت ہے۔ یہ پل قرطبہ کے شمالی اور جنوبی حصوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ جنوبی محلوں کے جو لوگ شہر کے شمالی حصہ میں آتے تھے۔ انہیں اس پل سے ہو کر آنا پڑتا تھا۔ اس پل کی ابتدا میں قلہرہ کا برج واقع تھا۔ یہ چھوٹا سا قلعہ ابھی تک باقی ہے۔ پل پار کرتے ہی باب القنطرہ واقع تھا، جس سے گزر کر لوگ شہر میں داخل ہوتے تھے۔ کچھ ہی دور آگے قرطبہ کی جامع مسجد ہے۔

ہشام نے اپنے مختصر دور حکومت میں کئی مساجد بنوائیں، سڑکیں تعمیر کروائیں، پُل بنوائے، نہری جاری کروائیں اور متعدد مسافر خانے تعمیر کروائے۔ انہوں نے شہر قرطبہ کے چاروں طرف باغات کا سلسلہ پھیلا دیا تھا۔

ہشام نے زکوٰۃ، عشر اور جزیے کے سوا باقی تمام ٹیکس معاف کر دیے تھے۔ جزیہ صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی وصولیابی کا عمدہ انتظام تھا۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے اہلکار "مصدق" کہلاتے تھے۔

ہشام کی خوبیوں کی وجہ سے حضرت امام مالکؒ نے بھی ان کی تعریف فرمائی۔ وہ فرماتے تھے دنیا کا کوئی شخص اگر خلیفۃ المسلمین ہونے کا مستحق ہے تو وہ ہشام بن عبدالرحمٰن ہیں۔ ہشام کو بھی امام مالکؒ سے عقیدت تھی، انہوں نے امام مالکؒ کو کئی بار پیغام بھجوایا کہ وہ اندلس

Marfat.com

تشریف لے آئیں، لیکن امام مالکؒ مدینہ منورہ کی سرزمین چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

ہشام، صفر ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء میں علیل ہوئے اور یہی علالت ان کے لیے اس دنیا سے رخصت کا پیغام لے کر آئی۔ ان کی عمر تقریباً ۴۱ برس تھی۔ انہوں نے سات سال آٹھ ماہ حکومت کی۔ ہشام کے پانچ لڑکے تھے۔ انہوں نے حکم کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس سلسلے میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام والیان (گورنر) اور اعلیٰ حکام شریک ہوئے۔ اس موقع پر ہشام نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو تقریر کی اس کا حرف حرف تاریخ کے ایوانوں میں روشنی بکھیر رہا ہے۔ آپ نے کہا:

"تم عدل و انصاف کرنے میں امیر و غریب میں امتیاز نہ کرنا۔ جو لوگ تمہارے ماتحت ہیں، ان سے مہربانی اور نرمی کا برتاؤ کرنا۔ اپنے صوبوں اور شہروں کی حفاظت کی ذمہ داری وفادار اور تجربہ کار افراد کے سپرد کرنا۔ تمہارے جو افسران رعایا کو تنگ کریں ان کو سخت سزا دینا۔ جو وعدہ کرو اسے ضرور پورا کرنا۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنا کہ تمہاری رعایا تم سے محبت کرے کیونکہ اس کی محبت ہی سے تمہاری حکومت قائم ہے۔ رعایا کو زیادہ ڈرانا اور خوفزدہ رکھنا حکومت کے استحکام کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح رعایا اگر حکومت سے نفرت کرنے لگے تو یہ بات حکمران کی بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ کاشتکاروں کے حال سے بے خبر نہ ہونا۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ فصلیں تباہ نہ ہو جائیں۔ ہر کام میں ایسا طرز عمل اختیار کرنا کہ تمہاری رعایا تمہیں دعائیں دے اور خوش و خرم رہے۔"

***

Marfat.com

عبدالرحمٰن الاوسط

اندلس کو تباہی سے بچا کر خوشحالی کے راستے پر گامزن کرنے والے حکمراں

وہ شہر دریائے تاجہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا تھا۔

دریائے تاجہ، جو مشرق اندلس کے پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کرتا تھا اور مغربی سمت میں یہاں سے کچھ فاصلے پر دریا اور بحر اوقیانوس گلے ملتے تھے، وہ شہر اسی تنگ پاٹ کے دائیں کنارے پر واقع تھا۔ لوگ اسے "لشبونہ" کہہ کر پکارتے تھے۔

لشبونہ بڑا خوبصورت تھا۔ شہر کے اطراف کے پہاڑوں میں شہباز اڑتے پھرتے تھے۔ بازاروں میں خالص شہد ملتا تھا۔ وسط شہر میں صاف ستھرے حمام تھے۔ ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ شہر میں بسنے والے بہت خوش، بڑی پر سکون اور نہایت خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ایک دن ان کی پر سکون زندگی میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر طرف شور اٹھا، "نارمن آگئے!"

ہاں، لشبونہ کے شہریوں کا خوف بجا تھا۔ نارمن آرہے تھے۔ بحری قزاق، جو جرمنی کے رہنے والے تھے لیکن اسکینڈی نیویا کے ساحلوں پر جا بسے تھے۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے ان کا یہی کام تھا، اچانک حملے کر کے ہنستی بستی پر امن، ساحلی آبادیوں کو اجاڑ دیتے۔ شگفتہ چہروں سے ان کی مسکراہٹ چھین لیتے۔ لوگوں کو ان کی عمر بھر کی کمائی اور مال و متاع سے محروم کر دیتے اور فضا میں موت کے بھیانک قہقہوں کی گونج چھوڑ کر رخصت ہو جاتے۔

نارمن تعداد میں تھوڑے نہ تھے۔ وہ اسی جہازوں میں آئے تھے۔ وہ ٹڈی دل کی طرح اندلس کے ساحلوں پر اترے اور لشبونہ پر چھا گئے۔ جس بستی میں مسرت و شادمانی کا راج تھا وہاں اب آہوں اور سسکیوں کی حکمرانی تھی۔ نارمنوں نے ۱۳ دن تک لشبونہ اور نواحی علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے رکھا۔ پھر ان کا رُخ مغربی اندلس کے جزیرہ قادس کی سمت ہوا، یہاں سے مدینہ شذونہ پہنچے پھر اندلس کے مشہور دریا وادی الکبیر کے دہانے سے گزر کر اشبیلیہ پر حملہ آور ہوئے۔ وہ جہاں جاتے تباہی مچا دیتے تھے۔ انسانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ گلی کوچوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فضا بے حد سوگوار تھی۔

ادھر قرطبہ کے سرکاری ایوان میں ایک باوقار حکمراں اپنے وزیروں سے صلاح مشورے میں مصروف تھا۔ اس طویل القامت حکمراں کا رنگ گندمی تھا، ڈاڑھی گھنی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بے پناہ ذہانت جھلکتی تھی۔ وزراء، حکمراں کو بتا چکے تھے کہ نارمن قزاق ذی الحجہ کے مہینے سے لوٹ مار کر رہے ہیں۔ ان کو روکنے اور مار بھگانے کی اب تک جتنی کوششیں کی گئیں وہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ اشبیلیہ میں انہیں خاصا نقصان پہنچایا گیا لیکن وہ پھر بھی باز نہیں آئے ہیں۔ ان کی دہشت اس قدر ہے کہ اشبیلیہ تقریباً خالی ہو چکا ہے اور شہریوں کی بڑی تعداد ۲۵ میل دور شہر، قرمونہ چلی گئی ہے۔ سرحدی صوبے کے والی (گورنر) موسیٰ بن قسی کے مشورے سے چھوٹے چھوٹے فوجی دستے لقنت، قرطبہ اور مورور کی طرف بھیجے گئے تھے، انہوں نے بھی قزاقوں کی ایک بڑی تعداد کو ہلاک یا زخمی کیا ہے لیکن ابھی تک ہم اس فتنہ کا سر کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

حکمراں کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی تڑپنے لگیں اور انہوں نے نہایت بارعب آواز میں بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ بیڑا تیار ہو گیا تو انہوں نے خود تمام انتظامات کا جائزہ لیا اور ضروری ہدایات کے ساتھ لشکر کو روانہ کر دیا۔ چند دنوں بعد قاصد آکر حکمراں کو خوشخبری سنا رہا تھا کہ اندلس کے بحری بیڑے نے کمال شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے نارمنوں کو مار بھگایا

Marfat.com

ہے۔ نارمن اندلس کی سرزمین کو چھوڑ کر بحر اوقیانوس میں کہیں دور نکل گئے ہیں۔

نارمنوں کی طرف سے اطمینان ہوا تو حکمران نے ان تمام شہروں میں نقصانات کی تلافی کا حکم دیا جہاں نارمنوں نے لوٹ مار کی تھی اور تباہی پھیلائی تھی۔ اس کے بعد حکمران نے اپنے وزراء کو طلب کیا۔ آج ان کا چہرہ غیظ و غضب کی بجائے سکون و اطمینان کی ترجمانی کر رہا تھا۔ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنے وزراء کو بتایا کہ نارمن قزاقوں کو مار بھگانے میں ہم تقریباً چار ماہ تک اس لیے کامیاب نہ ہو سکے کہ ہمارا بحری بیڑا طاقتور نہ تھا۔ اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ فوج کو بحری جنگ کی خصوصی تربیت دلوائی جائے گی۔ نئے جہاز بنائے جائیں گے۔ ساحل کے کنارے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر برج بنوائے جائیں گے جن میں محافظ مقرر ہوں گے۔ ساحل کے نزدیک حفاظتی انتظامات کا محکمہ قائم ہو گا۔ اشبیلیہ میں ایک دار الصناعہ (کارخانہ) قائم ہو گا جہاں جہاز تیار ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اندلس کا بحری بیڑا دنیا کے بڑے بحری بیڑوں میں سے ایک ہو۔

ان تمام فیصلوں پر فوری طور پر عمل درآمد کیا گیا اور چند سال میں اندلس کی بحری طاقت دنیا کی عظیم بحری طاقتوں میں شمار کی جانے لگی۔ ۲۳۰ھ / ۸۴۵ء میں اندلس پر نارمنوں کی پہلی یورش کے ۱۴ سال بعد جب نارمن اندلس پر دوسری بار حملہ آور ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اندلس کا عظیم بحری بیڑا اندلس کے پانیوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ وہ ابھی اپنی حیرانی پر قابو نہ پا سکے تھے کہ ان کے جہازوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ اندلس کی بحری فوج نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ نارمنوں کے لیے فرار کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔

اپنے مثالی حُسنِ انتظام اور غیر معمولی تدبیر کی بدولت اندلس کو تباہی اور بربادی سے بچانے اور اس سرزمین کو ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کرنے والے یہ حکمران تھے عبدالرحمٰن بن الحکم۔ جن کی روشن اور باوقار شخصیت آج بھی تاریخ کے صفحات کو جگمگا رہی ہے۔

آپ کا نام عبدالرحمٰن اور کنیت ابو المطرف ہے۔ آپ کے والد الحکم اول ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء سے ۲۰۶ھ / ۸۲۱ء تک اندلس پر حکمران رہے تھے۔ آپ کے دادا کا نام ہشام اور پردادا کا نام عبدالرحمٰن تھا جو عبدالرحمٰن الداخل ؒ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں۔ اندلس میں عبدالرحمٰن نام کے تین حکمران گزرے ہیں جن میں پہلے عبدالرحمٰن الداخل ؒ کہلاتے ہیں، جنہوں نے اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کی بنیاد ڈالی، دوسرے عبدالرحمٰن الاوسط کے لقب سے معروف ہیں جن کی شخصیت کا اس مضمون میں جائزہ لیا جا رہا ہے۔ عبدالرحمٰن نام کے تیسرے حکمران عبدالرحمٰن الناصر کے نام سے مشہور ہیں۔

عبدالرحمٰن الاوسط ۱۷۶ھ / ۷۹۲ء میں طلیطلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام حلاوہ تھا۔ آپ کے والد الحکم بن ہشام نے آپ کو بہت اچھی تربیت دلوائی تھی، چنانچہ آپ نے قرآن پاک، دینی علوم، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ مؤرخ ابن اثیر، عبدالرحمٰن الاوسط کے بارے میں لکھتے ہیں، "وہ ادیب و شاعر تھے اور علوم شرعیہ کے علاوہ علوم فلسفہ کے عالم تھے۔" مجموعہ اخبار اندلس کے مطابق انہیں ادب، فقہ، حفظِ قرآن پاک اور روایت و حدیث میں حصہ عطا ہوا تھا۔

ذہنی علوم کے ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن نے جسمانی فنون پر بھی توجہ دی اور لڑائی کے مروجہ طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے والد کے دورِ حکومت ہی سے جنگوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر جنگ سے فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے لوٹتے، اسی لیے لوگ انہیں "مظفر" یعنی کامیاب کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔ ان کی طبیعت میں رحم دلی کی صفت بہت نمایاں تھی اور وہ مسکینوں اور مستحق افراد کی بڑھ چڑھ کر مدد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے محبت کرتے تھے اور ان کا نام لینے کی بجائے "ابو المساکین" کہہ کر ان کا ذکر کرتے تھے۔ قدرت نے ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کو حسنِ انتظام کی صلاحیت سے بھی نوازا تھا۔ اپنے والد کے عہدِ حکومت کے آخری زمانے میں تقریباً سارا نظم و نسق ان ہی کے ہاتھوں میں تھا اور انہوں نے نہایت عمدگی، بردباری اور تدبر کے ساتھ ملکی معاملات کو سنبھال لیا تھا۔

جب عبدالرحمٰن الاوسط کی عمر ۳۱ سال ہوئی تو ان کے والد الحکم الاوّل انتقال فرما گئے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد حکومت کا بارِ گراں عبدالرحمٰن الاوسط پر آن پڑا۔ انہوں نے اندلس پر تقریباً ۳۰ برس حکمرانی کی اور تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اندلس کا یہ دور ترقی، کامرانی اور خوشحالی کا دور تھا۔ آپ کا انتقال ربیع الثانی ۲۳۸ھ / ستمبر ۸۵۲ء میں قرطبہ میں ہوا۔

آسودہ حالی اور سکون و اطمینان بھرے، آپ کے دورِ حکومت

میں دو اہم واقعات پیش آئے اور دونوں مرتبہ عبدالرحمٰن الاوسط نے اپنی فراست اور بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے تمام مسائل پر قابو پالیا اور مملکتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کی جو کوششیں کی گئیں انہیں ناکام بنادیا۔

ان دو واقعات میں سے ایک تو ۲۳۰ھ/۸۴۵ء میں اسلامی مملکت پر نارمنوں کا حملہ تھا جس کا ذکر مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔ دوسرے واقعے کا تعلق مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی مسیحی تحریک سے ہے جو طلیطلہ اور قرطبہ سے اٹھی۔ مسیحیوں نے اس تحریک کے بارے میں اپنی کتب میں بہت کچھ لکھا ہے، اس کی تفصیل پر بحث کیے بغیر مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ عیسائیوں میں اس عقیدے کو رواج دیا گیا کہ مذہب کی اصل روح تکلیف اٹھانا ہے اس لیے ایسے کام کیے جائیں جن سے حکومت مشتعل ہو، تاکہ وہ سزاؤں کا نفاذ کرے، اور سزا پانے والے مسیحی باشندے، تزکیۂ روح کے عمل سے گزر سکیں۔ اس تحریک کے بانی قرطبہ کے ایک راہب یولوجیس تھے۔ انہوں نے مسیحی نوجوانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دین اسلام اور (نعوذ باللہ) پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں تاکہ حکومت انہیں گرفتار کرکے سزائے موت دے اور یوں یہ مسیحی نوجوان شہادت کے مرتبہ بلند پر فائز ہو جائیں۔ یولوجیس کی اس تحریک میں قرطبہ کے ایک دولت مند عیسائی نوجوان الوارو اور ایک لڑکی فلورا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مسلمان اپنے پیارے رسول پاک ﷺ سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی شان میں کسی مسیحی کی جانب سے گستاخی کے باعث مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا مشتعل ہونا فطری بات تھی۔ صورتِ حال بڑی خطرناک تھی۔ عبدالرحمٰن الاوسط نے اس نازک صورتحال میں جبر اور دباؤ سے کام لینے کی بجائے حکمت اور تدبر کا راستہ اپنایا۔ انہوں نے عیسائیوں کے بڑے پادریوں سے گفت وشنید کرکے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ عام مسیحی باشندوں کو دین اسلام کے خلاف باتیں کرنے سے روکیں۔

عبدالرحمٰن الاوسط کو اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، ۲۳۸ھ/۸۵۲ء میں اشبیلیہ کے اسقف اعظم (مطران) کی صدارت میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ مسیحی پادریوں کی یہ کانفرنس قرطبہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یولوجیس کی تحریک پر بحث و مباحثہ ہوا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس تحریک کو ختم کر دیا جائے۔ اسقف اعظم نے تمام عیسائیوں کو ہدایت کی کہ وہ اس تحریک میں حصہ نہ لیں اور جو اس تحریک میں حصہ لے گا وہ گناہ گار ہوگا۔ کانفرنس میں اس تحریک کی مذمت کی گئی۔

پادریوں کی اس کانفرنس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور یہ فتنہ خاصی حد تک دب گیا تاہم چھوٹے پیمانے پر یہ تحریک چلتی رہی اور سات سال کے بعد یولوجیس نے دوبارہ اس تحریک میں نئی جان ڈالنے کی کوشش کی چنانچہ اس وقت کے حکمراں امیر محمد الاول کے حکم سے یولوجیس کو گرفتار کرکے سزائے موت دے دی گئی۔

عبدالرحمٰن الاوسط نے تہائی صدی پر محیط اپنے دورِ حکومت میں متعدد بار مختلف علاقوں پر فوج کشی کی اور ظفر مند لوٹے۔ ان کے عہد میں لیوانت (شرق الاندلس) کا علاقہ فتح ہوا۔ ۲۱۶ھ/ ۸۳۱ء میں ایلو کے اہم شہر کی جگہ نیا شہر مرسیہ بسایا۔ ۲۲۲ھ/۸۳۷ء میں طلیطلہ میں ہونے والی بغاوت کا خاتمہ کرکے شہر میں حکومت کا نظم ونسق بحال کیا گیا۔ انہی دنوں عبدالرحمٰن نے اندلس کی سرحدوں پر عیسائیوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کی اور تقریباً ہر سال موسم گرما میں عیسائیوں کی لیونشی سلطنت کے خلاف مہمات کی قیادت کرنے لگے۔

امیر بننے کے کچھ عرصے بعد عبدالرحمٰن الاوسط کو ایک سرحدی عیسائی ریاست گوتھک مارچ کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ یہ ریاست فرانسیسیوں کے ایما پر اندلس کی سرحد پر قائم ہوگئی تھی، اس کا بادشاہ برن ہارٹ تھا۔ برن ہارٹ کی فوج اندلس کے سرحدی شہروں میں مسلمانوں کی آبادیوں پر حملے کرنے لگی۔ عیسائی فوج دندناتی ہوئی وادی ثغر کے کنارے واقع شہر لاردہ میں گھس آئی۔ لاردہ کی حفاظت کے لیے بڑے پیمانے پر فوج متعین نہیں تھی اس لیے مسیحی فوج کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

عیسائی فوج کی لُوٹ مار کی خبر عبدالرحمٰن الاوسط تک پہنچی تو انہوں نے اپنے حاجب (وزیر اعلیٰ) کی قیادت میں ایک لشکر ریاست گوتھک مارچ کے دارالحکومت برشلونہ (بارسلونا) بھیجا۔ عیسائی مقابلے پر جم گئے لیکن اسلامی فوج نے گوتھک مارچ کی مملکت کے کئی شہروں پر یلغار کر دی۔ بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور متعدد علاقوں پر فتح کے پرچم لہرا دیے۔ ان علاقوں کے مسیحی باشندوں نے جزیہ ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی یعنی ایک مخصوص رقم بطور ٹیکس ادا کرنے کا وعدہ کیا جس

Marfat.com

کے عوض اسلامی حکومت ان کی جان و مال کا تحفظ کرتی تھی۔ عیسائیوں نے جن مسلمانوں کو قیدی بنالیا تھا انہیں رہائی دلوائی گئی۔ اس جنگ میں بہت ساماں غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

سنہ ۲۱۰ھ / ۸۲۷ء میں برشلونہ پر مزید حملے کیے گئے کیونکہ عیسائی ریاست گوتھک مارچ کی جانب سے شورشیں ہو رہی تھیں ان شورشوں کی پشت پر فرانس کے بادشاہ شارلیمن کا ہاتھ تھا۔ مسلمانوں کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں گورتھک مارچ کی تمام شورشوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔

اسلامی حکومت کی ان کامیابیوں کی دھاک اطراف کے ممالک پر بیٹھ گئی، چنانچہ ارضِ روم کے بازنطینی بادشاہ میکائل دوم نے اندلس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بادشاہ نے ۲۲۲ھ / ۸۳۷ء میں تحائف دے کر اپنے سفیر عبدالرحمٰن الاوسط کی خدمت میں بھیجے۔ عبدالرحمٰن نے اس سفارت کا خیر مقدم کیا جن میں بہترین نسل کی ایک گھوڑی بھی تھی لیکن عبدالرحمٰن اس بات کو بھانپ گئے کہ اس سفارت کا مقصد کیا ہے، دراصل اسی دور میں اسلام کے بڑے حصے پر عباسی خاندان کی حکمرانی تھی۔ شاہ میکائل دوم کی کوشش یہ تھی کہ وہ امویوں کو عباسیوں سے لڑوانے اور امویوں میں، دوبارہ پورے عالم اسلام پر برسراقتدار آنے کی خواہش کو بیدار کردے۔ لیکن بادشاہ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، کیونکہ عبدالرحمٰن الاوسط نے اس کی سفارت کا تو اچھی طرح جواب دیا لیکن عباسیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کے مشوروں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

شاہ میکائل کی وفات کے بعد ۲۲۴ھ / ۸۳۹ء میں شاہ تھیوفلس نے تخت و تاج سنبھالا۔ اس نے بھی ۲۲۵ھ / ۸۴۰ء میں اپنے سفیر قرطبہ بھیجے اور عبدالرحمٰن الاوسط کو عباسیوں پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ لیکن عبدالرحمٰن الاوسط نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔ بہر حال عبدالرحمٰن الاوسط وہ پہلے حکمراں ہیں جن کے دور میں قرطبہ اور بازنطینی حکومتوں کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ انہوں نے مغربی بربریہ کی تین چھوٹی آزاد ریاستوں تاہرت، تکور اور سجلماسہ سے بھی تعلقات قائم کیے۔

شمالی اندلس میں نبرہ (نوار) نام کا ایک علاقہ تھا۔ اس علاقے میں بشکنش (عیسائی جو، اب "باسک" کہلاتے ہیں) کی حکومت تھی۔ کوہ پائیرنیس کا سلسلہ اس علاقے میں مشرق تا مغرب پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے حکمراں فرانس کی شاہی حکومت کے باج گزار تھے یعنی انہیں خراج ادا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن الاوسط حکمراں بنے تو نبرہ کے حکمراں نے فرانس سے بغاوت کر کے اپنی آزاد ریاست کی داغ بیل ڈالی، لیکن انہیں پڑوسی فرانس سے بھی اندیشہ تھا کہ وہ اس چھوٹی سی ریاست کو پریشان کرے گا۔ اس غرض سے نبرہ کے حکمراں نے عبدالرحمٰن الاوسط کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور درخواست کی کہ اگر حکومت نبرہ پر کوئی طاقت حملہ کرے گی تو اندلس کی حکومت اس کا دفاع کرے اور اگر اندلس سے کوئی لشکر کوہ پائیرنس کے پار جائے گا تو نبرہ کی حکومت اس لشکر کو راہداری کی سہولتیں فراہم کرے گی، عبدالرحمٰن الاوسط نے یہ درخواست قبول کر لی۔

فرانس میں اس وقت حکمراں، شاہ لوئی کو یہ معاہدہ پسند نہ آیا اور اس کے حکم پر فرانسیسی فوج ریاست نبرہ کو روندتی ہوئی اندلس میں گھس آئی۔ فرانسیسی فوج نے پمپلونہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے واپس جانے لگی تو مسلمان سپاہیوں نے دروں اور تنگ راستوں سے نکل کر فوج پر دھاوا بول دیا۔

فرانسیسی فوج بوکھلاہٹ کے عالم میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ آئندہ چند برسوں میں امیر عبدالرحمٰن الاوسط نے فرانس کے کئی شہر فتح کیے اور جلیقیہ کے متعدد علاقوں کو مطیع کیا۔

عبدالرحمٰن الاوسط نے ۳۰ سال تین ماہ حکمرانی کی۔ مشہور مؤرخین ابن اثیر اور ابن خلدون کی رائے ہے کہ ان کا زمانہ عافیت اور سکون کا تھا اور ان کے پاس دولت کی بہتات ہو گئی تھی۔ ان کے زمانے میں اندلس کی حکومت کو خراج کی مد میں سالانہ دس لاکھ دینار کی آمدنی ہوتی تھی۔ انہوں نے قرطبہ میں ایک بڑی ٹکسال قائم کی تھی، جس میں مختلف سکے ڈھالے جاتے تھے۔

مورخ ابن خلدون کے مطابق عبدالرحمٰن الاوسط نے مملکت کا آئین اور قوانین نئے سرے سے مرتب کروائے۔ وزرا کے اختیارات کا تعین کیا۔ وزرا کو مختلف ملکی معاملات پر صلاح مشورے کے لیے سرکاری ایوان میں طلب کیا جاتا تھا۔ انہیں کئی لائق اور ذہین وزرا کا تعاون حاصل ہو گیا تھا۔ آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب رکھنے اور مالی امور کے انتظامات کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نے مالیات کا شعبہ قائم کیا تھا۔

مملکت میں انصاف کی سربلندی قائم رکھنے اور رعایا کو اس کا حق

Marfat.com

دلوانے کی غرض سے قاضی مقرر رہتے تھے۔ قاضیوں کے تقرر کے سلسلے میں عبدالرحمٰن، مشہور فقیہ اور عالم شیخ یحییٰ اللیثیؒ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ وہ شیخ یحییٰ اللیثیؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے سرکاری ایوان میں دیگر کئی فقہا موجود رہتے تھے۔ ان کے دور میں سعید بن محمدؒ، ابو عمر بن بشیرؒ، صفوان قرشیؒ، احمد بن زیادؒ، معاذؒ بن عثمان جیانی اور دیگر ممتاز علماکرام قاضی (جج) کے منصب پر فائز رہے۔

عبدالرحمٰن الاوسط نے قرطبہ کی مشہور جامع مسجد میں، جسے ان کے پردادا عبدالرحمٰن الداخلؒ نے تعمیر کروایا تھا، اضافہ کروایا اور مسجد میں مزید سات دالان تعمیر کروائے اس طرح ان دالانوں کی تعداد پندرہ ہوگئی۔ انہوں نے جیان اور اشبیلیہ میں بھی شاندار جامع مساجد تعمیر کروائیں، وہ مساجد کی تعمیر سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحت حکام کو ہدایت کی تھی کہ وہ مساجد کی تعداد میں اضافہ کریں چنانچہ ان کے دور میں بہت سی مساجد تعمیر ہوئیں۔ ان مساجد کی تعمیر میں بہت قیمتی سامان استعمال کیا گیا۔

عبدالرحمٰن الاوسط خود بھی اچھے عالم تھے اور علوم کی سرپرستی پسند کرتے تھے۔ ان کی ہدایت پر ہر مسجد کے ساتھ ایک وسیع مدرسہ بنایا گیا۔ مدرسہ کا انتظام مسجد کے امام اور اہل محلہ کی ایک مجلس کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ ایسے تمام مدرسوں کے اخراجات حکومت کے ذمے تھے۔ ان مدارس میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دو یا تین محلّوں کے درمیان شفاخانے قائم کیے گئے تھے جن میں ماہر طبیبوں کا تقرر کیا گیا تھا۔ ان شفاخانوں میں عوام کو مفت علاج معالجہ کی سہولتیں حاصل تھیں۔

عبدالرحمٰن الاوسط بہت نفاست پسند تھے۔ انہوں نے اندلس کو دل کش، سرسبز و شاداب اور خوبصورت بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے۔ سڑکوں کی مرمت اور صفائی پر خصوصی توجہ دی۔ ناقابلِ استعمال سڑکوں کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ سڑکوں کا ایک جال بچھا دیا گیا اور تمام سڑکوں کی پیمائش کروائی گئی۔ شہروں میں صفائی کا بہت اچھا انتظام کروایا۔ کوڑا کرکٹ جمع نہ ہونے پاتا تھا۔ قشتالیہ کے جنوب میں سیرا مورنیا کے پہاڑی سلسلے میں واقع چشموں سے سیسے کے پائپوں کی مدد سے صاف پانی لایا جاتا اور شہریوں کو فراہم کیا جاتا۔ شہروں میں شاندار حمام بنوائے گئے۔ کئی باغ لگوائے گئے جن میں جابجا فوارے چلتے تھے۔

اندلس سے گزرنے والے مشہور دریا وادی الکبیر کی دونوں جانب خوش نما باغات تھے، لوگ شام کو گھوڑوں پر سوار ہو کر ان باغات میں تفریح کرتے۔ عبدالرحمٰن الاوسط نے باغوں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کے لیے ملک سے باہر سے بھی پودے اور بیج منگوا کر لگوائے تھے۔ اندلس کے طول و عرض میں کئی پل بھی تعمیر ہوئے۔ ان کے دور میں ڈاک کا انتظام بھی بہت اچھا تھا۔ غرض یہ کہ یہ دور تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا جس سے دور اور نزدیک کی قومیں بہت متاثر ہوئیں اور انہوں نے مسلمانوں کے طور طریقے اپنانے شروع کر دیے۔

اچھے حکمراں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ اپنی رعایا کو ہر قسم کی تکالیف اور پریشانیوں سے بچائے رکھے اور اگر اس کی رعایا کا ایک فرد بھی کسی مشکل سے دوچار ہو جائے تو وہ اس کی مشکل کو رفع کرے۔ امیر عبدالرحمن الاوسط کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ انہیں کل، اللہ کے حضور اس بات کی جواب دہی کرنی ہے کہ انہوں نے اپنی رعایا کے حقوق کس حد تک ادا کیے اور اس سلسلے میں ان پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں کہاں تک پوری کیں۔ چنانچہ ان کے دور میں مستحقین، بیواؤں، یتیموں کی نگہداشت کرنے اور ان کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے کئی محکمے قائم کیے گئے۔

جو لوگ صنعت و حرفت سے دلچسپی رکھتے تھے انھیں ان کی پسند کے شعبہ میں تربیت دلوائی جاتی تھی۔ جو علم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے تھے انہیں مدرسوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ناگہانی قدرتی آفات کی صورت میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے الگ محکمے قائم تھے۔ ایک بار قحط پڑا تو کسانوں کے لگان معاف کر دیے گئے۔ اور عوام کو سرکاری ذخائر سے اناج فراہم کیا گیا۔ ایک بار ٹڈی دل نے فصلوں پر حملہ کر دیا اور فصلوں کا بڑا حصہ چٹ کر گیا۔ اس موقع پر حکومت کی جانب سے مفت کھانا اور کپڑا تقسیم کیا گیا اور بے روزگار افراد کو متبادل روزگار مہیا کیے گئے۔

عبدالرحمٰن الاوسط بہت اچھے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور ستھرا شعری ذوق رکھتے تھے۔ ان کے دربار میں ممتاز علماکرام کے علاوہ اچھا شعر کہنے والے کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ عبدالرحمٰن الاوسط کو قدرت نے تقریر کی زبردست صلاحیت بخشی تھی ان کی خطابت سامعین کو مسحور کر لیتی تھی۔ ان کی تقریر میں بلا کی روانی تھی۔ دلائل و براہین کے انبار لگاتے ہوئے ان کی تقریر میں کبھی

Marfat.com

ابر باراں کی شان ہوتی، کبھی نرم ونازک گل کی سی لطافت تو کبھی طوفانی لہروں کا ساغضب پایا جاتا، وہ صاف ستھرا لباس زیب تن کرنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لباس پر خود ہی طغرا کاڑھا تھا۔

امیر عبدالرحمٰن الاوسط کی نرم خوئی، انسان دوستی اور رحم دلی کے، کیا مسلم اور کیا غیر مسلم سب مداح تھے۔ ان کا یہی حُسنِ سلوک مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کو اسلام کی جانب کھینچ لایا تھا، اشبیلیہ میں تو عیسائی اس قدر بڑی تعداد میں مسلمان ہوئے کہ وہاں موجود مسجد نمازیوں کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی چنانچہ عبدالرحمٰن نے ایک نئی عالیشان مسجد تعمیر کروائی۔

در حقیقت دلوں کو مسخر محض کتابیں نہیں بلکہ وہ انسان کرتے ہیں جو، ان کتابوں کی عملی تفسیر ہوا کرتے ہیں۔

•••

Marfat.com

احمد بن طولون

ذہین اور باکمال حکمران جنہوں نے مصر کو خوشحالی اور تمدن کے اوجِ کمال پر پہنچایا

وہ کئی غلام تھے!

طویل سفر کی تھکان ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ انہیں سیکڑوں میل کا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ بخارا سے شروع ہونے والا ان کا سفر بغداد میں تمام ہوا تھا۔ جلد ہی انہیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔ ان تمام غلاموں کو بخارا کے والی نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں بطورِ خراج بھیجا تھا۔

غلاموں کو خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان میں سے ایک غلام اپنی منفرد شخصیت کی بنا پر دوسروں سے ممتاز نظر آتا تھا۔ خلیفہ نے اس غلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ جلد ہی خلیفہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ غلام دیگر غلاموں کے مقابلے میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ خلیفہ نے اس غلام کو اپنے ذاتی محافظوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔

کچھ عرصے بعد اس غلام کو، جو اَب خلیفہ کے ذاتی محافظ دستے کا افسرِ اعلیٰ تھا، قدرت نے ایک بیٹا عطا کیا۔ غلام نے اپنے بیٹے کا نام احمد رکھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہی احمد تقریباً تیس برس بعد سرزمینِ مصر کا حکمران بن جائے گا اور اس خطۂ ارض کو سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی و تمدنی لحاظ سے اوجِ کمال پر لے جانے کا عظیم کارنامہ انجام دے گا۔

یہ احمد بن طولون ہیں، جنہوں نے مصر کو خوشحالی کے عروج پر پہنچانے کا اعزاز حاصل کیا۔ تاریخ میں وہ ابنِ طولون کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے مصر و شام میں طولونی عہد کی بنیاد ڈالی جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود اس قدر تابناک ہے کہ اس کی ضوفشانی سے تاریخ کے ابواب آج تک منور ہیں۔

احمد بن طولون رمضان المبارک ۲۲۰ھ / ستمبر ۸۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت انہوں نے سامرا (سُرَّ مَن رَائی) میں حاصل کی۔ یہ بغداد سے ۷۵ میل شمال میں واقع بہت خوبصورت شہر تھا جسے خلیفہ معتمد باللہ نے دارالخلافے کی شکل دے دی تھی۔ جب احمد کے والد طولون کو بخارا کے والی نے ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء میں دیگر غلاموں کے ساتھ بطورِ خراج عباسی خلیفہ کو بھیجا تھا تو اس وقت مامون الرشید مسندِ خلافت پر موجود تھے اور ان کا دارالخلافہ بغداد تھا۔

احمد ابن طولون نے دیگر علوم کے ساتھ فوجی تربیت بھی سامرا میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ شام اور ایشیائے کوچک کی سرحد پر واقع ایک شہر طرسوس چلے گئے جہاں انہوں نے دینی علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

احمد بن طولون کی پیدائش کے وقت عباسی خلیفہ معتمد باللہ حکمران تھے۔ ان کے بعد ۲۲۷ھ / ۸۴۲ء میں واثق باللہ خلیفہ بنے، پھر متوکل علی اللہ پر بارِ خلافت ڈالا گیا۔ متوکل کے بعد عباسی خلافت سخت انتشار اور عدمِ استحکام کا شکار ہو گئی۔ نو برس کی مختصر مدت میں چار خلفا المنتصر، المستعین، المعتز اور المہتدی تخت نشین ہوئے۔ خلیفہ المستعین باللہ، احمد بن طولون کو ان کی شجاعت، ہوش مندی اور علم و فضل کی وجہ سے بہت پسند کرتے تھے، لیکن المستعین باللہ کو بہت تھوڑے عرصے تک برسرِ اقتدار رہنے کا موقع ملا۔ ۲۵۱ھ / ۸۶۵ء میں وہ خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ انہیں احمد بن طولون پر اتنا اعتماد تھا کہ ان ہی کی نگرانی میں جلاوطنی قبول کی۔

المستعین کے بعد المعتز برسرِ اقتدار آئے۔ المعتز نے ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء میں ایک ترک سپہ سالار باکباک کو مصر کا والی بنا دیا۔ اس وقت تک احمد بن طولون کے والد طولون کا انتقال ہو چکا تھا اور

Marfat.com

باکباک احمد بن طولون کی والدہ سے شادی کر چکے تھے۔ احمد بن طولون کے سوتیلے والد یعنی باکباک نے احمد کو مصر میں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ احمد بن طولون ۲۳ رمضان المبارک ۲۵۴ھ / ۱۵ ستمبر ۸۶۸ء کو فسطاط میں داخل ہوئے۔ فسطاط، قاہرہ کا قدیم نام ہے۔ اس زمانے میں اس شہر کو فسطاط ہی کہا جاتا تھا۔

احمد بن طولون نے مصر میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد محسوس کیا کہ مصر کی اقتصادی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ مالیات کا محکمہ ابن المدبر کے پاس تھا جو یوں تو قابل اور منتظم تھے لیکن ان سے مصر کے لوگوں کو بہت سی شکایات بھی تھیں۔ احمد بن طولون نے ابنِ المدبر کے خلاف مہم چلائی۔ بالآخر ابنِ المدبر کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

اسی اثنا میں احمد بن طولون کے سوتیلے والد باکباک کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد مصر، یرجوخ کے حوالے کیا گیا۔ یرجوخ نے اپنی ایک بیٹی کی شادی احمد بن طولون سے کر دی تھی۔ انہوں نے اب مصر کے صوبے کے ساتھ ساتھ اسکندریہ، برقہ اور سرحدی اضلاع کا انتظام بھی احمد بن طولون کے سپرد کر دیا۔ اسی زمانے میں فلسطین کے والی اماجور نے بغاوت کر دی۔ ابن طولون نے عباسی خلیفہ سے اجازت حاصل کر لی کہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے وہ بڑی تعداد میں غلاموں کی ایک فوج منظم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک بڑی اور طاقت ور فوج تیار ہو گئی۔ اگرچہ فلسطین کی بغاوت کو فرو کرنے کا کام کسی اور سے لے لیا گیا لیکن اس صورتِ حال کے باعث ابن طولون ایک مضبوط فوجی طاقت کے مالک بن گئے۔ کچھ عرصے بعد خلیفہ نے مصر اور شام کے سرحدی علاقوں کی مالیات کا تمام انتظام احمد بن طولون کی تحویل میں دے دیا۔

۲۵۶ھ / ۸۷۰ء میں المعتمد علی اللہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ ۲۵۸ھ / ۸۷۲ء میں انہوں نے اپنے بیٹے جعفر کو جو بعد میں المفوض کہلائے، یرجوخ کی جگہ مصر کا والی مقرر کر دیا۔ المعتمد نے ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء میں اپنی مملکت کو اپنے بیٹے جعفر المفوض اور اپنے بھائی احمد الموفق کے مابین تقسیم کر دیا۔ جعفر المفوض کو انہوں نے اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے مغربی صوبے ان کے حوالے کر دیے اور الموفق کو جعفر کا جانشین بناتے ہوئے مشرقی صوبوں کا والی مقرر کر دیا۔

الموفق اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے، لیکن انہیں جابجا شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مشرقی علاقوں میں خود مختاری کی تحریکیں چل نکلی تھیں۔ ادھر جنوب میں دریائے فرات کی زیریں وادی میں حبشی غلاموں نے بغاوت کر دی تھی۔ چنانچہ الموفق انہی معاملات میں الجھے رہے۔ جب الموفق نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ابن طولون سے ملنے والی امداد پر نظر ڈالی تو وہ انہیں ناکافی محسوس ہوئی۔ انہوں نے موسیٰ بن بغا کی قیادت میں ایک فوج ابن طولون کو ان کے عہدے سے ہٹانے کے لیے ۲۶۳ھ / ۸۷۷ء میں روانہ کی لیکن ابن طولون کی فوجی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ فوجی کارروائی ترک کر دی گئی۔

اب احمد بن طولون نے مناسب سمجھا کہ شام کے علاقے کو بھی اپنی قلمرو کا حصہ بنا لیں۔ چنانچہ ۲۶۴ھ / ۸۷۸ء میں انہوں نے دمشق پر بھی قبضہ کر لیا۔ دمشق کے بعد ان کی فوج شمالی جانب بڑھتی ہوئی حمص، حماہ اور حلب پر قابض ہو گئی۔ انطاکیہ بھی تسخیر ہو گیا۔ ۲۶۷ھ / ۸۸۰ء میں انہوں نے مصر اور شام دونوں ملکوں میں اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔

شام کو اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں شامل کرنے کے بعد احمد بن طولون نے اپنے ہاں رائج سونے کے سکوں پر خلیفہ اور ان کے بیٹے جعفر کے ناموں کے ساتھ ساتھ اپنا نام لکھوانا شروع کر دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احمد بن طولون ہمیشہ المعتمد علی اللہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ لیکن ۲۶۳ھ / ۸۷۷ء میں انہوں نے خلیفہ کو خراج کی ادائیگی روک دی تھی۔ اس طرح تمام رقم مصر کی ترقی پر صرف ہونے لگی۔ انہوں نے خلیفہ المعتمد کو اپنے ہاں آکر رہنے کی دعوت دی، تاہم خلیفہ کے مشیروں نے انہیں ایسا نہ کرنے دیا۔ خلیفہ کے بھتیجے الموفق نے احمد بن طولون کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ آخر الموفق نے نرم روی کا مظاہرہ کرنا چاہا اور مذاکرات کی خواہش ظاہر کی۔ احمد بن طولون بھی اس تجویز سے متفق تھے۔ لیکن مذاکرات کی نوبت آنے سے قبل ہی ۱۰ ذوالقعدہ ۲۷۰ھ / ۱۰ مئی ۸۸۴ء کو احمد بن طولون کا انتقال ہو گیا۔

احمد بن طولون کا تقریباً سولہ سال عہد مصر کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ درحقیقت مصر کی علیحدہ مملکت کی بنیاد ڈالنے کا سہرا احمد بن طولون کے سر ہے۔ ان کے عہد میں مصر نے ایسی معاشی ترقی کی جس کی مثال اس سے قبل تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔

احمد بن طولون نے جب مصر میں نائب والی کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں تو مصر سے حاصل ہونے والے خراج کی مالیت صرف آٹھ لاکھ دینار سالانہ تھی۔ احمد کے دور میں زراعت اور تجارت نے اس قدر ترقی کی کہ خراج کی مالیت ان کے عہد حکومت

Marfat.com

کے آخری ایام میں سالانہ چار کروڑ تیس لاکھ دینار ہو چکی تھی۔ یہ رقم جبر کے ذریعے حاصل نہیں کی گئی بلکہ احمد بن طولون نے مصری معیشت کے نظام میں نہایت دور اندیشی اور تدبر کے ساتھ بعض تبدیلیاں کردی تھیں۔ انہوں نے غیر ضروری محصولات (ٹیکس) منسوخ کردیے۔ تمام امرا، افسران اور اہلکاروں کی کڑی نگرانی کا نظام قائم کردیا گیا۔ اس طرح اختیارات کے ناجائز استعمال، کام چوری اور بدعنوانی کا خاتمہ ہو گیا۔

احمد بن طولون نے زراعت کے جدید طریقوں کو روشناس کروایا۔ اس نتیجے میں زیر کاشت رقبے میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ احمد بن طولون نے آبپاشی کو بہتر بنانے کی غرض سے اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے "نیلومیٹر" کی کارکردگی بڑھانے کی کامیاب کوشش کی۔ نیلومیٹر ایک آلہ تھا جس کے ذریعے دریائے نیل کی گہرائی ناپی جاتی تھی۔ یہ آلہ مصریوں کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ آب پاشی اور زراعت و تجارت سے اس کا گہرا تعلق تھا۔

احمد بن طولون نے ۲۵۸ھ تا ۲۶۱ھ / ۸۷۲ء تا ۸۷۵ء کے دوران پورے مصر کی اراضی کی پیمائش بھی کروائی۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں اشیا کی قیمتیں کم ہو گئیں اور زراعت و تجارت میں بہت اضافہ ہو گیا، چنانچہ خوشحالی ہو گئی۔ احمد بن طولون نے ملک میں پختہ کاریزیں بھی تعمیر کروائیں۔

احمد بن طولون کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مصر میں پہلا شفاخانہ قائم کیا۔ ۲۵۹ھ / ۸۷۲ء میں قائم ہونے والا یہ شفاخانہ 'بیمارستان' کہلاتا تھا۔ یہاں غربا کا علاج بالکل مفت کیا جاتا تھا۔ ایک خاص جائیداد کی آمدنی بیمارستان کے لیے وقف تھی۔ ابن طولون نے اس شفاخانے میں نہایت قابل طبیبوں کو ملازم رکھا۔ شفاخانے کے انتظامات بہت اچھے تھے۔ اس شفاخانے کے قیام پر ابن طولون نے ساٹھ ہزار دینار خرچ کیے۔ یہ شفاخانہ کئی صدیوں تک کام کرتا رہا۔ ابن طولون کے حکم کے مطابق کسی فوجی سپاہی یا غلام کو اس بیمارستان میں علاج کے لیے داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے الگ شفاخانے تھے۔ ابن طولون نے جامع ابنِ طولون کے عقب میں بھی ایک شفاخانہ قائم کیا تھا۔

احمد بن طولون نے مملکت میں انصاف کی سربلندی بھی قائم رکھی۔ انہوں نے دیوانِ انشا قائم کیا تھا جہاں وہ خود کھلی عدالت میں عوام کی شکایات سنا کرتے تھے۔ احمد بن طولون کے عہد میں غیر مسلموں سے بھی اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات انجام دینے کی پوری آزادی تھی۔

احمد بن طولون اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ان کے عہد میں نادار افراد میں خوراک مفت تقسیم کی جاتی تھی۔ اس غرض سے ایک مرکز خود جامع ابن طولون میں قائم تھا جہاں روزانہ کھانا پکتا تھا اور محتاج و مستحق افراد میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

احمد بن طولون نے غیر معمولی طور پر وسیع تعلیم پائی تھی۔ وہ علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے۔ انہوں نے مصر میں تعلیم کو عام کرنے اور علمی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ احمد بن طولون نے ۲۶۳ھ / ۸۷۶ء میں فسطاط (قاہرہ) میں جامع ابن طولون کے نام سے جو مسجد قائم کی وہ دینی تعلیم کا بہت بڑا مرکز بن گئی اور اس درس گاہ میں صدیوں تک علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی رہی۔ احمد بن طولون بہت خوش الحانی کے ساتھ کلام پاک کی قرأت کرتے تھے۔ ان کی میٹھی آواز کی مؤرخین نے تعریف کی ہے۔

احمد بن طولون کے عہد میں بھی سرزمینِ مصر میں بڑی قابل ہستیاں موجود تھیں۔ ان میں امام شافعیؒ کے شاگرد المزنی (وفات: ۲۶۴ھ / ۸۷۷ء) نے بہت شہرت پائی۔ ان کی کتاب "المختصر من علم الامام النفیس محمد بن ادریس" فقہ شافعیہ کی معتبر اور اوّلین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مؤرخین میں ابوالقاسم عبدالرحمان بن عبداللہ بن عبدالحکم (وفات: ۲۵۷ھ / ۸۷۱ء) قابلِ ذکر ہیں، جن کی کتاب "فتوح مصر و المغرب" مصر کے ابتدائی اسلامی عہد کی تاریخ کا قیمتی ماخذ ہے۔

شعر و ادب کے میدان میں ابو جعفر احمد بن یوسف بن دایہ المصری بہت بڑے ادیب اور انشاپرداز تھے۔ ان کی کتاب "کتاب المکافات وحسن العقبیٰ" جزا و سزا کی چھوٹی چھوٹی حکایتوں پر مشتمل ہے، جن کا مقصد پند و نصائح ہے۔ ان کی دوسری کتاب "سیرت احمد بن طولون" ہے۔ دونوں کتابوں کا انداز بیاں سادہ اور دلکش ہے۔ لغت نویسوں میں ابن ولّاد (وفات: ۳۳۲ھ / ۹۴۴ء) مشہور ہیں، جنہوں نے کتاب "المقصور والممدود" مرتب کی۔

احمد بن طولون کی فوج بہت مثالی تھی۔ اس طاقت ور فوج کا بیشتر عملہ ترک، یونانی اور سوڈانی غلاموں پر مشتمل تھا۔ مقامی فوجیوں

Marfat.com

کو شامل کر کے فوج کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ فوج میں نظم و ضبط قائم رکھنے پر بے انتہا زور دیا جاتا تھا۔ ہر پلٹن پر ایک کوتوال مقرر تھا۔ ۲۶۴ھ / ۸۷۷ء میں فوج میں نہ صرف جدید رضاکار فوج کا اضافہ ہو گیا بلکہ سابق ترک والیان کی نجی فوجیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔

احمد بن طولون نے نہ صرف بڑی فوج کو وسعت اور استحکام دیا بلکہ بحری بیڑے کو بھی مضبوط کرنے پر توجہ دی۔ انہوں نے جگہ جگہ بحری اڈے اور مراکز بنائے۔ شام کے ساحلی شہر عکّہ میں بھی انہوں نے ایک زبردست بحری مرکز قائم کیا۔ اس مقام پر انہوں نے بہت مضبوط سنگی پشتے تعمیر کر دیے۔ یہ پشتے مشہور جغرافیہ داں المقدسی کے دادا کی نگرانی میں تعمیر کیے گئے تھے جنہیں بیت المقدس سے بلایا گیا تھا۔

احمد بن طولون کے ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ عکّہ کی بندرگاہ بعد کے دور میں فاطمی حکمرانوں کی بحری قوت کا ایک اہم مرکز ثابت ہوئی۔ احمد بن طولون کے جانشینوں نے بحری بیڑے کو قائم رکھا۔ ابن طولون نے عکّہ کی دہری فصیل اس قدر مضبوط بنوائی تھی کہ تین سو سال بعد صلیبی مہموں کے سلسلے میں عکّہ پر قبضہ کرنے کی جو کوششیں کی گئیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء میں نپولین نے اس شہر پر توپوں سے گولہ باری کی لیکن عکّہ تسخیر نہ کیا جا سکا۔

دریائے نیل میں ایک جزیرہ "جزیرہ المصر" یا محض "الجزیرہ" کے نام سے موجود تھا۔ ابن طولون پہلے حکمراں تھے جنہوں نے اس جزیرے پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کروایا۔ یہ جزیرہ فوجی لحاظ سے اہم تھا اور دریائے نیل کو عبور کرنے کے مقام کی حفاظت کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ ابن طولون نے پورے جزیرے کو ایک مستحکم قلعہ کی شکل دے دی لیکن جب دریائے نیل میں شدید طغیانی آئی تو یہ قلعہ آہستہ آہستہ دریا کی تند و تیز موجوں کی نذر ہو گیا۔

احمد بن طولون نے فن تعمیر کے میدان میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ان کا سب سے بڑا شاہکار جامع ابن طولون ہے۔ اس شاندار مسجد کا احوال علیحدہ دیا گیا ہے۔ احمد بن طولون نے فسطاط (قاہرہ) میں بڑی تعداد میں عالی شان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ فسطاط کے مقابل ایک علاقہ "العسکر" کہلاتا تھا جو عباسی حکمرانوں کا مستقر تھا۔ "العسکر" میں بڑی بڑی عمارتیں اور منڈیاں تعمیر ہوئیں تو العسکر اور فسطاط مل کر ایک ہی بڑے شہر کی شکل اختیار کر گئے۔ احمد بن طولون نے زیادہ عمارتیں جس علاقے میں تعمیر کروائیں وہ العسکر ہی کا علاقہ تھا لیکن "العسکر" کا نام متروک ہونے لگا تھا اور اس کی بجائے اس علاقے کو "القطائع" کہا جانے لگا۔

القطائع بہت وسیع و عریض شہر تھا۔ یہاں متعدد قلعے اور قابل دید عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ یہ تمام عمارتیں جامع ابن طولون کے اطراف دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مؤرخین نے ان میں چوک رمیلہ اور زین العابدین کا ذکر کیا ہے۔

شہر میں چوگان کا بہت بڑا میدان تھا جہاں فوجی مشقیں بھی ہوتی تھیں۔ ان مشقوں اور فوجی نظاروں کو عام افراد بھی دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ یہاں مختلف اقسام کے کھیل بھی ہوتے تھے جن میں عوام بھی شرکت کرتے تھے۔ احمد بن طولون مختلف مواقع پر بڑے بڑے میلوں کا اہتمام بھی کرواتے تھے۔

القطائع میں بہت عمدہ قصر بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ قصر کے اطراف کی زمین مختلف قطعوں میں تقسیم کر دی گئی تھی، اسی وجہ سے شہر کو القطائع کہا جانے لگا تھا۔ یہ قطعے سرکاری حکام اور سپاہیوں کے درمیان تقسیم کیے گئے تھے۔ شہر میں ایک وسیع باغ کے وسط میں ایسی عمارت بنائی گئی تھی جہاں سے پورے شہر کا طائرانہ نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ عمارت اتنی بلند تھی کہ یہاں سے دور دور کے جزائر اور اہرام مصر بھی نظر آتے تھے۔ شہر "القطائع" اپنے محلات، مساجد، بازاروں اور حماموں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ابن طولون کی اپنی رہائش گاہ ایک پہاڑی پر واقع تھی۔

احمد بن طولون نے جامع ابن طولون کے جنوب میں ایک عمارت دارالامارہ تعمیر کروائی تھی۔ تمام سیاسی گفت و شنید اور امور مملکت سے متعلق معاملات پر دارالامارہ میں غور ہوتا تھا۔

احمد بن طولون کے بعد ان کے بیٹے خمارویہ حکمراں بنے۔ انہوں نے بارہ سال تک بہت عمدگی سے حکومت کی۔ احمد بن طولون نے مصر و شام میں جس مضبوط حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں عباسی خلیفہ المعتمد کی تخت نشینی کے بعد خمارویہ اور خلیفہ المعتمد کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے مطابق مصر، شام، کیلیکیا اور عراق (سوائے موصل) کا پورا علاقہ خمارویہ اور ان کے ورثا کو تیس برس کے لیے دے دیا گیا۔ اس کے بدلے خمارویہ نے تین لاکھ دینار سالانہ خراج دینا منظور کر لیا۔ اس سے قبل احمد بن طولون اتنی رقم صرف مصر کے عوض ادا کیا کرتے تھے۔

Marfat.com

یہ ضرور ہے کہ احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کے بعد حکومت جن ہاتھوں میں آئی وہ اس مملکت کو سنبھال نہ سکے۔ خمارویہ کے بعد بننے والے حکمران ہارون کم عمر تھے۔ ربیع الاول ۲۹۲ھ / جنوری ۹۰۵ء میں عباسی فوج نے فسطاط پر قبضہ کر لیا۔ القطائع کے شاندار شہر کو مسمار کر دیا گیا اور طولون خاندان کے افراد کو زنداں میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح اس خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا جس نے مصر کو الگ تشخص دینے اور اسے سیاسی و معاشی اعتبار سے بے حد ترقی دینے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

مصر و شام پر طولونی حکمرانوں کا عہد گو کہ محض ۳۷ برس پر محیط ہے لیکن اس خاندان کے پہلے حکمران احمد بن طولون نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس مختصر عہد کو بے حد یادگار بنا دیا ہے۔ ان کی اصلاحات کی بدولت فسطاط (قاہرہ) اور اطراف کے علاقوں نے زبردست ترقی کی اور ان کی قائم کردہ مستحکم اور طاقتور حکومت ہی کا اعجاز تھا کہ یہ علاقے مزید کئی صدیوں تک خوشحال رہے۔

جامع ابنِ طولون

مصر و شام کے حکمران احمد بن طولون (۲۵۴ھ تا ۲۷۰ھ / ۸۶۸ء تا ۸۸۴ء) کا ایک بڑا کارنامہ جامع ابنِ طولون کی تعمیر ہے۔ انہوں نے یوں تو دیگر کئی شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں لیکن ان میں سے کوئی عمارت اب باقی نہیں ہے۔ حملہ آوروں کی کارروائی یا امتدادِ زمانہ سے اب ان کے آثار موجود نہیں ہیں، البتہ جامع ابنِ طولون کے آثار گیارہ سو برس سے سلامت ہیں اور زبانِ حال سے عہدِ رفتہ کی داستان سنا رہے ہیں۔

یہ عظیم مسجد احمد ابنِ طولون نے ۲۶۳ھ / ۷۷-۸۷۶ء میں مصر کے شہر فسطاط (قاہرہ) میں تعمیر کروائی۔ مسجد کی تعمیر جبل یشکر کی ایک باہر کو نکلی ہوئی چٹان پر کی گئی۔ ایک لاکھ بیس ہزار دینار کے صرفے سے تعمیر کی جانے والی یہ مسجد فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور اس کے ذریعے اس دور کے طرزِ تعمیر کی بابت بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مسجد میں ۹۲ مربع میٹر کا صحن بنا دیا گیا تھا جس کے گرد بڑے کمرے تھے۔ قبلے کی طرف دالانوں کی چھت پانچ صفوں کے اور دیگر کی دو صفوں کے مساوی تھی۔ مسجد کا احاطہ ایک مستطیل (۱۲۲ء۲۶ x ۱۴۰ء۳۳ میٹر) بناتا تھا۔ اس کے گرد ایک اور بڑا احاطہ بنایا گیا تھا جسے "زیادہ" کہتے تھے۔ اس احاطے کی جنوب مشرقی سمت عمارت "دارالامارہ" تھی۔ بیرونی احاطہ اندرونی احاطے سے ۱۹ میٹر کا عرض چھوڑ کر بنایا گیا تھا اور پورا احاطہ بہت بڑے مربع کی شکل کا تھا۔ یہ احاطہ سرخ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ان پر بہت سخت گچ سے استرکاری کی گئی تھی جن پر آرائشی نقوش کندہ کیے گئے تھے۔ لکڑی کا استعمال ستونوں کی چوٹیوں کے سوا نہیں کیا گیا۔ مسجد کی دیواروں، ستونوں اور چھت پر کوفی رسم الخط میں قرآنی آیات بہت نفاست سے کندہ کی گئی تھیں۔

مسجد کے سامنے کا حصہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ بالائی حصے میں ۱۳۱ دریچے تھے جن کی اونچائی ۵ میٹر تک تھی۔ زیریں حصے میں سات مستطیل دروازے بنائے گئے۔ دیواروں کی بلندی چھت تک ۱۰ میٹر (تقریباً ۳۳ فٹ) رکھی گئی، جس کے اوپر مربعوں کے اندر تراشے ہوئے دائروں کی ایک قطار بنائی گئی۔ منفرد طرز کے کھلے ہوئے کنگورے تعمیر کیے گئے۔ اس طرح مکمل بلندی ۱۳ میٹر (تقریباً چالیس فٹ) ہو جاتی ہے۔

صحن کے چھت والے حصے میں پانچ محرابی دالان بنائے گئے۔ محرابوں کو آرائش پٹیوں سے مزین کیا گیا۔ وسطی پٹی کوئی نہ کوئی ہندسی (جیومیٹریکل) چوکھٹا بناتی ہے۔ ۴۷ سینٹی میٹر عرض کا ایک مسلسل آرائشی حاشیہ محرابوں کے دونوں رخ کے گرد چلا جاتا ہے۔ جس جگہ محرابوں کے گرد یہ آرائشی حاشیہ گزرا ہے، اس کے اوپر ہی گچ (مخصوص مسالا) نقش و نگار کی ایک گوٹ ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ اس سے تقریباً بیس سینٹی میٹر اوپر خطِ کوفی میں لکڑی پر کندہ کیا ہوا کتبہ (اس کا خاصا حصہ سلامت ہے) چھت کے شہتیروں سے کوئی تیس سینٹی میٹر نیچے چلا گیا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ اس آرائشی گوٹ کی مجموعی لمبائی دو کلو میٹر طویل ہو گی اور اس پر قرآنِ مجید کی ایک منزل (یعنی قرآن پاک کا ساتواں حصہ) آ گئی ہو گی۔

محرابی دریچوں پر سلطی ستارے کا نفیس کام نظر آتا ہے۔ یہ اس مسجد کی ممتاز خصوصیت ہے۔ دریچوں کی تعداد ۱۲۸ ہے۔ کھڑکی کی جھلملیوں میں سے صرف تین یا چار سلامت ہیں۔ یہ زیادہ تر دائروں کے باہم ملنے سے بننے والی اشکال پر مشتمل ہیں۔

محرابِ مسجد کے سامنے چوبی گنبد تعمیر کیا گیا اور ایک پیچ دار مینار بھی جو سامرا کے مینار ملویہ سے بہت مشابہ ہے۔ تاہم مسجد ابنِ طولون کا خاکہ مسجد سامرا سے بالکل مختلف ہے، البتہ اس کی آرائش سامرا سے

Marfat.com

ماخوذ ہے۔ ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ طرزِ تعمیر کے لحاظ سے جامع ابنِ طولون مصر میں ایک نئے طرز کی نمائندہ ہے کیونکہ یہ طرزِ تعمیر عراق سے وابستہ ہے۔ ابنِ طولون نے چونکہ اپنے بچپن اور جوانی کا خاصہ حصہ سامرا میں گزارا تھا اس لیے یہ بات فطری ہے کہ وہ عراقی طرزِ تعمیر سے متاثر ہوں گے۔

جامع ابنِ طولون میں سمائی اور ابادانی طرز کی چٹائیاں بچھائی گئی تھیں۔ اس مسجد میں روشنی کا بہت اچھا انتظام تھا اور سیکڑوں قندیلیں زنجیروں کی مدد سے آویزاں کی گئی تھیں۔

احمد ابنِ طولون نے اس مسجد کے اخراجات کے لیے متعدد املاک کو وقف کر دیا تھا۔ مسجد کے امام اور موذنوں کو بھاری مشاہرے دیے جاتے تھے۔ جامع ابنِ طولون گویا شہر کی تمام سیاسی، تہذیبی و تجارتی سرگرمیوں کا مرکز و محور تھی۔ مسجد کے ایک حصے میں روزانہ بڑے پیمانے پر کھانا پکتا تھا جو محتاجوں اور مساکین کو بلامعاوضہ فراہم کیا جاتا تھا۔ مسجد کے اطراف کا علاقہ بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا جہاں قسم قسم کی شاندار دکانیں تھیں اور ہر طرح کے پیشوں سے متعلق افراد ان دکانوں میں کام کرتے تھے۔

***

Marfat.com

عبدالرحمٰن الناصر

ان کا پچاس سالہ دورِ حکومت اندلس کی اسلامی تاریخ کا تابناک باب ہے

کتنے عرصے سے پانی کی ایک بوند بھی نہ برسی تھی۔

وہی قرطبہ، جہاں میلوں دور تک ہریالی نظر آتی تھی، درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جاتی تھیں، چپے چپے پر خوشحالی اور شادمانی کا راج تھا اور انواع و اقسام کے میووں سے بازار سجے دکھائی دیتے تھے، آج وہی قرطبہ قحط کے ہولناک عفریت کے ہاتھوں بے حال تھا۔ فصلیں اجڑ چکی تھیں۔ درخت سوکھ گئے تھے۔ غلہ ناپید ہو چکا تھا اور عوام فاقوں سے بے چین تھے۔

یہ صورت حال دیکھتے ہوئے حکمرانِ وقت کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ مسجدِ قرطبہ کے قریب میدان میں فلاں وقت نمازِ استسقاء ادا کی جائے گی۔ مقررہ وقت پر ایک جم غفیر میدان میں جمع ہو گیا۔ لوگ حسرت بھری نظروں سے اس نیلگوں آسمان کو بار بار تکتے تھے جس پر دور دور تک ابر کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی کہ شاید رحمتِ خداوندی جوش میں آجائے۔

نماز کی امامت کے لیے قاضی منذر بن سعید تشریف لے آئے تھے۔ اسی وقت ہجوم میں سے میانہ قد اور سرخ سپید رنگت والا ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے خدوخال نہایت دلکش تھے، اس کی نیلی چمکدار آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ اس کے بدن پر بہت معمولی لباس تھا اور ڈاڑھی خاک آلود تھی۔ یہی حکمرانِ وقت تھے۔ انہوں نے دوسروں کے ساتھ نماز ادا کی اور تمام لوگوں نے نہایت خشوع و خضوع سے گڑگڑا کر اپنے رب سے دعائیں مانگیں۔ حکمرانِ وقت پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ وہ عاجزی اور فروتنی کی تصویر بنے اپنے مالک سے التجا کر رہے تھے کہ ہمارے گناہ معاف کر دیجیے اور اس خطۂ ارض پر ابرِ رحمت برسا دیجیے۔

ابھی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک سمت سے کالی گھٹا اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف چھا گئی اور چند لمحوں میں موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

قرطبہ کے باشندے اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے، خوشی سے سرشار اپنے اپنے گھروں کی سمت رواں تھے اور ابرِ رحمت کھل کر ان پر برس رہا تھا۔ حکمرانِ وقت بھی آنکھوں میں تشکر کے آنسو لیے اپنے رفیقوں کے ساتھ گامزن تھے۔

یہ تھے اندلس کے آٹھویں اموی حکمران عبدالرحمٰن بن محمد جن کا پچاس سالہ دورِ حکومت اندلس کی اسلامی تاریخ کا سب سے درخشاں باب ہے۔ وہ اندلس کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے خلافت کا منصب سنبھالا۔

عبدالرحمٰن بن محمد کو عبدالرحمٰن ثالث کہا جاتا ہے کیونکہ ان سے قبل اندلس میں عبدالرحمٰن نام کے دو دیگر حکمران گزر چکے ہیں۔ ان میں پہلے حکمران عبدالرحمٰن الداخل تھے، جبکہ دوسرے حکمران عبدالرحمٰن الاوسط کے نام سے مشہور ہیں۔ عبدالرحمٰن ثالث، عبدالرحمٰن الناصر کے لقب سے بھی معروف ہیں۔ انہوں نے اندلس پر نصف صدی یعنی پچاس سال حکومت کی اور تاریخ داں اس بات پر متفق ہیں کہ اندلس کی تاریخ کا کوئی عہد اتنا درخشاں اور شاندار نہیں تھا جتنا عبدالرحمٰن الناصر کا دور تھا۔ وہ عبدالرحمٰن اعظم بھی کہلاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن الناصر نے جب اندلس کی عنانِ اقتدار سنبھالی تو ان کی عمر صرف ۲۳ برس تھی۔ اس کم عمری میں بھی انہوں نے بہت سے علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی تھی اور اپنے بلند اوصاف کی وجہ سے ایک خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ نہایت شیریں کلام اور ملنسار

Marfat.com

تھے اور ہر ایک ان سے مل کر خوشی محسوس کرتا تھا۔

تیسری صدی ہجری کے آخری دو عشروں میں اندلس پر امیر عبداللہ کی حکمرانی تھی۔ امیر عبداللہ، عبدالرحمٰن بن محمد کے دادا تھے۔ انہوں نے اپنے پوتے میں چھپے ہوئے جوہر قابل کو دیکھ لیا تھا، چنانچہ عبدالرحمٰن پر وہ غیر معمولی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن سے ان کی انسیت کا سبب یہ بھی تھا کہ عبدالرحمٰن بہت چھوٹی عمر میں جبکہ وہ ابھی دودھ پیتے بچے تھے، اپنے والد کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ عبدالرحمٰن کو اعلیٰ تعلیم دلوانے اور لڑائی کے جملہ فنون کی تربیت فراہم کرنے میں ان کے دادا امیر عبداللہ نے خصوصی دلچسپی لی۔ عبدالرحمٰن بھی دادا کی توقعات پر پورے اترے۔ انہوں نے بہت جلد اپنی لیاقت اور شاندار صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ عبدالرحمٰن ابھی سترہ برس کے ہوئے تھے کہ ان کے دادا امیر عبداللہ نے انہیں مختلف ذمہ داریاں دینا شروع کر دیں۔

چوتھی صدی ہجری کے آغاز کو ابھی صرف دو ماہ گزرے تھے کہ امیر عبداللہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۲۹ صفر ۳۰۰ھ / ۱۵ اکتوبر ۹۱۲ء کو امیر عبداللہ کے انتقال کے بعد ان کے جواں سال پوتے عبدالرحمٰن بن محمد نے زمام حکومت سنبھالی۔ عبدالرحمٰن بن محمد اپنی بلند سیرت اور اعلیٰ خوبیوں کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے، چنانچہ ان کے حکمراں بننے کا ہر خاص وعام نے خیر مقدم کیا۔

یہ وہ دور تھا جب اندلس میں مسلمانوں کی طاقت منقسم ہو رہی تھی۔ مختلف علاقوں میں بغاوتیں سر ابھار رہی تھیں اور حکومت عدم استحکام کا شکار تھی۔ عبدالرحمٰن نے حکمراں بنتے ہی بغاوتوں کا قلع قمع کرنے اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے خصوصی اقدامات کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے جنوبی اندلس کی جانب توجہ دی، جہاں ایک شخص عمر بن حفصون بہت سرگرم تھا۔ امیر عبداللہ کے انتقال کو ابھی مشکل سے دو ڈھائی ماہ گزرے ہوں گے کہ ۱۸ جمادی الاول ۳۰۰ھ / ۳۱ دسمبر ۹۱۲ء کو عبدالرحمٰن نے اپنے ایک نائب بدر کی قیادت میں ایک فوج استجہ بھیجی، جس نے شہر فتح کر لیا۔ چند ماہ بعد انہوں نے جیان، شنت لیون اور فنتیانہ کو تسخیر کیا۔ اس کے بعد قلعہ شبلیس فتح ہوا۔ پھر اسلامی لشکر نے شلوبیہ، شنت اشتیبان اور بنو قراطہ کا رخ کیا، جہاں ڈاکو سرگرم تھے۔ یہ ڈاکو البیرہ اور غرناطہ کے شہریوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ عبدالرحمٰن نے تین ماہ تک فوج کشی اور محاصروں کا سلسلہ جاری رکھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ علاقے رہزنوں اور لٹیروں سے بالکل پاک ہو گئے۔

اس اثنا میں شمالی عیسائی ریاستوں مثلاً لیون، قشتالیہ، گوتھک مارچ وغیرہ کی جانب بھی توجہ دی گئی جو اندلس کی حکومت کے ساتھ چھیڑ خانی کرتی رہتی تھیں۔

نبرہ (نوار) میں شانجہ حکمراں تھا۔ لیون میں اردون دوم کی حکومت تھی۔ اس نے ماردہ اور مسلمانوں کے دیگر علاقوں پر حملہ کیا اور الحنش کے قلعہ پر چڑھائی کر دی۔ عبدالرحمٰن نے محرم ۳۰۴ھ / جولائی ۹۱۶ء میں ایک فوج ابن ابی عبدہ کی قیادت میں بھیجی جس نے اردون کی چار گنا بڑی فوج کو شکست دی۔ اردون نے انتقام کے طور پر دریائے تاجہ کے کنارے لوٹ مار شروع کر دی۔ کئی لڑائیوں کے بعد عبدالرحمٰن نے محرم ۳۰۸ھ میں ایک لاکھ فوج جمع کی اور قرطبہ سے روانہ ہو گئے۔ لشکر اسلام شنت اشتیبان، قلعہ القبیلہ، قلعہ قلنہ سے ہوتا ہوا دریائے ایبرو کے پار اترا تو شانجہ نے حملہ کر دیا لیکن شکست اس کے نصیب میں تھی۔ اس نے اردون ثانی سے مدد مانگی۔ مدد تو اسے مل گئی لیکن اسلامی لشکر نے وادی قصب میں پہنچ کر عیسائی فوج پر حملہ کر دیا۔ زبردست جانی نقصان پہنچایا اور نبرہ پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

سنہ ۳۱۰ھ میں بنبلونہ (پمپلونہ) کے بادشاہ اور اردون نے پھر مسلمانوں کے شہروں پر حملے شروع کر دیے۔ ۳۱۲ھ میں عبدالرحمٰن پھر فوج لے کر روانہ ہوئے۔ بنبلونہ پہنچے تو شہر والے خوف کے مارے بھاگ چکے تھے۔ اسی اثنا میں عبدالرحمٰن دویرہ، حصن وشہ، غرماج، قلونیہ کے قلعوں کا سلسلہ فتح کر چکے تھے۔

۳۱۶ھ میں عبدالرحمٰن نے مشرق میں اوریولہ اور مغرب میں لبلہ فتح کیا۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے الناصر الدین اللہ کا لقب اختیار کیا اور خلافت کا منصب سنبھالا۔ اس کے بعد ماردہ، جاجہ اور بطلیوس تسخیر ہوئے۔ اب صرف طلیطلہ باقی رہ گیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی فوج نے شہر کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دو سال تک جاری رہا۔ اسی دوران عبدالرحمٰن نے قریبی پہاڑی پر ایک نیا شہر تعمیر کیا جس کا نام "الفتح" رکھا گیا۔

دو سال بعد طلیطلہ بھی فتح ہو چکا تھا۔ ۳۲۷ھ / ۹۳۹ء میں لیون کے بادشاہ رامیر ثانی کی فوج اور اسلامی فوج کے درمیان شنت مانکش کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی۔ مسلمان فوج بڑی بہادری سے لڑی لیکن اسے پسپا ہونا پڑا۔ تاہم کچھ ہی عرصے بعد عبدالرحمٰن نے زبردست

Marfat.com

حکمتِ عملی اور تدبر سے کام لیتے ہوئے ایسی کارروائی کی کہ اندلس کی اسلامی مملکت دشمنوں سے بالکل محفوظ ہو گئی۔ عبدالرحمٰن نے افریقہ میں سبتہ اور طنجہ کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا اور موجودہ مراکش و الجزائر کے علاقے بھی ان کے مطیع ہو چکے تھے۔

عبدالرحمٰن الناصر کی فراست اور حکمرانی کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت اندلس کے مسلمان ایک بار پھر ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ ان کی طاقت مجتمع ہو گئی اور پورا ملک استحکام اور خوشحالی کی تصویر بن گیا۔ مسلمانوں کی اس غیر معمولی وحدت اور قوت کو دیکھتے ہوئے غیر مسلم اقوام خوف کھانے لگیں، چنانچہ اطراف کی ریاستوں سے خیر سگالی کے طور پر سفارتی وفود کی قرطبہ آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں ۳۳۶ھ / ۹۴۷ء میں شاہ قسطنطنیہ کی جانب سے بھیجی گئی سفارت اہم ہے۔ قیصر کے ایلچی قیمتی تحائف لے کر عبدالرحمٰن الناصر کے پاس پہنچے۔ عبدالرحمٰن نے بھی ان سفرا کا شاندار خیر مقدم کیا۔ یہ سفیر قرطبہ کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان اس قدر ترقی کر چکے ہیں۔ قرطبہ کے گلی کوچے، بازار اور محلے کسی دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جرمنی کے بادشاہ، مشرقی فرانس کے شاہ ردفہ، صقالیہ (اٹلی)، سلاونیزا کے حکمرانوں کی طرف سے بھی سفارتی وفود آئے، جنہوں نے عبدالرحمٰن الناصر کو اپنی اپنی حکومتوں کی جانب سے دوستی کا یقین دلایا۔

عبدالرحمٰن الناصر کے عہد میں اندلس کی رعایا بہت خوشحال تھی۔ مملکت کے ایسے دور دراز علاقوں تک میں جہاں پہنچنا دشوار تھا، ہر مذہب کے افراد کی جانیں و مال محفوظ تھا۔ مسافروں کی حفاظت کے لیے ہر تھوڑے فاصلے پر چوکیاں قائم کی گئی تھیں جن پر سپاہی دن رات پہرہ دیتے تھے۔ نگرانی کے لیے بے شمار برج بنائے گئے تھے جنہیں اہلِ اسپین آج بھی "عرب اثالیہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ برج ساحل پر بھی بنے ہوئے تھے اور ان کے ذریعے دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع فوری طور پر مل جاتی تھی۔

ملک اور رعایا کی حالت اور حکام کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کی غرض سے ہر شہر میں افسر ڈاک مقرر تھے جن کی ذمہ داری ڈاک کے انتظام کی نگرانی بھی تھی اور وہ شہر کی صورت حال، عوام کی شکایات اور حکام کے طرزِ عمل سے بھی حکومت کو باخبر رکھتے تھے۔ عبدالرحمٰن نہایت لائق، عادل اور ہمدرد حکمران تھے۔ ان کے زمانے میں حکومت کی آمدنی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ دینار سالانہ تھی۔ اس رقم کا ایک تہائی حصہ فوج اور دفاعی ضروریات پر خرچ کیا جاتا تھا۔ باقی رقم مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جاتی تھی۔ عبدالرحمٰن نے حکمراں بنتے ہی بہت سے محاصل (ٹیکس) معاف کر دیے تھے۔ اس اقدام کی وجہ سے بھی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ قرطبہ میں یتیموں کی پرورش کے سیکڑوں سرکاری ادارے تھے۔ یہ بچے مملکت کے فرمانروا کے بچے تصور کیے جاتے تھے۔ محتاجوں اور معذوروں کی امداد کے لیے بھی سرکاری ادارے ہر جگہ قائم کیے گئے تھے۔

عبدالرحمٰن کے عدل و انصاف کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار ان کے لڑکے نے بغاوت کی لیکن گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ دوسرے بیٹے نے باپ سے رحم کی سفارش کی لیکن عبدالرحمٰن نے بڑے ضبط کے ساتھ جواب دیا:

"ایک باپ کی حیثیت سے تو میں اس کے مرنے پر عمر بھر آنسو بہاؤں گا لیکن میں محض باپ نہیں، حکمراں بھی ہوں۔ اگر میں باغیوں کے ساتھ رعایت کروں گا تو مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔"

عبدالرحمٰن الناصر کا دور علمی لحاظ سے بھی اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ صرف قرطبہ میں ثانوی مدارس (سیکنڈری اسکول) کی تعداد آٹھ سو تھی۔ سب سے بڑی جامعہ، جامعہ مسجد اعظم تھی۔ یہی وہ جامعہ تھی جہاں حکیم ابن رشد، ابن سعد، ادریس، ابن بشکوال، ابن طفیل، اسقوطیہ، ابن حزم، ابن زیدون، المنصور، القاسم (طیارہ کے موجد) اور ابن عمار جیسے افراد نے تعلیم پائی۔ اس جامعہ میں حدیث، فقہ، فلسفہ، منطق، ریاضی، طبیعیات، طب، قانون، فلکیات اور الٰہیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نہ صرف مسلمان طلبہ بلکہ انگلستان، فرانس، اٹلی اور جرمنی کے طلبہ بھی یہاں آ کر علم حاصل کرتے تھے۔

اندلس کے خلفا کا دربار بجائے خود بڑی علمی حیثیت کا حامل تھا، جہاں اکثر علما اور ماہرین کے مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر صوبے کے والی (گورنر) کی رہائش گاہ پر علما، فقہا، اطبا، مہندس (انجینئر)، شعرا اور محققین کی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ قرطبہ کے ایک حلقے میں ۱۷۰ تعلیم یافتہ اور پرہیزگار خوشنویس خواتین رہتی تھیں جو خطِ کوفی میں قرآن پاک کی کتابت کیا کرتی تھیں۔

مدرسوں اور درس گاہوں میں تعلیم مفت تھی۔ مستحق طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری حکومت

Marfat.com

پر تھی۔ اچھی تصنیفات پر انعامات بھی دیے جاتے تھے۔ مہندسین (انجینئروں) اور ماہرین نجوم و طب کے تجربات اور تحقیق کے لیے تجربہ گاہیں اور رصد گاہیں بنائی گئی تھیں۔ بعض سائنس دانوں کی تجربہ گاہیں بے حد شاندار تھیں۔ عوام سائنسدانوں کا زبردست احترام کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن خود بڑے عالم تھے۔ انہیں علم ہیئت اور تاریخ و فلسفے سے دلچسپی تھی۔ ان علوم کی ضخیم کتب کو انہوں نے عربی زبان میں منتقل کروایا تھا۔ ان کے پاس ہر زبان کے مترجم موجود تھے، جنہیں معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن کے کتب خانے میں دنیا بھر کی قیمتی کتابیں موجود تھیں۔

عبدالرحمٰن صاحب علم اور لائق شخصیات کو بہت پسند کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ایسی شخصیات اندلس میں آکر آباد ہوں۔ ان کے دور میں روزانہ شام کو علمی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ عیسیٰ بن اسحٰق اور خلف بن عباس، عبدالرحمٰن کے طبیب تھے۔ ان کے مکانات پر علم، طب، ہیئت اور ہندسہ کے ماہرین جمع ہوتے تھے۔ احمد بن سعید کی مجلس، فقہ، علم فصاحت و بلاغت اور شاعری کے لیے مشہور تھی۔ عبدالرحمٰن کو جو مشیر میسر تھے وہ بھی نہایت قابل اور اہل علم تھے۔ مثلاً موسیٰ بن حدیر، عبدلملک بن جہور، اسمٰعیل بن بدر وغیرہ۔ ان کے علاوہ عیسیٰ بن فطیس اپنے عہد کے بہترین انشاپرداز تھے اور منذر ابنِ سعید بلوطی علم و ادب اور خطابت ہی میں یکتا نہ تھے بلکہ قرآن و حدیث اور تصوف میں بھی گہرا فہم رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہیں عبدالرحمٰن نے قاضی مقرر کیا تھا۔ عبدالرحمٰن ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے فیصلوں کے آگے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔ منذر بن سعید، جامع مسجد زہرا کے امام بھی تھے۔ اسی دور میں ایک بڑے فقیہ ابو ابراہیم بھی تھے۔

یہ دور صنعتی اعتبار سے بھی ترقی کا دور تھا۔ عبدالرحمٰن نے آبپاشی اور آب رسانی کے نہایت جدید طریقے اختیار کیے تھے جن کی بدولت بنجر اور خشک زمینیں بھی گلزار میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ملک کے ہر حصے میں ہریالی اور سبزہ نظر آتا تھا۔ انہوں نے کاشتکاروں کو غیر معمولی سہولتیں دی تھیں۔ خصوصاً قرطبہ، غرناطہ اور مرسیہ کے مضافاتی علاقے بے حد زرخیز تھے۔ اشبیلیہ کے زیتون کے باغات کی تو دنیا بھر میں شہرت تھی۔ دریائے وادی الکبیر کی دونوں طرف، تیس میل تک پھل دار درخت تھے۔ درختوں کے ساتھ ساتھ آبادی تھی۔ پورے ملک میں نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ نہر کے ہر ٹکڑے کا انتظام ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا تھا جو اس علاقے میں آباد تھے۔ قرطبہ میں دریائے وادی الکبیر پر ایک مشہور پل تھا۔ اس عظیم الشان پل کی ۱۸ محرابیں تھیں اور یہ شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان آمدورفت کا ذریعہ تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس پل کی ضروری مرمت کروائی۔ انہوں نے سکے ڈھالنے کے لیے دارالضرب (ٹکسال) بھی قائم کیا۔

تجارت کی کثرت کا یہ حال تھا کہ بندرگاہوں پر جہازوں کو لنگرانداز ہونے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ اس زمانے میں دنیا کی کم ہی بندرگاہیں ایسی ہوں گی جہاں جہازوں پر اندلس کے پرچم لہراتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ اندلس میں المریہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مالقہ، بلنسیہ اور طلیطلہ میں سے ہر ایک کی آبادی لاکھوں میں تھی۔ قرطبہ کی آبادی پانچ لاکھ تھی اور یہاں ایک لاکھ بیس ہزار عالیشان مکانات تھے۔ خوشحالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر فرد کے پاس سواری موجود تھی۔ کوئی شخص بھیک مانگتا نظر نہ آتا تھا۔ بیکاری سب سے بڑا عیب سمجھی جاتی تھی اور ہر فرد کو روزگار فراہم کیا جاتا تھا۔

قرطبہ نہایت حسین شہر تھا۔ شہر کے گرد فصیل تھی جس میں سات دروازے تھے۔ ڈھائی فرسنگ (تقریباً سات میل) دور سے پائپ لائن بچھا کر شہریوں کو پانی فراہم کیا گیا تھا۔ گلی کوچوں میں روشنی کا معقول انتظام تھا۔ تمام سڑکیں پختہ تھیں۔ گرمیوں میں ہر جگہ خیمے تن جاتے تاکہ لوگ ان میں آرام کر سکیں۔ ہر سڑک کے کنارے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ شہر سے باہر سات آبادیاں تھیں، جہاں زیادہ تر سفید رنگ کے مکانات تھے۔ اس علاقے میں کئی میل تک نارنگی کے درخت تھے۔

عبدالرحمٰن الناصر نے فوجی اعتبار سے بھی اندلس کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔ باقاعدہ تربیت یافتہ فوج میں ڈیڑھ لاکھ سپاہی شامل تھے۔ ان کے علاوہ ہزاروں سپاہی ایسے تھے جو بطور جنگی قیدی یا غلام لائے گئے تھے اور پھر وہ یہیں بس گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے تو علم و ادب اور دیگر فنون میں کمال حاصل کیا اور بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔ عبدالرحمٰن نے ایک شاندار بحری بیڑا بھی تیار کیا تھا جس میں پچاس ہزار سے زائد سپاہی اور دو سو جنگی جہاز شامل تھے۔ عبدالرحمٰن نے تجارت کی غرض سے بھی ایک ہزار جہاز بنوائے تھے۔

عبدالرحمٰن الناصر کو تعمیرات سے بے حد دلچسپی تھی اور انہوں

Marfat.com

نے اس فن کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں جو تعمیرات ہوئیں انہیں آج بھی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

قرطبہ کے مغرب میں وہ قدیم محل واقع تھا جسے اندلس پر مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل قوطی بادشاہ رزریق نے بنوایا تھا۔ عبدالرحمٰن الناصر نے اس محل کو ترقی دی۔ انہوں نے قصر کے چاروں طرف نہایت حسین باغ لگوایا تھا۔ انہوں نے قرطبہ کے مغربی حصے میں بھی ایک عالیشان باغ کے لیے قرطبہ کے پہاڑوں سے ایک نہر کھدوائی تھی۔ پہاڑوں میں نہر کے منبع سے باغ تک نہر کے ساتھ ساتھ ستونوں پر نہایت خوشنما محرابیں تعمیر کی گئی تھیں اور ان میں نل لگائے گئے تھے۔ زمین کے نشیب و فراز کے مطابق ستونوں کو اونچا یا نیچا بنایا گیا تھا۔

باغ میں ایک خوبصورت حوض تعمیر کیا گیا تھا جس پر خالص سونے سے بنا ہوا شیر کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ پائپوں کے ذریعے پانی پہلے شیر کے جسم میں داخل ہوتا تھا اور پھر اس کے منہ سے نکل کر حوض میں جا گرتا تھا۔ اس شیر کی آنکھوں کی جگہ جواہرات لگائے گئے تھے جو چمکتے رہتے تھے۔ شیر کا مجسمہ اتنی مہارت سے بنایا گیا تھا کہ اس پر اصلی شیر کا گمان ہوتا تھا۔ یہ نہر، حوض اور شیر ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء میں تعمیر ہوئے تھے۔

فنِ تعمیر کے اعتبار سے عبدالرحمٰن الناصر کے دور میں جس منصوبے کو شاہکار کہا جاسکتا ہے وہ شہر مدینۃ الزہرا ہے۔ یہ ایک پُر تکلف اور عالی شان شہر تھا جسے عبدالرحمٰن نے ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں قرطبہ کے شمال کی سمت ایک وسیع میدان میں بنوانا شروع کیا تھا۔ یہ میدان ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس شہر کی تعمیر کے لیے بحیرۂ روم کے علاقوں سے کاریگر بلوائے تھے۔ یہ کاریگر مختلف قسم کے پتھروں پر کام کرنے میں ماہر تھے۔ انہیں دو ابعادی (ٹوڈائی منشنل) منبت کاری (ابھرے ہوئے نقش بنانا) میں مہارت حاصل تھی۔ اس شہر کی تعمیر پچیس برس تک جاری رہی اور الناصر کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے الحکم ثانی نے پندرہ برس تک اس میں اضافے کیے۔

مدینۃ الزہرا کی اہم ترین عمارت قصرِ شاہی تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک مجلس مونس اور دوسرا قصر الخلفا۔ مجلس مونس قصر کا مشرقی ایوان تھا۔ اس میں سبز رنگ کے پتھر کا حوض بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف شیر، ہرن، مگرمچھ، عقاب اور اژدہے وغیرہ کے سونے کے مجسمے تعمیر کیے گئے تھے اور انتظام کچھ ایسا تھا کہ ان سب جانوروں کے منہ سے پانی کی دھاریں نکل کر حوض میں گرتی تھیں۔

قصر الخلفا نہایت حسین عمارت تھی۔ اس کے بیچ میں ایک دلکش حوض تھا جو پارے سے بھرا رہتا تھا۔ ایوان کی ہر دیوار میں محرابوں والے آٹھ دروازے تھے۔ ان دروازوں کے کواڑ آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے۔ جب دھوپ اس ایوان کے اندر آتی تھی تو چھت اور دیواریں چمکنے لگتی تھیں۔ اور جب حوض میں بھرے پارے کو ہلا دیا جاتا تو پارے کے ہلنے سے سورج کی شعاعیں بجلی کی طرح پورے ایوان میں کوندنے لگتی تھیں۔ ایوان میں موجود لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا عمارت اُڑی چلی جارہی ہے اور کمرہ گردش کررہا ہے۔

مدینۃ الزہرا کی جامع مسجد بھی شان و شوکت کے اعتبار سے قصرِ شاہی سے کم نہ تھی۔ ایک طرف ۴۰ ہاتھ بلند مینار تھا۔ مسجد کا فرش سنگِ سرخ کا تھا۔ اس کا منبر نہایت خوبصورت تھا جو خاص طور پر تعمیر کروایا گیا تھا۔ مسجد تیار ہونے پر ۲۲ شعبان ۳۲۹ھ / ۲۳ جنوری ۹۴۱ء کو پہلی بار مغرب کی نماز باجماعت پڑھائی گئی۔

مدینۃ الزہرا کے جملہ انتظامات کے لیے ایک محکمہ قائم تھا۔ صرف مرد خدام کی تعداد ۱۳۷۵ تھی۔ کنیزوں اور خادماؤں کی تعداد ۶۵۰۰ تھی۔ حوضوں میں جو مچھلیاں پرورش پارہی تھیں ان کے لیے روزانہ بارہ ہزار روٹیاں ڈالی جاتی تھیں۔

اس شہر میں ایک دلچسپ چیز حیوانات کا عجائب گھر تھا۔ اس میں بڑے بڑے احاطے بنا کر جانوروں کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اسی طرح طیور خانہ تھا، جس میں سائبان قائم کر کے چاروں طرف جالیاں لگا دی گئی تھیں۔ لوگ ان جانوروں اور پرندوں کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔

مدینۃ الزہرا جس پہاڑ کے دامن میں آباد کیا گیا تھا اس کا رنگ سیاہ تھا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ بادام، انجیر اور دوسرے خوشنما درخت پہاڑ پر لگا دیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور یہ پہاڑ اتنا حسین نظر آنے لگا کہ اس کا نام جبل العروس رکھ دیا گیا۔

عبدالرحمٰن الناصر نے مساجد کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ تاریخ دان کہتے ہیں کہ ان کے دور میں قرطبہ میں مساجد کی تعداد آٹھ ہزار آٹھ سو ستر ہوگئی تھی۔ عبدالرحمٰن نے عظیم مسجد قرطبہ میں بھی تعمیراتی اضافہ کیا۔ یہ مسجد ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء میں اندلس کے پہلے اموی حکمران عبدالرحمٰن اول (عبدالرحمٰن الداخل) نے تعمیر کروائی تھی۔ اس کے بعد اس میں عبدالرحمٰن الاوسط نے اضافہ کروایا۔ پھر ان

Marfat.com

کے فرزند امیر محمد اور دیگر حکمرانوں نے اضافے کیے۔ ۲۶۷ھ/۸۸۸ء میں ایک زلزلہ آیا جس کے باعث مسجد کا مینار شہید ہو گیا۔ ۳۰۰ھ میں عبدالرحمٰن الناصر نے مملکت کی باگ ڈور سنبھالی تو انہوں نے پہلے مینار کی جگہ ایک بلند اور شاندار مینار بنوایا۔

یہ مینار ۷۲ ہاتھ (۱۰۸ فٹ) بلند تھا۔ ۵۴ ہاتھ کی بلندی پر مینار کے چاروں طرف ایک چوڑا چھجا تعمیر کیا گیا تھا۔ اس چھجے پر ستون قائم کر کے ایک بُرج بنا دیا گیا تھا۔ اس چھجے پر موذن اذان دیتے تھے۔ برج کے اوپر سیب کی شکل کے تین گولے ایک کے اوپر ایک قائم کیے گئے تھے۔ بیچ کا گولہ چاندی کا تھا اور بقیہ دو سونے کے بنے ہوئے تھے۔ ہر گولے کا محیط ساڑھے تین ہاتھ تھا، ان سے اوپر سونے کا چھ پنکھڑیوں والا سوسن کا پھول تھا۔ اور سب سے اوپر ایک نہایت حسین سونے کا انار بنایا گیا تھا۔ نئے مینار میں دو زینے تھے۔ جب یہ مینار تیار ہوا تو عبدالرحمٰن الناصر اسے دیکھنے کے لیے آئے۔ دیکھ کر بہت خوشی ظاہر کی۔ پھر جا کر مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی۔

عبدالرحمٰن الناصر نے ۲۳ برس کی عمر میں اندلس کی حکومت سنبھالی تھی۔ انہوں نے تقریباً پچاس برس نہایت خوبی کے ساتھ حکومت کی۔ ستر برس کی عمر کو پہنچنے پر انہوں نے بیشتر امور اپنے صاحبزادے الحکم کے سپرد کر دیے تھے۔ محرم ۳۵۰ھ/مارچ ۹۶۱ء میں سرد ہوا لگنے سے ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ علاج ہوا لیکن کچھ دنوں بعد پھر علیل ہو گئے۔ رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہوا تو علالت نے شدت اختیار کر لی اور اسی بابرکت مہینے کی ۲۲ تاریخ (۱۵ اکتوبر ۹۶۱ء) کو شہر قرطبہ میں اس اچھے حکمران کا انتقال ہو گیا۔

***

Marfat.com

المعز لدین اللہ

خلافت فاطمیہ کے چوتھے فرمانروا، عظیم شہر قاہرہ کے معمار

خلیفہ کی ذاتی رہائش گاہ کے لیے اشیائے خورد و نوش کی ضرورت تھی۔

خلافت چونکہ مملکت کا سب سے اعلیٰ عہدہ ہوتا ہے، اس لیے خلیفہ کی رہائش گاہ اور اس کی جملہ ضروریات کی فراہمی کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے تاکہ خلیفہ معاش کی فکر سے بے نیاز ہو کر امور مملکت پر پوری توجہ دے سکے۔

بیت المال کے افسر محمد بن حسین، ان اشیا کی فہرست بنانے کا ارادہ رکھتے تھے، جو انہیں خلیفہ اور ان کے اہل خانہ کے لیے خریدنی تھیں۔ ان میں باورچی خانے کا کچھ سامان تھا۔ نیز کچھ میوے اور دیگر اشیا شامل تھیں۔

ابھی وہ ان اشیا کی فہرست مکمل نہ کر پائے تھے کہ، خادم نے ایک خط لا کر دیا۔ خط کا انداز بتاتا تھا کہ یہ بہت اہم نوعیت کا خط ہے، جو دربار خلافت سے جاری ہوا ہے۔

محمد بن حسین نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا، یہ تحریر ان کے لیے اجنبی نہ تھی۔ خود خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے انہیں تحریر کیا تھا۔ خط کیا تھا، حکم نامہ تھا اور یہ حکم نامہ خود خلیفہ کی ذات اور ان کے اہل خانہ کے بارے میں تھا، خط میں لکھا تھا:

"اے محمد! اگر ہم آپ کو اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے میوہ جات اور باورچی خانے کی ضروریات منگوانے کا حکم دیں تو آپ یہ سامان اسی نرخ سے منگوائیں جس نرخ سے یہ عام لوگوں کو میسر ہے۔ تاجروں کو اس بات کا ہرگز علم نہ ہونا چاہیے کہ آپ، یہ سامان خلیفہ کے لیے خرید رہے ہیں، تاکہ وہ کسی قسم کی خصوصی رعایت نہ کریں۔"

یہ خط تحریر کیا تھا، المعز لدین اللہ نے جو چوتھے فاطمی خلیفہ ہیں۔

ان کو احساس تھا کہ اگر تاجروں کو اس بات کا پتا چل گیا کہ سامان خلیفہ کے لیے خریدا جا رہا ہے، تو وہ بے جا رعایت دیں گے اور یوں ایک طرف خلیفہ کو وہ رعایت میسر آئے گی جس کے وہ مستحق نہیں دوسری طرف اس طرح اشیائے صَرف کے نرخوں کے بارے میں خلیفہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں اور وہ عام انسانوں کی مشکلات سے بے خبر رہیں گے۔

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ المعز لدین اللہ، ایک نیک نفس اور خدا ترس حکمران تھے، یہی نہیں، بلکہ المعز، نہایت لائق، صاحب علم، اور اچھے منتظم بھی تھے۔ انہیں پہلی بار مصر و شام میں فاطمی خلافت قائم کرنے اور عظیم شہر قاہرہ کو آباد کرنے کا شرف حاصل ہے۔

المعز الدین اللہ کا نام معد بن اسمٰعیل المنصور، کنیت ابو تمیم اور لقب المعز لدین اللہ ہے وہ ۱۱ رمضان المبارک ۳۱۹ھ/۲۷ ستمبر ۹۳۱ء کو المہدیہ میں پیدا ہوئے۔ المہدیہ آج کل تیونس کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹا سا شہر ہے، لیکن جب المعز کے پردادا اور پہلے فاطمی خلیفہ المہدی عبید اللہ نے ۳۰۰ھ/ ۹۱۲ء میں اس شہر کو بسایا تھا تو یہ بے حد اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ مورخین کے مطابق یہ علاقے کا سب سے خوشحال شہر تھا۔

المعز نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے دادا ابو القاسم القائم باللہ شمالی افریقہ پر حکمران تھے۔ ان سے قبل المعز کے پردادا المہدی عبید اللہ نے ۲۹۷ھ/ ۹۰۹ء میں شمالی افریقہ میں خلافتِ فاطمیہ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس خلافت کو خلافتِ فاطمیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ المہدی عبید اللہ کے مطابق وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی

Marfat.com

حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے تھے۔ خلافت فاطمیہ ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصے قائم رہی اور اس دور میں علوم و فنون کو بڑی ترقی دی گئی۔ خلافت فاطمیہ کے جن حکمرانوں کا دور سب سے زیادہ تابناک رہا، ان میں سے ایک المعز لدین اللہ ہیں۔

المہدی عبید اللہ نے ۲۹۷ھ تا ۳۲۲ھ / ۹۰۹ء تا ۹۳۴ء حکومت کی۔ ان کے دور میں تیونس سے مراکش تک کا علاقہ زیر نگیں آ گیا تھا۔ ان کے ۲۵ سالہ دور میں فاطمی خلافت کو استحکام حاصل ہوا۔ ان کے بعد ابو القاسم القائم باللہ نے ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء میں زمام حکومت سنبھالی اور ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں اپنے بیٹے ابو طاہر اسمٰعیل منصور باللہ کو بارِ خلافت سونپ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اوپر کی سطور میں ذکر کیا ہے کہ جس وقت المعز نے ہوش سنبھالا تو ان کے دادا ابو القاسم القائم باللہ بقید حیات تھے اور شمالی افریقہ پر انہی کی حکمرانی تھی۔ جنگ و جدل سے بھرپور اس ماحول میں جہاں المعز کی حربی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع ملا وہیں حصولِ علم کے مواقع میسر آنے کے باعث المعز کو اپنی علمی پیاس بجھانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ انھیں مطالعے کا شوق تھا، اپنی خداداد ذہانت اور حافظے کی بدولت انہوں نے کئی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔ عربی تو مادری زبان تھی ہی، اس کے علاوہ المعز نے بربری، سوڈانی، اطالوی اور صقلی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ کئی زبانیں جاننے کی وجہ سے ان زبانوں میں میسر علوم کا مطالعہ کرنے میں بہت آسانی پیش آئی۔ مورخین کے مطابق المعز فن نحو اور لغات کے ماہر تھے۔

المعز کے والد ابو طاہر اسمٰعیل منصور باللہ ۲۸ شوال ۳۴۱ھ / ۱۸ مارچ ۹۵۳ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اسی ماہ نوجوان المعز پر بار خلافت ڈالا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۲ سال تھی، لیکن اس نوعمری میں ان کا تجربہ وسیع، عزم جواں اور حُسنِ انتظام قابل داد تھا۔ آپ میں جوہر قابل کو پرکھنے کی صلاحیت تھی چنانچہ انہوں نے جن قابلِ اعتماد اور منتظم افسران کا انتخاب کیا انہوں نے خلیفہ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی اور تقریباً ہر مہم سے فتوحات کے پھریرے لہراتے ہوئے لوٹے۔

المعز سے قبل جتنے فاطمی خلیفہ گزرے، ان کے دور میں فاطمی خلافت صرف بلادِ مغرب تک محدود رہی۔ بلادِ مغرب سے مراد بحیرۂ روم کا جنوب مغربی علاقہ ہے جس میں تیونس، مراکش، الجزائر اور لیبیا شامل ہیں۔ اس زمانے میں تیونس کا نام افریقیہ تھا۔ الجزائر کو مغرب الاوسط اور مراکش کو مغرب الاقصیٰ کہا جاتا تھا۔ المعز کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے مصر اور شام کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور سبتہ کو چھوڑ کر مغرب کے تمام شہر ان کی حکومت کا حصہ بن گئے۔

حکمران بنتے ہی المعز نے محسوس کیا کہ "اوراس" کے پہاڑی علاقے میں بنو کملان اور ملیلہ کے قبائل نے فاطمی خلافت کی اطاعت قبول نہیں کی ہے۔ خلیفہ بننے کے اگلے ہی برس یعنی ۳۴۲ھ / ۹۵۳ء میں وہ خود ایک لشکر لے کر 'اوراس' کے علاقے میں پہنچے، قبیلے والوں نے اطاعت قبول کر لی۔ المعز نے قبائل کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

۳۴۳ھ / ۹۵۴ء میں المعز کی ہدایت پر صقلیہ (سسلی) کے والی حسن بن علی نے اندلس پر حملہ کیا۔ ۳۴۷ھ / ۹۵۸ء میں المعز نے اپنے آزاد کردہ غلام جوہر صقلی کی قیادت میں ایک بڑی فوج مغرب الاقصیٰ (مراکش) کی طرف بھیجی کیونکہ انہیں یہاں چند شورشوں کی خبر ملی تھی۔ تاہرت اور سجلماسہ کسی مشکل کے بغیر تسخیر ہو گئے۔ گیارہ ماہ کے سخت محاصرے کے بعد رمضان ۳۴۸ھ میں فاس بھی فتح ہو گیا۔ صقلیہ کے جزیرے کے بعض قلعوں پر ابھی تک نصاریٰ (رومیوں) کا قبضہ تھا۔ والی صقلیہ احمد بن حسن نے ۳۵۱ھ / ۹۶۲ء میں قلعہ طرمین کو فتح کر ڈالا۔ اس قلعہ کا نام المعز کے نام پر قلعہ معزیہ رکھا گیا۔

اس کے بعد احمد بن حسن نے ۳۵۴ھ میں قلعہ رمطہ کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے اپنے بادشاہ سے مدد مانگی، اس نے بحری اور بری فوج بھیج دی۔ احمد بن حسن نے المعز کو پیغام دیا کہ کمک روانہ کی جائے۔ المعز نے اپنے صاحبزادے حسن کی قیادت میں ایک فوج بھیج دی۔ یہ فوج احمد بن حسن کی فوج سے جا ملی۔ آخر رومی فوج فرار ہونے لگی لیکن قلعے والوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ محاصرہ مزید سخت کر دیا گیا۔ دشمن کے پاس اناج کی قلت ہو گئی، تو باقی ماندہ فوج بھی فرار کی کوشش کرنے لگی۔ مسلمان فوج کے ماہر غوطہ خوروں نے دشمن کی کشتیوں میں سوراخ کر دیے۔ دشمن کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اب المعز نے مصر کی جانب توجہ کی۔ اس زمانے میں مصر گو کہ عباسی خلافت کے تحت تھا، لیکن مصر پر عباسی اقتدار خاصا کمزور ہو چکا تھا۔ ۳۳۵ھ / ۹۴۶ء میں مصر کے والی اخشید محمد کا انتقال ہوا تو ان کے نوعمر لڑکے انوجور کی رہنمائی کے لیے ایک حبشی غلام کافور کو مقرر کیا گیا۔ کافور نے مصر کا انتظام بڑی خوبی سے سنبھالا۔

Marfat.com

۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں کافور کی وفات کے بعد مصر میں قحط پڑ گیا، ساتھ ہی ایک وبا پھوٹ پڑی۔ ان حالات میں مصر کے بعض حکام نے المعز سے درخواست کی کہ وہ آکر صورتحال کو سنبھالیں۔

المعز نے یہ پیغام ملتے ہی برقہ کے عاملوں کو احکام بھیجے کہ مصر جانے والے راستے پر جابجا کنویں کھدوائیں اور سرائیں تعمیر کروائیں، تاکہ مصر کی جانب پیش قدمی کرنے والی فوج کو راستے میں تکلیف نہ ہو۔ ادھر المعز نے اپنے معتمد افسر جوہر صقلی کو حکم دیا کہ ایک بڑا لشکر تیار کریں۔ المعز خود بھی اس لشکر کی تیاری میں مشغول رہے اور ان کے کئی دن چھاؤنی میں گزرے۔ یہ فوج ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی، ایک بحری بیڑا اس کی مدد کر رہا تھا۔

جوہر کی قیادت میں یہ فوج ۱۴ ربیع الاول ۳۵۸ھ / ۵ فروری ۹۶۹ء کو روانہ ہوئی۔

۱۷ شعبان ۳۵۸ھ / ۶ جولائی ۹۶۹ء کو جوہر کی قیادت میں مسلمان لشکر فسطاط کے شہر میں داخل ہوا۔ یہ مصر کا پہلا شہر تھا، جس کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی تھی۔ اس شہر کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ نے آباد کیا تھا۔ اس دور میں یہ عالم اسلام کے خوشحال ترین شہروں میں سے تھا۔ یہاں اونچی اونچی عمارتیں تھیں اور پُررونق بازار تھے۔

جوہر کی فوج فسطاط کے شمالی علاقے میں جبل مقطم اور خلیج کے درمیان ٹھہری۔ اس زمانے میں یہ علاقہ ایک ریتیلا میدان تھا۔ جوہر نے اس مقام پر شہر قاہرہ کی بنیاد ڈالی۔ اس شہر کا نقشہ بغداد کی طرز پر تیار کیا گیا۔ ہزاروں مزدور دن رات کام کرنے لگے اور روز و شب کی محنت سے تین سال کے عرصے میں اس عظیم شہر کی تعمیر مکمل ہوئی۔ مصر میں استحکام قائم کرنے کے بعد جوہر نے اپنے سپہ سالار جعفر بن فلاح کو رملہ (شام) پر حملے کے لیے بھیجا۔ رملہ فتح کرنے کے بعد جعفر نے طبریہ کو تسخیر کیا، پھر مزید پیش قدمی کر کے ۳۵۹ھ / ۹۷۰ء میں دمشق پر حملہ کر دیا۔ لڑائی ہوئی اور دمشق پر فاطمی خلافت کا پرچم لہرانے لگا۔ یہاں خطبے میں المعز کا نام شامل کر دیا گیا۔ دمشق محرم ۳۶۰ھ / ۹۷۰ء میں فتح ہوا۔ اسی سال حلب اور حمص پر بھی فاطمی حکومت کی حکمرانی قائم ہو گئی۔

جوہر نے ۳۶۱ھ کے اواخر میں المعز کو مصر آنے کی دعوت دی۔ ۳۶۲ھ میں المعز مصر پہنچے۔ جوہر اور دیگر افسران نے زبردست خیر مقدم کیا۔ المعز نے اپنی تقریر میں کہا "اے لوگو! میں مال یا لشکر کی زیادتی کے لیے نہیں آیا ہوں، میں صرف جہاد کرنے آیا ہوں اور مسلمانوں کی مدد کرنا میرا اصل مقصد ہے۔" المعز رمضان المبارک کی ۷ تاریخ کو قاہرہ پہنچے۔ اسی تاریخ سے قاہرہ کو مملکتِ فاطمیہ کا دارالخلافہ قرار دے دیا گیا۔ قاہرہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی المعز سجدۂ شکر بجا لائے، مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس اہم موقع پر ایک ہزار قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ المعز نے مصر کی بگڑتی ہوئی سیاسی اور اقتصادی صورتحال سنبھالنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ قحط کے اثرات کو زائل کیا۔ رعایا کی شکایتیں دور کیں، ایک نئی عمارت محصولات کی وصولی کے لیے قائم کی گئی۔ اس طرح جو رقم جمع ہوئی وہ مصر کی ترقی پر صَرف کی گئی۔

سنہ ۳۴۸ھ میں المعز کو خبر ملی تھی کہ حجاز میں دو قبائل کے درمیان آویزش ہے۔ المعز نے فریقین میں مصالحت کروادی۔ دس سال بعد جب جوہر نے ۳۵۸ھ / ۹۶۹ء میں مصر فتح کیا تو حجاز میں بھی المعز کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی فاطمی خلافت قائم ہو گئی۔

سنہ ۳۶۵ھ میں المعز بیمار ہو گئے اور یہ بیماری ان کے لیے پیامِ اجل لے کر آئی۔ ۱۱ ربیع الثانی ۳۶۵ھ / ۱۸ دسمبر ۹۷۵ء کو جمعے کے روز المعز نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نزار العزیز کو خلیفہ نامزد کیا گیا۔

المعز علم دوست حکمران تھے اور علما اور صاحبان علم و فن کی قدر کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں فقہا، محدثین، شعرا اور تاریخ داں مجمع رہتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں قرآن، حدیث، فقہ، نحو، حساب، نجوم، منطق اور فلسفہ پر لاکھوں کتابیں تھیں۔ ابن الاثیر کہتے ہیں کہ المہدی عبید اللہ کو اپنے بزرگوں سے بڑی تعداد میں کتب ملی تھیں اور خیال ہے کہ کتب کا یہ بڑا ذخیرہ المعز اپنے ساتھ شمالی افریقہ سے قاہرہ لائے تھے۔

المعز کی اس علمی سرپرستی کی وجہ سے قاہرہ میں جابجا کتب خانے قائم ہو گئے تھے۔ کتابوں کی جلدیں چمڑے کی اور خوشنما اور منقش ہوتی تھیں۔ المعز اچھی کتب کی بڑی قدر کرتے تھے اور گراں قیمت دے کر انہیں خرید لیا کرتے تھے۔

ان کے دور میں مدارس اور مساجد میں تفسیر و قرأت کی تدریس کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ المعز خود بڑے صاحبِ علم حکمران تھے۔

Marfat.com

ان کے دور میں قاضی ابو حنیفہ النعمان نے تاریخ، فقہ اور علم باطن پر کئی کتابیں لکھیں۔ اور ان کی بعض تصانیف میں بڑی حد تک المعز کی شرکت کار شامل ہے۔

المعز کے دور کے علماکرام میں قاضی القضاۃ، ابو حنیفہ نعمان بن محمد نمایاں ہیں۔ انہوں نے پہلے چار فاطمی خلفا کا زمانہ دیکھا اور ۱۰۴ سال کی عمر میں ۳۶۳ھ / ۹۷۳ء میں وفات پائی۔ انہوں نے فقہ، حدیث، تاریخ اور عقائد پر ۴۴ کتب تحریر کیں۔ ابو حاتم بن حمدان الرازی نے کلام پاک اور حدیث کے اکثر الفاظ کی شرح پر مشتمل ایک اہم کتاب "کتاب الزینہ" نام سے لکھی۔ اعلام النبوۃ میں نبوت کے ثبوت میں دلائل دیے گئے ہیں۔ اس دور میں فن تاویل کے ایک ماہر جعفر بن منصور الیمین بھی تھے۔ ممتاز مؤرخ ابن زولاق مصری بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے تاریخ قضاۃ مصر اور سیرۃ المعز لکھیں۔ شعر و سخن میں ابن ہانی کو المعز کی مجلس میں نمایاں مقام حاصل تھا اور اطبا میں محمد بن سعید التمیمی نے شہرت حاصل کی۔

مؤرخین کے مطابق المعز بڑے خدا ترس اور عبادت گزار انسان تھے۔ ایک بار موسم سرما میں انہوں نے قبیلہ کتامہ کے سرکردہ افراد کو بلوایا اور ان سے کہا کہ، "اے بھائیو! تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں اپنی زندگی محض کھانے پینے میں صرف کرتا ہوں؟ ریشمی کپڑے پہنتا ہوں؟ شراب پیتا ہوں؟ جس طرح دنیا کے اور دوسرے حکمران رہتے تھے؟ میں نے سوچا کہ تم لوگوں کو بلاؤں تاکہ تم میری حالت کا مشاہدہ کر سکو کہ میں تنہائی میں کیسی زندگی گزارتا ہوں۔ میں دنیا کی صرف ضرورتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ میرا وقت مجھے ملنے والے خطوں کے جوابات دینے میں گزرتا ہے۔ یہ جوابات میں اپنے ہاتھ سے لکھتا ہوں۔ دنیا کی کوئی لذت مجھے نہیں بھاتی۔ تم بھی، اے سردارو! اپنی نجی زندگی اسی طرح بسر کرو۔ غرور اور جبر کا اظہار کبھی نہ کرو، ورنہ اللہ تم سے نعمتیں چھین کر دوسروں کو دے دے گا۔ جو لوگ تمہارے ماتحت ہیں ان پر ایسی ہی شفقت کی نظر رکھو جیسی کہ میں تم پر رکھتا ہوں۔"

المعز حد درجہ متحمل مزاج، بڑے روادار اور بردبار انسان تھے۔ انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا۔ اپنے عہد کے مشہور یہودی طبیب موسیٰ بن الغزالی اور ان کے دونوں بیٹوں اسحاق اور اسمٰعیل کو طب سے متعلق اعلیٰ عہدے دیے۔ اسی زمانے میں ایک نصرانی طبیب سعید بن بطریق بھی گزرے ہیں، انہوں نے فن طب پر کتاب لکھی۔

المعز اپنے غلاموں کے ساتھ بھی عزت کا سلوک کیا کرتے تھے۔ ایک بربری قبیلے زناتہ کے سردار محمد بن حسین بن خزر، المعز کے مخالف تھے۔ ان سے کئی جھڑپیں ہوئیں آخر ۳۵۹ھ میں وہ خود المعز کے پاس آئے اور اپنے طرزِ عمل کی معافی طلب کی۔ المعز نے انہیں معاف کر دیا اور بڑے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا، لیکن محمد بن حسین نے اسی طرح کئی بار مخالفت کی اور پھر معافی چاہی۔ المعز ہر بار معاف کرتے اور نیک سلوک کرتے رہے۔

المعز کے دور میں ایک اہم اصلاح "عدالتِ ازالۂ شکایات" کا قیام ہے۔ یہ عدالت جوہر نے قائم کی تھی۔ اس عدالت میں مملکت کے والیوں اور عہدے داروں کے خلاف شکایات کی سماعت ہوتی تھی۔ عدالت میں خود جوہر، چند وزرا، قاضی اور فقہا موجود ہوتے تھے۔ فیصلہ خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا تھا۔

جب المعز قاہرہ آئے تو انہیں اطلاع ملی کہ ان کے بعض فوجیوں نے قرافہ اور معافر کے اطراف سکونت اختیار کرلی ہے، حالانکہ انہیں شہر کے اطراف سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ شکایت ملتے ہی المعز خود اس مقام پر گئے اور ان فوجیوں کو عین الشمس کے اطراف آباد ہونے کی ہدایت کی۔ ان کے لیے نئے مکانات تعمیر کیے گئے اس طرح شہریوں کو زحمت سے نجات مل گئی۔

المعز نے اپنی قلمرو کا انتظام بہت اچھی طرح کیا۔ صوبوں کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں قابل افسران کا تقرر ہوا۔ حکومت کے مختلف شعبے ترتیب دیے گئے۔ المعز نے دیوان "الانشا و المکاتبات" پر خصوصی توجہ دی۔ اس دفتر سے سارے اہم احکام جاری کیے جاتے تھے۔ باہر سے تمام مراسلات اور خطوط اس محکمے میں آتے تھے پھر انہیں خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا تھا۔

المعز نے اپنی فوج کو بہت ترقی دی۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور میں، سرزمین مصر پر المعز کی فوج سے بڑی فوج کبھی جمع نہ ہوئی۔ فوج کا نظم و ضبط مثالی تھا۔ المعز نے اپنے بحری بیڑے کو بہت مضبوط و مستحکم بنادیا تھا۔ انہوں نے فس میں جہاز سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ فس دریائے نیل کے ساحل پر واقع ایک قصبہ ہے۔ اس کارخانے میں چھ سو جہازوں کی تعمیر و مرمت کا انتظام تھا۔

المعز کے دور میں صنعت و حرفت کو بھی بڑی ترقی دی گئی۔ پارچہ

Marfat.com

بانی کی صنعت تو قومی صنعت تھی۔ سیاح ناصر خسرو کے مطابق مصری ایسے عمدہ اور شفاف مٹی کے برتن بناتے ہیں کہ ان میں آدمی اپنا ہاتھ آرپار دیکھ سکتا ہے۔ قاہرہ میں مختلف اقسام کا ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ المعز نے اپنی مملکت کے مختلف خطوں کا نقشہ نیلے رنگ کے ریشمی کپڑے پر بنوایا تھا۔ یہ کپڑا "قرقبی تستری" کے نام سے مشہور تھا اور اس میں کئی رنگ تھے۔ اس نقشے کی مالیت بائیس ہزار دینار تھی۔ اس زمانے میں، لکڑی کی صنعت، شیشہ سازی، بلور سازی کا کام فسطاط اور اسکندریہ میں کوزہ گری، پچی کاری اور دھاتوں کا کام تینس میں ہوتا تھا، چاقو اور قینچیاں بھی بنتی تھیں۔ سرکاری کاموں کے لیے جو عمدہ کاغذ استعمال ہوتا تھا، وہ مصر میں ہی تیار ہوتا تھا۔

تعمیرات کے نقطۂ نظر سے بھی فاطمی دور نمایاں ہے۔ جامع ازہر، قصر کبیر کے علاوہ دیگر تعمیرات میں بڑی نازک نقاشی اور عمدہ پچی کاری کی جاتی تھی۔ المعز کی اہلیہ تعزیہ نے قرافہ میں سنگ مرمر کے ستونوں والی ایک نفیس مسجد تعمیر کروائی تھی۔ جامعہ ازہر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۳۵۹ھ میں تعمیر ہونے والی اس مسجد کا اینٹوں سے بنا ہوا درمیانی حصہ ابھی تک اصل حالت میں موجود ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر المعز کے آزاد کردہ غلام جوہر صقلی کا بھی تذکرہ کیا جائے۔ جوہر صقلی، جزیرہ صقلیہ (سسلی) میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں یہ جزیرہ سلطنتِ روم کا حصہ تھا۔ اس وقت خلیفہ مامون عباسی کی حکومت تھی۔ فتح کے بعد جزیرے کے اکثر باشندے مسلمان ہوگئے اور انہوں نے بہت سی مساجد تعمیر کیں۔ ۳۶۲ھ میں ابن حوقل نے اس جزیرے کی سیاحت کے بعد بتایا کہ یہاں ۳۰۰ سے زائد مساجد بنائی گئی ہیں۔

جوہر بڑے اچھے انشاپرداز، بہت لائق منتظم اور بہت باصلاحیت انسان تھے۔ المعز نے بارِ خلافت سنبھالتے ہی ۳۴۱ھ / ۹۵۳ء میں جوہر کو اپنا کاتب (سیکریٹری) بنالیا۔ یہ نہایت اہم عہدہ تھا۔ ۳۴۷ھ میں المعز نے جوہر کو بلادِ مغرب کے شہر فتح کرنے کے لیے لشکر دے کر روانہ کیا۔ بلادِ مغرب کے اکثر شہر جوہر کے ہاتھوں فتح ہوئے اور اس پورے عمل میں ایک سال سے بھی کم عرصہ لگا۔

جوہر کا اصلی کارنامہ قاہرہ کی تعمیر ہے۔ المعز کے حکم سے یہ شہر بڑی منصوبہ بندی سے تعمیر کیا گیا۔ قاہرہ کی تعمیر کا آغاز ۲۴ جمادی الآخر ۳۵۹ھ کو ہوا اور تقریباً تین سال میں شہر کی تعمیر تکمیل کو پہنچی۔ شہر کے اطراف بہت شاندار فصیل بنائی گئی، جس میں متعدد دروازے تھے۔ ان میں سے تین دروازے باب الزویلہ، باب النصر اور باب الفتوح ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود آج تک سلامت ہیں۔ فصیل کے بھی کچھ آثار ابھی تک موجود ہیں۔ شہر کے اندر بیس بڑے محل بنائے گئے تھے۔ المعز کے لیے قصر کبیر تعمیر کیا گیا۔ ایک محل، قصر صغیر کے نام سے تیار ہوا۔ دونوں قصروں کے درمیان مربع شکل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس میں دس ہزار سپاہی قواعد کر سکتے تھے۔ قصر خلافت موجودہ بازار خان خلیلی اور مشہد حسینی کے درمیان تھا۔

قاہرہ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ جوہر نے ۳۵۹ھ میں مسجد جامع الازہر کی بنیاد ڈالی۔ یہ مسجد ۳۶۱ھ میں مکمل ہوئی۔ جامع ابن طولون کے بعد یہ قاہرہ کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کی وسعت بھی بہت زیادہ ہے، اس لیے اسے جامع کبیر بھی کہتے تھے۔ اسی مسجد میں المعز کے جانشین العزیز باللہ کے حکم پر جوہر نے ایک شاندار کتب خانہ اور مدرسہ قائم کیا جو، جامعہ الازہر کہلایا۔ یہ یونیورسٹی دنیا کی قدیم ترین درس گاہ ہے۔

جوہر نے مصر کا انتظام اچھی طرح کیا۔ قحط پر قابو پانے کے لیے انہوں نے غلے کا ایک مرکزی گودام کھولا اور غلہ فروخت کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ محتسب کی نگرانی میں غلہ فروخت کریں۔ جوہر کی طبیعت میں انکسار اور اخلاص نمایاں تھا۔ مصر فتح کرنے کے بعد انہوں نے اپنے لشکر کے ساتھ جامع ابن طولون میں نماز ادا کی۔ خطیب عبدالسمیع بن عمر نے خطبہ میں جوہر کا بھی نام لیا۔ جوہر نے اسے پسند نہیں کیا اور کہا کہ امام کا نام لیا جائے۔ جوہر کا انتقال ۳۸۱ھ / ۹۹۲ء میں ہوا۔

المعز پہلے فاطمی خلیفہ ہیں جنہوں نے اپنی حکومت مصر اور شام کے علاقے میں قائم کی۔ ان کا ۲۴ سالہ دور حکومت خوشحالی اور خوش انتظامی کی درخشاں تصویر تھا۔ ان کے دور میں مملکت نے علمی اور فنی دونوں لحاظ سے نمایاں ترقی کی اور اس ترقی کے اثرات آنے والے عہد پر بھی پڑے۔

***

Marfat.com

العزیز باللہ

'جامعہ ازہر' کی بنیاد رکھنے والے فاطمی حکمران کے عہدِ زرّیں کا احوال

وہ ایک کمرے میں چھپا ہوا تھا!

چند گھنٹے پہلے تک وہ دمشق پر حکمراں تھا، لیکن خونریز جنگ ہار جانے کے بعد اب تخت و تاج اس سے چھن چکا تھا۔ موت کے بھیانک سائے اس کی نظروں کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ اس شخص کا خدشہ بے جانہ تھا۔ فاتح لشکر کے ہاتھوں اس کی گرفتاری کا واحد نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

اچانک دروازہ کھلا... کمرے میں موجود شخص نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حریف فوج کے سپاہی اسے تلاش کرتے ہوئے بالآخر اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے کمرے میں چھپے ہوئے شخص کو رسیوں میں جکڑ دیا اور اسی حالت میں اسے امیر لشکر کے روبرو لے گئے۔

امیر لشکر کا قد طویل، کندھے چوڑے، رنگت گندمی اور بال بھورے تھے۔ انہوں نے اپنی گہری نیلی سرخی مائل آنکھوں سے رسیوں میں بندھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اطراف میں موجود فوجی افسران کو یقین تھا کہ دمشق پر کچھ دیر قبل قابض اس دشمن حکمراں کا آخری وقت آپہنچا ہے اور امیر لشکر ابھی اس کے قتل کا حکم دے دیں گے، لیکن تمام لوگوں کی حیرت کی انتہانہ رہی جب انہوں نے امیر لشکر کو یہ حکم دیتے ہوئے سنا کہ اس شخص کو رہا کر دیا جائے!

امیر لشکر کے حکم پر رسیاں کھول دی گئیں۔

امیر لشکر نے اس شخص کے لیے خیمہ لگوایا، چھینا ہوا سارا مال واپس کر دیا۔ کچھ دنوں بعد فاتح لشکر دمشق سے واپس روانہ ہوا تو وہ شخص امیر لشکر کے ساتھ تھا۔ امیر لشکر جو دراصل ایک بہت بڑی مملکت کے فرمانروا تھے، اسے اپنے ساتھ قاہرہ لے گئے جہاں انہوں نے اس شخص کو اپنا حاجب (ایک اہم عہدیدار) بنایا۔ انہوں نے اس شخص کے ساتھی سپاہیوں کو بھی اپنی حکومت میں ملازمتیں دے دیں۔

کچھ عرصہ بعد اس شخص نے کسی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "امیر مملکت کے روبرو جاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، میں نے ہر طرح ان کی مخالفت کی لیکن انہوں نے مجھ سے بدلہ نہ لیا بلکہ مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔"

کسی نے امیر مملکت کو خط لکھا کہ جس شخص نے خلافت کو مٹانے کی کوشش کی آپ اس پر اتنے احسانات کرتے ہیں، امیر مملکت نے جواب دیا "میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے فتح حاصل ہوئی تو میں اس سے اچھا سلوک کروں گا، مجھ پر اپنے وعدے کی پابندی لازم ہے۔"

یہ امیر مملکت تھے، دولتِ فاطمیہ کے پانچویں حکمراں، العزیز باللہ، جن کے ۲۱ سالہ دور حکومت کو تاریخ دانوں نے فاطمیوں کے پونے تین سو سالہ دور کا عہدِ زرّیں قرار دیا ہے اور انہوں نے اپنے جس دشمن کو معاف کر کے اپنا حاجب بنالیا تھا وہ الپ تکین تھے جنہوں نے دمشق پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر العزیز کی فوج سے جنگ میں شکست کھا گئے تھے۔

العزیز باللہ کا اصل نام نزار ہے۔ ان کے والد المعز لدین اللہ بھی فاطمی خلیفہ تھے اور انہوں نے ۲۲ برس کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ انہیں فاطمی اس لیے کہا جاتا ہے کہ سلسلے کے بانی عبیداللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراؓ کی اولاد میں سے تھے۔ فاطمی سلسلے کے پونے تین سو سالہ دور میں دو ایسے خلفا ہیں جن کا عہد، علمی اور تمدنی ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے نہایت تابناک تھا۔ العزیز اس لحاظ سے اپنے والد سے سبقت لے گئے کہ ان کے دور میں

Marfat.com

پورا شام، حجاز (مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ) یمن، موصل، حلب اور شیزر فاطمی حکومت میں شامل ہو چکے تھے اور ان کی حکومت اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی۔ تیونس، مراکش، الجزائر، لیبیا (یہ علاقہ اس زمانے میں بلادِ مغرب کہلاتا تھا۔) صقلیہ (سسلی)، مصر، شام، یمن اس وسیع و عریض حکومت میں شامل تھے۔

العزیز باللہ کے والد المعز لدین اللہ کے دور میں، ۳۶۰ھ / ۹۷۱ء میں دمشق فتح ہو گیا تھا لیکن ۳۶۴ھ / ۹۷۴ء میں ایک ترک سردار الپ تکین نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ الپ تکین، آل بویہ کے حکمران معزالدولہ کے غلام تھے۔ معزالدولہ مشہور حکمران عضدالدولہ کے والد تھے۔ تاریخی کتب میں الپ تکین کا نام افتکین بھی لکھا گیا ہے۔ عضدالدولہ کے زمانے میں الپ تکین کو ترک فوج کا سالار مقرر کیا گیا۔ کچھ تنازعات کی وجہ سے وہ شام چلے گئے، ان کے ساتھ ان کے بہت سے حامی بھی تھے۔

الپ تکین نے پہلے ساحل شام پر واقع صیدا (اب سیدون) کا محاصرہ کیا۔ جنگ میں ہزاروں مصری سپاہی کام آئے۔ الپ تکین نے صیدا فتح کرنے کے بعد عکہ اور پھر طبریہ کا رخ کیا اس کے بعد دمشق کی طرف بڑھے، اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ المعز نے الپ تکین کو دمشق سے بے دخل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۱ ربیع الآخر ۳۶۵ھ / ۱۸ دسمبر ۹۷۵ء کو المعز کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے العزیز باللہ کو خلیفہ بنایا گیا۔ ان کی باقاعدہ جانشینی کا اعلان ۱۰ ذی الحجہ ۳۶۵ھ / ۹ اگست ۹۷۶ء کو کیا گیا۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد العزیز نے دمشق کی طرف توجہ کی جہاں الپ تکین قابض تھے۔ انہوں نے اپنے وزیر یعقوب ابن کلس سے مشورہ کیا تو ابن کلس نے مشورہ دیا کہ جوہر کاتب کو فوج دے کر دمشق بھیجا جائے۔ جوہر کاتب، جوہر صقلی بھی کہلاتے ہیں۔ "کاتب" اس زمانے میں ایک بڑا سرکاری عہدہ تھا، جو العزیز کے والد معز نے قائم کیا تھا۔ مصر پر فاطمیوں کی فتح اور وہاں کے نظم و نسق کو عمدہ خطوط پر استوار کرنے میں جوہر کا بڑا ہاتھ تھا۔ العزیز باللہ نے حکومت سنبھالنے کے بعد جوہر کو فوجی امور کا نگراں بنا دیا تھا کیونکہ جوہر فوجی امور کے ماہر تھے۔

جوہر نے حکم ملتے ہی تیاری کی اور فوج لے کر دمشق کی سمت چل پڑے۔ یہ ذی قعدہ ۳۶۷ھ / جون ۹۷۸ء کی بات ہے۔ جوہر کی فوج نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو ماہ جاری رہا، اس دوران متعدد جھڑپیں ہوئیں جن میں فریقین کا جانی نقصان ہوا۔ آخر الپ تکین نے فاطمیوں کے مخالف قرامطہ سے رابطہ قائم کیا۔ حسن بن احمد قرمطی کو بحرین کے شہر الاحسا سے بلوایا۔ قرامطہ کا پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر آ پہنچا۔ جوہر نے یہ دیکھ کر دمشق کا محاصرہ اٹھا لیا اور پسپائی اختیار کی لیکن قرامطہ نے جوہر کی فوج کو رملہ کے علاقے میں گھیر لیا۔ جوہر عسقلان چلے گئے، قرامطہ نے ان کا تعاقب کیا، آخر جوہر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی جس کے نتیجے میں انہیں دمشق سے عسقلان (فلسطین کے جنوبی ساحل پر ایک شہر) تک کا علاقہ الپ تکین کے حوالے کرنا پڑا۔ اس کے بعد جوہر واپس مصر چلے گئے۔

العزیز باللہ اپنی فوج کی پسپائی سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے بذات خود جا کر الپ تکین کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ جنگی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ محرم ۳۶۸ھ / اگست ۹۷۸ء میں العزیز کی فوج نے دمشق پر چڑھائی کر دی۔ العزیز نے الپ تکین کو پیغام بھیجا کہ آپ فاطمی حکومت کی اطاعت قبول کر لیں لیکن الپ تکین نے انکار کر دیا۔ اس پر جنگ ہوئی، باجود اس کے کہ الپ تکین کی حمایت کے لیے قرامطہ موجود تھے، فاطمیوں کے لشکر نے فتح حاصل کی۔ الپ تکین نے فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد العزیز باللہ نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ قبل ازیں ۳۶۷ھ / ۹۷۸ء میں العزیز نے حجاز میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ بحال کروایا۔

الپ تکین نے دمشق میں اپنا نائب قسام کو مقرر کیا تھا، اب دمشق میں وہی حکومت کرنے لگے اور انہوں نے فاطمی حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔ العزیز نے فضل بن صالح کی قیادت میں ایک لشکر دمشق بھیجا، لیکن یہ لشکر قسام سے دمشق واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک اور لشکر سلیمان بن جعفر کی سرکردگی میں بھیجا گیا لیکن قسام کی فوج اس لشکر پر بھی غالب رہی، آخر ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء میں العزیز باللہ نے ایک ترک سپہ سالار یلتکین کو فوج دے کر بھیجا۔ یلتکین کا نام مورخین نے بلتکین بھی لکھا ہے۔ اس سے قبل ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء میں مفرج بن دغفل نے فلسطین میں شورش برپا کر رکھی تھی جو وہاں کے والی تھے۔ العزیز کے حکم پر یلتکین نے فلسطین جا کر مفرج کو شکست دی۔ مفرج انطاکیہ فرار ہو گئے جہاں انہوں نے بازنطینیوں (رومیوں) کی

Marfat.com

پناہ لے لی۔ یلتیکین نے دمشق پر بھی چڑھائی کی اور قسام کو شکست دے دی اور خطلج کو امیر شہر بنادیا۔ قسام نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ یلتکین نے قسام کو ۳۷۳ھ/۹۸۳ء میں قاہرہ بھیج دیا جہاں العزیز نے قسام کو معاف کر دیا۔

حمص پر حمدانی حکمران تھے اور وہاں کے والی بکجور تھے۔ بکجور کے تعلقات حلب کے امیر سعد الدولہ سے کشیدہ ہوئے تو وہ ۳۷۳ھ/۹۸۳ء میں حلب کی طرف بڑھے لیکن بازنطینی سپہ سالار بردس فوکاس امیر حلب کی مدد کے لیے آپہنچے۔ بکجور وہاں سے راستہ بدل کر مصر کی طرف چلے گئے۔ العزیز باللہ نے بکجور کو دمشق کا حاکم بنادیا، لیکن بکجور بھی العزیز کی مخالفت کرنے لگے، العزیز نے ۳۷۸ھ/۹۸۸ء میں ایک لشکر دمشق بھیجا، بکجور امان حاصل کر کے رقہ چلے گئے۔ العزیز نے انہیں معاف کر دیا۔ ۳۸۰ھ/۹۹۰ء میں بکجور نے العزیز کی اجازت اور حمایت سے حلب پر حملہ کیا، لیکن لڑائی میں بکجور گرفتار ہوئے اور پھر قتل کر دیے گئے۔ سعد الدولہ نے رقہ پر قبضہ کر لیا۔ العزیز نے سعد الدولہ کو پیغام دیا کہ بکجور کے بیٹوں کو میرے پاس بھیج دیا جائے، سعد الدولہ نے اس پیغام کا مثبت جواب نہ دیا۔

سنہ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں العزیز نے ایک ترک سپہ سالار منگوتکین کو فوج دے کر حلب بھیجا۔ اس وقت حلب پر سعد الدولہ کے بیٹے ابوالفضائل حکمران تھے۔ انہوں نے سلطنت روم سے مدد طلب کی۔ روم کے بادشاہ نے انطاکیہ کے بازنطینی حاکم البرجی کو حکم دیا کہ وہ ابوالفضائل کی مدد کرے۔ منگوتکین نے یہ خبر سن کر حلب سے محاصرہ اٹھایا اور شمال میں انطاکیہ کی طرف پیش قدمی کر کے بازنطینی حاکم البرجی کی فوج کو شکست دی۔ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں منگوتکین کے ساتھ آنے والے وزیر ابن المغربی نے حلب کے حاکم سے صلح کر لی لیکن العزیز نے اس بات کو پسند نہ کیا، ابن المغربی کو معزول کر دیا اور حلب کا دوبارہ محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ حلب والوں نے روم سے پھر مدد مانگی۔ روم کے بادشاہ باسل ثانی خود فوج لے کر آئے۔ باسل نے حلب پر قبضہ کرنے سے تو فاطمیوں کو روک دیا لیکن وہ حلب کی اگلی چوکیوں کی پوری طرح حفاظت نہ کر سکے۔ انہوں نے شہر میں اپنے حفاظتی دستے متعین کر دیے۔ تاہم وہ طرابلس الشام پر قابض نہ ہو سکے۔ انہوں نے حمص میں تباہی پھیلائی اور واپس جاتے ہوئے راستے کے مقامات کو تاراج کر دیا۔

العزیز نے لڑائی تیز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۳۸۵ھ/۹۹۵ء کے اواخر اور ۳۸۶ھ/۹۹۶ء کے اوائل میں فاطمی فوج زبردست بڑی اور بحری جنگ کی تیاریوں میں لگی رہی۔ ایک بحری بیڑا بازنطینیوں کے قلعہ انطرطوس کے خلاف روانہ کیا گیا لیکن انطاکیہ سے بازنطینی فوجی کمک پہنچ گئی اور منگوتکین اس قلعہ پر قبضہ نہ کر سکے، تاہم حلب کے جنوبی حصے پر فاطمیوں کا غلبہ ہو گیا۔ اب العزیز باللہ نے بذات خود فوج کی قیادت کا ارادہ کیا۔ ۳۸۶ھ/۹۹۶ء میں وہ زبردست لشکر لے کر قاہرہ سے روانہ ہوئے تاکہ بازنطینی حکومت سے ٹکر لے سکیں لیکن راستے میں پیام اجل آگیا۔ فسطاط سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر بلبیس کے مقام پر ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور ۲۸ رمضان المبارک ۳۸۶ھ/۱۴ اکتوبر ۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

العزیز باللہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے قاہرہ میں مسجد الازہر کو جامعہ (یونیورسٹی) بنادیا۔ انہوں نے جامعہ کی عمارت میں توسیع کروائی۔ یہ درس گاہ دنیا کی وہ قدیم ترین درس گاہ ہے جو آج بھی کام کر رہی ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے مسلمان طلبہ دینی تعلیم کے لیے جامعہ الازہر آتے ہیں۔ العزیز باللہ نے جامعہ الازہر سے متصل فقہاکرام کے لیے ایک عمارت بھی بنوائی تھی جس کا نام "دارالجماعت" رکھا گیا تھا۔ فقہا اس عمارت میں نمازِ ظہر کے بعد جمع ہوتے تھے اور مختلف اہم علمی مسائل پر نمازِ عصر تک بحث و مباحثہ جاری رہتا تھا۔ العزیز کے حکم پر فقہا کے لیے بھاری مشاہرے مقرر کیے گئے۔

دُور دُور سے علما اور فقہا کو دعوت دے کر قاہرہ بلایا گیا۔ فقہ اور وعظ کی محافل میں شرکت کے لیے طالبانِ علم بہت بڑی تعداد میں دُور دراز کے مقامات سے طویل سفر کر کے پہنچتے تھے۔ علم کے ہر شعبے کے درس الگ الگ ہوتے تھے۔ مختلف علوم کے طلبہ اپنے اپنے استاد کے گرد، فرش پر حلقہ کی صورت میں بیٹھ جاتے تھے۔ خواتین کے لیے الگ حلقے قائم کیے جاتے تھے۔ جامع الازہر میں صرف اسماعیلی عقائد کے علما یا طلبہ ہی کے حلقے نہیں ہوتے تھے بلکہ شافعی، حنفی اور دیگر مسالک سے تعلق رکھنے والے علما کے حلقے بھی قائم کیے جاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اسی جامع الازہر میں فاطمی عقائد سے اختلاف رکھنے والے فقہا نے اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق فیصلے دیے ہیں۔ العزیز نے جامع الازہر میں مختلف فقہی مسالک کی تعلیم کا اہتمام کروایا تھا۔

العزیز کو فروغ علم سے بہت دلچسپی تھی، ان کے دور میں جامع

Marfat.com

الازہر کے کتب خانہ میں مختلف نادر مخطوطات اور قلمی نسخے بھی شامل کیے گئے۔ ایک بار العزیز کی محفل میں "کتاب العین" کا ذکر آیا۔ العزیز کے حکم پر کتب خانے کے مہتمم نے اس کتاب کے تیس نسخے نکال کر پیش کیے جن میں سے ایک نسخہ خود کتاب کے مصنف خلیل احمد بصری کے ہاتھ کا تحریر کردہ تھا۔ ایک بار ایک شخص تاریخ طبری کا نسخہ العزیز کے پاس لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے یہ نسخہ سو دینار میں خریدا ہے۔ العزیز نے معلوم کروایا تو بتایا گیا کہ اس کتاب کے تیس سے زائد نسخے کتب خانے میں موجود ہیں جن میں سے ایک نسخہ خود طبری کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔

العزیز کا اپنا کتب خانہ بھی بہت شاندار تھا۔ یہ کتب خانہ ان کے قصر کا حصہ تھا۔ یہ دراصل چالیس الگ الگ کتب خانوں کا مجموعہ تھا۔ ان میں سے صرف ایک کتب خانے میں قدیم علوم یعنی فلسفے وغیرہ پر اٹھارہ ہزار کتابیں تھیں۔ العزیز کے کتب خانے کے مہتمم ابوالحسن تھے۔ اس کتب خانے میں صرف قرآن کریم کے ۲۴۰۰ نسخے موجود تھے جن پر طلائی اور نقرئی کام کیا گیا تھا۔

العزیز کے دور میں سائنسی علوم پر بھی اچھا تحقیقی کام کیا گیا۔ اس شعبے میں اس عہد کی نمایاں علمی شخصیت ابن یونس کی ہے۔ ان کا پورا نام ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس ہے۔ وہ عربوں کے سب سے بڑے ہیئت داں تھے۔ ان کے والد ابوسعید عبدالرحمٰن بھی ابن یونس ہی کہلاتے تھے۔ وہ ایک نامور مؤرخ اور محدث تھے۔ ان کا انتقال ۳۴۷ھ / ۹۵۸ء میں ہوا۔ ان کے بیٹے، علم ہیئت کے ماہر ابن یونس کا انتقال ۳ شوال ۳۹۹ھ / ۳۱ مئی ۱۰۰۹ء کو قاہرہ میں ہوا۔ ہیئت اور فلکیات کے علاوہ علم و حکمت کے دوسرے شعبوں میں بھی انہیں اچھی دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

ابن یونس کا بڑا کارنامہ "زیج حاکمی" کی تصنیف ہے جسے "زیج ابن یونس" بھی کہتے ہیں۔ زیج یا زیچ سے مراد آسمان پر دمکنے والے لاتعداد ستاروں کی فہرستیں ہیں۔ ان میں ستاروں کا مقام، ان کی چمک اور رنگت اور دیگر اہم خصوصیات کی تفصیل درج کی جاتی تھی۔ ابن یونس کی مرتب کردہ زیج چار جلدوں پر مشتمل تھی۔ مشہور مؤرخ ابن خلکان کہتے ہیں کہ میری نظر سے بہت سی زیجیں گزری ہیں لیکن ابن یونس کی مرتب کردہ زیج جیسی مکمل زیج میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ابن یونس نے اس زیج کی تیاری العزیز باللہ کے حکم پر ۳۸۰ھ / ۹۹۰ء میں شروع کی تھی۔ یہ زیج العزیز کے صاحب زادے حاکم بامر اللہ کے دور میں تقریباً ۳۹۹ھ / ۱۰۰۹ء میں مکمل ہوئی۔ بدقسمتی سے یہ زیج اب مکمل حالت میں محفوظ نہیں ہے، البتہ اس کے کچھ حصے قاہرہ، لیڈن، آکسفورڈ، پیرس اور برلن میں اب بھی موجود ہیں۔ یہ زیج ہیئت کی تمام کتب میں نقل کی گئی ہے۔

العزیز کے دور میں طب پر بھی کام ہوا۔ ان کے ذاتی طبیب منصور بن مقشر تھے۔ العزیز کے بھائی تمیم (وفات: ۳۷۴ھ / ۹۸۴ء) بہت اچھے شاعر تھے۔ مؤرخ ابن خلکان کے مطابق تمیم فاضل، ماہر، لطیف اور ظریف تھے۔ ان کے تمام شعر اچھے ہیں۔ العزیز باللہ خود بھی اچھے شعر کہتے تھے۔

العزیز باللہ کے دور کی اہم ترین شخصیت یعقوب ابن کلس کی ہے۔ یعقوب ابن کلس نے مملکتِ فاطمیہ میں نہ صرف علمی سرگرمیوں کو عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے مملکت کے انتظامات کو مثالی بنانے کی غرض سے سخت محنت کی۔ یہ ان ہی کے تدبر اور فہم کا نتیجہ تھا کہ دولت فاطمیہ کا نظم و نسق عمدگی اور نفاست کا آئینہ دار بن گیا تھا۔

ابن کلس ابتداً میں یہودی تھے، وہ ۳۱۸ھ / ۹۳۰ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں شام چلے گئے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا اور بالآخر اپنے قدیم مذہب، یہودیت سے بیزار ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر وہ اکثر نماز اور تلاوت میں مصروف رہنے لگے اور تفسیر قرآن پاک کا مطالعہ کرنے لگے۔ بعد میں وہ العزیز باللہ کے والد المعز لدین اللہ کے پاس آ گئے۔ معز نے ۳۶۳ھ / ۹۷۴ء میں انہیں اقتصادی امور کا نگراں مقرر کیا۔ العزیز باللہ کے دور میں وہ ۳۶۸ھ / ۹۷۹ء میں مملکت کے وزیر بن گئے۔ وزیر کا عہدہ فاطمیوں میں سب سے پہلے العزیز باللہ نے ہی رائج کیا تھا۔ اس سے قبل فاطمی حکومت میں حاجب ہوتے تھے۔

یعقوب نے مملکت کے تمام حسابات، ریکارڈ، دفاتر کو باقاعدہ طور پر مرتب کروایا۔ انتظامات درست کیے۔ وہ خود بھی بہت اچھے منتظم تھے۔ ان کی اصلاحات کے نتیجے میں مملکتِ فاطمیہ میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ انہوں نے محاصل کے نظام کو بہتر بنایا جس سے محاصل سے ہونے والی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، ساتھ ہی مملکت میں فارغ البالی آئی اور معیار زندگی بہتر ہوا۔

Marfat.com

یعقوب خود بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے فقہ، قرأت اور دیگر علمی، ادبی اور اخلاقی موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ العزیز باللہ نے جامع الازہر کا پہلا نگرانِ اعلیٰ (چانسلر) یعقوب ہی کو مقرر کیا تھا۔ یعقوب اپنی رہائش گاہ پر ہفتہ میں دو بار علمی مجالس منعقد کرتے تھے جن میں فقہا، قرأت اور تجوید کے اساتذہ، محدثین اور شعرا شریک ہوتے تھے۔ یعقوب کی اپنی رہائش گاہ میں ایک بہترین کتب خانہ بھی تھا۔ ان کی قیام گاہ پر بہت سے کاتب، قرآن پاک کے نسخوں، حدیث، فقہ، ادب اور دیگر علوم کی کتب کی نقول تیار کرتے رہتے تھے۔ ان کاتبوں کو تنخواہیں خود یعقوب اپنے پاس سے ادا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا شفاخانہ بھی قائم کیا تھا، جہاں ماہر طبیب موجود رہتے تھے۔ اس شفاخانے میں علاج بالکل مفت تھا۔ طبیبوں کو بھی تنخواہیں، یعقوب اپنی جیب سے دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی قیام گاہ پر ایک کشادہ مہمان خانہ بھی بنوایا تھا۔ یعقوب ہر شام نمازِ مغرب کے بعد عدالت لگاتے تھے اور شہریوں کی شکایات اور ضروریات کے بارے میں مناسب کارروائی کرتے تھے۔

یعقوب اپنی ان ہی خوبیوں کی بنا پر بے حد مقبول تھے۔ العزیز باللہ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ جب ۳۸۰ھ / ۹۹۱ء کے آخر میں یعقوب شدید بیمار پڑے اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو العزیز باللہ ایک بار انہیں دیکھنے کے لیے آئے۔ اس وقت العزیز باللہ شدتِ غم سے رونے لگے اور انہوں نے کہا "اگر آپ کے مرض کا علاج ممکن ہوا اور مجھے اس کے لیے اپنی حکومت بھی قربان کرنی پڑی تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔" یعقوب کے انتقال کے بعد ان کی نمازِ جنازہ العزیز باللہ ہی نے پڑھائی تھی۔ یعقوب کے انتقال پر سو شعرا نے مرثیے کہے۔ العزیز کو یعقوب کی وفات کا شدید صدمہ پہنچا۔ ان کے سوگ میں ۱۸ دن تک دفاتر بند رکھے گئے۔

العزیز باللہ کے دور میں جو نامور علمائے کرام تھے ان میں قاضی محمد بن نعمانؒ (وفات ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء) نمایاں تھے۔ العزیز ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب کبھی سرکاری اجلاس منعقد کرتے انہیں اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ قاضی محمد بن نعمان عوام میں بھی بہت مقبول تھے۔ ان کا درس سننے کے لیے زبردست ازدحام ہوتا تھا۔ ایک بار بھیڑ کی کثرت کی وجہ سے گیارہ افراد جاں بحق ہو گئے۔

العزیز باللہ کو تعمیرات کا شوق تھا۔ وہ بہت اچھے ذوق کے مالک تھے۔ ان کے حکم پر رمضان المبارک ۳۸۰ھ / دسمبر ۹۹۰ء میں قاہرہ کے باب الفتوح کے قریب بڑی جامع مسجد کی تعمیر شروع کی گئی۔ ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء میں العزیز کے انتقال کے باعث یہ مسجد ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی تاہم ان کے بعد حاکم کے زمانے میں مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد کا نام "جامع ازہر" کے طرز پر "جامع انور" رکھا گیا تھا لیکن بعد میں یہ "جامع الحاکم" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس کے اور جامع الازہر کے نقشے میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

العزیز باللہ نے ایک اور مسجد قرافہ کے علاقے میں بنوائی تھی۔ انہوں نے دو عظیم الشان قصر بھی تعمیر کروائے تھے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک قصر کبیر مشرقی کہلاتا تھا۔ خلیفہ کی رہائش اسی میں تھی۔ دفاتر بھی اسی میں قائم تھے۔ دوسرا قصر دریائے نیل کے کنارے تھا۔ اس کے علاوہ العزیز نے کئی پل اور شفاخانے بھی تعمیر کروائے۔ ان کے دور کے جتنے بھی سکے ملے ہیں وہ سب طلائی ہیں تاہم چاندی کے سکے بھی ڈھالے جاتے تھے۔ مصر کے دارالضرب (ٹکسال) میں ہر سال سکے ڈھالے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ رملہ (فلسطین)، مہدیہ، افریقہ، صقلیہ، طرابلس اور مکہ مکرمہ میں بھی سکے ڈھالے گئے۔

العزیز باللہ کا دربار بہت پروقار ہوتا تھا یہ دربار جس کمرے میں منعقد ہوتا تھا اسے "قاعۃ الذہب" کہتے تھے۔ اس کمرے کے وسط میں خلیفہ کا تخت بچھا رہتا تھا جس پر پردے پڑے رہتے تھے۔ جب خلیفہ اس تخت پر بیٹھ جاتے تھے تو دو معتمد وزیر پردوں کو الٹ دیتے تھے۔ ان کے گرد قاریوں کی ایک جماعت بلند آواز میں ترتیل کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کر رہی ہوتی تھی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ایک شخص آتا جو "حامل دوات" کہلاتا تھا۔ وہ فرش کے کنارے دوات لا کر رکھ دیتا۔ پھر اجلاس کی کارروائی شروع ہو جاتی اور اس میں حکومت کے اہم معاملات اور جنگی مہمات پر بحث ہوتی۔

العزیز باللہ کے عہد میں ڈاک کا نظام بہت اچھا تھا۔ ڈاک گھوڑوں پر جاتی تھی۔ ہر منزل پر تازہ دم گھوڑے تیار ملتے تھے۔ انہیں "خیل البرید" کہتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے عملہ متعین تھا۔ ڈاک لے جانے والوں کے قیام و طعام کے لیے عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ صرف ایسے افراد کو ڈاک رساں بنایا جاتا تھا جو امین اور سمجھدار ہوں اور جغرافیے سے واقف ہوں۔ ڈاک رساں بعض مخصوص اشیا کی منتقلی کروانے کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے مثلاً بیماروں کے لیے یا دیگر اہم

Marfat.com

مقاصد کے لیے برف شام سے مصر منتقل کی جاتی تھی۔ ڈاک کی ترسیل کے لیے کشتیاں بھی استعمال ہوتی تھیں۔

فوری نوعیت کی ڈاک بھیجنے کے لیے کبوتر استعمال ہوتے تھے۔ کبوتروں کے اترنے کے لیے باقاعدہ برج تعمیر کیے گئے تھے۔ کبوتروں کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے مستقل عملہ مقرر تھا۔ کبوتروں کے ذریعہ جو پیغام بھیجا جاتا تھا وہ مختصر ہوتا تھا جیسے آج سے کچھ عرصہ قبل تک ٹیلیگرام بھیجا جاتا رہا ہے۔ یہ پیغام بہت باریک کاغذ پر لکھا جاتا تھا تاکہ کبوتر کو اڑنے میں دشواری نہ ہو۔ ایک مضمون کے دو خط دو مختلف کبوتروں کے ذریعہ روانہ کیے جاتے تھے۔ کبوتر جوں ہی منزل پر پہنچتا تھا، برج پر مامور فرد کبوتر کے بازو یا دُم سے بندھا ہوا خط نکال کر اسی وقت خلیفہ کو پیش کر دیتا تھا۔ خلیفہ کھانا کھا رہے ہوں یا سو رہے ہیں، خط پیش کرنا لازمی تھا۔ بعد میں شام اور مصر کے نامور حکمران نورالدین زنگیؒ ۵۴۱ھ تا ۵۶۹ھ / ۱۱۴۷ء تا ۱۱۷۴ء کے دور میں بھی کبوتروں کے ذریعہ ڈاک کی ترسیل کا کام وسیع پیمانے پر کیا گیا۔

العزیز باللہ بہت بردبار، خوش خصال، رحم دل، وسیع القلب اور سمجھدار حکمران تھے۔ وہ بہت بہادر تھے، انہوں نے کئی جنگوں میں اپنی فوج کی قیادت کی لیکن وہ خونریزی سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں مروت اور ملنساری بہت تھی۔ وہ عام طور پر کسی سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات میں بڑی حکمت سے کام لیتے تھے۔ اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیتے تھے اور اپنے حسن سلوک سے انہیں اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ ان کے دور میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کی اعلیٰ مثالیں قائم ہوئیں۔ انہوں نے ایک عیسائی شخص عیسیٰ بن سطورس اور ایک یہودی شخص اسحاق بن المنسا کو وزیر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے ابو سیفین کے منہدم گرجاگھر کو از سر نو تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ ایک بار انہوں نے ایک پادری سیورس کو قاضی محمد بن نعمان کے مذہبی جلسے میں شریک ہو کر مناظرہ کرنے کی ترغیب دی۔ تاہم بعض مورخین کے خیال میں العزیز باللہ کے دور میں اہل کتاب کی جس طرح حوصلہ افزائی کی گئی اس سے بعد میں نقصان پہنچا۔

***

Marfat.com

محمد بن ابی عامر

شمالی اندلس میں اسلام کا پیغام پہنچانے والے پہلے حکمراں

اتنی بڑی مسجد بھی اب بہت مختصر محسوس ہونے لگی تھی!

جب بھی موذن کی دلنشین آواز بلند ہوتی، لوگ اپنے تمام کام چھوڑ کر ربِ عظیم کے حضور سر بسجود ہونے کے لیے مسجد کی سمت چل پڑتے۔ مسجد کا اندرونی ہال اور دالان، دیکھتے ہی دیکھتے نمازیوں سے پُر ہو جاتے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مسجد سے باہر نماز ادا کرنی پڑتی۔

مسجد میں توسیع بے حد ضروری ہو گئی تھی!

ملک کے حکمراں کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا۔ اسی لیے انہوں نے مسجد کی عمارت میں توسیع کا ایک منصوبہ تیار کروالیا تھا لیکن اس منصوبے کی رُو سے مسجد سے متصل بہت سے مکانات ڈھا دینے کی صورت میں ہی مسجد کی عمارت کو وسعت دی جاسکتی تھی۔

حکمراں کے ایما پر ان تمام مکانات کے مالکان کو بلایا گیا جن کو ڈھا دینا مسجد کو وسیع کرنے کے لیے ضروری تھا۔ حکمراں ایک ایک مکان کے مالک کو باری باری اپنے پاس بلاتے، اسے نرمی سے سمجھاتے، مسجد کی اہمیت کا احساس دلاتے اور کہتے "آپ کے خیال میں آپ اپنے مکان کی کیا قیمت لینا پسند کریں گے، قیمت کم کر کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ جو قیمت سمجھتے ہیں بلا تکلف بتائیں۔" مکان کا مالک سوچ کر جو رقم بتاتا، حکمراں اس رقم سے دگنی رقم دلوا دیتے۔

ایک ایک کر کے مسجد میں توسیع کے لیے درکار تمام مکانات کے مالکان اپنی اپنی رقم وصول کر کے خوش و خرم چلے گئے لیکن ایک بوڑھی عورت نے اپنا مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ مسئلہ نازک تھا، بوڑھی عورت کو مکان فروخت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا اور مکان کو منہدم کیے بغیر مسجد کی عمارت میں توسیع ممکن نہ تھی۔

سرکاری کارندوں کی جانب سے اصرار اور بوڑھی عورت کے مسلسل انکار میں کئی روز بیت گئے۔ حکمران کے کہنے پر معلوم کیا گیا کہ بوڑھی عورت مکان فروخت کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہے، معلوم ہوا کہ بوڑھی عورت کے مکان میں ایک باغ ہے جس میں کھجور کا ایک خوبصورت درخت ہے۔ بوڑھی عورت نے کہا کہ وہ اپنا مکان اسی صورت میں چھوڑ سکتی ہے جب اسے مکان کی قیمت کے ساتھ ساتھ ایسا مکان بھی فراہم کیا جائے جس کے باغ میں ایسا ہی خوبصورت کھجور کا درخت ہو۔ حکمراں نے حکم دیا کہ ایسا مکان تلاش کیا جائے اور منہ مانگے دام دے کر خرید لیا جائے۔ حکم کے مطابق سرکاری کارندے ایسے مکان کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ بڑی تلاش کے بعد ایسا مکان مل ہی گیا۔ بھاری قیمت دے کر اسے خرید ا گیا اور بوڑھی عورت کے حوالے کر دیا گیا اس طرح قرطبہ کی عظیم جامع مسجد میں توسیع کی راہ ہموار ہو گئی۔

اللہ کے گھر میں توسیع کی تگ و دو کرنے والے یہ حکمراں تھے، محمد بن ابی عامر جنہوں نے اندلس (اسپین) کی سرزمین پر پچیس سال حکومت کی۔ اس عرصے میں اسلام دشمنوں کے خلاف پچاس سے زائد جنگیں لڑیں، ہر ایک جنگ میں سرخرو لوٹے اور اللہ کی مہربانی سے انہیں کسی جنگ میں شکست کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ یہی محمد بن ابی عامر ہیں جن کی قیادت میں مسلمانوں کے قدم ایسے علاقوں میں پہنچے جہاں اس سے قبل اسلام کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اس دور میں تمام عیسائی بادشاہ، بنی امیہ کے کسی حکمراں سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا محمد بن ابی عامر سے ڈرتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ محمد بن ابی عامر نہایت جری اور لائق سپہ سالار اور جنگ کے ماہر تھے۔ وہ انتہائی مدبر

Marfat.com

سیاست دان اور صاحب علم و فہم بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پکے اور سچے مسلمان تھے۔

عالم اسلام کے یہ قابل فخر فرزند ۳۳۰ھ / ۹۴۲ء میں اندلس کے ایک مقام طرش میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قبیلہ یمانیہ کے خاندان معافر سے ہے، ان کے جدِ اعلیٰ عبدالملک المعافری، اندلس کے فاتح طارق بن زیادؒ کی فوج کے ساتھ فتح اندلس کے معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ محمد بن ابی عامر کے دادا محمد بن عبداللہ آٹھ برس تک شہر اشبیلیہ کے قاضی رہے۔ ان کے صاحبزادے یعنی محمد بن ابی عامر کے والد ابو حفص عبداللہ بھی بڑے دیندار بزرگ اور قابل فقیہ تھے۔ ابو حفص عبداللہ کا انتقال اس وقت ہوگیا جب محمد بن ابی عامر بطن مادر میں تھے۔ والدہ بریہہ نے بچے کی پرورش کی، کم عمری کا زمانہ محمد نے طرش میں گزارا اور ذرا ہوش سنبھالا تو قرطبہ چلے آئے۔ قرطبہ اس زمانے میں علم وادب کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ محمد بن ابی عامر نے نامور علما کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور جامع مسجد قرطبہ میں علم کے موتی سمیٹے۔ نوجوان محمد کو تاریخ کی کتب سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔

تعلیم سے فارغ ہوئے تو قرطبہ کے محکمۂ قضا (محکمۂ انصاف) سے وابستہ ہوگئے۔ ان دنوں خلیفہ الحکم اندلس پر حکمراں تھے جن کا لقب مستنصر باللہ تھا۔ خلیفہ کو اپنے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے ایک منتظم کی ضرورت تھی، عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت پانچ سال تھی۔ خلیفہ کے وزیر مصحفی کی نگاہِ انتخاب محمد بن ابی عامر پر پڑی، انہوں نے خلیفہ سے ذکر کیا۔ مقررہ دن خلیفہ کی اہلیہ سلطانہ صبح نے منتظم کی اسامی کے لیے تمام امیدواروں کا انٹرویو لیا۔ ابن ابی عامر کے شائستہ انداز اور ان کی پُر اعتماد شخصیت سے سلطانہ صبح بہت متاثر ہوئیں، چنانچہ ۳۵۶ھ / ۹۶۷ء میں انہیں عبدالرحمٰن کی جائیداد کا منتظم مقرر کر دیا گیا۔ محمد بن ابی عامر نے عبدالرحمٰن کی جائیداد کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ سلطانہ صبح نے انہیں اپنی جائیداد کا بھی منتظم مقرر کر دیا۔ ۳۵۷ھ / ۹۶۸ء میں خلیفہ نے انہیں چند اور املاک کا مہتمم بنایا اور تقریباً گیارہ ماہ بعد انہیں اشبیلیہ اور لبلہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ بعد میں انہیں خلیفہ کے چھوٹے صاحبزادے ہشام کا اتالیق بنایا گیا۔ ۳۶۱ھ / ۹۷۲ء میں وہ فوج کے ایک دستے کے سالار مقرر کر دیے گئے۔

ربیع الاوّل ۳۶۴ھ / نومبر ۹۷۴ء میں خلیفہ الحکم پر فالج کا دورہ پڑا اور صفر ۳۶۶ھ / دسمبر ۹۷۶ء میں انہوں نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ انتقال سے قبل انہوں نے اپنے کمسن بیٹے ہشام (دوم) کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ ہشام بہت کم عمر تھے چنانچہ مصحفی جنہیں (وزیر اعظم) کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، تمام امورِ مملکت کی نگرانی کرنے لگے۔ ابن ابی عامر کو وزیر بنایا گیا۔

خلیفہ الحکم کے انتقال کی خبر سن کر شمالی اندلس میں آباد عیسائی سرکشی پر اتر آئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ قرطبہ میں آکر ڈاکے ڈالنے لگے۔ اس صورتِ حال پر خلیفہ اور ان کے مشیروں نے غور کیا۔ تجویز دی گئی کہ شمالی علاقے کے عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے مہم روانہ کی جائے۔ اس مہم کی قیادت کے لیے محمد بن ابی عامر کا انتخاب کیا گیا جمادی الآخر ۳۶۷ھ / فروری ۹۷۸ء میں محمد بن ابی عامر نے ملک کے ہر حصے سے مستعد اور بہادر سپاہی منتخب کیے اور شمال کی سمت روانہ ہوگئے۔ سرحد پار کر کے قلعہ الحمہ کا محاصرہ کیا اور اپریل کے وسط میں بہت سے عیسائیوں کو گرفتار کر کے قرطبہ واپس آئے۔ تقریباً ایک ماہ بعد انہیں عیسائیوں سے جنگ کرنے کے لیے لشکر کی کمان دے کر پھر شمالی سرحد کی جانب بھیجا گیا جہاں انہوں نے ایک قلعے پر قبضہ کیا اور عیسائیوں کی بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا۔ واپس لوٹے تو قرطبہ کے عامل (افسر اعلیٰ) بنا دیے گئے، عامل بنتے ہی محمد ابن ابی عامر نے سخت احکامات جاری کیے اور بدانتظامی یا بدامنی کے خلاف کڑی سزاؤں کا نفاذ کیا۔ ملزم چھوٹا ہو یا بڑا اس پر مقدمہ قائم کیا گیا اور جرم ثابت ہونے پر سزا دی گئی۔ محرم ۳۶۸ھ / اگست ۹۷۸ء میں انہیں پھر شمالی سرحد پر عیسائیوں کے خلاف مہم کی قیادت کرنے کے لیے بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ظلمنکہ کے مضافاتی علاقے اور کئی قلعے فتح کیے۔ اسی اثنا میں شمالی علاقے کے حاکم غالب کی بیٹی اسما سے ان کی شادی ہوگئی، ۳۶۸ھ / ۹۷۸ء ہی میں ملک کے حاجب (وزیر اعظم) کا منصب محمد بن ابی عامر کے سپرد کر دیا گیا۔

۳۷۱ھ / ۹۸۱ء میں محمد بن ابی عامر نے لیون کی شمالی عیسائی ریاست پر فوج کشی کی۔ وہاں کے عیسائی بادشاہ رومیر ثانی نے قشتالیہ کے قومس اور نبرہ کے غرسیہ سے مدد طلب کی۔ تینوں بادشاہ متحد ہو کر مقابلے پر آئے۔ روطہ کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں عیسائیوں نے شکست کھائی۔ ابن ابی عامر آگے بڑھے، لیون کے شہر پر حملہ کیا۔ مسلمان اس بے جگری سے لڑے کہ عیسائی فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں لیکن شدید برفانی طوفان کی وجہ سے ابن ابی عامر اپنی فوج کو لے کر

Marfat.com

واپس چلے آئے۔ اسی دوران لیون میں بادشاہ رومیر ثانی کے چچازاد بھائی برمند کو بادشاہ بنادیا گیا۔

محمد بن ابی عامر نے ۳۷۶ھ/۹۸۷ء میں برشلونہ (موجودہ بارسلونا) قلمریہ، سمورہ کے علاقے فتح کیے۔ لیون کا بادشاہ برمند، سمورہ میں موجود تھا لیکن وہ اسلامی فوج کے آتے ہی شہر سے بھاگ گیا اور شہر والوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ بعد میں برمند نے محمد بن ابی عامر سے امان طلب کی اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔ محمد بن ابی عامر کی ان کارروائیوں کے نتیجہ میں اندلس میں اب امن وامان تھا۔

تقریباً دس سال بعد برمند نے پھر سرکشی کی راہ اختیار کی اور سالانہ خراج دینے سے انکار کر دیا۔ محمد بن ابی عامر نے فوجی تیاریاں کیں اور جمادی الآخر ۳۸۷ھ/جولائی ۹۹۷ء میں فوج لے کر قرطبہ سے روانہ ہو گئے۔ قوریہ سے ہوتے ہوئے شہر بازو میں پہنچے، یہاں سے برتقال روانہ ہوئے جو دریائے دویرہ کے پار واقع تھا۔ محمد بن ابی عامر نے بحری بیڑہ پہلے ہی روانہ کر دیا تھا جو دریا کے کنارے لنگر انداز ہو کر فوج کا منتظر تھا۔ محمد بن ابی عامر نے بحری جہازوں کو دریا کے عرض میں اس طرح لنگر انداز کروا دیا کہ ایک پل سا بن گیا۔ اس پل کی مدد سے تمام فوج فوری طور پر دریا کے پار اتر گئی۔ دریائے دویرہ اور دریائے مینہ کے بیچ وسیع علاقہ تھا جہاں عیسائی حکمراں تھے۔ محمد بن ابی عامر نے اس علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا۔

ایک رات شدید سردی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اچانک محمد بن ابی عامر نے اپنے ایک قابل اعتماد سپاہی کو حکم دیا کہ وہ فوراً درّۂ طلیارش جا کر پہرہ دے اور اگر کوئی شخص لشکر کی سمت سے درّہ کی طرف آتا دکھائی دے تو اسے فوراً امیر لشکر کے سامنے حاضر کیا جائے۔ سپاہی حکم کی تعمیل میں رات بھر درّے کے دہانے پر کھڑا بارش میں بھیگتا رہا۔ پو پھٹنے پر اس نے دیکھا کہ لشکر گاہ کی سمت سے ایک بوڑھا شخص گدھے پر سوار درّے کی طرف آرہا ہے۔ سپاہی نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ میں لکڑہارا ہوں۔ سپاہی نے اسے جانے دیا لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ امیر لشکر کا حکم کیا تھا۔ اس نے دوڑ کر اسے پکڑا اور محمد بن ابی عامر کے پاس لے گیا۔ محمد بن ابی عامر خود بھی رات بھر نہ سوئے تھے۔ انہوں نے بوڑھے کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ اس کے گدھے کے پالان میں ایک خط ملا جو لیون کے چند ایسے عیسائیوں نے لکھا تھا جو مسلمانوں کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ اس خط میں دشمن عیسائیوں کو بتایا گیا تھا کہ مسلمان فوج کا کون سا رخ ایسا ہے جس کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے اور اس پر حملہ ممکن ہے۔

محمد بن ابی عامر نے اسلامی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ فوج کھلے میدانوں میں پھیل گئی۔ بیونہ اور توئی کے درمیان دیر قشطان اور دیر دامیان کو فتح کیا، قلعہ شنت (سینٹ) بلایہ کو سرنگوں کیا۔ قریب ہی خلیج دیگو میں دو چھوٹے جزائر تھے، ان میں سے ایک پر دشمن کی فوج نے پناہ لے لی تھی۔ محمد بن ابی عامر کے حکم پر فوج اس جزیرے تک جا پہنچی۔ اب لشکر آگے بڑھا، دریائے ایلہ کو عبور کیا اور شہر ایریا کو فتح کیا۔ شعبان ۳۸۷ھ/اگست ۹۹۷ء میں اسلامی فوج سینٹ یعقوب (کمپوستیلا) پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر شہر والے گھربار چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں۔ سینٹ یعقوب کا کلیسا، رومۃ الکبریٰ کے بعد پوری مسیحی دنیا میں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا اور دور دور سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ مسیحیوں میں مشہور تھا کہ اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری یعقوب ابن زبدی کی قبر ہے وہ اس مقام کو بے حد مقدس مانتے تھے۔ محمد بن ابی عامر کے حکم پر اس مزار کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔

سینٹ یعقوب کو محمد بن ابی عامر نے اپنے ۴۸ ویں جہاد میں فتح کیا۔ یہ فتح ان کے نمایاں کارناموں میں سے ایک ہے، اسی فتح کی یادگار کے طور پر وہ المنصور کے لقب سے دنیا بھر میں مشہور ہوئے، آئندہ سطور میں ہم انہیں اسی لقب سے یاد کریں گے۔ المنصور کے معنی ہیں "فاتح"۔

سینٹ یعقوب سے منصور کی فوج سینٹ مانکس تک جا پہنچی، یہ شمالی مغربی اندلس کا انتہائی کنارہ تھا اس سے قبل یہاں مسلمانوں کے قدم نہ پہنچے تھے۔ یہاں سے فوج نے لیقیہ کا رخ کیا اور بالآخر بہت سے قیدی اور مال غنیمت لے کر منصور کی فوج فاتحانہ انداز سے واپس قرطبہ پہنچ گئی۔ منصور کی ان زبردست فتوحات کے نتیجے میں عیسائیوں کی بغاوتیں سرد پڑ گئیں۔

۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں منصور شمال کے عیسائیوں سے لڑنے پھر روانہ ہوئے۔ وہ ہمیشہ دعا کرتے تھے کہ ان کی زندگی کے دن میدانِ جہاد میں پورے ہوں، انہیں اس دعا کے قبول ہونے کا اتنا زیادہ یقین تھا کہ وہ جب کبھی جہاد پر جاتے تو سامان میں کفن بھی شامل ہوتا جو ان کی بیٹیوں نے سیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہوا قرآن پاک کا نسخہ بھی

Marfat.com

اپنے ہر سفر میں ساتھ رکھتے تھے۔

شمالی اندلس کے علاقے قشتالیہ میں عیسائیوں کے خلاف ہونے والی یہ جنگ ان کی آخری جنگ تھی۔ قشتالیہ سے فاتح کی حیثیت سے قرطبہ واپسی کے سفر میں وہ بیمار پڑ گئے۔ علالت اس قدر شدید تھی کہ گھوڑے پر سوار نہ ہوسکتے تھے چنانچہ انہیں تخت پر سوار کر کے لے جایا گیا اور صوبہ سوریہ کے شہر سرقسطہ سے ۷۰ میل دور مدینہ السالم (میڈینا سیلی) میں لائے گئے جہاں ۲۷ رمضان المبارک ۳۹۲ھ / ۹ اگست ۱۰۰۲ء کو وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، انہیں اسی شہر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

منصور کے بہت سے نمایاں کارناموں میں ایک یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر خلافت کے ظاہری شکوہ کو قائم رکھا، خلیفہ ہشام کمسن تھے اور امورِ مملکت انجام دینے کے لائق نہ تھے، منصور نے خود کبھی خلیفہ بننے کی یا خود کو خلیفہ کہلوانے کی کوشش نہ کی۔

منصور اپنی رعایا سے بہت محبت کرتے تھے۔ راتوں کو شہر کا گشت کرتے تھے۔ سب کا دکھ درد سنتے اور ان کے مسائل حل کرتے۔ ایک بار ان کے ملازم نے کہا کہ مستقل جاگنے سے آپ کی صحت پر برا اثر پڑے گا آپ نے تو آرام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ منصور نے کہا کہ جب حکمراں سوتا ہے تو جرائم پیشہ لوگ جاگ اٹھتے ہیں اس لیے حکمراں پر لازم ہے کہ جب رعیت سو جائے تو وہ ان کی نگہبانی کے لیے جاگتا رہے۔

منصور نے انصاف کو سربلند رکھنے کی جانب بھی بھرپور توجہ دی۔

ایک بار ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ آپ کے پیچھے آپ کا جو خادم کھڑا ہوا ہے اس نے مجھ سے عہد کر کے توڑ دیا ہے اور جب میں نے اسے عدالت میں بلوایا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ منصور نے خادم کو اسی وقت عدالت بھجوا دیا اور کہلوایا کہ جرم ثابت ہو تو اس کو سخت سزا دی جائے یعنی اس بات کا خیال نہ رکھا جائے کہ یہ ملک کے حکمراں کا ملازم ہے۔

ایک بار ایک شخص یمن سے کچھ جواہرات لے کر آیا۔ راستے میں ایک جگہ وہ اپنے کپڑے اور جواہرات کی تھیلی نہر کے کنارے رکھ کر نہر میں نہانے لگا۔ ایک چیل آئی اور جواہرات کی تھیلی اٹھا لے گئی۔ وہ شخص نہر سے نکل کر رونے پیٹنے لگا۔ لوگ اکٹھے ہوگئے، واقعہ سن کر لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ آپ منصور کے پاس جائیں۔ وہ شخص مایوسی سے بولا۔ ”منصور کا حکم انسانوں پر چلتا ہے۔ پرندوں پر تو نہیں۔“ لیکن منصور کی رعایا کو اپنے حکمراں پر اس قدر بھروسا تھا کہ انہوں نے اس شخص کو مجبور کر کے منصور کے پاس بھجوا دیا۔ وہ شخص منصور کے پاس پہنچا تو منصور نے کہا کہ آپ ذرا انتظار کریں۔ پھر انہوں نے اپنے اہلکاروں سے تحقیق کروائی کہ اطراف میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جس کی مالی حالت گزشتہ ایک دو دن میں بہتر ہوگئی ہو۔ معلوم ہوا کہ ایک مزدور ہے جو نادار تھا لیکن اس نے ابھی ابھی اپنے اور بیوی بچوں کے لیے کپڑے بنوائے ہیں اور پھر خچر بھی خرید لیا ہے۔

مزدور کو بلوایا گیا، پوچھ گچھ پر اس نے اعتراف کر لیا کہ جواہرات کی تھیلی اسے ملی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے تھیلی سے صرف دس مثقال سونا نکالا ہے۔ منصور نے تھیلی کے مالک سے کہا کہ تھیلی کھول کر دیکھیں، کیا یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ تھیلی کے مالک نے تھیلی دیکھ کر تصدیق کی کہ واقعی دس مثقال سونا کم ہے پھر اس نے کہا کہ میں یہ دس مثقال سونا معاف کرتا ہوں۔ منصور نے کہا، نہیں اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔ پھر انہوں نے دس دینار تو جواہرات کے تاجر کو دیے اور دس دینار مزدور کو دیے اور کہا کہ اگر یہ شخص تھیلی ملتے ہی میرے پاس چلا آتا تو میں اسے بڑا انعام دیتا۔

عیسائیوں کے خلاف پے در پے کامیابیوں اور منصور کی بے پناہ جرأت سے عیسائی ہمیشہ ہیبت زدہ رہتے تھے۔ ایک بار وہ عیسائیوں کے علاقے میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک تنگ درّے سے گزرے، اس وقت عیسائیوں کی ہمت نہ ہوسکی کہ انہیں کچھ کہہ سکیں جب وہ واپس لوٹے تو دیکھا کہ درّے پر عیسائیوں کا قبضہ ہے۔ منصور نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر خیمے نصب کروا دیے اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ یہاں کاشتکاری شروع کر دیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ عیسائی گھبرا گئے اور منت سماجت کرنے لگے کہ وہ مالِ غنیمت لے کر یہاں سے واپس چلے جائیں۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو بار برداری کے جانور بھی دیے اور ان کا سامان خود سرحد تک پہنچایا۔

ایک بار عیسائیوں کے ایک شہر کے سامنے ایک بلند پہاڑی پر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا، جب منصور کی فوج وہاں سے کوچ کر گئی تو اسلامی فوج کا پرچم پہاڑی پر ہی لگا رہ گیا اور سپاہی اسے وہاں سے اتارنا بھول گئے یہ پرچم کئی دنوں تک پہاڑی پر لہراتا رہا اور کسی عیسائی کی ہمت نہیں ہوئی کہ پہاڑی پر چڑھ کر دیکھ لیتا۔

منصور خود بھی عالم تھے اور علماکرام کی بے حد قدر کرتے تھے

Marfat.com

ان کے عہد میں ملک میں ہزاروں علما موجود تھے۔ جب وہ کسی مشہور عالم کا تذکرہ سنتے تھے تو پھر وہ کہیں بھی بستا ہو، اسے بلوا لیتے تھے۔ ان کے دور میں دین شریعت، فلسفہ، ہیئت، تاریخ جغرافیہ، شعر و سخن اور دیگر موضوعات پر متعدد کتب لکھی گئیں۔ انہوں نے مدارس کی تعداد میں بھی اضافہ کیا، حصولِ علم کی پوری حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور ایسے تمام طلبہ کے تعلیمی اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی جو دوسرے ملکوں سے قرطبہ آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

منصور نے قرطبہ کی عظیم جامع مسجد میں تیسرا اور آخری بڑا اضافہ کیا۔ انہوں نے پہلے سے موجود دس دس ستونوں والے ۲۹ دالانوں کے ساتھ ملا کر شمالاً جنوباً سات سات ستونوں کے ۲۹ دالان در دالان بنوا دیے۔ اس طرح صحن مسجد میں قبلہ رُخ کھڑے ہو کر دیکھنے پر سترہ ستونوں والے ۲۹ دالان در دالان قبلہ کی دیوار تک نظر آتے تھے۔ انہوں نے جتنے بھی دالانوں کا اضافہ کیا ان میں ہر جگہ سنگِ رخام پر طلائی کام کروایا۔ مسجد کے ۹ دروازوں میں توسیع کر کے ۲۱ دروازے بنوائے۔ مسجد کی تعمیر سے ان کی عقیدت اور دلچسپی کا حال یہ تھا کہ ملک کے حکمران ہونے کے باوجود عام مزدوروں کی طرح خود بھی کدال بیلچہ اور آری وغیرہ تھامے ہوئے کام میں مصروف رہتے تھے۔

مسجدِ قرطبہ میں توسیع کے ساتھ ساتھ منصور کے دور میں کئی مساجد تعمیر ہوئیں، حتیٰ کہ ان کی تعداد ۷۰۰ تک پہنچ گئی۔ منصور نے دیگر تعمیراتی کاموں پر بھی توجہ دی۔ پورے اندلس میں دشوار گزار پہاڑیوں کو کٹوا کر متعدد سڑکیں اور شاہراہیں بنوائیں۔ شہر استجہ میں دریائے شنیل پر اور قرطبہ میں وادی الکبیر پر پل تعمیر کروائے۔

قرطبہ کے مشرق میں وادی الکبیر کے کنارے "مدینہ الزاہرہ" کے نام سے ایک نئے شہر کی تعمیر کا شرف بھی منصور کو حاصل ہے، اس شہر کی تعمیر ۳۶۸ھ /۹۷۸ء میں شروع ہوئی اور ۳۷۰ھ /۹۸۰ء میں یہ مکمل ہو گیا۔ اس وقت تک تمام سرکاری دفاتر مدینہ الزہرا میں قائم تھے۔ مدینہ الزہرا قرطبہ سے شمال میں تین یا چار میل دور واقع تھا۔ اسے خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے ۳۲۵ھ /۹۳۷ء میں تعمیر کروادیا تھا۔ خلیفہ کی سرکاری رہائش گاہ مدینہ الزہرا ہی میں واقع تھی۔ جب منصور وزیر اعظم بنے تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ سرکاری دفاتر کسی اور جگہ منتقل کر دیے جائیں، چنانچہ مدینہ الزہرا سے دس میل دور مدینہ الزاہرہ کے نام سے ایک شہر تعمیر کروانا شروع کیا۔ جلد ہی یہاں دفاتر، عدالتوں کی عمارتیں، سڑکیں، بازار بھی بن گئے اور اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔ اس شہر کو اتنی ترقی ملی کہ رات کے وقت مدینہ الزہرا اور مدینہ الزاہرہ کے درمیان دس میل طویل فاصلے پر کہیں تاریکی دکھائی نہ دیتی تھی اور پورا علاقہ روشنیوں سے جگمگا رہا ہوتا تھا۔

منصور نے صوبہ قاصرش کے شہر ترجالہ کو بھی از سرِ نو آباد کیا اور یہاں مسلمانوں کو بسنے کے مواقع فراہم کیے۔ منصور کے دور میں صنعتوں کو بھی خاصی ترقی دی گئی۔ اس زمانے میں اشبیلیہ اور قرطبہ میں ایسے کارخانے موجود تھے جن میں طِراز، یعنی ریشم اور زربفت کے کپڑے تیار ہوتے تھے ان کپڑوں اور ان سے تیار کردہ خلعتوں کا شمار قیمتی تحائف میں کیا جاتا تھا۔

منصور کے عہد میں فوج کو وسعت دی گئی، ان کی فوج آٹھ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں دو لاکھ سوار اور چھ لاکھ پیدل سپاہی شامل تھے۔ فوجیوں کی اس کثیر تعداد کے پیشِ نظر منصور نے قرطبہ سے باہر الگ چھاؤنی تعمیر کروائی تھی جس میں گھوڑوں کے لیے اچھے اصطبل بھی تھے۔ منصور گھوڑوں کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور اپنے ماتحتوں سے گھوڑوں کی خوراک وغیرہ کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے تھے۔ منصور فوجی قواعد و ضوابط کی پابندی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فوج میں مثالی نظم و ضبط پایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ماتحتوں کے لیے حد درجہ شفیق بھی تھے چنانچہ ان کے سپاہی ان پر جان چھڑکتے تھے۔

تاریخ ہمیشہ ایسے حکمرانوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کرتی ہے جنہوں نے اپنی ذات کو بنانے سنوارنے کی بجائے اپنی رعیت کو بنانے سنوارنے پر توجہ دی، اپنی بھاری ذمہ داریوں کو احسن طریقے پر پورا کرنے کی کوشش کی اور جن کی ذات سے خیر و فلاح کے چشمے پھوٹے۔

تاریخ نے محمد بن ابی عامر کا شمار بھی ایسے ہی حکمرانوں میں کیا ہے۔

•••

Marfat.com

عبد المؤمن

دولتِ موحدین کے بانی جنہوں نے وسیع مملکت میں شریعت نافذ کی

گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے!

شہسواروں کے جسموں پر جنگی لباس تھا۔ وہ ایک خاص ترتیب سے اپنے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی بہت بڑا لشکر گزر رہا ہے جو مختلف دستوں میں تقسیم ہے۔ لشکر کے ساتھ بہت سا سازوسامان بھی تھا۔ یہ افریقہ کے طول و عرض کو تسخیر کرنے والے حکمران کا لشکر تھا جو طرابلس سے سُوس تک اسلامی پرچم لہرانے کے بعد فاتحانہ انداز سے واپس آرہا تھا۔

اس وقت یہ لشکر بطحا اور تلمسان کے درمیان کسی علاقے سے گزر رہا تھا۔ اچانک گھوڑوں کی رفتار کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ وہ ٹھہر گئے۔ لشکر کے سپاہی متعجب تھے کہ اس غیر اہم سے مقام پر رُکنے یا پڑاؤ ڈالنے کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس مقام پر بیر کا ایک بڑا سا درخت تھا، جس کی شاخیں آپس میں الجھی ہوئی تھیں اور جھک کر زمین سے اس طرح جالگی تھیں کہ درمیان میں کشادہ جگہ بن گئی تھی۔

امیر لشکر سرخ وسپید رنگت والے بلند قامت انسان تھے۔ ان کی آنکھیں سیاہ، پلکیں لمبی، ناک بلند اور ڈاڑھی خوب بھری ہوئی تھی۔ سپاہی منتظر تھے کہ امیرِ لشکر کوچ کرنے کا حکم کب دیتے ہیں لیکن انہوں نے حیرت اور تعجب کے ساتھ سنا کہ امیر لشکر بیر کے درخت کے نیچے کشادہ جگہ پر اپنا خیمہ لگانے کا حکم دے رہے تھے۔

جب خیمہ لگ چکا تو امیر لشکر نے پوچھا "تم لوگ جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں ٹھہرا ہوں؟"

"نہیں، ہم نہیں جانتے۔" جواب ملا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ" امیر لشکر کہہ رہے تھے، "ایک بار میں رات کے وقت یہاں سے گزر رہا تھا، میرے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا، مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اور تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں نے اس درخت کے نیچے پناہ لی تھی۔ رات بھر بارش ہوتی رہی اور میں اس درخت کے نیچے پناہ لیے رہا۔ آج اللہ نے مجھے اتنے بڑے علاقے پر غلبہ عطا فرمایا ہے۔ میں یہاں اس لیے ٹھہرا ہوں کہ اپنی دونوں حالتوں کے درمیان فرق پر اللہ کا شکر ادا کروں۔"

یہ کہہ کر امیر لشکر اٹھے اور انہوں نے وضو کر کے شکرانے کی نماز ادا کی۔ امیر لشکر کی نمازِ شکرانہ کے بعد لشکر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس لشکر کے امیر تھے عبد المومن بن علی جنہوں نے شمالی افریقہ میں اتنی بڑی اسلامی حکومت قائم کی جو نہ اس سے پہلے قائم ہوئی نہ اس کے بعد ایسی وسیع سلطنت کسی مسلمان حکمران کی قلمرو میں رہی۔ انہوں نے افریقہ کو مسیحی قوتوں کی جارحیت سے نجات دلائی اور اس غرض سے زبردست جہاد کیا۔

عبد المومن ۴۸۷ھ / ۱۰۹۳ء میں تلمسان کے ایک نواحی گاؤں تاجرہ میں پیدا ہوئے۔ تلمسان، موجودہ الجزائر کا ایک شہر ہے اور اس کے معنی ہیں "چشموں کا شہر۔" قدیم شہر موجودہ شہر سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ شہر پرانے زمانے میں اغادیر اور پوماریا (باغ ہائے میوہ) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

عبد المومن کا تعلق ایک بربر قبیلے 'الکومیہ' سے تھا۔ خیال ہے کہ بربر نسل کے لوگ دراصل سامی عرب ہیں جو ہزاروں سال قبل مصر کے راستے شمالی افریقہ پہنچے تھے۔ عبد المومن کے والد علی بن علوی کوزے (پیالے) بنانے کا کام کرتے تھے۔ ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی۔ علامہ ابن خلکان نے اس دور کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جب عبد المومن بہت کمسن تھے۔ ایک دن وہ سو رہے تھے کہ بے شمار شہد کی

Marfat.com

مکھیاں آئیں اور سوتے ہوئے ننھے عبدالمومن کے جسم پر بیٹھ گئیں۔ ان مکھیوں کی تعداد اس قدر تھی کہ عبدالمومن کا جسم نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ عبدالمومن کے والدین شہد کی مکھیوں کو دیکھ کر خوف کے مارے چیخ اٹھے۔ ان کے لبوں پر یہی دعا تھی کہ رب العالمین ان کے بچے کو محفوظ رکھے۔ اتنی بڑی تعداد میں شہد کی مکھیوں کے کاٹنے کے بعد وہ اپنے بچے کی زندگی کے بارے میں ناامید ہو چلے تھے، لیکن وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ مکھیاں تھوڑی دیر بعد اڑ گئیں۔ ننھے عبدالمومن کو دیکھا تو وہ پہلے کی طرح سکون سے سو رہے تھے۔ ان کے والد نے بے تابانہ، اپنے بچے کو جگایا تو وہ بالکل خیریت سے تھے، مکھیوں نے انہیں ذرا سی بھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ علی یہ دیکھ کر دوڑتے ہوئے اپنے پڑوس میں مقیم ایک بڑے عالم دین کے پاس پہنچے اور انہیں سارا واقعہ سنایا۔ عالم دین نے سارا واقعہ سننے کے بعد کہا: "تمہارا بچہ کسی دن بڑے مرتبے پر پہنچے گا اور اہل مغرب اس کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہوں گے۔" عالم دین کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ صرف چالیس سال بعد عبدالمومن ایک وسیع اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے، جس کے پھریرے موجودہ مراکش، اسپین، شمالی افریقہ، الجزائر، تیونس، لیبیا اور مصر تک لہرا رہے تھے۔

عبدالمومن کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنی علم کی پیاس چشموں کے شہر تلمسان سے بجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے شوقِ طلب نے مجبور کیا کہ وہ دور دراز کے بڑے شہروں میں جا کر تحصیل علم کریں۔ چنانچہ وہ کمسنی ہی میں اپنے چچا یعلو کے ساتھ تاجرہ سے چل پڑے تاکہ کسی بڑے شہر جا کر علم و عرفان کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کر سکیں۔

موجودہ الجزائر کے شہر الجزیرہ سے ۱۷۵ کلو میٹر دور جبل جورایہ کی سب سے نیچی ڈھلانوں پر ایک شہر بجایہ واقع ہے۔ عبدالمومن نے جستجوئے علم میں اپنا مبارک سفر شروع کیا تو راستے میں بجایہ کا شہر آیا۔ عبدالمومن بجایہ کے نواح میں ایک گاؤں ملالہ میں مختصر مدت کے لیے ٹھہر گئے۔ ایک دن وہ ملالہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک بزرگ نظر آئے۔ ہلکی گندمی رنگت والے خوش رو بزرگ کا قد میانہ تھا اور ان کے ہاتھ پر ایک سیاہ تل تھا۔ بزرگ نے عبدالمومن کو دیکھا تو چونک پڑے۔ انہوں نے اس نو عمر لڑکے کے چہرے پر ذہانت اور فطانت کے آثار دیکھے اور اس کے روشن چہرے سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس لڑکے کو روک کر بے حد میٹھے لہجے میں سلام کیا اور پوچھا:

"میاں، تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا: "عبدالمومن۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"تاجرہ کا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"علم حاصل کرنے مشرقی ملکوں کی طرف جا رہا ہوں۔"

بزرگ عبدالمومن کو ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے۔

"اگر میں تمہیں اس سے اچھی بات بتاؤں تو کیسا رہے گا؟"

"وہ کیا ہے؟"

"دنیا اور آخرت کا شرف۔" بزرگ کہہ رہے تھے، "منکرات کی بربادی، بدعتوں کو غارت کرنے کے لیے اور علم کے احیاء کے لیے میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اس میں میری مدد کرو۔ تم جو علم پڑھنا چاہتے ہو میں تمہیں فراہم کروں گا۔ اللہ نے تمہارے مقدر میں علم، دولت، حکومت ہر شے لکھی ہے۔"

عبدالمومن حیرانی کے ساتھ یہ باتیں سنتے رہے، بالآخر انہوں نے بزرگ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح قدرت نے عبدالمومن کے لیے علم و ہدایت اور جہاں بانی کی راہ ہموار کی۔ یہ انہی بزرگ کی زبردست تربیت کا حاصل تھا کہ عبدالمومن دینی اور دنیاوی علوم کے زبردست عالم بنے۔ ساتھ ہی انہیں جنگی فنون، سیاست اور حکمرانی میں مثالی مہارت حاصل ہو گئی۔

یہ بزرگ محمدؒ بن عبداللہ تھے جو ابن تُومرت کے نام سے مشہور ہیں۔ عبدالمومن نے جس اسلامی تحریک کو آگے بڑھایا اس کی بنا دراصل ابنِ تومرت نے ہی ڈالی تھی۔ آپ مراکش کے بہت بڑے مصلح تھے، انہوں نے جو تحریک شروع کی وہ موحدین کی تحریک کہلاتی ہے، اس جماعت نے مراکش اور افریقہ کے دیگر حصوں میں جو اسلامی حکومت قائم کی اسے دولتِ موحدین کا نام دیا جاتا ہے۔ چونکہ موحدین چند قبائل کا مجموعہ تھے اور یہ قبائل المصامدہ کہلاتے تھے، اس لیے دولت موحدین کو دولتِ مصامدہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

موحدین، خالص توحید کی دعوت پیش کرتے تھے اسی لیے انہیں "موحدین" کہا جاتا ہے۔ ان کے حکمران خلفائے راشدینؓ کے نقش

Marfat.com

قدم پر چلنا پسند کرتے تھے اور حکومت کرنے کے لیے قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

عبدالمومن نے جس دور میں موحدین کی قیادت سنبھالی، کم و بیش یہی وہ دور تھا جب مشرق میں نور الدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ مسیحی طاقتوں کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ اس لحاظ سے عبدالمومن کا بھی مسلمانوں پر عظیم احسان ہے کہ ایک طرف نورالدین زنگیؒ نے مشرق میں مسیحی حکومتوں کا قلع قمع کیا اور دوسری طرف عبدالمومن نے تونس (تیونس) اور طرابلس کو فتح کر کے مغرب میں عیسائیوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی پھر انہوں نے اندلس میں مسیحیوں کی راہیں مسدود کر دیں۔ ان کا یہ کارنامہ بلاشبہ سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ابنِ تُومرت نے اپنی زندگی میں تینمل کے پہاڑی علاقے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی شہروں اور قلعوں کو فتح کر لیا تھا اور ان تمام علاقوں میں اسلامی شریعت نافذ کر دی تھی۔ اس طرح خاصے بڑے حصے پر موحدین کو اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ عبدالمومن پر موحدین کی قیادت کی ذمہ داری آپڑی تو انہوں نے مراکش کے بقیہ حصوں کی جانب توجہ دی۔ پہلے انہوں نے سوسہ اور درہ (وادی درعہ) پر حملہ کیا پھر شمالی افریقہ کے قلعوں کو مسخر کیا۔ اور شمال مشرق میں دمنہ اور دائی کے شہر فتح کیے۔ ۵۳۴ھ/۱۱۴۰ء میں وسطی اطلس اور تافیلالت کے نخلستانوں پر بھی موحدین کے پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کے بعد شمالی مراکش کے پہاڑی علاقے جبلہ میں فوجی مراکز قائم ہوئے اور تازا کے قلعے فتح ہوئے۔ عبدالمومن نے بحیرۂ روم کے علاقوں، وادی لاو، بادس، نکوز، ملیلہ اور شمالی وہران کے قبائل سے اپنی تحریک کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، جس کے بعد وہ ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے گاؤں تاجرہ واپس آئے۔

اب تک عبدالمومن کی فوجیں چھاپہ مار جنگ کا طریقہ اپنائے ہوئے تھیں لیکن اب انہوں نے کھلے میدانوں میں اتر کر مقابلے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پہلے وجدہ پھر اجر سیف کو فتح کیا اور ۵۴۰ھ/۱۱۴۶ء میں نو ماہ کے محاصرے کے بعد شمالی مراکش کے صدر مقام فاس پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی کے بعد مکناسہ اور سلا بھی مطیع ہو گئے۔ ۵۴۱ھ/۱۱۴۷ء میں عبدالمومن دارالحکومت مراکش بھی فتح کر چکے تھے۔

اس زمانے میں مسیحی طاقتوں کی نظریں افریقہ پر لگی ہوئی تھیں۔ الفانسو ہشتم نے 'شہنشاہ' کا لقب اختیار کرنے کے بعد قرطبہ، سیول اور کارمون میں قتل و غارت گری شروع کر دی تھی۔ نکیرس کو آگ لگائی تھی اور وادی عاش میں لوٹ مار کی تھی۔ جمین، بیزہ، عبیدہ اور اندوجار کے سرسبز و شاداب علاقے اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ تھے اور صقلیہ (سسلی) کے بادشاہ راجر ثانی کی قیادت میں نارمن عیسائی افریقہ کی اہم بندرگاہوں میں قدم جما رہے تھے۔

عبدالمومن نے مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے اس خطرے کو محسوس کیا اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف بھرپور جہاد کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے ۵۴۶ھ/۱۱۵۳ء میں سلا کے مقام پر اپنی فوج کو منظم کیا اور مشرق کی طرف پوری قوت سے پیش قدمی کر کے الجزائر، بجایہ اور قلعۂ بنو حماد قبضے میں لے لیے۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے ایک تجربہ کار جرنیل سردار ابو عمرو موسیٰ بن سعید کی سرکردگی میں تیس ہزار مجاہدین کا لشکر اندلس روانہ کیا۔ اس لشکر نے پہلے جزیرہ طریف پر قبضہ کیا، پھر زبردست حملہ کر کے قرطبہ، اشبیلیہ، قرمونہ اور غرناطہ فتح کر لیا۔ کچھ عرصے بعد عبدالمومن نے اپنے بیٹے ابو سعید کو بھی ایک فوج کی کمان دے کر اندلس بھیجا۔ انہوں نے المیریا بطلیوس اور دیگر علاقے فتح کیے۔

موحدین نے اس اثنا میں شریش، لبلہ، شلب اور مرتلہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں المریہ کا شہر بھی عیسائیوں سے چھن گیا۔ اب عبدالمومن نے خود آبنائے جبل الطارق کو عبور کیا۔ اندلس کی تمام آبادی نے ان کی اطاعت کا وعدہ کیا۔ پھر عبدالمومن نے مسیحی قوتوں پر ایسی طاقت ور ضربیں لگائیں کہ ان کے لیے اپنے اپنے علاقوں میں سر چھپا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ طلیطلہ کے حکمراں الفانسو کو عبرتناک شکست ہوئی۔ اس طرح چند ہی برس میں پورے اسلامی اندلس پر عبدالمومن کی حکمرانی قائم ہو گئی۔

اندلس اور مراکش کو زیر نگیں لانے کے بعد عبدالمومن نے مشرق کی جانب توجہ دی۔ بڑی فوج کی قیادت یحییٰ بن عبدالعزیز کے حوالے کی۔ ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں انہوں نے تونس (تیونس) پر حملہ کر دیا اور نارمن عیسائیوں کو وہاں سے نکال پھینکا۔ نارمنوں نے ۴۸۴ھ/۱۰۹۰ء میں صقلیہ (سسلی) پر قبضہ کر لیا تھا جہاں مسلمان تین سو سال تک حکمراں رہے تھے۔ صقلیہ کے بعد نارمنوں نے آہستہ آہستہ شمالی مراکش کے مختلف مقامات پر غلبہ حاصل کر لیا

Marfat.com

اور ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء تک وہ برشک، سفاقص، بجایہ، طرابلس، قابس اور مہدیہ پر قابض ہو چکے تھے۔ ان علاقوں کی مسلمان آبادی نارمنوں سے نفرت کرتی تھی لیکن ان کے خلاف طاقت کے استعمال پر قادر نہ تھی۔ عبدالمومن نے جب مختلف علاقوں کو نارمنوں سے واپس لینا شروع کیا اور مسیحی طاقتوں کو کچلنے کے اقدامات کیے تو شمالی افریقہ کے مسلمانوں میں بھی جوش و جذبہ کی نئی لہر دوڑ گئی۔

سفاقص، تونس کے مشرقی ساحل پر واقع ایک شہر تھا۔ یہ شہر زیتون کی کاشت کا بڑا مرکز تھا۔ مسلمانوں کے جہاز یہاں سے زیتون اٹلی کو برآمد کیا کرتے تھے۔ یہ شہر پارچہ بافی کی صنعت کے لیے بھی مشہور تھا۔ نارمنوں نے جب اس شہر پر قبضہ کیا تو انہوں نے ایک مسلمان عمر بن حسین کو یہاں کا والی (گورنر) مقرر کیا تھا لیکن انہوں نے شرارت یہ کی کہ عمر بن حسین کو اپنا مطیع رکھنے کی خاطر ان کے والد حسین کو صقلیہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔ حسین ایک درد مند اور سچے مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے عمر کو خفیہ طور پر پیغام بھیجا کہ تم میری زندگی کی پروا مت کرو اور نارمنوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کچھ کر گزرو۔

باپ کی یہ نصیحت بیٹے کے دل میں اتر گئی۔ ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء میں عمر بن حسین نے نارمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ پہلے تو انہوں نے لوٹ مار کرنے والے نارمنوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا، پھر سفاقص کے قلعے پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔ نارمنوں کے حکمران کو خبر ملی تو اس نے غضب ناک ہو کر ایک بے حد سخت خط عمر بن حسین کو روانہ کیا۔ جو قاصد یہ خط لے کر عمر بن حسین کے پاس پہنچا تھا، عمر نے اسی کے ہاتھ یہ جواب بھجوایا:

"میں نے سفاقص کی آزادی پر اپنے والد کو قربان کر دیا ہے۔ صقلیہ کے شاہ کو بتا دو۔"

قاصد نے واپس جا کر شاہ صقلیہ کو خط کا جواب پہنچایا تو شاہ غصے کے مارے کانپنے لگا۔ اس نے عمر کے والد حسین کو پھانسی دینے کا حکم صادر کر دیا۔ حسین کو پھانسی دے دی گئی، لیکن اس مجاہد کی شہادت نے افریقہ کے مسلمانوں میں نئی روح پھونک دی۔ خاکستر میں دبی چنگاریاں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ سفاقص، طرابلس، قابس ہر جگہ نارمنوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے لگے۔ عمر نے سفاقص سے نارمنوں کو نکال باہر کیا۔ ابو یحییٰ بن مطروح نے طرابلس میں آزادی کا اعلان کر دیا اور نارمنوں کو مار بھگایا، ادھر قابس میں محمد بن رشید نے نارمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ چند ماہ بعد عبدالمومن نے بجایہ اور بونہ پر حملہ کر کے شمالی افریقہ میں نارمنوں کے رہے سہے اقتدار کا بھی خاتمہ کر دیا۔

شمالی افریقہ میں مسیحیت کے خلاف مسلمانوں کی بیداری دیکھ کر زویلہ کے مسلمانوں نے بھی نارمنوں کے خلاف پرچم بغاوت بلند کیا۔ لیکن نارمنوں کی طاقت زیادہ تھی۔ انہوں نے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ چند مسلمان جان بچا کر عبدالمومن کے پاس پہنچے اور پورے واقعات کہہ سنائے۔ عبدالمومن نارمنوں کے لرزہ خیز مظالم کے واقعات سن کر رو پڑے۔ انہوں نے اسی وقت نارمنوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ اس زمانے میں نارمنوں کا سب سے مضبوط مرکز مہدیہ تھا۔ صفر ۵۵۴ھ / ۱۱۵۹ء میں عبدالمومن نے ایک لاکھ مجاہدین کی فوج منظم کی اور مہدیہ کا رخ کیا۔ پہلے زویلہ کو فتح کیا، اس کے بعد بحری، اور بری دونوں جانب سے مہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران سفاقص، طرابلس، جبال نفوسہ، قابس اور قفصہ نے بھی عبدالمومن کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔

شعبان کے آخر میں صقلیہ کے نارمن بادشاہ نے مہدیہ کے نارمن حکمرانوں کی مدد کے لیے ۱۵۰ جنگی جہازوں کا بیڑا روانہ کیا، لیکن عبدالمومن کے طاقتور جنگی بیڑے کے آگے نارمن جہازوں کی ایک نہ چلی اور انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ رنگ دیکھ کر مہدیہ میں محصور نارمنوں نے عبدالمومن سے امان طلب کی۔ عبدالمومن نے اسلامی طریقے کے مطابق انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ نارمنوں نے یہ دعوت تو قبول نہیں کی لیکن گڑگڑا کر درخواست کرتے رہے کہ ان کی جان بخش دی جائے۔ آخر عبدالمومن کو ان پر ترس آ گیا، انہوں نے نارمنوں کو ہلاک تو نہیں کیا لیکن شہر چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔

نارمن بہت سی کشتیوں میں سوار ہو کر مہدیہ سے روانہ ہو گئے، لیکن ہزاروں بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون ان کے سر تھا اور قانونِ قدرت کا تقاضا تھا کہ انہیں اپنے کیے کی سزا ملے۔ جب ان کی کشتیاں کھلے سمندر میں پہنچیں تو زبردست طوفان آیا اور تمام کشتیاں طوفانی موجوں کا نوالہ بن گئیں۔ اس طرح زمین پر اکڑ کر چلنے والے اور مخلوقِ خدا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے نیست و نابود

Marfat.com

ہو گئے۔ ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء میں عبدالمومن فاتحانہ شان سے مہدیہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے حسن بن علی صنہاجی کو مہدیہ کا والی مقرر کیا۔ اور پورے شمالی افریقہ کو نارمنوں سے نجات دلانے کے بعد واپس مراکش چلے گئے۔ اب مصر سے لے کر پورے ساحل اوقیانوس اور اندلس پر موحدین کی حکمرانی تھی۔

اس کے بعد عبدالمومن نے ایک بہت بڑے جہاد کا اعلان کیا۔ کچھ عرصے قبل تک یورپی اقوام مسلمانوں پر حملہ آور ہوتی رہی تھیں۔ اب عبدالمومن نے خود یورپ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاد کی زبردست تیاریاں کی گئیں۔ چار سو جنگی جہاز تعمیر ہوئے۔ پانچ لاکھ مجاہدین جمع کر لیے گئے۔ ان میں تین لاکھ دس ہزار سوار تھے لیکن ابھی یہ فوج روانہ نہ ہونے پائی تھی کہ عبدالمومن کو علالت نے آگھیرا اور جمادی الآخر ۵۵۸ھ/ مئی ۱۱۶۳ء میں اس عظیم حکمران نے اپنا سفر حیات تمام کیا۔ مسلمان مورخین کا کہنا ہے کہ اگر عبدالمومن کی زندگی کے دن پورے نہ ہوتے تو شاید یورپ کے بہت بڑے حصے پر مسلمان قابض ہو چکے ہوتے۔

عبدالمومن ایک بلند پایہ عالم تھے۔ ان کے استاذ ابن تُومرت نے ان کی خصوصی تربیت کی تھی۔ وہ انہیں بہت پسند کرتے تھے اور انہیں دیکھ کر اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے جس کا مفہوم ہے:

”تجھ میں تمام اخلاق پایہ کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ ہم تجھ سے خوش ہیں اور تجھ پر رشک کرتے ہیں، تیرے دانت خنداں ہیں، تیرے ہاتھ سخی ہیں، سینہ چوڑا اور چہرہ شگفتہ ہے۔“

علم سے گہری دلچسپی ہی کی وجہ سے عبدالمومن نے عالموں اور اہل کمال کی بہت پذیرائی کی۔ ان کی مجلس میں اہل علم موجود رہتے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر اندلس میں علم کو عام کیا۔ مراکش میں بھی کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اس دور کے مشہور فلسفی ابن طفیل (وفات: ۵۸۰ھ) اور اس زمانے کے سب سے بڑے طبیب عبدالملک بن زہران کے مشیروں میں شامل تھے۔ ان کے مشیروں میں ایک ذہین اور قابل شخص ابو جعفر احمد ابن عطیہ بھی تھے۔ یہ ادب اور انشا کی تمام اصناف میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے دیگر لائق کاتبوں میں ابوالقاسم عبدالرحمن قالمی اور ابو محمد عیاش بن عبدالملک قرطبی شامل تھے۔

عبدالمومن بے حد جری، بے خوف اور نڈر حکمران تھے۔ جنگوں میں وہ ہمیشہ اگلی صفوں میں موجود رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بیسیوں جنگیں لڑیں لیکن ایک لڑائی کے سوا تمام میں فتح حاصل کی۔ قدرت نے انہیں ذہانت، تدبر، معاملہ فہمی اور دور اندیشی جیسے اوصاف عطا کیے تھے۔ وہ مجاہدانہ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے اور عیش و عشرت اور فضولیات سے دور رہتے تھے۔ عبدالمومن کے ایک وزیر ابو جعفر ایک بار ان کے پاس پہنچے۔ عبدالمومن باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باغ بہت خوبصورت تھا اور طرح طرح کے رنگین اور خوشبودار پھولوں سے مہک رہا تھا، خوش الحان پرندے پھدکتے پھرتے تھے۔ ابو جعفر اس منظر کے حسن سے مسحور ہو گئے اور محویت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ عبدالمومن نے پوچھا ”ابو جعفر کیا دیکھ رہے ہو؟“ ابو جعفر نے کہا ”میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں، یہ بہت خوبصورت ہے۔“ عبدالمومن یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ دو تین روز بعد انہوں نے فوج کو معائنہ کے لیے پیش ہونے کا حکم دیا۔ وزیر ابو جعفر بھی ساتھ تھے۔ عبدالمومن ان کے ساتھ ایک بلند مقام پر بیٹھ گئے، فوج سامنے سے گزرنے لگی۔ ہر آنے والا دستہ اپنے سے پہلے گزرنے والے دستے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ہر دستے کا اسلحہ پہلے دستے کے مقابلے میں زیادہ موزوں، اس کے گھوڑے زیادہ تندرست، جوان اور زیادہ طاقت ور محسوس ہوتے تھے۔ جب فوج سامنے سے گزر چکی تو عبدالمومن نے ابو جعفر سے کہا ”ابو جعفر، دیکھو یہ منظر عمدہ ہے یا تمہارے پھول اور پھل؟“

مورخین کا کہنا ہے کہ عبدالمومن نے اپنی حکومت کو خلافت راشدہ کے انداز پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہ ہر مذہب کے لوگوں سے انصاف کا برتاؤ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کو بڑے اچھے خطوط پر منظم کیا۔ ان کے دور میں حکومت کے نو بڑے شعبے تھے۔ یعنی وزارت، حجابت، کتابت، قضا (عدلیہ)، احتساب و امانت، مالیات، فوج، تعلیم، رفاہ عامہ و تعمیرات۔

سربراہ مملکت کے بعد وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ملک کے تمام انتظام کی ذمے داری اسی پر تھی۔ صوبوں میں والی (گورنر) مقرر تھے۔ شکایات اور ضروریات سربراہ مملکت تک پہنچانے کے انتظامات کے لیے جو افسر مامور ہوتا تھا اسے حاجب کہا جاتا تھا اور اس کا شعبہ حجابت کہلاتا تھا۔ عہدیداروں اور دوسری حکومتوں سے مراسلت کرنے کے لیے شعبہ کتابت قائم تھا، اس شعبے کے افسر کو کاتب کہا جاتا تھا، جو بہت لائق اور عالم شخص ہوتا تھا۔ آج کل اس طرح کے

Marfat.com

عہدے کو سیکریٹری امورِ خارجہ کہا جاسکتا ہے۔ عام خط و کتابت کے لیے کاتب انشا مقرر تھا اور فوج سے متعلق خط و کتابت کرنے کے لیے جو افسر مقرر تھا اسے کاتب الجیش کا نام دیا گیا تھا۔

محکمۂ قضا کا سربراہِ اعلیٰ خود حکمرانِ وقت ہوتا تھا، لیکن خود اس کی ذات بھی احتساب سے بالاتر نہ تھی۔ تمام شہروں میں محتسب مقرر تھے، ان کا تعلق محکمۂ احتساب سے تھا۔ وہ "امین" کہلاتے تھے۔ امین اشیا کے نرخوں پر نظر رکھتے تھے۔ کم تولنے والوں یا زیادہ قیمت وصول کرنے والوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ ظلم و زیادتی اور جانوروں سے بے رحمی کے سلوک کی روک تھام کرتے تھے۔ شعبۂ مالیات کی نگرانی وزیر کرتا تھا۔ عبدالمومن نے افواج کو بھی بے حد منظم کر دیا تھا۔ انہوں نے مہدیہ میں اپنے بحری بیڑے کے لیے ایک دارالصناعہ بھی تعمیر کروایا تھا اور حلق الوادی، طنجہ، سبتہ، بادیس اور مہدیہ کی بندرگاہوں میں چار سو جہاز تیار کروائے تھے۔

عبدالمومن نے جب اپنی افریقی مہم (۵۵۴ھ تا ۵۵۵ھ / ۱۱۵۹ء تا ۱۱۶۰ء) مکمل کی تو اپنے بیٹے یوسف کو، جو اشبیلیہ کے عامل تھے، حکم دیا کہ جبل الطارق میں نیا شہر تعمیر کریں۔ چنانچہ یوسف نے اشبیلیہ اور ان کے بھائی عثمان نے غرناطہ میں ماہر کاریگر اور ساز و سامان جمع کیا۔ اس کام کی نگرانی معمار الحدیدی، کے سپرد کی گئی۔ عبدالمومن ذوالعقدہ ۵۵۵ھ / نومبر ۱۱۶۰ء میں جبل الطارق پہنچے، نئے شہر کا معائنہ کیا اور اس کا نام "مدینۃ الفتح" رکھا۔

عبدالمومن نے تلمسان کا نیا قصبہ بھی تعمیر کروایا اور مکناسہ (مراکش کا شہر جو رباط سے ۸۰ میل مشرق میں ہے) کو از سرِ نو تعمیر کروایا۔ انہوں نے پوری مملکت میں جامع مساجد، قلعوں اور فصیلوں کی مرمت کروائی۔ خشک سالی پر قابو پانے کے لیے چھت دار نہریں (کاریز) تعمیر کروائیں۔ انہوں نے پورے افریقہ اور مغربی شہروں میں زمین کی پیمائش کروائی اور اس کے مطابق خراج، عشر اور مالیہ وغیرہ کا تعین کیا۔ انہوں نے مراکش میں ایک عظیم الشان مسجد "جامع الکتبیین" بھی تعمیر کروائی۔

عبدالمومن نے اپنی ۵۸ سال کی مختصر زندگی میں جو کارنامے انجام دیے وہ انہیں تاریخ میں زندۂ جاوید بنانے کے لیے کافی ہیں۔ انہوں نے حکمرانی ورثے میں حاصل نہیں کی بلکہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور قوتِ ایمانی کے بل پر مقام بلند پایا۔ مسلمانوں کو مسیحیت کی یلغار سے نجات دلانے کے لیے انہوں نے جہادِ عظیم کیا، امتِ مسلمہ ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

•••

Marfat.com

یعقوب المنصور باللہؒ

دشمنوں کی چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے والے قابلِ فخر جرنیل

شہر کے محاصرے کو کئی روز گزر چکے تھے۔

ابھی تک قلعہ بند دشمن ہتھیار ڈالنے پر مائل نظر نہیں آتا تھا۔ رسد کے تمام راستے بند کیے جا چکے تھے، لیکن شہر کی فصیلوں کے اندر محصور فوج غالباً خوراک کا بہت بڑا ذخیرہ پہلے ہی جمع کر چکی تھی۔ شہر پر روز حملے ہو رہے تھے لیکن فصیل اس قدر مضبوط تھی کہ ابھی تک اس مستحکم دفاعی حصار کو توڑا نہ جا سکا تھا۔ آخر حکم دے دیا گیا کہ منجنیقیں اور قلعہ شکن توپیں حرکت میں لائی جائیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور جلد ہی منجنیقوں سے نکلنے والے بھاری پتھروں نے شہر کی مضبوط فصیل میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیے۔ دشمن اب مایوس ہو چکا تھا، اس کی واضح علامت یہ تھی کہ اس نے اپنے تمام پرچم سرنگوں کر دیے تھے۔ لڑائی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

اچانک چند خواتین شہر کے دروازے سے نکل کر آگے بڑھتی نظر آئیں۔ ان خواتین کی قیادت ایک بوڑھی عورت کر رہی تھی۔ خواتین نے حملہ آور فوج کے امیر کی بابت پوچھا۔ انہیں امیر لشکر کے پاس لے جایا گیا۔ امیر لشکر میانہ قد کی وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور ان کے خوبصورت چہرے پر ڈاڑھی نہایت سج رہی تھی۔ ان کی سرمگیں آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت کے آثار تھے۔ انہوں نے قدرے بلند آواز اور نہایت شستہ الفاظ میں خواتین سے ان کی آمد کا مقصد پوچھا۔ خواتین کے اس وفد کی قیادت کرنے والی بوڑھی عورت یوں گویا ہوئی: "اے بادشاہِ بلند اقبال، اس چراغِ سحری کی التجا ہے کہ میرے بیٹے اور اہلِ شہر کی جان بخشی کر دیجیے۔"

امیر لشکر کو بتایا گیا کہ یہ بوڑھی خاتون، طلیطلہ شہر میں محصور عیسائی حکمران الفانسو ہشتم کی ماں ہیں۔ ان کے ساتھ الفانسو کی بیوی اور بیٹیاں ہیں اور یہ اپنے بیٹے، اہلِ خاندان اور شہریوں کی زندگیوں کی بھیک مانگنے آئی ہیں۔

امیر لشکر کی نظروں کے سامنے وہ تمام مناظر گھوم گئے جب الفانسو نے جنگ میں شکست کھانے کے بعد عاجزی سے صلح کی درخواست کی تھی۔ پانچ سالہ معاہدۂ صلح کی مدت ختم ہوتے ہی اس نے اشبیلیہ اور دیگر علاقوں میں بے گناہ مسلمان شہریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے تھے۔ پھر ایک زبردست جنگ میں عبرتناک شکست کھانے کے بعد بھی اس کے غیظ و غضب کی آگ ٹھنڈی نہ پڑی تھی اور اس نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں کر لی تھیں — اور آج اسی الفانسو کی بوڑھی ماں جس نے پہلے کبھی شاہی محل سے باہر قدم نہ نکالا تھا، مسلمانوں کے امیر کے سامنے آ کر اپنے بیٹے کی جان بخشی کی التجا کر رہی تھی۔

امیر لشکر سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے بارعب آواز میں حکم دیا کہ خواتین کے ساتھ بے حد عزت و احترام کا سلوک کیا جائے۔ انہیں قیمتی زیورات، جواہرات اور اعلیٰ تحائف پیش کیے جائیں اور انہیں تکریم کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

چند ساعتوں کے بعد اسلامی لشکر کے سپاہی حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ خبر سن رہے تھے کہ امیر لشکر نے طلیطلہ فتح ہونے کے باوجود شہر کو الفانسو ہی کے حوالے کر دیا ہے۔

یہ ایک عظیم مسلمان جرنیل ہی کا ظرف تھا کہ اس نے اپنے بدترین دشمن کو ایسے لمحات میں نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اسے اس کا شہر بھی لوٹا دیا، جب وہ بالکل ذلیل و خوار ہو کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔

Marfat.com

یہ عظیم مسلمان جرنیل تھے، دولتِ موحدین کے تیسرے خلیفہ ابو یوسف یعقوب المنصور باللہ جن کی مضبوط قیادت نے مسلمانوں کو مسیحی دنیا کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی۔ ایک مستحکم اسلامی مملکت قائم کی جس میں عدل و انصاف کا بول بالا تھا، خوشحالی کا راج تھا اور یہ سرزمین علم کا بڑا مرکز تھی۔

آپ کا نام یعقوب، کنیت ابو یوسف اور لقب المنصور باللہ ہے۔ آپ کی ولادت ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں مراکش میں ہوئی۔ اس وقت تک آپ کے والد ابو یعقوب یوسف اور دادا عبدالمومن بقید حیات تھے۔ آپ کی والدہ ایک رومی خاتون تھیں اور ان کا نام ساحرہ تھا۔

یعقوب المنصور کے والد ابو یعقوب یوسف اور دادا عبدالمومن دونوں بڑے عالم تھے چنانچہ ان کا علم آپ تک بھی منتقل ہوا۔ مؤرخین نے آپ کے بچپن کے حالات نہیں لکھے لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے والد اور دادا نے آپ کی بہت اعلیٰ تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا تھا، کیونکہ خلیفہ بننے کے بعد یعقوب المنصور نے علم کی بھرپور سرپرستی کی۔ انہیں قرآن و حدیث سے خصوصی لگاؤ تھا اور وہ قرآنِ پاک اور احادیث کے بڑے حصے کے حافظ تھے۔ جب ان کے دادا عبدالمومن نے اندلس پر حکومت قائم کی۔ تو انہوں نے اپنے بیٹے یوسف کو اشبیلیہ کا والی (گورنر) بنا دیا تھا۔ خیال ہے کہ یعقوب المنصور نے اپنے بچپن کا کچھ عرصہ اندلس میں اپنے والدِ محترم کے پاس گزارا اور اس دوران میں اندلس کے بلند پایہ علما کرام نے یعقوب کی تربیت کی۔

یعقوب المنصور نے جب عالم شباب میں قدم رکھا تو ان کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آگئیں۔ ان کی غیر معمولی ذکاوت، معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان کے والد ابو یعقوب یوسف نے انہیں اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ یعقوب نے یہ ذمہ داری تین سال تک یعنی اپنے والد کے انتقال تک انجام دی۔ اس پوری مدت میں انہوں نے اپنے حُسنِ انتظام سے ہر ایک کو متاثر کیا۔

آپ کو جوانی کے عالم ہی میں مختلف جنگوں میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷ء میں الفانسو ہشتم نے مسلمانوں پر حملہ کر کے کونکہ اور شنت قیلہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری جانب پرتگال کے ولی عہد سینکو نے وادیٔ الکبیر کے زیریں علاقے میں لوٹ مار کی تھی۔ یہ حالات دیکھ کر ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں قشتالیہ اور لیون کی عیسائی ریاستوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔ ابو یعقوب یوسف نے دشمنوں کے ارادے بھانپ کر ایک زبردست فوج تیار کی اور اندلس جا پہنچے۔ اس فوج میں یعقوب بھی شامل تھے، شنترین کے مقام پر لڑی گئی اس جنگ میں یعقوب کے والد ابو یعقوب یوسف بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

ابو یعقوب یوسف کی شہادت کے بعد یعقوب نے یکم جمادی الاول ۵۸۰ھ / ۱۰ اگست ۱۱۸۴ء کو مملکت کی باگ ڈور سنبھالی۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی انہیں مختلف شورشوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے صرف چار سال کے عرصے میں یعنی ۵۸۳ھ کے اواخر تک تمام شورشوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ ۵۸۵ھ میں پرتگال اور قشتالیہ کے عیسائی حکمرانوں نے اسلامی مملکت سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اندلس میں مسلمانوں کے علاقوں میں تباہی مچانے لگے۔ یعقوب کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوری طور پر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس غرض سے انہوں نے اپنے بحری بیڑے کی قوت میں موثر اضافہ کیا اور بری فوج کو بھی کئی اعتبار سے مضبوط بنا دیا۔

ابھی یہ تیاریاں جاری تھیں کہ پرتگال کے بادشاہ سینکو اوّل نے جنوبی ساحلی مقام شلب پر حملہ کر دیا۔ اسے انگلستان کے انتہا پسند صلیبیوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ رجب ۵۸۵ھ / ستمبر ۱۱۸۹ء میں عیسائیوں نے شلب پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ادھر قشتالیہ کے بادشاہ الفانسو ہشتم نے اندلس پر حملہ کر کے القلقہ، وادی آرآ، کلسپرا، رین اور مغاسلہ سمیت کئی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ عیسائیوں کی یلغار شدید تھی، چنانچہ یعقوب کو خود فوج لے کر اندلس جانا پڑا۔

سنہ ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء کے آغاز میں یعقوب نے اندلس پر حملہ کرنے والے عیسائیوں اور صلیبیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور ایک وسیع لشکر اور طاقت ور بحری بیڑے کے ساتھ اندلس کی طرف روانہ ہو گئے۔ پہلے وہ جزیرۂ الخضرا پہنچے۔ پھر وہاں سے شنترین پر چڑھائی کر دی، یہ وہی شہر تھا جس پر حملے میں یعقوب کے والد ابو یعقوب یوسف شہید ہو گئے تھے۔ شنترین پر قبضے کے بعد یعقوب قشتالیہ کے بادشاہ الفانسو ہشتم کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی فوج کو ایسی عبرت ناک شکستیں دیں کہ الفانسو نہایت عاجزی کے ساتھ صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا۔ آخر فریقین کے درمیان پانچ سال کے لیے ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے الفانسو اس بات کا پابند تھا کہ وہ اپنے علاقے سے قدم باہر نہیں نکالے گا اور مسلمانوں پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس کے

Marfat.com

عوض مسلمان بھی اس کے علاقے پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس معاہدے میں یہ حکمت بھی تھی کہ اس طرح یعقوب نے پرتگال کے حکمران سینکو اول کو الفانسو سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔

اب یعقوب نے اپنی فوج ارکش کے مقام پر مجتمع کی اور پرتگالیوں کے تین قلعوں ٹورس نووس، تومر اور شلب پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ ٹورس نووس کا قلعہ تو جلد فتح ہو گیا، لیکن دیگر دو قلعوں کا محاصرہ طویل ہو گیا اور اس اثنا میں مسلمانوں کی فوج ایک وبائی بیماری پھیل جانے کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پرتگالیوں نے باجہ، یبورہ اور دیگر کئی شہروں پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ یعقوب نے قرطبہ کے والی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس فوج نے پرتگالیوں کے دانت کھٹے کر دیے اور باجہ، یبورہ اور شبونہ واپس لے لیے۔ دوسری طرف سے خود یعقوب نے ایک بڑی فوج لے کر دریائے تاجہ کے جنوب میں واقع پرتگالیوں کے کئی شہروں اور قلعوں پر چڑھائی کر دی اور زبردست حملے کر کے قصرابی دانس، پلمۃ اور المعدن کو فتح کر لیا۔ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں وہ شلب کو بھی تسخیر کر چکے تھے۔ ان فتوحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرتگالی کئی سال تک سنبھل نہ سکے۔

یعقوب نے اسلام دشمنوں کے خلاف جہاد میں اپنے ہم عصر مسلمان فرمانرواؤں کے ساتھ بھی تعاون کیا۔ شام اور مصر کے والی، عظیم مسلمان جرنیل صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں بیت المقدس فتح کر لیا تھا۔ یورپ کے مسیحی بادشاہوں نے ان کے خلاف اپنی تمام طاقت جھونک دی تھی۔ صلیبیوں کی اس یلغار کا مقابلہ کرنے کی غرض سے صلاح الدین ایوبی نے خلیفہ یعقوب سے بھی مدد مانگی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۵۸۵ھ/۱۱۸۹ء میں ایک سفارتی وفد ابوالحرث عبدالرحمن بن منقذ کی قیادت میں یعقوب کے پاس بھیجا۔ قرآن مجید کے دو بیش قیمت نسخے اور تحائف وفد کے ساتھ کیے۔ یعقوب نے سفیروں کے ساتھ احترام کا سلوک کیا۔ سفیروں نے صلاح الدین ایوبی کا پیغام پہنچایا کہ ساری مسیحی دنیا نے مل کر ارضِ مقدس (فلسطین) پر حملہ کر دیا ہے اگر آپ اپنے جنگی جہاز مسلمانوں کی امداد کے لیے بھیج دیں اور فلسطینی ساحل کے تحفظ کے سلسلے میں مدد کریں تو صلیبی انتہا پسندوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔"

یعقوب نے پیغام پڑھ کر بہت جلد ایک سو اسی بحری جہازوں کا ایک بیڑا صلاح الدین ایوبی کی مدد کے لیے بھیج دیا۔

سنہ ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء میں مسلمانوں سے پانچ سالہ معاہدے کی میعاد ختم ہو جانے پر الفانسو ہشتم (ادفنش) اپنی سابقہ روش پر اتر آیا اور اس نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں کر کے اشبیلیہ اور مسلمانوں کے دیگر علاقوں پر یلغار کر دی۔ اس کی فوج میں بہت سے صلیبی بھی شامل ہو گئے تھے۔ الفانسو کی فوج نے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ یعقوب کو جوں ہی ان حالات کا علم ہوا، انہوں نے الفانسو کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔

جمادی الآخر ۵۹۱ھ/مئی ۱۱۹۵ء میں انہوں نے اپنی فوج کے ساتھ آبنائے جبل الطارق عبور کی اور اشبیلیہ جا پہنچے۔ پھر انہوں نے موراول کی تنگ گھاٹی کی طرف پیش قدمی کی، جہاں الفانسو کی عیسائی فوج نے مضبوط مورچے بنا رکھے تھے۔ اسلامی لشکر کی آمد کی خبر الفانسو سے پوشیدہ نہ تھی اور اس نے بھی زبردست جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ کہتے ہیں کہ الفانسو نے اس جنگ کو "جنگِ مقدس" قرار دے دیا تھا اور قریبی ممالک کے تمام عیسائی حکمرانوں سے کمک حاصل کر لی تھی۔ بعض مؤرخین کا اندازہ ہے کہ الفانسو کا لشکر چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا جبکہ اس کے مقابل مسلمان فوج میں صرف چالیس ہزار مجاہدین شامل تھے۔

باڈاجوز (بطلیوس کے قریب نہر وادی انا اور پوبلیٹ کے درمیان)
ایک ناہموار میدان تھا یہیں پر ۸ شعبان ۵۹۱ھ/۱۸ جولائی ۱۱۹۵ء کو ایک تاریخی جنگ لڑی گئی جس میں اسلامی فوج نے اللہ تعالیٰ کی نصرت سے اپنے سے کئی گنا بڑی فوج کو عبرتناک شکست دی۔ یہ جنگ جو یعقوب کی فوج اور الفانسو ہشتم کے لشکر کے درمیان لڑی گئی "جنگ الارک" کے نام سے مشہور ہے۔ "الارک" دراصل ایک چھوٹے سے قلعے کا نام تھا جو میدانِ جنگ کے قریب ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ آج کل اس قلعہ کا نام "سانتامار یاداالارکو" ہے۔

اس جنگ کا شمار دنیا کی چند اہم ترین لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ اپنے سے دس گنا بڑی فوج کو مقابل دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ان کے سالار یعقوب بڑے اعتماد کے ساتھ انہیں بتا رہے تھے کہ اگر تم میں ایمان کی قوت ہے اور تمہارا عزم راسخ ہے تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دشمن پر فتح نصیب فرمائیں گے۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل یعقوب اپنے پروردگار سے عاجزی کے ساتھ دعاؤں میں مصروف رہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتے رہے کہ وہ

Marfat.com

بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت طلب کریں۔

عیسائی فوج کے سپاہی طاقت کے نشے میں چور تھے۔ چار لاکھ سپاہیوں کے ٹڈی دل کے سامنے چالیس ہزار مسلمان سپاہیوں پر مشتمل فوج انہیں بہت حقیر اور کمزور محسوس ہوتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی فوج کا کوئی سپاہی یہاں سے بچ کر نہ جاسکے گا۔ اپنی اسی قوت کے گھمنڈ میں انہوں نے انتظار کی زحمت بھی نہ کی اور جوں ہی لشکرِ اسلام کا ہراول دستہ سامنے آیا عیسائی فوج نے اس پر حملہ کر دیا۔ ہراول دستے کی قیادت یعقوب کے وزیر ابو یحییٰ ابو بکر کر رہے تھے۔ وہ بڑی دلیری سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوگئے لیکن عقب سے آنے والے مسلمان سپاہیوں کے دستوں نے منظم ہو کر عیسائی لشکر پر ہلّہ بول دیا۔

یعقوب نے کچھ دستوں کو عیسائی بادشاہ کے خیمے کی طرف بھیج دیا۔ اس طرح دشمن کی توجہ بٹ گئی۔ اسی دوران خود یعقوب اپنے بہادر مجاہدوں کو ساتھ لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں دور دور تک دشمن کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتی دکھائی دے رہی تھیں۔ لڑائی کا یہ رنگ دیکھ کر دشمن کے قدم اکھڑ گئے، شدید گرمی اور پیاس نے ویسے ہی اسے بے حال کر رکھا تھا۔ بہت جلد الفانسو کا لشکر ہزاروں لاشیں چھوڑ کر بدحواسی کے عالم میں تتر بتر ہوگیا۔ مؤرخین کا اندازہ ہے کہ اس لڑائی میں ایک لاکھ ۴۶ ہزار عیسائی ہلاک ہوئے، ۳۰ ہزار کو جنگی قیدی بنالیا گیا۔ ڈیڑھ لاکھ خیمے، ایک لاکھ خچر، اسی ہزار گھوڑے اور ستر ہزار زرہ بکتر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد میں زر و جواہر اور قیمتی سامان بھی ملا۔

الفانسو نے راہ فرار اختیار کی اور ریاح کے قلعے میں جا چھپا۔ یعقوب نے اپنی فوج کے ساتھ اس کا تعاقب کیا اور ریاح سمیت پانچ اور اہم مقامات پر یلغار کر دی۔ الفانسو نے بچنے کی کوئی راہ نہ دیکھی تو وہ طلیطلہ بھاگ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین سے ہمکنار کیا، اس عظیم کامیابی پر خود یعقوب کا حال یہ تھا کہ وہ بے اختیار اپنے رب کے حضور سربسجود ہوگئے تھے اور بڑی دیر تک اسی عالم میں اپنے مالک کا شکر ادا کرتے رہے تھے۔ اس جنگ میں کامیابی کے بعد یعقوب نے اپنے لیے المنصور باللہ کا لقب پسند کیا اور وہ یعقوب المنصور کہلانے لگے۔

الارک میں مسلمانوں کی اس شاندار کامیابی سے مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے۔ دوسری طرف مسیحی دنیا کے ممالک فرانس، اٹلی، برطانیہ وغیرہ میں غم و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ الفانسو ہشتم نے اس ذلت آمیز شکست سے ذرا بھی سبق نہ سیکھا اور اس نے شدید غیظ و غضب کے عالم میں اپنے سر کے بال اور ڈاڑھی منڈوا ڈالی، پھر اس نے صلیب اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک ہلاک ہونے والے عیسائی سپاہیوں کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لے لوں گا، نہ گھوڑے کی سواری کروں گا اور نہ کسی قسم کے عیش و آرام کو پاس پھٹکنے دوں گا۔ اس کے بعد وہ طلیطلہ میں زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ اس نے اپنی فوج کے لیے لڑائی کا سازو سامان اور خوراک کا ذخیرہ جمع کر لیا۔ عیسائی پادریوں نے پورے یورپ میں گھوم پھر کر مقدس جنگ (ہولی وار) کے لیے لوگوں کے جذبات بھڑکانے شروع کر دیے۔ ان کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر بہت سے صلیبی، الفانسو کی مدد کے لیے پہنچنے لگے۔ الفانسو نے طلیطلہ شہر کے قلعے اور فصیلوں کو بہت مضبوط بنا دیا۔ اب وہ اسلامی فوج کا ایک بار پھر مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

یعقوب المنصور کو الفانسو ہشتم کی جنگی تیاریوں کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ الفانسو کی طاقت پر ایک کاری ضرب لگانے کی ضرورت ہے، چنانچہ انہوں نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۵۹۱ھ/۱۱۹۶ء میں وہ ایک زبردست فوج لے کر عیسائی علاقوں کی طرف بڑھے۔ پہلے انہوں نے مَتالیس، ترجالہ، شنت قروش (سانتا کروز) پر قبضہ کر لیا، پھر دریائے تاجہ کی وادی طلبیرہ کو تسخیر کرتے ہوئے نومبر ۱۱۹۶ء میں طلیطلہ تک جا پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ طویل محاصرے کے بعد یعقوب کے حکم پر منجنیقوں اور قلعہ شکن توپوں کی مدد سے شہر کی فصیل میں شگاف ڈال دیے گئے۔ قریب تھا کہ اسلامی فوج شہر میں داخل ہو جاتی لیکن الفانسو کی بوڑھی ماں نے الفانسو کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ یعقوب کی خدمت میں حاضر ہو کر التجائیں شروع کر دیں، چنانچہ رحم کھا کر یعقوب نے الفانسو کو معاف کر دیا اور طلیطلہ اسی کے پاس رہنے دیا۔ یہ ایک عظیم مسلمان جرنیل کی شان تھی۔ اسی واقعہ کا ذکر اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ طلیطلہ سے یعقوب قرطبہ چلے گئے۔

الفانسو نے اطاعت کے اقرار کے لیے اپنے سفیر یعقوب المنصور کے پاس بھیجے۔ یہ سفیر قرطبہ پہنچے۔ فریقین کے مابین دس سال کے لیے صلح کا معاہدہ ہوگیا۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں یعقوب المنصور نے مسیحی علاقوں پر ایک اور زبردست حملہ کیا۔ اس حملے میں انہوں نے مجریط (میڈرڈ) قلعۃ النہر، سلامنکا اور کئی دوسرے شہر اور قلعے فتح کیے اور وادی

Marfat.com

الحجارہ تک جا پہنچے جو شمالی اندلس کے ایک صوبے کا دارالحکومت تھی۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ عیسائی علاقوں میں اتنی دور تک چلے گئے کہ کوئی مسلمان حکمران اس سے پہلے کبھی اتنی دور تک نہ گیا تھا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر وہ واپس قرطبہ چلے گئے۔ اندلس میں انہوں نے تقریباً چار سال قیام کیا، اس کے بعد وہ مراکش لوٹ آئے۔ یہ موحدین کے دورِ اقتدار کا عروج تھا۔ مراکش لوٹنے کے بعد یعقوب المنصور کی طبیعت ناساز رہنے لگی، چنانچہ انہوں نے امورِ مملکت کی نگرانی اپنے بیٹے محمد کو سونپ دی اور اپنا بیشتر وقت عبادت اور خدمتِ خلق میں گزارنے لگے۔

ربیع الاول ۵۹۵ھ / جنوری ۱۱۹۹ء میں یعقوب المنصور بہت زیادہ علیل ہو گئے۔ آخری لمحات میں انہوں نے موحدین کے سربر آوردہ لوگوں کو بلوایا، انہیں نصیحتیں اور وصیتیں کیں اور ۲۲ ربیع الاول ۵۹۵ھ / ۲۳ جنوری ۱۱۹۹ء کو اسلام کا یہ عظیم مجاہد اس دنیا کو خیر باد کہہ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ انہیں تینملل میں ان کے والد اور دادا کی قبروں کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔

قدرت نے دولتِ موحدین کے تیسرے فرمانروا یعقوب المنصور کو بہت اعلیٰ صفات اور نمایاں خوبیوں سے نوازا تھا۔ جب ان پر قیادت کا بارِ گراں ڈالا گیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مالی امور کے بارے میں چند سخت احکام صادر کیے، ساتھ ہی انہوں نے پوری مملکت میں اعلان کروایا کہ بدعتوں اور دین کے معاملے میں حد سے گزرنے سے گریز کیا جائے۔ انہوں نے نظامِ عدل کو بھی فوری طور پر بہتر بنانے کی کوشش کی اور تمام قاضیوں (ججوں) کو سختی سے ہدایت کی کہ سب فیصلے کتاب وسنت کی روشنی میں کیے جائیں۔

انصاف کی سربلندی دیکھنے کی خاطر ابتدا میں انہوں نے خود عدالت لگانی شروع کی، ہر خاص وعام کو اجازت تھی کہ وہ اپنی شکایت لے کر ان کے پاس آسکتا تھا، لیکن اس کھلی اجازت کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ بہت چھوٹی چھوٹی شکایات لے کر مملکت کے فرمانروا کے پاس آنے لگے، اس سے امورِ مملکت میں ہرج پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ یعقوب المنصور صرف خصوصی نوعیت کے مقدمات کی سماعت مخصوص دنوں میں کیا کریں گے، باقی مقدمات کی سماعت زیریں عدالتوں میں ہوا کرے گی۔

یعقوب بے حد سخی، فیاض اور رحم دل تھے۔ تمام مؤرخین نے اس سلسلے میں ان کی تعریف کی ہے۔ جنگِ الارک کے لیے روانہ ہونے سے قبل انہوں نے مستحقین میں چالیس ہزار طلائی دینار تقسیم کروائے تھے۔ وہ جہاں جاتے وہاں ناداروں کی دل کھول کر امداد کرتے۔ ہر سال کے آغاز پر تمام لاوارث یتیموں کے ناموں سے یعقوب المنصور کو مطلع کیا جاتا، پھر وہ ان سب کو جمع کر کے انہیں خوراک، لباس اور رقم دیتے تھے۔ انہوں نے پوری مملکت میں جگہ جگہ محتاج گھر بنوائے تھے جہاں نادار اور ایسے ضعیف افراد رکھے جاتے تھے جن کا کوئی سہارا نہ ہو۔

یعقوب المنصور کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کی بہت فکر رہتی تھی۔ انہوں نے پوری مملکت میں عدالتوں کا جال بچھا دیا تھا جن میں نہایت صاحبِ علم، قابلِ اعتماد اور دیانت دار قاضیوں (ججوں) کو مقرر کیا گیا تھا۔ ان قاضیوں کو وسیع اختیارات دیے گئے تھے اور وہ کسی بھی فرد کو، خواہ حاکم ہو یا کوئی عام فرد، عدالت میں طلب کر سکتے تھے۔ یعقوب المنصور نے بہت مستحکم نظامِ احتساب بھی قائم کیا تھا۔ تمام شہروں میں افسرانِ احتساب (محتسب) مقرر کیے گئے تھے۔ یہ افسران "امین" کہلاتے تھے۔ "امین" کا فرض تھا کہ وہ بازاروں میں اشیا کے نرخوں پر کڑی نظر رکھے، کم تولنے والوں کی نگرانی کرے، مقررہ قیمت سے زیادہ وصول کیے جانے کی نشاندہی کرے۔

امین کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ لوگ جانوروں پر ظلم نہ کریں، نہ ہی والدین اور اساتذہ، بچوں کو زیادہ ماریں پیٹیں۔ اگر امین کوئی خلافِ شرع یا خلافِ قانون بات ہوتے دیکھتا تو خلیفہ تک اس کی اطلاع پہنچا دیتا تھا۔ یعقوب ہر ماہ امینوں کو طلب کرتے تھے اور ان سے مملکت کا احوال دریافت کرتے تھے۔ اگر امین مختلف قاضیوں یا حکام کی تعریف کرتے تو یعقوب المنصور کہتے "یاد رکھو، تم جو شہادت دے رہے ہو، قیامت کے روز تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔"

یعقوب المنصور پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتے تھے بلکہ حکومت سنبھالنے کے بعد کئی ماہ تک وہ خود نماز کی امامت کرتے رہے لیکن جب ایک بار ان کے انتظار میں لوگوں نے دیر تک نماز ادا نہیں کی تو وہ سخت برہم ہوئے اور حکم دیا کہ دوسرا امام مقرر کر دیا جائے۔ وہ نفل نمازیں بھی اکثر پڑھتے تھے اور ان کی راتوں کا بیشتر وقت نوافل اور اذکار میں گزرتا تھا۔

قرآن کریم اور حدیث کے مطالعے سے یعقوب المنصور کو خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ نماز اور روزہ میدانِ جنگ میں بھی ترک نہ کرتے تھے۔ جنگ میں بھی وہ علماکرام اور نیک شخصیات کو ساتھ رکھتے تھے، ان سے دعائیں کرواتے تھے اور خود بھی دعائیں کرتے تھے۔ آپ کے سفر کا

Marfat.com

انداز یہ تھا کہ آپ کی سواری کے آگے آگے قاری قرآن کریم کی تلاوت کرتے جاتے تھے۔ کہیں پڑاؤ ڈالتے تو اگلی منزل کے لیے سفر کا آغاز ہمیشہ نمازِ فجر کے بعد کرتے۔ سفر کے آغاز سے قبل ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے۔ دورانِ سفر طلبہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے یا حدیثیں اور دیگر علمی کتب پڑھ کر سناتے۔ منزل پر پہنچتے تو یعقوب اپنے ماتحتوں کو لے کر اپنے خیمے میں جاتے اور وہاں بھی دعا کرتے۔

یعقوب المنصور کے پاس قرآن پاک کا وہ نسخہ بھی تھا جسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد قرآن پاک کا یہ نسخہ بنو امیہ کی تحویل میں آگیا۔ پھر عبدالرحمٰن الداخل اندلس پہنچے تو یہ نسخہ ان کے ساتھ تھا۔ جب موحدین کو اندلس میں اقتدار حاصل ہوا تو مصحفِ عثمانی کا یہ نسخہ موحدین کے پہلے حکمراں اور یعقوب المنصور کے دادا عبدالمومن کی تحویل میں آگیا۔ انہوں نے اس نسخے کی حفاظت اور اس کی تکریم کا بڑا اہتمام کیا۔ ان سے یہ نسخہ ان کے بیٹے ابو یعقوب یوسف اور پھر ابو یوسف یعقوب المنصور تک منتقل ہوگیا۔ یعقوب اس نسخے کو سفر یا جنگ میں ساتھ لے جاتے تھے۔ مصحف عثمانی کا یہ نسخہ بالآخر ترکی کے عثمانی حکمرانوں کے پاس پہنچ گیا اور آج بھی یہ ترکی ہی میں ہے۔

یعقوب المنصور کو علم کے حصول اور علم کی اشاعت سے بہت دلچسپی تھی وہ اہلِ علم و کمال کی بڑی قدر افزائی کیا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بلند پایہ عالم تھے۔ قرآن پاک کا بڑا حصہ انہیں حفظ تھا۔ بے شمار احادیث ازبر تھیں۔ شعر و ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ دور دور سے علما کرام اور صاحبانِ علم کو بلواتے تھے اور انہیں قیمتی تحائف دیتے تھے۔ علم سے ان کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر بہت سے علما مراکش منتقل ہوگئے۔ چنانچہ ان کے دور میں مراکش میں علم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ خصوصاً تفسیر حدیث کا بڑا چرچا تھا۔

ایک بار یعقوب نے علما اور محدثین کو حکم دیا کہ وہ حدیث کی صحیح کتابوں میں سے طہارت کے بارے میں احادیث کا بہت اچھا مجموعہ مرتب کریں۔ چنانچہ اس قسم کا ایک مجموعہ تیار ہوگیا۔

اس دور کی چند بڑی علمی شخصیات میں الشیخ الاکبر محی الدینؒ (جو ابن العربیؒ کے نام سے مشہور ہیں) کا نام نمایاں ہے جو تصوف اور دیگر اہم موضوعات پر بہت سے کتابوں کے مصنف ہیں۔ اسی دور میں ابنِ رشد (۵۲۰ھ۔ ۵۹۵ھ) بھی ابھر کر سامنے آئے جو حدیث، فقہ، طب کے علاوہ اصول، فلسفہ، ہیئت، کلام اور ادب کے عالم تھے۔ انہوں نے بے شمار کتب تصنیف کیں۔ ابو بکر محمد بن عبدالملک مشہور طبیب تھے جو "الحفید" کے لقب سے معروف تھے۔ یعقوب المنصور نے انہیں اپنا طبیبِ خاص مقرر کیا تھا۔ ابو محمد عبداللہ بن الحفید بھی ماہر طبیب تھے۔ یعقوب المنصور ان کے بہت قدردان تھے۔

شیخ الشیوخ ابو مدین شعیبؒ (۵۲۰ھ۔ ۵۹۴ھ) اندلس و مراکش کے صوفیائے کبار میں سے تھے۔ یعقوب المنصور نے انہیں دارالحکومت بلوایا تھا۔ لیکن شیخ جب ۵۹۴ھ میں خلیفہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے تو تلمسان میں علیل ہو کر وفات پاگئے۔ اسی دور میں ایک بہت بڑے مسلمان فلسفی اور طبیب ابنِ طفیل (۴۹۴ھ۔ ۵۸۱ھ) بھی تھے جنہیں موحدین کے دوسرے خلیفہ یعنی یعقوب المنصور کے والد، ابو یعقوب یوسف نے اپنا خاص طبیب مقرر کیا تھا۔ ۵۸۰ھ میں والد کی وفات کے بعد یعقوب المنصور نے ابن طفیل کو اپنے قریبی حلقے میں شامل کر لیا، وہ ان سے گھنٹوں علمی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ۵۸۱ھ میں ابن طفیل کا بھی انتقال ہوگیا۔ یعقوب ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ عہدِ موحدین کے نامور عالم اور مؤرخ علامہ عبدالواحد مراکشی، یعقوب المنصور کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یعنی ۵۸۱ھ میں مراکش میں پیدا ہوئے تھے۔ یعقوب المنصور کے عہد کے قابل علما میں ابو موسیٰ عیسیٰ بن عبدالعزیز الجزولی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

یعقوب المنصور کا دل جذبۂ جہاد سے معمور تھا۔ انہوں نے جتنی بھی جنگیں لڑیں، اسلام کو سربلند کرنے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے لڑیں۔ وہ بے حد جری اور دلیر سالار تھے۔ میدانِ جنگ میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ شہسواری، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ جنگ کا منصوبہ، غور و فکر، مشاہدے اور سوچ بچار کے بعد تیار کرتے تھے، بلاشبہ وہ دنیا کے بہترین جرنیلوں میں سے ایک تھے۔ ان کی بے مثال شجاعت اور بے پناہ فراست کا حاصل یہ تھا کہ ان کی مملکت لاکھوں مربع میل کے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا ایک سرا براعظم یورپ میں تھا تو دوسرا بحیرۂ روم کے پار افریقہ میں تھا۔

مملکت کے دفاع کے لیے انہوں نے بہت زبردست فوج تیار کی تھی۔ فوج کے اسلحہ خانوں میں ہتھیاروں کا وافر ذخیرہ رہتا تھا۔ فوج تلواریں، نیزے، گرز، تیر کے علاوہ منجنیقیں اور دیگر قلعہ شکن آلات

Marfat.com

بھی استعمال کرتی تھی۔ یعقوب المنصور کی بحریہ بھی بہت طاقتور تھی جس میں سینکڑوں جہاز شامل تھے، خیال ہے کہ جہازوں اور کشتیوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔

یعقوب المنصور کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے مغرب (مراکش، لیبیا، الجزائر، تیونس) اور اندلس کے کئی شہروں میں متعدد عظیم الشان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ مراکش کے مغربی حصے میں واقع جامع مسجد الکتبیین نہایت وسیع اور پُرشوکت مسجد ہے۔ یعقوب المنصور نے اسے مکمل کروایا۔ دراصل اس مسجد کے نیچے کتابوں کی سینکڑوں دکانیں ہیں اس لیے اس کا نام جامع الکتبیین یا جامع الکتبیہ پڑ گیا۔ اس کے مینار کی بلندی ۲۷۰ فٹ اور چوڑائی ۵۰ فٹ ہے۔

یعقوب المنصور نے رباط الفتح میں ایک جامع مسجد ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں تعمیر کروائی۔ یہ مسجد ۶۱۰ فٹ طویل اور ۴۷۰ فٹ چوڑی تھی۔ اس کے ۱۶ دروازے تھے۔ نماز کے مرکزی ایوان میں دو سو خوبصورت ستون تھے۔ مسجد کا مینار زیر تعمیر تھا کہ یعقوب المنصور کا انتقال ہو گیا۔ یہ نامکمل مینار بھی ۱۶۵ فٹ بلند ہے۔ یہ مینار 'برج حسن' کہلاتا ہے۔ اس کی دیواریں آٹھ فٹ چوڑی ہیں۔

یعقوب المنصور نے ۵۹۱ھ / ۱۱۹۵ء میں اشبیلیہ میں ایک مینار تعمیر کروایا تھا۔ سرخ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا یہ مینار ۳۰۰ فٹ بلند تھا۔ اس مینار کے باہر کی جانب پتھر سے تراشی ہوئی جالیاں اور کھڑکیاں ہیں جن میں پھولدار محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ خیال ہے کہ یہ مینار رصد گاہ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ بعد میں عیسائیوں نے اس مینار کی چوٹی پر ایک مجسمہ نصب کر دیا۔

اشبیلیہ ہی کے قریب، الشرف کے سب سے تنگ اور بلند مقام پر یعقوب المنصور نے ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ یہ مضبوط اور پُرشکوہ قلعہ دریا کے کنارے واقع تھا۔ مراکش سے متصل ایک بستی الصالحہ بھی یعقوب المنصور نے بسائی تھی۔ یہ بڑی خوبصورت بستی تھی اور اس میں کئی دیدہ زیب عمارتیں تھیں۔ اس کے علاوہ شہر رباط الفتح، بھی یعقوب المنصور ہی کے ہاتھوں تعمیر ہوا۔ یعقوب المنصور نے یہ شہر جنگ الارک میں فتح کے بعد دریا کے کنارے ۴۵۰ ہیکٹر کے رقبے میں بسایا۔ شہر کی لمبائی تقریباً چار میل ہے۔ یعقوب نے اس میں مساجد، مدرسے، اسپتال، محتاج گھر اور مکانات بنوائے تھے۔

یعقوب المنصور کے دور میں معیشت کو بے حد استحکام حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے مثالی تدبر اور انتظامی صلاحیت سے کام لے کر پوری مملکت کو خوشحالی کی معراج پر پہنچا دیا۔ پانی کی فراہمی کے لیے چھت دار نہریں (کاریز) بنوائیں جس سے زراعت کی صورت حال بہت اچھی ہو گئی۔ باغات لگانے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ زکوٰۃ کے نظام کو باقاعدہ شکل دے دی گئی تھی۔ ملک میں چاندی، گندھک، پارے وغیرہ کی بہت سی کانیں تھیں۔

صنعت و حرفت کو بھی ترقی دی گئی تھی۔ قرطبہ اور اشبیلیہ میں چاقو، چھریاں، تلواریں بنتی تھیں۔ قرطبہ کا چمڑا، ریشم، ہاتھی دانت کا کام اور سوتی کپڑا مشہور تھا۔ اشبیلیہ کے ریشم کے کارخانوں میں ہزاروں ہنر مند کام کرتے تھے۔ بلنسیہ میں روغنی مٹی اور ملاغہ میں چینی اور شیشے کے برتن بنتے تھے۔ غرناطہ کا حریر اور فولادی تلواریں مشہور تھیں۔ مراکش، فارس، مکناسہ، زجندر، تلمسان میں روئی، زعفران، کاغذ، ریشمی اور سوتی کپڑے، پھل، چمڑا، تلواروں اور روغن زیتون کی تجارت ہوتی تھی۔ تاجروں اور مسافروں کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ مسافر خانے اور حفاظتی چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ عوام کو طبی سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے یعقوب المنصور نے پوری مملکت میں جگہ جگہ شفاخانے قائم کیے تھے۔ ان میں ذہنی مریضوں، نابیناؤں اور کوڑھیوں کے شفاخانے الگ تھے۔ ہر شفاخانے میں علاج مفت تھا اور مریضوں کو کھانا بھی حکومت کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا۔ ان تمام شفاخانوں میں سب سے زیادہ مشہور مراکش کا بیمارستان تھا جو "بیمارستان کبیر مراکش" کہلاتا تھا۔

یعقوب المنصور نے اس عظیم الشان اسپتال کی تعمیر کے لیے شہر میں ایک وسیع میدان منتخب کیا تھا۔ شفاخانے کی عمارت انتہائی نفیس اور خوبصورت تھی۔ کمروں کی دیواروں پر دلکش اور خوشنما نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ عمارت کے گرد بہت عمدہ باغ لگایا گیا تھا جس میں صاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ ہر نہر کے کنارے سنگ مرمر کے تھے، ان کی تہ بھی پختہ تھی اور اس پر قیمتی پتھر ڈالے گئے تھے۔ موسم خواہ کوئی ہو، ان نہروں کا پانی گدلا نہیں ہوتا تھا۔

بیمارستان کبیر میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبیب موجود تھے۔ مریضوں کو خوراک فراہم کرنے کے لیے بہت بڑا مطبخ تھا اور انہیں لباس کی فراہمی کا خاص شعبہ تھا۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد یعقوب المنصور خود بیمارستان کبیر کا دورہ کرتے تھے، ہر مریض سے ملتے اور اس کی عیادت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھتے کہ اس کی درست دیکھ بھال ہو رہی ہے یا نہیں۔ بیمارستان کبیر کا دورہ کرنے کا یہ معمول یعقوب المنصور نے اپنی زندگی کے آخری دنوں تک برقرار رکھا۔

Marfat.com

ابو یوسف یعقوب

مغربِ اقصیٰ (مراکش) کے صاحبِ علم، لائق، منتظم اور بہادر حکمراں

موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔

ہر سال کی طرح اس برس بھی صحرائی خانہ بدوش قبائل کے قافلے چراگاہوں کی سمت چلے آرہے تھے۔ ان کے ہمراہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تھے۔ مختصر سامان ان کے ساتھ تھا۔ ان قبائل کا یہ سفر یوں ہی جاری رہتا تھا۔ وہ کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچاتے تھے۔ انہیں سیاسی امور سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ عموماً آبادیوں سے دور رہتے تھے۔

ان قبائل کے سفر پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اس بار حاکمِ وقت کے کارندوں نے بھیڑ بکریوں کے ساتھ چلنے والے اس کارواں کی راہ میں رکاوٹیں ڈال دیں۔ تکرار ہوئی اور بات بڑھ گئی۔ دونوں طرف سے ہتھیار اٹھا لیے گئے۔ حاکمِ وقت کے کارندوں نے اپنے افسران کو خبر کی۔ خبر ملتے ہی مرکز سے ایک فوج ان خانہ بدوش قبائلیوں کی خبر لینے کے لیے روانہ کر دی گئی۔

اب قبیلے کی عزت کا سوال تھا اور اپنی بقا کا معاملہ درپیش تھا۔ قبیلے والے سرکاری فوج کے آگے ڈٹ گئے اور اس قدر جان توڑ کر لڑے کہ فریقِ مخالف کو جان بچانے کے لیے میدان چھوڑنا پڑا۔

قبیلہ فتح اور اقتدار کی لذت سے آشنا ہو چکا تھا، اس نے شہروں کا رخ کیا۔ کئی معرکے ہوئے اور چند برسوں بعد بڑے علاقے پر اس قبیلے کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی، اللہ کو اس سے انسانیت کی بھلائی کا کام لینا تھا۔

یہ قبیلہ تھا "بنو مرین" جس نے براعظم افریقہ کی مملکت مغربِ اقصیٰ (مراکش) پر پونے تین سو برس تک کامیابی سے حکومت کی۔ شمالی افریقہ کو علم و فن کی روشنی سے منور کیا اور اسے ایک مہذب اور متمدن علاقہ بنانے کی غرض سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ بنو مرین کے پچیس حکمرانوں نے مراکش پر حکمرانی کی اور ان ۲۵ حکمرانوں میں ابو یوسف یعقوب کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ابو یوسف یعقوب کا اٹھائیس سالہ دور ۶۵۶ھ تا ۶۸۵ھ / ۱۲۵۸ء تا ۱۲۸۶ء مراکش کی تاریخ میں یادگار دور ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں عالمِ اسلام کے تحفظ اور اپنی مملکت کو علمی، فنی، صنعتی اور ثقافتی اعتبار سے ترقی دینے کے لیے جو کارنامے انجام دیے وہ انہیں زندۂ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ برصغیر پاک و ہند کے نامور حکمراں غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ / ۱۲۶۸ء تا ۱۲۸۷ء) اور مصر و شام کے عظیم حکمراں، ملک الظاہر بیبرس (۶۵۸ھ تا ۶۷۶ھ / ۱۲۶۰ء تا ۱۲۷۷ء) کے ہم عصر تھے۔

ابو یوسف یعقوب کی حکومت بنو مرین کی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ موجودہ مراکش پر حکمراں تھی۔ اس دور میں مراکش "مغربِ اقصیٰ" یا صرف "المغرب" کہلاتا تھا۔ (آج بھی مراکش کا سرکاری نام "المغرب" ہی ہے) "مراکش" نام کا ایک شہر ان دنوں بھی اس مملکت کا حصہ تھا اور آج بھی ہے۔ ابو یوسف یعقوب کے بعد بنو مرین کے بعض حکمرانوں نے کچھ عرصے کے لیے الجزائر اور تیونس کے بعض علاقوں پر بھی حکومت کی۔ قارئین کی سہولت کے لیے آئندہ سطور میں ابو یوسف یعقوب کا ذکر صرف امیر یعقوب کے نام سے کیا جائے گا۔

آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہوگا کہ بنو مرین کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل کے شمالی افریقہ کے حالات کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔ شمالی افریقہ جس میں المغرب (مراکش)، تیونس، الجزائر اور موجودہ لیبیا کا کچھ حصہ شامل تھا، تقریباً سو برس، یعنی ۵۲۴ھ تا ۶۲۵ھ / ۱۱۳۰ء تا ۱۲۲۸ء، ایک جماعت "موحدین" کے زیرِ انتظام رہا۔ موحدین نے اس علاقے کو بڑی ترقی دی۔ اس خاندان کے دو حکمراں عبدالمومن اور

Marfat.com

یعقوب المنصور تو بہت زیادہ قابلِ تعریف ہیں۔

ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر موحدین کا زوال شروع ہو گیا اور شمالی افریقہ کے علاقے ایک ایک کر کے ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگے۔ ۵۹۱ھ/ ۱۱۹۵ء میں بنو مرین نے موحدین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۸ء میں ایک خاندان "بنو حفص" نے تونس (تیونس) پر قبضہ کر لیا۔ اس حکومت میں طرابلس سے الجزائر تک کے علاقے شامل تھے۔ ۶۳۷ھ/ ۱۲۳۹ء میں "بنو عبدالواد" نے جنہیں "بنو زیان" بھی کہا جاتا ہے، موجودہ الجزائر کے مغربی حصے میں حکومت قائم کر لی، لیکن ان تینوں خاندانوں میں سب سے زیادہ طاقت، شہرت اور اہمیت "بنو مرین" نے حاصل کی۔ بنو مرین دراصل ایک قبیلے زناتہ کی شاخ تھی۔ اسے بنو مرین کا نام ایک خاص نسل کی بھیڑوں کے نام پر اور اسی نسل کی بھیڑوں کے اون سے بننے والے کپڑے "مرینو" کی مناسبت سے دیا گیا۔

عبدالحق کی قیادت میں بنو مرین نے سب سے پہلے دریائے زا اور مولاویہ کے درمیان واقع شمال مشرقی علاقے پر قبضہ کیا۔ ۶۱۳ھ/ ۱۲۶۱ء میں موحدین نے انہیں اس علاقے سے بے دخل کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی۔ وادی نکورہ کے ایک میدان میں دونوں فوجوں کے مابین سخت مقابلہ ہوا۔ موحدین اپنا ساز و سامان، اسلحہ، گھوڑے اور خیمے میدانِ جنگ ہی میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہ بنو مرین کی بڑی کامیابی تھی۔ اگلے ہی سال بنو مرین "تازا" کے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ "تازا" صوبائی حاکم کا مستقر تھا۔ صوبے کا حاکم اپنی بڑی فوج کے ساتھ شہر سے باہر آ کر بنو مرین سے لڑا لیکن شکست کھا کر فرار ہو گیا۔

موحدین کو اپنی شکست پر سخت پریشانی ہوئی۔ بنو رباح جو بنو مرین کے رشتہ دار تھے، موحدین سے مل گئے اور پچاس ہزار کی فوج لے کر بنو مرین کے خلاف نکل آئے۔ وادی سبو میں جو فاس کے نزدیک ہے، زبردست معرکہ ہوا جس میں بنو مرین کے سردار عبدالحق اور ان کے بڑے بیٹے ادریس جاں بحق ہو گئے۔ عبدالحق کے ایک اور بیٹے عثمان نے قیادت سنبھالی اور اپنے دیگر بھائیوں ابو بکر، یعقوب اور محمد کے ساتھ مل کر اس جوش و جذبے سے لڑے کہ فریق مخالف کو میدان چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد بنو مرین نے متعدد حملے کیے حتیٰ کہ ۶۳۷ھ/ ۱۲۳۹ء میں عثمان جاں بحق ہو گئے۔

اس وقت تک مشرقی مراکش کے تمام قبائل پر بنو مرین کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ فاس، قیصر الکبیر اور تازا کے حکام نے بنو مرین کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس دوران میں موحدین کے خلیفہ سعید نے نے بنو مرین کو بعض معرکوں میں شکست دی جس پر بنو مرین نے اپنی قوت کو سمیٹ لیا لیکن بہت جلد وہ عبدالحق کے ایک بیٹے ابو یحییٰ کی قیادت میں بڑی قوت بن کر ابھرے۔ ابو یحییٰ نے نہایت منصوبہ بندی سے ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء میں مراکش پر فوج کشی کی۔ پہلے ہی سال مکناس پر بغیر لڑائی کیے قبضہ ہو گیا۔ موحدین کے خلیفہ سعید، مکناس کو واپس لینے اور تلمسان کو بنو زیان سے چھیننے کے لیے لشکر لے کر روانہ ہوئے لیکن انہیں بنو زیان نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد بنو مرین کے حکمراں ابو یحییٰ نے فاس فتح کر لیا۔

سنہ ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں علالت کے باعث ابو یحییٰ کا انتقال ہو گیا جس کے بعد بنو مرین کی قیادت کی ذمے داری امیر یعقوب (ابو یوسف یعقوب) پر آ پڑی۔ ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء میں امیر یعقوب کو بیرونی جانب سے دو طرفہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک حملہ تلمسان اور دوسرا اندلس کی جانب سے تھا۔ شوال ۶۵۸ھ/ ستمبر ۱۲۶۰ء میں مسیحی اندلسی فوج نے سیلا پر قبضہ کر لیا۔ امیر یعقوب فوج لے کر خود آئے اور ۱۴ دن کے محاصرے کے نتیجے میں مسیحی فوج کو سیلا سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء میں انہوں نے سجلماسہ پر قبضہ کیا۔ یہ صحرائی شہر اب کھنڈر بن چکا ہے۔

اب امیر یعقوب نے مراکش کے بقیہ حصوں کی جانب توجہ کی۔ شہر مراکش کو انہوں نے ۶۶۸ھ/ ۱۲۶۹ء میں طویل محاصرے کے بعد فتح کیا۔ اسی دوران تلمسان کے بنو عبدالواد کو مولاویہ کے قریب ۶۶۷ھ/ ۱۲۶۸ء میں شکست دی۔ سجلماسہ پر جو صحارا کا مغربی دروازہ تھا، قبضے کے باوجود بنو مرین کو تلمسان کے حکمراں یغیراسن کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا، چنانچہ امیر یعقوب نے خود تلمسان پر چڑھائی کی ٹھانی۔ ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۴ء میں انہوں نے تین ماہ کے محاصرے کے بعد طنجہ بھی فتح کر لیا، البتہ مراکش کے انتہائی شمالی شہر سبتہ کو فتح کرنا دشوار ثابت ہوا کیونکہ اس کے حفاظتی انتظامات بہت مضبوط تھے۔ ۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء میں سبتہ بھی زیر نگین آ چکا تھا۔

اس زمانے میں اندلس کی اسلامی حکومت پہلے سے بہت چھوٹی ہو چکی تھی۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور بلنسیہ جیسے عظیم شہر مسلمانوں کے ہاتھ

Marfat.com

سے نکل چکے تھے۔ اب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت صرف جنوب مشرقی گوشے کے ایک چھوٹے علاقے تک محدود رہ گئی تھی جس کا رقبہ سات ہزار مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ اس مملکت کا صدر مقام غرناطہ تھا۔ یہ بنو احمر کی حکومت کہلاتی تھی جو ۶۳۶ھ تا ۸۹۸ھ / ۱۲۳۸ء تا ۱۴۹۲ء قائم رہی۔

شمال میں قشتالہ کی مسیحی حکومت، اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کو بھاری زک پہنچانے کے باوجود مطمئن نہ تھی اور اس کی کوشش تھی کہ اندلس میں مسلمانوں کی رہی سہی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے، چنانچہ وہ اندلس میں قائم بنو احمر کی حکومت کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ امیر یعقوب نے غرناطہ کے حکمران محمد الفقیہ کی درخواست پر اندلس کو مسیحی یلغار سے بچانے کے لیے بھرپور جہاد کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے تلسان کے حکمران یغمیر اسن سے جنگ بندی کا ایک معاہدہ کیا اور فوج لے کر اندلس میں داخل ہو گئے۔

الفانسو کے سپہ سالار نونہ نے اپنے بڑے لشکر کے ساتھ اسلامی فوج کا راستہ روک لیا۔ دریائے وادی الکبیر کے کنارے لڑی جانے والی یہ لڑائی اندلس کی گزشتہ سو سالہ تاریخ میں سب سے بڑی لڑائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان سے کئی گنا بڑی فوج پر فتح عطا فرمائی۔ امیر یعقوب نے نہ صرف دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا بلکہ اشبیلیہ تک اس کا پیچھا بھی کیا۔ مسیحی سپہ سالار نونہ لڑائی میں مارا گیا۔

بنو مرین کی اس کامیابی سے غرناطہ کی اسلامی مملکت کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ پہلے سے زیادہ دلجمعی کے ساتھ مسیحی یلغار کا مقابلہ کرنے لگے۔ اس زمانے میں اندلس کے مسلمان ایک کمزوری کا شکار تھے کہ ان کے مختلف حکمران آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ دشمن طاقتیں ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتی رہتی تھیں لیکن امیر یعقوب کی صورت میں مسلمانوں کو ایک ایسا مرکز میسر آگیا تھا جس پر تمام مسلمان طاقتیں یکجا اور متحد ہو سکتی تھیں۔

امیر یعقوب اندلس میں مزید پیش قدمی کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بعض ضروری امور انجام دینے کے لیے انہیں مراکش واپس آنا پڑا۔ وہ مراکش آگئے اور ضروری امور کی انجام دہی کے بعد ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء میں دوسری بار اندلس کی مہم پر روانہ ہو گئے۔ اس بار انہوں نے اشبیلیہ پر فوج کشی کی اور دشمن کو دریائے وادی الکبیر کے کنارے پھر للکارا۔

ان دنوں اندلس پر الفانسو کے بیٹے ابن اذفونش کی حکومت تھی۔ اس نے مسلمانوں کی آمد کی خبر سنی تو زبردست فوجی تیاری کی اور اشبیلیہ سے باہر نکلا۔ اس کی فوج اتنی بڑی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ امیر یعقوب بھی دشمن کی فوج کی کثرت دیکھ کر متفکر ہو گئے لیکن انہیں اپنے رب پر کامل بھروسا تھا۔ جب ان کی فوج دشمن کے سامنے صف آرا ہوئی تو امیر یعقوب اپنے پروردگار کے حضور دو رکعت نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے بعد وہ سربسجود ہو گئے، گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہے، دعا سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔

دشمن کی قوت بہت زیادہ تھی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ مسیحی لشکر نے بہت جارحانہ انداز میں حملے کیے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے نام لیواؤں کو نصرت سے نوازا۔ اسلامی فوج کے پے درپے حملوں کی تاب نہ لا کر مسیحی لشکر کے سپاہی بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو دریائے وادی الکبیر میں گر کر غرق ہو گئے۔ ان کی ایک محدود تعداد الفانسو کے بیٹے کے ساتھ بھاگ کر اشبیلیہ چلی گئی۔

اس کامیابی کے بعد امیر یعقوب نے قطنیانہ، جلیانہ اور القلیعہ سمیت کئی قلعے دشمن سے چھین لیے۔ کچھ دنوں بعد فوج کشی کر کے وہ الشریش، حصن روطہ، شلوقہ، غلیانہ اور قناطہ پر بھی قابض ہو چکے تھے۔

پھر امیر یعقوب نے قرطبہ کا رخ کیا۔ دشمن قرطبہ میں محصور ہو گیا۔ امیر یعقوب کی فوج نے تین دن تک قرطبہ کا محاصرہ کیے رکھا اور طبل بجا بجا کر دشمن کو سامنے آنے کے لیے للکارا لیکن دشمن میں اتنی جرأت نہ تھی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرتا۔ امیر یعقوب نے حکم دیا کہ نواحی قلعوں پر حملے کیے جائیں۔ پہلے حصن بنی بشیر پر حملہ کیا گیا۔ اس کی فتح کے بعد الزہرا، برکونہ اور ارجونہ کے قلعے فتح کر لیے گئے۔

امیر یعقوب کی ان مسلسل فتوحات کے نتیجے میں مسیحیوں کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ الفانسو کے بیٹے اور اس کے امرا نے ایک سفارتی وفد امیر یعقوب کی خدمت میں بھیجا جو صلح کی درخواست لے کر آیا تھا۔ امیر یعقوب کے مزاج کا انکسار ملاحظہ فرمائیں کہ اتنی فتوحات کے بعد بھی انہوں نے خود کو اندلس کا حکمران کہلوانا قبول نہ کیا، نہ ہی ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا بلکہ انہوں نے کہا کہ ہم تو صرف بنو احمر کی مدد کے لیے آئے تھے۔ مصالحت کی بات چیت بنو احمر ہی کریں گے۔ سفارتی

Marfat.com

وفد غرناطہ کی مسلمان حکومت کے پاس بھیج دیا۔

مذاکرات ہوئے، امیر یعقوب نے ان مذاکرات میں عیسائی حکومت سے یہ شرائط منوالیں:

۱۔ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گی اور کبھی ایک دوسرے کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کریں گی۔

۲۔ اندلس کے مسلمانوں سے کوئی محصول (ٹیکس) نہیں لیا جائے گا۔

۳۔ اندلس میں جس قدر عربی کتب موجود ہیں انہیں مراکش بھیج دیا جائے گا۔ (یہ کتب امیر یعقوب نے فاس کے مدرسہ الصفارین میں رکھوادیں)۔

معاہدہ ہو جانے پر امیر یعقوب اپنی فوج لے کر واپس مراکش آ گئے۔ بنو احمر کا مقصد بھی یہی تھا کہ انہیں عیسائی حکومت کی چھیڑ چھاڑ سے نجات مل جائے وہ سکون کے ساتھ غرناطہ کی مملکت کو ترقی دے سکیں۔

امیر یعقوب نے غرناطہ کی اسلامی مملکت کے تحفظ کا جو کارنامہ انجام دیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اگر وہ غرناطہ کے امیر کی درخواست پر اندلس پہنچ کر مسیحی لشکر کے خلاف جہاد نہ کرتے تو غرناطہ کی مملکت کب کی مسیحی لشکر کا تر نوالہ بن چکی ہوتی۔ امیر یعقوب کی ان مجاہدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے شمالی افریقہ کی دیگر دو حکومتوں بنو عبد الواد اور بنو حفص کو بھی سکون کا سانس لینے اور اپنے ملکی امور پر توجہ دینے کا موقع ملا۔

امیر یعقوب نے حالتِ جہاد ہی میں انتقال فرمایا۔ وہ جب ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء میں چوتھی بار جہاد کے لیے اندلس تشریف لے گئے تو جزیرہ الخضر اؔ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر یعقوب کے بارے میں ایک بڑے مؤرخ ابن خالد نے لکھا ہے: "وہ حلیم، متواضع، سخی اور کامیاب و کامران تھے۔ وہ جب بھی کسی فوج، کسی دشمن یا شہر پر حملہ آور ہوئے اسے لازماً شکست دی۔" امیر یعقوب نماز کے پابند تھے۔ ہر سال باقاعدگی سے روزے رکھتے تھے۔ اکثر ذکر اللہ کرتے رہتے تھے۔ وہ علما کرام کو اپنے قریب رکھا کرتے تھے اور علما کرام اور نیک شخصیات کے مشورے کے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے تھے۔ امیر یعقوب کے انکسار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خود کو "امیر المومنین" کبھی نہ کہلوایا جو خلیفہ کا خطاب تھا بلکہ وہ خود کو "امیر المسلمین" کہلواتے تھے۔

امیر یعقوب نے اپنی مملکت میں جس کثرت سے شفا خانے اور محتاج خانے قائم کیے اتنے پورے شمالی افریقہ میں اب تک کسی نے قائم نہ کیے تھے۔ علاج بالکل مفت تھا۔ انہوں نے نابینا افراد، اپاہجوں، کوڑھیوں اور دیگر معذوروں کے لیے ماہانہ وظائف مقرر کر دیے تھے۔ ہر علاقے کے تمام معذوروں کی فہرست اس علاقے کے حاکم کے پاس محفوظ ہوتی تھی اور مرکزی حکومت اس فہرست کے اعتبار سے وظائف مختلف علاقوں میں بھیج دیتی تھی۔ ان کے حُسنِ سلوک، اصلاحی کوششوں اور تعلیم کو عام کرنے کے اقدامات کے نتیجے میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔

امیر یعقوب نے کثرت سے مساجد، مدارس، کتب خانے، باغات، حمام اور مسقف (چھت دار) بازار تعمیر کروائے۔ ان کے دور میں المغرب (مراکش) نے صنعتی اعتبار سے بھی بہت ترقی کی۔ اندلس سے ہجرت کرنے والوں کی بڑی تعداد المغرب ہی میں آباد ہوئی۔ ان میں مختلف ماہرین علم و فن، صناع، فنکار، کاری گر، شاعر و ادیب شامل تھے۔ ان کی وجہ سے مراکش کی فنی اور ثقافتی زندگی کو بہت ترقی ملی۔

دارالحکومت ہونے کی وجہ سے فاس، مملکت کا سب سے بڑا اقتصادی مرکز بھی بن گیا تھا۔ المرابطون کے زمانے سے دستکاریوں کو بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ بنو مرین نے اسے مزید ترقی دی اور اندلس سے ماہر صناع یہاں آ کر کام کرنے لگے۔ ابو الحسن اور ابو العنان کے دور میں صناعوں کے ۱۵۰ ادارے کام کر رہے تھے۔ سب سے اہم صنعت کپڑا بُننے والوں کی تھی جس سے بیس ہزار افراد وابستہ تھے۔ ان اداروں کی اپنی ایک انجمن تھی جو حکومت سے رابطہ کا کام دیتی تھی۔ یہ انجمن اس صنعت سے وابستہ افراد کے مفادات کا تحفظ کرتی تھی۔ بزرگ دستکاروں اور ماہرین کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی اور ان کے اعزاز میں سالانہ جشن منائے جاتے تھے۔ ان صنعتوں میں استعمال ہونے والا بیشتر خام مال خود شہر میں مل جاتا تھا یا نواحی علاقوں سے آ جاتا تھا تاہم زیورات کے لیے سونا مغربی سوڈان سے آتا تھا۔ یہ تمام مصنوعات خود فاس کے علاوہ المغرب کے دیگر شہروں میں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ ہر سال حج کے موقع پر فاس کی مصنوعات ان تمام مشرقی ملکوں میں کثرت سے فروخت کی جاتی تھیں جہاں سے عازمین حج اور حجاج کرام کے قافلے گزرتے تھے۔

بنو مرین نے مراکش کے شہر فاس کو بہت زیادہ ترقی دی۔ امیر

Marfat.com

یعقوب نے فاس کے مغرب میں کچھ فاصلے پر "فاس الجدید" کے نام سے ایک نیا شہر بسایا۔ اس شہر کا سنگ بنیاد ۳شوال ۶۷۴ھ/۲۱ مارچ ۱۲۷۶ء کو رکھا گیا۔ ابتدا میں لوگ نئے شہر کو اس کی سفید عمارتوں کی وجہ سے "مدینہ البیضا" (سفید شہر) کہنے لگے لیکن پھر اس کا نام "فاس الجدید" پڑ گیا۔ قدیم فاس کو "فاس البالی" کہا جاتا تھا۔ فاس الجدید ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا۔

امیر یعقوب نے فاس کے گرد مضبوط فصیل بنوائی تھی جس کی اندرونی اور بیرونی دیواریں بھی تھیں۔ آمدروفت کے لیے شہر کی فصیل میں بہترین آرائشی کام سے مزیّن دروازے بنائے گئے تھے۔ ان دروازوں کے مختلف نام تھے۔ ان میں سے تین دروازے باب السماریہ، باب البکاکن اور باب المخزن ابھی تک موجود ہیں۔ اس دور میں فاس الجدید میں احاطے سے گھرے ہوئے بہت خوبصورت باغات لگائے گئے۔

امیر یعقوب نے فاس الجدید میں بہت خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان میں ایک عالی شان قصر، بہت بڑی جامع مسجد اور فوجی اور انتظامی ضرورتوں کے لیے عمارتیں شامل تھیں۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ فاس میں آج تک جو بھی تعمیراتی حسن پایا جاتا ہے وہ بنو مرین کی بدولت ہے۔ قدیم شہر کی بھاری فصیل کا کچھ حصہ شمالی حصے میں ابھی تک باقی ہے۔ جدید شہر کے گرد بنائی جانے والی فصیل تیس فٹ بلند تھی۔ بنو مرین نے فاس میں جو شاندار عمارتیں تعمیر کروائی تھیں ان کا تذکرہ عرب کی داستانوں میں ملتا تھا لیکن جدید زمانے کے مؤرخین ان داستانوں کو مبالغہ آرائی سمجھ کر ان پر یقین نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب فاس کے مدارس پر تحقیق ہوئی تو مؤرخین کو عرب کی ان داستانوں پر یقین کرنا پڑا جن میں بنو مرین کے فن تعمیر کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ امیر یعقوب نے فاس میں ایک ٹکسال اور ایک کاریز بھی تعمیر کروائی۔

مراکش میں قدیم ترین مدارس بنو مرین ہی نے بنوائے تھے۔ ان میں سے نو مدارس ابھی تک قائم ہیں جن میں مدرسہ الصفارین بھی ہے۔ مدرسہ الصفارین بہت اچھا مدرسہ تھا۔ اس مدرسے کے کتب خانے میں عربی زبان کی وہ تمام تصنیفات موجود تھیں جو قشتالہ کے بادشاہ سانچو نے امیر یعقوب کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ یہ مدرسہ ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء میں قائم کیا گیا تھا۔

فاس کے تمام مدارس ایک ہی نقشہ کے مطابق بنائے جاتے تھے، ہر مدرسے میں نماز اور درس کے لیے بڑا ایوان ہوتا تھا۔ اس سے آگے ایک اور صحن ہوتا تھا جس کی اطراف طلبہ کی رہائش کے لیے کمرے بنائے جاتے تھے۔ برابر میں ایک اور چھوٹا صحن طہارت خانوں اور وضو گاہ کے لیے ہوتا تھا۔ ہر مدرسے کا اپنا وقف تھا۔ طلبہ کو کھانا مدرسے کی جانب سے فراہم کیا جاتا تھا۔ تعلیمی اخراجات بھی مرکزی حکومت برداشت کرتی تھی اور طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔

ان مدارس کو آج بھی دیکھیں تو ان کا طرز تعمیر بے حد متاثر کرتا ہے۔ ان کی دیدہ زیب دیواریں، طاقچے، محرابیں، سجی ہوئی چھتیں، کانسی کے منقش دروازے، اس دور کے ماہر کاریگروں کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ دیواروں پر قرآنی آیات کی خطاطی بڑی خوبصورتی سے نقش کی گئی تھی۔ مدارس میں نہایت خوبصورت تالاب اور فوارے بھی تعمیر کیے گئے تھے جہاں طلبہ کے لیے وضو کا انتظام تھا۔

بنو مرین کا طرزِ تعمیر بہت نفیس اور پیچیدہ تھا۔ وہ اپنی عمارتوں کی اندرونی اور بیرونی زیبائش کے لیے نہایت خوبصورت اور نازک پھولوں، یا اقلیدسی (جیومیٹریکل) اشکال کو لکڑی یا پتھر پر نقش کرتے تھے۔ خاص طور پر لکڑی کا جتنا کام اس دور میں ہوا ہے، وہ بے حد یادگار ہے۔ مساجد کے منبروں، دروازوں، ستونوں اور بالکونیوں میں دیودار کی لکڑی استعمال کی جاتی تھی۔

فاس کی جامع قرویئن مراکش کی سب سے بڑی اور تاریخی مسجد ہے۔ اسے ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد کے ادوار میں اس میں ترامیم اور اضافے ہوئے۔ فاس کے چار مدرسے اسی مسجد سے ملحقہ ہیں ان میں امیر یعقوب کا مدرسہ صفارین بھی شامل ہے۔ یہ مدرسہ اس وقت فاس کا سب سے قدیم مدرسہ ہے۔ اس کی مسجد میں دیودار کا گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ مدرسے کے تیس کمرے تھے۔

مکناس، فاس سے ۶۴ کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ امیر یعقوب نے ۶۷۵ھ/ ۱۲۷۶ء میں اس شہر کو از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا، کیونکہ موحدین سے لڑائیوں میں یہ شہر تباہ ہو گیا تھا۔ مکناس میں بنو مرین کا قصر تھا وہ اب کھنڈر ہو چکا ہے، لیکن اپنے زمانے میں یہ دنیا کا سب سے بڑا قصر تھا۔ مکناس میں ایک بڑی مسجد موحدین نے بنوائی تھی۔ امیر یعقوب نے اسے از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ امیر یعقوب نے مکناس میں ایک قلعہ بھی بنوایا تھا۔

Marfat.com

بنو مرین کے دور میں جتنی مساجد تعمیر کی گئیں ان میں بڑی باقاعدگی اور سادگی پائی جاتی تھی۔ ان کی نماز گاہ مربع شکل کے ایک صحن میں کھلتی تھی۔ صحن کے بیچ میں حوض ہوتا تھا۔ محراب سے آگے ایک گنبد تھا۔ دالانوں کے اوپر باہم گتھے ہوئے چھوٹے چھوٹے شہتیر ہوتے تھے جو کھپریل کی چھت سے ڈھکے ہوئے تھے۔ مساجد کے دروازے بہت مزین ہوتے تھے۔ منارے کی شکل چوکور برج کی سی تھی، یہ منارہ مسجد کے ایک گوشے میں ہوتا تھا۔ اس کی آرائش میں جال کی طرح کے خانے بنائے جاتے تھے اور مختلف رنگوں میں چینی کا کام کیا جاتا تھا۔ منارے کے اوپر چھوٹا چوکور منارہ ہوتا تھا جو روشنی کی غرض سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے پہلوؤں پر کاشی کاری کے حاشیے ہوتے تھے اور ابھرے ہوئے جالی دار نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔

اسی دور میں صوفیا کے لیے خانقاہیں بھی تعمیر کی گئیں جنہیں زادیے کہا جاتا تھا۔ مراکش میں ایک ایسی خانقاہ کے کھنڈر سلا کے قریب ملتے ہیں۔ ایک اور زاویہ شالہ کے قبرستان کے نزدیک رباط کے مضافات میں تھا۔ بنو مرین کے حکمران اسی قبرستان میں دفن کیے جاتے تھے۔

***

Marfat.com

علامہ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون

عالمی شہرت کے حامل "مقدمہ ابنِ خلدون" کے خالق عظیم موٗرخ، مفکر اور فلسفی

گفتگو جاری تھی۔

حکمرانِ ریاست اس جواں سال سفیر کی مسحور کن شخصیت سے بے حد متاثر تھے جو صلح کے ایک معاہدے پر بات چیت کے لیے ان کے محل میں آیا ہوا تھا۔ اس سفیر کی وجاہت، اس کا اندازِ گفتگو، اس کی وسیع معلومات اور اس کی ذہانت نے حکمرانِ ریاست پر گویا جادو کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس قدر غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے فرد کو تو میری حکومت میں ہونا چاہیے۔ انہیں علم تھا کہ کئی صدیوں قبل سفیر کے آباؤ اجداد یہیں، اسی شہر میں سکونت پذیر تھے۔ چنانچہ انہوں نے سفیر سے کہا: "آپ ہمارے پاس ہی قیام فرمائیں، یہاں آپ کے آباؤ اجداد بھی رہے ہیں۔ ہم ان کی املاک آپ کے نام بحال کر دیں گے۔"

سفیر چند روز قبل اس ریاست میں پہنچ کر اپنے اسلاف کے آثار دیکھ چکے تھے۔ وہ چاہتے تو حکمرانِ ریاست کی فراخ دلانہ پیشکش کو فوراً قبول کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا تو انہیں غیر مسلم حکمرانوں کی خدمت انجام دینی پڑے گی اور ان کی تمام صلاحیتیں اسلام کے خلاف استعمال ہوں گی، چنانچہ سفیر نے حکمرانِ ریاست کی پیشکش کے جواب میں بڑی شائستگی سے معذرت کر لی۔

بہت جلد وہ اپنا سفارتی دورہ مکمل کر کے اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔

یہ سفیر تھے مشہورِ عالم مسلمان موٗرخ، مفکر اور فلسفی علامہ ابنِ خلدون جنہوں نے غرناطہ کی ریاست کی نمائندگی کرتے ہوئے قشتالہ کی ریاست کے غیر مسلم حکمراں بطرس کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ علامہ ابنِ خلدون ایک نہایت ذہین، طباع، قابل اور وسیع علم کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ فنِ تاریخ نویسی، فلسفۂ تاریخ اور عمرانیات میں آپ کا مقام بے حد بلند ہے۔

آپ کا نام عبدالرحمٰن ہے لیکن آپ "ابنِ خلدون" کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ نے اپنی مشہورِ عالم کتاب "مقدمہ ابنِ خلدون" میں اپنا تعارف یہ کہہ کر کروایا: "عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون الحضرمی۔" آپ کے نام میں خلدون کا لفظ کیوں شامل ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد میں جو پہلے بزرگ تیسری صدی ہجری میں یمن سے ہجرت کر کے اندلس آ گئے تھے ان کا نام خالدؒ تھا جو "خلدون" ہو گیا۔

آپ مشہور صحابیِ رسولؐ حضرت وائل بن حجرؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ بعض موٗرخین کا کہنا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں جب حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں فتوحات ہوئیں اور تونس (تیونس) کا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا تو حضرت خالدؒ (علامہ ابنِ خلدون کے جد) جہاد کی غرض سے مجاہدین کے ساتھ تونس آئے اور یہیں رہائش اختیار کر لی۔ لیکن ان ہی موٗرخین نے حضرت خالدؒ کا جو شجرۂ نسب دیا ہے وہ یہ ہے: حضرت خالد بن عثمان بن الخطاب بن کریب بن معدی یکرب بن الحارث بن وائل ابن حجرؓ۔ گویا حضرت خالد کا سلسلہ چھٹی پشت میں جا کر حضرت وائل بن حجرؓ سے ملتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ حضرت خالدؒ پہلی صدی ہجری میں نہیں بلکہ تیسری صدی ہجری میں اندلس آئے ہوں گے۔

خالد کا لفظ "خلدون" کیوں بن گیا۔ اس بارے میں دو توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اندلس میں آکر آباد ہونے والے خاندانوں کی روایت تھی کہ وہ اپنے کسی بزرگ کے نام کے آخر میں واؤ اور نون کا اضافہ کر لیتے اور اسی نام سے خود کو منسوب کرتے جیسے حفص سے حفصون، بدر سے بدرون اور خالد سے خلدون۔ اس ترمیم کا مقصد یا تو یہ

Marfat.com

تھا کہ اندلس میں پہلے سے آباد خاندانوں اور ان کے درمیان فرق واضح ہو جائے یا یہ اہلِ مغرب یعنی مراکش اور تونس کے لوگوں کے لب ولہجہ کا فرق تھا۔

دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ کسی لفظ کی حیثیت بڑھانے کی غرض سے ہسپانوی زبان میں اس لفظ کے آگے واؤ اور نون کا اضافہ کر دیا جاتا ہے یعنی حفص کو جب حفصون کر دیا جائے تو مراد ہے بڑا حفص اور خالد کو خلدون بنانے سے مراد ہے "خالد اکبر۔"

حضرت ابنِ خلدونؒ جب پہلے پہل اندلس پہنچے تو آپ نے اشبیلیہ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے خاندان کے کچھ لوگوں نے قرمونہ میں رہنا پسند کیا۔ اس خاندان کے افراد متعدد اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ جب اندلس میں موحدوں کی حکومت ختم ہوئی تو حضرت خلدون کا خاندان سبتہ منتقل ہو گیا۔ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون کے پردادا الحسن، حفصیہ خاندان کے حکمران ابوزکریا کی دعوت پر بونہ میں مقیم ہو گئے۔ الحسن کے بیٹے محمد نے تو بنو حفص کی حکومت میں کئی اہم عہدے حاصل کیے لیکن ان کے بیٹے نے جن کا نام بھی محمد ہی تھا، سرکاری عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی تمام تر توجہ علمی سرگرمیوں پر مرکوز کر دی۔ وہ تونس ہی میں مقیم رہے۔

سنہ ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء میں تونس میں طاعون کی وبا پھیل گئی جس کی لپیٹ میں آنے والوں میں محمد بن محمد بن حسن اور ان کی اہلیہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے تین بیٹے چھوڑے جن میں بڑے بیٹے محمد تو علمی اور سیاسی مصروفیات سے دور ہی رہے، البتہ دوسرے بیٹے عبدالرحمٰن اور تیسرے بیٹے یحیٰی نے مؤرخ اور سیاست داں کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ یہی عبدالرحمٰن ہیں جو مورخ ابنِ خلدون کے نام سے مشہور ہیں۔

عبدالرحمٰن ابنِ خلدون یکم رمضان المبارک ۷۳۲ھ/ ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء کو تونس میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بہت کم سنی میں تعلیم کا آغاز کر دیا۔ جلد ہی قرآن پاک حفظ کر لیا اور کلام مجید کو اس کی ساتوں قرأتوں کے ساتھ پڑھا۔ احادیث میں موطا امام مالکؒ اور صحیح مسلم مکمل کر لیں۔ صحیح بخاری کے دستیاب حصوں کا مطالعہ کیا۔ فقہ مالکی کے مختصرات کی تعلیم پائی۔ فقہ مالکی کی مشہور کتاب المدونہ کا مطالعہ کیا۔ پھر علوم نحو، لغت پر دسترس حاصل کی۔ ادبیات کی ضخیم کتاب "اغانی" کا بڑا حصہ آپ کو ازبر ہو گیا تھا۔

ابنِ خلدون نے اپنے بچپن میں جو کتابیں پڑھیں وہ تونس میں نایاب تھیں۔ آپ کو بے شمار اشعار یاد ہو گئے تھے۔ علم ہیئت، علم منطق اور علم کلام بھی پڑھا۔ عربیت اور ادب پر خاص توجہ دی اور انشا میں کمال حاصل کیا۔ پھر کتابت اور خوشنویسی کا فن سیکھا۔ اس کے بعد شیخ الحکمت ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم الوبلیؒ سے آٹھ برس تک ریاضی، منطق اور حکمت کی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں ابوالقاسم عبداللہ بن یوسف مالقیؒ ایک بڑے عالم تھے۔ عبدالرحمٰن ابنِ خلدون نے ان سے بھی فیض حاصل کیا۔

ابنِ خلدون نے ایک کتاب "رحلہ ابنِ خلدون فی المغرب و المشرق" میں اپنے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ۲۰ برس کی عمر میں انہوں نے مروّجہ علوم کی تکمیل کر لی اور اپنے اکثر اساتذہ سے "اجازت" یعنی سند بھی حاصل کر لی۔ یہ سند استاد اپنے شاگرد کو اس وقت عطا کرتا تھا جب استاد کو یقین ہو جاتا تھا کہ شاگرد نے جس مضمون کا علم حاصل کیا ہے وہ اب خود دوسروں کو اس کی تعلیم دے سکتا ہے۔

جب ابنِ خلدون کی عمر ۱۷ برس ہوئی تو انہیں ایک شدید مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس زمانے میں تونس میں طاعون کی زبردست وبا پھیل گئی۔ اس خوفناک مرض کی لپیٹ میں آکر ابنِ خلدون کے والد محترم، والدہ محترمہ کے علاوہ بڑے بڑے علما کرام اور ماہرین فن لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ صدمہ ابنِ خلدون کے لیے کیا کم تھا کہ تونس میں مرینی سلطان ابوالحسن کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ بہت سے علما تونس سے اپنے اپنے مقامات پر واپس چلے گئے۔ تونس پر بنو حفص کی حکومت قائم ہو گئی اور ابواسحٰق حفصی نے اقتدار سنبھال لیا۔

ان حالات میں بھی ابنِ خلدون نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

تقریباً بیس برس کی عمر میں انہیں سلطان ابواسحٰق کا کاتب مقرر کر دیا گیا۔ اس دور میں کتابت کی ذمے داری اسی شخص کو دی جاتی تھی جو فنِ انشا کا ماہر ہو اور سرکاری احکام کو فوری طور پر مسجع و مقفیٰ عبارت میں نہایت بلاغت کے ساتھ لکھ سکے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد شہر میں بدامنی پھیلی۔ سلطان ابو اسحٰق نے ایک فوجی مہم بھیجی۔ ابنِ خلدون اس مہم میں شامل تھے۔ اس فوجی لشکر کو شکست ہوئی۔ ابنِ خلدون زاب پہنچ گئے۔ زاب موجودہ الجزائر کا ایک علاقہ ہے۔ زاب پر ابن مزنی حکمراں تھے۔ ابنِ خلدون نے زاب

Marfat.com

کے مقام بسکرہ میں کچھ عرصے قیام کیا۔ پھر مرینی سلطان ابو عنان نے تلمسان اور بجایہ تک تمام مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ نہایت علم دوست حکمران تھے۔ انہوں نے اس دور کے نامور علما اور ماہرین کو اپنے دارالحکومت فاس میں اکٹھا کر رکھا تھا۔ انہوں نے جب ابنِ خلدون کی شہرت سنی تو انہیں بھی فاس بلوالیا۔ ابنِ خلدون فاس پہنچے تو سلطان ابوعنان نے انہیں اپنا معتمدِ خاص مقرر کر دیا جو "امیر اسرار" کہلاتا تھا۔

ابنِ خلدون فاس میں آٹھ سال تک (۷۵۵ھ تا ۷۶۴ھ / ۱۳۵۴ء تا ۱۳۶۲ء) مقیم رہے۔ تقریباً چار برس تک وہ سلطان ابوعنان کے معتمد رہے۔ اس دوران انہیں متعدد نامور اور جید اہلِ علم سے استفادہ کا موقع ملا۔ آپ نے رسائل نویسی، شعر گوئی اور خطبات کا سلسلہ جاری رکھا۔ درمیان میں لوگوں نے سلطان کو آپ سے بد ظن کر دیا جس کے نتیجے میں آپ کو قید کر دیا گیا۔ تین سال بعد جب سلطان کا انتقال ہو گیا تو آپ کو رہائی مل گئی اور نئے حکمران حسن بن عمر نے آپ کو سابقہ عہدے پر بحال کر دیا، لیکن فاس کی حکومت شورشوں کا شکار رہی۔ جب ابو سالم حکمران بنے تو انہوں نے بھی ابنِ خلدون کی بڑی عزت کی اور انہیں اپنا معتمد (سیکریٹری) مقرر کر دیا۔ دو سال بعد سالم کی جگہ ان کے وزیر عمر بن عبداللہ برسرِ اقتدار آگئے۔

کچھ عرصے بعد ابنِ خلدون ۶۵-۷۶۴ھ / ۶۳-۱۳۶۲ء میں غرناطہ چلے گئے جہاں وہ بنو الاحمر کی حکومت سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں ابو عبداللہ الخامس نے انہیں بہت عزت دی۔ اپنا ندیم خاص بنایا۔ سلطان کے لائق اور صاحبِ علم وزیر لسان الدین ابن الخطیب سے بھی ان کے قریبی مراسم ہو گئے۔ ابو عبداللہ نے ابنِ خلدون کو قشتالہ کے بادشاہ بطرس کے پاس سفیر بنا کر اشبیلیہ بھیجا۔ اس واقعے کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

کچھ عرصے بعد بجایہ کے حاکم محمد ابو عبداللہ نے ابنِ خلدون کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ ابنِ خلدون بجایہ چلے گئے۔ وہاں ان کا زبردست استقبال کیا گیا اور انہیں مملکت میں اعلیٰ ترین عہدہ یعنی حاجب کا عہدہ پیش کیا گیا۔ حاجب گویا ایک طرح سے وزیراعظم ہوتا تھا۔ ابنِ خلدون کو حاجب کی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ جامع قصبہ میں خطابت کی ذمے داری بھی سونپی گئی، لیکن صرف ایک سال بعد سلطان کو ایک معرکے میں قتل کر دیا گیا۔ ابنِ خلدون واپس بسکرہ چلے گئے۔

اس کے بعد ۷۶۸ھ سے ۷۷۶ھ / ۱۳۶۶ء سے ۱۳۷۴ء تک ابنِ خلدون فاس، غرناطہ اور تلمسان میں رہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ عدم استحکام کا زمانہ تھا۔ ابنِ خلدون اب مسلسل سیاسی خدمات انجام دیتے ہوئے تھک چکے تھے۔ وہ علمی خدمات انجام دینے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء میں وہ اولادِ عریف کے پاس چلے گئے جنہوں نے انہیں عزت کے ساتھ قلعہ ابن سلامہ میں ٹھہرا دیا۔ ان کے اہلِ خانہ کو بھی یہیں بلوالیا گیا۔

ابنِ خلدون نے قلعہ ابن سلامہ میں چار برس گزارے۔ اس تمام مدت میں وہ مطالعے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور یہیں انہوں نے اپنا مشہورِ عالم "مقدمہ" تصنیف کیا اور اپنی عالمگیر شہرت کی حامل "تاریخ ابنِ خلدون" کے متعدد ابواب اپنے زبردست حافظے کی مدد سے لکھے۔ تاہم انہیں مکمل تاریخ لکھنے کے لیے بعض کتابوں کی ضرورت پڑی، اس غرض سے وہ تونس چلے گئے۔ تونس میں ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا اور بادشاہ نے انہیں مکمل سہولتیں فراہم کیں تاہم یہاں بھی بعض افراد ان کے مخالف ہو گئے۔ ۷۸۴ھ / ۱۳۲۸ء میں وہ حج بیت اللہ کی غرض سے تونس سے روانہ ہوئے۔ راستے میں، انہوں نے شوال ۷۸۴ھ / دسمبر ۱۳۸۲ء میں اسکندریہ اور پھر ذی قعدہ ۷۸۴ھ / جنوری ۱۳۸۳ء میں قاہرہ میں مختصر قیام کیا۔

قاہرہ میں ابنِ خلدون کی شہرت ان کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی اس لیے جب وہ قاہرہ پہنچے تو طالب علم ان سے ملنے کے لیے بے تابانہ دوڑ پڑے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ علامہ ابنِ خلدون جامع ازہر میں تعلیم دیا کریں۔ حج بیت اللہ کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ آپ نے جامع ازہر میں فقہ مالکی کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ اس زمانے میں ملک الظاہر بیبرس مصر پر حکمران تھے۔ انہیں ابنِ خلدون کی زبردست صلاحیتوں اور بے پناہ قابلیت کا علم ہوا تو انہوں نے ابنِ خلدون کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی قائم کردہ درس گاہ مدرسہ کاملیہ میں درس دینے پر مامور کر دیا اور پھر ۷۸۶ھ / ۱۳۸۴ء میں مالکی فقہ کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کر دیا۔

اب ابنِ خلدون نے اپنے اہلِ خانہ کو بھی تونس سے مصر بلوانے کا فیصلہ کیا لیکن تونس کے سلطان نے اس خیال سے ان کے اہلِ خانہ کو روک لیا کہ شاید اس طرح ابنِ خلدون واپس تونس آجائیں۔ مجبوراً ابنِ خلدون نے ملک الظاہر بیبرس سے سفارش کروائی جس کے بعد ابنِ خلدون کے اہلِ خانہ ایک بحری جہاز کے ذریعہ مصر روانہ ہو گئے لیکن

Marfat.com

کچھ ہی دنوں بعد ابنِ خلدون کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ جس بحری جہاز کے ذریعے ان کے اہلِ خانہ مصر آ رہے تھے وہ بحری جہاز سمندر میں غرق ہو گیا ہے۔

ابنِ خلدون اب مکمل طور پر علمی سرگرمیوں اور خیر و فلاح کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں انہوں نے حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کیا۔ جمادی الاولیٰ ۷۹۰ھ / مئی ۱۳۸۸ء میں وہ قاہرہ واپس آ گئے۔ ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء میں انہیں مدرسہ قرغتمیش میں درس دینے کی ذمے داری سپرد کر دی گئی۔ ۸۰۱ھ / ۱۳۹۹ء میں انہیں پھر مالکی فقہ کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ ۸۰۳ھ کے اوائل (۱۴۰۰ء کے اواخر) میں انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔

۸۰۳ھ / ۱۴۰۱ء میں امیر تیمور نے ایشیائے کوچک فتح کرنے کے بعد شام پر چڑھائی کر دی۔ سلطانِ مصر نے فیصلہ کیا کہ مزاحمت کے لیے ایک فوج بھیجی جائے۔ ابنِ خلدون سے بھی اصرار کیا گیا کہ وہ اس فوج کے ساتھ چلیں۔ مصری فوج دمشق پہنچ کر اس کے دفاعی انتظامات میں مصروف ہو گئی۔ امیر تیمور کا لشکر پہنچا تو دونوں جانب سے اِکا دُکا جھڑپیں ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد سلطانِ مصر کو اطلاع ملی کہ قاہرہ میں ان کے خلاف شورش ہونے والی ہے چنانچہ سلطانِ مصر اور مملکت کے بڑے ذمہ داران واپس قاہرہ چلے گئے۔ تمام فقہا اور قاضی حضرات مدرسۂ عالیہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ امیر تیمور سے اپنے گھروں اور اہلِ خانہ کے لیے امان طلب کی جائے۔ (دراصل امیر تیمور نے صلح کی پیشکش کی تھی) لیکن قلعے کے نائب نے اس تجویز کو ناپسند کیا۔ دوسرے دن ابنِ خلدون اصرار کر کے رسیوں کے ذریعے قلعے کی دیوار سے اترے اور انہیں سواری پر بٹھا کر امیر تیمور کے پاس لے جایا گیا۔ امیر تیمور نے ایک خاص فقیہ اور بڑے عالم عبد الجبار ابن النعمان کو بطور مترجم طلب کیا۔

امیر تیمور نے ابنِ خلدون سے پوچھا کہ آپ کی جائے پیدائش کہاں ہے؟ جواب ملا: "اندرونِ مغرب میں۔" امیر تیمور نے پوچھا: "اندرونِ مغرب سے آپ کی کیا مراد ہے؟" ابنِ خلدون نے جواب دیا۔ "سارا مغرب بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر ہے۔ یہاں سے اس کے قریب ترین حصے برقہ اور افریقیہ ہیں۔ وسطی مغرب تلمسان اور زناتہ کے علاقے پر مشتمل ہے۔ مغربِ اقصیٰ سے فاس اور مراکش مراد ہے۔ اسی کو اندرونِ مغرب کہتے ہیں۔" امیر تیمور نے ان سے مغرب کے بارے میں مزید سوالات کیے اور پھر کہا: "مجھے اطمینان نہیں ہوا، میری خواہش ہے کہ آپ مغرب کے سارے علاقے کا حال میرے لیے تحریر کر دیں۔ اس کے دور دراز اور قریبی حصے، اس کے پہاڑ، اس کے دریا، اس کے دیہات اور اس کے شہر۔ اس طرح کہ میں گویا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

ابنِ خلدون نے جواب دیا کہ "یہ کام ہو جائے گا۔" بعد میں ابنِ خلدون نے مغرب کے علاقوں کا تفصیلی احوال تحریر کر دیا جو کتابی سائز کے تقریباً ۱۲ عدد دستوں (کراریس) پر مشتمل تھا۔ (اصل متن میں لفظ 'کراریس' استعمال کیا گیا ہے جس کا واحد 'کُراسہ' ہے۔ ایک کراسہ دس ورقوں پر مشتمل ہوتا ہے)۔

اس کے بعد امیر تیمور نے ابنِ خلدون کو کھانا کھلایا۔ ابنِ خلدون نے امیر تیمور کو ان کے نسب، عروج، ایشیا میں مہموں اور فتوحات کے حالات سے آگاہ کیا۔ یہ سارے حالات انہوں نے اپنی تاریخ عبر میں تحریر کیے تھے۔ انہوں نے امیر تیمور کو یہ حالات یہ کہہ کر سنائے کہ آپ ان میں اغلاط کی اصلاح کر دیں۔ امیر تیمور نے سن کر پوچھا کہ آپ کو یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں؟ جواب ملا۔ ان قابلِ اعتماد تاجروں سے جو میرے ملک میں آیا کرتے تھے۔

اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ شہر دمشق کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ امیر تیمور باب الجابیہ کے قریب تربت منجک (چبوترے) پر گئے۔ یہ باب شہر کی مغربی فصیل میں واقع ہے۔ وہاں امیر تیمور نے دربار منعقد کیا۔ شہر کے قاضیوں کو اعزازی خلعتیں دیں اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔ ابنِ خلدون اب رخصت ہو کر اپنے گھر چلے آئے، جہاں انہوں نے المغرب کے حالات تحریر کیے۔ چند دنوں بعد جب وہ یہ حالات لکھ کر امیر تیمور کے پاس پہنچے تو امیر تیمور نے اپنے معتمد کو حکم دیا کہ وہ ان کا منگولی زبان میں ترجمہ کروائیں۔

ابنِ خلدون نے دمشق کے معلمینِ قرآن، معتمدین اور دفتری عہدیداروں کو امیر تیمور سے امان نامہ دلوایا۔

جب امیر تیمور رخصت ہونے لگے تو ابنِ خلدون ان کے پاس گئے۔ امیر تیمور نے پوچھا: "آپ کے پاس کوئی خچر ہے؟" جواب ملا: "جی ہاں۔" امیر تیمور نے پوچھا: "کیا وہ اچھا ہے؟" جواب ملا: "جی ہاں۔" امیر تیمور نے دریافت کیا: "کیا آپ اسے میرے ہاتھ فروخت کریں گے؟" ابنِ خلدون نے کہا: "مجھ جیسا آدمی آپ سے

Marfat.com

خرید و فروخت نہیں کر سکتا میں اسے تحفتہً آپ کو پیش کرتا ہوں۔"

اس زمانے میں قاضی القضاۃ کا خچر خاکستری رنگ کا ہوتا تھا۔ کسی دوسرے کو اسی رنگ کا خچر استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ قاضی القضاۃ کا خچر بہت قیمتی ہوتا تھا۔

اس کے بعد ابنِ خلدون قاہرہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں قبائلیوں نے انہیں لُوٹ لیا۔ وہ شعبان ۸۰۳ھ / مارچ ۱۴۰۱ء میں قاہرہ پہنچے۔ وہاں ایک سفیر نے ابنِ خلدون کو کچھ رقم پہنچائی اور بتایا کہ امیر تیمور نے خچر کی قیمت کے طور پر یہ رقم بھجوائی ہے۔

قاہرہ میں ابنِ خلدون کو پھر قاضی کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کرتے رہے۔ بالآخر ۲۵ رمضان المبارک ۸۰۸ھ / ۱۶ مارچ ۱۴۰۶ء کو علم و عرفان کا یہ ماہِ درخشاں خاک نشین ہو گیا۔ ابنِ خلدون کو قاہرہ میں باب النصر کے باہر صوفیہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

تونس (تیونس) میں شارع تربتہ الباثی پر وہ مکان آج بھی موجود ہے جہاں ابنِ خلدون کی پیدائش عمل میں آئی تھی۔ اس کے دروازے پر ابنِ خلدون کی یاد میں ایک سنگی تختی بھی لگائی گئی ہے۔ اسی راستے کے آخر میں ایک خوبصورت گنبد کے نیچے ایک چھوٹی سی درسگاہ ہے، جہاں ابنِ خلدون درس دیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ قلعہ ابن سلامہ بھی موجود ہے جہاں چار سال قیام کے دوران ابنِ خلدون نے اپنا مشہور "مقدمہ ابنِ خلدون" تصنیف کیا۔ اس قلعے کے کھنڈرات شہر فرندا سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔

ابنِ خلدون محض ایک مورّخ نہیں تھے۔ وہ فلسفۂ تاریخ کے بانی اور عمرانیات کے پیش رو بھی تھے۔ ابنِ خلدون سے قبل تاریخ لکھنے سے مراد صرف گزشتہ قوموں کے حالات کو سنہ وار تحریر کر دینا ہوتا تھا۔ ابنِ خلدون نے پہلی بار اس بات پر غور کیا اور تحقیق کی کہ قوموں کے بنتے اور بگڑتے ہوئے حالات کے پس منظر میں آیا کوئی فلسفۂ حیات کام کر رہا ہے یا نہیں۔ کچھ معیارات اور کسوٹیاں ایسی ہیں جن سے حالات کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں درست اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ابنِ خلدون نے جو تاریخ لکھی وہ مروّجہ تاریخوں سے بالکل مختلف تھی۔ ان سے پہلے عام طور پر مورّخین، سال بہ سال پیش آنے والے واقعات کو ترتیب وار لکھ دیا کرتے تھے، اس طرح موضوعات تبدیل ہوتے رہتے اور پھر ان کی تکرار ہو جاتی یا پڑھنے والے کو تسلسل ملانا پڑتا تھا۔ ابنِ خلدون نے مضمون وار ترتیب کو اختیار کیا۔ ایک علاقے کے واقعات ایک جگہ درج کیے۔ ابنِ خلدون نے غیر مانوس الفاظ کا تلفظ درج کرنے کا اہتمام بھی کیا کیونکہ دوسری زبانوں کے الفاظ پڑھنے والوں کو دشواری ہو سکتی ہے۔

ابنِ خلدون کی تاریخ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے یہود کی جلاوطنی کے زمانے کی تاریخ بھی لکھی، کیونکہ وہ خود عبرانی زبان سے واقف تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے عبرانی زبان کی ایک نادر کتاب سے مدد لی۔ ان کے ایک یہودی دوست نے کتاب کے ترجمے میں مدد دی۔ اقوام بربر اور مغرب کی حکومتوں کے بارے میں ابنِ خلدون کے تحریر کردہ حالات قابلِ بھروسا ہیں کیونکہ وہ خود اس وقت موجود تھے۔ ان کی تاریخ ان کی ہمہ گیر معلومات اور سلاطین اور اہم شخصیات سے اچھی طرح واقفیت کی بنا پر زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

ابنِ خلدون کی اس عظیم تاریخ کا نام یوں تو طویل ہے تاہم اسے مختصراً "کتاب العبر" اور عام طور پر "تاریخ ابنِ خلدون" کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے ابنِ خلدون کے زمانے تک دنیا کے بڑے حصے کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کا وہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جو المغرب، بربر قبائل اور صحرائے اعظم کے جنوب میں آباد سیاہ فام باشندوں کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ ابنِ خلدون کی یہ تاریخ ان کے پچاس سال کے براہِ راست مشاہدے، متعدد کتابوں اور اپنے زمانے کی سفارتی اور سرکاری دستاویزات کے گہرے مطالعے اور طویل تجربے کا حاصل ہے۔ یہ تاریخ، سیرت نگاری کے لحاظ سے بھی نہایت قابلِ قدر ہے کیونکہ اس میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان تفصیلاً موجود ہے۔

ابنِ خلدون نے اپنی "کتاب العبر" کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ طویل تمہید یا تعارف پر مشتمل ہے۔ جس کا عنوان ہے: "المقدمہ فی فضل علم التاریخ"۔ دوسرے حصہ بربروں اور زناتہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔ ابنِ خلدون نے اپنی کتاب العبر کے آخری چند ابواب میں اپنی سوانح حیات کو شامل کیا ہے۔ ان کی سوانح کا یہ مطبوعہ حصہ ۷۹۷ھ / ۱۳۹۵ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ تاہم گزشتہ دنوں ابنِ خلدون کی خود نوشت سوانح عمری کے چند غیر مطبوعہ قلمی نسخے دریافت کر لیے گئے ہیں جن میں ابنِ خلدون کی وفات سے چند ماہ قبل تک کے حالات درج ہیں۔

Marfat.com

ابنِ خلدون کا مقصد یہ تھا کہ تاریخ کو سائنسی بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔ انہوں نے اپنے مقدمے میں تاریخی تنقید کے چند اصول پیش کیے۔ تاریخی اغلاط سے محفوظ رہنے کے لیے مؤرخین کو چند ہدایات دیں۔ مثلاً یہ کہ مؤرخ تعصب اور جانبداری سے کام نہ لے۔ تاریخی مآخذ کے مستند ہونے کا اطمینان کرلے۔ تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر رکھے۔ محض مشابہت کی بنا پر نتائج اخذ کرنے میں جلدی نہ کرے۔

ابنِ خلدون کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان تمام اصولوں کو جدید خطوط پر استوار کیا جو مسلم مؤرخین نے محدثین کے ذریعے حاصل کیے تھے۔

ابنِ خلدون کو اپنی تاریخ ”کتاب العبر“ سے زیادہ اس کتاب کے مقدمے کے باعث شہرت اور عظمت حاصل ہوئی۔ یہ مقدمہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہے جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں ابنِ خلدون نے پہلی بار اس بات سے بحث کی ہے کہ قوموں کی ترقی اور تنزل کی کیا وجوہ ہیں اور لوگوں کے اخلاق وعادات پر موسم، جغرافیہ اور ماحول کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق مقدمہ ابنِ خلدون، جس میں عربی علوم اور تہذیب کے تمام شعبوں سے بحث کی گئی ہے، مصنف کے خیالات کی گہرائی، وضاحتِ بیان اور اصابتِ رائے کے لحاظ سے یقیناً اپنے زمانے کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ مقدمہ ابنِ خلدون اور تاریخ ابنِ خلدون کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ کتاب فلسفۂ تاریخ کی اوّلین کتاب ہے۔ جب اندلس پر مسلمانوں کا اقتدار باقی نہ رہا اور اہلِ مغرب نے یہاں کے علمی خزانوں تک رسائی حاصل کی تو انہوں نے اس کتاب سے متاثر ہو کر اسی طرز کی کتابیں تصنیف کیں۔ یورپ کی جن یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی، مقدمہ ابنِ خلدون ان کے نصاب کا حصہ تھا۔

ابنِ خلدون نے اپنی مشہور کتاب تاریخ ابنِ خلدون کے علاوہ کئی دیگر کتابیں تصنیف کیں لیکن یہ کتابیں اب کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ غرناطہ کے عالم لسان الدین ابن الخطیب نے اپنی کتاب ”الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ“ میں ابنِ خلدون کی مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں تعریفی کلمات درج کیے ہیں:

۱۔ شرح قصیدہ بردہ، ۲۔ المحصل کی تلخیص، ۳۔ ابن الخطیب کے ایک ارجوزہ کی شرح، ۴۔ ابنِ رشد کے بعض رسائل کی تلخیص، ۵۔ منطق پر ایک رسالہ ”المنطق“، ۶۔ ریاضی پر ایک کتابچہ ”الحساب“

ابنِ خلدون شاعری بھی کرتے تھے اور ان کے اشعار کا ذخیرہ موجود تھا۔ لسان الدین ابن الخطیب سے ان کی خط وکتابت اشعار کی صورت میں ہوتی تھی لیکن اب یہ چیزیں ناپید ہو چکی ہیں۔

ابنِ خلدون انتہائی محنتی اور باہمت انسان تھے۔ علم کے حصول اور اپنے فرائض انجام دینے کی غرض سے آپ نے سخت تکالیف بھی برداشت کیں۔ آپ کی عمر کے ۲۴ برس تونس میں گزرے، ۲۶ برس مغربِ اقصیٰ اور اندلس میں اور ۲۴ برس مصر، شام اور حجاز میں۔ اس زمانے کے ذرائع آمدورفت اور مواصلات کی سہولتوں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابنِ خلدون نے کس قدر کم سہولتوں کے باوجود کتنی تیزی سے دور دراز ممالک کے سفر کیے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ تونس سے اسکندریہ تک پہنچنے میں، میں نے مسلسل ۴۰ روز تک سواری کی پیٹھ پر سفر کیا۔ اسی طرح طور سے ینبع تک جاتے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ لگ گیا۔

ابنِ خلدون کی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا دور ان کی پیدائش سے طالب علمی کے زمانے تک کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب انہیں بیس برس کی عمر میں سلطان ابواسحٰق کا کاتب مقرر کردیا جاتا ہے۔ اس وقت سے تقریباً بیس برس تک یعنی ۷۵۳ھ سے ۷۷۶ھ / ۱۳۵۲ء سے ۱۳۷۴ء تک آپ کے شب و روز علمی، سیاسی اور سفارتی سرگرمیوں سے عبارت ہیں۔ پھر ۷۷۶ھ / ۱۳۷۴ء سے ۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء تک کا چار سالہ دور آپ کی زندگی کا مختصر لیکن نہایت اہم دور ہے۔ اس تیسرے دور میں آپ نے تمام وقت قلعہ ابن سلامہ میں گزارا اور بے حد غور وفکر اور انہماک سے مقدمہ ابنِ خلدون تصنیف کیا۔ اس کے بعد ۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء سے ۸۰۸ھ / ۱۴۰۶ء تک کا ۲۸ سالہ آخری دور ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں آپ نے اپنے بیشتر اوقات کو علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لیے وقف کردیا تھا۔

***

Marfat.com

اسکیا محمدؒ

ایک لائق اور اچھے منتظم حکمران جنہوں نے افریقہ کو علم کی روشنی سے منور کر دیا

نویں صدی ہجری اپنی عمر کے ۹۷ برس مکمل کر چکی تھی۔

وہ ۱۵ ویں صدی عیسوی کی ہم عصر تھی اور اب رخصت ہونے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ ان ۹۷ برسوں میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ گزرے ہوئے برسوں کے کتنے ہی واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے ابھرنے لگے۔ اقتدار کی کشمکش، جنگیں، خوشحالی، تجارت، سفارت اور بہت کچھ۔ اس نے نامور عثمانی سالار محمد فاتح کو قسطنطنیہ فتح کرتے دیکھا تھا۔ کشمیر میں دیندار اور قابل حکمران زین العابدین کی حکومت کا مشاہدہ کیا تھا۔ ابھی چند ہی سال پہلے برصغیر میں سادگی پسند حکمران سکندر لودھی نے اقتدار سنبھالا تھا اور اُدھر افغانستان، خراسان اور مازندران میں حسین بایقرا جیسا لائق حکمران اس وقت بھی حکومت کر رہا تھا۔

نویں صدی ہجری کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ پھر اس کی نظریں دنیا کے نقشے پر گھومتی ہوئی، براعظم افریقہ پر جا کر رک گئیں، جہاں دنیا کا سب سے بڑا صحرا شان و تمکنت سے پھیلا ہوا تھا اور اس کے عقب میں گھنے جنگلات سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اس نے صحرائے اعظم کے جنوب میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی دیکھیں۔ یہ بلادِ سودان کا علاقہ تھا۔ یہاں اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی۔ نویں صدی ہجری نے دیکھا کہ بلادِ سودان میں صونغائی قبیلے کے ایک حکمران سنی علی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی جگہ قبیلے کے ایک اور قابل عہدیدار محمد توری نے نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ نویں صدی ہجری نے اس عہدیدار کو ذرا دلچسپی سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کرنے لگی۔ اپنی زندگی کے باقی ماندہ تین برسوں میں وہ یہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ محمد توری جنہوں نے اپنے لیے "اسکیا" کا لقب پسند کیا ہے، بہت لائق اور اچھے منتظم حکمران ہیں۔

نویں صدی ہجری رخصت ہوئی تو وہ افریقہ کے اس علاقے کی جانب سے بڑی مطمئن تھی جہاں اسکیا محمد کی حکمرانی تھی۔

اسکیا محمد، صونغائی سلسلے کے نامور حکمران ہیں، جن کا ۳۵ سالہ دور، افریقہ کی تاریخ میں ہمیشہ فروزاں رہے گا۔ اسلام کے پیغام کو عام کرنے، غیر مسلموں کو اسلام کی نعمت سے آشنا کرنے، افریقہ میں علم کا اُجالا پھیلانے اور اپنی افریقی مملکت کو ایک مکمل فلاحی ریاست بنانے کے سلسلہ میں اسکیا محمد نے عظیم خدمات انجام دی ہیں۔

اسکیا کا مطلب ہے حکمران یا بادشاہ۔ ان کے کارناموں کی وجہ سے مؤرخین نے انہیں "اسکیائے اعظم" کا لقب بھی دیا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش کتب میں نہیں ملتی، البتہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ۹۳۴-۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں ان کی عمر اسّی برس ہو چکی تھی۔ اس اعتبار سے اسکیا محمد کا سنہ پیدائش ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء بنتا ہے۔

اسکیا محمد کا تعلق قبیلہ صونغائی کی ایک شاخ 'سونن' کے سے ہے۔ صونغائی کو تاریخ کی کتب میں سونگھائی، سونغائی، سنغوئی، سنغائی بھی لکھا گیا ہے۔ یہ ان افراد کا قبیلہ تھا جو ہجری سنہ کے بہت ابتدائی برسوں میں موجودہ نائیجیریا کے بالائی علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ قبیلہ نائیجیریا کے علاقے اغادس سے آیا تھا، جہاں اس قبیلے کی زبان اب بھی بولی جاتی ہے۔ ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء میں صونغائی قبیلے نے دریائے نائیجر کے قریب ایک پختہ شہر "جنہ" کے نام سے تعمیر کیا۔ یہ شہر اب موجودہ مالی کا حصہ ہے۔

صونغائی قبیلے کو بعض حملہ آوروں کی وجہ سے اپنی سکونت تبدیل کر کے موجودہ مالی میں دریائے نائیجر کے کنارے منتقل ہونا پڑا۔ یہاں انہوں نے ایک نیا شہر "گاؤ" بسایا۔ اس شہر کا نام تاریخ کی کتب میں "کوکو" بھی لکھا گیا ہے اور عربوں نے اس کا تلفظ "قاؤ" بھی کیا ہے۔

صونغائی قبیلے نے پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی

Marfat.com

میں اسلام قبول کیا۔ اس خطے میں، یعنی دنیا کے سب سے بڑے ریگستان، صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع اس علاقے میں جہاں اب نائیجیریا، مالی، سینی گال اور دیگر ممالک واقع ہیں، اسلام پھیلانے کا سہرا مرابطین کے سر ہے۔ مرابطین دراصل بربر ہیں۔ انہوں نے پانچویں صدی ہجری میں تبلیغ اسلام کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے رہنما عبداللہ بن یاسین تھے جو مرابطین کے مشہور عالم سپہ سالار یوسف بن تاشفین کے چچا تھے۔

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مالی کی حکومت ایک نیک سیرت شخص منسا موسیٰ نے سنبھالی۔ انہوں نے ۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء تا ۷۳۳ھ / ۱۳۳۲ء تک حکومت کی۔ ٹمبکٹو اور گاؤ کے شہر، ان کی قلمرو میں شامل تھے۔ منسا موسیٰ نے جب گاؤ فتح کیا تو صونغائی قبیلے کے دو شہزادوں علی کولین اور سلیمان نار کو نظر بند کر دیا تھا۔ منسا موسیٰ کے بعد ان شہزادوں کو آزاد کر دیا گیا اور ۷۳۶ھ / ۱۳۳۵ء میں علی کولین نے گاؤ میں صونغائی حکومت قائم کر لی۔ یہ صونغائی حکومت ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء تک قائم رہی۔ ابتدائی سوا سو سال تک یہ بڑی محدود حکومت تھی۔ اس کے بعد ۸۶۸-۶۹ھ / ۱۴۶۴ء میں ایک قابل حکمران سنی علی نے صونغائی سلطنت کو وسعت دی اور ٹمبکٹو اور جنہ کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ انہوں نے ۲۶ سال حکومت کی۔

سنی علی کا انتقال ۸۹۷-۹۸ھ / ۱۴۹۲ء میں ہوا۔ ان کے بعد اسکیا محمد نے ۲۴ جمادی الآخر ۸۹۸ھ / ۱۲ اپریل ۱۴۹۳ء کو صونغائی حکومت کا اقتدار سنبھالا۔ اس سے قبل وہ سنی علی کی حکومت میں ایک بڑے عہدیدار تھے۔ ان کی اہلیت تسلیم کی جاچکی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، اسکیا محمد کا اصل نام محمد توری ہے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنے لیے "اسکیا" کا لقب اختیار کیا۔

ایک روایت کے مطابق اسکیا محمد نے ۹۰۲ھ / ۱۴۹۷ء اور دوسری روایت کے مطابق ۹۰۱ھ / ۱۴۹۶ء میں حج کیا۔ حج کا یہ سفر بڑا یادگار تھا۔ پانچ سو سوار، ایک ہزار پیدل افراد ان کے ساتھ تھے۔ سونے کے تین لاکھ سکے اسکیا اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ان میں سے کثیر رقم انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھلائی کے کاموں پر صرف کر دی۔

اسکیا محمد عالم اسلام کی وحدت اور خلافت کی مرکزیت کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر مسلمان دنیا کی بڑی طاقت نہیں بن سکتے اس لیے انہوں نے حج بیت اللہ کے بعد مصر کے عباسی خلیفہ متوکل سے ملاقات کی۔ ان سے مختلف اہم امور پر گفتگو رہی۔ خلیفہ متوکل نے اسکیا محمد کو بلادِ سودان کی حکومت کی سند دے دی۔ بلاد سودان سے مراد صحرائے اعظم کا جنوبی علاقہ ہے، جس میں مالی، نائیجر، سینی گال، نائیجیریا اور دیگر چند ممالک شامل ہیں۔ آج کل سوڈان صرف اس خطے کو کہا جاتا ہے جو کبھی مشرقی سودان یا مصری سودان کہلاتا تھا۔ اس علاقے کو سودان اس لیے کہتے تھے کہ یہاں سیاہ فام لوگ آباد تھے۔ عربوں نے اسے سودان یعنی کالے لوگوں کی سرزمین کہنا شروع کر دیا۔

اسکیا محمد خلافت عباسیہ سے ارضِ سودان کی حکومت کی سند حاصل کرنے کے بعد مصر ہی میں اس عہد کے مشہور عالم علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ عرصے ان کے پاس رہ کر علم حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ گاؤ واپس لوٹ آئے۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنا، خلیفہ سے حکومت کی سند کا حصول اور علامہ سیوطیؒ سے تحصیل علم ایسے اقدامات ہیں جو اسکیا محمد کی اسلام پسندی کو ظاہر کرتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ سے علم کے حصول کے بعد اسکیا محمد نے اپنی حکومت کے استحکام اور اسے وسعت دینے پر توجہ دینی شروع کی۔ انہوں نے اس علاقے کے بیشتر حصے فتح کر لیے، جو کبھی مالی کی سلطنت میں شامل تھے۔ انہوں نے موجودہ مالی میں شامل شہر اغادس کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ یہ شہر تیونس، طرابلس اور مصر سے آنے والے تجارتی راستے کا اہم مرکز تھا۔

شمال میں بربر قبیلہ ترقہ (توراغ) آباد تھا، جو نائیجیریا میں الحوصہ (ہاوسا) کی آسودہ حال بستیوں پر حملے کر کے انہیں لوٹ لیا کرتا تھا۔

اسکیا محمد نے ترقہ کے خلاف سخت کارروائی کی۔ بربروں کو صحرا نشین ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور اغادس میں صونغائی قبیلے کے افراد کو آباد کر دیا تاکہ اس علاقے کی حفاظت ہو سکے۔ ۹۱۹ھ / ۱۵۱۳ء میں اسکیا محمد نے الحوصہ کی مغربی ریاستوں کا رخ کیا۔ یہ نائیجیریا کی سات ریاستیں تھیں جن میں کانو، کٹ سینا، زاریا وغیرہ شامل تھیں۔ کانو اب بھی نائیجیریا کا اہم ترین شہر ہے۔ اسکیا محمد نے الحوصہ کی ان ریاستوں کو فتح کر کے انہیں اپنی مملکت کا جزو بنالیا۔ پہلے یہاں غیر مسلم حکمران تھے۔

اسکیا محمد کی حکومت اب بہت پھیل چکی تھی۔ اس میں پورا موجودہ شمالی نائیجیریا، مالی اور سینی گال شامل تھا۔ ان کا قانون جنوب کے ساحلی جنگلات کو چھوڑ کر اس پورے علاقے میں نافذ تھا جو کسی دور میں

Marfat.com

فرانسیسی مغربی افریقہ کہلاتا تھا۔ جھیل چاڈ سے سینی گال کی آخری حدود یعنی بحر اوقیانوس تک کا یہ علاقہ تقریباً اٹھارہ ہزار مربع میل پر محیط تھا۔ یہ سیاہ فام باشندوں کی سب سے بڑی مملکت تھی۔ اسکیا محمد نے اس وسیع مملکت کا انتظام تقریباً پندرہ برس تک بہت عمدگی سے کیا۔ ان کے ہم عصر حکمرانوں میں سلطنت عثمانیہ کے فرمانروا، بایزید ثانی، سلیم اول اور سلیمان اول، صفوی سلطنت کے اسمٰعیل صفوی، تیموری سلطنت کے حسین بایقرا، وسط ایشیا کے ازبک شیبانی خان اور برصغیر پاک وہند کے لودھی خاندان کے فرمانروا اسکندر لودھی شامل تھے۔

اسکیا محمد نے اپنی مملکت میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی بھرپور کوششیں کیں۔ انہوں نے جب اقتدار سنبھالا تو بلاد سودان کے باشندوں میں اسلام قبول کرلینے کے باوجود بعض معاشرتی خرابیاں موجود تھیں اور بدعتیں اور غلط رسوم عام تھیں۔ اسکیا محمد نے بدعنوانی اور بری رسوم کا خاتمہ کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے اور اسلامی قوانین نافذ کیے۔ وہ علم سے محبت کرتے تھے اور خود بھی صاحبِ علم تھے، اس لیے انہوں نے علماکرام اور صاحبانِ تحریر کو بڑی عزت دی۔ انہیں اہم ذمے داریاں سونپ دیں۔ انہوں نے جن علماکرام کی پذیرائی کی ان میں صحارا کے ایک بڑے عالم محمد المغیلیؒ بھی شامل تھے۔ وہ شمالی نائیجیریا میں آباد ہوگئے تھے۔ انہوں نے حکمرانوں کے فرائض پر ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ اسکیا محمد، علامہ جلال الدین سیوطیؒ سے بھی رابطہ رکھتے تھے اور اہم شرعی اور فقہی مسائل درپیش ہوتے تو علامہ سیوطیؒ کے پاس اپنا قاصد بھیج کر دریافت کرلیتے تھے۔ اسکیا محمد نے غیر مسلم اقوام تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا بھی اہتمام کیا۔ افریقہ کے مختلف حصوں میں مظاہر پرستی (بت پرستی) کا رواج تھا۔ اسکیا محمد کی کوششوں سے بت پرستوں میں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا اور ان کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا۔

مراکش کے ایک سیاح حسن ابن محمد الوزان سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں مملکت صونغائی دو مرتبہ آئے۔ وہ مراکش کے سلطان کی طرف سے سفارتی دورے پر تھے۔ انہوں نے اسکیا محمد سے ملاقات کی اور اس علاقے کی اچھی طرح سیر بھی کی۔ بعد میں حسن کو صقلیہ (سسلی) کے قزاقوں نے پکڑلیا اور روم لے جاکر پوپ لیو دہم کے حوالے کردیا۔ پوپ نے ان سے کہا کہ وہ افریقہ کے حالات لکھیں۔ پوپ نے حسن کو نیا نام "جان لیو" دے دیا۔ اس طرح یورپی دنیا حسن الوزان کا تذکرہ لیو افریکانس کے نام سے کرتی ہے۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی پیدا کی گئی ہے، حالانکہ افریقہ کے بارے میں بہت سی اہم معلومات حسن الوزان نے فراہم کی تھیں، جو مسلمان تھے نہ کہ لیو افریکانس نے۔ حسن ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء سے پہلے تیونس آئے تھے اور انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اسلام کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

حسن الوزان نے گاؤ، ٹمبکٹو، جنہ اور مالی کے دیگر شہروں کا دورہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہاں بادشاہ، اہلِ علم حضرات کو بہت عزت دیتے ہیں۔ محمد توری (اسکیا محمد) نے بہت سے علما اور فنی مہارت رکھنے والوں کو ٹمبکٹو بلالیا ہے۔ وہ علما، قاضیوں اور طبیبوں کو بہت اچھی تنخواہیں دیتے ہیں"۔

صونغائی مملکت میں یوں تو تجارت عروج پر تھی لیکن حسن الوزان کے مطابق یہاں کتابوں اور قلمی نسخوں کی بڑی مانگ تھی اور کسی بھی شے کے مقابلے میں کتابوں کی تجارت زیادہ نفع بخش تھی یعنی باہر سے آنے والے کسی بھی سامان کے مقابلے میں کتابوں کی قیمت زیادہ ملتی تھی۔ حسن کے اس تبصرے سے اس دور میں علم کی وسعت، اہمیت اور عام لوگوں میں علم کی طلب کا اندازہ ہوتا ہے۔

حسن کے مطابق ٹمبکٹو میں کتب خانے بڑی تعداد میں قائم تھے۔ یہاں کی جامع مسجد بہ یک وقت مسجد بھی تھی اور جامعہ (یونیورسٹی) بھی۔ اس یونیورسٹی میں دینیات، اسلامی قانون، قواعد، ادب اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مقامی علما اور جید اساتذہ کے علاوہ مراکش کے شہر فاس اور مصر کے شہر قاہرہ سے بھی بڑے بڑے علماکرام کو تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے بلایا جاتا تھا۔

اسکیا محمد نے مغربی افریقہ میں علم کی جو مشعلیں روشن کیں ان کی روشنی تادیر قائم رہی اور پھر انہی مشعلوں سے مزید مشعلیں روشن ہوئیں۔ ان کے دور میں ٹمبکٹو اور جنہ، علم کے بڑے مراکز تھے۔ جنہ میں مندنگو قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ اسکیا محمد کے انتقال کے صرف تیس سال بعد ٹمبکٹو میں ایک بڑی علمی شخصیت ابھری۔ یہ احمد بابا (۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء تا ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۷ء) کی شخصیت تھی جو پچاس کتابوں کے مصنف تھے۔ جنہ میں بھی ایک بڑے مؤرخ اور مصنف نے نام پیدا کیا۔ یہ عبدالرحمٰن سعدی (۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء تا ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء) ہیں جو تاریخ سودان کے مصنف ہیں۔

اسکیا محمد نے اپنی مملکت کو نہایت مضبوط بنیادوں پر مستحکم کیا اور مملکت کا انتظام چلانے کے لیے پہلی بار شعبہ جات قائم کیے۔ ان شعبوں میں سیاسی، انتظامی اور فوجی محکمے شامل تھے۔ ملک کو صوبوں میں تقسیم

Marfat.com

کر کے ان کے والی (گورنر) مقرر کیے۔ انصاف، امور داخلہ، خزانہ، زراعت، جنگلات وغیرہ کی وزارتیں تشکیل دیں۔ انہوں نے صحارا کی سرحد پر رہنے والے، بربروں کے امور کی دیکھ بھال کے لیے بھی الگ وزارت قائم کی۔ اسکیا محمد نے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور جرائم کے انسداد کے لیے پولیس قائم کی، شہریوں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے عدالتیں قائم کیں اور ان میں قاضی مقرر کیے۔

انہوں نے مملکت کی حفاظت کے لیے مستقل فوج بنائی اور دریائے نائیجر میں نقل و حرکت کے لیے کشتیوں کا بیڑا بنوایا۔ اسکیا محمد نے عوام پر سے غیر ضروری محصولات (ٹیکس) ختم کر دیے اور محاصل کے نظام کو باقاعدہ بنایا۔ اسکیا محمد کے ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے سفر حج کے دوران اور اس کے بعد حجاز اور مصر میں حکومتوں کے انتظامی امور اور اصلاحات کا بہت گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے بروقت اور موزوں اقدامات سے ان کی ذہانت، تدبر، فراست اور غیر معمولی حافظے کا پتا چلتا ہے۔ اسکیا محمد کے اچھے انتظامات اور پُر حکمت فیصلوں کی بدولت علاقے میں خوشحالی آگئی۔ لوگ پُر سکون زندگی بسر کرنے لگے۔ عام لوگ اسکیا محمد سے بہت محبت کرتے تھے۔

اسکیا محمد کی مملکت کا دارالحکومت گاؤ تھا۔ حسن الوزان نے اس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہاں تجارت اچھی ہوتی ہے۔ تاجر بہت دولت مند ہیں"۔ عام لوگوں کی خوشحالی کا اندازہ حسن کے اس تبصرے سے لگایا جاسکتا ہے کہ "یہاں سونا اس کثرت سے ہوتا ہے کہ جب لوگ بازار میں فروخت نہیں کر پاتے تو واپس لے جانا پڑتا ہے"۔ اسکیا محمد کی مملکت میں سونے کی تو کثرت تھی، لیکن نمک کی کمی تھی، چنانچہ نمک اچھے داموں فروخت ہوتا تھا۔ اسکیا محمد اچھے گھوڑوں کو پسند کرتے تھے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی زیادہ قیمت بڑی فراخ دلی سے ادا کرتے تھے۔ ان کے دور میں سونے کے سکے رائج تھے جن پر کوئی نشان یا تحریر ہوتی تھی۔ کم مالیت کے سکّے کے طور پر سیپیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

گاؤ سے تقریباً ڈھائی سو میل مغرب میں مشہور شہر ٹمبکٹو واقع ہے۔ یہ موجودہ مالی کا اہم شہر ہے۔ اس شہر کی بنیاد قبیلہ توارگ (طوارق) نے پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں رکھی تھی۔ اسکیا محمد نے اس شہر کو بہت ترقی دی۔ یہ شہر نہ صرف علمی سرگرمیوں کا بڑا مرکز بن گیا بلکہ تجارتی لحاظ سے بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ اس شہر سے چار اہم راستے نکلتے تھے۔ ایک گاؤ سے ہو کر مصر جاتا تھا۔ دوسرا ہکار کے راستے تیونس کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ تیسرا راستہ سجلماسہ کے راستے مراکش کی سمت نکل جاتا تھا اور چوتھا راستہ مالی کے راستے بلاد سودان لے جاتا تھا۔ اٹلی سے تجارت تیونس اور طرابلس کے راستے ہوتی تھی۔

اس دور میں یہاں کپڑے، سونے، ہاتھی دانت، شتر مرغ کے پروں اور مسالوں کی تجارت ہوتی تھی۔ پانی کی فراہمی کے لیے دریائے نائیجر پر بند باندھے گئے تھے، کنویں بھی موجود تھے۔ یہ پانی زراعت کے لیے بھی کافی تھا۔ یہاں سوتی کپڑا بننے کی صنعت بھی موجود تھی۔ مکئی، مکھن، دودھ اور مویشیوں کی کمی نہ تھی۔ لوگ خوش مزاج اور نرم خو تھے۔ خواتین پردہ کرتی تھیں، صرف ملازم عورتیں نقاب نہیں پہنتی تھیں۔ شہر میں دو مساجد تھیں، ایک جامع مسجد اور دوسری سنکورہ کی مسجد جو شمالی سمت میں واقع تھی۔

اسکیا محمد نے تقریباً ۳۵ سال کامیابی سے حکومت کی لیکن جب وہ بوڑھے ہو گئے اور ان کی بینائی قریب قریب جاتی رہی تو ان کے لڑکوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ بڑے لڑکے موسیٰ نے ۳۵-۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء میں مملکت کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی، لیکن وہ حکومت کا انتظام ٹھیک طور نہ چلا سکے۔ ان کے اقدامات رعایا کو پسند نہ آئے، انہیں ظلم سے تعبیر کیا گیا اور وہ قتل کر دیے گئے۔ موسیٰ کے جانشین نے اسکیا محمد کو دریائے نائیجر کے جزیرے میں قید کر دیا، جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس عظیم فرمانروا کو گاؤ میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا جو اب بھی اچھی حالت میں ہے۔

اسکیا محمد کے بعد صونغائی سلسلے کے آٹھ حکمران برسر اقتدار آئے۔ اسکیا داؤد (۹۵۶ھ / ۱۵۴۹ء تا ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء) نے اسکیا محمد کے انداز میں حکومت کی کوشش کی لیکن ان کے بیٹے اسحٰق مملکت کو سنبھال نہ سکے۔ مراکش کے حکمران منصور نے شمال کی جانب سے چڑھائی کر دی اور ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء میں ٹمبکٹو اور گاؤ کو فتح کر لیا۔ اس طرح اسکیا خاندان کی حکومت کا سلسلہ اختتام کو پہنچا۔

***

Marfat.com

منصور ذہبی

مراکش کے سعدی خاندان کے ذہین، ذی علم، مستعد اور منتظم حکمران

اہم اجلاس جاری تھا!

اس اجلاس کی صدارت خود سربراہِ مملکت کر رہے تھے اور اس وقت وہ ممتاز علماکرام، اپنے خصوصی معاونین، فوجی ماہرین، مشیروں اور وزرا سے ایک اہم مسئلے پر بات چیت کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ صحرا کے پاس واقع پڑوسی مملکت پر حملہ کیا جائے یا نہیں۔ فوجی ماہرین، مشیروں اور اجلاس میں موجود بیشتر افراد کی رائے یہ تھی کہ یہ حملہ خودکشی کے مترادف ہوگا کیونکہ صحرا کا سفر بہت پُرخطر اور طویل ہے، راستے بھی غیر محفوظ ہیں اور لوٹ مار کے اندیشے اپنی جگہ ہیں۔

بحث طویل ہوگئی۔ آخر سربراہِ مملکت نے بحث کو سمیٹتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان کی تقریر ایک دلیر اور اولوالعزم سپہ سالار کے بے پناہ حوصلے اور جرأت کی مظہر تھی۔ انہوں نے مدلل انداز سے اس مہم کے اغراض و مقاصد واضح کیے۔ صحرا عبور کرنے کے بارے میں ان کے نائبین جن اندیشوں اور تفکرات کا اظہار کر رہے تھے انہیں سربراہِ مملکت نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ تاجروں کے قافلے بھی صحرا پار کرتے ہیں اور ان تاجروں کے مقابلے میں مہم کا زیادہ خوبی سے انتظام ہم لوگ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم سے پہلے کسی نے صحرا پار کرنے کی ہمت نہیں کی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعد میں آنے والے ایسی کوئی کوشش نہ کریں۔

اس کے بعد سربراہِ مملکت نے اس فوجی مہم کے جائز ہونے کے سلسلے میں علماکرام سے فتوے لیے۔ جب وہ اس جانب سے مطمئن ہوگئے تو انہوں نے جنگی تیاریوں کا حکم دے دیا۔

یہ سربراہِ مملکت تھے مراکش کے سعدی خاندان کے ساتویں حکمران احمد بن محمد المنصور الذہبی، جن کا ۲۵ سالہ دورِ حکومت صرف مراکش ہی کی نہیں بلکہ عالمِ اسلام کی تاریخ میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ان کے عہد میں چونکہ بلادِ سودان کو تسخیر کیا گیا اور وہاں سے بڑے پیمانے پر سونا حاصل کرنے کی وجہ سے خوشحالی آئی اس لیے انہیں منصور ذہبی کہتے ہیں (عربی زبان میں "ذہب" کے معنی "سونا" ہیں)۔

سعدی خاندان کو حسنی شریفی خاندان بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان سے پہلے ۶۶۷ھ تا ۸۷۵ھ/۱۲۶۹ء تا ۱۴۷۰ء مراکش پر خاندان بنو مرین کی حکمرانی تھی۔ ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں بنو مرین کی ایک شاخ بنو وطاس نے بنو مرین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی دور میں مراکش اور اطراف کے علاقوں پر اسپین اور پرتگال نے حملے شروع کر دیے تھے۔ سبتہ، الجدیدہ، صافی، ازمور (بحر اوقیانوس کے ساحل پر مراکش کا شہر) اور اغادیر (مراکش کا ایک شہر جو بحر اٹلانٹک کے ساحل پر واقع ہے) پر، پرتگال کا اور جبل الطارق اور طنجہ پر اسپین کا قبضہ ہوگیا۔ اندلس سے ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کو نکال دیا گیا اور اس پر مسیحیوں کا قبضہ ہوگیا۔ بنو مرین کی حکومت اتنی سمٹ گئی کہ ان کا اقتدار صرف ایک شہر فاس پر رہ گیا۔ انتشار کا عالم یہ تھا کہ جب مراکش کے باشندے پرتگالیوں سے صلح کی بات کرتے تو طنزیہ لہجے میں جواب ملتا کہ تمہارا رہنما کون ہے، جس سے بات کی جائے؟

اس سنگین صورت حال کے پیشِ نظر جنوبی مراکش کے علماکرام اور سرکردہ رہنما اکٹھے ہوئے، انہوں نے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ ضلع درعہ کے ایک صاحب شریف محمد کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ شریف محمد، امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے اور اپنے زہد اور پرہیزگاری کی وجہ سے بے حد مشہور تھے۔ عوام نے شریف محمد کو لشکر ترتیب دینے کی غرض سے رقم بھی دی۔ اس طرح ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں مراکش میں

Marfat.com

حسنی شریفی خاندان کی حکمرانی کی داغ بیل پڑی جو سعدی خاندان کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

مؤرخین نے شریف محمد کو "ابو عبداللہ محمد" کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ انہوں نے بعد میں "القائم" کا لقب اختیار کیا۔ شریف محمد نے اقتدار سنبھالتے ہی کفار کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ جہاد بیس سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں شریف محمد کو پرتگالیوں کے خلاف خاصی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کے بعد ان کے بڑے لڑکے احمد برسر اقتدار آئے۔ لیکن جلد ہی احمد اور ان کے بھائی محمد الشیخ میں اختلاف ہو گیا۔ محمد الشیخ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ انہوں نے پرتگالیوں سے بعض علاقے واپس لے لیے اور آہستہ آہستہ پورے مراکش پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔

محمد الشیخ کے بعد محمد عبداللہ الغالب باللہ حکمراں بنے۔ ان کے بعد ان کے سب سے بڑے لڑکے محمد کے پاس حکومت آئی جنہیں متوکل باللہ کا لقب ملا۔ انہوں نے صرف دو سال حکومت کی تھی کہ ان کے چچا عبدالملک نے فاس اور مراکش پر قبضہ کر لیا۔ (یہ دونوں شہر آج بھی اسی نام سے موجود ہیں)۔ متوکل باللہ نے پرتگال میں پناہ حاصل کی۔ انہوں نے ایک غلط قدم یہ اٹھایا کہ پرتگال سے جنگی امداد طلب کر لی اور وعدہ کر لیا کہ وہ اس امداد کے بدلے فتح کے بعد مراکش کا تمام ساحلی علاقہ پرتگال کو دے دیں گے۔ پرتگال نے اس زریں پیشکش سے پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کی باہمی کشاکش کو صلیبی جنگ کی حیثیت دے دی۔ پورا یورپ فوجی امداد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جو مسیحی لشکر اکٹھا ہوا اس میں ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ سپاہی شامل تھے۔ اس میں پرتگال، اسپین، اٹلی اور جرمنی کی نمائندگی تھی۔ اس کے مقابلے پر مسلمانوں کی فوج ۴۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ مسیحی فوج طنجہ کے ساحل پر اتری اور پیش قدمی کرتی ہوئی فاس کے قریب آ پہنچی۔ ۳۰ جمادی الاول ۹۸۶ھ / ۴ اگست ۱۵۷۸ء کو قصر الکبیر کے قریب فریقین کا آمنا سامنا ہوا، اس لیے یہ جنگ، 'جنگ القصر' کہلاتی ہے۔ عبدالملک نے اپنی فوج کو ہلال کی شکل میں صف آرا کیا تھا۔ مسلمان بڑی بے جگری اور منصوبہ بندی سے لڑے۔ پانچ گھنٹے میں مسیحی لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ عبدالملک دورانِ جنگ ہی جاں بحق ہو گئے۔ شاہ پرتگال کو لڑائی کے دوران ہلاک کر دیا گیا یا انہوں نے خودکشی کر لی۔ مسلمانوں کو بہت بڑی مقدار میں مالِ غنیمت حاصل ہوا اور دشمن کے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔

عبدالملک نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی احمد کو مملکت کا آئندہ حکمراں مقرر کر دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی احمد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ عبدالملک کے انتقال کے بعد مملکت کا نظم و نسق احمد نے سنبھال لیا۔ یہی احمد، منصور ذہبی کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ۹۸۶ھ تا ۱۰۱۲ھ / ۱۵۷۸ء تا ۱۶۰۳ء حکومت کی۔ سعدی خاندان کے دورِ حکمرانی میں منصور ذہبی کا زمانہ سب سے زیادہ تابناک ہے۔

احمد بن محمد المنصور الذہبی ۹۵۶ھ / ۱۵۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ انہیں بچپن ہی میں اپنا شہر چھوڑ کر اپنے دو بھائیوں عبدالملک اور عبدالمومن کے ساتھ تلمسان (اسے اغادیر بھی کہتے تھے یہ مراکش کا ایک ساحلی شہر ہے) آنا پڑا کیونکہ کچھ لوگ ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ عبدالملک الجزائر چلے گئے تھے۔ منصور ذہبی بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس دوران عبدالملک کو منصور کی شخصیت میں پوشیدہ صلاحیتوں کا علم ہوا۔ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں عبدالملک اور منصور کے بھائی عبداللہ کا انتقال ہو گیا جو مراکش پر حکمراں تھے۔ عبدالملک نے اس موقع پر کوشش کی کہ انہیں مراکش میں اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس مل جائیں۔ اس غرض سے انہوں نے عثمانی حکمراں مراد سوم سے مدد طلب کی۔ ۱۵۷۴ء میں وہ خود قسطنطنیہ گئے۔

ادھر منصور ذہبی نے مراکش میں کئی امرا اور خصوصاً فاس شہر کی سرکردہ شخصیات سے مذاکرات کیے اور ان کی حمایت حاصل کر لی۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بھی مطلع کر دیا۔ ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء میں عبدالملک ایک ترک فوج کے ساتھ مراکش میں داخل ہوئے۔ منصور ذہبی نے مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا اور جب مراکش میں حکمراں متوکل (عبداللہ کے بڑے لڑکے) شکست کھا کر بھاگے تو ان کا تعاقب کرنے والوں میں منصور بھی شامل تھے۔ مراکش پر عبدالملک نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی احمد (منصور ذہبی) کے آئندہ سربراہِ مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ منصور ذہبی نے اپنے بھائی کے نائب کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں اور امورِ مملکت کا تجربہ حاصل کیا۔

کچھ ہی عرصے بعد متوکل نے شاہ پرتگال کی مدد سے مراکش پر چڑھائی کی لیکن جنگ القصر میں اس بڑے لشکر کو شکست فاش دے دی گئی جو پورے یورپ کی فوجی امداد سے تشکیل دیا گیا تھا۔ اسی جنگ کے دوران میں عبدالملک نے وفات پائی اور اسی دن منصور کو فرمانروائے

Marfat.com

مملکت تسلیم کر لیا گیا۔

منصور ایک اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ، مہذب اور صاحب تدبیر حکمران تھے۔ انہوں نے ایسی تمام مشکلات پر بڑی حکمت سے قابو پالیا جو ہر نئے حکمران کو پیش آیا کرتی ہیں۔ مثلاً فوجیوں کی سرکشی، قبائلی کشمکش یا عوام کے مطالبات وغیرہ۔ جنگ القصر میں مسلمانوں کی کامیابی کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ اس فتح کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی اور پڑوسی ممالک نے منصور ذہبی کی حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے سفارتی وفود ان کی خدمت میں بھیجنا شروع کر دیے۔ ان کے پاس آنے والے سفیروں میں الجزائر، پرتگال، ہسپانیہ (اسپین)، ترکی، انگلستان اور فرانس کے سفرا شامل تھے۔ کئی سفیر اپنے ساتھ بیش قیمت تحائف بھی لائے۔ عثمانی ترکوں سے منصور کے تعلقات بہت خوشگوار ہو گئے۔

منصور ہر سال عثمانی حکمران کو تحفے ارسال کرتے تھے اور وہاں سے خلعتیں آتی تھیں۔ ہسپانیہ کی جانب سے ایک باقاعدہ سفیر، مراکش میں مستقل طور پر رہا کرتا تھا۔ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ سے منصور ذہبی کے بہت اچھے تعلقات تھے تاہم ملکہ کے انتقال کے بعد جب جیمز اوّل انگلستان میں تخت نشین ہوئے تو انگلستان اور مراکش کے دوستانہ تعلقات میں کمی آگئی۔

منصور نے اقتدار سنبھالنے کے بعد پہلی فوجی مہم ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں توات اور تیکرارین کے نخلستانوں کی سمت بھیجی جو زمانۂ دراز سے مراکش کے شریفی خاندان کے حلقۂ اثر سے آزاد تھے۔ ان نخلستانوں کو فتح کر لیا گیا۔ یہاں نمک کی کانیں تھیں جن پر منصور کی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے بلادِ سودان کا راستہ کھل گیا۔ آج کل سوڈان صرف اس حصے پر مشتمل ایک مملکت ہے جو کسی زمانے میں مشرقی سودان یا مصری سودان کہلاتا تھا، لیکن منصور ذہبی کے زمانے میں بلادِ سودان سے مراد وہ تمام علاقہ لیا جاتا تھا جہاں آج کل مالی، نائیجر، سینی گال، نائیجیریا اور دیگر چند ممالک واقع ہیں۔

بلادِ سودان میں ان دنوں صونغائی قبیلے کی حکومت تھی جس سے تعلق رکھنے والے حکمران اسکیا (بادشاہ) کہلاتے تھے۔ اس قبیلے کے ایک حکمران اسکیا محمد اول (اسکیائے اعظم) کا دور (۸۹۸ھ تا ۹۳۵ھ/۱۴۹۳ء تا ۱۵۲۸ء) بڑا یادگار رہا ہے، تاہم جب منصور نے بلادِ سودان پر فوج کشی کی تو صونغائی حکومت زوال پذیر تھی۔ اس وقت وہاں اسحٰق حکومت کر رہے تھے۔ بلادِ سودان اپنی سونے کی کانوں کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا۔ منصور چاہتے تھے کہ یہ دولت حاصل ہو جائے تاکہ ان مسیحی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جا سکے جو مسلمانوں کو اندلس سے نکال رہے تھے اور شمالی افریقہ یعنی منصور کے زیر انتظام علاقوں پر ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

منصور نے جب بلادِ سودان پر فوج کشی کی تجویز اپنے امرا کے سامنے رکھی تو بیشتر امرا اور سرکردہ افسران کی رائے یہ تھی کہ یہ مہم بہت پرخطر ہے۔ اس موقع پر منصور نے اپنے امرا اور ساتھیوں کو پرجوش تقریر کے ذریعہ حوصلہ دلایا جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ آخر ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ مضبوط اور توانا اونٹ، گھوڑے، خچر جمع کیے جانے لگے، توپیں ڈھالی گئیں، توپوں کی گاڑیاں تیار ہوئیں، بڑی مقدار میں گولہ بارود اکٹھا کر لیا گیا۔ کشتیاں بنانے کے لیے فولادی اور چوبی اجزا جمع کیے گئے۔ پانی ذخیرہ کرنے کے لیے پیپے لائے گئے۔ یہ کشتیاں دریائے نائگر کے راستے روانہ ہونی تھیں۔

یکم محرم ۹۹۱ھ/۱۵ جنوری ۱۵۸۳ء کو سپہ سالار جوذر پاشا کی قیادت میں فوج نے بلادِ سودان کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ یہ ایک خطرناک مہم تھی کیونکہ صحرا میں سفر بڑا مشکل تھا۔ درعہ کے راستے یہ فوج کسی قسم کی لڑائی کے بغیر ۱۳۵ دن میں ٹمبکٹو جا پہنچی جو، اب مالی کا حصہ ہے۔ صونغائی قبیلے کے حکمران اسحٰق نے اس فوج کا مقابلہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن منصور کی فوج توپوں اور آتشیں اسلحہ سے لیس تھی۔ مراکشی لشکر نے مختصر عرصے میں پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔

سوڈان فتح ہونے کی اطلاع مراکش پہنچی تو ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تین دن تک جشن منایا گیا۔ ادھر جوذر پاشا نے ٹمبکٹو اور گاو کو فتح کر لیا۔ اس طرح مملکتِ مالی، مراکش کی حکومت کا حصہ بن گئی۔ بلادِ سودان کیا فتح ہوا، مراکش کے لیے طلائی دروازے کھل گئے۔ بلادِ سودان میں سونے کی بہت بڑی کانیں تھیں۔ اتنی بڑی مقدار میں سونا مراکش آنے لگا کہ صرف اشرفیاں تیار کرنے کے کام پر ایک ہزار چار سو سنار مامور تھے۔ زیورات بنانے والے کاریگر الگ تھے۔ اب صورت یہ تھی کہ مراکش کے سونے کے سکے یورپی مالی منڈیوں میں زبردست قیمت اختیار کر گئے تھے۔

منصور نے محمود پاشا کو بلادِ سودان میں حاکم مقرر کیا۔ محمود پاشا نے ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں ایک ہتھنی مراکش بھیجی، اس طرح مراکش کے باشندوں نے پہلی بار ہاتھی دیکھا۔ اس ہتھنی کے ساتھ ہی تمباکو بھی

Marfat.com

پہلی بار مراکش آیا۔ اس فتح کے نتیجے میں آبنوس اور گینڈوں کے سینگ بھی مراکش لائے گئے۔

منصور ایک وسیع رقبے کو مراکش کی اسلامی مملکت کے پرچم تلے متحد کرنے کے خواہش مند تھے۔ اندلس میں مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے خاتمے پر وہ بہت متاثر تھے اور ان کی تمنا تھی کہ اندلس پر ایک بار پھر اسلام کا پرچم لہرانے لگے۔ اس غرض سے انہوں نے ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں مصر کے ایک عالم دین کو خط تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی اندلس پر فوج کشی کریں گے۔ انہوں نے عالم دین سے درخواست کی تھی کہ وہ دعا فرمائیں کہ اسلام کو پھر غلبہ حاصل ہو اور کفار کو شکست ہو اور اندلس کی سرزمین پر اسلام کے نام لیوا پھر حکومت کرنے لگیں۔ تاہم منصور کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

منصور فوج کی تنظیم پر خاص توجہ دیتے تھے۔ ان کی فوج ترک لشکر کے طرز پر منظم کی گئی تھی۔ سواروں کی تعداد ۲۶ ہزار سے زائد تھی۔ سپاہیوں کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان دستوں کے مختلف نام تھے۔ ان میں سے ایک "بندوق بند" تھا جو اندلس کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ بڑی رجمنٹ کے سربراہ "بیلر بے" اور اعلیٰ افسران "پاشا" کہلاتے تھے۔

منصور اپنی مملکت کے امور سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ صوبوں سے آنے والی رپورٹس کا روزانہ مطالعہ کرتے تھے وہ اپنے ماتحتوں کے خطوط کے جواب میں ذرا بھی دیر نہ لگاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ حاکموں کے خطوط کے جواب میں تاخیر نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ منصور نے نظام انصاف کو بھی بہت مستحکم بنا دیا تھا۔ وہ ہر بدھ کو عام عدالت منعقد کرتے تھے جس میں کسی بھی فرد کو اپنا مقدمہ پیش کرنے کی اجازت تھی۔

منصور، ترکی کے عثمانی سلاطین مراد سوم اور محمد سوم، دہلی کے مغل بادشاہ اکبر اور ایران کے سربراہ عباس اول کے ہم عصر تھے۔ انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ ان مذکورہ حکمرانوں کے برابر تھے۔ انہوں نے مراکش کو خانہ جنگی سے بچایا اور مملکت میں توسیع کی۔

منصور ایک ذی علم حکمران تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ عربی کے اچھے عالم تھے۔ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق منصور ذہبی عالم، فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب اور اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مراکش کے بعض علماکرام منصور ذہبی کو دسویں صدی ہجری کا مجدّد قرار دیتے ہیں۔

منصور کو کتابوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک بہت شاندار کتب خانہ قائم کر لیا تھا۔ منصور نے خود بھی دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ انہیں خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے ایک لباس بھی ایجاد کیا تھا جو ان کے نام پر "منصوریہ" کہلاتا تھا۔ منصور کے عہد میں دینی علوم کی تدریس کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ علماکرام تدریس کے علاوہ تحقیق میں مصروف رہتے تھے اور ان کا خاصا وقت درسی کتابوں کی تشریح اور ان پر حاشیے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔

بلادِ سودان کی ممتاز شخصیت کا ذکر احمد بابا کے بغیر ادھورا ہے۔ احمد بابا اس خطے کے بہت قابلِ احترام فقیہ، عالم اور سوانح نگار ہیں۔ آپ کا پورا نام ابوالعباس احمد بن التکروری ہے۔ آپ ٹمبکٹو کے ایک گاؤں اروان میں ۲۱ ذوالحجہ ۹۲۳ھ/۲۷ اکتوبر ۱۵۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے بہت سے بزرگ قاضی کے منصب پر مامور رہے تھے۔ آپ کا شمار بھی بہت جلد مملکت کے مشہور فقہا میں ہونے لگا۔

جب مراکش کے سعدی خاندان کے حکمران منصور ذہبی نے بلادِ سودان فتح کر لیا تو احمد بابا نے منصور کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں ان کے کئی ہم وطنوں کے ساتھ گرفتار کر کے مراکش بھیج دیا گیا۔ منتقلی کے اس عمل میں آپ کی ۱۶۰۰ کتابیں ضائع ہو گئیں جن کا آپ کو بہت افسوس ہوا۔ مراکش میں کچھ عرصے بعد آپ کو قید سے رہائی دے دی گئی اور آپ نے مراکش کی جامع الشرفاً میں حدیث اور فقہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ آپ کو متعدد بار قاضی بھی بنایا گیا۔ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں منصور ذہبی کی وفات کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے پھر وطن واپس آئے۔ ۶ شعبان ۱۰۳۶ھ/۱۲ اپریل ۱۶۲۷ء کو آپ نے انتقال فرمایا۔

احمد بابا نے فقہ مالکی، صرف و نحو اور دیگر موضوعات پر پچاس کے قریب کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم کتاب مالکی فقہا کا ایک تذکرہ ہے جس کا نام انہوں نے نیل الابتہاج بتطریز الدیباج رکھا۔ احمد بابا کی یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک مغربِ اقصیٰ کے مشہور علما اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس میں اس دور کے بڑے مراکشی اولیا اللہ کے متعلق معلومات بھی موجود ہیں۔

منصور کے دور کے ممتاز علماکرام میں القصار اور احمد الفاسی ممتاز

Marfat.com

ہیں۔ وہ حدیث کی دو مستند ترین کتابوں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حافظ تھے۔ ان کے علاوہ السراج، ابن عاشر اور الزیاتی نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ابوالقاسم الوزیر طب کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے طب کے موضوع پر کتاب المفردات لکھی جو ایک عرصے تک نصابِ تعلیم میں شامل رہی۔ سوانح اور تراجم میں ابن القاضی نے کام کیا۔ اس دور کے بڑے ادیبوں میں عبدالعزیز الفشتالی، شعرا کرام میں الوزیر ابن علی، الہوزالی، ابوالحسن شامی، القاضی الشاطبی اور وزیر الشلیطی قابل ذکر ہیں۔

منصور کا زمانہ فارغ البالی اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ متعدد نئے قلعے، محلات اور پل بنوائے۔ خاندانِ سعدی کے مشاہیر کے مقبرے منصور ذہبی کے دور میں تعمیر ہوئے۔ ان کے شاندار طرزِ تعمیر کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں تعمیرات کا فن کتنی ترقی کر چکا تھا۔ اپنے آخری زمانے میں منصور کا ارادہ یہ تھا کہ وہ فاس کے نمونے پر شہر مراکش کی از سر نو تعمیر کروائیں۔ منصور کو عمارتیں بنوانے سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے دور میں جو سب سے عالی شان اور پُرشکوہ عمارت تعمیر ہوئی وہ مراکش کا قصر بدیع تھا۔ اس قصر کو بڑے اہتمام سے تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے سنگِ مرمر اٹلی سے منگوایا گیا۔ اس خاص پتھر کو شکر کے مساوی تول کر خریدا جاتا تھا۔ منصور نے اس غرض سے ہزاروں ایکڑ اراضی پر سرکاری انتظام کے تحت گنے کی کاشت کروائی۔ قصر کی تعمیر سترہ برس جاری رہی اور یہ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں مکمل ہوا۔ منصور نے اس قصر کی تعمیر کے لیے ہسپانیہ اور یورپ تک سے معمار اور کاریگر بلوائے۔ ان کے خاندانوں کی کفالت کا انتظام کیا۔

قصر بدیع پر منصور نے دل کھول کر رقم خرچ کی۔ اس کی عمارت میں فرش سے گنبد تک سفید اور سیاہ اعلیٰ قسم کا پتھر اور سنگِ رخام استعمال کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ سونے سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ قرطبہ کا قصر الزہرہ بھی اس قصر کے آگے پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس قصر کے ہر ایوان میں پانی کی نہریں تعمیر کی گئی تھیں۔ پُرتکلف بارہ دریاں بنائی گئی تھیں جن کے گرد دلکش باغیچے تھے ان میں سیکڑوں فوارے لگے ہوئے تھے۔ تاہم فنِ تعمیرات کا یہ شاہکار صرف ایک سو آٹھ سال تک قائم رہا۔ ۱۱۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں فلالی خاندان سے تعلق رکھنے والے مراکش کے حکمران مولائے اسماعیل نے اس شاندار قصر کو مسمار کروادیا اور اس کے ملبہ سے دوسری عمارتیں تعمیر کروادیں۔

منصور کے دور میں زراعت نے بھی ترقی کی۔ نئی نئی اشیا کاشت کی گئیں۔ انہوں نے گنے کی کاشت کو بہت فروغ دیا۔ ان کے عہد میں پوری مملکت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چینی بنانے کے کارخانے قائم ہوگئے تھے۔ یہ چینی بڑے پیمانے پر برآمد کی جاتی تھی۔ انگلستان کے تاجروں سے کپڑا خریدا گیا اور انہیں چینی فروخت کی گئی۔

منصور کے دور میں برطانیہ، فرانس اور دیگر ملکوں سے مراکش کے اچھے تجارتی روابط قائم ہوگئے تھے۔ مراکش سے غلہ برآمد کیا جاتا تھا۔ سوڈان کے علاقے سے سونا، قلمی شورہ، تانبا اور جانوروں کی کھالیں باہر بھیجی جاتی تھیں۔ باہر سے زیادہ تر کپڑا اور تعمیراتی سامان آتا تھا۔ انگلستان کے تاجر تعلقات بڑھانے میں پیش پیش تھے اور مراکش سے ان کی تجارت نے اتنی ترقی کی کہ ۹۹۲ھ/۱۵۸۵ء میں باقاعدہ نظام کے تحت ایک ادارہ "باربری کمپنی" کے نام سے قائم کیا گیا۔

منصور بہت کشادہ دل اور بردبار حکمران تھے۔ غیر مسلموں کے ساتھ ان کا رویہ رواداری پر مبنی تھا، چنانچہ دوسرے ملکوں میں ان کی عالی ظرفی اور فیاضی کے چرچے عام ہوگئے۔ منصور نے اپنی حکومت میں نومسلموں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیے۔ مثال کے طور پر خزانہ سے متعلق امور میں ایک نومسلم کو ذمہ داری دی گئی۔ منصور نے اپنی نجی تجارت کے انتظامات بھی بعض نومسلموں کو سونپے تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں تک پیغامات پہنچانے کے فرائض بھی بعض ایسے نومسلم انجام دیا کرتے تھے جو پہلے مسیحی تھے۔

منصور کے چار بیٹے تھے۔ الشیخ، ابوفارس، زیدان اور ابوالحسن۔ تاہم ابوالحسن جن سے منصور کو بہت محبت تھی ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں جاں بحق ہوگئے۔ الشیخ، المامون کے لقب سے زیادہ معروف تھے اور فاس میں نائب سلطنت تھے۔ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں منصور نے المامون کو اپنا جانشین نامزد کیا لیکن بعد میں تنازعات بڑھ گئے اور منصور نے ابوفارس کو جانشین نامزد کردیا۔ مگر طاعون کی وبا پھیل گئی اور منصور اس کی لپیٹ میں آکر ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں انتقال کر گئے۔

سعدی خاندان کی حکومت منصور کے بعد بھی نصف صدی تک قائم رہی۔ احمد ششم (۱۰۶۶ھ تا ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۵ء تا ۱۶۵۹ء) آخری سعدی حکمران تھے۔ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں شریفی خاندان کی ایک اور شاخ فلالی شرفا (علوی شرفا) کے ایک شخص مولائے شریف نے مراکش کے جنوبی شہر سجلماسہ میں حکومت قائم کرلی۔ پھر یہ حکومت پھیلتی گئی اور ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں مولائے رشید نے پورے مراکش پر فلالی شرفا کی حکومت قائم کردی۔

Marfat.com

اندلس کی عظمتِ رفتہ

سرزمینِ اندلس پر مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ دورِ حکومت نہایت تابناک یادوں کا حامل ہے

شہر کے گلی کوچے اداس تھے!

شہر کے در و بام، گزرگاہیں اور شجر و حجر جنہوں نے صدیوں تک مسلمانوں کو حکومت کرتے دیکھا تھا، تصویرِ حیرت بنے دیکھ رہے تھے کہ اب دوسرے لوگوں نے اقتدار سنبھال لیا ہے۔

برسرِ اقتدار آنے والوں کے تیوروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی تمام علامات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا ہے ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان اپنے تابناک ماضی پر فخر نہ کر سکیں نہ ہی اسے یاد کر کے پھر ایک روشن مستقبل کے لیے جدوجہد پر آمادہ ہو سکیں۔

مسلمانوں کا رابطہ ان کے ماضی سے منقطع کرنے کی غرض سے نئی حکومت نے ایک انوکھا اعلان کیا: "عربی زبان میں گفتگو کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔"

وہ زبان جو صدیوں تک اظہار کا وسیلہ بنی رہی اور جس میں علوم و فنون کی گراں قدر تصانیف تیار کی گئیں، اب اس میں گفتگو، اربابِ اختیار کی سماعت پر گراں ہو گئی تھی۔

لیکن بہت جلد اس شہر کے گلی کوچوں نے ایک اور سرکاری اعلان بڑی حیرت سے سنا۔ اعلان یہ تھا کہ "صرف کلیساؤں میں عربی زبان بولنے کی اجازت دے دی گئی ہے!" یعنی وہ زبان جس میں قرآن کریم نازل ہوا، اسے بولنے کی اجازت مسلمانوں کو نہ تھی بلکہ صرف عیسائی اپنے گرجا گھروں میں اس زبان میں بات کر سکتے تھے۔

حکومت مجبور تھی۔ صدیوں تک عربی رائج رہنے کے باعث عیسائی بھی عربی زبان بولنے کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ لاطینی زبان بھول چکے تھے اس لیے انہیں عربی زبان میں عبادت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ گرجا گھروں میں عربی زبان اس کے بعد بھی طویل عرصے تک ذریعہ اظہار بنی رہی۔

یہ وسطی اندلس کا شہر طلیطلہ تھا، جہاں مسلمانوں نے ۳۸۶ برس حکومت کی اور اپنی تہذیب و ثقافت کے گہرے اثرات مرتسم کر دیے۔ ایک طلیطلہ ہی پر موقوف نہیں، پوری سرزمینِ اندلس، مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کو سات سو برس گزر جانے کے باوجود ان کی قائم کردہ عظیم یادگاروں کی ضَو سے جگمگا رہی ہے۔ مسلمانوں سے وابستہ ہر شے کو مٹانے کی دانستہ کوششوں اور امتدادِ زمانہ کے باوجود آج بھی اندلس کے متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی عظمت کی جھلکیاں ہر راہرو کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں۔

اندلس پر مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی ۷۸۰ برس حکومت کی۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے اس سرزمین کو اپنی پاکیزہ تہذیب و ثقافت سے آراستہ کر دیا اور علوم و فنون کے میدانوں میں ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔

اندلس کے اسلامی عہد کی عظمتوں کی چند جھلکیاں پیش کرنے سے پہلے اندلس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہو گا۔

تاریخی پس منظر

کسی زمانے میں برِاعظم یورپ کے جنوب میں واقع جزیرہ نما اندلس کو "آئی بیریا" کہا جاتا تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں موجودہ اسپین اور پرتگال واقع ہیں۔ پہلے اسپین اور پرتگال دو الگ الگ مملکتیں نہ تھیں اور

Marfat.com

پورا جزیرہ نما ایک ہی مملکت تصور کیا جاتا تھا۔ یونانیوں نے اس جزیرہ نما کو آئی بیریا کا نام دیا۔ رومیوں نے اسے 'اسپانیہ' یا 'ہسپانیہ' کہہ کر پکارا اور مسلمانوں نے اس سرزمین کو 'اندلس' کا نام دیا۔

خیال یہ ہے کہ اندلس کا نام ایک قوم "وانداال" سے منسوب ہے جس نے شمالی افریقہ پر فوج کشی سے قبل جزیرہ نمائے آئی بیریا سے گزرتے وقت ہسپانیہ کے جنوبی حصے پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس حصے کو بیٹیکا (بتیقا) کہتے تھے۔ اسی حصے کا نام وانداال کے نام پر اندلس رکھ دیا گیا۔ بعض قدیم عرب مصنفوں کے مطابق اندلس کا نام، ایک شخص اندلس بن طوبال کے نام پر ہے۔

اندلس کا نام خاصا قدیم ہے ۹۸ھ / ۷۱۶ء سے تعلق رکھنے والے ایک دینار پر بھی اندلس کا نام ثبت ملا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لاطینی مترادف "اسپانیہ" بھی درج کیا گیا تھا۔

یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ ہسپانوی لاطینی مؤرخوں نے پورے جزیرہ نما آئی بیریا کے لیے ہسپانیہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جبکہ مسلمان مؤرخین جب بھی الاندلس لکھتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صرف اسلامی ہسپانیہ ہوتی ہے خواہ اس کی جغرافیائی حدود کچھ بھی رہی ہوں۔ اندلس کا تلفظ "اَندُلس" بھی کیا گیا ہے۔

آئی بیریا یعنی موجودہ اسپین اور پرتگال کے علاقوں کو زمانہ قدیم میں مشرقی یا وسطی یورپ کی قوموں مثلاً آئی بیری، کلٹ، یونانی، رومانی، شیواتی، الانی، وانداال، قوطی اور ایشیائی قوم فینیقی نے آباد کیا۔ قوطیوں نے تقریباً تین سو برس تک اس علاقے پر حکومت کی۔ ان ہی کے زمانے میں مسلمانوں نے اسپین اور پرتگال میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ جن قوموں کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا گیا ہے، وہ صدیوں تک ساتھ رہنے کے باعث ایک ہی قوم یعنی اسپینی قوم کی حیثیت اختیار کرگئی تھیں اور ان کا مذہب عیسائیت تھا۔

اسلام کی آمد

اندلس کو اسلام کی ضو سے منور کرنے کی سعادت سب سے پہلے موسیٰ بن نصیرؒ کے حصے میں آئی۔ آپؒ تابعی تھے اور ان دنوں افریقیہ (تیونس) اور المغرب کے والی (حاکم) تھے۔ آپؒ کے تحت برقہ، افریقیہ، سجلماسہ، فاس اور سوس اقصیٰ کے علاقے تھے۔ موسیٰ بن نصیرؒ افریقیہ اور المغرب کی شمالی سرحدوں کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے، پھر یہ کہ اندلس کے عوام اپنی حکومت کے مظالم سے سخت نالاں تھے۔

۹۳ھ / ۷۱۲ء میں موسیٰ بن نصیرؒ اور ان سے قبل ان کے بھیجے ہوئے سالار، طارق بن زیادؒ نے اندلس میں پرچم اسلام بلند کیا۔ موسیٰ بن نصیرؒ جب اندلس میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ شرفائے حجاز کی بڑی جماعت بھی تھی۔ ان میں ایک صحابی حضرت منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور متعدد تابعین شامل تھے۔ ان میں سے چند کے نام ہیں: حنش الصنعانیؒ، ابو عبداللہ علی بن رباحؒ، ابو عبدالرحمٰنؒ، عبداللہ بن یزید المعافریؒ، حیان بن ابی جبلہؒ، مغیرہ بن ابی بردہؒ، حیوبن رجائیؒ، عیاض بن عقبہ الفہریؒ، عبداللہ بن شماسہؒ، عبدالجبار بن ابی سلمہؒ (آپ کے دادا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے)۔

طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیرؒ کے بعد ذوالحجہ ۱۳۸ھ / مئی ۷۵۶ء تک ۲۳ مختلف افراد اندلس کے امیر بنائے گئے۔ اس کے بعد ۱۳۸ھ / ۷۵۶ء میں پہلے اموی حکمراں عبدالرحمٰن الداخل کی خلافت قائم ہوگئی۔ اموی خلافت کا یہ سلسلہ ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء یعنی تقریباً ۲۸۴ برس تک چلا اور اس عرصے میں ۱۶، اموی خلفا تخت نشین ہوئے۔ ہشام ثالث آخری اموی خلیفہ تھے۔ ان کے خلیفہ بننے سے قبل مختلف مواقع پر تھوڑی مدت کے لیے خاندان بنی حمود کے چار افراد قرطبہ کے تخت پر حکمراں رہے۔

بنی امیہ کے بعد ۴۲۳ھ / ۱۰۳۲ء تا ۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء تک یعنی ۴۰ برس تک بنی جہور کی حکمرانی رہی۔ پھر بنو عباد نے ۲۱ برس تک حکومت کی۔ اس کے بعد ملوک مرابطین نے ۵۹ برس تک، یعنی ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء تک حکمرانی کی۔ مرابطین کے بعد حکمرانی کا منصب موحدین کے پاس آیا جنھوں نے ۹۱ برس تک یعنی ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء تک حکومت کی۔ ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء میں عیسائی بادشاہ فردی نند نے قرطبہ پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح کل ۵۴۳ برس تک قرطبہ اسلامی حکومتوں کا مرکز بنا رہا۔

سنہ ۶۳۶ھ / ۱۲۳۹ء میں بلنسیہ اور ۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء میں اشبیلیہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے لیکن غرناطہ کی سلطنت مزید ۲۵۰ سال تک مسلمانوں کے زیر انتظام رہی۔ یہ مملکت جبل الطارق سے المریہ تک بحیرۂ روم سے گھری ہوئی تھی۔ ۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ / ۳ جنوری ۱۴۹۲ء کو غرناطہ پر بھی عیسائی حکومت نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح مسلمانوں نے اندلس پر تقریباً ۷۸۰ برس تک حکمرانی

Marfat.com

کی اور اس طویل عرصے میں زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی پاکیزہ تہذیب و تمدن کے گہرے نقوش ثبت کیے، جن کی اہم جھلکیاں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

تعمیرات

تعمیرات کے لحاظ سے اندلس میں مسلمانوں کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ چاہے وہ قرطبہ کی عالی شان جامع مسجد ہو، قرطبہ ہی میں تعمیر کیے گئے متعدد دروازے ہوں، شاہی محلات ہوں، غرناطہ میں بیت الحمرا کی شاندار عمارات ہوں یا مدینۃ الزہرا کی پُرشکوہ تعمیرات، ہر تعمیر میں اسلامی اندلس کا مخصوص رنگ نمایاں ہے۔

قرطبہ کی عظیم جامع مسجد کو اندلس کے پہلے اموی حکمراں عبدالرحمٰن الداخل نے ۱۶۸ھ / ۷۸۴ء سے ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء کے درمیان تعمیر کروایا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کا انتقال ہوا تو مسجد کی عمارت میں جو نوک پلک کی درستگی باقی تھی، اسے عبدالرحمٰن کے بیٹے ہشام اول نے چھ برس میں پورا کر دیا۔

اس قدیم عبادت گاہ کی عمارت کا شمالی اور مغربی حصہ ابھی تک محفوظ ہے۔ اس کی دیواریں پتھر کی ہیں جن میں قبلہ رُخ شمالاً جنوباً گیارہ دالان ہیں۔ وسطی دالان سب سے بڑا ہے۔ دالانوں کو سنگِ مرمر کے ستون ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔

امیر ہشام کے عہد میں مسجد کی صورت یہ تھی کہ گیارہ دالان در دالانوں میں سب سے آخری دالان سے ملے ہوئے دالان کے وسط میں ایک خوشنما گنبد کے نیچے محراب تھی جہاں امام کھڑے ہوتے تھے۔ دالانوں کے ستونوں کی ہر صف پر ایک ہی وضع کی محرابوں کی ایک صف تھی۔ پھر ہر ستون پر ایک اور ستون تھا۔ ستونوں کی اس دوسری صف پر ایک صف محرابوں کی تھی اور کہیں کہیں محرابوں کی پہلی اور دوسری صفوں میں محرابوں کی ایک تیسری صف قائم کر کے نہایت خوبصورت چھت تعمیر کی گئی تھی جس کی بلندی ۲۰ ذراع (۳۵ فٹ) تھی۔

جس رخ سے دیکھیے تاحدِ نظر ستونوں کی صفوں پر محرابوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا۔ اس طرزِ تعمیر سے یہ بات ممکن ہو گئی کہ پتلے پتلے ستونوں پر ایک ایسی عظیم عمارت کھڑی کر دی جائے جس کے اندرونی حصے کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جا سکے اور وہاں بیٹھ کر نمازی امام کو بخوبی دیکھ سکیں۔

ایک دوسرے کے اوپر بنی ہوئی دوہری محرابوں سے تعمیر کا طریقہ کسی اور مسجد میں نہیں ملتا چنانچہ اس سے مسجد قرطبہ کو ایک انوکھا حسن اور امتیازی مقام حاصل ہو گیا ہے۔

قرطبہ کی جامع مسجد میں اس کے بعد تین بار اضافے کیے گئے۔ پہلا اضافہ ہشام بن عبدالرحمٰن کے پوتے عبدالرحمٰن الاوسط (۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ / ۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) نے کیا۔ انہوں نے مسجد میں دس دس ستونوں کی صفوں والے سات دالان در دالان قبلے کی سمت بڑھا دیے۔ اس طرح پندرہ دالان در دالان ہو گئے۔

سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء میں جب عبدالرحمٰن الناصر خلیفہ بنے تو انہوں نے مسجد کا نیا مینار بنوایا جو ۷۲ ہاتھ بلند تھا۔ زمین سے ۵۴ ہاتھ کی بلندی پر چاروں طرف ایک چوڑا چھجا نکالا گیا تھا اس پر ستون قائم کر کے اس پر بُرج بنایا گیا تھا۔ بُرج پر کلس تھا۔ کلس کی صورت یہ تھی کہ سیب کی شکل کے تین گولے یا لٹو ایک کے اوپر ایک قائم کیے گئے تھے۔ بیچ کا لٹو چاندی اور باقی دو خالص سونے کے تھے۔ ہر لٹو کا دور ساڑھے تین ہاتھ کا تھا۔ ان پر سونے کی چھ پنکھڑیوں والا سوسن کا پھول تھا اور اس پھول کے اوپر نہایت خوبصورت سونے کا انار بنایا گیا تھا۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے بعد ان کے فرزند الحکم المستنصر باللہ نے خلافت سنبھالی (۳۵۰ھ / ۹۶۱ء)۔ انہوں نے مسجد کے مسقف (چھت دار) حصے کو تقریباً دگنا کروا دیا اور قبلے کی طرف دس دس ستونوں والے ۱۴ دالان در دالانوں کا اضافہ کروا دیا۔ اس طرح دس دس ستونوں والے ۲۹ دالان در دالان وجود میں آ گئے۔

مسجد کے دالانوں کو طے کر کے محراب میں داخل ہونے سے قبل ایک سہ درہ آتا تھا جس کے ستون سبز سنگ مرمر اور لاجورد کے تھے۔ اوپر کے ستونوں پر تین صفیں نہایت خوبصورت محرابوں کی تھیں۔ ان محرابوں کے متعلق ایک یورپین مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے حسن کو بیان کرنے کے لیے نہ الفاظ کام دیتے ہیں نہ فنِ تعمیر کی اصطلاحات کچھ مدد کرتی ہیں۔ مسجدِ قرطبہ میں آخری بڑا اضافہ ہشام المؤید باللہ (۳۶۶ھ تا ۳۹۹ھ / ۹۷۶ء تا ۱۰۰۹ء) کے حکم پر ان کے وزیر محمد بن ابی عامر المنصور نے کیا۔ یہ اضافہ سب سے زیادہ پُرشوکت اور وسیع تھا۔ انہوں نے مسجد کے پورے طول میں شمالاً جنوباً سات سات ستونوں کے ۲۹ دالان در دالان بڑھا دیے۔ اس طرح اٹھارہ ستونوں کے ۲۹ دالان در دالان ہو گئے۔ یہ کل ستون ۱۴۰۹ تھے جو سنگ مرمر، سنگ سماق اور زبرجد کے تھے۔ کہیں کہیں سونے اور چاندی کے جڑاؤ ستون بھی تھے۔

ساڑھے چار سو برس تک یہ عظیم مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہ

Marfat.com

کے طور پر قائم رہی۔ ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں قرطبہ پر قشتالیہ کے مسیحی بادشاہ فردی نند ثالث کا قبضہ ہو گیا۔ اسپین کے لوگ اب بھی اس مسجد کو مسکیتا (یعنی مسجد) کہتے ہیں۔

عیسائیوں نے اس مسجد کو کلیسا بنا ڈالا اور اس کی قیمتی آرائشی و زیبائشی اشیا کو اکھاڑ ڈالا۔ ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء میں جب غرناطہ کے عیسائی بادشاہ چارلس پنجم نے مسجد قرطبہ کو دیکھا تو انہوں نے آزردہ ہو کر اسقفِ اعظم سے کہا: "افسوس ہے، جو چیز آپ نے یہاں بنائی ہے وہ دوسری جگہ بھی بن سکتی تھی لیکن جس چیز کو آپ نے بگاڑا ہے اس کی مثل اب کبھی میسر نہ ہو گی۔"

قرطبہ کی تعمیرات میں ایک اہم تعمیر دریائے وادی الکبیر پر بنایا گیا عظیم الشان پل ہے۔ علامہ مقری کے مطابق یہ پل اندلس کے عجائبات میں سے ہے۔ دریا کا پاٹ، جو اشبیلیہ کے سامنے بہت چوڑا ہے، قرطبہ میں پہنچ کر کم ہو جاتا ہے۔ اس جگہ عربوں کی فتوحات سے تقریباً دو سو برس قبل ایک سنگی پل تھا لیکن یہ بے حد شکستہ ہو چکا تھا۔ مملکت اسلامیہ کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں اسمح بن مالک الخولانی (۱۰۰ھ تا ۱۰۲ھ/۷۱۹ء تا ۷۲۱ء) اندلس کے والی تھے۔ انہوں نے اسی جگہ ایک نیا پل تعمیر کروادیا۔

نئے پل کی ۱۸ محرابیں تھیں۔ اس کی لمبائی ۸۰۰ ہاتھ، چوڑائی ۲۰ ہاتھ اور سطح دریا سے بلندی ۶۰ ہاتھ تھی۔ یہ پل ابھی تک موجود ہے اور اب اس کی ۱۶ محرابیں ہیں۔ ہر محراب ۵۰ ہاتھ چوڑی ہے اور محرابوں کے بیچ میں جو ستون ہیں ان میں سے ہر ایک کی چوڑائی بھی اتنی ہی ہے۔

اندلس میں تعمیرات کے لحاظ سے سب سے اہم دور دسویں صدی عیسوی میں عبدالرحمٰن ثالث کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے قرطبہ کے قریب مدینۃ الزہرا کے نام سے ایک لاجواب محل تعمیر کروایا تھا۔ مدینۃ الزہرا میں سنگی منبت کاری والی جو آرائش نظر آتی ہے وہ اس زمانے میں بلادِ مشرق کے مروجہ عباسی انداز آرائش سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ فن یہاں شام سے نہیں بلکہ شمالی افریقہ کے راستے پہنچا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں اندلس کی اسلامی مملکت چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گئی لیکن اس دور میں علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز قرطبہ ہی رہا۔ سرقسطہ میں جسے اسپین والے "زاراگوزا" لکھتے ہیں، وہاں کے فرمانروا ابو جعفر المقتدر نے قصر الجعفریہ تعمیر کروایا تھا جو اس دور کی اہم عمارت ہے۔ اس محل کے بعض ٹکڑے اسپین کے مختلف عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔

مرابطین کے بربری خاندان نے ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں اندلس اور مراکش کو ایک مملکت کی صورت میں یکجا کر دیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں اندلسی تہذیب و فنون نے المغرب میں جگہ پائی جہاں مراکش، فاس اور تلمسان جیسے شہروں میں اعلیٰ درجے کی آرائش سے مزین عمارتیں وجود میں آئیں۔

اندلس میں مسلمانوں نے اپنے طویل دورِ حکومت میں جو عظیم الشان تعمیرات کیں ان میں سے بعض ابھی تک موجود ہیں۔ جنوبی اندلس کے شہر المریہ میں عبدالرحمٰن الناصر کے عہد میں ایک قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ بعد میں خلیفہ ہشام المؤید کے زمانے میں المریہ کے والی خیران صقبلی نے اس قلعے کی تعمیر میں اضافے کیے اور اس میں عالی شان عمارتیں بنوائیں۔ یہ "قلعہ خیران" کہلایا۔ اس قلعے کی تعمیر کو ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس کے چار مینار ابھی تک سربلند کھڑے ہیں۔

جنوبی اندلس ہی میں شہر اشتبیرہ میں، جہاں مسلمانوں نے ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء تک یعنی ۷۰۰ برس سے زائد عرصے تک حکومت کی، ایک قدیم قلعہ ابھی تک موجود ہے۔ پرتگال کے علاقے بیرا کے شمال میں بلیقیہ کے نام سے ایک شہر موجود ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کے زمانے کا ایک قلعہ اب تک باقی ہے۔ مسلمانوں نے ۳۸۷ھ/۹۹۷ء کے بعد تک یعنی ۲۷۵ برس یہاں حکومت کی۔ جنوبی اندلس کے صوبہ المریہ میں مسلمانوں نے ۲۰ سے زائد قلعے تعمیر کیے۔ ان میں بجانہ سے دس میل دور الحابیہ (موجودہ نام الہادیہ) کا مشہور قلعہ بھی تھا۔

شہر اشبیلیہ سے چند میل دور موحدین کے حکمراں یعقوب المنصور نے بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کروائی تھیں۔ شمالی اندلس کے شہر سرقسطہ میں ایک تابعی حضرت حنش بن عبداللہؒ نے پہلی صدی ہجری میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ ڈیڑھ سو برس بعد امیر قرطبہ محمد بن عبدالرحمٰن نے ۲۴۲ھ/۸۵۶ء میں اس مسجد میں توسیع کر کے اسے مکمل کروایا تھا۔ آج یہاں پر گرجا گھر قائم ہے لیکن عمارت پر جو نقش و نگار اور چینی کا کام ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک مسجد تھی۔ مسلمانوں کی یادگار ایک محل بھی ابھی تک موجود ہے جو "الہافیریہ" کہلاتا ہے۔ یہ "الجعفریہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

شمالی وسطی اندلس کے پرانے شہر شنت بانکش (موجودہ سمان کس) پر مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک حکومت کی۔ دوسری صدی ہجری میں تعمیر کیا گیا ایک قلعہ ابھی تک باقی

Marfat.com

ہے۔ جنوب مغربی اندلس کا ایک شہر شریشہ جس پر مسلمانوں نے ساتویں صدی ہجری تک حکومت کی، آج بھی قائم ہے اور اس کی فصیل اس کے چھ دروازوں سمیت سلامت ہے۔ اسی طرح مشرقی اندلس میں بلنسیہ کے ایک شہر قلیرہ میں مسلمانوں کے وقت کا ایک قلعہ ابھی تک موجود ہے۔ ادھر شمالی اندلس کے شہر لاردہ (موجودہ: لریدہ) میں بھی اسلامی عہد کا قلعہ آج بھی موجود ہے۔ فرانس کی سرحد سے ملنے والے اس شہر پر مسلمانوں نے ۴۵۰ برس تک حکومت کی۔

پرتگال کا موجودہ دارالحکومت لزبن ایک زمانے میں ''اشبونہ'' کہلاتا تھا۔ مسلمانوں نے یہاں بھی ۴۵۰ برس تک حکمرانی کی۔ شہر کے پرانے حصے میں ایک اونچی پہاڑی پر ایک قلعہ مسلمانوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ ادھر مشرقی اندلس میں صوبہ مرسیہ کے شہر لورقہ (موجودہ: لورکا) میں سب سے بلند مقام پر مسلمانوں کے زمانے کا ایک قلعہ ابھی تک سلامت ہے۔ جنوبی اندلس کے پہاڑی شہر لوشہ (موجودہ: لوجا) میں بھی پہاڑ کی چوٹی پر مسلمانوں کے عہد کا ایک قلعہ موجود ہے۔

مسلمانوں نے یہاں پہلی صدی ہجری کے آخر سے نویں صدی ہجری کے آخر تک یعنی تقریباً ۸۰۰ برس حکمرانی کی۔ جنوبی اندلس ہی کے شہر مالقہ میں مسلمانوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ القارہ ابھی تک اچھی حالت میں ہے۔ جنوبی اندلس میں منت فرید اور جنوب مغربی اندلس میں منت فیق میں بھی مسلمانوں کے زمانے کے قلعے آج تک سلامت ہیں۔

۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء کے قریب اندلس میں عیسائیوں کی بتدریج فتوحات کے باعث یورپ میں اسلامی حکومت کا زوال شروع ہو گیا لیکن غرناطہ کے نصریہ خاندان نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا اور اسلامی اندلس کی قدیم عظمت کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان کا تعمیر کردہ محل الحمرا اندلس میں چودھویں صدی عیسوی کے اسلامی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے جو اندلسی اور عربی دونوں اسالیب کا مظہر ہے۔ گچ کاری میں نیلے، سرخ اور سنہری رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے اور اقلیدسی اشکال بنائی گئی ہیں۔ اس قسم کی رنگین گچ کاری اندلس کے دوسرے حصوں میں بھی رائج ہو گئی مثلاً اشبیلیہ کا القصر اور طلیطلہ کی متعدد عمارتیں۔ الحمرا کو خاندان نصریہ کے بانی امیر محمد بن یوسف بن نصر نے ساتویں صدی ہجری میں تعمیر کروایا۔ اس کی دیواریں سرخی مائل مسالے سے تیار ہوئی ہیں، اس لیے اسے القصر الحمرا یعنی ''سرخ محل'' کہتے ہیں۔

اندلس میں مسلمانوں کا اندازِ تعمیر اس قدر منفرد اور ممتاز تھا کہ اس کے اثرات نہایت دیرپا ثابت ہوئے۔ اسپین، پرتگال اور جنوبی اٹلی نے ان کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا۔ یہ علاقے طویل عرصے تک مسلمان حکومتوں کا حصہ رہے۔ جب عیسائیوں نے ان ملکوں پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی مسلمانوں کے فنون اختیار کیے جو اوجِ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ اسپین کے عیسائی اپنے گرجا یورپی طرز پر بناتے لیکن ان میں مسلمانوں کے انداز کے نقش و نگار اور عربی کتبات ہوتے تھے مثلاً طلیطلہ میں کرسٹو دی لالوز۔

یہی طرزِ تعمیر عیسائیوں کے محلوں میں بھی رائج رہا۔ مثلاً ڈان پنڈور کا محل، اشبیلیہ کا القصر یا لزبن کے نزدیک قنطرہ۔ رہائشی مکانات اور یہودی عبادت گاہیں بھی اسلامی طرزِ تعمیر کے مطابق بنائی جاتی تھیں۔ مثلاً طلیطلہ میں سانتا ماریا لا بلانکا اور سال ٹرانزیٹو۔ اس اندازِ تعمیر کی خوش نما چھتیں اور ہندسی اشکال، سولھویں صدی عیسوی میں بھی مدت تک اور لاطینی امریکا تک میں مقبول رہیں۔ جس طرح مسلمان اپنی عمارتوں کو نقش و نگار سے مزین کرتے تھے اسی طرح یورپی اور امریکی عمارتیں بھی سرتاسر منقش ہونے لگیں، جیسے قالین ہوں۔

موجودہ اسپین اور پرتگال کے بعض شہر صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک مسلمانوں کے انداز کے شہر ہیں، مثلاً پرتگال کا شہر برتگال جو اب ''اپروٹو'' کہلاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں نے ۲۹۰ برس حکومت کی۔ اسی طرح مغربی اسپین میں شہر ''بطلیوس'' جو اب ''بیڈجوز'' یا ''بڈاہوس'' کہلاتا ہے، مسلمانوں کا بسایا ہوا ہے۔ یہاں کی کئی تعمیرات مسلمانوں کے وقت سے ابھی تک قائم ہیں۔ ایک شکستہ قلعہ بھی آج تک موجود ہے۔

قرطبہ

شہر قرطبہ کے ۲۱ ربض (محلے) تھے ان ۲۱ محلوں کے درمیان قرطبہ کا خاص شہر تھا۔ شہر کے سات دروازے تھے۔ قرطبہ کا شاہی محل نہایت قدیم تھا۔ اس میں پرانے زمانے کے بادشاہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے قیام کرتے آئے تھے۔ اموی خاندان کے مسلمان حکمرانوں نے بھی اپنی رہائش کے لیے اسے منتخب کیا اور اس میں اضافے کیے۔ دور دراز پہاڑوں سے میٹھے پانی کی نہریں کاٹ کر قصر میں لائی گئیں، پھر یہاں سے اس پانی کو جست کے نلوں میں جاری کر کے شہر کے چپے چپے کو سرسبز و شاداب بنایا گیا۔ ان ہی نلوں کے ذریعے یہ پانی سونے، چاندی کے مختلف حوضوں میں اور پھر بڑی جھیلوں میں جمع ہو جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن الناصر (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ/۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) نے اس

Marfat.com

شہر کو سب سے زیادہ ترقی دی۔ انہوں نے قصر کے چاروں طرف بڑے بڑے باغ لگوائے تھے۔

قصر شاہی سے شمال کی جانب امیر عبدالرحمٰن الداخل کا باغ "رصافہ" تھا۔ رصافہ لفظ "رصیف" سے ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں ایسی جگہ جہاں پتھر کی سلوں کا فرش ہو۔ اسی لفظ سے اسپینی زبان میں ایک لفظ "اریسیفی" بنالیا گیا جس کے معنی "پتھر کے راستے" کے ہیں۔

"رصافہ" کا نام دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ ایک رصافہ قرطبہ، دوسرے رصافہ بلنسیہ۔ رصافہ قرطبہ میں عبدالرحمٰن الداخل نے دور دور سے پودے اور بیج منگوا کر درخت لگوائے تھے۔ طرح طرح کی سبزیاں اور پھل اندلس میں پیدا ہونے لگے۔ رصافہ بلنسیہ کا نام آج کل "روزافہ" ہے۔ یہ شہر بلنسیہ (ویلنسیا) سے چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر کے قریب بہت سے باغات اور سیر گاہیں ہیں۔

ایک محل کا نام 'دمشق' تھا۔ اس کی چھتیں سنگ مرمر کے خوشنما ستونوں پر قائم تھیں اور چھتوں کے اندر کے رخ خوبصورت پچی کاری کی گئی تھی۔ موحدین کے زمانے کے ایک حاکم ابو یحییٰ ابن ابو یعقوب بن عبدالمومن نے شہر سے باہر ایک قصر بنوایا تھا۔ یہ قصر دریا کے بیچ میں محرابوں پر قائم کیا گیا تھا۔ "منیہ" نام کے بہت سے قصر تھے۔ ان میں ایک منیہ الزبیر تھا جو عالی شان محل اور باغ پر مشتمل تھا۔ دیگر محلوں اور باغات میں منیہ السرور، منیہ عامرہ، منیہ الناعورہ، (رہٹ والا باغ)، قصر الفارسی، مرج النضیر شامل تھے۔

ایک خوبصورت سبزہ زار کا نام "مرج الخُز" یا "مرج الخز" تھا۔ (خُر ایسی پہاڑی زمین کو کہتے ہیں جس کو پانی کی روانے جابجا کاٹ دیا ہو۔ یہاں پتھروں اور چٹانوں سے پانی بہنے کی ہلکی ہلکی آواز ہوگی۔ اگر "خُز" پڑھیں تو ایک سبزہ زار ہوگا جس کی گھاس بہت نرم اور ریشمی ہوگی)۔ ایک سبزہ زار "فحص السد" تھا جسے "فحص الاراحی" یعنی پن چکیوں والا مزروعہ میدان بھی کہتے تھے۔ ایک سبزہ زار فحص السارق تھا۔ یہ شہر سے باہر کے مقامات بڑی سیر و تفریح کے تھے جن کا پتا صرف پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔

"منیتہ الناعورہ" جسے "قصر ناعورہ" یا "دار ناعورہ" بھی کہتے تھے، قرطبہ کے مغربی حصے میں عالی شان باغ اور محل تھا۔ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے قرطبہ کے پہاڑوں سے ایک نہر اس باغ تک پہنچائی تھی۔ پہاڑوں میں واقع نہر کے منبع سے باغ تک ستونوں پر نہایت خوش نما محرابیں تعمیر کی گئی تھیں۔ زمین کے نشیب و فراز کے مطابق ستونوں کو بڑی حکمت عملی سے اونچا نیچا رکھا گیا تھا تاکہ نہر کی سطح ہموار رہے۔ باغ میں ایک حسین حوض تعمیر کیا گیا تھا، جس کے درمیان شیر کا ایک بڑا، خالص سونے کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔ شیر کی آنکھیں جواہرات سے بنائی گئی تھیں۔ اس شیر کی صورت اصلی شیر سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔

قرطبہ نے خلیفہ ہشام المؤید (۳۶۶ھ تا ۳۹۹ھ/۹۷۶ء تا ۱۰۰۹ء) اور ان کے وزیر محمد بن ابی عامر کے عہد میں بہت وسعت حاصل کی۔ اس زمانے میں عام افراد کے مکانات کی تعداد دو لاکھ ۷۰ ہزار اور امراء، وزراء اور حکومت سے متعلق اعلیٰ شخصیات کے مکانات کی تعداد ۶۰ ہزار تھی۔ ۴۳۰۰ بازار تھے۔ مساجد کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۸۳۷ بیان ہوئی ہے، حمام زیادہ سے زیادہ ۷۰۰ رہ چکے ہیں۔

مدینتہ الزہراء

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے قرطبہ سے باہر شمال کی سمت چار میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر مدینتہ الزہراء کے نام سے بسایا تھا۔ خلیفہ الناصر کی زندگی میں ۲۵ برس تک اس شہر کی تعمیر جاری رہی اور ان کے بعد خلیفہ الحکم ثانی کے دور میں مزید ۱۵ برس تک شہر میں اضافے ہوئے۔ اس طرح شہر کی تکمیل میں ۴۰ برس صرف ہوئے۔ یہ بڑا شاندار اور غیر معمولی شہر تھا۔

مدینتہ الزہراء میں یوں تو بہت سی اہم عمارتیں تھیں لیکن مؤرخین نے دو عمارتوں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ ایک مجلس مونس اور دوسری قصر الخلفا۔ مجلس مونس شاہی محل کا مشرقی ایوان تھا۔ اس میں ایک طلائی حوض تھا جس کی چاروں جانب شیر، ہرن، مگرمچھ، عقاب، اژدہے، کبوتر اور دیگر پرندوں کے طلائی مجسمے تھے۔ ان مجسموں میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اور ان کے منہ سے پانی کی دھاریں نکل کر حوض میں گرتی تھیں۔

قصر الخلفا شاہی محل کا ایک اور ایوان تھا۔ اس کی چھت اور دیواریں سونے اور سنگ مرمر کی تھیں۔ اس ایوان کے بالکل بیچ میں ایک خوبصورت حوض تھا جس میں پارہ بھرا رہتا تھا۔ اگر اس پارے کو ہلا دیا جاتا تو سورج کی شعاعیں اس پارے سے منعکس ہو کر پورے ایوان میں کوندنے لگتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ پورا ایوان گردش کر رہا ہے۔

مدینتہ الزہراء کی جامع مسجد بھی فن تعمیر کا شاہکار تھی۔ اس کا ہر حصہ بہت خوبصورتی سے بنایا گیا تھا۔

Marfat.com

شہر میں صحرائی جانوروں کا ایک بڑا حیرت خیز عجائب گھر بھی تھا۔ یہ سفاری پارک کے انداز کا عجائب گھر تھا جس میں جانور کھلے پھرتے تھے۔ مدینۃ الزہرا کی تعمیر کے لیے خلیفہ الناصر کے حکم پر دس ہزار مزدور اور کاریگر روزانہ کام کرتے تھے۔ شہر کے شمال میں ایک سیاہ پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ پر اتنی عمدہ شجر کاری کی گئی کہ وہ دلہن محسوس ہونے لگا اسی لیے اس پہاڑ کا نام "جبل العروس" رکھ دیا گیا۔

اشبیلیہ

اندلس کے شہروں میں قرطبہ کے بعد جو شہر ممتاز رہا، وہ اشبیلیہ ہے، جسے اسپین والے "سیویلا" کہتے ہیں۔ آج کل یہ جنوب مغرب اندلس کا ایک علاقہ ہے۔ یہ شہر دریائے وادی الکبیر کے بائیں کنارے، بحر محیط سے ۵۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنایا گیا تھا۔ یہاں کی سپید عمارتیں، سرسبز باغات میں ایسی لگتی تھیں جیسے آسمان پر ستارے۔ دریا کے دونوں کناروں پر انگور اور سیب کے باغات تھے جو دور تک چلے گئے تھے۔ شہر سے باہر جبل الرحمت پر انجیر کے باغ تھے۔ شہر میں ہر طرف نہریں جاری تھیں۔ درختوں، خصوصاً نارنگی اور لیموں کے درختوں کی کثرت تھی۔

اشبیلیہ پر مسلمانوں نے تقریباً ۵۵۰ برس تک حکومت کی۔ شہر کے بعض گلی کوچے اب بھی ایشیائی شہروں کی وضع کے ہیں۔ شاہی قصر میں آج بھی اسلامی فن تعمیر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس شہر پر مسلمانوں نے بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ خلیفہ عبدالرحمٰن ثانی (۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ / ۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) کے دور میں اشبیلیہ میں عیسائیوں نے اس بڑے پیمانے پر اسلام قبول کیا کہ ایک نئی مسجد بنوانے کی ضرورت پیش آگئی۔ جن عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ان کے اسلامی ناموں میں عیسائی نام مثلاً انجلینو، سبریقوو غیرہ مدتوں تک شامل رہے۔

تعمیرات کے لحاظ سے بھی اشبیلیہ کا شہر ممتاز رہا ہے۔ مسلمانوں نے یہاں تقریباً ساڑھے پانچ سو برس تک حکومت کی۔ ۱۰۰ھ / ۷۱۹ء میں مسلمانوں نے اشبیلیہ کی بجائے قرطبہ کو اندلس کا دارالحکومت قرار دے دیا تھا لیکن اس سے اشبیلیہ کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ امیر عبدالرحمٰن الاوسط کا دور آیا تو انہوں نے اشبیلیہ کے گرد ایک مضبوط فصیل اور ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ موحدین کے دور میں ابو یعقوب یوسف اور یعقوب المنصور نے اشبیلیہ کو مزید ترقی دی۔ بڑے بڑے پُر شکوہ محل تیار کروائے۔ مساجد، حمام، کارواں سرائے اور بازاروں میں اضافہ کیا۔

سنہ ۵۶۷ھ / ۱۱۷۲ء میں شہر میں دریائے وادی الکبیر پر ایک پل اور شہر میں دو نئے محلے تعمیر کیے گئے۔ کئی قلعے اور خندقیں بنائی گئیں۔ سلطان ابو یعقوب یوسف کی جامع مسجد کا ایک حصہ ابھی تک باقی ہے۔ مسجد کے دروازے کا نام عیسائیوں نے "پوار تو دیل پردون" یعنی معافی کا دروازہ رکھ لیا ہے۔ مسجد کے مینار کا ہسپانوی نام "جرالدا" ہے۔ مسجد کا مینار چو پہلو ہے اس کا قاعدہ ۴۳ مربع فٹ ہے۔ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں اشبیلیہ کے حاکم ابو العلاءؒ نے وادی الکبیر کے کنارے ایک مینار بنوایا تھا تاکہ سرکاری عمارتوں اور دریا پر کشتیوں کے بیڑے کی حفاظت کے لیے نظر رکھی جاسکے۔

علوم وفنون

اندلس پر صدیوں حکمرانی کے دوران میں مسلمانوں نے علوم و فنون کو زبردست ترقی دی اور مختلف علوم کے بڑے بڑے ماہرین تیار ہوئے۔ ان ماہرین کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

دارالحکومت قرطبہ سے اہل علم کی بڑی تعداد وابستہ رہی۔ ان میں حدیث کے حافظ، ایک بڑے عالم خلفؒ بن القاسم (وفات: ۳۹۳ھ / ۱۰۰۲ء) تھے جو ابن الدباغ الازدی قرطبیؒ کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ احمد بن محمد بن عبدالبرؒ (وفات: ۳۳۸ھ / ۹۴۹ء) بھی حدیث کے عالم تھے۔ احمدؒ بن محمد بن موسیٰ (وفات: ۳۴۴ھ / ۹۵۶ء) بھی علم حدیث کی تاریخ کے ماہر تھے۔ خالد بن سعد القرطبیؒ (وفات: ۳۶۶ھ / ۹۷۶ء) بھی حدیث اور راویانِ حدیث کی تاریخ کے ماہر تھے۔ حسن بن الولیدؒ چوتھی صدی ہجری میں فقہ اور نحو کے عالم تھے۔ ابو محمد علی بن احمد سعید ابن حزمؒ بڑے فقیہ، مؤرخ اور شاعر تھے۔ ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ شعبان ۴۵۶ھ / جولائی ۱۰۶۴ء میں انتقال ہوا۔ ابنِ رُشد (ابو الولید محمد بن احمد) نے فقہ اور طب کی تعلیم قرطبہ میں حاصل کی۔ وہ اندلس کے سب سے بڑے فلسفی تھے۔ ۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء میں انتقال فرمایا۔ پورے اندلس میں سب سے زیادہ کتابیں قرطبہ شہر میں تھیں۔ جس رئیس کا کتب خانہ سب سے بڑا ہوتا، اس کا ذکر زیادہ عزت اور رشک سے کیا جاتا تھا۔

خلیفہ الحکم مستنصر باللہ (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ / ۹۶۱ء تا ۹۷۶ء) کا کتب خانہ تو عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ قاہرہ، بغداد، دمشق، اسکندریہ، اس زمانے میں علوم وفنون کے بڑے مراکز تھے۔ خلیفہ کے نمائندے ان شہروں میں بڑی بڑی رقمیں لیے موجود رہتے تھے کہ کہیں سے کوئی

Marfat.com

نادر قلمی کتاب ملے تو خرید لیں یا نقل کروا کے خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔

الحکم مستنصر باللہ کے کتب خانے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ صرف کتابوں کی فہرست ہی ۴۴ جلدوں میں تھی اور ہر جلد میں ۵۰ اوراق تھے۔ کتابوں کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ تھی اور ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس کا الحکم نے خود مطالعہ نہ کیا ہو۔ وہ جس کتاب کو پڑھتے تھے اس کے شروع یا آخر میں مؤلفِ کتاب کا نام، پیشہ، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اور مختصر حالات زندگی خود اپنے قلم سے لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ حواشی نہایت مستند اور قابلِ قدر تھے۔

قرطبہ میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں سوائے پادریوں یا اعلیٰ سرکاری افسران کے بقیہ تمام افراد ناخواندہ ہوتے تھے۔ لیکن اندلس کے مسلمانوں میں سے ہر ایک پڑھا لکھا ہوتا تھا۔ قرطبہ کا دارالعلوم دنیا بھر میں مشہور تھا۔

علامہ ابو بکر بن معاویہؒ حدیث کا درس دیتے تھے۔ علامہ ابو علی القالی باشندگانِ عربِ قدیم کے حالات، زبان اور شاعری پر خطبے دیتے تھے۔ ابن القرطبہ نحو پڑھاتے تھے جو اندلس میں نحو کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اس دارالعلوم میں ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔

غرناطہ کی کیفیت بھی یہ تھی کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب یہ شہر علما اور شعر و ادب کے ماہرین سے خالی رہا ہو۔ یہ خصوصیت غرناطہ ہی کو حاصل تھی کہ یہاں علم و فضل اور شعر و ادب میں کمال رکھنے والی خواتین پیدا ہوئیں مثلاً نزہون القلعیہ، زینب بنت زیاد، حفصہ الرکونیہ وغیرہ۔

جنوب مغربی اندلس کا مشہور شہر اشبیلیہ بھی اسلامی عہد میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ عبداللہ بن عمر بن خطاب اشبیلی اشبیلیہ کے قاضی تھے (وفات: ۳۷۶ھ / ۹۸۶ء)۔ غرناطہ، صوبہ البیرہ کا حصہ تھا۔ صوبہ البیرہ کا سب سے مشہور شہر قسطیلیہ تھا اسے مدینہ البیرہ بھی کہتے تھے۔ یہاں ہر فن کے علما موجود تھے۔ اسد بن عبدالرحمٰن البیریؒ، مشہور محدث اور قاضی تھے۔ البیرہ کے سات بڑے محدثوں میں سعید بن حسانؒ، ابراہیم بن شعیبؒ، احمد بن سلیمانؒ، سلیمان بن نصرؒ، ابراہیم بن خلاؒ، عمر بن موسیٰؒ، سعید بن نمرؒ شامل تھے۔ فقہ اور حدیث میں کئی کتابوں کے مؤلف ابو مروان عبدالملکؒ تھے۔ وہ نحو، تاریخ اور نسب کے ماہر بھی تھے اور شاعر بھی۔ ۲۳۸ھ / ۸۵۳ء میں وفات پائی۔

مشرقی اندلس کے پہاڑی شہر الثانیہ میں ابو زید عبدالرحمٰنؒ حدیث اور ادب کے عالم تھے۔ ان کے بھتیجے ابو جعفرؒ نے قرآن کی قرأت کا علم ساتوں قرأتوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ صوبہ جیان کے شہر اندوجہ میں علم و ادب اور نحو کے عالم ابو اسحاق ابراہیمؒ یہیں سے تعلق رکھتے تھے۔ موجودہ پرتگال کے شہر باجہ میں ابو محمد عبداللہ بن علی الباجیؒ حدیث کے بڑے عالم تھے۔ ۳۷۸ھ / ۹۸۸ء میں انتقال ہوا۔ شمال مشرقی اندلس کے شہر بربشتر میں ابو القاسم خلف بن یوسفؒ قرآن و حدیث کے عالم تھے۔ (وفات: ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء) یوسف بن عمر بن ایوبؒ بڑے محدث تھے۔ مشرقی اندلس کے شہر بلنسیہ میں ابوالحسن سعد الخیرؒ بڑے فقیہ اور محدث تھے۔ قرطبہ کے قریب واقع شہر جالطہ میں ابو عبداللہ بن قاسمؒ بڑے محدث تھے۔ فقہ اور ادب میں بھی بصیرت رکھتے تھے۔ ۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء میں انہیں بربروں نے قتل کر دیا۔

اندلس کے مشرقی ساحل کے مشرق میں ۱۲۵ میل دور بحر متوسط میں واقع جزیرے میورقہ میں مسلمان تقریباً ۵۰۰ برس حاکم رہے۔ ۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء میں ابوالجیش مجاہد الموفق العامریؒ نے اس جزیرے پر اپنی حکومت قائم کی۔ وہ بڑے ادیب و فاضل تھے۔ عروض میں ایک کتاب لکھی تھی۔ وسطی اندلس کے شہر جیان سے بھی بہت سے علما منسوب تھے۔ ابن مالکؒ مشہور نحوی تھے۔ قرطبہ کے بڑے محدث، علم لغت و نحو کے ماہر حسین بن محمد بن احمد غسانیؒ بھی یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے (وفات: ۴۹۹ھ / ۱۱۰۵ء)۔

مشرقی اندلس کے شہر دانیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ قرآن مجید کے قاری جتنی بڑی تعداد میں دانیہ میں تھے، اتنے اندلس کے کسی شہر میں نہ تھے۔ شمالی اندلس کے علاقے سرقسطہ میں بڑے بڑے علما اور فضلا گزرے ہیں۔ ابو القاسم ثابت بن حزمؒ بڑے عالم تھے۔ حدیث، فقہ، نحو، شعر کے ماہر تھے۔ ابوالقاسم ثابتؒ کے فرزند قاسم بن ثابتؒ علم و فضل اور تقویٰ میں اپنے والد سے بھی آگے تھے۔ حدیث کی شرح میں ایک کتاب "الدلائل" لکھنی شروع کی لیکن تکمیل سے قبل انتقال ہو گیا، پھر ان کے والد نے یہ کتاب مکمل کی۔ مشرقی اندلس کے صوبے بلنسیہ (ویلنسیا) کے جنوبی حصے کے بڑے پرانے شہر شاطبہ میں ابوالقاسم بن فیرہ ممتاز عالم تھے۔ حدیث کے ایک عالم ابو محمد عبدالعزیز بن عبداللہؒ تھے۔

شمالی اندلس میں شلمنکہ کے شہر میں ابو جعفر بن محمدؒ بڑے قاری تھے۔ اس فن پر ان کی کئی کتابیں موجود تھیں۔ انہوں نے حدیثیں بھی روایت کیں۔ جنوبی اندلس کے شہر قرمونہ میں ابوالمغیرہ خطاب ممتاز

Marfat.com

محدث تھے۔(وفات: ۳۲۷ھ/۹۳۸ء)۔ ادھر وسطی اندلس کے شہر قلعہ ایوب سے علما کی ایک بڑی جماعت منسوب تھی، مثلاً ابو عبداللہ محمد بن قاسم بن حزمؒ حدیث کے عالم تھے۔(وفات: ۳۴۴ھ/۹۵۵ء)۔ ابو عبداللہ محمد بن نصر الثغری تاریخ و اشعار کے حافظ، لغت اور نحو کے عالم اور بڑے بلیغ خطیب تھے (وفات: ۳۴۵ھ/۹۵۶ء)۔ وسطی اندلس میں قلعہ رباح کے فقہا اور محدثین میں محمد بن ابی سہلویہؒ اور قاسم بن الشارحؒ شامل تھے۔ بلنسیہ کے قریب واقع شہر مربیطر میں سفیان بن العاصی بن احمدؒ بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ بہت سے لوگوں سے حدیثیں سنیں اور ایک جماعت نے ان سے روایت کی (وفات: ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء)۔

سائنس

اندلس کے مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ عبدالرحمٰن الناصر کے زمانے (۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ/۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) میں اندلس نے خوب ترقی کی۔ علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔ الحکم ثانی کے عہد (۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ/۹۶۱ء تا ۹۷۶ء) میں عریب بن سعد الکاتب قرطبی نے طب میں بڑا کام کیا۔ انہوں نے خواتین کے امراض پر تحقیق کی اور اپنے تجربات کو تین کتابوں میں محفوظ کر دیا۔ وہ علم نباتات کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر بھی کتاب لکھی۔ ان کی ایک اور حیثیت مورخ کی تھی۔ انہوں نے اندلس کی مکمل تاریخ لکھی۔

ابوالقاسم مسلمہ بن مجریطیؒ اندلس کے ممتاز سائنس داں تھے۔ ان کا خاص مضمون ریاضی تھا۔ انہوں نے عبدالرحمٰن الناصر، حکم ثانی اور ہشام ثانی کے ادوار دیکھے۔ ابوالقاسم مسلمہؒ علم ہیئت، علم کیمیا اور علم حیوانات میں بھی ماہر تھے۔ انہوں نے علم ریاضی میں حسابِ تجارت پر توجہ دی اور اس کے بنیادی اصول مرتب کر کے "المعاملات" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ علم حیوانات اور کیمیا پر بھی دو الگ الگ کتابیں مرتب کیں۔ ان کا انتقال ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں ہوا۔

ابوالقاسم ابن عباس زہراویؒ کے نام سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے فن طب میں جراحت (سرجری) کا طریقہ رائج کیا اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔ ان سے پہلے صرف دواؤں سے علاج ہوتا تھا۔ زہراوی نے موتیابند کا آپریشن کیا۔ آپریشن کے ذریعے حلق کے غدود کے بڑھ جانے اور ہڈیوں کے جوڑنے، کاٹنے کے علاج دریافت کیے۔ انہوں نے آپریشن کے اصول اور قاعدے مقرر کیے اور آپریشن کے ۱۰۰ سے زیادہ آلات ایجاد کیے۔ انہوں نے اپنی کتاب "تصریف" میں اپنے تجربات کو یکجا کر دیا ہے۔ زہراوی نے اندرونِ جسم آپریشن کرنے کے نہایت نازک طریقے بتائے۔ انہوں نے سرطان (کینسر) پر بھی تحقیق کی۔ وہ ایک اچھے دندان ساز بھی تھے اور اس موضوع پر بھی انہوں نے اپنی کتاب میں مفید معلومات دی ہیں۔ وہ دنیا کے پہلے سرجن ہیں جنہوں نے انسانی اعضا اور امراض کی تحقیق کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت پر زور دیا۔

ابو عبداللہ الشریف محمد بن الادریسیؒ علم جغرافیہ کے ماہر تھے۔ انہوں نے زمین پر تحقیق کی، اس کا نقشہ بنایا اور نمونہ (ماڈل) تیار کیا۔ لسان الدین ابن الخطیبؒ غرناطہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے متعدی یعنی اُڑ کر لگنے والے امراض کے بارے میں انکشافات کیے۔ وہ ایک اچھے شاعر، مورخ، جغرافیہ داں اور فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ۶۰ کتابیں لکھیں۔ ابن الخطیب نے یہ دریافت کیا کہ امراض کے پھیلنے کا سبب جراثیم ہوتے ہیں۔ ابن الخطیب کا انتقال ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں ہوا۔ اندلس کے مشہور سائنس داں ابنِ فرناس نے دنیا میں فضائی پرواز کا سب سے پہلا کامیاب تجربہ کیا۔

ابنِ رشدؒ ریاضی، ہیئت، منطق اور فقہ کے عالم تھے۔ ان کی تصانیف بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں جن میں زیادہ تصانیف طب اور فقہ سے متعلق ہیں۔ وہ خاصے عرصے تک منصبِ قضا پر فائز رہے۔ انہوں نے پہلی بار ثابت کیا کہ اگر انسان کے چیچک نکل آئے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس مرض سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ علم نباتات کے ماہر ابنِ بیطار کا تعلق بھی اندلس سے تھا۔ تاہم وہ قاہرہ اور دمشق میں مقیم ہو گئے تھے۔

اندلس میں کوئی دوسرا حکیم ابنِ باجہ کے درجے کو نہ پہنچ سکا۔ انہوں نے ریاضی، منطق، ہیئت، ہندسہ، فلسفہ اور موسیقی پر ۳۵ کتابیں لکھیں۔ وہ سرقسطہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۵۳۳ھ/۱۱۳۸ء میں ہوا۔

اندلس کے سب سے بڑے فلسفی اور طبیب ابنِ طفیل تھے۔ انہوں نے فلسفے کے موضوع پر شہرۂ آفاق کتاب "حیّ ابن یقظان" لکھی۔ اس کتاب کے ترجمے لاطینی، فرانسیسی، ولندیزی، روسی، ہسپانوی اور دیگر زبانوں میں ہوئے۔

Marfat.com

صنعتی ترقی

اندلس نے مسلمانوں کے دور میں مختلف صنعتوں میں بھی بہت ترقی کی۔ مثال کے طور پر عبد الرحمٰن الاوسط نے ہتھیار اور جنگی جہاز تیار کرنے کی غرض سے ایک دارالصناعہ اشبیلیہ میں قائم کروایا۔ یہاں بہت سے تیز رفتار جنگی جہاز تیار کیے گئے اور جہاز سازی کے فن کو بڑی ترقی ملی۔ اس کے علاوہ موحدین کے تمام محل اشبیلیہ ہی کے معماروں نے تیار کیے تھے۔ ریشمی کپڑے، موسیقی کے آلات، مثلاً خیال، کرتیخ، عود، رباب، قانون وغیرہ نہایت عمدہ بنائے جاتے تھے۔ باغبانی کے فنون میں یہاں کے مسلمان طاق تھے۔ مینا کاری اور پچی کاری کا کام بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔ اشبیلیہ سے تھوڑے فاصلے پر طریانتہ میں ایک قسم کی گھاس حلفہ سے طرح طرح کی اشیا بنائی جاتی تھیں، مٹی کے برتن بھی بہت خوبصورت تیار کیے جاتے تھے۔

جنوبی اندلس کے شہر المریہ میں زراعت خوب ہوتی تھی۔ ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت عروج پر تھی۔ یہاں مسلمانوں نے تقریباً ۸۰۰ برس حکومت کی۔ عبد الرحمٰن الداخل ہی کے زمانے میں یہاں جنگی سامان اور جہاز بنانے کے کارخانے قائم ہوگئے تھے۔ مرابطین کی حکومت (۴۸۴ھ تا ۵۴۱ھ/۱۰۹۱ء تا ۱۱۴۷ء) سے پہلے سے یہاں تانبے اور لوہے کے آلات تیار ہوتے تھے۔ مرابطین کے زمانے میں یہ شہر صنعتوں کا مرکز بن گیا۔ ریشم کے آٹھ سو کارخانے تھے جن میں طرح طرح کے عمدہ کپڑے تیار ہوتے تھے۔

موجودہ پرتگال کے شہر "باجہ" میں جو، اب "بیجا" کہلاتا ہے، مسلمانوں نے ۵۵۰ برس حکومت کی۔ یہاں سوتی کپڑے اور چمڑے کے کام کی صنعتیں بہت مشہور تھیں۔ مشرقی اندلس کے صوبہ تُدمیر کے ایک شہر بکیران میں جو، اب "بکیرینٹ" کہلاتا ہے، ایک قسم کا سفید کپڑا تیار کیا جاتا تھا جو اتنا مضبوط ہوتا تھا کہ برسوں بعد کہیں جا کر پھٹتا تھا۔ بعض کپڑے اتنے باریک بُنے جاتے تھے کہ بالکل باریک کاغذ محسوس ہوتے تھے۔

مشرقی اندلس کے صوبے اور شہر بلنسیہ میں مسلمانوں نے ۵۳۲ برس حکومت کی۔ زراعت اور باغبانی مسلمانوں کے بڑے پیشے تھے اور مسلمانوں نے ان شعبوں میں جس طرح کی بنا ڈالی تھی وہی آج بھی قائم ہے۔ مسلمانوں نے یہاں بہت اچھا نظام آب پاشی قائم کیا تھا۔ مشرقی اندلس کے شہر "جنجالہ" یا "جنجیلہ" (موجودہ نام: جنجیلا) میں اون کی اتنی عمدہ مسندیں تیار کی جاتی تھیں جو کہیں اور ممکن نہ تھیں۔ اسی طرح وسطی اندلس کے جنوبی شہر جیان میں ریشم کے کیڑے کی صنعت عروج پر تھی اسی لیے اسے "جیان الحریر" بھی کہتے تھے۔ یہاں ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے دور دور تک شہتوت کے باغات لگائے گئے تھے۔ یہاں مسلمانوں نے ۵۷۵ برس حکومت کی۔

مشرقی اندلس کے شہر دانیہ (موجودہ نام دینیہ) میں جہاز سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم تھے۔ مسلمانوں نے ۹۳ھ/۷۱۲ء سے ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء تک (۵۵۰ برس) یہاں حکومت کی۔ شمالی اندلس کے شہر سرقسطہ (موجودہ نام سارا گوسا) میں نہایت عمدہ پوستینیں تیار ہوتی تھیں اور دور دور کے ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔ مشرقی اندلس کے صوبہ بلنسیہ (ویلنسیا) کے جنوبی شہر شاطبہ (موجودہ نام شاتیوا) میں کاغذ ایسا شاندار بنتا تھا کہ رُوئے زمین پر اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔

محققین کے مطابق اندلس میں کاغذ کی صنعت کو سب سے پہلے مسلمانوں نے متعارف کروایا۔ یورپ میں مسلمانوں کی حکومت سے پہلے لوگ "کاغذ" سے بالکل ناواقف تھے۔ جب شاطبہ میں مسلمانوں نے کاغذ بنایا تو چھٹی صدی ہجری میں قریبی عیسائی حکومت قشتالہ کے بادشاہ انفونزو ہم نے اسی نمونے پر کاغذ تیار کروا کے اس کا استعمال شروع کروا دیا پھر یہ کاغذ اندلس سے فرانس اور وہاں سے جرمنی اور پھر انگلستان میں بھی رائج ہوگیا۔

وسطی اندلس کے ایک صوبے اور اس کے دارالحکومت کونکہ میں نہایت عمدہ اونی مسندیں، بستر اور فرش بنائے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے اس علاقے پر پہلی صدی ہجری کے آخر سے پانچویں صدی ہجری کی ساتویں دہائی تک حکومت کی۔

جنوبی مشرقی اندلس کے شہر لقنت (موجودہ نام الیکنت) میں بارش اور بڑے دریاؤں کی کمی کے باوجود مسلمانوں نے زراعت کو ترقی دی اور اس علاقے کے بنجر حصوں کو نخلستان بنا دیا۔ حلفہ (اسپارٹو گھاس) بڑی مقدار میں برآمد ہوتی تھی اور اس سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ زیتون، گنا اور کئی قسم کے میوے مسلمانوں کی وجہ سے اس ملک میں آئے۔ شہد کی مکھیوں کی پرورش اور ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت بھی بہت اچھی طرح کام کر رہی تھی۔ شہر سمندر کے کنارے آباد تھا اور یہاں بحری جہاز بھی تیار کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں ۱۰۰ھ/۷۱۸ء سے ۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء تک حکومت کی۔

جنوبی اندلس کے شہر مالقہ (موجودہ نام مالگا) میں انجیر کی پیداوار

Marfat.com

بہت تھی اسے "ربّی" کہتے تھے۔ یہ پھل مصر، شام، عراق بلکہ ہندوستان تک بھیجا جاتا تھا۔ یہاں ایک قسم کے رنگین کپڑے کی صنعت بہت مشہور تھی۔ مالقہ پر مسلمانوں نے ۸۹۱ھ / ۱۴۸۶ء تک، تقریباً آٹھ سو برس حکومت کی۔ یہاں سنہری مٹی کے برتن بھی بہت خوبصورت تیار کیے جاتے تھے۔

جنوبی اندلس کے ایک قدیم شہر مدینہ شذونہ (موجودہ نام میڈیا سیڈونیا) میں سیاہ مٹی کے بہت خوبصورت برتن تیار کیے جاتے تھے۔ یہ جگہ اب تک اس قسم کے برتنوں کے لیے مشہور ہے۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہاں زراعت بھی خوب ہوتی تھی۔ خاص قسم کے فرش اور بوریے تیار ہوتے تھے۔ اب تک یہاں عربی طرز کے نقش و نگار والے بوریے مل جاتے ہیں، جو "استیراس" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں ملنے والی بعض مٹھائیوں کے بارے میں ابھی تک مشہور ہے کہ وہ پرانے عربی نسخوں کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ مدینہ شذونہ کو مسلمانوں نے ۹۲ھ / ۷۱۱ء میں فتح کیا اور ۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء تک یعنی ۵۵۰ برس وہ یہاں حاکم رہے۔

جنوب مشرقی اندلس کا شہر مرسیہ ایک قسم کے قالینوں کے لیے شہرت رکھتا تھا۔ جن کو "تنتلی" کہتے تھے۔ مشرق و مغرب کے ملکوں کو یہ قالین بڑی تعداد میں بھیجے جاتے تھے۔ مرسیہ کے ماہر کاریگر ایک قسم کے شوخ رنگت والے بوریے بھی تیار کرتے تھے جن کو دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے بوریے یہاں اب بھی بنتے ہیں۔ مسلمانوں نے مرسیہ کو ۹۶ھ / ۷۱۴ء میں فتح کیا اور ۶۶۸ھ / ۱۲۶۹ء تک مرسیہ پر ان کی حکومت رہی۔ جنوبی اندلس کے شہر منت فرید میں جو اب تک مسلمانوں کے زمانے کی وضع قطع رکھتا ہے، عمدہ سوتی کپڑے کی صنعت قائم تھی۔

اندلس اور شمالی افریقہ میں قرآن کریم کی خطاطی ایک خاص قسم کے خط میں کی جاتی تھی۔ اس خط کو "خطِ مغربی" کہا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین نے اسے "خطِ اندلسی" یا "خطِ قرطبی" بھی کہا ہے۔ اس خط کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لکھے جانے والے حروف لمبے اور قدرے جلی ہوتے ہیں۔ گولائی میں لکھے گئے حروف کے دائرے نسبتاً زیادہ کھلے ہوتے ہیں۔ خطِ مغربی، اندلس میں اس وقت رائج ہوا، جب المغرب کا مرکز حکومت قیروان (شمالی افریقہ) سے اندلس میں منتقل ہوا۔

اندلس کی سرزمین چوبی کندہ کاری کی بھی قابلِ فخر تاریخ رکھتی ہے گو کہ منبر اور مقصورہ کی جالی غائب ہو چکی ہے جو خلیفہ الحکم نے مسجد القرطبہ کے لیے بنوائی تھی۔ البتہ گیارھویں اور بارھویں صدی کے بعض منبر ابھی تک شمالی افریقہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں قدیم ترین منبر الجزائر کی مسجد کا ہے جسے مرابطین نے ۴۷۵ھ / ۱۰۸۲ء میں تعمیر کروایا تھا۔ خصوصاً چودھویں صدی میں اندلسی کندہ کاری میں مراکشی نمونوں کی پیروی کی گئی ہے۔ ان میں الحمرا اور قصر اشبیلیہ کے دروازے شامل ہیں۔ اشبیلیہ (جسے اسپین والے "سیویلا" کہتے ہیں) قرطبہ کی طرح دریائے وادی الکبیر پر واقع ہے۔ بنو عباد کے زمانے کا خوبصورت قصر یہاں اب تک باقی ہے۔

اندلس کے اموی فرمانرواؤں کے عہد میں ہاتھی دانت کے گول اور مستطیل ڈبے اور صندوقچے بہت مقبول تھے۔ قدیم ترین نمونے دسویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ان پر عبدالرحمٰن ثالث کا نام کندہ ہے۔ دو مستطیل صندوقچے ایسے ہیں جو مدینۃ الزہرا میں بنائے گئے تھے، ان پر ۳۵۵ھ / ۹۶۶ء درج ہے۔ ان صندوقچوں کی بنیادی آرائش کھجور کے پتوں سے کی گئی ہے۔ یہ پتے اتنی نفاست سے کھودے گئے ہیں کہ ان کی باریک رگیں تک ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

اندلس میں عربی طرز کے زیورات زیادہ تر غرناطہ میں بنتے تھے۔ ان پر بے حد نفیس طلاکاری ہوتی تھی اور بعض اوقات میناکاری بھی۔ ان کے نمونے چودھویں صدی عیسوی کے بنے ہوئے گلوبندوں اور کنگنوں میں ملتے ہیں۔ چاندی کا ایک صندوقچہ الحکم ثانی کی فرمائش پر بنایا گیا تھا۔

کانسی کے برتنوں میں قصر الحمرا کی مسجد کا ایک چراغ قابلِ ذکر ہے جو، اب میڈرڈ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ چراغ ۷۰۵ھ / ۱۳۰۵ء میں محمد ثالث کے حکم سے بنایا گیا تھا۔ اس پر عربی عبارت اور عربی نقش و نگار موجود ہیں۔ کانسی کے کئی دروازے اندلسی مسلمانوں کی یادگار ہیں۔

کوزہ گری کے فن میں بھی اندلس کے مسلمانوں نے کمال حاصل کیا۔ مدینۃ الزہرا کی کھدائی سے جو کوزے برآمد ہوئے ہیں وہی اندلس کے اب تک دستیاب ہونے والے قدیم ترین کوزے ہیں۔ ان پر پرندوں، پھولوں اور عبارتوں کی نقاشی ہے جن کے لیے سبز، نیلا اور سیاہی مائل بادامی رنگ کام میں لایا گیا ہے۔

بلنسیہ کے قریب ایک مقام بطرنہ (پیٹرنا) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اندلس میں کوزہ گری کا اہم مرکز تھا۔ اس زمانے میں مالقہ (جنوبی اسپین کا تاریخی شہر) اور غرناطہ کے کوزہ گر، مٹی کی رنگین ٹائلیں، بڑے پیالے اور گلدان بنانے میں ماہر تھے۔

Marfat.com

قرطبہ کے قریب مدینۃ الزہرا میں کھدائی کے دوران بہت سے آرائشی ظروف برآمد ہوئے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) سے نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) تک مالقہ میں سنہری جلا کی قابیں اور بڑے بڑے مرتبان بنائے جاتے تھے، جن کی سب سے مشہور قسم "الحمرائی مرتبان" کے نام سے موسوم ہے۔

عرب مسلمان جب اندلس پہنچے تو وہ قالین بافی کا فن بھی ساتھ لے گئے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اندلس میں قالین تیار ہوتے تھے لیکن چودھویں صدی سے قبل کے قالین اب محفوظ نہیں ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے قالینوں پر ہشت پہلو اشکال ہیں جن میں شوخ رنگوں میں تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ حاشیے میں کوفی خط میں عبارتیں، اقلیدسی شکلیں اور خیالی جانوروں کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ اندلس میں جو قالین بنائے جاتے تھے لاطینی امریکا میں بھی ان کی نقل کی گئی اور یورپ کے بہت سے کلیساؤں میں بھی انہیں استعمال کیا گیا۔

اندلسی موسیقی کے عروج کے زمانے میں اس فن نے المغرب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ المغرب نے بہت سے آلاتِ موسیقی اندلس ہی سے لیے۔ الشقندی (وفات: ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء) نے ان آلاتِ موسیقی کی طویل فہرست دی ہے جو اندلس سے برآمد کیے جاتے تھے۔ ان آلات میں جواق (چھوٹی بانسری)، خلّال (بہت بڑی نوبت)، دبدبہ (ڈھول) اور ابو قرون (نرسنگھا) بظاہر المغرب کی بربر آبادی کے لیے مخصوص تھے۔ اندلس سے زیادہ نازک اور لطیف قسم کے آلات بھی آیا کرتے تھے مثلاً قیثارہ (گٹار)، بَندیر (طنبورہ) اور غَیطہ (بانسری)۔

ناموں میں تبدیلی

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت صدیوں تک قائم رہی۔ اس کے اثرات جہاں ہر شعبۂ زندگی پر مرتب ہوئے، وہیں مقامات کے ناموں میں بھی تبدیلی آئی۔ پھر جب مسیحیوں نے اندلس پر قبضہ کیا تو انہوں نے تلفظ کے معمولی سے فرق کے ساتھ ان ہی ناموں کو اختیار کر لیا۔ بعض مقامات پر تلفظ میں بڑا فرق آ گیا۔ مثال کے طور پر غرناطہ کے ایک پہاڑی علاقے کا نام مسلمانوں نے "البشارات" رکھا تھا۔ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "جہاں گھاس کثرت سے پیدا ہوتی ہو۔" اسپینی زبان میں یہ لفظ بگڑ کر "الپکساراس" یا "الپجاراس" ہو گیا۔ اسی طرح "الخندق" نام کے کئی مقامات ہیں جو اسپین میں منتقل ہوئے تو "الہندیگا" ہو گئے۔ ان میں سے ایک اور ظلمنکہ ہے جو اسپین میں "توری الہندیگا" کہلاتا ہے۔

ادھر مشرقی اندلس میں شنت مریہ بنورزین کے نواحی علاقے کو اہلِ عرب "القرطام" کہتے تھے۔ قرطام لفظ قرطم سے نکلا ہے اور قرطم لاطینی لفظ "کرتھاموس" سے ہے جس کے معنی "زعفران" کے ہیں۔ اس علاقے میں زعفران کثرت سے پیدا ہوتا تھا اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ زعفران کے پھولوں کی کثرت کی وجہ سے اسپینی اس علاقے کو "الازور" بھی کہتے تھے یعنی "پھولوں والا علاقہ"۔

دیگر جن مقامات کے ناموں کے عربی تلفظ میں تبدیلی آئی ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ صوبہ المریہ کا مقام بجانہ جو اب "پچینا" کہلاتا ہے۔ قاصرش کا شہر "ترجالہ" جو اب "تروجیلو" کہلاتا ہے۔ اسی طرح وسطی اندلس میں ایک تابعی حضرت ایوب بن حبیبؒ نے ایک شہر "مدینہ قلعہ ایوب" آباد کیا تھا۔ اب یہ نام اسپینی میں بگڑ کر "کلاتایوڈ" بن گیا ہے۔ مغربی اندلس میں ایک شہر کا نام عربوں نے "قنطرۃ السیف" رکھا یعنی "تلوار والا پل" یہی نام اب "الکنتارا" کہلاتا ہے۔

ناموں کی تبدیلی اپنی جگہ، یہ تاریخی حقیقت اپنی مسلم ہے کہ قدرت نے سرزمینِ اندلس کو اعلیٰ تہذیبی اور تعلیمی اقدار سے مزین کرنے کی جو عظیم خدمت مسلمانوں سے لی اس کی مہک موجودہ اسپین اور پرتگالی فضاؤں میں صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سرزمین ایک بار پھر منتظر ہے کہ کوئی موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد آ کر یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پھول کھلائے گا اور اندلس کی عظمتِ رفتہ کے احیا کا سبب بن جائے گا۔

•••

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

ابنِ خلدون: ڈاکٹر طٰہٰ حسین / عبد السلام ندوی
ابنِ خلدون اور امیر تیمور: ضیاالدین برنی / ڈاکٹر جے فشل
ابنِ خلدون کے معاشرتی سیاسی اور معاشی خیالات: عبد القادر
ابویوسف یعقوب المنصور باللہ: طالب ہاشمی
اخبار مجموعہ: مولوی محمد زکریا مائل
اسلام اینڈ دی عربز: روم لینڈاؤ
اسلامیہ ہسپانیہ: قدرت اللہ خان
افتتاح الاندلس: محمد جمیل الرحمٰن
افریقہ ان ہسٹری: باسل ڈیوڈسن
افریقہ ایک چیلنج: احمد عبد اللہ المسدوسی
افکار ابنِ خلدون: مولانا محمد حنیف ندوی
اندلس تاریخ وادب: ڈاکٹر سید محمد یوسف
اندلس کا تاریخی جغرافیہ: محمد عنایت اللہ / جی لی اسٹرینج
اندلس کی اسلامی تاریخ: سید منیر علی جعفری
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
ایجنٹ' لینڈ آف دی نیل: للیان گور
اے سروے آف نارتھ ویسٹ افریقہ: نیول باربور
اے شارٹ ہسٹری آف افریقہ: رونالڈ اولیور، جے ڈی فیج
اے ہسٹری آف دی مغرب: جمیل ایم ابو النصر
تاریخ ابن خلدون: علامہ عبد الرحمٰن ابن خلدون / علامہ حکیم احمد حسین عثمانی
تاریخ اسلام: مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی
تاریخ الامت: علامہ اسلم جیراج پوری
تاریخ اندلس: عبد القوی ضیا
تاریخ اندلس: مولانا ریاست علی ندوی
تاریخ دولت فاطمیہ: سید رئیس احمد جعفری
تاریخ شام: فلپ کے حتی
تاریخ عالم اسلام: محمد عبد اللطیف انصاری
تاریخ فاطمیین مصر: ڈاکٹر زاہد علی
تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ: مولانا احمد / مولوی محمد انشاءاللہ
تاریخ مغرب: محمد جمیل الرحمٰن
تاریخ ملت: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
تاریخ موحدین: عبد الواحد مراکشی / مولوی محمد نعیم الرحمٰن،
تاریخ ہسپانیہ: سید محمد احمد خان / میریا کالیکٹ
تاریخ ہسپانیہ عرب: مولانا عبد الحلیم شرر / ڈاکٹر جے اے کینڈی
تھنگس سین ان مورو کو: ایل ای بکر استیف
خلافت اندلس: نواب ذوالقدر جنگ بہادر
خلافتِ عباسیہ اور فاطمیین مصر: سید عین الحق
خلافتِ موحدین: عبد الواحد مراکشی / مولوی محمد نعیم الرحمٰن
دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور
دولتِ ہسپانیہ: مولوی محمد صدیق حسن، اصلاح: عبد الحلیم شرر / ڈاکٹر جے اے کانڈی
دی انفلوئنس آف اسلام ان پان افریقا: جے اسپنسر ٹرمنگھم
دی ڈان آف افریکن ہسٹری: رولینڈ اولیور
دی ڈیولپمنٹ آف اسلام ان ویسٹ افریقہ: مروِن ہسکہ
دی کیمبرج ہسٹری آف اسلام: پی ایم ہولٹ
دی مورو کنس یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے: روم لینڈاؤ
دی ویسٹرن صحارا اینڈ دی فرنٹیئرز آف مورکو
دی ہسٹری آف افریکن پیپل: رابرٹ ڈبلیو جولائی
دی ہسٹری آف دی مغرب: عبد اللہ لاروئی
دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ افریقا: چارلس ایف گیلفر

Marfat.com

سفر نامہ روم، مصر و شام: علامہ شبلی نعمانی
سلاطین اندلس: مفتی انتظام اللہ شہابی
سوانح عمری ابنِ خلدون: کارپردازانِ وطن
عبرت نامۂ اندلس: مولوی محمد عنایت اللہ صاحب / پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی،
عظیم مصر: محمد حسن الاعظمی الازہری
غیر مطبوعہ مقالہ: ثروت صولت
فاطمی خلافتِ مصر: قدرت اللہ خاں / خورشید بیگم
فکر و نظر: خصوصی شمارہ (اندلس کی اسلامی میراث)
لیگیسی آف اسلام: سر تھامس آرنلڈ
مسلمان اندلس میں: منشی حامد علی صدیقی / اسٹینلے لین پول
مسلمان اندلس میں: رشید اختر ندوی
مسلمان حکمران: رشید اختر ندوی
مسلمان سائنس دان اور ان کی خدمات: ابراہیم عمادی ندوی
مسلمان موجد اور سائنس دان: علی ناصر زیدی
مسلمانوں کے فنون: شیخ عنایت اللہ / ایم ایس ڈیمنڈ
مشہور مسلمان سائنس دان: خواجہ جمیل احمد
مقدمہ ابنِ خلدون: ترجمہ: مولانا سعد حسن خان یوسفی
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
مورد کوٹورازم: مئی ۱۹۶۵ء۔ جون ۱۹۶۵ء
مورو کو: نیول باربور
نارتھ افریقا: فوڈرز ٹریول گائیڈ
نارتھ افریکن پری موڈ: گال بریتھ ویلیج
نفح الطیب: علامہ شہاب الدین ابو العباس المقری / مولوی محمد خلیل الرحمٰن سرادھوی
ویسٹرن صحارا: ٹونی ہوجز
ہسٹری آف سیراسنس: جسٹس امیر علی سید

***

Marfat.com

ادوارِ زریں

ترکی، شام اور ایران کی نامور شخصیات

Marfat.com

انتساب

اپنے محسن، مربی اور صاحبِ علم شخصیت

محترم ثروت صولت مرحوم

کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

آج کے دور میں یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ کبھی کوئی اسلامی سلطنت سپر پاور کا درجہ بھی رکھتی تھی، کبھی دنیا کے بیشتر حصے پر اسلام کا پرچم لہراتا تھا اور کئی طاقتور یورپی ممالک مسلمانوں کے باج گزار تھے۔ گزشتہ صدی کی دو عالمی طاقتوں میں روس بہ حیثیت سپر پاور ایک صدی بھی مکمل نہ کر سکا اور رہی سہی اکلوتی سپر پاور امریکا کا کیا انجام ہو گا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن دنیا کے مختلف ممالک میں یہ پیش گوئیاں کی جا رہی ہیں کہ آئندہ کچھ برسوں میں امریکا بھی اتحاد سے محروم ہو کر اپنی حیثیت کھو بیٹھے گا جبکہ ان کے مقابلے میں صرف عثمانی سلطنت نے تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک ایک سپر پاور کا اعزاز قائم رکھا اور اس کے نام کا ڈنکا دنیا کے اکثر ممالک میں بجتا رہا۔ مسلمانوں کے تاریخی ورثے کی یہ کہانی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی —اس حوالے سے کلیم چغتائی صاحب کی کتاب "ادوارِ زریں" کے مطالعے نے نہ صرف میری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا اور میرے ذہن میں غور و فکر کے چراغ جلائے بلکہ میرے اندر مسلمانوں کے ماضی کے حوالے سے احساسِ تفاخر اور خود اعتمادی کو بھی پروان چڑھایا۔ قوموں اور تہذیبوں کا عروج و زوال انسانی زندگی کا حصہ ہے، آج مسلمان زوال پذیر ہیں، کون جانے کب عروج مسلمانوں کا مقدر بن جائے، مسئلہ فقط عصرِ حاضر کی روح کو سمجھنے اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا ہے۔

کلیم چغتائی صاحب کی کتاب 'ادوارِ زریں' ترکی، شام اور ایران کی اُن نامور شخصیات کی کہانی ہے جنہوں نے انسانی تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑے اور عظمتِ کردار کی ایسی روشن مثالیں قائم کیں جنہیں پڑھ کر خون رگوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے اور قاری انسانی تاریخ کے حیرت کدوں میں سفر کرنے لگتا ہے۔ اس کتاب میں کلیم چغتائی صاحب نے جہاں نور الدین زنگی جیسے عاشقانِ رسولؐ کو تحقیق کا موضوع بنایا ہے جن کا محض مطالعہ ہی مغفرت کا ذریعہ بن سکتا ہے، وہیں سلطان محمد فاتح جیسے عظیم مسلمان جرنیلوں اور حکمرانوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے گھوڑوں کی ٹاپ سے رومی اور یورپی سلطنتیں لرز جاتی تھیں اور یورپی حکمرانوں کے دل دہل جاتے تھے۔ خاص طور پر ترکی کے شہر استنبول کی فتح کی کہانی نہ صرف نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ہے بلکہ ایمان افروز بھی ہے کیونکہ اس کی فتح کی پیش گوئی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور کتنے ہی صحابہ کرامؓ اس دن کے انتظار میں زندگیاں بسر کرتے اور اس لمحے کا انتظار کرتے رہے جبکہ دشمنانِ اسلام "نعوذ باللہ" اسے غلط ثابت کرنے کے لیے زور لگاتے رہے۔ عظیم عاشق رسول حضرت ایوب انصاریؓ تو اس شہر کی فصیل کے ساتھ دفن ہیں کیونکہ اُنہیں اس فتح کا شدت سے انتظار تھا۔

اسلامی فتوحات کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فلاحی ریاست (Social Welfare State) کا تصور سب سے پہلے مسلمانوں نے متعارف کرایا جنھوں نے ہر شعبے میں نہ صرف تحقیق کی حوصلہ افزائی کی بلکہ رعایا کے علاج و معالجے کے لیے مفت شفاخانے تعمیر کیے، مسافروں کے لیے مسافر خانے بنائے، کتب خانے اور لائبریریاں قائم کیں، مستحق افراد کے لیے مالی امداد کا انتظام کیا اور رعایا کے ہر فرد کو انصاف مہیا کرنے کے لیے وسیع انتظامات کیے۔

کلیم چغتائی صاحب نے بڑی محنت اور تحقیق سے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر اسے نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اُن کا انداز تحریر نہایت پختہ اور اعلیٰ درجے کے ادبی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور اسلوب اس قدر دلکش ہے کہ تاریخ کی خشک وادیوں سے گزرتے ہوئے بھی قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کہانی پڑھ رہا ہے۔ یہ کتاب مصنف کی تحقیق اور عرق ریزی کی آئینہ دار ہے اور میں اس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر صفدر محمود

پی۔ ایچ۔ ڈی، جامعہ پنجاب،

مؤرخ، محقق، مدرس، امریکی یونیورسٹیز میں وزٹنگ لیکچرر

Marfat.com

عرضِ مؤلف

تاریخ ایک آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ، جو قوموں کو ان کے ماضی کی تصویر دِکھاتا ہے۔ ہر لمحہ تاریخ بنتا جاتا ہے اور قوموں کی بری یا بھلی تصویر کو محفوظ کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ہر قوم مختلف حالات میں مختلف ادوار سے گزرتی ہے۔ اگر کسی قوم میں باضمیر اور باصلاحیت افراد کی اکثریت ہو تو وہ تاریخ کو اپنی بہترین تصویر پیش کرتی ہے، اور اگر قوم کا بڑا حصہ بے ضمیر، بے صلاحیت اور بے عمل افراد پر مشتمل ہو تو اس قوم کی بدنما تصویر، تاریخ کا حصہ بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے۔

غفلت کے مارے اور کم ظرف افراد سے ترکیب پانے والی قوم جب تاریخ کے آئینہ میں اپنی بھیانک تصویر دیکھتی ہے تو اس کی بے حسی، بے دلی اور غفلت کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی قوم دلِ زندہ اور دیدۂ عبرت نگاہ رکھنے والے افراد سے عبارت ہو تو وہ آئینۂ ایام میں اپنے بگڑے ہوئے نقوش دیکھ کر نصیحت حاصل کرتی ہے، اپنی مسخ تصویر کو سنوارنے کا عزم کرتی ہے اور نئے جوش اور ولولے کے ساتھ جدوجہد میں معروف ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی قوم، تاریخ کے آئینہ میں اپنا روشن اور باوقار عکس دیکھ کر اس سے جذبۂ تازہ، احساسِ ذمہ داری اور اعتماد حاصل کرتی ہے جبکہ ظرف سے عاری اور غفلت کی ماری کسی قوم کی تاریخ اگر جگمگاتے اوراق پر مشتمل ہو بھی تو یہ روشن اوراق اس قوم کے لیے محض اظہارِ فخر واستکبار کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

"ادوارِ زرّیں" کے عنوان سے اس کتاب میں، مسلمانوں کی تاریخ سے چند درخشندہ تصاویر پیش کی گئی ہیں، جو ہمیں مطلع کرتی ہیں کہ تاریخ نے وہ طویل دور بھی دیکھا ہے جب مسلمان دنیا کے بیشتر حصہ پر حکمراں تھے اور ان کے تحت آنے والے علاقے خوش حالی اور خوش انتظامی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ اناطولیہ (ترکی) سے ابھرنے والی ایک چھوٹی سی ریاست دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع و عریض سلطنت کا روپ دھار گئی۔ پھر اس دولتِ عثمانیہ نے خلافتِ عثمانیہ کی صورت اختیار کر لی۔ خلافت ترکوں کا حق تھی یا نہیں، اس بحث سے قطع نظر، سیکڑوں برسوں پر محیط عثمانی دور میں مسلمان حکمرانوں نے جو قابلِ قدر خدمات انجام دیں، ان کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ ان ہی خدمات کے نتیجہ میں عثمانی ساڑھے پانچ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔

دولتِ عثمانیہ کے آٹھ اچھے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ، شام اور ایران کے چند اہم حکمرانوں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام تذکرے، امتِ مسلمہ کے تابناک ماضی کی دلفریب اور درخشاں تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ تصویر آج بھی امتِ مسلمہ کے لیے پیغام بیداری ہے۔ یہ آج کے منتشر، بے امید اور خوف زدہ مسلمانوں کو ایمان، اتحاد، بے تعصبی، علم، اعتماد، امنگ اور حوصلہ کے حصول کی دعوت دے رہی ہے۔

آیئے! اس دعوت کو قبول کر لیں۔ ان شاءاللہ، تاریخ بہت جلد ہماری روشن تصویر کو اپنے دامن میں محفوظ کر رہی ہوگی۔

میں، رفعتِ کردار کے مالک، نفیس و مخلص شخصیت، متعدد اہم کتابوں کے مصنف، صاحبِ طرز و باخبر کالم نگار، محقق، استاد اور بہت مہربان کرم فرما، محترم ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کا بے حد ممنون اور ان کے لیے بہت دعاگو ہوں کہ انہوں نے مجھ سے کوئی واقفیت نہ ہونے کے باوجود، محض اس کتاب کا مسودہ پڑھ کر اس پر نہایت فکر انگیز اور حوصلہ افزا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

عضد الدولہ

آلِ بویہ کے نامور حکمران جنہوں نے علم وفن کی بھرپور سرپرستی کی

ایران اور روس کی سرحد سے متصل بحیرۂ خزر (بحیرۂ کیسپیئن) کے نیلے چمکتے پانی کے جنوب میں گیلان کے مرتفع میدان اپنا دامن کشادہ کیے نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں سے گھرے اس قلعہ نما علاقے میں جو دیلم کہلاتا تھا، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ایک قوم آباد تھی۔ اس قوم کے افراد بلند قامت اور طاقت ور تھے۔ سر کے لمبے اور گھنگریالے بال ان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ یہ بڑی بہادر اور جنگجو قوم تھی۔ تاریخ ان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ابو شجاع بویہ بن فناخسرو بتاتی ہے اور انہی کے نام پر یہ قوم، آلِ بویہ کہلاتی ہے۔ (بویہ کا صحیح تلفظ بُوَیہ ہے)۔

آلِ بویہ نے ایک وسیع علاقے پر تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور اس دوران یادگار علمی وتمدنی خدمات انجام دیں۔ آلِ بویہ کے اس عہدِ حکومت میں جو نام سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے وہ عضد الدولہ ہے۔ عضد الدولہ نے پوری مملکت میں کامل اتحاد واتفاق قائم کر کے اپنے زیر حکومت علاقوں میں جو امن وامان اور مثالی انتظام قائم کیا وہ آج ہزار سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔ مسلمانوں کو علمی اور فنی ترقی سے ہم کنار کرنے میں عضد الدولہ نے جو خدمات انجام دی ہیں انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

عضد الدولہ کا نام ابو شجاع فناخسرو، والد کا نام حسن اور لقب رُکن الدولہ ہے۔ ابو شجاع نے ۵ ذوالقعدہ ۳۲۴ھ / ۲۴ ستمبر ۹۳۶ء کو ایران کے مشہور شہر اصفہان میں آنکھیں کھولیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ابو الفضل محمد بن عبد اللہ جیسے قابل اور بلند پایہ اُستاد میسّر آ گئے۔ ابو الفضل ' ابن العمید کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ نہ صرف فنونِ حرب اور سیاست کے ماہر تھے بلکہ انہیں علم ہندسہ، منطق، فلسفہ، مابعد الطبیعیات، اور نقاشی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس کے مہتمم ابن مسکویہ تھے۔ ابو شجاع کے والد رُکن الدولہ نے ابن العمید کو ۳۲۸ھ / ۹۴۰ء میں اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ اس وقت ابو شجاع کی عمر صرف چار سال تھی۔ بعد میں جب وہ ابن العمید کی شاگردی میں آئے تو انہوں نے اپنے استاد کو ہمیشہ 'اُستاد الرئیس' کہہ کر پکارا اور اُن کا ہمیشہ احترام کیا۔

ابو شجاع کو قدرت نے بہترین قائدانہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ ان کے چچا عماد الدولہ فارس پر حکمران تھے۔ ۳۳۸ھ / ۹۴۹ء میں عماد الدولہ کے انتقال پر عنانِ اقتدار ابو شجاع کے ہاتھ میں آئی۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ بنی بویہ کی طاقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے، چنانچہ انہوں نے قوت، اتفاق واتحاد اور حکمت سے اطراف کے علاقوں کو اپنے زیر انتظام لانا شروع کیا۔ ان کے کارناموں کی شہرت بغداد بھی پہنچی، چنانچہ عباسی خلیفہ المطیع نے ۳۵۱ھ / ۹۶۲ء میں انہیں "عضد الدولہ" یعنی "بازوئے حکومت" کا خطاب دیا۔ ۳۵۶ھ / ۹۶۷ء میں عضد الدولہ عمان پر قابض ہو چکے تھے اور اس سے اگلے برس کرمان پر بھی ان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ پھر سیستان والوں نے بھی ان کی اطاعت قبول کرلی۔ اب عضد الدولہ جنوب مشرق کی طرف مکران کے علاقے میں پہنچے اور وہاں کے باشندوں کو بھی اپنا مطیع بنالیا۔

۳۶۶ھ / ۹۷۷ء میں عضد الدولہ نے اہواز فتح کیا۔ ذوالقعدہ ۳۶۸ھ / جون ۹۷۹ء میں عضد الدولہ پورے عراق، دیار ربیعہ، دیار بکر اور الجزیرہ کے بیشتر حصّے پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ اس طرح آلِ بویہ اب ایک وسیع علاقے پر حکمراں تھے اور عباسی خلیفہ طائع اللہ

Marfat.com

اس علاقے پر ان کی ولایت تسلیم کر چکے تھے۔

عضد الدولہ کے عہد کی ایک نمایاں اور تابندہ خصوصیت یہ ہے کہ اِن کے دور میں علم کو عام کیا گیا، علوم کو ترقی دی گئی، صاحبِ علم لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور یوں مسلمانوں نے علمی لحاظ سے بڑی ترقی کی۔ خود عضد الدولہ کو سائنس کے مختلف شعبوں میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ وہ بڑے عالم اور ماہر ریاضی داں تھے۔ اُنھیں بہت سے علوم پر عبور حاصل تھا وہ ایک اچھے ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔ وہ نہایت باصلاحیت حکمراں تھے اور صاحبِ علم افراد کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علماکرام کو انہوں نے ملک کے گوشے گوشے سے بُلا کر سرکاری مجلسوں میں جگہ دی تھی۔ علما کے تبادلۂ خیالات سے اُنہیں بہت دلچسپی تھی، چنانچہ وہ اکثر علما کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے دور میں بغداد ایک بار پھر علمی اور تمدنی سرگرمیوں کا گہوارہ بن گیا اور ہر جگہ سے علم کے پیاسے سمٹ کر بغداد میں جمع ہوگئے۔

عضد الدولہ نے اپنے عہدِ حکومت میں جگہ جگہ کتب خانے قائم کیے۔ ان میں شیراز کا کتب خانہ بہت مشہور ہے، جس کی بنیاد خود عضد الدولہ نے رکھی تھی۔ مقدسی کہتے ہیں کہ مختلف علوم پر اس وقت تک جتنی کتابیں لکھی گئی تھیں عضد الدولہ نے ان تمام کتابوں کو اس کتب خانے میں جمع کر لیا تھا۔ کتب خانے کا ایک معتمد تھا۔ ایک مہتمم (لائبریرین) اور شہر کا ایک معزز فرد اس کتب خانے کا نگراں ہوتا تھا۔ کتابیں موضوع کے اعتبار سے الگ الگ الماریوں میں رکھی گئی تھیں اور ہر موضوع کی کتب کی فہرستیں (کیٹلاگ) بھی مرتب کی گئیں تھیں۔

عضد الدولہ کے دور میں سائنسی علوم پر بہت کام ہوا۔ ابو سعید احمد بن محمد عبد الجلیل السجزی، جیومٹری، فلکیات اور علم نجوم کے ماہر تھے۔ انہوں نے عضد الدولہ کے لیے کام کیا۔ بغداد کے مشہور طبیب سنان بن ثابت نے کئی طبی رسالے تصنیف کیے اور اِن میں سے ایک کو عضد الدولہ سے منسوب کیا۔ بعض مؤرخین کے خیال میں سنان بن ثابت، عضد الدولہ کے حکمراں بننے سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ ابو الحسین عبد الرحمٰن ابن عمر الرازی فلکیات کے ماہر تھے۔ ان کا انتقال ۳۷۶ھ / ۹۸۶ء میں ہوا۔ اپنی جگہ قائم رہنے والے ستاروں (فکسڈ اسٹارز) کے بارے میں ان کے مشاہدات بہت اہم ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک کتاب "صور الکواکب الثابتہ" تصنیف کی ہے جس میں یہ مشاہدات موجود ہیں۔ ابن بلتان ماہر طبیب تھے اور بیمارستان عضدی (عضدی شفاخانہ) میں طب کے پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم و تربیت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

اِسی دور میں ایرانی طبرستان کے شہر قوہ کے ابو ساحل ریحان القوہی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ ماہر حساب داں اور فلکیات کے عالم تھے۔ انہوں نے عضد الدولہ اور ان کے صاحبزادے شرف الدولہ کے لیے کام کیا۔ القوہی نے راس السرطان (۲۱ جون) اور راس الجدی (۲۲ دسمبر) کے مشاہدے میں مدد دی تھی۔ اس کے لیے عضد الدولہ نے انہیں ہدایت کی تھی۔ واضح رہے کہ ۲۱ جون سال کا سب سے بڑا دن اور ۲۲ دسمبر سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے۔

عضد الدولہ ہی کے عہد میں علم الادویہ (فارما کولوجی) اور علوم فطری (نیچرل سائنس) کے ماہر ابو الحسن علی ابن عباس علی ابن عباس المجوسی نے موسمیات، صحت، انسانی رویّوں اور جراحی پر کام کیا۔ انہوں نے ایک طبی رسالہ 'الملکی' کے نام سے لکھ کر عضد الدولہ سے منسوب کیا تھا۔

غیاث الدین جمشید مسعود کاشانی نے اپنی ایک کتاب میں کائنات کے مشاہدے کے لیے تیار کیے گئے آٹھ آلات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض آلات دسویں صدی عیسوی میں شیراز میں عضد الدولہ کے عہدِ حکومت میں ایجاد کیے گئے تھے۔

ابو اسحٰق ابراہیم الحرّانی، علم طب، ہیئت اور ریاضیات میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے عضد الدولہ کے وزیر المطہر بن عبد اللہ کے لیے درہم کے برابر اصطرلاب (ستاروں کی بلندی، مقام اور رفتار بتانے والا آلہ) بنایا تھا۔ اِسی دور میں ایک طبیب ابو الحسن نے مرگی کا نیا طریقۂ علاج متعارف کروایا تھا۔ علی ابن مسکویہ کو دیوان مالیات کا منصب سونپا گیا تھا۔

عضد الدولہ نے شاعروں کی حوصلہ افزائی کی، عرب کے مشہور شاعر ابو طیب المتنبی عضد الدولہ کے بہت قریب تھے۔ ابو الحسن محمد السلامی بھی اِسی دور کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ عضد الدولہ کو تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ابو اسحٰق ابراہیم الحرّانی سے آلِ بویہ کی تاریخ لکھوائی۔ عضد الدولہ کا لقب "تاج الملت" بھی تھا، اس لیے اس کتاب کو "کتاب التاجی" کا نام دیا گیا۔ اسی دور میں نحو میں کتاب الالصیناح والتکملہ، قرأتِ سبعہ میں حجہ، جیسی کتابیں لکھ کر عضد الدولہ سے منسوب کی گئیں۔ عضد الدولہ کے دور کے صاحبانِ علم

Marfat.com

وادب کا ذکر صاحب ابن عباد کے بغیر ادھورا ہے۔ وہ بڑے عالم اور نقاد تھے۔ انہوں نے ایک عربی لغت "محیط" کے نام سے مرتب کی اور علم و فن پر کتاب "اقنا" لکھی۔

عضد الدولہ نے مختلف فنون خصوصاً کپڑے کی صنعت کی بھی سرپرستی کی۔ شاپور کا سب سے بڑا شہر کازرون، سوتی کپڑے کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ رام ہرمز میں ریشم کے کیڑے بڑے پیمانے پر پالے جاتے تھے اور یہاں سے کچا ریشم باہر بھیجا جاتا تھا۔ شیراز کے قریب عضد الدولہ نے ایک شہر 'کرد فنا خسرو' کے نام سے آباد کیا تھا جہاں اونی کپڑے بننے والوں اور دیگر اقسام کا کپڑا تیار کرنے والے کاریگروں کے مکانات تھے۔ ان کاریگروں کو عضد الدولہ نے مختلف مقامات سے بلوا کر یہاں آباد کیا تھا۔ سیرجان کا شہر سلے سلائے کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔ کازرون میں السی کا نرم اور باریک کپڑا بنتا تھا۔ بغداد میں عمدہ کپڑے کی صنعتیں قائم تھیں۔ دیز فل اور شوستر میں نیل کو عضد الدولہ ہی نے متعارف کروایا تھا۔

عضد الدولہ کا سب سے بڑا کارنامہ بغداد میں ایک عظیم شفاخانے کی تعمیر ہے۔ یہ شفاخانہ جو خود ان کے نام پر "بیمارستانِ عضدی" کے نام سے مشہور ہے، ۳۷۲ھ میں قائم ہوا اور ڈھائی سو برس تک کام کرتا رہا۔ دریائے دجلہ کے موڑ پر بنایا گیا یہ شفاخانہ اس قدر شاندار تھا کہ وفیات الاعیان کے مصنف ابنِ خلکان کے مطابق اس زمانے میں اس شفاخانے کا دنیا بھر میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ عضد الدولہ نے اس شفاخانے کے قیام پر بڑی رقم صرف کی اور اس کے انتظام و انصرام کے لیے بھی انہوں نے بڑی جاگیر مختص کر دی تھی تاکہ اس کی آمدنی سے شفاخانے کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 'بیمارستانِ عضدی' کے لیے جگہ کا انتخاب مشہور سائنسدان اور طبیب رازی نے کیا تھا اور وہی اس شفاخانے کے مہتمم اعلیٰ (ساعور) مقرر ہوئے تھے لیکن بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ رازی اس شفاخانے کی تعمیر سے پچاس برس قبل فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے شفاخانے کے سلسلہ میں رازی کا ذکر بے محل ہے البتہ بعد میں ابن التلمیذ، اس شفاخانے کے 'ساعور' بنائے گئے۔

'بیمارستانِ عضدی' بہت وسیع تھا۔ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں مشہور عرب سیاح ابن جبیر جب حج کے ارادے سے سفر کرتے ہوئے اس علاقے سے گزرے تو وہ شفاخانے کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ محلہ باب البصرہ اور شارع عام کے درمیان سوق المارستان کے نام سے محلہ آباد ہے، اسی میں بغداد کا شفاخانہ قائم ہے۔ اس میں بہت سے کمرے ہیں اور علاج معالجہ کا بہترین سامان موجود ہے۔ تمام ضروریات کے لیے پانی دجلہ سے آتا ہے۔ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو شہر کے بڑے بڑے طبیب اس شفاخانے میں جاتے ہیں اور پیچیدہ امراض کی تشخیص میں طبیبوں کی مدد کرتے ہیں۔

اسپتال میں چوبیس اطبا تھے۔ ماہرین خصوصی کی متعدد جماعتیں موجود تھیں۔ کحال (ماہرین امراض چشم)، طبائعیون (ماہرین عضویات)، جرائح (سرجن)، مجبرّ (ہڈی بٹھانے والے) بھی اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

یہ شفاخانہ محض مریضوں کی علاج گاہ ہی نہ تھا، طبی تعلیم کا اعلیٰ مرکز بھی تھا۔ یہاں طلبہ کے لیے علوم طب کی تدریس کا اچھا انتظام تھا۔ دُنیا کے دُور افتادہ حصّوں کو کھنگال کر ہر قسم کی جڑی بوٹیاں اور دوائیں اس اسپتال میں جمع کر دی گئی تھیں۔ ہر شعبہ منظم تھا اور ہر چیز کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔ شیراز میں بھی عضد الدولہ نے ایک اچھا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا، یہ شفاخانہ بھی خاصا مشہور تھا۔

عضد الدولہ کا ایک اور کارنامہ 'بند امیر' کی تعمیر ہے۔ یہ بند ان کے نام پر 'بند عضدی' بھی کہلاتا تھا اور شیراز سے ۸۰ کلو میٹر شمال میں دریائے کُر پر باندھا گیا تھا۔ دریائے کُر علاقہ کروان سے نکلتا تھا اور جنوب کی طرف بہتا ہوا بالآخر جھیل بختگان میں گر جاتا تھا۔ اس کے بالائی حصے کو ایران کے لوگ 'رود عاصی' یعنی نافرمان دریا کہتے تھے، کیونکہ جب تک اس کا پانی بند باندھ کر روکا نہ گیا، اُسے آب پاشی میں استعمال نہ کیا جاسکا۔

بندِ امیر، کربال اعلیٰ کے علاقے کو سیراب کرنے کے لیے بنوایا گیا تھا۔ مقدسی کہتے ہیں کہ یہ بند فارس کے عجائبات میں سے تھا۔ بند کی بنیاد پتھروں سے چنی گئی تھی اور ان پتھروں کو سیسے کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ بند کی بدولت دریائے کر کا پانی رُک کے وسیع جھیل بن جاتا تھا۔ جھیل کے کناروں پر عضد الدولہ نے دس بڑے بڑے رہٹ لگائے تھے جن کے ذریعے پانی بلندی پر اٹھایا جاتا تھا تاکہ تین سو قریات (دیہات) میں آب پاشی اور آب رسانی ہو سکے۔ ہر ایک رہٹ کے قریب اناج پیسنے کی ایک پن چکی تھی —— کچھ مدت بعد بند کے قریب ایک بڑا شہر بھی بسایا گیا تھا۔

عضد الدولہ نے تعمیرات پر خاص توجہ دی۔ متعدد نئے شہر آباد کیے۔ ان کے دور میں شیراز، کرمان شاہان، سیرجان اور دیگر شہروں میں عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مقدسی لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

"عضد الدولہ نے شیراز میں جو محل بنوایا ہے، اس کی نظیر میں نے مشرق و مغرب میں کہیں نہیں دیکھی۔ اس میں داخل ہو کر عام آدمی مسحور ہو جاتا ہے۔ عضد الدولہ نے کئی نہریں نکلوائی ہیں جو محل سے گزرتی ہیں۔" سیر جان میں بڑا محل باب حکیم کے قریب تھا۔ یہ شہر کرمان کا پرانا دارالحکومت تھا۔ یہ شہر سلے سلائے کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔ شہر کی جامع مسجد پرانے اور نئے بازار کے درمیان تھی۔ اس کے خوبصورت مینار عضد الدولہ نے بنوائے تھے۔

شیراز سے نصف فرسخ (ڈیڑھ میل) جنوب میں عضد الدولہ نے ایک محل تعمیر کروایا تھا اور اس کے گرد ایک حسین شہر بسایا تھا۔ اس شہر کا نام انہوں نے اپنے لقب پر "کرد فنا خسرو" رکھا تھا۔ شہر کے باغ ایک فرسخ (تین میل) تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان باغوں پر بے تحاشا دولت صرف کی گئی تھی۔ اس شہر میں عضد الدولہ نے جو عمارتیں بنوائی تھیں وہ اس قدر شاندار تھیں کہ انہیں دیکھ کر المقدسی وجد میں آ گئے۔ عضد الدولہ نے مدینہ طیبہ کی شہر پناہ (فصیل) تعمیر کروائی تھی۔ اس کے علاوہ، اصفہان کی شہر پناہ بھی عضد الدولہ ہی نے چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کروائی تھی، اس کا دور اکیس ہزار قدم تھا۔

عضد الدولہ نے رام ہرمز کے شہر میں نہایت عمدہ بازار بنوائے تھے۔ یہ شہر اہواز سے ۸۷ میل مشرق میں تھا۔ مقدسی کے مطابق "میں نے رام ہرمز کے بازاروں سے زیادہ حسین اور صاف ستھرے بازار کہیں نہیں دیکھے۔" شیراز سے ۸۸ میل جنوب مغرب میں کازرون کا شہر تھا۔ یہاں عضد الدولہ نے ایک بڑی عمارت تعمیر کروائی تھی۔ یہ عمارت السی کے نرم اور باریک کپڑے کی تھوک منڈی تھی۔ یہ شہر خوشحالی کی تصویر تھا اور اس کا ہر مکان محل محسوس ہوتا تھا۔

بصرہ سے چار فرسنگ (بارہ میل) کے فاصلے پر شہر ابلّہ آباد تھا۔ ابن خلّکان کہتے ہیں کہ عضد الدولہ کے دور میں اس شہر کو ارضی جنّت کہا جاسکتا تھا۔ شیراز کے نزدیک شعب بوان کا مقام بھی بے حد خوبصورت تھا۔ ابلّہ سے پانچ فرسنگ (پندرہ میل) دور کھاڑی کے پار، بیان کا شہر تھا۔ عضد الدولہ نے چار فرسنگ (بارہ میل) طویل رود خفّار (نہر) کھدوائی اور وسیع کروائی تھی۔ یہ نہر دجلہ کی کھاڑی کے شمالی حصے کو دجیل (دریائے کارون) سے ملا دیتی تھی۔ بصرہ سے جو کشتیاں اہواز جاتی تھیں، اس سے قبل ان کشتیوں کو دجیل کی کھاڑی میں سے ہو کر سمندر میں آنا پڑتا تھا۔ وہاں سے دجلہ کی کھاڑی میں سے گزر کر اور بیان کے پاس سے ہو کر وہ دجلہ پہنچتی تھیں۔

دریائے پلوار اور دریائے کُر کے سنگم سے چند میل شمال میں اصطخر کا شہر واقع تھا۔ اس شہر کے شمال مغرب میں پہاڑیاں تھیں جن پر تین مشہور قلعے تھے، جن کے نام قلعہ اصطخریار، قلعہ شکستہ اور قلعہ شنکوان تھے۔ مجموعی طور پر انہیں قلعے سہ گنبدان کہا جاتا تھا۔ پہاڑوں میں ایک بڑے غار کے منہ پر بند باندھ کر پانی روک لیا گیا تھا اور یہیں سے قلعہ اصطخریار کو پانی پہنچایا جاتا تھا۔ قلعے میں عضد الدولہ نے پانی جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے تالاب بنوائے تھے۔ ان تالابوں پر بیس بیس ستون تعمیر کر کے چھتیں ڈال دی گئی تھیں۔ اسی طرح ان تالابوں میں اتنا پانی ذخیرہ کیا جاسکتا تھا کہ ایک ہزار افراد سال بھر تک پانی استعمال کر سکتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر فوجوں کی معمول کی ورزش اور مشقوں کے لیے میدان تھا۔ اس میدان کا نقشہ خود عضد الدولہ نے تیار کیا تھا اور اُسے اپنی نگرانی میں تعمیر کرایا تھا۔

عضد الدولہ نے شہر بغداد کو بہت ترقی دی۔ مغربی بغداد تک آب رسانی کرنے والی جو نہریں تباہ ہوگئی تھیں، ۳۶۷ھ سے ۳۷۴ھ / ۹۷۷ء سے ۹۸۴ء تک کے عرصے میں عضد الدولہ نے انہیں صاف کروایا اور پل وغیرہ دوبارہ تعمیر کروائے۔ انہوں نے حکم دیا کہ بغداد کے مکانات اور بازار نئے سرے سے تعمیر کیے جائیں۔ انہوں نے بغداد کی جامع مساجد کی تعمیر نو پر بڑی رقم صرف کی۔ انہوں نے دریائے دجلہ کے گھاٹوں کی مرمت بھی کروائی اور دولت مند افراد کو حکم دیا کہ وہ ویران مقامات پر باغات لگائیں۔ عضد الدولہ نے شہر کے وسط میں پل کو جو تنگ اور بوسیدہ محسوس ہونے لگا تھا نئے سرے سے بنوایا اور کشادہ بھی کروایا۔ انہوں نے ڈاک کا اس قدر عمدہ انتظام کیا کہ بغداد سے قاصد خطوط لے کر چلتا تھا اور سات دن میں یہ خطوط شیراز پہنچ جاتے تھے، حالانکہ دونوں شہروں کے درمیان تقریباً چھ سو میل کا فاصلہ تھا۔

عضد الدولہ کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر دریافت کی اور اُسے محفوظ کر دیا۔ انہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا روضۂ مبارک بھی تعمیر کروایا۔ انہوں نے وصیت کی کہ انہیں بھی حضرت علیؓ کی قبر مبارک کے قریب ہی سپرد خاک کیا جائے۔ چنانچہ جب ۸ شوال ۳۷۲ھ / ۲۶ مارچ ۹۸۳ء کو آل بویہ کے اس عظیم حکمران نے دُنیا سے اپنا ناتا توڑا تو انہیں ان کی وصیّت کے مطابق حضرت علیؓ کی قبر مبارک کے قریب ہی خاک نشین کر دیا گیا۔

Marfat.com

عمادالدین زنگی

انہیں صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے کا شرف حاصل ہوا

""ہمیں اب الرہا پر حملہ کر دینا چاہیے۔""

حکمران نے اپنے ماتحتوں سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس طویل قامت حکمران کا رنگ گندمی مائل سرخ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور چہرہ پاکیزگی اور وجاہت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو اپنے فیصلے سے مطلع کر رہا تھا کہ ہمیں اب الرہا پر حملہ آور ہو جانا چاہیے۔

الرہا، جسے صلیبی ایڈیسہ کے نام سے پکارتے تھے اس شہر کو اور بھی کئی نام دیے گئے، مثلاً 'رہا'، 'اعزاز' (آج کل اسے اورفا کہتے ہیں)۔ یہ شہر کبھی دیارِ بکر (موجودہ ترکی) کے نواحی علاقے میں ایک نیم خود مختار عیسائی ریاست میں شامل تھا لیکن اب صلیبی اس پر قابض ہو کر یہاں پہلی صلیبی ریاست قائم کر چکے تھے۔ عیسائی اسے پانچواں مقدس شہر مانتے تھے۔ ان کے دیگر مقدس شہر یروشلم (بیت المقدس)، انطاکیہ، روم اور قسطنطنیہ تھے۔ صلیبیوں نے یہاں زبردست فوج قائم کر رکھی تھی اور وہ موصل، دیارِ بکر اور بغداد وغیرہ کے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے واقع یہ شہر مضبوط فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔

یہ ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء کا ذکر ہے۔ اب سے کچھ عرصے قبل صلیبی، مسلمانوں سے ان کا قبلۂ اوّل بیت المقدس چھین چکے تھے اور اس صدمے سے ہر مسلمان کا دل تڑپ رہا تھا۔

حکمران نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ فوج کے تمام سپاہی بڑی پھرتی کے ساتھ سامانِ جنگ سے لیس ہو کر صف بستہ ہو گئے۔ وہ اپنے سالار کے حکم کے منتظر تھے۔ سدھے ہوئے تازہ دم گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ منجنیقیں اور دیگر اسلحہ اکٹھا کیا جا چکا تھا۔ مستعد سپاہی اسلامی پرچم اٹھائے چاق و چوبند کھڑے تھے اور کوئی دم میں لشکرِ اسلام روانہ ہوا چاہتا تھا۔

سالار نے اشارہ کیا اور نعرۂ تکبیر کی گونج میں اسلامی فوج الرہا کی طرف روانہ ہو گئی۔ ادھر الرہا (ایڈیسہ) پر حکمران عیسائیوں کے رہنما جوسلن ثانی کو خبر مل گئی کہ اسلامی فوج آ رہی ہے۔ اس کا چہرہ پریشانیوں اور تفکرات کی آماجگاہ بن گیا۔ اس نے فوج کے سالار کو بلا کر جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی دیر بعد جوسلن ثانی اپنے چند وفادار ساتھیوں سمیت فرار ہو کر کسی محفوظ مقام کا رخ کر رہا تھا۔

اسلامی لشکر جلد ہی الرہا کی فصیلوں تک آ پہنچا۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا اور مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ اسلامی فوج کے سالار نے کہا ""شہر کے حکام کو پیغام بھیج دیا جائے کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں گے تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"" پیغام بھجوا دیا گیا، لیکن کچھ دیر بعد ہرکارے، عیسائی حکام کا جوابی پیغام لا رہے تھے جس میں اسلامی لشکر کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا تھا۔

اب جنگ کرنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ اسلامی فوج کی منجنیقیں حرکت میں آ گئیں۔ شہر پر حملوں کا آغاز ہو گیا۔ شہر میں اسلحہ اور خوراک کا وافر ذخیرہ موجود تھا، چنانچہ شہر والے قلعہ بند ہو کر ۲۸ دن تک مقابلہ کرتے رہے لیکن ۲۹ویں دن قلعے میں محصور عیسائی فوجی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اسلامی فوج شہر کی فصیلیں توڑ کر شہر میں داخل ہو رہی ہے۔

الرہا فتح ہو چکا تھا۔ وہی صلیبی جنھوں نے کچھ عرصے قبل بے گناہ

Marfat.com

مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے، عورتوں کو ان کے سہاگ سے محروم کیا تھا، معصوم بچوں کے سروں سے والدین کا سایہ چھین لیا تھا، اب مسلمان فوج کے رحم و کرم پر تھے۔ اسلامی لشکر کے سپاہی غم و غصہ سے بے چین تھے۔ ان کی آنکھوں میں صلیبی سپاہیوں کے لیے رحم کی کوئی علامت نہ تھی لیکن یہ اسلامی لشکر تھا جس کا ایک ایک سپاہی اپنے افسر اعلیٰ کے حکم کا پابند تھا اور وہ منتظر تھے کہ دیکھیں سالار صلیبیوں کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

سپہ سالار نے اپنی بڑی بڑی ملیح آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے خوبصورت چہرے پر سکون تھا۔ انہوں نے حکم دیا، "جو لوگ ہتھیار پھینک دیں انہیں کچھ نہ کہا جائے اور جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا ہے انہیں رہا کر دیا جائے۔"

یہ اس مسلمان حکمراں کا اعلیٰ ظرف تھا اور ان کی مثالی رحم دلی تھی کیونکہ وہ اس نبی کریمؐ کی امت میں سے تھے جس نے ۱۳ سال تک مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو فتح مکہ کے دن معاف کر دیا تھا۔

الرہا کی فتح کوئی معمولی واقعہ نہ تھی اس کی خبر فوراً ہی پوری دنیا میں پھیل گئی اور تمام مسیحی ممالک میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن الاثیر کے الفاظ میں ایڈیسہ (الرہا) کی فتح، "فتح الفتوح" (فتح مبین) تھی۔

ادھر پورے عالم اسلام میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ شعرا مبارکباد کی نظمیں کہہ رہے تھے۔ علما، مشائخ، الرہا کے فاتح کو محافظ الاسلام اور مجاہد کبیر کے خطاب دے رہے تھے۔ خلیفہ بغداد مقتفی الامر باللہ بھی اس فتح سے بے حد خوش تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ الرہا کے فاتح کا نام خطبوں میں شامل کیا جائے۔

اپنے بھرپور جذبۂ ایمانی، مثالی غیرت اور بے پناہ جرأت سے کام لیتے ہوئے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے والے یہ اوّلین حکمراں تھے، عماد الدین زنگی جن کو بجا طور پر ملتِ اسلامیہ کا محسن قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو صلیبیوں کی زبردست طاقت کے خلاف متحد اور منظم کیا بلکہ اپنے زیرِ انتظام علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کر کے اسے ایک مثالی اسلامی ریاست بنا دیا۔

عماد الدین زنگی نے جب اس جہان میں اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا تو اس وقت عالم اسلام کے بڑے حصے پر سلجوقیوں کی حکمرانی تھی۔ سلجوقی خاندان کے نامور حکمراں سلطان ملک شاہ سلجوقی اس حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے دور میں مغرب میں شام، جنوب میں یمن اور عمان مشرق میں چین تک اسلامی مملکت کی حدود پھیل چکی تھی۔

قسیم الدولہ آق سنقر بن عبداللہ، سلطان ملک شاہ سلجوقی کے معزز مصاحب تھے۔ آق سنقر، ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی سفید باز کے ہیں۔ سلطان اپنے قابل وزیر نظام الملک طوسی کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ طوسی کے مشورے پر سلطان نے آق سنقر کو ۴۷۷ھ / ۱۰۸۴ء میں حلب اور حماۃ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ دونوں علاقے اب شام میں شامل ہیں۔ اسی سال آق سنقر کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ آق سنقر نے اپنے بیٹے کا نام عماد الدین رکھا۔ عماد الدین ہی آق سنقر کی اکلوتی اولاد تھے۔

۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء میں ملک شاہ سلجوقی کی حیاتِ مستعار کے دن پورے ہو گئے۔ ان کے بیٹے رکن الدین ابو المظفر برکیارق نے شوال ۴۸۷ھ / اکتوبر ۱۰۹۴ء میں سلجوقی سلطنت کی زمام کار سنبھالی۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ میں بیداری کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس وقت تک عیسائیوں کی حکومت صرف براعظم یورپ تک محدود تھی لیکن سلطان ملک شاہ سلجوقی کے انتقال کے بعد عیسائیوں نے بیت المقدس، فلسطین اور دیگر علاقوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں فرانس کا ایک راہب پیٹر دی ہرمٹ اٹھا۔ اس نے ملک ملک گھوم کر اپنی شعلہ بیانی سے مسیحیوں کے دلوں میں آگ بھڑکا دی۔

نومبر ۱۰۹۵ء میں فرانس کے شہر کلیرمانٹ میں پوپ اربن ثانی نے مسیحیوں کا بہت بڑا اجتماع بلایا۔ اس اجتماع میں عیسائی راہبوں، پادریوں اور عام لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں شرکت کی کہ شہر بھر میں جہاں دیکھو لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ اسی اجتماع میں پوپ نے فتویٰ دیا کہ "بیت المقدس کو "کافروں" کے قبضہ سے آزاد کروانے کے لیے خداوند یسوع مسیح کے ہر پیرو کا اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا دے۔"

بیت المقدس اور فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائیوں نے جو جنگیں لڑیں وہ صلیبی جنگیں کہلاتی ہیں کیونکہ کلیرمانٹ کے اجتماع میں پوپ اربن ثانی نے لوگوں کو ایک صلیب دکھا کر کہا تھا:

Marfat.com

"خداوند یسوع مسیح خود اپنی قبر سے یہ صلیب تمہارے سینوں پر آویزاں کرنے کے لیے نکلا ہے۔ یہی تمہاری نجات کا نشان ہے اور یہی تمہاری فتح کی ضامن ہے۔"

صلیبی جنگوں کی کل تعداد آٹھ ہے اور یہ ۱۷۵ سال، یعنی ۴۸۹ھ سے ۶۷۵ھ / ۱۰۹۶ء سے ۱۲۷۱ء تک جاری رہیں۔ ان میں سے پہلی تین جنگیں مشہور ہیں۔ شعبان ۴۸۹ھ / اگست ۱۰۹۶ء میں صلیبیوں کا پہلا لشکر بیت المقدس کی سمت روانہ ہوا۔ شعبان ۴۹۲ھ / جون ۱۰۹۹ء میں صلیبی، مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس پر قابض ہو چکے تھے اور کچھ ہی عرصے بعد ان کی حکومت بالائی الجزیرہ میں ماردین سے مصر کی سرحد العریش تک پھیل چکی تھی۔ ارضِ مقدس میں عیسائیوں کی چار ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ جن کے صدر مقامات بیت المقدس، الرہا، انطاکیہ اور طرابلس تھے۔

یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا کٹھن اور کرب ناک تھا۔ وہ اپنی نظروں کے سامنے صلیبیوں کو بیت المقدس پر قابض ہوتے اور مسجدِ اقصیٰ میں خون کی ندیاں بہاتے دیکھ چکے تھے۔ فی الحقیقت مسلمان بڑی بے بسی سے دوچار تھے۔

اللہ کی بارگاہ میں مسلمانوں کی دعائیں قبول ہوئیں اور ظلم و ستم کی اس سیاہ رات میں بالآخر امید کی ایک کرن چمک اٹھی اور پھر اس کرن سے پھوٹنے والی کئی کرنوں نے دور دور تک اجالا کر دیا۔ جبر و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگ کھڑے ہوئے اور ارضِ مقدس فلسطین نورِ اسلام سے جگمگا اٹھی۔

شبِ ظلمت میں امید کی یہ پہلی کرن تھی عماد الدین زنگی، جنہوں نے اپنی عظیم قوتِ ایمانی، بے مثال جرأت اور قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے پے در پے حملے کر کے صلیبیوں کے دانت کھٹے کر دیے اور ان کے مضبوط اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ صلیبیوں کے خلاف جس مقدس جہاد کا آغاز انہوں نے ۵۰۷ھ / ۱۱۱۳ء میں کیا تھا، اسے ان کے بیٹے نور الدین زنگی اور پھر صلاح الدین ایوبی نے دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ فی الحقیقت صلیبی سیلاب کے آگے بند باندھنے کے جرأت مندانہ اقدام میں پہل عماد الدین زنگی ہی نے کی۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء میں سلجوقی سلطنت کی باگ ڈور سلطان رکن الدین ابو المظفر برکیارق کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ انہوں نے امیر کربوقا، کو موصل کا امیر مقرر کر دیا تھا۔ امیر کربوقا، عماد الدین کے والد آق سنقر کے دوست تھے۔ انہوں نے عماد الدین کو اپنے پاس بلالیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اساتذہ مقرر کیے، ان کی رہائش، خوراک، لباس اور دیگر ضرورتوں کا اعلیٰ انتظام کیا۔

۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء میں جرکمیش کے امیر کے لڑکے ناصر الدین کی بیٹی سے عماد الدین کی شادی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد امیر مودود موصل کی حکمرانی پر فائز ہوئے۔ وہ بڑے غیرت مند اور باہمت انسان تھے۔ انہوں نے ہی صلیبیوں کے خلاف باقاعدہ جدوجہد کی داغ بیل ڈالی۔ عماد الدین تو خود دل سے جہاد کے خواہاں تھے۔ ابھی صرف چند سال پہلے صلیبی لشکر بیت المقدس پر قابض ہو چکا تھا اور اس المناک واقعہ سے عماد الدین کا دل بے حد افسردہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں صلیبیوں کو ارضِ مقدس سے مار بھگانے کا موقع مل جائے۔ امیر مودود کی فوج میں شامل ہو کر انہوں نے صلیبیوں کے خلاف زبردست لڑائیاں لڑیں۔ ان لڑائیوں میں بلاد شجستان، ایڈیسہ اور طبریہ کے معرکے مشہور ہیں۔ ۵۰۷ھ / ۱۱۱۳ء میں طبریہ کا معرکہ پیش آیا۔ عماد الدین اس جنگ میں نہایت بہادری سے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے شہر کے دروازے تک پہنچ گئے اور اس میں اپنا نیزہ گاڑ دیا۔ ان معرکوں کے نتیجے میں عماد الدین کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی اور صلیبی ان کے نام سے خوف کھانے لگے۔

۵۱۱ھ میں سلطان محمد سلجوقی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سلطان محمود تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ۵۱۶ھ / ۱۱۲۲ء میں عماد الدین کو واسط کا حاکم بنایا اور ساتھ ہی بصرہ کی نیابت بھی سپرد کی۔ کچھ عرصے بعد موصل کے امیر آق سنقر برسقی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد صلیبیوں نے موصل کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر موصل کے دو سرکردہ علماکرام بہاالدین ابوالحسن علی شہرزوریؒ اور صلاح الدین محمدؒ، سلطان محمد کے پاس پہنچے اور ان کو مشورہ دیا کہ موصل میں کسی تجربہ کار شخص کو حاکم بنایا جائے۔ مشیروں سے مشورہ لیا گیا تو سب نے متفقہ طور پر رائے دی کہ موصل کی امارت کے لیے عماد الدین سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے چنانچہ عماد الدین موصل کے گورنر مقرر کر دیے گئے۔

عماد الدین نے رمضان المبارک ۵۲۲ھ / ستمبر ۱۱۲۷ء میں موصل کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمود نے اپنے

Marfat.com

دونوں بیٹوں الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تعلیم عماد الدین زنگی کے سپرد کردی اور انہیں اتابک کا خطاب دیا۔ اتابک ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی "بزرگ اور اتالیق" کے ہیں۔ یہ لقب سب سے پہلے سلطان ملک شاہ سلجوقی نے اپنے قابل وزیر نظام الملک طوسی کو دیا تھا، اس کے بعد سلجوقی سلطنت میں اس خطاب کو نہایت اہمیت حاصل ہوگئی اور یہ صرف اس امیر کو دیا جاتا جو بے حد محترم اور ذی عزت سمجھا جاتا تھا اور نوجوان شہزادوں کی تربیت، نگرانی اور نگہداشت بھی اسی کے سپرد کی جاتی تھی۔

مؤرخ ابن الاثیر" کے مطابق یہ وہ دور تھا جب عیسائی حکمران شہروں پر آبادی کا لحاظ کیے بغیر خراج لگا رہے تھے۔ وہ حلب کی نصف آمدنی اسی طرح وصول کرلیا کرتے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ انہوں نے شہر کے دروازے پر باغ کے قریب نصب چکیوں پر بھی خراج لگا دیا تھا۔

صلیبی جب چاہتے دمشق اور حلب کی چراگاہوں میں آگھستے اور تباہی مچاتے۔ دمشق اور حلب کے نواحی علاقوں میں عیسائیوں کی ٹولیاں روزانہ لوٹ مار کیا کرتی تھیں۔ ۵۲۲ھ میں حلب سے شہریوں کا ایک وفد عماد الدین زنگی کے پاس موصل آیا اور حلب کے شہریوں کی مظلومیت کی داستان سنائی۔ عماد الدین زنگی نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا اور حلب پر حملہ کردیا۔ یہ حملہ اس قدر تند و تیز تھا کہ صلیبی حکمرانوں کے ہوش اُڑ گئے۔ عماد الدین عیسائی علاقے میں دُور تک بڑھتے چلے گئے۔ یہ کسی عیسائی ریاست پر پہلا باقاعدہ حملہ تھا۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور عماد الدین زنگی نے حلب کو مستقل چھاؤنی کی حیثیت دے دی۔ وہ تقریباً ایک سال تک یہاں مقیم رہے اور اس عرصے میں انہوں نے آس پاس کی عیسائی چوکیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ اگلے سال انہوں نے عیسائیوں کے زیر تسلط علاقے کے سب سے بڑے سرحدی قلعے حصن الاثارب پر حملہ کردیا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یروشلم (بیت المقدس) کے بادشاہ بالڈون نے فوراً جاگیرداروں اور رؤسا کی کانفرنس بلائی اور ان سے صلاح و مشورہ کیا کہ عماد الدین زنگی کے حملے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آیا یہ ایک وقتی جوش ہے اور ذاتی اغراض کے پیش نظر کیا جارہا ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی بڑا مقصد اور تحریک کار فرما ہے۔ بیشتر مشیروں کا خیال یہ تھا کہ یہ ایک وقتی ابال ہے اور بہت جلد اس آندھی کا زور ٹوٹ جائے گا۔ لیکن بعض مشیروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ طوفان تھمنے والا نہیں ہے۔ عماد الدین وہی شیر دل سالار ہے جس نے طبریہ کے دروازے پر نیزہ گاڑ دیا تھا۔ شاہ بالڈون نے فیصلہ کیا کہ ایک بڑی فوج تیار کی جائے اور حصن الاثارب کی سمت کوچ کیا جائے۔ حصن الاثارب حلب سے چار میل کے فاصلے پر انطاکیہ جانے والے راستے پر واقع تھا۔

جب عماد الدین کو بالڈون کی فوج کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور دل ہلا دینے والے تکبیر کے نعروں کی گونج میں دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ یہ جنگ نہایت خونریز تھی اور اس جنگ میں صلیبیوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ علامہ ابنِ خلدون کے مطابق لڑائی کے ساٹھ ستر برس بعد تک صلیبی سپاہیوں کی ہڈیاں میدان جنگ میں بکھری رہیں۔

بالڈون کی فوج کو شکست سے دوچار کرنے کے بعد عماد الدین زنگی پھر قلعہ الاثارب کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک زبردست حملہ کرکے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ اس مضبوط قلعے کی فتح سے صلیبی دہل کر رہ گئے۔ اب حلب اور نواحی علاقے صلیبیوں کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ ہوگئے تھے۔

اس دوران عیسائی فوجیں دمشق کے دروازے تک آپہنچی تھیں۔ عماد الدین زنگی نے بعرین کا رخ کیا اور صلیبیوں کو خوفناک شکست دی۔ ان واقعات سے صلیبی اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ان کے پادری سیاہ ماتمی لباس پہن کر یورپی ممالک جا پہنچے اور وہاں نوحے اور مرثیے پڑھنے لگے۔ اس فریاد کا اثر یہ ہوا کہ روم اور فرانس کے بادشاہوں نے لاکھوں سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور ۵۳۴ھ / ۱۱۴۰ء میں ارضِ شام پر یلغار کردی۔ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا اس میں شیزر کا علاقہ بھی آتا تھا۔

اس زمانے میں شیزر پر ابو العساکر سلطان ابن منقذ حکمران تھے۔ انہوں نے عماد الدین سے مدد طلب کی۔ عماد الدین نے فوراً فوج کو منظم کیا اور شیزر کے قلعہ کا محاصرہ کرنے والی صلیبی فوج کی جانب روانہ ہوگئے۔ دریائے عاصی کے کنارے پڑاؤ ڈال کر انہوں نے قیصر روم کو میدانِ جنگ میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آؤ ہم تمہاری تلواروں کا مزہ چکھیں اور تم ہماری تلواروں کا۔

شاہِ روم کو قلعہ الاثارب کے عیسائیوں نے یہ کہہ کر خوفزدہ کردیا کہ اثارب کے معرکے میں عماد الدین زنگی کا لشکر عیسائیوں کی فوج کا قلع قمع کرچکا ہے اس لیے میدان میں مقابلہ سود مند نہ ہوگا۔ چنانچہ قیصر روم نے پہاڑوں کی بلندی سے مقابلے کو ترجیح دی لیکن انہیں شاید علم نہ

Marfat.com

تھا کہ زنگی بھی ان نشیب و فراز سے بخوبی آشنا ہیں۔ زنگی کا لشکر بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن اپنا سارا سامان اسلحہ، منجنیقیں وغیرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عماد الدین نے صلیبیوں کا دُور تک تعاقب کیا۔ ہزاروں صلیبی ہلاک، زخمی یا گرفتار کر لیے گئے اور تعاقب اس وقت تک جاری رکھا گیا جب تک قیصر روم کی فوج شام کے ساحل پر شاہی بیڑے میں سوار ہو کر روم کی طرف بھاگ کھڑی نہ ہوئی۔ اس لڑائی میں عماد الدین کی فوج نے بڑی مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اس شاندار فتح پر بہت سے مسلمان شعراء نے مبارکباد کے قصیدے لکھے۔

شیزر کے بعد عماد الدین نے قلعہ عرفہ پر حملہ کیا جو طرابلس کے عیسائی نواب کے قبضے میں تھا۔ چند ہی دن میں یہ قلعہ فتح ہو گیا۔ پھر قلعہ بعرین کا محاصرہ کر لیا، اس سے قبل بعرین کے مضافات میں شاہ یروشلم اور شاہ فرانس کی متحدہ فوج نے عماد الدین کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ قلعہ بعرین کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا جس کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

۶ جمادی الاول ۵۳۹ھ / ۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء کا دن وہ تاریخی دن تھا جب عماد الدین نے پہلی صلیبی ریاست کے صدر مقام الرہا کو بھی تسخیر کر لیا۔ اس معرکے کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ الرہا کی فتح کے بعد عماد الدین نے دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف پیش قدمی کی اور متعدد قلعے اور شہر فتح کیے، ان میں سیروج کا مشہور قلعہ بھی شامل تھا۔

عماد الدین نے جس بھرپور طریقے سے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا وہ پوری مسیحی دنیا کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ عماد الدین صلیبی فوجوں کو ارضِ مقدس سے پوری طرح نکال باہر کرنے اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اپنا یہ مشن جاری رکھتے لیکن ۵ ربیع الآخر ۵۴۱ھ / ۱۴ ستمبر ۱۱۴۶ء کو انہیں ایک مملوک (غلام) نے شہید کر دیا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔

اس بطل جلیل کی شہادت کی خبر پوری اسلامی دنیا میں انتہائی رنج کے ساتھ سنی گئی لیکن عیسائیوں میں مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ فرانسیسی مورخ مچاؤ کے مطابق: "عماد الدین زنگی کی موت نے عیسائیوں کو حیاتِ نو عطا کر دی۔"

عماد الدین زنگی شریعت کی پابندی کرنے والے اور قوانین حکومت پر عمل کروانے کے سلسلے میں بہت سخت تھے۔ وہ سرکاری حکام اور فوجی افسروں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ انہیں ذاتی جائیدادیں بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے فوج کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ کبھی فصلوں اور کھیتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور شہریوں اور دیہاتیوں سے معاوضہ ادا کیے بغیر کوئی چیز نہ لیں۔ وہ کہتے تھے "جو سلطان اپنی فوج کو رعایا کی املاک اور زمین پر قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے وہ بڑا ظالم ہے اور ظلم کو رواج دینے کا موجب ہے۔" ان احکام کا نتیجہ یہ تھا کہ علامہ ابن الاثیر کے مطابق "جب عماد الدین زنگی کی فوج کسی دیہاتی علاقے سے گزرتی تو یوں محسوس ہوتا کہ دو رسیاں اس فوج کے دونوں جانب پھیلا دی گئی ہیں اور فوج ان کے اندر سے اپنی منزل کی طرف جا رہی ہے اور کبھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتی۔ شہید اتابک زنگی کا انصاف مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے یکساں تھا اور رعایا کا کوئی بھی فرد خواہ اس کا کسی مذہب سے تعلق ہو، عماد الدین زنگی کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا۔"

عماد الدین زنگی نہایت سخی، رحم دل اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ وہ ہر جمعہ کو نماز سے قبل ایک سو سرخ دینار مستحقین میں تقسیم کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اپنے قابلِ اعتماد ماتحتوں کے ذریعے غریبوں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحت افسران کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کے علاقے میں کوئی فرد ایسا نہیں ہونا چاہیے جس کے پاس کھانے کے لیے خوراک اور پہننے کے لیے لباس نہ ہو۔ عماد الدین زنگی کی سخاوت کی وجہ سے بعض مورخین نے انہیں 'ابوالجود' کا خطاب بھی دیا۔

علامہ ابن الاثیر کا کہنا ہے کہ "شہید اتابک زنگی کے دور میں اپنے وقت کی بہترین اور انتہائی منظم حکومت تھی۔ زنگی کو اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی گزر اوقات کا وسیلہ اور اس کے اخراجات کی کیفیت کا علم رہتا تھا۔ ان کے مقرر کردہ نگراں ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر قریے میں پھیلے ہوئے تھے جو انہیں رعایا اور بستیوں کی صورتحال سے ہمیشہ باخبر رکھتے تھے۔"

عماد الدین زنگی نے اس قسم کا نظامِ حکومت نافذ کیا تھا کہ ان کی رعایا خود کو ایک وسیع خاندان کا حصہ سمجھتی تھی جس کے سربراہ وہ خود تھے۔ شہید زنگی بے روزگاروں کو خود روزگار فراہم کرتے۔ مزدوروں اور کاریگروں کو اجرت کم ہونے کی شکایت ہوتی تو اجرت بڑھواتے۔ جن کاشتکاروں کے پاس زرعی اراضی کم ہوتی انہیں زمین دلواتے تھے۔

Marfat.com

عمادالدین زنگی اپنا یہ قول اکثر دہرایا کرتے تھے: "ملک ایک باغ کی طرح ہے۔ جب تک باغبان اس کی آبپاشی اور حفاظت میں سرگرم رہے گا وہ سرسبز شاداب رہے گا، جونہی اس نے غفلت کی، سارا باغ اجڑ کر رہ جائے گا۔"

عماد الدین زنگی نے جب موصل کی حکمرانی سنبھالی تو شہر کا اکثر حصہ ویران تھا۔ مساجد ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ جامع عتیق سے محلہ طیاطلین تک ایک ویرانہ تھا۔ لیکن عماد الدین نے موصل کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ چند سال کے اندر اندر یہ ویرانہ آباد ہو گیا۔ اس سے قبل شام کا تقریباً سارا علاقہ بنجر پڑا ہوا تھا اور صلیبیوں کی لوٹ مار سے تجارت بند ہو گئی تھی۔ عماد الدین نے ایک جانب پے در پے دستے بھیج کر لوٹ مار کا یہ سلسلہ سرے سے ختم کروا دیا دوسری جانب لاکھوں افراد کو باہر سے بلوا کر دیہات میں آباد کیا۔ ہر قسم کے پھلوں کے باغات اور طرح طرح کے اناج کی فصلیں لگوائیں۔ حتیٰ کہ پیداوار اتنی بڑھی کہ پھل اور غلہ شہر سے باہر بھی بھیجا جانے لگا۔ تجارت چمک اٹھی۔ مسمار عمارتوں کی جگہ نئی اور جدید طرز کی تعمیرات نے لے لی۔ عماد الدین نے موصل کے شمال میں بھی ایک شہر آباد کیا جس کا نام خود ان کے نام پر عمادیہ رکھا گیا۔

عماد الدین زنگی ایک علم دوست حکمران تھے۔ ان کی مجلس میں علما اور صاحب علم افراد موجود رہتے تھے۔ انہوں نے اہم ملکی عہدوں کے لیے بھی قابل اشخاص کا انتخاب کیا تھا۔ ان میں ایک اہم شخصیت ابو جعفر محمد الجواد کی ہے جو عماد الدین زنگی کے مشرف (وزیر اعظم اور مجلس شوریٰ کے صدر) تھے۔ ابو جعفر محمد الجواد نے نہ صرف علم کی ترویج اور سرپرستی کی بلکہ رفاہِ عامہ سے متعلق متعدد کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے خاصے فاصلے سے ایک نہر کھدوائی جو عرفات تک پانی پہنچاتی تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حاجیوں کو آرام د سہولت مہیا کرنے کے لیے کئی عمارتیں بنوائیں، مدینہ منورہ کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی۔ وہ ہر سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مستحقین کے لیے اس قدر رقم، غلہ اور کپڑا بھیجتے تھے جو ان کی سال بھر کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوتا تھا۔ ان مستحقین کو فراہم کی جانے والی امداد کا حساب کتاب بھی رکھا جاتا تھا اور بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کے کوائف محفوظ رکھے جاتے تھے۔

عماد الدین نہ صرف صاحبِ علم حکمراں تھے بلکہ عمل کے میدان میں بھی آگے تھے۔ وہ نماز اور روزہ کو میدانِ جنگ میں بھی ترک نہ کرتے تھے۔

عماد الدین زنگی کی صورت میں ہمیں ایک نہایت متقی، صاحبِ ایمان، غیرت مند اور بے انتہا دلیر سالار نظر آتا ہے۔ علامہ ابن اثیر نے اپنی کتاب "تاریخ الکامل" میں عماد الدین کو ہر جگہ 'شہید اتابک' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں: "شہید اتابک کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر غیرتِ دینی اور شجاعت و دیعت کی تھی وہ بہت کم نامورانِ اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ ان کے جوش ایمانی کا یہ عالم تھا کہ وہ فوجوں کو لڑاتے لڑاتے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر تنہا دشمن کی صفوں میں جا گھستے تھے اور اپنی شمشیر خارا شگاف سے ان کو کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔"

عماد الدین زنگی چاہتے تو اپنے زیر تسلط علاقے پر اطمینان سے حکومت کر سکتے تھے لیکن ان کی غیرتِ ایمانی نے گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کا قبلۂ اوّل بیت المقدس صلیبیوں کے قبضے میں رہے۔ انہوں نے انتہائی کم وسائل اور قلیل افرادی قوت کے باوجود ایک بڑی طاقت سے ٹکر لے کر اسے لرزہ براندام کر دیا اور اس عظیم جہادِ مقدس کی بنیاد رکھ دی جس کے نتیجے میں مسلمان کچھ ہی عرصے بعد بیت المقدس کو صلیبیوں سے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

•••

Marfat.com

نور الدین زنگی

انہوں نے خلافتِ راشدہ کے دور کی یاد تازہ کر دی

کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اسلامی مملکت کے فرمانروا نمازِ عشاء کے بعد نوافل ادا کر چکے تھے اور اب ذکر اذکار کرنے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے کے بعد دو گھڑی آرام کے لیے بستر پر لیٹ گئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ چند گھنٹے کی نیند لینے کے بعد تہجد کے لیے بیدار ہو جاتے تھے۔

چند ثانیوں کے بعد نیند ان کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔ ان کے کشادہ پیشانی والے سرخ و سفید کتابی چہرے پر بلا کا سکون و اطمینان تھا لیکن جو بھی اس چہرے کو دیکھتا تھا وہ اس کی ہیبت اور جلال سے مرعوب ہو جاتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے خوبصورت چہرے پر سخت اضطراب تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ بار بار استغفار پڑھتے اور رو کر کہتے "میرے آقا و مولا ﷺ کو میرے جیتے جی کوئی ستائے، یہ نہیں ہو سکتا۔" ان کی نظروں کے سامنے اس خواب کا منظر بار بار گھوم جاتا، جو انہوں نے ابھی چند لمحوں پیشتر دیکھا تھا۔ خواب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ ان کے سامنے جلوہ فرما ہیں اور آپؐ دو افراد کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں: "یہ آدمی مجھے ستا رہے ہیں، ان کے شر کا خاتمہ کر دے۔"

اب انہیں کسی گھڑی قرار نہ تھا۔ سرورِ دو عالم ﷺ نے انہیں یاد فرمایا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر سفر کی تیاری کی، چند ساتھیوں کو لیا اور دمشق سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھی ہی نہیں دمشق میں بسنے والا ہر فرد حیران تھا کہ اس اچانک سفر کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

یہ ۵۵۷ھ / ۱۱۶۲ء کا ذکر ہے یعنی یہ آج سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو برس پرانی بات ہے۔ اس زمانے میں دمشق سے مدینہ منورہ کا سفر بیس پچیس دنوں میں طے ہوتا تھا، لیکن مملکت اسلامی کے فرمانروا نے اپنے ساتھیوں کو راستے میں آرام کرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتے ہوئے سولہویں دن مدینہ منورہ جا پہنچے۔

انہوں نے مدینہ پہنچتے ہی شہر میں داخلے کے تمام دروازے بند کروا دیے اور اعلان کروا دیا کہ آج شہر کے تمام باشندے ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ کھانے کا اہتمام کیا گیا لیکن فرمانروا کو حاضرین میں وہ دو چہرے کہیں دکھائی نہ دیے جو انہیں خواب میں نظر آئے تھے اور جن کی طرف اشارہ کر کے رسالتمآب ﷺ نے فرمایا تھا کہ "یہ دو آدمی مجھے ستا رہے ہیں۔"

طویل قامت حکمراں کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کے حکام سے دریافت کیا کہ کوئی ایسا شخص تو نہیں جو کسی وجہ سے کھانے میں شریک نہ ہو سکا ہو۔ جواب ملا مدینہ کے شہریوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں ہے، البتہ دو مغربی زائر ہیں جو مدتوں سے یہاں رہتے ہیں، ہر وقت عبادت میں لگے رہتے ہیں، کچھ وقت بچتا ہے تو جنت البقیع میں لوگوں کو پانی پلاتے ہیں۔ ان کا کسی سے ملنا جلنا نہیں ہے۔"

حکمراں نے کہا "انہیں بھی یہاں لائیں ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔" دونوں مغربی زائروں کو بلایا گیا۔ انہیں دیکھتے ہیں فرمانروا کی نظروں میں خواب کا منظر گھوم گیا۔ وہ دونوں بلاشبہ وہی تھے جن کی طرف آنحضرت ﷺ نے اشارہ کر کے فرمایا تھا، "یہ دو آدمی مجھے ستا رہے ہیں۔"

حکمراں نے دیکھا، دونوں مغربی زائر اپنے حلیے اور وضع قطع سے

Marfat.com

بڑے خدا رسیدہ اور عبادت گزار لگتے ہیں۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ روضۂ اقدس کے قریب ایک مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ وہیں وہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

فرمانروا نے دونوں زائروں کو اپنے ماتحتوں کی نگرانی میں چھوڑا اور خود چند افسروں کے ساتھ اس مکان میں پہنچ گئے جہاں دونوں زائر مقیم تھے۔ بظاہر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس پر اعتراض کیا جاسکے۔ مکان میں تھا ہی کیا، مختصر سا سامان، ایک چٹائی اور ایسی ہی دو چار اشیا۔ حکمراں نے چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اچانک انہیں چٹائی کے نیچے فرش لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ انہوں نے چٹائی ہٹائی تو ایک چوڑی سِل نظر آئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ سِل فرش میں مضبوطی سے پیوست نہیں ہے۔ حکمراں کی ہدایت پر اس سِل کو ہٹایا گیا تو حکمراں اور ان کے ساتھ آنے والے افسران حیرت زدہ رہ گئے۔ سِل کے نیچے ایک سرنگ تھی۔ جائزہ لینے پر انکشاف ہوا کہ یہ سرنگ سیدھی نبی کریم ﷺ کے روضۂ مبارک کی طرف جاتی تھی۔

حکمراں کے چہرے پر قہر و غضب کی بجلیاں کوندنے لگیں وہ تیزی سے لوٹے اور حکم دیا کہ دونوں زائروں کو زنجیروں میں جکڑ کر حاضر کیا جائے۔ حکم پر فوراً عملدرآمد کیا گیا۔ حکمراں نے بظاہر درویش صفت نظر آنے والے دونوں زائروں سے ڈانٹ کر پوچھا:

"سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

اب راز تو کھل چکا تھا۔ دونوں زائر اپنے اصلی روپ میں پہچانے جاچکے تھے۔ دونوں نے ڈھیٹ بن کر جواب دیا۔

"ہم نصرانی ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے تمہارے پیغمبر کی لاش چرانے پر مامور کیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑھ کر ثواب کا اور کوئی کام نہیں لیکن افسوس کہ عین اس وقت جب ہمارا کام بہت تھوڑا رہ گیا تھا، تم نے ہمیں گرفتار کرلیا۔"

حکمراں میں اب مزید کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ مجرم اپنے جرم کا بھری بزم میں اقرار کرچکے تھے۔ حکمراں نے دونوں مجرموں کی گردنیں اڑانے اور ان کی لاشیں بھڑکتے ہوئے الاؤ میں ڈال دینے کا حکم دے دیا۔

دونوں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد حکمراں رو پڑے۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آتے تھے اور سسکیوں کے درمیان وہ کہہ اٹھتے تھے، "یہ میرے نصیب کہ اس خدمت کے لیے حضور ﷺ نے اس غلام کا انتخاب فرمایا۔"

ایک ناپاک سازش کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ ضرورت تھا کہ اب ایسی سازشوں کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا جائے۔ حکمراں نے معمار بلائے اور ہدایت کی کہ روضۂ رسول ﷺ کے چاروں طرف اتنی گہری خندق کھودی جائے کہ پانی نکل آئے اور پھر اس خندق کو پگھلے ہوئے سیسے سے پاٹ دیا جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ رحمتِ عالم ﷺ کے روضۂ اقدس کے گرد گہری خندق کھودی گئی اور پھر اس میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا گیا۔ سیسہ پلائی ہوئی یہ خندق روضۂ رسول ﷺ کے گرد آج بھی موجود ہے۔

نبی رحمت ﷺ کی خواب میں زیارت اور پھر حضور ﷺ کے حکم پر مدینہ منورہ جاکر روضۂ رسول ﷺ کی حفاظت کرنے کی سعادت جس عظیم مسلمان فرمانروا کو حاصل ہوئی وہ تھے نورالدین محمود زنگی، جنہوں نے اپنے ۲۸ سالہ دور حکومت میں صلیبی طاقتوں کو پے در پے شکستوں سے دوچار کرکے بیت المقدس کی بازیابی کی راہ ہموار کردی۔ ان کا عہد بلاشبہ اسلامی تاریخ کا عہد زریں تھا۔ انہوں نے مملکت اسلامی کا انتظام و انصرام اس خوبی سے کیا اور ایک خداترس حکمراں کی حیثیت سے امورِ مملکت کو اتنی عمدگی سے چلایا کہ خلافتِ راشدہ کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

عالم اسلام کے یہ مایہ ناز اور قابل فخر جرنیل ۱۳ شوال ۵۱۱ھ / ۷ فروری ۱۱۱۸ء کو موصل میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ، موصل کے امیر جرکمیش کے فرزند ناصرالدین کی صاحبزادی تھیں۔ والد محترم عماد الدین زنگی نے، جنہیں مؤرخین شہید اتابک کے لقب سے یاد کرتے ہیں، بیت المقدس کی صلیبیوں سے بازیابی کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس جدوجہد کا آغاز ۵۰۷ھ میں کیا تھا، اسے ان کے بیٹے نور الدین زنگی نے آگے بڑھایا۔ گوکہ وہ اس مقصد کو اپنی زندگی میں حاصل نہ کرسکے تاہم انہوں نے اسلامی مملکت کو نہایت مستحکم بنادیا اور ان کے بعد عظیم سپہ سالار صلاح الدین ایوبی نے اپنے تدبر اور شجاعت کو کام میں لاتے ہوئے صلیبیوں سے تقریباً تمام مقبوضہ علاقے واپس لے لیے۔

عماد الدین زنگی کے چار بیٹے تھے۔ سیف الدین غازی، نور الدین محمود، قطب الدین مودود اور نصر الدین امیر امیراں۔ ان سب میں

Marfat.com

نورالدین محمود سب سے زیادہ ہوشیار اور قابل تھے۔ ان کے والد نے بھی ان کے شوق و جستجو کو دیکھتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ وہ جب تقریباً چار برس کے ہوئے تو انہیں مدرسے میں داخل کروادیا، تعلیم و تربیت کے لیے بے حد قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔ اس زمانے میں عماد الدین زنگی واسط کے حکمراں تھے۔ اور بصرہ کے سرکاری امور کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔

نورالدین سولہ برس کی عمر کو پہنچے تو وہ قرآن کریم، حدیث پاک، تفسیر، فقہ، اصول، ادب، مناظرہ میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ ان کے اساتذہ نے ان کا اچھی طرح امتحان لے کر انہیں تکمیل علوم کی سند دے دی تھی۔ اسی دوران عماد الدین نے اپنے بیٹے کے لیے فنونِ حرب کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ بہت مختصر مدت میں نورالدین شمشیر زنی، نیزہ بازی اور تیر اندازی میں ماہر ہو چکے تھے۔ ماہرینِ جنگ نے انہیں لشکر ترتیب دینے، مورچہ بنانے، محاصرہ کرنے اور لڑائی کی مختلف چالوں کی تربیت دی تھی۔ نور الدین نے اپنی سپاہیانہ تربیت کے مکمل ہونے کا ثبوت اپنے والد کے ساتھ شیزر، عرقہ، بعرین اور ایڈیسہ (الرہا) کی لڑائیوں میں شریک ہو کر فراہم کر دیا۔ ۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء میں جب عماد الدین شہید ہو گئے تو نور الدین کی عمر ۳۰ برس تھی۔

عماد الدین کی شہادت کے بعد مملکت کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری نورالدین پر آپڑی۔ نور الدین کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا، بیت المقدس کی بازیابی۔ فوری طور پر انہیں صلیبی حکمرانوں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب بھی دینا تھا اور مسلمانوں کی بکھری ہوئی قوت کو یکجا کر کے متحد اور منظم بھی کرنا تھا۔ الرہا (ایڈیسہ) کو تو عماد الدین زنگی نے فتح کر لیا تھا اور وہاں کا عیسائی حکمران جوسلن ثانی الرہا سے فرار ہو کر دریائے فرات کے مغرب میں واقع شہر تل باشر میں جا چھپا تھا۔ عماد الدین کی شہادت سے شہ پا کر جوسلن ثانی نے الرہا کے عیسائی باشندوں سے ساز باز کی اور جمادی الآخر ۵۴۱ھ / نومبر ۱۱۴۶ء میں الرہا پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ مکر و فریب سے رات کی تاریکی میں کیا گیا تھا، لیکن الرہا کے باشندے بروقت چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو فصیل کے اندر پہنچا دیا اور قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنے لگے۔ ادھر نور الدین کو جیسے ہی اس حملے کی اطلاع ملی انہوں نے فوراً دس ہزار سواروں کو تیار کیا اور آندھی اور طوفان کی مانند الرہا جا پہنچے۔

دوسرے دن جوسلن ثانی کی فوج عجب بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔ فصیل شہر کے اندر سے بھی اس پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور لشکر کے عقب سے نور الدین کی فوج نے حملہ کر دیا تھا۔ گھمسان کا یہ معرکہ شام تک جاری رہا اور عیسائی فوج کے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ جوسلن ثانی سخت سراسیمہ تھا۔ اس کے اطراف صرف بیس وفادار افسر رہ گئے تھے۔ اس نے ان بیس افسروں کے ساتھ بھاگ کر ایک برج میں پناہ لے لی۔ مسلمانوں کو اس بات کا علم ہو گیا۔ انہوں نے بارود کی سرنگ بچھا کر اس برج کو اڑا دیا۔ تمام عیسائی افسران ہلاک ہو گئے لیکن جوسلن ثانی کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بھیس بدل کر راہِ فرار اختیار کی۔ نور الدین کی فوج نے شہر پر مسلمانوں کا قبضہ بحال کروادیا تھا۔ اس واقعے کے بعد شہر کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے گئے۔

الرہا کی فتح عیسائیوں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ چنانچہ مسیحی پادریوں اور حکمرانوں نے عوام کو جنگِ مقدس میں شریک کرنے کے لیے باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم اور جرمنی کے حکمراں کانرڈ سوم کی قیادت میں لاکھوں کا لشکر بیت المقدس کی سمت روانہ ہو گیا۔ بیت المقدس پہنچنے پر دونوں بادشاہوں نے صلاح مشورے سے طے کیا کہ مسلمانوں کو فوجی لحاظ سے غیر مستحکم بنانے کے لیے سب سے پہلے دمشق پر حملہ کیا جائے، چنانچہ صلیبیوں نے دمشق اور اس کے اطراف کے علاقوں میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ نور الدین کی بصیرت افروز نگاہیں دیکھ چکی تھیں کہ فوجی اعتبار سے اس شہر کی کس قدر اہمیت ہے۔ انہوں نے دمشق کے بااثر امرا سے راز داری کے ساتھ گفت و شنید کر کے ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء میں دمشق پر قبضہ کر لیا۔ یہ کارروائی اتنی حکمت سے کی گئی کہ صلیبیوں کو اس کا پہلے سے علم نہ ہو سکا اور جب صورتِ حال ان پر واضح ہوئی تو دمشق ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور وہ ایک بڑے خطرے کو سر پر منڈلاتا دیکھ رہے تھے۔ اب بیت المقدس تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔

بعد کے برسوں میں بعلبک، حارم، شیزر اور جیش کے معرکے پیش آئے۔ رمضان المبارک ۵۵۹ھ / اگست ۱۱۶۴ء میں ایک سخت لڑائی کے نتیجے میں نور الدین نے حارم کو فتح کر لیا۔ عیسائیوں کا یہ مضبوط قلعہ حلب کے مغرب میں انطاکیہ کے قریب واقع تھا۔ اس لڑائی کی خاص بات یہ تھی کہ نور الدین کے پاس صرف چار ہزار سپاہی تھے جب کہ مقابلے پر ۳۲ ہزار سپاہیوں پر مشتمل عیسائی فوج تھی، لیکن نور الدین

Marfat.com

نے اپنے سے آٹھ گنا بڑی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ارضِ لبنان میں واقع قلعہ بینطرہ پر بھی نورالدین کی فوج قابض ہو چکی تھی۔

ادھر صلیبی مصر پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور ان کے دلوں میں یہ تمنا کروٹیں لے رہی تھی کہ کسی طرح مصر پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ ان دنوں مصر پر فاطمی خلیفہ فائز بنصر اللہ (۵۴۹ھ تا ۵۵۶ھ) حکمران تھے۔ ان کے بعد صلیبیوں کو موقع ملا۔ یروشلم کے صلیبی حکمران اموری نے مصر پر چڑھائی کر دی اور بلبیس کے قلعے پر قابض ہو گئے۔ جمادی الاول ۵۵۹ھ / مارچ ۱۱۶۳ء میں نورالدین نے اپنے نامور سالار اسد الدین شیر کوہ کو فوج دے کر مصر کی سمت بھیجا۔ اس مہم میں شیر کوہ کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھے جن کو بیت المقدس بازیاب کروانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ شیر کوہ نے مصر پر قبضہ کر لیا۔

۵۶۴ھ / ۱۱۶۸ء میں جب نورالدین دریائے فرات کے شمالی علاقوں میں مصروف تھے تو موقع مناسب جان کر یروشلم کے حکمران اموری نے ایک بڑی فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کر دیا۔ یکم صفر ۵۶۴ھ / ۴ نومبر ۱۱۶۸ء کو بلبیس کے گلی کوچوں میں درندگی کا راج تھا۔ صلیبی سپاہی بڑی بے دردی اور سفاکی سے بے گناہ مسلمان شہریوں کو قتل کر رہے تھے۔ انہوں نے نہ تو بچوں کا لحاظ کیا نہ ہی پردہ دار خواتین کے ساتھ رعایت کی۔ یہاں سے صلیبی لشکر قاہرہ کے قریبی شہر فسطاط جا پہنچا۔ جنونی سپاہیوں نے شہر میں مکانات اور دکانوں کو آگ لگا دی۔ ۱۰ صفر ۵۶۴ھ / ۱۳ نومبر ۱۱۶۸ء کو صلیبی فوج قاہرہ کا محاصرہ کر چکی تھی۔ فاطمی خلیفہ العاضد نے نورالدین کو پیغام بھجوایا۔ نورالدین نے فوراً اپنے بہادر سالار اسد الدین شیر کوہ کو فوج دے کر مصر کی سمت روانہ کر دیا۔ نورالدین کے لشکر کی صلیبیوں پر ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ شیر کوہ کی فوج کے قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی صلیبی قاہرہ کا محاصرہ ختم کر کے یروشلم فرار ہو گئے۔

۲۲ جمادی الآخر ۵۶۴ھ / ۲۳ مارچ ۱۱۶۹ء کو شیر کوہ کا انتقال ہو گیا ان کے بعد مصر کی وزارت صلاح الدین ایوبی جیسے لائق اور ذہین سالار کے سپرد کی گئی۔

اسی سال نورالدین نے بیت المقدس پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہوں نے حلب اور دمشق سے ماہر کاریگر بلا کر ایک خصوصی منبر تیار کروایا تاکہ جب بیت المقدس فتح ہو جائے تو اس منبر کو مسجد اقصیٰ میں رکھا جائے اور اس پر خطبہ پڑھا جائے۔ اس کے بعد نورالدین نے جہاد کا اذنِ عام دیا اور فوج کو تیاریاں کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی دوران کچھ معرکے پیش آئے جن میں یمن کا معرکہ بھی تھا۔ اس معرکے کے نتیجے میں یمن پر بھی نورالدین کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ اب وہ وقت آ پہنچا تھا کہ مسلمان قبلۂ اول کو صلیبیوں کے پنجے سے آزاد کروانے کے لیے پیش قدمی کریں۔ نورالدین نے اس غرض سے بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع کر دیں، لیکن عظیم سپہ سالار کی حیاتِ مستعار کے دن پورے ہو چکے تھے۔ شوال ۵۶۹ھ / مئی ۱۱۷۴ء میں نورالدین کو خناق (ڈفتھیریا) کے عارضے نے آلیا۔ یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ ۲۱ شوال ۵۶۹ھ / ۲۵ مئی ۱۱۷۴ء کو نورالدین زنگی امت کو غمزدہ اور سوگوار چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی ۵۸ سال کی عمر میں ۲۸ برس حکومت کی اور ان ۲۸ برسوں میں وہ کارنامے انجام دیے جو تاریخ میں ہمیشہ سنہرے الفاظ سے لکھے جائیں گے۔

نورالدین زنگی کی رحلت کی خبر پھیلی تو پورے عالم اسلام پر غم و اندوہ کے سیاہ بادل چھا گئے۔ دمشق کی گلیوں میں لوگ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ بہت سے لوگ صدمے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ نورالدین کی رعایا ان سے والہانہ محبت کرتی تھی۔

نورالدین زنگی کی میت کو دمشق کے علما کرام نے غسل دیا اور ان کی ذاتی آمدنی سے خریدے گئے پاک کپڑے سے ان کا کفن تیار کیا گیا اور انہیں دمشق کے مدرسہ نوریہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آج بھی سیکڑوں لوگ دمشق کے بازار سوق الخیاطین میں آکر نورالدین کی قبر پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ ان کی قبر پر ایک سادہ سی لوح نصب ہے جس پر درج ہے "یہ شہید نورالدین زنگی کی قبر ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔"

نورالدین زنگی نے ایک شادی کی۔ ان کی اہلیہ کا نام رفیع خاتون بنت معین الدین تھا۔ اللہ نے نورالدین کو ایک لڑکے الملک الصالح اسمٰعیل اور ایک لڑکی شمس النساء سے نوازا تھا۔

نورالدین زنگی کے بعد ان کے کام کو صلاح الدین ایوبی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور جب بیت المقدس کی فضاؤں میں فاتح اسلامی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں تو صلاح الدین ایوبی حکم دے رہے تھے کہ محترم نورالدین زنگی نے مسجد اقصیٰ کے لیے جو خصوصی منبر تیار کروایا تھا اسے لاکر مسجد اقصیٰ میں رکھا جائے۔ نورالدین زنگی کی آرزو پوری ہو چکی تھی۔ ان کا بنوایا ہوا منبر مسجد اقصیٰ میں جگمگا رہا تھا۔

Marfat.com

نور الدین زنگی کو قدرت نے اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیت اور گہری سیاسی بصیرت سے نوازا تھا۔ دمشق پر قبضہ کرنے کے بعد بہت مختصر عرصے میں انہوں نے کلیسیا کے پہاڑی دامن کے شمال میں جلیل (یہ مقام اب گیلیلی کہلاتا ہے) کے پہاڑوں تک ایک متحد حکومت قائم کردی۔ اس حکومت کے تحت پورے علاقے کو زبردست استحکام حاصل ہوا۔ بنی امیہ کے دور کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ دمشق پھر ایک وسیع، متحد اور خود مختار اسلامی مملکت کا دارالحکومت بنا۔

دمشق کو عسکری اعتبار سے مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے نور الدین زنگی نے شہر کی فصیل پر توجہ دی۔ نئے برج تعمیر کیے گئے۔ فصیل کے کئی دروازوں مثلاً باب شرقی اور باب الجابیہ کو مضبوط بنایا گیا۔ باب الصغیر اور باب السلام میں دہرے پھاٹک لگوائے گئے۔ فصیل کی شمالی دیوار کے ایک حصے میں توسیع کی گئی اور قلعے کی مشرقی سمت میں ایک نیا دروازہ تعمیر کیا گیا۔

نور الدین کے حکم سے قلعے کے اندر باب الجدید کو مستحکم کیا گیا۔ انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ شہر میں فوجی دستوں کی تربیت اور معمول کی مشقوں کے لیے دو بڑے میدان مخصوص کر دیے۔ ان میں میدان الاخضر شہر کی مغربی سمت میں تھا جب کہ میدان الحصیٰ جنوبی سمت میں واقع تھا۔

علم کی ترویج و اشاعت اور دینی علوم کی سرپرستی سے نور الدین زنگی کو خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کے دور میں دینی اور علمی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا۔ حدیث کی تعلیم کے لیے شام میں پہلا دار القرآن، مدرسۃ دار الحدیث اور دار الفقہ قائم کرنے کا شرف نور الدین کو حاصل ہے۔ اس مدرسے کے پہلے معلم مشہور مؤرخ ابن عساکر تھے۔ اس کے بعد حنفی، مالکی، شافعی اور حنفی مسالک سے متعلق کئی دار العلوم (جامعات) حلب، حماۃ، حمص اور دمشق میں قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ دیگر مدارس کی تعداد ۱۶ تھی۔ اسی زمانے میں مدرسہ الصالحیہ کی تعمیر کا آغاز ہوا جسے صلاح الدین ایوبی نے تکمیل کو پہنچایا۔ العادلیہ (یہاں اب عرب اکادمی قائم ہے) میں ایک عظیم مدرسے کی تعمیر شروع کروانے کا فخر بھی نور الدین نے حاصل کیا۔ اس مدرسے کی تعمیر ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں شروع ہوئی اور نصف صدی بعد یعنی ۶۱۹ھ/۱۲۲۲ء میں مکمل ہوئی۔

علم سے نور الدین کے لگاؤ اور خصوصی تعلق کو دیکھتے ہوئے دور دور سے علما کرام دمشق چلے آئے۔ اس دور میں کسی مدرسے سے تعلیمی سند حاصل کیے بغیر کسی شخص کو حکومت کے کسی شعبے یا تعلیمی ادارے میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔ نور الدین کے قائم کردہ مدارس ان کے انتقال کے سیکڑوں سال بعد تک کام کرتے رہے۔ دمشق میں نور الدین زنگی نے ایک اور بڑی درس گاہ، مدرسہ نُوریہ کے نام سے قائم کی تھی۔ یہی درس گاہ ان کی آخری آرام گاہ بنی۔

نور الدین کی مجلس میں چاروں فقہی مسالک سے تعلق رکھنے والے علما کرام موجود رہتے تھے۔ نور الدین خود فقہ حنفی کے اچھے عالم تھے لیکن وہ فقہ کے تمام مذاہب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ علم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے لیے وہ دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ علامہ ابن الاثیرؒ کے مطابق صرف دمشق اور حلب کے مدارس کے اساتذہ کرام کی تنخواہوں پر نور الدین دو لاکھ سولہ ہزار دینار سالانہ خرچ کرتے تھے۔ اسی طرح حماۃ اور حمص کے مدارس اور مساجد کے سالانہ اخراجات کی مالیت دو لاکھ چونسٹھ ہزار دینار تھی۔

نور الدین زنگی نے اپنی مملکت میں انصاف کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے بڑے انقلابی اقدامات کیے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بغداد کے خلیفہ کی جانب سے "الملک العادل" کا خطاب دیا گیا۔ انہوں نے ایک نیا ادارہ 'دار العدل' کے نام سے قائم کیا۔ یہی ادارہ آگے چل کر 'دار السعادۃ' کہلایا۔ یہ انصاف کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) تھی۔ یہ ادارہ قلعے کے جنوب میں واقع ایک عمارت میں قائم تھا۔ نور الدین زنگی نے یہ اہتمام کیا تھا کہ چاروں فقہی مسالک کے نمائندے یہاں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

دار العدل کے اجلاس ہفتے میں دو بار ہوتے تھے جن کی صدارت خود نور الدین کرتے تھے۔ ماتحت عدالتیں ملک بھر میں جگہ جگہ قائم تھیں۔

نور الدین زنگی نے اپنے تمام ماتحتوں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اپنے دروازوں پر دربان نہ رکھیں اور جب کوئی نادار اور بے بس شخص فریاد لے کر آئے تو اس سے نرمی کا سلوک کریں تاکہ وہ کسی جھجک کے بغیر اپنی بات بیان کرسکے۔

تعمیرات کے اعتبار سے بھی نور الدین زنگی کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ دمشق میں اس ضمن میں نئے تجربات کیے گئے اور تعمیرات میں عراقی رنگ جھلکنے لگا۔ عمارتوں میں گنبد کا اضافہ

Marfat.com

کیا جانے لگا۔ یہ گنبد باہر کی جانب سے مسدّس (چھ پہلو والے) ہوتے تھے۔ خود نورالدین کے مقبرے اور اس سے ملحق مدرسے کی عمارت پر اسی طرز کے گنبد ملتے ہیں۔

نورالدین زنگی نے دمشق میں طب کی ایک عظیم درس گاہ بھی قائم کروائی جس کے ساتھ اعلیٰ پائے کا شفاخانہ بھی بنایا گیا۔ یہ شفاخانہ "مارستان النوری" کہلاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ شفاخانہ قائم رہا اس کے چولہے کی آگ کبھی نہ بجھی۔ آج کل اس عمارت میں ایک تجارتی درس گاہ قائم ہے۔

'مارستان' میں مریضوں کو کھانے پینے، علاج معالجے اور دواؤں کے حصول کی سہولتیں بالکل مفت فراہم کی جاتی تھیں۔ تمام اخراجات کا تحریری طور پر حساب رکھا جاتا تھا۔ اسپتال کے ایک بڑے ہال (الایوان الکبیر) میں شاندار کتب خانہ تھا۔ حلب میں بھی نورالدین نے بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا۔ ان کی مملکت میں اس طرح کے شفاخانوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

مارستان کی عمارت کو اسلامی فنِ تعمیر کی تاریخ میں بے حد اہم حیثیت حاصل ہے۔ مارستان کے بیرونی دروازے (باب الداخلہ) پر مخصوص طرز کا گنبد تعمیر کیا گیا تھا اور دروازے کو نقش و نگار اور طاقچوں سے مزین کیا گیا تھا۔ نورالدین کے دور میں مساجد میں بہت اضافہ ہوا۔ ان کے عہد کے آخری حصے میں دمشق کی فصیل کے اندر مساجد کی تعداد ۲۴۲ ہو چکی تھی، فصیل سے باہر ۱۷۸ مساجد تھیں۔ موصل کی جامع مسجد ۵۶۸ھ / ۱۱۷۲ء میں تعمیر کرائی گئی۔ اس مسجد کے مینار پر جو منقش کام کیا گیا تھا وہ فنی نقطۂ نظر سے بے حد معیاری اور اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد نوری کہلاتی تھی۔ حماۃ میں بھی انہوں نے ایک عظیم مسجد بنوائی جو آج تک ان کے نام پر مسجد نوری کے نام سے مشہور ہے۔ صرف دمشق اور حلب کی مساجد پر ایک لاکھ آٹھ ہزار دینار سالانہ خرچ کیے جاتے تھے۔

موصل سے شمال کی طرف جانے والی سڑک پر ازخو کے مقام پر نورالدین نے ایک پختہ پل تعمیر کروایا تھا جو آج بھی عہد زنگی کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ان کی وسیع مملکت میں جگہ جگہ مضبوط قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ حلب کے قلعے کے مغربی برج پر نورالدین کے نام کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عربی کا قدیم کوفی رسم الخط ترک کرکے اس کی جگہ خط نسخ اختیار کیا جا رہا تھا چنانچہ نورالدین کے نام کے کتبے اس اہم تاریخی موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

نورالدین زنگی نے حلب، حماۃ، حمص، شیزر، ماردین، منبج اور دیگر کئی شہروں کی فصیلیں بھی تعمیر کروائیں۔ بعض فصیلوں کے اطراف خندقیں کھدوانے کا اہتمام کروایا۔ انہوں نے مدینہ منورہ کی چہار دیواری میں اضافہ کروایا اور اسے مستحکم بنا دیا۔

نورالدین زنگی نے اپنی فوج کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ فوج سے تعلق رکھنے والے معاملات نمٹانے کے لیے ایک الگ دفتر تھا جس میں تمام سپاہیوں کے کوائف، ان کی جاگیروں اور اسلحہ وغیرہ کی تفصیل کا حساب کتاب رکھا جاتا تھا۔ نورالدین نے ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر ان کی فوج کا کوئی سپاہی شہید ہو جائے یا کسی اور وجہ سے جاں بحق ہو جائے تو اس کے بیٹے کو فوج میں ملازمت دے دی جائے۔ اگر اس کا کوئی بیٹا نہ ہو یا کمسن ہو تو کسی قریبی عزیز کو فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔ جب بھی کسی فوجی کے ہاں کوئی اولاد ہوتی تو اس کا اندراج سرکاری کاغذات میں کر لیا جاتا اور اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

فوج کا پرچم سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر کلمۂ توحید کڑھا ہوا تھا۔ جہاد کے دوران طبل یا باجے نہیں بجائے جاتے تھے بلکہ تکبیر کے نعرے بلند کیے جاتے تھے۔ نورالدین نے ہر افسر اور سپاہی کو ایک مخصوص مدت کے بعد کچھ عرصے کے لیے اپنے گھر جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

بیت المال (سرکاری خزانہ) کا اہتمام نورالدین نے خلفائے راشدین کے طرز پر کیا۔ انہوں نے واضح طور پر ہدایت کی کہ بیت المال میں صرف وہی مال جمع کیا جائے جس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ بیت المال کی نگرانی کا نظام بہت سخت تھا۔

نورالدین زنگی اپنی رعایا کے لیے نہایت شفیق حکمراں تھے۔ انہوں نے عوام پر عائد ہر قسم کے غیر ضروری محصولات (ٹیکس) ختم کر دیے۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ نورالدین نے تجارت پر ٹیکس اور نہروں کا محصول بالکل معاف کر دیا اور مال کی درآمد و برآمد پر لیا جانے والا محصول بھی ختم کر دیا۔ اس دانشمندانہ اقدام کے نتیجے میں تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ عام استعمال کی اشیا کم قیمت پر ملنے لگیں اور بحیثیت مجموعی خوشحالی میں اضافہ ہو گیا۔ ۵۵۲ھ / ۵۷-۱۱۵۶ء میں شام کے متعدد علاقوں میں ہولناک زلزلے آئے۔ کفر تاب، معرۃ النعمان اور افامیہ کے شہر اور حلب اور حماۃ کے بہت سے دیہات صفحۂ ہستی سے

Marfat.com

مٹ گئے۔ شیزر اور پھر دمشق میں بھی شدید زلزلے آئے۔ اس زمانے میں نورالدین نے مصیبت زدہ افراد کے لیے بڑے پیمانے پر اقدامات کیے۔ وہ دن رات کا لحاظ کیے بغیر متاثرہ شہروں اور دیہات کے دورے کرتے اور امدادی سرگرمیوں کا معائنہ کرتے تھے۔ انہوں نے اس غرض سے فوج کے بڑے حصہ کو طلب کر لیا تھا۔

نورالدین نے اپنے والد محترم عمادالدین زنگی کے قائم کردہ وقائع نگاری کے نظام کو اور زیادہ منظم اور وسیع بنا دیا۔ اس نظام کے تحت مملکت کے گوشے گوشے میں حکومت کے مخبر موجود رہتے تھے جو اپنے علاقے کے واقعات اور لوگوں کے مسائل سے سربراہِ مملکت کو باقاعدگی کے ساتھ آگاہ کرتے تھے۔ یہ وقائع نگار کسی بڑے افسر یا بااثر شخصیت کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مملکت میں کسی بھی باشندے کے ساتھ ذراسی بھی زیادتی ہوتی تو سربراہِ مملکت کو اس کی خبر مل جاتی تھی۔ یہ وقائع نگار سرحد پار دشمن کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ان پر افسرِ اعلیٰ بھی مقرر تھے۔ وقائع نگاری یا خفیہ خبر رسانی کا یہ نظام مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا۔ سرکاری اہلکاروں اور عوام کی اصلاح کے لیے محکمۂ احتساب و مواخذہ قائم کیا گیا تھا۔ ہر شہر اور قصبے میں نورالدین زنگی نے محتسب مقرر کیے تھے جو اپنے علاقے میں نہ صرف امن و امان قائم رکھنے کے ذمے دار تھے بلکہ لوگوں کو برائیوں اور زیادتیوں سے روکنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔

نورالدین کی حکومت میں ڈاک کا نظام نہایت معقول اور موثر تھا۔ باقاعدہ محکمۂ ڈاک سب سے پہلے قائم کرنے کا اعزاز مسلمانوں ہی کے پاس ہے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے سرکاری خطوط کی ترسیل کے لیے باقاعدہ طریقۂ کار متعین کیا تھا۔ بعد کے ادوار میں دیگر مسلمان حکمرانوں نے اس نظام کو ترقی دی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اس نظام کو بہت بہتر بنایا۔ نورالدین زنگی نے بھی اپنی وسیع مملکت میں ڈاک کی ان گنت چوکیاں قائم کیں۔ ان چوکیوں میں ڈاک کی ترسیل کے لیے گھوڑے، خچر، اونٹ اور ہرکارے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ڈاک کے جانوروں کے جسموں پر خاص نشان لگائے جاتے تھے۔ ہر جانور کے گلے میں ایک گھنٹی ہوتی تھی جس کی آواز سے دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ڈاک آرہی ہے۔ ڈاک کے ہرکارے ایک مخصوص لباس پہنتے تھے، انہیں 'سعاۃ' کہا جاتا تھا۔

ہنگامی طور پر ڈاک کی ترسیل کے لیے نورالدین زنگی نے کبوتروں کو بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ کبوتروں کو اس غرض سے زمانۂ قدیم سے استعمال کیا جارہا ہے لیکن نورالدین وہ پہلے مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے ڈاک کی ترسیل کے لیے کبوتروں کو نہایت وسیع پیمانے پر اور ایک باقاعدہ نظام کے تحت استعمال کیا۔ انہوں نے اس غرض سے بڑی تعداد میں ماہرین مقرر کیے جو کبوتروں کو تربیت دیتے تھے۔ مملکت میں بے شمار چوکیوں پر اونچے اونچے مینار تعمیر کیے گئے تھے تاکہ کبوتر ان میناروں کو پہچان کر ان پر اتر سکیں۔ ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء میں نورالدین کے حکم سے کبوتروں کے ذریعے خبر رسانی کا آغاز ہوا۔ جو بھی اطلاع کسی مقام پر بھیجنی ہوتی اسے ایک خاص قسم کے کاغذ پر لکھا جاتا تھا۔ یہ کاغذ جو "ورق الطیر" کہلاتا تھا، پانی میں بھیگ کر خراب نہیں ہوتا تھا۔ اطلاع یا خبروں میں غیر ضروری الفاظ شامل نہیں کیے جاتے تھے۔ کاغذ کبوتر کے بازو میں باندھ کر اسے چھوڑ دیا جاتا۔ سدھا ہوا کبوتر تیزی سے پرواز کر کے اگلی چوکی تک پہنچ جاتا، جہاں موجود اہلکار کبوتر کے بازو سے 'ورق الطیر' کھول کر دوسرے کبوتر کے بازو میں باندھ دیتا اور دوسرا کبوتر اگلی چوکی تک پہنچ جاتا تھا۔ کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کا یہ نظام اس قدر موثر ثابت ہوا کہ اکثر اوقات نورالدین نے دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر چڑھائی کر دی اور اسے عبرتناک شکست سے دوچار کر دیا۔ نورالدین زنگی کے بعد بھی کبوتروں سے خبر رسانی کا یہ حیرت انگیز نظام تقریباً دو سو سال تک جاری رہا۔

نورالدین محمود زنگی نے سرکاری امور اور قومی مسائل سے مشورے کے لیے مجلس شوریٰ قائم کی تھی۔ وہ ہر اہم معاملے میں مجلس شوریٰ سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔ دینی مسائل کے سلسلے میں وہ سرکردہ علماکرام سے رجوع کرتے تھے۔

نورالدین زنگی کی بلند پایہ شخصیت ایک روشن مینار کی مانند تاریخ کے ایوانوں میں اجالا کر رہی ہے۔ ان کی ذات میں ہمیں ایک خداترس، متقی، ہوش مند، زیرک اور اعلیٰ پائے کے منتظم حکمراں کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ انہیں جہاد فی سبیل اللہ سے عشق تھا۔ مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس اور دیگر علاقوں پر صلیبیوں کے قبضے کے باعث وہ سخت بے چین رہتے تھے کہ مسلمانوں کے علاقوں کو صلیبیوں کے پنجے سے آزاد کروایا جائے اور اسلام کا پرچم سربلند کر دیا جائے۔

Marfat.com

میدانِ جنگ میں نورالدین زنگی کا طریقہ یہ تھا کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے وہ وضو کرتے۔ نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرتے اور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر مسلمانوں کی فتح و کامیابی کی دعائیں کرتے، پھر پوری فوج کا معائنہ کرتے۔ اس دوران ان کے لبوں پر قرآن کریم کی ایسی آیات جاری رہتیں جن میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ فوج کی طرف سے مطمئن ہونے پر نعرۂ تکبیر بلند کرتے۔ تیسری یا چوتھی تکبیر (جس طرح کی ہدایت ہوتی) پر فوج دشمن پر حملہ کر دیتی۔

نورالدین نہایت عالی ظرف انسان تھے۔ وہ دشمن کو کسی تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے تو اس پر حملہ ملتوی کر دیتے۔ ذی الحجہ ۵۵۷ھ/نومبر ۱۱۶۱ء میں یروشلم (بیت المقدس) کی عیسائی ریاست کے بادشاہ بالڈون کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے نورالدین کو مشورہ دیا کہ موقع اچھا ہے، ہمیں فلسطین پر حملہ کر دینا چاہیے۔ لیکن نورالدین کا جواب تھا "ہمیں ان لوگوں پر رحم کھانا چاہیے۔ ان کے نزدیک وہ اچھا بادشاہ تھا۔ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ایسے موقع پر جب ان کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اور وہ اپنے بادشاہ کا سوگ منا رہے ہیں میں ان پر حملہ کر دوں۔"

نورالدین زنگی ایک وسیع و عریض مملکت کے فرمانروا ہونے کے باوجود نہایت سادہ مزاج اور قناعت پسند تھے۔ وہ سرکاری خزانے سے اپنے لیے کوئی رقم نہیں لیتے تھے بلکہ جنگوں میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں سے انہیں جو کچھ حصہ ملتا تھا اسی سے دکانیں یا زمین وغیرہ خرید لیتے تھے اور اس کی آمدنی سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ ایک بار ان کی اہلیہ نے شکایت کی کہ آپ گھر کا خرچ چلانے کے لیے بہت کم رقم دیتے ہیں تو نورالدین نے ناراض ہو کر کہا "میرے پاس حمص میں تین دکانوں کی آمدنی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ میرے قبضے میں بڑے بڑے ملک اور ان کے خزانے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ سب کچھ عام مسلمانوں کا ہے۔ حمص کی تینوں دکانیں میں تمہارے نام کرتا ہوں۔ اب تم چاہو تو انہیں فروخت کر دو یا ان کا کرایہ وصول کرتی رہو۔" یہ دو ٹوک جواب سنا تو نورالدین کی اہلیہ خاموش ہو گئیں اور پھر انہوں نے اپنے شوہر سے اخراجات کی زیادتی کی شکایت کبھی نہیں کی۔

نورالدین نے زندگی بھر کبھی بھی سونا، ریشم اور ہیرے جواہرات استعمال نہیں کیے۔ ان کا کھانا جو کی روٹی یا گیہوں کی خمیری روٹی اور گوشت پر مشتمل تھا۔ ان کی رہائش گاہ میں نہ تو قیمتی قالین نظر آتے تھے نہ پُر تکلف سامانِ آرائش اور نہ بیش قیمت ظروف۔ نورالدین شرک و بدعت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارنے کو بھی وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ انہیں اہل اللہ سے بڑی محبت تھی۔ موصل میں ایک بزرگ شیخ عمر تھے۔ وہ محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کا علم بہت وسیع تھا۔ جہاد میں بھی باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ نورالدین جب بھی موصل جاتے، شیخ عمر کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔

نورالدین زنگی علم سے بہت محبت کرتے تھے۔ فقہی مسائل سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ وہ حنفی فقہ کے عالم تھے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی ایسی احادیث کا مجموعہ مرتب کیا تھا جو عدل و خیرات اور زہد و تقویٰ کے بارے میں تھیں۔ اس مجموعہ کا نام 'فخر النوری' رکھا گیا۔

نورالدین باجماعت نماز کے سختی سے پابند تھے۔ ذکرِ الٰہی کا بطورِ خاص اہتمام کرتے تھے۔ نصف رات گزرنے پر تہجد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ تلاوت قرآن پاک باقاعدگی سے کرتے تھے اور تلاوت کے دوران اکثر ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

•••

Marfat.com

صلاح الدین ایوبی

فاتح بیت المقدس، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ جہاد میں گزرا

بابِ داؤد کے سوا شہر کے تمام دروازے بند تھے۔

فضا میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ انسانوں کی ایک لمبی قطار تھی جو آہستہ روی کے ساتھ بابِ داؤد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس قطار میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے بوڑھے بھی تھے اور وزنی سامان اٹھائے ہوئے جوان بھی۔ سفری لبادے پہنے عورتیں بھاری گٹھڑیاں اٹھائے چل رہی تھیں۔ بعض کی گودوں میں ننھے بچے تھے جو حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ نوکر مویشیوں کی رسیاں تھامے پیچھے پیچھے چلے جارہے تھے ان مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں دھیمے سُروں میں بج رہی تھیں۔

یہ اس شہر کے سوگوار مکینوں کی قطار تھی جسے شہر القدس کہا جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل، مسجدِ اقصٰی اور مقدس مقامات موجود ہیں۔ اس دن یہ شہر القدس، مسیحی تسلط سے رہائی حاصل کرچکا تھا۔ قدرت نے اس شہر کے لیے ایک عظیم جرنیل کی شکل میں نجات دہندہ بھیجا تھا، جس نے نہ صرف شہر کو تسخیر کرلیا تھا بلکہ اپنے حُسنِ سلوک اور عفوودرگزر سے دلوں کو بھی تسخیر کرلیا تھا۔

تقریباً ۹۱ سال قبل اس شہر مقدس نے ایک اور منظر دیکھا تھا، جب پوپ اربن ثانی نے پورے یورپ سے صلیب کے نام پر اپیل کی تھی کہ بیت المقدس کو بہانہ بناؤ اور سرزمین مقدس کو مسلمانوں سے چھین کر اس کے خود مالک بن جاؤ۔ پھر پوپ کی اس اپیل پر صلیب بردار یورپی فوجیں ۴۸۹ھ /۱۰۹۶ء میں بیت المقدس پر چڑھ دوڑی تھیں۔ انہوں نے بچوں، بوڑھوں، جوانوں کو کسی امتیاز کے بغیر قتل کرڈالا تھا، شہر کے گلی کوچے ان بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوگئے تھے۔ جابجا لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ شہداء کی تعداد ستر ہزار کے قریب تھی۔ مسلمانوں کا لہو اس قدر ارزاں ہوگیا تھا کہ صلیبی فوج کے گھوڑوں کی ٹانگیں اس لہو میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اس شہر کے درو دیوار، قبہ الصخرہ کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر اور مسجد اقصٰی کی محرابیں آج پھر یہ منظر دیکھ رہی تھیں کہ عظیم سپہ سالار صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مسلمانوں کی فوج نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر القدس کو فتح کرلیا ہے۔ کسی مسیحی کے ساتھ ذرا بھی زیادتی نہیں کی گئی اور جب ایسے بہت سے مسیحی شہری بیت المقدس میں رہ گئے ہیں جو فدیہ ادا نہ کرسکے ہیں تو رحم دل اور مہربان حکمران صلاح الدین ایوبی نے ان کا فدیہ معاف کردیا ہے اور جب بہت سی ایسی عیسائی عورتیں آکر فاتح بیت المقدس کے سامنے رونے لگی ہیں، جن کے شوہر یا والد قتل یا قید ہوگئے تھے تو یہ شیر دل حکمران خود بھی آبدیدہ ہوگیا ہے اور اس نے ان عورتوں کے عزیزوں کو نہ صرف رہا کردیا بلکہ کثیر رقم سے ان کی مدد بھی کی ہے۔

اسی صلاح الدین کی مسحور کن شخصیت نے تاریخ کو اسیر کررکھا ہے۔

عالم اسلام کے اس عظیم جرنیل نے ۵۳۲ھ /۱۱۳۸ء میں تکریت کے مقام پر آنکھیں کھولیں۔ تکریت، دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ایک قصبہ ہے جو بغداد سے تقریباً ۹۰ میل دور ہے۔ عراق کا یہ علاقہ شمالی سرحد سے قریب ہے۔ صلاح الدین نے تکریت میں اپنی زندگی کے چند ہی دن گزارے تھے کہ ان کے والد نجم الدین ایوب شام منتقل ہوگئے جہاں سلطان عمادالدین زنگی نے انہیں بعلبک کا گورنر مقرر کردیا۔ صلاح الدین اور ان کے بھائیوں نے عنفوانِ شباب کا عہد بعلبک ہی میں گزارا، وہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ دینی علوم میں دسترس پیدا کی اور جنگی فنون سیکھے۔

سلطان عماد الدین زنگی کے بعد سلطان نورالدین زنگی نے

Marfat.com

مسندِ اقتدار سنبھالی۔ صلاح الدین کی صلاحیتیں سلطان نور الدین زنگی کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکیں۔ ۵۵۹ھ / ۱۱۶۴ء میں نور الدین زنگی نے صلاح الدین کو ان کے چچا اسد الدین شیر کوہ کے ساتھ مہمات پر روانہ کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً پانچ سال بعد اسد الدین شیر کوہ نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ ان کے انتقال کے بعد صلاح الدین کو مصر کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ مصر میں فاطمی خلیفہ العاضد حکمراں تھے جو بہت جلد انتقال کر گئے۔ اب صلاح الدین مصر پر خود مختار حکمراں تھے۔

گیارہویں صدی کے آخری عشرے میں صلیبی فوجیں بیت المقدس پر قابض ہو چکی تھیں۔ ان کا وجود مسلمانوں کے دلوں میں کانٹے کی مانند تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ نور الدین زنگی ۵۶۹ھ / ۱۱۷۴ء میں انتقال کر چکے تھے اور قدرت صلاح الدین ایوبی کی شکل میں مسلمانوں کو ایک عظیم رہنما عطا کرنا چاہتی تھی۔

اس عظیم رہنما نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، انہیں "جہاد" جیسے اہم ترین فریضے کی جانب متوجہ کیا اور اپنی باتوں سے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دی۔

اب صلاح الدین ایوبی کے پاس جوشِ جہاد سے سرشار جوانوں کی فوج تھی جو اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ ۵۷۲ھ / ۱۱۷۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کا رخ کیا اور معرکہ خیر و شر کا آغاز ہو گیا۔

صلاح الدین کی فوجوں اور بالڈون چہارم کی فوجوں کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ ۵۷۶ھ / ۱۱۸۰ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد سلطان نے محسوس کیا کہ فوج کو از سر نو منظم کرنے اور بہتر تیاری کرنے کے لیے جنگ بندی ضروری ہے۔ چنانچہ ۵۷۶ھ / ۱۱۸۰ء میں بالڈون پنجم سے عارضی صلح کر لی گئی۔ دو سال تک تیاری کے بعد موسم گرما میں سبز اور سیاہ علم بلند ہوئے اور سلطان کا لشکر پوری آن بان سے روانہ ہو گیا۔ لوگ گھروں اور دکانوں سے نکل نکل کر غازیوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہے تھے۔

صلاح الدین نے حصن یعقوب کے قلعے پر حملہ کیا اور اسے برباد کر دیا پھر کرک کے مضبوط قلعے پر دھاوا بول دیا جس کا حکمراں ایک مکار عیسائی ریجنالڈ تھا۔ کرک کے قلعے کے اندر غلام گردشوں میں ایک ہزار گھوڑے باندھے جا سکتے تھے۔ اس کے گول برج خود قلعہ کی مانند تھے۔

ان برجوں میں علیحدہ دروازے اور پُل اٹھانے والی کلیں نصب تھیں۔ یہ لڑائی مہینہ بھر جاری رہی حتیٰ کہ بیت المقدس کے سپہ سالار ریمنڈ کی قیادت میں فوج کی کمک آ پہنچی۔ ریمنڈ نے جو صورتِ حال دیکھی تو سلطان صلاح الدین سے صلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ سلطان نے بھی اسی وقت صلح کو بہتر جانا اور ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں سرحد سے لوٹ گئے۔

صلح کو ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ شاہ بالڈون کا انتقال ہو گیا۔ کرک کے حکمراں ریجنالڈ نے سوچا کہ صلح تو ریمنڈ نے کی تھی، صلاح الدین سے میرا تو کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اس نے کرک کے قریب سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ صلاح الدین نے ریجنالڈ سے احتجاج کیا، لیکن ریجنالڈ نے گستاخانہ انداز میں کہا "کہاں ہیں تمہارے محمدؐ (نعوذ باللہ) انہیں اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔" یہی نہیں ریجنالڈ نے قافلے کے چند بے گناہ افراد کو قتل کر ڈالا۔

صلاح الدین ایوبی جو مقدس سرزمین کو صلیبیوں سے آزاد کروانے کے لیے پہلے ہی مضطرب تھے، ان واقعات پر تڑپ اٹھے۔ انہوں نے بلا تاخیر فوج مجتمع کی اور دریائے اردن کا رخ کیا۔ سلطان کی فوج بارہ ہزار سرفروشوں پر مشتمل تھی۔

۱۶ ربیع الآخر ۵۸۳ھ / ۲۶ جون ۱۱۸۷ء کو نماز جمعہ کے بعد سلطان کی فوج حرکت میں آ گئی، یکم جولائی کو وہ دریائے اردن عبور کر کے طبریہ سے چھ میل جنوب مغرب میں کفر سبت کی پہاڑیوں پر پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ ادھر صلیبی بھی جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہیں آنے والے خطرات کا بخوبی اندازہ تھا۔ پچاس ہزار عیسائیوں کا لشکر اٹھا اور بڑی شان کے ساتھ بڑھتا ہوا صفوریہ کے چشموں تک پہنچ گیا۔ اس مقام سے آگے ایک وسیع بنجر میدان تھا جس کی حد طبریہ کی پہاڑیوں کو چھوتی تھی۔ عیسائیوں کو اطلاع ملی کہ مسلمانوں کی فوج طبریہ کی پہاڑیوں پر خیمہ زن ہے۔ اب وہ منتظر تھے کہ کب صلاح الدین کی فوج آتی ہے اور کب معرکہ گرم ہوتا ہے، لیکن اسلامی فوج طبریہ کی پہاڑیوں پر ہی موجود رہی۔

آخر مسیحیوں کے سالاروں نے بحث مباحثے کے بعد ۲ جولائی کی صبح کوچ کے لیے نقارے بجا دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ دوپہر تک وہ اسلامی لشکر کے روبرو پہنچ چکے ہوں گے، لیکن ان کا یہ خیال درست نہ تھا۔ شام تک سفر کرنے کے باوجود اسلامی لشکر ان کی نگاہوں سے

Marfat.com

اور جہل تھا۔ دراصل صلاح الدین کی فوج ایک گہرے نشیب کے بالائی کنارے پر مورچہ بند تھی۔ دوسرے دن سورج طلوع نہ ہونے پایا تھا کہ عیسائیوں کے لشکر میں چہل پہل شروع ہو گئی اور جلد ہی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا گیا۔

مسیحی فوج کچھ آگے گئی ہوگی کہ اس کے سپاہیوں نے فضا میں سیاہ اور سبز پرچم لہراتے دیکھے اور گھوڑوں کے دوڑنے سے اٹھنے والے غبار نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس غبار کی اوٹ سے نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کے دل ہلا دینے والے نعرے بلند ہوئے اور مسیحی لشکر پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ صلاح الدین کی فوج کے پاس تیروں سے لدے ہوئے ستر اونٹ تھے اس کے علاوہ تیروں کے چار سو فاضل گٹھے تھے۔

مسیحیوں کے لشکر میں بیت المقدس کے شاہ گائی اور کرک کے حکمران ریجنالڈ سمیت متعدد سردار تھے۔ دونوں جانب سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ مسلمان پامردی سے لڑ رہے تھے۔ دوپہر کو مسیحیوں کی قوت جواب دینے لگی۔ ان کے تمام سالار ریجنالڈ کے گرد حطین کی پہاڑی پر جمع ہو گئے اور صلیبی جھنڈا اس پہاڑی پر لہرانے لگے۔ مسیحیوں کے ساتھ ایک مشکل اور تھی کہ مسلمان فوجیوں نے آس پاس کے پانی کے ذخائر پر قبضہ کر لیا تھا۔

لڑائی دیر تک جاری رہی۔ صلاح الدین کے بیٹے الافضل کہتے ہیں کہ "میرے والد نے جب اپنے سپاہیوں کو للکار کر دشمن پر حملہ کرنے کے لیے کہا تو اسلامی فوج میں بجلی سی دوڑ گئی۔ انہوں نے زبردست یورش کر کے دشمن کا شاہی خیمہ الٹ دیا۔ والد محترم یہ دیکھتے ہی گھوڑے سے اترے اور اپنے رب کے حضور سر بہ سجود ہو گئے اس وقت خوشی سے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔"

اسی دوران مسلمانوں نے بچے ہوئے مسیحی لشکر کے گرد موجود خاردار جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔ جب دھواں صاف ہوا تو دیکھا کہ صلیبی جھنڈا سرنگوں ہو چکا ہے۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی کام آئے۔ شاہ گائی، ریجنالڈ اور متعدد سردار گرفتار ہوئے۔ بیت المقدس کی فوج کا سالار ریمنڈ بچ نکلنے میں کامیاب تو ہو گیا، لیکن وہ بڑی مشکل سے طرابلس کے قلعے تک پہنچ پایا، دو ہفتے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے بادشاہ گائی ان کے بھائی ایمالرک اور ریجنالڈ کو طلب کیا اور ریجنالڈ کو یاد دلایا کہ اس نے مصری قافلے کو لوٹتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں کہا تھا "کہاں ہیں تمہارے محمد ﷺ، انہیں اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔" پھر سلطان نے کہا کہ "میں تمہارے خلاف ناموس مصطفی ﷺ کی حمایت کروں گا۔" اس کے بعد سلطان نے ریجنالڈ کو اسلام کی دعوت دی، لیکن اس کے انکار پر سلطان کی تلوار حرکت میں آئی اور رسولِ ﷺ خدا کی توہین کرنے والے اس بدعہد سالار کا خاتمہ ہو گیا۔

لوبیہ کے مقام پر ہونے والا یہ معرکہ "جنگِ حطین" کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ حطین کا مقام اس جگہ سے قریب ہے۔ "حطین" میں شکست سے مسیحیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور پھر وہ طوفان کی مانند بڑھنے والی سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں لشکر اسلام نے طبریہ اور عکہ کے قلعے فتح کیے۔ پھر عکہ اور طبریہ کا درمیانی علاقہ، جنوب میں حیفہ، صفوریہ، ناصریہ، قیصریہ، شمال میں طبنین کا قلعہ سر کر لیا۔ سلطان کے دیگر دستوں نے سیدون اور پھر آٹھ دن کے محاصرے کے بعد بیروت کو تسخیر کیا۔ تمام مفتوحہ شہروں میں سلطان نے اپنی فوج متعین کر دی۔ جو شہری شہر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

ستمبر ۱۱۸۷ء کے شروع میں جنوبی فلسطین کی بندرگاہ عسقلان پر مسلمان قابض ہو چکے تھے۔ اسی دوران غزہ، دارم، رملہ اور ابلین بھی مفتوح ہو گئے۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں سلطان صلاح الدین سرزمین مقدس کے بیشتر حصے پر اسلامی پرچم لہرا چکے تھے اور اب وہ گھڑی آنے والی تھی جس کا مسلمانوں کو بے چینی سے انتظار تھا یعنی بیت المقدس کی صلیبیوں کے قبضے سے آزادی۔

۱۴ رجب ۵۸۳ھ / ۲۰ ستمبر ۱۱۸۷ء کو سلطان کی فوج بیت المقدس کے ایک مغربی دروازے بابِ داؤد کے مقابل پہاڑی پر خیمے گاڑ چکی تھی۔

شہر القدس میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ عیسائی تمام اطراف سے سمٹ کر اس شہر میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ شہر میں لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار تھی۔ بیت المقدس میں مسیحی رہنما سر جوڑے بیٹھے تھے کہ صلاح الدین کی فوج کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ ابلین کے شکست خوردہ سردار بالیان بھی بیت المقدس میں پناہ لینے کے لیے آ چکے تھے۔ مسیحی رہنماؤں نے بالیان سے اصرار شروع کر دیا کہ وہ مسیحی لشکر کی قیادت کریں۔ بالیان نے بہت انکار کیا کہ مجھے صلاح الدین نے قید کر لیا تھا پھر ان کے خلاف ہتھیار نہ اٹھانے کا حلف دینے پر انہوں

Marfat.com

نے مجھے رہا کر دیا، اب میں اپنے حلف سے کیسے پھر سکتا ہوں؟ لیکن عیسائی پادریوں کا اصرار بڑھتا گیا، بالآخر بالیان نے سلطان کو خط لکھ کر انہیں اپنے حالات سے آگاہ کیا اور اپنے اہل و عیال کی سلامتی کی درخواست کی۔

عالی ظرف سلطان صلاح الدین نے جواب میں لکھا کہ میں تمہارے حالات سے واقف ہوں اور تمہارے اہل و عیال کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہوں۔

اب بالیان نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور جتنے وسائل موجود تھے انہیں بروئے کار لانے میں مصروف ہو گئے۔ سلطان کی فوج نے پانچ دن تک بیت المقدس کا محاصرہ کیے رکھا، پھر سلطان نے اپنی فوج کو مشرق کی طرف ایسی جگہ منتقل کر دیا جہاں شہر کی فصیل قدرے کمزور تھی۔ شہر والوں نے اسلامی فوج کو جاتے دیکھا تو خوشی کے مارے ناچنے لگے اور شکر ادا کرنے کے لیے کلیسا کی طرف دوڑے۔ لیکن اگلے روز لشکر اسلام کے پرچم شہر کی مشرقی پہاڑی جبل زیتون پر لہرا رہے تھے اور چالیس منجنیقیں نصب ہو چکی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں مسلمانوں کی فوج کے جانبازوں نے مورچہ بند ہو کر فصیل میں سوراخ کر ڈالا اور بنیاد کے نیچے لکڑی کے موٹے کھمبے دے کر آگ لگا دی۔ بالآخر فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا تھا اور مسلمان سپاہی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اس منہدم حصے سے شہر میں داخل ہو گئے۔

مسیحی سرداروں نے دیکھ لیا تھا کہ اب وہ بیت المقدس پر زیادہ دیر قابض نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے سلطان کو پیغام بھجوایا کہ ہم جیتے جی یروشلم سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ اپنے تمام مویشیوں کو ذبح کریں گے۔ حرم شریف کی عبادت گاہوں کے تمام سامان اور تبرکات کو آگ لگا دیں گے اور عورتوں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اسی دوران اسقف اعظم ہرقلیس، بالیان سے ملے اور انہیں مشورہ دیا کہ شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔ بالیان نے سلطان سے صلح کی درخواست کر دی۔

سلطان نے صلح کی درخواست منظور کرتے ہوئے شہریوں پر فدیہ عائد کر دیا۔ ہر مرد پر دس دینار، ہر عورت پر پانچ دینار اور ہر بچے پر ایک دینار فدیہ عائد کیا گیا۔ دوسرے دن سے شہریوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے جس دن بیت المقدس فتح کیا اس روز رجب کی ۲۷ تاریخ تھی۔ ۲۷ رجب معراج النبی ﷺ کی تاریخ ہے اور معراجِ نبوی ﷺ کو بیت المقدس سے خاص نسبت حاصل ہے۔

بہت جلد ہزاروں مسلمان مسجد اقصیٰ کی صفائی میں مصروف ہو چکے تھے۔ اس مقدس مسجد کو مسیحیوں نے محل میں تبدیل کر رکھا تھا۔ قبہ الصخرہ پر سونے کی صلیب لگا دی گئی تھی۔ صخرہ درمیان سے کھلا تھا، اسے سنگِ مرمر کی سلوں سے ڈھانپ کر قربان گاہ تعمیر کر دی گئی تھی۔ بیت المقدس سے صلیبی تسلط ختم ہوتے ہی مسلمانوں نے قبہ الصخرہ سے قربان گاہ کو ہٹا دیا۔ دیواروں پر نقش و نگار اور تصاویر کو مٹا دیا گیا۔ مرمریں مجسمے توڑ ڈالے گئے۔ مسجدِ اقصیٰ کے فرش کو دھو کر عرقِ گلاب چھڑکا گیا۔ سلطان نور الدین زنگی نے لکڑی کا نہایت حسین، نازک، منقش منبر مسجدِ اقصیٰ میں رکھنے کے لیے بنوایا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے وہ منبر حلب سے منگوا کر محراب میں رکھوایا۔ مسجد میں قالین بچھائے گئے۔ میناروں سے گھنٹیاں اتار لی گئیں اور قبہ الصخرہ پر لگی سنہری صلیب بھی ہٹا لی گئی۔ اس کی جگہ ہلال نے لے لی۔

صلاح الدین ایوبی کے حکم سے قبہ الصخرہ (گنبد) پر دوبارہ سنہرا رنگ کروایا گیا۔ مسجدِ اقصیٰ کی دوبارہ تعمیر پر بہت محنت کرنی پڑی کیونکہ صلیبیوں نے مقدس مقامات میں بہت تبدیلیاں کر دی تھیں۔ محراب اور مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ مسجدِ اقصیٰ کے جنوب مغربی حصے میں "فرسان الہیکل" کے نام سے جو مرکز تھا اس کا نام بدل کر "مسجد النسا" رکھا گیا۔ جانبازان یوحنا کے اقامت خانے کو مسجد عمرؓ کے لیے مخصوص کر دیا گیا، وہاں گرجا کی جگہ ایک شفا خانہ بنا دیا گیا۔

القدس کے گرد فصیلوں کی خود سلطان کی نگرانی میں مرمت کی گئی۔ انہیں محاصرے کی حالت میں نقصان پہنچا تھا۔ فصیلوں کے سامنے ایک گہری خندق کھودی گئی، چند برجوں کو بھی از سر نو تعمیر کیا گیا۔ مغربی پہاڑی کا ایک حصہ جو اب تک فصیل سے باہر تھا، شہر کے اندر شامل کر لیا گیا۔

جمعہ ۴ شعبان ۵۸۳ھ / ۹ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو یعنی بیت المقدس فتح ہونے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد مسجدِ اقصیٰ میں نمازِ جمعہ کا اہتمام کیا گیا۔ مسجد کے میناروں سے مؤذن کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی اور شہر القدس کے گلی کوچے اس آفاقی کلمے سے گونج اٹھے "اللہ اکبر، اللہ اکبر" "اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔"

Marfat.com

صرف اکیانوے سال بعد بیت المقدس مسیحی تسلط سے آزاد ہو چکا تھا اور اللہ کے نام لیوا اپنے مالک کے حضور اپنی جبینیں جھکائے کھڑے تھے۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضے کی خبر ملتے ہی پورے یورپ میں کھلبلی مچ گئی۔ شام کے اسقف اعظم ولیم صوری راہبوں کی جماعت لے کر ماتمی لباس میں روم جا پہنچے۔ انہوں نے اشتعال انگیز تقاریر شروع کر دیں۔ پاپائے روما نے فتویٰ دے دیا کہ جو شخص بیت المقدس کی بازیابی کی جنگ میں شریک ہو گا اس کے سارے گناہ دھل جائیں گے اور جو اس کارِ خیر میں حصہ نہ لے گا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ فرانس اور انگلستان کے بادشاہوں نے آپس کی رنجشیں فراموش کر دیں۔ شاہ انگلستان ہنری دوم، فرانس کے شاہ فلپ آگسٹس اور جرمنی کے شاہ فریڈرک باربروسہ، جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی دوران ہنری دوم کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا رچرڈ جانشین بنا۔ جنگ کے مصارف پورے کرنے کے لیے انگلستان اور فرانس میں "عشر صلاح الدین" کے نام سے ایک عام ٹیکس عائد کیا گیا۔

سب سے پہلے فریڈرک باربروسہ جرمنی سے ایک لاکھ سپاہی لے کر شام کی سمت روانہ ہوا، لیکن راستے میں دریائے سلف عبور کرتے ہوئے اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ پھر اس کے لڑکے فریڈرک ثانی نے فوج کی قیادت سنبھالی تو فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ فریڈرک ثانی فوج کے ایک حصے کو لے کر شام پہنچا تو کوئی وبا پھیل گئی جس سے بہت سے فوجی بیمار پڑ گئے۔ جب بچی کھچی فوج حلب پہنچی تو اس کی بڑی تعداد کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔

انگلستان کے رچرڈ اور فرانس کے شاہ فلپ بھی روانہ ہوئے۔ صلیبیوں کا ٹڈی دل لشکر ارضِ مقدس کی طرف بڑھ رہا تھا اور یورپ سے چھوٹی بڑی جماعتیں صور کی بندرگاہ پر اتر رہی تھیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اس خطرے سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے بھی تیاریوں کا حکم دے رکھا تھا۔

دشمن نے ۱۴ رجب ۵۸۵ھ / ۲۸ اگست ۱۱۸۹ء کو عکہ کے اہم ساحلی شہر کا محاصرہ شروع کر دیا۔ یہ جنگ تین سال جاری رہی جس کے دوران ۱۰۰ سے زائد لڑائیاں اور ۹ بڑے معرکے ہوئے۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کی سب سے بڑی فوجی مہم تھی، جس میں یورپ کے متعدد ممالک سے صلیبیوں کو مسلسل کمک پہنچتی رہی۔ یہی تیسری صلیبی جنگ تھی۔

دشمن نے بری اور بحری دونوں راستوں سے یلغار کر رکھی تھی۔ تین سال تک جاری رہنے والی اس جنگ میں ہزاروں صلیبی مارے گئے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، لیکن طویل محاصرے سے عکہ کے شہریوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ بالآخر عکہ پر صلیبیوں کا قبضہ ہو گیا، لیکن تین سال کی مسلسل خونریزی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی یہ کامیابی بڑی غیر اہم تھی۔ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں رچرڈ نے بیت المقدس پر فوج کشی کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ رچرڈ بیمار بھی تھا ادھر انگلستان کے خراب سیاسی حالات کی وجہ سے رچرڈ کی واپسی ضروری ہو گئی تھی، بالآخر ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ / ۳ ستمبر ۱۱۹۲ء کو رچرڈ اور صلاح الدین کے درمیان صلح ہو گئی جو "صلح نامۂ رملہ" کے نام سے تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ اس صلح نامے کی رُو سے عکہ سے یافہ تک کا علاقہ رچرڈ کے بھانجے ہنری کو دیا گیا جبکہ عسقلان سے جنوب کے ساحلی علاقے تک صلاح الدین کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ عیسائیوں کو بیت المقدس کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح پورے فلسطین پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ اب صور سے لے کر یافہ کے ساحل تک ایک پتلی سی پٹی کے سوا سارا ملک مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ شوال ۵۸۸ھ / اکتوبر ۱۱۹۲ء میں صلیبی، یورپ واپس چلے گئے۔ سلطان صلاح الدین نے اب بیت المقدس پر بھرپور توجہ دی اور اس مقدس شہر کے انتظامات مستحکم بنانے کے بعد سلطان دمشق چلے گئے جہاں انہوں نے موسم سرما اپنے بال بچوں میں بسر کیا۔

قدرت عالم اسلام کے اس عظیم سپوت سے جو کام لینا چاہتی تھی وہ لے چکی تھی اور اب اس کی حیاتِ مستعار کے دن پورے ہونے کو تھے۔ ۱۵ صفر ۵۸۹ھ / ۲۰ فروری ۱۱۹۳ء کو سلطان حاجیوں کے استقبال کے لیے گئے۔ کچھ دن سے ان کی طبیعت خراب تھی۔ بارش کا موسم تھا۔ بخار نے آن گھیرا۔ اگلے چند دن میں بخار اور تیز ہو گیا۔ دسویں دن قدرے افاقہ ہوا، لیکن دو دن بعد پھر حالت خراب ہو گئی اس وقت ایک قاری ان کے قریب بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا جب وہ سورۂ حشر کی اس آیت پر پہنچا: (ترجمہ) وہ اللہ ہی جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، وہ نہایت مہربان اور رحیم ہے۔

تو سلطان نے آہستہ سے کہا، "درست" اور یہ آیت قرآن پاک پڑھی 'اِنّی توکلتُ علیہ' (میں اس (رب) پر توکل کرتا ہوں) پھر

Marfat.com

بیت المقدس کے فاتح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس اولوالعزم مجاہد نے مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگالیا۔

۲۷ صفر ۵۸۹ھ / ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین ایوبی کا انتقال ہوا۔ اسی دن نماز عصر کے بعد عالم اسلام کے اس بطل جلیل کو دمشق کے قلعے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی وہ تلوار بھی ان کے ساتھ ہی دفن کر دی گئی، جس سے انہوں نے کتنے ہی معرکے سر کیے تھے اور جو دشمنوں کے سروں پر بجلی بن کر ٹوٹا کرتی تھی۔

صلاح الدین ایوبی کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک بھر میں پھیل گئی۔ اس خبر کو جس نے سنا دل تھام کر رہ گیا۔ تدفین کے بعد دمشق کی گلیوں پر ویرانی کا راج تھا اور بازاروں کی رونق اجڑ چکی تھی۔

صلاح الدین ایوبی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے رفیق، قاضی بہاالدین ابن شداد اپنے زمانے کے نامور عالم تھے، انہوں نے صلاح الدین کو جیسا پایا اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”صلاح الدین دینی احکام کی پابندی اور شریعت کے امور کی حفاظت میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ نماز جماعت سے ادا کرتے تھے اور رات کے آخری پہر میں تہجد کے لیے اپنے رب کے حضور کھڑے رہتے۔ قرآن پاک سننے کا بڑا ذوق تھا اور جب ان کے سامنے قرآنی آیات تلاوت کی جاتیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حدیث سننے کا بہت شوق تھا۔ حافظ سلفی سے حدیث سننے کے لیے صلاح الدین نے کئی بار قاہرہ سے اسکندریہ تک کا سفر کیا۔

صلاح الدین نہایت سخی، شجاع، نڈر اور مستقل مزاج تھے۔ میں نے ایک کتاب جہاد کے آداب اور جہاد سے متعلق آیات اور احادیث پر لکھی تھی۔ یہ کتاب اکثر سلطان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔“

صلاح الدین ایوبی نے مصر و شام پر تقریباً ۲۴ سال حکومت کی اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لڑائیوں میں گزرا۔

عکہ کے محاصرے کے دوران اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھانا نہ کھا سکتے تھے لیکن ان کا پورا دن گھوڑے کی پشت پر گزرتا وہ کہتے، ”میں گھوڑے پر بیٹھتا ہوں تو میرا درد جاتا رہتا ہے اور گھوڑے سے اترتا ہوں تو پھر درد میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔“

صلاح الدین ایوبی حسن سیرت کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لائق سپہ سالار اور زیرک سیاستدان بھی تھے۔ تحمل اور بردباری ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک جنگ کے دوران ان کے نوجوان لڑکے اسمٰعیل کے انتقال کی خبر آئی۔ سلطان نے یہ خبر کسی سے بیان نہ کی، نہ اپنے طرزِ عمل سے کوئی ملال ظاہر ہونے دیا۔ ہاں، جب وہ خط پڑھتے تھے جس میں انتقال کی خبر تھی تو آنکھیں بھر آتی تھیں۔

سلطان صلاح الدین شام، مصر اور فلسطین جیسے زرخیز علاقوں پر حکمران تھے انہیں زندگی میں بہت کچھ آسائشیں حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے لیکن انہوں نے سادگی اختیار کی اور ان تمام آسائشوں کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے اپنے ترکہ میں کوئی محل یا جاگیر نہیں بلکہ صرف ایک دینار اور ۴۷ درہم چھوڑے۔

ہر پیر اور جمعرات کو عوام کی شکایات سنتے اور ان پر فیصلے صادر کرتے۔ لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا لیکن صلاح الدین کی جبیں پر کبھی شکن نہ آتی۔

صلاح الدین کی زندگی کا بیشتر حصہ صلیبیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گزرا تاہم انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں رفاہِ عامہ کے بہت کام کیے۔ انہوں نے قاہرہ کو وسعت دی۔ تفریح گاہیں قائم کیں۔ شہر کے قریب کوہ مقطم کی مغربی پہاڑیوں پر ایک قلعہ تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا جسے بعد میں ان کے بھتیجے نے مکمل کروایا۔

صلاح الدین ایوبی کے ماتحت امیروں میں تعمیرات کے ایک ماہر قراقش بھی تھے۔ سلطان کے حکم سے قراقش نے ۲۸۰ فٹ گہرا کنواں بئر یوسف، چٹان کو کاٹ کر کھدوایا۔ قاہرہ سے باہر جیزہ میں پتھر کی دیوار بنوائی جو بیرونی فصیل کا کام دیتی تھی۔ قراقش نے فصیل اور آب رسانی کی نہر بنانے کے لیے اہرام کے وزنی پتھر بھی استعمال کیے۔ یہ نہر پہاڑی چشموں سے صاف پانی لانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ شہر کے گندے پانی کے نکاس سے دریا کا پانی آلودہ ہو جاتا تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے مضبوط بند تعمیر کیا گیا۔ سلطان نے کئی مساجد بھی تعمیر کروائیں۔

علم کو بڑے پیمانے پر فروغ دینا صلاح الدین کا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ دینی علوم کی سرپرستی کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے قاہرہ میں ایک دارالعلوم قائم کیا اور مصر، شام، فلسطین اور جزیرے کے تمام شہروں میں سینکڑوں مدرسے تعمیر کروائے۔ ابن جبیر کے مطابق ان کے علمی ذوق کو دیکھ کر ان کے صاحبزادوں، اہل خانہ اور عورتوں میں بھی مدرسے قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ مصر کے ان مدارس میں مدرسہ

Marfat.com

صلاحیہ، مدرسہ صوفیہ، مدرسہ شرقیہ، مدرسہ عالیہ، مدرسہ فاضلیہ، مدرسہ صالحہ وغیرہ شامل ہیں۔

حلب، شام کا علمی کا مرکز تھا جہاں کئی مشہور مدارس قائم کیے۔ ناداروں کے بچوں اور یتیموں کی تعلیم کے اخراجات حکومت خود برداشت کرتی تھی۔ حکومت کی جانب سے علما کے لیے مقرر کیے گئے وظائف کی مالیت تین لاکھ دینار سالانہ تھی۔ سلطان نے کئی اوقاف قائم کیے تھے جن کے تحت مختلف منصوبوں کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ سلطان نے قاہرہ میں ایک بہترین اسپتال اور دیگر شہروں میں کئی شفاخانے بھی تعمیر کروائے۔

صلاح الدین کے عہد میں ڈاک کا بہت اچھا انتظام تھا۔ ہفتے میں دو بار ان کی وسیع مملکت کے ہر حصے سے رپورٹیں دارالخلافہ آتیں۔ ہر ڈاک خانے پر گھوڑے تیار رہتے، کبوتروں کے ذریعے ڈاک بھیجنے کا نظام بھی رائج تھا۔

صلاح الدین ایوبی عالم اسلام کے وہ قابل فخر اور عظیم رہنما ہیں جن پر مسلمان رہتی دنیا تک ناز کریں گے، جن کے روشن و درخشاں کارنامے ہمیشہ مسلمانوں کے لیے سرمایۂ افتخار بنے رہیں گے اور ہر دور میں دلوں میں جہاد کی تڑپ بیدار کرتے رہیں گے۔ صلاح الدین ایک پکے اور سچے مسلمان کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اپنے رب پر کامل بھروسا، دل جذبۂ جہاد سے معمور اور سیرت اسلامی اوصاف سے مزین — یہ تھے صلاح الدین!

***

Marfat.com

ملک الظاہر بیبرس

بیدار مغز عظیم مسلمان جرنیل جو اسلام دشمنوں کے آگے سیسے کی دیوار بن گئے

وسط ۶۵۸ھ کی ایک گرم صبح تھی۔

قاہرہ کے گلی کوچے ان مظلوم مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے جو وحشی تاتار قبائل کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے بعد قرب و جوار کے ممالک سے پناہ لینے کے لیے مصر آ گئے تھے۔ اچانک ان مسلمانوں نے چند تاتاریوں کو قاہرہ کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ تاتاری مخصوص سفارتی لباس پہنے ہوئے تھے اور بڑی رعونت کے ساتھ چل رہے تھے۔ تاتاریوں کی آمد سے قاہرہ کے گلی کوچوں میں غم و غصے اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمان بجا طور پر ایک بڑے خطرے کو اپنی سروں پر منڈلاتا دیکھ رہے تھے۔

تاتاری سفیروں نے حکمرانِ وقت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مصری سپاہیوں کے ایک دستے نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا اور مصر کے فرمانروا ملک مظفر کے ایوان میں لے گئے۔ تاتاری سفیروں کی ہر حرکت اور ہر ادا سے غرور ٹپکتا تھا۔ انہوں نے سفارتی آداب کا بھی خیال نہ کیا اور سالار ہلاکو خاں کا خط بڑی بدتمیزی کے ساتھ ملک مظفر کے سامنے پھینک دیا۔ مسلمانوں کے حکمراں نے خط پڑھنے کا حکم دیا۔ خط کے مندرجات کچھ یوں تھے:

”یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی شہر پناہیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں امن چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا اور اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر تم کو جو کچھ پیش آئے گا وہ بلند و بالا جاودانی آسمان کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

خط سنتے ہی ملک مظفر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ان کی جبیں شکن آلود ہو گئی لیکن انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا: ”ہم نے ہلاکو خان کا کچھ نہیں بگاڑا اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ہمارے امن و امان میں خلل نہ ڈالے۔“

تاتاری سفیر یہ جواب سن کر غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے درشت لہجے میں کہا، ”اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے آقا کی قوت لامحدود ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس سے ٹکر نہیں لے سکتی۔“

ملک مظفر نے تاتاری سفیروں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کا انداز گفتگو گستاخ سے گستاخ تر ہوتا چلا گیا۔

ایوان میں ملک مظفر کے کئی اعلیٰ مشیر بھی موجود تھے جو بڑے صبر و تحمل کے ساتھ تاتاری سفراء کی ہرزہ سرائیوں کو سن رہے تھے۔

ملک مظفر نے اپنے مشیروں پر نگاہ ڈالی کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے۔ بعض مشیروں کا تو کہنا تھا کہ ہمیں تاتاریوں کی پیش کش قبول کر لینی چاہیے لیکن اس ایوان میں ایک دراز قد، قوی الاعضا اور خوش رُو شخص موجود تھا جس کا پیہم اصرار تھا کہ ہمیں تاتاریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس شخص کا چہرہ نہایت بارعب اور پُر وقار تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ بال سرخ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ بڑے اعتماد سے ایوان کو بتا رہا تھا کہ تاتاریوں کے وعدے اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مصر مسلمانوں کی امیدوں کا آخری مرکز ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ہمیں سردھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے۔ اس دراز قد اور وجیہہ شخص کی پرجوش اور مدلل تقریر سن کر ایوان میں موجود بہت سے امرا اور مشیر بھی اس کے ہم خیال ہو گئے۔

ملک مظفر خود بھی تاتاریوں کے آگے سپر ڈالنے کی حق میں نہ تھے۔ انہوں نے جب اپنے اعلیٰ مشیروں کو بھی اپنا ہمنوا پایا تو محسوس کیا کہ اب فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔ اگر اس وقت مسلمان اپنی میراث کو بچانے کے لیے نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو شاید وہ صدیوں تک سنبھل نہ پائیں گے۔ انہوں نے محافظ دستے کو حکم دیا کہ تمام تاتاری سفیروں کو موت کی نیند سلا دیا جائے۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ سپاہیوں کا ایک دستہ

Marfat.com

تاتاری سفیروں پر ٹوٹ پڑا۔ اور پلک جھپکتے میں ان کی لاشیں خون میں نہائی ہوئی پڑی تھیں۔

تاتاری سفیروں کا قتل گویا تاتاریوں کے ساتھ کھلا اعلانِ جنگ تھا۔ حکمرانِ مصر ملک مظفر نے فوری طور پر اعلیٰ مشیروں کا اجلاس بلایا اور جنگی تیاریوں کا حکم دیتے ہوئے امیر بیبرس بند قداری کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ امیر بیبرس بند قداری وہی دراز قد، خوش رُو اور نیلی آنکھوں والے شخص تھے، تاتاری سفیروں کے سامنے جن کی پُرجوش تقریر نے پورے ایوان میں جذبے اور ولولے کی نئی لہر دوڑا دی تھی اور دلوں میں جہاد کی تڑپ بیدار کر دی تھی۔

چند گھنٹوں بعد قاہرہ کے مسلمان حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ اکڑ کر چلنے والے تاتاری سفیروں کی خون آلود لاشیں قاہرہ کی اہم سڑکوں پر لٹکی ہوئی ہیں۔ تاتاری سفیروں کی لاشیں اہم مقامات پر لٹکانے کا جرأت مندانہ فیصلہ امیر بیبرس ہی کا تھا۔ بہت جلد ملک کے طول و عرض میں سرکاری اعلان کیا جا چکا تھا کہ ہر تندرست اور بالغ مرد کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ سالار اعلیٰ بیبرس، فوجی تیاریوں کے ضمن میں رات دن مصروف تھے۔

یہ تھے ملک الظاہر بیبرس، عالم اسلام کے مایۂ ناز اور باعثِ صد افتخار جرنیل جنہوں نے امتِ مسلمہ کے سفینے کو منجدھار سے بچا کر بڑے بڑے طوفانوں سے مردانہ وار ٹکرلی اور اپنی غیر معمولی فراست، حکمت اور قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو ایک بار پھر دنیا کی عظیم طاقت بنا دیا۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے اس ایک مردِ جری میں کس قدر اعلیٰ صفات مجتمع کر دی تھیں۔ انہوں نے اپنے سترہ سالہ دورِ حکومت میں ایک جانب تاتاریوں کے اس سیلِ رواں کا خاتمہ کر دیا جس نے مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا، دوسری جانب صلیبی انتہا پسندوں پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے اور تیسری طرف انہوں نے خفیہ تحریک باطنیہ کا استیصال کر دیا۔ جنگ و جدل کی ان تمام مصروفیات کے ساتھ انہوں نے نہ صرف اسلامی مملکت کو ترقی اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے عروج پر پہنچا دیا بلکہ خلافتِ اسلامی کا احیا کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیا۔

تاریخ اسلام کی اس حیرت انگیز شخصیت نے ۶۱۹ھ / ۱۲۲۳ء میں وسط ایشیا (موجودہ جنوبی روس) کے علاقے دشت قپچاق میں جنم لیا۔ بیبرس نے ایک مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کے والد جق جق نے اپنے بیٹے کا نام محمود رکھا۔ محمود ابھی لڑکپن کی منزلیں سر کر رہے تھے کہ دشت قپچاق اور قرب و جوار کے علاقوں پر تاتاریوں کا قہر و غضب ٹوٹ پڑا۔ تاتاری ان علاقوں سے اَن گنت نوجوانوں اور بچوں کو پکڑ کر ساتھ لے گئے اور انہیں مختلف شہروں میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ محمود کو مصر کے ایک امیر علی ابن الورقہ نے دمشق کی منڈی میں بیس دینار کے عوض حاصل کیا۔

علی ابن الورقہ ایک دوسرے مصری امیر کے قرضدار تھے۔ انہوں نے قرض اتارنے کی یہ تدبیر نکالی کہ محمود کو اپنے قرض خواہ کے حوالے کر دیا۔ دوسرے مصری امیر کی بیوی نے محمود کو ایک دن کسی غلطی پر مارا پیٹا۔ اس موقع امیر کی بہن فاطمہ بھی موجود تھی۔ اس نے اپنی بھابی سے کہا کہ اگر تمہیں یہ غلام پسند نہیں ہے تو اسے میرے حوالے کر دو۔ امیر کی بیوی راضی ہو گئی۔ فاطمہ کمسن محمود کو اپنے گھر دمشق لے گئی۔ دراصل فاطمہ کا ایک بیٹا کچھ عرصے قبل فوت ہو چکا تھا اس کی شکل محمود سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ فاطمہ کو محمود میں اپنے بیٹے کی شباہت پا کر اس سے انس ہو گیا ہو۔

فاطمہ کے مرحوم بیٹے کا نام بیبرس تھا، فاطمہ محمود کو بھی بیبرس ہی کے نام سے پکارنے لگی۔ یہ نام اتنا عام ہوا کہ لوگ محمود کا اصل نام بھول گئے۔ فاطمہ کے ایک بھائی مصر کے حکمراں الملک الصالح نجم الدین ایوب کی حکومت میں اہم عہدیدار تھے۔ ایک دن وہ اپنی بہن کے پاس دمشق آئے تو وہاں انہوں نے بیبرس کو دیکھا۔ اس نوجوان کی عادات اور اوصاف انہیں اتنے پسند آئے کہ انہوں نے اپنی بہن سے اصرار کر کے بیبرس کو مانگ لیا اور اپنے ساتھ قاہرہ لے گئے۔ قاہرہ جا کر انہوں نے بیبرس کو اس وقت کے حکمراں الملک الصالح کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس نے وسط ایشیا کے صحراؤں میں پلنے والے اور غلام بنا کر فروخت ہونے والے ایک لڑکے کے مصری قیادت تک پہنچنے کی راہ ہموار کر دی اور اس کے لیے جہاں بانی کا دروازہ کھول دیا۔

ملک الصالح نے ۶۴۳ھ / ۱۲۴۷ء میں مصر کا اقتدار سنبھالا تھا۔ ان کے حکمراں بننے سے پہلے ہی ساتویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں تاتاریوں نے دنیا بھر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے شروع

Marfat.com

کر دیے تھے۔ بے شمار مسلمانوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جا رہا تھا۔ تاتاریوں کے فروخت کردہ مسلمان مملوک کہلاتے تھے۔

ملک الصالح نے بیبرس کو بھی اسلامی علوم اور جنگی فنون کی اعلیٰ تربیت دلوائی۔ اپنی نمایاں صلاحیتوں، غیر معمولی جسمانی قوتوں اور حیرت انگیز ذہانت کی بدولت بیبرس کو بہت جلد فوج کے ایک دستے کی کمان سونپ دی گئی۔ اسی زمانے میں ساتویں صلیبی جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ شاہ فرانس لوئی نہم کی قیادت میں چھیڑی گئی تھی اور صلیبیوں نے اس بار مصر کو خصوصی ہدف بنایا تھا۔ صلیبیوں کا خیال تھا کہ مصر فتح ہو جانے کے بعد بیت المقدس اور شام و فلسطین کے دیگر مقدس مقامات پر قبضہ کرنا زیادہ دشوار نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے میں مصر ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ صلیبی فوج اور لشکر اسلام کے مابین منصورہ کے مقام پر زبردست جنگ لڑی گئی جس میں بیبرس نے مثالی شجاعت کا ثبوت دیا۔ صلیبیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔

۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں مصر پر مملوکوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ مملوکوں کی حکومت کا یہ عہدِ زریں تقریباً پونے تین سو سال کے عرصے پر محیط ہے۔ پہلے مملوک حکمران کا نام معزالدین ایبک تھا پھر الملک منصور نے زمام کار سنبھالی۔ یہ وہ دور تھا کہ تقریباً چالیس برس قبل اٹھنے والے تاتاری طوفان نے شدت اختیار کر لی تھی اور اس کی شوریدہ سر موجیں شام اور مصر کے دروازوں پر دستک دینے لگی تھیں۔ ملک المنصور کم عمر تھے، چنانچہ آنے والے خطرے کے پیش نظر تمام امرا نے سیف الدین قطوز کو شوال ۶۵۷ھ/ستمبر ۱۲۵۹ء میں مصر کا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ انہوں نے اپنے لیے ملک مظفر کا لقب پسند کیا۔

بالآخر تاتاری سیلاب کی موجِ اوّل کے طور پر ایک تاتاری وفد وہ دھمکی آمیز خط لے کر قاہرہ پہنچ گیا جس کا ذکر اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، ملک مظفر کے اعلیٰ مشیر، بیبرس کے مشورے پر تاتاری سفیروں کو قتل کر کے ان کی لاشیں قاہرہ کی اہم سڑکوں پر لٹکا دی گئی تھیں اور یہ ظاہر تھا کہ بپھرے ہوئے تاتاریوں کا سیلاب مصر کی طرف بڑھنے والا ہے اور یہی ہوا۔ تاتاری سفیروں کے قتل کی اطلاع ملتے ہی ہلاکو خان کا ٹڈی دل لشکر مصر کی طرف بڑھنے لگا۔ تاتاری لشکر کی پیش قدمی جاری تھی کہ اچانک ہلاکو خان کو اپنے بھائی منگو خان کی وفات کی وجہ سے واپس جانا پڑا۔ اس نے اپنے سپہ سالار کتبغا کی قیادت میں ایک بڑی فوج کو یہیں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ کتبغا نے مشہور فلسطینی شہر ناصرہ کے قریب عین جالوت کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

اچانک بیبرس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو جذبۂ شہادت سے معمور دل اور انتہائی بیدار ذہن رکھنے والا کوئی مسلمان جرنیل ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ بجائے مصر کا دفاع کرنے کے ہم خود آگے بڑھ کر کتبغا کے لشکر پر حملہ کریں گے۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ بیبرس کے اس پُرجوش اعلان سے لشکر اسلام میں نئی امنگ اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

جمعہ ۱۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ/۲۵ اگست ۱۲۶۰ء کا وہ تاریخی دن تھا جب دونوں لشکر زبردست قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ اللہ کی نصرت مجاہدینِ اسلام کے ساتھ تھی۔ تاتاریوں کو شکست ہوئی اور ان کا سالار کتبغا اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ بیبرس نے کتبغا کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ عین جالوت کی یہ جنگ تاریخ کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ کے بعد بیبرس نے حلب، حماۃ، دمشق اور شام کے دیگر شہروں میں جنگی کارروائی کر کے تاتاریوں کو مار بھگایا اور واپس قاہرہ پہنچ گئے۔

بیبرس واپس قاہرہ پہنچے تو ایک نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ مملوک امرا نے اتفاق رائے سے بیبرس کو مصر کا فرمانروا منتخب کر لیا۔ بیبرس نے حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے لیے ملک الظاہر کا لقب پسند کیا۔ کچھ عرصے بعد شام والوں نے بھی بیبرس کی دعوت پر انہیں اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس طرح شام بھی مملوک حکومت کا حصہ بن گیا۔ اس دور کے شام میں آج کا لبنان، اردن اور فلسطین بھی شامل تھے۔

ہلاکو خان کی یلغار کے نتیجے میں سقوط بغداد کے ساتھ ہی عباسی خلافت بھی معدوم ہو گئی تھی۔ بیبرس نے محسوس کیا کہ اس خلافت کے احیا کی ضرورت ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو خلافت سے ایک قسم کی روحانی وابستگی تھی۔ چنانچہ بیبرس نے خاندان عباسی کے کسی فرد کو تلاش کروایا۔ تلاش کے دوران اس خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم احمد کا سراغ ملا۔ بیبرس نے انہیں قاہرہ بلوایا اور ان کا زبردست استقبال کیا۔ اس موقع پر عظیم الشان جشن منایا گیا اور ابوالقاسم احمد کے بارے میں تمام شہادتوں کی تکمیل کے بعد انہیں خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ بیبرس نے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سکے اور خطبے میں خلیفہ کا نام شامل کیا گیا۔ اس طرح بیبرس کی حکومت کو دنیا بھر کے مسلمانوں میں مرکزیت

Marfat.com

حاصل ہوگئی۔ چند ماہ بعد ابوالقاسم احمد بغداد کو تاتاریوں سے واپس حاصل کرنے کی ایک مہم کے دوران لاپتہ ہوگئے۔ ان کے بعد بیبرس نے خاندان عباسیہ کے ایک اور رکن اور ابوالعباس احمد کو خلیفہ مقرر کیا۔ وہ مجاہدانہ مزاج کے مالک تھے اور تاتاریوں کے خلاف کئی جنگوں میں شریک ہوچکے تھے۔ وہ مصر کے دوسرے عباسی خلیفہ تھے۔ انہیں الحاکم بامر اللہ کا لقب دیا گیا۔ انہوں نے چالیس برس خلافت کی۔ مصر میں عباسی خلافت مملوکوں کے دورِ اختتام، یعنی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء تک قائم رہی اس کے بعد منصب خلافت ترکوں کو منتقل ہوگیا۔

یہ بیبرس کی خوش قسمتی تھی کہ برسر اقتدار آنے کے بعد تاتاریوں کا ایک سردار برکہ خان مسلمان ہوگیا۔ یوں تاتاریوں میں پھوٹ پڑگئی۔ بیبرس نے ایک ہوشمند جرنیل کی طرح فوراً برکہ خان سے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔ اس طرح برکہ خان کی سلطنت میں، جو خوارزم مغربی قپچاق اور روس کے لاکھوں مربع میل علاقے پر مشتمل تھی، اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس انقلابی تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہلاکو خان نے مصر اور شام پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو برکہ خان کی بڑی فوج نے ہلاکو خان کے لشکر پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح ہلاکو کی توجہ بٹ گئی اور وہ اپنی ہی سرحدوں کے دفاعی انتظامات میں الجھ گیا۔

ادھر بیبرس نے ایسی سیاسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ قسطنطنیہ کا بازنطینی حکمران قیصر روم عالمی سیاست میں غیر جانبدار رہنے پر مجبور ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ہلاکو خان اور اس کی بیوی دوقوز خاتون کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح تاتاری طاقت کا بڑی حد تک خاتمہ ہوگیا۔ بیبرس نے اب مسیحی طاقتوں کی طرف توجہ کی اور وینس اور جینوا کی حکومتوں سے تجارتی معاہدے کر کے انہیں دوست بنالیا۔ پھر انہوں نے اطالیہ اور صقلیہ کے حکمراں شاہ مینفریڈ کے پاس ایک وفد بھیج کر سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔

۶۶۲ھ / ۱۲۶۳ء کے وسط میں بیبرس نے صلیبیوں کے خلاف اپنی زبردست مہم کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا نشانہ الکرک کا قدیم اور مضبوط قلعہ تھا، جہاں قابض صلیبی، مصر سے عرب جانے والے عازمین حج کے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ الکرک کی تسخیر کے دو سال بعد قیساریہ کا اہم قلعہ فتح ہوا۔ اس کے بعد رسوف اور صفر بھی صلیبیوں سے چھینے گئے اور یافا (موجودہ تل ابیب) پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد شقیف عرنون کا قلعہ فتح ہوا جس تک پہنچنا بے حد دشوار تھا۔ بہت جلد صلیبیوں کے مضبوط مرکز انطاکیہ پر بھی بیبرس کی فوج یلغار کر رہی تھی۔ چھ دن کی خونریز لڑائی کے بعد یہ شہر بھی فتح ہوگیا۔ اس کے بعد ارمینیہ کو تسخیر کیا گیا اور ۶۶۹ھ / ۱۲۷۱ء میں حصن الاکراد اور القرین کے مستحکم قلعوں پر بھی اسلامی پرچم لہرا رہے تھے۔

مسلمانوں کی ان پے در پے فتوحات سے صلیبیوں کے ہوش اُڑ گئے۔ انہوں نے بیبرس کے پاس صلح کی درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں۔ بیبرس نے اس موقع پر نہایت اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند شرائط پر صلیبیوں سے صلح کی منظوری دے دی۔ یہ معاہدہ دس سال دس ماہ اور دس دن کے لیے کیا گیا۔

ملک الظاہر بیبرس کا ایک بڑا کارنامہ باطنیوں کا قلع قمع ہے۔ باطنیہ ایک خفیہ تحریک تھی جس نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچایا اور ان کے بڑے بڑے رہنماؤں کو شہید کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دشمن اسلام گروہ کو بہت بڑی زک ایک دوسرے دشمن اسلام گروہ کے ہاتھوں پہنچی۔ ۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء میں ہلاکو خان نے جب اس علاقے پر حملہ کیا تو اس نے باطنیوں کے ۱۰۰ سے زائد قلعے تباہ کر دیے لیکن ان کے کچھ قلعے شام میں بھی تھے اور ہلاکو خان شام کا رخ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ بیبرس نے ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں باطنیوں کا خاتمہ کرنے کی طرف توجہ دی اور زبردست حملے کر کے ان کے تمام قلعے تباہ کر دیے۔ جو کچھ باطنی زندہ بچے انہیں بیبرس نے مصر کے مختلف شہروں میں بسا دیا۔ ۶۷۴ھ / ۱۲۷۵ء میں نوبہ (سوڈان) کے مسیحی بادشاہ ڈیوڈ نے سرکشی اختیار کی تو بیبرس نے نوبہ پر چڑھائی کر دی لیکن ڈیوڈ کی جانب سے تاوانِ جنگ اور سالانہ خراج کے وعدے پر اس کی جان بخش دی۔ نوبہ کی فتح کے بعد ایک بار پھر تاتاریوں کا فتنہ بیدار ہوگیا۔ ہلاکو خان کا بیٹا اباقاخان ۶۷۵ھ / ۱۲۷۷ء میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ فلسطین، شام اور ارمینیہ کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔ بیبرس نے بھی زبردست تیاری کی اور سینکڑوں میل کا سفر کر کے فلسطین، شام کی سرحد کی نزدیک ابلستین کے مقام پر ڈیرہ ڈال دیا۔ بئر التاب کے میدان میں زبردست جنگ ہوئی، جس میں تاتاریوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔

۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء کے اوائل میں بیبرس دمشق میں مقیم تھے۔ ان ہی دنوں انہیں سخت بخار نے آلیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق ابلستین کی جنگ میں انہیں ایک کاری زخم آیا تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ اب

Marfat.com

انہیں بخار ہو گیا تھا۔ اطبا نے اپنے محبوب فرمانروا کی جان بچانے کی سر توڑ کوشش کی، لیکن اب رخصت کی گھڑی آپہنچی تھی۔ ۲۷ محرم ۶۷۶ھ / ۳۰ جون ۱۲۷۷ء کو عظیم مسلمان جرنیل ملک الظاہر بیبرس نے دار فانی کو الوداع کہا۔ انہوں نے ستاون برس کی عمر پائی۔ انہیں دمشق ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اسی شہر کی خاک میں دو بڑے مسلمان جرنیل نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبیؒ بھی آرام کر رہے ہیں۔ دمشق میں بیبرس کے مقبرے کے ایک حصے میں آج کل ایک بہت اچھا کتب خانہ موجود ہے جو ملک الظاہر بیبرس کے نام کی مناسبت سے "کتب خانہ ظاہریہ" کہلاتا ہے۔

ملک الظاہر بیبرس کی وفات جہاں مسلمانوں کے لیے یاس والم کا پروانہ بن کر آئی وہاں اس کی بدولت صلیبیوں نے سکھ اور مسرت کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب ان کے ادھورے خوابوں کی تکمیل ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ بیبرس کے دو جانشینوں الملک المنصور قلاوؤن اور ملک الاشرف صلاح الدین خلیل نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ء میں ہلاکو خان کے بیٹے اباقاخان نے زبردست فوج کے ہمراہ شام پر حملہ کر دیا۔ ۱۴ رجب ۶۸۰ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۲۸۱ء کو حمص کے نواح میں فریقین کے درمیان ایک خونریز جنگ لڑی گئی۔ کئی گھنٹے کی خوفناک لڑائی کے بعد تاتاری کمزور ہونے لگے اور بالآخر ہزاروں لاشیں تڑپتی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد اباقاخان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی تکودار اوغلان بادشاہ بنا۔ اس نے مسلمانوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ اس نے قلاوؤن کی مملکت سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ اسی دوران صلیبی شرپسندی پر اتر آئے تھے۔ قلاوؤن نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی اور قلعہ المرکب اور طرابلس الشام کو فتح کر لیا۔ قلاوؤن کی وفات کے بعد ان کے فرزند صلاح الدین خلیل نے صلیبیوں کے خلاف جہادِ عام کا اعلان کر دیا۔ صلیبیوں کا سب سے بڑا مرکز اب عکّہ تھا۔ ۶۹۰ھ / ۱۲۹۲ء میں صلاح الدین خلیل نے عکّہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک ماہ بعد صلیبیوں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔

عکّہ پر مسلمانوں کا قبضہ بہت بڑی بات تھی۔ اس سے صلیبی دہشت زدہ ہو گئے اور اس کے چند روز بعد صور، صیدا بیروت، انطرطوس اور عثلیث کے صلیبیوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح ۱۷ شعبان ۶۹۱ھ / ۳ اگست ۱۲۹۱ء کو صلیبیوں کی اس جنونی جدوجہد کا خاتمہ ہو گیا جس کا آغاز ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں ہوا تھا۔

اولوالعزم مجاہد ملک الظاہر بیبرس کا قلب، شوق جہاد سے معمور تھا۔ انہوں نے اپنے سترہ سالہ دورِ حکومت کا بڑا حصہ دشمنانِ اسلام سے جہاد کرتے ہوئے گزارا۔ جنگوں میں وہ ہمیشہ خود قیادت کیا کرتے تھے۔ وہ بے انتہا دلیر اور بے حد جری سالار تھے۔ ان کی شجاعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی مؤرخین تک ان کی بہادری کا اعتراف کرتے ہیں۔ مشہور امریکی مؤرخ ہیرلڈلیم نے اپنی کتاب "تاتاریوں کی یلغار" میں یہ اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ایک سپاہی کی حیثیت سے بیبرس کا مرتبہ جولیس سیزر سے کم نہ تھا۔" واضح رہے کہ رومی جرنیل جولیس سیزر (۱۰۰ قبل مسیح تا ۴۴ قبل مسیح) کا شمار عالمی تاریخ کے عظیم ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔

بیبرس کو تیر اندازی، گھڑ سواری، پیراکی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں کمال حاصل تھا۔ وہ اس قدر نڈر تھے کہ تن تنہا دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ جنگ کے دوران وہ پورے میدان میں تیزی سے گردش کرتے رہتے تھے اور اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ اسلامی فوج کسی اعتبار سے کمزور نہ پڑنے پائے۔ بیبرس بے حد جفاکش تھے۔ سخت محنت ان کے کردار کا لازمی جزو بن چکی تھی۔ وہ گھوڑے کی پشت پر مسلسل کئی دن سفر کرتے تھے۔ موسم کی سختیاں ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھیں۔

بیبرس کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کی حاضر دماغی اور فہم کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ بعض اوقات وہ مختلف زبانوں کے کاتبوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتے تھے اور مختلف ممالک کے حکمرانوں کو مختلف زبانوں میں خطوط بیک وقت لکھوانا شروع کر دیتے تھے۔ ہر خط کا مضمون الگ ہوتا تھا اور زبان بھی مختلف۔ وہ ایک کاتب کو چند فقرے لکھواتے پھر دوسرے کاتب کی طرف رخ کر کے اسے دوسری زبان میں چند فقرے لکھوا دیتے، ابھی یہ دونوں کاتب یہ فقرے لکھ رہے ہوتے کہ بیبرس تیسرے کاتب کو کسی تیسری زبان میں چند فقرے لکھوا دیتے۔ جب وہ اٹھتے تو تمام خطوط مکمل ہو چکے ہوتے۔ بیبرس کو یونانی، عربی، حبشی، تاتاری اور کئی دیگر زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

بیبرس نہ صرف علم بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی بلند درجہ پر فائز تھے۔ ان کے پہلو میں ایک سچے مسلمان کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ خود بھی

نماز اور روزے کے پابند تھے بلکہ عام مسلمانوں کو شریعت کی پابندی کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ۶۶۷ھ / ۱۲۶۹ء میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس موقع پر انہوں نے کعبۃ اللہ کو اپنے ہاتھوں سے عرقِ گلاب سے غسل دیا اور اس پر دیبا (ایک قیمتی کپڑا) کا غلاف چڑھایا۔ پھر انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر نبی کریم ﷺ کے روضۂ مبارک کے گرد ایک کٹہرا (محجّر) بنوایا۔ ان کے حکمران بننے سے چند سال قبل مسجد نبویؐ کا کچھ حصہ آتشزدگی کی وجہ سے گر گیا تھا۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی تعمیر شروع کروائی تھی لیکن یہ کام نامکمل رہا، اسے بیبرس نے مکمل کروایا۔

بیبرس بے حد فیاض اور کریم النفس حکمراں تھے۔ ان کے در سے سائل کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا، ان کا دستر خوان بہت وسیع تھا، جہاں ہزاروں افراد کھانا کھاتے تھے۔ وہ فقرا اور مساکین میں ہزاروں من غلہ تقسیم کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حرم شریف کے خادمین کے لیے مستقل وظائف بھی مقرر کیے تھے۔ بیبرس اپنی رعایا کے مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اکثر بھیس بدل کر مملکت کے طول و عرض میں نکل جاتے تھے اور لوگوں میں گھل مل کر ان کے حالات دریافت کر لیتے۔ حتیٰ کہ بھیس بدل کر انہوں نے دشمنوں کے متعدد علاقوں تک کا دورہ کیا اور دشمنوں کے اہم راز جان لیے۔ یہ کام وہ تن تنہا کیا کرتے تھے۔ بیبرس کوئی اہم دینی یا دنیوی کام علما سے فتویٰ لیے بغیر نہ کرتے تھے۔ ان کی مملکت میں چاروں بڑے فقہی مسالک کے علما کو اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔

بیبرس نے مختلف ذمے داریوں کے لیے بے حد بلند پایہ اور جلیل القدر علما کرام کی خدمات حاصل کی تھیں۔ مشہور مؤرخ اور تذکرہ نگار علامہ ابن خلکان، بیبرس کے عہد میں عرصے تک شام کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) رہے۔ وہاں سے پھر آپ قاہرہ آگئے اور یہاں مدرسہ فخریہ میں تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ آپ نے "وفیات الاعیان" کے عنوان سے نہایت عمدہ تاریخی کتاب لکھی جس میں ۱۸ برس صَرف ہوئے۔ محدث امام نوویؒ بھی بیبرس کے ہم عصر تھے اور بیبرس ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بیبرس مشہور صوفی بزرگ سید احمد البدویؒ کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان طبیب اور فقہ، صَرف و نحو اور منطق کے عالم ابن النفیس کو بیبرس کے عہد میں رئیس اطبائے مصر کا عہدہ دیا گیا تھا۔ ملک الظاہر بیبرس نے ۶۶۲ھ / ۱۲۶۴ء میں قاہرہ میں مدرسۂ الظاہریہ بڑے اہتمام سے تعمیر کروایا تھا۔

بیبرس ایک عادل اور انصاف پرور حکمراں تھے۔ انہوں نے محکمۂ قضا میں چاروں بڑے فقہی مسالک کے قابل ترین قاضیوں (ججوں) کو مقرر کیا تھا۔ ہفتہ میں دو یا تین دن 'دارالعدل' میں وہ خود بھی مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ فوج کے لیے بھی ایک قاضی کا تقرر کیا گیا تھا۔ وہ عدالتِ عظمیٰ میں بیبرس کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

بیبرس نے رعایا کو مظالم اور زیادتیوں سے نجات دلانے کی غرض سے صیغۂ احتساب بھی قائم کیا تھا۔ اس محکمے کے افسران "محتسب" کہلاتے تھے۔ جو بازاروں میں اشیا کے نرخوں کی نگرانی کرتے تھے۔ اشیا کے خالص ہونے اور ان کے درست تولنے کا اہتمام کرواتے تھے۔ مویشیوں اور دیگر حیوانات کے ساتھ ظلم کا انسداد کرتے تھے۔ محتسب کے فرائض میں طبیبوں، دواسازوں اور امراضِ چشم کے ماہروں کا امتحان لینا بھی شامل تھا۔ اس امتحان میں کامیابی پر اجازت نامہ دیا جاتا تھا جس کے بغیر طبیب اور دواساز کسی کا علاج نہ کر سکتے تھے۔ محتسب امنِ عامہ میں خلل ڈالنے والوں سے باز پرس کر سکتے تھے۔ قرض خواہوں کو قرض واپس دلواتے تھے۔ ان کے اختیارات وسیع تھے اور وہ قوانین کی خلاف ورزی پر فوراً سزا بھی دے سکتے تھے۔

محتسب کے انتخابات میں بہت چھان پھٹک سے کام لیا جاتا تھا اور صرف اہل، دیندار اور امانت دار کو ہی محتسب بنایا جاتا تھا۔ پولیس کا محکمہ بھی قائم تھا جس کا افسر اعلیٰ "والی" کہلاتا تھا۔ کوتوال شہر کو "صاحبِ عسس" کہا جاتا تھا۔ آگ بجھانے کا محکمہ بھی کوتوال شہر کے تحت کام کرتا تھا۔

بیبرس کی حکومت میں مملکت کے سربراہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی تاہم وہ تمام معاملات میں اپنے اعلیٰ مشیروں سے مشورہ ضرور لیتے تھے۔ انہوں نے 'نائب سلطان' کا عہدہ قائم کیا تھا جس کی حیثیت وزیر اعظم کے برابر تھی۔ بیبرس کی غیر موجودگی میں نائب سلطان، ہی ملک کے قائم مقام سربراہ ہوتے تھے۔ بیبرس جب کبھی کسی جنگی مہم یا سرکاری دورے پر جاتے تھے تو ایک وزیر ان کے مشیر کے طور پر ساتھ ہوتے تھے جو "وزیر الصحبۃ" کہلاتے تھے۔

باہر سے آئے ہوئے خطوط سے نمٹنے اور سربراہِ مملکت کے دستخط کروانے کا کام "دوادار" کے سپرد تھا۔ "امیر جاندار" کا عہدہ دراصل

Marfat.com

افسر استقبال کا اہم عہدہ تھا۔ بیبرس کے ذاتی محافظ امیر مجلس کہلاتے تھے۔ اسلحہ اور سامان جنگ کا انتظام کرنے والے افسر کو "امیر السّلام" کا نام دیا گیا تھا۔ صاحب دیوان انشأ کی حیثیت بیبرس کے پرائیویٹ سیکریٹری اور وزیر خارجہ کی سی تھی۔ بڑی فوج کے سالار کو رئیس العساکر کہا جاتا تھا۔ بحری فوج کے افسر اعلیٰ امیر البحر کہلاتے تھے۔ مملکت کی تمام تعمیرات کی نگرانی "امیر التعمیر" کے سپرد تھی۔

مملکت کے دو اہم انتظامی حصے تھے، مصر اور شام۔ ان دونوں کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر صوبہ 'نیابہ' کہلاتا تھا۔ اور 'ہر نیابہ' میں ایک نائب (گورنر) مقرر تھا۔

بیبرس کے عہد میں پیداوار پر لگان وصول کیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی وصولیابی سرکاری نگرانی میں ہوتی تھی۔ حکومت سامان برآمد بھی کرتی تھی۔ غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت فوجی خدمت سے استثناء اور دوسری سہولتوں کے بدلے معمولی جزیہ (ٹیکس) لیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار عام طور پر دس اور پچیس درہم کے درمیان ہوتی تھی۔ درآمدی سامان پر دس سے پینتیس فیصد درآمدی محصول عائد تھا۔

بیبرس نے ڈاک کے محکمے پر خصوصی توجہ دی۔ اس محکمے کا مرکز قائم کیا جو قاہرہ کے مشرق میں قلعہ جبل میں تھا۔ یہ قلعہ ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعے سے چار راستے چار مختلف سمتوں کو نکلتے تھے۔ ایک راستہ اسکندریہ، دوسرا قوص، تیسرا دمیاط اور غزہ اور چوتھا عیذاب کو جاتا تھا۔ عیذاب بحیرۂ احمر کی بندرگاہ تھی، جہاں ہندوستان، یمن اور حبشہ سے جہاز آتے تھے۔ مصر سے جانے والے عازمین حج اسی بندرگاہ سے جدہ روانہ ہوتے تھے۔ پوری مملکت میں جگہ جگہ ڈاک چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ ہر ڈاک چوکی میں تیز رفتار گھوڑے موجود رہتے تھے۔ ان گھوڑوں پر سرکاری نشان ہونا لازمی تھا۔ پیغام رسانوں (ڈاکیوں) کے گلے میں چاندی کی ایک تختی آویزاں کی جاتی تھی، جس کی ایک جانب لاالہ الا اللہ اور ایک قرآنی آیت لکھی ہوتی تھی۔ دوسری طرف کچھ سرکاری کلمات درج ہوتے تھے۔ جب پیغام رساں اپنے کام سے فارغ ہو جاتا تو، تختی گلے سے اتار کر دفتر میں جمع کرا دیتا تھا۔

نور الدین محمود زنگی کی طرح بیبرس نے بھی کبوتروں کے ذریعہ ڈاک بھیجنے کا اہتمام کیا۔ ان نامہ بر کبوتروں کا مرکز بھی قلعہ جبل ہی میں تھا، جہاں بیبرس نے نامہ بر کبوتروں کے لیے خاص قسم کے برج تعمیر کروائے۔ یہاں کبوتروں کی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ سرکاری ڈاک بالعموم کبوتروں کے ذریعے بھیجی جاتی تھی۔ ان کے لیے مناسب فاصلوں سے چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ ہر چوکی پر ایک برج بنا ہوا تھا جہاں کبوتر اترتا تھا اور وہاں موجود عملہ اس کے پروں سے خط کھول کر دوسرے تازہ دم کبوتر کے پروں میں باندھ دیتا تھا۔ جو کبوتر صرف بیبرس کے لیے خصوصی پیغام لاتا تھا اس کی چونچ پر سرخ رنگ کر دیا جاتا تھا۔

بیبرس کی فوج بہت منظم اور فن حرب میں ماہر تھی۔ ان کی فوج کے دو حصے تھے۔ "مملوک سلطانی" اور "جنودِ حلقہ"۔ پہلی قسم کی فوج میں بیبرس ان مملوکوں کو شامل کرتے تھے جنہیں انہوں نے چھوٹی عمر میں خریدا تھا اور ان کی دینی اور علمی تربیت کرنے کے بعد انہیں فوجی تربیت دلوائی تھی۔ جنودِ حلقہ میں مختلف علاقوں کے عام سپاہی شامل تھے۔ اس فوج کے پانچ حصے تھے۔ پیدل دستے، سوار دستے، رضاکار دستے، محفوظ دستے اور مشینی دستے۔ آخر الذکر دستے کے کام یہ تھے: فوج کے گزرنے کے لیے راستے تیار کرنا، ندی نالوں پر پل باندھنا، محاصرے کی صورت میں منجنیقیں اور قلعہ شکن آلات استعمال کرنا۔ (آج کے دور میں فوج کا یہ دستہ انجینئرنگ بٹالین کہلاتا ہے)۔ خیال ہے کہ محفوظ دستوں سمیت، بیبرس کی فوج دو لاکھ سے زائد سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

فوج کی وردی میں سر پر زرد کلاہ اور جسم پر سوتی قبا شامل تھی جس کا گریبان تنگ ہوتا تھا اور بٹنوں کی جگہ روئی کی ٹھوس گھنڈیاں لگی ہوتی تھیں۔ ہتھیار زیادہ تر دمشق اور قاہرہ میں تیار کیے جاتے تھے۔ عام طور پر تلوار، نیزہ اور تیر کمان کا استعمال ہوتا تھا۔ اگر منجنیقوں کی مدد سے کسی قلعے کی دیوار شق نہ ہو سکتی تھی تو دبابہ استعمال کیا جاتا تھا۔ دبابہ لکڑی کا ایک برج ہوتا تھا جس میں اوپر تلے کئی درجے ہوتے تھے۔ اس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس میں تیر اندازوں اور سنگ اندازوں کے علاوہ کچھ ایسے ماہرین کو بٹھایا جاتا تھا جو خصوصی آلات کے ذریعہ دیوار میں شگاف ڈال سکتے تھے۔ دبابے کو دھکیلتے ہوئے قلعے کی دیوار تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

بیبرس نے اسکندریہ اور دمیاط میں جہاز سازی کے دو نئے کارخانے قائم کیے تھے۔ جزیرہ روضہ میں جہاز سازی کا ایک بڑا کارخانہ پہلے ہی سے کام کر رہا تھا۔ ان کارخانوں کو "دار الصناعۃ" کہا جاتا تھا۔ جہاز

Marfat.com

سازی کے لیے ایک خاص قسم کی لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ بیبرس نے دیگر مقاصد کے لیے اس لکڑی کا استعمال ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہ لکڑی لبنان کے جنگلات سے حاصل کی جاتی تھی۔

بیبرس حالانکہ جنگوں میں مصروف رہتے تھے لیکن انہوں نے صنعت و حرفت اور تجارت کو بڑے پیمانے پر ترقی دی۔ انہوں نے اہل وینس اور دوسرے یورپی تاجروں کو خصوصی مراعات دیں جس سے مشرق وسطیٰ اور یورپ کے درمیان تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ایران، ہندوستان، عراق، چین اور دیگر ایشیائی اور افریقی ملکوں سے تجارتی روابط پہلے سے قائم تھے۔ اس دور میں قاہرہ پوری دنیا کا اہم تجارتی مرکز بن گیا تھا۔

بیبرس کے عہد میں جو اشیا برآمد کی جاتی تھیں ان میں چینی، روئی، بلوری ظروف، چینی کے ظروف، سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے، کمبل، ریشم، عطریات، قالین، ہاتھی دانت اور دھات کی اشیا، لکڑی کے برتن، روغن زیتون، صابن، بعلبک کی قبائیں، معدنی نمک، جواہرات وغیرہ شامل ہیں۔ جو اشیا درآمد کی جاتی تھیں ان میں سے اہم یہ ہیں: چین سے ریشم، عرب، لنکا، ہندوستان سے گرم مسالے، خلیج فارس سے موتی، سوڈان سے شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت۔

بیبرس نے زراعت کو بھی خاصی ترقی دی۔ آبپاشی کے اچھے انتظامات کیے۔ دریائے نیل سے کئی نہریں نکلوائیں۔ کئی مقامات پر بند تعمیر کروائے اور تالاب بنوائے۔ اس طرح قابل کاشت اراضی میں اضافہ ہو گیا۔

بیبرس نے تعمیرات پر بڑی توجہ دی۔ انہوں نے نئی سڑکیں بنوائیں۔ پل تعمیر کروائے۔ ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء میں انہوں نے دریائے اردن پر ایک عظیم الشان پل بنوایا اور اس پر اپنا کتبہ لگوایا جس کی دونوں جانب شیر نصب تھے۔ (شیر ببر، بیبرس کا نشان تھا)۔ یہ پل آج بھی موجود ہے اور ''جسر الدامیہ'' کہلاتا ہے، البتہ دریا کے رخ بدل لینے کی وجہ سے اب اس پل کے نیچے خشک زمین ہے۔ بیبرس نے قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حلب اور دیگر مقامات پر سرائیں اور مہمان خانے بنوائے۔ انہوں نے قاہرہ کی مسجد الازہر کی مرمت کروائی۔ اس کے علاوہ کئی تاریخی مساجد کی بھی مرمت کروائی جن میں قبۃ الصخرا (بیت المقدس) بھی شامل تھا۔

۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء میں بیبرس نے قاہرہ میں ایک شاندار مسجد بنانے کا حکم دیا۔ یہ مسجد دو سال کے عرصے میں تیار ہو گئی۔ بیبرس نے اس کا نام ''جامع حسنیہ'' رکھا۔ بیبرس نے متعدد قلعوں کی تعمیر و مرمت کروائی۔ ان میں حلب، حماۃ، دمشق، حصن الاکراد اور جزیرۂ روضہ کے قلعے اہم ہیں۔

***

Marfat.com

عثمان خان

سلطنت عثمانیہ کے بانی، باعمل، بہادر، ذہین اور سادگی پسند حکمران

کمرہ بے حد سادہ تھا اور وہ بستر پر دراز تھے۔

پیرانہ سالی اور کئی روز کی علالت کے باوجود ان کے خوبصورت چہرے پر غیر معمولی عزم و اعتماد تھا اور ذہین آنکھیں گویا بولتی محسوس ہوتی تھیں۔

دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ آنے والا، مضبوط جسم اور بہت کھلتی رنگت کا مالک تھا اور اس کے نقوش بستر پر دراز شخصیت سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے چہرے پر مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ اس نے خوشی سے لرزتی آواز سے کہا: "ابا جان! اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے بروصہ فتح کر لیا ہے۔"

بستر پر دراز شخصیت کے چہرے پر بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ان کے ہونٹوں پر کلمہ شکر خداوندی جاری ہو گیا۔ پھر انہوں نے آنے والے کو مخاطب کیا:

"بیٹے! میں اب اس دنیا سے جا رہا ہوں، لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میرا لائق بیٹا میرا جانشین ہو گا۔ میری باتیں غور سے سنو۔ ظلم کبھی اختیار نہ کرنا۔ رعایا سے عدل و انصاف کے ساتھ پیش آنا تاکہ رعایا خوشحال ہو اور ملک آباد رہے۔ فتوحات کا دامن پھیلانا تاکہ اللہ کا دین ہر سُو عام ہو۔ علما، فضلا اور حکما کو ہمیشہ اپنے قریب رکھنا، ان کے مشوروں پر عمل کرنا اور شریعت کی پیروی کرنا، رعایا اور امرا میں اچھے اخلاق اور اچھی سیرت پیدا کرنے کی جدوجہد کو ہر بات پر مقدم رکھو گے تو انسانیت پھیلے گی۔ میری زندگی کا ایک مقصد تھا، دین پھیلے اور اخلاقِ حسنہ کا سکہ رواں ہو، تم بھی اس بات کو اپنا مقصد بنا لو۔ جو حکمراں رعایا کو عدل وانصاف نہیں دے سکتا وہ حکمراں بننے کا اہل نہیں ہے۔"

بیٹے کو گراں قدر نصیحتیں کرنے والی یہ شخصیت عثمان خان کی تھی جو سلطنت عثمانیہ کے بانی تھے اور شہر بروصہ کی فتح کی خوشخبری لے کر آنے والے تھے، عثمان خان کے صاحب زادے "اور خان۔"

عثمان خان کی شخصیت اس قدر سحر انگیز تھی کہ اس کا تاثر تقریباً سات صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی روزِ اوّل کی طرح بھرپور ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی داغ بیل ڈالنے اور اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں عثمان خان کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے پرچم جہاد بلند کیا، اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارا اور کئی محاذوں پر اسے شکست کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ کفار کے خلاف جہاد کرنے کی وجہ سے آپ کو عثمان غازی بھی کہا جاتا ہے۔

عثمان خان کا تعلق ترکوں کے قبیلے اوغوز سے ہے۔ اس قبیلے کے مورثِ اعلیٰ اوغوز خان تھے۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے "ترکانِ غز" کہلاتے تھے۔

ساتویں صدی ہجری / ۱۳ویں صدی عیسوی میں جب چنگیز خان اور اس کے بیٹوں نے عالم اسلام پر یلغار کی تو "ترکانِ غز" کا ایک قبیلہ اپنا وطن خراسان چھوڑ کر، ماہان چلا گیا۔ ماہان موجودہ روس میں ترکستان کے مشہور شہر "مرو" کے قریب ایک گاؤں ہے۔ ماہان کی تباہی کے بعد اس قبیلے کے سربراہ سلیمان شاہ ۵۹۷ھ / ۱۲۰۰ء میں اناطولیہ چلے آئے۔ اناطولیہ سے مراد موجودہ ترکی کا وہ حصہ ہے جو ایشیا میں شامل ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ جہاد کے خواہش مند تھے۔ مشرقی اناطولیہ میں سات برس قیام کے دوران انہوں نے شمال کے عیسائی دہشت پسندوں کا قلع قمع کیا جو اخلاط آکر لوٹ مار کرتے تھے۔ انہوں نے شمال کی بازنطینی (رومی) حکومت سے ٹکر لی جس کا مرکز طرابزون (موجودہ ترکی کی اہم بندرگاہ) تھا۔

اس کے بعد سلیمان شاہ نے شام کے مشہور شہر حلب کی طرف

Marfat.com

ہجرت کی۔ مختلف موٴرخین نے ان کے اس اقدام کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایران میں منگولوں کی واپسی شروع ہوگئی تھی، دوسرے یہ کہ سلیمان شاہ آخری صلیبی جنگ میں شرکت کے لیے بیت المقدس جارہے تھے۔ جب یہ قافلہ حلب کے قریب دریائے فرات پر پہنچا تو سلیمان شاہ دریا پار کرتے ہوئے پانی میں ڈوب کر جاں بحق ہوگئے۔ ان کو قلعہ جعبر کے سامنے دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کو "ترک مزاری" کہتے ہیں اور یہ آج بھی قائم ہے۔

سلیمان شاہ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے ارطغرل اور دوندار نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشرقی اناطولیہ کا سفر جاری رکھا۔ وہ قونیہ کی طرف گامزن تھے کہ راستے میں شہر سیواس کے قریب ایک میدان میں اُنہیں دو فوجوں میں زبردست جنگ ہوتی نظر آئی۔ ان میں سے ایک حریف طاقتور تھا اور دوسرا کمزور۔ ارطغرل نے کمزور کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے فوجوں کے پرچموں اور سپاہیوں کی وضع قطع اور لباس سے بھی ان کی قومیت اور مذہب کا اندازہ لگا لیا ہو۔ بہرحال ارطغرل کے پاس حالانکہ صرف ۴۴۴ سوار تھے لیکن وہ اس مختصر سی جمعیت کو لے کر اس طاقتور فوج پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے جو ایک کمزور فوج کے سپاہیوں کو مار رہی تھی۔ یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ اس بڑی فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو یہی گمان گزرا کہ حریف کو کہیں سے تازہ دم سپاہیوں کی بڑی کمک حاصل ہوگئی ہے۔ اس زبردست فوج کے سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انہیں بھاگتے ہی بنی۔

جب میدان صاف ہوگیا تو فاتح فوج کے سپہ سالار نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ کون لوگ تھے جو ایک نازک موقع پر رحمت کے فرشتے بن کر آئے۔ تعارف کی رسم ادا ہوئی تو انکشاف ہوا کہ بھاگنے والی فوج منگولوں (چنگیز کے ساتھیوں) کی تھی اور ارطغرل اور ان کے ساتھیوں نے جس فوج کی مدد کی وہ سلجوقی حکمران علاؤالدین کیقباد کی تھی۔

علاؤالدین کیقباد نے ارطغرل کی بہادری اور جواں مردی کے اعتراف کے طور پر انہیں ایک علاقہ کا حاکم بنادیا۔ اس علاقے کا نام "سغد" بھی لکھا گیا ہے "سغوت" بھی اور "سوگود" بھی۔ یہ سرسبز علاقہ دریائے سقاریہ کی بائیں جانب واقع تھا۔ گو کہ یہ کوئی وسیع علاقہ نہ تھا لیکن بازنطینی (رومی) سلطنت کی سرحد کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے اس کی بہت اہمیت تھی۔ علاؤالدین نے ارطغرل کو "اوج بک" یعنی "سرحدی سردار" کا لقب بھی دیا۔ ارطغرل بہت نڈر اور ہوشیار جرنیل تھے۔ رومی سرحدی قلعوں میں موجودہ فوجوں کی جانب سے جتنے بھی حملے ہوئے، ارطغرل نے اپنی مختصر سی سپاہ کو خوبی سے استعمال کر کے یہ تمام حملے پسپا کردیے۔ اس طرح اطراف کے تمام علاقوں میں ترکوں کی شجاعت کے چرچے عام ہوگئے اور بہت سے ترک قبائل ارطغرل سے آملے، یوں ترکوں کی قوت میں اضافہ ہوگیا۔

کچھ عرصے بعد ارطغرل نے علاؤالدین کے نائب کی حیثیت سے منگولوں اور بازنطینیوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اس کارنامے پر خوش ہو کر علاؤالدین نے "اسکی شہر" کو بھی ارطغرل کے زیر انتظام دے دیا۔ اور ان کے تحت آنے والے پورے علاقے کا نام "سلطانونی" رکھ دیا۔ "اسکی شہر" وسطی اناطولیہ کے مغربی حصے میں واقع ہے اور اپنے گرم چشموں کے لیے مشہور ہے۔ علاؤالدین نے ارطغرل کو اپنی فوج کے مقدمۃ الجیش (ہراول دستے) کا سالار بھی مقرر کردیا۔ سلطانونی کا علاقہ بھی بہت سرسبز تھا، اس کے بڑے حصے میں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی اور انگور کے باغات کی کثرت تھی۔

۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں اللہ تعالیٰ نے ارطغرل کو ایک بیٹا عطا کیا، ارطغرل نے اپنے بیٹے کا نام عثمان خان رکھا۔ لوگوں نے انہیں "عثمان جوق" یعنی پیارا عثمان یا ننھا عثمان کہنا شروع کردیا۔ یہ وہی سال ہے جب منگولوں کے ہلاکت خیز طوفان نے بغداد کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عثمان خان کی ولادت کی صورت میں ملتِ اسلامیہ ایک نئے دور کا آغاز کررہی تھی۔ ایک بھرپور اور تابناک دور، جو دولتِ عثمانیہ کے نام سے تقریباً ساڑھے چھ سو برس کی طویل مدت پر محیط ہے۔

عثمان خان نے مروّجہ تعلیم پائی اور جنگی فنون پر دسترس حاصل کی۔ جلد ہی وہ مختلف جنگوں میں اپنے والد کی نیابت کرنے لگے۔ اسکی شہر سے ملے ہوئے علاقے "ایترونی" میں ایک بڑے عالم رہتے تھے جن کا نام شیخ ادہ بالی تھا۔ عثمان اکثر شیخ کے پاس ان کے علم سے فیضیاب ہونے کے لیے جایا کرتے تھے۔ شیخ نے اپنی بیٹی مال خاتون کی شادی عثمان خان سے کردی۔ مال خاتون نہ صرف ظاہری خوبصورتی سے مالا مال تھیں بلکہ علم و عمل اور سیرت کے اعتبار سے بھی بلندیوں پر فائز تھیں۔ انہی خاتون کے بطن سے عثمان خان کے بیٹے اور خان اور علاؤالدین پیدا ہوئے۔ عثمان کے انتقال کے بعد اور خان ہی نے عثمانی مملکت کی باگ ڈور سنبھالی۔

Marfat.com

۶۸۷ھ /۱۲۸۸ء میں ارطغرل کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۹۰ سال تھی۔ انہیں سغوت کے قریب دفن کیا گیا۔ ارطغرل کی وفات کے بعد ان کے زیر انتظام تمام علاقہ، عثمان خان کے سپرد کردیا گیا۔ عثمان خان نے انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی بازنطینی علاقوں کی جانب توجہ دی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے اور اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کوشاں تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکومت آپس کی فرقہ وارانہ جنگوں اور بدنظمی کا شکار تھی، تاہم عثمان خان نے رومی سلطنت پر خود بڑھ کر حملے نہیں کیے بلکہ چھیڑ چھاڑ پہلے خود رومیوں نے شروع کی۔ عثمان خان کے اقتدار سنبھالنے کے صرف ایک سال بعد یعنی ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں قراجہ حصار کے قلعہ والوں نے حملہ کیا۔ عثمان خان نے اس قلعے کو فتح کرلیا۔ علاؤالدین نے یہ قلعہ بھی عثمان خان کی تحویل میں دے دیا، اپنے نام کا سکہ ڈھالنے کی اجازت دی اور ان کا نام خطبے میں شامل کردیا۔

۶۹۰ھ /۱۲۹۱ء سے ۶۹۷ھ /۱۲۹۸ء تک کا عرصہ عثمان خان نے اپنی قلمرو کے نظم ونسق کو سنوارنے میں صرف کیا۔ ۶۹۷ھ میں رومیوں نے پھر حملہ کیا لیکن عثمان خان نے انہیں مار بھگایا۔ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۸ء میں حصار بیلہ جک کے سردار نے اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب میں عثمان خان کو مدعو کیا۔ سردار کا ارادہ یہ تھا کہ اس تقریب میں عثمان خان کو بے بس کر کے انہیں قیدی بنالیا جائے، لیکن عثمان خان کو اس سازش کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ اپنے چالیس ساتھیوں کے ہمراہ تقریب میں پہنچے جن کے لباس میں اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ تقریب کے دوران میں ان پر قابو پاکر انہیں قید کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور بڑی چابکدستی کے ساتھ قلعے پر قبضہ کرلیا۔

اپنے ابتدائی دور میں عثمان خان نے اطراف کے عیسائی قبائل اور حکام کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ خرمتجک کے عیسائی حاکم کوسہ میخائیل مسلمان ہوگئے اور انہوں نے رومیوں کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ اسی دور میں شمال کی سمت اینہ گول، یار حصار اور کوپری حصاری کے قلعے بھی فتح کیے گئے۔ پہلے ان مقامات پر ان امرا کا قبضہ تھا جو رومیوں کو باقاعدگی سے خراج ادا کیا کرتے تھے۔ یہ علاقے پہاڑیوں اور وادیوں پر مشتمل ہیں۔ کوپری حصاری کی فتح بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ بعد میں جو علاقے فتح ہوئے ان کے لیے فوجی کارروائیوں کا مرکز کوپری حصاری کا قلعہ تھا۔

عثمان خان نے جب اطراف کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت پہنچائی تو لفکہ اور قادرلی کے شہزادوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا، لیکن جن حکمرانوں نے اسلام کی دعوت کا مذاق اُڑایا، عثمان خان نے ان حکمرانوں کے علاقوں کو بھرپور حملہ کر کے فتح کرلیا۔ ان میں مارطونی، گوئیک، طرقلی، قراقین، طقرنیاری وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

۷۰۰ھ / ۱۳۰۰ء میں جب آخری سلجوقی حکمران علاؤالدین ثانی، منگولوں کے حملے میں جاں بحق ہوگئے تو عثمان خان نے ینی شہر پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔ اسی عرصے میں عثمان خان نے ایک قریبی ریاست "قرۃ مان" کو جنگ کر کے فتح کرلیا۔ رومیوں نے خطرہ بھانپ کر ۷۰۱ھ / ۱۳۰۱ء میں ایک بڑی فوج حملے کے لیے بھیجی۔ عثمان خان کی فوج قیون حصار کے مقام پر بڑی بہادری سے لڑی۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ چھ سال کے مختصر عرصے میں عثمان خان کی مملکت کی حدود بحراسود کے ساحل کو چھورہی تھیں۔

اس کے بعد عثمان خان نے "برُسہ" کی طرف توجہ دی، جو ماضی میں "بروصہ" کہلاتا تھا۔ یہ شہر موجودہ مشرقی ترکی میں بحیرۂ مرمرہ کے قریب کول الوداق کے دامن میں واقع ہے اور ترکی کا ایک بڑا شہر ہے۔ ماضی میں بھی یہ بڑا اہم شہر تھا جسے بعد میں عثمانیوں نے خوب ترقی دی۔ اس شہر کی حفاظت کے لیے رومی فوج نے جان توڑ کوشش کی۔ شہر والے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ قیصر روم نے منگول حکمران غازان خان کو ساتھ ملانے کی بڑی تگ ودو کی۔ اپنی بہن میریا کی شادی غازان خان سے کرنے کا اعلان کیا، لیکن یہ تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، بہرحال یہ ضرور ہے کہ برسہ والوں نے ۷۱۷ھ /۱۳۱۷ء سے ۷۲۶ھ /۱۳۲۶ء تک یعنی تقریباً دس سال کے طویل عرصے تک عثمانی فوج کے محاصرے کے خلاف مزاحمت کی لیکن عثمانی فوج کی مستقل مزاجی کے آگے وہ اس سے زیادہ نہ ٹھہر سکے، ان کے پاس سامان خورونوش ختم ہوگیا اور فاقوں تک نوبت آگئی۔

برسہ کے خلاف جہاد کا آغاز عثمان خان نے کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی اسلامی مملکت کو تیزی سے وسعت دیتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچنا چاہتے تھے، یہ خواب ان کی زندگی میں تو پورا نہ ہوسکا البتہ، دولتِ عثمانیہ کے ساتویں حکمران سلطان محمد فاتح نے اس خواب کو پورا کر دکھایا۔ برسہ کا محاصرہ طول پکڑ گیا تھا، دس سال کی مدت کم نہیں ہوتی۔ اس دوران

Marfat.com

عثمان خان علیل ہو گئے۔ وہ سغد چلے گئے اور برسہ کی فتح کی خوشخبری کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔

آخر ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں وہ تاریخی دن آ گیا جب عثمان خان کے صاحب زادے اورخان برسہ کی فتح کی خوشخبری لیے ہوئے اپنے والد کے پاس حاضر ہوئے اور وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ اس کے چند دنوں بعد ۲۱ رمضان المبارک ۷۲۶ھ/۲۱ اگست ۱۳۲۶ء کو عثمان خان سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں برسہ لے جا کر دفن کیا گیا۔ برسہ میں ان کا مزار آج بھی موجود ہے۔

برسہ کو دارالحکومت بنانے کی جو ہدایت عثمان خان نے اپنے بیٹے کو دی تھی وہ نہایت دانشمندانہ تھی۔ اس طرح عثمانیوں نے اس شہر میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے اور قسطنطنیہ کی فتح کی راہیں ہموار ہو گئیں۔

عثمان خان نے ۶۸ برس کی عمر پائی اور ۳۸ سال حکومت کی۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے عثمانی مملکت کو جنوب میں قوطیہ اور شمال میں بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ اسود تک وسیع کر دیا۔ ان کی قلمرو کا طول ایک سو بیس میل اور عرض ساٹھ میل تھا۔ گو کہ یہ مملکت بہت مختصر محسوس ہوتی ہے لیکن یہی ننھا سا پودا صرف دو سو سال میں بڑھ کر ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ عثمانی سلطنت کے اس گھنے درخت کی شاخیں، دسویں عثمانی فرماں روا سلیمان اعظم قانونی (سلیمان اول) کے دور میں پھیل کر ایک طرف بحیرۂ ہنگری اور دوسری جانب بصرہ، تیسری طرف بحیرۂ کیسپیئن (بحیرۂ خزر) اور چوتھی جانب بحیرۂ روم کے مغربی حصے تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عثمان خان کے ابتدائی دور میں اناطولیہ میں کئی تحریکیں جاری تھیں۔ یہ تحریکیں فوجی اور روحانی بنیادوں پر قائم تھیں۔ ان میں غازیانِ روم اور باجیانِ روم شامل ہیں۔ ہر تحریک میں تیس ہزار مسلح افراد شامل تھے۔ باجیانِ روم صرف خواتین کی تحریک تھی، تاہم عثمانی مملکت کو وسعت اور استحکام بخشنے میں جس تحریک نے بڑا کردار ادا کیا وہ "اخی تحریک" کہلاتی ہے۔ اس تحریک کا آغاز مولانا جلال الدین رومیؒ اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی تعلیمات اور کوششوں سے ہوا۔ یہ تحریک عالمِ اسلام پر منگولوں کے پے در پے حملوں کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوئی۔ اس تحریک نے اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف زبردست مزاحمت کی اور مسلمانوں میں اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ ساتھ اجتماعی جہاد کا احساس بھی بیدار کیا۔

عثمان خان نے جب ہوش سنبھالا تو پورے اناطولیہ میں اخی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی۔ خود عثمان خان کے والد ارطغرل اس تحریک کے سرگرم رکن تھے، عثمان خان نے بھی بعد میں اسی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ اس تحریک کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ارکان، اسلام کو اپنی زندگی کے ہر گوشے پر نافذ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے قائدین میں ذی علم شخصیات شامل تھیں۔ یہ قائدین نہ صرف دین کے علم سے بہرہ ور تھے بلکہ عمل کی دنیا کے بھی شہسوار تھے اور جنگی مہارت سے بھی مالا مال تھے۔

تحریک کے ارکان بڑے محنتی تھے، وہ عام مسلمانوں کی مدد کرتے تھے، ان کو ظلم و زیادتی سے بچاتے تھے، مسافروں کی خدمت کرتے تھے، لوٹ مار کی روک تھام کرتے تھے۔ ملحد، نجومی، بدچلن اور سود خور لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مشہور سیاح ابنِ بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے میں اس تحریک کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اخی لوگ مسافروں کی خاطر مدارات کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ساری دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں پایا جاتا۔"

عثمان خان کو اس تحریک کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ خود عثمان خان اس تحریک کے اہم رکن تھے۔ عثمان خان کے خسر شیخ ادہ بالی، قرہ خلیل، اخی حسن اور غازی محمود تحریک کے قائدین میں سے تھے۔

عثمان خان کا مزاج نہایت سادہ تھا۔ انہوں نے جب ینی شہر فتح کیا تو وہاں اپنے لیے سادہ سا مکان منتخب کیا، حالانکہ یہ شہر یونانیوں کا بڑا مرکز تھا اور یہاں محلوں اور عالی شان مکانات کی کوئی کمی نہ تھی۔ عثمان خان کا دستر خوان بھی سادگی کی تصویر ہوتا تھا اور اس پر پُرتکلف کھانے نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے ہاں سونے اور چاندی کے برتنوں کا بھی کوئی رواج نہ تھا اور گھر میں سامانِ تعیش کبھی نہ دیکھا گیا۔ عثمانی حکومت کے اس پہلے سربراہ کے انتقال کے بعد ان کے گھر سے جو مختصر سا اثاثہ برآمد ہوا وہ یہ تھا: ایک سوتی عمامہ، لکڑی کے دو چمچے، ایک نمکدان، ایک دیگچی، چند عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند بیل، چند بھیڑیں اور ایک تلوار۔ عثمان خان معمولی کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ بھیڑوں کی گلہ بانی کو باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

Marfat.com

عثمان خان بڑے باعمل انسان تھے۔ نماز کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ فرض نمازوں کے علاوہ راتوں کو بھی اپنے رب کی عبادت کیا کرتے تھے۔ وہ بے حد دلیر، باہمت، بے خوف اور مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت نرم خو، رحم دل اور فیاض بھی تھے۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے اپنی کتاب "تاریخ اسلام" میں لکھا ہے کہ "جب عثمان سیدھے کھڑے ہوتے تھے تو ان کے ہاتھ، ان کے گھٹنوں تک پہنچ جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص غیر معمولی طور پر بہادر ہوتا ہے۔" وہ اپنے دشمنوں سے بہت سخت برتاؤ کرتے تھے اور جب تک جنگ جاری رہتی، پوری قوت سے دشمن پر حملے جاری رکھتے تھے، لیکن جب دشمن مفتوح ہوجاتا اور اس کی رعایا عثمانی حکومت کی رعایا بن جاتی تو وہ کسی شفیق باپ کی طرح مہربان ہوجاتے تھے۔ وہ خداترس اور شریعت کے پابند حکمراں تھے۔

وہ جب بھی کسی نئے علاقے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرتے، اس علاقے کے باشندوں اور حکمرانوں کو دعوت دیتے کہ اسلام قبول کرلیں یا محکوم بن کر جزیہ دیتے رہیں، ان کا تحفظ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہوگی یا پھر جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔ یہ بالکل درست اسلامی طرز عمل تھا۔ عثمان خان جب بھی اپنی فوج کو کسی علاقے کی سمت پیش قدمی کا حکم دیتے تو ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کردیتے کہ اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے حملوں کا بڑا مقصد یہ تھا کہ دنیا کا زیادہ سے زیادہ حصہ اسلام کی برکتوں سے فیض یاب ہوسکے۔

یہ عثمان خان کی خوش خلقی اور اچھے سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ غیر مسلموں نے ان سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں اسلام قبول کرلیا۔ ان میں مشہور رومی سپہ سالار اور بیجک کے فرمانروا، کوسہ میخائل بھی شامل ہیں۔ ان کے قبولِ اسلام سے عثمانی مملکت کو بہت تقویت پہنچی۔ عثمان خان اناطولیہ کے پہلے مسلمان حکمراں ہیں جنہوں نے منگولوں کی بڑی فوج کو قنیسہ کے مقام پر زبردست شکست دی۔ اس جنگ میں منگولوں کی بڑی تعداد ماری گئی اور بے شمار کو قیدی بنالیا گیا۔ ان تمام قیدیوں سے بہت اچھا برتاؤ کیا گیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں قیدی مسلمان ہوگئے۔ ان نو مسلم منگولوں نے اسلام کی تبلیغ میں اہم کردار ادا کیا، اس طرح عثمان خان نے اسی قوم سے اشاعتِ اسلام کا کام لیا جو کچھ ہی عرصہ قبل عالم اسلام کے بڑے حصے کی بربادی کا باعث بنی تھی۔ وہ اناطولیہ کے پہلے مسلمان حکمراں ہیں جنہوں نے روم اور یونان کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دی۔

عثمان خان بے حد ذہین اور معاملہ فہم انسان تھے۔ وہ انتظامی امور کو سلیقہ سے نمٹانے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ مشکل سے مشکل اور نہایت پیچیدہ مسائل کا حل فوراً تلاش کرلیتے اور ان کا ذہن بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ جاتا اور ان کے مشیر محسوس کرتے کہ امیر عثمان کی رائے سب سے زیادہ سلجھی ہوئی اور درست ہے۔ وہ زبردست قوتِ فیصلہ کے مالک تھے۔ وہ لوگوں سے کام لینے کا گر بھی جانتے تھے۔

عسکری صلاحیتیں ان میں گویا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ دشمن پر حملہ کی عجیب تکنیک اختیار کرتے۔ ان کی فوج دشمن کے علاقے کے قلب پر حملہ آور ہوتی اور علاقے کو بیچ سے دو حصوں میں منقسم کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی، اس طرح دشمن کی قوت دو حصوں میں بٹ جاتی اور اس کے لیے بھرپور حملہ کرنا دشوار ہوجاتا۔ عثمان خان بہت اچھے شہسوار بھی تھے۔

عثمان خان کو جاہ و حشمت اور حکمرانی کی ہوس نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب سلجوقی حکومت بہت کمزور ہوگئی تب بھی عثمان خان نے اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا، حالانکہ وہ چاہتے تو سلجوقیوں کے پورے علاقے پر قبضہ کرسکتے تھے۔ جب سلجوقی حکمراں علاءالدین کیقباد کا انتقال ہوا تو کرمان کے سوا ان کے زیر انتظام تمام علاقے، عثمان خان کے تحت آگئے، اس وقت عثمان خان نے سلجوقی دارالحکومت قونیہ پر اپنی پسند کے آدمی مقرر نہیں کیے بلکہ سلجوقی خاندان ہی کے افراد کو قونیہ پر حکومت کی اجازت دے دی۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عثمان خان کس قدر نیک نفس حکمراں تھے۔ عثمان خان نے خود کو بھی سلطان نہیں کہلوایا۔ وہ اپنے آپ کو امیر کہلوانا پسند کرتے تھے۔

عثمان خان کے بہترین انتظام حکومت میں ان کے بہادر اور وفادار رفقائے کار، غازی عبدالرحمٰن، آئیغود الپ، آقچہ قوجہ، قوغور آلپ کا بھی کردار ہے۔ عثمان خان نے اپنے ۳۸ سالہ دور حکومت کا بڑا حصہ جنگوں میں گزارا۔ وہ عثمانی حکومت کے پہلے حکمران تھے، چنانچہ انہیں علمی خدمات انجام دینے اور تعمیرات کی جانب توجہ دینے کی زیادہ فرصت نہ مل سکی۔ ان کے مذہبی مشیروں میں ان کے خسر شیخ ادہ بالی، المولیٰ طور، ابوالقاسم القرہ حصاری، شیخ عارف باللہ، شیخ عاشق باشا اور شیخ حسن شامل ہیں۔ المولیٰ طور مذہبی امور کے قاضی القضاۃ تھے۔ شیخ

Marfat.com

عارف باللہ جنگوں میں عثمان خان کے ساتھ رہتے تھے۔ شیخ عاشق باشا نے تصوف پر کئی کتابیں تحریر کی تھیں۔ عثمان خان نے اسکی شہر میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ یہ سلطنتِ عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔

عثمان خان کے نام پر رُوئے زمین پر ایک وسیع و عریض مملکت قائم ہوئی۔ انہی کے نام پر ترکوں نے اپنے آپ کو عثمانی کہنا شروع کیا۔ عثمانی سلطنت ۶۸۷ھ سے ۱۳۳۴ھ / ۱۲۸۸ء سے ۱۹۲۴ء تک یعنی تقریباً ساڑھے چھ سو برس تک قائم رہی، دنیا کی تاریخ میں اتنی طویل مدتِ اقتدار شاید ہی کسی خاندان کو نصیب ہوئی ہو۔ پھر یہ کہ اس خاندان نے اسلامی مملکت کو جو استحکام عطا کیا، علم و فن اور تعمیرات کے جو روشن نمونے قائم کیے اور اسلام کی جس طور خدمت کی وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، عثمانیوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے خلافت کو صدیوں تک برقرار رکھا۔

تمام عثمانی، عثمان خان سے بہت عقیدت رکھتے ہیں اور ترکوں کی داستانوں میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ عثمان خان کی زبردست شخصیت کے سحر کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ عثمان خان کے بعد جتنے عثمانی حکمران اور خلفا تخت نشین ہوئے ان سب کی تخت نشینی کے وقت عثمان خان کی تلوار نئے حکمران یا خلیفہ کی کمر سے باندھی جاتی تھی۔ تلوار کمر سے باندھنے کی یہ تقریب مسجد جامع ابو ایوب انصاریؓ میں منعقد ہوتی تھی اور اس موقع پر نئے خلیفہ کے لیے یہ دعا کی جاتی تھی کہ "اللہ تعالیٰ ان میں بھی عثمان جیسی خوبیاں پیدا فرمائے۔"

***

Marfat.com

اَور خان

انہوں نے یورپ میں مسلمانوں کی پہلی حکومت قائم کی

"لالہ شاہین، آپ ازنیق پر حملہ کریں۔ اگر آپ دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو مالِ غنیمت آپ کا ہو گا۔" صاف رنگت، دلکش نقوش اور مضبوط جسم کے مالک شخص نے اپنے آزاد کردہ غلام کو مخاطب کیا۔

لالہ شاہین اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد وہ سرخرو ہو کر لوٹے۔ اس مہم کے نتیجے میں بہت سامالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا تھا۔

دلکش نقوش والی شخصیت نے اپنے نائب امیر امور مذہبی مولیٰ خلیل کو بلایا جو برسہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بھی تھے اور ان سے پوچھا: "اصول تو یہ ہے کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ حکومت کے لیے رکھ لیا جائے لیکن میں لالہ شاہین کو مالِ غنیمت دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ آپ بتائیں کہ کیا کیا جائے؟"

"اگر لالہ شاہین آپ کے غلام ہوتے تو اس صورت میں آپ کو ان کے مال پر حق تھا، لیکن اب وہ آزاد ہیں اس لیے آپ کا ان کے مال پر کوئی حق نہیں، جبکہ آپ اپنا مالِ غنیمت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔" مولیٰ خلیل نے جواب دیا۔

نائب امیر امور مذہبی کا دو ٹوک جواب سن کر دلکش نقوش کی مالک شخصیت نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لالہ شاہین کے مالِ غنیمت سے ایک ذرہ بھی نہ لیا۔

یہ تھے دوسرے عثمانی فرمانروا "اور خان" جن کا شاندار عہد حکومت ترکوں کی تاریخ کا دمکتا باب ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کی پہلی حکومت اَور خان ہی کی کوششوں کے نتیجے میں قائم ہوئی اور دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج تشکیل دینے کا شرف بھی اَور خان کو ہی حاصل ہے۔

اَور خان کا نام تاریخ میں "ارخان" یا آرخان بھی لکھا گیا ہے۔

ابن بطوطہ نے ان کا ذکر "اختیار الدین ارخان بک" کے نام سے کیا ہے۔ ترک انہیں "اَور خان غازی" کہتے ہیں۔ اَور خان کی تاریخ پیدائش کے معاملے میں اختلاف ہے۔ عثمانی مؤرخین کے مطابق اَور خان یکم محرم الحرام ۶۸۷ھ / ۶ فروری ۱۲۸۸ء کو پیدا ہوئے، دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق دیگر مؤرخین کا اصرار ہے کہ اَور خان کی پیدائش یکم محرم الحرام ۶۸۰ / ۲۲ اپریل ۱۲۸۱ء کو عمل میں آئی۔ اَور خان کے والد عثمان خان، دولتِ عثمانیہ کے بانی تھے، اور ان کی والدہ مال خاتون ایک برگزیدہ بزرگ شیخ ادہ بالی کی صاحبزادی تھیں۔ اَور خان کی تربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ تھا جو ۴۵ برس تک اَور خان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔

اَور خان کو بچپن ہی سے فنونِ حرب کی تعلیم دی گئی تھی۔ جب وہ ۱۹ برس کے ہوئے تو یار حصار کے حکمران کی بیٹی نیلوفر خاتون سے ان کی شادی کر دی گئی۔ یہ ایک یونانی لڑکی تھی، جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی خاتون سے اَور خان کے دو لڑکے سلیمان پاشا (۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء) اور مراد اول (۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء) پیدا ہوئے۔

اَور خان اپنے والد محترم عثمان خان کے شانہ بہ شانہ جنگوں میں شریک ہوتے رہتے تھے اور انہوں نے اپنی لیاقت، قائدانہ صلاحیت اور جرأت کا لوہا منوالیا تھا۔ ۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء میں عثمان خان نے شہر برسہ کا محاصرہ کیا۔ یہ بہت اہم شہر تھا۔ اس شہر کی حفاظت کے لیے رومی فوج نے سرتوڑ کوشش کی۔ عثمان خان کو بھی اس شہر کی اہمیت کا اندازہ تھا اس لیے انہوں نے محاصرہ ختم نہ کیا حتیٰ کہ دس سال بیت گئے۔

اس دوران میں عثمان خان بیمار ہو گئے۔ ان کی عمر تقریباً ستر برس ہو گئی تھی۔ وہ برسہ کا محاصرہ اپنے بیٹے اَور خان کے سپرد کر کے خود سغد چلے گئے، جو دریائے سقاریہ کی بائیں جانب واقع تھا۔ اَور خان کی قیادت

Marfat.com

میں جاری رہنے والا محاصرہ کامیاب ثابت ہوا اور برسہ کی فوج نے فاقوں سے تنگ آکر بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ یہ فتح اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس جنگ میں کسی کا خون نہیں بہا۔

برسہ پر مسلمانوں کے قبضہ کے کچھ ہی دنوں بعد عثمان خان کا انتقال ہوگیا۔ عثمان خان نے اپنے انتقال سے قبل اپنے بیٹے اُورخان کو نصیحت کی: "ہماری روح تم سے اسی وقت خوش رہ سکتی ہے جب تم خلقِ خدا کو خوش رکھو گے۔"

اُورخان نے اپنے باپ کی نصیحت کا پوری طرح احترام کیا۔ ان کا ۳۳ سالہ دورِ حکومت اس بات پر شاہد ہے کہ انہوں نے خلقِ خدا کو خوش و خرم رکھا۔

عثمان خان کے دو بیٹے تھے۔ اُورخان اور علاؤالدین۔ اورخان کو جنگی فنون میں مہارت حاصل تھی اور علاؤالدین دینی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ تمام حالات اورخان کے حق میں تھے۔ علاؤالدین یوں بھی صلح جو قسم کے انسان تھے۔ اُورخان چاہتے تو پوری عثمانی مملکت کے حکمران بننے کا اعلان کر دیتے لیکن انہوں نے ایسا کرنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے اپنے بھائی علاؤالدین کو پیشکش کی کہ مملکت کو آدھا آدھا تقسیم کرلیا جائے لیکن علاؤالدین نے اسے منظور نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو آپ نیلوفر ندی (برسہ کے میدان سے گزرتی ہے) کے کنارے کسی گاؤں میں آباد ہو جانے کی اجازت دے دیں۔ اورخان نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اصرار کرتے رہے کہ علاؤالدین مملکت کی وزارت قبول کرلیں حتیٰ کہ علاؤالدین نے ان کی بات مان لی۔

علاؤالدین عثمانی قلمرو کے پہلے وزیر ہیں۔ "پاشا" کا لقب بھی پہلی بار ان ہی کو دیا گیا۔ انہیں فوج کا سپہ سالار بھی بنایا گیا، علاؤالدین کو وزارت سونپنے کا فیصلہ بہت اچھا ثابت ہوا۔ اُورخان کی حکومت کو استحکام اور وسعت بخشنے میں علاؤالدین کا کردار بے حد اہم ہے۔ وہ بہت اچھے منتظم تھے۔ انہوں نے عثمانی حکومت کو فوجی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بہت مضبوط بنا دیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، اُورخان نے اپنے والد کی زندگی میں ہی برسہ کو فتح کرلیا تھا۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنے والد کی ہدایت کے مطابق برسہ کو دارالحکومت بنایا۔ اپنی حکمرانی کے پہلے ہی سال انہوں نے ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں جزیرہ نما بیتینیا (بیتھینیہ) پر قبضہ کرلیا۔ یہ جزیرہ نما شمال میں بحیرۂ اسود، جنوب میں خلیج نیقومدیہ اور مشرق میں باسفورس سے گھرا ہوا ہے۔

اُورخان نے سمندرہ اور ایدوس کے مضبوط قلعوں کو رومیوں سے چھین لیا۔ یہ قلعے نیقومدیہ سے قسطنطنیہ جانے والی سڑک کے تحفظ کے لیے بنائے گئے تھے۔ یہ علاقہ ایک مشہور سپہ سالار اقچہ قوجہ کو دے دیا گیا اور ان ہی کے نام پر قوجہ ایلی کہلانے لگا۔ اس میں خلیج نیقومدیہ کا سارا ساحل شامل تھا۔ سمندرہ اور ایدوس کے مضبوط قلعے تسخیر ہونے کے نتیجے میں خلیج نیقومدیہ کی دونوں جانب ساحلوں پر کئی چھوٹے چھوٹے قصبے فتح ہوگئے تاہم قلعہ ہرکہ والوں نے زیادہ مزاحمت کی۔ اورخان کے ایک سالار قرہ مُرسل نے یالوہ پر قبضہ کیا۔ یہ قصبہ اپنے گندھک کے چشموں کی وجہ سے مشہور تھا۔ قرہ مُرسل نے جنوبی ساحلی علاقوں کو بھی فتح کیا۔ انہوں نے ایک چھوٹا بحری بیڑہ بھی بنایا، جس کی وجہ سے قسطنطنیہ والے، نیقومدیہ سے بحری مواصلات کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ قسطنطنیہ پر ان دنوں بازنطینی رومیوں کا قبضہ تھا۔

اب نیقومدیہ پر قبضہ بہت آسان ہوگیا تھا چنانچہ ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں نیقومدیہ فتح ہوگیا۔ اس شہر کو "نیکومیڈیا" بھی لکھا گیا ہے۔ ابتدائی زمانے کے عرب جغرافیہ نویس اسے "نقمودیہ" لکھتے تھے۔ آج کل اسے "ازمید" کہا جاتا ہے۔ ازمید چھن جانے کے بعد بازنطینی (رومی) سلطنت کے پاس ایشیا میں صرف ایک بڑا شہر "نیقیا" رہ گیا تھا۔ (اس شہر کو "نیکیا" بھی لکھا گیا ہے، ترک اسے "یزنیق" یا ازنیق کہتے ہیں)۔ ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ ازنیق کا شہر جھیل ازنیق کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ شہر میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک اونچی سنگی سڑک تھی جس کی دونوں جانب پانی تھا۔ یہ راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک وقت میں اس پر سے ایک ہی سوار گزر سکتا تھا۔

اس شہر میں بہت سے باغات تھے۔ اس کے گرد چار فصیلیں تھیں اور ہر دو فصیلوں کے درمیان ایک خندق تھی۔ ان خندقوں کو عبور کرنے کے لیے لکڑی کے ایسے پل تعمیر کیے گئے تھے جنہیں حسبِ ضرورت اٹھا لیا جاتا تھا۔ اُورخان نے ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں اس شہر کو فتح کرلیا۔ اس موقع پر اُورخان نے رواداری اور فراخ دلی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ انہوں نے نیقیا کے باشندوں کو مکمل امان دے کر ان سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا تمام مال و اسباب لے کر کسی دوسرے شہر میں جاسکتے ہیں۔ اس حسن سلوک کے نتیجے میں یہ ہوا کہ بہت سے غیر

Marfat.com

مسلموں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس دوران اُورخان کو چند چھوٹی ریاستوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو سلجوقی سلطنت کے اندر قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں ایک ریاست قرہ سی تھی۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں آماسیہ کہلاتا تھا۔ قرہ سی میں ایلی عجلان بیگ کی حکومت تھی جن کے اُورخان سے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ عجلان بیگ نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے طرسون کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اُورخان کے پاس بھیجا تھا۔ عجلان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے تیمور کو حکومت ملی لیکن لوگ ان سے ناخوش تھے۔ طرسون نے اُورخان سے مدد چاہی اور بدلے میں برغمہ، بلکسری اور ادرمد کے علاقے دینے کا وعدہ کیا۔ اُورخان نے قرہ سی پر حملہ کر دیا اور راستے میں اولوباد، کرماستی اور دیگر کئی یونانی قلعوں کو بھی فتح کر لیا۔ طرسون اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا گیا۔ ۷۳۷ھ/ ۱۳۳۶ء میں اُورخان نے قرہ سی پر قبضہ کر لیا۔ اُورخان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر ساحلی علاقوں میں آباد یونانیوں کی بڑی تعداد مسلمان ہو گئی۔

۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء میں اُورخان نے چھتیس بحری جہازوں کی مدد سے قسطنطنیہ کے قریب اترنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد غالباً تراکیا (تھریس) پر قبضہ کرنا تھا، لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور ترک اپنا صرف ایک جہاز بچا کر لا سکے۔ تھریس مقدونیہ کا حصہ تھا جس میں سالونیکا بھی شامل تھا۔ اس دوران قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ کہاں تو یہ وقت تھا کہ یہ پورے اناطولیہ (ایشیائی ترکی) سے شام تک پھیلی ہوئی تھی اور اب یہ صرف تھریس اور یونان میں موریا کے بڑے حصے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

۷۳۹ھ/ ۱۳۳۸ء میں بازنطینی شہنشاہ اینڈرونیکس سوم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے نابالغ لڑکے جان پیولوغوس (پلیولوگس) کے سر پر تاج رکھ دیا گیا اور کانتاکوزنیوس (کنٹاکوزین) کو نگران مقرر کیا گیا۔ کانتاکوزنیوس نے صرف پانچ سال بعد خود شہنشاہ بننے کا اعلان کر دیا۔ ملکہ کو اعتراض ہوا اور دونوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ کانتاکوزنیوس نے اُورخان سے چھ ہزار سپاہی مانگے اور اپنی لڑکی تھیوڈورا سے اُورخان کی شادی کر دینے کی پیشکش کی۔ اُورخان نے چھ ہزار سپاہی بھیج دیے جنہوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ ملکہ نے صلح کر لی۔ معاہدہ ہو گیا کہ کانتاکوزنیوس، اس کی بیوی، ملکہ اور شہزادہ جان پیولوغوس، چاروں کی مشترکہ حکمرانی ہو گی۔ اُورخان کی شادی تھیوڈورا سے کر دی گئی۔

اُورخان نے تھیوڈورا کو اجازت دی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی ہے۔ چھ ہزار عثمانی سپاہی واپس آ گئے۔

چند سال بعد یعنی ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء میں کانتاکوزنیوس کو پھر مدد کی ضرورت پڑی کیونکہ سروبا کے حکمران اسٹیفن دوشان نے سالونیکا پر حملہ کر دیا تھا۔ اُورخان نے کانتاکوزنیوس کی درخواست پر بیس ہزار سپاہی روانہ کر دیے جنہوں نے اسٹیفن کو سالونیکا میں شکست دی۔ عثمانی سپاہی واپس آ گئے۔ ۷۵۴ھ/ ۱۳۵۳ء میں کانتاکوزنیوس نے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، اس پر بازنطینی مملکت میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ کانتاکوزنیوس نے پھر اُورخان سے مدد مانگی اور یورپی ساحل کا ایک قلعہ معاوضہ کے طور پر پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ اُورخان نے اپنے لائق بیٹے سلیمان پاشا کی سرکردگی میں بیس ہزار سپاہی روانہ کر دیے، جن کی مدد سے جان پیولوغوس کو شکست دی گئی اور قسطنطنیہ پر کانتاکوزنیوس کا قبضہ ہو گیا۔ کانتاکوزنیوس نے وعدہ کے مطابق قلعہ تزیمپہ (زنپ) عثمانیوں کے حوالے کر دیا۔

اس کے چند دنوں بعد تھریس میں شدید زلزلہ آیا۔ کئی شہروں کی فصیلوں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ان میں "کالی پولی" کا شہر بھی تھا۔ اسے اب "گیلی پولی" کہا جاتا ہے۔ یہ ایشیا اور یورپ کے درمیان بہنے والے کم چوڑے سمندر، درہ دانیال کے مغربی ساحل پر تزیمپہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع بہت اہم قلعہ تھا۔ قسطنطنیہ سے اس کا فاصلہ ۲۱۲ کلو میٹر ہے۔ سلیمان نے زلزلہ کو قدرت کا ایک اشارہ قرار دیا اور زبردست حملہ کر کے گیلی پولی پر ۷۵۹ھ/ ۱۳۵۷ء میں قبضہ کر لیا۔ یہاں سے ترکوں کی تاریخ نے ایک نئی کروٹ لی۔ سلیمان نے تھریس کے چند دیگر مقامات بھی فتح کر کے ان میں ترک اور عرب باشندوں کو لا کر آباد کر دیا۔

گیلی پولی کی فتح عثمانیوں کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس کے صرف دو صدیوں بعد عثمانی سلطنت ویانا کی سرحد تک پھیل چکی تھی۔ بازنطینی حکومت بہت کمزور ہو چکی تھی اور وہ اب دولتِ عثمانیہ کی باج گزار تھی۔

اُورخان کو زمام حکومت سنبھالے ہوئے ۳۲ سال ہو رہے تھے۔ ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۶ء میں اُورخان کو اپنے والد عثمان خان کے انتقال پر جو مملکت ملی تھی اس کا رقبہ آٹھ ہزار مربع کلو میٹر تھا اُورخان کے ۳۲ سال کامیاب حکومت کرنے کے بعد اب عثمانی قلمرو کا رقبہ بڑھ کر ایک لاکھ دو ہزار مربع کلو میٹر ہو چکا تھا۔

Marfat.com

اُورخان اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی ساری امیدیں اپنے ہونہار بیٹے سلیمان سے وابستہ تھیں۔ سلیمان میں ایک اچھے منتظم کی جملہ صفات موجود تھیں اور مختلف مہمات میں انہوں نے بڑی فراست اور جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن سلیمان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء میں سلیمان گھوڑے کے بدک جانے سے گھوڑے سے گر پڑے اور جاں بحق ہو گئے۔ انہیں ترا کیا (تھریس) میں بلیر کے مقام پر اس جامع مسجد کے قریب سپرد خاک کیا گیا جو انہوں نے ہی تعمیر کروائی تھی۔ سلیمان کی موت کا اُورخان کو شدید صدمہ پہنچا اور اس صدمے کی تاب نہ لا کر ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں اُورخان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔ انہیں برسہ میں اپنے والد کی قبر کے قریب دفن کیا گیا۔

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے، اُورخان کی حکومت کو سیاسی اور اقتصادی استحکام بخشنے میں اُورخان کے بھائی علاؤالدین نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ علاؤالدین کا بڑا کارنامہ عثمانیوں کی فوجی طاقت میں کئی گنا اضافہ کروانا ہے۔ ان کے پُر حکمت فیصلوں کے نتیجے میں عثمانیوں کی جنگی صلاحیت اس قدر بڑھ گئی کہ انہوں نے آئندہ تین سو برس تک فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُورخان سے قبل عثمان خان اور ارطغرل کے عہد میں ترک فوج کی کوئی باقاعدہ شکل متعین نہ تھی۔ فوج کی وردی بھی نہ تھی۔ علاؤالدین نے ایک باقاعدہ فوج کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پیدل سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی جس کا نام "پیادے" تھا۔ دس، سو اور ہزار کی تعداد میں سپاہیوں پر مشتمل دستے بنائے گئے تھے۔ ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر تھیں۔ ہر دستے کا نگران مقرر تھا جو اپنے ماتحت پیادوں کو جنگی تربیت دیتا تھا۔

۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں اُورخان کو عثمانی خاندان کے ایک فرد قرہ خلیل نے مشورہ دیا کہ جنگوں میں جو عیسائی بچے جنگی قیدی بنائے جاتے ہیں ان میں سے دس بارہ سال کی عمر کے ایسے بچوں کو منتخب کیا جائے جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے صحت مند ہوں اور ان کو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی دی جائے۔ اُورخان کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ انہوں نے اپنے بھائی علاؤالدین کو اس نئی فوج کی تربیت و تنظیم کی ذمے داری سونپ دی۔ علاؤالدین نے اس فوج میں عیسائی جنگی قیدیوں، ہتھیار ڈالنے والے یونانیوں اور باہر سے آنے والے تاتاریوں کے نوعمر بچوں کو شامل کرنا شروع کر دیا۔ بعض مسیحی مؤرخین کے نزدیک عیسائی بچوں پر مشتمل فوج کا قیام زیادتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بچوں کو کسی جبر کے ذریعے فوج میں شامل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان بچوں کے والدین اُورخان اور علاؤالدین کے شکر گزار اور احسان مند تھے کہ انہوں نے ان بچوں کو باعزت روزگار فراہم کیا اور انہیں عسکری تربیت دلوائی۔ ان میں سے بعض بچے بڑے سپہ سالار بنے۔

اس نئی فوج کا پہلا دستہ مرتب ہوا تو اُورخان اس دستے کے نوعمر سپاہیوں کو لے کر اس وقت کے ایک بہت بڑے بزرگ حاجی بکطاش کے پاس لے گئے تاکہ ان سے دعا لیں۔ حاجی بکطاش نے اپنے جبہ کی آستین ان لڑکوں کے قائد کے سر پر رکھ دی اور فرمایا۔ "اس دستہ کا نام "ینی چری" ہے۔ اللہ اسے اور سفید رو کرے، ان کے ہتھیار قوی، ان کی شمشیریں رواں اور ان کے تیر مہلک ہوں اور یہ کامراں ہوں۔" "سفید رُو ہونا" دراصل ترکی محاورہ ہے جس کے معنی سرخرو ہونے کے ہیں۔

یہیں سے اس فوج کا نام "ینی چری" یعنی "نئی فوج" رکھ دیا گیا عرب اسے "انکشاری" کہتے ہیں۔ حاجی بکطاش چونکہ اونچی سفید ٹوپی پہنتے تھے جس کی پشت کی جانب کپڑا لٹکا ہوتا تھا اس لیے ینی چری کے فوجی لباس میں بھی اسی قسم کی ٹوپی شامل کی گئی جو اس کی خاص علامت قرار پائی۔

ینی چری میں ہر سال ایک ہزار بچوں کو شامل کیا جاتا تھا، اس میں بہت سے ایسے بچے تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے، ان بچوں کو ایسے اچھے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد سلطان محمد رابع کے دور میں اس طریقہ کار میں تبدیلی کی گئی اور ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء سے خود اسی فوج کے سپاہیوں اور دیگر ترک باشندوں کے لڑکے فوج میں شامل کیے جانے لگے۔ اس طرح یہ فوج بہت وسعت اختیار کر گئی۔ یہ "نئی فوج" دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج کہی جاتی ہے۔ عثمانیوں کی فتوحات میں اس فوج نے اہم کردار ادا کیا۔

اُورخان نے "ینی چری" کے سپاہیوں کے لیے نہایت عمدہ فوجی تربیت کا اہتمام کروایا۔ انہیں زمینیں اور دیگر مراعات بھی دی گئیں۔ یہ فوج "جاں نثاری فوج" بھی کہلاتی تھی۔ ہر "جاں نثار" کو روزانہ ایک اقچہ دیا جاتا تھا۔ یہ اس دور کا سکہ تھا جس میں چھ قیراط چاندی ہوتی تھی۔ اس کا قطر اٹھارہ ملی میٹر تھا۔ علاؤالدین نے پیادوں کی طرح سواروں کی بھی

Marfat.com

فوج تیار کی۔ ان میں مستقل تنخواہ دار سوار، چار دستوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ یہ فرمانروائے مملکت کے دائیں بائیں چلتے تھے۔ ایک خاص دستہ "سپاہی" کہلاتا تھا۔ باضابطہ سواروں کی ایک فوج آ "قپنچی" کہلاتی تھی۔ اس طرح عہد جدید میں پہلی مستقل فوج تیار کرنے کا اعزاز عثمانیوں کو حاصل ہے۔

اورخان کے عہد میں خبر رسانی کا نظام اتنا اچھا تھا کہ انہیں ہمیشہ پہلے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ دشمن کی فوج کب اور کہاں سے آ رہی ہے اور کس مقام پر اس سے مقابلہ کرنا مفید ہو گا۔ ایک قدیم سیاح بروکیے کا کہنا ہے کہ "عثمانی فوراً روانہ ہو سکتے ہیں اور سو عیسائی فوجی، دس ہزار عثمانی سپاہیوں کے مقابلے میں زیادہ شور کرتے ہیں۔ طبل بجتے ہی عثمانی سپاہی فوراً کوچ کر دیتے ہیں اور جب تک حکم نہ ملے اپنے قدم نہیں روکتے۔ ان کے پاس ہلکا اسلحہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ایک رات میں اتنا فاصلہ طے کر لیتے ہیں جتنا فاصلہ عیسائی سپاہی تین دن میں طے کرتے ہیں۔"

اورخان جب برسر اقتدار آئے تو اس وقت تک ان کی مملکت میں سلجوقی سکے رائج تھے۔ اورخان کے بھائی علاؤالدین نے وزیر بننے کے بعد اورخان کے نام کے نئے سکے ڈھلوائے۔ ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء میں پہلی عثمانی ٹکسال قائم ہوئی جہاں سونے اور چاندی کے سکے ڈھالے گئے۔ ان سکوں پر قرآنی آیت کندہ کی گئی تھی۔

اورخان علم کے شیدائی تھے۔ انہوں نے اپنی مملکت میں جابجا مدارس اور تعلیمی ادارے قائم کروائے۔ سب سے زیادہ ترقی برسہ (بروصہ) کو نصیب ہوئی۔ یہاں پہلی عثمانی جامعہ (یونیورسٹی) قائم کی گئی اس یونیورسٹی میں متعدد علوم کے شعبے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں اس درسگاہ نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ ایران، عراق، عرب اور غزنی تک سے طلبہ حصول علم کے لیے یہاں آنے لگے۔

ازنیق (نیقیا) میں بھی بڑی تعلیم گاہیں قائم کی گئیں۔ یہاں بھی ایک بڑا دارالعلوم بنایا گیا۔ یہ ایک بڑی یونیورسٹی تھی۔ اورخان اور علاؤالدین نے فروغِ علم کی جو تحریک شروع کی تھی اسی میں انہیں سیکڑوں جید علماکرام کا تعاون حاصل تھا۔ ان علما میں سے بیشتر نے شیخ ادہ بالیؒ (اورخان کے والد عثمان خان کے خسر) سے استفادہ کیا تھا۔ حضرت مولیٰ داؤدؒ کو ازنیق کی یونیورسٹی کا نگراں معلم (چانسلر) مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بھی شیخ ادہ بالی کے خاص شاگرد تھے۔ ان سے بہت بڑی تعداد میں افراد نے علم حاصل کیا۔ وہ بڑے عالم ہی نہیں، نہایت باعمل انسان بھی تھے۔ حضرت مولیٰ داؤدؒ کے انتقال کے بعد ازنیق یونیورسٹی کے انتظام کی ذمے داری حضرت تاج الدین الکراریؒ پر ڈالی گئی۔ ان کی محنت کی وجہ سے ازنیق یونیورسٹی ایشیائے کوچک کی سب سے بڑی یونیورسٹی بن گئی۔

اورخان کے دور میں ایک اور بڑے فقیہ حضرت علاؤالدین اسود تھے۔ انہوں نے فقہ کی کتاب شرح "وقایہ" تصنیف کی۔ حضرت تاج الدین الکراریؒ کے انتقال کے بعد ازنیق یونیورسٹی کا نگران معلم ان ہی کو بنایا گیا۔ اورخان اور علاؤالدین ہر معاملے میں حضرت علاؤالدین اسودؒ سے مشورہ لیتے تھے۔ وہ عثمانی مملکت کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بھی تھے۔ اورخان نے کئی مساجد بھی تعمیر کروائیں۔ ان میں برسہ کی عالی شان مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ مسجد "اورخان جامع" کہلاتی تھی۔ اس مسجد میں اورخان نے ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کروایا تھا۔ ایک اور بڑی مسجد ازنیق میں تعمیر کروائی گئی۔ ازنیق اب کھنڈر بن چکا ہے۔ اورخان کی مسجد اور حماموں کے کھنڈرات موجود ہیں۔

اورخان علماکرام کی بہت عزت کرتے تھے۔ عارف باللہ الشیخ الغزالؒ سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ برسہ میں ان کے لیے اورخان نے بڑی خانقاہ تعمیر کروائی تھی۔ ہزاروں افراد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے انتقال پر اورخان نے ان کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ ایک اور بزرگ عارف باللہ قروجا احمدؒ نے بھی اورخان کی تربیت اور رہنمائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ شیخ مولیٰ ابدالؒ، شیخ ابدال مرادؒ اور عارف باللہ دوغلو باباؒ کے بھی اورخان بے حد معتقد تھے۔

اورخان کی کوشش یہ تھی کہ بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنے والوں کی اچھی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ علاؤالدین اور قرہ خلیل نے اورخان کی ہدایت پر کئی تعلیم گاہیں قائم کیں جہاں نو مسلم افراد کو دینی تعلیم دی جاتی تھی۔

اورخان نے برسہ میں پہلا سرکاری شفاخانہ (اسپتال) بنوایا۔ انہوں نے مملکت کو اقتصادی لحاظ سے خوشحال بنانے کے لیے نہریں تعمیر کروائیں، زراعت کو فروغ دیا۔ ناداروں کی امداد کے لیے ہر شہر میں محتاج گھر قائم کیے۔ پولیس اور بلدیات کے محکمے تشکیل دیے۔ نئی سڑکیں تعمیر کروائیں اور حفاظتی چوکیوں کا بندوبست کیا۔ انصاف کو فروغ دینے کے لیے ہر شہر میں عدالتیں قائم کیں۔ اورخان کی اہلیہ

Marfat.com

نیلو فر خاتون نے بھی رفاہِ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اَورخان نے برسہ کو بے حد ترقی دی۔ ۷۴۰ھ / ۱۳۴۰ء میں انہوں نے قلعے کے نیچے میدان میں ایک مسجد، ایک لنگر خانہ، ایک حمام اور ایک کارواں سرائے تعمیر کروائی۔ آج بھی یہی علاقہ برسہ کا سب سے بارونق تجارتی مرکز ہے۔ اسی دور میں شہر میں نئے نئے محلے مثلاً علاالدین بیگ، چوبان بیگ، قوجہ نائب آباد ہوئے۔ ۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے برسہ کا دورہ کرنے کے بعد لکھا:

''یہ ایک بڑا اور عظیم الشان شہر ہے جس میں دلکش بازار اور وسیع سڑکیں ہیں۔ یہاں کا سلطان اختیار الدین اَورخان ابن السلطان عثمان ہے۔ یہ سلطان ملوک ترکمان میں سب سے بڑا اور مال، شہروں اور لشکر کے اعتبار سے سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کے قلعوں کی تعداد تقریباً ۱۰۰ ہے۔ یہ اکثر اوقات ان کا دورہ کرتا رہتا ہے اور ہر قلعہ میں وہاں کے لشکر کی اصلاح اور حالت کی تحقیق کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی پورا ایک مہینہ کسی شہر میں نہیں ٹھہرا۔ اس نے برسہ کا بارہ سال محاصرہ کر کے اسے فتح کیا۔ میری بھی اس سے ملاقات ہوئی۔''

اَورخان اپنی رعایا کے لیے بے حد شفیق تھے۔ ان کی حقیقت ایک مہربان باپ کی سی تھی۔ وہ بہت سادہ مزاج کے مالک تھے، معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے دور میں محتاج گھر قائم کیے گئے تھے وہ اکثر ان کا دورہ کر لیا کرتے تھے اور وہاں ناداروں اور مستحق افراد میں اشیا کی تقسیم کا معائنہ کرتے تھے۔ اکثر اوقات وہ مساکین اور مستحقین میں روٹی اور سالن اپنے ہاتھ سے تقسیم کیا کرتے تھے۔

***

Marfat.com

مُراد اوّل

اولوالعزم فرمانروا جن کا دور، عثمانی مملکت کی توسیع کے حوالے سے یادگار ہے

تیز ہوائیں چل رہی تھیں!

بے پناہ گرد و غبار کی وجہ سے چند گز دُور کا منظر بھی نظر نہ آتا تھا۔ دریا کے کنارے دور تک خیموں کی قطار چلی گئی تھی۔ ان خیموں کے باہر مسلح سپاہی مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ خیموں کے پچھلے حصے میں بہت سے افراد گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

ان خیموں میں ایک خیمہ قدرے مختلف نوعیت کا تھا۔ اس خیمے میں ایک شخص مصلیٰ پر بیٹھا عبادت میں مصروف تھا۔ اس شخص کا قد میانہ تھا اور گول چہرے پر سفیدی مائل ڈاڑھی بہت سج رہی تھی۔

اس شخص نے نہایت عاجزی کے ساتھ اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں، وہ بار بار التجا کر رہا تھا: "اے اللہ! مجھے اس جنگ میں شہادت عطا فرما۔ اے پروردگار! تو حق کو غالب کر دے، تو اسلام کے نام لیواؤں کو فتح سے ہمکنار کر۔۔۔۔"

صبح کا اجالا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا۔ اچانک افق پر کالی گھٹا گھر کر آئی اور بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے گرد بیٹھ گئی اور دور تک کا منظر دکھائی دینے لگا کہ دریا کی شمالی جانب بھی اک بہت بڑا لشکر خیمہ زن ہے۔ کچھ دیر میں بارش تھم گئی اور مطلع صاف ہو گیا۔

اب لشکر حرکت میں آ گئے اور دونوں جانب صفیں ترتیب دے لی گئیں۔ رزمیہ نعرے بلند ہوئے۔ نعرۂ تکبیر کی گونج سنائی دی اور فریقین پوری قوت سے آپس میں ٹکرا گئے۔ تیر برس رہے تھے، تلواریں لہرا رہی تھیں۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے حشر بپا تھا، پھر اس شور میں توپوں کی گرج بھی شامل ہو گئی۔ یہ لڑائی کئی گھنٹے جاری رہی، آخر مسلمانوں کے لشکر کا پلہ بھاری ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد دشمنوں کا لشکر ہزاروں لاشیں اور تڑپتے زخمی چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ اچانک ایک جانب سے دشمنوں کا ایک سپاہی گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا: "مجھے مسلمانوں کے امیر سے راز کی باتیں کہنی ہیں۔ میں اپنے مذہب کے لوگوں سے بغاوت کر کے آیا ہوں۔"

مسلم فوج کے سپاہی، اس کی جانب بڑھے اور اسے امیر لشکر کے پاس لے گئے۔ وہ شخص امیر لشکر کے پاس پہنچا۔ احتراماً جھکا اور پھر اچانک اس نے اپنے لباس سے ایک خنجر نکال کر امیر لشکر کے سینے میں گھونپ دیا۔ یہ حملہ اتنی سرعت سے ہوا کہ موقع پر موجود محافظ کچھ نہ کر سکے۔

امیر لشکر کے سینے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اسی وقت بہت سے محافظ لپکے۔ کچھ نے امیر کو سنبھالا اور کچھ نے حملہ آور کو پکڑ کر اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

اطبا، امیر لشکر کی جان بچانے میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن امیر لشکر نے اپنے رب سے، مسلم سپاہ کی فتح اور اپنی شہادت کی جو دعائیں رات بھر مانگی تھیں وہ شرفِ قبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ اسلامی فوج ظفر مند ہو چکی تھی اور امیر لشکر شہادت کا مرتبہ پا چکے تھے۔

یہ امیر لشکر تھے۔ تیسرے عثمانی فرمانروا، مراد اوّل، جن کی پُرعزم اور ولولہ انگیز قیادت میں عثمانی لشکر نے اپنے سے دگنی، سربیا اور دیگر ملکوں کی مشترکہ فوج کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ مراد اوّل کا دور عثمانی مملکت کی توسیع کے اعتبار سے بہت یادگار ہے۔

مراد اول، دوسرے عثمانی حکمراں، اُورخان کے فرزند ہیں۔ وہ ۷۲۶ھ / ۱۳۲۵ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی وفات کے بعد ۷۶۰ھ / ۱۳۵۹ء میں ۳۴ برس کی عمر میں برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے تقریباً تیس برس حکومت کی۔ اورخان نے اپنے بیٹوں سلیمان پاشا اور مراد اوّل کی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ مراد اوّل نوجوانی ہی میں جنگی فنون اور کشتی میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ قدیم ترکی مورّخ مراد اوّل کو مراد غازی لکھتے ہیں، لیکن

Marfat.com

بعد میں ان کے لیے "خداوند گار" کا لقب بھی استعمال کیا جانے لگا جس کے معنی ہیں مالک یا حاکم۔ قدیم ترین مؤرخین اس لفظ کی جگہ "خنکیار" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جب اور خان نے شہر برسہ (بروصہ) فتح کیا تو انہوں نے مراد اوّل کو برسہ اور اس کے اطراف کے علاقے کا نگراں بنادیا۔ برسہ اسی لیے اپنے پہلے عثمانی حاکم کے نام پر "خداوند گار" کہلانے لگا۔

مراد اوّل نے حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) میں بازنطینی (رومی) حکومت کے ان چند علاقوں کی طرف توجہ دی جن پر بازنطینیوں کا قبضہ باقی رہ گیا تھا۔ مراد اول نے کارروائی کرکے بحیرۂ اسود کے ساحل پر ارگلی اور بحیرۂ مرمرہ کے بعض ساحلی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد انہوں نے رومیلی کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں آج کل یورپی ترکی واقع ہے۔ سب سے پہلے ۷۶۲ھ / ۱۳۶۱ء میں چورلو (چورلی) فتح ہوا۔ پھر دیموتوقہ (دیموتکہ) کو تسخیر کیا گیا۔ اسی سال ایک بہت اہم شہر ادرنہ (ایڈریانوپل) کو فتح کرکے عثمانی مملکت میں شامل کیا گیا۔ یہ شہر ۷۶۹ھ / ۱۳۶۸ء میں عثمانی قلمرو کا دارالحکومت بنا اور ۸۵۷ھ / ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ (حالیہ استنبول) کی فتح تک یہی شہر عثمانیوں کا دارالحکومت رہا۔

اب تقریباً سارا تھریس عثمانیوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ ۷۶۴ھ / ۱۳۶۳ء میں مراد اوّل کی فوج بلغاریہ میں داخل ہوکر فلیو پولس (فلبی) کو بھی فتح کرچکی تھی۔ عثمانیوں کی ان فتوحات کے باعث قسطنطنیہ کے شہنشاہ کو مجبور ہوکر مراد اوّل کی جانب صلح کا ہاتھ بڑھانا پڑا اور انہوں نے عثمانیوں کی بالادستی قبول کرتے ہوئے معاہدہ کرلیا کہ تھریس کے جو علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور عثمانیوں کے آئندہ حملوں میں سربیا اور بلغاریہ کی مدد نہیں کریں گے۔

عثمانیوں کی ان فتوحات سے سربیا، بوسنیا اور ہنگری والے بہت گھبرائے اور انہوں نے آپس میں اتحاد قائم کرلیا۔ سربیا کی ریاست اس زمانے میں بڑی طاقتور تھی۔ اس میں موجودہ یوگوسلاویہ کا ایک حصہ، یونان کا ایک حصہ اور البانیہ کا ایک حصہ شامل تھا۔ بوسنیا اب ایک آزاد ریاست ہے۔ پوپ اربن پنجم نے ہنگری، سربیا، بوسنیا اور ولاچیا (اب رومانیہ کا حصہ ہے) کے حکمرانوں کو جوش دلایا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سپاہ کی راہ روکیں، چنانچہ ان چاروں ریاستوں نے ۷۶۴ھ / ۱۳۶۳ء میں ایک بڑی فوج تھریس کی سمت روانہ کردی اور اعلان کردیا کہ عثمانیوں کو یورپ سے نکال باہر کیا جائے گا۔

مراد اوّل اس زمانے میں اناطولیہ (ایشیائی ترکی) میں تھے۔ دشمن کی فوجوں کی آمد کی اطلاع ملتے ہی وہ تھریس روانہ ہوگئے، لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ان کے قابل اور بہادر سالار لالہ شاہین ایک فوج لے کر دریائے مرتزہ (مارٹیزا) کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کی فوج مسیحی لشکر کے مقابلے میں نصف تھی، لیکن انہوں نے نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے دشمن کے لشکر پر شب خون مارا۔ مخالف فوج کے سپاہی اس اچانک حملے کی تاب نہ لاسکے اور میدان عثمانیوں کے ہاتھ رہا۔

اس جنگ کے نتیجے میں کوہ بلقان کے جنوب کا تمام علاقہ عثمانی مملکت کا جزو بن چکا تھا۔ مراد اوّل فیصلہ کرچکے تھے کہ عثمانی قلمرو میں توسیع اب یورپ کی جانب ہوگی۔ اسی لیے انہوں نے دیموتوقہ کو دارالحکومت بنایا اور اس کے تین سال بعد ادرنہ کو دارالحکومت کی حیثیت دے دی۔ جنگ مرتزہ کے نتیجے میں مراد اول کی حکومت کو ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ شاہ قسطنطنیہ نے عثمانیوں کو سالانہ خراج دینے کا وعدہ کرلیا۔ اگلے سال عثمانیوں نے مقدونیہ کے اہم شہروں سرس، درمہ اور قولہ پر قبضہ کرلیا۔

کچھ عرصے تک تو قسطنطنیہ کے شہنشاہ قیصر روم مجبوراً اخراج ادا کرتے رہے، لیکن پھر ان سے رہا نہ گیا اور وہ ۷۷۱ھ / ۱۳۶۹ء میں پوپ کی خدمت میں جا پہنچے۔ عثمانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے عقائد تک کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے آرتھوڈکس کلیسا کو کیتھولک کلیسا میں ضم کردیا۔ پوپ نے انہیں چند بادشاہوں کے نام خطوط فراہم کردیے، لیکن قیصر روم، عثمانیوں کے خلاف کوئی متحدہ طاقت نہ پیدا کرسکے، بلکہ خود ان کے پوتے کے باغی ہوجانے سے انہیں سیاسی نقصان پہنچا۔ ۷۷۳ھ / ۱۳۷۱ء میں مراد اوّل کے سالار لالہ شاہین نے بلغاریہ کے مشہور شہر صوفیہ کے قریب ساکوف کے میدان میں بلغاریہ اور سربیا کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ فتح نے مسلمانوں کے قدم چومے۔ دوسری طرف درمہ، سرس اور قولہ پر عثمانیوں کے قبضہ کے بعد سربیا کے بادشاہ لازار نے مراد اوّل کی اطاعت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ بلغاریہ کے بادشاہ سیسمان نے بھی صلح کی درخواست کی، چنانچہ بلغاریہ کا وہ حصہ جو اب تک عثمانی مملکت میں شامل نہیں کیا گیا

Marfat.com

تھا، بلغاریہ ہی کے پاس رہنے دیا گیا۔

۷۷۸ھ / ۱۳۷۶ء سے ۷۸۳ھ / ۱۳۸۱ء تک کا عرصہ نسبتاً پُرسکون گزرا۔ اس زمانے میں کوئی نئی جنگ نہیں چھیڑی گئی۔ مراد اول نے اس دوران مملکت کے انتظامات پر خصوصی توجہ دی۔ اراضی کو نئے سرے سے تقسیم کیا اور متعدد اصلاحات جاری کیں۔

اس پُرامن زمانے میں مراد اوّل نے اپنے بیٹے بایزید کی شادی، ایشیائے کوچک (اناطولیہ) کی ریاست گرمیاں کے امیر کی لڑکی سے کر دی۔ دلہن کو جہیز میں گرمیاں کی ریاست کا بڑا حصہ اور قلعہ کوتاہیہ دیا گیا۔ یہ قلعہ بہت اہم تھا۔ ایشیائے کوچک میں سلجوقی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد چھوٹی چھوٹی سلجوقی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ مراد اوّل کے تدبر کی بدولت یہ ریاستیں آہستہ آہستہ عثمانی مملکت میں ضم ہو گئیں۔ ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء میں مراد اوّل نے ایشیائے کوچک میں واقع ریاست "حمید" کے امیر سے ان کی ریاست کا بڑا حصہ خرید لیا۔ اس میں آق شہر بھی شامل تھا۔ اب عثمانی مملکت کی حدود کرمانیہ تک جا پہنچی تھیں۔ (کرمانیہ کو قرامان کہتے تھے۔ یہ اب صوبہ قونیہ کا ایک حصہ ہے)۔

کرمانیہ اور عثمانیوں کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ ان تعلقات میں بہتری پیدا کرنے کی غرض سے مراد اوّل نے اپنی لڑکی نفیسہ کی شادی کرمانیہ کے حکمران علاؤالدین سے کر دی، لیکن علاؤالدین نے خود سری برقرار رکھی، چنانچہ دونوں فریقوں کے مابین جنگ ہوئی جس میں مراد اوّل نے قونیہ میں علاؤالدین کی فوج کو شکست دی، لیکن اپنی عالی ظرفی کے باعث علاؤالدین کو معاف کر دیا۔ یہی وہ جنگ ہے جس میں مراد اوّل کے بیٹے بایزید نے بھی حصہ لیا اور ان کی بے انتہا پھرتی کی وجہ سے انہیں "یلدرم" یعنی "بجلی" کا لقب دیا گیا۔

عثمانیوں کی حکومت اب اس قدر وسیع ہو چکی تھی کہ سربیا اور دیگر مسیحی طاقتیں سخت خلجان میں مبتلا تھیں۔ سربیا، بوسنیا اور بلغاریہ نے ایک بار پھر مسیحیوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ البانیہ، ولاچیا، ہنگری اور پولینڈ نے اپنی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ مغربی یورپ کو بھی فوج بھیجنے کی دعوت دی گئی، لیکن وہاں کی حکومتیں مختلف وجوہ کی بنا پر اس جانب متوجہ نہ ہوئیں۔ بہر حال سربیا نے مختلف ممالک کو اکسا کر اچھی خاصی بڑی فوج اکٹھی کر لی۔

مراد اوّل کو برسہ میں، اتحادیوں کی فوج کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ گو کہ اس وقت ان کی عمر تقریباً ستر برس ہو چکی تھی، لیکن انہوں نے فوراً جنگ کی تیاریاں کیں اور فوج لے کر روانہ ہو گئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بوسنیا میں اتحادیوں نے عثمانی فوج پر حملہ کر کے اسے خاصا جانی نقصان پہنچایا۔ تاہم مراد اوّل نے اپنے سالار علی پاشا کو درۂ دربند کے راستے بلغاریہ بھیج دیا، جنہوں نے شوملہ اور ترنودو پر قبضہ کر لیا۔ بلغاریہ کے شہنشاہ سیسمان (ششمن) بھاگ کر نائکوپولس میں پناہ گزین ہو گئے، لیکن ان کو عثمانیوں سے صلح کرنی پڑی اور سلسترہ (سلسٹریا) کا علاقہ دینے کا وعدہ کیا۔

مراد اوّل نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیسمان کو معاف کر دیا، لیکن بہت جلد سیسمان نے عہد توڑ دیا اور سربیا کے بادشاہ لزر (لازار) سے جاملا۔ اس نے سلسترہ کو عثمانیوں کے حوالے کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ مراد نے پھر علی پاشا کو فوج دے کر بھیجا۔ نکہ بولی یا نکو پولیس میں سیسمان کو شکست ہوئی۔ مراد اوّل نے ایک بار پھر سیسمان کی بدعہدی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا، لیکن بطور سزا، بلغاریہ کا جنوبی حصہ عثمانی مملکت میں ضم کر دیا۔

عثمانیوں کی زبردست طاقت سے خائف ہو کر سربیا کے بادشاہ لزر نے اپنے حلیفوں کی قوت مجتمع کر کے عثمانیوں پر فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض سے اس نے بلغاریہ، ولاچیا (رومانیہ)، بوسنیا، البانیہ، پولینڈ اور ہنگری کے حکمرانوں کو اپنی اپنی فوج بھیجنے کی ترغیب دی، چنانچہ بہت جلد ایک لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر مشتمل لشکر قوصوبا (قوصووہ اور کوسووا بھی لکھا گیا ہے) کے میدان میں اپنے خیمے نصب کر رہا تھا۔ یہ موجودہ یوگوسلاویہ میں واقع ہے۔ دوسری جانب مراد اوّل بھی دشمن کی نقل و حرکت سے بے خبر نہ تھے۔ دشمن کی پیش قدمی کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور جب ۲۴ جمادی الاول ۷۹۱ھ / ۲۰ جون ۱۳۸۹ء کو مسیحی لشکر قوصوبا کے میدان میں دریائے شنیزہ کی شمالی جانب پڑاؤ ڈال رہا تھا تو دریا کی جنوبی سمت عثمانی لشکر کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ دشمن کی فوج عثمانی لشکر سے تعداد میں دگنی تھی۔

مراد اوّل لشکر کے وسط میں قیادت کر رہے تھے۔ جنگ ہوئی جس میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح بخشی، لیکن سربیا کے ایک امیر، میلوس قابیلووچ نے دھوکے سے مراد اوّل کو شہید کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

مراد اوّل جب میلوس قابیلووچ کے خنجر سے گھائل ہو گئے تو

Marfat.com

سربیا کے بادشاہ لزر (لازار) کو گرفتار کر کے ان کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے لزر کو سزائے موت دینے کا حکم دیا، اس کے کچھ دیر بعد مراد اوّل سفر آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے صاحب زادے بایزید اوّل نے ان کی میت برسہ پہنچانے کا اہتمام کروایا، جہاں چکرگہ کے محلے میں اس مسجد کے قریب انہیں سپرد خاک کر دیا گیا جو خود مراد اوّل نے بنوائی تھی۔

مراد اوّل نے تقریباً تیس برس حکومت کی جن میں سے تقریباً ۲۴ برس جنگوں اور معرکہ آرائیوں میں گزرے، چنانچہ انہیں تعمیراتی اور ترقیاتی سرگرمیوں کی طرف توجہ دینے کا بہت زیادہ موقع نہ مل سکا، تاہم ان کا دور، مملکت میں توسیع کے ساتھ ساتھ بھرپور استحکام کا دور تھا۔ انہوں نے تعمیرات کے سلسلے میں بھی اقدامات کیے۔ جب انہوں نے شہر ادرنہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو اس شہر میں متعدد شان دار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ شہر برسہ (بروصہ) میں ایک بہت خوبصورت جامع مسجد "اولو جامع" کے نام سے مراد اوّل ہی نے بنوائی تھی۔

"اولو جامع" دراصل نئی طرز کی مساجد تھیں، جن کی چھتیں مسطح اور سپاٹ نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ ستونوں کے درمیانی فاصلوں پر چھتریاں سی تعمیر کی جاتی تھیں۔ ترکی میں یہ مساجد اپنے مخصوص طرزِ تعمیر کے ساتھ آج بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ برسہ کی اولو جامع میں بھاری ستونوں کی پانچ قطاریں تھیں، جو محراب کی سمت جاتی تھیں۔ ہر قطار میں چار چار گنبد بنے ہوئے تھے۔ درمیانی قطار کے دوسرے خلا کو کھلا رکھا گیا تھا، جس کے نیچے وضو کے لیے حوض تھا۔ عثمانیوں کے دور کی یہ خاص بات ہے کہ انہوں نے مساجد کو باقاعدہ ادارے کی شکل دی اور مسجد کے ساتھ مدرسہ اور شفاخانے بھی تعمیر کیے تھے۔ مراد اول نے برسہ کے مقام چکرگہ، نیز، سرس، بیلہ جک اور ینی شہر میں بھی جامع مساجد تعمیر کروائی تھیں۔ برسہ کی مسجد میں چند حجرے بھی بنوائے گئے تھے، جہاں حکمراں اپنے دور کے نامور علما کے ساتھ اہم علمی اور انتظامی امور پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔

برسہ ہی میں ایک بڑے مدرسے اور مسافر خانے کی عمارتیں بھی مراد اوّل نے بنوائی تھیں۔ انہوں نے ازنیق میں ایک عالی شان عمارت اپنی والدہ نیلوفر خاتون کے نام پر "نیلوفر عمارتی" کے نام سے تعمیر کروائی۔ اس عمارت میں نصب کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس میں مخصوص ترتیب سے چھ گنبد اس طرح تعمیر کیے گئے تھے کہ ایک جُھمکا سا محسوس ہوتے تھے۔ پانچ حصوں کی ڈیوڑھی تھی جس کی مسقف (چھت دار) محرابیں، خوبصورت ستونوں پر قائم تھیں۔ دیواروں پر رنگین اور چمک دار پتھر نصب کیے گئے تھے۔ مراد اوّل نے ادرنہ میں قلعے کے باہر ایک قصر بھی بنوایا تھا جہاں وہ ۷۶۷ھ / ۱۳۶۵ء میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ قصر میدان قاواق میں واقع تھا۔ یہ قصر اتنا مضبوط تھا کہ بعد کے ادوار میں بھی اسے فوجی مرکز کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا حتیٰ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں بھی یہاں فوجی تربیت گاہ قائم کی گئی۔

مراد اوّل نے ینی شہر میں صوفیا کرام کے لیے ایک خانقاہ بھی تعمیر کروائی تھی۔ وہ مذہبی رجحانات رکھتے تھے۔ انہوں نے مساجد اور دیگر مذہبی اداروں کے لیے بہت سی اراضی وقف کر دی تھیں۔ مراد اوّل کے دادا اور دولتِ عثمانیہ کے پہلے فرمانروا عثمان خان کے زمانے سے ایک دینی تحریک بہت موثر کردار ادا کر رہی تھی۔ یہ تحریک "اخی تحریک" کہلاتی تھی جس کا آغاز مولانا جلال الدین رومیؒ اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی تعلیمات اور کوششوں سے ہوا تھا۔ عثمان خان بھی اس تحریک کے رکن تھے۔ اس تحریک کے ارکان نہ صرف دین کا اچھا علم رکھتے تھے بلکہ فلاحی خدمات کے اعتبار سے بھی بہت آگے تھے۔ مراد اوّل نے ۷۶۲ھ / ۶۱-۱۳۶۰ء میں انقرہ کا قبضہ اخی تحریک کے ارکان ہی سے لیا تھا۔ مراد اوّل کی ایک دستاویز ۷۶۷ھ / ۱۳۶۶ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد اول بھی اخی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

مراد اوّل کے عہد میں علم کی ترویج و اشاعت کے لیے ترکی زبان کو بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے قبل سرکاری دستاویزات فارسی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ کتبوں اور قانونی دستاویزات میں عربی زبان استعمال ہوتی تھی۔ دینی کتب عربی میں اور تصوف کی کتابیں عربی اور فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مراد اوّل کے احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دور میں سرکاری معاملات میں ترکی زبان کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ اس دور میں ترکی زبان میں کتابیں تصنیف ہونے لگی تھیں اور کئی کتابوں کا عربی اور فارسی سے، ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق قونیہ، نگدہ، لاذقیہ، سنوب، سیواس، قیر شہر، برسہ اور ازنیق میں چودھویں صدی عیسوی کے دوران ترکی زبان میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن افسوس کہ ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئیں، تاہم کچھ کتابیں سلامت ہیں جنہیں ترکی اور دنیا کے دیگر عجائب گھروں

Marfat.com

میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ان کتابوں میں سے ایک سورۂ ملک کی تفسیر پر مشتمل ہے جو انقرہ کے ایک مصنف مصطفیٰ بن محمد نے مراد اوّل کے بڑے بھائی سلیمان پاشا کے لیے لکھی تھی۔ کتب خانۂ عام بایزید میں اسی مصنف کی ایک کتاب "حلوالناصحین" کے نام سے ہے۔ قلعہ توقات کے حاکم عارف علی نے ۷۶۲ھ / ۱۳۶۱ء میں مراد اوّل کی فرمائش پر ایک کتاب "دانشمند نامہ" لکھی۔ مراد اوّل ہی کے دور میں مشہور کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا گیا۔

نظم کے میدان میں، ایک شاعر، احمدی نے ۷۹۲ھ / ۱۳۹۰ء میں "اسکندر نامہ" تصنیف کی جو بہت مشہور ہوئی۔ اس کتاب میں عثمانی فرمانرواؤں کی تاریخ، اشعار کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ احمدی کو ترکوں کی پہلی منظوم تاریخ کا مصنف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی نظموں میں شہر برسہ کے بارے میں تفصیل بھی شامل ہے۔ ایک اور شاعر شیخ اوغلی مصطفیٰ (پیدائش ۷۴۱ھ) نے ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں "خورشید نامہ" کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ ان کا تعلق گرمیان کی ریاست کے ایک بااثر خاندان سے تھا۔ ایک اور شاعر شادی یا شیاد نے ۷۶۳ھ / ۱۳۶۱ء میں داستان قتل حسینؓ کو نظم کیا۔ ایک اور شاعر عزالدین اوغلی نے نظم طاؤس لکھی جو شیاد کی کتاب ہی میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ مولوی یوسف مداح نے ۷۷۰ھ / ۱۳۶۹ء میں سیوداس میں، مثنوی "ورقہ و گلشاہ" لکھی۔

طب کے میدان میں اسحاق بن مراد نے ۷۹۰ھ میں "منتخب الشفا" تحریر کی۔ مراد اوّل کے والد اور خان نے برسہ اور ازنیق میں جو بڑی جامعات (یونیورسٹیاں) قائم کی تھیں وہ مراد اول کے دور میں بھی کام کر رہی تھیں۔

مراد اوّل کے دور میں زراعت نے بڑی ترقی کی۔ انہوں نے زرعی نظام کو جدید انداز سے مرتب کیا اور نئے اصولوں کے تحت زمینوں کو تقسیم کیا۔ اس دور کی کامیاب زراعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وادی مرترہ (اسے وادی مارزا بھی لکھا گیا ہے) میں صرف چاول کی کاشت سے عثمانی حکومت کو سالانہ چالیس لاکھ آقچہ (چاندی کا سکہ) کی آمدنی ہوتی تھی۔

مراد اوّل کے دور سے قبل عثمانی مملکت میں خمس کے نظام پر عمل در آمد نہیں ہو رہا تھا۔ خمس کے نظام سے مراد یہ ہے کہ اموال غنیمت کا پانچواں حصہ حکومت کو دیا جاتا ہے اور حکومت اسے شریعت کے اعتبار سے تقسیم کرتی ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس دور کے مشہور عالم شیخ قرہ رستم نے ۷۶۳ھ / ۱۳۶۱ء میں قاضی عسکر (فوجی قاضی) خلیل آفندی کو اس جانب متوجہ کیا۔ خلیل آفندی نے مراد اوّل کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔ مراد اول نے حکم دیا کہ شریعت کے مطابق خمس کا نظام نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک شعبہ قائم کیا گیا جس کے نگراں شیخ قرہ رستم مقرر ہوئے۔

مراد اوّل نے فوجی نظام کو نئے خطوط پر استوار کیا۔ نئے علاقوں کو تسخیر کرنے اور دشمنوں کی شرانگیزیوں کا جواب دینے کے لیے عسکری اعتبار سے طاقتور ہونا، ان کے لیے بے حد ضروری تھا، چنانچہ ایک جانب تو انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں مختلف قطعہ ہائے اراضی، اپنے سپاہیوں اور افسروں میں تقسیم کیے جو جاگیر کے طرز پر تھے۔ چھوٹی جاگیریں "تیمار" اور بڑی "زعامت" کہلاتی تھیں۔ دوسری جانب جن افراد کو یہ قطعہ ہائے اراضی دیے گئے ان میں سے ہر ایک کے لیے لازم تھا کہ وہ جنگ کے موقع پر ایک یا ایک سے زائد مسلح سوار فراہم کرے گا۔ فوج کی افرادی قوت میں اضافہ کے اس نظام کا آغاز مراد اوّل ہی کے دور میں ہوا۔ مراد اوّل نے ادنیٰ فوجی خدمات کے لیے بھی ایک خصوصی سپاہ تیار کی، جس کے ذمے اصطبل کی صفائی، خیمہ نصب کرنا، سامان کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ جیسے کام تھے۔ یہ سپاہ، رعایا میں سے افراد کو منتخب کر کے تیار کی گئی تھی۔

مراد اوّل ہی کے دور میں سپاہیوں کے لیے "عَلَم" (پرچم) تیار کیا گیا جس کا رنگ سرخ تھا۔ مراد اوّل کے والد "اور خان" نے اپنے دور حکومت میں دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج قائم کی تھی جو "ینی چری" یعنی "نئی فوج" کہلاتی تھی۔ مراد اوّل نے "ینی چری" کے نظام کو بے حد مستحکم بنادیا اور ان کی کوششوں سے اس فوج کو بڑی وسعت حاصل ہوئی۔

مراد اوّل سے قبل عثمانیوں کی بحری طاقت برائے نام تھی۔ ادرنہ فتح کرنے کے بعد مراد اول نے بحریہ پر بھرپور توجہ دی اور کچھ ہی عرصے میں جنگی جہازوں کا ایک بڑا بیڑہ تیار کر لیا۔

مراد اوّل کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ جنگوں میں عثمانیوں نے پہلی بار توپ اور گولہ بارود کا استعمال ان ہی کے دور میں کیا۔ عثمانیوں کی پہلی توپ ۷۶۶ھ / ۱۳۶۴ء میں برسہ میں ڈھالی گئی تھی۔ قوصویا کی جنگ ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء میں بھی مراد اوّل کی فوج نے توپوں اور بندوق

Marfat.com

کا استعمال کیا۔ اس سے قبل صرف تلواروں، نیزوں اور تیروں سے جنگ لڑی جاتی تھی۔

مراد اوّل نے فوج میں ایک نئے عہدے کا بھی اضافہ کیا، یہ عہدہ "دوینوق" کہلاتا تھا۔ دراصل یہ فوجی "سائیس" کا عہدہ تھا۔ اس عہدے پر افراد کے تقرر سے قبل سپاہیوں کو اپنے اپنے گھوڑوں کی دیکھ بھال بھی خود کرنی پڑتی تھی، لیکن اس عہدے پر افراد مقرر ہو جانے کے بعد سپاہی اب اپنی پوری توجہ جنگ پر مرکوز رکھ سکتے تھے۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور تازہ دَم گھوڑے ہر وقت فراہم کرنے کے لیے "دوینوق" موجود تھے، جو فوج کے پچھلے حصے میں رہتے تھے۔

مراد اوّل کا دور اپنی چند نمایاں خصوصیات کے باعث عثمانیوں کی تاریخ میں بے حد ممتاز ہے۔ مراد اوّل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عثمانی مملکت کو بے پناہ وسیع بنا دیا اور انہوں نے ان تمام علاقوں کو فتح کیا جہاں آج کل یورپی ترکی، بلغاریہ، البانیہ، یوگوسلاویہ اور یونان کا بڑا حصہ واقع ہے۔ دوسری جانب انہوں نے اس علاقے کے بڑے حصے کو بھی عثمانی قلمرو کا حصہ بنا دیا جہاں آج کل ایشیائی ترکی واقع ہے۔ اس دور میں یہاں رومی سلجوقیوں کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ مراد اول نے اپنی حکمت اور تدبر سے کام لے کر ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ایک عثمانی سلطنت میں ضم کر دیا۔ اس طرح مراد اول کو اپنے والد سے جو ایک لاکھ دو ہزار مربع کلو میٹر پر مشتمل مملکت حاصل ہوئی تھی، اسے انہوں نے چار لاکھ ساٹھ ہزار مربع کلو میٹر تک وسیع کر دیا۔ انہوں نے جن علاقوں کو فتح کیا، عثمانی حکمراں ان علاقوں پر مزید پانچ سو برس تک حکومت کرتے رہے۔

مراد اوّل ہی کے دور میں فوجی لحاظ سے اہم شہر ادرنہ فتح ہوا۔ یہ شہر اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ یورپ کو جانے والے تمام راستے اسی شہر سے گزرتے تھے اور اسے فوجی مرکز بنا کر یورپ کے خلاف پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔

مراد اوّل ہی کے عہد میں عثمانیوں نے یورپ کی کسی ریاست سے سرکاری معاہدہ کیا۔ اس معاہدے میں بلقان کی جمہوریہ راغوزا نے عثمانیوں کی بالادستی تسلیم کی اور ترکوں کو سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا جس کے بدلے راغوزا کو تجارت کی آزادی دی گئی۔

مراد اوّل ہی نے پہلی بار مصر اور شام کی مملوک حکومت سے عثمانیوں کی جانب سے سیاسی تعلقات قائم کیے۔ یورپ میں جب مراد اوّل کو فتوحات حاصل ہوئیں تو مصر کے حکمراں برقوق نے ایک خط میں مراد کو "سلطان الغزات" کے (جنگوں کا بادشاہ) کے لقب سے یاد کیا اور اظہارِ مسرت کیا۔ مراد اوّل برصغیر (پاک و ہند) کے فرمانروا فیروز شاہ تغلق کے ہم عصر تھے۔

مراد اول نے پہلی بار عثمانیوں میں وزیر اعظم کے عہدے کا اضافہ کیا جو "صدر اعظم" کہلاتا تھا۔ پہلے صدر اعظم جندرلی خیر الدین خلیل پاشا تھے۔ انہوں نے ترک مملکت کو مضبوط و مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مراد اوّل ہی نے پہلی بار قاضی عسکر یعنی "فوجی قاضی" کا عہدہ بھی قائم کیا۔ ان کے دور میں ایک اور عہدہ بک لربکی کا تھا۔ اس عہدے کے لیے "امیر الامرا" کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ مراد اوّل کے عہدے میں لالہ شاہین کو بک لربکی (یا بیگلر بگی) مقرر کیا گیا۔ لالہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اتالیق یا مربی۔ بیگلر بگی سے مراد ہے بیگوں کا بیگ۔ ابتدا میں یہ لقب صرف سپہ سالار اعظم کے لیے استعمال ہوتا تھا، بعد میں یہ صوبوں کے حاکموں کے لیے مخصوص ہو گیا اور آگے چل کر محض ایک اعزاز رہ گیا۔

مراد اوّل بہت سنجیدہ اور پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر معاملے میں نظم و ضبط اور قرینہ پسند کرتے تھے، خصوصاً فوج کے معاملے میں ان کی واضح ہدایت تھی کہ ہر سپاہی اور ہر افسر، مکمل فوجی تربیت حاصل کرے اور احکامات کی فوری طور پر تعمیل ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ ذرا سی لاپروائی بھی برداشت نہ کرتے تھے اور کسی بھی حکم کی خلاف ورزی پر سخت سرزنش کرتے تھے، تاہم اپنی طبیعت کے لحاظ سے وہ بے حد مہربان اور شفیق تھے۔ کسی سے وعدہ کرتے تھے تو اسے پورا کرتے تھے۔ اپنی بات صاف گوئی سے بیان کرتے اور دلیل کی زبان میں گفتگو کر کے اپنے مخاطب کو قائل کر لیتے تھے۔ جب کسی سے غلطی ہو جاتی تھی تو اس کے خلاف اقدام کرتے تھے، لیکن اگر وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا تھا اور معافی طلب کرتا تو فراخ دلی سے اسے معاف کر دیتے تھے۔ مراد اوّل بہت مضبوط اعصاب کے حامل تھے اور نہایت خطرناک اور سنسنی خیز لمحات میں بھی اپنے اوسان قائم رکھتے تھے۔ جنگی معرکوں میں وہ اپنے تجربہ کار افسروں کو بھی مشورے میں شریک کیا کرتے تھے اور ان کے اچھے مشوروں کو قبول کر لیتے تھے۔

Marfat.com

مراد دوم

چھٹے عثمانی حکمراں جن کے تدبر، دلیری اور انتظامی صلاحیتوں نے عثمانی سلطنت کو مستحکم بنایا

سورج طلوع ہونے کو تھا۔

ایک روشن اور چمکیلی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد نمازی کب کے رخصت ہو چکے تھے لیکن اجلی رنگت، سیاہ بالوں اور متوسط قد کا مالک ایک شخص تلاوتِ کلام پاک میں منہمک تھا۔

اچانک ایک اور شخص آیا اور اس نے پہلے شخص کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پہلے شخص نے قرآن پاک کی تلاوت مکمل کر لی تھی۔ اس نے قرآن پاک کو احترام کے ساتھ بند کیا اور آنے والے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔" آنے والے نے ادب سے یہ خوشخبری سنائی۔

پہلے شخص کا چہرہ مسرت و شادمانی سے کھل اٹھا۔ یہ اس کا دوسرا بیٹا تھا۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کیا کہ چونکہ اس نے ابھی ابھی قرآن پاک کی سورۂ محمدؐ کی تلاوت مکمل کی ہے اس لیے وہ اپنے نومولود کا نام محمد رکھے گا۔

یہ تھے چھٹے عثمانی حکمراں مراد بن اوّل جنہیں مراد ثانی یا مراد دوم بھی کہا جاتا ہے۔ انہیں جس بیٹے کی ولادت کی خوشخبری سنائی گئی تھی وہی بڑے ہو کر سلطان محمد فاتح کہلائے اور قسطنطنیہ کی فتح ان کے ہاتھوں عمل میں آئی، لیکن محمد فاتح کے والد مراد دوم کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ بلکہ یہ ان ہی کا تدبر، ثابت قدمی، دلیری اور انتظامی صلاحیت تھی کہ عثمانی سلطنت کئی برسوں کے عدم استحکام کے بعد نہ صرف پھر سے مستحکم ہوگئی بلکہ اس نے توسیع مملکت کے لیے ضروری بنیادیں فراہم کر دیں۔

مراد دوم ۸۰۶ھ / ۴ - ۱۴۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو عثمانی مملکت شدید بحران سے گزر رہی تھی تاہم مراد کے والد محمد اوّل نے اپنی ہوش مندی، تدبر اور جواں مردی سے کام لیتے ہوئے مملکت کو بحران سے نکال لیا تھا۔ محمد اوّل نے آٹھ برس حکومت کی، اس سے قبل وہ گیارہ برس تک اپنے زیر انتظام علاقے پر حکمرانی کر چکے تھے۔ ان کا انتقال ۴۷ برس کی عمر میں ۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء میں ہوا۔ والد کے انتقال کے وقت مراد ایشیائے کوچک میں تھے۔ انہیں وہاں سے بلایا گیا اور دارالحکومت برسہ (بروصہ) میں اقتدار سونپ دیا گیا۔

مراد دوم کے لیے یہ بات خوش قسمتی کا باعث ہوئی کہ ان کے والد محمد اوّل بن بایزید اوّل ان شدید نقصانات کا ازالہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو عثمانی سلطنت کو بایزید اوّل (بایزید یلدرم) اور امیر تیمور کے درمیان ۸۰۴ھ / ۱۴۰۲ء میں ہونے والی جنگِ انگورہ (انقرہ) کے نتیجے میں پہنچے تھے۔ بایزید یلدرم نے اپنے ۱۳ سالہ دورِ حکومت میں اناطولیہ کی بہت سی ریاستوں کو فتح کر کے مملکت میں شامل کر لیا تھا لیکن بدقسمتی سے امیر تیمور کے ساتھ ان کی جو شدید جنگ ہوئی اس کے باعث عثمانی سلطنت کو بڑا دھچکا پہنچا۔ بہت سی ریاستیں پھر سے خود مختار ہو گئیں۔ عثمانی خاندان کے بہت سے نوجوان باہمی کشاکش کے شکار ہو گئے۔ لیکن بایزید کے لڑکے محمد اول نے ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء میں کھوئی ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کر لی۔ یہی نہیں، ان کے دور میں عثمانی افواج نے ہنگری اور بوسنیا کی حدود پر یلغار کی۔

مراد دوم نے جب ۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء میں دولتِ عثمانیہ کا اقتدار سنبھالا تو ان کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ گو کہ وہ حکمراں بننے سے قبل ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) میں اپنے والد محمد اوّل کے قائم مقام رہ چکے تھے اور انہیں امورِ مملکت انجام دینے کا خاصا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی ان کی مخالف قوتوں کے نزدیک وہ ایک کم

Marfat.com

عمر حکمراں تھے۔ محمد اوّل نے جن بغاوتوں کو کچل دیا تھا وہ پھر سے سر اٹھانے لگیں۔

مراد دوم کو پہلی شدید مخالفت کا سامنا بازنطینی سلطنت کی جانب سے کرنا پڑا۔ مراد دوم کے والد محمد اوّل نے قیصر روم مینوئیل سے اچھے تعلقات استوار کر لیے تھے اور انہیں اپنا حلیف بنالیا تھا۔ انہوں نے قیصر پر بہت احسانات بھی کیے تھے، لیکن محمد اوّل کی وفات کے بعد مینوئیل نے ایک شخص مصطفیٰ کی قیادت میں ایک فوج عثمانی مملکت پر حملے کے لیے روانہ کر دی۔ اس شخص کو بایزید یلدرم کا بیٹا بتایا جاتا تھا جب کہ درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ اس لیے اسے دوزمہ (جعلی) مصطفیٰ کہتے ہیں۔

مراد نے صدر اعظم (وزیر اعظم) بایزید پاشا کی قیادت میں ایک فوج مقابلے کے لیے بھیجی لیکن سازلی درہ (ادرنہ اور سرس کے درمیان) کے مقام پر لڑائی میں بایزید پاشا شہید ہو گئے اور بازنطینی فوج نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔

اس فتح سے مصطفیٰ دوزمہ کی ہمت بڑھ گئی۔ وہ رومی بحری بیڑہ لے کر دردانیال عبور کر گیا۔ مراد نے فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور حملہ آور فوج کا مقابلہ دلیری سے کیا۔ مصطفیٰ کو اولوباد کے پل پر شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر گیلی پولی میں محصور ہو گیا۔ مراد نے سمندر عبور کیا اور گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ ادرنہ میں فاتحانہ داخل ہو گئے، دوزمہ مصطفیٰ کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔

قسطنطنیہ کے حکمراں (بازنطینی سلطنت کے بادشاہ) مینوئیل نے جو غداری کی تھی، اب انہیں اس کی سزا دینا ضروری تھا، چنانچہ مراد دوم نے ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء میں بیس ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کی اور پیش قدمی کر کے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، جو اب استنبول کہلاتا ہے۔ اس شہر کو فتح کرنے والے کے لیے آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی ہے اس لیے اس شہر پر ماضی میں بھی کئی مسلمان سالاروں نے حملے کیے تھے۔ تاہم قسطنطنیہ کی فتح کا اعزاز مراد دوم کے بیٹے سلطان محمد فاتح کو حاصل ہوا۔ بہرحال مراد دوم نے بھی قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ بازنطینیوں (رومیوں) نے شہر کو بچانے کے لیے اپنی تمام قوت داؤ پر لگا دی۔

مؤرخین کے مطابق مراد نے اس محاصرے کے سلسلے میں غیر معمولی فوجی لیاقت کا ثبوت دیا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ یہ محاصرہ کامیاب ہو جاتا لیکن شاہِ قسطنطنیہ نے سازش کی اور مراد کے چھوٹے بھائی مصطفیٰ کو اکسا کر مراد کے مقابل کھڑا کر دیا۔ مصطفیٰ نے کرمانیہ اور گرمیان کے امراء کی مدد سے ایشیائے کوچک میں مراد دوم کی ایک فوج کو شکست دی اور اپنے سلطان ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

مراد دوم کو اس بغاوت کی اطلاع ملی تو انہوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھالیا اور ایشیائے کوچک پہنچ کر مصطفیٰ کی فوج کو شکست دی۔ مراد نے مناسب سمجھا کہ اناطولیہ کی ریاستوں میں بغاوت کے امکانات کو معدوم کر دیا جائے۔ کرمانیہ کے امیر محمد بک نے مصطفیٰ کا ساتھ دیا تھا۔ مراد نے اس ریاست کے خلاف کارروائی کی۔ معرکہ ہوا جس میں امیر کرمانیہ مارے گئے۔ مراد نے کرمانیہ پر قبضہ کرنے کی بجائے امیر کرمانیہ کے بیٹے ابراہیم کو حکومت دے دی اور اسے باج گزار بنالیا۔ اس کے بعد گرمیان، قسطمونی، منتشا، صاروخان اور حمید کی ریاستوں کو مطیع کر کے انھیں بھی باج گزار بنالیا۔

اب ایشیائے کوچک میں امن قائم ہو چکا تھا۔ مراد دوبارہ قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس دوران شاہ مینوئیل کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا جان پیلیولوگس حکمراں تھا۔ جان کو خدشہ ہوا کہ مراد اب پھر حملہ کریں گے۔ اس نے صلح کی درخواست کی۔ تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینے کا معاہدہ کیا اور سلیمبریا اور درکوس کے سوا زیتون اور دریائے اسٹرائیا اور بحیرۂ احمر کے کنارے واقع دیگر تمام یونانی شہر مراد کے حوالے کر دیے۔

موریہ ایک جزیرہ نما تھا جسے قدیم زمانے میں یونان کا قلعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس پر شاہ قسطنطنیہ کے نائب تھیوڈور اور پیلیولوگس حکمراں تھے۔ مراد ثانی کے دادا بایزید یلدرم نے یونان کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جس کے بعد موریہ کا حکمراں عثمانی سلطنت کا باج گزار بن گیا تھا۔ لیکن جنگِ انگورہ میں بایزید کی شکست کے بعد بازنطینیوں (رومیوں) نے پورے جزیرہ نما پر قبضہ کی کوشش شروع کر دی۔ مینوئیل نے ایک طویل قلعہ بند فصیل تعمیر کروائی لیکن مراد دوم کے دور میں موریہ پر فوج کشی کی گئی اور مینوئیل ثانی پیلیولوگس بھاری خراج ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔

مراد دوم کے عہد کے آخری برسوں میں شہنشاہ قسطنطنیہ کے دو بھائی قسطنطین اور طاموس، موریہ کے الگ الگ حصوں پر حکمراں تھے۔ قسطنطین نے خاکنائے کورنتھ کی قلعہ بندی کے بعد عثمانیوں کے مقبوضہ شہر تھیبز پر قبضہ کر لیا۔ یہ اطلاع ملی تو مراد دوم نے فوج لے کر حملہ کر دیا۔ عثمانی توپ خانے کے آگے کورنتھ کا مضبوط قلعہ مٹی کی دیوار

Marfat.com

ثابت ہوا۔ قسطنطین اور طامس دونوں نے اطاعت کا اظہار کر کے خراج دینے پر آمادگی ظاہر کر دی اور موریہ کو سلطنت عثمانیہ کی باج گزار ریاستوں میں شامل کر لیا گیا۔

۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء میں مراد دوم نے تکہ اور منتشا کو بھی عثمانی حکومت میں شامل کر لیا۔ مشرقی اناطولی میں، توقاد اور اماسیہ کے اطراف کا علاقہ اور جانیق کا علاقہ بھی تسخیر کر لیا گیا۔

مراد دوم کا مشہور ترین کارنامہ سالونیکا کی فتح ہے۔ اس شہر کا نام سلانیک بھی لکھا گیا ہے۔ یہ موجودہ شمال مشرقی یونان میں بازنطینی سلطنت کا ایک اہم اور معروف شہر تھا۔ ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں مراد اول، ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں بایزید اول یلدرم اور ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں محمد اول نے اس شہر کو فتح کیا لیکن ہر بار بازنطینیوں نے اس شہر کو واپس لے لیا تھا۔ مراد دوم کے زمانے میں قیصر اینڈرونیکس اس علاقے کا حکمران تھا۔ اس نے سالونیکا کو وینس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ مراد دوم نے اس فروخت کی مخالفت کی۔ ۸۳۳ھ/۱۴۳۰ء میں سالونیکا پر فوجی کارروائی کی گئی اور شہر فتح کر لیا گیا۔

سالونیکا کی فتح کے بعد مراد نے سربیا کی جانب توجہ دی جو ان کی سلطنت کی شمال مغربی سرحد پر واقع تھا۔ اس زمانے میں سربیا کی ریاست بہت وسیع تھی اور اس میں سابقہ یوگوسلاویہ کا ایک حصہ، یونان کا ایک حصہ اور البانیہ کا ایک حصہ شامل تھا۔ مراد ثانی کے پردادا، مراد اول کی فوجی کارروائی پر ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء میں سربیا کے بادشاہ لازار نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ لازار نے اس معاہدے کا احترام کیا لیکن ۸۳۰ھ/۱۴۲۷ء میں لازار کے انتقال کے بعد جارج برنیکووچ برسر اقتدار آئے۔ انہیں عثمانیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے ترکوں کے خلاف ہنگری سے معاہدہ کر لیا۔ انہوں نے دریائے ڈینیوب کے ساحل پر سمندریا میں ایک مستحکم قلعہ بھی تعمیر کروالیا۔

مراد دوم نے اس خطرے کو محسوس کیا۔ سربیا، عثمانی سلطنت کے ماتحت تھی۔ جارج کے ارادے خطرناک تھے چنانچہ مراد نے جارج سے مطالبہ کیا کہ وہ سمندریا کا قلعہ عثمانیوں کے حوالے کر دیں۔ جارج نے انکار کر دیا، اس پر مراد نے فوجی کارروائی کی اور جنگ کے نتیجے میں ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء میں سربیا کا پورا علاقہ عثمانی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ جارج نے یہ صورت حال دیکھی تو صلح کا ہاتھ بڑھایا اور صلح نامے کی تجدید کروالی۔ انہوں نے اپنی بیٹی مارا کی شادی مراد دوم سے کر دی۔

ہنگری نے جنگ انگورہ کے بعد سے خاصی طاقت حاصل کر لی تھی چنانچہ عثمانی سلطنت سے اس کی سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بوسنیا والے بھی عثمانیوں سے خائف تھے۔ البانیہ کو بھی خطرہ تھا کہ عثمانی کہیں اسے فتح نہ کر ڈالیں۔ دوسری طرف ولاچیا (موجودہ رومانیہ کا حصہ ہے)، جو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تھا، خود مختار ہونا چاہتا تھا۔ تاہم مراد دوم کے حکمراں بننے کے بیس برس بعد تک ان مختلف عیسائی حکومتوں کے درمیان کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکا۔ لیکن جب ۸۴۴ھ/۱۴۴۰ء میں شاہ پولینڈ لاڈ سلاس ششم نے ہنگری کا اقتدار سنبھالا تو عثمانیوں کے دشمن متحد ہو کر مقابلے کے منصوبے بنانے لگے۔ انہیں اس اتحاد پر آمادہ کرنے میں نمایاں کردار ایک یورپی سردار جان ہنیدی ('ہونیاڈے' بھی لکھا گیا ہے) نے ادا کیا۔ جان ہنیدی بڑے دلیر جنگجو تھے اور مغربی یورپ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ شاہ ہنگری نے ان کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں مراد نے بلغراد پر حملہ کیا۔ اس زمانے میں بلغراد دریائے ڈینیوب کے ساحل پر سربیا کا اہم شہر تھا، لیکن ۸۳۰ھ/۱۴۲۷ء سے ہنگری نے اس پر قبضہ کر رکھا تھا اور ہنگری میں داخل ہونے کے لیے اس شہر کو فتح کرنا ضروری تھا۔ بلغراد پر حملہ ناکام رہا اور مراد کو پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد عثمانیوں کو ہرمان اسٹاٹ اور وازاگ کے مقامات پر دو بڑی جنگوں میں شکست ہوئی۔ عثمانیوں کی ان شکستوں کے باعث تمام یورپی حکومتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ سب یورپ سے ترکوں کو نکال باہر کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، سربیا، ولاچیا اور بوسنیا شریک تھے۔ فرانس اور جرمنی نے بھی فوج بھیجی۔ یورپ کے ہر ملک سے سپاہی روانہ کیے گئے۔ پوپ ایوجی نیس چہارم نے اپنے نمائندے کو مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ درحقیقت یہ ایک صلیبی جنگ تھی۔ وینس نے اپنے بحری بیڑے بھیج دیے تھے۔

مراد دوم اس وقت کرمانیہ کی بغاوت کو ختم کرنے کے سلسلے میں فوجی مہم پر تھے۔ اسی زمانے میں عیسائی لشکر نے ۸۴۷ھ/۱۴۴۳ء میں دریائے ڈینیوب کو عبور کر لیا اور نش کے مقام پر عثمانی لشکر کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اس کے بعد صوفیہ بھی فتح ہو گیا۔ مراد دوم نے اس صورت حال میں بہتر یہ سمجھا کہ صلح کر لی جائے، چنانچہ ربیع الاول

Marfat.com

۸۴۸ھ / جولائی ۱۴۴۴ء میں زیجی ڈین کے مقام پر ہنگری سے دس سالہ معاہدہ ہوگیا۔ یہ صلح نامہ گو کہ ہنگری کے حق میں تھا تاہم عثمانیوں کی مملکت کی حدود قائم رہیں۔ صرف افلاق (ولاچیا) کا صوبہ ہنگری کا باج گزار ہوگیا۔

صلح نامے کے بعد جب مراد جب ایشیائے کوچک واپس گئے تو انہیں اپنے بڑے لڑکے علاؤالدین کے انتقال کی افسوس ناک خبر ملی۔ کچھ تو بیٹے کا دکھ تھا، کچھ یہ کہ مسلسل بیس بائیس برس تک جنگوں میں مصروف رہنے کے باعث مراد اب تھک سے گئے تھے چنانچہ انہوں نے ۸۴۸ھ / ۱۴۴۴ء میں اپنے دوسرے بیٹے محمد کو اقتدار سونپ دیا اور خود ریاست آیدین کے شہر مغنیسیا میں قیام پذیر ہوگئے۔ محمد کی عمر صرف ۱۴ برس تھی۔ یہ وہی محمد ہیں جنہیں چند برس بعد قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا شرف حاصل ہوا اور جو سلطان محمد فاتح کے نام سے مشہور ہیں۔ تاہم اس وقت محمد کی کم سنی کو دیکھتے ہوئے ہنگری والوں کے دل میں بے ایمانی پیدا ہوئی اور انہوں نے صلح نامہ زیجی ڈین کی خلاف ورزی کا ارادہ کر لیا۔

اس بدعہدی پر شاہ ہنگری کو آمادہ کرنے میں پوپ کے نمائندے کارڈینل جولین نے اہم کردار ادا کیا۔ ہنگری والوں نے ایک نئی صلیبی جنگ کی تیاری شروع کر دی، البتہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے اعلان کو چند دن کے لیے اس غرض سے ملتوی کر دیا گیا کہ اس عرصے میں ترک ان تمام قلعوں اور علاقوں کو دیانت داری سے خالی کر دیں گے جن کے بارے میں معاہدے میں طے کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب عثمانیوں نے قلعوں اور علاقوں کو خالی کر دیا تو ۱۷ جمادی الاول ۸۴۸ھ / یکم ستمبر ۱۴۴۴ء کو شاہ ہنگری لاڈسلاس، کارڈینل جولین اور ہونیاڈے، بیس ہزار سپاہیوں کی فوج کے ساتھ حملے کے لیے روانہ ہوگئے۔ عثمانی اس دھوکے سے بالکل لاعلم تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا۔ عیسائی لشکر کئی اہم مقامات کو فتح کرتا ہوا دریائے ڈینیوب کے جنوب میں مشہور شہر وارنہ تک آپہنچا اور اس پر قابض ہوگیا۔

عیسائی لشکر کی اس بدعہدی اور غارت گری کی خبریں سن کر مراد دوم گوشہ نشینی ترک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چالیس ہزار سپاہیوں کی فوج فوراً تیار کی اور روانہ ہوگئے۔ درِ دانیال پر عیسائیوں کے جہازوں کا قبضہ تھا لیکن مراد ثانی نے جنیوا کے جہازوں کو ایک ایک سپاہی کا محصول ادا کر کے بڑی سرعت کے ساتھ اپنی فوج کو یورپ میں منتقل کر دیا۔ مراد کی فوج نے وارنہ سے چار میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

ہونیاڈے کو اپنی سابقہ کامیابیوں پر اتنا گھمنڈ تھا کہ وہ مراد کی فوج پر حملہ کرنے کے لیے اپنا لشکر لے کر چل پڑا۔ ۲۶ رجب ۸۴۸ھ / ۱۰ نومبر ۱۴۴۴ء کو فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ ابتدا میں عیسائیوں کو کامیابی ہوئی لیکن پھر عثمانیوں نے سنبھالا لیا۔ جنگ زور پکڑ گئی۔ لاڈسلاس کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا۔ عیسائیوں کی معاہدہ شکنی کی وجہ سے عثمانی لشکر میں اس قدر غم و غصہ تھا کہ بعض جوشیلے سپاہیوں نے لاڈسلاس کو اسی وقت قتل کر ڈالا اور اس کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر دیا۔ عیسائی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کے بہترین جرنیل مارے گئے اور اسے عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں ۶۵ ہزار مسیحی سپاہی ہلاک ہوئے جب کہ تیس ہزار مسلمان سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں سربیا اور بوسنیا کی ریاستیں عثمانیوں کے قبضے میں آگئیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ریاستیں اور ان کے عوام عیسائی حکمرانوں سے بیزار تھے کیونکہ ہونیاڈے نے انہیں مسیحی مذہب قبول کرنے پر مجبور کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ جنگ کے صرف آٹھ دن بعد بوسنیا کے ستر قلعوں کے دروازے عثمانیوں کے لیے کھول دیے گئے۔ بوسنیا کے بہت سے امرا مسلمان ہو چکے تھے۔

جنگ وارنہ کے بعد مراد دوم نے اقتدار پھر اپنے بیٹے محمد کے سپرد کیا لیکن اس بار ینی چری فوج نے اپنے بعض مطالبات کے حق میں بغاوت کر دی۔ مراد کو اندازہ ہوگیا کہ محمد ابھی کم سن ہیں اور بڑے بڑے معاملات سے تنہا نہیں نمٹ سکتے۔ مراد واپس کرسیِ اقتدار پر آگئے اور بقیہ تمام عمر امورِ مملکت انجام دیتے رہے۔

مراد دوم کو اپنی زندگی کے ان آخری چھ برسوں میں بھی سکون کے لمحات میسر نہ آنے اور وہ تقریباً پورا عرصہ جنگوں میں مصروف رہے۔

۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء میں موریہ کے ایک حصے پر حکمران قسطنطین نے عثمانی سلطنت کے مقبوضہ شہر تھیبیز پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ مراد کو اطلاع ملی تو وہ فوج لے کر بڑھے اور انہوں نے کورنتھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد قسطنطین اور اس کے بھائی طامس کے لیے اطاعت کے سوا کوئی راستہ نہ رہا۔ موریہ بھی دولتِ عثمانیہ کا باج گزار بن گیا۔

وارنہ میں شدید ہزیمت اٹھانے کے بعد ہونیاڈے بدلہ لینے کے

Marfat.com

لیے بے چین تھا۔ اس نے چار سال میں اسی ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج جمع کر لی اور ہنگری، سربیا اور بوسنیا کی فوجوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ یہ بڑا لشکر قوصوبا (اسے کسووا، قوصووا، قوصووہ بھی لکھا گیا ہے) کے میدان میں صف آرا ہوا۔ یہ وہی میدانِ جنگ تھا جہاں ساٹھ برس قبل مراد ثانی کے پردادا، مراد اول نے سربیا کی مضبوط حکومت کو شکست دی تھی۔

مراد دوم کو ہونیاڈے کے لشکر کی پیش قدمی کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ بھی جنگی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ۱۸ شعبان ۸۵۲ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۴۴۸ء کو دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ ہولناک جنگ تین دن تک جاری رہی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی۔ ہونیاڈے کی متحدہ فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔

اس زمانے میں البانیہ میں بغاوت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ مراد دوم کے دورِ حکومت کی ابتدا میں البانیہ کی ایک ریاست کے امیر جان کستریو نے اطاعت اختیار کر لی تھی اور اپنے چار لڑکے مراد کی خدمت میں بھیج دیے تھے۔ تین لڑکے تو بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ایک لڑکا جارج کستریو زندہ رہا۔ مراد نے انہیں اپنی نگرانی میں فوجی تعلیم دلوائی۔ اسکندر بک کا خطاب دیا اور ایک علاقے کا حاکم بنا دیا۔ جان کستریو کے انتقال کے بعد جارج کستریو (اسکندر بک) نے سرکشی اختیار کر لی۔ وہ تقریباً پچیس برس تک عثمانیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ البانیہ میں پُر پیچ پہاڑی دروں کی وجہ سے عثمانی فوج اسکندر بک کی بغاوت کو پوری طرح ختم نہ کر سکی۔ بالآخر ۵ محرم ۸۵۵ھ / ۶ فروری ۱۴۵۱ء کو مراد دوم نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ ان کا انتقال ادرنہ میں ہوا، انہیں برسہ لا کر اسی مسجد کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا جو انہوں نے بنوائی تھی۔

جنگ انگورہ کے بعد عثمانی سلطنت عدم استحکام کا شکار ہو گئی تھی۔ محمد اول نے اس سلطنت کو استحکام دیا اور ان کے بیٹے مراد دوم نے اپنی شجاعت، لیاقت اور مثالی انتظام کی بدولت اس سلطنت کو وہی مقام دلوا دیا جو بایزید یلدرم کے دور میں حاصل تھا۔

مراد دوم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ عثمانیوں میں شیخ الاسلام کا عہدہ ان کے دور میں قائم ہوا اور یہ عہدہ اس کے بعد ۴۹۸ برس تک برقرار رہا۔ عثمانیوں کے ابتدائی عہد میں اس قسم کا ایک عہدہ "مفتی الانام" کے نام سے قائم تھا۔ فتویٰ دینے کی ذمہ داری "مفتی الانام" ہی کی ہوتی تھی۔ مراد دوم کے دور سے 'مفتی الانام' کی جگہ شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس کے اختیارات وسیع کر دیے گئے۔ شیخ الاسلام کا عہدہ وزیر اعظم کے بعد سب سے بڑا تھا۔ شیخ الاسلام عام طور پر تاحیات مقرر کیے جاتے تھے۔ دیگر عہدیداران مثلاً صوبائی افسران یا وزرا وزیر اعظم یا سلطان کو جواب دہ تھے لیکن شیخ الاسلام کے لیے ایسی قید نہ تھی۔ وہ ہر فیصلہ شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ ہر مسئلے میں خواہ اس کا تعلق جنگ سے ہو یا امن سے، پہلے شیخ الاسلام کی رائے حاصل کی جاتی تھی۔

شیخ الاسلام کا دبدبہ اتنا تھا کہ سلاطین تک ان سے گھبراتے تھے۔ شیخ الاسلام پوری مملکت کے مدارس کے منتظم اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام عدالتوں کے نگراں ہوتے تھے۔ ججوں کا تقرر اور تنزلی ان کے حکم سے ہوتی تھی۔ مدارس کا انتخاب اور تعلیمی پالیسی کا تعین وہی کرتے تھے۔ تاہم شیخ الاسلام آمر مطلق نہ تھے۔ ان کے ساتھ جید علمائے کرام رہتے تھے جو شیخ الاسلام کے فیصلوں پر نظر رکھتے تھے اور اگر کوئی بات شریعت سے متصادم ہوتی تو وہ شیخ الاسلام کو بھی ٹوک دیتے تھے۔ عثمانیوں کے پورے دور میں ۱۳۱ شیخ الاسلام مقرر کیے گئے۔ مراد دوم کے دور میں پہلے شیخ الاسلام ملا شمس الدین فناری کا تقرر ۸۴۶ھ / ۱۴۴۲ء میں ہوا تھا۔

ترکی زبان اور ادب کی ترقی میں سب سے زیادہ اہم کردار مراد دوم نے انجام دیا۔ اس سلسلے میں ان کی عظیم خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ علم و ادب سے ان کی گہری دلچسپی کے باعث نامور علماء کرام، شعرا اور ماہرین علم و فن کی بڑی تعداد دارالحکومت برسہ میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ مراد خود بھی اچھے شاعر تھے۔ مراد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں یا ترکی میں ترجمہ کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے: شیخ زادہ احمد مصری کی "ترق وزیر حکایہ سی"، محمد بن عمر الحلبی کا ترجمہ "الفرج بعد الشدہ"، اسی مصنف کا ترجمہ مناقب امام اعظم، دیگر کئی تراجم، دولت اوغلی یوسف کے تراجم "ہدایہ" اور "رقایہ"۔ شیخ الوان شیرازی کا ترجمہ "گلشن راز"، ایک نامعلوم مترجم کا ترجمہ مثنوی جلال الدین رومیؒ بعنوان مثنوی مرادی، سائنس دان ابن بیطار کی مفردات کا ترجمہ "فرح نامہ"، "جاماسپ نامہ"، "باہ نامہ"، "سلیمان نامہ" اور دیگر کئی کتابیں۔

مراد دوم ہی کے دور میں قرآن مجید کی ایک ترکی تفسیر لکھی گئی۔ تاریخ ابن کثیر کا ترجمہ کیا گیا۔ "سلجوق نامہ"، یازیجی زادہ علی نے

Marfat.com

لکھا۔ یحییٰ بن محمد کاتب نے "مناہج الانشا" لکھی جس میں کئی اہم تاریخی دستاویزات ہیں۔ ابو الفضل موسیٰ بن حاجی حسین نے تفسیر "النفس الجواہر" کا ترجمہ کیا۔ ابن عرب شاہ نے ابو اللیث کی تفسیر اور عوفی کی "جامع الحکایات" کے تراجم کیے۔ اس عہد کی شاعری کی تاریخ کے بارے میں سب سے اہم تصنیف "مجموعہ النظائر" ہے جسے عمر بن مزید نے ۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء میں تصنیف کیا، اس میں تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے ۸۳ شعرا کرام کا کلام شامل ہے۔

مراد دوم کے دور میں موسیقی پر بھی کئی کتب لکھی گئیں۔ ایک ماہر موسیقی عبدالقادر ابن غیبی (وفات:۸۳۸ھ/۱۴۳۵ء) نے ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں موسیقی پر رسالہ، "مقاصد الالحان" کے عنوان سے لکھا اور اسے خود مراد دوم کو پیش کرنے کی غرض سے سمرقند سے بُرسہ کا سفر اختیار کیا۔ اس کتاب سے ترکوں کے آلاتِ موسیقی کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ خاص مقامی ساز طنبورۂ ترکی، قوپوز رومی اور بلبان تھے۔ ابن غیبی اس دور کے سب سے مشہور مغنی تھے اور ان کی تصانیف "شرح الادوار"، "کنز الالحان"، بہت بلند پایہ کتب شمار ہوتی ہیں۔ یہ کتب فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ بہت سے راگوں کو ابن غیبی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اسی زمانے میں علم موسیقی کے ایک اور ترک مصنف خضر بن عبداللہ نے مراد دوم کے حکم سے "ادوار موسیقی" کے عنوان سے رسالہ لکھا۔ ایک اور مصنف احمد اوغلو شکر اللہ نے موسیقی کے موضوع پر ایک کتاب ترکی زبان میں تصنیف کی جو بہت اہم ہے۔ اس میں کئی آلاتِ موسیقی مثلاً عود، اقلیغی، رباب، مزمار، پیشہ، چنگ، نُزھہ، قانون اور مغنی کے بارے میں تفصیلات اور خاکے دیے گئے ہیں۔

مراد دوم کے دور میں بہت سے اہم شعرا کرام موجود تھے۔ مثلاً شیخی، رومی، حسامی، شمسی، حسان، صفی، ازہری، نجومی، ندیمی، علوی، ضعیفی۔ مراد دوم کے والد محمد اوّل کے عہد میں سلیمان چلبی نے اپنی مشہور نظم "مولد" بُرسہ میں لکھی جو صدیوں تک پڑھی جاتی رہی ہے۔ یہ نظم ترکی ادب کا شاہکار قرار دی گئی ہے۔ احمد داعی، گرمیان اوغلی اور آلِ عثمان کے درباریوں میں تھے۔ انہوں نے عربی، فارسی اور ترکی کا لغت "عقود الجواہر" بھی مرتب کیا۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے۔

اسی دور میں شیخی بھی تھے جو اچھے شاعر تھے۔ مراد دوم انہیں پسند کرتے تھے۔ ان کا اصل نام سنان گرمیانی تھا۔ انہوں نے نظامی کی مثنوی "شیریں و خسرو" کا ترجمہ بھی کیا۔ انہیں شیخ الشعرا بھی کہا جاتا ہے۔ بُرسہ کے عطائی بھی اس عہد کے کامیاب شاعر تھے۔ ان کا دیوان ابھی تک موجود ہے۔ ان کا انتقال ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء میں ہوا۔ صفی مصور اسی عہد کے نمایاں شاعر تھے۔

اسی زمانے میں علوی برسوی، ہمامی از نیقی (مصنف مثنوی "سی نامہ")، گیلی پولی کے احمد رومی اور ضعیفی، بکتاشیوں کے بابا ندیمی بھی تھے۔ ضعیفی نے نظموں میں مراد دوم کی جنگوں کا حال بیان کیا ہے۔ جمالی نے اپنی کتابیں محمد ثانی اور مراد دوم کے نام معنون کیں۔ انہوں نے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں مراد دوم کے لیے ایک مثنوی بعنوانِ "گلشنِ عشاق" لکھی۔

مراد دوم کے دور میں صوفیانہ ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ تصوف کی امہات کتب (گلشن راز، مرصاد العباد، فصل الخطاب، تذکرۂ اولیا) کے ترجموں کے ساتھ ساتھ صوفیوں کے طریقِ ریاضت اور قواعدِ طریقت پر نظم و نثر میں کئی کتب لکھی گئیں مثلاً مثنوی ہائے "مناجات نامہ"، "فتوت نامہ"، "عبرت نامہ"، "معذرت نامہ"، "الست نامہ" اور "حیرت نامہ"۔ اسی زمانے کے کئی صوفیائے کرام نے نظمیں لکھیں، ان میں امیر سلطان بھی شامل ہیں۔

امیر سلطان نے حلقۂ ملامیہ بیرمیہ کے بانی انقرہ کے حاجی بیرم ولی کے ساتھ مل کر صوفی شعرا کے ایک سلسلے کی بنیاد رکھی۔ یازیجی صلاح الدین کے بیٹے محمد اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جو یازیجی اوغلی کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی شہرت ان کی نظم "محمدیہ" کی وجہ سے ہے جو ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس نظم کا موضوع سیرت کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ اس نظم کے ادبی اثرات بہت دوررس تھے۔

اس زمانے کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر صوفی شعرا میں سے ایک کمال امی ہیں۔ عبداللہ بن اشرف (اشرف اوغلی) بھی بہت مشہور ہیں وہ کتاب مزکی النفوس اور ایک دیوان کے مصنف ہیں۔ صوفی اہلِ قلم کی تصانیف کی بدولت ایک باقاعدہ علم قصص اولیا کی تخلیق ہوئی۔

مراد دوم کے امرا میں سے ایک اہم امیر اومور بیگ نے بھی ترکی ادب کی ترقی میں بہت دلچسپی لی۔ بہت سی تصانیف ان کے نام پر لکھی گئیں ان میں محمد بن محمود شیروانی کا "جوہر نامہ اکسیر السعادات" کا ترجمہ شامل ہے۔

Marfat.com

مراد دوم کے زمانے میں تعمیرات پر بھی توجہ دی گئی۔ بُرسہ کی یشیل جامع کو محمد اوّل (وفات:۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء) اور مراد ثانی (وفات:۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء) نے تعمیر کیا۔ یہ سب سے عظیم مسجد ہے اور یہ ان چھ بڑی مساجد میں شامل ہے جو بُرسہ میں ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء سے ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء تک چھ عثمانی حکمرانوں کے دور میں تعمیر کی گئیں۔ ان میں اُورخان، مراد اوّل، بایزید، محمد اوّل، مراد دوم اور محمد فاتح شامل ہیں۔ ہر مسجد پر ایک سلطان کا نام ثبت ہے۔

یشیل جامع کی دیواروں میں جو کھڑکیاں ہیں، ان کی چوکھٹوں کی تختیوں پر پتھر کی ابھرواں پٹیاں نظر آتی ہیں جن پر قرآنی آیات ثبت ہیں۔ مدخل کے حصے میں سلطان اور درباریوں کے لیے دو منزلہ حجروں کا اضافہ کیا گیا، انہیں طوس کے صناعوں کی کاشی کاری سے مزیّن کیا گیا۔ محراب پر بھی شاندار کاشی کاری کی گئی ہے۔ مسجد کی دیواریں دو میٹر کی بلندی تک، شش پہلو سبز اور نیلی روغنی ٹائلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اوپر کی طرف نیلی زمین پر سفید ابھرواں حروف میں قرآنی آیات نظر آتی ہیں۔

مراد دوم نے ۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء میں بُرسہ میں جامع مرادیہ (مسجد) تعمیر کی۔ انہوں نے ادرنہ میں ایک اور عمارت دارالحدیث کے نام سے تعمیر کروائی جسے بعد میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ مراد ثانی نے ایک اور مسجد ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء اور ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء کے درمیان تعمیر کروائی جو تین منزلوں (گیلری) والی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کا مرکزی گنبد ایک شش پہلو ستون پر قائم ہے۔ اس کے پہلو میں چار اوسط درجے کے چھوٹے گنبد ہیں۔ چاروں طرف ایک سائبان ہے جس میں ۲۱ گنبد ہیں۔ یہ گنبد ۱۸ ستونوں پر قائم ہیں۔ مسجد کے چار مینار ہیں۔ ان میں سے ایک تین منزلوں پر مشتمل ہے۔ ہر منزل کے لیے الگ زینہ ہے۔ بُرسہ کی اولو جامع کا مسقّف (چھت دار) حصہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس طرز کی مسجد ترکی میں ایک ہی ہے۔ اس مسجد کے کتبے ۱۵ویں صدی کی ترک خطاطی کا بہترین نمونہ ہیں۔

دوسرے عثمانی سلطان اورخان نے ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں فلاحِ عامہ کا ایک ادارہ ازنیق میں قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ "عمارت" کہلاتا تھا۔ یہاں مستحق افراد اور مدارس کے طلبہ کے لیے کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا اور مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ مراد دوم نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا اور "عمارت" کا خود افتتاح کیا۔ یہ سلسلہ بعد کے عثمانی سلاطین نے بھی صدیوں تک جاری رکھا۔ مراد دوم نے چند بڑے پل بھی تعمیر کروائے تھے۔

اُورخان، مراد اوّل اور بایزید اوّل نے اپنے اپنے دور میں کئی شفاخانے قائم کیے۔ مراد دوم نے ان میں اضافہ کیا۔ انہوں نے ادرنہ میں جذام کے مریضوں کے لیے شفاخانہ قائم کیا۔ یہ شفاخانہ تقریباً دو صدیوں تک کام کرتا رہا۔ ان سے قبل سیواس، قسطمونی اور قیصری کے مقامات پر جذام کے شفاخانے قائم ہو چکے تھے۔

مراد دوم نے جتنی جنگیں لڑیں، ان کا مقصد اپنی مملکت میں توسیع نہ تھا، بلکہ ہر بار انہیں جنگ لڑنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جنگ جیتنے کے بعد انہوں نے مفتوحہ علاقے کو بالعموم اپنی مملکت کا حصہ نہیں بنایا بلکہ اسے محض باج گزار ریاست کی حیثیت دے دی۔

مراد دوم نے ۴۹ برس کی عمر پائی اور ان کی حکومت تیس سال چھ ماہ قائم رہی۔ وہ عادل اور دلیر حکمراں تھے۔ ان کی کشادہ دلی، مستقل مزاجی، فیاضی اور علم دوستی کے سب معترف ہیں۔ وہ جب بھی کسی علاقے کو فتح کرتے تھے تو سب سے پہلے وہاں مساجد، سرائے، شفاخانے اور مدرسے تعمیر کرواتے تھے۔ ہر سال وہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس میں دین دار لوگوں اور فقرا کے لیے خطیر رقوم روانہ کرتے تھے۔ مراد دوم کے بلند کردار اور شرافتِ نفس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک نے کیا ہے۔ مسلمان مؤرخین ہی نہیں غیر مسلم مؤرخین بھی ان کو اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔

•••

Marfat.com

سلطان محمد فاتح

سلطنت عثمانیہ کے ساتویں حکمران جنہیں قسطنطنیہ کا فاتح ہونے کا اعزاز نصیب ہوا

چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔

غلطہ کے نواح میں واقع درختوں کے گھنے جھنڈ، ٹھنڈی اور پُرسکون چاندنی میں نہائے ہوئے تھے، ہوا کے نرم جھونکے پتّوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے لیکن موسم گرما کی اس رات فضا میں ایک اضطراب سا تھا۔ ہزاروں افراد زمین پر لکڑی کے تختے بچھانے میں مصروف تھے اور بہت سے، ان تختوں پر گائے کی چربی مل کر انہیں چکنا بنا رہے تھے۔

چاند نے اس منظر کو حیرت سے دیکھا اور شاید اپنی حیرت رفع کرنے کی خاطر آگے بڑھ آیا لیکن، آنے والے لحات اس کی حیرت میں اضافہ ہی کا باعث بنے کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ درجنوں بادبانی جہاز لکڑی کے ان تختوں پر چڑھائے جا رہے تھے، جہازوں کو تو پانی میں تیرنا چاہیے، لکڑی کے تختوں پر انہیں سوار کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر چاند نے تعجب سے دیکھا کہ ہزاروں انسان کی مشترکہ قوت نے ان جہازوں کو چکنے تختوں پر دھکیلنا شروع کر دیا ہے۔ خشکی پر بادبانی جہازوں کا یہ انوکھا سفر کوئی دس میل طویل تھا اور اس کے سفر کے اختتام پر سمندر کی پُرسکون لہریں آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔

چوبی تختوں کے سینے پر بحری جہازوں کو سفر کروانے کا اچھوتا خیال جس حکمران کے ذہن رسا میں آیا تھا وہ تھے عثمانی سلطنت کے ساتویں حکمران، سلطان ابوالفتح محمد ثانی جنہوں نے لاجواب تدبیر اپنا کر وہ شہر تسخیر کر ڈالا جسے فتح کرنے والے کے لیے سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کی دعا فرمائی۔ ہماری مراد شہر قسطنطنیہ سے ہے جس کی فتح نے سلطان محمد ثانی کو فاتح، کے لقب سے نوازا اور ان کا نام تاریخ کے سنہرے صفحات میں شامل کر لیا۔

سلطان محمد کو ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے قبل عثمانی خاندان میں ایک اور محمد خان حکمران تھے لیکن سلطان محمد ثانی اب محمد فاتح کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ رجب ۸۳۲ھ / اپریل ۱۴۲۹ء میں پیدا ہوئے ان کے والد مراد ثانی بھی سلطان تھے۔ محمد ثانی نے ہوش سنبھالا تو والد مغنیسیا کے حاکم تھے۔ والد کی وفات کے بعد محرم ۸۵۵ھ / فروری ۱۴۵۱ء میں محمد ثانی نے مملکت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔

سلطان محمد ثانی کا دور حکومت ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء سے ۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء تک جب ان کی وفات ہوئی، تیس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس عرصے میں سلطان نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے نہایت جرأت کے ساتھ وسیع علاقوں پر فوج کشی کی اور ان علاقوں کو فتح کر کے اسلامی مملکت کا حصہ بنا دیا۔ ان کی فتوحات کی بدولت سلطنتِ عثمانیہ کو بہت وسعت حاصل ہوئی اور سولہویں صدی میں اس کے مزید وسیع ہونے کے امکانات پیدا ہوئے۔ سلطان نے اپنے تیس سالہ عہد حکومت میں ۱۲ سلطنتیں اور ریاستیں اور ۲۰۰ سے زائد شہر اور قلعے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیے لیکن ان کا پہلا اور سب سے زیادہ درخشاں کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ قسطنطنیہ اب ''استنبول'' کہلاتا ہے۔

قسطنطنیہ کا شہر روم کے شہنشاہ قسطنطین اول نے ۳۳۰ء میں آباد کیا تھا۔ یہ شہر آبنائے باسفورس کے کنارے اس مقام پر آباد ہے جہاں سے یورپ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد قسطنطنیہ پونے پانچ سو سال سے زیادہ عرصے تک مملکتِ اسلامیہ کا دارالحکومت بنا رہا۔ اس شہر کو اس لیے بے حد اہمیت حاصل ہے کہ اس کو فتح کرنے والی فوج اور اس کے سالار کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے بشارت دی ہے کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے

Marfat.com

شہر پر حملہ آور ہوگا اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔ (بخاری)۔ اس کے علاوہ مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی یہ حدیث موجود ہے کہ "تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرلو گے ۔ رحمت ہو اس حکمراں اور اس لشکر پر جس کے ہاتھوں یہ فتح نصیب ہو۔"

قسطنطنیہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر ساتویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل تک مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کرنے کی دس مرتبہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ قسطنطنیہ کو تسخیر کرنے کی سعادت پانے کی خواہشمندوں میں کئی بلند پایہ صحابہ کرامؓ سمیت بہت سے لوگ شامل تھے۔ ۴۸ھ / ۶۶۸ء میں اس شہر کے محاصرے کے دوران صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے شہادت پائی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کے سامنے سپرد خاک کیے گئے۔

ربِ کائنات کا فیصلہ یہ تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا اعزاز سلطنتِ عثمانیہ کے ایک حکمران سلطان غازی محمد ثانی کو حاصل ہوا۔ سلطان محمد ثانی نے جب سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو قسطنطنیہ پر قیصر قسطنطین دوازدہم حکومت کر رہا تھا۔ اس زمانے میں رومی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہوچکا تھا صرف قسطنطنیہ باقی تھا اگر یہ شہر تسخیر ہوجاتا تو یورپی ممالک کی فتوحات کا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھل جاتا۔

قسطنطین دوازدہم نے محمد ثانی کے تخت نشین ہونے کے بعد انہیں پیغام بھیجا کہ سلطان مراد ثانی کے زمانے سے عثمانی خاندان کا ایک شہزادہ ارخان ہمارے پاس نظر بند ہے۔ اس کے اخراجات کی رقم شاہی خزانے سے آتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے ورنہ ہم شہزادے کو آزاد کردیں گے اور وہ آپ سے حکومت چھین لے گا۔ محمد ثانی اس چال کو سمجھ گئے اور قسطنطین کے ایلچی کو ٹال دیا۔

اب سلطان محمد ثانی نے ایشیائے کوچک (روم) میں ہونے والی بغاوت کو فرو کیا، پھر ہنگری کے بادشاہ ہنی ڈیز سے تین سال کے لیے صلح کا معاہدہ کرلیا، اس طرح سلطنت کی شمالی سرحدیں محفوظ ہوگئیں۔ اسی اثنا میں قسطنطین نے شہزادہ ارخان کے نفقہ میں اضافہ کا پھر مطالبہ کیا لیکن محمد ثانی نے جواب میں نفقہ بالکل بند کردیا اور قسطنطنیہ پر حملے کی تیاریاں شروع کردیں۔ سب سے پہلے سلطان محمد ثانی نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروانا شروع کردیا۔ یہ قلعہ جسے حصن رومیلیا کا نام دیا گیا تھا، آبنائے کے دوسرے کنارے پر سلطان بایزید کے بنائے ہوئے قلعہ کے مقابل تھا۔ ہزاروں مزدوروں نے اس قلعہ کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اس کی دیواریں تیس فٹ چوڑی تھیں۔ اس کے خصوصی بُرج پر ایک بھاری توپ خانہ تھا جو چھ ہنڈرویٹ وزن تک کے گولے پھینک سکتا تھا۔ یہ قلعہ ۸۵۶ھ / ۱۴۵۲ء میں موسم سرما سے قبل تیار ہوگیا۔ اب آبنائے باسفورس پر ترکوں کا قبضہ تھا اور کوئی جہاز ان کی اجازت کے بغیر اسے عبور نہ کرسکتا تھا لیکن قسطنطین بھی صورتحال کو بھانپ کر جنگ کی تیاریوں میں معروف تھے اور انہیں دردانیال کے راستے یورپی ممالک سے کمک پہنچ رہی تھی۔

سلطان محمد ثانی نے ستر ہزار سوار اور بیس ہزار پیادوں کی فوج اکٹھی کی۔ ہنگری کا ایک عیسائی باشندہ اربان مسلمان ہوکر سلطان کے پاس آگیا تھا، وہ بہترین آہن گر تھا۔ سلطان کے حکم پر اربان نے ایک بہت بڑی توپ بنائی جس کے گولوں کا قطر ڈھائی فٹ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی توپیں بنائیں۔ یہ وہ دور تھا جب جنگوں میں منجنیقوں (پتھر پھینکنے والی توپوں) اور بارود کے گولے پھینکنے والی توپوں کا استعمال ساتھ ساتھ کیا جارہا تھا۔ اربان نے جو توپیں بنائی تھیں ان کی نقل و حرکت دشوار تھی اور ان سے صبح سے شام تک صرف سات آٹھ مرتبہ گولے داغے جاسکتے تھے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد توپوں سے لڑائی کے فن کو بہت ترقی دی گئی۔

قسطنطنیہ کا شہر مثلث نما ہے، اس کے دو حصے پانی سے گھرے ہوئے ہیں۔ شمال میں شاخ زریں اور جنوب میں بحیرۂ مارمورا ہے، شہر پر خشکی کی راہ سے صرف مغربی جانب سے حملہ کیا جاسکتا تھا لیکن اس سمت میں تین مضبوط دیواریں حائل تھیں۔ اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سو ستر فٹ کے فاصلے سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے۔ ان دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ دوسری اور تیسری دیوار کے درمیان ساٹھ فٹ چوڑی اور سو فٹ گہری خندق تھی۔ یہ دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں بادشاہ تھیوڈوسیس ثانی نے بنوائی تھیں۔ ادھر قسطنطین نزاکت کو دیکھتے ہوئے شہر کی حفاظت کے زبردست انتظامات میں معروف تھے۔ انہوں نے شہر کی دیواروں کی مرمت کروائی تھی اور مغربی یورپ سے مدد کی اپیلیں کر رہے تھے۔ ان کی اپیل پر پوپ نکلسن پنجم نے عیسائیوں کو جنگ کی ترغیب دی۔ چنانچہ اندلس کے شمالی صوبوں اراگون اور قسطلہ سے عیسائیوں کی فوجیں قسطنطنیہ پہنچنے لگیں۔ پوپ نے خود ایک زبردست فوج اپنے نائب

Marfat.com

کارڈینل کے ساتھ روانہ کی۔ وینس اور جنیوا کی بحری اور بری فوجیں بھی روانہ ہوگئیں۔ شہر قسطنطنیہ کی آبادی ایک لاکھ سے زائد تھی۔ شہریوں سے چندے وصول کیے گئے اور انہیں جوش دلایا گیا کہ وہ شہر کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

۶ ربیع الآخر ۸۵۷ھ / ۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کا تاریخی محاصرہ شروع ہوا، سلطان محمد ثانی خشکی کی طرف سے قسطنطنیہ کے سامنے نمودار ہوئے ادھر عثمانی جہازوں نے بحیرۂ مارمورا میں سٹ کر بندرگاہ قسطنطنیہ، یعنی شاخِ زریں کے سامنے بحری محاصرہ شروع کر دیا۔ فصیل پر گولہ باری شروع ہوگئی۔ دونوں جانب بڑا جوش و خروش تھا، تیر برس رہے تھے اور توپوں سے آگ اور دھواں نکل رہا تھا۔ سلطان محمد ثانی نے اپنا خیمہ شہر کے دروازے سینٹ رومانوس کے سامنے نصب کروایا تھا۔ اسی دروازے پر سلطان کی فوج اپنا زیادہ زور صرف کر رہی تھی۔ چند روز کی گولہ باری کے نتیجے میں فصیل میں کچھ شگاف پڑ گئے لیکن عیسائیوں نے انہیں جلد ہی پُر کر لیا۔ مسلمان فصیل پر چڑھنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

سلطان محمد ثانی نے اب فصیل کی بلندی کے برابر اونچے اونچے لکڑی کے مینار بنوائے، ان کے نیچے پہیے لگے تھے اور اوپر سیڑھی بندھی ہوئی تھی۔ ان میناروں کو راہ میں حائل خندق کے کنارے لے جا کر مینار کے اوپر بندھی سیڑھی کا دوسرا سرا افقی طور پر قلعہ کی دیوار پر رکھ دیا جاتا، اس طرح خندق پر ایک پل سا بن جاتا تھا، لیکن جوں ہی کوئی پل باندھا جاتا شہر کے اندر سے آگ کے گولے برسنے لگتے۔ اسلامی فوج نے لکڑیوں کے گٹھے، پیپے درختوں کے تنے وغیرہ ڈھیر کر کے خندق کو پاٹنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ ترکیب بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس دوران ۱۵ اپریل کو جنیوا کے چار جہاز غلہ اور گولہ بارود کا سامان لے کر آئے اور باسفورس کے قریب ترک جہازوں کی ناکہ بندی کو توڑ کر شاخِ زریں میں داخل ہوگئے، پھر مزید پانچ جہاز آئے، انہیں بھی نہ روکا جا سکا۔ اب اہل قسطنطنیہ کے پاس خاصی رسد پہنچ چکی تھی۔

سلطان محمد ثانی کئی دن کے محاصرے کے بعد سمجھ چکے تھے کہ جب تک بحری اور بری دونوں جانب سے حملہ نہ کیا جائے گا، شہر کو تسخیر کرنا بہت مشکل ہوگا۔ بحری سمت سے حملہ اس لیے دشوار تھا کہ شاخِ زریں کے دہانے کے قریب قسطنطنیہ کے جہاز پہرہ دے رہے تھے۔ آخر سلطان کو ایک عمدہ ترکیب سوجھ گئی۔ شاخِ زریں کی بندرگاہ سے مشرق کی سمت میں دس میل چوڑی خشک پٹی تھی جس کی دوسری جانب آبنائے باسفورس میں سلطان کے جہاز نقل و حرکت کر رہے تھے۔ یہ پٹی غلطہ کے نواحی علاقے کے پیچھے سے گزرتی تھی اور اس پر درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔

امیر لشکر محمد ثانی کے حکم پر اس راستے کی ناہمواری کو دور کیا گیا اور اس پر لکڑی کے مضبوط تختے بچھا دیے گئے، ان تختوں پر بھیڑ اور گائے کی چربی مل کر انہیں خوب چکنا بنا دیا گیا۔ اب ۸۰ سے زائد بادبانی جہاز جو پچاس اور تیس پتواروں سے چلنے والے تھے، باسفورس کے ساحل پر لگا دیے گئے، جہازوں کو بڑی ہوشیاری سے لکڑی کے تختوں پر چڑھا دیا گیا۔ یہ ۱۴ جمادی الاول ۸۵۷ھ / ۲۳ مئی ۱۴۵۳ء کی رات تھی، چاندنی چٹکی ہوئی تھی، بادبان ہوا کے رُخ پر کھول دیے گئے۔ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے رزمیہ نغمے الاپے جانے لگے۔ ہزاروں افراد نے جہازوں کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ ان کا شور و غل، انقلابی نعرے اور رزمیہ گیت! اس رات قسطنطنیہ والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں لیکن صبح ہوئی اور آفتاب طلوع ہوا تو شہر والے یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اسلامی فوج کے جہاز فصیل شہر کے نیچے پہنچ چکے ہیں اور سمندر کے تنگ حصہ پر لکڑی کے شہتیروں اور زنجیروں سے بنا ہوا ایک ٹھوس فرش تیر رہا ہے جس پر توپ خانہ بھی نصیب ہے۔ قسطنطین اور اس کی فوج تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ مسلمان اتنے زبردست دفاعی حصار کو یوں توڑ کر شہر کی فصیل تک پہنچ جائیں گے۔

اب عیسائیوں کی توجہ تقسیم ہو چکی تھی اور وہ مجبور تھے کہ دو اطراف سے شہر کا دفاع کریں۔ اسی دن قسطنطین نے سلطان کو پیغام بھجوایا کہ آپ جتنا خراج مقرر کریں میں دینے کے لیے تیار ہوں لیکن قسطنطنیہ میرے پاس رہنے دیں۔ سلطان نے جوابی پیغام میں کہا کہ اگر اطاعت قبول کرو گے تو تم کو یونان کا جنوبی حصہ دیا جا سکتا ہے لیکن قسطنطنیہ پر مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ سلطان کو معلوم تھا کہ قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت جب تک باقی رہے گی اسلامی حکومت کے لیے خطرے کا باعث بنی رہے گی پھر یہ کہ قسطنطنیہ، سلطنتِ عثمانیہ کا بہترین دارالسلطنت ثابت ہو سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس شہر کو تسخیر کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی ہو اسے تسخیر کیے بغیر سلطان واپس کیسے جا سکتے تھے۔

مزید پانچ دن گزر گئے، شہر کے محاصرے کو ۵۲ دن ہو چکے

Marfat.com

تھے۔ مسلسل گولہ باری کے باوجود قسطنطنیہ کا مضبوط حصار اپنی جگہ قائم تھا۔ ۱۹ جمادی الاول ۸۵۷ھ / ۲۸ مئی ۱۴۵۳ء کو سلطان نے اپنی فوج میں اعلان کروایا کہ کل صبح سویرے شہر پر فیصلہ کن حملہ ہو گا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسلامی فوج کو فتح سے ہمکنار کرے تو کوئی فوجی امن طلب کرنے والی رعایا، ضعیفوں، بچوں وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائے اور سرکاری عمارتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ادھر قسطنطین کو بھی اطلاع مل چکی تھی کہ اگلے دن مسلمان بھرپور حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس نے اپنے تمام مشیروں اور افسروں کو طلب کر لیا۔ مورخ فرانزا خوف بھی اس مجلس مشاورت میں موجود تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر رو رہے تھے۔ قسطنطین نے سب کو دلاسا دینے کی کوشش کی اور آخری سانس تک لڑنے کا وعدہ لیا۔ کچھ دیر بعد سینٹ آیا صوفیہ کے کلیسا میں عشائے ربانی کی دعائیں گونج رہی تھیں۔

ادھر سلطان کی فوج بھی عبادت میں مصروف تھی اور اللہ سے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ صبح کا اجالا پھیلا تو فضا نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے دہل اٹھی۔ دلوں میں شوقِ شہادت لیے مجاہدوں نے شہر کی فصیل پر زبردست حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا اور اس حصے سے مسلمان سپاہی شہر میں داخل ہو گئے، دست بہ دست جنگ شروع ہو گئی۔ عیسائی اس لڑائی میں زیادہ دیر نہ ٹک سکے۔ ادھر فصیل گری اور ادھر بندرگاہ کی طرف سے سلطان کے ایک بحری دستے نے ایک برج پر قبضہ کر کے اسلامی فوج کا علم بلند کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا اور لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اب تک تو جنیوا کا کمانڈر جسٹینانی، قسطنطنیہ کی فوج کو جوش دلا رہا تھا لیکن لڑائی کے دوران جسٹینانی زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے پر فوج میں بددلی پھیل گئی، یہ رنگ دیکھ کر قسطنطین نے اپنی امتیازی سرخ عبا اتار پھینکی اور عام سپاہیوں کی طرح لڑتے ہوئے مارا گیا۔

ظہر کے وقت قسطنطنیہ تسخیر ہو چکا تھا۔ سلطان محمد شہر میں داخل ہوئے۔ سینٹ آیا صوفیہ کے کلیسا پہنچے۔ وہاں صفائی کروائی اور پہلی بار اس شہر کی فضاؤں میں یہ آفاقی کلمات گونج اٹھے، "اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔" وہ شہر جسے تسخیر کرنے والوں کے لیے رسول خدا ﷺ نے بشارت دی تھی، جب مسلمانوں کے زیر نگیں آیا تو پھر مسلمانوں کو روکنا اہل یورپ کے لیے ممکن نہ رہا اور ایک ایک کر کے یورپی علاقے مسلمانوں کے زیر تسلط آتے چلے گئے۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے شہریوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ آیا صوفیہ کے سوا باقی کلیساؤں کو قائم رکھا گیا۔ عیسائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ جنگی قیدیوں کو خود سلطان نے اپنے سپاہیوں سے خرید کر آزاد کیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کے اگلے سال سلطان محمد فاتح جنوبی یونان کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں کی خود مختار ریاستوں کو فتح کیا۔ پھر بحیرۂ اسود کے جنوبی ساحل پر طرابزون پر اسلامی پرچم لہرایا۔ ۸۶۰ھ /۱۴۵۶ء میں واپس قسطنطنیہ آکر سرویا اور بوسنیا کو عثمانی سلطنت میں شامل کیا، ۸۶۱ھ / ۱۴۵۷ء میں اسلامی فوج ہنگری کی طرف بڑھی۔ بلغراد کا محاصرہ کیا گیا لیکن زبردست لڑائی میں خود سلطان زخمی ہوئے اور بعض وجوہ کی بنا پر بلغراد فتح نہ ہو سکا تاہم کچھ ہی عرصے بعد سلطان نے البانیہ پر فوج کشی کی اور اسے بھی سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بنا دیا۔

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تشویش میں مبتلا ہو کر وینس نے بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ سلطان نے فوراً سمندر کے کنارے دور دور تک وینس کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں فتح کر لیا۔ یہاں تک کہ خود وینس والوں نے سلطان سے صلح کر لی۔ اب اسلامی حکومت، ساحل شام سے لے کر بحیرۂ ایڈریاٹک تک پھیل چکی تھی۔

۸۷۹ھ / ۱۴۷۴ء میں سلطان نے اپنے سپہ سالار احمد قیدوق کو کریمیا پر حملے کے لیے بحیرۂ اسود کی جانب روانہ کیا۔ احمد قیدوق چالیس ہزار کی فوج لے کر گئے اور چار دن کے محاصرے کے بعد یافہ کو فتح کر لیا۔ کریمیا کے خان نے عثمانی سلطنت کی اطاعت قبول کی اور پھر تین سو سال تک کریمیا کے خوانین، سلطنت عثمانیہ کے وفادار رہے۔

۸۸۵ھ / ۱۴۸۰ء میں سلطان محمد فاتح نے اپنے سالار احمد قیدوق کو جنوبی اٹلی روانہ کیا۔ چنانچہ احمد قیدوق نے اٹلی کے ساحل پر اتر کر شہر اوٹرانٹو کا محاصرہ کر لیا۔ ۴ جمادی الآخر ۸۸۵ھ / ۱۱ اگست ۱۴۸۰ء کو شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اوٹرانٹو کے مسلمانوں کے قبضے میں چلے جانے سے پورے اٹلی میں کھلبلی مچ گئی اور زبردست دفاعی تیاریاں ہونے لگیں۔

سلطان کو فتح کی خوشخبری ملی تو انہوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ آبنائے باسفورس کے کنارے فوجی علم نصب کروا دیے گئے، جو

Marfat.com

اس بات کی علامت تھے کہ سلطان فوج کے ساتھ کسی مہم پر روانہ ہونے والے ہیں لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سلطان کی منزل کون سی ہے کیونکہ سلطان اپنے جنگی منصوبے ہمیشہ راز میں رکھتے تھے۔ بہر حال گمان غالب یہی ہے کہ وہ اٹلی پر حملے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ قسطنطنیہ سے روانہ ہوتے ہی سلطان بیمار پڑے اور یہی بیماری ان کے لیے پیامِ اجل لے کر آئی۔ ۳ ربیع الاول ۸۸۶ھ / ۲ مئی ۱۴۸۱ء کو اس اولوالعزم فاتح نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انہیں قسطنطنیہ واپس لایا گیا اور جامع فاتح کے قریب قسطنطنیہ کی خاک نے فاتح کے جسم کو اپنی آغوش میں چھپالیا۔

سلطان محمد فاتح کی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ان کی ذات بڑی ہمہ گیر نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف ایک اولوالعزم، دانشمند اور دلیر قائد تھے، بلکہ اعلیٰ پائے کے منتظم بھی تھے۔ انہیں کتاب اللہ سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے بہترین اساتذہ کی زیر نگرانی متعدد علوم و فنون حاصل کیے تھے۔ علم سے ان کے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد بھی حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ زبردست عالم بھی تھے اور انہیں قرآن و حدیث، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعیات اور علم ہیئت پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ عربی، فارسی، ترکی، لاطینی اور عبرانی کے ماہر بھی تھے اور یہ زبانیں روانی سے بول سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی مملکت میں بھی علم و فن کو عام کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کیے جس کا اعتراف متعدد مؤرخین نے کیا ہے۔ کریسی کہتے ہیں کہ محمد ثانی کے پیش روؤں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے کا بڑا شوق تھا لیکن محمد ان میں سب سے آگے تھے۔ انہوں نے سلسلۂ علما قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم و تربیت کا ضابطہ مرتب کیا، وہ جانتے تھے کہ عدالت کا نظم و نسق درست رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ قاضیوں کا احترام کیا جائے اور وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے عہدے پر مقرر ہوں اور افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کردیے جائیں۔ علامہ شبلی "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں لکھتے ہیں کہ "ترکوں کا سر رشتہ تعلیم پولیٹیکل حیثیت رکھتا تھا وہ سلطنت کے لیے لائق عہدیدار پیدا کرتا تھا۔"

سلطان محمد فاتح نے پوری مملکت میں تعلیمی اداروں کا جال بچھا دیا تھا۔ باقاعدہ نظامِ تعلیم کے تحت بڑے دیہات میں مکاتب (اسکول) کھول دیے گئے تھے، اس کے علاوہ اونچے درجے کے مدارس کثرت سے قائم کیے گئے تھے۔ ان مدرسوں کا درجہ موجودہ دور کے کالجوں کے برابر تھا اور ان میں دس مضامین یعنی صَرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، لسانیات، بلاغت، طرزِ تحریر، فنِ خطابت، اقلیدس اور ہیئت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو طلبہ ان تمام مضامین کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرلیتے تھے انہیں "دانشمند" کی سند ملتی تھی۔ یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ میں تدریس کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی۔

علما کی جماعت کا رکن بننے کے لیے "دانشمند" کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصولِ فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا اور مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کرنی ہوتی تھی۔ جو لوگ علما کی اس جماعت کے رکن منتخب ہوجاتے تھے انہیں، حکومت اہم سرکاری عہدے دیتی تھی اور انہیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل ہوتے تھے۔ مدارس (کالجوں) کے اساتذہ، علما کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے۔ یہ اساتذہ "مدرس" کہلاتے تھے، علما کی اسی جماعت سے عدالتوں کے حکام کا انتخاب ہوتا تھا جن میں قصبوں، دیہات اور بڑے شہروں کے قاضی (جج) قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور مفتی شامل تھے۔ محمد فاتح نے اپنے دربار میں وزرا، سپہ سالار، پیش کار وغیرہ کے ساتھ علمائے دین کی جماعت کی موجودگی لازمی قرار دی تھی اور علما کا درجہ اراکینِ سلطنت میں سب سے بالا رکھا تھا۔

ملک میں رائج نصابِ تعلیم، سلطان نے علما کے مشورے سے خود تجویز کیا تھا، وہ سائنس کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اس نصابِ تعلیم کو مکمل کرکے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو ملازمت یا جائیداد دی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم بالکل مفت تھی اور تمام اخراجات سرکاری خزانے سے پورے کیے جاتے تھے۔ اکثر طلبہ کے قیام و طعام کے انتظامات بھی حکومت کی جانب سے ہوتے تھے، اعلیٰ تعلیم کے مدارس میں طلبہ کو جزوی امداد دی جاتی تھی۔ تعلیم کے جس سلسلے کو عثمانیہ سلطنت کے دوسرے حکمراں اورخان نے تقریباً سوا سو سال قبل شروع کیا تھا اس نے محمد فاتح کے عہد میں بے پناہ ترقی کی۔ محمد فاتح نے ۸۶۵ھ / ۱۴۶۰ء میں قسطنطنیہ میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) کی بنیاد ڈالی جس کے تحت آٹھ کالج تھے اور کالج کے ساتھ طلبہ کے لیے دارالاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) تھا۔

Marfat.com

محمد فاتح کے دور میں نظامِ انصاف مثالی تھا۔ وہ سلسلۂ عثمانیہ کے پہلے سلطان ہیں جنہوں نے آئینِ سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا۔ انہوں نے جو قانون نامہ مرتب کیا تھا وہ سلطنتِ عثمانیہ کا بنیادی دستور بنا۔ اس دستور میں سلطنت کو ایک خیمے سے تشبیہ دی گئی ہے جو چار ستونوں یعنی وزرا (کابینہ)، قضاۃ عسکر، دفتر دار (خازن) اور معتمد سلطنت (وزیر اعظم) پر قائم ہوتا ہے۔

ہر بڑے شہر کے قاضی کے ساتھ مفتی مقرر کیا جاتا تھا۔ عام طور پر ہر مفتی کا درجہ قاضی کے بعد تھا لیکن قسطنطنیہ میں سلطان اور دیگر افسران کو مختلف اہم معاملات میں فتوے لینے پڑتے تھے چنانچہ قسطنطنیہ کے مفتی کا درجہ قاضیوں سے بڑھ گیا، انہیں مفتی اعظم کہا جاتا تھا، سلطان محمد ثانی نے انہیں شیخ الاسلام کا لقب بھی دیا۔ مفتی اعظم کو خود محمد فاتح، قاضیوں میں سے مقرر کرتے تھے۔ مفتی اعظم کو سلطنت کے دیگر مفتیوں کے تقرر اور انہیں ترقی دینے کا اختیار حاصل تھا۔ سلطان محمد فاتح کے دور میں نظامِ انصاف مثالی تھا اور عدالتوں میں مقدمات کا فیصلہ صاف اور سادہ الفاظ میں فوری طور پر کر دیا جاتا تھا۔ محمد فاتح خود بھی اعلیٰ پائے کے قانون داں تھے۔ انہوں نے ایسے قوانین وضع کیے جن کی بدولت فوج اور انتظامی محکموں سے ہر قسم کی بدعنوانی کا سدباب ہو گیا۔

مملکت میں جو قانون نافذ تھا اس کے مطابق قرآن حکیم کو ہر فرمان اور فیصلے پر بالادستی حاصل تھی۔ اس کے بعد احادیث رسولؐ، سنتِ مبارکہ، فقہائے اربعہ اور پھر احکامِ سلطانی کی باری آتی تھی۔ سلطان کا کوئی بھی حکم اگر قرآن وسنت کے منافی ہوتا تو علما کو یہ حق تھا کہ وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس حکم کا خلافِ شریعت ہونا ثابت کریں۔

محمد فاتح کی حکومت میں مرکزی سطح پر جو مجلس، اہم امور پر فیصلے کرتی تھی اسے دیوان کہا جاتا تھا۔ افسرانِ اعلیٰ کو "آغا" کہتے تھے صوبوں کی حکومت بے اور بیلر بے کے سپرد تھی۔ "بے" دراصل وہ پاشا تھے جن کے نیزے کے ایک سرے پر گھوڑے کی دم باندھی جاتی تھی۔ یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا۔ پاشا کا لقب عموماً صوبائی گورنروں (والیوں) کو دیا جاتا تھا۔ "بیلر بے" وہ افسران تھے جن کے علم میں گھوڑوں کی دو دُمیں ہوتی تھیں یہ اضلاع کے نگراں تھے۔ علَم کو ترکی زبان میں "سنجق بے" کہنے لگے۔ محمد فاتح کے دور میں صرف یورپی علاقوں میں ۳۶ سنجق تھے، ان میں سے ہر ایک کے تحت چار سو سوار تھے، یورپ اور ایشیا میں سلطنت کے باضابطہ سواروں اور پیادوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔

سلطان محمد فاتح بے حد عملی انسان تھے۔ وہ ضرورت کے بغیر کبھی دربار جما کر نہیں بیٹھتے تھے۔ لغو باتوں سے گریز کرتے تھے۔ نماز روزے کے سخت پابند تھے اور باجماعت نمازیں ادا کرتے تھے، اس کے ساتھ وہ اچھے اہل کاروں کی قدر کرتے۔ ان کے ماتحت ان سے بہت محبت کرتے تھے اور انہیں اپنا شفیق باپ سمجھتے تھے۔

سلطان محمد ثانی ایک عظیم فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ اور دیگر شہروں میں نہایت خوبصورت مساجد تعمیر کروائیں، ان میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے نام پر تعمیر کی گئی جامع مسجد ایوبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس مسجد کو سلطان محمد فاتح نے ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قبر اسی مسجد کے قریب واقع ہے۔ اس کے علاوہ محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں آیا صوفیہ کلیسا کو مسجد میں تبدیل کیا، شاخِ زریں پر، اون کپان کے اوپر ایک خانقاہ تھی۔ فتح کے بعد یہاں کچھ دن چٹزار تنگنے کا کارخانہ رہا بعد میں سلطان نے اسے مسجد جامع زیرک بنا دیا، ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء میں جامع مراد پاشا تعمیر کی گئی۔ قسطنطنیہ میں چوتھی پہاڑی پر جامع محمدیہ (جامع فاتح) ۸۶۷ھ/۶۳-۱۴۶۲ء میں تعمیر کروائی۔ اس میں ۸ مدرسے بھی شامل تھے۔ اسی مسجد کے قریب سلطان کو سپردِ خاک کیا گیا۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کے بیچوں بیچ تیسری پہاڑی پر ایک قصر تعمیر کروایا جو بعد کے دور میں "اسکی سرای" (قدیم محل) کہلانے لگا، ۱۸۷۰ء میں اسے منہدم کر کے اس جگہ نئی عمارت کھڑی کر دی گئی لیکن اس کا قدیم نام اسکی سرای، عوام میں بدستور رائج رہا۔ ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء میں سلطان نے ایک اور قصر اس پہاڑی کی چوٹی پر بنانا شروع کیا جو بحیرۂ مار مورا سے باسفورس میں داخلے کے دروازے اور شاخِ زریں کے درمیان واقع ہے۔ ۸۸۲ھ/ ۱۴۷۷ء میں چینی محل کی عمارت بنوائی۔ اس عمارت کو اب عجائب خانوں سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ یہ محل الگ الگ عمارتوں کے ایک پیچیدہ مجموعے پر مشتمل ہے۔ اس میں تین بڑے صحن ہیں جن میں داخل ہونے کے تین بڑے دروازے ہیں جو بابِ ہمایوں، بابِ اسلام اور بابِ سعادت کہلاتے ہیں۔ پہلے صحن میں دیگر عمارتوں کے علاوہ محل کا اسلحہ خانہ بھی تھا۔

Marfat.com

۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء کے بعد یہاں ٹکسال بنائی گئی۔

محمد فاتح نے فتح کے چند سال بعد قسطنطنیہ کی فصیلوں کی مرمت کروائی اور سات برجوں کا قلعہ تعمیر کروایا جو "یدی قلعہ" کہلاتا تھا، یہ قلعہ سترھویں صدی عیسوی تک خزانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ سلطان نے بلغراد کے قریب سیر مہ میں ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ سلطان نے قسطنطنیہ میں ایک مسقف (چھت دار) بازار بھی بنوایا اور متعدد شفاخانے اور کتب خانے قائم کیے۔ رومی شہنشاہوں نے باسفورس کے یورپی ساحل کے دور دراز چشموں سے نئی کاریزوں اور پائپوں سے پانی شہر تک پہنچایا تھا، محمد فاتح نے آب رسانی کے ذرائع کو مزید ترقی دی۔

اسلام جس انداز کے رہن سہن، تہذیب و ثقافت اور طرز بود و باش کی اجازت دیتا ہے، وہ دیگر مذاہب سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ سلطان نے زمام کار سنبھالتے ہی حکم دیا کہ چوراہوں اور عوامی مقامات پر لگے مجسمے ہٹا دیے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جسٹینین کا گھڑ سوار مجسمہ، جو کانسی کا بنا ہوا تھا پگھلا دیا گیا اور اس کی توپیں ڈھال لی گئیں۔ سلطان نے شاخ زریں کے شمالی ساحل پر اوق میدان (تیر اندازی کا میدان) بھی بنوایا تھا۔ اس میدان میں بہت سے حکمرانوں اور سلاطین نے تیر اندازی کی مشق کی۔

سلطان محمد فاتح ایک اچھے شاعر بھی تھے اور "عمونی" تخلص کرتے تھے۔ وہ ہر سال خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کو قیمتی تحائف بھیجتے تھے۔ سلطان کو مشاہیر کے کارناموں سے بڑی دلچسپی تھی وہ سکندر اعظم اور قسطنطین کی سوانح ہائے حیات پڑھا کرتے تھے۔ ان کے حکم پر یونانی سوانح نگار پلوٹارک کی مشہور تالیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب میں یونان اور روم کے مشاہیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

سلطنتِ عثمانیہ کی ابتدا ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں اس وقت ہوئی تھی جب ایک ترک سردار ارطغرل کے بیٹے عثمان اوّل نے سغوت کے علاقے میں اقتدار حاصل کیا تھا۔ یہ چھوٹی سی اسلامی سلطنت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی اور دنیا کے بہت سے گوشے اسلام کی روشنی سے منور ہوتے گئے۔ چھ صدیوں سے زائد عرصے تک عثمانی سلسلے سے وابستہ حکمراں، مملکتِ اسلامیہ کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ انہوں نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے اور مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے سلسلے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں، سلطنت عثمانیہ کو یہ دوام اور یہ استحکام دلوانے میں عظیم سلطان محمد فاتح کا کردار بلاشبہ ناقابلِ فراموش ہے۔

***

Marfat.com

سلیم اوّل

انہوں نے مختصر عرصے میں عثمانی حکومت کو بے پناہ مستحکم اور وسیع بنا دیا

فضا میں قرآن پاک کی تلاوت کی دلکش آواز گونج رہی تھی۔

قافلہ قسطنطنیہ کی سمت رواں تھا۔ یہ کوئی عام تجارتی قافلہ نہ تھا، یہ ایک تاریخ ساز قافلہ تھا جسے ملت اسلامیہ کی تاریخ کا ایک نیا باب کھولنا تھا۔ یہ ایک مقدس قافلہ تھا جس میں وہ انسان سفر کر رہے تھے جن کی تحویل میں نہایت بابرکت امانتیں دی گئی تھیں۔ ان امانتوں میں اللہ کے محبوب نبی کریم ﷺ کی ردائے مبارک (چادر) عَلَم، تلوار اور دیگر کئی متبرک اشیا شامل تھیں یہ تمام اشیا خلافتِ اسلامیہ کی نشانیوں کے طور پر آخری عباسی خلیفہ متوکل سوم کے پاس محفوظ تھیں۔ اب خلافتِ عباسیہ کا ساڑھے سات سو برس طویل دور ختم ہو چکا تھا اور خلافت کی نشانیاں دولتِ عثمانیہ کو منتقل کی جا رہی تھیں۔ امتِ مسلمہ کی خلافت کی عظیم ذمہ داری اب عثمانیوں کے کاندھوں پر تھی۔

قرآن کریم کی تلاوت مصر سے قسطنطنیہ (اب استنبول) تک کے سفر میں راستے بھر جاری رہی۔

پہلے عثمانی خلیفہ جو خود قافلے کے ساتھ طویل سفر طے کر کے قسطنطنیہ پہنچے تھے، اب توپ کاپی سرائے کی سمت قدم بڑھا رہے تھے۔ رواں کوشک محل کے ایک کمرے میں پہنچ کر ان کے قدم رک گئے، پھر ان کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ وہ معماروں اور کاریگروں کو بلانے کا حکم دے رہے تھے۔

معمار اور کاریگر فوراً بلائے گئے اور نئے خلیفہ کے حکم پر سبز رنگ کے اس کمرے میں اس مقام کی تعمیر شروع ہو گئی جہاں مقدس امانتوں کو مستقل طور پر رکھا جانا تھا۔ اس دوران خلیفہ کی ہدایت پر امانتوں کو ایک بلند مقام پر رکھوا دیا گیا۔ خلیفہ طویل سفر کی تکان کی پروا کیے بغیر رات بھر کھڑے رہ کر تعمیر کی نگرانی کرتے رہے۔ اسی رات خلیفۃ المسلمین نے چالیس حفاظ کو مامور کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اس مخصوص کمرے میں باری باری تلاوتِ کلام پاک جاری رکھیں اور تلاوت کا سلسلہ ایک لمحے کے لیے منقطع نہ ہونے پائے۔ ان چالیس حافظوں میں ایک حافظ خود خلیفہ تھے۔

اس مقدس کمرے میں، اس رات جس تلاوتِ کلام پاک کا آغاز ہوا وہ چار سو سال سے زائد عرصہ تک ایک لمحے کے لیے بھی بند نہ ہوئی۔ مشہور ترک شاعر و نثر نگار اور پاکستان میں ترکی کے پہلے سفیر یحییٰ کمال بیاتلی نے ۱۹۲۱ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ "وہ دن اور آج کا دن، اس کمرے میں تلاوتِ قرآن پاک ایک لمحے کے لیے بھی بند نہیں ہوئی ہے۔ حافظوں کی تعداد بھی چالیس ہے۔"

اللہ کے کلام کی تلاوت کا یہ سلسلہ ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ آج بھی لوگ جب توپ کاپی عجائب گھر میں "خرقۂ سعادت" دیکھنے جاتے ہیں وہ وہاں تلاوتِ کلام پاک ضرور کرتے ہیں۔

اس کمرے کو "خرقۂ سعادت" اس لیے کہا جانے لگا کہ یہاں متعدد تبرکات میں حضور اکرم ﷺ کی چادر بھی تھی۔ عربی میں چادر کے لیے "خرقہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

خلافت کی عباسیوں سے عثمانیوں میں منتقلی، خرقۂ سعادت کی تعمیر اور وہاں قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کروانے کے متبرک امور جس عثمانی حکمراں نے انجام دیے، وہ تھے سلطنت عثمانیہ کے نویں حکمراں سلیم اوّل، جنہیں پہلے عثمانی خلیفہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عثمانیوں نے خلافت اسلام کی چار سو سال سے زائد مدت تک حفاظت کی۔ یہ دور تہذیبی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے ناقابل فراموش ہے۔

سلیم اوّل ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷–۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ انہیں سلیم اوّل اس لیے کہا جاتا ہے کہ عثمانی خاندان میں ان کے بعد دو اور حکمراں

Marfat.com

گزرے ہیں جو سلیم دوم اور سلیم سوم کہلاتے ہیں۔ سلیم اوّل کے والد بایزید ثانی، ان سے قبل مملکتِ عثمانیہ پر تیس سال تک حکمرانی کر چکے تھے۔ بایزید ثانی کا دور پُرامن تھا اور وہ علم و ادب کے اچھے سرپرست تھے۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے لیکن ان میں سے پانچ بیٹے بایزید کی حیات میں انتقال کر گئے تھے۔ باقی بیٹوں میں قورقود، احمد اور سلیم شامل تھے۔ بایزید نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی تھی۔ ترک قوم فطری طور پر دلیری، شجاعت اور بے خوفی جیسے اوصاف کی حامل ہے۔ سلیم نے بھی ورثے میں اپنے والد سے یہی اوصاف پائے تھے۔ وہ مذہب سے دلی لگاؤ رکھتے تھے اور انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا تھا۔

قدرت نے سلیم اوّل کو بہترین انتظامی صلاحیتوں اور قیادت کے اعلیٰ اوصاف سے نوازا تھا۔ چنانچہ اپنے والد بایزید ثانی کے عہدِ حکومت کے آخری حصے میں وہ طربزون کی سنجق کے حاکم بنائے گئے تھے۔ سنجق سے مراد مخصوص انتظامی علاقہ ہے۔

ربیع الاول ۹۱۸ھ کی دس تاریخ (۲۶ مئی ۱۵۱۲ء) سلیم اوّل کے لیے ایک المناک خبر لے کر آئی۔ ان کے والد بایزید ثانی اپنے رب سے جا ملے تھے۔ وہ یونان کے ایک سرحدی شہر دیمتوقہ جا رہے تھے کہ راستے میں پیامِ اجل آ گیا۔ اس وقت سلیم اوّل کی عمر ۴۶ سال تھی اور وہ امورِ مملکت کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے والد اور دیگر تجربہ کار افسران سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مصر میں ملک اشرف قانصوہ غوری حکمران تھے۔ برصغیر میں سکندر لودھی کی حکومت تھی۔ مغلیہ سلطنت کے بانی بابر کابل میں حکمرانی کر رہے تھے اور ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی بادشاہت قائم تھی۔ تیموریوں کے زوال کے بعد سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایران تقریباً دس ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ان میں سب سے بڑی حکومت آق قویونلو ترکمانوں کی تھی جن کے قبضے میں تبریز سے دیارِ بکر تک کا علاقہ تھا۔ اسمٰعیل صفوی نے ۹۰۵ھ / ۱۴۹۹ء میں اقتدار سنبھالا اور صرف چار سال کے عرصے میں جنوب میں شیراز اور یزد تک، مشرق میں استرآباد تک اور مغرب میں بغداد اور موصل تک کے علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ ازبکوں کو شکست دے کر اسمٰعیل صفوی نے ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء میں خراسان پر بھی قبضہ کر لیا۔

ادھر مصر و شام پر مملوک خاندان حکمران تھا۔ یہ لوگ دراصل ابتدا میں ایوبی سلطان ملک الصالح ایوبی کے غلام تھے جن کا دورِ حکومت ۶۳۷ھ تا ۶۴۷ھ / ۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۹ء تھا۔ عربی میں چونکہ غلام کو مملوک کہتے ہیں، اس لیے خاندان کا نام ہی مملوک خاندان رکھ دیا گیا۔ عثمانی حکمران سلیم اوّل نے اس موقع پر نہایت بیدار مغزی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس وقت مسلمانوں کی طاقت کو یکجا کرنے اور انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو یورپ کی مختلف حکومتوں وینس، ہنگری اور روس وغیرہ سے صلح ناموں کی تجدید کی پھر ایران کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے شاہ اسمٰعیل صفوی کو پے در پے متعدد خطوط تحریر کیے جن کا اسلوب تحریر نہایت شستہ اور پاکیزہ تھا لیکن شاہ کی جانب سے جواب مثبت نہ ملنے پر انہوں نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔

شاہ اسمٰعیل صفوی نے جنگ کے آثار دیکھ کر اپنے دارالحکومت تبریز اور عثمانی حکومت کے علاقے کے درمیانی حصے کو بالکل ویران کر دیا تاکہ ترک فوج ریگستان کا سفر کر کے تازہ دم نہ رہ سکے۔ لیکن عثمانی لشکر تیار کر لیا گیا اور اسی ہزار سواروں سمیت ایک لاکھ چالیس ہزار کی فوج ۲۲ صفر، ۹۲۰ھ / ۱۹ اپریل ۱۵۱۴ء کو ایران کی سمت روانہ ہوگئی۔ راستے کی صعوبتیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ یہ راستہ پہاڑی تھا اور درمیان میں کوئی سڑک نہ تھی۔

تقریباً چار ماہ کے دشوار گزار سفر کے بعد عثمانی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں تبریز کے گلی کوچوں میں سنائی دے رہی تھیں۔ ۲ رجب ۹۲۰ھ / ۲۴ اگست ۱۵۱۴ء کو چالدران کے میدان میں دونوں لشکر صف آرا ہو چکے تھے۔ ایرانی فوج اسی ہزار سواروں پر مشتمل تھی جو جنگ و جدل کے ماہر تھے۔ ترک فوج کے جوان ۱۲۶ دن کے سفر سے بالکل خستہ حال تھے لیکن وہ اپنے امیر کے حکم کے منتظر تھے۔ حکم ملتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے، ان کا حملہ دشمن کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھا، پھر ان کے توپ خانے کی یلغار نے قیامت ڈھا دی اور مخالف فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ تبریز پر عثمانی فوج کا پرچم لہرانے لگا۔

سلیم اوّل نے تبریز میں زیادہ دن قیام نہیں کیا۔ آٹھ روز بعد وہ شمال میں قرہ باغ کی سمت چلے گئے۔ تبریز میں قیام کے دوران انہوں نے یہاں کے انتظامات بہتر کیے۔ تبریز میں فنِ تعمیر، نقاشی نیز دھات اور کپڑے کی صنعت کے ہزاروں ماہر کاریگر موجود تھے۔ سلطان نے ایسے ایک ہزار بہترین صناع اور ماہرین عثمانی دارالحکومت قسطنطنیہ روانہ

Marfat.com

کر دیے جہاں سلطان کے حکم پر انہیں رہنے کے لیے مکانات دیے گئے اور ان کے فن سے متعلق تمام ضروری آلات اور سازوسامان بھی فراہم کیا گیا۔ سلطان کا یہ اقدام بڑا اہم تھا، آنے والے دور میں اس کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ سلطان کے صاحبزادے سلیمان اوّل نے جنہیں ترک "سلیمان اعظم قانونی" کہتے ہیں۔ مملکتِ عثمانیہ میں تعمیر و ترقی کے متعدد کام کروائے اور بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔

تبریز فتح کرنے کے بعد سلطان سلیم اوّل کا ارادہ تھا کہ موسم سرما آذربائیجان کے میدانوں میں گزارنے کے بعد فوج کو مزید پیش قدمی کا حکم دیں لیکن طویل سفر اور جنگ کی مشقتوں کے پیشِ نظر انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور قسطنطنیہ واپس لوٹ گئے۔ چالدران کی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیار بکر اور کردستان کے صوبے مستقل طور پر عثمانی سلطنت کے قبضے میں آ گئے۔ سلیم اوّل نے ان صوبوں کا حاکم مشہور مؤرخ ادریس کو مقرر کیا۔ تاریخ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر عثمانی فوجیں پیش قدمی کر کے ازبک حکمرانوں سے مل جاتیں تو ایران میں بڑی تبدیلی آتی اور وسط ایشیا میں روس کی یلغار رک جاتی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، مصر و شام پر مملوک حکمران تھے۔ سلیم اوّل نے محسوس کر لیا تھا کہ اس وقت ملتِ اسلامیہ کو متحد اور منظم کرنے کی از حد ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کیا اور بحث و مباحثے کے بعد اس بات پر اتفاق ہوا کہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقت ور اس وقت اور کوئی اسلامی حکومت نہیں ہے۔ وہی جہاد کا فریضہ ڈیڑھ سو برس سے ادا کر رہی ہے اور اسی کو حرمین شریفین کی خدمت کا حق دیا جانا چاہیے۔ چنانچہ عثمانی لشکر کو شام کی جانب کوچ کا حکم دیا گیا۔

۲۵ رجب ۹۲۲ھ / ۲۴ اگست ۱۵۱۶ء کو حلب کے قریب مرج دابق کے میدان میں جنگ ہوئی جس کا فیصلہ بہت جلد ہو گیا۔ سلیم اوّل فاتح کی حیثیت سے حلب میں داخل ہوئے، حلب کے باشندوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ سلیم اوّل نے شہریوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور شہر کا اچھا انتظام کیا۔ یہاں سے وہ شام کے دیگر شہروں کی سمت روانہ ہوئے۔ ہر شہر میں ان کا استقبال خوش دلی کے ساتھ کیا گیا۔ دمشق، بیت المقدس، حمص اور متعدد دیگر شہروں پر عثمانی حکومت قائم ہو گئی۔ ہر شہر میں سلیم اوّل نے رفاہِ عامہ کے متعدد کام کروائے، مثلاً دمشق میں محتاجوں اور مساکین کے لیے کھانے پینے کا سرکاری انتظام کروایا اور سلسلے میں اخراجات کے لیے بڑی جائیداد وقف کر دی۔ انہوں نے دمشق میں شیخ محی الدین بن عربیؒ کے مزار کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی۔

شام فتح کرنے کے بعد سلطان سلیم اوّل مصر کی جانب بڑھے جہاں مملوک حکمراں طومان بے موجود تھے۔ طومان بے، نہایت بہادر اور قابل حکمران تھے۔ انہوں نے ایک فوج مزاحمت کے لیے روانہ کی۔ غزہ کے مقام پر مقابلہ ہوا لیکن طومان بے کی فوج زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکی۔ عثمانی فوج نے دس دن کے اندر صحرا عبور کر لیا۔ سلطان سلیم اوّل نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے صحرا عبور کرنے کے لیے کئی ہزار اونٹوں کا بندوبست کیا تھا جن پر پانی کے ہزاروں مشکیزے بھی لاد دیے گئے تھے۔

قاہرہ تک راستے میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ قاہرہ سے کچھ فاصلے پر روانیہ کے مقام پر عثمانی فوج نے ڈیرے ڈال دیے۔ اسی مقام پر ۲۹ ذی الحجہ ۹۲۲ھ / ۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء کو دونوں فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں طومان بے کی فوج فتح حاصل نہ کر سکی۔ بالآخر ۱۷ اپریل ۱۵۱۷ء کو سلیم اوّل مصر بھی فتح کر چکے تھے۔

سلطان سلیم اوّل نے مصر کی سابقہ انتظامی تقسیم کو برقرار رکھا۔ مملوکوں کے دور میں مصر ۲۴ اضلاع میں منقسم تھا۔ سلطان سلیم اوّل نے ان ۲۴ اضلاع کو بارہ بارہ سنجقوں (علاقوں) میں تقسیم کر کے ہر سنجق کا نگراں ایک مملوک سردار کو مقرر کیا۔ مرکزی حکومت کے لیے ایک مجلس تشکیل دی جسے دیوانِ کبیر کا نام دیا گیا۔ والیٔ مصر اس مجلس کے صدر مقرر ہوئے اور خیر بے کو مصر کا والی نامزد کیا گیا۔ غزالی شام کے والی مقرر ہوئے۔ دیوان کبیر کو اختیار دیا گیا کہ معقول اسباب کی بنا پر والی کے احکام منسوخ کر سکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر عثمانی حکومت کے مرکز کی اجازت سے نیا والی بھی مقرر کر سکتی ہے۔

اس وسیع علاقے کو عثمانی حکومت کے زیر اثر لانے کے بعد اب لازمی تھا کہ خلافت کا منصب دولتِ عثمانیہ کے حوالے کیا جائے کیونکہ وہی اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی۔ چنانچہ سلطان سلیم اوّل نے مکہ مکرمہ کے امیر، شریف برکات بن حسن کے پاس ایک وفد امیر مصلح بیگ کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ شریف برکات نے وفد کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں سے سلیم اوّل کی بیعت لی اور

Marfat.com

سلیم اوّل کے نام کے ساتھ خادم الحرمین شریفین کے القاب کا اضافہ کیا۔ اس سلسلے میں اعلان اس وقت کیا گیا جب کل عالم اسلام سے مسلمان حج بیت اللہ کے فریضے کی ادائیگی کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے حرمین شریفین کی خدمت کا شرف دولتِ عثمانیہ کے حکمرانوں کو حاصل ہو گیا اور عثمانی حکمران چار سو برس تک یہ عظیم خدمت انجام دیتے رہے۔

اس زمانے میں خلافتِ اسلامیہ، عباسی خاندان کے پاس تھی جو ساڑھے سات سو سال سے یہ ذمہ داری اٹھائے ہوئے تھا۔ عباسی خلیفہ المتوکل سوم ان دنوں قاہرہ میں مقیم تھے۔ سلیم اوّل کے خادم الحرمین شریفین بننے کے بعد خلیفہ المتوکل نے خلافت کی تمام اسناد سلیم اوّل کو پیش کر دیں۔ ان اسناد میں رسول پاک ﷺ کی چادر مبارک، تلوار، علم، حرمین شریفین کی چابیاں اور دیگر تبرکات شامل تھے۔ اس طرح خلافت اسلامیہ عثمانی خاندان میں منتقل ہو گئی۔ دنیا بھر میں سلیم اوّل کو خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور ان کا ذکر خطبوں میں کیا جانے لگا۔

اس وقت کوئی دوسری اسلامی حکومت وسعت اور طاقت میں دولتِ عثمانیہ کے برابر نہ تھی۔ تقریباً ڈیڑھ صدی سے یہی حکومت جہاد کا مقدس فریضہ انجام دے رہی تھی۔ سلسلۂ عثمانیہ کے ساتویں حکمران سلطان محمد فاتح کو قسطنطنیہ تسخیر کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جس کے بعد مسلمانانِ عالم یورپ پر چھا گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو کسی جانب سے اس کی مخالفت نہیں کی گئی اور دولتِ عثمانیہ کے حکمراں چار سو برس تک یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔

مصر اور حجاز کے انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد سلیم اوّل دمشق پہنچے اور تقریباً پانچ ماہ وہاں قیام کیا۔ دمشق سے وہ حلب گئے اور وہاں دو ماہ ٹھہرے۔ اس دوران انہوں نے شام کا نظم و نسق درست کیا۔ ۷ا رجب ۹۲۴ھ / ۲۵ جولائی ۱۵۱۸ء کو دارالحکومت قسطنطنیہ واپس پہنچ گئے۔ انہیں حکومت کرتے ہوئے صرف چھ برس ہوئے تھے اور چھ برسوں میں انہوں نے عثمانی سلطنت کے زیرِ انتظام رقبہ کو تقریباً دوگنا اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ایک پرچم تلے متحد اور منظم کر دیا تھا۔

سلیم اوّل کے حکمراں بننے سے پہلے ہنگری اور یوگوسلاویہ کے کچھ حصے کو چھوڑ کر پورا بلقان ترکوں کے پاس تھا۔ "بلقان" سے مراد موجودہ یونان، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور ہنگری کا علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ کریمیا (روس) پر بھی ترکوں کی حکومت تھی۔ سلیم اوّل نے حکمراں بننے کے بعد مصر، شام، حجاز، جنوب مشرقی ترکی (جس میں عدانہ سے موصل تک کا علاقہ شامل تھا) اور دیارِ بکر کے علاقوں کو بھی عثمانی سلطنت کا جزو بنا دیا۔

خلیفہ سلیم اوّل کی قسطنطنیہ واپسی پر ہسپانیہ کے سفیر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے درخواست کی کہ عیسائیوں کو بیت المقدس کی زیارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ مسیحی حکومت جو رقم مصر کے سلاطین کو پیش کرتی تھی اب خلیفہ سلیم اوّل کو دیا کرے گی۔ سلیم اوّل نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور اس ضمن میں ہسپانیہ کی حکومت سے باضابطہ معاہدہ کیا گیا۔

ملتِ اسلامیہ کو متحد کرنے اور بارِ خلافت اٹھانے کے بعد سلیم اوّل نے دولتِ عثمانیہ کی فوجی طاقت کی جانب توجہ کی۔ انہوں نے ڈیڑھ سو بحری جنگی جہاز تیار کرنے کا حکم دیا۔ ان میں سے ہر جہاز کا وزن سات سو ٹن تھا۔ ۱۰۰ چھوٹے جہاز بھی بنوائے۔ اس کے علاوہ توپوں اور بندوقوں کے بہت سے کارخانے قائم کروائے۔ بارود سازی کے کارخانے الگ کام کر رہے تھے۔ ترکی میں ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل مسلح فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارے اقدامات اس بات کے غماز تھے کہ کوئی بڑی جنگی کارروائی ہونے والی ہے لیکن جنگی مصلحتوں کے پیش نظر سلیم اوّل نے اپنے ماتحتوں تک سے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ اب وہ یورپی ممالک کی طرف پیش قدمی کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے پہلے جزیرہ روڈس پر حملہ کیا جائے گا، جہاں کے عیسائی حکمران خلافتِ عثمانیہ کے لیے الجھنیں پیدا کرتے رہتے تھے۔

روڈس کا جزیرہ کسی مضبوط قلعے کی مانند تھا چنانچہ اس کو تسخیر کرنے کے لیے بڑی جنگی تیاریوں کی ضرورت تھی۔ خلیفہ سلیم اوّل کو اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن اپنے مشیروں کو بلا کر کہا: "تم لوگ عجلت کر رہے ہو جبکہ میرا خیال ہے کہ ہم جس قدر جنگی ساز و سامان اکٹھا کر چکے ہیں اس کی دگنی مقدار بھی ناکافی رہے گی اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مجھے اب ایک ہی سفر یعنی سفر آخرت کرنا ہے۔"

۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء میں سلیم اوّل ادرنہ سے قسطنطنیہ پہنچے جہاں انہوں نے جنگی بیڑے کی تیاری کا معائنہ کیا۔ انہی دنوں وہ بیمار پڑ گئے۔

Marfat.com

ان کے جسم میں ایک قسم کا پھوڑا نکل آیا۔ جسے اطبا "شیر پنجہ" کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک قسم کا سرطان تھا۔ اس مرض کی وجہ سے سلیم اوّل راستے ہی میں ایک گاؤں چورلو میں رک گئے۔ عید الفطر کو گزرے صرف سات دن گزرے تھے۔ ۷ شوال ۹۲۶ھ/ ۲۰ ستمبر ۱۵۲۰ء کو عثمانی خلیفہ سلیم اوّل نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی میت قسطنطنیہ سے شمال مغرب میں واقع ایک پہاڑی پر لے جا کر دفنائی گئی۔ ان کے صاحبزادے سلیمان اوّل نے، جو ان کے بعد خلیفہ المسلمین بنے، والد کی قبر کے ساتھ ہی ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ مسجد محرم ۹۲۹ھ / ستمبر ۱۵۲۲ء میں بن کر تیار ہوگئی۔ سلیم اوّل کی والدہ محترمہ اور ان کی چند بیٹیوں کی قبریں بھی اسی پہاڑی پر واقع ہیں۔

خلیفہ سلیم اوّل جس کام کو اپنی زندگی میں پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، اسے ان کے صاحبزادے سلیمان اوّل نے مکمل کر دکھایا۔ سلیمان اوّل نے ۴۲ برس تک خلافت کی نازک اور اہم ذمے داری نہایت خوبی سے انجام دی اور اس عرصے میں متعدد یورپی ممالک کو تسخیر کرلیا۔ انہوں نے مملکتِ اسلامیہ کا انتظام اس قدر عمدگی سے چلایا کہ مغربی مصنفین انہیں سلیمان ذی شان (Suleman the Magnificent) اور ترک انہیں سلیمان اعظم قانونی کہہ کر پکارتے ہیں کیونکہ انہوں نے قانون سازی کا بہت اہم کام انجام دیا تھا۔

سلیم اوّل نے صرف آٹھ سال پانچ مہینے حکومت کی لیکن اس مختصر عرصے میں انہوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو متحد کرکے ایک لڑی میں پرو دیا۔ انہوں نے عثمانی حکومت کو جو استحکام بخشا اس کے نتیجے میں مسلمان چار سو برس تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکمران رہے اور انہیں دنیا کی بڑی طاقت تسلیم کیا جاتا رہا۔

سلیم اوّل انتظامی معاملات میں نہایت سخت گیر تھے اور سرکاری احکامات پر عملدرآمد میں تاخیر یا سستی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے مملکتِ عثمانیہ کو بے حد استحکام حاصل ہوا۔ خلیفہ سلیم اوّل کے اٹل فیصلوں اور سخت رویے کے باوجود ان کی رعایا ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ ترک انہیں "یاووز" (یاؤز) کے لقب سے پکارتے ہیں۔ "یاووز" کا لفظ اپنے دامن میں وسیع معنی لیے ہوئے ہے۔ یہ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو نہایت قابل، اٹل، ثابت قدم، مستقل مزاج، باہمت اور دلیر ہو اور جو آسانی سے جھک نہ سکے۔

اپنے مزاج کی روایتی سختی کے باوجود سلیم اوّل علماء کرام کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ انہیں بے حد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور انہیں بڑے عہدوں پر فائز کرتے تھے۔ دولتِ عثمانیہ میں سب سے اہم دینی شخصیت شیخ الاسلام کی ہوتی تھی۔ شیخ الاسلام سے تمام معاملات میں لازماً مشورہ لیا جاتا تھا اور شیخ الاسلام حکومت کے نظام میں نہایت با اثر سمجھے جاتے تھے۔ شیخ الاسلام کا عہدہ سب سے پہلے سلطنت عثمانیہ کے چھٹے حکمران سلطان مراد ثانی نے ۱۴۴۲ء میں قائم کیا۔ پہلے شیخ الاسلام ملا محمد شمس الدین فناریؒ تھے۔ شیخ الاسلام کا عہدہ عثمانی سلطنت کے پورے دور میں قائم رہا۔ دولت عثمانیہ کے ۴۹۸ برسوں میں کل ۱۲۹ شیخ الاسلام مقرر کیے گئے۔ ان میں شیخ الاسلام علی جمالیؒ زنبیلی کا نام سر فہرست ہے جو سلطنتِ عثمانیہ کے آٹھویں شیخ الاسلام تھے۔

علی جمالی زنبیلی کو دراصل سلیم اوّل کے والد بایزید ثانی نے ۹۰۸ھ/ ۱۵۰۳ء میں شیخ الاسلام مقرر کیا تھا۔ انہیں نو تعمیر مدرسہ بایزید میں تدریس کی ذمے داری بھی سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد سے روایت قائم ہوگئی کہ اس مدرسے میں تدریس کے فرائض شیخ الاسلام ہی انجام دیں گے۔ ۱۵۱۲ء میں سلیم اوّل نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تو علی جمالی زنبیلیؒ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا اصل نام تو علاؤالدین علی جمالی تھا، لیکن وہ عوام میں مفتی زنبیلی یا شیخ الاسلام زنبیلی کے نام سے معروف تھے۔ اس نام کے مشہور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ شیخ الاسلام جمالی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے ایک ٹوکری لٹکا رکھی تھی۔ لوگ کسی دینی مسئلے کے بارے میں ان سے فتویٰ لینا چاہتے تو مسئلہ لکھ کر اس ٹوکری میں ڈال دیتے۔ شیخ الاسلام ٹوکری اوپر کھینچ لیتے اور سوال پڑھ کر اپنا فتویٰ اسی ٹوکری میں رکھ کر ٹوکری نیچے لٹکا دیتے تھے۔ "ٹوکری" کے لیے فارسی زبان میں "زنبیل" کا لفظ ہے اس لیے شیخ الاسلام جمالی کو "شیخ الاسلام زنبیلی" کہا جانے لگا۔

سلیم اوّل فطری طور پر دلیرانہ اوصاف کے حامل تھے اور حق گوئی کو پسند کرتے تھے۔ شیخ الاسلام جمالی کی حق گوئی اور بے باکی نے خلیفہ سلیم اوّل کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے شیخ الاسلام کے مشوروں کو ہمیشہ اہمیت دی اور انہیں تسلیم کیا۔

خلیفہ سلیم اوّل کو حرمین شریفین کی خدمت کی سعادت تین سال کے لیے حاصل ہوئی۔ اس مختصر عرصے میں انہوں نے بہت سے اہم فیصلے کیے۔ پہلی بار کسی ترک سلطان کی طرف سے ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء

Marfat.com

میں غلاف کعبہ تیار کروا کے بھیجا گیا۔ مکہ کے امیر کو مملوک سلاطین کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا، سلیم اوّل نے اس میں پانچ سو دینار کا اضافہ کر دیا۔ حرم پاک کے خادموں میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا۔ تیس افراد کی ایک جماعت تشکیل دی جو روزانہ ایک قرآن پاک پڑھا کرتی تھی۔ مصر کے حکمراں ہر سال مستحق افراد کے لیے غلے کی معقول مقدار مکہ مکرمہ بھیجا کرتے تھے۔ سلیم اول نے اس مقدار میں اضافہ کیا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب غلہ حرمین شریفین بھیجا جائے۔ (اردب کم و بیش من کے برابر ہوتا ہے)۔ سلیم اوّل کے بعد آنے والے عثمانی خلفا نے بھی غلے کی اس مقدار میں اضافہ کیا۔ سلیم اول نے مدینہ منورہ میں بھی رفاہِ عامہ کے بہت سے کام انجام دیے۔

سلیم اوّل ایک صاحبِ علم خلیفہ تھے۔ وہ رات میں بہت کم وقت کے لیے آرام کرتے تھے اور رات کا خاصا بڑا حصہ مطالعے میں صرف کیا کرتے تھے۔ انہیں تاریخ اور فارسی شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور ترکی اور فارسی زبانوں میں نہایت خوبصورت شعر کہتے تھے۔ ان کا دیوان فارسی میں ہے جو ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ میں طبع ہوا تھا۔ ان کے دور میں ترکی اور فارسی شاعری نے بہت ترقی کی۔ علمی ذوق رکھنے والوں کو وہ فیاضی سے انعام دیا کرتے تھے۔ تاریخ سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کبھی کسی مہم پر جاتے تو وقائع نگاروں کو بھی ساتھ لے جاتے تاکہ وہ جنگ کے واقعات قلمبند کر سکیں۔

اس دور کے مصنفین میں سب سے اہم شخصیت کمال پاشازادہ کی ہے جنہوں نے فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں تقریباً تین سو کتابیں تصنیف کیں۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور انہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور شاعری پر ملکہ حاصل تھا۔ سلیم اوّل کے صاحبزادے سلیمان اول کے عہدِ خلافت میں وہ شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔

سلیم اوّل سادہ زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر میں آج بھی ان کا کمرہ موجود ہے جو اتنا چھوٹا اور سادہ ہے کہ کسی معمولی سرائے کا حصہ محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کمرے میں کوئی مسافر کسی طویل سفر کے دوران دو گھڑی آرام کے لیے رک گیا تھا اور آرام کر کے پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔

***

Marfat.com

سلیمان اوّل

'سلیمان اعظم قانونی' اور 'سلیمان عالی شان' کا لقب پانے والے عثمانی حکمران

رسول پاک ﷺ کے میزبان اور پیارے صحابی حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار مبارک پر معمول سے زیادہ رونق تھی۔ شاید کسی تقریب کا اہتمام تھا، لیکن یہ تقریب بڑی پر وقار اور سادہ تھی۔ تمام لوگ مؤدبانہ انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی، شیخ الاسلام آگئے تھے۔ لوگ، محترم شیخ کی تعظیم کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیخ نے دولت عثمانیہ کے پہلے حکمران غازی عثمان خان کی تلوار اپنے ہاتھ میں لی اور ایک خوش شکل نوجوان کو اشارہ کیا۔ یہ نوجوان مردانہ وجاہت کا بھرپور نمونہ تھا اور اپنی شاندار شخصیت کی وجہ سے سینکڑوں میں ممتاز نظر آتا تھا۔

شیخ الاسلام کے اشارے پر نوجوان ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ شیخ الاسلام نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار، نوجوان کی کمر میں باندھ دی اور فضا سبحان اللہ کے کلمات سے گونج اٹھی۔

عثمانیہ سلطنت کی تخت نشینی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔

یہ نوجوان تھے سلیمان اول بن سلیم اول جنہوں نے ۴۶ سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیے اور اپنے بے مثل عدل و انصاف اور لاجواب انتظام کی بدولت پوری مملکت اسلامیہ کو خوشحالی اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ انہوں نے مملکت کے لیے قانون سازی کا جو خصوصی اہتمام کیا اس کی بنا پر ترک انہیں سلیمان اعظم قانونی کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اہل مغرب ان کی عظمت کے اس قدر معترف ہیں کہ مغربی مصنفین انہیں سلیمان ذی شان یا سلیمان عالی شان کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کی حکومت میں سرزمین حجاز، ترکی، مصر، الجزائر، عراق، کردستان، یمن، شام، بیت المقدس، خلیج فارس اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقے، یونان اور مشرقی و مغربی ہنگری شامل تھے۔

سلیمان ۹۰۰ھ / ۹۵-۱۴۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلیم اوّل، دولت عثمانیہ کے نویں سلطان تھے۔ والدہ کا نام عائشہ تھا۔ سلیم اوّل نے آٹھ سال (۹۱۸ھ-۹۲۶ھ) حکومت کی۔

سلیمان نے اپنے والد سے سولہ سال تک جنگی فنون کی تربیت حاصل کی تھی۔ سلیم اوّل نے اپنے بیٹے کو دینی اور دنیاوی تعلیم دلوانے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ سلیمان کی انتظامی صلاحیتوں کو اس وقت جلا ملی جب انہیں مختلف صوبوں میں حاکم مقرر کیا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے دادا سلطان بایزید ثانی کے زمانے میں کفہ کی سنجق کی حکمرانی کے فرائض ادا کیے۔ سنجق سے مراد انتظامی یا جغرافیائی علاقہ ہے۔ والد سلیم اوّل کے عہد میں انہیں مغنیسیا کی ذمے داری سونپی گئی۔ انہوں نے ادرنہ اور صاروخان کی حکمرانی کی ذمہ داریاں بھی ادا کیں۔ والد سلیم اوّل نے جب ایران پر حملہ کیا تو وہ سلیمان ہی کو نائب بنا کر قسطنطنیہ میں چھوڑ گئے تھے۔

سلیم اوّل کا انتقال ۷ شوال ۹۲۶ھ / ۲۰ ستمبر ۱۵۲۰ء کو ہوا، جس کے بعد عثمانی سلطنت کی باگ ڈور سلیمان اوّل کے ہاتھ میں آئی۔ یہاں سے دولتِ عثمانیہ کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جو اپنی خوشحالی، استحکام اور وسعت کے اعتبار سے یادگار ہے۔ سلیمان اوّل نے اپنے ۴۶ سالہ دور حکومت میں خلافتِ عثمانیہ کو سیاسی برتری دلوانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جو جدوجہد کی وہ بلاشبہ لائق صد تحسین ہے۔ ان کا یہ کارنامہ اس لحاظ سے بھی بے حد ممتاز ہے کہ اس دور میں مسیحی اور مغربی طاقتیں بیدار اور متحد ہو رہی تھیں اور بڑی بڑی شخصیات سے ان کا مقابلہ تھا۔ مثلاً شاہ چارلس پنجم جو یورپ کے نصف سے زائد حصے پر حکمران تھے، جس میں موجودہ اسپین، بلجیم، ہالینڈ، جرمنی شامل تھے ادھر انگلستان میں ملکہ الزبتھ اوّل حکمران تھیں۔ ہنگری میں شاہ لوئی اور فرانس پر شاہ

Marfat.com

فرانسس اوّل کا سکہ چل رہا تھا۔

یہ یورپ کی بیداری کا زمانہ تھا۔ فرانس، انگلستان اور آسٹریا نے اپنے اختلافات ختم کر لیے تھے اور مسیحی طاقتیں متحد ہونے کی فکر میں تھیں۔ چنانچہ حکومت سنبھالنے کے بعد سے اپنے ۴۶ سالہ دورِ حکومت میں سلیمان کسی نہ کسی جنگ یا مہم میں مصروف رہے، اگرچہ درمیان میں مختصر وقفے بھی آئے لیکن جہاد کا جو جذبہ سلیمان کے سینے میں موجزن تھا اس نے انہیں آخر وقت تک میدانِ عمل میں مصروف رکھا، حتیٰ کہ ایک جنگ کے دوران ہی انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انہوں نے ذاتی طور پر ۱۳ بڑی جنگوں میں شرکت کی، تین ایشیا میں اور دس یورپ میں اور اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کی حدود میں ۱۳ مرتبہ توسیع کی گئی۔

خلیفہ بننے کے بعد سلیمان کی زندگی کا پہلا معرکہ بلغراد کی فتح ہے۔ ہنگری کا بادشاہ لوئی ثانی، سلیمان کے والد سلیم اوّل کے عہد سے ہی شورشیں برپا کر رہا تھا۔ سلیمان نے خلیفہ بننے کے بعد شاہ ہنگری کے پاس اپنے سفیر بھیجے جنہوں نے سلیمان کی جانب سے خراج کی ادائیگی کا مطالبہ شاہ ہنگری تک پہنچایا۔ شاہ ہنگری طاقت کے نشے میں چُور تھا۔ اس نے ترک سفیروں کے ساتھ بہت بدسلوکی کی بلکہ بعض روایات کے مطابق انہیں قتل کروا دیا۔ سلیمان کو خبر ملی تو انہوں نے فوجی تیاریوں کا حکم دیا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں یہ مہم سر کی گئی۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں اسلامی فوجی بلغراد پر قبضہ کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دریائے ڈینیوب پر واقع شہر بوغوردلن اور سرمیہ کو بھی فتح کیا جا چکا تھا۔ سلیمان نے بلغراد میں کسی کو نقصان نہ پہنچایا۔ وہاں بڑے کلیسا کی صفائی کروائی اور نماز ادا کی اور مسجد کا اہتمام کیا۔ بلغراد کا انتظام کر کے وہ واپس چلے گئے۔

اگلے سال انہوں نے روڈس کے جزیرے کی طرف نظر کی جہاں سینٹ جان کے سورما (نائٹ) موجود تھے۔ یہ لوگ عرصۂ دراز سے سلطنت عثمانیہ کے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ عیسائی بحری قزاقوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ سلیمان ۲۰ رجب ۹۲۸ھ/۱۵ جون ۱۵۲۲ء کو قسطنطنیہ سے فوج لے کر روانہ ہوئے۔ ۳۰۰ جنگی جہاز اور ۴۰۰ باربرداری کے جہاز الگ روانہ کیے۔ بحری اور برّی فوجیں آکر خلیج مارمریس پر مل گئیں۔ ۴ رمضان المبارک/۲۸ جولائی کو سلطان ساحل پر اترے اور ۸ رمضان المبارک/یکم اگست کو روڈس کا محاصرہ شروع کیا۔ یہ محاصرہ ایک دو نہیں بلکہ پانچ ماہ تک جاری رہا۔ آخر روڈس کے حاکم نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلیمان نے جزیرہ والوں کو بارہ دن کی مہلت دی اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے انہیں اجازت دی کہ وہ اپنا سامان اور اسلحہ لے جا سکتے ہیں اور ضرورت پڑے تو عثمانی جہازوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ روڈس کے مسیحی باشندے یہاں سے نکل کر جزیرہ کریٹ چلے گئے۔

چند سال بعد سلیمان نے ہنگری پر حملے کا فیصلہ کیا۔ رجب ۹۳۲ھ/اپریل ۱۵۲۶ء میں ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج روانہ ہوئی، ۳۰۰ توپیں ساتھ تھیں۔ دریائے دراوہ عبور کرنے کے بعد مہاج کے مقام پر اسلامی فوج ہنگری کی فوج کے مقابل صف آرا ہوئی۔ مسلمان اس جوش و جذبہ سے لڑے کہ صرف دو گھنٹے میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ شاہ لوئی نے فرار کی راہ اختیار کی لیکن دریا میں ڈوب گیا اور یہ غرقابی اس کے لیے پیامِ اجل لائی۔

سلیمان نے اب ہنگری کے دار الحکومت بوڈا پر چڑھائی کر دی۔ ۳ ذی الحجہ ۹۳۲ھ/۱۰ ستمبر ۱۵۲۶ء کو بوڈا پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شاہ لوئی لاولد تھا اس لیے خلیفہ سلیمان نے مقامی امراء کے مشورے سے کاؤنٹ زاپولیا کو حاکم مقرر کر دیا اور واپس چلے گئے۔ بوڈا اب بڈاپسٹ کہلاتا ہے۔

کچھ عرصے بعد شہنشاہ چارلس پنجم کے بھائی فرڈیننڈ نے ہنگری کا حکمران بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے اور اپنے ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی غرض سے اس نے ہنگری پر حملہ کیا اور زاپولیا کو شکست دے کر پولینڈ بھگا دیا۔ زاپولیا نے سلطان سے فریاد کی۔ فرڈیننڈ بھی سلطان سے امداد کا طالب ہوا لیکن اس تکبر سے کہ ہنگری کے جن شہروں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا وہ بھی واپس طلب کر لیے۔ ظاہر ہے کہ اس پُرغرور درخواست پر سلطان توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے زاپولیا کی مدد کا فیصلہ کیا۔

۱۲ رمضان المبارک ۹۳۵ھ/۲۰ مئی ۱۵۲۹ء کو سلطان ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوئے۔ بوڈا پہنچے اور چھ روز محاصرہ کر کے قلعہ فتح کیا۔ زاپولیا کو ان کے عہدے پر بحال کیا اور فتنے کی جڑ کاٹنے کی غرض سے آسٹریا کا رخ کیا۔ ۲۷ ستمبر کو سلطان نے ویانا کا محاصرہ شروع کیا۔ یہ محاصرہ طویل ہو گیا۔ موسم بہت خراب تھا، رسد کی کمی تھی۔ راستوں کی خرابی کی وجہ سے سلطان کو بڑی توپیں، ہنگری ہی میں چھوڑنی پڑی تھیں

Marfat.com

اس لیے یہ محاصرہ بے نتیجہ رہا اور سلطان کو واپس آنا پڑا۔ لیکن اس مہم کے نتیجے میں مسلمانوں کے قدم یورپ میں اتنی دور تک پہنچ گئے جس کے باعث اہل یورپ پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ تین سال بعد سلطان نے آسٹریا کا پھر رخ کیا لیکن ایک مقام گونز کو فتح کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگ گیا، وہاں سے استیریا کو فتح کیا۔

سلطان نومبر میں قسطنطنیہ واپس پہنچے، اس دوران آسٹریا سے عارضی صلح ہو گئی۔ سلطان کا چھٹا بڑا حملہ ایران کے خلاف تھا۔ سلطان کے وزیر اعظم ابراہیم نے محرم ۹۴۱ھ / جولائی ۱۵۳۴ء میں تبریز پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر میں سلطان بذاتِ خود اس شہر میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔ یہاں سے ترک فوج نے ہمدان کے راستے بغداد کا رخ کیا۔ سلطان بغداد میں چار ماہ رہے پھر ایرانیوں نے چونکہ عثمانیوں کے مفتوحہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا اس لیے ترک فوج نے ایک بار پھر ایران کا رُخ کیا۔ آذر بائیجان اور کئی علاقے فتح کیے۔ ۲۳ رجب ۹۴۳ھ / ۱۷ جنوری ۱۵۳۶ء کو سلطان واپس قسطنطنیہ پہنچ گئے۔

بعد کے چند برسوں تک سلطان مختلف چھوٹی بڑی مہمات میں مصروف رہے۔ ادھر فرڈینینڈ اور زاپولیا نے ہنگری کو ایک معاہدے کے ذریعے آپس میں تقسیم کر لیا تھا لیکن صرف ایک سال بعد زاپولیا کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد فرڈینینڈ اپنی حریص طبیعت سے مجبور ہو کر پورے ہنگری پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ سلطان کو یہ اطلاعات ملیں تو انہوں نے ربیع الآخر ۹۴۸ھ / اگست ۱۵۴۱ء میں ہنگری کا رخ کیا۔ شہر بوڈا اور دیگر کئی شہر فتح کیے اور انہیں اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ صرف ٹرانسلوینیا کو زاپولیا کی بیوہ ملکہ ازابیلا کے لیے چھوڑ دیا۔ والپو، ہیکلوس، فونفکیرشن پر بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے۔ یہاں ترک دستے متعین کر دیے گئے۔ ہنگری کو سنجقوں (انتظامی علاقوں) میں تقسیم کر دیا گیا اور یہاں ترک گورنر مقرر کر دیے گئے۔

۹۵۴ھ / ۱۵۴۷ء میں شہنشاہ چارلس پنجم اور فرڈینینڈ نے سلطان سے سات سالہ صلح کر لی۔ ہنگری اور ٹرانسلوینیا پر سلطان کی حکومت قائم ہو گئی۔ فرڈینینڈ نے ایک کثیر رقم سالانہ خراج کے طور پر دینے کا وعدہ کیا۔

بعد کے چند برسوں میں سلطان نے ایران میں اندر جا کر حملے کیے اور بغداد، موصل، اریوان، آرمینیا اور میسوپوٹیمیا (عراق) کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ دوسری طرف عدن پر قبضہ کیا اور بحیرۂ روم میں اپنے طاقت ور بحری بیڑے کی مدد سے الجزائر، طرابلس اور بحیرۂ بلقان کے متعدد جزیرے فتح کر لیے۔ اس زمانے میں بڑی قوت کے اعتبار سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولتِ عثمانیہ کے برابر نہ تھی اور بحری لحاظ سے اس کا شمار دنیا کی چند بڑی مملکتوں میں ہوتا تھا۔

۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء میں آسٹریا سے جنگ پھر شروع ہو گئی جس میں عیسائیوں نے کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ سلطان اس زمانے میں بیمار تھے۔ انہیں نقرس (گٹھیا) کی شکایت تھی، اس کے باوجود وہ افواج کی قیادت کے لیے مردانہ وار نکل آئے۔ آسٹریا کے قلعے سگتوار کا محاصرہ ۵ محرم ۹۷۳ھ / ۲ اگست ۱۵۶۵ء کو شروع ہوا جو ۱۲ صفر / ۸ ستمبر تک جاری رہا۔ ۱۲ صفر ۹۷۳ھ / ۸ ستمبر ۱۵۶۵ء کو قلعہ فتح ہو چکا تھا اور لشکر اسلام کامیابی کے پھریرے لہراتا ہوا قلعہ میں داخل ہو رہا تھا لیکن سپاہی اس اندوہناک حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کا محبوب سلطان اب ان کے درمیان نہیں ہے بلکہ وہ ۹ اور ۱۰ صفر ۹۷۳ھ / ۵ اور ۶ ستمبر ۱۵۶۵ء کی درمیانی رات ہی انہیں چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملا ہے۔ سلطان کی وفات کی خبر وزیر اعظم صوقولی پاشا نے دانستہ مخفی رکھی اور فتح کے بعد اسے عام کیا۔ فتح کے شادیانے فوراً موقوف ہو گئے اور فضا سوگوار ہو گئی۔ سلطان کی میت واپس قسطنطنیہ لائی گئی جہاں خود ان کی تعمیر کردہ مسجد سلیمانیہ میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سلطان کی عظیم الشان فتوحات میں ان کی بحری فوج کے سربراہ خیر الدین باربروسہ کا بڑا حصہ ہے۔ خیر الدین باربروسہ کسی زمانے میں بحری قزاق تھے، بعد میں وہ اپنے اس پیشے سے تائب ہوئے اور سلطان کے پاس آ کر فوج میں شامل ہو گئے۔ ان کی فطری بہادری، جوانمردی اور لڑائی کی غیر معمولی صلاحیت اب مثبت رخ پر استعمال ہونے لگی۔ سلطان نے انہیں بحری بیڑے کا سربراہ یعنی امیر البحر بنا دیا۔ امیر البحر کی حیثیت سے خیر الدین باربروسہ نے متعدد کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے بحیرۂ بلقان کے تقریباً تمام جزائر پر قبضہ کر کے انہیں سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ ۹۳۴ھ / ۱۵۲۸ء میں پوپ اور فرڈینینڈ نے ترکوں کے خلاف اتحاد مقدس قائم کیا۔ اتحادیوں کا زبردست بیڑا شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر انڈریا ڈوریا کی قیادت میں پریویسا کے مقام پر عثمانی بیڑے کے مقابل آیا۔ خیر الدین باربروسہ نے اتحادی بیڑے کو شکست دی۔

سلطان سلیمان اوّل کا ۴۶ سالہ عہد حکومت امن و خوشحالی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان کی سلطنت میں ۲۰ مختلف قومیں آباد تھیں

Marfat.com

لیکن کبھی کسی قوم یا گروہ کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی اور کسی جانب سے سلطان کے خلاف علَمِ بغاوت بلند نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمران بنتے ہی سلطان نے پوری مملکت میں حکام کو سخت ہدایات دی تھیں کہ ہر ایک سے عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے۔ انہوں نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کو ۲۱ ولایتوں اور پھر ان ولایتوں کو ۲۵۰ سنجقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

سلطان نے حکومت کے اداروں کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ اسے مثالی انتظام کہا جاسکتا ہے۔ ان کا دور ایک جمہوری دور تھا۔ انہوں نے شاہی خاندان کے افراد کی بجائے وزراء کو نظم و نسق سونپ دیا تھا۔ انہوں نے قانون سازی کی طرف خصوصی توجہ دی، فوج کے نظم و تربیت، فوجی نظام جاگیرداری، زمینی جائیداد کے قوانین، پولیس اور فوج کی خدمات کے عوض جاگیر وغیرہ دینے کا ضابطہ اور آئین مرتب کروایا۔ انہوں نے ٹیکس کی مقدار خود مقرر کی تھی۔ قانون کی رُو سے کاشت کار اراضی کا مالک تھا۔ کاشتکاروں کو میسر سہولتوں کی وجہ سے ہنگری کے علاقوں میں مقیم اکثر عیسائی کاشتکار بھاگ کر مسلمانوں کے علاقوں میں آباد ہو جاتے تھے۔ مختلف جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی گئیں۔ ان تمام قوانین کو بعد میں مجموعے کی شکل میں مرتب کیا گیا۔

سلطان نے ملک بھر میں اشیائے صَرف کی قیمتیں مقرر کیں، محکمۂ انسداد بے رحمی حیوانات بنوایا۔ سرکاری دفاتر میں ریکارڈ کے لیے رجسٹر مرتب کروائے جو "کوتکات" کہلاتے تھے۔ انہوں نے آب رسانی کے نظام کو بھی بہت ترقی دی۔ پانچ بڑی کاریزیں بنوائیں، قسطنطنیہ میں ایک نہر جاری کروائی۔ مکہ مکرمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کروائی، بڑے شہروں میں اسپتال قائم کیے اور پل بنوائے۔

سلطان نے علم کی اشاعت پر بھی توجہ دی۔ مکہ مکرمہ میں چاروں فقہی مذاہب کے لیے چار مدرسے قائم کیے۔ متعدد شہروں میں خوبصورت مساجد تعمیر کروائیں جن کے ساتھ مدارس کام کرتے تھے۔ کئی مدرسے اور دارالعلوم بنوائے۔ علما کی تنظیم اور ان کے منصب سے متعلق بہت سی اصلاحات کیں۔ انہوں نے علما کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا اور انہیں خصوصی مراعات دیں، طلبہ کے لیے وظائف بھی مقرر کیے۔

۸۲۷ھ / ۱۴۲۴ء میں سلطان مراد ثانی کے زمانے میں شیخ الاسلام کا عہدہ قائم ہوا تھا، سلطان سلیمان نے اسے برقرار رکھا۔ یہ عہدہ دولتِ عثمانیہ میں ۴۹۸ سال تک رہا اور اس پر ۱۳۱ علما فائز ہوئے۔ شیخ الاسلام تمام دینی اور تعلیمی معاملات کے نگرانِ اعلیٰ ہوا کرتے تھے۔ عدالتوں کے سربراہ بھی وہی تھے، ان کے اختیارات نہایت وسیع ہوتے تھے ججوں کو مقرر اور معزول وہی کرتے تھے اور شرعی امور میں حکومت کی رہنمائی کرتے تھے۔

سلطان نے فوج کو بہتر بنانے کا خاص اہتمام کیا۔ ان کے پاس مستقل تنخواہ دار فوج ۴۸ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی لیکن جنگ کے موقع پر دو لاکھ سپاہی اکٹھے کیے جاسکتے تھے۔ تاہم انہوں نے فوج کو محض انتقامی جذبے سے کبھی کسی مہم پر روانہ نہیں کیا۔ جب بھی فوج جنگ کے لیے روانہ ہونے لگتی تو اسے سختی سے تاکید کی جاتی کہ وہ عام لوگوں کی جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

فنِ تعمیر وہ میدان ہے جس میں سلطان کے کارنامے آج بھی ٹھوس اور مستحکم شکل میں اپنی نوعیت اور جاہ جلال کی داستان بیان کر رہے ہیں۔ سلطان نے مفتی ابوالسعود کے فتوے کی بنیاد پر کعبۃ اللہ کی از سرِ نو تعمیر کروائی۔ سلطان کی تعمیرات نے ترک ثقافت پہ گہرے اثرات مرتب کیے۔ سلطان نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دیگر کئی شہروں میں نہایت حسین اور عالیشان مساجد تعمیر کروائیں ان میں سب سے بلند مقام جامع سلیمانیہ کا ہے جو ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء اور ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء کے درمیانی عرصے میں تکمیل کو پہنچی۔ یہ عظیم مسجد قسطنطنیہ (اب استنبول) کی سب سے اونچی پہاڑی پر ہے۔ اس میں چار مدرسے، ایک عمارت اور دیگر مکانات تعمیر کروائے گئے۔ چاروں میناروں میں بل کھاتے ہوئے دس زینے تھے۔ سلطان کی قبر مسجد کے صحن میں ہے۔ وہیں سلیمان ثانی اور کئی دیگر عثمانی خواتین کی قبریں ہیں۔

جامع سلیمیہ، سلطان نے اپنے والد سلیم اوّل کی یاد میں ۹۲۸ھ / ۱۵۲۲ء میں بنوائی تھی۔ سلیم اوّل اس مسجد میں مدفون ہیں۔ دیگر مساجد میں "شاہزادہ جامعی"، "خاصکی جامعی" اور استنبول اور سقوطری کی مساجد قابلِ ذکر ہیں۔ جامع سلیمیہ کے سوا باقی عمارتیں ایک مشہور معمار "سنان" نے تعمیر کیں۔ سلطان نے بغداد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مزار بنوایا۔ قونیہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار کے ساتھ ایک مسجد بنوائی۔ بیت المقدس کی دیواروں کو بحال کرایا اور مکہ مکرمہ میں پختہ کاریزیں بنوائیں۔ سلطان بے حد خدا ترس اور دیندار تھے، انہوں نے قرآن پاک کے آٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے نقل کیے تھے۔

Marfat.com

وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں سے بھی ان کے اسلامی عقیدے کی پختگی کا پتا چلتا ہے۔ وہ جنگ کے دوران روزمرہ کے واقعات لکھتے جاتے تھے۔ ان کے یہ روزنامچے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان روزنامچوں سے ان کی بیدار مغزی، چوکسی اور احساسِ ذمہ داری کا بھی پتا چلتا ہے۔ انہوں نے شعر و ادب کی بڑی سرپرستی کی اور نثر نگاروں کو تاریخ لکھنے کی جانب متوجہ کیا۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ مسیحی طاقتوں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزما کر مسلمانوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی لیکن سلیمان اوّل کی اعلیٰ قیادت میں سولہویں صدی عیسوی کے دوران مسلمانوں کی حکومت پھیلتی چلی گئی۔ اس وسیع و عریض مملکت کی حدود بڈاپسٹ سے بصرہ تک اور بحیرۂ خزر سے بحیرۂ روم کے مغربی حصے تک پھیلی ہوئی تھیں اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس سلطنت کا حصہ تھے۔

***

Marfat.com

عباس اوّل

عہدِ صفوی کے پانچویں حکمران، جنہوں نے اصفہان کو نصف جہان بنا دیا

تقریباً سات صدی پرانی بات ہے۔
آٹھویں صدی ہجری اپنی زندگی کے ۹۰ برس گزار چکی تھی۔ شمالی ایران پر مشہور فاتح امیر تیمور کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایران کے علاقے گیلان کا شہر اردبیل بزرگوں اور اولیا کا مرکز تھا۔ یہاں ایک بزرگ حضرت صدر الدینؒ مسندِ ارشاد پر فائز تھے۔ ان کی شہرت امیر تیمور کے کانوں تک بھی پہنچی تو وہ صدر الدینؒ کے پاس حاضر ہوئے۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" امیر تیمور، حضرت صدر الدینؒ سے کہہ رہے تھے۔

بزرگ نے کچھ سوچا اور پھر فرمایا "دیارِ بکر میں آپ نے جن ترک باشندوں کو قیدی بنایا ہے انہیں آزاد کر دیجیے۔"

امیر تیمور نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ ترکوں نے رہائی پا کر حضرت صدر الدینؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور صوبہ گیلان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ انہی ترکوں کی مدد سے ایران میں وہ حکومت قائم ہوئی جو صفوی حکومت کہلاتی ہے۔ صفوی دورِ حکومت دو صدیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے اور اس عہد کا سب سے درخشندہ باب، عباس اوّل کا ۴۳ سالہ دورِ حکمرانی ہے۔

عباس اوّل، عہدِ صفوی کے پانچویں حکمران ہیں جنہوں نے اصفہان کو نصف جہان بنا دیا، ان کے کارناموں کی وجہ سے انہیں عباس اعظم بھی کہا جاتا ہے۔

عباس اوّل کا پورا نام عباس مرزا ہے۔ آپ یکم رمضان ۹۷۸ھ / ۲۷ جنوری ۱۵۷۱ء کو ماژندران میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد خدابندہ نے دس سال تک حکومت کرنے کے بعد ۹۹۵ھ / ۱۵۸۷ء میں حکومت آپ کے حوالے کر دی تھی۔ اس وقت عباس مرزا کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ جس وقت انہوں نے اقتدار سنبھالا، اس زمانے میں ایران عدم استحکام کا شکار تھا۔ شمال مغربی ایران کو ترکوں کی جانب سے حملوں کا سامنا تھا اور مشرق میں خراسان کا علاقہ ازبک قبائل کے قبضے میں تھا۔ ملک کے ان حصوں میں شورشیں اٹھتی رہتی تھیں اور دیگر حصوں میں بھی شدید بے چینی پائی جاتی تھی۔

نوجوان عباس اوّل نے نہایت حکمت اور فراست سے اس پوری صورتحال کا سامنا کیا۔ وہ ۹۹۵ھ / ۱۵۸۷ء میں مملکتِ ایران کے فرمانروا بنے۔ تین سال تک ترکوں سے آویزش جاری رہی لیکن اس کے بعد عباس اوّل نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ۹۹۸ھ / ۱۵۹۰ء میں ترکوں سے صلح کر لی۔ اس صلح کے نتیجے میں آذربائیجان، گرجستان، لُرستان کا ایک حصہ، کردستان کے کچھ حصے، قرہ باغ گنجہ اور قراجہ داغ، عثمانی ترکوں کے حوالے کر دیے گئے۔ اس صلح نامے کے نتیجے میں شمال مغربی سمت سے انہیں اطمینان ہو گیا۔

۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء میں رابرٹ شرلے اور سرانتھونی شرلے کی قیادت میں انگریزوں کی ایک جماعت قزوین پہنچی۔ یہ جماعت اپنے ساتھ تحائف لائی تھی۔ عباس اوّل نے انگریزوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا تو نہیں کیا، البتہ ایران کو دفاعی اعتبار سے مضبوط بنانے میں ان کی مدد لی۔ مقامی کاشتکاروں کو فوج میں شامل کیا گیا۔ ساٹھ ہزار بندوقیں، پانچ سو توپیں تیار کی گئیں۔ بارہ ہزار توپچیوں کی فوج منظم کر لی گئی۔ ۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء ہی میں عباس اوّل نے ازبک قبائل کو ہرات میں شکست دے دی اور مشہد اور ہرات ان سے واپس لے لیے۔ یہ علاقے دس سال سے ازبکوں کے قبضے میں تھے۔ شمال مشرق کی جانب سے سرحدوں کو محفوظ بنانے کی غرض سے عباس اوّل نے بلخ، مرو اور استر آباد میں ان ازبک سرداروں کو متعین کیا جو ان کی اطاعت کا اقرار

Marfat.com

کر چکے تھے۔

۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں ترکوں کے خلاف مہموں کا آغاز ہوا۔ لڑائیوں کا یہ سلسلہ پندرہ سال تک جاری رہا۔ اس عرصے میں عباس اوّل نے تبریز، اریوان، نخچوان، آذر بائیجان، کردستان، موصل، دیار بکر، نجف اور کربلا کے علاقوں کو فتح کیا یا ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ صفوی حکمران نے گنجہ اور طفلس پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں عباس اوّل نے بحرین کا الحاق ایران سے کر دیا تھا۔ ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں شیروان دوبارہ صفویوں کے پاس آ گیا۔ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء ایران اور ترکیہ کے درمیان معاہدہ ہو گیا جس کی رُو سے ایران کی وہی سرحد قبول کر لی گئی جو عثمانی حکمران سلیم اوّل کے زمانے میں تھی۔ بدلے میں عباس اوّل نے عثمانی حکومت کو ریشم کی دو سو گانٹھیں سالانہ دینے کا وعدہ کیا، تاہم یہ معاہدہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔

خلیج فارس میں بندرگاہ ہرمز کو تجارتی لحاظ سے بے حد اہمیت حاصل تھی۔ ایک ایرانی محاورہ ہے کہ "اگر رُوئے زمین کو ایک انگشتری فرض کر لیا جائے تو ہرمز اس کا نگینہ ہے۔" سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس بندرگاہ پر پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس قبضے کا قصہ یوں ہے کہ ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں حکومتِ پرتگال نے اپنی بحریہ کے کپتان الفانسو کو ہرمز پر حملے کے لیے بھیجا۔ اس زمانے میں ایران پر اسمٰعیل صفوی کی حکومت تھی۔ الفانسو نے سات جہازوں کا بیڑہ لیا اور اپنی بندرگاہ سوقوطرا سے روانہ ہوا۔ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اس نے راستے میں آنے والی بندرگاہوں کو لُوٹا پھر وہ ہرمز پہنچا اور اس کو مطیع بنا لیا، لیکن جہازوں کے کپتانوں میں اختلاف کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔

سات سال بعد حکومت پرتگال نے الفانسو کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا۔ الفانسو نے ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں ایک طاقتور بیڑے کی مدد سے ہرمز پر حملہ کیا، اور اس بندرگاہ پر پرتگیزیوں کا قبضہ ہو گیا۔ الفانسو نے یہاں ایک شاندار قلعہ تعمیر کروایا۔ ہرمز پر، پرتگیزیوں کا قبضہ سو سال تک برقرار رہا۔ جب عباس اوّل نے ایران کی عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے ہرمز جیسی اہم بندرگاہ پرتگیزیوں سے چھڑانے کی ٹھانی۔ اس غرض سے انہوں نے تیاریاں کیں۔ انگریزوں سے سفارتی رابطے قائم کیے اور ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں پرتگالیوں سے ہرمز چھین لیا۔ پرتگیزی جہاز تباہ کر دیے گئے۔ ہرمز کا نام پرتگالیوں نے کمبرون رکھ دیا تھا۔ پرتگالیوں سے یہ بندرگاہ واپس لینے کے بعد اس کا نام عباس اوّل کے نام پر بندر عباس رکھ دیا گیا۔ آج بھی یہ بندرگاہ اسی نام سے پہچانی جاتی ہے۔

عباس اوّل نے یورپی ملکوں اور ہندوستان کے ساتھ قریبی سفارتی تعلقات قائم کیے۔ ہندوستان کے مغل حکمران اکبر اور جہانگیر سے ان کے خوشگوار تعلقات رہے، کریمیا کے تاتاری خوانین سے بھی ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ انہوں نے اپنے سفیر حسین علی بیگ کو پراگ، وینس، روم اور لزبن بھیجا۔ جواب میں ہسپانیہ (اسپین)، پرتگال اور انگلستان نے بھی اپنے سفیر روانہ کیے۔ وہ مذہبی رواداری کے قائل تھے، چنانچہ ان کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں اور اقلیتوں کو اپنی مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ عباس اوّل نے ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کو بھی ایران آکر مراعات حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ولندیزیوں نے بندر عباس میں اپنی فیکٹری ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۳ء میں قائم کی۔

عباس اوّل کا دور دلکش اور وجد آفریں تعمیرات کی وجہ سے نہایت ممتاز ہے۔ انہوں نے پورے ملک میں اور خصوصاً اصفہان میں اس قدر خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں اور اصفہان کو اس قدر خوبصورت بنا دیا کہ لوگ اصفہان کو نصف جہان کہنے لگے۔ عباس نے اپنا دارالحکومت قزوین کی بجائے اصفہان کو بنایا۔ ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء میں تہران کو ملک کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

عباس اوّل کے عہد میں اصفہان کے وسط میں ایک وسیع میدان بنایا گیا۔ یہ میدان دو فرلانگ طویل اور ایک فرلانگ چوڑا تھا۔ اس میدان کو میدانِ شاہ کا نام دیا گیا۔ آج کل یہ میدانِ امام کہلاتا ہے۔ اس میدان کے گرد عباس اوّل نے نہایت پُرکشش عمارتیں تعمیر کروائیں۔ میدان کے وسط میں وسیع اور سرسبز باغ لگوایا۔ شمالی سمت ایک بڑا دروازہ تعمیر کیا گیا جس کے ذریعے بازار خیاطاں میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میدان کی مشرقی سمت مسجد شیخ لطف اللہ اور مغربی سمت علی قاپو (عالی قاپو) کی مشہور عمارت ہے۔ یہ عمارت دراصل ایک دروازے کا کام بھی دیتی تھی۔ یہاں سے شاہی محلوں کو راستہ جاتا تھا۔ یہ محل تین میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔

صفوی حکمران غیر ملکی مہمانوں کا خیر مقدم علی قاپو ہی میں کرتے تھے اور پولو میچ کے نظارے کے لیے بھی یہی جگہ استعمال ہوتی تھی۔

Marfat.com

بالائی برآمدے میں ایک حوض بنایا گیا۔ اس کا پانی ایک بڑے آبی ذخیرے سے آتا تھا، جو موجودہ ہوائی اڈے کے قریب تھا۔ علی قاپو کی عمارت ساٹھ گز بلند بنائی گئی۔ اس کی سات منزلیں تھیں اور اوپر سے پورا اصفہان نظر آتا تھا۔ اس عمارت کے ستون نہایت نازک اور خوبصورت ہیں۔

علی قاپو کی دائیں سمت مسجدِ شاہ ہے جو اب مسجدِ امام کہلاتی ہے۔ ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء میں اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ہوا اور یہ اٹھارہ سال میں مکمل ہوئی۔ عباس اوّل کی تعمیر کردہ اس مسجد کا شمار دنیا کی حسین ترین مسجدوں میں ہوتا ہے۔ مسجد کے درودیوار پر کاشی کا نفیس کام ہے۔ یوں لگتا ہے گویا دیواروں پر پھول کھلے ہوئے ہیں۔ وسط میں ہشت پہلو حوض ہے، جس کے اندرونی حصے کی سلیں اتنی شفاف بنائی گئی ہیں کہ دیکھنے والے کو ان میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔

مسجد امام کی دائیں جانب اور علی قاپو کے سامنے، عباس اوّل نے مسجد شیخ لطف اللہ تعمیر کروائی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ مسجد بنیادوں کے بغیر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی نچلی دیواریں انڈے کی طرح بیضوی شکل کی ہیں اور انہی پر پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ مسجد میں لگی ہوئی ٹائلیں بہت عمدہ ہیں، اور خطاطی کے لاجواب شاہکار مسجد کی زینت ہیں۔ مسجد میں تہ خانہ بھی ہے۔ تقریباً چار سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ مسجد اسی طرح چمک دمک رہی ہے حالانکہ ان چار صدیوں میں اسے برفباری، بارش اور دھوپ کی تمازت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

شاہی محلوں کی عمارتوں میں چہل ستون کی عمارت آج بھی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ عباس اوّل کے دور میں تعمیر ہونے والی اس عمارت کے نازک چوبی ستون یوں تو تعداد میں بیس ہیں لیکن عمارت کو چہل ستون یعنی چالیس ستون والی عمارت کہا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بیس ستونوں کے سامنے ایک حوض ہے، جس میں ان ستونوں کا عکس دکھائی دیتا ہے، اسی لیے عمارت کا نام چہل ستون رکھ دیا گیا۔

عباس اوّل نے اصفہان میں پُل تعمیر کروائے۔ یہ شہر دریا زندہ رود کے کنارے واقع ہے۔ 'زندہ رود' کو اب 'زاینده رود' کہا جاتا ہے۔ زاینده رود پر بنائے گئے خوبصورت پلوں میں سے ایک شہر کے وسط میں ہے، اسے پُل جلفا کہا جاتا تھا کیونکہ اس پل کا راستہ ایک بستی 'جلفا' کو جاتا ہے۔ اسے 'پُل اللہ وردی خاں' بھی کہتے تھے، کیونکہ اسے عباس اوّل کے ایک افسر اللہ وردی خان نے بنوایا تھا۔ آج کل یہ پُل "سی وسہ چشمہ" کہلاتا ہے، یعنی ۳۳ محرابوں والا۔ ایک پل، "پل خواجو" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پل ۱۵۴ گز لمبا اور ۲۴ فٹ چوڑا ہے۔ ایک اور پل "پل شہرستان" کہلاتا ہے۔

عباس اوّل نے ملک بھر میں پختہ سڑکوں کا جال بچھادیا۔ ان میں سے ایک سڑک "رہِ سنگ فرش" کے نام سے مشہور ہوئی۔ سڑک گیلان اور ماژندران کے دلدلی علاقے میں بنائی گئی۔ اس کی وجہ سے بحیرۂ خزر (بحیرۂ کیسپیئین) کے ساحلی علاقوں میں آمدورفت آسان ہوگئی۔ عباس اوّل نے کارواں سرائے اور پل اتنی بڑی تعداد میں تعمیر کروائے کہ اس سلسلے کی قدیم عمارتیں بھی شاہ عباس کے نام سے موسوم کی جانے لگیں۔ انہوں نے پانی کے ذخائر کا اہتمام کیا اور کاریزیں کھدوائیں۔ مشہد، فرح آباد، اردبیل، قزوین، کاشان، استر آباد، تبریز، ہمدان اس دور میں نہایت پُررونق اور خوشحال شہر تھے۔

عباس اوّل نے اصفہان کے قریب نیا شہر "جلفا" بھی بسایا۔ اس شہر میں ان پانچ ہزار افراد کو بسایا گیا جو آرمینیا کی مہم میں قیدی بنائے گئے تھے۔ اس شہر کے باشندوں نے ایران کی تجارت کو فروغ دیا۔ عباس اوّل نے کاشان کے قریب مشہور بند "بند کوہ رود" بھی تعمیر کروایا۔ ماژندران ان کی جائے پیدائش ہے۔ فطری طور پر اس شہر سے انھیں محبت تھی، چنانچہ یہاں بہت سی خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔

عباس اوّل نے تعمیرات کے ساتھ دیگر فنون پر بھی توجہ دی۔ ان کی کوششوں سے کاشی کاری، نقاشی، قالین بافی، دھات کی صنعت اور تصویر کشی کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ایران والوں نے ان فنون کے بڑے بڑے ماہرین پیدا کیے۔ کاشی کاری کی صنعت اگرچہ ایران کی قدیم صنعتوں میں شمار ہوتی تھی لیکن صفوی دور میں اس صنعت کو نیا روپ دیا گیا۔ ایران کے علاقے کاشان سے ابھرنے کی بنا پر یہ صنعت کاشی کاری کہلائی۔ اس قسم کے کام میں نیلے رنگ کی ٹائلیں نمایاں ہوتی ہیں۔ پاکستان کے بعض حصوں مثلاً ٹھٹھہ، ملتان وغیرہ میں بھی کاشی کاری کے نمونے ملتے ہیں۔

صفوی دور میں کاشی کاری کو وسعت دی گئی۔ پھولوں کی تصاویر ٹائلوں پر کاشی کے ذریعے پھیلادی جاتی تھیں۔ اس طرح کئی ٹائلوں کے خاص ترتیب سے یکجا ہونے پر ایک مکمل تصویر ابھر کر سامنے آجاتی تھی۔ مختلف برتن، گلدان، پلیٹیں، پرچ، پیالے بھی کاشی کے بننے لگے۔

Marfat.com

شیشے کے برتنوں پر میناکاری بھی ایران کی خاص صنعت ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں شیشے کے ظروف تیار ہونے شروع ہوئے، یورپ والوں نے یہ فن ایران ہی سے سیکھا تھا۔ عباس اوّل کے دور میں ایک آرائشی تکنیک نے فروغ پایا جو "خاتم" کہلاتی تھی۔ لکڑی کی پٹیوں، ہاتھی دانت اور دھات کو ملا کر نہایت خوبصورت اشکال اور ڈیزائن تیار کیے جاتے تھے، اور پھر انہیں فرنیچر، دروازوں، صندوقوں وغیرہ پر ثبت کر دیا جاتا تھا۔

صفوی عہد میں نقاشی اور مصوری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے دور میں بہزاد نے مصوری کے نئے باب کا آغاز کیا۔ سعدیؒ اور حافظؒ کا کلام مصور کیا گیا۔ عباس اوّل کے عہد میں مانی نے فنِ مصوری میں بڑا نام پیدا کیا۔ مانی مصوری کے نئے مکتب کے بانی تھے۔ ان کی پیروی اکثر مصوروں نے کی۔ ان کے علاوہ رضا عباسی اس عہد کے نامور مصور تھے۔ ان کے فن کی جھلکیاں، سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے مصوروں کے شہ پاروں میں بھی ملتی ہیں۔ اسی دور میں ماہر خطاط بھی ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں مرزا احمد تبریزی، میر عماد قزوینی، محمد حسین تبریزی اور معزی کاشانی مشہور ہیں۔

قالین بافی ایران کی قدیم صنعت ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے پہلے بھی ایران میں قالین بنائے جاتے تھے۔ صفوی دور میں قالین کی تصویروں کو نمایاں کرنے کے لیے سنہری تار استعمال ہونے لگے۔ مخملیں قالین بھی بنائے گئے۔ رنگوں میں جدت پیدا کی گئی۔ قالینوں پر بڑی مہارت کے ساتھ درخت، پھول، پھل اس طرح اجاگر کیے جاتے کہ وہ اصلی محسوس ہونے لگتے۔ صفوی دور کے بہت سے قالین آج بھی مختلف ملکوں کے عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ عباس اوّل نے اصفہان میں قالین بافی کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا تھا جو "کارگاہ" کہلاتا تھا۔ یہ کارگاہ، چہل ستون اور میدانِ عظیم کے درمیان واقع تھی۔

عباس اوّل کے دور میں پارچہ بافی کے فن کو بھی عروج حاصل ہوا۔ خیموں، ملبوسات، پردوں اور غلافوں کے لیے قیمتی پارچہ جات استعمال ہوتے تھے۔ یہ بات اس دور کی خوشحالی کی نشاندہی کرتی ہے۔ امرا اور فرمانرواؤں کو قیمتی پارچے، تحفۃً ارسال کیے جاتے تھے۔ بیرون ملک جو اہم خطوط بھیجے جاتے تھے انہیں بھی بیش قیمت پارچہ جات میں لپیٹ کر روانہ کیا جاتا تھا۔ ان پارچہ جات پر تجریدی اشکال بھی بنتی تھیں اور خوبصورت مناظر بھی ثبت کر دیے جاتے تھے۔ شاہ نامے کے مناظر، سیر و شکار، مختلف خوبصورت پھولوں کی تصاویر ان کپڑوں کی شان بڑھاتی تھیں۔ اسی دور میں دو سوتی، ساٹن کے کپڑے تیار کرنے، کپڑے پر چھوٹے ٹھپے لگانے اور زردوزی کا رواج بھی تھا۔ اس دور میں جتنا حسین مخمل تیار ہوتا تھا، بعد کے دور میں ایسا مخمل نہیں نظر آیا۔ ماہر کاریگر مخمل ہی میں دلفریب مناظر بھی بُن دیتے تھے۔

عباس اوّل نے اپنے دور میں فروغِ علم کے لیے بھی کوششیں کیں۔ ان کے عہد کے علما میں شیخ بہاالدین محمد بن حسین عاملی اور میر داماد، مشہور ہیں۔ حکما میں حکیم شرف الدین حسن شفائی، حکیم باشی، میر ابوالقاسم فندرسکی کا بڑا نام ہے۔ اس عہد کے شعراء کرام میں محمد وقاری، سنجابی استر آبادی، طالب آملی، وحشی یزدی، محتشم اور دیگر کئی نام نمایاں ہیں۔ ایران سے بہت سے شعراء برصغیر چلے آئے، جہاں انہوں نے مغل حکمرانوں کے دربار میں اپنے فنِ شعر گوئی کا لوہا منوایا۔ اس دور میں حسن روملو اور سکندر منشی نے تاریخ کو محفوظ کرنے کا کام بھی انجام دیا۔

عباس اوّل قانون کے نفاذ کے معاملے میں سخت گیر تھے۔ ان کے دور میں ہر صوبے کا گورنر اور مقامی فوجدار اپنے ماتحت اضلاع کی شاہراہوں کے امن و امان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ جھوٹ بولنے کی سزا بہت سخت تھی۔ عباس اوّل نے ہمسایہ ممالک کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے خبر رسانی کا اچھا اہتمام کیا۔ وہ علم النسہ سے واقف تھے اور شعر فہمی کے ساتھ ساتھ خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان سے ملنے والوں کا تاثر یہ تھا کہ عباس اوّل کا قد تو زیادہ نہ تھا لیکن وہ خوش وضع تھے اور موزوں جسم کے مالک تھے۔ رنگ گورا تھا۔ کسی بات کی تہ تک پہنچنے اور نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ ارادے کے مضبوط اور دُھن کے پکے تھے۔ متواضع بھی تھے اور اجنبیوں کی خاطر مدارات کرتے تھے۔ عباس اوّل زندہ دل انسان تھے۔ اکثر شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کر عام افراد سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، لیکن ان کا رعب و دبدبہ اتنا تھا کہ لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ عباس اوّل بڑے مدبر اور جرأت مند انسان تھے۔ وہ ایک اچھے شمشیر زن بھی تھے۔

عباس اوّل کا انتقال جمادی الاول ۱۰۳۸ھ / جنوری ۱۶۲۹ء میں ۵۸ برس کی عمر میں ہوا۔ صفوی عہد کے سوا دو سو برسوں میں عباس اوّل کا ۴۲ سالہ دورِ حکومت ترقی اور خوشحالی کا دورِ عروج تھا۔

Marfat.com

مراد چہارم

آہنی عزم و حوصلے کے مالک، لائق وزیرک حکمراں

(یہ مضمون محترم ڈاکٹر محمد صابر صاحب (سابق صدر شعبہ تاریخ اسلام جامعہ کراچی) کی رہنمائی میں لکھا گیا)

دروازہ کھول دیا گیا تھا!

مستعد اور چاق و چوبند محافظوں نے سرکاری خزانے کی عمارت کا آہنی دروازہ کھول دیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد مضبوط جسم، اچھی صحت اور نکلتے ہوئے قد کا مالک ایک نوجوان رعب و تمکنت سے چلتا ہوا ایک جانب سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ وہ دونوں سرکاری خزانے کی عمارت میں داخل ہوگئے۔

عمارت کے اندر محفوظ کمرے تھے جہاں کبھی سونے اور چاندی کے بے شمار ظروف رکھے رہتے تھے، سونے کے سکوں کی مُہر بند تھیلیوں کے انبار موجود رہتے تھے اور زر و جواہر کا ایک بڑا خزانہ بند تھا۔ لیکن اس وقت یہ کمرے کسی بیوہ کی اجڑی ہوئی مانگ کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ ان میں ایک بے نام سی اداس فضا چھائی ہوئی تھی۔ ایک جگہ صرف ۳۰ ہزار پیاستر (چھوٹے نقرئی سکے) رکھے ہوئے تھے اور الماریوں میں مونگے اور چینی کے چند برتن نظر آتے تھے۔ غالباً انہیں غیر اہم اور بے قیمت سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

نوجوان کا چہرہ سرکاری خزانے کی بے وقعتی اور کم مائیگی پر متغیر ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں عزم و ہمت کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ پھر وہ جھکا اور اس نے قبلہ رُو ہو کر ربِ کائنات کے حضور سجدہ ادا کیا۔ اس کے بعد اس نے سجدے سے سر اٹھایا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

"ان شاء اللہ اس خزانے کو ان ہی لوگوں کی جائیدادوں سے پُر کردوں گا جنہوں نے اسے لُوٹا ہے۔"

پیکرِ عزم صمیم یہ شخصیت تھی سلطنتِ عثمانیہ کے ۱۷ ویں خلیفہ مراد خان چہارم کی، جنہوں نے نامساعد حالات میں شدید عدم استحکام کی شکار سلطنت کی حکمرانی سنبھالی اور قلیل عرصے میں عثمانی سلطنت کو دوبارہ ایک مستحکم اور پائیدار سلطنت بنادیا۔ انہوں نے صرف ۲۸ برس کی عمر پائی۔ لیکن اس مختصر مدت میں ان کے کارنامے اس لائق ہیں کہ انہیں روشن حروف سے تحریر کیا جائے۔

مراد چہارم کا نام مراد خان ہے۔ ان کے والد، احمد خان (احمد اوّل) عثمانی سلطنت کے ۱۴ ویں خلیفہ تھے (۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ / ۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء)۔ والدہ کا نام ماہ پیکر تھا لیکن وہ "کوسم سلطان" کے لقب سے مشہور ہیں۔ مراد چہارم کو مراد چہارم اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے قبل عثمانی سلطنت کی تاریخ میں مراد نام کے تین حکمراں گزر چکے تھے۔

مراد چہارم ۲۸ جمادی الاول ۱۰۲۱ھ / ۲۷ جولائی ۱۶۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ یہ ان کے والد سلطان احمد اول کا دورِ حکومت تھا۔ احمد اول ایک دین دار حکمراں تھے۔ انہوں نے کئی مذہبی ادارے قائم کیے۔ انہوں نے کعبہ شریف اور روضہ رُسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تزئین و زیبائش میں بھی حصہ لیا۔ وہ شاعر بھی تھے اور "بختی" تخلص رکھتے تھے۔

احمد اول کا انتقال ۲۳ ذیقعدہ ۱۰۲۶ھ / ۱۲ نومبر ۱۶۱۷ء کو علالت کے باعث ہوا۔ ان کے انتقال کے دن ہی ان کے بھائی مصطفیٰ تخت نشین ہوئے۔ انہیں مصطفیٰ اول کہا جاتا ہے۔ عثمانی سلطنت میں "مصطفیٰ" نام کے مزید تین سلطان بعد کے ادوار میں حکمراں رہے۔ مصطفیٰ اوّل حکمرانی کے اہل نہ تھے۔ وہ کمزور اعصاب کے مالک تھے بلکہ بعض موَرخین کے مطابق انہیں خللِ دماغ کا مرض تھا۔ وہ صرف تین ماہ تک برسرِ اقتدار رہے۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ / ۲۶ فروری ۱۶۱۸ء کو ایک

Marfat.com

انقلاب کے ذریعے انہیں معزول کر دیا گیا اور ان کے بھتیجے عثمان ثانی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ عثمان ثانی، احمد اوّل کے بیٹے تھے۔

عثمانی ثانی ایک ذہین انسان تھے۔ شہسواری میں ماہر تھے اور اچھے شاعر بھی تھے۔ تاہم ان کے دور میں بھی "ینی چری" فوج کی شورشیں عروج پر رہیں۔ "ینی چری" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "نئی فوج"۔ یہ نام پیادہ فوج کو دیا گیا تھا۔ اس فوج کو دوسرے عثمانی سلطان اورخان کے زمانے میں (۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء) ترتیب دیا گیا تھا۔ بعد میں اس فوج نے بڑی قوت حاصل کرلی۔ بالآخر ۱۷ رجب ۱۰۳۱ھ/۱۸ مئی ۱۶۲۲ء کو ینی چری کے سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ انہوں نے محل پر قبضہ کر کے عثمان ثانی کو قیدی بنا لیا اور ۱۹ رجب ۱۰۳۱ھ/ ۲۰ مئی ۱۶۲۲ء کو انہیں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ ینی چری دوبارہ مصطفیٰ اوّل کو بلا لائے اور زبردستی انہیں سلطان بنادیا۔ یہ حکومت کے انتہائی عدم استحکام کا زمانہ تھا۔ اقتدار عملاً ینی چری کے ہاتھ میں تھا۔ آخر صدرِ اعظم کمال کیش علی پاشا نے مفتی سے مل کر ۲۵ ذی قعدہ ۱۰۳۲ھ/ ۱۰ ستمبر ۱۶۲۳ء کو مصطفیٰ اوّل کو کرسی اقتدار سے محروم کر دیا اور احمد اوّل کے نو عمر بیٹے مراد چہارم کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دیا۔

مراد چہارم نے صرف ۱۲ برس کی عمر میں حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ حکمرانی و جہاں بانی کے لیے موزوں نہ تھی اور یہ بات بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے کہ مراد چہارم کی سرپرست ان کی والدہ کوسم سلطان تھیں اور تمام اختیارات عملاً کوسم سلطان ہی کے ہاتھ میں تھے لیکن اس کم عمری میں بھی مراد چہارم جس عزم و حوصلہ سے سرشار تھے اس کا اندازہ اس مضمون کی ابتدا میں بیان کیے گئے واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مراد چہارم نے جس زمانے میں حکومت سنبھالی، وہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔ پوری عثمانی سلطنت داخلی اور خارجی دونوں جانب سے طرح طرح کے خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ مملکت کی سرحد پر ایرانی فوجیں دستک دے رہی تھیں۔ ایران کے شاہ عباس اوّل نے نہ صرف قندھار پر قبضہ کرلیا تھا جس پر پہلے مغلوں کی حکمرانی تھی بلکہ ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں ایرانی فوج، ترکوں سے بغداد بھی چھین چکی تھی اور موصل بھی ایرانیوں کے زیر تسلط جاچکا تھا۔

ادھر ایشیائے کوچک (ایشیائی ترکی) کے حاکم اباذہ پاشا، عثمان دوم کے قتل کے بعد سخت ناراض تھے اور انہوں نے باغیانہ طرز عمل اختیار کرلیا تھا۔ لبنان میں بھی بغاوت کا سماں تھا۔ مصر اور دیگر صوبوں کے حاکم بھی عدم اطاعت کے لیے پر تول رہے تھے۔ الجزائر، تونس (تیونس) اور طرابلس کی حکومتیں خود مختار ہوچکی تھیں اور یورپ کی حکومتوں سے خود ہی مختلف معاہدے کر رہی تھیں۔ روسی قزاق نہ صرف بحیرۂ اسود کے ساحل پر حملے کر رہے تھے بلکہ آبنائے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ (استنبول) سے ملحق علاقوں میں بھی غارت گری کر رہے تھے۔

سلطنت کی فوج ینی چری کو عملاً وسیع اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔ وہ جسے چاہتے تھے معزول کروا دیتے تھے یا سزائے موت دلوا دیتے تھے۔ معاشرے میں بدامنی اور بدعنوانیوں کا چلن تھا۔

ان حالات میں نو عمر مراد چہارم نے سلطنت کا انتظام سنبھالا۔ ان کے سامنے متعدد مسائل اور خطرات تھے تاہم ان کی والدہ کوسم سلطان نے بڑے تدبر اور ذہانت کا ثبوت دیا اور تمام مسائل پر دھیرے دھیرے قابو پانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ابتدا میں امورِ مملکت پر کوسم سلطان ہی کا اختیار رہا اور یہ صورتِ حال مراد چہارم کی تخت نشینی سے ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ء تک رہی۔ اس کے بعد مراد چہارم نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اپنی زبردست صلاحیتوں اور قوتِ برداشت سے کام لیتے ہوئے مملکت عثمانیہ کو مسائل کے گرداب سے نکال لیا۔

مراد نے جب کم سنی میں اقتدار سنبھالا تو ایران کے شاہ عباس اوّل اپنی مملکت کو وسعت دینے میں مصروف تھے۔ انہوں نے قندھار پر قبضہ کرلیا تھا اور اریوان (آرمینیا کا صدر مقام) پر بھی ان ہی کا تسلط تھا۔ اہم بات یہ ہوئی کہ مراد کی تخت نشینی کے ابتدائی زمانے ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس اوّل نے عثمانی مملکت کے انتشار اور عدم استحکام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغداد پر بھی قبضہ کرلیا۔

مراد چہارم نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ بغداد کو ایرانیوں کے پنجے سے ہر قیمت پر آزاد کروائیں گے، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں کوششوں کا آغاز کردیا۔ بغداد میں عثمانیوں کو ایرانیوں کے ہاتھوں جو شکست ہوئی تھی، اس کی ذمہ داری صدرِ اعظم کمال شاہ کیش علی پاشا کے مخالفین نے صدرِ اعظم پر عائد کی اور مراد پر شدید دباؤ ڈالا گیا۔ بالآخر صدرِ اعظم علی پاشا کو سزائے موت دے دی گئی۔ ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء میں حافظ پاشا کو صدرِ اعظم بنایا گیا۔ انہوں نے اسی برس بغداد پر فوج کشی کی اور اس کا

Marfat.com

محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ کئی دن تک قائم رہا لیکن بغداد فتح نہ کیا جاسکا، آخر ینی چری نے گھبرا کر محاصرہ اٹھا دینے کا اعلان کر دیا۔ حافظ پاشا نے مجبوراً محاصرہ اٹھالیا اور واپس دیار بکر چلے آئے۔ ان کی اس پسپائی کو بہانہ بنا کر انہیں بھی مخالفین نے معزول کرا دیا۔ ان کی جگہ خلیل پاشا صدرِ اعظم بنے لیکن اگلے برس انہیں بھی ہٹا دیا گیا۔ پھر خسرو پاشا صدرِ اعظم بن گئے۔

اسی اثنا میں مراد چہارم نے کوشش کی کہ ایشیائے کوچک کے حاکم ابازہ پاشا کو مطیع کیا جائے۔ انہوں نے کئی وزرا اور سرکردہ افراد کو ابازہ شاہ کو سمجھانے کے لیے بھیجا مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ آخر خسرو پاشا (صدر اعظم) کو بھیجا گیا۔ انہوں نے جا کر ابازہ پاشا کو اطاعت پر مجبور کر دیا اور قسطنطنیہ لے آئے۔ مراد چہارم نے ابازہ پاشا کو سرزنش تو کی لیکن ان کی تالیفِ قلب کے لیے انہیں بوسن (موجودہ بوسنیا) کا بیگلر بیگی (امیر الامرا) بنا کر بھیج دیا۔

۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء میں ایران کے شاہ عباس اول کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مراد چہارم نے ایرانیوں کے خلاف کارروائیاں تیز کر دیں۔ خسرو پاشا کو ایران پر فوج کشی کے لیے بھیجا۔ خسرو پاشا ہمدان میں داخل ہوگئے۔ ہمدان فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھے اور بغداد کا محاصرہ کرلیا لیکن کچھ دنوں بعد فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں وہ واپس آگئے اور انہیں معزولی کا سامنا کرنا پڑا۔ حافظ پاشا کو دوبارہ صدر اعظم بنایا گیا، لیکن ینی چری کی باغیانہ روش کے باعث ایک دن حافظ پاشا کو قتل کر دیا گیا، جس کا مراد چہارم کو شدید صدمہ ہوا۔

اب مراد چہارم نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کی۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک وہ مکمل طور پر اختیارات اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اور ینی چری کو قابو نہ کریں گے مملکت میں یوں ہی بدامنی اور لاقانونیت عام رہے گی اور بیرونی محاذوں پر بھی وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکیں گے۔ چنانچہ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۲ء میں مراد چہارم نے اقتدار کلی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب حکومت کے معاملات میں مراد چہارم کی والدہ کوسم سلطان کا عمل دخل بہت ہی کم رہ گیا۔

جملہ اختیارات سنبھالنے کے بعد مراد چہارم نے سرکشی، بغاوت اور لاقانونیت کے خلاف انتہائی سخت اقدامات کا آغاز کر دیا۔ بعض مؤرخین ان کے اقدمات کو جابرانہ قرار دیتے ہیں لیکن مملکت میں پھیلے ہوئے بگاڑ کو ختم کرنے کے لیے ایسے اقدامات غالباً ضروری تھے۔

مراد چہارم نے "دویومہ شرمہ" یعنی جبری بھرتی کا قانون منسوخ کر دیا جس کی رُو سے "ینی چری" میں سپاہیوں کو جبراً بھرتی کیا جاتا تھا۔

انہوں نے قابلِ اعتماد سپاہیوں کو اکٹھا کر کے ان کے دستے تشکیل دیے۔ اناطولیہ (ایشیائی ترکی) کا طویل دورہ کیا۔ بدعنوان افسران کو موقع پر ہی سزائے موت دلوادی۔ ان میں ایک مارشل، تین جنرل اور بہت سے قاضیوں کے علاوہ ہزاروں جرائم پیشہ عناصر شامل تھے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ جرائم کے ارتکاب پر اس شدت سے سزائیں دی گئیں کہ پورے اناطولیہ میں امن و امان ہوگیا اور بغاوت کے آثار جاتے رہے۔

مراد چہارم نے بالآخر فوجی مہم کی قیادت خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ بغداد کو واپس حاصل کرنا ان کی دلی آرزو تھی۔ اس غرض سے انہوں نے ۱۹ شوال ۱۰۴۴ھ/۲۸ مارچ ۱۶۳۵ء کو اپنے سفر کا آغاز کیا۔ عثمانیوں میں سلطان کی قیادت میں جو فوجی مہم روانہ کی جاتی تھی اسے "سفر ہمایوں" کہتے تھے۔ سلطان مراد نے اپنے پہلے سفر ہمایوں کا آغاز کیا اور پہلے اریوان (آرمنیا کے موجودہ مرکز روان) اور آذربائیجان کے شہر تبریز پر ربیع الاول ۱۰۴۵ھ/اگست ۱۶۳۵ء کے اوائل میں قبضہ کرلیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب تبریز، لندن اور پیرس کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ تاہم اگلے سال ایرانیوں نے اریوان واپس لے لیا۔ تبریز پر قبضے کے بعد سلطان مراد واپس چلے گئے۔

مراد چہارم نے اپنا دوسرا "سفر ہمایوں" ۴ محرم ۱۰۴۸ھ/۸ مئی ۱۶۳۸ء کو شروع کیا۔ یہ ان کے عہد کی آخری مہم تھی۔ عثمانی فوجیں سلطان مراد کی قیادت میں بغداد کی طرف بڑھیں جو گزشتہ پندرہ برس سے ایرانیوں کے زیرِ تسلط تھا۔ ۱۸ رجب ۱۰۴۸ھ/۱۵ نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ ۳۹ دن جاری رہا۔ محصورین نے سخت مزاحمت کی لیکن عثمانی فوج کے آگے ان کی ایک نہ چل سکی۔ مراد چہارم خود معمولی سپاہیوں کی طرح کھائیوں میں کام کرتے رہتے تھے اور عام سپاہیوں کے ساتھ مل کر فوجی کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے۔ جس لشکر کا سربراہ خود میدان میں عام سپاہیوں کے ساتھ مل کر دادِ شجاعت دے رہا ہو اور ان کا حوصلہ بلند کر رہا ہو، مخالف فوج کے لیے اس لشکر کی جرأت اور جذبۂ شجاعت کا مقابلہ کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ایرانی لشکر[1] کے قائدین نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے تو انہوں نے اپنے سب سے بہادر اور جنگ آزما سپاہی کو میدان میں اتارا اور عثمانی فوج کو للکارا کہ وہ اپنے سب سے بہادر سپاہی کو مقابلے کے لیے بھیجے۔ یہ للکار سن کر سلطان مراد خود مقابلے کے لیے میدان میں اتر آئے۔ ایرانی سورما اور مراد چہارم کے درمیان کچھ دیر تک شمشیر زنی کا سخت مقابلہ ہوتا رہا پھر سلطان مراد نے تاک کر تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ ایرانی جنگجو کا سر دو ٹکڑے ہو گیا۔

۲۵ شعبان ۱۰۴۸ھ / ۲۲ دسمبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی لشکر کی توپوں نے شہر بغداد کی فصیل میں ۸۰۰ گز چوڑا شگاف ڈال دیا۔ تین دن تک ترک شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے، آخر عثمانی دستے گولیوں کی بوچھاڑ کی پروا کیے بغیر مردانہ وار شہر میں داخل ہو گئے۔ ۲۸ شعبان ۱۰۴۸ھ / ۲۵ دسمبر ۱۶۳۸ء وہ یادگار دن ہے جب بغداد دوبارہ عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا اور اس کے بعد بھی کم و بیش ۲۷۸ برس تک عثمانیوں ہی کے زیر انتظام رہا۔

بغداد فتح کرنے کے بعد مراد چہارم نے ایک دُور اندیشانہ اقدام کیا۔ انہوں نے ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۹ء میں ایرانی حکومت سے امن کا ایک معاہدہ کر لیا۔ اس طرح مزید خونریزی کا خطرہ ٹل گیا۔ مراد چہارم کے اس فیصلے سے ایران اور عثمانی سلطنت کے درمیان ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء سے جاری جنگوں کا سلسلہ بھی رک گیا۔ اس سے قبل دونوں مملکتوں کی فوجیں ایک دوسرے کے علاقوں میں دور دور تک تباہی پھیلاتی رہتی تھیں۔

معاہدے کے مطابق عراق، بغداد، بصرہ اور شہرزور عثمانی سلطنت کے حصے تسلیم کیے گئے اور اریوان یعنی آرمینیا کا مرکز روان، ایران کے پاس رہا۔ اس طرح عثمانی حکمران تبریز اور کوہ قاف کے علاقوں سے دستبردار ہو گئے۔ معاہدے میں یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی کہ ایران، عثمانی سلطنت پر حملہ نہیں کرے گا اور نہ ہی عثمانی حکومت ایران کے علاقوں پر قبضہ کرے گی۔ اس معاہدے کے مطابق دونوں مملکتوں کی سرحدیں آج بھی قائم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایران، اریوان سے محروم ہو چکا ہے اور عراق ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

یورپی محاذ پر بھی مراد چہارم نے بھرپور کارروائی کی۔ پولینڈ نے سابقہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، چنانچہ ۱۰۴۳ھ / ۱۶۳۴ء میں سلطان مراد یورپی مہم پر روانہ ہوئے۔ جب وہ اورنہ پہنچے تو پولینڈ نے عثمانیوں کی جنگی تیاریوں سے خوفزدہ ہو کر ایک صلح نامے پر دستخط کر دیے۔ اس طرح یورپ میں ایک خوفناک جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔

وینس اور مغربی بحری طاقتوں سے پُرامن تعلقات رہے تاہم عثمانی مرکز کا اختیار الجزائر کی بربری ریاستوں پر نہیں رہا تھا چنانچہ انگلستان، ہالینڈ اور فرانس نے وہاں کے حکمرانوں سے الگ الگ عہد نامے کر لیے۔

مراد چہارم نے بغداد سے واپس آ کر بحریہ کو طاقتور بنانے کی کوشش کی اور البانیہ اور قریبی علاقوں کی شورشوں کو رفع کیا۔ انہوں نے طرابلس غرب (موجودہ لیبیا)، تیونس اور الجزائر میں ینی چری افسروں کی لاقانونیت کا خاتمہ کیا۔ یمن بھی عثمانی سلطنت کا جزو بنا رہا۔

مراد چہارم نے ملکی خزانے کو مستحکم بنانے پر بھی بھرپور توجہ دی۔ اس مضمون کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ جب مراد چہارم خلیفہ بنے تو حکومت کا خزانہ خالی تھا لیکن مراد چہارم نے مکمل اختیارات حاصل کرنے کے بعد نہایت سخت مالی قوانین نافذ کر دیے۔ بڑی بڑی امارتوں کو ضبط کر لیا اور اخراجات کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملکی معیشت مستحکم ہو گئی اور مالی بدعنوانیوں کے راستے بھی بند ہو گئے۔ رعایا نے سکون کا سانس لیا اور عام آدمی کو انصاف میسر آنے لگا۔

مراد چہارم نے اناطولیہ (ایشیائی ترکی) میں بہت سی سرائیں، بڑے بڑے پُل اور سڑکیں بھی تعمیر کروائیں۔ انہوں نے جب ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء میں خود فوج کی قیادت کرتے ہوئے بغداد فتح کیا تو تمام مقبروں خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہؒ اور شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کے مقبروں کی از سر نو تعمیر کروائی۔ ان کے جانے کے بعد باب الطلسم کے گرد فصیل بنا دی گئی اور وہ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء تک اسی طرح رہا۔ مراد چہارم کے صدر اعظم نے قلعے کی بھی تعمیر و مرمت کروائی۔ مراد چہارم کے دور میں برسہ (بروصہ) شہر ریشم کی پیداوار کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ قسطنطنیہ میں مراد چہارم کے دور میں ٹکسال بھی قائم ہوئی۔

مراد چہارم کے چند اقدامات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

شراب نوشی پر پابندی: ۲۰ صفر ۱۰۴۴ھ / ۱۵ اگست ۱۶۳۴ء کو مراد چہارم نے پوری سلطنت میں شراب نوشی پر سخت پابندی عائد کر دی۔ تمام مے خانے بند کر دیے گئے۔ گھر کے اندر بھی شراب نوشی پر پابندی تھی۔ اگر کوئی شراب پیتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے فوراً پھانسی دے دی جاتی تھی۔

Marfat.com

تمباکو نوشی پر پابندی: عثمانی سلطنت میں تمباکو نوشی عام تھی اور علماء کرام کا خیال تھا کہ تمباکو نوشی مضر ضرور ہے لیکن گناہ نہیں۔ لیکن ربیع الثانی ۱۰۴۳ھ / ستمبر ۱۶۳۳ء میں تمباکو نوشی کرنے والوں کی کسی لاپروائی کے باعث قسطنطنیہ میں آگ لگ گئی اور ۲۰ ہزار مکانات جل کر تباہ ہو گئے۔ مراد چہارم نے اس سانحے کو بنیاد بنا کر تمباکو نوشی پر مکمل پابندی لگادی۔ یہ پابندی اتنی سخت تھی کہ گھر کے اندر بھی تمباکو نوشی کی اجازت نہ تھی۔ تمباکو نوشی کرتے ہوئے گرفتار ہونے پر بعض افراد کو سزائے موت دے دی گئی۔

قہوہ نوشی پر پابندی: مراد چہارم کے دور میں فوجیوں نے اپنی اپنی بارکوں میں قہوہ خانے قائم کر لیے تھے اور وہ ان قہوہ خانوں میں گھنٹوں بیٹھے حکومت کے خلاف باتیں کرتے رہتے تھے یا سیاسی مداخلت کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ مراد چہارم نے ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء میں اچانک تمام قہوہ خانوں کو مسمار کروادیا اور کھلے عام قہوہ پینے پر پابندی لگادی۔ البتہ گھر کے اندر قہوہ پینے پر کوئی پابندی نہ تھی۔

مراد چہارم آہنی عزم و حوصلے کے مالک تھے۔ ان کے فیصلے محکم اور اٹل ہوتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں پر بڑی قوت کے ساتھ عمل درآمد کرواتے تھے۔ وہ جسمانی اعتبار سے بہت طاقت ور تھے۔ شہسواری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ نہایت بھاری گُرز استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے امیر تیمور کا لقب "صاحب قران" پسند کیا تھا۔ "صاحب قران" اقبال مند اور جری شخص کو سمجھا جاتا تھا۔ مجازاً اسے "اپنے دور کا عظیم ترین حکمراں" کہا جاسکتا ہے۔

مراد چہارم اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ شعرا کرام کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ ترک شاعر طفلی (احمد چلبی) کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان سے شاہنامۂ فردوسی سنا کرتے تھے۔ مراد چہارم اور طفلی کی دوستی اتنی شہرت اختیار کر گئی تھی کہ ایسی کہانیاں لکھ دی گئی تھیں جن میں مراد اور طفلی تمثیلی کرداروں کی شکل میں پیش کیے گئے تھے۔ اس طرح کی کہانیاں آج بھی استنبول کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ طفلی کا انتقال ۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۰ء میں ہوا۔

مراد چہارم خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بغداد کی جنگ کے موقع پر انہوں نے صدرِ اعظم حافظ پاشا کے منظوم خط کے جواب میں منظوم خط تحریر کیا۔ مراد چہارم ایک اچھے خطاط اور ماہر موسیقی بھی تھے۔

مراد چہارم نے قسطنطنیہ کی طوپ قپو سرای (توپ دروازہ سرائے جہاں اب توپ قاپی عجائب گھر قائم ہے) کے تیسرے صحن میں دو کوشک تعمیر کروائے۔ کوشک سے مراد "کشادہ باغ میں الگ عمارت" ہے۔ ان کوشکوں کے نام "بغداد کوشک" اور "رواں کوشک" تھے۔ ان کوشکوں کی زنانہ شہ نشینوں میں کاشی کاری کی آرائش کا حقیقی حسن نظر آتا ہے۔ کاشی چینی کی مربع یا مسدس تختیوں (ٹائلوں) کو کہتے ہیں جو دیواروں کی آرائش کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان شہ نشینوں میں سرخ منقاروں (چونچوں) والے پرندے ٹائلوں پر نظر آتے ہیں۔ ان ٹائلوں کی لمبائی ۱۲۵ سینٹی میٹر تک ہے۔

مراد چہارم کی والدہ ماہ پیکر کا کردار عثمانی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ وہ ایک یونانی پادری کی صاحب زادی تھیں جو مسلمان ہو گئی تھیں۔ انہیں زیادہ تر، کوسم سلطان یا کوسم والدہ کہا جاتا ہے۔ "کوسم" کے معنی ہیں "بہادر، جری"۔ کوسم سلطان قریباً ۱۰۰۰ھ / ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء تک بقید حیات رہیں۔ وہ انتہائی ذہین، زیرک اور دُور اندیش خاتون تھیں۔ سلطنت عثمانیہ کی سیاست پر ان کے گہرے اثرات تقریباً تیس برس تک رہے۔ وہ اپنے خاوند سلطان احمد اوّل کی زندگی میں امورِ مملکت میں حصہ لیتی رہی تھیں پھر جب ان کے صاحبزادے مراد چہارم حکمراں بنے تو ان کی کم عمری کے باعث کاروبار سلطنت کوسم سلطان ہی کے ہاتھوں میں تھا۔

ترک آج تک مراد چہارم کی والدہ کوسم سلطان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوسم سلطان نے متعدد رفاہی خدمات انجام دی تھیں اور کئی فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی تھی۔ کوسم سلطان نے اپنی واحد ملکیت پانچ شاہی جاگیروں کی پوری سالانہ آمدنی مندرجہ ذیل فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی: ایک سرائے تعمیر کروائی جو ان کے نام سے موسوم تھی (والدہ خان، جو ۶ رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ / ۲۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو منہدم ہو گئی)۔ سقوطری میں اپنے نام کی ایک جامع مسجد تعمیر کروائی، قسطنطنیہ (استنبول) میں ایک اور مسجد (والدہ جامع) کی تعمیر شروع کروائی۔ اس مسجد کے مینار صرف دو ہیں لیکن گنبد بے شمار ہیں۔ مسجد اس خوبی سے تعمیر کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد کے آخری حصے میں کھڑا ہو تو اسے بھی امام کی آواز اسی طرح سنائی دے گی جیسی کہ پہلی صف میں کھڑے نمازیوں کو سنائی دیتی ہے۔ کوسم سلطان نے مصر میں آب رسانی، مکہ مکرمہ میں ناداروں کی امداد،

Marfat.com

مقروضوں کے قرضہ جات کی ادائیگی اور بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے انتظامات بھی کیے۔

مراد چہارم کے دور کی اہم شخصیت مشہور ترک مصنف حاجی خلیفہ کی ہے۔ حاجی خلیفہ کا اصل نام تو مصطفیٰ بن عبداللہ ہے لیکن وہ کاتب چلبی کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ ذوالقعدہ ۱۰۱۷ھ / جنوری ۱۶۰۹ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ برس کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گئے اور ۱۰۳۳ھ تا ۱۰۴۵ھ / ۱۶۲۳ء تا ۱۶۳۵ء مراد چہارم کے دور میں متعدد جنگوں میں شریک رہے۔ انہوں نے اس جنگ میں بھی حصہ لیا جو مراد چہارم کی قیادت میں بغداد کی فتح کے لیے لڑی گئی۔ اس جنگ کے بعد انہوں نے اپنی علمی سرگرمیوں اور تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز کیا اور ۲۲ کتابیں تصنیف کیں جن میں تاریخ کی بے حد اہم کتابیں شامل ہیں۔ کاتب چلبی کو اپنی جس کتاب کی وجہ سے عالم گیر شہرت حاصل ہوئی وہ "کشف الظنون" ہے، جس کے لیے انہوں نے بیس سال سے زائد عرصے تک تیاری کی۔ اس ضخیم کتاب میں انہوں نے ابتدائے اسلام سے لے کر اپنے زمانے تک کے مصنفین اور کتابوں کا احوال قلمبند کر دیا ہے۔

مراد چہارم کے دور کے ایک اور مصنف قوچی بیگ تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں پہلی بار سلطنتِ عثمانیہ کے زوال سے بحث کی گئی تھی۔ یہ رسالہ انہوں نے مراد چہارم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مراد چہارم، قوچی بیگ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

اسی دور کی ایک باکمال شخصیت اولیا چلبی کی تھی جو مشہورِ عالم سیاح تھے اور انہوں نے اپنے مشاہدات اور علم کو "سیاحت نامہ" کے نام سے ایک کتاب میں یکجا کر دیا تھا۔ یہ کتاب دس جلدوں میں ہے۔ اولیا چلبی محرم ۱۰۲۰ھ / مارچ ۱۶۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۱۰۹۵ھ / ۱۶۸۴ء) میں ہوئی۔ وہ قرآن مجید کو خاص لحن کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۶ء میں انہیں مراد چہارم کے قصر میں ملازمت مل گئی، جہاں انہوں نے خوش نویسی، موسیقی، عربی نحو اور تجوید کی اور زیادہ مشق کی۔ مراد چہارم ان کی خوش طبعی، فراست اور خوش کلامی کو پسند کرتے تھے اور اکثر انہیں اپنے پاس بلا کر ان کے علم سے مستفید ہوتے تھے۔

مراد چہارم ۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء میں علیل ہو گئے۔ یہی علالت ان کی حیاتِ مستعار کے آخری باب کا عنوان ثابت ہوئی۔ ۲۶ شوال ۱۰۴۹ھ / ۹ فروری ۱۶۴۰ء کو یہ پُر عزم اور شجیع حکمران سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

مراد چہارم کو قسطنطنیہ (استنبول) کی مشہور مسجد جامع سلطان احمد کے دالان میں ان کے والد محترم احمد خان اور بھائی عثمان ثانی کے پہلوؤں میں سپرد خاک کیا گیا۔

مراد چہارم کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ چاروں بیٹے مختلف جنگوں میں جاں بحق ہو گئے۔ مراد کے انتقال کے بعد ان کے بھائی ابراہیم کو سلطنتِ عثمانیہ کی حکمرانی سونپ دی گئی۔

مراد چہارم اپنی زندگی کے ۲۸ برس بھی مکمل نہ کر سکے لیکن اپنی ۲۷ سال ۶ ماہ اور ۱۳ دن کی مختصر حیات میں انہوں نے وہ عظیم کارنامے انجام دیے جو عمرِ طویل پانے والے انجام نہ دے سکے۔

•••

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

ادب نامہ ایران: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی
اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر: پروفیسر محمد زبیر صدیقی
اسلام کے مشہور امیر البحر: عبدالواحد سندھی
اسلامک ری پبلک آف ایران: از سفارتخانہ ایران
اسلامی دُنیا دسویں صدی عیسوی میں: مقدسی / خورشید احمد فاروق
الملک الظاہر بیبرس: طالب ہاشمی
انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس: جلد: سارٹن
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
اے ہسٹری آف ٹرکی: ایم فلپس پرائس
تاریخ ابن خلدون: علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون / حافظ سید رشید احمد ارشد
تاریخ ادبیاتِ ایران: رضازادہ شفیق
تاریخ ادبیاتِ ایران: سید وہاج الدین احمد کنتوری / ایڈورڈ جی براؤن
تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی
تاریخ اسلام: محمد اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تاریخ اسلام: جسٹس امیر علی، ترجمہ: حسین رضوی
تاریخ اسلام: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
تاریخ الامت: مولانا محمد اسلم جیراج پوری
تاریخ الخلفا: علامہ جلال الدین السیوطی / اقبال الدین احمد
تاریخ ایران: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی
تاریخ ترکان عثمانیہ: علی محمد شاہین
تاریخ ترکیہ: نصیر احمد ناصر
تاریخ تمدن اسلام: مولوی محمد حلیم انصاری / جرجی زیدان
تاریخ خاندانِ عثمانیہ: مولوی محمد انشاءاللہ
تاریخ دعوت وعزیمت: علامہ ابوالحسن علی ندوی
تاریخ دولتِ عثمانیہ: مولوی سید ہاشمی فرید آبادی / دلاڑوں کیئر
تاریخ سلاطین آلِ عثمان: محمد حفیظ اللہ قریشی
ترکانِ عثمانی: ڈاکٹر محمد صابر احسن اوغلو
ترکی اور ترک: ثروت صولت
ترکی تاریخ: علی سیویم
جغرافیہ خلافت مشرقی: محمد جمیل الرحمٰن / جی لی اسٹرینج
حالات بنی عثمان: کرنل اسمٰعیل بک / محمد حلیم انصاری
دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور
دس سلطان: سید بشیر احمد اسعدی
وفیات الاعیان: ابن خلکان
دولتِ عثمانیہ: ڈاکٹر محمد عزیر
ڈکشنری آف سائنٹفک بایوگرافی: جلد ۲، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳،
سفر نامہ ابن بطوطہ: رئیس احمد جعفری
سلاطینِ ترکیہ: نصیب اختر / اسٹینلے لین پول
سلطان صلاح الدین ایوبی: پروفیسر یوسف عباسی / ہیرلڈ لیم
صلاح الدین ایوبی: خورشید احمد انور
صلاح الدین ایوبی: نصیب اختر / اسٹینلے لین پول
طب العرب: حکیم نیرؔ احمد واسطی / ایڈورڈ جی براؤن
عثمانلی تاریخی کرونواد: اسماعیل حامی دانشمند
عثمانلی دیولیوی تاریخ: یلمیز اوزتونا
لائیوز آف دی اوٹومن سلطانز: سید تنویر واسطی
مختصر تاریخ خلافتِ اسلامیہ: عبدالقدوس ہاشمی
مسلمان حکمراں: رشید اختر ندوی
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
میراثِ ایران: سید عابد علی عابد / پروفیسر اے جے آربری
نورالدین محمود زنگی: طالب ہاشمی
ہسٹری آف اوٹومن ٹرکس: ای۔ سی۔ کریسی
ہسٹری آف پرشیا: سر پرسی سائیکس

Marfat.com

وسط ایشیا کے جواہر

علم وفن اور حکمرانی کے ماہر وسط ایشیا کے مسلمان زعمأ

Marfat.com

انتساب

اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک
اپنے پیارے بچوں
سعد چغتائی، صائمہ طارق
صہیب چغتائی
اور صدف کلیم
کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

کلیم چغتائی بہت لکھتے ہیں اور متنوع موضوعات پر علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی انداز میں قرطاس و قلم کا حق ادا کرتے ہیں۔ اُن کی کسی بھی تحریر کی جہاں معنویت اور افادیت ہوتی ہے وہیں اس تحریر کا اپنا ایک پس منظر نہایت وسعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں حصولِ معلومات اور ادراکِ حقائق کے بھرپور حوالے اور اسناد ہوتی ہیں۔ اسی لیے جب قاری اُنھیں پڑھتا یا سامع اُنھیں سنتا ہے تو وہ پُر اعتماد ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب صرف اہلِ حکومت و دولت کے تذکرے تک ہی سمٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام سے وابستہ چند ایک سلاطین اور اُمرا کے ساتھ ساتھ بکثرت علما، فضلا، فقہا اور صاحبانِ فیض کا بھرپور ذکر شامل ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ہمہ جہت دستاویز ہے۔

کلیم چغتائی جب کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو اُس کا خاندانی پس منظر، اُس کے احوال و کوائفِ حیات، اُس کی زندگی کا ابتدا سے ارتقائی عمل، اُس کی نیک نامی اور شہرت کی خصوصی وجوہات و علل اور بعد میں دوسروں پر اُس کے اثرات و برکات۔ ایک شخص حکومت تک پہنچا تو کن اقدامات و اعمال کے ساتھ، کوئی اور شخص علم و فضل کے مراتب و مدارج تک پہنچا تو کن مساعی کے ساتھ۔ اُس کے شہر یا علاقے یا ملک کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے متعلقہ احوال۔ الغرض اس مناسبت سے کلیم چغتائی مختلف مقامات کے جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، تمدنی، دینی، اخلاقی اور سیاسی، الغرض ہر پہلو کا تعارف کرا دیتے ہیں تاکہ ہم پڑھتے ہوئے ان تمام تناظرات کو ذہن میں رکھیں۔ ایک بات کا ہمیں خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ یہ زیرِ قلم شخصیات اسلام سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے ہمارے سامنے معیارِ شناخت یہ ہونا چاہیے کہ ایسا کوئی شخص کس حد تک اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات و اخلاقیات کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور کس حد تک وہ، بحیثیت مسلمان حکمران، اسلام کو اپنی حدود و اختیارات میں فروغ دیتا ہے۔ ہمیں اس کتاب کے مطالعے سے ان تمام شخصیات کے حوالے سے یہ اطمینان ہوا کہ یہ لوگ اسلام سے وابستہ تھے اور اِن کے ہر قول و عمل سے اسلام کے اثرات پھیلتے تھے۔ ان سب نے عوام کی معاشرتی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی اور علمی و ادبی زندگی کو مفید اور پُرسکون بنانے میں کیا کچھ نہیں کیا۔ مثلاً: علوم و فنون کا فروغ اور مختلف انواع کے حوالے سے اُن کی توسیع و ترقی کا کام۔ اس سلسلے میں درس گاہیں اور مختلف مدارج کے مراکزِ علم جابجا قائم کرنا۔ لائق فائق اساتذہ کی تعلیم و تدریس کے انتظامات۔ اسی طرح متدیّن علما و فضلا کا چناؤ اور اُن کے وسیلے سے علوم کی توسیع۔ بعض علما کی تصانیفِ عہد آفریں اور ہر عہد کے لیے مفید۔ پھر یہ بات علوم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ زمانے کے مطابق جو ہنر یا فن وجود میں لاتا ہُوا اُس کی ایجاد و فروغ۔ مثلاً خطاطی، نقاشی، مصوری، میناکاری، ظروف سازی، فنِ تعمیر میں تنوع و ترقی۔ فنِ زراعت اور فنِ صنعت پر بھرپور توجہ۔ الغرض پھیلے ہوئے پہلوؤں سے عوامی افادیت کا عمل۔ ان کے علاوہ بے شمار عمارات مثلاً مدرسے، مکاتب، مساجد، باغات، سڑکیں، شفاخانے وغیرہ۔

کسی بھی معاشرے کے امن کی بنیاد عدل و انصاف ہوتا ہے۔ بیشتر مسلمان حکمرانوں کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ نہایت غیر جانبداری کے ساتھ بلا امتیاز مسلم و غیر مسلم، سب سے یکساں عدل سے پیش آتے تھے۔ اُن حکمرانوں کی وسیع ممالک تک پھیلی ہوئی غیر مسلم رعایا اِن کے عدل و برکت سے مسلمانوں ہی کی طرح فیض پاتی تھی اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگیاں گزارتی تھی۔ ان لوگوں نے جنگیں بھی لڑیں اور بے شمار فتوحات بھی حاصل کیں لیکن کبھی اسلام کے متعین کردہ اصولِ جنگ سے اغماض نہیں برتا اور اُن کے عسکری تحفظات پر پورا عمل کرتے رہے۔

یہ حکمران عوام سے تھے۔ مسندِ حکومت اور تختِ اقتدار پر آ کر بھی اُن میں اپنے بارے میں کوئی امتیاز پیدا نہیں ہوا۔ خود عوام میں سے ایک، ویسی ہی سادہ زندگی۔ کوئی تشخص نہیں۔ اُنھی میں گھل مل کر رہنا۔ صرف اپنی حکومتی ذمے داریوں کا احساس کرنا اور اپنی ذات کو کسی سے بالاتر نہ سمجھنا۔ اسی طرح یہ لوگ ارکانِ اسلام کے پابند تھے۔ متقی، دین دار، عبادت گزار تھے۔ نماز عوام کے ساتھ مل کر ادا کرتے۔ قرآن کی تلاوت کرتے اور نیکی کے نقوش و اعمال پر ثابت قدم رہتے تھے۔ ایک اور بات رہی جاتی ہے وہ یہ کہ لوگوں کو پوری اجازت تھی کہ وہ ہماری لغزشِ اعمال پر گرفت کریں۔ بے باکی اور صداقت کے ساتھ ہماری اصلاح کریں۔

کلیم چغتائی صاحب کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف جہاں ہمارے سامنے ہمارے عظیم و بے مثال ماضی کا آئینہ رکھتی ہے وہاں ہمارے سامنے دو سوال بھی چھوڑتی ہے (اور ہمارے خیال میں یہی مصنف کا مقصودِ کلام بھی ہے)

۱۔ کیا ہم کبھی واقعی ایسے تھے؟ ۲۔ اور کیا ہم دوبارہ ایسے ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر عاصی کرنالی

سابق پرنسپل، ولایت حسین کالج، ملتان، سابق پروفیسر بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

Marfat.com

عرضِ مؤلف

قدرت نے جس طرح زمین کے سینے میں طرح طرح کے بیش قیمت جواہر کو پنہاں کیے رکھا ہے، اسی طرح قدرت، ہر قوم کے اندر بھی باصلاحیت شخصیات کی صورت میں، بیش قدر جواہر پیدا کرتی ہے۔ ان جواہر کی تراش خراش، ان میں آب و تاب پیدا کرنے اور ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے عمل میں، قدرت مختلف عوامل کو حصہ لینے کے مواقع عطا کرتی ہے۔ ان عوامل میں ذاتی شوق، اہلیت، اعتماد اور لگن کے علاوہ اچھے اساتذہ، درکار وسائل اور اربابِ اختیار کی دلچسپی و سرپرستی قابلِ ذکر ہیں۔

امتِ مسلمہ کی تاریخ بھی قیمتی انسانی جواہر کے تذکروں سے جگمگا رہی ہے۔ ان جواہر کی ضو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ تاریخ کے ایوانوں میں پھیلی ہوئی یہ روشنی آج اور مستقبل کے مسلمانوں کے لیے جہاں فخر و مسرت کا باعث ہے، وہیں انہیں بھی علم و تحقیق کے روشن مینار بننے کی دعوت دیتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب آپ کو وسط ایشیا لیے چلتی ہے، جہاں آپ تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے بیش بہا جواہر کو اپنے روبرو جلوہ گر پائیں گے۔ نظام الملک طوسی ہوں یا الپ ارسلان، رشید الدین ہوں یا اُلغ بیگ، ایک جہانِ حیرت ہے جو مسحور کر دیتا ہے۔ جو یہ باور کرنے پر اصرار کرتا ہے کہ ہم مسلمان کبھی علم و فن کی اتنی بلندیوں پر تھے۔

مسلمان علم کی منزلِ بلند تک اس لیے پہنچے کہ انہوں نے علم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ انہیں نظام الملک طوسی اور اُلغ بیگ جیسے حکمران میسر آئے جو نہ صرف خود صاحبِ علم تھے بلکہ انہوں نے علم کو فروغ دینے کے لیے مستقل بنیادوں پر بے حد موثر اقدامات کیے۔ طوسی کی قائم کردہ جامعہ نظامیہ کے تحت مدارس کا شاندار نظام اس کی زریں مثال ہے۔ اسی طرح سنجر سلجوقی جیسے علم دوست حکمران کے عہد میں امام غزالی، عمر خیام اور خواجہ فرید الدین عطار جیسے بلند پایہ اور قابلِ احترام نام سامنے آتے ہیں جن کی علمی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

ایلخانی دور کے ذی علم وزیر اعظم رشید الدین کی قائم کردہ بستی "ربع رشیدی" تو علم و فن کا گہوارہ تھی۔ اسی طرح تیموری عہد کے لائق اور علم پسند حکمران شاہ رخ کا دور نامور صاحبانِ علم کی قابلِ قدر علمی سرگرمیوں کی بدولت جگمگا رہا ہے۔ تیموری عہد ہی میں ہمیں اُلغ بیگ جیسا صاحبِ علم حکمران نظر آتا ہے جن کو محض ڈھائی برس حکمرانی کا موقع ملا لیکن اس مختصر مدت میں سائنس، تاریخ اور تعمیرات کے میدانوں میں ان کے نمایاں کارناموں نے انہیں زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اسی عہد کے تسلسل میں حسین بائیقرا جیسا اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھنے والا حکمران بھی سامنے آتا ہے جن کا دور علمی و ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے تابندہ ہے اور اسی حکمران کے دور میں علی شیر نوائی جیسی لائق و فائق، عہد ساز اور اثر آفریں شخصیت نمودار ہوتی ہے جن کی علمی خدمات سے تاریخ کے اوراق درخشاں ہیں۔

مسلمانوں نے سیکڑوں برس قبل جو تابناک علمی ترقی کی تھی وہ آج بھی ہمیں دعوتِ علم و عمل دے رہی ہے۔

میں بے حد لائق احترام، بلند کردار انسان، نہایت شفیق استاد، صاحبِ طرز ادیب و شاعر محترم پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں اور انہیں دعاؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرمایا اور اس پر مشفقانہ اور حوصلہ افزا پیش لفظ تحریر فرمایا۔ کتاب کی پہلی اشاعت پر انہوں نے مجھے اپنی محبت آگیں دعاؤں اور پُرشفقت ستائش سے نوازا تھا۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

نظام الملک طوسی

سلجوقی عہد کو درخشندہ بنانے والے نہایت دانا، صاحبِ علم، مدبر اور منتظم وزیر

قاصد نے خط پیش کیا اور ادب سے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

ایوان میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ایوان کی مرکزی مسند پر جو شخصیت تشریف فرما تھی ان کا چہرہ تدبر، فراست اور متانت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ قاصد نے خط ان ہی کو پیش کیا تھا۔ انہوں نے خط کھول کر پڑھا۔ خط عراقِ عجم سے آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ایک پہاڑی چراگاہ میں آپ کے پانچ سو عربی گھوڑے چر رہے تھے۔ اچانک بڑے بڑے پرندوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ پہاڑ کی چوٹی سے اڑا۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز اتنی ہیبت ناک تھی کہ تمام گھوڑے بدک کر بھاگے اور ایک درّے میں جا گرے۔ اس بلند مقام سے ایک بڑی ندی نکل کر نشیب میں گرتی ہے چنانچہ بہت سے گھوڑے پانی میں غرق ہو گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اعضاء ٹوٹ گئے ہیں۔

مرکزی مسند پر بیٹھے ہوئے صاحب خط پڑھنے کے بعد کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور وہ رونے لگے۔ حاضرین نے انہیں تسلی دی اور حقیقت جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ ان صاحب نے حاضرین کو خط کے متن سے آگاہ کیا، پھر یوں گویا ہوئے:

"میں اس نقصان پر نہیں رو رہا ہوں بلکہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے آنسو نکل آئے ہیں۔ اس خط کی وجہ سے مجھے یاد آیا کہ کئی سال قبل میں غزنی سے خراسان جا رہا تھا۔ میرے پاس صرف تین دینار تھے۔ میں نے مزید چار دینار قرض لیے اور ایک گھوڑا خریدا، لیکن وہ اسی دن مر گیا۔ اس سے مجھے جو پریشانی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے، لیکن آج مجھ پر اللہ کا اتنا فضل ہے کہ پانچ سو گھوڑے ضائع ہو جانے کے باوجود میرے مال و دولت میں کمی نہیں آئی ہے۔"

یہ شخصیت تھی سلجوقی مملکت کے نامور وزیر نظام الملک طوسی کی، جن کے علم، تفقہ، تدبر اور دانائی نے دولت سلجوقیہ کو اوجِ کمال پر پہنچایا۔ نظام الملک طوسی کا ۲۹ سالہ دورِ وزارت عالم اسلام کی تاریخ کا ایک تابندہ باب ہے۔

نظام الملک طوسی کا اصل نام حسن ہے۔ ان کے والد کا نام علی اور والدہ کا نام زمرد خاتون ہے۔ نظام الملک دراصل لقب ہے۔ انہیں بہت سے القاب دیے گئے تھے جن میں "نظام الملک" اتنا مشہور ہوا کہ تاریخ میں ان کا ذکر "نظام الملک طوسی" ہی کے نام سے کیا جانے لگا۔ انہیں "طوسی" اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش ایران کے مشہور شہر طوس کے ایک نواحی محلے نوقان میں عمل میں آئی۔ "طوس" اب "مشہدِ مقدس" کہلاتا ہے۔ قدیم شہر طوس کے کھنڈرات مشہد سے پندرہ میل دور شمال مشرق میں واقع ہیں۔ طوس کی تاریخ بڑی تابناک ہے، اس شہر نے عالم اسلام کو امام غزالیؒ، ابونصر سراج صوفیؒ، شیخ ابو علی فارمذیؒ اور فردوسی جیسی شخصیات فراہم کی ہیں۔

نظام الملک ۲۱ ذی قعدہ ۴۰۸ھ / ۱۰ اپریل ۱۰۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤاجداد نوقان سے ملحق علاقے رادکان میں باغبانی کے پیشے سے منسلک تھے۔ نظام الملک بہت چھوٹے تھے کہ ان کی والدہ رحلت فرما گئیں۔ والد علی بن اسحاق نے اپنے کمسن بچے کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے مختلف اتالیقوں کا انتظام کیا۔ علی بن اسحاق بڑے پڑھے لکھے، سخی اور نیک نفس انسان تھے۔ وہ حکمران وقت چغری بیگ داؤد کی جانب سے طوس میں مال گزاری کی وصولی کے مہتمم یعنی "صاحب الخراج" تھے۔ "صاحب الخراج" کا عہدہ معمولی عہدہ نہ تھا۔ اس عہدے پر اسی شخص کو مامور کیا جاتا تھا جو علم فقہ، حساب اور مساحت (پیمائش) کا گہرا علم رکھتا ہو۔

Marfat.com

نظام الملک نے ہوش سنبھالا تو انہیں مکتب بھیجا گیا۔ ان کے پہلے اتالیق فقیہ عبدالصمد فندوجی تھے۔ نظام الملک کے والد علی کو بھی مورخین نے فقیہ شمار کیا ہے۔ علی کے بھائی عبداللہ تو مشہور فقیہ تھے۔

نظام الملک نے ابتدا ہی سے اپنی ذہانت اور حافظے کا سکہ پورے شہر میں بٹھا دیا۔ انہوں نے صرف گیارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور فقہ اور حدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر لی۔ ان کی ذہانت کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن انہوں نے اپنے اتالیق، عبدالصمد فندوجی سے کہا کہ طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ناظرہ اور حفظ قرآن دونوں کا سلسلہ متاثر ہے۔ مشکل سے دس طلبہ کو سبق یاد ہوتا ہے۔ اتالیق نے پوچھا، پھر کیا کیا جائے؟ ننھے حسن (نظام الملک) نے کہا: اس وقت مکتب میں ساٹھ طلبہ ہیں۔ ان میں سے چھ طالب علموں کو منتخب کر لیا جائے۔ ہر ایک کے سپرد ۹ طالب علم کر دیے جائیں۔ یہ چھ طلبہ اپنے تحت دیے گئے طالب علموں کے سبق سنیں، اسی طرح انعامات کی تقسیم بھی انہی چھ طلبہ کے توسط سے ہو جائے گی۔

نوقان (طوس) میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نظام الملک کو ان کے والد نے نیشاپور بھیج دیا۔ اس زمانے میں نیشاپور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ وہاں ایک بڑے عالم، امام موفقؒ درس دیا کرتے تھے۔ نظام الملک، امام موفقؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور چار سال تک ان سے تعلیم حاصل کی۔ مشہور ریاضی داں اور شاعر عمر خیام اور باطنی فرقے کے بانی حسن بن صباح بھی اسی زمانے میں نظام الملک کے ہم جماعت تھے۔ نظام الملک چار سال تک امام موفقؒ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ واپس طوس آئے، پھر بخارا چلے گئے اور وہاں مختلف مدارس میں علوم اور فنون کی تربیت حاصل کی۔ نظام الملک نے اصفہان، نیشاپور اور بغداد میں نامور ائمہ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ مرو چلے گئے جہاں سے ماوراء النہر ہوتے ہوئے غزنی پہنچ گئے جہاں خاصے عرصے مقیم رہے۔

یہ عبدالرشید غزنوی (۴۴۱ھ / ۱۰۴۹ء تا ۴۴۴ھ / ۱۰۵۲ء) کا دور حکومت تھا۔ تمام بڑے سرکاری دفاتر اور محکمے غزنی ہی میں تھے۔ نظام الملک نے غزنی میں ایک دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس دوران انہوں نے دفتری امور کی تربیت، نیز علم حساب اور انشا کے فن پر عبور حاصل کیا۔ اسی زمانے میں نظام الملک نے اپنا ایک مختصر سفر نامہ لکھا۔ غزنی میں چند سال گزارنے کے بعد وہ خراسان آ گئے۔ یہاں بھی کچھ عرصے ملازمت کی۔ یہاں سے وہ بلخ پہنچے، جہاں ابو علی احمد بن شاذان حاکم تھے۔

اس علاقے پر چغری بیگ داؤد سلجوقی (سلجوقی فرمانروا الپ ارسلان کے والد) کی حکومت تھی۔ ابو علی احمد نے نظام الملک کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے انہیں میر منشی (کاتب) بنا دیا، لیکن کچھ عرصے بعد نظام الملک، ابو علی احمد کے مزاج کی تندی کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر مرو چلے گئے جو خراسان کے حکمران چغری بیگ داؤد کا پایۂ تخت تھا۔ چغری بیگ، نظام الملک سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ شخص بہت قابل اور ذہین ہے۔ چغری بیگ نے اپنے بیٹے الپ ارسلان کے ذریعے نظام الملک کو یہ رقعہ لکھ کر بھیج دیا کہ "حسن (نظام الملک) تمہارے کاتب، مدبر، مشیر اور محاسب ہیں، تم انہیں اپنے والد کے برابر سمجھنا۔"

نظام الملک نے الپ ارسلان کی تربیت شروع کر دی۔ ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں چغری بیگ داؤد کا انتقال ہو گیا۔ چار سال بعد سلجوقی مملکت کے سربراہ طغرل بیگ محمد بھی وفات پا گئے۔ اب مملکت میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی لیکن نظام الملک نے بڑی حکمت سے تمام تنازعات پر قابو پا لیا اور الپ ارسلان سربراہ تسلیم کر لیے گئے۔ الپ ارسلان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد نظام الملک کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ وہ موقع تھا جب انہیں "نظام الملک" کا لقب دیا گیا۔ اس وقت نظام الملک کی عمر ۴۸ برس تھی۔ الپ ارسلان نے نظام الملک کو اپنے گیارہ سالہ بیٹے ملک شاہ کا اتالیق بھی مقرر کر دیا۔ نظام الملک نے نہایت توجہ اور محنت سے ملک شاہ کی تربیت کی۔ ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء میں الپ ارسلان کا انتقال ہو گیا۔ نظام الملک نے اس موقع پر پھیلی ہوئی کشاکش پر بڑی تدبیر سے قابو پا لیا اور ان کی کوششوں سے ملک شاہ بر سر اقتدار آ گئے۔ ملک شاہ نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد نظام الملک کو نہ صرف وزیر کے عہدے پر برقرار رکھا بلکہ انہیں وسیع اختیارات دے دیے۔

نظام الملک طوسی نے ملک شاہ کے وزیر کی حیثیت سے تقریباً بیس برس خدمات انجام دیں۔ اس دوران انہوں نے مملکت کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ ملک شاہ کا دور، سلجوقی تاریخ میں سب سے زیادہ شاندار اور درخشاں شمار کیا جاتا ہے۔ نظام الملک نے ایک طرف تو وسیع مملکت اور مملکت کے دفاع کے سلسلے میں ملک شاہ کی بروقت اور بھرپور رہنمائی کی

Marfat.com

اور متعدد جنگی مہمات میں خود بھی شریک ہوئے۔ دوسری طرف انہوں نے مملکت کو ترقی دینے کے لیے کئی اقدامات کیے اور رعایا کو سہولتیں فراہم کرنے اور علمی و فنی ترقی سے ہمکنار کرنے کے لیے سخت محنت کی۔

نظام الملک طوسی، الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی دونوں کے دورِ حکومت میں نہایت اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ فی الحقیقت مملکت کے تمام اہم سیاسی اور انتظامی فیصلوں میں نظام الملک کے تدبر، فراست اور ایما کا بڑا دخل ہوتا تھا۔ یہ ان ہی کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا کہ پوری مملکت سیاسی، انتظامی اور دفاعی اعتبار سے نہایت مستحکم ہو گئی تھی۔ مورخ سید امیر علی کے مطابق: "ملک شاہ کی وسیع مملکت میں، جو چین کی سرحدوں سے جنوب میں یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف امن و امان کا چرچا تھا۔"

مملکت میں زراعت کی ترقی کے لیے نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا، دریاؤں اور نہروں پر مضبوط پُل تعمیر کیے گئے تھے۔ جگہ جگہ مساجد، سرائیں، سڑکیں، شفاخانے اور حفاظتی چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ ان تمام انتظامات میں نظام الملک طوسی نے اہم کردار ادا کیا۔

نظام الملک طوسی نہ صرف اعلیٰ پائے کے منتظم تھے بلکہ بہت بڑے عالم، فقیہ، ادیب، انشاپرداز اور شعر و ادب کے ماہر بھی تھے۔ ابنِ خلکان اور بعض دیگر مورخین تو انہیں "محدث" قرار دیتے ہیں اور ان سے حدیث کی ایک روایت بھی منسوب کرتے ہیں۔ نظام الملک، بغداد، خراسان اور دیگر کئی شہروں میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے جس میں علما کرام بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی تصانیف میں بہت عمدہ فارسی نثر کے نمونے ملتے ہیں، خصوصاً انہوں نے مختلف شخصیات کو جو خطوط تحریر کیے وہ انشاپردازی کی اعلیٰ مثال ہیں۔ ان خطوط سے نظام الملک کی نیک نفسی اور اخلاق و کردار کی بلندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

نظام الملک نے دو بہت عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایک کتاب کا عنوان "وصایا نظام الملک" ہے جسے "دستور الوزرا" بھی کہا جاتا ہے۔ دوسری کتاب "سیاست نامہ" کہلاتی ہے، جس کا دوسرا نام "سیر الملوک" ہے۔ یہ دونوں کتابیں نظام الملک کی فراست، ذہانت اور تدبر کی اعلیٰ مثال ہیں۔

دستور الوزرا، نظام الملک نے اپنے زمانۂ وزارت کے آخر میں تصنیف کی۔ یہ کتاب نظام الملک نے اپنے بیٹے فخر الملک کو مخاطب کر کے لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے بچپن کے حالات تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ، وزارت کی کٹھن ذمہ داریوں اور مشکلات کو تفصیل سے رقم کیا ہے اور وزارت کے آداب و قواعد اور وزیر کے فرائض پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب بے حد قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔

نظام الملک کی دوسری کتاب "سیاست نامہ" بھی بے حد اہم ہے۔ انہوں نے یہ کتاب اپنے انتقال سے ایک سال قبل تصنیف کی۔ اس کتاب کی مدد سے عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے سیاسی نظام اور سیاسی تصورات کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی عہد میں یہ کتاب بڑے عرصے تک غیر منقسم ہندوستان میں، سول سروس (آئی سی ایس) کے نصاب میں شامل رہی۔

"سیاست نامہ" کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بار سلجوقی حکمران ملک شاہ سلجوقی نے اپنے تمام امرا سے کہا کہ وہ حکومت کے پورے نظام، شعبوں اور اندازِ کار کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کی خامیاں معلوم کریں اور پھر ایک جامع دستور العمل مرتب کریں تاکہ مملکت کے کسی شعبے کے انتظامات میں کوئی خرابی نہ رہے۔ ملک شاہ نے ہدایت کر دی کہ اس سلسلے میں کوئی بات مجھ سے چھپائی نہ جائے۔ تمام امرا نے کئی دن تک محنت کر کے اپنا اپنا مسودہ تیار کیا اور ملک شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا لیکن ملک شاہ کو صرف نظام الملک طوسی کا تیار کردہ مسودہ پسند آیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ "نظام الملک کا مسودہ ہی آئندہ میرا دستور العمل ہوگا۔"

"سیاست نامہ" پچاس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کا مضمون جداگانہ ہے۔ ہر مضمون میں قرآن، حدیث اور فقہ سے استدلال پیش کیا گیا ہے اور کئی مقامات پر تاریخی واقعات شامل کر کے نفسِ مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ آج بھی اربابِ اختیار اور حکمرانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں نظم و نسق کے اصول بہت عمدگی سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ پوری کتاب حکیمانہ فقروں اور پُر مغز تبصروں سے عبارت ہے۔

"سیاست نامہ" میں نظام الملک طوسی نے عدل و انصاف پر بہت زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "مملکت، کفر سے تو باقی رہ جاتی ہے لیکن ظلم و ستم کے باعث باقی نہیں رہتی۔" انہوں نے حاکمِ وقت کو بہت مفید مشورے دیے ہیں، مثلاً یہ کہ حاکم کو مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ رفاہِ عامہ کے سلسلے میں انہوں نے نہریں جاری کرنے، پل

Marfat.com

بنوانے، شہر آباد کرنے اور مسافر خانے بنوانے جیسے متعدد اہم امور کی جانب توجہ دلائی ہے۔ عدل و انصاف کرنے والے حکمرانوں، مثلاً حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، ہارون الرشید، مامون الرشید، اسمٰعیل سامانی اور محمود غزنوی کے واقعات بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

"سیاست نامہ" اور "دستوار الوزرا"، نظام الملک طوسی کے وسیع علم اور عمیق تجربے کی آئینہ دار ہیں۔ ایک لحاظ سے انہیں سلجوقی دور کی سیاسی اور انتظامی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ ان میں بیان کردہ بیشتر امور پر سلجوقی دور میں عمل ہوتا رہا ہے۔

نظام الملک طوسی نے دونوں کتابیں تحریر کرتے ہوئے شخصی نظام اور بادشاہت کی خرابیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ گو کہ انہوں نے اس نظام کی کھل کر مخالفت نہیں کی کیونکہ وہ خود حکومت کے بلند عہدے پر فائز تھے اور اس نظام کی عملی دشواریوں اور پیچیدہ مشکلات کا گہرا ادارک رکھتے تھے۔

نظام الملک طوسی کا ایک عظیم کارنامہ "مدارسِ نظامیہ" کا قیام ہے۔ وہ خود بھی صاحبِ علم تھے اور علما کی قربت پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اس غرض سے بغداد میں ایک بڑی جامعہ (یونیورسٹی) قائم کی جو 'جامعہ نظامیہ' یا مدرسہ نظامیہ کہلائی۔ جلد ہی اس مدرسے کی طرز پر پوری مملکتِ سلجوقیہ میں جگہ جگہ مدارسِ نظامیہ قائم ہوگئے۔ اگرچہ مدارسِ نظامیہ سے پہلے بھی مملکت میں کئی مدارس کام کررہے تھے لیکن جو شہرت، مقبولیت اور ہمہ گیری مدارسِ نظامیہ کے سلسلے کو حاصل ہوئی وہ اور کوئی مدرسہ حاصل نہ کرسکا۔ بیشتر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ عالمِ اسلام میں مدارس کے پہلے باقاعدہ نظام کے قیام کا سہرا نظام الملک طوسی کے سر ہے۔

علامہ شہاب الدین مقدسی اپنی تصنیف "کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین" میں لکھتے ہیں: "سلجوقیوں کی وسیع مملکت میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں نظام الملک طوسی کا تعمیر کردہ مدرسہ موجود نہ ہو، حتیٰ کہ جزیرہ ابن عمر میں بھی، جو ایک گوشے میں واقع ہے اور وہاں کم لوگوں کا گزر ہوتا ہے، ایک بڑا مدرسہ موجود ہے۔"

جامعہ نظامیہ کے قیام کے بعد بغداد کے مشرقی حصہ میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع قطعہ اراضی کا انتخاب کیا گیا۔ اس زمانے میں بغداد کا سب سے اچھا اور آباد حصہ یہی تھا۔ یکم ذی قعدہ ۴۵۷ھ/۱۴ اکتوبر ۱۰۶۵ء کو جامعہ نظامیہ کی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ دو سال میں عمارت بن کر تیار ہوگئی۔ اس عمارت کی چاروں طرف بازار اور حمام بنوائے گئے۔ یہ عمارت بہت وسیع تھی اور اس میں لاکھوں افراد سما سکتے تھے۔

مورخین کے مطابق نظامیہ کی تعمیر پر ساٹھ ہزار دینار صرف ہوئے۔ یہ رقم آج کل کے اعتبار سے لاکھوں روپے کے برابر تھی۔ ۱۰ ذی قعدہ ۴۵۹ھ/۲۱ ستمبر ۱۰۶۷ء کو جامعہ نظامیہ کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ جامعہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں تمام علوم و فنون کی ان گنت کتابیں رکھ دی گئی تھیں۔ نظام الملک نے اپنے ذاتی کتب خانے کی کتابیں بھی اس کتب خانے کو دے دی تھیں۔ ان میں ابراہیم الحربی کی کتاب غریب الحدیث کی دس جلدیں بھی شامل تھیں۔ اس کتاب کا کوئی اور نسخہ دنیا بھر میں کہیں موجود نہ تھا۔ اس زمانے میں علما کرام نظام الملک طوسی کو اکثر کتابوں کے تحفے پیش کرتے تھے اور نظام الملک ان کتابوں کو نظامیہ کتب خانوں میں رکھوایا کرتے تھے۔

کتب خانے کو "خزانۃ الکتب" کہا جاتا تھا اور اس کے مہتمم (لائبریرین) کے لیے "خازن" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اس عہدے کے لیے بے حد عالم فاضل شخص کا تقرر کیا جاتا تھا۔ ایک بڑا عملہ "خازن" کے تحت کام کرتا تھا۔ اس عملے میں کاتب تھے جو کتابوں کو خوشخط نقل کرتے تھے۔ جلد ساز، ان کتابوں کی جلدیں تیار کرتے تھے۔ فہرست نویس کتابوں کی فہرستیں تیار کرتے تھے اور کسی بھی شخص کے طلب کرنے پر مطلوبہ کتاب بلا تاخیر فراہم کردیتے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر کئی افراد کتب خانے کے انتظامات کرتے تھے۔

جامعہ نظامیہ میں تمام امور نہایت منظم انداز سے انجام دیے جاتے تھے۔ تدریسی شعبہ جات میں فقہ، حدیث، تفسیر، صرف و نحو، ادب، علم کلام، تاریخ، جغرافیہ کے شعبے قائم تھے۔ ہر شعبے میں نہایت قابل اساتذہ مقرر کیے گئے تھے جو "شیخ" کہلاتے تھے۔ جامعہ کے سربراہ "مدرسِ اعظم" کہلاتے تھے۔ ان کے علاوہ تدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے نائب شیخ (لیکچرر) اور معید بھی تھے۔ معید کا کام یہ تھا کہ وہ شیخ یا نائب شیخ کے درس کو طلبہ کے سامنے بلند آواز سے دہرائیں اور بوقتِ ضرورت اس کی تشریح بھی کریں۔ جامعہ نظامیہ کے اساتذہ میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی، شیخ ابو نصر بن صباغ، امام احمد غزالیؒ، امام ابن

Marfat.com

جوزیؒ اور متعدد نامور ائمہ شامل تھے۔

جامعہ نظامیہ کے غیر تدریسی عملے میں سب سے بڑا عہدہ "متولّی" کا تھا۔ اسے ہم سیکریٹری تعلیمات کہہ سکتے ہیں۔ "متولّی" تمام دفتری اور انتظامی امور کا نگراں ہوتا تھا۔ عوام کو مسائلِ شرعی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا فریضہ "مفتی" کے سپرد تھا جو مدرسے سے ملحق دار الافتا سے منسلک تھے۔ جامعہ اور اس کے ماتحت مدارس کے لیے وقف کی جانے والی املاک اور جائیدادوں کی نگرانی اور انتظام کی ذمہ داری "ناظرِ وقف" کی تھی۔ وعظ کی خصوصی مجالس کے لیے واعظ مقرر تھے۔ ان میں سے بعض تو دور دراز ممالک سے آئے تھے۔ جامعہ نظامیہ میں طلبہ کے طعام و قیام کی بہت اچھی سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ طلبہ کو وظائف (اسکالرشپ) بھی دیے جاتے تھے۔ جامعہ کے لیے حکومت اور بعض امرا نے مختلف جائیدادیں وقف کر رکھی تھیں۔ نظام الملک طوسی نے اپنی ذاتی املاک کا دسواں حصہ مدارس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق نظام الملک سالانہ چھ لاکھ دینار اس مد میں صَرف کیا کرتے تھے۔

جامعہ نظامیہ محض ایک ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل تعلیمی نظام تھا۔ اس جامعہ کے تحت متعدد شہروں میں مدارسِ نظامیہ قائم ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے مشہور "نظامیہ نیشاپور" تھا۔ اس مدرسے کو نظام الملک طوسی نے امام الحرمین ضیاء الدین جوینیؒ کی حجاز سے واپسی پر تعمیر کرایا تھا۔ امام جوینیؒ اس عظیم مدرسے میں تیس سال تک درس دیتے رہے۔ حجت الاسلام امام غزالیؒ، شمس الاسلام کیا ہراسیؒ اور احمد بن محمد خوافیؒ نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ بعد میں امام غزالیؒ نے اسی مدرسے میں نظام الملک طوسی کی دعوت پر چار سال تک درس بھی دیا۔

نظام الملک طوسی نے جو دیگر مدارس تعمیر کروائے ان میں نظامیہ اصفہان، نظامیہ مرو، نظامیہ آمل (مازندران)، نظامیہ موصل، نظامیہ بصرہ، نظامیہ ہرات، نظامیہ جزیرہ ابن عمر، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ہزاروں مدارس کام کر رہے تھے۔ نظام الملک طوسی کے متعلق مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ ہر اس مقام پر ایک کتب خانہ قائم کر دیتے تھے جہاں کوئی ممتاز عالم رہتے تھے۔ بغداد کی جامعہ نظامیہ تو دو سو سال بعد یعنی ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں تاتاری حملہ آور ہلاکو خان کی یلغار کے نتیجے میں تباہ ہو گئی، البتہ دیگر مدارس کئی صدیوں تک کام کرتے رہے۔

نظام الملک طوسیؒ کا دور علم کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں بڑے نامور علما کرام اپنے علم سے لاکھوں افراد کو فیض یاب کر رہے تھے۔ ان میں علامہ ابو اسحاق شیرازیؒ تھے جو فقہ، حدیث اور علمِ کلام کے ماہر تھے۔ امام الحرمین جوینیؒ بھی تھے جو متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے علاوہ شیخ ابو علی فارمذی، خواجہ عبد اللہ انصاری ہرویؒ، امام غزالیؒ، امام احمد غزالیؒ، علامہ ابن ابی الفرج ذکی مازریؒ اور امام سرخسیؒ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عمر خیام کو نظام الملک طوسی ہی نے ملک شاہ سلجوقی سے متعارف کروایا تھا۔ انہی کے کہنے پر عمر خیام نے تقویم کی اصلاح کا اہم کام انجام دیا جس سے سنہ کے تعین میں بڑی مدد ملی۔ اس دور میں برہانی سمرقندی اور امیر معزی جیسے نامور شعراء موجود تھے۔ الطغرائی، عربی نظم و نثر اور فنِ کتابت میں یکتا تھے۔ معالجوں میں محمد بن منصور الجرجانی، لغت و ادب میں ابن خطیب تبریزی مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ نامور علمی شخصیات کی طویل فہرست ہے جو نظام الملک کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔

نظام الملک طوسی نے سلجوقی مملکت کے دفاعی استحکام اور توسیع کے لیے متعدد جنگی مہموں میں حصہ لیا۔ ان مہمات کا آغاز الپ ارسلان کے دور میں ہوا۔ ربیع الاول ۴۵۶ھ / فروری مارچ ۱۰۶۳ء میں الپ ارسلان نے مسیحی آرمینیا اور گرجستان (جارجیا) پر چڑھائی کی۔ اس مہم میں ملک شاہ اور نظام الملک بھی شریک تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں جارجیا کے کئی قلعے فتح ہوئے۔ جارجیا اس زمانے میں انجاز (انجازیہ) کہلاتا تھا۔ وہاں کے حکمراں نے خطیر رقم سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ نظام الملک نے مسیحی آرمینیا کی تسخیر کے لیے کئی جنگوں میں حصہ لیا، جن کے نتیجے میں آعال لال، ناحیہ فرس، نورہ، دارالحکومت آنی فتح ہوئے اور آرمینیا کی قدیم مسیحی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ ملک شاہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بھی نظام الملک نے بہت سی جنگوں میں شرکت کی۔ ان جنگوں کے نتیجے میں ملک شاہ کی حکومت کو زبردست وسعت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ ملک شاہ کی سلجوقی مملکت میں موجودہ پورا ایران، عراق، عرب، یمن، شام، عمان، بحرین، ترکی کا بہت بڑا حصہ آرمینیا اور جارجیا، روسی ترکستان اور افغانستان کے بڑے حصے شامل ہو گئے تھے۔

نظام الملک نے متعدد اہم سیاسی معاملات کو سلجھانے میں بڑے

Marfat.com

تدبر کا ثبوت دیا۔ خصوصاً ایسے مواقع پر جو ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم موڑ ثابت ہوئے، نظام الملک نے گہری سیاسی بصیرت سے کام لیا۔ مثال کے طور پر جب الپ ارسلان کو شہید کیا گیا تو ملک شاہ اور نظام الملک ترکستان کی مہم میں الپ ارسلان کے ساتھ شریک تھے۔ الپ ارسلان کی شہادت کے فوراً بعد نظام الملک نے ترکستان کی مہم ملتوی کر دی اور لشکر کو بڑی تیزی سے واپس نیشا پور لے گئے، جہاں ملک شاہ کو تخت نشین کروانے میں نظام الملک نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

ملک شاہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد بڑے پیمانے پر جو مختلف شورشیں ہوئیں، ان کو ناکام بنانے میں بھی نظام الملک طوسی کا بڑا دخل ہے۔ ایک ایسے موقع پر ملک شاہ کے خلاف بہت سے امرا اور فوجیوں کے خطوط پکڑے گئے، جب ان کے خلاف ایک بڑی شورش ناکام بنائی گئی تھی۔ ملک شاہ نے نظام الملک طوسی کو حکم دیا کہ ایک ایک خط پڑھ کر سنائیں۔ نظام الملک نے بجائے خط پڑھنے کے تمام خطوط کو آتشدان میں جھونک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام خطوط جل کر برباد ہو گئے۔ ملک شاہ نے نظام الملک کی جانب سے اس حکم عدولی کے باوجود کوئی اعتراض نہ کیا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ نظام الملک کا فیصلہ حکمت سے خالی نہ ہو گا اور بات بھی یہی تھی۔ اگر نظام الملک ایک ایک خط پڑھ کر سنا دیتے تو ممکن تھا کہ تمام باغی امرا کو سزا دی جاتی اور یہ بات ملکی استحکام کے لیے مضر ہوتی۔ نظام الملک کی جانب سے ان امرا کی پردہ پوشی سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور اب چونکہ ملک شاہ کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا اس لیے امرا نے بھی ان کی اطاعت کی۔

ملک شاہ کے والد الپ ارسلان نے قیصر روم کو ملاذ گرد کی جنگ میں شکست دے کر اپنا باج گزار بنا لیا تھا، لیکن ملک شاہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کے خلاف شورشوں سے فائدہ اٹھا کر قیصر روم نے سلجوقی مملکت چڑھائی کر دی۔ ملک شاہ نے بھی فوراً جنگی تیاری کی اور قیصر کے لشکر کے سامنے جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ ملک شاہ کو شکار کھیلنے کا شوق تھا۔ زمانۂ جنگ میں بھی وہ اس شوق کی تکمیل کے لیے چند ساتھیوں کے ہمراہ نکل کھڑے ہوئے۔ قیصر کے سپاہیوں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنے پڑاؤ میں لے جا کر قید کر دیا۔

اس موقع پر نظام الملک نے بڑی تدبیر سے ملک شاہ کو رہائی دلوائی۔ انہوں نے پہلے تو مشہور کیا کہ ملک شاہ شکار سے واپس آ گئے ہیں اور ان کے حکم سے نظام الملک، قیصر سے ملنے جا رہے ہیں، اگلے دن وہ قیصر کے پاس پہنچے۔ قیصر پہلے ہی مسلمانوں سے مرعوب تھا۔ اس نے بڑی عاجزی کا اظہار کیا۔ باتوں باتوں میں قیصر نے بتایا کہ کل آپ کے چند سپاہی ادھر آ نکلے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے انہیں جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا ہے، آپ چاہیں تو انہیں لے جائیں۔" نظام الملک نے ان سپاہیوں کو بلوایا، ان میں ملک شاہ بھی تھے جنہیں عام لباس میں ہونے کی وجہ سے کوئی پہچان نہ سکا تھا۔ نظام الملک نے ان سپاہیوں کو جان بوجھ کر سخت سست کہا اور قیصر سے ان سپاہیوں کو چھڑوا لائے۔ بعد میں قیصر کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ نظام الملک کی ذکاوت پر حیران رہ گیا۔

نظام الملک کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے ہوتا ہے۔ جب سمرقند فتح کرنے کے بعد ملک شاہ نے کاشغر پر فوج کشی کی تو اس زمانے میں قیصر روم کا سفیر خراج کی رقم لے کر دارالحکومت حاضر ہوا۔ نظام الملک نے سفیر سے خراج دارالحکومت میں وصول نہیں کیا بلکہ اسے ساتھ لے کر کاشغر تک گئے اور کاشغر کی تسخیر کے وقت سفیر سے خراج وصول کیا تاکہ رومی سفیر کو سلجوقی مملکت کی وسعت کا اندازہ ہو اور یہ بات تاریخ میں درج ہو جائے کہ قیصر روم کا سفیر، مسلمانوں کو خراج دینے کے لیے وسط ایشیا کے اس دور دراز مقام کاشغر تک آیا تھا۔

نظام الملک نے عباسی خلیفہ المقتدی بامر اللہ سے ملک شاہ کے خاندانی مراسم قائم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ملک شاہ کی بیٹی کی شادی المقتدی بامر اللہ سے کروانے میں نظام الملک کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔

نظام الملک بے حد متقی، دیندار، عبادت گزار اور باعمل انسان تھے۔ وہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اذان کی آواز سنتے ہی وہ تمام مصروفیات ترک کر کے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت روزانہ بلاناغہ کرتے تھے۔ ہر پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتے تھے۔ اپنی پوری زندگی انہوں نے سادگی سے بسر کی اور برے کاموں سے ہمیشہ دور رہے۔

سیرت اور اخلاق کے اعتبار سے بھی نظام الملک طوسی کی ذات ہمیں مینارۂ نور نظر آتی ہے۔ وہ بے حد فیاض، کریم النفس، حلیم، متحمل مزاج، اور خوش گفتار انسان تھے۔ ایک رات آندھی آئی اور نظام الملک کے بستر پر گرد کی تہ جم گئی۔ خادموں کے نگران نے خدام کو آواز دی، لیکن کوئی خادم نہ آیا۔ نگران سخت برہم ہوئے اور بڑبڑانے لگے۔ نظام الملک نے ان کی بڑبڑاہٹ سن لی اور کہا: "خدام کسی کام سے چلے

Marfat.com

گئے ہوں گے، کون ہے جس کو ذاتی کام نہ ہوتا ہو؟ ادائے فرض میں کوتاہی ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان (خدام) پر فضیلت دی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم ان کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سزا دیں۔"

نظام الملک روزانہ ایک بڑی رقم سے محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے۔ ان کے دستر خوان پر مساکین اور فقرا کے لیے کھانے کا بندوبست تھا۔ ایک بار نظام الملک کھانا کھا رہے تھے، ایک عورت دروازے پر کچھ مانگنے کے لیے آئی۔ دربان نے اس عورت کو واپس جانے کا حکم دیا۔ نظام الملک نے سن لیا اور دربان پر سخت خفا ہوئے، کہنے لگے "تم صرف اس لیے یہاں ملازم ہو کہ اس دروازے سے کوئی محتاج خالی ہاتھ نہ جائے۔"

نظام الملک روزانہ جب اپنے دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتے تو رقم سے بھری ہوئی تھیلیاں ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ راستے میں جو محتاج ملتا اس کی مدد کرتے تھے۔ ایک بار ان کی سواری ایک بوڑھے سبزی فروش کی دکان کے سامنے سے گزری۔ بوڑھے نے انہیں روک کر اپنی مجبوریوں کا ذکر کیا کہ میرا خاندان بڑا ہے دکان کی آمدنی زیادہ نہیں ہے۔ نظام الملک نے بوڑھے کو رقم کی ایک تھیلی دے دی۔ بوڑھے نے سوچا کہ ایک اور تھیلی حاصل کر لی جائے۔ وہ اپاہج کا بھیس بدل کر دوسرے راستے پر جا بیٹھا جہاں سے نظام الملک کی سواری گزرنے والی تھی۔ نظام الملک کی سواری قریب آئی تو سبزی فروش نے آواز بدل کر اپنی 'جسمانی معذوری' سے انہیں آگاہ کیا۔ نظام الملک نے رقم کی ایک اور تھیلی اسے دے دی۔

بوڑھے کی حرص اب بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بہروپ بدلا اور ایک اور راستے پر جا کھڑا ہوا۔ نظام الملک کی سواری وہاں سے گزری تو بوڑھے نے انہیں روک کر اپنی بپتا سنائی کہ گھر میں جوان لڑکیاں ہیں، اتنی رقم پاس نہیں کہ ان کی شادیاں کر سکوں۔ نظام الملک نے رقم کی ایک تھیلی بوڑھے کی طرف بڑھا دی۔ اتنی رقم مل جانے کے باوجود بوڑھے کی نیت سیر نہ ہوئی تھی۔ اس نے ایک اور روپ دھارا اور ایک دوسرے راستے پر پہنچ کر نظام الملک کی سواری کا انتظار کرنے لگا۔ نظام الملک کی سواری آئی تو بوڑھے نے عرض کیا کہ میں اسپیجاب (ماوراء النہر کا ایک شہر) کا باشندہ ہوں۔ جہاد کے لیے نکلا تھا۔ قسمت دیکھیے کہ ہمارے لشکر کو شکست ہوگئی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ اب میرے پاس اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ نظام الملک نے بوڑھے کو مزید ایک تھیلی دی، لیکن ساتھ ہی مسکرا کر کہا: "بوڑھے سبزی فروش، اپاہج، جوان لڑکیوں کے باپ، اسپیجاب کے غازی، لے ایک تھیلی اور لے۔"

نظام الملک گو کہ فیاض تھے، لیکن مال دولت کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ ان کے تمام امور میں اعتدال و توازن پایا جاتا تھا۔ امام الحرمین جوینیؒ نے اپنے ایک خطبے میں نظام الملک کی مذہب میں استقامت، عدل و انصاف اور فیاضی و احسان کی بہت تعریف کی ہے۔

آخری زمانے میں ملک شاہ سلجوقی کو بعض حاسدوں نے نظام الملک سے بدظن کر دیا تھا۔ چنانچہ ملک شاہ نے نظام الملک سے عہدۂ وزارت واپس لے لیا، تاہم ان کے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ وہ انہیں اتابک (اتا: باپ، بک: سردار) اور خواجۂ بزرگ کہتے تھے۔

نظام الملک طوسی نے ایک باطنی فرقہ کے خلاف کارروائی کا آغاز بھی کیا۔ اس فرقے کا بانی حسن بن صباح، نظام الملک کے زمانۂ طالب علمی میں ان کا ہم جماعت تھا۔ کئی برس بعد حسن بن صباح اس وقت نظام الملک سے اچانک آکر ملا۔ نظام الملک نے اسے ملک شاہ سلجوقی سے متعارف کروایا۔ ملک شاہ، حسن بن صباح کی ذہانت سے متاثر ہوئے، لیکن بعد میں اس سے ناراض ہوگئے اور اسے اپنے دربار سے نکال دیا۔

حسن بن صباح نے یہاں سے نکلنے کے کچھ عرصے بعد صوبہ رودبار کے علاقے طالقان میں ایک قلعہ پر قبضہ کر لیا (آج کل یہ علاقہ ایران کے صوبہ ماژندران میں شامل ہے)۔ اس قلعے کا اصل نام "آلہ آموت" تھا جس کے معنی "آشیانۂ عقاب" ہیں۔ کثرت استعمال سے یہ "قلعۂ الموت" کہا جانے لگا۔ حسن بن صباح نے یہاں رہ کر ایک خطرناک تحریک قائم کی جو باطنی یا ملاحدہ کی تحریک کہلاتی ہے۔ اس تحریک کے کارکن "فدائی" کہلانے لگے، کیونکہ وہ اپنے شیخ کے اشارے پر جان فدا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہ فتنہ ۱۷۱ سال تک پوری دنیائے اسلام میں دہشت کا مظہر بنا رہا۔ اس فرقے کے ماننے والوں نے عالم اسلام کی بڑی بڑی شخصیات کو شہید کیا۔ ان میں نظام الملک طوسی بھی شامل تھے۔

۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں ملک شاہ نے اپنے ایک سردار، امیر ارسلان کو لشکر دے کر حسن بن صباح کے قلعۂ الموت پر حملے کے لیے

Marfat.com

بھیجا۔ پھر ایک اور امیر کی قیادت میں مزید کمک روانہ کی۔ حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ اس کارروائی کی پشت پر نظام الملک کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے ایک فدائی کو نظام الملک کے قتل پر مامور کیا۔ نظام الملک رمضان المبارک ۴۸۵ھ / اکتوبر ۱۰۹۲ء میں ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ملک شاہ نے (ایران کے شہر) نہاوند میں قیام کیا۔ رمضان المبارک کی ۱۰ تاریخ/ ۱۴ اکتوبر ۱۰۹۲ء تھی۔ نظام الملک نے افطار کرنے کے بعد مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر وہ علما اور فقہا سے گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے نہاوند کے مقام پر ہونے والے ایک معرکہ کا ذکر کیا جس میں کئی صحابہ کرامؓ شہید ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے ان صحابہ کرامؓ کے حالات بیان کیے۔

نمازِ تراویح کے بعد نظام الملک اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں صحابہ کرامؓ شہید ہوئے تھے اور بڑے سوز سے کہا کہ مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں ان عظیم ہستیوں کی رفاقت میسر آجائے۔ ذرا آگے گئے تھے کہ دیلم کے ایک نوجوان نے جو درویشانہ لباس پہنے ہوئے تھا، اپنی درخواست بڑھائی۔ نظام الملک نے درخواست لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ نوجوان نے اسی وقت نظام الملک پر چھری سے وار کیا۔ چھری قلب کے پار ہوگئی۔

زخم اتنا گہرا تھا کہ نظام الملک ذرا دیر بعد آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ ان کے قاتل کا نام ابوطاہر حارث بتایا جاتا ہے۔ وہ باطنی تحریک سے متعلق تھا۔ نظام الملک کی میت اصفہان بھیج دی گئی، جہاں انہیں محلہ کران کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انہوں نے ۷۷ برس کی عمر پائی اور اپنے تقریباً ۲۹ سالہ دورِ وزارت میں وہ عظیم کارنامے انجام دیے کہ دنیا ان کی نظیر پیش کرنے سے آج بھی قاصر ہے۔

***

Marfat.com

طغرل بیگ محمد

عظیم سلجوقی فرمانروا جنہوں نے عالم اسلام کو متحد اور مستحکم بنا دیا

رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔

نیشاپور کے باغ شادیاخ میں بڑی چہل پہل تھی۔ ہر کسی کی زبان پر سلجوقیوں کا تذکرہ تھا۔ سلجوقی، وہ غز ترکمان، پہاڑی خانہ بدوش جو تہذیب و تمدن سے ناواقف تھے، آج نیشاپور جیسے علم پرور شہر پر قابض ہو چکے تھے۔ ہر چہرے پر دبا دبا اضطراب تھا اور ہر آنکھ میں امید کا دیا روشن کہ دیکھیں یہ نئے حکمران شہر والوں کے ساتھ شاید اچھا سلوک کرتے ہوں۔

اچانک شور اٹھا، "وہ آ گئے، وہ آ گئے!" پورا شہر نئے حکمران کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے امڈ آیا تھا۔ لوگ بڑی حیرت اور دلچسپی سے اپنے نئے حکمران کو دیکھ رہے تھے جس کے ساتھ نہ تو زرق برق لباس پہنے خدام کی فوج تھی، نہ بھاری بھرکم اور پُر تکلف ساز و سامان ساتھ تھا اور فاتح سالار کا اپنا یہ حال تھا کہ کمر سے ترکش اور بازو سے کمان لٹک رہی تھی۔ بدن پر ایک سادہ سی قبا تھی۔ سر پر عمامہ اور پاؤں میں موزے تھے۔ لیکن اس سادہ لباس امیر کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں مرعوب ہو جاتا تھا۔ فاتح امیر کا قافلہ باغِ شادیاخ میں جا کر ٹھہرا۔

دوسرے دن فاتح امیر نے دربارِ عام منعقد کیا۔ نیشاپور کے شہریوں نے دیکھا کہ اس دربار میں امیر غریب اعلیٰ اور ادنیٰ سب مل کر بیٹھے ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا رہی۔ نہ کسی کو غریب ہونے کی وجہ سے کمتر سمجھا جا رہا ہے نہ کسی کو دولت مند یا صاحب اثر و رسوخ کی وجہ سے زیادہ عزت دی جا رہی ہے۔ پھر یہ کہ دربار میں ہر ایک کو سوال کرنے کی اجازت تھی۔ جس کا جی چاہتا اٹھ کر نئے حکمران سے سوال کر لیتا۔ اسی دوران قاضی صاعد اٹھے اور کہنے لگے۔

"پردۂ غیب میں بہت سی چیزیں پوشیدہ ہیں۔ نہیں معلوم کہ ابھی اور کیا ہونا ہے۔ ہوشیار رہیے۔ اللہ سے ڈریے۔ انصاف کیجیے۔ ستم رسیدہ اور درماندہ افراد کی بات سنیے اور لشکر کو ظلم کرنے کی آزادی نہ دیجیے کہ بے انصافی منحوس ہوتی ہے۔"

فاتح سالار نے بڑے تحمل سے ان باتوں کو سنا اور پھر وہ یوں گویا ہوا:

"جو کچھ آپ فرماتے ہیں میں نے اس کو قبول کیا۔ اس کے مطابق کام کروں گا۔ ہم نووارد اور غریب لوگ ہیں۔ یہاں کی رسموں سے ناواقف ہیں۔ اگر کوئی نصیحت کی بات ہو تو کہلا بھیجنے میں دریغ نہ کیجیے گا۔"

نئے حکمران نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ انہوں نے فوج کو سخت تاکید کر دی کہ کسی شہری کو نہ لُوٹا جائے اور نہ پریشان کیا جائے۔

نیشاپور کے شہری اب پُر سکون تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ نیا حکمران جو کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے۔ یہ حکمران تھے طغرل بیگ محمد، دولتِ سلجوقیہ کے پہلے فرمانروا۔ انہوں نے اپنی بے مثال شجاعت اور غیر معمولی فراست سے کام لیتے ہوئے عالم اسلام کو ایک مرکز اور محور پر متحد کر دیا اور سلجوقی حکومت کو ایسی مضبوط بنیاد فراہم کر دی کہ سلجوقی حکمران تقریباً تین سو برس تک دنیا بھر کے مسلمانوں کی قیادت کرتے رہے۔

طغرل بیگ محمد کو طغرل بک یا طغرل بے بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا پورا نام رکن الدین ابو طالب محمد بن میکائل ہے۔ آپ سلجوقی حکومت

Marfat.com

کے پہلے فرمانروا ہیں۔ سلجوقیوں کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کے لیے ہمیں ماضی کی سمت سفر کر کے چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں جانا ہوگا۔

ماضی میں سفر کر کے، اگر دریائے سیحون کے کنارے خوارزم تک اور پھر خوارزم سے فُراوہ اور دہستان تک کے علاقے پر نظر ڈالی جائے تو خانہ بدوش لوگوں کی ایک قوم نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ کبھی ترکستان اور بلاد چین کے درمیان ایک بڑے پہاڑی درّے میں آباد تھے۔ بعد میں یہ لوگ ترکستان میں آکر بس گئے۔ یہ قوم ہمیں تہذیب و تمدن سے ناواقف نظر آتی ہے۔ بھیڑ بکریاں اور گھوڑے پالنا ان کا پیشہ ہے۔ سادگی، محنت اور جفاکشی ان کا شیوہ ہے۔ بھیڑ بکریوں کے بالوں یا اون سے ان کا لباس تیار ہو جاتا ہے اور ان ہی جانوروں کی کھال خیمے بنانے میں کام آتی ہے۔ یہ نسلاً ترک ہیں عرب والے انہیں "اوغوز" اور دوسرے لوگ "غز" کہتے ہیں۔

جب "غز" ترک قبائل پہاڑی درّے سے نکل کر ترکستان کے علاقے میں آباد ہوئے تو ترک علاقے پر ایک شخص "بیغو" کی بادشاہت قائم تھی۔ 'غز' قبیلے کی قیادت ایک بہادر اور جری انسان دُقاق (تقاق) کے ہاتھوں میں تھی۔ دقاق کو قدرت نے محض شجاعت اور دلیری جیسے اوصاف ہی سے نہیں نوازا تھا بلکہ وہ بے حد ذہین اور معاملہ فہم بھی تھا اور اکثر معاملات میں اس کی رائے بہت صحیح ثابت ہوتی تھی۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے 'بیغو' اسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ اور اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔

دُقاق کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلجوق رکھا گیا۔ انہی کے نام پر ان کی قوم سلجوق کہلانے لگی۔ سلجوق کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تربیت ملی۔ شاہی خاندان کے قرب کی وجہ سے لڑائی کے تمام مروجہ فنون میں مہارت حاصل ہوگئی۔ سلجوق نے جب جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو دُقاق کا انتقال ہوگیا۔ بیغو نے محسوس کیا کہ سلجوق، بہادری اور جواں مردی جیسے اوصاف سے مزیّن ہونے کے ساتھ شرافت اور ذہانت کی دولت سے بھی مالامال ہے۔ بیغو نے سلجوق کو اپنے قریبی مشیر کا درجہ دے دیا اور اسے "یاشی" کا لقب دیا یعنی قائدِ لشکر یا سالارِ فوج۔

سلجوق کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور اس پر بیغو کی مہربانیوں کو دیکھتے ہوئے بیغو کے دربار کے دوسرے عہدیدار اور شاہی خاندان کے لوگ اس سے حسد کرنے لگے۔ انہوں نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ سلجوق نے محسوس کیا کہ اب ان کا بیغو کے دربار میں رہنا مفید نہ ہوگا چنانچہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو لے کر "جند" چلے آئے۔ جند دریائے سیحون کے قریب ایک بڑا شہر تھا جو خوارزم سے دس دن کی مسافت پر تھا۔ اس علاقے پر امیر نوح بن منصور سامانی کی حکومت تھی۔ یہاں رہتے ہوئے ترکمانوں کا مسلمانوں سے میل جول بڑھا اور سلجوق دین اسلام سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے ساتھ ان کے قبیلے کے بیشتر افراد بھی مسلمان ہوگئے۔ یہ سلجوقیوں کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

ترکستان کا بادشاہ بیغو، جند والوں سے ہر سال خراج لیا کرتا تھا۔ سلجوق جب اسلام لے آئے تو انہوں نے بیغو کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ بیغو کو یہ جسارت بڑی ناگوار گزری۔ اس نے جنگ کے لیے فوج بھیج دی۔ سلجوق بڑی دلیری سے لڑے اور بیغو کی فوج کو مار بھگایا۔ اس واقعے سے اطراف کی قوتوں کو اندازہ ہوگیا کہ سلجوقیوں کو زیر کرنا آسان نہیں ہے۔

۳۸۲ھ / ۹۹۲ء میں ترکستان کے حکمران شہاب الدولہ ہارون بن سلیمان نے سامانیوں کے علاقے ماوراءالنہر پر حملہ کر دیا۔ شہاب الدولہ "بغراخان" کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ سلجوقیوں نے بغرا خان کے خلاف سامانیوں کا ساتھ دیا اور ایسی بے جگری سے لڑے کہ بغراخان اور اس کی فوج شکست کھا کر بلاساغون کی طرف بھاگ گئی۔ بغرا خان کی حکومت خاصی وسیع تھی۔ اتنے طاقتور حکمران کو سلجوقیوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی تو دور دور تک سلجوقیوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

اس جنگ کے بعد سلجوق کا ۱۰۷ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ سلجوق کے پانچ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: میکائیل، اسرائیل (ارسلان) یونس، نہال، موسیٰ۔ میکائیل کو اللہ نے دو بیٹے عطا کیے۔ ایک کا نام چغری بیگ داؤد اور دوسرے کا نام طغرل بیگ محمد تھا۔

طغرل بیگ کی پیدائش کب ہوئی؟ تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے۔ تاہم خیال یہ ہے کہ ان کی پیدائش ۳۸۰ھ / ۹۹۰ء اور

Marfat.com

۳۸۵ھ/۹۹۵ کے درمیان کسی وقت ہوئی تھی۔ وہ ابھی کم عمر تھے کہ ان کے والد میکائیل ایک جنگ میں لڑتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔ انہوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کے دادا سلجوق کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب سلجوقی ترکوں کے ایک حصے نے طغرل بیگ اور ان کے بھائی چغری بیگ کو اپنا راہنما تسلیم کر لیا۔ دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی اور چغری بیگ نے ہمیشہ طغرل بیگ کی اطاعت کی۔

بغرا خان سے جنگ کے بعد سلجوقی جند سے بخارا آ کر آباد ہو گئے۔ بغرا خان نے بڑی کوشش کی کہ طغرل بیگ اور چغری بیگ دونوں اس کے پاس آ جائیں تا کہ وہ دونوں کو بے بس کر سکے لیکن دونوں بھائیوں میں اتنا ایکا تھا کہ جب طغرل بیگ بغرا خان کے پاس جاتے تو چغری فوج کی نگرانی کرتے تھے اور جب چغری، بغرا کے پاس جاتے تو طغرل فوج کی نگرانی کے لیے موجود رہتے تھے۔ آخر ایک دن بغرا خان نے طغرل کو گرفتار کر لیا اور چغری کی گرفتاری کے لیے ایک بڑی فوج بھیج دی۔ چغری بیگ نے اس فوج کا ڈٹ کا مقابلہ کیا اور بغرا خان کی فوج کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس سے مرعوب ہو کر بغرا خان نے طغرل کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد طغرل اور چغری دونوں بھائی، اپنی فوج کو لے کر جند چلے گئے۔ اس کے بعد تقریباً تیس سال کا عرصہ طغرل بیگ اور چغری بیگ نے خاموشی سے گزارا۔ وہ اپنی قوم کی قیادت کرتے رہے لیکن دوسرے علاقے پر فوج کشی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ماوراء النہر کے سلجوقیوں کی قیادت ارسلان کے پاس رہی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں مسلمانوں کی کئی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ ماوراء النہر میں سامانی حکمران تھے جبکہ عراق کا پورا ملک اور خراسان کو چھوڑ کر باقی ایران بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔ اُدھر شمالی افریقہ میں فاطمی خاندان کی حکومت تھی۔ جب سامانی حکمران کمزور ہو گئے تو غزنویوں کا دورِ حکومت آ گیا۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کی قوت مجتمع اور یکجا نہیں تھی بلکہ مختلف محاذوں پر بکھری ہوئی تھی۔ ان حالات میں طغرل بیگ اٹھے اور انہوں نے صرف ۲۴ سال کے عرصے میں ایک وسیع علاقے کو اسلام کے پرچم تلے متحد کر دیا اور خلافتِ اسلامیہ کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا۔

شعبان ۴۲۹ھ/مئی ۱۰۳۷ء میں طغرل بیگ نے سرخس کے میدان میں ایک جنگ لڑی جس میں کامیابی کے بعد ابراہیم انیال (ماں کی طرف سے طغرل کے بھائی) نیشاپور پہنچے اور شہریوں کو پیغام دیا کہ اطاعت کرتے ہو تو دروازہ کھول دو ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شہر بھر میں اس پیغام سے کھلبلی مچ گئی۔ تاہم اس شرط پر کہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، نیشاپور والوں نے اطاعت کرنے کا وعدہ کر لیا۔

وسط رمضان ۴۲۹ھ / جون ۱۰۳۸ء میں خود طغرل بیگ نیشاپور پہنچ گئے اور وہاں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ نیشاپور کی فتح سلجوقیوں کی تاریخ میں نہایت اہم موڑ ہے۔ سلجوقی اب تہذیب سے نا آشنا، پہاڑوں میں پلنے والی، خانہ بدوش قوم نہیں تھی بلکہ جہاں گیری اور کشور کشائی کا عزم لیے، بہادر اور جفاکش افراد کی ایک بہت بڑی جمعیت تھی۔ اسے دیکھ کر اب کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی قوم ہے جو گزشتہ پچاس سال سے بے خانماں تھی اور مختلف علاقوں میں آباد ہونے کی سعی ناکام کیے جاتی تھی۔

سلجوقیوں کی اس کامیابی میں ان کے شاندار اوصاف کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ ایسی قوم تھی جس کا بچہ بچہ فنونِ حرب کا ماہر اور جفاکشی کی زندگی سے پوری طرح آشنا تھا۔ اس کے سردار لڑائی میں خود پیچھے رہ کر سپاہیوں کو آگے بھیجنے والے نہ تھے بلکہ خود پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی زندگی میں کمال کا نظم و ضبط تھا۔ ان کا زادِ راہ مختصر تھا اور وہ جنگلوں اور بیابانوں میں مہینوں سفر کر سکتے تھے۔ موسم کی سختیاں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں اور راستوں کے نشیب و فراز ان کا حوصلہ پست نہ کر سکتے تھے۔

۴۲۹ھ میں نیشاپور کی فتح کے بعد تقریباً چار سال طغرل کے لیے بے حد اہم اور نازک نوعیت کے حامل تھے کہ اس عرصے میں انہیں ہر آن نت نئے حریفوں سے الجھنا پڑا اور مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے اقدامات کرنے پڑے۔ بہت جلد خراسان بھی فتح ہو گیا۔ جب طغرل بیگ نے خراسان فتح کیا تو انہوں نے اپنے خاندان کے تمام افراد کو جمع کر کے باہمی اتفاق اور اتحاد کا درس دیا اور سب سے متحد رہنے کا عہد لیا۔ اس موقع پر طغرل بیگ نے اپنے بھائی کو ایک تیر دیا اور کہا کہ اسے توڑ دو۔ بھائی نے تیر کو فوراً توڑ دیا۔ پھر طغرل نے دو تیر نکال کر دیے اور کہا انہیں توڑ دو۔ بھائی نے انہیں بھی توڑ ڈالا۔ اس کے بعد طغرل نے تین تیر

Marfat.com

دیے اور انہیں توڑنے کے لیے کہا۔ ان کے بھائی ان تیروں کو ذرا مشکل سے توڑ سکے۔ پھر طغرل نے چار تیر دیے اور کہا اب انہیں توڑ کر دکھاؤ۔ طغرل کے بھائی سارا زور لگانے کے باوجود چار تیروں کو نہ توڑ سکے۔

طغرل نے کہا:

"ہماری بھی ایسی ہی مثال ہے۔ اگر ہم الگ الگ رہے تو دشمن ایک ایک پر حملہ کرے گا اور آسانی سے ہمیں توڑ کر رکھ دے گا اور اگر ہم ملے رہیں گے تو طاقتور سے طاقتور دشمن کو بھی ہم پر حملہ کرنے کی مجال نہ ہوگی اور جو کوئی حملہ کرے گا وہ خود ٹوٹ کر رہ جائے گا۔"

خراسان کی فتح کے بعد طغرل بیگ نے بغداد میں موجود عباسی خلیفہ القائم بامر اللہ کو ایک خط لکھا۔ خلیفہ نے یہ خط پڑھ کر نہ صرف خراسان پر طغرل کی حکومت کو اپنی سند عطا کی بلکہ طغرل کو "رکن الدین" کا لقب بھی دیا۔

امیر طغرل محمد بیگ نے نیشاپور کے انتظامات درست کرنے کے بعد اپنے بھائی ابراہیم انیال کو فوج دے کر جبال کی طرف بھیجا۔ ابراہیم نے رے اور ہمدان کے علاقے فتح کر لیے۔ دوسری طرف طغرل نے جرجان اور طبرستان پر قبضہ کر لیا۔

جرجان اور طبرستان کی فتح کے بعد طغرل نے شمال کا رخ کیا جہاں انہوں نے خوارزم کی مہم میں چغری بیگ داؤد کی مدد کی۔ ۴۳۴ھ / ۱۰۴۲ء میں ہونے والی اس جنگ میں سلجوقیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں سے واپس آتے ہوئے طغرل رے واپس آئے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے قزوین پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ پھر ہمدان کی باری آئی اور یہ شہر بھی طغرل کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء میں ماوراالنہر کی طرف سے غز ترکمانوں نے طغرل بیگ کے علاقے پر یلغار کر دی۔ طغرل نے نہایت ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے اس لشکر کا رخ روم کی عیسائی حکومت کی طرف پھیر دیا۔ پیچھے پیچھے ابراہیم انیال کی قیادت میں سلجوقی لشکر روانہ ہوا۔ غز ترکمان آرمینیا میں گھس گئے اور روم اور الجزیرہ کی سرحد پر واقع اہم مقام ملاز گرد کو فتح کر لیا۔ پھر وہ بلادِ روم میں داخل ہو کر طرابزون تک کے علاقے کو پامال کرتے چلے گئے۔ رومیوں اور ریاست انجاز (موجودہ جارجیا) نے مزاحمت کی لیکن جنگ میں غز ترکمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ انجاز کا شاہ قاریط گرفتار ہو گیا، حتیٰ کہ قسطنطنیہ صرف پندرہ دن کی مسافت پر رہ گیا۔

قیصر روم نے یہ رنگ دیکھا تو فوراً اپنے سفیر دوڑائے جنہوں نے طغرل بیگ کے پاس پہنچ کر انہیں قیمتی تحائف پیش کیے اور درخواست کی کہ بلادِ روم میں سلجوقیوں کی پیش قدمی روک دی جائے اور دونوں حکومتیں معاہدہ کر لیں۔ طغرل نے اس موقع پر بے حد بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے قیصر کی سفارت کو قبول کر لیا اور بلادِ روم میں سلجوقیوں کی پیش قدمی روک دی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے شاہ قاریط کو رہا کرنے کا حکم بھی دیا۔ اس رحم دلانہ سلوک کے شکریہ کے طور پر قیصر نے قسطنطنیہ میں مسجد آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ مسجد از سر نو تعمیر کی گئی۔ مسلمان وہاں آزادی کے ساتھ نماز ادا کرنے لگے اور طغرل بیگ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اس جنگ کی بدولت سلجوقیوں کو ایک طرف بہت سا مالِ غنیمت ملا دوسری طرف ان کے سیاسی اثرات آذر بائیجان، آرمینیا اور مغربی فرات تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد طغرل نے اصفہان کو بھی اپنا مطیع بنا لیا۔

۴۴۶ھ / ۱۰۵۴ء میں طغرل نے ایک بڑی فوج کے ساتھ آذر بائیجان پر چڑھائی کر دی۔ وہاں کی حکومت نے اظہارِ اطاعت کیا۔ طغرل کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ اسی سال موصل والوں نے بھی طغرل کی اطاعت قبول کر لی اور یہاں بھی طغرل کا خطبہ جاری ہو گیا۔ اس کے بعد طغرل شیراز، جنزہ اور دیار بکر کو بھی مسخر کر چکے تھے۔

طغرل نے خلیفہ قائم بامر اللہ سے اپنے تعلقات کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے اپنی بھتیجی (چغری بیگ کی بیٹی) خدیجہ ارسلان خاتون کی شادی خلیفہ قائم بامر اللہ سے کر دی۔ محرم ۴۴۵ھ / اپریل ۱۰۵۳ء میں نکاح ہوا اور شعبان میں رخصتی عمل میں آئی۔

محرم ۴۴۷ھ / اپریل ۱۰۵۵ء میں طغرل نے اعلان کیا کہ میں حج کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ اسی زمانے میں کچھ لوگوں نے عباسی خلیفہ کے خلاف بغاوت کی کوشش کی۔ خلیفہ نے طغرل کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کی سرکوبی کریں۔ طغرل نے ہمدان سے کوچ کیا اور عراق و کردستان کی سرحد پر پڑاؤ ڈالا۔ خلیفہ کی خواہش تھی کہ سلجوق عراق میں آجائیں۔

Marfat.com

۲۲ رمضان المبارک ۴۴۷ھ / ۱۵ دسمبر ۱۰۵۵ء کو جمعہ کے دن بغداد کے منبروں پر طغرل کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا۔

اب طغرل نے دارالخلافہ آنے کی اجازت طلب کی جو خوشی سے دے دی گئی۔ طغرل نہروان تک پہنچے کہ بغداد سے اعلیٰ حکام اور امرا استقبال کے لیے پہنچ گئے۔ طغرل ۲۵ رمضان المبارک ۴۴۷ھ کو بغداد پہنچے اور باب الشماسیہ پر قیام کیا، پھر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت طغرل خراسان سے بغداد تک کے علاقے پر حکمران تھے، لیکن یہ خلافت کا احترام تھا کہ طغرل خلیفہ کے سامنے نہایت ادب سے کھڑے رہے۔

۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء میں پھر کچھ بغاوتیں ہوئیں، ۱۰ ذی قعدہ ۴۴۸ھ / ۱۹ جنوری ۱۰۵۷ء کو طغرل بغداد سے موصل روانہ ہوئے جہاں ایک شخص بساسری فتنہ انگیزیوں میں مصروف تھا۔ بساسری بھاگ کر الرحبہ چلا گیا۔ طغرل نے موصل سنجار اور جزیرہ ابن عمر فتح کیا۔ ان شہروں کو مسخر کرنے کے بعد طغرل ۲۵ ذی قعدہ ۴۴۹ھ / فروری ۱۰۵۷ء کو عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے لیے خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ خلیفہ نے انہیں تاج اور زریں عمامہ پہنانے کا حکم دیا۔ گلے میں ہار ڈالا گیا۔ سات پارچوں کی خلعت عطا کی جس میں سات ولایتوں کی طرف اشارہ تھا۔ کمر میں زرنگار تلوار باندھی گئی۔ اس موقع پر خلیفہ نے طغرل کو "الملک المشرق والمغرب" یعنی "مشرق و مغرب کا بادشاہ" کا خطاب دیا۔

اس کے بعد ایک سال تک طغرل کچھ داخلی تنازعات میں الجھے رہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر بساسری نے پھر بغاوت کی۔ طغرل ایک بار پھر لشکر لے کر بغداد کی طرف چلے۔ خلیفہ خود ان کے استقبال کے لیے آئے ایک تلوار عنایت کی۔ ۲۵ ذی قعدہ ۴۵۱ھ / یکم جنوری ۱۰۶۰ء کو طغرل شہر بغداد میں داخل ہوئے۔ ان کے خیر مقدم کے لیے پورا شہر امڈ آیا تھا۔ طغرل نے خلیفہ کے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لی اور ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے خلیفہ کے مخصوص کمرے تک گئے۔ یہ اس عظیم سپہ سالار کی شان تھی کہ وہ ایک وسیع مملکت پر حکمراں ہونے کے باوجود خلافت کے احترام میں، خلیفہ کے خچر کی باگ تھامے پیدل چل رہا تھا۔

بہت جلد بساسری کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ اب مملکت اسلامیہ میں امن و چین تھا اور خلافت کو وہی شان و شوکت حاصل ہو چکی تھی جو پہلے حاصل تھی۔ ۴۵۲ھ / ۱۰۶۰ء میں طغرل کو ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی اہلیہ زنجان میں انتقال کر گئیں۔ اس کے اگلے سال طغرل نے خلیفہ کو پیغام دیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی طغرل سے کر دیں تاکہ ان کا تعلق بھی ہاشمی خاندان سے ہو جائے۔ یہ ایسی عزت کی بات تھی جو پہلے بڑے سے بڑے فرمانروا کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔ خلیفہ نے سوچ بچار کے بعد اپنی بیٹی سید النسا کا نکاح طغرل بیگ سے کرنے کی اجازت دے دی۔ شعبان ۴۵۴ھ / اگست ۱۰۶۲ء میں نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔

ربیع الاول ۴۵۵ھ / مارچ ۱۰۶۳ء میں طغرل رے کی سمت روانہ ہوئے۔ رے پہنچ کر وہ اچانک بیمار پڑ گئے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ طغرل بیگ نے رے سے باہر واقع ایک گاؤں طجرشت میں قیام کو ترجیح دی کہ وہاں کا موسم قدرے ٹھنڈا تھا۔ اس گاؤں میں اچانک طغرل کی نکسیر پھوٹنے سے خون بہنے کا ایسا سلسلہ جاری ہوا کہ کسی طرح نہ رکا۔ رمضان المبارک کی آٹھ تاریخ ۴۵۵ھ / ۴ ستمبر ۱۰۶۳ء کو اس عظیم سلجوقی فرمانروا نے اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ انہیں رے میں سپرد خاک کیا گیا جو آج کل تہران کہلاتا ہے۔

طغرل بیگ محمد کی شخصیت میں ہمیں ایک غیر معمولی صلاحیتوں والا انسان نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے ۲۶ سالہ دورِ حکومت میں جس کمال ہوشمندی اور دانائی سے کام لیتے ہوئے ایک وحشی اور غیر متمدن قوم کو دنیائے اسلام کا امام بنا دیا، وہ بجا طور پر حیران کن ہے اور یہ بات طغرل کی سیاسی بصیرت، قائدانہ صلاحیت اور مثالی جرأت کی عکاسی کرتی ہے۔

طغرل بیگ محض ایک حکمراں یا جنگجو سالار ہی نہیں تھے ایک اچھے منتظم، ایک عادل فرمانروا اور ایک رحم دل انسان بھی تھے۔ بردباری اور حلم ان کی شخصیت کے نمایاں جزو تھے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صحیح اور سچا عقیدہ رکھنے والے خدا ترس انسان تھے۔ دین اسلام سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ تہجد کی نماز کا بھی لازماً اہتمام کرتے

Marfat.com

تھے، ہر جمعرات اور پیر کو روزہ رکھتے تھے۔ انہیں مساجد تعمیر کروانے سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں کوئی عمارت بنواؤں اور اس کے پہلو میں مسجد نہ ہو۔

آپ نے عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔ اتوار اور بدھ کو خود مقدمات کی سماعت کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ طغرل کو علم سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے علما کرام کو بہت عزت دی تھی۔ ان کے وزیر ابو نصر محمد بن منصور جو عبدالملک الکندری کے لقب سے مشہور تھے، بڑے علم دوست انسان تھے۔ وہ دولت سلجوقیہ کے قابل ترین وزیر تھے۔ امام الحرمین اور امام القاسم قشیری، طغرل کے دربار میں آتے تھے۔ عمادی شہریاری جیسے مشہور شاعر طغرل کی محفلوں میں موجود رہتے تھے۔ طغرل پُر تکلف لباس کے قائل نہ تھے اور ہمیشہ سادہ اور سفید لباس ان کا پہناوا ہوتا تھا۔

گو کہ طغرل کو اپنے دورِ حکومت میں جنگوں سے فرصت نہ ملی لیکن جہاں تک ہو سکا انہوں نے رفاہی کام انجام دینے کی کوشش کی۔ رے کا شہر ہنگاموں میں تباہ ہو گیا تھا، طغرل نے اسے از سر نو تعمیر کروایا۔

مؤرخ ابن کثیر کے مطابق طغرل حلیم الطبع تھے۔ وہ بھید کو چھپاتے تھے اور دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ مؤرخ الاصفہانی کہتے ہیں کہ طغرل خون بہانا پسند نہ کرتے تھے۔ نہ محرم کی بے حرمتی کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی کثرت سے خیرات کی اور مساجد خوب بنائیں۔ مؤرخ ابن خلکان کے مطابق طغرل نے رعایا میں انصاف وعدل عام کیا اور خوشحالی کی دولت ہر سُو پھیلا دی۔

***

Marfat.com

اَلپ ارسلان

فوجی قوت اور وسیع مملکت کے لحاظ سے اپنے عہد کے سب سے بڑے فرمانروا

وہ شہر دو طرف پہاڑوں سے اور دو جانب دریا سے گھرا ہوا تھا۔

مسیحی آرمینیا کے اس شہر کے اطراف پہاڑوں پر زبردست قلعے ایستادہ تھے جن کی مضبوط فصیلوں پر چاق و چوبند سپاہیوں کی نقل و حرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ شہر کے گرد مستحکم فصیل تھی اور واقف کاروں کا کہنا تھا کہ اس فصیل کے اندر ایک اور فصیل ہے۔

اسلامی لشکر شہر کو گھیرے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ گھوڑوں کی باگیں کھینچ لی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد امیر لشکر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لشکر کے سپاہی، دریا پر کشتیوں کا پُل باندھنے میں مصروف تھے۔ پُل بندھ گیا تو لشکر بڑی تیزی سے دریا کے پار اتر گیا۔ شہر والوں کو للکارا گیا کہ ہتھیار ڈال دیں۔ اس للکار کے جواب میں تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ اسلامی لشکر کے سپاہیوں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور زبردست جنگ کا آغاز ہو گیا۔ محاصرہ سخت کر دیا گیا اور شہر کو رسد پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے گئے۔

لڑائی زور و شور سے جاری تھی، اچانک شہر کی فصیل پر سفید پرچم لہرانے لگا۔ مجاہدینِ اسلام کو رک جانے کا حکم ملا۔ شہر کی جانب سے دو آدمیوں نے اعلان کیا کہ ہم امان چاہتے ہیں، آپ اپنا ایک دستہ بھیج دیں جو شہر کا قبضہ حاصل کر لے۔ اسلامی فوج کا ایک دستہ روانہ ہو گیا، لیکن شہر والے بد عہد نکلے۔ اسلامی دستہ جوں ہی شہر کی فصیل عبور کر کے اندر داخل ہوا، دروازے بند کر دیے گئے اور شہر والوں نے اسلامی فوجی دستے کے ایک ایک سپاہی کو شہید کر دیا۔

اس واقعے کی اطلاع بہت جلد اسلامی فوج تک پہنچ گئی۔ طبل جنگ بجنے لگے اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ امیر لشکر اس وقت نماز ادا کرنے میں مصروف تھے، ان کے خیمے کے باہر مچی ہوئی ہلچل کی آوازیں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں لیکن وہ پورے وقار، سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ اسلامی فوج میں شدید اضطراب اور بے چینی تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد امیر لشکر خیمے سے باہر نکلے۔ انہیں دشمن کی بد عہدی سے آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے فوج کو منظم کیا اور اسلامی فوج نے اس شہر کی مضبوط فصیلوں پر دھاوا بول دیا۔ اس وقت لشکرِ اسلام کا ایک ایک سپاہی شعلۂ جوالہ بنا ہوا تھا۔ جذبۂ شہادت کے سامنے مضبوط سے مضبوط فصیلوں کی کیا حیثیت تھی۔ کچھ ہی دیر میں اسلامی فوج شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ وعدہ کر کے پھر جانے والے بد دیانت عہدیداروں کو قیدی بنایا جا رہا تھا اور امیر لشکر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ شہر کا جائزہ لے رہے تھے۔

یہ امیر لشکر تھے، سلجوقی سلطنت کے دوسرے فرمانروا الپ ارسلان، جن کی بے مثال شجاعت اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیت نے مسلمانوں کو کل عالم میں سربلندی عطا کی اور جن کا دس سالہ دورِ حکومت قوت و استحکام کی علامت بن کر تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔

الپ ارسلان کا نام محمد تھا۔ ''ابو شجاع'' ان کی کنیت تھی۔ انہیں عباسی خلیفہ کے دربار سے ضیاالدین اور عضدالدّولہ کے خطابات ملے تھے، لیکن دنیا انہیں الپ ارسلان ہی کے نام سے جانتی ہے۔ ''الپ'' کا تلفظ ''آلپ'' بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں شجاع، دلیر، طاقتور، ہیرو۔ الپ ارسلان کے لقب کے دوسرے حصے یعنی ارسلان کے معنی ہیں ''شیر'' ۔ یہ خطاب ''الپ ارسلان'' (بہادر شیر)، اس عظیم سلجوقی فرمانروا کی بلند صفات کو دیکھتے ہوئے بہت موزوں نظر آتا ہے۔

Marfat.com

الپ ارسلان کے والد کا نام چغری بیگ داؤد تھا جو سلجوقی سلطنت کے پہلے فرمانروا اور طغرل بیگ محمد کے بھائی تھے۔ طغرل بیگ محمد کی کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ وہ اپنے بھائی چغری بیگ کے بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

الپ ارسلان کی تاریخ پیدائش پر مورخین کے مابین اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ وہ ۴۲۴ھ میں پیدا ہوئے تھے (ابن اثیر، عماد کاتب اور ابن خلکان) ابن الراوندی، حمد اللہ مستوفی اور میر خوند کے نزدیک الپ ارسلان کی تاریخ پیدائش ۲ محرم ۴۲۱ھ / ۱۰ جنوری ۱۰۳۰ء ہے جب کہ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق الپ ارسلان یکم محرم ۴۲۰ھ / ۲۰ جنوری ۱۰۲۹ء کو پیدا ہوئے۔

کچھ عرصے قبل قائم ہونے والی سلجوقی حکومت کو مختلف خطرے درپیش تھے۔ ان خطرات کے سدِباب کے لیے بہت چوکس رہنے اور بروقت اقدامات کرتے رہنے کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ کم سنی ہی میں الپ ارسلان کو مختلف مہمات میں شرکت کرنے کے مواقع ملنے لگے۔ اس طرح انہیں لڑائی کے جملہ فنون پر دسترس حاصل ہو گئی۔ اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے اپنے تحت دیے جانے والے ہر دستے کو کامیابی سے منظم کیا اور اپنی نگرانی میں آنے والے ہر علاقے میں عمدہ نظم و نسق قائم کر دیا۔ وہ بڑے شجیع تھے۔

ایک بار ایران میں بغاوت ہو گئی اور الپ ارسلان کے چچا طغرل بیگ باغیوں میں گھر گئے، اس وقت الپ ارسلان نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر چچا کی جان بچائی تھی، اس واقعے کے کچھ عرصے بعد الپ ارسلان نے اپنے والد کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں کیونکہ ان کے والد چغری بیگ داؤد عرصے سے صاحب فراش تھے۔

۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں چغری بیگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق بیٹے الپ ارسلان نے مَرو کی ریاست کا انتظام سنبھال لیا۔ ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ محمد کا انتقال ہو گیا۔ زیادہ تر امرا الپ ارسلان کے حامی اور ان کی بہترین صلاحیتوں اور متاثر کن شخصیت کے مداح تھے۔ چنانچہ محرم ۴۵۶ھ / جنوری ۱۰۶۴ء کے آخر میں الپ ارسلان نے سلجوقی حکومت کے دوسرے فرمانروا کی حیثیت سے زمام کار سنبھال لی۔ اس وقت ان کی حکومت میں خراسان، جرجان، طبرستان، ہمدان، اصفہان، آذربائیجان، موصل، شیراز، دیار بکر، خوزستان، الجزیرہ، عراق، کردستان، رے، زنجان وغیرہ شامل تھے۔

الپ ارسلان نے حکمراں بننے کے بعد بغداد میں عباسی خلیفہ کو پیغام بھیجا تاکہ خلیفہ سے نئی سلجوقی سلطنت کو اذنِ حکمرانی مل جائے۔ خلیفہ کو جب الپ ارسلان کا پیغام ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ۷ جمادی الاول ۴۵۶ھ / ۲۷ اپریل ۱۰۶۴ء کو انہوں نے ایک دربارِ عام منعقد کیا جس میں خلافت کی طرف سے باقاعدہ طور پر الپ ارسلان کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ الپ ارسلان کو ضیاالدین اور عضد الدّولہ کے خطابات دیے گئے۔ ان کے لیے خلعتیں، ان کے ایلچیوں کے حوالے کی گئیں اور بغداد میں الپ ارسلان کے نام کا خطبہ جاری کر دیا گیا۔

خلافت کی جانب سے اذنِ حکمرانی مل جانے سے پہلے ہی الپ ارسلان نے اپنے اطراف کے علاقوں پر نظر کی جہاں دشمن ریاستوں نے شورشیں برپا کر رکھی تھیں۔ ربیع الاول ۴۵۶ھ / فروری ۱۰۶۴ء میں سلجوقی لشکر آذربائیجان کی سمت روانہ ہوا۔

الپ ارسلان نے دریائے ارس عبور کیا اور نخجوان پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنے بیٹے ملک شاہ اور وزیر نظام الملک کو انجاز (جارجیا) بھیجا۔ ملک شاہ نے انجاز میں اپنی لیاقت کے جوہر دکھائے اور کئی قلعے فتح کر لیے حتیٰ کہ انجاز کے فرمانروا بقراط نے خوفزدہ ہو کر خود صلح کی درخواست کی اور سالانہ جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر الپ ارسلان نے ملک شاہ اور نظام الملک کو واپس بلا لیا اور اپنی مکمل فوج کے ساتھ ارمینیہ کے مسیحی حصے پر چڑھائی کر دی۔ اس زمانے میں ارمینیہ کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ اسلامی ارمینیہ کہلاتا تھا جس کا دارالحکومت 'دبیل' تھا دوسرا مسیحی ارمینیہ کہلاتا تھا جس کا دارالحکومت 'آنی' تھا۔

الپ ارسلان کی فوج مسیحی ارمینیہ میں سپید شہر کو فتح کرتی ہوئی "آعال لال" کی طرف بڑھی۔ یہ ارمینیہ کا اہم شہر تھا۔ اس کے گرد دوہری فصیل تھی۔ اس شہر کی تسخیر کے وقت وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اس مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

رجب ۴۵۶ھ / جون ۱۰۶۴ء میں سلجوقی فوج گرجستان میں پیش قدمی کر رہی تھی۔ قرس کا علاقہ فتح ہو گیا۔ پھر ناحیہ اور نورہ تسخیر ہوئے۔ اس کے بعد الپ ارسلان کے حکم پر فوج کا رخ مسیحی ارمینیہ کے صدر مقام آنی کی سمت موڑ دیا گیا۔ یہ شہر دریائے ارس کے کنارے واقع تھا۔ مسیحی اس شہر کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس میں پانچ سو سے زائد گرجا گھر تھے۔ شہر کے چاروں طرف پانی تھا اور شہر تک پہنچنے کے

Marfat.com

لیے لکڑی کا صرف ایک پل تھا۔ سلجوقی لشکر نے شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن شہر فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ اس موقع پر الپ ارسلان نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے لکڑی کا ایک بہت بڑا برج بنوایا۔ یہ برج بے حد مضبوط تھا۔ اس پر ایک بڑی منجنیق رکھ دی گئی اور سپاہیوں نے شہر کی فصیل پر سنگباری شروع کر دی۔

فصیل پر جو محافظ متعین تھے وہ اس سنگباری کا سامنا نہ کر سکے اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کا پسپا ہونا تھا کہ سلجوقی فوج کے ماہر نقب زنوں نے فصیل کی جڑوں میں نقب لگا دی۔ بہت جلد فصیل کا ایک حصہ گر پڑا۔ فصیل کا گرنا تھا کہ سلجوقی لشکر فتح کے پرچم لہراتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔ شہر والوں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح ارمینیہ کی قدیم مسیحی ریاست بقارطہ کا خاتمہ ہو گیا۔

مسیحی ارمینیہ کی فتح کے بعد الپ ارسلان نے جنگ کا سلسلہ روک دیا اور اصفہان چلے گئے۔ اصفہان سے وہ کرمان اور مرو گئے جہاں انہوں نے اپنے بیٹے ملک شاہ کی شادی ماوراء النہر (دریائے جیحون اور دریائے سیحون کا درمیانی علاقہ) کے بادشاہ طفغاج خان کی بیٹی سے کر دی۔ دوسرے بیٹے ارسلان شاہ کے لیے انہوں نے سلطان ابراہیم غزنوی کی بیٹی کا انتخاب کیا۔ غزنوی خاندان سے رشتے داری قائم کرنے کا فیصلہ بہت دانشمندانہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے درمیان اور زیادہ اتحاد و اتفاق ہو گیا۔

۴۵۷ھ / ۱۰۶۴ء میں ارسلان اس علاقے کی طرف بڑھے جہاں ان کے آباؤ اجداد نے زندگی گزاری تھی۔ دریائے جیحون پار کر کے وہ ماوراء النہر سے ہوتے ہوئے سیحون کے کنارے پہنچ گئے۔ جند کے علاقے میں وہ اپنے پردادا سلجوق کی قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔ جند کے حکمران الپ ارسلان کی خدمت میں خود حاضر ہوئے اور اطاعت کا وعدہ کیا۔

ارسلان نے جند کی حکومت کو برقرار رکھا اور اس کے حکمران کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا۔ یہاں سے وہ صبر ان اور گرگانج ہوتے ہوئے مرو واپس پہنچ گئے۔ اس مہم میں کہیں خون نہیں بہا اور کسی لڑائی کے بغیر الپ ارسلان کی حکومت دریائے سیحون کی دوسری طرف ترکستان تک وسیع ہو گئی۔

۴۵۸ھ / ۱۰۶۵ء میں الپ ارسلان نے انتظامی امور کی جانب توجہ دی اور مختلف علاقوں میں والیوں کا تقرر کیا۔ اگلے سال کرمان اور فارس میں شورشوں کا قلع قمع کیا گیا۔ فارس کا مشہور قلعہ اصطخر فتح ہوا۔ قلعے کے حاکم نے اطاعت کا یقین دلایا اور بہت سے قیمتی تحفے پیش کیے۔ ان میں فیروزے کا ایک پیالہ بھی تھا جس پر ایران کے قدیم بادشاہ جمشید کا نام کھدا ہوا تھا۔ اصطخر کے بعد دوسرے قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے، حتیٰ کہ بہنزاد کا مستحکم قلعہ بھی تسخیر ہو گیا۔ یہ قلعہ ایک بلند پہاڑ پر بنا ہوا تھا اور اس کو فتح کرنا بے حد مشکل کام تھا۔

الپ ارسلان کو اس قلعہ کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ انہوں نے اپنے تیر اندازوں اور منجنیق برداروں کو بڑی مہارت سے مختلف مقامات پر متعین کیا۔ محاصرہ ۱۶ دن جاری رہا۔ اس عرصے میں تیر اندازوں اور منجنیق برداروں نے اس قدر درست نشانے لگائے کہ قلعے کی فصیل جگہ جگہ سے منہدم ہو گئی۔ الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک ان صحیح نشانوں پر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے تیر اندازوں کو ہر صحیح نشانے پر ایک مٹھی بھر دینار اور منجنیق چلانے والوں کو ہر پتھر کی ضرب پر ایک نفیس کپڑا انعام دیا۔

الپ ارسلان کے ایک سالار افشین نے ۴۶۰ھ / ۱۰۶۷ء میں ملطیہ کے نواح میں رومی سلطنت کی ایک فوج کو شکست دی اور قیصریہ پر قبضہ کر لیا۔ اگلے سال الپ ارسلان نے دریائے ارس پار کر کے گرجستان کے بادشاہ بغرات کو مطیع بنا لیا۔ یہ فتوحات روم کی قدیم سلطنت کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھیں۔ ۴۶۱ھ / ۱۰۶۸ء میں روم کی قیصرہ یوڈوسیا نے ایک دلیر جنرل رومانس دیو جانس سے شادی کر لی اور حکومت اس کے سپرد کر دی۔ رومانس دیو جانس نے اقتدار سنبھالتے ہی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اگلے سال وہ زبردست تیاریوں کے ساتھ مشرق کی سمت بڑھا۔ جب وہ پالو کے مقام پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ملطیہ میں اس کی فوج کو جنوب سے حملہ کرنے والے ترک لشکر نے تباہ کر دیا ہے۔ کچھ مدت بعد خبر ملی کہ ترک فوج نے قونیہ پر بھی قبضہ کر لیا ہے، اس پر رومانس واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔

اسی دوران الپ ارسلان شام، یمن، حجاز اور فلسطین میں عباسی خلافت کا خطبہ جاری کر چکے تھے۔ ۴۶۲ھ / ۱۰۷۰ء کے وسط میں الپ ارسلان اپنی پوری مشرقی فوج کے ساتھ آذربائیجان پہنچے اور گھوم کر ملاذ گرد جا پہنچے۔ اس اہم شہر پر قبضہ کرنے کے بعد آپ نے جنوب کی طرف یلغار کی اور دجلہ اور اس کے معاون دریائے مراد کے طاس کے دوسرے مقامات اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں کو ترک ابھی تک

Marfat.com

فتح نہ کر سکے تھے۔ آخر الپ ارسلان میافارقین تک پہنچ گئے۔ دیار بکر پر نصر اور سعید دو بھائی حکمراں تھے۔ دونوں بھائیوں نے الپ ارسلان کا خیر مقدم کیا۔ یہاں سے سلطان الجزیرہ کے علاقے میں آئے۔ کئی قلعے تسخیر کیے پھر اور فہ (الرہا) کا ۵۰ دن تک محاصرہ کیے رکھا۔ اس کے بعد آپ نے حلب کی طرف توجہ کی۔ شہر کے حکمراں محمود نے اطاعت کا وعدہ کیا۔ یہاں سے الپ ارسلان نے مصر کا رخ کیا لیکن اس موقع پر ان کو یہ معلوم ہوا کہ روم کا بادشاہ زبردست فوج لے کر پیش قدمی کر رہا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ مشرقی اناطولیہ اور آذر بائیجان پر قبضہ کر لے۔

قیصر روم، رومانس دیوجانس کی یہ فوج کوئی معمولی فوج نہ تھی۔ اس میں بلغاریہ، مالڈیویا، یورپی اتحادیوں، مقدونیہ کی فوجیں تھیں، فرنچ اور نارمن رسالے تھے۔ اس کے علاوہ روس، قبچاق، انجاز (جارجیا) اور ارمینیا کے سپاہی بھی بہت بڑی تعداد میں اس میں شامل تھے۔ ابن اثیر کے مطابق یہ فوج دو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ روضۃ الصفا کے مطابق قیصر کی فوج میں تین لاکھ فوجی تھے اور گبن کا کہنا ہے کہ کم از کم ایک لاکھ فوجی تھے۔ ابن الراوندی کا بیان ہے کہ رومی فوج میں چھ لاکھ سوار شامل تھے۔ یہ فوج الجزیرہ میں منبج کو روندتی ہوئی ارمینیا میں اعمال خلاط تک پہنچ گئی اور ملاذ گرد کو مسلمانوں سے چھین لیا۔

اس زمانے میں الپ ارسلان آذر بائیجان کے شہر خُوی میں مقیم تھے اور ان کے ساتھ بہت تھوڑی فوج تھی۔ بیوی بچے بھی ساتھ تھے۔ رومیوں کی اتنی بڑی فوج کے ملاذ گرد تک پہنچنے کی خبر بڑے سے بڑے حکمران کو پریشان کر دینے کے لیے کافی تھی لیکن دلیر سلجوقی حکمراں ذرا بھی سراسیمہ نہ ہوئے۔ انہوں نے فوراً فیصلہ کیا کہ رومیوں کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے اہل و عیال اور خواتین کو نظام الملک کے ساتھ تبریز یا ہمدان بھیج دیا اور خود فوج لے کر ملاذ گرد کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اسلامی مورخین کے مطابق فوج صرف پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جبکہ یورپی مورخین نے زیادہ سے زیادہ تعداد چالیس ہزار لکھی ہے۔ رومیوں کی فوج کے پاس اسلحہ بھی اعلیٰ قسم کا تھا۔ بیسیوں ایسی منجنیقیں تھیں جن میں آٹھ درجے تھے اور ہر درجے میں ڈیڑھ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔

اتنی طاقتور فوج کے سامنے الپ ارسلان کا اسلامی لشکر محض مٹھی بھر سپاہیوں کا دستہ محسوس ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ قیصر روم اور اس کے جرنیل بڑے غرور سے کہتے تھے، "آئندہ موسم سرما ہم 'رے' (سلجوقیوں کے دارالحکومت) میں گزاریں گے۔ موسم گرما عراق میں گزرے گا، واپسی میں ہم شام کے علاقوں کا فیصلہ کرتے ہوئے آئیں گے۔" قیصر روم نے تو اسلامی مملکت کو فتح کرنے سے پہلے ہی سارے اسلامی علاقوں کو عیسائی حکام کے درمیان تقسیم بھی کر دیا تھا۔

الپ ارسلان اپنے سے بیس گنا بڑی طاقت کو دیکھ کر قطعاً خوفزدہ نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک طاقت اور ہے جو کُل زمینوں اور آسمانوں پر حکمراں ہے۔ انہوں نے اپنی فوج سے کہا:

"اے مجاہدین اسلام، بے شک ہماری تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن ہمیں صبر و ہمت سے کام لینا ہے اور اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسا کرتے ہوئے دشمن سے نبرد آزما ہونا ہے۔ اگر فتح پائی تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے۔ ورنہ درجہ شہادت پر تو ضرور فائز ہوں گے۔"

۔ ۴ ذی قعدہ ۴۶۳ھ / ۲ ستمبر ۱۰۷۰ء کو خلاط کے قریب اسلامی لشکر کی رومیوں کے ایک ہراول دستے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ ہراول دستہ بھی بہت بڑا تھا اور لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل رومی فوج کے لحاظ سے اس ہراول دستے میں بھی دس ہزار سے بیس ہزار سوار شامل تھے، اس کی قیادت ایک رومی جنرل کر رہا تھا۔ اسلامی فوج کے سپاہی اس وقت جذبۂ شہادت سے سرشار تھے۔ رومی ہراول دستے کے سپاہی دیکھتے ہی دیکھتے تہ تیغ کر دیے گئے۔

الپ ارسلان کی پیش قدمی اور اپنے ہراول دستے کی تباہی کی خبر ملتے ہی قیصر نے سنبھل کر اپنی ساری فوج یکجا کر لی اور ملاذ گرد اور خلاط کے درمیان واقع ایک مقام الزہرہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ دو روز بعد الپ ارسلان کا لشکر بھی رومی لشکر سے دو فرسنگ (تقریباً چھ میل) کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ الپ ارسلان نے دانشمند جرنیل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے قیصر روم کو مشورہ دیا کہ جنگ میں بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں گی بہتر یہ ہے کہ جنگ نہ کی جائے اور فریقین اپنے اپنے ملک واپس چلے جائیں، لیکن قیصر روم تو فتح سے پہلے ہی تمام اسلامی علاقوں کو اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر چکا تھا۔ اس نے نہایت تکبر کے ساتھ جواب دیا:

"اے وحشی! اگر تم امن پسند ہو اور آدمیوں کا خون بہانا پسند نہیں کرتے ہو تو اس جگہ کو جہاں تم نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے رومی فوج کے لیے خالی کر دو اور اپنی سچائی کے ثبوت کے طور پر اپنے دارالحکومت رے کو ہمارے حوالے کر دو۔"

یہ متکبرانہ جواب سن کر الپ ارسلان نے فیصلہ کیا کہ جنگ

Marfat.com

ناگزیر ہے، اس موقع پر امام الصلوٰۃ اور فقیہہ حضرت امام ابو نصر محمد بن عبدالمالک بخاری حنفیؒ نے مشورہ دیا کہ "آج کے دن اور ٹھہر جائیں کل جمعہ ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان آپ کی فتح کے لیے دعائیں کریں گے، اس کے بعد آپ حملہ کیجیے گا۔"

الپ ارسلان کو یہ مشورہ پسند آیا۔ دوسرے دن انہوں نے اپنی فوج کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ بارگاہِ الٰہی میں خوب گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ دعا مانگتے ہوئے الپ ارسلان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور پوری فوج پر گریہ وزاری کی کیفیت طاری تھی۔ دعا مانگنے کے بعد سلجوقی فرمانروا نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے مجاہدو! مجھے علم ہے کہ شجاعت تمھارا ذاتی جوہر ہے اور اس کے اظہار کا موقع تم اللہ سے چاہتے ہو، لیکن میری خواہش ہے کہ تم میرے بعد زندہ رہو۔ واللہ تمھاری وفاداری اور جاں نثاری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو شخص کسی بھی وجہ سے واپس جانا چاہتا ہے وہ بلا تکلف واپس چلا جائے، جو شہادت چاہتا ہے وہ ٹھہر جائے۔ اب بادشاہی اور افسری ختم ہو چکی۔ میری حیثیت اسلام کے ایک ادنیٰ سپاہی سے زیادہ نہیں ہے۔"

یہ تقریر سُننا تھا کہ لشکر کا ایک ایک سپاہی بول پڑا، "اللہ کی قسم ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ وہ شخص ملعون ہے جو لڑائی سے جان چُرائے۔"

یہ سُن کر الپ ارسلان کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے گھوڑے کی دُم باندھی۔ ایک سفید قبا زیب تن کر کے کہا، "اگر میں شہید ہو گیا تو یہی میرا کفن ہو گا۔" پھر تلوار نیام سے نکال کر نیام پھینک دی۔ یہ دیکھ کر مجاہدین میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا اور میدانِ جنگ تکبیر کے نعروں سے گونجنے لگا۔

اب فوج کو کوچ کرنے کا اشارہ ہُوا۔ کچھ دیر بعد دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ الپ ارسلان نے اپنی فوج کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اپنا عمامہ اُتارا اور زمین پر سربسجود ہو گئے۔ ساری فوج پر رِقّت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد الپ ارسلان سجدے سے اُٹھے، جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور نعرہ لگا کر لڑائی کا اِذنِ عام دے دیا۔ اسلامی لشکر برقِ تپاں بن کر رومی فوج کے ٹڈی دل پر گرا۔ پہلے ہی ہلّے میں مشہور رومی جنرل باسیلا سیوس پسپا ہو گیا۔ اس کے قریب مالڈیویا کے دستے تھے وہ بھی گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک جانب شہزادہ انڈرونیکوس کی پلٹن تھی۔ شہزادے اور قیصر روم کے درمیان رنجش چل رہی تھی، اس لیے وہ دل سے نہیں لڑ رہا تھا۔ ادھر اسلامی لشکر کے جانباز جم کر حملے کر رہے تھے۔

الپ ارسلان نے نہایت حکمت کے ساتھ اپنے ترک تیر اندازوں کو منظم کیا تھا۔ وہ ہلال کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور اتنی پھرتی سے تیروں کی بارش کر رہے تھے کہ رومی فوج کو آگے بڑھنے کی مہلت ہی نہ مل رہی تھی۔ رومی لشکر کی اگلی صفوں میں تجربہ کار جرنیل تھے۔ وہ بھی اپنی فوج میں پھیلنے والی افراتفری پر قابو نہ پا سکے۔ شہزادہ انڈرونیکوس تو اس بے ترتیبی کے ساتھ پسپا ہوا کہ رومی فوج کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اس موقع پر قیصر روم سے ایک زبردست غلطی سرزد ہوئی۔ گھمسان کی لڑائی میں اپنی فوج کی پسپائی سے وہ بوکھلایا ہُوا تو تھا ہی، اس پر نہایت تیز دھوپ نے اس کو مزید بدحواس کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں چند لمحے اپنے خیمے میں دم لے لوں تو شاید زیادہ بہتر انداز میں لڑ سکوں گا، اور یہی اس کی غلطی تھی۔

شہنشاہ نے اپنے خیمے کا رُخ کیا تو اس کے ساتھ ساتھ بلند عَلَم بھی حرکت میں آیا۔ دُور تک پھیلے ہوئے رومی سپاہیوں نے یہی سمجھا کہ شہنشاہ نے پسپا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب لڑائی جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، چنانچہ رومی فوج میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ فوج کو اس طرح میدانِ جنگ چھوڑتے ہوئے دیکھ کر قیصر روم پھر میدان میں آیا اور اپنے خاص دستوں کو ساتھ لے کر ایک بار پھر ڈٹ گیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ رومی فوج کا بڑا حصّہ راہِ فرار اختیار کر چکا تھا، باقی ماندہ فوج کا حوصلہ پست ہو چکا تھا اور اسلامی لشکر کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

قیصر نے اپنی سی پوری کوشش کی لیکن وہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو منظم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے انتہائی وفادار سپاہی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے یا مجاہدین کی تلواروں سے گھائل ہو کر گر پڑے۔ خود قیصر کو بھی زخم آئے اور اس کا گھوڑا بھی مارا گیا، وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ اس موقع پر ایک غلام نے کمند پھینکی قیصر کا پاؤں اس کمند میں اُلجھ گیا۔ اس طرح اس غلام نے قیصر کو گرفتار کر لیا اور اسلامی لشکر کے حوالے کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اس غلام کو علم نہ تھا کہ اس نے کسے گرفتار کیا ہے۔

اسلامی لشکر کے سپاہیوں نے جب قیصر کو قید کیا تو اسے کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ اسے دوسرے عام قیدیوں کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ صبح

Marfat.com

ہونے پر الپ ارسلان کے سامنے تمام قیدیوں کو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ان سلجوقی سفیروں نے جو رومی دربار میں جا چکے تھے، قیصر کو پہچان لیا۔ جنگی قیدیوں میں رومی جنرل باسیلا سیوس بھی شامل تھا اس نے بڑھ کر قیصر کی قدم بوسی کی۔ اس طرح یہ راز فاش ہو گیا۔

الپ ارسلان نے اس موقع پر دنیا کی اتنی بڑی مملکت کے حکمراں کے ساتھ جو شریفانہ اور مہذبانہ سلوک کیا وہ مثالی ہے۔ کچھ دیر پہلے یہی قیصر روم لاکھوں کی فوج لے کر مسلمانوں کی بستیوں کو اجاڑنے کے درپے تھا اور اسلامی علاقوں پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی قیصر نے الپ ارسلان کی طرف سے جنگ نہ کرنے کی پیش کش کو متکبرانہ انداز میں ٹھکرا دیا تھا۔ یہی قیصر تھا جس کے رعب و دبدبے سے روم کے لوگ کانپتے تھے، آج وہی قیصر ذلیل و رسوا ہو کر، درماندگی کے عالم میں سر جھکائے، اسلامی حکومت کے سربراہ کے سامنے کھڑا تھا۔

الپ ارسلان نے اپنے بدترین دشمن سے عزت کا جو برتاؤ کیا اس کی تعریف سخت متعصب یورپی مؤرخین تک نے کی ہے۔ الپ ارسلان اپنی نشست سے اُٹھے چند قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے قیصر سے مصافحہ کیا۔ اسے عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور یقین دلایا کہ اس کا احترام کیا جائے گا۔

سات دن تک فتح کا جشن منایا گیا۔ اس دوران الپ ارسلان کی ہدایت پر قیصر اور اس کی فوج کے کئی جرنیلوں کو ایک شاندار خیمے میں ٹھہرایا گیا۔ وہ روز دو وقت قیصر کے پاس آتے اور انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ آٹھویں دن الپ ارسلان نے قیصر سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا: "آپ اب مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہیں؟" قیصر نے کہا۔ "اگر آپ ظالم ہیں تو مجھے قتل کر دیں گے، متکبر ہیں تو پوری اسلامی مملکت میں میری تشہیر کریں گے یا عمر بھر کے لیے زنداں میں ڈال دیں گے اور بعید امکان اس کا بھی ہے کہ فیاضی سے کام لیتے ہوئے تاوان لے کر معاف کر دیں گے۔"

الپ ارسلان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ انہوں نے پوچھا: "اگر آپ کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوتی اور میں اس حالت میں آپ کے پاس قیدی بن کر آتا تو آپ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے؟" قیصر نے بے ساختہ کہا۔ "بدترین سلوک جو میرے بس میں ہوتا۔" ایک مؤرخ کے مطابق قیصر نے کہا: "میں آپ کو بہت سے کوڑے لگواتا۔" الپ ارسلان نے کہا، "اب مجھے آپ کی ذہنیت کا حال معلوم ہو گیا ہے، کیوں نہ میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک کروں؟"

قیصر نے کہا: "آپ نے میری ذہنیت کا انجام بھی تو دیکھ لیا ہے۔" الپ ارسلان ہنس پڑے، پھر انہوں نے کہا: "میں دین حق کا پیرو ہوں۔ اسلام امن و سلامتی کا پیام دیتا ہے۔ جو سلوک آپ میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے، وہ میں آپ کے ساتھ نہیں کروں گا۔"

فریقین کے مابین پچاس سال کے لیے ایک معاہدہ طے پا گیا۔ معاہدے کی خاص باتیں یہ تھیں: ۱۔ پندرہ لاکھ دینار رومی سلطنت فوری طور پر ادا کرے گی۔ ۲۔ ہر سال تین لاکھ ساٹھ ہزار دینار، رومی سلطنت کو ادا کرنے ہوں گے۔ ۳۔ رومیوں کی قید میں موجود تمام مسلمانوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ ۴۔ ضرورت کے وقت قیصر، مسلمانوں کو فوجی امداد دے گا۔

معاہدہ ہو جانے کے بعد الپ ارسلان نے قیصر کو قیمتی خلعتیں تحفے میں پیش کیں۔ دونوں سربراہان نے معانقہ کیا۔ قیصر اس حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے ہوئے بغداد کی طرف سر جھکا کر تین سلام کیے۔ گویا وہ خلافت بغداد کی اطاعت کا اظہار کر رہا تھا۔ الپ ارسلان خود ایک کوس تک، قیصر کے ساتھ گئے اور اسلامی فوج نے اپنی حفاظت میں، قیصر اور اس کے ساتھیوں کو رومی سرحد تک پہنچا دیا۔

اُدھر قیصر کی شکست کی خبر ملتے ہی روم کے پادریوں نے اعلان کر دیا کہ خداوند یسوع مسیح، قیصر سے ناراض ہیں اس لیے یہ شخص بادشاہت کا اہل نہیں رہا۔ اس پر سلطنت میں انقلاب برپا ہو گیا اور میکائیل ہفتم نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ قیصر روم رومانس دیوجانس جب الپ ارسلان سے رخصت ہو کر رومی علاقے میں داخل ہُوا تو اسے انقلاب کی خبر ملی۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی قیصر نے دو لاکھ دینار اور سونے کا ایک طبق جس میں نوّے ہزار دینار مالیت کے جواہر تھے، الپ ارسلان کی خدمت میں بھیجا اور معذرت کی کہ اس سے زیادہ میں ادا کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ رومانس کے اس طرز عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ الپ ارسلان کے حُسنِ سلوک سے وہ کس قدر متاثر ہوا تھا۔

الپ ارسلان کو جب یہ رقم اور سونے کا طبق موصول ہُوا تو انہوں نے چاہا کہ وہ رومانس کی مدد کریں اور اسے اس کی حکومت واپس دلائیں لیکن کچھ ہی دنوں میں اطلاع ملی کہ باغیوں نے رومانس کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا اور پھر قتل کر ڈالا۔ ابن اثیر کا بیان دیگر مؤرخین سے

Marfat.com

مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رومانس نے رہبانیت اختیار کرلی اور میکائل کو پیغام دیا کہ الپ ارسلان سے ان شرائط پر مشتمل معاہدہ ہُوا ہے تم چاہو تو اس پر قائم رہو اور چاہو تو مسترد کردو۔ میکائل نے اس معاہدے کو قبول کرلیا۔

ملاذ گرد کی اس تاریخی جنگ سے سلجوقی سلطنت کی حدود میں تو اضافہ نہ ہُوا لیکن مسلمانوں کی دھاک کُل عالم میں بیٹھ گئی۔ اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت کو اسلامی لشکر نے جس خوبی سے شکست دی، اس کو دیکھ کر بڑی بڑی طاقتیں لرزہ براندام تھیں۔ مسلمانوں کو بہت زیادہ مالِ غنیمت حاصل ہُوا۔ صرف باربرداری کی تین ہزار گاڑیاں ہاتھ آئیں، بہت سی منجنیقیں حاصل ہوئیں، جن میں سے ایک تو اتنی بڑی تھی کہ بارہ سو آدمی اس پر کام کرتے تھے اور یہ ایک سو بیس رطل (تقریباً تین من) کا پتھر پھینکتی تھی۔ بڑی مقدار میں اسلحہ ہر سپاہی کے حصے میں آیا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی فقید المثال کامیابی کی اطلاع جب بغداد پہنچی تو وہاں بھی خوشیاں منائی گئیں۔ خلیفہ نے بے حد مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے الپ ارسلان کی بیٹی سفری خاتون کے لیے اپنے بیٹے المقتدی بامر اللہ کا پیغام بھیجا۔ الپ ارسلان نے اسے خوشی سے قبول کرلیا۔ نیشاپور کے قریب نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔

الپ ارسلان کا ارادہ تھا کہ وہ ترکستان کے تمام علاقوں کو اسلامی مملکت میں شامل کریں اور پھر چین کا رخ کریں۔ چنانچہ وہ صفر ۴۶۵ھ / اکتوبر ۱۰۷۲ء میں دو لاکھ مجاہدین کا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ دریائے جیحون پہنچ کر کشتیوں کا پُل بندھوایا۔ پورے لشکر اور سازو سامان کو دریا پار پہنچانے میں بیس پچیس دن صَرف ہوگئے۔ لشکر نے قریر کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

الپ ارسلان کی زندگی کے دن باقی ہوتے تو شاید وہ بلادِ ترکستان کو تسخیر کرکے ایک وسیع علاقے کو اسلامی مملکت کا حصّہ بنانے میں کامیاب ہوجاتے، لیکن قدرت فیصلہ کرچکی تھی۔ قریر کے مقام پر ایک سرحدی قلعے کے محافظ نے الپ ارسلان پر حملہ کرکے انہیں شدید زخمی کردیا۔ اس محافظ کو موقع پر مار ڈالا گیا اور الپ ارسلان کو فوراً طبّی امداد فراہم کی گئی۔ لیکن زخم بے حد گہرا تھا۔ ۱۰ ربیع الاوّل ۴۶۵ھ / ۲۴ نومبر ۱۰۷۲ء کو اسلام کے اس عظیم اور جری سالار نے دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ ان کی میت مرو لے جائی گئی جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ انہوں نے چالیس یا پینتالیس سال کی عمر پائی۔

الپ ارسلان بلاشبہ اپنی شجاعت، قائدانہ صلاحیت اپنے عسکری نظام اور اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے اپنے عہد کے سب سے بڑے حکمران تھے۔ ایک وسیع اور مضبوط مملکت کے فرمانروا ہونے کے باوجود وہ بے حد منکسر المزاج، خلیق اور معتدل طبیعت کے انسان تھے۔ وہ انصاف کو پوری قوت سے نافذ کرنا پسند کرتے تھے اور اس معاملے میں کوئی نرمی انہیں گوارا نہ تھی۔ اگر کبھی انہیں شکایت موصول ہوتی کہ کسی سرکاری افسر نے کسی عام آدمی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو شکایت کی تحقیق کرواتے اور جرم ثابت ہونے پر متعلقہ افسر کو سخت سزا کا حکم دیتے۔ اس سختی کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی سرکاری افسر کو عوام کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

انتظامی امور میں سخت ہونے کے ساتھ ساتھ الپ ارسلان بے حد رقیق القلب اور نرم دل تھے۔ ان کے دفتر میں بے شمار محتاجوں کے نام درج تھے، جنھیں سرکاری خزانے سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ وہ جب بھی کسی مسکین یا محتاج کو دیکھتے تو آبدیدہ ہوجاتے تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔ ان کے مطبخ میں مساکین اور ناداروں کے لیے روزانہ پچاس بکریاں ذبح کی جاتی تھیں۔ رمضان المبارک میں وہ پندرہ ہزار دینار صدقہ کیا کرتے تھے۔

الپ ارسلان ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہیں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بہت عقیدت تھی۔ ۴۵۹ھ/ ۱۰۶۶ء میں انہیں اطلاع ملی کہ امام صاحب کا مزار خستہ حالت میں ہے، تو انہوں نے ابوسعد محمد بن منصور کو حکم دیا کہ امام صاحبؒ کی قبر پر ایک عظیم الشان گنبد تعمیر کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک اچھا مدرسہ تعمیر کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ مدرسے کی رسمِ افتتاح بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی اور یہ مدرسہ صدیوں تک کام کرتا رہا۔

***

Marfat.com

ملک شاہ سلجوقی

سلجوقی فرمانرواؤں کی کہکشاں کا سب سے درخشاں ستارہ

وہ ایک غریب بیوہ تھی!

اس کے چہرے پر رنج و الم کے سائے منڈلا رہے تھے اور آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔ رہ رہ کر وہ اپنے تین معصوم بچوں کی طرف دیکھتی اور اس خیال سے دل مسوس کر رہ جاتی کہ اب ان بچوں کے ساتھ گزر اوقات کیسے ہوگی۔ ایک گائے کے دودھ سے دو وقت کی روٹی میسر آجاتی تھی لیکن اب یہ آسرا بھی جاتا رہا تھا، اسے ابھی اطلاع ملی تھی کہ حاکم وقت کے سپاہیوں نے اس کی گائے کو لاوارث سمجھ کر ذبح کر ڈالا ہے اور اس کے گوشت کے کباب بنا کر کھا چکے ہیں۔

بیوہ بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی، پھر اس کی سسکیاں تھم گئیں۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔

صبح ہوئی اور آفتاب نے مشرق کی سمت سے اپنا تر و تازہ سرخ چہرہ نکال کر دنیا پر نگاہ ڈالی تو اس نے دیکھا کہ ایک غریب عورت اصفہان کے قریب بہنے والی مشہور نہر "زندرود" کے پل پر آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ وہ بار بار متلاشی نظروں سے ایک جانب دیکھتی۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ ہاں، اسے حکمرانِ وقت کا انتظار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سربراہِ مملکت کی سواری اس پل پر سے گزرنے والی ہے۔

اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ جلد ہی گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور کئی سپاہیوں کے جلو میں فرمانروائے وقت نمودار ہوئے۔ وہ ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار تھے۔ پل پر ایک عورت کو دیکھ کر انہوں نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کر لی لیکن عورت نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں غیظ و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اس نے صاف اور بلند آواز میں پوچھا۔

"بتاؤ تم انصاف نہر کے اس پل پر کرو گے یا پل صراط پر؟"

فرمانروائے مملکت چونک اٹھے۔ سوال ہی تھرا دینے والا تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آئے اور کہنے لگے: "اماں، پل صراط کی طاقت نہیں ہے۔ میں انصاف اس پل پر کروں گا، آپ بتایئے آپ کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے؟"

بیوہ نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حال بیان کر دیا۔ حکمرانِ وقت کے چہرے سے شرمندگی ہویدا تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ بیوہ کی گائے کو لاوارث سمجھ کر ذبح کر ڈالنے والے سپاہیوں کو حاضر کیا جائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ سپاہی حاضر کر دیے گئے۔ حکمرانِ وقت نے ان سپاہیوں کو سخت سرزنش کی۔ چونکہ یہ فعل لاعلمی میں سرزد ہوا تھا اس لیے ان سپاہیوں کو سخت سزا نہیں دی گئی، لیکن سربراہِ حکومت حکم دے رہے تھے کہ بیوہ عورت کو ستر گائیں دے دی جائیں۔

بیوہ عورت کو نہر زندرود کے پل پر انصاف میسر آچکا تھا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

یہ حکمراں تھے، دولتِ سلجوقیہ کے فرمانروا ملک شاہ سلجوقی جنہیں بجا طور پر سلجوقی عہد کا سب سے درخشاں ستارہ کہا جاسکتا ہے۔ آپ کا دورِ حکومت سلجوقیوں کا دورِ عروج تھا۔ آپ کی وسیع و عریض اسلامی حکومت ترکستان کے آخری شہر کاشغر سے بیت المقدس تک اور اناطولیہ سے لے کر بحیرۂ خزر (بحیرۂ کیسپیئن) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس مملکت میں ترکستان، ماوراء النہر، خوارزم، دہستان، خراسان، قہستان، مکران، کرمان، کردستان، موجودہ ترکی کا بڑا حصہ، شام، عراق، کویت، عمان اور حجاز کے علاقے شامل تھے۔

ملک شاہ سلجوقی ۱۹ جمادی الاول ۴۴۷ھ / ۱۶ اگست ۱۰۵۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام الپ ارسلان تھا، جو سلجوقی عہد کے

Marfat.com

دوسرے فرمانروا تھے۔ ملک شاہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ جس زمانے میں آپ کی پیدائش ہوئی تو طغرل بیگ محمد حکمراں تھے۔ طغرل بیگ، ملک شاہ کے دادا چغری بیگ کے سگے بھائی تھے۔ اس وقت طغرل بیگ نے چغری بیگ کو جیحون سے نیشاپور کے وسیع علاقے کی حکمرانی سونپ رکھی تھی۔ الپ ارسلان، چغری بیگ کے سب سے ے بیٹے تھے۔

چغری بیگ کا انتقال ۱۸ رجب ۴۵۱ھ / ۳۰ اگست ۱۰۵۹ء کو ہو۔ ان کے انتقال کے بعد طغرل بیگ نے، الپ ارسلان کو خراسان کا ر بنادیا۔ اس وقت ننھے ملک شاہ کی عمر چار سال تھی۔ الپ ارسلان نے اپنے پیارے بیٹے کے لیے اس قابل اور تجربہ کار شخصیت کا انتخاب جس کے سامنے وہ خود بھی زانوئے تلمذ تہ کر چکے تھے یعنی عہد سلجوقی کے نامور وزیر نظام الملک طوسی۔ یہ حقیقت ہے کہ سلجوقی دور کو عروج پہنچانے میں نظام الملک طوسی کا نہایت اہم کردار ہے۔ ملک شاہ نے نہ صرف نظام الملک طوسی بلکہ دیگر بلند پایہ علماکرام سے بھی تربیت پائی اور ت جلد عربی، فارسی اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ نظام الملک نے دینی و دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ، ملک شاہ کو فنونِ حرب سے بھی آراستہ کرنے کی پوری کوشش کی چنانچہ صرف دس سال عمر میں، ملک شاہ کو شہسواری، شمشیر زنی، تیر اندازی اور نیزہ بازی پر ر حاصل ہو چکا تھا۔

ملک شاہ کی تربیت کا سلسلہ آنے والے برسوں میں جاری رہا۔ جس اپنے والد الپ ارسلان کے ساتھ کئی جنگوں میں شرکت کا موقع ن دیا گیا۔ الپ ارسلان محرم ۴۵۶ھ / جنوری ۱۰۶۴ء میں پوری سلجوقی مملکت کے حکمراں بن گئے۔ ربیع الاول ۴۵۶ھ میں الپ ارسلان جہاد کی غرض سے روم کی سمت روانہ ہوئے۔ اس مہم میں ملک شاہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ نخچوان پہنچ کر الپ ارسلان مسیحی آرمینیا پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے، اور ملک شاہ کو انجاز (جارجیا) کی طرف روانہ کیا جہاں مسیحی حکمراں تھے۔ نظام الملک بھی ان کے ساتھ تھے۔ ملک شاہ نے کم عمری کے باوجود زبردست کارنامے انجام دیے۔ ان کی ایک کامیابی کا ذکر تاریخی کتب میں خاص طور پر کیا جاتا ہے اور وہ قلعہ مریم مقدس کی تسخیر۔

یہ نہایت مضبوط قلعہ تھا، اس کے چاروں طرف وسیع اور گہری خندق تھی جس میں پانی بھرا تھا۔ سلجوقی فوج نے کشتیوں کے ذریعہ اس خندق کو عبور کرلیا اور قلعہ پر ٹوٹ پڑی، بڑی زبردست لڑائی ہوئی لیکن مسیحی سپاہ اپنی جگہ مضبوطی سے جمی رہی۔ اس موقع پر قدرت کی مدد پہنچی اور شدید آندھی آگئی، پھر زلزلہ آیا اور اس کی وجہ سے قلعہ کی فصیل کا مشرقی حصہ منہدم ہوگیا۔ آندھی کا زور ٹوٹتے ہی، مسلم فوج فصیل کے ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر داخل ہوگئی اور قلعے پر قبضہ ہوگیا۔

اس مہم کے بعد ملک شاہ اپنے والد کے ساتھ مسیحی آرمینیا کے خلاف جنگ میں شریک ہوگئے اور کئی معرکوں میں آپ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔

دس ربیع الاول ۴۶۵ھ / ۲۴ نومبر ۱۰۷۲ء کو الپ ارسلان کی شہادت کے بعد بارِ حکومت ملک شاہ کے کندھوں پر ڈالا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ مملکت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد انہیں سلطان العادل، جلال الدولہ اور ابوالفتح کے القاب دیے گئے۔

ملک شاہ کے والد الپ ارسلان نے قبل ازیں اپنی زندگی میں ملازگرد کی جنگ میں قیصر روم، رومانوس دیوجانس کو شکست فاش دی تھی جس کے بعد رومانوس ان کا مطیع اور فرمانبردار بن گیا تھا۔ لیکن رومی پادریوں نے مشہور کر دیا کہ رومانوس بادشاہت کے لائق نہیں ہے اس لیے رومی سلطنت پر میکائل ہفتم نے قبضہ کرلیا اور قیصر روم کا اعزاز اب میکائل کے پاس آگیا۔ ملک شاہ کے حکمراں بننے کے بعد میکائل نے سرکشی دکھانا شروع کردی۔ اس نے فوج تیار کی اور ایران میں داخل ہوگیا۔

ملک شاہ کو دشمن کی یلغار کی خبر مل چکی تھی، انہوں نے فوری طور پر جہاد کا حکم جاری کردیا۔ بجلی کی سی پھرتی سے فوج تیار کی اور رومی لشکر کے مقابل پہنچے۔ یہ فاصلہ انہوں نے چند دنوں میں طے کیا۔ عام حالات میں یہ سفر ہفتوں میں مکمل ہوتا تھا۔ قیصر کو توقع نہ تھی کہ اسلامی لشکر اتنی جلد مقابلے کے لیے آ پہنچے گا۔ وہ مسلمانوں کی شجاعت اور بے خوفی سے بڑا مرعوب ہوا۔ اس نے اطاعت کی باتیں شروع کردیں۔ ملک شاہ کی تمام شرائط تسلیم کرلیں اور اپنی فوج سمیت واپس چلا گیا۔

سلجوقی حکمرانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے خلافت کے احترام کو قائم رکھا اور برسراقتدار آنے کے بعد ہمیشہ خلیفۃ المسلمین سے اپنے اقتدار کی سند حاصل کی۔ ملک شاہ نے بھی صفر ۴۶۶ھ / اکتوبر ۱۰۷۳ء میں ایک سفارت بغداد روانہ کی جس نے خلیفہ سے ملاقات کی۔ ایک شاندار تقریب میں خلیفہ نے ملک شاہ کی حکومت

Marfat.com

کو سند عطا کی اور ملک شاہ کو یمین امیر المومنین کا لقب دیا۔ اس کے بعد بغداد، عراق عرب و عجم، ایران، ماوراء النہر شام، حرمین اور بیت المقدس میں ملک شاہ کا نام بھی جمعے کے خطبے میں شامل کر دیا گیا۔

۴۶۶ھ / ۱۰۷۴ء میں ملک شاہ نے سمرقند اور ترمذ پر اپنا اقتدار بحال کیا۔ آپ کے والد الپ ارسلان کے دور میں ان کے ایک جرنیل اتسز بن اوق نے شام اور فلسطین کے بیشتر علاقے فتح کر لیے تھے۔ ملک شاہ کے حکمراں بننے کے بعد رمضان ۴۶۷ھ / اپریل ۱۰۷۵ء میں اتسز نے دمشق کو بھی تسخیر کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ شعبان ۴۶۸ھ / مارچ ۱۰۷۶ء میں اتسز نے ایک بار پھر دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ دو یا تین ماہ بعد شہر والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور دمشق میں بھی خلیفہ مقتدی عباسی کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ بعد میں ملک شاہ کے حکم پر تاج الدولہ تتش بن الپ ارسلان کو شام کا والی مقرر کر دیا گیا۔

بعد کے برسوں میں ملک شاہ نے سمرقند کی بغاوت کو فرو کیا، موصل فتح کیا اور دیگر کچھ شورشوں کا خاتمہ کیا۔ ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ء میں ملک شاہ کے چچا سلیمان بن قتلمش نے انطاکیہ کو تسخیر کیا جہاں مسیحی بادشاہ فردوروس حکمراں تھا۔ اس کے بعد ملک شاہ کے فرستادہ فخر الدولہ نے میافارقین اور جزیرہ ابنِ عمر پر قبضہ کر لیا، پھر ملک شاہ خود ایک فوج لے کر حلب فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے، قسیم الدولہ آقسنقر ان کے ساتھ تھے۔ آقسنقر کے بیٹے عماد الدین زنگی اور پوتے نور الدین زنگی نے تاریخ میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ حران کے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد الرہا، قلعہ جعبر، منبج فتح ہوئے پھر حلب بھی آسانی سے تسخیر ہو گیا۔ شیزر اور دیگر قلعوں کے والیوں نے آکر خود اطاعت کا اظہار کیا۔

ذی الحجہ ۴۷۹ھ / مارچ ۱۰۸۷ء میں ملک شاہ نے پہلی بار بغداد جا کر خلیفہ المقتدی بامر اللہ سے ملاقات کی۔ انہوں نے خلیفہ کا بڑا احترام کیا۔ قیامِ بغداد کے دوران ملک شاہ حضرت امام موسیٰ رضاؒ، حضرت معروف کرخیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مزاروں پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔ ۴۸۲ھ / ۱۰۸۹ء میں ملک شاہ نے سمرقند میں اٹھنے والی تیسری بغاوت کا خاتمہ کیا۔ سمرقند جاتے ہوئے راستے کے شہر بھی فتح ہو گئے۔ ان میں بخارا کا عظیم شہر بھی شامل تھا اس کے بعد کاشغر والے بھی مطیع ہو گئے۔

۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء میں حمص، عرقہ، افامیہ کی تسخیر کے بعد ملک شاہ کی فوج طرابلس الشام کی طرف بڑھی اور اسے بھی فتح کر لیا۔ اسی اثنا میں ایک فرقے کا ظہور ہوا جو باطنی فرقہ کہلاتا تھا۔ اس فرقے نے بہت طاقت حاصل کر لی اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ ملک شاہ نے اس فرقے کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۳ شوال ۴۸۵ھ / ۶ نومبر ۱۰۹۲ء کو ملک شاہ شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ بغداد اور تکریت کے درمیان شکار کھیلتے ہوئے انہیں شدید بخار آ گیا۔ کہتے ہیں کہ حمیٰ محرقہ یا معویہ (ٹائیفائیڈ) ہو گیا تھا۔ انہیں بغداد لا کر علاج کرنے کی بڑی کوشش کی گئی لیکن ۱۵ شوال ۴۸۵ھ / ۱۸ نومبر ۱۰۹۲ء کو یہ عظیم اور لائق حکمران اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ان کی عمر ۳۸ سال چند ماہ تھی، انہوں نے بیس سال حکومت کی۔

ملک شاہ نے تین یا چار شادیاں کیں۔ ان کی وفات کے وقت ان کے چار بیٹے برکیارق، محمد، سنجر اور محمود موجود تھے۔ ان میں سے سنجر نے بعد میں زمام حکومت سنبھالی۔ ملک شاہ کی ایک صاحبزادی کی شادی عباسی خلیفہ المقتدی بامر اللہ سے ہوئی تھی۔

ملک شاہ کو ملک العادل کا خطاب بھی دیا گیا ہے جو ان کے عدل و انصاف سے بھرپور دورِ حکومت کا آئینہ دار ہے۔ ملک شاہ صاحبِ علم حکمراں تھے، اچھا علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ علماکرام اور علم پرور شخصیات کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق ملک شاہ کو عربی اور فارسی نظم و نثر پر کمال کی قدرت حاصل تھی۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے۔ سوءِ اتفاق سے ان کا سارا کلام زمانے کے نشیب و فراز کی نذر ہو گیا۔ ملک شاہ نے ایک سفر نامہ بھی لکھا تھا جو "رسالہ ملک شاہی" کہلاتا ہے۔ وہ فنِ خطاطی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور خطِ نستعلیق اور خطِ رقاع میں انہیں استاد تسلیم کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے عہد میں فارسی اور عربی علم و ادب کو فروغ دینے کی بڑی کوشش کی۔ ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان کے دورِ حکومت میں عالمگیر شہرت کی حامل کئی کتب تصنیف کی گئیں۔ ان کتابوں میں نظام الملک طوسی کی سیاست نامہ، ابو روح محمد بن منصور جرجانی کی نور العیون، طغرائی کی لامیۃ العجم، امام الحرمین جوینیؒ کی کتاب البرہان اور کئی دیگر کتابیں شامل ہیں۔

ملک شاہ سلجوقی کی علم دوستی اور علم نوازی کا یہ نتیجہ نکلا کہ کل عالم اسلام کی اہلِ علم شخصیات اور ماہرین فن سمٹ کر سلجوقی دارالحکومت میں جمع ہو گئے تھے۔ ملک شاہ بھی ان تمام اہلِ علم و فن کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہر فن اور شعبے کے ماہرین کو باری باری اپنے

Marfat.com

پاس مدعو کرتے تھے اور ان سے ان کے شعبے اور متعلقہ موضوعات پر تفصیلی گفتگو کیا کرتے۔ ان میں علم و ادب، شعر و سخن، تاریخ، جغرافیہ، نجوم، ہندسہ، فلسفہ، منطق غرض ہر شعبے کے ماہرین شامل تھے۔ ملک شاہ کے دور میں تدریس اور تعلیم کو بہت ترقی دی گئی، چنانچہ اس دور نے عالم اسلام کو بڑے بڑے اہل کمال عطا کیے۔ علامہ ابو اسحاق شیرازیؒ فقہ، حدیث اور علم کلام کے امام تھے۔ ابو المعالی امام الحرمین جوینیؒ بہت بڑے عالم تھے۔ دیگر علما کرام میں شیخ ابو علی فارمذیؒ، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہرویؒ، امام غزالیؒ، علامہ ذکی مازریؒ، خواجہ نظام الملک طوسی، عمر خیام، شمس الائمہ سرخسیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

ریاضی و ہیئت کے مشہور عالم عمر خیام نے ملک شاہ کی ہدایت پر ایک نئی تقویم تیار کی تھی۔ اس سے پہلے ملک میں خرچ تو قمری مہینوں کے مطابق ہوتا تھا لیکن آمدنی شمسی سال کے اعتبار سے وصول کی جاتی تھی۔ اس طرح غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں۔ ملک شاہ نے علما اور فقہا سے ایک نئے سنہ کے جواز کا فتویٰ حاصل کرنے کے بعد عمر خیام کے ذریعے نئی تقویم تیار کروائی۔ یہ کام ذی الحجہ ۴۶۷ھ / جولائی ۱۰۷۵ء میں شروع ہوا اور ۴۷۱ھ / ۱۰۷۹ء میں مکمل ہوا۔ عمر خیام نے نئی تقویم کا نام جلال الدولہ ملک شاہ سلجوقی کے نام پر تقویم جلالی رکھا اور ایک جنتری "زیچ ملک شاہی" کے نام سے تیار کی۔ دس رمضان المبارک ۴۷۱ھ / ۱۲ مارچ ۱۰۷۹ء سے پوری مملکت سلجوقیہ میں سنہ جلالی رائج کر دیا گیا۔ یہ تقویم بہتر تھی لیکن یہ زیادہ عرصے رائج نہ رہ سکی۔

جلال الدولہ ملک شاہ سلجوقی کھلے ذہن کے مالک اور دین اسلام کی آفاقیت کے پوری طرح قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سلجوقی قلمرو کو کسی ایک فقہی مسلک کے حصار میں قید کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ وہ خود حنفی مسلک کے مقلد تھے لیکن ان کے قابل وزیر نظام الملک طوسی شافعی مسلک کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے دور میں بہت سے شافعی علما تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ غیر مسلموں سے بھی ملک شاہ نے کبھی تنگ نظری پر مبنی یا متعصبانہ سلوک نہ کیا۔ وہ اچھی نصیحت قبول کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتے تھے۔ ان ہی کی فرمائش پر خواجہ نظام الملک طوسی نے مشہور زمانہ کتاب "سیاست نامہ" تحریر کی جس میں ملک شاہ کے دور کے حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ماضی کے ادوار کی تصویر بھی پیش کی گئی تھی اور جابجا پند و نصائح سے کام لیا گیا تھا۔

ملک شاہ کا ایک اور کارنامہ حجاج کرام کے لیے سہولتوں کی فراہمی ہے۔ ۴۸۱ھ / ۱۰۸۹ء میں جب وہ خود حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے تو کوفہ اور سبعیہ (وادی السباع) سے گزرنے کے بعد واقصہ کے مقام پر انہیں بتایا گیا کہ اس علاقے میں پانی کی شدید قلت ہے اور زمین اس قدر سخت ہے کہ کنواں کھودنا بہت مشکل ہے۔ ملک شاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ اخراجات کی پروا کیے بغیر یہاں ایک بڑا کنواں کھودا جائے۔ چنانچہ پندرہ مربع گز کا ایک بڑا کنواں کھودا گیا جس کی گہرائی چار سو گز تھی۔ اس کنویں کا نام "چاہ قودن" رکھا گیا۔ غالباً یہ کنواں ملک شاہ سلجوقی کے غلام "قودن" کی نگرانی میں تعمیر ہوا تھا۔

چاہ قودن کے علاوہ بھی ملک شاہ نے مکہ معظمہ کو جانے والے راستے میں کئی کنویں، تالاب اور حوض بنوائے اور پرانے کنووں اور حوضوں کی مرمت کروائی۔ حاجیوں کے لیے کئی سرائیں تعمیر کروائیں۔ علامہ ابن اثیر کے مطابق ملک شاہ نے حجاج کو پیش آنے والی بیشتر مشکلات دور کر دیں۔ راستے میں رہزنی کا خطرہ رہتا تھا۔ ملک شاہ نے راستوں کو بالکل پُر امن بنا دیا۔ اب قافلے بلا خوف و خطر سفر کیا کرتے تھے کیونکہ شاہراہوں پر حفاظتی دستوں کی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ ملک شاہ نے مکہ معظمہ آنے والوں پر عائد محصول بھی ختم کروا دیا۔ اپنے سفر حج میں انہوں نے لاکھوں دینار صدقہ کیے۔

ملک شاہ کے دورِ حکومت میں مملکت کو بڑی وسعت حاصل ہوئی اور بڑے علاقے پر سلجوقی حکومت کا اقتدار قائم ہو گیا۔ ان کے والد الپ ارسلان اور ان سے قبل طغرل بیگ محمد کے دور میں صورتحال یہ تھی کہ مملکت تین حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک قسم کے علاقے مکمل طور پر خود مختار تھے لیکن وہ سلجوقی حکمراں کو اپنا سربراہ مانتے تھے۔ مثلاً مرو اور ہرات وغیرہ۔ دوسری قسم کے علاقے وہ تھے جو داخلی طور پر خود مختار تھے، لیکن وہ دوسرے ممالک سے اپنے طور پر تعلقات قائم نہ کر سکتے تھے۔ یہ علاقے باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے، ان میں کردستان، آذر بائیجان، خوزستان وغیرہ شامل تھے۔ تیسری قسم کے علاقوں پر سلجوقی فرمانروا کا براہِ راست اقتدار قائم تھا۔ مثلاً نیشاپور، رے، ہمدان اور زنجان وغیرہ۔

ملک شاہ جب برسر اقتدار آئے تو اصفہان، رے، ہمدان، زنجان، شمالی قہستان، خراسان، عراق وغیرہ براہِ راست ان کی حکمرانی میں آ گئے۔ ملک شاہ نے اپنا دار الحکومت اصفہان کو بنایا۔ موسم سرما کا

Marfat.com

دارالحکومت بغداد تھا۔ ان کی وسیع و عریض قلمرو کی آمدنی کے بارے میں مؤرخین کا خیال ہے کہ کروڑوں دینار تھی۔ اس میں مختلف ریاستوں اور علاقوں سے آنے والا خراج، زمینوں کی مالگزاری (کُل پیداوار کا چوتھایا پانچواں حصہ) اور جنگوں سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ شامل تھا۔ تجارتی اشیا کی برآمد اور درآمد پر محصول سے بھی آمدنی ہو سکتی تھی لیکن ملک شاہ نے یہ محصول ختم کر دیا تھا۔ یہ ایک دانشمندانہ اقدام تھا کیونکہ اس کے نتیجے میں تجارت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور رعایا خوشحال ہو گئی۔

ملک شاہ کے عہد میں امورِ مملکت انجام دینے کے لیے کئی شعبے قائم تھے۔ ان میں سب سے اہم "دیوانِ وزارت" تھا جس کے سربراہ، وزیر السلطنت یا وزیراعظم کہلاتے تھے۔ ملک شاہ کے دور میں یہ منصب نظام الملک طوسی کو حاصل رہا۔ اس شعبے کے سربراہ کے پاس وسیع اختیارات تھے۔ مملکت کی تمام آمدنی اور اخراجات کا حساب کتاب "دیوان الاستیفا" کے سپرد تھا۔ ایک اور محکمہ "دیون الانشاؤ الطغرا" کہلاتا تھا۔ اس عہدے پر بہت لائق اور صاحبِ علم شخص کو مقرر کیا جاتا تھا۔ کاتب تمام سرکاری احکام اپنے ہاتھ سے تحریر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ فوجوں کی دیکھ بھال کے لیے "دیوان الجند"، معاشرے کو بدعنوانیوں سے پاک رکھنے کے لیے "دیوانِ احتساب"، جرائم کی روک تھام اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے "دیوانِ الشرطہ"، عدل و انصاف کی فراہمی کے لیے "دیوانِ قضا" اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے لیے "دیوانِ اوقاف" قائم تھا۔

ملک میں پیش آنے والے اہم واقعات کی روداد سربراہِ مملکت کے سامنے پیش کرنے کی ذمے داری، حاجب کے سپرد تھی۔ یہ بڑا اعلیٰ عہدہ تھا۔ اس کے بعد "امیر حرس" کا منصب تھا جس کا کام سزاؤں کو نافذ کرنا تھا۔ ملک شاہ کی بے حد طویل و عریض مملکت کی حفاظت کے لیے ایک زبردست فوج تشکیل دی گئی تھی۔ اس فوج میں چار لاکھ سپاہی شامل تھے۔ جہاد کے موقع پر مزید ہزاروں رضاکار فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔

سلجوقی عہد میں صنعت و حرفت کو بھی زبردست فروغ حاصل ہوا۔ ملک شاہ کے زمانے میں بغداد میں اعلیٰ قسم کی باریک ریشم، کمخواب، زربفت اور مخمل تیار ہوتا تھا۔ یہ کپڑے یورپ کی منڈیوں کو برآمد کیے جاتے تھے۔ قالین بافی کا کام بھی اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا۔ سلجوقیوں ہی نے مغربی ایشیا کو گرہ دار بافت کے قالینوں سے متعارف کروایا۔ ملک شاہ کے دور میں کاغذ کی صنعت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح علم کی اشاعت میں بھی تیزی آ گئی۔ اس عہد میں منقش اور رنگین ظروف تیار کرنے کے فن کو بڑی ترقی دی گئی۔ کانسی، تانبے اور دیگر دھاتوں کے بہت خوبصورت برتن تیار ہونے لگے۔ چینی کے نہایت نفیس برتن بھی بنائے جانے لگے تھے۔ ظروف سازی کا کام رے، کاشان، موصل، حلب، بغداد، اصفہان اور دمشق میں بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔

ملک شاہ سلجوقی نے پوری مملکت میں تمام دریاؤں، نہروں اور ندی نالوں پر حسبِ ضرورت مضبوط پل تعمیر کروائے، نہروں کا جال بچھایا۔ تعمیرات کے ضمن میں عظیم خدمات انجام دیں۔ لاتعداد سرائیں، مدرسے، شفاخانے، پل، قلعے، یادگار مینار، مساجد اور دینی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اصفہان اور بغداد میں کئی عظیم الشان مساجد بنوائی گئی تھیں لیکن یہ مساجد زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ سلجوقی جو عمارتیں بناتے تھے وہ نہایت بھاری بھرکم اور مضبوط ہوتی تھیں اور ان سے وقار جھلکتا تھا۔ ان کے دور میں مساجد نمایاں ترین مقامات پر تعمیر کی جاتی تھیں۔ یہ مساجد قدرے بلندی پر بنائی جاتی تھیں، ان کے مخروطی گنبد بہت شاندار ہوتے تھے اور ان مساجد پر نقاشی اور خطاطی بہت دلکش ہوتی تھی۔

ملک شاہ کی تعمیرات میں سے اصفہان کی جامع مسجد اب بھی موجود ہے، گو کہ اس کی اصل صورت میں خاصی ترمیم کی جا چکی ہے لیکن اس کا ایک دروازہ اپنی اصل شکل میں ابھی تک قائم ہے۔ اس کی بلندی ایک سو اسی فٹ ہے اور اس پر نہایت عمدہ کام کیا گیا ہے۔ ملک شاہ نے بغداد میں بھی ایک شاندار مسجد "جامع سلطان" کے نام سے تعمیر کروائی۔

ملک شاہ کے دور میں مدرسوں کی عمارتیں عام طور پر دو منزلہ اور وسیع ہوتی تھیں۔ دارالحکومت اصفہان میں بھی نہایت پُرشکوہ عمارتیں تعمیر کروائی گئیں۔ ملک شاہ کے دور کے قلعے تبرک اور وژکوہ آج بھی موجود ہیں۔ انہوں نے اصفہان اور دیگر علاقوں میں بہت خوبصورت باغات بھی لگوائے تھے۔

•••

Marfat.com

سنجر سلجوقی

نیک، بُردبار، ذہین و شجیع حکمراں جن کا دور علمی ترقی کے لحاظ سے یادگار ہے

چیدہ چیدہ امرا دربار میں موجود تھے۔

سربراہِ مملکت سادہ لباس زیب تن کیے، تخت پر وقار کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ان تک شکایت پہنچائی گئی تھی کہ مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے مدرّس نے، امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ کے خلاف بے جا تنقید کی ہے۔ یہ مدرس کوئی معمولی بزرگ نہ تھے، بہت بڑے مفکر، فقیہ، فلسفی اور محقق تھے۔ ان کی ذاتِ گرامی پر اس قسم کے الزام کی تحقیق ضروری تھی۔

سربراہِ حکومت نے حکم دیا کہ ان بزرگ کو ہمارا پیغام پہنچایا جائے کہ وہ دارالحکومت تشریف لے آئیں۔ پیغام پہنچا دیا گیا۔ بزرگ تشریف لے آئے۔ وقتِ مقررہ پر سربراہ مملکت دربار میں نمودار ہوئے اور تخت پر متمکن ہوگئے۔ وزیر نے اطلاع دی کہ بزرگ تشریف لے آئے ہیں۔ وہ گئے اور بزرگ کو عزت کے ساتھ لے کر حکمرانِ وقت کے سامنے لے آئے۔ بغداد سے خوارزم تک پھیلی ہوئی وسیع مملکت کے فرمانروا، بزرگ کی تعظیم کے لیے خود اٹھے، آگے بڑھ کر انہیں اپنے تخت پر بٹھایا۔

بزرگ نے ایک طویل تقریر کی اس کے بعد فرمایا کہ مجھے دو باتیں دربار میں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ "طوس کے لوگ بدانتظامی اور ظلم کا شکار ہیں اس پر سردی اور قحط کی وجہ سے ان کی پریشان حالی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ان پر رحم کیجیے۔ اللہ آپ پر رحم کرے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے وزیر فخر الملک نے یہاں آنے کے لیے مجھ سے اصرار کیا تھا۔ میرے بارے میں مشہور کیا گیا ہے کہ میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کی ہے، یہ غلط ہے۔ میں امام ابو حنیفہؒ کو فن فقہ میں انتخابِ روزگار سمجھتا ہوں۔"

یہ جراَت مندانہ خطاب سن کر دربار میں سناٹا طاری ہوگیا۔ اس سکوت کو سربراہِ مملکت کی آواز نے ختم کیا جو کہہ رہے تھے، "آج عراق و خراسان کے تمام علما یہاں ہوتے تو سب لوگ آپ کے کلام سے استفادہ کرتے، تاہم یہ حالات آپ اپنے ہاتھ سے قلم بند فرمائیں تا کہ ان کی تشہیر ملک بھر میں ہو۔ آپ کو درس کی خدمت ضرور قبول کرنی ہوگی۔ میں حکم دوں گا کہ تمام علما کرام سال میں ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں اور اپنے مسائل کے حل کے لیے آپ سے رجوع کریں۔"

یہ حکمراں تھے عظیم سلجوقی فرمانروا، سنجر سلجوقی جنہوں نے اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و مجتہد حضرت امام غزالیؒ سے استفادہ کرنا تمام علما کرام کے لیے لازمی قرار دیا تھا۔ سنجر سلجوقی کا طویل دور امن واستحکام اور علمی ترقی کے لحاظ سے مثالی دور ہے۔ وہ اپنے دور میں "سلطان اعظم" کہلاتے تھے اور ان کی گوناگوں خوبیوں اور ان کے درخشاں کارناموں کے پیشِ نظر، یہ خطاب ان کے لیے بے جا نہیں۔

سنجر رجب ۴۷۹ھ / اکتوبر ۱۰۸۶ء میں شمالی عراق کے مشہور شہر سنجار میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر موصل سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ اسی شہر کی مناسبت سے ان کا نام سنجر رکھا گیا۔ سنجر جب چھ برس کے ہوئے تو اپنے والد ملک شاہ سلجوقی کے سائے سے محروم ہوگئے۔ ملک شاہ سلجوقی کی وفات صرف سلجوقی مملکت ہی نہیں بلکہ کل عالم اسلام کے لیے بہت بڑا نقصان ثابت ہوئی۔ ملک شاہ نے اپنے غیر معمولی حسنِ انتظام کے ذریعے ایک ایسی مملکت میں امن واستحکام قائم کر رکھا تھا جس کا رقبہ کم وبیش پندرہ ہزار مربع میل تھا۔ یہ مسلم دنیا کے اوج کمال کا عہد تھا۔ شمالی اندلس میں یوسف بن تاشفین نے مسیحیوں کو

Marfat.com

شکست دے دی تھی۔ برصغیر میں ابراہیم غزنوی نے لاہور اور ملتان تک کے علاقوں میں اسلامی مملکت قائم رکھی۔ ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے رومیوں کی کوشش ناکام ہوچکی تھیں۔ ان حالات میں یورپ کو شدید خوف تھا کہ مسلمان کہیں یورپ پر چڑھائی نہ کردیں۔ اسی لیے یورپ نے متحد ہوکر فلسطین پر یلغار کردی اور صلیبی جنگوں کی ابتدا ہوئی۔

اگر سلجوقی حکمراں متحد ہوتے تو شاید مسیحی لشکر کو اتنی جرأت نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے، ملک شاہ سلجوقی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین کا مسئلہ تنازعے کا باعث بن گیا۔ ملک شاہ کے چار بیٹے تھے۔ برکیارق، محمد، سنجر اور محمود۔ ان میں سے سب سے بڑے برکیارق تھے۔ ملک شاہ بھی ان ہی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے اور سلجوقی امرا کی بھی یہی خواہش تھی لیکن ملک شاہ کی ایک بیوی ترکان خاتون اپنے بیٹے محمود کو سربراہ بنانے کی آرزومند تھی، حالانکہ محمود کی عمر اس وقت صرف چار برس تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برکیارق نے رے میں اور محمود نے اصفہان میں تخت سنبھال لیا۔ اس صورت حال کے باعث ملک شاہ کے بھائی بھی قیادت کا دعویٰ کرنے کے لیے، تاہم ملک شاہ کی بیوہ ترکان خاتون، ملک شاہ کے بھائیوں اور بیٹے محمود کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ اب ملک شاہ کے دو بیٹوں برکیارق اور محمد میں ٹھن گئی۔ تاہم پانچ برس بعد ۴۹۷ھ / ۱۱۰۳ء میں دونوں کے درمیان صلح ہوگئی اور مملکت دو حصوں میں بٹ گئی۔ بغداد اور اس کے مشرق کے علاقے، برکیارق اور موصل، جزیرہ، دیار بکر اور شام، محمد کے حصے میں آئے۔

صلح کے صرف ایک سال بعد ربیع الثانی ۴۹۸ھ / دسمبر ۱۱۰۴ء میں برکیارق کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد محمد، پوری سلجوقی سلطنت کے حکمراں تسلیم کرلیے گئے۔ لیکن اس طویل عرصے میں عالمی نقشہ پر کئی تبدیلیاں عمل میں آچکی تھیں۔ مسیحی بیت المقدس پر قبضہ کرچکے تھے۔ ساحل شام اور فلسطین پر مسیحی پرچم لہرا رہا تھا اور جنوبی حصوں میں الرہا اور انطاکیہ کی مسیحی ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ ادھر ایشیائے کوچک میں سلجوقی حکمرانوں نے خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ دوسرا خطرہ داخلی تھا یعنی مملکت میں باطنی فرقے کے لوگ زور پکڑ گئے تھے۔ یہ ملحدانہ عقائد رکھنے والے دہشت گرد تھے۔

بارہ برس کی اس خانہ جنگی میں سنجر نے عملاً حصہ نہ لیا البتہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۴۹۰ھ / ۱۰۹۷ء میں ہوچکا تھا، جب ان کے بھائی برکیارق نے انہیں خراسان اور مشرقی صوبوں کا والی مقرر کیا تھا۔ سنجر نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر اسی وقت سے دکھانے شروع کردیے تھے اور یہ ان ہی کی سیاسی تدابیر کا نتیجہ تھا کہ ایسے وقت جبکہ مملکت کے اطراف میں خطرات منڈلا رہے تھے اور مملکت کے اندر باطنیوں کا فتنہ عروج پر تھا، رے، نیشاپور، ہرات، مرو، بلخ، بخارا، سمرقند اور خوارزم میں امن تھا اور یہاں تیزی سے علمی اور تمدنی ترقی ہورہی تھی۔

محمد نے ۱۳ سال حکومت کی، وہ بہت نیک اور نفیس حکمراں تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں باطنیوں کی بیخ کنی پر بھرپور توجہ دی تھی۔ گوکہ وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئے، لیکن ان کی کوششوں سے باطنیوں کے کئی قلعے فتح کیے گئے۔ ذی الحجہ ۵۱۱ھ / اپریل ۱۱۱۸ء میں محمد کا انتقال ہوگیا۔ محمد اور سنجر میں بہت محبت تھی اس لیے محمد نے اپنے بیٹے محمود کو سنجر کی اطاعت کرنے کی وصیت کی تھی۔ محمد کی وفات کے بعد محمود نے اصفہان میں اقتدار سنبھالا۔ مغربی ایران، عراق، جزیرہ (دجلہ اور فرات کا درمیانی شمالی علاقہ) پر محمود کی حکمرانی تھی اور مشرقی حصے یعنی خراسان اور ترکستان کے امورِ مملکت کی نگرانی محمود کے چچا سنجر کررہے تھے۔ انہوں نے اپنا دارالحکومت مرو کو بنایا تھا۔ کچھ عرصے بعد محمود نے سرکشی اختیار کی اور ان سے کچھ بے قاعدگیاں سرزد ہوئیں تو سنجر نے آگے بڑھ کر ان سے حکومت چھین لی۔ لیکن سنجر کی والدہ نے اس پر ناخوشی کا اظہار کیا جس کے بعد سنجر نے محمود کو اپنا نائب مقرر کردیا اور حکم دیا کہ پوری مملکتِ سلجوقیہ میں جہاں جہاں خطبہ پڑھا جائے وہاں خطبے میں سنجر کے نام کے بعد محمود کا نام بھی لیا جائے۔ سنجر کا کوئی بیٹا نہ تھا، وہ محمود سے بہت محبت کرتے تھے۔

سنجر نے ۶۱ برس حکومت کی۔ پہلے بیس برس اپنے بھائیوں برکیارق اور محمد کے مقرر کردہ حاکم کی حیثیت سے فرائض انجام دیے اور آخر کے ۴۱ برس خودمختار حاکم کی حیثیت سے بسر کیے۔ اس دوران انہوں نے ۱۹ جنگیں لڑیں اور دو کے سوا سب میں کامیابی حاصل کی۔ سنجر نے پہلا بڑا کارنامہ اپنے بھائی محمد کے دور حکومت میں انجام دیا۔ ۵۱۰ھ / ۱۱۱۶ء میں انہوں نے غزنی کی ریاست پر حملہ کیا۔ اس زمانے میں وہاں غور کے لوگ حکمراں تھے۔ سنجر نے غوریوں کو شکست دی اور بہرام شاہ غزنوی کا اقتدار بحال کردیا۔ اس مہم میں غزنی کا بہت بڑا خزانہ سنجر کے ہاتھ لگا جس میں پانچ بیش قیمت تاج بھی تھے، جن میں سے ہر

Marfat.com

ایک کی قیمت دو لاکھ دینار تھی۔ سترہ تخت سونے چاندی کے تھے اور جوہرات سے مرصع تیرہ سو زیورات ان کے علاوہ تھے۔ اس فتح کے بعد غزنی کی حکومت سلجوقی سلطنت کی باج گزار بن گئی۔ یہ ایسی کامیابی تھی کہ اس سے قبل کسی سلجوقی حکمراں کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس کامیابی کے نتیجہ میں طبقاتِ ناصری کے مطابق، غزنی اور غزنوی مقبوضات یعنی پاکستان میں لاہور اور ملتان کے علاقوں میں سنجر کا خطبہ اور سکہ رائج ہوا۔

جب سنجر خود مختار حکمراں بنے تو انہوں نے سب سے پہلے باطنی فتنے کی طرف توجہ دی۔ یہ لوگ عباسی خلافت کے سخت دشمن تھے اور کئی برسوں سے ہنگاموں اور شورو شر میں مصروف تھے۔ چوتھی صدی ہجری میں کعبۃ اللہ میں حاجیوں کو شہید کر چکے تھے۔ ایک بار حجر اسود اٹھا لے گئے تھے۔ پاکستان کے علاقے میں ملتان اور منصورہ پر قبضہ کر چکے تھے۔ انہوں نے افغانستان میں غور کے قبائل کو اپنے گمراہ کن عقائد قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اصفہان میں ان کی ایسی دہشت پھیل گئی تھی کہ اگر کوئی شخص مقررہ وقت پر گھر نہ آتا تو سمجھ لیا جاتا کہ باطنی دہشت گرد اسے اٹھا لے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے مغربی ایران سے شام تک کے علاقے کے دشوار گزار پہاڑوں میں پچاس قلعے بنا رکھے تھے۔ ان میں ستر ہزار باطنی فدائی چھپے رہتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مرکز 'قلعہ الموت' کہلاتا تھا۔ باطنی تحریک کا بانی اور باطنیوں کا قائد حسن بن صباح تھا۔

سنجر نے جب اقتدار سنبھالا تو باطنی، قلعہ الموت میں بدستور سرگرم تھے۔ سنجر کے بھائی محمد نے باطنیوں کے بہت سے قلعے تسخیر کر لیے تھے اور قلعہ الموت کا بھی محاصرہ کر لیا تھا، لیکن اسی عرصے میں محمد کا انتقال ہو گیا اور یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ سنجر نے حکمراں بننے کے بعد فیصلہ کیا کہ قلعے کا پھر محاصرہ کیا جائے چنانچہ اس فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔ اسی دوران ایک دن سنجر نے اپنے خیمے میں اپنے بستر کے قریب ایک خنجر زمین میں گڑا دیکھا جس کے ساتھ ایک رقعہ منسلک تھا، رقعہ میں لکھا تھا۔

"اے سنجر، اگر تمہاری رعایت منظور نہ ہوتی تو اس سخت زمین میں خنجر پیوست کرنے کی بجائے تمہارے نرم سینے میں یہ خنجر گاڑ دینا زیادہ آسان تھا۔"

سنجر نے یہ خط پڑھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کی فوج اور خدام میں باطنی فدائین موجود تھے۔ ان کالی بھیڑوں کے ہوتے ہوئے باطنیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ خنجر کے ساتھ جو خط تھا اس میں صلح کی خواہش بھی ظاہر کی گئی تھی چنانچہ سنجر نے مناسب سمجھا کہ مصالحت کر لی جائے جو مندرجہ ذیل شرائط پر ہوئی۔

1۔ باطنی اپنے قلعوں میں کسی نئی فوجی عمارت کا اضافہ نہ کریں گے۔

2۔ نیا اسلحہ اور منجنیقیں نہ خریدیں گے۔

3۔ کوئی نیا شخص مرید نہیں بنایا جائے گا۔

اس مصالحت کے بعد حسن بن صباح کا بھی ۵۱۸ھ / ۱۱۲۴ء میں انتقال ہو گیا اور سنجر کے بقیہ دور حکومت میں باطنی، خاصی حد تک پُرسکون رہے۔

سنجر کی ایک اہم کامیابی غور کے کوہستانی علاقے کی فتح ہے۔ جب غور کی سلطنت علاؤالدین حسین کو حاصل ہوئی تو انہوں نے سنجر کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ہرات اور چشت کے درمیانی علاقے "اوبہ" میں سنجر اور علاؤالدین کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ غوریوں کو شکست ہوئی۔ علاؤالدین قیدی بنا لیے گئے، لیکن سنجر نے انہیں جلد رہا کر کے اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ سنجر کی ایک اور کامیابی ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء میں سمرقند کے حاکم احمد بن سلیمان کی بغاوت کا خاتمہ ہے۔ ایک اور خونریز جنگ سنجر کے بھتیجے مسعود کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دینور کے قریب ۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء میں لڑی گئی۔ ۵۳۵ھ / ۱۱۴۰ء میں سمرقند کے حاکم نے پھر بغاوت کی تو سنجر نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا، لیکن حاکم سمرقند احمد خان فالج کا شکار ہو کر وفات پا گئے تو شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ سنجر نے احمد خان کے لڑکے کو حاکم بنا دیا۔ ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء تک سنجر کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر حکومت کرتے رہے لیکن پھر قرہ خطائیوں کی جانب سے انہیں ایک بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔

سنجر کے دورِ حکومت میں نیم وحشی قرہ خطائیوں کا ایک گروہ چین سے ترکستان پہنچا اور سنجر سے وہاں بس جانے کی درخواست کی۔ سنجر نے انہیں بلا ساغون، قیالق اور المالق میں چراگاہیں بنانے کی اجازت دے دی۔ قرہ خطائیوں کی نسل بڑھی اور پھر وہ دن آیا کہ انہوں نے سرکشی پر کمر باندھ لی۔ ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء میں لاکھوں قرہ خطائیوں نے ماوراء النہر (وسط ایشیا) پر حملہ کر دیا۔ سمرقند کے شمال میں صحرائے قطوان میں سنجر کی فوج اور قرہ خطائی صف آرا ہوئے۔ ایک خوفناک جنگ ہوئی جس میں سنجر کی فوج کے تیس ہزار سپاہی کام آئے۔ سنجر کی بیوی بھی قیدی بنا

Marfat.com

لی گئیں اور ماوراالنہر کا علاقہ قرہ خطائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سنجر نے ترمذ اور پھر بلخ میں پناہ لی۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر خوارزم کے والی اتسز نے بھی بغاوت کر دی اور انہوں نے مرو، سرخس اور خراسان کے کئی مقامات میں تباہی پھیلائی۔

سنجر نے بہت ہوش مندی اور پامردی کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کیا اور جلد ہی صورتحال پر قابو پالیا۔ اتسز کو بھی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا اور قرہ خطائیوں کا فتنہ بھی دب گیا، لیکن بارہ برس بعد یعنی ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں سنجر کو قرہ خطائیوں سے بھی بڑے خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی ابتدا بہت معمولی سی بات ہوئی۔ نو مسلم غز ترکمانوں کے چالیس ہزار خاندان، ختلان اور بلخ کی حدود میں مقیم تھے۔ وہ ہر سال ۲۴ ہزار بکریاں بطور خراج، سنجر کو دیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک اہلکار نے زیادہ بکریاں طلب کیں، جو ظاہر ہے کہ زیادتی تھی۔ تلخی پیدا ہوئی اور غزوں نے اس اہلکار کو مار ڈالا۔ اس اہلکار کے افسر نے کچھ عرصے بعد بلخ کے والی قماج سے اس بات کا ذکر کیا۔ قماج نے سنجر کو یہ بات جا کر بتائی اور مطالبہ کیا کہ غزوں سے خراج وصول کرنے کا منصب مجھے دیا جائے۔ سنجر نے قماج کو افسر محاصل بنا دیا۔ قماج نے بلخ جا کر غزوں سے بکریاں طلب کیں تو غزوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ ہمارا اور سنجر کا معاملہ ہے۔ اس پر بات بڑھ گئی اور لڑائی میں قماج اور اس کا لڑکا مارے گئے۔

سنجر کو اطلاع ملی تو ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں انہوں نے غزوں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ غزوں کو خبر ملی تو وہ بہت گھبرائے اور اپنا ہرکارہ بھیجا کہ ہم ایک لاکھ دینار اور سو غلام دینے کے لیے تیار ہیں۔ سنجر یہ پیشکش قبول کر لینا چاہتے تھے مگر ان کے مشیروں نے مخالفت کی۔ سنجر نے لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جب لشکر غزوں کے علاقے کے قریب پہنچا تو غزوں کے نمائندے آئے، انہوں نے اطاعت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ ہم ہر گھر سے ایک من چاندی دیں گے۔ سنجر کو غزوں پر رحم آگیا لیکن سنجر کے مشیروں نے پھر مخالفت کی اور زور دیا کہ نرمی کرنے سے غز زیادہ سرکش ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سنجر نے جنگ کا حکم دے دیا۔ سنجر کی فوج ان کے مشیروں سے کچھ ناراض تھی چنانچہ وہ جم کر نہ لڑ سکی۔ غز اب تو یوں بھی مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ انہوں نے مرو، نیشاپور اور خراسان کے دیگر شہروں کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ سنجر کو ان کی اہلیہ سمیت قید کر لیا گیا۔

اس زمانے میں بھی سنجر کی ہیبت اور سیاسی قوت کا یہ عالم تھا کہ غز، رات میں تو سنجر کو لوہے کے پنجرے میں قید رکھتے تھے لیکن دن کا اجالا پھیلتے ہی وہ سنجر کو تخت پر بٹھا دیتے تھے۔ اس حالت میں سنجر، غزوں کی بات ماننے اور ان کی پسند کے احکام پر دستخط کرنے پر مجبور تھے۔ اس طرح چار سال گزر گئے۔ آخر ۵۵۱ھ / ۱۱۵۶ء میں سنجر کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اب سنجر نے اپنے ایک امیر احمد قماج کو لکھا کہ کسی بھی طریقے سے دریائے جیحوں کے کنارے ایک کشتی پہنچا دو۔ دوسری طرف سنجر نے غزوں سے جیحوں کے کنارے شکار کھیلنے کی خواہش ظاہر کی۔ غز پہرے میں انہیں شکار کے لیے جیحوں کے کنارے لے گئے۔ شکار کے دوران احمد قماج تیزی سے آئے اور سنجر کو غزوں کے نرغے سے نکال کر لے گئے۔ انہیں کشتی میں بٹھا کر قلعہ ترمذ پہنچا دیا جہاں ان کے بعض وفادار ساتھی ان سے آملے۔

یہاں سے سنجر مرو گئے۔ لیکن چار سال کے عرصے میں حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ غزوں نے مرو کو جس بے دردی سے لوٹا تھا اسے دیکھ کر سنجر کو سخت صدمہ پہنچا کیونکہ سلجوقی مملکت کی آبیاری کے لیے انہوں نے پچاس ساٹھ برس تک سخت محنت کی تھی۔ اس صدمے سے وہ بیمار پڑ گئے اور ۲۵ ربیع الاول ۵۵۲ھ / ۷ مئی ۱۱۵۷ء کو اس عظیم حکمران نے مرو میں اپنی زندگی کا سفر مکمل کر لیا۔ انہیں مرو ہی میں ایک مقبرے میں سپرد خاک کیا گیا جو انہوں نے خود بنوایا تھا۔

سنجر کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بارہ سال تک خانہ جنگیوں، باطنیوں کے داخلی فسادات اور بیت المقدس پر صلیبی یلغار کے باوجود مملکت کے بڑے حصے کو پارہ پارہ ہونے سے بچالیا اور مزید پچاس برس تک اسے ایک مرکز پر متحد اور مستحکم رکھا۔ اگرچہ ایشیائے کوچک پر سلجوقی مرکز کا اختیار ختم ہو گیا، شام کے ساحلی اور فلسطین کے علاقوں پر مسیحیوں نے قبضہ کر لیا تھا، لیکن پھر بھی سلجوقی مملکت اس وقت کی سب سے بڑی مملکت تھی اور بعد کی اسلامی تاریخ میں عثمانی ترکوں کے سوا کوئی اتنی بڑی مملکت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سنجر کے زیر انتظام مملکت میں موجودہ افغانستان، روسی ترکستان (افغانستان اور ایران کے شمال میں روس کا وہ علاقہ جہاں ازبکستان، سمرقند، بخارا، خوارزم، ترکمانستان واقع ہیں) پورا ایران، عراق، آذربائیجان (جس میں روسی اور ایرانی دونوں آذربائیجان شامل ہیں)، جارجیا، آرمینیا اور حجاز اور مشرقی ترکی کا کچھ حصہ شامل تھا۔ بغداد سے

Marfat.com

خوارزم تک پھیلی ہوئی اس وسیع و عریض مملکت کا رقبہ تقریباً بارہ لاکھ مربع میل تھا۔

اگرچہ ایشیائے کوچک میں خود مختار سلجوقی ریاست قائم ہو گئی تھی، لیکن یہ خود مختار سلجوقی ریاست اور خود ملک شاہ اور سنجر کی وسیع مملکت، مسیحی یلغار کے سامنے بہت مضبوط بند ثابت ہوئیں۔ ان کی وجہ سے یورپ مجبور ہوا کہ اپنے صلیبی لشکر ایشیائے کوچک کے راستے بھیجنے کی بجائے سمندر کے راستے بھیجے۔ اگر سنجر کمال ہوشیاری اور حکمت سے سلجوقی مملکت کو مستحکم اور متحد نہ بناتے تو عین ممکن تھا کہ مسیحی یلغار کا رخ دمشق سے بغداد اور پھر خراسان کی طرف ہو جاتا۔

سنجر کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کئی ایسے علاقوں کو ترقی دی جو ابھی تک پس ماندہ تھے۔ ان میں سے ایک کرمان کا علاقہ ہے۔ سنجر کے دور میں کرمان کی رونق دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کرمان کے صرف ایک شہر سیر جان میں، جو دارالحکومت بردسیر (موجودہ کرمان) کے بعد دوسرا بڑا شہر تھا، ۴۵ مساجد تھیں۔ سنجر نے کردستان کو بھی ترقی دی۔ یہ نیا صوبہ انہوں نے جبال سے الگ کر کے بنایا تھا اور اپنے بھتیجے سلیمان شاہ کو کردستان کا حاکم مقرر کیا تھا۔

سلیمان شاہ نے کردستان کو خوب ترقی دی۔ ان کے دور میں کردستان کا مالیہ بیس لاکھ دینار تھا۔ سنجر نے آذربائیجان کے شہروں اردبیل، مراغہ اور تبریز کو بھی بہت ترقی دی۔ سنجر کے مقرر کردہ سلجوقی وزیر شمس الدین محمد ایلدگز اور ان کے جانشینوں نے تبریز کو علم و ادب کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

سنجر کے عہد میں نیشاپور بہت بڑا شہر بن گیا تھا۔ اس کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جغرافیہ داں یاقوت حموی نے ساتویں صدی ہجری میں جب نیشاپور کو دیکھا تو انہوں نے بتایا کہ ۵۴۰ھ / ۱۱۴۵ء میں زبردست زلزلے اور ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں غزوں کے ہاتھوں شدید بربادی کے باوجود انہوں نے پورے خراسان میں نیشاپور سے بہتر شہر نہ دیکھا۔ یہاں کے باغات کے میوے مشہور تھے۔ غزوں کی تباہ کاریوں کی وجہ سے قریب ہی ایک اور بستی شادیاخ کے نام سے بسائی گئی تھی۔ سنجر کے وفادار غلام المؤید نے اس شہر کو وسیع کر کے اس کے گرد فصیل بنوائی تھی۔

سنجر کے عہد میں سب سے زیادہ شاندار شہر مرو تھا، جسے انہوں نے اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ شہر کے چاروں طرف نہریں بہتی تھیں اور باغات اور ہریالی کی کثرت تھی۔ یہاں ریشمی کپڑے کی صنعت عروج پر تھی۔ دریائے مرغاب پر کئی بند تعمیر کیے گئے تھے تاکہ آبپاشی ہو سکے۔ مرو کے کتب خانوں نے تو عالمی شہرت حاصل کی۔ چھٹی صدی ہجری کے نصف اوّل یعنی سنجر کے عہد کے علما کی فہرست پر نظر ڈالیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ ان علما کرام کی بڑی تعداد یا تو مرو کی رہنے والی تھی یا یہاں آکر آباد ہو گئی تھی۔

سلجوقیوں کا نظامِ حکومت کچھ اس طرح کا تھا کہ حکمران خاندان کے تمام والیانِ عہد کو کسی نہ کسی علاقے کی حکومت دی جاتی تھی تاکہ ان کی صلاحیتیں نکھریں۔ اس دور میں قابل اور لائق غلاموں کو بھی مختلف علاقوں کا حاکم بنا دیا جاتا تھا۔ یہ غلام اتابک کہلاتے تھے، البتہ اس سلسلے میں روایت یہ پڑ گئی تھی کہ ان غلاموں کی آئندہ نسلیں بھی ان علاقوں پر حکومت کرتی رہتی تھیں۔ یہ حکومتیں، مرکزی سلجوقی حکومت کی مطیع تھیں تاہم بڑی حد تک خود مختار تھیں۔

اس نظام کے تمدنی فوائد تو ہوئے لیکن سیاسی لحاظ سے یہ نظام نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ آہستہ آہستہ مختلف علاقوں کے امرا اپنے اختیارات میں اضافہ چاہنے لگے اور ان علاقوں پر مرکز کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ تاہم اس لحاظ سے سلجوقیوں کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں میں ایسے نہایت اہل اور باصلاحیت اتابکوں (غلاموں) کو حکومت دی جن کی نسلوں نے آگے چل کر بہت مستحکم حکومتیں قائم کیں، مثلاً، آذربائیجان میں اتابکانِ ایلدگز کی حکومت ۵۳۱ھ / ۱۱۳۶ء سے ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء تک قائم رہی۔ اس حکومت کا صدر مقام مشہور شہر تبریز تھا۔ سنجر نے فارس میں اپنے اتابک سلغر کو حکومت دی تھی۔ انہوں نے حکومت سلغریہ قائم کی جو ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء تا ۶۸۲ھ / ۱۲۸۴ء قائم رہی۔ اس حکومت کا صدر مقام شیراز تھا۔ اس خاندان میں کئی اچھے حکمران گزرے جن میں سعد بن زنگی اور ابو بکر بن سعد قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح مشہور حکمران نورالدین زنگی اتابکان موصل میں سے تھے۔

سنجر کے عہد میں تعمیرات کے بارے میں تاریخ کی کتب زیادہ تر خاموش ہیں، البتہ طبقاتِ ناصری کے مطابق بغداد میں سنجر کے نام پر کئی عالی شان رہائشی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ مرو میں سنجر سلجوقی نے اپنے لیے مقبرہ تعمیر کروایا تھا، جسے اب ترکستان میں اسلامی فنِ تعمیر کی سب سے قدیم اور تاریخی اہمیت کی عمارت سمجھا

Marfat.com

جاتا ہے۔ یہ مقبرہ فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ مشہور جغرافیہ داں یاقوت حموی ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء میں یہاں آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سنجر کی قبر ایک بڑی عمارت میں تھی۔ مقبرے کے دو گنبد تھے۔ بیرونی گنبد جو، اب گر چکا ہے، اس قدر بلند تھا کہ ایک دن کی مسافت سے نظر آنے لگتا تھا۔ اس پر فیروزی رنگ کا کاشی کا کام تھا۔ اب جو گنبد رہ گیا ہے وہ اندرونی حصے سے متعلق ہے، اس کی بلندی ۳۶ میٹر اور قطر ۱۶ میٹر ہے۔ وسط ایشیا میں اس سے بڑا گنبد صرف خواجہ احمد یسیوی کے مقبرے کا ہے جو ۷۶۱ھ / ۱۳۶۰ء میں تیمور کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔

یاقوت حموی نے بتایا کہ بڑے گنبد سے متصل جامع مسجد تھی۔ گنبد کے نیچے دیواروں کی کھڑکیاں جامع مسجد کی سمت کھلتی تھیں۔ مرو سے دو فرسخ (چھ میل) کے فاصلے پر "اندرانہ" کے گاؤں میں سنجر کے محل کے کھنڈرات ساتویں صدی ہجری / ۱۳ ویں صدی عیسوی تک نظر آتے تھے۔ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں منگولوں نے مرو کو لوٹ کر یہاں کے کتب خانے جلا ڈالے اور سنجر کے مقبرے اور قریب کی مساجد اور عمارتوں کو بھی نذر آتش کر دیا۔ سنجر نے اپنے ایک غلام شمس الدین ایلد کز کو آذربائیجان میں حکمران مقرر کیا تھا۔ انہوں نے نخجوان میں ایک منفرد عمارت تعمیر کروائی جس کے آٹھ پہلو تھے اور اوپر ایک وسطی گنبد تھا۔ عمارت کے آٹھوں پہلوؤں پر خط کوفی میں نقش و نگار تھے۔

سنجر کے دور کا سب سے تابناک پہلو وہ علمی ترقی ہے جس نے نہ صرف عالم اسلام کی فکری رہنمائی کی بلکہ یورپ اور دیگر مغربی دنیا پر بھی اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں علم وادب کے ہر شعبے میں ایسی باکمال شخصیات ابھر کر سامنے آئیں کہ جن کی مثال نہیں ملتی۔ اس عہد میں بڑی تعداد میں ایسی مفید ونایاب کتب تصنیف کی گئیں جنہوں نے زبردست انقلاب برپا کیا۔

سنجر کے عہد کی سب سے ممتاز علمی شخصیت امام غزالیؒ کی ہے۔ وہ نہ صرف بہت بڑے مفکر، فلسفی، بلند مرتبت فقیہ، صوفی، مصنف اور محقق تھے بلکہ مجتہد، مصلح اور مجدّد بھی تھے۔ امام غزالیؒ نے تقلید پرستی کی برائی کو نشانہ بنایا اور بڑھتے ہوئے اخلاقی انحطاط پر کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے فلسفہ کو عام فہم بنا کر پیش کیا اور یونانی فلسفے کا بھرپور جواب دیا۔ امام غزالیؒ کی سب سے مشہور کتاب احیاء العلوم ہے جو سنجر ہی کے دور میں لکھی گئی۔ ان کی کتب کی تعداد ۷۸ کے قریب ہے۔ امام صاحب کے ایک ہزار شاگرد تھے اور سب نے نام پیدا کیا۔ اس مضمون کے آغاز میں بیان کیے گئے واقعہ سے ظاہر ہے کہ سنجر امام غزالیؒ کے کتنے معتقد تھے۔

سنجر ہی کے دور میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (۴۷۰ھ / ۱۰۷۸ء۔ ۵۵۶ھ / ۱۱۶۱ء) بغداد میں اصلاحی خطبات دینے میں مصروف تھے۔ انہوں نے ان خطبات کا آغاز ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء میں کیا۔ یہ خطبات "فتوح الغیب" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس زمانے میں سنجر کے مقرر کردہ محمود سلجوقی، عراق کے حاکم تھے۔

سنجر کے دور کے ایک اور بہت بڑے بزرگ علامہ زمخشری تھے۔ اس کا نام ابوالقاسم محمود بن عمر تھا۔ انہوں نے زندگی کا خاصا عرصہ مکہ مکرمہ میں بسر کیا تھا اس لیے جار اللہ (اللہ کے ہمسائے) مشہور ہو گئے۔ اپنے دور کے بہت قابل عالم تھے۔ علم تفسیر، حدیث، لسانیات، صرف و نحو، اور علم معانی میں سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے ۵۲۸ھ / ۱۱۳۳ء میں قرآن کریم کی بہترین تفسیر مکمل کی جو "کشاف" کے نام سے مشہور ہے۔ "کتاب المفصل" کے نام سے عربی اور فارسی کی لغت مرتب کی۔ ایک لغت جغرافیہ کی ترتیب دی جس کا نام ہے "کتاب الامکنہ والجبال والما"۔ علامہ زمخشری نے ۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء میں وفات پائی۔

سنجر ہی کے عہد کے ایک اور مشہور عالم الشہرستانی ہیں جن کا پورا نام ابوالفتح محمد بن ابوالقاسم ہے۔ وہ خراسان کے ایک قصبے میں ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء میں پیدا ہوئے، ۵۱۰ھ / ۱۱۱۶ء میں بغداد گئے اور تین برس تک مدرسہ نظامیہ میں درس دیا۔ انہوں نے دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ "الملل والنحل" کے عنوان سے پانچ حصوں میں لکھی، انہوں نے تاریخ الحکما بھی لکھی۔

علامہ زمخشری کے ہم عصروں میں ابوالقاسم محمود بن عزیز العریضی بھی تھے، جو عربی علم وادب اور فلسفے کے بڑے عالم تھے۔ علامہ زمخشری کے ایک شاگرد زین المشائخ تھے جن کا انتقال ۵۶۲ھ / ۱۱۶۷ء میں ہوا۔ وہ عربی زبان وادب پر سند تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھی۔

سنجر کے عہد کے ایک اور عالم راغب اصفہانی ہیں جن کا انتقال ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء میں ہوا۔ وہ قرآن مجید کی ایک لغت کے مرتب ہیں۔ "کتاب المفردات فی غریب القرآن" کے عنوان سے یہ لغت

Marfat.com

آج تک نہایت مستند سمجھی جاتی ہے۔ اسی عہد کے ایک بڑے عالم، علامہ ابن جوزیؒ ۵۰۸ / ۱۱۱۴ء میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپؒ بڑے مفسر، محدث، مؤرخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں۔ آپؒ کی تالیف کردہ کتب کی تعداد ایک ہزار ہے۔ آپؒ کے ہاتھ پر بیس ہزار افراد نے اسلام قبول کیا۔

سنجر کے عہد میں جن دیگر اہل علم حضرات نے گراں قدر علمی خدمات انجام دیں ان میں ابو سعد سمعانی بہت نمایاں ہیں۔ مرو سے تعلق تھا۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "کتاب الانساب" ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اہم اور مفید تاریخی اور جغرافیائی معلومات کا خزانہ ہے۔ سمعانی نے ۵۲ کتب تصنیف کیں۔ ان میں بیس جلدوں پر مشتمل تاریخ مرو بھی شامل تھی۔

سنجر ہی کے عہد کی ایک شخصیت عمر خیام کی ہے جو یوں تو اپنی رباعیوں کی وجہ سے آج بھی دنیا بھر میں مشہور ہیں لیکن دراصل وہ بہت لائق ہیئت دان، ریاضی کے ماہر اور فلسفی تھے۔ انہوں نے علم ریاضی میں مستقل اضافہ کیا۔ ایک تقویم تیار کی۔ سنجر کے والد ملک شاہ سلجوقی کے کہنے پر ایک زیچ (ستاروں کی فہرست جس میں ستاروں کا مقام، رنگت اور چمک وغیرہ درج کی جاتی ہے) تیار کی۔ وہ سنجر کے عہد میں بھی اکثر مرو جاتے رہتے تھے اور سنجر کے وزرا اُسے ملتے تھے۔ زیچ ملک شاہی کے سلسلے میں جن سات افراد کو عمر خیام کی مشاورت کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان میں ایک خواہ ابو حاتم المظفر الفزاری تھے۔ مرو میں عمر خیام ان ہی کے مہمان ہوتے تھے۔ ابو حاتم نے ریاضی میں کئی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے سنجر کے لیے "میزان ارشمیدس" کے نام سے ایک انوکھی ترازو تیار کی تھی، جس کی مدد سے چاندی اور سونے کا کھوٹ معلوم کیا جاسکتا تھا۔ اس ترازو کو سرکاری خزانے کے مہتمم نے توڑ دیا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں کوئی خیانت ظاہر نہ ہو جائے۔ ابو حاتم کو اپنی محنت ضائع ہونے کا اتنا دکھ ہوا کہ وہ اس صدمے سے بیمار ہو کر جلد ہی انتقال کر گئے۔ سنجر کو ابوالفتح ابن کوشک سے بہت عقیدت تھی۔ وہ اچھے سائنس دان تھے۔ ان کی کتابیں سنجر کے کتب خانے میں موجود تھیں۔

ایک بہت قابل سائنس دان ابوالفتح عبدالرحمٰن خازنی تھے، جنہوں نے سنجر کے لیے "زیچ سنجری" تیاری کی تھی۔ یہ زیچ اب برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ خازنی، ارمنی غلام تھے۔ علم ہندسہ کے ماہر تھے۔ انہوں نے "میزان الحکمت" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ ابوالحسن بیہقی طب، ریاضی اور علم نجوم کے ماہر تھے۔ ۵۶۵ھ / ۱۱۷۰ میں انتقال ہوا۔ زیادہ تر مرو، نیشاپور اور رے میں رہے۔ ان کی شہرت کا سبب "تاریخ حکمائے اسلام" کی تصنیف ہے۔

سنجر کے دور میں اصطرلاب (ایسے آلات جو فلکی تحقیق میں بہت کام آتے ہیں) بنانے کے سب سے بڑے ماہر، ابوالقاسم حبتہ اللہ بدلیع الزماں اصطرلابی تھے جو اصفہان اور بغداد میں رہتے تھے۔ ۵۲۳ھ / ۱۱۲۹ء میں بغداد میں انتقال کیا۔ سنجر کے دور میں اشیاء کا وزن کرنے سے متعلق اہم رسالے، ابو حاتم فزاری، عمر خیام اور خازنی نے لکھے۔ محمد بن احمد الخراقی (وفات: ۵۳۲ھ / ۱۱۳۸ء) مرو کے رہنے والے تھے۔ بہت اچھے ریاضی دان، ہیئت دان اور جغرافیہ کے ماہر تھے۔ کئی کتابیں لکھیں ان میں سے ایک میں ابن ہیثم کے نظریات کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا۔

"ذخیرۂ خوارزم شاہی" کے نام سے ایک بہت مفید کتاب ۵۰۹ھ / ۱۱۱۵ء میں اسمٰعیل جرجانی نے سنجر کے مقرر کردہ سلجوقی حاکم خوارزم، قطب الدین کے لیے لکھی۔ یہ فارسی زبان کا پہلا طبّی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس میں ساڑھے چار لاکھ الفاظ ہیں۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

اس دور میں عربی اور فارسی نثر میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ سنجر کے عہد کے ممتاز ترین ادیب ابو محمد القاسم الحریری ہیں (۴۴۶ھ / ۱۰۵۴ء تا ۵۱۶ھ / ۱۱۲۲ء)۔ انہوں نے کتاب "مقامات" تصنیف کی جو عربی انشا پردازی کا عظیم شاہکار ہے۔ ابن حمدون بغدادی (۴۹۵ھ / ۱۱۰۲ء تا ۵۶۲ھ / ۱۱۶۷ء) کی "کتاب التذکرہ" بھی عربی ادب کی معروف کتاب ہے۔ یہ کتاب ۱۲ جلدوں میں ہے اور تاریخی ادبی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ غزنی میں سنجر کے مقرر کردہ حاکم بہرام شاہ غزنوی کے حکم سے مشہور کہانی 'کلیلہ و دمنہ' کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ ترجمہ نصر اللہ نے عربی سے کیا۔ اسی دور میں مشہور ادیب و شاعر، نظامی عروضی سمرقندی نے کتاب چہار مقالہ لکھی اور نامور شاعر رشید وطواط نے فن شاعری پر فارسی نثر کی مشہور کتاب "حدائق السحر" تصنیف کی۔

سنجر کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ ان کے دور میں بڑے شعرا کے نام ملتے ہیں۔ ان کے دربار سے چار سو شعراُ وابستہ تھے۔ ان میں سب سے مشہور نام انوری کا ہے جو فارسی قصیدے کے سب سے

Marfat.com

بڑے شاعر ہیں۔ وہ ریاضی اور نجوم میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء میں بلخ میں وفات پائی۔ سنجر کے دربار کے ملک الشعرا معزی تھے۔ نظامی گنجوی فارسی کے سب سے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ پانچ عمدہ مثنویوں کے خالق ہیں۔ اسی دور میں خاقانی کا نام ابھرتا ہے جو ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں تبریز میں انتقال کر گئے۔ وہ بھی فارسی کے عظیم شاعر تھے۔

سنجر کے عہد کے شعرا میں ایک بہت معتبر اور قابل احترام نام خواجہ فرید الدین عطارؒ کا ہے۔ نیشا پور کے رہنے والے تھے، عطاری اور طباعت ان کا پیشہ تھا۔ سنجر کے انتقال کے وقت عطارؒ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ انہوں نے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں۔ تذکرۃ اولیا کے نام سے فقرا کا تذکرہ بھی لکھا۔ ایک اور شاعر سنائی غزنوی تھے، جنہوں نے ۵۲۵ھ / ۱۱۳۱ء میں انتقال کیا۔ وہ ایران کے نامور عارفوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ سنجر کے دور میں خواتین بھی شاعری سے لگاؤ رکھتی تھیں۔ چنانچہ ایک شاعرہ "مہستی" تو سنجر کی ادبی محافل میں بھی شریک ہوتی تھیں۔

سنجر ذاتی لحاظ سے بہت دیندار، شریعت کے پابند، علم دوست، متحمل مزاج اور بہادر انسان تھے۔ وہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ان کے دور میں شریعت پر عمل کیا جاتا تھا۔ وہ بہت سادہ مزاج تھے اور سادہ لباس زیب تن کیا کرتے تھے، تاہم اپنے دربار کے دبدبے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ عالموں اور اہل فن کے بہت قدردان تھے اور دل کھول کر ان کو مراعات دیا کرتے تھے، ان کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ انہیں سائنسی ترقی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ سنجر بے حد دریادل تھے اور ادبی شہ پاروں یا اچھے اشعار پر فیاضی سے انعام دیا کرتے تھے۔

سنجر کی طبیعت میں رواداری اور درگزر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خوارزم میں برکیارق نے سنجر کے مشورے سے ایک غلام انوشتگین کے بیٹے قطب الدین محمد کو حکمراں مقرر کیا تھا۔ قطب الدین کے بعد ان کے بیٹے مظفر الدین اتسز حکمراں بنے۔ اتسز نے ایک مہم میں سنجر کے قتل کی سازش کو ناکام بنادیا تھا۔ اس پر سنجر، اتسز کے ہمیشہ احسان مند رہے، حتیٰ کہ بعد میں اتسز نے کئی بار سنجر کے خلاف بغاوت کی، ایک بار لشکر لے کر لڑنے بھی آئے، پھر معافی طلب کی اور ہر بار سنجر نے انہیں معاف کر دیا اور ان کی زیادتیوں سے درگزر کرتے رہے۔ سنجر کے تحمل اور درگزر کے ایسے کئی واقعات ملتے ہیں۔

سنجر بے حد جری اور جرأت آزما سالار بھی تھے۔ ایک مہم میں جب وہ باغیوں کے لشکر کے پاس پہنچ گئے تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ فوج کم ہے۔ وہ اسی کم فوج کی مدد سے بہادری سے لڑے اور باغیوں کو شکست دی۔

تاریخ، سنجر کا ذکر ہمیشہ، ایک اچھے، علم دوست، شجیع و ہوشمند حکمراں کے طور پر کرے گی۔

•••

Marfat.com

رشید الدّین

بلند پایہ عالم، مؤرخ، طبیب، اعلیٰ منتظم، ایلخانی دور کے نامور وزیر اعظم

کتاب کی نقل تیار ہو چکی تھی۔

یہ دور چھاپہ خانوں کا نہ تھا۔ کتابوں کی حفاظت کے لیے قلمی نقول تیار کی جاتی تھیں۔ اس کتاب کی نقل بے حد احتیاط سے تیار کی گئی تھی۔ کاتب کا انتخاب بہت سے کاتبوں کو پرکھنے کے بعد کیا گیا تھا۔ اس کاتب نے کئی دن کی محنت کے بعد کتاب کی نقل تیار کرلی تھی۔ یہ قلمی نسخہ بڑے نفیس کاغذ پر تھا۔ اب اسے جلد بندی اور تزئین کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

جِلد بندی اور تزئین کے بعد، کتاب کے مصنف کو مطلع کر دیا گیا کہ کتاب کی نقل تیار ہے۔

مصنف اپنے احباب کے ساتھ مسجد تشریف لائے۔ کتاب کی مجلد و مزین نقل پیش کی گئی۔ اس کتاب کو مسجد کے منبر اور محراب کے درمیان، ایک رحل پر رکھ دیا گیا۔

تمام حاضرین کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے اور مسجد کی پُرسکون فضا میں یہ دعائیہ کلمات گونجنے لگے:

"اے اللہ، اے بھیدوں کے کھولنے والے، اے تاریخ و روایات کا علم بخشنے والے، تونے اپنے بندے کو جو تیری وسیع رحمت کا حاجت مند ہے، ان کتابوں کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائی جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو تقویت دینے والی تحقیقات اور حکمتوں اور (قدرت کے) قوانین کی توضیحات پر مشتمل ہیں، صنعتوں کی ایجادات پر غور کرنے والوں کے لیے مفید ہیں، مخلوقات کی عجیب وغریب باتوں پر فکر کرنے والوں کے لیے منفعت بخش ہیں۔ تونے اسے یہ توفیق بھی دی کہ نجی املاک کا کچھ حصہ وقف کردے کہ اس کی آمدنی سے ان کتابوں کے نسخے تیار کیے جائیں کہ تمام ملکوں کے مسلمان کل زمانوں میں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اے اللہ! اس عاجز بندے کی جملہ مساعی کو مشکور کر، اس کے گناہ بخش دے، اس کارِ خیر میں کوشش کرنے والوں اور ان کے پڑھنے اور ان پر عمل کرنے والوں کی مغفرت فرما اور اس بندے کو دنیا اور آخرت میں نیکی عطا فرما۔ بے شک تجھ ہی سے ڈرنا مناسب ہے اور تو ہی بخشش کرنے کا اہل ہے۔"

دعا ختم ہوئی۔ اب کتاب شہر کے قاضی کو پیش کر دی گئی۔ قاضی صاحب نے کتاب کو بغور پڑھا اور تصدیق کی کہ کتاب تمام معیّنہ ضوابط پر پوری اترتی ہے۔ اس کے بعد کتاب کو شہر کے کتب خانۂ عام میں رکھوا دیا گیا۔

اب عام افراد اس کتاب سے استفادہ کرسکتے تھے۔ مصنف کی ہر کتاب کی جو نقل تیار ہوتی تھی، اسے انہی مراحل سے گزارا جاتا تھا۔

یہ کتاب تھی ایلخانی حکومت کے نامور وزیر اعظم رشید الدین کی ایک تصنیف، جنہوں نے اپنے ۲۲ سالہ دورِ وزارت میں علمی، تنظیمی اور ترقیاتی اعتبار سے نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ رشید الدین کا نام، بہترین مؤرخ، بلند پایہ عالم، لائق طبیب، دور اندیش مدبر اور اعلیٰ درجے کے منتظم کے طور پر تاریخ میں ہمیشہ روشن حرفوں میں لکھا جائے گا۔

بہتر ہو گا کہ آگے بڑھنے سے قبل یہ جان لیا جائے کہ ایلخانی حکومت کی ابتدا کیسے ہوئی۔

تقریباً سو برس تک ایک وسیع خطے پر حکمراں رہنے والی اس حکومت کا بانی چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان تھا۔ ہلاکو خان کا لقب "ایل خان" تھا، اس لیے یہ حکومت "ایلخانی" کہلائی۔ ہلاکو خان سے تو تباہیوں اور بربادیوں کی بہت سی داستانیں وابستہ ہیں لیکن اس کی آئندہ

Marfat.com

نسلیں مسلمان ہو گئیں اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور ترقی کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

ایلخانی حکومت کی ابتدا کچھ یوں ہوتی ہے کہ منگول سردار چنگیز خان ترکستان، افغانستان اور شمالی ایران کو فتح کرنے کے بعد واپس منگولیا چلا گیا جہاں ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے پہلے اس نے وسیع و عریض سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تولی خان منگولیا میں حکمراں بنا۔ تولی خان کے تین بیٹے تھے۔ منگو خان، قبلائی خان اور ہلاکو خان۔ منگو خان قراقرام میں رہتا تھا اور خانِ اعظم تھا۔ منگو کے زمانے میں شمال مغربی ایران میں باطنی فرقے (فدائیوں) نے بڑی خونریزی مچار کھی تھی۔ مقامی آبادی نے منگو خان سے فریاد کی جس پر منگو نے ۶۵۴ھ / ۱۲۵۶ء میں اپنے بھائی ہلاکو خان کو ایران بھیج دیا۔ ہلاکو خان نے ایران پہنچ کر باطنیوں کے خلاف زبردست کارروائی کی، ان کے سب سے بڑے مرکز قلعہ الموت پر قبضہ کر لیا اور ان کے آخری بادشاہ، خورشاہ کو قتل کروایا۔ اس کے بعد ہلاکو نے بغداد کا رخ کیا اور ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں بغداد کو شعلوں کی نذر کر دیا۔

منگو خان کے بعد ہلاکو خان نے ایران میں مستقل طور پر حکومت قائم کر لی۔ یہی حکومت ایل خانی حکومت کہلاتی ہے۔ ہلاکو کے بعد ۶۶۳ھ / ۱۲۶۵ء میں حکومت اس کے بیٹے اباقاخان کو ملی۔ ان کے دور میں رشید الدین نے سرکاری طبیب کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اباقاخان کے بعد اس کے بھائی تکودار اغلن حکمراں بنے۔ وہ پہلے عیسائی تھے لیکن وزیر اعظم شمس الدین جوینی کی کوششوں سے مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا نام احمد خان رکھ لیا تھا۔ احمد خان کے بعد حکومت ارغون خان، گیخاتو، بائیدو آغول اور پھر غازان خان کے ہاتھوں میں آئی۔ غازان خان نے ۶۹۴ھ / ۱۲۹۴ء میں اقتدار سنبھالا۔ اسی زمانے میں وہ ایک بہت دین دار مسلمان امیر نوروز کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے ۴ شعبان ۶۹۴ھ / ۱۹ جون ۱۲۹۵ء کو دس ہزار منگولوں کے ساتھ صدر الدین ابراہیم حمویؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنا نام محمود رکھ لیا۔ انہوں نے ہی، رشید الدین کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔

رشید الدین اتنے لائق اور منتظم ثابت ہوئے کہ نہ صرف محمود خان (غازان خان) بلکہ ان کے بعد ان کے بھائی الجائیتو خدا بندہ کے پورے دورِ حکومت اور پھر الجائیتو کے بیٹے ابو سعید کے ابتدائی دور حکومت یعنی ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء تک رشید الدین ہی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی وزارتِ عظمیٰ ۲۲ برسوں کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ ان کے زیر انتظام علاقوں میں موجودہ ایران، عراق، افغانستان کا بڑا حصہ، مشرقی ترکی، قفقاز (آذربائی جان کا وہ حصہ جو روس سے آزاد ہوا ہے، نیز آرمینیا، داغستان، جارجیا) شامل تھے۔

رشید الدین کا ایک بڑا کارنامہ "ربع رشیدی" کا قیام ہے۔ "ربع رشیدی" ایک خوبصورت بستی تھی جو رشید الدین نے تبریز کے مضافات میں بسائی تھی۔ یہ بستی کیا تھی پوری جامعہ تھی۔ اس بستی کی تعمیر پر رشید الدین نے بہت محنت کی اور خطیر رقم خرچ کی۔ ٹھوس چٹانوں کو کاٹ کر نہریں نکالی گئیں اور انہیں دریائے سراو رود سے منسلک کر کے، بستی میں پانی پہنچایا گیا۔ اس شاندار بستی میں تیس ہزار مکانات، ڈیڑھ ہزار دکانیں اور ۲۴ کارواں سرائیں تعمیر کی گئی تھیں۔

بستی میں جگہ جگہ سرسبز و شاداب باغات لگائے گئے تھے، صاف ستھرے حمام موجود تھے، پن چکیاں لگائی گئی تھیں۔ کپڑا بننے اور کپڑا رنگنے اور کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے گئے تھے۔ ایک ٹکسال بھی تھی۔ ایک اعلیٰ قسم کا اسپتال قائم کیا گیا، اس اسپتال میں پچاس نہایت ماہر طبیب مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں ہر ایک کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ دس شاگردوں کو فنِ طب کی تعلیم دے۔ یہ طبیب چین، ہندوستان، مصر اور شام سے بلائے گئے تھے۔ اس اسپتال میں امراضِ چشم کے ماہرین، جراح، ہڈی بٹھانے والے بھی مقرر تھے۔ ان میں سے ہر ایک پر لازم تھا کہ وہ پانچ افراد کو اپنا فن سکھائے۔ یہ تمام طبی ماہرین جس علاقے میں رہتے تھے اسے "کوچہ معالجاں" کا نام دیا گیا تھا۔

بستی میں ایک رصد گاہ بھی تھی، جہاں علم ہیئت کے تجربے کیے جاتے تھے اور فلکی اجسام کا مشاہدہ کیا جاتا تھا۔ ربع رشیدی میں سکونت کے لیے مختلف شہروں اور ملکوں سے افراد کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا گیا تھا۔ ان میں پیشہ ور علما و فضلا کے علاوہ ماہر کاریگر، صناع اور دستکار بھی شامل تھے۔

ربع رشیدی میں ایک محلے کا نام، "کوچہ علما" تھا۔ اس کوچے میں چار سو علمائے کرام، فقہائے کرام اور محدثین رہتے تھے۔ ان تمام افراد کو حکومت کی جانب سے ماہانہ تنخواہ اور وظائف ملتے تھے۔ اسی کوچے میں

Marfat.com

طلبہ کی رہائش کا انتظام بھی تھا جہاں مختلف اسلامی ملکوں سے آئے ہوئے ایک ہزار طلبہ سکونت پذیر تھے۔ ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ دار حکومت تھی اور انہیں ان کے رجحانات کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ تقریباً سات ہزار طلبہ بستی میں زیر تعلیم تھے۔ مختلف شہروں اور ملکوں سے جن افراد کو منتخب کر کے ربع رشیدی میں بسایا گیا تھا ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر تھیں۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ایک مقرر مسجد میں روزانہ قرآن کریم کی تلاوت کریں اور چالیس منتخب طلبہ کو قرآن پاک حفظ کروائیں۔ رشید الدین نے ربع رشیدی کے کتب خانے میں تاریخ، سائنس اور ادب کی ساٹھ ہزار کتابیں رکھوائیں تھیں۔ ان کے علاوہ کتب خانے میں مختلف خطاطوں کے لکھے ہوئے اعلیٰ درجے کے قرآن پاک کے ایک ہزار نسخے بھی شامل تھے۔

رشید الدین نے مملکت کے نئے دارالحکومت سلطانیہ کے نواح میں بھی ایک چھوٹا سا شہر آباد کیا تھا۔ سلطانیہ، ایران کے شہروں قزوین اور زنجان کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا۔ اب یہ شہر عالی شان عمارتوں کا کھنڈر ہے لیکن اس دور میں یہ تبریز کے بعد ایران کا سب سے بڑا شہر تھا۔ رشید الدین نے سلطانیہ کے نواح میں جو شہر آباد کیا تھا اس کا نام "رشیدیہ" رکھا گیا۔ رشیدیہ میں، ہزاروں مکانات، بہت اچھا اسپتال، بے حد خوبصورت مسجد اور متعدد شاندار سرکاری عمارتیں تعمیر کروائی گئی تھیں۔

رشید الدین نے سلطانیہ میں بھی نہایت خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ وہ تعمیرات اور آبادکاری کا اچھا علم رکھتے تھے۔ جب کوئی نئی بستی بساتے تھے تو متعلقہ حکام کو بستی کا مجوزہ نقشہ اور بستی کا نام بھی فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے دیار بکر (موجودہ ترکی کا سرحدی شہر) میں ایک نئی نہر کھدوائی اور اس کی دونوں جانب ۱۴ بستیاں بسائیں۔ ان بستیوں کے نقشے اور نام رشید الدین ہی نے مہیا کیے۔ رشید الدین نے اپنے بیٹے جلال الدین کے نام ایک خط میں دریائے فرات سے نئی نہر نکالنے اور دس بستیوں کی بنیاد رکھنے کی ہدایات دی تھیں۔ اس خط کے ہمراہ نئی بستیوں کے نقشے اور نام موجود تھے۔

رشید الدین نے اپنی مملکت میں اسپتالوں کو ترقی دینے اور فن طب کی سرپرستی کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے شیراز کے ایک اسپتال کو از سر نو بنوایا جس کی بنیاد ایک صدی قبل رکھی گئی تھی اور اس زمانے میں یہ اسپتال بالکل خستہ اور خراب حالت میں تھا۔ رشید الدین نے اسپتال میں نئے طبیب مقرر کیے اور طبیب محمود بن الیاس کو اس اسپتال کا منتظم مقرر کیا۔ رشید الدین نے اپنے آبائی شہر ہمدان کے اسپتال پر بھی توجہ دی جو ناقابلِ اطمینان حالت میں تھا۔ رشید الدین نے یہاں طبیب، ابنِ مہدی کو نگران بنادیا۔ رشید الدین خود بھی اعلیٰ درجے کے طبیب تھے۔ انہوں نے دواؤں سے متعلق ابن مہدی کی رہنمائی کی اور ان دواؤں کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا جن کی فراہمی آسان نہ تھی۔

رشید الدین نے ربع رشیدی میں جو اسپتال قائم کیا تھا اس کے افسر اعلیٰ محمد بن الکنیلی تھے۔ اس اسپتال کی وسعت اور یہاں آنے والے مریضوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس اسپتال کے لیے مختلف اقسام کے جو روغن منگوائے جاتے تھے ان کی مقدار سینکڑوں من ہوتی تھی۔ رشید الدین اپنی مملکت کے اداروں کو مستعد، فعال اور سہولت بخش بنانے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو رشید الدین نے اسپتال کے لیے مختلف روغن منگوانے کے لیے تحریر کیا۔

اس خط میں انہوں نے نہایت وضاحت سے بتایا کہ کون سا روغن، کتنی مقدار میں، کس شہر سے حاصل کیا جائے۔ ہر روغن کی مقدار ایک من سے لے کر تین سو من تک تحریر کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ شیراز سے چھ، بصرہ سے سات، ایشیائے کوچک سے چھ، بغداد سے نو اور شام سے تین اقسام کے روغن مہیا کیے جائیں۔ اس خط کو مکمل کرنے کے بعد انہوں نے حاشیے پر تاکید کی کہ یہ روغن فوراً بھیجے جائیں اور تاخیر سے بچنے کے لیے ہر مقام پر الگ الگ نمائندہ بھیجا جائے جو روغنیات کا انتظام کرے۔ رشید الدین، علاج کی بہتر سے بہتر سہولت فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ایک بار انہیں چند ایسی مفید دوائیں حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کا سفر کرنا پڑا جو ایران میں دستیاب نہیں تھیں۔

رشید الدین اپنے ماتحتوں پر کڑی نگرانی رکھتے تھے اور اگر کسی ماتحت سے کوئی فرد گزاشت ہو جاتی تو فوری طور پر خط لکھ کر اسے سرزنش کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی قریبی رشتے کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کے بعض بیٹے مختلف علاقوں میں حکمراں بنائے گئے تھے۔ رشید الدین نے جب ضرورت محسوس کی اپنے بیٹوں کو بھی سخت نوعیت کے خطوط تحریر کیے، مثال کے طور پر کرمان میں حاکم اپنے بیٹے

Marfat.com

امیر محمود کو انہوں نے رعایا کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنے پر خط لکھ کر ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اسی طرح انطاکیہ وطرسوس پر حاکم اپنے بیٹے سعد الدین کو نظم ونسق میں خرابیوں اور تن آسانی اختیار کرنے کی روش پر تنبیہ کی۔ اپنے ایک اور بیٹے امیر احمد کو جو اردبیل پر حاکم تھے، اس بات پر سرزنش کی کہ وہ علم نجوم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ رشید الدین نے اپنے کئی بیٹوں کو علم وفضل، حلم، عقل اور سخاوت کی صفات اختیار کرنے کی تلقین کرنے کے لیے خطوط تحریر کیے۔

رشید الدین نے ایلخانیوں کے سب سے اچھے حکمراں، غازان خان کو، متعدد اہم اصلاحی اور فلاحی اقدامات کرنے میں بڑی مدد دی۔ غازان خان نے تاتاری قوانین کا خاتمہ کیا اور اسلامی شریعت کو رواج دیا۔ ناجائز محصولات ختم کر دیے، امن وامان بحال کیا، ملک کی مالی حالت کو مستحکم بنا دیا، عصمت فروشی ختم کر دی گئی۔ نئے سکّے ڈھالے گئے جن پر خلفائے راشدینؓ کے نام درج تھے، متعدد مساجد، سرائیں، مدارس تعمیر ہوئے۔ اس سے قبل جو مالیاتی نظام رائج تھا اس کے تحت، مالیے کا بہت کم حصہ حکومت تک پہنچتا تھا، چنانچہ رشید الدین نے تمام زمینوں کی پیمائش نئے سرے سے کروائی، پیداوار کے مطابق لگان مقرر کیا جو آسان اقساط میں وصول کیا جاتا تھا۔ جو سرکاری اہلکار ناجائز محصول وصول کرتا تھا، جرم ثابت ہونے پر اس کے لیے موت کی سزا مقرر تھی۔ رعایا کو محصول وصول کرنے والوں کی زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے رشید الدین نے حکم دیا تھا کہ لگان کی تفصیل کی نقل ہر گاؤں میں چسپاں کی جائے۔

اس دور میں بعض سرکاری اہلکار ڈاک کے گھوڑوں کو ذاتی شکار کھیلنے میں استعمال کرنے لگے تھے۔ رشید الدین نے ڈاک کے گھوڑوں کو کسی اور کام میں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی۔ قافلوں کو رہزنوں سے بچانے کے لیے عہدیدار مقرر کیے گئے جو "امین راہ دار" کہلاتے تھے۔ ان کی مدد کے لیے فوج کے دستے بھی مہیا کیے گئے۔ اگر کسی جگہ ڈکیتی یا رہزنی کی واردات ہوتی اور مجرم پکڑے نہ جاتے تو لوٹے ہوئے مال کی تلافی راہ دار کو کرنی پڑتی تھی۔ قافلے جن راستوں پر سفر کرتے تھے، ان میں جگہ جگہ پتھر کے ستون نصب کیے گئے تھے جن پر "امین راہ داروں" کے نام اور محصول کی رقم وغیرہ درج ہوتی تھی۔ ملک بھر میں لوہے کے یکساں باٹ اور پیمانے مقرر کیے گئے جن پر سرکاری مہر ہوتی تھی۔ دکانداروں کو حکومت کی طرف سے باٹ اور پیمانے فراہم کیے جاتے تھے اور ان دکانداروں کے نام حکومت کے پاس درج ہوتے تھے۔

رشید الدین، دیگر مملکتوں کے حکمرانوں سے سفارتی سطح پر تعلقات بھی رکھتے تھے۔ برصغیر (پاک وہند) پر حکمراں علاؤالدین خلجی سے تو ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ انہوں نے ہندوستان جا کر علاؤالدین خلجی سے ملاقات کی تھی اور خواجہ محمود ساوجی کو ہندوستان میں اپنا سفیر مقرر کیا تھا۔ علاؤالدین خلجی نے ایک موقع پر رشید الدین کو ۲۲ اقسام کی دوائیں، گرم مسالے، مربّہ جات، خشک میوے، جانور غالیچے، مختلف اقسام کے تیل، نادر عماراتی لکڑی، سونے چاندی کے برتن، ہاتھی دانت وغیرہ بطور تحائف روانہ کیے۔ علاؤالدین خلجی، رشید الدین سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے ایک خط میں رشید الدین کے جذبۂ محبت اور بنی نوع انسان کے لیے ان کی خدمات کی بہت اچھے الفاظ میں تعریف کی۔

رشید الدین وسیع علم اور بے پناہ شہرت رکھنے کے باوجود بہت منکسر المزاج تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ اس دور کے حکمرانوں کی طرح لمبے چوڑے القاب شامل نہیں کرتے تھے اور خود کو محض "رشید طبیب" کہلوانا پسند کرتے تھے۔

رشید الدین کی شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے۔ انہوں نے وزیر اعظم ہونے کے ناتے، پوری مملکت میں امن وامان قائم رکھا، نظم ونسق کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ فلاحی اور ترقیاتی اقدامات کی ایک طویل فہرست ہے جو، ان کی کوششوں سے کیے گئے اور کمال یہ ہے کہ اتنی ساری مصروفیات کے باوجود انہوں نے علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے وقت نکالا اور مسلمانوں کے علمی سرمائے میں کئی نادر اور قیمتی کتابوں کا اضافہ کیا۔

رشید الدین کی سب سے نمایاں اور مشہور کتاب "جامع التواریخ" ہے، جو خود ان کی شہرت کے بڑے اسباب میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب دنیا کی پہلی عالمی تاریخ ہے۔ اس وقت تک کسی زبان میں تاریخ عالم نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب رشید الدین نے محمود خان (غازان خان) کے حکم پر لکھنی شروع کی تھی۔ غازان نے رشید الدین کو سرکاری کاغذات اور تاتاری تاریخ کے علما فراہم کر دیے تھے۔ رشید الدین حالانکہ بہت مصروف رہتے تھے، لیکن انہوں نے کتاب کی تیاری کے لیے وقت نکال کر محنت شروع کر دی۔ مورخین کے مطابق وہ روزانہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد کتاب لکھنا شروع کر دیتے تھے اور جب

Marfat.com

آفتاب طلوع ہو جاتا تھا تو لکھنا روک دیتے تھے اور دوسرے امور میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ابھی یہ کتاب نامکمل تھی کہ غازان خان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بھائی الجائیتو خدابندہ حکمراں بنے۔ خدابندہ نے حکم دیا کہ کتاب کی تیاری جاری رکھی جائے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ کتاب میں تاتاری تاریخ کے علاوہ عالم اسلام کی ایک عام تاریخ اور ایک جغرافیائی ضمیمہ شائع کیا جائے۔ ابتدائی خاکے کے مطابق یہ کتاب دو بڑے حصوں پر مشتمل ہونی تھی:

ا۔ مغلوں کی تاریخ

۲۔ عالم اسلام کی تاریخ اور جغرافیائی ضمیمہ

لیکن ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء میں جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو یہ ایک ضخیم دستاویز کی صورت اختیار کر چکی تھی جس میں چھ لاکھ الفاظ تھے اور اس کی جلدوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی:

جلد اول: ا۔ ترک اور مغل قبائل کی تاریخ، ان کی شاخیں، انساب، شجرے اور قصے۔

۲۔ چنگیز خان، اس کے اسلاف اور جانشینوں کی تاریخ جو غازان خان کے عہد تک کا احاطہ کرتی تھی۔

جلد دوئم: تمہید، حضرت آدم علیہ السّلام اور دیگر انبیاکرام علیہم السّلام اجمعین (بشمول بنی اسرائیل)

ا۔ قدیم ایران کے بادشاہوں کی تاریخ۔

۲۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ، خلافت اور ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں اس کے خاتمے کی تاریخ، اسلامی عہد کے ایرانی حکمرانوں کی تاریخ، غزنی، سلاجقہ، خوارزم شاہی، ترک، چینی، یہودی، فرنگی بادشاہوں، پاپاؤں کی تاریخ، ہندوستان، مہاتما بدھ اور بدھ مت کی تاریخ اور تفصیل۔

رشید الدین نے ۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء میں الجائیتو خدابندہ کے عہد کے حالات بھی اس کتاب میں شامل کیے۔ یہ بات واضح نہیں کہ انہوں نے دنیا کے جغرافیائی حالات سے متعلق ضمیمہ اس کتاب میں شامل کیا یا نہیں۔ ایک مؤرخ کا ترمیر کا خیال ہے کہ رشید الدین نے جغرافیائی حالات لکھے ضرور تھے لیکن وہ لوٹ مار میں ضائع ہو گئے۔

جامع التواریخ اس لحاظ سے بے حد اہمیت کی مالک ہے کہ یہ کتاب رشید الدین نے بے حد احتیاط سے مرتب کی اور اس قدر وسیع میدان میں، لوگوں کو بھرپور معلومات فراہم کر دیں۔ انہوں نے دنیا کے مختلف علاقوں کے بارے میں حقائق اور اعداد و شمار اکٹھے کرنے کے لیے ان علاقوں کے ماہرین، مؤرخین اور علما سے براہ راست ملاقات کی۔ مشہور مؤرخ براؤن کے الفاظ میں، فارسی کی نثری کتب میں اور کم از کم تاریخ کے شعبے میں شاید ہی کوئی کتاب اپنی منفعت کے لحاظ سے اس کتاب کا مقابلہ کر سکے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے برطانوی عجائب خانے اور لینن گراڈ کے کتب خانے میں آج بھی محفوظ ہیں۔

رشید الدین نے صرف تاریخ ہی پر قلم نہیں اٹھایا بلکہ دیگر کئی موضوعات پر بیش قیمت کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی، ان کی وسعت اور گونا گونی کو دیکھ کر رشید الدین کے بے پناہ علم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب، "کتاب الاحیاؤ الآثار" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے چوبیس حصے ہیں۔ اس میں موسمیات، زراعت، شجرکاری، شہد کی مکھیوں کی پرورش، فن تعمیر، قلعہ بندی، جہاز سازی، کان کنی، خام دھاتوں کو صاف کرنے، ضرر رساں حشرات کو ہلاک کرنے کے طریقے، مرغیوں اور مویشیوں کی پرورش پر نہایت قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ افسوس کہ یہ اہم کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

رشید الدین نے ایک اور کتاب "ایل خان در فنون و علوم خطا" کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب چینی طب سے متعلق ہے۔ اس کی پہلی جلد استنبول (ترکی) کے آیا صوفیہ کتب خانے میں موجود ہے۔

رشید الدین کی ایک اور کتاب علم دین اور تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس کا عنوان "توضیحات" رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب پیرس کے قومی کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے علاو، قرآن کریم کی فصاحت، اس کی تفاسیر، مفسّرین اور ان کے اصولوں پر بھی رشید الدین نے ایک کتاب "مفتاح التفاسیر" کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے خیر و شر، مدتِ حیات، تائید غیبی، تقدیر، حشر کے موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ عقیدۂ تناسخ (مرنے کے بعد جاندار کا کسی اور روپ میں دوبارہ جی اٹھنا) کو مسترد کرنے کے سلسلے میں دلائل بھی دیے ہیں۔

الجائیتو خدابندہ کی موجودگی میں ایک بار ایک دینی مناظرہ ہوا جس میں رشید الدین بھی شریک ہوئے۔ اس مناظرے کے نتیجے میں رشید الدین نے ایک کتاب "الرسالہ السلطانیہ" کے عنوان سے لکھی۔

Marfat.com

انہوں نے ایک اور کتاب "لطائف الحقائق" کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ بھی دینی موضوع پر ہے اور رشید الدین کے ۱۴ مکاتیب پر مبنی ہے۔ توضیحات، مفتاح التفاسیر، الرسالہ السلطانیہ اور لطائف الحقائق، یہ چاروں کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں۔ ان چاروں کتابوں کو ملا کر ایک کتاب تشکیل دی گئی جو "مجموعۂ رشیدیہ" کہلاتی ہے۔

رشید الدین نے ایک کتاب "بیان الحقائق" کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ کتاب دینی مسائل کے ۱۷ مکتوبات پر مشتمل ہے جن میں طبی نوعیت کی بحث بھی آ گئی ہے۔

رشید الدین کی وسیع معلومات کے خزانے کا ایک حصہ ان خطوط میں بھی محفوظ رہ گیا ہے جو انہوں نے اپنی ۲۲ سالہ وزارتِ عظمیٰ کے دوران مختلف شخصیات کو لکھے۔ ان خطوط سے اس عہد کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور کئی اہم حقائق ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

رشید الدین کی کتابوں کی ایک خاص بات ان میں رنگین تصاویر کی موجودگی ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کو چینی تصاویر سے مزین کیا تھا۔ یہ تصاویر آج بھی رشید الدین کی کتب کے قلمی نسخوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رشید الدین نے چودھویں صدی عیسوی کے آغاز پر، ایران میں مصورانہ تصانیف کی ابتدا کی۔

رشید الدین کو احساس تھا کہ ہلاکو خان کی غارت گری کے نتیجے میں بغداد کے کتب خانوں میں موجود قیمتی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دور میں کتابوں کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ ہر کتاب کی کئی کئی نقول تیار کرواتے تھے۔ عام لوگوں کو کھلی اجازت تھی کہ وہ ذاتی استفادہ کے لیے کسی بھی کتاب کی نقل تیار کر لیں۔ اس غرض سے انہوں نے کتب خانوں کے منتظمین کو حکم دے رکھا تھا کہ جو فرد کتب خانے کی کسی بھی کتاب کی نقل تیار کرنا چاہے اسے لکھنے کا سامان، کاغذ اور دیگر ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ تاہم کتاب کو کتب خانے سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

رشید الدین نے کتب کی حفاظت کی غرض سے اپنی تمام فارسی تصانیف کے تراجم عربی میں اور عربی تصنیفات کے تراجم فارسی میں کروائے۔ ایک ضخیم جلد میں اپنے تصنیف کردہ رسائل اکٹھے کروا دیے۔ اس میں ضروری نقشے اور تصاویر بھی شامل کر دیں۔ اس ضخیم جلد کا نام انہوں نے "جامع التصانیف رشیدی" رکھا۔ انہوں نے طب اور تاتاری نظام حکومت سے متعلق اپنی چار دیگر کتب کے چینی، عربی اور فارسی میں نسخے تیار کروائے۔ تبریز کے قریب بستی ربع رشیدی کی مسجد کے لیے جو اوقاف متعین تھے، ان کی آمدنی سے سالانہ رقم مقرر کی کہ ہر سال ان کی تصانیف کی دو مکمل نقلیں تیار کی جائیں، ایک عربی میں اور ایک فارسی میں۔ یہ نقول، عالم اسلام کے خاص خاص شہروں کو روانہ کی جاتی تھیں۔ یہ نقلیں بغداد کے بنے ہوئے نہایت نفیس کاغذ پر بے حد عمدہ اور صاف خط میں تحریر کی جاتی تھیں۔ کاتب بہت جانچ کر چنے جاتے تھے۔ ان کے کام کی نفاست اور رفتار دونوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ کاتبوں کی رہائش کا اچھا بندوبست کیا جاتا تھا۔ نقل جب تیار ہو جاتی تھی تو اصل مسودے کے ساتھ اس کا بہت احتیاط کے ساتھ موازنہ کیا جاتا تھا۔

رشید الدین نے علمی سرمائے کو محفوظ کرنے کی غرض سے حکم دیا تھا کہ مجموعۂ رشیدیہ کے عربی نسخے نیز، بیان الحقائق اور کتاب الاحیاء و الآثار کی ایک نقل ربع رشیدی کے اوقاف کے اساتذہ کے لیے بھی تیار کی جائے، جو روزانہ ان کتب کا کچھ حصہ طالب علموں کو پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے تھے۔ مزید یہ کہ ہر مدرس پر واجب تھا کہ اپنے زمانہ تدریس میں ایک کتاب کی عربی یا فارسی میں نقل کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہتا تو اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا تھا۔ نقل تیار ہو جانے کے بعد مدرس کو اختیار تھا کہ وہ اسے فروخت کر دے، کسی کو تحفہ کے طور پر دے دے یا اپنے پاس رکھے۔ رشید الدین نے اپنی کتابوں کو نقل کروانے، ترجمے کروانے اور انہیں تصاویر سے مزین کروانے پر ساٹھ ہزار دینار صرف کیے۔ چھاپے خانے کی ایجاد سے قبل اپنی کتابوں کی حفاظت کے لیے وہ یہی کچھ کر سکتے تھے، لیکن پھر بھی ان میں سے کئی کتب ضائع ہو گئیں۔

رشید الدین علما اور ماہرین فن کی سرپرستی کرنا پسند کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک خط میں حکم دیا کہ دریائے جیحوں سے مغرب میں ایشیائے کوچک اور مصری سرحدوں تک پوری مملکت کے علما کرام کو وظائف اور تحائف دیے جائیں۔ اسی طرح ایک بار انہوں نے ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی) کے حکما کو ہدایت دی کہ قرطبہ، اشبیلیہ، اندلس، تیونس، طرابلس، اور قیروان کے ان علما کرام کو رقومات ادا کی جائیں جنہوں نے کتابیں تحریر کی ہیں۔ رشید الدین نے اپنے دور میں تاریخ کی ایک بہت اچھی کتاب تحریر کرنے والے مؤرخ وصّاف کو حکمران وقت غازان خان سے متعارف کروایا تھا۔ وصّاف

Marfat.com

نے اپنی کتاب "تاریخ وصّاف" کی پانچ میں سے پہلی تین جلدیں غازان خان کو پیش کی تھیں۔ وصّاف کا پورا نام عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی تھا۔ رشید الدین نے غازان خان کے انتقال کے بعد الجائتو خدا بندہ سے بھی وصّاف کو ملوایا تھا اور وصّاف نے اپنی کتاب الجائتو خدا بندہ کو بھی پیش کی تھی۔

رشید الدین کے ہم عصروں میں ابو سلیمان داؤ بناکتی کا نام اہم ہے۔ انہوں نے ۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء میں تاریخ کی ایک اچھی کتاب تصنیف کی جو "تاریخ بناکتی" کہلائی۔ یہ کتاب، رشید الدین کی کتاب "جامع التواریخ" کے طرز پر لکھی گئی اور اس کا بھی نصف سے زائد حصہ غیر مسلم اقوام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اسی دور کی ایک اور نامور ہستی قطب الدین شیرازی (۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء۔ ۷۱۱ھ / ۱۳۱۱ء) ہیں۔ انہوں نے علم ہیئت، طب اور علم صحت پر بہت عمدہ کتابیں لکھیں۔

رشید الدین، غازان خان، الجائتو خدا بندہ کے پورے دورِ حکومت میں، یعنی ۶۹۵ھ / ۱۲۹۴ء سے ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء تک (۲۲ برس) وزیر اعظم رہے۔ الجائتو خدا بندہ کے بعد ان کے بیٹے ابو سعید کو سربراہ مملکت بنایا گیا۔ وہ کمسن تھے اور ان کے دور میں بعض نامناسب افراد نے حکومت میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ ایسے ہی ایک فرد نے حکمراں کو رشید الدین کے خلاف بھڑکایا چنانچہ رشید الدین کو ان کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو رشید الدین کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ لیکن مخالفین نے ان پر ایک جھوٹا الزام لگا دیا کہ رشید الدین نے اپنے بیٹے ابراہیم کے ساتھ مل کر، حکمراں ابو سعید کے والد الجائتو خدا بندہ کو دوا کے بہانے زہر دے دیا تھا۔ ابو سعید نے رشید الدین اور ان کے بیٹے کو سزائے موت دلوادی۔ اس طرح ایک عظیم شخصیت ناکردہ گناہ کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔ رشید الدین اور ان کے بیٹے کو ۱۸ جمادی الاول ۷۱۸ھ / ۱۸ جولائی ۱۳۱۸ء کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس وقت رشید الدین کی عمر تقریباً ۷۱ سال تھی۔ ان کے مخالفین نے ان کی املاک کو تباہ کر دیا۔ ربع رشیدی کو لوٹ لیا گیا اور بہت سی کتابیں ضائع کر دی گئیں۔

۹ برس بعد ابو سعید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہیں اندازہ ہوا کہ رشید الدین جیسی قابل اور عظیم شخصیت کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی گئی۔ انہوں نے رشید الدین کے لڑکے خواجہ غیاث الدین کو ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء میں اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔

***

Marfat.com

شاہ رُخ

تابناک علمی اور فنی ترقی کے حامل، تیموری دور کے قابلِ فخر حکمراں

کھیل اپنے عروج پر تھا!

شطرنج کی بساط پر میدانِ جنگ کا سا سماں تھا۔ ایک فریق کے مُہرے پٹ رہے تھے، اس کی فوج مات کھا رہی تھی اور اس کا بادشاہ سخت مشکل میں تھا۔

جو شخصیت جیت رہی تھی، ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے، لیکن ان کی صحت غیر معمولی طور پر اچھی تھی۔ مضبوط جسم، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، چوڑے شانے، سرخ و سفید رنگ اور مرعوب کن چمک لیے ہوئے آنکھیں۔

اچانک ایک خادم نے حاضری کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر اس نے جیتنے والی شخصیت سے مؤدبانہ عرض کیا: "امیر محترم، اللہ نے آپ کو صاحبزادہ عطا کیا ہے۔"

امیر کے چہرے پر مسرت کی شفق پھوٹ پڑی۔ یہ ان کا چوتھا بیٹا تھا۔ پھر انہوں نے شطرنج کی بساط پر نظر ڈالی، جہاں ان کا رخ فریق مخالف کے شاہ کو مات دے رہا تھا۔ بازی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ امیر تیمور بازی جیت چکے تھے۔

یہ امیر تیمور تھے۔ دلیر، اور جنگجو سالار جو اس وقت تک ترکستان، ماوراء النہر اور موجودہ افغانستان کے بڑے حصے کو فتح کر چکے تھے اور جنہوں نے اس کے بعد ایک وسیع خطے کو تسخیر کر کے اپنی مملکت قائم کر دی تھی۔ عملی میدان میں بھی فتح نے ان کے قدم چومے تھے اور شطرنج کی بساط پر بھی جیت ان کا مقدر بنی۔

امیر تیمور کو اپنے بچے کی پیدائش کی خوشخبری چونکہ ایسے اس وقت ملی جب شطرنج کی بساط پر ان کا رخ، فریق مخالف کے شاہ کو مات دے رہا تھا، اس لیے اس یادگار موقع کی مناسبت سے نومولود بچے کا نام "شاہ رخ" رکھ دیا گیا۔ اسی شاہ رخ نے چالیس برس بعد اپنے والد کی قائم کردہ مملکت کی باگ ڈور سنبھالی اور ۴۳ برس تک اپنے علم، تدبر، فراست اور قابل رشک انتظامی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس مملکت کو اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا کر فلاح و بہبود کی برکتوں سے ہمکنار کر دیا۔

شاہ رخ ۱۴ ربیع الآخر ۷۷۹ھ / ۲۰ اگست ۱۳۷۷ء کو سمرقند میں پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے انہیں مروّجہ علوم و فنونِ حرب کی تعلیم دی گئی۔ بہت کم سنی میں انہیں پوری مملکت کا انتظام سنبھالنے کا عارضی طور پر موقع ملا۔ انہوں نے کئی جنگی مہموں میں اپنی شجاعت، ذہانت اور دلیری کے جوہر دکھائے اور اپنے تدبر اور فراست کا لوہا بنوایا۔ ۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء میں انہیں سمرقند اور نواحی علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ تین سال بعد انہیں ایران، شام اور ایشیائے کوچک کی مہمات میں شرکت کے لیے جانا پڑا۔

حلب کے محاصرے کے وقت نہایت نازک مواقع پر فوج کی کمان شاہ رخ کے ہاتھوں میں تھی۔ مملکت کا فرماں روا بننے سے قبل وہ خاصے عرصے تک پورے خراسان پر حکومت کرتے رہے۔

شاہ رخ کے والد امیر تیمور کی فتوحات کی کثرت اور زبردست انتظامی صلاحیتوں کے تو ان کے مخالفین بھی معترف ہیں۔ انہوں نے ایک وسیع مملکت قائم کی جس کا ایک سرا موجودہ بھارت کے صوبے اتر پردیش میں تھا اور دوسرا سرا موجودہ ترکی کے شہر ازمیر سے جا ملا تھا۔ ایک جانب ان کی سرحدیں موجودہ چین تک جا پہنچی تھیں تو دوسری جانب ان کی مملکت کی حدود مصر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۱۷ شعبان ۸۰۷ھ / ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کو امیر تیمور کے انتقال

Marfat.com

کے بعد ان کی سلطنت ان کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ امیر تیمور کے چار بیٹے تھے۔ جہانگیر، عمر شیخ مرزا، میراں شاہ اور شاہ رخ۔ ان میں جہانگیر اور عمر شیخ مرزا کا انتقال امیر تیمور کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ امیر تیمور نے گو کہ بہت وسیع علاقہ فتح کیا تھا، لیکن ان کی عادت تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں کو مقامی حکمرانوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایشیائے کوچک (موجودہ ایشیائی ترکی)، شام، روس اور برصغیر پاک وہند کے بہت سے علاقے امیر تیمور نے فتح کے باوجود اپنی مملکت میں شامل نہ کیے۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد آذر بائی جان، عراق اور اس سے متصل علاقے امیر تیمور کے بیٹے میراں شاہ کو مل گئے، خراسان کا علاقہ امیر تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ رخ کو ملا، سمرقند اور ماوراء النہر میں امیر تیمور کے پوتے (جہانگیر کے بیٹے) پیر محمد برسر اقتدار آئے، لیکن میراں شاہ کے بیٹے خلیل سلطان نے انہیں ہٹا کر سمرقند پر قبضہ کر لیا۔

شاہ رخ صلح جو طبیعت کے حامل تھے۔ انہوں نے خلیل کو ملک کا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ لیکن جلد ہی امرا کو اندازہ ہوا کہ خلیل سلطان گو کہ علم دوست حکمراں ہیں لیکن ان کے اخراجات میں اعتدال نہیں، چنانچہ خلیل سلطان کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور خانہ جنگی کی سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر بعض امرا نے شاہ رخ کو دعوت دی کہ وہ حکومت سنبھال لیں۔ شاہ رخ نے بھی محسوس کیا کہ خانہ جنگی کو روکنا اور مملکت کے شیرازے کو بکھرنے سے بچانا بہت ضروری ہے، اس لیے انہوں نے فوجی مداخلت کر کے پوری مملکت پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ شاہ رخ نے خلیل سلطان سے بہت اچھا سلوک کیا۔ خلیل کا انتقال ۸۱۴ھ / ۱۴۱۱ء میں ہوا۔

امیر تیمور نے لاہور، دیپالپور (ملتان) اور دہلی تک کا علاقہ فتح کیا تھا، لیکن بعد میں انہوں نے لاہور اور دیپالپور کی حکومت خضر خان کو دے دی تھی، چنانچہ امیر تیمور کے انتقال کے بعد بھی ان کے جانشینوں نے یہی فرض کیا کہ پنجاب اور دہلی کے علاقوں پر اصل حکمرانی آلِ تیمور ہی کی ہے۔ شاہ رخ کی مملکت سمرقند سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ماوراء النہر (دریائے جیحوں اور سیحوں کا درمیانی علاقہ)، موجودہ افغانستان، ایران اور عراق کے علاقے شامل تھے۔

شاہ رخ بڑے علم دوست حکمراں تھے۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے بڑے بڑے نامور علما کرام اور اہل فن، دارالحکومت ہرات میں یکجا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک اہم نام حافظ آبرو کا ہے۔ وہ بڑے پائے کے مؤرخ اور جغرافیہ داں تھے۔ ان کا نام عام طور پر خواجہ نورالدین لطف اللہ بن عبداللہ لکھا جاتا ہے لیکن دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے مطابق ان کا اصل نام عبداللہ بن عبدالرشید الخوافی تھا۔ حافظ آبرو ہرات میں پیدا ہوئے۔ وہ امیر تیمور سے بہت قریب تھے۔ امیر تیمور کے انتقال کے بعد وہ شاہ رخ اور ان کے بیٹے بایسنغر کے ایوانوں سے وابستہ رہے۔

شاہ رخ کی فرمائش پر ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں حافظ آبرو نے جغرافیہ کی ایک اہم کتاب لکھی۔ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں المغرب سے کرمان اور فارس کے اہم جغرافیائی حالات اور سیاسی تاریخ شامل ہے۔ پہلی جلد کا ایک قلمی نسخہ برطانیہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ دوسری جلد مکمل طور پر دستیاب نہیں ہے' تاہم مؤرخین کے مطابق دوسری جلد میں صرف خراسان والا باب ہی پہلی جلد سے زیادہ ضخیم ہے۔

حافظ آبرو نے شاہ رخ کے حکم پر ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء میں تاریخ عالم کی اہم ترین کتابوں کو "مجموعہ حافظ" میں یکجا کر دیا۔ اس کتاب کی تدوین کے لیے انہوں نے تاریخ طبری، رشیدالدین کی جامع التواریخ اور نظام الدین الشامی کے ظفرنامہ سے بھرپور مدد لی اور خود بھی اہم تاریخی حقائق قلم بند کیے۔

حافظ آبرو نے ۸۲۶ھ / ۱۴۲۳ء میں "زُبدۃ التواریخ" کے عنوان سے دنیا کی تاریخ بھی لکھنی شروع کی۔ اس کتاب کا نام "مجمع التواریخ السلطانی" بھی لکھا گیا ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ۸۳۰ھ / ۱۴۲۷ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی پہلی جلد میں زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ، اور ایران کے شاہانِ قدیم کے حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور المعتصم تک کے خلفاء کے حالات شامل ہیں۔ یہ پہلی دو جلدیں امپریل اکیڈمی سینٹ پیٹرز برگ میں محفوظ ہیں۔ تیسری جلد میں بعد از خلافت، سلجوقیوں اور منگولوں کے حالات ابوسعید ایل خانی کی وفات تک درج ہیں۔ چوتھی جلد دو حصوں میں ہے جس میں پہلی جلد سوانح تیمور پر مشتمل ہے، جبکہ دوسری جلد میں شاہ رخ کے عہد ۸۳۰ھ / ۱۴۲۶ء تک کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسری اور چوتھی جلد کے پہلے حصے اب ناپید ہیں۔ البتہ چوتھی جلد کا دوسرا حصہ کتاب خانہ بوڈلین میں ہے۔ حافظ آبرو کا انتقال ۳ شوال ۸۳۳ھ / ۲۵ جون ۱۴۳۰ء کو جوزنجان میں ہوا۔

اس دور کی ایک اور علمی شخصیت فصیحی خوافی ہیں۔ وہ بہت قابل

Marfat.com

مورخ اور سیرت نگار تھے۔ انہوں نے تاریخ اور سیرت کی کتاب، "مجمل" تصنیف کی۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ سینٹ پیٹرز برگ کی وزارتِ خارجہ کے ادارے السنہ شرقیہ میں محفوظ ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں ہجرت کے پہلے سال سے ۸۴۵ھ / ۴۲-۱۴۴۱ء تک کے تاریخی واقعات وحقائق درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں مصنف کی جائے پیدائش ہرات کے حالات اور اس شہر کے قبل از اسلام حالات شامل کیے گئے ہیں۔

فصیحی ۷۷۷ھ / ۶-۱۳۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ مذکورہ کتاب انہوں نے ذوالحجہ ۸۴۵ھ / اپریل ۱۴۴۲ء میں شاہ رخ کے ملاحظہ کے لیے پیش کی۔ اس کتاب میں ہر سال کے واقعات کے ساتھ اس سال وفات پانے والے ممتاز افراد کی فہرست بھی شامل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ تیموری دور میں خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں علما، ادبا اور شعرا کی کتنی بڑی تعداد آباد تھی۔

اس دور کے اہم اربابِ علم وفن میں کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی کا نام بھی نمایاں ہے۔ وہ شعبان ۸۱۶ھ / نومبر ۱۴۱۳ء میں گو کہ ہرات میں پیدا ہوئے، لیکن ان کے نام میں سمرقندی کا اضافہ ان کے والد جلال الدین اسحٰق کی وجہ سے ہے جن کی جائے پیدائش سمرقند ہے اور جو شاہ رخ کے قاضی عسکر اور امام تھے۔ وہ شاہ رخ کے لیے شرعی مسائل حل کیا کرتے تھے۔ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی نے ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء میں صرف ونحو کی ایک کتاب تصنیف کی اور اسے شاہ رخ کے نام معنون کیا۔

عبدالرزاق سمرقندی نے تاریخ کی ایک کتاب "مطلع السعدین" کے نام سے لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ ۱۷۰ برس کے حالات پر مشتمل اس تاریخ میں منگول حکمراں ابوسعید کی ولادت ۷۰۴ھ / ۱۳۰۴ء سے ان کے ہم نام، ابوسعید تیموری (تیمور کے پڑپوتے) کے زمانے ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ء تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل یہ کتاب بہت اہم ہے، کیونکہ موکف نے چشم دید واقعات درج کیے ہیں۔ انہوں نے ہرات اور اس کے اضلاع کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ عبدالرزاق سمرقندی نے جمادی الآخر ۸۸۷ھ / جولائی-اگست ۱۴۸۲ء میں وفات پائی۔

اسی زمانے میں معین الدین اسفزاری نے کتاب "روضۃ الجنت فی تاریخ مدینۃ الہرات" لکھی۔ انہوں نے ملکی امور اور سفارت کے موضوع پر بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔ ہرات کی تاریخ پر بھی کتاب لکھی جس کا نسخہ برطانیہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔

سرزمین ایران کے مشہور عالم، شاعر اور مفسر مولانا جامیؒ سے کون واقف نہیں۔ آپ کا پورا نام ملا نور الدین عبدالرحمٰن جامی ہے۔ آپ کو جامی ضلع جام کی نسبت سے کہا جاتا ہے، جس کے قصبے خرجرد میں آپ ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ / ۷ نومبر ۱۴۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ بعد میں آپ کے والد جام کے علاقے میں آکر مقیم ہوگئے۔ مولانا جامیؒ نے شاہ رخ کے دور کے ۳۳ برس دیکھے۔ مولانا جامیؒ نے تصنیف وتالیف کا کام اسی دور میں شروع کر دیا تھا، تاہم ان کی تصانیف بعد میں منظرِ عام پر آئیں۔ آپ نے قرآن کی تفسیر لکھی، شہادت نبوتؐ، حدیث، اولیائے کرام کی سیرت، تصوف، صرف ونحو، قافیہ، عروض، موسیقی اور دیگر مضامین پر خامہ فرسائی کی۔ آپ کی کتب کی فہرست بہت طویل ہے۔ ۴۹ کتب کے نام محفوظ ہیں، تاہم میر علی شیر نوائی نے آپ کی کتب کی تعداد ۹۹ بتائی ہے۔ آپ نے صوفی اولیا کا بہت اہم تذکرہ "نفحات الانس" کے نام سے لکھا۔ آپ کی نمایاں کتب میں سات مثنویوں کا مجموعہ "مثنویات ہفت اورنگ" بہت مشہور ہے۔ آپ کی غزلوں کے تین دیوان ہیں۔

شاہ رخ کے ہی دور کی ایک صاحب علم شخصیت، کمال الدین حسن بن خوارزمی کی ہے۔ ان کی وفات ۸۳۵ھ اور ۸۴۰ھ / ۱۴۳۲ء اور ۱۴۳۷ء کے درمیان کسی وقت ہوئی۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں۔ بہت سی کتب کے ترجمے بھی کیے۔ انھوں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی قابلِ قدر مثنوی کی شرح جوہر الاسرار، کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے حصۂ اول کا ایک حصہ قلمی صورت میں برطانوی عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ کتاب بھارت میں شائع ہو چکی ہے۔

صوفیانہ شاعری کرنے والوں میں سید نعمت اللہ کرمانی کا نام نمایاں ہے۔ آپ کا انتقال ۲۲ رجب ۸۳۴ھ / ۱۵ اپریل ۱۴۳۱ء کو تقریباً ایک سو چار برس کی عمر میں ہوا۔ شاہ رخ انہیں بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے کہے ہوئے اشعار کی تعداد چودہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ایک اور اچھے شاعر کاتبی نیشاپوری تھے جنہوں نے ۸۳۸ھ / ۵-۱۴۳۴ء میں وفات پائی۔ انہیں خطاطی پر بھی عبور حاصل تھا۔ عارفی ہروی بھی مثنوی "گوی وچوگان" کے حوالے سے مشہور ہیں۔ ان کا انتقال ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء

Marfat.com

میں ہوا۔

مغربی ایران کے ایک نامور شاعر محمد شیریں مغربی تبریزی تھے جن کا انتقال ۸۰۹ھ / ۷-۱۴۰۶ء میں ہوا۔ آپ کی شاعری کا خاص موضوع غذائیں تھیں، اس لیے آپ "اطعمہ" کہلاتے تھے۔ اسی دور میں ۳۱ کتب کے خالق علی ابن محمد السید الشریف الجرجانی بھی موجود تھے۔ وہ ۷۴۰ھ / ۱۳۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء میں انتقال کیا۔ شاہ رخ ہی کے عہد میں ابن عرب شاہ بھی تھے جنہوں نے امیر تیمور کی سوانح عمری لکھی۔ ان کا انتقال ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء میں قاہرہ میں ہوا۔

ابو طاہر محمد بن یعقوب الشیرازی فیروز آبادی، فارس کے مقام فیروز آباد میں، ۷۲۹ھ / ۱۳۲۹ء میں پیدا ہوئے اور ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں یمن میں وفات پائی۔ عربی کا لغت "لغات القاموس" ان کی وجہ شہرت ہے۔ دو اور کتابیں شاہ رخ کے زمانے میں تصنیف کی گئیں۔ ان میں امیر تیمور کے زمانے کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں بے حد معلوماتی ہیں۔ ان میں سے ایک نظام الدین کا "ظفر نامہ" اور دوسرا شرف الدین علی یزدی کا "ظفر نامہ" ہے جو ۸۲۸ھ / ۱۴۲۵ء میں شاہ رخ کے لڑکے مرزا ابراہیم سلطان کی خواہش پر لکھی گئیں۔ شرف الدین علی یزدی شاعر تھے اور شاہ رخ کے بہت قریب تھے۔ ان کا انتقال ۸۵۸ھ / ۱۴۵۴ء میں ہوا۔ انہوں نے نظام الدین کے ظفر نامہ میں بیان کیے گئے حالات کو تفصیل کے ساتھ دوبارہ تحریر کیا ہے۔ شرف الدین علی یزدی، امیر تیمور کے ساتھ آخری زمانے کی لڑائیوں میں شریک رہ چکے تھے۔

اسی زمانے یعنی ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں محمد بن فضل اللہ نے "احسن التاریخ" لکھی۔ شاہ رخ کے دربار میں ایک مشہور مصور خلیل نقاش اور موسیقی کے دو ماہرین خواجہ عبدالقادر مراغی اور یوسف اندکانی بھی موجود رہتے تھے۔

شاہ رخ کے عہد میں ان کے قابل بیٹے الغ بیگ نے بھی علم کی سرپرستی بہت اچھے انداز میں کی۔ انہوں نے سمرقند میں بہت شاندار مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ الغ بیگ کہلاتا ہے۔ الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہترین رصد گاہ بھی قائم کی تھی۔ سمرقند علم ہیئت کا مرکز تھا۔ یہاں علم ہیئت کے خصوصی کتب خانے بھی تھے۔ اسی دور میں کئی آلاتِ رصد ایجاد کیے گئے اور چار ماہرین نے مل کر زیچ الغ بیگ تیار کی۔

(زیچ سے مراد ستاروں کی فہرست ہے جس میں ستاروں کے بارے میں تفصیل ہوتی ہے)۔

شاہ رخ کا دور فنِ تعمیر کے حوالے سے بھی یادگار ہے۔ ان کے دور میں متعدد ایسی عمارتیں تعمیر ہوئیں جنہیں بجاطور پر فنِ تعمیر کا شاہکار قرار دیا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں سے بعض نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ ان میں مسجد گوہر شاد، مدرسہ و مصلیٰ ہرات، مدرسہ خرجرد، مسجد شاہ اور مقبرہ شاہ نعمت اللہ شامل ہیں۔ شاہ رخ نے علم و فن کے ماہرین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ دارالحکومت ہرات میں اس زمانے کے نامور ترین معمار اکٹھے ہو گئے تھے۔ شاہ رخ کی ملکہ گوہر شاد کے ایما پر ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸ء میں تعمیر کی گئی مسجد گوہر شاد، مشہد (موجودہ ایران) میں امام رضاؒ کے مقبرے کے قریب واقع ہے۔ یہ مسجد اسلامی فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کا مسقف (چھت دار) دروازہ سمرقندی طرز تعمیر لیے ہوئے ہے اور اسے محراب در محراب بنایا گیا ہے۔ مسجد کے مینار برج نما اور وسیع گھیر کے ہیں۔ یہ مینار دروازے کی منڈیر کے بیرونی گوشوں سے ابھرتے ہیں۔

صحن کے چاروں طرف روغنی اینٹوں اور رنگین چینی پتھروں سے نہایت نفیس پچی کاری کی گئی ہے۔ اس میں گو کہ ہر طرح کے رنگ استعمال کیے گئے ہیں لیکن آسمانی اور فیروزی رنگ غالب ہیں اور پھر سفید، سبز، زرد، زعفرانی سنہری اور چمکیلا سیاہ۔ یہ تمام رنگ مختلف تدریجی کیفیتوں کے ساتھ دمکتے نظر آتے ہیں۔

مسجد میں جتنے بھی نقش و نگار بنائے گئے ہیں وہ بے حد واضح اور گہرے ہیں۔ ایوانِ عبادت کا رنگ بالکل سفید ہے۔ بقیہ تین ایوانوں میں زمین (دیواروں کا پس منظر) ہلکے سرخ رنگ کی ہے اور اس پر سفید خطوط کے اندر ہلکے فیروزی رنگ میں بڑے بڑے مستطیل کتبے بنے ہوئے ہیں جو کوفی خط میں ہیں۔ اس مسجد کو مشہور معمار قوام الدین شیرازی نے تعمیر کیا تھا۔ مسجد کی آرائش میں رنگوں کے استعمال کا جو سلیقہ جھلکتا ہے وہ نہایت منفرد و ممتاز ہے۔ مسجد کی تعمیر میں بارہ سال کا عرصہ صَرف ہوا۔ آج کل یہاں ایک عجائب گھر ہے جس میں شاہ رخ کے دور کے نوادرات بھی رکھے گئے ہیں۔

تیموری فنِ تعمیر کے اثرات دور دور تک پہنچے۔ مغل اسے اپنے ساتھ برصغیر پاک و ہند لے آئے، چنانچہ برصغیر کی قدیم مساجد میں ہرات کی مسجد گوہر شاد کی طرح چوڑی محرابیں بنائی گئی ہیں۔ مسجد کی

Marfat.com

تکمیل کے فوراً بعد ملکہ گوہر شاد نے ہرات میں کئی تعمیرات کی ہدایت کی جن میں ایک بڑا مدرسہ، ایک مسجد اور خود ملکہ کا اپنا مقبرہ شامل ہے۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ہرات میں سب سے خوبصورت جگہ شاہ رخ، گوہر شاد اور مشہور مصور بہزاد کا مقبرہ ہے، یہ تینوں افراد ایک ہی مقبرے میں مدفون ہیں۔ مقبرہ ایک دلکش باغ میں ہے جس میں صنوبر کے سیکڑوں درخت ہیں۔ مقبرے کا گنبد بہت حسین ہے اس پر سیدھی اور نمایاں ابھری ہوئی دھاریاں ہیں، گنبد پر نیلی ٹائلیں ہیں۔ مقبرے کے گنبد کے نیچے چھ قبریں ہیں۔

ہرات میں چھ قدیم مینار بھی قابل دید ہیں۔ یہ مینار بھی شاہ رخ کے دور میں تعمیر ہوئے۔ دو مینار تو اسی باغ میں ہیں جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ دیگر چار مینار باغ کی چہار دیواری سے باہر ایک کھنڈر کا حصہ ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بڑا مدرسہ اور مسجد تھی۔ میناروں کے کچھ حصے گر گئے ہیں لیکن جتنے بھی حصے باقی رہ گئے ہیں ان سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شاہ رخ نے ہرات میں جو عمارتیں تعمیر کروائیں ان میں ایک بہترین مدرسہ اور مسجد بھی شامل ہے۔ ان دو عمارتوں کی تعمیر ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء میں شروع ہوئی اور ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء میں تکمیل کو پہنچی۔ شان و شوکت کے لحاظ سے ان عمارتوں کا مقابلہ سمرقند میں امیر تیمور کی بنوائی ہوئی بہترین عمارتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ اس مدرسے کا صحن ۱۹۵x ۳۵۷ فٹ تھا۔ اس کے آٹھ مینار تھے جن پر رنگین چینی کی ماہرانہ اور باکمال پچی کاری تھی۔ عمارت کے کئی گنبد بھی تھے۔ اب اس عمارت کے صرف دو مینار باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی چوٹی پر طاقچوں سے بنا ہوا تاج ہے اور نچلے حصوں میں سنگ مرمر کے آرائشی خانے ہیں جن پر گل بوٹے تراشے گئے ہیں۔

ہرات کے مغرب میں موجودہ ایران کی مشرقی سرحد کے بالکل متصل علاقے خرگرد (اسے خیر گرد بھی لکھا گیا ہے) میں بھی شاہ رخ نے ایک شاندار مدرسہ تعمیر کروایا۔ اس مدرسے کا نقشہ بھی مشہور معمار قوام الدین نے بنایا تھا اور اس کی تکمیل غیاث الدین کے ہاتھوں ۸۴۸ھ / ۱۴۴۵ء میں ہوئی۔ غیاث الدین کا تعلق بھی شیراز سے تھا۔ اس مدرسے کی عمارت، فن تعمیر کا لاجواب شاہکار ہے۔ یہ مدرسہ چار ایوانوں پر مشتمل تھا جن کی بلندی یکساں تھی۔ عمارت کے صدر دروازے پر تین گنبد دار کمرے بنائے گئے تھے جن کی بیرونی دیواروں پر بھی بہت خوش رنگ نقش و نگار تھے اور اندر کی جانب رنگین نقاشی کے علاوہ گچ (ایک قسم کی سفیدی جسے چونے کے ساتھ ملا کر پلستر کرتے ہیں) کی استر کاری میں نہایت، نازک کندہ کاری کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ طاقچوں کی پیچ در پیچ قطاریں بنائی گئی تھیں۔ صحن میں روغنی اینٹوں اور چینی پتھروں سے مختلف رنگوں میں پچی کاری کی گئی تھی۔ سامنے ایک وسیع دروازہ تھا جس کے اطراف کی دیواریں بند نوکیلی محرابوں سے مزین تھیں اور کناروں پر برجیاں تھیں۔ یہ تیموری طرز تعمیر میں ایک نیا رنگ تھا۔ خرگرد کا یہ مدرسہ اب شکستہ حالت میں ہے۔

شاہ رخ نے خواجہ عبداللہ انصاری کے مقبرے کی عمارت کو بھی ۸۳۲ھ / ۱۴۲۸ء میں از سر نو تعمیر کروایا تھا۔ کرمان کے قریب ماہن کے مقام پر ایک بزرگ سید نورالدین شاہؒ کا مقبرہ ہے۔ یہ بزرگ شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس مزار پر کاشی کاری کا عمدہ کام ہوا ہے۔ یہ مزار ۸۴۰ھ / ۱۴۳۶ء میں تعمیر ہوا تھا۔ شاہ رخ نے ہرات میں ایک باغ، باغ سفید کے نام سے بھی بنوایا تھا۔

شاہ رخ کے وزیر خواجہ غیاث الدین نے خراسان اور عراق میں رفاہ عامہ کی متعدد عمارتیں تعمیر کروائیں۔ شاہ رخ کو علوم و فنون کی سرپرستی سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے دربار میں تعمیرات، مصوری اور موسیقی کے اعلیٰ درجے کے چار سو ماہرین موجود تھے۔

اس دور میں کاشی کاری، مٹی کے ظروف بنانے، چاندی، تانبے اور لکڑی میں منبت کاری (ابھرے ہوئے نقش بنانا)، زربفت کا عمدہ کپڑے بننے اور اسلحہ سازی کے فنون نے بڑی ترقی کی۔ زربفت کے کارخانے تبریز، گرجستان، مرو، طوس، شوستر، شیراز اور نیشاپور میں واقع تھے۔ شاہ رخ کے عہد میں قالین سازی کا کام بھی ہوا، گو کہ اس فن نے بہت زیادہ ترقی نہ کی۔ فن گنبد سازی کو البتہ بہت عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں چاندی کے ایسے ظروف پسند کیے جاتے تھے جن میں سونے کی لوح، قیمتی جواہر اور مینائی (مرصع یا جڑاؤ) شیشے جڑے ہوئے ہوں۔ پیتل کا کام بھی اچھا ہوتا تھا۔ ظروف پر نقاشی اور کندہ کاری بھی ہوتی اور ایک دھات میں دوسری دھات کے ٹکڑے جڑنے کا بھی رواج تھا۔ شاہ رخ نے اپنے دور میں ہرات اور مرو کے شہروں کو بہت ترقی دی۔ مرو کو تو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ دریائے مرغاب کی پرانی گزرگاہ کو بحال کروا کے بند کے پشتے نئے سرے سے تعمیر کیے گئے۔

شاہ رخ کے دور میں کاغذ سازی، خطاطی، ہیئل گری (جلانا اور

صاف کرنا)، رنگ سازی، نقاشی اور جلد سازی نے بھی بہت ترقی کی۔ ان تمام فنون کے ماہرین کتب کی تیاری میں مل کر کام کرتے تھے اور کمال کی کتابیں تیار کرتے تھے۔ اس دور کی کتب کی شان و شوکت اور زیبائش کا اندازہ تہران میں محفوظ "شاہ نامہ" کے اوراق سے لگایا جا سکتا ہے۔ شاہ رخ کے بیٹے بایسنغر مرزا، جن کا انتقال ۸۴۷ھ / ۱۴۴۳ء میں ہوا، اپنے والد کے دور میں وزیر تھے۔ انہوں نے بھی دارالحکومت ہرات میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا۔

انہوں نے استر آباد میں کتب کا اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا جہاں مولانا جعفر تبریزی کی نگرانی میں چالیس خطاط کتابوں کی نقلیں تیار کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ بایسنغر مرزا خود بھی اپنے دور کے مشہور خطاط تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے خطاط جعفر بایسنغری نے ۸۳۳ھ / ۳۰-۱۴۲۹ء میں بایسنغر مرزا کے کتب خانے کے لیے شاہ نامہ کی خطاطی مکمل کی۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی تو کتاب سازی کا ایک اعلیٰ ترین معیار بن گئی۔ کتاب کی خطاطی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سنہری خطوط کے درمیان نہایت خوبصورت نقوش تخلیق کیے گئے ہیں۔ متن سے پہلے تین اوراق پر کمال کی آرائش ہے۔ آخر میں بھی زیبائش کی گئی ہے۔ آرائش میں میناکاری کے رنگوں سے کام لے کر نیلی، سنہری اور سرخ گل کاری کر کے چین کی عجیب و غریب اشکال دکھائی گئی ہیں۔

اس دور میں کتابوں کی جلدیں بہت اہتمام سے تیار کی جاتی تھیں۔ ان پر عمدہ نقاشی ہوتی تھی۔ متن کے لیے رنگین و دبیز کاغذ استعمال ہوتا تھا اور سونے کا برادہ افشاں کی طرح چھڑکا جاتا تھا۔ کتابوں میں بعض مقامات پر فطری مناظر کی عکاسی بھی کی جاتی تھی۔ کتاب کی بیرونی سطح کی آرائش کے لیے دھات کے بڑے سانچے (بلاک) استعمال ہوتے تھے۔ ابھرے ہوئے نقش بھی بنائے جاتے تھے۔ جلد سازی کے اس انداز نے اہل یورپ کو بہت متاثر کیا اور یہ طرز بہت مقبول ہوا۔

شاہ رخ نے تقریباً ۴۳ برس حکومت کی۔ ان کی مملکت اپنے وقت کی نہایت مضبوط حکومت سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے دیگر ممالک کے سربراہوں سے سفارتی تعلقات بھی قائم کیے۔ ۸۲۱ھ / ۱۴۱۸ء میں دہلی کے حکمراں خضر خان نے سفیر شاہ رخ کے پاس روانہ کیا۔ ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء میں شاہ رخ نے چین کے بادشاہ کے پاس سفیر بھیجا۔ ۸۴۰ھ / ۱۴۳۶ء میں انہوں نے "مطلع السعدین" (تاریخ کی مشہور کتاب) کے مولف عبدالرزاق سمرقندی کو ایک سفارتی وفد کا سربراہ بنا کر دکن (بھارت) بھیجا۔ چین تیموری خاندان کی بالادستی تسلیم کرتا تھا اور خراج دیتا تھا۔ ہندوستان بھی ان کے اقتدار کو رسمی طور پر تسلیم کرتا تھا۔ شاہ رخ کی حکومت کے عثمانی ترکوں، مصر کے حکمرانوں اور تبت کے ساتھ بھی سفارتی تعلقات تھے۔

شاہ رخ بہت نیک دل، سچے مسلمان اور عبادت گزار حکمراں تھے۔ ان کی طبیعت میں حلم اور فیاضی بہت زیادہ تھی۔ تمام مؤرخین ان کی سخاوت اور امن پسندی کے معترف ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ شاہ رخ حرص و ہوس سے پاک تھے۔ وہ شریعت کے پابند تھے۔ نمازوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ایام بیض، (چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخیں) اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ ہر جمعہ کی شام قرآن پاک کے حافظوں کو بلوا کر ان سے تلاوت کرواتے تھے۔

شاہ رخ اپنی فطرت کے اعتبار سے نرم دل اور امن پسند انسان تھے، لیکن وہ کمزور یا بزدل حکمراں نہ تھے۔ باغیوں کی سرکوبی کا معاملہ ہو یا دشمنوں سے ٹکر لینے کا سوال، وہ ہر محاذ پر ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے نظر آئے۔

شاہ رخ نے ۸۱۰ھ / ۸-۱۴۰۷ء میں بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے متعدد مہمات روانہ کی تھیں۔ ان میں بلخ اور استر آباد کی مہمات بھی شامل ہیں۔ ۸۱۲ھ / ۱۴۰۹ء میں بدخشاں میں شاہ بہاالدین کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ دو سال بعد شاہ رخ کو شیخ نورالدین کی سرکشی کے خاتمے کے لیے ماوراالنہر جانا پڑا۔ خوارزم کو مطیع بنانے کے لیے بھی مہم بھیجی گئی۔

شاہ رخ کا انتقال صوبہ "رے" میں فشاورد کے مقام پر ۲۵ ذوالحجہ ۸۵۰ھ / ۱۳ مارچ ۱۴۴۷ء کو ہوا۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ الغ بیگ، ابوالفتح، ابراہیم بایسنغر، سیور غتمش اور محمد جوکی۔ ان میں سے صرف الغ بیگ نے اتنی عمر پائی کہ شاہ رخ کے انتقال کے بعد مملکت کے فرمانروا بن سکے۔

***

Marfat.com

علی شیر نوائی

عہد ساز، ہنر آفریں، ہمہ داں ذی علم شخصیت جو بہترین تربیت کار بھی تھی

باغِ زاغان میں بڑی چہل پہل تھی!

باغ اور اس میں واقع محل کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ چاق وچوبند باوردی محافظ آنے جانے کے راستوں پر مستعد کھڑے تھے۔ مختلف ملازمین اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

شاید کسی دعوت کا اہتمام تھا۔

کچھ دیر بعد باغ کے صدر دروازے پر شان دار سواریاں آکر رکیں۔ ان میں سے متعدد امرا کے جلو میں سلطانِ وقت اترے۔ وہ سرخ و سپید رنگت اور چھریرے بدن کے مالک تھے۔ ایک وجیہ اور پُرتمکنت شخصیت ان کے ساتھ تھی۔ سلطانِ وقت اس شخصیت کو بے حد عزت واحترام کے ساتھ محل میں لے گئے۔ تمام حاضرین کو اس بات کا علم تھا کہ اس باوقار شخصیت کو سلطانِ وقت نے خصوصی طور پر درخواست کرکے سمرقند سے ہرات بلوایا ہے۔

تھوڑی دیر بعد خدام طرح طرح کی قابیں لاکر دستر خوان پر رکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا دستر خوان پُرتکلف اور لذیذ کھانوں سے سج گیا۔ سلطان کے اشارے پر دعوت کا آغاز ہوا۔ دعوت ختم ہوئی تو امرا کی موجودگی میں سلطان نے جوش ومسرت کے ساتھ اعلان کیا:

''ہم نے اپنے دیرینہ دوست علی شیر کو اپنا مُہردار مقرر کردیا ہے۔''

فضا تحسین وآفرین کے کلمات سے گونج اٹھی۔

تیموری سلطنت کے آخری ممتاز حکمران سلطان حسین بایقرا نے جس مایۂ ناز شخصیت کے اعزاز میں اس دعوت کا اہتمام کیا تھا وہ علی شیر نوائی کی عہد ساز اور ہنر آفریں شخصیت تھی۔

علی شیر نوائی نہ صرف یہ کہ ترکی ادبیات کی تاریخ میں بہت بڑا نام ہے بلکہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین، طبّاع، ذی علم اور قابل انسان تھے جن کی ذات میں بے شمار خوبیاں سمٹ آئی تھیں۔ انہوں نے مشرقی ترکی زبان (ترکی کی چغتائی شاخ) کو عظمت ورفعت عطا کی اور اسے فارسی کے ہم پلہ کردیا۔ وہ ترکی اور فارسی کے اعلیٰ درجے کے شاعر، مصنف، تاریخ داں ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی، نقاشی، مصوری، خوش نویسی، طِلا کاری، سنگ تراشی اور معماری کے ماہر بھی تھے۔ ان تمام شعبوں میں انہوں نے بے شمار افراد کی تربیت کی جن میں سے بہت سے افراد نے اپنے اپنے شعبے میں بڑا نام پیدا کیا۔

علی شیر نوائی کا نام تاریخ کی کتب میں علی شیر بیگ یا امیر علی شیر بتایا گیا ہے۔ نوائی ان کا تخلص ہے۔ وہ ۱۷رمضان المبارک ۸۴۴ھ / ۹ فروری ۱۴۴۱ء کو ہرات میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قبیلہ اویغور سے تھا۔ ان کے والد کا نام کچکنہ بخشی یا کچکنہ بہادر تھا۔

علی شیر کا خاندان ایک علم دوست خاندان تھا۔ خود علی شیر کے اپنے بیان کے مطابق ان کے آباؤاجداد سات پشتوں سے امیر تیمور اور ان کے جانشینوں کی حکومتوں سے وابستہ تھے۔ خاص طور پر امیر تیمور کے بیٹے عمر شیخ مرزا اور ان کے بیٹے بایقرا مرزا کی حکومتوں سے علی شیر کے خاندان کو زیادہ وابستگی رہی۔ علی شیر کے پرنانا ابوسعید چیک، بایقرا مرزا کے بیگلر بیگی یعنی امیر الامرا تھے۔

علی شیر کے والد کچکنہ بہادر، ایک ذی علم انسان تھے۔ وہ ترکی شیوخ میں سے ایک شیخ، بابا کوکی کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ خود ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ کچھ عرصے تک وہ صوبہ سبزوار کے حاکم رہے، پھر استر آباد میں مامور کیے گئے۔ ایک بار وہ سمرقند کے حاکم ابوسعید مرزا کے پاس علمائے ہرات کے ساتھ روانہ کیے گئے۔ علی شیر کے چچا میر

Marfat.com

سعید کابلی اور محمد علی غریبی بھی ان امراء میں شامل تھے جو ترکی زبان میں شعر کہتے تھے۔

علی شیر کے والد کچکنہ بہادر اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ ۸۵۰ھ/۱۴۴۷ء میں امیر تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ رخ کے انتقال کے بعد مملکت کی سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی آنے لگی اور ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء میں شاہ رخ کے صاحب زادے الغ بیگ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ ان حالات کے باعث وہ وسیع تیموری سلطنت جو خراسان، مازندراں، سیستان، ماوراء النہر، فارس، کرمان، آذربائیجان، عراق اور قریبی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی، عدم استحکام کا شکار ہو گئی۔ صورتِ حال اتنی خراب ہوئی کہ کچکنہ بہادر کو اپنے چھوٹے بیٹے علی شیر کو ساتھ لے کر ہرات سے نکلنا پڑا۔ وہ یزد کے راستے عراق پہنچ گئے۔ اسی سفر میں کم سن علی شیر کی ملاقات امیر تیمور کے سوانح نگار شرف الدین یزدی سے ہوئی۔ یہ ملاقات ان کے لیے بڑی یادگار تھی وہ اس کا ذکر فخر سے کرتے تھے۔

یہ زمانہ علی شیر اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے لیے بڑا دشوار تھا۔ ان کٹھن حالات میں شاہ رخ کے پوتے ابوالقاسم بابر نے علی شیر اور ان کے والد کچکنہ بہادر کو پناہ دی۔ ابوالقاسم بابر ان دنوں خراسان کے حاکم تھے۔ ابوالقاسم بابر ہی نے اسی زمانے میں بایقرا مرزا کے پوتے حسین بایقرا کو بھی اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا جو علی شیر کے ہم عمر تھے۔ حسین بایقرا کو بھی مملکت کے بگڑے ہوئے سیاسی حالات کے باعث ہرات چھوڑنا پڑا تھا۔ یہی حسین بایقرا تقریباً بیس برس بعد یعنی ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء میں تیموری سلطنت کے حکمراں بنے جو موجودہ افغانستان، خراسان اور مازندران کے علاقوں پر مشتمل تھی۔

یوں علی شیر اور حسین بایقرا کو ابوالقاسم کی زیرِ سرپرستی ایک ہی مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ حسین بایقرا کے مطابق، علی شیر ان کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی تھے۔ علی شیر کے بھائی درویش علی بیگ بھی حسین بایقرا کے رضاعی بھائی تھے۔

ابوالقاسم بابر کو حسین بایقرا اور علی شیر کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال تھا اور وہ بذاتِ خود دونوں ہونہار بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتے تھے۔ جلد ہی دونوں بچوں نے فارسی اور ترکی زبانوں میں نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ ابوالقاسم بابر خود بھی شاعر تھے۔ وہ علی شیر کی نظموں کو بہت پسند کیا کرتے تھے۔ علی شیر کا رجحان فارسی کے مقابلے میں ترکی زبان کی طرف زیادہ تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا اپنا خاندان فارسی کے مقابلے میں ترکی سے زیادہ قریب تھا۔ ابوالقاسم بابر بھی ترکی زبان کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

ابوالقاسم بابر کا انتقال ہوا تو ان کے صاحب زادے حسن اردشیر نے ان کی جگہ حکومت سنبھالی۔ اس موقع پر اس وقت کے ایک مشہور شاعر مولانا لطفی نے علی شیر کو مشورہ دیا کہ وہ حسن اردشیر کو اپنا سرپرست قرار دے دیں۔ چنانچہ علی شیر نے حسن اردشیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ حسن اردشیر صاحب علم حکمراں تھے۔ ترکی میں شاعری کرتے تھے۔ انہوں نے علی شیر کی بہت اچھی تربیت کی۔ اس بات پر علی شیر، حسن اردشیر کے احسان مند رہے۔ جب ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں حسن اردشیر کا انتقال ہوا تو علی شیر نے محل اور پائیں باغ کے شمالی پہاڑ کے دامن میں حسن اردشیر کا مقبرہ تعمیر کروایا۔

تیموری سلطنت پر امیر تیمور کے پوتے ابوسعید مرزا کی حکمرانی ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء سے ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء تک قائم رہی۔ ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء کے لگ بھگ صرف بیس برس کی عمر میں جب وہ مشہد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، علی شیر ہرات آئے اور انہوں نے سلطان ابوسعید کی ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن اس ذہین، فطین اور لائق نوجوان کی یہاں کچھ زیادہ قدر نہیں کی گئی۔ انہیں رہنے کی جگہ تک فراہم نہیں کی گئی۔ ان کی کوئی باقاعدہ تنخواہ مقرر نہ تھی۔ انہیں کوئی ہم مذاق ساتھی بھی میسر نہیں آیا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے ہرات کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

ان دنوں سمرقند کے والی، احمد حاجی بیگ تھے۔ وہ علی شیر کے پرانے دوست تھے۔ انہوں نے اس مشکل گھڑی میں علی شیر کی بھرپور مدد کی۔ علی شیر سمرقند چلے گئے اور وہاں کے مقامی شاعروں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ دو سال کا عرصہ وہ حضرت فضل اللہ ابواللیثیؒ کی خانقاہ میں رہے اور تحصیل علم میں مصروف رہے۔

۸۷۲ھ/ ۱۴۶۸ء میں سلطان ابوسعید مرزا نے فوج لے کر عراق کی طرف پیش قدمی کی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حسین بایقرا نے خراسان کے اندرونی علاقوں پر حملہ بول دیا۔ ابوسعید کے بیٹے احمد مرزا جو اس وقت سمرقند کے حاکم تھے، آمو دریا کو پار کر کے خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ علی شیر بھی اسی لشکر میں شامل تھے۔ اسی دوران

Marfat.com

اطلاع ملی کہ ابو سعید کو ان کے مخالف حکمراں اوزون حسن نے قتل کروادیا ہے۔ اسی سال حسین بایقرا نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس صورتِ حال کے باعث سلطان احمد مرزا کو پسپا ہونا پڑا۔

حسین بایقرا نے جب ہرات میں مسندِ اقتدار سنبھالی تو وہ اپنے بچپن کے ساتھی، ہم جلیس، ہم مکتب اور لائق دوست علی شیر کو نہ بھولے تھے۔ انہوں نے سلطان احمد مرزا کو خط ارسال کیا کہ ازراہِ کرم علی شیر کو ہرات روانہ کر دیا جائے۔ سلطان احمد مرزا نے ان کی یہ بات مان لی۔ جلد ہی علی شیر کو بڑی عزت و احترام اور سرکاری اعزاز کے ساتھ ہرات روانہ کر دیا گیا جہاں سلطان حسین بایقرا نے اپنے دیرینہ دوست کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور ہرات سے باہر واقع باغِ زاغان کے محل میں علی شیر کے اعزاز میں پُر تکلف تقریب منعقد کی۔ مضمون کے آغاز میں اسی واقعے کا ذکر ہے۔

ابتدا میں سلطان حسین بایقرا نے علی شیر نوائی کو اپنا مُہردار مقرر کیا۔ ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں انہوں نے علی شیر کو دیوان بیگی اور پھر امیر دیوان مال بنا دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حسین بایقرا نے علی شیر نوائی کو امیر دیوان بزرگ امارت یا "تواچی دیوانی بک بیگی" مقرر کیا تھا۔ تواچی دیوان اس محکمے کو کہتے تھے جس کی تحویل میں ترک رعایا اور فوج کا انتظام ہوتا تھا چنانچہ اسے "ترک دیوانی" بھی کہا جاتا تھا، جو دیوان مال، مالیات اور غیر ترک ایرانی رعایا کا نگراں تھا۔ ان دیوانوں کے نگراں کو "ترک امیر دیوان بیگی" کہتے تھے۔ وہ ترک امیر جو ترکی دیوان یا سرت دیوان میں سے کسی ایک کا صدر ہوتا تھا "الغ بیگ" کہلاتا تھا۔ علی شیر "الغ بیگ" نہیں تھے بلکہ وہ دیوان عالی (ترکی دیوان) کے ایک رکن تھے۔ اس کے ساتھ وہ "ایچکی" بھی تھے یعنی سلطان کے مقرب اور ندیم۔

علی شیر ۸۹۳ھ / ۸-۱۴۸۷ء میں پندرہ ماہ تک صوبہ استر آباد کے والی رہے۔ ان کی باقی زندگی ہرات میں یا سلطان حسین بایقرا کے ساتھ سفر میں گزری۔ جب سلطان حسین بایقرا کسی جنگی مہم پر جاتے تو علی شیر ہرات میں رہتے اور سلطان احمد مرزا کے ساتھ مل کر نائب السلطان کی حیثیت سے کام کرتے۔ سلطان احمد مرزا، پہلے چغتائی شاعر سیدی احمد میرزا کے صاحب زادے اور سلطان حسین بایقرا کے برادر نسبتی میراں شاہ کے نواسے تھے۔

سلطان حسین بایقرا نے علی شیر کے ساتھ ان کے سرپرست اور استاد حسن اردشیر کو بھی دیوانِ عالی کا رکن مقرر کیا تھا۔ ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں علی شیر کے بھائی درویش علی کو بھی اس دیوان کا رکن مقرر کیا گیا۔

علی شیر نوائی پوری مملکت میں سلطان حسین بایقرا کے بعد سب سے زیادہ اثر و رسوخ کے مالک تھے لیکن ان کی خواہش تھی کہ محض سلطان حسین بایقرا کے "ایچکی" یعنی ندیم یا مقرب بن کر رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں دولت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود ایک متمول اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں اس بات کی خواہش نہ تھی کہ وہ کسی سرکاری عہدے کے ذریعے صاحبِ ثروت بن جائیں۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ بعض روایات اور قوانین کی رُو سے اہم سرکاری اجلاسوں میں علی شیر کو دیگر ترک اور مغل سرداروں کے پیچھے بیٹھنا پڑتا تھا چنانچہ ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء میں علی شیر نے دیوان کی صدارت چھوڑ کر ایک اور شخص بابا علی اشک آغا کے حوالے کر دی اور خود سلطان کے ندیم (مقرب) بن کر رہنے لگے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تمام عہدوں سے دستبرداری کے بعد علی شیر نوائی کی سیاسی اہمیت اور اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ امورِ مملکت میں ان کا وجود ناگزیر صورت اختیار کر گیا۔ علی شیر نوائی کا سیاسی قد اب بہت بلند ہو چکا تھا۔ جب بعض سرکاری امرا نے بغاوت کر دی تو یہ علی شیر نوائی ہی تھے جنہوں نے اس بغاوت کو ختم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح سلطان حسین بایقرا کے اپنے خاندان میں جب کچھ تنازعات نے سر اٹھایا تو علی شیر ہی نے ان تنازعات کا خاتمہ کروایا۔

سلطان حسین بایقرا کو انتظامی امور کے سلسلے میں علی شیر کا تعاون ہمیشہ درکار رہتا تھا اور علی شیر کے بغیر وہ ہمیشہ بے چینی محسوس کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب ۹۰۴ھ / ۱۴۹۹ء میں علی شیر نوائی نے سلطان حسین بایقرا سے حج بیت اللہ کی اجازت چاہی تو سلطان نے اجازت دے تو دی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ اجازت واپس لے لی اور توقع ظاہر کی کہ وہ ابھی حج کے لیے نہیں جائیں گے۔

علی شیر نوائی نے ۳۲ برس تک حسین بایقرا کی سلطنت کے لیے علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی اور انتظامی خدمات انجام دیں۔ ۹۰۶ھ / ۱۵۰۰ء میں جب حسین بایقرا استر آباد کی مہم سے واپس آ رہے تھے تو علی شیر نوائی ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے گئے۔ اس موقع پر علی

Marfat.com

شیر پر دل کا دورہ پڑا۔ سلطان حسین بایقرا کے حکم پر انہیں بہت احتیاط سے شاہی سواری پر ہرات، واپس لایا گیا۔ ہرات میں بہترین طبیبوں نے ان کا علاج شروع کر دیا۔ حسین بایقرا کو علی شیر کی علالت کی بڑی فکر تھی وہ بار بار مزاج پُرسی کے لیے علی شیر کی رہائش گاہ پر جایا کرتے تھے۔

علی شیر کی علالت نے طول پکڑا اور بالآخر ۲۹ جمادی الآخر ۹۰۶ھ / ۲۰ جنوری ۱۵۰۱ء کو علم و ادب کا یہ چمکتا ہوا آفتاب بے نور ہو گیا۔ ان کے انتقال کے وقت حسین بایقرا ان کے سرہانے موجود تھے۔ علی شیر کے انتقال کا حسین بایقرا کو شدید صدمہ ہوا۔ علی شیر کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی اپنی تعمیر کردہ مسجد قدسیہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ سلطان حسین بایقرا خود تین دن تک علی شیر نوائی کی رہائش گاہ میں موجود رہے۔ سات دن بعد علی شیر نوائی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی غرض سے ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں تمام امرا نے معمولی خادموں کی طرح کھڑے ہو کر کھانا کھلایا۔ وہ گویا اس عظیم مدبر کے لیے اپنے احترام کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

علی شیر نوائی کا سب سے بڑا کارنامہ علوم و فنون کی نہایت اچھے انداز میں سرپرستی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود عظیم علمی خدمات انجام دیں بلکہ علما کرام، مختلف علوم کے ماہرین اور اہل فن کی اس طور فیاضانہ سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی کہ ہرات علم و فن کی معراج پر جا پہنچا۔ علی شیر نوائی کے مربیانہ رویے اور تربیت کی بدولت نامور اساتذۂ فن ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں مشہور صوفی شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی، مفسر و مصنف حسین واعظ کاشفی، مورّخ میر خواند، مصور بہزاد اور دیگر بہت سے مشاہیر شامل ہیں۔

علی شیر نوائی نے مشرقی ترکی زبان کو ترقی دی اور اس زبان میں اتنی زیادہ تصانیف لکھی گئیں کہ یہ بے حد اہمیت اختیار کر گئی۔ یہ زبان منگولوں کے دور میں خوارزم کے علاقے میں پروان چڑھی، تیموری عہد میں یہ زبان خراسان اور خصوصاً ہرات میں پھیل گئی۔ خود علی شیر نے اس زبان میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور دیگر اہل علم نے بھی اس زبان میں بہت کام کیا۔ ترکی چغتائی زبان میں تصنیف کردہ یہ کتب مشرقی ترکستان کی طرح عراق اور اناطولیہ (ترکی) کے اطراف کے علاقوں میں آسانی سے سمجھی جا سکتی تھیں۔

علی شیر کے اس انقلابی اقدام کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ سولھویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں کاشغر کے چغتائی شاعر سعید خان (وفات: ۹۴۰ھ / ۱۵۳۴ء) اور عراق کے ترکی آذری بولی میں لکھنے والے ترک شاعر، و فضولی (وفات: ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء) براہِ راست علی شیر نوائی سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ علی شیر نوائی کی طرز میں اشعار کہے بلکہ ان کی نظموں کے جواب میں اشعار کہے۔ اس اعتبار سے علی شیر نوائی کو تمام ترکی ادبیات کی تاریخ میں منفرد مقام حاصل ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ترکوں کے تعلیم یافتہ اس طبقے کو بیدار کریں جو ایرانی ادبیات سے مرعوب تھے اور اس کی پیروی کرنا چاہتے تھے اور علی شیر نوائی اپنی اس خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہے۔

علی شیر نوائی کم از کم ۲۹ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہیں نظم اور نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے ترکی چغتائی زبان کے علاوہ فارسی میں بھی لکھا۔ ان کی سب سے اہم تصنیف "خمسہ" ہے۔ "خمسہ" سے مراد پانچ مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ علی شیر نوائی نے "خمسہ" نظامی اور امیر خسرو دہلوی کی تصنیف کردہ خمسہ کے طرز پر لکھی۔ علی شیر نوائی کے "خمسہ" میں ۶۴ ہزار اشعار ہیں۔ اس خمسہ کا پہلا حصہ "خیرات الابرار" ہے جو اخلاق و تصوف سے متعلق سرگزشت اور حکایات کا مجموعہ ہے۔ دیگر چار حصے منظوم افسانے ہیں جن میں شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سکندر و بہرام گور سے متعلق حکایتیں اور کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

علی شیر نوائی نے مشرقی ترکی زبان میں ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا۔ ان کے اس دیوان کا عنوان "خزائن المعانی" ہے جس میں ۵۵ ہزار اشعار ہیں۔ اس دیوان میں وہ قصائد اور قطعات شامل کیے گئے ہیں جو علی شیر نے اپنی عمر کے چار ادوار میں کہے اور اسی مناسبت سے ان کے نام غرائب الصغیر، نوادر الشباب، بدائع الوسط اور فوائد الکبر رکھے گئے ہیں۔ علی شیر نوائی نے فارسی میں بھی ایک دیوان تصنیف کیا ہے جس میں تقریباً ۱۲ ہزار اشعار ہیں۔ فارسی میں وہ فانی متخلص کرتے تھے۔

علی شیر نوائی نے اپنی عمر کے آخری ایام میں حضرت فریدالدین عطارؒ کی مثنوی "منطق الطیر" کے طرز پر "لسان الطیر" لکھی۔ اس میں ۷ ہزار اشعار ہیں۔

علی شیر نوائی کے دیوان "خزائن المعانی" میں، جو چار حصوں پر مشتمل ہے، زیادہ تر غزلیں ہیں۔ ان میں علی شیر نوائی کی اپنی پوری زندگی کا عکس نظر آتا ہے اور ان کے اپنے اور ماحول کے بارے میں

Marfat.com

جذبات و احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان غزلوں کو اس دور کے بڑے نامور خطاطوں نے لکھا اور مایۂ ناز مصوروں اور نقاشوں نے ان کی تزئین کی۔ نامی گرامی ماہرین موسیقی نے ان غزلوں کی دھنیں مرتب کیں۔

علی شیر نوائی نے مشرقی ترکی میں ایک اہم کتاب "مجالس النفائس" کے نام سے ۸۹۶ھ / ۱۴۹۰ء میں لکھی۔ یہ کتاب ایک تمہید اور آٹھ دفاتر پر مشتمل ہے۔

پہلا دفتر ان شاعروں کے بارے میں ہے جو اس وقت انتقال کر گئے جب مصنف کم سن تھا اور جن سے ملنے کا اسے اتفاق نہ ہوا۔ ان میں اہم ترین شاعر قاسم الانوار ہیں۔ دوسرا دفتر ان شاعروں کا تذکرہ کرتا ہے جن سے علی شیر نوائی کی ذاتی طور پر شناسائی تھی لیکن "مجالس النفائس" کی تصنیف کے وقت وہ اس دنیا میں نہیں تھے۔ ان میں سب سے مشہور شخصیت شرف الدین علی یزدی کی ہے جو امیر تیمور کی مشہور تاریخ "ظفر نامہ" کے مصنف تھے۔

تیسرا دفتر ان شعرا کے بارے میں ہے جو اس کتاب کی تصنیف کے وقت بقیدِ حیات تھے اور جن سے علی شیر نوائی ذاتی طور پر واقف تھے مثلاً امیر شیخم سُہیلی، سیفی، آصفی، بنائی اور اہلی ترشیزی۔ چوتھا دفتر ان قابلِ احترام بزرگوں کے حالات کا احاطہ کرتا ہے جنہوں نے خاص خاص موقعوں پر شعر کہے۔ گو کہ ان کی اوّلین حیثیت شاعر کی نہ تھی، مثلاً واعظ حسین واعظ کاشفی، مورخ میر خواند وغیرہ۔ پانچویں دفتر میں خراسان اور دیگر مقامات کے ان سلاطین اور شاہی خاندانوں کے افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے گاہے بگاہے شعر کہے۔

چھٹا دفتر ان غیر خراسانی فضلا، شعرا اور بذلہ سنجوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اچھے شعر کہے۔ ساتویں دفتر میں ان سلاطین اور امرا کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے یا تو خود اشعار کہے یا دوسروں کے اشعار اس برجستگی کے ساتھ بر محل نقل کیے کہ وہ شاعروں کے ہم پلہ قرار پائے۔ اس دفتر میں امیر تیمور، شاہ رخ، خلیل سلطان، الغ بیگ، بایسنغر مرزا، عبداللطیف مرزا اور دیگر سلاطین شامل ہیں۔

آٹھواں دفتر علی شیر نوائی کے ہمدم و ہم جلیس سلطان حسین بایقرا کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

علی شیر نوائی نے مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی معرکۃ الآرا کتاب "نفحات الانس" کا مشرقی ترکی میں ترجمہ کیا۔ کتاب میں صوفی اولیا کرام کا تذکرہ ہے جس میں ۶۱۱ اولیا اور برگزیدہ خواتین کے حالاتِ زندگی شامل ہیں۔ علی شیر نوائی نے صوفیا کرام کے حالات زندگی اور سیرت پر ایک اور کتاب "نسائم المحبۃ من شمیم الفتوۃ" کے نام سے لکھی جو ترکی تصوف کی تاریخ اور سادگی زبان کی بنا پر اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولانا جامیؒ کے بارے میں ایک کتاب "خمسۃ المتحیرین" کے نام سے، اپنے استاد حسن اردشیر کے بارے میں ایک کتاب "حالات حسن اردشیر" کے نام سے اور پہلوان محمد کے بارے میں ایک کتاب "حالات پہلوان محمد، کشتی گیر" کے نام سے لکھی۔

"خمسۃ المتحیرین" پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں علی شیر نوائی نے مولانا جامیؒ کا نسب، ولادت، ان سے ملاقات، باہمی خط و کتابت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان تصانیف کے بارے میں بھی بتایا ہے جو مولانا جامیؒ نے علی شیر نوائی کی تجویز اور توجہ دلانے پر تصنیف کیں۔ علی شیر نوائی نے ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا مطالعہ انہوں نے مولانا جامیؒ کی تجویز پر کیا۔ علی شیر نوائی کی دیگر مشہور تصانیف میں "محاکمۃ اللغتین" اور "محبوب القلوب" شامل ہیں۔ "محبوب القلوب" اخلاقیات پر مبنی ہے اور اس میں معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والوں مثلاً بہادر سپاہی، نوکر، موسیقار، دیہاتی وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔

علی شیر نوائی کی متعدد کتابوں کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ ان کی کتابوں کے متعدد نسخے استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر، پیرس، پیٹرزبرگ اور دیگر مشہور شہروں کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

علی شیر نوائی کو تاریخ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ مشہور مورخ میر خواند نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "روضۃ الصفا" (تاریخ عالم) علی شیر نوائی ہی کے کہنے پر لکھی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ تاریخ منصوبہ بندی کے اعتبار سے علی شیر کی تصنیف ہے۔ علی شیر نوائی نے خود بھی "زبدۃ التواریخ" کے عنوان سے ترک سلاطین (ایلخانی اور تیموری) کی تاریخ لکھی تھی، لیکن یہ تاریخ محفوظ نہ رہ سکی۔

علی شیر نوائی کو زبان و ادب پر کامل عبور حاصل تھا۔ وہ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیے لکھتے تھے تو فارسی اور ترکی کی ثقیل اور مشکل تراکیب استعمال کرتے تھے اور صرف و نحو کے لحاظ سے ان کی تحریر بڑی پیچیدہ ہوتی تھی، لیکن جب وہ عام افراد کے لیے کوئی کتاب تصنیف کرتے تھے تو نہایت سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے تھے۔

Marfat.com

علی شیر نوائی بہت وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی زبان کے کلاسیکی ادب کو ترکی زبان کے روپ میں از سر نو ڈھالا، بلکہ ترک زندگی کی بڑی مہارت سے عکاسی بھی کی۔ اس طرح ان کی تصانیف اس دور کے خواص و عوام کے مختلف طبقوں کے طرزِ بود و باش کے بارے میں مستند حوالوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ علی شیر نے قدیم داستانوں کے مشہور کرداروں مثلاً شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سکندر اور بہرام گور کو اپنی کہانیوں میں نہایت مرصع انداز میں پیش کیا بلکہ ترکوں کی تاریخ سے معروف کرداروں مثلاً خوارزم شاہ، چنگیز خان اور سلطان ابو سعید مرزا کو بھی اپنی کہانیوں میں پیش کر دیا ہے۔

علی شیر نوائی نے اپنی تصانیف میں یہ خاص خیال رکھا کہ ان کے ساتھ دی جانے والی تصاویر اور نقاشی کو خود اپنی نگرانی میں بہترین اور پائے کے مصوروں سے بنوایا۔ اس طرح یہ تصاویر ان کتابوں کے متن سے بالکل مطابقت رکھتی ہیں۔ اس سے قبل نظامی اور خسرو دہلوی کی تصانیف کو تیموری دور ہی میں جن تصاویر سے مزین کیا گیا تھا وہ ان کتب کے متن سے ہم آہنگ نہ ہوتی تھیں۔

علی شیر نوائی محض ایک اچھے سیاست داں، منتظم، شاعر اور مصنف ہی نہ تھے وہ موسیقی، نقاشی، مصوری، سنگ تراشی، معماری، طلاکاری اور خوش نویسی کے بھی ماہر تھے۔ ظہیر الدین بابر نے اپنی تزک میں علی شیر نوائی کی مرتب کردہ دُھنوں کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ موسیقی کے شعبے میں اپنے وقت کے نامور اساتذہ قل محمد عودی، حسین عودی اور شیخم نائی نے علی شیر نوائی ہی سے تربیت پائی تھی۔

یہ تینوں اساتذۂ موسیقی، قیام کابل کے ابتدائی ایام میں بابر کے دربار میں موجود تھے۔ علی شیر نوائی نے متعدد دُھنیں ترتیب دیں۔ ان کا ایک لحن خاص طور پر مشہور ہے جو بطورِ خاص بابر کے لیے لکھا گیا اور اسے راگ "نوا" میں گایا جاتا تھا۔ میر محمد بخاری نے موسیقی پر لکھی گئی اپنی کتابوں میں بتایا ہے کہ علی شیر نوائی نے خراسان میں مشہور موسیقی کے "سات بحر" پرندوں کی بولیوں کی بنیاد پر ایجاد کیے تھے۔

علی شیر نوائی نے بڑے بڑے خطاطوں اور مصوروں کی تربیت کی۔ ان کے کتاب خانے میں سلطان علی مشہدی، سلطان علی قائنی، میر علی مشہدی، سلطان محمد خندان جیسے عظیم خطاط اور بہزاد، شاہ مظفر، قاسم علی، حاجی محمد، درویش محمد، سلطان محمد تبریزی، محمد مذہب اور یوسف جیسے نامور مصور کام کیا کرتے تھے۔ ان سب نے علی شیر نوائی سے تربیت پائی اور ان سب کو بابر، حیدر مرزا، خواند امیر اور واصفی جیسے مصنفین نے پائے کے صناع قرار دیا ہے۔ ان تمام مصوروں کے کام میں جو مشترکہ خصوصیات نظر آتی ہیں وہ بجا طور پر علی شیر کی فکری رہنمائی کا نتیجہ ہیں۔ علی شیر کے ذاتی کتب خانے کے مہتمم حاجی محمد تھے جو ایک بڑے مصور اور ہرات کے سب سے بڑے طلاکار تھے۔ انہوں نے چینی نمونے کے چینی کے شفاف برتن (فغفور) بھی تیار کیے تھے۔

حسین بایقرا کے عہد کے مشہور مؤرخ میر خواند (وفات: ۹۰۳ھ / ۱۴۹۸ء) نے علی شیر نوائی کو مخلص اور پاکیزہ اخلاق کا مالک انسان قرار دیا ہے۔ انہوں نے علی شیر نوائی کے لیے باتدبیر اور بارعب سیاست داں کے الفاظ استعمال کیے۔ علی شیر نوائی میں بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی تمام تر کوششیں بھلائی اور خیر کے مقاصد کے لیے تھیں۔

علی شیر نوائی بڑے فیاض اور کریم النفس انسان تھے۔ جب تک وہ سلطان حسین بایقرا کے پاس ملازم تھے انہوں نے سرکاری خزانے سے کبھی تنخواہ نہیں لی بلکہ خود اپنی جیب سے بڑی بڑی رقوم دے کر حکومت کو اس کے منصوبوں کی تکمیل میں مدد دی۔

ظہیر الدین بابر نے علی شیر نوائی کا تذکرہ "تزکِ بابری" میں بہت ہی اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ہنر کا ایسا فیاض اور کامیاب کوئی اور مربی، میری نظر میں نہیں، ان متعدد مصنفوں اور شاعروں کے علاوہ جن کی علی شیر نے حوصلہ افزائی اور تربیت کی، مشہور مصور بہزاد اور شاہ مظفر اور بے نظیر ماہرینِ موسیقی، گل محمد، شیخم نائی اور حسین عودی کی کامیابی کا سہرا علی شیر ہی کے سر ہے۔ وہ خود ایک کامیاب ماہر موسیقی، نغمہ گر اور مصور تھے۔ ترکی زبان میں شاعر کی حیثیت سے یگانہ تھے۔ ایسا شعر کہتے تھے کہ کوئی کیا کہے گا۔ فن موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ اہلِ فضل اور اہل ہنر کا قدردان و مربی علی شیر بیگ جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے۔ علی شیر بیگ نے جس قدر نیکیاں کی ہیں کسی نے کم کی ہوں گی۔ وہ ہزاروں افراد کے بال بچوں کی خبر گیری کرتے تھے۔"

عظیم صوفی شاعر مولانا جامیؒ نے علی شیر نوائی کو نقش بندی درویش تسلیم کیا ہے۔

علی شیر نہایت بہادر انسان تھے۔ ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء میں حسین بایقرا کے ایک مخالف یادگار مرزا نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت حسین بایقرا، علی شیر نوائی کے ساتھ مرغاب میں تھے۔ مرغاب سے

Marfat.com

ہرات تک کا سفر تین دنوں میں طے ہوتا تھا، حسین بایقرا یہ سفر صرف ایک دن میں طے کر کے برق رفتاری سے ہرات آ پہنچے۔ علی شیر ان کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر علی شیر نے جواں مردی کا ثبوت دیا اور باغِ زاغان کے محل میں جہاں یادگار مرزا موجود تھے، صرف ایک سپاہی کے ساتھ داخل ہو کر یادگار مرزا کو گرفتار کر لیا۔

ہرات اور مملکت کے دیگر کئی علاقوں کو ترقی دینے اور وہاں عالیشان تعمیرات کروانے کے لیے علی شیر نوائی نے عظیم خدمات انجام دیں۔ ۸۸۱ھ / ۱۴۷۶ء میں یعنی ہرات واپس آنے کے سات برس بعد، علی شیر نے ہرات کی شمالی جانب وسیع املاک کو آباد کیا۔ یہ املاک نہر انجیل اور کوہ کازر گاہ کے درمیان واقع تھیں۔ علی شیر نوائی نے اپنے نام پر ایک محلے "محلہ علی شیر" کی بنیاد رکھی اور اپنے قصر انسیہ کے پہلو میں ایک جامع مسجد (مسجد قدسیہ)، ایک مدرسہ (خلاصیہ)، ایک سرائے (تکیہ)، ایک اسپتال اور دارالحفاظ تعمیر کروایا۔ دارالحفاظ کے گرد تفریح کے میدان (پارک) بنوائے۔ رفاہِ عامہ کے ان تمام اداروں کے لیے انہوں نے پچاس لاکھ کپک دینار مالیت کی بڑی جائیداد وقف کر دی۔ وہ سلطان حسین بایقرا کو بھی نصیحت کیا کرتے تھے کہ وہ انتظام مملکت میں عدل و رحم سے کام لیا کریں اور رفاہِ عامہ کے بڑے بڑے منصوبوں پر عمل کریں تاکہ تاریخ میں ان کی نیک یاد باقی رہے۔

علی شیر نے ہرات اور خراسان کے دیگر شہروں میں متعدد مدرسے، خانقاہیں، کارواں سرائیں، سرائیں، پل اور مقبرے تعمیر کروائے۔ ان تمام تعمیرات کی تعداد ۳۷۰ کے لگ بھگ ہے۔

علی شیر نے اپنے اشعار میں اپنی تعمیر کردہ مسجد قدسیہ کے دو میناروں کو "دو بھائیوں" سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے اس مسجد اور اپنے مدرسہ اخلاصیہ کی خوبصورتی کا ذکر اپنے اشعار میں بہت دلکش انداز سے کیا ہے۔

علی شیر کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں سے جو عمارتیں یا ان کے آثار آج تک محفوظ ہیں وہ یہ ہیں: ہرات کی جامع کبیر کا جدید طاق (محراب) جو ۱۴۹۸ء میں بنایا گیا۔ علی شیر کے تعمیر کردہ ایوان۔ ابو الولید کے مقبرے کی خانقاہ کی عمارت اور طاق (محراب) نیشاپور اور رباط عشق کی عمارتیں۔

علی شیر نوائی نے نیشاپور میں فرید الدین عطارؒ کا مزار بھی تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ ہرات کی جامع کبیر کا ایک حصہ از سر نو بنوایا۔ علی شیر کا محلہ آج کل ویران ہے۔ اب اس جگہ باغ ہیں البتہ اس سارے احاطے کا نام آج بھی کوچہ علی شیر ہے۔ علی شیر کا مقبرہ ان کی بنوائی ہوئی مسجد قدسیہ آثار کے پہلو میں ابھی تک موجود ہے اور لوگ دور دور سے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

•••

Marfat.com

الغ بیگ

تیموری دور کے قابلِ فخر، صاحبِ علم اور لائق حکمراں

وہ موسم بہار کا ایک حسین دن تھا۔

سانولی رنگت، گھنے ابرو اور پُر کشش آنکھوں کی مالک ایک شخصیت ایک جانب سے نمودار ہوئی۔ ایک سفید پوش بزرگ ان کے ہمراہ تھے۔ تمام طالب علم تعظیماً اٹھ کھڑے ہوگئے۔ سانولی رنگت والی پُر شکوہ شخصیت نے رُوپہلا عمامہ زیب سر کر رکھا تھا اور ان کا لباس ان کی امارت کا مظہر تھا۔

وہ سفید پوش بزرگ کو لے کر چنار کی گھنی چھاؤں میں آبیٹھے۔ ان کی درخواست پر سفید پوش بزرگ نے زری میں لپٹی ہوئی ایک موٹی سی کتاب اٹھائی، اسے کھولا اور اجرامِ فلکی پر اظہارِ خیال شروع کر دیا۔ بزرگ پیچیدہ ترین سوالوں اور دقیق ترین مسائل کو ایسی سادگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کر رہے تھے کہ طالب علم محسوس کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ ترین بحث نہیں بلکہ دلکش موسیقی سن رہے ہوں جس کی مترنم لہریں ان کی روح تک کو سیراب کرتی چلی جا رہی ہوں۔

بزرگ نے اپنا بیان ختم کیا تو رُوپہلے عمامے والے صاحب نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تمام طالب علموں سے دریافت کیا: "کیا سب لوگوں نے سب کچھ سمجھ لیا؟"

تمام طالب علموں نے سر جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔ چھوٹی سی نوکیلی داڑھی والے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر جھجکتے ہوئے کہا: "استادِ محترم کا بیان نہ صرف سمجھ میں آیا بلکہ اس نے بے حد لطف اندوز بھی کیا۔"

بزرگ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ رُوپہلے عمامے والے صاحب نے کھڑے ہونے والے طالب علم کو دلچسپی سے دیکھا اور ان سے علمی انداز کے سوالات شروع کر دیے۔ سوالات کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ طالب علم ہر سوال کا جواب بہت تفصیل کے ساتھ اور بے حد جوش و خروش سے دے رہا تھا۔ اب رُوپہلے عمامے والی شخصیت نے طالب علم کو اپنے پاس بلایا اور ان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کس جگہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا خاندان کون سا ہے۔ کہاں تعلیم پائی ہے اور آئندہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟

اس کے بعد انھوں نے طالب علم کو اپنے محل آنے کی دعوت دی اور سفید پوش بزرگ نے مسرت کے ساتھ اس طالب علم کی پیشانی چوم لی۔

یہ طالب علم تھے مولانا علی قوشچی، جنھوں نے سفید پوش بزرگ قاضی زادہ رُومی کا درس سن کر سوالات کے جوابات دیے اور سوالات کرنے والی شخصیت تھی تیموری سلطنت کے تیسرے فرماں روا الغ بیگ جن کی علمی خدمات تقریباً ساڑھے پانچ سو برس گزر جانے کے بعد بھی تاریخ کے ایوانوں میں اجالا کر رہی ہیں۔ الغ بیگ محض ایک حکمراں ہی نہیں، ایک بلند پایہ عالم بھی تھے۔ علمِ ہیئت کے لیے ان کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔

الغ بیگ کا نام محمد تورغائی ہے۔ ان کے والد شاہ رخ، تیموری سلطنت کے (۸۰۷ھ تا ۸۵۰ھ / ۱۴۰۵ء تا ۱۴۴۷ء) حکمران رہے۔ الغ بیگ کی والدہ کا نام گوہر شاد ہے۔ الغ بیگ ۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء میں سلطانیہ میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر موجودہ ایران کے شمالی حصے میں رے کے قریب واقع تھا۔ الغ بیگ کو کم عمری ہی سے امور جہاں بانی سیکھنے کے متعدد مواقع میسر آئے۔ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء میں، یعنی صرف ۱۴ برس کی عمر میں، انھیں خراسان کے کچھ حصے اور مازندران کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ کم عمری کے باوجود انھوں نے اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت

Marfat.com

کے بل بوتے پر ان علاقوں کا بہت اچھا انتظام کیا۔ ایک سال بعد شاہ رخ نے الغ بیگ کو ترکستان اور ماوراًلنہر آ کا حاکم بنادیا۔ وہ تقریباً تیس برس تک اس علاقے پر حکمران رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے سمرقند کو اسلامی تہذیب اور تمدن کا اعلیٰ مرکز بنادیا۔

الغ بیگ خود بھی بڑے عالم تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ تفصیل کے ساتھ کیا تھا۔ وہ قرآن حکیم کے حافظ بھی تھے۔ انہیں قرآن پاک کی تمام قراتوں پر عبور حاصل تھا۔ دینیات کا وسیع علم رکھتے تھے۔ انہیں شعر و سخن سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کے ایوانوں میں بڑے بڑے شعراً مثلاً خواجہ عصمت بخاری، برہان الدین برندق، رستم خوریانی اور طاہر ابیوردی موجود رہتے تھے۔ الغ بیگ ایک مؤرخ بھی تھے۔ وہ نہ صرف علمی تحقیقات اور تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ خود بھی تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب کے مؤلف تھے۔ اس کتاب کا نام "اولوس اربعہ چنگیزی" (چنگیزی خاندان کے چار بیٹوں کی تاریخ) تھا۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

الغ بیگ ریاضی کے ماہر تھے اور علم ہندسہ (جیومیٹری) کے مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے کا فن جانتے تھے۔ ان تمام علمی خوبیوں اور صلاحیتوں سے بڑھ کر وہ علم ہیئت کے بہت بڑے عالم تھے۔ فلکیات کے موضوع پر ان کا مطالعہ اور معلومات نہایت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں تحقیق (ریسرچ) کو ترقی دینے کے لیے الغ بیگ نے بہت اہم اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ۸۳۲ھ / ۱۴۲۸ء میں سمرقند شہر کے جنوب میں واقع پہاڑی "کوہک" کی دوسری جانب ایک رصد گاہ کی تعمیر شروع کروائی۔ یہ بہت عظیم الشان رصد گاہ تھی اور اپنے عہد میں اس کا شمار دنیا کی بڑی رصد گاہوں میں ہوتا تھا بلکہ اس عہد میں اسے دنیا کے عجائبات میں سے ایک قرار دیا گیا تھا۔ اس رصد گاہ میں فلکیات کے مشاہدے کے سلسلے میں اہم تجربات کیے گئے۔

اس رصد گاہ کے قیام کے سلسلے میں چار بڑے ہیئت دانوں نے الغ بیگ کی معاونت کی۔ ان میں حسن چلبی تھے جنہیں قاضی زادہ رومی بھی کہتے ہیں۔ غیاث الدین جمشید تھے، ملا علاؤالدین علی قوشچی تھے اور معین الدین کاشانی تھے۔ ان ماہرین کی مدد سے الغ بیگ نے فلکیاتی تحقیق کے دوران محسوس کیا کہ ان کے مشاہدات اور مشہور یونانی ہیئت داں بطلیموس کے حسابات کے درمیان اختلاف ہے۔ انہوں نے بطلیموس کے حسابات کی اصلاح کی۔

الغ بیگ کی زیرِ نگرانی اس رصد گاہ میں "زیچ سلطانی" مرتب کی گئی۔ زیچ سے مراد ستاروں کی فہرست ہے جس میں ستاروں کے بارے میں وسیع معلومات درج کی جاتی ہیں۔ اس زیچ میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں:

۱۔ مختلف حسابات اور سنہ ۲۔ وقت کے بارے میں معلومات
۳۔ ستاروں کے راستے ۴۔ ثوابت کا مقام

ان ابواب سے قبل بہت علمی انداز کے مقدمات دیے گئے ہیں جس میں ان وجوہ پر بحث کی گئی ہے جنہوں نے الغ بیگ کو اس مجموعے کی تالیف پر آمادہ کیا۔

اس عظیم کتاب نے یورپ بھر میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گریوز نے اس کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا۔ ۱۶۶۵ء میں ہائڈ نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ اے۔ سیڈیلوٹ نے اس کتاب کے مقدمات کا ترجمہ کیا۔ ای۔ بی۔ نوبل نے ان تمام مخطوطات سے اس کتاب کا موازنہ کیا جو برطانیہ میں موجود ہیں اور پھر فارسی اور عربی کی فرہنگ کا اضافہ کر کے اسے "کیٹلاگ آف اسٹارز" کے نام سے شائع کیا۔ یہ زیچ ۸۴۱ھ / ۱۴۳۷ء میں مکمل ہوئی۔

الغ بیگ کی رصد گاہ کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ اسے ۱۹۰۸ء میں دوبارہ دریافت کیا گیا۔ اس دریافت کا سہرا ایک روسی ماہر آثار قدیمہ کے سر ہے۔ رصد گاہ کی مدوّر عمارت تین منزلہ تھی۔ اس عمارت میں ایک خمدار سرنگ بھی تھی جس میں نشانات لگے ہوئے تھے۔ الغ بیگ نے اس رصد گاہ کی مدد سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کی بنیاد پر جو کیلنڈر ترتیب دیا تھا اس میں اور موجودہ زمانے کے کیلنڈر میں صرف چھ گھنٹے کا فرق ہے۔

ایک ایرانی مصنف کے مطابق علما و حکما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سکندر کے عہد سے الغ بیگ کے دور تک کوئی فرماں روا ایسا نہ تھا جو حکمت اور علوم و فنون کے معاملے میں الغ بیگ کا ہم سر ہو سکے۔ الغ بیگ نے جو زیچ تیار کروائی تھی اسے آج بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے، بعض ماہرین تو اسے طوسی کی مرتب کردہ "زیچ ایلخانی" پر ترجیح دیتے ہیں۔

الغ بیگ کی رصد گاہ میں بہت نادر اور نایاب کتابیں بھی موجود تھیں۔ ان میں سے بعض کتابیں بغداد کے بیت الحکمت سے لائی گئی تھیں۔ کتب خانے میں الخوارزمی کی کتاب "الجبر فی الحساب والمقابلہ"، بو علی سینا کی ۱۲ کتابیں، الفارابی کی ۱۶ جلدیں، البیرونی کی کتاب "القانون

Marfat.com

المسعودی" اور دیگر سیکڑوں کتابیں موجود تھیں۔

الغ بیگ کا دور، تعمیرات کے اعتبار سے بھی بڑا یادگار ہے۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں کو فنِ تعمیر کے شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ الغ بیگ نے سمرقند میں دو بہت شاندار مساجد تعمیر کروائیں۔ ایک مسجدِ مقطع یا مسجد الغ بیگ کہلاتی ہے۔ اس کی اندرونی زیبائش چینی طرز کی منقش اور رنگ دار لکڑی سے ہوئی ہے۔ یہ مسجد ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں مکمل ہوئی۔ دوسری مسجد کو شاہ زندہ کی مسجد کا نام دیا گیا، جو ۸۳۸ھ / ۱۴۳۴ء میں تعمیر ہوئی۔ سمرقند ہی میں ایک خانقاہ بھی تعمیر ہوئی جس کا گنبد بہت بلند تھا۔ تزک بابری اور دیگر کتب کے مطابق اس زمانے میں اتنا بڑا گنبد دنیا بھر میں کہیں نہیں تھا۔

الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہت بڑا مدرسہ ۸۲۸ھ / ۱۴۲۴ء میں تعمیر کروایا۔ اس مدرسے کے چار ایوان تھے۔ آج مسجد اور خانقاہ کی عمارتیں تو موجود نہیں لیکن مدرسے کی شاندار عمارت اب بھی اچھی حالت میں موجود ہے جس کو دیکھ کر اس دور کے عمدہ طرزِ تعمیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مدرسے کی دیواروں پر رنگین ٹائلوں کا کام بہت نفاست سے کیا گیا ہے اور ان پر ہندسی اشکال بڑی خوبصورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ یہ ٹائلیں پہلے مختلف رنگوں میں رنگی جاتی تھیں، پھر انہیں ماہر معمار اپنی ضرورت کی شکل کے مطابق تراشا کرتے تھے۔ یہ ایک مشکل اور وقت طلب طریقہ تھا اور اس پر سرمایہ بھی زیادہ صرف ہوتا تھا، لیکن اس کے نتیجے میں جو غیر معمولی اور منفرد اشکال (ڈیزائن) ابھر کر آتی تھیں وہ بڑی متاثر کن اور دیرپا ہوتی تھیں۔

الغ بیگ نے "کوہک" پہاڑ کے دامن میں مغرب کی سمت ایک باغ میں "چہل ستون" کے نام سے ایک قصر بھی بنوایا تھا۔ اس کے نام "چہل ستون" سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں چالیس ستون ہوں گے لیکن اس عمارت میں چالیس کی بجائے چار سو سنگی ستون تھے اور ان میں سے ایک ستون سیدھا تھا، دوسرا ترچھا تھا اور اسی طرح تمام ستونوں کی ترتیب تھی۔ ان ستونوں کی شکلیں اور جزئیات عجیب و غریب تھیں۔ اس محل کی اطراف چار بلند مینار (برج) تھے۔ محل کی آرائش سنگِ مرمر کی سلوں سے بنے ہوئے مسقف (چھت دار) محرابی راستوں سے کی گئی تھی۔

الغ بیگ نے ایک اور عمارت ایوانِ تخت (کورنش خانہ) کے نام سے بنوائی۔ (ترکی زبان میں) "کورنش" کے معنی ہیں: وہ مکان جہاں لوگ جمع ہوتے ہوں)۔ اس عمارت میں ایک بڑی بارہ دری تھی جس میں ایک بہت بڑا سنگی تخت تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ تخت ایک بہت بڑے پتھر پر مشتمل تھا۔ یہ پتھر پندرہ گز لمبا، آٹھ گز چوڑا اور ایک گز بلند تھا۔ اتنے بڑے پتھر کو بہت دور سے لایا گیا تھا اور لانے کے عمل کے دوران وہ ایک جگہ سے ٹوٹ بھی گیا تھا۔

الغ بیگ نے ایک اور محل چینی طرزِ تعمیر کے مطابق بنوایا تھا۔ اس کی دیواروں پر چینی فنکاروں سے بنوائی ہوئی تصاویر آویزاں تھیں۔ الغ بیگ نے سمرقند میں امیر تیمور کے مقبرے اور دیگر عمارتوں پر مشتمل کمپلکس "گورِ امیر" کے داخلی دروازے پر پچی کاری اور نقاشی کا خوبصورت کام بھی کروایا۔ یہ کام محمد بن محمد الاصفہانی نے انجام دیا۔ الغ بیگ نے بخارا میں بھی ایک اچھا مدرسہ قائم کیا۔

اس دور کی تعمیرات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے طرزِ تعمیر سے برصغیر پاک و ہند کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ یہ برصغیر پر تیموری حملوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ تیمور بڑی تعداد میں معمار و سنگتراش ہندوستان سے لے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الغ بیگ کے دور میں تعمیر میں پتھر کا استعمال بہت بڑھ گیا تھا۔ نہ صرف بنیادوں میں بلکہ جنگلے، کٹہروں، آرائشی خانوں، خوبصورت الواح مزار اور روشوں حتیٰ کہ گنبدوں کی بالائی چھتوں میں بھی پتھر کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا تھا۔ گنبدوں کی بالائی چھتوں میں پتھر کے جوڑ بڑی مضبوطی کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔

الغ بیگ نے ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں پر تو طویل مدت تک حکومت کی لیکن جب ۸۵۰ھ / ۱۴۴۷ء میں انہیں پوری مملکت یعنی وسط ایشیا، ماوراء النہر، افغانستان اور ایران کا اقتدار ملا تو شورشوں اور بغاوتوں کی کثرت کے باعث وہ سکون کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے نہ سکے۔

الغ بیگ بہت بہادر انسان تھے اور جنگوں میں عزیمت اور شجاعت کے ساتھ لڑتے تھے لیکن فطری طور پر انہیں لڑائی سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک علم دوست انسان تھے۔

الغ بیگ ۲۵ ذوالحجہ ۸۵۰ھ / ۱۳ مارچ ۱۴۴۷ء کو اپنے والد شاہ رخ کی وفات کے بعد حکمران بنے۔ چند ہی روز بعد الغ بیگ کے اپنے بیٹے عبداللطیف، اپنی دادی گوہر شاد اور ان کے خدام کو قید کر کے سمنان لے گئے۔ وہاں سے وہ ہرات چلے گئے اور اس پر قابض ہو کر اپنے

Marfat.com

حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسری جانب ایک شخص سلطان عبداللہ نے شیراز کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اُدھر کابل اور غزنی میں ایک نئی ریاست قائم کر کے کچھ اور لوگوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ایک اور شہزادے بابر میرزا، جرجان اور مازندران میں اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ادھر عبداللطیف جب اپنے قیدیوں کو لے نیشاپور پہنچے تو ان پر حملہ کر دیا گیا۔ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور عبداللطیف کو گرفتار کر کے الغ بیگ کے عم زاد بھائی علاؤالدولہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

الغ بیگ نے صورتحال کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے فوجی تیاری کی اور خراسان کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے دریائے جیحوں کو عبور کیا۔ وہ عبداللطیف کو معاف کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے اپنے وزیر نظام الدین میرک کو اس غرض سے ہرات روانہ کیا۔ اسی اثنا میں بابر میرزا نے خراسان پر حملہ کر کے علاؤالدولہ کے ہراول دستے کو جام کے مقام پر شکست دے دی۔ جب علاؤالدولہ نے دیکھا کہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو انہوں نے مصالحت پر آمادگی ظاہر کی۔ عبداللطیف کو رہا کر دیا گیا اور علاؤالدولہ کے ساتھ صلح ہو گئی، لیکن یہ صلح زیادہ دن قائم نہ رہی۔

بعد میں الغ بیگ نے عبداللطیف کی سپاہ کی مدد سے علاؤالدولہ کے خلاف کارروائی کی۔ ہرات سے چار میل دور ترناب کے مقام پر خونریز جنگ کے بعد علاؤالدولہ کو شکست ہوئی۔ انہوں نے مشہد میں جا کر پناہ لی اور اطاعت قبول کرنے کا بہانہ کیا لیکن الغ بیگ ان کی چال میں نہ آئے۔ وہ آگے بڑھے انہوں نے ہرات اور اس کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے اسفرائن کی طرف پیش قدمی کی جہاں انہوں نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو میرزا عبداللہ شیرازی کے ساتھ بسطام کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ دوسرا حصہ عبداللطیف کی قیادت میں استرآباد کی سمت بڑھا۔ اسی موقع پر ازبکوں نے ماوراًالنہر پر حملہ کر دیا۔

عبداللطیف بعض وجوہ کی بنا پر اپنے والد الغ بیگ سے خفا تھے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے والد کو راضی کیا کہ وہ بلخ کی حکومت انہیں دے دیں، پھر انہوں نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی۔ فوج لے کر دریائے جیحوں عبور کیا۔ الغ بیگ نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ یہ جنگ شاہ رخیہ کے مقام پر ہوئی۔ عبداللطیف نے اپنے والد کو اپنے ایک ملازم عباس کے حوالے کر دیا۔ عباس نے الغ بیگ کو ۱۰ رمضان ۸۵۳ھ / ۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء کو قتل کروا دیا۔ اس طرح علم و عرفان کا یہ دمکتا ہوا آفتاب صرف ڈھائی برس کی حکمرانی کے بعد گہنا گیا۔

الغ بیگ کو سمرقند میں اپنے دادا امیر تیمور کی قبر کے نزدیک سپرد خاک کیا گیا۔

•••

Marfat.com

حسین بایقرا

زریں تاریخی دور کے حامل، تیموری خاندان کے آخری ممتاز حکمران

اسے قتل کر دیا گیا تھا!

قاتل کوئی معمولی حیثیت کا مالک نہ تھا، وہ سلطانِ وقت کا بیٹا تھا جب کہ مقتول ایک عام سا شخص تھا۔

مقتول کے ورثا فریاد لے کر سلطانِ وقت کے پاس پہنچے۔ سب لوگ دل گرفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس فکر میں بھی گرفتار تھے کہ قاتل بہت اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ بھلا سلطان اپنے بیٹے کے خلاف کوئی کارروائی پسند کریں گے۔ فریادیوں نے سلطان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ سلطان کو اطلاع دی گئی۔ فریادیوں کو اندر بلا لیا گیا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے سارا معاملہ سلطان کے گوش گزار کر دیا۔

سرخ و سپید رنگت اور چھریرے بدن کے مالک سلطانِ وقت نے تحمل سے پورا واقعہ سنا۔ جب انہیں علم ہوا کہ قتل کرنے والا کوئی اور کوئی نہیں خود ان کا اپنا بیٹا ہے تو انہوں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر فوراً حکم دیا: "ملزم کو فوراً دارالقضا (عدالت) میں پیش کر دیا جائے۔"

یہ حکمراں تھے وسط ایشیا میں تیموری خاندان کے آخری ممتاز حکمراں حسین بایقرا، جن کا ۳۵ سالہ دور علمی اور فنی ترقی اور رفاہِ عامہ کے تابندہ اقدامات کی بدولت بے حد یادگار ہے۔ انہوں نے ہرات کو علم و فن کا دبستان بنا دیا، جس کے وسیع اثرات آئندہ آنے والی نسلوں پر مرتب ہوئے۔

حسین بایقرا کا نام دراصل حسین مرزا ہے لیکن وہ حسین بایقرا کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے دادا کا نام بایقرا تھا۔ حسین بایقرا کا لقب "ابوالغازی" تھا۔ وہ خاندان کے اعتبار سے اعلیٰ نسب کے حامل تھے کیونکہ وہ اپنے والد منصور اور والدہ فیروزہ بیگم دونوں کی جانب سے براہِ راست امیر تیمور کی نسل سے تھے۔ منصور کے دادا، عمر شیخ مرزا تھے جو امیر تیمور کے بیٹے تھے۔ تاریخ کی کتب میں حسین بایقرا کا نام حسین بایقرا، حسین بائیقرا، حسین بایقرہ، حسین بائے قرا مختلف طریقے سے لکھا گیا ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ان کا نام حسین بایقرا لکھا گیا ہے۔

حسین بایقرا محرم ۸۴۲ھ / جون ۱۴۳۸ء میں مشہور شہر ہرات میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر موجودہ افغانستان کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ حسین بایقرا اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی نوعمری کا زمانہ ان کے لیے قدرے دشوار ثابت ہوا۔ ۸۵۰ھ / ۱۴۴۷ء میں امیر تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ رخ انتقال کر گئے، جو ایک وسیع تیموری سلطنت پر حکمراں تھے۔ اس سلطنت میں خراسان مازندران، سیستان، ماوراالنہر، فارس، کرمان، آذربائیجان، عراق اور ملحقہ علاقے شامل تھے۔

شاہ رخ کے انتقال کے بعد ان کے نیک دل اور لائق صاحب زادے اُلغ بیگ نے حکومت سنبھالی لیکن انہیں اپنے ہی بیٹے عبداللطیف کی جانب سے شدید شورشوں کا سامنا کرنا پڑا اور ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء میں الغ بیگ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ ان حالات کے باعث تیموری سلطنت انتشار کا شکار ہو گئی۔ خود عبداللطیف کو الغ بیگ کے قتل کے چھ ماہ بعد قتل کر دیا گیا۔ ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء سے ۸۶۱ھ / ۱۴۵۷ء تک حسین بایقرا، ابوالقاسم بابر کے ساتھ رہے۔ ابوالقاسم بابر، شاہ رخ کے پوتے تھے۔ ان کے والد کا نام بایسنغر مرزا تھا۔

ابوالقاسم ان دنوں خراسان کے حاکم تھے۔ انہوں نے حسین بایقرا اور ان کے بہت قریبی ساتھی اور ہم مکتب علی شیر کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ (یہ وہی علی شیر ہیں جو بعد میں علی شیر نوائی کے نام

Marfat.com

سے مشہور ہوئے اور زبردست علمی خدمات انجام دیں)۔ حسین بایقرا نے ان ہی دنوں میں فارسی اور ترکی زبانوں میں نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جب وہ جوان ہوئے تو انہوں نے مشہد میں تحصیل علم شروع کر دی۔

ادھر الغ بیگ کے انتقال کے بعد تیموری سلطنت شدید عدم استحکام کا شکار ہوگئی تھی لیکن امیر تیمور کے بیٹے میران شاہ کے پوتے، ابو سعید مرزا نے ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں حکومت سنبھال کر سلطنت کو منتشر ہونے سے بچا لیا۔ ۸۶۳ھ/ ۱۴۵۸ء تک انہوں نے خراسان، ماوراَ النہر، موجودہ افغانستان، آذربائیجان اور شمالی ایران پر اپنی حکومت مستحکم کرلی۔ برِصغیر کے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر ان ہی ابو سعید مرزا کے پوتے تھے۔ ابو سعید مرزا جب تک برسرِ اقتدار رہے بایقرا مرزا کے پوتے اور رشتے دار سخت حالات سے دوچار رہے۔

ابو سعید مرزا نے الغ بیگ اور ان کے بیٹے کی وفات کے بعد حسین بایقرا کو قید کر دیا۔ حسین بایقرا کچھ عرصے بعد قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور خوارزم کی سمت چلے گئے۔ ۸۶۲ھ/۱۴۵۷ء میں حسین بایقرا نے صوبہ جرجان (گرگان) کے دارالحکومت استر آباد پر قبضہ کرلیا۔ جرجان بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی گوشے پر واقع ہے۔ استر آباد اب موجودہ ایران میں مازندران کا حصہ ہے۔

ابو سعید مرزا ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۷ء میں اپنے مخالف حکمران اوزون حسن کے ساتھ ایک جنگ میں گرفتار ہوگئے۔ اوزون حسن نے انہیں قتل کروادیا۔ اس کے بعد حسین بایقرا نے ہرات پر بھی قبضہ کرلیا۔ ۱۰ رمضان المبارک ۸۷۲ھ/۱۳ اپریل ۱۴۶۸ء کو ہرات میں حسین بایقرا نے باقاعدہ ایک تقریب میں عنانِ اقتدار سنبھالی۔ ان کی سلطنت گو کہ بہت وسیع نہ تھی پھر بھی اس میں موجودہ افغانستان، خراسان اور مازندران کے علاقے شامل تھے۔

حسین بایقرا کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل تیموری سلطنت کا شیرازہ بری طرح بکھر چکا تھا لیکن حسین بایقرا نے اس سلطنت کو پارہ پارہ ہوجانے سے بچایا اور تقریباً ۳۵ برس تک اپنے زیرِ انتظام علاقے میں بہت مستحکم انداز سے حکومت کی۔ تاہم حسین بایقرا کی حکومت کو تاریخ نے اس کی وسعت یا استحکام کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دور کی علمی، ادبی اور فنی ترقی کے باعث زریں ادوار میں شمار کیا ہے۔

حسین بایقرا کے دورِ حکومت میں ہرات نے بے مثال ترقی کی اور یہ شہر اس زمانے میں دنیا کا بے حد ترقی یافتہ اور بارونق شہر بن گیا۔ امیر تیمور کے دور میں ہرات کی آبادی ڈھائی لاکھ تھی۔ شاہ رخ کے عہد میں اس شہر کو وسعت ملی لیکن حسین بایقرا کے دور میں تو شہر کا رنگ روپ ہی بدل گیا۔ یہاں شاندار عمارتیں تعمیر ہوگئیں اور باغات لگا دیے گئے۔

مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے تزکِ بابری میں لکھا:

"ساری دنیا میں ہرات کی طرح کا کوئی دوسرا شہر نہیں ہے۔ سلطان حسین مرزا کے زمانے میں اس کی خوب صورتی اور رعنائی میں دس گنا بلکہ بیس گنا اضافہ ہوگیا تھا، اس وجہ سے مجھے ہرات دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔"

بابر نے ہرات کی سیر کے بعد اپنی کتاب میں شہر کی قابلِ ذکر عمارتوں کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ان عمارتوں کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ ان میں مساجد، محل، مدرسے، مقبرے، کاغذ سازی کے کارخانے، پُل، مچھلیوں کے تالاب، آبی ذخیرے، بُرج، خانقاہیں، شفاخانے اور حمام شامل ہیں۔

بعض مؤرخین کے مطابق تیموری دور میں ہرات میں تین ہزار حمام اور دس ہزار دکانیں تھیں۔ یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز محسوس ہوتے ہیں لیکن ان سے محسوس ہوتا ہے کہ شہر بہت بڑا تھا۔ کتاب تیمور کے مصنف ہیرلڈ لیمب نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں لندن اور پیرس کی آبادی ۶۰ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔

حسین بایقرا نے غزنہ (غزنی) اور سمرقند کے باغوں والے محلات کے مقابلے میں ۴۴۰ جریب (۱۱۰ ایکڑ) کا ایک چہار باغ ہرات میں بنوانا شروع کیا۔ باغ کے لیے کام کا آغاز ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء میں ہوا لیکن مسلسل کوشش، بے انتہا لاگت اور خود حسین بایقرا کی خصوصی دلچسپی کے باوجود یہ باغ ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء تک نامکمل ہی رہا۔ مؤرخین نے اس باغ کے بارے میں لکھا ہے: "یہ ایسا باغ تھا جس کا تصور کوئی انجینئر کبھی نہیں کرسکتا تھا۔" باغ کے مرکز میں نہایت حسین محل تھا۔ اس کے علاوہ اس میں متعدد ایسی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں جنہیں روضۃ الجنۃ کے مطابق روحانی اعتبار سے رفیع کہنا درست ہوگا۔ آج ان عمارتوں میں سے کسی عمارت کے آثار باقی نہیں ہیں۔

حسین بایقرا نے ہرات میں ایک اسپتال، ایک مسقف (چھت دار) بازار اور دیگر کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ انہوں نے ملکہ گوہر شاد کی قائم کردہ عبادت گاہ "مصلا" سے متصل ایک مدرسہ بھی قائم کروادیا

Marfat.com

جس کے چار مینار تھے۔ ہر مینار ۱۵۰ فٹ بلند تھا۔ حسین بایقرا کے دور میں جو تعمیرات ہوئیں ان میں نوک دار اور بصلہ نما (پیاز کی مانند) گنبد نمایاں تھے۔ کاشی کی چوکور تختیوں کی پچی کاری کا کمال ان عمارتوں کی خصوصیت تھی۔

حسین بایقرا شریعت کی حتی الامکان پابندی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر دین میں کوئی نئی باتیں نکالنے کی کوشش کی جاتی تو اس کی سختی سے حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ اسی طرح گمراہیوں کے خلاف بھی اقدامات کرتے تھے۔ وہ ایک منصف مزاج حکمراں تھے۔ ہفتے میں دو بار پیر اور جمعرات کو علماکرام اور قاضیوں کا اجلاس طلب کرتے تھے اور تمام سرکاری امور ان ہی کے مشوروں سے طے کرتے تھے۔ حسین بایقرا کو صوفیا اور درویشوں سے گہری عقیدت تھی۔ وہ اکثر صوفیا کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ نہایت فیاض واقع ہوئے تھے اور علوم وفنون کی ترویج کے علاوہ مساجد، مدارس، مسافرخانوں اور رفاہِ عامہ کی دیگر عمارتوں کی تعمیر پر بھی دل کھول کر رقم خرچ کرتے تھے۔

حسین بایقرا کے متعلق ظہیرالدین بابر نے اپنی تزک میں لکھا:

"وہ تفریح پسند اور خوش مزاج تھے۔ ان کے اظہار و بیان میں تیزی تھی۔ وہ خود تلوار لے کر میدانِ جنگ میں اترتے تھے۔ خنجر زنی میں کوئی شخص تیموری خاندان میں ان کے پائے کا نہ تھا۔ شعر گوئی کی طرف ان کا قدرتی میلان تھا۔ شعر اچھے کہتے تھے اور حسینی تخلص کرتے تھے۔ وہ سرخ اور سبز رنگ کے پشمینے کا لباس پہنتے تھے۔ ٹوپی سیاہ برے کے پوست کی ہوتی تھی۔ کبھی عید کے موقع پر ہلکی سی دستار باندھ لیتے تھے اور اس میں کلغی لگالیا کرتے تھے۔"

حسین بایقرا بہت اچھا علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے اور خود بھی اچھے عالم تھے۔ انہوں نے ۹۰۸ھ / ۱۵۰۲ء میں سیرت کی ایک کتاب "مجالس العشاق" تصنیف کی۔ یہ کتاب ۷۶ مقالوں پر مشتمل ہے۔ ہر مقالے کا عنوان "مجلس" رکھا گیا اور ہر مقالے میں کسی نہ کسی برگزیدہ شخصیت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ پہلے ۵۵ مقالے زمانی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ ابتدا حضرت امام جعفر صادقؒ (وفات: ۱۵۱ھ / ۷۶۸ء) کی گئی ہے اور اس کا اختتام اپنے زمانے کی بلند پایہ علمی شخصیت مولانا جامیؒ (وفات: ۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء) کے حالات پر کیا ہے۔ کتاب میں آخری تذکرہ خود مصنف کا ہے۔

حسین بایقرا کے دور کا تذکرہ دو اہم شخصیات کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ دو شخصیات ہیں حسین بایقرا کے رفیقِ خاص، عالم، مصنف، شاعر علی شیر نوائی اور مشہور صوفی، مفسر اور شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ۔ ان دونوں شخصیات کی علمی اور عملی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ علی شیر نوائی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ ہرات میں ان کا دربار علم وفن کا ایک عظیم دبستان تھا۔ انہوں نے مشرقی ترکی زبان یا ترکی کی چغتائی شاخ کو فروغ دیا اور اسے فارسی زبان کے مقابل لا کھڑا کیا۔ علی شیر نوائی ۱۷ رمضان المبارک ۸۴۴ھ / ۹ فروری ۱۴۴۱ء کو ہرات میں پیدا ہوئے اور ۲۹ جمادی الآخر ۹۰۶ھ / ۲۰ جنوری ۱۵۰۱ء کو وفات پائی۔

مولانا جامیؒ کی علمی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ آپؒ نے تفسیر قرآن، تصوف، اخلاق، سیرت، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر کم از کم ۴۶ کتب تصنیف کیں۔ بعض مؤرخین کے نزدیک مولانا جامیؒ کی کتب کی تعداد ۱۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ مولانا جامیؒ ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ / ۷ نومبر ۱۴۱۴ء کو پیدا ہوئے اور آپ نے ۱۸ محرم ۸۹۸ھ / ۹ نومبر ۱۴۹۲ء کو ہرات میں وفات پائی۔

مولانا جامیؒ نے حسین بایقرا کے دورِ حکومت کے تقریباً ۲۴ برس دیکھے۔ مولانا جامیؒ کے ایک شاگرد عبدالغفور لاری تھے۔ وہ قانون دان تھے اور انہوں نے اپنے استاد کی مشہور کتاب "نفحات الانس" کی شرح بھی لکھی۔ وہ ۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء میں فوت ہوئے۔ اسی دور میں عربی کے اچھے عالم میر عطاءاللہ مشہدی تھے جنہوں نے فارسی میں بھی ایک کتاب تحریر کی جو قافیے کے علم سے متعلق تھی۔ اس دور کے دیگر شعرا میں آصفی، بنّائی، سیفی بخاری، ہاتفی، میر حسین معمائی، محمد بدخشی وغیرہ شامل ہیں۔ حسین بایقرا کے دور میں نامور فضلا اور شعرا کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ تھی۔ اسی دور میں مولانا فصیح الدین مرزا بھی حسین بایقرا کے دربار سے وابستہ تھے۔ وسط ایشیا کی درس گاہوں میں ان کی لکھی ہوئی مذہبی کتب کی شرحیں مدتوں پڑھائی جاتی رہیں۔ ان کا انتقال ۹۱۹ھ / ۱۵۱۳ء میں ہوا۔

حسین بایقرا کے عہد میں حسین واعظ کاشفی کو بڑا عروج نصیب ہوا۔ وہ اعلیٰ پائے کے مصنف تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں قرآن کریم کی فارسی زبان میں تفسیر بھی شامل ہے۔ وہ یہ تفسیر چار جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے لیکن ان میں سے صرف ایک جلد مکمل کرسکے۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنے سرپرست میر علی شیر نوائی کے

Marfat.com

لیے ایک مختصر تفسیر لکھی جس کا نام اسی لیے "مواہب علیہ" رکھا۔ عام طور پر یہ "تفسیر حسینی" کے نام سے مشہور ہے۔

کاشفی نے اخلاقیات پر ایک کتاب "اخلاقِ محسنی" کے نام سے لکھی اور اسے حسین بایقرا کے نام معنون کیا۔ یہ کتاب ۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء میں مکمل ہوئی۔ قبل ازیں نصر اللہ بن محمد بن الحمید نے مشہور داستان "کلیلہ و دمنہ" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ کاشفی نے اس داستان کو جدید فارسی میں منتقل کیا۔ انہوں نے نظام الدین شیخ احمد السہیلی کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اپنی کتاب کا نام "انوار سہیلی" رکھا۔ کاشفی نے "مخزن الانشا" کے نام سے اصنافِ کلام اور معائبِ سخن (معائب: عیوب) پر ایک رسالہ ۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء میں تحریر کیا اور حسین بایقرا کے نام معنون کیا۔ بعد میں انہوں نے "صحیفہ شاہی" کے نام سے خطوط نویسی اور انشا پر کتاب لکھی۔ حاتم طائی کی کہانی "قصص و آثار حاتم طائی" میں بیان کی۔ حسین کاشفی کا انتقال ۹۱۰ھ / ۱۵۰۵ء میں ہوا۔

اسی زمانے میں "اخلاقِ جلالی" کے نام سے ایک کتاب جلال الدین دوانی نے تصنیف کی۔ ان کتابوں سے ایرانی رسوم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے انگریزی میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔

حسین کاشفی کے صاحب زادے علی ابنِ حسین کاشفی نے "رشحات عین الحیات" کے عنوان سے ایک کتاب ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء میں لکھی۔ اس کتاب میں مشہور نقش بندی بزرگ خواجہ عبید اللہؒ کے حالاتِ زندگی اور ان کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ خواجہ عبید اللہ "خواجہ احرارؒ" کے لقب سے مشہور ہیں۔

حسین بایقرا کے دور کی ایک علمی شخصیت معین الدین محمد اسفزاری کی ہے۔ ان کی کتاب "روضۃ الجنۃ فی التاریخ مدینۃ الہرات" بھی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے یہ کتاب حسین بایقرا کے لیے لکھی۔ اس کتاب میں ہرات کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ابتدا میں انہوں نے شہر ہرات اور اس کے مضافات کی تفصیل اور اس کی جغرافیائی خصوصیات دی ہیں۔ اس کے بعد اس علاقے پر حکمراں 'کرت خاندان' اس کے ساتویں اور آٹھویں تاجدار اور پھر امیر تیمور کے ہاتھوں اس خاندان کے خاتمے کا احوال قلم بند کیا ہے۔ پھر انہوں نے امیر تیمور اور ان کے جانشینوں کی حکمرانی کی تاریخ بیان کی ہے اور اسے حسین بایقرا کی تخت نشینی کے واقعے پر ختم کیا ہے۔ اس کتاب میں ۸۷۵ھ / ۱۴۷۰ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ معین الدین محمد اسفزاری درباری امور اور سفارت کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔ ان کی تاریخ ہرات کے تین قلمی نسخے برطانوی عجائب خانے (برٹش میوزیم) میں محفوظ ہیں۔

حسین بایقرا کے عہد کی ایک اور ممتاز شخصیت میر خواند کی ہے۔ ان کا نام میر خاوند بھی لکھا گیا ہے۔ وہ ایک اچھے مؤرخ تھے۔ انہوں نے تاریخ کی ایک ضخیم کتاب "روضۃ الصفا" کے نام سے لکھی۔ ان کے والد برہان الدین بخارا کے رہنے والے تھے۔ بعد میں بلخ منتقل ہو گئے۔ میر خواند نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہرات میں گزارا جہاں انہیں حسین بایقرا کے ندیم اور مقربِ خاص علی شیر نوائی کی سرپرستی حاصل تھی۔ میر خواند کا انتقال ۲ ذوالقعدہ ۹۰۳ھ / ۲۲ جون ۱۴۹۸ء کو ہرات ہی میں ہوا۔

میر خواند کی کتاب "روضۃ الصفا" تاریخ عالم کی کتاب ہے اور یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں بزرگانِ اسرائیل، انبیا کرام علیہم السلام اور ایران کے قبل از اسلام بادشاہوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسری جلد میں خاتم الانبیاؐ نبی کریم سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ تیسری جلد میں خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس، چوتھی جلد میں بعد از اسلام ایرانی خاندانوں کی تاریخ ہے۔ پانچویں جلد میں مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ چھٹی جلد میں امیر تیمور اور ان کے جانشینوں کی تاریخ کا احوال ہے جو ۸۷۳ھ / ۱۴۶۸ء تک احاطہ کرتی ہے۔ ساتویں جلد حسین بایقرا کی زندگی اور عہد حکومت کی تاریخ پر مشتمل ہے، جن کا انتقال ۹۱۱ھ / ۱۵۰۶ء میں ہوا۔ یہ آخری جلد میر خواند کی وفات کے کئی سال بعد تک کے حالات بیان کرتی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ جلد غالباً میر خواند کے پوتے خواند امیر نے لکھی ہے۔

"روضۃ الصفا" کی آخری جلدیں چوں کہ مصنف کے اپنے زمانے سے متعلق ہیں اس لیے ان میں بیان کیے گئے واقعات زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ میر خواند کا انداز تحریر بہت آراستہ اور طنطنہ آمیز ہے۔

میر خواند کے پوتے خواند امیر، ان متعدد مصنفین اور اہلِ فن میں شامل تھے جن کی سرپرستی اور تربیت علی شیر نوائی نے کی۔ انہوں نے اپنی پہلی تالیف "خلاصۃ الاخبار" کے نام سے مرتب کی۔ یہ دراصل "روضۃ الصفا" کی تلخیص ہے۔ اسے خواند امیر نے حسین بایقرا کی عمر

Marfat.com

کے آخری ایام، یعنی ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں تحریر کیا۔ خواند امیر نے اپنی مشہور تاریخ "حبیب السیّر" کے نام سے ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء میں تصنیف کی۔ خواند امیر کا انتقال ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں ہوا۔

حسین بایقرا کے دور کی ایک اور مشہور شخصیت عبدالرازق کمال الدین اسحٰق سمرقندی کی تھی، وہ بڑے پائے کے مؤرخ تھے۔ انہوں نے مشہور کتاب "مطلع سعدین و مجمع بحرین" لکھی۔ عبدالرازق ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں ہرات میں پیدا ہوئے اور ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں اسی شہر میں انتقال کیا۔ وہ شاہ رخ کے دور میں حکومت سے وابستہ تھے۔ شاہ رخ نے انہیں سفیر بنا کر ہندوستان اور گیلان بھیجا تھا۔ شاہ رخ کی وفات کے بعد وہ مرزا عبداللطیف، مرزا عبداللہ اور مرزا ابو القاسم بابر کے پاس مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ابو سعید کے عہد میں انہیں شاہ رخ کی خانقاہ کا شیخ (متولی) مقرر کر دیا گیا اور حسین بایقرا کے دور میں بھی اسی عہدے پر برقرار رہے۔

تاریخ مطلع سعدین دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ایلخانی دور کے آخری حکمران ابو سعید کی ولادت (۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء) سے امیر تیمور کے انتقال (۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) تک کے حالات کا احاطہ کرتی ہے جب کہ دوسری جلد میں امیر تیمور کے پڑپوتے ابو سعید کی وفات ۸۷۲ھ/۱۴۶۷ء کے بعد تک کے حالات دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے نام میں "سعدین" سے مراد غالباً یہی دو "ابو سعید" ہیں۔ دوسری جلد ابو سعید کی وفات کے دو سال بعد تک، یعنی ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء تک کے حالات بیان کرتی ہے یعنی جب کہ حسین بایقرا برسر اقتدار آچکے تھے۔ عبدالرازق نے ۸۳۰ھ تا ۸۷۵ھ/۱۴۲۶ء تا ۱۴۷۱ء کے جو حالات قلم بند کیے ہیں وہ نہایت اہم اور اصل تحقیق پر مبنی ہیں۔

عبدالرازق نے ہرات اور اس کے اضلاع کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ عبدالرازق شاعر بھی تھے اور علی شیر نوائی نے ان کی غزلوں کی تعریف کی ہے۔

حسین بایقرا کے عہد میں ایک اور نامور مصنف دولت شاہ تھے۔ وہ حسین بایقرا کے ساتھ لڑائیوں میں بھی شریک ہو چکے تھے۔ اپنا بیشتر وقت مطالعہ اور لکھنے میں گزارتے تھے۔ انہوں نے "تذکرۃ الشعرا" کے عنوان سے ایک بہت ایک اہم اور مفید کتاب ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں لکھی۔ یہ تذکرہ سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے میں تقریباً ۲۰ شعرا کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان سلاطین اور حکمرانوں کا حال بھی لکھا ہے جو، ان شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ کتاب کا ایک دیباچہ بھی ہے جس میں فنِ شعر سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ان سات شاعروں کے حالات و خدمات بیان کرتا ہے جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ اس حصے میں سلطان حسین بایقرا پر تذکرہ بھی شامل ہے جو خود ایک اچھے ادیب و شاعر تھے۔ کتاب میں شعرا کے کلام کا نہایت عمدہ انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

حسین بایقرا کو موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کے دربار میں چیدہ چیدہ ماہرین موسیقی موجود تھے۔ حسین بایقرا کے قریبی رفیق علی شیر نوائی بھی موسیقی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

یہ دور مصوری کے فروغ کا بھی دور تھا۔ تیموری دور کے پہلے بیس برسوں میں (۸۰۰ھ تا ۸۲۰ھ/۱۳۹۷ء تا ۱۴۱۷ء) میں بغداد، شیراز، تبریز اور ہرات میں مخطوطے تیار ہوئے۔ مثلاً کلیلہ و دمنہ (ہرات)، جنگ (مجموعۂ تصاویر) شیراز وغیرہ۔ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء کے بعد اس اسلوب کا مرکز ہرات قرار پایا۔ بایسنغر مرزا (وفات: ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء) نقاشی کے بہت اچھے سرپرست تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اور حسین بایقرا کی تخت نشینی (۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء) کے درمیان مصوری اور نقاشی کا عمل قدرے جمود کا شکار ہوا لیکن حسین بایقرا کے دور میں اس فن کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ اس دور میں مصوری کے حوالے سے عظیم شخصیت بہزاد کی ہے۔

بہزاد کا پورا نام کمال الدین بہزاد ہے۔ وہ ۸۴۲ھ/۳۹۔۱۴۳۸ء کے قریب کے زمانے میں ہرات میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں اپنے والدین سے محروم ہو گئے تھے۔ استاد میرک نقاش نے ان کی پرورش اور تربیت کی۔ بعد ازاں انہوں نے سید احمد تبریزی سے بھی فنِ مصوری کی تربیت پائی۔ بہزاد نے فنِ مصوری میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انہیں حسین بایقرا کے دربار سے وابستگی کے بعد اپنے فن کو جِلا دینے کا موقع ملا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار میں سہولت حاصل ہوئی۔ اب مصوری میں زیادہ لچک دار اور قدرتی انداز اختیار کیا جانے لگا۔

قدیم مؤرخین نے بہزاد کو اپنے عہد کا عظیم ترین فن کار قرار دیا ہے۔ خواند امیر نے بہزاد کی نفاست، کمال اور جیتی جاگتی شبیہ بنانے کی صلاحیت کی تعریف کی ہے۔ حیدر مرزا نے تو بہزاد کا موازنہ ان کے استادِ اول میرک سے کیا ہے جن کے فن کی پختگی تو زیادہ تھی لیکن نفاست کی کمی تھی۔ قاضی احمد نے ان کے احساسِ تناسب کو واضح کیا ہے

Marfat.com

اور بتایا ہے کہ پرندوں کی تصاویر بنانے میں بہزاد کو کمال حاصل تھا۔ وہ کوئلے سے خاکہ کشی میں بڑے مشاق تھے۔ بابر نے بھی بہزاد کے فن کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ بڑے نازک قلم ہیں۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے لکھا ہے کہ بہزاد جنگی مناظر کی تصویر کشی میں خاص طور پر ممتاز تھے۔

بہزاد کی سب سے واضح اور قطعی تصاویر مصر کے قومی کتب خانے قاہرہ میں موجود مخطوطے بوستان میں ہیں۔ یہ مخطوطہ سلطان علی الکاتب نے حسین بایقرا کے لیے لکھا تھا اور اسے رجب ۸۹۳ھ / جون ۱۴۸۸ء میں ہرات میں مکمل کیا گیا۔ اس میں سرورق پر دو صفحوں کی ایک تصویر ہے اور اندر چار عدد یک صفحی تصاویر ہیں۔ آخری دو تصویروں پر بہزاد کا نام موجود ہے۔ یہ تصاویر بڑی ہنر مندی کے ساتھ بنائی گئی ہیں اور ان میں خوشنما رنگوں کا بڑا تنوع ہے۔ بہزاد بظاہر مجموعی طور پر ٹھنڈے رنگوں مثلاً نیلے اور سبز رنگوں کو ترجیح دیتے تھے، خصوصاً اندرونی مناظر میں۔ لیکن انہیں منظر کی مناسبت سے گرم رنگوں خصوصاً شوخ نارنجی رنگ سے متوازن کر دیتے تھے۔ بہزاد کی تصاویر سے محض بادشاہوں کی شجاعت آمیز کارناموں اور ان کی مصروفیات ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ ان میں معاشرتی لحاظ سے کم درجے کے افراد کے معمولات مثلاً ملازم کو کھانا لاتے ہوئے یا کسان کو کام کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔

بہزاد کے کچھ اور فن پارے بھی بہت مشہور ہوئے مثلاً میر علی شیر نوائی کا خمسہ جو ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ء میں لکھا گیا۔ امیر خسرو دہلوی کا خمسہ جسے محمد بن اظہر نے ۸۹۰ھ / ۱۴۸۵ء میں لکھا۔ اس میں بھی بہزاد کی تصاویر ہیں۔ شرف الدین علی یزدی کا ظفر نامہ جو حسین بایقرا کے لیے لکھا گیا۔ اس میں چھ عدد دوہرے صفحے کی تصاویر ہیں جو ۸۹۵ھ تا ۹۰۶ھ / ۱۴۹۰ء تا ۱۵۰۰ء میں بنائی گئیں۔ اسی طرح تہران کے ایک کتب خانے میں حسین بایقرا کی ایک بڑی تصویر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہزاد کی تخلیق ہے۔

بہزاد کی بیشتر مصوری کتابی مصوری سے متعلق ہے جسے اس زمانے کی بہترین مصوری کہا جاسکتا ہے۔ اس صنف مصوری کو میناتوری (منی ایچر یا چھوٹی کتابی تصویر) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بہزاد نے حسین بایقرا کی کئی تصاویر بنائیں۔ انہوں نے دیگر شخصیات مثلاً شیبانی خان، مولانا عبداللہ ہاتفی کی اور خود اپنی تصاویر بھی بنائیں۔ بہزاد صرف مصور ہی نہ تھے، وہ اعلیٰ درجے کے نقشہ نویس بھی تھے۔ مسجد سمرقند کا نقشہ انہوں نے ہی تیار کیا تھا۔ وہ جس طرح اپنی تصاویر میں کاشی کاری اور نقش و نگاری کا استعمال کرتے تھے اسی طرح عمارتی نقشوں میں بھی اس ہنر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بہزاد نے ہرات کے باغِ بہشت کے گنبد کے دور کا حاشیہ بھی کھینچا تھا۔ اس ضمن میں "نسخہ خمسۂ نظامی" مصور میں بہزاد کی ایک تصویر ملتی ہے جس میں زیرِ تعمیر مسجد کی محراب کا حصہ خصوصی طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس محراب میں پاڑ تین حصوں میں لگی ہوئی ہے اور مسالا الگ تیار ہو رہا ہے۔ یہ تصویر عملی فنِ تعمیر کی بہترین عکاسی کرتی ہے اور ایسا منظر وہی دکھا سکتا ہے جو خود بھی انجینئر ہو۔ بہزاد نے عمارتوں کے کتبے بھی لکھے جن میں موقع کے لحاظ سے موزوں آیاتِ قرآنی کا استعمال کیا۔

بہزاد نے ابو سعید کا زمانہ بھی دیکھا، حسین بایقرا کے زمانے میں ان کے فن کو نکھرنے کا موقع ملا۔ پھر جب ہرات پر شیبانی خان کا قبضہ ہو گیا تھا تو انہوں نے بھی بہزاد کی قدر کی۔ ان کے قتل کے بعد شاہ اسمٰعیل صفوی، بہزاد کو تبریز لے گئے۔ شاہ اسمٰعیل کی وفات کے بعد بہزاد نے شاہ اسمٰعیل کے فرزند طہماسپ کا دور بھی دیکھا۔

تیموری دور (۷۷۱ھ تا ۹۰۶ھ / ۱۳۶۹ء تا ۱۵۰۰ء) میں خطاطی کو بھی زبردست ترقی دی گئی۔ اس زمانے میں کتابوں کی خطاطی میں زیب و زینت کا استعمال کیا جانے لگا۔ کتابوں کو پودوں اور پرندوں کی اشکال سے مزین کیا جاتا تھا۔ اس دور کے ایک مشہور خطاط سلطان علی مشہدی تھے جن کا انتقال ۹۱۹ھ / ۱۵۱۳ء میں ہوا۔ وہ ہرات میں حسین بایقرا کے دربار سے وابستہ رہے۔ وہ فنِ نستعلیق کے عظیم نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔ بابر نے اپنی تزک میں اساتذۂ نستعلیق کا ذکر کرتے ہوئے بطور خاص سلطان علی مشہدی کا تذکرہ کیا ہے۔ سلطان علی مشہدی حسین بایقرا اور ان کے وزرا کے لیے کتابیں لکھا کرتے تھے اور ان کتابوں کی تصاویر بہزاد اور شاہ مظفر تیار کرتے تھے۔ انہوں نے علی شیر نوائی کے ایک دیوان کی کتابت بھی کی۔ حسین بایقرا نے سلطان علی مشہدی کو "قبلۃ الکتاب" کا خطاب دیا۔

حسین بایقرا نے کئی شادیاں کیں۔ ان کے متعدد بیٹے اور بیٹیاں تھیں لیکن ان کے سات بیٹے ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے اور باقی بیٹے حسین بایقرا کے انتقال کے صرف ایک یا دو سال بعد تک زندہ رہے۔ صرف ایک بیٹے بدیع الزماں نسبتاً زیادہ عرصے تک حیات رہے

Marfat.com

لیکن وہ بھی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں قسطنطنیہ کے طاعون کی لپیٹ میں آکر جاں بحق ہو گئے۔

حسین بایقرا بے حد بہادر اور جنگ آزما حکمراں تھے تاہم ان کا دورِ حکومت پُر سکون تھا۔ ایک بار دریائے گرگان کے کنارے پر ان کی جنگ ازبکوں سے ہوئی۔ حسین بایقرا نے دریا پار کر کے ازبکوں کی خبر لی۔ ایک بار سلطان ابو سعید مرزا نے اپنے ایک سپہ سالار کو تین ہزار سواروں کی فوج دے کر چڑھائی کے لیے بھیجا۔ حسین بایقرا اس لڑائی کے لیے تیار نہ تھے لیکن انہوں نے صرف ۶۰ سپاہیوں کے ساتھ مخالف فوج کا مقابلہ کیا اور اسے مار بھگایا۔ ابو سعید اور ان کے بیٹوں سے ان کی جنگ رہتی تھی۔ صفر ۸۷۵ھ / اگست ۱۴۷۰ء میں انہوں نے ہرات کی طرف تیزی سے یلغار کی اور اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ پھر یادگار مرزا سے ایک اور لڑائی میں خراسان کا علاقہ چھین لیا۔ اندخود اور شیر خان کے نواح میں چکمان کے مقام پر ایک جنگ سلطان محمود خان سے ہوئی، جس میں حسین بایقرا غالب آئے۔

آخری عمر میں حسین بایقرا گٹھیا کے مرض کے باعث خاصی تکلیف میں مبتلا رہے۔ اس دور میں شیبانی خان کی قیادت میں ازبک قبیلے کے لوگ پورے ماوراء النہر پر قابض ہو چکے تھے۔ شیبانی خان اب ہرات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حسین بایقرا ازبکوں کے خلاف جنگ کے لیے روانہ ہوئے لیکن راستے ہی میں ایک گاؤں "بابا الٰہی" میں ۱۱ ذی الحجہ ۹۱۱ھ / ۵ مئی ۱۵۰۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ حسین بایقرا کے دو صاحب زادے بدیع الزماں مرزا اور مظفر حسین مرزا اس موقع پر موجود تھے۔ حسین بایقرا کی میت کو ہرات لایا گیا اور ان ہی کے قائم کردہ مدرسے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

***

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

ابن خلدون اور امیر تیمور: ضیاالدین احمد برنی/ڈاکٹر جے فشل
اسلامی آرٹ اور فن تعمیر: مولانا غلام طیب / ارنسٹ کوہنل
افغانستان: ڈونالڈ این ولبر
الغ بیگ کا خزانہ: عادل یعقوبوف/شاہدہ زیدی
الغزالی: علامہ شبلی نعمانی
اے ہسٹری آف پرشیا: سر پرسی سائکس
بابر نامہ: ظہیر الدین بابر/میرزا نصیر الدین حیدر
تاریخ ابن خلدون: عبد الرحمٰن ابن خلدون
تاریخ ادبیات ایران: ڈاکٹر رضازادہ شفق / سید مبارز الدین رفعت
تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولاں: محمد داؤد رہبر / ایڈورڈ جی براؤن
تاریخ اسلام: شاہ معین الدین احمد ندوی
تاریخ اسلام: اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تاریخ ایران: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی
تاریخ بخارا: نفیس الدین احمد / آرمینیس ویمبرے
تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ: ڈاکٹر احمد شبلی / محمد حسین خان زبیری
تاریخ خوارزم شاہی: پروفیسر غلام ربانی عزیز
تاریخ دعوت وعزیمت: مولانا ابو الحسن علی ندوی
تاریخ ملت: انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
تاریخ الخلفا: جلال الدین سیوطیؒ
تباہی بغداد کے بعد مشرق وسطیٰ کے ڈھائی سو سال (مقالات):
ثروت صولت
جغرافیہ خلافت مشرقی: محمد عنایت اللہ / جی لی اسٹرینج
دائرۂ معارفِ اسلامیہ
روس کے مسلمان تاریخ کے آئینے میں: ثروت صولت
زمان ومکان اور بھی ہیں: محمد حمزہ فاروقی
سلاجقہ: ابوالاعلیٰ مودودی
سمرقند، بخارا، خیوہ: روبن میگووان
سیاست نامہ: نظام الملک طوسی
شعر العجم: علامہ شبلی نعمانی
طب العرب: حکیم سید علی احمد نیر واسطی / ایڈورڈ جی براؤن
طبقاتِ ناصری: منہاج سراج / غلام رسول مہر
علم پروری وہنر شناسی: ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی
غیر مطبوعہ مقالہ: ثروت صولت
فور اسٹڈیز آن دی ہسٹری آف سینٹرل ایشیا: وی وی بار تھولڈ
قدیم اسلامی مدارس: منور جہاں رشید
کشور محمود وبابر: منظور ممتاز
مسلمان حکمران: رشید اختر ندوی
مقالات روزنامہ 'جسارت' کراچی: از ثروت صولت
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
ملک شاہ سلجوقی: طالب ہاشمی
ملوکِ وسط ایشیا: مرزا رفیع الدین بیگ دحشی
میراثِ ایران: سید عابد علی عابد / پروفیسر اے۔ جے۔ آربری
نظام الملک طوسی: مولانا عبد الرزاق کانپوری
نظام الملک طوسی: ارشاد الحق قدوسی
نظام الملک طوسی: طالب ہاشمی
ہسٹری آف سیراسن: سید امیر علی

•••

Marfat.com

ہند کے حکمراں

برصغیر پاک وہند کے نامور اور قابلِ فخر
حکمرانوں کے حالات

Marfat.com

انتساب

اپنے نہایت محترم اور محبت پاش برادران
اپنے محسنوں
جناب فصیح چغتائی، جناب عزیز چغتائی (مرحوم)
جناب حکیم چغتائی، جناب احمد چغتائی
اور
اپنی بے حد عزیز اور مشفق بہن اور اپنی محسن
محترمہ فاطمہ خانم کے نام

Marfat.com

پیش لفظ

تاریخ نویسی کی ابتدا اقوام وافراد کی اجتماعی وانفرادی انا کی ایک شکل ہے جس میں اپنے قدیم کارناموں پر فخر کرنے یا اپنی شکست پر دشمنوں سے بدلہ لینے کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس کا ایک تعلق تفریحی قصہ گوئی سے بھی ہے۔

تاریخ نویسی کی تحریری ابتدا تو ہیروڈوٹس سے ہوتی ہے جسے مزید یونانی ورومی مؤرخوں نے ایک الگ صنف کی شکل عطا کی لیکن اس کا انداز بیان ستائشی روایات اور کارناموں کے اندراج پر مبنی رہا۔ اسلام کی اشاعت نے جہاں نسل انسانی کو ہر جہت میں ایک نئے مثبت انداز سے روشناس کرایا اس میں تاریخ کو ایک منضبط اور مدلل شکل بھی عطا کی جس کی ابتدا کلام پاک کی آیات کے اندراج سے ہوتی ہے جب کہ ہر آیت کے لیے دو صحابہ کرامؓ کی تصدیق لازمی قرار دی گئی، یعنی وہ راوی جنہوں نے خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کو سنا، یاد کیا اور تحریر کیا۔ جب تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر شریعت اور فقہ کی تدوین لازمی قرار پائی تو احادیث وسنت نبوی کے لیے تواتر سے روایات ودرایت کے ساتھ ساتھ نص قرآنی واسوۂ حسنہ سے مطابقت اور راوی کے ثقہ ہونے کے اصول مرتب ہوئے اور یہی طریقہ تاریخ نویسی میں بھی اختیار کیا گیا۔ لہٰذا ابتدائی دور میں محدثین اور مؤرخین تقریباً مترادف اصطلاحات تھیں۔ سنہ ہجری کی ابتدا نے واقعات کے تعین زمانہ کو رواج دیا۔ عالمگیر اسلامی سلطنت یا خلافت نے عالمگیر تہذیبی ورثے کی سال بہ سال جامع عالمگیر تواریخ کو رائج کیا تو پھر یہ ممکن ہوا کہ دور نبوی وخلافت کو معیار بنا کر ہر عہد کو پرکھا جائے اور سلطنتوں واقوام کے عروج وزوال کو سمجھا جائے۔ بہر حال خلافت راشدہ سے عروج سلاطین تک تاریخ نویسی ایک باقاعدہ صنف بن گئی۔ دور جدید میں قومیت اور جدوجہد آزادی کی تحریکات نے تاریخ نویسی کو مزید اہمیت عطا کی اور اقوام عالم میں تاریخ کی تعلیم وتحقیقات کو درسی نصاب میں اہم مقام ملا، ورنہ تعلیمی نصاب میں اسے کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی۔

برصغیر جنوبی ایشیا میں مسلم دور سے قبل تاریخ نویسی کی واحد مثال پنڈت کلہانا کی 'راج ترنگنی' کی ہے ورنہ قدیم ہند کے بارے میں آج جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر دارومدار آثار قدیمہ کی دریافتوں پر ہے۔ مسلم سلاطین اور سلطنت مغلیہ کے ادوار میں کوئی بھی دور تاریخ نویسی سے خالی نہیں۔ نثر نہیں تو نظم میں سہی، تاریخ بہر حال موجود ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے دس سال بعد اپنے عہد کی تاریخ لکھوانی بند کر دی لیکن پھر بھی اس دور کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں۔ نوآبادیاتی وسامراجی دور (۱۸۵۷-۱۹۴۷ء) میں جدید تعلیم کے ساتھ ہر شعبے میں جدید نظریات نے فروغ حاصل کیا۔ تاریخ نویسی بھی اس سے متاثر ہوئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ ۱۹ویں صدی کے دور میں تاریخ نویسی کی جو روایات عذر خواہی اور رومانی انداز سے قائم ہوئیں ان سے اچانک ایک وقفہ ایسا آیا کہ جس میں ہمیں مسلم مؤرخین میں کوئی بڑا نام نہیں ملتا۔ ہمارے طلبہ یوروپین اور مقامی غیر مسلم مؤرخین سے یک رُخی تاریخ نویسی ہی پڑھتے رہے جس میں ایلیٹ ڈاؤسن کی قائم کردہ نظیر "صرف مسلم دور کے تاریک ادوار کی پیشکش" کا سلسلہ ہی جاری رہا۔ قیام پاکستان کی تحریک کے زمانے میں اس رجحان نے اور زور پکڑا، لہٰذا ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے ساتھ ساتھ ہمارے رہنماؤں کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ تاریخ کا روشن پہلو بھی سامنے لایا جائے۔ حالانکہ تحقیق وتنقید کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن مثبت طرز بیان نے اسے مدلل پہلو سے کمزور کر دیا۔ دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے نصاب میں تاریخ کو سوشل اسٹڈیز میں شامل کر کے تاریخ کو ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ ساتھ ساتھ غلط سیاسی فیصلوں نے لوگوں میں قنوطیت ویاسیت کو بڑھا دیا اور ایسے بھی لوگ دانشور بن کر سامنے آئے جو اس ملک کے قیام وبقا ہی کو غلط سمجھنے اور لکھنے لگے۔

فن تاریخ نویسی پاکستان میں ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے محققین اپنی نئی تخلیقات کو انگریزی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ اصل ماخذ بھی یا تو فارسی وعربی میں ہیں یا چند انگریزی تراجم میں ملتے ہیں۔ لہٰذا عام شہری جو اردو دان ہے، وہ ان سب سے ناواقف ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب کے مستند تراجم اردو میں شائع کیے جائیں۔

بظاہر تاریخ ایک غیر دلچسپ اور خشک موضوع ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عام قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اسے ایک دلکش پیرائے میں پیش کیا جائے۔ محترم کلیم چغتائی یوں تو ایک صحافی رہے ہیں لیکن تاریخ سے ان کی دلچسپی قائم رہی ہے۔ مقبول ومعروف رسالے 'رابطہ'

Marfat.com

سے وابستگی کے زمانے میں انہوں نے مسلم دنیا کی نامور شخصیات، حکمرانوں، منتظمین، سپہ سالاروں، ادیبوں اور فلسفیوں وغیرہ پر مقالات تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین ان ہی مقالات کے نقش ثانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چغتائی صاحب ایک صاحب قلم ادیب کی طرح مولانا شبلی اور مولانا شرر کے طرز تحریر میں شگفتہ تاریخی حقائق، کچھ رومانوی کچھ افسانوی چاشنی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔ ہر مقالے کی ابتدا کسی پُر اثر واقعے کی عکاسی کے طور پر، شروع سے ہی قاری کی دلچسپی اپنی جانب منعطف کر لیتی ہے۔ زبان کی روانی اور چاشنی کا یہ تاثر آخر وقت تک قائم رہتا ہے۔ یقیناً سنجیدہ محققین کو یہ انداز پسند نہ آئے گا لیکن اس میں کلام نہیں کہ نوجوان اور کم عمر قارئین ہوں یا زمانے کی بہاریں دیکھے ہوئے معمر حضرات، ان کی پُر اثر تحریر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس کتاب میں چغتائی صاحب نے برصغیر کے قابل فخر حکمرانوں کے پچیس خاکے شامل کیے ہیں، جن میں محمد بن قاسم سے ٹیپو سلطان تک کے حکمران شامل ہیں۔ اس فہرست میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کے نام نہیں ہیں۔ اگر انہیں شامل کر لیا جاتا اور علاقائی سلطنتوں کے چند نامور حکمران بھی شامل کر لیے جاتے تو کتاب کا تاثر اور بڑھ جاتا۔ امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ بہر حال چغتائی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آمین۔

پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد خان

جنرل سیکریٹری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

ایڈیٹر، جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (ہسٹاریکس)، ایڈیٹر، ہمدرد اسلامیکس

Marfat.com

عرضِ مؤلف

دنیا میں کہیں بھی اچھے مسلم حکمرانوں کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ بات ان تمام حکمرانوں میں مشترک نظر آئے گی کہ وہ اس پوری کائنات کے بادشاہ کے سامنے خود کو جوابدہ سمجھتے تھے، اسی احساسِ ذمہ داری نے ان حکمرانوں سے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اچھی اور موثر منصوبہ بندی کروائی۔ قابلِ قدر اقدامات کروائے۔ اسی احساس نے ان کو انصاف کی بالادستی قائم کرنے پر آمادہ کیا اور اسی احساس نے ان کو اتحاد بین المسلمین کے لیے کوششوں کی طرف متوجہ کیا۔ اسلام سے وابستگی ہی کے باعث ان حکمرانوں نے علم کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کے فروغ کے لیے ٹھوس اور دیرپا انتظامات کیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی دنیا کو اچھے مسلمان حکمران میّسر آئے، ان کے ادوارِ حکومت میں اعلیٰ سطح پر علمی کام ہوا اور متعدد شعبوں میں علمی سرمایہ کو بڑے پیمانے پر محفوظ کیا گیا۔

یہی صورت ہمیں برصغیر (پاک وہند) میں بھی نظر آتی ہے، جہاں مسلمانوں کی تاریخ اپنی الگ شان رکھتی ہے۔ محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک، تقریباً گیارہ سو برس کے طویل عرصے میں مختلف خاندانوں کی حکومت قائم رہی۔ ان میں نیکوکار، بدکردار، انصاف پسند، ناانصاف، رحم دل، سخت دل غرض ہر طرح کے حکمران شامل تھے۔ تقریباً تمام ہی حکمرانوں میں بادشاہوں والی خوبُو اور اس نظام سے تعلق رکھنے والی خرابیاں بھی تھیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود، بحیثیتِ مجموعی، مسلمان اس سرزمین اور اس کے باسیوں کے لیے خوشیاں، آسانیاں اور خیر و فلاح لے کر آئے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل، یہاں کے لوگ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے۔ مسلمان آئے تو اپنے ساتھ علمی اور فنّی ترقی، تہذیب اور تمدن لے کر آئے۔ اسلام نے ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق پر کاری ضرب لگائی، چنانچہ مسلمانوں کی آمد کے بعد نچلی ذات کے غیر مسلموں پر بھی علم کے دروازے کھل گئے۔ محمود غزنوی ہوں، مسعود غزنوی یا ابراہیم غزنوی، ان کے ادوار جنگ وجدل کے ساتھ ساتھ علم کی بھرپور سرپرستی سے بھی عبارت ہیں۔ یہ حکمران خود بھی علمی لیاقت کے مالک تھے۔ شہاب الدین غوری کو لیجیے، جنگوں میں مصروف رہنے کے باعث انہیں علم کی ترویج واشاعت کا زیادہ موقع نہ مل سکا لیکن انہوں نے فوجی مہمات تک میں علماء کو ساتھ رکھا اور مدارس قائم کر کے ان کے تعلیمی نظام کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ قطب الدین ایبک نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں علم کو عام کرنے کی جو کوششیں کیں ان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دور میں لاہور شہر کی نوّے فی صد آبادی تعلیم یافتہ تھی۔ اُدھر اُچ اور ملتان میں علم کی ترویج واشاعت کا باقاعدہ آغاز ناصر الدین قباچہ کے دورِ حکومت میں ہوا۔ "طبقاتِ ناصری" کے مصنف مولانا منہاج الدین کے مطابق "التمش کے دور میں علم وادب کی جو ترقی شروع ہوئی وہ برابر بڑھتی چلی گئی۔" علاء الدین خلجی تو بعض مؤرخین کے مطابق ناخواندہ تھے لیکن مؤرخ ضیاء الدین برنی کے مطابق "علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی اور اس کے اطراف میں جس درجہ کے علماء موجود تھے، اس کی مثال بعد کی تاریخوں میں نہیں ملتی۔ ان میں سے ہر ایک علامۂ وقت تھا اور اپنے فن میں ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا میں اس کا ثانی نہیں مل سکتا تھا۔" فیروز شاہ تغلق برصغیر کے حکمرانوں میں غالباً پہلے حکمران ہیں جنہوں نے صنعت وحرفت کی تعلیم کا باقاعدہ اور وسیع نظام قائم کیا۔ فروغِ علم کے لیے کشمیری حکمران زین العابدین کی خدمات سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ظہیر الدین بابر کی زندگی کا بڑا حصہ جنگوں میں گزرا لیکن مؤرخین کے مطابق کوئی علمی شعبہ ایسا نہ تھا جس سے بابر کو دلچسپی نہ ہو۔ وہ قیام کی حالت میں ہوں یا سفر میں، اپنا کتب خانہ ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ شیر شاہ سوری برصغیر کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے پوری مملکت میں اراضی کی پیمائش کروائی۔ انہوں نے جو مالیاتی نظام نافذ کروایا وہ مغلیہ دور میں بھی برقرار رہا بلکہ انگریزوں نے بھی اس نظام کی کئی باتیں اپنائیں۔ ٹیپو سلطان اپنی مثالی دلیری اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ علمی ذوق رکھتے تھے۔ صاحبِ کتاب تھے اور اپنا ذاتی کتب خانہ رکھتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کی علم دوستی نے برصغیر کی تہذیب وثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے، چنانچہ کھانے پکانے، لباس و آرائش، طرزِ بود وباش، تعلیم، علاج معالجے سے لے کر تعمیرات تک ہر شعبے میں مسلم تہذیب کو قبولِ عام حاصل ہو گیا۔

اس حیرت انگیز تبدیلی کی گواہی صرف مسلمان مؤرخین ہی نہیں دیتے، غیر مسلم مؤرخین بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں، چنانچہ مشہور

Marfat.com

ہندو مورخ مجمدار کے مطابق:

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ کپڑے سینا تک نہ جانتے تھے۔ ایک ہی لمبا سا بغیر سلا کپڑا بدن کے گرد لپیٹ لیا جاتا تھا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں یا گھاس کے جوتوں کا رواج تھا لیکن غزنوی حکمرانوں کی آمد کے بعد لباس و خوراک کا انداز ہی بدل گیا۔

برصغیر کے نیک سیرت، لائق اور باصلاحیت مسلمان حکمرانوں میں سے چند کا احوال زیر نظر کتاب "ہند کے حکمران" میں پیش کیا گیا ہے۔ ان حکمرانوں کی قابل تحسین خدمات یہ پیغام دیتی ہیں کہ اگر مسلمان ماضی میں صداقت اور راستبازی کی راہ اپنا سکتے تھے، علمی میدان میں دنیا کی قیادت کر سکتے تھے اور ان کی تہذیب، مثالی اور لائق تقلید کہلائی جاتی تھی تو وہ آج بھی یہ مقام بلند حاصل کر سکتے ہیں۔

میں اپنے انتہائی لائق احترام اور ازحد شفیق و مکرم استاد، نہایت نفیس شخصیت کے مالک، علم کے روشن مینار، ماہر تعلیم، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل "ہسٹاریکس" اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے جرنل "ہمدرد اسلامیکس" کے ایڈیٹر محترم پروفیسر ڈاکٹر انصار زاہد خان صاحب کا بے حد شکر گزار اور ان کے لیے بہت دعاگو ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا ضخیم مسودہ پوری توجہ سے ملاحظہ فرمایا، نقائص کی درستگی کے لیے رہنمائی فرمائی اور کمال شفقت سے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

کلیم چغتائی

Marfat.com

محمد بن قاسم

نوجوان سپہ سالار جنہوں نے سندھ فتح کیا اور دلوں پر حکومت کی

وہ چھپتا چھپاتا آگے بڑھ رہا تھا!

اس کا تعلق چنّہ قبیلے سے تھا اور اسے اس کی قوم نے دشمن کے فوجی کیمپ میں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا۔ اسے یہ پتا چلانا تھا کہ سیوستان کے قلعے کو فتح کرنے والے لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ اس کی چاروں طرف دشمن کی فوج کے خیمے بڑی ترتیب سے تنے ہوئے تھے۔ انہی خیموں کی آڑ لے کر وہ نہایت احتیاط کے ساتھ حرکت کر رہا تھا، اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور وہ بے چینی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں دشمن فوج کا کوئی سپاہی اسے دیکھ نہ لے اور پھر نہ معلوم اس کا کیا حشر کرے۔

اچانک وہ ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ اس کے کانوں سے کسی اجنبی زبان کے الفاظ ٹکرائے تھے۔ وہ یہ الفاظ سمجھ تو نہیں سکتا تھا لیکن اسے یوں لگا جیسے ان الفاظ میں بڑا ترنم ہے، نغمگی ہے اور جو شخص ان الفاظ کو ایک خاص انداز سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہا تھا، اس کی آواز اسے گویا اپنے دل میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔

جب یہ آواز آنی بند ہو گئی تو جاسوس نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک کھلے مقام پر دشمن کا سارا لشکر جمع ہو رہا تھا۔ سپاہیوں نے صفیں بنالی تھیں۔ چند لمحوں بعد ایک خوش رُو نوجوان آگے بڑھا، اس کی گلابی رنگت پر سیاہ ڈاڑھی بے حد کِھل رہی تھی۔ وہ صفوں کے آگے کھڑا ہو گیا اس نے کچھ کہہ کر ہاتھ اٹھائے اور پھر ہاتھ باندھ لیے، جیسے کسی بہت بڑی ہستی کے سامنے حاضر ہو اور اپنے ادب کا اظہار کرنا چاہتا ہو۔ جاسوس نے دیکھا کہ اسی وقت پورے لشکر نے ہاتھ اٹھائے اور اس نوجوان کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔

وہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑے غور سے دیکھا کہ صفوں کے آگے کھڑا ہوا نوجوان چند الفاظ کہہ کر کبھی جھک جاتا تو تمام سپاہی اسی کی طرح جھک جاتے، وہ نوجوان کبھی زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتا تو اس کے سارے سپاہی فوراً اس کی تقلید کرتے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا لشکر اپنے افسر کے حکم کی سختی سے پابندی کرنا جانتا ہے۔

'یہ عجیب فوج ہے' جاسوس نے دل میں سوچا۔ 'انہوں نے ابھی سیوستان کا قلعہ فتح کیا ہے۔ قلعہ چھوڑ کر بھاگنے والے واپس بھی تو آسکتے ہیں، جب یہ سپاہی زمین پر اپنے ماتھے ٹیک دیتے ہیں تو کوئی بھی انہیں ہلاک کر سکتا ہے لیکن انہیں ذرا بھی خوف نہیں۔ یقیناً نہیں۔ ان کو بھلا کون شکست دے سکتا ہے؟'

جاسوس وہیں سے الٹے قدموں لوٹ گیا۔ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا "میں نے ان لوگوں میں جو اتفاق اور اتحاد دیکھا ہے اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ ان پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔"

چنّہ قبیلے کے بڑے بوڑھوں اور سرداروں نے جب اپنے ہم قوم کی یہ بات سنی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں قیمتی تحفے لے کر قلعے کے فاتح سالار کے پاس چلنا چاہیے۔ انہوں نے بیش قیمت تحائف اکٹھے کیے اور دشمن کے فوجی پڑاؤ کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ دستر خوان بچھائے جا رہے ہیں اور پورا لشکر کھانا کھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا، "اس فوج کا سپہ سالار کہاں ہے؟" سپاہیوں نے انہیں سپہ سالار تک پہنچا دیا۔

چنہ قبیلے کا جاسوس، سپہ سالار کو دیکھتے ہی حیرت زدہ رہ گیا، یہ تو

Marfat.com

وہی خوش رُو نوجوان ہے، کچھ دیر قبل جس کے اشارے پر صف بستہ پورا لشکر حرکت کر رہا تھا۔ اس نوجوان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں پیشانی کشادہ تھی، اس کا بھرا بھرا بدن اور چوڑی کلائیاں اس کی غیر معمولی قوت کو ظاہر کرتی تھیں۔ جب وہ ان سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز تو بارعب تھی لیکن لہجہ نہایت شیریں، اور پھر اس کے چہرے کا حسین اور دل آویز تبسم۔

نوجوان سپہ سالار کی شخصیت نے آنے والوں پر سحر طاری کر دیا تھا! اس نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ انہیں اس آفاقی دین کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بعد جٹ قبیلے کے اس وفد کے ارکان کی زبانوں پر کلمہ توحید جاری تھا۔

دلوں کو فتح کر لینے والے یہ نوجوان سپہ سالار تھے فاتح سندھ محمد بن قاسم جن کی ولولہ انگیز قیادت میں سندھ کو باب الاسلام بننے کا شرف حاصل ہوا، اور جن کی بے مثل جرأت، ہوش مندی اور فراست کی بدولت مختصر سے عرصے میں اسلام کی روشنی نے ایک وسیع علاقے کو منور کر دیا۔

عالم اسلام کا یہ عظیم جرنیل ۷۵ھ / ۹۵-۶۹۴ء میں طائف کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عبدالملک بن مروان خلیفۃ المسلمین تھے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کو ۷۵ھ میں مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے اپنے بھائی قاسم بن محمد یعنی محمد بن قاسم کے والد کو بصرہ کا گورنر نامزد کیا، خیال ہے کہ اس کے بعد محمد بن قاسم کی تربیت بصرہ ہی میں ہوئی۔ آپ کی کنیت ابوالبہار تھی کیونکہ آپ ایک خوشبودار پھول بہارالبر کو بہت پسند کرتے تھے۔

اس زمانے میں بصرہ ایک بڑا علمی، ثقافتی اور عسکری مرکز تھا۔ صحابی رسولؐ حضرت انس بن مالکؓ اس وقت بقید حیات تھے۔ اس کے علاوہ امام حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ بھی اپنے علم سے لوگوں کو فیضیاب کر رہے تھے۔

قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھنے والے اس بہادر سپوت کے سر سے والد کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا اور اس کی تربیت کی تمام ذمے داری والدہ حبیبہ پر آ پڑی۔ والدہ نے اپنے پیارے بچے کی بہت اچھی تربیت کی اور اسے دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اوصاف سے مزین کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ محمد نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو فوج کی ملازمت اختیار کی جہاں قابل اور تجربہ کار فوجی افسران کے زیر تربیت ان کی صلاحیتیں اور نکھر کر سامنے آئیں۔ اس کمسن نوجوان نے لڑائی کے تمام مروّجہ طریقوں پر اتنی عمدگی سے اور اس قدر جلد دسترس حاصل کر لی کہ صرف ۱۴ سال کی عمر میں اسے فوج کے اعلیٰ عہدے کے لیے موزوں قرار دے دیا گیا۔

سنہ ۹۰ھ / ۷۰۹ء میں ایران میں کردوں نے بغاوت کر دی، حجاج بن یوسف نے باغی کردوں کے خلاف ایک فوج روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فوج کی قیادت کے لیے اس کی نگاہ اپنے مرحوم بھائی قاسم کے بیٹے محمد پر پڑی جن کی عمر گو کہ صرف پندرہ سال تھی لیکن اچھی صحت اور بچپن ہی سے فنون حرب کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں بڑے دکھائی دیتے تھے۔ محمد اپنی ذہانت اور قائدانہ صلاحیتوں کا بارہا اظہار کر چکے تھے۔ انہوں نے فوج کی کمان سنبھالی اور ایران پہنچ کر کردوں کو شکست فاش دی۔ پھر اصطخر کو تسخیر کیا اور جرجان کی طرف بڑھے۔ اس کے بعد ایک خصوصی نقشہ تیار کروا کے شہر شیراز کی بنیاد ڈالی اور اسے فارس کا پایۂ تخت بنایا۔ شیراز اس سے قبل ایک معمولی چھاؤنی تھی۔

محمد بن قاسم نے شیراز میں بے حد عمدگی سے امورِ مملکت انجام دیے۔ سترہ سال کی عمر میں انہیں شیراز کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ محمد بن قاسم کو اسلام سے بڑی محبت تھی۔ اسلام کا پیغام عام کرنے کی جو تڑپ اس صالح نوجوان کے دل میں جاگزیں تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محمد بن قاسم کو جو تنخواہ ملتی، اس کا بڑا حصہ وہ اسلام کی دعوت پھیلانے پر صرف کر دیا کرتے تھے۔ قدرت نے اس نوجوان سالار کی زبان میں ایسی مٹھاس بھر دی تھی کہ جب وہ لوگوں کے سامنے تقریر کرتے تو لوگ دم بخود ہو کر سنتے رہ جاتے۔

محمد بن قاسم کو حجاج کی طرف سے شہر "رے" پر فوج کشی کا حکم مل چکا تھا اچانک حجاج بن یوسف کا ایک اور حکم نامہ انہیں موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ رے کی بجائے سندھ جاؤ اور اس فوج کا انتظار کرو جسے میں تمہارے لیے خشکی کے راستے بھیج رہا ہوں۔

سندھ پر حملہ کرنے کا یہ فیصلہ دراصل اس مسلمان لڑکی کی پکار کا جواب تھا جس نے سندھ کے ساحل پر لٹیروں کے ہاتھوں اپنے جہاز کو لٹتے دیکھ کر حجاج کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ یہ بحری قافلہ سراندیپ (موجودہ سری لنکا) کے بادشاہ نے خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک کے

Marfat.com

خدمت میں تحائف کے ساتھ بھیجا تھا۔ قافلے میں چند مسلمان عورتیں اور مسلمان تاجروں کی بیوائیں اور بچے شامل تھے۔ یہ جہاز گرداب میں گھر کر تباہ ہوئے اور دیبل کی طرف جا نکلے جہاں بحری قزاقوں نے انہیں لوٹ لیا۔ ان میں قید کی جانے والی عورتوں نے حجاج کا نام لے کر دہائی دی۔

قافلے کے چند مسافر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے عراق پہنچ کر حجاج بن یوسف کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ حجاج بن یوسف نے سندھ کے راجا داہر کو ایک خط لکھا کہ آپ نے جن مسلمانوں کو قید کر لیا ہے ان کو رہا کر دیں اور لوٹا ہوا مال و اسباب واپس کر دیں۔ راجا داہر نے جواب میں لکھا کہ یہ کام تو بحری ڈاکوؤں کا ہے جن پر ہمارا بس نہیں چلتا۔

داہر کا جواب آنے پر حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی۔ اجازت نہ ملی تو حجاج نے دوبارہ دمشق پیغام بھیجا کہ میرا خیال ہے کہ کثیر اخراجات کی وجہ سے سندھ پر حملے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو رقم سرکاری خزانے سے صَرف ہو گی اس سے دگنی رقم خزانے میں داخل کروں گا۔ اس پر خلیفۂ وقت نے حملے کی اجازت دے دی۔

آج سے ۱۳ سو سال قبل سندھ چھوٹا سا صوبہ نہ تھا بلکہ سندھ کے نام کا اطلاق ایک وسیع علاقے پر ہوتا تھا جو مغرب میں مکران تک، جنوب میں بحیرۂ عرب اور گجرات تک، مشرق میں مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک، اور شمال میں ملتان سے گزر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی حکومت مکران تک وسیع ہو چکی تھی۔

سنہ ۷۵ھ میں حجاج بن یوسف کو مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ بنائے جانے سے قبل گو کہ سندھ کے سرحدی علاقوں پر مسلمانوں نے اکا دکا حملے کیے تھے لیکن ان کا مقصد ڈاکوؤں کی سرکوبی تھا۔ باقاعدہ فوج کشی نہیں کی گئی تھی۔ حجاج بن یوسف نے سعید بن اسلم کو مکران اور سرحد کا حاکم مقرر کیا۔ اسی زمانے میں ایک قبیلہ بنی آسار اپنے سردار محمد علافی (علفی) کے ساتھ عمان کے راستے سندھ میں آکر آباد ہو گیا۔ اس نے سندھ کے راجا داہر کی ایک لڑائی میں مدد کی۔ راجا نے سرحد مکران کا ایک علاقہ اس قبیلے کو دے دیا۔ سعید بن اسلم نے کسی جرم پر اس قبیلے کے ایک فرد کو سزائے موت دے دی۔ اس پر قبیلے والوں نے سعید کو قتل کر کے مکران پر قبضہ کر لیا۔ حجاج بن یوسف کو یہ خبر ملی تو وہ بہت غضب ناک ہوئے اور انہوں نے اپنے ایک افسر مجاعہ بن سحر کو مکران بھیجا۔ علافی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکران چھوڑ کر سندھ بھاگ گئے جہاں راجا داہر نے ان کو پناہ دے دی۔ راجا داہر نے حکومتِ اسلامیہ کے باغی کو پناہ دی تھی، اس وجہ سے اس کے خلاف کارروائی مسلمانوں کے لیے ضروری ہو گئی۔

اسی اثنا میں مسلمان عورتوں اور بچوں کو لے جانے والے تجارتی جہاز سندھ کے بحری قزاقوں کے ہاتھوں لوٹ جانے کا واقعہ پیش آیا، اور راجا داہر نے اپنی قوت کے گھمنڈ میں مسلمان عورتوں اور بچوں اور قیمتی سامان کو واپس نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا وہی اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کا باعث بن گیا۔

حجاج بن یوسف نے پہلے عبداللہ بن بنہان کی قیادت میں ایک فوج سندھ کے ساحلی شہر دیبل بھیجی لیکن عبداللہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے پھر بدیل بن طہفہ کو جو عمان میں تھے، حکم ملا کہ مکران کے گورنر سے تین ہزار سپاہی لے کر دیبل پر حملہ کریں لیکن بدیل نے بھی لڑائی میں شہادت کا مرتبہ پایا۔ حجاج نے اپنے دو سپہ سالاروں کی شہادت کے بعد فیصلہ کیا کہ سندھ پر منظم حملے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے شامی لشکر سے چھ ہزار پیادے سپاہی اور چھ ہزار سوار لیے۔ بوجھ لادنے کے لیے کئی ہزار اونٹ فراہم کیے۔ ضرورت کی ہر چیز ساتھ کر دی حتیٰ کہ سوئی دھاگا تک دیا۔ جب سندھ میں سپاہیوں کا ہاضمہ خراب ہوا اس وقت سرکہ فراہم کیا گیا۔ حجاج نے روئی کو سرکہ میں بھگو کر سائے میں خشک کروایا اور پھر اس روئی کے گٹھے بندھوا کر جہازوں کے ذریعہ روانہ کیے تاکہ جب بھی سرکہ کی ضرورت ہو روئی تر کر کے اسے چھان لیا جائے۔ فوجی ساز و سامان دیگر کئی جہازوں پر لاد کر دیبل روانہ کیا۔ اس میں کئی منجنیقیں بھی تھیں، ایک بہت بڑی منجنیق بھی تھی جسے "عروس" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ منجنیق اتنی بڑی تھی کہ اسے حرکت میں لانے کے لیے پانچ سو افراد کی ضرورت ہوتی تھی۔

حجاج بن یوسف نے سندھ پر فوج کشی کے لیے اب نوجوان محمد بن قاسم کا انتخاب کیا تھا۔ یہاں سے محمد بن قاسم کی زندگی کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ یہ باب جہادِ فی سبیل اللہ سے عبارت ہے، فتوحات اور معرکہ آرائیوں سے معمور ہے، مفتوح باشندوں کے تشکر آمیز آنسوؤں سے لبریز ہے۔ وہی باب جس نے محمد بن قاسم کو 'فاتح سندھ' کا لقب عطا

Marfat.com

کیا۔ در حقیقت وہ محض سندھ کے فاتح نہیں تھے بلکہ سندھ کے تمام باشندوں کے دلوں کے فاتح تھے۔ انہوں نے مفتوح عوام کے دلوں کو اپنے حُسنِ سلوک سے تسخیر کر ڈالا اور صرف ساڑھے تین سال کے عرصے میں عوام کو اپنا اس حد تک گرویدہ بنا ڈالا کہ لوگوں نے ان کا مجسمہ بنا کر عقیدت اور احترام سے اپنے پاس رکھ لیا۔

اتنی محبت، اتنی عزت اسی کو ملتی ہے جسے دلوں کو فتح کرنے کا ڈھنگ آتا ہو۔

حجاج بن یوسف نے جہم بن زحر کی قیادت میں جو لشکر روانہ کیا تھا، وہ شیراز پہنچ چکا تھا، یہاں سے محمد بن قاسم اس لشکر کو لے کر خشکی کے راستے مکران پہنچے۔ یہاں سے ارمن بیلہ کی طرف روانہ ہوئے، قنزپور (پنجگور) پر حملہ کیا اور فتح نے محمد بن قاسم کے قدم چومے۔ اس علاقے میں یہ پہلا مقام ہے جہاں ابنِ قاسم کی فتح کے نشان ثبت ہوئے، اس کے بعد ارمن بیلہ فتح ہوا۔ ۹۲ھ / ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی فوج دیبل پہنچ چکی تھی۔ سرزمین سندھ پر سب سے پہلے نماز جمعہ اسی جگہ ادا کی گئی۔ اسی دن بحری جہاز کے ذریعے فوجی سامان بھی پہنچ گیا۔

دیبل مغربی سندھ کا نہایت پرانا ساحلی شہر تھا۔ ایران، عراق اور افریقہ کے بحری جہاز آکر اسی بندرگاہ میں ٹھہرتے تھے۔ یہ بندرگاہ تقریباً چھ سو برس تک سندھ کی اہم بندرگاہ رہی اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں ایک نئی بندرگاہ "لوہارانی بندر" کے قیام کے باعث دیبل کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی، خیال ہے کہ سندھ میں موجود بھنبھور کے کھنڈرات ہی کسی زمانے میں دیبل کی بندرگاہ ہوا کرتے تھے۔

دیبل کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ اس شہر میں ایک شاندار دیول (مندر) تھا جس کی وجہ سے اس شہر کا نام دیبل پڑ گیا تھا۔ مندر کا گنبد بہت بڑا اور بلند تھا اور دور سے نظر آتا تھا۔ گنبد پر بہت لمبے بانس پر ریشم کا سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ شہر کے گرد مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی۔

محمد بن قاسم کے دیبل پہنچتے ہی شہر والے فصیل کے دروازے بند کر کے محصور ہو گئے۔ محمد بن قاسم کے حکم پر شہر کی چاروں اطراف خندقیں کھود دی گئیں اور جگہ جگہ مورچے قائم کر لیے گئے۔ جنگ شروع ہوئی۔ فصیل کئی مقامات پر منہدم ہو چکی تھی لیکن شہر فتح نہیں ہو رہا تھا، ایک دن ایک مفرور کسی طرح شہر سے نکل کر محمد بن قاسم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ سندھ کو مسلمان فتح کر لیں گے لیکن جب تک مندر پر جھنڈا لہرا رہا ہے اس وقت تک اس شہر کی فتح ممکن نہیں۔ آپ کوشش کریں کہ مندر پر لہرانے والا پرچم گرا دیا جائے۔ حجاج کو یہ اطلاع ملی تو انہوں نے پیغام بھجوایا کہ انہیں مندر اور اس کے پرچم کی اونچائی سے آگاہ کیا جائے۔ اطلاعات ملنے پر انہوں نے ہدایات بھجوائیں کہ منجنیق کو کس زاویہ پر استعمال کیا جائے۔

محمد بن قاسم نے منجنیق چلانے کے ماہر جعونہ سلمی کو حکم دیا کہ مندر کے گنبد پر لہرانے والے پرچم کو نشانہ بنائیں۔ دیبل پہنچنے کے نویں روز طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی سنگ باری شروع ہو چکی تھی۔ منجنیق نے اپنا کام کر دکھایا اور گنبد ٹوٹ گیا۔ گنبد کا ٹوٹنا تھا کہ دشمن کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ شہر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ محمد بن قاسم کی فوج نے زبردست یورش کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ شہر پر قبضے کے بعد محمد بن قاسم نے زمین کے قطعات مسلمانوں میں تقسیم کیے۔ حمید بن وداع کو شہر کا افسر اعلیٰ مقرر کیا اور شہر میں ایک خوب صورت مسجد تعمیر کروائی، یہ سندھ میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد تھی۔ محمد بن قاسم نے جنگوں میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں داخل کیا۔ ارمن بیلہ کا مالِ غنیمت فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

دیبل فتح ہونے کی خبر راجا داہر کو ملی تو اس نے اپنے بیٹے جے سیہ / سنہہ کو حکم دیا کہ دریائے سندھ عبور کر کے برہمن آباد چلا جائے۔ برہمن آباد ضلع سانگھڑ کے اس علاقے میں تھا جہاں اب منصورہ واقع ہے۔ خیال ہے کہ اس شہر کے کھنڈرات آج بھی تحصیل سنجھوروُ کے قریب پائے جاتے ہیں۔ جے سنہہ اس وقت نیرون (اب حیدرآباد) کا حکمران تھا۔ ادھر محمد بن قاسم نیرون جانے کے لیے سیسم کی طرف روانہ ہوئے۔ سیسم سے نیرون کوٹ کی طرف بڑھے جو دیبل سے تقریباً ۷۵ میل دور ہے۔ ساتویں دن نیرون کوٹ کے باہر بردری کے میدان میں پڑاؤ ڈالا، گرمی کا موسم تھا، پانی کا میلوں دور تک پتا نہ تھا۔ سخت تکلیف تھی۔ محمد بن قاسم نے فوج کو نماز استسقا کا حکم دے دیا۔ نماز کے بعد محمد بن قاسم نے دعا مانگی "اے گمراہوں اور پریشان لوگوں کے رہبر، اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے، میری دعا کو سن۔"

اللہ نے مجاہدین کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔ رحمت خداوندی جوش میں آئی، بادل گھر کر آئے اور موسلا دھار بارش سے ہر طرف

Marfat.com

جل تھل ہو گیا۔

بروری سے اسلامی فوج نیرون پہنچی۔ وہاں کے بودھ مذہب کے پیروکار حاکم نے پہلے ہی حجاج کو اطاعت کی یقین دہانی کرادی تھی، انہوں نے فاتح سندھ اور ان کے لشکر کی خوب آؤ بھگت کی۔ تحائف دیے، نیرون میں بھی محمد بن قاسم نے ایک مسجد تعمیر کروائی۔ یہاں سے ۹۰ میل دور "بہرج" پہنچے اور وہاں سے سدوستان، یعنی سیوستان، جسے آج کل سیہون کہا جاتا ہے۔ یہ سندھ کا مشہور شہر ہے۔ سیوستان والے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک ہفتے تک جنگ ہوتی رہی، یہاں تک کہ سیوستان کی فوج لڑائی سے جی چرانے لگی۔ سیوستان پر داہر کا بھتیجا بجھراد حکمراں تھا، اس نے فوج کے یہ تیور دیکھے تو رات کے اندھیرے میں قلعے کے شمالی دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے سیوستان میں نئے انتظامات کیے اور نئے حاکم مقرر کیے۔ سیوستان سے فرار ہو کر بجھراد نے سیسم کے قلعے میں پناہ لی تھی۔ محمد بن قاسم نے اس قلعے کو بھی نشانہ بنایا، آخر بجھراد اور اس کے سردار لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اب محمد بن قاسم مغربی سندھ کے تمام علاقے پر حکمراں تھے اور علاقے کے تمام سردار آپ کے حسن اخلاق کے اسیر ہو چکے تھے۔

سیسم میں محمد بن قاسم کو حجاج کا خط ملا کہ نیرون لوٹ جاؤ اور دریائے سندھ عبور کر کے راجا داہر سے مقابلہ کرو۔ محمد بن قاسم نیرون لوٹ گئے اور محرم ۹۳ھ / اکتوبر ۷۱۱ء میں قلعہ اشبہار (خیال ہے کہ یہ قلعہ ٹنڈو محمد خان کے قریب پہاڑیوں پر واقع تھا) پہنچے۔ ایک ہفتے کے محاصرے کے بعد قلعہ والوں نے امان طلب کی۔ یہاں کے انتظامات کر کے محمد بن قاسم دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر راور کی حدود میں پہنچے۔ غالباً یہی شہر "رڑی" کہلایا جو دو تین صدی قبل برباد ہو چکا ہے۔ یہ شہر موجودہ بدین کے قریب تھا۔

راجا داہر کو محمد بن قاسم کی فوج کے دریا تک پہنچ جانے کی اطلاع ملی تو وہ بھی ہاتھی پر سوار ہو کر نکل آیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان دریا عبور نہ کر سکیں اور اگر کوشش کریں تو ان پر زبردست حملہ کیا جائے۔ راجا نے اپنے سپاہیوں کو ضروری ہدایات دیں اور واپس جا کر اپنے بیٹے جے سنہہ کو محمد بن قاسم کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج دے کر روانہ کیا۔

محمد بن قاسم کی فوج کو جھم اور کرہل (ٹھٹھہ کا نواحی علاقہ) میں تقریباً پچاس دن رہنا پڑا۔ اس عرصے میں خوراک کی کمی ہو گئی اور گھوڑے بیمار ہو کر مرنے لگے۔ محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو فوراً پیغام روانہ کیا۔ جواب آیا کہ دو ہزار گھوڑے بھیجے جا رہے ہیں اور اسلامی فوج کو کشتیوں کا پل بنا کر دریا عبور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، ساتھ ہی محمد بن قاسم کے کہنے پر حجاج نے سرکہ بھی روانہ کیا۔

اب محمد بن قاسم نے دریا عبور کرنے کی تدبیروں پر کام شروع کر دیا۔ کشتیاں حاصل کی گئیں انہیں ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا دریا عبور کرنے کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا گیا جہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا اور پانی کی روانی بہت تیز تھی۔ کشتیوں کے ایک سرے کو مغربی کنارے پر باندھ دیا گیا اور دوسرا سرا دریا میں چھوڑ دیا گیا جو خود بخود مشرقی کنارے پر پہنچ گیا جہاں سب سے اگلی کشتی پر موجود سپاہیوں نے دشمن کی مخالفت کے باوجود کشتی کو رسوں اور کھونٹوں کے ذریعہ مشرقی کنارے پر باندھ دیا۔ اس طرح محمد بن قاسم کی پوری فوج کشتیوں کے اس پل کے ذریعے دریا کے دوسرے کنارے پر اتر گئی۔

داہر کو اطلاع مل چکی تھی کہ مسلمان دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں بلکہ انہوں نے راور کے قریب ایک گاؤں رجپور پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اب اس کے پاس لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ بھی اپنا لاؤلشکر لے کر اسلامی فوج کے مقابل پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک جھیل حائل تھی۔

اسی اثنا میں رمضان کا مبارک مہینہ برکتیں اور سعادتیں لیے آ پہنچا۔ یکم رمضان المبارک ۹۳ھ / ۱۱ جون ۷۱۲ء کو راجا داہر اور محمد بن قاسم کی فوجوں کے درمیان اس فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا جس کے خاتمے کے ساتھ ہی سندھ میں جبر و استبداد کے بت پاش پاش ہو گئے اور یہ سرزمین اسلام کے نور سے جگمگا اٹھی۔

یہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ باطل قوتیں بظاہر زیادہ طاقت ور تھیں۔ راجا داہر کے پاس دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہی تھے، ۱۰۰ جنگی ہاتھی تھے اور اس کے پاس جنگی ساز و سامان کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے مقابلے پر حق کے لشکر کی شان یہ تھی کہ وہ صرف بارہ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔ نو دن تک فریقین میں جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۹ رمضان المبارک کو لڑائی میں شدت آگئی۔ راجا داہر نے یہ دیکھ کر ہاتھی میدان میں اتارے لیکن مسلمان سپاہیوں نے چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم ہو کر ہاتھیوں پر ہلّہ بول دیا۔ ہاتھی اس یلغار سے بوکھلا

Marfat.com

کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور لڑائی تھم گئی۔

دس رمضان المبارک کی سحر طلوع ہوئی تو راجا داہر اپنے وسیع لشکر کو لے آگے بڑھا ادھر محمد بن قاسم نے اپنی فوج کو منظم کیا، ہدایات دیں اور ساری فوج پانچ صفوں میں تقسیم ہو گئی۔ امیر لشکر محمد بن قاسم نے اس کے بعد اپنے مجاہدین سے کہا کہ "جس شخص کو جہاں مقرر کیا گیا ہے وہ اسی جگہ رہ کر لڑے۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ کی فتح و نصرت نیک لوگوں اور پرہیز گاروں کو حاصل ہوتی ہے۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہو اور اللہ کا ذکر کرتے رہو۔"

جنگ کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں دونوں جانب سے دستے بھیجے گئے، پھر باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ مسلمان اس جوش اور جذبے سے دشمن کی صفوں پر ٹوٹ کر گرے کہ اس کی صفیں تتر بتر ہو گئیں۔ محمد بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر حملے کا حکم دیا۔ نوجوان سپہ سالار کی آواز نے اسلامی فوج میں نئی روح پھونک دی۔ تیروں کی بارش ہونے لگی۔ منجنیقیں پتھر برسانے لگیں۔ تلواروں کی جھنکار سے میدانِ جنگ گونج اٹھا۔ ایک مسلمان تیر انداز نے راجا داہر کی سواری کو نشانہ بنایا۔ مسلمان فوج آگ لگانے والے تیر استعمال کر رہی تھی۔ تیر سیدھا راجا کی سواری میں لگا اور ہاتھی پر راجا کے بیٹھنے کے لیے جو خوب صورت نشست گاہ بنائی گئی تھی، اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ ہاتھی اس صورتحال سے حواس باختہ ہو کر قریبی جھیل میں جا گھسا اور بیٹھ گیا۔ مہاوت نے بڑی مشکل سے ہاتھی کو کھڑے ہونے پر آمادہ کیا۔ راجا داہر اب مجبور ہو کر پیدل میدان میں کود پڑا۔ اس کے وفادار ساتھی اس کے اطراف موجود تھے لیکن داہر کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ادھر آفتاب غروب ہوا ادھر راجا داہر کے اقتدار کا سورج بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ ایک مسلمان سپاہی نے اس کے سر پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ تلوار سر کو کاٹتی ہوئی گردن تک اتر گئی۔ ایک مغرور اور خود پسند راجا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ راجا داہر کے مرتے ہی برہمنوں نے اس کی لاش کو کیچڑ میں چھپا دیا۔ ادھر اسلامی لشکر راور کے قلعے میں داخل ہو گیا۔ بعد میں برہمنوں کی نشاندہی پر راجا داہر کی لاش برآمد کر لی گئی۔

راور فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے فوجیوں کو تو سزائے موت دے دی لیکن پرامن شہریوں سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ انہیں زیادہ سہولت کے ساتھ شہر میں آباد کر دیا۔ اس فتح کے نتیجے میں بہت سارا مالِ غنیمت حاصل ہوا جس کا پانچواں حصہ محمد بن قاسم نے حجاج یوسف کو روانہ کر دیا۔

راجا داہر کے بیٹے جے سنہہ کے دل میں باپ کے قتل کے انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔ وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور برہمن آباد پہنچ کر چاروں طرف سے فوج اکٹھی کر رہا تھا۔ شوال ۹۳ھ / جولائی ۷۱۲ء کے مہینے میں محمد بن قاسم کی فوج نے برہمن آباد کی طرف پیش قدمی کی۔ راستے کے قلعوں کو فتح کیا، دہلیلہ میں قیام کیا، اسی دوران میں محمد بن قاسم نے ہندوستان کے راجاؤں اور دیگر حکمرانوں کے نام خطوط لکھ کر انہیں قبولِ اسلام کی دعوت دی۔

برہمن آباد کے مشرقی کنارے پر پڑاؤ ڈالنے کے بعد محمد بن قاسم نے جے سنہہ کو پیغام بھیجا کہ یا تو اسلام قبول کر دیا ہمارے مطیع ہو کر جزیہ دو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جے سنہہ برہمن آباد میں فوج کو تیار کر کے خود چنیسر کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ فوج نے لڑنے پر آمادگی ظاہر کی تو رجب ۹۴ھ کی پہلی تاریخ / ۲ اپریل ۷۱۳ء کو برہمن آباد کی جنگ شروع ہوئی۔ یہ جنگ چھ ماہ تک جاری رہی۔ دشمن کی فوج قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ چچ نامہ کے مطابق داہر کی سابقہ ملکہ اور اب ابن قاسم کی بیوی نے برہمن آباد والوں کو سمجھایا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ برہمن آباد کے باشندے تنگ آ گئے تھے انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ انہیں امان دے دی جائے۔

برہمن آباد کی فتح کے بعد فاتح سندھ نے اعلان کیا کہ جو لوگ خوشی سے مسلمان ہو گئے ہیں ان کے حقوق دیگر مسلمان کے برابر ہوں گے، جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے انہیں جزیہ دینا پڑے گا اس پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے مندروں کے لیے قائم جائیدادوں میں کوئی دخل نہ دیا۔ جنگ میں جن تاجروں، کسانوں اور دیگر شہریوں کو نقصان پہنچا تھا، ان کی مالی امداد کی۔ مال گزاری وصول کرنے کے لیے ان برہمنوں کو مقرر کر دیا جو پہلے بھی یہی کام کرتے تھے۔ انہیں تاکید کی کہ رعایا پر ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔ اس قسم کے اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ کل تک جو برہمن مسلمانوں کے دشمن تھے آج وہ گاؤں گاؤں جا کر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ اگر ہم عربوں کی اطاعت نہ کریں گے، تو نقصان میں رہیں گے۔

برہمن آباد کے داخلی انتظام کے لیے محمد بن قاسم نے چار معزز تاجروں کی ایک کمیٹی بنائی اور دیوانی عدالت اس کے سپرد کر دی۔

Marfat.com

انتظامات سے فارغ ہو کر ۳ محرم ۹۵ھ / ۲۸ ستمبر ۷۱۳ء کو محمد بن قاسم منہل پہنچے، وہاں بدھ مت کے ماننے والوں نے اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ یہاں سے بھراور، سمہ قوم کے علاقے لوہانہ اور پھر سہتہ قوم کے علاقے میں پہنچے۔ اب ان کا ارادہ ارور پر فوج کشی کا تھا جو دارالحکومت تھا اور جہاں راجا داہر کا ایک اور بیٹا گوپی حکمراں تھا۔ (ارور یا الور نامی شہر روہڑی سے تقریباً تین میل جنوب مشرق میں دریا کی مغربی جانب واقع تھا۔ اس قدیم شہر کے آثار اب بھی موجود ہیں)۔

محمد بن قاسم نے اروڑ اور بغرور (موجودہ بھکر) کے انتظامات کیے، پھر قلعہ باتیہ پہنچے۔ وہاں راجا داہر کا چچازاد بھائی ککسہ حکمراں تھا، اس نے اطاعت قبول کی۔ یہاں سے فاتح سندھ نے دریائے بیاس کو عبور کر کے قلعہ اسکلندہ فتح کیا اس کے بعد سکّہ پر قبضہ کیا (سکہ ملتان سے متصلہ شہر تھا)۔

سکّہ سے محمد بن قاسم دریائے راوی عبور کر کے ملتان پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں کی فوج مقابلے پر اتر آئی۔ دو ماہ تک جنگ جاری رہی آخر قلعے کی مضبوط دیوار منجنیقوں کی مار نہ سہ سکی اور ٹوٹ گئی جس کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔

فتح ملتان کے بعد محمد بن قاسم نے شہر میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی۔ اطراف کے علاقوں کے انتظامات کیے، اس کے بعد فاتح سندھ قنوج پر فوج کشی کرنے والے تھے کہ شوال ۹۵ھ / جون ۷۱۴ء میں حجاج بن یوسف کا انتقال ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے مشرقی ممالک کے نئے حاکمِ اعلیٰ کے تقرر تک قنوج پر فوج کشی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سیلمان (بھیلمان) اور کیرج کے علاقوں کو فتح کر لیا۔

حجاج بن یوسف کی وفات کے آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی ۹۶ھ / فروری ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنے۔ انہوں نے یزید بن مہلب کو مشرقی ممالک کا حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا جو حجاج کے مخالف تھے۔ ان کے دور میں محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس عراق بلا لیا گیا اور واسط کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے بارے میں داستانیں تاریخ دانوں کے نزدیک غیر مستند ہیں۔

نوجوان محمد بن قاسم نے سندھ کے وسیع و عریض علاقے پر صرف ساڑھے تین سال حکومت کی لیکن یہ ان کا غیر معمولی تدبر اور خداداد انتظامی صلاحیت تھی جس کی بدولت انہوں نے پورے علاقے کو عدل و انصاف، خوشحالی اور مسرت و اطمینان کی تصویر بنا دیا۔ انہوں نے سندھ میں جو علاقے فتح کیے، عموماً ان کے قدیم حاکموں سے اطاعت کا اقرار لے کر انہی کو حکومت پر بحال رکھا۔ صرف انتظامات بہتر بنانے اور نظامِ انصاف کو تقویت دینے کے لیے ان کے ساتھ مسلمان افسران بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ پولیس اور فوج میں زیادہ تر سندھ کے نو مسلم باشندے تھے۔

مالیات کی تحصیل کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ جو قومیں مسلمان ہوئیں، ان کی زمینوں پر عشر وصول کیا جاتا تھا۔ لگان اور خراج سے جو رقم حاصل ہوتی تھی اس کا بڑا حصہ ملک میں رفاہِ عامہ کے کاموں پر صَرف کیا جاتا تھا۔ مال گزاری کی وصولی، حساب کتاب وغیرہ برہمنوں کے ذمے تھا۔ کسانوں کو طرح طرح کی سہولتیں دیں۔ جن کاشتکاروں کے یہاں پیداوار کم تھی ان پر سرکاری لگان معاف کر دیا گیا۔ معاشرے میں بعض طبقوں کو پست اور ذلیل سمجھا جاتا تھا، محمد بن قاسم نے ان طبقوں کو عزت اور احترام دلوایا۔

محمد بن قاسم نے انصاف کو سربلند کرنے کے لیے تمام شہروں میں قاضیوں کا تقرر کیا۔ قاضی حضرات عام طور پر خطابت اور قضا دونوں عہدے سنبھالتے تھے۔ انہوں نے ہر علاقے میں مساجد تعمیر کروائیں، یہ مساجد علوم کے مراکز کی حیثیت اختیار کر گئیں، چنانچہ آنے والے دور میں دیبل علم حدیث کا ایک بڑا مرکز بنا۔ اس کے علاوہ منصورہ، ملتان اور دیگر شہروں میں بھی علم کے بڑے مراکز قائم ہوئے۔

تاریخ میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں کہ ایک نوعمر سپہ سالار نے صرف ساڑھے تین سال کے عرصے میں ایک ایسی قوم کو اپنا مطیع ہی نہیں بلکہ گرویدہ بنا لیا جو اس کی کٹر دشمن تھی۔ یہ محمد بن قاسم کا مثالی حُسنِ سلوک، ان کی رواداری، نرم مزاجی اور رحم دلی تھی جس کی بدولت اہلِ سندھ اپنے نوجوان فرمانروا سے پرستش کی حد تک محبت کرنے لگے۔ یہ محبت آج بھی زندہ ہے اور آنے والی نسلیں بھی اپنے محسن محمد بن قاسم کو یاد رکھیں گی۔

***

Marfat.com

محمود غزنوی

اُن کی فتوحات نے اسلام کے لیے برّ صغیر کے دروازے کھول دیے

دور تک پھیلے خیموں پر مسلسل برف گر رہی تھی۔
یہ خیمے رات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مشعلوں کی روشنی جھلک رہی تھی جو اس مہیب اندھیرے کو شکست دینے کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ اعصاب شکن سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا، جسے گشتی پہرے داروں کے قدموں کی دھمک وقفے وقفے سے توڑ دیتی تھی۔
انھی خیموں میں سے ایک میں گٹھے ہوئے جسم اور میانہ قد کا حامل ایک شخص بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اس نے سر اٹھایا۔ شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے خادم کو آواز دی اور گرم پانی لانے کے لیے کہا۔ معلوم ہوا کہ نصف شب گزر چکی ہے اور اس وقت گرم پانی کی دستیابی ممکن نہیں ہے۔
"ٹھنڈا پانی لایا جائے۔" اس شخص نے حکم دیا۔
"امیر محترم! آپ آرام کرلیں، صبح دشمن سے معرکہ ہے۔"
"حکم کی تعمیل کی جائے۔" امیر کی بارعب آواز گونجی۔
سرد پانی لایا گیا۔ لشکر کے سالار نے غسل کیا اور مصلّیٰ بچھا لیا۔ اس موقع پر ان کے ایک نائب نے پھر ہمت کی۔
"امیر محترم، آج کی رات تو آرام کرلیں۔ صبح دشمن سے جنگ لڑنی ہے۔"
"میرا کام آج رات ہی کا ہے۔" امیر لشکر کہہ رہے تھے، "کل کا کام اللہ کا ہے۔"
امیر لشکر صبح تک عبادت اور آہ وزاری میں مصروف رہے۔ صبح ہوئی تو فجر کی نماز ادا کی، پھر ان کے ہاتھ اپنے رب کے حضور اٹھ گئے۔ ان کے لبوں کو جنبش ہوئی وہ کہہ رہے تھے: "الٰہی، ہم دو فریقوں میں سے جو، تیرے بندوں کے حق میں بہتر ہو، اسے فتح عنایت فرما۔"

یہ دعا مانگ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوئے، تیار فوج کا معائنہ کیا اور میدانِ جنگ میں اتر آئے۔ لڑائی شروع ہوئی اور جلد ہی فتح ان کے قدم چوم رہی تھی۔
یہ عظیم سپہ سالار تھے محمود غزنوی جو "محمود بت شکن" کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ وہ ایسے بلند مرتبت حکمراں ہیں جن پر مسلمان رہتی دنیا تک بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں۔ ان کے پے در پے حملوں نے اسلام کے لیے برصغیر پاک وہند کے دروازے کھول دیے اور بہت مختصر مدت میں یہ خطہ اسلام کا گہوارہ بن گیا۔ محمود کی ذات اعلیٰ انسانی صفات کا بے مثال نمونہ ہے۔ عالی ظرفی، بردباری اور حُسنِ سلوک کی جو نظیر انہوں نے قائم کی وہ قوموں کی تاریخ میں خال خال نظر آتی ہے۔
عالم اسلام کے یہ قابلِ فخر رہنما ۱۰ محرم الحرام ۳۶۱ھ / یکم اور ۲ نومبر ۹۷۱ء کی درمیانی شب کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابو منصور سبکتگین ایک دانشمند اور بہادر انسان تھے جنہوں نے خاندانِ غزنویہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ سبکتگین، خراسان کے سپہ سالار الپ تگین کے غلام تھے۔ الپ تگین نے بعد میں زابلستان کا علاقہ فتح کرکے وہاں آزاد ریاست قائم کرلی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے لائق غلام سبکتگین سے کردی تھی۔ اسی خاتون کے بطن سے اس بچے نے جنم لیا جسے دنیا محمود بت شکن کے نام سے جانتی ہے۔
محمود نے ذرا ہوش سنبھالا تو ان کے والدین نے ان کی بہترین تعلیم کا بندوبست کیا۔ محمود نے قرآن پاک حفظ کیا، فقہ، حدیث اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں قاضی ابو نصر سرِ فہرست ہیں۔ فنِ حرب (لڑائی کے فنون) کی تعلیم خود ان کے والد سبکتگین نے دی اور بہت جلد محمود نے تیر اندازی، نشانہ بازی اور شہسواری میں

Marfat.com

مہارت حاصل کرلی۔ محمود پندرہ برس کے ہوئے تو انہیں ہندو راجا جے پال کے خلاف ۳۷۶ھ/۹۸۶ء میں اپنے والد کے ساتھ جنگ لڑنے کا موقع ملا۔ جے پال نے خود غزنی پر حملہ کیا تھا۔ شجاعت اور جواں مردی محمود کو ورثے میں ملی تھی۔ اس جنگ میں انہوں نے زبردست بہادری کا ثبوت دیا۔ جے پال خراج کا وعدہ کرکے پسپا ہوگیا۔ بعد میں اپنے وعدے سے پھر گیا۔ ۳۸۱ھ/۹۹۱ء میں اس نے سبکتگین سے جنگ لڑی لیکن شکست کھائی اور غزنی کی حکومت پشاور تک وسیع ہوگئی۔ مسلمانوں کا پشاور پر پہلی بار قبضہ سبکتگین ہی کے عہد میں ہوا۔ سبکتگین نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں دین اسلام کی تبلیغ کا اچھا انتظام کیا۔ تین سال بعد جب سامانی حکمران امیر نوح کے خلاف بغاوت ہوئی تو انہوں نے سبکتگین سے مدد مانگی۔ اس موقع پر محمود ایسی بہادری سے لڑے کہ سامانی حکمران نے انہیں سیف الدولہ کا خطاب دیا۔

سبکتگین کے انتقال کے بعد ربیع الاول ۳۸۸ھ/مارچ ۹۹۸ء میں غزنی کی حکومت محمود نے سنبھال لی، کچھ ہی عرصے بعد وہ خراسان پر بھی قابض ہوچکے تھے۔ اس موقع پر بغداد کے عباسی خلیفہ القادر باللہ نے انہیں ان دونوں صوبوں یعنی غزنہ اور خراسان کا والی تسلیم کرلیا اور یمین الدولہ اور امین الملکت کے خطاب دیے۔

اس کے بعد محمود غزنوی نے درۂ خیبر کے مشرق میں یعنی برصغیر پر سولہ حملے کیے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے، لیکن خود محمود کے ہم عصر مؤرخ عتبی نے اپنی تاریخ یمینی میں ۱۶ حملوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ مؤرخ فرشتہ اور نظام الدین احمد کے مطابق محمود نے ہندوستان پر پہلا حملہ ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء میں کیا لیکن اس حملے کا ذکر تاریخ یمینی میں نہیں ہے۔

پنجاب کا راجہ جے پال، سبکتگین کے ہاتھوں دوبار شکست کھانے کے بعد خراج ادا کیا کرتا تھا۔ سبکتگین کے انتقال کے بعد اس نے سوچا کہ اب غزنی کی حکومت پر ضرب لگانے کا بہترین موقع ہے۔ اس نے ۱۲ ہزار جنگجو سپاہی جمع کیے اور ۳۰۰ جنگی ہاتھی لے کر پشاور پر حملہ کردیا جو غزنی کی حکومت کے تحت تھا۔ حملہ آور کا جواب دینا محمود کا فرض تھا۔ انہوں نے دس ہزار سرفروش سپاہیوں کی فوج منظم کی اور پشاور پہنچ گئے۔ ۸ محرم ۳۹۲ھ/۲۷ نومبر ۱۰۰۱ء کو دونوں فوجوں میں زبردست جنگ ہوئی، جس میں جے پال کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ جے پال اور اس کے ۱۵ بیٹے اور پوتے گرفتار ہوئے اور محمود تمام جنگی قیدیوں کو غزنی لے گئے۔ آٹھ ماہ بعد انہوں نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جے پال کو پھر معاف کردیا اور اس وعدے پر رہا کردیا کہ وہ آئندہ بغاوت نہیں کرے گا اور خراج ادا کرتا رہے گا۔ لیکن غزنوی حکمرانوں سے مسلسل تیسری بار شکست جے پال کے لیے اعصاب شکن ثابت ہوئی۔ اس نے لاہور واپس آکر خود کو نذرِ آتش کرلیا۔

سنہ ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں محمود نے ملتان کے قریب بھاٹیہ (بھاطنہ) کی ریاست پر حملہ کیا۔ بھاطنہ میں بجے رائے کی حکومت تھی اور وہ ایک ملحد فرقے قرامطہ کی مدد کیا کرتا تھا۔ قرامطہ مسلمانوں کے سخت خلاف تھے۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں پر حملے کرتے تھے۔ حجاج کے قافلوں کو لوٹ کر حاجیوں کو قتل کردیا کرتے تھے۔ وہ عباسی خلافت کے بھی زبردست مخالف تھے۔ اس بنا پر محمود نے ان کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا۔ بجے رائے نے چار روز تک محمود کی فوج کا مقابلہ کیا، پھر بھاگ نکلا لیکن محصور ہوجانے پر خودکشی کرلی۔ محمود نے بھاطنہ اور اس کے گردونواح کے علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہاں تبلیغ اسلام کے انتظامات کیے اور واپس غزنی چلے گئے۔

محمود غزنوی کا تیسرا اور چوتھا حملہ بھی قرامطہ کے خلاف تھا۔ تیسرا حملہ ۳۹۶ھ/۱۰۰۶ء میں ملتان پر کیا گیا جہاں داؤد بن نصر قرمطی حکمران تھا۔ محمود نے دریائے سندھ کو ملتان کے قریب سے عبور کرنے کی بجائے پشاور کے قریب سے عبور کرنے کا فیصلہ کیا لیکن راجا جے پال کے بیٹے آنند پال نے راستہ روک لیا۔ دونوں فوجوں میں جنگ چھڑ گئی لیکن آنند پال کی فوج جلد ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ آنند پال نے بھاگ کر کشمیر کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ اس جنگ میں آنند پال کے ہاتھیوں نے اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ اس وقت محمود کی فوج دباؤ میں تھی۔ محمود نے آنند کی فرار ہوتی فوج کا تعاقب کیا اور جوالا مکھی مندر (نگر کوٹ) تک پہنچ گئے جہاں خزانہ ہاتھ آیا۔ محمود اب ملتان کی طرف بڑھے۔ داؤد بن نصر فرار ہوگیا اور اس کی فوج قلعہ بند ہوگئی۔ سات روز کے محاصرے کے بعد قلعہ تسخیر ہوچکا تھا۔ شہریوں نے دو کروڑ درہم خراج ادا کیا، لیکن قرامطیوں کی جاں بخشی نہیں کی گئی۔ محمود نے یہاں کی حکومت راجہ جے پال کے نواسے سکھ پال کے سپرد کردی جو نواسہ شاہ بھی کہلاتا تھا۔ سکھ پال نے اسلام قبول کرلیا۔

سنہ ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء میں نواسہ شاہ مرتد ہوگیا۔ محمود ان دنوں ایل خان کے خلاف بلخ میں مصروف تھے۔ محمود کو نواسہ شاہ کے مرتد

Marfat.com

ہونے کی اطلاع ملی تو وہ شدید برفباری اور راستے مسدود ہونے کے باوجود بلخ سے سیدھے ملتان پہنچے۔ سکھ پال خوفزدہ ہو کر فرار ہو گیا اور اس نے اپنے رشتے داروں کے پاس کوہستانِ نمک میں پناہ لی، لیکن محمود نے اسے ڈھونڈ نکالا، اسے گرفتار کر لیا اور غورک میں قید کر دیا۔

سنہ ۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء میں جب محمود نے ملتان پر حملہ کیا تھا تو اس وقت ایل خان نے موقع ملنے پر خراسان پر قبضہ کر لیا تھا۔ برف باری کے باوجود یہ اطلاع ملتے ہی محمود لوٹ آئے اور ایل خان کے سرداروں کو شکست دے کر خراسان واپس لے لیا۔ ایل خان نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اور ۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء میں اس کے مرنے کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی محمود کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر، محمود نے دریائے جیحوں کو عبور کر کے سمرقند فتح کر لیا۔

آنند پال جو بھاگ کر کشمیر میں روپوش ہو گیا تھا، انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس نے گجرات، قنوج اور کالنجر تک کے بیس پچیس ہندو راجاؤں سے مدد مانگی اور ایک بڑی فوج جمع کر کے اپنے بیٹے برہمن پال کی قیادت میں غزنی پر حملے کے لیے روانہ کر دی۔ محمود کو اطلاع ملی تو انہوں نے بھی جنگی تیاریاں کیں اور غزنی سے روانہ ہو کر پشاور پہنچ گئے۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور سخت سردی تھی، لیکن اس سے قبل کہ ہندوؤں کی فوج دریائے سندھ کو عبور کر سکے، محمود نے اپنی فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دیا۔ فوج نے دریا عبور کر کے دشمن کے مقابل ڈیرے ڈال دیے۔ یہ واقعہ ۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء کا ہے۔

لڑائی شروع ہوئی۔ ہندوؤں نے سخت مقابلہ کیا لیکن شکست ان کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ پسپا ہو کر نگر کوٹ (کانگڑہ) میں پناہ لینے کے لیے بھاگ گئے۔ محمود کی فوج نے ان کا پیچھا کیا اور نگر کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کر کے تین دن میں اسے فتح کر لیا۔ آنند پال گو کہ فرار ہو گیا تھا لیکن بعد میں اس نے معافی طلب کی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔ محمود نے اس حقیقت کے باوجود کہ آنند پال اور اس کا باپ پہلے بھی اپنے عہد سے پھر چکے ہیں، آنند پال کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے غزنی کی حکومت پر کبھی حملہ نہیں کیا۔

صرف ایک سال بعد محمود نے ملتان کے قرمطی حکمراں کے خلاف حملہ کیا اور ملتان کو براہِ راست غزنوی حکومت کا حصہ بنا دیا۔ یہاں محمد بن قاسمؒ نے ایک مسجد بنوائی تھی جسے قرامطہ نے بند کر دیا تھا۔ محمود نے اس مسجد کو دوبارہ کھول دیا۔ ملتان پر محمود کے قبضہ کے نتیجے میں قرامطہ کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اسی زمانے میں محمود نے نارائن پر حملہ کیا۔ وہاں کے راجا نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس معاہدے سے خراسان اور ہندوستان میں تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

سنہ ۴۰۱ھ / ۱۰۱۱ء میں محمود نے مشرقی غور کے علاقے پر حملہ کیا جہاں کے حکمران ابن سوری نے خراج کی ادائیگی بند کر کے سرکشی اختیار کر لی تھی۔ محمود نے مشرقی غور کے بعد شمال مغربی غور کو بھی فتح کیا۔ اس طرح غور کے تقریباً پورے علاقے پر محمود کا قبضہ ہو گیا۔ اسی سال قصدار (اب خضدار) کے والی نے محمود کے خلاف بغاوت کی۔ قصدار تک پہنچنے کا راستہ بڑا دشوار گزار تھا لیکن محمود نے ۴۰۲ھ / ۱۰۱۱ء میں قصدار پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ قصدار کے والی نے خراج دینے پر آمادگی ظاہر کی اور محمود نے کمالِ مہربانی سے اسے معاف کر دیا۔ ۴۰۲ھ میں محمود نے دہلی کے قریب تھانیسر پر حملہ کیا جہاں سوم جگ نام کا ایک مندر تھا۔ محمود کو اطلاعات ملی تھیں کہ یہ مندر سازشوں کا گڑھ ہے۔ محمود نے یہ مندر مسمار کروا دیا۔

آنند پال کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے جے پال ثانی نے خراج دینے سے انکار کر دیا۔ محمود نے اس کے علاقے کوہستانِ نمک پر حملہ کیا اور نندنہ کا قلعہ فتح کر لیا۔ فتح کی خبر سن کر قرب و جوار کے بہت سے راجاؤں نے محمود کی بالادستی قبول کر لی۔ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ محمود نے یہاں مسجدیں تعمیر کروائیں۔ نو مسلموں کو تعلیم دینے کے لیے معلم مقرر کیے۔ جے پال فرار ہو کر کشمیر چلا گیا تھا۔ بعد میں اس نے معافی مانگ لی اور محمود نے بار بار سرکشی اختیار کرنے والے اس خاندان کو ایک بار پھر معاف کر دیا۔

۴۰۶ھ میں محمود نے کشمیر پر حملہ کیا کیونکہ وہاں کے راجا نے محمود کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا تھا اور ہندو راجاؤں کو پناہ دی تھی۔ ابھی لوہ کوٹ کے قلعے کا محاصرہ جاری تھا کہ خوارزم کی بغاوت کی وجہ سے محمود کو لوٹنا پڑا۔ ۴۰۷ھ / ۱۰۱۷ء میں محمود نے خوارزم کے باغی حکمرانوں سے جنگ کی اور دارالحکومت جرجانیہ پر قبضہ کر لیا۔

میرٹھ، متھرا اور مہابن کے راجاؤں کے ساتھ قنوج کے راجا نے بھی محمود کے خلاف آنند پال کی مدد کی تھی۔ محمود نے فیصلہ کیا کہ آئے دن سازشوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو مطیع کرنا ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے ۴۰۹ھ / ۱۰۱۹ء میں ایک بڑی فوج اکٹھی کی۔ پہلے انہوں نے کشمیر کے راجا کو اطاعت پر آمادہ کیا۔ کشمیر کا

Marfat.com

راجا، سلطان کے غیر معمولی عفو و درگزر اور اچھے سلوک سے پہلے ہی متاثر تھا۔ راستے میں محمود نے دریائے جمنا کے قریب سرسادہ کا قلعہ فتح کیا۔ اس کے بعد محمود نے برن (بلند شہر) کا رُخ کیا۔ وہاں کا راجا ہردت مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد محمود نے قلعہ مہابن کو تسخیر کیا اور متھرا پر حملہ کر دیا۔ متھرا لڑائی کے بغیر فتح ہو گیا۔ اب محمود قنوج کی طرف بڑھے، وہاں کے راجا جے پال نے فرار ہو کر دریائے گنگا کے پار ایک قلعے میں پناہ لے لی، محمود نے اس قلعے کو بھی فتح کر لیا۔ واپسی میں کئی دوسرے قلعے تسخیر کرتے ہوئے وہ غزنی پہنچ گئے۔

قنوج سے محمود کی واپسی کے بعد کالنجر کے راجا نندا نے قنوج پر حملہ کر دیا اور اس نے جے پال کے بیٹے ترلوچن پال کو تخت پر بٹھا دیا۔ دونوں میں معاہدہ ہو گیا کہ وہ محمود سے لڑیں گے۔ محمود کو اطلاع ملی تو وہ ۴۱۰ھ /۱۰۱۹ء میں پھر قنوج کی طرف روانہ ہوئے۔ ترلوچن پال کو شکست دینے کے بعد وہ کالنجر کی سمت بڑھے۔ راجا نندا نے بڑی فوج اکٹھی کر رکھی تھی۔ محمود نے جب دشمن کی کثیر تعداد کو دیکھا تو اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر بڑے عجز و انکسار سے دعا مانگی۔ لڑائی سے قبل محمود ہمیشہ مصلیٰ بچھا کر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ ایک چھوٹی سی جھڑپ کے بعد راجا نندا کے دل میں اتنی دہشت پیدا ہوئی کہ وہ رات ہی میں سارا مال واسباب چھوڑ کر بھاگ گیا۔

سنہ ۴۱۱ھ /۱۰۲۰ء میں محمود نے دریائے نور و تیرۃ کی وادیوں پر حملہ کیا۔ یہ علاقہ کافرستان کے نام سے آج کل پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ وادیٔ نور کے حاکم کو شکست ہوئی اور وادی تیراۃ کا حاکم اسلام لے آیا۔ محمود نے یہاں اسلام کی تبلیغ کے انتظامات کیے اور غزنی واپس چلے گئے۔ ۴۱۲ھ /۱۰۲۱ء میں محمود نے بار بار کی بغاوتوں کا خاتمہ کرنے کی غرض سے لاہور پر حملہ کیا اور پنجاب کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

راجا نندا اب بھی محمود کے خلاف مسلسل شرارتیں کر رہا تھا۔ چنانچہ ۴۱۳ھ /۱۰۲۲ء میں محمود ایک بار پھر کالنجر روانہ ہوئے۔ راستے میں گوالیار کا شہر تھا جہاں کے راجا نے آنند پال کی مدد کی تھی۔ محمود کے حملے سے گوالیار کا راجا خوفزدہ ہو گیا اور اس نے صلح کر لی۔ اب محمود غزنوی نے کالنجر کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا اور رسد کے راستے بند کر دیے۔ آخر کار راجا نندا نے صلح کی درخواست کی، سالانہ خراج دینے کا یقین دلایا اور محمود کی شان میں ہندی زبان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ محمود نے ایک بار پھر عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجا نندا کو معاف کر دیا۔ کالنجر کا راجا محمود کی بلند سیرت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے محمود کے انتقال کے بعد بھی سرکشی نہیں کی اور کالنجر کا قلعہ کئی سال تک غزنی کی حکومت کے زیرِ استعمال رہا۔

دو سال بعد یعنی ۴۱۵ھ /۱۰۲۵ء میں محمود کو گجرات اور کاٹھیاواڑ کی طرف توجہ دینی پڑی۔ اس زمانے میں یہاں اکثر عرب جہاز لوٹ لیے جاتے تھے۔ قرامطہ کے لوگ بھی اسی علاقے میں آکر سرگرم ہو گئے تھے۔ گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی جا رہی تھیں۔ سومناتھ میں مسلمان تاجروں کی ایک بستی تھی، جہاں ایک بڑے متقی بزرگ، محمد بن حسن عراقیؒ مقیم تھے جو محمود شاہ سنگرولیؒ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان سے مسلمانوں کی حالتِ زار نہ دیکھی گئی۔ انہوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا کہ آکر مسلمانوں کو مصیبتوں سے نجات دلائیں۔

محمود غزنوی ان تمام حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ بھی اطلاعات مل گئی تھیں کہ سومناتھ کے مندر میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر سازشیں ہو رہی ہیں۔ سومناتھ کو سومنات بھی لکھا جاتا ہے لیکن غالباً سومناتھ ہی درست ہے یہ دو الفاظ کا مرکب ہے، سوم، یعنی 'چاند' اور 'ناتھ' یعنی 'دیوتا'۔

سومناتھ پر حملے کی غرض سے محمود نے راجپوتانہ کا راستہ اختیار کیا تاکہ گجرات کے راجا کو ان کی آمد کا پہلے سے علم نہ ہو سکے۔ ۲۲ شعبان ۴۱۶ھ /۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء کو محمود غزنی سے روانہ ہوئے۔ ملتان میں قیام کیا، جس کے دوران صحرائی سفر کی تیاریاں کیں۔ ہر سپاہی کو صرف پانی لے جانے کے لیے دو اونٹ دیے۔ دیگر سامان کے لیے اونٹ الگ تھے۔ اس کے علاوہ ہنگامی ضرورت کے لیے مزید بیس ہزار اونٹوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ فوج میں تیس ہزار باقاعدہ سپاہی تھے۔ ۲ شوال ۴۱۶ھ /۲۶ نومبر ۱۰۲۵ء کو محمود کی فوج نے ملتان سے کُوچ کیا اور راجستھان کے صحرا کو عبور کر کے لاردہ پہنچے جو اس زمانے میں جیسلمیر کا دارالحکومت تھا۔ لاردہ کے قلعے کو فتح کر کے وہ انہلواڑہ جا پہنچے (دریائے سرسوتی کے کنارے شہر جو، اب پٹن کہلاتا ہے)۔ یہاں کا راجا بھاگ گیا۔ محمود یہاں سے مندھیر کو فتح کرتے ہوئے دیلواڑہ کے راستے ۱۴ ذی قعدہ ۴۱۶ھ /۶ جنوری ۱۰۲۶ء کو سومناتھ پہنچ گئے، جہاں کے مضبوط مندر میں پجاری مسلمانوں پر ہنس رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی موت انہیں یہاں کھینچ لائی ہے اور سومناتھ کا دیوتا ان سب کو برباد

Marfat.com

کر دے گا۔

محمود کی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مندر میں موجود ہندوؤں کی فوج بڑی بہادری سے لڑی، شام کے سائے دراز ہو گئے اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ اسلامی فوج کی جانب سے زبردست تیروں کی بارش کے آگے ہندو سینا جم نہ سکی اور قلعے کی فصیل سے ہٹ گئی۔ مسلمان سپاہی فصیل پر چڑھ گئے اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرہ ہائے تکبیر سنائی دینے لگے۔ ہندوؤں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے حملہ کیا اور مسلمانوں کو فصیل چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے دن مسلمانوں نے پھر قلعے کی فصیل پر قبضہ کر لیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ہندو پجاریوں کی حالت دیدنی تھی، وہ بھاگ بھاگ کر مندر میں جاتے اور دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے، پھر لوٹ کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے لگتے۔ لیکن اب سومناتھ پر ہندو راج کے دن پورے ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں قلعہ پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور ہندو سینا کے زخم خوردہ سپاہی قیدی بنائے جا رہے تھے۔

محمود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان پر حملے دولت کے لالچ میں کیے۔ یہ الزام غلط ہے جو اسلام مخالف قوتوں کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو محمود سومناتھ کے بڑے بت کو نہ توڑتے، کیونکہ بت نہ توڑنے کے عوض انہیں بڑی رقم کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سومناتھ فتح کرنے کے بعد محمود کھمبایت اور بھڑوچ جیسے دولت مند شہروں کی طرف بھی نہیں گئے، حالانکہ وہ چاہتے تو وہاں پہنچ کر بھی بے تحاشا دولت اکٹھی کر سکتے تھے۔ محمود نے تو سومناتھ میں رکنا تک گوارا نہیں کیا۔ وہ کچھ اور منصورہ کے راستے ملتان اور پھر واپس غزنی پہنچ گئے۔

سومناتھ کی فتح ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا بھر میں دھوم مچا دی۔ خلیفۂ بغداد نے محمود کو ۴۱۷ھ میں علَم اور خط بھیجا جس میں محمود کو خراسان، ہندوستان، نیم روز اور خوارزم کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور انہیں یمین الملت، کہف الدولہ اور جمال الملت کے خطابات دیے گئے تھے۔ اس وقت محمود کی حکومت بے حد وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی جس میں خراسان، طبرستان، پورا پنجاب، موجودہ افغانستان کا پورا علاقہ، اصفہان، ہمدان، مشرق میں گنگا کے کنارے، شمال میں دریائے آمو تک اور جنوب میں ساحل بلوچستان کے علاقے شامل تھے۔

ہندوستان کے خلاف سولھواں اور آخری حملہ محمود نے ۴۱۸ھ / ۱۰۲۷ء میں کیا جب سندھ کے جاٹوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ انہوں نے سومناتھ سے واپسی پر فوج پر حملے کیے تھے۔ محمود نے آ کر جاٹوں سے کشتیوں کے ذریعے جنگ کی۔ جاٹوں کی لوٹ مار کا خاتمہ کیا اور غزنی واپس چلے گئے۔

اگلے سال محمود نے خراسان اور اس سے اگلے سال جرجان میں بغاوتوں کو فرو کیا۔ ان دو برسوں میں محمود زیادہ تر علیل رہے۔ سندھ کے جاٹوں کے خلاف مہم کے دوران موسمی بخار نے انہیں آ لیا تھا۔ غالباً اسی بخار سے طبیعت بگڑتی گئی۔ بالآخر دق جیسے موذی مرض نے اس اولوالعزم رہنما کو گھیر لیا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ مہمات میں مصروف رہے۔ جرجان سے غزنی واپس پہنچے تو مرض شدت اختیار کر گیا۔ ایک ہفتے تک بستر علالت پر رہنے کے بعد اس عظیم سالار نے ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ / ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہا، جس نے اپنی زندگی دین اسلام کی سربلندی کے لیے وقف کر دی تھی۔ آپ کو غزنی میں سپرد خاک کیا گیا۔

محمود غزنوی کے تمام حملوں میں سے کوئی ایک بھی حملہ ایسا نہیں جو انہوں نے جاہ و ہوس یا دولت کے حصول کے لیے کیا ہو۔ ان کا ہر حملہ یا تو اس لیے تھا کہ باجگزار ہندو حکمران بغاوت پر اتر آئے تھے اور غزنی کی حکومت کے خلاف پر تول رہے تھے یا اس لیے تھا کہ ملحد اور بے دین افراد عام مسلمانوں کو تکلیف پہنچا رہے تھے۔ محمود غزنوی نے اپنے پورے دورِ حکومت میں کسی ہندو کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ خراج ادا کرنے والے ہندو راجا جب بغاوت کرتے تھے تو محمود ان کے خلاف کارروائی کرنے کے بعد انہیں معاف کر دیا کرتے تھے اور ان سے چھینا ہوا علاقہ انہی کو لوٹا دیا کرتے تھے۔ عفو و درگزر کی یہ مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

محمود کے طرزِ عمل میں غیر مسلموں سے رواداری کا اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔ انہوں نے پورے برصغیر میں صرف چند مندروں کو مسمار کیا جو ان کے خیال میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے مراکز تھے۔ ورنہ برصغیر کے طول و عرض میں ہزاروں مندر موجود تھے اور محمود چاہتے تھے تو ان سب کو زمیں بوس کر سکتے تھے لیکن محمود نے ان مندروں کو جوں کا توں رہنے دیا اور ہندوؤں کو آزادی دی کہ وہ اپنی مذہبی رسوم و عبادات انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے اس حسن سلوک

Marfat.com

نے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔

محمود غزنوی کی برصغیر آمد اس خطے کے لیے اسلام کا حیات افزا پیغام لے کر آئی۔ ہزاروں افراد اسلام کی نعمت سے شاد کام ہوئے۔ محمود نے اس سرزمین کو تہذیب و تمدن کی دولت بھی عطا کی۔ وہ ایک مربوط معاشرتی نظام اور اندازِ فکر ساتھ لے کر آئے۔ ہندوستان میں ان کی آمد سے قبل علم کے حصول کا حق صرف برہمنوں کے پاس تھا۔ مسلمان آئے تو انہوں نے علم کے دریا پر برہمنوں کی اجارہ داری ختم کر کے اس نعمت کو ہر ایک کے لیے عام کر دیا۔ ایک مشہور ہندو مؤرخ مجمدار کے مطابق مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ کپڑے سینا تک نہ جانتے تھے۔ ایک ہی لمبا سا بغیر سلا کپڑا بدن کے گرد لپیٹ لیا جاتا تھا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں یا گھاس کے جوتوں کا رواج تھا۔ لیکن غزنوی حکمرانوں کی آمد کے بعد لباس و خوراک کا انداز ہی تبدیل ہو گیا۔

تاریخ، محمود غزنوی کو محض ایک جنگجو سپہ سالار کے طور پر ہی پیش نہیں کرتی، جنگوں میں اس قدر مصروف رہنے اور مملکت کا نظم و نسق سنبھالنے کے ساتھ ساتھ محمود غزنوی ایک علم دوست انسان تھے۔ انہیں خود بھی حصولِ علم سے گہری دلچسپی تھی اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مملکت کا گوشہ گوشہ علم کی ضوفشانیوں سے چمک اٹھے۔ چنانچہ انہوں نے علم و فن کے ماہرین کی بھرپور حوصلہ افزائی کی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے ترقی اور کامرانی کے دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔

محمود غزنوی قرآن پاک کے حافظ تھے۔ انہیں علم حدیث سے بھی بہت محبت تھی۔ مؤرخ ابن خلکان کے مطابق "محمود غزنوی کو علم حدیث میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔" حدیث سے انہیں اس قدر لگاؤ تھا کہ رات کے وقت علماء کرام کے ساتھ ان کی نشست ہوتی۔ علماء کرام احادیث بیان کرتے جاتے اور محمود پوری توجہ سے سنا کرتے۔ جہاں ضرورت محسوس کرتے وہاں سوال بھی کرتے۔ محمود علم فقہ کے بھی عالم تھے۔ بعض علما کے مطابق محمود نے فقہ کی چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب "التفرید فی الفروع" مشہور ہے۔ امام مسعود نے محمود سے اسے نقل کیا ہے۔ اس کتاب میں شافعی فقہ کے مسائل درج کیے گئے ہیں۔

محمود علمی بحثوں سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ مؤرخ عتبی نے ایسی محفلوں کا ذکر کیا ہے جن میں علمی نوعیت کے بحث و مباحثے ہوتے تھے۔ محمود ان مباحثوں کی صدارت کیا کرتے تھے۔ غزنی کے اس عظیم حکمران کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ مؤرخ عوفی نے ان کے قطعات نقل کیے ہیں۔ درحقیقت فارسی شاعری کو پروان چڑھانے اور اسے زندۂ جاوید کرنے کا سہرا محمود غزنوی ہی کے سر ہے۔ ان کے دربار سے چار سو شاعر وابستہ تھے۔ شاعری کا باقاعدہ محکمہ قائم تھا۔ اس عہد کے مشہور عالم عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دے کر اس محکمے کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ عنصری حکومت کی جانب ادبی محتسب بنائے گئے تھے۔ تمام شعرا اور مصنفین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ جو کچھ بھی لکھیں اسے پہلے عنصری کو دکھائیں۔

محمود کی علم دوستی اور علم پروری کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور اور نزدیک سے صاحبانِ علم و فن کھنچ کر غزنی میں جمع ہو گئے۔ بغداد سے بہت سے علمی شخصیتیں غزنی چلی آئیں۔ محمود علما اور شعرا کرام کو انعام دینے میں بہت فیاض تھے۔ وہ سخن شناس اور سخن سنج حکمراں تھے اور اچھا شعر سن کر اس سے نہ صرف محظوظ ہوتے تھے بلکہ شاعر کی قدر افزائی کے طور پر اسے خطیر انعام سے نوازتے تھے۔ مؤرخین کے مطابق وہ ہر سال علما کرام اور شعرا پر چار لاکھ دینار خرچ کیا کرتے تھے۔ محمود "پیل بار" یعنی "ہاتھی کے وزن کے برابر عطا کرنے والا" مشہور تھے۔

ابو عبد اللہ محمد حاکم نیشاپوریؒ (۳۲۱-۴۰۵ھ) سامانی اور غزنوی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری اٹھارہ سال محمود غزنوی کے پاس گزارے۔ وہ علم حدیث کے امام تھے۔ انہوں نے دو بہت اہم کتابیں مرتب کیں۔ ایک 'مستدرک علی الصحیحین' ہے جس میں وہ تمام احادیث جمع کر دی گئی ہیں جو بخاری اور مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے انہیں اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ دوسری کتاب 'معرفت علوم الحدیث' ہے جس میں امام حاکمؒ نے ۵۲ ایسے علوم اور شرائط سے بحث کی ہے جو فنِ حدیث کے اصول و ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمود غزنوی ہی کے عہد میں ممتاز فقیہ اور محدث احمد بن حسین بیہقیؒ نے قابلِ قدر علمی کام کیا۔ ابن خورک نے نیشاپور میں رہ کر سو کتابیں تصنیف کیں، ابو نصر محمد جباری جو عتبی کے نام سے مشہور ہوئے، محمود غزنوی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ یمینی لکھی جو سبکتگین اور محمود غزنوی کے حالات پر سب سے مستند کتاب ہے۔

Marfat.com

عہدِ غزنوی میں بے پناہ علمی کام ہوا۔ ہم نے عنصری کا ذکر کیا ہے جو اس دور کے مشہور عالم اور سائنس داں تھے، کئی زبانیں جانتے تھے۔ وہ فلسفی، شاعر اور بڑے ادبی نقاد تھے۔ انہیں کئی برس تک غزنی کی عظیم درسگاہ جامعہ غزنی کی سربراہی اور وہاں تعلیم دینے کا شرف حاصل ہے۔ چار سو شعر، اور علما نے عنصری کو استاد تسلیم کیا۔ عنصری کے شاگردوں میں عسجدی اور فرخی جیسے زبردست شعرا شامل ہیں۔

محمود کے دربار کے ایک اہم رکن البیرونی تھے جو انتہائی ذہین اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کا نام عام طور پر بطور سیاح لیا جاتا ہے لیکن وہ محض سیاح نہیں تھے بلکہ دینیات، ریاضی، ہیئت، فلسفہ، کیمیا، تاریخ، علم الاقوام، نقشۂ عالم، طب اور سنسکرت پر یکساں عبور رکھنے والی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ وہ خوا (خوارزم) میں پیدا ہوئے تھے اور محمود نے ہی انہیں بلوایا تھا، محمود ان کی بے حد قدر کیا کرتے تھے۔ البیرونی نے یہاں آکر سنسکرت سیکھی اور عربی سے سنسکرت میں اور سنسکرت سے عربی میں نہایت قیمتی کتب کے ترجمے کیے۔ ان میں کتاب الہند اور آثار الباقیہ مشہور ہیں۔ یہ کتب تاریخی معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہیں۔ البیرونی نے سلطان محمود کے زمانے کی تاریخ اور ان کے والد کے حالات بھی لکھے لیکن یہ کتب اب نایاب ہیں۔ البیرونی نے غزنی میں ایک رصد گاہ بھی قائم کی تھی۔ محمود غزنوی نے مشہور مسلمان سائنسدان ابنِ سینا کو بھی غزنی آنے کی دعوت دی تھی جو انہوں نے بعض وجوہ کی بنا پر قبول نہیں کی۔

غزنوی عہد میں تاریخ پر بھی قابلِ قدر کام ہوا۔ تاریخ یمینی کے مصنف عتبی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس تاریخ میں آلِ سلجوق کا ذکر کیا ہے۔ اسی دور میں اسدی طوسی نے فارسی لغات اور جوہری نے تاج اللغات کی تدوین کی۔ اس عہد کے سات مشہور شاعر عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غفاری، فرخی اور منوچہری ہیں۔ عنصری نے ۱۸۰ اشعار کا ایسا قصیدہ لکھا تھا جس میں محمود غزنوی کی تمام جنگوں کا تفصیلی احوال موجود ہے۔ بدائعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا۔ اس دور کے شعرا نے فنِ شعر گوئی کو ترقی دی اور فارسی شاعری کو اس قابل کر دیا کہ اس میں ہر قسم کے مطالب ادا کیے جانے لگے اور شاعری کی تمام اصناف کو فارسی زبان میں سمو لیا گیا۔ محمود غزنوی کا دربار گویا نامور شعرا کی اکادمی تھا۔

فارسی شاعری کا ذکر دس صدیاں گزرنے کے باوجود فردوسی کے ذکر کے بغیر آج بھی نامکمل ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق نظم 'شاہنامہ' فارسی ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ شبلی کے مطابق شاہنامہ میں جنگوں کی اس قدر تفصیل ہے کہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ دو ہزار سال قبل آلاتِ جنگ کیسے تھے۔ محمود غزنوی نے فردوسی کی ہر ممکن سرپرستی کی اور ان کے انتقال کے بعد طوس میں ایک عظیم کارواں سرائے بنوائی جسے فردوسی کے نام سے منسوب کیا گیا۔

محمود غزنوی نے جب لاہور کو صدر مقام بنایا تو اسے بھی ہر اعتبار سے بہت ترقی دی۔ یہ شہر فارسی کا عظیم مرکز بن گیا۔ ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان یہاں کے بڑے شاعر تھے۔ اس دور میں لاہور میں فارسی ادب کا جو بیج بویا گیا وہ بعد میں مغلیہ دور میں ایک تناور درخت بن کر ابھرا جس کی شاخیں پورے برصغیر پر سایہ فگن تھیں۔ برصغیر نے فارسی ادب کو امیر خسرو، عرفی، ظہوری، صائب اور بیدل جیسے عظیم شعرا دیے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ محمود غزنوی نے لاہور کو علم و ادب کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ مسعود سعد سلمان نہ صرف فارسی اور عربی کے شاعر تھے بلکہ ان کا ہندی شاعری کا دیوان بھی تھا۔ پنجابی زبان کی شاعری نے بھی اس دور میں ترقی کی اور نومسلموں میں بھی شاہ حسین لاہوری جیسے پنجابی کے شاعر ابھر کر سامنے آئے۔

محمود غزنوی نے دوسرے انتظامی محکموں کے ساتھ ساتھ شعبۂ دبیری بھی قائم کیا۔ خواجہ حسن میمندی جیسے نامور ادیب اس شعبے کے صدر رہے تھے۔ اس شعبہ کے ارکان کی ذمہ داری مراسلہ نویسی تھی۔ دفتری امور یا سرکاری معاملات کے سلسلے میں مختلف شعبہ جات یا صوبائی سربراہوں کے درمیان جتنی بھی خط و کتابت ہوتی اس کا متن شعبۂ دبیری تیار کرتا تھا۔

محمود غزنوی علم کے زبردست مربی تھے۔ انہوں نے غزنی میں ایک بڑی جامعہ (یونیورسٹی) قائم کی تھی۔ یہاں طلبہ کے قیام اور تعلیم پر خطیر رقوم خرچ کی جاتی تھیں۔ اس جامعہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جس میں دنیا بھر کی کتب جمع کرلی گئی تھیں۔ محمود غزنوی جس علاقے کو بھی فتح کرتے تھے وہاں سے کتابیں اکٹھی کر کے غزنی لے جاتے تھے اور اس علاقے کے علما اور ماہرین کو بھی غزنی چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ جامعہ غزنی میں ایک شاندار عجائب گھر بھی تھا جس میں دنیا جہاں کے نوادرات اور عجائبات ذخیرہ کیے گئے تھے۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں غزنی کو نہ صرف علمی بلکہ

Marfat.com

تعمیری اور تہذیبی اعتبار سے اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ اس شہر کی دھوم دنیا بھر میں مچ گئی۔ محمود غزنوی نے اپنے کمالِ انتظام سے اس شہر کو حسن و دلکشی کا مرقع بنا دیا۔

انہوں نے شہر میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ نہریں کھدوائیں، باغات اور فوارے لگوائے۔ محمود کے باغ کا نام 'فیروزہ' تھا، جس میں وہ اہلِ علم کے ساتھ مجالس منعقد کیا کرتے تھے۔ شہر میں پانی کی کمی تھی اس لیے پانی ذخیرہ کرنے کے خصوصی انتظامات کروائے۔ غزنی میں ایک نہایت شاندار مسجد تعمیر کروائی جس کے در و دیوار پر انتہائی قیمتی اور دیدہ زیب طلائی، نقرئی اور جڑاؤ کا کام کروایا۔ اس غرض سے انہوں نے نیشاپور کے کاریگروں کو بلوایا تھا۔ یہ مسجد مشرق کے عجائبات میں شمار کی جاتی تھی اور 'جامع مسجد عروس الفلک' کے نام سے مشہور تھی۔ اس مسجد کے ساتھ ہی جامعہ غزنی، عظیم کتب خانہ اور عجائب گھر تھا جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ مسجد کے گرد تین ہزار طلبہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ سر جان مارشل نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ پوری خلافتِ عباسیہ میں کوئی شہر غزنی کی عمارتوں کی شان و شوکت کو نہیں پا سکتا تھا۔

شہر کے عین وسط میں قلعہ تھا۔ قلعے کے ساتھ ہی سربراہِ مملکت کی رہائش گاہ تھی۔ شہر کا مرکزی حصہ 'مدینہ' کہلاتا تھا، جس میں چند منڈیاں تھیں۔ شہر کے اردگرد فصیل تھی جس میں چار دروازے تھے۔ غزنی جسے قدیم دور میں غزنین یا غزنیک یا غزنہ بھی کہا جاتا تھا ایک وسیع و عریض اسلامی مملکت کا دارالحکومت تھا جو محمود غزنوی کے زمانے میں مغربی ایران سے ہندوستان میں گنگا کی وادی تک پھیلی ہوئی تھی۔

غزنی کے بازاروں کی رونق دیکھ کر یہاں پہلی بار آنے والا حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ بارش کے دوران بازاروں میں لوگوں کو خرید و فروخت میں دشواری ہوتی تھی۔ محمود غزنوی نے حکم دیا کہ تمام بازاروں میں چھت ڈال دی جائے۔ چنانچہ بازاروں کی تمام سڑکوں پر چھت ڈال دی گئی تھی۔ ان چھتوں میں روشن دان بھی بنائے گئے۔ محمود کے تعمیراتی کاموں میں ایک فیل خانے کی تعمیر بھی شامل ہے جس میں ایک ہزار ہاتھیوں کو رکھنے کی گنجائش تھی۔ اس کے ساتھ ہی خدمت گاروں کے رہنے کے لیے مکانات تعمیر کیے گئے۔

پورے ضلع میں آبپاشی کے لیے بہت سے بند بنائے گئے تھے ان میں سے ایک بند آج بھی موجود ہے جو 'بندِ سلطان' کہلاتا ہے۔ یہ بند غزنی کے شمال میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ محمود غزنوی کو فنِ تعمیر سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں سے اب پرانی غزنی میں صرف ایک مینار باقی ہے لیکن اسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی عمارتیں کس قدر عمدگی سے تیار کی گئی ہوں گی۔ محمود جب متھرا میں جنگ لڑ رہے تھے تو وہاں مندروں کے تعمیراتی حسن سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں اپنے تاثرات لکھ کر غزنی بھیجے تھے۔ ان کی اس یادداشت کو مؤرخ عتبی نے نقل کیا ہے۔

محمود نے اپنی پوری زندگی میں عدل و انصاف کا بول بالا رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہر شہر میں قاضی مقرر کیے تھے جو اسلامی شریعت کے مطابق انصاف کرتے تھے۔ محمود یہ بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد اپنے مذہب سے پھر جائے۔ اگر کبھی کوئی مسلمان اپنے عقیدے سے روگردانی کرتا تو اس کی تحقیق اور مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد محمود اسے سخت سزا دیتے۔ محمود خود بھی عوام کی شکایات سنتے تھے اور اس پر تحقیق کے بعد فوراً کارروائی کرتے تھے تاکہ تاجر ناپ تول میں کسی قسم کی بے ایمانی نہ کر سکیں۔ وہ ظلم سے سخت نفرت کرتے تھے اور عدل و انصاف کے معاملے میں کسی رعایت کے قائل نہ تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ اعلیٰ سرکاری یا فوجی افسران کو جرم ثابت ہونے پر سرعام کوڑے لگوائے گئے۔

انصاف کا یہ ترازو صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی یکساں طور پر انصاف کیا جاتا تھا۔ محمود کی ذات میں ہمیں اس قدر عالی ظرف انسان نظر آتا ہے جس نے اپنی فوج میں ہندوؤں کو بھرتی کرنے کی اجازت دی۔ غزنی میں ہندوؤں کا ایک محلہ تھا جہاں وہ آزادی سے اپنی مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے سکوں پر سنسکرت زبان میں بھی الفاظ لکھوائے۔ محمود کے حسن سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندو بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ مشہور مؤرخ الفنسٹن نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا ہے کہ محمود نے ایک بھی ہندو کو جبراً مسلمان بنایا ہو۔ سوائے لڑائی کے انہوں نے کسی ہندو کو قتل نہیں کیا۔

محمود غزنوی کی فوج نہایت منظم تھی اور باقاعدہ نظام کے تحت کام کرتی تھی۔ اس فوج میں عرب، افغانی، دیلمی، خراسانی، غوری، خلجی اور ہندو سبھی تھے لیکن سب باہمی اتفاق اور اتحاد سے مل کر رہتے تھے۔ فوج کی تربیت اس طور کی گئی تھی کہ اس کی قوت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

Marfat.com

محمود کی فوج اپنی تیز رفتاری کے لیے مشہور تھی۔ اس فوج نے دو سال کی مختصر مدت میں دو ہزار میل کا سفر طے کیا۔ اس سفر میں سندھ، جہلم اور چناب جیسے دریا بھی راہ میں آئے۔ صحراؤں کی وسعتوں نے بھی قدم چومے، کوہ سلیمان اور کوہ ہندوکش کے بلند و بالا اور دشوار گزار پہاڑ بھی حائل ہوئے، موسموں کی سختی، برسات، گرمی، سردی اور برفباری نے بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی لیکن محمود نے کسی رکاوٹ کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔

فوج کا اعلیٰ عہدیدار صاحب دیوان یا عارض کہلاتا تھا جس کی حیثیت وزیر جنگ کی سی تھی۔ عارض جنگی امور میں سربراہ مملکت کا خصوصی مشیر بھی تھا۔ ہر سال فوج کا معائنہ عارض ہی کی ذمہ داری تھی۔ یہ معائنہ غزنی کے قریب شاہبہار کے میدان میں ہوتا تھا۔ پوری فوج تیار ہو کر عارض کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اس موقع پر محمود بھی موجود رہتے تھے۔ فوجیوں کی حاضری، بیماری، موت اور دیگر تفصیلات کی حتمی جانچ پڑتال بھی عارض کی ذمہ داری تھی۔ مہمات کے دوران فوج کے لیے اشیائے خورونوش کی فراہمی، نقل و حمل کی سہولتوں کے انتظام اور لڑائی کے بعد ملنے والے مالِ غنیمت کی حفاظت جیسے کاموں کی نگرانی بھی عارض کے سپرد تھی۔ ہر صوبے کی فوج کا بھی ایک عارض اور نائب عارض مقرر کیا جاتا تھا۔

محمود لڑائی میں جدید ترین طریقے اختیار کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ جنگی نقشہ تیار کرنے میں بھی ماہر تھے۔ انہوں نے کئی طرح کی جنگی چالوں سے کام لیا مثلاً دوسری جنگِ پشاور میں محمود نے اپنے لشکر کے گرد خندق کھدوائی اور ایک ہزار تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ آنند پال کی متحدہ فوج پر تیر اندازی کرتے ہوئے پسپائی اختیار کریں تاکہ دشمن کی فوج خندق کے قریب آنے پر مجبور ہو جائے۔ محمود نے کشتیوں سے لڑائی بھی لڑی اور اس میں بھی جدید تکنیک اختیار کی۔ مثلاً ۴۱۸ھ میں جاٹوں کے خلاف جنگ کا مرحلہ درپیش ہوا تو ملتان پہنچ کر حکم دیا کہ ایسی ۱۴۰۰ کشتیاں بنائی جائیں جن میں لوہے کے تین نوک دار بھالے مضبوطی سے نصب ہوں۔ اس طرح کہ ایک کشتی کے سامنے ہو اور بقیہ دو سلاخیں دائیں بائیں ہوں۔

جب لڑائی کا مرحلہ آیا تو ہر کشتی میں بیس آدمی بٹھائے گئے جن میں سے ہر ایک کے پاس ہتھیار اور تیر کمان وغیرہ تھے۔ جاٹوں کے پاس بھی چار ہزار (بعض روایتوں میں آٹھ ہزار) کشتیاں تھیں لیکن یہ سادہ کشتیاں تھیں۔ لڑائی شروع ہوئی تو محمود غزنوی نے دریا کے بالائی حصے پر اپنی فوج لگا دی اور ساحل پر دونوں جانب اپنے ہاتھیوں اور سواروں کے دستے کھڑے کر دیے۔ جاٹوں کے لیے یہ بالکل نیا طریقہ جنگ تھا۔ ان کی بظاہر مضبوط کشتیاں غزنوی فوج کی کشتیوں میں لگی نوکیلی سلاخوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھیں۔

محمود نے جنگوں میں ہاتھیوں کو بھی خوب استعمال کیا۔ جب ہاتھی غزنی میں رہنے کی وجہ سے کمزور ہو جاتے تو انہیں کچھ عرصے کے لیے ہندوستان بھیج دیا جاتا جہاں کی آب و ہوا ان کے لیے مناسب تھی۔ محمود کا اندازِ جنگ یہ تھا کہ وہ دس بارہ ہزار کی تازہ دم فوج لڑائی شروع ہونے کے باوجود تیار رکھتے تھے اور جب دشمن لڑتے لڑتے تھک جاتا تھا تو تازہ دم دستے اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ جنگوں کے زمانے میں مرموز (کوڈ) خط و کتابت کی جاتی تھی تاکہ سرکاری رازِ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔

محمود کے دور میں ڈاک کا نظام بھی بہت عمدہ تھا۔ ڈاک دو طرح سے بھیجی جاتی تھی۔ عام ڈاک پیادوں کے ذریعے اور ہنگامی نوعیت کی ڈاک سواروں کے ذریعے جاتی تھی۔ محکمۂ ڈاک کا نگرانِ اعلیٰ، صاحب برید کہلاتا تھا۔ وہ تمام خبریں صاحبِ رسالت کو بھیجا کرتا تھا جو خط و کتابت کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا تھا۔

خفیہ نویسی کے نظام کو ہندوستان میں غزنوی حکمرانوں نے متعارف کروایا۔ انہوں نے خبر ناموں کی ترتیب اور اطلاعات کی ترسیل کا سارا کام عباسیوں سے سیکھا تھا۔ مؤرخ بیہقی کے مطابق محمود کی سلطنت میں اخبار و اطلاعات کا مستقل محکمہ قائم تھا۔ یہ خبرنامے ایک طرف تو حکمران کو تمام واقعات سے باخبر رکھتے اور دوسری جانب یہ مؤرخین کو بھی تاریخی مواد اور حقائق فراہم کرتے تھے۔ جنگوں کے دوران محمود معرکہ آرائیوں کی تمام تفصیلات لکھوا کر غزنی بھیج دیا کرتے تھے جہاں انہیں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ تمام صوبوں کے محاصل اور اخراجات کی تفصیل باضابطہ رکھی جاتی تھی۔ صوبائی حاکموں کی نگرانی ایک وزیر کے ذمہ تھی جو محمود کو جوابدہ تھے۔

محمود غزنوی نے جب اپنی حکومت کو وسعت دی تو کمال ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے لاہور کو مرکز بنایا۔ ان کا یہ فیصلہ سیاسی اعتبار سے بے حد دانشمندانہ تھا۔ یہاں سے آگے پیش قدمی کرنا آسان تھا۔ محمود نے لاہور کو بے پناہ ترقی دی، اس سے پہلے لاہور ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ محمود نے غزنی سے معمار بلوا کر لاہور میں نئی عمارتیں تعمیر

Marfat.com

کروائیں۔ محمود نے ملک ابوالنجم ایاز کو لاہور کا ناظم مقرر کیا۔ انہوں نے ۲۲ سال تک نظامت کی، وہ لاہور کے پہلے مسلمان صوبے دار تھے۔ انہوں نے لاہور کو از سرِ نو آباد کیا، بہت ترقی دی اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ چند سال میں لاہور میں فارسی بولنے والے علماء، اولیا، حکما اور امرا اس کثرت سے آباد ہوگئے کہ یہ شہر "غزنی خُرد" یعنی "چھوٹا غزنی" کہلانے لگا۔ دور دور سے علماکرام اور بزرگانِ دین جن میں شیخ علی ہجویریؒ، (داتا گنج بخش) محدث اسماعیل غزنویؒ اور شاہ حسین زنجانیؒ جیسی عظیم ہستیاں شامل ہیں، آکر لاہور میں آباد ہوئے۔ جلد ہی یہ شہر علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور یہیں سے اسلام کی روشنی پورے برصغیر میں پھیلتی چلی گئی۔

محمود غزنوی نے لاہور سے متصل محمود پور نام کا ایک قلعہ بنوایا تھا۔ اس میں ان کے حکام رہتے تھے، اس قلعے میں ٹکسال بھی تھی۔ محمود پور کے بنے ہوئے سکے جن پر خلیفہ القادر باللہ اور سلطان محمود غزنوی کے نام ہیں، اب بھی موجود ہیں۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر محمود نے قلعے میں ایک مینار تعمیر کروایا اور شہر میں ایک مسجد بنوائی جسے "خشتی مسجد" کہتے تھے۔ یہ لاہور میں تعمیر ہونے والی پہلی اسلامی عمارت تھی۔ آج اس کے کوئی آثار نہیں البتہ لاہور میں محمود کے پہلے باقاعدہ ناظم ملک ایاز کی قبر اب بھی موجود ہے۔

محمود کی شخصیت ایسے بلند انسانی اوصاف سے عبارت ہے جن کی مہک سے تاریخ کے اوراق آج تک معطر ہیں۔ وہ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ رمضان المبارک میں روزوں کا اہتمام کرتے۔ روزانہ تلاوت کلام پاک ان کا معمول تھا۔ ضرورت مندوں اور مساکین کی امداد کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ وہ بے حد جری اور بہادر تھے۔ میدانِ جنگ میں ہمیشہ اس مقام پر نظر آتے تھے جہاں لڑائی پورے عروج پر ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کے لیے بھی ہمیشہ عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا۔

محمود بے پناہ قوتِ برداشت کے حامل تھے۔ وہ انتہائی سخت حالات میں بھی اپنی فوج کی قیادت کرتے ہوئے دشوار گزار راستوں سے گزر جاتے تھے۔ ان کی ہمت اور غیر معمولی قوتِ برداشت کا یہ حال تھا کہ جب وہ شدید بیمار تھے اور ان کا آخری وقت آن پہنچا تھا، اس وقت بھی وہ مریضوں کی طرح لیٹے نہیں بلکہ دن رات تکیوں کے سہارے بیٹھے رہتے تھے۔ اسی حالت میں ان کا سفرِ حیات تمام ہوا۔ انہوں نے ۶۳ سال کی عمر پائی۔ یہ مدت مختصر ہے لیکن قوموں کی تاریخ پر محیط ہے اور عمرِ جاوداں کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

***

Marfat.com

مسعود غزنوی

دلیر اور جرأت آزماں حکمران، جنہوں نے علم کی بھرپور سرپرستی کی

وہ ایک سوداگر تھا۔

کسی دور دراز شہر سے غزنی آیا تھا۔ یہاں اسے مشکلوں نے گھیر لیا۔ اس نے اپنا اسبابِ تجارت ملک کے حکمران کے بیٹے کے ہاتھ ساٹھ ہزار دینار میں فروخت کر دیا لیکن اسے رقم موصول نہیں ہوئی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور سوداگر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر وہ اٹھا اور مملکت کے حکمراں کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ اس نے سربراہِ مملکت تک اپنی شکایت پہنچائی۔ سربراہِ مملکت کو شکایت سن کر بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے فوری طور پر بیٹے کو پیغام بھجوایا کہ سوداگر کی رقم فوراً واپس کر دو ورنہ قاضی کے سامنے پیش ہو جاؤ۔

سلطانِ وقت کا یہ حکم جب ان کے بیٹے کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنے خزانچی سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنی رقم ہے۔ اس نے بتایا کہ بیس ہزار دینار ہیں۔ حکمراں کے بیٹے نے کہا کہ یہ رقم تو سوداگر کو فوراً دے دو اور تین دن کی مہلت مانگ لو۔

سلطان نے مہلت کی درخواست سنتے ہی کہا کہ ہرگز نہیں، تم جب تک سوداگر کا روپیہ ادا نہ کرو گے میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سلطان کے بیٹے میں انکار کی مجال نہ تھی انہوں نے اِدھر اُدھر سے قرض لے کر اگلی نماز کے وقت تک ساٹھ ہزار دینار کی پوری رقم سوداگر کو ادا کر دی۔

یہ سلطان تھے مشہور عالم رہنما محمود غزنوی، جنہوں نے اپنی مملکت میں انصاف کا پرچم سربلند رکھا اور ان کے بیٹے تھے مسعود غزنوی، جنہوں نے اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں کسی تاخیر یا بہانے سے کام نہ لیا اور ثابت کر دیا کہ انصاف ہر شخص کے لیے یکساں ہے۔ محمود غزنوی کے بعد مسعود غزنوی ہی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، ان کا تقریباً دس سالہ عہد حکومت علمی ترقی کے لحاظ سے یادگار ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے دیگر بھائیوں کے نام محمد اور عبدالرشید ہیں۔ مسعود ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائی محمد سے محض چند گھنٹے بڑے تھے۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی دن عمل میں آئی تھی۔

مسعود کی صحت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے بڑے ہو کر اچھا قد کاٹھ نکالا۔ کم عمری ہی سے انہیں ورزش اور زور آزمائی کا شوق تھا۔ ان کی جسمانی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے بھاری پتھر اکیلے اٹھالیا کرتے تھے۔ انہیں کشتی سے بھی بڑی دلچسپی تھی، سخت کوشی کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ قوتِ برداشت میں اضافے کے لیے وہ سخت سردی کے موسم میں برف پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق کرتے تھے۔

مسعود غزنوی کو شکار کھیلنا بھی بہت پسند تھا۔ بہادر اس قدر تھے کہ شیر سے دو بدو لڑ کر نیزے کی مدد سے اسے ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے تیر اندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ان کا تیر اتنی قوت سے جاتا تھا کہ اس دور میں استعمال ہونے والی لڑائی کے مضبوط لباس 'برگستوان' کو توڑتا ہوا مخالف کے جسم میں جا گھستا تھا۔ مسعود کے پاس ایک نہایت بھاری گرز تھا جسے وہ محض ایک ہاتھ سے اٹھا لیتے تھے جب کہ دوسرے افراد اس گرز کو دونوں ہاتھوں سے بھی نہیں اٹھا پاتے تھے۔

محمود غزنوی اپنے بیٹے کی جنگجویانہ صلاحیتوں کے معترف تھے اور انہیں مختلف معرکوں میں ساتھ رکھا کرتے تھے۔ ۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء میں محمود غزنوی، مسعود کو غور کی لڑائی میں اپنے ساتھ لے گئے۔ غور کا قلعہ

Marfat.com

فتح کرنے میں مسعود غزنوی کی عمدہ تیر اندازی کا بڑا ہاتھ تھا۔ محمود غزنوی کی زندگی میں مسعود نے غور اور خراسان کی فتوحات میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ "غور" سے مراد غزنی اور بامیان کے درمیان وسیع پہاڑی علاقہ ہے اور "خراسان" ایران کے مشرق میں ایک وسیع صوبے کو کہتے ہیں، جس میں دریائے جیحوں کے جنوب اور ہندوکش کے شمال کا علاقہ شامل تھا۔ سیاسی طور پر ماوراً النہر (ترکستان) اور سجستان اس میں شامل رہے ہیں۔

۴۰۶ھ / ۱۶-۱۰۱۵ء میں محمود غزنوی نے مسعود کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ دو برس بعد انہوں نے مسعود کو ہرات کا حاکم بنا دیا۔ ۴۱۱ھ / ۱۰۲۰ء میں مسعود غزنوی نے اپنے والد کے حکم سے غور میں ایک جنگی مہم کی قیادت بھی کی اور غور کا شمال مغربی حصہ فتح کر لیا۔ ۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء میں رے کا صوبہ فتح کر لیا گیا تو محمود غزنوی نے مسعود کو رے کا بھی حاکم بنا دیا۔ مسعود نے رے کے دور افتادہ حصوں کو مطیع کرنے کے بعد ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں اصفہان اور ہمدان بھی فتح کر لیے۔ اس سے قبل ان علاقوں پر آل بویہ کے علاؤالدولہ بن کاکویہ کی حکمرانی تھی۔ اس کے بعد وہ مزید علاقوں کو تسخیر کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے کہ انہی دنوں ان کو اپنے والد کی وفات کی المناک خبر ملی۔

محمود غزنوی کی وفات ملتِ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا المیہ تھی۔ انہوں نے بحیرۂ عرب سے ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے تک اور مشرق میں قنوج سے غزنی اور وسط ایشیا تک ایک عظیم مملکت قائم کی تھی۔ اب اتنی وسیع مملکت کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا کیونکہ محمود غزنوی کی زبردست اور پُرہیبت شخصیت کے دنیا سے رخصت ہو جانے سے مفسدوں کو شہ مل سکتی تھی لیکن انتشار کے عمل کا آغاز خود مملکت کے مرکز سے ہوا تاہم مسعود غزنوی نے اپنی حکمتِ عملی سے اس پر جلد ہی قابو پا لیا۔

مسعود غزنوی کو اپنے والد کے انتقال کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ غزنی سے تقریباً چھ سو فرسنگ دور سفاہان میں تھے۔ وہ فوری طور پر غزنی روانہ ہو گئے۔ غزنی پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ان کے بھائی محمد نے زمامِ حکومت سنبھال لی ہے۔ جب مسعود "رے" کی طرف بڑھ رہے تھے تو انہیں خلیفۃ المسلمین قادر باللہ کا پیغام ملا کہ رے اور جو علاقے آپ نے تسخیر کیے ہیں ان پر ہم نے آپ کو حاکم مقرر کیا ہے۔ اس زمانے میں گو کہ خلافتِ عباسیہ بہت کمزور ہو چکی تھی، مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود تمام حکومتیں عباسی خلیفہ کی بالادستی اور سیادت کو تسلیم کرتی تھیں اور حکمرانی کے لیے ان کی رضامندی حاصل کرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔

قادر باللہ کا پیغام ملنے پر مسعود غزنوی نے اس پیغام کی نقول مختلف شہروں میں بھجوا دیں اور خود رے سے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے بھائی محمد کو پیغام روانہ کیا کہ ہمیں مل کر حکومت کرنی چاہیے۔ ہم آپ کو حکمران بنانے کے لیے تیار ہیں لیکن خطبوں میں میرا نام بھی لیا جائے۔ سکوں پر بھی میرا نام ہو۔ میں عراق اور روم (ترکی اور یونان) کی طرف توجہ دوں گا، آپ غزنی اور ہندوستان کا انتظام و انصرام سنبھالیں۔ محمد نے جواب دیا کہ آپ رے میں موجود رہیں اور خراسان نہ آنے کا وعدہ کریں۔ اس پر مسعود ہرات جا پہنچے۔

اس اثنا میں صورتِ حال تبدیل ہو گئی۔ جن امرا نے محمد کو مسندِ اقتدار پر بٹھایا تھا، وہ ان کے خلاف اور ان سے بیزار ہو گئے اور انہوں نے ان کو معزول کر کے مسعود غزنوی کو دارالحکومت آنے کی دعوت دے دی۔ ایک بڑا لشکر ایاز اور علی دایہ کی قیادت میں غزنی سے نکل کر نیشاپور کی سمت روانہ ہو گیا۔ مسعود غزنوی، غزنی پہنچ گئے اور ۳ شوال ۴۲۱ھ / ۴ اکتوبر ۱۰۳۰ء کو یعنی اپنے والد محمود غزنوی کی وفات کے پانچ ماہ بعد انہوں نے مملکت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ خلیفہ قادر باللہ نے انہیں اس موقع پر ناصر دین اللہ، حافظ عباداللہ اور ظہیر خلیفۃ اللہ کے خطابات دیے۔

مسعود غزنوی نے ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء میں مکران کے علاقے پر فوج کشی کی۔ یہاں کے حاکم عیسیٰ نے بغاوت کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ اسی طرح کچ کا علاقہ بھی غزنی کی حکومت کا حصہ بن گیا۔ ان علاقوں میں مسعود کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا گیا۔

سنہ ۴۲۳ھ / ۱۰۳۲ء میں مسعود نے جنوبی کشمیر کی پہاڑیوں میں سرستی نام کے قلعے پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ ۴۲۶ھ / ۱۰۳۵ء میں طبرستان کے حکمران ابو کالنجار نے سرکشی اختیار کر کے استر آباد پر قبضہ کر لیا تھا چنانچہ مسعود نے طبرستان پر حملہ کیا اور ابو کالنجار کو اطاعت کے لیے مجبور کر دیا۔ اس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

ذی الحجہ ۴۲۶ھ / اکتوبر ۱۰۳۵ء میں لاہور کے حاکم احمد نیال تگین نے بغاوت کر دی۔ احمد نیال تگین کو مسعود نے اریاروق کی جگہ ربیع الاول ۴۲۲ھ / مارچ ۱۰۳۱ء میں لاہور کا حاکم مقرر کیا تھا کیونکہ

Marfat.com

اریاروق کے بارے میں بہت سی شکایات مل رہی تھیں لیکن احمد نیال تگین کے حاکم بنائے جانے پر یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ دارالحکومت کی طرف سے ہندوستان میں مقرر کردہ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) قاضی ابوالحسن علی اور احمد نیال تگین میں تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ گو کہ احمد نیال تگین بہت عرصے تک محمود غزنوی کے قریبی رفیق رہے تھے اور خزانے کی نگرانی انہی کے سپرد تھی۔ ۴۲۴ھ / ۱۰۳۳ء میں انہوں نے بنارس کی طرف پیش قدمی کی اور اسے فتح کر لیا تھا لیکن قاضی ابوالحسن علی بعض وجوہ کی بنا پر ان سے خوش نہیں تھے۔

جب کشیدگی بڑھ گئی تو مسعود نے احمد نیال تگین کے خلاف کارروائی کی اور اپنے جرنیل بالنہ (بانہ) کو فوج دے کر بھیجا لیکن بانہ کو شکست ہوئی اور وہ جنگ میں کام آ گئے۔ اس کے بعد مسعود نے ایک اور ہندو سالار تلک کو فوج دے کر بھیجا۔ احمد نیال تگین لاہور چھوڑ کر فرار ہو گئے اور دریائے سندھ عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب گئے۔ ان کے بیٹے کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس جنگ کی تفصیل فخر مدبر نے دی ہے کہ مسعود نے کس طرح نیال تگین کی فوج کو ڈبو دیا اور دلدل میں دھکیل دیا۔

تین ذوالقعدہ ۴۲۷ھ / ۲۹ اگست ۱۰۳۶ء کو مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا حاکم بنا دیا۔ محمود غزنوی کے معروف غلام ایاز کو مجدود کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ لاہور غزنویوں کی سلطنت کے اس حصے کا دارالحکومت بن گیا جو موجودہ پاکستان و بھارت میں شامل تھی۔

ذی الحجہ ۴۲۷ھ / اکتوبر ۱۰۳۶ء کے آخر میں مسعود غزنوی نے ہندوستان کے مزید کچھ حصوں پر لشکر کشی کی اور ہانسی اور سونی پت کے قلعے فتح کر لیے۔ ۴۳۰ھ / ۳۹-۱۰۳۸ء میں مسعود نے بخارا کے حاکم پور تگین پسر علی تگین کو اس کی سرکشی کی سزا دینے کی غرض سے دریائے سیحوں عبور کیا اور پیش قدمی شروع کر دی لیکن مزید کوئی کارروائی کرنے سے قبل یہ اطلاع ملی کہ سلجوقی لشکر بلخ کی جانب سے آ رہا ہے اس لیے وہ خراسان واپس آ گئے۔

مسعود غزنوی کو اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد سلجوقیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں مسعود تخت نشین ہوئے اور ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء میں سلجوقیوں نے ہرات پر حملہ کر دیا تاہم انہیں فراوہ کے میدان میں شکست اٹھا کر بلخان کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ کچھ عرصے ان کی سرگرمیاں ماند رہیں لیکن ۴۲۵ھ / ۳۴-۱۰۳۳ء سے انہوں نے خراسان پر باقاعدہ حملے شروع کر دیے۔ شعبان ۴۲۶ھ / جون ۱۰۳۵ء میں مسعود غزنوی نے سلجوقیوں کے خلاف اپنے دو سالار، حاجب بکتغدی اور حسین علی ابن میکائیل کو روانہ کیا۔ اس لشکر نے سلجوقیوں کو شکست تو دے دی لیکن آخری لمحات میں سلجوقیوں کے تازہ دم دستے نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ اگر مسعود سلجوقیوں کی مخالفت کو ختم کرنے پر توجہ دیتے تو یہ ان کے لیے زیادہ مفید ہوتا لیکن وہ ۴۲۷ھ / ۱۰۳۶ء میں برصغیر کی مہم میں مصروف رہے۔ ان کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر سلجوقیوں نے مزید طاقت حاصل کر لی۔ ۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء میں انہوں نے بلخ پر قبضہ کر لیا۔ مسعود انہیں جواب دینے کے لیے پہنچے تو وہ مرو کی طرف ہٹ گئے اور صلح کی درخواست کی لیکن یہ صلح عارضی تھی۔

سلجوقیوں نے اب سرخس، نسا اور باورد (ابیورد) کے باشندوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مسعود نے بھی جنگی تیاریاں کر لیں۔ سلجوقی اپنے سالار طغرل کی قیادت میں آگے بڑھے۔ دندانقان (مرو سے جنوب مغرب میں واقع شہر) کے مقام پر ۸ رمضان ۴۳۱ھ / ۲۳ مئی ۱۰۴۰ء کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مسعود بڑی بے جگری سے لڑے لیکن ان کی فوج کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ مسعود بڑی مشکل سے غزنی پہنچے۔ خراسان پر سلجوقی تسلط قائم ہو گیا۔

سلجوقیوں کے ہاتھوں اس شکست کے بعد مسعود نے اپنا دارالحکومت غزنی سے لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنا تمام ضروری مال و اسباب اور خزانہ اکٹھا کیا اور لشکر کو لاہور کی سمت کوچ کا حکم دیا۔ غالباً ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لاہور کو اپنا مستقر بنا کر اپنی قوت بحال کر لیں گے اور پھر کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیں گے لیکن بدقسمتی سے مسعود کے اپنے ساتھیوں نے ان سے وفا نہ کی۔ رباط ماری کلہ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد مسعود کے بعض ماتحتوں نے بغاوت کر دی اور خزانہ لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار میں اور لوگ بھی شامل ہو گئے۔

مسعود کو گرفتار کر کے ان کے چھوٹے بھائی محمد کو رہنما بنایا گیا۔ محمد نابینا تھے۔ انہوں نے مسعود کو قلعہ گیری میں نظر بند کروا دیا اور حکمرانی اپنے بیٹے احمد کے سپرد کر دی۔ احمد کی طبیعت میں خود سری بہت تھی۔ انہوں نے باپ سے مشورہ تک نہ لیا اور ان کے ایما پر ۱۱ جمادی الاول ۴۳۲ھ / ۱۷ جنوری ۱۰۴۱ء کو مسعود غزنوی جیسے جری اور شجیع

Marfat.com

رہنما کو موت کی نیند سلادیا گیا۔ مسعود نے دس سال تین ماہ حکومت کی۔

مسعود غزنوی کا دور خوشحالی کا دور تھا۔ انہوں نے غزنی میں ایک عالی شان قصر تعمیر کروایا تھا۔ یہ قصر اور اس میں رکھا گیا قیمتی تخت، عجائبات میں شمار ہوتے تھے۔ اس قصر کی تعمیر میں تین سال صَرف ہوئے۔ شعبان ۴۲۹ھ / مئی ۱۰۳۸ء میں قصر کی تکمیل کا جشن منایا گیا۔ مؤرخ بیہقی بھی اس جشن میں شریک تھے۔ انہوں نے بھی اس محل کی آرائش کی بڑی تعریف کی ہے۔

۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء میں جب عباسی خلیفہ قادر باللہ کا انتقال ہوا اور قائم بامر اللہ ان کی جگہ خلیفہ بنائے گئے تو ایک سفیر غزنی آئے۔ اس موقع پر پورے شہر کو اعلیٰ پیمانے پر سجایا گیا۔ میلوں تک پیادہ اور سوار فوجیوں کی صفیں، جنگی ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔

مسعود غزنوی بے انتہا دلیر اور اچھی صحت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد فیاض بھی تھے۔ ایک بار انہوں نے رمضان المبارک کے مہینے میں تمام مستحق افراد میں فی کس ایک ہزار دینار تقسیم کیے۔ رمضان المبارک میں ان کی سخاوت عروج پر ہوتی تھی۔ وہ بہت اچھے شعری ذوق کے مالک بھی تھے اور شعرا کرام کو اچھے اشعار سنانے پر خطیر رقوم بطور انعام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مشہور سائنس داں البیرونی کو کتاب "قانون مسعودی" کی تصنیف پر ایک ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی انعام میں دینا چاہی تھی لیکن البیرونی نے انکار کر دیا۔

مسعود غزنوی کا دور علمی ترقی کے لحاظ سے بڑا اہم ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق مسعود غزنوی نے اپنی مملکت کے تمام شہروں میں اس قدر مدارس اور مساجد تعمیر کروائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز ہے۔ علما کی سرپرستی کی وجہ سے غزنی میں بڑے بڑے اہل علم اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی اور ابو الفضل بیہقی شامل ہیں۔

مسعود غزنوی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس دور کی کئی معرکہ آراء کتابیں یا تو ان کے حکم سے لکھی گئیں یا ان کے نام معنون کی گئیں۔ ان کتابوں میں سب سے مشہور کتاب "القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم" ہے جو ریاضی، ہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیہ کے موضوعات پر لاجواب کتاب ہے۔ اس کتاب کو البیرونی نے لکھا اور مسعود غزنوی کے نام مُعنْوَن کیا۔ اس کے علاوہ ابو الفضل بیہقی نے "تاریخ آلِ سبکتگین" لکھی۔ امام ناصحی نے "فقہ مسعودی" کے نام سے ایک کتاب فقہ حنفیہ پر مسعود غزنوی کے حکم سے لکھی۔ علامہ ثعلبی نے عربی شعرا کے ایک تذکرے کا ضمیمہ لکھ کر اسے مسعود کے نام معنون کیا۔

مسعود غزنوی کا دورِ حکومت جن علمی شخصیات کی وجہ سے تاریخ کے ایوانوں میں اجالا کر رہا ہے ان میں سرفہرست البیرونی ہیں۔ ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی ریاضی، ہیئت، طبیعات، مساحت و ہندسہ، ارضیات، علم کیمیا، تاریخ، جغرافیہ اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ بہت اچھے سیاح ہونے کے ساتھ معدنیات، خواص الادویہ، قدیم مذاہب اور تقویم کے ماہر بھی تھے۔ انہوں نے مختلف علوم پر ۱۷۵ کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں "القانون المسعودی" ریاضی، ہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیہ پر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب "کتاب الہند" کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب کے اسی باب ہیں اور اس میں ہندوؤں کے مذہب، فلسفے، ادب، جغرافیہ، سنین، ہیئت، رسوم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔

البیرونی عربی، فارسی، عبرانی، یونانی اور سریانی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ہندوستان آکر انہوں نے خاص طور پر سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی اور سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ مرتب کیا۔ اس زمانے میں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور طبیعی علوم میں البیرونی سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔

مسعود غزنوی نے البیرونی کے لیے غزنی میں ایک اچھی رصد گاہ بنوائی تھی۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ رصد گاہ محمود کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ البیرونی نے کتاب "قانونِ مسعودی" یہیں تصنیف کی۔ البیرونی نے ایران کے زرتشتیوں، اہل خوارزم، اہل صغد اور اہل سمرقند کی تاریخ اور تقویم (کیلنڈر) کے بارے میں نادر معلومات فراہم کیں۔ البیرونی ۳ ذوالحجہ ۳۶۲ھ / ۴ ستمبر ۹۷۳ء کو پیدا ہوئے اور ۲ رجب ۴۴۰ھ / ۱۱ دسمبر ۱۰۴۸ء کو انہوں نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔

مسعود غزنوی کے دور کی ایک اور اہم علمی شخصیت ابو الفضل محمد بن الحسین کاتب البیہقی ہیں۔ وہ غزنوی حکومت سے بیس سال وابستہ رہے۔ وہ غزنوی دور کے اہم دبیروں میں شامل تھے، جنہیں بہت خفیہ اور اہم نوعیت کی مراسلت اور دستاویزات تیار کرنے کے کام سپرد کیے

Marfat.com

جاتے تھے۔ مسعود غزنوی سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور وہ سلطنت کے اہم رازوں سے واقف تھے۔

بیہقی فارسی کے بڑے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کے چشم دید واقعات کو نہایت دیانت کے ساتھ فصیح زبان میں پیش کیا ہے۔ ان کی اہم تصنیف "جامع التواریخ" یا "تاریخ آل سبکتگین" ہے، جس کی تیس جلدیں تھیں۔ ہر حصہ کسی نہ کسی غزنوی حکمراں کے نام پر تھا چنانچہ تیسرا حصہ 'تاریخ مسعودی' کے نام سے مرتب کیا گیا جو مسعود غزنوی سے متعلق تھا۔ افسوس کہ ان تیس جلدوں میں سے اب صرف چھ جلدیں دستیاب ہیں۔ ابو نصر محمد جباری جو عتبی کے نام سے مشہور ہیں، ایک اور بڑے مؤرخ تھے۔ ان کا انتقال ۴۳۱ھ / ۴۰-۱۰۳۹ء میں ہوا۔

مسعود غزنوی کے دور میں ایک اور بڑے عالم ابو المنصور عبد الملک الثعلبی تھے جو ادب اور تاریخ کے امام وقت تھے۔ ان کا تعلق نیشاپور سے تھا۔ وہ غزنی کی حکومت سے مستقل طور پر متعلق تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "یتیمہ" کا ضمیمہ مسعود غزنوی کے نام معنون کیا۔ یہ کتاب عربی زبان کے شعرا کا ضخیم تذکرہ ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ علامہ ثعلبی نے ایک اور کتاب "کتاب الغزرفی سیر الملوک" کے نام سے لکھی جس میں تخلیق آدمؑ سے محمود غزنوی کے دور تک کی تمام اقوام کے حالات شامل کیے۔ علامہ ثعلبی کا انتقال ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء میں ہوا۔

مسعود غزنوی کے امرا میں سرہنگ خطیبی بروی کا نام بھی بطور شاعر اور ادیب لیا جاتا ہے۔ وہ سندھ کے حاکم بھی رہے تھے اور انہوں نے مختلف جنگوں میں بہادرانہ کارنامے انجام دیے۔

محمود غزنوی کے عہد کے ملک الشعرا عنصری، مسعود کے دور میں بھی موجود تھے۔ ان کا انتقال ۴۳۱ھ یا ۴۴۱ھ / ۱۰۳۹ء یا ۱۰۴۹ء میں ہوا۔ انہوں نے تیس ہزار اشعار کہے۔ ایک اور بڑے شاعر فرخی تھے جن کا انتقال ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء میں ہوا۔ اسدی (وفات: ۴۲۵ھ) عسجدی (وفات: ۴۳۲ھ) اور عضائری (وفات: ۴۲۶ھ) کا شمار بھی اچھے شعرا میں ہوتا تھا۔ منوچہری (وفات: ۴۳۲ھ) یوں تو شروع میں جرجان کے ملک العالی ابن قابوس کی حکومت سے وابستہ تھے لیکن بعد میں مسعود غزنوی کے دربار سے منسلک ہو گئے۔

ابو نصر مشکان (وفات: ۴۳۹ھ) مشہور مؤرخ بیہقی کے شاگرد تھے۔ مسعود غزنوی کے دور میں دیوانِ رسالت کا عہدہ ان کے سپرد تھا۔ وہ عربی میں شعر کہتے تھے اور اچھے نثر نگار تھے۔ عبید اللہ دبوسی سمرقندی (وفات: ۴۳۰ھ) ماوراء النہر کے مشہور حنفی عالم تھے۔ ایک اور بڑے عالم شیخ ابو المنصور بن علی غزنوی تھے۔ انہیں مسعود غزنوی نے ۴۲۶ھ / ۱۰۳۴ء میں لاہور میں دیوان الانشا کا افسر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔

محمود غزنوی کے مشہور غلام ایاز، محمود غزنوی کے انتقال کے بعد بھی غزنوی حکومت سے وابستہ رہے۔ ابتدا میں مسعود نے انہیں رے کی حکومت سپرد کرنے میں تامل سے کام لیا حالانکہ امرا کا کہنا یہ تھا کہ ایاز کو رے کی حکومت دے دی جائے۔ البتہ پانچ برس بعد مسعود غزنوی نے ایاز کو ۴۲۷ھ / ۱۰۳۶ء میں اپنے بیٹے مجدود کا اتالیق بنا کر لاہور بھیجا۔ مسعود نے مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا تھا۔ ایاز یہیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ ملکی امور میں عملاً انہی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کا انتقال ۴۴۹ھ / ۱۰۵۷ء میں لاہور ہی میں ہوا۔

مسعود غزنوی کے دور حکومت ہی میں مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور تشریف لائے، جہاں انہوں نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے تک درس دیتے رہے پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپؒ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سب سے مشہور کتاب 'کشف المحجوب' ہے۔ آپؒ کے ہاتھ پر کئی افراد نے اسلام قبول کیا۔ ان میں رائے راجو بھی تھے، جو مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کے نائب تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے رائے راجو کے مسلمان ہو جانے کے بعد انہیں شیخ ہندی کا لقب دیا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس خطے میں اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔

ایسی ہی عظیم المرتبت علمی شخصیات کی بدولت مسعود غزنوی کا دس سالہ دور حکومت، تاریخ کا ایک روشن باب کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

•••

Marfat.com

ابراہیم غزنوی

انہوں نے ملک کو علمی، ادبی، فنی اور فلاحی لحاظ سے مثالی ریاست بنا دیا

رات کا وقت تھا!

قلعے کے صدر دروازے پر چند سائے نظر آ رہے تھے۔ ان کے لباس اور چال ڈھال سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی فوجی مشن پر آئے ہیں۔ انہوں نے قلعے کے نگراں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں نگراں تک پہنچا دیا گیا۔

یہ افراد دارالحکومت سے آئے تھے۔ انہوں نے قلعے کے نگراں کو مرکز کا ایک حکم نامہ دکھایا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ اس حکم نامے کے حامل افراد کو ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ذمہ داری یہ تھی کہ قلعہ میں موجود دو اہم سیاسی قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔

قلعے کا نگراں جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے پیامِ اجل لانے والوں کو مشورہ دیا کہ اس وقت تو رات ہو چکی ہے، آپ آرام کریں، کل صبح اس حکم پر عمل درآمد کر لیجیے گا۔ مرکز سے آنے والے افراد مان گئے۔

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا۔ اہم سیاسی قیدیوں کی زندگیوں کے اب بس چند ہی لمحات باقی رہ گئے تھے۔ مرکز سے آنے والے افراد دونوں سیاسی قیدیوں کی زندگیوں کے چراغ گل کرنے کی غرض سے تیار ہو کر قلعے میں جا پہنچے لیکن زندگی اور موت کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار اس ذات نے اپنے پاس رکھا ہے جس کی مرضی کے بغیر کوئی پتا تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ ابھی مرکز سے آنے والے افراد اہم سیاسی قیدیوں کی کوٹھڑی کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ چند ہی لمحوں میں کچھ گھڑ سوار ان کے قریب رکے۔ انہوں نے ایک عجیب خبر سنائی کہ جس باغی حکمراں نے اہم سیاسی قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کیا تھا، خود اسی حکمراں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وفادار امرأ نے بغاوت کا خاتمہ کر دیا ہے اور مسندِ اقتدار سلطنت کے اصل وارثوں کا انتظار کر رہی ہے۔

سلطنت کے اصل وارث وہی دونوں سیاسی قیدی تھے جن کے سر چند لمحوں بعد ان کے تن سے جدا کر دیے جانے تھے۔ ہماری مراد سلطنتِ غزنویہ کے اولوالعزم حکمراں محمود غزنوی کے پوتوں ابراہیم غزنوی اور فرخ زاد سے ہے۔ ان دونوں کو قتل کر دینے کا حکم ان کے والد مسعود غزنوی کے ایک سابق غلام طغرل نے دیا تھا جس نے بغاوت کر کے محمود غزنوی کے ایک بیٹے عبدالرشید بن محمود کو قتل کر دیا تھا جو اس وقت غزنوی سلطنت کے فرماں روا تھے۔ اس طرح غزنوی اقتدار پر طغرل قابض ہو گیا تھا۔ اگر طغرل ابراہیم غزنوی اور فرخ زاد کو بھی قتل کروانے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید آج افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ یکسر مختلف ہوتی۔ لیکن طغرل کا اقتدار محض مہینہ بھر رہا۔ غزنوی خاندان کے وفادار امرأ نے ۱۷ ذیقعد ۴۴۳ھ/۲۱ مارچ ۱۰۵۲ء کو طغرل کو قتل کر دیا۔ اب راستہ صاف ہو چکا تھا۔ ابراہیم غزنوی اور فرخ زاد کو عزت کے ساتھ غزنی لایا گیا۔ قید کی تکالیف اٹھا کر ابراہیم بہت بیمار اور کمزور ہو چکے تھے اس لیے امرأ نے متفقہ طور پر فرخ زاد کو سلطنت غزنی کا فرماں روا چن لیا۔

فرخ زاد نے سات برس حکومت کی۔ صفر ۴۵۱ھ / مارچ ۱۰۵۹ء میں وہ علیل ہوئے، یہ علالت جان لیوا ثابت ہوئی۔ ان کی عمر صرف ۳۴ برس تھی۔ ان کے بعد ۹ صفر ۴۵۱ھ / ۲۷ مارچ ۱۰۵۹ء کو ان کے بھائی ابراہیم غزنوی کو سربراہ منتخب کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی غزنوی سلطنت کے ایک یادگار دور کا آغاز ہو گیا۔ ابراہیم غزنوی نے تقریباً چالیس برس حکومت کی اور انہوں نے اپنی شاندار انتظامی صلاحیتوں سے

Marfat.com

کام لیتے ہوئے ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت کا شکار غزنوی سلطنت کو ایک بار پھر مضبوط اور مستحکم بنا دیا۔ مملکت کی توسیع کے لیے موثر اقدامات کیے اور اسے علمی، ادبی، فنی اور فلاحی لحاظ سے ایک مثالی مملکت بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ابراہیم غزنوی ۴۲۴ھ /۱۰۳۳ء میں ہرات میں پیدا ہوئے جو موجودہ افغانستان کا معروف شہر ہے۔ اس وقت سلطنتِ غزنی کی قیادت ابراہیم کے والد مسعود غزنوی کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ مسعود غزنوی نے ۴۲۱ھ تا ۴۳۲ھ/ ۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء حکومت کی۔ وہ ایک اولوالعزم، شجاع اور سخی حکمراں تھے جنہوں نے علم کی بھرپور سرپرستی کی۔ وہ اپنے بیٹے ابراہیم کی زندگی کے ابتدائی تقریباً آٹھ برس تک بقید حیات رہے۔ ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں انہیں قتل کر دیا گیا۔

مسعود کے زمانے میں غزنوی سلطنت قدرے سمٹ گئی تھی کیونکہ سلجوقی حکمرانوں نے طغرل بیگ محمد کی قیادت میں خراسان کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسعود کے بعد ان کے بیٹے مودود نے ۴۳۴ھ / ۱۰۴۲ء میں حکومت سنبھال لی۔ ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء میں مودود کے انتقال کے بعد ان کے بھائی علی بن مسعود حکمراں بنے۔ ۴۴۱ھ /۱۰۴۹ء میں ان کی معزولی کے بعد عبدالرشید بن محمود نے اقتدار سنبھالا لیکن ۴۴۳ھ / ۱۰۵۲ء میں انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطنت کی باگ ڈور مسعود غزنوی کے ایک اور بیٹے فرخ زاد کے ہاتھوں میں آئی۔ فرخ زاد نے غزنوی سلطنت کو سنبھالا دیا اور سلجوقیوں کو پسپا کر دیا۔ ۴۵۱ھ /۱۰۵۹ء میں فرخ زاد نے وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم بن مسعود غزنوی نے سلطنتِ غزنویہ کے بارہویں فرماں روا کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا۔ اس زمانے میں پڑوس کی سلجوقی سلطنت پر طغرل بیگ محمد حکمراں تھے۔ ان کی حکومت خراسان سے بغداد تک پھیلی ہوئی تھی۔ بغداد میں عباسی خلافت قائم تھی اور القائم بامر اللہ خلیفہ تھے۔

ابراہیم غزنوی نے حکمراں بنتے ہی غزنوی اور سلجوقی سلطنتوں کے مابین کش مکش ختم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ضرور ہے کہ ابراہیم کے بھائی مودود نے سلجوقی حکومت کے ایک اہم رکن چغری بیگ (سلجوقی فرماں روا طغرل بیگ کے بھائی) کی بیٹی سے شادی کر لی تھی لیکن یہ رشتہ بھی دونوں فریقوں کے درمیان الفت و محبت کے تعلقات قائم کرنے میں ناکام رہا۔ بلخ اور سیستان کے علاقوں میں لڑائیاں جاری تھیں۔ تاہم اب فریقین کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس باہمی کشمکش سے کوئی فائدہ نہیں۔ مزید پیش رفت ابراہیم غزنوی نے کی۔ انہوں نے ختلان، چغانیاں اور قبادیان کے علاقے سلجوقیوں کو پیش کر کے ان سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ (ختلان کو "ختل" بھی لکھا گیا ہے)۔ یہ دریائے جیحوں (دریائے آمو) کے بالائی حصے پر ایک علاقہ ہے۔ چغانیاں، شہر ترمذ کے شمال میں واقع ہے۔ قبادیان کا علاقہ جنوب مشرق کی جانب ہے۔

ابراہیم غزنوی نے سلجوقی حکمرانوں کو قیمتی تحائف بھی پیش کیے۔ ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ محمد کے انتقال پر ان کے بھتیجے (چغری بیگ کے صاحب زادے) الپ ارسلان کو سلجوقی سلطنت کا فرماں روا تسلیم کر لیا گیا۔ الپ ارسلان اور ابراہیم غزنوی کے درمیان زیادہ قریبی تعلقات قائم ہوگئے۔ ابراہیم غزنوی نے اپنی بیٹی کی شادی الپ ارسلان کے بیٹے ارسلان شاہ سے کر دی اور اپنے بیٹے مسعود کی شادی ملک شاہ سلجوقی کی بیٹی سے کی۔ سلجوقیوں سے دوستی کے معاہدے کے بعد ان سے قرابت داری قائم کرنے کا یہ فیصلہ بڑا دانشمندانہ تھا۔ اس کے نتیجے میں مغرب کی جانب سے غزنوی سلطنت کو لاحق خدشات ٹل گئے۔

اب ابراہیم غزنوی نے برصغیر کی جانب توجہ کی۔ ابتدا میں انہوں نے ایک بڑی فوج برصغیر کی طرف روانہ کی۔ اس فوج نے بعض ایسے علاقے فتح کیے جو ابھی تک غزنی کی اسلامی سلطنت کے زیر نگیں نہ تھے۔ ۴۷۲ھ /۱۰۷۹ء میں ابراہیم خود فوج کی قیادت کرتے ہوئے اس علاقے میں داخل ہوئے جو اب پاکستان کا خطہ ہے۔ انہوں نے اجودھن کے قلعے کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ اجودھن کا موجودہ نام پاک پٹن ہے۔

اس کے بعد ابراہیم نے ایک اور بڑے قلعے روپال پر فوج کشی کی۔ یہ قلعہ ایک بلند پہاڑی چوٹی پر بنا ہوا تھا جس کی ایک جانب دریا بہتا تھا اور دوسری طرف گھنا جنگل تھا۔ جنگل میں بڑے بڑے درختوں کی شاخیں آپس میں اس طرح پیوست تھیں کہ سورج کی روشنی زمین تک نہ پہنچ پاتی تھی۔ یہ درخت زہریلے سانپوں کے مسکن بھی تھے۔ قلعے کی دونوں جانب فوجوں کو ٹھہرانے کی جگہ بالکل نہ تھی۔ ان حالات میں یہ قلعہ فتح کرنا بہت مشکل نظر آتا تھا لیکن ابراہیم نے مہم ترک نہ کی اور تمام مشکلات کے باوجود قلعے تک جا پہنچے۔ کچھ عرصے کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔

Marfat.com

قلعہ روپال کے بعد ابراہیم غزنوی نے ایک اور شہر درہ پر حملہ کیا۔ اس شہر میں وہ غیر مسلم آباد تھے جو خراسانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بڑی جنگجو قوم تھی اور ان لوگوں نے مقامی راجاؤں کو تنگ کر رکھا تھا۔ اس شہر کے آس پاس بھی بے انتہا گھنے جنگل تھے۔ شہر میں داخل ہونے اور باہر آنے کے راستوں کا پتا چلانا بہت دشوار تھا۔ ابراہیم نے کسی رکاوٹ کی پروانہ کی اور پیدل سپاہیوں کو اس ہدایت کے ساتھ آگے روانہ کر دیا کہ وہ درخت کاٹ کر، باقی فوج کے لیے راستہ بناتے جائیں۔ جب فوج درہ تک پہنچی تو تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش کا سلسلہ قریباً تین ماہ جاری رہا۔ فوج شہر سے باہر رکی رہی۔ بارش تھمنے کے بعد ابراہیم غزنوی نے پہلے تو شہر والوں کو اسلام قبول کرنے یا غیر مسلم رہ کر جزیہ دینے کی دعوت دی لیکن نفی میں جواب ملنے پر حملہ کر دیا۔ زبردست جنگ ہوئی جس میں ابراہیم فتح مند ہوئے۔ یہ قلعہ بہت بڑا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابراہیم غزنوی کی فوج نے یہاں سے تقریباً ایک لاکھ افراد گرفتار کیے۔

ابراہیم غزنوی سے قبل غزنوی اور سلجوقی سلطنتوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر خصوصاً پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں شورشیں بہت زور پکڑ گئی تھیں۔ ان کے دور میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو پنجاب سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ ابراہیم کی عمدہ منصوبہ بندی، شاندار قائدانہ صلاحیت اور بہادری کی وجہ سے دہلی تک کا علاقہ غزنی کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ابراہیم کی فوجوں نے بنارس اور سہارنپور تک کامیاب حملے کیے۔ ان کی سلطنت اتنی وسیع تو نہ تھی جتنی ان کے دادا محمود غزنوی نے قائم کی تھی لیکن پھر بھی اس میں مشرقی افغانستان، موجودہ پنجاب اور دہلی کے علاقے شامل تھے اور یہ ایک مستحکم اور خوشحال ریاست تھی۔

ابراہیم غزنوی نے غور کے علاقے پر بھی فوج کشی کی تھی۔ غور کے علاقے پر ایک شخص عباس حکمران تھا۔ یہ ایک ظالم اور مفاد پرست شخص تھا جس سے رعایا بہت نالاں تھی۔ جب اس کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو رعایا نے ایک وفد ابراہیم غزنوی کے پاس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس ظلم سے نجات دلائیں۔ ابراہیم غزنوی نے غور پر چڑھائی کی۔ جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں عباس نے ہتھیار ڈال دیے اور خود کو ابراہیم غزنوی کی فوج کے حوالے کر دیا۔ اسے غزنی لایا گیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم چاہتے تو غور کے علاقے کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ عباس کے لڑکے محمد کو غور کا حکمراں بنا دیا۔ محمد نے نہایت عدل اور خوش اسلوبی سے حکومت کی۔

ابراہیم غزنوی کے زمانے میں شہر آگرہ بھی تسخیر ہوا۔ اس وقت یہاں راجا جے پال کی حکومت تھی جو راجپوت تھا۔ آگرہ ایک مضبوط قلعے کے اندر واقع تھا جو بڑے بڑے پتھروں اور لوہے کی مدد سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے سیف الدولہ کو فوج دے کر آگرہ کی جانب بھیجا کیونکہ جے پال نے کھلم کھلا بغاوت کر دی تھی۔ موسم بہار میں کی گئی اس فوج کشی کے نتیجے میں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ راجپوتوں نے جب سلطنتِ غزنویہ کی اطاعت قبول کر لی تو ابراہیم غزنوی نے انہیں ولایت بیانہ کا والی بنا دیا اور آگرہ پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ آگرہ کا موجودہ قلعہ بعد میں شہنشاہ اکبر نے ۹۷۲ھ تا ۹۸۰ھ / ۱۵۶۵ء تا ۱۵۷۳ء کے عرصے میں تعمیر کروایا۔ ابراہیم غزنوی کے زمانے میں جالندھر سے آگے بھی ایک فوجی مہم بھیجی گئی تھی جس کے قائد ابوالنصر ہبتہ اللہ تھے۔

شہر لاہور کو اس کا موجودہ نام ابراہیم غزنوی ہی کے عہد میں دیا گیا۔ لاہور کی ترقی کا آغاز تو ابراہیم کے دادا، محمود غزنوی ہی کے دور میں ہو گیا تھا لیکن اسے باقاعدہ ترقی ابراہیم کے عہد میں دی گئی اور یہ شہر علم و ادب کا دبستان بن گیا۔ محمود غزنوی نے اس شہر کا نام محمود پور رکھا لیکن محمود غزنوی کی وفات (۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے بعد شہر کا عام نام "لاہور" مشہور ہو گیا۔ تمام شعرا اور مصنفین اس شہر کا یہی نام استعمال کرنے لگے اگرچہ مختلف تلفظ رائج تھے۔ مثلاً مؤرخ بیہقی نے اپنی کتاب تاریخ بیہقی میں اس شہر کو لاہور کے علاوہ لوہور اور لہور بھی لکھا ہے۔ ابراہیم غزنوی کے عہد کے معروف شاعر ابوالفرج رونی نے اپنے اشعار میں اس شہر کا نام لوہاور لکھا ہے۔ اسی زمانے کے بے حد مشہور شاعر مسعود سعد سلمان نے اپنے شعروں میں کئی مقامات پر لاہور کا ذکر کیا ہے لیکن کہیں اسے لہاور لکھا ہے کہیں لہاور، لوہاور، لاوہور، لاہور لکھا ہے، اگرچہ کہیں کہیں ضرورتِ شعری سے بھی کام لیا گیا ہے۔ بہر حال لاہور کا موجودہ نام ابراہیم غزنوی کے عہد میں مقبول ہوا۔ ابراہیم غزنوی نے اپنے لائق بیٹے سیف الدولہ کو ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء میں لاہور کے صوبے کا والی (گورنر) مقرر کیا۔ سیف الدولہ ایک بہادر حکمران تھے۔ انہوں نے لاہور کو خاصی ترقی اور وسعت دی۔

Marfat.com

غزنوی دور ہی میں یا اس سے ذرا قبل لاہور کی تاسیس ہوئی اور اس شہر کو پہلی مرتبہ تہذیبی اور سیاسی اہمیت بھی اس زمانے میں حاصل ہوئی۔ اسی کے ساتھ یہ شہر علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ لاہور کی یہ علمی اور ادبی حیثیت آج تقریباً ہزار برس گزر جانے کے بعد بھی قائم ہے۔

اسی زمانے میں ایک جانب لاہور میں فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور دوسری جانب ہندی بولنے والے افراد میں فارسی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ غزنی اور لاہور کے گہرے تعلقات کے نتیجے میں لاہور کو "غزنہ صغیر" (چھوٹا غزنی) بھی کہا جانے لگا۔ اس اختلاط کے باعث فارسی داں شاعر، ہندی زبان میں بھی شعر کہنے لگے۔ ابراہیم غزنوی کے عہد کے معروف شاعر مسعود سعد سلمان کا ایک دیوان ہندی زبان میں بھی ہے۔ اسی دور میں مقامی ہندی زبان میں فارسی کے الفاظ کی آمیزش بڑے پیمانے پر ہوئی۔ ابراہیم غزنوی کا یہی چالیس سالہ دور حکومت ہے جس میں لاہور فارسی شاعری کا دبستان بن گیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہی وہ زمانہ ہے جب عربی، ہندی اور فارسی کی آمیزش سے اردو کے خدوخال ابھرنے لگے تھے۔ غزنوی عہد میں فارسی شعر و ادب کو تو فروغ حاصل ہوا ہی تھا، اس زمانے میں برصغیر میں عربی کو بھی دینی، ادبی اور تہذیبی حیثیت حاصل رہی تھی اور کئی شعراء ایک وقت عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان میں عربی کے ایک شاعر ابوالعطا بن یعقوب الغزنوی کو شہرت حاصل ہوئی۔ جب ابراہیم برصغیر آئے تو ابوالعطا ان دنوں لاہور کے قید خانے میں تھے۔ ابوالعطا بہت اچھے شاعر تھے۔ مسعود سعد سلمان نے ان کی تعریف میں قصیدہ کہا ہے اور ان کی وفات پر مرثیہ لکھا۔ ابوالعطا کا انتقال ۴۹۱ھ / ۱۰۹۷ء میں ہوا۔

ابراہیم غزنوی کے عہد کی ایک نہایت محترم اور معروف شخصیت حضرت علی ہجویریؒ کی ہے جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ ابراہیم غزنوی کے والد مسعود غزنوی کے دورِ حکومت میں لاہور تشریف لائے اور اپنی بقیہ عمر یہیں بسر فرمائی۔ لاہور اور اس کے اطراف، دور تک اسلام کا پیغام آپؒ کی کوششوں سے پھیلا۔ لاہور کا ہندو نائب رائے راجو آپؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ حضرت علی ہجویریؒ کی معرکہ آراء کتاب "کشف المحجوب" صوفیانہ ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ آپ شاعر بھی تھے لیکن آپ کا دیوان ضائع ہو چکا ہے البتہ آپ کے متعدد اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ نے دیگر نو عدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں لیکن یہ کتابیں بھی اب دستیاب نہیں ہیں۔ حضرت علی ہجویریؒ کا سنہ وفات ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء مشہور ہے لیکن تحقیق سے یہ بات قرین قیاس ہے کہ آپؒ کا سنہ وفات ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ / ۱۰۸۸ء اور ۱۱۰۲ء کے درمیان ہے۔

ابراہیم غزنوی کے دور کی ایک معروف ادبی شخصیت مسعود سعد سلمان کی ہے۔ مسعود سعد سلمان کے آباؤ اجداد ہمدان سے تعلق رکھتے تھے۔ غزنوی عہد کے آغاز میں وہ لاہور آکر آباد ہو گئے۔ لاہور ہی میں مسعود سعد سلمان کی پیدائش ۴۳۸ھ اور ۴۴۰ھ / ۱۰۴۶ء اور ۱۰۴۸ء کے درمیان عمل میں آئی۔ مسعود کے والد سعد سلمان علم و فضل میں بڑا نام رکھتے تھے۔ وہ ساٹھ برس تک غزنوی حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مسعود نے عربی اور فارسی کی تعلیم والد سے پائی اور ہندی ایک ہندی عالم سے پڑھی۔ والد کی وفات کے بعد وہ غزنوی حکومت سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں سلطنت غزنی کے حکمران ابراہیم غزنوی تھے۔

ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے سیف الدولہ کو ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء میں صوبہ لاہور کا حکمران مقرر کیا اور برصغیر میں فتوحات کی ذمہ داری سونپی تو مسعود سعد سلمان کو دیوان رسالت کے اندر شاہی کتب خانے کے منتظم کا اہم منصب دیا گیا۔ مسعود سلمان نے متعدد علمی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ سیف الدولہ کی کئی مہمات میں عملی حصہ بھی لیا۔ سیف الدولہ نے آگرہ فتح کیا تو مسعود سعد سلمان نے شاندار قصیدہ کہا۔ مسعود سعد سلمان کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخ کو محفوظ کرنے کا باعث بن گئی ہے۔ جب سیف الدولہ برصغیر سے لوٹ کر غزنی روانہ ہوئے تو مسعود سعد سلمان ان کے ساتھ تھے۔ جس راستے سے وہ غزنی پہنچے، اسے بھی انہوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔

مسعود سعد سلمان کئی برس تک سیف الدولہ کے شانہ بشانہ خدمات انجام دیتے رہے پھر ان کے بعض مخالفین نے حکام کے کان بھر دیے چنانچہ مسعود کے دورِ ابتلا کا آغاز ہو گیا۔ مسعود پر ان کے حریف شعرا اور امراء نے بعض سیاسی نوعیت کے الزامات بھی عائد کیے چنانچہ مسعود کو ہندوستان کے قلعہ دھک میں قید کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بعد میں انہیں قلعہ سو میں قید کرا دیا گیا جو ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعہ سو میں ایک بوڑھا شخص بہرام بھی قید تھا۔ اس شخص سے مسعود نے علم نجوم سیکھا۔ قلعہ سو سے مسعود کو قلعہ نای میں منتقل کیا گیا۔ یہ قلعہ بے حد مضبوط تھا اور ایک بلند مقام پر تعمیر کیا گیا تھا۔

Marfat.com

دس سال کی قید کے بعد مسعود کو رہائی نصیب ہوئی۔ ابراہیم غزنوی کی وفات کے بعد مسعود بن ابراہیم نے حکومت سنبھالی۔ ان کے بیٹے عضد الدولہ شیر زاد نے جب جالندھر فتح کیا تو مسعود سعد سلمان کو جالندھر کا حاکم مقرر کر دیا۔ مسعود سعد سلمان کا انتقال ۵۱۵ھ/۱۱۲۰ء میں ہوا۔ مسعود سعد سلمان کا شمار صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ برصغیر کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عربی اور فارسی کے ساتھ ہندی میں بھی شاعری کی۔ انہوں نے ہندی زبان میں ایک دیوان بھی مرتب کیا جو اب دستیاب نہیں ہے۔ مسعود نے ایک نئی صنفِ سخن پر بھی طبع آزمائی کی۔ اس صنف کو انہوں نے "شہر آشوب" کا نام دیا۔ "شہر آشوب" میں اس وقت کے معاشرے کے خدوخال بڑی خوبی سے نمایاں کیے گئے ہیں۔ اس نظم سے اس زمانے میں رائج پیشوں مثلاً عطار، تاجر، بڑھئی، نانبائی، زرگر، دیباباف، فصاد، قاضی، فال گیر، پہلوان، چاہ کن، موسیقار اور نقاش وغیرہ کا تعارف بھی سامنے آتا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے ہندی "بارہ ماسے" کی طرز پر ایرانی مہینوں کو موضوع بنا کر قطعات بھی لکھے جن میں مہینوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس صنف کو انہوں نے "ماہ ہای فارسی" کا نام دیا۔ مسعود کا فارسی دیوان مشہور صوفی شاعر سنائی نے ترتیب دیا۔ یہ دیوان اٹھارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

مسعود سعد سلمان کی تعریف میں اس دور کے نامور شعرا ابوالفرج رونی، دشتیاری سمرقندی، عثمان مختاری غزنوی، امیر معزی اور سنائی نے بہت اچھے قصائد کہے ہیں، جن میں مسعود سعد سلمان کے علم وفضل کا اعتراف کیا گیا ہے۔

ابراہیم غزنوی کے عہد کی ایک اور بہت بلند پایہ علمی شخصیت ابوالفرج رونی کی ہے۔ ابوالفرج رونی کو برصغیر پاک وہند کا پہلا ممتاز شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ فارسی زبان کے اساتذۂ سخن میں سے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ "رونی" کا حوالہ ان کے شہر "رونہ" یا "روئن" کی مناسبت سے ہے۔ غزنوی دور میں رونہ یا روئن کے نام سے ایک قصبہ لاہور کے نواح میں واقع تھا۔ اب اس قصبے کا نام ونشان نہیں ملتا۔ ابوالفرج رونی کی عمر ۶۴ برس اور سنہ وفات ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء بیان کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی پیدائش ۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء میں ہوئی ہوگی۔

ابوالفرج کو شہرت اور مقبولیت ابراہیم غزنوی ہی کے دور میں حاصل ہوئی۔ اس دور میں لاہور کے والی نجم الدین زریر شیبانی اور پھر ابراہیم غزنوی کے دو فرزند سیف الدولہ مسعود اور علاؤالدولہ مسعود یکے بعد دیگر مقرر کیے گئے۔ ابوالفرج رونی کا کلام بھی تاریخ کے معتبر حوالوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا کلام ان کی وفات کے دو سو برس بعد تک بھی مقبول رہا اور آج بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فارسی کے اوّل درجے کے شاعر انوری تک ان کی عظمت کے معترف ہیں، وہ ان کی پیروی کرتے رہے اور ان کے کلام کا اکثر مطالعہ کیا کرتے تھے۔

ابراہیم غزنوی کے عہد کی ایک ممتاز علمی شخصیت ابوالفضل محمد بن الحسین بیہقی کی ہے۔ ان کا تعلق خراسان میں نیشاپور کے مغرب میں واقع ضلع بیہق سے تھا۔ وہ ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں پیدا ہوئے اور صفر ۴۷۰ھ/اگست ۱۰۷۷ء میں وفات پائی۔ انہیں فارسی زبان کا سب سے بڑا مورخ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ غزنوی حکمرانوں کے ساتھ گزارا۔ وہ ان دبیروں میں شامل تھے جو غزنوی سلطنت کے محکمۂ مراسلات (سیکریٹریٹ) کے صدر خواجہ ابو نصر بن مشکاں کے تحت کام کرتے تھے۔ اہم ترین خطوط کی تیاری ان ہی کے سپرد تھی۔

وہ بیس برس تک غزنوی سلطنت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد ۴۵۱ھ/۱۰۵۹ء میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب جامع التواریخ لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ کتاب انہوں نے تیس جلدوں میں مکمل کی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے چشم دید واقعات کو نہایت دیانت اور حق گوئی کے ساتھ ادبی زبان میں صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا۔ اس کتاب کا ہر حصہ کسی نہ کسی غزنوی حکمراں کے نام پر تھا۔ بدقسمتی سے اب اس قیمتی تصنیف کی صرف چھ جلدیں دستیاب ہیں۔ اس کا آغاز ناصر الدین سبکتگین کے دور ۳۶۷ھ/۹۷۷ء سے ہوتا ہے اور مسعود کے جانشینوں کے زمانے کی تاریخ پر اختتام پذیر ہوتا ہے جس میں ابراہیم غزنوی کی سلطنت کے آغاز تک کے حالات یعنی مودود، مسعود دوم، ابوالحسن علی، عبدالرشید اور فرخ زاد کے عہد تک کے حالات (۴۳۲ھ تا ۴۵۱ھ/۱۰۴۰ء تا ۱۰۵۹ء) بیان کر دیے گئے ہیں۔

بیہقی نے اپنی اس تاریخ کے آخر میں مشہور عالم البیرونی کی کتاب المسامرہ فی اخبار خوارزم کو ہو بہو شامل کر دیا تھا۔ اس کتاب کا سراغ کسی اور جگہ نہیں ملتا لیکن افسوس کہ تاریخ بیہقی کی دسویں جلد اب دستیاب نہیں، اس لیے البیرونی کی یہ اہم کتاب جو تاریخ خوارزم سے متعلق ہے اپنی اصلی حالت میں آج کی دنیا تک نہیں پہنچ سکی۔

Marfat.com

بیہقی نے مزید دو اہم کتب بھی تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک "مقامات ابونصر مشکان" ہے۔ اس میں وہ تاریخی واقعات درج کیے گئے ہیں جنہیں بیہقی نے اپنے استاد اور محمود مسعود غزنوی کے محکمۂ مراسلات کے مہتمم ابو نصر مشکاں سے سنا۔ دوسری کتاب "زینۃ الکتاب" یا "رتبتہ الکتاب" ہے۔ یہ کتاب انشاپردازی اور نامہ نویسی کے فن پر ہے۔ بیہقی شاعر بھی تھے۔

ابراہیم غزنوی کے عہد کی ایک اور ممتاز شخصیت ابو نصر فارسی کی ہے۔ ان کا پورا نام قوام الملک نظام الدین ہبتہ اللہ تھا۔ وہ لاہور میں نائب السلطنت رہے اور ابراہیم غزنوی کے آخری زمانے میں وزیر بنا دیے گئے تھے۔ مسعود سعد سلمان ان کے خاص رفقا میں سے تھے۔ لاہور کو فارسی کا دبستان بنانے اور اس کی تربیت میں ابو نصر فارسی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ابو نصر فارسی کا انتقال ۵۰۹ھ اور ۵۱۱ھ / ۱۱۱۵ء اور ۱۱۱۷ء کے درمیان ہوا۔

ابراہیم غزنوی کے عہد کے ایک اور مشہور شاعر مختاری ہیں۔ ان کا پورا نام سراج الدین عثمان بن محمد المختاری ہے۔ معروف شاعر سنائی ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ سنائی کی کئی تصانیف میں مختاری کے کلام کا اثر نمایاں ہے۔ اسی دور کے ایک نامور شاعر ابو حنیفہ اسکافی بھی تھے۔

ابراہیم غزنوی کے عہد میں بھی مملکت کو سیاسی اعتبار سے صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر صوبے میں حاکم مرکز کی جانب سے مقرر کیا جاتا تھا۔ امورِ مملکت کو انجام دینے کی غرض سے صدرِ اعظم (وزیر اعظم) وزیر مالیہ، وزیر دیوان وغیرہ موجود تھے۔ وزارتِ دفاع کا محکمہ سپہ سالار کے ماتحت تھا۔ محکمۂ سفارت اور دفتر تحریرات، دبیر بزرگ کے سپرد تھے۔ خازن اور کوتوال کے محکمے بھی تھے۔ محکمۂ ڈاک، محکمۂ سراغرسانی اور پولیس کا محکمہ بھی قائم تھا۔

غزنوی دور میں فنِ تعمیر کو خاص طور پر فروغ حاصل ہوا اور مختلف دستکاریوں کے فنون کو ترقی ملی۔ اس دور میں غزنی، بُست، ہرات اور نیشاپور میں جو تعمیرات ہوئیں وہ فنِ تعمیر کا شاہکار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ سب عمارتیں اب ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں اور ان عظیم آثار پر کوئی عمدہ تحقیقی کام بھی نہیں ہوا ہے، تاہم جو کچھ بھی تحقیق ہوئی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ غزنوی فنِ تعمیر میں مخروطی شکل کی اینٹیں استعمال ہوتی تھیں جو کتبات اور آرائشی کام سے مرصع ہوتی تھیں۔ نیز ہندسی اشکال کے زنجیرے، جلی کوفی خط میں خطاطی، پیچ در پیچ پتوں کے بیل بوٹے نظر آتے ہیں۔ محلوں میں یشب اور سنگ مرمر اور سرخ شنگرف کی استرکاری ہوتی تھی۔ اس دور کا فنِ تعمیر خراسانی اور سامانی طرزِ تعمیر سے مشابہ ہے، کیونکہ مشرقی ایران کے علاقے غزنوی مملکت کے ساتھ ملے ہوئے تھے البتہ بعد میں غزنوی تعمیرات میں سلجوقی رنگ بھی جھلکنے لگا۔

ابراہیم غزنوی کے دور کے بڑے شہروں میں غزنی (اسے اس زمانے میں غزنہ کہا جاتا تھا) لاہور اور بُست بہت نمایاں ہیں۔ غزنہ دارالحکومت تھا۔ اسے سبکتگین، محمود غزنوی اور مسعود غزنوی نے خوب ترقی دی اور ابراہیم غزنوی نے بھی اسے برقرار رکھا۔ شہر کے گرد فصیل تھی، اس میں چار دروازے تھے۔ شہر کے نواح میں ایک قصبہ تھا جو ربض کہلاتا تھا۔ اس میں منڈیاں اور مکانات تھے۔ شہر میں عالی شان عمارتیں اور مساجد تعمیر کی گئی تھیں۔ جامع مسجد عروس الفلک کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ تھا جس میں شاندار کتب خانہ بھی تھا۔

بُست کا شہر افغانستان کے جنوبی علاقے میں قندھار سے ہرات جانے والی شاہراہ کے نزدیک دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا۔ قدیم شہر اب تو صرف کھنڈرات کا مجموعہ ہے لیکن ابراہیم غزنوی کے عہد میں یہ ایک بارونق اور بڑا شہر تھا اور دو دریاؤں یعنی دریائے ہلمند اور دریائے ارغنداب کے درمیان واقع ہونے کے باعث بڑا زرخیز خطہ تھا۔ یہاں میوے دار درختوں کے باغات تھے۔ شاندار عمارتیں تھیں۔ بڑے بازار تھے۔ یہاں جو کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں ان میں سے ایک کا سلسلہ سات کلومیٹر طویل اور بعض مقامات پر دو کلومیٹر چوڑا ہے۔

ابراہیم غزنوی کے عہد میں شہر لاہور کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ اس شہر میں عبدالحمید، جو بعد میں وزیر سلطنت بنائے گئے، ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے لاہور کے انتظامات میں اہم کردار ادا کیا۔ منصور بن سعید اور الملک ظاہر ابن علی بھی لاہور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ الملک ظاہر ابن علی نے لاہور کو ترقی دی۔ ابو الرشد رشید محتاج، ابراہیم غزنوی کے خاص مشیر تھے۔ وہ لاہور میں صدر دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کے صاحب زادے شہاب الدین محمد بھی عالم فاضل شخص تھے۔ لاہور کے نائب السلطنت ابو نصر فارسی نے شہر میں ایک خانقاہ بنوائی تھی جو صدیوں تک مشہور رہی۔ رشید محتاج نے لاہور میں ایک شاندار قصر تعمیر کروایا تھا۔ اس کے علاوہ مسعود سعد سلمان نے بھی ایک عمدہ محل تعمیر کروایا تھا۔

Marfat.com

ابراہیم غزنوی بے حد متقی، دین دار اور منکسر المزاج حکمراں تھے۔ وہ نہ صرف فرائض کی سختی سے پابندی کرتے تھے بلکہ نوافل کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ہر سال رمضان ہی کے نہیں بلکہ رجب اور شعبان کے روزے بھی رکھتے تھے۔ ابراہیم ایک اعلیٰ درجے کے خطاط بھی تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے انہیں اتنی عقیدت تھی کہ وہ ہر سال کلام پاک کے ایک نسخے کی خطاطی کرتے اور اسے حرم شریف بھجوادیتے، ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے مدینہ منورہ کے کتب خانے میں سیکڑوں برس تک موجود رہے۔

ابراہیم غزنوی علماکرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے دور میں امام یوسف سجاوندی درس دیا کرتے تھے۔ امام صاحبؒ ابراہیم غزنوی کو مخاطب کرکے بہت سخت باتیں بھی کہہ دیتے تھے لیکن ابراہیم یہ تمام باتیں سر جھکا کر سن لیا کرتے تھے۔ ابراہیم غزنوی کو علماکرام سے جو دلی تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام بیٹیوں کی شادیاں علماکرام اور اہل علم و فن سے کیں۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی مشہور مورخ منہاج السراج کے پردادا ابراہیم جوزجانی سے ہوئی جو ایک زبردست عالم تھے۔

علم کی ترویج سے بھی ابراہیم کو خاص دلچسپی تھی۔ انہیں محلوں کی تعمیر سے زیادہ ایسی عمارتیں تعمیر کروانا پسند تھا جو عام افراد کے لیے مفید ثابت ہوں۔ انہوں اپنے دورِ حکومت میں چار سو سے زائد تعلیمی ادارے، سرائیں اور مساجد تعمیر کروائی تھیں۔ ابراہیم غزنوی نے غزنی میں ایک بہت اچھا اسپتال بھی قائم کیا تھا۔ اس اسپتال میں علاج معالجہ بلامعاوضہ کیا جاتا تھا۔ یہاں مریضوں کو دواؤں کے علاوہ غذا بھی مفت فراہم کی جاتی تھی۔ خاص طور پر آنکھوں کے امراض کی بہت اچھی دوائیں یہاں دستیاب تھیں۔ ابراہیم غزنوی نے چند شہر بھی تعمیر کروائے۔ ان میں سے ایمن آباد اور خیر آباد کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے۔ خیر آباد دریائے اٹک کے کنارے ضلع پشاور میں آج بھی آباد ہے۔ یہاں اس نام کا ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں ایک قصبہ تھا۔

ابراہیم غزنوی بہت درد مند حکمراں تھے۔ انہیں رعایا کے مسائل کی فکر رہتی تھی۔ وہ رات میں غزنی کے محلوں میں خود گشت کرتے تھے اور ضرورت مندوں کو تلاش کرکے ان کی مدد کرتے تھے۔ بعض مورخین نے ان کی دینداری اور سادگی پسندی کی وجہ سے انہیں ولی اللہ بھی کہا ہے۔

ابراہیم کا انتقال ۵ شوال ۴۹۲ھ/ ۲۵ اگست ۱۰۹۹ء کو ہوا۔ انہیں غزنی کے باغِ فیروزہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

شہاب الدین غوری

برصغیر میں متحدہ اسلامی حکومت کے بانی

ایک کھلے مقام پر تمام سپاہی جمع تھے!

ان کے اطراف دور دور تک خیمے تنے ہوئے تھے، تمام سپاہی مؤدب ہو کر بیٹھے تھے۔ آج ہفتہ وار وعظ کا دن تھا۔ چند لمحوں بعد ایک بزرگ منبر کی سمت بڑھتے نظر آئے۔ درمیانہ قد اور مضبوط جسم والے ان بزرگ کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی۔ منبر پر بیٹھنے کے بعد بزرگ نے اپنی قوی اور پُرجوش آواز میں وعظ کا آغاز کر دیا۔ ان کے وعظ کرنے کا انداز متاثر کن تھا۔ ان کی آواز کے اتار چڑھاؤ، چہرے کے تاثرات اور حکمت سے بھرپور کلمات نے حاضرین پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ تمام سپاہی، افسر، سالار اور دیگر حضرات ہمہ تن گوش ہو کر وعظ سن رہے تھے۔ اچانک بزرگ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک خوش شکل اور باریش شخص کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اے سلطان! نہ ترا اقتدار قائم رہے گا اور نہ رازی کا تملق و نفاق باقی رہے گا۔ ہم سب کو اللہ کے پاس واپس جانا ہو گا۔"

بزرگ کے ان الفاظ میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ خوش شکل شخص زار و قطار رونے لگا۔

اپنے دل میں خوفِ خدا رکھنے والے یہ حکمراں تھے، شہاب الدین غوری، جن کے مسلسل جہاد کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں ایسی مضبوط اور مستحکم اسلامی حکومت قائم ہوئی جو چھ سو برس تک برقرار رہی، اور جن بزرگ کے وعظ کے ایک جملے سے شہاب الدین غوری پر گریہ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، وہ تھے مشہور مفسر اور عالم دین امام فخر الدین الرازی، وہ شہاب الدین غوری کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ شہاب الدین غوری ان سے دینی رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

شہاب الدین غوری کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے ملحد فرقوں کا بڑی حد تک قلع قمع کر دیا اور انتشار و بدنظمی دور کر کے مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایسی وسیع مملکتِ اسلام قائم کر دی جس کی حدود موجودہ افغانستان، ایران کے کچھ حصوں، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کا احاطہ کرتی تھیں۔

شہاب الدین غوری کا اصل نام محمد غوری ہے۔ بچپن میں انہیں شہاب الدین کہا جاتا تھا، جب ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء میں شہاب الدین کے بڑے بھائی غیاث الدین غوری نے غزنی فتح کیا تو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو غزنی کا حکمراں بنا دیا اور انہیں معز الدین کا لقب دیا، لیکن تاریخ نے معز الدین کو شہاب الدین کے نام سے یاد رکھنا زیادہ پسند کیا چنانچہ وہ اپنے اسی نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ غور کے علاقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ غوری کہلاتے ہیں۔ غور کو غورستان بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ موجودہ افغانستان کے شہر ہرات سے ۱۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

غور کے علاقے پر غزنوی خاندان کی حکمرانی تھی۔ اس کے بعد یہاں غوریوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ پہلے غوری حکمران سیف الدین محمد سوری تھے۔ ان کے بعد علاؤالدین جہاں سوز اور پھر ان کے بیٹے نے حکومت کی۔ ان کا بھی نام سیف الدین تھا۔ سیف الدین کو کسی نے قتل کر دیا جن کے بعد امر آنے غیاث الدین غوری کو حکمران تسلیم کر لیا۔ غیاث الدین کا اصل نام شمس الدین ہے۔

شہاب الدین، دین کا اچھا علم اور دل میں ایمان کی تڑپ رکھتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اطراف کے حالات اور مستقبل پر ان کی نظر تھی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ملتان کے علاقے میں قرامطہ کی

Marfat.com

سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ ملحد لوگوں کا بڑا گروہ تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آئے دن شورشیں برپا کرتا رہتا تھا۔ اس سے پہلے محمود غزنوی نے بھی قرامطہ کے خلاف جہاد کیا تھا، لیکن محمود غزنوی کے بعد قرامطہ کو ابھرنے کا پھر موقع مل گیا۔ شہاب الدین نے جہاد کا آغاز انہی قرامطہ کے خلاف کارروائی سے کیا۔ وہ لشکر لے کر ملتان پر حملہ آور ہوئے۔ قرامطہ نے زبردست مقابلہ کیا لیکن آخرکار وہاں سے بھاگ کر اُچ کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ بعض مؤرخین نے قرامطہ کی جگہ "ملاحدہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "ملاحدہ" کی تعریف میں قرامطہ، باطنی عقائد رکھنے والے، فدائین وغیرہ سب ہی آجاتے ہیں۔

ملتان ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء میں فتح ہوا۔ شہاب الدین نے اپنے سالار علی کرماخ کو ملتان کا حاکم مقرر کیا، پھر اُچ (بھاولپور) پر حملہ کیا۔ اُچ پر بھٹی قبیلے کا ایک راجا حکومت کر رہا تھا۔ شہاب الدین کی فوج نے اچ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور قلعہ فتح کر لیا گیا، اس طرح ملاحدہ کی شورشیں خاصی حد تک کم ہو گئیں۔ جب شہاب الدین، علی کرماخ کو ملتان کی حکومت سونپ کر واپس غزنی چلے گئے تو گجرات کے علاقے نہروالہ (انہلواڑہ) کے راجا بھیم دیو اور ملاحدہ نے آپس میں سازباز کر لی اور مل کر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں انہوں نے علی کرماخ سے ملتان کا علاقہ چھین لیا۔ یہ اطلاع ملتے ہی شہاب الدین، ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷ء کے آخر میں، غزنی سے روانہ ہو کر ملتان پہنچے اور یہاں سے انہوں نے نہروالہ کا رخ کیا تاکہ راجا بھیم دیو کو اس کی سازشوں کی سزا دیں۔

شہاب الدین گجرات تک کے سفر کی صعوبتوں کا ٹھیک طور پر اندازہ نہ کر سکے، راستے میں تپتا ہوا صحرا تھا، چنانچہ اسلامی لشکر کو خاصی مشکلات پیش آئیں۔ گجرات کے راجا بھیم دیو نے جم کر مقابلہ کیا، شہاب الدین اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکے اور انہیں غزنی لوٹ آنا پڑا۔

۵۷۵ھ / ۱۱۷۹ء میں شہاب الدین نے بکرام، پرشور اور فرسور کے علاقوں پر قبضہ کیا۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں اب پشاور موجود ہے۔ اس سے اگلے برس شہاب الدین نے محسوس کیا کہ گجرات کے راجا کی طرف سے ملاحدہ کو جو امداد ملتی ہے، اس کی روک تھام کا طریقہ یہی ہے کہ سندھ کا علاقہ فتح کیا جائے، چنانچہ شہاب الدین نے جنگی تیاریاں کیں اور ۵۷۶ھ / ۱۱۸۰ء میں ان کی سپاہ سندھ کے مشہور شہر دیبل پر حملہ آور ہو گئی۔ یہ شہر سمندر کے کنارے آباد تھا، کہتے ہیں، سندھ میں بھنبھور کے موجودہ کھنڈرات اسی شہر دیبل کو ظاہر کرتے ہیں۔

دیبل کے ساتھ ساتھ شہاب الدین نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا تمام علاقہ بھی فتح کر لیا اور دیبل میں ایک ماتحت مقرر کر کے وہ واپس چلے گئے۔ اس فتح کا فائدہ یہ ہوا کہ گجرات کے حاکم کی طرف سے ملاحدہ کو سندھ کے راستے امداد کی فراہمی بند ہو گئی۔

سنہ ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین لاہور پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ انہوں نے علی کرماخ کو ملتان کے ساتھ پنجاب کے صوبے کی حکومت بھی سونپ دی۔ اب تقریباً وہ پورا علاقہ شہاب الدین غوری کی قلمرو کا حصہ بن چکا تھا جو موجودہ پاکستان پر مشتمل ہے۔

شہاب الدین دیکھ رہے تھے کہ ہندو راجا مسلسل ملاحدہ کے ساتھ سازشیں کر کے مسلمانوں کے خلاف کارروائی کرتے رہتے ہیں اور ان راجاؤں نے شمالی ہندوستان کے اس تمام علاقے پر بھی قبضہ کر رکھا ہے جنہیں محمود غزنوی نے تسخیر کیا تھا، اس لیے شہاب الدین نے ضروری سمجھا کہ ان شرپسند راجاؤں کے خلاف پرچم جہاد بلند کیا جائے اور ان سے جنگ کر کے وہ تمام علاقے واپس لے لیے جائیں جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر شہاب الدین نے ۵۸۷ھ / ۱۱۹۲ء میں بھٹنڈہ پر حملہ کیا اور قلعہ فتح کر لیا۔ بھٹنڈہ میں ملک ضیاالدین کو حاکم مقرر کر کے وہ غزنی واپس روانہ ہوئے ہی تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ دہلی اور اجمیر کا راجا، پرتھوی راج بہت بڑا لشکر لے کر بھٹنڈہ واپس حاصل کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت شہاب الدین کے ساتھ بہت تھوڑی فوج تھی، لیکن صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے پرتھوی راج کے لشکر کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

پرتھوی راج کوئی معمولی راجا نہ تھا، وہ ایک بہادر اور کامیاب سپاہی تھا، اس کی حکومت دہلی اور اجمیر سمیت بڑے علاقے پر قائم تھی، ہندوؤں کے عوامی گیتوں میں اس کی بہادری کے چرچے تھے۔ پھر اس کے ساتھ فوج بھی بہت بڑی تھی، لیکن شہاب الدین ان باتوں سے پریشان نہیں ہوئے اور انہوں نے خود اس جانب پیش قدمی شروع کر دی جس طرف سے پرتھوی راج کا لشکر آ رہا تھا۔

ترائن کے میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئیں۔ بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ترائن اب تراوڑی یا تلاوڑی کہلاتا ہے اور یہ مقام تھانیسر سے ۱۴ میل دور ہے، لیکن بعض دیگر مؤرخین نے سختی کے ساتھ اس بات کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ

Marfat.com

تھانیسر بھٹنڈہ سے ۱۰۰ میل دور جنوب مشرق میں ہے، اس لیے یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ شہاب الدین نے بھٹنڈہ فتح کرنے کے بعد اتنی دور پہنچ کر پرتھوی راج سے جنگ کی ہوگی۔ ان مؤرخین کا اصرار ہے کہ ترائن، موجودہ سرسا اور بھٹنڈہ کے درمیان واقع ہے۔ بھٹنڈہ سے ۲۷ میل دور ایک گاؤں "تراونا" کے نام سے موجود ہے خیال ہے کہ یہی ترائن کہلاتا تھا۔

پرتھوی راج کی فوج کیا تھی، لشکریوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، تین ہزار جنگی ہاتھیوں کی موجودگی نے اس لشکر کو مزید خوفناک بنادیا تھا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ مسلمان جم کر لڑ رہے تھے لیکن راجپوتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بہت سے مسلمان سپاہی شہید ہوگئے۔ شہاب الدین نے اپنی تھوڑی سی فوج سمیٹ کر بھرپور حملہ کیا اور وہ دشمن کی صفوں کو مردانہ وار چیرتے ہوئے اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں پرتھوی راج کا بھائی اور ان کی فوج کا سپہ سالار کھانڈے رائے، ہاتھی پر بڑی شان سے براجمان تھے، شہاب الدین نے نیزہ سنبھال کر کھانڈے رائے پر حملہ کیا۔ نیزے کی ضرب اتنی شدید تھی کہ کھانڈے رائے کے کئی دانت ٹوٹ کر اس کے حلق میں جاگرے، مگر کھانڈے رائے نے بھی سنبھل کر جوابی وار کیا، شہاب الدین زخمی ہوگئے، قریب تھا کہ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑتے، لیکن اسی وقت ایک وفادار غلام نے غیر معمولی پھرتی دکھائی اور وہ جست لگا کر شہاب الدین کے گھوڑے پر سوار ہوگیا، ایک ہاتھ سے اس نے اپنے زخمی سالار کو سنبھالا، دوسرا ہاتھ باگ پر رکھا اور دشمنوں کی خون آشام تلواروں اور نیزوں کی پروا کیے بغیر گھوڑا بھگا لے گیا۔ بعد میں اس نے اپنے زخمی آقا کو محفوظ مقام پر پہنچادیا۔

اگرچہ ترائن کی اس جنگ میں مسلمان کامیابی حاصل نہ کر سکے لیکن مسلمان سپاہیوں کی بے مثال بہادری اور موت سے بے خوفی کی دھاک بیٹھ گئی اور مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے، یہی وجہ ہے کہ جب پرتھوی راج نے ترائن کی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہانسی کے قلعے کا محاصرہ کرلیا، قلعے کے حاکم قاضی ضیاالدین نے ۱۳ ماہ تک مقابلہ کیا، تب کہیں قلعہ خالی کیا۔

شہاب الدین کو ترائن کے میدان میں کامیابی حاصل نہ کرنے کا بڑا قلق تھا، کچھ عرصہ ان کے زخم مندمل ہونے میں لگ گیا لیکن اس پورے عرصے میں وہ چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح بے چین رہے۔

کہتے ہیں کہ ایک سال تک انہوں نے نیا لباس نہیں پہنا اور ہر قسم کا آرام اپنے لیے ممنوع قرار دے دیا۔ سال بھر تک وہ جنگ کی تیاریاں کرتے رہے۔ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۳ء میں ایک بار پھر وہ ترائن کی سمت روانہ ہوئے۔ اس بار ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی ان کے ساتھ تھے جن میں سواروں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ طبقاتِ ناصری کے مطابق شہاب الدین کے ساتھ کل چالیس ہزار یا پینتالیس ہزار سپاہی تھے۔

مسلمانوں کا لشکر جب لاہور پہنچا تو شہاب الدین نے رکن الدین حمزہ کو سفیر کے طور پر اجمیر بھیجا تاکہ وہ پرتھوی راج اور ان کی رعایا کو اسلام کی دعوت دیں۔ رکن الدین حمزہ تقریر اچھی کرتے تھے اور بات کو اچھے انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ شہاب الدین کا یہ طرزِ عمل ایک مسلمان جرنیل کے شایان شان تھا کہ انہوں نے جنگ چھیڑنے سے قبل، حریف کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ پرتھوی راج کی جانب سے اس دعوت کے جواب میں سخت جواب دیا گیا اور دھمکی دی گئی کہ مسلمانوں کے لشکر میں سے کسی کو زندہ واپس جانے نہ دیا جائے گا۔

پرتھوی راج بھی اس وقت سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا جب سے اسے مسلمانوں کے لشکر کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تھی۔ اس نے ڈیڑھ سو راجاؤں کو مدد کے لیے بلالیا تھا چنانچہ اب اس مشترکہ لشکر میں تین لاکھ سپاہی موجود تھے۔ گزشتہ جنگ میں کامیابی کے باعث پرتھوی راج نے ترائن کے میدان کو مبارک سمجھ کر، اسی میدان میں جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔

دریائے سرستی (سُرسوَتی) کے دونوں کناروں پر دونوں فوجیں خیمہ زن ہوگئیں۔ شہاب الدین نے اتمام حجت کے لیے ایک بار پھر اپنے ایلچیوں کے ذریعے پرتھوی راج اور اس کی رعایا کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی لیکن مخالف سمت سے درشت جواب موصول ہوا۔

شہاب الدین دیکھ رہے تھے کہ دشمن کا لشکر بہت بڑا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جبکہ مسلمانوں کے لشکر میں اضافے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن وہ بالکل نہ گھبرائے۔ انہوں نے اس جنگ میں غیر معمولی سوجھ بوجھ اور حکمت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے فوج کو پانچ حصوں میں تقسیم کردیا اور حکم دیا کہ پہلے ایک حصہ حملہ کرے اور پھر پسپائی اختیار کرے دشمن جوش میں آگے بڑھتا جائے گا، پھر اشارہ ملتے ہی دوسرا حصہ حملہ آور ہو جائے۔ ایک اور جرأت مندانہ اقدام انہوں

Marfat.com

نے یہ کیا کہ اپنی فوج کو راتوں رات دریا پار کروادیا۔ صبح کو پرتھوی راج کے سپاہی ابھی پوری طرح ہوشیار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ نعرۂ تکبیر کی گونج سے ترائن کا میدانِ جنگ لرز اٹھا۔ پرتھوی راج نے فوج کو ہنگامی بنیادوں پر منظم ہونے کا حکم دیا اور جلد ہی گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ دشمن کے ہاتھیوں کی جھولوں میں آئینے لگے ہوئے تھے جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھی۔ ہاتھیوں کے چنگھاڑنے، گھوڑوں کی ٹاپوں اور زخمی انسانوں کی آہ و بکا سے میدان جنگ گونج رہا تھا۔

مسلمانوں کی جنگی حکمتِ عملی کامیاب رہی۔ شہاب الدین کے لشکر کا پہلا حصہ حملہ آور ہوا اور منظم طریقے سے لڑتا ہوا پسپا ہونے لگا۔ پرتھوی راج کے سپاہی جوش میں آگے بڑھتے چلے گئے، جوں ہی ان کی صفیں بے ترتیب ہوئیں، شہاب الدین کے اشارے پر ان کی فوج کے دوسرے حصے نے ہندوؤں کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ لڑائی جاری رہی لیکن کوئی فیصلہ ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ دوپہر ہو گئی تو پرتھوی راج اپنے حامی ڈیڑھ سو راجاؤں کو لے کر درختوں کے سائے میں آیا۔ سب نے تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں کہ ماریں گے یا مر جائیں گے۔ پھر راجاؤں کا یہ گروہ میدان میں اترا۔ عصر کے قریب شہاب الدین نے فوج کے پانچویں حصے کے خاص بارہ ہزار سواروں کو حرکت دی اور بھرپور حملہ کیا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ حریف لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ مخالف سالار کھانڈے رائے مارا گیا۔ پرتھوی راج کو فرار ہوتے ہی بنی لیکن غروبِ آفتاب کے قریب، مسلمان سپاہیوں نے اسے قلعہ سرستی کے قریب پکڑ کر ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پرتھوی راج کے اقبال کا سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

یہ فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس فتح نے مسلمانوں کے لیے وادیٔ گنگا اور شمالی ہند کی فتوحات کا راستہ کھول دیا۔ شہاب الدین نے سرستی، ہانی، سامانہ، کہرام وغیرہ کے قلعے فتح کیے۔ پھر اجمیر تسخیر کیا تاہم انہوں نے رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے اجمیر میں پرتھوی راج کے بیٹے اکولہ جی کو راجا بنا دیا اور ان سے سالانہ خراج کا وعدہ لے لیا۔ شہاب الدین یہاں سے دہلی پہنچے۔ وہاں پرتھوی راج کا دوسرا بیٹا رین جی حکمران تھا، اس نے بڑی عاجزی کا ثبوت دیا، شہاب الدین نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا اور رین جی ہی کو دہلی پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ دہلی میں داخل تک نہیں ہوئے اور کہرام (دہلی سے ستر میل دور شہر) میں اپنے تربیت کردہ غلام قطب الدین ایبک کو حکمران بنا کر خود واپس غزنی چلے گئے۔ انہوں نے قطب الدین ایبک کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا۔

میرٹھ میں پرتھوی راج کا کوئی رشتے دار حکومت کر رہا تھا۔ شہاب الدین چاہتے تو میرٹھ پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے میرٹھ کے راجا سے کوئی تعرض نہ کیا، اس حُسنِ سلوک کا بدلہ میرٹھ کے راجا نے یہ دیا کہ اس نے دہلی کے راجا کو اکسایا اور دونوں نے قطب الدین ایبک کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ ایبک کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوجی تیاریاں کیں اور آگے بڑھ کر دہلی اور میرٹھ کو فتح کر لیا۔ پھر علی گڑھ کے ہندو راجا نے مقابلہ کی تیاری کی تو ایبک نے کول (علی گڑھ) بھی فتح کر لیا اور ۵۸۹ھ میں اپنا دارالحکومت دہلی منتقل کر لیا۔ اب مسلمانوں کی حکومت کی حدود قنوج کے ہندو راجا جے چند کی سرحدوں کی حدود کو چھو رہی تھیں۔ جے چند نے خطرہ سر پر منڈلاتا دیکھ کر گوالیار، بدایوں، اودھ، بہار وغیرہ کے راجاؤں سے مدد چاہی اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

قطب الدین ایبک نے یہ صورتحال دیکھی تو شہاب الدین کو مطلع کیا، شہاب الدین اطلاع ملتے ہی لشکر لے کر دہلی کی سمت روانہ ہو گئے۔ دہلی پہنچ کر انہوں نے قطب الدین ایبک کو کچھ فوج دے کر ہراول دستے کے طور پر آگے بڑھنے کا حکم دیا اور خود باقی لشکر لے کر چل پڑے۔ قطب الدین ایبک بہت ماہر سپہ سالار تھے۔ فوجوں کو بہت تیزی سے پیش قدمی کرواتے تھے۔ انہوں نے باقی لشکر کی آمد کا بھی انتظار نہ کیا اور جندواڑہ کے مقام پر جہاں جے چند کی فوج جمع تھی، حریف لشکر پہ حملہ کر دیا۔ جے چند، قطب الدین ایبک کے تیر سے مارا گیا اور اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

جندواڑہ قنوج کے قریب ہے اس طرح قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ ۵۹۱ھ / ۱۱۹۴ء کی بات ہے۔ اس کے بعد شہاب الدین نے بنارس پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ ۵۹۲ھ / ۱۱۹۵ء میں شہاب الدین غوری پھر ہندوستان آئے اور انہوں نے تھنکر (بیانہ) کا قلعہ فتح کیا۔ پھر قلعہ گوالیار کا محاصرہ کیا لیکن انہیں کسی وجہ سے واپس غزنی جانا پڑا اور انہوں نے اپنی ذمہ داری بہاالدین ظفر کو دے دی۔ اس دوران قطب الدین ایبک نے گجرات، بندیلکھنڈ میں کالنجر، کالپی اور روہیلکھنڈ میں بدایوں فتح کیا۔ دوسری طرف قطب الدین کے ایک اور عہدے دار محمد بختیار خلجی نے بہار، بنگال اور آسام کو فتح کر کے ان علاقوں کو بھی اسلامی

Marfat.com

قلمرو کا حصہ بنادیا۔ اس طرح چند سال کے اندر اندر مسلمانوں کی مملکت غزنی سے مشرقی خلیج بنگال اور جنوب میں بحیرۂ عرب تک پھیل چکی تھی۔

سنہ ۵۹۹ھ میں شہاب الدین کے بھائی غیاث الدین کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد پوری غوری مملکت کے انتظام کی ذمہ داری شہاب الدین کے شانوں پر آپڑی۔ شہاب الدین نے اپنے بھائی کے چھوڑے ہوئے کام کو سنبھالا۔ غیاث الدین خوارزم کے محاذ پر لڑ رہے تھے، شہاب الدین کو بھی اس محاذ پر جانا پڑا۔ ان کے مقابل کفار ترکستان، قرہ خطائی اور بعض دیگر طاقتیں تھیں۔ ۶۰۱ھ / ۱۲۰۴ء میں جب شہاب الدین اندخود (آج کل اندخوئی کہلاتا ہے، بلخ کے مغرب میں ہے) پہنچے تو کفارِ ترکستان کا لشکر آپہنچا۔ مسلمانوں کی فوج کے سالار عزالدین حسین خرمیل تھے۔ انہوں نے کفار کو مار بھگایا اور دشمن کا تعاقب کرنے کے لیے شہاب الدین سے اجازت طلب کی۔ شہاب الدین نے اس موقع پر کہا:

"میں سالہا سال سے ایسے ہی جہاد کا آرزو مند رہا، اب میں پیچھے نہ ہٹوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے روبرو جنگ کریں گے اور دیکھیں گے، اللہ کسے فتح عطا کرتا ہے، مجھے کم از کم سنت کے مطابق جہاد کا ثواب تو مل ہی جائے گا۔"

اس اثنا میں کفار کو کمک مل گئی۔ شہاب الدین نے پھر بھی جنگ شروع کردی، بہت سے مسلمان سپاہی شہید ہوگئے۔ بہت تھوڑے سے سپاہی شہاب الدین کے ساتھ رہ گئے۔ آخر شہاب الدین کے ایک غلام اور بیہ آگے بڑھے اور شہاب الدین کو کھینچ کر قلعے میں لے گئے دوسرے دن ترکستان کے بعض سرداروں (جو مسلمان ہوچکے تھے) کی کوششوں سے صلح ہوگئی اور قرہ خطائی واپس چلے گئے۔

ادھر دریائے نیلاب (سندھ) اور شوالک (ہمالیہ کے جنوب میں واقع گنگا اور ستلج کا درمیانی علاقہ) کے درمیان آباد کھوکھروں نے بڑی شورشیں برپا کر رکھی تھیں۔ یہ بڑی جنگجو قوم تھی، اسلام کو نہیں مانتی تھی اور اس میں بہت ساری اخلاقی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ شہاب الدین غوری کے دور میں اس قوم کی کایا پلٹ گئی۔ اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ کھوکھروں نے لوٹ مار کے دوران ایک عام مسلمان کو قیدی بنا لیا۔ اس مسلمان کا اخلاق اور طور طریقے کھوکھروں کو پسند آئے۔ قیدی نے بھی کھوکھروں کے سامنے مسلمانوں کی اچھی عادات کی خوب تعریف کی۔ قبیلے کے سردار نے پوچھا کہ اگر میں مسلمان ہوجاؤں تو تمہارا بادشاہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ مسلمان قیدی نے کہا مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں اس علاقے کی حکومت سونپ دے گا۔ سردار نے شہاب الدین کو خط لکھا، اس کے ساتھ مسلمان قیدی کا خط بھی تھا۔ جواب میں شہاب الدین نے کچھ تحائف بھیج دیے۔ اس کے بعد کھوکھر سردار خود جاکر شہاب الدین سے ملا اور اسلام قبول کیا۔ شہاب الدین نے اس نو مسلم کھوکھر سردار کو اس علاقے کا حاکم بنادیا۔ ان کی کوششوں سے بہت سے کھوکھر مسلمان ہوگئے اور تاریخ فرشتہ کے مطابق چار لاکھ کھوکھروں نے اسلام قبول کرلیا۔ جو قوم انتہائی بدخو، درشت مزاج تھی اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھی وہ ایک عام قیدی کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے اسلام کی علمبردار، متمدن اور شائستہ قوم بن گئی۔ بعض مؤرخین نے کھوکھروں اور گکھڑوں کو خلط ملط کردیا ہے۔ یہ دو الگ الگ قومیں ہیں۔ پنجاب اور غزنی کے درمیان پہاڑی علاقے میں بسنے والے غیر مسلموں کی بڑی تعداد نے بھی اسلام قبول کیا۔

کھوکھروں کے قبول اسلام کے بعد ۱۶ رجب ۶۰۲ھ / ۲۶ فروری ۱۲۰۶ء کو شہاب الدین لاہور سے غزنی روانہ ہوئے۔ اس سے قبل وہ حکم دے چکے تھے کہ ترکستان پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کردی جائیں۔ وہ قرہ خطائیوں پر حملہ آور ہونے کا پورا ارادہ کرچکے تھے۔ لاہور سے روانہ ہونے سے قبل انہوں نے بامیان کے حاکم ملک بہاؤالدین کے نام خط لکھا کہ ہم ترکستان کی غیر مسلم آبادی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ تم بامیان کی فوج جمع کرکے روانہ ہوجاؤ اور دریائے جیحوں کے کنارے خیمے گاڑ کر دریا پر پل باندھ دو۔

ممکن ہے شہاب الدین آئندہ چند ماہ میں ترکستان کے وسیع علاقے پر بھی اسلامی پرچم لہرانے میں کامیاب ہوجاتے لیکن جب وہ پنجاب کے ضلع جہلم میں دمیک کے مقام پر پہنچے اور ان کے قافلے نے دریائے جہلم کے کنارے خیمے گاڑ دیے تو خیال کیا جاتا ہے کہ رات کے وقت ملاحدہ سے تعلق رکھنے والے چند سرکش افراد نے شہاب الدین کے خیمے پر ہلہ بول دیا۔ اس وقت شہاب الدین نماز عشا ادا کر رہے تھے۔ حملہ آوروں نے عالم اسلام کے اس باہمت، غیرت مند اور صاحبِ ایمان جرنیل کو حالتِ نماز میں شہید کر ڈالا۔ اس روز شعبان ۶۰۲ھ کی ۲ تاریخ (۱۴ مارچ ۱۲۰۶ء) تھی۔ شہاب الدین کی نعش غزنی لے جائی گئی اور انہیں اس عمارت میں دفن کیا گیا جو انہوں نے اپنی بیٹی

Marfat.com

کے لیے بنوائی تھی۔ انہوں نے ۶۳ برس کی عمر پائی اور تقریباً ۳۳ سال حکومت کی۔

شہاب الدین کا بیٹا کوئی نہ تھا، صرف ایک بیٹی تھی۔ کسی نے ایک بار اس بات پر اظہارِ افسوس کیا تو شہاب الدین غوری نے اطمینان سے کہا، "میرا کوئی بیٹا نہیں ہے تو کیا ہوا، میرے اتنے غلام ہیں جنہیں میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور جن کی تعلیم و تربیت پر میں نے بے حد محنت کی ہے، وہ سب فرزندوں کی طرح میرا نام روشن کریں گے۔" شہاب الدین کی بات درست ثابت ہوئی۔ ان کے جانشین (خاندان غلاماں کے حکمران) ان کا نام خطبے میں لیتے رہے۔

شہاب الدین غوری بہت مستقل مزاج، حد درجہ بردبار اور متحمل انسان تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جنگوں کی قیادت کرتے ہوئے گزرا۔ اتنے بڑے پیمانے پر کشت و خون دیکھنے کے باوجود ان کی طبیعت میں درشتی یا اذیت پسندی نام کو بھی نہ تھی۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ انہوں نے کسی بھی علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہاں بسنے والوں کو کبھی تکلیف دی نہ کسی پر ظلم کیا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ کئی علاقوں میں انہوں نے ہندو راجاؤں ہی کو برسر اقتدار رہنے دیا اور جب ان راجاؤں نے ان کی اس رواداری اور رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تب ان راجاؤں سے حکومت چھین لی گئی۔

شہاب الدین کا یہ وصف خاص طور پر تعریف کے قابل ہے کہ برصغیر کے باشندوں کے خلاف ان کے دل میں تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے کئی لڑائیوں میں ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ پنجاب کی اکثر لڑائیوں میں جموں و کشمیر کے ہندو راجا نے ان کا ساتھ دیا۔ شہاب الدین غوری کی عالی ظرفی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ترائن کی لڑائی میں مسلمانوں کی حمایت کرنے والا قنوج کا راجا جے چند، چند سال بعد جب مسلمانوں کا مخالف ہوگیا اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا تو شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کے ساتھ مل کر جے چند کی فوج کو شکست دے دی لیکن اتنی دشمنی کے باوجود قنوج جے چند کے خاندان کے پاس رہنے دیا۔

شہاب الدین غوری کی مذہبی رواداری کی ایک مثال ان کے دور کے سکے ہیں جن پر عبارت سنسکرت زبان میں بھی درج ہے۔ انہوں نے غیر مسلم رعایا کے مذہبی مراسم، عبادات کے طریقوں اور عبادت گاہوں کو کبھی نہ چھیڑا، نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے دور میں لاکھوں افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

شہاب الدین غوری کو جاہ و حشمت سے دلچسپی نہ تھی، نہ ہی وہ حکومت کرنے کی حرص میں مبتلا تھے۔ ان کے کسی طرزِ عمل سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے حکمرانوں سے حسد کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی زندگی کے آخری تین سال چھوڑ کر، بقیہ پورے عرصے میں غوری سلطنت کے فرمانروا غیاث الدین رہے اور شہاب الدین ان کے نائب اور سپہ سالار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اگرچہ غیاث الدین نے انہیں خود مختاری دے رکھی تھی لیکن شہاب الدین نے ہمیشہ بڑے بھائی کے مرتبے کا خیال رکھا۔ تمام مہمات اور اہم فیصلوں میں غیاث الدین کی خواہش کو مدنظر رکھا۔ خطبوں میں انہی کا نام شامل کیا۔ غیاث الدین ہندوستان کبھی نہیں آئے لیکن شہاب الدین نے ہمیشہ ان کی بالادستی تسلیم کی حتیٰ کہ قطب مینار پر سلاطین ہند کی جو فہرست کندہ کی گئی ہے اس میں پہلا نام غیاث الدین ہی کا ہے۔

شہاب الدین نے عالم اسلام کی وحدت اور مرکزیت کے تصور کو مستحکم کرنے کی بھی کوشش کی۔ انہوں نے جب برصغیر کے علاقے فتح کرنے شروع کیے تو بغداد میں عباسی خلیفہ المستضی بامر اللہ حکمران تھے۔ پنجاب کی فتح کے وقت شہاب الدین کے جاری کردہ سکوں پر عباسی خلیفہ کا نام بھی کندہ ہوتا تھا۔ عباسی دربارِ خلافت سے غوری حکمرانوں کا رابطہ رہتا تھا اور عباسی خلفا المستضی بامر اللہ اور الناصر الدین اللہ کی طرف سے غیاث الدین غوری کو کئی بار خلعتیں ارسال کی گئیں اور انہیں ناصر المومنین کا لقب دیا گیا۔

جنگوں میں مصروف رہنے کے باعث شہاب الدین کو علم کی ترویج و اشاعت کا زیادہ موقع نہ مل سکا، تاہم وہ علم دوست حکمراں تھے۔ ان کے بھائی غیاث الدین بھی علما کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان میں ایک بڑا نام امام فخر الدین الرازی کا ہے جو عالم اسلام کے مشہور ترین علمائے دین اور مفسرین میں سے ہیں۔ امام رازی بعد میں شہاب الدین کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ امام صلوٰۃ تھے اور ہر ہفتہ وعظ کہنے کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی۔ وعظ کی ان مجالس میں شہاب الدین اکثر شریک ہوتے تھے۔ امام صاحب کے علاوہ مشہور شاعر نظامی عروضی بھی غزنی کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ امام رازی اور نظامی عروضی دونوں نے اپنے دوست شہاب الدین کی صلاحیتوں کو

Marfat.com

خراج تحسین پیش کیا ہے۔

شہاب الدین کے دربار کی ایک اور اہم علمی شخصیت فخر الدین مبارک شاہ تھے، جن کی بہت تصانیف ہیں۔ ان میں شجروں کی ایک مختصر کتاب بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ شہاب الدین نے جب ۵۸۲ھ میں لاہور فتح کیا تو انہوں نے مولانا سراج الدین کو اپنی فوج کا قاضی اور امام مقرر کیا تھا۔ مولانا سراج الدین، تاریخ کی مشہور کتاب طبقاتِ ناصری کے مصنف منہاج السراج کے والد تھے۔

شہاب الدین کے دربار میں فقہ اور دیگر دینی علوم کے مسائل زیر بحث رہتے تھے۔ جب شہاب الدین غوری نے ہندوستان کا سفر کیا تو بہت سے علماکرام، شہاب الدین غوری کے ساتھ ہی ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے۔ شہاب الدین کے دور میں سید کمال الدین عثمانی ترمذی، شیخ سراج الدین محمد بن عثمان جوزجانی، شیخ خطیر الدین محمد بن عبدالملک جرجانی جیسے ممتاز اہل علم گزرے ہیں۔

شہاب الدین نے جب اجمیر فتح کیا تو یہاں متعدد مدارس تعمیر کروائے۔ انہوں نے تعلیمی نظام اس طرح ترتیب دیا کہ طلبہ کو دینی اور ادبی تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ شہاب الدین نے اپنے غلاموں کی تربیت کا بہت اعلیٰ انتظام کیا۔ ان کے ایک غلام قطب الدین ایبک نے شمالی ہندوستان پر بڑی خوبی سے حکومت کی۔ سندھ اور ملتان میں ان کے ایک غلام ناصر الدین قباچہ کا دورِ حکومت اپنی خوبیوں کی وجہ سے نمایاں ہے۔

شہاب الدین غوری کو جن بڑے علماکرام اور صوفیا عظام کی سرپرستی حاصل رہی ان میں سے ایک حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ بھی ہیں۔ خواجہ صاحبؒ محرم ۵۶۱ھ / دسمبر ۱۱۶۵ء میں اجمیر پہنچے۔ ان کی تبلیغ سے پرتھوی راج (رائے پتھورا) کے بہت سے ملازمین مسلمان ہونے لگے۔ اس پر پرتھوی راج نے دھمکی دی کہ وہ خواجہ صاحبؒ کو اجمیر سے نکلوا دے گا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے اس دھمکی کے جواب میں پیش گوئی کی کہ پتھورا مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور ۵۸۸ھ / ۱۱۹۳ء میں ترائن کی لڑائی میں پتھورا مارا گیا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ شہاب الدین غوری نے جب اجمیر پر حملہ کیا تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ تھے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

شہاب الدین عدل و انصاف کا بول بالا دیکھنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ہفتہ میں چار دن مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ ان چار دنوں میں قاضی شہر دربار میں بیٹھتے تھے اور شریعت کے مطابق فیصلے سنایا کرتے تھے۔ اگر کسی کی خواہش ہوتی کہ خود شہاب الدین اس کے مقدمہ کا فیصلہ کریں تو اس مقدمہ کی سماعت خود شہاب الدین کرتے تھے اور قاضی کے مشورے سے فیصلہ سناتے تھے۔

شہاب الدین کی دیانت داری اور تحمل کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ گجرات کے شہر نہروالہ یعنی انہلواڑہ کو فتح کرنے میں ناکام ہو کر واپس غزنی پہنچے اور اگلی جنگ کی تیاریاں کرنے لگے تو ان کے پاس کسی کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ نہروالہ میں ایک مشہور تاجر ہے جس کا نام دسالہ ابہر ہے۔ وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے غزنی بھیجتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس مال کو ضبط کر کے سرکاری خزانے میں شامل کر سکتے ہیں۔ شہاب الدین نے خط کی پشت پر لکھ دیا:

"دسالہ ابہر کا یہ مال اگر نہروالہ میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لیے حلال ہوتا لیکن غزنی میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام ہے کیونکہ وہ ہماری پناہ میں ہے۔"

شہاب الدین غوری کا صوبائی نظام اقطاع پر مشتمل تھا۔ اقطاع سے مراد تنظیمی علاقہ ہے۔ ہر اقطاع کا انچارج "مقطیع" کہلاتا تھا۔ مقطیع کا تقرر خود شہاب الدین کرتے تھے۔ اس پر اپنے اقطاع کے دفاع اور وہاں امن و امان قائم رکھنے کی ذمے داری عائد تھی۔

شہاب الدین کو آدمیوں کے انتخاب میں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ وہ فرد کی صلاحیتوں کا فوراً اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔ انہوں نے جنگی مہمات جس طرح ترتیب دیں ان سے ان کی ذہانت، حکمتِ عملی اور تدبر کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان تمام جنگوں میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی طریقوں کی پیروی کرنے اور سنت کے مطابق جہاد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خزانے میں جہاد کی غرض سے خطیر رقم اور جواہر جمع کیے گئے تھے۔ ان کے جنگی پرچموں پر "نصر من اللہ" کے الفاظ درج ہوتے تھے۔

جہاد کی جو تڑپ انہوں نے اپنے سپاہیوں میں بیدار کرنے کی کوشش کی اس کا اظہار ان کے دور میں لکھی گئی نظموں سے ہوتا ہے۔ اس دور کے شاعر ملک یار غرشین نے ہندوستان میں لڑی گئی کئی جنگوں میں شہاب الدین کے ساتھ شرکت کی۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

Marfat.com

انہوں نے اپنی ایک رزمیہ نظم میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا:

اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اب ہم حملہ کر رہے ہیں۔
یہ ملک غیروں کا ہے۔ نمازیو! دیکھو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔
شمشیر کی دھار تیز کرلو۔ دشمن کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالو۔
اپنی انگلیاں اس کے خون سے سرخ کرلو۔ ہم میدان سے کیوں
بھاگیں جب
اللہ ہمارے ساتھ ہے۔
اے نمازیو! آؤ سب مل کر سلطان شہاب الدین کی مدد کرو اور
دشمن کو کاٹ ڈالو۔
اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

***

Marfat.com

قطب الدین ایبک

برصغیر کے پہلے مسلمان فرمانروا

وہ سوداگر ترکستان سے آرہا تھا۔

اس کے ساتھ بہت سا سامان تھا اور سانولی رنگت والا ایک بچہ بھی۔۔۔جو اپنی معصوم اور حیران نگاہوں سے نیشاپور کے ترقی یافتہ اور شاندار شہر کی ہر چیز تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بچہ خوش شکل تو نہ تھا لیکن اس کے چہرے کا بے پناہ بھولپن اور ذہین آنکھیں، پہلی ہی نظر میں متاثر کرتی تھیں۔ سوداگر نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس بچے کو نیشاپور میں کسی کے ہاتھ فروخت کردے گا۔ اسے اس سیاہ رُو بچے کے زیادہ دام ملنے کی امید تو نہ تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ نیشاپور بڑا شہر ہے، یہاں بڑے بڑے بازار ہیں، کھاتے پیتے لوگ رہتے ہیں، شاید کوئی اس بچے کے مناسب دام دے دے۔

سوداگر نے بچہ فروخت کرنے کے لیے جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ گھر قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کا تھا، جو نیشاپور اور مضافات کے حاکم تھے، قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا منصب بھی انہی کے پاس تھا۔ شاید سوداگر نے سوچا ہو کہ شہر کا حاکم ہی سب سے زیادہ مالدار ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی کے ہاتھ بچے کو فروخت کردیا جائے تو اچھے پیسے مل سکتے ہیں۔

قاضی فخر الدین نے بچے کو دیکھا اور پھر حکم دیا کہ سوداگر کو بچے کے عوض ایک رقم ادا کردی جائے۔ سوداگر رقم لے کر خوش خوش چلا گیا۔

اب قاضی صاحب بچے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اجنبی ماحول کی وجہ سے اس کے انداز میں جھجک اور ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ قاضی صاحب نے اسے تسلی دی، پُرشفقت انداز میں اس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے خادموں کو حکم دیا کہ بچے کی رہائش اور تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے۔

یہ بچہ قطب الدین تھا جو آگے چل کر قطب الدین ایبک کہلایا۔ نیشاپور میں غلام کی حیثیت سے فروخت ہونے والے قطب الدین کو قدرت نے برصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلمان فرمانروا ہونے کا شرف بخشا۔ قطب الدین ایبک نے برصغیر پر بحیثیت مجموعی بیس سال اور چند ماہ حکومت کی۔ اس عرصے میں انہوں نے دہلی، میرٹھ، علی گڑھ، بدایوں، قنوج، کالپی، بنارس، ہانسی، بہار اور بنگال تک کا وسیع علاقہ فتح کرکے اسلامی مملکت میں شامل کردیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں اس سرزمین پر اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ خود قطب الدین کے ہاتھوں پر اجمیر اور دیگر شہروں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی اور مسلمان تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے۔

قاضی فخر الدین بن عبدالعزیز کوفی حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ وہ بڑے دیندار، نیک اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ انہوں نے قطب الدین کی پرورش اپنے بیٹوں کے ساتھ کی اور ان کی تربیت کا اچھا انتظام کیا۔

قطب الدین نے اپنے محسن قاضی فخر الدین کو مایوس نہیں کیا۔ انہوں نے بہت جلد قرآن پاک حفظ کرلیا، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرلیا، ادب اور رسم الخط میں مہارت حاصل کی۔ قرآن پاک سے تو انہیں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ لوگوں میں "قرآن خواں" کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ انہوں نے فقہ کا گہرا علم بھی حاصل کیا۔ قدرت کا بے پناہ کرم تھا اور قطب الدین کی خوش بختی تھی کہ انہیں قاضی فخر الدین جیسی علمی اور متقی شخصیت کے ہاں پرورش پانے کا موقع

Marfat.com

ملا، جہاں علمی ماحول تھا اور گھر کا ہر فرد فقہ اسلامی سے آشنا تھا۔ قطب الدین نے گھڑسواری، تیر اندازی کی تربیت بھی حاصل کی اور لڑائی کے دیگر فنون بھی سیکھے۔

قاضی فخر الدین کے انتقال کے بعد قطب الدین کو ایک بار پھر آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ صاحب علم ہونے کے باوجود ان کا شمار اب بھی غلاموں میں ہوتا تھا۔ حالات ایسے ہوئے کہ انہیں ایک بار پھر کسی سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ غلاموں کے اس تاجر نے اور بھی سیکڑوں غلام خریدے تھے۔ وہ ان سب کو لے کر غور کے علاقے میں پہنچا جو افغانستان میں شامل ہے۔ وہاں معز الدین غوری کی حکمرانی تھی، جو شہاب الدین غوری بھی کہلاتے تھے۔

شہاب الدین غوری نے بہت سے غلام خریدے۔ قطب الدین کا رنگ و روپ تو متاثر کرنے والا نہ تھا لیکن علم کا نور ان کی شخصیت کو سیکڑوں غلاموں میں ممتاز کر رہا تھا۔ شہاب الدین نے قطب الدین کے عوض بڑی رقم ادا کی اور یوں قطب الدین کی زندگی کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔

قطب الدین "ایبک" کیوں کہلائے؟ اس بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ کچھ مؤرخین کہتے ہیں کہ قطب الدین کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے لوگ اسے "ایبک شل" کہنے لگے۔ ایبک ترکی زبان میں انگلی کو کہتے ہیں اور شل سے مراد سوکھا ہوا، کمزور ہے، یعنی وہ شخص جس کی انگلی کمزور ہو۔

بعض دیگر مؤرخین کا کہنا ہے کہ "ایبک" دراصل ایک ترک قبیلے کا نام ہے۔ یہ مرکب لفظ ہے یعنی "اے" اور "بک" کا مجموعہ ہے۔ "اے" ترکی زبان میں چاند کو کہا جاتا ہے، "بک" سے مراد سردار یا خان ہے۔ اس زمانے میں کئی ترک امیروں کے نام کے آخر میں ایبک آتا تھا مثلاً بہاؤ الدین ایبک۔ ترکستان میں یہ لفظ اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ مؤرخین کہتے ہیں کہ قطب مینار کے کتبہ پر بھی "اے" اور "بک" کے الفاظ الگ الگ لکھے گئے ہیں۔

قطب الدین ایبک کو قدرت نے فطرتِ سلیم، اچھے اوصاف اور بہادری و جواں مردی کی جن خصوصیات سے نوازا تھا وہ زیادہ عرصے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ ایک بار شہاب الدین غوری نے اپنے خادموں کو ایک جشن کے موقع پر انعام دیا۔ قطب الدین کو بھی ان کے حصے کی رقم دی گئی۔ قطب الدین نے چند لمحوں میں یہ رقم دیگر خدام میں تقسیم کر دی۔ ان کی اس سخاوت کی خبر شہاب الدین غوری تک بھی پہنچی۔ شہاب الدین ان کی اس صفت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے قطب الدین کو بلا کر اپنے دربار میں خصوصی جگہ دی۔ کچھ ہی عرصے بعد انہیں مطبخ کا نگراں، پھر اصطبل کا نگراں بنا دیا اور بہت جلد قطب الدین نے فوج میں اپنا مقام بنالیا۔ انہوں نے شہاب الدین غوری کے مخالف حکمرانوں کے خلاف جو معرکے لڑے ان میں نہایت بے خوفی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے شہاب الدین غوری نے انہیں ہراول دستے کا سالار مقرر کر دیا۔

شہاب الدین غوری کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ ایک دن ان کی مجلس میں کسی نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ سلطان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ شہاب الدین نے بے پروائی سے کہا "اور حکمرانوں کے ایک یا دو بیٹے ہوں گے لیکن میرے ہزاروں بیٹے ہیں جو میرے بعد میری حکومت کے وارث ہوں گے۔"

شہاب الدین غوری کا اشارہ اپنے ہزاروں غلاموں کی جانب تھا۔ یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے غلاموں کے ساتھ روا رکھا جانے والا غیر انسانی سلوک ختم کیا اور غلاموں کو اتنی عزت دی کہ وہ ہزاروں میل تک پھیلی ہوئی اسلامی مملکت کے سربراہ بنے اور انہوں نے جس حکمت، تدبر اور خوش انتظامی سے اس وسیع مملکت کو سنبھالا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان غلاموں کے آقا ان کی پرورش کتنے اچھے طریقے سے کیا کرتے تھے۔ شہاب الدین غوری کی بات درست ثابت ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے غلاموں نے سندھ اور گجرات سے بنگال اور آسام تک، وسیع و عریض علاقے پر اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے طویل عرصے تک حکومت کی اور خاندانِ غلاماں کے نام سے تاریخ کا ایک درخشندہ باب رقم کیا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب حفیظ جالندھری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "شاہنامۂ اسلام" میں قطب الدین ایبک کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

وہ جس کے نام پر لفظِ غلامی ناز کرتا ہے
ترقی کا تخیل عرش تک پرواز کرتا ہے

شہاب الدین غوری نے جب غزنی میں اپنا اقتدار مستحکم کیا تو انہوں نے دیکھا کہ سندھ اور ملتان کے علاقوں میں بے دین عناصر بہت سرگرم ہو گئے ہیں جن کے اثرات خود "غور" کے علاقے میں بھی

Marfat.com

نمایاں ہیں۔ شہاب الدین نے ان بے دین عناصر کی سرکوبی کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء میں انہوں نے اپنی مملکت سے نکل کر پہلا حملہ کیا اور ملتان اور اُچ پر قبضہ کرلیا۔ ۵۷۵ھ / ۱۱۷۹ء میں پشاور فتح کیا اور اس سے اگلے سال پورے صوبۂ سندھ پر شہاب الدین کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔

شہاب الدین غوری نے ۵۸۷ھ / ۱۱۹۲ء میں بھٹنڈہ پر قبضہ کرلیا۔ ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں انہوں نے اجمیر، کہرام اور سمانہ کے علاقے فتح کیے۔ کہرام دہلی سے ستر میل دور ہے۔ ان تمام مہمات میں قطب الدین ایبک بھی شریک تھے۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری نے قطب الدین ایبک کو کہرام کا حاکم اور ہندوستان میں اپنی فوج کا سالار بنایا اور خود غزنی واپس چلے گئے۔

قطب الدین ایبک بہت اعلیٰ پائے کے منتظم اور بے حد جری سالار ثابت ہوئے۔ انہوں نے کمال خوبی سے اپنی فوج کو ترتیب دیا اور اسی سال دہلی پر حملہ کرکے اسے پرتھوی راج اور کھانڈے رائے کے رشتے داروں سے چھین لیا۔ کچھ عرصے بعد میرٹھ کی سڑکوں پر بھی اسلامی فوج گشت کر رہی تھی۔ ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں قطب الدین قلعہ کول (علی گڑھ) تسخیر کر چکے تھے۔ اسی سال قطب الدین نے دہلی کو دارالحکومت بنا کر تمام مفتوحہ شہروں میں اسلامی قوانین نافذ کردیے۔

شہاب الدین ۵۹۰ھ / ۱۱۹۴ء میں پھر ہندوستان آئے۔ انہوں نے قنوج کا راستہ اختیار کیا۔ قنوج اور بنارس کا راجہ جے چند بڑی فوج لے کر آیا۔ اس فوج میں تین ہزار ہاتھی بھی تھے۔ قطب الدین پچاس ہزار سپاہی لے کر شہاب الدین کی مدد کے لیے پہنچے۔ شہاب الدین نے اپنے لائق سالار کا ماتھا چوما اور اپنے ہراول دستے کے طور پر آگے روانہ کردیا۔ جے چند نے گوالیار، بدایوں، اودھ اور بہار کے راجاؤں سے مدد حاصل کرکے بڑی فوج اکٹھی کرلی تھی۔ اٹاوہ سے شمال میں جندواڑہ کے مقام پر جے چند کی فوج جمع ہوگئی۔ قطب الدین اپنا ہراول لشکر لے کر تیزی سے آگے بڑھے اور شہاب الدین غوری کی فوج کے میدانِ جنگ تک پہنچنے سے پہلے ہی دشمن پر ٹوٹ پڑے، زبردست لڑائی میں ہندو فوج کے قدم اکھڑ گئے۔

قطب الدین ماہر تیر انداز تھے۔ انہوں نے راجہ جے چند کا نشانہ لے کر جو تیر چھوڑا وہ سیدھا راجا کی آنکھ میں پیوست ہوگیا۔ راجا الٹ کر اپنے ہاتھی سے گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی بھگدڑ مچ گئی اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے دیو پیکر ہاتھی حواس باختہ ہوکر اپنے ہی سورماؤں کو روندرہے تھے۔ بعد میں جے چند کی لاش بڑی دقتوں سے تلاش کی گئی اور اس کو اس طرح شناخت کیا گیا کہ اس کے دانت سونے کی کیلوں اور تاروں سے بندھے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کو مالِ غنیمت میں ۳۰۰ ہاتھی ملے۔ ان میں سفید رنگ کا ایک ہاتھی بھی تھا۔ قطب الدین نے یہ سفید ہاتھی شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کیا۔ غوری نے یہ ہاتھی ایبک کو دے دیا۔ یہ ہاتھی ایبک کے پاس ہی رہا اور ان کی وفات کے چند روز بعد چل بسا۔

شہاب الدین غوری نے راجا جے چند کی اس شکست سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے قنوج، بنارس اور پھر گوالیار اور بدایوں کے علاقے فتح کرلیے۔ اسی طرح شمالی ہند کا بڑا حصہ اسلامی حکومت میں شامل ہوگیا۔ بعد کے برسوں میں قطب الدین نے مزید علاقے فتح کیے۔ ۵۹۳ھ / ۱۱۹۵ء میں انہوں نے گجرات پر کامیاب فوج کشی کی۔ اس سے قبل تھنکر (بیانہ) کا الحاق کیا۔ انہلواڑہ (مغربی راجپوتانہ) پر بھی ۵۹۳ھ میں مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے کالنجر اور رنتھمبور کے مشہور قلعے فتح کیے۔ پھر کالپی کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔ اسی دوران قطب الدین کے ایک لائق ماتحت بختیار الدین خلجی نے بہار اور بنگال کو فتح کیا۔ اس کے بعد کامروپ (آسام) کے راجا نے اطاعت قبول کی۔ مسلمانوں کی تبلیغ سے اس علاقے میں دو قوموں کوچ اور میچ کے سردار مسلمان ہوگئے۔ اب سندھ سے آسام تک اسلام کی حکمرانی تھی۔

ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شہاب الدین غوری کو اطلاع ملی کہ دریائے سندھ سے کوہ سوالک کے دامن تک ایک غیر مسلم قوم کھوکھر نے بڑے شورش بپا کر رکھی ہے۔ کھوکھروں کی وجہ سے خاص طور پر پشاور اور نواح کے علاقوں کے مسلمانوں کا جینا دوبھر ہوگیا ہے۔ شہاب الدین نے فوج اکٹھی کی اور قطب الدین ایبک اور ایک غلام شمس الدین التمش کی مدد سے کھوکھروں پر چڑھائی کردی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ کھوکھروں نے کچھ مسلمانوں کو قیدی بنالیا۔ ان میں سے ایک قیدی کی تبلیغ سے کھوکھروں کے سردار اسلام لے آئے۔ اللہ نے ایک گمراہ قوم کو راہِ راست دکھادی، اس کے بعد کھوکھر اسلام کے متوالے بن گئے۔ چار لاکھ کھوکھروں نے اسلام قبول کیا، تاہم ان میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔

شہاب الدین غوری ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں لاہور آئے۔ انہوں

Marfat.com

نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں قطب الدین کو "ملک" کا خطاب دیا۔ یہ خطاب امرا اور شاہی خاندان کے افراد ہی کو دیا جاتا تھا۔

تقریب سے واپسی پر جہلم کے نواح میں دَمیک کے مقام پر شہاب الدین غوری کو ایک فرقے کے افراد نے شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد غزنی کی حکومت محمود بن غیاث الدین کے ہاتھ میں آئی۔ سلطان محمود بن غیاث الدین نے قطب الدین کو پیغام بھیجا کہ آپ ہندوستان کا کُل انتظام سنبھال لیں۔

گیارہ ذی قعدہ ۶۰۲ھ/۱۹ جون ۱۲۰۶ء کو قطب الدین ایبک لاہور کے نواح میں دادیموہ کے مقام پر پہنچے۔ ان کی آمد سے قبل لاہور کے شہریوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ ان کے محبوب حکمراں لاہور آرہے ہیں جہاں ایک تقریب میں وہ پورے ہندوستان کی قیادت سنبھالنے کا اعلان کریں گے۔ اس خبر سے پورے لاہور میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، استقبال کی تیاریوں میں لگ گیا، حالانکہ یہ جون کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔

۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ/۲۶ جون ۱۲۰۶ء کو قطب الدین ایبک لاہور میں داخل ہوئے۔ اگلے روز ایک تقریب منعقد ہوئی اور قطب الدین ایبک کُل ہندوستان کے خود مختار فرمانروا بن گئے۔

قطب الدین ایبک کو چوگان (پولو) کھیلنے کا شوق تھا۔ اس کھیل کے لیے شہسواری پر عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔ لاہور میں ایک وسیع میدان چوگان کے لیے وقف تھا۔ کئی قسم کے عربی، ترکی اور مقامی گھوڑے چوگان کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ایک دن وہ چوگان کھیل رہے تھے کہ اچانک گھوڑے سے گر پڑے۔ وہ اس زاویے سے گرے کہ ان کے گھوڑے کی زین کا اگلا فولادی حصہ ان کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس زخم سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور یوں برصغیر ایک متقی اور لائق حکمراں سے محروم ہو گیا۔

خود مختار سربراہِ مملکت کی حیثیت سے قطب الدین ایبک نے صرف چار سال حکومت کی۔ اس مختصر عرصے میں انہوں نے اپنے حسنِ سلوک سے رعایا کے ہر فرد کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا اور اپنی رواداری اور فراخدلی کی وجہ سے غیر مسلموں تک کے دل موہ لیے۔

قطب الدین ایبک کو لاہور ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے بعد آنے والے حکمراں شمس الدین التتمش نے ان کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ مغلیہ دور میں شہر کی توسیع ہوئی تو مقبرہ کے قریب جو محلہ آباد ہوا وہ محلہ قطب غوری کہلایا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں مقبرے اور اس سے متصل عمارتیں تباہ کر دی گئیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد مزار از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ آج بھی قطب الدین ایبک کی قبر لاہور کے انار کلی بازار میں موجود ہے جہاں لوگ اس عظیم مسلمان فرمانروا کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

قطب الدین ایبک برصغیر کے پہلے مسلمان حکمراں ہیں۔ انہوں نے جو حکومت قائم کی اس میں اسلامی قوانین کو پوری طرح رائج کر دیا۔ ان کے بعد آنے والے حکمرانوں نے بھی ان قوانین کو برقرار رکھا۔ مشہور مؤرخ فخر مدبر کہتے ہیں کہ قطب الدین ایبک نے مسلمانوں کی زندگی اسلامی اور شرعی نہج پر تشکیل دینے کی کوشش کی۔ غیر شرعی خراج (ٹیکس) ختم کر دیے۔ شریعت کے مطابق عشر لینے کا حکم دیا۔ بدعتوں کی ممانعت کر دی۔ سنت کی پیروی کروانے کی کوشش کی۔ قطب الدین نے اپنا بچپن ایسی جگہ گزارا تھا جہاں شریعت اور فقہی احکام کا تذکرہ رہتا تھا۔ ان کی شخصیت پر بچپن کی دینی تربیت کی گہری چھاپ تھی۔ وہ جب ہندوستان کی وسیع مملکت کے حکمران بنے تو فقہی اور شرعی احکام پر عمل کروانے میں سرگرم ہو گئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے۔

قطب الدین ایبک نہایت ہوش مند، زیرک اور صائب الرائے حکمران تھے۔ انہوں نے مملکت میں بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ انہوں نے جو قوانین بنائے، ان کی بدولت ہر طرف عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا۔ ان کی فوج میں ترک، غوری، خراسانی، خلجی، ہندوستانی اور ٹھاکر غرض مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے سپاہی موجود تھے۔ قطب الدین ایبک کے مستحکم نظامِ حکومت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کی فوج کے کسی سپاہی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ناجائز طور پر کسی سے ایک چپاتی لے لے، یا جنگل سے کوئی بکری یا آبادی سے کسی کی چڑیا پکڑ لے۔ ان کا نظامِ انصاف اس قدر عمدہ تھا کہ کوئی بھی سرکاری ملازم رعایا کے کسی فرد کو ستانے یا اس سے زبردستی کچھ لینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

قطب الدین نہایت علم دوست حکمراں تھے۔ انہوں نے علم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور علما کی خدمت کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ ان کے دور میں مساجد کے ساتھ مدارس قائم کیے گئے۔ علم کا خاص مرکز لاہور تھا۔ اس زمانے میں شہر کی نوّے فیصد آباد تعلیم یافتہ تھی۔

Marfat.com

یہاں فخر مدبر مبارک شاہؒ، شیخ عبد العزیز مکیؒ، سید احمد توختہ ترمذیؒ اور شیخ یعقوب زنجانیؒ، جیسے علما کرام موجود تھے۔ ان کے علاوہ مولانا بہاء الدین اوشیؒ اوش سے ہندوستان آئے، وہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر و ادیب تھے۔ اسی دور میں جمال الدین محمد اور قاضی حمید الدین جیسے شعرا بھی تھے۔ قطب الدین ایبک نے ان تمام علمی شخصیات کی خدمت کی۔

اس عہد کی مشہور تاریخ "تاج المآثر"، قطب الدین ہی کی خواہش پر لکھی گئی۔ اس کتاب کے مؤلف حسن نظامی نیشاپوریؒ تھے۔ یہی کتاب ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی پہلی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی بدولت بعد کی نسلوں کو ایبک کے حالات معلوم ہوئے۔ کتاب میں عربی اور فارسی کے سات ہزار اشعار بھی درج ہیں۔ مؤلف نے اپنا کلام بھی شامل کیا ہے۔ اس زمانے میں فخر مدبر نے ایک کتاب "بحر الانساب" لکھ کر قطب الدین ایبک کو پیش کی۔ فخر مدبر کا اصل نام محمد بن منصور بن سعید تھا۔ ان کا لقب مبارک شاہ تھا۔ فخر مدبر نے کتاب "بحر الانساب" بارہ سال کی محنت اور ایک ہزار کتابوں کے مطالعے کے بعد لاہور میں تصنیف کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور میں اس قدر کتب خانے تھے کہ فخر مدبر ان میں سے اپنی ضرورت کے مطابق ایک ہزار کتب تلاش کر کے ان سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کتاب میں حضور اکرم ﷺ کے عہد سے مؤلف کے زمانے تک کے ۱۳۶ شجرے درج ہیں اور قطب الدین کے ابتدائی حالات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ فخر مدبر نے جب یہ کتاب مرتب کر کے قطب الدین ایبک کو پیش کی تو قطب الدین بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ خصوصی اہتمام کے ساتھ سربراہِ مملکت کے کتب خانے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سربراہِ مملکت کا کتب خانہ بھی تھا۔

اسی دور میں ایک اور عالم امام رضی الدین ابو الفضائل الحسن صغانیؒ تھے۔ آپ بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ قطب الدین نے انہیں لاہور کا قاضی (جج) بننے کی دعوت دی تھی، لیکن انہوں نے یہ دعوت قبول نہیں کی۔ انہوں نے فقہ، حدیث اور لغت پر بہت سی کتب لکھی ہیں۔ ان کی کتاب "مشارق الانوار" بہت مشہور ہوئی جس میں ۲۶۴۶ احادیث ہیں۔

قطب الدین ایبک نے دہلی میں مسجد قوتِ الاسلام قائم کی تھی جہاں اس عہد کے جید علما کرام درس دیتے تھے۔ درس میں ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ قطب الدین نے لاہور اور اجمیر میں بھی کئی درس گاہیں قائم کیں۔

قطب الدین ایبک کو فنِ تعمیر سے بھی دلچسپی تھی۔ تعمیرات کے معاملے میں وہ اسلامی ذوق رکھتے تھے، چنانچہ دہلی اور اجمیر کی عظیم جامع مسجد تعمیر کروائیں، دہلی کی جامع مسجد قوتِ الاسلام، قطب الدین نے دہلی پر قبضہ کے فوراً بعد تعمیر کروائی تھی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اس مسجد پر بہت اچھی نظم کہی ہے۔

مسجد کے مشرقی دروازے پر سالِ بنا ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء درج ہے۔ مسجد کا وسطی دالان تقریباً ۶۵ میٹر طویل اور تقریباً ۴۵ میٹر عریض تھا۔ اس مسجد کے پانچ گنبد تھے۔ ایک نیا شاندار دالان دوسرے سال تعمیر ہوا۔ مسجد کی تکمیل ۵۹۴ھ / ۱۱۹۶ء میں ہوئی۔ مسجد کا رقبہ اُس وقت پچاس ہزار مربع فٹ سے کچھ کم تھا۔ قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التتمش نے اس میں اضافہ کیا۔ دالان کی محرابیں نوک دار اور ۵۲ فٹ بلند تھیں۔ مسجد کے صدر دروازے پر بیس فٹ قطر کا گنبد تھا۔

قطب الدین ایبک کی یادگار تعمیرات میں ایک اہم عمارت دہلی کا قطب مینار ہے۔ ماہرین نے اس مینار کو دنیا بھر میں اس نوعیت کی حسین ترین عمارتوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ سنگِ سرخ کا ۲۳۸ فٹ بلند یہ مینار موجودہ دہلی سے تقریباً گیارہ میل دور پرانے شہر کے آثار میں آج بھی سر اٹھائے کھڑا ہے اور آٹھ سو برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود صحیح سلامت ہے۔ دنیا بھر سے لوگ اس نادر مینار کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ عظیم یادگار جامع مسجد قوتِ الاسلام کی عمارت سے تقریباً ۱۶۰ فٹ کے فاصلے پر، مسجد کے بیرونی جنوبی صحن کے جنوب مشرقی گوشے میں ہے۔ اس مینار پر چڑھ کر مؤذن اذان دیا کرتے تھے۔ مینار کی پانچ منزلیں ہیں اور اوپر کی منزل کے سوا ہر منزل پر آگے کو نکلتے ہوئے جھروکے ہیں جن کے نیچے قرآنی آیات خوبصورتی سے کندہ کی گئی ہیں۔

خیال ہے کہ مینار کی بنیادی دو منزلیں قطب الدین نے بنوائی تھیں، پھر تیسری اور چوتھی منزلیں شمس الدین التتمش نے ۶۶۱ھ / ۱۲۲۵ء میں تعمیر کروائیں۔ اس کے بعد جب فیروز شاہ کے عہد میں مینار پر بجلی گری تو ۱۳۲۸ء میں فیروز شاہ نے اس کی مرمت کروائی اور پانچویں منزل کا اضافہ کر دیا جو سنگِ مرمر سے تعمیر ہوئی۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ قطب مینار کا نام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار

Marfat.com

کاکی کے نام پر ہے جو خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے، جن کا شمس الدین التتمش بہت احترام کرتے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کا انتقال ۱۲۳۵ء میں دہلی میں ہوا۔ انہیں مینار کے قریب ہی سپرد خاک کیا گیا۔ قطب الدین ایبک ہی کے عہد میں ایک جدید طرز کا محل "قصر سفید" کے نام سے پتھورا کے قلعہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ محل متروک اور ویران ہو گیا۔

قطب الدین ایبک بے حد دریا دل تھے۔ وہ کسی کی مدد کرتے یا انعام دیتے تو لاکھوں کے حساب سے دیتے اس لیے لوگ انہیں "لکھ بخش" یا "لکھ داتا" کہتے تھے۔ وہ نہایت دانشمند، معاملہ فہم اور جری سپہ سالار تھے۔ ان میں فوری طور پر منصوبہ بندی کرنے کی اچھی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ جرأت و بہادری ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ جب دشمن کے خلاف کسی مہم پر نکلتے تو فوج کے ساتھ تیز رفتاری سے پیش قدمی کرتے۔ ہانسی کی طرف فوج لے کر بڑھے تو ایک رات میں ۴۵ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ وہ اس قدر نڈر اور شیر دل تھے کہ اپنے نیزے کی مدد سے میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کو ڈھیر کر دیتے تھے۔ کول (علی گڑھ) کی جنگ میں انہوں نے تین ہاتھیوں کو اپنی شاندار تیر اندازی سے مار ڈالا تھا۔ وہ شمشیر زنی میں بھی مہارت رکھتے تھے، جب وہ شہاب الدین غوری کے ساتھ بنارس کی جنگ لڑنے کے لیے جا رہے تھے تو راستے میں انہیں چار خونخوار شیر ملے جنہیں انہوں نے اپنی تلوار سے ہلاک کر ڈالا۔

قطب الدین ایبک اپنی رعایا کے کم حیثیت اور نادار افراد کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ ان کے دور میں آبادیاں، ڈاکوؤں اور رہزنوں سے پاک ہو گئی تھیں اور انصاف کی حکمرانی تھی۔ فوج کے علاوہ محکمۂ مال میں بھی ہندو باشندے ملازم تھے۔

قطب الدین کے اعلیٰ انتظام اور مثالی حُسنِ سلوک کا نتیجہ یہ تھا کہ انتقال کے بعد بھی لوگ انہیں عرصے تک یاد کرتے رہے اور بعد کے ادوار میں جب کسی اچھے حکمران نے کوئی اچھا کام انجام دیا تو لوگ اسے "قطب الدین زمانہ" کہا کرتے تھے۔

***

Marfat.com

ناصر الدین قباچہ

سرزمینِ سندھ و ملتان کے علم پرور حکمراں

شہرت اور ناموری حاصل ہونے کے سوڈھنگ ہیں۔

تاریخ، مختلف شخصیات کو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے اوراق میں نمایاں مقام دیتی ہے، کسی حکمراں کے دور میں شاندار تعمیرات ہوئیں اوراس حکمراں نے ان تعمیرات کے حوالے سے اپنا نام تاریخ میں محفوظ کروالیا، کسی حکمران کے دور میں فتوحات بہت زیادہ ہوئیں تو تاریخ نے اسے فاتح عالم کے طور پر یاد رکھا، کسی حکمراں کا دور صنعتی ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے مثالی رہا تو تاریخ نے حکمراں کی انتظامی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا اور کچھ حکمراں ایسے بھی تھے، جنھوں نے ایک ایسی فصل کی آبیاری کی جس پر علم و عرفان کے برگ وبار آتے ہیں اور علم کا یہ خزانہ آنے والی نسلوں تک کے لیے خیر و فلاح کی نوید لے کر آتا ہے۔

ایسے ہی حکمرانوں میں سرزمینِ سندھ و ملتان کے علم دوست حکمران ناصر الدین قباچہ کا نام نمایاں ہے۔

ناصر الدین قباچہ، برصغیر پاک وہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے والے مشہور حکمراں، شہاب الدین غوری کے ترک غلام تھے۔ شہاب الدین غوری کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیکڑوں غلاموں کو بیٹوں کی طرح پالا پوسا اور ان کو بہت اعلیٰ تربیت دی۔ اسی تربیت کا اعجاز تھا کہ شہاب الدین غوری کے غلاموں میں سے کئی لائق افراد سامنے آئے جنھوں نے وسیع عریض علاقوں کا انتظام سنبھالا اور اپنی دانش مندی، فراست اور اہلیت کی بدولت ان علاقوں کو نہ صرف دشمنوں کی یلغار سے محفوظ رکھا بلکہ اپنی رعایا کو امن، سکون اور خوشحالی کی دولت سے مالامال کر دیا۔

ان میں برصغیر کے اوّلین فرمانروا قطب الدین ایبک بھی شامل ہیں، غزنی، غور اور بنیان (بنوں) کے علاقوں پر کامیابی سے حکومت کرنے والے تاج الدین یلدوز کا بھی نام آتا ہے اور برصغیر پاک وہند کے نامور حکمراں شمس الدین التمش بھی غلاموں کے سلسلے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناصر الدین قباچہ بھی شہاب الدین غوری کے غلام تھے۔ شہاب الدین نے ان کی صلاحیتوں کا ابتدا ہی میں اندازہ کر لیا تھا۔

ناصر الدین ایک سلجھے ہوئے، سمجھدار، دور اندیش اور مہذب انسان تھے۔ شہاب الدین کی صحبت میں رہ کر اور ان کے مقرر کردہ اساتذہ سے تربیت پا کر یہ جوہر اور بھی آبدار ہو گیا۔ وہ کئی سال تک مختلف شعبوں میں اہم ذمہ داریوں پر فائز رہے اور نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ مختلف ذمہ داریاں نبھانے کے باعث ناصر الدین کی صلاحیتیں مزید نکھر گئیں۔ ان کے تجربے میں اضافہ ہوا اور ان کے انتظامی اسلوب میں پختگی آگئی۔

شہاب الدین غوری ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء سے ۶۰۲ھ /۱۲۰۶ء تک برصغیر پاک وہند، ایران کے کچھ حصوں اور افغانستان پر حکمراں رہے۔ اس پورے عرصے کے دوران انھیں مختلف طاقتوں سے ٹکر لینی پڑی۔ کئی مقامات پر سرکش قبائل کی سرکوبی کے لیے اقدامات کرنے پڑے۔ ان تمام کارروائیوں کے نتیجے میں انہوں نے ایک وسیع مملکت قائم کی جس کے باسی امن و سکون کی فضا میں سانس لیتے تھے۔ شہاب الدین غوری نے تاج الدین یلدوز کو غور اور غزنی کا انتظام سونپا، اپنے لائق غلام قطب الدین ایبک کو برصغیر میں شمالی ہندوستان کا حاکم بنایا۔ (بعد میں قطب الدین ایبک پورے برصغیر پاک وہند کے حکمراں بنے) اور اُچ وسندھ کا انتظام ناصر الدین قباچہ کے حوالے کیا۔

ناصر الدین قباچہ سے قبل اُچ اور ملتان کے علاقے کی ذمہ داری

Marfat.com

ناصر الدین ایتم کے پاس تھی۔ اس دوران شہاب الدین غوری کو قرہ خطائیوں (ترکستان کی ایک غیر مسلم قوم) اور ترکستان کے حکمرانوں سے جنگ لڑنا پڑی۔ اس جنگ میں ناصر الدین ایتم نے بڑی بہادری اور بے خوفی کا ثبوت دیا اور شہاب الدین غوری کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے۔ خطائی ان کی اس دلیری سے بہت جھنجلائے ہوئے تھے، موقع پاکر انہوں نے ناصر الدین ایتم کو شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد شہاب الدین غوری نے اچ کا علاقہ اپنے قابل غلام ناصر الدین قباچہ کے سپرد کر دیا۔

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اُچ کے علاقے کے بارے میں چند باتیں تحریر کر دی جائیں۔ اس لفظ کا تلفظ اُچ، اوچ، اوچھ، اوچہ کئی طرح کیا جاتا ہے۔ دائرۂ معارف اسلامیہ نے تمام تلفظ درج کرنے کے بعد "اُچ" کو ترجیح دی ہے۔ یہ لفظ سنسکرت کے لفظ "اوچا" سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونچا، بلند کے ہیں۔ یہ ایک عہد میں بہت بڑا شہر تھا، جو پاکستان کے موجودہ بہاولپور ڈویژن کی حدود میں واقع تھا۔ اس علاقے میں اُچ نام کا ایک چھوٹا سا شہر آج بھی موجود ہے۔ یہ شہر دریائے چناب اور ستلج کے سنگم کے قریب ایک سطح مرتفع پر واقع ہے اور اس کا فاصلہ بہاولپور سے ۳۸ میل ہے۔ ناصر الدین قباچہ نے اُچ کو بہت ترقی دی۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کیا۔

قطب الدین ایبک سے ناصر الدین قباچہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ قطب الدین ایبک اس ذہین نوجوان سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی ناصر الدین قباچہ سے کر دی اور جب اس بیٹی کا انتقال ہو گیا تو اپنی دوسری بیٹی بھی ناصر الدین قباچہ کی زوجیت میں دے دی۔ بڑی بیٹی سے ایک بیٹا ہوا، جس کا نام علاؤالدین مسعود بہرام شاہ رکھا گیا۔ ناصر الدین قباچہ اپنے خسر، قطب الدین ایبک کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے قطب الدین ایبک کی بالادستی ہمیشہ تسلیم کی اور تمام امور میں ان کی اطاعت کرتے رہے۔ وہ اپنے خسر سے ملنے کے لیے اکثر اُچ سے دہلی جایا کرتے تھے۔ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد شمس الدین التتمش نے برصغیر کی اسلامی مملکت کی عنانِ اقتدار سنبھالی۔ التتمش بھی قطب الدین ایبک کے داماد تھے اور اس لحاظ سے ناصر الدین قباچہ کے قرابت دار تھے۔

قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے مناسب سمجھا کہ اپنی خود مختار حکومت بنائیں اور اسے وسعت دیں، چنانچہ انہوں نے ملتان پر تسلط قائم کر لیا اور سیوستان اور دیول کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

سیوستان سے مراد سہون کا علاقہ ہے اور دیول سے مراد دیبل کا مشہور ساحلی علاقہ ہے، گویا کہ پورا سندھ ان کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے لاہور پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کو مشرقی پنجاب تک وسیع کر لیا اور سرستی، سرہند اور کہرام کے علاقے بھی ان کے زیر تسلط آ گئے لیکن تاج الدین یلدوز اور پھر التتمش نے یہ کوششیں ناکام بنا دیں۔ بہر حال سندھ اور ملتان کے علاقوں پر ناصر الدین قباچہ کی حکومت اس کے بعد بھی اٹھارہ برس تک قائم رہی۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز ہوا تو حالات نے ایک نئی کروٹ لی، منگولیا کی سرزمین سے ایک نئی طاقت ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چند برسوں میں دنیا کے بڑے حصے میں تباہی اور بربادی پھیلا دی۔ یہ منگولوں کی طاقت تھی، جو اپنے سردار چنگیز خان کی قیادت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء میں چنگیز خان اور خوارزم کے حکمراں محمد خوارزم شاہ کے درمیان آویزش ہوئی اور مسلمانوں کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ منگول سیلاب نے نہ صرف خوارزم بلکہ ترکستان، ایران اور افغانستان کو بھی روند ڈالا۔ سمرقند، بخارا، بلخ، نیشاپور، رے غرض وسط ایشیا اور ایران کے بڑے بڑے شہر جنہیں مسلمانوں نے بڑی محنت سے آباد کیا تھا اور ترقی دی تھی، چنگیزی طوفان کی زد میں آکر برباد ہو گئے۔

اس طوفان کے اثرات برصغیر پر بھی پڑے۔ وسط ایشیا، افغانستان اور ایران سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے برصغیر پہنچنے لگے۔ چونکہ پنجاب کی طرف کھوکھروں نے راستہ بند کر رکھا تھا، اس لیے ترکستان، افغانستان اور ایران کی طرف سے آنے والوں کے لیے صرف ملتان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء، دانشور اور ماہرین ہندوستان جاتے ہوئے جب اُچ اور ملتان سے گزرے تو وہ یہاں کی علمی فضا سے متاثر ہو کر یہیں ٹھہر گئے۔ ناصر الدین قباچہ کے لیے یہ زمانہ آزمائشوں سے بھرپور تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ منگول سیلاب برصغیر کا رخ کر سکتا ہے اور منگولوں کے مظالم سے تنگ آنے والے اُچ اور ملتان ہی کا رخ کر رہے ہیں۔ بہر حال انہوں نے اپنے پاس آنے والوں کا محبت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اہل علم افراد کو ہر ممکن

Marfat.com

سہولتیں فراہم کیں۔

چنگیز خان اور محمد خوارزم شاہ کے درمیان ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء میں جس تنازع کا آغاز ہوا تھا، پانچ سال بعد وہ خوارزم شاہ کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ اور چنگیز خان کے درمیاں بڑی لڑائی میں تبدیل ہو گیا۔ جلال الدین بہادر سالار تھے، لیکن وہ چنگیز خان کے ٹڈی دل لشکر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالآخر انہوں نے برصغیر کا رخ کیا، لیکن چنگیز خان خود فوج لے کر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ شوال ۶۱۸ھ / نومبر ۱۲۲۱ء میں دریائے سندھ کے کنارے دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی، جلال الدین خوارزم دلیری کے ساتھ دریا عبور کر گئے۔ اچ اور ملتان پہنچ کر انہوں نے کوشش کی کہ یہاں اپنے قدم جمالیں لیکن یہاں ناصر الدین قباچہ کی حکومت تھی، انہوں نے مزاحمت کی، قباچہ کی فوج کامیابی حاصل نہ کر سکی، مگر دوسری طرف سے چنگیزی لشکر کے آنے کی اطلاع ملی، یہ اطلاع ملنے پر جلال الدین ٹھٹھہ چلے گئے اور اس کے بعد کچھ اور مکران کے راستے ایران وعراق کی طرف نکل گئے۔

اس کشمکش کے ختم ہونے کے بعد ایک اور طوفان ناصر الدین قباچہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ یہ چنگیزی فوج کا طوفان تھا۔ ۶۲۱ھ / ۱۲۲۴ء میں چنگیزی سردار نے بھاری فوج کے ساتھ ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ ناصر الدین قباچہ بالکل ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے نہایت پامردی کے ساتھ چنگیزی لشکر کا مقابلہ کیا، آخر کار چالیس روز کے بعد دشمن لشکر محاصرہ ختم کر کے واپس چلا گیا۔

منگول لشکر سے چھٹکارا حاصل کیے ابھی صرف دو سال گزرے تھے کہ ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء میں ملک خان خلجی نے افغانستان کی جانب سے سرزمین سندھ پر حملہ کیا، لیکن ناصر الدین قباچہ نے اپنی فوج کو منظم انداز میں ترتیب دے کر اس طرح مقابلہ کیا کہ ملک خان خلجی لڑائی میں ہلاک ہو گیا اور اس کی فوج شکست سے دوچار ہوئی۔

جنگوں کا سلسلہ ابھی تھما نہ تھا، برصغیر کے نامور اور اہل حکمراں شمس الدین التتمش نے محسوس کیا کہ مملکت کو استحکام بخشنے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پورے برصغیر میں ایک حکومت قائم ہو اور یہ صورت نہ ہو کہ سندھ اور ملتان پر ایک شخصیت کی حکمرانی ہو تو بنگال کی سمت کوئی اور حکمراں ہو، برصغیر کے وسطی حصوں پر کسی اور کی حکومت ہو اور برصغیر کی حکومت مختلف ٹکڑوں میں بٹی رہے۔ چنانچہ التتمش نے ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء میں ناصر الدین قباچہ کی حکومت کی انفرادی حیثیت ختم کرنے کا فیصلہ کیا، ناصر الدین قباچہ نے اس اقدام کے خلاف مزاحمت کی۔ التتمش نے فوجی تیاریوں کے بعد اُچ شہر کی طرف پیش قدمی کا آغاز کر دیا، کچھ دنوں بعد التتمش کی فوجیں اُچ کے قلعے کا محاصرہ کر چکی تھیں۔

ناصر الدین قباچہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ التتمش کی زبردست فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتے چنانچہ وہ اُچ چھوڑ کر بکھر چلے گئے۔ یہ سکھر اور روہڑی کے درمیان ایک جزیرہ ہے۔ اس کا تلفظ "بکر" بھی کیا جاتا رہا ہے، اب یہ بھکر کہلاتا ہے۔ التتمش نے اپنے وزیر نظام الملک کو فوج دے کر بھیجا جس نے بکھر کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر ۲۷ جمادی الاول ۶۲۵ھ / ۴ مئی ۱۲۲۸ء کو اُچ فتح ہو جانے کی خبر ملی تو ناصر الدین نے اپنے بیٹے علاالدین مسعود بہرام شاہ کو سفارتی نمائندے کے طور پر التتمش کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ صلح کے سلسلے میں کوئی بات چیت کریں۔ التتمش نے علاالدین کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا لیکن انھیں واپس جانے کی اجازت نہ دی۔ اس دوران بکھر میں ناصر الدین قباچہ اور ان کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ۲۲ جمادی الآخر ۶۲۵ھ / ۲۹ مئی ۱۲۲۸ء کو بکھر پر بھی التتمش کی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔

ناصر الدین قباچہ نے التتمش کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے پر فرار ہو جانے کو ترجیح دی اور کشتی میں بیٹھ کر بکھر سے نکلنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے دریائے سندھ میں شدید طغیانی آئی ہوئی تھی۔ کشتی سیلاب کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور دریا کی بے رحم موجوں کی نذر ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اچھے انسان اور قابل حکمراں کی زندگی کا باب تمام ہو گیا۔

ناصر الدین قباچہ نہایت ذہین، باصلاحیت، فیاض، اچھے منتظم اور علم دوست حکمراں تھے۔ انہوں نے بائیس سال تک سندھ اور ملتان کی سرزمین کو اور اس طرح برصغیر کے باقی پورے حصے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے محفوظ رکھا۔ اگر وہ چنگیزی لشکر کا جرأت سے مقابلہ نہ کرتے تو ممکن تھا کہ تاتاریوں کا طوفان سندھ، ملتان اور پھر برصغیر کے باقی حصوں کو بھی لپیٹ میں لیتا۔ لیکن تاریخ نے ناصر الدین قباچہ کو اس وجہ سے یاد نہیں رکھا کہ انہوں نے ایک کامیاب حکومت کی یا برصغیر کے اس حصے میں امن وامان قائم رکھا بلکہ تاریخ نے ناصر الدین قباچہ کو علم سے ان کی والہانہ محبت اور شیفتگی کی وجہ سے یاد رکھا ہے۔

ناصر الدین قباچہ کا یہ کارنامہ نہایت قابل تحسین ہے کہ اُچ اور

Marfat.com

ملتان میں علم کی ترویج و اشاعت کا باقاعدہ آغاز قباچہ ہی کے دور میں ہوا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، تاتاریوں کے حملوں کے باعث وسط ایشیا اور ایران سے بہت سی علمی شخصیات نے برصغیر کا رخ کیا اور ان میں سے کئی افراد نے ملتان اور اُچ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ناصر الدین قباچہ نے ان افراد کی بہت تعظیم کی اور علم کے فروغ کے لیے صاحب علم افراد کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ بعض علما اور دانشوروں کو تو خود قباچہ نے دعوت دے کر اپنے پاس بلوایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق برصغیر میں قائم ہونے والے اوّلین مدرسوں میں سے ایک اہم مدرسہ ملتان میں، ناصر الدین قباچہ کے عہد میں قائم ہوا۔ یہ حضرت بہاالدین زکریاؒ (۵۷۵ھ / ۶۶۱ھ) کی علمی درسگاہ تھی جو ۶۰۵ھ میں قائم ہوئی۔ اس درس گاہ سے ہزاروں طالبانِ علم نے قرآن، حدیث، فقہ کے علاوہ خطاطی، علم قرأت اور تجارت کی تعلیم حاصل کی۔

قباچہ ہی کے عہد میں ایک بڑے مورخ اور فقیہ کا نام تاریخ میں ابھرتا ہے۔ یہ قاضی منہاج الدین بن قاضی سراج الدین ہیں، جو "منہاج السراج" کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ غوری حکمرانوں کے دارلحکومت فیروز کوہ میں ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فیروز کوہ ہی میں حاصل کی۔ چنگیزی مظالم سے متاثر ہو کر ۳۵ سال کی عمر میں برصغیر چلے آئے۔ بعد میں التتمش، منہاج السراج کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء میں انہوں نے "ناصری نامہ" لکھی۔ یہ کتاب اب موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں انہوں نے تاریخ کی مشہور کتاب "طبقات ناصری" مکمل کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ناصر الدین قباچہ کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

مشہور عالم دین مولانا قطب الدین کاشانی، ناصر الدین قباچہ کی دعوت پر ترکستان سے ہجرت کر کے ملتان آئے تو قباچہ نے ملتان میں ان کے لیے بہت بڑا مدرسہ اور ساتھ ہی مسجد تعمیر کروائی۔ مولانا کاشانی کا یہ مدرسہ صدیوں تک قائم رہا۔ مولانا، اپنے ساتھ منطق اور علم کلام کی کتب کا بڑا ذخیرہ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ملتان میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔

ناصر الدین قباچہ اہل علم کو دوست رکھتے تھے۔ ان کی علمی محفلوں میں شمس الدین بلخی جیسے بڑے خطاط و شاعر، فضلی ملتانی جیسے عالم اور محمد بن یحیٰی العوفی جیسے علم الرجال اور جرح و تعدیل کے ماہر اور مشہور ادیب، شریک ہوتے تھے۔ قباچہ کے وزیر عین الملک بھی بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بھی علم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

تاریخ میں عوفی کے کئی لقب درج کیے گئے ہیں، جن میں نورالدین، سدید الدین اور جمال الدین شامل ہیں۔ عوفی مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اولاد میں سے ہیں، اسی نسبت سے عوفی کہلاتے ہیں۔ وہ بخارا میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم پائی اس کے بعد تحصیلِ علم کے لیے ماوراء النہر (ترکستان) خراسان، سمرقند، خوارزم، ہرات، غزنی اور دیگر بہت سے علاقوں کا سفر کیا۔ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء میں وہ تاتاری فتنے سے بچنے کے لیے سندھ چلے آئے۔ جہاں ناصر الدین قباچہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں ناصر الدین قباچہ نے عوفی کو سرکاری عہدہ دیا، ۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء تک عوفی اچ میں مقیم رہے، اسی دوران انہوں نے کتاب "لبابُ الالباب" تحریر کی اور اسے قباچہ کے وزیر یمین الملک فخر الدین الاشعری کے نام منسوب کیا۔

"لباب الالباب" فارسی زبان کے شاعروں کا بہت اہم اور سب سے قدیم تذکرہ ہے۔ اس میں ابتدا سے ساتویں صدی ہجری تک کے تین سو ستر شعرا کے حالات اور حکمرانوں، علما کرام اور وزرا کے حالات اور اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض شعرا کے بارے میں کسی اور کتاب سے معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تاتاریوں کی یلغار کے وقت جو شعرا کرام اپنا دیوان مرتب نہیں کر سکے تھے، ان کا تذکرہ اور کلام بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ناصر الدین قباچہ نے عوفی سے ایک اور اہم کتاب بھی لکھوائی۔ یہ کتاب "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" ہے۔ کتاب ابھی زیر تصنیف تھی کہ شمس الدین التتمش نے اچ پر حملہ کر دیا اور قباچہ بکھر چلے گئے۔ جو لوگ قباچہ کے ساتھ بکھر کے قلعے میں گئے تھے ان میں عوفی بھی تھے۔ قباچہ کے انتقال کے بعد عوفی التتمش کے ساتھ دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے یہ کتاب مکمل کی اور اسے التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی سے منسوب کیا۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس میں تاریخی کہانیاں شامل ہیں جن کو سبق آموز اور ادبی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایسی اہم معلومات موجود ہیں جو تاریخ کی بہت سی دیگر اہم کتب میں نہیں ملتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوفی نے اس کتاب کی تیاری میں ایسی بہت سی کتب سے استفادہ کیا جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب، اسلام، ایران، اور برصغیر کی تاریخ اور مصنف کے زمانے یعنی ساتویں صدی ہجری کے پہلے پچیس سال کی ممتاز اور اہم شخصیات کے حالات کے لیے اہم ترین

Marfat.com

تاریخی ماخذ ہے۔ عوفی نے ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء میں عربی زبان کی ایک کتاب "الفرج بعد الشدّہ" کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس میں بھی تاریخی حکایات تھیں تاہم عوفی کی یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ عوفی نے اپنی کتاب "جوامع الحکایات" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ناصر الدین قباچہ کے دور میں ایک اور اہم کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب سندھ کی سب سے قدیم تاریخ "چچ نامہ" ہے۔ یہ کتاب تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں قاضی اسماعیل بن علی ثقفی نے مرتب کی تھی۔ عربی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا نام "الہند والسند و منہاج المسالک" رکھا گیا۔ یہ کتاب نایاب تھی لیکن ایک شخص علی بن حامد بن ابو بکر کوفی کو جو عراق سے اُچ آگئے تھے، اس کتاب کا ایک نسخہ بکھر میں مل گیا۔ ۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء میں علی بن حامد نے اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی برس میں اسے قباچہ کے اہلِ علم وزیر عین الملک کو پیش کیا۔

علی بن حامد کو اس کتاب کے اوراق، بکھر کے ثقفی خاندان سے حاصل ہوئے تھے۔ علی بن حامد نے "چچ نامہ" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ جب وہ صحرا نوردی اور ملک ملک کی سیر کے بعد اُچ پہنچے تو انھیں یہاں بڑا سکون ملا اور انھوں نے یہاں بڑی آسودگی کی زندگی بسر کی۔ "چچ نامہ" سندھ کی بے حد اہم تاریخ ہے۔ اس میں جغرافیائی معلومات بھی ہیں۔ بعد میں مرزا قلیچ بیگ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کا فارسی متن اور مستند انگریزی ترجمہ کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر این۔ اے۔ بلوچ نے شائع کیا ہے۔ ناصر الدین قباچہ کے یہ وہ علمی کارنامے ہیں جو قباچہ کا نام تاریخ کے ایوانوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

***

Marfat.com

شمس الدین التمش

برصغیر کی اسلامی مملکت کو اتحاد و استحکام بخش کر، علم کا گہوارہ بنانے والے حکمراں

وہ بڑا ہی خوبصورت بچہ تھا!

بخارا کے مصروف بازار میں اس حسین و جمیل بچے کی طرف توجہ دینے کی اس وقت کسی کو فرصت نہ تھی، کوئی نہ تھا جو رک کر دیکھتا کہ اس بھولے بھالے بچے کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ سسکیاں لے کر رو رہا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک درویش صفت شخص کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے بچے کو روتے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ بچے کو تسلی دی، پھر اس کے رونے کی وجہ پوچھی۔ بچے نے بتایا کہ اس کے مالک نے اسے بازار سے انگور لانے کے لیے کچھ رقم دی تھی، وہ رقم کہیں راستے میں گر گئی ہے۔ اب وہ انگور خریدے بغیر کیسے گھر واپس جائے۔ درویش نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور انگور خرید کر بچے کے حوالے کر دیے۔ بچے کے آنسو تھم گئے۔ اس نے احسان مندی کی نظر سے اجنبی کو دیکھا اور انگوروں کا لفافہ تھام کر گھر جانے لگا۔ اسی لمحے درویش نے بچے کو روک کر کہا:

"دیکھو جب تمہارے پاس دولت آجائے تو فقیروں اور درویشوں کا احترام کرنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کو اپنا فرض جاننا۔"

بچے نے وعدہ کیا اور انگور لے کر گھر چلا آیا۔

یہ بچہ بخارا کے ایک گھرانے کا غلام تھا۔ چند سال بعد یہی غلام برصغیر کی اسلامی مملکت کا فرمانروا بنا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بخارا میں غلامی کی زندگی بسر کرنے والے اس بچے سے قدرت مستقبل میں اتنا بڑا کام لینے والی ہے۔

تاریخ اس بچے کو شمس الدین التمش کے نام سے جانتی ہے، جنہوں نے برصغیر کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کو نہ صرف انتشار کا شکار ہونے سے بچا لیا بلکہ اپنی بصیرت اور انتظامی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے مملکت کو بے حد وسیع و مستحکم کیا۔ انھوں نے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا اور اس سرزمین کو اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا۔ التمش نے اپنے بچپن میں درویش سے جو وعدہ کیا تھا اسے عمر بھر نبھایا۔ چنانچہ وہ سربراہِ مملکت بننے کے بعد آخر دم تک علما، مشائخ اور صوفیا کرام کی خدمت کرتے رہے۔

لفظ "التمش" کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً التمش، ایلتتمش، ایلتمش وغیرہ۔ لیکن جدید تحقیق کے نتیجے میں "اِلتُتمِش" پر بیشتر محققین کا اتفاق ہو گیا ہے۔

التمش برصغیر کی وسیع اسلامی مملکت کے فرمانروا کیسے بنے، اس کی داستان بہت دلچسپ ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتی ہے۔ التمش ترکستان کے ایک قبیلے البری سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ ان کے والد ایل خان (ایلم خان) قبیلے کے سردار تھے اور انہیں اپنی دولت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے شہرت حاصل تھی۔ ایل خان کے کئی لڑکے تھے لیکن قدرت نے التمش کو غیر معمولی حسن و جمال، وجاہت اور ذہانت بخشی تھی۔ انہی خوبیوں کی بنا پر ان کے والد انہیں اپنے دیگر بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

ایل خان کے بیٹوں کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی کہ التمش کو اپنے بھائیوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ انہوں نے برادرانِ یوسف کی مانند آپس میں صلاح و مشورہ کیا اور طے پایا کہ التمش کو کسی بہانے گھر سے دور لے جا کر کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل کیا گیا۔ تمام بھائی اور ان کے بعض بچے التمش کو گھوڑے دکھانے اور سیر و تفریح کے بہانے گھر سے دور ایک باغ میں لے گئے جہاں ایک

Marfat.com

سوداگر سے التتمش کی بابت سودا ہو گیا۔ التتمش کے بھائی دام کھرے کر کے گھر لوٹ آئے اور التتمش کی قسمت انہیں بخارا لے گئی۔ ان کو خریدنے والے سوداگر نے انہیں بخارا لے جا کر اس شہر کے صدر جہاں (ایک سرکاری عہدہ) کے عزیز کے ہاتھوں بیچ دیا۔

اس وقت التتمش کی عمر مشکل سے نو یا دس برس ہو گی۔ صدر جہاں کے عزیز کا یہ گھرانا بڑا مہذب اور متمدن تھا اور گھر کے مکین نہایت خلیق اور مہربان تھے۔ انہوں نے التتمش کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔ یوں التتمش کی فطری دانائی اور ذہانت کو علم کی روشنی میں پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ التتمش بخارا کے اس گھرانے میں اپنی کل عمر گزار دیں، وہ تو ان سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی تھی۔ ایک تاجر حاجی بخاری نے التتمش کو بخارا کے اس گھرانے سے خرید لیا، پھر حاجی بخاری نے التتمش کو ایک تاجر جمال الدین عرف "چست قبا" کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔

جمال الدین چست قبا، التتمش کو بغداد لے گئے۔ اس زمانے میں بغداد علما اور مشائخ کا بڑا مرکز تھا۔ اس میں رہتے ہوئے التتمش کو بڑے صوفیا عظام کی خدمات میں حاضر ہونے اور ان سے برکات سمیٹنے کا موقع ملا۔ مسجد ابو اللیث سمرقندی، مسجد جنید بغدادیؒ میں صوفیا اور اولیا کرام کی مجالس منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ان مساجد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، مولانا عماد الدینؒ، شیخ کرمانیؒ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے مواعظ اور نصائح سے خلقِ خدا کو مستفید فرما رہے تھے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں، بغداد میں ایک روز حضرت خواجہ معین الدینؒ، شیخ اوحد الدین کرمانیؒ اور شیخ شہاب الدینؒ تشریف فرما تھے، پرانے زمانے کے اولیا کرام پر گفتگو ہو رہی تھی، میں بھی شریک تھا۔ اس اثنا میں ایک دس بارہ سالہ لڑکا ہاتھ میں کمان لیے ادھر سے گزرا۔ تمام بزرگوں کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ دفعتاً حضرت خواجہ معین الدینؒ کی زبانِ مبارک سے نکلا: "یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ ہو گا۔"

یہ دس بارہ سالہ لڑکا التتمش تھا۔

ایک بار التتمش، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے دعا فرمائی اور فرمایا: "اس شخص کے چہرے سے انوارِ سلطنت چمکتے نظر آتے ہیں۔"

کچھ عرصے بعد جمال الدین، التتمش کو لے کر غزنی آئے تا[کہ] وہاں انہیں فروخت کر کے زیادہ رقم حاصل کی جا سکے۔ التتمش اب جوان ہو چکے تھے اور ان کی بے مثال فراست و دانائی اور بے پناہ وجاہت کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر غزنی کے حکمران شہاب الدین غوری تک پہنچی۔ انہوں نے معلوم کروایا کہ اس دانشمند غلام کی قیمت کیا ہے۔ جمال الدین چست قبا نے التتمش کے ساتھ ایک ترک غلام بھی منسلک کر دیا تھا اور دونوں کو اکٹھے فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ شہاب الدین غوری نے دونوں غلاموں کی قیمت ایک ہزار دینار تک لگا دی لیکن جمال الدین راضی نہ ہوئے۔ اس پر شہاب الدین نے ناراض ہو کر ان دونوں غلاموں کی فروخت ممنوع قرار دے دی۔

جمال الدین دونوں غلاموں کے ساتھ سال بھر تک غزنی میں ٹھہرے رہے لیکن جب وہ ان غلاموں کو فروخت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو واپس بخارا چلے گئے اور دونوں غلاموں کو بھی لے گئے۔ تین سال بعد وہ پھر غزنی آئے لیکن چونکہ ان غلاموں کی فروخت پر حکومت کی طرف سے پابندی عائد تھی اس لیے مزید ایک سال گزر گیا۔ جب برصغیر کے پہلے مسلمان فرمانروا قطب الدین ایبک (جو شہاب الدین غوری کے غلام تھے) نہروالہ کی لڑائی اور گجرات کی فتح کے بعد غزنی آئے تو انہوں نے بھی التتمش کی دانائی اور فراست کے تذکرے سنے۔ قطب الدین ایبک نے شہاب الدین غوری سے اس غلام کو خریدنے کی اجازت طلب کی۔ شہاب الدین غوری نے کہا کہ غزنی میں تو فرمان جاری ہو چکا ہے کہ ان غلاموں کو کوئی نہ خریدے، تم یوں کرو کہ دہلی جا کر ان غلاموں کو وہاں بلوا لو اور دہلی میں ان کی خریداری کا معاملہ طے کر لو۔

قطب الدین ایبک نے نظام الدین محمد کو بعض امور کی تکمیل کے لیے غزنی میں چھوڑ دیا اور انہیں ہدایت کی کہ جب وہ دہلی آئیں تو اپنے ساتھ جمال الدین چست قبا کو بھی لیتے آئیں تاکہ التتمش کے معاملے پر بات ہو سکے۔ نظام الدین محمد جب دہلی آئے تو انہوں نے قطب الدین کی ہدایت پر عمل کیا۔ چنانچہ دہلی میں دونوں غلاموں کی خریداری کا معاملہ طے پایا۔ بعض مؤرخین کے مطابق قطب الدین ایبک نے دونوں غلاموں کو ایک لاکھ "تنکہ" میں خریدا (تنکہ اس زمانے کا سکہ تھا)۔ ایبک، التتمش کی شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے التتمش کو اپنا بیٹا بنا لیا۔

التتمش اپنے سابقہ مالکوں سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل

Marfat.com

کر چکے تھے۔ بغداد میں صوفیائے کبار اور مشائخ کرام سے تقویٰ، طہارت اور تزکیہ کا درس لیا تھا۔ اب قطب الدین ایبک کی سرپرستی میں انہوں نے فن حرب پر دسترس اور لڑائی کے مختلف طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ بہت جلد قطب الدین نے التتمش کو خصوصی محافظ فوج کا سالار بنادیا جسے "سرجاندار" کہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہیں امیر شکار بنادیا گیا، پھر گوالیار کا علاقہ فتح ہوا تو ایبک نے اپنے لائق غلام التتمش کو گوالیار کا حاکم بنادیا اور برن (بلند شہر) کو مضافات سمیت ان کی جاگیر میں دے دیا۔ التتمش پر جو بھی ذمہ داری ڈالی گئی اسے انہوں نے بڑی خوبی سے پورا کیا اور ہر شعبے میں اپنی لیاقت، فراست اور معاملہ فہمی کی بدولت نام پیدا کیا۔ کچھ مدت بعد ایبک نے التتمش کو بدایوں کا ملک (گورنر) مقرر کردیا۔

شہاب الدین غوری نے ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۶ء میں خوارزم پر فوج کشی کی۔ اس اثنا میں افواہ پھیل گئی کہ شہاب الدین غوری شہید ہوگئے ہیں۔ اس پر پنجاب کے علاقے میں کھوکھروں نے بغاوت کا پرچم بلند کردیا۔ شہاب الدین غوری نے فیصلہ کیا کہ اس بغاوت کو کچل دینا چاہیے۔ وہ فوج لے کر چلے۔ انہوں نے دہلی کے حکمران قطب الدین ایبک کو بھی پیغام بھیج دیا کہ وہ اپنا لشکر لے کر مدد کو پہنچیں۔ التتمش کو بھی اطلاع دے دی گئی اور وہ بھی اپنی فوج لے کر روانہ ہوگئے۔ دریائے جہلم کے کنارے کھوکھروں سے جنگ ہوئی۔ کھوکھر ایک جزیرے میں محصور ہو گئے اور زبردست مزاحمت شروع کردی۔

دریا کی تندو تیز موجوں کو چیر کر جزیرے تک پہنچنا اور سرکش کھوکھروں کو زیر کرنا بڑا مشکل کام تھا لیکن اس وقت التتمش نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ انہوں نے بڑی بے خوفی سے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور نہایت تیزی سے دریا پار کرکے دشمن کے ٹھکانے پر جا پہنچے۔ ان کی اس دلیری کو دیکھ کر ان کے سپاہیوں کو بھی جوش آگیا اور اپنے سالار کی پیروی میں انہوں نے بھی گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور جزیرے تک پہنچ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ کھوکھر اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ انہوں نے کچھ دیر لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ شہاب الدین غوری یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قطب الدین ایبک سے کہا: "یہ شخص بڑے کارنامے انجام دے گا اس سے اچھا برتاؤ کرنا۔" پھر انہوں نے التتمش کو بلایا۔ اپنی خلعتِ خاص دی اور قطب الدین ایبک کو حکم دیا کہ التتمش کی آزادی کا پروانہ لکھ

دیں۔ اس کے بعد التتمش کو امیر الامرا کا لقب دیا گیا اور قطب الدین نے اپنی ایک بیٹی کی شادی التتمش سے کردی۔

سنہ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کا انتقال ہوگیا۔

اب یہ بے حد ضروری تھا کہ برصغیر کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کو متحد رکھنے اور اسے استحکام بخشنے کے لیے کوئی راست باز اور منتظم شخصیت سامنے آئے۔ دہلی کے امیر داد (چیف جسٹس) علی اسماعیل اور دیگر امرا نے محسوس کیا کہ اس منصب کے لیے التتمش سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے بدایوں خط بھیجے اور التتمش کو آکر امورِ مملکت سنبھالنے کی دعوت دی۔ التتمش دہلی آگئے اور ۶۰۷ھ ہی میں انہوں نے مملکت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ انہوں نے شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔

ابتدائی چند برس مختلف شورشوں کے خاتمے میں صرف ہوگئے۔ اس دوران التتمش نے لاہور، تھانیسر، 'اچ' ملتان اور جالور کے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ انہوں نے مشرق میں بنارس سے آگے بڑھ کر اڑیسہ کے راجہ جاج سنگھ پر فوج کشی کی اور اسے بھی اپنا باج گزار بنا لیا۔ اسی اثنا میں جلال الدین خوارزم شاہ، چنگیزیوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر پنجاب کی حدود میں داخل ہوگئے۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوا کہ چنگیزی (تاتاری) فوج جلال الدین کے تعاقب میں برصغیر میں پہنچ جائے گی اور پھر زبردست خونریزی ہوگی۔ ایک روایت کے مطابق چنگیزی فوج ضلع جہلم کے قلعہ نندونہ پر قابض ہو چکی تھی۔ اس خطرے کو محسوس کرکے التتمش نے فوری طور پر فوج تیار کی اور لاہور کی سمت روانہ ہوگئے۔ جلال الدین خوارزم شاہ نے صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کرلیا اور وہ 'اچ' ملتان اور سندھ سے ہوتے ہوئے کچھ اور مکران کے راستے برصغیر سے نکل گئے۔ کہتے ہیں کہ تاتاری فوج کو التتمش نے ہی پنجاب سے واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ التتمش کی مضبوط اسلامی حکومت کو دیکھتے ہوئے تاتاری لشکر نے برصغیر کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کی ورنہ بغداد کی تاریخ دہلی میں بھی دہرائی جاچکی ہوتی۔

التتمش نے ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں لکھنوتی (بنگال) کا رخ کیا، جہاں ایک شخص غیاث الدین عوض نے خود مختاری کا اعلان کردیا تھا۔ غیاث الدین نے التتمش کی فوج کو دیکھ کر اطاعت کا وعدہ کرلیا اور اڑتیس ہاتھیوں سمیت قیمتی تحائف پیش کیے۔ التتمش نے اپنے بڑے

Marfat.com

بیٹے ناصر الدین محمود کو بنگال کا حاکم مقرر کر دیا اور بہار کے صوبے کو الگ کر کے ملک عز الدین کے حوالے کیا۔ ۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء میں التتمش نے رنتھمبور پر فوج کشی کی۔ جے پور سے اسّی میل دور واقع یہ نہایت مضبوط قلعہ ہندوستان کے ناقابلِ تسخیر حصاروں میں شمار ہوتا تھا۔ اہلِ ہند کی تاریخ کے مطابق ستّر سے زیادہ حکمرانوں نے اس قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے، لیکن التتمش نے صرف چند ماہ میں اسے تسخیر کر ڈالا۔ پھر چتوڑ فتح ہوا۔ ایک سال بعد جودھ پور سے پانچ میل جنوب میں واقع مندور کا قلعہ فتح ہوا۔ اس کے بعد کوہستان، سوالک کے تمام علاقوں پر التتمش کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء میں التتمش نے سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کا پورا علاقہ پہلی بار دہلی کی اسلامی مملکت کے تحت آ گیا۔

بائیس ربیع الاول ۶۲۶ھ / ۱۸ فروری ۱۲۲۹ء کی تاریخ اہلِ برصغیر کے لیے یادگار تھی کیونکہ اسی مبارک تاریخ کو خلیفہ بغداد نے التتمش کی اسلامی حکومت کو سند عطا کی۔ خلیفہ بغداد المستنصر باللہ کے سفیر قیمتی تحائف اور خلعت لے کر دہلی پہنچے تو پورا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا اور جشن کا سماں تھا۔ خلیفہ نے التتمش ہی کے لیے نہیں بلکہ التتمش کے بیٹوں، امراء اور غلاموں تک کے لیے خلعتیں اور تحائف بھیجے تھے۔ اس یادگار موقع پر ایک سکہ بھی جاری ہوا۔ التتمش وہ پہلے ترک حکمران ہیں جنہوں نے سکوں پر عربی حروف لکھوائے۔ ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں یعنی خلافتِ بغداد سے سند حاصل ہونے سے تقریباً دس سال قبل عباسی خلیفہ الناصر نے حسن صنعائی کو اپنے سفیر کی حیثیت سے التتمش کے پاس بھیجا تھا۔ اب برصغیر کے عوام کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی سرزمین دارالاسلام کا ایک حصہ ہے۔

گوالیار کا قلعہ بعد میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا چنانچہ التتمش نے ۶۲۹ھ / ۱۲۳۲ء میں گوالیار پر فوج کشی کر دی اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ہندو راجا دیوبل گیارہ ماہ تک محصور رہ کر مقابلہ کرتا رہا۔ اسلامی فوج نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نمازیں بھی اسی دوران ادا کیں۔ آخر راجہ دیوبل کی ہمت جواب دے گئی اور وہ راتوں رات فرار ہو گیا۔ صبح ہوئی تو قلعہ والوں نے مجبوراً قلعہ کے دروازے کھول دیے۔ ۶۳۱ھ / ۱۰ اپریل ۱۲۳۴ء میں مالوہ پر بھی التتمش کا قبضہ ہو گیا۔ اسی سال بھیلسہ بھی فتح ہوا اور صرف ایک سال بعد التتمش کی فوج اجین پر بھی حملہ آور ہو گئی۔ اجین کی فتح کے بعد واپسی کے سفر میں التتمش علیل ہو گئے۔ یکم شعبان ۶۳۳ھ / ۱۰ اپریل ۱۲۳۶ء کو التتمش دہلی پہنچے۔ علالت شدید ہو گئی اور ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ / ۲۹ اپریل ۱۲۳۶ء کو اس عظیم مسلمان حکمران نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انہیں دہلی (موجودہ پرانی دہلی) میں مسجد قوتِ الاسلام کے قریب سپردِ خاک کیا گیا۔

شمس الدین التتمش بے حد خدا ترس اور انتہائی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے حکمران تھے۔ انہوں نے تقریباً ۲۶ سال حکومت کی اور کمالِ مہارت سے برصغیر کی اس اسلامی حکومت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا جو ابھی چند ہی سال قبل محمود غزنوی کے کامیاب حملوں اور شہاب الدین غوری اور قطب الدین ایبک کی کاوشوں سے قائم ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں بدایوں، بنارس، رنتھمبور، چتوڑ، مندور، دیبل، بہار، بکھر، ملتان، سیوستان، اجین، بھیلسہ، گوالیار، لاہور، کہرام، لکھنوتی، قنوج، دربھنگہ، تھنکر (بیانہ)، جاج نگر، جھجر، نندنہ، سیالکوٹ اور متعدد دیگر علاقوں کو فتح کیا۔ ان کی قلمرو کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک، ہمالیہ سے بندھیاچل تک اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع ہو گئی تھی۔

التتمش بے حد پرہیزگار، عبادت گزار، متقی اور دین دار حکمران تھے۔ مؤرخین نے انہیں ولیوں میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ حضرت خواجہ صاحبؒ التتمش سے قریب بھی رہے اور دور بھی۔ وہ التتمش کو عزیز رکھتے تھے لیکن ان کے مال و دولت سے فائدہ اٹھانا اپنی شانِ درویشی کے خلاف تصور کرتے تھے۔ خواجہ صاحبؒ التتمش کے دورِ حکومت میں اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ دہلی پہنچے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنی کتاب "فوائد المساکین" میں التتمش کی تعریف کی ہے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں:

"التتمش کا عقیدہ صحیح تھا۔ وہ راتوں کو جاگتے تھے۔ اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ جگاتے۔ گدڑی زیب تن کر لیتے۔ کسی کو ساتھ لے کر نکل جاتے۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کے تنکے کا توشہ دان ہوتا۔ وہ لوگوں کے دروازوں پر جاتے ان کے حالات پوچھتے، ان کی مدد کرتے، انہیں قسمیں دے کر تلقین کرتے کہ جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہے یا کوئی ان پر ظلم کرے تو میرے دربار میں آ کر عدل و انصاف کی زنجیر ہلائیں۔ وہ طرح طرح سے معذرت کر کے کہتے کہ لوگ ان کی مدد

Marfat.com

کا ذکر کسی سے نہ کریں۔"

"خزینۃ الاصفیا" کے مطابق التتمش مٹی کے برتن میں اشرفیاں بھر دیتے تھے اور اوپر گیہوں رکھنے کے بعد ضرورت مندوں کے حوالے کر دیتے تا کہ ان کی سخاوت ظاہر نہ ہو اور ریا کا پہلو نہ آئے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں: "التتمش راتوں کو خود بیدار ہوتے، کسی کو نہ جگاتے، خود پانی بھر کر وضو کرتے اور مصلّے پر بیٹھ جاتے۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے التتمش کا ذکر بہت محبت اور عزت سے کیا ہے۔ انہوں نے التتمش کے بعض اقوال اور افعال کو بطورِ نصیحت اپنے مریدوں کے سامنے بھی پیش کیا۔ جب التتمش کا انتقال ہوا تو حضرت نظام الدین اولیا نے ایک شعر میں التتمش کی وفات کی تاریخ بھی قلم بند کی۔

التتمش کے اعلیٰ کردار کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ / ۲۷ نومبر ۱۲۳۵ء (التتمش کے انتقال سے صرف پانچ ماہ قبل) کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا اور جنازہ تیار ہوا تو خواجہ ابو سعیدؒ نے اعلان کیا کہ حضرت خواجہ قطبؒ صاحب نے وصیت کی تھی کہ "ہماری نمازِ جنازہ کا امام ایسا شخص ہو جو عفیف رہا ہو، عصر کی سنتیں اور فرائض اور نماز کی ادائیگی میں تکبیر اولیٰ اس سے کبھی ترک نہ ہوئی ہو۔"

یہ سنتا تھا کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ ان کڑی شرائط کو پورا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ہر فرد نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ تیسرے اعلان کے بعد التتمش آگے بڑھے اور کہنے لگے: "میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی نمازوں کی اس طرح نمائش کروں لیکن بہر حال حضرت قطبؒ صاحب کے حکم کی تعمیل لازم ہے۔" یہ کہہ کر التتمش نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت قطبؒ صاحب کے جنازے کو دیگر اولیا کرام کی مدد سے کندھا دیتے ہوئے قبرستان تک لے گئے۔

التتمش کو اولیا کرام اور بزرگانِ دین سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے عہد میں دیگر علاقوں سے مشائخ، صلحا اور اولیا کرام بڑی تعداد میں آئے۔ ان میں شیخ بہاالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت جلال الدین تبریزیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، شیخ نجیب الدین نخشبیؒ اور دیگر ممتاز صوفیا کرام شامل ہیں۔ حضرت شیخ بہاالدین زکریا ملتانیؒ، التتمش کو بہت پسند کرتے تھے۔ التتمش کی درخواست پر انہوں نے شیخ الاسلام کا عہدہ قبول فرمایا تھا۔ التتمش نے علما اور مشائخ سے علوم باطن، علوم طریقت، علوم ظاہری اور علوم شریعت حاصل کیے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے "فوائد الفواد" میں التتمش کے قوی حافظے کی تعریف فرمائی ہے۔ فوائد، شیخ سجزی کی کتاب ہے جس میں شیخ نظامؒ کے ملفوظات درج ہیں۔

جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، کو دہلی سے اجمیر لے گئے تو التتمش ہزاروں عقیدت مندوں کے ساتھ ان بزرگوں کے پیچھے میلوں دور تک گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جب دیکھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دہلی سے چلے جانے سے التتمش اور ان کی رعایا سخت رنجیدہ ہے تو انہوں نے حضرت قطبؒ صاحب کو دہلی میں قیام کی اجازت دے دی۔ جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بغداد سے دہلی تشریف لائے تو التتمش ان کے استقبال کے لیے میلوں دور تک نکل گئے۔

التتمش کو حالانکہ جنگوں کی وجہ سے فرصت کے لمحات کم ہی میسر آئے اور وہ دوسرے امور کی طرف بھرپور توجہ نہ دے سکے، لیکن انہوں نے علم کو فروغ دینے کی زبردست کوشش کی۔ ان کے دربار میں تین طرح کی مذہبی مجالس ہوتی تھیں، وعظ، علمی مباحثے اور مجالس ذکر۔ ہفتہ میں تین بار وعظ کی مجلس آراستہ ہوتی تھی۔ رمضان المبارک کے مہینے میں وعظ کی مجلس روزانہ ہوتی تھی۔ جنگوں اور مہمات کے دوران میں بھی وعظ ہوتے تھے۔ ۶۲۹ھ / ۱۲۳۲ء میں التتمش نے قلعہ گوالیار کا جو محاصرہ کیا تھا وہ گیارہ ماہ تک جاری رہا تھا۔ "طبقات ناصری" کے مصنف مولانا منہاج الدین عثمان بن سراج الدینؒ لشکر کے ساتھ تھے۔ محاصرے کے دوران میں مجالس میں وہی وعظ کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس محاصرے کے دوران، امیر لشکر کے خیمے میں ۹۵ مجالس منعقد ہوئیں۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر مولانا منہاج الدین ہی نے نماز کی امامت فرمائی اور خطبہ پڑھا۔ ۶۳۰ھ / ۱۲۳۳ء میں قلعہ گوالیار فتح ہوا تو مولانا منہاج الدین کو وہاں کا قاضی، خطیب، امام اور محتسب مقرر کیا گیا۔ مولانا منہاج الدین فرماتے ہیں: "التتمش کے دور میں علم و ادب کی جو ترقی شروع ہوئی وہ برابر بڑھتی چلی گئی۔"

التتمش نے علم کو عام کرنے کے لیے جابجا مدارس قائم کیے۔ ان مدارس میں دہلی کا مشہور مدرسہ معزی خاص طور پر قابل ذکر ہے جسے معز الدین (شہاب الدین) غوری کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ بدایوں

Marfat.com

میں بھی اسی نام کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ اس سے متصل مسجد تھی۔
التتمش کے دور میں ایشیا بھر کے علما اور انشا پرداز وں کی بڑی تعداد برصغیر میں اکٹھی ہوگئی تھی۔ التتمش کی سرپرستی میں ان علما اور انشاپردازوں نے بڑے پیمانے پر تصنیف و تالیف کا کام کیا، اس طرح گراں قدر علمی خزانہ محفوظ ہوگیا۔ اس دور کے صاحب علم لوگوں میں نورالدین عوفی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کتاب ''جامع الحکایات'' لکھی اور کتاب ''الفرج بعد الشدہ'' کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔ التتمش نے نظامِ حکومت کے موضوع پر بھی بڑی توجہ دی چنانچہ اسی دور میں مشہور مصنف فخر مدبر نے اپنی کتاب ''آداب الملوک'' لکھ کر التتمش کی خدمت میں پیش کی۔ اس کتاب کو ''آداب الحرب والشجاعہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے سیاسی، انتظامی اور فوجی اداروں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب لسانی تحقیقات اور قرونِ وسطیٰ کے فنِ حرب کی تاریخ کے مطالعے کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں بنائے لاہور کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو اس سے قبل کسی اور ماخذ میں میسر نہیں آئیں۔
یہ کتاب شمس الدین التتمش کے نام معنون کی گئی ہے۔ کتاب میں فرمانرواؤں اور وزرا کے فرائض، ہر قسم کے اسلحے، لشکر کی خصوصیات، میدانِ جنگ کے طریقے، فوج کے حقوق، فتح و ظفر کے آداب، جزیہ، خطا و سزا، گھوڑوں کی شناخت، ان کی بیماریاں، علاج وغیرہ کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے۔ التتمش ہی کے دور میں موید جاجری نے امام غزالی کی مشہور کتاب ''احیاالعلوم'' کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اسے التتمش کے نام معنون کیا۔ اس دور کے ممتاز شعرا کرام میں امیر روحانی اور تاج الدین ریزہ شامل ہیں۔
التتمش نے فخر الملک کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا جو بغداد کے خلیفہ کے دربار میں تیس سال کام کر چکے تھے۔ وہ اپنے علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس دور میں دیوان رسائل (سیکریٹریٹ کے انچارج) کے عہدے پر مولانا تاج الدین دہلوی فائز تھے۔ ممتاز قضاۃ (ججوں) میں قاضی سعد الدین کروری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی قطب الدین کاشانی اور قاضی نصیر الدین شامل تھے۔ ممتاز علما کرام میں مولانا شرف الدین ابو قوامہ اور شیخ علی بن حامد کوفی کے نام نمایاں ہیں۔ ممتاز شاعر بہاالدین علی بن احمد تو فنِ حرب سے بھی واقف تھے، انہوں نے جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ بعد میں التتمش نے انہیں بدایوں کا امیر داد مقرر کر دیا تھا۔
التتمش نے انصاف کا بول بالا کیا۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس فرد کو یہ شکایت ہو کہ اس پر ظلم کیا گیا ہے وہ پیلے رنگ کا لباس زیب تن کرے تاکہ اسے آسانی سے پہچان کر اس کی داد رسی کی جاسکے۔ التتمش نے اپنی قیام گاہ کے دروازے پر دو برج بنوا کر ان پر سنگِ مرمر کے دو شیر نصب کروائے تھے۔ دونوں شیروں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جس کسی کو انصاف کروانا ہوتا یا ظلم کی شکایت کرنی ہوتی تو وہ دن رات میں کسی بھی وقت آکر یہ گھنٹیاں بجاسکتا تھا۔ انصاف سے متعلق عہدہ ''امیر داد'' کا تھا جسے ہم چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ امیر داد بہت بااختیار ہوتا تھا اور اسے کثیر تنخواہ ملتی تھی۔ اس منصب پر صاحبِ علم اور متقی شخص کو مقرر کیا جاتا تھا۔
التتمش کے دور میں جو تعمیرات ہوئیں، ان سے بھی التتمش کے اسلامی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل تعمیرات پر مقامی رنگ کی چھاپ تھی لیکن التتمش کے زمانے سے اسلامی فنِ تعمیر و ثقافت کو فروغ دیا جانے لگا۔ التتمش نے بدایوں کی عید گاہ اور جامع مسجد بنوائی۔ اجمیر میں سنگِ سرخ سے عالیشان مسجد بنوائی جسے ڈھائی دن کا جھونپڑا کہا جاتا ہے۔ اس کی محراب پر سنہ تعمیر ۶۱۴ھ درج ہے۔ قصبہ منڈوار (ضلع بجنور) کی وسیع جامع مسجد بھی التتمش نے ہی بنوائی تھی۔ التتمش کے پیشرو قطب الدین ایبک نے دہلی میں قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام تعمیر کروائی تھی۔ التتمش نے اس مینار کو مکمل کروایا اور مسجد کو شمال، مشرق اور جنوب کی سمت بڑھایا اس طرح مسجد کی وسعت پہلے کے مقابلے میں تین گنا ہوگئی۔ مسجد کے سامنے محراب دار پردہ تعمیر کروایا۔
التتمش نے دہلی میں ایک بڑا حوض بھی بنوایا تھا جسے ''حوض شمسی'' کا نام دیا گیا۔ یہ حوض دو پہاڑوں کے درمیان تھا۔ شہر کو میٹھا پانی اسی حوض سے فراہم کیا جاتا تھا۔ حوض کے بیچ منقش پتھروں کا گنبد تعمیر کیا گیا تھا جو دو منزلہ تھا۔ ابن بطوطہ نے تقریباً سو برس بعد، محمد تغلق کے عہد میں (۷۲۵ھ۔۷۵۲ھ) آکر اس حوض کو دیکھا اور اپنے سفر نامے میں اس کا ذکر یوں کیا: ''اہلِ شہر اس حوض کا پانی پیتے ہیں۔ اس کا طول دو میل اور عرض ایک میل ہے۔ شہر کی عید گاہ بھی قریب ہی ہے۔ عید گاہ کی طرف پتھر کے گھاٹ بنے ہوئے ہیں جو چبوتروں کی شکل میں ہیں۔ ہر چبوترے کے کونے پر گنبد بنا ہوا ہے جس میں سیاح آکر بیٹھتے ہیں۔''

Marfat.com

بہت سے صوفیا کرام نے اس حوض کے قریب اپنے حجرے تعمیر کیے۔ صوفیا نے ایک مسجد بھی تعمیر کی جو "مسجد اولیا" کہلائی۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی مجلس میں اس حوض کی برکت کا ذکر فرمایا۔ کئی بڑے بزرگانِ دین یہیں سپرد خاک کیے گئے۔ پرانی دہلی میں واقع یہ حوض اب ناپید ہے۔

ریاست بہاولپور میں ایک شہر دریائے ستلج کے جنوبی کنارے پر آباد ہے۔ پہلے اس کا نام دیوگڑھ تھا۔ جب اس شہر کے حکمراں کی لڑکی نے اسلام قبول کرلیا تو اس لڑکی نے اس شہر کا نام "اُچ شہر" رکھ دیا۔ بعد میں مختلف حملوں میں یہ شہر ویران ہوگیا۔ التتمش نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا اور یہ ایک بڑا شہر بن گیا۔ آج کل یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ التتمش نے کئی علاقوں میں جنگلات کٹوا کر نئی بستیاں بسائیں اور نئی سڑکیں تعمیر کرائیں۔ التتمش نے زراعت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے پہلی بار وزیرِ زراعت کا تقرر کیا جو "امیر کوہی" کہلاتا تھا۔

قطب الدین ایبک سے برصغیر میں جس سلسلۂ حکومت کی بنیاد پڑی وہ خاندانِ غلاماں کہلاتا ہے۔ اس خاندان میں ایبک، آرام شاہ، التتمش، رکن الدین، رضیہ بیگم، بہرام شاہ، علاالدین مسعود، ناصر الدین محمود، بلبن اور کیقباد شامل ہیں۔ ان دس حکمرانوں نے ۶۰۳ھ سے ۶۸۹ھ /۱۲۰۶ سے ۱۲۹۰ء تک یعنی چھیاسی برس حکومت کی۔ بلاشبہ ان حکمرانوں میں التتمش کا دورِ حکومت اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز نظر آتا ہے۔

شمس الدین التتمش کا جو درخشاں کردار تاریخ کے صفحات سے اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے وہ حد درجہ متاثر کن ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حیرت انگیز بھی ہے۔ ترکستان کی سرزمین پر جنم لینے والے اس ذہین و وجیہ شخص کو اس کے بچپن ہی میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، لیکن قدرت نے اس کی تربیت اور اس کے قلب کو انوار و تجلیات سے منور کرنے کا اہتمام کیا اور پھر اس کی تقدیر کو اس طرح سنوارا کہ قلبِ صافی رکھنے والا یہ غلام ایک بہت بڑی اسلامی مملکت کا فرمانروا بن گیا۔ اس کی توجہ اور علم سے اس کی شیفتگی کی بنا پر اولیا کرام، صوفیائے عظام اور بزرگانِ دین دور و نزدیک سے آکر برصغیر میں آباد ہوگئے اور ان کی مسلسل محنت کے نتیجے میں دینِ اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا اور لاکھوں گنہگاروں کو ہدایت میسر آگئی۔

***

Marfat.com

ناصر الدین محمود

ایک خداترس، دین دار، عبادت گزار، سادہ مزاج اور بہادر حکمراں

وہ ایک شکایت لے کر آئی تھیں!

وہ اس مملکت کے فرماں روا کی اہلیہ تھیں جس کی حدود غزنی سے لے کر آسام تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ شکایت کسی پڑوسی ملک کے حکمراں کے خلاف نہ تھی، نہ ہی سربراہِ حکومت کی اہلیہ کو اپنے ہی ملک کے کسی بڑے عہدیدار سے رنج پہنچا تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے لیے کوئی عالی شان محل نہ ہونے پر خفا تھیں۔ بلکہ اتنی بڑی مملکت کے سربراہ کی اہلیہ اپنے شوہر سے یہ شکایت کر رہی تھیں: ''آپ کو علم ہے کہ گھر میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔ گھر کا سارا کام تنہا میں ہی انجام دیتی ہوں۔ روٹی پکاتے ہوئے میرے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ گھر کے کام کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی جائے اور اس کی تنخواہ سرکاری خزانے سے ادا کی جایا کرے۔''

سربراہِ مملکت نے اپنی رفیقۂ حیات کی تکالیف کا ذکر سنا تو ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں لیکن انہوں نے ان تکالیف کو دور کرنے اور گھر کے لیے سرکاری خرچ پر کوئی ملازمہ رکھنے کا حکم نہیں دیا، اس کی بجائے وہ کہہ رہے تھے:

''بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے، میری ملکیت نہیں ہے، میں اسے ذاتی استعمال میں کیسے لا سکتا ہوں۔''

پھر انہوں نے اپنی اہلیہ کو تسلی دی:

''دنیا عارضی ہے۔ اس چند روزہ مشقت پر صبر کیجیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ العزیز، اللہ رب العالمین آپ کو اس صبر کا بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔''

یہ درویش صفت انسان تھے برصغیر (پاک و ہند) کے سربراہ ناصر الدین محمود جو ایک وسیع مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک ہونے کے باوجود صرف اور صرف اپنی محنت کی کمائی سے اپنے اخراجات پورے کیا کرتے تھے اور انہوں نے اپنی اہلیہ کو بھی، جو ان کے وزیر اعظم غیاث الدین بلبن کی صاحبزادی تھیں، سرکاری خرچ پر ایک ملازمہ تک دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ناصر الدین محمود نے اپنے اعلیٰ کردار کی بدولت قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔

ناصر الدین محمود ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس وقت برصغیر پر ان کے والد محترم، شمس الدین التتمش حکمراں تھے۔ شمس الدین التتمش بڑے ہی علم دوست اور نیک سیرت انسان تھے۔ ان کے کئی بیٹے تھے۔ ۶۲۷ھ / ۱۲۳۰ء میں ان کے سب سے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود لکھنوتی (بنگال) میں وفات پا گئے تھے۔ التتمش کو اپنے بڑے بیٹے سے بہت محبت تھی۔ ان ہی کے نام پر انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام بھی ناصر الدین محمود رکھا، جن کی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد التتمش کے سب سے بڑے بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔

شمس الدین التتمش نے اپنے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ ان کی تربیت کا عمدہ انتظام کیا۔ جب ناصر الدین محمود تقریباً سات برس کے ہوئے تو ان کے والد التتمش انتقال کر گئے۔ شمس الدین کا تقریباً ۲۶ سالہ دورِ حکومت ان کے عدل و انصاف، علم و فن کی سرپرستی اور مملکت میں وسعت و استحکام کے باعث بڑا یادگار ہے لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ التتمش کو اچھے جانشین میسر نہ آسکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رکن الدین نے اقتدار سنبھالا لیکن وہ زیادہ دن حکومت نہ کر سکے اور ان کی بہن رضیہ سلطانہ نے زمام کار اپنے

Marfat.com

ہاتھ میں لے لی۔ مگر رضیہ سلطانہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کے باوجود صرف تین سال تک حکومت کر سکیں۔ لوگ ان کے خلاف ہو گئے اور وہ ایک لڑائی میں جاں بحق ہو گئیں۔

اس کے بعد مملکت مسلسل عدم استحکام اور انتشار کا شکار رہی۔ اس دوران معز الدین بہرام (۶۳۷ھ تا ۶۳۹ھ/۱۲۳۹ء تا ۱۲۴۲ء) اور علاؤ الدین مسعود (۶۳۹ھ تا ۶۴۴ھ / ۱۲۴۱ء تا ۱۲۴۶ء) کو حکمرانی ملی، لیکن صورتحال مزید خراب ہوتی چلی گئی۔

معز الدین بہرام نے امورِ مملکت کی طرف مناسب توجہ نہ دی چنانچہ لاہور پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا۔ امرا کی سازشوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذیقعدہ ۶۳۹ھ / مئی ۱۲۴۲ء میں بہرام کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد علاؤ الدین مسعود حکمراں بنے جو رکن الدین فیروز شاہ کے بیٹے تھے۔ ابتدا میں تو ان کا طرزِ حکمرانی بہتر تھا اور وہ خود بھی اچھے کردار کے مالک تھے لیکن پھر ان کی توجہ سرکاری امور اور اپنے فرائض سے ہٹ گئی۔

ناصر الدین محمود کو علاؤ الدین مسعود کے دور میں بہرائچ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۶ برس تھی۔ ناصر الدین محمود نے بہت ابتدا ہی میں اپنی نیک نفسی، عدل پروری اور اچھی انتظامی اہلیت کا سکہ جما لیا تھا۔ انہوں نے اپنے زیرِ انتظام علاقے کو ترقی دی۔ اس دوران مسلمان حکومت کے مخالف راجاؤں سے ان کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ قرب و جوار کے پہاڑی علاقوں میں بھیجی جانے والی کئی فوجی مہمات کی قیادت خود ناصر الدین محمود نے کی۔ انہوں نے اپنے علاقے میں رعایا کی خوشحالی، خصوصاً کاشت کاروں کی فلاح و بہبود کے لیے اہم اور موثر فیصلے کیے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، دہلی کے حکمراں علاؤ الدین مسعود امورِ مملکت سے غافل ہو چکے تھے۔ ان کے دور میں حکومت عدم استحکام کا شکار ہو گئی تھی اور اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو برصغیر کی مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی جسے شمس الدین التتمش نے بڑی حکمت، تدبر اور محنت سے پارہ پارہ ہونے سے بچایا تھا۔

ان حالات میں چند دردمند اور نیک نفس امرا نے مل کر فیصلہ کیا کہ کسی ایسے فرد کو حکمراں بنایا جائے جو صاحبِ کردار ہو اور مملکت کو ٹوٹنے سے بچا کر ایک فلاحی ریاست بنا سکے۔ اس سلسلے میں ان کی نگاہِ انتخاب ناصر الدین محمود پر جا کر ٹھہری جو بہرائچ میں خوش اسلوبی کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے، چنانچہ ان افراد نے ناصر الدین محمود کو خط ارسال کیا جس میں انہیں دہلی کی صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ دہلی آ کر اقتدار سنبھالیں اور اس مملکت کو تباہ ہونے سے بچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

ناصر الدین محمود کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ مزاجاً جاہ پسند نہ تھے لیکن مملکت کو بچانے کی خاطر وہ بہرائچ سے چل پڑے۔ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ / ۱۰ جون ۱۲۴۶ء کو ناصر الدین محمود نے دہلی میں قدم رکھا۔ امرا نے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ اسی وقت علاؤ الدین مسعود کو گرفتار کر لیا گیا اور قید خانے بھیج دیا گیا۔ ان کا انتقال قید ہی میں ہوا۔ ناصر الدین محمود نے ۲۳ محرم ۶۴۴ھ ہی کو مملکت کے فرماں روا کا منصب سنبھالا۔ اس سلسلے میں دارالحکومت دہلی کے قصرِ سفید میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اقتدار سنبھالنے کے تیسرے دن ناصر الدین محمود نے اجلاسِ عام طلب کیا جس میں تمام امرا نے ان کی بیعت کی۔ یہ گویا ایک طرح کی رائے شماری تھی کہ مملکت کو چلانے والے سرکردہ افراد نئے سربراہِ مملکت پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔

ناصر الدین محمود نے غیاث الدین بلبن کو اپنا نائب المالک مقرر کیا اور انہیں "الغ خان" کا خطاب دیا۔ "الغ" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "دوسروں سے بزرگ تر"۔ نائب المالک کا عہدہ وزیر اعظم سے برتر تھا۔ بلبن نے ناصر الدین کے نائب کی حیثیت سے بیس برس خدمات انجام دیں۔ ناصر الدین محمود نے بلبن کو یہ عہدہ سونپتے ہوئے انہیں نصیحت کی کہ: "میں نے آپ کو تمام اختیارات دے دیے ہیں۔ آپ کوئی ایسا کام نہ کیجیے گا جس کے باعث اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور آپ کو اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

جس طرح شمس الدین التتمش نہایت عبادت گزار، پارسا اور نیک نفس انسان تھے، اسی طرح ناصر الدین محمود بھی بہت دیندار، خدا ترس، پرہیزگار اور صوفیانہ طرزِ زندگی کے مالک تھے۔ تمام مؤرخین نے ان کی دیانت داری، مذہب سے گہرے لگاؤ اور سادگی پسندی کی تعریف کی ہے۔ مشہور مؤرخ مولانا منہاج السراج، ناصر الدین محمود کے عہد میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "طبقاتِ ناصری" میں ناصر الدین محمود کے عہد کے حالات ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء تک تحریر کیے ہیں۔

مولانا منہاج السراج لکھتے ہیں: "ناصر الدین محمود میں انبیا کرام

Marfat.com

علیہم السلام اور اولیا اللہ رحمت تعالیٰ علیہم کے اوصاف تھے۔" اس کے بعد مولانا نے ناصر الدین کے تقویٰ، دیانت، زہد، سخاوت، عدل پروری، بردباری اور دیگر خوبیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے: "عہد ماضی میں ایسا بادشاہ نہیں گزرا۔"

جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے دور کے مشہور عالم، شاعر اور مؤرخ امیر خسرو (۶۵۱ھ تا ۷۲۵ھ / ۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) نے اپنی تاریخی مثنوی میں ناصر الدین محمود کو "شاہ فرشتہ سرشت" قرار دیا۔

عہد شاہجہاں کے مؤرخ مولانا نورالحق دہلوی نے تو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرونِ سابقہ کا کوئی سلطان ان صفات اور خوبیوں کا مالک نہ تھا جو ناصر الدین کی ذات میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دی گئی تھیں۔ مولانا نورالحق دہلوی اپنی کتاب "زبدۃ التواریخ" میں لکھتے ہیں: "تخت پر بیٹھنے کے بعد ہر سال انہوں نے ایسی فتوحات کیں اور ایسے کام انجام دیے جن سے اسلام کی عزت اور مسلمانوں کی شوکت ظاہر ہوئی اور شیوۂ عدل پروری اور دادگستری وجود میں آیا۔"

ناصر الدین محمود نہایت سادہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ اتنی بڑی مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود سرکاری خزانے سے اپنی گزربسر کے لیے کچھ نہ لیتے تھے۔ اس کی بجائے وہ قرآن پاک کی خطاطی کر کے اپنی گزراوقات کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے قرآن پاک کی خطاطی مکمل کر کے نسخہ بازار میں بھجوایا تاکہ کوئی اس کا ہدیہ ادا کر کے اسے خرید لے۔ ایک سرکاری افسر کو علم ہو گیا کہ قرآن پاک کا یہ نسخہ خود سربراہِ مملکت ناصر الدین محمود کے ہاتھ کا کتابت شدہ ہے۔ انہوں نے اس نسخے کو معمول سے بہت زیادہ ہدیہ ادا کر کے خرید لیا۔ ناصر الدین محمود کو یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی سرکاری افسر نے ان کا کتابت کردہ نسخۂ قرآنِ پاک معمول سے زیادہ ہدیہ ادا کر کے خریدا ہے تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے اہلکاروں کو بلا کر ناراضگی کا اظہار کیا اور تاکید کی کہ آئندہ ان کے ہاتھ سے کتابت شدہ جو بھی نسخہ کلام پاک بھیجا جائے اس کے بارے میں کسی کو یہ خبر نہ ہونے پائے کہ یہ نسخہ سربراہِ مملکت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

ناصر الدین محمود کے انتقال کے ۱۰۰ برس بعد بھی ان کے ہاتھ سے کتابت شدہ کلام پاک کے نسخے دہلی میں موجود تھے۔ مشہور مسلمان سیاح ابنِ بطوطہ نے بھی یہ نسخے دیکھے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے: "قاضی کمال الدین نے ناصر الدین محمود کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف مجھے دکھایا۔ خط اچھا تھا۔"

مؤرخین کے مطابق ناصر الدین کی خوش نویسی اور کتابت میں دلچسپی کا اثر اس عہد کے سکوں پر بھی پڑا۔ ان کے خیال میں ناصر الدین محمود کے عہد کے سکوں کی فارسی عبارت ماضی میں جاری کیے گئے سکوں سے بہتر ہے۔ ایڈورڈ ٹامس کا خیال ہے کہ علی گڑھ مینار پر جو کتبہ درج تھا وہ ناصر الدین محمود ہی کے خط کا نمونہ تھا۔ یہ مینار انگریزوں کے عہد میں لیفٹیننٹ گورنر سرجان ایڈمنٹن کے حکم سے منہدم کر دیا گیا تھا۔ سرسید احمد خان نے اس مینار کا کتبہ "نظام میوزیم" میں لا کر نصب کر دیا تھا۔ نظام میوزیم کی جگہ بعد ازاں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شعبۂ تاریخ قائم کر دیا گیا تھا۔

ناصر الدین محمود کو حضرت سرور کونین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت اور محبت تھی۔ اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے: ان کے ایک اہلکار کا نام محمد تھا۔ ناصر الدین ہمیشہ ان کو ان کا نام لے کر بلایا کرتے تھے۔ ایک دن ناصر الدین نے محمد کو "تاج الدین" کہہ کر بلایا۔ محمد آئے اور ناصر الدین نے ان کو جس کام کے لیے کہا وہ کیا، اس کے بعد محمد اپنے گھر چلے گئے اور تین دن تک ناصر الدین محمود کے پاس حاضر نہ ہوئے۔ ناصر الدین محمود کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے محمد کے گھر پر ہرکارہ بھیجا اور انہیں گھر سے بلوالیا۔ محمد آئے تو ان سے تین دن کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔ محمد نے عرض کیا: "آپ مجھے ہمیشہ میرا نام لے کر بلایا کرتے تھے لیکن اس دن آپ نے مجھے "تاج الدین" کہہ کر بلایا۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے جس کی بنا پر آپ مجھے اس طرح یاد فرما رہے ہیں۔"

ناصر الدین نے یہ بات سنی تو کہا: "واللہ! میں تم سے بدگمان نہیں ہوں دراصل بات یہ تھی کہ جس وقت میں نے تمہیں تاج الدین کہہ کر بلایا تھا، میں اتفاق سے بے وضو تھا۔ مجھے شرم آئی کہ میں آنحضرت ﷺ کا نام نامی وضو کیے بغیر لوں، اس لیے تمہیں تاج الدین کہہ کر پکارا تھا۔"

ناصر الدین محمود دوسروں کی عزتِ نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے اور کسی کا دل دکھانا انہیں پسند نہ تھا۔ ایک بار وہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک شخص کوئی مسئلہ لے کر ان کے پاس آیا۔ اس نے قرآن شریف پر نظر ڈالی تو کسی لفظ کی طرف توجہ دلائی جو اس کے

Marfat.com

نزدیک غلط تھا۔ ناصر الدین نے قلم اٹھایا اور اس لفظ کے گرد دائرہ بنادیا جو دو مرتبہ لکھا گیا تھا۔ پھر اس شخص کا مسئلہ سنا، اس سلسلے میں ضروری کارروائی کی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے احکام صادر کیے۔

جب وہ شخص چلا گیا تو ناصر الدین محمود نے قلم تراش اٹھایا اور لفظ کے گرد بنا ہوا دائرہ مٹادیا۔ ایک اور شخص کھڑا ہوا یہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ آپ نے پہلے تو لفظ کے گرد دائرہ بنادیا جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ واقعی ایک لفظ غلطی سے دوبارہ لکھ دیا گیا تھا لیکن جب وہ شخص چلا گیا تو آپ نے دائرہ مٹا دیا، یعنی کہ لفظ دو مرتبہ بالکل درست لکھا گیا ہے۔ ناصر الدین محمود نے کہا: "دیکھو! وہ شخص کوئی مسئلہ لے کر آیا تھا۔ اگر میں اس کے اعتراض کی تردید کرتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ شرمندہ ہوتا اور اپنا مسئلہ بتائے بغیر واپس چلا جاتا، یوں اس کا مسئلہ جوں کا توں رہ جاتا۔ اس لیے میں نے اس کی خاطر لفظ کے گرد دائرہ کھینچ دیا تھا۔ یاد رکھو کہ کاغذ کا نقش مٹانا آسان ہے لیکن دل کا غبار دور کرنا بہت مشکل ہے۔"

ناصر الدین محمود عبادت، ریاضت، تلاوتِ کلام پاک، شب بیداری اور ذکر اللہ کا خصوصی اہتمام کیا کرتے تھے۔ وہ مزاجاً بہت سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے تاہم جب وہ دربار میں تشریف لاتے تو سرکاری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاہی لباس زیب تن کر لیتے۔ جب واپس اپنی رہائش گاہ پہنچتے تو شاہانہ لباس اتار کر اپنا سادہ اور کم قیمت لباس پہن لیتے۔

"خزینۃ الاصفیاء" کے مطابق غیاث الدین بلبن نے اپنی ایک صاحبزادی بی بی ہزیرہ کی شادی صوفیا کے امام حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے کی تھی۔ یہ روایت اگر درست ہے تو ناصر الدین محمود کے خاندانی تعلقات حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے یقیناً بڑے قریبی ہوں گے، کیونکہ غیاث الدین بلبن کی ایک اور صاحبزادی ناصر الدین محمود کے عقد میں تھیں۔

ناصر الدین محمود کو حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے گہری عقیدت تھی۔ ایک بار ناصر الدین محمود کو ایک فوجی مہم پر ملتان جانا پڑا۔ جب وہ نہر والہ کے پاس پہنچے تو ان کی خواہش ہوئی کہ وہ اجودھن جا کر حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ غیاث الدین بلبن اس زمانے میں نائب الملک تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمارے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے اور راستے میں پانی کی کمی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں خود حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں جا کر تحائف پیش کروں۔ ناصر الدین محمود نے اجازت دے دی۔

ایک اور موقع پر ناصر الدین محمود کو بھی حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

ناصر الدین محمود کے عہد کے جید علماکرام میں مولانا منہاج السراج، قاضی جلال الدین کاشانی، شیخ عماد الدین شقور قانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، شیخ الاسلام جمال الدین بسطامی اور مولانا سید قطب الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ناصر الدین محمود خاص طور پر مولانا منہاج السراج کے بڑے گرویدہ تھے۔ مولانا کا پورا نام مولانا منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی ہے۔ وہ اپنا بیشتر وقت ناصر الدین محمود کے ساتھ گزارتے تھے اور سفر اور جنگوں میں بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء میں ناصر الدین محمود ملتان، لاہور اور نندانہ کی مہم پر گئے تو مولانا منہاج السراج ان کے لشکر کے ہمراہ تھے۔ جب فوج واپس روانہ ہوئی تو جالندھر میں عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی گئی۔ یہ نماز مولانا منہاج السراج ہی نے پڑھائی۔ ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء میں ناصر الدین محمود، تلسندہ (نندنہ اور تلندہ بھی لکھا گیا ہے) کے قلعے کو فتح کرنے گئے تو اس مہم میں بھی مولانا منہاج شریک تھے۔ مولانا منہاج السراج نے اس جنگ کا احوال ایک نظم میں بیان کیا اور اس نظم کا عنوان ناصر الدین کے نام پر "ناصری نامہ" رکھا۔

ناصر الدین محمود نے ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء میں مولانا منہاج السراج کو "صدر جہاں" کا لقب دیا اور انہیں پوری مملکت کا قاضی (چیف جسٹس) بنادیا۔ مولانا منہاج السراج بہت دلنشین تقریر کرتے تھے۔ ان کے وعظ میں حضرت نظام الدین اولیاؒ جیسے عظیم بزرگ صوفی بھی شریک ہوتے تھے۔ "فوائد الفواد" میں تحریر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ: "دہلی میں قاضی منہاج کا وعظ ہر پیر کو ہوتا تھا اور میں بھی اس میں شرکت کرتا تھا۔"

ناصر الدین محمود کے دور میں جو علمی کارنامے انجام دیے گئے ان میں تاریخ کی مشہور کتاب "طبقاتِ ناصری" کی تصنیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ کتاب مولانا منہاج السراج نے لکھی تھی اور انہوں نے اپنے عزیز دوست حکمران ناصر الدین محمود کے نام پر اس کتاب کا عنوان "طبقاتِ ناصری" رکھا۔ مولانا منہاج نے یہ کتاب

Marfat.com

۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں مکمل کی جب ان کی عمر ستر برس ہو چکی تھی۔ جب مولانا منہاج نے یہ کتاب ناصر الدین محمود کو پیش کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اپنی مسرت اور تشکر کے اظہار کے طور پر اپنے شانے سے چادر اتار کر ان کو دے دی۔ پھر خلعت کے علاوہ دس ہزار جیتل سالانہ مقرر کر دیے۔ مولانا منہاج کو اُلغ خان (غیاث الدین بلبن) نے بھی قیمتی تحائف پیش کیے۔ مولانا نے ایک قطعے میں ان تحائف کا شکریہ ادا کیا۔

"طبقاتِ ناصری" سات سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح کارآمد ہے جیسی کہ اپنی تصنیف کے وقت تھی۔ اس کتاب میں مولانا منہاج نے اس کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا سے اپنے عہد یعنی ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء تک کے تاریخی واقعات ترتیب وار بیان کر دیے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مفید حصے وہ ہیں جو غزنی، غور کے سلاطین اور پھر برصغیر کے حکمرانوں، قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود اور ان کے امرا کے حالات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۲۲ حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ ایک طبقہ کہلاتا ہے۔ آخری طبقہ منگولوں کے حملوں سے متعلق ہے۔

"طبقاتِ ناصری" کے تراجم اردو اور انگریزی میں ہوئے ہیں، لیکن یہ تراجم نامکمل ہیں اور پوری کتاب کا ترجمہ ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم راورٹی نے اس کتاب کا جو ترجمہ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء میں کیا وہ بہت اہم ہے اور اس میں متعدد مفید حواشی شامل ہیں۔

دہلی کے مملوک سلاطین پر دو ہی ہم عصر مؤرخین نے کتابیں لکھیں۔ ایک حسن نظامی نیشاپوری کی "تاج المآثر" اور دوسری "طبقات ناصری"۔ "طبقات ناصری" اپنے سادہ، سلیس اور عام فہم انداز کے باعث زیادہ مقبول ہوئی۔

ناصر الدین محمود کے دور کے شعرا میں مولانا منہاج السراج اور عمید الدین سنامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہر اہم تقریب اور موقع پر مولانا منہاج السراج کوئی شعری تخلیق، قطعہ، نظم ضرور پیش کرتے تھے۔ عمید الدین سنامی کا نام فخر الدین عمید تھا۔ وہ بھی باکمال شاعر تھے اور شعر کہنے کے لیے مشکل ردیفوں کا انتخاب کرتے تھے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مطابق ناصر الدین محمود نے تعمیرات پر کثیر رقوم خرچ کیں جن میں نہریں بھی شامل تھیں۔ مؤرخین کے مطابق ناصر الدین محمود نے کئی جامع مساجد تعمیر کروائی تھیں۔ ان مساجد میں میرٹھ کی جامع مسجد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

سجان رائے بٹالوی نے لکھا ہے کہ: ناصر الدین محمود سرکاری خزانے کی تمام رقم رعایا کی بہبود اور فوج کو بہتر بنانے پر صَرف کرتے تھے۔ انہوں نے مملکت میں جگہ جگہ مساجد، خانقاہیں، سرائیں اور پُل بنوائے۔ بہت سے باغ لگوائے اور نہریں نکلوائیں۔

ناصر الدین محمود اگرچہ ایک نرم خو، صلح جو اور امن پسند انسان تھے لیکن مملکت کے دفاع اور اس کی خیر و فلاح کی خاطر انہوں نے جنگیں لڑنے سے کبھی گریز نہیں کیا اور متعدد مہمات میں نہایت دلیری کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے برصغیر پر بیس برس حکومت کی اور اپنے نائب بلبن کی مدد سے مملکت کو نہ صرف ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا بلکہ اسے منگولوں کی وحشیانہ یلغار سے بھی محفوظ رکھا۔

ناصر الدین محمود نے ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء میں برصغیر کی حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی سال انہوں نے دریائے سندھ اور ملتان کی طرف لشکر کشی کی اور نندنہ اور کوہ جود کی ریاستوں کو فتح کیا۔ (راورٹی کے مطابق نندنہ غالباً میانوالی میں ایک قلعہ تھا، دیگر مؤرخین کے مطابق نندنہ سلسلہ کوہستان نمک میں واقع تھا جہاں البیرونی نے زمین کی پیمائش کا تجربہ کیا تھا)۔ اس مہم کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ دریائے سودرہ کے کنارے پڑاؤ ڈالے رکھا اور پھر سامانِ رسد کی کمی کی وجہ سے لشکر کو دہلی لوٹنے کا حکم دے دیا۔ راورٹی کے مطابق یہ مقام سودرہ نہیں بلکہ "سودھرا" تھا جو وزیر آباد کے جنوب مغرب میں آدھے میل کے فاصلے پر واقع ایک شہر تھا۔ قدیم زمانے میں یہاں کے لوگ دریائے چناب کو "سدرہ" کہتے تھے ممکن ہے اسی وجہ سے علاقے کا نام بھی سودھرا پڑ گیا ہو۔

اس مہم میں ناصر الدین محمود اور ان کے نائب اُلغ خان (بلبن) نے باغی امرا کے خلاف کارروائی کی۔ وہ قدیم امرا جو قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کے زمانے سے ملتان اور لاہور میں مقیم تھے، منگولوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ ناصر الدین محمود نے بلبن کے مشورے سے ان تمام امرا کو معزول کر دیا اور انہیں اپنے ساتھ دہلی لے آئے تھے۔ اس طرح پنجاب اور ملتان میں سیاسی استحکام پیدا ہو گیا۔

ناصر الدین محمود نے ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء میں دو آب (گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ) پر چڑھائی کی، جب وہ قنوج کے مضافات میں پہنچے تو انہوں نے دو آب کے مرکزی علاقے تلندہ کو فتح کیا۔ وہاں کے راجا دلکی ملکی کو گرفتار کر لیا گیا۔

Marfat.com

راورٹی کے خیال میں ممکن ہے کہ یہ شہر تلندہ نہیں بلکہ تلسرہ ہو جو قنوج سے ۱۲ میل دور واقع تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق ناصرالدین محمود نے اس مہم میں قنوج کے قریب "نبرتھ" کا قلعہ بڑی ہمت اور محنت سے فتح کیا۔ اسی برس ذی قعدہ کے مہینے میں ناصرالدین نے اپنے نائب بلبن کو لشکر دے کر کڑہ (الہ آباد کے مقابل) بھیجا۔ بلبن نے وہاں کے راجا سے جنگ کر کے اسے شکست دی۔

۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء میں ناصرالدین نے میوات پر حملہ کیا۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جو دہلی کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں بہت سے سرکش قبائل آباد تھے جو آئے دن لوٹ مار اور رہزنی میں مصروف رہتے تھے۔ ناصرالدین محمود کے حکم پر ان کے نائب اُلغ خان (بلبن) نے میوات کے سرکشوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ ان کی کارروائی کے باعث میواتی جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔

چند سال بعد میواتی پھر لوٹ مار کرنے لگے چنانچہ ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں بلبن نے میوات پر زبردست تیاری کے ساتھ شدید حملہ کیا۔ ان کی ہدایت پر دہلی سے اودھ تک تمام جنگلوں کا صفایا کر دیا گیا۔ بہت سے رہزنوں کو ہلاک کر دیا گیا لیکن یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہا، چنانچہ شہر کے اطراف جگہ جگہ چوکیاں قائم کر دی گئیں اور رہزنوں کو زندہ یا مردہ حالت میں لانے پر انعام مقرر کر دیا گیا۔ اس پر فوج کے ساتھ عام شہری بھی ڈاکوؤں کو پکڑنے میں مصروف ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ڈاکوؤں کی طاقت ماند پڑ گئی اور ان علاقوں میں امن قائم ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل صورت یہ تھی کہ روزانہ عصر کی نماز کے بعد دہلی شہر کے بیرونی دروازے ڈاکوؤں کے خوف سے بند کر دیے جاتے تھے۔

شہر ناگور کے حاکم ملک اعزالدین بلبن نے ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں بغاوت کی۔ ناصرالدین ان کی سرکوبی کے لیے ناگور روانہ ہوئے۔ لیکن جب وہ ناگور کے قریب پہنچے تو ملک اعزالدین بلبن نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کر لی۔ اس کے بعد ناصرالدین محمود نے کانپور، چندیرہ اور مالوہ پر چڑھائی کی جہاں چاہر دیو حکمران تھا۔ وہ دو لاکھ سپاہیوں اور پانچ ہزار سواروں کے ساتھ جنگ کے لیے میدان میں اترا۔ ناصرالدین کی فوج نے زبردست جنگ کے بعد چاہر دیو کے لشکر کو شکست پر مجبور کر دیا۔

سنہ ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء کے آخر میں منگولوں کے لشکر نے اُچ اور ملتان کے علاقوں پر حملہ کیا۔ ناصرالدین نے ان کو روکنے کے لیے لشکر روانہ کیا۔ اس لشکر کا تمام تر انتظام بلبن نے کیا تھا بلکہ لشکر بھیج کر منگولوں کو روکنے کا مشورہ بھی ان ہی کا تھا۔ چار ماہ تک لشکر ملتان اور اُچ کے علاقے میں بالکل چوکس حالت میں رہا۔ آخر منگول مسلمانوں کی زبردست فوجی طاقت سے خائف ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

ایک سال بعد یعنی ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان کے سفیر دہلی آئے۔ یہ سفارت بلبن اور ہلاکو خان کی باہمی خط و کتابت کا نتیجہ تھی۔ بلبن نے اس موقع پر ناصرالدین محمود کو مشورہ دیا کہ منگول سفیر کا خیر مقدم بہت شاندار کیا جائے۔ ناصرالدین محمود نے یہ مشورہ مان لیا۔

جب ہلاکو خان کے سفیر دارالحکومت دہلی پہنچے تو شہر کے باہر دو لاکھ چاق و چوبند سپاہیوں اور ۵۰ ہزار مستعد سواروں کی عظیم الشان فوج نے ان کا خیر مقدم کیا۔ دو ہزار ہاتھی بھی اسلحہ سے لیس ہو کر کھڑے تھے۔ پرچموں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ چمکتے ہوئے نیزے، تلواریں جابجا نظر آرہی تھیں۔ طبل بج رہے تھے۔ ہاتھیوں کے چنگھاڑنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ منگول سفیر اتنے زبردست لشکر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ جب وہ دربار میں پہنچے تو وہاں بھی تزئین و آرائش کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ سفیر نے واپس جا کر ہلاکو خان کو برصغیر کی اسلامی مملکت کی بڑی متاثر کن تصویر پیش کی اور ہلاکو خان نے سلطان دہلی سے اچھے تعلقات قائم کیے۔

ناصرالدین محمود ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء میں علیل ہو گئے۔ یہی علالت ان کے لیے پیغام اجل لے کر آئی۔ ۱۱ جمادی الاول ۶۶۴ھ/۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو اس اچھے حکمراں کا انتقال ہو گیا۔ انہیں دہلی کے علاقے ملک پور میں ایک ہشت پہلو مقبرے میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ مقبرہ تقریباً دو میٹر بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرے کی چار دیواری میں مورنی والی محرابیں تراشی گئی ہیں اور مشرقی و مغربی دیواروں پر محرابی دالان ہیں۔ مغربی سمت کے دالان میں چھوٹی سی مسجد ہے۔ بیرونی صدر دروازے پر کوفی خط میں تاریخ تعمیر کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس مقبرے کو "مقبرۂ سلطان غازی" کہا جاتا ہے۔

***

Marfat.com

غیاث الدین بلبن

برصغیر کو منگولوں کی تباہ کاریوں سے بچانے والے عادل اور جرأت آزما حکمراں

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی!

اس کے چہرے پر زمانے بھر کا حزن و یاس سمٹ آیا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اقتدار کے نشے میں چُور حاکم شہر نے اس کے دل کے قرار، اس کے محبوب شوہر کو ہلاک کروادیا تھا۔ دنیا اب بھی ویسی ہی تھی۔ اس کی رنگینیاں اپنی جگہ تھیں، لوگ بے فکری سے ہنس بول رہے تھے، لیکن اس عورت کے لیے ہر خوشی اور ہر دلچسپی بے معنی تھی۔

کسی نے عورت کو خبر دی، "سربراہِ مملکت دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ تم چاہو تو ان سے فریاد کر سکتی ہو۔"

بیوہ کی آنکھیں جو غم و غصے کے احساس سے جل رہی تھیں، ان میں امید کی کرن جگمگا اٹھی۔ "اس ظلم کو روکنا بہت ضروری ہے" اس نے سوچا، "ورنہ کل کسی اور عورت کا سہاگ اجڑ جائے گا۔" وہ اٹھی اور فرمانروائے مملکت کے پاس جا پہنچی۔

روشن چہرے اور خوبصورت داڑھی کے مالک، سربراہِ مملکت نے عورت کا جائزہ لیا اور اس سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ عورت نے کھل کر بتادیا کہ اس کے شوہر کو حاکم شہر نے کوڑے لگوا کر ہلاک کروادیا ہے جبکہ اس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا تھا جس کی سزا موت ہو۔

سربراہِ مملکت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ان کا عدل و انصاف مشہور تھا اور ان کے دور میں بے اختیار اور کمزور عوام پر یہ ظلم ڈھایا جارہا تھا اور انہیں اس کا علم تک نہ ہو سکا۔ انہوں نے معاملے کی فوراً تحقیقات کا حکم دیا۔ اسی وقت حاکم شہر کے خلاف تحقیقات شروع کر دی گئی۔ حاکم شہر کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ سربراہِ مملکت کے قریبی عہدیداروں میں سے تھے۔ ان کے تحت چار ہزار سوار بھی تھے لیکن مملکت کے فرمانروا کا حکم تھا کہ انصاف کے معاملے میں کسی عہدے، کسی رشتے اور کسی حیثیت کی پروانہ کی جائے۔ تحقیقات سے الزام درست ثابت ہوا، شہر کے حاکم قتل عمد کے مرتکب پائے گئے تھے۔

سربراہِ مملکت نے اسی وقت حکم دیا: "حاکم شہر کو اسی طرح کوڑے لگا کر ہلاک کر دیا جائے جس طرح انہوں نے اپنے غریب خدمت گار کو کوڑے لگوا کر ہلاک کروایا تھا۔" حکم سے سرتابی کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ حاکم شہر کو اسی وقت لایا گیا اور اس مظلوم بیوہ عورت کے سامنے کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ ہی حکمرانِ وقت اس پیغام رساں کی گرفتاری کا حکم بھی دے چکے تھے جسے انہوں نے شہر میں اسی غرض سے تعینات کیا تھا کہ وہ شہر کے حالات اور حکام کی کارکردگی سے سربراہِ حکومت کو آگاہ کرتا رہے۔ اس نے ایک معمولی خدمت گار کو ناجائز سزائے موت دیے جانے کے اہم واقعے سے مملکت کے فرمانروا کو بے خبر رکھا تھا، اس کا یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ حکمراں کے فرمان کے مطابق اسے شہر کے مرکزی دروازے پر پھانسی دے دی گئی۔

یہ برصغیر کے نامور حکمراں غیاث الدین بلبن کا انصاف تھا، جنہوں نے بدایوں کے حاکم ملک بق بق کے سیاسی مرتبے کی پروا کیے بغیر انہیں ایک سنگین جرم کی پاداش میں سزائے موت دے دی تھی۔ بلبن کے اسی عدل و انصاف کی وجہ سے ان کے دور میں کوئی عہدیدار اپنے کسی ماتحت پر ظلم کرنے یا اس کا حق غصب کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر کبھی کبھار ایسا واقعہ پیش آیا تو بلبن نے ظلم کرنے والے اہلکار کو کڑی سزا دی جو طویل عرصے تک لوگوں کے لیے سامانِ عبرت بنی رہی۔

بلبن کا دورِ حکومت محض ان کے عدل و انصاف ہی کی وجہ سے

Marfat.com

شہرت نہیں رکھتا بلکہ اس عظیم حکمراں کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور انہی خدمات کی وجہ سے تمام مؤرخین بلبن کا ذکر احترام اور ستائش کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

غیاث الدین بلبن کا تعلق ترکوں کے ایک قبیلے البری سے تھا۔ ان کے والد قبیلے کے سردار تھے۔ ترک قبائل ترکستان کے مختلف علاقوں میں سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک منگولوں نے ترکستان پر بھی یلغار کر دی۔ منگول سپاہی دندناتے ہوئے آئے اور ترکوں کی بڑی تعداد کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان میں بلبن بھی شامل تھے۔ بلبن کو بغداد میں فروخت کر دیا گیا۔ جن بزرگ نے انہیں خریدا ان کا نام جمال الدین بصری تھا۔ جمال الدین بصری نے بلبن کی تربیت کی اور انہیں لے کر دہلی آئے جہاں حکمراں شمس الدین التتمش نے بلبن کو خرید لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے التتمش کا تعلق بھی ترکوں کے اسی قبیلے البری سے تھا جس سے بلبن کا تعلق تھا۔ بلبن کی عمر اس وقت تقریباً پچیس برس تھی۔

ابتدا میں بلبن کو بہت معمولی نوعیت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں، مثلاً پانی بھرنے کا کام دیا گیا، لیکن بہت جلد بلبن نے اپنی صلاحیتوں کا اظہار شروع کر دیا اور ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے التتمش نے انہیں اپنا "خاصہ بردار" یعنی سرکاری اسلحہ کا نگراں مقرر کر دیا اور انہیں آزاد بھی کر دیا۔ شعبان ۶۳۳ھ / اپریل ۱۲۳۶ء میں التتمش کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد مملکت کی سربراہی التتمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کے پاس آئی۔ ان کے دور میں بلبن کو مزید ترقی دے کر میر شکار بنا دیا گیا۔ رضیہ سلطانہ کے بعد معزالدین بہرام اور علاؤالدین مسعود تخت پر بیٹھے لیکن ان کے عہد میں حکومت عدم استحکام کا شکار رہی۔ آخر مملکت کے سرکردہ افراد نے التتمش کے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو حکمراں منتخب کر لیا۔ ناصر الدین محمود محرم ۶۴۴ھ / جون ۱۲۴۶ء میں تخت نشین ہوئے۔ وہ بہت خدا ترس، متقی اور دیانت دار حکمراں تھے اور سرکاری خزانے سے ایک پائی تک اپنے لیے لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ وہ قرآن کریم کی کتابت کرتے تھے اور اس کا جو ہدیہ ملتا تھا اس سے گزر اوقات کرتے تھے، لیکن غالباً وہ اپنی صلح جو طبیعت کی وجہ سے امور مملکت میں الجھنا پسند نہ کرتے تھے چنانچہ انہوں نے غیاث الدین بلبن کو اپنا نائب مقرر کر کے جملہ اختیارات انہی کو سونپ دیے تھے۔ انہوں نے بلبن کو "نائب الملک" کے منصب پر فائز کر کے انہیں "الغ خان" کا خطاب دیا۔ "الغ" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، "دوسروں سے بزرگ تر۔" ناصر الدین محمود نے بلبن کو اختیارات سونپتے ہوئے ان سے کہا "میں نے تمہیں تمام اختیارات دے دیے ہیں، تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کے باعث کل، اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔" اس زمانے میں "نائب الملک" کا عہدہ بہت بڑا تصور کیا جاتا تھا اور وزیر اعظم سے برتر تھا۔ بلبن نے ناصر الدین محمود کے نائب کی حیثیت سے بیس برس تک فرائض انجام دیے۔

بلبن کا سب سے اہم کارنامہ برصغیر پاک و ہند کو منگولوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ بلبن نے ۶۴۴ھ میں ناصر الدین محمود کے نائب کا عہدہ سنبھالا تو چنگیز خان ۶۰۲ھ تا ۶۲۴ھ / ۱۲۰۶ء تا ۱۲۲۷ء سمرقند، بخارا، خوارزم، بلخ، نیشاپور وغیرہ میں تباہی لا چکا تھا بلکہ ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء میں موجودہ پاکستان کے علاقے میں داخل ہو کر دس ہزار ہندو قیدیوں کو قتل کر کے جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ صرف پانچ سال قبل یعنی ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء میں منگول حملہ آوروں نے لاہور پر زبردست حملہ کر کے بڑے پیمانے پر بربادی پھیلا دی تھی، پھر ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء میں جہلم کے راجا کی سازش سے بھی منگول پنجاب پر حملہ کر چکے تھے۔

ان تمام واقعات سے بلبن بہت متاثر تھے اور ان کی جہاندیدہ نظریں بھانپ چکی تھیں کہ اس وقت مملکت کو منگولوں کے وحشی طوفان سے بچانے کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے منگولوں کے خلاف کئی مہمات ترتیب دیں۔ منگولوں کے حملے کا بھرپور جواب دینے کے لیے طاقتور فوج روانہ کی۔ انہوں نے مملکت کی شمال مغربی سرحدوں کو محفوظ رکھنے کے موثر انتظامات کیے۔ ان کے اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ منگولوں کو برصغیر کی مملکتِ اسلامیہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ بلبن کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ہلاکو خان کے لشکر نے ناصر الدین محمود کے حکمراں بننے کے صرف بارہ برس بعد بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس عظیم شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔

منگولوں کو برصغیر پر حملہ کرنے سے باز رکھنا ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس زمانے میں اطلاعات، مواصلات اور سفر کے جدید وسائل نہ تھے۔ دریائے جہلم کے پار آبادی کم تھی اور اراضی کا بیشتر حصہ ناقابلِ زراعت تھا۔ یہاں بڑی بڑی چھاؤنیاں بنانا آسان نہ تھا۔ ان علاقوں میں کھوکھر قبائل آباد تھے جنہیں مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہ

Marfat.com

تھی۔

ذی الحجہ ۶۵۵ھ / دسمبر ۱۲۵۷ء میں منگولوں نے ایک بار پھر یلغار کی۔ بلبن نے ناصر الدین محمود کو مشورہ دیا کہ فوج تیار کی جائے اور بڑھ کر منگولوں کو روکا جائے چنانچہ محرم ۶۵۶ھ / جنوری ۱۲۵۸ء میں فوج روانہ ہوگئی۔ روانگی سے قبل مولانا منہاج سراج نے تقریر کی اور سپاہیوں کو جہاد کی فضیلت سے آگاہ کیا۔ ادھر منگول لشکر کو مسلمانوں کی تیاریوں کا علم ہوا تو وہ سرحد پر ہی رک گیا۔ بلبن نے لشکر کو چار ماہ تک بالکل تیار حالت میں رہنے کا حکم دیا آخر منگول مایوس ہو کر سرحدوں سے ہٹ گئے۔ بلبن نے منگولوں کے متوقع حملوں کے پیش نظر اپنے عم زاد بھائی شیر خان کو پنجاب اور ملتان کا صوبے دار (گورنر) مقرر کیا۔ شیر خان نے فوج کو اچھے پیمانے پر منظم اور چوکس رکھا۔ شیر خان کے انتقال کے بعد بلبن نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو پنجاب اور ملتان کی ذمہ داری سونپ دی۔

منگولوں کے ہاتھوں لاہور تباہ ہو چکا تھا۔ ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء میں بلبن خود لاہور آئے، شہر کی تعمیر از سر نو کروائی۔ قلعہ کو نئے سرے سے بنوایا۔ بہت سے سرکاری معمار مقرر کیے تاکہ رعایا کے لیے مکان بنائیں پھر شہر کے قدیم باشندوں کو جو اِدھر اُدھر چلے گئے تھے، بلا کر دوبارہ بسایا۔ شہر میں ویرانی کی وجہ سے کنویں تک خشک ہو چکے تھے، بلبن نے بہت سے ماہرین اور اہل فن کو شہر میں لا کر آباد کیا۔ سندھ اور ملتان کی فوجی تنظیم نو کی۔ ان اقدامات کی وجہ سے منگولوں کو تقریباً دس سال تک ادھر کا رخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بلبن نے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کو سمانہ (مشرقی پنجاب) کی حکومت دے دی تھی۔ ۶۷۸ھ / ۱۲۷۹ء میں منگول ایک بار پھر شمال مغربی سرحد پر نمودار ہوئے، انہوں نے دریائے ستلج بھی پار کر لیا لیکن محمد سلطان اور بغرا خان کی مشترکہ فوج نے منگولوں کو ایسا سبق سکھایا کہ انہیں دوبارہ ستلج پار کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

بلبن نے ایک جانب تو ہلاکو خان اور اس کے ساتھیوں کے حملوں کا بھرپور جواب دینے کے لیے اپنی فوج کو منظم کیا اور مستعد رکھا اور متعدد حفاظتی اقدامات کیے اور دوسری جانب انہوں نے ہلاکو خان سے مراسلت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ان کی دوستانہ خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہلاکو خان نے اپنا سفیر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں دہلی بھیج دیا۔ اس موقع پر گو کہ ناصر الدین محمود ہی فرمانروا تھے لیکن بلبن نے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ہلاکو خان کے سفیر کا پورے فوجی طمطراق کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے چنانچہ ان کی ہدایت پر اسلحہ سے لیس دو لاکھ پیدل سپاہی (پیادے) اور پچاس ہزار سوار دہلی سے کچھ دور واقع نئے شہر کیلوکھری میں صف بستہ ہو گئے۔ ان کی چمکتی ہوئی تلواروں، نیزوں اور جا بجا لہراتے پرچموں نے عجب سماں باندھ دیا تھا۔ چوکس جوانوں پر مشتمل اس فوج کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ ہلاکو کا سفیر آیا تو وہ اتنی زبردست فوج دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس نے واپس جا کر ہلاکو خان سے بلبن کی فوجی طاقت کا تذکرہ ضرور کیا ہو گا۔

بلبن کو منگولوں کی طاقت کا اندازہ تھا۔ برصغیر کو منگولوں کے حملے سے بچانے کے لیے انہیں اس قدر فکر رہتی تھی کہ مملکت کی حفاظت کی خاطر انہوں نے دوسرے چھوٹے علاقوں پر حملے کر کے اپنی مملکت کو وسعت دینے کی کوشش بھی نہیں کی، حالانکہ وہ چاہتے تو بہت آسانی کے ساتھ دکن اور مالوہ وغیرہ کو اپنی قلمرو میں شامل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ان علاقوں کے خلاف کبھی کوئی فوج کشی نہیں کی۔ ان کے امرا اکثر ان سے اصرار کرتے تھے کہ راجاؤں کے خلاف فوجی کارروائی کر کے دکن پر قبضہ کر لیا جائے یا مالوہ کے راجا سرکشی اختیار کر رہے ہیں ان کو سزا دی جائے اور مالوہ ان سے چھین لیا جائے۔ لیکن بلبن کا جواب تھا، "مجھے معلوم ہے کہ ان لوگوں کے پاس ایک لاکھ سپاہی ہوں گے جنہیں میرے چھ سات ہزار فوجی آسانی سے زیر کر سکتے ہیں، لیکن فتح کے بعد مجھے مفتوحہ علاقوں کے انتظام کے لیے لائق اور تجربہ کار افراد کی ضرورت پڑے گی۔ اگر میں دارالحکومت سے اہل افراد کو ان علاقوں میں بھیج دوں تو دارالحکومت میں مشکلات پیش آئیں گی اور اگر نہ بھیجوں تو ان علاقوں میں امن و امان قائم نہیں رہ سکے گا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر منگولوں کا خطرہ موجود ہے۔ چنگیز خان کا پوتا ہلاکو اور اس کے ہزاروں ساتھی اس ملک پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں، ہلاکو عراق پر قبضہ کر چکا ہے۔ ان لوگوں نے ہندوستان کی کثیر دولت کے بارے میں سنا ہے اور اسے لوٹنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ وہ لاہور تباہ کر چکے ہیں اور موقع کے منتظر ہیں، ان حالات میں میرے لیے یہ مناسب نہ ہو گا کہ میں دارالحکومت چھوڑ کر دوسری مہمات پر نکل جاؤں۔ میں نہیں چاہتا کہ دہلی کا وہی حال ہو جو منگولوں کے ہاتھوں بغداد کا ہوا ہے۔"

Marfat.com

بلبن کا ایک اور بڑا کارنامہ دہلی، بدایوں، فرخ آباد اور اطراف کے علاقوں میں رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتوں کا مکمل خاتمہ ہے۔ بعض قومیں، لوٹ مار اور رہزنی کو اپنا جائز پیشہ سمجھتی تھیں ان میں دہلی کے اطراف میں بسنے والے میواتی سر فہرست تھے۔ میواتیوں نے شہریوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ دن دہاڑے شہر میں گھس آتے تھے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ روزانہ عصر کی نماز کے بعد شہر کے بیرونی دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ بلبن کو شہریوں کی اس اذیت اور بے چینی کا پورا احساس تھا۔ انہوں نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کی سرکوبی کی کوشش اسی وقت سے شروع کر دی تھی جب وہ ناصر الدین محمود کے نائب مقرر ہوئے تھے۔ ان کی موثر کارروائی سے میواتی گھنے جنگلوں میں جا چھپے لیکن چند سال بعد پھر سرگرم ہو گئے۔

بلبن نے اب سخت کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں بلبن نے دہلی کے جنوبی علاقے میوات پر زبردست حملہ کیا۔ انہوں نے علاقے کے تمام جنگل صاف کروا دیے۔ بہت سے ڈاکو مارے گئے۔ پھر بھی میواتیوں کی سرگرمیاں جاری رہیں، تقریباً چار ماہ تک لڑائی جاری رہی۔ پھر بلبن نے اعلان کیا کہ رہزنوں کو زندہ یا مردہ لانے کا انعام دیا جائے گا۔ اس پر فوجیوں کے ساتھ عام افراد بھی لٹیروں کو پکڑنے میں مصروف ہو گئے۔ بلبن نے شہر کے اطراف جگہ جگہ حفاظتی چوکیاں قائم کروا دیں اس طرح ڈاکوؤں کا زور ٹوٹ گیا اور رفتہ رفتہ ان کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ اسی طرح کی کارروائیاں بلبن نے کٹھیر (بدایوں)، کنپل، پٹیالی اور میرٹھ میں بھی کیں اور ان تمام علاقوں میں مکمل امن و امان قائم کر دیا۔

ہندوؤں کی جانب سے وقتاً فوقتاً اٹھنے والی بغاوتوں اور شورشوں پر قابو پانے کے لیے بلبن نے ایک دانشمندانہ اقدام یہ کیا کہ ہندوؤں کے مضبوط مراکز مثلاً کنپل، پٹیالی اور بھوج پور وغیرہ میں ایسے مسلمانوں کی بستیاں بسا دیں جو لڑائی کے فنون سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہ ترکیب اتنی کامیاب رہی کہ اس کی وجہ سے مشرقی ہندوستان (بنگال تک) کو جانے والی سڑک فیروز شاہ تغلق (وفات: ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء) کے زمانے تک بالکل محفوظ رہی۔ میوات کے جن جنگلوں کو صاف کروایا گیا تھا بلبن نے وہاں کی زمین زراعت پیشہ افراد میں تقسیم کر دی۔ بلبن کے ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہراہیں پُرامن ہو گئیں، تجارتی قافلوں کی آمد و رفت زور و شور سے شروع ہو گئی۔ اس طرح بحیثیتِ مجموعی روزگار میں بھی اضافہ ہو گیا اور اشیائے صَرف سستی ہو گئیں۔ گھوڑوں، مویشیوں اور دیگر سامانِ تجارت کی قیمتوں میں بھی واضح کمی ہو گئی لیکن ان اشیا کی فروخت میں کئی گنا اضافہ ہو جانے کے باعث تاجروں کو بھی بہت فائدہ ہوا۔

ناصر الدین محمود کا انتقال ۱۱ جمادی الاول ۶۶۴ھ / ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء کو ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد بلبن نے مسندِ اقتدار سنبھالی۔ برصغیر کے خود مختار حکمراں کی حیثیت سے انہوں نے تقریباً بیس برس حکومت کی۔

بلبن ۶۷۸ھ / ۱۲۷۹ء میں شدید علیل ہو گئے اور علالت کے باعث مہینہ بھر تک اپنی سرکاری قیام گاہ سے باہر نہ نکل سکے۔ افواہ پھیل گئی کہ بلبن کا انتقال ہو گیا۔ اس افواہ سے متاثر ہو کر لکھنوتی (بنگال) کے صوبہ دار طغرل نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بلبن نے طغرل کی سرکوبی کے لیے یکے بعد دیگرے دو لشکر بھیجے لیکن دونوں لشکروں نے شکست کھائی۔ آخر بلبن خود لشکر لے کر چلے۔ اس وقت زبردست بارش ہو رہی تھی لیکن بلبن نے ایک لمحہ کی تاخیر نہ کی۔ طغرل نے بلبن کی آمد کی خبر سنی تو اسے فرار ہوتے ہی بنی۔ بلبن نے اس کا پیچھا کیا اور جاسوس پھیلا دیے۔ کئی ماہ بعد طغرل کا سراغ ملا اور جاسوسوں نے اسے اسی وقت ختم کر دیا۔ جن لوگوں نے بغاوت میں طغرل کا ساتھ دیا تھا انہیں سزائے موت دے دی گئی۔

ایک منگول صوبے دار تیمور خان نے ۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء میں درۂ خیبر اور لاہور کے راستے حملہ کر دیا، اس کے ساتھ بیس ہزار سوار تھے۔ بلبن کے بیٹے محمد سلطان نے فوج کو فوراً کوچ کا حکم دیا اور منگولوں کے لشکر کو مار بھگایا۔ محمد سلطان اور ان کے ساتھیوں نے بھاگنے والی فوج کا پیچھا شروع کر دیا۔ اس دوران نماز کا وقت آیا تو محمد سلطان اپنے پانچ سو افراد کے ساتھ ایک تالاب کے کنارے نماز ظہر ادا کرنے لگے۔ اسی وقت دو ہزار منگول سپاہیوں نے جو گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے محمد سلطان اور ان کے ساتھیوں پر ہلہ بول دیا۔ محمد سلطان حملے کا جواب دینے لگے لیکن ایک تیر آ کر انہیں لگا۔ زخم ایسا تھا کہ محمد سلطان اس سے جانبر نہ ہو سکے اور شہید ہو گئے۔ اسی وجہ سے مؤرخین انہیں خان شہید کہتے ہیں۔

محمد سلطان کے شہید ہونے کا بلبن کو شدید رنج ہوا تاہم وہ اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ اللہ کی رضا جس بات میں ہو،

Marfat.com

میں اسی پر راضی ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمد سلطان کی شہادت، بلبن کے لیے بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ اس غم نے انہیں گھلا کر رکھ دیا۔ بلبن کو اپنے لائق بیٹے محمد سلطان سے بہت امیدیں تھیں۔ بیٹے سے جدائی کا غم ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں یہ عظیم حکمران اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی۔ انہیں دہلی میں ان ہی کے بنائے ہوئے ایک مکان میں سپرد خاک کیا گیا جس کا نام "دارالامن" تھا۔

بلبن کے انتقال کی خبر پھیلی تو لوگ دیوانہ وار روتے پیٹتے گلیوں میں نکل آئے۔ بہت سے افراد نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈال لی، فی الواقع بلبن کی رعایا ان سے بہت محبت کرتی تھی۔

بلبن انتہائی بردبار، سنجیدہ اور پُرشکوہ حکمران تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ جو حکمران اپنا رعب اور دبدبہ قائم نہیں رکھ سکتا وہ اپنے فرائض پوری طرح انجام نہیں دے سکتا اور اس کے نتیجے میں عوام میں خرابیاں جنم لینے لگتی ہیں اور بعض افراد سرکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلبن نے اپنے پورے چالیس سالہ دورِ حکومت میں انتہائی سنجیدہ روش اپنائے رکھی۔ لوگ ان کا نام سن کر سہم جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں کبھی کسی سے مذاق نہ کیا اور نہ دوسرے کسی فرد کو ان کی موجودگی میں کسی سے مذاق کرنے کی جرأت ہوئی۔ انہیں کسی نے کبھی کھل کر قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ وہ سرکاری آداب کے اس قدر پابند تھے کہ ان کے نجی خدمت گاروں نے بھی کبھی انہیں نامکمل لباس میں یعنی کلاہ اور موزے وغیرہ کے بغیر نہیں دیکھا۔

حقیقت یہی ہے کہ بلبن نے اپنے رعب و جلال اور قوت و اختیار کو دینِ اسلام کی سربلندی، مملکتِ اسلامیہ کو اسلام دشمن طاقتوں سے بچانے، معاشرے کو فسق و فجور، فرائض سے غفلت اور بددیانتی سے پاک کرنے کے لیے بھرپور انداز میں استعمال کیا۔

ذاتی طور پر بلبن نہایت نرم دل، رقیق القلب اور اللہ سے ڈرنے والے انسان تھے۔ علما کرام کا درس سنتے تو کئی بار آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ مولانا نورالدین مبارک غزنویؒ سے بہت متاثر تھے اور ان کے اقوال، اپنے صاحب زادوں، بھتیجوں اور دیگر امرا کے سامنے بار بار بیان کرتے تھے۔ اکثر یہ اقوال بیان کرتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ گلوگیر لہجے میں کہہ اٹھتے، "میری کیا ہستی ہے کہ میں اسلام کی حفاظت کا حق ادا کروں، ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ کسی پر ظلم ہو تو اسے نظر انداز نہ کروں اور اس ظلم کا مداوا کرنے میں کسی سے رعایت نہ کروں۔ تم لوگ میرے بچے اور میرے قریبی اعزہ یا عہدیدار ہو، اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کسی کا ظلم میرے علم میں آیا تو میں اس کو ضرور سزا دوں گا۔ اگر میرا بیٹا بھی جرم کرے گا تو میں اسے بھی معاف نہ کروں گا۔"

بلبن دینی احکام کی پابندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ حکمران بننے کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مستحکم بنانے کا غیر معمولی اہتمام کیا۔ وہ ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ نہ صرف پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے تھے بلکہ تہجد کی نماز بھی پڑھتے تھے۔ اکثر روزے رکھتے تھے۔ مختلف مواقع پر اوراد و وظائف پڑھا کرتے تھے۔ بلبن کو نماز باجماعت کی اس قدر فکر رہتی تھی کہ نماز ادا نہ کرنے پر اپنے بیٹوں کی سخت سرزنش کرتے تھے۔ ان کے صاحب زادے بغرا خان نے اپنے بیٹے کیقباد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر والد صاحب (بلبن) کو معلوم ہو جاتا کہ ہم دو بھائیوں (یعنی بلبن کے بڑے صاحب زادے محمد سلطان اور بغرا خان) سے کوئی ایک نماز چھوٹ گئی ہے یا ہم سوتے رہ گئے اور ہم نے فجر کی نماز باجماعت نہیں پڑھی تو وہ مہینہ بھر ہم سے بات نہ کرتے تھے اور اگر کسی اور سے ایک نماز چھوٹ جاتی اور وہ والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ اس کی جانب سے منہ پھیر لیتے تھے۔

بلبن علما کرام کا بہت ادب کرتے تھے۔ ہر جمعے کو نماز جمعہ کے بعد وہ اس وقت کے سب سے بڑے عالم مولانا برہان الدین بلخیؒ کی قیام گاہ جاتے اور ان کی علمی باتیں سنتے تھے۔ بلبن کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ وہ کھانے کے لیے اس وقت تک نہ بیٹھتے تھے جب تک دسترخوان پر علمائے دین موجود نہ ہوں، کھانے کے دوران میں بھی دینی مسائل پر گفتگو جاری رہتی۔ جب کبھی بلبن کے علم میں یہ بات آتی کہ کوئی بہت اچھے عالم دین کسی مقام پر فلاں تاریخ کو درس دیں گے تو وہ مقررہ وقت پر عام آدمیوں کی طرح خاموشی کے ساتھ حاضرین مجلس میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ بلبن علما کرام کو بڑی مراعات، انعامات اور تحائف دیا کرتے تھے۔ قاضی منہاج السراج نے ایسے کئی تحائف کا ذکر کیا ہے جو بلبن نے انہیں دیے تھے۔

بلبن کے عہد میں بڑے بڑے نامور فقہا، صوفیا اور علما کرام موجود تھے۔ مثلاً مولانا برہان الدین بلخیؒ، مولانا برہان الدین بزازؒ، مولانا

Marfat.com

فخر الدین رازیؒ کے شاگرد مولانا نجم الدین دمشقیؒ، مولانا سراج الدین سنجریؒ، مولانا شرف الدین ولوالجیؒ، صدر جہاں منہاج الدین جرجانیؒ، قاضی جلال الدین کاشانیؒ (جو قاضی قطب الدین کاشانی کے صاحب زادے تھے)، قاضی سدید الدینؒ وغیرہ۔ بلبن کے ابتدائی عہد میں، جب وہ برصغیر کے حکمراں نہیں بنے تھے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بقید حیات تھے، شیخ صدرالدینؒ بھی موجود تھے جو شیخ بہاالدین زکریاؒ کے صاحب زادے تھے۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ شیخ بدرالدین غزنویؒ بھی اسی عہد میں خدمات انجام دے رہے تھے۔

مولانا برہان الدین بلخیؒ کا علمی مرتبہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے فقہ کی اہم کتاب "ہدایہ" خود اس کتاب کے مصنف شیخ برہان الدینؒ سے پڑھی اور اس کتاب کو برصغیر میں متعارف کروایا۔ انہوں نے امام حسن صنعانی لاہوریؒ سے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار پڑھی اور ہندوستان میں اس کتاب کا درس دینا شروع کیا۔ آپ کے شاگرد علامہ کمال الدینؒ زاہد تھے اور ان کے شاگرد حضرت نظام الدین اولیاؒ تھے جنہوں نے آپ سے مشارق الانوار پڑھی۔

علماکرام میں شیخ شمس الدین خوارزمیؒ بہت نمایاں ہیں، دہلی کے تمام علما ان ہی سے رجوع کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بھی ان سے علم حاصل کیا۔

بلبن کے دور کے اطبا اور حکما بھی شہرت کے حامل تھے ان میں مولانا حمید الدین مطرزؒ، مولانا بدرالدین دمشقیؒ، مولانا حسام الدین مارگلہؒ نہ صرف طب میں اپنی مثال آپ تھے بلکہ زہد و تقویٰ کے لحاظ سے بھی اعلیٰ سیرت کے مالک تھے۔ بلبن تمام اہلِ علم کی بے حد توقیر کرتے تھے۔

بلبن نے اپنے عہد حکومت میں عدل وانصاف کی سربلندی پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے مشہور عالم دین اور مؤرخ منہاج السراج کو صدر جہاں (چیف جسٹس) مقرر کیا۔ شہروں اور دیہات میں قاضی مقرر کیے۔ انتظامیہ، عدالتی امور میں دخل نہیں دیتی تھی۔ غیر مسلموں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے جھگڑوں کے فیصلے مقامی پنچایتوں سے کروائیں۔ انصاف برقرار رکھنے اور سرکاری عہدیداروں کو ظلم سے روکنے میں سب سے نمایاں کردار "محکمۂ برید" کا تھا۔ برید یعنی ڈاک کا محکمہ تو پہلے بھی قائم تھا لیکن بلبن نے اسے بہت وسعت دی۔ ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک قابلِ اعتماد افسر اطلاعات مقرر کیا جاتا تھا جو "برید" کہلاتا تھا۔

"برید" کا انتخاب بلبن خود بہت چھان پھٹک کر کرتے تھے۔ برید کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے شہر یا گاؤں کے حالات سے سربراہِ مملکت کو مسلسل باخبر رکھے اور مقامی حکام اور افسروں کی کارروائی کا کڑا جائزہ لے کر سربراہِ مملکت کو اس سے مطلع کرتا رہے۔ برید کو بھاری تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس طرح بلبن اپنی مملکت کے ہر گوشے کے حالات سے آگاہ رہتے تھے اور ان کے ماتحت حکام کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ اپنے فرائض سے غفلت برتنا شروع کردیں۔ بلبن نے مختلف علاقوں میں محتسب بھی مقرر کیے تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ شریعت کی کھلے عام خلاف ورزی نہ ہونے دیں۔

برید کا محکمہ سرکاری ڈاک کے علاوہ عام ڈاک لانے یا لے جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، اس زمانے میں مواصلاتی ذرائع محدود تھے۔ ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں نہ تھیں۔ صرف گھوڑوں کے ذریعے ڈاک بھیجی جاتی تھی لیکن ڈاک کے اچھے نظام کی وجہ سے بلبن کی خصوصی ڈاک دہلی سے بنگال تک صرف دو یا تین دن میں پہنچ جاتی تھی۔

بلبن فوج کی اعلیٰ کارکردگی پر بہت زور دیتے تھے۔ ان کے دور میں فوجیوں کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن ساتھ ہی فوجیوں کی سخت تربیت کی جاتی تھی اور ان کی نگرانی کا کڑا انتظام تھا۔ خاص طور پر حاضری کی جانچ پڑتال ضرور کی جاتی تھی۔ وزارتِ دفاع کو "دیوانِ عارض" کہا جاتا تھا اور اس کا سربراہ "عارض ممالک" کہلاتا تھا جو تمام فوجی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اچھی فوج کی تیاری سے بلبن کو جو دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ناصر الدین محمود کے عہد میں جب، بلبن سربراہ مملکت کے نائب تھے، صرف دہلی ہی میں فوج کے دولاکھ پیادوں (پیدل فوج) اور پچاس ہزار سواروں نے اپنے گھر بنا لیے تھے۔ فوج کے ساتھ بھی قاضی موجود رہتے تھے۔ انہیں "بحرمان" کہا جاتا تھا۔ بلبن ان کی بھی بڑی عزت کرتے تھے۔ جنگوں کے موقعوں پر علمادین کو مدعو کیا جاتا جو سپاہیوں کے سامنے جہاد پر ابھارنے والی جوشیلی تقریریں کرتے۔

بلبن اپنی فوج کو چاق و چوبند اور ہر آن چوکس دیکھنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر شکار کی مہمات ترتیب دیتے اور دہلی سے میلوں دور تک شکار کھیلنے کے لیے نکل جاتے۔ ان مہمات میں فوج کے ہزاروں جوان ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ خاص طور پر موسم سرما

Marfat.com

میں بلبن روزانہ شکار کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ صبح ہونے سے دو تین گھنٹے قبل اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے اور آدھی رات یا دو تہائی رات گزرنے پر لوٹتے تھے۔ شکار سے ان کی اس غیر معمولی دلچسپی کے چرچے منگول حکمران ہلاکو خان تک بھی پہنچے تو ہلاکو خان نے کہا "بلبن جہاں دیدہ حکمران ہیں، وہ بظاہر تو شکار کھیلتے ہیں لیکن در حقیقت ان کا مقصد اپنی فوج کو چاق و چوبند اور لڑائی کے لیے ہر وقت تیار رکھنا ہے" اور حقیقت بھی یہی تھی، جب ہلاکو خان کا تبصرہ بلبن کے کانوں تک پہنچا تو انہوں نے متانت سے کہا کہ یہ رموز مملکت ہیں اور انہیں وہی سمجھ سکتا ہے جس نے جہاں بانی کی ہو۔

مؤرخ ضیاالدین برنی نے اپنے والد اور دادا کے حوالے سے بتایا ہے کہ بلبن جب بھی کسی مہم پر روانہ ہونے لگتے تو پہلے اچھی طرح غور و فکر کرتے اور منصوبہ بناتے۔ جب اس مہم کے تمام پہلوؤں پر غور کے بعد ان کا دل مطمئن ہو جاتا تو روانگی کا حکم دیتے، لیکن روانگی کے دن تک کسی کو معلوم نہ ہو پاتا کہ بلبن کس مہم پر جا رہے ہیں۔

بلبن اپنی رعایا کے ہر فرد کی جان و مال کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کوشش میں وہ مسلمان یا غیر مسلم کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے غیر مسلموں پر نظریۂ اسلام مسلط کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ کسی ہندو کو ہندو ہونے کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچایا، کسی غیر مسلم کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ ان کے دور میں جو مشہور صوفیا کرام تھے مثلاً حضرت فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت بہاالدین زکریاؒ، حضرت شیخ صدرالدینؒ، شیخ بدرالدینؒ وغیرہ، ان کی دعوت و تبلیغ سے اسلام تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ پنجاب کی مختلف ذاتوں سیال، گکھڑ، کھوکھر، بھٹی، جاٹ وغیرہ نے انہی علما کرام کی کوششوں سے اسلام قبول کیا۔ ٹوانہ قوم کا سربراہ ایک ہندو راجپوت تھا وہ بھی حضرت خواجہ فریدؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

بلبن اپنے پورے دور میں بیرونی اور اندرونی خطرات سے نمٹنے میں مصروف رہے۔ برصغیر میں اسلامی حکومت کے قیام کو بہ مشکل پچاس برس گزرے تھے، چنانچہ بلبن کے دور میں تعمیرات کے لحاظ سے بہت زیادہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے مطابق بلبن نے دہلی میں عالیشان عمارتیں خود بھی بنوائیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں "قصر ہزار ستون" کے نام سے ایک محل بھی شامل ہے۔

بلبن نے لاہور، گوپال گڑھ، کنپل، پٹیالی، بھوج پور اور شمال مغربی سرحد پر متعدد قلعے تعمیر کروائے۔ انہوں نے کئی علاقوں میں بلند اور وسیع مساجد بھی تعمیر کروائیں۔

منگولوں کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے بہت سے شہزادے برصغیر میں آبسے تھے۔ بلبن نے ان تمام شہزادوں کو پناہ دی، ان کے ساتھ عزت کا سلوک کیا اور ان کے نام پر دہلی میں محلے آباد کروائے۔ ان شہزادوں کی تعداد ۱۵ تھی اور ان کے نام پر جو محلے آباد ہوئے وہ یہ تھے: عباسی، سنجری، خوارزم شاہی، دیلمی، علوی، اتابکی، غوری، چنگیزی، رومی، سنقری، یمنی، موصلی، سمرقندی، کاشغری اور خطائی۔ بلبن کے عم زاد بھائی شیر خان نے بھٹنڈہ اور بھٹنیر میں قلعے تعمیر کروائے تھے۔ جو پندرہ شہزادے دہلی میں آکر آکر پناہ گزیں ہوئے تھے ان میں دو کا تعلق عباسی خاندان سے تھا۔ ان کے علاوہ علما، فضلا، فقہا، مؤرخین، ادیب، شاعر اور ماہرین فن و حرفت کی بڑی تعداد منگولوں سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئی تھی۔ بلبن نے ایسے تمام افراد کی سرپرستی کی، انہیں اعلیٰ مقام دیا اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

بلبن خلافتِ اسلامیہ کی یک جہتی کے قائل تھے۔ برصغیر کی اسلامی حکومت گو کہ بغداد کی عباسی خلافت سے براہ راست وابستہ نہ تھی لیکن التتمش کے دور سے عباسی خلیفہ الناصر الدین اللہ کا نام برصغیر میں رائج سکوں پر لکھا جانے لگا تھا۔ ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کر کے خلافت کا خاتمہ کر دیا تو آخری خلیفہ مستعصم باللہ نے کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا، لیکن پھر بھی بلبن نے مستعصم باللہ کا نام سکوں پر بدستور رہنے دیا۔ بغداد کی تباہی کے چالیس سال بعد تک مستعصم کا نام دہلی کے سکوں پر باقی رہا، حتیٰ کہ ۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء میں جلال الدین فیروز خلجی کے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

بلبن کے بڑے صاحب زادے محمد سلطان جو 'خان شہید' کے لقب سے معروف ہیں، بہت قابل، شائستہ، سلجھے ہوئے اور علم دوست انسان تھے۔ ان کی مجلس دانشوروں، شاعروں اور اہل ہنر سے بھری رہتی تھی۔ ان میں مشہور شاعر و ادیب امیر حسن سنجری اور امیر خسرو بھی تھے جو پانچ سال تک خان شہید کے ساتھ رہے۔ خان شہید نے دو بار شیراز پیغام بھیج کر حضرت سعدی شیرازیؒ کو بھی ملتان آنے کی

Marfat.com

دعوت دی تھی، لیکن انہوں نے ضعیفی کی وجہ سے معذرت کرلی البتہ اپنا کلام خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کر کے خان شہید کو ارسال کیا تھا۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت لعل شہباز قلندرؒ بھی ملتان آئے تھے۔ خان شہید نے ان سے ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے کسی وجہ سے اس درخواست کو قبول نہ کیا۔ امیر حسن اور امیر خسرو نے علمی میدان میں بہت کام کیا۔ امیر خسرو نے تو نظم و نثر میں تقریباً سو کتب تحریر کیں۔ انہوں نے موسیقی کے فن پر بھی خاصی تحقیق کی۔ امیر حسن اور امیر خسرو، خان شہید سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب محمد سلطان منگولوں کے مقابلے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تو ان دونوں بزرگ شعرا نے ایسے رقت آمیز مرثیے کہے کہ جو انہیں سنتا تھا تڑپ اٹھتا تھا۔

بلبن بڑے فیاض اور وسیع القلب حکمراں تھے۔ ان کی سخاوت کا اثر ان کے ماتحتوں پر بھی پڑا تھا اور وہ سب ناداروں کی مدد اور بے سہارا افراد کی اعانت کے معاملے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ بلبن کے ایک چچازاد بھائی ملک علاؤالدین کشلی خان تو جود و سخا میں سب سے بازی لے گئے تھے۔ بلبن خود بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کے ایک غلام کے بیٹے امیر علی تھے، وہ اکثر مستحق افراد کی مدد بڑے پیمانے پر کرتے رہتے تھے۔ بلبن نے ان کے والد کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ بلبن کو امیر علی کی سخاوت کی خبر ملتی تو وہ بہت خوش ہوتے اور امیر علی کو نئی جائیداد عطا کر دیتے تا کہ وہ مزید لوگوں کی مدد کر سکیں۔

بلبن ہی کے عہد میں ملک فخر الدین کوتوال دہلی تھے۔ وہ بھی اپنی خدا ترسی، نیک دلی اور سخاوت کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کے پاس بارہ ہزار حفاظ قرآن تھے جو قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ ان کے اخراجات خود ملک فخر الدین پورے کرتے تھے۔ ملک فخر الدین ہر سال ایک ہزار یتیم اور مستحق لڑکیوں کو جہیز مہیا کرتے تھے۔

فی الحقیقت بلبن کا عہد اسلامی تاریخ کے قابلِ فخر ابواب میں سے ایک ہے۔

***

Marfat.com

جلال الدین خلجی

برصغیر کو منگولوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے والے نرم خو، شیر دل حکمراں

محل میں بڑی چہل پہل تھی!

سرکاری اہلکار تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے، دروازوں پر چاق و چوبند محافظ کھڑے تھے، ہر چیز کو قرینے سے رکھا جا رہا تھا۔ مملکت کے سربراہ آج پہلی بار محل میں تشریف لا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ہل چل مچی، محافظ اور زیادہ مستعد ہو گئے، محل کے دروازے پر نئے حکمراں کے ساتھ آنے والے لوگ نمودار ہوئے، محافظوں اور مشیروں کے جلو میں نئے سربراہِ مملکت نے محل میں قدم رکھا۔ ان کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر زخم کا نشان تھا۔ چلنے کے انداز سے ایک فوجی سپہ سالار کی شان جھلکتی تھی اور بشرے سے جہاندیدگی، حلم اور تدبر کے آثار ہویدا تھے۔

سربراہِ مملکت نے محل میں آکر پہلے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی، پھر وہ تخت پر متمکن ہوئے۔ حاضرین ان کی جانب متوجہ ہو گئے کہ دیکھیں نئے فرمانروا کن اہم فیصلوں کا اعلان کرتے ہیں۔

نئے سربراہ کی آواز ایوان میں گونجنے لگی، وہ کہہ رہے تھے: "میں اپنے رب کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ ایک دن وہ تھا کہ میں اس تخت کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا تھا اور آج میں خود اس تخت پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے بہت سے ساتھی جن کے ساتھ میں نے دوستانہ طریقے پر عمر گزاری ہے اور جو مجھ سے بہتر ہیں، میرے سامنے ادب سے کھڑے ہیں۔"

پھر وہ تخت سے اترے اور گھوڑے پر سوار ہو کر سابق حکمراں کے خاص محل کی طرف چل پڑے۔ خاص محل کے دروازے پر ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑے۔ ان کے نائب نے کہا: "اب تو آپ مملکت کے فرمانروا ہیں، آپ کا دروازے پر گھوڑے سے اتر آنا درست نہیں، اب یہ خاص محل آپ ہی کا ہے۔" سربراہِ مملکت نے کہا "اگر یہ محل میرے باپ دادا نے بنایا ہوتا تو بے شک میری ملکیت ہوتا، یہ تو سابق حکمراں نے اپنے پیسے سے بنوایا تھا۔ میں اسی چبوترے پر بیٹھوں گا جہاں میں سابق حکمراں کے عہد میں بیٹھا کرتا تھا۔" چنانچہ وہ چبوترے پر بیٹھ گئے۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ کہہ اٹھے:

"میں نے مجبوراً اس بارِ عظیم (حکمرانی) کو اپنے ناتواں کندھوں پر لاد لیا ہے۔ میں نے برسوں امیر اور ملِک کے طور پر زندگی بسر کی ہے۔ ہمیشہ خوش حالی اور راحت کے دن گزارے ہیں۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، چار روزہ زندگی کے لیے سلطنت کا جنجال ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے بعد میرے وارث کیا کریں گے۔"

یہ ان سربراہِ مملکت کے الفاظ تھے جنہیں حکومت سنبھالے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ وہ اس موقع پر اظہارِ مسرت کرنے یا تکبر کا بول بولنے کی بجائے اپنے پروردگار کے حضور دعا گو تھے اور ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کی رقت انگیز تقریر سن کر حاضرین کی اکثریت پر بھی رقت طاری ہو گئی تھی۔ زمانے کی بے ثباتی کا تصور کر کے ان کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں اور فضا میں سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ یہ حکمراں تھے، برصغیر کے پہلے خلجی فرمانروا جلال الدین خلجی، جن کی بے مثال بہادری، بے اندازہ نرم خوئی اور بے حد رحم دلی نے انہیں ایسے مسلمان حکمرانوں کی صف میں شامل کر دیا ہے جن کا ذکر تاریخ ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ کرتی رہے گی۔

جلال الدین خلجی کا ذکر تاریخ میں پہلی بار اس وقت آتا ہے جب وہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں مشرقی پنجاب کے بڑے شہر سمانہ کے حاکم تھے۔ جلال الدین کے اس سے قبل کے حالاتِ زندگی کے

Marfat.com

بارے میں تاریخ نے سکوت اختیار کر رکھا ہے، البتہ وہ یہ بتاتی ہے کہ خلجی قبیلہ جس سے ان کا تعلق تھا دراصل ترک تھا جو برس ہا برس قبل سکونت تبدیل کر کے غور اور جرجستان (موجودہ افغانستان کے علاقے) میں آباد ہو گیا تھا۔ مؤرخین نے بتایا ہے کہ ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء میں جلال الدین کی عمر تقریباً ۷۰ برس تھی۔ اس لحاظ سے ان کا سنہ پیدائش ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء بنتا ہے۔

لفظ "خلجی" کی اصل کے بارے میں مؤرخین کے مابین اختلاف ہے۔ تاریخ فرشتہ میں مشہور مؤرخ نظام الدین احمد بخشی کے حوالے سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ خلجیوں کا سلسلۂ نسب چنگیز خان کے داماد قالج خان سے جا ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چنگیز خان کے داماد قالج خان اپنے اہل و عیال اور قبیلے کے تین ہزار افراد سمیت غور اور جرجستان کے پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ جب سلاطین غور نے اس علاقے کو فتح کر لیا تو قالج خان کی نسل کے بہت سے افراد برصغیر پاک و ہند منتقل ہونے لگے۔ ان میں جلال الدین خلجی کے والد یغرش خلجی بھی تھے۔ قالج خان کی نسبت سے یہ لوگ "قالجی" کہلانے لگے جو رفتہ رفتہ "قلجی" اور پھر "خلجی" کی صورت اختیار کر گیا۔

دوسری جانب تاریخ فرشتہ کے مؤلف محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ سلجوقیان کے مؤلف کی رائے کو ترجیح دی ہے کہ خلجی چنگیز خان سے پہلے بھی تھے اور ان کا سلسلہ بہت پہلے ایک شخص "خلج" سے ملتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ خلجی ایک تاتاری قوم ہے۔ بعض مؤرخین نے تو خلجیوں کو پٹھانوں کی قوم غلزئی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک خلجی دراصل ترک تھے لیکن غور کے علاقے میں برسوں رہنے کی وجہ سے ان کی عادات و خصائل میں اس قدر تبدیلی آ چکی تھی کہ لوگ انہیں پٹھان سمجھنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی حکومت جب خاندانِ غلامان سے نکل کر خلجیوں کے پاس آئی تو عام افراد خلجیوں کے خلاف ہو گئے، کیونکہ وہ ترکوں کی حکومت کے عادی تھے، تاہم جلال الدین خلجی نے اپنے حُسنِ سلوک، اخلاق، درگزر اور خوش انتظامی کی بدولت جلد ہی لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

جلال الدین خلجی کا اصل نام غالباً فیروز تھا اور اسی وجہ سے حکمراں بننے کے بعد وہ جلال الدین فیروز کہلائے۔ برصغیر کا حکمران بننے سے قبل انہوں نے غیاث الدین بلبن کے دور میں مشرقی پنجاب کے علاقے سمانہ کے نائب کی حیثیت سے ذمے داریاں انجام دیں۔ یہ "کلکٹر" کی طرح کا عہدہ تھا۔ بلبن کے بعد ان کے پوتے معزالدین کیقباد برسراقتدار آئے۔ لوگوں نے ان کے کان بھرے کہ جلال الدین بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ معزالدین کیقباد نے جلال الدین کو حراست میں لینے اور پاس لانے کا حکم دیا۔ جلال الدین کو لایا گیا لیکن ان پر الزامات غلط ثابت ہوئے چنانچہ معزالدین کیقباد ان پر پہلے سے زیادہ اعتماد کرنے لگے اور انہوں نے جلال الدین کو دارالحکومت کی فوج کا ناظم اعلیٰ بنا دیا۔ یہ عہدہ "عرض ممالک" یا "عارض ممالک" کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں انہیں سیاست خان یا شایست خان کا لقب دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد معزالدین کیقباد علیل ہو گئے اور فالج نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ امراء نے آپس میں مشورہ کیا اور معزالدین کیقباد کے کمسن لڑکے شمس الدین کیکاؤس کو تخت پر بٹھا دیا۔ امورِ مملکت چلانے کی ذمہ داری مختلف امراء نے سنبھال لی۔ چونکہ کیکاؤس کمسن تھے اس لیے ان کے نام پر حکومت حاصل کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ اس موقع پر جلال الدین خلجی نے ہوش مندی اور تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے حامی فوجیوں کو مجتمع کیا اور شمس الدین کیکاؤس کو برسراقتدار رکھنے کے لیے سخت رویہ اختیار کیا۔ غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کو، کڑہ (ضلع الہ آباد) کا حاکم بنا کر روانہ کر دیا۔ ادھر معزالدین کیقباد جو علیل تھے، وفات پا گئے۔ تاریخ مبارک شاہی کے مطابق وہ ۱۹ محرم ۶۸۹ھ / یکم فروری ۱۲۹۰ء کو فوت ہوئے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مطابق معزالدین کیقباد کو بعض افراد نے دریائے جمنا میں پھینک دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد جلال الدین خلجی کو نائب السلطنت بنا دیا گیا۔ کمسن شمس الدین کیکاؤس تو امورِ مملکت کو سمجھ نہ سکتے تھے۔

جلال الدین ہی درحقیقت حکومت کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے مملکت کو سیاسی ابتری سے بچایا اور ان کے تجربے اور بصیرت کو دیکھتے ہوئے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ فوری طور پر امورِ مملکت میں دخل اندازی یا من مانی کر سکے۔ تاہم تین ماہ بعد ان کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں جو نہایت شدت اختیار کر گئیں۔

جلال الدین نے بڑی حکمت اور بہادری سے ان تمام سازشوں کو ناکام بنایا۔ اس موقع پر انہوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے بڑھ کر حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لی تو مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ ان

Marfat.com

کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند نہ تھے اور یہ کام انہیں مجبوراً کرنا پڑا۔ اس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے جو اس مضمون کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے، انہوں نے پھر بھی اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ عہدیداروں اور بااثر شخصیات سے صلاح مشورے کیے اور ربیع الآخر ۶۸۹ھ / اپریل ۱۲۹۰ء میں مملکت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنے ماتحتوں اور عام افراد سے بیعت بھی لی اور ان کے مخالفوں نے بھی ان کو سربراہ بنائے جانے پر رضامندی ظاہر کی۔

جلال الدین خلجی انتہائی نرم دل، بردبار، سادہ مزاج اور درگزر کرنے والے حکمراں تھے۔ گو کہ ان کی ان خوبیوں کو دیگر عہدیداران حکومت نے پسند نہیں کیا اور ناپسندیدگی کا برملا اظہار کئی بار کیا، لیکن جلال الدین عفو و درگزر کی روش پر قائم رہے۔ ان کی تحمل مزاجی کا عالم یہ تھا کہ لوگ ان کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، ان کی حکومت کا تختہ الٹنے اور خود انہیں قتل کردینے کے منصوبے بناتے تھے لیکن وہ اس قسم کی تمام اطلاعات کو سننے کے بعد ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ جب ربیع الآخر ۶۸۹ھ / اپریل ۱۲۹۰ء میں وہ حکمراں بنے تو شعبان ۶۸۹ھ / اگست ۱۲۹۰ء میں غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک اختیار الدین نے جو کشلی خان یا ملک چھجو بھی کہلاتے تھے، ان کے خلاف بغاوت کی ٹھانی۔ جلال الدین نے اپنے بزرگ غیاث الدین بلبن کے متعلقین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہوئے انہیں مختلف علاقوں کا حاکم بنادیا تھا چنانچہ ملک چھجو کو کڑہ (جو الہ آباد کے قریب واقع ہے) کی حکمرانی سونپ دی تھی۔

ملک چھجو نے جب لوگوں کے بہکائے میں آکر پورے برصغیر کا حکمراں بننے کا ارادہ کرلیا تو اودھ کے حاکم ملک امیر علی اور کئی ہندو راجا بھی ان کے حامی ہوگئے۔ ملک چھجو نے کڑہ اور مانک پور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ شاہی تاج سر پر رکھ لیا۔ سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کرلیا۔ اودھ اور کڑہ میں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کردیا۔ پھر ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء میں وہ ایک بڑی فوج لے کر دہلی کی سمت چل پڑے۔ جلال الدین کو اس فوج کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے منجھلے بیٹے ارکلی خان کو ایک لشکر دے کر آگے بھیج دیا اور خود ایک فوج کے ساتھ بدایوں روانہ ہوگئے۔ ارکلی خان نے بدایوں میں ملک چھجو کی فوج کو جالیا۔ دونوں فوجوں میں جنگ چھڑ گئی جو چند دن جاری رہی۔

ملک چھجو کی فوج ارکلی خان کے لشکر کے منظم حملوں کی تاب نہ لاسکی اور پھر اس اطلاع سے ملک چھجو کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے کہ جلال الدین خلجی خود ایک فوج لے کر کسی بھی لمحے بدایوں پہنچنے والے ہیں۔ وہ راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے، اور ایک گاؤں میں پناہ لی۔ ان کی فوج کے بعض اہم سالار مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ جس گاؤں میں ملک چھجو نے پناہ لی وہاں کے مقدم (مکھیا) نے انہیں پکڑ کر جلال الدین خلجی کے پاس بھجوادیا۔

جلال الدین کے بیٹے ارکلی خان بہت سخت طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی رائے میں مملکت سے بغاوت کی سیدھی سادی سزا موت تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ملک چھجو اور دیگر گرفتار شدگان کے ساتھ بڑا ذلت آمیز سلوک کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ حضرت امیر خسرو نے جو جلال الدین خلجی کے بہت قریب تھے، اس واقعے کو تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاالدین برنی سے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ارکلی خان نے ملک چھجو اور دیگر قیدیوں کو میلے کچیلے کپڑے پہنوائے، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈلوائیں، گردنوں میں دوشاخے (طوق) لٹکائے اور وہ اس حال میں اونٹوں پر سوار کرواکے جلال الدین خلجی کے سامنے لائے گئے کہ ان کے سر اور چہروں پر گرد جمی ہوئی تھی اور ندامت سے ان کی آنکھیں جھکی جارہی تھیں۔

اکثر حکام کا خیال تھا کہ بغاوت کے ان مجرموں کو سزائے موت دینے سے قبل انہیں پورے لشکر اور آبادی کے سامنے اسی حالت میں گھمایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو عبرت ہو۔ لیکن جلال الدین خلجی کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کا عالم یہ تھا کہ جوں ہی ان کی نگاہ ملک چھجو اور دیگر قیدیوں پر پڑی، وہ رومال آنکھوں پر رکھ کر پکار اٹھے۔

"ارے، یہ سب کیا ہے؟" پھر انہوں نے اسی وقت حکم دیا کہ تمام قیدیوں کو اس تکلیف دہ حالت سے نجات دلائی جائے، انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا جائے۔ ان کے حکم پر قیدیوں کو مناسب لباس پہننے کے لیے دیا گیا۔ جو امرا تھے ان کے لیے الگ خیمے کا اہتمام کیا گیا۔ پھر جلال الدین خلجی، ملک چھجو اور دیگر امرا کے پاس گئے اور انہیں تسلی دی کہ تم نے نمک حرامی نہیں کی بلکہ اپنے پیشرو کی حکومت حاصل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ خاندان غلاماں سے حکومت چھن کر خلجیوں کے پاس آجائے اور مجھے بڑھاپے میں اقتدار سنبھالنا پڑے۔ پھر ان کے حکم پر ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا گیا جہاں ان

Marfat.com

کے لیے اچھے مکان اور دیگر لوازمات کا بندوبست کیا گیا۔ دیگر تمام باغیوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔

امراء کو باغیوں کے ساتھ جلال الدین کا یہ نرم سلوک پسند نہ آیا۔ نائب امیر حاجب (نائب وزیر اعظم) ملک احمد چپ نے اسی دن جلال الدین سے عرض کی کہ آپ نے بہت عفو و درگزر سے کام لیا ہے جو حکمرانوں کا طریقہ نہیں۔ آپ سے قبل بلبن تھے جو اس قسم کے سیاسی جرائم پر عبرت ناک سزا دیا کرتے تھے۔ یہ سن کر جلال الدین گویا ہوئے، "اے احمد، تم نے جو کہا میں اس سے واقف ہوں، بغاوتوں کے موقع پر دیگر حکمرانوں کی جانب سے دی گئی سزاؤں کا مشاہدہ بھی کر چکا ہوں، لیکن کیا کروں کہ میں نے کبھی کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا۔ اگر ہم دشمنوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو خون ان کی گردنوں پر ہوتا اور وہ دوزخ کا ایندھن بنتے۔ میں نے جو، ان کی بغاوت پر انہیں سزائے موت نہیں دی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کل تک میں اور میرا بھائی غیاث الدین بلبن کے ملازم تھے، ان کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ اب جب کہ مجھے اس مملکت کا اقتدار مل گیا، تو اس تائید غیبی کے شکریہ میں مجھے چاہیے کہ میں ان لوگوں کو آزاد کر دوں، میں نے ان قیدیوں کے سلسلے میں غور کیا ہے۔ اگر میں انہیں سزائے موت نہیں دوں گا تو وہ بھی مسلمان ہیں اور محکمۂ انصاف سے وابستہ رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ وہ دل سے میرے ممنون ہوں گے اور آئندہ بغاوت نہیں کریں گے۔"

جلال الدین اپنی رعایا کے لیے حد سے زیادہ شفیق تھے۔ جب مختلف جرائم میں ماخوذ ملزمان گرفتار کر کے ان کے پاس لائے جاتے تو وہ انہیں مجرمانہ زندگی سے تائب ہونے کی نصیحت کرتے، انہیں آخرت کا خوف دلاتے اور ان سے یہ وعدہ یا حلف لے کر انہیں رہا کر دیتے کہ وہ آئندہ جرائم کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ ایک بار شہر کیلوکھری میں ایک ہزار ٹھگ (جعل ساز) گرفتار کیے گئے، جلال الدین نے حکم دیا کہ ان ٹھگوں کو کشتیوں میں سوار کروا کے لکھنوتی (بنگال) چھوڑ دیا جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ آئندہ اس طرف کا رخ نہ کریں۔ "ٹھگ" ایک فرقہ تھا۔ اس فرقے کے لوگ مسافروں کو لوٹ کر قتل کر دیا کرتے تھے۔

جلال الدین کی یہ غیر معمولی رحم دلی اور شفقت ان کی حکومت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی اور بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ کوچی برادران کا شمار اہم اور بااثر امراء میں ہوتا تھا۔ ایک دن تاج الدین کوچی کی رہائش گاہ پر ایک محفل منعقد ہوئی اس میں کئی اہم امراء کو بھی مدعو کیا گیا۔ محفل میں باتیں ہونے لگیں کہ جلال الدین خلجی حکمرانی کے اہل نہیں ہیں بلکہ تاج الدین کوچی یا ملک احمد چپ کو سربراہ مملکت ہونا چاہیے۔ ایک امیر نے کہا کہ میں اپنی تلوار سے جلال الدین کا سر کاٹ لوں گا۔ دیگر امراء نے بھی اس قسم کے عزائم کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے اس محفل میں کی گئی تمام باتیں جلال الدین خلجی تک پہنچا دیں۔ انہوں نے تمام امراء کو طلب کر لیا۔

اس روز جلال الدین بہت طیش میں تھے۔ انہوں نے اپنی تلوار نکالی اور ران امراء کے سامنے رکھ دی اور انہیں للکار کر کہا: "تم میں سے کس میں ہمت ہے کہ یہ تلوار اٹھائے اور میرا مقابلہ کرے۔ میں یہاں نہتا بیٹھا ہوں، آؤ مجھے قتل کرو۔" کسی امیر کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی نکال سکے۔ آخر ایک امیر ملک نصرت صباح نے کچھ منت سماجت اور کچھ ظرافت کے رنگ میں کہا کہ "ہم آپ کو کس طرح مار سکتے ہیں آپ نے تو اولاد کی طرح ہماری پرورش کی ہے۔ آپ سے زیادہ شریف اور بردبار بادشاہ ہمیں کہاں سے ملے گا۔"

یہ سننا تھا کہ جلال الدین خلجی کا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ فی الحقیقت اپنے ماتحتوں سے بے اندازہ محبت کرتے تھے۔ انہوں نے نرمی سے کہا کہ "آپ لوگ جو کچھ میرے بارے میں کہتے ہیں، اگر کسی اور حکمران کے بارے میں کہتے تو وہ اب تک تمہارا سر اڑا چکا ہوتا۔ میرے مزاج میں جبر اور قہر نہیں ہے لیکن میں ڈرنے والا بھی نہیں ہوں۔ آپ سب ہتھیار باندھ کر میرے سامنے کھڑے ہو جائیں، دیکھیں پھر بھی آپ کا کیا حال کرتا ہوں۔ میرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں قاتل، مرتد اور زانی کے سوا کسی انسان کو قتل کرنا جائز نہیں۔ میں اس شریعت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ آپ مجھ سے نہیں ڈرتے لیکن یہ سن لیں کہ میرے منجھلے بیٹے ارکلی خان نے اگر آپ کی باتیں سن لیں تو وہ آپ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔"

چنانچہ انہوں نے تمام امراء سے کہا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں چلے جائیں اور جب تک میں اجازت نہ دوں، دارالحکومت نہ آئیں۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق بادشاہ اپنے نام کے ساتھ کئی طرح کے القاب لگانا پسند کرتے تھے۔ ایک دن جلال الدین خلجی کو خیال آیا کہ میں نے کئی برس تک منگولوں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اگر جمعہ کے خطبے میں میرے نام کے ساتھ "المجاہد فی سبیل اللہ" پڑھا جانے

Marfat.com

لگے تو مناسب ہو گا۔ تاہم وہ اپنی فطری شرم کی وجہ سے یہ بات براہ راست علما سے نہ کہہ سکے، تاہم اپنی بیوی ملکہ جہاں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جب قاضی اور علما کرام کسی تقریب میں آئیں تو ان سے کہنا کہ وہ مجھ سے درخواست کریں کہ خطبہ میں میرے نام کے ساتھ "المجاہد فی سبیل اللہ" کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔

کچھ دنوں بعد جلال الدین کے بیٹے قدر خان کے نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔ ملکہ جہاں کے ایما پر قاضی فخر الدین اور دیگر علما نے سلطان جلال الدین خلجی سے درخواست کی کہ آپ کے نام کے ساتھ "المجاہد فی سبیل اللہ" کے الفاظ استعمال کیے جانے چاہئیں۔ یہ سننا تھا کہ جلال الدین خلجی زارو قطار رونے لگے۔ انہوں نے واضح طور پر بتا دیا کہ ملکہ جہاں نے آپ سے یہ بات میرے کہنے پر کہی تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں یہ پیغام دے کر سخت پشیماں ہوا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس لقب کا ہرگز مستحق نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے جلال الدین خلجی کی نیک نفسی، انکسار اور اخلاص کا پتا چلتا ہے۔

جلال الدین خلجی کی اسی نرم دلی اور رواداری کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دور میں نہ کسی کی املاک ضبط کی گئیں، نہ کسی کو بلا وجہ اس کے عہدے سے معزول کیا گیا۔ وہ کسی کو برا بھلا کہتے تھے نہ کسی سے بدسلوکی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آج میں کسی کو جاگیر دوں اور کل اس سے واپس لے لوں۔ مورخ ضیا الدین برنی لکھتے ہیں کہ اس کے باوجود امرا اور کارکنوں نے سلطان جلال الدین کی قدر نہیں کی اور ان پر الزام لگاتے رہے کہ وہ حکمرانی کرنا نہیں جانتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان سب کا واسطہ سلطان علاؤ الدین خلجی سے پڑا (جلال الدین خلجی کے بعد بننے والے حکمراں) جو نہایت سخت مزاج تھے۔

جلال الدین خلجی کے عہد میں شریعت کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی حکومت کے بڑے سے بڑے عہدیدار کی مجال نہ تھی کہ احکام دیتے ہوئے شریعت کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے یا لوگوں کے ساتھ متکبرانہ رویہ اختیار کرے۔ تاریخ فیروز شاہی کے مولف ضیاالدین برنی کہتے ہیں، "میں نے جلال الدین خلجی کے عہد میں قرآن کریم ختم کر لیا تھا۔ میں نے اپنے دادا موید الملک کے پاس آنے والے علما کرام سے سنا تھا کہ جلال الدین کا زمانہ ایک نادر عہد ہے۔ اس عہد میں زبردستی جرمانے وصول کرنا، لوگوں کی املاک پر قبضہ جمانا، جوا کھیلنا جیسے افعال دیکھنے میں نہیں آتے۔ بازاری لوگوں اور نااہلوں کو ترقی پاتے اور خوشحال ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ ظالموں کے ہاتھ پاؤں عدل کی تلوار اور انصاف کی چھری سے کاٹ دیے گئے ہیں۔ ہر شخص اپنا مال و اسباب بلاخوف وخطر باہر نکال سکتا ہے۔" جلال الدین خلجی نے سرکاری اداروں میں ہر طرح کی فضول خرچی کا سدباب کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک نیا عہدہ "وقوف" کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس عہدیدار کا کام یہ تھا کہ وہ مقامی سرکاری اداروں کے مصارف کی نگرانی کرے۔ یہ عہدہ اس قدر مفید ثابت ہوا کہ اسے بہت جلد ایک ادارے کی شکل دے دی گئی اور اس کے عملے میں اضافہ کر دیا گیا۔

جلال الدین خلجی عبادات کی سخت پابندی کرتے تھے۔ وہ عام افراد کے ساتھ مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ روزانہ قرآن کریم کی تلاوت ان کے معمولات میں شامل تھی۔ جلال الدین خلجی مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے معتقد تھے۔

جلال الدین خلجی اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شاعر تھے۔ ان کی محفل میں امیر خسرو کو اہم مقام حاصل تھا۔ امیر خسرو سے ان کے مراسم اس وقت سے تھے جب جلال الدین عارض ممالک یعنی فوج کے اعلیٰ ترین عہدیدار تھے۔ اسی زمانے میں جلال الدین نے امیر خسرو کو انعامات سے نوازنے کا آغاز کیا تھا۔ جب جلال الدین نے عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے مصحف دار یعنی کتب خانے کے سربراہ کا منصب امیر خسرو کے سپرد کر دیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سربراہِ مملکت کا کتب خانہ بھی تھا۔ امیر خسرو روز تازہ غزل کہہ کر ان کے پاس لاتے تھے اور داد و انعام پاتے تھے۔ ان کے علاوہ اس محفل میں تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، امیر ارسلان کلاہی، اختیار الدین باغ، تاج خطیب اور دیگر کئی شخصیات شریک رہتی تھیں اور ان میں سے ہر ایک تاریخ دانی، شعر گوئی، انشا پردازی اور سخن فہمی میں طاق تھا۔

جلال الدین خلجی نے صرف سات برس حکومت کی۔ ان کا دور مجموعی طور پر خوشحالی اور امن و سکون کا دور تھا۔ وہ بڑے نفاست پسند اور صاحب ذوق انسان تھے۔ انہوں نے کیلوکھری کو نئے سرے سے آباد کیا۔ شہر کا نام کیلوکھری اور کیلوگڑھی بھی لکھا گیا ہے۔ یہ موجودہ دہلی کے مضافات میں واقع تھا۔ اس شہر کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں۔ جلال الدین نے کیلوکھری کو دارالحکومت بنا کر اس کا نام "شہر نو" رکھا۔ کیلوکھری کی بنیاد ان کے پیشرو حکمراں معز الدین کیقباد کے دور میں

Marfat.com

پڑی تھی۔ یہ شہر دس سال تک دارالحکومت رہا۔

جب جلال الدین خلجی حکمراں بنے تو انہوں نے کیلو کھری کی از سرِ نو تعمیر کا حکم دیا۔ انہوں نے شہر میں بہت خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ کئی مساجد بنوائیں۔ شاندار بازاروں کا سلسلہ قائم کیا۔ وہ اپنے ماتحتوں اور امرا کو اکثر اچھی عمارتیں بنوانے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ان کے "شہرِ نو" میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے بڑے بڑے عہدیداروں اور امرا نے بھی شہرِ نو میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرلیں، اس طرح یہ شہر پُررونق ہوگیا اور قدیم دہلی کی رونق میں کمی آگئی۔ جلال الدین کے حکم پر اس محل کی تعمیر مکمل کی گئی جس کی بنیاد ان سے قبل سلطان معزالدین کیقباد نے ڈلوائی تھی۔ اس محل کو نہایت دلکش نقش و نگار سے مزین کیا گیا۔ جلال الدین کی ہدایت پر محل کے سامنے دریائے جمنا کے کنارے بے حد دلفریب باغ لگایا گیا۔ انہوں نے بڑے تاجروں کو بھی اس شہر میں لاکر آباد کیا۔ شہر کے چاروں طرف فصیل تعمیر کی گئی جس میں اونچے اونچے برج تھے۔ اس فصیل سے متاثر ہوکر امیر خسرو نے ایک شعر کہا جس کا ترجمہ ہے:

"اے بادشاہ، آپ نے شہرِ نو میں ایسا حصار (فصیل) تیار کیا ہے جس کے کنگروں سے چاند تک پتھرا جاتا ہے۔"

جلال الدین خلجی نے گوالیار کے قریب ایک بڑا اور بلند گنبد اور مسافر خانہ بھی تعمیر کروایا تھا اور وہاں اپنی رباعی بھی کندہ کروائی تھی۔

تمام مؤرخین جلال الدین خلجی کی نرم دلی اور عفو پسندی کا بار بار ذکر کرتے ہیں لیکن مؤرخین نے اسی دور میں ایک ایسے واقعے کا ذکر بھی کیا ہے جس سے بظاہر جلال الدین خلجی کی سخت مزاجی مترشح ہوتی ہے۔ یہ واقعہ سیدی مَوَلِہ کے قتل سے متعلق ہے۔ سیدی مَوَلِہ کے بارے میں کتب کہتی ہیں کہ وہ جرجان (شمالی ایران کا علاقہ) سے آئے تھے۔ بلبن کے ابتدائی عہد میں انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ بلبن کے دور میں تو وہ گوشہ نشین رہے لیکن بعد میں انہوں نے ایک بڑی خانقاہ بنوائی اور ان کے ہاں کھانوں اور حاجت براری پر روزانہ خطیر رقم صَرف ہونے لگی۔ اتنی رقم کہاں سے آتی تھی، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

تاریخ فیروز شاہی، تاریخ فرشتہ اور دیگر کتب کے مطابق سیدی مَوَلِہ نے اپنے ہزاروں مریدوں کی مدد سے جلال الدین خلجی کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ دیگر محققین کے مطابق یہ الزام درست نہیں۔ سیدی مَوَلِہ، حضرت فرید الدین گنج شکر کے مرید اور خلیفہ تھے اور ان کی ہدایت کے برخلاف دہلی آگئے تھے۔ ان کے پاس بلبنی دور کے ترک امراء جمع ہوتے تھے۔ بہرحال سیدی مَوَلِہ کے منصوبے کی اطلاع جلال الدین تک پہنچ گئی۔

جلال الدین خلجی نے بغاوت کے منصوبے کے شرکا کو دور دور کے علاقوں میں بھیج دیا اور ان کی املاک ضبط کرلیں۔ منصوبے کے اہم کردار قاضی جلال الدین کو بدایوں کا قاضی مقرر کرکے روانہ کردیا۔ اب سیدی مَوَلِہ رہ گئے تھے۔ جلال الدین نے ان سے بحث و مباحثہ کیا لیکن سیدی مَوَلِہ نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ اس پر جلال الدین نے موقع پر موجود درویشوں سے کہا کہ تم ہی انصاف کرو۔ یہ سن کر ایک درویش نے سیدی مَوَلِہ پر چند وار کیے اور انہیں زخمی کردیا۔ جلال الدین سیدی مَوَلِہ کو کسی قسم کی سزا دینے میں متامل تھے کہ ان کے منجھلے بیٹے ارکلی خان نے فیلبان کو اشارہ کیا اور اس نے سیدی مَوَلِہ پر ہاتھی چڑھا کر انہیں کچل ڈالا۔

اس واقعہ پر غور کریں تو عقل یہ باور کرنے پر تیار نہیں ہوتی کہ جلال الدین خلجی جیسا منکسر المزاج اور نرم دل حکمراں جس نے بغاوت کے کئی منصوبوں کو ماضی میں ہنس کر ٹال دیا تھا اور ان منصوبوں کے شرکا سے کوئی باز پرس نہیں نہ کی تھی، سیدی مَوَلِہ کے ساتھ اچانک بلاوجہ اتنا سخت سلوک کرنے پر اتر آئے گا۔ قیاس کہتا ہے کہ سیدی مَوَلِہ جس منصوبے میں مبینہ طور پر شامل تھے وہ بہت خطرناک نوعیت کا تھا جس کے تدارک کے لیے جلال الدین خلجی نے اتنا سخت قدم اٹھایا، گوکہ اس سلسلے میں بھی اقدام کرنے میں وہ اپنی نرم دلی کے باعث کشش و پیچ کا شکار رہے اور بالآخر حتمی قدم انہوں نے نہیں بلکہ ان کے بیٹے ہی نے اٹھایا۔

جلال الدین صرف نرم دل اور حلیم الطبع نہیں بلکہ بڑے بہادر اور شیر دل سپہ سالار بھی تھے۔ سربراہِ مملکت بننے سے قبل خاندانِ غلاماں کے حکمراں غیاث الدین بلبن اور ان کے جانشینوں کے دورِ اقتدار میں وہ فوجوں کی کئی بار قیادت کرچکے تھے۔ ان کا بڑا کارنامہ برصغیر پاک و ہند کو منگولوں کی یلغار سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سرحد پار سے حملے کے لیے آنے والے منگول لشکروں کا کئی بار آگے بڑھ کر راستہ روکا اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان حملہ آوروں کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔

Marfat.com

حکمراں بننے کے بعد بھی جلال الدین کو منگولوں کے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا۔ ۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء میں مشہور منگول سالار ہلاکو خان کا ایک رشتے دار ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں کا ٹڈی دل لے کر برصغیر پر چڑھ دوڑا۔ جلال الدین کو دشمن کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً فوجی تیاریوں کا حکم دیا اور فوج لے کر پنجاب کے علاقے میں پہنچ گئے۔ منگول لشکر منزلیں مارتا ہوا پنجاب کے علاقے میں پہنچا تو ایک دریا کی دوسری جانب اسلامی فوج کے پرچم لہراتے نظر آئے۔ منگول لشکر نے دریا کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ کچھ دن تک چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن منگول فوج کے ہراول دستے نے دریا عبور کر لیا۔ ادھر سے اسلامی لشکر کے دستے آگے بڑھے۔ فریقین میں خونریز جنگ ہوئی بہت سے منگول سپاہی تہ تیغ ہوئے اور کئی ہزار کو جنگی قیدی بنالیا گیا۔

اس جنگ سے منگول سالار کو اندازہ ہو گیا کہ برصغیر کے مسلمان نرم چارہ نہیں ہیں، وہ بڑی حکمتِ عملی سے لڑنا جانتے ہیں چنانچہ اس نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ دونوں طرف سے نمائندے بھیجے گئے، بات چیت ہوئی، تحائف کا تبادلہ ہوا، فریقین کے درمیان صلح ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے خرید و فروخت کے معاملات بھی سر انجام دیے۔ منگول لشکر واپس چلا گیا لیکن اس لشکر میں شامل ایک منگول سردار الغو خان کئی ہزار امرا اور سپاہیوں کے ساتھ جلال الدین کے پاس چلا آیا اور جلال الدین کی ترغیب سے ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔

جلال الدین نے الغو کے ساتھ بہت محبت کا برتاؤ کیا۔ اپنی ایک لڑکی کی شادی الغو سے کر دی۔ الغو اور ان کے ساتھ آنے والے ہزاروں سپاہیوں اور ان کے اہل خانہ کو دہلی، کیلوکھری اور غیاث پور میں آباد کر دیا۔ جن علاقوں میں یہ لوگ آباد ہوئے وہ مغل پورہ کہلانے لگے۔ ان منگول سپاہیوں میں سے بعض کو دہلی اور گرد و نواح کی آب و ہوا راس نہ آئی تو وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر اپنے وطن واپس چلے گئے لیکن بہت سے یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور اس محلے میں رہتے رہے جہاں اب بستی نظام الدین واقع ہے۔ انہوں نے مقامی آبادی کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم کر لیے تھے۔

اتنی بڑی منگول سپاہ کے ہاتھوں برصغیر کو تباہ و برباد ہونے سے بچانا اور کئی ہزار منگولوں کو اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے پر آمادہ کرنا جلال الدین خلجی کے وہ کارنامے ہیں جن پر مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہونا چاہیے۔

جلال الدین خلجی دنیا بھر کے مسلمانوں کی وحدت اور باہمی رابطوں کے حامی تھے۔ انہوں نے خود کو کبھی خلیفہ نہیں کہلوایا بلکہ عباسی خلافت کے تحت تصور کیا، حالانکہ اس زمانے میں عباسی خلافت کا ہلاکو خان کے ہاتھوں خاتمہ ہو چکا تھا۔ ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی اور عباسی خلافت کے اختتام کے باوجود دہلی کی حکومت نے اپنا رشتہ علامتی طور پر عباسی خلافت سے قائم رکھا اور دہلی کے سکوں پر آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا نام کندہ کیا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ جلال الدین خلجی کے دورِ حکومت کے اختتام تک جاری رہا۔

جلال الدین خلجی نے نہ صرف غیاث الدین بلبن کی قائم کردہ جغرافیائی حدود کو قائم رکھا بلکہ ان کے دور میں مملکت میں توسیع بھی ہوئی۔ ان کے زیر انتظام علاقوں میں سندھ، پنجاب، اُتر پردیش، بہار اور بنگال کے علاوہ وسط ہند کا ایک حصہ شامل تھا جو جنوب میں دریائے نربدا تک پھیلا ہوا تھا۔

راجپوتانہ (راجستھان) اور مالوہ (دریائے نربدا کا شمالی حصہ) کے سرحدی علاقوں میں مقامی راجا سر اٹھانے لگے تھے اور انہوں نے قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء میں جلال الدین نے مالوہ کا رخ کیا۔ رنتھنبور (راجستھان کا ایک علاقہ) پر فوج کشی کی۔ رنتھنبور کا راجا قلعے میں محصور ہو گیا۔ جلال الدین نے حکم دیا کہ "مغربیاں" ترتیب دی جائیں۔ ("مغربی" پتھر پھینکنے والی منجنیق کی طرح کی مشین ہوتی تھی) ساباط اور "گرگج" بنائے جائیں۔ ("ساباط" قلعہ تک پہنچنے والا چھت دار راستہ ہوتا تھا اور "گرگج" سے مراد بلند ٹیلہ نما جگہ ہے جو قلعہ پر حملے کے لیے بنائی جاتی تھی) اور قلعے پر حملے کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔

یہ تیاریاں جاری تھیں کہ جلال الدین نے آکر معائنہ کیا اور پھر جھاین (اجین) چلے گئے۔ اگلے دن انہوں نے رنتھنبور کا محاصرہ ختم کرنے کا حکم دیا۔ ان کے ماتحت اس حکم کو سن کر حیران رہ گئے اور کچھ نے افسوس اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ کچھ نے مشورہ دیا کہ اس طرح رنتھنبور کا راجا مزید سرکش ہو جائے گا، لیکن نرم خو جلال الدین خلجی کا جواب تھا کہ "تم لوگ سمجھتے ہو میں امور جہاں داری سے واقف نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس قلعے کو فتح کروں اور اس کے لیے مزید فوج منگواؤں، لیکن میں نے جب قلعہ کا تفصیل سے جائزہ لیا اور غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ قلعہ اس وقت تک فتح نہیں ہو سکتا جب تک بہت سے

Marfat.com

مسلمان لڑتے ہوئے اپنی جان نہ دے دیں، وہ اسباب اور مالِ غنیمت جو اتنے مسلمانوں کے مرنے کے بعد مجھے ملے گا، میرے کس کام آئے گا، ان سپاہیوں کی بیوائیں اور یتیم بچے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو جائیں گے میں انہیں کیا جواب دوں گا۔" نائب امیر حاجب ملک چَپ نے بھی جلال الدین کے فیصلے پر اعتراض کیا تو جلال الدین نے کہا کہ "عام طور پر بادشاہ لاکھوں مسلمانوں کے مرنے کا غم نہیں کرتے اور ملک گیری کی دُھن میں لگے رہتے ہیں لیکن مجھے تو آخرت میں جواب دینا ہے۔"

رنتھنبور کو تو جلال الدین نے چھوڑ دیا لیکن راجپوتانہ اور مالوہ کے دیگر علاقوں کا دورہ کر کے انتظام درست کر دیا، مگر وہاں بھی جنگ اور خونریزی سے حتی الامکان اجتناب کیا۔ جھاین (اجین) اور مالوہ کو تسخیر کرنے کے بعد وہ دارالحکومت لوٹ آئے۔

اگلے برس جلال الدین خلجی کے بھتیجے علاؤالدین خلجی نے جلال الدین کی اجازت سے بھیلسہ پر حملہ کیا۔ بھیلسہ، بھوپال کے قریب واقع ہے۔ ماضی میں اسے التتمش نے فتح کیا تھا لیکن اب یہاں غیر مسلم پھر قابض ہو گئے تھے۔ علاؤالدین نے بھیلسہ فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا اور اسے جلال الدین خلجی کو پیش کر دیا۔ جلال الدین اس فتح سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کڑہ بھی علاؤالدین کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد علاؤالدین نے ۶۹۳ھ / ۱۲۹۴ء اپنے چچا جلال الدین خلجی سے چندیری پر فوج کشی کی اجازت طلب کی اور اجازت ملنے پر فوج لے کر روانہ ہو گئے، لیکن انہوں نے چندیری کی بجائے دکن کے علاقے دیوگری (مہاراشٹر میں شامل موجودہ دولت آباد، اسے دیوگیر بھی لکھا گیا ہے) کا رخ کیا۔ یہ علاقہ کڑہ سے تقریباً آٹھ سو میل کے فاصلے پر قائم ہے۔ علاؤالدین نے یہ فاصلہ گھنے جنگلوں، پہاڑی راستوں اور دریاؤں کو عبور کر کے مختصر راستے سے طے کیا۔ اس طرح اس کی مسافت چھ سو میل رہ گئی۔ انہوں نے دیوگری کے راجاؤں کے زیر انتظام علاقے اِلچ پور تک یہ فاصلہ صرف دو ماہ میں طے کیا۔

علاؤالدین کی آمد کی اطلاع دیوگری کے راجا کو اس وقت ملی جب وہ دیوگری سے ۱۴ میل دور "گھٹی لاجورا" کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ دیوگری کے راجا نے فوجی قوت مجتمع کی اور قلعہ بند ہو گیا، لیکن علاؤالدین نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور بھاری تاوانِ جنگ وصول کیا جس میں منوں سونا، چاندی، جواہرات، ہاتھی، اونٹ وغیرہ شامل تھے۔ گو کہ یہ فتوحات علاؤالدین نے جلال الدین کی اجازت کے بغیر کیں لیکن بہر حال انہیں ہم جلال الدین کے دور سے منسلک کر سکتے ہیں۔

علاؤالدین دیوگری سے واپس کڑہ ۶۹۵ھ کے اوائل میں پہنچ گئے۔ کڑہ سے ان کی اتنی طویل غیر حاضری پر جلال الدین کو تشویش ہوئی، وہ کڑہ پہنچ گئے۔ ۱۷ رمضان ۶۹۵ھ / ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء کو جلال الدین کی کشتی جوں ہی دریائے گنگا کے کنارے لگی اور انہوں نے علاؤالدین سے گفتگو شروع کی، تاک میں لگے ہوئے کچھ افراد نے ان پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیا، یوں اس نیک نفس، رحم دل اور بہادر حکمراں کی زندگی کے دن پورے ہو گئے جس نے برصغیر پاک و ہند کو منگولوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو جانے سے بچایا تھا۔

***

Marfat.com

علاالدین خلجی

ذہین، معاملہ فہم اور منتظم حکمراں، انہوں نے برِصغیر کو مستحکم فلاحی مملکت بنادیا

وہ فتح مند لوٹے تھے!

ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں سے شہر گونج رہا تھا۔ فوجیوں کے پُرجوش نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مسلح اور چاق و چوبند سپاہی ترتیب اور صف بندی کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ مسرور اور شاداں اور جیت کی خوشی سے تمتماتے چہروں میں کچھ چہرے ایسے بھی تھے جن پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں قیدی بنا کر دارالحکومت لایا جارہا تھا۔ ان میں ایک بڑی ریاست کا حکمراں اور اس کا بیٹا بھی شامل تھا۔ چند دنوں قبل وہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کیا کرتا تھا، لیکن اب تخت و تاج اس سے چھن چکا تھا اور وہ ایک عام آدمی جتنی حیثیت کا بھی مالک نہ رہا تھا۔

قیدیوں کو سلطانِ وقت کے سامنے پیش کیا گیا۔

بڑی ریاست کے غیر مسلم راجا پر الزام تھا کہ اس نے بار بار بغاوت کی کوشش کی ہے۔ اسلامی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں۔

حاضرین دم بخود تھے۔ انہیں یقین تھا کہ باغی راجا کا سر تن سے جدا کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے سلطانِ وقت کو یہ کہتے سنا:

"راجا کو عزت کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے۔ انہیں رائے رایان کا خطاب دیا جاتا ہے اور انہیں ایک لاکھ تنکے دیے جائیں۔"

راجا کی آنکھیں ندامت سے جھکی جارہی تھیں۔ مسلمان حکمران کے حُسنِ سلوک نے اسے گویا خرید لیا تھا۔

یہ حکمراں تھے برصغیر کے ممتاز اور لائق فرمانروا علاالدین خلجی جنہوں نے اپنے حُسنِ سلوک سے دیوگیر کے راجا رام دیو کے دل کو تسخیر کرلیا۔

رام دیو اس کے بعد عمر بھر علاالدین خلجی کا احسان مند رہا اور پھر اس نے کبھی بغاوت کی کوشش نہ کی۔

علاالدین خلجی کا شمار بہترین انتظامی صلاحیت رکھنے والے حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مملکت کی حدود بے حد وسیع کر دیں بلکہ اپنے مدبرانہ اقدامات کی بدولت پوری مملکت کو خوش حالی اور امن و سلامتی کی تصویر بنادیا۔

علاالدین خلجی کی زندگی کے ابتدائی حالات کے بارے میں تاریخ نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ ان کے والد کا نام ملک شہاب الدین خلجی تھا۔ علاالدین برصغیر کے پہلے خلجی حکمران جلال الدین خلجی کے بھتیجے تھے۔ جلال الدین خلجی جب ۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء میں حکمراں بنے تو انہوں نے علاالدین خلجی کو اپنے امرا میں شامل کرلیا اور ایک بیٹی سے ان کی شادی کر دی۔

جلال الدین خلجی نے ۶۹۲ھ / ۱۲۹۳ء میں علاالدین کو کڑہ مانک پور کا حاکم بنادیا۔ اس زمانے میں علاالدین نے بھیلسہ (بھوپال کے ایک نواحی مقام) پر جلال الدین خلجی کی اجازت سے حملہ کیا۔ اس مہم میں بہت سامالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔ جب وہ یہ مالِ غنیمت لے کر دہلی پہنچے تو جلال الدین خلجی نے ان کو سراہا اور عارض ممالک (یعنی وزارتِ دفاع کا سربراہ) مقرر کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ اودھ کا انتظام بھی ان کے حوالے کر دیا۔

اگلے برس علاالدین نے دیوگڑھ (اسے ضیاالدین برنی نے "دیوگیر" لکھا ہے۔ یہ علاقہ آج کل مہاراشٹر میں شامل ہے اور دولت آباد کہلاتا ہے) پر چڑھائی کی جہاں راجا رام دیو حکمران تھا۔ ان کے ساتھ بہت زیادہ نفری نہ تھی لیکن انہوں نے راستے کی صعوبتوں اور لمبی

Marfat.com

کم فوجی قوت کی کوئی پروانہ کی اور دیوگڑھ جا پہنچے۔ راجا رام دیو نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ راجا نے بہت سے ہاتھی گھوڑے، سونا، موتی اور قیمتی کپڑے پیش کیے اور اطاعت کا اقرار کیا لیکن جب علاؤالدین واپس روانہ ہوئے تو راجا رام دیو کے بیٹے نے دیوگڑھ سے تین کوس کے فاصلے پر اپنی فوج کھڑی کر دی۔ دونوں فوجوں میں جنگ چھڑ گئی آخر علاؤالدین کی فوج نے فتح حاصل کی۔ اب علاؤالدین نے دیوگڑھ کا از سر نو محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کئی دن جاری رہا۔ دیوگڑھ والے قلعہ بند ہو گئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ ان کے پاس اناج وافر مقدار میں موجود ہے لیکن بعد میں انہیں علم ہوا کہ اناج کی بوریوں میں نمک بھرا ہوا ہے۔ یہ نمک سوداگر کوکن سے لائے تھے۔ حملہ ہوا تو وہ قلعے کے باہر بوریاں چھوڑ کر بھاگ گئے اور قلعہ والے یہ سمجھ کر انہیں قلعہ میں لے گئے تھے کہ ان میں اناج ہے۔

راجا رام دیو نے صلح کا ہاتھ بڑھایا اور سیکڑوں من سونا، موتی، یاقوت، چاندی، ریشمی کپڑے اور دیگر اشیا نذر کر دیں۔ علاؤالدین اس مہم میں فوج کشی کرتے ہوئے ایلچ پور پہنچے تھے۔ راجا نے پیشکش کی کہ ایلچ پور کا علاقہ بھی علاؤالدین ہی کے پاس رہے گا۔

جلال الدین خلجی کو دیوگڑھ کی فتح کی خوشخبری مل چکی تھی۔ انہوں نے ملک احمد چپ (علاؤالدین کا عم زاد) کے اصرار پر کڑہ تک سفر کا ارادہ کیا۔ ادھر علاؤالدین مالِ غنیمت اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے کر کڑہ پہنچ گئے۔ جلال الدین خلجی ان سے ملنے کے لیے کڑہ پہنچے۔ دونوں کی ملاقات ۱۷ رمضان المبارک ۶۹۵ھ / ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء کو دریائے گنگا کے کنارے ہوئی۔ ابھی گفتگو جاری تھی کہ جلال الدین خلجی جیسے اچھے حکمراں کو کچھ لوگوں نے قتل کر دیا۔

کئی مؤرخین کے مطابق جلال الدین خلجی کو علاؤالدین خلجی کے ایما پر قتل کیا گیا۔ اگر یہ بات درست ہے تو یقیناً علاؤالدین خلجی کا یہ فعل ناقابلِ معافی ہے لیکن جب ہم علاؤالدین خلجی کے بیس سالہ دور حکومت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی عظمت ہماری نظروں میں دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ علاؤالدین خلجی نے اپنے مثالی اقدامات اور جرأت مندانہ اور دانشمندانہ فیصلوں کی بدولت برِ صغیر کو ایک فلاحی مملکت بنا دیا۔

جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد ان کی بیوہ ملکہ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ رکن الدین ابراہیم کو سربراہِ مملکت بنانے کا اعلان کر دیا۔ جلال الدین کے منجھلے بیٹے ارکلی خان جو ولی عہد تھے، ان دنوں ملتان میں تھے۔ علاؤالدین دہلی کی طرف بڑھے۔ جب وہ بدایوں پہنچے تو انہیں اس فوج کا سامنا کرنا پڑا جو رکن الدین ابراہیم نے ان سے لڑنے کے لیے بھیجی تھی۔ یہ فوج علاؤالدین خلجی سے جا ملی۔

رکن الدین ابراہیم کے پاس ایسی صورت میں ایک ہی راستہ تھا کہ وہ دہلی سے فرار ہو جائیں چنانچہ انہوں نے تھوڑی بہت رقم ساتھ لی اور اپنی والدہ، بہنوں اور کچھ رفقا کے ساتھ ملتان روانہ ہو گئے۔ علاؤالدین اب سیری کے جنگل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شہر کے تمام امرا اور سرکردہ افراد علاؤالدین خلجی کے پاس حاضر ہوئے اور علاؤالدین کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا گیا۔

علاؤالدین خلجی ۲۲ ذوالحجہ ۶۹۵ھ / ۲۱ اکتوبر ۱۲۹۶ء کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کی تخت نشینی پر شہر میں جشن منایا گیا۔

منگولوں کے ایک بڑے لشکر نے ۶۹۸ھ / ۹۹-۱۲۹۸ء میں قتلغ خان کی قیادت میں دریائے سندھ پار کر کے برصغیر پر حملہ کر دیا۔ علاؤالدین نے اپنے بھائی الغ خان (الماس بیگ) اور الپ خان اور ظفر خان کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجا۔ منجھور (جالندھر) کی حدود میں فریقین کے مابین جنگ ہوئی۔ الغ خان نے گھات لگا کر حملہ کیا۔ دشمن کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ شدید نقصان اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔

علاؤالدین خلجی نے سربراہ بننے کے تیسرے برس کے اوائل میں ایک بڑا لشکر لے کر گجرات پر حملہ کیا۔ امیر خسرو نے اس حملے کی تاریخ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۶۹۸ھ / ۲۴ فروری ۱۲۹۹ء بیان کی ہے۔ گجرات کے راجا رائے کرن نے نہروالا سے بھاگ کر دیوگیر کے راجا رام دیو کے پاس پناہ حاصل کر لی۔ گجرات پر علاؤالدین خلجی کا قبضہ ہو گیا۔ رائے کرن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ تیس ہزار سواروں اور اسّی ہزار پیادہ سپاہیوں کے بڑے لشکر کا مالک تھا۔

اس زمانے میں علاؤالدین خلجی کے ایک عہدے دار نصرت خان نے کھمبایت پر حملہ کیا۔ یہ ساحلی شہر احمد آباد سے ۵۲ میل دور واقع ہے۔ اسی سال منگولوں نے صلدی کی قیادت میں حملہ کر کے سیوستان (اب سہون) پر قبضہ کر لیا۔ ظفر خان ایک بڑا لشکر لے کر سیوستان گئے

Marfat.com

اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے صرف تیروں، تلواروں اور ناچخ (زین سے باندھا جانے والا تبر یا چھوٹا نیزہ) کی مدد سے مغربی (چھوٹی منجنیق) اور منجنیقوں کو استعمال کیے بغیر قلعہ فتح کر لیا۔ ظفر خان کی اس فتح کی دھاک بیٹھ گئی۔

اسی سال کے آخر میں منگول حکمراں قتلغ خان ایک بڑا لشکر لے کر حملہ آور ہوئے۔ یہ منگولوں کا علاؤالدین خلجی کی حکومت پر تیسرا حملہ تھا۔ منگولوں کو دہلی پر قبضہ کرنے کی دُھن تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے راستے میں لوٹ مار نہیں کی اور دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ منگولوں کے اس ٹڈی دل لشکر کی آمد سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ دہلی اور اس کے نواح میں منتقل ہونے لگے۔ دہلی میں اتنے زیادہ لوگ جمع ہو گئے کہ شہر میں ہر طرف بھیڑ نظر آتی تھی۔ اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا، یہ سخت پریشانی کا عالم تھا۔

علاؤالدین خلجی نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مکمل جنگی تیاریاں کر لیں۔ شہر کے تمام دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ اب علاؤالدین اپنے لشکر کے ساتھ سیری سے کیلی کے میدان میں آئے۔ خونریز جنگ ہوئی۔ مسلمان بڑی بہادری سے لڑے اور انہوں نے منگولوں کی فوج پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ انہیں بھاگتے ہی بنی۔ مسلمانوں کے سپہ سالار ظفر خاں نے ۱۸ کوس تک دشمن کا پیچھا کیا۔ اس کوشش میں وہ اپنی فوج سے بہت آگے نکل گئے اور دشمن کے نرغے میں آ گئے۔ دشمن کے سپاہیوں نے انہیں گھیر لیا اور ان کے گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں لیکن ظفر خان اس حالت میں بھی لڑتے رہے۔ بالآخر چاروں طرف سے دشمن کے سپاہی ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں شہید کر دیا۔

منگول چاہتے تو لوٹ کر حملہ کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کی شجاعت سے وہ سخت ہیبت زدہ تھے اور خصوصاً ظفر خان کی شہادت کے باوجود ان کی دہشت ان پر طاری تھی، یہ دہشت ان پر مدتوں طاری رہی۔ جب ان کے جانور پانی نہیں پیتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ شاید ان جانوروں نے ظفر خان کو دیکھ لیا ہے جو پانی نہیں پی رہے ہیں۔

علاؤالدین نے اب اپنی قلمرو کے اطراف کے علاقوں کی جانب توجہ کی اور جہاں جہاں بدامنی یا بدانتظامی یا بغاوت کی لہریں اٹھ رہی تھیں ان علاقوں کو مطیع بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے منگولوں کی آمد کی روک تھام کا بھی عزم کیا۔

سب سے پہلے علاؤالدین رنتھنبور کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے جھائن کا قلعہ سر کیا اس کے بعد رنتھنبور کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران علاؤالدین کے قتل کی ناکام سازش کی گئی جس میں علاؤالدین زخمی ہو گئے۔ سازش میں ملوث افراد کو سزائے موت دے دی گئی۔

ادھر علاؤالدین نے سخت معرکے کے بعد رنتھنبور کا قلعہ فتح کر لیا۔ اس قلعے کو الغ خان کے حوالے کر دیا گیا۔ علاؤالدین واپس دہلی آ گئے۔ ۷۰۰ھ / ۱۳۰۰ء میں علاؤالدین نے مانوہ کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ انہی دنوں دہلی کے جنوب میں قلعہ سیوانہ اور مغربی راجپوتانہ کی ریاست جودھپور میں جالور کا علاقہ بھی فتح کیا گیا۔ اجین، چندیری بھی تسخیر ہوئے۔

اس کے بعد علاؤالدین نے محسوس کیا کہ بغاوتوں اور مملکت میں بدعنوانیوں اور دیگر معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لیے سخت اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی اہم فیصلے کیے۔

کچھ عرصے بعد علاؤالدین نے بنگالہ کے راستے ایک فوج تلنگانہ کے مشہور علاقے ورنگل کو فتح کرنے کے لیے بھیجی اور خود ایک بڑا لشکر لے کر قلعہ چتوڑ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قلعہ ابھی تک غیر مسلموں کے قبضے میں تھا۔ علاؤالدین نے چھ ماہ کے محاصرے کے بعد محرم ۷۰۳ھ / اگست ۱۳۰۳ء میں یہ قلعہ فتح کر لیا اور اپنے نائب خضر خاں کے حوالے کر کے اس علاقے کا نام خضر آباد رکھ دیا۔

ادھر منگولوں کو خبر ملی کہ علاؤالدین خلجی دارالحکومت سے دور ہیں تو انہوں نے برصغیر کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ علاؤالدین کو اطلاع مل گئی اور وہ فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں علاؤالدین کی فوج کا بڑا حصہ دکن کی مہمات پر گیا ہوا تھا اس لحاظ سے علاؤالدین کو قدرے تشویش ہوئی تاہم انہوں نے سیری کے علاقے میں پڑاؤ ڈالا اور چاروں طرف خندق کھدوادی۔ منگولوں نے دہلی کے نواحی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

منگولوں نے دہلی کے اطراف کے علاقوں کی ناکہ بندی کر دی تھی چنانچہ علاؤالدین کی فوج کے وہ حصے جو دیگر محاذوں پر تھے، وہ واپس بلوائے جانے پر لوٹ آئے لیکن بدایوں اور کول (علی گڑھ) میں آ کر

Marfat.com

ٹھہر گئے۔ دریائے جمنا کی تمام گزر گاہوں پر منگولوں کا قبضہ تھا۔ ان حالات میں علاؤالدین کے پاس جتنی فوج موجود تھی، اسی کے ساتھ جنگ لڑنے کے لیے تیار تھے۔

منگولوں کا محاصرہ اگر طویل ہو جاتا تو ممکن تھا کہ دہلی میں عام لام بندی کا اعلان کر دیا جاتا، لیکن معلوم نہیں کس وجہ سے منگولوں کے سردار طرغی نے محاصرہ اٹھالیا اور اپنا لشکر لے کر واپس لوٹ گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ دہلی میں اس وقت جو بہت سے برگزیدہ بزرگ اور اولیاءاللہ موجود تھے، ان کی دعائیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرمالیں اور دارالحکومت کو تباہی سے بچالیا۔ یحییٰ بن احمد سرہندی نے تاریخ مبارک شاہی میں بالکل مختلف بات لکھی ہے کہ منگولوں کو شکست دی گئی اور طرغی کو گرفتار کرلیا گیا۔

اس کے بعد علاؤالدین نے دارالحکومت سیری کے علاقے میں منتقل کر دیا۔ سیری بھی دہلی کے پاس ہی تھا۔ اسے علاؤالدین نے بسایا تھا۔ یہاں انہوں نے مضبوط قلعہ، محل اور دیگر عمارتیں تعمیر کروائی تھیں۔ علاؤالدین نے یہ حکم بھی دیا کہ منگولوں کی آمد کے راستے میں جتنے شکستہ اور قدیم قلعے ہیں انہیں از سر نو تعمیر کیا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی نئے قلعے بھی تعمیر کروائے۔ دشمن کی آمد کے راستوں پر باصلاحیت عہدیداروں کا تقرر کیا۔ بڑی تعداد میں منجنیقیں اور جنگی آلات بنوائے۔ سامانہ اور دیپال پور میں منتخب سپاہیوں کو ملازم رکھنے کی ہدایت کی۔

اس موقع پر علاؤالدین نے محسوس کیا کہ مملکت کے موثر دفاع کے لیے فوج کا مضبوط اور مستحکم ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے جب اس سلسلے میں اپنے مشیروں سے رائے لی تو ملکی معیشت کے کئی پہلو، ان کے سامنے آئے۔ ان صلاح مشوروں کی روشنی میں انہوں نے متعدد اہم فیصلے کیے۔ ان اہم فیصلوں کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے جس سے واضح ہو گا کہ علاؤالدین نے ملک کو فلاحی ریاست بنانے کی غرض سے کون سے دوررس فیصلے کیے۔

منگولوں نے چوتھا حملہ ۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء میں کیا۔ خراسان کے شہزادے ترتق (برنی نے ترتاک لکھا ہے) اور علی بیگ فوج لے کر امروہہ تک آپہنچے۔ یہ شہر دہلی سے تقریباً اسی میل مشرق میں ہے۔ گویا دشمن دہلی کو نظر انداز کرتے ہوئے مملکت کے اندرونی علاقے میں چلا آیا تھا۔ علاؤالدین نے ملک نائب (ملک کافور جو سپہ سالار تھے) کو فوج دے کر مقابلہ کے لیے بھیجا۔ امروہہ کے قریب دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ترتق اور علی بیگ دونوں گرفتار ہوئے اور انہیں سزائے موت دی گئی۔

اسی برس منگولوں کے ایک اور سردار کبک نے فوج اکٹھی کر کے ملتان کے مضافات پر حملہ کیا۔ یہ منگولوں کا پانچواں حملہ تھا۔ گو کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن وہ مسلمانوں کی بہادری کا مشاہدہ کر چکے تھے اس لیے انہیں پیش قدمی کی جرأت نہ ہوئی۔ علاؤالدین نے ملک نائب اور ملک تغلق کو دشمن سے جنگ لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ جب وہ ملتان کی حدود میں پہنچے تو منگول لشکر لوٹ مار کر کے واپس جا چکا تھا۔ مسلمانوں کی فوج نے دشمن کا پیچھا کیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ کبک کو گرفتار کرلیا گیا اور لوٹا ہوا مال واپس چھین لیا گیا۔

یحییٰ بن احمد سرہندی کے مطابق اس کے بعد منگولوں نے پھر حملے کی ہمت نہ کی لیکن ضیاالدین برنی کے مطابق ۷۰۷ھ/۸-۱۳۰۷ء میں ایک اور منگول سردار اقبال مندہ نے حملہ کیا۔ اس بار اسلامی فوج کا دشمن سے مقابلہ تلنبہ میں ہوا۔ اقبال مندہ جنگ میں کام آیا اور دشمن کے ہزاروں سپاہی بھی مارے گئے۔ اس کے بعد منگولوں کے دل میں مسلمانوں کا خوف بیٹھ گیا اور پھر انہوں نے برصغیر کی سرحد کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ کی۔

منگولوں کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد علاؤالدین نے دیگر علاقوں کو مطیع کرنے کا ارادہ کیا۔ دکن میں دیوگیر کا راجا رام دیو بغاوت پر اتر آیا تھا۔ علاؤالدین نے ملک کافور کو حکم دیا کہ رام دیو کی سرکوبی کریں۔ ملک کافور فوج لے کر دیوگیر پہنچے اور راجا رام دیو اور اس کے بیٹے کو قیدی بنا کر دہلی لے آئے لیکن علاؤالدین نے رام دیو کو معاف کر دیا۔ اس واقعے کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

علاؤالدین نے ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں ملک کافور کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ ارنگل بھیجا۔ (اسے اب ورنگل کہتے ہیں۔ بعد میں یہ سلطنت آصفیہ حیدرآباد کا ضلع بنا۔ اس جگہ پہلے قلعہ کی تعمیر ہوئی پھر شہر آباد ہوا) یہاں راجا لدر دیو حکمراں تھا۔ ملک کافور نے اسے شکست دی اور اس پر سالانہ خراج عائد کر دیا۔

سنہ ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء کے ابتدائی مہینوں میں ملک کافور نے ارنگل

Marfat.com

سے آگے بڑھ کر پورے دکن کو سمندر کے کنارے تک فتح کر لیا۔ اس مہم میں مالابار'میسور' معبر اور دکن کے دیگر تمام شمالی حصے تسخیر ہوئے۔ علاؤالدین خلجی پہلے مسلمان حکمراں ہیں جن کے دور میں سلطنتِ دہلی، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیل گئی تھی۔ دوسرے مسلمان حکمراں اورنگ زیب عالمگیرؒ ہیں جن کی سلطنت کی حدود بھی یہی تھیں۔

علاؤالدین خلجی نے اپنی مملکت کو دفاعی اعتبار سے مضبوط و مستحکم بنانے کی غرض سے متعدد اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے دفاعی امور کے سلسلے میں ایک وزارت قائم کی جسے "دیوانِ عرض" کہتے تھے۔ اس وزارت کا سربراہ "عارض ممالک" کہلاتا تھا۔ عارض ممالک فوج کو بہتر حالت میں رکھنے اور فوجی معاملات کے پورے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ وہ فوجی بھرتی کے لیے بھی منظوری دیتا تھا اور تنخواہوں کا تقرر کرتا تھا۔ عارض ممالک سال میں ایک بار سوار سپاہیوں کا معائنہ بھی کرتا تھا۔ سپاہیوں کی ترقی اور تنزلی کا انحصار عارض ممالک پر تھا۔ فوجی مہمات کی تیاریاں عارض ممالک کے ذریعے ہوتی تھیں۔

عارض ممالک کا دفتر سپاہیوں کے لیے اقطاعات (زمین کا ایک متعین رقبہ) کی سفارش اور فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کا ذمے دار ہوتا تھا۔ رسد اور نقل و حمل کے معاملات کی نگرانی بھی عارض ممالک کے سپرد تھی۔ عارض ممالک کی مدد کے لیے کارکنوں کا بڑا عملہ موجود تھا اور مرکز اور صوبوں میں نائبین بھی کام کرتے تھے۔

علاؤالدین خلجی کے حکم پر پہلی بار ان گھوڑوں کو باقاعدہ داغنے کا طریقہ رائج کیا گیا جو سپاہی لا کر پیش کرتے تھے۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ کسی جانور کو دوبار پیش نہ کیا جا سکے نہ کسی ادنیٰ جانور سے تبدیل کیا جا سکے۔ یہ طریقہ دراصل بنی امیہ کے زمانے سے شروع ہوا تھا۔

دیوانِ عرض میں ہر سپاہی کی شناختی علامات اور تفصیلی کیفیت درج کی جاتی تھی جسے "حلیہ" کہتے تھے۔ علاؤالدین خلجی کی فوج میں سپاہی تین اقسام کے تھے۔ مرتب: وہ سپاہی جن کے پاس اپنا گھوڑا نہ ہو۔ سوار: وہ سپاہی جن کے پاس اپنا گھوڑا موجود ہے۔ پایک: پیادہ سپاہی۔ علاؤالدین خلجی کی فوج میں ۴ لاکھ ۷۵ ہزار سوار موجود تھے۔

علاؤالدین خلجی اہلِ علم اور بزرگانِ دین کی بہت عزت کرتے تھے۔ انہیں کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے خود علم حاصل کرنے کے لیے مولانا قاضی کہرامی اور قاضی مغیث الدین کو زحمت دی تھی۔ برنی کے سوا کسی مؤرخ نے علاؤالدین خلجی کی مذہب سے بے تعلقی کا تذکرہ نہیں کیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ برنی کے ذہن میں سماجی تعصبات کام کر رہے تھے اور علاؤالدین خلجی نے ذات و نسل کے امتیازات مٹا دیے تھے۔ یہ چیز برنی کے سماجی تصورات سے ٹکراتی تھی۔ امیر خسرو، امیر حسن سجزیؒ، عصامی اور وصاف نے علاؤالدین خلجی کی دین پروری، دین داری اور پاسِ شریعت کی تعریف کی ہے۔

علاؤالدین خلجی کا دینی علم اگرچہ زیادہ نہ تھا بلکہ مؤرخین کے مطابق وہ ناخواندہ تھے اور وہ اس بات کا اعتراف برملا کرتے تھے لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میں پشتوں سے مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہوں۔ یعنی وہ اسلام سے گہری محبت رکھتے تھے۔ خود برنی کے مطابق وہ اسلام میں عام لوگوں کی طرح بڑا پختہ تقلیدی اعتقاد رکھتے تھے اور بدمذہب اور بددینوں کا سا کلام نہ کہتے تھے، نہ سنتے تھے، نہ جانتے تھے۔

علاؤالدین خلجی کا عہد اسلامی حکومتوں کی تاریخ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس دور میں جس درجے کے علما کرام دہلی اور اس کے اطراف کے علاقوں میں موجود تھے، اس کی مثال بعد کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ برنی کے مطابق ان علما کرام میں سے ہر ایک علامۂ وقت تھا اور اپنے فن میں ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا میں بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، دمشق، تبریز، رے اور روم میں بھی اس کا ثانی نہیں مل سکتا تھا۔

علم کا کوئی سا شعبہ ہو، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، اصولِ دین، نحو، لغت، کلام، منطق، ہر فن میں کامل مہارت حاصل رکھنے والے یہاں موجود تھے۔ جس علمی تصنیف پر یہاں کے علما اپنی توثیق کی مہر ثبت کر دیتے وہ علمی دنیا میں انتہائی مستند اور معتبر سمجھی جاتی تھی۔ دنیا بھر کے دور دراز علاقوں سے علما کرام دہلی آتے تھے اور یہاں موجود بزرگ علما سے تحصیلِ علم کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔

برنی نے ۴۶ علما کرام کے نام دیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ وہ عظیم علما کرام ہیں جن سے میں نے خود علم حاصل کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اہلِ علم موجود تھے جن میں سب سے نمایاں حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ گو کہ علاؤالدین خلجی سے کبھی نہیں ملے لیکن وہ علاؤالدین خلجی کی حکومت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہے۔

Marfat.com

ان کے خاص مرید حضرت امیر خسرو علاالدین خلجی کے بہت قریب تھے۔ امیر خسرو نے اپنی مثنویوں میں علاالدین خلجی کے دینی رجحانات کا تذکرہ جگہ جگہ کیا ہے اور "خزائن الفتوح" میں تو انہوں نے علاالدین خلجی کو بہت شاندار خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اس دور میں شیخ علاالدین صابرؒ جیسے عظیم بزرگ بھی تھے جو حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پوتے تھے۔ پورے عہد علائی میں شیخ علاالدین صابرؒ، اجودھن میں مقیم رہے۔ ان کی ذات علم و عرفان کا مرکز تھی۔ ملتان میں شیخ بہاالدین زکریاؒ کے آستانے پر مولانا شیخ رکن الدین بن شیخ صدر الدینؒ عارف موجود تھے۔ علاالدین خلجی ان کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ شیخ رکن الدینؒ دو مرتبہ ملتان تشریف لائے۔ علاالدین خلجی شیخؒ کے استقبال کے لیے بہت دور تک پہنچ گئے۔ نہایت احترام اور عزت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

علاالدین کے عہد کے علماکرام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ حق بات کہتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بڑے سے بڑے عہدیدار حتیٰ کہ خود سربراہِ مملکت کی بھی پروانہ کرتے تھے۔ دوسری جانب علاالدین اپنی سخت طبیعت کے باوجود نہایت تحمل کے ساتھ ان علماکرام کی سخت تنقید سنتے تھے اور کئی بار ایسا ہوا کہ علماکرام کے دلائل سننے کے بعد علاالدین نے اپنے فیصلے تبدیل کیے یا اپنی غلطی کو محسوس کرلیا۔

علاالدین برصغیر کے وہ پہلے فرمانروا تھے جنہوں نے شراب نوشی اور شراب فروشی کی روک تھام کی باقاعدہ اور بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے شراب، بھنگ اور جوئے پر کڑی پابندی لگادی۔ شراب پینے والوں کو سزا دینے کے لیے قید خانے بنوائے۔ شراب بندی کے اعلان کے بعد مملکت میں شراب کے ساغر اور شراب اس طرح گلیوں میں پھینک دی گئی کہ جگہ جگہ کیچڑ ہوگئی۔ تاہم جو لوگ شراب کے عادی تھے وہ چوری چھپے شراب منگوانے لگے یا گھروں میں خفیہ طور پر شراب کشید کرنے لگے۔

علاالدین خلجی نے سراغرسانی کا سخت نظام قائم کیا اور جہاں اس بات کا علم ہوتا تھا کہ شراب پی یا بیچی جارہی ہے حکومت کے کارندے چھاپے مار کر اس فعل میں ملوث افراد کو گرفتار کرلیتے تھے۔ جو فرد شراب پیتا یا فروخت کرتا ہوا پکڑا جاتا اسے ایک کنویں نما تہ خانے میں قید کر دیا جاتا تھا۔ ان سخت سزاؤں کی دہشت کی وجہ سے ہی بہت سے لوگوں نے شراب پینے سے توبہ کرلی۔

علاالدین خلجی نے یہ پابندیاں آنحضرت ﷺ کی شریعت پر عمل کرنے کی غرض سے لگائی تھیں اور بعض مورخین کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ ان اقدامات کا مقصد سیاسی تھا، جیسا کہ قاضی مغیث الدین سے گفتگو کرتے ہوئے علاالدین خلجی نے کہا:

"میں خدا تعالیٰ سے اپنی مناجات میں کہتا ہوں کہ کسی چور یا زانی یا شراب خور نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں اس کو سزا دوں۔ اس کے باوجود میں اس کو سزا دیتا ہوں تو صرف پیغمبروںؑ کے نقشِ قدم پر چلنے کی غرض سے دیتا ہوں۔"

علاالدین کا ایک اور کارنامہ ملک میں عصمت فروشی کا انسداد ہے۔ انہوں نے طوائفوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا پیشہ ترک کردیں اور پاک دامنی کی زندگی بسر کریں۔ اس غرض سے انہوں نے طوائفوں کے نکاح کروادیے۔ علاالدین علم نجوم و کیمیاگری کے سخت خلاف تھے۔ ان کے خوف سے نجومی اور کیمیاگر اپنے علم کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

علاالدین خلجی ہی کے عہد میں مشہور بزرگ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ بھی موجود تھے۔ وہ ان ہی کے عہد میں اودھ سے دہلی آکر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عظیم درس گاہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے گو کہ علاالدین خلجی سے کبھی ملاقات نہیں کی لیکن تمام حالات پر ان کی نظر تھی اور انہوں نے اپنے ملفوظات پر مشتمل کتاب "خیر المجالس" میں علاالدین خلجی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ "خیر المجالس" فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مرتب کی گئی۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے نزدیک علاالدین خلجی کا عہد خوشحالی اور فراغت کے اعتبار سے فیروز شاہ تغلق کے عہد سے بھی اچھا تھا۔

بعض تذکروں میں حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ سے بھی علاالدین خلجی کی عقیدت کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بار علاالدین خلجی نے حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کی خدمت میں حضرت امیر خسرو کے ہاتھ چند تحائف ارسال کیے۔ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ نے یہ کہہ کر تحائف کو قبول کرلیا کہ اگر حضرت نظام الدین اولیاؒ درمیان میں نہ ہوتے تو ہرگز قبول نہ کرتا۔ جب امیر خسرو رخصت ہونے لگے تو ایک

Marfat.com

خط شیخ نظام الدین اولیاؒ کے نام اور دوسرا علاؤالدین خلجی کے نام لکھ کر مرحمت فرمایا۔

علاؤالدین خلجی کے عہد میں علم قرأت کے بھی بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ مولانا جمال الدین شاطبی، مولانا علاؤالدین مقری اور خواجہ ذکی درسِ قرأت دیتے تھے اور بہت سے حفاظ اپنی قرأت درست کرتے تھے۔

اسی دور میں مولانا عماد الدین حسام درویش، مولانا ضیاالدین سنامی (جو مفسر اور فقیہ بھی تھے)، مولانا شہاب الدین خلیلی، مولانا کریم الدین وغیرہ جیسے باکمال واعظ بھی موجود تھے۔

علاؤالدین خلجی کے اہلِ علم ندیموں میں تاج الدین عراقی، غیاث الدین بلبن کے نواسے خداوندزادہ چاشنی گیر، رکن الدین دبیر اور دیگر بہت سے دانشور اور کتاب خواں شامل تھے۔

عہدِ علائی کے شعرا کرام بھی بڑے پائے کے تھے۔ ان میں امیر خسرو کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے نظم و نثر میں گویا ایک کتب خانہ تصنیف کر ڈالا۔ وہ ایک عظیم صوفی بھی تھے اور دین کا گہرا علم رکھتے تھے۔ امیر حسن سجزی بھی اس دور کے بڑے شاعر اور نثر نگار تھے۔ بہت اچھی سیرت کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ کئی اہم شعرا موجود تھے۔

اسی عہد میں بڑے پائے کے مؤرخین بھی پائے جاتے تھے۔ ان میں ایک امیر ارسلان کوہی تھے جنہیں سلاطینِ ماضی کی تاریخ حفظ تھی۔ علاؤالدین ان سے جب بھی تاریخ سے متعلق کوئی سوال کرتے تو وہ اپنے حافظے کی بنا پر مفصل جواب دیتے۔ انہیں کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ دوسرے بڑے مؤرخ کبیر الدین بن تاج الدین عراقی تھے جو بلاغت، دبیری اور انشأ کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے علاؤالدین کے عہد کی تاریخ لکھی۔

ضیاالدین برنی بھی اسی دور میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں علاؤالدین خلجی کے عہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

علاؤالدین کا عہد ممتاز اطبا کی موجودگی کے سبب بھی ممتاز ہے۔ ان کے دور میں مولانا بدرالدین دمشقی جیسے کہنہ مشق طبیب موجود تھے۔ شہر کے اطبا ان سے طب کی تعلیم حاصل کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بڑی شفا دی تھی اور مرض کی تشخیص اور علاج میں انہیں بہت مہارت حاصل تھی۔ بو علی سینا کی کتاب "القانون فی الطب" اور "قانونچہ" اور دیگر کتب بہت عمدہ تشریح کر کے اپنے شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔ دیگر اطبا میں مولانا صدر الدین طبیب، یمنی طبیب، علم الدین، مولانا اعز الدین بداؤنی وغیرہ شامل ہیں۔

علاؤالدین کے عہد میں جیسے اور جتنی تعداد میں خطاط، کاتب، مطرب، کمان گر، تیر گر، کلاہ دوز، موزہ دوز، تسبیح بان اور دیگر ماہر کاریگر موجود تھے ویسے اور اتنی تعداد میں کسی اور زمانے میں نہیں تھے۔

علاؤالدین خلجی نے حکومت کے خلاف بغاوتوں کی روک تھام کے لیے ابتدا میں انتہائی سخت اقدامات کیے۔ انہوں نے معاشرے کے ان سرکردہ طبقوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی جو دولت کے بل پر غریبوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔ ان کڑے اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر فرد محنت کر کے روزی کمانے میں مصروف ہو گیا۔

سرکاری عہدیداروں پر زیادہ سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔ چنانچہ ایسے اجتماعات کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا جو سازشوں کی غرض سے منعقد کیے جاتے تھے۔ علاؤالدین کے محکمۂ سراغرسانی کی بروقت کارروائیوں کی وجہ سے بھی بغاوت کا خطرہ بہت کم ہو گیا۔

علاؤالدین خلجی کا ایک بڑا کارنامہ ان کی زرعی اصلاحات ہیں۔ انہوں نے ایسے اقدامات کیے کہ کوئی فرد زیادہ اراضی کا مالک ہونے کی بنا پر دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔ انہوں نے حکم دیا کہ جو افراد کاشت کرتے ہوں وہ اپنی زمین کی پیمائش کروائیں اور اسی حساب سے پیداوار کا نصف حصہ حکومت کو ادا کریں۔ اس کے علاوہ ایک حکم کے ذریعے دودھ دینے والی بھینسوں اور بکریوں کی چرائی پر محصول عائد کر دیا گیا۔

دوسری جانب علاؤالدین نے غلے کی ارزانی کے لیے چند مستحکم ضابطے بنا دیے۔ انہوں نے حکومت کی طرف سے غلے کے نرخوں کا تعین کر دیا۔ مثلاً گیہوں ساڑھے سات جیتل فی من اور چنا پانچ جیتل فی من۔

جیتل تانبے کا سکہ ہوتا تھا جس کا وزن دو تولے تھا۔ تنکہ بڑا سکہ تھا جو ایک تولے سونے یا چاندی سے بنایا جاتا تھا اور تنکہ طلائی یا تنکہ نقرئی

Marfat.com

کہلاتا تھا۔ ایک تنکے میں پچاس جیتل ہوتے تھے اور اس دور میں ایک من میں چالیس سیر ہوتے تھے۔ اور ہر سیر ۲۴ تولے کا ہوتا تھا۔ (انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کے مطابق سیر ۳۰ تولے کا ہوتا تھا۔ اس طرح عہد علائی کا من، موجودہ وزن کے لحاظ سے ساڑھے بارہ سیر کا تھا)۔

علاؤالدین نے حکم دیا کہ کھیتوں میں ضرورت سے زائد جس قدر غلہ پیدا ہو، اسے وہیں فروخت کر دیا جائے اور ذاتی ضرورت سے ایک دانہ بھی زائد نہ رکھا جائے۔ اس طرح ذخیرہ اندوزی کا سدباب ہوا۔ علاؤالدین نے جگہ جگہ سرکاری ذخیرے قائم کرنے کا حکم دیا جن میں غلہ جمع کیا جاتا اور پھر یہ غلہ دہلی بھیج دیا جاتا۔ اس طرح حکومت خود سب سے بڑی بیوپاری ہو گئی تھی۔ اگر قحط پڑ جاتا تو سرکاری ذخائر سے غلہ منڈی میں پہنچا دیا جاتا جو حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر فروخت ہوتا۔

علاؤالدین نے ایک اور اہم اقدام یہ کیا کہ ملک کے بیشتر غلہ فروشوں کو دریائے جمنا کے کنارے آباد کروا دیا۔ غلہ کی نجی طور پر ذخیرہ اندوزی جرم قرار دے دی گئی۔ اگر کوئی ایک من غلہ بھی خفیہ طور پر ذخیرہ کر لیتا اور پھر اسے فروخت کرتا تو اس کا غلہ ضبط کر لیا جاتا اور سزا دی جاتی۔

علاؤالدین کو منڈی کے نرخ اور دیگر معاملات کی خبریں روزانہ تین ذرائع سے پہنچتی تھیں۔ ایک تو منڈی میں مقررہ نگران تھا جو "شحنہ" کہلاتا تھا۔ دوسرا "برید منڈی" تھا جو رپورٹ بھیجتا تھا۔ تیسرے وہ جاسوس تھے جو منڈی میں متعین کیے گئے تھے۔ اگر برید اور جاسوسوں کی رپورٹس شحنہ کی رپورٹ سے مختلف ہوتیں تو شحنہ کو کڑی سزا دی جاتی۔ علاؤالدین نے کپڑوں، چینی، سبزی، پھل، گھی کی قیمتوں کی سطح کم رکھنے کی غرض سے سرائے عدل قائم کی۔ بدائوں دروازے کے سامنے میدان کو "سرائے عدل" کا نام دیا گیا۔ علاؤالدین کے حکم پر شہر میں جو کپڑا لایا جاتا وہ سرائے عدل میں اتارا جاتا اور سرکاری نرخوں پر فروخت ہوتا۔ شہر اور اطراف کے تمام سوداگروں کے نام دیوانِ ریاست میں درج کر لیے گئے تھے اور ان سے عہد لے لیا گیا تھا کہ وہ باقاعدگی سے کپڑا لاتے رہیں گے۔

تاجروں کو سرکاری خزانے سے رقم دی گئی تاکہ وہ دیگر علاقوں سے کپڑا لائیں اور سرکاری نرخ پر کپڑا فروخت کریں۔ بیش قیمت کپڑوں کی خریداری کے لیے حکومت سے اجازت لینی ضروری تھی۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ کوئی فرد کم داموں میں کپڑا خرید کر دیگر علاقوں میں جا کر مہنگے داموں فروخت نہ کرے۔ گھوڑوں اور جانوروں کی قیمتیں بھی کم ہو گئیں۔ اس سلسلے میں بھی ضابطے بنائے گئے۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ کوئی جانور مقررہ نرخ سے زیادہ قیمت دے کر خریدا گیا ہے تو متعلقہ فرد کو کڑی سزا دی جاتی۔ جانوروں کی قسموں اور قیمتوں کی ماہانہ جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

بازاروں میں فروخت ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی اشیا کی قیمتیں مقرر کر دی گئیں حتیٰ کہ ایک سوئی، کنگھے، جوتے، پیالے سے لے کر روٹی، پودینہ اور پان تک ہر شے کی قیمت متعین تھی۔ ان اشیا کی قیمت کے تعین میں بیچنے والے کے منافع کا خیال رکھا گیا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ مقررہ نرخوں پر اشیا فروخت ہو رہی ہیں یا نہیں، کوتوال، رئیس بازار اور جاسوس بازاروں پر نظر رکھتے اور رپورٹس حکومت کو پہنچاتے۔ اس پر بھی علاؤالدین کو اطمینان نہ ہوتا تو وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بازار بھیجتے تاکہ چیزیں خرید کر لائیں۔ اگر کوئی دکاندار زیادہ قیمت وصول کرتا یا کم تولتا تو اسے سزا دی جاتی۔ بازاروں میں قیمتوں پر نظر رکھنے اور سرکاری احکام پر عمل درآمد کروانے کے لیے علاؤالدین نے یعقوب ناظر کو رئیس مقرر کیا۔ رئیس اچانک معائنہ کرتے تھے اور جہاں کسی کو کم تولتا ہوا پاتے، چیز کا وزن کرتے اور جتنی کم ہوتی اس کے مطابق سزا دیتے۔ ان سخت اقدامات کے نتیجے میں اشیائے صَرف مقررہ کم قیمت پر ملنے لگیں اور ناپ تول میں کمی کا مرض جاتا رہا۔

علاؤالدین کے عہد میں کثرت سے تعمیرات ہوئیں۔ محکمۂ تعمیرات میں ستر ہزار کاریگر تھے۔ مؤرخین کے مطابق انہوں نے بے شمار مساجد، قلعے، محرابیں، دروازے اور محل تعمیر کروائے۔ علاؤالدین کے عہد کی ایک اہم یادگار علائی دروازہ ہے جو، اب بھی ان کی یاد دلا رہا ہے۔ یہ دہلی میں قطب صاحب کے علاقے کی بہترین عمارت ہے۔ تزئین کے لحاظ سے اسے دنیا کی بہترین تعمیرات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ دروازے کی محرابوں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اس دروازے کی محرابوں پر جو عبارتیں کندہ ہیں ان سے علاؤالدین کے گہرے مذہبی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ علاؤالدین نے دہلی کی فصیل کو از سر نو تعمیر کروایا اور دیگر عمارتیں بنوائیں۔

Marfat.com

علاؤالدین نے پوری مملکت میں سڑکیں تعمیر کروائیں۔ یہ سڑکیں بہت اچھی حالت میں تھیں۔ ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ دہلی سے دولت آباد (دیوگڑھ) تک چالیس دن کا سفر ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کی دونوں جانب اتنے درخت ہیں کہ مسافریوں محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ کسی باغ کی روش پر چل رہا ہے۔

ہر میل پر ڈاک کی چوکی تھی۔ راستے میں ہر چیز فراوانی سے دستیاب ہو جاتی تھی گویا بازار لگا ہوا ہو۔ مفلس مسافروں کو فکر بالکل نہ ہوتی تھی، گاؤں کے مکھیا ان کو مہمان رکھتے تھے۔

علاؤالدین کی عمر زیادہ ہوئی تو وہ بیمار رہنے لگے آخری دنوں میں انہیں تپ دق ہوگئی تھی۔ ۶ شوال ۷۱۶ھ/۲۲ دسمبر ۱۳۱۶ء کو علاؤالدین نے انتقال کیا۔ امیر خسرو اور برنی نے سنہ وفات ۷۱۵ھ درج کیا ہے۔ علاؤالدین کا جنازہ سیری کے محل سے لایا گیا۔ انہیں جامع مسجد کے سامنے مقبرے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ جب دہلی آئے تو انہوں نے لوگوں کو علاؤالدین خلجی کا بڑا مداح پایا۔ ابنِ بطوطہ لکھتے ہیں: ”وہ بہت اچھے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اہل ہند اب تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔“

***

Marfat.com

غیاث الدّین تغلق

برصغیر کے دین دار، لائق، شیر دل منتظم اور مثالی حکمراں

تمام سرکش راجاؤں نے اطاعت اختیار کرلی تھی!

بنگال کے علاقے لکھنوتی، سنار گاؤں اور دیگر کئی ریاستیں برصغیر کی اُس اسلامی مملکت میں شامل ہو چکی تھیں جو پنجاب سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور جو، اب سوائے کشمیر کے، موجودہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے تمام علاقوں پر مشتمل تھی۔

بنگال کے علاقوں کی تسخیر کا یہ کارنامہ برصغیر کے اس حکمراں نے انجام دیا تھا جنہیں برسر اقتدار آئے ہوئے ابھی صرف چار سال ہوئے تھے۔ یہ مہم بڑی کامیاب رہی تھی، لیکن ترہٹ کا راجا ابھی تک سرکشی پر آمادہ تھا۔ اُسے اپنے مضبوط دفاعی حصار پر بڑا ناز تھا۔ ترہٹ کی ریاست موجودہ دربھنگہ اور مظفر پور کے اضلاع پر مشتمل اور نیپال کی سرحد تک وسیع تھی۔

مسلمان فوج کی قیادت خود برصغیر کے حکمراں کر رہے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ ترہٹ کا راجا بہت گھنے جنگلوں میں واقع ایک قلعے میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا دفاعی نظام نہایت مضبوط ہے اور گھنے جنگلوں کو عبور کر کے راجا پر حملہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

حکمراں نے تحمل سے بات سنی، پھر انہوں نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد فوج اس جگہ پہنچ چکی تھی جہاں سے گھنے جنگل شروع ہوتے تھے۔ قلعہ واقعی نہایت مضبوط تھا۔ اس کے گرد پانی سے بھری ہوئی سات خندقیں بنائی گئی تھیں، لیکن اسلامی فوج کی قیادت ایک شیر دل اور تجربہ کار سالار کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے فوج کو اس طرح ترتیب دیا اور حملوں کا ایسا انداز اختیار کیا کہ صرف چند دنوں میں ترہٹ کا راجا شکست تسلیم کر کے گرفتار ہو چکا تھا۔

یہ جرأت آزما سالار تھے، برصغیر میں تغلق خاندان کے پہلے حکمراں غیاث الدین تغلق، جنہوں نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں برصغیر پاک وہند کو خوش حالی اور ترقی کی منہ بولتی تصویر بنادیا۔

غیاث الدین تغلق کی زندگی کے ابتدائی حالات تاریخ کی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ نسلاً ترک تھے۔ ان کے آباؤ اجداد برصغیر آگئے۔ ان کے والد برصغیر کے فرمانروا غیاث الدین بلبن کے غلام تھے۔ غیاث الدین تغلق پنجاب میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عملی زندگی کی ابتدا ایک سوداگر کے گھوڑوں کی دیکھ بھال سے کی۔ پھر وہ برصغیر کے حکمراں علاالدین خلجی کے بھائی کے پاس بطور پیادہ سپاہی بھرتی ہوگئے اور ترقی کرتے ہوئے امیر آخور (سوار فوج کا افسرِ اعلیٰ) بنے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس حد تک منوایا کہ منگولوں کی یلغار کے خلاف مملکت کے دفاع کی مہمات ان ہی کے سپرد کی گئیں۔ ۷۰۵ھ / ۱۳۰۵ء میں انہیں ملتان اور دیپالپور کے علاقے کا حاکم بنادیا گیا تھا۔

خلجی خاندان کے حکمراں علاالدین خلجی کے انتقال کے بعد ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں ایک کم عمر شہزادے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھادیا گیا۔ یہاں سے مملکت کا نظم ونسق بگڑنے لگا۔ تین ماہ بعد ایک اور شہزادے مبارک شاہ برسر اقتدار آئے اور قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے لقب سے معروف ہوئے۔ ان کے دور میں ایک بظاہر مسلمان شخص، خسرو خاں (غلام خسرو پاروانی) نے انہیں قتل کروا کے خود اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ خسرو خاں صرف چار ماہ حکمراں رہا لیکن اس عرصے میں اس نے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیا۔ اس کے ظلم وستم کی خبریں دیپال پور کے حاکم غازی ملک تک پہنچ رہی تھیں۔ آج کل دیپال پور، ضلع ساہیوال میں پاک پٹن سے ۲۸ میل مشرق میں واقع ہے۔ خلجیوں

Marfat.com

کے عہد میں یہ پنجاب کا دارالحکومت اور اہم شہر تھا۔
غازی ملک نے فوجی تیاری کر کے دیپال پور سے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ خسرو خان نے اپنے بھائی اور دیگر امیروں کو فوج دے کر بھیجا۔ تھانیسر (دہلی سے ۷۸ میل دور دریائے سرستی کے کنارے ایک شہر) کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ غازی ملک کی فوج نے دشمن کو مار بھگایا اور فاتح فوج، پیش قدمی کرتے ہوئے دہلی تک پہنچ گئی۔ دوسرے دن خسرو کی فوج کے ساتھ معرکہ ہوا۔ غازی ملک کا لشکر ظفریاب ہوا۔ خسرو فرار ہو کر ایک باغ میں جا چھپا لیکن اسے ڈھونڈ نکالا گیا۔

شعبان ۷۲۱ھ / اگست ۱۳۲۱ء میں خسرو کو سزائے موت دینے کے بعد اتفاقِ رائے اور باہمی صلاح مشورے سے غازی ملک کو برصغیر کا حکمراں تسلیم کر لیا گیا۔ غازی ملک نے حکمراں بن کر غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دہلی فتح کرنے کے بعد غیاث الدین تغلق نے تمام امرا کے سامنے واضح کر دیا تھا کہ وہ اقتدار کے خواہش مند نہیں ہیں، لیکن امرا کے بے حد اصرار پر غیاث الدین تغلق نے مجبور ہو کر حکمراں بننا قبول کر لیا۔ پھر بھی انہوں نے پہلے امرا سے اور پھر عوام سے بیعت لی کہ وہ انہیں حکمراں بنانے کے لیے راضی ہیں۔

برسر اقتدار آتے ہی غیاث الدین تغلق کو، شدید سیاسی اور انتظامی بے چینی اور بدنظمی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سے قبل حکمراں خسرو خان نے بدعنوانی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس نے فوج کو اپنا وفادار بنانے کے لیے سپاہیوں کو کئی کئی ماہ کی تنخواہیں پیشگی ادا کر دی تھیں، اس طرح ملکی خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ خسرو خان سمیت بہت سے سرکاری عہدیدار اور بااثر افراد غیر اخلاقی حرکات میں ملوث تھے۔ غیاث الدین تغلق نے علاءالدین خلجی کے خاندان کی تمام خواتین کو یکجا کیا۔ جن لوگوں نے خواتین کے ساتھ زیادتی کی تھی ان کو سخت سزائیں دیں۔ اس خاندان کی بیٹیوں کے نکاح باعزت گھرانوں میں کروا دیے۔ بدعنوان افراد کو چُن چُن کر الگ کیا اور دیانت دار، اہل اور مستعد افراد کو ذمہ داریاں دیں۔

خسرو خاں کے دور میں بہت سے لوگ بلاوجہ نوازے گئے تھے اور بے شمار افراد کو بلاسبب خطیر رقوم، زمینیں اور املاک وغیرہ دی گئیں تھیں۔ اس کے علاوہ بدامنی کے دور میں مختلف افراد نے بڑی رقم لوٹ لی تھی یا ناجائز طریقے سے حاصل کر لی تھی۔ غیاث الدین تغلق کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے سخت روش اختیار کرتے ہوئے، لوٹی ہوئی یا غصب شدہ رقم کا بہت بڑا حصہ صرف ایک سال میں لوگوں سے واپس لے لیا۔ البتہ انہوں نے ان رقوم کی وصولیابی کا طریقۂ کار نرم بنا دیا اور انہیں آسان قسطوں میں واپسی کی اجازت دی۔

غیاث الدین تغلق نے بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے سخت قوانین بنانے کے ساتھ لوگوں کو روزگار کے اچھے مواقع فراہم کیے اور تنخواہوں میں خاصا اضافہ کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ ظلم و زیادتی کے خاتمے، قانون میں اصلاحات یا کسی عہدے دار کے خلاف کسی کارروائی کے لیے اقدامات سے قبل، غیاث الدین تغلق اپنے اعلیٰ مشیروں یا حکام سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ اعتدال اور میانہ روی، ان کی نمایاں خوبیاں تھیں۔ وہ حکمرانی کے تمام امور میں افراط و تفریط سے گریز کرتے تھے۔

رعایا کو انعامات سے نوازنے کے سلسلے میں غیاث الدین تغلق کا نظریہ بہت سلجھا ہوا تھا۔ وہ کم دیتے تھے لیکن زیادہ افراد کو دیتے تھے اور بار بار دیتے تھے۔ ان کی عطا کردہ رقوم اور دیگر انعامات کی مالیت کو اگر یکجا کیا جائے تو سال بھر میں بہت بڑی رقم بن جاتی تھی۔ انہوں نے یتیموں، بیواؤں، ناداروں اور دیگر مستحقین کی مستقل مالی اعانت کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی رواداری کا ثبوت دیا اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔

غیاث الدین تغلق نے کاشت کاروں کی حالت بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ خراج اور لگان دس فیصد سے زیادہ وصول نہ کیا جائے اور وصولی کے طریقۂ کار کو آسان بناتے ہوئے، رقوم قسطوں میں لی جائیں۔ انہوں نے تمام صوبوں اور علاقوں کے والیوں (حاکموں) کو سختی سے ہدایت کی کہ خراج وصول کرنے کے لیے جس فرد کو مقرر کیا جائے، اس کے کردار کے بارے میں کڑی چھان بین کی جائے اور خیال رکھا جائے کہ خراج وصول کرتے ہوئے کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے۔ قحط کے زمانے میں مالیے کی شرح کم کر دی جاتی یا وہ بالکل معاف کر دیا جاتا۔ اراضی کی پیمائش کے قدیم نظام کو ختم کر کے خود تشخیصی نظام رائج کیا گیا اور پوری اراضی کی پیمائش کروائی گئی۔ انہوں نے محاصل کی وصولی کے لیے ٹھیکیداری نظام کا خاتمہ کر دیا۔
غیاث الدین تغلق کی تمنا تھی کہ ان کی مملکت میں ہر فرد

Marfat.com

آسودگی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرے۔ اس غرض سے وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر فرد کو ذریعۂ معاش کے طور پر کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے۔ وہ گداگروں کو بھی گداگری چھوڑنے، کوئی ہنر سیکھنے اور اپنی روزی خود کمانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اپنی رعیت کو آسودہ حال اور خوش باش دیکھنے کی آرزو ان میں اس قدر شدید تھی کہ وہ مختلف خاندانوں کے افراد کو ہر ہفتے یا ہر مہینے طلب کرتے تھے اور ان پر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ وہ انہیں خوش لباس، خوش حال اور روزگار میں مصروف دیکھنا چاہتے ہیں۔

غیاث الدین تغلق نے کئی قلعے بنوائے، ان میں سے تغلق آباد کا قلعہ بہت اہم ہے جسے ابن بطوطہ نے اپنے عہد میں دنیا کا سب سے مضبوط اور بے نظیر قلعہ قرار دیا۔ کئی مساجد تعمیر کروائیں، ان میں سے ایک بہت بڑی مسجد ملتان میں تھی۔ مؤرخ ضیاالدین برنی کے مطابق آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کرنے کا طریقہ سب سے پہلے غیاث الدین تغلق ہی کے دور میں جاری ہوا۔ غیاث الدین تغلق نے کئی خوبصورت باغ لگوائے، غیر آباد زمینوں کو آباد کیا اور بنجر اراضی کو قابلِ کاشت بنوایا۔

اس قابلِ فخر اور اہل حکمراں نے مختصر عرصے میں ایسے مؤثر اقدامات کیے کہ شاہراہوں اور بستیوں میں رہزنی اور ڈکیتی کے واقعات کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ غیاث الدین تغلق کی شخصیت کی دہشت اتنی تھی کہ رہزنوں اور ڈاکوؤں نے اس قبیح پیشے کو خیر باد کہہ دیا، اپنی تلواریں توڑ دیں، کمانیں پھینک ڈالیں اور زراعت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ اس طرح شاہراہیں اور آبادیاں پُرامن ہو گئیں، تجارت کو فروغ ملا اور مجموعی طور پر خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ غیاث الدین تغلق نے ڈاک کا نظام بھی بہتر بنایا۔ ان کے دور میں کوئی اطلاع اوسطاً ایک سو میل یومیہ کی رفتار سے آگے پہنچ جاتی تھی۔

غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد کو دارالحکومت بنایا تھا۔ نیم دائرے کی شکل کا یہ شہر موجود دہلی کے نواح میں واقع تھا۔ اس جگہ کا انتخاب انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے پہلے ہی برس کر لیا تھا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ کے مطابق اس شہر میں ایک خوبصورت قصر تھا، جسے غیاث الدین تغلق نے چمکیلی اینٹوں سے تعمیر کروایا تھا۔ سورج کی روشنی میں ان اینٹوں کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ انہوں نے تغلق آباد میں اپنا مقبرہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے تعمیر شدہ اس مقبرے کے گنبد کی بلندی ۸۰ فٹ تھی۔ پاکستان کی موجودہ تحصیل پاک پتن میں ایک شہر قبولہ بھی غیاث الدین تغلق ہی نے آباد کروایا تھا۔

عوام کو انصاف کی فراہمی اور ان کی شکایات سے آگاہ ہونے کی غرض سے غیاث الدین نے دن میں دوبار کھلی کچہری لگانی شروع کر دی تھی۔

غیاث الدین تغلق نہایت دین دار حکمراں تھے۔ وہ اکثر باوضو رہتے تھے۔ روزانہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ رمضان میں تراویح کا اہتمام کرتے تھے۔ روزے باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ وہ شراب نوشی اور جوئے کے سخت مخالف تھے۔ ان کے دور میں ان افعال پر سخت پابندی تھی۔ غیاث الدین تغلق بے حد سلجھی ہوئی اور متین طبیعت کے حامل انسان تھے۔ کسی نے انہیں غیر ضروری یا بے ہودہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا نہ ہی انہوں نے کبھی تکبر یا خود نمائی کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کیے۔ وہ علماکرام کے بے حد قدردان تھے۔ خصوصاً امیر خسرو، ان کے بہت قریب تھے۔ بزرگانِ دین میں وہ مشہور صوفی بزرگ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

جس زمانے میں غیاث الدین تغلق بنگال میں سرکش حکام کے خلاف کارروائی میں مصروف تھے انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید مولانا شمس الدین یحییٰ سے کہا کہ آپ کشمیر جائیں اور وہاں اسلام کا پیغام عام کریں۔ مولانا نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں، لیکن وہ بیمار پڑ گئے اور وفات پا گئے۔

غیاث الدین بہت بہادر، ہوش مند، بیدار مغز اور اعلیٰ درجے کے منتظم سالار تھے۔ وہ فوج کو منظم کرنا، سپاہیوں کو مطمئن رکھنا بلکہ ان کے دل موہ لینا جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور ہی میں فوج میں ہزاروں اہل اور مستعد سواروں، پیادوں اور متعدد آزمودہ کار سرداروں کا اضافہ کر لیا تھا۔ تمام سپاہیوں کو تنخواہیں نقد رقم کی شکل میں ادا کی جاتی تھیں۔ اسی فوج کی مدد سے غیاث الدین تغلق نے متعدد بڑی مہمات سر کیں۔ وہ فوج کے سپاہیوں کو چاق و چوبند اور چوکس دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ سپاہیوں کی وضع قطع، تیر اندازی کے امتحان، گھوڑوں کو چست اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے انہوں نے سخت ہدایات جاری کی تھیں۔ غیاث الدین تغلق نے ایک اچھا اقدام یہ

Marfat.com

کیا کہ فتوحات کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کو خود ہی نہ رکھ لیا، بلکہ فوج کے سپاہیوں، علماء، صوفیا کے ساتھ ساتھ محتاجوں کو بھی اس میں برابر شریک کیا۔

غیاث الدین تغلق کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ برصغیر کا حکمراں بننے سے قبل، جب وہ دیپال پور کے حاکم تھے، انہوں نے پندرہ سال تک اس خطے کو منگولوں کی وحشیانہ یلغار کا نشانہ بننے سے متعدد بار بچایا۔ انہوں نے منگولوں سے کئی جنگیں لڑیں۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے ملتان میں غیاث الدین تغلق کی بنوائی ہوئی ایک بڑی مسجد میں گنبد پر خود لکھا دیکھا کہ میں غیاث الدین تغلق، منگولوں سے ۲۹ بار لڑا ہوں اور ایک جنگ میں بھی شکست نہیں کھائی۔

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوبی ہند میں تلنگانہ کے راجا مہادیو (لدر دیو) نے دہلی کی حکومت کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ غیاث الدین تغلق نے اپنے بڑے بیٹے الغ خان (محمد تغلق جو غیاث الدین کے بعد حکمراں بنے) کو ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء میں لشکر دے کر تلنگانہ اور معبر کی طرف بھیجا۔ راستے میں کئی اور علاقوں کی فوجیں اس لشکر سے آملیں۔ الغ خان نے تلنگانہ کے دارالحکومت وارنگل کا محاصرہ کر لیا۔ راجا قلعہ بند ہو گیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ محاصرہ طویل ہو گیا۔ اس اثنا میں تقریباً ایک ماہ تک دہلی سے ڈاک نہ پہنچ سکی کیونکہ راستے بہت دشوار گزار تھے۔ کچھ شر پسندوں نے غیاث الدین تغلق کی وفات کی افواہ پھیلا دی۔ الغ خان کو محاصرہ اٹھانا پڑا اور وہ واپس دہلی پہنچ گئے۔ چار ماہ بعد غیاث الدین نے الغ خان کو پھر فوج دے کر تلنگانہ بھیجا۔ الغ خان نے زبردست کارروائی کر کے تلنگانہ کو فتح کر لیا۔ انہوں نے مدورا (معبر) کے علاقے کو بھی دہلی کی مملکت کا حصہ بنایا۔ وارنگل کا نام سلطان پور رکھ دیا۔ واپسی پر الغ خان نے اڑیسہ کی ریاست اتکلا کو بھی فتح کیا۔

انہی دنوں منگولوں کے ایک لشکر نے دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب کے سرحدی علاقے پر حملہ کیا۔ غیاث الدین تغلق نے اپنی فوج بھیجی جس نے منگولوں کو شکست دی اور اس کے دو سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد بنگال کے علاقوں میں بغاوت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اس زمانے میں بنگال کے مختلف علاقوں پر مختلف مسلمان اور غیر مسلم حکمراں قابض تھے اور کم و بیش سب نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے دہلی میں اپنے بیٹے محمد تغلق کو نائب بنا کر خود فوج کی قیادت سنبھالی اور بنگال کی طرف کوچ کیا۔ یہ مہم بہت کامیاب رہی اور بنگال کے تمام راجا مطیع ہو گئے۔

ربیع الاول ۷۲۶ھ / مارچ ۱۳۲۵ء میں بنگال کی کامیاب مہم سے غیاث الدین کی واپسی پر ان کے بیٹے، الغ خان (محمد تغلق) نے ان کے شاندار خیر مقدم کا اہتمام کیا۔ اس غرض سے انہوں نے بہت کم وقت میں دارالحکومت کے باہر چار میل کے فاصلے پر ایک چوبی محل تیار کروایا تاکہ غیاث الدین تغلق رات میں وہاں قیام کر سکیں۔

عصر کی نماز کے وقت غیاث الدین اس محل کے قریب پہنچے۔ محل میں قیام کیا۔ کھانا کھانے کے بعد تمام حاضرین تو ہاتھ دھونے کی غرض سے باہر نکل آئے لیکن غیاث الدین تغلق، ان کے ایک بیٹے اور چند دیگر افراد اندر ہی رہے۔ اس وقت محل کی چھت گر پڑی اور غیاث الدین تغلق اور دیگر کئی افراد ملبے تلے دب کر جاں بحق ہو گئے۔ محل کی چھت گرنے کی مختلف توجیہات پیش کی گئی ہیں، لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ محل بہت کم وقت میں تعمیر ہوا تھا اور اس کی بنیادیں گیلی تھیں۔ جب ہاتھی معائنے کے لیے لائے گئے تو ان کے پیروں کی دھمک سے یہ بنیادیں ہل گئیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ محل پر بجلی گری تھی۔ بہر حال اس افسوسناک واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر ایک دین دار، لائق اور منتظم حکمراں سے محروم ہو گیا۔ غیاث الدین تغلق کو تغلق آباد میں اس مقبرے میں سپرد خاک کیا گیا جو انہوں نے اپنی حیات میں اپنے لیے تعمیر کروایا تھا۔

•••

Marfat.com

محمد بن تغلق

غیر معمولی طور پر ذہین، ذی علم، قابل، منصف، منتظم اور عبادت گزار حکمران

قاضی نے درخواست کا جائزہ لیا!

یہ ایک غیر مسلم شخص کی درخواست تھی جس نے سربراہ مملکت کے خلاف کوئی دعویٰ کیا تھا۔

قاضی نے سربراہِ مملکت کو حاضر ہونے کے لیے حکم جاری کر دیا۔ مقررہ وقت پر سربراہِ مملکت عدالت میں داخل ہوئے، قاضی سمیت کوئی بھی فرد انہیں دیکھ کر تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوا، وہ عام آدمی کی طرح عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے، ان کو ان کے خلاف دائر کیے گئے دعوے سے مطلع کیا گیا، ان پر جرح ہوئی۔ سربراہِ مملکت نے جواب دیا، لیکن دعوے کو غلط ثابت نہ کر سکے۔

قاضی نے فیصلہ سنایا، "سلطانِ وقت اگر مدعی کو راضی کر سکتے ہیں، تو کرلیں ورنہ سزا پانے کے لیے تیار ہو جائیں!"

سربراہِ مملکت نے مدعی سے بات کی اور اس کے نقصان کی تلافی کرنے کا پختہ وعدہ کر کے اسے اپنا دعویٰ واپس لینے اور معاف کر دینے پر راضی کر لیا۔

یہ سربراہِ مملکت تھے، برصغیر پاک و ہند میں تغلق خاندان کے دوسرے فرمانروا محمد بن تغلق، جنہوں نے ۲۶ برس تک برصغیر پر کامیاب حکومت کی اور اپنے بے پناہ علم، تدبر اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کی بدولت اس خطے کو خوشحالی کا مرقع بنا دیا۔ آئندہ سطور میں سہولت کے لیے انہیں محمد تغلق کہا جائے گا۔

محمد تغلق کس طرح برسرِ اقتدار آئے؟ اس کا پس منظر یہ ہے کہ علاؤالدین خلجی کے تقریباً بیس سالہ مستحکم دورِ حکومت کے بعد مملکت میں عدم استحکام پیدا ہو گیا۔ علاؤالدین کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے تقریباً چار برس حکومت کی، لیکن وہ مملکت کا نظم و نسق سنبھالنے میں ناکام رہے، آخر ایک شخص خسرو خاں نے مبارک شاہ کو قتل کروا کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں محمد تغلق دہلی میں "امیر آخور" یعنی "سوار فوج کے افسرِ اعلیٰ" تھے اور "جونا خاں" کہلاتے تھے، وہ موقع پا کر دہلی سے فرار ہو گئے اور دیپال پور (ملتان) پہنچ گئے، جہاں ان کے والد غازی ملک (غیاث الدین تغلق) حاکم تھے۔ غازی ملک نے فوج لے کر دہلی پر چڑھائی کر دی، خسرو خاں بھاگ کھڑا ہوا، لیکن گرفتار کر لیا گیا اور اسے سزائے موت دے دی گئی، اس کے بعد غازی ملک کو امراء نے اتفاق رائے سے اپنا حکمراں مان لیا۔ اس طرح ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں غیاث الدین تغلق کے نام سے غازی ملک کی قیادت میں تغلق خاندان کی حکمرانی کی بنیاد پڑی۔

غیاث الدین تغلق نے اپنے بڑے بیٹے جونا خاں کو الغ خاں کا خطاب دیا، یہی اُلغ خان، محمد تغلق کے نام سے مشہور ہیں۔ محمد تغلق کو حکمراں بننے سے قبل ہی مختلف انتظامی اور جنگی منصوبوں کی قیادت کا موقع ملا، ان میں دکن کی مہمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنہ ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء میں بنگال کے مختلف حصوں پر چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی حکمرانی تھی۔ ان راجاؤں نے دہلی کی حکومت سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو غیاث الدین تغلق نے محمد تغلق کو ورنگل سے دہلی بلوا کر دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا۔ خود وہ فوج لے کر بنگال کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ مہم بہت کامیاب رہی اور تمام بغاوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اس مہم سے واپسی پر غیاث الدین تغلق کا محمد تغلق نے دہلی سے باہر افغان پور کے مقام پر شاندار خیر مقدم کیا، لیکن اس خوشی کے موقع پر افسوسناک بات یہ ہوئی کہ غیاث الدین تغلق چوبی محل کی چھت گرنے سے دب کر مع چھوٹے بیٹے کے

Marfat.com

جاں بحق ہو گئے، ان کی وفات کے بعد زمام حکومت محمد تغلق کے ہاتھوں میں آئی۔

محمد تغلق نے جب ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں اقتدار سنبھالا تو منگول سردار ہلاکو خان کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے چین، مشرقی ترکستان، ہرات، قندھار، غزنی، ماوراء النہر (سمر قند و بخارا)، ایران، خراسان، اور عراق پر اپنی اپنی حکومتیں قائم کر رکھی تھیں، شام اور مصر کے علاقوں پر ہلاکو خان کے بیٹے حملے کرتے رہے۔ ہلاکو خان کی نسل میں سب سے پہلے اس کے بیٹے تکودار نے ۶۸۱ھ / ۱۳۸۲ء میں اسلام قبول کیا تھا، لیکن انہیں شہید کر دیا گیا تھا ان کا نام احمد خاں رکھا گیا تھا، احمد خاں کے بھتیجے ارغون خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

ارغون خان کا بیٹا غازان خان ۶۹۴ھ / ۱۲۹۵ء میں مسلمان ہو گیا، لیکن اس نے اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کیا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ در حقیقت عیسائی تھا۔ غازان خان کو شام و مصر میں مسلمانوں کے خلاف مہمات میں شکست ہوئی۔ غازان کے بعد اس کا بھائی الجائتو خدا بندہ بر سر اقتدار آیا۔ اس نے بھی شام اور مصر پر حملہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء میں الجائتو کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو سعید حکمراں بنا۔ اس وقت تک خراسان کے بعض حصوں اور قندھار اور غزنی پر کبک خان چغتائی اور اس کی اولاد کا قبضہ ہو چکا تھا۔ کبک خان چغتائی کے نو مسلم بھائی ترمہ شیریں خان نے غزنی میں فوج جمع کی اور خراسان اور ایران پر حملے کا ارادہ کیا، لیکن ابو سعید کے بہنوئی امیر حسن سلدوز کے بیٹے امیر حسن سلدوز نے غزنی پر حملہ کیا اور ترمہ شیریں خاں کو شکست دی۔

ترمہ شیریں خاں شکست کھا کر ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں محمد تغلق کے پاس دہلی چلا آیا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق ترمہ شیریں خاں فاتح کی حیثیت سے محمد تغلق کے پاس آیا تھا اور محمد تغلق نے خراج ادا کر کے اسے واپس بھیجا تھا، لیکن مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اسے غلط قرار دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ دیا ہے کہ ترمہ شیریں خاں نے دہلی سے واپس جا کر اپنے داماد امیر نوروز کو بہت سے سپاہیوں اور سرداروں کے ساتھ محمد تغلق کی فوج میں شامل ہونے کے لیے بھیج دیا تھا، پھر یہ کہ ترمہ شیریں خاں کی آمد پر محمد تغلق کی فوج کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہونا، ناقابلِ یقین ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں کے مطابق ترمہ شیریں خاں کی دہلی آمد کا مقصد ایران و خراسان کو ہلاکو خان کی اولاد سے نجات دلانے کے لیے مشترکہ کوشش پر محمد تغلق کو آمادہ کرنا تھا اور محمد تغلق اس کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

مولانا اکبر شاہ خان نے لکھا ہے کہ اس بات کے زبردست قرائن موجود ہیں کہ یہ سارا کام امام ابن تیمیہؒ کی تجاویز کے مطابق ہوا تھا، جن کی ترمہ شیریں خان سے خط و کتابت ہو چکی تھی۔ اس بات کے بھی شواہد ہیں کہ ترمہ شیریں خان نے غزنی اور اس کا نواحی علاقہ محمد تغلق کے حوالے کر دیا تھا۔ محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بھی غزنی برصغیر کی مملکت کا حصہ تھا اور ملتان سے غزنی تک کا علاقہ ایک صوبہ دار کے ماتحت رہتا تھا۔

محمد تغلق نے خراسان (ایران) پر فوج کشی کا ارادہ بھی کیا تھا، جہاں ایلخانی حکمراں تھے، اس غرض سے تین لاکھ سے زائد سواروں پر مشتمل فوج بھی تیار کر لی گئی تھی، لیکن پھر خراسان کے حالات درست ہو جانے پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

محمد تغلق کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں شورشوں اور بغاوتوں نے سر اٹھا لیا۔ دکن میں دو آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک حکومت مسلمانوں کی تھی جو ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء میں قائم ہوئی، یہ بہمنی سلطنت کہلاتی تھی جو ۹۳۴ھ / ۱۵۲۷ء تک قائم رہی۔ دوسری حکومت جنوبی ہند کی وجے نگر تھی، جہاں ہندو حکمراں ہو گئے تھے۔ بنگال کا علاقہ دکن سے بھی پہلے یعنی ۷۳۹ھ / ۱۳۳۸ء میں دہلی کی حکومت سے الگ ہو گیا تھا اور وہاں تین حکومتیں مشرقی بنگال، شمالی بنگال اور مغربی بنگال قائم ہو گئی تھیں۔

۷۵۱ھ / ۱۳۵۰ء میں سندھ کے علاقہ میں بھی سرکشی شروع ہو گئی تھی، جسے رفع کرنے کی غرض سے محمد تغلق نے سندھ کا دورہ کیا۔ ٹھٹھہ کے قریب ایک مقام پر انہیں بخار آ گیا، اس دوران محرم کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، محمد تغلق نے بیماری کے باوجود یوم عاشورہ کا روزہ رکھا۔ افطار میں انہوں نے مچھلی تناول کی جس کے باعث مرض اور بڑھ گیا۔ گیارہ دن کی علالت کے بعد ۲۱ محرم ۷۵۲ھ / ۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو انہوں نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا، انہیں دہلی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

محمد تغلق نہایت ذی علم، مختلف فنون میں طاق اور بے حد باصلاحیت انسان تھے، ان کو عربی اور فارسی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا، وہ جب ان زبانوں میں مراسلے تحریر کرتے تو اتنے اچھے الفاظ استعمال کرتے اور ایسا عمدہ ادبی انداز اختیار کرتے کہ زبان و ادب کے

Marfat.com

ماہرین اور انشا پرداز یہ مراسلے پڑھ کر بے حد متاثر ہوتے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، علم تاریخ سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور وہ تاریخ کے ماہر تھے۔ انہیں علم منطق اور معقولات سے بھی لگاؤ تھا۔ محمد تغلق طب، حکمت، نجوم اور ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے، اکثر وہ مرض کی خود تشخیص کرتے اور نسخہ تجویز کرتے، مختلف امراض اور ان کے علاج پر ممتاز طبیبوں سے مباحثے کرتے اور انہیں اپنے موقف کا قائل کر لیتے۔

وہ فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ محمد تغلق کو فارسی کے کلاسیکی ادب، فلسفہ اور ہیئت کا بھی وسیع علم حاصل تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کے خوشنویس بھی تھے۔ ان کے پاس رہنے والوں میں علما، فقہا اور فلسفی شامل تھے، ان سے وہ مختلف مسائل پر بحث کرتے تھے اور کم افراد ایسے تھے جو بحث میں ان سے جیت سکتے تھے۔

محمد تغلق علم کی سرپرستی پر بہت فیاضی سے خرچ کرتے تھے اور علما اور ادبا کو دل کھول کر نوازتے تھے۔ ان کے عہد کے مشہور شاعر بدر چاچ تھے، جن کا تعلق تاشقند سے تھا۔ انہوں نے تیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک شاہ نامہ تصنیف کیا تھا، جو اب ضائع ہو چکا ہے، یہ اشعار محمد تغلق کے کارناموں کے عکاس تھے۔ محمد تغلق نشانہ بازی، شہسواری، چوگان (پولو) اور شکار کے بھی ماہر تھے۔

محمد تغلق بہت عبادت گزار اور شریعت کے پابند انسان تھے، وہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے، جیسے ہی اذان کی آواز بلند ہوتی سارے کام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد بہت سی دعاؤں اور وظائف کا اہتمام کرتے تھے، روزے کبھی ترک نہیں کرتے تھے، تاریخ فرشتہ کے مطابق محمد تغلق نوافل بڑے خشوع و خضوع سے ادا کرتے تھے۔ عیدالاضحی کے موقع پر محمد تغلق خود اپنے ہاتھ میں نیزہ لے کر اونٹ نحر (مسنون طریقے سے اونٹ کو قربان کرنا) کرتے تھے۔

محمد تغلق تمام اخلاقی برائیوں سے دور رہتے تھے، کسی قسم کی نشہ آور اشیا یا حرام چیزوں کے استعمال یا فواحش سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ جب وہ اپنی قیام گاہ (قصر) میں داخل ہوں تو نامحرم خواتین پردے میں چلی جائیں۔ محمد تغلق اپنے بزرگوں خصوصاً والدۂ محترمہ اور اپنے اساتذہ کا بے حد ادب کرتے تھے۔ وہ بہت فیاض اور کھلے دل کے مالک تھے۔ ذاتی زندگی میں وہ نہایت سادگی پسند اور منکسر المزاج تھے، ان کے انکسار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے دیگر حکمرانوں کی طرح برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے کوئی لقب مثلاً نظام الدین، غیاث الدین وغیرہ اختیار نہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا نام محمد ہے اور رُوئے زمین پر اس سے زیادہ محترم نام اور کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے جو سکے رائج کروائے ان پر بھی اپنا نام درج نہیں کروایا، بلکہ آیاتِ قرآنی، کلمۂ طیبہ اور خلفائے راشدین کے نام کندہ کروائے۔

محمد تغلق مملکت کے گوشے گوشے کو اسلام کے نور سے منور کرنے کے خواہش مند تھے، اس غرض سے انہوں نے علما کرام کو خاص طور پر ان علاقوں میں بھیجا جہاں مسلمان بہت کم تعداد میں آباد تھے۔ ان کا یہ فیصلہ ان کی سیاسی بصیرت کا بھی آئینہ دار ہے، کیونکہ جس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی نہ تھی، وہاں سیاسی اقتدار کو مستحکم رکھنا ان کے لیے مشکل تھا، دکن کے علاقے کا مسئلہ بھی یہی تھا۔ علاؤالدین خلجی جیسے طاقتور حکمران بھی دکن کو مملکت کا باقاعدہ حصہ نہ بنا سکے تھے، صرف اس علاقے کے حکمرانوں سے خراج لیا کرتے تھے، لیکن محمد تغلق نے یہ بات محسوس کر لی اور فیصلہ کیا کہ علما کرام اور مشائخ کو بڑی تعداد میں دکن لے جا کر آباد کیا جائے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کی غرض سے انہیں دہلی کی انتظامیہ میں خاصی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ انتظامی امور کے بہت سے ماہرین کو دکن میں دیوگیر کے شہر منتقل کیا گیا، جس کا نام دولت آباد رکھ دیا گیا تھا۔

اس فیصلے سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے، دہلی کے باشندوں کی بڑی تعداد سکونت تبدیل کر کے دولت آباد جانے پر مجبور ہوئی، اس لیے اس فیصلے کے خلاف شدید ردعمل ظاہر ہوا۔ یہ کہا جانے لگا کہ محمد تغلق دارالحکومت دہلی سے دولت آباد منتقل کر رہے ہیں، حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ فوج کی اکثریت، دفاتر، خزانہ سب کچھ دہلی میں تھا، محمد تغلق صرف یہ چاہتے تھے کہ دکن میں اسلام کو پھیلانے اور اسے ایک متمدن اسلامی مرکز بنانے کے لیے بھرپور کوشش کی جائے اور تاریخ نے بعد میں ثابت کیا کہ ان کا یہ فیصلہ درست تھا۔ دکن میں اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ محمد تغلق کا یہی فیصلہ تھا۔ انہوں نے دکن میں جو سکے جاری کیے ان پر "قبۂ دین اسلام" یعنی "دین اسلام کا گنبد" کے الفاظ کندہ کروائے، تاہم چونکہ بہت سے لوگوں کو دولت آباد میں آباد ہونا پسند نہ آیا اس لیے دس سال بعد ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء میں محمد تغلق نے ان لوگوں کو دہلی واپس آنے کی اجازت دے دی۔

Marfat.com

محمد تغلق نے دکن کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی علما کرام کو تبلیغ کے لیے بھیجا، مثلاً خواجہ علاؑالدین اجودھنیؒ کے بیٹے شیخ معزالدینؒ کو گجرات روانہ کیا، البتہ ان کے سپرد انتظامی امور کیے تھے، اس کے علاوہ حضرت خواجہ علاؑالدینؒ کے دوسرے صاحبزادے شیخ علم الدینؒ کو پورے برصغیر کا شیخ الاسلام بنایا تھا۔ بابا فریدؒ کی نواسی کے شوہر خواجہ کریم سمرقندیؒ کو شیخ الاسلام بنا کر ستگاؤں بھیجا تھا۔

محمد تغلق علما کرام کی ہم نشینی پسند کرتے تھے، مؤرخین کے مطابق وہ سفر میں بھی علما کرام کو ساتھ رکھتے تھے، دو سو فقہا ان کے دسترخوان پر روزانہ موجود ہوتے تھے اور وہ اکثر ان سے مختلف موضوعات پر مباحثے کرتے تھے۔ محمد تغلق نے دیگر ملکوں میں مقیم ممتاز علما اور بزرگانِ دین کو دہلی آنے کی دعوت بھی دی۔ انہوں نے سمرقند کے معروف عالم دین حضرت برہان الدین ساغرجیؒ کو چالیس ہزار تنکے (اس زمانے کا سکہ) بطور سفر خرچ ارسال کیے اور ان سے دہلی آنے کی درخواست کی۔ شیراز کے قاضی مولانا مجد الدینؒ کے لیے دس ہزار تنکے ارسال کیے تھے۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مریدوں میں بہت سے بزرگانِ دین، فقہ کے ماہر تھے۔ محمد تغلق ان فقہا سے بہت متاثر تھے اور وہ دیگر اسلامی ممالک سے بھی فقہ کی کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ محمد تغلق کو شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے بہار کے حاکم مجد الملک کو ہدایت کی تھی کہ شیخؒ کے لیے پتھر کی خانقاہ بنائی جائے، محمد تغلق نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھی علم دوست گھرانوں میں کی تھیں۔ ان کے ایک داماد شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

محمد تغلق کا ایک انقلابی اقدام علما کرام کو حکومت میں شریک کرنا ہے، تاہم وہ اس کوشش میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ان پر صوفیا کے نظام میں خلل ڈالنے کے الزامات لگائے گئے اور ان کے خلاف مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن علما کرام کو امورِ مملکت میں شریک کرنے کا ان کا فیصلہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق چلانے کے خواہش مند تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس کام میں علما کرام ان کی مدد کریں۔ علما کرام کے ایک طبقے نے تو ان کی پکار پر لبیک کہا، لیکن بہت سے علما نے ان کی مخالفت کی۔

محمد تغلق نے شرعی احکام کے نفاذ کے سلسلے میں اہم فیصلے کیے۔ ان کے دور میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔ شراب پر سخت پابندی تھی اور اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی تھی، خواہ وہ کتنا ہی بڑا عہدے دار کیوں نہ ہو، اسی طرح جوا اور دیگر فحش کاموں کی بھی سخت ممانعت تھی۔

محمد تغلق نے عالم اسلام کی وحدت اور خلافت کے نظام کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے بھی انقلابی فیصلے کیے۔ وہ برصغیر آنے والے سیاحوں سے خلافتِ عباسیہ کے بارے میں سوال کرتے تھے، جب انہیں علم ہوا کہ مصر میں عباسی خلیفہ موجود ہیں اور خلافت کا سلسلہ جاری ہے، تو انہوں نے اپنے نمائندے کو مصر روانہ کیا۔ ۷۴۵ھ / ۱۳۴۴ء میں حاجی سعید مرمری، مصر سے خلیفہ المستکفی باللہ کی سند، علَم اور خلعت لے کر دہلی پہنچ گئے، گویا برصغیر کی مملکتِ اسلامیہ کا الحاق اب خلافتِ عباسیہ سے ہو چکا تھا۔ اس موقع پر زبردست جشن منایا گیا۔ دہلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ اس کے بعد سے خطبہ میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔ محمد تغلق نے اس کے بعد قرآن پاک سامنے رکھ کر تمام امرا سے از سر نو بیعت لی۔ سکوں پر بھی اب عباسی خلیفہ کا نام لکھا جانے لگا۔ اس کے بعد محمد تغلق نے زکوٰۃ اور عشر کے سوا باقی تمام محصول معاف کر دیے۔

محمد تغلق نے جہاں پوری مملکتِ ہندوستان میں متحدہ سیاسی تصور کو اجاگر کیا، وہیں انہوں نے بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کی کوشش بھی کی۔ چین، مصر، خوارزم، شام، عراق اور ماوراالنہر کے علاقوں سے سیاسی اور ثقافتی روابط استوار کیے، یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی تذکروں اور کتب میں محمد تغلق کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد تغلق کو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

محمد تغلق کا نظم حکومت بڑا مثالی تھا۔ ان کے انتظامات اور نگرانی کا نظام اس قدر سخت تھا کہ اتنی وسیع مملکت کے تمام حسابات بڑی باریک بینی سے تیار ہوتے تھے، جتنی تفصیل کے ساتھ دہلی اور نواحی علاقوں کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیل درج کی جاتی تھی، اتنی ہی تفصیل کے ساتھ بنگال اور دکن کے ایک گاؤں کے کاغذات مرتب ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں قصر ہزار ستون دہلی میں دفتر قائم کیا گیا تھا۔ جتنی سختی کے ساتھ حسابات کی جانچ پڑتال ہوتی تھی، اس کے نتیجے میں چند پیسے کی بھول چوک بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک محکمہ صرف سرکاری

Marfat.com

احکام جاری کرنے اور جوابات وصول کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، اتنی سخت نگرانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری آمدنی میں اضافہ ہوا۔

ضیاالدین برنی کے مطابق انتظامی لحاظ سے پوری مملکت کو ۱۲، اور "مسالک الابصار" کے مطابق ۲۳ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ہر صوبے کا حاکم، "نائب سلطان" کہلاتا تھا۔ محمد تغلق کسی ایک عہدے پر ایک فرد کو طویل مدت کے لیے نہیں رہنے دیتے تھے۔

اراضی کو ہزار اور سو گاؤں کی صورت میں تقسیم کیا گیا تھا، جو "ہزارہ" اور "صدی" کہلاتے تھے، مرکز میں محمد تغلق کے نائب، وزیر اعظم کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے چار معتمد (سیکریٹری) ہوتے، جو "دبیر" کہلاتے تھے، ہر دبیر کے تحت ۳۰۰ منشی ہوتے تھے۔ مالیات کے محکمے میں نہایت احتیاط برتی جاتی تھی۔ حکومت کی جانب سے اگر کسی کو کوئی وظیفہ، انعام یا امدادی رقوم دینے کا فیصلہ ہوتا تو اس کے لیے باقاعدہ خط جاری ہوتا تھا، جس پر کئی افراد کے دستخط کروانے پڑتے تھے۔

محمد تغلق کو اپنی مملکت میں دوبار قحط کے بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلا قحط ۷۳۰ھ / ۱۳۳۰ء میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے آیا۔ مالوہ، دہلی، نواحی علاقوں اور دو آبہ کے درمیانی علاقوں میں شدید قحط پڑا۔ ۷۳۶ھ / ۱۳۳۶ء تک، یعنی سات برس کے عرصے میں صرف ایک بار ۷۳۳ھ / ۱۳۳۳ء میں بارش ہوئی۔ محمد تغلق نے عوام کو قحط کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کیے۔ بنگال اور بہار میں قحط کے اثرات نہ تھے، وہاں اناج وافر مقدار میں دستیاب تھا، محمد تغلق کے حکم پر ان صوبوں سے اناج منگوا کر قحط زدہ علاقوں میں ارزاں نرخوں پر فروخت کیا گیا۔ قحط زدہ عوام میں رقوم اور زرعی آلات تقسیم کیے گئے۔ محتاج خانے قائم ہوئے، ناداروں کو اناج اور کھانا فراہم کرنے کی غرض سے حکومت نے اپنے انتظامات کیے۔ دوسری جانب کاشتکاروں کو امداد دے کر زراعت پر آمادہ کیا گیا۔

قحط شدت اختیار کر گیا تو محمد تغلق نے متاثرین کو دہلی آنے کی ہدایت کی تاکہ غلے کی تقسیم کا کام آسان ہو سکے۔ سندھ، گجرات، دولت آباد (دکن) اور اڑیسہ سے بھی غلہ منگوانا شروع کر دیا۔ ابتدا میں روزانہ فی کس ڈیڑھ رطل (ساڑھے دس چھٹانک) غلہ تقسیم کیا گیا پھر چھ چھ ماہ کا اناج ہر شخص کو دے دیا گیا۔ کسانوں کو مزید رقوم دیں کہ کھیتی باڑی میں لگ جائیں۔ تاکید کی گئی کہ کسان اپنے اپنے علاقے میں آب پاشی کے لیے کنویں کھودیں۔ سرکاری اہلکاروں کو سختی سے ہدایت کی کہ کنوؤں کی کھدائی کے کام کی کڑی نگرانی کریں اور اسے جلد مکمل کروائیں۔

محمد تغلق نے ملک کو قحط کے وبال سے نجات دلانے اور آئندہ کے لیے قحط کی روک تھام کرنے کی غرض سے محکمۂ زراعت قائم کیا جو برصغیر کی تاریخ میں نئی چیز تھی، یہ دیوان امیر کوہی کہلاتا تھا۔ انہوں نے دریاؤں سے نہریں نکالنے کے لیے افسران مقرر کیے کہ وہ اس منصوبے کے لیے جامع تجاویز تیار کریں۔ پنجاب کے حاکم ملک تاتار کو حکم دیا کہ وہ اپنے صوبے میں کنوؤں کے ذریعے آب پاشی کو فروغ دیں۔ ہر ضلع اور تحصیل میں تخمینے تیار کروائے گئے کہ آب پاشی کے ایک کنویں کی کھدائی پر کیا لاگت آئے گی اور کتنا پانی حاصل ہونے کی توقع ہے۔ نہریں کہاں کہاں نکالی جاسکتی ہیں اور کن کن راستوں سے انہیں گزرنا چاہیے۔ کنوؤں کا رواج تو برصغیر میں پہلے سے تھا، لیکن آب پاشی کی غرض سے خاص قسم کے کنویں محمد تغلق ہی کی ایجاد ہیں۔ نہروں کی تعمیر کا منصوبہ محمد تغلق نے بنوایا تھا، لیکن انہیں اس منصوبے پر عملدرآمد کا موقع نہ ملا، ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق نے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچایا۔

سنہ ۷۴۴ھ / ۱۳۴۴ء میں دوبارہ قحط پھوٹ پڑا۔ اس بار قحط کے اثرات بہت وسیع تھے اور پڑوس کا ملک چین تک اس کی لپیٹ میں تھا۔ محمد تغلق نے اپنے سابقہ تجربے کے پیش نظر قحط سے نمٹنے کے لیے اچھے انتظامات کیے۔ انہوں نے امرا اور وزرا کے درمیان مختلف اضلاع کی ذمہ داریاں تقسیم کر دیں۔ ناداروں کی فہرستیں تیار کروائیں۔ حکم دیا کہ ہر صاحب ثروت شخص محتاجوں کی ایک خاص تعداد کو سہارا دے اور انہیں غلہ اور ضروری اشیا فراہم کرے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ پانچ سو محتاجوں کی کفالت میرے ذمے تھی۔ ان کے لیے میں دونوں وقت کھانے کا انتظام کرواتا تھا۔ ان کے لیے ایک بڑا مکان بھی مجھے بنوانا پڑا تھا۔

محمد تغلق ۷۴۴ھ کے وسط میں دورہ کرتے ہوئے پھر دہلی آئے، لیکن قحط کی نازک صورتحال کے پیش نظر قنوج کے قریب گنگا کے کنارے چلے گئے، تاکہ ان کی اور ان کی سپاہ کی موجودگی کی وجہ سے شہر میں غذائی بحران مزید شدت اختیار نہ کر جائے۔ ۷۴۶ھ کے رمضان المبارک اور شوال کے مہینوں میں رحمت خداوندی جوش میں آئی اور

Marfat.com

بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ بارش ہو جانے سے فصلیں بہتر ہونے لگیں اور قحط کے مہیب سائے معدوم ہونے لگے۔

محمد تغلق نے ۷۳۷ھ/۷-۱۳۳۶ء کا پورا سال ملک میں زراعت کو فروغ دینے اور زرعی سرگرمیوں کو مستحکم بنانے پر صرف کیا۔ انہوں نے میان دو آب کے پورے قابل زراعت علاقے کو سو برابر مربعوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک مربع کو ہم ایک ضلع تصور کر سکتے ہیں، ہر مربع کا طول و عرض تیس کوس تھا، ہر مربع میں ایک قابل افسر مقرر کیا گیا۔ ان تمام افسران کو تاکید کی گئی کہ بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنوائیں اور کاشت کروائیں۔ محمد تغلق کے زرعی منصوبے بہت اچھے تھے، تاہم یہ ضرور ہے کہ مستعد اور اہل عملہ نہ ہونے کی وجہ سے ان پر خاطر خواہ عملدرآمد نہ ہو پایا، پھر بھی ان منصوبوں کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ محمد تغلق کے دور میں دہلی کے نواح میں میلوں تک باغات کا سلسلہ تھا۔

محمد تغلق کی فوج دارالحکومت دہلی کے علاوہ دیوگیر، ملتان، کہرام، سمانہ، سیوستان، اُچ، ہانسی، سرستی، معبر، گجرات، بداؤں، قنوج، لکھنوتی، بہار، مالوہ، لاہور وغیرہ میں تعینات رہتی تھی۔ لشکر کا اعلیٰ ترین عہدیدار "خان" کہلاتا تھا، اس کے بعد ملک پھر امیر اور اس کے بعد سپہ سالار کے عہدے تھے۔ خان کو کوئی نہ کوئی لقب دیا جاتا تھا، مثلاً قتلغ خان، اُلغ خان وغیرہ۔

لڑائی میں ہاتھی سب سے اہم جانور سمجھا جاتا تھا۔ فوج میں تین ہزار سدھے ہوئے ہاتھی تھے، اس وقت تک توپوں کا رواج تو نہ تھا، لیکن آتشیں گولے، آتشیں تیر اور منجنیق کا استعمال ہوتا تھا۔ ہاتھیوں پر برجوں سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے تھے، ان برجوں میں سوراخ ہوتے تھے، جن کے ذریعے نشانے لگائے جاتے تھے، ہودجوں میں روغن نفط ہوتا تھا جو شیشے کی نلکیوں کے ذریعہ دشمن کے دستوں پر اچھالا جاتا تھا۔ اس سے آگ لگ جاتی تھی۔

محمد تغلق نے اپنے دور میں پرانی دہلی، کیلوکھری، سری اور تغلق آباد کو ملا کر ان کے چاروں طرف فصیل بنوانے کی کوشش کی، لیکن اس میں خرچ زیادہ تھا، چنانچہ انہوں نے قریب ہی ایک نیا شہر "جہاں پناہ" کے نام سے آباد کیا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "اس شہر کی فصیل دنیا بھر میں بے نظیر ہے۔ اس کی چوڑائی گیارہ ہاتھ ہے۔ اس میں کوٹھڑیاں اور مکانات بنے ہوئے ہیں، جن میں محافظ رہتے ہیں۔ غلے کے کھتے بھی ہیں جنہیں "انبار" کہتے ہیں۔ لڑائی کے لیے ہتھیار بھی ان ہی گوداموں میں رکھے جاتے ہیں۔ ان گوداموں میں غلہ ہر آفت سے محفوظ رہتا ہے، فصیل کا نچلا حصہ پتھر کا ہے اور اوپر سے پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس پر بہت سارے برج ہیں۔ شہر کے ۲۸ دروازے ہیں۔"

محمد تغلق نے ۷۴۴ھ/۱۳۴۳ء میں ایک قلعہ بنوایا تھا جس کا نام خُرّم آباد رکھا گیا تھا۔ اب یہ بالکل ویران ہے، اس کے آثار تغلق آباد میں ملتے ہیں۔ تغلق آباد کی تین اطراف بارہ میل تک پھولوں اور پھلوں کے باغات تھے۔ محمد تغلق نے دکن میں دیوگیر کو جب وسعت دے کر اس کا نام دولت آباد رکھا تو وہاں بھی بہت شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں، دہلی سے دیوگیر تک دورویہ درخت لگوائے۔ محمد تغلق نے اودھ کے ضلع فرخ آباد میں ایک شہر آباد کیا اس کا نام "سرگ دواری" (جنت کا دروازہ) رکھا۔ محمد تغلق نے اپنے عہد میں کئی مشہور بزرگانِ دین کے مزار بھی تعمیر کروائے جن میں بدایوں میں میراں ملہمؒ، دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاؒ، ملتان میں شیخ بہاالدین ملتانیؒ اور اجودھن میں شیخ علاالدینؒ کے مزار شامل ہیں۔

محمد تغلق نے اپنے عہد میں ڈاک اور خبر رسانی کے نظام کو بھی ترقی دی۔ ابن بطوطہ نے اس دور میں خاصا عرصہ برصغیر میں گزارا۔ انہوں نے محمد تغلق کے قائم کردہ ڈاک کے نظام کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "سیوستان (اب سیہون) سے ملتان دس دن کا راستہ ہے، ملتان سے دہلی پچاس دن کا، لیکن جو خبر، اخبار نویس سربراہ مملکت کو بھیجتے ہیں وہ صرف پانچ دن میں ان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ گھوڑے کی ڈاک کو "الاق" کہتے ہیں۔ ہر چار کوس میں گھوڑا بدلا جاتا ہے۔

"پیدل ڈاک کا نظام یہ ہے کہ ایک میل میں جسے "کروہ" کہتے ہیں، ہرکاروں کی تین چوکیاں بنی ہوتی ہیں۔ اس چوکی کو "دھاوہ" کہتے ہیں۔ ہر تہائی میل پر ایک گاؤں ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر، ہرکارے کے لیے برجی بنی ہوتی ہے۔ ہر ہرکارے کے پاس دو گز لمبی چھڑی ہوتی ہے، جس کے سر پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوتے ہیں۔ جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا اور دوسرے میں چھڑی لے کر پوری طاقت خرچ کر کے دوڑتا ہے۔ اس طرح اس کے گھنگرو کی آواز سن کر دوسرا ہرکارہ تیار ہو جاتا ہے۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے بھی جلد جاتی ہے۔"

تاریخ مبارک شاہی کے مطابق ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں محمد تغلق

Marfat.com

دیوگیر (دکن) سے روانہ ہوئے تو انہوں نے دہلی سے دیوگیر تک ہر میل پر دھاوے (چوکیاں) بنوائیں، ان کے لیے جاگیریں بھی مقرر تھیں۔ ہر منزل پر ایک قیام گاہ اور عبادت گاہ ہوتی تھی، یہاں ایک شیخ مقیم رہتے، یہاں ٹھہرنے والے ہر کاروں یا مسافروں کے کھانے پینے کا انتظام وہی کرتے تھے۔ ابنِ بطوطہ کے ہم عصر شہاب الدین دمشقی نے "مسالک الابصار" میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ہر چند میل پر ایک نقارہ خانہ ہوتا تھا، جس میں نقارچی ہر وقت بیٹھا رہتا تھا۔ جب ایک جگہ سے نقارہ بجنے کی آواز آتی تو وہ اس آواز کو بغور سن کر ویسی ہی آواز میں نقارہ بجاتا، تاکہ اگلی منزل پر موجود نقارچی اس آواز کو سن لے اور وہ بھی اسی طرح کا نقارہ بجائے، دراصل یہ خاص قسم کے اشارے (سگنل) تھے۔ مختلف اقسام کی اطلاعات بھیجنے کے لیے مختلف اشارے مقرر تھے۔ مثلاً دہلی اور دولت آباد کی فصیل کے دروازے کھلنے کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص انداز میں نقارہ بجایا جاتا تھا۔ اسی طرح جنگ و فتح، دشمنوں کے حملے، امداد کی درخواست، بغاوت، قتل، ڈاکہ، شادی، موت، ولی عہد کی ولادت، غرض مختلف واقعات کے لیے مختلف آواز اور مخصوص انداز سے نقارہ بجایا جاتا تھا۔

خبر رسانی کا نظام اس وسیع و عریض مملکت کے حالات اور واقعات سے باخبر رکھنے میں بھی بہت مددگار تھا۔ محمد تغلق کے مقرر کردہ ہزاروں اہلکار مملکت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ حکام اور عوام کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ سرگرمیوں سے محمد تغلق کو آگاہ رکھتے تھے۔

محمد تغلق غیر مسلموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ مؤرخ عصامی اور ابنِ بطوطہ کے مطابق محمد تغلق ہندو جوگیوں سے ملتے رہتے تھے، انہیں سنسکرت زبان سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شعرا موجود رہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں ہندی شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ جب انہوں نے لڑائیوں میں حصہ لیا تو مندروں کو مسمار کرنے سے گریز کیا۔ ہندو مصنفین کی کتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو ان کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے، مثلاً چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی ودیاپتی ٹھاکر کی مشہور کتاب "پرس پرشکا" میں محمد تغلق کا ذکر تعریفی انداز میں کیا گیا ہے۔ محمد تغلق نے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوؤں کو بھی مقرر کیا۔ صوبہ سندھ کی حکومت، ایک ہندو عہدیدار رتن کے سپرد کی تھی۔ اسی طرح دولت آباد کا نائب وزیر بھی ایک ہندو شخص دھارادھر کو بنایا تھا۔ محمد تغلق نے ستی کی رسم (شوہر کی موت پر بیوی کی لاش کے ساتھ جل مرنا) پر پابندی لگادی تھی۔

محمد تغلق نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے مثالی اقدامات کیے۔ تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے انہوں نے مدارس میں ہزاروں فقہا مقرر کیے، انہیں حکومت سے تنخواہ ملتی تھی، صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں بھی بڑی تعداد میں تھیں۔ محمد تغلق کے دور میں عوام کو اچھی طبی سہولتیں بھی مہیا کی گئیں۔ صرف دہلی میں ستر شفا خانے کام کر رہے تھے۔ محمد تغلق خود بھی ایک اچھے طبیب تھے، ان کے دور میں گداگری اور بھیک مانگنے پر پابندی تھی، البتہ محتاجوں اور مساکین کی امداد حکومت کی جانب سے کی جاتی تھی۔ حکومت بازاروں میں چیزوں کے نرخوں پر کڑی نظر رکھتی تھی، تاکہ عوام کو مناسب داموں پر اشیائے صَرف دستیاب ہوتی رہیں۔ دہلی کے سرکاری کارخانے میں چار ہزر پارچہ باف، ریشم اور دیگر کپڑے تیار کرتے تھے، محمد تغلق سال میں دو بار دو لاکھ خلعتیں (لباس) تقسیم کرتے تھے۔ محمد تغلق نے اپنے دور میں سونے اور چاندی کے سکوں کی جگہ پیتل کے سکے چلانے کی کوشش کی لیکن یہ تجربہ کامیاب نہ رہا۔

محمد تغلق کے دور میں عدل و انصاف کا نظام بہت عمدہ تھا۔ مقدمات کی سماعت کے لیے "دیوانِ سیاست" موجود تھا۔ مخصوص فقہا کو مقدمات کے فیصلے سنانے پر مامور کیا گیا تھا۔ اس محکمے میں دو قسم کے اہم عہدیدار تھے۔ "مفتی" جو فتویٰ دیتے تھے اور "مستفحص" جو معاملے کی تحقیقات کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انتظامی عہدے دار اور محرر بھی تھے، جو "امیر" اور "متصرف" کہلاتے تھے۔ ابن بطوطہ کے مطابق محمد تغلق ہر پیر اور جمعرات کو خود بھی عوام کی شکایات سنتے تھے۔ ان تک رسائی مشکل نہ تھی، ان سے شکایت بڑی موثر ثابت ہوتی تھی۔ محمد تغلق نے نظام انصاف کو موثر بنانے کے لیے ایک عہدہ "میر داد" کے نام سے قائم کیا تھا۔ میر داد کا کام یہ تھا کہ جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا جائے اسے لاکر عدالت میں پیش کرے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عہدیدار ہو۔

تمام قاضیوں کے سربراہ "قاضی القضاۃ" (چیف جسٹس) کہلاتے تھے، ان کو بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی، تمام شرعی امور کا انتظام ان کے سپرد تھا، مقامی قاضیوں کو وہی مقرر کرتے تھے۔ محمد تغلق قاضی

Marfat.com

کا بہت احترام کرتے تھے، اگر خود محمد تغلق کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کرتا تو عام آدمی کی طرح عدالت میں حاضر ہوتے تھے، قاضی کو ہدایت تھی کہ وہ انہیں دیکھ کر کھڑے نہ ہوں۔ اگر عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف ہوتا تب بھی وہ فیصلے کا بے حد احترام کرتے تھے اور سزا پر اصرار کرتے تھے، ایک اہم عہدہ محتسب کا تھا جو شرعی احکام پر عملدرآمد کی نگرانی کرتا تھا۔

محمد تغلق نے مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کو قاضی القضاۃ مقرر کیا تھا۔ ابنِ بطوطہ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں امام مالکؒ کے مسلک کا تابع ہوں اور اہل ہند حنفی مسلک کی پیروی کرتے ہیں، لیکن محمد تغلق نے کہا کہ میں نے بہاالدین ملتانیؒ اور کمال الدین بجنوریؒ کو آپ کا نائب مقرر کردیا ہے۔ ۷۴۳ھ / ۱۳۴۲ء میں محمد تغلق نے ابنِ بطوطہ کو چین میں سفیر مقرر کردیا تھا، لیکن وہ چین نہیں جاسکے۔

محمد تغلق کی سخت گیری اور ان کی جانب سے سزاؤں کے نفاذ پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ فیصلہ کرنے میں کبھی ان سے غلطی بھی ہوئی ہو، لیکن ان کا معمول ہمیشہ یہ رہا کہ فیصلہ کرنے سے قبل وہ فقہا اور مفتیوں سے مشورہ ضرور کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ آپ سوچ سمجھ کر رائے دیں۔ اس کے بعد وہ ان فقہا سے بحث کرتے تھے، اگر بحث میں وہ فقہا کو قائل کرلیتے تو اپنی رائے پر اصرار کرتے تھے۔ فیصلہ ہوجانے کے بعد اس پر عملدرآمد میں دیر نہیں لگائی جاتی تھی۔ سزا پانے والے مجرم کو چاہے آدھی رات کا وقت ہو، سزا دے دی جاتی تھی اور رہائی پانے والے فرد کو جس وقت فیصلہ ہوتا اسی وقت رہا کردیا جاتا تھا۔

محمد تغلق کو بعض مؤرخین نے سزاؤں کے نفاذ کے سلسلے میں انتہا پسند یا مغلوب الغضب قرار دیا ہے، لیکن انہی کے دور میں لکھی گئی شمس سراج عفیف کی کتاب تاریخ فیروز شاہی اور شہاب الدین دمشقی کی کتاب مسالک الابصار میں محمد تغلق کے کسی ظلم و ستم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ خود ابنِ بطوطہ جو محمد تغلق کے دور میں قاضی القضاۃ رہے، انہوں نے محمد تغلق کے بارے میں لکھا ہے: "ان کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔" تاہم یہ درست ہے کہ محمد تغلق احکام کے نفاذ میں سخت گیر تھے، لیکن ان کی سخت گیری وقت اور حالات کا تقاضا تھی۔

ایک موقع پر محمد تغلق نے مشہور مورخ ضیاالدین برنی سے کہا: "باغیوں، نافرمانوں اور مخالفوں کا علاج صرف تلوار ہے، میں تو سزا اس لیے دیتا ہوں اور تلوار اس لیے استعمال کرتا ہوں کہ اس کے ڈر سے ساری خرابیاں دور ہوجائیں گی۔" انہوں نے یہ بھی کہا کہ "اگر مملکت کا حال بہتر اور اس طرح ہوجائے جیسا کہ میں چاہتا ہوں تو میں حکومت تین آدمیوں یعنی ولی عہد فیروز، ملک کبیر اور احمد ایاز کے سپرد کرکے خانۂ کعبہ چلا جاؤں۔"

•••

Marfat.com

فیروز شاہ تغلق

تغلق خاندان کے تیسرے فرمانروا جن کا دور فلاحِ عامہ کے لحاظ سے مثالی ہے

لڑائی کئی دنوں سے جاری تھی۔

ایک فریق شہر کی فصیل کے اندر محصور تھا اور دوسرا فریق شہر کی فصیل کے باہر مورچہ بند تھا۔ روزانہ شہر پر یلغار کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن فصیل مضبوط تھی۔ پھر شہر کے اندر موجود فوج جوابی کارروائی کر کے حملہ آور کو پیچھے دھکیل دیتی۔

ایک دن فصیل کا برج گر پڑا۔ دراصل برج پہلے ہی کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ اس پر محافظوں کی بڑی تعداد چڑھ گئی تھی، برج اتنے آدمیوں کا وزن نہ سہار سکا اور گر پڑا۔

موقع بہت اچھا تھا۔ حملہ آور فوج اب بڑی آسانی سے شہر میں داخل ہو سکتی تھی کیونکہ برج کے ٹوٹنے کی وجہ سے بڑا شگاف پیدا ہو گیا تھا۔

حملہ آور فوج کے بڑے افسران فوراً فوج کے سپہ سالار کے پاس پہنچے اور شہر پر بھرپور حملے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے میدانِ جنگ کی تازہ ترین صورتحال اور شہر میں داخل ہونے کے لیے موزوں ترین موقع سے بھی سپہ سالار کو آگاہ کیا۔

سپہ سالار تمام صورتحال سے باخبر تھے۔ وہ چاہتے تو اسی وقت حملے کا حکم دے سکتے تھے لیکن انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"ذرا ٹھہر جاؤ۔ اگر ہماری فوج شہر کے اندر اچانک داخل ہو گی تو زیادہ خونریزی ہو گی، بھگدڑ مچے گی، خواتین کی بے پردگی ہو گی، شہریوں کو پریشانی ہو گی۔" افسران یہ بات سن کو لوٹ گئے۔

چند ہی دن بعد شہر میں اناج کے ذخائر ختم ہو گئے۔ محاصرہ سخت تھا۔ باہر سے رسد نہ آ سکتی تھی۔ شہر میں محصور فوج کے سالار نے اطاعت کا پیغام بھیج دیا۔ چند شرائط پر اطاعت کا یہ پیغام منظور کر لیا گیا۔

فصیلِ شہر کے دروازے کھل چکے تھے۔ کسی بڑی خونریزی کے بغیر شہر فتح ہو چکا تھا اور سرکش حکمراں نے اطاعت اختیار کر لی تھی۔

حملہ آور فوج کے نیک دل اور دور اندیش سپہ سالار تھے برصغیر پاک و ہند میں تغلق خاندان کے تیسرے فرمانروا فیروز شاہ تغلق، جنہوں نے اکدالہ (بنگال) کے محاصرے کے دوران اکدالہ اور اس کے شہریوں کو خونریزی اور تباہی سے بچا لیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کا چالیس سالہ عہدِ حکومت، فلاحِ عامہ کے کاموں کے لحاظ سے مثالی دور ہے۔

فیروز شاہ تغلق ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رجب تھا۔ رجب، برصغیر میں تغلق خاندان کے پہلے فرمانروا غیاث الدین تغلق کے بھائی تھے۔

فیروز شاہ کی عمر سات برس کی ہوئی تو ان کے والد انتقال کر گئے۔ غیاث الدین تغلق نے انہیں اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ انہیں اچھی تعلیم دلوائی اور امورِ مملکت کے پیچ و خم سے آگاہ کیا۔ جب غیاث الدین تغلق برصغیر کے حکمراں بنے تو فیروز شاہ کی عمر ۱۴ برس تھی۔ غیاث الدین تغلق نے کئی برس تک مختلف علاقوں کے دوروں میں فیروز شاہ کو اپنے ساتھ رکھا۔ غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے محمد تغلق برسرِ اقتدار آئے۔ اس وقت فیروز شاہ ۱۸ برس کے تھے۔ محمد تغلق نے فیروز شاہ کو امیر نائب مقرر کیا اور نائب باربک کا خطاب دیا۔ بارہ ہزار سواروں کا افسر بنایا۔ محمد تغلق کو فیروز شاہ سے بہت محبت تھی اور وہ انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔

۲۱ محرم ۷۵۲ھ/۲۰ مارچ ۱۳۵۱ء کو محمد تغلق ٹھٹھہ کی مہم کے دوران بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد شورشیں ہونے لگیں۔ امراء نے اتفاقِ رائے سے فیروز شاہ کو ملک کا فرمانروا بنا دیا۔ فیروز

Marfat.com

شاہ حکمراں بننے کے خواہش مند نہ تھے۔ وہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن امرا کے مسلسل اصرار کے آگے وہ بے بس ہو گئے۔ ۲۴ محرم ۷۵۲ھ / ۲۳ مارچ ۱۳۵۱ء کو فیروز شاہ نے مملکت کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

فیروز شاہ کی طبیعت میں سخت گیری کا عنصر نہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں حکومت قدرے سست گئی اور دکن کے علاقوں میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں تاہم انہوں نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔

سنہ ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء میں فیروز شاہ کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد منگولوں نے دریائے سندھ کے کنارے فوج کشی کی۔ فیروز شاہ کی ہدایت پر منگولوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ منگول پسپا ہو کر اپنے ملک واپس چلے گئے۔

فیروز شاہ کے ابتدائی دور حکومت میں لکھنوتی (بنگال) کے حاکم الیاس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ترہٹ پر فوج کشی کی اور رعایا کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ فیروز شاہ نے فوجی تیاری کی۔ ۱۰ شوال ۷۵۴ھ / ۸ نومبر ۱۳۵۳ء کو وہ فوج لے کر لکھنوتی کی سمت روانہ ہو گئے۔ زبردست لڑائی ہوئی جس کے بعد الیاس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

الیاس نے ۷۶۰ھ / ۱۳۵۹ء میں پھر سرکشی کی اور لکھنوتی کے پورے علاقے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ فیروز شاہ پھر اسی ہزار کی فوج لے کر لکھنوتی روانہ ہوئے۔ اس دوران الیاس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا سکندر حکمراں بن گیا۔ سکندر نے صلح کر لی۔ اس واقعہ کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا ہے۔

فیروز شاہ کو اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ ان کے پیشرو محمد تغلق کی یہ آرزو ناتمام رہی کہ وہ ٹھٹھہ فتح کر لیں۔ اس بات کا اظہار فیروز شاہ بار بار کیا کرتے تھے۔ آخر انہوں نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ فوج ٹھٹھہ کی طرف چلی۔ اس زمانے میں یہاں جام اور بانہبینہ اور اس کا بھتیجا حکمراں تھے۔ ٹھٹھہ کے قریب جنگ ہوئی۔ آخر جام اور بانہبینہ نے اطاعت پر آمادگی ظاہر کر دی۔ فیروز شاہ نے ٹھٹھہ میں بانہبینہ کے بھائی تماچی کو حاکم بنا دیا۔

فیروز شاہ نے دیگر مہمات میں نگر کوٹ اور جاج نگر کو بھی مطیع بنایا۔ انہوں نے دکن کو تسخیر کرنے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ جب ان کے ماتحتوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ دکن پر حملہ کریں تو ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں اسلام کا نام لینے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں پر جنگ مسلط نہیں کروں گا۔ تاہم فیروز شاہ مفسدوں کے لیے سخت تھے۔ ایک بار سیکڑوں مسلح ملحدوں نے جامع مسجد میں داخل ہو کر نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ فیروز شاہ نے ان ملحدوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ فیروز شاہ کو حالانکہ سزائے موت دینا بالکل پسند نہ تھا لیکن جب ان کے ایک قریبی عزیز پر قتل کا الزام ثابت ہو گیا تو انہوں نے اپنے عزیز کو سزائے موت دلوانے میں ہرگز دیر نہیں لگائی۔

فیروز شاہ تغلق نے بھی اپنے پیشرو کی طرح خلافت عباسیہ سے سند حاصل کی۔ ذی الحجہ ۷۵۷ھ / دسمبر ۱۳۵۶ء میں عید الاضحیٰ کے دن مصر سے انہیں خلیفہ الحاکم بامر اللہ کی طرف سے خلعت اور حکومت کا فرمان پہنچا۔ فیروز شاہ نے جو سکے جاری کیے ان پر فیروز شاہ کے ساتھ عباسی خلیفہ کا نام بھی درج ہوتا تھا۔ خطبوں میں بھی عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ سے قبل جو خطبے پڑھے جاتے تھے ان میں ماضی کے حکمرانوں کا تذکرہ نہیں کیا جاتا تھا۔ فیروز شاہ نے حکم دیا کہ شہاب الدین غوری سے لے کر ان کے دور تک کے تمام حکمرانوں کے نام لیے جائیں، یعنی ان حکمرانوں کے نام بھی جنہیں عباسی خلیفہ سے سند نہیں ملی تھی۔

فیروز شاہ تغلق نے اسلام کا پیغام عام کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان ہو جانے والوں کو جزیہ (ایک محصول) سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ فیروز شاہ نے کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، لیکن ان کے اخلاق اور اچھے سلوک سے متاثر ہو کر بہت سے افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ فیروز شاہ نے غیر مسلموں سے کسی قسم کے تعصب کا برتاؤ نہیں کیا۔ ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد ان کی حکومت میں کام کر رہے تھے۔

فیروز شاہ تغلق نے علم کی سرپرستی کے لیے اہم اقدامات کیے۔ وہ برصغیر کے حکمرانوں میں غالباً پہلے حکمراں ہیں جنہوں نے صنعت و حرفت کی تعلیم کا مستقل نظام قائم کیا۔ اس کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ انہوں نے منتخب غلاموں کو طلب کیا۔ ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں کا انتخاب کیا گیا۔ مختلف شہروں میں ان کے قیام کے انتظامات کیے گئے اور پھر انہیں ان شہروں میں بھیج دیا گیا۔ مختلف غلاموں کو مختلف ذمہ داریاں دی گئیں۔ بعض نے قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ

Marfat.com

دینی علوم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ کسی نے کسی خاص فن یا ہنر میں مہارت پیدا کرلی۔ رفتہ رفتہ غلاموں کی تربیت کا خاص محکمہ قائم ہوگیا۔ اس محکمے نے اتنی وسعت اختیار کرلی کہ یہ تربیت یافتہ افراد مہیا کرنے کا ادارہ بن گیا۔ حکومت کی اہم ذمہ داریوں کو انجام دینے کی غرض سے قابل افراد اسی محکمہ کی جانب سے فراہم کیے جاتے تھے۔

فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں فیروز آباد شہر میں مدرسہ فیروز شاہی قائم کیا۔ یہ ایک بہترین مدرسہ تھا۔ اس کی عمارت بھی بہت خوبصورت تھی۔ ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں فیروز شاہ تغلق نے اپنے بیٹے فتح خان کی وفات پر اس کے مقبرے کے ساتھ ایصالِ ثواب کے طور پر ایک اور مدرسہ قائم کیا۔

مدرسہ فیروز شاہی میں دو بڑے علما تعلیم دیتے تھے۔ ایک مولانا جلال الدین رومی (یہ وہ مولانا روم نہیں ہیں جن کی مثنویاں مشہور ہیں) جو تفسیر، حدیث اور فقہ کے جید عالم تھے۔ دوسرے ایک سمرقندی فاضل تھے۔ یہ مدرسہ وسیع دارالعلوم تھا۔ مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت، فیروز شاہ تغلق نے اپنے پیشرو حکمران علاؤالدین خلجی کے بنوائے ہوئے تالاب کے بند پر تعمیر کروائی تھی۔ یہ عمارت ایک وسیع میدان میں اونچے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور اس کے کئی گنبد تھے۔

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں علما اور مشائخ کی تنخواہوں اور وظائف پر ماہانہ ۳۶ لاکھ ٹنکے (اس دور کا سکہ) خرچ کیے جاتے تھے۔ ان کے دور میں متعدد مدرسے قائم کیے گئے۔ "جامع التواریخ" کے مطابق ان مدرسوں کی تعداد چالیس اور "مآثر رحیمی" کے مطابق پچاس ہے۔ فیروز شاہ نے قدیم مدارس کی عمارتوں کی مرمت بھی کروائی۔ مثلاً التتمش کے مدرسے کو اپنی اصلی حالت کے مطابق دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

دہلی میں فیروز شاہ تغلق نے ایک اور عمارت 'بالا بند سیری' کے نام سے تعمیر کروائی تھی۔ یہاں بھی ایک عظیم درسگاہ قائم کی گئی۔ ایک بڑے عالم مولانا نجم الملت والدین سمرقندی یہاں تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ درس گاہ میں اقامت گاہ بھی تھی۔

فیروز شاہ بھی صاحب علم شخصیت تھے۔ وہ ایک قابل فقیہ، علم الابدان کے ماہر اور کامیاب طبیب تھے۔ انہوں نے طب پر ایک کتاب "طب فیروز شاہی" کے نام سے لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی سوانح عمری "فتوحاتِ فیروز شاہی" کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب کی عبارت کو پہلے جامع مسجد کے ایک مینار پر کندہ کر دیا گیا تھا بعد میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ کر لیا گیا۔ فیروز شاہ کو علم ہیئت سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک رصد گاہ تعمیر کروائی۔ رصدی آلات میں اصلاح کی اور نئی زیچ (ستاروں کی فہرست) مرتب کروائی۔ انہوں نے علم ہیئت پر تحقیق کی غرض سے بعض ماہرین کو بیرونِ ملک سے بلوایا۔ ان کے حکم پر حکیم حسن گیلانی، سید محمد گازرونی اور چند دیگر علما ہیئت کے علم پر تحقیق میں مصروف ہوئے لیکن حکیم حسن کے انتقال اور چند دیگر وجوہ کی بنا پر یہ کام جاری نہ رہ سکا۔

اسی دور میں ایک کتاب "سیرت فیروز شاہی" کے نام سے ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں فیروز شاہ کے عہد کی تاریخ کے ساتھ فیروز شاہ کے کردار، ان کی اصلاحات اور تعمیراتی سرگرمیوں پر بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "فقۂ فیروز شاہی" کے عنوان سے مرتب ہوئی۔ یہ قوانین کا خلاصہ ہے جسے یعقوب کرامی نے مرتب کیا اور فیروز شاہ کی نگرانی میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ اس میں انتظامی اور دیگر اہم مسائل پر شرعی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی زمانے میں طبیعیات کی ایک کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام "کتابِ فیروز شاہی" رکھا گیا۔ مشہور مورخین شمس سراج عفیف اور ضیاالدین برنی فیروز شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ فیروز شاہ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اسی دور میں "تاریخ فیروز شاہی" لکھی گئی۔ دو تواریخ ایک ہی نام سے ہیں۔ شمس سراج عفیف اور ضیاء الدین برنی دونوں نے "تاریخ فیروز شاہی" کے عنوان سے الگ الگ کتابیں لکھیں۔

فیروز شاہ تغلق نے تراجم کا ایک باقاعدہ شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کی ہدایت پر ہندی اور سنسکرت کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ ایک شاعر عزالدین خالد خانی نے فلسفہ، نجوم اور الٰہیات پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا جس کا نام "دلائل فیروز شاہی" رکھا گیا۔ فیروز شاہ کی فرمائش پر سنسکرت میں علم نجوم پر لکھی گئی ایک اور کتاب "برہم سمستھیا" کا فارسی میں ترجمہ شمس سراج عفیف نے کیا۔ جب فیروز شاہ نگر کوٹ گئے تو انہوں نے وہاں سیکڑوں کتابیں دیکھیں۔ انہوں نے برہمنوں کو حکم دیا کہ ان کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ فیروز شاہ کے عہد کے بڑے شعرا کرام میں امیر خسرو کے صاحب زادے ملک احمد نمایاں ہیں جو بہت اچھے نقاد بھی تھے۔ مولانا مظہر کڑہ اور قاضی عابد بھی اچھے شاعر تھے۔

اسی دور میں ایک گھڑی ایجاد کی گئی۔ اس گھڑی سے ہر گھنٹہ مکمل

Marfat.com

ہونے پر ایک آواز سنائی دیتی تھی جو ترنم کے ساتھ ایک شعر پڑھتی تھی۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"بادشاہ کے دروازے پر ہر گھنٹے جو گھڑیال بجاتے ہیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہو گیا۔"

فیروز شاہ ہی کے زمانے میں ایک اور گھڑی ایجاد کی گئی جو نماز کے اوقات، روزہ کھولنے کا وقت اور بعض دیگر اوقات کی نشاندہی کرتی تھی۔ اس گھڑی کو فیروز آباد میں نصب کیا گیا۔ یہ گھڑی بہت مشہور ہوئی۔ فیروز شاہ نے کئی نئے شہر آباد کیے اور پرانے شہروں کو نئی آب و تاب دی۔ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء میں انہوں نے دہلی کے نزدیک دریائے جمنا کے کنارے ایک عظیم شہر "فیروز آباد" کے نام سے تعمیر کروایا۔ اس کے علاوہ جونپور، فتح آباد، حصار فیروزہ اور بدایوں کے قریب فیروز پور بھی بسائے۔ بنگال کی مہموں کے دوران میں انہوں نے اکدالہ کا نام آزاد پور اور پانڈو کا نام فیروز آباد رکھ دیا۔ انہوں نے نگر کوٹ کا نام محمد تغلق کے نام پر محمد آباد کر دیا تھا۔

فیروز آباد شہر پانچ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر کو بسانے کے لیے اٹھارہ گاؤں کی زمینیں حاصل کی گئیں۔ دہلی سے اس شہر کا فاصلہ پانچ کوس تھا۔ دہلی آنے جانے کے لیے سواریاں ہر وقت دستیاب رہتی تھیں۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور گوہانہ کو بھی آباد کیا۔ انہوں نے شہر حصار فیروزہ میں کثرت سے باغات لگوائے۔ حصار فیروزہ دہلی کے قریب اس جگہ واقع ہے جہاں دو بڑے گاؤں آباد تھے۔ ایک راس بزرگ اور دوسرا راس کو چک کہلاتا تھا۔ فیروز کو راس بزرگ کا علاقہ پسند آیا۔ یہاں پانی کی بہت قلت تھی۔ موسم گرما میں خراسان سے آنے والے تاجروں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ پھر بھی فیروز شاہ نے شہر کی تعمیر کا حکم دے دیا۔ چند سال بعد شہر تعمیر ہو گیا۔ فیروز شاہ نے شہر کے گرد خندق کھدوائی۔ اسی کی مٹی سے شہر کے گرد دمدمہ بنوایا۔ حصار کے اندر گہرا تالاب بنوایا۔ فیروز شاہ کے دور میں تعمیرات کے محکمے کا سربراہ "میر عمارت" کہلاتا تھا۔ سنگ تراشوں، ترخانوں (بڑھئی)، لوہاروں وغیرہ پر الگ الگ عہدیدار مقرر کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کا محیط چالیس میل کا تھا۔

فیروز شاہ نے اپنے دور میں متعدد قلعے بھی تعمیر کروائے۔ ان میں دریائے جمنا کے کنارے حصار فیروزہ، ہانسی اور سرستی کے درمیان فتح آباد کا حصار اور بھٹنیر کی حدود میں واقع حصار فیروز آباد قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے کئی پرانی عمارتوں کو اس طرح از سر نو تعمیر کروایا کہ وہ بالکل نئی محسوس ہونے لگیں۔ دہلی میں شہاب الدین غوری کی تعمیر کردہ جامع مسجد شکستہ حالت میں تھی۔ شہاب الدین غوری کا مقبرہ ایک جانب سے منہدم ہو رہا تھا۔ فیروز شاہ نے ان عمارتوں کی تعمیر اور دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دی۔ مقبرے کی محرابوں اور دروازوں پر صندل سے کام کروایا۔ انہوں نے التتمش کے مدرسے کو بھی از سر نو تعمیر کروایا۔ اسی طرح التتمش کے بیٹوں معزالدین اور رکن الدین کے مقبروں کو دوبارہ بنوایا۔ سلطان قطب الدین اور علاؤالدین کے بیٹوں اور پوتوں کے متعدد مقبروں کی از سر نو تعمیر کروائی۔ ان کے اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ماضی کی عمارتوں کو کھنڈر بننے سے بچانے اور انہیں محفوظ رکھنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔

ایک بار فیروز شاہ دہلی سے ۹۰ کوس کے فاصلے پر سالورہ گئے۔ انہوں نے توبرہ میں پتھر کا ایک مینار دیکھا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ مینار صدیوں پرانا ہے اور خیال ہے کہ پانڈوں کے عہد سے وہاں موجود ہے۔ فیروز شاہ نے ہدایت کی کہ اس مینار کو یہاں سے اکھڑوا کر دہلی لے جایا جائے۔ مزدور بلائے گئے۔ مینار اکھاڑا گیا۔ اسے بڑی احتیاط سے روئی کے ڈھیر میں لپیٹا گیا۔ اس کے لیے بیالیس پہیوں کا چھکڑا تیار کیا گیا جس میں دس من کا مضبوط رسا باندھا گیا۔ رسے کو دو سو آدمیوں نے کھینچنا شروع کیا۔ مینار کو دریائے جمنا تک لایا گیا۔ وہاں ایسی بڑی کشتیاں موجود تھیں جن میں سے ہر ایک میں سات ہزار من غلہ سما جاتا تھا۔ بڑی کوشش سے اس مینار کو کشتیوں میں رکھا گیا۔ مینار کو فیروز آباد پہنچا دیا گیا۔

فیروز شاہ کے حکم پر جامع مسجد کے قریب ایک عمارت تعمیر کی گئی۔ موٹے رسے اور چرخیاں لگا کر مینار کو بلندی پر پہنچایا گیا اس کے گرد سنگ مرمر کا کام کروایا گیا۔ چوٹی پر سونے کا کلس لگا دیا گیا۔ یہ "مینار زریں" کے نام سے مشہور ہوا اور اب بھی یہ مینار دہلی میں فیروز شاہ کوٹلہ میں موجود ہے اور "فیروز شاہ کی لاٹھ" کہلاتا ہے۔ یہ مینار ۳۲ گز طویل تھا، آٹھ گز زمین کے اندر اور ۲۴ گز زمین سے باہر تھا۔

میرٹھ میں بھی ایسا ہی ایک مینار تھا۔ فیروز شاہ نے اسے بھی اکھڑوا کر فیروز آباد میں نصب کروایا تھا۔ فیروز شاہ کے عہد کی تعمیرات میں سنگ مرمر کا استعمال نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سونے کا کام اور آرائشی نقاشی بھی ملتی ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں کئی ضابطے اور قوانین وضع

Marfat.com

کیے۔ ان میں سے ایک ضابطے کی رُو سے سزائے موت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ضیاالدین برنی جو اسی زمانے میں موجود تھے، لکھتے ہیں کہ سزائے موت کا قانون منسوخ ہونے کے باوجود امن و امان رہا۔ لوگ مذہب کی طرف مائل ہوئے اور خوشحالی آئی۔ دوسرے ضابطے کی رُو سے خراج پیداوار کی بنیاد پر لینا لازمی کر دیا گیا۔ پہلے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر خراج لے لیا جاتا تھا۔ اس طرح کاشتکار کو نقصان ہوتا تھا۔ تیسرے ضابطے کے مطابق تمام عہدوں پر نیک، خدا ترس، رحم دل افراد کا تقرر کیا جانے لگا۔

فیروز شاہ کا دور انتظامی لحاظ سے بہت مستحکم تھا۔ سرکاری امور انجام دینے کے لیے ایک بہت بڑا محکمہ تھا جس کے ۳۶ شعبے تھے جو "کارخانے" کہلاتے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں۔ "راتبی" اور "غیر راتبی"۔ ہر وہ کارخانہ جس کا تعلق گلنے سڑنے یا خراب ہونے والی اشیا سے ہوتا تھا پہلی قسم یعنی "راتبی" کے تحت آتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ کارخانے جو اصطبلوں، سگ خانوں اور باورچی خانوں کے لیے خوراک اور چارہ مہیا کرتے تھے "راتبی" کہلاتے تھے۔ چراغ اور تیل فراہم کرنے والا کارخانہ جو "شمع خانہ" کہلاتا تھا وہ بھی "راتبی" ہی کے ذیل میں آتا تھا۔ غیر راتبی کارخانوں میں کپڑے، وردیاں، سامان رہائش، خیمے جیسی اشیا مہیا کرنے والے کارخانے آتے تھے۔ ہر کارخانے کا امیر "ملک" یا "خان" کہلاتا تھا۔ کارخانوں کے حسابات کا الگ شعبہ تھا جس کے نگراں کو "مُتصَرِّف" کہا جاتا تھا۔ ہر سال کارخانوں کے منشیوں کو دیوانِ وزارت طلب کر کے حسابات کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

- فیروز شاہ تغلق کا دور فلاحِ عامہ کے کاموں کے لحاظ سے یادگار اور لائقِ صد تحسین ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں سو نہریں تعمیر کروائیں۔ جب ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء میں وہ دیپالپور (ملتان) کی طرف گئے تو انہوں نے دریائے ستلج سے جھجھر تک ۴۸ کوس طویل نہر نکلوائی۔ اگلے برس یعنی ۷۵۷ھ میں انہوں نے کوہ مندتی اور سرمور کے نواحی علاقے میں سے نہر فیروز آباد تعمیر کروائی اور اس میں سات دیگر نہروں کا پانی شامل کروا کے اسے ہانسی تک پہنچا دیا۔ پھر اسے اراسن تک لے جا کر وہاں حصار فیروزہ کے نام سے ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی۔ فصیل کے اندر ایک محل میں بہت بڑا تالاب بنوایا اور اسے نہر کے پانی سے پُر کروا دیا۔ ایک اور نہر دریائے گھگھر (گھاگھرا) سے نکلوا کر قلعہ سرستی تک اور پھر نہر سرکھترہ تک پہنچائی۔ ان دونوں نہروں کے درمیان فیروز آباد کے نام سے شہر آباد کیا۔ دریائے جمنا سے ایک اور نہر نکال کر حصار فیروزہ تک پہنچائی اور وہاں سے اسے مزید آگے تک لے جایا گیا۔

فیروز شاہ نے نہری نظام کو بہت ترقی دی اور باغبانی پر خصوصی توجہ دی۔ ان کے دور میں ہزاروں باغات لگانے کا اہتمام کیا گیا۔ صرف دہلی کے نواح میں میلوں تک باغات کا سلسلہ تھا۔ ان باغات کا محصول ایک لاکھ اسی ہزار تنکے تھا۔ شاہدرہ کے نواح میں استی باغ اور اور چتوڑ کے نواح میں چالیس باغ لگائے گئے تھے۔ ان میں صرف انگور سات اقسام کے لگتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغبانی پر خصوصی تحقیق کی گئی تھی اور اس کام میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کی گئی تھی۔

نہری نظام کو ترقی دینے کی بدولت کھیتی باڑی کو بھی فروغ حاصل ہوا اور نئی نئی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ صرف گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں ۵۲ نئے گاؤں آباد ہوئے۔ گیہوں، گنا، مسور کی فصلیں بہتر ہو گئیں۔ بہت سے ویران صحرا گلستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ فیروز شاہ نے ۱۷۵ کنویں کھدوائے اور بنجر اراضی پر کاشت کا خصوصی اہتمام کروایا۔ ایسی اراضی کی کاشت سے ہونے والی آمدنی تعلیمی مصارف پر خرچ کی جاتی تھی۔

فیروز شاہ تغلق نے مسافروں کو اچھی سہولتیں فراہم کیں۔ انہوں نے دہلی اور فیروز آباد میں ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ اس زمانے میں سرائے یا مہمان خانوں کا کام خانقاہوں سے لیا جاتا تھا۔ یہاں مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ ان کے طعام کا بھی بندوبست تھا۔

فیروز شاہ نے نادار لڑکیوں کی شادیاں کروانے کی غرض سے ایک الگ محکمہ قائم کیا۔ ہزاروں ضرورت مند افراد نے اس محکمے میں اپنی بچیوں کے نام کا اندراج کروایا۔ محکمے میں دیانت دار افراد کا تقرر کیا گیا تھا جو امداد دینے سے قبل تحقیق کر لیتے تھے۔ اس محکمے کے ذریعے ہزاروں تنگ دست افراد اپنی بچیوں کی شادیوں کے فریضے سے سبکدوش ہوئے۔

فیروز شاہ نے اپنی مملکت میں پانچ سو شفا خانے (اسپتال) بھی بنوائے تھے۔ ان شفاخانوں کے مصارف پورے کرنے کی غرض سے بہت سے دیہات وقف کیے گئے تھے۔ اسی دور میں سو پل بنوائے گئے۔

فیروز شاہ تغلق نے غیر شرعی رسوم و رواج کو ختم کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے ظروف، تلواروں کی نیام اور ترکش وغیرہ میں سونے کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ قمار بازی بند کروا دی۔ عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے فیروز شاہ نے دو کروڑ تنکے کے وہ

Marfat.com

تمام قرضے معاف کر دیے جو محمد تغلق کے عہد میں جاری کیے گئے تھے۔ عوام کو اطمینان دلانے کے لیے قرضوں کی تمام دستاویزات شاہراہِ عام پر جلا دی گئیں۔ فیروز شاہ نے تمام غیر اسلامی محصولات کی ممانعت کر دی اور صرف قرآن پاک کے احکام کے مطابق چار قسم کے محاصل یعنی عشر، زکوٰۃ، جزیہ اور خمس لینے کی ہدایت کر دی۔

تاجروں پر سے محصول اٹھا لیے گئے۔ اس سے آزادانہ تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور روزمرہ استعمال کی اشیا کے نرخوں میں بڑی کمی ہو گئی۔ فیروز شاہ نے غیر شرعی سزاؤں پر بھی پابندی لگا دی۔ انہوں نے اپنے ماتحت حکام کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر کسی شخص کا راہ چلتے انتقال ہو جائے یا کسی کی لاش کہیں پڑی ملے تو علاقے کے حکام فوری طور پر قاضی کو مطلع کریں اور قاضی معائنے کے بعد اپنے دستخطوں اور مہر کے ساتھ ایک صداقت نامہ جاری کرے کہ متوفی کے جسم پر کسی قسم کے زخم یا تشدد کا نشان نہیں تھا۔ اس کے بعد لاش کو اس کے وارثوں تک پہنچایا جائے یا لاوارث ہونے کی صورت میں تدفین کے انتظامات کیے جائیں۔

حکام کو فیروز شاہ کی ہدایت تھی کہ ملک میں جتنے بھی افراد بے روزگار ہیں ان کی فہرست تیار کی جاتی رہے اور انہیں روزگار فراہم کیا جاتا رہے۔ فیروز شاہ نے ایک قانون یہ بنایا تھا کہ کسی ملازم کے انتقال کی صورت میں اس کے بیٹے کو کوئی نہ کوئی ملازمت دے دی جاتی تھی۔ اگر اس کا بیٹا نہ ہوتا تو اس کے کسی قریبی رشتے دار کو ملازمت دی جاتی تھی۔ فیروز شاہ نے بہت سے نادار افراد کی رقوم سے امداد کی تاکہ وہ کاشتکاری شروع کر سکیں۔ انہوں نے گداگروں کو ترغیب دی کہ وہ کوئی مفید پیشہ اختیار کر لیں۔

فیروز شاہ تغلق مالی معاملات میں نہایت سخت گیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اعلیٰ عہدے دار، صوبوں کے حکام کو مالی امور میں راہِ راست پر رکھنے کے لیے سختی سے پیش آتے تھے۔

فیروز شاہ کے فلاحی اقدامات کے نتیجے میں رعایا خوشحال ہو گئی۔ اس زمانے میں کوئی عورت ایسی نہ تھی جس کے پاس زیور نہ ہوں۔ ہر گھر سے فارغ البالی کے آثار جھلکنے لگے۔ دہلی کے شیخ الاسلام بہاالدین کا کہنا تھا کہ انسان کو فکر ہوتی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ ان کی کفالت کون کرے گا؟ اس فکر کو فیروز شاہ تغلق نے دور کر دیا۔

فیروز شاہ نے ۱۸ رمضان ۷۹۰ھ / ۲۰ ستمبر ۱۳۸۸ء کو ۸۰ برس کی عمر میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔

•••

Marfat.com

زین العابدین

کشمیر سے پشاور تک ہر شعبۂ زندگی میں اپنی قلمرو کو مثالی بنا دینے والے عظیم حکمراں

مقدمات کی سماعت جاری تھی!

مملکت کے حکمراں خود مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔

مدعیان یکے بعد دیگرے، اپنی درخواستیں پیش کرتے تھے۔ یہ درخواستیں سربراہِ مملکت کے سامنے لائی جاتی تھیں اور وہ ہر درخواست بغور پڑھ کر مناسب کارروائی کا حکم دیتے تھے۔

اچانک ایک درخواست پڑھ کر سربراہِ مملکت چونک گئے۔ انہوں نے درخواست کو تعریفی نظروں سے دیکھا، پھر ان کی آواز کمرۂ عدالت میں گونجی:

"یہ درخواست کن صاحب کی تحریر کردہ ہے؟ غالباً ہم انہی صاحب کے قلم سے لکھی گئی درخواستیں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ ان کا مضمون بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہم ان صاحب کے علم سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔" سربراہ مملکت کو بتایا گیا کہ یہ درخواست قاضی جمال الدین کی تحریر کردہ ہے، جو ایک بڑے عالم ہیں۔ شاہ ہمدان کی خانقاہ پر بڑی سادگی سے زندگی بسر کر رہے ہیں، بہت سے لوگ ان کے علم سے استفادہ کرتے ہیں۔

"انہیں ہمارا پیغام پہنچایا جائے کہ ہم ان سے ملنے کے خواہشمند ہیں، لہٰذا وہ یہاں آنے کی زحمت فرمائیں۔" سربراہِ مملکت نے کہا اور ایک معزز شخص کو قاضی جمال الدین کے پاس اپنے پیغام کے ساتھ روانہ کر دیا۔

قاضی جمال الدین تشریف لائے تو سربراہِ مملکت نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہیں اپنے قریب نمایاں جگہ دی۔ قاضی جمال الدین نے حکمرانِ وقت کو اپنے علمی کام کا ایک حصہ، کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ حکمرانِ وقت نے کتاب کا جائزہ لیا۔ ان کا چہرہ ان کی دلی مسرت کا آئینہ بن گیا تھا۔ چند روز بعد مملکت میں اعلان ہو رہا تھا کہ قاضی جمال الدین کو مملکت کا منصفِ اعلیٰ (چیف جسٹس) مقرر کر دیا گیا ہے۔

علم سے بے انتہا محبت رکھنے والے یہ حکمراں تھے، زین العابدین جنہوں نے کشمیر، پنجاب، سرحد کے بڑے حصے، لدّاخ اور بلتستان کے علاقوں پر نصف صدی تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور ہر شعبۂ زندگی میں اپنی قلمرو کے ہر حصے کو مثالی بنا دیا۔ ان کا عہد علم و ادب، تہذیب و تمدن اور صنعت و تعمیرات، غرض ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ اہلِ کشمیر آج بھی ان کا نام محبت اور احترام سے لیتے ہیں۔ ان کی عظیم شخصیت اور قابلِ فخر کارناموں کی وجہ سے کشمیری انہیں بڈ شاہ (عظیم بادشاہ) کہتے ہیں۔

زین العابدین کے حالات بیان کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ کشمیر میں مسلمانوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

کشمیر میں مسلمانوں کی آمد کا آغاز آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی مہمات تو دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھیں تاہم کشمیر، پہاڑی علاقہ ہونے اور عام راستے سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی گزرگاہ نہ بن سکا۔ چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر پر راجا سہادیو کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں ایک مسلمان شخص شہ میر، ملازمت کی تلاش میں سوات سے کشمیر آیا اور راجا سہادیو کا ملازم ہو گیا۔ اس دوران تبت خرد یعنی لدّاخ کے راجا وکتینا کو باغیوں نے قتل کرا یا تو اس کے بیٹے رنچن کشمیر آگئے اور راجا سہادیو کے پاس پناہ لے لی۔ رنچن بدھ مت کے پیرو تھے۔

Marfat.com

راجا سہادیو ہی کے عہد میں ایک تاتاری سردار زلچو نے کشمیر پر حملہ کیا اور ہزاروں کشمیریوں کو قیدی بنا کر لے گیا لیکن شدید برف باری کی وجہ سے زلچو کی پوری فوج اور قیدی برف میں دب گئے۔ سہادیو حکومت چھوڑ کر بھاگ گیا، اس کے بعد حکومت افراتفری کا شکار ہو گئی۔ رنجن نے ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک مسلمان درویش، عبدالرحمٰن بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ ان کا نام صدر الدین رکھا گیا، وہی کشمیر کے پہلے مسلمان حکمراں ہیں۔ ۲۵ ذی قعدہ ۷۲۳ھ / ۲۵ نومبر ۱۳۲۳ء کو صدر الدین کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے کمسن بیٹے حیدر خان کو حکومت ملی لیکن سیاسی حالات دگرگوں ہو گئے۔ اس پر شہ میر نے ۷۳۹ھ / ۱۳۳۹ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اپنا لقب شمس الدین رکھا۔ شہ میر ہی کشمیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے پہلے فرمانروا ہیں۔ خاندان شہ میر نے کشمیر پر تقریباً ڈھائی سو برس حکومت کی۔ زین العابدین اس سلسلے کے آٹھویں حکمراں ہیں۔

زین العابدین کا اصل نام شاہی خان ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش، تاریخ کی کتب میں بیان نہیں کی گئی ہے البتہ مؤرخین کا کہنا ہے کہ جب ذی الحجہ ۸۲۳ھ / دسمبر ۱۴۲۰ء میں انہوں نے کشمیر کی حکومت سنبھالی تو ان کی عمر ۱۹ سال تھی۔ اس لحاظ سے زین العابدین کا سنہ پیدائش ۸۰۳ھ / ۱۴۰۱ء ٹھہرتا ہے۔ زین العابدین نے جب اس دنیا میں اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا تو کشمیر پر ان کے والد سکندر حکمراں تھے جو "بت شکن" کے لقب سے معروف ہیں۔ سکندر نے ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء سے ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء تک حکومت کی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علی شاہ کو اقتدار ملا جن کا اصل نام میر خان تھا۔

علی شاہ نسبتاً کمزور حکمراں تھے۔ ان کے عہد میں لداخ، خود مختار ہو گیا، آخر علی شاہ کے چھوٹے بھائی شاہی خان نے پوٹھوہار کے گکھڑ سردار جسرت خان کی مدد سے علی شاہ کے خلاف جنگ لڑی جس میں شاہی خان کو فتح حاصل ہوئی۔ ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں شاہی خان نے کشمیر کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی اور زین العابدین کا لقب اختیار کیا، اس کے بعد کشمیر کے اس انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے جو پچاس سال کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ دور، زین العابدین کی پُرحکمت اور مدبرانہ اصلاحات اور ان کے دانشورانہ اقدامات کی بدولت کشمیر کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے۔

علم کی سرپرستی اور فروغِ علم کے سلسلے میں زین العابدین کی خدمات تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ انہوں نے سری نگر سے متصل، نوشہر میں ایک شاندار جامعہ (یونیورسٹی) قائم کی تھی۔ مولانا کبیر نحوی اس جامعہ کے سربراہ تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے اور ان کی خدا ترسی، پارسائی، علم و فضل اور تجربے کا شہرہ تھا۔ وہ شیخ الاسلام بھی تھے۔ ان کے تحت قابل اور لائق اساتذہ کی ایک بڑی جمعیت کام کر رہی تھی۔ یہ اساتذہ دنیا کے مختلف حصوں سے، جامعہ کی شہرت سن کر یہاں پہنچے تھے۔ ان اساتذہ میں ملا احمد کاشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری، ملا جمال الدین خوارزمی (جو بعد میں منصفِ اعلیٰ یعنی چیف جسٹس بنے)، میر علی بخاری اور ملا یوسف راشدی جیسے نامور اور جید علما کرام شامل تھے۔

زین العابدین نے اس جامعہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دیہات سے حاصل ہونے والی آمدنی مختص کر دی تھی۔ جامعہ میں مختلف کتابوں کے ترجمے کی غرض سے ایک خصوصی شعبہ "دارالترجمہ" قائم کیا گیا تھا، جہاں عربی اور سنسکرت کے علمی خزانوں کو فارسی اور کشمیری زبانوں میں منتقل کیا جاتا تھا۔ زین العابدین کے حکم پر "مہابھارت" کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ مہابھارت سنسکرت کی مشہور رزمیہ نظم ہے جس میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ زین العابدین ہی کی ہدایت پر سنسکرت میں لکھی گئی کشمیر کی تاریخ کی ضخیم کتاب "راج ترنگنی" کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان دونوں کتابوں کا ترجمہ ملا احمد نے کیا جو ملک الشعرا تھے۔ "راج ترنگنی" کے ترجمے کا نام "بحر الاسمار" یعنی "واقعات کا سمندر" رکھا گیا۔

زین العابدین، صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم عالموں کی بھی سرپرستی کرتے تھے اور انہیں بھی علمی خدمات پر بھاری انعامات دیا کرتے تھے۔ تعلیم کے شعبے کے سربراہ اتھاسوم تھے۔ انہیں ترجمے کے محکمے میں اہم مقام حاصل تھا۔ انہوں نے زین العابدین کی سوانح حیات "جیناچاریتا" کے نام سے لکھی تھی۔ یودھابھاٹیا کو فردوسی کے شاہنامہ پر عبور حاصل تھا۔ وہ زین العابدین کو شاہنامہ سنایا کرتے تھے۔ ایک مشہور مصنف نروتراج نے اسی دور میں "راج ترنگنی" کے طرز پر "زینہ ترنگنی" لکھی۔ اس کتاب میں ہرش دیو سے زین العابدین تک کے حالات شامل کیے گئے ہیں۔

زین العابدین نے نوشہر کی جامعہ میں ایک شاندار کتب خانہ بھی

Marfat.com

قائم کیا تھا۔ اس کتب خانے میں نادر اور مفید کتب جمع کرنے کی غرض سے انہوں نے خطیر رقوم خرچ کیں۔ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے نمائندے بھیجا کرتے تھے، جن کا کام یہ تھا کہ وہ جامعہ نوشہر کے کتب خانے کے لیے اہم کتب اور مخطوطات حاصل کریں۔ مؤرخین کے مطابق جامعہ نوشہر کا یہ کتب خانہ اپنے وقت میں ترکستان اور ایران کے چوٹی کے کتب خانوں کے ہم پلہ تھا۔ یہ کتب خانہ ایک صدی تک قائم رہا۔ زین العابدین کو علم سے جس قدر دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سیالکوٹ میں مدرسۃ العلوم کے لیے چھ لاکھ روپے دیے تھے، جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی رقم تھی۔

زینہ گیر میں، زین العابدین نے اپنی رہائش گاہ اور باغ کے درمیان ایک کالج قائم کیا تھا جو وادی میں علم کی ترویج و اشاعت کا اچھا مرکز تھا۔ کشمیر میں اسلام آباد (اننت ناگ) کے قریب دشن پور کے مقام پر بھی ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ ملا غازی خان، اس مدرسے کے سربراہ تھے۔

فارسی زبان کشمیر میں اسلام کے ساتھ آئی لیکن اس زبان کو کشمیر میں عروج، سکندر اور زین العابدین کے عہد میں حاصل ہوا۔ اس وقت تک ادب اور علمی موضوعات کی زبان سنسکرت تھی لیکن زین العابدین جو خود فارسی، عربی اور کشمیری کے عالم تھے اور ان زبانوں پر عبور رکھتے تھے، انہوں نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا اور دنیا کی اہم کتب کے تراجم فارسی میں کروانے شروع کر دیے۔ ان کے عہد میں ملا احمد، احمد سید، محمد امین منطقی، اویس کاشمیری، ملا ندیمی، ملا مسیحی، ملا ملیحی، ملا جمیل، ملا احمد رومی، ملا نور الدین، ملا علی شیرازی، ملا نادری، مولانا حسین غزنوی جیسے علما موجود تھے، جن کی کوششوں سے وادیِ کشمیر میں فارسی زبان نے جڑیں پکڑ لیں اور سنسکرت کے غیر مسلم علما بھی فارسی میں لکھنے لگے۔

زین العابدین کے دور میں جو عظیم علمی شخصیات ابھر کر سامنے آئیں اور جن سے زین العابدین نے استفادہ کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے چند کے نام اور مختصر کوائف ذیل میں درج ہیں:

مولانا کبیر: زین العابدین نے انہیں شیخ الاسلام اور جامعہ کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ شیخ الاسلام ایک بڑا عہدہ تھا اور مذہبی امور کے شعبے کی نگرانی ان ہی کے سپرد تھی۔ مولانا کبیر کشمیر ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ تحصیل علم کے لیے وہ ہرات چلے گئے تھے، جہاں انہوں نے دینیات اور متعلقہ علوم میں کمال حاصل کیا۔ زین العابدین نے کئی بار درخواست کر کے انہیں واپس کشمیر بلوایا تھا۔

ملا احمد کاشمیری: بخارا کے صدر المدرسین مولانا محمد افضل کے شاگرد تھے۔ ملا احمد بہت جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ معروف شاعر اور اچھے تاریخ دان تھے۔ انہوں نے "تاریخ واقعی کشمیر" لکھی۔

حافظ احمد بغدادی اور ملا پارسا: جامعہ کے قابل اساتذہ تھے۔ حافظ بغدادی، بغداد سے اور ملا پارسا، بخارا سے آئے تھے۔

سید حسین قمر رضاوی: زین العابدین نے انہیں مدعو کیا تھا۔ اسلامی علوم کے بڑے ماہر تھے۔ زین العابدین نے باغ زینہ گیر میں ان کے قیام کا انتظام کیا تھا۔ یہ علاقہ اب سید حسین رضاوی کے نام پر سید پور کہلاتا ہے۔

ملا نادری: ممتاز مؤرخ اور شاعر تھے۔

شیخ بہاالدین گنج بخش: اس دور کے بڑے صوفی عالم تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ کے واقعات کشمیر میں عام تھے۔

قاضی حامد: انہوں نے کشمیر کی اچھی تاریخ لکھی۔ ان کے صاحب زادے قاضی ابراہیم نے اس تاریخ کو آگے بڑھایا اور بعد کے واقعات تحریر کیے۔

زین العابدین نے فن خطاطی کو بھی ترقی دی۔ وہ پہلے حکمراں ہیں جنہوں نے وسط ایشیا سے ماہر خطاطوں کو کشمیر بلوایا۔ انہوں نے ہی، خطاطی کے لیے بھوج پتر (برچ کے درخت کی چھال) کی جگہ کاغذ کے استعمال کو رواج دیا۔ زین العابدین نے مشہور عالم علامہ زمخشریؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر کلام پاک، "کشاف" کے کئی نسخوں کی خطاطی کروائی اور ان نسخوں کو نوشہر کی جامعہ میں رکھوایا۔ انہوں نے خطاطوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور انہیں املاک عطا کیں۔

زین العابدین کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ وہ شاعروں کی صحبت میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ ان کے دور میں سب سے نمایاں شاعر، ملا احمد کاشمیری تھے جو "ملک الشعرا" کہلاتے تھے اور قطب تخلص کرتے تھے۔ زین العابدین اور ملا احمد کاشمیری میں وقتاً وقتاً فی البدیہہ شعر گوئی کا مقابلہ ہوتا تھا۔

زین العابدین کو طب سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے خود بھی کئی دواؤں کے نسخے فراہم کیے تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کے نامور طبیب کریا بھاٹا کو ملازمت دی تھی۔ کریا بھاٹا نوشہر میں رہتے تھے۔

Marfat.com

جس جگہ ان کا مکان تھا وہ کریابھاٹا وان (دکان) کے نام سے مشہور رہی ہے۔ ان کی دکان کے کھنڈرات سری نگر کے محلہ ہوال، سنگین دروازہ میں بتائے جاتے ہیں۔ اس دور میں منصور بن محمد بھی بڑے طبیب تھے۔ انہوں نے "کفایۂ منصوری" کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے زین العابدین کے نام معنون کیا اور انہیں منصف حکمراں قرار دیا۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اسے لکھنؤ سے نول کشور پریس نے شائع کیا ہے۔

زین العابدین نے کشمیر میں لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کرنے اور طب کے شعبے کو ترقی دینے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انہوں نے جگہ جگہ سرکاری شفا خانے بنوائے۔ سمرقند سے تربیت یافتہ خواتین کو بلوایا جو دایہ گیری اور نرسوں کے فرائض انجام دے سکتی تھیں۔ اس طرح باقاعدہ زچہ خانوں کا رواج ہوا اور خواتین کو ایک بنیادی سہولت میسر آگئی۔ یہ ایسی سہولت تھی جو زین العابدین کے ہم عصر حکمرانوں میں سے بہت سوں نے فراہم نہ کی تھی۔ زین العابدین نے طب کو جو ترقی دی، اس کا ایک دلچسپ ثبوت یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ میں آج بھی جو بڑے گھرانے طب کے پیشے سے وابستہ ہیں، ان کے آباو اجداد کشمیر ہی سے آئے تھے۔

زین العابدین کا عہد، تعمیرات کے لحاظ سے بھی نہایت درخشاں ہے۔ انہوں نے زینہ گیر (نوشہر) میں ایک محل تعمیر کروایا تھا۔ اس محل کی پوری عمارت لکڑی کی مدد سے تعمیر کی گئی تھی۔ مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں کہ زین العابدین نے کشمیر کی سب سے بڑی جھیل، وولر جھیل کے عین وسط میں ایک محل تعمیر کروایا تھا اور اس میں بہت خوبصورت پیڑ پودے لگوائے تھے۔ اس محل کی خصوصیت یہ ہے کہ جھیل کے وسط میں پہلے ایک جزیرہ بنایا گیا اور اس پر محل تعمیر کیا گیا۔ مؤرخین نے اس کی کہانی یوں بیان کی ہے کہ جھیل کی جگہ راجا سدرسن کا محل تھا۔ یہ راجا بہت ظالم تھا۔ ایک درویش نے اسے ظلم سے روکنے کی کوشش کی لیکن راجا کے باز نہ آنے پر وہ درویش مکافاتِ عمل کی تنبیہ کر کے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد پورا محل اور اطراف کی آبادی جھیل میں تبدیل ہو گئی۔

زین العابدین کے دور تک اس جھیل میں غرقاب عمارتوں پر کسی نے توجہ نہ دی۔ زین العابدین جب حکمراں بنے تو انہوں نے جھیل میں محل بنوانے کا خیال ظاہر کیا۔ ان کی ہدایت پر غوطہ خوروں کی مدد سے جھیل میں غرقاب راجا کے محل اور مندر کے کھنڈر دریافت کیے گئے اور ان ہی پر پتھر ڈال کر بنیاد تیار کی گئی جس پر نیا محل تعمیر کیا گیا، یہ محل بھی اب کھنڈر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ قریب ہی ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی۔ محل پر جو سنگ بنیاد نصب تھا اس کے مطابق یہ عمارت ۸۴۷ھ / ۱۲۴۳ میں تعمیر کی گئی تھی۔

زین العابدین نے وولر جھیل کے اس جزیرے کو "زینہ لنک" کا نام دیا تھا۔ "لنک" کشمیری زبان میں جزیرے کو کہتے ہیں۔ جزیرے پر تعمیر ہونے والے شاندار شاہی محل کے اخراجات سونے کے ان دو بتوں کو ڈھال کر پورے کیے گئے جو غوطہ خوروں کو وولر جھیل سے ملے تھے۔

زین العابدین نے متعدد علاقے بھی آباد کیے اور ان میں کئی عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ ان عمارتوں میں سے بعض کے آثار اب بھی مل جاتے ہیں۔ ان علاقوں کے نام ہیں: زینہ پور (کئی دیہات کا مجموعہ)، زینہ تلک (دریائے جہلم کے کنارے)، زینہ گیر (سوپور کے شمال مغرب میں ہے)، زینہ گام، زینہ کنڈل اور زینہ پٹن (وولر جھیل کے قریب)، زینہ کوٹ (سری نگری سے چار میل مغرب میں)، زینہ ماتھ (جھیل ڈل کے کنارے ایک خانقاہ)۔

زین العابدین نے نوشہر میں بھی ۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء میں ایک عالی شان محل تعمیر کروایا تھا۔ اس محل کی بارہ منزلیں تھیں اور ہر منزل پر پچاس کمرے تھے۔ یہ پوری عمارت اینٹوں اور لکڑی سے تعمیر کی گئی تھی۔ محل کی چھت پر بہت خوبصورت سنہری گنبد کنول کی مانند کھلا نظر آتا تھا۔ زین العابدین اپنی بقیہ تمام عمر اس قصر میں رہے۔ قصر میں ایک بڑا کشادہ کمرہ (ہال) تھا جو ساعت گاہ کا کام دیتا تھا۔ اس کی دیواریں شیشوں سے مزین تھیں۔

نوشہر کے قصبے میں کئی عالی شان عمارتیں صنوبر کی لکڑی سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر عمارتیں پانچ منزلہ تھیں۔ ہر منزل پر کمرے، ہال، بالکونیاں اور مینار تھے۔ زین العابدین نے ڈل جھیل کے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں بھی ایک سہ منزلہ عمارت تعمیر کروائی تھی جو "سونا لنک" کہلاتی تھی۔ بعد میں ایک زلزلے کے باعث یہ عمارت منہدم ہو گئی۔

زین العابدین نے نہری نظام کو بہت ترقی دی۔ انہوں نے پورے کشمیر میں نہروں کا جال بچھا دیا، ان میں آٹھ نہریں بہت بڑی تھیں۔ اتنے اچھے نہری نظام کی وجہ سے کشمیر کا بڑا حصہ سیراب ہونے لگا اور زراعت

Marfat.com

کو فروغ حاصل ہوا، حتیٰ کہ زین العابدین کے دور میں چاول کی پیداوار ۷۷ لاکھ خروار تک پہنچ گئی تھی۔ ایک خروار ساٹ سو پاؤنڈ کے برابر ہے گویا کہ پیداوار ساڑھے چوبیس لاکھ میٹرک ٹن تک پہنچ گئی تھی۔

زین العابدین نے دریائے جہلم پر مستقل پل تعمیر کروایا۔ اس پل کا نام "زینہ کدل" رکھا گیا۔ "کدل" کشمیری زبان میں پل کو کہتے ہیں۔ اس سے قبل کشتیوں کے پل استعمال ہوتے تھے۔ زینہ کدل لکڑی کا پُل تھا۔ زین العابدین کے دور میں ڈل جھیل کا پانی حبہ کدل کے راستے جہلم میں جا گرتا تھا، لیکن زین العابدین نے اس راستے کو بند کر دیا اور نالہ مار میں پانی کے گرنے کا انتظام کر دیا۔ اس نالے پر انہوں نے پتھر کے سات پل تعمیر کروائے۔ انہوں نے اندر کوٹ سے سوپور تک ایک بڑی آبی گزرگاہ بھی بنوائی۔ کشمیر کے پل، کم سرمائے سے تعمیر کیے گئے تھے، لیکن یہ مضبوط، دیدہ زیب اور منفرد تھے۔ زین العابدین کو باغات بہت پسند تھے۔ وہ جہاں گئے وہاں سرسبز وشاداب باغات لگوائے۔ ان میں سے چار باغات بہت مشہور ہوئے، جن کے نام یہ ہیں: باغ زینہ گیر، باغ زینہ داب، جو نوشہر میں تھا، باغ زینہ پور اور باغ زینہ کوٹ، تاہم آج کل ان باغات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

کشمیر پھولوں اور پھلوں کے لیے مشہور ہے۔ کشمیر کو یہ شہرت دلانے میں زین العابدین کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے ایران اور ترکستان سے طرح طرح کے پھولوں اور پھلوں کے پودے اور بیج منگوا کر کشمیر میں ان کی کاشت کروائی۔ کشمیر میں سمر قندی سیب اور ناشپاتیوں کی کاشت کا آغاز زین العابدین ہی کے دور میں ہوا۔ ۸۶۴ھ / ۱۴۶۰ء میں مملکت میں شدید قحط پڑ گیا۔ زین العابدین نے تمام متاثرین میں بڑے پیمانے پر غلہ تقسیم کروایا۔ محصولات پہلے کے مقابلے میں ایک چوتھائی کر دیے اور اپنے حُسنِ انتظام کے ذریعے قحط پر قابو پالیا۔

زین العابدین بہت فراخ دل اور فیاض تھے۔ وہ علم کے فروغ، تعمیرات اور فنون کی ترقی پر زرِ کثیر خرچ کرتے تھے۔ اس قسم کے مصارف تانبے کی کانوں، لداخ کے علاقے میں حاصل ہونے والے سونے اور وسعت پذیر نہری نظام کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے۔

زین العابدین کا عہد حکومت اصلاحات کے حوالے سے بھی یادگار ہے۔ انہوں نے باقاعدہ قوانین مدوّن کرائے اور انہیں تانبے کی تختیوں پر لکھوا کر نہ صرف عدالتوں میں آویزاں کروایا بلکہ یہ تختیاں، شہروں کے عام بازاروں میں بھی نظر آتی تھیں۔ کشمیر میں قانون کو اس انداز سے نافذ کرنے والے پہلے حکمراں زین العابدین ہی ہیں۔

قوانین مدوّن کرنے کے لیے ماہرین فقہ اور علما کی مجلس بنائی گئی تھی۔ زین العابدین ہر قسم کی بلا جواز خونریزی سے نفرت کرتے تھے۔ وہ بے حد منصف مزاج تھے۔ اپنی تمام تر رحم دلی کے باوجود اگر ان کے بیٹے، وزیر یا دوست تک پر کوئی جرم ثابت جاتا تو اسے کبھی معاف نہ کرتے تھے اور جرم کی سزا بہر حال دی جاتی تھی۔ چوریوں کے سلسلے میں قانون یہ تھا کہ جس علاقے میں چوری ہوتی اس علاقے کے حاکم کو سزا دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ زین العابدین نے گزشتہ ادوار میں ناجائز طور پر قید کیے گئے تمام افراد کو رہا کر دیا تھا۔

زین العابدین کا ایک بڑا کارنامہ باقاعدہ جیل خانوں کا قیام اور ان میں صنعتی منصوبوں کا اجرا ہے۔ ماضی میں اوّل تو قید خانے بہت کم تھے اور جو موجود تھے ان کا انتظام بہت خراب تھا۔ زین العابدین کے حکم پر قید خانوں کا نظام درست کیا گیا اور قیدیوں سے مختلف کام لیے جانے لگے۔ مثلاً برتن تیار کرنا، کاشت کاری، دست کاری وغیرہ۔ جن قیدیوں کو کوئی ہنر نہیں آتا تھا انہیں ہنر سکھائے جانے لگے۔ قیدیوں سے اس نوعیت کے مفید کام لینے کا رواج، دنیا کے دیگر ملکوں میں ۱۹ ویں صدی عیسوی میں یعنی زین العابدین کے عہد حکومت کے چار سو برس بعد پڑا۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ زین العابدین ہی اس اہم اصلاح کے بانی تھے۔

زین العابدین نے اپنے دور میں رائج پیمانوں میں تبدیلی کروائی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی رعایا کے لیے بہت شفیق تھے۔ انہوں نے گز اور جریب کی لمبائی بڑھوادی تھی (۲۲ گز = ایک جریب) تاکہ عام افراد کو زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ عام دیہاتی کاشتکاروں کو افسران محصولات (ٹیکس لینے والے افسران) کے جبر اور ظلم سے بچانے کے لیے ایک قانون نافذ کیا گیا، جس کی رُو سے ان افسران کو عام افراد سے کسی قسم کے تحفے لینے کی ممانعت کر دی گئی۔

اشیائے صَرف کی قیمتیں مقرر کر دی گئی تھیں، ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ان قیمتوں پر نظر ثانی کی جاتی تھی اور عوام کو ان قیمتوں سے مطلع کیا جاتا تھا۔ املاک اور جائیداد کی خرید و فروخت کے جتنے بھی معاہدے ہوتے تھے ان سب پر سلطان زین العابدین کی مہر لگوانا لازمی تھا۔ اہم سڑکوں پر آرام گاہیں، (سرائیں) تعمیر کی گئی تھیں۔ جنگلات تک میں

Marfat.com

اس قسم کی آرام گاہیں تعمیر کی گئی تھیں جہاں سفر کے دوران رات میں قیام کیا جاسکتا تھا اور جنگلی جانوروں سے محفوظ رہا جاسکتا تھا۔ زین العابدین ترقیاتی منصوبوں میں ذاتی دلچسپی لیتے تھے اور خود جا کر پلوں کی تعمیر، نہروں اور آبی گزر گاہوں کی کھدائی اور دیگر منصوبوں کا جائزہ لیا کرتے تھے۔

زین العابدین کو فنونِ لطیفہ سے اس قدر دلچسپی تھی کہ انہوں نے ایران، ترکستان، اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے ماہر کاریگر، معمار، دستکار، نقاش اور صناع کشمیر بلوائے تھے۔ ان ماہرین کو اچھی مراعات اور سہولتوں کی پیش کش کی گئی چنانچہ بڑی تعداد میں ماہر کاریگر اور دستکار کشمیر چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے اس علاقے نے خوب ترقی کی اور اس کی اقتصادی صورتِ حال بہتر ہوگئی۔ کشمیری مصنوعات کی مانگ دور دور تک کے علاقوں میں بڑھ گئی اور انہیں اچھے داموں خریدا جانے لگا۔ یہ زین العابدین کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ کشمیری دستکاروں کو آج بھی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

زین العابدین ہی کی کوششوں سے وادیِ کشمیر میں شالوں کی صنعت کا آغاز ہوا۔ کشمیری شالیں آج بھی دنیا بھر میں پسند کی جاتی ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ کشمیر میں شال بافی شاہ ہمدان نے ۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء میں شروع کروائی تھی۔ زین العابدین نے کشمیر سے بہت سے افراد کو اس ہدایت کے ساتھ خاص طور پر دیگر ممالک میں بھیجا کہ وہ مختلف فنون میں مہارت حاصل کر کے واپس آئیں۔

زین العابدین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے وادیِ کشمیر میں قالین بافی کی صنعت کو متعارف کروایا۔ یہ صنعت اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ زین العابدین کے دور کے بعد بھی عرصے تک مقبول رہی۔ ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور ریشم سازی کی صنعت کشمیر کی قدیم صنعت ہے۔ اس کا سلسلہ بخارا سے جا ملتا ہے۔ بخارا کے راستے کشمیر کا ریشم دمشق، مغربی ایشیا اور یورپ تک پہنچا۔ زین العابدین کے دور میں بھی کشمیر میں ریشم سازی کی صنعت موجود تھی۔

زین العابدین کو کشمیر میں ایک اور صنعت کی ابتدا کروانے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ صنعت کاغذ سازی کی صنعت ہے۔ انہوں نے سمرقند سے ماہرین بلوائے۔ سمرقند میں یہ صنعت چین سے پہنچی تھی۔ گندربل اور نوشہر میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے گئے۔ زین العابدین ہی نے سمرقند سے ماہرین بلوا کر، کٹی (کچلے ہوئے کاغذ) کے ذریعے، خوبصورت قلمدان اور چھوٹے ڈبے تیار کرنے کی صنعت کو رواج دیا۔ یہ صنعت "کار قلمدانی" یا "کار منقش" کہلاتی تھی۔ لکڑی پر کندہ کاری یا نقاشی کا ہنر کشمیر میں پہلے بھی موجود تھا، لیکن زین العابدین کے عہد میں اسے زبردست فروغ حاصل ہوا۔ دروازوں، چھتوں اور آرائشی محرابوں پر بہت خوبصورت کندہ کاری کی جاتی تھی۔

زین العابدین نے اپنے دور میں ٹکسال بھی قائم کی تھی۔ یہ ٹکسال سری نگر کے علاقے زینہ کدل کے محلے صرافہ نگر میں قائم کی گئی تھی۔ زین العابدین سے قبل کشمیر میں تانبے کے سکے رائج تھے۔ زین العابدین نے چاندی اور پیتل کے سکوں کو رواج دیا۔

سنجیدہ امور پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ زین العابدین نے اپنی رعایا کے لیے تفریحات کا انتظام کرنے کی بھی کوشش کی۔ انہوں نے بازی گروں اور شعبدہ بازوں، جسمانی کرتب دکھانے والوں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ موسیقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ زین العابدین موسیقی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ موسیقی سے ان کے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے ایران اور ترکستان کے مشہور ماہرینِ موسیقی، کشمیر چلے آئے تھے۔ ان میں ایک ملا عودی تھے جنھیں عُود (بربط) بجانے میں کمال حاصل تھا۔ زین العابدین نے فنِ مصوری کو بھی فروغ دیا۔

زین العابدین کے دور میں فوج کو مضبوط بنانے اور دفاعی انتظامات کو مستحکم کرنے پر بھی توجہ دی گئی۔ فنِ آتش بازی کے ایک ماہر، حبیب نے بارود تیار کیا۔ مختلف دھاتوں سے تلواریں، اور کئی طرح کے ہتھیار بنائے گئے۔ جب زین العابدین نے اقتدار سنبھالا تو ان کی فوج ایک لاکھ پیادوں اور تیس ہزار گھڑسواروں پر مشتمل تھی۔ زین العابدین کا رویہ اپنی فوج کے ساتھ اتنا اچھا اور خلیقانہ تھا کہ ان کی فوج کا ایک ایک سپاہی، زین العابدین کے اشارے پر بڑے سے بڑے خطرے سے ٹکرا جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔

زین العابدین نے جو مہمات انجام دیں ان میں پورے پنجاب کی تسخیر بھی شامل ہے، تاہم ڈاکٹر صوفی کا خیال ہے کہ یہ باقاعدہ قبضہ نہیں تھا بلکہ پنجاب پر کامیاب حملہ تھا جس کے نتیجے میں زین العابدین کو فتح حاصل ہوئی۔ زین العابدین نے جسرت خان گکھڑ کی قیادت میں دہلی فتح کرنے کے لیے جو فوج بھیجی تھی اسے تو کامیابی حاصل نہ ہو سکی، البتہ زین العابدین نے مغربی تبت خرد (لداخ) کے علاقے بھوٹا لینڈ کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ ایک قبیلے "کولوتا" یا "کولو" کو فتح کیا جس پر تبتی

Marfat.com

قابض تھے۔ اس علاقے کا بادشاہ، لیہ کے بادشاہ کے تابع تھا۔

زین العابدین ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے مملکت کو سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے مستحکم بنانے کے لیے جو اقدامات کیے وہ ان کی فراست اور ہوش مندی کے غماز ہیں۔ پنجاب کا علاقہ ان کی حکومت میں شامل تھا، جہاں جسرت خان گکھڑ، حکمراں تھے۔ موجودہ صوبہ سرحد میں پشاور تک کا علاقہ، زین العابدین کی قلمرو کا حصہ تھا۔ کھلی یعنی ہزارہ کا علاقہ، لداخ اور بلتستان بھی ان کی مملکت میں شامل تھے اور جموں اور راجوری کے راجا ان کے باج گزار تھے۔ بعض مورخین کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ زین العابدین نے سندھ کو بھی تسخیر کیا تھا، تاہم سندھ کے حکمراں جام نظام الدین سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔

زین العابدین اپنے ہم عصر حکمرانوں اور بادشاہوں سے اچھے اور دوستانہ تعلقات رکھنے کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ انہوں نے تحائف اور خطوط دے کر اپنے سفیر خراسان، ترکستان، آذربائیجان، گیلان، سیستان اور ترکی کے بادشاہوں کے پاس بھیجے۔ اس طرح کے تحائف اور خطوط انہوں نے اپنے سفرا کے ذریعے مصر کے برجی مملوک حکمراں، مکہ مکرمہ کے شریف، دہلی کے سلطان بہلول لودھی، گجرات کے حکمراں محمود بیگڑہ اور سندھ کے جام نظام الدین۔ کے پاس بھی روانہ کیے تھے۔ تبت کے حکمراں نے زین العابدین کو ہنسوں کا ایک خوبصورت جوڑا بطور تحفہ بھیجا تھا۔ گوالیار کے راجا بھی زین العابدین کے دوست تھے۔ زین العابدین نے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے دادا، ابو سعید مرزا کے پاس بھی اپنا سفیر بھیجا جو خراسان پر حکمراں تھے۔ ابو سعید مرزا نے جواب میں خیر سگالی کے طور پر زین العابدین کو، اونٹ خچر اور گھوڑے بھجوائے تھے۔

زین العابدین بہت متحمل مزاج اور روادار حکمراں تھے۔ ان کے دور میں ہندوؤں کے مقدمات کے فیصلے ان کے مذہبی قوانین کے مطابق ہوتے تھے۔ گزشتہ ادوار میں جن برہمنوں کو کشمیر سے نکال دیا گیا تھا، زین العابدین نے انہیں واپس بلوالیا۔ جو مندر مسمار کر دیے گئے تھے انہیں از سر نو تعمیر کروایا اور نئے مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ ہندو بچوں کے لیے پاٹھ شالے کھول دیے گئے تاکہ وہ اپنی مذہبی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ تمام لوگوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے وظائف (اسکالرشپ) مقرر کیے گئے اور انہیں مزید تعلیم کے لیے دکن اور کاشی (بنارس) بھیجنے کے انتظامات کیے گئے۔ زین العابدین نے عوام پر عائد محصولات (ٹیکس) ختم کر دیے۔ زین العابدین ہی کے دور میں برہمنوں کے ایک طبقے سپرس نے فارسی اور اسلامی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ اس دور میں ہندو اور مسلمان پُرامن طریقے پر مل کر رہتے تھے۔ اگر کبھی کبھار کوئی تنازع اٹھ کھڑا ہوتا تو اسے پنچایت میں صلح صفائی کے ذریعے حل کر لیا جاتا تھا۔

زین العابدین نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی تاج خاتون بیہقی بیگم سے ہوئی۔ ان سے زین العابدین کی دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹا کوئی نہ تھا، اس کے بعد زین العابدین نے جموں کے حکمراں کی بیٹی سے شادی کی جن سے ان کے چار بیٹے، آدم خان، حاجی خان، جسارت خان اور بہرام خان پیدا ہوئے۔ جسارت خان کا انتقال غالباً کمسنی میں ہوگیا۔ بقیہ تینوں بیٹے اپنے والد کی قائم کردہ شاندار روایات کو باقی نہ رکھ سکے۔ ان میں آپس میں تنازعات شروع ہوگئے، بلکہ انہوں نے اپنے والد کی مخالفت پر کمر باندھ لی، آخر کار حاجی خان کو زین العابدین کے بعد سربراہ نامزد کر دیا گیا۔

زین العابدین کا انتقال ۸۷۴ھ / ۱۴۷۰ء میں ہوا۔ ان کی عمر ۶۹ برس تھی۔ انہیں ان کے والد سکندر بت شکن کی قبر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کا مقبرہ زینہ کدل، پل کے قریب واقع ہے۔ یہ علاقہ زین العابدین کے نام پر بڈشاہ کہلانے لگا۔

زین العابدین کے انتقال پر ان کی رعایا کے ہر فرد کی آنکھ پُرنم تھی۔ شعرا نے ان کی یاد میں پُراثر اشعار کہے اور تاریخ دانوں نے ان کی شاندار خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ زین العابدین ایک قابل فخر حکمراں تھے۔ جن کا عہد حکومت تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

***

Marfat.com

بہلول لودھی

دین دار، منکسر مزاج اور مدبر حکمراں، انہوں نے مملکت کو پارہ پارہ ہو جانے سے بچایا

مکان کی چھت گر پڑی تھی!

ملتان کے محلے کماں گراں کی اس گلی میں کہرام بپا تھا۔ لوگ ملبہ ہٹانے میں دیوانہ وار مصروف تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ایک خاتون مکان میں موجود تھیں جو ملبہ تلے دبی ہوئی ہیں۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ خاتون امید سے تھیں اور چند دنوں بعد ان کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔

بہت سے لوگ گرے ہوئے مکان کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ملبہ ہٹا کر خاتون کو باہر نکالا گیا، لیکن خاتون کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اس موقع پر خاتون کے غم زدہ رشتے داروں نے رائے دی کہ جو ننھی سی جان خاتون کے جسم میں پل رہی تھی، اس کو تو بچانے کی کوشش کی جائے، چنانچہ ہنگامی طور پر انتظامات کیے گئے اور خاتون کا شکم چاک کر کے بچے کو نکال لیا گیا، جس میں ابھی زندگی کے آثار موجود تھے۔

یہ ایک بہت نحیف و ناتواں بچہ تھا لیکن اس وقت کسی کو بھی علم نہ تھا کہ یہی نحیف و ناتواں بچہ چند برس بعد برصغیر کے ایک بڑے حصے کا حکمراں بنے گا اور برصغیر کی مملکتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

یہ بہلول لودھی تھے جنہوں نے برصغیر میں لودھی خاندان کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مملکت میں شدید سیاسی بد نظمی کا خاتمہ کیا اور ایک مستحکم اسلامی حکومت قائم کر دی۔ تمام مؤرخین نے بہلول کی متاثر کن شخصیت اور ان کے اعلیٰ اوصاف کی تعریف کی ہے۔

اس نحیف و نزار بچے کو اس کے افسردہ اور ملول رشتے دار اپنے ساتھ لے گئے۔ مشکل یہ بھی تھی کہ چند دنوں بعد بچے کے والد ملک کالا ایک جنگ میں مارے گئے۔ بچے کے چچا سلطان شاہ نے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کرنے کا اعلان کیا۔ بچے کو لوگ پیار سے بلو کہنے لگے۔ بلو کے معنی مقامی زبان میں "تیز دوڑنے والا" ہیں۔ بلو بچپن ہی سے نہایت شوخ، ذہین اور تیز تھے۔

بلو جب بڑے ہوئے تو انہیں لوگ بلو خان کہنے لگے۔ سلطان شاہ نے ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ بلو خان نے گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ وہ افغانستان اور اس سے آگے کے علاقوں سے (جنہیں ولایت کہا جاتا تھا) گھوڑے خرید کر لاتے اور ہندوستان میں فروخت کر دیتے۔

آگے بڑھنے سے قبل بہتر ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ لودھی کون تھے اور برصغیر میں کب آئے اور بلو خان کو بہلول لودھی بننے کے لیے کن حالات سے گزرنا پڑا۔

لودھی دراصل افغانستان کے غلزئی قبیلے کی ایک شاخ کا نام ہے۔ محمود غزنوی کے برصغیر (پاک و ہند) پر حملے سے قبل لودھی قبیلے کا خاندان ملتان میں آ کر آباد ہو چکا تھا۔ یہاں ابوالفتح داؤد حکومت کرتے تھے، جو شیخ حمید لودھی کے پوتے تھے جنہوں نے یہاں سب سے پہلے سکونت اختیار کی تھی۔ تاہم اس قبیلے کو اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب تغلق خاندان سے تعلق رکھنے والے مشہور فرمانروا فیروز شاہ تغلق کے عہد میں لودھی قبیلے کے چند افراد تجارت کی غرض سے برصغیر آئے۔

تجارت کے لیے برصغیر آنے والے لودھی قبیلے کے افراد میں ایک صاحب ملک بہرام بھی تھے۔ وہ ملتان آئے اور ملتان کے حاکم ملک مردان کے پاس ملازمت کر لی۔ یہ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ تھا۔ ملک بہرام

Marfat.com

کے پانچ بیٹے تھے۔ ملک سلطان شاہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد اور ملک خواجہ۔ ملک بہرام کے انتقال کے بعد بھی ان کے پانچوں بیٹے ملتان میں مقیم رہے۔ اس دوران خضر خان ملتان کے حاکم بن گئے۔ ملک سلطان شاہ نے خضر خان کے پاس ملازمت اختیار کرلی۔ انہیں اسلام خان کا خطاب دیا گیا۔ مختلف عہدوں پر بتدریج ترقی پاتے ہوئے وہ سرہند کے حاکم بنادیے گئے۔

فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد ملک میں افراتفری اور بدنظمی پھیل گئی۔ چھ سال کی مدت میں تین تغلق حکمراں تبدیل ہوئے۔ اسی دوران ۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے برصغیر پر حملہ کیا۔ ان کے حملوں سے متعدد علاقے متاثر ہوئے جن میں دہلی بھی شامل تھا۔

وہ ۲۲ جمادی الاول ۸۰۱ھ/یکم جنوری ۱۳۹۹ء کو واپس چلے گئے اور خضر خان (حاکم ملتان) کو اپنا نائب مقرر کر گئے۔ تغلق خاندان کے چوتھے اور آخری حکمران محمود تغلق تھے جو کچھ عرصے تک تو خضر خان سے لڑتے رہے لیکن ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں محمود تغلق کا انتقال ہوگیا۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں خضر خان نے دہلی پر پھر چڑھائی کی اور دہلی کو فتح کرلیا۔

خضر خان چونکہ سید تھے اس لیے ان کی قائم کردہ حکومت سید خاندان کی حکومت کہلاتی ہے۔ یہ حکومت ۸۱۷ھ سے ۸۵۵ھ/۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک قائم رہی۔ اس دوران اس میں چار حکمراں ہوئے۔ خضر خان کی حکومت اگرچہ دہلی اور نواحی علاقوں کے علاوہ پنجاب پر بھی مشتمل تھی لیکن ان کا دور بڑا ہنگامہ خیز رہا۔ حکومت میں استحکام نہ آسکا اور شورشیں جاری رہیں۔ خضر خان کی حکومت سات سال تک قائم رہی۔ ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں خضر خان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مبارک شاہ حکمراں بنے۔ انہیں بھی کھوکھروں (گکھڑوں) کی جانب سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۸۲۹ھ/۱۴۲۵ء میں مبارک شاہ نے ابراہیم شرقی، شاہ جونپور کو شکست دی۔ تاہم سازشوں اور شورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء میں مبارک شاہ کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد خضر خان کے پوتے محمد شاہ کو حکمراں بنایا گیا۔ ان کی حکومت ایک کمزور حکومت تھی۔

ایک بار بلوخان اپنے گھوڑے لے کر محمد شاہ کے پاس جا پہنچے۔ محمد شاہ نے تمام گھوڑے پسند کیے اور انہیں خرید لیا۔ معاوضے کی ادائیگی اس طرح طے ہوئی کہ محمد شاہ نے ایک پرگنہ (ضلع) کے پورے سال بھر کا محصول بلوخان کے نام لکھ دیا۔ یہ پرگنہ سرکشوں اور باغیوں کا مرکز تھا۔ بلوخان کے ساتھیوں نے محصول وصول کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ بلوخان نے محمد شاہ سے اجازت چاہی کہ محصول کی وصولیابی کے لیے وہ اپنی مرضی سے کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ محمد شاہ نے کہا کہ اگر تم ان باغیوں کو مطیع بنالوگے تو میں وہ پرگنہ بھی تمہارے حوالے کردوں گا بلکہ جتنا مال تمہارے ہاتھ لگے گا وہ بھی تمہیں بخش دوں گا۔ چنانچہ بلوخان نے پرگنہ میں جاکر سخت کارروائی کی اور تمام سرکشوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا۔

محمد شاہ اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ انعام کے طور پر مزید چند پرگنے دے دیے۔ ملک بہلول کا خطاب دیا اور اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ بہلول سپاہی بن کر دیگر سپاہیوں کی تربیت کرنے لگے۔ ہر سال تربیت یافتہ سپاہیوں کی ایک کھیپ تیار کرکے محمد شاہ کے سامنے پیش کردیتے۔ محمد شاہ خوش ہوکر اور پرگنے، بہلول کے حوالے کردیتے۔

اس دور میں بھی بہلول کے چچا سلطان شاہ (اسلام خان) سرہند کے حاکم (گورنر) تھے۔ وہ اپنے بھتیجے بہلول سے بہت متاثر تھے اور ان سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ سلطان شاہ نے اپنے سگے بیٹوں پر بہلول کو فوقیت دیتے ہوئے اعلان کردیا تھا کہ بہلول ہی میرا جانشین ہوگا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ بہلول کی شادی بھی کردی۔ کچھ عرصے بعد سلطان شاہ کا انتقال ہوگیا۔ بہلول اپنے چچا کے جانشین ہوکر سرہند کے حاکم ہوگئے۔ ابتدا میں انہیں کچھ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد شاہ نے بھی ایک فوج بہلول کے خلاف بھیجی لیکن اس فوج نے شکست کھائی۔ اس کے بعد محمد شاہ نے سرہند اور اطراف کے علاقوں پر بہلول کی حکمرانی تسلیم کرلی اور انہیں فتح خان کا خطاب بھی دے دیا۔

محمد شاہ کی حکومت کمزور تھی چنانچہ آس پاس کے خود مختار حکمرانوں نے دہلی پر حملے شروع کردیے۔ جونپور کے حکمراں ابراہیم شاہ شرقی نے تو بہت سے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ بعض میواتی امیروں نے مالوہ کے حکمراں محمود خلجی کو دہلی پر حملے کی دعوت دے دی۔ محمود خلجی نے ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں دہلی پر چڑھائی کردی۔ محمد شاہ نے بہلول کو مدد کے لیے بلایا۔ بہلول بیس ہزار سپاہی لے کر پہنچ گئے۔ صبح سے شام تک جنگ ہوئی۔ پھر محمود کو واپس جانا پڑا کیونکہ احمد شاہ گجراتی نے مالوہ پر چڑھائی کردی تھی۔ بہلول نے مالوہ تک ان کا تعاقب کیا۔

Marfat.com

محمد شاہ سید، بہلول کی اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے بہلول کو اپنا بیٹا بنالیا اور انہیں خانِ خاناں کا خطاب دیا۔ اس کے بعد بہلول لودھی کی حکمرانی لاہور، دیپال پور، ملتان پر بھی قائم ہوگئی۔ بہلول نے ہانسی، فیروز آباد اور ناگور پر بھی قبضہ کرلیا۔

محمد شاہ سید کا انتقال ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء میں ہوا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علاؤالدین عالم شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ وہ کمزور حکمراں تھے۔ ان کے عہد میں سلطنتِ دہلی انتشار اور عدم استحکام کی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ:

۱۔ دکن، گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال میں خود مختار حکومتیں قائم تھیں، ان کے اپنے اپنے سکے رائج تھے۔

۲۔ پانی پت سے لاہور، دیپال پور اور سرہند تک بہلول لودھی کی حکومت تھی۔

۳۔ مہرولی اور میوات میں (دہلی سے سات کوس تک) احمد خان میواتی قابض تھے۔

۴۔ سنبھل سے حدودِ دہلی تک دریا خاں لودھی کی حکومت تھی۔

۵۔ کمپلا اور پٹیالی میں پرتاب سنگھ کی حکمرانی تھی۔

۶۔ بیانہ میں داؤد خان لودھی حکمراں تھے۔

۷۔ گوالیار، دھولپور اور بھدورا میں مختلف راجا حکومت کررہے تھے۔

۸۔ راپڑی اور مضافات میں قطب خاں افغان کا تسلط تھا۔

سید خاندان کے آخری حکمراں علاؤالدین عالم شاہ کی حکومت سمٹ کر صرف دہلی تک محدود رہ گئی تھی۔ اس سلطنت کی حدود ایک جانب بارہ میل تک اور دوسری جانب محض ایک میل تک تھیں چنانچہ اس زمانے میں ایک فقرہ ضرب المثل کی صورت اختیار کرگیا تھا کہ "بادشاہیِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم!" ظرفہ یہ کہ علاؤالدین عالم شاہ بدایوں چلے گئے، کیونکہ انہیں بدایوں بہت پسند تھا۔

ان حالات میں بہلول لودھی نے پیش قدمی کی اور دہلی کی اس حکومت پر قبضہ کرلیا جو بظاہر اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی سلطنت دہلی کے فرمانروا بن چکے تھے۔ اس طرح برصغیر میں لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ لودھی خاندان ۸۵۵ھ سے ۹۳۲ھ/ ۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء تک برصغیر پر حکمراں رہا۔ اس کے بعد ظہیر الدین بابر نے حکومت سنبھال کر مغلیہ خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ "مرقع افغان" میں مولوی ابرار حسین نے لکھا ہے: علاؤالدین عالم شاہ تو دراصل ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ء ہی میں حکومت سے دستبردار ہوچکے تھے اور بہلول لودھی ۱۷ ربیع الاول ۸۵۰ھ/ ۱۲ جون ۱۴۴۶ء کو سلطنتِ دہلی کے حکمران بن چکے تھے۔

بہلول لودھی نے حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے پنجاب کی جانب توجہ کی۔ انہوں نے دہلی میں اپنے بیٹے بایزید کو قائم مقام مقرر کیا اور خود ۸۵۶ھ/ ۱۴۵۲ء میں دیپال پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دیپال پور، پاک پتن سے ۲۸ میل مشرق میں تھا۔ خلجیوں کے عہد میں یہ پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ چونکہ لاہور اور ملتان کے وسط میں تھا اس لیے بیرونی حملوں کی روک تھام کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ تیمور کے حملے کے وقت یہ ملتان کے مساوی شہر تھا۔ جو عناصر بہلول لودھی کے اقتدار کے مخالف تھے، انہوں نے سید خاندان کے آخری حکمراں علاؤالدین عالم شاہ کو ترغیب دی کہ وہ بہلول کے خلاف کارروائی کریں لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ اس پر ان عناصر نے جونپور کے حکمراں محمود شرقی کو حملے پر آمادہ کیا۔ محمود شرقی نے دو لاکھ سپاہیوں اور ڈیڑھ ہزار جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی پر چڑھائی کردی۔ بہلول کو اس فوجی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ بیچ راستے ہی سے لوٹ آئے۔ فریقین کے مابین جنگ ہوئی جس میں محمود شرقی کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ جونپور واپس چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد مسلسل ۲۶ برس تک بہلول لودھی اور جونپور کے حکمرانوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔

محمود شرقی کی جانب سے اطمینان ہونے پر اب بہلول لودھی میوات کی طرف بڑھے۔ وہاں کے حکمراں احمد خان میواتی نے اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد بہلول نے سنبھل، کول، برہان آباد، بھوئیگاؤں اور راپڑی فتح کیا۔ پھر وہ اٹاوہ پہنچے۔ یہاں کے حاکم کو اپنی جگہ برقرار رکھا۔

کچھ عرصے بعد جونپور کے حکمراں محمود شرقی سے پھر اٹاوہ کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ جنگ کے بعد صلح ہوگئی۔ محمود شرقی کے انتقال کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوئے۔ دریائے سرستی کے کنارے پھر جنگ ہوئی جس میں محمد شاہ کی فوج نے پسپائی اختیار کی۔ اس دوران میں محمد شاہ کے چھوٹے بھائی حسین شرقی حکمراں بن گئے۔ ان سے چار سال کے لیے صلح ہوگئی۔ صلح کی مدت ختم ہونے پر چندوارہ کے مقام پر حسین شرقی سے پھر جنگ ہوئی جو سات دن تک جاری رہی۔ آخر

Marfat.com

تین برس کے لیے صلح ہوگئی۔ اس میعاد کے اختتام پر حسین شرقی نے ایک لاکھ سپاہیوں اور ایک ہزار ہاتھیوں کے ساتھ دہلی پر چڑھائی کردی۔ بہلول نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہوئی لیکن ۸۸۳ھ / ۱۴۷۸ء میں حسین شرقی نے پھر جنگ چھیڑ دی۔ بہلول نے کنپل، شمس آباد، سکیت، مارہرہ وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ حسین شرقی سے مزید جنگیں ہوئیں جن میں بہلول کو کامیابی حاصل ہوئی۔ حسین گوالیار کے راستے فرار ہوئے۔

بہلول نے اٹاوہ پر قبضے کے بعد حسین شرقی کے لشکر پر چڑھائی کردی جو ان دنوں کالپی میں تھے۔ دریائے جمنا کے کنارے جنگ کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر حسین شرقی جونپور کی طرف چلے گئے۔ بہلول نے ان کا تعاقب کیا۔ حسین بہرائچ کے راستے قنوج پہنچے، قنوج کے نزدیک ایک ندی آب رہب کے کنارے جنگ ہوئی۔ حسین کو پھر شکست ہوئی۔ ان کی بیوی خوترہ (خونزا) جو سلطان علاءالدین کی بیٹی تھیں، گرفتار ہونے والوں میں شامل تھیں۔ بہلول نے خوترہ کے ساتھ بہت عزت کا سلوک کیا اور انہیں حسین شرقی تک بحفاظت پہنچا دیا۔ اس کے بعد حسین شرقی سے مزید سات معرکے ہوئے۔ حسین آخری بار شکست کھا کر بہار کی طرف چلے گئے۔ بہلول لودھی نے ۸۹۳ھ / ۱۴۸۸ء میں جونپور کی سلطنت کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔ ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی نے جونپور کے سلطنت دہلی میں انضمام کا سال ۸۸۴ھ / ۱۴۷۹ء درج کیا ہے۔

بہلول لودھی نے رانا اودے پور کو بھی شکست دی اور اجمیر کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح اپنے ۳۸ سالہ دور حکومت میں بہلول لودھی نے کڑہ، بہرائچ، لکھنؤ، کالپی، دوآبہ کا تمام حصہ، اٹاوہ، گوالیار، اودے پور، سنبھل، میوات، کول (علی گڑھ) اور برہان آباد کو پھر سے سلطنتِ دہلی میں شامل کرلیا اور پنجاب میں بھی مستحکم اقتدار قائم کردیا۔

بہلول لودھی نے اس وسیع سلطنت کو اپنے بیٹوں اور رشتے داروں میں تقسیم کردیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہلول نے سلطنت حاصل کرکے اپنے سابق وطن 'لڈہ' کے قبائل کو اس وعدے کے ساتھ مدعو کیا کہ ان کی انفرادی آزادی برقرار رہے گی۔ لہٰذا سلطنت مختلف قبائل میں تقسیم ہوگئی۔ جونپور میں انہوں نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو مقرر کیا۔ کڑہ مانک پور عالم خان کو دیا۔ بہرائچ میں اپنے بھانجے شیخ قمر علی کا تقرر کیا۔ لکھنؤ اور کالپی میں خواجہ اعظم ہمایوں کو حکمراں بنایا۔ بدایوں میں اپنے عزیز خان جہاں کو مقرر کیا اور دوآبہ کا علاقہ اپنے چھوٹے بیٹے نظام خان کو دیا۔ یہی نظام خان سکندر لودھی کے لقب سے بہلول لودھی کے بعد مملکت کے فرمانروا بنے۔

بہلول لودھی نے ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء میں گوالیار کے سرکش راجا کے خلاف فوج کشی کی۔ راجا نے اسی لاکھ تنکے دے کر اطاعت کا یقین دلایا۔ بہلول لودھی جب اس مہم سے واپس دہلی لوٹ رہے تھے تو راستے میں ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ سکیت کے نواحی قصبے بھداونی (اسے تلاولی بھی لکھا گیا ہے) میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے سکندر لودھی نے میت دہلی بھیج دی جہاں انہیں سپردِ خاک کردیا گیا۔ بعد میں ان کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ یہ مقبرہ حضرت روشن چراغ دہلی" کی درگاہ کے عقب میں واقع ہے۔ سکندر لودھی کے بنوائے ہوئے اس مقبرہ کی عمارت بہت سادہ ہے لیکن اس کی مجموعی ہیئت خوبصورت ہے۔ نیچے کی سمت بارہ در ہیں اور اوپر پانچ برج تعمیر کیے گئے ہیں۔

بہلول لودھی کے نو لڑکے تھے، جن میں سے نظام خان کو انہوں نے اپنا جانشین مقرر کیا۔ وہ سکندر لودھی کے لقب سے سلطنتِ دہلی کے حکمراں بنے اور نہایت عمدگی کے ساتھ حکومت کی۔

تمام مورخین نے بہلول لودھی کی عمدہ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے بلند کردار، بردباری، شرافتِ نفس، رحم دلی اور احکامِ شریعت کی پابندی کی تعریف کی ہے۔ بہلول لودھی ایک بڑی مملکت کے سربراہ ہونے کے باوجود بے حد منکسر المزاج انسان تھے۔ وہ شاہی شان و شوکت کو پسند نہ کرتے تھے اور شاہانہ رکھ رکھاؤ کے قائل نہ تھے حتیٰ کہ وہ نجی یا سرکاری محفلوں میں سربراہِ مملکت کے لیے مخصوص تخت پر بھی نہیں بیٹھتے تھے اور اپنے امرا، سرداروں اور مشیروں کے ساتھ فرش پر کام کرتے تھے۔ وہ اپنے امرا اور ادنیٰ سپاہیوں کے ساتھ برادرانہ اور رحم دلانہ برتاؤ کرتے تھے۔ وہ عیادت اور تعزیت کے لیے لوگوں کے گھروں پر چلے جایا کرتے تھے۔ اپنے دسترخوان پر ہر کسی کو شریک کرلیتے تھے۔ وہ خود سادہ غذا کھایا کرتے تھے تاہم اپنے دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو پُرتکلف کھانے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے دروازے پر کوئی دربان نہ تھے۔ جب ان سے کوئی ملنے کے لیے آتا تھا تو وہ اسے کھڑا نہ رہنے دیتے تھے بلکہ اپنے قریب ہی بیٹھنے کی جگہ دے دیتے تھے۔ بہلول جب بھی اپنے ماتحتوں کو خط لکھتے تھے تو انہیں

Marfat.com

"مسندِ عالی" لکھتے تھے۔

بہلول لودھی کی حکومت سے قبل یہ رسم رائج تھی کہ جب کسی فرد کا انتقال ہو جاتا تھا تو اس کے سوئم کے دن اس کے گھر والے تعزیت کے لیے آنے والوں میں شربت، پان اور مصری تقسیم کرتے تھے۔ بہلول نے اس رسم کو بند کروادیا، اور صرف پھول پیش کرنے کی رسم جاری کی۔ غالباً اسی لیے دہلی میں سوئم کو پھول کہا جانے لگا۔

بہلول لودھی دینی مزاج کے حکمراں تھے۔ وہ شریعت کی پابندی کی پوری کوشش کرتے تھے۔ تمام نمازیں باقاعدگی کے ساتھ مسجد میں ادا کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت جب دشمن کی فوج پر نظر پڑتی تو فوراً گھوڑے سے اتر آتے اور استخارہ کرتے تھے اور مسلمانوں کی خیریت کے لیے دعائیں کرنے لگتے تھے۔ انہیں جب بھی کسی دلیر شخص کے بارے میں علم ہوتا وہ اسے بلا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

بہلول لودھی نہایت علم دوست انسان تھے۔ علما اور فضلا کی ہمنشینی پسند کرتے تھے۔ اہلِ علم کی خدمت کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ بہلول کو علوم اسلامی میں اسلامی قانون کے علم سے خاص دلچسپی تھی، وہ اکثر اسلامی قوانین پر کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔ بہلول لودھی نے متعدد مدارس اور مساجد میں خطیبوں اور موذنوں کا اور مدارس میں اساتذہ کا تقرر خود کیا اور ان کے اخراجات بھی حکومت کی جانب سے برداشت کیے۔ بہلول لودھی نے بدایوں میں بھی مساجد، مقبرے اور مدارس قائم کیے۔ اس طرح دہلی سے سو میل کے اندر علم کا ایک اور مرکز قائم ہو گیا۔

بہلول لودھی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایک بکھری ہوئی غیر مربوط اور افراتفری کا شکار حکومت کو تباہی سے بچالیا اور اسے ایک مرکز پر یکجا کر کے ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ ان کی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بعد ان کے بیٹے سکندر لودھی کا دور نہ صرف یہ کہ خوش حالی بلکہ مسلم ثقافت کی نشاۃ ثانیہ کی نوید لایا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں غیر مسلم افراد خصوصاً ہندوؤں کو اسلامی علوم و فنون حاصل کرنے سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی اور یہ علوم و فنون ان کے پاس بھی عام ہو گئے۔

بہلول لودھی شاہانہ کروفر کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ بے حد فیاض انسان تھے۔ ان کے در سے محتاج اور مساکین کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے تھے۔ وہ اپنی مملکت میں نادار اور مستحق افراد کے حالات کی ہمیشہ تحقیق کرواتے رہتے تھے اور جہاں کسی ضرورت مند کے بارے میں علم ہوتا اس کی مدد کرواتے تھے۔ بہلول نے اپنے لیے کبھی خزانہ جمع نہ کیا۔ انہیں محاصل سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اسے وہ اپنے ماتحت افسران اور کارکنوں پر صرف کر دیتے تھے۔

بہلول انصاف پسند حکمراں تھے، ان کے دور میں ظلم اور ناانصافی کی شکایتیں بہت کم ملتی ہیں۔ بہلول لودھی خود بھی مقدمات کی سماعت کیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انکسار اس حد تک تھا کہ وہ ناراض امرا کی ناراضگی دور کرنے کے لیے ان کے گھروں پر چلے جایا کرتے تھے۔ بہلول کے مزاج میں تحمل بھی بلا کا تھا۔ ان کی نرم دلی اور رواداری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جونپور کے حکمراں حسین شرقی نے دہلی پر کئی بار حملے کیے اور پھر جنگوں میں شکست کھا کر کئی بار صلح کی درخواست کی اور ہر بار بہلول نے اسے قبول کر لیا۔ بہلول انتہا کے نرم دل اور بردبار تھے اور جنگ میں کبھی پہل نہیں کرتے تھے مگر جب جنگ شروع ہوتی تو وہ انتہائی دلیری سے لڑتے۔ وہ کبھی کوئی معرکہ نہیں ہارے۔

بہلول عالم اسلام کی مرکزیت اور یکجائی کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں جو سکے رائج کیے ان پر "نائب امیر المومنین" کے الفاظ کندہ کروائے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو عباسی خلیفہ کا نائب تصور کرتے تھے۔ ان کے دور میں ایک سکہ "بہلولی" کے نام سے رائج ہوا۔ اس کا نام بہلول لودھی کے نام پر ہی رکھا گیا تھا۔ ان کے دور میں طلائی، نقرئی اور تانبے کے مختلف اوزان کے سکے جاری کیے گئے۔ سکوں پر کلمہ طیبہ کے علاوہ سلطان کے القاب اور دارالضرب (ٹکسال) کا نام بھی درج ہوتا تھا۔

بہلول لودھی نے بنگال کی سرحد تک جونپور کی حکومت اور شمالی اور وسطی ہند کو فتح کر لیا تھا چنانچہ ان کی تعمیر کردہ عمارتیں نہ صرف دہلی، مہرولی، خیرپور، سیری، بلکہ سرہند، سکندرہ، آگرہ، بیانہ، دھولپور اور سنبھل میں بھی پائی جاتی ہیں۔

بہلول لودھی کے عہد کی مساجد اور مقبروں میں بلند گنبد تعمیر کیے گئے تھے لیکن وہ گاؤدم نہ ہوتے تھے۔ ان تعمیرات کو خالص وسط ایشیائی طرز کے کتبوں اور گہری کھدی ہوئی منقوش مسالے دار گچ کی گل کاری کے حاشیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کاشی کاری کی

Marfat.com

اینٹوں، طاقچوں اور عجیب و غریب وضع کے کنگروں کے استعمال سے ان کی تزئین کی گئی تھی۔ مقبرے ہشت پہلو ہوتے تھے جو کھلے محرابی بر آمدے سے گھرے ہوئے ہوتے تھے۔ مقبروں کے گنبد تو نیم کروی شکل کے ہوتے تھے لیکن ان کے بھاری پن کو کم کرنے کے لیے برج کے اطراف میں چھوٹی چھتریاں بنائی گئی تھیں۔

بہلول لودھی ہی کے دور میں شہر پٹیالہ بسایا گیا۔ پنجاب پر چونکہ کابل اور بلخ کے منگول حکمراں بار بار حملے کرتے رہتے تھے، اس لیے یہ علاقہ ویران ہو گیا تھا اور زمین کی پیداوار بہت کم ہو گئی تھی۔ بہلول لودھی کے زمانے میں جب تاتار خان لاہور کے صوبے دار مقرر ہوئے تو رائے رام دیو بھٹی نے پورے پنجاب کو ۹ لاکھ ٹکے پر لے لیا۔ کچھ عرصے بعد رام دیو بھٹی مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء میں تاتار خان کی اجازت سے ایک ویران مقام پر شہر پٹیالہ کی بنیاد ڈالی۔

پٹیالہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سے قبل تاتار خان نے ایک اور جگہ شہر کو آباد کرنا چاہا تھا لیکن کسی وجہ سے فیصلہ تبدیل کر کے دوسری جگہ شہر کو آباد کیا۔ پنجابی میں "پٹے" کے معنی "مبادلہ" کے ہیں اس لیے جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے شہر کا نام "پٹالہ" پڑ گیا جو بعد میں "پٹیالہ" ہو گیا۔ متعدد گاؤں اطراف میں آباد تھے اور زرعی پیداوار بڑھانے کے امکانات تھے چنانچہ اسے پرگنہ قرار دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں پٹیالہ سے حاصل ہونے والی مالگزاری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

بہلول لودھی علماء کرام کی عزت کرتے تھے۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد جب پنجاب میں نظم حکومت شدید متاثر ہو گیا تو سہروردیہ سلسلے کے مشائخ نے شیخ بہاالدین زکریاؒ کی خانقاہ کے سجادہ نشین شیخ یوسفؒ کو ملتان کا حاکم نامزد کر دیا، لیکن لنگاہ قبیلے نے ان کی مخالفت کی اور انہیں اقتدار سے ہٹا دیا۔ شیخ یوسفؒ چند رفقا کے ساتھ دہلی آ گئے۔ بہلول لودھی نے انہیں نہایت احترام سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی اور اپنی ایک بیٹی کی شادی شیخ یوسفؒ کے صاحب زادے شیخ عبداللہ سے کر دی۔

شیخ یوسفؒ نے بہلول کو مشورہ دیا کہ وہ لنگاہ قبیلے کے خلاف کوئی کارروائی کریں تاہم بہلول مصلحت کے تحت ایسا کرنے سے گریز کرتے رہے۔ جب لنگاہ قبیلے کے افراد میں آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو بہلول نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ گو کہ اس حملے کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا لیکن سہروردی علما اور اس سلسلے سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کی نظر میں بہلول کا مقام بہت بلند ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سہروردیہ کے تذکروں میں بہلول لودھی کا ذکر احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

شیخ سماالدینؒ سہروردی کا شمار بہلول لودھی کے عہد کے مشہور ترین مشائخ میں ہوتا تھا۔ جب ملتان میں لنگاہ قبیلے کے افراد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو شیخ سماالدینؒ دہلی تشریف لے آئے۔ وہ حکمرانوں سے زیادہ میل جول پسند نہ کرتے تھے لیکن بہلول لودھی کے اعلیٰ کردار کے وہ بھی معترف تھے۔ بہلول ان کے پاس آیا کرتے تھے اور مختلف امور میں ان سے رہنمائی کی درخواست کرتے تھے۔ شیخ سماالدینؒ نے بہلول لودھی کو ان کی حکومت مستحکم بنانے میں مدد بھی دی۔

ایک بار بہلول لودھی شیخ سماالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے بہلول لودھی کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ بہلول لودھی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی:

"حضرت! اتنے سارے گناہوں کے باوجود میں اپنے دل میں درویشوں کی محبت پاتا ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان فقرا کی محبت کی برکت سے مجھے نجات عطا فرمائے گا۔"

***

Marfat.com

محمود شاہ بیگڑہ

سلطنتِ گجرات کے خدا ترس، علم دوست، دلیر اور منتظم حکمراں

اس کا کوئی قصور نہ تھا!

وہ ملک کے سربراہ کا ایک ادنیٰ عہدیدار تھا۔ سربراہِ مملکت کے ساتھ شکار پر گیا ہوا تھا۔ راستے میں حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار بہاالدین نے اسے قتل کر دیا اور خود فرار ہو گئے۔

قتل کی اطلاع بہت جلد سربراہِ مملکت تک پہنچ گئی۔ انہیں بہت افسوس ہوا، وہ سخت برہم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے دو امیروں عماد الملک اور عضد الملک کو حکم دیا کہ قاتل کو فوراً گرفتار کیا جائے۔

دونوں امیروں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر بہاالدین پکڑے گئے تو وہ سزائے موت سے نہ بچ سکیں گے۔ انہوں نے ایک سازش کی کہ بہاالدین کو گرفتار کر کے پیش کرنے کی بجائے دو معمولی سپاہیوں کو راضی کر لیا کہ وہ سربراہِ مملکت کے پاس جا کر اقرار کر لیں کہ قتل انہوں نے کیا تھا۔ دونوں امیروں نے سپاہیوں کو یقین دلایا کہ سلطان بہت رحم دل ہیں وہ معاف کر دیں گے اور پھر ہم بھی تمہاری سفارش کریں گے۔

دونوں سربراہِ مملکت کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپنے "جرم" کا اقرار کیا۔ سربراہِ مملکت نے علما کرام اور مفتیوں کا فتویٰ لیا۔ اور دونوں سپاہیوں کو سزائے موت دینے کا حکم دے دیا۔ دونوں سپاہیوں کو ناکردہ جرم کی سزا موت کی شکل میں مل گئی۔

سازش زیادہ دن تک چھپی نہ رہ سکی۔ سلطان کو جلد ہی علم ہو گیا، ان کی برہمی انتہا کو پہنچ گئی۔ سلطان نے علما سے فتویٰ لیا اور دونوں امرا کو بھی سزائے موت دے دی گئی۔

سربراہ مملکت کہتے تھے "ان دو امرا نے دو مسلمانوں کو ناحق قتل کروایا۔ اگر ان کا قصاص نہ ادا کیا گیا تو میں قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

یہ سربراہ تھے سلطنتِ گجرات کے شجیع، لائق اور خدا ترس حکمراں محمود شاہ بیگڑہ، جن کا ۵۲ سالہ دور حکومت نہ صرف سلطنتِ گجرات کا عہدِ زریں کہلاتا ہے بلکہ برِ صغیر کی تاریخ میں اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث نمایاں اور تابناک حیثیت کا حامل ہے۔

گجرات کا لفظ بھارت میں اس علاقے کے لیے بولا جاتا رہا ہے جہاں گجراتی زبان بولی جاتی ہے، تاہم جب یہاں مسلمان حکمراں تھے تو اس میں صرف وہی علاقہ شامل نہ تھا جسے اس دور میں "سورٹھ" کہتے تھے (اب اسے "سورت" کہا جاتا ہے) بلکہ جنوب کی طرف بمبئی، مشرق میں خاندیس اور مالوہ کا ایک حصہ اور راجپوتانہ کا جنوب مغربی گوشہ اور انہلواڑ بھی گجرات کے حصے سمجھے جاتے تھے۔

گجرات کے علاقے میں مسلمانوں کے قدم سب سے پہلے محمود غزنوی کے زمانے میں ۴۱۶ھ / ۱۰۲۴ء میں پہنچے۔ ۶۹۸ھ / ۱۲۹۹ء میں علاالدین خلجی نے اس سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء تک یہاں خلجی اور تغلق حکمرانوں کے مقرر کردہ عہدے دار حکومت کرتے رہے۔ فیروز شاہ تغلق کا دورِ حکومت ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء میں ختم ہوا تو ان کے بیٹے محمد شاہ تغلق نے مملکت کی باگ ڈور سنبھالی۔ انہوں نے ۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء میں ظفر خان کو گجرات کا حاکم مقرر کیا۔ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۷ء میں ظفر خان نے سلطنتِ دہلی سے الگ ہو کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنا لقب مظفر شاہ رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی پر امیر تیمور کی فوجوں نے یلغار کر دی تھی۔

گجرات کی حکومت ۸۱۴ھ / ۱۴۱۱ء میں ظفر خان کے پوتے احمد شاہ کو ملی۔ خود مختار سلاطین گجرات کا دور صحیح معنوں میں یہیں سے

Marfat.com

شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ۱۷۰ برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران ۱۴ سلاطین نے حکومت کی۔ احمد شاہ جو احمد اوّل بھی کہلاتے ہیں، بہت اچھے حکمراں تھے، احمد آباد ان کا ہی بسایا ہوا ہے۔ محمود شاہ بیگڑہ، سلطنت گجرات کے آٹھویں حکمران ہیں۔

محمود شاہ کے نام کے ساتھ "بیگڑہ" کیوں لگایا جاتا ہے؟ مختلف تاریخ دانوں نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ چونکہ محمود شاہ نے دو اہم گڑھ یعنی جونا گڑھ اور پاوا گڑھ فتح کیے تھے اس لیے ان کے نام سے کے ساتھ "بیگڑہ" کا لفظ شامل کر دیا گیا یعنی "دو گڑھ"۔ گجراتی زبان میں "دو" کے لیے "بے" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

محمود شاہ بیگڑہ کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے، تاہم ان کا انتقال رمضان المبارک ۹۱۷ھ / نومبر ۱۵۱۱ء میں ہوا اور ان کی عمر ۶۹ سال بتائی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا سنہ پیدائش ۸۴۶ھ / ۱۴۴۲ء بنتا ہے۔

محمود شاہ کو ۸۶۶ھ / ۱۴۶۱ء میں دکن کے نظام شاہ بہمنی کا پیغام موصول ہوا جس میں مالوہ کے محمود خلجی کی شکایت کی گئی تھی کہ وہ دکن کی بہمنی حکومت کو پریشان کر رہے ہیں۔ محمود شاہ خود لشکر لے کر گئے۔ محمود خلجی میدان چھوڑ گئے۔ ۸۶۷ھ / ۱۴۶۲ء میں محمود خلجی نے پھر دکن پر فوج کشی کی۔ بہمنی سلطان نے محمود بیگڑہ سے مدد مانگی۔ محمود شاہ بیگڑہ پھر فوج لے کر دکن کی سمت روانہ ہوئے۔ محمود خلجی نے ان کی آمد کی خبر سنی تو فوراً واپس چلے گئے۔ محمود شاہ بیگڑہ نے واپس پہنچ کر محمود خلجی کو خط لکھا کہ: "بغیر کسی وجہ کے مسلمانوں کے ملکوں کو تباہ و برباد کرنا مذہب اسلام کے قوانین کے سراسر خلاف ہے لیکن اگر مذہب اور اخلاق کو نظر انداز کر کے ایسی حرکت کی جائے تو پھر میدانِ جنگ سے آنکھیں چرا کر بھاگ نکلنا جرأت و مردانگی کے خلاف ہے۔"

محمود شاہ نے ۸۶۹ھ / ۱۴۶۴ء میں گجرات اور مالوہ کے درمیان واقع قلعے باور پر چڑھائی کی۔ اس قلعے پر ایسے راجا کی حکمرانی تھی جس نے ڈاکوؤں کے گروہوں کو مختلف راستوں پر متعین کر رکھا تھا۔ محمود شاہ نے قلعے پر قبضے کے بعد تمام خزانے ضبط کر لیے، پھر راجا کو اس کی حکومت واپس کر دی۔

محمود بیگڑہ نے گرنار کا قلعہ بھی فتح کیا جو ایک بلند پہاڑ پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کے اطراف بھی کئی پہاڑ ہیں جن میں متعدد درّے ہیں۔ ان میں سے ایک درۂ مہابلہ ہے جس پر راجا مندلک کی حکمرانی تھی۔ محمود بیگڑہ نے گرنار پر فوج کشی کر دی۔ راجپوتوں نے درّے کی حفاظت کی بڑی کوشش کی لیکن درّہ مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ رائے مندلک نے امان طلب کی۔ محمود شاہ بیگڑہ واپس چلے گئے۔ ۸۷۲ھ / ۱۴۶۷ء میں محمود شاہ کو اطلاع ملی کہ رائے مندلک خود کو خود مختار بادشاہ سمجھنے لگا ہے۔ ۸۷۴ھ / ۱۴۶۹ء میں محمود شاہ بیگڑہ نے گرنار اور جونا گڑھ کے قلعے فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ خاصے عرصے تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۸۷۵ھ / ۱۴۷۰ء میں راجا مندلک نے جونا گڑھ کا قلعہ محمود بیگڑہ کے حوالے کر دیا، اس کے بعد راجا کے ساتھیوں نے ڈکیتیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ محمود شاہ لشکر لے کر گرنار پہنچ گئے۔ جنگ کے بعد رائے مندلک نے گرنار کا قلعہ بھی محمود شاہ بیگڑہ کے حوالے کر دیا، جو تقریباً ہزار برس سے رائے مندلک کے خاندان کے پاس تھا۔ رائے مندلک نے اسلام قبول کر لیا۔ محمود نے انہیں خان جہاں کا خطاب دیا۔

محمود شاہ بیگڑہ نے ۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں رَن کچھ عبور کیا اور سندھ میں داخل ہو گئے تاکہ جام نندہ نظام الدین کو باغیوں سے نجات دلائیں۔ اس بغاوت کو کچلنے کے بعد واپسی پر وہ دوارکا کی بندرگاہ جا پہنچے جہاں راجا بھیم کی سرپرستی میں ڈاکوؤں نے طوفان مچا رکھا تھا۔ راجا بھیم کو گرفتار کر کے سزائے موت دے دی گئی اور دوارکا میں ایک مسلمان حاکم مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں محمود نے مالابار کے بحری لٹیروں کے خلاف بھی کامیاب کارروائی کی جنہوں نے کھمبایت کے ساحل پر لوٹ مار مچا رکھی تھی۔

انہی دنوں محمود شاہ کو اطلاع ملی کہ سندھ کی سرحد پر کچھ کے علاقے میں مچھیروں نے بڑے پیمانے پر رہزنی شروع کر دی ہے۔ ۸۷۹ھ / ۱۴۷۴ء میں محمود شاہ نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور کچھ کی طرف روانہ ہو گئے یہ سفر انہوں نے بہت تیزی سے طے کیا۔ محمود شاہ کی آمد کی خبر سن کر مچھیروں پر ہیبت طاری ہو گئی۔ انہوں نے سامنے آ کر معافی مانگی۔ محمود شاہ نے انہیں معاف کر دیا۔ ان لوگوں کو دین کا بالکل علم نہ تھا۔ محمود شاہ نے ان میں سے چند کو ساتھ لیا۔ احمد آباد لے کر آئے اور مسلمان علمائے کرام کے حوالے کر کے درخواست کی کہ انہیں دین کا علم سکھائیں۔

محمود شاہ نے ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء میں چمپانیر کے قلعے پر حملے کی تیاری کی۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ پر واقع تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور بلند پہاڑ

Marfat.com

پر ایک اور قلعہ پاوا گڑھ تھا۔ دونوں قلعوں پر رائے بناہی کی حکومت تھی۔ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور عرصے سے ڈاکوؤں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ صفر ۸۸۸ھ / مارچ ۱۴۸۳ء میں محمود فوج لے کر چمپانیر پہنچے۔ کئی دن تک لڑائی ہوئی، بالآخر ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں چمپانیر فتح ہو گیا۔ محمود شاہ نے اس شہر کے قریب نیا شہر محمد آباد بسایا۔

سنہ ۹۱۳ھ / ۱۵۰۷ء میں پرتگیزیوں نے گجرات پر چڑھائی کر دی۔ وہ مسالوں اور دیگر اشیا کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے اور کھمبایت اور دوسری بندر گاہوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بحری طاقت بہت بڑھالی تھی اور بحری قزاقی شروع کر دی تھی جس سے مصر اور ہندوستان کی تجارت بند ہو گئی تھی۔

محمود شاہ نے پرتگیزیوں کے خلاف مصر کے مملوک حکمران ملک قانصوہ غوری سے اتحاد کر لیا۔ مصری بیڑا، امیر حسن کی قیادت میں گجرات کے ساحل پر پہنچا۔ محمود شاہ بیگڑہ کی بحریہ کے سربراہ ملک ایاز کی قیادت میں کئی جنگی جہاز مصری جہازوں سے جا ملے۔ دو دن تک "چیول" کے مقام پر لڑائی جاری رہی جس میں پرتگیزی بیڑے کا قائد ڈوم لورنکو مارا گیا، تاہم ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں پرتگیزی فوج کو کامیابی ہوئی جس کے بعد محمود شاہ بیگڑہ نے پرتگیزوں کو "دیو" کے مقام پر اپنا کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دی۔

محمود بیگڑہ کی ان بروقت فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں پورے بحیرۂ عرب میں امن و امان قائم ہو گیا۔ تجارت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ان کے دور میں گجرات کے تحت کام کرنے والی بندر گاہوں کی تعداد ۸۴ تھی۔ ان بندر گاہوں پر مالِ تجارت سے لدے ہوئے جہاز کھڑے رہتے تھے اور ایران، بغداد، یمن، حبشہ اور مصر کے تاجر موجود رہتے تھے۔

محمود بیگڑہ اپنی سلطنت میں بلاوجہ توسیع پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اگر کسی علاقے پر حملہ کیا تو اس کی وجہ اس علاقے کے لوگوں یا حکمرانوں کی ناپسندیدہ کارروائیاں تھیں یا عوام الناس کے لیے وہ حکمران تکلیف کا باعث بن رہے تھے۔ تاہم محمود بیگڑہ کے عہد میں سلطنتِ گجرات کو خاصی وسعت ملی۔ ان کی سلطنت کی حدود مانڈو کی سرحدوں سے سندھ تک، پھر برہان پور سے برار اور دریائے نربدا اور راجپوتانہ کی طرف کمبھل گڑھ اور چتوڑ تک اور سمندر کی طرف چیول کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی سلطنت میں یہ علاقے شامل تھے: ناگور، جالور، نذر باد، سلطان پور، تھانہ، دھولکا، پٹن، بڑودہ، احمد آباد، محمود آباد، محمد آباد، مصطفی آباد، بھروچ، کروانچ، راندھر (سورت)، کھمبایت، احمد نگر، مہائم (بمبئی)، جھالا واڑ، داہود، خاندیس، چمپانیر، جونا گڑھ، دوارکا، دیو اور دمن۔ اس کے علاوہ کاٹھیا واڑ، کانٹا کی غیر مسلم ریاستیں مثلاً ریڈر، راج پیلا وغیرہ سلطنتِ گجرات کی باج گزار تھیں۔

محمود بیگڑہ، کشمیر کے حکمراں زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء)، سندھ کے جام نظام الدین (۱۴۶۰ء تا ۱۵۰۹ء)، بنگال کے حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۱۹ء) اور بہمنی سلطنت کے محمود گاواں (۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۱ء) کے ہم عصر تھے۔ اسی زمانے میں دہلی کی سلطنت پر سکندر لودھی، (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء)، عثمانی سلطنت پر محمد فاتح (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) اور ہرات کی تیموری سلطنت پر حسین بائیقرا (۱۴۶۷ء تا ۱۵۰۶ء) حکومت کر رہے تھے۔ سکندر لودھی اور محمود بیگڑہ کے درمیان تو تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ جونپور، دہلی، بنگال اور کشمیر کے علاوہ ایران، روم، مصر اور یورپ کے سفیر محمود بیگڑہ کے پاس آیا کرتے تھے۔

محمود شاہ بیگڑہ نے کئی نئے شہر بسائے۔ احمد آباد سے جنوب مشرق میں تقریباً ۷۸ میل کے فاصلے پر ہندوؤں کا ایک قدیم شہر چمپانیر واقع تھا۔ جب محمود بیگڑہ نے اس شہر کو ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں فتح کیا تو انہوں نے اس شہر کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام محمد آباد رکھا۔ انہوں نے اس شہر کو شہر مکرم کا خطاب دیا۔ یہ شہر ۵۰ سال تک گجرات کا دار الحکومت رہا لیکن اب یہ ویران ہو چکا ہے اور اس کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔

محمود بیگڑہ کے ایک عہدے دار حاجی بہاالدین نے ایک شہر حاجی پور آباد کیا اور محمود کے ایک اور عہدے دار دریا خان نے دریا پور کے نام سے ایک شہر بسایا۔

محمود بیگڑہ نے احمد آباد کو بڑی ترقی دی۔ ان کے دور میں شہر کو وسعت ملی۔ یہاں عالی شان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ محمود شاہ بیگڑہ نے احمد آباد سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر نیا شہر محمود آباد کے نام سے تعمیر کروایا۔ دونوں شہروں کو ملانے والی شاہراہ کی دونوں جانب اس طرح آبادی ہو گئی کہ محسوس ہوتا تھا یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی شہر ہے۔

Marfat.com

محمود بیگڑہ نے ۸۹۲ھ /۱۴۸۷ء میں احمد آباد کے گرد ایک فصیل بنوائی جس کا محیط چھ میل کا تھا۔ اس میں ۱۸۹ برج اور چھ ہزار کنگرے تھے۔ پانچ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ فصیل آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ ابتدا میں فصیل کے ۱۲ دروازے تھے، اب ان میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔ احمد آباد میں دہلی دروازے کے قریب ایک بہت خوبصورت مسجد ۸۹۷ھ / ۱۴۹۲ء میں تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد محمود بیگڑہ کے ایک معتمد امیر محافظ خان کے نام پر مسجد محافظ خان کہلاتی ہے۔

احمد آباد بہت صاف ستھرا شہر تھا۔ مؤرخ فرشتہ کے مطابق شہر کی سڑکیں اتنی کشادہ تھیں کہ ۱۰ گاڑیاں آسانی سے پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں۔ یہ سڑکیں پتھر کی تھیں۔

محمود بیگڑہ کے طویل عہدِ حکومت میں تعمیرات کے اعتبار سے بھی بہت کام ہوا۔ جب انہوں نے ۸۸۹ھ / ۱۴۸۴ء میں چمپانیر کے قریبی قلعے پاواگڑھ کو فتح کرنے کے بعد چمپانیر کو فتح کیا تو نیا شہر محمد آباد بسا کر اس کے ارد گرد ایک بہت مضبوط فصیل بنوائی اور ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ محمود بیگڑہ نے پاواگڑھ کے مقابل چٹان کے سرے پر ایک سلسلہ وار سات منزلہ محل تعمیر کروایا۔ اس محل کی اب صرف نچلی منزل باقی رہ گئی ہے۔ فصیل کے سوا بقیہ تمام عمارتوں کا طرزِ تعمیر مقامی ہے۔ محمود نے پاواگڑھ کی چوٹی پر مستطیل سطح مرتفع پر پتھر کا ایک قلعہ "مولیہ قلعہ" کے نام سے تعمیر کروایا۔ اوپر چڑھتے ہوئے محمد آباد (چمپانیر) کے کھنڈر نظر آتے ہیں، جن میں جامع مسجد نیلا گنبد، دیگر مساجد اور کئی حوض دکھائی دیتے ہیں۔ اس شہر کے تاریخی آثار میں جامع مسجد انتہائی خوب صورت فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ مرکزی گنبد کے نیچے ایک دوسرے کے روبرو ستونوں کی تین قطاریں ہیں جن کے درمیان سنگ تراشی کر کے بالا خانے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے ۱۷۲ ستون ہیں جنہیں اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان پر گیارہ بڑے بڑے گنبد ہیں۔ یہ مسجد ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں تعمیر ہوئی تھی۔

محمود شاہ بیگڑہ کو احمد آباد کا قریبی شہر سرکھیج بہت پسند تھا۔ ایک بڑے عالم شیخ احمد کھتو کا مقبرہ اسی شہر میں واقع ہے۔ محمود شاہ نے سرکھیج میں کئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان میں سید عثمانؒ کا مقبرہ بھی قابلِ ذکر ہے جسے محمود بیگڑہ نے ۸۶۴ھ / ۱۴۶۰ء میں تعمیر کروایا تھا۔ محمود شاہ نے شہر میں حرم اور محل بھی بنوائے۔ یہ دونوں عمارتیں گو کہ اب ویران ہو چکی ہیں لیکن ان کے برآمدوں، شہ نشینوں اور طرزِ تعمیر سے پتا چلتا ہے کہ دونوں عمارتوں میں خنکی کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ محمود شاہ بیگڑہ نے سرکھیج میں ساڑھے سترہ ایکڑ کی ایک حسین جھیل بھی بنوائی، جس کے جنوب مشرق میں شیخ احمد کھتو کا مقبرہ ہے۔ مقبرے کے سامنے محمود بیگڑہ نے اپنے لیے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے مقبرے تعمیر کروائے۔

احمد آباد کے قریب ایک گاؤں وتوا میں سید جلال بخاریؒ (مخدوم جہانیاں جہاں گشت) کے پوتے سید برہان الدین قطبؒ کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ بھی محمود بیگڑہ نے تعمیر کروایا تھا۔ اس میں محرابیں ہی محرابیں ہیں اور گنبد بھی محرابوں پر بنایا گیا ہے۔ محمود بیگڑہ نے احمد آباد کے مضافاتی قصبے عثمان پور میں حضرت قطب عالم کے خلیفہ سید عثمانؒ (شمع برہانی) کا مقبرہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ انہوں نے یہاں ایک حسین مسجد بھی بنوائی۔ احمد آباد کے شمال میں حاجی پور میں بھی ایک شاندار مسجد ۱۴۷۲ء میں تعمیر کی گئی جو اس عہد کے فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ 'بی بی اچھوت کوکی' کی مسجد کہلاتی ہے۔

جب محمود بیگڑہ نے ۸۷۵ھ / ۱۴۷۰ء میں کاٹھیاواڑ کو مکمل طور پر فتح کیا تو جونا گڑھ اور اوپر کوٹ (قلعہ بالا) کے گرد فصیل بنوائی جو کم از کم ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء تک بالکل صحیح حالت میں تھی۔ اوپر کوٹ کی چوٹی پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ قلعہ اوپر کوٹ کی بستی جونا گڑھ کہلاتی رہی اور نیچے محمود بیگڑہ نے مصطفیٰ آباد کے نام سے نیا شہر آباد کیا، جہاں بڑے بڑے مکانات اور رفاہِ عام کی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ محمود بیگڑہ نے گجرات میں متعدد اہم شاہراہیں بھی تعمیر کروائی تھیں ان میں پٹن سے بڑودہ تک تعمیر کی گئی بڑی شاہراہ بھی شامل ہے۔ اس شاہراہ کی دونوں جانب آم اور کھرنی کے درخت لگوائے۔

محمود بیگڑہ کے زمانے میں کئی پل بھی تعمیر ہوئے۔ محمود آباد کے قریب دریا پر مضبوط بند باندھے گئے۔ ان کے ایک عہدیدار ملک ایاز نے جزیرہ دیو پر ایک بڑا پل بنوایا تھا۔ محمود بیگڑہ نے محمود آباد میں ایک بڑا تالاب بنوایا۔ انہوں نے دو بڑے عالی شان مسافر خانے بھی تعمیر کروائے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے ایک امیر عالم خان نے بھی مسافر خانہ بنوایا۔

محمود بیگڑہ کے زمانے میں باولیاں (سیڑھیوں والے وسیع کنویں) بھی تعمیر کیے جاتے تھے۔ احمد آباد کے شمال مشرق میں رسالہ وا کے قصبے

Marfat.com

میں بائی حریر کی باولی بنائی گئی۔ احمد آباد سے ۱۲ میل دور شمال میں گاؤں اولاج میں اس سے بھی زیادہ خوبصورت کنواں تعمیر ہوا۔ اس قسم کے کنویں "واو" کہلاتے ہیں۔ یہ بڑے پُر شکوہ تھے اور خاص نقشے کے مطابق بنائے گئے تھے۔ ان میں سیڑھیوں کے درمیان ستون دار گیلریاں تھیں جن کی قطاریں گہرائی کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی۔ ان پر اعلیٰ قسم کی نقاشی کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی باؤلیوں کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ بائی حریر کی باؤلی ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں بنی تھی۔

محمود شاہ بیگڑہ کے عہد میں زراعت اور باغبانی کو بھی خاصی ترقی دی گئی۔ احمد شاہ کے عہد سے قاعدہ یہ تھا کہ ہر سپاہی کو اس کی تنخواہ کا نصف حصہ نقدی کی شکل میں دیا جاتا اور نصف کے بدلے میں زمین دی جاتی تھی تاکہ وہ اس پر کاشت کرے۔ یہ زمین سپاہی کے مرنے پر اس کے بیٹے کو دے دی جاتی تھی اور اگر سپاہی کا بیٹا نہ ہوتا تو حکومت یہ زمین واپس لے لیتی تھی۔ محمود بیگڑہ نے اس قانون میں ترمیم کی کہ اگر سپاہی کا بیٹا نہ ہو تو زمین اس کی لڑکی کی اولاد نرینہ کو دے دی جائے۔

یہ طریقۂ کار اتنا کامیاب رہا کہ احمد شاہ اول کے دور (۸۱۴ھ تا ۸۴۶ھ/۱۴۱۱ء تا ۱۴۴۲ء) سے محمود شاہ کے عہد (۸۶۳ھ تا ۹۱۷ھ/۱۴۵۸ء تا ۱۵۱۱ء) تک پہنچتے پہنچتے زرعی پیداوار دگنی ہو گئی اور مزید پچاس برس بعد دس گنی ہو گئی۔ اس دور میں زیادہ تر باجرہ، مکئی، ارہر اور موٹھ کی کاشت کی جاتی تھی۔

محمود شاہ بیگڑہ کو باغات سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے طرح طرح کے باغات لگوائے۔ مثلاً پھولوں کے باغ، پھلوں کے باغ وغیرہ۔ انہوں نے احمد آباد کے مشرق میں چھ میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا باغ لگوایا۔ اس کا نام "باغِ فردوس" رکھا گیا۔ یہ باغ پانچ میل طویل تھا اور اس میں ۹ لاکھ درخت تھے۔ اس لیے اسے "نو لکھی باغ" بھی کہتے تھے۔ باغ میں آم، کھرنی اور آملہ کے درخت زیادہ تھے۔ کھرنی کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کا پھل نیم کے پھل سے مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن ذائقے میں بہت میٹھا ہوتا ہے۔ پٹن سے بڑودہ کو ملانے والی شاہراہ پر بھی آم اور کھرنی کے کئی لاکھ درخت موجود تھے۔ اسی لیے پورے ہندوستان میں سب سے اچھی کھرنی گجرات کی مانی جاتی تھی۔

محمود بیگڑہ نے مصطفیٰ آباد اور محمد آباد میں بھی باغات لگوائے۔ انہوں نے آم، انار، کھرنی، گولر، ناریل، مہوہ اور جامن کے درخت کثرت سے لگوائے۔ آم بہت نفیس اور خوشبودار ہوتے تھے۔ انار، انجیر، انگور، بادام، سیب، کیلا، امرت پھل، نارنگی، کٹہل اور فالسہ خوب پیدا ہوتا تھا۔ آملہ اور ہڑ کا ایک باغ تو عالمگیر کے زمانے (۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء) تک باقی تھا۔ محمود نے خربوزے کی کاشت بھی بڑے اہتمام سے کروائی۔ اس وقت تک روایتی طریقے سے باغ لگائے جاتے تھے۔ پھر ایک خراسانی شخص نے ایرانی طریقے کے مطابق باغ لگانے کی اجازت چاہی، اسے زمین دے دی گئی۔ باغ تیار ہوا تو لوگوں نے پسند کیا۔ پھر گجرات کے ایک اور باشندے نے اس سے بھی اچھا باغ تیار کر دکھایا۔

محمود بیگڑہ نے پھولوں کے درخت لگوانے پر بھی توجہ دی تھی، اور گل لالہ، گل سیوتی، چنبیلی، چمپا، بیلا، موگرہ، جوہی، مولسری، کیوڑہ اور کیتکی کے درخت بڑی تعداد میں لگوائے تھے۔

محمود بیگڑہ کا عہد صنعتی لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ ان ہی کے دور میں گجرات کے دارالحکومت احمد آباد میں کاغذ کے کارخانے قائم ہوئے۔ رفتہ رفتہ پٹن اور کھمبایت میں بھی کاغذ کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔ پٹن کے کاغذ کا نام ہی "پٹنی" ہو گیا تھا۔ احمد آباد تو کاغذ سازی کا مرکز تھا۔ یہاں سے کاغذ دُور دُور کے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ یہ کاغذ اپنی سفیدی اور چکنے پن میں بے مثال ہوتا تھا۔ ہندوستان کے کسی اور علاقے میں اتنا معیاری کاغذ تیار نہیں ہوتا تھا۔ بادامی رنگ کا کاغذ زیادہ تر روزنامچوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس قسم کے کاغذ کی صنعت بہت عرصے تک برقرار رہی۔ کاغذ کے کارخانے والوں کو کاغذی کہتے تھے۔ متعدد خاندانوں کے نام ہی "کاغذی" ہو گئے تھے۔ احمد آباد میں ان کا محلہ بھی "کاغذی" کہلاتا تھا۔

گجرات میں سُوت، ریشم اور اون کا کام بہت عمدہ ہوتا تھا۔ مراۃ احمدی کے مصنف علی محمد خان کے مطابق سنہری اور ریشمی کپڑے مثلاً کمخواب، مخمل اور زربفت تیار کیے جاتے تھے جو اپنے رنگ اور حُسن کی وجہ سے نہ صرف برصغیر میں مقبول تھے بلکہ چین، ایران، روس، مصر اور شام کو بھی بھیجے جاتے تھے۔ ایک قسم کا کپڑا "محمودی" کے نام سے بنتا تھا جس کی بڑی مانگ تھی۔ قالین سازی کا مرکز کھمبایت تھا۔ احمد آباد میں صابن سازی کی صنعت کام کر رہی تھی۔ تیل کے کئی کارخانے سر کھیج میں تھے۔ موسیقی کے آلات بھی تیار ہوتے تھے۔

ابتدا میں محمود بیگڑہ کی فوج کے لیے اسلحہ باہر سے منگوایا جاتا تھا، لیکن بعد میں جنگی آلات گجرات ہی میں بننے لگے۔ سروہی کے علاقے

Marfat.com

نے اعلیٰ قسم کی کٹاروں اور تلواروں کی تیاری میں بڑی شہرت حاصل کی۔ گجرات کی تلوار اب بہت قیمتی سمجھی جانے لگی تھی، کیونکہ وہاں کی آب وہوا کے علاوہ ایک مخصوص کنویں کا پانی تلواروں کی دھار کے لیے بے حد مفید تھا۔ ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء میں محمود بیگڑہ نے قلعہ شکن میدانی توپوں کے علاوہ خصوصی بیڑے کے لیے بھی توپیں تیار کروائیں۔ مشہور قلعہ "چمپانیر" انہی توپوں کے ذریعے فتح ہوا۔

یہ فخر صرف گجرات کو حاصل ہے کہ یہاں کے حکمراں نے خشکی سے آگے بڑھ کر بحری جنگ میں بھی توپوں کا استعمال کیا۔ محمود بیگڑہ نے ایسے جہاز تیار کروائے جو توپوں کی دھمک کو برداشت کر سکیں۔ خیال ہے کہ محمود بیگڑہ نے کھمبایت اور گھوگھ کے علاوہ دیو میں بھی جہاز سازی کے کارخانے قائم کیے تھے۔

مملکت میں عدلیہ کا نظام بھی عمدہ تھا۔ محکمۂ انصاف، قاضی القضاۃ، اقضی القضاۃ، صدر القضاۃ اور ملک القضاۃ پر مشتمل تھا۔ ہر شہر میں ایک مفتی اور ایک قاضی کا تقرر کیا گیا تھا۔ قاضی کے فیصلے سے اگر کوئی مطمئن نہ ہوتا تو وہ قاضی القضاۃ کے پاس اپیل کر سکتا تھا اور وہاں بھی اسے تسلی نہ ہوتی تو اقضی القضاۃ، پھر صدر القضاۃ اور ملک القضاۃ تک کی عدالتوں میں اپیل کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ ہر شہر میں ایک کوتوال مقرر تھا جو پولیس کا نگراں تھا۔ ایک محکمۂ احتساب بھی قائم تھا جس کا افسر "محتسب" کہلاتا تھا۔ شرعی امور پر عمل درآمد کی نگرانی محتسب کی ذمے داری تھی۔

محمود بیگڑہ کا ایک محکمۂ شکار بھی تھا۔ اُن کے دور میں چمپانیر سے متصل "مورآملی" کے علاوہ راج پیپلا اور سورٹھ شکار گاہیں تھیں۔ محمود کے دور میں کئی اقسام کے سکّے رائج تھے، مثلاً جیتل، تنکہ، تنکہ سفید، تنکہ طلائی وغیرہ۔ چاندی کے تنکے کا نام "محمودی" رکھ دیا گیا تھا۔

شفا خانے جگہ جگہ کھولے گئے تھے۔ ان میں سرکاری اور نجی دونوں طرح کے شفا خانے تھے۔ محمود نے ہندی کی ایک کتاب "داگھ بٹ" کا ترجمہ فارسی میں کروایا تھا تاکہ ہندی طریقۂ علاج سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔

محمود بیگڑہ علم دوست حکمراں تھے اور علما کی قدر کرتے تھے۔ ان کے عہد میں کئی جید علمائے کرام موجود تھے۔ مثلاً مولانا شاہ عالم، علامہ شاہ وجیہ الدین علوم عقلیہ میں امام تھے۔ مولانا عماد الدین طارمی، حسام الدین علی متقی، مولانا نور الدین احمد شیرازی، جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، صدر جہاں بینائی، شہاب الدین احمد عباسی، شیخ طیب سندھی وغیرہ صاحبانِ علم میں شامل تھے۔ محمود کے وزرا میں بھی بڑے بڑے عالم موجود تھے۔

محمود بیگڑہ کے حکم پر سید عثمانؒ (شمع برہانی) کے صاحب زادے مولانا یوسفؒ نے مشہور تاریخ ابن خلکان کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اس دور میں گجرات کے مشہور بزرگ شاہ عالمؒ (وفات: ۸۸۰ھ / ۱۴۷۵ء) کے جانشین نے ان کی یاد میں ایک مدرسہ شاہ عالم قائم کیا۔ یہ مدرسہ بہت بڑا تھا۔ اس میں دارالاقامہ (ہاسٹل) بھی تھا۔ مولانا شاہ عالمؒ کا ایک بڑا کتب خانہ بھی موجود تھا۔ اسی دور میں مولانا محمد محمود طارمیؒ، شیراز سے گجرات آئے تو اپنا بڑا کتب خانہ ساتھ لائے تھے۔ چمپانیر میں مولانا نصر اللہ، قاضی شہر تھے۔ آپ کا کتب خانہ بھی بہت بڑا تھا۔ محمود بیگڑہ کے دور میں دینی مدارس کے علاوہ دیگر علوم کے مدارس بھی موجود تھے جن میں فنی تعلیم کے مدارس بھی شامل تھے۔

محمود بیگڑہ ایک دیندار اور متقی انسان تھے۔ علما اور بزرگانِ دین سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ آخری عمر میں زیادہ تر عبادت میں مصروف رہنے لگے تھے۔ ان کی خواہش پر ان کے صاحب زادے خلیل خان نے کلام پاک حفظ کر لیا تھا، جس پر محمود بیگڑہ بہت خوش ہوئے تھے۔

محمود بیگڑہ اچھی صحت کے مالک تھے۔ نہایت بہادر تھے۔ ایک بار انہوں نے محض نیزے کی مدد سے ایک بدمست ہاتھی کو مار بھگایا تھا۔ تاہم وہ نہایت حلیم الطبع تھے۔

محمود بیگڑہ جب ۶۹ برس کی عمر کو پہنچے تو وہ بیمار رہنے لگے۔ یہی علالت ان کے لیے سفر آخرت کا پروانہ لے کر آئی۔ ۲ رمضان المبارک ۹۱۷ھ / ۲۳ نومبر ۱۵۱۱ء کو اس اولوالعزم، قابل اور عظیم حکمراں کا انتقال ہو گیا۔

محمود بیگڑہ کو احمد آباد کے قریب سرکھیج میں شیخ احمد کھتوؒ کے مقبرے کے مقابل تالاب کے کنارے سپردِ خاک کیا گیا۔

***

Marfat.com

محمود گاواں

جنوبی ہند کی بہمنی سلطنت کے نہایت لائق اور صاحب علم وزیر اعظم

مہمان رخصت ہو چکے تھے!

کھانے کے برتن سمیٹے جا رہے تھے اور خدام برتن اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ دعوت کے میزبان، مہمانوں کو الوداع کہنے کے بعد لوٹ آئے تھے۔ ان کی عمر تقریباً پچپن برس ہو گی۔ ان کا باریش چہرہ ایک جہاندیدہ اور مدبر شخص کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔

میزبان ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا، پھر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ شدید بے چینی کے عالم میں گریہ و زاری کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے بہنے والے اشک ان کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان کی تمام دولت اور مال و متاع شہر کے تمام علما کرام اور درویشوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کے لیے صرف کتابیں، گھوڑے اور ہاتھی رہنے دیے جائیں۔ حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ ایک عالم دین نے ان سے سوال کیا: "آپ نے لیے اپنے صرف کتابیں، گھوڑے اور ہاتھی ہی کیوں پسند کیے اور باقی تمام دولت کیوں بانٹ دی ہے؟"

جواب ملا: "جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس دعوت میں سلطنت کے فرمانروا (محمد شاہ سوم) اور ان کی والدہ (ملکہ مخدومہ جہاں) شریک تھیں۔ ملکہ صاحبہ نے مجھے "بھائی" کہہ کر مخاطب کیا۔ میرے نفس نے اس پر سرکشی کی اور غرور و تکبر نے میرے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ میں نے اس تکبر اور سرکش نفس سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی دولت سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ رہیں یہ کتابیں تو یہ طالب علموں کے لیے وقف ہیں اور یہ گھوڑے اور ہاتھی حکمران وقت کی ملکیت ہیں۔"

یہ بلند پایہ شخصیت تھی جنوبی ہند میں بہمنی سلطنت کے قابل، واجب الاحترام اور عظیم وزیر اعظم محمود گاواں کی، جنہوں نے سلطنت کو بام عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا اور جب ان کی خدمات کے صلے میں ملکہ نے انہیں بھائی کہہ کر مخاطب کیا تو انہوں نے اپنے نفس کے فتنے سے بچنے کے لیے اپنی دولت اور مال و متاع سے نجات حاصل کر لی۔

محمود گاواں کا پورا نام خواجہ عماد الدین محمود ہے۔ ان کے نام کے ساتھ "گاواں" دراصل ان کی جائے پیدائش کی نسبت سے لگا دیا گیا ہے۔ وہ ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء میں ایران کے علاقے گیلان کے ایک گاؤں گاوان (قاوان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان گیلان کے علاقے میں حکمرانی کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ محمود گاواں کے والد کا نام خواجہ محمد تھا۔ ان کے چچا خواجہ شمس الدین گیلان کے حکمراں کے وزیر تھے۔ محمود کی عمدہ تعلیم و تربیت میں ان کے چچا اور دیگر رشتے داروں کا بڑا حصہ ہے۔

حصولِ تعلیم کے بعد محمود گاواں نے اپنے چچا کے ساتھ امورِ مملکت میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ عالم جوانی میں انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ابھی وہ سرزمین حجاز میں تھے کہ انہیں گیلان کے سیاسی حالات تبدیل ہونے کی اطلاع ملی۔ انہیں بتایا گیا کہ گیلان کے حالات ان کے خاندان کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ انہیں ایران کے دیگر علاقوں میں بعض عہدے پیش کیے گئے لیکن انہوں نے معذرت کر کے تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اسی دوران انہوں نے قاہرہ جا کر محمد بن محمود الشمسی الحنفیؒ سے علم حاصل کیا اور علامہ زرکشیؒ سے "صحیح مسلم" کا درس لیا۔ وہ شام کے بعض بہت پائے کے علما کرام کے

Marfat.com

علم سے بھی مستفید ہوئے۔ اس طرح کئی ملکوں کے علماکرام سے ان کے گہرے مراسم استوار ہوگئے جو زندگی بھر قائم رہے۔

محمود گاواں کو علماکرام اور بزرگان دین سے بہت محبت تھی۔ تقریباً پچاس برس کی عمر میں انہوں نے برصغیر (پاک وہند) کا رخ کیا۔ اس زمانے میں یہ سرزمین ہند کہلاتی تھی۔ محمود گاواں ۸۵۹ھ / ۱۴۵۵ء میں بذریعہ بحری جہاز روانہ ہوئے اور دابھول کی بندرگاہ پر اترے۔ یہاں سے وہ جنوبی ہند کے مشہور شہر بیدر پہنچے۔ یہ شہر حیدرآباد دکن سے اسّی میل مغرب میں واقع ہے۔

اس زمانے میں حیدرآباد دکن اور اطراف کے علاقوں میں بہمنی سلطنت قائم تھی۔ بہمنی سلطنت جمادی الاول ۷۴۸ھ / اگست ۱۳۴۷ء میں علاالدین بہمن شاہ نے قائم کی تھی۔ جب محمود گاواں بیدر پہنچے تو ان زمانے میں یہاں بہمنی سلطنت کے دسویں حکمراں علاالدین ثانی برسراقتدار تھے۔ بیدر پہنچ کر محمود گاواں نے تجارت شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ علماکرام کی صحبت میں بھی اٹھنے بیٹھنے لگے۔ ان کے علم اور لیاقت کے چرچے جلد ہی عام ہوگئے۔ محمود دیگر علماکرام سے ملنے کے لیے دہلی جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن بہمنی حکمراں علاالدین ثانی نے انہیں اپنے پاس بلالیا اور انہیں اچھا منصب دے کر امرا کی صف میں شامل کر دیا۔

علاالدین ثانی ۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ہمایوں حکمراں بنے۔ ہمایوں نے محمود گاواں کو "ملک التجار" کا لقب دیا جو اس دور میں بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ہمایوں کا دور سیاسی بے چینی کا دور تھا۔ محمود گاواں ہمایوں کے تقریباً تین سالہ دور (۸۶۲ھ تا ۸۶۵ھ / ۱۴۵۷ء تا ۱۴۶۱ء) میں تلنگانہ کے علاقے میں بغاوتوں کو سرد کرنے اور نظم ونسق کے قیام میں مصروف رہے۔

ہمایوں کا انتقال ۸۶۵ھ / ۱۴۶۱ء میں ہوگیا۔ ان کے بعد ان کے کم سن بیٹے نظام شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ نظام شاہ کے اسی دور میں محمود گاواں کو بیجاپور کا طرف دار (صوبے کا حاکم) بنایا گیا۔

محمود گاواں نے بہمنی مملکت پر اڑیسہ کے راجا کے حملے کو پسپا کرنے کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ان کی جرأت کی وجہ سے راجا کو کثیر رقم بطور تاوان ادا کرنا پڑی۔ اس کے بعد مالوہ کے حکمراں نے دکن پر حملہ کیا اور نظام شاہ کی فوج نے شکست کھائی، لیکن محمود گاواں نے گجرات کے حکمراں محمود بیگڑہ کی مدد حاصل کرلی اور حملہ آور فوج کو مار بھگایا۔ نظام شاہ عین جوانی کے عالم میں ۸۶۷ھ / ۶۳-۱۴۶۲ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی محمد شاہ سوم برسراقتدار آئے۔ ان کے دور میں محمود گاواں کی حیثیت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ انہیں "امیر الامرا" اور "خواجہ جہاں" کے خطاب بھی دے دیے گئے۔ گویا اب محمود گاواں کی حیثیت بہمنی سلطنت کے وزیراعظم کی سی تھی۔

محمود گاواں کو ۸۷۳ھ / ۱۴۶۹ء میں کوتکن کے علاقے میں بحری قزاقوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا۔ محمود گاواں نے تین سال کی جدوجہد کے بعد یہ علاقہ فتح کرلیا۔ بحری قزاقوں کا قلع قمع کر دیا اور گوا پر قبضہ کرلیا جو اس زمانے میں وجے نگر کی بہترین بندرگاہ تھی۔

محمود گاواں کا ایک بڑا کارنامہ بہمنی سلطنت کے انتظامی امور کی اصلاح ہے۔ شروع میں یہ سلطنت چار بڑے صوبوں پر مشتمل تھی۔ یعنی گلبرگہ، دولت آباد، برار اور تلنگانہ۔ ہر صوبے کو "طرف" کہا جاتا تھا اور صوبے کے حکمراں یا گورنر کے لیے "طرف دار" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ "طرف دار" کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔ اپنے علاقے کا وہی مختارِ کل ہوتا تھا۔ محصول (مالیہ) اکٹھا کرنا، فوج بھرتی کرنا، فوجیوں کو تنخواہ دینا، فوج کی قیادت کرنا، ہر قسم کے عہدیداروں کا تقرر کرنا، یہ سب کام طرف دار کی مرضی سے انجام پاتے تھے۔

محمود گاواں دیکھ چکے تھے کہ صوبائی حکمرانوں کو لامحدود اختیارات دینے کا نتیجہ ماضی میں بغاوتوں کی صورتوں میں برآمد ہوا تھا اور آئندہ کے لیے بھی یہی خطرات موجود تھے۔ جب تک مملکت مختصر تھی اور سربراہِ مملکت بیدار مغز تھے، صوبائی حکمرانوں نے اطاعت کا رویہ اختیار کیے رکھا لیکن اب مملکت وسیع ہوچکی تھی۔ محمود گاواں نے صوبوں کی تعداد دگنی کر دی۔ ہر صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح صوبوں کی تعداد آٹھ ہوگئی۔ برار کو گاویل اور ماھور میں تقسیم کر دیا گیا۔ دولت آباد کے دوحصے دولت آباد اور جنار کہلائے۔ گلبرگہ کی تقسیم سے گلبرگہ اور بیجاپور وجود میں آئے اور تلنگانہ کے دوحصے ہوئے تو وارنگل اور راجا مہندری کے نام کے دو صوبے نمودار ہوگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ "طرف داروں" کے اختیارات میں بھی کمی کر دی گئی۔

محمود گاواں کے ان اقدامات سے مملکت کو درپیش سیاسی خطرات اور انتظامی مشکلات میں تو کمی ہوگئی لیکن "طرف داروں" کی ناراضگی میں اضافہ ہوگیا کیونکہ نہ صرف ان کے اختیارات محدود کر دیے گئے

Marfat.com

بلکہ آمدنی بھی گھٹ گئی تھی۔ در حقیقت محمود گاواں کا یہ اہم سیاسی فیصلہ ہی ان کی جان لینے کی سازش کا پیش خیمہ بنا۔

محمود گاواں کے ہاتھوں صوبوں کی تقسیم سے سب سے زیادہ شکایت تلنگانہ کے "طرف دار" ملک حسن بحری نظام الملک کو ہوئی جن کے اختیارات اور آمدنی پر اس تقسیم سے بھاری ضرب پڑی تھی۔ اب انہیں صرف نئے صوبے "راجامہندری" کی طرف داری پر قناعت کرنا پڑ رہی تھی۔ انہوں نے ایک سازش کی اور محمود گاواں کے معتمدِ خاص کو دھوکا دے کر ایک سادہ کاغذ پر محمود گاواں کی مہر لگوالی۔ اس کے بعد اس کاغذ پر محمود گاواں کی طرف سے اڑیسہ کے راجا کے نام ایک خط لکھ دیا گیا جس میں اسے بہمنی سلطنت پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

ملک حسن بحری اور ان کے ساتھیوں نے یہ جعلی خط بہمنی سلطنت کے حکمران محمد شاہ سوم کو دکھایا اور انہیں باور کروادیا کہ محمود گاواں ان کی حکومت کے خلاف منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور اڑیسہ کے راجا کی مدد سے مملکت پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ محمد شاہ سوم ان لوگوں کی باتوں میں آگئے۔ انہوں نے محمود گاواں کو طلب کر لیا۔

محمود گاواں محمد شاہ سوم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ محمد شاہ نے ان سے پوچھا کہ "غداری کی سزا کیا ہے؟" محمود گاواں نے بلا تامل جواب دیا۔ "موت۔" اس کے بعد محمد شاہ نے انہیں وہ (جعلی) خط دکھایا جو مبینہ طور پر انہوں نے اڑیسہ کے حاکم کو لکھا تھا۔ محمود گاواں نے بلا جھجک کہا کہ یہ مہر تو اصلی ہے لیکن خط جعلی ہے۔ لیکن محمد شاہ کو یقین نہ آیا اور انہوں نے محمود گاواں کو سزائے موت دینے کا حکم صادر کر دیا۔

پانچ صفر ۸۸۶ھ / ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو عالم اسلام کی اس عظیم مدبر، سیاستدان اور صاحبِ علم شخصیت کو سزائے موت دے دی گئی۔ جب تلوار ان کی گردن پر پڑی تو انہوں نے بلند آواز میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کی موت عطا فرمائی۔ بعد میں محمد شاہ سوم نے تمام معاملات کی تحقیقات کرائی تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ محمود گاواں بالکل بے گناہ تھے اور وہ کتنی قابل قدر شخصیت تھے۔ لیکن اب پشیمان ہونے سے کیا حاصل تھا۔ تاہم محمد شاہ کے حکم پر محمود گاواں کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کی قبر بیدر سے دو میل دور موضع گوران بلی (بہمنی دور کا بہت بڑا قبرستان) میں آج بھی موجود ہے۔

محمود گاواں نے اپنے ترکے میں بہت تھوڑی سی نقدی اور تین ہزار بیش قیمت کتب پر مشتمل ایک کتب خانہ چھوڑا۔

محمود گاواں بے حد علم دوست انسان تھے۔ وہ خود بھی پائے کے عالم تھے۔ ادب، شاعری اور انشاپردازی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ طب اور ریاضی کے علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے اور علم ہیئت پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ انہوں نے ایک دھوپ گھڑی بھی ایجاد کی تھی۔ اس ایجاد کا تذکرہ ایک روسی سیاح اتھیانا سیوس نکے تن نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔

محمود گاواں اچھے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "دیوانِ محمود گاواں" کے نام سے ہے۔ ان کی اصل شہرت کا باعث انشاپردازی یعنی خطوط اور دستاویز نویسی کے موضوع پر ان کی دو تصانیف ہیں۔ یہ تصانیف "ریاض الانشا" اور "مناظر الانشا" کے نام سے لکھی گئی تھیں۔ "ریاض الانشا" محمود گاواں کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف سیاسی اور غیر سیاسی شخصیات اور اپنے عزیزوں کو تحریر کیے۔ یہ خطوط زبان و بیان کے لحاظ سے بہت بلند تر ہیں اور فصاحت اور بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ان مکاتیب میں تین قسم کے خطوط شامل ہیں۔ ایک تو وہ خطوط ہیں جو محمود گاواں نے بہمنی حکمراں محمد شاہ سوم کی جانب سے مختلف حکمرانوں کو تحریر کیے۔ دوسرے وہ خطوط ہیں جو محمود گاواں نے علماکرام کو تحریر کیے اور بعض خطوط وہ ہیں جو انہوں نے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو لکھے۔ یہ تینوں اقسام کے خطوط محمود گاواں کی ہمہ پہلو شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ تمام خطوط ایک لحاظ سے اس دور کی تاریخ بھی ہیں کیونکہ ان سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کا علم ہوتا ہے۔

"مناظر الانشا" کے نام سے محمود گاواں کی کتاب دراصل قواعد انشانویسی پر ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ مخطوطے کی صورت میں جامعہ پنجاب لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس زمانے میں انشانگاری ایک مستقل علم اور فن تھا۔ انشاپرداز کے لیے بہت سے علوم کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ محمود گاواں نے اس کی تفصیل لکھی ہے اور انشاپردازوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

Marfat.com

سرزمینِ ایران کے مشہور عالم، شاعر اور مفسر مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ بھی محمود گاواں کے علم اور فن انشاپردازی کے معترف تھے۔ مولانا جامیؒ اور محمود گاواں کے درمیان خط و کتابت رہتی تھی اور خطوط میں مولانا جامیؒ نے محمود گاواں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ محمود گاواں نے مولانا عین الدین بیجاپوری کی کتاب ”کتاب الانوار“ پر نظر ثانی بھی کی۔ اس کتاب میں اولیاء کرام کے حالات ہیں۔ محمود گاواں نے اس کتاب کو نظر ثانی کے بعد مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی خدمت میں بھیجا اور مزید حالات لکھنے کی گزارش کی جس پر مولانا جامیؒ نے کتاب 'نفحات الانس' تصنیف فرمائی جو اولیاء کرام کا وسیع تذکرہ ہے۔ محمود گاواں ایک اچھے خوش نویس بھی تھے۔

علماء کرام کے نام خطوط میں محمود گاواں کی علمی حیثیت پوری طرح آشکار ہوتی ہے۔ یوں تو ان کا ہر خط انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن علماکرام کے نام لکھے گئے خطوط میں تو لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں انہوں نے کمال کر دکھایا ہے۔ اساتذہ کے اشعار کا برمحل استعمال ایک اور خوبی ہے۔

محمود گاواں نہایت مدبر اور نکتہ رس سیاستداں بھی تھے۔ انہوں نے نہ صرف مملکت کے داخلی امور پر کڑی نظر رکھی، سیاسی عدم استحکام پیدا نہ ہونے دیا اور بغاوتوں کو فرو کر دیا بلکہ امورِ خارجہ پر بھی بھرپور توجہ دی۔ انہوں نے بہمنی سلطنت کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھا۔ اطراف کے تمام حکمرانوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ گجرات کے محمود بیگڑہ نے تو جنگ میں ان کی مدد بھی کی تھی۔ ہمسایہ سلطنتوں میں وہ اپنے نمائندے اسی طرح مقرر کرتے تھے جس طرح آج کل مملکتیں اپنے سفیر مقرر کیا کرتی ہیں۔ سفیروں کے تقرر سے قبل انہیں باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔

محمود گاواں دولت عثمانیہ کے سربراہ مشہورِ عالم فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح کے ہم عصر تھے۔ سلطان محمد فاتح سے ان کی خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ محمود گاواں کشمیر کے عظیم حکمراں زین العابدین، سندھ کے جام نظام الدین اور مالوہ کے محمود خلجی کے بھی ہم عصر تھے۔

محمود گاواں نے بہمنی سلطنت کی فوج کو بھی اعلیٰ خطوط پر منظم کیا تھا۔ ان کی جہاں دیدگی اور تدبر کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے انتظامات کے نتیجے میں فوج کے معمولی سپاہی سے اعلیٰ افسران تک سب ہی بے حد مطمئن اور خوش تھے۔

محمود گاواں بہت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ معمولی غذا کھاتے اور سادہ لباس زیب تن کرتے۔ ان کا بستر چٹائی پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ بے حد دیانت دار اور خدا ترس انسان تھے۔ بہمنی سلطنت کے اتنے بڑے عہدے پر ہونے کے باوجود اپنے ذاتی اخراجات کے لیے سرکاری خزانے سے ایک ذرّہ تک نہیں لیتے تھے۔ اپنی تنخواہ وہ غریبوں اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے، اپنا خرچ چلانے کے لیے وہ تجارت کرتے تھے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بھی تھوڑا سا حصہ اپنے ذاتی استعمال میں لاتے تھے۔ باقی رقم ضرورت مندوں کے کام آتی تھی۔

روسی سیاح نکتن کے مطابق محمود گاواں کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو افراد موجود رہتے تھے، ان میں اکثر نادار اور معمولی حیثیت کے لوگ ہوتے تھے۔ دو یا تین وزرا بھی ان ہی معمولی حیثیت کے افراد کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ محمود گاواں راتوں میں گلیوں میں گھوم پھر کر نہایت خاموشی سے حاجت مندوں کی امداد بھی کرتے تھے۔ محمود گاواں سے ملاقات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ انکسار کا روشن نمونہ تھے۔ لیکن ان کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ جب وہ کسی سرکاری کام یا امورِ مملکت کے بارے میں کسی کو ہدایت دیتے یا باز پرس کرتے تو بڑے بڑے عہدیدار خوف سے کانپنے لگتے تھے۔

محمود گاواں کے حُسنِ انتظام اور دانش مندانہ اقدامات کے نتیجے میں بہمنی سلطنت کی اقتصادی حالت بھی بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ ان کے دور میں بیدر کا شہر دو سو پچیس مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ بہمنی سلطنت کے باشندے صرف وہ اشیا استعمال کریں جو اپنے ملک میں بنتی ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنوعات کی تیاری کے معاملے میں ملک خود کفیل تھا۔ مؤرخین تصدیق کرتے ہیں کہ بہمنی سلطنت کی سب سے اہم بندرگاہ مصطفیٰ آباد، دابھول سے مال و اسباب کے بھرے ہوئے جہاز چین، افریقہ اور دیگر ملکوں کو بھیجے جاتے تھے۔

بہمنی دور کے مشہور جغرافیہ نویس مولانا آذری کے مطابق بہمنی سلطنت سے جو مال برآمد کیا جاتا تھا اس میں ہیرے، موتی، فولاد، ہاتھی دانت، ادویات، عطریات، بیدر کے برتن، چھینٹ، ململ اور رنگ شامل تھے۔ جو اشیا درآمد کی جاتی تھیں ان میں اون، مخمل، زریں کپڑے، اصفہانی ہتھیار، عربی گھوڑے، مغزیات، فیروزہ، عقیق اور یشب شامل

Marfat.com

تھے۔ بر آمد کی جانے والی اشیا میں آم، نارنگیاں، کافور اور صندل کی لکڑی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محمود گاواں کے دور میں زرعی اعتبار سے بھی بڑی ترقی ہوئی۔ مشہور مؤرخ فرشتہ کہتے ہیں کہ محمود گاواں نے زعفران، امرود اور ہر طرح کے انگور کے باغات لگوائے تھے۔ انہوں نے جدید علوم زراعت سے استفادہ کیا تھا اور درختوں میں پیوند لگا کر نئی اقسام پیدا کرنے اور میووں کو زیادہ میٹھا، خوشبودار اور مفید بنانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کے دور میں گلاب کے پھول کا رنگ حسبِ مرضی تبدیل کر لیا جاتا تھا اور نئی قسم کے گلاب کے پودے اگنے لگتے تھے۔ زرعی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ماہرین انگور کے ایسے خوشے حاصل کر لیتے تھے جن میں مختلف رنگوں کے انگور کے دانے ہوں۔ مولی، گاجر، شلجم جیسی ترکاریوں کی جسامت بڑی کر لی گئی تھی۔

زرعی زمین کو سیراب کرنے کے لیے متعدد مقامات پر تالاب بنائے گئے تھے۔ فصلوں کو امراض سے بچانے کے لیے کیمیائی مادے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں سیکڑوں باغات لگائے گئے جن میں باغ نعمت آباد، باغ علائی، باغ عدل، سنگار باغ وغیرہ مشہور ہیں۔ البتہ بہت سے باغات بعد میں دیہی آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے گاؤں میں تبدیل ہو گئے اور ان کے نام بھی بدل گئے۔

محمود گاواں کے دور میں مدرسہ محمود گاواں کی شاندار عمارت کے علاوہ روسا، پرندہ، شولہ پور اور دھرور کے مضبوط قلعے بھی تعمیر کیے گئے۔ بیجاپور میں مولانا عین الدین بیجاپوریؒ کے مزار کا گنبد محمود گاواں نے ذاتی سرمائے سے تعمیر کروایا۔

محمود گاواں کا ایک بہت بڑا کارنامہ مدرسہ محمود گاواں کا قیام ہے۔ یہ کوئی معمولی مدرسہ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل جامعہ (یونیورسٹی) تھی۔

یہ اقامتی طرز کا مدرسہ تھا جس میں طلبہ کے لیے طعام و قیام اور لباس کی اچھی سہولتیں میسر تھیں۔ طلبہ سے تعلیم، طعام و قیام اور لباس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ اساتذہ کی رہائش کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ مدرسے کے مصارف پورے کرنے کے لیے محمود گاواں نے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا تھا۔ بہمنی سلاطین بھی خطیر رقوم فراہم کرتے تھے اور متعدد عطیات اور جائیدادیں اس کے لیے وقف تھیں۔

مدرسہ محمود گاواں میں بڑے لائق اور فاضل اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا۔ محمود گاواں نے ایران سے مشہور عام مفسر و شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کو بھی مدرسہ محمود گاواں آنے کی دعوت دی تھی۔ مدرسے کے سربراہ کے طور پر انہی کا نام تجویز ہوا تاہم مولانا جامیؒ نے کسی وجہ سے معذرت کر لی جس کا محمود گاواں کو بڑا افسوس ہوا۔ خود محمود گاواں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس مدرسے میں دس سال تک ریاضی اور علم ہیئت کی تعلیم دی۔

مدرسے میں محض دینی علوم کی تدریس ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ دیگر مروّجہ سائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ مدرسے میں پڑھائے جانے والے مضامین میں حفظِ قرآن، تجوید القرآن، تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ، قانون، عقائد، فلسفہ، منطق، علم کلام، بلاغت، عربی صَرف و نحو، ادب، معانی، بیان، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، طب و حکمت شامل تھے۔

تعلیم کے دو درجے تھے۔ پہلے درجے میں کامیابی حاصل کرنے والے "ملازم" کی سند حاصل کرتے تھے جبکہ دوسرے درجے سے کامیاب گزرنے والے "مدرس" کہلاتے تھے۔ "ملازم" کے نصاب کے دو حصے تھے پہلے حصے میں بلاغت اور علم کلام کی اعلیٰ درجے کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور دوسرے درجے میں حدیث، عقائد، اصول، فقہ اور قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ "ملازم" کی سند ملنے پر دوسرے درجے کے قاضی یا بڑے شہروں میں نائب قاضی کی ملازمت مل سکتی تھی۔

"مدرس" کی سند حاصل کرنے کے لیے کوئی نصاب یا امتحان مقرر نہ تھا بلکہ "ملازم" کی سند پانے کے بعد ایک خاص مدت تک اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کی تدریس کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ اس مدت میں اطمینان بخش کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر ایک سند ملتی تھی جسے "رعوس" کہتے تھے۔ "مدرس" کی سند حاصل کرنے والا سلطنت کے اعلیٰ درجے کے عہدوں کا مستحق بن جاتا تھا۔ "مدرس" کے بھی کئی درجات تھے مثلاً کاتب، منشی، مولوی اور ملا۔ منشی کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دیا جاتا تھا۔ سب سے اعلیٰ سند "ملا" کی تھی جو تمام فنون میں کمال حاصل کرنے والے کو دی جاتی تھی۔

اس مدرسے نے نہ صرف بہمنی سلطنت بلکہ اطراف کی سلطنتوں مثلاً احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو فقہا، قاضی، معلم، ماہرین

Marfat.com

اور منتظمین فراہم کیے۔

مدرسہ محمود گاواں میں ایک شاندار کتب خانہ بھی تھا۔ محمود گاواں کے زمانے میں اس کتب خانے میں تیس ہزار سے زائد قیمتی کتابیں موجود تھیں۔ محمود گاواں ان کتب میں اضافہ کرواتے رہتے تھے۔ کتب خانے میں کلام پاک کا ایک نادر نسخہ موجود تھا جس میں ایک ہزار ورق تھے۔ ہر ورق کو اس طرح حفاظت سے رکھا گیا تھا کہ قرآن شریف کے اوراق کبھی پرانے محسوس نہ ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قرآن شریف کے اس نسخے کی تیاری آج ہی مکمل ہوئی ہے۔ اس نسخے کی تیاری کے لیے کشمیر، اصفہان، دمشق اور خود ہندوستان سے بڑے بڑے نقاش اور ماہرین بلوائے گئے تھے۔

مدرسہ محمود گاواں کی عمارت کی تعمیر ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء میں شروع ہوئی اور تقریباً گیارہ برس کے عرصے میں شاندار عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ محمود گاواں نے عمارت کی تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی۔ وہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اکثر تعمیراتی کام کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ ۸۷۶ھ/۱۴۷۱ء میں مدرسے کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ مدرسے کی عمارت مستطیل طرز کی ہے۔ اس کا طول ۷۵ گز اور چوڑائی ۵۵ گز ہے۔ اس تین منزلہ عمارت کے ایک سو پچیس فٹ بلند دو مینار تھے جو کاشغر کے طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتے تھے۔

مدرسے کی عمارت کی تعمیر سنگِ سیاہ سے کی گئی تھی۔ عمارت کے سامنے کے حصے اور میناروں پر بہترین نقاشی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چینی کی پچی کاری کے ذریعے سورۂ زمر (پارہ ۲۴) کی آیات بڑی نفاست سے تحریر کی گئی تھیں۔ آیات کے حروف کی لمبائی تین تین فٹ تھی۔ دیوار گر جانے کے باعث مکمل آیات باقی نہیں رہیں تاہم اب بھی ان آیات کا کچھ حصہ اچھی حالت میں موجود ہے۔ عمارت کے وسط میں سو مربع فٹ کا صحن بنایا گیا تھا۔ عمارت میں درس کے لیے کشادہ ایوان تعمیر کیے گئے تھے جہاں ایک ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔

محمود گاواں کی یہ عظیم درس گاہ کم و بیش دو سو برس تک طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتی رہی۔ پھر بہمنی سلطنت کے زوال پر اسے ملنے والی امدادیں بند ہو گئیں اور بیرونی حملوں کے اندیشوں کے پیش نظر مدرسے کی عمارت کے کئی حصے منہدم کر کے اس کے ملبے سے برج اور فصیلیں تیار کر دی گئیں۔ بعد میں مدرسے کی عمارت میں لگایا گیا قیمتی ساز و سامان بھی نکال لیا گیا۔

مغل فرمانروا اورنگ زیب عالمگیر نے گیارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) میں بیدر کو فتح کیا تو حکم دیا کہ اس مدرسے کی حالت درست کی جائے۔ چنانچہ مدرسے کی عمارت درست کر کے اس میں تدریس کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا گیا۔ رمضان المبارک ۱۱۰۷ھ/اپریل ۱۶۹۶ء میں مدرسے کی عمارت پر بجلی گری، جس کے نتیجے میں مدرسے کا ایک مینار، کتب خانہ اور باب الداخلہ منہدم ہو گئے۔ ریاست حیدرآباد دکن میں محکمۂ آثار قدیمہ نے اس مدرسے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

آج بھی اس عظیم مدرسے کی عمارات کے کھنڈر موجود ہیں اور اپنی عظمتِ رفتہ کی کہانیاں سنا رہے ہیں۔

***

Marfat.com

سکندر لودھی

شہر آگرہ آباد کرنے والے برصغیر کے ایک لائق حکمراں

وہ شخص زمین کھود رہا تھا!

اتر پردیش کے شہر سنبھل کے اس شخص کو شاید کوئی تعمیر کرنی تھی یا کوئی اور کام تھا، اچانک اس کی کدال کسی شے سے ٹکرائی۔ اس نے حیران ہو کر ہاتھ روک لیا۔ غور سے دیکھنے پر میں مٹی میں دبی کوئی شے نظر آئی۔ اس شخص نے احتیاط سے مٹی کھود کر اس شے کو نکال لیا۔

یہ ایک چھوٹی سی دیگ تھی۔ اس شخص نے دیگ کھولی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیگ میں بہت ساری اشرفیاں چمک رہی تھیں۔

اس شخص کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس غیبی امداد سے وہ بہت مسرور تھا۔ اب وہ اپنی تمام ضرورتیں پوری کر سکتا تھا، لیکن اس کی خوشی جلد ہی دم توڑ گئی۔ چند دنوں بعد کسی نہ کسی طرح یہ خبر عام ہو گئی کہ اس شخص کے پاس خزانہ نکلا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر سنبھل کے حاکم قاسم خان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اس شخص کو بلایا اور ساری دولت اس سے لے لی۔ پھر مملکت کے فرمانروا کو خبر کی۔ فرمانروا نے حکم دیا، "ساری دولت اس شخص کو واپس کر دی جائے۔" قاسم نے عرض کی، "حضور، یہ دولت اس شخص کو ملی ہے جو اس کے لائق نہیں ہے۔"

فرمانروا نے کہا:

"اے نادان! اگر دینے والا اس شخص کو اس لائق نہ سمجھتا تو اسے نہ دیتا۔ لائق اور غیر لائق سب اسی کے بندے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ یہ دولت اسی کے حوالے کر دیجیے اور جب تک اس دولت کے لیے محفوظ جگہ تیار نہ ہو، اس کی حفاظت آپ کی ذمہ داری ہے۔"

یہ حکمراں تھے، برصغیر میں لودھی خاندان کے دوسرے فرمانروا سکندر لودھی جن کا ۲۷ سالہ عہد، علمی ترقی، امن، خوشحالی اور اعلیٰ انتظام کی خوبیوں سے عبارت ہے۔ سکندر لودھی نے اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے جو وسیع حکومت قائم کی تھی اس میں پاکستان اور بھارت کے پنجاب (مغربی اور مشرقی پنجاب) ہریانہ، اتر پردیش، بہار اور کچھ ملحقہ علاقے اور راجستھان کے بعض حصے شامل تھے۔ ان کی اہم ترین فتوحات میں جونپور اور بہار شامل ہیں۔

سکندر لودھی کا اصل نام نظام خان ہے۔ ان کا سنہ پیدائش تاریخ کی کتب میں نہیں ملتا، البتہ تاریخ شاہی میں احمد یادگار نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی نے ۱۷ شعبان ۸۹۴ھ کو ۱۸ سال کی عمر میں دہلی کی حکومت سنبھالی، اس لحاظ سے سکندر کا سنہ پیدائش ۸۷۶ھ / ۱۴۷۱ء بنتا ہے۔ سکندر کا انتقال ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں ہوا۔ اس اعتبار سے انہوں نے تقریباً ۴۶ برس کی عمر پائی۔

برصغیر میں لودھی خاندان کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کی انگلی تھام کر چھ سو برس قبل فیروز شاہ تغلق کے دور میں جانا ہو گا۔

کابل اور اطراف کے علاقوں سے لودھی خاندان کے بہت سے افراد، تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک ملک بہرام بھی تھے۔ برصغیر کے مشہور حکمراں فیروز شاہ تغلق کے زمانے (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ / ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) میں ملک بہرام ملتان چلے آئے، جہاں انہوں نے ملتان کے حاکم ملک مردان دولت کی ملازمت اختیار کر لی۔ ملک بہرام کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ملک کالا اور دوسرے ملک سلطان شاہ تھے۔ ملتان کے گورنر خضر خان تھے۔ ملک سلطان شاہ، خضر خان کے پاس ملازم ہو گئے۔ ملک سلطان کو اسلام خان کا خطاب ملا۔ کچھ عرصے بعد انہیں مشرقی پنجاب کے مقام سرہند کا حاکم بنا دیا گیا۔ ملک کالا کو دورالہ کا حاکم بنایا گیا۔ ان کے

Marfat.com

باقی بھائی بھی ساتھ رہنے لگے۔
کچھ عرصے بعد ایک حادثہ پیش آیا۔ ملک کالا کا مکان کسی وجہ سے منہدم ہو گیا اور ملبے میں دب کر ملک کالا کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان دنوں امید سے تھیں، ان کا بچہ بچا لیا گیا۔ اس بچے کا نام بہلول رکھا گیا۔ ننھا بہلول ماں کی آغوش سے تو محروم تھا ہی، تھوڑے دنوں بعد باپ کے سائے سے بھی محروم ہو گیا، ملک کالا تنازعات میں مارے گئے۔ بہلول کے چچا اسلام خان (سلطان شاہ) نے اپنے معصوم بھتیجے کو سرہند بلا لیا۔
بہلول بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اسلام خان نے ان میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو محسوس کر کے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور بڑے ہونے پر ان سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ اسلام خان کے بعد بہلول خان ہی سرہند کے حکمراں بنے، خود اسلام خان کی یہی خواہش تھی۔ اس زمانے میں دہلی پر سلطان محمد شاہ کی حکومت تھی، جن کا تعلق خاندان سادات سے تھا۔ خاندان سادات، خاندان تغلق کی حکومت کے خاتمے کے بعد ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں برسر اقتدار آیا تھا، لیکن اس خاندان کی حکومت سمٹ کر بہت چھوٹی سی رہ گئی تھی۔
بہلول نے سرہند کا حکمراں بننے کے بعد محسوس کیا کہ برصغیر بہت چھوٹی چھوٹی غیر مستحکم حکومتوں کے درمیان بٹ چکا ہے، چنانچہ ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم ہونی چاہیے۔ انہوں نے پنجاب کے بیشتر علاقوں کو ایک ایک کر کے فتح کر لیا، جن میں لاہور اور ملتان بھی شامل تھے۔ خاندان سادات کے سلطان محمد شاہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے علاؤالدین کو حکومت ملی، اس وقت تک صورتحال اور بگڑ چکی تھی۔ بہلول لودھی کے پاس مشرقی اور مغربی پنجاب تھا۔ گجرات، دکن، مالوہ، جونپور اور بنگال میں الگ الگ حکمرانوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ علاؤالدین کے پاس صرف دہلی کا شہر اور چند دیہات رہ گئے تھے۔ آخر بہلول نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔
بہلول نے مختلف علاقوں میں اپنے اہل عزیزوں اور بیٹوں کو حاکم بنا دیا تھا۔ ان کے ایک بیٹے نظام خان بھی تھے، جو بعد میں سکندر لودھی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ نظام خان کو دوآبہ یعنی گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے کی حکومت ملی تھی۔
بہلول لودھی کے بعد ان کے لائق بیٹے نظام خان نے زمام کار سنبھالی۔ انہوں نے اپنے لیے سکندر لودھی کا لقب پسند کیا۔ سکندر کے سامنے بہت بڑی آزمائش تھی کیونکہ اس وقت بھی برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان ریاستوں کو یکجا کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ سکندر لودھی نے ۱۷ شعبان ۸۹۴ھ / ۱۶ جولائی ۱۴۸۹ء کو دہلی کی حکومت سنبھالی۔ ان کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ اپنے ہی خاندان کے افراد کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ ایک متحدہ حکومت کے قیام میں مدد دیں۔ ان کے چھوٹے بھائی عالم خان، راپری کے حاکم تھے۔ سکندر نے راپری کی طرف پیش قدمی کی۔ عالم خان راپری سے چلے گئے، لیکن سکندر نے انہیں بلا کر اٹاوہ کا حاکم بنا دیا۔ دوسرے بھائی باربک شاہ، جونپور کے حاکم تھے۔ سکندر نے باربک شاہ کو اطاعت کی دعوت دی، لیکن باربک نے انکار کر دیا۔ اس پر قنوج کے قریب دونوں فوجوں میں لڑائی ہوئی جس میں باربک کو شکست ہوئی، لیکن سکندر نے فراخ دلی کے ساتھ باربک کو معاف کر دیا اور انہیں دوبارہ جونپور کا حکمراں بنا دیا۔
اگلی مہموں میں سکندر نے کالپی کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔ گوالیار کے حکمراں مان سنگھ نے اطاعت قبول کی۔ ۸۹۷ھ / ۱۴۹۱ء میں بیانہ فتح ہوا۔ ادھر جونپور پر راجپوت زمینداروں نے قبضہ کر لیا۔ ۸۹۹ھ / ۱۴۹۳ء میں سکندر اس طرف گئے۔ کھگر میں ہندو اور جاٹ زمینداروں سے مقابلہ ہوا۔ خونریز جنگ کے بعد دشمن شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جونپور پر باربک شاہ کا قبضہ بحال کروایا۔ واپس ہوئے تو اطلاع ملی کہ باربک شاہ کو مخالفین نے پریشان کر رکھا ہے۔ سکندر نے باربک کو کمک بھیج دی۔ قلعہ کنشت (ضلع مرزاپور میں الٰہ آباد جانے والی سڑک پر واقع ہے) کے راجا رائے بھید چندر نے اطاعت کا یقین دلایا۔ پھر ضلع الہ آباد میں اریل کا شہر فتح کیا۔ ۹۰۰ھ / ۱۴۹۴ء میں بھٹہ کی طرف بڑھے۔ راجا بھید چندر کے بیٹے برسنگھ نے مقابلہ کیا، لیکن ہزیمت اٹھا کر بھاگا۔
رائے بھید کے بڑے لڑکے لکھمی چند اور چند دیگر زمینداروں نے جونپور کے سابق حکمراں سلطان حسین شرقی کو اکسایا کہ سکندر پر حملہ کر دیں۔ سکندر بھی اپنی فوج لے کر روانہ ہوئے۔ بنارس سے کچھ فاصلے پر جنگ ہوئی۔ حسین شرقی شکست کھا کر پٹنہ (بہار) کی طرف بھاگے۔ سکندر نے ان کا پیچھا کیا، ۱۴۹۴ء میں سکندر لودھی بہار پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ حسین شرقی، بنگال چلے گئے اور وہاں کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کے پاس اپنی بقیہ زندگی بسر کی۔ آئندہ چند دنوں میں سکندر ترہت کے راجا کو اطاعت پر مجبور کر چکے تھے۔ ۹۰۰ھ / ۱۴۹۵ء میں

Marfat.com

سکندر نے بنگال کے سلطان علاؤالدین حسین شاہ کے علاقے پر چڑھائی کی، لیکن علاؤالدین نے امن اور صلح کی درخواست کی۔ فریقین میں صلح نامہ ہو گیا جس کے تحت طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے کی علاقائی حدود کا احترام کریں گے اور ایک دوسرے کے دشمنوں کو پناہ نہیں دیں گے۔

سکندر، ۹۰۱ھ / ۱۴۹۵ء میں مشہور شہر سنبھل (اتر پردیش) چلے گئے جہاں چار سال رہ کر کئی مہموں میں حصہ لیا اور بغاوتوں کا قلع قمع کیا۔ رمضان ۹۰۶ھ / مارچ ۱۵۰۰ء میں راجستھان کے سرحدی شہر دھول پور کا قلعہ فتح کر لیا۔ یہاں بنایک دیو حکمراں تھا جو قلعہ چھوڑ کر گوالیار بھاگ گیا۔ سکندر نے بعد میں بنایک دیو سے اطاعت کا وعدہ لے کر دھول پور اسی کو دے دیا۔ ایک ماہ بعد سکندر نے گوالیار کا رخ کیا۔ وہاں کے راجا نے صلح کی درخواست کی جو بعض شرائط پر مان لی گئی۔ رمضان ۹۱۰ھ / فروری ۱۵۰۴ء میں قلعہ مندر ایل (اب ریاست کرولی میں ہے) فتح کیا۔ آئندہ دو برسوں میں انہوں نے گوالیار کے باغی راجا کو لڑائی میں شکست دی۔ کرولی سے ۴۸ میل دور واقع اونت نگر فتح کیا۔ ۹۱۳ھ / ۱۵۰۷ء میں گوالیار سے ۴۴ میل دور قلعہ نرور پر چڑھائی کی، یہ قلعہ ۸ کوس قطر میں پھیلا ہوا تھا۔ محاصرہ کے ساتھ جنگ کئی دن جاری رہی۔ آخر قلعہ والوں نے خوراک اور پانی کی قلت سے تنگ آ کر جاں بخشی کی درخواست کی اور قلعہ چھوڑ کر چلے گئے۔ ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں سکندر نے آگرہ سے جنوب مشرق میں ہتکانت کا علاقہ رہزنوں اور لٹیروں سے پاک کیا۔

سکندر لودھی ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء کے دوران کام کی زیادتی کی وجہ سے بیمار رہنے لگے۔ یہی بیماری ان کے لیے پیام اجل لے کر آئی۔ ۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ / ۲۱ نومبر ۱۵۱۷ء کو اس عظیم حکمراں نے آگرہ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ انہیں دہلی میں ان کے اپنے لگائے ہوئے باغ "جود" میں ان کے والد کی قبر کے نزدیک سپرد خاک کیا گیا۔ بعد میں شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ سوری نے بہلول لودھی اور سکندر لودھی کی قبروں پر مقبرے تعمیر کروائے، جو آج بھی موجود ہیں۔ سکندر لودھی کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم لودھی نے حکومت سنبھالی۔ وہ ۹ برس تک حکمراں رہے۔ ان کے بعد برصغیر کی حکومت ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں خاندان مغلیہ کو منتقل ہو گئی۔

سکندر لودھی شریعت کے پابند، متقی اور خوفِ خدا رکھنے والے حکمراں تھے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ اس کے لیے ظہر کی نماز کے بعد کا وقت مقرر تھا۔ قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجلس علما منعقد ہوتی تھی جس میں سکندر شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے مملکت میں متعدد مساجد تعمیر کروائیں۔ تمام مساجد میں امام صاحبان، قاری اور خادموں کے تقرر کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ انہوں نے غیر اسلامی رسوم کی سختی سے ممانعت کی، اس ضمن میں مزاروں پر خواتین کے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

سکندر کی اسلام پسندی اور خلوصِ نیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت ان کی فوج ان کے بھائی باربک شاہ کی فوج کے مقابل صف آرا تھی، ایک فقیر آیا اور اس نے سکندر کا ہاتھ تھام کر کہا: "تیری فتح ہو گی" سکندر نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا اور کہا "جب دو مسلمانوں میں معرکہ آرائی ہو رہی ہو تو کبھی یک طرفہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ کہنا چاہیے کہ خدا کرے ایسا ہو جس میں اسلام کی بھلائی ہو۔"

سکندر بردبار، اعلیٰ ظرف اور نیک دل انسان تھے۔ ان کی فراخدلی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے بھائی باربک شاہ نے ان کے خلاف بغاوت کی اور جونپور پر قابض ہونا چاہا، لیکن سکندر نے باربک شاہ کو لڑائی میں شکست دینے کے باوجود، ان ہی کو دوبارہ جونپور کا حاکم بنا دیا۔ اسی طرح جب کنشت (بہار کے نواح میں علاقہ) کا راجہ بھید چندر، سکندر کو اطاعت کا یقین دلانے کے باوجود ان سے خوفزدہ ہو کر پٹنہ کی طرف بھاگ گیا تو سکندر نے اس کا سارا سامان اسے بھجوا دیا تھا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ اس وقت پیش آیا جب جونپور کے سابق حاکم سلطان حسین شرقی ایک لڑائی میں سکندر کی فوج سے شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے تو سکندر کے مشیروں نے پوچھا کہ کیا سلطان حسین شرقی کا پیچھا کیا جائے۔ اس پر سکندر لودھی نے کہا "وہ خدا جس نے اسے زمین پر گرا دیا ہے اور تمہیں زمین سے اٹھایا ہے، وہ سب دیکھ رہا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ مغرور نہ بنو۔"

سکندر لودھی علم دوست اور علم پرست حکمراں تھے اور علما کو اپنا ہم نشین رکھنا پسند کرتے تھے۔ تاریخ ہندوستان کے مصنف مولوی ذکاءاللہ کے مطابق سترہ جید علما کرام سکندر لودھی کے پاس رہتے تھے۔ سکندر لودھی کے دور میں ملتان سے دو بڑے علما کرام شیخ عبداللہ تلنبی (تلنبہ، ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے) اور شیخ عزیزاللہ، دہلی تشریف

Marfat.com

لائے۔ سکندر نے ان بزرگوں کی بہت تعظیم کی۔ ان علماکرام نے درس وتدریس کے معیار کو پہلے سے بھی بہتر بنادیا اور زیادہ کتابیں نصاب میں داخل کیں۔

سکندر لودھی، شیخ عبداللہ کی مجلس درس میں خود شریک ہوتے تھے، لیکن اس طرح کہ شیخ کے شاگردوں کو پتا نہ چلے۔ وہ چھپ کر ایک گوشے میں بیٹھ جاتے تاکہ درس کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ جب درس ختم ہو جاتا تو سکندر اٹھ کر شیخ کے پاس بیٹھ جاتے اور دیر تک ان کی باتوں سے استفادہ کرتے۔ سکندر ہی کے زمانے میں مولانا رفیع الدین شیرازیؒ جو اچھے محدث تھے، شیراز سے دہلی آئے، سکندر نے ان کی بڑی توقیر کی۔ مولانا شیرازی نے آگرہ میں درسِ حدیث کا سلسلہ خاصے عرصے تک جاری رکھا۔

سکندر لودھی کا ایک اہم کارنامہ فارسی زبان کا تحفظ اور اس کا فروغ ہے۔ سکندر نے جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو برصغیر پاک وہند تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا تھا۔ دہلی کی مرکزی حیثیت ختم ہو جانے کے باعث بہت سے خود مختار ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ ان ریاستوں میں بیشتر حاکم مسلمان تھے، لیکن ہر جگہ مقامی رجحانات غالب تھے، مثلاً بنگال میں بنگالی زبان رواج پا رہی تھی، جنوبی ریاستوں میں دکنی زبان کا چلن تھا، ایک دو ریاستوں میں مرہٹی زبان کو اہمیت دی جا رہی تھی، یوں فارسی زبان اپنی سرکاری حیثیت تقریباً کھو بیٹھی تھی۔ سکندر لودھی نے ان تمام مقامی زبانوں کو کماحقہ اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ فارسی کو سرکاری سطح پر رواج دیا۔

برصغیر میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد بھی حساب کتاب مقامی زبانوں میں رکھا جاتا تھا، ہندو پٹواری، قانون گو اور محاسب الگ الگ مقامی زبانوں میں ریکارڈ رکھتے تھے۔ سکندر لودھی نے حکم دیا کہ حسابات فارسی زبان میں رکھے جائیں، چنانچہ ہندو ملازمین کو فارسی زبان سیکھنی پڑی۔ بہت سے ہندوؤں نے فارسی میں کمال حاصل کیا اور ان میں فارسی زبان کے بہت سے اچھے شاعر پیدا ہوئے، مثلاً پنڈت ڈونگر مل فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

ہندوؤں کے فارسی سیکھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سنسکرت کی کئی اچھی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کیے گئے۔ سکندر لودھی خود بھی نئی کتابیں تصنیف کروانے اور تراجم کروانے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ علم کی ہر شاخ سے متعلق کتابیں لکھواتے تھے۔

سکندر لودھی کے دور کی ایک مفید اور اہم کتاب ''معدن الشفا'' ہے، جسے ''طبِ سکندری'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کو میاں بھوہ نے تحریر کیا تھا، جو سکندر کے امرا میں سے ایک تھے۔ انہوں نے سکندر سے کہا تھا کہ حکمائے ہند کی کتابوں کا فارسی زبان میں ایسا خلاصہ مرتب کیا جانا چاہیے جس میں تمام مشہور ہندوستانی طبیبوں کے نسخوں اور دواؤں کا ذکر آجائے۔ سکندر کو یہ مشورہ بہت پسند آیا، چنانچہ انہوں نے خراسان اور ہندوستان کے طبیبوں کو جمع کیا اور ان اطبا سے یونانی اور ہندوستانی طب کی کتابوں سے مضامین کا انتخاب کروایا۔ یہ کتاب میاں بھوہ نے مرتب کی۔ کتاب کے پانچ سو صفحات تھے، اور اس میں گیارہ سو سات امراض اور ان کے علاج کے لیے دواؤں کا ذکر تھا۔ ہندوستان میں اسلامی طب کی تدوین میں اس کتاب کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب آج بھی استعمال ہوتی ہے۔ اسے نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ سکندر کے دور میں مختلف قسم کے قدیم مخطوطات بھی جمع کیے گئے۔ ایک فرہنگ، ''فرہنگ سکندری'' کے نام سے مرتب کی گئی۔

سکندر لودھی کے عہد کی سب سے مشہور ادبی شخصیت شیخ جمالی کی ہے۔ شیخ جمالی بڑے پائے کے صوفی، شاعر اور تذکرہ نگار تھے۔ انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ سیر و سیاحت میں گزارا۔ وہ عراق، خراسان، روم اور شام گئے۔ ہرات میں وہ مولانا جامیؒ سے ملے۔ مولانا جامیؒ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ سکندر نے بھی جب شیخ جمالی کے اشعار سنے تو وہ ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ جب شیخ جمالی دہلی آئے تو سکندر لودھی نے ایک قطعہ کہا جس میں شیخ جمالی سے ''سنبھل'' آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ ان دنوں سکندر ''سنبھل'' میں تھے۔ سکندر نے یہ قطعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دہلی بھیجا۔ انہوں نے شیخ سے ان کی مثنوی کی کتاب ''مہر و ماہ'' کی بھی درخواست کی۔ شیخ خود تو نہ آئے البتہ مثنوی کی کتاب بھیج دی۔

سکندر نے شیخ جمالی کے استاد شیخ سماالدین سے درخواست کی کہ وہ شیخ جمالی کو لے آئیں۔ شیخ سماالدین نے شیخ جمالی کو راضی کر لیا۔ جب شیخ جمالی سنبھل کے قریب پہنچے تو سکندر لودھی نے دو میل آگے آکر شیخ کا استقبال کیا۔ بعد میں سکندر لودھی نے شیخ جمالی کو اپنے سے بہت قریب رکھا۔ شیخ بھی سکندر سے متاثر ہوئے اور سکندر کی وفات پر انہوں نے بہت دردناک اشعار کہے۔

شیخ جمالی کی اہم کتاب ''سیَر العارفین'' ہے، جس میں ہندوستان

Marfat.com

کے مشائخ کا تذکرہ ہے۔ یہ اولیاء کرام کی مستند سوانح عمری ہے۔ ان کا دیوان آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ سکندر کے دور میں جونپور کے ایک عالم شیخ الہدایہ تھے، انہوں نے فقہ کی شرح لکھی۔

سکندر لودھی خود بھی فارسی کے اچھے عالم اور شاعر تھے۔ وہ "گل رخ" تخلص کرتے تھے اور شیخ جمالی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ سکندر نے روزانہ چند گھنٹے اہل علم اور شعرا کے ساتھ بحث و مباحثہ کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔

سکندر علم کے شیدائی تھے اور عالموں کو دوست رکھنا پسند کرتے تھے۔ وہ عمومی علم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے خواہش مند تھے۔ سکندر علما کی رائے کا نہایت احترام کرتے تھے اور ان سے شرعی مسائل پوچھ لیا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں گو کہ تھوڑی سی سختی تھی اور مذہب کے معاملے میں وہ قدرے جذباتی ہو جاتے تھے، لیکن جب انہیں شرعی احکام کا حوالہ دیا جاتا تو وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کر کے درست موقف اختیار کر لیتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب انہیں بتایا گیا کہ کورو کھشیتر میں بہت سے ہندوؤں نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ وہ مندر میں پوجا پاٹ کرتے ہیں اور تالاب میں اشنان کرتے ہیں۔ سکندر نے ایک بڑے عالم شیخ عبداللہ سے مشورہ کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہنگامہ کرنے والے ہندوؤں کو قتل اور ان کے مندر کو مسمار کر دیا جائے۔ شیخ نے فرمایا کہ ذمیوں کی عبادت گاہ کو گرانا شریعت کے خلاف ہے۔ اس پر سکندر برہم ہو گئے اور کہنے لگے: "آپ بھی کفار کے ساتھی ہیں، میں پہلے آپ کا اور پھر کفار کا خاتمہ کروں گا۔" شیخ نے اطمینان سے فرمایا: "زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے، آپ نے جو کچھ پوچھا میں نے حضور ﷺ کے احکام کے مطابق جواب دیا، اگر آپ کو اس کی قدر نہ تھی تو آپ نے پوچھا ہی کیوں؟"

شیخ کا یہ جرأت مندانہ جواب سن کر سکندر نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

سکندر لودھی اپنی مملکت میں عدل و انصاف کا پرچم سربلند رکھنے کے خواہش مند تھے۔ روز عدالت لگاتے تھے، عوام کی فریادیں سنتے تھے۔ شریعت کے مطابق فیصلوں میں مدد دینے کے لیے بارہ علماء کرام عدالت میں موجود رہتے تھے۔

سکندر لودھی دریا دل، سخی اور نیک نفس حکمراں تھے۔ انہوں نے اپنی مملکت میں ناداروں اور محتاجوں کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ سال میں دو بار محتاجوں اور مستحقین سے درخواستیں طلب کی جاتی تھیں اور اتنی رقم جاری کر دی جاتی تھی جو چھ ماہ کے لیے کافی ہوتی تھی۔ موسم سرما میں غریبوں کے درمیان گرم چادریں، لحاف، کمبل وغیرہ تقسیم کیے جاتے تھے۔ جمعے کے روز مساجد میں جو رقم جمع ہوتی تھی وہ بھی نادار افراد میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ رمضان المبارک اور محرم میں محتاجوں اور مسکینوں کی امداد کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ سکندر کے ماتحتوں میں سے اگر کوئی مستحقین کی ذاتی طور پر امداد کرتا تو سکندر اس سے بہت خوش ہوتے اور کہتے: "آپ نے ایک نیک کام کی بنیاد ڈالی ہے۔"

سکندر لودھی نے مملکت میں خوشحالی لانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ وہ سخت محنت کے عادی تھے۔ ان کی مصروفیات کا نظام الاوقات متعین تھا۔ وہ انتظامی امور پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا، ان کی نگاہوں سے کوئی معاملہ پوشیدہ نہ رہتا تھا۔ ان کے خفیہ نویس (انٹیلی جنس سروس) بہت فعال تھے اور مملکت کے کسی بھی حصے میں پیش آنے والے اہم واقعات ان کے علم میں رہتے تھے۔ صوبائی گورنروں کو تفصیلی ہدایات دی گئی تھیں کہ قیمتوں پر نظر رکھیں اور اس بارے میں روزانہ رپورٹ بھیجیں۔ سکندر کے دربار میں روزانہ منڈیوں میں اشیائے صرف اور اناج کے بھاؤ پڑھ کر سنائے جاتے تھے، مملکت کے مختلف حصوں کے اہم حالات سے بھی سکندر کو آگاہ کیا جاتا تھا، اگر سکندر کسی قسم کی تبدیلی چاہتے تو اس ضمن میں ضروری ہدایات جاری کر دیتے تھے۔ ڈاک کا نظام بہت عمدہ تھا۔ جگہ جگہ ڈاک چوکیاں بنی ہوئی تھیں، جن پر تازہ دم گھوڑے تیار رہتے تھے۔

سکندر لودھی نے حسابات (اکاؤنٹس) کی جانچ پڑتال اور معائنہ (آڈٹ) کا نظام سختی سے نافذ کیا تھا۔ وہ اس بات پر بہت اصرار کرتے تھے کہ افسران کو دیانت دار ہونا چاہیے۔ اگر کسی افسر کی غلطی سے سرکاری املاک کا نقصان ہو جاتا تو متعلقہ افسر پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا۔ سکندر لودھی کی ہیبت اتنی تھی کہ ان کے ماتحت اور ضلعی حکام ان کا خط آتے ہی خوف زدہ ہو جاتے تھے اور اس خط کو بہت احترام سے وصول کرتے۔ جو احکام عوام سے متعلق ہوتے تھے وہ مساجد کے منبر سے پڑھ کر سنا دیے جاتے تھے۔

سکندر کا دربار بھی بہت پُروقار ہوتا تھا۔ اس دربار میں کوئی

Marfat.com

ناشائستہ یا نازیبا گفتگو یا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ سکندر نظم و ضبط کے سختی سے قائل تھے، چنانچہ ان کے دربار میں ضابطوں کی پوری طرح پابندی کی جاتی تھی۔ سکندر جاہ و حشم اور کروفر کے عادی نہ تھے، وہ زرق برق لباس پہننے کی بجائے سادہ لباس زیب تن کرتے تھے، اور تکلفات سے اجتناب کرتے تھے۔

مشہور شہر آگرہ بسانے کا اعزاز سکندر لودھی ہی کو حاصل ہے۔ سکندر اپنا دارالحکومت کسی موزوں جگہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس غرض سے دریائے جمنا کے کنارے کا انتخاب کیا۔ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں وہ دہلی سے متھرا آئے۔ پہلے انہوں نے ماہرین کی ایک جماعت اس علاقے میں بھیجی جہاں نیا شہر بسانا مقصود تھا۔ ماہرین کشتی میں سوار ہو کر دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلے۔ انہوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر وہ مقام پسند کیا جہاں آج کل آگرہ آباد ہے۔ انہوں نے سکندر لودھی کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

سکندر خود اس جگہ پہنچے۔ انہیں یہاں دو بلند ٹیلے نظر آئے۔ انہوں نے ایک ملاح سے پوچھا کہ ان دو بلندیوں میں سے کونسی بہتر ہے۔ ملاح نے کہا "جو بھی "آگرہ" یعنی سعد ہو۔" سکندر نے مسکرا کر کہا "اس شہر کا نام "آگرہ" ہو گا۔" یہ روایت تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی میں خواجہ نعمت اللہ ہروی کی ہے۔

مولوی ذکاءاللہ نے تاریخ ہندوستان میں مختلف بات لکھی ہے۔ ان کے مطابق ملاح نے سکندر کا سوال سن کر کہا تھا، "وہ جو آگرہ" ہے، یعنی وہ جو آگے والا ٹیلہ ہے۔ مولوی ذکاءاللہ نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے کہ آگرہ کا لفظ "اگور" سے نکلا ہے جس کے معنی "نمک دان" کے ہیں، اس علاقے کو آگرہ اس لیے کہا گیا کہ یہاں کی زمین میں شوریت (نمک) بہت تھی۔

آگرہ میں سکندر نے بیانہ (تھنکر) کے ۵۲ پرگنوں میں سے ۹ پرگنے شامل کر دیے اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا جس کا نام قلعہ بادل گڑھ رکھا گیا۔ بعد میں مغل شہنشاہ اکبر نے اس قلعہ کی جگہ ایک اور قلعہ تعمیر کروا دیا تھا۔ سکندر نے آگرہ میں ایک بارہ دری بھی تعمیر کروائی تھی، جو، اب بھی موجود ہے۔

آگرہ نے بہت جلد اہمیت حاصل کر لی۔ دنیائے اسلام کے بہت سے حصوں سے ماہرین علم و فن آکر یہاں آباد ہو گئے۔ یہ شہر جنگی اور تجارتی لحاظ سے نہایت اہم مرکز بن گیا، کیونکہ جنوب میں گوالیار اور مالوہ، مغرب میں راجپوتانہ، شمال مغرب میں دہلی اور پنجاب اور مشرق میں وادی گنگا کو جانے والے رستے، آگرہ ہی سے گزرتے تھے۔ سکندر لودھی نے آگرہ سے دھول پور تک ہر دس میل کے فاصلے پر سرائیں اور عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔

لودھی خاندان کے عظیم فرمانروا سکندر لودھی نے اپنے ۲۷ سالہ دور حکومت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔ سکندر لودھی کے ان کارناموں کی وجہ سے تاریخ ان کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرے گی۔

***

Marfat.com

ظہیر الدین بابر

اولو العزم، فہیم و دانا حکمران جنہوں نے برِ صغیر میں مغلیہ سلطنت کی بنا ڈالی

فوجی دستے گزر رہے تھے!

کئی میل دور تک دریا کے کنارے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں واقع شہر، ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج رہا تھا۔ ان گھوڑوں پر اسلحہ بردار چاق و چوبند فوجی دستے سوار تھے۔

شہر والے اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف کے سائے رقصاں تھے کہ پتا نہیں کہ حملہ آور لشکر ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ وہ دروازوں کی جھریوں سے جھانک کر گزرنے والی فوج کو سہمی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

لشکر کے وسط میں سپہ سالار کی شاندار سواری تھی۔ سپہ سالار مضبوط اور توانا بدن اور اوسط قد کا حامل ایک خوش شکل جوان تھا۔ اس کے چہرے اور انداز و اطوار سے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ ایک شائستہ، بامروت اور نرم خُو لیکن پُر عزم انسان ہے۔

اچانک شہر کے ایک حصے سے کچھ چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کچھ لوگ فریاد کر رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں لُٹ جانے کا نوحہ تھا۔ بے بسی کا اظہار تھا۔ سپہ سالار نے فوراً حکم دیا کہ اس ہنگامے کا سبب معلوم کیا جائے۔

بہت جلد سپہ سالار کو مطلع کیا گیا کہ ان کی فوج کے ایک حصے نے شہریوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

سپہ سالار کے خوب صورت چہرے پر طیش کے آثار نمودار ہوگئے۔ انہوں نے فوراً ان تمام سپاہیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا جنہوں نے شہریوں کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

کچھ ہی دیر میں تمام ملزمان حاضر کر دیے گئے۔

سپہ سالار نے حکم دیا کہ فلاں فلاں سپاہیوں کو سزائے موت دے دی جائے اور فلاں فلاں کی ناکیں کٹوا دی جائیں اور ان فیصلوں کی پورے شہر اور فوج میں اچھی طرح تشہیر کر دی جائے۔ تشہیر کا حکم اس لیے دیا گیا کہ آئندہ فوج کے کسی اعلیٰ ترین افسر کو بھی رعایا کے کسی فرد یا اپنے محکوم و مفتوح شہریوں یا دیہاتیوں سے کسی طرح کی زیادتی کی جرأت نہ ہو سکے۔

یہ سپہ سالار تھے، برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے بانی، عظیم حکمران ظہیر الدین بابر جنہوں نے دریائے جہلم کے کنارے واقع شہر بھیرہ سے گزرتے ہوئے اپنی فوج کے سپاہیوں کو شہریوں سے زیادتی کی سزا دینے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لیا۔ ظہیر الدین بابر نہ صرف ایک اچھے سپہ سالار تھے بلکہ ایک ذی علم شخصیت، اچھے شاعر، خطاط اور علم و فن کے بڑے قدر دان بھی تھے۔

ظہیر الدین بابر ٦ محرم ٨٨٨ھ / ١٤ فروری ١٤٨٣ء کو پیدا ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کے مطابق بابر کا اصلی نام ظہیر الدین تھا لیکن انہیں "بابر" یعنی "شیر" کہتے تھے۔ خافی خان (نظام الملک) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بابر کا نام "مرزا بابر" تھا، جب انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد فرغانہ کی حکومت سنبھالی تو "ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔

بابر کے والد کا نام عمر شیخ مرزا اور والدہ کا نام قتلغ نگار خانم ہے۔ دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق والدہ کا نام قلوک نگار خانم ہے جبکہ خافی خان نے اسے مہر نگار خانم لکھا ہے۔ بابر کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے تیموری سلطنت کے بانی امیر تیمور سے پانچویں پشت میں جا ملتا ہے۔ بابر کی والدہ چنگیز خان کی نسل سے تھیں۔ بابر کا سلسلۂ نسب والدہ کی جانب سے چنگیز خان سے پندرھویں پشت میں جا کر ملتا ہے۔

Marfat.com

بابر کے والد عمر شیخ مرزا سے قبل تیموریوں (امیر تیمور کی نسل) اور منگولوں (چنگیز خان کی نسل) کے درمیان طویل عرصے سے کشاکش چلی آرہی تھی، لیکن بابر کے دادا (امیر تیمور کے پڑپوتے) ابو سعید مرزا نے اس کشاکش کا خاتمہ کر کے باہمی روابط کے نئے دور کی بناڈالی۔ انہوں نے چغتائی خاندان کے فرماں روا یونس خان (جو تاشقند پر حکومت کر رہے تھے) کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ دونوں خاندانوں نے دیرینہ عداوتوں اور رنجشوں کو بھلا دیا۔ یہاں تک کہ یونس خان نے اپنی تین بیٹیوں کی شادیاں ابو سعید مرزا کے تین بیٹوں سے کر دیں۔ ان تین بیٹوں میں سے ایک عمر شیخ مرزا تھے جن کی شادی قتلغ نگار خانم (مہر نگار خانم) سے ہوئی۔ انہی خاتون نے ظہیر الدین بابر نام کے اس بچے کو جنم دیا جس نے بڑے ہو کر برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنا ڈالی۔ کہتے ہیں کہ نام خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے تجویز کیا تھا۔ بابر لقب بعد میں ملا۔

بابر اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت تھے کہ والد اور والدہ دونوں کی طرف سے انہیں بھرپور علمی سرپرستی میسر آئی تھی۔ والد عمر شیخ مرزا بھی اپنے آباؤ اجداد اور خاندان کے دیگر بزرگوں امیر تیمور، الغ بیگ، شاہ رخ کی طرح علم دوست انسان تھے۔ خود بابر نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، بیشتر وقت قرآن پاک کا مطالعہ کرتے تھے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ (اس دور کے ایک بہت بڑے بزرگ) ان کو اپنا فرزند کہا کرتے تھے۔ خمسین (خمسۂ نظامی اور خمسۂ خسرو)، مثنوی (مثنوی جلال الدینؒ رومی) اور تاریخ کی کتابیں ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔"

بابر کی والدہ قتلغ نگار خانم بھی ایک ذہین اور قابل خاتون تھیں۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا نے ان سے شادی اسی وجہ سے کی تھی کہ قتلغ نگار خانم کے والد یونس خاں ایک باکمال اور ذی علم انسان تھے۔ یونس خان کی ایک اور بیٹی، خوب نگار خانم کی شادی محمد حسین گورگان دغلت سے ہوئی۔ ان کے لڑکے حیدر مرزا دغلت نے اپنی کتاب تاریخ رشیدی میں اپنے نانا یونس خان کے متعلق لکھا ہے: "خان (یونس خان) مولانا شرف الدین علی یزدیؒ کے ساتھ ۱۲ برس رہے اور ان سے فیض حاصل کیا۔ مولانا یزدیؒ کے انتقال کے بعد خان، عراق، فارس اور آذربائیجان چلے گئے۔ وہ قرآن پاک کی قرأت خوب کرتے تھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ موسیقی اور مصوری میں بھی ماہر تھے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر والد اور والدہ دونوں جانب سے ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بابر کی تعلیم و تربیت پر ابتدا ہی سے خاص توجہ دی گئی۔ خود بابر بھی بے حد ذہین اور زیرک تھے۔ ان کے بچپن سے جوانی تک جن اساتذہ نے ان کو خصوصی تربیت دی ان میں شیخ فرید بیگ، بابا قلی علی خدائی، بیری بیگ اور خواجہ مولانا قاضی عبد اللہ شامل تھے۔

بابر کی کتاب سے پتا چلتا ہے کہ قرآن کریم، شیخ سعدیؒ کی گلستان بوستان، فردوسی کا شاہ نامہ، نظامی اور خسرو کے خمسے، مولانا شرف الدین علی یزدیؒ کا ظفر نامہ اور ابو عمر منہاج الجوز جانی کی طبقاتِ ناصری کی کتب ان کے مطالعے میں رہیں۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی لیکن انہوں نے عربی اور فارسی کی بھی مکمل تعلیم حاصل کی۔

بابر نے ہوش سنبھالا تو سمرقند، فرغانہ، خراسان اور خصوصاً ہرات، علوم و فنون کے بے مثال مراکز بن چکے تھے۔ اس علمی فضا میں بابر کو تعلیم و تربیت کے بہترین مواقع میسر آئے۔ پانچ برس کی عمر میں انہیں سمرقند بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ ۶ برس تک زیر تعلیم رہے۔ اس زمانے میں مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ بھی بقیدِ حیات تھے۔ گو کہ جب بابر نے حکومت سنبھالی تو مولانا جامیؒ وفات پا چکے تھے لیکن یقین ہے کہ بابر نے مولانا جامیؒ کے علم سے بھرپور استفادہ کیا ہو گا کیونکہ اپنی تزک میں بابر نے مولانا جامیؒ کا ذکر نہایت عقیدت سے کیا ہے۔

بابر، شیخ الاسلام سیف الدین احمدؒ سے بھی بہت متاثر تھے جو شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بابر کے الفاظ میں: "وہ بڑے پرہیزگار عالم تھے۔ ستر برس تک انہوں نے جماعت سے نماز ایک بار بھی ترک نہیں کی۔" بابر، ملا شیخ حسنؒ کے علم کلام کے بھی معترف تھے اور میر جمال الدینؒ محدث کے بھی بڑے قدر دان تھے۔ ان کے بارے میں بابر نے لکھا: "خراسان میں علم حدیث کا جاننے والا ان جیسا کوئی نہ تھا۔" عربی ادب میں بابر میر عطاءاللہ مشہدی کو پسند کرتے تھے اور علم فقہ میں قاضی اختیارؒ کو ستائش کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر ایک وسیع المطالعہ اور ذی علم انسان تھے اور علم کے تمام اہم شعبوں سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

بابر کو شعر و سخن سے بھی دلی لگاؤ تھا۔ انہوں نے اپنے دور کے ایک بڑے شاعر اور ماہر علم و فن علی شیر نوائی کی خدمات اور علمی کارناموں پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصروں

Marfat.com

کے علمی کام پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ بابر نے دیگر کئی شعرا کے فن پر بھی تبصرے کیے ہیں جس سے بابر کے مطالعے کی وسعت اور تجزیے کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بابر کے والد فرغانہ اور اندجان پر حکمراں تھے۔ ۸۹۹ھ / ۱۴۹۴ء میں وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد بابر نے رمضان المبارک ۸۹۹ھ / جون ۱۴۹۴ء میں امرا کی تائید سے فرغانہ کی حکومت سنبھالی۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۱۲ برس تھی۔ نو عمر حکمراں کے لیے یہ وقت بڑا کٹھن تھا کیونکہ اقتدار کے دعویدار بہت سے تھے۔ بابر کے ماموں سلطان محمود مرزا نے حصار کے علاقے سے اور چچا سلطان احمد مرزا نے سمرقند سے فوجی پیش قدمی کر دی۔ بابر اندجان چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد فریقین میں چند شرائط پر صلح ہو گئی۔ ربیع الاول ۹۰۳ھ / نومبر ۱۴۹۷ء تک بابر نے اپنے مخالفین پر قابو پا کر سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا تاہم اپنے صدر مقام اندجان میں سازش کے باعث انہیں سمرقند چھوڑنا پڑا۔ وہ اندجان گئے اور سازش کا خاتمہ کیا۔

بابر نے ۹۰۵ھ / ۱۴۹۹ء میں فرغانہ کو اپنے اور اپنے بھائی جہانگیر مرزا کے درمیان تقسیم کر لیا۔ اسی سال بابر نے شادی کی۔ اگلے سال بابر نے سمرقند پھر فتح کر لیا جس پر ازبک حکمراں شیبانی خان نے قبضہ کر لیا تھا لیکن شیبانی خان نے رمضان ۹۰۶ھ / مارچ، اپریل ۱۵۰۱ء میں بابر کو شکست دی۔ سامان رسد کی کمی کی وجہ سے بابر کو سمرقند چھوڑنا پڑا۔

یہ بڑے جاں گسل لمحات تھے کیونکہ بابر کے لیے اب کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ بابر اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ ختن اور ہشیار کے خانہ بدوشوں کے پاس پناہ گزیں رہے۔ آخر بابر نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی ایسے علاقے کا رخ کرنا چاہیے جس میں ازبک حکمرانوں کو دلچسپی نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے کابل کا رخ کیا۔ کابل جاتے ہوئے انہوں نے بدخشاں پر قبضہ کیا۔ کابل پر الغ بیگ مرزا (بابر کے چچا) کے ایک داماد محمد مقیم کی حکومت تھی، بابر کی آمد پر وہ قلعہ بند ہو گئے لیکن چند دن میں ہتھیار ڈال دیے۔ بابر نے اس شہر کی حکومت سنبھالنے کے بعد شہر کو بڑی ترقی دی۔ یہاں باغات لگوائے، تعمیرات کروائیں اور نظم و نسق پر توجہ دی۔

سنہ ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں بابر کی والدہ قتلغ نگار خانم کا انتقال ہو گیا۔

اسی زمانے میں بابر نے ازبکوں کے خلاف حسین بایقرا کی مدد کی۔ ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء میں بابر نے قندھار کا قلعہ فتح کیا، پھر وہ خراسان کی مہم کے لیے تیاریاں کرنے لگے۔ ان ہی دنوں ۹۱۳ھ / ۱۵۰۷ء میں بابر کے بیٹے ہمایوں کی ولادت ہوئی۔ ادھر شیبانی خان نے فارس کی صفوی حکومت کے بادشاہ اسمٰعیل صفوی کی سرحدوں پر چڑھائی کر دی۔ اسمٰعیل صفوی نے جوابی کارروائی کی اور ہرات تسخیر کر لیا۔ اسی زمانے میں بابر نے بدخشاں پر دوبارہ فوج کشی کی جہاں ازبک قابض ہو گئے تھے۔ بدخشاں فتح کرنے کے بعد بابر نے حصار، قندز اور بقلات پر قبضہ کیا اور پھر بخارا پر بھی تیموری پرچم لہرا دیا۔ اس اثنا میں شیبانی خان نے قندھار پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن رمضان المبارک ۹۱۶ھ / دسمبر ۱۵۱۰ء میں شیبانی خان مرو کے مقام پر شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوجوں سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

اس کے بعد بابر نے رجب ۹۱۷ھ / اکتوبر ۱۵۱۱ء میں سمرقند پر قبضہ کر لیا، تاہم چونکہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے ان کی مدد کی تھی، اس لیے بابر نے چاہا کہ ان کی فوج کی وردی بھی شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوج کی وردی جیسی ہو جائے۔ اس تبدیلی کو سمرقند کے امرا نے پسند نہیں کیا۔ بابر کو صفر ۹۱۸ھ / مئی ۱۵۱۲ء میں ازبکوں سے ایک لڑائی میں شکست بھی کھانی پڑی۔ وہ کابل واپس چلے گئے۔

اسی زمانے میں برصغیر (پاک و ہند) سے خبریں آنے لگیں کہ ہند کے فرماں روا سکندر لودھی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی جگہ ابراہیم لودھی کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور امرا کے درمیان آئے دن جھگڑے ہو رہے ہیں۔ بابر خود بھی ۹۲۲ھ / ۱۵۱۶ء سے چھوٹی چھوٹی مہمات روانہ کر کے سرزمین ہند کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دہلی کے حکمراں ابراہیم لودھی کے چچا عالم خان اور لاہور کے دولت خان لودھی نے دی تھی کہ آ کر ابراہیم لودھی کے خلاف ان کی مدد کریں۔

بابر ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء سے ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء تک برصغیر پر چار حملے کر چکے تھے۔ پہلی بار انہوں نے ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء میں اٹک تک یلغار کی اور پنجاب کی سرحد پر ککروں (گکھڑوں) اور دیگر مخالفین کی خبر لی۔ واضح رہے کہ قبل ازیں اس جانب کے کئی علاقے خوشاب، بھیرہ وغیرہ امیر تیمور نے فتح کیے تھے اور انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ بابر نے ان علاقوں کا نظم و نسق درست کیا۔

دوسری بار بابر نے لاہور، ملتان اور سرہند تک پیش قدمی کی۔ ایک قلعہ اور کئی عمارتیں بنوائیں لیکن کابل سے تشویش انگیز اطلاعات

Marfat.com

موصول ہونے پر وہ واپس چلے گئے۔

تیسری مرتبہ بابر ۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء میں سرہند تک بڑھتے چلے گئے لیکن قندھار کے بگڑے ہوئے معاملات کی وجہ سے انہیں واپس جانا پڑا۔

چوتھی بار وہ ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء میں لاہور پر حملہ آور ہوئے اور کھکھروں کے خلاف کارروائی کی۔

بابر نے سرزمینِ ہند پر پانچواں اور فیصلہ کن حملہ ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں کیا۔ جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ ہند کے حکمراں ابراہیم لودھی ایک لاکھ سواروں کے ساتھ پانی پت کے میدان میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ جنگی ہاتھی بھی ہیں۔ بابر کے ساتھ تقریباً پچیس ہزار کا لشکر تھا۔ فریقِ مخالف کے پاس کئی گنا زیادہ طاقت تھی اس لیے بابر کی فوج میں تشویش کا پھیل جانا فطری تھا لیکن بابر نے اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دلایا، انہیں منظم کیا اور سرہند پہنچ کر وہاں بھروسے کے قابل حکام مقرر کر کے پانی پت کی سمت کوچ کر دیا۔

پانی پت کا میدان دہلی سے ۴۰ کوس کے فاصلے پر دہلی اور سرہند کے درمیان واقع ہے۔ ۹ رجب ۹۳۲ھ / ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت کے میدان میں تاریخی جنگ لڑی گئی جس کے نتیجے میں برِصغیر کی تاریخ کا ایک نیا باب کھل گیا۔ بابر نے حکم دیا کہ توپوں کی گاڑیاں، بیلوں کی مروڑ دار کھالوں کے ساتھ زنجیر کی طرح جوڑ دی جائیں۔ ہر دو توپ گاڑیوں کے درمیان چھ یا سات لوہے کے توے تھے۔ گولہ پھینکنے والے ان تووں کے عقب میں کھڑے ہو کر گولہ پھینکتے تھے۔ بابر نے ان تیاریوں پر پانچ یا چھ دن صرف کیے تھے۔ اس کے بعد وہ پانی پت کی طرف بڑھے تھے۔ صبح میں لڑائی کا آغاز ہوا، گھوڑوں کی ٹاپوں، ہاتھیوں کی چنگھاڑوں اور رزمیہ نعروں سے میدان گونج اٹھا، خون کے فوارے اچھلنے لگے اور گرد و غبار کے بادلوں نے میدان کو ڈھانپ لیا۔ توپوں کی گرج نے دلوں پر ایک دہشت طاری کر دی۔ بابر کی مختصر مگر جنگ آزما فوج کے آگے ابراہیم لودھی کا دس گنا بڑا لشکر نہ ٹھہر سکا اور دوپہر ہونے تک اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ابراہیم لودھی لڑتے ہوئے مارے گئے اور بابر کا لشکر فتح یاب ہوا۔

بابر نے کئی دن سے تھکی ہوئی فوج کو آرام کرنے کا موقع نہ دیا اور اسی دن اپنے بیٹے ہمایوں کی قیادت میں فوج کے ایک حصے کو آگرہ فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ خود بابر نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔

۱۲ رجب ۹۳۲ھ / ۲۴ اپریل ۱۵۲۶ء کو بابر دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ شیخ زین الدین کو جو بابر کے معتمد تھے، حکم دیا کہ ظہیر الدین بابر کے نام کا خطبہ پڑھیں۔ اگلے دن بابر نے دہلی میں بزرگانِ دینؒ کے مزاروں کی زیارت کی۔ دہلی کے قلعے اور شاہی محلوں کی سیر کی اور دس دن دہلی میں قیام کے بعد آگرہ روانہ ہوئے۔

بابر کی آگرہ آمد سے پہلے ہمایوں قلعہ آگرہ پر قبضہ کر چکے تھے جو پہلے راجا بکرماجیت کے پاس تھا۔ راجا بکرماجیت نے پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم لودھی کا ساتھ دیا تھا۔ آگرہ کے قلعے سے ہمایوں کو بہت بڑا خزانہ ملا تھا۔ اس میں آٹھ مثقال وزن کا وہ نہایت بیش قیمت الماس بھی شامل تھا جو علاؤالدین خلجی دکن سے لے کر آئے تھے۔

بابر آگرہ پہنچے تو ان کا شاندار استقبال ہوا۔ بابر کو آگرہ کا خزانہ پیش کیا گیا تو انہوں نے حکم دیا کہ اس میں سے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کے علما کرام اور بزرگوں کو حصہ روانہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ کابل اور دیگر تمام ملکوں کے مستحقین کے لیے بھی رقوم روانہ کرنے کی ہدایت کی۔

اس موقع پر بابر کی فوج گرمی کی شدت سے پریشان تھی۔ سرسام کی بیماری سے بھی فوج کے جوانوں کو شکایت تھی لیکن بابر کی جوشیلی اور مدلل تقریریں سن کر جوانوں نے پھر کمر ہمت باندھ لی۔ بابر کی فوج اب دریائے گنگا کی سمت بڑھتی ہوئی جونپور اور غازی پور تک پہنچ چکی تھی۔

ادھر دہلی اور آگرہ پر بابر کے قبضے کے باعث ہند کے دیگر راجاؤں کو شدید تشویش ہوگئی چنانچہ اطراف کے راجاؤں نے مشرقی پنجاب میں حکمراں لودھی سرداروں سے رابطہ قائم کیا۔ سرکش میواتیوں کو اپنے ساتھ ملایا اور سب مل کر چتوڑ کے حکمراں رانا سانگا کے پاس فریاد لے کر پہنچ گئے۔ رانا سانگا نے تمام راجاؤں اور ریاستوں کے حکمرانوں کو پیغامات بھجوائے اور جلد ہی تقریباً دو لاکھ راجپوت اور پٹھان سواروں کی فوج جمع کر لی۔ اس فوج میں دو ہزار جنگی ہاتھی اور توپ خانہ بھی شامل تھا۔

رانا سانگا کی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی تو اس کی خبریں بابر تک پہنچنے لگیں۔ بابر کی فوج کے تجربہ کار افسران تک اس زبردست فوج کی آمد کی خبر سن کر پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن بابر نے کسی تردد کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ انہوں نے بیانہ

Marfat.com

کے مقام پر اپنی خصوصی چوکی قائم کر دی اور جاسوسوں کو ہدایت کر دی کہ دشمن کی نقل و حرکت سے مستقلاً آگاہ کرتے رہیں۔

بابر نے تمام اعلیٰ فوجی افسران اور امراً کا اجلاس طلب کیا۔ بیشتر افسران اور امراً کا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فی الحال پنجاب اور کابل کی طرف کوچ کر دینا چاہیے۔ بابر نے ان تمام مشوروں کو مسترد کر دیا اور نہایت ولولہ انگیز تقریر کی۔ انہوں نے کہا: "کیا تمہارے دلوں سے جذبۂ شہادت ختم ہو گیا ہے؟ یاد رکھو! اگر ہم کفار پر غالب آ گئے تو ہم غازی ہوں گے ورنہ رتبۂ شہادت ہمیں مل کر رہے گا۔ کیا یہ بات اس سے بہتر نہیں کہ ہمارا نام صرف بادشاہوں کی تاریخوں میں آئے اور وہ بھی "بھگوڑوں" کے لقب کے ساتھ۔ ہر فرد جو بھی اس دنیا میں آتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔ بدنامی کی زندگی سے ناموری کی موت کتنی بہتر ہے۔"

اس جوشیلی تقریر نے تمام افسران کی غیرت کو بیدار کر دیا۔ سب نے عہد کیا کہ وہ کفار کے مقابلے میں جان دینے کے لیے تیار ہیں۔

گیارہ جمادی الاول ۹۳۳ھ / ۱۳ فروری ۱۵۲۷ء کو آگرہ کے قریب خانوہ کے مقام پر دونوں فوجوں کے مابین خونریز جنگ کا آغاز ہوا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن بابر کی فوج کے جوان سر سے کفن باندھ کر لڑ رہے تھے۔ رانا سانگا کی فوج کا ہراول دستہ حسن خان میواتی کی قیادت میں دس ہزار سواروں پر مشتمل تھا، اس کے ساتھ راجپوتوں کا ایک بہادر گروہ بھی تھا۔ اس ہراول دستے کی یلغار سے بابر کی فوج کا ایک حصہ متاثر ہونے لگا اور قریب تھا کہ اس کے قدم اکھڑ جاتے لیکن بابر نے اپنی فوج کے مرکزی حصے کو پیش قدمی کا حکم دیا۔

حسن خان میواتی کے سواروں نے تیروں کی بارش کر دی لیکن بابر کے جری سپاہی تیروں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے رانا سانگا کی فوج کے تیر اندازوں کا خاتمہ کیا جس کے باعث دشمن کی اگلی صفوں میں بے ترتیبی پھیل گئی۔ بابر کی فوج نے اب دشمن کے قلب پر ہلا بول دیا۔ دس گھنٹے جنگ ہوتی رہی۔ رانا سانگا نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں، وہ تو کسی نہ کسی طرح اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا میدان سے فرار ہو گیا۔ جلد ہی مسلمانوں کی فوج سے فتح کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

اس جنگ کے بعد بابر نے راجپوتوں کو مزید سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے چندیری کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن کے محاصرے کے بعد قلعے پر قبضہ ہو گیا لیکن راجپوتوں نے پھر حملہ کرنے کی کوشش کی اور کئی ہزار راجپوت مارے گئے۔

اس کے بعد بابر کو قدرے سکون کے لمحات میسر آئے اور انہوں نے آگرہ میں عمارتیں تعمیر کروائیں اور باغات لگوائے۔

کچھ عرصے بعد بہار میں بہلول لودھی کے پوتے سلطان محمود نے بغاوت کر دی۔ اُدھر ملتان سے بھی سرکشی کی اطلاعات ملنے لگیں۔ بابر نے پہلے بہار کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ شعبان ۹۳۵ھ / مئی ۱۵۲۹ء میں بابر نے اس مقام پر لودھیوں پر فتح پائی جہاں گھاگرا اور گنگا آپس میں ملتے ہیں لیکن اس کے بعد بابر کو بنگالیوں کے ساتھ چپقلش مول لینی پڑی۔ بابر نے گنگا عبور کر کے بنگالیوں کو شکست دی۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "سیر افغانستان" میں لکھا ہے کہ قندھار کے باہر ایک پہاڑی پر ایک مسجد کے طاق میں بابر کے حکم سے ان تمام شہروں کے نام لکھے گئے ہیں جنہیں بابر نے فتح کیا تھا۔ یہ تمام نام جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں پٹنہ، حاجی پور، سہسرام سے لے کر لکھنؤ اور لاہور وغیرہ تک کے نام شامل ہیں۔

بابر نے اپنے سب سے بڑے بیٹے ہمایوں کو کابل میں حکمراں مقرر کیا تھا۔ ہمایوں اپنے والد سے ملنے کی خاطر واپس آئے تو بیمار ہو گئے۔ انہیں زبردست بخار چڑھ گیا۔ معالجوں نے ہر طرح کا علاج آزما لیا لیکن افاقہ نہ ہوا، حتیٰ کہ معالجوں نے بالکل ناامیدی ظاہر کر دی۔ بابر کو ہمایوں بے حد عزیز تھے۔ ان سے کسی نے کہا ہمایوں کی جان بچانے کے لیے صدقہ دے دیا جائے اور تجویز دی کہ اس قیمتی الماس کو صدقہ کر دیا جائے جو علاؤالدین خلجی کے خزانے سے حاصل ہوا تھا لیکن بابر نے کہا کہ پتھر کا یہ ٹکڑا میرے بیٹے کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے، ہمایوں کے بعد مجھے میری اپنی جان عزیز ہے۔ چنانچہ بابر تنہائی میں چلے گئے جہاں انہوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر اللہ تبارک و تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی صحت کی دعائیں مانگیں، پھر وہ بیمار بیٹے ہمایوں کے پاس گئے اور بیٹے کی چارپائی کے گرد چکر لگا کر کہا:

"برداشتم، برداشتم، برداشتم۔" (میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی)۔

اسی دن سے ہمایوں صحت یاب ہونے لگے اور بابر بیمار پڑ گئے۔ یہی بیماری ان کے لیے سفر آخرت کا پیغام لے کر آئی۔ ۶ جمادی الاول ۹۳۷ھ / ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو عظیم اور اولوالعزم حکمراں نے اس عالم فانی کو آگرہ میں خیرباد کہا۔ انتقال سے قبل بابر نے ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

Marfat.com

بابر کو آگرہ میں امانتاً دفن کیا گیا۔ کئی سال بعد، بابر کی وصیت کے مطابق ان کی نعش کابل منتقل کر دی گئی اور ان کی خواہش کے مطابق باغ نور افشاں میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اس باغ سے بابر کو بڑی محبت تھی۔ بابر کا مزار اسی باغ میں واقع ہے۔ مؤرخین کے مطابق شیر شاہ سوری نے بابر کی اہلیہ بی بی مبارکہ کو اجازت دی تھی کہ وہ بابر کا تابوت دفن کرنے کے لیے آگرہ سے کابل لے جائیں۔

بابر نہایت اچھے خیالات اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ وہ اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا کرتے تھے۔ اپنے خاندان کے لوگوں سے ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔ خصوصاً خواتین کی بے حد عزت کرتے تھے۔ جب انہوں نے برِ صغیر پاک و ہند میں حکومت سنبھالی تو اپنی دو پھوپھیوں فخر جہاں اور خدیجہ کو کابل سے آگرہ مدعو کیا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ آگرہ پہنچیں تو بابر نے خود شہر سے باہر جا کر ان کا خیر مقدم کیا۔ بابر کابل میں اپنی خالاؤں کے گھر جاتے رہتے تھے۔ آگرہ میں قیام کے دنوں میں ہر جمعے کو وہ اپنی چچیوں سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ ایک جمعے کو سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ بابر کی اہلیہ ماہم بیگم نے یہ کہہ کر بابر کو روکنے کی کوشش کی کہ: "اگر ایک جمعہ کو آپ چچی کے پاس نہ گئے تو کیا حرج ہے۔" بابر نے کہا: "ایسا نہ کہو، یہ سب اپنے باپ بھائیوں سے جدا ہو گئی ہیں۔ ان کی خاطر مجھ پر ہر حال میں لازم ہے۔"

بابر نے مختلف اوقات میں سات شادیاں کیں جن سے ۱۱ بیٹے اور کئی بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ کئی بچے کمسنی میں انتقال کر گئے۔ بابر کے مشہور بیٹوں میں ہمایوں، کامران، ہندال اور عسکری شامل ہیں۔ بیٹیوں میں گل بدن بیگم نے شہرت حاصل کی۔ بابر کو اپنے بچوں، خصوصاً ہمایوں سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کرنے کی کوشش کی چنانچہ بابر کی بیٹی گل بدن بیگم نہایت شائستہ اور شستہ مذاق کی انشاپرداز اور مؤرخہ تھیں۔ ان کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا۔ انہوں نے بابر کی فرمائش پر ایک کتاب "ہمایوں نامہ" بھی لکھی تھی جو نہ صرف اس دور کی مستند تاریخ ہے بلکہ اس سے حرم کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بابر مذہبی رجحانات رکھتے تھے۔ وہ نماز اور روزے کی ہمیشہ پابندی کرتے تھے۔ ایک بڑے بزرگ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ سے وہ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ایک خط کے ذریعے بابر کو تاکید کی تھی کہ وہ عدل قائم کریں۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں، اسلامی احکام کی پابندی کریں اور علمائے کرام کو دوست بنائیں۔

بابر جنگ لڑنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ وہ ایک بہادر، لیکن محتاط سپہ سالار تھے اور جنگ کا منصوبہ سوچ سمجھ کر بناتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے ازبک فوجی افسروں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان کی کڑی فوجی تربیت کا نتیجہ تھا کہ بابر نے برصغیر کی مہمات میں مورچہ بندی، خندق سازی، تفنگ اندازی، گولہ باری، دشمن کا محاصرہ کرنے کی تکنیک کو بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ بابر ضرورت پڑنے پر نئی توپیں ڈھلوایا کرتے تھے۔ انہوں نے توپ کا نام "ضرب زن" رکھا تھا تاہم یہ نام لوگوں کی زبان پر چڑھ نہ سکا۔ ابتدا میں بابر کی توپوں کے گولے ۲۰۰ قدم تک مار کرتے تھے بعد میں ۱۶۰۰ قدم تک مار کرنے لگے۔

بابر منتشر گروہوں کو متحد کرنے کا گر جانتے تھے اور فوج میں نظم و نسق پیدا کرنے کی بھی مؤثر صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی اس کامیابی میں ان کی دلکش شخصیت اور ہشاش بشاش طبیعت کا بھی بڑا دخل تھا۔

بابر اپنے ماتحتوں کی عزتِ نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے ماہر توپ ساز استاد علی قلی کو حکم دیا کہ ایک بڑی توپ تیار کی جائے۔ علی قلی نے تمام انتظامات مکمل کر کے بابر کو دعوت دی کہ وہ خود تشریف لا کر توپ ڈھلنے کا معائنہ فرمائیں۔ ۲۵ محرم ۹۳۳ھ / یکم نومبر ۱۵۲۶ء کو بابر معائنے کے لیے پہنچے۔ توپ ڈھالنے کے لیے آٹھ عدد بھٹیاں لگائی گئی تھیں۔ ہر بھٹی کے نیچے سے ایک نالی توپ کے سانچے تک جا رہی تھی۔

استاد علی قلی کے حکم پر بھٹیوں کی نالیوں کا منہ کھولا گیا۔ نالیاں کھلتے ہی مسالا پانی کی طرح بہہ کر آیا اور سانچے میں بھرنے لگا۔ ابھی سانچہ پوری طرح بھرا نہ تھا کہ بھٹیوں سے مسالے کی آمد رک گئی۔ فوری طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ ایسا بھٹیوں میں کسی نقص کی وجہ سے ہوا یا مسالے میں کوئی خرابی تھی، لیکن اس واقعے کے باعث علی قلی بے حد شرمسار ہوئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا چھپیں۔ بابر نے علی قلی کی یہ حالت دیکھی تو شفقت کے ساتھ انہیں دلاسا دیا۔ ان کی دل جوئی کی اور خلعت دے کر ان کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی۔

بابر کو جفاکشی والے مشاغل بہت پسند تھے۔ وہ غیر معمولی جسمانی طاقت اور زبردست قوتِ برداشت کے حامل تھے۔ اس کا اندازہ یوں لگائیں کہ وہ دو افراد کو اپنی بغلوں میں دبا کر دوڑ لگا سکتے تھے۔ شہسواری

Marfat.com

میں ماہر تھے اور بہت عمدہ پیراک تھے۔ جب انہیں جنگ کے دوران دریائے گنگا کو عبور کرنا پڑا تو دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی لیکن بابر نے تیر کر دریا عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ۳۳ ہاتھوں میں دریا کے پار پہنچ گیا اور پھر واپس بھی آ گیا۔' شہسواری اور پیراکی بابر کے معمولات میں شامل تھے۔

بابر بہت اچھے شمشیر زن بھی تھے اور دست بدست لڑائی کے ہنر سے بھی خوب واقف تھے۔ ازبکوں سے ایک لڑائی میں ان کے ساتھ صرف پانچ سو سوار رہ گئے تھے جب کہ مقابلے میں پانچ ہزار سوار تھے لیکن بابر نے ذرا حوصلہ نہ ہارا، انہوں نے دست بدست لڑائی میں مخالف فوج کے پانچ نامور سرداروں کو اپنی تلوار، تیروں اور گرز کی مدد سے مار گرایا اور ان پانچ سرداروں کے گرتے ہی مخالف فوج کے جوان میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

بابر کی زندگی کا بڑا حصہ کوہساروں، میدانوں اور برف زاروں میں جنگیں لڑتے ہوئے گزرا لیکن وہ جب کبھی اپنا دربار منعقد کرتے تو ان کا دربار آداب، تہذیب اور شائستگی کی منہ بولتی تصویر ہوتا تھا۔ متعدد ممتاز علما کرام، مؤرخین، شعرا اور دانشوروں کو بابر اپنے قریب رکھنا پسند کرتے تھے۔ ان میں خواند امیر (وفات: ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء) تھے جو تاریخ کی مشہور کتاب "حبیب السیر" کے مصنف تھے۔

مولانا شہاب الدین معمائی اور مرزا ابراہیم ہراتی کو بھی بابر عزیز رکھتے تھے۔ بابر کے دور کے ایک بڑے عالم، ادیب، شاعر شیخ زین الدین تھے۔ بابر کے فرامین وہی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے بابر کی 'مثنوی مبین' کی ایک شرح بھی لکھی اور بابر کے ہاتھوں فتح ہندوستان کی ایک تاریخ بھی رقم کی۔ شیخ زین الدین نے اکبر آباد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کا انتقال بابر کی وفات کے تین برس بعد ۹۴۰ھ / ۱۵۳۳ء میں ہوا۔

بابر کے دور کے ممتاز فضلا میں مولانا بقائی بھی تھے۔ مولانا شہاب الدین بھی اس عہد کے بڑے عالم تھے۔ کلام پاک اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ معما گوئی میں ماہر تھے، اس لیے مولانا شہاب الدین معمائی کہلاتے تھے۔ انہوں نے ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء میں وفات پائی۔

اس دور کے شعرا میں شیخ ابو الواجد فارغی، سلطان محمد کوسہ اور شیخ جمالی شامل تھے۔ خواجہ نظام الدین خلیفہ، مولانا یوسفی اور سید میر ابو البقا صف اول کے طبیب تھے۔

ظہیر الدین بابر کا علمی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ ان کی مادری زبان ترکی تھی لیکن وہ عربی اور فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ جغرافیہ، تاریخ اور فلکیات سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا بلکہ مؤرخین کے مطابق کوئی علمی شعبہ ایسا نہ تھا جس سے بابر کو دلچسپی نہ ہو۔ بابر حالانکہ جنگی سرگرمیوں اور ملکی انتظامات میں بے حد مصروف رہتے تھے لیکن وہ نہ صرف اہل علم کے لیے وقت نکالتے تھے بلکہ اپنے شب و روز میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی گنجائش پیدا کر لیتے تھے۔ علم سے ان کی گہری محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قیام کی حالت میں ہوں یا سفر میں، اپنا کتب خانہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ لاہور کے قریب ایک سردار غازی خان کو جب بابر نے شکست دی تو غازی خان کے کتب خانے پر بھی بابر کا قبضہ ہو گیا۔ بابر نے نہایت احتیاط سے تمام کتابوں کا جائزہ لیا۔ کچھ کتابیں اپنے کتب خانے میں شامل کر دیں، کچھ کتابیں اپنے بیٹوں ہمایوں اور کامران کو بھیج دیں۔

بابر فن خطاطی کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے خود ایک خط ایجاد کیا تھا جو "خطِ بابری" کہلاتا تھا۔ بابر نے قرآن پاک کا ایک نسخہ اسی خط میں کتابت کر کے مکہ مکرمہ ارسال کیا تھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق بابر نے قرآن پاک کے کئی نسخے کتابت کر کے مکہ مکرمہ بھیجے تھے۔ خط بابری میں قرآن کریم کا یہ نسخہ 'کتاب خانۂ آستانِ قدس' مشہد میں موجود ہے۔ اس کا کاغذ اور آرائش کشمیری ہے۔ سورتوں کے عنوان طلائی رنگ میں ہیں۔

بابر نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور "تزکِ بابری" ہے جسے "توزکِ بابری" یا "بابر نامہ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب دراصل بابر کی خود نوشت سوانح ہے لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مختلف سوانح ہے۔ اس میں بابر کے دور کے حالات بھی آ گئے ہیں۔ اس طرح یہ تاریخ اور جغرافیہ کی ایک اہم دستاویز بھی بن گئی ہے۔

بابر نے یہ کتاب چغتائی ترکی زبان میں تحریر کی۔ اس کتاب کو ترکی نثر کا نفیس ترین نمونہ قرار دیا گیا۔ اس کتاب کی علمی اور ادبی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی اہم زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے۔ تزکِ بابری کا پہلا ترجمہ شیخ زین خوافی نے فارسی زبان میں کیا اور ہمایوں کی ہدایت پر علی الکاتب نے ۹۳۷ھ / ۱۵۳۱ء میں اس

Marfat.com

نسخے کی نستعلیق رسم الخط میں کتابت کی۔ "بابر نامہ" کا فارسی زبان میں ایک ترجمہ عبدالرحیم خانخاناں نے بابر کے پوتے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے حکم سے کیا۔ ایک فرانسیسی مصنف ایم پیرٹ ڈی کورٹیل نے اس کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ تزک بابری کا ایک انگریزی ترجمہ لیڈن اور ارسکائن نے اور ایک ترجمہ مسز اے ڈی بیورج نے کیا۔ روس کی اورینٹیل اکیڈمی نے روسی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ کیا۔ تزک بابری کو اردو میں پیش کرنے کا شرف مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی (تخلص: فانی) کو حاصل ہوا۔ بابر نامہ کا جدید اردو میں ترجمہ ڈاکٹر حسن بیگ نے "وقائع بابر" کے عنوان سے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

تزکِ بابری میں بابر نے نہایت سادہ اور پاکیزہ زبان استعمال کی ہے اور اپنے بھرپور مشاہدے سے کام لیتے ہوئے فطری انداز میں مختلف علاقوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ بابر نے ہندوستان کے بارے میں لکھتے ہوئے اس ملک کا نہ صرف حدودِ اربعہ، آبادی، ذرائع آمدنی وغیرہ کا حال لکھا ہے بلکہ یہاں کے پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں، چوپایوں اور آبی جانوروں کی عادات اور خصوصیات سے متعلق عمدہ معلومات یکجا کر دی ہیں جن سے ماہرین نباتات و حیوانات فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بابر نے ان علاقوں کی ترقی کے لیے اپنے مشورے بھی پیش کیے ہیں۔ تزکِ بابری سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ حکمراں کی غیر معمولی اور غیر ضروری ستائش پر مبنی کوئی کتاب ہے۔ بابر نے اپنی کمزوریوں، غلطیوں اور شکستوں کی پردہ پوشی کی کوشش نہیں کی۔

بابر شعر و سخن کی تمام فنی باریکیوں سے پوری طرح واقف تھے اور اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے "عروضِ رسالہ سی" کے نام سے ایک کتاب علمِ عروض (منظومات کے قواعد کے بارے میں علم) پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا تذکرہ تزکِ بابری میں تھا اور ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی نے بھی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں اس کا ذکر کیا تھا لیکن ۱۹۳۲ء تک یہ رسالہ دستیاب نہ تھا۔ آخر ایم فواد کو پرولو کو پیرس کے ایک مخطوطے میں اس کتاب کا ایک نسخہ مل گیا۔ "عروضِ رسالہ سی" میں بابر نے شعر کے اوزان کے متعلق نہایت گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ بعض مؤرخین کے نزدیک یہ معلومات ترکی کے عظیم شاعر علی شیر نوائی کی کتاب "میزان الاوزان" میں دی گئی معلومات سے بھی بڑھ کر ہیں۔

بابر نے اوزان کا تعارف کرواتے ہوئے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں سے مثالیں پیش کیں اور اپنے اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ انہوں نے ایسے اوزان بھی متعارف کروائے ہیں جو ان کی اپنی ایجاد ہیں۔ ان کی مثال دیتے ہوئے بابر نے صرف ترکی زبان کے اشعار کو پیش کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے بتایا کہ عروض رسالہ سی ہندوستان کی فتح سے دو یا تین سال قبل یعنی ۹۳۲ھ اور ۹۳۴ھ / ۱۵۲۵ء اور ۱۵۲۸ء کے درمیان تکمیل کو پہنچا۔

بابر کا شعری سرمایہ ایک دیوان، ایک طویل مثنوی اور ایک منظوم رسالے پر مشتمل ہے۔ دیوان کا بیشتر حصہ ترکی چغتائی زبان میں ہے اور بیس سے زائد نظمیں فارسی زبان میں ہیں۔ بابر نے کئی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، چنانچہ ان کے دیوان میں غزلیں، رباعیات، مثنویات، قطعات، تیوغ، معما اور فردیات شامل ہیں۔ بابر کی شاعری میں صوفیانہ رنگ اور جذب دعشق کا گہرا اثر ملتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو نہایت صاف اور سلیس زبان میں کسی تصنع اور تکلف کے بغیر بیان کرتے ہیں تاہم انہوں نے شاعرانہ نکتہ طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ بابر کو ترکی کی زبان کے پہلے تین کلاسیکی شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آج بھی فرغانہ والے انھیں اپنا ہیرو اور بڑا شاعر مانتے ہیں۔

اس زمانے کے ذوق کے مطابق بابر نے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں بہت سے "معمے" بھی لکھے۔ دیوان میں ۵۲ معمے شامل ہیں۔ بابر نے ترکی شاعری کی مخصوص صنف "تیوغ" بھی لکھی اور مقبول صنف "تورکو" پر بھی طبع آزمائی کی۔ وہ اپنے اشعار میں ترکوں کی شجاعت کا ذکر کرتے ہیں اور اس بات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ خود بھی ترکوں میں سے ہیں۔

بابر کی تصنیف کردہ طویل مثنوی "مبیّن" دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ مثنوی ۹۲۸ھ / ۱۵۲۱ء میں مکمل کی۔ بابر نے یہ مثنوی اپنے صاحبزادے کامران کے لیے لکھی تھی۔ اس مثنوی میں حنفی فقہ کے متعدد مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو فقہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ مثنوی میں اخلاقی مسائل کا بھی تذکرہ ہے اور لشکر کشی سے متعلق بعض امور کا بھی۔ اس مثنوی کو "در فقہ مبین" اور "فقہ بابری" بھی کہا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام مبین (بروزن معین) لکھا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ "معین" اس کتاب کی شرح ہے جو بابر کے دور کے شاعر شیخ زین نے لکھی تھی، اس مثنوی کا نام "مُبیّن" ہی ہے۔

Marfat.com

بابر نے وسط ایشیا کے ایک بڑے صوفی بزرگ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی کتاب "رسالۂ والدیہ" کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کو تمام تیموری اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ یہ کتاب خواجہ صاحب نے اپنے والد کے کہنے پر لکھی تھی اور اس میں اخلاقیات پر مضامین ہیں۔ بابر نے ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں اس کتاب کا چغتائی ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۲۴۳ اشعار پر مشتمل ہے۔

بابر کا جمالیاتی ذوق نہایت اعلیٰ تھا۔ فنونِ لطیفہ سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی تاہم ان کی زندگی کا بیشتر حصہ عملاً جنگ و جدل میں گزرا چنانچہ وہ سکون کے ساتھ تعمیرات پر توجہ نہ دے سکے۔ یوں بھی برصغیر میں انہوں نے صرف پانچ برس حکومت کی اس کے باوجود بابر نے آگرہ، بیانہ، سنبھل، پانی پت اور دیگر مقامات پر کئی عمارتیں بنوائیں۔ بابر گو کہ تیموری طرزِ تعمیر سے متاثر تھے لیکن انہوں نے اپنی جدتِ طبع کی بنا پر کسی ایک جگہ کے ماہرینِ تعمیرات سے کام لینے کی بجائے کئی علاقوں کے ماہرین سے کام کروایا۔ فنِ تعمیر سے ان کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ وہ جب ہندوستان آئے تو چند ایرانی ماہرینِ تعمیرات بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ بعد میں انہوں نے قسطنطنیہ کے مشہورِ عالم مہندس اور ماہر تعمیرات سنان کے چند شاگردوں کو ہندوستان بلوالیا تھا۔

بابر کی بنوائی ہوئی بہت سی عمارتیں وقت کے ساتھ برباد ہو گئیں تاہم پانی پت اور سنبھل میں ان کی تعمیر کروائی ہوئی مساجد موجود ہیں۔ بابر نے اپنی بے تحاشا مصروفیات کے باوجود پانی پت کے میدان میں فتح کی یادگار کے طور پر کابل شاہ مسجد تعمیر کروائی۔ روہیل کھنڈ کے شہر سنبھل میں جو مسجد بنوائی وہ اپنے بیضوی شکل کے گنبدوں کے باعث نمایاں ہے۔

بابر نے آگرہ میں ایک شاندار محل بھی تعمیر کروایا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ 'صرف آگرہ میں اس شہر کے جو سنگ تراش میرے محلوں میں کام کرتے تھے، ان کی تعداد ۶۸۰ تھی۔ آگرہ، سیکری، بیانہ، دھول پور، گوالیار اور کول (علی گڑھ) میں روزانہ ۱۴۹۱ سنگ تراش میرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔' بابر نے قلعہ آگرہ میں ایک عظیم الشان باؤلی بھی بنوائی۔

بابر نے جو باغات لگوائے ان میں کابل کے "باغِ وفا" اور "باغِ کلاں" اور آگرہ کے "ارم باغ" اور "زہرا باغ" قابلِ ذکر ہیں۔ ارم باغ اب رام باغ کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ چہار باغ، باغِ گل افشاں، بہشت باغ اور نیلوفر باغ بھی لگوائے۔ آخر الذکر باغ دھول پور میں تھا۔ بابر کے بیٹے کامران نے جو لاہور کے حاکم تھے، راوی کے کنارے سب سے پہلا مغلیہ طرز کا باغ لگوایا۔

مغلیہ طرز کے باغات کا اپنا منفرد طرز تھا۔ بلند دیواروں سے بنا احاطہ، باغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پایاب نہر، جس میں برابر فاصلے سے فوارے لگے ہوتے، آس پاس پھولوں کی کیاریاں، باغ کے وسط میں شفاف پانی کا حوض، پیچھے وسیع سبزہ زار جس میں چنار اور صنوبر کے گھنے اور اونچے درخت لگے ہوتے تھے۔

راستے کی مسافت معلوم کرنے کی غرض سے پیمائش بھی بابر کی اختراع تھی۔ جس رسی یا فیتے کی مدد سے راستہ ناپتے تھے اسے "طناب" کہتے تھے۔ ایک طناب چالیس گز کی ہوتی تھی اور سو طناب کا ایک کوس مانا جاتا تھا۔ غیر ہموار یا دلدلی زمینیں ہونے کی صورت میں ساڑھے بارہ گز کے بانس سے ناپتے تھے۔

بابر کو موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی بلکہ "تزکِ بابری" سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر علم موسیقی کے ماہر تھے اور خود دھنیں ترتیب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ "تزکِ بابری" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "میں نے مدت سے کوئی راگ مرتب نہیں کیا تھا لیکن جب میں نے ملا یار اک سے پانچ آہنگ میں گانا سنا تو اس فن سے میرا شغف از سر نو زندہ ہو گیا۔" اس کے بعد بابر نے اپنے نغمات کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا۔ موسیقی سے بابر کے اس گہرے لگاؤ کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اطراف ایسا ماحول پایا تھا۔ بابر کے تایا سلطان احمد مرزا کے امرا میں درویش بیگ ترخان (متوفی: ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء) کو علم موسیقی میں مہارت حاصل تھی اور وہ کئی ساز بھی عمدگی سے بجاتے تھے۔ بابر کے داماد عود بجانے کے شوقین تھے اور ان کے قاضی القضاۃ، خواجہ عبداللہ مروارید جیسا "قانون" (ایک قسم کا ساز) بجاتے تھے، ویسا کوئی اور نہ تھا۔

جب بابر کابل کے حکمران تھے تو ان کے دربار میں موسیقی کے تین نامور ماہرین قل محمد عودی، حسین عودی اور شیخ نائی موجود تھے۔ یہ تینوں موسیقار علی شیر نوائی کے تربیت یافتہ تھے۔ خود علی شیر نوائی نے کئی دھنیں ترتیب دیں اور ان کا ایک لحن خاص طور پر مشہور ہے، جسے انہوں نے بطور خاص بابر کے لیے لکھا۔ بابر کے دربار کے دیگر موسیقار غلام شادی، میر ازو اور محمد بو سعید تھے۔

Marfat.com

بابر انتہائی ذہین، معاملہ فہم، دور اندیش، مدبر، جرأت آزما اور پُرعزم حکمراں تھے۔ مصائب کی بدترین یورش میں بھی انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور تقریباً تنہا ہو جانے کے باوجود پھر ایک دنیا کو اپنے ساتھ لے کر چلے اور برصغیر کے وسیع و عریض رقبے پر مغلیہ سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے سلطنت کی اتنی مضبوط بنیاد رکھ دی کہ اس کے بعد سوری خاندان کی حکمرانی کے ۱۵ برس چھوڑ کر مغل حکمراں ۳۳۱ برس تک اس سرزمین پر حکومت کرتے رہے۔

بابر نے اتنی بڑی مملکت قائم کی، انہیں بے پناہ عزت، دولت اور شہرت حاصل ہوئی لیکن وہ فطری طور پر منکسر المزاج تھے اور اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ عزت اور ذلت سب خدائے بزرگ و برتر کی عطا کردہ ہوتی ہے چنانچہ جب انہوں نے برصغیر پاک و ہند کو فتح کیا تو اپنی تزک میں لکھا:

"خدائے تعالیٰ نے میری محنت اور کوشش ضائع نہ کی، ایسے زبردست مقابل کو مغلوب کر دیا۔ ہندوستان جیسا وسیع ملک فتح کروا دیا۔ میں اس دولت کے حصول کو اپنی تاب و طاقت پر محمول نہیں کرتا اور اس سعادت کے نصیب ہو جانے کو اپنی کوشش اور ہمت کی بدولت نہیں جانتا بلکہ محض خدائے تعالیٰ کی عنایت سمجھتا ہوں۔"

***

Marfat.com

شیر شاہ سوری

دلیر فاتح اور ذہین منتظم، جنہوں نے مختصر مدت میں برِ صغیر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا

سہسرام کے اس خوبصورت گاؤں میں تمام مزارعے، سرکاری اہلکار اور سپاہی جمع تھے۔

وہ سب ایک خوش رُو نوجوان کی بات بڑے غور سے سن رہے تھے جو کہہ رہا تھا:

"میں اس علاقے میں عدل کا قانون نافذ کرنے آیا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہاں ظلم کا نام و نشان مٹ جائے۔ اب نئے سال سے تمام ناجائز محصول ختم کیے جا رہے ہیں۔ اب کوئی جاگیردار، رعایا پر ظلم نہ ڈھا سکے گا۔ مجھے اگر معلوم ہوا کہ میرے کسی ملازم نے رعایا کی گھاس کا ایک تنکا بھی، ظلم کے ذریعے حاصل کیا ہے تو میں اسے سخت سزا دوں گا، چاہے وہ میرا قرابت دار کیوں نہ ہو۔"

موقع پر موجود لوگوں کے چہروں پر حیرت اور مسرت کے آثار تھے۔ نوجوان نے کہا:

"آپ لوگوں کو کوئی شکایت ہے تو بتائیں۔"

"دیہات میں بعض زمینداروں نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ وہ محصول بھی ادا نہیں کرتے۔ ان کی لوٹ مار سے تو لوگ عاجز آ چکے ہیں۔" اہلکاروں نے عرض کیا۔

"ٹھیک ہے۔ ان سرکش زمینداروں کو طاقت کے ذریعے درست کیا جائے گا۔" نوجوان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"لیکن، جناب، لشکر تو آپ کے والد صاحب کے ساتھ گیا ہوا ہے۔" کسی نے توجہ دلائی۔

"میں لشکر کا انتظار نہیں کر سکتا۔ آپ ارد گرد کے دیہات میں جائیں اور ہر گاؤں سے ایسے جوانوں کو لے آئیں جو ملازمت نہیں کر رہے۔" حکم کی تعمیل کی گئی۔ جلد ہی دو سو نوجوان حاضر ہو گئے۔

نوجوان نے ان دو سو نوجوانوں سے کہا:

"بعض سرکش زمینداروں اور جاگیرداروں نے آپ کے علاقے میں رعایا پر ظلم ڈھا رکھا ہے۔ آپ ان کو قابو میں لانے کے لیے میری مدد کریں۔ جن نوجوانوں کے پاس گھوڑے نہیں، انہیں گھوڑے میں فراہم کروں گا۔ آپ کو خوراک اور لباس کی فراہمی بھی میری ذمہ داری ہو گی۔ لڑائی میں جو مالِ غنیمت حاصل ہو گا وہ آپ کا ہو گا، اس کے علاوہ جو نوجوان بہادری کا مظاہرہ کرے گا اسے میں ملازمت دلواؤں گا۔"

اب نوجوان حکمراں نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ وہ قریبی دیہات سے گھوڑے عاریتاً مانگ لائیں۔ انہوں نے کہا کہ جن لوگوں کے گھوڑے لڑائی میں کام آ جائیں گے انہیں متبادل گھوڑے فراہم کر دیے جائیں گے۔

جلد ہی دو سو نوجوان، گھوڑوں پر سوار سرکش زمینداروں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ان نوجوانوں نے متعلقہ مقامات کی ناکہ بندی کر دی۔ باغی و خود پسند زمینداروں کا غرور رخاک میں مل گیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نیا نوجوان حکمراں خود نوجوانوں کی اس چھوٹی سی فوج کی قیادت کر رہا ہے۔ دیہات کے گرد واقع درخت کٹوا دیے گئے ہیں تاکہ چھپنے کی جگہ نہ رہے۔ گاؤں کے گرد کچا قلعہ تیار کر دیا گیا ہے، اور ان کے خلاف سخت کارروائی کی جا رہی ہے۔

یہ کارروائی اتنی سخت تھی کہ زمینداروں کی غرور سے اکڑی ہوئی گردنیں جھک گئیں اور کچھ ہی عرصے بعد وہ سب کے سب نئے حکمراں کے حضور مطیع اور فرمانبردار بن کر کھڑے تھے۔ رعایا کو ظلم و ستم سے نجات مل چکی تھی، معصوم دیہاتیوں کے چہروں پر سکون و شادمانی رقصاں تھی اور خوشحالی، سہسرام اور خواص پور کے دروازوں پر دستک

Marfat.com

دے رہی تھی۔

یہ نوجوان تھے فرید خان، جنہیں دنیا شیر شاہ سوری کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے نوعمری ہی میں ایک چھوٹے سے علاقے کی حکومت سنبھال کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کس قدر شاندار انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں عوام کو ظلم و زیادتی سے جس طرح نجات دلائی، سرکش اور جابر زمینداروں کا غرور جس طرح توڑا وہ ان کی پاکیزہ فطرت کا آئینہ دار ہے۔ اسی نوجوان نے چند سال بعد برصغیر کی عنانِ اقتدار سنبھالی اور صرف پانچ سال کی مختصر مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دے ڈالے، جنہیں بہت سے حکمراں برسہابرس تک اقتدار میں رہنے کے باوجود انجام نہ دے سکے۔

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان ہے۔ آپ کا تعلق افغان قبیلہ "سور" سے ہے۔ یہ قبیلہ روہ کے علاقے میں آباد تھا۔ روہ سے مراد کابل سے قندھار تک کا علاقہ ہے۔ جس زمانے میں برصغیر پر سلطان بہلول لودھی کی حکومت تھی، (۸۵۵ھ تا ۸۹۴ھ / ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۹ء) اس زمانے میں شیر شاہ سوری کے دادا ابراہیم سور، روہ سے ہجرت کر کے برصغیر چلے آئے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے حسن خان بھی تھے۔ ابراہیم، باجواڑہ میں آکر مقیم ہوگئے۔ وہ کچھ عرصہ حصار فیروزہ میں بھی رہے۔ اسی جگہ ۸۹۱ھ / ۱۴۸۶ء میں ان کے پوتے یعنی حسن خان کے بیٹے فرید خان (شیر شاہ) پیدا ہوئے۔ اس کے بعد یہ گھرانہ کچھ عرصے "نارنول" میں رہا۔ نارنول، سیالکوٹ سے ۳۵ میل جنوب مشرق میں ہے۔ آج کل یہ قصبہ "نارووال" کہلاتا ہے۔

جب سلطان بہلول لودھی کا ۸۹۴ھ / ۱۴۸۹ء میں انتقال ہو گیا تو تمام سلطنت ان کے بیٹے سکندر لودھی کے ہاتھ میں آئی۔ اسی دور میں سور قبیلے کے ایک امیر جمال خان کو جونپور کی حکومت ملی۔ ابراہیم خان کے بیٹے حسن نے جمال خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ جمال خان، حسن سوری سے بہت خوش تھے، انہوں نے حسن سوری کو سہسرام، خواص پور ٹانڈہ کے پرگنے بطور جاگیر عطا کیے اور پانچ سو سوار بھی دیے۔ اسی ماحول میں فرید خان نے پرورش پائی۔

فرید خان نے ہوش سنبھالا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی سوتیلی والدہ ان سے کچھ ناخوش رہتی ہیں۔ صورتحال کو ناخوشگوار ہونے سے بچانے کے لیے وہ جونپور چلے گئے جہاں جمال خان حکمراں تھے۔ جمال خان نے نوجوان فرید کو بڑی خوشی سے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔ اس زمانے میں جونپور علم و فن کی بلندیوں پر تھا۔ یہاں بڑے بڑے اہلِ علم حضرات موجود تھے۔ شیر شاہ نے جونپور میں قیام کے دوران قاضی شہاب الدین صاحب سے "الکافیہ فی النحو" پڑھی۔ فارسی کی دیگر کُتب، گلستان، بوستان، سکندر نامہ بھی یاد کر ڈالیں، وہ انبیاؑ علیہم السلام کے حالات اور تاریخی کتب کا مطالعہ بہت شوق سے کرتے تھے۔ اس طرح انہیں صرف و نحو پر مکمل عبور حاصل ہو گیا تھا۔ انہوں نے جمال الدین ابن حاجب کی کتاب الکافیہ کی شرح بھی پڑھی تھی جو 'شرح مُلّا' کے نام سے شائع ہوئی۔ "الکافیہ" اور "شرح ملا" دونوں کتب مختلف ممالک میں متعدد بار چھاپی گئیں اور کئی ملکوں کے مدارس کے نصاب میں شامل رہیں۔ فرید خان نے فلسفے کی کتب بھی پڑھیں اور عملی اخلاق کے درس بھی لیے تھے۔ کتب سیر ملوک مافیہ یعنی گزرے ہوئے حکمرانوں کے حالاتِ زندگی اکثر ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔

چند سال بعد حسن سوری جونپور آئے تو ان کے اعزہ نے ان سے کہا کہ آپ نے فرید خان جیسے لائق لڑکے کو اپنے سے دُور رکھا ہے۔ اس پر حسن سوری نے بیٹے کو اپنے ساتھ سہسرام واپس چلنے کی دعوت دی۔ فرید اپنے والد کے ساتھ سہسرام واپس آگئے جہاں حسن سوری نے فرید کو اپنی جاگیروں کا ناظم مقرر کر دیا۔ فرید نے ان جاگیروں کے بگڑے ہوئے نظام کو جس لیاقت اور حُسنِ انتظام کے ساتھ درست کیا اس کی تفصیل مضمون کے شروع میں بیان کی گئی ہے۔

رجب ۹۳۲ھ / اپریل ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی جنگ چھڑی، فرید خان اس زمانے میں بہار کے حاکم، بہار خان ولد دریا خان نوحانی کے ملازم ہوگئے تھے۔ بہار خان نے اپنے لیے سلطان محمد کا لقب پسند کیا تھا۔

ایک دن سلطان محمد شکار کے لیے نکلے۔ فرید بھی ساتھ تھے۔ اچانک ایک طرف کی جھاڑیوں سے ایک قوی الجثہ شیر نکل کر سلطان پر حملہ آور ہوا۔ سلطان اس حملے سے حواس باختہ ہو گئے لیکن فرید خان نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا، وہ ذرا نہ گھبرائے اور انہوں نے نیام سے تلوار نکال کر شیر پر حملہ کر دیا۔ ان کی تلوار شیر کے جسم کے آر پار ہو گئی۔ شیر کی کربناک دہاڑوں سے جنگل گونج اٹھا۔ چند لمحوں بعد شیر کی خون میں نہائی ہوئی لاش فرید خان کے قدموں میں پڑی تھی۔ سلطان محمد اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے محسن فرید خان کی بہت تعریف کی اور اس واقعے کی بنا پر فرید خان کو "شیر خان" کا خطاب دیا۔ سلطان محمد نے فرید کو اپنے کمسن بیٹے جلال خان کا اتالیق بھی مقرر

Marfat.com

کر دیا۔ کچھ عرصے بعد سلطان محمد کا انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے جلال خان حکمران بنے۔ انہیں اپنی والدہ "دودو" کی سرپرستی حاصل تھی۔ "دودو" کا بھی جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس طرح بہار کی حکومت عملاً فرید خان کے ہاتھ میں آ گئی۔

آئندہ چند برسوں میں فرید خان نے پورے بہار کو مسخر کیا۔ پھر قلعہ چنار کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ قلعہ چنار پر دراصل ایک شخص تاج خان حکمران تھا۔ اس کا انتقال ہوا تو فرید خان نے تاج خان کی بیوہ ملکہ لاڈ سے شادی کر لی۔

ظہیر الدین بابر نے ۱۵۳۰ء میں وفات پائی۔ ان کی جگہ نصیر الدین ہمایوں پر بارِ حکومت ڈالا گیا۔ دوسری طرف فرید خان نے اپنا دائرۂ اثر و نفوذ بڑھا لیا تھا اور اس میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ بہار کے بعد بنگال پر بھی فرید خان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ آگرہ اور دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے "شیر شاہ" کا لقب اختیار کیا اور اپنے مفتوحہ علاقے میں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کر دیا۔ اس دوران پر گڈھی (سکری گلی) قلعہ گوڑ، بنارس، اودھ، لکھنؤ، بہرائچ، سنبھل، جونپور، کڑہ مانک پور، قنوج فتح ہوئے۔ اس سے قبل بہار کے قلعہ رہتاس (سہسرام) پر بھی شیر شاہ قابض ہو چکے تھے جہاں راجہ ہری کشن کا قبضہ تھا۔

محرم ۹۴۷ھ / مئی ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کی حکومت برصغیر کے بڑے حصے پر قائم ہو چکی تھی، جس میں بہار، بنگال، اتر پردیش اور پنجاب کا بڑا حصہ شامل تھا۔ اب شیر شاہ نے اپنی فوج کے ایک حصے کو نیلاب (دریائے اٹک جس کا پانی نیلگوں ہوتا ہے) کی طرف اور دوسرے حصے کو ملتان اور سندھ کی طرف روانہ کیا۔ اسی اثنا میں شیر شاہ نے جہلم سے بارہ میل مغرب میں واقع نمک کی کانوں کے علاقے نندنہ اور ٹیلہ بال ناتھ کے گردونواح کے علاقے کا جائزہ لیا۔ بہت تلاش اور غور و فکر کے بعد انہوں نے ایک جگہ منتخب کی اور وہاں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ جب شیر شاہ نے رہتاس (خوشاب کی شمالی جانب کا علاقہ) میں رہنے والے گکھڑوں سے کہا کہ وہ اطاعت قبول کر لیں تو انہوں نے جواب میں چند تیر اور ببر شیر کے دو بچے بھیج دیے۔ یہ اطاعت قبول نہ کرنے کا واضح اعلان تھا۔ جب شیر شاہ نے علاقے میں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تو گکھڑوں کے سرداروں نے طے کیا کہ گکھڑ اس قلعہ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیں گے۔ شیر شاہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے حکم دیا کہ قلعہ ہر قیمت پر تعمیر کیا جائے چنانچہ قلعہ کے لیے پتھر لانے کی مزدوری فی پتھر ایک اشرفی مقرر کر دی گئی۔ اعلان کی دیر تھی، مزدوروں کی بھرمار ہو گئی۔ مزدور اتنے زیادہ ہو گئے کہ ایک پتھر ایک روپے میں اور پھر ایک بہلولی سکے کے عوض آنے لگا۔

یہ قلعہ ۱۵۴۲ء میں تیار ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس قلعے کی تعمیر پر چوبیس کروڑ پندرہ لاکھ پانچ ہزار بہلولی سکے خرچ ہوئے۔ قلعے کی تعمیر کا مقصد سرکش گکھڑوں کو قابو میں کرنا اور افغانستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کی روک تھام تھا۔ اس کے لیے شیر شاہ نے جس جگہ کا انتخاب کیا وہ ان کی دانش مندی اور فراست کو ظاہر کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی راستے سے سکندر اپنی کشتیاں کھینچتا ہوا گزرا تھا۔

شیر شاہ نے ۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء میں قلعہ گوالیار اور مالوہ پر فوج کشی کی۔ یہ دونوں مقامات فتح کیے۔ اس کے بعد قلعہ رنتھمبور تسخیر ہوا۔ پھر ملتان پر شیر شاہ کے فرستادہ، ہیبت خان نے قبضہ کر لیا۔

اب شیر شاہ بنگال سے پنجاب کے پورے علاقے پر اپنی حکمرانی قائم کر چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مشیروں سے کہا کہ ہمیں اجمیر، مارواڑ، چتوڑ اور کالنجر کی طرف توجہ کرنی چاہیے چنانچہ شیر شاہ کا لشکر مارواڑ کی سمت روانہ ہوا۔ ان دنوں مارواڑ، ناگور اور اجمیر پر ایک راجپوت مال دیو قابض تھا۔ اس کے پاس پچاس ہزار سوار تھے۔ شیر شاہ کے لشکر کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ راستے میں جہاں پڑاؤ ڈالتا، وہاں کچا قلعہ تعمیر کرتا یا خندقیں کھودی جاتی تھیں۔

شیر شاہ کا لشکر بالآخر، جودھپور اور ناگور کے حکمران راجا مال دیو کے علاقے پر حملہ آور ہوا۔ اجمیر میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شیر شاہ نے ایسی کامیاب جنگی چال چلی کہ مال دیو خوفزدہ ہو کر میدانِ جنگ چھوڑ بھاگا۔ صرف اس کے دو سردار گوپا اور جیتام آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ میدان میں رہ گئے۔ گوپا اور جیتا نے شیر شاہ کے لشکر پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔ شیر شاہ اپنی فراست سے سمجھ گئے کہ دشمن کے یہ بچے کھچے سوار شب خون ماریں گے۔ انہوں نے حکم دیا کہ شام کی تاریکی گہری ہوتے ہی لشکر، دو تین میل دور کسی جگہ منتقل ہو جائے، کیونکہ شام تک گوپا اور جیتا کے جاسوس یہاں موجود رہیں گے۔ پھر جا کر خبر دیں گے کہ لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ رات ہوتے ہی شیر شاہ کا لشکر خاموشی سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔

رات کو دشمن کے سوار شب خون مارنے نکلے تو پہاڑی علاقے میں راستہ بھول گئے۔ گوپا اور جیتا کے لشکر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کئی

Marfat.com

گھنٹوں بعد وہ یکجا ہونے میں کامیاب ہوئے اور صبح صادق کے قریب کہیں جا کر انہوں نے شیر شاہ کے لشکر کو ڈھونڈ نکالا۔ دونوں راجپوت سرداروں گوپا اور جیتا نے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ شیر شاہ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ شیر شاہ کی فوج اس حملے کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ راجپوت بڑی بے جگری سے لڑے لیکن بالآخر شکست کھائی۔ اس جنگ میں دو ہزار راجپوت کام آئے۔

شیر شاہ نے اپنے معتمد افسران کو ناگور، اجمیر اور جودھپور میں مقرر کیا۔ ۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء میں شیر شاہ نے پھر فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ امراء نے توجہ دلائی کہ برسات کا موسم ہے۔ آرام سے گزر جائے پھر کہیں فوج کشی کی جائے۔ شیر شاہ نے کہا "میرے لیے کام میں آرام ہے۔" انہوں نے فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ چتوڑ گڑھ تسخیر کیا پھر مالوہ کے سرحدی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے کالنجر کی طرف بڑھے۔ کالنجر پر حملہ کرنے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ کالنجر کے راجا نے ایک باغی کو پناہ دے رکھی تھی اور شیر شاہ کے حکم کے باوجود باغی واپس نہیں کیا تھا۔

کالنجر کے راجا کیرت سنگھ کو شیر شاہ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے قلعے کے ارد گرد کی اونچی عمارتیں مسمار کروا دیں اور ضروری اجناس 'اسلحہ' گولہ بارود وغیرہ لے کر قلعہ بند ہو گیا۔ یہ قلعہ ہندوستان کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار ہوتا تھا۔ شیر شاہ کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شیر شاہ نے قلعہ کے گرد مورچے تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ مورچے اتنے اونچے بنائے گئے کہ ان کے اوپر کھڑے ہونے سے قلعے کے اندر لوگ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ محاصرہ طول پکڑ گیا 'لیکن راجا کیرت سنگھ نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔

۹ ربیع الاول ۹۵۲ھ / ۲۱ مئی ۱۵۴۵ء کو شیر شاہ دوپہر کے کھانے پر بیٹھے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ علماء کرام کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران شیخ خلیل اور ملا نظام دانشمند نے جہاد کا تذکرہ چھیڑ دیا اور کہا کہ "کفار کے خلاف جہاد سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔" شیر شاہ اس بات سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے کھانے کے بعد فوری طور پر آتشیں بموں سے قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

شیر شاہ کے حکم پر آتشیں بموں سے حملہ شروع ہوا۔ یہ بم اس دور کی اصطلاح میں "حقے" کہلاتے تھے۔ شیر شاہ خود ایک مورچے پر کھڑے ہو کر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ گولہ باری کے دوران اتفاق سے ایک گولہ قلعہ کی دیوار پر لگا اور پلٹ کر واپس اس جگہ آ گرا جہاں شیر شاہ کی فوج نے گولہ بارود ذخیرہ کیا ہوا تھا۔ اس گولے کے پھٹنے سے گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی۔ شیر شاہ اسی ذخیرہ کے قریب کھڑے ہوئے تھے، وہ بری طرح جھلس گئے۔ شیخ خلیل اور مولانا نظام دانش مند بھی وہیں موجود تھے، وہ دونوں وہیں شہید ہو گئے، شیر شاہ جھلسی ہوئی حالت میں اپنے مورچے تک پہنچے۔ انہیں فوراً اٹھا کر ان کے خیمے میں لایا گیا۔ شیر شاہ شدتِ کرب سے بے ہوش تھے لیکن جوں ہی ہوش آتا، یہی پکارتے "ڈٹے رہو، آگے بڑھو" بار بار تاکید کرتے کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے چین سے نہ بیٹھنا۔ اگلے دن عصر کی نماز کا وقت ہوا تو قلعہ فتح ہو گیا۔ اسلامی لشکر قلعہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوا اور قلعے کے اندر سے عصر کی اذان گونجنے لگی، "اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔"

شیر شاہ کو فتح کی خوشخبری سنائی گئی تو وہ سخت تکلیف کے عالم میں تھے، لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور ان کے لبوں پر کلمۂ شہادت جاری ہو گیا۔ ۱۰ ربیع الاول ۹۵۲ھ / ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو اس عظیم حکمراں نے دنیا کو خیر باد کہا۔ انہیں سہسرام میں سپردِ خاک کیا گیا۔

شیر شاہ بے حد اعلیٰ درجے کے منتظم اور انتہائی بیدار مغز حکمراں تھے۔ وہ منفرد تخلیقی صلاحیتیں رکھتے تھے اور انہوں نے مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے بہت سوچے سمجھے اقدامات کیے۔ انہوں نے ایسے ضوابط اور اصول تشکیل دیے اور محکموں کا ایسا مربوط نظام قائم کیا جس کے تحت پورا معاشرہ خوش حالی اور فارغ البالی کی مثالی تصویر بن گیا۔

شیر شاہ سوری بہت اچھا دینی مزاج رکھتے تھے۔ علماء کرام کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ انہوں نے حاجیوں کے لیے دو جہاز بنوائے تھے۔ اپنی وفات سے قبل انہوں نے حسرت سے کہا تھا کہ میری خواہش تھی کہ میں مکہ معظمہ جانے والوں کے لیے بحری راستے میں مختلف مقامات پر پچاس پچاس جہازوں کے بیڑے پر مشتمل سرائے بناؤں۔ یہ بیڑا اس قدر مضبوط ہو کہ اس پر سمندری طوفان اور بارش کا کوئی اثر نہ ہو، تاکہ حاجی حضرات اطمینان سے حج بیت اللہ کے لیے آجا سکیں۔ شیر شاہ عبادت کا بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ حکمراں کے لیے لازم ہے کہ اللہ کی عبادت کیا کرے تاکہ اس کی رعیت بھی عبادت کی طرف راغب ہو سکے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ تمام معاملات شریعت کے مطابق انجام پائیں۔

Marfat.com

شیر شاہ سوری رعایا کے لیے بے حد شفیق تھے۔ وہ انتہائی فراخدل اور کریم النفس انسان تھے۔ ان کے سرکاری مطبخ میں ہر روز ہزاروں افراد کا کھانا پکتا تھا اور اعلانِ عام تھا کہ جو بھوکا ہو وہ سرکاری مطبخ سے کھانا کھا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں محتاجوں کے لیے مفت لنگر خانے تھے جن کا یومیہ خرچ پانچ سو اشرفی تھا۔ فقراء، بیواؤں، اپاہجوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کا حکومت کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی شخص کو بے کار نہیں رہنے دیتے تھے۔ ان کا قول تھا "بے کاری سے اخلاقی گراوٹ پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں بدکاری راہ پا جاتی ہے۔" شیر شاہ خود بھی ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ہر قسم کا کام اپنے ہاتھوں سے کر لیا کرتے تھے۔

اس عظیم مسلمان جرنیل کا قول تھا "کوئی طاقت عدل کے برابر نہیں، صاحب دولت کو اکثر بیدار رہنا چاہیے۔ غفلت کو اپنا شعار نہیں بنانا چاہیے۔ میں ہمیشہ ملوکِ زمانہ سے خبردار رہا ہوں۔" انہوں نے اپنے مختلف کاموں کے اوقات متعین کر رکھے تھے اور ان کے روز و شب ایک لگے بندھے نظام الاوقات کے تحت گزرتے تھے۔ وہ رات کے آخری حصے میں بیدار ہو جاتے۔ غسل کر کے تہجد کی نماز ادا کرتے، وظیفہ پڑھتے۔ پھر امورِ حکومت کا جائزہ لینے بیٹھ جاتے۔ پیداوار کے حساب کی جانچ پڑتال کرتے اور مختلف احکامات لکھواتے۔ پھر نمازِ فجر کے لیے وضو کرتے۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے۔ اس کے بعد مختلف سرکاری اہلکار حاضر ہونے لگتے۔ اس دوران میں نمازِ اشراق کا وقت ہو جاتا۔

نمازِ اشراق کے بعد دوپہر بارہ بجے تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ مختلف علاقوں سے امرا اور حکام کے خطوط موصول ہوتے، ان کے جوابات لکھواتے۔ مظلوموں کی داد رسی کرتے، مختلف ملکوں کے سفیر حاضر ہوتے، ان سے گفتگو رہتی۔ دوپہر ہونے پر اٹھ کر اپنی رہائش گاہ میں چلے جاتے اور علماء کرام کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کھانے کے بعد وہ سنتِ نبویؐ کی پیروی میں تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ اس کے بعد اٹھ کر جماعت کے ساتھ نمازِ ظہر ادا کرتے۔ نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔ پھر امور مملکت میں مصروف ہو جاتے۔ عصر تک یہی مصروفیت رہتی۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب تک کا وقت فوجی کھیلوں یا تفریحی مشاغل کے لیے مخصوص تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد علماء اور مشائخ کے ساتھ مختلف امور پر گفتگو کرتے۔ پھر کھانا کھاتے اور عشا کی نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد آرام کرنے چلے جاتے۔ شیر شاہ نے اپنی زندگی کے یہ معمولات سفر میں بھی برقرار رکھے۔

شیر شاہ نے اپنی وسیع و عریض مملکت کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ مملکت کے دور دراز گوشوں تک کے حالات براہ راست ان کے علم میں رہتے تھے اور وہ فوری کارروائی کر کے اپنی مملکت کے کسی بھی حصے میں پیدا ہونے والی بے قاعدگی کو دور کر سکتے تھے۔ کئی مؤرخین کے مطابق شیر شاہ نے اپنی قلمرو کو ۴۷ قسمتوں (ضلعوں) اور ایک لاکھ سترہ ہزار پرگنوں (تحصیلوں) میں تقسیم کر رکھا تھا، لیکن شیر شاہ سوری کے حالاتِ زندگی پر بہت اچھی کتاب لکھنے والے مؤرخ پروفیسر کالکا رنجن قانون گو کا کہنا ہے کہ مؤرخین نے پرگنوں اور دیہات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ۴۷۶ پرگنے تھے۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ شیر شاہ کے دور میں پرگنے مقابلتاً کچھ چھوٹے تھے تب بھی اس زمانے میں پرگنوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین گنا ہونی چاہیے۔

ہر پرگنے میں ایک نگراں یا حاکم ہوتا تھا جو "شق دار" کہلاتا تھا۔ شق دار کی ذمے داری اپنے علاقے میں امن و امان قائم رکھنا اور سرکاری احکام پر عمل درآمد کروانا تھا۔ دو ہزار سے پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ اس کی ماتحتی میں دیا جاتا تھا۔ لیکن شیر شاہ کی کوشش یہی رہی کہ ملکی نظم و نسق میں فوج کی مداخلت نہ ہونے پائے۔ ہر پرگنے میں ایک امین، ایک خزانچی، ایک مشرف (انسپکٹر) اور ایک منصف (جج) ہوتا تھا۔ امین کا کام غیر فوجی شعبوں کو سنبھالنا تھا۔ فوجوں کی نقل و حرکت سے اگر فصلوں کو نقصان پہنچتا تو امین ہی اس کا جائزہ لیتا تھا۔ مشرف، فصلوں کی پیداوار کا تعین کرتا تھا۔ امورِ مملکت کا حساب کتاب رکھنے کے لیے ایک ہندی نویس اور ایک فارسی نویس کارکن موجود ہوتا تھا۔

شیر شاہ کا سب سے بڑا انتظامی حلقہ "سرکار" کہلاتا تھا۔ انہوں نے مختلف انتظامی حلقوں میں گورنر بھی مقرر کیے۔ پرگنے اور سرکار کے عہدیداروں کا ہر دو سال بعد تبادلہ کیا جاتا تھا۔ یہ بڑا دانشمندانہ فیصلہ تھا، اس طرح نظام حکومت خرابیوں سے محفوظ رہتا تھا۔ انگریزوں نے بھی بعد میں شیر شاہ کے نظام کی پیروی کی۔ اس دور کے مجسٹریٹ اور کلکٹر گویا شق دار کا کام انجام دے رہے تھے اور عامل یا امین کی ذمہ داری تحصیلدار کے سپرد کی گئی تھی۔

شیر شاہ سوری کو نو عمری ہی کے زمانے میں اراضی اور زراعت

Marfat.com

کے انتظام کا اچھا تجربہ ہوگیا تھا، چنانچہ حکمراں بننے کے بعد انہوں نے اپنے اس تجربے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان سے پہلے پیمائش کے قاعدے کو عام کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ شیر شاہ برصغیر کے پہلے حکمراں ہیں جنہوں نے اپنی پوری مملکت میں اراضی کی پیمائش کروائی۔ یہ پیمائش ڈوری کی مدد سے کی گئی۔ اس کے مطابق کل زرعی اراضی بیگھ میں تقسیم کی گئی۔ ایک بیگھ (جریب) ۳۶۰۰ مربع گز کا ہوتا تھا۔ پیمائش کے بعد زرعی اراضی پر مال گزاری عائد کی گئی۔ پیداوار کا چوتھائی حصہ حکومت مال گزاری کے طور پر وصول کرتی تھی۔ مال گزاری کی تفصیل لکھ کر، کاشتکار، امین کے حوالے کرتا تھا۔ امین ایک تحریر کاشتکار کے حوالے کرتا تھا جو "پٹہ" کہلاتا تھا۔

شیر شاہ کا یہ مالی نظام آئندہ چل کر "ٹوڈرمل بندوبست" کی بنیاد بنا اور مغلیہ دور میں بھی برقرار رہا بلکہ انگریزوں نے بھی اپنے زمانے میں اس نظام کی کئی باتیں اپنائیں۔ شیر شاہ کی کامیابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جو علاقہ فتح کرتے اس کی زرعی اصلاحات کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے۔ مزارعوں کو زمینداروں کے ظلم سے نجات دلاتے۔ اور بدعنوانیوں کے خاتمے کے لیے نئے اور موثر قوانین وضع کرتے تھے۔

شیر شاہ نے اپنی مملکت میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے بے حد دانشمندانہ اقدامات کیے۔ انہوں نے تجارتی اشیا کی نقل و حمل میں حائل رکاوٹوں کا خاتمہ کردیا اور تمام اندرونی چنگیاں معاف کردیں۔ اب تاجروں سے صرف سرحد اور جائے فروخت پر چنگی وصول کی جانے لگی۔ تمام صوبائی حکام کو سختی سے ہدایت کردی گئی کہ تاجروں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے اور ان کا مال مقررہ شرح سے کم قیمت پر نہ خریدا جائے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت پیشہ لوگ دور دور سے برصغیر کا رخ کرنے لگے اور ملکی خوش حالی میں اضافہ ہوا۔

تجارت کو فروغ دینے میں شیر شاہ کے ایک اور اہم فیصلے کا بڑا حصہ ہے۔ شیر شاہ نے پوری قلمرو میں پختہ اور مضبوط سڑکوں کا جال بچھایا۔ ان سڑکوں کی وجہ سے جہاں فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہوگئی، وہاں تجارت میں بھی بڑی سہولت میسر آگئی۔ شیر شاہ کا ایک بڑا کارنامہ جرنیلی سڑک کی تعمیر ہے۔ یہ سڑک قلعہ رہتاس سے سنار گاؤں تک تقریباً دو ہزار میل لمبی تھی۔ (سنار گاؤں ڈھاکہ سے پندرہ میل مشرق میں دریائے میگھنا کے کنارے آباد تھا، اب نرائن گنج سے چھ میل کے فاصلے پر اس کے کھنڈرات ملتے ہیں)۔ اب یہ سڑک جی ٹی روڈ کہلاتی ہے اور پشاور کو کلکتہ سے ملاتی ہے۔

اس سڑک کے کنارے ہر دو میل کے فاصلے پر پکی اینٹوں سے سرائے، مسجد اور کنواں تعمیر کیا گیا تھا۔ ہر مسجد میں ایک قاری، امام اور صفائی کے لیے خادم مقرر کیا گیا تھا۔ ہر سرائے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے الگ الگ کھانے اور پانی کا بندوبست تھا اور رہائش کا الگ الگ انتظام تھا۔ گھوڑوں اور مویشیوں کے لیے چارہ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ کئی پہرے دار بھی موجود تھے۔ ان تمام چیزوں کے اخراجات اس زمین سے پورے کیے جاتے تھے جو سرائے کے قریب ہی وقف ہوتی تھی۔ سڑک کی دونوں اطراف سایہ دینے والے پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔ شیر شاہ نے اس طرح کی سترہ سو سرائیں تعمیر کروائی تھیں۔ ایک اور سڑک آگرہ سے دکن کی سرحد پر برہان پور تک تعمیر کی گئی تھی۔ تیسری سڑک آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک بنوائی گئی تھی۔ ایک اور سڑک لاہور سے ملتان جاتی تھی۔ ان تمام سڑکوں پر سایہ دار درختوں اور سرایوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ بعض سرائیں تو تجارتی منڈیوں کی شکل اختیار کرگئی تھیں، جہاں کاشتکار اور اجناس کے تاجر اپنی اشیا فروخت کیا کرتے تھے۔

شیر شاہ سوری نے دہلی کو از سر نو بسایا۔ اس زمانے میں یہ شہر جمنا سے دُور واقع تھا چنانچہ شہریوں کو پانی کے حصول میں دقت پیش آتی تھی۔ شیر شاہ نے اسے جمنا کے کنارے بسا دیا اور یوں محسوس ہوا کہ شہر اپنی اصلی جگہ واپس آگیا ہو۔ دہلی میں جو قلعہ تعمیر کیا گیا اس میں ایک جامع مسجد بنائی گئی جس میں لاجوردی اور شنگرفی کی نقاشی کروائی گئی۔ خیال ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی مسجد تھی جسے آراستہ کیا گیا اور اس میں نقاشی کروائی گئی تھی۔

شیر شاہ نے شہر میں متعدد دروازے بھی بنوائے۔ جن میں سے لال دروازہ، کابلی دروازہ، جنوبی دروازہ ابھی تک سلامت ہیں۔ قلعے میں ایک عمارت "شیر منڈل" کے نام سے بنائی گئی جو ابھی تک باقی ہے۔ ایک باؤلی بھی موجود ہے۔ شہر کی بیرونی فصیل بھی تعمیر کی گئی لیکن ابھی یہ تعمیر مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ شیر شاہ کا انتقال ہوگیا۔ شیر شاہ نے قنوج کے قدیم شہر کو بھی از سر نو پختہ بنیادوں پر تعمیر کروایا۔

شیر شاہ کے دورِ حکومت میں ڈاک کا بھی اعلیٰ انتظام کیا گیا تھا۔ ہر

Marfat.com

سرائے میں ڈاک چوکی کے دو گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ شیر شاہ کے پیغام رساں ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے، جو سرکاری ڈاک بڑی سرعت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ان کے علاوہ خفیہ خبر رسانی کا سلسلہ بھی تھا، جس کی وجہ سے شیر شاہ پوری مملکت کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے اور کسی بھی جگہ ہونے والی بے قاعدگی کی اطلاع انہیں فوراً مل جایا کرتی تھی۔ ڈاک لانے لے جانے کے لیے تین ہزار چار سو گھوڑے منصوص کیے گئے تھے۔ ایک مؤرخ کے نزدیک مسلمان حکمرانوں میں شیر شاہ پہلے حکمراں ہیں جنہوں نے ڈاک کا انتظام سواروں کے ذریعہ کیا۔

شیر شاہ سوری اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ گھوڑوں میں خرد برد کی روک تھام کے لیے انہوں نے گھوڑوں کو داغنے کا قانون بنایا۔ اس طرح اچھی نسل کے گھوڑے ہٹا کر خراب نسل کے گھوڑے شامل کر دینے کا امکان ختم ہو گیا۔ گھوڑوں کا حلیہ بھی درج کیا جانے لگا اور باقاعدہ ریکارڈ رکھنے کی روایت پڑی۔ فوجیوں کے بھی کوائف درج کیے جانے لگے جس میں ان کا حلیہ بھی لکھا جاتا تھا۔ شیر شاہ نے سکے کی اصلاح بھی کی اور ملک میں چاندی کی اصل قیمت کے مطابق تقریباً ایک تولے کا سکہ رائج کیا، اس کا نام انہوں نے "روپیہ" رکھا۔ برصغیر پاک و ہند میں آج بھی یہی سکہ رائج ہے۔ شیر شاہ نے قانونِ مسکوکات کی خرابیوں کو بھی دور کیا۔ مالیہ کے نئے نظام کی تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ قانون گو اور چودھری کے دو نئے عہدے بھی شیر شاہ کے ذہن کی اختراع ہیں۔

شیر شاہ غیر متعصب حکمراں تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی بھرپور مراعات دیں۔ اسلامی قانون کے مطابق انہوں نے غیر مسلموں سے جزیہ (ٹیکس) وصول کیا۔ ان کی فوج میں ہندوؤں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ انہوں نے جو سکہ جاری کیا تھا اس کی ایک جانب نستعلیق رسم الخط میں کلمۂ طیبہ کے ساتھ چاروں خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی درج تھے۔ دوسری جانب ہندی رسم الخط میں "سلطان شیر شاہ سور خلد اللہ ملکہ، حفظ الدنیا والدین شری شیر شاہ" کندہ تھا۔

شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں پولیس کا نظام سادہ لیکن نہایت موثر تھا۔ شق دار امن و امان کا نگہبان تھا اور ماتحت شق دار بھی یہی فرائض انجام دیتے تھے۔ شیر شاہ نے قانون تشکیل دیا تھا کہ اگر کسی علاقے میں کوئی چوری یا ڈکیتی ہوتی اور مجرم پکڑے نہ جاتے تو اس علاقہ کے حکام کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس قانون کی وجہ سے ہر علاقے کا حاکم اپنے علاقے میں مجرموں کی سرکوبی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ یہ نظام اتنا موثر تھا کہ عہد مغلیہ کے مؤرخ نظام الدین کے مطابق شیر شاہ کے عہد میں اگر کوئی مسافر اشرفیوں کی تھیلی اپنے پاس رکھ کر کسی سنسان جگہ سو جاتا تو کسی کو اس کی حفاظت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ "تاریخ شیر شاہی" کے مصنف عباس خان سروانی کے مطابق علاقے کا زمیندار مسافروں کی دیکھ بھال کا ذمے دار ہوتا تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی بوڑھی عورت سر پر زیورات کی گٹھڑی رکھ کر تنہا سفر پر روانہ ہوتی تو شیر شاہ کی سزا کے خوف سے کوئی مجرم اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔

شیر شاہ سوری نے فوج کو جدید انداز سے منظم کیا تھا۔ ان کی فوج میں ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچیس ہزار پیادے تھے۔ جنگی ہاتھیوں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ شیر شاہ کے دور میں ماہر کاریگر توپیں تیار کرتے تھے۔ فوجیوں کو سرنگ لگانے کے فن کی تربیت دی جاتی تھی۔ دارالحکومت میں موجود توپچیوں کی تعداد پچیس ہزار تھی، جبکہ کئی ہزار توپچی اہم قلعوں میں متعین تھے۔ شیر شاہ نے چتوڑ، رنتھمبور پور، بیانہ اور جودھ پور میں چار اہم فوجی مراکز قائم کیے تھے۔ انہوں نے جہلم کے قریب قلعہ رہتاس بنوایا جبکہ ایک قلعہ رہتاس بہار میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس طرح ان کے قلمرو کے دونوں سروں پر رہتاس کے قلعے موجود تھے۔ اس کے علاوہ دہلی، قنوج بہرہ کھنڈ، کوہستان میں بھی قلعے تعمیر کروائے۔ قنوج کے قلعے کا نام "شیر گڑھ" رکھا اور کوہستان کے قلعے کا نام "شیر کوہ" رکھا گیا۔ ان کے علاوہ شمالی پنجاب میں سیالکوٹ کے قریب مان کوٹ تک اور وہاں سے پہاڑی علاقے میں نگر کوٹ تک قلعوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

شیر شاہ کی فوج جب ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کرتی تو اسے حکم تھا کہ فصلوں کو ہرگز نقصان نہ پہنچے۔ اگر کوئی سپاہی اس حکم کی خلاف ورزی کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی اور فصل کے مالک کو ہرجانہ دیا جاتا۔ وہ سپاہیوں سے براہِ راست ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں تیر کمان کا زیادہ رواج تھا، جو سپاہی اچھا تیر انداز ہوتا اس کی قدر کرتے تھے۔ سفر کے دوران فوج راستے میں جہاں بھی قیام کرتی تھی، وہاں ایک کچا قلعہ تعمیر کیا جاتا تھا۔ شیر شاہ قلعہ کی تعمیر میں خود بھی عام سپاہیوں کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ فوجی قوانین بہت سخت تھے اور

Marfat.com

فوجیوں کو ہر ماہ ملنے والی تنخواہ کے علاوہ مزید مطالبات کرنے یا جنگوں میں ملنے والا مالِ غنیمت خود رکھ لینے کی اجازت نہ تھی۔ شیر شاہ جہاد کی روح کو سمجھتے تھے۔ ان کے دور میں جو قاضی مقرر کیے جاتے تھے ان کو تحریری حکم ملتا تھا کہ ہر مسجد میں نماز ظہر کے بعد قاضی، امام اور مقتدی، کم از کم دس، دس تیر چلانے کی مشق کریں۔

شیر شاہ سوری کُل عالم اسلام کو ایک مرکز و محور پر یکجا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا دل جہاد کے جذبے سے معمور تھا۔ اس بات کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مارواڑ کا علاقہ فتح ہو گیا اور شیر شاہ سوری کی حکومت بنگال، بہار، اتر پردیش، پنجاب، سندھ، راجپوتانہ اور مالوہ تک پھیل گئی تو اس دور کے مشہور عالم سید رفیع الدین نے شیر شاہ سوری سے حرمین شریفین جانے کی اجازت چاہی، اور فرمایا "اب جی چاہتا ہے وہیں باقی عمر گزار دی جائے۔" شیر شاہ سوری نے کہا۔ "آپ کا خیال مبارک ہے۔ لیکن میں نے آپ کو ایک خاص مقصد سے اپنے پاس رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ایران پر حملہ کروں اور پھر آپ کو اپنا سفیر بنا کر عثمانی حکمراں سلیمان اعظم کے پاس بھیجوں تاکہ میرے اور ان کے درمیان مضبوط اسلامی اتحاد قائم ہو جائے اور عثمانی اور ہماری فوجیں مل کر پورے ایشیا میں اسلامی قوانین رائج کر دیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ سلیمان اعظم، حرمین شریفین میں سے ایک کی خدمت میرے سپرد کریں۔"

اگر شیر شاہ کو مہلتِ عمل ملتی تو وہ ضرور ایسا کر گزرتے۔

***

Marfat.com

اسلام شاہ سوری

شیر شاہ سوری کے لائق فرزند اور ایک جری، نیک نفس اور اعلیٰ منتظم حکمراں

وہ ایک تنگ گلی تھی۔

اس گلی سے دو افراد گزر رہے تھے۔ ایک صاحب عمر رسیدہ تھے۔ وضع قطع سے وہ بڑے عالم دین دکھائی دیتے تھے۔ دوسرے صاحب جواں عمر تھے۔ ان کی چال میں تمکنت اور عسکری شان تھی، لیکن یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ چلنے والے بزرگ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

اچانک گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مکانات کے دروازے دھڑادھڑ بند ہونے لگے اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

معلوم ہوا کہ ایک ہاتھی مشتعل ہو کر بے قابو ہو گیا ہے اور اس گلی میں آنکلا ہے۔

بزرگ نے چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر ہاتھی کو روکنے کی تدبیر کریں لیکن ان کے ساتھ چلنے والے جواں عمر شخص نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ بزرگ نے فرمایا: ”مجھے قدم بڑھانے دیں کیونکہ اس ہاتھی کی وجہ سے اگر آپ کو کوئی بڑا نقصان پہنچ گیا تو سلطنت میں بدنظمی پھیل جائے گی۔“

جواں عمر نے جواب میں کہا: ”مولانا! آپ یہ تو سوچیں کہ میں اگر کام آگیا تو میری جگہ پُر کرنے کے لیے لاکھوں افراد موجود ہیں، لیکن آپ کی جگہ لینے کے لیے تو ممکن ہے صدیوں تک کوئی پیدا نہ ہو۔“

یہ جواں عمر شخصیت تھی مشہور زمانہ جرنیل اور برصغیر کے لائق حکمراں شیر شاہ سوری کے صاحب زادے اسلام شاہ سوری کی، جنہوں نے شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری کے تحفظ کی خاطر مشتعل ہاتھی سے لڑ جانا گوارا کر لیا۔ اسلام شاہ سوری نے اپنے والدِ محترم کی چھوڑی ہوئی حکومت کو قریباً ساڑھے آٹھ برس تک نہایت مستحکم انداز میں قائم رکھا اور رفاہِ عامہ کے سلسلے میں بہت سی مفید خدمات انجام دیں۔

جب کالنجر کی لڑائی میں شیر شاہ سوری نے ۱۰ ربیع الاول ۹۵۲ھ / ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو جام شہادت نوش کیا تو امراً سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے آپس میں صلاح مشورے سے یہ طے کیا کہ سربراہِ مملکت کی مسند کو خالی رکھنا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔ اگر سربراہ کا یہ عہدہ پُر کرنے کے لیے شیر شاہ سوری کے بڑے صاحب زادے عادل خان کو بلواتے ہیں تو ان کی یہاں آمد میں خاصی تاخیر ہو سکتی ہے کیونکہ وہ رنتھنبور میں ہیں، جبکہ شیر شاہ سوری کے چھوٹے صاحب زادے جلال خان پٹنہ کی مضافاتی بستی ریون (اسے مورخین نے ”ریوہ“ ”یاریواں“ بھی لکھا ہے) میں ہیں انہیں بلالینا بہتر ہو گا کیونکہ ریون کالنجر سے صرف ۵۰ میل دور ہے۔ جلال خان کم وقت میں کالنجر پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ جلال خان کو فوراً اطلاع دے دی گئی۔

جلال خان نے اطلاع ملتے ہی تدبر کا ثبوت دیا۔ انہوں نے کسی قسم کی جذباتیت کا مظاہرہ نہ کیا اور ریون کو فوراً چھوڑ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس طرح وہاں عدم استحکام پیدا ہو جاتا۔ انہوں نے پہلے ریون میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیں، اس کے بعد کالنجر روانہ ہو گئے۔ اس طرح وہ اپنے والد کی وفات کے پانچ دن بعد کالنجر پہنچے۔ امراً نے جلال خان کا خیر مقدم کیا۔ کالنجر کے قلعے میں 15 ربیع الاول ۹۵۲ھ / ۲۷ مئی ۱۵۴۵ء کو جلال خان نے مملکت کے سربراہ کا عہدہ سنبھال لیا۔

تخت نشین ہو جانے کے بعد جلال خان نے اپنا لقب اسلام خان یا

Marfat.com

اسلام شاہ اختیار کیا۔ بعد میں لوگوں نے انہیں اسلام شاہ کی بجائے سلیم شاہ کہنا شروع کر دیا۔ شیر شاہ سوری کی میت کو عارضی طور پر کالنجر کے نزدیک سپردِ خاک کر دیا گیا۔ بعد میں انہیں سہسرام (بہار) میں ان کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

اسلام شاہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے بڑے بھائی عادل خان کو خط ارسال کیا جس میں انہوں نے صورتِ حال کی وضاحت کی کہ چونکہ والدِ محترم کی شہادت کے وقت آپ خاصے دور دراز مقام پر موجود تھے اور میں نسبتاً قریب تھا، اس لیے امرا نے کسی قسم کے عدم استحکام یا فتنہ و فساد کی روک تھام کی غرض سے مملکت کا اقتدار مجھے سونپ دیا ہے۔ آپ تشریف لائیں اور حکومت سنبھال لیں، مجھے آپ اپنا فرماں بردار پائیں گے۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات کے لیے فتح پور سیکری کا مقام منتخب کیا گیا۔ عادل خان فتح پوری سیکری پہنچے۔ دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔ والدِ محترم کی جدائی کا زخم تازہ تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا دکھ بانٹا۔ یہاں سے وہ آگرہ روانہ ہو گئے۔ آگرہ کے قلعے میں پہنچ کر اسلام شاہ نے اپنے بھائی سے کہا کہ اب تک تو میں نگراں رہا ہوں اب آپ آگئے ہیں لہٰذا اب اقتدار آپ سنبھالیں، یہ کہہ کر وہ مسند سے اترے اور عادل خان کو مسند پر بٹھا دیا۔ عادل خان اس بات سے واقف تھے کہ ان کے بھائی جلال خان (اسلام شاہ) کتنی عمدہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، انہوں نے اپنے اوپر اپنے بھائی کو ترجیح دی۔ انہوں نے مسند سے اتر کر اسلام شاہ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں مسند پر بٹھا دیا۔ تمام امرا نے اس بات کو پسند کیا اور اسلام شاہ کی اطاعت کا یقین دلایا۔

اقتدار سنبھالنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسلام شاہ کو عادل خان، جودھ پور کے سردار خواص خان اور ناگور کے سردار عیسیٰ خان نیازی کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں اس مخالفت میں بعض دیگر سردار مثلاً جلال خان بن جالو، برہم جیت گوڑ وغیرہ بھی شامل تھے لیکن پھر انہوں نے مخالفت ترک کر کے اسلام شاہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ آگرہ کے قریب ایک لڑائی ہوئی۔ عادل خان کی فوج جم کر نہ لڑ سکی اور جلد تتر بتر ہو گئی۔

ایک برس بعد اسلام شاہ کو انبالہ کے قریب ایک لڑائی میں حصہ لینا پڑا۔ یہ لڑائی نیازیوں کے خلاف تھی جن کی فوج ہیبت خان نیازی کی قیادت میں انبالہ کے میدان میں اتر آئی تھی۔ اس فوج کو خواص خان کی فوج کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی، لیکن پھر خواص خان نے ہیبت خان نیازی کا ساتھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیبت نیازی کی فوج لڑائی نہ لڑ سکی اور منتشر ہو گئی۔ ہیبت خان نیازی سندھ کی سمت چلے گئے۔ دھن کوٹ کے مقام پر انہوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کیا۔ اسلام شاہ نے ان کے تعاقب میں فوج بھیجی تھی، جس نے انہیں کھیوڑہ کی طرف چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ نمک کی کانوں کے اس علاقے میں گکھڑوں نے ہیبت خان نیازی کا ساتھ دیا اور یوں اسلام شاہ کے مخالفین پھر زور پکڑنے لگے۔ اسلام شاہ کو ان تبدیلیوں کا علم تھا۔ وہ ایک بڑی فوج لے کر گکھڑوں اور نیازیوں کے خلاف کارروائی کے لیے روانہ ہوئے۔ کئی برس تک معرکہ آرائی جاری رہی۔ آخر گکھڑوں کے حاکم سلطان آدم نے معافی طلب کی اور ہیبت خان نیازی کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔

اسلام شاہ پنجاب میں شورشیں رفع کرنے کے بعد دہلی کی سمت روانہ ہوئے۔ راستے میں انہیں اطلاع دی گئی کہ مغل حکمراں نصیر الدین ہمایوں کے چھوٹے بھائی کامران مرزا، ہمایوں سے برگشتہ ہو کر اسلام شاہ کی حمایت کی غرض سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ اسلام شاہ نے کامران مرزا سے ملاقات تو کی لیکن ان کی کوئی خاص مدد نہ کی۔

اسلام شاہ دہلی پہنچے۔ کچھ عرصے بعد انہیں خبر ملی کہ نصیر الدین ہمایوں اپنی فوج کے ساتھ دریائے سندھ پار کر چکے ہیں۔ اسلام شاہ نے فوراً فوجی تیاریاں کیں اور طوفانی رفتار سے لاہور جا پہنچے۔ اس مہم کا حال آگے بیان کیا جائے گا۔

اسلام شاہ اپنے والد شیر شاہ سوری کی طرح بہت اچھے منتظم تھے۔ وہ سرکاری امور میں حد درجہ نظم و ضبط کے قائل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب کوئی قانون بنایا جائے تو اس پر سختی سے عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اسی طرح جب سربراہِ مملکت کی جانب سے کوئی حکم نامہ جاری ہو تو اس کی تعمیل میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی اس سخت روش کا نتیجہ یہ تھا کہ مملکت میں قانون کا احترام پایا جاتا تھا اور بڑے سے بڑا افسر بھی کسی قانون کو توڑنے کی جرأت نہ کر پاتا تھا۔

اسلام شاہ کی ہیبت اس قدر تھی کہ ان کے حکم نامے مختلف اضلاع میں بھیجے جاتے تھے، ان اجلاسوں میں گو کہ اسلام شاہ بذاتِ خود موجود نہ ہوتے تھے لیکن ان کے حکم نامے نہایت توجہ اور احترام سے اس طرح سنے جاتے تھے گویا اسلام شاہ خود سامنے تشریف فرما ہوں۔

Marfat.com

مؤرخ عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکپن میں اس طرح کے اجلاس میں اپنے نانا کے ساتھ شرکت کی تھی۔

اگر کوئی عہدے دار سربراہِ مملکت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا تھا تو سربراہ تک اس کی خبر پہنچ جاتی تھی کیونکہ اطلاعات کا نظام بہت مستحکم تھا۔ اس کے بعد قصور وار عہدیدار کے بارے میں تحقیق کر کے اسے سزا دی جاتی تھی۔

اسلام شاہ کے والد شیر شاہ سوری تاریخ کے اچھے طالب علم تھے۔ سابقہ حکومتوں نے جو اچھے اور کامیاب قوانین وضع کیے تھے، شیر شاہ سوری نے ان کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا۔ انہوں نے سرکاری اداروں کی کارکردگی بڑھانے میں ذاتی دلچسپی لی۔ اس طرح بحیثیتِ مجموعی تمام اداروں میں نظم وضبط پیدا ہو گیا۔ اسلام شاہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سرکاری اداروں کے اس نظم وضبط کو نہ صرف بحال رکھا بلکہ اسے مزید مستحکم بنا دیا۔ ان کے عہد میں کسی بااثر فرد کی مجال نہ تھی کہ کسی عام فرد کو ستائے یا تنگ کرے۔

اسلام شاہ نے مملکت کو ترقی دینے اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بعض اہم اقدامات بھی کیے، مثلاً ان کے حکم پر قانون گویوں کے کاغذات میں دیہات کی چھوٹی سے چھوٹی بات تک درج کی جانے لگی۔ آبادی اور زراعت کو ترقی دینے کے منصوبے اسلام شاہ ہی کی ہدایت پر تشکیل دیے جانے لگے۔ لگان وصول کرنے کے قواعد بنائے گئے۔ اسلام شاہ کی خواہش پر انہیں رعایا کی کیفیت سے تحریری طور پر باخبر رکھا جانے لگا۔

اسلام شاہ نے قانون سازی پر بھرپور توجہ دی اور ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں تفصیلی قوانین جاری کیے۔ ان طریقوں کی مکمل وضاحت بھی کی گئی جن کے مطابق فوج، تاجروں اور عام افراد کو معاملات کرنے چاہئیں۔

اسلام شاہ نے رفاہِ عامہ کے سلسلے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شیر شاہ سوری نے برصغیر میں چار اہم شاہراہوں پر سرائیں تعمیر کروائی تھیں۔ ایک شاہراہ قلعہ پنجاب سے سنار گاؤں (بنگال) تک جاتی تھی۔ دوسری شاہراہ آگرہ کو برہان پور (دکن) سے ملاتی تھی۔ تیسری شاہراہ آگرہ سے جودھ پور تک جاتی تھی اور چوتھی شاہراہ لاہور کو ملتان سے منسلک کرتی تھی۔ شیر شاہ نے ان شاہراہوں پر ہر کروہ (دو میل) کے بعد سرائے تعمیر کروائی تھی۔ ہر سرائے میں مسافروں کے قیام کرنے کے لیے کمرے تھے۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام تھا، آرام کے لیے چارپائیاں تھیں، مسافروں کے لیے کھانے اور گھوڑوں، مویشیوں کے لیے چارے کا انتظام تھا۔ ہر سرائے کے ساتھ بازار تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں تھا۔ ہر سرائے میں ایک کنواں بھی ہوتا تھا اور پکی اینٹوں کی ایک مسجد بھی بنائی گئی تھی۔ مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام اور قرآن کے معلموں کا تقرر بھی کیا گیا تھا۔

اسلام شاہ نے حکمراں بنتے ہی حکم دیا کہ ہر نصف کروہ (ایک میل) پر اس طرح کی سرائیں تعمیر کی جائیں، اس فیصلے سے ملک میں سراؤں کی تعداد دگنی ہو گئی۔ اسلام شاہ نے یہ ہدایت بھی کی کہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں جتنے باغات لگائے گئے تھے ان میں کوئی کمی نہ ہونے پائے اور غیر ذمہ داری سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

اسلام شاہ نے یہ تاکید بھی کی کہ شیر شاہ کے دور میں سرکردہ افراد اور عام لوگوں کو مالی استحکام فراہم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے تھے اور جو منصوبے قائم کیے گئے تھے انہیں جاری رکھا جائے۔

اسلام شاہ علماء کرام کی بڑی عزت کرتے تھے۔ خاص طور پر شیخ الاسلام مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوریؒ کے بے حد معتقد تھے۔ اسلام شاہ عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان تھے۔ وہ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے تھے۔

اسلام شاہ اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہیں بہت سے اشعار یاد تھے۔ اسلام شاہ نے اپنی رہائش گاہ کے قریب کئی ایوان تعمیر کروائے تھے۔ ایوانوں کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور ان میں قیمتی ساز وسامان رکھا گیا تھا۔ ان ایوانوں میں اس وقت کے ماہرین فنونِ لطیفہ مثلاً سید منجمن، شاہ محمد، حیاتی اور سیفی اکٹھے ہوتے تھے۔ ان محفلوں میں وہ اشعار پڑھتے اور ادبی اور فلسفیانہ موضوعات پر بحث و مباحثے کرتے۔ بعض اوقات اسلام شاہ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے اور بحث و مباحثے میں حصہ لیتے۔ اسلام شاہ یوں تو سرکاری آداب اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھتے تھے لیکن ان محفلوں میں وہ اصرار کرتے کہ جب وہ آئیں تو لوگ اٹھ کر ان کا استقبال نہ کریں۔

اسلام شاہ کا دور بعض تعمیرات کے لحاظ سے بھی یادگار ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ شیر شاہ سوری نے مغل حکمراں نصیر الدین ہمایوں کو شکست دی تھی اور ہمایوں اپنی حکومت واپس لینے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اسلام شاہ نے ہمایوں کی واپسی کی روک تھام کی غرض سے

Marfat.com

دہلی کی سرحد پر ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ یہ قلعہ دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا اور شہر کے بیرونی مورچے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں تعمیر کیے گئے اس قلعے کا نام "سلیم گڑھ" رکھا گیا تھا۔ اسلام شاہ کو سلیم شاہ بھی کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے قلعے کا نام ان کے نام پر رکھ دیا گیا تھا۔

اسلام شاہ کی خواہش تھی کہ وہ پنجاب کا دارالحکومت لاہور سے کسی اور محفوظ مقام پر منتقل کریں۔ ان کا خیال تھا کہ لاہور، کابل دہلی شاہراہ پر واقع ہونے کے باعث غیر محفوظ ہے۔ چنانچہ انہوں نے دریائے چناب کے مشرقی کنارے کے قریب کوہ شوالک پر قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کروایا۔ یہ قلعے پہاڑیوں پر اس طرح تعمیر کیے گئے کہ دور سے دیکھنے والوں کو صرف ایک فلک بوس قلعہ دکھائی دیتا ہے۔ ان قلعوں تک دشمن کا پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ قلعوں میں میٹھے پانی کی قطعاً کمی نہیں تھی اور کھانے پینے کی اشیا بھی بالافراط موجود تھیں۔ قلعوں کا یہ سلسلہ مان کوٹ کہلاتا تھا۔ یہ سلسلہ چار قلعوں اور چار شہروں پر مشتمل تھا۔ ان قلعوں اور شہروں کی تعمیر کے لیے مزدور مسلسل دو برس تک مصروف رہے۔

اسلام شاہ کے زمانے میں بھی مخصوص سوری طرزِ تعمیر نمایاں رہا، یعنی مقبرے ہشت پہلو تعمیر کیے جاتے تھے، چنانچہ ناگور کے سردار عیسیٰ خان نیازی کا مقبرہ ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء میں اسی انداز سے تعمیر کیا گیا۔ اس میں کاشی کاری کے روغنی چوکے (ٹائلز) بڑی تعداد میں استعمال کیے گئے تھے۔ صحن بھی ہشت پہلو تھا، جس کے مغربی حصے میں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جس میں بھورا سنگِ مورہ اور سنگِ سرخ استعمال کیا گیا تھا۔ چوڑائی میں تین دالان بنائے گئے تھے۔ اوپر ایک وسطی گنبد تعمیر کیا گیا اور بغلی دالانوں پر چھتریاں بنائی گئیں۔ دہلی میں یہ آخری عمارت ہے جو اس انداز سے تعمیر کی گئی ہے۔

اسلام شاہ فوج کو بے حد منظم رکھتے تھے اور فوجی اصول و قواعد کی سختی سے پابندی کرواتے تھے۔ اپنے حریفوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے وہ ذرا بھی تاخیر گوارا نہ کرتے تھے اور مشکلات یا رکاوٹوں کے باوجود پیش قدمی شروع کروا دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مغل حکمراں نصیر الدین ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کی خاطر دریائے سندھ پار کر کے لاہور کی جانب پیش قدمی شروع کی اور اس پیش قدمی کی اطلاع اسلام شاہ کو ملی تو اس وقت وہ دہلی میں تھے اور حکیموں نے ان کے گلے سے فاسد خون نکالنے کی غرض سے ۷۰ جونکیں لگا رکھی تھیں، لیکن اس خبر کو سنتے ہی اسلام شاہ نے جونکیں نکال کر ایک طرف پھینک دیں اور فوج کو فوری طور پر تیاری کا حکم دے دیا۔

اسلام شاہ کی فوج کا توپ خانہ ۶۰ بڑی توپوں پر مشتمل تھا۔ یہ توپیں نہایت بھاری بھر کم تھیں اور انہیں کھینچنے کے لیے بیل استعمال کیے جاتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب اسلام شاہ نے فوجی تیاریوں کا حکم دیا تو تمام بیل دور دراز کے دیہات میں چرنے کے لیے بھیجے جا چکے تھے۔ فوری طور پر تمام بیلوں کو واپس لے کر آنا دشوار تھا۔ اسلام شاہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے ایک لحہ ضائع کیے بغیر حکم دیا کہ ان توپوں کو پیادہ سپاہی کھینچیں گے چنانچہ ایک ایک توپ گاڑی کو دو دو ہزار پیادہ سپاہیوں نے کھینچنا شروع کیا اور فوج تیزی سے پیش قدمی کرنے لگی۔ اس بروقت کارروائی کے نتیجے میں فوج اسی دن دہلی سے تین میل دور جا پہنچی، اور جب یہ فوج لاہور پہنچی تو ہمایوں اس سے پہلے ہی واپس کابل جا چکے تھے۔ انہیں اسلام شاہ کی فوری فوجی کارروائی کی خبر مل گئی تھی۔

مغل حریف نصیر الدین ہمایوں کے خلاف اس فوجی مہم میں اسلام شاہ نے غیر معمولی اہتمام کیا۔ فوجی تیاری کے لیے نہایت مختصر مہلت میسر ہونے کے باوجود لکڑی کاٹنے کے ماہر ڈیڑھ لاکھ سپاہی اور خندقیں کھودنے کے ماہر ڈیڑھ لاکھ افراد اس مہم میں اسلام شاہ کے ساتھ تھے۔ فوج جب کہیں پڑاؤ ڈالتی تھی تو یہ ڈیڑھ لاکھ ماہرین فوج کی حفاظت کے لیے آن کی آن میں خندقیں کھود کر رکھ دیتے تھے اور لکڑی کاٹنے والے ماہر سپاہی فوجی خیموں کے چاروں طرف جنگلے لگا دیتے تھے۔ یہ جنگلے "کٹ گھرے" کہلاتے تھے۔ اسلام شاہ کی فوج میں دفاعی تعمیرات، مورچوں اور جنگی آلات کا محکمہ بہت منظم تھا۔

اسلام شاہ ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء میں علیل ہو گئے۔ ان کے جسم پر ایک پھوڑا نکل آیا تھا۔ یہ مرض اتنا بڑھا کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۲۲ ذی قعدہ ۹۶۰ھ/۳۰ اکتوبر ۱۵۵۳ء کو اس جری اور پُرعزم حکمراں کی کتابِ زندگی کا آخری باب بند ہو گیا۔ اسلام شاہ نے آٹھ برس پانچ ماہ حکومت کی۔ اسلام شاہ کی وفات کے بعد ان کے کمسن بیٹے فیروز خان کو حکمراں بنایا گیا لیکن جلد اسلام شاہ کے بھائی مبارز خان نے "عادل شاہ" کے لقب سے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عادل شاہ کی حکومت بھی بمشکل ایک

Marfat.com

برس تک قائم رہی۔ ان کے بعد ابراہیم شاہ اور سکندر شاہ سوری کو چند ماہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔

سکندر شاہ نے سرہند کے میدان میں مغلوں سے شکست کھائی۔ نصیر الدین ہمایوں پہلے ہی ذی الحج ۹۶۱ھ / نومبر ۱۵۵۴ء میں پشاور اور ربیع الاول ۹۶۲ھ / فروری ۱۵۵۵ء میں لاہور پر قابض ہو چکے تھے۔ رمضان المبارک ۹۶۲ھ / جولائی ۱۵۵۵ء میں ہمایوں دہلی میں داخل ہو گئے، لیکن ربیع الاول ۹۶۳ھ / جنوری ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کا انتقال ہو گیا تو عادل شاہ کے سپہ سالار ہیمو نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری لڑائی میں ہیمو کی فوج کو جلال الدین اکبر کی فوج کے ہاتھوں بری طرح شکست ہوئی۔ اس طرح برصغیر میں مغلوں کی حکمرانی بحال ہو گئی اور سوری خاندان کی حکومت کا تذکرہ صرف تاریخ کی کتابوں میں باقی رہ گیا۔

•••

Marfat.com

ٹیپو سلطان

برطانوی تسلط کے خلاف اور وطن کی آزادی پر جاں نثار کرنے والے شیر دل حکمران

مسجد تیار ہو چکی تھی!

دریا کے کنارے ایک خوبصورت اور دلکش عمارت تھی جس کی منقش دیواروں سے شان و شوکت ٹپکتی تھی۔ اس عمارت کی مشرقی جانب یہ مسجد تھی جس کے دونوں مینار بڑے وقار سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مسجد کی تعمیر میں نفاست کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

آج اس مسجد میں غیر معمولی ہجوم تھا۔ ممتاز علما کرام، امرا اور اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ آج اس مسجد کا باقاعدہ افتتاح ہونا تھا۔

نماز کا وقت ہوا تو نمازیوں نے صفیں باندھ لیں۔ اس موقع پر یہ تجویز سامنے آئی کہ مسجد کے افتتاح کے دن نماز کی امامت ایسا شخص کرے جو صاحبِ ترتیب ہو (یعنی جس کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو اور اس نے تمام نمازوں کو ترتیب سے وقتِ مقررہ پر ادا کیا ہو)۔

یہ سننا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ شاید کوئی بھی اس کڑے معیار کے مطابق خود کو امامت کے قابل نہیں پاتا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک جواں سال شخص بڑھا، گندمی رنگت کے حامل اس دراز قد شخص کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا اس کے بھرے بھرے چہرے پر قدرے خمدار ناک بڑی بھلی محسوس ہوتی تھی اور اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ اس شخص نے انکسار سے کہا:

"الحمدللہ، میں صاحبِ ترتیب ہوں۔"

تمام حاضرین کی ستائشی اور رشک بھری نظریں اس شخص کی جانب اٹھ گئیں۔ یقیناً امامت ایسے ہی شخص کو کرنی چاہیے تھی۔ وہ شخص وقار کے ساتھ آگے بڑھا اور امام کی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اقامت پڑھی گئی اور اس شخص نے تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔

سرنگاپٹم کی مسجدِ اعلیٰ میں نماز کی امامت کرنے والے یہ جواں سال رہنما تھے، عالم اسلام کے عظیم اولوالعزم، جرأت مند اور صاحبِ تدبیر، بطلِ جلیل ٹیپو سلطان، جن کی پوری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ ٹیپو سلطان کو عموماً لوگ محض ایک جنگجو سپہ سالار کی حیثیت سے جانتے ہیں جو بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے لیکن ٹیپو سلطان محض ایک جنگجو سپہ سالار نہ تھے۔ وہ ایک ذی علم اور علم دوست شخصیت کے مالک بھی تھے۔ وہ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے بھی حامل تھے۔ انہوں نے نہ صرف جنگی نقطۂ نظر سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا اور اس کا دفاع کیا بلکہ فلاحی اعتبار سے بھی نہایت اہم اور منفرد اقدامات کیے۔ وہ غیر معمولی، خداداد ذہانت کے مالک تھے۔ ہر شعبے میں ان کی جدت اور اختراع پسندی کے باعث نت نئی راہیں کھلتی چلی گئیں اور ان کی رعایا پر آسودگی اور خوشحالی کے در، وا ہو گئے۔

ٹیپو سلطان وسیع النظر اور دور بین شخصیت تھے۔ انہوں نے عالم اسلام کو متحد اور یکجا کرنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی اور اس غرض سے مسلم ممالک کے ساتھ صرف جنگی روابط ہی قائم نہیں کیے بلکہ ان کے ساتھ تجارتی مراسم کو بھی فروغ دیا۔ یقیناً ٹیپو سلطان ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔

ٹیپو سلطان کا پورا نام فتح علی ٹیپو سلطان ہے۔ ان کے والد کا نام حیدر علی اور والدہ کا نام فخر النسا (فاطمہ) ہے۔ ٹیپو سلطان کے نام "فتح علی" میں ان کے والد حیدر علی اور دادا فتح محمد دونوں کے نام شامل ہیں۔ ان کے والد حیدر علی نے ان کے نام میں "ٹیپو سلطان" کا اضافہ ارکاٹ کے ایک بزرگ حضرت ٹیپو مستان ولی سے عقیدت کے باعث کیا۔

ٹیپو سلطان کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے تاہم بیشتر مورخین کا

Marfat.com

خیال ہے کہ ٹیپو سلطان کی درست تاریخ پیدائش ۱۴ صفر المظفر ۱۱۶۵ھ / ۲۱ دسمبر ۱۷۵۱ء ہے۔

عالم اسلام کے اس عظیم جرنیل کی پیدائش بنگلور سے تقریباً ۲۲ میل دور ایک قصبے دیون ہلی میں عمل میں آئی۔ اس مقام کا نام بعد میں ٹیپو سلطان نے یوسف آباد رکھ دیا تھا۔ ٹیپو سلطان کے آبا و اجداد کے متعلق روایت ہے کہ وہ قریشی النسل تھے اور غالباً ۱۶ویں صدی عیسوی کے اواخر میں برصغیر (پاک و ہند) پہنچے۔ اس خاندان کے ایک فرد شیخ ولی محمد گلبرگہ (جنوبی ہند) آئے۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے محمد علی تھے جو ٹیپو سلطان کے پردادا تھے۔ محمد علی کے بیٹوں نے، جن میں ٹیپو سلطان کے دادا فتح محمد بھی شامل تھے، فوج کی ملازمت کا پیشہ اختیار کیا۔ جب فتح محمد کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے شہباز اور حیدر (ٹیپو سلطان کے والد) کمسن تھے۔ ان بچوں کی والدہ بنگلور اور پھر سرنگاپٹم منتقل ہو گئیں۔

حیدر علی نے بھی بڑے ہو کر فوج کی ملازمت اختیار کی۔ ان کے جوہر خاص طور پر ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں (۲۸ برس کی عمر میں) کھلے جب انہوں نے ایک جنگ میں غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ اس جنگ کے تقریباً دو برس بعد ٹیپو سلطان کی پیدائش عمل میں آئی۔

حیدر علی نے اپنے پیارے فرزند کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ ننھے ٹیپو کو قرآن کریم، فقہ، عربی، فارسی، فرانسیسی، انگریزی اور کنٹری (مقامی زبان) کی تعلیم دی گئی۔ اس زمانے میں اردو بھی رائج ہو رہی تھی۔ اس کا بھی علم حاصل کیا۔ ٹیپو کے اساتذہ میں علی حسین (بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں ملک الشعراء مقرر ہوئے) اور نصیر الدین اختر ترک شامل ہیں۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ ان تمام علوم و فنون کے نامور اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان اساتذہ کی خصوصی توجہ، لگن اور محنت کے نتیجے میں ٹیپو نے بہت جلد شہ سواری، تیغ زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، بندوق چلانے، بانک، بنوٹ، لکڑی (گتکا)، پیراکی، کشتی اور دو بدو جنگ لڑنے میں مہارت حاصل کر لی۔ بعد کے ادوار میں ٹیپو سلطان نے فنِ حرب میں مزید کمال حاصل کیا، حتیٰ کہ فنونِ حرب پر "فتح المجاہدین" جیسی جامع کتاب لکھی۔ ٹیپو سلطان نے خطاطی کے فن پر بھی عبور حاصل کیا تھا اور علم حکمت کے اعتبار سے بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ ان کے کتب خانے سے ایک کتاب "رسالہ در طرز خطِ محمدی" کے نام سے ملی جس میں خطاطی کے بارے میں خود ٹیپو سلطان کے وضع کردہ اصول درج تھے۔ سلطان فن مصوری کے بھی ماہر تھے۔ علم نجوم پر بھی سلطان نے ایک کتاب "زبرجد" کے نام سے تصنیف کی تھی۔

ٹیپو سلطان نے ایسے عہد میں ہوش سنبھالا جب برصغیر پاک و ہند کی عظیم اسلامی مملکت سیاسی خلفشار کا شکار ہو چکی تھی۔ مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جگہ جگہ خود مختار ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں اور ان میں کشاکش جاری تھی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر انگریز ایک تجارتی ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیس میں اپنا جال پھیلا چکے تھے۔

سنہ ۱۱۷۸ھ / ۱۷۶۴ء میں بنگال سے اودھ تک انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی دور رس نظروں نے اس مہیب خطرے کو بھانپ لیا تھا جو بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا باعث بنا اور جس کے نتیجے میں انگریز برصغیر کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے، چنانچہ انہوں نے نو آبادیت پسند سامراج کی راہ روکنے کے لیے خود بھی جدوجہد شروع کر دی تھی اور اپنے باصلاحیت فرزند ٹیپو سلطان کو بھی اس عظیم مقصد کے لیے تیار کرتے رہے۔

ٹیپو سلطان کو اپنی غیر معمولی شجاعت اور جنگی مہارت کا مظاہرہ کرنے کا موقع کمسنی ہی میں مل گیا۔ ان کے والد حیدر علی نے ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء میں مالابار پر حملہ کیا تو انہوں نے نوجوان ٹیپو کو بھی اس مہم میں ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ اس وقت ٹیپو کی عمر صرف ۱۵ برس تھی۔ حیدر علی نے بڈنور کے جنوب میں کوہستانی علاقے بالم پر حملہ کیا۔ وہاں کے حاکم کو شکست ہوئی لیکن اس نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور گھنے جنگل میں پناہ لے لی۔ اس موقع پر ٹیپو صرف ہزار سپاہی لے کر گھنے اور تاریک جنگل میں بے دھڑک داخل ہو گئے اور بالم کے حاکم اور اس کے ساتھیوں کو جالیا۔ یہ لوگ "پالیگار" کہلاتے تھے۔ پالیگاروں نے مجبوراً اطاعت کا یقین دلایا۔ ان کی دیکھا دیکھی مالابار کے دیگر جاگیرداروں نے بھی حیدر علی کو اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ حیدر علی اپنے بہادر فرزند کی اس کارکردگی سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نوجوان ٹیپو کو دو سو سواروں کا کماندار مقرر کر دیا۔

انگریز حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سخت خائف تھے۔ انہوں نے مرہٹوں اور نظام حیدرآباد دکن کو ساتھ ملا کر سلطنتِ میسور پر چڑھائی کر دی۔ پہلی اینگلو میسور جنگ کا آغاز ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء میں

Marfat.com

ہوا۔ حیدر علی مرہٹوں کو اس اتحادِ ثلاثہ سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے پھر انہوں نے محرم ۱۱۸۱ھ / جون ۱۷۶۷ء میں ٹیپو سلطان کو نظام الملک حیدر آباد دکن کے پاس تحائف دے کر بھیجا۔ ٹیپو سلطان نے اتنے سلیقے سے گفتگو کی کہ نظام، حیدر علی کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ٹیپو کو مدراس کی طرف پیش قدمی کا حکم ملا۔ وہ مدراس پہنچ کر مخالفوں کی سرکوبی کر رہے تھے کہ انہیں ان کے والد نے واپس بلا لیا۔ ٹرپاتور اور۔ وانم باڑی فتح کرنے کی مہم اور انبور کے محاصرے میں وہ اپنے والد کے ساتھ رہے۔ جب انگریزوں نے بندر کوڑیال (بنگلور) پر قبضہ کر لیا تو ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا۔ پھر حیدر علی بھی پہنچ گئے۔ دونوں بہادر باپ بیٹے نے مل کر پوری قوت سے حملہ کیا۔ ٹیپو کے حملوں میں ایسی شدت تھی کہ انگریز توپیں چھوڑ کر بھاگے اور قلعے میں محصور ہو گئے۔ ٹیپو ان کا تعاقب کرتے ہوئے قلعے میں جا پہنچے۔ انگریز قلعہ چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگے اور راستے میں ٹیپو کی فوج کے ہاتھوں یا تو مارے گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔

انگریزوں سے لڑائی ختم ہوئی تو مرہٹوں نے رجب ۱۱۸۳ھ / نومبر ۱۷۶۹ء میں میسور پر حملہ کر دیا۔ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو حکم دیا کہ دشمن کو زچ کر دیا جائے چنانچہ ٹیپو سلطان نے مرہٹوں کی رسد کے راستے بند کر دیے، دشمن کو نہ پانی مل سکا نہ گھوڑوں کے لیے چارہ۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن شوال ۱۱۸۳ھ / فروری ۱۷۷۰ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے ٹیپو کو واپس بلا لیا۔ مرہٹوں نے جنگ شروع کر دی۔ حیدر علی ملکوٹہ میں تھے، وہ سرنگاپٹم پہنچ گئے لیکن افراتفری میں ٹیپو ان سے الگ ہو گئے۔ حیدر علی سرنگاپٹم میں سخت بے چین تھے کہ ٹیپو کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی لیکن آخر کار ٹیپو ایک مفلس سبزی فروش کے بھیس میں سرنگاپٹم پہنچ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیپو موقع کی مناسبت سے کس قدر درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مرہٹوں نے ۳۳ دن تک سرنگاپٹم کا محاصرہ کیے رکھا، آخر مرہٹے رسد کی کمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ شعبان ۱۱۸۶ھ / نومبر ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کے پیشوا مادھوراؤ کی وفات کے بعد حیدر علی نے ٹیپو کو مرہٹوں سے مقابلے کے لیے پھر بھیجا۔ ٹیپو نے مرہٹوں سے سیرا، مداگری، گوام کونڈا، چھنارایادرگا، ہوسکوٹ، بلاری وغیرہ چھین لیے۔

انگریزوں سے دوسری لڑائی ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء میں ہوئی جو دوسری اینگلو میسور جنگ کہلاتی ہے۔ حیدر علی ۹۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ کرناٹک پہنچ گئے۔ ٹیپو ساتھ تھے۔ انگریز سپہ سالار ہیکٹر منرو، کانجی ورم پہنچ کر کرنیل بیلی کی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ حیدر علی نے ٹیپو کو دس ہزار سپاہی دے کر کرنیل بیلی کی فوج پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ ٹیپو نے کانجی ورم سے پندرہ میل پہلے ہی کرنیل بیلی کی فوج پر حملہ کر دیا۔ کانجی ورم سے نو میل دور رات میں اس قدر شدید گولہ باری کی کہ کرنیل بیلی نے ہتھیار ڈال دیے۔ چار ہزار یورپی سپاہیوں میں سے صرف دو سو سپاہی زندہ بچے جنہیں قیدی بنا لیا گیا۔ انگریزوں نے اعتراف کیا کہ اس وقت تک انگریزوں پر ہندوستان میں لگنے والی یہ شدید ترین ضرب تھی۔ ٹیپو سلطان نے انگریز قیدیوں سے بڑا نرم سلوک کیا۔ ہر قیدی کو کپڑے اور رقم دی، پھر انہیں سرنگاپٹم بھیج دیا۔ انگریز سپہ سالار ہیکٹر منرو نے مایوس ہو کر مدراس واپسی کا فیصلہ کیا۔ بھاری توپیں اور گولہ بارود واپس لے جانا مشکل تھا چنانچہ انگریز یہ سامان ایک بڑے تالاب میں پھینک گئے!

اس کے بعد ٹیپو نے ارکاٹ، ست گڑھ، تیاگ گڑھ فتح کیے۔ اس اثنا میں مغربی محاذ پر مالابار میں انگریزی فوج کی کامیابیوں کی خبریں ملیں۔ ٹیپو کو اس محاذ پر بھیج دیا گیا۔ ٹیپو نے انگریزوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ وہ انگریزوں پر دن بھر گولہ باری کرتے رہے، حتیٰ کہ شام کو دریائے پونانی پر پہنچ گئے۔ انگریز دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹیپو نے بھی دریا پار کیا اور شہر پونانی کی ناکہ بندی کر دی۔ اسی دوران میں ٹیپو کو اپنے والد حیدر علی کی وفات کی اندوہناک اطلاع ملی۔ ۳۰ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ / ۶ دسمبر ۱۷۸۲ء کو حیدر علی کا انتقال ہوا۔ ٹیپو سلطان اطلاع ملنے پر خاموشی کے ساتھ چکلور پہنچ گئے جہاں حیدر علی کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان نے خود ہدایت کی تھی کہ ان کا رسمی استقبال نہ کیا جائے۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ / ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ء کو ٹیپو سلطان کی مسند نشینی عمل میں آئی۔ اب وہ اس وسیع سلطنت کے حکمراں تھے، جسے ان کے والد حیدر علی نے بڑے تدبر، حوصلے اور جرأت کے ساتھ حاصل کیا تھا۔

ٹیپو سلطان نے اقتدار سنبھالتے ہی حکم دیا کہ فوجیوں کی تنخواہیں اور واجبات فوراً ادا کر دیے جائیں۔ انہیں اس بات کا خوب احساس تھا کہ

Marfat.com

ابھی انہیں بہت سے حریفوں سے برسرِ پیکار ہونا ہے اور آئندہ تمام معرکوں میں کامیابی کے لیے انہیں مضبوط فوج درکار ہوگی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان نے ایک فرانسیسی افسر کو خصوصی ذمے داری سونپی کہ وہ ان کی فوج کو جدید خطوط پر منظم کرے۔ ٹیپو سلطان نے ایک اور اہم فیصلہ یہ کیا کہ سامانِ خورونوش اور دیگر اشیا کی قیمتیں از خود مقرر کرنے کا پرانا دستور منسوخ کر دیا، اس کے نتیجے میں فوج کو رسد کی فراہمی افراط کے ساتھ ہونے لگی۔

مشرقی محاذ پر انگریزوں نے پیش قدمی کی تو ٹیپو خود فوج لے کر روانہ ہوئے اور زبردست حملہ کر کے دشمن کو ونڈی واش اور کرنگولی سے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں نے تیاری کر کے بڈنور کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ شعبان ۱۱۹۷ھ / جولائی ۱۷۸۳ء میں ٹیپو ایک بڑی فوج کے ساتھ آندھی اور طوفان کی مانند بڈنور کی سرحد پر جا پہنچے۔ انہوں نے حیدر گڑھ اور کیول درگ پر قبضہ کر لیا۔ پھر بڈنور شہر پر تسلط قائم کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ تیرہ مقامات پر توپیں نصب کر دیں اور گولہ باری شروع کر دی۔ چند ہی دنوں میں انگریز فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

انگریزوں نے ایک معاہدہ کر کے قلعہ چھوڑنا چاہا لیکن خود ہی اس معاہدے کی خلاف ورزی کی جس پر ٹیپو کی فوج نے دشمن کو گھیر کر مارنا شروع کیا۔ آخر انگریز فوج معافی کی خواستگار ہوئی لیکن انگریزوں نے چالاکی یہ دکھائی کہ قلعہ میں جتنا خزانہ تھا اسے بھیڑ، بکریوں، مرغوں، کتوں تک کے جسموں میں چھپا کر لے جانے کی کوشش کی۔ ٹیپو کو یہ اطلاعات مل گئیں۔ انہوں نے تلاشی لینے کا حکم دیا اور تقریباً چالیس ہزار پگوڈے (سونے کے سکے) صرف افسروں ہی کے پاس سے برآمد کر لیے گئے۔ انگریزوں نے معاہدے کی پھر خلاف ورزی کی اور عوامی ذخائر لوٹ لیے، سرکاری دستاویزات جلائیں اور میسور کے جنگی قیدیوں کو آزاد نہ کیا چنانچہ ٹیپو نے انہیں ہتھکڑیاں لگوا کر چیتل درگ بھیج دیا۔

بڈنور سے ٹیپو سلطان بنگلور پہنچے۔ وہاں انگریزوں نے خود کو قلعے میں محصور کر لیا۔ قریب تھا کہ یہ قلعہ بھی فتح ہو جاتا، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ بندی ہو گئی۔ چنانچہ فرانسیسی فوج ٹیپو کی مدد سے پیچھے ہٹ گئی۔ ۱۸ ربیع الثانی ۱۱۹۸ھ / ۱۱ مارچ ۱۷۸۴ء کو ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے مابین صلح کا معاہدہ ہوا۔ ایک ذمہ دار انگریز افسر لارڈ میکارٹنی نے خود اعتراف کیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ ہوتا تو ہم اپنے مصارف کے بوجھ تلے ڈوب جاتے۔ معاہدے کے مطابق فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے۔

ادھر انگریزوں سے جنگ ختم ہوئی ادھر مرہٹوں کے مذہبی پیشوا نانا فرنویس نے میسور پر حملے کے لیے نظام حیدر آباد دکن کو ترغیب دینا شروع کر دی۔ ٹیپو سلطان نے نانا فرنویس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں تو مل کر انگریز کا مقابلہ کرنا چاہیے لیکن وہ نہ مانے۔ ادھر نظام حیدر آباد نے مرہٹوں سے اتفاق کر لیا کہ حیدر علی نے جتنے علاقے پر قبضہ کیا تھا، وہ واپس لے لیا جائے۔ ٹیپو نے ان دونوں رہنماؤں کو بہت کچھ سمجھایا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔ مجبور ہو کر ٹیپو کو بھی فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلنا پڑا۔ چند معرکوں کے بعد آخر کار جمادی الاول ۱۲۰۱ھ / فروری ۱۷۸۷ء میں صلح نامے پر دستخط ہو گئے جس کی رُو سے ٹیپو سلطان اپنے بعض علاقوں سے دستبردار ہو گئے اور کچھ نئے علاقے انہیں مل گئے۔

ٹیپو سلطان نے اسی زمانے میں خطبے میں مغل بادشاہ کی جگہ اپنا نام شامل کیا اور نیا روپیہ جاری کیا جسے "امامی" کہتے تھے۔ سنہ ہجری کی جگہ سنہ محمدیؐ اسی زمانے میں رائج کیا۔ یہ سنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے سال سے شروع ہوتا تھا۔ ٹیپو کے حکم پر ہر شہر، قصبے اور قلعے سے ایک ایک فرسنگ (تین تین میل) کے فاصلے پر خاردار تاروں کا انتظام کر دیا گیا۔

ٹیپو سلطان نے ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں عثمانی خلیفہ سے اپنی حکمرانی کی توثیق حاصل کی اور قسطنطنیہ میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا۔ اس غرض سے ٹیپو سلطان نے جو سفارتی وفد قسطنطنیہ روانہ کیا اس کے ارکان کے ساتھ بڑے پیمانے پر تجارتی اشیا بھی تھیں جن میں کپڑا، صندل کی مصنوعات، مسالے، سونے چاندی کے میسوری سکے، ملبوسات، جواہرات اور ہاتھی شامل تھے۔ گویا اس سفر سے ہر ممکن مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سفرا نے راستے میں کچھ سامان فروخت کیا۔

وفد کے ارکان کو ٹیپو نے ہدایت کی تھی کہ خلیج فارس سے گزرتے ہوئے بوشہر میں اتریں اور شاہِ فارس سے تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ وہ جن مقامات سے گزریں وہاں کے جغرافیائی، سماجی اور معاشی حالات کا مطالعہ کریں اور اپنے تجربات کو قلم بند کرتے رہیں۔ ٹیپو نے یہ ہدایت بھی کی کہ عثمانی حکومت سے ترکی مقبوضات میں کارخانوں کے قیام کا معاہدہ کرنے کی کوشش کریں اور

Marfat.com

عثمانی حکومت سے معاہدہ کریں کہ عثمانی حکومت ٹیپو کی مدد کے لیے فوج بھیجے۔ ایسے صنعت کار بھی بھیجیں جو بندوقیں اور توپیں ڈھال سکیں، شیشے اور چینی کے برتن بنا سکیں۔ ان کے بدلے ٹیپو اپنے ایسے کاریگر بھیجیں گے جن کی عثمانی خلیفہ کو ضرورت ہوگی، تاہم وفد ٹیپو کی حکومت کے لیے یہی اسناد حاصل کر سکا کہ عثمانی حکومت نے ٹیپو کو خود مختار بادشاہ تسلیم کیا اور انہیں اپنے سکے جاری کرنے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کا حق حاصل ہوگیا۔

ادھر انگریز بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ برصغیر میں ان کی توسیع پسندی کی راہ میں اگر کوئی موثر قوت حائل ہے تو وہ ٹیپو سلطان کی میسوری ریاست ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے مرہٹوں اور نظام حیدرآباد دکن کے ساتھ مل کر ٹیپو کے خلاف اتحاد قائم کرلیا۔ فریقین کے درمیان لڑائی کے تین دور ہوئے، آخر جمادی الثانی ۱۲۰۶ھ / فروری ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا گیا اور صلح نامے پر دستخط ہو گئے۔ اس صلح نامے کی رُو سے ٹیپو سلطان کو اپنی نصف مملکت سے دستبردار ہونا پڑا۔ یوں جنگوں کے اس سلسلے کا اختتام ہوا جس کا آغاز ۱۰ رمضان المبارک ۱۲۰۴ھ / ۲۴ مئی ۱۷۹۰ء کو ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان کو تین کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کا تاوان ادا کرنا تھا۔ مخالفین کے قیدی رہا کرنے پڑے۔ معاہدے کی ضمانت کے طور پر ٹیپو کے دو کمسن بیٹوں عبدالخالق اور معزالدین کو یرغمال بنایا گیا۔ جب دونوں شہزادے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ انگریز سالار کارنوالس کے کیمپ میں پہنچے تو انہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی اور کارنوالس نے انہیں گلے لگالیا۔

ٹیپو سلطان کی شکست ان کی ریاست پر انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے اتحاد کی بڑی کاری ضرب تھی، تاہم ٹیپو نے معاہدے کی شرائط کی پوری پابندی کی اور مطلوبہ رقم مقررہ وقت پر اتحادیوں کو ادا کردی۔ اس کے باوجود شہزادے واپس نہیں آئے بلکہ انہیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔

ٹیپو سلطان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید بقیہ نصف مملکت بھی جلد ہی گنوا بیٹھتا لیکن ٹیپو ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نقصانات کی تلافی میں مصروف ہو گئے۔ یہ ان کی غیر معمولی خداداد ذہانت، لیاقت، تدبر اور حُسنِ انتظام کی صلاحیت تھی کہ صرف چھ سال کے عرصے میں ٹیپو سلطان نے اپنی مملکت کو پھر سے خوشحال بنا دیا۔ اس غرض سے انہوں نے زراعت کو خصوصی ترقی دی۔ جنگی محاذ پر انہوں نے تمام قلعوں کی مرمت کروائی، فوج کی تنظیم نو کی۔ اس کے علاوہ اس عرصے میں ٹیپو سلطان نے اسلامی مملکت کو متحد کرنے کی غرض سے زمان شاہ والی کابل، سلطانِ روم، شاہ ایران اور خود برصغیر کے تمام حکمرانوں کے پاس سفیر اور خطوط ارسال کیے۔

لارڈ ویلزلی ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل مقرر ہو کر برصغیر آئے۔ انہیں ٹیپو سلطان کے اس قدر کم مدت میں سنبھالا لینے پر شدید تشویش تھی۔ ادھر انگریزوں کو یہ بھی فکر تھی کہ فرانسیسی سالار نپولین بوناپارٹ مصر فتح کر چکے تھے اور اصل بات جس نے انگریزوں کو ٹیپو سلطان کی طرف سے سخت پریشان اور خوفزدہ کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ نپولین بوناپارٹ نے ٹیپو سلطان کے نام چند خطوط لکھے تھے، بدقسمتی سے یہ خطوط ٹیپو تک پہنچنے کی بجائے انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط نپولین نے ۱۹ شعبان ۱۲۱۳ھ / ۲۶ جنوری ۱۷۹۹ء کو قاہرہ سے ٹیپو سلطان کے نام بھیجا تھا۔ اس خط میں نپولین نے لکھا:

> "بنام جلیل القدر سلطان ہمارے عزیز ترین دوست ٹیپو صاحب۔ ایک لاتعداد اور ناقابلِ شکست فوج کے ساتھ آپ کو انگلستان کے آہنی پنجے سے نجات دلانے کی خواہش کے ساتھ بحیرۂ احمر کے کنارے آیا ہوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا سیاسی موقف کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے کسی قابلِ اعتبار آدمی کو سویز جلد روانہ کر دیں جس سے میں گفتگو کر سکوں۔"

لارڈ ویلزلی نے آتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ وہ مرہٹوں اور نظام سے اتحاد قائم کرنے کی کوششیں بھی کرتے رہے۔ دوسری جانب انہوں نے ٹیپو سلطان کو بے دست و پا کرنے اور انہیں ہر قسم کی امداد سے محروم کرنے کی کوششوں کا بھی آغاز کر دیا۔ داخلی طور پر بھی سازشوں کا ایک جال بچھایا گیا۔ عوام کو یہ باور کروادیا گیا کہ انگریز اسلامی رسوم کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس غرض سے ان غیر ضروری رسوم کا انگریزوں نے بڑا احترام کیا جنہیں غیر اسلامی قرار دے کر ٹیپو سلطان نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ دوسری طرف سب سے زیادہ افسوسناک اور سنگین بات یہ ہوئی کہ انگریزوں کی ترغیب کے نتیجے میں کچھ مسلمان امرا اور ایک ہندو افسر درپردہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان باغیوں میں سرفہرست میر صادق تھا جو مجلس (پارلیمنٹ جسے "جماعتِ خاص" کہتے تھے) کا صدرِ اعظم تھا۔ دیگر باغیوں میں میر غلام علی، میر قمرالدین، میر قاسم علی، بدرالزماں اور ہندو وزیر مالیات و دیوان، پورنیا

Marfat.com

شامل تھے۔

لارڈ ویلزلی نے ٹیپو سے مذاکرات شروع کر دیے کہ وہ نیا معاہدہ کریں جس کی شرائط نہایت توہین آمیز تھیں۔ آخر لارڈ ویلزلی نے ۲۷ شعبان ۱۲۱۳ھ / ۳ فروری ۱۷۹۹ء کو جنرل ہیرس کو حکم دیا کہ وہ ٹیپو سے مذاکرات ختم کر کے میسور پر حملہ کر دیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ٹیپو سلطان فرانسیسیوں سے مل کر برصغیر میں انگریزوں کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے وضاحت کے لیے ٹیپو کو صرف ۲۴ گھنٹے کا وقت دیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس سے قبل وہ ٹیپو سلطان سے دوستانہ ماحول میں بات چیت کرتے رہے تھے، جو درحقیقت ان کی ایک چال تھی۔ وہ گزشتہ کئی ماہ سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھے۔

جنرل ہیرس کی قیادت میں ۲۱ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج نے ۹ رمضان المبارک ۱۲۱۳ھ / ۱۴ فروری ۱۷۹۹ء کو میسور کی طرف کوچ کیا۔ ۲۸ رمضان / ۵ مارچ کو جنرل ہیرس میسور میں داخل ہوئے اور ۷ شوال / ۱۴ مارچ کو بنگلور پر قبضہ جمالیا۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کی اس پیش قدمی کے پیش نظر مقابلے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ پورنیا اور سید غفار کی قیادت میں کچھ فوج چھوڑ کر مشرق کی سمت بڑھے۔ انگریزوں کی فوج میں جانوروں کی کثرت تھی۔ جنرل ہیرس کی فوج میں ۶۰ ہزار بیل تھے اور نظام کی فوج میں ۳۶ ہزار۔ نجی افراد کے بیلوں، اونٹوں اور ہاتھیوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ چارے کی کمی کی وجہ سے بیل مرنے لگے۔ ٹیپو سلطان کی فوج دشمن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن چونکہ اس کے اعلیٰ افسر انگریزوں سے جا ملے تھے اس لیے انہوں نے انگریزوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔

جنرل ہیرس نے ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ / ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو دوسرا مسودۂ مصالحت ٹیپو سلطان کے حوالے کیا۔ اس کی شرائط پہلے سے بھی زیادہ سخت تھیں۔ یعنی کہ یہ نصف سلطنت سے دستبردار ہو جاؤ، دو کروڑ روپے تاوان دیا جائے، چار بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیے جائیں۔ ٹیپو نے ان شرائط کو مسترد کر دیا۔

۲۳ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ / ۲۸ اپریل ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹم کے باہر توپیں نصب کر دی گئیں اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔ ۳ مئی کو قلعے کی فصیل میں چھوٹا شگاف پڑ گیا۔ جنرل ہیرس نے فوراً حملے کا فیصلہ کیا کیونکہ رسد کی کمی کی وجہ سے ان کی فوج فاقے کر رہی تھی اور وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے موقع پر غدارانِ ملت انگریزوں کے کام آئے۔ میر صادق نے صلاح دی کہ ۴ مئی کو دوپہر کے وقت حملہ کیا جائے۔ میر صادق نے تنخواہیں دینے کے بہانے ان سپاہیوں کو واپس بلا لیا جو قلعے کی فصیل کے شگاف کی حفاظت پر متعین تھے، چنانچہ انگریز فوج بلا تکلف اور بلا مزاحمت شگاف کے راستے قلعے میں داخل ہو گئی۔ البتہ ایک اور سمت سے حملہ کرنے والی انگریز فوج کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ٹیپو سلطان دفاعی انتظامات میں بری طرح مصروف تھے۔ ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ / ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو دوپہر کا کھانا ان کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ انہیں اپنے نہایت وفادار افسر سید غفار کی شہادت کی اطلاع ملی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: "ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں۔" ٹیپو سلطان پاپیادہ دوڑے اور اپنی منتشر فوج کو مجتمع کرنے کی سرتوڑ کوشش کی، لیکن جب سپاہی اپنی قوت کھو بیٹھے تو ٹیپو سلطان گھوڑے پر سوار ہوئے اور ڈڈی دروازے (پانی کے دروازے) کی طرف بڑھے۔ اسے میر صادق نے بند کروا دیا تھا تاکہ ٹیپو سلطان باہر نہ جا سکیں۔ میر صادق کہتے ہوئے نکلا کہ میں کمک لاتا ہوں لیکن سلطان کے وفادار ساتھی میر صادق کی غداری کو بھانپ چکے تھے، انہوں نے تلواروں کے وار کر کے اس قابلِ نفرین شخص کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔

ٹیپو سلطان اس دروازے کی طرف بڑھے جہاں سے قلعے کے اندرونی حصے کو راستہ جاتا تھا۔ اس دروازے سے گزرنے کی کوشش میں وہ تین بار زخمی ہوئے۔ ان کے گھوڑے نے بھی زخمی ہو کر دم توڑ دیا۔ ٹیپو اب بھی مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ اتنے میں چند انگریز سپاہی ادھر کو آئے۔ ایک نے ٹیپو کی تلوار کی قیمتی پٹی چھیننے کی کوشش کی۔ زخمی سلطان نے تلوار کا وار کیا۔ ایک انگریز زخمی ہوا۔ انگریز سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ سلطان ایک تنگ جگہ میں لڑتے رہے۔ تین افراد کو ہلاک کیا۔ اس اثنا میں ان کی کنپٹی پر گولی لگی اور یہ عظیم و شجیع مردِ مومن مقامِ شہادت پر فائز ہو گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق ٹیپو کے چہرے پر غیر معمولی طمانیت تھی اور کسی قسم کے جذباتی ہیجان یا غضب کا تاثر نہ تھا۔

دوسرے دن سہ پہر کو محل سے اس دلیر و جانباز جرنیل کا جنازہ اٹھایا گیا۔ چار یورپین کمپنیاں ساتھ تھیں۔ جنازے کا جلوس جس راستے سے گزرتا وہاں دونوں جانب کھڑے شہریوں کا جمِ غفیر دعائیں

Marfat.com

مار مار کر رو رہا تھا۔ لال باغ کے مقبرے میں ٹیپو سلطان کو ان کے والد حیدر علی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ٹیپو سلطان ایک ہمہ جہت و ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سلطنت کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ فوج کے سربراہِ اعلیٰ بھی تھے۔ دیگر ممالک کے حکمرانوں سے اہم مراسلت وہ خود کرتے تھے۔ گویا وہ وزیرِ خارجہ بھی تھے۔ منصفِ اعلیٰ بھی وہی تھے۔ اہم معاملات میں وہ فوجی اور غیر فوجی افسروں سے مشورہ بھی لیتے تھے لیکن جب فیصلہ ہو جاتا تو سختی سے اس پر عملدرآمد کرواتے۔ ان کی اسی سخت پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کبھی ان کا کوئی فرمان جاری ہوتا تو تمام ضلعی افسران (عاملین) اس فرمان کی روح کو سمجھتے ہوئے اس پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ٹیپو سلطان عام طور پر اصول اور حدود قیود مقرر کر دیتے تھے اور عاملین کو ان ہی اصولوں کے مطابق اور ان ہی حدود و قیود میں رہ کر فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ ٹیپو سلطان نے درمیانی واسطہ بنے ہوئے افسران کو بددیانتی سے محفوظ رکھنے کے لیے سخت سزائیں بھی دیں جن کے بعد بدعنوانیوں اور کام سے غفلت کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹیپو سلطان محض سرکاری کاموں ہی میں نہیں بلکہ افسران کی نجی اور انفرادی زندگی میں بھی پاکیزگی اور دیانت کو فروغ دینے کے خواہش مند تھے۔ مسلمان رعایا پر شرعِ محمدیؐ کا اطلاق ہوتا تھا جبکہ دیگر مذاہب کے لوگوں سے ان کے مذہبی اصولوں کے مطابق معاملہ کیا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان روزانہ علی الصباح بیدار ہو جاتے تھے۔ غسل اور نمازِ فجر کے بعد ایک گھنٹے تک قرآن پاک کی تلاوت لازماً کیا کرتے تھے، پھر ورزش کے بعد ناشتہ کرتے۔ ناشتہ میں زیادہ تر پھل اور دودھ استعمال کرتے تھے۔ اکثر خطوط ناشتے کے وقت لکھواتے تھے۔ ناشتے کے بعد فوج کا معائنہ کرتے۔ واپسی پر باہر سے آئی ہوئی اطلاعات اور حالات سنتے تھے اور موقع پر احکام جاری کرتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد ڈھلائی کے یا دیگر فوجی کارخانوں کا معائنہ کرتے، غروبِ آفتاب کے ایک گھنٹے بعد محل واپس آتے، پھر مختلف شعبوں کی کارگزاریاں سنتے، احکام جاری کرتے۔

رات کے کھانے پر امرا اور افسران سلطنت ضرور حاضر رہتے۔ کھانے کے وقت اکثر تاریخی موضوعات اور شعر و شاعری کا تذکرہ ہوتا۔ رات سونے سے قبل چہل قدمی کرتے اور پھر اپنے کمرے میں جا کر کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے۔ سلطان دن بھر میں صرف دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ ٹیپو سلطان انگریزی، فرانسیسی، ہندوستانی اور کنڑی زبانوں سے واقف تھے لیکن وہ گفتگو عموماً فارسی میں کرتے تھے اور اسی زبان میں لکھتے تھے۔

ٹیپو سلطان ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ نمازوں کے لیے ان کی پابندی کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ حیادار اس قدر تھے کہ عمر بھر میں کسی نے ان کے پاؤں اور ہاتھوں کے سوا کوئی حصۂ جسم برہنہ نہ دیکھا۔ ان کا لباس سادہ ہوتا تھا۔ اپنی دستار پر ایک سفید رومال رکھ کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ لیتے تھے۔ آخری دور میں سبز شملے والی دستار باندھنے لگے تھے۔ کمر کی پٹی میں ایک پیش قبض (خنجر) اور تلوار رہتی تھی۔

ٹیپو سلطان نہایت منکسر المزاج تھے۔ اتنی بڑی سلطنت کے حکمراں ہونے کے باوجود وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ کوئی ان کے احترام کے لیے کھڑا ہو جائے یا جھک کر سلام کرے۔ حتیٰ کہ وہ مسجدِ اعلیٰ میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے کے لیے بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی کی عبادات میں خلل واقع نہ ہو یا لوگ ان کی تکریم کا اہتمام شروع نہ کر دیں۔

ٹیپو سلطان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رعایا کو ایک مکمل آئین دیا جو "آئینِ سلطانی" کہلایا۔ اس آئین میں مملکت میں نفاذ کے لیے تمام قوانین کی تفصیل موجود ہے۔ صرف عدلیہ کے قوانین اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انصاف کی فراہمی کے لیے ہر گاؤں میں پنچایتیں موجود تھیں۔ لوگ ان سے مطمئن تھے۔ دیہات میں پٹیل اور شہروں میں آصف، عامل اور فوجدار، پنچایتوں کے فیصلے کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کے فیصلوں سے مطمئن نہ ہوتا تو ہر شہر میں قاضی اور پنڈت موجود تھے۔ مسلمان اور ہندو ان سے رجوع کر سکتے تھے اگر پھر بھی کوئی مطمئن نہ ہوتا تو سرنگاپٹم کی عدالتِ عالیہ میں اپیل کر سکتا تھا۔ آخری اور سب سے بڑی اپیل خود ٹیپو سلطان سے کی جا سکتی تھی۔

ٹیپو سلطان نے مسلم ممالک کے مابین اتحاد اور یک جہتی قائم کرنے کے لیے بھی کوششیں کیں۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ دنیا بھر کے مسلمان متحد ہو جائیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ترکی کے سلطان سلیم، ایران کے فرماں روا کریم خان ژند، افغانستان کے بادشاہ زمان شاہ کو خطوط ارسال کیے تھے۔ خود برصغیر (پاک و ہند) کی ہر ریاست میں خواہ

Marfat.com

وہاں مسلمان حکمراں ہوں یا ہندو، ٹیپو سلطان نے اپنے سفیر اور خطوط بھیجے اور برصغیر کے تمام باشندوں کے مابین اتحاد اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کے لیے انہوں نے مرہٹوں، دہلی کے بادشاہ، راجپوت حکمرانوں حتیٰ کہ نیپال کے راجا تک کو خط لکھے۔

ٹیپو سلطان نے ترکی اور ایران کے حکمرانوں کو خطوط لکھ کر باہمی تجارتی مراسم قائم کرنے کی تجاویز دیں۔ عثمانی حکمراں کو ٹیپو نے پیشکش کی کہ بصرہ میں سلطنتِ خداداد (سلطنتِ میسور) ایک تجارتی کوٹھی قائم کرے، اس کے عوض بندرگاہ بنگلور (کوڑیال) میں عثمانی سلطنت ایک تجارتی کوٹھی قائم کرلے۔ اسی طرح ایرانی بادشاہ کو ٹیپو سلطان نے تجویز دی کہ ایران، سلطنتِ خداداد کی بندرگاہوں میں سے کوئی ایک بندرگاہ استعمال کرلے۔ اس کے عوض سلطنتِ خداداد کو بندرگاہ بوشہر میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت دے۔ افسوس کہ عثمانی اور ایرانی حکمرانوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔

ٹیپو سلطان جدتِ فکر کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے زیرِ انتظام ہر شعبے میں اصلاحات کیں اور نئی اصطلاحات کو متعارف کروایا۔ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ ٹیپو سلطان اپنی مملکتِ میسور کو "سلطنتِ خداداد" یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بخشی ہوئی سلطنت کہا کرتے تھے۔ یہ سلطنت تقریباً ۸۰ ہزار مربع میل کے رقبے پر محیط تھی۔ یہ شمال میں دریائے کرشنا اور جنوب میں ریاست ٹراونکور اور ضلع تناولی تک وسیع تھی۔ مشرق میں مشرقی گھاٹ اس کی حد تھی جبکہ مغرب میں یہ سمندر کو جا چھوتی تھی۔

ٹیپو سلطان نے اپنے دارالحکومت کا نام "ٹیپو نگر" یا "ٹیپو پٹن" نہیں رکھا بلکہ "گنجِ عام" یعنی "خزینۂ عام" رکھا۔ یہ نام ذرا سے تصرف سے "گنجام" ہوگیا اور ابھی تک لوگ اس جگہ کو "گنجام" کہتے ہیں۔ ٹیپو کے مقرر کردہ اس نام میں بڑی معنویت ہے کیونکہ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہر ملک، ہر قوم اور ہر قسم کے ماہرینِ علم و فن آکر بس گئے تھے اور جہاں عالی شان محلات اور سرکاری دفاتر تعمیر کیے گئے تھے۔ آج یہاں کھنڈروں کا راج ہے، صرف ایک محل، دریا دولت باغ، دریائے کاویری کے کنارے باقی رہ گیا ہے۔

ٹیپو سلطان نے فوجی دستے "جیش" کا نام بدل کر "عسکر" رکھا۔ اسی لیے بنگلور چھاؤنی کو بعد میں بھی "معسکر" کہا جاتا رہا۔ بندوق کو "تفنگ" کہا جانے لگا۔ توپ کا نام "درخش" رکھا گیا۔ بان یعنی تیر کو 'شہاب' کہنے لگے۔ ٹیپو سلطان کے دور میں سکّوں کے نام بھی تبدیل کردیے گئے۔ اشرفی کو احمدی اور صدیقی کہا جانے لگا۔ ہُن کو فاروقی، روپیہ کو امامی، اٹھنّی کو باقری، دونّی کو کاظمی اور آنہ کو آیہ کہنے لگے۔

ٹیپو سلطان نے حسابِ ابجد میں بھی تبدیلی کی اور ابجد کی بجائے ایک نیا حساب "ابتث" ایجاد کیا جس میں عربی زبان کے حروف کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے رکھا گیا تھا اور اسی اعتبار سے ان کے عدد مقرر کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہجری سال کے ساتھ ساتھ ابجد کے حساب سے مہینوں کا نظام رائج تھا۔ یعنی احمدی، بہاری، جعفری، دارائی، ہاشمی، واسعی، زبرجدی، حیدر، صلوعی، یوسفی، یازدی، بیاسی۔ ٹیپو سلطان نے ان مہینوں کے نام تبدیل کردیے۔ نئے نام بالترتیب یہ تھے: احمدی، بہاری، تقی، ثمری، جعفری، حیدری، خسروی، دینی، ذکری، رحمانی، راضی، ربانی۔ ٹیپو نے اپنی اس نئی تقویم کو مولودی کا نام دیا اور مولودی سال کا آغاز ہجرتِ نبویؐ کی بجائے ولادتِ نبویؐ سے کیا۔ ٹیپو کے دور کی تمام سرکاری دستاویزات پر سنہ مولودی کے مطابق تاریخیں درج کی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کے حساب سے ساٹھ سال کا ایک جگ بنتا ہے۔ ان ساٹھ سالوں کے ناموں کو بھی ٹیپو سلطان نے ابتث کے اعتبار سے تبدیل کردیا مثلاً چھٹے سال "باج" کا نام "تاب" کردیا۔ ۹ویں سال "جاہ" کا نام بدل کر "تاج" کردیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ٹیپو سلطان جب کارخانوں کے معائنے کے لیے جاتے تو ضرور کوئی اختراع کرتے، شال، مخمل، کمخواب میں نئی اختراعات کی جاتی تھیں۔ ٹیپو سلطان نے ایک ایسی زرہ بکتر تیار کروائی تھی جس پر گولی کا اثر نہ ہو۔ ٹیپو سلطان کی انفرادیت پسندی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ سیاہ روشنائی سے لکھتے تھے اور نہ سرخ روشنائی سے، بلکہ دونوں روشنائیوں کو ملانے سے جو مختلف رنگ کی روشنائی حاصل ہوتی ہے، اسے استعمال کرتے تھے۔

ٹیپو سلطان کو ایک مستحکم نظامِ حکومت اپنے والد سے ملا تھا۔ لیکن انہوں نے اس نظام میں متعدد اصلاحات کرکے اسے اور بھی زیادہ موثر اور مفید بنادیا۔ انہوں نے اس نظام کو تشکیل دیتے ہوئے بعض باتیں مغلوں کے نظام ہائے حکومت سے اخذ کیں۔ جو یورپی کمپنیاں برصغیر میں قائم تھیں ان کی وساطت سے مغربی سیاسی تصورات بھی انہوں نے اخذ کیے۔

Marfat.com

ٹیپو سلطان کی حکومت میں سب سے بڑا انتظامی محکمہ "صدر الصّدور" تھا۔ اس کے ماتحت مختلف محکمے تھے، جو 'کچہریاں' کہلاتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے دور میں سات بڑی کچہریاں تھیں۔ اس کے علاوہ سات بورڈ تھے۔ تاریخ نشانِ حیدری کے مطابق کل محکموں کی تعداد ۹۹ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ بھی ۹۹ ہیں۔ سات بڑی کچہریوں کا مختصر احوال حسب ذیل ہے:

کچہری میر آصف (شعبہ محاصل ومالیات): اس شعبے کے سربراہ کو صاحب دیوان، حضورِ دیوان یا میر آصف کہا جاتا تھا۔ یہی افسر ٹیپو سلطان کی حکومت کا اہم ترین افسر ہوا کرتا تھا۔ اس افسر کے تحت پانچ افسروں کو بھی میر آصف کہا جاتا تھا۔ محکمے کے حسابات تین زبانوں فارسی، کنڑ اور مرہٹی میں رکھے جاتے تھے۔ میر صادق محاصل اور مالیات کے محکمے کے دیوان تھے۔

کچہری میر میران (فوجی شعبہ): اس شعبے کے سربراہ پرنیا تھے۔

کچہری میر میران (زمرہ): یہ شعبہ اس فوج کی دیکھ بھال کرتا تھا جس کے تمام سپاہی میسور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

کچہری میر صدر (ذخائر حربی اور حفاظتی فوج کا شعبہ): یہ شعبہ، اسلحہ اور فوجی سامان کی تیاری اور قلعوں کے انتظام کی نگرانی کرتا تھا۔

کچہری ملک التجار (شعبۂ تجارت): یہ محکمہ تجارت وصنعت کی نگرانی کرتا تھا۔

کچہری میر یم (بحری شعبہ): یہ شعبہ بحری تجارت کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

کچہری میر کاظم (خزانہ اور ٹکسال کا شعبہ): سرنگاپٹم میں پانچ ٹکسالیں قائم تھیں، جن کا انتظام اور نگرانی اس شعبے کے سپرد تھی۔

ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ الگ سے قائم تھا۔ اس کے تحت مختلف شہروں میں بہت سے داروغہ تعینات کیے گئے تھے۔ اس اہم شعبے کی وساطت سے ٹیپو سلطان اپنے تمام امرأ اور افسران کی سرگرمیوں سے بھی باخبر رہتے تھے۔ اس محکمے میں بہت سے خفیہ خبر نویس بھی ملازم تھے جو اہم خبریں پہنچایا کرتے تھے۔

ٹیپو سلطان نے ڈاک پہنچانے والے ہرکاروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ سب سے تیز رفتار قاصدوں کو "بجلی" اور ڈاک تقسیم کرنے والوں کو "انچ" کہا جاتا تھا۔ تقریباً دو صدیاں بیت جانے کے بعد بھی مالابار اور تراونکور کے دیہات میں ڈاکیوں کو "انچل" ہی کہا جاتا ہے اور بہت سے خاندان "بجلی" کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں۔

ٹیپو سلطان نے صنعتوں کو ترقی دینے کی غرض سے فرانس کے ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں جنہیں لوئی شانزدہم (سولہ) نے بھیجا تھا۔ انہوں نے مہم جو فرانسیسیوں اور انگریز قیدیوں سے بھی یہ کام لیا۔ عثمانی سلطان سے بھی ٹیپو سلطان نے رہنمائی کی درخواست کی تھی۔

ٹیپو سلطان نے سرنگاپٹم، چیتل درگ، بنگلور اور بڈنور سمیت مختلف شہروں میں ۳۰ کارخانے قائم کیے تھے، ان کارخانوں میں قینچیاں، چاقو، گھڑیاں، تیر، دستی بندوقیں، بارود، کاغذ اور ظروف تیار کیے جاتے تھے۔ ایک فرانسیسی انجینئر نے بھاپ سے چلنے والا، ایسا انجن تیار کیا تھا جو توپوں میں سوراخ کر سکتا تھا۔ بڈنور کے اسلحہ ساز کارخانے میں سالانہ ۲۰ ہزار دستی بندوقیں تیار ہوتی تھیں۔ ٹیپو سلطان کے قول کے مطابق اس کارخانے نے انہیں اسلحہ کے معاملے میں خود کفیل بنا دیا تھا۔

قلعہ سرنگاپٹم میں کاغذ سازی کا ایک بڑا کارخانہ تھا۔ سرنگاپٹم کے قریب پتھر کی کانوں میں مختلف وضع کے پتھر تراشے جاتے تھے۔ میسور میں اعلیٰ قسم کا بارود تیار ہوتا تھا۔ چناپٹنا میں شیشے کے آلات بنتے تھے۔ شکر سازی کا کارخانہ بھی تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بہترین قسم کی شکر کے بنانے کی ترکیب کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا تھا۔ چکبال پور کی اعلیٰ درجے کی شکر نہایت عمدہ ہوتی تھی۔ اس کی تیاری کا طریقہ ٹیپو سلطان نے خود ایجاد کیا تھا۔ بنگلور میں اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ ساحل مالابار پر صدف گیری کی صنعت قائم کی گئی اس غرض سے مسقط سے غوطہ خور بلوائے گئے جو سمندر سے سیپیاں نکالا کرتے تھے۔

ٹیپو سلطان کے عہد میں چینی کے برتن اور شیشے کے گلاسوں کا کارخانہ بھی تھا۔ لکڑی کے کام کے لیے میسور مشہور تھا۔ چناپٹنا میں بھی لکڑی کی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ ہری ہر میں بہترین سرخ چمڑا تیار کیا جاتا تھا۔ تیل اور تیل کی مصنوعات، رسی اور قالین بھی تیار ہوتے تھے۔ ہاتھی دانت کے کام کا فن مسلمان ہی میسور میں لائے تھے۔ فولاد کے تار اور توپیں اور گولے بنانے کا کام مختلف شہروں میں ہوتا تھا۔ کاغذ پر سونے کا رنگ چڑھانے کی صنعت موجود تھی جو بعد کے ادوار میں ختم ہو گئی۔ یہ کاغذ معمولی کاغذ نہ تھا۔ اکثر عالیشان عمارتوں وغیرہ میں زیبائش کے لیے استعمال ہوتا تھا اور برسوں خراب نہ ہوتا تھا۔ اون کی مصنوعات، کمبل اور شالیں بھی بنتی تھیں۔

Marfat.com

ٹیپو سلطان نے کان کنی کو بھی فروغ دیا۔ ان کے عہد میں سونا اور لوہا نکالنے پر خاص توجہ دی گئی۔ سونا زیادہ تر کولار اور وائیناڈ میں ملتا تھا۔ سونا نکالنے کا ایک تو سادہ طریقہ تھا کہ مٹی لے کر اسے پانی میں چھان لیا جاتا تھا۔ سونا بھاری ہونے کی وجہ سے تہ نشین ہو جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کنویں کے طرز پر کانیں کھودی گئی تھیں۔ ان کا طول و عرض پچیس سے تیس فٹ ہوتا تھا، بعض کانیں ۲۵۰ فٹ تک گہری ہوتی تھیں۔ اس طرح کی کانیں اننت پور میں ناگسمدرم ریلوے اسٹیشن سے ۱۰ میل مغرب میں تھیں جن کا سلسلہ تقریباً ۱۰ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ کرنل سے ۴۰ میل دور تانبے کی کانیں بھی اسی طرز کی تھیں۔ پتھروں سے سونا نکالنے کے لیے کانوں کے نزدیک پتھروں کی بڑی بڑی سلیں اور پتھر کے گولے رکھے جاتے تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پتھروں کو یہاں لا کر پیس لیا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان کا ایک اور کارنامہ سرمایہ کاری کے ایک ادارے کا قیام ہے۔ یہ ایک طرح کا بینک یا فنانس کمپنی تھی جو چھوٹے سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ اس ادارے کے حصص ہر کوئی خرید سکتا تھا۔ جو فرد اس ادارے میں رقم جمع کرواتا اسے سالانہ منافع دیا جاتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کم رقم کی سرمایہ کاری پر منافع کی شرح زیادہ تھی، چنانچہ ۵۰۰ روپے جمع کروانے پر ۵۰ فیصد منافع دیا جاتا تھا جبکہ ۵۰۰۰ روپے جمع کروانے پر منافع کی شرح گھٹ کر ۱۲ فیصد رہ جاتی تھی۔ اس ادارے کے تحت سرکاری دکانیں تھیں جہاں ہر قسم کا مال دستیاب تھا جس کی فروخت سے حاصل ہونے والا منافع ادارے کے ذریعے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان کو تجارت سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ مملکت کو طاقتور بنانے کے لیے اسے اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہونا چاہیے۔ ٹیپو سلطان ذاتی طور پر بہت سے تجارتی امور کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور بروقت ہدایات جاری کرتے تھے۔ دیگر ملکوں میں اپنے نمائندوں یا شراکت داروں سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ ٹیپو سلطان نے ملکی تجارت کو فروغ دینے کی غرض سے فرانس اور ترکی کے لیے بھی اپنے سفیر روانہ کیے تھے۔ بحری قزاقوں کے خوف سے چینی تاجر اپنا سامان مالابار کے ساحل تک لاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ٹیپو سلطان نے حکم دیا کہ میسور کے جنگی جہاز چین کے جہازوں کو اپنی حفاظت میں لائیں۔ ٹیپو سلطان نے آرمینیا کے تاجروں کو میسور میں آبادکاری کی سہولتیں دیں اور انہیں تجارتی مراعات دیں کیونکہ آرمینیا کے تاجر تجارت کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

ٹیپو سلطان نے سرکاری اور نجی، دونوں سطحوں پر تجارت کو رواج دیا۔ خام سونا، تمباکو، صندل کی لکڑی، قیمتی دھاتوں، ناریل اور سیاہ مرچ کی تجارت حکومت کے زیر انتظام تھی۔

تجارت کو ترقی دینے کے لیے ٹیپو سلطان نے ایک خاص کتاب لکھی تھی۔ آٹھ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں تجارت کے اصول، قواعد و ضوابط درج تھے۔ تجارت کی ترقی اور نگرانی کے لیے محکمۂ تجارت قائم تھا، اس میں ۹ بڑے عہدے دار مقرر کیے گئے جو ملک التجار کہلاتے تھے۔

ٹیپو سلطان نے اپنی سلطنت کو اقتصادی لحاظ سے بے حد مستحکم بنانے کی غرض سے متعدد تجارتی اصلاحات کیں اور صنعتی و تجارتی لحاظ سے سلطنت کو خوب ترقی دی، وہ یورپی ممالک کی تجارتی پیش رفت سے متاثر تھے۔ انہوں نے ۱۷۸۹ء میں دو بڑے تجارتی ادارے کچھ کے علاقوں مُنڈھی اور مُندرا میں قائم کیے۔ ان میں ۷ داروغہ اور ۱۵۰ سپاہی تھے۔ یہ ادارے میسور اور کچھ کے مابین وسیع پیمانے پر کاروبار کرتے تھے۔ ٹیپو سلطان نے موتیوں کی خریداری کا ایک ادارہ ارموز میں قائم کیا تھا۔ ایک تجارتی ادارہ جدہ میں بھی تھا۔ انہوں نے عدن، بوشہر اور بصرہ میں بھی اس طرز کے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ۱۷۸۵ء میں مسقط میں ایک تجارتی ادارہ قائم ہو گیا تھا جس کے توسط سے میسور کی مصنوعات خلیج فارس کے ملکوں تک لے جائی جاتی تھیں۔ یہ ادارے ''کوٹھیاں'' کہلاتے تھے۔ اس طرح کی ۳۰ تجارتی کوٹھیاں میسور میں تھیں اور ۱۷ تجارتی کوٹھیاں ہندوستان کے دیگر حصوں میں اور بیرونِ ملک واقع تھیں۔

مملکتِ میسور کی برآمدات میں عمارتی لکڑی، صندل کی لکڑی، ریشم، الائچی، سیاہ مرچ، چاول، ہاتھی دانت اور کپڑا شامل تھا۔ درآمدی اشیا میں زعفران کے بیج، ریشم کے کیڑے، گھوڑے، پستہ، کشمش، پہاڑی نمک، موتی، گندھک، تانبہ، کھجور اور چینی کے برتن شامل تھے۔ ریشم کے کیڑے، سلطنت میں ریشم کی صنعت کے لیے، گھوڑے فوج کے لیے اور بارود کی تیاری کے لیے گندھک کی ضرورت پڑتی تھی۔ مالاباری سال کی لکڑی خلیج فارس میں کشتیاں بنانے کے کام آتی تھی اور کالی کٹ سے برآمد کی جاتی تھی۔ ٹیپو سلطان اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ

Marfat.com

سلطنت میسور میں مقامی طور پر بنی ہوئی اشیا ہی استعمال کی جائیں۔

ٹیپو سلطان نے شہروں کے قدیم ناموں کو تبدیل کر کے ان کے اسلامی طرز کے نام رکھ دیے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

قدیم نام	نیا نام
ڈنڈیگل	خالق آباد
کشنگری	فلک الاعظم
پاؤگڑھ	ختمی
سنگل درگ	مظفر آباد
نپوکنڈہ	فخر آباد
قلعہ بُل	منظر آباد
ملولی	گلشن آباد
دیون ہلّی	یوسف آباد
ہوس کوٹہ	اسلام پور
سرنگاپٹم	ظفر آباد
بلاری	ثمر پٹن
کوئمبو تور	سلام آباد
قلعہ گتی	فیض حصار
نندی گڑھ	گردون شکوہ
میسور	نظر آباد
سرا	رستم آباد
کلیکوٹ	اسلام آباد
بنگلور	دارالسرور
ماگڑی	ساون گڑھ
قلعہ چتل درگ	زحباب حصار

مسقط، ہندوستان، بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ملکوں کے مابین تجارت کی بہت بڑی منڈی بن گیا تھا۔ اس اہمیت کے باعث ٹیپو سلطان نے اپنے والد حیدر علی کی طرح مسقط میں اپنے وکیل مقرر کیے جو ان کے مفادات کی نگرانی کے علاوہ امام مسقط سے دوستانہ روابط رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے امام مسقط سے اچھے تعلقات تھے یہی وجہ ہے کہ مسقط میں ہندوستانیوں کو تو ۸ فیصد چنگی دینا پڑتی تھی لیکن میسوریوں سے صرف ۴ فیصد چنگی لی جاتی تھی۔

ٹیپو سلطان کا عہد تعمیرات کے لحاظ سے بھی یادگار ہے، حیدر علی نے لال باغ اور قلعہ سرنگاپٹم کے درمیان دریائے کاویری کے جنوبی کنارے پر ایک محل تعمیر کروایا تھا، جو "دریا دولت" کہلاتا تھا۔ ٹیپو سلطان نے اس محل میں مزید اضافے کیے اور یہ ایک بہترین تفریح گاہ بن گیا۔ اس دلکش عمارت کی نمایاں خصوصیت اس کی نقشین دیواریں ہیں۔ اس کی آرائش و زیبائش اصفہان کے محلوں کی یاد دلاتی ہے۔ اندرونی دیواروں پر طغروں اور نقش و نگار کا اہتمام فراخ دلی سے کیا گیا تھا۔ بیرونی دیواروں پر ایسی تصاویر بنائی گئی تھیں جن میں انگریزوں کے خلاف ٹیپو کی فتوحات کی عکاسی کی گئی تھی۔ قلعہ سرنگاپٹم کو حیدر علی نے تعمیر کروایا تھا لیکن بعد میں اسے دوبارہ منہدم کر کے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ اس میں بھی ٹیپو سلطان نے ایک محل تعمیر کروایا تھا، جس کا اب نشان نہیں ملتا۔ یہ محل باہر سے معمولی قسم کی عمارت محسوس ہوتا تھا لیکن اندرونی حصہ نہایت شاندار تھا۔

مشرقی دروازے (بنگلور دروازے) سے متصل ایک نفیس قسم کی مسجد ٹیپو سلطان نے ۱۲۰۱ھ /۱۷۸۷ء میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجدِ اعلیٰ کہلاتی تھی۔ مرکزی دروازے کی دونوں جانب پختہ سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ میناروں میں بھی اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ٹیپو سلطان نے اپنے والد حیدر علی کا مقبرہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ وہ خود بھی اسی مقبرے میں مدفون ہیں۔ مربع طرز کی اس عمارت پر ایک گنبد ہے جو سیاہ سنگِ مرمر کے روغنی ستونوں پر قائم ہے۔

سرنگاپٹم میں ایک اور مسجد بھی تعمیر ہوئی جو مسجدِ اقصیٰ یا مسجدِ احمدی کہلاتی تھی۔ لال باغ میں ایک رنگین محل، چتلدرگ میں ایک محل اور ایک مسجد، نگر میں محل اور مسجد، ہوسکوٹہ میں عید گاہ، کولار میں حیدر علی کی والدہ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ بنگلور میں ایک ایسی مسجد تعمیر کروائی جو فنِ تعمیر کے لحاظ سے ہندوستان کی پہلی مسجد تھی یعنی مراکشی فنِ تعمیر کا نمونہ تھی۔ اس مسجد کو بعد میں شہید کر دیا گیا۔ یہ مسجد موجودہ گوپی پورم کی پہاڑی پر تھی۔

ٹیپو سلطان نے متعدد قلعے بھی تعمیر کروائے تھے۔ مثلاً علاقہ حیدرآباد دکن کپل میں پہاڑی پر ایک قلعہ تھا جس کے تین دروازوں میں سے ایک ٹیپو سلطان کے نام پر سلطانی دروازہ کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ بنگلور، ساوندرگ، ماگڑی، چتلدرگ، ہوسکوٹہ، نگر میں بھی قلعے موجود تھے۔

Marfat.com

سرنگاپٹم، میسور کے جنوب میں دریائے کاویری کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس تک پہنچنے کے لیے دریا پر دو پل تھے۔ شمال مغربی سمت میں ٹیپو سلطان نے ایک اور پل کی بنیاد رکھی۔ شہر میں آب رسانی کے لیے دریائے کاویری سے نہر کاٹ کر لائی گئی تھی جس سے کئی چھوٹی نہریں نکالی گئی تھیں۔ قلعہ کے اندر بھی پانی زمین دوز نہروں کے ذریعے لایا گیا تھا۔

ٹیپو سلطان وہ پہلے حکمراں تھے جنہوں نے مالابار میں سڑکیں تعمیر کروائیں، اس سے قبل آمدورفت اور باربرداری کے لیے صرف کشتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ ٹیپو ہی نے اس علاقے میں پہیہ دار گاڑیاں متعارف کروائیں۔ ٹیپو نے مالابار میں سڑکوں کا جال سا بچھا دیا اور سڑکوں کا سلسلہ جنگل کے قریب کے علاقوں تک پہنچ گیا۔ سلطنت کے دیگر حصوں میں بھی ٹیپو نے سڑکیں تعمیر کروائیں۔ سب سے مشہور شاہراہ جو ٹیپو ہی کے نام سے موسوم ہے، کاویری کے ناہموار مشرقی کناروں سے ہوتی ہوئی میسور اور دھرم پوری تعلقوں کے مغربی حصے تک جاتی ہے۔ دھرم پوری تعلقے کے مختلف مقامات کو مربوط کرنے والی ایک سڑک بھی ٹیپو سلطان نے بنوائی تھی۔ ٹیپو کی تعمیر کردہ ایک اور اہم سڑک کرشناگری کو یودی کوٹا سے ملاتی تھی۔ ٹیپو سلطان نے مسافروں کی آسانی کے لیے مالابار میں پہلی بار سرائیں بھی تعمیر کروائیں۔

ٹیپو کو نہروں کے شعبے سے خاص دلچسپی تھی۔ سرنگاپٹم سے چند میل دور بند کی تعمیر کا ذکر کیا جا چکا ہے جس کے پشتے کی بلندی ۷۰ فٹ تھی۔ داروجی کے مقام پر بھی سلطان نے ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کروایا تھا جس کے عظیم الشان پشتے کا طول تقریباً ڈھائی میل اور بلندی بعض مقامات پر ۴۵ فٹ تھی۔ ٹیپو نے ایک اور بڑے آبی ذخیرے "موتی تالاب" کی مرمت کروا کے اس کی شکل ہی بدل دی۔ تالابوں اور نہروں کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے اہلکار موجود تھے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے تقریباً ۱۱۰ برس بعد میسور میں دریائے کاویری پر جو بند تعمیر کیا گیا اس کے لیے ابتدائی کام ٹیپو سلطان ہی کے دور میں شروع کیا گیا تھا۔ دریائے کاویری کے دامن میں قابلِ کاشت علاقے کا رقبہ ۱۱،۵۰۰ مربع میل تھا۔ دریا سے نالے نکال کر جتنی زمین کاشت کی جاتی تھی، اس کا رقبہ ۱۸۰ مربع میل تھا۔ چنانچہ کرشناراجہ وڈیار بہادر کے زمانے میں ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں اس بند کی تعمیر شروع ہوئی جسے "کرشناراج ساگرا" کا نام دیا گیا تھا۔ یہ بند، سرنگاپٹم سے ۹ میل مغرب میں ہے۔ اس کا رقبہ ۵۰ مربع میل ہے۔

جب بند کی تعمیر کے لیے کھدائی کا کام ہو رہا تھا تو اس علاقے سے ایک قدیم کتبہ ملا جو فارسی زبان میں تھا۔ اس پر جو تحریر پائی گئی اس نے حیرتوں کے در، وا کر دیے۔ تحریر کے مطابق دریائے کاویری پر بند کے پشتے "محی" کا سنگِ بنیاد ٹیپو سلطان نے رکھا۔ اس پشتے پر لاکھوں روپے صرف کیے گئے۔ تحریر میں وضاحت ہے کہ یہ رقم صرف اللہ کی راہ میں صرف کی گئی ہے۔ تحریر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو کوئی اس تالاب سے آبپاشی کرے گا وہ اپنی پیداوار یا رقم پر خصوصی محصول کا صرف تین چوتھائی حصہ حکومت کے خزانے میں جمع کروائے گا بقیہ ایک چوتھائی حصہ راہِ خدا میں معاف کر دیا گیا ہے۔ تحریر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کوئی اس تالاب سے نئی زمین میں کھیتی باڑی کرے گا تو وہ زمین اس کے اور اس کے وارثوں کے قبضے میں نسل در نسل رہے گی۔

راجا وڈیار بہادر کی حکومت نے اس کتبے کو بند کے داخلے کی جگہ پر نمایاں انداز سے آویزاں کروا دیا۔

ٹیپو سلطان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی سلطنت میں زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس طرح معمولی کسانوں کو زمینداروں کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی تھی۔ دُور افتادہ زمینیں نرم شرائط پر کسانوں کو دے دی جاتی تھیں۔ آبیاری کے لیے جگہ جگہ تالاب بنوائے، غریب کاشتکاروں کو تقاوی پر رقم دی جاتی تھی۔

ٹیپو سلطان زراعت اور باغبانی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے "لال باغ" کے نام سے کئی باغات لگوائے۔ سرنگاپٹم کا لال باغ ختم ہو چکا ہے۔ میسور میں جائفل کا درخت نہیں تھا، سلطان نے ٹراونکور سے جائفل کے پودے بڑی احتیاط سے منگوائے اور لال باغ میں لگوائے۔ حیدر نگر میں ریشم کی پیداوار کے لیے حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے بڑی محنت کی۔ چناپٹنا اور مدور سے ریشم کے کیڑے اور شہتوت کے پودے منگوا کر ان کی افزائش کی کوشش کی گئی تاہم کامیابی نہ ہوئی۔ بارہ محل میں جا بجا شہتوت کے درخت لگوائے تھے۔

ٹیپو سلطان کو گنے، گندم، جو اور پان کی کاشت سے خاص دلچسپی تھی۔ درختوں میں چیڑ، سال، ساگوان، سپاری، صندل اور ناریل کے درخت لگانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ٹیپو سلطان نے راس امید سے اناس اور شاہ بلوط کے درخت منگوائے تھے۔ روئی کی کاشت بھی کروائی۔ پھلوں میں آم، سنترے، سیب اور امرود پر خاص توجہ دی۔

Marfat.com

ٹیپو سلطان نے بھنگ کی کاشت پوری سلطنت میں ممنوع قرار دے دی تھی۔ مزید یہ کہ پوری سلطنت میں منشیات کے استعمال پر بھی پابندی لگادی تھی۔ اس غرض سے ٹیپو سلطان نے پہلے تو منشیات کی تجارت کو حکومت سے لائسنس لینے سے مشروط کر دیا پھر چند ہی سال بعد منشیات کا استعمال مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا۔ اس سلسلے میں سن اور خشخاش کی کاشت بھی بند کر دی گئی۔ لوگوں کو اپنے خاص باغوں تک میں نشہ آور اجزاء فراہم کرنے والے درخت لگانے کی اجازت نہ تھی۔ صندلے کے درخت سے تاڑی تیار ہوتی تھی، ایسے درخت لگانے پر بھی پابندی لگادی گئی۔ اس طرح حکومت کی آمدنی میں جو کمی واقع ہوئی اس کو سلطان نے دوسرے طریقوں سے پورا کیا۔

ٹیپو سلطان نے غریب کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے اہم اقدامات کیے۔ بنجر اراضی پر لگان پہلے سال معاف ہوتا دوسرے سال تمام شرح کا ایک چوتھائی وصول کیا جاتا۔ پہاڑی یا پتھریلی یا تھور زدہ اراضی پر بھی پہلے سال لگان معاف تھا۔ دوسرے سال ایک چوتھائی اور تیسرے سال نصف لگان وصول کیا جاتا تھا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنے زیرِ کاشت رقبے میں اضافے کے لیے یہی طریقہ کار اختیار کیا تھا۔

چھالیا کی شجر کاری کرنے والے پہلے پانچ سال کے لیے محصول سے مستثنیٰ تھے۔ ناریل اور پان کی کاشت پر پہلے تین برسوں تک مروّجہ محصول کا صرف نصف حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ کاجو، الائچی، دار چینی اور سبزیاں محصول سے مستثنیٰ تھیں۔ لگان بھی سال بھر میں تین اقساط میں وصول کیا جاتا تھا۔ فصل کی خرابی یا کسی اور وجہ کی بنا پر لگان بھی معاف کر دیا جاتا تھا۔

ہر ضلع کا عامل وہاں کا افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا۔ اس کے فرائض میں داخل تھا کہ سال کے اختتام پر ضلع کا دورہ کرے۔ چنانچہ ہر سال تمام عاملین اپنے اپنے ضلع کا دورہ کرتے۔ زیرِ کاشت رقبے کی جانچ پڑتال کرتے، رپورٹ تیار کرتے جس میں مواضع کی تعداد، زیرِ کاشت زمین کا رقبہ، کسانوں اور ان کے اہلِ خانہ کی تعداد، ان کی ذات اور پیشے درج ہوتے۔ جو کاشتکار غربت کی وجہ سے ہل نہ خرید سکتے انہیں تقاوی (حکومت کی طرف سے کاشت کاروں کو زراعت کے لیے دی جانے والی امدادی رقم) دی جاتی۔ کسانوں سے بلا معاوضہ ادا کیے کھیتوں میں کام لینے کی ممانعت تھی۔ اگر کوئی پٹیل ایسا کرتا تو اس کی پوری فصل ضبط کر لی جاتی۔

ٹیپو کے دورِ حکومت سے قبل مالیانہ وصول کرنے کے لیے ساہوکار مقرر تھے۔ یہ لوگ اپنا حصہ بھی وصول کرتے تھے اور کسانوں پر ظلم کرتے تھے۔ ٹیپو نے ساہوکاروں سے یہ کام واپس لے لیا اور اپنے افسر مقرر کیے۔ ۱۲۰۲ھ /۸۸-۱۷۸۷ء میں ٹیپو سلطان نے محاصل کی از سر نو جانچ پڑتال کروائی اور اس کے نتیجے میں ناجائز انعامی اراضیوں کو ضبط کر لیا، البتہ جائز ساہوکار اور سند یافتہ اراضیوں کو نہیں چھیڑا گیا۔

سرکاری افسروں کو تنخواہ کے عوض جاگیریں دینے کے نظام کو ٹیپو سلطان نے ختم کر دیا تھا اور افسروں کو تنخواہ نقد رقوم کی شکل دی جانے لگی تھی۔ عوام کی خوشحالی میں اضافے کی غرض سے ٹیپو سلطان نے ضلعی افسران کو ہدایت کی تھی کہ لوگ شادی بیاہ اور تہواروں پر فضول خرچی کرتے ہیں چنانچہ کوئی گاؤں اپنی دولت کا ایک فیصد سے زیادہ حصہ تہواروں پر خرچ نہیں کر سکتا۔

ٹیپو سلطان کے زمانے میں ہندو عورتوں کو سر بازار علانیہ فروخت کیا جاتا تھا۔ بڑے شہروں میں ان عورتوں کی خرید و فروخت کی خاص منڈیاں تھیں۔ ان منڈیوں سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی وہ راجا کو ملتی تھی اور "سمایاچار" کہلاتی تھی۔ ٹیپو سلطان نے عورتوں کی خرید و فروخت کو یکسر ممنوع قرار دے دیا۔ اس طرح یہ گھناؤنا کاروبار ختم ہو گیا۔ کورگ اور ملیبار میں خواتین لباس کے طور پر صرف ایک تہمد استعمال کرتی تھیں۔ ٹیپو نے اس قسم کے لباس کی ممانعت کر دی اور اعلان کر دیا کہ اگر مکمل لباس کے بغیر کوئی عورت گھر سے باہر نظر آئی تو اسے سزا دی جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد ان علاقوں میں خواتین کا لباس بہت بہتر اور ساترانہ ہو گیا۔ میسور کے قریب چامنڈی کے پہاڑ پر کالی دیوی کا ایک مندر تھا جہاں عرصۂ دراز سے انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ ٹیپو نے اس رسم کو سختی سے روک دیا۔

ٹیپو ایک غیر متعصب حکمراں تھے۔ انہوں نے غیر مسلموں کی املاک کا تحفظ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ جس جگہ ٹیپو سلطان نے پرورش پائی تھی اس جگہ مسجدِ اعلیٰ تعمیر کی گئی، لیکن اس جگہ پہلے ایک چھوٹا سا مندر اور مسافر خانہ تھا۔ سلطان نے پجاریوں اور ہندوؤں کے رہنماؤں کو بلا کر انہیں پیش کش کی کہ اگر یہ جگہ مسجد کے لیے دے دی جائے تو اس کے عوض وہ ایک عالی شان مندر تعمیر کروا دیں گے۔ ہندوؤں نے یہ پیشکش قبول کر لی چنانچہ سلطان نے مسجد سے صرف

Marfat.com

ایک فرلانگ دور ایک بڑا مندر تعمیر کروا دیا۔

مالا بار میں گورداپور کا مندر بہت پرانا اور مشہور ہے۔ جب ٹیپو سلطان ایک جنگ میں مالا بار کو فتح کرتے ہوئے اس مندر کے قریب پہنچے تو انہوں نے اپنی فوج کو گورداپور فتح کرنے کے لیے بھیج دیا۔ ان کے چند سپاہیوں نے مندر کو آگ لگانا چاہی، ابھی عمارت کو آگ لگائی ہی گئی تھی کہ دیگر سپاہیوں کو سلطان کے احکام کا خیال آ گیا۔ انہوں نے آگ بجھا دی۔ ٹیپو سلطان کو جیسے ہی اطلاع ملی کہ چند مسلمان سپاہیوں نے مندر کو آگ لگائی ہے وہ فوراً گورداپور پہنچے تحقیقات کی اور جو سپاہی قصوروار پائے گئے انہیں سخت سزا دی۔ اس کے بعد انہوں نے مندر کی عمارت کی مرمت کروائی اور حکم دیا کہ اس شہر سے جو آمدنی ہو وہ سرکاری خزانے میں داخل کرنے کے بجائے مندر کو دے دی جائے۔ مرہٹوں سے ایک جنگ میں مرہٹہ سرداروں کی عورتیں گرفتار ہو کر آئیں۔ سلطان نے ان عورتوں کو عزت کے ساتھ پالکی میں بٹھا کر تحائف کے ساتھ پونا روانہ کر دیا۔

ٹیپو سلطان نہایت علم دوست انسان تھے۔ جنگوں اور مہمات میں اپنی بے تحاشا مصروفیت کے باوجود انہوں نے سرنگاپٹم میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) قائم کی تھی جس کا نام "جمیع الامور" رکھا گیا تھا۔ اس جامعہ میں دینی اور دیگر علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ٹیپو سلطان کا خاص کتب خانہ قائم تھا جس میں نادر اور بیش قیمت کتابیں موجود تھیں۔ کتابوں کی بہت نفیس جلد بندی کروائی گئی تھی۔

کتب خانے کی ترتیب و انتظام کے لیے مہتمم مقرر تھا۔ ٹیپو سلطان کی ہدایت اور خواہش پر بھی بہت سی کتب لکھی گئیں۔ یہ کتب زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق ہیں۔ سلطان نے اپنے فرامین کے کئی مجموعے تیار کروائے تھے جو آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ سلطان جس کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اس پر اپنی مہر لگا دیتے تھے۔ ان مہروں کی تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا۔ کتب خانے میں ہندی یا دکنی زبان کی ۷ کتب بھی شامل تھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں ہندی یا دکنی زبان رائج ہو چکی تھی۔

ٹیپو سلطان کے اس کتب خانے میں کتابوں کی فہرست بہت عمدگی، مہارت اور تفصیل سے تیار کی گئی تھی۔ اس فہرست (کیٹلاگ) میں کتاب اور مصنف کا نام، سنہ تصنیف، رسم الخط اور کتب کے مندرجات کا مختصر خلاصہ درج کیا گیا تھا۔ ٹیپو سلطان نے خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ان کے کتب خانوں میں سے تقریباً ۴۵ کتابوں کے مسودے برآمد ہوئے۔ ان میں علم خطاطی پر کتاب "رسالہ در خط طرز محمدی"، علم نجوم پر کتاب "زبرجد" شامل ہیں۔ ٹیپو سلطان نے علم موسیقی کی بھی ایک کتاب حسن علی عزت سے "مفتاح القلوب" کے نام سے لکھوائی تھی۔

ٹیپو سلطان کی تحریر، دیگر تحریروں سے بالکل ممتاز ہوتی تھی۔ اس بات کا اعتراف انگریز مؤرخین نے بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹیپو سلطان مختصر اور پُر معنی جملے لکھتے تھے۔ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معانی نکلتے تھے۔ الفاظ میں تحکم پایا جاتا تھا۔ ٹیپو سلطان نظم و نثر دونوں اصناف پر قادر تھے۔ انہوں نے فنونِ حرب پر ایک کتاب "فتح المجاہدین" تحریر کی۔ فتح المجاہدین، وقائع منازل، احکام نامہ، سلطان کی خاص نگرانی میں لکھی گئیں۔ ان کتب میں بہت سے مضامین اور اشعار سلطان کی تصنیف ہیں۔

ٹیپو سلطان کی شہادت اور سرنگاپٹم کے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد یہاں بڑے پیمانے پر لوٹ مار ہوئی۔ اس کے باوجود مندرجہ ذیل کتب ٹیپو سلطان کے خاص کتب خانے میں موجود تھیں۔

قرآن کریم:	۴۴ نسخے	فقہ:	۹۵ نسخے
کتب احادیث:	۴۲ نسخے	تصوف:	۱۱۵ نسخے
کتب وظائف:	۳۵ نسخے	علم اخلاق:	۲۴ نسخے
الٰہیات:	۴۶ نسخے	فلسفہ:	۵۴ نسخے
علوم و فنون:	۱۹ نسخے	ریاضی:	۷ نسخے
تاریخ:	۱۱۸ نسخے	تحقیق زبان:	۴۵ نسخے
حکمت (طب):	۶۲ نسخے	منظومات:	۱۹ نسخے
فرہنگ و لغات:	۲۹ نسخے	ہندی و دکنی انشا:	۴ نسخے
ہندی نظم:	۲۳ نسخے	قصص و حکایات:	۱۸ نسخے
ترکی نثر:	۲ نسخے	انشا:	۵۳ نسخے
تفاسیر:	۴۱ نسخے	علم نجوم:	۲۰ نسخے

سوائے چند کتب کے تمام کتابیں انگریزوں نے انگلستان بھیج دیں۔ کچھ کتابیں کلکتہ بھی بھیجی گئیں۔

ٹیپو سلطان کا فوجی نظام نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار تھا۔ حیدر

Marfat.com

علی کی فوج میں سواروں کی تعداد پیادوں (پیدل سپاہیوں) سے زیادہ تھی۔ لیکن ٹیپو سلطان نے ۱۷۹۰ء میں سواروں کی تعداد ۳۴ ہزار سے کم کر کے ۲۰ ہزار کر دی اور پیادوں کی تعداد کو ۱۵ ہزار سے بڑھا کر ۵۰ ہزار کر دیا۔ بعض تجزیہ نگار، ان کے اس فیصلے کو ان کی شکست کے اسباب میں سے ایک قرار دیتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کی کل فوج تین لاکھ ۲۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جو مختلف قلعوں اور سرحدی چوکیوں پر تعینات تھی۔ تاہم فوج کے سپاہیوں کی تعداد متعین نہ تھی بلکہ ضرورت اور حالات کے مطابق اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ فوج میں ۹۰۰ ہاتھی، ۶۰۰ اونٹ، باربرداری کے ۴ لاکھ بیل شامل تھے۔ ۹۰۰ سے زائد توپیں، دو لاکھ ۲۲ ہزار تلواریں، تین لاکھ توڑے دار بندوقیں، تین لاکھ چقماق بندوقیں، اسلحہ خانہ میں موجود رہتی تھیں۔

فوج کو نہایت منظم انداز سے ترتیب دیا گیا تھا۔ عسکر (سواروں) کو چار کچہریوں (بریگیڈ) میں اور ہر کچہری کو پانچ موکموں (رجمنٹس) میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کچہری کے سالار کو بخشی اور موکم کے سربراہ کو موکمدار کہا جاتا تھا۔ ہر موکم کو چار رسالوں (اسکویڈرن) میں تقسیم کیا گیا۔ ہر رسالے کا افسر رسالدار کہلاتا تھا۔ ہر رسالہ یازوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر یاز کا سربراہ یزکدار (کیپٹن) کہلاتا تھا۔ اس کے تحت سرخیل (لیفٹیننٹ) حوالدار اور سپاہی ہوتے تھے۔ پیدل سپاہی "جیش" کہلاتے تھے۔ جیش کو چار کچہریوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر کچہری میں چار قشون (رجمنٹس) ہوتی تھیں۔ ہر قشون میں چار جوق (کمپنیاں) ہوتی تھیں۔ جوق کا سربراہ جوق دار کہلاتا تھا۔

ٹیپو اپنی فوج میں سپاہی، پڑوسی ریاستوں سے بھی بھرتی کرتے تھے۔ میسور سے بھرتی کیے جانے والے سپاہیوں کو زمرہ کہا جاتا تھا۔ ان کی پگڑی سبز ہوتی تھی جس پر سرخی مائل پٹی ہوتی۔ سلطنت میسور سے باہر سے بھرتی ہونے والے سپاہی غیر زمرہ کہلاتے تھے ان کی پگڑیوں کا رنگ صرف سبز ہوتا تھا۔

ٹیپو سلطان کی پیدل فوج کے سپاہی دستی بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح ہوتے تھے جو خود سلطنتِ میسور میں بنائی جاتی تھیں۔ ٹیپو سلطان اپنی سلطنت میں بنے ہوئے اسلحہ کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی فوج جو ہلکی توپیں استعمال کرتی تھی وہ بھی میسور میں ڈھالی جاتی تھیں اور لمبی نال کی وجہ سے انگریزوں کی توپوں کے مقابلے میں زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ ٹیپو سلطان فوجی افسروں کو زیادہ مدت تک ایک ہی دستے میں نہیں رہنے دیتے تھے۔

ٹیپو سلطان نے اپنی فوج کی ضروریات کے پیش نظر پہلی بار میسور میں گھوڑوں کی افزائش نسل کا خاص اہتمام کیا۔ ایک محکمہ 'امرت محل' قائم کیا گیا جس کے تحت نہایت محنتی اور جفاکش قسم کے بیلوں کی نسل پیدا کی گئی جسے "ہلی کار" کہا جاتا ہے۔ یہ بیل، فوج کا بھاری سازوسامان لے کر بڑی پھرتی اور سبک رفتاری سے چلتے تھے۔ سلطنت میسور میں خچروں اور ہاتھیوں کی افزائش نسل اور پرورش کے انتظامات بھی کیے گئے۔

ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی نے بحری فوج تیار کرنے کی دو بار کوشش کی تھی۔ ایک بار تو ان کے بحری کمانڈر اسٹین نٹ، انگریزوں سے جا ملے اور دوسری بار جب انہوں نے یورپی ماہرین کی مدد سے بحری بیڑا تیار کیا تو فرانسیسی ایڈمرل نے اسے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

ٹیپو سلطان نے ابتدا میں اپنی بحریہ کو مضبوط بنانے پر توجہ نہ دی، اس وجہ سے انہیں تیسری اینگلو میسور جنگ میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اپنی حکومت کے آخری چند برسوں میں ٹیپو سلطان نے بحریہ پر بھرپور توجہ دی۔ ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں ایک مجلس بحریہ بنائی جس کے تحت ۳۰ میر بحر اور دیگر افسران کام کرتے تھے۔ بحریہ میں ۲۲ بڑے جنگی جہاز اور ۲۰ چھوٹے جنگی جہاز تھے۔ بڑے جہاز دو قسم کے تھے ان پر ۷۲ اور ۶۲ توپیں نصب تھیں۔ چھوٹے جہازوں پر ۴۶ توپیں نصب ہوتی تھیں۔

جہازوں کی تعمیر کے لیے منگلور، میر جان کے نزدیک واجد آباد میں اور مولد آباد میں تین گودیاں تعمیر کی گئی تھیں۔ مالابار کے جنگلوں سے ساگوان کی لکڑی کاٹ کر کالی کٹ سے ان گودیوں تک بھیجی جاتی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ جہازوں کے نقشے خود ٹیپو سلطان تیار کر کے بھیجا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ جہازوں کے پیندے لوہے کی بجائے تانبے سے بنائے جائیں، تاکہ یہ جہاز ساحلی پہاڑیوں میں موجود قدرتی مقناطیس سے محفوظ رہ سکیں۔

ٹیپو سلطان نے ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۳ء میں بھٹکل میں "بحری مدرسہ" (نیول اکیڈمی) قائم کیا جہاں انگریزی طرزِ جہاز رانی کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ بحری فوجی تعلیم کے لیے ایک کتاب "فتح المجاہدین" لکھی گئی۔ جس میں جہازوں کی ایک کیل سے لے کر پورے جہاز کی ضروریات، جہاز کی تعمیر، بحری جنگ کے قواعد، جہاز چلانے کے طریقے، سپاہیوں کی خوراک، بندرگاہ کی تعمیر وغیرہ کے بارے میں تفصیلی

Marfat.com

ہدایات درج تھیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مختلف امراض اور زخموں کے فوری علاج کی تدابیر بھی بیان کی گئی ہیں اور ایک باب میں خاص طور پر تمباکو نوشی کے مضر اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے سپاہیوں کو تمباکو نوشی سے منع کیا گیا ہے۔ اسی برس سلطان نے ۱۰۰ جنگی جہازوں کی تیاری کا حکم دیا۔ سلطان معیار کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ۱۷۹۴ء میں سلطان نے ۲۰ جنگی جہازوں کو ناقابلِ استعمال ٹھہرا کر ڈبو دینے کا حکم دیا۔ بحریہ میں دس ہزار سے زائد ملاح شامل تھے۔

ٹیپو سلطان نہایت شجیع اور جرأت مند رہنما تھے۔ ان کی شجاعت و بسالت کے کارنامے تو ان کے بچپن ہی سے مشہور ہیں۔ شہسواری میں طاق تھے۔ گھوڑے بہت پسند کرتے تھے۔ پالکی اور اس قسم کی سواریاں سخت ناپسند تھیں۔ شیر کا شکار ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی نوجوانی کے دور کا ایک واقعہ تاریخ کی کتب میں مذکور ہے کہ ایک بار وہ ایک فرانسیسی افسر کے ساتھ شیر کے شکار کے لیے جنگل میں گئے۔ جب شیر نمودار ہوا تو فرانسیسی افسر نے بندوق تان لی۔ ٹیپو سلطان نے افسر سے بندوق چھین لی اور اپنی دو دھاری تلوار سونت کر شیر پر پل پڑے۔ ان کا حملہ اتنا برق رفتار تھا کہ شیر کو مدافعت کا موقع نہ مل سکا اور آن کی آن میں شیر کے چاروں پاؤں اس کے جسم سے کٹ کر الگ ہو چکے تھے۔

ٹیپو سلطان شیر کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہیں شیر کا رنگ اتنا مرغوب تھا کہ ان کے محل، ان کی تعمیر کردہ مسجد اور گنبد، سب کا رنگ شیر کے رنگ سے ملتا جلتا رکھا گیا تھا۔ انہوں نے ایک خاص کپڑا رائج کیا تھا جو "ببری کپڑا" کہلاتا تھا۔ اس کپڑے کا رنگ شیر کے رنگ جیسا تھا اور اس پر دھاریاں ہوتی تھیں۔ سلطان نے کئی شیر پال رکھے تھے۔

ایک بار حیدرآباد دکن سے چند ماہر مصور سرنگاپٹم آئے اور ٹیپو سلطان کی تصویر بنانے کی اجازت چاہی۔ ٹیپو سلطان مصوروں کو دریا دولت باغ لے گئے، وہاں چند شیر طلب کیے اور ان سے زور آزمائی کرنے لگے۔ مصور حیران تھے کہ سلطان جب سکون سے کسی جگہ بیٹھتے نہیں ہیں تو ان کی تصویر کس طرح بنائیں۔ یہ سلسلہ تین دن تک چلتا رہا۔ مقررہ وقت پر سلطان شیروں سے زور آزمائی کرتے اور مصوروں کو تصویر بنانے کے لیے بٹھا دیا جاتا۔ مصوروں نے ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی سے واقعہ عرض کیا۔ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو طلب کیا تو ٹیپو سلطان نے مصوروں سے بڑی خوبصورت بات کہی: "مرد کی عمدہ تصویر اس کی شجاعت اور جوانمردی ہے۔"

حیدر علی اس بات سے بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے مصوروں سے کہا کہ جائیے یہ بات نظام الملک حیدرآباد کو سنا دیجیے۔

ٹیپو انسان دوست اور خوش خلق حکمران تھے۔ اپنے ماتحتوں سے ان کا سلوک بہت شفقت آگیں ہوتا تھا۔ انہیں خطوط لکھتے ہوئے محبت آمیز انداز اختیار کرتے تھے۔ ان کی صحت کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس کے لیے دوائیں بھی تجویز کرتے تھے۔ اپنی فوج کے سپاہیوں کا خیال رکھتے تھے۔ طویل سفر کے بعد انہیں آرام کا وقفہ دینے کی ہدایت کرتے تھے۔ زخمیوں کے علاج کا اہتمام کرتے تھے۔ جنگ میں جاں بحق ہو جانے والے سپاہیوں کے لواحقین کو وظائف جاری کرتے تھے۔ بعض وظائف نسل در نسل جاری رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیپو اپنی فوج میں بہت مقبول تھے اور ان کے اشارے پر سپاہی جان لڑانے کے لیے تیار رہتا تھا۔

ٹیپو اصول پسند اور تحکم آمیز شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود مزاجاً بہت رحم دل اور وسیع القلب تھے۔ انہوں نے بدعہدی کے مرتکب ہونے والے اپنے اہم افسران میر صادق، پرنیا اور قمر الدین خان تک کو اس وقت معاف کر دیا جب انہوں نے معافی مانگی۔ (گو کہ یہی معافی خود ٹیپو سلطان کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوئی) تاہم مسلسل بغاوت یا غداری کرنے والوں کو ٹیپو سلطان نے معاف نہیں کیا اور سخت سزائیں دیں لیکن انہیں انسانوں کو قتل کرنے یا انہیں ایذائیں دینے کا کوئی شوق نہ تھا۔

ہم اس عظیم، دلیر، ضیاء افروز، علم پرور اور عہد ساز شخصیت کے لیے اللہ رب العزت سے رحمت اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

•••

Marfat.com

حوالہ جات

اس کتاب کے مضامین کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آبِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
آثار الصنادید: سر سید احمد خاں
آثار الکرام: حکیم سید شمس اللہ قادری
آئینہ حقیقت نما: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
اسلامی فنِ تعمیر ہندوستان میں: مولانا ہاشمی فرید آبادی
امام رازی: عبد السلام ندوی
اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان: ایم. کبیر
اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان: شیخ اے. رشید
بابر نامہ: ظہیر الدین بابر / مرزا نصیر الدین حیدر
برصغیر میں اسلامی کلچر: پروفیسر عزیز احمد
بزمِ مملوکیہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
بزمِ تیموریہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
بزمِ ثقافت ہندوستان میں: عبد المجید سالک
بزمِ صوفیہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
پشتون تاریخ کے آئینے میں: سید بہادر شاہ ظفر کاکا خیل،
سید انوار الحق جیلانی
تاریخ ابنِ خلدون: عبد الرحمٰن ابنِ خلدون / حکیم احمد عثمانی
تاریخ اسلام: رئیس احمد جعفری
تاریخ پاک و ہند: ریاست علی ندوی
تاریخ پاک و ہند: انور ہاشمی
تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ: ثروت صولت
تاریخ پشتون: سردار شیر محمد گنڈاپور، سراج احمد علوی
تاریخ پنجاب: اکرام علی ملک
تاریخ ٹیپو سلطان: محب الحسن، حامد اللہ افسر، عتیق صدیقی
تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی: خواجہ نعمت اللہ بروہی /
ڈاکٹر محمد بشیر حسین
تاریخ سلطنت خداداد میسور: محمود خان محمود بنگلوری
تاریخ سندھ: ڈاکٹر مبارک علی
تاریخ سندھ: اعجاز الحق قدوسی
تاریخ شاہی: احمد یادگار / سید نذیر نیازی
تاریخ شیر شاہی: عباس خان سروانی / مظہر علی خان ولا
تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ، ترجمہ: عبد الحی خواجہ
تاریخ فیروز شاہی: ضیاء الدین برنی / ڈاکٹر سید معین الحق
تاریخ مبارک شاہی: یحییٰ بن احمد سرہندی / ڈاکٹر آفتاب اصغر
تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت: سید ہاشمی فرید آبادی
تاریخ ملت: مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی
تاریخ ملتان: مولانا نور احمد خان آفریدی
تاریخ ملتان ذیشان: منشی عبد الرحمٰن خان
تاریخ ہند: مولوی سید ہاشمی فرید آبادی
تاریخ ہندوستان: مولوی محمد ذکاء اللہ
تقویم ہجری: ابو النصر محمد خالدی
ٹیپو سلطان: محمود بنگلوری
ٹیپو سلطان: ایم. عبد اللہ بٹ
جرنیلی سڑک: رضا علی عابدی
جغرافیہ خلافت مشرقی: عنایت اللہ / جی لی اسٹرینج
جنوبی ہند کی تاریخ: کے اے. نیل کنٹھ شاستری
جونا گڑھ: ڈاکٹر محمد اسماعیل اے. بیگ
چشمہ کوثر: شیخ محمد اکرام
حیدر علی: اقتدار حسین صدیقی / نریندر کرشن سنہا
خلاصۃ التواریخ: سجان رائے بٹالوی / ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
خلافت امویہ اور ہندوستان، اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ، ہندوستان میں
عربوں کی حکومتیں: مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
دائرۂ معارف اسلامیہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور
دربارِ ملی: شیخ محمد اکرام / ڈاکٹر وحید قریشی
دولتِ غزنویہ: مولانا محمود الرحمٰن ندوی
دی امپیریل گزیٹر آف انڈیا: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس
دی سلطنت آف دہلی: ودیادھر مہاجن
دی ہسٹری آف انڈیا: ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن
دی آکسفرڈ ہسٹری آف انڈیا: ونسنٹ اے. اسمتھ
سلطنتِ دہلی کا نظمِ حکومت: اشتیاق حسین قریشی / ہلال احمد زبیری
سفر نامہ ابنِ بطوطہ: ترجمہ: رئیس احمد جعفری
سفر نامہ ابنِ بطوطہ: ماہنامہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۴۹ء

Marfat.com

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات: خلیق احمد نظامی
سلاطین ہند کی علم پروری: محمد حفیظ اللہ
شعر العجم: شبلی نعمانی
شیر شاہ سوری: میاں عبد الرشید
طبقاتِ ناصری: منہاج السراج / غلام رسول مہر
طبقاتِ اکبری: خواجہ نظام الدین احمد / محمد ایوب قادری
عہدِ اسلامی کا ہندوستان: سید ریاست علی ندوی
عہدِ اسلامی میں علمی ترقی: ڈاکٹر این. این. لاء
عہدِ سلاطین دہلی: صلاح الدین ناسک
عہدِ غزنوی کی علمی و ادبی سرگرمیاں (مقالہ): ثروت صولت
کشمیر: چراغ حسن حسرت
کشمیر: ڈاکٹر محی الدین صوفی
کشمیر میں اشاعتِ اسلام: سلیم خان گمی
کمپنی کی حکومت: باری
گجرات کی تمدنی تاریخ: مولانا سید ابو ظفر ندوی
ماہنامہ البرہان دہلی دسمبر ۶۹ء: خصوصی مقالہ
ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۵۲ء نومبر ۵۲ء: شیر شاہ:
پروفیسر کالکارنجن قانون گو
مآثر لاہور: مولانا ہاشمی فرید آبادی
محمڈنز آف انڈیا: ڈاکٹر ٹیس
مختصر تاریخ ہند: مولانا سید ابو ظفر ندوی
مدرسہ محمود گاواں: سید محمد بیدری
مرقعِ افغان: مولوی ابرار حسین
مسلم ثقافت ہندوستان میں: عبد المجید سالک
مسلمان حکمران: رشید اختر ندوی
مسلمانانِ ہند و پاکستان کی تاریخِ تعلیم: پرفیسر سید نوشہ علی
مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت: مولانا سید مناظر احسن گیلانی
معاشری و علمی تاریخ: ڈاکٹر سید معین الحق
مقالاتِ برنی: سید حسن برنی
مقالہ جات: سید علی اصغر بلگرامی
مقالہ جات: سید محمد بیدری
مقالہ جات: مولوی مبارز الدین رفعت
مقالہ جات: مولوی عبد القادر سروری
مقالہ جات: پروفیسر ہارون خان شیروانی
مقالہ جات: اناراؤ گنا کھی
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ثروت صولت
ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ: سید محمد لطیف
منتخب اللباب: خافی خان / محمود احمد فاروقی
منتخب التواریخ: ملا عبد القادر ملوک شاہ بدایونی، ترجمہ: محمود احمد فاروقی
نشانِ حیدری: سید میر حسین علی کرمانی / محمود احمد فاروقی
نقوش لاہور نمبر، مرتبہ: محمد طفیل
ہسٹری آف میڈیول انڈیا: ایشوری پرشاد
ہندوستان کی بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: مولوی ابو الحسنات ندوی
ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر:
سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے عہدِ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری:
سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے مسلمان: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: سید صباح الدین عبد الرحمٰن
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے:
دار المصنفین اعظم گڑھ
ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس: اے. بی. ایم. حبیب اللہ
ہندی مسلم تہذیب: قاضی جاوید
یادگار محمود گاواں: مولوی شفیع الدین ایڈووکیٹ

Marfat.com

عظیم مسلمان شخصیات

رفیقانِ محمدؐ
رحمتِ دو عالمؐ کے وہ بلند مرتبت رفقائے کار جن کے بارے میں کم لکھا گیا ہے

امت کے محسنین
امتِ مسلمہ کو راہِ ہدایت دکھانے والے ائمہ اور اہل علم

صاحبانِ باصفا
راہِ ہدایت کو روشن کرنے والے صوفیا اور مصلحینِ گرامی

مسلم تہذیب کے پاسباں
اسلامی تہذیب وتمدن کے سرپرست اموی اور عباسی حکمراں

ریگزاروں کے امین
اندلس اور افریقہ کی قابلِ فخر شخصیات

ادوارِ زریں
ترکی، شام اور ایران کی نامور شخصیات

وسط ایشیا کے جواہر
علم وفن اور حکمرانی کے ماہر وسط ایشیا کے مسلمان زعما

ہند کے حکمراں
برصغیر پاک وہند کے نامور اور قابلِ فخر حکمرانوں کے حالات

ISBN: 978-969-9019-16-6